

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

# سلسلہ جدید فقہی مباحث

مع تقاریر علمائے کرام

جلد 17

تعلیم کے لئے قرض کا حصول  
علم معاشیات اور اسلامی معاشیات  
تفریح و سیاحت اور شرعی احکام و ضوابط  
ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی  
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات  
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی  
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم  
شیخ الاسلام جناب مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان

کاپی رائٹ رجسٹریشن نمبر.....  
 اسلامی فقہ اکیڈمی کی تحریری اجازت کے مطابق  
 جملہ حقوق طباعت و اشاعت بحق دارالاشاعت اردو بازار کراچی محفوظ ہیں

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات و کمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاک اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

U. Re 7  
 297-3  
 م 199 ج  
 140842  
 14

﴿..... ملنے کے پتے .....﴾

ادارۃ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی  
 مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد  
 دارالاحلاص صدف پلازہ محلہ جنگلی پشاور  
 مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور  
 کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی  
 مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی  
 بیت القرآن اردو بازار کراچی  
 بیت القلم اردو بازار کراچی  
 مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار فیصل آباد

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

ISLAMIC BOOKS CENTRE  
 119-121, HALLI WELL ROAD  
 BOLTON BL 3NE, U.K.

AZHAR ACADEMY LTD.  
 54-68 LITTLE ILFORD LANE  
 MANOR PARK, LONDON E12 5QA

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

DARUL-ULOOM AL-MADANIA  
 182 SOBIESKI STREET,  
 BUFFALO, NY 14212, U.S.A

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE  
 6665 BINTLIFF, HOUSTON,  
 TX-77074, U.S.A.

## فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

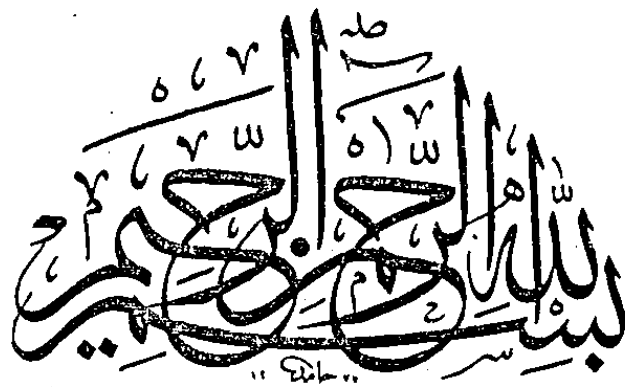
نمبر	موضوع	نمبر	موضوع
۹۷	تعلیم کے لئے قرض حاصل کرنا / مفتی محمد شوکت ثناء قاسمی	۱۹	تعلیم کے لیے قرض کا حصول
۱۰۰	جدید تعلیم اور تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مولانا محمد ارشد فاروقی	۲۰	اکیڈمی کا فیصلہ
۱۰۳	اعلیٰ عصری علوم اور قرض کا حصول / مولانا محمد ممتاز خاں ندوی	۲۱	سوالنامہ
۱۰۷	تعلیمی قرض اور احکام / مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی آواپوری	۲۱	تلخیص مقالات / مولانا سحیحی قریشی فلاحی
۱۱۰	حصول علم کے لئے سودی قرض / مفتی احمد نادر القاسمی	۳۱	عرض مسئلہ بینکوں سے تعلیمی قرض / مفتی جمیل احمد ندیری
۱۱۳	تعلیمی قرض کا حکم / مولانا محمد شاہ جہاں ندوی	۳۶	تعلیمی قرض اور ہندوستانی مسلمان / ڈاکٹر ایم آئی باگ
۱۱۷	تعلیمی قرض اور اس کے مسائل / مولانا عبد اللہ خالد لونا داڑی		سراج
۱۲۰	تعلیمی قرض اور اس کے شرعی احکام / مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی	۴۵	تعلیمی قرض / انجینئر طارق سجاد
۱۲۲	سودی قرض لے کر تعلیم حاصل کرنا / مولانا عبد اللہ انتواب	۴۹	دوبیا بینک، (تعلیمی قرض)
۱۲۵	تعلیمی قرض کا حکم / مفتی شیر علی گجراتی	۵۲	تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت / مفتی محمد صادق محی الدین
۱۲۶	تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت / مولانا مفتی فضیل الرحمن بلال	۵۴	جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے تعلیمی قرض / مفتی جمیل احمد ندیری
۱۲۷	تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مفتی محبوب علی وجیبی	۵۹	تعلیمی قرض / مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی
۱۲۸	تعلیمی قرض - مسائل و احکام / مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی	۶۳	اعلیٰ عصری تعلیم کے لئے بینکوں سے قرض حاصل کرنا / مولانا راشد حسین ندوی
۱۲۹	تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مولانا سلطان احمد اصلاحی	۷۱	تعلیمی قرض کے شرعی احکام / مفتی محمد ثناء البدری قاسمی
۱۳۰	تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت / مولانا ابوسفیان مفتاحی	۷۳	بینکوں کے تعلیمی قرض کا حکم / مولانا سید اسرار الحق سیبیلی
۱۳۱	تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مولانا نور الحق رحمانی	۷۵	تعلیمی قرض / مولانا خورشید انور اعظمی
۱۳۲	تعلیمی قرض کی حقیقت / مفتی انور علی اعظمی	۷۷	تعلیمی قرض کے سلسلہ میں شریعت کا موقف / مولانا خورشید احمد اعظمی
۱۳۳	تعلیمی قرض کی حقیقت / مفتی انور علی اعظمی	۷۹	تعلیم کے لئے بینکوں سے قرض حاصل کرنا / مولانا افتخار احمد
۱۳۵	قرض لے کر تعلیم حاصل کرنا / قاضی محمد بارون میہنگل	۸۱	تعلیم کے لئے قرض کا حصول / مولانا ریاض احمد قاسمی
۱۳۶	تعلیمی قرض اور اسلام / مولانا عبدالرحمن مفتاحی	۸۵	تعلیمی قرض، ان کی صورتیں اور احکام / مفتی محمد جعفر علی رحمانی
۱۳۸	تعلیم کے لئے قرض حاصل کرنا / مفتی سراج احمد علی		
۱۳۹	تعلیمی قرض سے فائدہ حاصل کرنا / مولانا عطاء اللہ قاسمی	۸۷	تعلیمی قرض کی حیثیت اور اس کے احکام / مولانا عبدالحفیظ
۱۴۰	تعلیمی قرض / مفتی اسماعیل بھٹو کوڈروی	۸۹	جدید تعلیم کی شرعی حیثیت / مولانا مفتی اقبال شکاروی

۲۳۱	پہلا باب تمہیدی امور	۱۳۱	تعلیمی قرض کا حصول اور اس سے استفادہ / قاضی محمد زاہد حسین قاسمی
۲۳۱	سوالنامہ: تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط	۱۳۳	تعلیمی قرض کا حکم / مولانا اشتیاق احمد اعظمی
۲۳۴	اکیڈمی کا فیصلہ	۱۳۴	تعلیمی قرض اور اس کے احکام / مولانا ارشد مدنی چپارنی
۲۳۶	تلخیص مقالات / مفتی محمد سراج الدین قاسمی	۱۳۶	تعلیمی قرض کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے / مولانا محمد ذکاء اللہ شلی، اندور
۲۷۸	عرض مسئلہ: (سوال نمبر: ۱) مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	۱۳۷	تعلیمی قرض کے مسائل / مولانا حافظ شیخ کلیم اللہ عمری
۲۸۴	عرض مسئلہ: (سوال نمبر: ۲) مفتی اشرف عباس قاسمی	۱۳۸	تعلیمی قرض اسلامی نقطہ نظر سے / مولانا محمد سلمان (کھلی)
۳۸۹	عرض مسئلہ: (سوال نمبر: ۳) ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی	۱۳۹	تعلیمی قرض کا حکم / مفتی شاہد علی قاسمی
۲۹۳	عرض مسئلہ: (سوال نمبر: ۴) مفتی اقبال احمد قاسمی	۱۵۰	تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مفتی ظہیر احمد قاسمی
۲۹۶	دوسرا باب مقالات	۱۵۱	تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مولانا اقبال احمد قاسمی
۲۹۶	تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط / ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	۱۵۳	تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت / مولانا محمد ابوبکر قاسمی
۳۱۵	سیر و تفریح - جائز وسائل اور شرعی ضوابط / ڈاکٹر سید اسرار الحق سیبیلی	۱۵۵	تعلیمی قرض کی حیثیت / مولانا مفتی لطیف الرحمن فلاحی، ممبئی
۳۲۳	تفریحی امور اور کھیل کود کے شرعی احکام / مفتی اقبال احمد	۱۵۶	عصری تعلیم کا شرعی حکم / مولانا محمد فاروق
۳۴۷	تفریح کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط / مولانا شاہ جہاں	۱۵۷	تعلیمی لون کی گنجائش ہے / مفتی عبدالرشید قاسمی
۳۵۸	تفریح، سفر و سیاحت کے وسائل اور شریعت کا موقف / مفتی حنیف حسین و مفتی محمد داؤد مانگرولی	۱۵۸	تعلیمی قرض کا شرعی حکم / مولانا محمد اشرف
۳۶۲	تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرائط و ضوابط / مفتی غلام اللہ کاوی	۱۵۹	علم معاشیات اور اسلامی معاشیات
۳۶۵	تفریح و مزاح سے متعلق شرائط و ضوابط / مفتی عبداللہ کاوی والا	۱۶۱	پیش لفظ / مولانا سیف اللہ خالد رحمانی
۳۶۹	تفریح کے ذرائع اور ان کا استعمال / مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	۱۶۲	دیباچہ / ڈاکٹر اوصاف احمد
۳۷۷	تفریح اور کھیل کود کے جائز وسائل اور اس کے شرعی ضابطے / مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی	۱۶۳	علم معاشیات تعریف، مقصد اور منہاج
۳۸۷	تفریح و مزاح - احکام و مسائل / مولانا محمد نصر اللہ ندوی	۱۷۵	معاشی نظام: اقسام، وظائف اور ماہیت
۳۹۱	تفریح و مزاح سے متعلق ضابطے / مولانا اشرف عباس قاسمی	۱۷۸	معاشی نظاموں کی تقسیم
۴۰۱	تفریح و سیاحت - احکام و مسائل / مولانا شوکت ثناء قاسمی	۱۹۵	اسلامی معاشیات ایک تعارف
۴۱۱	سیر و تفریح سے متعلق اصول و قواعد / مولانا عبدالجبار طیب	۲۰۵	ہندوستان میں اسلامی مالیات موجودہ مسائل اور امکانات
۴۱۶	مزاح و تفریح سے متعلق احکام / مفتی محمد شاہد قاسمی	۲۱۹	اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک
		۲۳۳	حواشی
		۲۳۷	تفریح و سیاحت
		۲۳۹	پیش لفظ / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵۵۰	عرض مسئلہ: (سوال نمبر ۶ تا ۱۰) مولانا رحمت اللہ ندوی	۴۲۰	سیر و تفریح کے جائز ذرائع اور شرعی ضوابط/مولانا محمد عارف باللہ قاسمی
۵۷۳	عرض مسئلہ: (سوال نمبر ۷ تا ۱۰) مفتی اقبال احمد قاسمی	۴۳۱	سیاحت و تفریح سے متعلق شرعی احکامات/مولانا محمد یوسف علی
۵۸۰	دوسرا باب تفصیلی مقالات	۴۳۵	سیر و تفریح سے متعلق شرعی ضابطے/مولانا محمد عمران ندوی
۵۸۰	ایکشن کے شرعی مسائل/مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی	۴۳۹	تفریح کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط/مولانا محمد عفان منصور پوری
۵۸۶	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل/ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی	۴۴۴	تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط/مولانا محمد رمضان علی
۵۹۸	ایکشن میں شرکت کا حکم/مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی	۴۵۶	تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط/مفتی لطیف الرحمن ولایت علی
۶۱۴	ایکشن سے متعلق اہم مسائل - اسلامی تناظر میں/مفتی راشد حسین ندوی	۴۶۱	تفریح اور اس کے جائز وسائل/مولانا محمد ارشد علی رحمانی
۶۲۴	ایکشن سے مربوط مسائل/مولانا نور الحق رحمانی	۴۶۹	تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط/مولانا محمد مغفور باندوی دہلی
۶۳۳	جمہوری حکومتوں میں ایکشن اور اس کے مسائل/مفتی اقبال احمد قاسمی	۴۷۲	سیر و تفریح سے متعلق شریعت کے ضابطے/مولانا عبید اللہ ندوی
۶۴۰	ایکشن میں حصہ داری - موجودہ تناظر میں/مفتی عبدالرحیم الحسنی لکھنوی	۴۷۸	سیر و تفریح - شرعی تناظر میں/مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی
۶۵۴	ایکشن - اسلامی تناظر میں/مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی	۴۸۲	شریعت میں تفریح و مزاح/مفتی ممتاز احمد ندوی
۶۶۴	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل/مفتی تنظیم عالم قاسمی	۴۸۷	تفریح کے جائز وسائل/مولانا محمد امداد اللہ ندوی
۶۷۴	ایکشن میں شرکت خصوصی حالات کے تناظر میں/مولانا شوکت ثنا قاسمی	۴۹۲	تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط/مولانا محمد سرفراز ندوی
۶۸۲	ایکشن کے شرعی مسائل/مفتی محمد عارف باللہ القاسمی	۴۹۷	مزاح کے شرائط/ڈاکٹر بہاء الدین محمد ندوی
۶۹۱	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل/مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی	۴۹۸	مناقشہ
۶۹۹	ایکشن سے مربوط اہم مسائل/مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان واپی سعادت	۵۰۳	ایکشن کے شرعی مسائل
۷۰۸	ایکشن اور اسلام/مولانا محمد ارشد علی رحمانی	۵۰۵	پیش لفظ/مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۷۱۵	ایکشن سے مربوط چند مسائل/مولانا محمد فاروق غفرلہ	۵۰۷	خطبہ صدارت/مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
۷۲۳	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل اور ان کا حل/مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	۵۱۰	پہلا باب تمہیدی امور
۷۳۰	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل اور ان کا حل/مولانا غلام رسول منظور القاسمی	۵۱۰	سوال نامہ: ایکشن سے مربوط شرعی مسائل
		۵۱۲	تجاویز: ایکشن سے مربوط شرعی مسائل
		۵۱۳	تلخیص مقالات/مولانا فخر عالم قاسمی و مفتی احمد نادر القاسمی

۸۲۷	جمہوری ممالک میں ایکشن اور اسلام کا نقطہ نظر / مفتی محمد نصر اللہ ندوی	۷۳۵	ایکشن میں شرکت اور اسلام کا نقطہ نظر / مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی
۸۳۲	ایکشن کے مسائل - اسلامی تناظر میں / مفتی شبیر احمد دیوبندی	۷۴۱	ایکشن میں شرکت اور ووٹ کے شرعی احکام / مولانا ریحان مبشر مٹوی قاسمی
۸۳۵	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل / مفتی سلمان پالنپوری قاسمی	۷۵۴	تیسرا باب مختصر تحریریں
۸۴۰	ایکشن سے متعلق شرعی مسائل / مولانا عبداللطیف پالنپوری	۷۵۴	ایکشن سے مربوط مسائل / قاضی عبدالجلیل قاسمی
۸۴۲	ایکشن سے متعلق شرعی مسائل - ہندوستان کے تناظر میں / مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی	۷۵۵	ایکشن میں شرکت کے مسائل / مولانا شیر علی گجراتی
۸۴۷	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل / مفتی اکمل یزدانی القاسمی	۷۵۶	ایکشن سے مربوط شرعی احکام / مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی
۸۵۰	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل / مولانا محمد عمران ندوی	۷۵۹	ایکشن سے مربوط شرعی احکام / ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی
۸۵۴	ووٹ اور اسلام کا نقطہ نظر / مفتی لطیف الرحمن ولایت علی	۷۶۲	ایکشن سے مربوط مسائل / مولانا ابوسفیان مفتاحی
۸۵۸	جمہوری نظام حکومت سے متعلق چند مسائل اور ان کا حل / مولانا محمد ابراہان خان ندوی	۷۶۵	ایکشن سے مربوط احکام / مفتی انور علی الاعظمی
۸۶۲	ایکشن میں شرکت کا شرعی حکم / ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی	۷۷۰	ووٹ کی شرعی حیثیت / مفتی محمد عبدالرحیم القاسمی
۸۶۵	ایکشن سے متعلق چند اہم مسائل / مولانا محمد ممتاز خاں ندوی	۷۷۵	ایکشن سے متعلق مسائل / مولانا بدر احمد مجیبی
۸۶۹	ایکشن سے مربوط چند مسائل / مولانا افتخار احمد مفتاحی	۷۷۹	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل / ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
۸۷۳	جمہوری ممالک میں ایکشن سے متعلق مسائل و احکام / مولانا محمد مجیب الرحمن ندوی	۷۸۳	ایکشن سے متعلق چند مسائل و احکام / مولانا اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی
۸۷۶	ایکشن سے متعلق چند اہم مسائل / قاضی محمد حسن ندوی مدھونی	۷۸۸	ایکشن سے مربوط فقہی مسائل / مفتی محمد ابوبکر قاسمی
۸۸۰	ایکشن سے متعلق مسائل / مولانا حیدر علی قاسمی	۷۹۲	ایکشن کے احکام کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں / مولانا رحمت اللہ ندوی
۸۸۴	ایکشن سے مربوط شرعی مسائل / مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۷۹۷	ایکشن سے مربوط شرعی احکام و مسائل / مولانا محمد ساجد قاسمی
۸۸۸	ایکشن میں مسلمانوں کی حصہ داری / مولانا محمد قمر عالم قاسمی	۸۰۲	ایکشن سے متعلق شرعی مسائل / مفتی عبدالرشید کانپوری
۸۹۰	ایکشن سے متعلق شرعی احکام / مفتی محمد اشرف قاسمی	۸۰۵	ایکشن سے متعلق شرعی مسائل / مولانا کلیم اللہ عمری
۸۹۲	چوتھا باب اختتامی امور	۸۰۸	جمہوری ممالک میں ایکشن سے متعلق شرعی مسائل / مفتی سہیل اختر قاسمی
۸۹۲	مناقشہ: ایکشن سے مربوط شرعی مسائل	۸۱۳	ووٹ کی شرعی حیثیت / مفتی محمد جعفر علی رحمانی
		۸۱۸	ایکشن کا مسئلہ / مولانا محمد مقصود فرقتانی
		۸۱۹	ایکشن کی شرعی حیثیت / مفتی اعجاز الحسن بانڈے القاسمی
		۸۲۲	جمہوری ممالک میں ایکشن کی شرعی حیثیت / مولانا محمد عثمان بستوی

مشیت







بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تبارک و تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت و لگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرفیولیت عطا فرمائے جو کی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ”سلسلہ جدید فقہی مباحث“ کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ”اسلامی فقہ اکیڈمی“ کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریر شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ”دانشگاہین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا“ کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا مقصد ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تسامح یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالحوں اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہو جائے بہر حال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت و اخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱..... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲..... پورے علمی ذخیرے کو از سر نو بڑے سائز میں کمپوز سیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳..... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کئی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ نمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴..... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جاسکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵..... بجز اللہ! اب ”سلسلہ جدید فقہی مباحث“ کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶..... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنادیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

”اسلام ملک فقہ اکیڈمی ہند“ ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں..... بالخصوص علماء اور دینی غیرت و فکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری و فکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ و صحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

”مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کر سکے۔..... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

## تقدیم

### شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جده

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين الصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ بیہقی نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاءنا امر ليس فيه امر ولا نهي فماذا تأمرنا فيه“

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا:

”شاو روا الفقهاء العابدین ولا تمضوا فيه برای خاص“

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجے میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تنقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

”کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔“

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت سچے علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندہ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکتے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہو جاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگا دی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شریعہ کا استنباط کر سکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کر سکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکٹریوں کے ذریعہ اس کے ترے جے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجنا کہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (ایڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطہ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہو سکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہو سکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سوڈ، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سوڈ کو جوں کا توں قبول کر لیں..... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجے میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جوئی و با مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ..... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (ایڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ ایڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی..... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چون کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ ”جس کی لاشی اس کی بھینس“ جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت، ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چونکہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموماً بلوئی کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلوئی کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہوئی ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشبیہ کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر ”جمع بین المذاہب“ اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کر لیا..... اتباع ہوئی کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

”اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔“

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباع ہوئی کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ ”جمع بین الصلوٰتین“ کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک مدت قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدت سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطہ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا..... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی بہت اور ذاتی مفاد ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مد نظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مد نظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاہب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہوئی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعہ اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہوئی، تشبیہ اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیر اور تکرار عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو..... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہرنی و باکو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے..... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یا کلھن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بچہ میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتادیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروہ فی سنبیلہ..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتادیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی..... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمد للہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے دیگر علوم و فنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت و دستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تیرہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور و توجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین



علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

## Educational Loan

# تعلیمی قرض

تعلیم کے لئے قرض کا حصول اور اس سے متعلق شرعی مسائل

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان

ب  
ا  
س  
ع  
ل  
ك  
ك  
ك  
ق  
ظ

## اکیڈمی کا فیصلہ

### تعلیم کے لئے قرض کا حصول

اکیڈمی کا اٹھارہواں سیمینار مورخہ ۲-۴ / ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸ فروری ویکم، ۲ مارچ ۲۰۰۹ء کو ریاست تملناڈو کے مشہور تجارتی شہر مدورائی میں ”جامعۃ الریحان“ کے زیر اہتمام منعقد ہوا، جس میں پورے ملک سے تقریباً ڈھائی سو علماء و مفتیان کرام نے شرکت کی، ان کے علاوہ متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین اور سری لنکا سے بھی ممتاز علماء شریک ہوئے، اس سیمینار میں موجودہ عالمی اور سماجی حالات و ضرورتوں کے پس منظر میں چار موضوعات پر بحث ہوئی اور با اتفاق رائے تجاویز منظور کی گئیں، یہ تجاویز حسب ذیل ہیں:

تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور ہر علم نافع کی اسلام نے حوصلہ افزائی کی ہے، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے فرد، سماج اور حکومت تینوں کو اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہے، اس پس منظر میں یہ سیمینار حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

ہمارے ملک میں تعلیم اتنی مہنگی ہو چکی ہے کہ ملک کے غریب شہریوں خاص کر مسلمانوں کی اکثریت کے لئے معاشی پسماندگی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کا حصول مشکل ترین امر بن گیا ہے، یہ ملک مختلف مذہبوں، زبانوں اور تہذیبوں کا گلدستہ ہے، اس میں کسی ایک طبقہ کا پیچھے جانا یقیناً قومی ترقی کے لئے نقصان دہ ہے؛ اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں اپنا موثر رول ادا کرے، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مسلمانوں کو بلا سودی قرض فراہم کرے، نیز تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسلمان بچوں کو معقول اسکالرشپ فراہم کرے اور اس کے حصول کی شرائط کو آسان کرے۔ یہ اجلاس مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے کہ:

- ۱- ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کو اولین ترجیح دیں اور اپنی آمدنی کا معقول حصہ ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں۔
- ۲- مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی نئی نسل کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر ملکی، ریاستی اور علاقائی سطح پر اطلاعی ادارہ، انجمن، سنٹر قائم کریں، جو ملک اور بیرون ملک میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع اور حکومت کی تعلیمی امدادی اسکیموں سے نئی نسل کو واقف کرائیں۔
- ۳- مختلف علوم اور کورسوں کے لئے اسکالرشپ فراہم کرنے والے اداروں، تنظیموں کے مابین رابطہ اور تعاون و اطلاعات کے تبادلہ کا نظم قائم ہو؛ تاکہ طالب علموں کو اسکالرشپ کے حصول میں سہولت ہو۔
- ۴- ریاستی اور علاقائی سطح پر ایسے تعلیمی فنڈ قائم کریں، جس سے ہونہار اور ضرورتمند بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مدد کی جاسکے۔
- ۵- عصری علوم کے ماہرین خصوصاً ریٹائرڈ اور پروفیشنل حضرات کو چاہئے کہ وہ اپنی معلومات اور تجربات سے نئی نسل کی موثر رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔
- ۶- علماء اور اصحاب ثروت کو چاہئے کہ وہ ان حضرات کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی منظم کوشش کریں۔
- ۷- مسلمانوں کے عصری تعلیمی ادارے، اخراجات میں ایسی سہولتیں فراہم کریں کہ ضرورتمند و باصلاحیت طلبہ ان سے باسانی فائدہ اٹھاسکیں، بالخصوص ڈوینشن کے بھاری اور غیر شرعی بوجھ سے مسلمان طلبہ و طالبات کو آزاد کریں، کہ یہ نہ صرف غیر اسلامی؛ بلکہ غیر انسانی طرز عمل بھی ہے۔ یہ اجلاس مسلمان طلبہ و طالبات کو تلقین کرتا ہے کہ:
- ۱- علم مؤمن کی متاع گم گشتہ ہے؛ لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ پروفیشنل علوم کو انسانی خدمت کے جذبہ سے حاصل کریں۔
- ۲- مسلمان طلبہ و طالبات کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی دینی پہچان کے ساتھ محنت اور تعلیمی مسابقت کو اپنا شعار بنائیں۔
- ۳- اپنے تعلیمی اخراجات کی تکمیل کے لئے حسب ضرورت اسکالرشپ اور غیر سودی قرض حاصل کرنے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔
- ۴- جس طرح سود کا لینا حرام ہے، اسی طرح شریعت نے سودی قرض لینے اور سود ادا کرنے کو بھی حرام قرار دیا ہے؛ اس لئے بنیادی طور پر تعلیم کے لئے سودی قرض حاصل کرنا جائز نہیں؛ البتہ اگر کسی کے پاس مالی گنجائش نہ ہو، غیر سودی قرض نہ مل پائے اور اس کے مطلوبہ تعلیم سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے طلبہ کو چاہئے کہ کسی معتبر مفتی کے سامنے اپنے حالات رکھ کر ان کے مشورہ پر عمل کریں۔ ☆☆☆

## تعلیم کے لیے قرض کا حصول

اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کسی بھی قوم کی باعزت زندگی کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے، انفرادی طور پر بھی تعلیم ایک اہم ضرورت ہے اور اجتماعی حیثیت سے بھی، نیز اسلام میں دینی تعلیم تو مطلوب ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ ہر علم نافع کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اسلام نے اس کے حصول کی ترغیب دی ہے، بد قسمتی سے اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کے غلبہ کی وجہ سے ”تعلیم“ خدمت کے بجائے ”تجارت“ بن گئی ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک کے باشندوں کے لئے تعلیم کی فراہمی اصل میں حکومت کی ذمہ داری تھی، لیکن حکومت اس ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کر رہی ہے اور زیادہ تر پرائیویٹ ادارے کمرشیل بنیاد پر تعلیم کی سہولت فراہم کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ اس صورت حال نے تعلیم کو گراں کر دیا ہے اور متوسط آمدنی کے لوگوں کے لئے ان اداروں تک رسائی دشوار ہو گئی ہے۔

ان حالات میں حکومت نے تعلیم کے لئے خصوصی قرض (Educational Loan) کا نظم کیا ہے، جس میں خاص تعلیمی مقصد کے لئے قرض دیا جاتا ہے، اور یہ قرض تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد قابل ادا ہو گا، اس قرض پر (جو نیشنلائز بینک کے واسطے سے دیا جاتا ہے) عام قرضوں کے مقابلہ میں کافی کم شرح سود عائد کی جاتی ہے، حکومت کا دعویٰ ہے کہ یہ قرض ..... جو طویل مدت کے لئے کم شرح سود پر دیا جاتا ہے ..... اس کا مقصد سود حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ تعلیم میں تعاون کرنا ہے، اس پس منظر میں درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

- ۱- جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟
- ۲- سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے، نیز حکومت کا ادعا ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں، تو کیا اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کیا جاسکتا ہے؟
- ۳- اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، تو کیا اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟
- ۴- اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے، لیکن اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کیا والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے صاحب استطاعت سمجھا جائے گا، یا قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا؟
- ۵- اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود وہ فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں تو کیا ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟



## تعلیم کے لئے قرض کا حصول

مولانا تحسینی قمر اثری فلاحی

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اٹھارہویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ”تعلیمی قرض“ ہے۔ اس موضوع پر اکیڈمی کو اب تک ۳۵ مقالات موصول ہو چکے ہیں۔ مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا شاجہاں ندوی، حافظ شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا محبوب علی وجیبی، مولانا راشد مدنی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا عبداللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولوی ریحان بشر قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا عبدالنواب انادی، مولانا جمیل احمد ندیری، مولانا اقبال شکاروی، مفتی محمد جعفر علی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا شیر علی ترکیسری، مولانا محمد فاروق، مولانا عبدالحفیظ، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی۔

فاضل مقالہ نگاروں کے مقالات کی روشنی میں سوالنامہ کے جوابات کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے:

سوال نمبر ۱: جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کا کپارویہ ہونا چاہیے؟  
جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کا حکم

مقالہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول فرض کفایہ ہے۔

[مولانا شاجہاں ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا عبدالنواب انادی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبدالحفیظ، مولانا محمد فاروق]۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

### قرآنی آیات:

{قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون} (الزمر: ۹)۔

{وعلم آدم الأسماء كلها} (البقرہ: ۳۱)۔

{وعلمناه صنعة لبوس...} (الانبیاء: ۸۰) اس آیت کے ذیل میں تفسیر قرطبی (۱۱، ۳۲۰) [مولانا شاجہاں ندوی]

{يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين أوتوا العلم درجات} (المجادلہ: ۱۱)۔

### احادیث:

”طلب العلم فريضة على كل مسلم“ (ابن ماجہ، فی المقدمة، باب فضل العلماء: ۲۲۴)۔

”من سلك طريقاً يلتمس فيه علماً سهل الله له طريقاً إلى الجنة“ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)۔

”اطلبوا العلم ولو بالعين“ (ابن ماجہ: کتاب العلم)۔ مولانا مظاہر حسین قاسمی۔

”الحکمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو أحق بها“ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ۱:۲۴۴)۔

”أمرني رسول الله ﷺ أن أتعلم السريانية“ (أخرجه البخاري في الأحكام تعليقاً وأبو داود في العلم: ۲۶۳۱۶)۔

اقوال صحابه:

حضرت عائشہؓ کا قول: ”العلم ضالة المؤمن فخذ ولو من المشركين“ (الترتيب الإداري للنكتاني ۲:۲۳۸) [مولانا شاہجہاں ندوی]۔

فقہی عبارتیں:

”أما فرض الكفاية من العلم، فهو كل ما لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب“ (رد المحتار نقلاً عن تبيين المحارم ۱:۱۲۶)۔

”فيتناول ما هو ديني كصلاة الجنازة ودينوي كالصناعات المحتاج إليها“ (رد المحتار ۱:۱۲۶)۔

آراء علماء و مفکرین:

امام غزالی تحریر فرماتے ہیں:

”فالعلوم التي ليست بشرعية تنقسم إلى ما هو محمود، وإلى ما هو مذموم، وإلى ما هو مباح. فالمحمود ما يرتبط به مصالح أمور الدنيا، كالطب والحساب، وذلك ينقسم إلى ما هو فرض كفاية، وإلى ما هو فضيلة، وليس بفرض: أما فرض الكفاية فهو علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا، كالطب إذ هو ضروري في حاجة بقاء الأبدان، والحساب فإنه ضروري في المعاملات، وقسمة والوصايا والمواثيق وغيرهما... فإن أصول الصناعات أيضاً من فروض الكفایات كالزراعة والحياكة والسياسة، بل الحياطة والخياطة، فإنه لو خلا البلد من الحجام تسارع الهلاك إليهم... وأما ما يعد فضيلة، لا فريضة، فالتعمق في دقائق الحساب، وحقائق الطب وغير ذلك مما يستغنى عنه، ولكنه يفيد زيادة قوة في القدر المحتاج إليه، وأما المذموم فعلم السحر والطلسمات وعلم الشعبة والتلبسات، وأما المباح منه، فالعلم بالأشعار التي لا يسف فيها، وتواريخ الأخبار، وما يجري مجراه“ (أحياء علوم الدين ۱:۲۴، دار الكتب العلمية، بيروت: ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۲ء)۔

[مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا شوکت شاہ، مولاانا راشد حسین، مولانا راشد حسین ندوی]۔

علامہ یوسف القرضاوی ”مشکلۃ الفقر وکیف عالجها الإسلام“ میں رقم طراز ہیں:

”وليس العلم المطلوب محصوراً في علم الدين وحده، بل كل علم نافع يحتاج إليه المسلمون في دنياهم فإن تعلمه فرض كفاية كما قرر الغزالي والشاطبي وغيرهما من العلماء“ (۱۰۹)۔ [دیکھئے مقالہ: مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی]۔

معروف عالم اور فقیہ علامہ و سید زین العابدین فرماتے ہیں: ”يختلف الحكم التكليفي تبعاً لفائدة العلم والحاجة إليه، فمنه ما تعلمه فرض ومنه ما هو محرم، والفرض منه ما هو فرض عين ومنه ما هو فرض كفاية، فمن العلوم التي تعلمها فرض عين تعلم ما يحتاجه الإنسان من علم الفقه والحقيدة، قال ابن عابدين نقلاً عن العلامي من فرائض الإسلام: تعلم ما يحتاج إليه العبد في إقامة دينه وإخلاص عمله لله تعالى ومعاشرته عباده وفرض على كل مكلف ومكلف بعد تعلمه علم الدين والهداية تعلم علم الوضوء والغسل والصلاة والصوم، وعلم الزكاة لمن له نصاب والحج لمن وجب عليه والبيوع على التجارة ليحترزوا عن الشبهات والمكروهات في سائر المعاملات وكذا أهل الحرف وكل من اشتغل بشيء يفرض عليه علمه وحكمه ليمتنع عن الحرام فيه“۔

140192

وأما العلوم التي هي من فروض الكفاية فهي العلوم التي لا بد للناس منها في إقامة دينهم من العلوم الشرعية كحفظ القرآن والأحاديث وعلومهما والأصول والفقه واللغة والتصرف ومعرفة رواة الحديث والإجساء والخلاف.

ومن فروض الكفاية أيضاً: العلوم التي يحتاج إليها في قوام أمر الدنيا كالطب والحساب والصنائع التي هي سبب قيام مصالح الدنيا كالخياطة والفلاحة“ (الموسوعة الفقهية ۲۰۰۲-۲۰۰۳ بحوالہ ابن عابدین والمجموع ۲۶۶-۱۰۲)۔  
[دیکھئے مقالہ: مولانا مظاہر حسین نماد القاسمی]۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کو فرض کفایہ کی اصطلاح نہ استعمال کرتے ہوئے ناگزیر اور ضروری قرار دیا ہے۔

[مولانا محبوب علی وجیبی، مولانا ارشد مدنی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مفتی انور علی اعظمی]۔

جبکہ بعض دوسرے مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ مستحسن اور باعث اجر و ثواب ہے۔

[مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا عبدالرحمن قاسمی، مفتی محمد جعفر نئی]۔

مولانا شاہد علی قاسمی کا خیال ہے کہ یہ واجب لغيرہ ہے۔

مولانا کلیم اللہ عمری اور مولانا افتخار احمد مفتاحی کی رائے ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول مشروع ہے، البتہ علوم شرعیہ پہلے نمبر پر ہیں، ان کے بعد ہی جدید علوم کا نمبر آتا ہے۔

مقالہ نگاروں کی ایک جماعت نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول جائز ہے۔

[مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا جمیل احمد ندیری، مولانا خورشید احمد اعظمی]۔

قاضی ہارون مینگل صاحب کے مطابق یہ تعلیم اگر دین اور اسلامی خدمت و مد نظر رکھتے ہوئے حاصل کی جائے تو جائز ہے۔

مولوی ریحان مبشر قاسمی نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس تعلیم کے حصول میں حدود شرع کی پابندی ضروری ہے۔

اور مولانا اقبال ٹیکاروی کی رائے میں یہ تعلیم صحیح نیت کے ساتھ ہی جائز ہوگی۔

ان تمام ہی حضرات نے اپنی رائے کی دلیل کے طور پر جو نصوص اور عبارات پیش کی ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جنہیں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ بعض حضرات نے ”الأصل في الأشياء الإباحة“ کے اصول سے بھی استدلال کیا ہے۔

سوال نمبر ۲: سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت

کے لئے دیا جاتا ہے، نیز حکومت کا ادعا ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں، تو کیا اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

[مولانا شاہجہاں ندوی، حافظ شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا مظاہر حسین نماد القاسمی، مولانا ارشد مدنی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا محبوب علی وجیبی، مولانا ارشد مدنی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا اقبال احمد قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا عبدالرحمن قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولوی ریحان مبشر قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا جمیل احمد ندیری، مولانا اقبال ٹیکاروی، مفتی محمد جعفر نئی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا عبدالغنیظ]۔  
ان حضرات نے اس رائے کی تائید میں درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

احادیث: ..... ”كل قرض جز نفعاً فهو ربا“ [مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ارشد مدنی، مولانا مظاہر حسین نماد القاسمی، مولانا ارشد مدنی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا محبوب علی وجیبی، مولانا ارشد مدنی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا اقبال احمد قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا عبدالرحمن قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولوی ریحان مبشر قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا جمیل احمد ندیری، مولانا اقبال ٹیکاروی، مفتی محمد جعفر نئی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا عبدالغنیظ]۔

الربا) ”ما أسكر كثيره فقليله حرام“ (السنن الكبرى للنسائي ۴، ۱۸۶، رقم الحديث ۵۸۲۰)۔

فقہی عباراتیں: ..... ”الشبهة كالحقيقة في باب الربا“ [مولانا محمد سلمان کھلی]۔ ”كل قرض جز نفعاً حرام أي إذا كان

اصول:..... ”ما حرم كشيده حرم قليله“ [مولانا محمد ہارون مینگل]۔ ”ما كان سبباً لحرام حرام“ (موسمۃ قواعد الفقہیہ ۲، ۹۱۴، رقم القاعدہ: ۲۱۰۶)۔

آراء علماء:..... مولانا تقی عثمانی قرآن کی آیت {یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا إن کنتمہ مؤمنین} کے بعد لکھتے ہیں: ”إنہ أمر بترك كل مقدار من الربا دون أى تفصیل بین القلیل والكثیر“ ایسے ہی دوسری آیت {وحرم الربوا} کے بعد لکھتے ہیں: ”فإنہ يدل على أن الربوا حرام مطلقاً ولا فرق بین قليله وكثيره“ (تكملة فتح الملهم ۵۶۷، ۵۶۸)۔

دیگر:

مولانا اسرار الحق سبیلی نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ عام طور پر قومیائے ہوئے بینک تعلیمی قرض پر دس تا بارہ یا چودہ فیصد سود وصول کرتے ہیں اور کرنٹ اکاؤنٹ کھاتہ داروں اور سیف لاکر سے استفادہ کرنے والوں سے آدھا فیصد سروس چارج کے نام پر وصول کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تعلیمی قرض پر عائد ہونے والے دس تا بارہ یا چودہ فیصد شرح سود کو کسی صورت میں سروس چارج شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ حقیقت میں سود (ربا) ہی ہے۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی نے اپنی رائے کے حق میں درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

الف۔ سروس چارج کی رقم غیر معمولی نہیں ہوتی، جبکہ بینک ان قرضوں پر بارہ فیصد شرح سود عائد کرتا ہے، اس اعتبار سے اگر کوئی شخص چار لاکھ روپے پانچ سال کے لئے لے رہا ہے تو سود کی مجموعی رقم اصل رقم کے نصف سے بھی زائد ہو جائے گی۔

ب۔ سروس چارج کی رقم کسی چیز پر سالانہ فیصد کے لحاظ سے نہیں لی جاتی ہے، جبکہ اس قرض پر ہر سال بارہ فیصد کے لحاظ سے رقم لی جاتی ہے۔

ج۔ ایک ہی چیز پر سروس چارج کے نام سے ڈبل رقم نہیں لی جاتی ہے، جبکہ بینک قرض جاری کرتے وقت سروس چارج کے نام سے مجموعی قرض کی رقم سے دو فیصد کے لحاظ سے رقم وصول کرتا ہے۔ بینک بھی تعلیمی قرض کی کم شرح سود کو سروس چارج تسلیم نہیں کرتا، بلکہ بینک اور ماہرین بھی اس کو سود ہی مانتے ہیں۔ البتہ بینک تعلیمی قرض پر یہ رعایت دیتا ہے کہ شرح سود سالانہ عائد کرتا ہے اور سالانہ شرح سود کی جو رقم ہوتی ہے اس کو اصل رقم کے ساتھ جوڑ کر اس پر سود نہیں لگاتا، بلکہ ہر سال کی شرح سود کا حساب الگ رہتا ہے، لیکن یہ سہولت تعلیم کے ختم ہونے کے ایک سال بعد یا تعلیم کی تکمیل اور ملازمت کے ملنے کے چھ ماہ بعد تک رہتی ہے، اس کے بعد وہ ساری رقم ایک ساتھ ملا دی جاتی ہے، اب اس کے بعد ادائیگی نہیں کی گئی یا ادائیگی میں تاخیر کی گئی تو مجموعی رقم پر سود لگایا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ تعلیمی قرض جو زیادہ مدت کے لئے کم شرح سود پر جاری کیا جاتا ہے اس میں اصل رقم سے زائد جو رقم ہوتی ہے وہ سود ہے اور شریعت میں سود حرام ہے، خواہ وہ سود مفرد ہو یا مرکب۔

مولانا شاہد علی قاسمی کے مطابق تعلیمی قرضوں پر بینک جو معمولی سود لیتا ہے اس کو سروس چارج قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ وہ سود ہی سمجھا جائے گا، کیونکہ جتنا زیادہ قرض لیا جاتا ہے اسی حساب سے سود میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس شرح سود میں کچھ تبدیلی کر کے اگر اسے سروس چارج کی شکل دے دی جائے تو یہ جائز ہوگا۔

[مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی]۔

مولانا ناراشد حسین ندوی صاحب کے الفاظ میں: ”البتہ اگر اس میں تبدیلی کر دی جائے اور سالانہ یا ماہانہ اضافہ کرنے کے بجائے دفتری مصارف کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھاک حساب کر کے ان کو یک لخت مقبرہ کر دیا جائے، وصولی خواہ قسط وار ہی کی جائے تو اس کو سروس چارج قرار دیا جاسکتا ہے اور شرعاً جواز کا حکم لگایا جاسکتا ہے، اس صورت میں یہ گنجائش بھی رہے گی کہ اس سروس چارج کو قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے مربوط کر دیا جائے، یا ہر قرض پر یکساں چارج لگایا جائے، یعنی سروس چارج وصول کرنا بھی جائز ہے اور اس کو فیصد نہ منسوب کرنا بھی جائز ہے۔“

اس رائے کی تائید میں ان حضرات نے درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

”يستحق القاضى الأجر على كتب الوثائق أو المحاضر أو السجلات قدر ما يجوز لخيره كالمفتي“ (رد مختار ۶۸، الرد ۱۲۷)۔



”قرض جاری کرنے اور اس کا حساب کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئے ہیں۔

لہذا دلال کے کمیشن پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلہ میں قرض کے اجراء پر آنے والے دفتری اخراجات کو قرض کی مقدار پر فیصد سے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا جائے گا“ (مفتی تقی عثمانی صاحب: فقہی مقالات ۱/۲۷۶)۔

بعض مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس کم شرح سود کو سروس چارج یا اجرت خدمت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

[مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالنور انادی، مولانا محمد فاروق]۔

مولانا لطیف الرحمن فلاحی نے دلیل کے طور پر لکھا ہے کہ اس پر مفتی اعظم نظام الدین صاحب کا فتویٰ بھی موجود ہے (فتاویٰ نظام الدین ۱۱۸)۔

مولانا عبدالرشید قاسمی لکھتے ہیں کہ حکومت غیر مسلم ہے، وہ سود کی قباحت کا اعتقاد نہیں رکھتی، ورنہ شاید اس کا نام سود نہ رکھا جاتا اور تعلیمی قرض کے ضابطے بھی سود جیسے نہ بنائے جاتے، نیز خود حکومت کا ادعاء ہے کہ اس قرض کا مقصد سود کمانا نہیں ہے، ایسے حالات میں اگر اس کم شرح سود کو ”الاھور بمقاصدھا“ کے تحت سروس چارج پر محمول کر لیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کے خلاف ان کو ہر میدان میں کمزور اور پیچھے رکھنے کی منصوبہ بند کوششیں ہو رہی ہوں۔

مولانا عبدالنور انادی اپنے مقالہ میں رقم طراز ہیں: ”سوالنامہ میں مذکور تعلیمی قرض پر شرح سود کو اگر اجرت خدمت مان لیا جائے تو بھی کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ وہاں پر لکھنے پڑھنے، کاغذات کی حفاظت اور پیسوں کے لین دین کا عمل خود موجود ہے اور عمل پر اجرت دینا کوئی معیوب بات نہیں ہے، بلکہ اجرت عمل بہر حال جائز ہے۔

صورت مسئولہ کو خواہ قاضی کی اجرت کتابت و تالیق اور مفتی کی کتابت فتویٰ پر قیاس کیا جائے یا اسے اجرت دلال پر قیاس کیا جائے، بہر دو صورت عمل پائے جانے کی وجہ سے صورت مسئولہ کو اجرت خدمت پر محمول کیا جانا چاہئے، کیونکہ اجرت دلال کا جواز بھی عمل ہی ہے۔“

اس کی تائید میں مختلف فقہی عبارتیں نقل کرنے کے بعد انہوں نے مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے: ”دونوں طرف سے دلالی جائز ہے جبکہ عرف ہو، اصلہ دلالی کا معاملہ ناجائز ہے، مگر حاجت اور عرف کی بنا پر فقہاء نے اجازت دی ہے اور یہ اجازت اپنے عموم کی حیثیت سے ایک طرفہ دو طرفہ سب کو شامل ہے، خواہ اس طرح کہ فی صد دن روپیہ یا فی صد ماہ ایک آنہ اجرت مقرر کی جائے، وہ اجرت درست ہے جس قدر بھی ہو“ (فتاویٰ محمودیہ ۱۸/۶۱۷-۶۱۹)۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں: ”دلالی کی اجرت میں مفتی بقول یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور فی صد کے حساب سے بھی سمرہ کی اجرت لینا جائز ہے“ (انعام الباری ۱۶/۳۵۷)۔

”مذکورہ عبارات و فتاویٰ سے مستفاد ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں قرض پر برہتی ہوئی رقم کو اجرت عمل، اجرت خدمت پر محمول کیا جائے گا، اسے سود کہنا ہی غلط ہے، کیونکہ سوالنامہ میں درج حکومت کا پہلا قول قول ثانی سے باطل ہو جاتا ہے، لہذا وہ سود ہے ہی نہیں، اسے سود نہیں کہا جائے گا“۔ [دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالنور انادی]

مولانا سلطان احمد اصلاحی لکھتے ہیں: ”تعلیمی قرضوں کے لئے سرکاری بینکوں سے استفادہ کرنے میں حکومت کی اس وضاحت کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے کہ اس پر لیا جانے والا اضافہ سود نہیں بلکہ سروس چارج ہے..... ان سے استفادہ میں ان کی اصل حیثیت کو مد نظر رکھا جانا مناسب ہے۔“

سوال نمبر ۳: اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، تو کیا اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکیڈمی کو دو طرح کی آراء موصول ہوئی ہیں۔ مقالہ نگاروں کی تقریباً نصف تعداد کا خیال ہے کہ دوسرا کوئی نظم نہ ہونے کی صورت میں ایسے شخص کے لئے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

[مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا محبوب علی دجیبی، مولانا افتخار احمد مقاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا

اقبال احمد قاسمی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا عبدالنواب انادی، مولانا جمیل احمد نذیری، مولانا اقبال احمد نیکاروی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا محمد فاروق۔ ان حضرات نے اپنی رائے کے حق میں ذریعہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

قرآن: { لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها } (البقرہ: ۲۸۶)۔

فقہی عباراتیں:

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: لیکن اگر حکومت کم شرح سود کے بغیر نظم نہیں کرتی ہے تو اپنے جائز حق تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے مسلم طلبہ کا سود کی رقم دینا جائز ہوگا، اس صورت میں گناہ سود خور پر ہوگا، نہ کہ سود دینے والے پر، چنانچہ فقہاء نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے، یا ظلم و ضرر کو دور کرنے کے لئے رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۳۵۸/۸، نہایۃ المحتاج للفرلی ۲۳۶/۸)۔

”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (البحر الرائق: باب الربا: الأشباه والنظائر: ۱۱۵)۔

اصول:

”فرض کفایہ متعین افراد کی نسبت سے فرض عین بن جاتا ہے“ [دیکھئے مقالہ: مولانا سلطان اصلاحی]۔

”الضرورات تبيح المحظورات“ (الأشباه والنظائر: القاعدة الخامسة، الضرر يزال)۔

”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة“ (الأشباه والنظائر: القاعدة الخامسة، الضرر يزال)۔

لہذا اگر عصری علوم و فنون کی ضرورت کو شرعی ضرورت کے زمرہ میں شامل نہ بھی کیا جائے، شرعی حاجت کے قبیل سے تو ضرور ہو سکتا ہے، اور شرعی حاجت بھی بسا اوقات ضرورت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، موجودہ زمانہ کے حالات اور تقاضہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ عصری علوم و فنون کی ضرورت شرعی ضرورت نہیں تو شرعی حاجت میں داخل ہے اور اس حاجت کو علوم کی عمومی و خصوصی ضرورتوں کے پیش نظر شرعی ضرورت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ [مولانا شوکت ثناء قاسمی]

”إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“ (الأشباه والنظائر: ۱۳۵)۔

اس سوال میں صورتحال یہ ہے کہ اگر اس اسکیم سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اعلیٰ تعلیم سے محرومی ہوگی، جو ایک مفسدہ ہے، اور اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کی جائے تو یہ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے بغیر ممکن نہیں، ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک مفسدہ ہے۔ غور کیا جائے کہ پہلی شق یعنی اعلیٰ تعلیم سے محرومی کا مفسدہ بڑا مفسدہ ہے، اس لئے اس کی رعایت کرتے ہوئے چھوٹے مفسدہ کا ارتکاب یعنی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا۔ [مولانا شاہد علی قاسمی]

”وأما الحاجيات معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المؤدى في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بغوت المطلوب“ (الموافقات: ۳۰۵)۔

مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں: ”اضطرار دو قسم کا ہوتا ہے، ایک اضطرار انفرادی و شخصی اور ایک اضطرار اجتماعی و قومی، پس جس طرح ”ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ کے تحت اضطرار شخصی اور انفرادی میں سودی قرض لے کر سود دینے کی اجازت ہے، اسی طرح اضطرار اجتماعی و قومی میں بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی (جدید فقہی تحقیقات ۳۷۲/۴)۔ [مولانا عبداللہ خالد]۔

”قال الحموی: ههنا خمسة مراتب: ضرورة وحاجة ومنفعة وزينة وفضول، فالضرورة بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب وهذا ذبيح تناول الحرام والحاجة كالجائع الذى لو لم يجد ما يأكله لم يهلك غير أنه يکون فى جهد ومشقة، وهذا لا يبيح الحرام ويبیح الفطر فى الصوم“ (حاشية الأشباه والنظائر: ۱۰۸)۔

ضرورت و حاجت کی اس تعریف سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جدید تعلیم کا حصول اگرچہ ضرورت کے درجہ میں نہیں ہے لیکن حاجت کے درجہ میں ضرور شامل ہے، کیونکہ عبادت الہی کے لئے دینی علوم کا بقدر ضرورت ہر مسلمان کا سیکھنا فرض اور ضروری ہے، تو معاشی اور سیاسی ضرورت اور اسلام کی طرف سے دفاع کے لئے صحیح نیت کے ساتھ جدید علوم کا سیکھنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے [دیکھئے مقالہ: مولانا اقبال احمد نیکاروی]

بقیہ مقالہ نگار حضرات کی رائے کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لئے اس صورت میں بھی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

[مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ناراشد حسین ندوی، مولانا ممتاز خان ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عبدالحی قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولوی ریحان مبشر قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی محمد جعفر علی، مولانا عبدالحفیظ]۔  
ان حضرات نے اپنی رائے کی تائید میں درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

قرآن: ..... {یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذرّوا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین۔ فیان لم تفعّلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسوله} (سورہ البقرہ: ۲۹-۳۸)۔ {أحلّ اللہ البیع وحرّم الربوا} (سورہ البقرہ: ۲۹)۔ {لا یكلف اللہ نفساً إلا وسعها} (القرآن)۔ اور شریعت ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتی جو ناگزیر ہوں۔ [قاضی محمد ہارون مینگل]۔

حدیث: ..... ”لعن اللہ آکل الربا وموكله وشاهديه وكاتبه وقال: هم سواء“ (مسلم)۔

اصول: ..... ”لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات“ (الاشباه والنظائر: ۸)۔ جدید تعلیم کی تحصیل فرض کفائی ہے اور سود کے لین دین سے بچنا فرض عین ہے، لہذا فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفائی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ شریعت اسلامیہ نے مامورات سے زیادہ منہیات کی جانب اعتناء کیا ہے۔ [دیکھئے مقالہ: مفتی محمد جعفر علی رحمانی]۔

دیگر: ..... اعلیٰ تعلیم کے لئے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے عدم جواز کی دلیل اکثر حضرات نے یہ دی ہے کہ یہ نہ ضرورت کے درجہ میں ہے اور نہ ہی حاجت کے درجہ میں۔ [مولانا محمد ممتاز خان ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عبدالحی قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولوی ریحان مبشر قاسمی]۔

اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولوی ریحان مبشر قاسمی لکھتے ہیں: ”شریعت میں ضرورت کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن ہر ضرورت معتبر نہیں، بلکہ اس کے کچھ ضوابط و شرائط ہیں۔ علامہ تقی عثمانی اس سلسلہ میں دو شرائط بیان کرتے ہیں:

۱- ”أن تكون الضرورة قائمة لا منتظرة. فيحصل في الواقعة خوف الهلاك أو التلف على النفس أو المال“۔

۲- ”أن لا يكون لدفع الضرر وسيلة أخرى من المباحات، ويغلب على ظن المبتلى به أن دفع الضرر ممكن بارتكاب بعض المحرمات“ (المصباح: ۵۵۸، اتحاد بکذب، دیوبند)۔

ان مذکورہ بالا تفصیل سے پتہ چلا کہ تعلیمی سلسلہ میں سودی قرض لینے کے حق میں ضرورت کا تحقق نہیں، اس لئے سودی قرض لینا شرعاً ناجائز و حرام ہوگا۔

پھر حاجت کی تعریف کرتے ہوئے وہ ثابت کرتے ہیں یہ حاجت کے دائرہ میں بھی نہیں آتا، وہ لکھتے ہیں: ”حاجت کا اعتبار اسی جگہ ہوگا جہاں نص نہ ہو، اور اگر ہو تو نص کی مخالفت لازم نہ آئے، دوسری شرط یہ ہے کہ حاجت کا اعتبار خود شریعت نے کیا ہو۔“ ”أن تكون نصوص القرآن والسنة صرحت بنفسها باعتبار تلك الحاجة، مثل إباحة لبس الحرير للرجال في المرض والحرب۔“

أن يكون أصل الحكم محتملاً، غير صريح في الكتاب والسنة، أو مجتهداً فيه، فحينئذ ترجح الإباحة في مواضع الحاجة، ذلك مثل: كشف المرأة عن وجهها، وأما في المسائل المنصوصة القطعية التي ليست محل اجتهاد، فالظاهر أن الحاجة لا تؤثر فيها، إلا إذا بلغت منزلة الضرورة، لأن الحاجة إذا كانت عامةً، فإنها تنزل منزلة الضرورة (المصباح: ۵۵۰)۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: المشقة والخرج، وإنما يعتبران في موضع لا نص فيه، وأما مع النص بخلافه فلا، فلذا قال أبو حنيفة ومحمد بجرمة رعي حشيش الحرم وقطعه إلا الإذخ، وجوز أبو يوسف رعيه للحرج ورد عليه بما ذكرناه“ (الاشباه والنظائر: ۲، دار الكتب العلمية، بيروت)۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ عصری تعلیم کے حوالہ سے سودی قرض لینے میں حاجت کا تحقق نہیں ہوتا، اس لئے سودی قرض لینا شرعاً ناجائز و حرام ہوگا۔

[دیکھئے مقالہ: مولوی ریحان میشر قاسمی]۔

مولانا محمد ارشد مدنی کا خیال ہے کہ چونکہ اعلیٰ تعلیم کا حصول فرض نہیں ہے اس لئے اس کی خاطر قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔  
سوال نمبر ۴: اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے، لیکن اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کیا والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے صاحب استطاعت سمجھا جائے گا، یا قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا؟  
اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ والد کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں طالب علم بھی مستطیع سمجھا جائے گا۔  
[مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا اسرار الحق سیبلی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا اقبال ننگاروی، مولانا محمد فاروق]۔

ان حضرات نے اپنی رائے کے حق میں درج ذیل دلائل ذکر کئے ہیں: ”و کذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنثی مطلقاً، وزمن... و طالب علم لا يتفرغ لذلك“ (الدر المختار ۵۰۲۲)۔

رد المحتار میں اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ”حاصله أن السلف قالوا بوجوب نفقته على الأب، لكن أفتى أبو حامد بعدهم لفساد أحوال أكثرهم، ومن كان بخلافهم نادر في هذا الزمان، فلا يفرد بالحكم، دفماً لخرج التمييز بين المصلح والمفسد، قال صاحب القنية: لكن بعد الفتنة العامة: يعني فتنة التتار، التي ذهب بها أكثر العلماء والمتعلمين، نرى المشتغلين بالفقه والأدب، الذين هما قواعد الدين، وأصول كلام العرب، يمنعهم الاشتغال بالكسب عن التحصيل، ويؤدي إلى ضياع العلم والتعطيل، فكان المختار الآن قول السلف، وهفوات البعض لا تمنع الوجوب“ (رد المحتار ۵۰۲۲-۲۲۳)۔

”إذا كان الابن في حضنة أمه، لم يمنع من الاختلاف لأبيه يعلمه، لأن للأب تعليمه وتأديبه وإسلامه في المكتب والصنائع“ (التاج والإكليل للمواق ۲۰۲۱۵)۔

”وان اختارها- أي الأم- ذكر، فعندها ليلاً، وعند الأب فهاراً، يعلمه الأمور الدينية والدنيوية، على ما يليق به، ويسلمه للمكتب- وهو اسم للموضع الذي يتعلم فيه- وذی حرفة، يتعلم من الأول الكتابة، ومن الثاني الحرفة على ما يليق بحال الولد“ (مغنی المحتاج ۲۰۲۵۸)۔

”وإذا استغنى الغلام عن الخدمة أجزى الأب أو الوصي أو الولي على أخذه؛ لأنه أقدر على تأديبه وتعليمه“ (رد المختار، نقلاً عن شرح المجموع ۵۰۲۶۸)۔

”وعن أبي يوسف أنه اعتبر القدرة على النفقة دون المهر، لأنه تجرى المساهلة في المهر ويعد المهر قادراً عليه بيسار أبيه“ (هدايه مع الفتح ۳۰۱۹۲)۔

”وفي المجتبى البالغ إذا كان عاجزاً عن الكسب وهو صحيح فنفقته على الأب، وهكذا قالوا في طالب العلم إذا كان لا يهتدى إلى الكسب لا تسقط نفقته عن الأب بمنزلة الزمن والأنثى“ (البحر الرائق ۲۰۲۱۸)۔

مولانا لطیف الرحمن فلاحی نے اس کے لئے طالب علم میں دو شرطوں کے پائے جانے کو ضروری قرار دیا ہے:

- ۱- وہ طالب علم ”علم نافع“ کے حصول کا ارادہ رکھتا ہو، علم رکھ کر ایک اور علم فلاسفہ میں مشغول نہ ہو۔
- ۲- وہ واقعی علم نافع میں اپنے اوقات لگا بھی رہا ہو، اور پوری یکسوئی سے اس کے حصول کی کوشش میں مصروف ہو۔

اس رائے کے حق میں انہوں نے فتاویٰ ہندیہ کی یہ عبارت پیش کی ہے: ”الذكور من الأولاد إذا بلغوا حد الكسب ولم يبلغوا في أنفسهم بدفعهم الأب إلى عمل ليكسبوا أو يؤاجرهم وينفق عليهم من أجرهم وكسبهم، وقال الإمام الحلواني إذا

كان الابن من أبناء الكرام ولا يستأجره الناس فهو عاجز وكذا طلبه العلم إذا كانوا عاجزين عن الكسب لا يهتدون إليه لا تسقط نفقتهم عن آباءهم إذا كانوا مشغولين بالعلوم الشرعية لا بالخلافات الركيكة وهذيان الفلاسفة ولهم رشد وإلا لا تحب“ (۱۰۵۳)۔

اس کے برخلاف مقالہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ والد کے صاحب استطاعت ہونے سے طالب علم مستطیع نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اس کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا۔ اس رائے کے حاملین کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

[حافظ شکیہ الشعمری، مولانا ابوسفیان مقاسمی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا محبوب علی وجیہی، مولانا راشد مدنی، مولانا افتخار احمد مقاسمی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولوی ریحان مہر قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبدالنور اناری، مولانا جمیل احمد ندیری، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مولانا سلطان احمد اصلاحی]۔

ان حضرات نے اپنی رائے کے حق میں درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

”إن الطفل يعد غنياً يعني أبيه، بخلاف الكبير فإنه لا يعد غنياً بغني أبيه“ (حاشیة ابن عابدین ۳۰۲۷)۔

”أما الكبار، فعلى الظاهر كما سيأتي، وإن لم يكونوا عاجزين، لا نفقة لهم“ (فتح القدير، كتاب الطلاق ۳۰۲۷)۔

”ولا إلى طفله بخلاف ولده الكبير (إني) فيجوز لانتفاء المانع (قوله لانتفاء المانع) علة للجُميع، والمانع أن

الطفل يعد غنياً بغني أبيه“ (شامی ۲، ۷۷۲، فتاویٰ ہندیہ ۱۰۱۸۹)۔

مفتی محبوب علی وجیہی لکھتے ہیں: ”اس صورت کو زکوٰۃ کے مسئلہ پر قیاس کیا جائے گا کہ جس بچہ کے والد صاحب استطاعت ہوں اور وہ بالغ ہو، لیکن وہ صاحب نصاب نہ ہو تو اسے زکوٰۃ دینا درست ہے اور اگر بچہ نابالغ ہے لیکن اس کے والد صاحب نصاب ہیں تو پھر بچہ بھی صاحب نصاب مانا جائے گا اور اسے زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے، لیکن اگر بچہ کے والدین اس کی کفالت نہ کریں تو اسے زکوٰۃ دینا بھی درست ہے اور اس بچہ کو سود پر قرض لینا تعلیم حاصل کرنے کے لئے، یہ بھی جائز ہے۔ شامی (۱۵/۲) میں ہے: ”وإذا كان ولده صغيراً فلا بد عن كونه فقيراً أيضاً لأن الصغير يعد غنياً بغني أبيه۔ اور زکوٰۃ میں مسئلہ یہ بھی ہے کہ طالب علم اگر صاحب نصاب ہو تو اسے جب بھی زکوٰۃ لینا جائز ہے لیکن سود پر قرض لینا جائز نہیں ہوگا، پہلے وہ اپنا مال خرچ کرے، اس کے بعد بدرجہ مجبوری سود پر قرض لے سکتا ہے۔“

مولانا خورشید احمد اعظمی ”قتیہ“ کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: فقہاء نے اس کو علوم دینیہ اور طالب علم کی رشد و صلاح کے ساتھ متعین کیا ہے، لہذا صورت مسئلہ میں طالب علم کے صاحب استطاعت نہ ہونے کے باوجود اس کے لئے سودی قرض لینا جائز نہ ہوگا اور والد کے مستطیع ہونے سے طالب علم صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، علوم جدیدہ عصریہ کے لئے باپ کے اوپر تعلیمی نفقہ واجب نہیں۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی اس بات کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہ بلوغ کے بعد شرعاً باپ پر بچے کا نان و نفقہ اور دیگر اخراجات واجب نہیں ہوتے، لکھتے ہیں: ”فقہاء کی ان تشریحات کی روشنی میں طالب علم کی معاشی حالت اس لائق نہ ہو کہ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکے، لیکن اس کے والد کے پاس استطاعت موجود ہو اور اب تک کے جملہ اخراجات اس کے والد برداشت کر رہے تھے تو ایسی صورت میں اس طالب علم کے لئے اس قرض اسکیم سے استفادہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ سودی قرض بوقت ضرورت شدیدہ جب کہ اس کا کوئی دوسرا متبادل موجود نہ ہو لینے کی اجازت ہوتی ہے اور یہاں چونکہ والد کو استطاعت ہے اور اب تک اپنے لڑکے کے سارے اخراجات برداشت کر رہے تھے اس لئے اس شخص کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔“

مولانا راشد حسین ندوی مذکورہ بالا مختلف دلائل نقل کرنے کے بعد اپنی رائے پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”نابالغ کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے، اور شریعت نابالغ کو باپ کی مالدار سے مالدار تسلیم کرتی ہے، لہذا اس عمر میں اگر باپ مالدار ہے تو اس پر اس طرح کی رقمیں صرف کرنا جائز نہیں ہوگا، اور بلوغ کے بعد اس پر اس طرح کی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں، لیکن اگر باپ مالدار ہے اور خرچ کرنے کا عرف بھی موجود ہے، بلکہ وہ خرچ کرنے پر راضی بھی ہے تو اس طرح کی رقمیں صرف کرنا اگرچہ اس حالت میں بھی جائز ہوگا، لیکن مکروہ ہوگا، اس لئے کہ بلاوجہ جلال و طیب سے روگردانی کی جارہی ہے۔“

مولانا عبدالنور اناری اپنے مقالہ میں لڑکے اور لڑکیوں کے حکم میں فرق واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”بالغ لڑکے کی کفالت باپ کے ذمہ واجب

نہیں ہے، البتہ بالغ لڑکیوں کی کفالت قبل از نکاح ضرور باپ کے ذمہ ہوتی ہے، لہذا طلبہ علوم عصریہ جدیدہ اپنے احوال میں باپ کی حالت سے علاحدہ رہیں گے، البتہ طالبات علوم عصریہ جدیدہ اپنے باپ کے احوال کے تابع ہوں گی۔ لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ تقسیم عام ہے، صورت مسئولہ کے ساتھ خاص نہیں، کیونکہ صورت مسئولہ میں تو ہر طالب علم استفادہ کر سکتا ہے۔

مفتی ثناء الہدی قاسمی ہندوستان کے خاص حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”ہندوستان کے خاص ماحول میں بلوغت کے بعد بھی جب تک لڑکا برسر روزگار نہیں ہو جاتا یا کار جین اسے مشترکہ خاندان سے الگ نہیں کرتا، عرفاً والد کی استطاعت ہی معتبر سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری محکموں میں بھی آمدنی کے سرٹیفکیٹ میں خاندان کے سربراہ کی آمدنی کا ہی اعتبار ہوتا ہے۔ اس لئے عرف کی رعایت کرتے ہوئے میرے نزدیک طالب علم کے پاس اگر استطاعت نہ ہو اور والد صاحب استطاعت ہو اور وہ اپنے لڑکے کو تعلیم دینے کا خواہش مند بھی ہو تو اسے اپنے مال سے خرچ کرنا چاہئے، تعلیمی قرض سود کے ساتھ لینا درست نہیں ہوگا۔

البتہ اگر والد صاحب استطاعت کے باوجود پڑھانا نہیں چاہتے، اور طالب علم اپنی اہلیت کی بنیاد پر آگے پڑھنا چاہتا ہے تو اس حالت میں لڑکے کی استطاعت ہی معتبر ہوگی اور ضرورتاً اس کے لئے تعلیمی قرض لینا درست ہوگا۔ والد پر اعلیٰ تعلیم کے لئے مستطیع ہونے کے باوجود جر نہیں کیا جاسکتا۔“

سوال نمبر ۵: اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود وہ فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں تو کیا ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

اس سوال کے دو اجزاء ہیں: ۱۔ اگر طالب علم صاحب استطاعت ہو۔ ۲۔ اگر والد صاحب استطاعت ہوں۔

یہ سوال ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے متعلق نہیں جو ایجوکیشن لون پر اخذ کردہ سود کو اجرت خدمت پر محمول کرنے کے قائل ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ بقیہ تمام افراد کی متفقہ رائے ہے کہ طالب علم کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ عدم جواز کے قائلین کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: [مولانا شاہ جہاں ندوی، حافظ شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا محبوب علی وحیدی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا اقبال شکاروی، مولانا محمد فاروق]۔

اس کی دلیل کے طور پر ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت محض ضرورت یا حاجت کی بنیاد پر دی گئی ہے، اب جب وہ ضرورت اور حاجت ہی نہ رہی تو اس اجازت کی بنیاد ہی منہدم ہوگئی، لہذا اب اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

اس سوال کا دوسرا جز یہ ہے کہ والد کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا یا نہیں؟

بعض مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس صورت میں اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔

[مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی]۔

اس سلسلہ میں ان کی دلیل یہ ہے کہ والد کو اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ وہ شرعاً اس کا مکلف ہے، گزشتہ سوال کے جواب میں اس کے دلائل بیان ہو چکے ہیں۔

دوسرے بعض حضرات کا خیال ہے کہ والد کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں طالب علم کے لئے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

[حافظ شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا اقبال شکاروی، مولانا محمد فاروق]۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ سود کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے، اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت بحالت مجبوری ضرورت و حاجت کی بنا پر دی گئی ہے۔ والد کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں یہ حاجت باقی نہیں رہتی، کیونکہ والد پر طالب علم کا نفقہ واجب اور اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے دلائل گزشتہ سوال کے جواب میں ذکر ہو چکے ہیں۔

مولانا جمیل احمد ندیری صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ”یہ مجبوری درج کی چیز ہے، صاحب استطاعت افراد کے حق میں اس سے احتراز اولیٰ ہے۔“

مولانا سلطان احمد اصلاحي لکھتے ہیں: ”باپ بیٹے کے صاحب استطاعت ہوتے ہوئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا اسی صورت میں جائز ہوگا جب کہ

ان کے اوپر بیٹی کی شادی یا اس جیسی کوئی دوسری ذمہ داری یا ذمہ داریاں ہوں جو تعلیم سے اہم تر ہوں، دوسری صورت میں ان کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔“

## بینکوں سے تعلیمی قرض

مفتی جمیل احمد ندوی

فقہ اکیڈمی نے بینکوں سے تعلیمی قرض کے سلسلے میں جو سوالنامہ جاری کیا تھا، اس کے کُل ۲۹ جوابات اکیڈمی کے توسط سے راقم سطور تک پہنچے، مقالہ نگار حضرات کے اسامی گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا اقبال ٹنکاروی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محمد سلمان پالنپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا محمد ارشد الدینی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبداللہ خالد لوناداری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ریحان مبشر منوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا شوکت شاہ قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا عبدالنواب اناری، مفتی جمیل احمد ندوی، مفتی محبوب علی وجیبی، مفتی اقبال احمد قاسمی، قاضی محمد ہارون میٹگل، مولانا سید اسرار الحق سیبلی، مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی آو پوری، مولانا عبدالحی مفتاحی۔

جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر:

پہلا سوال تھا: جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟

اس کے جواب میں سارے مقالہ نگار حضرات نے بقدر ضرورت دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عصری تعلیم بشمول جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی اجازت دی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسلامی دائرے میں ہو، انسانیت کے لئے نافع ہو، حرام علوم کی آمیزش سے پاک ہو۔

مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالنواب اناری، مولانا اقبال ٹنکاروی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی اور مولانا راشد حسین ندوی نے علم، حصول علم، عصری تعلیم، خصوصاً جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر بہت ہی محققانہ اور تفصیل سے لکھا ہے۔

زیادہ تر مقالہ نگاروں نے جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کو جائز قرار دینے پر اکتفاء کیا ہے لیکن بعض حضرات نے تاکید جملے استعمال کئے ہیں مثلاً:

جدید اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنا واجب لغیرہ ہے (مولانا شاہد علی قاسمی)۔

جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول بغرض صحیح مباح بلکہ مستحسن ہے (مولانا عبدالحی مفتاحی)۔

انسانیت کے لئے نفع بخش اور مفید اعلیٰ تعلیم کا حصول ایک ضرورت (فرض کفایہ) ہے (مولانا عطاء اللہ قاسمی)۔

مسلمان مرد و عورت ان علوم کو حاصل کریں اور ان کو یورپ کے ملحدانہ اثرات سے پاک کر کے اسلامی رنگ میں رنگ دیں (مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی)۔

جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول، فرض کفایہ ہے (مولانا محمد شاہ جہاں ندوی)۔

اعلیٰ عصری تعلیم کے جن شعبوں سے ملت کا مفاد وابستہ ہو ان کا سیکھنا فرض کفایہ ہے (مولانا راشد حسین ندوی)۔

بانی و مہتمم جامعہ عربیہ بین الاسلامیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ (اتر پردیش)۔

مسلمانوں کو یہ تعلیم حاصل کرنی چاہئے کیونکہ دینی عزت و وقار کے ساتھ دنیاوی عزت و وقار کا حصول بھی شریعت کے نزدیک ایک محمود و مطلوب صفت ہے (مفتی جمیل احمد ندوی)۔

اس موضوع پر مقالہ نگار حضرات کے ذرائع کم و بیش مشترک ہیں، ایک تو یہی کہ ”الأصل فی الأشياء الإباحة“ (الأشياء ص ۹۷) (اشیاء میں اصل اباحت ہے)۔

دوم یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے علم نافع کی دعا مانگی ہے اور علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے (ابن ماجہ ۱۵۲، ترمذی حدیث ۳۴۸۲)۔

سوم یہ کہ حدیث نبوی ہے: ”طلب العلم فريضة على كل مسلم“ (ابن ماجہ حدیث: ۲۲۳) (علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

اس میں فرض عین اور فرض کفایہ، دونوں شامل ہیں، اور شریعت اسلامیہ کے مزاج و ماحول کی رعایت کرتے ہوئے ان علوم کی تحصیل مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ چنانچہ علماء محققین امام غزالی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ نے اپنے اپنے زمانوں میں بہت سے دنیاوی علوم، طب، زراعت، بنائی، سلائی، حساب، لوباری وغیرہ کی تحصیل، فرض کفایہ قرار دی تھی (احیاء علوم الدین ۱۹/۱، ۲۳، حجة الله البالغة، در مختار و رد المحتار ۳۱ وغیرہ)۔

حضرت زید بن ثابتؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے یہودیوں کی زبان عبرانی دسریانی سیکھی (مسند احمد ص ۱۵۵۲، ۱۵۹۳)۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی زبان تو فارسی تھی ہی، حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی فارسی آتی تھی (مشکوٰۃ ۲۹۳/۲ بحوالہ دارمی)۔

کچھ حضرات نے سورہ بقرہ کی آیت ”وعلّم آدم الأسماء کلہا“ (سورہ بقرہ: ۳۱) سے استدلال کیا ہے، کچھ حضرات کا استدلال ”ربنا آتانا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة“ (سورہ بقرہ: ۲۰۱) سے ہے (دیکھئے: مقالہ: مولانا شاہد علی قاسمی)۔

مولانا اسرار الحق سبیلی لکھتے ہیں کہ حدیث نبوی ”الکلمة الحکمة ضالة الحکیم فحیث وجدھا فهو أحق بہا“ (ترمذی و ابن ماجہ، مشکوٰۃ ۱۱۲۲) میں حکمت سے جدید تعلیم مراد لینے کی گنجائش ہے۔

تعلیمی قرض میں کم سود، کیا سروس چارج پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے، نیز حکومت کا ادا ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں، تو کیا اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

اس کے جواب میں دو مقالہ نگار مفتی انور علی اعظمی اور مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب لکھتے ہیں کہ تعلیمی قرضوں میں شرح سود کم نہیں ہوتی، بلکہ بھرپور ہوتی ہے کیونکہ فقہ اکیڈمی نے انجینئر طارق سجاد کا جو مضمون بھیجا ہے اس میں لکھا ہے کہ چار سے دس لاکھ میں بینک کی شرح سود ۱۲ فیصد اور ۱۰ فیصد ہوتی ہے اور دس لاکھ سے اوپر میں شرح سود ۱۲ فیصد سے ۱۴ فیصد ہو جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ شرح سود کم نہیں ہے اور شرح سود کم ہو یا زیادہ ہر صورت میں سود ہی ہے، اسے سروس چارج نہیں کہا جاسکتا۔

یہی رائے اکثر مقالہ نگاروں کی ہے، وہ شرح سود کے کم یا زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں کرتے، ہر صورت میں سود ہی قرار دیتے ہیں اور سروس چارج پر محمول نہیں کرتے۔

حق الخنت، محنت کے مطابق ہوا کرتی ہے نہ کہ ہر حال میں یکساں، جبکہ سود کی شرح متعین اور ہر حال میں یکساں رہتی ہے (مولانا عطاء اللہ قاسمی)۔

جتنا زیادہ قرض لیا جاتا ہے اسی حساب سے سود میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے، اگر بینک تمام قرض لینے والوں سے ایک متعین رقم لیتا، قرض کی مقدار میں کمی زیادہ کا اعتبار نہیں کرتا تو اسے سروس چارج کہا جاسکتا تھا، لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے (مفتی شاہد علی قاسمی)۔

کئی مقالہ نگاروں نے ربا کی تعریف اور اس کے تفصیلی احکام بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ تعلیمی قرض پر سود کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے اسے سروس چارج نہیں کہا جاسکتا مثلاً مولانا عبدالحی مفتاحی، مولانا اقبال شکاروی، مولوی ریحان مبشر، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی وغیرہ۔



مفتی محمد شوکت ثنائی نے تین وجوہ سے اس کے سروس چارج پر محمول کرنے سے انکار کیا ہے ایک تو یہ کہ سروس چارج کی رقم بہت زیادہ نہیں ہو کرتی جبکہ بینک ان قرضوں پر بارہ فیصد شرح سود عائد کرتا ہے، اگر کوئی شخص چار لاکھ روپے پانچ سال کے لئے لے رہا ہے تو سود کی مجموعی رقم اصل رقم کے نصف سے بھی زائد ہو جائے گی، دوم یہ کہ سروس چارج کی رقم کسی چیز پر سالانہ فیصد کے لحاظ سے نہیں لی جاتی جبکہ اس رقم پر ہر سال بارہ فیصد کے لحاظ سے رقم لی جاتی ہے، سوم یہ کہ ایک ہی چیز پر سروس چارج کے نام سے ڈبل رقم نہیں لی جاتی جبکہ بینک قرض جاری کرتے وقت سروس چارج کے نام سے مجموعی قرض کی رقم سے دو فیصد کے لحاظ سے رقم وصول کرتا ہے اور سال پر شرح سود الگ ہوتا ہے۔

بہر حال ”کل قرض جبرئعاً فہو ربا“ کے تحت اکثر مقالہ نگار اسے سود قرار دے کر حرام کہتے ہیں۔

تین مقالہ نگاروں کی رائے اس کے برعکس ہے، مولانا عبدالنور التواب اناوی لکھتے ہیں کہ وہ سود ہے ہی نہیں، اسے سود نہیں کہا جائے گا، مفتی عبد الرشید ثنائی لکھتے ہیں: اس کم شرح سود کو ”الامور بمقاصدھا“ کے تحت سروس چارج پر محمول کر لیا جائے، اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اگر سروس چارج اجرت مثل کے برابر ہو تو گنجائش ہے (مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا خورشید احمد اعظمی اسے سروس چارج نہیں قرار دیتے البتہ انہوں نے اس میں کچھ ترمیم کر کے جواز کی راہ نکالی ہے۔

کمزور معاشی حالت والے کا اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا:

تیسرا سوال تھا: اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، تو کیا اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

اس کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کے چار نقطہ نظر سامنے آئے:

پہلا نقطہ نظر: یہ سودی قرض ہے، شرعی حاجت و ضرورت متحقق نہیں، اس لئے جائز نہیں (مولانا عبدالحی مفتاحی، مولانا عطاء اللہ ثنائی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی ابوسفیان مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ریحان مبشر، مولانا محمد ارشد مدنی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی محمد سلمان کھلی، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی)۔

مولانا کلیم اللہ صاحب لکھتے ہیں: یہ تعلیم فرض کفایہ ہے، وسائل و ذرائع مہیا ہوں تو ضرور حاصل کرے ورنہ نہیں۔

مولانا ارشد مدنی لکھتے ہیں: جن کے معاشی حالات اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کے متحمل نہ ہوں ان پر اعلیٰ تعلیم کا حصول فرض نہیں۔

اس نقطہ نظر کے قائلین کی نگاہ میں محتاج کے لئے جس سودی قرض کی اجازت دی گئی ہے اس کا یہاں تحقق نہیں، شرعی اعتبار سے یہاں نہ ضرورت کا تحقق ہے، نہ حاجت کا، کیونکہ جدید اعلیٰ تعلیم، اگر کوئی مسلمان حاصل نہ کرے تو وہ ہلاک نہیں ہو جائے گا، لہذا ضرورت کا تحقق نہیں ہوا، اسی طریقہ سے وہ مشقت شدیدہ میں بھی نہیں پڑے گا، لہذا حاجت کا تحقق نہیں، زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ ہے، تو بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن کے معاشی حالات کہیں اچھے ہیں اور وہ یہ تعلیم حاصل کر بھی رہے ہیں، لہذا اس کمزور معاشی حالت والے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بہر حال یہ تعلیم حاصل کرے خواہ سودی قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔

سود کے لین دین سے بچنا فرض عین ہے، فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، جبکہ شریعت اسلامیہ نے مامورات سے زیادہ منہیات کی جانب اعتناء کیا ہے، الاشاہ (ص ۷۸) میں ہے: ”لأن اعتناء الشرع بالمنہیات أشد من اعتنائہ بالہامورات“ (مقالہ: مفتی محمد جعفر علی رحمانی)

دوسرا نقطہ نظر: یہ سودی قرض، حاجت کی بنا پر جائز ہے، ان حضرات میں زیادہ تر افراد نے اشباہ کی اس عبارت کا حوالہ دیا ہے: ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (ص ۱۱۵، البحر الرائق، ۶، ۱۱۲)، ان کے بقول یہاں حاجت، ضرورت کے درجہ میں آگئی لہذا یہ سودی قرض لینا محتاج کے لئے جائز ہوا، ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة“ (الاشباہ والنظائر القاعدة الخامسة الضرريال)۔

ان حضرات کے خیال میں اگر ایسے اہل افراد، مجبوری کی وجہ سے جدید اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کریں گے تو امت مسلمہ کو شدید نقصان پہنچے گا، اور

مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جدید اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جائے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے، لہذا اس حاجت کی بنا پر جو کہ انفرادی اعتبار سے بھی ہے اور اجتماعی اعتبار سے بھی، اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش رہے گی (مقالہ: مفتی محبوب علی وجیبی، مولانا اسرار الحق سہیلی، مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی، مفتی شوکت شاکا قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا اقبال ٹنکاروی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالنور اناری، مولانا عبداللہ بن خالد)۔

مفتی عبدالرشید قاسمی نے اس ضمن میں مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے ظالمانہ رویہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، یہ رویہ بھی مجبور کرتا ہے کہ اس اسکیم سے ضرورت مند اشخاص فائدہ اٹھائیں اور حکومت کے منصوبوں کو ناکام کریں۔

تیسرا نقطہ نظر: مفتی شاہد علی قاسمی لکھتے ہیں: اگر اس اسکیم سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اعلیٰ تعلیم سے محرومی ہوگی جو ایک مفسدہ ہے، اور اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کی جائے تو یہ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھائے بغیر ممکن نہیں، ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک مفسدہ ہے، اعلیٰ تعلیم سے محرومی کا مفسدہ بڑا مفسدہ ہے، لہذا اس کی رعایت کرتے ہوئے چھوٹے مفسدہ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا۔ موصوف نے اسیابہ کی عبارت "إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمها ضرر ابار تکاب أخفهما" (ص ۱۳۵) کا حوالہ دیا ہے۔

چوتھا نقطہ نظر: راقم سطور (مفتی جمیل احمد ندیری) نے بانی فقہ اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی ایک تحریر کے حوالہ سے پیش کیا ہے جو حضرت "نے گورنمنٹ کے اقتصادی قرضوں کی بابت لکھی ہے، راقم کے خیال میں یہ تحریر اقتصادی قرضوں اور تعلیمی قرضوں دونوں پر یکساں صادق آتی ہے، قاضی صاحب نے پہلے ہندوستان کی حیثیت، یہاں کے جمہوری نظام اور مسلمانوں کی پوزیشن پر بحث کی ہے، پھر سرکاری خزانہ کی ملکیت اور اس سے انتفاع کے حق پر گفتگو کرنے کے بعد لکھا ہے: "سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق، عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے..... اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اس حق کی تحصیل کے لئے جب آگے آنا چاہتا ہے تو حکومت جس نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے اور فی الحال اکثریت کے فقدان کی وجہ سے ہم اس کی تہدیلی پر قادر نہیں)..... اس کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے آڑے آتا ہے، پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجہ مجبوری سود دینا اور سود دے کر حق کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں: میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے..... اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کریں (مباحث فقہیہ ص ۴۶۸)۔

بطور دلیل قاضی صاحب نے اسیابہ کی وہ عبارت نقل کی ہے جو اپنا حق لینے کے لئے رشوت دینے کے جواز کی ہے۔

احقر نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے: حکومت کی اس اسکیم سے جو اعلیٰ تعلیم میں تعاون کی غرض سے ہے، ہندوستان کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو بھی فائدہ اٹھانے کا حق ہے، لیکن یہ حق جزا ہوا ہے سود سے، لہذا قاضی صاحب کے الفاظ میں "یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کریں"۔

اس اعتبار سے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کا جواز ہر مسلمان کے لئے رہے گا، خواہ وہ معاشی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا متحمل ہو یا نہ ہو۔

مقالہ نگار حضرات میں سے مولانا محمد شاہ جہاں ندوی نے بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کو حق لینے کے لئے رشوت دینے کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے جائز کہا ہے۔

کئی مقالہ نگار حضرات نے مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے کہ وہ ایسے طالب علموں کے لئے امدادی ادارے قائم کریں، ایسی اسکیمیں بنائیں جن سے بغیر سود میں ملوث ہوئے، مسلمانوں کے لئے جدید اعلیٰ تعلیم کی راہیں ہموار ہوتی رہیں۔

باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بیٹے کے صاحب استطاعت ہونے کا معاملہ:

چوتھا سوال تھا: اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے، لیکن اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کیا والد کے صاحب

استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے صاحب استطاعت سمجھا جائے گا، یا قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا؟

اس کے جواب میں مقالہ نگار حضرات نے بالغ اور نابالغ کا فرق کیا ہے، نابالغ بچے کو باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے، صاحب استطاعت قرار دیا ہے، اور بالغ کو باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے صاحب استطاعت نہیں مانا۔

کچھ حضرات نے بالغ طالب علم کو اس معاملے میں باپ کے تابع مانا ہے کیونکہ وہ اپنی تعلیم کی مشغولیت کی وجہ سے کمانے کے لئے فارغ نہیں، اس کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، لہذا فقر اور غناء میں یہ ذمہ باپ کے تابع رہے گا (مقالہ مولانا سید اسرار الحق سیلی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی)۔

”و کذا تجب النفقة لولده الكبير العاجز عن الكسب... وطالب علم لا يتفرغ لذلك“ (در مختار ۵۰۲۲)۔

اس سلسلہ میں کچھ مقالہ نگاروں نے بالغ طالب علم کا نفقہ باپ کے ذمہ ہونے میں طالب علم کے رشد و صلاح اور دینی تعلیم کی قید لگائی ہے (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

”القول بوجوبها لذی الرشدا لا غیره“ (شامی ۵۰۲۲)۔

درج ذیل حضرات لکھتے ہیں کہ قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا (مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی، مولانا ریحان مہر، مفتی اقبال احمد قاسمی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا عبداللہ بن خالد)۔

جو حضرات، باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے، بالغ بیٹے کو صاحب استطاعت نہیں مانتے، ان کے نزدیک بھی نتیجہ یہ نکلے گا کہ طالب علم کے اپنے حالات کا اعتبار ہوگا مگر ان میں کی اکثریت، محتاج طالب علم بالغ کے لئے بھی اس سودی قرض کو جائز نہیں سمجھتی اور باپ کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں کہ وہ بیٹے کی اعلیٰ تعلیم میں بیٹے کے بالغ ہونے کے بعد بھی برابر خرچ کرتا رہے۔

لیکن جن مقالہ نگاروں کے نزدیک اپنا حق لینے کے لئے رشوت دینے کے جواز پر قیاس کر کے اس سودی قرض کے لینے کا جواز ہے جن میں راقم سطور مفتی جمیل احمد ندیری، اور مولانا محمد شاہ جہاں ندوی شامل ہیں، ان کے اعتبار سے باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بالغ بیٹے کے صاحب استطاعت ہونے نہ ہونے کا مسئلہ کچھ موثر نہیں، البتہ جو لوگ حاجت و ضرورت کی بنا پر اس قرض کے جواز کے قائل ہیں، ان کے اعتبار سے یہ مسئلہ زیر غور ہوگا۔

استطاعت کے باوجود قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا:

اس سلسلے کا آخری سوال تھا: اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود وہ فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں تو کیا ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

اس کے جواب میں چند کو چھوڑ کر تقریباً سارے ہی مقالہ نگار حضرات نے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کو ناجائز لکھا ہے، یا پھر احتراز کو ادلی قرار دیا ہے، اور صاحب استطاعت باپ پر، بیٹے کے تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری ڈالی ہے، کچھ مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اگر والد، تعلیم پر خرچ نہ کریں تو لڑکا بدرجہ مجبوری اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے (مقالہ مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی)۔

صرف ایک مقالہ نگار مولانا عبدالنواب اناوی لکھتے ہیں کہ جب وہ اجرت عمل و خدمت (بنام سروس چارج) پر محمول ہوگی تو اب تمام طلبہ علوم عالیہ جدیدہ کے لئے راستہ بالکل صاف ہے، غنی و محتاج، مذکور و مؤنث، بالغ و نابالغ سب مساوی ہیں بلا فرق مراتب۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض اور ہندوستانی مسلمان

ڈاکٹر ایم آئی باگ سراج

ہمارا معاشرہ معلوماتی معاشرہ ہے، آج کسی معاشرہ کی علمی سطح اقوام عالم کے درمیان اس کی معاشی، سماجی اور سیاسی سطح کا تعین کرتی ہے، تعلیم نے تمام ہی ملکوں اور اقوام کے نزدیک اہم ترین صنعت کی صورت اختیار کر لی ہے، تعلیم کے مختلف شعبہ جات بالخصوص اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم تو اس قدر مہنگی ہے کہ متوسط طبقہ بھی اس کا خرچ برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہی وجہ ہے کہ وہ اب تعلیمی قرض کا سہارا لینے پر مجبور ہے، بشری اثاثہ میں سرمایہ کاری کو اس بات کے لئے قبول کر لیا گیا ہے کہ وہ مستقبل میں اعلیٰ ترین منافع کا سبب بنے گی، آج تقریباً تمام ہی قومی اور نجی تجارتی بینک سود کی مختلف شرحوں پر تعلیمی قرض فراہم کر رہے ہیں۔

سچر کمیٹی رپورٹ سے یہ بات ایک بار پھر واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستانی مسلم قوم تعلیم، ملازمت اور سماجی و معاشی سطح پر دوسری بہت سی اقوام سے پیچھے رہ گئی ہے، لہذا یہ بات مسلم ہے کہ مسلم قوم کو وہ تمام سہولیات فراہم کرنے کی سخت ضرورت ہے جن سے وہ دیگر اقوام کے مساوی تعلیم حاصل کر سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ باصلاحیت مسلمان اپنے وسائل کو تعلیم کی سمت میں استعمال نہیں کر رہے ہیں، بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے قلیل وسائل ان کی مذہبی تعلیم کے لئے بھی ناکافی ہیں، اس پر مزید یہ کہ عام مسلمانوں کی ماہانہ آمدنی اتنی کم ہے کہ مدد کے لئے اٹھا ہوا ہر ہاتھ خاندان کی غذائی ضروریات کی تکمیل میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ان کی کوئی مدد نہیں کر پاتا جس سے کہ وہ اپنی آمدنی کے دائرہ کو وسیع کر سکیں، اگر ہندوستانی مسلمان اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے انہیں دیگر اخراجات سے کچھ بچت کر کے اپنے بچوں کی تعلیم پر مزید خرچ کرنا ہوگا۔

تعلیمی مصارف:

۱۹۹۳ء میں NCAER کے ذریعہ کئے گئے ایک سروے سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ دیہی ہندوستان میں ۶ سے ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کے تعلیمی اخراجات ہر خاندان پر ۶۸۰ روپے اور سالانہ ایک طالب علم پر ۸۷۳ روپے ہیں، لڑکیوں کے اسکول کے تعلیمی مصارف لڑکوں کے اخراجات کا ۶۸ فیصد ہیں، ان مصارف کا معتد بہ حصہ کتابوں، اسٹیشنری، اسکول یونیفارم، پرائیوٹ کوچنگ اور فیس پر خرچ ہوتا ہے۔ یہ اخراجات کتابوں، اسٹیشنری اور یونیفارم کی قیمتوں میں تغیر کے لحاظ سے کم و بیش ہوتے رہتے ہیں۔

پرائیوٹ اسکولوں میں جانے والے بچوں کا تناسب زیادہ آمدنی والے گھرانوں میں بہتر ہے، یہ بات دلچسپ ہے کہ درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے ۷۰ فیصد سے زیادہ بچے حکومتی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، صرف ۴۳ فیصد عیسائی اور ۴۹ فیصد مسلمان بچے حکومتی اسکولوں کا رخ کرتے ہیں، جبکہ بقیہ عیسائی بچوں میں سے بیشتر حکومت سے امداد یافتہ اداروں میں تعلیم پاتے ہیں۔

مسلمان، درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے افراد تعلیم پر نسبتاً کم خرچ کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی گھریلو آمدنی کا صرف تین فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔

درج ذیل جدول ہندوستان کے دیہی اور شہری علاقوں میں تعلیمی اخراجات کے اعداد و شمار پیش کرتا ہے:

دارالامور، سری رنگا پٹنم، کرناٹک

### Percentage Share of Household Expenditure on Education in Total Household Expenditure

Occupational Categories	Rural	Urban
MIMAP-☆ only poor		
Self employed Farm	3.71%	3.50%
Self employed Non Farm	1.47%	5.73%
Salary	3.97%	5.58%
Agricultural Wage	2.31%	3.59%
Non-agricultural Wage	2.47%	3.51%
Others	3.13%	7.99%
All	2.87%	5.04%
NSSO☆☆		
Poor	0.79%	1.66%
Total (poor & Non-poor)	1.60%	4.00%

#### Notes:

☆ Micro Impacts of Macroeconomic and Adjustment Policies Survey 1994-95 (NCAER)

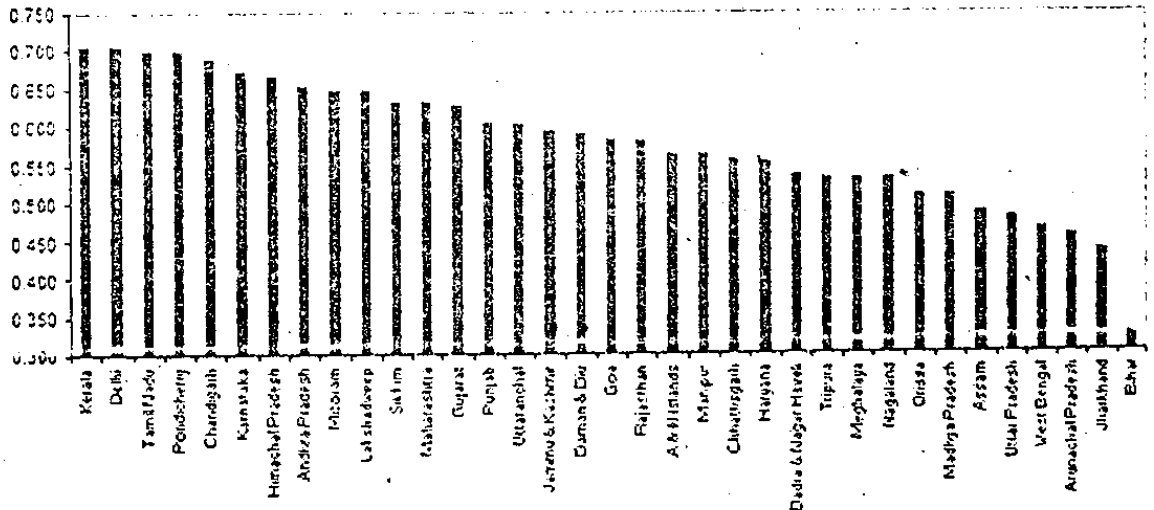
☆ Excludes boarding and lodging costs for education and also transport cost. Source National

#### Sample Survey Organisation

مسلم گھرانوں میں تعلیم پر ہونے والے اخراجات کے اعداد و شمار تو دستیاب نہیں، لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قومی اخراجات کے مقابلہ میں اس کا تناسب کم ہے، چنانچہ تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے یہ بات انتہائی اہم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر ہونے والے اخراجات کے لئے اپنی کمائی کا مزید حصہ مخصوص کریں۔

درج ذیل جدول ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی تعلیمی ترقی کا خاکہ پیش کرتا ہے:

HUEPA's Educational Development Index (EDI) ranking for states



آٹھ نمایاں ریاستوں میں پانچ جنوبی ریاستیں کیرالہ، تمل ناڈو، پانڈیچری، کرناٹک اور آندھرا پردیش، اور تین شمالی ریاستیں دہلی، چندی گڑھ اور ہماچل پردیش ہیں۔

اس اشاریہ میں بہار سب سے نیچے ہے اور اس کے بالکل اوپر جھارکھنڈ ہے جو جغرافیائی اور تعلیمی ترقی کے اشاریہ دونوں لحاظ سے بہار کا پڑوسی ہے، اگر آنے والی دہائیوں میں ملک کی بقیہ ریاستیں جھارکھنڈ، بہار اور مغربی بنگال کی صف میں نہیں آنا چاہتیں تو ان ریاستوں کے افراد اور بالخصوص حکومت کو ان علاقوں پر فوری اور اہم توجہ دینی ہوگی۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ مغربی بنگال اس اشاریہ کی آخری صف میں کھڑا ہے، بنیادی تعلیم سے اس کی یہ دوری یقیناً حیران کن ہے۔

ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ، گریجویٹیشن، پوسٹ گریجویٹیشن اور پیشہ ورانہ تعلیم کی قیمتیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں، انجینئرنگ کی تعلیم میں تقریباً چار لاکھ کا خرچ آتا ہے، اگر آپ ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں اور خصوصی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو بھی اس کا خرچ دس لاکھ کے قریب ہے، بصورت دیگر یہ چالیس لاکھ سے ساڑھے لاکھ تک ہو سکتا ہے۔ ایم بی اے کے اخراجات ساڑھے تین لاکھ سے چھ لاکھ تک ہو سکتے ہیں، اور ایک کامرس یا مینجمنٹ گریجویٹ کو اپنی تعلیم پر ایک سے دو لاکھ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے، تین سالہ ڈپلومہ کا خرچ بھی ایک لاکھ سے کم نہیں ہوتا، بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کی صورت میں یہ اخراجات انتہائی گراں ہو جاتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ایک متوسط خاندان اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا یہ بار گراں اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

تعلیم کے لئے سرمایہ کی فراہمی کے وسائل:

تعلیم کے لئے سرمایہ فراہم کرنے والے وسائل میں سب سے مقبول وہ لون ہیں جو بینکوں سے حاصل کئے جاتے ہیں، قومی اور ریاستی سطح پر حکمت عملی وضع کرتے وقت اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ عوام کی یہ بنیادی ضرورت عوامی اور نجی شعبہ جات کے مناسب اقدامات کے ذریعہ پوری ہو سکے۔ ایک طرف حکومت بنیادی تعلیم فراہم کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے تو دوسری طرف اعلیٰ تعلیم رفتہ رفتہ نجی شعبہ تک محدود ہوتی جا رہی ہے۔ حکومت کی جانب سے رعایتوں میں مسلسل کمی کے سبب اعلیٰ تعلیم کافی مہنگی ہو گئی ہے، اور اسی کے ساتھ اس میدان میں باضابطہ طور پر سرمایہ کی فراہمی کی ضرورت زور پکڑتی جا رہی ہے۔

ایک اسٹڈی گروپ کی سفارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے انڈین بینکنگ اسوسی ایشن نے ۲۰۰۱ء میں ایجوکیشن لون اسکیم کا ایک خاکہ تیار کیا، ۲۸ اپریل ۲۰۰۱ء کو ریزرو بینک آف انڈیا نے ایک سرکلر کے ذریعہ تمام بینکوں کو اس کے نفاذ کا مشورہ دیا، اس کے ساتھ وہ اصلاحات اور اضافہ جات بھی تھے جو ہندوستانی حکومت نے اس میں کئے تھے۔ ۲۰۰۲ء-۲۰۰۵ء میں وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر میں کئے گئے اعلانات کے مطابق انڈین بینکنگ اسوسی ایشن نے چار لاکھ سے ساڑھے سات لاکھ تک کے تعلیمی قرضوں پر لاگو ہونے والے ضمانتی معیارات میں کچھ تبدیلیاں کیں، اس کا نظر ثانی شدہ خاکہ اسٹڈی گروپ کی سفارشات اور مشوروں کو مد نظر رکھ کر تیار کیا گیا۔

۲۔ اسکیم کے مقاصد: ..... ایجوکیشنل لون اسکیم کا مقصد ضرورت مند اور باصلاحیت طلبہ کو مالی امداد فراہم کرنا ہے، تاکہ وہ ملک یا بیرون ملک میں حاصل کر سکیں، اس کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ باصلاحیت طلبہ خواہ وہ غریب ہوں انہیں بینکنگ نظام سے آسان شرائط پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مالی امداد فراہم کی جائے۔ کوئی بھی ذی استعداد طالب علم محض اقتصادی مجبوریوں کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے محروم نہیں رہنا چاہئے۔

۳۔ اسکیم کا انطباق:

تمام تجارتی بینک اس اسکیم کو اختیار کر سکتے ہیں، اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے تعلق سے اس میں بینک کے لئے تفصیلی ہدایات فراہم کی گئی ہیں، بینک کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اس میں طلبہ اور والدین کی سہولت کے لئے کچھ تبدیلیاں کرے اور اسے مزید پرکشش بنا کر پیش کرے۔

اسکیم کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

۴۔ اہلیت کا معیار: ۴۔ الف: طالب علم کی اہلیت:

۱۔ ہندوستان میں:

ہندوستان کا شہری ہو۔

اس نے ہندوستان یا بیرون ملک میں داخلہ امتحان یا میرٹ کی بنیاد پر انتخاب کے ذریعہ پیشہ ورانہ یا تکنیکی کورسز میں داخل حاصل کر لیا ہو۔

۲۔ ب: کورسز جو اس کے اہل ہیں:

گریجویٹ کورسز: بی اے، بی کام، بی ایس سی وغیرہ۔

پوسٹ گریجویٹ کورسز: ماسٹرز اور پی ایچ ڈی۔

پیشہ ورانہ کورسز: انجینئرنگ، میڈیکل، زراعت، جانوروں کی ڈاکٹری، قانون، دانت سازی، مینجمنٹ، کمپیوٹر وغیرہ۔

معروف اداروں میں کمپیوٹر کے سرٹیفیکٹ کورس جو ڈیپارٹمنٹ آف الیکٹرانکس سے منظور شدہ ہوں یا کسی یونیورسٹی سے ملحق ادارے کا کورس۔

آئی سی ڈبلیو اے، سی اے اور سی ایف اے جیسے کورسز۔

وہ کورسز جو آئی ایم، آئی آئی ٹی، آئی آئی ایس سی، ایکس ایل آر آئی، این آئی ایف ٹی وغیرہ کے ذریعہ منعقد ہوتے ہیں۔

ریگولر ڈگری یا ڈپلومہ کورسز مثلاً پائلٹ ٹریننگ اور شپنگ وغیرہ جو متعلقہ ڈائریکٹر جنرل سے منظور شدہ ہوں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ کورس

ہندوستان میں کیا جائے، بیرون ملک سے کورس کرنے کی صورت میں اس ملک کی متعلقہ انتظامیہ سے اس کی منظوری ضروری ہے۔

ہندوستان میں مختلف بین الاقوامی موقر یونیورسٹیز کے ذریعہ فراہم کئے جانے والے کورسز۔

منظور شدہ اداروں کے شام کے کورسز۔

وہ کورسز جو قومی ادارے اور دیگر معروف پرائیویٹ ادارے فراہم کرتے ہیں۔

وہ کورسز جو اوپر ذکر کئے گئے معیار پر پورے نہ اترتے ہوں، کچھ بینک ان کے بارے میں غور کر کے انہیں بھی شامل کر سکتے ہیں۔

۲۔ بیرون ملک:

گریجویٹ: پیشہ ورانہ یا تکنیکی کورسز۔

وہ کورسز جو معروف یونیورسٹیاں فراہم کرتی ہیں۔

پوسٹ گریجویٹ: ایم سی اے، ایم بی اے، ایم ایس وغیرہ۔

وہ کورسز جو CIMA لندن میں اور CPA امریکہ میں فراہم کرتا ہے۔

۴۔ ج: مصارف جن کے لئے لون ملتا ہے:

فیس۔ کالج، اسکول یا ادارہ الاقامہ کی۔

امتحان، لائبریری اور تجربہ گاہ کی فیس۔

کتابوں، آلات اور یونیفارم وغیرہ کی خریداری کا خرچ۔

ضمانتی رقم، تعمیراتی فنڈ، قابل واپسی رقم وغیرہ، اس کے لئے یہ شرط ہے کہ یہ رقم مکمل ٹیوشن فیس کے دس فیصد سے زائد نہیں ہونی چاہئے۔

بیرون ملک تعلیم کی صورت میں سفر کے اخراجات۔

کمپیوٹر کی خریداری اور کورس کی تکمیل کے لوازمات کے اخراجات۔

بیمہ معاہدہ کی قسط۔

کورس کی تکمیل کی راہ میں دیگر تمام اخراجات مثلاً تعلیمی دورے، پروجیکٹ ورک، مقالہ وغیرہ کے اخراجات۔

۵۔ سرمایہ کی فراہمی کی اجازت یافتہ مقدار:

ضرورت کے وقت سرمایہ کی فراہمی دراصل طالب علم یا والدین کی استطاعت پر منحصر ہوتی ہے کہ آیا وہ رقم واپس کر سکتے ہیں یا نہیں، اس کا مارجن اور آخری حد درجہ ذیل ہیں:

ہندوستان میں تعلیم کے لئے: زیادہ سے زیادہ دس لاکھ روپے۔

بیرون ملک تعلیم کے لئے: زیادہ سے زیادہ بیس لاکھ روپے۔

۶۔ مارجن:

چار لاکھ تک کچھ نہیں۔

چار لاکھ سے زائد ہندوستان میں ۵ فیصد۔

چار سے زائد بیرون ملک ۱۵ فیصد۔

اسکالرشپ اور اسٹنڈنٹ شپ مارجن میں داخل ہے۔

مارجن کو سالانہ بنیاد پر کیا جاسکتا ہے جبکہ ادائیگی صحیح تناسب سے ہو۔

۷۔ ضمانت:

چار لاکھ تک: والدین کی مشترکہ ذمہ داری، کوئی ضمانت نہیں۔

چار لاکھ سے ساڑھے سات لاکھ تک: والدین کی مشترکہ ذمہ داری کے ساتھ قرض کی ضمانت کے طور پر مناسب تیسرے شخص کی ضمانت، استثنائی صورتوں میں اگر بینک چاہے تو والدین جنہوں نے مشترکہ قرضدار کی حیثیت سے معاہدہ کیا ہے ان پر اطمینان کرتے ہوئے تیسرے شخص کی ضمانت کی شرط ختم کر سکتا ہے۔

ساڑھے سات لاکھ سے زائد: والدین کی مشترکہ ذمہ داری کے ساتھ بطور ضمانت غیر منقولہ جائیداد کو رہن رکھنا جو مناسب قیمت کی ہو، ساتھ ساتھ اقساط کی ادائیگی کے لئے طالب علم کی مستقبل میں آمدنی کا ہبہ نامہ۔

۸۔ شرح سود:

چار لاکھ تک BPLR -

چار لاکھ سے زائد BPLR+ ایک فیصد -

ادائیگی کی مہلت تک مفرد سود عائد ہوگا۔

تعزیری سود مختلف بینکوں کے اپنے اپنے قوانین کے لحاظ سے عائد ہوگا۔



## ۹۔ تفتیش منظوری ادا کیگی:

ایک عام کورس کے سلسلہ میں جانچ کرتے وقت طالب علم کی مستقبل میں آمدنی کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں بوقت ضرورت والدین کا بھی اس ناحیہ سے جائزہ لیا جاسکتا ہے کہ آیا وہ رقم واپس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں۔

لون انتظامیہ کے ذریعہ ترجیحی بنیاد پر والدین کی جائے سکونت سے قریب ترین شاخ سے جاری کیا جاتا ہے۔

تعلیمی قرض کے لئے موصول شدہ کوئی بھی درخواست اگلے با اختیار اشخاص کی اتفاق رائے کے بغیر نام منظور نہیں کی جاسکتی۔

لون بقدر ضرورت مختلف مرحلوں میں بلا واسطہ طور پر ادارہ، کتاب فروش اور آلات فروش کو ممکن حد تک ادا کیا جائے گا۔

## ۱۰۔ قرض کی واپسی:

واپسی کی مہلت۔ کورس کی مدت + ایک سال یا ملازمت کے حصول کے بعد چھ مہینہ (ان میں جو مدت پہلے پوری ہو جائے)۔

رقم کی واپسی کے آغاز سے پانچ تا سات سال کے اندر لون واپس کرنا ہوتا ہے، اگر طالب علم متعینہ وقت کے اندر کورس کی تکمیل نہ کر سکے تو زیادہ سے زیادہ دو سالوں کے لئے اسے مزید مہلت دی جاسکتی ہے، اگر طالب علم کچھ ایسی وجوہات کی بنا پر کورس مکمل نہ کر سکے جو اس کے بس میں نہ ہوں تو قرض کی منظوری دینے والے با اختیار افراد اگر چاہیں تو کورس کی تکمیل کے لئے مطلوبہ وقت تک مزید مہلت دینے کے بارے میں غور کر سکتے ہیں۔

قرض کی ادا کیگی کی مہلت کے درمیان حاصل ہونے والا قرض اصل رقم میں جوڑا جاتا ہے اور واپسی برابر ماہانہ اقساط میں متعین ہوتی ہے۔

لون لینے والوں کو ایک فیصد کی رعایت دی جاسکتی ہے اگر سود کی رقم اسکیم کے مطابق متعین کردہ تعلیم کی مدت ہی میں ادا کر دی جائے۔

۱۱۔ انشورنس:..... بینک ان طلبہ کے لئے جو تعلیمی قرض حاصل کرتے ہیں لائف انشورنس کی سہولت فراہم کر سکتے ہیں، مختلف بینک مختلف انشورنس

کمپنیوں

کے ساتھ مل کر خصوصی طریقہ کار وضع کر سکتے ہیں۔

۱۲۔ تفتیش:..... بینک قرض حاصل کرنے والے طالب علم کے ادارے یا یونیورسٹی سے مستقل ربط رکھ کر ذمہ داروں سے طالب علم کی ترقی

مناسب

رپورٹ

وقفہ سے حاصل کرتا رہتا ہے، بیرون ملک تعلیم کی صورت میں بینک طالب علم کا UIN یا شناختی کارڈ نمبر اپنے ریکارڈ میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

۱۳۔ پروسیسنگ چارجز: ہندوستان میں تعلیم کے لئے حاصل کئے گئے تعلیمی قرضہ جات پر کوئی پروسیسنگ چارج نہیں لیا جائے گا۔

## ۱۴۔ اہلیت کا ثبوت:

وہ طلبہ جو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جا رہے ہوں، بینک انہیں اہلیت کا ثبوت جاری کر سکتا ہے، اس مقصد کے لئے بوقت ضرورت درخواست گزار سے ضروری کاغذات طلب کئے جاسکتے ہیں۔

(کچھ بیرونی یونیورسٹیاں طلبہ سے ایسے دستاویزات کا مطالبہ کرتی ہیں جو ان کے بینکرز کی جانب سے اس بات کا ثبوت ہوں کہ ان کے قرض کی ذمہ داری لینے والے قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تاکہ وہ اس بات کو یقین بنا سکیں کہ طلبہ کے کورس کی تکمیل تک ان کے اسپانسر ان کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔

۱۵۔ دیگر شرائط:

الف۔ وہ بینک جو استثنائی طور پر غیر معمولی استعداد کے طلبہ کو بغیر ضمانت کے تعلیمی قرض فراہم کرنا چاہتے ہوں، وہ اس قسم کے اختیارات اونچے درجے کے باختیار افراد کے سپرد کر سکتے ہیں۔

ب۔ ایک سے زائد لون:

ایک ہی خاندان سے متعدد یا ایک سے زائد تعلیمی قرضوں کے لئے درخواست وصول ہونے کی صورت میں خاندان ایک اکائی سمجھا جائے گا اور پوری رقم کے بقدر ضمانت درکار ہوگی۔

ج۔ عمر کی ادنیٰ حد:

تعلیمی قرض کے حصول کے لئے عمر کی کوئی ادنیٰ ترین حد نہیں ہے۔

د۔ پتہ کی تبدیلی:

بار بار یا کبھی پتہ تبدیل ہونے کی صورت میں بینک مراسلت کا پتہ نوٹ کرنے کی سہولت فراہم کر سکتا ہے تاکہ وہ ان سے ربط میں رہے۔

بینک اہلیت کی حد کے اندر طلبہ کو مزید تعلیم کے لئے مزید لون فراہم کر سکتا ہے اور اس میں تبدیلی کر سکتا ہے، اس صورت میں وہ مطلوبہ ضمانت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

و۔ قرض کی واپسی کی ذمہ داری قبول کرنے والے طالب علم کے والدین یا سرپرست ہو سکتے ہیں، اگر وہ شخص شادی شدہ ہے تو اس کی بیوی، شوہر یا ساس و سرسبھی یہ ذمہ داری لے سکتے ہیں۔

درج ذیل بینک طلبہ کو تعلیمی قرض فراہم کرتے ہیں:

State Bank of India	بینک کا نام
<a href="http://www.statebankofindia.com">http://www.statebankofindia.com</a>	ویب سائٹ
لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق	شرح سود
ہندوستان میں دس لاکھ روپے بیرون ملک بیس لاکھ روپے	لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار
<a href="http://www.sbi.co.in/viewsection.jsp?id=0,1,20,118">http://www.sbi.co.in/viewsection.jsp?id=0,1,20,118</a>	فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک

Allahabad Bank	بینک کا نام
<a href="http://www.allahabadbank.com">http://www.allahabadbank.com</a>	ویب سائٹ
لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق	شرح سود
ہندوستان میں ساڑھے سات لاکھ روپے بیرون ملک ۱۵ لاکھ روپے	لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار

فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک <http://www.allahabadbank.com/educationloan.htm>

Union Bank of India	بینک کا نام
<a href="http://www.unionbankofindia.com">http://www.unionbankofindia.com</a>	ویب سائٹ
لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق	شرح سود
ہندوستان میں ساڑھے سات لاکھ روپے بیرون ملک ۱۵ لاکھ روپے	لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار
<a href="http://www.unionbankofindia.co.in/In_Union_Education.aspx">http://www.unionbankofindia.co.in/In_Union_Education.aspx</a>	فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک

Bank of Broda	بینک کا نام
<a href="http://www.bankofbaroda.com">http://www.bankofbaroda.com</a>	ویب سائٹ
لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق	شرح سود
ساڑھے سات لاکھ روپے	لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار
<a href="http://www.bankofbaroda.com/pfs/eduloan.asp">http://www.bankofbaroda.com/pfs/eduloan.asp</a>	فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک

UCO Bank	بینک کا نام
<a href="http://www.ucobank.com">http://www.ucobank.com</a>	ویب سائٹ
لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق	شرح سود
ہندوستان میں ساڑھے سات لاکھ روپے بیرون ملک ۱۵ لاکھ روپے	لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار
<a href="http://www.ucobank.com/loan.htm#EDUCATIONALLOAN">http://www.ucobank.com/loan.htm#EDUCATIONALLOAN</a>	فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک

Bank of India	بینک کا نام
<a href="http://www.bankofindia.com">http://www.bankofindia.com</a>	ویب سائٹ
لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق	شرح سود
ہندوستان میں دس لاکھ روپے بیرون ملک تیس لاکھ روپے	لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار

فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک <http://www.bankofindia.com/Home/productservices/eduloans.aspx>

بینک کا نام	Oriental Bank of Commerce
ویب سائٹ	<a href="http://www.obcindia.com">http://www.obcindia.com</a>
شرح سود	لون کی ادائیگی کے وقت بینک کی پالیسی کے مطابق
لون کی زیادہ سے زیادہ مقدار	ہندوستان میں دس لاکھ روپے بیرون ملک بیس لاکھ روپے
فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک	دستیاب نہیں ہے۔

### تعلیم کے لئے سرمایہ کی فراہمی کے دیگر ذرائع:

چونکہ سود مسلمانوں کے لئے حرام ہے لہذا وہ غیر سودی تعلیمی قرض، اسکالرشپ، زکوٰۃ اور اوقاف ایجنسیوں کے ذریعہ سرمایہ کی فراہمی کا کوئی ذریعہ تلاش کرتے ہیں، بہر حال یہ ذرائع ناکافی ہیں اور اسی لئے مسلم طلبہ کو تعلیمی قرض فراہم کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

سچر کمیٹی رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد مرکزی حکومت نے کم آمدنی والے مسلم خاندانوں کے لئے پری میٹرک، پوسٹ میٹرک اور ڈگری سطح کی تعلیم کے لئے چند تعلیمی وظائف کا سلسلہ شروع کیا ہے، مرکزی حکومت کے تحت مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن اور چند ریاستوں کے اقلیتی مالیاتی اداروں نے بھی مسلم طلبہ کے لئے کچھ خصوصی وظائف کی شروعات کی ہے، بہر حال ان کا افسر شاہی طریقہ کار ان وظائف کی ادائیگی کی راہ میں مختلف رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے، سعودی عرب کا اسلامی ترقیاتی بینک وہ واحد ادارہ ہے جو ہر سال ایسے ایک سو بیس مسلم طلبہ کو غیر سودی قرض اور وظائف فراہم کرتا ہے جنہوں نے کسی پیشہ ورانہ کورس میں داخلہ حاصل کر لیا ہو۔

دیگر تمام ذرائع بھی مسلم طلبہ کی تعلیم اور مسلم معاشرہ کی ترقی کے لئے کافی نہیں ہیں، اسی لئے ہمیں مرکزی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ہندوستان میں غیر سودی اسلامی بینکنگ کو ممکن بنائے اور غیر سودی تعلیمی قرض فراہم کرے، ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی اس کے بغیر ناممکن ہے۔



## تعلیمی قرض (Educational Loan)

انجینئر طارق سجاد

ہندوستان کا تعلیمی پس منظر:

گذشتہ ایک دہائی سے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا منظر نامہ بالکل بدل چکا ہے۔ نئی نسل میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اور خاص طور پر پروفیشنل اور پروفیشنل کورسز کو کرنے کے لیے ایک ہوڑی لگی ہے۔ چنانچہ 17 ہزار کالجز، 400 یونیورسٹیاں اور 13 قومی سطح پر مقبول و معروف تعلیمی ادارے (IIT, IIM, IISC, IIIT, NIT) وغیرہ تعلیمی ادارے بھی اب جدید اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ناکافی ہو رہے ہیں۔ آج سے چند سال قبل ان اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات ہر طالب علم کے لئے اٹھانا ممکن نہیں تھا نتیجتاً ایسے ذہین اور ہونہار طلباء و طالبات صرف مالی پریشانی کی وجہ سے ان اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مسابقتی (Competative) امتحانات میں کامیاب ہونے کے باوجود ان اداروں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے تھے۔ غرض یہ کہ ایسے باصلاحیت نوجوان صرف مالی پریشانیوں کے سبب تعلیم چھوڑ کر مجبوراً کچھ چھوٹے موٹے روزگار میں لگ جاتے تھے۔

اس پس منظر میں جب ہم مسلمانوں کی نئی نسل کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ اور بھی ابتر نظر آتی ہے۔ زیادہ تر مسلم بچے میٹرک اور پلس ٹو آتے آتے ڈراپ آؤٹ ہو جاتے ہیں اور جو چند باقی رہ جاتے ہیں وہ مالی دشواریوں کی بنا پر نہ اچھی کو چنگ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان مسابقتی امتحانات میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ غرض اس طرح کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی فیصد محض 2% - 4% تک ہی رہ پاتی ہے۔ حالیہ سچر کمیٹی کی رپورٹ نے اس طرف واضح نشاندہی کی ہے۔

### تعلیمی وظیفہ (Scholarship) اور قرض (Loan):

سرکاری اور چند غیر سرکاری اداروں نے ایسے ذہین طلباء و طالبات کے لئے کچھ مخصوص وظائف کا اہتمام کیا ہے جو مالی طور سے تعلیم حاصل کرنے میں قاصر رہتے ہیں لیکن ان وظائف کی تعداد بہت کم رہتی ہے اور یہ بیشتر ضرورت مند طلباء تک نہیں پہنچ پاتی ہے۔ البتہ حکومت ہند نے حالیہ سچر کمیٹی کی سفارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے وزارت اقلیتی امور (Ministry of Minority Affairs) نئی دہلی اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تحت کئی طرح کے اسکالرشپ کا اعلان کیا ہے جسکی تفصیل آگے پیش کی جا رہی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحان اور تعلیمی اخراجات کے روز افزوں اضافے کے سبب کئی پرائیویٹ اور نیشنلائزڈ (Nationalised) بینک طلباء کو تعلیمی قرض دینے کے لئے سامنے آئے ہیں۔ چند بینک جو طلباء و طالبات کو تعلیمی قرض دے رہے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں الہ آباد بینک، پنجاب نیشنل بینک، انڈین بینک، اسٹیٹ بینک آف انڈیا، سنٹرل بینک، HDFC بینک، IDBI بینک وغیرہ ریزرو بینک آف انڈیا (RBI) کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق مختلف بینکوں کے ذریعہ دی جانے والی تعلیمی قرض گذشتہ سال 9962 کروڑ سے بڑھ کر پندرہ ہزار کروڑ ہو گئی، یعنی تقریباً 51 فی صد کا اضافہ ہوا۔ ان بینکوں سے تعلیمی قرض کا حصول کس طرح سے ہوا اور اس کی جانکاری مسلم طلباء و طالبات کو نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو انکی شرائط اور ان کے سود کی شرح (Interest rate) اتنی ہوتی ہے کہ مسلم طلباء و طالبات اس شرح کے لون (قرض) کو ترجیح نہیں دیتے۔ آئیے ہم ان بینکوں کے ذریعہ تعلیمی قرض کے حصول کی تفصیلات کو مطالعہ کریں۔

ٹ سکرپٹی مرکز ادب و سائنس۔

بینکوں کے ذریعہ دیئے جانے والے تعلیمی قرض:

کوئی بھی طالب علم کسی بھی ایسے پرو فنیشنل یا وکیشنل، گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ کورسز کے لئے ان بینکوں سے لون حاصل کر سکتا ہے جو کہ حکومت کے یو جی سی (UGC) AICTE، یا اسی طرح کے مرکزی اداروں سے منظور شدہ ہوں۔ کچھ بینکنس پرائیویٹ اداروں کے ذریعہ چلائے جانے والے کورسز کے لئے بھی لون فراہم کرتے ہیں لیکن ترجیح ایسے کورسز کو ہی ملتی ہے جو ریاستی یا مرکزی حکومت سے منظور شدہ ہوں۔

عمومی طور پر بینک ایک امیدوار کو ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ 10 لاکھ کا قرض فراہم کرتا ہے۔ اور جو بیرون ملک میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے 20 لاکھ تک۔ یہ رقم بینک کے ذریعہ ٹیوشن فیس کی ادائیگی، کورس بک کی خریداری، روزمرہ کے اخراجات اور ہوسٹل چارجز، کمپیوٹر یا کسی قسم کے آلات (Instruments) کی خریداری کے لئے دی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ بینک 4 لاکھ تک کے قرض میں کسی طرح کا سود (Interest) نہیں لیتا۔ 4 سے 10 لاکھ میں بینک کی شرح 10% - 12% اور 10 لاکھ سے اوپر قرض لینے پر 12% - 14% سالانہ تک ہوتی ہے۔ قرض کی رقم کو لینے کے لئے امیدوار کے والدین کو گارنٹر (Guarantor) بننا پڑتا ہے۔ اور بینک لون دیتے وقت والدین کی مالی صورت حال کی تحقیق و تفتیش بھی کرتا ہے۔

دوران تعلیم اور تعلیم کے مکمل ہونے کے 6 مہینے سے ایک سال تک بینک امیدوار سے لون کی رقم واپس کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا لیکن امیدوار کو روزگار ملتے ہی یا تعلیم مکمل ہونے کے ایک سال کے بعد سود کے ساتھ تمام قرض کی رقم کی ادائیگی پانچ سے سات سالوں کے اندر بینک کو کرنی پڑتی ہے۔ جو امیدوار کسی وجہ سے قرض کی ادائیگی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نہیں کرتا ہے تو بینک اسکے گارنٹر سے لون کے رقم کی وصولی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ بینک شروعات کے دو سے تین سالوں میں سود کی رقم کی وصولی کرتا ہے۔ اور آخر کے سالوں میں اصل (Principal) رقم کی وصولی کرتا ہے۔ اگر کوئی امیدوار چاہے تو پورے قرض رقم کی واپسی تعلیم مکمل کرنے کے لئے فوراً بعد بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لئے کچھ بینک پرنسپل رقم پر کچھ فی صد ہرجانہ (Penalty) لگا کر رقم واپس لے لیتے ہیں اور اس طرح وہ امیدوار سود کی زائد رقم کئی سالوں تک دینے سے بچ جاتا ہے۔

قرض کی منظوری (Sanction) کے لئے بینک امیدوار سے جن کاغذات و دستاویزات کا مطالبہ کرتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

تعلیمی لون کے لئے پُر کیا ہوا درخواست

آخری امتحان (Qualifying) کا مارکس شیٹ

داخلے کا ثبوت

کورس کے دوران ہونے والے اخراجات کی تفصیلات

گارنٹر کی آمدنی کی تفصیلات وغیرہ

مسلم امیدواروں کو تعلیمی لون کے حصول میں مشکلات:

مسلم طلباء و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بینکوں کے ذریعہ مختلف لون اسکیم کی جانکاری نہیں ہوتی اور اگر معلومات ہوتی بھی ہے تو بینک سے رجوع کرنے پر بینک والے عام طور پر مسلم امیدواروں کو ناٹل مٹول (Discourage) کرتے ہیں۔ امیدواروں کے گارنٹر کی آمدنی کی بلاوجہ تحقیق کرتے ہیں اور کم آمدنی ہونے پر درخواست کو نامنظور بھی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بینک کو یہ کلی اختیار ہے کہ بغیر گارنٹر کے یا اسکی آمدنی کے کم ہونے پر بھی امیدوار کو لون دے سکتا ہے۔

دوسری سب سے بڑی قباحت جو مسلم امیدواروں کو تعلیمی قرض لینے میں حائل ہے وہ ہے اسکا سودی نظام۔

واضح رہے کہ حکومت نے RBI کے ذریعہ تمام بینکوں کو یہ ہدایت دے رکھی ہے کہ تعلیمی قرض امیدواروں کو کم سے کم سودی شرح پر دی جائے لیکن مختلف بینک اپنے طور پر من مانہ طریقے سے سود کی شرح عائد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم امیدواروں کی تعداد بینکوں سے تعلیمی قرض لینے میں کم ہوتی ہے۔ جسکی نشاندہی سچر کمیٹی کی رپورٹ نے بھی کی ہے۔

حکومت ہند کی اسکالرشپ اسکیم:

سچر کمیٹی کی سفارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت ہند کی وزارت اقلیتی امور (MMA) نے اقلیتوں کے لئے مندرجہ ذیل وظائف کا اعلان کیا ہے:

- (1) پری میٹرک اسکالرشپ اسکیم
- (2) پوسٹ میٹرک اسکالرشپ اسکیم
- (3) میرٹ کم مینس اسکالرشپ (Means-Cum-Merit)
- (4) مفت کوچنگ اسکیم

۱۔ پری میٹرک (Matric-Pre) اسکالرشپ اسکیم:

اس اسکیم کے تحت ایسے بچے جو سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کے والدین کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے سے کم ہے اس وظیفہ کے لئے درخواست دے سکتے ہیں۔ اس اسکالرشپ کے تحت طلباء/طالبات کو Rs. 5700 سالانہ کی رقم فیس، کتابوں وغیرہ کی خرید داری اور دیگر اخراجات کو پر کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ اس اسکالرشپ کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ اقلیتوں کے بچے کم سے کم ڈراپ آؤٹس ہوں کیونکہ اگر شروع سے ہی ابتدائی سطح پر ان ڈراپ آؤٹس (Drop Outs) کو نہیں روکا گیا تو اعلیٰ تعلیم تک اقلیتوں کے بچے نہیں پہنچ سکیں گے۔

۲۔ پوسٹ میٹرک (Post Matric) اسکالرشپ اسکیم:

یہ اسکالرشپ ایسے بچوں کے لئے حکومت ہند نے دینا شروع کیا ہے جو +2 سطح پر مختلف مسابقتی امتحانات مثلاً میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر پروفیشنل کورسز کی تیاری اور کوچنگ کر رہے ہوں۔ اس اسکالرشپ کے حقدار ایسے والدین ہیں جن کی آمدنی دو لاکھ روپے سالانہ سے کم ہے اور جن کے بچے میٹرک میں 50% سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہیں۔ اس اسکالرشپ کے تحت فیس اور دیگر امور کے اخراجات کے لئے 8400 روپے سالانہ کوچنگ کے لئے دیا جاتا ہے۔

۳۔ میرٹ کم مینس (Means-Cum-Merit) اسکالرشپ:

یہ اسکالرشپ ایسے مسلم طلباء و طالبات کے لئے ہے جو میڈیکل، انجینئرنگ، اکاؤنٹس مینجمنٹ وغیرہ کے تکنیکی یا پروفیشنل کورسز کو کر رہے ہوں اور جن کے والدین کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ روپے سے کم ہے۔ اس اسکیم کے تحت حکومت دس ہزار روپے براہ راست امیدوار کو قیام و طعام اور ہاسٹل کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے دے رہی ہے۔ اور دس ہزار روپے ان اداروں کو بھی دیا جا رہا ہے جہاں سے امیدوار تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ قومی سطح پر معیاری اداروں مثلاً NIT, IIT, IIM, IIIT, IIT وغیرہ سے تعلیم حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی مکمل فیس کی ادائیگی براہ راست حکومت کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔

مندرجہ بالا تینوں اسکالرشپ اسکیموں کا کوٹا ریاست وارفنٹری آف مائنارٹی افریز کے ویب سائٹ میں درج ہے جو مندرجہ ذیل ہے [www.minorityaffairs.gov.in](http://www.minorityaffairs.gov.in) ان تمام اسکالرشپ میں لڑکیوں کی 30% صد تعداد محفوظ (Reserve) کر دی گئی ہے۔

۴۔ کوچنگ اسکیم:

اس اسکیم کے تحت حکومت ایسے طلباء کو وظیفہ دے رہی ہے جو سول سروسز یا ریاستی سطح پر کرائے جا رہے امتحانات کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (MAEF) ایسے کوچنگ اداروں کے قیام کے عمل میں اچھی خاصی رقم دے رہا ہے جہاں سے اقلیتی بچے IUPSC اور ریاستی حکومت کے امتحانات کی کوچنگ لے رہے ہیں۔

## اسکا لرشپ اسکیم کے لئے کارپس فنڈ:

حکومت ہند نے ان مختلف مندرجہ بالا وظائف کو دینے کے لئے مخصوص کورپس فنڈ کی تشکیل کی ہے جو کہ تعلیمی ٹیکس (Educational Cess) اور دیگر ذرائع سے کھڑا کیا گیا ہے۔ اس فنڈ کے سود (Interest) کے ذریعہ جو آمدنی ہو رہی ہے اس کو مختلف فلاحی کاموں اور تعلیمی وظائف میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ اسکا لرشپ کی رقم کو طلباء و طالبات کو لوٹانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی ہے، لیکن اس طرح کے وظائف کی تعداد کم ہوتی ہے۔ لہذا امیدواروں کو مجبوراً بینک لون کی طرف جانا ہی پڑتا ہے۔

غیر سرکاری اداروں کے ذریعہ دی جانے والی رقم:

ہندوستان میں چند ایسے بھی غیر سرکاری فلاحی ادارے ہیں جو مختلف قسم کے تعلیمی لون طلباء و طالبات کو اپنے ذرائع سے دے رہے ہیں۔ ان میں چند جو مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جا رہے ہیں وہ غیر سودی تعلیمی لون امیدواروں کو فراہم کر رہے ہیں۔ اس طرح کے لون دینے والے ادارے بہت کم ہیں۔ مثلاً مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ، اسلامک ڈیولپمنٹ بینک، اسٹوڈنٹس اسلامک ٹرسٹ، فاؤنڈیشن فار سوشل کیئر (FSC) وغیرہ۔

حکومت ہند اگر واقعی اقلیتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لئے سنجیدہ ہے تو اسے مندرجہ ذیل امور پر جلد از جلد پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے:

- (1) بینکوں کے ذریعہ دیے جانے والے تعلیمی لون کو اقلیتوں کے لئے سود سے مستثنیٰ کیا جائے۔
- (2) مختلف وظائف اور اسکا لرشپ کی تعداد کو بڑھایا جائے
- (3) بینکوں سے قرض کے حصول کو اقلیتوں کے لئے آسان کیا جائے
- (4) مسلمانوں کے لئے بلا سودی تعلیمی کورپس فنڈ کی تشکیل دی جائے
- (5) بلا سودی غیر سرکاری اداروں کو حکومت زیادہ سے زیادہ مالی تعاون دے کر فروغ دے۔
- (6) مرکزی وقف کونسل اور ریاستی بورڈ اپنی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ تعلیمی قرض کے لئے مختص کرے
- (7) ہر شہر علاقہ، پچائنت اور بلوک لیول پر مسلم افراد اور اداروں کو اپنے طور پر تعلیمی قرضوں اور تعلیمی وظائف کا موثر نظم کرنا چاہئے۔

علماء اور فقہاء اور دانشوروں کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ جب تک تعلیمی قرض کی شرائط اور سود کی شرح کم نہیں ہوتی ہے تب تک کے لئے مسلم طلباء و طالبات اعلیٰ مگر خرچہ چلی تعلیم کس طرح حاصل کریں؟





## وجیا بینک (تعلیمی قرض)

استحقاق:

طالب علم ہندوستان کا شہری ہو، اس نے مبنی بر صلاحیت انتخابی عمل یا امتحان داخلہ کے ذریعہ ہندوستان یا کسی دوسرے ملک میں متعلقہ پیشہ ور یا ٹیکنیکل کورس میں داخلہ لے لیا ہو۔

ایسے کورسز (Courses) جن کے لئے قرض دیا جاتا ہے۔

الف۔ اندرون ہند تعلیم کے لئے۔

گریجویٹ کورسز (عالمیت کے مساوی مختلف نصابیات): جسے (BA) بی اے، بی کوم (B Com)، بی ایس سی (Sc.B) وغیرہ۔

پوسٹ گریجویٹ کورسز (فضیلت کے مساوی نصابیات): جیسے ماسٹر ڈگری، پی ایچ ڈی وغیرہ (تخصصاتی اور ریسرچ و تحقیق سے متعلق کورسز)۔

پیشہ ورانہ کورسز: انجینئرنگ، میڈیکل، زراعت، بیگاری (جانوروں سے متعلق طب کا شعبہ)، قانون، ڈینٹل (طب کا وہ شعبہ جو دانتوں سے متعلق ہے)،

مینیجمنٹ، کمپیوٹر سائنس کے کورسز (بی سے اے BCA، ایم سی اے MCA، بی ایس سی ایس BSC in computer science، وغیرہ)۔

اینی میشن Animation (مسلحہ قلمی خاکوں کے ذریعہ بنی ہوئی تصویروں کو پردے پر حرکت کرتا ہوا دیکھانا، کارٹوننگ Cartooning،

کمپیوٹر سافٹ ویئر یا کمپیوٹر کے ذریعہ مضحکہ خیز صورت طرازی)، ملٹی میڈیا یا Multi Media (پرنٹ و الیکٹرانک اور ڈیجیٹل وغیرہ وسائل کا

مجموعہ یعنی جو عبارت و سماعت اور بصارت پر مشتمل ہو) اور گرافک ڈیزائننگ Graphic Designing وغیرہ۔

(ترسیلی فنون کی تخلیقات و تزئین خصوصاً تجارتی مقاصد کے لئے)۔

ان تمام کورسز کی مدت کم از کم ایک سال یا اس سے زیادہ ہونا ضروری ہے اور ان کی تعلیم ایسے مشہور و معروف اداروں میں ہوتی ہے جن کے اندر مندرجہ ذیل

شرائط پائی جاتی ہیں:

الف۔ جس کی تصدیق ناس کام NASSCOM کی طرف سے کی ہو۔

ب۔ جس کا الحاق AICTE سے ہوا ہو۔

ج۔ یو جی سی UGC سے ملحق کسی بھی ہندوستانی یونیورسٹی سے منظور شدہ ہو۔

د۔ کسی بھی غیر ملکی مشہور و معروف یونیورسٹی سے ملحق ہو۔

یونیورسٹی سے ملحق اداروں یا شعبہ الیکٹرانک سے تسلیم شدہ اداروں کے کمپیوٹر سٹیمٹ کورسز

سی اے سی ایف اے اور آئی سی ڈپلومہ وغیرہ جیسے کورسز (یہ تمام کورسز مالیات سے جڑے ہوتے ہیں)۔

XLPI, IISC, IIT, IIM اور NIFT وغیرہ جیسے باوقار عالمی شہرت کے حامل اداروں میں پڑھائے جانے والے کورسز۔

CFAI نیشنل کالج کے پیشہ ورانہ کورسز۔

مسٹر اینڈ مسز فرینکفمن انسٹی ٹیوٹ آف ایئر ہوٹس کے پیش کردہ کورسز (جہازوں میں امور ضیافت پر مامور لڑکے لڑکیوں کی تربیت کے کورسز)۔  
 تربیتی پروگرام برائے پائلٹ (حکومت یا حکومت ہند کے شہری ہوابازی کے ڈائریکٹر جنرل سے منظور شدہ اداروں کے ذریعہ)۔  
 غیر ملکی مشہور معروف یونیورسٹی کے ذریعہ ہندوستان میں پڑھائے جانے والے کورسز۔

منظور شدہ اداروں کے شام والے کورسز

دوسرے تمام ایسے کورسز جو ایسے کالج یونیورسٹی کے ذریعہ پڑھائے جاتے ہوں جو UGC حکومت ہند، ICRM, AIBMS, AICTE وغیرہ سے منظور شدہ ہوں اور ان کورسز کے اختتام پر Diploma یا ڈگری دی جاتی ہو۔

ملکی اور مشہور معروف اداروں میں پڑھائے جانے والے کورسز بنک کسی بھی ادارے کے قابل تعریف مظاہرے کی بنیاد پر اس کے کورسز منظور کر سکتا ہے۔  
 بیرون ملک تعلیم کے لئے:

گریجویٹیشن، ملازمت دلانے والے پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل کورسز جو مشہور معروف یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہوں۔

پوسٹ گریجویٹیشن (فضیلت) MS, MBA, MCA وغیرہ۔

CIMA لندن، ICMA امریکہ وغیرہ کی طرف سے چلائے جانے والے کورسز۔

بیرون ملک کی حکومتوں کے اتھارٹیٹی کی طرف سے منظور شدہ اداروں کے تربیتی پروگرام برائے پائلٹ۔ اس کی مثال میں حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مرکزی ہوابازی انتظامیہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

ان اداروں کی طرف سے جاری کردہ سندوں کا اس کے مساوی ہندوستانی سندوں میں تبدیل کیا جانا ممکن ہو جب کہ امیدوار ہندوستان میں ملازمت کا خواہاں ہو، یا پھر اپنی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد حکومت ہند کے شہری ہوابازی کے ڈائریکٹر جنرل کی ہدایتوں کے مطابق۔

کن اخراجات کے لئے قرض دیا جاتا ہے:

اسکول، کالج، یا اسپتال کی فیس ادا کرنے کے لئے۔

امتحان، لائبریری یا تجربہ گاہ کی فیس ادا کرنے کے لئے۔

کتاب، مشین، آلات، یونیفارم کی خریداری کے لئے۔

شمانتی رقم، تعمیراتی فنڈ، بعد میں واپس کیا جانے والا ڈپازٹ کی ادائیگی کے لئے جس کی رسید اس ادارے کو دی گئی ہو۔

کرایہ، سفر کا خرچ (باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی صورت میں)۔

کمپیوٹر اور کورس کی تکمیل کے لئے لازمی اشیاء کی خریداری۔

کورس کی تکمیل کی خاطر کوئی بھی خرچ جیسے تعلیمی سفر، پراجیکٹ ورک اور تھیسز وغیرہ کی تکمیل کے لئے۔

CET CELL کے نام سے DD جاری کرنے کے لئے۔

ادارہ، ہاسپٹل، امتحان، کتاب، سفر و باہر تعلیم حاصل کرنے کی صورت میں کمپیوٹر وغیرہ کے اخراجات کے لئے۔

قرض کی رقم:

ہندوستان میں تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ دس لاکھ روپے۔

بیرون ہند تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ ۲۰ لاکھ روپے۔

BPLR سالانہ روال شرح سود 50.1 فیصد۔

دوران تعلیم قرض کی یا سود کی ادائیگی کی فرصت کی مدت میں سادہ سود (کورس کی تکمیل کے ایک سال بعد یا کسی ملازمت کے لئے تقرر کے چھ مہینے بعد اس میں جو بھی پہلے ہو۔ ایسے قرض داروں کو سود میں ایک فیصد کی رعایت کی جائے گی اگر دوران تعلیم سود کی رقم دی جاتی ہے۔

مارجن:

چار لاکھ تک کچھ نہیں۔

اندرون ہند تعلیم کے لئے چار لاکھ سے زیادہ پر ۵ فیصد۔

بیرون ہند تعلیم کے لئے چار لاکھ سے زیادہ پر ۱۵ فیصد۔

اسکالرشپ یا تعاون مارجن میں شامل ہے اور مارجن رو بہ عمل ہو جائے گی جب قسط وار ادائیگی کا آغاز ہوگا۔

سیکورٹی

مقدار	ہندوستان میں تعلیم	بیرون ملک تعلیم
چار لاکھ تک	کچھ نہیں	کچھ نہیں
چار لاکھ سے ساڑھے سات لاکھ تک	فریق ثالث کی مناسب ضمانت	فریق ثالث کی مناسب ضمانت
ساڑھے سات لاکھ سے دس لاکھ تک انڈیا میں اور اس کے باہر پندرہ لاکھ تک	قرض کی پوری مقدار کے مطابق باوثوق گروی ضمانت کے طور پر	ضمانت کے طور پر قرض کی پوری مقدار کے مطابق باوثوق گروی یا قسطوں کی ادائیگی کے فریق ثالث کی ضمانت کے ساتھ طالب علم کے مستقبل کی آمدنی کا تنویض نامہ
پندرہ لاکھ سے بیس لاکھ تک	لاگو نہیں	”

آن لائن تعلیم لون کی درخواستوں کے لئے اضافی شرطیں:

صرف پیشہ ورانہ کورسز ہی کے لئے قرض دیا جائے گا۔

امیدوار کی طرف سے سپرد کئے گئے غلط ای میل آئی ڈی کی بنا پر بینک کی طرف سے جواب نہ ملنے پر وہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

صرف وہی امیدوار درخواست دے سکتے ہیں جن کا آبائی وطن ہوائی پتہ وجیا بینک کی سب سے قریب شاخ کے دس کیلومیٹر کے دائرے کے اندر واقع ہو۔

ترجمی طور پر جس شاخ سے امیدوار کو قرض لینا ہے اسی سے پچاس ہزار کا DD/PO بنوائے جو وجیا بینک کے نام سے ہو۔

نوٹ: بینک ایک ایسا ادارہ ہے جس کی ساری سرگرمی صرف حصول نفع کے لئے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ طلبہ کو تعلیمی قرض دیتے وقت وہ اس بات کو یقین بناتا ہے کہ خسارہ نہ ہو، چنانچہ عموماً ایسے کورسز ہی کے لئے لون دیئے جاتے ہیں، جو Job Oriented ہوں اور ان کی تعلیم ایسے اداروں میں دی جاتی ہو جو اپنے میدان میں شہرت رکھتے ہیں۔

ان سبھی کاغذات میں تمام تر باتیں تقریباً یکساں ہیں وہ یہ کہ کن کن کورسز کے لئے کن کن اداروں میں تعلیم کے لئے لون دیا جائے گا، قرض کی مقدار کیا ہوگی، شرح سود کتنی ہوگی، قسط وار قرض کی ادائیگی کیسے ہوگی، ضمانت کے لئے کیا شرائط ہیں، درخواست کے ساتھ کون کون سے کاغذات و دستاویزات منسلک کرنا ضروری ہے۔ مارجن منی Margin Money کی فیصد کیا ہوگی وغیرہ۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت

مفتی محمد صادق محی الدین علی

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی وحی کا نزول فرمایا تو اس میں علم کا ذکر فرمایا، اس ابتدائی وحی نے دنیائے انسانیت کو علم کی برتری و فضیلت کا پیغام دیا، علم ایک نور و روشنی ہے جس سے راہ حق و صواب اور راہ شر و فساد میں فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات علام الغیوب ہے، علم کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے دست قدرت میں ہیں، اس نے فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت و مرتبت کو علم کی بنیاد پر ثابت فرمایا، انبیاء کرام علیہم السلام کے قلوب کو علوم ہدایت و رشد سے مستنیر فرمایا، اپنے محبوب بندے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوقات یہاں تک کہ تمام انبیاء میں بھی سب سے زیادہ علوم و معرفت کے خزانے عطا فرمائے "وعلمک مالکم تکن تعلمہ وکان فضل اللہ علیک عظیماً" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تمام معجزات عطا فرمائے گئے جو سارے انبیاء کرام علیہم السلام کو انفرادی طور پر بخشے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن پاک ہے، قرآن پاک علوم و فنون، معارف و اسرار، زمانہ نزول قرآن سے لے کر قیامت تک ہونے والے انکشافات و ایجادات کا منبع و مخزن ہے، دور حاضر کی ترقیات، انکشافات، جمادات و نباتات، شمس و قمر اور سیاروں کی گردش، زمین کے سارے طبقات اور ان کے اندر پوشیدہ خزانوں کی دریافت، سمندروں کی گہرائیاں، اس میں رہنے بسنے والی ساری نادر مخلوقات اور اس میں بہتے پانی کے کھارے اور میٹھے سمندر، اور ان کے درمیان برزخ و حجاب اور ان دونوں سمندروں کے ملنے کی جگہ لولو و مرجان کا وجود، ان جیسے ان گنت حقائق و معارف کا علم دنیائے انسانیت کو قرآن پاک ہی نے دیا۔

قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی ہے اور جس خاندان و قوم میں پیدا ہوئے ان کی زبان عربی ہے، لیکن قرآن پاک دنیا جہاں میں بولی و سمجھی جانے والی تمام زبانوں کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نشانیاں بتاتا ہے۔

"ومن آیاتہ خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتکم الخ"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے پہلے کئی ایک آسمانی صحائف و کتب دوسری زبانوں میں نازل ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "أفضل الصدقة أن يتعلم المرء المسلم ثم يعلم أخاه المسلم"۔ (سب سے افضل ترین نیکی یہ ہے کہ انسان خود علم حاصل کرے، پھر اپنے بھائیوں کو سکھائے)۔

علم کی اہمیت کا اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک عمل سے بھی ہوتا ہے کہ اسیران بدر سے بطور فدیہ مال لینے کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مسلمانوں کو لکھنا و پڑھنا سکھادیے کو فدیہ مقرر فرمایا، اس سے اس بات کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ مال سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ علم ہے، ورنہ ایسے دور میں جبکہ مسلمانوں کو تنگی حالات کی بنا پر مال کی ضرورت زیادہ تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بجائے مال کے علم کو کیوں ترجیح دیتے، یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ وہ علم سکھانے والے کوئی دینی علوم کے ماہر نہیں تھے ظاہر ہے وہ صرف لکھنا اور پڑھنا سکھانے کی صلاحیت رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک عمل سے یہ روشنی ملتی ہے کہ مسلمان دینی علوم کے ساتھ بنیادی و اساسی ضروری علوم سے نابلد نہ رہیں، اسلام تمام شعبہ ہائے حیات میں انسانوں کی رہبری کرتا ہے اور ان سے متعلقہ تمام احکامات و ہدایات دیتا ہے، علوم الہیات، اسلامی اعتقادات، رسالت و آخرت عبادات و احکامات سے متعلقہ تمام اصول و فروع کا علم یقیناً افضل و برتر ہے، لیکن معاشرتی زندگی سے متعلقہ عصری علوم، زمین سے غلہ و دانے اور پھل پھلار اگانے کے طریقے، بیمار ہونے پر دواؤں کے ذریعہ علاج، بوقت ضرورت جراحت کے طبی اصول کی جانکاری، سائنسی ایجادات، آسمان و زمین میں چھپے ہوئے مادی وسائل کی دریافت و تحقیقات کی بھی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے، انسانوں کو درپیش

اشیاء ضروریہ کی ایجاد و صنعت کی تعلیم خود اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبروں (علیہم السلام) کو دی ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کو زہر بنانے کی صنعت سکھائی گئی۔  
 ”وعلمناه صنعة لبوس لکم“، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا فن سکھایا گیا ”واصنع الفلک بأعيننا“، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں از یاد علم کی دعا فرمائی: ”رب زدنی علما“ وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے علم نافع کا سوال کیا: ”اللهم إني أَسئَلُكَ علما نافعا“ اور علم غیر نافع سے پناہ چاہی: ”اللهم إني أعوذ بك من علم لا ينفع“۔

اسلام صرف علم کی نہیں بلکہ نفع بخش علم کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے، اور غیر نفع بخش علوم سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے، اس تناظر میں جہاں اسلامی علوم و فنون کے ماہرین کی معاد (آخرت) کی صلاح و فلاح کے لئے دنیائے انسانیت کو ضرورت ہے وہیں سارے وہ علوم و فنون جو انسانی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں معاش کی بہتری کے لئے ان کی تحصیل بھی ضروری ہے، اور وہ عصری تحقیقات جو آفاق و انفس میں اور بحر و بر میں کی جا رہی ہیں ان سب کا جاننا اور دیکھنا یقیناً علوم نافع کی صنف سے تعلق رکھتا ہے، ایسے علوم میں بھی مسلمانوں کا خاطر خواہ حصہ ہونا چاہئے تاکہ مسلمان ان تحقیقات سے اسلام کی حقانیت و صداقت کو ثابت کر سکیں۔

اقوام و ملل میں امت مسلمہ کی سر بلندی کے لئے ایسے علوم کے ماہرین و فاضلین کی تیاری بھی عصر حاضر کی ضرورتوں میں اہم ترین ضرورت ہے، الطب النبوی کے نام سے ایک کتاب امام حدیث حافظ شمس الدین ذہبی کی طرف نسبت کے ساتھ چھپی ہے اس میں ایک روایت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں جیسے مکان بنانا، کپڑا بنانا، کاشت کرنا، درخت اگانا، کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنا، حمل و نقل کے لئے سواریوں کا ایجاد کرنا یہ سب ضروری صنعتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے انبیائے کرام علیہم السلام کو سکھائی ہیں (معارف القرآن ۷/۱۳۴)۔

۱۔ سوال نمبر ایک کی صراحت کے پس منظر میں صدر بالاسطور علوم اسلامیہ کے ساتھ عصری علوم کی تحصیل اور اس کے ماہرین کی معتد بہ تعداد جدید تحقیقات و اکتشافات اور صنعت و ایجادات میں بھی مسلمانوں کی خصوصی توجہ اور اس کے ماہرین کے مسلم جماعت میں وجود کے فوائد کو ثابت کرتے ہیں۔

۲۔ سوال نمبر دو کی وضاحت کے مطابق سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض طویل المدت ہوتا ہے اور حکومت کا ایسی اسکیمات سے قرض پر نفع کمانا مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس پر جواز ائدرم قرض لینے والے کو ادا کرنی پڑتی ہے اس کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے، اس خصوص میں مسلم زعمائے ملت حکومتی سطح پر کوشش کریں تو بینکوں میں بھی مسلمانوں کے لئے جو معمولی رقم قرضوں پر لی جا رہی ہے اس کو اجرت خدمت قرار دینے میں غیر اسلامی ملکوں میں بھی نظام بینکنگ کے کارپردازوں کو راضی کیا جاسکتا ہے اور اسلامی ممالک کے غیر اسلامی طرز کے بینکوں میں تو بآسانی یہ کوشش بار آور ہو سکتی ہے۔

۳۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی شعبہ میں داخلہ کما اہل ہو یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تو صدر بالاسطور میں کی گئی وضاحتوں کے مطابق ان کے حق میں اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے جواز کا فیصلہ دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ سوال نمبر چار اور پانچ میں ذکر کردہ صورت ہو تو شرعی حکم واضح ہے کہ بالغ اولاد کی کفالت شرعی نقطہ نظر سے والد پر واجب نہیں، اس لئے بالغ اولاد کو صاحب استطاعت نہیں سمجھا جاسکتا، اس صورت میں قرض لینے اور نہ لینے کے بارے میں خود قرض لینے والے طالب علم کا اعتبار ہوگا، یعنی وہ صاحب استطاعت و ذی حیثیت ہو تو عدم جواز کا ورنہ جواز کا حکم رہے گا، ان تمام صورتوں میں غیر اسلامی ممالک میں بینکنگ کے نظام کو بوا سے مستثنیٰ قرار دینے والے علماء کی رائے کے مطابق سارے باشندگان کو خواہ وہ صاحب استطاعت ہوں یا نہ ہوں اس طرح کی اسکیمات سے استفادہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، اور جو اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں ان کی رائے کو درست سمجھا جائے تو استطاعت و عدم استطاعت کو بنیاد بنا کر استطاعت نہ رکھنے والوں کے لئے استفادہ کو جواز قرار دیا جاسکتا ہے۔

جس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہو اس میں توجیہات و تاویلات کا مختلف ہونا متحقق ہو جاتا ہے تو اس صورت میں توجیہ و تاویل کا مختلف ہونا خود ثبوت جواز کو فراہم کرتا ہے، عدم جواز کے قائل علماء کرام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جائز راستے کی رہبری کریں یا کوئی ایسے متبادل انتظام کو یقینی بنائیں کہ بینکنگ کے نظام سے بچتے ہوئے مسلمان اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکیں، اگر یہ ممکن العمل نہ ہو تو جواز کے قائل علماء کی رائے سے ”لیس علیکم فی الدین من حرج، الدین یسر، یسر وادلاء عسرا“ کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاص طور پر ہندوستان جیسے ملک میں اتفاق کر لیں۔

☆☆☆

## جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے تعلیمی قرضے

مفتی جمیل احمد ندوی

جدید اعلیٰ تعلیم کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر:

رسول اللہ ﷺ نے علم نافع کی دعا مانگی ہے، اور غیر نافع سے پناہ چاہی ہے، احادیث کریمہ میں آپ ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

”اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا“ (مشکوٰۃ الصّٰیغ ۱۱۲۲۰) (اے اللہ میں تجھ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں)۔

”اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ“ (رواہ مسلم، کتاب مذکور ص ۲۱۶) (اے اللہ میں اس علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع نہ دے)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے: ”إِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا“ (مرقات النّٰفَع ۲۹۸۱) (بعض علم، جہالت ہوتے ہیں)۔

”وَمِنْ حَسَنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ“ (ترمذی ۲۰۵۵، ابواب الزہد) (انسان کے اسلام کی خوبی میں سے اس چیز کا چھوڑ دینا ہے جس کی کوئی رغبت نہ ہو جو بے فائدہ ہو)۔

اسی علمی جہالت اور ”لا یعنی“ سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی: ”اللّٰهُمَّ أَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِمْنِي مَا يَنْفَعُنِي وَزِدْنِي

عِلْمًا“ (رواہ الترمذی و ابن ماجہ، مشکوٰۃ الصّٰیغ ۱۱۲۱۹) (اے اللہ! مجھے اس چیز کے ذریعہ نفع پہنچا جو تو نے مجھے سکھائی ہے، اور مجھے اس چیز کی تعلیم دے جو مجھے نفع دے اور میرے علم میں اضافہ فرما)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا علم نظر وہ علوم ہیں جو نافع ہوں، جن سے انسان کی ذات، اس کے سماج اور دنیا کو نفع پہنچے، اور ان کا شمار لا یعنی میں نہ ہو، لیکن وہ علوم جو انسان، انسانیت اور دنیا کے لئے ضرر کا باعث ہوں، اسلام ان سے صرف بچنے کو ہی نہیں، پناہ مانگنے کی تلقین کرتا ہے۔

علوم اسلامیہ، ظاہر ہے کہ سراسر خیر ہی خیر اور نفع ہی نفع ہیں، دیگر دنیاوی علوم بھی اگر بنی نوع انسان کے لئے نافع ہوں اور شریعت سے متصادم نہ ہوں تو ان کو سیکھنے کی اجازت ہے، بلکہ علماء و محققین نے بعض ایسے علوم کی تحصیل فرض کفایہ قرار دی ہے۔

چنانچہ طب، زراعت، بنائی، سلائی، حساب، لوہاری وغیرہ کے فرض کفایہ ہونے کی صراحت کتب فقہ و فتاویٰ میں موجود ہے (رد المحتار ۱/۳۲۱، احیاء علوم الدین ۱۹/۱، مرقات النّٰفَع ۲۹۹۱)۔

علماء اسلام نے اپنے اپنے وقتوں میں جدید علوم اور جدید زبانیں سیکھی بھی ہیں اور سکھائی بھی ہیں، اور سیکھنے سکھانے کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے، کتب تاریخ و سیر میں ان کی تفصیلات مل جائیں گی۔

آج کے دور کی جدید اعلیٰ تعلیم خواہ انجینئرنگ و ٹکنالوجی کے قبیل کی ہو، یا طب و سائنس کے ذیل میں آتی ہو یا اور کسی قسم کی ہو، شریعت اسلامیہ کے مزاج اور ماحول کی رعایت کرتے ہوئے ان سب کے سیکھنے کی اجازت اور گنجائش ہے۔

یہ ان تمام علوم کی تحصیل کا ایک اجمالی حکم ہے، تفصیلی حکم اس وقت بتایا جاسکتا ہے جب کسی علم کے بارے میں خاص طور سے استفسار ہو اور اس کی تفصیلات و جزئیات سے بھی کسی درجہ میں متعارف کرایا جائے۔

موضوع پر غور کرنے سے پہلے فقہ اکیڈمی کی طرف سے پیش کردہ سوالنامہ میں ”تسلیمی قرض“ سے متعلق جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، ان پر غور کرتے

ہوئے، فقہ اکیڈمی کا ہی ایک بہت پہلے کا فیصلہ اور ایک تجویز بھی سامنے رہنی چاہئے، دونوں راقم نقل کر رہا ہے:

فقہ اکیڈمی کا ایک فیصلہ:

سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم رہے یا مناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے ص ۲۶)۔

فقہ اکیڈمی کی ایک تجویز:

سرکاری بینکوں سے ملنے والے ترقیاتی قرضوں اور ان پر ادا کئے جانے والے سود کے مسئلہ پر ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں غور کر کے کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے علماء و محققین کی ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ پر پہنچے (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے ص ۲۶)۔

یہ فیصلہ اور تجویز، دونوں، فقہ اکیڈمی کے دوسرے سمینار کے ہیں۔

مفتی نظام الدین صاحب سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کا نقطہ نظر:

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے بینکوں کے اقتصادی قرضوں کی بابت جو گفتگو کی ہے، وہ ہمارے لئے غور کی بنیاد بنتی ہے، کیونکہ اقتصادی قرضے اور تعلیمی قرضے آپس میں مماثلت رکھتے ہیں، دونوں میں شرح سود بہت کم ہوتی ہے اور دونوں ہی کا مقصد حکومت کے دعوے کے مطابق ہے، عوام کا تعاون کرنا اور ان کی دشواریوں کو حل کرنا، لہذا یہاں مفتی صاحب کی تحریر پیش کی جا رہی ہے:

”بینک کا ابتدائی دور ایسا ضرور تھا کہ اس کا پورا کاروبار محض سود ہی پر ہوتا تھا، مگر اب ایسا نہیں ہے، اس کے اصول و مقاصد میں اور طریقہ کار میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں، اب تو بہت سے بینکوں میں مختلف نوع کے مستقل کاروبار تجارتی اصول پر ہونے لگے ہیں، بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر چلنے لگے ہیں، جیسا کہ خود سوال کے بعض جملوں سے (مگر کاروبار میں عام طور سے) بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے، پس جن کاروبار میں مطالبات کی ادائیگی بینک کے چیک کے ذریعہ ہوتی ہے یا جن ملازموں کی تنخواہیں بینک کے چیک کے ذریعہ برآمد ہوتی ہیں ان میں اگر بینک اپنے لئے بھی کوئی رقم وصول کرے تو اس کا سود ہونا ہی ضروری نہ ہوگا، بلکہ وہ بینک کا محتانہ بھی کہا جاسکتا ہے، بینک اجیر یا وکیل یا درمیانی واسطہ قرار دے کر اس رقم کو بینک کی اجرت یا عوض کارکردگی میں کہا جاسکتا ہے، اس لئے اب ہر بینک کا ایک ہی حکم باقی نہیں رہے گا، بلکہ ہر بینک اصول و ضوابط و طریقہ کار و معاملات کے اعتبار و لحاظ سے الگ الگ حکم رہے گا“ (نظام الفتاویٰ ص ۲۷۵)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ”البتہ چونکہ ربوا (سود) کا ایک مفہوم شرعی متعین و منضبط ہے کسی فرد یا جماعت کے کسی غیر سودی معاملہ کو سود کا نام دے دینے سے اس کو سود کہنا اور اس پر سود کا حکم لگا دینا ضروری نہیں، جیسا کہ پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کی رقم میں سود کے نام سے کچھ رقم دینے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کسی سودی معاملہ کو کسی فرد یا جماعت کے غیر سودی قرار دینے سے وہ سود کے حکم سے خارج نہیں ہو جائے گا“ (نظام الفتاویٰ ص ۲۷۸)۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں: ”پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت ہے، اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوئے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے، جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے، اور انانت لینے والوں اور دینے والوں، دونوں کا معاملہ صاف رہتا ہے، اور یہ محض ایک قومی و مشترکہ نظام کی صورت و نوعیت ہے، کوئی سودی کاروبار نہیں ہے، بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے، اس کے منتظمین و کارکنان قوم کے اجیر و وکیل ہو سکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت اور پسماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لئے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا ایک انتظام کہا جاسکتا ہے، نیز اس طریقہ کار و محکمہ میں نفع و سہولت بھی، دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہے۔ سو تو نام ہے، اس نفع اور زیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو اور عوض سے خالی ہو، ”کما صرح بہ الفقہاء: الربا هو فضل خال عن العوض لاحد المتعاقدين في المعاوضة هذا التعريف يستفاد من الشاهي من باب الربا“۔

غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کیا جاسکتا ہے اور یہ توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت اگرچہ سود کے نام پر دیتی ہے مگر ہمارے فقہاء محققین اس کو سود نہیں کہتے بلکہ انعام کہتے ہیں، اور اس کو جائز فرماتے ہیں (کمانی امداد الفتاویٰ ص ۱۲۳ تا ۱۲۵)، نیز توجیہ ایسی ہوگی جیسی منی آرڈر کی فیس میں کی جاتی ہے، فیس کو اجرت کتابت و اجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے ”کما قال بہ العلامة اتمھانوی فی حاشیہ امداد الفتاویٰ“ ایک طویل مسئلہ کلام میں فرماتے ہیں البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ فیس (منی آرڈر) کو اجرت کتابت و روانگی فارم کہا جائے، اس سے اس کی حرمت تقاضل تو رفع ہو جائے گی مگر کراہت سفحہ باقی رہے گی (امداد الفتاویٰ ص ۱۰۶ جلد ۳ جدید ایڈیشن مطبوعہ پاکستان)۔

پھر آگے فرماتے ہیں: اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تقاضل ختم ہو گیا تو اباحت اصلیہ لوٹ آئے گی وہو المراد۔ پھر اسی امداد الفتاویٰ میں جلد ۳ صفحہ ۱۰۸ میں فرماتے ہیں: البتہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت و روانگی فارم کی کہہ کر حرمت تقاضل کو رفع کیا جاسکتا ہے لیکن کراہت سفحہ کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی تو ابتلاء عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الاقولہ)، حتیٰ کہ اگر یہ بھی مل جائے کہ سفحہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا، پھر فرماتے ہیں: منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم لکھنے اور روانہ کرنے پر قیام فیس کے دی جاتی ہے، اور دونوں معاملے جائز ہی نہیں بلکہ دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے، چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے اس لئے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ مناسب ہے (انتہی بلغظہ)۔

امداد الفتاویٰ کی ان مجموعی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے معاملات میں جب ابتلاء عام ہو جائے یا ضرورت صحیحہ داعی ہو جائے تو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے..... ممکن توجیہ جواز تلاش کرنا امر متحسن ہے، نیز عالمگیری کتاب الحیل کی عبارت سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے۔

”کما قال وکل حیلۃ یحتال بہا الرجل یتخلص بہا عن حرام أو یتوصل بہا إلى حلال فھی حسنة والأصل فی جواز هذا النوع من الحیل قوله اللہ عز وجل: وخذ یدک ضغثا فاضرب بہ ولا تخنث، وهذا تعلیم المخرج لأیوب النبی علی نبینا علیہ السلام (الی قوله) وعامة المشائخ ان حکمها لیس بمنسوخ وهو الصحیح فی المذهب کما فی الذخیرة الفتاویٰ العالمگیریة کتاب الحیل ۶۰۶۹۰“۔

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل و توجیہات کا مدار ابتلاء عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے اور سوالنامہ سے ان دونوں چیزوں کا وجود متشریح ضرور ہوتا ہے، اس لئے یہ توجیہ متحسن بھی ہو سکتی ہے، خاص کر ایسے ملکوں میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو وہاں یہ توجیہ اور بھی آسان ہوگی (نظام الفتاویٰ ۲۷۹/۱)۔

پھر ”چند شہادت اور ان کا ازالہ“ کا عنوان قائم کر کے شہادت کا جواب دیتے ہیں، اس ضمن میں لکھتے ہیں: ”دوسرا شہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تاویلات و توجیہات ارباب حکومت یا اس شعبہ کے اصحاب حل و عقد کے پیش نظر نہیں اور نہ وہ اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں، تو پھر یہ توجیہات و تاویلات کس طرح موثر اور مفید ہو سکتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہی اشکالات پراویڈنٹ فنڈ اور منی آرڈر کی تاویلات میں بھی وارد ہوتے ہیں اور باوجود اس کے علماء ان کو صحیح اور معتبر تسلیم کرتے ہیں، ”کما اشیرت الیہ سابقاً“ پس اس طرح یہاں بھی معتبر و مفید کہا جاسکتا ہے، چونکہ معاملہ اسوال ربویہ کا اور حرمت اباحت کے قیاس کا ہے اس لئے اکابر امت و علماء فحول بطور خود ہی غور فرمائیں۔

اگر ابتلاء عام یا ضرورت صحیحہ معتبرہ واقعی میں متحقق ہے جب تو اس توجیہ میں کوئی کلام ہی نہیں، وہو المراد (کتاب مذکور ص ۲۸۱)۔

مذکورہ عبارت میں امداد الفتاویٰ جلد سوم کے جو حوالے مرقوم ہیں وہ ہندوستانی نسخہ مطبوعہ دیوبند کے صفحہ ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶ پر موجود ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت تھانویؒ نے اپنے ایک مفصل فتوے ”القصص السننی فی حکم حصص کبیری“ میں حصص یا شیراز کے اوپر بحث کرتے ہوئے، حصص پر حاصل شدہ سود کے متعلق رقم طراز ہیں: ”اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کر دیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا، مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی“ (امداد الفتاویٰ ۳۹۱/۳)۔

جہاں تک سفحہ کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں ڈاکٹر وہب زحیلی لکھتے ہیں: ”والراجح عند الحنابلة هو جواز تلك المعاملة إن كانت بلا مقابل واختار ابن تيمية وابن القيم وابن قدامة بالجواز مطلقاً لأن المنفعة لا تخص المقرض بل



یشتغاف بہا جمیعاً“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۲۸)۔

(اگر کسی مقابل کے بغیر ہو تو حنا بلہ کے نزدیک راجح اس معاملہ کا جواز ہے اور ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن قدامہ نے مطلقاً جواز کو اختیار کیا ہے، کیونکہ منفعت مقرض کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس سے دونوں نفع اٹھاتے ہیں)۔

بہر حال مذکورہ سارے حضرات کی یہ ساری توجیہات و تاویلات منی آرڈر شیئرز اور حکومت کے اقتصادی قرضوں سے متعلق ہیں۔

اقتصادی قرضوں کے سلسلے میں جو توجیہ حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے پیش فرمائی ہے، وہ توجیہ بعینہ تعلیمی قرضوں پر بھی صادق آتی ہے، کیونکہ ان قرضوں کے مقابلے میں اقتصادی قرضوں کی طرح کافی کم، شرح سود عائد کی جاتی ہے اور حکومت کا دعویٰ ہے کہ یہ قرض جو طویل مدت کے لئے کم شرح پر دیا جاتا ہے اس کا مقصد سود حاصل کرنا نہیں، بلکہ تعلیم میں تعاون کرنا ہے۔

لیکن احقر کا دل اقتصادی قرضوں کی اس توجیہ و تاویل پر مطمئن نہیں، لہذا تعلیمی قرضوں کی بھی یہی توجیہ قبول کرنے پر دل کیسے آمادہ ہو سکتا ہے، کیونکہ سود کے متعین کرنے اور وصول کرنے کا طریقہ کار وہی ہے، جسے خود شریعت بھی سود قرار دیتی ہے۔ خود فقہ اکیڈمی اپنے دوسرے فقہی سمینار میں فیصلہ کر چکی ہے کہ سود کی حرمت پر شرح سود کے کم یا زیادہ ہونے کا اثر نہیں پڑے گا (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے ص ۲۶)۔

دوسرے سمینار میں فقہ اکیڈمی نے اقتصادی قرضوں کے بارے میں غور کرنے کیلئے علماء اور متخصصین کی جس کمیٹی کی تشکیل کی تجویز پاس کی تھی، اس کا کیا ہوا؟ احقر اس سے بھی ناواقف ہے (کتاب مذکور ص ۱۳۵)۔

لہذا حضرت مفتی نظام الدین صاحب کی مفصل تحریر پڑھنے اور سارے پہلوؤں پر اپنی بساط کی حد تک غور کرنے کے بعد احقر کا رجحان اس طرح ہے کہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی توجیہ و تاویل کے مقابلے میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی رائے زیادہ وزن دار ہے، اور یہ اقتصادی قرضوں اور تعلیمی قرضوں دونوں پر پورے طور پر صادق آتی ہے۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی تحریر:

قاضی صاحب نے پہلے ہندوستان کی حیثیت، یہاں کے جمہوری نظام اور مسلمانوں کی پوزیشن پر بحث کی ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

”اگرچہ یہ درست ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی شہری اپنی انفرادی حیثیت میں پبلک اکاؤنٹ (سرکاری خزانہ) کا مالک نہیں ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہر فرد اپنی انفرادی حیثیت میں عوامی خزانہ سے انتفاع کا حق رکھتا ہے اور دستور ہند کی رو سے ہر شہری کو مقررہ ضوابط کے تحت حق انتفاع سرکاری خزانہ سے حاصل ہے۔ یہ صورت کہ ہم کسی چیز کے مالک تو نہ ہوں، لیکن اس سے ہمارا حق متعلق ہو، اس کی ایک نظیر قانون اسلامی میں یہ موجود ہے کہ کوئی مورث اگر مرض الموت میں مبتلا ہو تو اس کے ذمہائی مال میں حق وارثوں کا متعلق ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ مالک نہیں ہوتے اور تصرف کی اجازت نہیں ہوتی۔

اسی طرح مساجد، سڑکیں، نہریں وغیرہ فلاح عامہ کی چیزیں شرعی نقطہ نظر سے کسی کی ملک تو نہیں ہوتیں، لیکن حق انتفاع عوام کا اس سے متعلق ہو جاتا ہے، اس کی ایک نظیر شاید ”وقف علی الاولاد“ بھی ہو کہ اولاد میں سے کوئی خاص فرد اپنی انفرادی حیثیت میں مالکانہ تصرفات کا حق (بیع) نہیں رکھتا، لیکن انتفاع کا ہر فرد کو حسب تصریحات واقف حاصل ہوتا ہے۔

پس میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی اور صنعت و حرفت کی ہمت افزائی، نیز بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح دوسروں کا، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لئے جب آگے آنا چاہتا ہے تو حکومت جس نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے (اور فی الحال اکثریت کے فقدان کی وجہ سے ہم اس کی تبدیلی پر قادر بھی نہیں) اگرچہ اس فاسد نظام کی تبدیلی کی خواہش اور اس کے لئے ممکن حد تک عملی جدوجہد ہر مسلمان کا بہر حال فرض ہے کہ ”من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، وان لم یستطع فبلسانہ، وان لم یستطع فبقلبہ“ (الحديث: متفق علیہ)۔

اس کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے آڑے آتا ہے، پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: ”مسلمانوں کے لئے اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجہ مجبوری سود دینا اور سودے کر اپنے حق کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟“

میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری سودے کر اپنے حق حاصل کریں۔

اور شرع میں اس کی نظیر موجود ہے، اس لئے کہ شرع کا عام اصول تو یہ ہے کہ ”ما حرم أخذہ حرم إعطاءہ“ اس اصول کے تحت علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لیکن ایسی صورت میں جب کہ جائز حق کا حصول رشوت دینے بغیر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینا جائز ہے۔

صاحب الاشباہ علامہ ابن نجیم چودھویں قاعدہ ”ما حرم أخذہ حرم إعطاءہ“ کے ذیل میں ”البرشوة لخشوف علی مالہ أو نفسہ“ کا استثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”إلا فی مسائل الرشوة لخشوف علی مالہ أو نفسہ (قوله الرشوة لخشوف علی مالہ) هذا فی جانب الدافع، أما فی جانب المدفوع له فحرام ولم ینبه علیه، وینبغی أن یتثنی الأخذ بالربا للمحتاج فإنه لا یحرم كما صرح به المصنف فی البحر. ویحرم علی الدافع الإعطاء بالربا“۔

(مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل ہیں، لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے، اس شخص کے حق میں جس کو دیا گیا ہے حرام ہے، اور اس پر تنبیہ نہ ہو سکا ہے، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنی ہو کہ کوئی محتاج شخص سود پر قرض حاصل کرے کہ یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ اس کی البحر اراقی میں تصریح کر دی گئی ہے، لیکن قرض دینے والے کے لئے سود کی شرط پر قرض دینا حرام ہوگا)۔  
راقم سطور کار جحان:

- ۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم جو انسانیت اور مخلوق خدا کے لئے نافع ہو، اور شریعت سے متصادم نہ ہو، شریعت کی نگاہ میں جائز ہے، مسلمانوں کو حاصل کرنی چاہئے، کیونکہ دینی عزت و وقار کے ساتھ، دنیاوی عزت و وقار کا حصول بھی شریعت کے نزدیک ایک محمود و مطلوب صفت ہے۔
- ۲۔ کم شرح سود کے باوجود یہ سود ہی ہے اسے سروس چارج پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔
- لیکن حکومت کی اس اسکیم سے، جو اعلیٰ تعلیم میں تعاون کی غرض سے ہے، ہندوستان کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور یہ حق جزا ہوا ہے سود سے، لہذا قاضی صاحب کے الفاظ میں ”یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری سودے کر اپنے حق حاصل کریں“۔
- گویا احقر کے نزدیک حق لینے کے لئے رشوت دینے کے جواز پر، یہاں اس سود دینے کو قیاس کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح ایسا سودی قرض لینے کی گنجائش رہے گی۔
- ۳۔ مذکورہ تفصیلات کے مطابق جائز ہے۔
- ۴۔ اگر طالب علم بالغ ہو تو والد کے صاحب استطاعت ہونے سے وہ خود صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، اس معاملہ میں خود طالب علم کے حالات کا اعتبار ہوگا۔
- ۵۔ یہ مجبوری کے درجہ کی چیز ہے، صاحب استطاعت افراد کے حق میں اس سے احتراز اولیٰ ہے۔

## تعلیمی قرض

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی

۱۔ ایک مرسل روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا: ”علم و حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے جہاں سے ملے اسے حاصل کر لینا چاہئے“، ”العلم ضالة المؤمن، الحكمة ضالة المؤمن حیثما وجد المؤمن ضالة فليجمعها إليه“، ایک دوسری روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے: ”استعينوا على كل صنعة بصالح أهلها، قديستانس بقوله ما كان من أمر دنياكم فإليكم“ (المقاصد الحسنه ص ۷۸)، نیز حضور ﷺ نے فرمایا: ”تعشوا ولو بكف من حشف فان ترك العشاء مہرمة“ (المقاصد الحسنه ص ۱۸۵) رات میں کھایا کرو اگر ایک مٹھی رومی کھجور ہی سہی کیوں کہ رات میں نہ کھانے سے بڑھا پا جلد آتا ہے۔

مسلم شریف میں مشہور حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ کھجور کے درختوں پر چڑھ کر مؤنث پر مذکر کو مار رہے ہیں یعنی تیغ کا عمل کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے منع فرمایا لیکن جب معلوم ہوا کہ فصل کم ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے طریقہ کے مطابق عمل کرتے رہو، ”أنتم اعلم بأمر دنياكم“۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ اسلام کی شکل میں جو دین تم کو دیا گیا ہے وہ انسانوں کے لئے ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ”حدی ورحمة رحمت سے مراد اس کا دنیوی پہلو ہے۔

جائز حدود میں جائز مقاصد کے لئے موسیقی کا فن بھی سیکھنے کی اجازت ہے، قرآن میں خود موسیقی ہے، احقر نے ایک کتاب ”موسیقی فی القرآن“ نامی مدراس کے کتب خانہ محمدیہ میں دیکھی تھی، موسیقی کی ضرورت جنگ میں بھی پڑتی تھی، تاکہ اس کے ذریعہ مجاہدین میں حوصلہ پیدا کئے جائیں، خود قرآن کریم کی کئی ایک سورتیں ایسی ہیں جو کائنات، انفس، مناظر قدرت میں غور و فکر اور اس کے علوم کے حصول پر دال ہیں، سورہ نمل، چینی، نحل، شہد، عنکبوت، مکرئی، انعام، چوپائے، دخان، اسٹیم، ماندہ طعام، الکھف، غار، نجم، ستارے، قمر چاند، حدید، لوہا، فولاد، انفطار پہاڑوں کا سینا، البروج آسمان کے طبقات، الطارق مسافر شب، الشمس سورج، الہین انجیر، زلزال زلزلہ، الفیل ہاتھی، الفلق طلوع صبح وغیرہ۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں: مطالعہ کائنات کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم، زکوٰۃ سے طلاق وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات ہیں اور مطالعہ کائنات سے متعلق سات سو چھپن ۵۶ آیات ہیں۔

فقہ اسلامی مجلہ سبیل السلام حیدرآباد کے ص ۳۰-۳۱ پر معاشرتی احکام سے متعلق آیات مفسرین کی تحقیق کے بموجب ستراتی ہی اعداد معاملاتی احکام کی تعزیری احکام سے متعلق، ۳۰ آیات خصوصیات سے متعلق، دستوری احکام آیات دس بین الاقوامی احکام سے متعلق، ۲۵ اقتصادیات سے متعلق دس آیات بتائی گئی ہیں۔ پانی میں دو حصہ ہیں: ہائیڈروجن اور آکسیجن، اگر آکسیجن کی بیشی کی جائے تو اس سے طرح طرح کے محلول بن سکتے ہیں، جن میں سے کچھ مفید، کچھ مہلک ثابت ہو سکتے ہیں، اگر اس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کی نسبت ۲:۲ ہوتی تو یہ مرکب پانی کے بجائے ہائیڈروجن پراکسائیڈ بن جاتا جو بذات خود ایک تیزاب ہے، اگر آکسیجن ہائیڈروجن کے بجائے نائیٹروجن ہوتی تو یہ مرکب بجائے پانی کے نائٹرس بن جاتا جو مائع نہیں بلکہ گیس ہے اور اس کے سونگھنے سے انسان بے اختیار ہنسنے لگ جاتا ہے، اس گیس کو لافنگ گیس کہتے ہیں، اگر پانی کے مرکب میں ہائیڈروجن کلورین ہوتی تو یہ مرکب کلورین بن جاتا جو ہر ملی گیس ہے، اگر پانی کے مرکب میں بجائے آکسیجن نائیٹروجن ہوتی تو مختلف مرکبات بن جاتے جو سارے کے سارے زہریں۔

حضرت میمونہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے لئے غسل کا پانی رکھا تو آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ سے پانی پر ڈالا پھر دونوں ہاتھوں کوٹی سے مل کر دھویا، اب ملاحظہ کیجئے مٹی سے دھونے میں کیا حکمت ہے، مٹی میں سوڈیم کاربونیٹ ہوتی ہے جس سے مکمل صفائی ہو جاتی ہے۔

ط شیخ الحدیث و پرنسپل دارالعلوم منو۔

ایک حدیث میں ہے: بہت پانی پاک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے آج کل کے سائنسدانوں نے عمل تکمیر کے ذریعہ پانی کے صاف کرنے کا طریقہ سیکھا ہے، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز معراج میں ملی اور یہ اتنی مبارک و مفید عبادت ہے کہ اس سے ہائی بلڈ پریشر نازل، درد اور کینسر جیسی موذی بیماریوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر برق صاحب تحریر کرتے ہیں: علامہ ابن رشد، فارابی، بوعلی سینا اور فخر الدین رازی وغیرہ نے ہمیں قانون قدرت کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا..... علامہ شعرانی اسلام کے طبعی پہلو سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اگر مسلمان مسلمان رہا تو وہ علم شریعت کی طرح علم فطرت میں بھی ایک نہ ایک دن کمال پیدا کرے گا، اس لئے فرمایا تھا: ”إن الاسلام في أول أمره كان شريعة ثم في آخر الزمان يكون حقيقة“۔

قرآن کریم کی آیت ”كتاب أنزلناه إليك لتخريج الناس من الظلمات إلى النور“ (سورہ ابراہیم)، میں ظلمت سے مراد جہل اور نور سے مراد علم ہے، یعنی کتاب الہی وہ صحیفہ ہے جس نے لوگوں کو جہالت سے نکال کر علم کی روشنی سے مالا مال کیا، ایک حدیث میں ہے: ”رب زدني تحيداً فيك“ (خدا یا تیری ذات کے متعلق میری حیرت بڑھتی ہی چلی جائے)۔

ایک صبح بیدار ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لقد أنزلت علي الليل آية وويل لمن قرأها ولم يتدبر ويل له“ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ”ان في خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار الخ: الشمس والقمر بحسبان“، سورج وچاند ایک حساب سے گردش کر رہے ہیں، مدار اس کی صبح چند منٹوں کے بعد دہلی پھر پشاور پھر ایران پھر عرب پھر افریقہ اور بحر اوقیانوس کو عبور کر کے امریکہ پہنچ جاتی ہے۔

کلام الہی میں فلکیات (Astronomy)، طبیعیات (Physics)، علم الماء (Hydrogens)، عمل تبخیر (Evaporation)، ارضیات (Geology)، علم البحر (Oceanology)، علم نباتات (Botany)، علم حیوانات (Zoology)، علم طب (Medical)، علم افعال الاعضاء (Psychology)، جنرل سائنس، علم القانون، علم النفس، علم تعلیم ریاضی، منطق و فلسفہ، علم حیاتیات، علم الجینین اور علم الاخلاق اور اس کے ذیلی عناوین سے متعلق آیات ملتی ہیں۔

جنرل سائنس اور اس کے ذیلی عناوین پر بہت ساری آیات موجود ہیں، چند آیات پیش ہیں: ”ألَمْ تَرَوا كيف خلق الله سبع سموات طباقاً، وهو الذي خلق الليل والنهار والشمس والقمر كل في فلك يسبحون“، اگر فلک کے کاف سے اگلے لکھیں تو بھی کل نی فلک ہی ہوگا، جو ان دونوں کی الٹی گردش پر دال ہے۔

محترم ڈاکٹر ذاکر نامک صاحب لکھتے ہیں: ۱۹۲۶ء میں امریکی ماہر فلکیات نے اس بات کا مشاہداتی ثبوت مہیا کیا کہ کہکشاؤں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے، اس کی بابت قرآن نے بہت پہلے ہی کہہ دیا ہے: ”والسما بنيناها بأيدٍ وإنا لموسعون“، ”ألَمْ تَرَ أن الله أنزل من السماء فسلكه ينابيع في الأرض ثم يخرج به زرعاً مختلفاً الوان“، علم الماء کی دلیل ہے اور ”ألَمْ نجعل الأرض مهاداً والجبال أوتاداً“ سے ارضیات، مرج البحرین يلتقيان سے علم البحر، ”ومن كل الثمرات جعل فيها زوجين“ علم نباتات کی دلیل ہو سکتی ہے۔

حضرت حذیفہ بن الیمان وعلی کرم اللہ وجہہ کا ایک اثر ہے: ”تكثر الخطباء المنابر... اس سے بعض حضرات نے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر پر استدلال کیا ہے، ڈاکٹر طہ جابر العلوانی تحریر فرماتے ہیں: ”الجمع بين القراءتين يا قراءة النص أو الوحي وقراءة الكون“ (مقاصد شریعت ص ۳۲۹)۔

زمین میں جامع مواد اور گھٹلی سے سبزہ پیدا ہوتا ہے، اور یہ جانوروں کی طرح ہوا میں سانس لیتا ہے، کاربن ڈائی آکسائیڈ سبزہ (کلوروفل) کی موجودگی میں پانی کے ساتھ کیمیائی تعامل کر کے اپنے جسم کی نشوونما کرتا ہے جب یہی پودے جانوروں کی خوراک بنتے ہیں تو جانوروں کی نشوونما ہوتی ہے، آخر کار یہ پودے مرگ کر اور جانور کے مرنے کے بعد ایک قسم کی بیسیٹیئر یا سے اثر انداز ہوتے ہیں اور جامد مواد ان اثرات میں تبدیل ہو کر پھر زمین کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے ختنہ کا حکم دیا، آج کی تحقیق یہ ہے کہ ختنہ نہ کرنے سے کینسر ہو سکتا ہے (قرآن اور سائنس ص ۳۹ پر ڈاکٹر ایم اے عظیم)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زیتون کا تیل استعمال کرنے کا حکم دیا، قرآن میں زیتون کی قسم بھی کھائی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ اس کی افادیت بہت زیادہ ہے، زیتون مقوی معدہ ہے، زیتون کے درخت کا گودا مقوی ذہن ہے، ذات الجنب (نمونیا) کا علاج بھی زیتون سے کرنے کا آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

قرآن نے سورج کی حرکت کو سورہ یسین میں بیان کیا ہے، سورہ انعام میں کوروسل کا تذکرہ کیا ہے کہ کوروسل کی حیثیت نباتات میں ایسی ہے جیسی خون کی حیوانات میں۔ ہمیں مختلف زبانوں کے پڑھنے، لکھنے اور سیکھنے کا حکم دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ عبرانی رسم الخط سیکھ لیں، چنانچہ انہوں نے بہت جلد سیکھ لیا، ان کو عبرانی کے علاوہ سریانی، فارسی اور قطعی زبانیں بھی آتی تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں: ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں، اس میں تاریخ کا بھی ذکر ہے، ان میں ان علوم کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں ہم سائنس کا نام دیتے ہیں، مثلاً علم نباتات، علم حیوانات، علم حجر، علم بحر، علم ہیئت، یہاں تک کہ علم جنین کا بھی ذکر ملتا ہے (خطبات بجاو پورہ ص ۳۱۸-۳۱۹)۔

ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں: عہد نبوی میں طبیوں کی حالت اور جراحی کرنے والے سرجنوں کی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے (خطبات بجاو پورہ ص ۳۱۹)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علم ہیئت سے بڑی اچھی طرح واقف تھے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم انساب سیکھنے اور عسکریات کے سلسلہ میں لوگوں کو ترغیب دلاتے تھے، کرہ ارض پر آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن، گندھک، لوہے سمیت سو سے زیادہ عناصر موجود ہیں جن کے حیوانات و نباتات وغیرہ محتاج ہیں، ہم جب تک ان کی پوری حقیقت دریافت نہیں کریں گے اللہ کی قدرت کا استحضار کیسے ہوگا جو جو علوم جدیدہ پر حذاقت بردہتی جائے گی خدا شناسی کامل ہوتی چلی جائے گی، نیز اس کے بعد اس سے جو علم حاصل ہوگا وہ استدلال ہوگا۔

حال ہی میں انسان نے یہ معلوم کیا ہے کہ آسمان پر سات مضبوط راستے ہیں، اور ستارے سات طرح کی چال چلتے ہیں، ۱۔ کسی سیٹلائٹ کی سیارے کے گرد گردش، ۲۔ سیارے کی خود اپنے گرد، ۳۔ سیارے کی گردش ستارے کے گرد، ۴۔ ستارے کی خود اپنے گرد، ۵۔ سیارے ستارے اور سیٹلائٹ کی اپنے کہکشاں کے مرکز کے گرد، ۶۔ کہکشاؤں کی گردش مقامی کہکشاؤں کے گروپ کے ساتھ، ۷۔ کہکشاؤں کا پھیلاؤ عام سمت میں۔ قرآن کہتا ہے ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط راستے بنائے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں کم و بیش چار ہزار اقسام کی زبانیں بولی جاتی ہیں، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ زبانوں کا احصاء بجز نبی کے کو دوسرا نہیں کر سکتا، یورپ میں ۵۸۷، ایشیاء میں ۹۳۷، افریقہ میں ۲۷۶، امریکہ میں ۱۶۲۳، اور ہندوستان میں تقریباً چار سو۔

زمین و آسمان کی تحقیق نیز رنگوں اور زبانوں کا تنوع انہی آیات میں سے ہے، بے شک علماء فطرت کے لئے ان مناظر میں چند اسباق موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ”ومن آیاتہ خلق السموات والأرض واختلاف السننكم وألوانكم إن فی ذلک لآیات للعالمین“ (سورہ روم)، زمین و آسمان کی تخلیق نیز رنگوں اور زبانوں کا تنوع انہی آیات میں سے ہے، بے شک علماء فطرت کے لئے ان مناظر میں چند اسباق موجود ہیں۔

طب کو لیجئے تو حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سیکڑوں قسم کی دوائیں ملتی ہیں، جسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے تجویز کی ہیں، DNA کی بنیاد بھی قرآن عزیز ہے، کنز العمال علی حاشیہ مسند احمد بن حنبل ۲۸۱۳ پر دی گئی حدیث ”العلماء ثلثۃ رجل عاش یعلمہ وعاش الناس بہ الخ“، ایک اور حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، ”تفکر وافی آلاء اللہ ولا تفکر وافی اللہ“ (کنز العمال حدیث ۵۷۰۷)۔

اب بخوبی معلوم ہو چکا ہوگا کہ شریعت اسلامیہ (قرآن و حدیث) میں جدید اعلیٰ تعلیم کے واضح اشارات بھی ہیں اور اس کے حصول کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے، احقر کی تمام گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ علوم جدیدہ کی تائید کلام الہی اور احادیث سے ہو رہی ہے نہ کہ سائنسی علوم کے ذریعہ شرعی علوم کی۔

۲۔ ڈاکٹر وہب زحلی کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ڈی بیٹ کارڈ لون دینے کے معاہدہ پر مشتمل رہتا ہے اس وقت یہ کارڈ اپنی تنظیم کے قانون کے خلاف لون دینے کا ذریعہ شمار ہوتا ہے، آگے لکھتے ہیں: کارڈ جاری کرنے والے اسلامی بینک کے لئے کارڈ کو تسلیم کرنے والے تاجر سے سامان فروخت اور خدمات کی قیمت سے فیصد کے حساب سے کمیشن لینا جائز ہے، اس لئے کہ وہ مارکیٹنگ اور دلالی نیز قرض دینے کی خدمت کی اجرت کی طرح ہے (از مقالہ ڈاکٹر وہب زحلی بینک سے جاری ہونے والے کارڈ کے شرعی احکام ص ۷۳)۔

چونکہ سارے مسائل کی پیوٹنٹ ہو گئے ہیں اور اس میں انٹرنیٹ کی مدد لی جاتی ہے اس لئے اس کو دفتری کارروائی کا عوض قرار دیا جاسکتا ہے، علامہ علاء الدین حصکفی تحریر کرتے ہیں: ”لیستحق القاضی الأجر علی کتب الوثائق أو المحاضر والسیجلات قدر ما یجوز لغیرہ کالمفتی“ (الدر المختار علی الرد ۹۱۲۷)۔ قاضی دستاویز، معاہدات کے رجسٹر اور وثیقہ کے لکھنے پر اتنی ہی اجرت کا مستحق ہوگا جتنی دوسرے کو جیسے مفتی وغیرہ کو

دی جاتی ہے، اکیڈمی کے پندرہویں سیمینار کے فیصلے میں یہ تحریر ہے کہ اے ٹی ایم کارڈ اور ڈی بیٹ کارڈ کے حصول اور استعمال کے لئے جو رقم ادا کی جاتی ہے وہ کارڈ کا معاوضہ اور سروس چارج ہے اس لئے اس کا ادا کرنا جائز ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے صورت مسئولہ میں اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کرنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے اس کی تائید اس سے بھی ”حکومت کا ادعاء ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں“ ہو رہی ہے کیونکہ ربا کی تعریف میں جو لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے وہ نفع ہی ہے کل قرض جر بہ نفعاً فہو ربا۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب تحریر کرتے ہیں: ”دفتر کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا، سفری چیک، بینک ڈرافٹ، خطوط اور مختلف قسم کی مالی سندوں کے ذریعہ بینک ہر چھوٹی بڑی رقم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں اور اس کا معاوضہ فیصد کمیشن یا فیس کی صورت میں وصول کرتے ہیں“ آگے لکھتے ہیں: ”اپنے گاہکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے غیر منقولہ جائیداد کی خرید و فروخت کا معاملہ کرنا اور اس سلسلہ میں قانونی کارروائیوں کی تکمیل کرنا بھی ان بالمعاوضہ خدمات سے ہے جو بینک انجام دیتے ہیں..... فی الجملہ کاروبار کی ترویج و ترقی میں ان کے کاروباری اور قانونی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں..... تمام معاوضہ سود سے پاک ہیں“ (غیر سودی بینکاری از نجات اللہ صدیقی ص ۲۷)۔

۳۔ لون لینے کی شرطوں میں سے ایک گارنٹر بننا (والدین کی مالی صورتحال) تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ وہ اپنی پراپرٹی کا کچھ حصہ فروخت کر کے تعلیم پر خرچ کرتا اور اگر فروخت کرنے میں کچھ قانونی یا گھریلو مشکلات ہوں تو اسے اتنا ہی قرض لینا چاہئے جو سود سے مستثنی ہو، بندہ نے مختلف یونیورسٹیوں سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ بی ٹیک کی سالانہ فیس زیادہ سے زیادہ ۵۵۰۰۰ سے زیادہ ۷۰۰۰۰ ہزار روپے، ایم ٹیک کی ۴۰۰۰۰ ہزار روپے، بی سی اے کی ۴۰۰۰۰ ہزار، ایم سی اے کی ۶۰۰۰۰ ہزار روپے، ہوٹل چارج ۱۲۰۰۰ ہزار روپے اور ۲۰۰۰۰ ہزار روپے کھانے کی فیس ہے، اور ان میں علی الترتیب چار سال، دو سال اور تین سال تعلیم کی مدت ہے، لہذا پورا خرچ چار لاکھ کے قریب یا اس سے کچھ زیادہ ہو سکتا ہے اور ۴ لاکھ پر سود نہیں دینا پڑتا تو اس کو چاہئے کہ انہیں جیسی تعلیم کی طرف رجوع کرے، بعد کو اگر اس کے معاشی حالات بہتر ہو گئے تو ہندوستان کے باہر بھی جا کر تعلیم حاصل کر سکتا ہے، باوجود اس کے قرض لینے والے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ارباب افتاء سے رجوع کرے اور مفتی کو مبتلی بہ کے حالات سامنے رکھ کر جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

محترم ڈاکٹر صلاح الدین سلطان صاحب نے مقاصد شریعت کے ص ۳۰ پر ایک تحریر پیش کی ہے احقر ضروری سمجھتا ہے کہ اسے پیش کر دے: ”اب مقاصد شریعت کی روشنی میں غور کیجئے کیا یہ بڑا سنگین خطرہ نہیں کہ مسلمان جاہل یا بے روزگار رہ جائیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً“ (اور ان کافروں کا ہرگز مؤمنوں پر غلبہ نہ ہونے دے گا)، اب ایک مسلمان نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق کفار پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے لون لیا اور ڈاکٹر بن گیا، وکیل بن گیا، انجینئر بن گیا، موجودہ تخلیق کار بن گیا تو کیا اس نے بڑے خطرے کو دور نہیں کیا، آگے موصوف لکھتے ہیں: ”کیا کوئی سروے رپورٹ ایسی ہے جو یہ بتاتی ہو کہ آج کے بے رحم معاشرہ میں اگر کسی مسلمان بچہ کو پڑھایا لکھایا نہ جائے کمپیوٹر کی تعلیم نہ دلائی جائے، گریجویٹیشن کی سطح کی تعلیم نہ دلائی جائے تو وہ سماج کا کوئی صالح عنصر رہ سکے گا، کیا بے کار گھر بیٹھے رہنا اس کے لئے کسی بھی حیثیت سے مفید ہوگا؟“ اگر کوئی بلاسودی نظام یا ادھار بدون سود کی کوئی صورت نہ بن سکے تو احقر اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے حق میں ہے، کیونکہ فی زمانہ تعلیم حاجت کے درجہ میں ہے، لیکن مال کے اعتبار سے ضرورت کے درجہ میں ہے، اور کبھی دنیوی اور دینی حیات کی تکمیل اسی پر منحصر ہو جاتی ہے، شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

”الضروریات ہی التي يتوقف عليها حياة الناس الدينية والدينية بحيث اذا فقدت اختلت الحياة في الدنيا وضاء النعيم وحل العقاب في الآخرة“۔

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں: ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة“، اور الاشباہ کا یہ جزئیہ ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“، کتب صحاح میں بیع عربیہ کا ثبوت بھی موجود ہے، بیع عربیہ اور استقراض بالربح میں ربا پائے جانے کے باوجود ضرورت ہی کے تحت فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۴۔ قرض کے جواز اور عدم جواز کا تعلق تو بالغ اولاد سے ہی ہوگا، لیکن والد پر کچھ اخلاقی اور سماجی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، وہ یہ کہ جب تک اولاد زیر تعلیم ہے والد اس کی مکمل کفالت کرے۔

۵۔ اگر مقصد صرف یہ ہو کہ اپنے بینک بینس پر حرف نہ آئے تو اسکی قطعاً گنجائش نہیں ہونی چاہئے، بسورت دیگر جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن اس میں بھی

”الضرورة تنقذ بقدر الضرورة“، کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ☆☆☆

## اعلیٰ عصری تعلیم

کے لئے بینکوں سے قرض حاصل کرنا

مولانا راشد حسین ندوی

۱۔ اسلام میں علم کی اہمیت:

اسلام میں علم کی جس قدر اہمیت و فضیلت بیان کی گئی ہے، شاید کسی اور مذہب میں اس کا تصور بھی مشکل ہے، قرآن کی ابتدا ہی لفظ ”اقرا“ سے کی گئی ہے، اور پھر تاکید اس کی تکرار بھی کی گئی (سورہ علق ۱ تا ۵)۔ قرآن پاک میں یہ بھی صراحت سے آیا ہے کہ حضرت آدم کی ملائکہ پر فوقیت علمی تفوق کے بنیاد پر دی گئی (سورہ بقرہ: ۳۰ تا ۳۳)۔ اس کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر علم اور علماء کی فضیلت بیان کی گئی، ان کا احصاء دشوار ہے، ہم نمونہ کے طور پر تیرہ کا صرف چند آیات کا ذکر کرتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون انما يتذكر اولوا الالباب“ (سورہ زمر: ۹) (کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ اور نصیحت تو وہی کیڑتے ہیں جو عقلمند ہیں)۔

نیز فرمایا: ”يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات“ (سورہ مجادلہ ۱۱) (جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم عطا کیا گیا خدا ان کے درجے بلند کرے گا)۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ”انما يخشى الله من عباده العلماء“ (سورہ فاطر: ۲۸) (خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں)۔

کئی جگہ یہ بھی بتایا گیا کہ کائنات پر غور و فکر کا صحیح اور ٹھیک ٹھیک فائدہ اہل علم ہی کو ہو سکتا ہے، ارشاد ہے:

”ان في ذلك لايات للعالمين“ (سورہ روم: ۲۳) (اہل دانش کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں)۔

”شهد الله انه لا اله الا هو والملائكة وأولو العلم قائما بالقسط“ (سورہ آل عمران: ۱۸) (اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اور فرشتوں نے، علم والوں نے بھی وہی حاکم انصاف کا ہے)۔

نبی کریم ﷺ نے بھی متعدد مواقع پر علم کی فضیلت اور اہمیت کی طرف متوجہ فرمایا، ایک موقع پر فرمایا:

”من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له طريقا الى الجنة“ (بخاری کتاب العلم باب العلم قبل القول والعمل (تعلیقا) ابوداؤد کتاب العلم باب في فضل العلم، ترمذی ابواب العلم باب ماجاء في فضل الفقه) (جو شخص طلب علم میں کسی راہ پر چلتا ہے تو اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے)۔

آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ”ان العالم يستغفر له من في السموات والأرض والحيتان في جوف الماء، وان فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب“ (المصادر السابقه، البخاری) (عالم کے لئے آسمانوں نیز زمین کی تمام چیزیں اور پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں استغفار کرتی رہتی ہیں، اور عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جیسے چودھویں کے چاند کی دوسرے ستاروں پر)۔

مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، بکری کلاں، رائے بریلی۔

## علم کی تعریف:

لغت کے اعتبار سے علم جہل کی ضد ہے، یعنی کسی چیز کو جاننا اور محسوس کرنا چنانچہ لسان العرب میں ہے: ”والعلم نقيض الجهل، وعلمت الشيء علمه علماً: عرفته، وعلم بالشيء: شعر“ (لسان العرب مادہ: علم)، اور القاموس المحيط میں ہے: ”علمه كسمعه علماً بالكسر عرفه“ (القاموس المحيط مادہ: علم)۔

دونوں عبارتوں کا لب لباب وہی ہے جو علم کی تعریف میں اوپر عرض کیا گیا، لہذا لغوی اعتبار سے چاہے جس طرح کا علم حاصل کیا جائے اوپر بیان کردہ فضائل حاصل ہوں گے، اس لئے کہ وہ علم ہے البتہ چونکہ ان نصوص ہی میں بعض شرطیں لگی ہوئی ہیں لہذا ان کا موجود ہونا ضروری ہوگا، مثلاً سورہ معلق میں ہے:

”اقرأ باسم ربك الذي خلق“ (سورہ معلق: ۱) (پڑھا اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس علم کو حاصل کر رہا ہے اس کا حصول پروردگار عالم کے عرفان میں معین و مددگار ہو، اس میں رکاوٹ نہ ہو۔

دوسری شرط کی طرف سورہ فاطر میں اشارہ کیا گیا: ”إنما يخشى الله من عباده العلماء“ (سورہ فاطر: ۲۸) (خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن علم کی قرآن وحدیث میں فضیلتیں وارد ہوئی ہیں اس سے مراد مطلق علم نہیں ہے بلکہ ایسا علم مراد ہے جس سے اللہ کا خوف اور تقویٰ پیدا ہو۔ پھر ایک حدیث شریف میں تو صاف صراحت ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص میں جہاں بھی علم کی فضیلت بیان کی جاتی ہے، اس سے صرف دینی علوم ہوتے ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے: ”وعن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: العلم ثلاثة وما كان سوى ذلك فهو فضل: آية محكمة أو سنة قائمة أو فريضة عادلة“ (ابو داؤد، کتاب الفرائض باب ماجاء في تعليم الفرائض، ابن ماجہ کتاب السنۃ باب اجتناب الرأى والقياس)۔ (حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم تین ہیں: اس کے علاوہ بقیہ فضل ہیں، آیت محکمہ، سنت قائمہ یا فریضہ عادلہ)۔

اس حدیث کی تشریح میں علماء کی دو آراء ہیں: ۱۔ ان تین کے علاوہ بقیہ چیزیں علم نہیں ہیں۔ ۲۔ یہاں صرف علوم دینیہ کے فرض کفایہ کا ذکر ہے۔

پہلے قول کی ترجمانی کرتے ہوئے ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”وما عدا ذلك من الفضول، ولا مدخل له في علم الدين، وأما الطب فليس بفضول لما ثبت بنصوص السنة الافتقار إليه... أقول فيه: ان كل ما ثبت بالسنة الافتقار إليه لا يلزم أن يكون علماً كالجماعة والزراعة والنساجة، فإنها من فروع الكفاية ولا يسنى علوماً مع ان العلم بالطب جائز لا يفرض اجماعاً الفتح“ (مرقاۃ: ۱۱۲۵۷)۔

(طبی فرماتے ہیں) اس کے علاوہ وہ علوم فضائل میں سے ہیں، اور علم دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، جہاں تک طب کا تعلق ہے تو وہ فضائل میں سے نہیں ہے، اس لئے کہ نصوص سنت سے ان کی حاجت ثابت ہے... اس کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ سنت سے جن چیزوں کی حاجت ثابت ہو، ان کا علم ہونا لازم نہیں ہے، جیسے کھچنے لگانا، کھیتی کرنا اور کپڑے بنانا فرض کفایہ میں سے ہے، لیکن ان کو علم نہیں کہا جاتا، پھر طب کا علم بالا جماع جائز ہے نہ کہ فرض)۔

دوسرے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں: ”أقول: هذا ضبط وتحديد لما يجب عليهم بالكفاية (الی) فهذه الثلاثة يحرم خلو البلد عن غالبها لتوقف الدين عليه، وما سوى ذلك من باب الفضل والزيادة“ (حجة الله ۱۱۰۳۸۹، ۳۹۰)۔ (میں کہتا ہوں کہ یہ ان علوم کی تعیین اور حد بندی ہے جو مسلمانوں پر فرض کفایہ ہیں (آگے فرماتے ہیں) تو ان تین کے غالب سے شہر کا خالی ہونا حرام ہے، اس لئے کہ دین کا دار و مدار انہیں پر ہے، اور ان کے علاوہ فضیلت اور زیادتی سے متعلق ہیں)۔

امام غزالی نے بھی علم کی کئی قسمیں بیان کی ہیں، اور خاصی طویل بحث کی ہے، خلاصہ اس کا یہی ہے کہ علم صرف شریعت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اسی لئے انہوں نے فرمایا کہ بعض دوسرے علوم بھی فرض کفایہ ہیں، فرماتے ہیں:

غیر شرعی علوم کی تین قسمیں ہیں: محمود، مذموم، مباح، تو محمود وہ ہیں جن سے دنیاوی امور جڑے ہوئے ہوں، جیسے طب اور حساب، اور اس کی دو قسمیں ہیں:



ایک فرض کفایہ، دوسرے وہ جو فضیلت والے ہیں اور فرض نہیں ہیں، جہاں تک فرض کفایہ کا تعلق ہے تو یہ وہ علوم ہیں جن سے امور دنیا کے چلانے میں استغناء نہیں ہو سکتا ہے جیسے کہ طب اس لئے کہ جسموں کے باقی رکھنے کی حاجت میں وہ ضروری ہے اور جیسے کہ حساب اس لئے کہ وہ معاملات، نیز وصیتوں اور میراث کی تقسیم میں ضروری ہیں، اور یہ ایسے علوم ہیں کہ اگر شیران کو انجام دینے والوں سے خالی ہو تو اہل بلد کو دشواری ہوگی اور اگر ایک ان کو انجام دے دے تو کافی ہوگا اور دوسروں سے فرض ساقط ہو جائے گا تو ہمارے اس قول سے تعجب نہ ہونا چاہئے کہ طب اور حساب فرض کفایہ میں سے ہیں، اس لئے کہ صنعتوں کے اصول بھی فرض کفایہ میں سے ہیں جیسے کاشتکاری، کپڑے کی بنائی اور گھوڑوں کی دیکھ بھال بلکہ بچھنے لگانا اور کپڑوں کی سلائی کرنا بھی (آگے فرمایا) کہ وہ علوم جن کو فضیلت مانا جاتا ہے نہ کہ فریضہ تو وہ حساب کی باریکیوں اور طب کے حقائق کی گہرائیوں میں جانا نیز وہ چیزیں ہیں جن سے استغناء ہوتا ہے لیکن وہ اس مقدار میں زیادتی قوت کا فائدہ دیتے ہیں، جس کی حاجت ہوتی ہے (احیاء علوم الدین ۱/۲۷۷)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک یہ علوم بھی علم کی تعریف میں شامل ہیں۔

اس کی تائید ہندیہ کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے: ”(العلوم ثلاثہ) علم نافع یجب تحصیلہ، وهو علم معرفة المعبود وخلق الأشياء سوى الله تعالى و بعد ذلك العلم بالحلال والحرام والأمر والنهي وما بحث الأنبياء به وعلم یجب الاجتناب عنه وهو السحر وعلم الحكمة والطلسمات وعلم النجوم إلا على قدر ما يحتاج إليه في معرفة الأوقات وطلوع الفجر والتوجه إلى القبلة والهداية في الطريق، وعلم آخر ليس فيه نفع يرفع إلى الآخرة وهو علم الجلال والمناظرات فيكون الاشتغال به تضييع العمر في شئ لا ينفذ في الآخرة“ (ہندیہ ۵/۲۴۸)۔

(علوم تین ہیں: ایک علم نافع جس کا حاصل کرنا واجب ہے، یہ معبود کی معرفت نیز اللہ کے علاوہ بقیہ اشیاء کی خلقت کی معرفت کا علم ہے، اس کے بعد حلال حرام، امر و نہی نیز جس کے ساتھ انبیاء کی بعثت ہوئی اس کا علم ہے، دوسرا وہ علم ہے جس سے اجتناب واجب ہے، یہ جادو، علم فلسفہ، طلسمات اور علم نجوم ہے سوائے اتنی مقدار کے جس کی اوقات اور طلوع فجر جاننے، قبلہ کی طرف رخ کرنے اور راستہ تلاش کرنے میں حاجت ہوتی ہے، تیسرا علم وہ ہے جس میں آخرت کی طرف لوٹنے والا کوئی نفع نہیں ہوتا ہے، یہ علم جدل اور مناظرہ ہے، تو اس سے اشتغال عمر کو ایسی چیز میں ضائع کرنا ہے جو اسے آخرت میں فائدہ نہیں پہنچائے گی)۔

بہر حال علوم دینیہ کے علاوہ بقیہ دوسرے علوم کو خواہ علم کہا جائے، جیسا کہ عرف ہے، لغت کا تقاضہ ہے اور ہمارے بہت سے علماء نے سمجھا ہے، یا انہیں علم کے بجائے کوئی دوسرا نام دیا جائے، بہر حال اس پر تو سب متفق ہیں کہ جن علوم و فنون پر کاروبار معیشت کا دارومدار ہو، اور جن کے بغیر کسی صالح اور متمدن معاشرہ کا چلنا دشوار ہو ان کا سیکھنا بھی ضروری ہے اور فقہی حیثیت سے ان کو فرض کفایہ قرار دیا جائے گا۔

فرض عین کون سا علم ہے؟

حدیث شریف میں آیا ہے: ”عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: طلب العلم فریضة علی کل مسلم“ (ابن ماجہ کتاب السنة باب فضل العلماء والبعث علی طالب العلم) (حضرت انسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

اس حدیث کے بارے میں صاحب مشکاة فرماتے ہیں: ”رواہ ابن ماجة و روی البيهقي في شعب الايمان الى قوله: ”مسلم“ وقال: هذا حدیث مستند مشهور، واسنادہ ضعیف و قدروی من أوجه کلها ضعیف“ (اس کی روایت ابن ماجہ نے کی ہے، اور بیہقی نے شعب الايمان میں ”مسلم“ تک اس کی روایت کی اور فرمایا: اس حدیث کا متن مشہور ہے اور اس کی سند ضعیف ہے، اس کی روایت کئی طریق سے ہوئی ہے اور سب ضعیف ہیں)۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”لکن کثرة الطرق تدل علی ثبوته ویقوی بعضه ببعض“ (مرقاة ۱/۲۲۵) (لیکن کثرت طرق اس کے ثابت ہونے پر دال ہیں اور ایک کو دوسرے پر تقویت مل رہی ہے)۔

سوال یہ ہے کہ اس حدیث میں جس علم کو فرض عین قرار دیا گیا ہے اس سے کون سا علم مراد ہے؟ امام غزالی فرماتے ہیں: ”اختلف الناس في العلم الذي هو فرض علی کل مسلم، ففرقوا فيه أكثر من عشرين فرقة، ولا نطیل بنقل التفصیل، ولكن حاصله أن کل

فريق نزل الوجوب على العلم الذي هو يصدده“ (احياء ۱۰۲۵)۔

(اس علم کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے، چنانچہ اس کے بارے میں بیس سے زیادہ گروہ ہو گئے ہیں، ہم تفصیل نقل کر کے طوالت نہیں کریں گے، لیکن خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر فریق نے وجوب کو اس علم سے متعلق کیا ہے جس میں وہ لگا ہوا ہے)۔

خود امام غزالی نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ انسان جب مکلف ہوتا ہے تو اسپر اقرار تو حید فرض ہو جاتا ہے، پھر نماز کا وقت آتا ہے تو نماز کا علم فرض ہو جاتا ہے، اسی طرح جو فرض اخص ہوتے رہتے ہیں ان کا جاننا فرض ہوتا رہتا ہے (ایضاً ۲۵۵، ۲۶)۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”قال الشراح: المراد بالعلم ما لا مندوحة للعبد من تعلمه كمعرفة الصانع، والعلوم بوجدانيتها ونبوة رسوله و كفيية الصلاة، فان تعلمه فرض عين وأما بلوغ مرتبة الاجتهاد والفتيا ففرض كفاية“ (مرقاۃ ۱۰۲۲) (شرح فرماتے ہیں: علم سے مراد وہ ہے جس کے حصول کے بغیر چارہ کار نہ ہو، جیسے خالق کی معرفت، اس کی وحدانیت اس کے رسول کی نبوت اور نماز کی کیفیت کا علم، اس لئے کہ اس کا سیکھنا فرض عین ہے، رہا مرتبہ اجتہاد اور افتاء تک پہنچنا فرض کفایہ ہے)۔

ہندیہ میں فرماتے ہیں: ”طلب العلم فريضة بقدر الشرائع وما يحتاج إليه لا مر لا بد منه من الكلام الموضوع، والصلاة، وسائر الشرائع والأموار معاشه وما وراء ذلك ليس بفرض، فان تعلمها فهو أفضل وان تركها فلا إثم عليه كذا في السراجيه“ (ہندیہ ۵۰۲۷)۔

(شرح کے بقدر اور ضروری امور میں جن کی حاجت ہوتی ہے اس کے بقدر علم کا حاصل کرنا فرض ہے، جیسے وضو، نماز اور دوسرے شرعی معاملات کے احکام نیز اپنے معاش سے متعلق امور، اس کے علاوہ چیزیں فرض نہیں ہیں، اگر ان کو سیکھا تو افضل ہے نہیں سیکھا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صاحب مظاہر حق کے الفاظ میں: جس علم کی ضرورت پڑے اس کا سیکھنا فرض ہے، مثلاً جب آدمی مسلمان ہو تو خالق کی معرفت فرض ہے، پھر اس کی صفات کا جاننا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جاننا فرض ہے، اور جب نماز کا وقت آتا تو احکام نماز کا سیکھنا فرض ہے، غرض جو بات اسکو پیش آتی رہے اس کا سیکھنا فرض ہوگا (مظاہر حق ۹۶۱، ۹۷۰، ۹۷۱)۔

اور اس سے زیادہ کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہوگا بشرطیکہ وہ ایسی چیز ہو جس کی ضرورت پیش آتی ہو، خواہ وہ علم دین ہو یا ڈاکٹری، انجینئرنگ جیسی ضروری چیزوں میں مہارت، خواہ علم دین کے علاوہ کو علم کہا جائے یا نہ کہا جائے اگر ان کی حاجت ہے تو ان کے حصول کے فرض کفایہ ہونے پر سبھی متفق ہیں۔

اعلیٰ عصری تعلیم کا حصول بھی فرض کفایہ ہے:

اس تفصیل کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ علوم عصریہ کو خواہ علم کہا جائے یا نہ کہا جائے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن ان کے فرض کفایہ ہونے میں دو اسکی نہ ہونا چاہئے۔

لہذا چاہے میڈیکل لائن ہو یا انجینئرنگ کی، فضائی سائنس کا شعبہ ہو یا بحری سائنس کا، میڈیسن کی تیاری کی شاخ ہو یا جراثیم وغیرہ میں مہارت کا، ہتھیاروں کی تیاری کا علم ہو یا مصنوعی سیاروں کی تیاری کا، ان سب علوم میں بھی مسلمانوں کو نہ صرف دوسری قوموں کے شانہ بشانہ رہنا چاہئے بلکہ ان سے برتر اور ممتاز رہنا چاہئے، ورنہ دنیا میں انہیں غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایک دور گزرا ہے جب مسلمان ان علوم میں بھی دنیا کی امامت کر رہے تھے، اور ان علوم و فنون میں اپنی مہارت کے جھنڈے گاڑ رہے تھے، آج جب کسی بھی علم و ہنر کا نام لیا جاتا ہے تو ہم مسلمان فخریہ کہتے ہیں کہ اس فن میں ہمیں اولیت حاصل ہے، اور پھر ناموں کی ایک پوری فہرست پیش کر دیتے ہیں، بہر حال یہ دور مسلمانوں کے عروج کا تھا، ڈاکٹر صباح الدین عبدالرحمن مرحوم لکھتے ہیں:

”یونان و روم مٹ چکے تھے، یورپ میں ذہنی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، ایران میں حکمرانی طوائف الملوک تھی، ہندوستان جاگ کر پھر سو رہا تھا، تو بغداد منصور سے معتضد باللہ کے عہد تک بیت الحکمت بن کر علوم کے انوار سے منور ہو رہا تھا (آگے فرماتے ہیں) بغداد کی طرح قرطبہ، غرناطہ اور قاہرہ بھی علمی مرکز بنے، اہل یورپ یہاں کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے، پوپ سادس ثانی نے اپنی تعلیم قرطبہ کی اسلامی درس گاہ میں پائی“ (مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب ص ۷۲-۷۳)۔

اور آج مسلمانوں کے دور زوال میں یہ صورتحال ہے کہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے کل ممالک میں جتنے سائنس دان ہیں اس سے زیادہ یورپ کے اکیلے ایک فرانس میں ہیں، عرب ممالک کو خاصا مالدار سمجھا جاتا ہے، اور یہ مالدار پیٹرول کے سبب ہے، لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ نہ تو ان کے پاس یہ اہلیت ہے کہ خود نئے چشموں کی تلاش کر سکیں، اور نہ یہ اہلیت ہے کہ نکلے ہوئے پیٹرول کو صاف ہی کر سکیں، ان کا پورا مدار غیر ملکی ماہرین پر ہے، بتایا جاتا ہے کہ افغانستان اور کئی مسلم ممالک کے پہاڑی علاقے بعض اتنی قیمتی معدنیات سے مالا مال ہیں جن سے ان کی تقدیریں بدل سکتی ہیں، لیکن افسوس نہ تو ان کے اندران کو کھوجنے کی صلاحیت ہے نہ استعمال کرنے کی گویا مسلمانوں کے پاس نہ تو نفی قوت کم ہے نہ مال و دولت اور قدرت معدنیات کی کمی ہے، کمی صرف تکنیکی صلاحیتوں کی ہے، اگر یہ کمی نہ ہوتی تو وہ آج بھی اقوام عالم پر اسی طرح غالب ہوتے جیسے اسلاف تھے، اور ان کی حیثیت سمندر کے جھاگ کی طرح نہ ہوتی جسے بھونک مار کر بھی معدوم کیا جاسکتا ہے۔

اگر مسلمان اور عرب نت نئے ہتھیاروں، جدید ترین اسلحوں اور تکنیکی صلاحیتوں سے لیس ہوتے تو کیا اسرائیل جیسی معمولی ریاست ان کو آنکھ دکھا سکتی تھی؟ کیا یہودیوں کا ایمانی جذبہ مسلمانوں سے بڑھ کر ہے؟

حالانکہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو صاف صاف حکم دیا گیا تھا: ”وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تَرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ“ (سورہ انفال: ۶۰) (اور جس قدر تم سے ہو سکے قوت (یعنی ہتھیار) سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارا دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم بالیقین نہیں جانتے ان کو اللہ ہی جانتا ہے)۔

موجودہ دور میں اس حکم پر عمل کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ کیا صرف علوم شرعیہ کی مہارت سے موجودہ تقاضوں کے مطابق اس حکم پر عمل ممکن ہے؟ میرے خیال سے تو اس حکم کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جدید علوم و فنون میں مہارت حاصل کرے، اور جس طرح ماضی میں بارود توپ اور طرح طرح کی ایجادات کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، موجودہ دور میں بھی جدید ترین ایجادات ان کی رہن منت ہوں، یا کم از کم اس میدان میں وہ غیروں کے شانہ بشانہ ہوں، لیکن افسوس اس میدان میں ہم بہت پچھڑ گئے اور دوسری قومیں بازی مار لے گئیں۔

اس کی ایک وجہ رقم کے نزدیک یہ بھی رہی کہ کچھ خطرات کے پیش نظر علماء نے اس میدان سے مکمل طور پر دوری اختیار کی، لہذا جو لوگ عصری علوم کا میدان منتخب بھی کرتے ہیں ان کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے، اس لئے کہ یہ لوگ یہ میدان معاشی مجبوریوں کے سبب اختیار کرتے ہیں نہ کہ فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے ملی ضروریات کے پیش نظر، جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ منصوبہ بند طریقہ سے ذہن سازی کر کے فرض کفایہ ادا کرنے کے لئے اور مسلمانوں کی ملی ضروریات پوری کرنے کے لئے حسب ضرورت افراد کو ان میدانوں میں بھیجا جاتا تھا کہ پوری ملت اس فرض سے سبکدوش ہوتی، اس طرح کی کتنی ہی لائنیں ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ کو دیکھتے ہوئے جتنے افراد کی ضرورت تھی یا جتنے کمال کی ضرورت تھی ابھی وہ پوری نہیں ہو سکی ہے۔

خلاصہ کلام: ..... یہ کہ اعلیٰ عصری تعلیم کے جن شعبوں سے ملت کا مفاد وابستہ ہے ان کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جس طرح کی مہارت کی ضرورت تھی اور جتنی بڑی ٹیم کی ضرورت تھی ابھی وہ پوری نہیں ہو سکی ہے، لہذا میں سمجھتا ہوں کہ پوری ملت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ اس سمت توجہ دے ورنہ اس کی باز پرس ہو سکتی ہے، جس طرح دین کے بقاء کے لئے مدارس کی ضرورت سمجھی گئی اور قریہ قریہ بستی بستی مدارس و مکاتب کا جال بچھا کر اس ضرورت کو پورا کیا گیا اور دین کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا گیا، ٹھیک اسی طرح ملت کی بقاء اور اس کی سرخروئی اور انفعیت ثابت کرنے کے لئے عصری علوم کے میدان میں بھی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، یہ کام بھی میرے نزدیک اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہوگا جب اس کی باگ ڈور علماء اور مخلصین سنبھالیں گے۔

۲۔ تعلیمی قرض کیا سروس چارج ہے؟

سود کی مذمت کتاب و سنت میں اتنے سخت الفاظ سے کی گئی ہے کہ شاید ہی کسی چیز کی اتنی سخت مذمت کی گئی ہوگی، مثلاً ارشاد ہے: ”فَاتَّخَذُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سَوَادًا وَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۹) (پھر اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنک کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے)۔

دوسری جگہ کہا گیا کہ باز نہ رہنے پر عذاب تزکیہ نہیں بلکہ کفار کی طرح عذاب الیم ہوگا:

”وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ“ (آل عمران ۱۳۱) (اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے)۔

حدیث شریف میں بھی سخت ترین وعیدیں ارشاد ہوئیں، اور سود و شبہ سود دونوں سے بچنے کی تاکید کی گئی:

”دعوا الربا والربیة“ (ابن ماجہ تجارت باب التغلیظ فی الربا) (سود بھی چھوڑ دو اور شبہ سود بھی)، نیز سود کا سب سے معمولی گناہ ماں کے ساتھ زنا کاری کے برابر قرار دیا گیا۔ ان نصوص کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک مسلمان سود سے کوسوں دور رہے۔

البتہ اضطرار کی حالت میں جس طرح مرد اور لحم خنزیر کا استعمال بقدر سدر متق جائز ہے، ظاہر ہے اس حالت میں بقدر ضرورت سود کا استعمال بھی جائز ہوگا، اور چونکہ بہت سے مواقع میں حاجت کو شریعت نے ضرورت کے مرتبہ میں قرار دیا ہے ”الحاجة تنزل منزل الضرورة عامة كانت أو خاصة“ (الاشباه والنظائر ۱۱۱۳)، اسی لئے بعض علماء نے حاجت شدیدہ کی بنیاد پر بھی اس کی اجازت دی ہے، ضرورت و حاجت و منفعت فضول کی پانچ مدارج کا حموی کے حوالہ سے ذکر کرتے ہوئے قاضی مجاہد الاسلام قاسمی لکھتے ہیں: ”حاجت علی العموم حرام کو مباح تو نہیں کرتی لیکن کبھی کبھی حاجت چاہے عام ہو یا خاص ضرورت کے درجہ میں تسلیم کر لی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ایسے حاجت مند لوگ جن کے لئے اپنی ضروریات کی تکمیل کا کوئی اور راستہ نہ ہو اور ضروریات بھی ایسی ہیں کہ اگر وہ انہیں پورا نہ کریں تو بڑی دشواری میں پڑ جائیں گے ان کے لئے فقہاء نے سودی قرض لینا جائز قرار دیا ہے (مباحث فقہیہ ص ۴۶۴)۔

لیکن سودی قرض لے کر بہر حال اعلیٰ تعلیم کے حصول کی شرعاً گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ عصری تعلیم بلاشبہ فرض کفایہ میں سے ہے، اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس کی بڑی اہمیت ہے، لیکن ظاہر بات ہے جس شخص کے پاس جائز وسائل نہ ہوں اس پر اس کا حصول فرض نہیں ہوگا، لہذا اس کو ناجائز ذرائع وہ بھی سود جیسے ملعون ذریعہ سے اس کے حصول کو جائز نہیں قرار دیا جاسکتا، ہاں یہ مذموم و ملامت کی ہے کہ کسی کو نہایت طالب علم کو صرف وسائل کی کمی کی وجہ سے محروم نہ ہونے دے۔ مذکورہ قرض کیا ہے؟

سوالنامہ کے ساتھ وجہ یا بینک کی تعلیمی قرض سے متعلق جو تفصیلات منسلک کی گئی ہیں (اور بظاہر اسی سے ماقہ حلتی تفصیلات دوسرے بینکوں اور اداروں کی بھی ہونگی) اس میں شرح سود و اقساط بہت کم ہے، لیکن سوال شرح سود کے کم یا زیادہ ہونے کا نہیں ہے، بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس کو سروس چارج قرار دیا جاسکتا ہے یا یہ سود ہی ہے؟ میرے خیال سے اس کو سروس چارج کہنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اگر یہ سروس چارج ہوتا تو اس میں سالانہ اضافہ نہ ہوتا، اس انداز سے اضافہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ سود ہے، اس لئے کہ اس پر سود کی تعریف صادق آ رہی ہے، سود کی تعریف علامہ شامی نے بایں الفاظ کی ہے:

”وشرعاً: فضل مال بلا عوض فی معاوضۃ مال بمال“ (شامی ۱۹۶، ۴) (مال کے مال سے معاوضہ کے وقت بلا عوض زائد مال)۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ”کل قرض جو نفعاً حراماً إذا کان مشروطاً“ (شامی ۱۹۳، ۴) (ہر وہ قرض جو نفع لائے حرام ہوگا بشرطیکہ وہ مشروط ہو)۔ اس قرض میں بھی سالانہ منافع مشروط ہے اگرچہ اس کی مقدار کم ہے، اس کا انداز سروس چارج کا نہیں ہے کہ حساب کر کے صرف مصارف وصول کئے جاتے ہوں، بلکہ سراسر سود کا ہے۔

البتہ اگر اس میں تبدیلی کر دی جائے، اور سالانہ یا ماہانہ اضافہ کرنے کے بجائے دفتری مصارف کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھیک حساب کر کے ان کو ایک لخت مقرر کر دیا جائے، وصولی خواہ قسط وار ہی کی جائے تو اس کو سروس چارج قرار دیا جاسکتا ہے، اور شرعاً جواز کا حکم لگایا جاسکتا ہے، اس صورت میں یہ گنجائش بھی رہے گی کہ اس سروس چارج کو قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے مربوط کر دیا جائے، یا ہر قرض پر یکساں چارج لگایا جائے، یعنی سروس چارج وصول کرنا بھی جائز ہے، اور اس کو فیصد سے مربوط کرنا بھی جائز ہے، مولانا تفتی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

”قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئے ہیں“ (فقہی مقالات ۲۷۰)۔

مولانا موصوف نے اس سروس چارج کو فیصد سے مربوط کرنے کی بھی اجازت دی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض کی مقدار کی مناسبت سے سروس چارج میں بھی کمی بیشی ہو، اور اس پر استدلال مختلف کتب فقہیہ کے حوالہ سے دلال کی اجرت سے کیا ہے، کہ اس کو فیصد سے مربوط کرنے کی اجازت فقہاء نے دی ہے، اخیر میں لکھتے ہیں: ”لہذا دلال کے کمیشن پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلہ میں قرض کے اجراء پر آنے والے دفتری اخراجات کو قرض کی مقدار پر فیصد کے لئے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا جائے گا“ (فقہی مقالات ۲۷۶)۔

اس کی ایک دوسری شکل بھی ممکن ہے، جو حضرت مفتی نظام الدینؒ سے ایک استفتاء اور جواب سے ماخوذ ہے، استفتاء کچھ اس طرح تھا: ”کسی شخص نے اس ارادہ سے حکومت سے بطور قرض امداد لی ہے کہ اس میں سے بعض رقم کو بینک کے کسی ایسے کھاتے میں جمع کر دے جس میں جمع کی ہوئی رقم کا سالانہ سود و بیان قرض لی ہوئی رقم سے بڑھ جاتی ہو۔“ اس کا مفتی صاحب نے یہ جواب دیا: ”مجبور و غریب کا حکومت سے قرض لینا کہ اس میں سے کچھ رقم بینک کے کسی ایسے کھاتے میں جمع کر دی جائے جس سے ملنے پر سود پورے قرضہ کے سود کی ادائیگی کے لئے کافی ہو، اور بقیہ رقم اپنے کاروبار میں لگا دی جائے جس کو الگ سے ادا نہ کرنا پڑتا ہو تو شرعاً یہ حیلہ درست ہے“ (من أراد بالحيلة الهرب من الحرام فلا باس) (سراج علی الخانیہ ۲۰۲۵، ۲۰۲۴) ”وأجمعوا علی ان ما لا یبطل حق الخیر لا یکره فیہ استعمال الحیلة وتعلم الحیلة“ (خانیہ ۲۰۲۴، منتخبات نظام الفتاویٰ ۲۰۲۲)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر مذکورہ تعلیمی قرض سالانہ شرح سود کے اعتبار سے لیا جاتا ہے تو وہ ناجائز ہوگا، سود کی حرمت اس کے کم یا زیادہ ہونے پر نہیں ہے، ہاں اس میں کچھ تبدیلی کر دی جائے تو جواز ہو سکتا ہے، تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ اس کو مکمل طور سے سروس چارج کے انداز میں کر دیا جائے، یا پھر کوئی حیلہ اختیار کر لیا جائے۔

۳۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے قرض:

ہم نے سوال نمبر ۲ کے تحت عرض کیا کہ اس طرح کا قرض سودی قرض ہے، جس کا جواز صرف ضروریات یا حاجت کے تحت ہو سکتا ہے، یا اس میں وہ تبدیلیاں کر کے ہو سکتا ہے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا۔

اور سوال نمبر ایک کے تحت عرض کیا گیا کہ اعلیٰ عصری تعلیم کا حصول فرض کفایہ ہے، فرض کفایہ کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ کے تمام افراد پر لازم نہیں ہوتا، بلکہ صرف اتنے ہی افراد پر لازم ہوتا ہے جس سے معاشرہ کی ضرورت پوری ہو جائے، لہذا اس ضرورت کے تحت سودی قرض لینے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے۔

البتہ یہ معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ کسی ہونہار طالب علم کو ضائع نہ ہونے دے، ورنہ اگر کوئی شخص صلاحیت کے باوجود اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ گیا جبکہ معاشرہ کو اس کی ضرورت بھی تھی (ظاہریات ہے موجودہ حالات میں زندگی کے تمام شعبوں اور اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم کے تمام گوشوں اور میدانوں میں ماہرین فن کی ملت اسلامیہ کو کتنی سخت ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم غیروں کی محتاجی سے باہر نہیں نکل سکتے) تو پورا معاشرہ اس کے لئے ذمہ دار ہوگا۔

لہذا اس اسکیم کے تحت قرض لینا تو جائز نہیں ہے (جب تک کہ اس کے ضابطوں میں تبدیلی نہ کی جائے) البتہ ملت کے قائدین اور ذمہ داروں کا فریضہ ہے کہ جس طرح دین کی بقاء کے لئے مدارس کا جال بچھادیا گیا ہے، اور جس طرح دوسری ملی ذمہ داریوں کو حتی الوسع پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میدان میں بھی اپنا فریضہ ادا کیا جائے اور کردار نبھایا جائے، اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعہ ہونہاروں کو اس طرح فنڈ مہیا کیا جائے کہ کوئی بھی باصلاحیت فنڈ کی کمی کی وجہ سے محروم نہ رہنے پائے۔

۴۔ طالب علم والد کے صاحب حیثیت ہونے سے صاحب حیثیت شمار ہوگا یا نہیں؟

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ طالب علم کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی راقم کے نزدیک گنجائش نہیں ہے، وہ صاحب حیثیت ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس سوال میں ایک الگ بحث کو چھیڑا گیا ہے کہ کوئی انسان والد کے صاحب استطاعت ہونے سے شرعاً صاحب حیثیت شمار ہوگا یا نہیں؟ تو ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، اگرچہ اوپر کا جواب اپنی جگہ قائم ہے کہ خواہ اس کو صاحب حیثیت مانا جائے یا نہ مانا جائے وہ اس اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، ہاں اگر وہ نادار ہے تو زکوٰۃ یا سودی جمع رقم سے فنڈ اس پر صرف کی جاسکتی ہے۔

کیا نابالغ اپنے باپ کی مالداری سے مالدار شمار ہوگا:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب تک انسان نابالغ ہو اس کو باپ کی مالداری سے مالدار اور اس کی ناداری سے نادار سمجھا جائے گا، اور بلوغ کے بعد باپ کی مالداری سے مالدار نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اس کی اپنی حیثیت کے مطابق اس کی سطح کا اعتبار کیا جائے گا، اس سلسلہ کی چند فقہی عبارات ملاحظہ ہوں:

علامہ شامی کتاب الزکوٰۃ باب المصروف میں فرماتے ہیں:

۱۔ ”ولا ى طفله بخلاف ولده الكبير (الى) فيجوز لانتفاء المانع (قوله لانتفاء المانع) علة للجمیع، والمانع ان الطفل يعد غنيا بخني ابيه“ (شامی ۲۰۷۷۲، ہندیہ ۱۰۱۸۹)۔

(نہ ہی مالدار کے نابالغ بچے کو زکوٰۃ دی جائے گی برخلاف اس کے بالغ اولاد کے (آگے ہے) تو مانع نہ پائے جانے کی وجہ سے زکوٰۃ دینا جائز ہوگا (مصنف کا قول مانع نہ پائے جانے کی وجہ سے) سب کی علت ہے، اور مانع یہ ہے کہ نابالغ باپ کی مالداری سے مالدار شمار ہوتا ہے)۔

۲- ”وفی الشرح المجموع: وإذا استغنى الغلام عن الخدمة أجبر الأب أو الوصي أو الولی علی أخذہ، لانه اقدر علی تادیبہ وتعلیمہ“ (شاہی ۲۰۶۹۵)۔

(اور شرح الجمع میں ہے: جب بچہ خدمت سے مستغنی ہو جائے تو باپ، وصی یا ولی کو اس کے لینے پر مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ اس کو ادب سکھانے اور تعلیم دلانے پر اس کو زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے)۔

۳- ”وعن أبي يوسف إنما اعتبر القدرة علی النفقة دون المهر، لأنه تجرى المساهلة فی المهر ويحد المهر قادراً علیہ بیسار أیہ“ (هدایہ مع الفتح ۳۰۱۹۲)۔

(اور امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ انہوں نے نفقہ پر قادر ہونے کا اعتبار کیا ہے مہر پر نہیں، اس لئے کہ مہر میں مسابھت چلتی ہے، اور آدمی کو باپ کی مالداری سے اس پر قادر سمجھا جاتا ہے)۔

۴- ”والثابت عادة كالثابت بالنص فيما فيه معنى المؤنة بخلاف ما هو عبادة محضة كالزكاة“ (فتح القدير ۲۰۲۲۱)۔  
(جن چیزوں میں مؤنت کے معنی ہوں اس میں عرف سے ثابت ہونے والی چیز اس طرح ہوتی ہے جیسے نص سے ثابت ہوئی ہو برخلاف اس کے جو زکوٰۃ کی طرح عبارت محضہ ہو)۔

ان فقہی عبارتوں سے مندرجہ ذیل احکام معلوم ہوئے:

الف- عبارت (۱) اور بعد کی کئی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ باپ مالدار ہو تو اس کی نابالغ اولاد بھی مالدار مانی جائے گی، لہذا اس پر زکوٰۃ اور اس جیسی کوئی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہوگا، جس کا استحقاق ناداروں کو ہوتا ہے۔

ب: ان عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بالغ اولاد کو یہ حکم حاصل نہیں ہے، لہذا باپ کے مالدار ہونے کے باوجود اگر وہ نادار ہوں تو ان پر اس طرح کی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں۔

ج- عبارت (۲) سے معلوم ہوا کہ بچے کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری باپ اور اس کے وصی پر ہوتی ہے۔

د- عبارت (۳ اور ۴) سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نفقہ میں یہ عرف ہو کہ اس کے والد اس کو برداشت کر لیتے ہیں تو اس کی بنیاد پر اسے قادر سمجھا جاسکتا ہے۔  
خلاصہ کلام یہ کہ نابالغ کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے، اور شریعت نابالغ کو باپ کی مالداری سے مالدار تسلیم کرتی ہے، لہذا اس عمر میں اگر باپ مالدار ہے تو اس پر اس طرح کی رقمیں صرف کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اور بلوغ کے بعد اس پر اس طرح کی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں لیکن اگر باپ مالدار ہے اور خرچ کرنے کا عرف بھی موجود ہے، بلکہ وہ خرچ کرنے پر راضی بھی ہے تو اس طرح کی رقمیں صرف کرنا اگرچہ اس حالت میں بھی جائز ہوگا، لیکن مکروہ ہوگا، اس لئے کہ بلاوجہ حلال و طیب سے روگردانی کی جارہی ہے۔

۵- استطاعت ہونے کے باوجود باپ کا تعلیمی خرچ نہ دینا:

ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ قرض اسکیم میں کچھ تبدیلیاں کئے بغیر اس سے کسی کے لئے بھی استفادہ کرنا جائز نہیں ہوگا، البتہ اس سوال پر ہم نے ایک دوسری حیثیت سے غور کرنے کی کوشش کی تھی کہ باپ کے مالدار ہونے پر ان رقوم کے استعمال کا کیا حکم ہوگا جو ناداروں کے لئے مخصوص ہیں۔

سوال نمبر ۴ کے تحت ہم اس پر بھی اپنی معروضات پیش کر چکے ہیں، اور اشارہ عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں چونکہ بچوں کی تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کا عرف ہے، لہذا باپ کے مالدار ہونے سے بچوں کو (بالغ ہو یا نابالغ) مالدار سمجھا جائے گا۔ البتہ اگر والد تعلیمی اخراجات اٹھانے سے انکار کر دیں تو البتہ ان رقوم کو بالغ اولاد پر صرف کیا جاسکتا ہے، تعلیمی قرض کے بارے میں اپنی حقیر رائے ہم اوپر پیش کر چکے ہیں۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کے شرعی احکام

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی

۱۔ اسلام نے حصول تعلیم پر خاصہ زور دیا ہے اور اسے رفح درجات کا سبب قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے:

”یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین أو تو العلم درجات“ (اللہ تم میں سے ایمان والے اور علم والوں کے درجات بلند کرتا ہے)۔  
یہ علم جو رفح درجات کا سبب ہے، اس میں علوم آلیہ اور عالیہ دونوں شامل ہیں، کیونکہ دونوں نفع بخش ہیں، اور علم میں اصل نفع بخشی ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دینا مانگی اور غیر نافع سے پناہ چاہی۔

”اللہم انی أسئلك علما نافعا، اللہم انی أعوذ بک من علم لا ینفع“ (رواہ مسلم حدیث نمبر: ۲۷۲۲)۔

(اے اللہ میں آپ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ میں غیر نافع علوم سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نفع بخش علوم کو من جملہ ان اعمال کے قرار دیا، جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ارشاد فرمایا:

”اذا مات الانسان انقطع عمله إلا من صدقة جاریة أو علم ینتفع به أو ولد صالح یدعو له“ (رواہ مسلم حدیث نمبر: ۱۶۳۱)۔

(جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا دفتر بند ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے، ایک صدقہ جاریہ، دوسرے علم نافع اور تیسرے نیک اولاد جو والدین کے لئے مغفرت کی دعا کرے)۔

ان روایات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حصول علم کے لئے اگر وہ نفع بخش ہو تو ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق شریعت میں نہیں ہے، البتہ وہ علوم جو ہمارے ایمان و عقیدہ کی حفاظت کرتے ہیں اور احکام شرعیہ کی سمجھ پیدا کرتے ہیں ان کا نفع کامل ہوتا ہے، اس کی وجہ سے انسان فوز و فلاح کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، اور آخرت میں بھی کامیاب ہوتا ہے، ایسے علوم کا حصول مسلمانوں کی ترجیحات میں ہے، اور انہیں کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سماج کو اچھے انجینئر، ڈاکٹر، سیاست دان، دانشور، سائنسدان وغیرہ کی بھی ضرورت ہے، آج سماج کے انتشار، اخلاقی قدروں کے فقدان اور پھیلتی ہوئی انارکی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ سماجی علوم کے میدان میں آج دین بیزار لوگوں کا غلبہ ہے، ان حالات میں جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول عین مطلوب ہے، اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو تیزی سے آگے آنے کی ضرورت ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس طرف اکابر کی توجہ گئی ہے، اور مختلف قسم کے اعلیٰ تعلیم کے لئے انہوں نے ادارے اور کوچنگ کھولنا شروع کر دیا ہے، اور مفت تربیت کا نظام جاری ہو گیا ہے۔

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ایسے اداروں کی تعداد بہت کم ہے اور مسلم سماج کے لئے جتنے بڑے پیمانے پر اس کام کو ہونا چاہئے، نہیں ہو پارہا ہے، ایسے میں بہت سارے طلبہ اپنی مالی پسماندگی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں، اگر وہ بینک سے تعلیمی قرض لے لیں تو ان کی اس ضرورت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

۲۔ لیکن بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ بینک کا سارا نظام سود پر مبنی ہے، جس کی اسلام میں اجازت نہیں ہے، اس سلسلے میں سود کی شرح کے کم یا زیادہ ہونے کا مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ نفس سود کا ہے، کیا اسے بنیادی ضرورت قرار دے کر ”یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ کے اصول پر عمل کیا جاسکتا ہے؟

میری رائے میں بینک سے تعلیمی قرض کی وہ مقدار جس پر سود دینا نہیں ہوتا، بالاتفاق درست ہے، البتہ وہ شکلیں جس میں برائے نام ہی سود دینا پڑتا ہے

اس سے بچنے کی شکل اگر ممکن ہو تو بچنا چاہئے اس کم شرح سود کو سروس چارج قرار دینا، یا اجرت و محنت پر محمول کرنا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ بینک والے اسے سود ہی کہتے ہیں، سروس چارج نہیں، صاحب معاملہ تو اسے سود کہے اور ہم سروس چارج، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اب اگر کوئی طالب علم اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی معاشی حالت اس قابل نہیں تو اسے غیر سودی قرض کی تلاش کرنی چاہئے، اور اگر اس میں کامیابی نہ ملے تو وہ اس قرض اسکیم سے ضرور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

۴۔ طالب علم تو استطاعت نہیں رکھتا لیکن اس کے والدین اس کی صلاحیت رکھتے ہوں، تو بلوغیت سے قبل تک اگر طالب علم مستطیع نہیں ہے تو بالاتفاق والد کی استطاعت اس طالب علم کے حق میں معتبر ہوگی، اس لئے کہ بلوغیت سے قبل نان، نفقہ اور تعلیم و تربیت سب اس کی ذمہ داری ہے۔

ہندوستان کے خاص ماحول میں بلوغیت کے بعد بھی جب تک لڑکا برسر روزگار نہیں ہو جاتا یا گارجین اسے مشترکہ خاندان سے الگ نہیں کرتے عرفاً والد کی استطاعت ہی معتبر سمجھی جاتی ہے، سرکاری حکموں میں بھی آمدنی کے سرٹیفکٹ میں خاندان کے سربراہ کی آمدنی کا ہی اعتبار ہوتا ہے، اس لئے عرف کی رعایت کرتے ہوئے میرے نزدیک طالب علم کے پاس اگر استطاعت نہ ہو اور والد صاحب استطاعت ہو اور وہ اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دینے کا خواہش مند بھی ہو تو اسے اپنے مال سے خرچ کرنا چاہئے، تعلیمی قرض سود کے ساتھ لینا درست نہیں ہوگا، فتاویٰ ہندیہ کے ایک جزیئہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

”وقال الامام الحلواني: إذا كان الابن من أبناء الكرام ولا يستاجرہ الناس فهو عاجز وكذا طلبه العلم إذا كانوا عاجزين عن الكسب لايهتدون إليه لا تسقط نفقتهم عن آبائهم إذا كانوا مشغولين بالعلوم الشرعية“ (۱،۵۶۳)۔

حلوانی نے علوم شرعیہ کے ساتھ اس کو خاص کیا ہے اور اس کے علاوہ فلسفہ وغیرہ کی تعلیم کے بارے میں صراحت کر دری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”والا لا تجب“ (کذا فی الوجیز)۔

لیکن میرے نزدیک یہ تفریق صحیح نہیں ہے بلکہ جس طرح علوم شرعیہ کے حصول میں مشغول طلبہ کو عاجز جان کر ان کا نفقہ والد کے اوپر لازم قرار دیا گیا ہے دوسرے علوم کے حصول کی صورت میں بھی والد کی ذمہ داری ہے کہ نفقہ فراہم کرے، کیونکہ کسب علم میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ عاجز کی طرح ہے۔

”ولا يجب على الاب نفقة الذكور الكبار الا ان يكون الولد عاجزا عن الكسب لزمانة أو مرض ومن يقدر على العمل لكن لا يحسن العمل فهو بمنزلة العاجز كذا في فتاوى قاضي خا“ (الہندیہ ۱،۵۶۳)۔

البتہ اگر والد صاحب استطاعت کے باوجود پڑھانا نہیں چاہتے، اور طالب علم اپنی اہلیت کی بنیاد پر آگے پڑھنا چاہتا ہے تو اس حالت میں لڑکے کی استطاعت ہی معتبر ہوگی اور ضرورتاً اس کے لئے تعلیمی قرض لینا درست ہوگا، والد پر اعلیٰ تعلیم کے لئے مستطیع ہونے کے باوجود جبر نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود تعلیم میں پیسہ نہ لگانا چاہتے ہوں تو ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ جو رقم ان کی بینک میں جمع ہے اس پر جو انٹرسٹ مل رہا ہے اس سے وہ تعلیمی قرض کے سود کی ادائیگی کریں، حالانکہ استطاعت کی صورت میں قرض کا جواز محل نظر ہے۔





## بینکوں کے تعلیمی قرض کا حکم

مولانا سید اسرار الحق صاحب مدظلہ

تعلیم کی اہمیت ہر زمانہ میں مسلمہ رہی ہے، آج کے دور میں تعلیم قوموں کے لئے ایک ہتھیار سے کم نہیں ہے، اقوام کو زیر دست اور ان کے استحصال کے لئے جدید تعلیم اور اعلیٰ تکنالوجی سے کام لیا جا رہا ہے، ایسے حالات میں امت مسلمہ کا دوسری قوموں کے مقابلہ جدید اعلیٰ تعلیم اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانا تباہ کن اور بہت سے مسائل کا سبب بن گیا ہے، اس لئے امت مسلمہ میں جدید اعلیٰ تعلیم کی حوصلہ افزائی اور تعاون ضروری ہے، اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ایسی مرکزی فنڈ قائم کرنے کی ضرورت ہے کہ جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ کو بلا سودی تعلیمی قرض فراہم کیا جاسکے، لیکن ابھی تک ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسا مرکزی فنڈ قائم کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے، اور نیز اب تک ہندوستان میں بلا سودی بینک کاری نظام مروج نہیں ہوا ہے، اس لئے موجودہ صورت حال میں بینکوں خصوصاً سرکاری بینکوں سے تعلیمی قرض لینے کے بارے میں علماء و ارباب افتاء کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

### ۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم اور شرعی نقطہ نظر:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وقل رب زدنی علماً" (طہ: ۱۱۴) (اور آپ یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! میرا علم بڑھا دیجئے)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فهو أحق بہا" (رواہ الترمذی وابن ماجہ، مشکا: ۱۰۳۳) (حکمت کی بات مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے، اسے جہاں مل جائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے)۔

حدیث میں "حکمت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے جدید تعلیم بھی مراد لینے کی گنجائش ہے۔

ایک روایت میں ہے: "منہومان لا یشبعاں: منہوم فی العلم لا یشبعا منہ ومنہوم فی الدنیا لا یشبعا منہا" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مشکا: ۱۰۳۴)۔ (دو حریص کبھی آسودہ نہیں ہوتے، ایک علم کا حریص جو علم سے آسودہ نہیں ہوتا اور دوسرا دنیا کا حریص، وہ دنیا داری سے آسودہ نہیں ہوتا ہے)۔

اسلام میں علم دین اور علم دنیا کی تفریق نہیں کی گئی ہے، بلکہ علم نافع اور علم غیر نافع کی تحدید کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے علم نافع کی دعا فرمائی ہے، اور علم غیر نافع سے پناہ مانگی ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پیش تر عصری علوم اپنی اصل کے لحاظ سے علم نافع ہیں، البتہ قرض، نائک اور سنگیت وغیرہ کی تعلیم علم غیر نافع ہے، جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے، مسلمانوں کو اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کرنی چاہئے۔

### ۲۔ سود یا سروس چارج؟

عام طور پر قومیائے ہوئے بینک (Nationalised Bank) تعلیمی قرض پر دس تا بارہ یا چودہ فیصد سود حاصل کرتے ہیں، اور کرنٹ اکاؤنٹ کھاتہ داروں اور سیف لاکر سے استفادہ کرنے والوں سے آدھائی صد سروس چارج کے نام پر وصول کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے تعلیمی قرض پر عائد ہونے والے دس تا بارہ یا چودہ فیصد شرح سود کو کسی صورت میں سروس چارج شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ حقیقت میں سود (ربا) ہی ہے۔

### ۳۔ تعلیمی قرض اسکیم سے استفادہ:

کوئی نوجوان اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہو اور وہ ملک یا بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند ہو، لیکن اس کے معاشی حالات اس کے تعلیمی

اخراجات برداشت کرنے کا متحمل نہ ہو، اور اس کا لرشپ یا بلا سودی لون اس کا لرشپ سے اس کے تعلیمی اخراجات پورے نہ ہوتے ہوں تو اس کے لیے حکومت کے زیر انتظام قومیائے ہوئے بینک کے کم سود پر مبنی تعلیمی قرض اسکیم سے استفادہ کی گنجائش ہوگی، علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ”فی القنیة والبیغیة یجوز للمحتاج الإیستقراض بالربح“ (الاشیاء والنظائر: ۱۱۵، البحر الرائق: ۲۱۰۱۲۷)۔ (قنیة اور بیغیہ میں ہے کہ محتاج شخص کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے)۔

۳۔ طالب علم کے والد کا اعتبار:

اگر خود طالب علم میں اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کی صلاحیت نہ ہو لیکن اس کے والد میں صلاحیت ہو تو والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے بھی صاحب استطاعت سمجھا جائے گا، کیونکہ والد کے ذمہ اولاد کا نفقہ اور تعلیم و تربیت واجب ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں: ”وکذا تجب لولده الکبیر العاجز عن الکسب کأنشی مطلقاً وزمن، ومن یلحقه العار بالتکسب، وطالب علم لا یتفرغ لذلك کذا فی الزیلعی والعینی، وأفتی أبو حامد بعدمها لطلبه زماناً کما بسطه فی القنیة“ (الدر المختار علی الرذ: ۵۰۲۷-۲۷۱)۔

(اسی طرح اپنی بڑی اولاد کے لیے جو کمانے سے عاجز ہو، نفقہ واجب ہے، جیسا کہ مؤنث اولاد کے لیے مطلقاً نفقہ واجب ہے، اور پانچ اولاد کے لیے بھی اور جس کو کمانے میں شرم محسوس ہو، اور طالب علم جو کمانے کے لیے وقت نہ نکال سکے، جیسا کہ زیلعی اور عینی نے لکھا ہے اور ابو حامد نے اپنے زمانہ کے طالب علموں کے لیے عدم نفقہ کا فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ ”قنیة“ میں انہوں نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے)۔

اس کے ذیل میں علامہ ابن عابدین شامی وضاحت کرتے ہیں: ”قال صاحب القنیة: لکن بعد الفتنه العامه: یعنی فتنه التاتار التي ذهب بها اکثر العلماء والمتعلمین نری المشتغلین بالفقه والأدب الذین هما قواعد الدین وأصول کلام العرب یمنعهم الأشغال بالکسب من التحصیل ویؤدی إلى ضیاع العلم والتعطیل، فكان المختار الآن قول السلف، وبفوات البعض لا تمنع الوجوب کالأولاد والأقارب اه ملخصاً وأقره فی البحر“ (رد المختار: ۵۰۲۷)۔

(صاحب ”قنیة“ کہتے ہیں: لیکن فتنہ عامہ یعنی فتنہ تاتار کے بعد جب کہ اکثر علماء اور طلبہ ختم ہو گئے، ہم فقہ وادب، جو دین کی بنیاد اور کلام عرب کی اصل ہیں، میں مشغول رہنے والے طلبہ کے لیے کمائی میں مشغول ہونا ان کو تحصیل علم میں مانع ہے اور علم کا نقصان ہے تو اب سلف کے قول کو اختیار کیا جائے گا، اور بعض لوگوں کے کہنے پر وجوب ساقط نہیں ہوگا، جیسا کہ اولاد اور قریبی رشتہ دار کا حکم ہے، اور ”بجر“ میں اسی کو برقرار رکھا گیا ہے)۔

۵۔ طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہو:

اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے لیے نقد رقم نہ لگا کر قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو یہ ان کے لیے جائز نہیں ہوگا، کیونکہ صرف مجبوری کی بنا پر سودی قرض لینے کی اجازت ہے، اور بغیر مجبوری سود لینا اور دینا دونوں ناجائز اور سخت گناہ ہے۔

”عن جابر بن عبد الله عن النبي ﷺ، قال: ”لعن الله آكل الربا، وموكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء“ (مسلم: ۲۰۲۷)۔ (سیدنا جابر بن عبد اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہان پر اللہ کی لعنت ہے، اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں)۔

جوابات کا خلاصہ:

- ۱۔ شریعت میں مطلق علم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، اس لیے مسلمانوں کو جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے اور اس بارے میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا چاہئے۔
- ۲۔ تعلیمی قرض پر عائد ہونے والے کم شرح سود کو سودی شمار کیا جائے گا، اس کو سروس چارج پر محمول نہیں کیا جائے گا۔
- ۳۔ معاشی طور پر کم زور طالب علم کے لیے مجبوراً تعلیمی قرض اسکیم سے استفادہ کی گنجائش ہوگی۔
- ۴۔ والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے طالب علم کو بھی صاحب استطاعت سمجھا جائے گا۔
- ۵۔ استطاعت کے باوجود قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔ ☆☆☆

## تعلیمی قرض

مولانا خورشید انور اعظمی صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم، بنارس۔

آج ہر طرف تعلیم کا شور ہے، بالخصوص عصری تعلیم کے حصول کے لئے معاشرے کا ہر فرد پورے طور پر سنجیدہ ہے، اور اپنے بچوں کو اس سے آراستہ کرنے کے لئے بہر صورت تیار ہے، لیکن یہ تعلیم اس درجہ مشکل اور گراں ہو چکی ہے کہ عام آدمی اس کے اخراجات کا تحمل نہیں کر پاتا، اور اس کی تمنا دل ہی دل میں سک کے رہ جاتی ہے، حکومت کم شرح سود پر تعلیمی قرض اسکیم چلا کر ایسے لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہے، تاکہ جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش و صلاحیت رکھنے والے وہ افراد جو اقتصادی اعتبار سے کمزور خستہ حال ہیں، تعلیم کے میدان میں آگے بڑھ سکیں، یہ اسکیم بظاہر بہت پرکشش، نفع بخش اور مفید ہے، مگر اس میں سود کی آمیزش کے سبب از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے۔

”استقرض رسول اللہ ﷺ سنا فأعطى سنا خيرا منه وقال خياركم أحسنكم قضاء“ (سنن ترمذی ۱۰۲۲۵)، لیکن جب قرض سے سود بڑھا جاتا ہے تو وہ حرام ہو جاتا ہے، شامی میں ہے: ”كل قرض جر نفعاً فهو ربا أي إذا كان مشروطاً“ (۷۰۵۵)۔

اس وجہ سے کہ سود نفع قطعی سے حرام ہے، ارشاد باری ہے: ”أحل الله البيع و حرّم الربوا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

نیز نبی اکرم ﷺ نے سودی معاملے سے جڑے ہوئے تمام افراد پر لعنت فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ:

”لعن رسول الله ﷺ أهل الربوا وموكله وشاهديه وكاتبه“ (سنن ترمذی ۱۰۲۲۹)۔

اس لئے جتنی بھی سودی اسکیمیں رائج ہیں ان سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص صاحب ضرورت ہو کہ اس کے پاس کسی طرح کا ذریعہ معاش نہ ہو یا صاحب حاجت ہو کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہو پاتی ہوں اور بے حد مشقت و پریشانی میں مبتلا ہو تو اضطراری صورت میں فقہاء کرام نے سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، الاشاہد والنظار میں ہے: ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (ص ۱۱۵)۔

لیکن عام حالات میں صرف اسباب راحت و آرام میں اضافے اور دنیا کی چمک دکھ کر اپنے معیار زندگی کو بڑھانے کی غرض سے سودی قرض لینے کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی، جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی مرتبہ ضرورت و حاجت تک نہیں پہنچتا کہ اس کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت دی جائے۔

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم شریعت کی نگاہ میں:

یہ سچ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جس تعلیم کے حصول کو فرض قرار دیا ہے، وہ دینی تعلیم ہے، لیکن اگر کوئی شخص دوسرے کسی ایسے علم کو سیکھنا چاہتا ہے جو اصول شریعت سے متصادم نہ ہو تو شرعی حدود کا پاس دلناظر کرتے ہوئے اس کی اجازت ہوگی، امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”احیاء علوم الدین“ میں علوم کی تقسیم کی ہے، اور بعض غیر شرعی علوم کو محمود و مباح بتایا ہے اور بعض کو مذموم پھر محمود علم میں بعض کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور بعض کو فضیلت تحریر فرماتے ہیں:

”العلوم تنقسم إلى شرعية وغير شرعية وأعني بالشرعية ما استفيد من الأنبياء صلوات الله عليهم وسلامه ولا يرشد العقل إليه مثل الحساب، ولا التجربة مثل الطب، ولا سماع مثل اللغة، والعلوم التي ليست بشرعية تنقسم إلى ما هو محمود وإلى ما هو مذموم وإلى ما هو مباح فالمحمود ما ترتبط به مصالح أمور الدنيا كالطب والحساب وذلك ينقسم إلى ما هو فرض كفاية وإلى ما هو فضيلة وليس فريضة“ (اتحاف السادة المتقين بشرح آحياء علوم الدين ص ۱۲۳)۔

مذکورہ تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم اگر محمود و مباح ہو تو اسلامی اصول و آداب کی رعایت کرتے ہوئے اس کا حصول جائز ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں فرض کفایہ ہوگا، اور سقوط فرض کے لئے شہر کے کم از کم ایک آدمی کا اس علم سے بہرہ مند ہونا لازم ہوگا، جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرض کفایہ علوم کی وضاحت کی ہے (اتحاف السادة المتقين بشرح آحياء علوم الدين ص ۱۲۳)۔

ایسی صورت حال میں مسلمانوں کو حدود شرع کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے، اور اپنے بچوں کو

حتی الوبح اس سے بہرہ یاب ہونے کا موقع فراہم کرنا چاہئے۔

## ۲۔ کم شرح سود پر تعلیمی قرض:

لیکن کوئی شخص جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے سودی قرض لیتا ہے تو اس کا لینا شرعاً ناجائز ہوگا، خواہ اس کی شرح سود اور مدت ادائیگی کم ہو یا زیادہ اسی طرح کم شرح سود کو سروس چارج کہنا بھی درست نہیں ہوگا، اس وجہ سے کہ قرض میں کچھ بھی مشروط ہو جانے کے بعد سود ہو جاتا ہے، جو حرام ہے، شامی میں ہے:

”کل قرض جبر نفعاً فهو ربا أي إذا كان مشروطاً“ (۷، ۲۵۵)۔

اسی طرح علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں تحریر فرمایا ہے: ”کل قرض شرط فیہ أن یزید فهو حرام بلا خلاف“ (۴، ۳۶)۔

البتہ اگر اس رقم کو سروس چارج یا فارم کی قیمت کے نام پر پہلے ہی وصول کر لی جائے تو درست ہوگا۔

## ۳۔ معاشی تنگی کے سبب تعلیمی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا:

اگر کوئی شخص علمی اعتبار سے صاحب اہلیت و صلاحیت ہے اور اس کی دلی خواہش ہے کہ اندرون ملک یا بیرون ملک کسی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر جدید اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہو، لیکن اس کی معاشی تنگی آڑے آتی ہے اور اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس سلسلے کے جملہ اخراجات کا تحمل کر سکے، تب بھی ایسی صورت میں اس کے لئے سود پر مبنی تعلیمی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا ناجائز نہیں ہوگا، اس وجہ سے کہ فقہاء نے سودی قرض لینے کی اجازت صرف ضرورت و حاجت شدید کی بنا پر دی ہے، اور بس الاشبہ والنظائر میں ہے: ”یحوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (ص ۱۱۵)۔

اسی طرح حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون سی ضرورت ہے، جس میں سودی قرض لینا جائز ہے تو آپ نے جواب دیا کہ: ناقابل برداشت مجبوری کے وقت سود لینے سے گناہ نہ ہونے کی توقع ہے، ہکذا اسائر المحرمات (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۷۹۷)۔

ظاہر ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم ضرورت و حاجت کے زمرے میں نہیں آتی کہ اس کی بنا پر سودی قرض لینے کو جائز قرار دیا جائے، البتہ قوم کے اصحاب ثروت کو چاہئے کہ ایسے ذہین و فطین اور علم و فن کے شوقین طلبہ کی کفالت کریں اور جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ہر ممکن تعاون کریں، اور ایسا کوئی مستقل نظام بنائیں کہ قوم کے ہونہار بچے عصری علوم کے میدان میں بھی اپنی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں اور ملک و ملت کے لئے بہر صورت مفید ثابت ہو سکیں۔

## ۴۔ باپ کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں بیٹے کا تعلیمی قرض لینا:

اگر بیٹا نابالغ ہو اور اس کا باپ مالدار تو بیٹے کو بھی مالدار تصور کیا جاتا ہے، لیکن اگر بیٹا بالغ ہو تو باپ کے مالدار ہونے سے اس کو مالدار نہیں مانا جاتا، جیسا کہ علامہ کاسانی نے ”بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع“ میں ادائیگی زکوٰۃ کے تعلق سے اس کی صراحت فرمائی ہے (بدائع الصنائع ۷۲/۴)۔

مذکورہ بالا تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بالغ بیٹے کو صاحب استطاعت نہیں مانا جائے گا۔

اسی طرح تعلیمی قرض لینے کے سلسلے میں بیٹے کے صاحب استطاعت ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس وجہ سے کہ عدم استطاعت کی صورت میں بھی وہ اس درجہ مجبور نہیں ہے کہ اسے سودی قرض لینے کی اجازت دی جائے، کیونکہ اگر بالغ لڑکا کمائی کرنے سے عاجز ہو تو باپ پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اور فقہاء کرام نے اسی زمرے میں ایسے طالب علم کو بھی شامل کیا ہے جو کسب معاش کے لئے فارغ نہ ہو سکے، شامی میں ہے:

”وطالب علم لا یتفرغ لذلك یعنی الکسب“ (شامی ۵، ۲۳۱)۔

جب طالب علم بیٹے کے خورد و نوش، لباس و پوشاک اور رہائش کی ذمہ داری باپ کے سر کر دی گئی تو وہ ایسا محتاج نہیں رہا کہ سود پر مبنی کسی اسکیم سے نفع اٹھانے کا مجاز ہو، رہی جدید اعلیٰ تعلیم کے بھاری بھر کم اخراجات کی ذمہ داری، تو یہ باپ پر نہیں ہوگی۔

## ۵۔ صاحب استطاعت کے لئے تعلیمی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا:

اگر کوئی طالب علم یا اس کے والد صاحب استطاعت ہوں اور اپنے پیسے کو تعلیم میں لگانے کے بجائے تعلیمی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو یہ جائز نہیں ہوگا، اس وجہ سے کہ یہ سودی معاملہ ہے جو نفع قطعی سے حرام ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وابستہ تمام افراد پر لعنت فرمائی ہے۔

## تعلیمی قرض کے سلسلہ میں شریعت کا موقف

مولانا خورشید احمد اعظمی

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کا تہذیبی ارتقاء، فکر کی بلندی، اور تمدن کی بالیدگی و پاکیزگی اس کی تعلیم پر منحصر ہے، جس قوم میں علم کے حصول اور اس کی نشر و اشاعت پر جتنی زیادہ توجہ مرکوز ہوگی، اس کے افرادات اتنا ہی زیادہ مہذب اور شائستہ ہوں گے، اور ان میں باہم ایک دوسرے کی قدر و منزلت کا ماحول ہوگا، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ علم کو خیر خواہی، نفع رسانی، اور صحیح غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہو۔

مگر جب کسی علم کو محض دنیا داری اور تاجرانہ ذہنیت کے پیش نظر حاصل کیا گیا ہو، اور غرض حصول جاہ و زر ہو تو پھر اس کے اہل میں ظاہری وجاہت، اور خیرہ کن شکل و صورت تو ضرور ہوگی، مگر حقیقی تہذیب و تمدن اور فکری ارتقاء کا فقدان ہوگا، ان میں بظاہر تو ایک دوسرے کی عزت ہوگی مگر باطن میں حسد اور نفرت کا جذبہ ہوگا، ترغ و ترغ اور استکبار کا غلبہ ہوگا، تہذیب کا مطلب صرف خوبصورت بنگلہ، کار اور ظاہری ٹپ ٹاپ نہیں ہے بلکہ اصل تہذیب، باہمی اخوت و محبت، انسانیت کی قدر اور خیر خواہی ہے۔

ہمارے موجودہ معاشرہ میں جو افراد اہل علم اور باعزت سمجھے جاتے ہیں، مثلاً پروفیسر و معلمین، ڈاکٹر، وکیل یا تاجر حضرات، جو اپنے علوم کے ذریعہ ملک و ملت اور انسانیت کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں، انسان کے دکھ درد کو محسوس کر سکتے ہیں، اور قوم کی ترقی کا ذریعہ بن سکتے ہیں، ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنے علم کو محض حصول زر اور عوام کی جیبیں خالی کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے، ان کی اس خالص تاجرانہ ذہنیت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ انہوں نے علم کا حصول اسی غرض سے کیا ہے، اور اس علم کو بھاری رشوت اور لمبی فیس دے کر حاصل کیا ہے، جو اکثر قرض لے کر ادا کی گئی ہوتی ہیں، ظاہر ہے وہ رقم انہیں وصول کرنی ہے، اور کئی چند وصول کرنی ہے، قرض کے حصول اور اس کی بھری پائی کے لئے جن دشوار گزار مصائب سے وہ گزر رہے ہیں اس کے اثرات ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتے اور پیسے کی محبت ان کے نفس میں کوٹ کوٹ کر بھر چکی ہوتی ہے۔

جبکہ اسلام نے علم کی ترغیب کے ساتھ اس بات سے روکا ہے کہ اسے دنیا حاصل کرنے کا مقصد بنایا جائے، دین کی بنیادی ضروریات سے متعلق علم حاصل کرنے کے بعد کسی بھی اعلیٰ تعلیم خواہ علوم شرعیہ ہوں یا عصریہ، اسلام میں اس کی ممانعت نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”ومن سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له به طريقا إلى الجنة“ (مشکاۃ ص ۲۲ بحوالہ صحیح مسلم)۔

(جو شخص کوئی راستہ چلے جس میں وہ علم حاصل کر رہا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی وجہ سے جنت کی جانب راستہ آسان کر دیتے ہیں)، مگر حصول علم کی نیت کا صحیح ہونا ضروری ہے، اس کے بارے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”من تعلم علما مما يبتغى به وجه الله لا يتعلمه إلا ليصيب به عرضا من الدنيا لم يجد عرف الجنة يوم القيامة یعنی ریحھا“ (سنن ابوداؤد ۲۴۲۲)۔

(جو شخص کوئی علم حاصل کرے ایسے علوم میں سے جن سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے، نہیں حاصل کرتا ہے اس کو مگر اس لئے کہ اس کے ذریعہ دنیا کا کوئی سامان حاصل کرے تو نہیں پائے گا جنت کی خوشبو کو قیامت کے دن)۔

اور اکثر علوم ایسے ہیں کہ آدمی نیت صالح کے ساتھ ان کے ذریعہ خدمت خلق کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے، اور دنیا بھی حاصل ہو جائے گی۔

۱۔ اسلامی شریعت میں جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول مباح اور جائز ہے، بشرطیکہ ان کے حصول میں کسی حرام کار تکاب لازم نہ آئے، یا وہ علوم کسی ایسے امر سے متعلق نہ ہوں جن کی شریعت میں ممانعت آئی ہے، جیسے سحر، تصویر سازی (جاندار کی) رقص و سرور، گانا، بجانا وغیرہ۔

علوم عصریہ جدیدہ میں سے بیشتر کا تعلق انسان کی اصلاح معیشت اور اصلاح جسم سے ہے جو انسان کی ضروریات میں سے ہیں، احادیث میں کسب

۱۔ رگھوناتھ پورہ، منو (یوپی)۔

معیشت کی فضیلت وارد ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک کے اقوال میں سے ہے: ”لا یقعہ موقع الکسب علی العیال شیء ولا الجہاد فی سبیل اللہ“ (مقدمہ کتاب الزہد)۔

نیز اس لئے بھی علوم جدیدہ کی اجازت ہونی چاہئے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے ”وفی الہدایۃ (۴۰۸) من فصل الحداد أن الإباحة اصل“ (الأشیاء والنظائر ص ۹۷)۔

لہذا علوم جدیدہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کا رویہ مثبت ہونا چاہئے، بقدر ضرورت علوم دینیہ کے حصول کے بعد علوم عصریہ کے حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی شریعت میں سود حرام ہے ”وأحل اللہ البیع و حرّم الربوا“ (بقرہ: ۲۷۵) اور اس کے لینے دینے والے، کھانے کھلانے والے، لکھنے اور گواہی دینے والے پر لعنت کی گئی ہے (سنن ابوداؤد ۳۳/۲۳۴)۔ اور یہ سود خواہ قلیل شرح پر ہو یا کثیر، طویل مدت کے لئے ہو یا قصیر، بہر صورت حرام ہے، اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ سود لینے یا دینے کا مقصد کیا ہے، لہذا حصول علم کے لئے سودی قرض لینا خواہ سرکاری بینک سے ہو یا پرائیویٹ کسی ادارہ سے قلیل ہو یا کثیر جائز اور درست نہیں ہوگا۔

نیز قلیل شرح سود کو سروس چارج پر محمول کرنے سے بھی وہ جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ معاملہ مستقر اض سودی طے ہوا ہے۔

البتہ اگر قرض لیتے وقت معاملہ سود نہ ہو اور اصل رقم ہی واپس کرنی ہو تو سروس چارج کے طور پر کچھ رقم دینے میں حرج نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ بینک سے لین دین میں فارم اور دیگر امور کے اخراجات ہوتے ہیں، اور بہتر یہ ہوگا کہ یہ اجر خدمت قرض حاصل کرتے وقت ہی دے دیا جائے۔

۳۔ ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا خواہش مند ہے، یا بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کے اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، تب بھی اس کے لئے سودی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اور جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول، یا بیرون ملک تعلیم کا حصول ایسی ناگزیر ضرورت یا حاجت نہیں ہے کہ اس کے لئے کسی محظور یا حرام کو بقدر ضرورت بھی جائز کہا جائے۔

اس کی جائز صورت یہ ہے کہ مجلہ یا شہر کے اغنیاء اور اصحاب ثروت اپنا ایک امدادی ادارہ قائم کریں جس میں وہ حسب استطاعت رقم جمع کریں، اور اصحاب ضرورت کو بطور قرض حسب ضرورت رقم فراہم کریں، اور جب وہ واپس کرنے کے اہل ہو جائیں تو ان سے واپس لے لیں، معاشرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے باہمی تعاون ضروری ہے۔

۴۔ سودی قرض لینا جائز نہیں، خواہ طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل ہو یا نہ ہو، والد کے صاحب استطاعت ہونے سے اس کی بالغ اولاد صاحب استطاعت نہیں ہوتی، والد کے اوپر بالغ اولاد کا نفقہ اس صورت میں واجب ہے جبکہ لڑکا کسب سے عاجز یا معذور ہو، طالب علم کو بھی عاجز مانا گیا ہے، ”وطالب علم لا یتفرغ لذلك یعنی للكسب“ (در مختار ۵۰۲۳) لیکن فقہاء نے اس کو علوم دینیہ اور طالب علم کی رشد و صلاح کے ساتھ مقید کیا ہے، ”قال صاحب القنیۃ: لکن بعد الفتنة العامة... یعنی فتنة التتار التي ذهب بها أكثر العلماء والمتعلمین، نرى المشتغلین بالفقه والأدب الذین هما قواعد الدین و اصول کلام العرب یمنعهم الإشتغال بالكسب عن التحصیل ویؤدی إلى ضیاء العلم والتعطیل، فكان المختار الآن قول السلف... وقال ۳: وأقول الحق الذی تقبله الطبایع المستقیمة ولا تنفر منه الأذواق السلیمة القول بوجوبها لذی الرشد لا غیره“ (شامی ۵۰۲۳)۔

لہذا مسئلہ صورت میں طالب علم کے صاحب استطاعت نہ ہونے کے باوجود اس کے لئے سودی قرض لینا جائز نہ ہوگا، اور والد کے مستطیع ہونے سے طالب علم صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، علوم جدیدہ عصریہ کے لئے باپ کے اوپر تعلیمی نفقہ واجب نہیں۔

۵۔ سود کا لینا اور دینا حرام ہے، اور کسی بھی سودی معاملہ میں یا ایسا کوئی معاملہ جس سے سود کے تعامل پر تعاون لازم آئے حرام ہے، سود کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، اور اس کا ادنیٰ ترین شعبہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرنا۔

’عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ: الربوا سبعون جزءاً أیسرها أن ینکح الرجل أمه“ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲) لہذا طالب علم یا اس کے والد صاحب استطاعت ہوں مگر فی الحال اپنا پیسہ تعلیم میں لگانا نہیں چاہتے، تب بھی ان کے لئے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، اس لئے کہ اسکیم سودی ہے۔

☆☆☆

## تعلیم کے لئے بینکوں سے قرض حاصل کرنا

مولانا افتخار احمد مفتاحی ۷

۱۔ موجودہ حالات کے تناظر میں جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول وقت کی اہم ضرورت ہے تعلیم وہ بنیادی ضرورت ہے جس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے چاہے یہ جدید علوم کسی بھی زبان (انگریزی، ہندی) وغیرہ میں ہوں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ اس سے انسان کے اطوار شرعیہ و عقائد دینیہ میں خلل واقع نہ ہو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو زبان یہودی سیکھنے کی اجازت دی ہے، جامع ترمذی میں حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے: ”أمرني رسول الله ﷺ أن أتعلم السريانية، وفي رواية أمرني أن أتعلم كتاب يهود وقال: إني ما آمن يهود على كتاب قال فما مرني نصف شهر حتى تعلمته فكان إذا كتب الي يهود كتبت وان كتبوا اليه قرأت له كتابهم“ مزیدہ تعلیم جس سے اپنی اور اپنی قوم کی جان و مال کی حفاظت کے ساتھ حلال روزی حاصل کرنے میں مدد مل سکے بلاشبہ جائز اور کار خیر و موجب اجر و ثواب ہے، اس کی طرف لوگوں کو رغبت دلانی چاہئے کہ دینی تعلیم کو مقدم رکھیں، دینی تعلیم سے اعراض کر کے دنیوی تعلیم میں منہمک ہونا اچھا نہیں قرآن پاک میں ہے:

”بل توشرون الحياة الدنيا والآخرة خير وأبقى“ (سورہ اعلیٰ) (بلکہ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت اچھی اور سدا باقی رہنے والی ہے)۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ”طلب العلم فريضة على كل مسلم“ میں بھی دینی علوم ہی کی طرف اشارہ ہے۔

الحاصل مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو پہلے دینی علوم سے آراستہ و پیراستہ کریں اس کے بعد جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول میں بھی پوری لگن اور دلچسپی کا مظاہرہ کریں تاکہ یہ بچے حلال روزی کے ساتھ اپنی آنے والی نسل کے مستقبل کو تابناک بنا سکیں۔

۲۔ اسلامی نقطہ نظر سے سودی معاملہ اور سودی لین دین قطعاً حرام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”أحل الله البيع وحرم الربوا“ (اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا (سود) کو حرام کیا)۔

”يحق الله الربوا ويربى الصدقات“ (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔

بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فإن لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله“ (اگر سودی معاملہ سے باز نہ آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان سن لو)۔

احادیث میں بھی سودی لین دین پر بہت سخت وعیدیں آئی ہیں: ایک حدیث میں ہے: ”عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: اجتنبوا السبع الموبقات قالوا يا رسول الله: وما هن، قال، الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، واكل الربوا، واكل ما اليتيم، والتولي يوم الرجع، وقذف المحصنات المومنات الغافلات“۔

(حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون سی چیزیں ہیں؟ فرمایا: شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی کا قتل کرنا، سودی معاملہ کرنا، یتیم کا مال ناحق کھانا، جہاد سے بھاگنا، پاک دامن خواتین پر زنا کی تہمت لگانا)۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سودی لین دین کا رواج ہو جاتا ہے تو اللہ ان پر ضروریات زندگی کی گرانی مسلط کر دیتے ہیں اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جاتی ہے تو ان پر دشمنوں کا رعب و غلبہ چھا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ سودی معاملہ قطعاً حرام اس کا مرتکب سخت گنہگار، فاسق، باغی و سرکش ہے۔

۷ استاذ جامعہ مفتاح العلوم، شاہی کٹرہ، منو (پوپی)۔

اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ سودی معاملہ سے حتی الامکان بچتے رہیں اسی میں خیر ہے اور صرف سودی سے نہیں بلکہ جس میں سود کا شبہ ہو اس سے بھی اپنے آپ کو بچائیں۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں: "دعوا الربوا والربیة" (مشکوٰۃ) ربوا اور شبہ ربوا کو بھی چھوڑ دو، اس لئے اگر کہیں سے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو تو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت دی جائے گی، ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: "وفی القنیة والبغیة: یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"۔ ورنہ اصلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرض سے منع کیا جس کا مقصد نفع کمانا ہو جیسا کہ یہی نے سنن میں روایت کیا: "عن رسول اللہ ﷺ أنه نهی عن قرض جر نفعاً"۔

مذکورہ بالا باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سود کے معاملہ میں ہماری شریعت میں بہت سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے، اس لئے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں آنے والے اخراجات کے لئے اپنی ذاتی جدوجہد، محنت و کاوش کو زیادہ سے زیادہ عمل میں لائیں اور اگر اس سے کام نہ چل سکتا ہو تو اعزہ و اقارب اور قوم کے ذمی ثروت لوگوں سے غیر سودی، غیر مشتہر قرض حاصل کریں اور انہیں اس بات سے واقف کرائیں کہ قرض دینے کا ثواب صدقہ و ہدیہ سے کم نہیں ہے۔

اگر اس میں بھی ناکامی کا سامنا ہو تو چونکہ ہماری شریعت میں حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام کی سختی کو نرم کرنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے چنانچہ فقہ کے اصول میں ایک یہ بھی ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" اور "المشقة تجلب التیسیر"۔

مذکورہ بالا قاعدہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں سود کے مسئلہ میں احکام شریعت کے اندر کس حد تک تخفیف کی جاسکتی ہے۔ سودی قرض لینے کے لئے کوئی سخت مجبوری درپیش ہو جس میں سود پر قرض لینے بغیر کوئی چارہ نہیں، جان یا عزت پر آفت آنے کا امکان ہو ایسی صورت میں ایک مجبور مسلمان کے لئے سود قرض بقدر ضرورت لینا جائز ہوگا، اور چونکہ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے اس لئے اس میں گنجائش کا پہلو نکالنے کی مناسب کوشش کی جاسکتی ہے۔

زیر بحث مسئلہ "سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے، نیز حکومت کا ادعا ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں تو کیا اس کم شرح سود کو سروس چارج اور اجرت خدمت پر محمول کیا جاسکتا ہے" میں جیسے اسلامی ترقیاتی بینک بنیادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے غیر سودی قرضے فراہم کرتا ہے اور قرض جاری کرنے پر جو دفتری مصارف آتے ہیں بینک سروس چارج کے نام سے ایک متعین رقم وصول کرتا ہے قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے کے لئے بینک کو متعدد تنخواہ دار ملازمین رکھنے پڑیں گے اور متعدد دوسرے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے، اس کے مد نظر قرض دینے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک قرض داروں سے بطور سروس چارج ان کو وصول کر سکتا ہے یہ جائز نہیں ہونا چاہئے بشرطیکہ یہ اجرت اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل کے برابر ہو اور دوسرے یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ بنا لیا گیا ہو، اس لئے اگر اس بات پر اطمینان ہو کہ حکومت اور ذمہ داران بینک اس قرض اسکیم سے نفع کمانا نہیں چاہتے تو سروس چارج پر محمول کر کے جواز کی راہ نکالی جاسکتی ہے۔

۳۔ موجودہ حالات کے تناظر میں یہ ضروری ہے کہ تعلیم کا ہر وہ شعبہ جس میں اپنے افراد کا رہنا خود ان کے اور مسلمانوں کے تحفظ اور تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہو اس تعلیم کے حصول کے لئے "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت حکومت کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہونی چاہئے۔

۴۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اخلاقاً ماں، باپ پر عائد ہے اور تعلیم و تربیت پر خرچ کرنا صدقہ و خیرات کرنے سے بہتر ہے، "لان یودب الرجل ولده خیر له من ان یتصدق بصاء"، یعنی آدمی کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

بچے کو تعلیم دلانا ماں، باپ کے فرائض میں داخل ہے، اس کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے خواہ اس کی تعلیم کے لئے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ برداشت کرنی پڑے اور کتنی ہی رقم کیوں نہ خرچ کرنی پڑے، اس لئے اگر ماں، باپ صاحب استطاعت ہیں تو انہیں پر یہ بوجھ ڈالنا چاہئے اور سرکاری ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دینی چاہئے جس میں ربا کا شائبہ ہو اور اگر ماں باپ کسی طرح آمادہ نہ ہوں تو چونکہ لڑکے کے مستقبل کا بننا، سنورنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے اور قرض کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے تو باپ کے صاحب استطاعت ہونے کے باوجود ضرورت کے تحت اسے بقدر ضرورت اجازت دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بچہ صاحب استطاعت نہیں ہوگا۔

۵۔ چونکہ قرض اسکیم میں کچھ نہ کچھ ربا کا شائبہ موجود ہے اور طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہیں اس کے باوجود تعلیم میں اپنا پیسہ لگانا نہیں چاہتے تو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔ ☆☆☆



## تعلیم کے لئے قرض کا حصول

مولانا ریاض احمد قاسمی علیہ السلام

۱۔ اس سوال کے دو جز ہیں، ذیل میں دونوں کا نمبر وار جواب لکھا جا رہا ہے:

الف۔ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول فی نفسہ، شرعی نقطہ نظر سے نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے اور اگر خدمت خلق یا غلبہ اسلام کی نیت بھی شامل ہو تو ثواب بھی ملے گا۔ چنانچہ اس سلسلے کی چند آیات و احادیث ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:

۱۔ ”وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ (البقرہ: ۳۱)۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ رشید رضا مصری صاحب فرماتے ہیں: ”أودع في نفسه علم جميع الأشياء من غير تحديد ولا تعيين“ (المنار ۱: ۱۲۲)۔

مولانا شہاب الدین ندوی صاحب نے اس آیت کو سامنے رکھ کر ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے، جس کا نام ہے ”بین علم آدم والعلم الحديث“، اس کتاب میں انہوں نے مختلف حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو ”علم الأسماء“ دیا گیا ہے، وہ وہی علم ہے جو آج ان کی اولاد میں ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے، اور یہی وہ علم ہے جس کی بنا پر انسان ”خلافت ارضی“ کا مستحق ہوا ہے۔

۲۔ جناب طالوت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وزاده بسطة في العلم والجسم“ (بقرہ: ۲۴۷) ”وقال في تفسير

المنار: السعة في العلم الذي يكون به التدبير“ (المنار ۲: ۴۷۷)۔

ظاہر ہے حضرت طالوت کو جس علم کی وسعت دی گئی تھی، وہ دینی و شرعی علم نہ تھا کیونکہ وہ ان کے نبی شمول علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا، بلکہ وہ سیاسی و معاشی علم تھا، جس کی بنیاد پر قوم کی قیادت و سیادت ان کے سپرد کی گئی۔

۳۔ ”وَاتَيْنَا لِقْمَانَ الْحِكْمَةَ“ (لقمان: ۱۴)۔

حضرت لقمان نبی نہ تھے، بلکہ بڑے حکیم تھے، ان کو جو حکمت دی گئی تھی، وہ عام تھی، خدا کی معرفت اور دین کی جانکاری کے ساتھ، وہ اشیاء کے خواص اور ان کی خوبیوں و خرابیوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے، یہی دانائی ان کے لئے وجہ امتیاز بنی اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان کلام پاک میں ذکر فرمایا۔

۴۔ ”عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: الحكمة ضالة المؤمن، أينما وجدها، فهو أحق بها“ (مشکوٰۃ ۳: ۳۳) یعنی دانائی کی بات مومن کا گمشدہ سامان ہے، جہاں اسے پائے وہ (کہنے والے سے زیادہ) اس کا حقدار ہے، یہاں بھی ”الحکمتہ“ سے ”عام دانائی و جانکاری“ مراد ہے، جس پر ”أينما وجدها“ کا عموم شاہد ہے، لہذا حدیث کی رو سے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے حصول میں اوروں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے، کیونکہ وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔

۵۔ ”عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ: العلم ثلاثة: آية محكمة، أو سنة قائمة أو فريضة عادلة، وما كان سوى ذلك فهو فضل“ (مشکوٰۃ شریف ۳۵)۔

اس حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”علم دین“ کو تین شعبوں میں منحصر فرمایا ہے، جس کا حاصل: قرآن، حدیث اور فريضة عادلہ ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ان تینوں کے علاوہ جتنے علم کے شعبہ جات ہیں، وہ سب فضل ہیں، انسان ان کے حصول کا شرعاً پابند تو نہیں ہے،

۱۔ استاذ جامعہ رحمانی، خانقاہ مولگیر، بہار۔

البتہ اللہ خود جسے چاہتا ہے اپنے ”فضل“ سے نوازتا ہے: ”ذلت فضل اللہ یوتیہ من یشاء“ (الجمعة: ۳) اب ہمیں چاہئے کہ ہم اس فضل کو تلاش کریں، طلب کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر فضل چاہنے والے کو اپنے فضل سے نوازتا ہے ”یؤتی کل ذی فضل فضله“ (ہود: ۳)۔

مذکورہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم دین کا ہر مسلمان مکلف ہے اور بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنا مسلمان پر فرض ہے، اس کے بعد ہی ”عصری علوم“ کا نمبر آتا ہے، چنانچہ مشہور حدیث ہے: ”طلب العلم فریضة علی کل مسلم“ (مسلم شریف)، لہذا اگر کوئی مسلمان بقدر ضرورت دین کی تعلیم حاصل کئے بغیر ”عصری علوم“ کے حصول میں لگ جائے، تو یہ جائز نہ ہوگا، اسی طرح یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر جدید تعلیم کے حصول سے دین اور دیانت، یا ایمان و اخلاق متاثر ہونے لگیں، تو ایسی تعلیم کا حصول بھی جائز نہیں ہوگا۔

ب۔ سوال کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ اس کا جواب گذشتہ تفصیلات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے، اور جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور آئندہ نسل کو اس سے آراستہ کرنے کے لئے ہر جائز اقدام کرنا چاہئے، مسلم قوم پر من حیث القوم یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ جس طرح اپنی گاڑھی کمائی سے دینی مدارس کو چلا رہے ہیں اسی طرح پاکیزہ ماحول اور صاف شفاف نظام تعلیم پر مشتمل ایسے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کریں اور چلائیں جہاں مسلمان بچے ”عصری علوم“ حاصل کر سکیں۔

۲۔ اصل قرض سے زائد جو رقم بھی دی جائے وہ شرعاً سود ہی ہے، جسے قرآن مجید میں صراحتاً حرام قرار دیا گیا ہے، اس کو ”سروس چارج“ پر محمول کر کے جواز کی راہ نکالنا درست نہیں، ذیل میں اس کے چند دلائل ملاحظہ ہوں:

”بنو تغلب عرب نصاری، هم عمر بنو تغلب ان یضرب علیہم الجزیة، فأبوا وقالوا: نحن العرب لا نؤدی ما یؤدی العجم، ولكن خذنا ما یاخذ بعضکم من بعض، یعنون الصدقة فقال عمر: لاهذه فرض المسلمین، فقالوا فزدماشت بهذا الاسم، لا باسم الجزیة، ففعل وتراضی هو وهم علی ان یضعف علیہم الصدقة وفي بعض طرقه هی جزیة سموها ماشتم“ (فتح القدیر ۲۰۱: ۳)۔

غور کیا جائے: بنو تغلب کی مذکورہ تجویز پر حضرت عمرؓ نے اولاً صاف منع فرمایا کہ ہم اس کے اہل ہیں لیکن جب زیادہ اصرار کیا، بلکہ ”عمانیہ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی دشمنوں سے جاننے کا خیال ظاہر کیا تو حضرت عمرؓ نے ان کی تجویز کے مطابق زکوٰۃ سے دو گنی رقم صحابہ کرام کے مشورے سے ان پر واجب کر دی اور فرمایا کہ ہے تو یہ ”جزیہ“ ہی، البتہ تم اسے جو چاہو نام دو۔

معلوم ہوا کہ نام بدل دینے سے ”اشیاء کی حقیقت شرعی“ نہیں بدلتی۔ اسی طرح زیر بحث مسئلے میں بھی اصل قرض سے زائد جو رقم دی جا رہی ہے، اس کی حقیقت شرعاً سود ہے، بینک کے اس ادعا سے کہ ہمارا مقصد نفع کمانا نہیں، یا سود کا نام بدل کر اسے ”سروس چارج“ قرار دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔

۳۔ اگر مذکورہ صورت میں ”شرح سود“ کو سروس چارج قرار دے کر جائز کر دیا جائے تو پھر حرام کون سا سود ہوگا؟

یہ بات تو ہر ”سود“ پر صادق آئے گی کہ مالک سرمایہ جو اضافی رقم وصول کر رہا ہے، وہ اس کا سروس چارج ہے، پھر ”حرم الربوا“ کے تحت کیا باقی رہے گا؟ کیا ”اشیاء ستہ“ میں تفاضل والا ”ربوا“ جو ”ربوا“ کا اصل مصداق ہی نہیں، بلکہ اسے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”سد الذریعہ“ منع کیا تھا، اور نہ آج دنیا میں اس کا رواج ہے؟ سوال میں ایک لفظ آیا ہے ”کم شرح سود“ جس میں ”کم“ کی صراحت کر کے، غالباً اس کے سروس چارج ہونے کی طرف ذہن کو مائل کرنا مقصود ہے، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ عالمی سرمایہ جس تیزی سے سمٹ رہا ہے اور چند بڑے خزانوں میں جمع ہو رہا ہے (جس کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں) اس کے پیش نظر یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس سے بھی کم شرح سود پر ادارے سود دیا کریں گے، انسانیت کے بچے کھچے خون کو چوسنے اور اپنی تجوری کی خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے، تا آنکہ انسانیت شدیداً اقتصادی بحران کا شکار ہو جائے اور عالم پر ایک عمومی فساد طاری ہو جائے، تو کیا ہم سوہم ترقی کی لالچ میں ”کم سے کم شرح سود“ کو سروس چارج پر محمول کرتے جائیں گے؟

۳۔ یہاں یہ اصول قابل ذکر ہے کہ کسی بھی حرام چیز کی گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے، تو وہ صرف ”ضرورت یا حاجت“ کی حالت میں پیدا کی جاسکتی ہے، قرآن مجید نے حرام چیزوں کو بیان کرنے کے بعد ”إلا ما اضطررتمہ“ کا استثناء کر کے اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے، جس کی بنا پر فقہاء

نے ”الضرورات تبيح المحظورات“ اور ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة“ کا اصول مقرر فرمایا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ”تعلیمی قرض“ قوم یا فرد کی ضرورت یا حاجت کے دائرے میں آتا ہے، جس کی وجہ سے سود کی اجازت دی جاسکے؟ ذیل میں اس کا مختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ضرورت مند، یا حاجت مند کے لئے فقہاء نے ”الاستقراض بالربح“ کی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم نے اپنی کتاب ”الاشباه والنظائر“ میں فرماتے ہیں: ”وفي القنية والبغية: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (۱۲۹) ”استقراض بالربح“ کے معنی ہیں ”سود پر قرض لینا“، مذکورہ تعلیمی قرض بھی ”استقراض بالربح“ کے دائرے میں آتا ہے، لہذا اس کے جواز کے لئے اب یہ دیکھنا ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان اس قرض کا محتاج ہے یا نہیں؟ اس کے لئے ہمیں پہلے ”ضرورت اور حاجت“ کی تعریف پر غور کرنا چاہئے! چنانچہ علامہ سیوطی ”ضرورت کی تعریف ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

”بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع، هلك، أو قارب، وهذا يبيح تناول المحظور“ (الاشباه والنظائر: ۸۵) یعنی ”ضرورت“ مجبوری کی اس حالت کا نام ہے، جس میں انسان اگر ممنوع کا ارتکاب نہ کرے، تو یقیناً یا غالب گمان ہو کہ وہ مر جائے گا، یا مرنے کے قریب ہو جائے گا، اس کا حکم یہ ہے کہ اس حالت میں بقدر ضرورت ”حرام“ کے ارتکاب کی گنجائش ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمان تعلیمی قرض کے معاملے میں اس حالت کو نہیں پہنچتا ہے، نہ من حیث الفرد نہ من حیث القوم۔

”والحاجة: كالجائع الذي لو لم يجد ما يأكله، لم يهلك، غير أنه يكوّن في جهده ومشقة، وهذا لا يبيح الحرام، ويبيح الفطر في الصوم“ (حوالہ سابق) یعنی حاجت تنگی کی اس حالت کا نام ہے، جس میں انسان اگر ممنوع کا ارتکاب نہ کرے، تو یقیناً یا غالب گمان ہے کہ وہ نہ مرنے کے قریب ہوگا، مگر سخت تکلیف اور مشقت میں ضرور پڑ جائے گا۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس حالت میں حرام کے ارتکاب کی گنجائش نہیں ہوتی، البتہ سہولیات اور آسانیاں اس کے لئے فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس تعریف کی رو سے ہندوستانی مسلمان تعلیمی قرض کے معاملے میں حاجت کے درجے تک بھی نہیں پہنچتا، کیونکہ جدید اعلیٰ تعلیم سے عاری مسلمانوں کی ایک جماعت تدریس، تجارت، زراعت وغیرہ دوسرے ذرائع سے خوشحال اور باعزت زندگی گزار رہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے سود پر تعلیمی قرض اگر نہ لیا جائے، تو اس سے کوئی تنگی یا مشقت لازم نہیں آئے گی، خصوصاً جبکہ دوسرے جائز طریقوں سے تعلیم جاری رکھی جاسکتی ہو، مثلاً جب کوئی باصلاحیت طالب علم اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہے، تو بعض کمپنیاں اس کے اخراجات کی کفالت کرتی ہیں، اس معاہدے کے تحت کہ فراغت کے بعد کمپنی کے لئے کام کریں گے، بعض دفعہ تعلیمی اخراجات کی کفالت خود سرکار بھی کرتی ہے، اس طرح کی مزید صورتوں کا بیان آگے آ رہا ہے، لہذا سود پر تعلیمی قرض لینا تو جائز نہیں ہوگا، البتہ جدید اعلیٰ تعلیم مسلمانوں کے لئے ”منفعت“ کا درجہ ضرور رکھتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر اسے حاصل کیا جائے، تو معاشی تقویت ملے گی، معیار زندگی بلند ہوگا، اور حاصل نہ کیا جائے، تو کوئی خاص تنگی یا دشواری نہیں ہوگی، چنانچہ علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

”والمنفعة كالذي يشتهي خبز البر. ولحم الغنم، والطعام الدسم“ (حوالہ سابق)۔

حضرت مفتی شفیع صاحب نے اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ: اگر جائز طریقے سے وہ حاصل ہو سکے، تو حاصل کرے، ورنہ صبر سے کام کرے (جواہر

الفقہ ۲۸/۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ”جدید اعلیٰ تعلیم“ مسلمان بے شک حاصل کریں، مگر جائز طریقوں سے، مثلاً اس کے لئے وہ خود تعاون باہمی کا طریقہ اپنائیں اور اس طرح کے امدادی ادارے قائم کئے جائیں، نیز حکومت سے بلاسودی قرض کا مطالبہ کیا جائے، وظائف کی تعداد اور مقدار میں اضافہ کرایا جائے، مرکزی وقف کونسل اور ریاستی وقف بورڈ کو ایماندار اور فعال بنانے کی تحریک چلائی جائے اور اس کی آمدنی کا معتد بہ حصہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرایا جائے، یہ وہ جائز طریقے ہیں، جن سے ”جدید اعلیٰ تعلیم“ کی منفعت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں سوال ۳ کے جواب کا متن یہ ہوگا:

مذکورہ صورت میں چونکہ ضرورت یا حاجت متحقق نہیں ہے، اس لئے مذکورہ طالب علم کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، جس میں سود ادا کرنا ضروری ہے۔

البتہ جائز طریقوں سے جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اس یقین کے ساتھ کہ ”ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء“ یہ اللہ کا فضل ہے،

جسے چاہے نوازے۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں جدید اعلیٰ تعلیم کے بغیر اسلام کا غلبہ اور مسلمانوں کی ترقی نہیں ہو سکتی اور ان کی بے بسی اور مظلومی دور نہیں کی جاسکتی، اس لئے جدید اعلیٰ تعلیم ایک ضرورت اور حاجت ہے، جس کے نہ ہونے کی وجہ سے آج مسلمان بین الاقوامی سطح پر نفسیاتی مشقت اور ذلت کا شکار ہیں۔

لیکن یہ بڑی سطحی بات ہے، جو سرسری نظر میں بڑی گہری معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسلام کے غلبہ اور مسلمانوں کی ترقی کا اصل طریقہ وہی ہے، جو قرآن مجید نے بیان فرمادیا ہے اور جس پر عمل کر کے مسلمان اس دور میں بھی غالب رہ چکے ہیں، جب عصری اور عقلی علوم ایران اور روم کے پاس تھے، یا یونان کے پاس، لیکن مسلمانوں نے پوری دنیا پر اپنے ایمان، اخلاق اور اعمال کی ایسی دھاک بٹھادی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے، کامیابی ان کے قدم چومتی۔

۴۔ تیسرے سوال کے جواب میں جو تفصیلات عرض کی گئیں ہیں، ان کی روشنی میں مذکورہ طالب علم کے لئے بھی اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، چاہے باپ کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے اس کو صاحب استطاعت مانیں یا نہ مانیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ اس صورت میں والد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی دولت اولاد کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرے، اسے اس پر ثواب ملے گا۔

ب۔ رہا یہ مسئلہ کہ والد کے صاحب استطاعت ہونے سے اولاد صاحب استطاعت سمجھی جائے گی یا نہیں؟ تو اس کے جواب سے اصل مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ اس سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے، اس لئے ہم اس کا جواب بھی عرض کئے دیتے ہیں کہ: اس کا دار و مدار عرف پر ہے، یہ کوئی منصوص مسئلہ نہیں ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ نے کتاب الزکوٰۃ میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ مالدار کی نابالغ اولاد کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، ”لأنه یعد غنیا بیسار ایہ“ کہ وہ اپنے والد کے مالدار ہونے کی وجہ سے مالدار ہی سمجھی جاتی ہے، جبکہ اس کی نابالغ اولاد کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، ”لأنه لا یعد غنیا بیسار ایہ“ اس فرق کی بنیاد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ کے زمانے میں عرف یہی تھا، اس لئے یہ حکم بیان کیا گیا، لیکن ہمارے ہندوستان کا عرف یہ ہے کہ جب تک اولاد اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے اور شادی کر کے مستقل گھر نہ بسالے، اس وقت تک مالدار اور غربت میں باپ ہی کے تابع شمار کی جاتی ہے، اسی وجہ سے اس کی کفالت، اس کی تعلیم کا بندوبست، اور اس کی جیب خرچ وغیرہ کا انتظام والد ہی کے ذمہ رہتا ہے، لہذا مذکورہ مسئلے میں والد کے صاحب استطاعت ہونے سے طالب علم بھی صاحب استطاعت ہی سمجھا جائے گا اور اس کے لئے بدرجہ اولیٰ سود پر قرض لینا جائز نہیں ہوگا؟

۵۔ مذکورہ صورت میں بدرجہ اولیٰ اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ پہلے سوال کے جواب میں تعلیم کی اہمیت اور فضیلت پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام کی نظر میں تعلیم کا مقام کیا ہے؟ اس کے مقابلے میں اسلام مال کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس پر دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں، صرف ”إنما أموالکم وأولادکم فتنة“ کافی ہے، کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ ”المال غاد ورائح“ مال آنے جانے والی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حصول مقاصد کا ذریعہ بنا کر پیدا فرمایا ہے، اس لئے اکتنا مال کے مقابلے میں حصول علم کو ترجیح دی جائے گی اور اس مد میں اپنے مال کو خرچ کرنے کا حکم دیا جائے گا، لہذا جب تنگ دست کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے تو مالدار کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس کے حق میں تو حاجت کا ادنیٰ شبہ نہیں ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرضے، ان کی صورتیں اور احکام

مفتی محمد جعفر علی رحمانی

کسی بھی قوم کی بقاء و زندگی اور عزت کے لئے تعلیم اس کی بنیادی ضرورت ہے، یہ ضرورت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی اس سے کسی کو انکار نہیں، اور تعلیم سے مراد دینی تعلیم ہے اس پر بھی جمہور کا اتفاق ہے: ”قل رب زدنی علماً“ (سورۃ طہ: ۱۱۴)۔ ”المراد بالعلم العلم الشرعی الذی یفید معرفة ما یجب علی المکلف من أمر دینہ فی عباداتہ و معاملاتہ، والعلم باللہ و صفاتہ، وما یجب له من القيام بأمرہ“ (فتح الباری لابن حجر العسقلانی ۱۰۱۸۷ باب فضل العلم)۔

کیونکہ اس میں دنیوی و اخروی فلاح و کامیابی مضمون پوشیدہ ہے اور یہی ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو آیت نازل فرمائی وہ تعلیم ہی سے تعلق رکھتی ہے: ”اقراء باسم ربک الذی خلق“ (سورۃ علق: ۱)۔

مگر اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم و فنون کی تحصیل کی بھی شریعت نے نہ صرف حمایت کی، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے تاکہ انسان ان فنون کے ذریعہ دیگر انسانوں کی خدمت کر سکے، انہیں اپنے لئے حلال آمدنی کا ذریعہ بنا سکے، اور ان فنون میں وہ دیگر اقوام کا دست نگر نہ رہے۔

رہی دینی تعلیم تو وہ آج بھی مفت دی جا رہی ہے، البتہ عصری فنون کی تعلیم بڑی مہنگی ہو چکی، کیونکہ لوگوں نے اسے ایک نفع بخش تجارت بنا لیا، اور ان کی تحصیل کو اس قدر گراں کر دیا کہ متوسط المعاش لوگوں کے لئے ان تک رسائی انتہائی دشوار گزار امر بن چکا ہے، حکومت ہند نے ایسے ہی لوگوں کی سہولت کے لئے کم شرح سود پر تعلیمی قرضوں کا نظم کیا ہے، اور اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ ان قرضوں سے سود حاصل کرنا ہمارا مقصد نہیں بلکہ تعلیم میں تعاون مقصود ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: کیا جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے اس طرح کا کم شرح والا سودی قرض لینا جائز ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سودی قرض صرف بوقت ضرورت اور وہ بھی بقدر ضرورت ہی لیا جاسکتا ہے، ”یحوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشیاء والنظائر لابن نجیم ۱۲۲۷ القواعد الكلية والضوابط الفقهية، ص ۲۲۲)، ”ما أیبح للضرورة یتقدر بقدرها“ (ایضاً ۱۰۴۰۸)۔ اور ضرورت وہی ہے جسے فقہاء کرام نے ضرورت قرار دیا ہے، اور اعلیٰ تعلیم ایسی ضرورت نہیں ہے جس کے لئے سودی قرض لینا جائز ہو، خواہ وہ کم شرح سود والا قرض ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ حرام قلیل ہو یا کثیر حرام ہوتا ہے، اور اس سے بچنا فرض ہے۔

”فأما الضرورة فمعناها لا بد منها في قيام المصالح الدين والدنيا بحيث إذا فقدت لم تجر مصالح الدنيا على استقامته بل على فساد و تمأرج و فوت حياة و في الآخرة فوت النجاة والنعيم والرجوع بالخسران المبين“ (الموافقات للشاطبي ۲۰۴۵-۴)۔

ضرورت یہ ہے کہ دینی اور دنیوی مصلحت کے لئے اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، بایں طور کہ اگر وہ نہ ہو تو دنیوی مصلحت ٹھیک طرح سے انجام پذیر نہ ہو بلکہ اس میں اضطراب اور بگاڑ پیدا ہو جائے، وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور آخرت میں نجات آرام و آسائش میسر نہ ہو اور وہ بالکل گھائے میں پڑ جائے۔

۲۔ شریعت اسلامیہ میں سود کا لینا دینا بالکل حرام ہے، اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس کی شاعت اور قباحت کو سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے گناہ پر اعلان جنگ نہیں فرمایا سوائے دو گناہ کے، سود کا لین دین، خدا کے ولی سے عداوت۔

جدید اعلیٰ تعلیم ایسی ضرورت نہیں ہے جس کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت دی جائے، اور نہ ہی اس کم شرح سود کو سروس چارج پر محمول کیا جائے گا،

کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”کل قرض جر منفعہ فہو ربوا“ (ہر وہ قرض جو منفعہ کو کھینچ لائے وہ سود ہے)، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرح سود کم ہو یا زیادہ بہر صورت حرام ہے، نیز کم شرح سود والے قرض کو جائز قرار دینا سود کے دروازے کو کھولنے کے مترادف ہے، وہ اس طرح کہ اگر اعلیٰ تعلیم کے لئے اس طرح کے قرض کو لینا جائز قرار دیا جاتا ہے تو لوگ دیگر مواقع میں بھی بلا تھک و بلا روک ٹوک زیادہ شرح سود والے قرض کو بھی لیں گے، اور یہی کہیں گے کہ ”یہ شرح سود کم ہی ہے کیوں کہ پہلے شرح سود اتنی تھی اور اب اتنی“ جیسا کہ آج کل گھروں کے لئے قرض کی شرح سود کم کی گئی، جبکہ فقہ کا مسلم قاعدہ ہے کہ ”ذریعہ حرام بھی حرام ہے“ ”ما کان سبب الحرام حرام“ (الجمہرۃ و موسوعۃ قواعد الفقہیہ ۲۱۰۶)۔

”یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ“ (سورہ بقرہ: ۲۸۷-۲۸۹)۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”لعن اللہ اکل الربا وموکلہ وشاہدیہ وکاتبہ وقال: ہر سواہ“ (صحیح مسلم ۲۰۲۷، التفسیر المنیر ۲۰۹۲)۔

(اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، گواہوں پر، لکھنے والے پر، اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں)۔

۳۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبے میں داخلہ کا اہل ہو اور وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کے لئے سازگار نہیں ہیں، اور وہ کم شرح سود والے قرض سے فائدہ اٹھانا چاہے، تو اسے بھی اس کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کی تحصیل فرض کفایہ ہے، اور سود کے لین دین سے بچنا فرض عین ہے، اور فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ شریعت اسلامیہ نے مامورات سے زیادہ منہیات کی جانب اعتناء کیا ہے، وہ اس طرح کہ امر بالشیء میں امر حسب استطاعت بجالانے کا حکم ہے، اور نہی میں بچنا ہی بچنا ہے۔

”فاذا امرتکم بشئ فخذوا منه ما استطعتم واذا نہیتکم عن شئ فانتہوا“ (سنن ابن ماجہ ص ۲، صحیح بخاری ۲۰۱۰۸۲) (جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم کروں تو جہاں تک ہو سکے تم اس کو بجالاؤ اور جب میں تمہیں کسی چیز سے روکوں تو باز آ جاؤ)۔

اور الاشبہ والنظائر میں ہے: ”لأن اعتناء الشرع بالمنہیات أشد من اعتنائه بالمأمورات“ (ص ۷۸)۔

۴۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اعلیٰ تعلیم کی متحمل نہیں، لیکن اس کے والد کی معاشی حالت اس کی متحمل ہے تو والد اپنے ولد کے لئے اعلیٰ تعلیم کا نظم کرے، یہ والد کی طرف سے ولد کے لئے بہترین تحفہ اور اسلام اور مسلمانوں کی عمدہ خدمت ہوگی، والد کے صاحب استطاعت ہونے اور نہ ہونے سے سودی قرض لینے کے عدم جواز کے حکم پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، کیونکہ ولد کے عدم استطاعت اور والد کے صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں نہ والد پر اپنے ولد کو یہ اعلیٰ تعلیم دینا فرض عین ہے، اور نہ ولد پر اس کی تحصیل فرض اور امر مستحسن ہے، کیونکہ دستور خداوندی ہے: ”لا یكلف اللہ نفسا الا وسعها“ (آل عمران: ۲۸۶) (اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اس کی بساط کے مطابق)۔

اس کی تفسیر میں صاحب روح المعانی علامہ ابوالفضل شہاب الدینؒ یہ فرماتے ہیں: ”أبی سذتہ تعالیٰ لا یكلف نفسا من النفوس الا ما تطیق“ (۱۱۲/۳) یعنی یہ سنت خداوندی ہے کہ وہ انسانوں میں سے کسی صاحب نفس کو اس کی بساط کے مطابق ہی ذمہ داری سونپتا ہے۔

۵۔ ہرگز جائز نہیں (بحوالہ سابق)۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کی حیثیت اور اس کے احکام

مولانا عبدالحمید صاحب

۱۔ جدید تعلیم مثلاً سائنس، میڈیکل، انجینئرنگ، ٹیکنالوجی وغیرہ کی تعلیم امت مسلمہ کے لئے ضروری بلکہ ایک درجہ میں فرض کفایہ ہے اور دین اسلام کے غلبہ کے لئے مسلمانوں میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید عصری مفید علوم کا حصول بھی ضروری ہے، مسلمانوں میں ایسے افراد ضرور ہونے چاہئیں جو باصلاحیت ہوں اور اپنا دینی اور مذہبی تشخص برقرار رکھتے ہوئے حالات کی ضرورت کے پیش نظر جدید علوم حاصل کریں اور ان علوم کے ذریعہ اپنی صلاحیتیں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کریں تاکہ امت مسلمہ ترقی کے میدان میں پیچھے نہ رہے اور اغیار کی احتیاجی کم سے کم ہو۔

”و عن زید بن ثابت قال: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أتعلم السريانية. وفي رواية: إنه أمرني أن أتعلم كتاب يهود وقال: إني ما آمن يهود على كتاب. قال: فما مر بي نصف شهر حتى تعلمت فكان إذا كتب إلى يهود كتبت وإذا كتبوا إلي قرأت له كتابهم“ (رواه الترمذی فی مشکوٰۃ ص ۳۹۹)۔

”قیل فیہ دلیل علی جواز تعلم ما هو حرام فی شرعنا للتوقی والحذر عن الوقوع فی الشرکذا ذکره الطیبی فی ذیل کلام المظهر وهو غیر ظاهر إذ لا یعرف فی الشرع تحریم تعلیم لغة من اللغات سریانیة أو عبرانیة أو ہندیة أو ترکیة أو فارسیة وقد قال تعالیٰ: ”من آیاتہ خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتکم“۔ الروم۔ أي لغاتکم بل هو من جملة المباحات، نعم یعد من اللغو ومما لا یعنی وهو مذموم عند أرباب الکمال إلا إذا ترتب علیہ فائدة فحینئذ یتحب کما یتستفاد من الحدیث“ (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاة المصابیح ۹۰۶۲)۔

۲۔ قرض کی رقم پر لئے جانے والے اضافے کو اجرت خدمت پر محمول کر کے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس میں حقیقی اخراجات مثلاً کاغذات تیار کرنے وغیرہ کے اخراجات سے زائد لی جانے والی رقم تو بلاشبہ سود ہوگی، اور حقیقی اخراجات کے بقدر لینے کی صورت میں ان اخراجات کا صحیح ٹھہرنا بہت دشوار ہے، تاہم اگر کسی ذریعہ سے واقعہ اس کا صحیح ٹھہرنا ہو سکے تو صرف حقیقی اخراجات کے بقدر لینے کی ہی گنجائش ہوگی، لہذا قرض پر دی گئی رقم پر فقط حقیقی اخراجات کے علاوہ کوئی بھی زائد اضافہ لینا دینا جائز نہیں۔

علاوہ ازیں اجرت خدمت پر محمول کرنے کی صورت میں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ قرض کی مقدار میں کمی یا زیادتی یا مدت ادا ہونے میں کمی بیشی سے اس اجرت میں کوئی تبدیلی نہ ہو، بلکہ ہر حال میں حقیقی اخراجات کے بقدر ہی لیا جائے، جبکہ عملاً ایسا نہیں کیا جاتا بلکہ رقم کی مقدار بڑھنے یا مدت زائد ہونے کی صورت میں رقم بھی زیادہ لی جاتی ہے، ایسی صورت میں مدت و میعاد وغیرہ کے عوض میں اضافی رقم کا لینا لازم آتا ہے جس کو اجرت عمل قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ یہ اضافی رقم لینا سود ہی ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان دارالحرب ہے، لہذا ”لاریب بین الحربی والمسلمہ“ کی رو سے وہاں سودی معاملہ سرکاری بینکوں کے ساتھ جائز ہونا چاہیے تو جواب یہ ہے کہ حربی سے سودی معاملہ کا جواز صرف طرفین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے جبکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر ائمہ ثلاثہ اس صورت میں بھی عدم جواز کے قائل ہیں، نیز طرفین کے نزدیک بھی جواز کی کچھ شرائط ہیں جیسا کہ امداد الفتویٰ میں رسالہ ”رافع الضمنک فی منافع البنک“ میں ذکر کی گئی ہیں اور عموماً ان شرائط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، چنانچہ اسی مذکورہ رسالہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ:

”مشاہدہ ہے کہ عوام سب قیود سے قطع نظر کر کے ان صورتوں کے مرتکب ہونے لگے ہیں جو بالاجماع ناجائز ہیں اس لئے کسی کو اس قول پر عمل کرنے کی

اجازت نہ ہوگی“

نیز ربو کی حرمت کے بارے میں قرآن و حدیث کے قطعی نصوص جو عام ہیں ان کی روشنی میں امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب قوی اور راجح معلوم ہوتا ہے، علمائے محققین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی کو اختیار کرتے ہوئے دارالحرب میں عدم جواز کا قول کیا ہے حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ امداد المفتین (ص ۷۰۵) میں سود پر وعیدوں سے متعلق روایات نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

”لہذا کفار کے بینکوں سے سود لینے کے متعلق بھی علمائے محققین کا فتویٰ بنظر احتیاط اسی پر ہے کہ جائز نہیں“

حاصل یہ کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کی تقدیر پر بھی اس میں حربی کو سود دینے کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔

”وعن عمر بن الخطاب رضي الله عنه: إن آخر ما نزلت آية الربا وإن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربا والريبة۔ رواه ابن ماجه والدارمي“ (مشكاة المصابيح ص ۲۳۶)۔

۳۔ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ سود پر قرض لینا ناجائز اور حرام ہے، مذکورہ حاجت کی وجہ سے اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ الاشباہ والنظائر میں مذکور ہے کہ:

”السادسة: الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة... وفي القنية والبخية يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“۔

اور البحر الرائق (۲۱۱/۶) میں بھی قنیہ کے حوالے سے مذکورہ جزئیہ نقل کیا گیا ہے۔

اور الاشباہ کی شرح میں علامہ حمویؒ تحریر فرماتے ہیں:

”قوله: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح ( وذلك نحو أن يقترض عشرة دنانير مثلا ويجعل لربها شيئا معلوما في كل يوم ربحا“۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محتاج کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے، اور اعلیٰ تعلیم کا حاصل کرنا بھی ایک اہم حاجت ہے، لہذا اس کی وجہ سے بھی سودی قرض کا لینا جائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مذکورہ جزئیہ میں محتاج سے مراد اگر مضطر ہے جیسا کہ سود سے متعلق قطعی نصوص کا تقاضا بھی یہی ہے تو اس جزئیہ سے اعلیٰ تعلیم وغیرہ کی حاجت کے لئے سودی قرض لینے کے جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہر ایک کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شرعی ضرورت میں داخل نہیں، اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا درجہ فرض کفایہ تک ہو سکتا ہے اور وہ بعض افراد کی طرف سے اس تعلیم کو حاصل کرنے سے پورا ہو جاتا ہے، باقی افراد کے لئے اعلیٰ تعلیم کا حصول کوئی ایسی شرعی ضرورت نہیں کہ جس کی وجہ سے ربو محرم کو جائز قرار دیا جائے اور اگر اس سے مراد یہ لیا جائے کہ (ضرورت شدیدہ کے علاوہ) بوقت حاجت بھی سود پر قرض لیا جاسکتا ہے تو یہ محل نظر ہے، اس لئے کہ اس صورت میں قنیہ کا مذکورہ جزئیہ نصوص قطعیہ جو کہ مطلق ہیں ان کے خلاف ہو جائے گا، اور یہ واضح ہے کہ اس صورت میں اس جزئیہ کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، نیز اس سے دیگر حاجات میں سودی قرض لینے کے جواز کا ایک دروازہ کھل جائے گا جو کہ انتہائی خطرناک ہے۔

”عن جابر بن عبد الله قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربو و موكله و كاتبه و شاهده و قال هم سواء“ (مشكاة المصابيح

ص ۲۳۲)۔

۵۰۴۔ طالب علم یا اس کے والد کے صاحب استطاعت ہونے یا نہ ہونے سے مذکورہ عدم جواز والے حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ مذکورہ اسکیم کے سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانا مطلقاً ناجائز ہے۔

☆☆☆



## جدید تعلیم کی شرعی حیثیت

مولانا مفتی اقبال رضا رومی علیہ

علم خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، علم کے ذریعہ انسان کو تمام مخلوق پر برتری اور فوقیت دی گئی ہے، علم انسان کی بنیادی ضرورت ہے، پانی، ہوا اور روشنی جس طرح انسانی زندگی کی بقاء کے لئے بنیادی عنصر ہیں، اسی طرح علم انسانی زندگی کے لئے وہ بنیادی پتھر ہے، جس کے بغیر اس کی عملی زندگی کو ثبات و دوام حاصل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی روحانی زندگی قائم رہ سکتی ہے، انسان اور چوپائے کا فرق مٹ جائے گا، اس لئے قرآن پاک میں علم کو فضل عظیم قرار دیا گیا ہے۔

”وعلمت ما لہ تکن تعلم وکانت فضل اللہ علیک عظیما“ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تعلیم دی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقف نہیں ہیں، اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے (نساء: ۱۱۳)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی پہلی آیت میں تعلیم اور پڑھنے کی ترغیب اور تذکرہ ہے، جب کہ اس وقت ہر طرح کی برائیاں (شرک، میت پرستی، زنا، فحاشی، ظلم و زیادتی، خوریزی و سفاکی) عام تھیں۔

ارشاد الہی ہے: اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم۔ (انرا) (اے محمد! اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، جس نے انسان کو خون کی پھنگی سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ سب باتیں سکھائیں، جس کا اس کو علم نہ تھا)۔

غرض قرآن پاک میں علم حاصل کرنے پر جتنا زور دیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کو علم اور تفہیم کے ساتھ وابستہ کیا ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی ہے اور آپ سے یہ کہا جاتا ہے کہ زیادتی تعلیم کی دعاء اللہ تعالیٰ سے کریں: **وقل رب زدنی علماً** (آپ کہیے، اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما)۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ایک موقع پر یوں وضاحت فرمائی ہے: بعثت معلماً۔ (مجھے تعلیم دینے والا بنا کر بھیجا گیا ہے)۔ اور علم کی فضیلت و شرافت اس لئے ہے کہ یہ تقویٰ کے لئے وسیلہ ہے اور تقویٰ ہی سے دربار خداوندی میں عزت و عظمت ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم** (حجرات: ۱۳) (اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ پر لحاظ ہے)۔

اس وقت دنیا میں علم کی بہتات اور کثرت ہے، مختلف چیزیں علم و فن کے نام پر وجود میں آچکی ہیں، علوم کی اس دنیا میں مفید اور غیر مفید کا امتیاز لوگ کھو بیٹھے ہیں، جس کی وجہ سے ان علوم سے فائدہ ہونے کے بجائے نقصانات و مضرت زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے اس راستہ میں غور و فکر کر کے قدم رکھنا چاہئے۔

امام غزالی فرماتے ہیں: الخوض فی علم لا یستفید الخائض فیہ فائدة علم فهو مذموم، فکم من شخص خاص فی العلوم واستضر بها... (احیاء العلوم، ۱، ۲۷) (ایسے علم میں غور و خوض جس سے غور و خوض کرنے والا فائدہ حاصل نہ کر سکے وہ علم اس کے لئے مذموم ہے کتنے اشخاص ہیں جنہوں نے کسی علم میں غور کیا اور اس سے ان کو ضرر پہنچا)۔

اور حضرت شیخ الہند اگر ایک طرف مسلم بچوں کو جدید علوم کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالتے ہیں تو دوسری طرف اپنے نظریہ تعلیم کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

آپ میں سے جو حضرات محقق یا باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنا یا دوسری قوم کے علوم و فنون حاصل

علیہم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروج، گجرات۔

کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں، یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت کی پرستش کرنے لگیں، تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے (خطبہ صدارت مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۲۰ء، حوالہ فتاویٰ رحیمیہ ۱۶۳/۳، دارالعلوم دیوبند ستمبر ۲۰۰۰ء)۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ علم ایک دودھاری تلوار ہے، اس سے انسان کو نفع بھی پہنچتا ہے، ضرر بھی، علم کے ذریعہ انسان ہدایت پاتا ہے اور گمراہ بھی ہوتا ہے۔  
**علم نافع اور غیر نافع:**

درحقیقت علم ایک ہی ہے، اسلام میں علم دین اور دنیا کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے، علم ایک ہے، علم خدا کی ازلی اور ابدی صفت ہے، علم ایک نور ہے، جس سے ظلمتیں دور ہوتی ہیں، علم وہ عنایت ربانی اور نعمت یزدانی کا مظہر ہے، البتہ اس کی دو قسمیں نافع اور ضرار (غیر نافع) کی حیثیت سے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دعاء مانگی ہے، اور غیر نافع سے پناہ مانگی ہے:

اللھم انی اسئلتک علما نافعا وعملا متقبلا ورزقا طیباً (مشکوٰۃ ۲، ۲۲۰، حوالہ ابن ماجہ) اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ایسے علم کا جو نفع دے اور ایسے عمل کا جو قبول ہو جائے اور ایسے رزق کا جو حلال و پاکیزہ ہو۔

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں دعا مانگتے تھے: اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع و من نفس لا تشبع و من دعویٰ لا یتجاب لھا۔ (ابن ماجہ ۳۱/۳۳) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، اور ایسے دل سے جو تیرے آگے نہ بھٹکے، اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو، اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو)۔

ان احادیث مبارکہ اور دعاء ماثورہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نفع اور ضرر کے اعتبار سے علم کی دو قسمیں ہیں، بعض نافع اور بعض غیر نافع، لہذا وہ علوم جو دنیا اور آخرت کے اعتبار سے نافع ہیں، ان کے حصول کے لئے کوشش اور اپنے حد تک وسائل کا استعمال بھی کرے، نیز اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگے، لیکن وہ علوم جو غیر نافع ہیں ان سے دور رہے اور پناہ بھی مانگنی چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ کون علم نافع ہے اور کون غیر نافع؟ اس سلسلہ میں حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جو علم دین صرف زبان تک ہو دل تک نہ پہنچتا ہو ایسا علم دین بھی غیر نافع ہے، جو علم صرف علم تک محدود ہو، اس کے مطابق عمل نہ ہو وہ غیر نافع ہیں (کتاب العلم حوالہ داری ۱/۳۷)۔

بہر حال وہ علم جو علم والے کو بھی فائدہ پہنچائے اور دوسرے کو بھی، مثلاً دین و شریعت اور اس کے متعلقات کا علم، طب، حساب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ، غیر نافع وہ علم ہے جو نہ صاحب علم کو فائدہ پہنچائے، نہ دوسرے کو، جسے سحر، موسیقی، عشقیہ شعر و مشاعرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ علم کی تقسیم اولیٰ سے علم کی دو قسمیں نکلیں، علم نافع، علم غیر نافع، پھر علم نافع کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) علم دین یا شریعت (۲) علم دنیا۔

اب ہم اس سے متعلق بحث کریں گے کہ کون سا علم کس درجہ میں حاصل کرنا ضروری ہے۔

### علم فرض عین:

علامہ حاکمیؒ رقمطراز ہیں: واعلم ان تعلم العلم یكون فرض عین وهو بقدر ما یحتاج لدینہ (الدر المختار علی حاشیہ رد المحتار ۱/۱۴)۔

اسی طرح ابن عابدین شامیؒ نے اس کی تفصیلات علانی کے حوالہ سے لکھی ہے: یعنی فرائض اسلام میں سے یہ ہے کہ اپنا دین قائم کرنے، اپنے اخلاص عمل اور بندگان خدا کے ساتھ رہنے سہنے کے لئے بندہ جن کا محتاج ہوتا ہے، چنانچہ ہر عاقل بالغ مرد و عورت پر دین و ہدایت سیکھنے کے بعد فرض ہے کہ وہ وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کا علم سیکھے، تاجر حضرات خرید و فروخت کے مسائل سیکھیں، ایس، ہی صنعت کار اور ہر وہ شخص جو کسی کام میں مشغول ہو، اس پر وہ علم اور اس کا سیکھنا فرض ہے، تاکہ اس میں حرام کام نہ ہو (حاشیہ ابن عابدین ۲۹/۱)۔

### علم فرض کفایہ:

اگر علم دین اپنی ذاتی ضرورت تک حاصل کرتا ہے، تو فرض عین ہوا، لیکن اگر ذاتی ضرورت سے بڑھ کر دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے حاصل کرے تو

فرض کفایہ ہوا۔

در مختار میں ہے: وفرض کفایۃ وهو ما زاد علیہ نفعہ غیرہ ائی علی قدر ما یحتاجہ لدینہ فی الحال (در المختار مع رد المحتار ۱: ۱۲۲)۔ (فرض کفایہ وہ ہے جو اس سے زیادہ ہوا پے غیر کونفع پہنچانے کے لئے یعنی اس مقدار سے زیادہ ہو، جس کا اپنی دینی ضرورت کے لئے فی الحال محتاج ہے)۔

مذکورہ بحث سے یہ بات ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں جدید تعلیم معاشی ضرورت اور دشمن کی مدافعت کے لئے مسلمانوں کے لئے ضروری ہیں، تو زندگی کے دیگر مسائل کی طرح ان کے اختیار کرنے اور سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”قل من حرم زینۃ اللہ الی آخرہ لعبادہ والطیبات من الرزق قل ہی للذین آمنوا فی الحیوۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ“ (الاعراف: آیت ۳۲)۔  
(کہو! اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا، اور کھانے کی پاک چیزوں کو، کہو! وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لئے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہیں کے لئے ہوں گی)۔

نیز دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة“ (الانفال: ۶۰) (ان کے لئے جس قدر تم سے ہو سکتا قوت تیار رکھو)۔ ان آیات کے مطابق مسلمانوں کے لئے جدید علوم کو سیکھنا درست نہیں بلکہ ایک ضرورت ہے اور اس کی تائید تو شیخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی فتنہ سے بچنے کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا اور کفار و مشرکین کے اعتراضات کے جواب دینے کے لئے حضرت حسان بن ثابتؓ کو عربی اشعار میں مہارت حاصل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور اسی طرح فقہاء نے اوقاف، مسلم پرسنل لاء اور مسلمانوں کے دوسرے معاملات میں رہنمائی کے لئے وکالت کی تعلیم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، جیسا کہ امام غزالی نے ان تمام علوم کو سیکھنا ضروری قرار دیا ہے، جن کی امور دنیا کی درستگی میں ضرورت پڑتی ہیں:

فرض کفایہ ہر ایسا علم ہے کہ امور دنیا کی درستگی میں جس سے بے نیاز نہ رہا جاسکے، جیسے طب کیوں کہ وہ بقاء بدن کے لئے ضروری ہے اور جیسے حساب اس لئے کہ وہ معاملات اور وصیت و میراث کی تقسیم کے لئے ضروری ہے (احیاء العلوم ۱: ۲۳)۔

### تعلیم کے حصول میں ترتیب:

لیکن ان تمام علوم کے حصول میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے، یعنی قرآن و حدیث کے علوم کو پہلے حاصل کرنی چاہئے، اور جدید تعلیم کے حصول میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جائز و درست نہیں ہوگا، جو مستعلم اور معلم کو دینی علوم سے غافل کر دے اور اس پر جدید تعلیم کو فوقیت دینا لازم آئے، تو ایسی صورت میں جدید تعلیم تعلیم نہیں رہے گی، بلکہ وہ لہو و حدیث (یعنی لایعنی باتیں) کے مصداق ہوگی، اور جو لوگ لہو الحدیث میں اپنے آپ کو مشغول کرتے ہیں ان کے لئے قرآن پاک میں بڑی وعید آئی ہے:

ومن الناس من یشتري لہو الحدیث لیفضل عن سبیل اللہ بخیر علم ویخذھا ہزواً أو لائلت لہم عذاب مہین۔ (لقمان: ۶)۔ اور ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے، تاکہ بچلائیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے اور ٹھہرائیں اس کو ٹھسی، وہ جو ہے ان کو ذلت کا عذاب ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علم صرف زبان تک ہو دل تک نہ پہنچتا، ہو ایسا علم دین بھی غیر نافع ہیں یعنی جو علم صرف علم تک محدود ہو عمل نہ ہو وہ غیر نافع ہے (کتاب العلم بحوالہ داری)۔

اس لئے سب سے پہلے قرآن و حدیث کا علم اور دین کی وہ ساری باتیں پہلے جانی چاہئے، جن کی ہر وقت ضرورت پڑتی ہیں جیسے نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کے مسائل اور پھر زندگی گزارنے کے لئے جدید علوم کو حاصل کرے اور تمام علوم پر عمل بھی کرے، تب علم نافع ہوں گے۔

اولاد کی تعلیم و تربیت میں والدین کا کردار:

اولاد کی پرورش کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی والدین پر ہے، قرآن پاک نے اس کو ایک مختصر اور بلوغ جملہ میں ادا کیا ہے: یا ایہا الذین

آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم نارا (تحریم: ۶)۔ (اے ایمان والو! اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)۔

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں اور خرابیوں سے بچانا جو آتش دوزخ بناتی ہیں، اس میں اخلاقی تعلیم و تربیت کے سارے پہلو آجاتے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ والد کا اولاد کے لئے سب سے بہتر عطیہ حسن ادب کی تعلیم ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ما نحل والد ولده من نحل أفضل من أدب حسن (ترمذی شریف) (کسی باپ نے اپنے بچے کو کوئی عطیہ اور تحفہ حسن ادب یعنی اچھی سیرت سے بہتر نہیں دیا)۔

دوسری حدیث میں ہے: أکر موا اولادکم وأحسنوا أدبهم (مشکوٰۃ) (اپنی اولاد کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرو اور ان کی اچھی تعلیم و تربیت کرو)۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدین پر ہے، کہ انہیں اچھی سے اچھی تعلیم دے، ایسی اسکول میں داخلہ نہ کرائے اور ایسی تعلیم نہ دے جس سے ان کی سیرت اور اخلاق اچھا ہونے کے بجائے بگڑ جائے، گویا کہ تعلیمی ذمہ داری والد کی طرح ماں پر بھی ہے، البتہ ماں کے مقابلہ میں والد پر زیادہ ذمہ داری ہے۔

اب یہاں تحقیق طلب بات یہ ہے کہ والدین پر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کب تک ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ بچوں اور نیچوں کی پرورش کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے بالغ ہونے تک ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے: بچہ یا بچی بالغ ہونے تک ان کا نفقہ والد پر ہے، لیکن بچہ یا بچی کے نام سے کوئی جائداد یا نقد رقم ہے تو ایسی صورت میں والد پر ذمہ داری عائد نہیں ہوگی، بلکہ ان کی جائداد سے تعلیم و تربیت میں خرچ کی جائے گی۔

نفقة الصغیر واجبة علی ائیه۔ (بچہ کا نفقہ اس کے والد پر واجب ہے)۔

إنما تجب النفقة علی الأب اذا لم یکن للصغیر مال، فالأصل أن نفقة الانسان فی مال نفسه صغیرا أو کبیرا۔ (مدایہ ۲، ۴۳۵) (یقیناً والد پر بچوں کا نفقہ اس وقت ہے جب کہ بچوں کا اپنا کوئی مال نہ ہو، اصل یہ ہے کہ انسان کا نفقہ اپنے حلال مال میں واجب ہوتا ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے علامہ ابن ہمام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: باپ مالدار ہو، بچے نابالغ ہوں، اگر بچے خود اتنی جائداد کے مالک نہ ہوں جس سے ان کی کفایت نہ ہو سکے تو لڑکوں کے کمانے کے لائق ہونے تک اور لڑکیوں کی شادی تک باپ پر نفقہ کی ذمہ داری ہوگی (قاموس الفقہ ۲۱۲/۵)۔

غرض یہ ہے کہ نفقہ کی طرح والدین پر اولاد کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہے، لہذا اگر اولاد نابالغ ہیں مگر ان کے پاس جائداد یا نقد روپیہ ہے تو ان کی تعلیم کا خرچہ باپ پر عائد نہیں ہوگا، اگر اولاد بالغ ہو گئیں ہیں اور تندرست ہیں تو انہیں کمانے کے لئے مجبور کریں گے، اس صورت میں باپ کے ذمہ داری نہیں ہوگی، ہاں اگر اس حالت میں بھی والدین ان کی کفالت کرتے ہیں تو اولاد کے حق میں ان کا احسان ہوگا، ایسے ہی مولانا مجیب اللہ صاحب نے اپنی کتاب اسلامی فقہ میں ذکر کیا ہے (۱۳۹/۲)۔

جدید تعلیم کے لئے سودی قرض کا حکم

اس کا جواب لکھنے سے پہلے درج ذیل امور کی وضاحت ضروری ہیں:

(۱) سود کی تعریف اور اس کا حکم۔

(۲) سود لینا اور دینا دونوں کا حکم یکساں ہے، یا کچھ فرق ہے؟

(۳) جدید تعلیم کی اجازت ضرورت کی بناء پر ہے یا حاجت کی بناء پر؟

(۱) سود کو عربی میں ”ربوا“ کہتے ہیں جس کے معنی بڑھنے اور زیادہ کے ہیں اور وہ مقدار جو راند ہو، اور اس کا کوئی بدل نہ ہو، شریعت میں اسے سود کہتے ہیں۔

علامہ شامیؒ سود کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

(هو) شرعاً (فضل) ولو حکماً خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة (لأحد المتعاقدين) أي بائع أو مشتري - (قوله أي بائع أو مشتري) أي مثلاً فمثلها المقرضات والراهنات - قال ويدخل فيه ما إذا شرط الانتفاع بالرهن كالاستخدام والركوب والزراعة واللبس ... فان الكل ربوا حرام كما في الجواهر والتنف - (۲۰۲۵)۔

(ربا شرعاً لاین دین کے سلسلے میں فریقین میں سے کسی ایک کیلئے ایسے اضافہ کا نام ہے جو عوض سے خالی ہو، چاہے یہ اضافہ حکماً ہو، متعاقدين سے مراد مثلاً بیچنے اور خریدنے والا ہے، چنانچہ اس کے مثل قرض اور رہن کے دونوں فریق بھی ہیں، اور اس میں یہ صورت بھی داخل ہوگی کہ مرہن مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کی شرط لگا دے، جیسے خدمت لینا، سوار ہونا، کاشت کاری، کپڑے پہننا، دودھ پینا اور پھل کھانا، یہ سبھی کچھ سود اور حرام ہے)۔

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر بائع قرض کے معاملے میں بھی کوئی زیادتی کسی جانب کیلئے بطور شرط ہو تو وہ ”ربوا“ ہوگا اور حرام ہے۔ شامی میں ہے۔  
کل قرض جرنفعاً حرام اذا كان مشروطاً بحدود قرض جس سے فائدہ اٹھایا جائے حرام ہے، جبکہ معاملے میں اسکی شرط لگا دی گئی ہو، اور شرح المجتہد میں ہے: کل قرض بشرط فيه منفعة فهو حرام (۲۰۹۶)۔  
سود کا حکم:

سود کی حرمت نص قطعی سے ہے، اور اسکی حرمت پر کئی آیات ہیں، اسکی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ جمہور فقہاء اور محدثین اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ سود حرام ہے، یہاں قرآن مجید کی چند آیات اور احادیث پیش کی جا رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أحل الله البيع وحرم الربوا (سورہ بقرہ: ۲۷۵) (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے، اور سود کو حرام قرار دیا ہے)۔  
جو لوگ سود لینے سے باز نہیں آتے ان کیلئے اعلان جنگ ہے۔

فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله۔ (بقرہ: ۲۷۸) (اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کیلئے، اللہ اور اسکی رسول کی طرف سے)۔  
سود خور کے لئے سخت وعید ہے۔

يا ايها الذين آمنوا لا تأكلوا الربوا أضعافاً مضاعفة واتقوا النار التي أعدت للكافرين۔ (آل عمران: ۱۳۱) (اے ایمان والو! سود کئی کئی حصہ بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے)۔  
سود کا ایک درہم لینا چھتیس دفعہ زنا کرنے سے بھی شدید ہے۔

عن عبيد الله بن حنظلة غسيل الملائكة قال قال رسول الله ﷺ درهم ربا يأكله الرجل وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية۔ (مشکوٰۃ: ۱۰۲۳۶) (حضرت عبید اللہ جو حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ کے صاحبزادے ہیں، وہ نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ربا کا ایک درہم جو آدمی جان بچھ کر کھاتا ہے، ۳۶ مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے)۔

حدیث شریف میں سود دینے والے، سود لینے والے، سود کا رقعہ لکھنے والے، سود کی گواہی دینے والے سب پر لعنت آئی ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال لعن رسول الله ﷺ أكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهده وقال هم سواء۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم ۲۳۶۱۲) (حضرت جابر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے سود کھانے والے، لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت پر فرمائی ہے)۔

(۲) سود لینا اور دینا دونوں گرجہ حرام ہیں لیکن دونوں کی حرمت کے مدارج میں کچھ فرق ہے، اور فرق کے درجہ ذیل اسباب ہیں:

(۱) سود لینا حرام ہے اس لئے کہ اس میں ایک شخص بلا عوض دوسرے کا مال لیتا ہے۔

(۲) سود لینا چوں کہ یہ بھی حرام کا ذریعہ ہے اسلئے یہ بھی حرام ہے، ورنہ نئی ذات اسکی حقیقت بس اتنی ہے کہ ایک شخص اپنا ذاتی روپیہ کسی کو بلا عوض دے دیتا ہے، یہ کوئی

براکام نہیں ہے، البتہ اس صورت میں قسوت، سخت دلی اور معاشی کھسوٹ کا باعث بنتا ہے، یعنی وہ ربا جسکو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اور اس پر شدید وعیدیں نازل فرمائیں پس سود لینا اور دینا دونوں ہی حرام ہیں، لیکن حرمت اور قبح اول کی لعینہ اور دوسرے کی بغیرہ ہے (مباحث فقہیہ ص ۱۰۷)۔

بہر حال سود لینے کی اجازت کسی حالت میں درست نہیں ہوگی، اسی طرح قرض دے کر اس پر مقرض کا فائدہ اٹھانا درست نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ ربا میں داخل ہے، اور یہ حرام ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کل قرض جرنفعاً حرام ای اذا کان مشروطاً (حوالہ سابق ص ۲۳۲) فقہاء نے ”الضرورات تبیح المحضورات، المشقة تجلب التيسير“ قاعدہ کے تحت ضرورت کے وقت یا اس حاجت کے وقت جو ضرورت کے قائم مقام ہو، سود دینے اور سود کی شرط پر قرض لینے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ قنیر اور بغیہ کے حوالہ سے علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے۔

وفي القنية والبغية يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح۔ (الاشباه والنظائر مطبع دیوبند ص ۱۳۵) (قنیر اور بغیہ میں ہے کہ حاجت مند کے نفع کی شرط پر قرض حاصل کرنا جائز ہے)۔

نیز علامہ ابن نجیمؒ چودھویں قاعدہ ماحترم اخذہ حرم اعطاء کے ذیل میں ”الرشوة لخوف على ماله كاستئثار كرتے ہیں۔ الا في مسائل الرشوة لخوف على ماله اونفسه (قوله على الرشوة لخوف على ماله) هذا في جانب الدافع أما في جانب المدفوع له فهو حرام ولم ينبه عليه، وينبغي أن يستثنى الأخذ بالربا للمحتاج فانه لا يحرم كما صرح به المصنف في البحر ويحرم على الدافع الاعطاء بالرباء (حموی ص ۱۷۶)۔

(مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل ہیں، لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے، اس شخص کے حق میں جس کو دیا گیا ہے حرام ہے، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنیٰ ہو کہ کوئی محتاج سود پر قرض حاصل کرے یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ بحر میں ہے)۔

(۳) اب رہا یہ مسئلہ کہ جدید تعلیم کی اجازت مسلمانوں کے لئے ضرورت کی بنا پر ہے یا حاجت کی بنا پر؟ تو اس سلسلہ میں فقہاء نے ضرورت اور حاجت کی جو تعریف کی ہے اس سے اور علم کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اجازت حاجت کی بنا پر ہے، جیسا کہ علامہ حموی نے ضرورت کی تعریف درج ذیل صورت میں کی ہے۔

قال الحموی: ههنا خمسة مراتب: ضرورة وحاجة ومنفعة وزينة وفضول، فالضرورة بلوغه حدًا إن لم يتناول الممنوع هلك أوقارب وهذا يبيح تناول الحرام، والحاجة كالجائع الذي لولم يجد ما يأكله لم يهلك غير أنه يكون في جهد ومشقة وهذا لا يبيح الحرام ويبيح الفطر في الصوم (حاشیہ الاشباہ والنظائر ص ۱۰۸)۔

(احکام کے پانچ درجات ہیں، ضرورت، حاجت، منفعت، زینت، اور فضول، ضرورت کا اس حد کو پہنچ جانا کہ اگر ممنوع شے کو استعمال نہ کرے تو ہلاک ہو جائے، یا ہلاکت کے قریب پہنچ جائے، یہ صورت حرام کے استعمال کو مباح کر دیتی ہے، حاجت کی مثال اس بھوکے شخص کی مانند ہے کہ اگر کھانے کی چیز نہ ملے تو ہلاک تو نہ ہو، مگر مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے، اس کی وجہ سے حرام اشیاء مباح تو نہیں ہوتی ہے، البتہ روزہ افطار کر لینا جائز ہو جاتا ہے)۔

ضرورت و حاجت کی اس تعریف سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ جدید تعلیم کا حصول اگرچہ ضرورت کے درجہ میں نہیں ہے، لیکن حاجت کے درجہ میں ضرور شامل ہے، کیونکہ عبادت الہی کیلئے دینی علوم کا بقدر ضرورت ہر مسلمان کا سیکھنا فرض اور ضروری ہے، تو معاشی اور سیاسی ضرورت اور اسلام کی طرف سے دفاع کیلئے صحیح نیت کے ساتھ جدید علوم کا سیکھنا بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے (حوالہ سابق، احیاء العلوم)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں: کوئی بھی علم جو انسانیت کیلئے نفع بخش ہو، اسلام اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے حکمت کو گمشدہ مال قرار دیا ہے، آج ہم جس کو عصری تعلیم یا جدید تعلیم کہتے ہیں، وہ اسی حکمت کا مصداق ہے..... یہ عصری علوم نہ مذہب سے متصادم ہیں اور نہ مذہب کی رہنمائی سے بے نیاز (شرح فروزاں ۲/ ۹۳، ۹۲)۔

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید تعلیم کا حصول حاجت کی بنیاد پر ہے، تو کیا یہ صورت حرام کے استعمال کو مباح کر دیتی ہے؟

اس سلسلہ میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ حاجت عموماً حرام کو مباح نہیں کرتی، لیکن کبھی کبھی حاجت چاہے عام ہو یا خاص، ضرورت کے درجہ میں تسلیم کر لی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے حاجت مند لوگ جن کے لئے اپنی ضروریات کی تکمیل کا کوئی راستہ نہ ہو اور ضروریات بھی ایسی ہیں کہ اگر وہ انہیں پورا نہ کریں تو بڑی

دشواری میں پڑ جائیں گے، ان کے لئے فقہاء نے سودی قرض لینا جائز قرار دیا ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: ”القاعدة السادسة من الخامسة“ الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة ولهذا جوزت الإجازة على خلاف القياس للحاجة، وفي القنية والبغية يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباه والنظائر ص ۱۱۵)

(چھٹا قاعدہ یہ ہے کہ ”حاجت“ ”ضرورت“ کے قائم مقام ہو جاتی ہے، عام ہو یا خاص، اسی بنا پر خلاف قیاس بر بنائے حاجت ”اجارہ“ کو جائز رکھا گیا ہے، قنیہ اور بغیہ میں نہ حاجت مند لوگوں کیلئے نفع کی شرط پر قرض حاصل کرنا جائز ہے)۔

لہذا ایسے ہی اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا ذہبیرون ملک جائز تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، تو اس کے لئے اس قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

سرکاری بینک عام معمول کے خلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت کیلئے دیا جاتا ہے، تو کیا اس کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

شریعت میں مطلقاً سود حرام ہے، چاہے وہ کم مقدار میں ہو، یا زیادہ مقدار میں، اگر کوئی شخص کوئی شے کسی کو دے رہا ہے جو عوض سے خالی ہے اور شرط کے طور پر ہے تو سود میں شامل ہے اور وہ حرام ہے۔

عن أبي بن كعب وابن مسعود وابن عباس نھوا عن قرض جر نفعا (رواه البيهقي بحواله الفقه الاسلامي ۴، ۴۲۶)۔

(حضرت ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے ایسے قرض سے منع فرمایا ہے جس پر فائدہ اٹھایا جائے)۔

وقال رسول اللہ ﷺ: كل قرض جر نفعا فهو ربا۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو قرض نفع کے لئے بنایا جائے وہ ربا (سود) ہے)۔ كل قرض جر نفعا حرام ای إذا كان مشروطا۔ (حوالہ سابق: ۲۳۲/۳) (ہر وہ قرض جس سے فائدہ اٹھایا جائے حرام ہے، جب کہ معاملے میں اس کی شرط کی گئی ہو)۔

فتح القدیر کے حوالہ سے حضرت حکیم الامتؒ ذکر کرتے ہیں، ربا حقیقی اور اصلی وہی ہے جو بیع کے علاوہ قرض اور دین میں ہوتی ہے، اور علامہ ابن ہمامؒ کی عبارت کو پیش کیا ہے۔ وقال ابن الھمام فی الفتح باب الصرف إن اسم الربا تضمن الزيادة من الأموال الخاصة فی أحد العوضین فی قرض أو بیع (امداد الفتاویٰ ۳، ۲۱۱)۔

سود کی تعریف سے معلوم ہوا کہ اگر مقرض کی طرف سے قرض پر نفع کی شرط ہے چاہے وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر مقدار میں وہ حرام ہے، کیوں کہ قرض مقرض کی طرف سے ایک ایسا عقد ہے جو مستقرض کے فائدہ اور آسانی کے لئے مشروع ہے لیکن جب اس سے مقرض نے (قرض خواہ) فائدہ کی شرط لگا دی تو قرض اپنے موضوع سے نکل گیا، لہذا قرض دینا صحیح ہو جائے گا لیکن شرط باطل ہو جائے گی، یعنی قرض کی مقدار سے زیادہ لینا درست نہیں ہوگا۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ قرض پر مقرض کی طرف سے فائدہ کی جو بھی شرط ہوگی وہ سود میں شامل ہوگی اور وہ حرام ہے، چاہے قلیل مقدار ہو یا کثیر مقدار، اسلئے موجودہ زمانہ میں سرکاری بینک تعلیمی قرض میں کم شرح سود لیتے ہیں اگر یہ بینک کی طرف سے شرط ہوتی ہے کہ ہر متعین قرض پر سود لیتے ہیں تو یہ سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول نہیں ہوگا بلکہ سود پر محمول ہوگا۔

ہاں اگر بینک کی طرف سے کوئی شرح سود متعین نہ ہو، اور نہ اس کی کوئی شرط ہو اور مستقرض (مدیون) اپنے طور پر قرض ادا کیگی کے وقت متعین قرض کی مقدار سے زیادہ دیدے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور مقرض کا اس صورت میں (مستقرض) سے زیادہ لینے میں کوئی کراہیت نہیں ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فإن خیرکم أحسنکم قضاء (یقیناً تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرض کی ادائیگی اچھی صورت میں کرے) (نیل الاوطار: ۲۲)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں: فإن أقرض شخص غیرہ مطلقاً من غیر شرط فقضاء خیرامنہ فی الصفة أوزادہ فی القدر... جاز ولا یکرہ للمقرض أخذہ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ۴، ۴۲۶)۔

(اگر کسی شخص نے دوسرے کو بغیر کسی شرط کے قرض دیا، اور مستقرض نے اس سے بہتر صورت میں قرض واپس کر دیا، یعنی صفت اور مقدار میں زیادتی کی تو یہ جائز و درست ہے، اور مقرض کا اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اسی طرح اگر مستقرض نے مقرض کو ہدینہ کے طور پر کچھ دیا تو مقرض اسے لے سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی طرف سے شرط نہ ہو۔

سابق مباحث کا خلاصہ یہ ہے :-

- {۱} جدید اعلیٰ تعلیم اگر علم نافع ہے تو مسلمانوں کے لئے صحیح نیت کے ساتھ اسے حاصل کرنا جائز اور درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- {۲} سرکاری بینک تعلیمی قرضوں میں جو سود لیتے ہیں تو اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ ربا پر محمول ہوگا، اور وہ حرام ہے۔
- {۳} ہاں اگر وہ طالب علم کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے اور اس کے والد کی معاشی حالت اس کو برداشت کرنے پر متحمل نہیں ہیں تو اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔
- {۴} اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے، اور طالب علم کا تعلیم کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں ہے، لیکن اس کے والد اسکی صلاحیت رکھتے ہیں تو ایسی صورت میں والد صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے صاحب استطاعت سمجھا جائے گا۔
- {۵} واقعی اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں تو دونوں صورتوں میں اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔





## تعلیم کے لئے قرض حاصل کرنا

مفتی محمد شوکت ثناء قاسمی

اسلام نہ کسی علم کا مخالف ہے اور نہ کسی زبان کا اور کیوں کر اسلام ان کا مخالف ہو سکتا ہے، جبکہ قرآن مجید نے کتنے ہی ایسے حقائق پر روشنی ڈالی ہے، جن کا تعلق فلکیات، طبیعیات، نباتات اور حیوانات کے علوم سے ہے، گذشتہ اقوام کے قصص و واقعات ذکر کئے گئے ہیں اور ان میں غور و فکر اور تدریجی دعوت دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تدریجی علوم کے تحصیل کے بغیر کیوں کر ممکن ہوگا؟

جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر:

اسلام میں بنیادی طور پر علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں، علم نافع اور علم غیر نافع، علم نافع سے ایسے علوم مراد ہیں جو انسانیت کے لئے دنیا یا آخرت کے اعتبار سے فائدہ مند ہو اور غیر نافع وہ علوم ہیں جو دین اور دنیا کے اعتبار سے بے فائدہ یا نقصان دہ ہوں، رسول اکرم علم نافع کے لئے دعا کیا کرتے تھے اور جو علم نافع نہ ہو اس سے پناہ چاہتے تھے۔

”اللہم انی اسألت علما نافعا وأعوذ بک من علم لا ینفع“ (نسائی: ۷۸۶۸، ابن حبان، طبرانی) (اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں اور علم غیر نافع سے پناہ چاہتا ہوں)۔

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ علم و حکمت مومن کا گمشدہ خزانہ ہے ”الحکمة ضالة المومن“ (الترمذی ۳۶۸۷، ابن ماجہ ۳۱۶۹) اس ارشاد کا منشاء بھی یہی ہے کہ جو علم و حکمت کی بات حاصل ہو اور وہ انسانیت کے مفاد میں ہو اس کو رغبت و اشتیاق کے ساتھ حاصل کرنا چاہئے، اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو اکثر عصری علوم و فنون علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، طب انسانی جسم کے لئے نفع بخش ہے، انجینئرنگ انسانی ضروریات کی تکمیل میں مفید ہے، علم قانون میں انسان کی عزت و آبرو کی حفاظت ہے، ادب و صحافت کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام ہوتا ہے، تجارت اور معاشیات سے متعلق علوم کا مقصد فرد اور سماج کی معاشی ضرورت کو پورا کرنا اور اس کے صرف کے جائز اور ناجائز مواقع کی رہنمائی کرتا ہے جس کے مفید اور نافع ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اس لئے تمام علوم اسلام میں مطلوب ہیں اور ان کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے، امام غزالی لکھتے ہیں:

غیر شرعی علوم تین قسم کے ہیں: بعض تو محمود ہیں بعض مذموم اور بعض مباح و جائز ہے، محمود وہ ہیں جس سے دنیوی امور کے مفادات وابستہ ہوں، جیسے کہ طب اور حساب، پھر ان کی بھی تقسیم فرض کفایہ اور محض فضیلت کی طرف کی گئی ہے، جو کہ فرض نہیں ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی ان علوم سے بے توجہی قطعاً مناسب نہیں بلکہ بقدر ضرورت دینی علوم کے حصول کے بعد جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول میں قسمت آزمائی مناسب ہی نہیں بلکہ تقاضہ وقت ہے۔

کیا تعلیمی قرض کی شرح سود کو سروس چارج پر محمول کیا جا سکتا ہے؟

بینک خیر خواہ اور خیراتی ادارہ نہیں ہوتا، بینک کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع کمانا اور سرمایہ حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لئے بینک عام طور سے جو بھی کرتا ہے وہ بھی سود سے خالی نہیں، اس پر دس سے بارہ فیصد شرح سود عائد کیا جاتا ہے، البتہ ان قرضوں پر سود و سود نہیں لگایا جاتا ہے، جیسا کہ دیگر قرضوں پر ہوتا ہے، حکومت کا یہ دعویٰ کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے یہ محض ایک دعویٰ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اگر حکومت

اپنے دعوؤں میں واقعی سنجیدہ ہوتی تو پھر اس تعلیمی قرض پر دس سے بارہ فیصد تک شرح سود عائد نہیں کرتی، جبکہ ملک کے باشندوں کے لئے تعلیم کی فراہمی اس کی ذمہ داری ہے۔

تعلیمی قرض کی کم شرح سود کو سروس چارج پر محمول کرنا مندرجہ ذیل وجوہ کی وجہ سے قطعاً درست نہیں ہو سکتا ہے:

۱۔ سروس چارج کی رقم غیر معمولی نہیں ہوتی، جبکہ بینک ان قرضوں پر بارہ فیصد شرح سود عائد کرتا ہے، اس اعتبار سے اگر کوئی شخص چار لاکھ روپے پانچ سال کے لئے لے رہا ہے تو سود کی مجموعی رقم اصل رقم کے نصف سے بھی زائد ہو جائے گی۔

۲۔ سروس چارج کی رقم کسی چیز پر سالانہ فیصد کے لحاظ سے نہیں لی جاتی ہے، جبکہ اس قرض پر ہر سال بارہ فیصد کے لحاظ سے رقم لی جاتی ہے۔

۳۔ ایک ہی چیز پر سروس چارج کے نام سے ڈبل رقم نہیں لی جاتی ہے جبکہ بینک قرض جاری کرتے وقت سروس چارج کے نام سے مجموعی رقم سے دو فیصد کے لحاظ سے رقم وصول کرتا ہے، بینک بھی تعلیمی قرض کے کم شرح سود کو سروس چارج تسلیم نہیں کرتا، بلکہ بینک اور ماہرین بھی اس کو سود ہی مانتے ہیں، البتہ بینک تعلیمی قرض پر یہ رعایت دیتا ہے کہ شرح سود سالانہ عائد کرتا ہے اور سالانہ شرح سود کی جو رقم ہوتی ہے اس کو اصل رقم کے ساتھ جوڑ کر اس پر سود نہیں لگاتا، بلکہ ہر سال کی شرح سود کا حساب الگ رہتا ہے، لیکن یہ سہولت تعلیم کے ختم ہونے کے ایک سال کے بعد یا تعلیم کی تکمیل اور ملازمت کے ملنے کے چھ ماہ بعد تک رہتی ہے، اس کے بعد وہ ساری رقم ایک ساتھ ملا دی جاتی ہے، اب اس کے بعد ادائیگی نہیں کی گئی یا ادائیگی میں تاخیر کی گئی تو مجموعی رقم پر سود لگایا جاتا ہے، الحاصل یہ کہ تعلیمی قرض جو زیادہ مدت کے لئے کم شرح سود پر جاری کیا جاتا ہے اس میں اصل رقم سے زائد جو رقم ہوتی ہے وہ سود ہے اور شریعت میں سود حرام ہے، خواہ وہ سود مفرد ہو یا مرکب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خطی بنا دیا ہو لپٹ کر، یہ سزا اس لئے ہوگی کہ لوگوں نے کہا تھا کہ بیچ بھی تو مثل سود کے ہے، اللہ تعالیٰ نے بیچ کو حلال فرمایا اور سود کو حرام کر دیا) (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: (اے ایمان والو! موت کھاؤ سود دونے دونا اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو) (آل عمران: ۱۳۰)۔

عام حالات میں سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہے، اگر کوئی شخص واقعی اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہو، لیکن اس کے معاشی حالات اس تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہ ہوں تو خواہ وہ بیرون ملک تعلیم کے لئے جائے یا اندرون ملک اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ آج کل اعلیٰ تعلیم بھی انسان کی ضرورتوں میں شامل ہے، اور فقہاء کرام نے ضرورت کے وقت محظورات کی اجازت دی ہے۔

”الضرورات تبیح المحظورات“ (الاشباہ والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر یزال)۔

اسی طرح فقہاء نے ضرورت کے وقت سودی قرض لینے کی بھی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ”یحوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (البحر الرائق: باب الربا، الاشباہ والنظائر: ۱۱۵) (ضرورت مند کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت ہے)۔ اسی طرح علماء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ کبھی کبھی حاجت کو بھی ضرورت کا درجہ دے دیا جاتا ہے خواہ یہ حاجت عمومی ہو یا خصوصی۔

”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة“ (الاشباہ والنظائر: القاعدة الخامسة: الضرر یزال)۔

لہذا اگر عصری علوم و فنون کی ضرورت کو شرعی ضرورت کے زمرہ میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے، شرعی حاجت کے قبیل سے تو ضرور ہو سکتا ہے، اور شرعی حاجت بھی بسا اوقات ضرورت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، موجودہ زمانہ کے حالات اور تقاضہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ عصری علوم و فنون کی ضرورت شرعی ضرورت نہیں تو شرعی حاجت میں ضرور داخل ہے، اور اس حاجت کو اس علوم کی عمومی و خصوصی ضرورتوں کے پیش نظر شرعی ضرورت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

قرض کے جواز اور عدم جواز کا تعلق طالب علم کے معاش سے ہے یا اس کے والد سے؟

بچے کی پیدائش سے بلوغ تک کے سارے اخراجات اس کے والد پر ہوتے ہیں لیکن بلوغ کے بعد شرعاً باپ پر اس کا نان و نفقہ اور دیگر

اخراجات واجب نہیں ہوتے (مگر جب بالغ مذکر اولاد کسی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو) اسی لئے باپ پر بالغ مذکر اولاد پر صدقہ فطر اور قربانی واجب نہیں ہے (البدائع ۷۰۲، الدر المختار مع الشامی ۲۸۵/۳)۔

اور زکوٰۃ کے جواز اور عدم جواز کے مسئلہ میں بھی باپ کی مالدار کی اعتبار نہیں کیا جاتا، اگر باپ مالدار ہو اور اس کی مذکر بالغ اولاد غریب ہو تو اس کے لئے زکوٰۃ کی رقم حلال ہو جائے گی اور اس کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور فقہاء نے اس صورت میں باپ کے مالدار ہونے کی وجہ سے اس کی اس اولاد کو مالدار نہیں سمجھا۔ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

”اب الطفل يعد غنيا بغني أبيه، بخلاف الكبير فانه لا يعد غنيا بغني أبيه“ (حاشیہ ابن عابدین ۳۲۷۰)۔

(نابالغ بچہ اس کے باپ کے مالدار ہونے سے مالدار سمجھا جاتا ہے، برخلاف بڑی اولاد کے وہ باپ کے مالدار ہونے سے مالدار نہیں سمجھا جاتا۔)

فقہاء کی ان تشریحات کی روشنی میں طالب علم کی معاشی حالت اس لائق نہ ہو کہ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکے، لیکن اس کے والد کے پاس اتنی استطاعت موجود ہو اور اب تک کے جملہ اخراجات اس کے والد برداشت کر رہے تھے تو ایسی صورت میں اس طالب علم کے لئے اس قرض اسکیم سے استفادہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ سودی قرض بوقت ضرورت شدیدہ (جب کہ اس کا کوئی دوسرا متبادل موجود نہ ہو) لینے کی اجازت ہوتی ہے اور یہاں چونکہ والد کو استطاعت ہے اور اب تک اپنے لڑکے کے سارے اخراجات برداشت کر رہے تھے، اس لئے اس شخص کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

طالب علم یا والد کے صاحب استطاعت ہونے کے باوجود قرض اسکیم سے استفادہ:

یہ بات گذر چکی ہے کہ تعلیم کے نام پر جو قرض جاری ہوتا ہے اگرچہ اس میں شرح سود عام قرضوں کے بالمقابل کم ہوتی ہے، لیکن وہ بھی درحقیقت سود ہی ہے، اس لئے عام حالات میں اس قرض سے استفادہ کی اجازت نہیں ہے اور خاص طور سے جب لینے والا صاحب استطاعت ہو تو اس کے لئے تو کسی طرح بھی جائز نہیں ہوگا۔



## جدید تعلیم اور تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مولانا محمد ارشد فاروقی

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر:

جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر بہت نمایاں اور واضح ہے:

علامہ شامی فرماتے ہیں: علم حاصل کرنا فرض عین اور فرض کفایہ ہے، فرض کفایہ جن علوم کا حاصل کرنا ہے وہ ہر وہ علم ہے جس کے بغیر نظام دنیا رواں دواں نہ ہو سکے جیسے طب، حساب، نجوم، لغت، کلام، فن قرأت و تجوید، اسناد حدیث، تقسیم وصیت، میراث، کتابت، معانی، بدیع، بیان، اصول، ناسخ و منسوخ کی شناخت، عام و خاص نص و ظاہر کی واقفیت درحقیقت یہ علوم تفسیر و حدیث کے علوم کے لئے ذریعہ و وسیلہ ہیں، مزید برآں فرض کفایہ آثار و اخبار اور فن رجال بھی ہے صحابہ کے ناموں اور ان کی خصوصیات کی آگہی اور روایت کے باب میں عدالت کی جانکاری ضعیف و قوی میں امتیاز اسی طرح صنعتوں کے اصول اور کاشت کاری، کپڑے کی صنعت، پچھنہ لگانے کا فن (رد المحتار علی الدر المختار ۱۲۲، دارالکتب دیوبند)۔

جن علوم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے ان کا مفصل بیان اور فہرست عبارت بالا سے معلوم ہوتی ہے جسے ان الفاظ میں تعبیر کر سکتے ہیں کہ ان تمام علوم کا حاصل کرنا اور ان میں مہارت پیدا کرنا فرض کفایہ ہے، جن علوم کی ضرورت دنیوی نظام چلانے باقی رکھنے اور بڑھانے میں پڑتی ہے۔

قرآن و حدیث کے اعلیٰ علوم کے حصول کے لئے نحو و صرف، لغت، قرأت، معانی و بدیع اور بیان کا حصول ذریعہ و وسیلہ کے طور پر فرض کفایہ ہے جس کا مطلب عالم دین فقہی قاری محدث بننا فرض کفایہ ہے۔

اسی طرح طبیب و معالج اور ڈاکٹر بننا فرض کفایہ ہے اور آج کے دور میں طبی دنیا نے جس قدر علمی ترقی کی ہے وہاں تک پہنچنا اور اس فن کو مزید ترقی دینا فرض کفایہ ہے تاکہ مریضوں کا علاج کیا جاسکے اور جو امراض اور علاج قرار دیئے گئے ہیں ان کا علاج ان نصوص کی روشنی میں تلاش کیا جاسکے جن میں بتایا گیا ہے کہ موت کے علاوہ ہر مرض کا علاج ہے۔

محاسب بننا فرض کفایہ ہے ان فنون علم حساب نے ترقی کی ہے اور یہ مستقل فن اور پیشہ کے طور پر متعارف ہے اس لئے سی اے (CA) کا کورس کرنا فرض کفایہ ہے کاشت کاری بھی فرض کفایہ میں داخل ہے، انگریزی کلچر نے بھی خاصی ترقی کی ہے اس لئے اس فن کی مہارت بھی بطور فرض کفایہ مطلوب ہے۔

حیا کہ: کپڑا بنانا یا ایسا پیشہ ہے جس کی کئی قسمیں اور مراحل ہیں گھر کے پاور لوم سے لے کر بڑے بڑے کارخانے اسی مقصد کے لئے مشغول عمل ہیں، اور ٹیکسٹائل انڈسٹری وجود میں آچکی ہے اس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے والے نصاب اور کورس کا مکمل کرنا اور ایسی مہارت حاصل کرنا کہ مارکیٹ کی مطلوبہ مانگ کے مطابق ڈیزائن و تیاری کو ممکن بنانا اور مارکیٹ پر چھا جانے کی لیاقت پیدا کرنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

دنیاوی ان تمام علوم میں جن کی انسانیت کو ضرورت ہے مہارت و حذاقت پیدا کرنا اور اس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا دنیا بھر کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشی معیار کو بلند کرنے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے بحیثیت امت مسلمہ کے اجاگر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مسلم نسل کو دنیاوی علوم کی اعلیٰ تعلیم دی جائے اور فرض عین سے غفلت نہ برتی جائے۔

امام غزالی نے علم کی دو قسمیں کی ہیں: ایک فرض عین جو اعتقاد، فعل اور ترک کے اعتبار سے ہر مسلمان پر لازم ہے یعنی اللہ کے وجود کا اعتقاد رکھنا، اس نے جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے اس کو کرنا اور جس سے منع کیا ہے اس کو ترک کرنا۔

اور دوسری قسم فرض کفایہ ہے یہ وہ علم ہے جو دنیا کے نظام کو درست رکھنے کے لئے ضروری ہے اس سے کوئی چارہ کار نہیں ہے جیسے طب، اس لئے کہ وہ بدن کو

صدر شعبہ افتاء جامعہ امام النور دیوبند، سہارنپور (پوپی)۔

باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے اور جیسے حساب کہ وہ معاملات و وصایا اور میراث کی تقسیم کے لئے ضروری ہے (الاحیاء ۱۵۱)۔

امام غزالی کے نزدیک تعلیم کی سب سے اعلیٰ غرض و غایت اللہ تعالیٰ اور اس کے امر و نہی کی معرفت ہے، اس لئے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اس کی معرفت پر موقوف ہے اور ان میں سے جن کا تعلق دنیا کے علوم سے ہے جن کو زندگی کی بقائیں دخل ہے، وہ بھی ضروری و لازم ہوں گے، خواہ اصل ہوں یا خادم، یا تحسین و تزئین کرنے والے۔

اس مفہوم کی دوسری تعبیر علوم عالیہ اور علوم آلیہ ہے علم مقصود اور علم ذرائع و ذوں کی تحصیل ضروری ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک تعلیم ضروری ہے اس لئے کہ اس سے عقلی ملکہ پیدا ہوتا ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے دین و دنیا کے امور میں تصرف کرتا ہے انکی وجہ سے انسان حیوان سے ممتاز ہوتا ہے وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں: "انسان کے لئے نفس ناطقہ صرف بالقوہ ہوتا ہے اور وہ پہلے پہل قوت سے فعل کی طرف علوم و ادراکات کے محسوسات سے علاحدگی کے ذریعہ پھر اس کے بعد نظری قوت سے حاصل کردہ علوم کے ذریعہ منتقل ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ بالفعل ادراک اور عقل محض بن جاتا ہے اس وقت وہ ایک روحانی ذات میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور اپنے وجود کی تکمیل کر لیتا ہے، لہذا یہ ضروری ہے کہ علم و نظر کی ہر قسم سے اسے بحیثیت ایک بے مثال عقل کے فائدے پہنچے، فنون، ہمیشہ اس سے مستفاد ہوں اور اس کے ملکہ سے ایک ایسا علمی قانون ظہور میں آئے جو اس ملکہ سے مستفاد ہو (مقدمہ ابن خلدون ۳۵۹)۔

یہی وجہ ہے کہ بہتر تجربہ، فنی ملاقات اور کامل تہذیب عقل کے لئے مفید ہیں، کیونکہ یہ ایسے امور کا مجموعہ نہیں جن میں تدبیر منزل اپنے ہم جنسوں کے ساتھ معاشرتی رویہ، ان سے ربط و تعلق کے طریقہ کا حصول، پھر امور دین کی انجام دہی، ان سے متعلق آداب و شرائط سب شامل ہیں، یہ سب کے سب ایسے قوانین ہیں جن سے علوم کی تشکیل ہوتی ہے اور ان کے ذریعہ عقل میں اضافہ ہوتا ہے (مقدمہ ابن خلدون ۳۵۹)۔

ابن خلدون کی یہ تشریح تحصیل علوم کا ایک جامع منصوبہ پیش کرتی ہے یہ واضح حقیقت ہے کہ اسلام نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے علم کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہے پھر علم کی فرضیت دو طرح کی بتائی گئی ہے ایک فرض عین دوسری فرض کفایہ دونوں کی تفصیلات کی توضیح مشہور علماء اسلام کی تحریروں کے ذریعہ کی گئی۔

البتہ علم کے باب کی موجودہ صورت حال طرح طرح کی مشکلات پیدا کر رہی ہے عملی طور پر علم کی دوئی کے فلسفہ کو قبول کر لیا گیا ہے کہ دینی تعلیم کے مراکز مستقل وہاں عصری علوم کا ذکر نہیں اور عصری تعلیم کے مراکز علاحدہ جہاں مبادیات دین سے بھی بے اعتنائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اور دانشور کے دو طبقے وجود میں آئے اور دونوں کے مابین کشمکش شروع ہوئی اور جاری ہے۔

جبکہ ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم کو دوئی سے محفوظ رکھا جائے دین کا وہ علم جس کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اس مقدار میں ہر مسلمان شہری کو یہ علم حاصل کرنے کے مواقع پیدا کئے جائیں۔

اس کے بعد فرض کفایہ علوم میں سے جس علم کا انتخاب طالب علم کے سرپرست یا خود طالب علم کرے یا منصوبہ بندی کے ذریعہ جن علوم کے ماہرین کی ضرورت ہو اس علم کا تخصص و ماہر تیار کیا جائے۔

جب تک جامع منصوبہ بند تعلیمی نظام برپا نہیں ہوتا اس وقت تک دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے عصری علوم سکھانے کا نظم اس انداز میں کیا جائے گا کہ وہ مبادیات سے واقف ہو سکیں تاکہ احوال زمانہ سے بھی وہ باخبر رہ کر دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

عصری علوم حاصل کرنے والوں کے لئے دینی علوم کے مبادیات و اصول سکھانے کا انتظام کیا جائے، تاکہ معرفت الہ انہیں حاصل ہو سکے اور عبادات کی انجام دہی ممکن ہو سکے۔

ملت اسلامیہ ہند یہ کا طاقتور تعلیمی بورڈ پورے ملک اور ملت کا نقشہ سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے کہ ملت کو کن علوم کے ماہرین کی کس مقدار میں ضرورت ہے اس کے مطابق دینی و عصری علوم کے ماہرین تیار کئے جائیں یہ ملت اسلامیہ ہند یہ کے ذمہ شرعی ذمہ داری ہے اور فرض کفایہ کی ادائیگی ہے۔

۲۔ اسلامی شریعت نے سود کو معاشرے میں برپا کرنے والی تباہ کاریوں کی بنیاد پر حرام قرار دیا ہے، جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، اور محقق علماء بینک کے سود کو بھی سود اور ربا کا مصداق مانتے ہیں۔

البتہ فقہاء نے بہ وقت ضرورت سودی قرض لینا جائز قرار دیا ہے (دیکھئے: جدید فقہی مسائل ۳۱۶)۔

علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں: ”ویجوز للمحتاج الإستقراض بالربح“ (الاشباہ والنظائر ۱۱۵) (ضرورت مند کے لئے نفع کے ساتھ قرض حاصل کرنا درست ہے)۔

فقہاء نے ضرورت مند کے لئے سود پر قرض لینے کی اجازت دی ہے اور ضرورت میں کھانا، کپڑا اور مکان شمار کیا ہے۔

جب شخصی ضرورت کے لئے سود پر قرض لینے کی گنجائش رکھی ہے تو ہم صورت مسئلہ کو سامنے رکھ کر چند امور کی صراحت کریں گے:

۱۔ انسان کی زندگی کے لئے تعلیم سب سے بڑی ضرورت ہے جو کھانا کپڑا اور مکان سے زیادہ ضرورت ہونے میں فائق ہے روٹی کپڑا مکان ایک وقتی ضرورت ہے تو تعلیم دائمی ضرورت ہے۔

۲۔ اعلیٰ عصری تعلیم کا تعلق جہاں فرد سے ہے وہیں اس کا تعلق معاشرہ، سماج اور اجتماعیت سے ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ترقی و ترقی میں تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

امور بالا کے پیش نظر مسلم طالب علم جو اعلیٰ عصری تعلیم کے لئے کوشاں ہے اور غربت و افلاس کے باعث وہ بینک سے سود پر قرض لینا چاہتا ہے تو خود اس طالب علم کی ضرورت اور امت اسلامیہ ہندیہ کی اجتماعیت کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اجازت ہونی چاہئے۔

پھر تعلیم کے لئے بینک سے سودی قرض لینے میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ملک کے ہر شہری کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے جب حکومت اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتی اور بینک سے نقلی قرض دے رہی ہے تو طالب علم اسے اپنا حق سمجھ کر لے سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود قرض کو سودی سمجھتے ہوئے بر بنائے ضرورت جائز سمجھئے (مزید وضاحت کے لئے دیکھئے: جدید فقہی مسائل ص ۴۱۷)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب لکھتے ہیں: ”اس معاملہ کی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے“ (نظام الفتاویٰ ص ۲۶۳)۔

فقہاء و مفتیان کرام کی ان عبارتوں سے مسئلہ کی تصویر سامنے آتی ہے چونکہ عالمی نظام سودی بینک سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ سر دست اس سے چھٹکارا کی کوئی صورت نہیں ہے، اس لئے اس میں رائج سودی نظام کو صراحتاً سود ماننا اور حرام گردانا مقاصد شریعت کا تقاضا ہے ضرورت کی بنیاد پر جواز کا فتویٰ دینا بھی تقاضا شریعت ہے۔

تعلیمی قرض لینے والا اس قرض کو جو سود پر لے رہا ہے اسے سود چارج یا اجرت خدمت پر محمول نہ کرے بلکہ سود ہی سمجھے اور ضرورت کی بنیاد پر لینا درست سمجھے، اسی کے ساتھ غیر سودی نظام معیشت کو رواج دینے کے لئے حسب استطاعت کوشاں رہے۔

۳۔ اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، تفصیلات جواب ۲ میں گذر گئیں۔

۴۔ فقہاء نے نفقہ کے باب میں بالغ لڑکے کا نفقہ والد کے ذمہ نہیں رکھا ہے، ہدایہ میں ہے: ”ونفقة الأولاد الصغار علی الأب“ (ہدایہ ۲، ۲۲۲)۔

اس لئے اگر طالب علم صاحب استطاعت نہیں ہے اور باپ صاحب استطاعت ہے تو فقہی اور قانونی طور پر یہ طالب علم تعلیمی قرض لینے کا مستحق ہے، کیونکہ اس کے نان و نفقہ کا ذمہ دار اس کا والد نہیں ہے۔

لیکن اخلاقی طور پر باپ جو صاحب استطاعت ہے اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کرے، اور معاشرے میں اخلاقی صورت رائج بھی ہے باپ بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے فکر مند رہتا ہے تو اس صورت میں بیٹے کو بینک کے سودی قرض سے بچائے۔

قرض کے جواز و عدم جواز کا تعلق طالب علم کے اپنے ذاتی احوال کے اعتبار ہی سے ہوگا۔

۵۔ طالب علم اور اس کے والد کے صاحب استطاعت ہونے کے باوجود اپنا پیسہ اعلیٰ تعلیم کے مد میں صرف نہیں کرنا چاہتے بلکہ تعلیمی قرض بینک سے لینا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے حالات کا تجزیہ خود کرنا ہوگا، اگر اپنی رقم کو محصولات و ٹیکس سے بچانا مقصود ہو یا اصل پونجی ظاہر کرنے کی صورت میں مضرات و خطرات کا سامنا ہو تو تعلیمی قرض لینا درست ہوگا۔

عام حالات میں صاحب استطاعت ہوتے ہوئے سودی قرض لینا درست نہیں ہوگا، ”الضرورة تقدر بقدر الضرورة“ ☆☆☆

## اعلیٰ عصری علوم اور قرض کا حصول

مولانا محمد ممتاز خاں ندوی

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں شریعت کا نقطہ نظر:..... علم کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں: ۱۔ علم دینی، ۲۔ علم دنیوی۔  
علم دینی:

علم دین ایک مسلمان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے، بغیر علم دین کے آدمی کا مشیت خداوندی کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہے، سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی اس کا تعلق علم سے ہی ہے۔

”إقرا یا سمر ربك الذی خلق... الخ“ (سورہ بقرہ: ۱۲۹) (اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو، جس نے (عالم کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

سورہ زمر میں ہے: ”قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون“ (سورہ زمر: ۹) کہو، بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں، اور جو نہیں رکھتے ہیں، دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

سورہ طہ میں ہے: ”قل رب زدنی علما“ (طہ: ۱۱۴) (اور دعا کیا کرو کہ میرا پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے)۔

اللہ کے رسول ﷺ نے علم دین کے حصول پر بہت زیادہ زور دیا ہے، اور اتنے علم کا سیکھنا جس سے وہ بہ آسانی احکام خداوندی کو بجالائے فرض قرار دیا ہے، طلب العلم فریضة علی کل مسلم (ابن ماجہ باب فضل العلم والبحث علی طلب العلم) (علم کا طلب کرنا ہر مسلمان ہر فرض ہے)، ارشاد نبوی ہے:

”من سلك طریقاً یلتمس فیہ علماً سهل اللہ لہ طریقاً الی الجنة“ (مسلم: فی کتاب الذکر والدعاء باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن) (جو علم کے راستے میں نکلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں)، آپ ﷺ نے فرمایا: ”فضل العالم علی العابد کفضلی علی من أدناکم ثم قال رسول اللہ ﷺ: إن اللہ وملائکته وأهل السموات والأرضین حتی النملة فی حجرها وحتى الحوت لیصلون علی معلم الناس“ (ترمذی العلم: باب فضل الفقہ علی العبادة)۔ (عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کم تر شخص پر، بے شک اللہ تعالیٰ فرشتے، آسمان، اور زمین والے، یہاں تک کہ چوئیاں اپنے سوراخ میں اور مچھلیاں لوگوں کو خیر سکھانے والے کے لئے دعا کرتی ہیں)، نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ”من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل اللہ حتی یرجع“ (ترمذی العلم: باب فضل طلب العلم) (جو علم کی طلب میں نکلتا ہے تو وہ اللہ کے راستے میں ہوتا ہے یہاں تک کہ لوٹ آئے)۔

علم دنیوی:

علماء کرام اور اسلام نے علم دنیوی کو شجر ممنوعہ نہیں قرار دیا ہے، بلکہ عالم دنیوی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور ان کی توصیف فرمائی ہے، البتہ دنیوی علوم فرض، واجب کے دائرہ میں تو نہیں بلکہ ان کی حیثیت فضیلت اور تطوع کی ہوگی، ایک شخص علم دینی جو اس کے لئے ضروری ہے نہ سیکھے تو گنہگار ہوگا، لیکن اگر علم دنیوی مثل علم طب، سائنس، انجینئرنگ وغیرہ نہ سیکھے تو گنہگار نہیں ہوگا، علم دنیوی کے سلسلہ میں کچھ دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ سنن ابوداؤد کی روایت ہے: ”عن عبد اللہ بن عمرو أن رسول اللہ ﷺ قال: العلم آية محكمة أو سنة قائمة أو

مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور، رائے بریلی۔

فريضة عادلة وما سوى ذلك ذلك“ (رواه ابوداؤد)۔

(عبداللہ ابن عمرو سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم کی تین قسمیں ہیں: آیت محکمہ، سنت قائمہ، فریضہ عادلہ یعنی وراثت کی منصفانہ تقسیم، اس کے علاوہ فضیلت اور تطوع کی چیزیں ہیں)۔

اس حدیث کے ذیل میں صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں: ”وما كان سوى ذلك كعلم الحروض والطب والهندسة والهيئة والميقات فهو فضل“ (مرقاۃ ۱: ۲۵۶) (اور جو علوم ان کے علاوہ ہیں، جیسے علم عروض اور علم طب، انجینئرنگ، اور علم نجوم تو ان کی حیثیت تطوع اور فضیلت کی ہوگی)۔  
۲۔ ہندیہ جو فقہ حنفی کا دائرۃ المعارف ہے، اس میں ہے:

علم کا طلب کرنا فرض ہے، اور جس علم کی ایک آدمی کو ضرورت پڑتی ہے، اس کا سیکھنا فرض ہے، جیسے وضو اور نماز کے احکام، نماز اور شرعی چیزوں کا علم، رہا معاشی امور کا علم اور اس کے علاوہ چیزوں کا علم تو یہ فرض نہیں ہے، تو اگر کوئی ان علوم کو سیکھے، تو افضل ہے، اور اگر کوئی ان کو چھوڑ دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، اسی طرح سراجیہ میں ہے (ہندیہ ۳۷۷/۵)۔

۳۔ حضرت علی نے فرمایا: ”العلوم خمسة، الفقه للاديان والطب بالابدان والهندسة للبنيان والنحو للسان والنجوم للزمان“ (مفتاح السعادة ۱: ۲۶۷)۔

(مقصدی علوم پانچ ہیں: فقہ مذہب کو سمجھنے کے لئے، طب جسمانی علاج کے لئے، انجینئرنگ تعمیر کے لئے، قواعد و نحو زبان دانی کے لئے، اور علوم نجوم وقت کی تحقیق کے لئے)۔

۵۔ حضرت امام شافعیؒ سے نقل کیا گیا ہے: ”العلم علمان علم الفقه للاديان وعلم الطب للابدان“ (مفتاح السعادة ۱: ۲۶۷) (علم دو طرح کے ہیں: ایک فقہ کا علم ہے مذہب کو جاننے کے لئے، اور دوسرا طب کا علم ہے جسموں کے علاج کے لئے)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم دین جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، اس کے حصول کے بعد علم دنیوی کا حصول افضل اور تطوع کے درجہ میں ہے، ہمارے اسلاف نے علم دنیوی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اس کی توصیف فرمائی ہے۔

جدید اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کا رویہ:

اتحادی علم جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، اس کو حاصل نہ کر کے جدید علوم کی طرف توجہ دینا جائز نہیں ہے، اور یہ چیز مسلمان کے لئے زہر آلود ہے، حضرت مولانا عبدالرحیم لاچپوریؒ فرماتے ہیں:

”دینی تعلیم سے اعراض کر کے اور دینی مدارس کو چھوڑ کر دنیوی تعلیم میں منہمک ہو جانا اچھا نہیں ہے، خدائے پاک کو ناراض کرنے کے مرادف ہے، قرآن پاک میں ہے: ”بل تؤولون الحياة الدنيا والآخرة خیر وأبقى“ (بلکہ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ دنیا کے مقابلہ آخرت اچھی اور سدا باقی رہنے والی ہے) (فتاویٰ رحیمیہ ۳۵/۳)۔

لیکن علم دین جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، اس کے حصول کے بعد دنیوی علوم مثلاً سائنس، طب، انجینئرنگ، وغیرہ کی تعلیم فضیلت اور تطوع کے درجہ میں ہوگی بلکہ چونکہ یہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے، دنیوی علوم سے ناواقفیت سے ایک شخص زندگی کے میدان میں پیچھے سمجھا جاتا ہے، اور تصور کیا جاتا ہے کہ ایسا شخص زمانہ کی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے، اور ایسا شخص دوسری قوم میں جو جدید اعلیٰ تعلیم میں معراج کو پہنچی ہوئی ہیں، احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔

اس وجہ سے ایک مسلمان کے لئے جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی ضروری ہوگا، تاکہ مسلمان زندگی کے میدان میں پیچھے نہ رہے، اور احساس کمتری کا شکار نہ ہو، اور اس کے معاش کا مسئلہ بھی کسی قدر حل ہو جائے۔

۲۔ جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بینک کا قرض، شرعی نقطہ نظر:

احقر کی رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بینک کے قرض جس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ ہر سال میں اصل رقم کے ساتھ کچھ



مزید رقم دینی ہوگی، اس کو سروس چارج پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ اس قرض میں سودی تعریف صادق آ رہی ہے، پہلے ہم ربا (سود) کی تعریف کرتے ہیں تاکہ اصل مسئلہ سمجھنے میں ہی آسانی ہو۔

۱۔ علامہ شامی نے ربا کی تعریف بایں الفاظ کی ہے: ”شرعاً: فضل مال بلا عوض فی معاوضۃ مال بمال“ (ردالمحتار ۳، ۱۹۶) (مال کے مال سے معاوضہ کے وقت بلا عوض زائد مال)۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ”کل قرض جر نفعاً حرام إذا کان مشروطاً“ (ردالمحتار ۳، ۱۹۳) (ہر وہ قرض جو نفع لائے حرام ہوگا، بشرطیکہ وہ مشروط ہو)۔

مذکورہ تمام تعریف کا حاصل یہ ہے کہ بغیر عوض اصل رقم کے ساتھ مزید رقم کی ادائیگی کی شرط رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بینک طالب علم کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے جو قرض دے رہا ہے، اور ہر سال اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم کی ادائیگی کی شرط لگا رہا ہے، یہ سود ہے، اور سود خواری کی نفسیات یہی رہی ہے کہ پہلے قرض دو تاکہ لوگ ہنسی خوشی نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اسے لے لیں، اور جب وقت پر ادا نہ کر سکیں تو زائد ادائیگی کی شرط پر مہلت دے دو، زمانہ جاہلیت میں ربا کا یہی طریقہ زیادہ مروج تھا، جسے ربانسیہ سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

”ثم اذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فان تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به“ (تفسیر کبیر ۷، ۹۱)۔

(پھر جب دین کی ادائیگی کا وقت آ جاتا ہے، تو قرض دینے والے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتے، اب اگر اس کے لئے ادا کرنا مشکل ہوتا تو رقم میں بھی اضافہ کر دیتے، یعنی زائد رقم کا مطالبہ کرتے، اور مہلت بھی دیتے، ربا کی یہ صورت ہے جو زمانہ جاہلیت میں مروج تھا)۔

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ سرکاری بینک سے قرض پر لی جانے والی زائد رقم سود میں داخل ہے، اور سود کا لینا بھی حرام ہے، اور دینا بھی۔

اگر بینک سالانہ اضافہ نہ کر کے، قرض دیتے وقت ایک لخت حساب لگا کر ٹھیک ٹھیک کچھ رقم دفتری کاغذات، قلم، دوات اور دیگر امور کی انجام دہی کے لئے متعین کر دے خواہ وصولی قسط وار کی جائے، اس کو سروس چارج پر محمول کیا جاسکتا ہے، اس کی تائید در مختار کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے:

”يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق أو المحاضر أو السجلات قدر ما يجوز لغيره كالنفسي“ (در مختار ۶، الرد ۱۲۷) (قاضی وثیقہ لکھنے اور محضر وغیرہ کے لکھنے پر اس قدر اجرت کا مستحق ہوگا، جو دوسرے کو جیسے قاضی کو دی جاتی ہے)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کی اس عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ”قرض جاری کرنے اور اس کا حساب کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرض داروں سے بطور ”سروس چارج“ کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئے ہیں“ (فقہی مقالات ۲۷۰/۱)۔

۳۔ طالب علم جس کی معاشی حالت کمزور ہے جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بینک سے قرض لینا:

پہلے بیان کیا گیا ہے کہ بینک کا قرض یہ سودی قرض ہے، سودی قرض عام حالات میں لینا جائز نہیں ہے، بلکہ فقہاء کرام نے ضرورت و حاجت کے وقت سودی قرض کی اجازت دی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت، حاجت کی تعریف کر دی جائے، علامہ حموی نے فتح القدیر کے حوالہ سے پانچ درجے قائم کئے ہیں، اور ہر ایک کی تعریف کی ہے: ضرورت، حاجت، منفعت، زینت، فضول۔

۱۔ ضرورت: یہ ہے کہ اگر ایک شخص ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے گا، تو وہ ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا، یہی صورت اضطرار کی ہے، اس حالت میں حرام اور ممنوع چیز کا استعمال (چند شرائط کے ساتھ) جائز ہو جاتا ہے۔

”فالضرورة بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك إذا قاربه وهذا يبيح تناول الحرام“ (غمز عیون البصائر شرح اشباہ والنظائر ۱، ۲۷۷)۔

۲- حاجت: یہ ہے کہ اگر وہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہوگا، مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی، یہ صورت اضطرار کی نہیں، ایسی حالت میں بہت سے احکام میں رعایت اور سہولت رکھی گئی ہے:

”والحاجة كالجائع الذي لو لم يجد ما يأكله لم يهلك غير أنه يكون في جهد ومشقة وهذا لا يبيح الحرام ويبح الفطر في الصوم“ (ایضاً)۔

۳- منفعت: یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال کرنے سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا، لیکن نہ کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاک کا خطرہ نہیں، جیسے عمدہ قسم کے کھانے، اور مقوی غذائیں، اس حالت کے لئے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے، نہ روزہ افطار جائز ہوتا ہے، مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہو سکیں تو استعمال کرے، اور نہ حاصل ہو سکیں تو صبر کرے۔

”والمنفعة كالذي يشتهي خبز البر ولحم الغنم والطعام دسم“ (ایضاً)۔

زینت: جس سے بدن کو کوئی خاص تقویت بھی نہیں، محض تفریح خواہش ہے، ظاہر ہے اس کام کے لئے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ”والزينة كالشمعة الحلوى والسكر“ (ایضاً)۔

فضول: زودہ ہے جو زینت مباح کے دائرہ سے بھی آگے محض ہوس ہو، اس کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کے لئے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے، اس فضول کی مخالفت احادیث صحیح میں وارد ہے۔

جدید تعلیمی تعلیم کا حصول، اضطرار اس وجہ سے نہیں ہے کہ اگر جدید تعلیمی تعلیم حاصل نہ کی جائے، تو طالب علم نہ ہلاک ہوگا، اور نہ موت سے قریب ہوگا، اور نہ اعلیٰ تعلیم کا حصول حاجت میں سے ہے، کیونکہ اگر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی جائے تو شدید تکلیف میں مبتلا نہیں ہوگا۔

۴- باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے لڑکے کے صاحب استطاعت ہونے کا مسئلہ:

باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے لڑکا جس کے پاس کچھ مال نہیں ہے، کیا وہ صاحب استطاعت سمجھا جائے گا۔

فقہ کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر باپ صاحب استطاعت ہے، اور لڑکا نابالغ ہے تو باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے نابالغ لڑکا بھی صاحب استطاعت سمجھا جائے گا، اور اگر لڑکا بالغ ہے، تو باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بالغ لڑکا صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، اس سلسلہ میں کچھ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

۱- در مختار میں ہے: ”ولا إلى طفله بخلاف ولده الكبير“ (در مختار مع الرد ۲، ۲۰۲)۔

اور باپ اپنے نابالغ بچے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، البتہ اپنے بالغ لڑکے کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

علامہ شامی نے اس پر بیوٹ چڑھایا ہے: ”إن الطفل يعد غنيا بغني أبيه بخلاف الكبير فإنه لا يعد غنيا بغني أبيه“ (شامی ۲، ۲۰۲) (بے شک بچہ اپنے والد کی مال داری کی وجہ سے مال دار سمجھا جائے گا، برخلاف بالغ لڑکے کے کہ یہ باپ کی مال داری سے مال دار نہیں سمجھا جائے گا)۔

۲- ہندیہ میں ہے: ”ولو كان كبيراً فقيراً جاز“ (ہندیہ ۱۰، ۱۸۹)۔ اگر بالغ لڑکا فقیر، تو باپ لڑکے کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

بالغ لڑکا باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے اگر وہ فقیر ہے تو وہ صاحب استطاعت تو نہیں سمجھا جائے گا، لیکن اس کے لئے بینک کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ سودی قرض ہے، جیسا کہ واضح کیا گیا کہ سودی قرض بغیر ضرورت اور حاجت کے جائز نہیں ہے، اور اعلیٰ تعلیم کا حصول یہ نہ ضرورت میں ہے اور نہ حاجت ہی ہے۔

۵- طالب علم یا والد کے صاحب استطاعت ہونے کے باوجود بینک سے سودی قرض لینا:

سوال نمبر ۲ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بینک جو اعلیٰ تعلیم کے لئے قرض دیتا ہے یہ سودی قرض ہے اور سودی قرض بغیر ضرورت اور حاجت کے جائز نہیں ہے، اس میں طالب علم یا والد کے صاحب استطاعت ہونے یا نہ ہونے کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض اور احکام

مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی آواپوری علیہ

۱۔ تعلیم و تربیت دراصل انسانی معاشرہ کو با مقصد زندگی کی طرف گامزن کرنے اور اس کے مختلف عناصر کو مقصدیت کی روح سے آشنا کرنے اور انسانی وحدت کے وسائل کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنے کی ایک مثبت کوشش کا نام ہے، تاکہ کسی بھی معاشرہ کے افراد میں بلا تفریق ذمہ داری کا صحیح احساس پورے توازن کے ساتھ پایا جائے، اور یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں ہے کہ سب سے پہلے اسلام نے تعلیم و تربیت کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کو تعمیر کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی سب سے پہلی وحی میں تعلیم و تربیت کی حقیقت کو براہ راست نہایت صراحت کے ساتھ بیان فرمایا اور سورہ علق کی پہلی آیتوں میں تعلیم و تربیت اور اس کے وسائل کا ذکر یوں کیا گیا: ”اقرا باسم ربك الذي خلق... الخ“ (سورہ علق ۱-۵)۔

چنانچہ نبوت کی بنیاد بھی تعلیم پر قائم کی گئی اور خلافت کی بلند و بالا اعمارت علم کے امتیاز پر قائم ہوئی، اسلامی تہذیب و ثقافت کا دار و مدار علم پر ہے اور دنیا کی سیادت و قیادت بھی علم کے بغیر ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ عہد اسلامی کے ابتدائی دور میں صفحہ کی درس گاہ قائم ہوئی، یہ وہی صفحہ تھا جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم فرمایا تھا، اور اسی صفحہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسے علوم و فنون اور علمی حقائق و اکتشافات سے آراستہ کیا تھا جو تمام علمی میدانوں میں بعد میں آنے والے فقہاء و محدثین اور محققین، اصحاب علم و فضل کا بنیادی مرجع اور مرکزی محور رہا۔ اس درس گاہ میں تربیت پانے والے علماء محققین فقہاء و محدثین کے عمیق مطالعہ اور طویل تحقیقات و تجربات سے علم کا میدان وسیع ہوا اور اس کے مختلف شعبوں ریاضیات، فلکیات، طب، طبیعیات، جغرافیہ، فن تعمیر، سمندر، جہاز رانی کے بڑے بڑے یکتائے زمانہ اہل علم پیدا ہوئے اور اسی علمی ترقی نے یورپ کے ظلمت کدوں کو روشن کیا اور ان کے دل و دماغ اور علم کی اہمیت و ضرورت، سائنسی دریافت اور کائنات کے آثار و اسرار میں تحقیق و تدبر کے لئے تیار کیا۔

۱۔ عصر حاضر میں علوم عصریہ ”سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم“۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تعلیم کسی بھی قوم کی باعزت زندگی کے لئے شرک کی حیثیت رکھتی ہے، انفرادی طور پر بھی تعلیم ایک اہم ضرورت ہے اور اجتماعی حیثیت سے بھی، مذہب اسلام صرف دینی تعلیم ہی پر تکیہ کرنے کو نہیں کہتا بلکہ ہر نفع علم کی تحصیل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان کی تعلیم کی تحصیل کے لئے حکم فرمایا تھا:

خارجہ بن زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ زید بن ثابتؓ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی تحریر سیکھنے کا حکم دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ کی قسم مجھ کو یہودیوں پر بھروسہ نہیں ہے، کہ وہ میری طرف سے درست لکھے، زید بن ثابتؓ نے ارشاد فرمایا کہ آدھا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ میں نے یہودیوں کی تحریر خوب اچھی طرح سیکھ لی پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لکھوانا چاہتے تھے تو میں ہی آپ کا مکتوب لکھتا تھا، اور جب کہیں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مکتوب آتا تو میں ہی اس کو پڑھتا تھا (ابوداؤد ۲/۵۱۳، کتاب العلم باب فی فضل العلم، بذل الجہود ۱۵/۲۳۳)۔

”العلم علمان علم الأديان و علم الأبدان“ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۲۵، كشف الخفاء للعلوانی ۲۰۸۹)۔  
علم کی دو قسمیں ہیں: علم دین، بدن کا علم (میڈیکل کا علم)۔

امام غزالی احیاء علوم میں حضرت علیؓ کا قول نقل کرتے ہیں: علوم پانچ ہیں: علم فقہ دین کے لئے، علم طب میڈیکل کے لئے، جسم کے لئے، علم ہندسہ انجینئرنگ، تعمیر کے لئے، علم نحو زبان دانی کے لئے، اور علم نجوم وقت کے لئے۔

حضرت امام شافعی کا قول ہے: ”العلم علمان علم الطب للأبدان وعلم الفقه للأديان“ (مفتاح السعادة ۱: ۲۶۷)۔  
 (علم دو قسم کے ہیں، علم طب جسم کے لئے اور علم فقہ دین کے لئے)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلف صالحین جدید علوم و فنون کے معاملہ میں کتنے وسیع النظر واقع ہوئے تھے اور اس کی تحقیق کرتے تھے، امام غزالی اپنے دور کے ان علماء پر تنقید کرتے تھے جو صرف فقہ پڑھنے پر اکتفا کرتے تھے اور دیگر علوم و فنون باطنی و ظہری وغیرہ سے بے اعتنائی برتتے تھے۔  
 مسلمانوں کو دینی تعلیم کی طرح جدید علوم و فنون میں بھی دست گاہ اور مہارت حاصل کرنی ہوگی تاکہ مسابقت اور مقابلہ کے اس دور میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہیں۔

”عن أبي هريرة قال قال ﷺ: الكلمة الحكمة ضالة المؤمن حيث ما وجدها فهو أحق بها“ (ابن ماجه ۲: ۲۱۷)۔  
 (حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی حکمت و دانش کی بات ہے وہ مؤمن کی ہی ہے جو اس کے پاس سے گم ہوگئی تھی جہاں بھی اس کو ملے وہ اس کو اسی شوق و جذبہ سے لے لے جیسے اس کی گم شدہ چیز مل گئی ہے کیونکہ اس گمشدہ چیز کے لینے کا زیادہ حقدار وہی ہے)۔

”اللهم انى أعوذ بک من الأربع من العلم لا ينفع من قلب لا يخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعاء لا يسمع“ (ابن ماجه ۲: ۲۷۲ ابواب الدعاء باب دعاء رسول الله ﷺ)۔  
 (اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں تیری چار چیزوں سے: ۱۔ اس علم سے جو فائدہ نہ دے، ۲۔ اور اس دل سے جو اللہ کے سامنے نرم نہ ہو، ۳۔ اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو، ۴۔ اور اس دعا سے جو سنی نہ جاوے)۔

قرآن مجید میں مختلف قوموں، پیغمبروں، بادشاہوں اور بعض دوسرے اشخاص کا تذکرہ ہے، شہروں، ملکوں، پہاڑوں، سمندروں کا ذکر بھی آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ، جغرافیہ، سیر اور انساب وغیرہ کا علم سیکھنا قرآن مجید کی رو سے ممنوع نہیں ہو سکتا، اسی طرح دوسرے سائنسی علوم وغیرہ۔  
 ”عن جابر قال سمعت النبی ﷺ يقول: سلوا الله علما نافعا، وتعوذوا بالله من علم لا ينفع“ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱۳: ۵۸۷)۔

(حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ سے علم نافع طلب کرو، اور اللہ تعالیٰ سے اس علم سے پناہ مانگو جو فائدہ نہ دے)۔

۲۔ سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے، نیز حکومت کا ادعا ہے کہ اس قرض سے مقصد نفع کماتا نہیں، تو حکومت کے اس بہ بانگ دہل کے باوجود اس کم شرح سود کو سروس چارج ”اجرت خدمت“ پر محمول ہرگز نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ سود ہی کہلائے گا، اگر حکومت یہ اعلان کرتی کہ جو رقم قرض تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لئے زیادہ مدت کے لئے دے رہی ہے اس کا مقصد نفع کمانا اور سود حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ قرض سے زیادہ مزید رقم جو حکومت وصول کرے گی وہ سروس چارج ”اجرت خدمت“ ہوگی، تو بلاشک و شبہ وہ سروس چارج ”اجرت خدمت“ پر محمول کیا جاسکتا تھا، مگر یہاں ربا ہی ربا ہے، کم ہو یا زیادہ سود ہے۔

۳۔ اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے مستحمل نہیں ہیں تو ایسی صورت میں اس کے لئے اس تعلیمی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

ابن نجیمؒ نے لکھا ہے: ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشباه والنظائر ۱: ۲۹۳) (ضرورت مندوں کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہوتی ہے)۔

اصولیین کی اصطلاح میں حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف تو نہ ہو لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہو جائے۔

یہ حاجات بعض اوقات ”ضرورت“ کے حکم میں تسلیم کی جاتی ہیں اور جیسے ضرورت کی بنا پر ناجائز بہ قدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح حاجت کی بنا پر فقہاء احکام میں سہولت پیدا کرتے ہیں (الموافقات ۵۳)۔

۴۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی تحمل نہیں ہے لیکن اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو والد کو چاہئے کہ اپنے لڑکے کی تعلیمی مراحل کو آگے بڑھائیں جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو سمجھیں اور اپنے لڑکے کو خوب اعلیٰ تعلیم دلا کر آراستہ و پیراستہ کرنے میں کوئی عذر تنگ پیش نہ کریں۔

والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے لڑکے کو صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، والد کی ذمہ داری ہے کہ اپنے لڑکے کی تعلیمی مراحل کو آگے بڑھائے مگر والد اس کی طرف توجہ نہیں دیتا ہے تو پھر قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق لڑکے کے اپنے حالات سے ہوگا، اگر یہ لڑکا خود یقین کامل رکھتا ہے کہ اپنے تعلیمی مراحل کو آگے بڑھائے گا چاہے سودی قرض لے کر اپنی تعلیم کو اس کو پوری کرنے کی ضرورت پڑے، تب بھی اپنی تعلیم کو ضرور بلند و جمیل کر کے چھوڑوں گا، تو اس صورت میں اس لڑکے کے لئے بھی سودی قرض لینے کی شرعا گنجائش ہوگی (تفصیلی معلومات کے لئے دیکھئے: اسلام اور جدید معاشی مسائل ص ۸۶ تا ۸۸)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو نقصان سے بچاؤ اور دوسرے کو بھی نقصان سے بچاؤ، جو شخص کسی کو تکلیف پہنچائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نقصان سے دوچار کر دے گا، اور جو شخص کسی دوسرے سے مخالفت و دشمنی کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو مشقت میں ڈال دے گا (دارقطنی ۶۱۳، اسنادہ حسن: اخرجہ الحاکم فی المستدرک ۵۸۲، عن عباس بن محمد صحیح)۔

اسی حدیث سے یہ بات بھی المشرح ہوگئی کہ اپنے آپ کو زیور تعلیم سے لا تعلق رکھنا بھی اپنے آپ کو اور لوگوں کو اور مذہب اسلام کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے، اور یہ مجبور ہے تو شرعی نقطہ نظر سے الضرورات تیج المحظورات کے تحت بہ درجہ اولیٰ اس کو سودی قرض لے کر تعلیمی مراحل کو آگے بڑھانے کی اجازت ہے۔

۵۔ اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں تو اس صورت میں ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا شرعی نقطہ نظر سے کسی بھی حال میں جائز نہ ہوگا، درحقیقت ملک کے باشندوں کے لئے تعلیم کی فراہمی اصل میں حکومت کی ذمہ داری تھی، لیکن حکومت اس ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کر چکی ہے، تو اب خود ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر دھیان دیں، اولاد ہمارے پاس خدائے تعالیٰ کی امانت ہے، ہمیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو اس کی روحانی و جسمانی تربیت کے لئے ضروری ہے، بچہ کی پیدائش کی غرض سے حق تعالیٰ کی معرفت و اطاعت ہے اور اس کی تربیت کا مقصد دین اور روحانیت کا حاصل کرنا ہے، اولاد کو چھوٹی اور معمولی باتوں کی تعلیم دینا اور ادب سکھانا ایک صاع ”ساڑھے تین کلو غلہ“ خیرات کرنے سے بہتر ہے، حضور ﷺ نے کا ارشاد ہے: ”لان یودب الرجل ولده خیر له من ان یتصدق بصاع“ (ترمذی ۲۰۱۶) (یعنی آدمی کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے)، ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”مانحل والد ولدا من نخل أفضل من ادب حسن“ (ترمذی ۲۰۱۶) (یعنی کسی والد نے اپنی اولاد کو نیک ادب سے افضل کوئی عطیہ عطا نہیں کیا)۔



## حصول علم کے لئے سودی قرض

مفتی احمد نادر القاسمی

کیا حصول علم بنیادی ضرورت ہے؟

تعلیم حاصل کرنے کے لئے سودی قرض لینا خواہ حکومتی اداروں اور پرائیویٹ کمپنیوں کی طرف سے منظم طریقے پر یہ قرض فراہم کئے جانے کے انتظامات ہوں، یا کسی بھی بینک سے اتفاقی طور پر حاصل کر لیا جائے، یہ مسئلہ دراصل اس بات پر مبنی ہے کہ تعلیم حاصل کرنا انسان کی بنیادی ضرورت میں شامل ہے یا نہیں؟

جہاں تک خالص کتاب و سنت کی تعلیم کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں کہ ایمان باللہ کے بعد کتاب و سنت اور دین کی تعلیم اس حد تک ضروری ہے کہ ایک مسلمان کے اندر ایمان و اسلام اور حرام و حلال کی پہچان پیدا ہو جائے۔

جہاں تک عصری تعلیم کا تعلق ہے تو اس کی حیثیت زندگی گزارنے کے لئے ایک فن اور آرٹ، نیز معاش و معاد حاصل کرنے کے لئے ایک آلہ اور ہنر کی ہے، موجودہ سیاسی، سماجی، معاشی اور عالمی تناظر میں اس کی حیثیت حصول معاش کے لئے لازمی حرفت کی ہو گئی ہے۔

اگر اس پس منظر میں دیکھا جائے تب یہ بات موضوع بحث بھی بن سکتی ہے، اجتہادی طور پر اس سودی قرض کی اجازت اور عدم اجازت پر غور کیا جاسکتا ہے، اور اگر اسے صرف تعلیم کا نام دیتے ہیں تو پھر اس سودی قرض لینے کی خواہ ہم اس کا نام ”ایجوکیشنل لون“ رکھیں یا سودی قرض رکھیں اس پر گفتگو کی ضرورت نہیں ہے، ”أحل الله البيع و حرم الربوا“، خواہ کم ہو یا زیادہ اور کسی بھی نام سے لیا جائے۔

اس مختصری تمہیدی گفتگو کے بعد جو بات سپرد قلم ہیں:

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول:

شریعت اسلامی تعلیم و تعلم کے باب میں دنیوی اور اخروی دونوں اعتبار سے ”نافعیت“ کو اہمیت دیتی ہے، دنیوی اور دینی خانوں میں تعلیم کو تقسیم نہیں کرتی بلکہ اس علم کو فیوض و برکات کے صلہ میں آخرت کی جواب دہی کو پیش نظر رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ شریعت نے جا بجا علم نافع، رزق حلال اور عمل مستقبل کی اللہ تعالیٰ سے استجاء کرنے کی تلقین کی ہے۔

حصول علم میں شریعت نے مقاصد کو ضرور سامنے رکھا ہے، اور مقاصد کی روشنی میں ہی آخرت میں اس کے اجر ملنے یا نہ ملنے کی بات آئی ہے، اگر کتب حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اس کے عموم میں انسانی زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے اور رشد و ہدایت کی جانب رہنمائی کرنے، نیز صالح فکر کو پروان چڑھانے والے تمام علوم و افکار کو شامل ہے، اسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو علم دو طرح کے ہوتے ہیں:

الف۔ وہ علم جو معرفت الہی کا ذریعہ ہو اسے علم شرائع جیسے قرآن و سنت کا علم کہا جاتا ہے، اور اس کی اتنی جانکاری فرض ہے جس سے کہ انسان حرام و حلال اور دین کے واجبات و کلیات کو جان سکے۔

ب۔ وہ علوم جسے انسان نے براہ راست انبیاء سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ مرور ایام، کائنات کے مشاہدات اور تجربوں سے حاصل کیا ہے اور اسے تحریر و

فن کے قالب میں ڈھالا ہے، اسے علوم عصریہ بھی کہا جاتا ہے، یہ علوم صرف اور صرف انسانوں کو راحت پہنچانے، یا ہلاک کرنے یا پھر انسان کو نفع پہنچانے والے مواد سے بحث کرتے ہیں، دوسرے الفاظ میں کائنات میں موجود اشیاء ان کا محور ہیں، خالق کائنات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں عصری علوم یہاں تک کہ طب و علاج بھی صرف اور صرف حصول معاش سے مربوط ہو گئے ہیں، اور انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتوں کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے، اس لئے ان علوم کی حیثیت اب رزق کے وسائل کی ہو گئی ہے، زمانہ قدیم کے مقابلہ اس عہد میں معاشی جدوجہد بھی تبدیل ہوئی ہے، زمانہ قدیم میں ذرائع معاش صرف زراعتی شعبوں اور باغات تک ہی محدود تھے، مگر اب مختلف میدان ہو گئے۔

### عصری علوم اور سیاسی برتری:

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ عہد میں عصری علوم جہاں معاشی برتری اور حصول رزق سے مربوط ہیں، وہیں سیاسی برتری کا بھی ذریعہ ہیں، اگر عصری علوم اور خاص طور سے جدید ٹکنالوجی میں مجموعی طور سے مہارت کے بغیر سیاسی برتری تو دور کی بات ہے، موجودہ اقوام کے ساتھ چلنا بھی دشوار ہے، اگر مسلمان شرعی علوم کے ساتھ عصری علوم جس کی حیثیت مباح علوم کی ہے اور دنیا نے اسے ضروری قرار دے رکھا ہے، حاصل نہیں کرتے تو نہ صرف یہ کہ وہ پوری دنیا سے کٹ جائیں گے بلکہ بے حیثیت ہو جائیں گے، اور مسلم قوم کا دنیا میں بے حیثیت ہونا اسلام کی عظمت کے منافی ہے، جو دعوت دین، تبلیغ شریعت اور رسالت اسلام کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنے گا، اس لئے بھی عصری علوم سے بے اعتنائی اسلام کے روشن مستقبل کو متاثر کر سکتا ہے۔

نیز دنیا میں انسانوں کا یہ مزاج رہا ہے کہ انسان ہمیشہ یا تو اپنے سے بلند رتبہ انسان کی بات سنتا ہے یا پھر اپنے سے برابر کے آدمی کا، اگر مسلمان عصری علوم نہیں حاصل کریں گے تو دنیا ان کو اپنے سے کم تر محسوس کر کے ان کے حوالہ سے اسلام کی دعوت کو نظر انداز کر دے گی، نیز یہ کہ عصری علوم کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جس کی رہنمائی کتاب و سنت میں بھی دی گئی ہے، جیسے سیاست و خلافت، زراعت، معدنیات وغیرہ، ظاہر ہے کہ کتاب و سنت میں کسی چیز کا بیان ہونا، اس کا شرعی ہونا ہے، اس لئے بعض علوم جو اس وقت عصری کہلاتے ہیں وہ شرعی بھی ہیں۔

### ۲۔ سود کی کم شرح اور سروس چارج:

بینکوں کا عام ضابطہ یہ ہے کہ وہ کھاتہ داروں سے سروس چارج (اجرت خدمت) سالانہ علاحدہ سے وصول کرتا ہے، یا پھر کھاتہ باقی رکھنے کے لئے، ایک متعین رقم کو بینک میں چھوڑے رکھنے کو لازمی قرار دیتا ہے، اور وہ اس رقم کو سود پر لگا کر سود حاصل کرتا رہتا ہے، اور الگ سے کوئی اضافی رقم نہیں لیتا۔

لیکن جو رقم بینک قرض دیتا ہے ہر حال میں اس پر سود کی شکل میں اضافی رقم وصول کرتا ہے، خواہ اس کی شرح جو بھی ہو، حکومت اور بینک کا یہ دعویٰ کہ اس کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے، یہ بات درست نہیں ہے، اگر نفع کمانا نہیں ہے تو پھر کم یا زیادہ اضافہ رقم لی کیوں جا رہی ہے؟

سود کی جو تعریف فقہاء نے کتاب و سنت کی روشنی میں کی ہے، اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ چونکہ حدیث میں ”الفضل ربا“ آیا ہے جو مطلق زیادتی کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے اس پر بھی ربا محرم کا حکم لگے گا، اسے اجرت عمل کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔

ہاں رقم دینے سے پہلے کاغذات وغیرہ پر کرنے کی کوئی فیس بینک وصول کرے تو اس پر اجرت عمل یا خدمت کا اطلاق ہوگا۔

### ۳۔ جدید اعلیٰ عصری تعلیم کے لئے سودی قرض:

شریعت اسلامی میں روٹی، کپڑا اور مکان اور موجودہ دور میں صحت بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے، اور بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے شریعت نے انسان کو بہت سی مراعات اور ایسرو آسانی فراہم کی ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ دور جدید میں تعلیم کو معاش سے جوڑ دیا گیا ہے، اور جہاں کسب معاش کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے، وہیں اب عصری علوم، زبان اور طریقہ تجارت کی تعلیم بھی اتنی ہی ضروری ہو گئی ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا حصول تعلیم بھی اسی طرح اس ضرورت کے دائرے میں آتا ہے جو ضرورت متبذخ محرمات ہوتی ہے؟ اور اس حاجت کو بھی ضرورت کا درجہ

حاصل ہوگا؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عصری علوم حاصل کرنا بقائے حیات کے لئے اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ روٹی کپڑا اور مکان ضروری ہے، اس لئے فقہاء کا بیان کردہ قاعدہ: "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" اس جگہ منطبق نہیں ہوگا، اور اس طرح کی سود پر قرض فراہم کرنے والی اسکیموں سے مستفید ہونے کی جو کہ زندگی بھر کے لئے انسان کو سود کی لعنت میں گرفتار کر دے، شرعاً اجازت نہیں ہوگی۔

اس طرح کی اسکیموں کے ذریعہ بینکوں کا انسان کی خدمت کرنے کا جذبہ کم اور ہمیشہ کے لئے سود دینے والا گراہک بنانے کا زیادہ ہے، اس لئے قطعاً اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

### ۴۔ سودی قرض کا تعلق والدین کی استطاعت سے ہے یا طالب علم کی؟

اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ طالب علم اگر بالغ ہے تو اس کا حکم الگ ہے اور نابالغ ہے تو اس کا حکم الگ، اس لئے اس کی دو جہتیں ہیں:

۱۔ اگر کوئی طالب علم بالغ ہے تو استطاعت کا تعلق خود اس کی ذات سے ہے، اگر فقیر اور مجبور ہے اور ایسے حالات سے دوچار ہے کہ اسے سودی قرض کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے تو پھر اسے اس کی اجازت ہوگی، اگرچہ والدین اسے اخراجات دے رہے ہوں، کیونکہ بالغ اولاد کو اخراجات دینا واجب نہیں، بلکہ تبرع ہے، اس لئے استطاعت کا تعلق بالغ طالب علم کے معاملہ میں خود اس کی اپنی ذات سے ہوگا والدین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ اور اگر طالب علم نابالغ ہے اور والدین کے ساتھ رہتا ہے تو اس کی استطاعت کا تعلق والدین سے ہوگا، کیونکہ اس کا نفقہ والد پر واجب ہے: "وعلی المولود لہ رزقہن وکسوتہن بالمعروف"۔

لیکن اگر طالب علم والدین کے ساتھ نہیں ہے، گھر سے دور ہے تو طالب علم جس کے ساتھ ہے یا جس ادارہ میں رہ رہا ہے اس کے نگراں کے توسط سے یہاں پر استطاعت کا تعلق خود اس طالب علم کی ذات سے وابستہ ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ فن من حیث المجموع بالغ طالب علم کی صورت میں قرض کے جائز اور ناجائز ہونے کے معاملہ میں استطاعت کا تعلق خود اس طالب علم سے ہے، اور نابالغ ہونے کی صورت میں والدین سے ہے۔

### ۵۔ اگر طالب علم یا اس کے والدین صاحب استطاعت ہوں:

اگر طالب علم یا اس کے والدین صاحب استطاعت ہوں تو ان کے لئے کسی بھی صورت میں سودی قرض کی اجازت نہیں ہوگی کیونکہ وہ از روئے شرع محتاج نہیں ہے، اور سودی قرض کی اجازت شریعت نے ضرورت کے وقت صرف مجبور و محتاج کو دی ہے۔





## تعلیمی قرض کا حکم

مولانا محمد شاہ جہاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اسلام جس نقشے پر انسان کی اخلاقی تربیت، تمدنی شیرازہ بندی اور معاشی تنظیم کرنا چاہتا ہے، اس کے ہر جز سے سودگلی منافات رکھتا ہے، اور سودی کاروبار کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور بظاہر معصوم سے معصوم صورت بھی اس پورے نقشے کو خراب کر دیتی ہے، چنانچہ اسلام سود کی تمام شکلوں کو قطعی انداز میں حرام قرار دیتا ہے اور اس شدت کے ساتھ حرام قرار دیتا ہے کہ اسلامی شریعت میں اس کے علاوہ کسی معصیت پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ نہیں کیا گیا، ارشاد باری ہے:

”یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین فایم لہم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسوله...“ (بقرہ: ۲۷۸-۲۷۹) (اے ایمان والو! خدا سے ڈرو، اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے.....)۔

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ علوم دنیویہ جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہے، یا جن سے ان کے جائز مفادات پورے ہوتے ہیں ان کا حصول فرض کفایہ ہے، امام غزالی تحریر کرتے ہیں:

غیر شرعی علوم میں اچھے اور برے ہر طرح کے علوم ہیں، چنانچہ اچھے علوم میں سے وہ ہیں جن سے دنیاوی معاملات اور مصابح مربوط ہوں، جیسے طب اور حساب وغیرہ۔ اور ان پسندیدہ علوم میں بھی بعض فرض کفایہ ہیں، اور بعض مستحب ہیں، اور بعض مباح ہیں:

۱۔ فرض کفایہ ہر وہ علم ہے، جس سے دنیوی معاملات کے انصرام و بندوبست کے سلسلہ میں کسی طرح بے نیازی نہیں برتی جاسکتی ہے، جیسے طب جو کہ انسان کی جسمانی صحت کی حفاظت کے لئے ضروری ہے، اور جیسے علم حساب جو معاملات، وصیتوں اور میراث وغیرہ کی تقسیم کے لئے لازم ہے..... اسی طرح صنعتی علوم بھی فرض کفایہ ہیں، جیسے زراعت کا علم، کپڑے بننے کا علم، اور پولیٹیکل سائنس، بلکہ کچھ لگانے اور سلائی کا علم بھی فرض کفایہ ہے، کیونکہ اگر کوئی شہر کھینچنے لگانے والے سے خالی ہو جائے تو وہاں کے باشندگان کی طرف ہلاکت لپک پڑے گی۔

۲۔ مستحب علم وہ ہے، جس سے ضروری و لازمی علم میں مزید قوت حاصل ہو، جیسے حساب کی باریکیوں، اور طب کی حقیقتوں میں مہارت خصوصی اور انفرادیت (Specialization) پیدا کرنا، جو قدر لازم سے زائد شے ہے۔

۳۔ مباح وہ علم ہے جس میں کوئی فائدہ ہو، اور کوئی خاص ضرر نہ ہو جیسے غیر فحش اشعار کا علم، اور امتوں کی تاریخ وغیرہ کا علم۔

۴۔ مذموم اور ناپسندیدہ علوم وہ ہیں جن میں ضرر ہو، جیسے سحر، طلسم اور شعبدہ بازی وغیرہ کا علم (احیاء علوم الدین للغزالی ص ۲۳ طبع دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع سوم، ۱۳۲۳ھ ۲۰۰۲ء)۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ امام غزالی نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے مثال دی ہے، لیکن ہمارے اس عہد میں علم کی بے شمار قسمیں ہیں، اور ان سب میں انسان نے خصوصی مہارت پیدا کر لی ہے، اور وہ علوم بھی ایسے ہیں جن سے کسی بھی قوم کا عروج و زوال وابستہ ہے، اور ان سے معاشی، مالی اور فوجی میدان میں برتری حاصل ہوتی ہے، اور ان تمام علوم کی مسلمانوں کو براہ راست یا بالواسطہ ضرورت ہے۔

لہذا جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول شریعت کی نگاہ میں فرض کفایہ ہے، امت اسلامیہ کے اندر بقدر حاجت تمام نافع علوم و فنون کے ماہرین کا وجود لازم

ہے، اسی طرح ٹیکنیکل علوم کے ماہرین کا وجود بھی لازم ہے، خود اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی قوم پر احسان کا تذکرہ کے ضمن میں فرمایا کہ ہم نے ان کو زرہ سازی اور لوہے کے استعمال کا طریقہ سکھایا (الانبیاء: ۸۰)۔

قرطبی تحریر کرتے ہیں: ”وہذہ الآیۃ أصل فی اتخاذ الصنائع والأسباب، وقد أخبر اللہ عن نبیہ داؤد علیہ السلام أنه کان یصنع الدروع“ (تفسیر القرطبی ۱۱، ۲۰۱-۲۲۱)۔

(یہ آیت صنعت اور اسباب قوت کی تحصیل میں بنیادی دلیل ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی داؤد علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے کہ وہ زرہیں بناتے تھے)۔

خود فقہاء نے بھی صراحت کی ہے کہ ان تمام علوم کا سیکھنا فرض کفایہ ہے، جن کی مسلمانوں کو ضرورت پڑتی ہے (دیکھئے: نہایۃ المحتاج إلی شرح المہاج للربلی ۳۸/۸ طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۳۰-۱۹۹۲ء، ومعنی المحتاج إلی معرفۃ معانی الفاظ المہاج للشریح بنی الخطیب ۲۱۱/۳)۔

اور رد المحتار میں ہے: ”وأما فرض الکفایۃ من العلم، فهو کل ما لا یستغنی عنه فی قوام أمور الدنیا کالطلب والحساب“ (رد المحتار نقلاً عن تبیین المحارم ۱، ۱۲۶)۔

(فرض کفایہ ہر وہ علم ہے جس سے دنیا کے معاملات کی درستگی میں بے نیازی نہیں برتی جاسکتی ہے، جیسے طب اور حساب)۔

اور ایک جگہ تحریر ہے: ”فیتناول ما هو دینی کصلاة الجنایة، و دنیوی کالصنائع المحتاج إلیها“ (مرجع سابق ۱، ۱۲۶) (فرض کفایہ میں وہ معاملہ بھی شامل ہے جو دینی ہو، جیسے نماز جنازہ، اور وہ معاملات بھی جو دنیوی ہوں، جیسے صنعتیں جن کی ضرورت پڑتی ہے)۔

اس تفصیل سے دنیوی علوم کی تحصیل کے لئے سفر کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ اگر ان کی تحصیل فرض ہو، خواہ فرض کفایہ ہو تو اس طرح کے علوم کے لئے سفر بھی فرض کفایہ ہوگا، اور اگر ان کی تحصیل مستحب یا مباح ہو، تو ان کی تحصیل کے لئے سفر بھی مندوب اور مباح ہوگا۔

اسی طرح ان دنیوی علوم کی تحصیل کفار سے بھی جائز ہوگی، چنانچہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: ”العلم ضالة المؤمن فخذ ولو من المشرکین“ (التراویب الإدریة للکتانی ۲، ۲۲۸) (علم مومن کی متاع گمشدہ ہے، سو اسے حاصل کرو، خواہ مشرک ہی سے کیوں نہ حاصل کرنا پڑے)۔

خود بعض صحابہ کرام نے معرکہ بدر کے مشرک قیدیوں سے کتابت سیکھی، ایسے ہی مدینہ کے یہودیوں سے بھی کتابت سیکھی (مرجع سابق ۳۲۸/۲)۔

ان تفصیلات سے روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ تمام ان نافع جدید علوم و فنون کی تحصیل شریعت کی نگاہ میں فرض کفایہ ہے، جن کی مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور فوجی میدان میں برتری کے لئے ضرورت ہے، ان میں کسی طرح کی غفلت برتنا اور لاپرواہی کا شکار ہونا، ان کی پسماندگی میں مزید اضافہ کا سبب ہوگا۔

چنانچہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں مثبت رویہ اپنائیں، اور نئی نسل کی اعلیٰ تعلیم کا بہتر نظم کریں، ذہین طالب علموں کی حوصلہ افزائی اور ذہن سازی کریں، اور انہیں ہر طرح کا مالی تعاون دیں۔

مسلمانوں کے ذہن میں لازماً یہ بات رہنی چاہئے کہ اسلام انہیں مختلف علوم و فنون اور ترقی کے میدانوں میں پیش پیش دیکھنا چاہتا ہے۔

۲۔ بینکوں کا عام مقصد نفع کمانا ہی ہوتا ہے، اور حکومت کا یہ ادعا کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے، ایسا ہی ہے، جیسے حکومت کہتی ہے کہ کسانوں کو کم شرح پر سودی قرض دینا زراعت میں تعاون کرنا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سود کا ہی کھیل ہے، چنانچہ حکومت عموماً ایسے کورسز ہی کے لئے لون دیتی ہے جو Job Oriented ہوں، اور ان کی تعلیم بھی ایسے اداروں میں دی جاتی ہو، جو اپنے میدان میں شہرت رکھتے ہوں یعنی جن کورسز کے بعد کام اور ملازمت ملنا یقینی ہو، اور رقم کی ادائیگی اور واپسی قطعی ہو، حکومت ہر طرح کی تعلیم کے لئے قرض نہیں دیتی ہے، اگر اس کا مقصد نفع کمانا نہ ہوتا تو ہر طرح کی تعلیم کے لئے قرض فراہم کرتی، اور ہر طرح کی تعلیم کو فروغ دیتی، لہذا حکومت کا ادعا کچھ بھی ہو، یہ سودی لین دین ہے، جس میں

شرح سود کم کر دی گئی ہے، لہذا اس کم شرح سود کو سروس چارج یا اجرت محنت پر محمول نہیں کر سکتے ہیں۔

۳۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں سود قطعی طور پر حرام، اور کبیرہ گناہوں میں سے بھی مہلک گناہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سود خور کے علاوہ کسی گنہگار کو اعلان جنگ نہیں دیا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سود کسی ایسی شریعت میں حلال نہیں تھا (دیکھئے: المجموع للنووی ۳۷۵/۹ طبع دار الفکر، بیروت ۲۰۰۵ء)۔

لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت نہ ہو، اور نہ ہی کوئی ایسی تنظیم ہو جو اعلیٰ تعلیم کے اہل مسلم طلبہ کو تعاون یا غیر سودی قرض فراہم کرتی ہو، تو مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے، مسلم طلبہ کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، کیونکہ تعلیم ملک کے ہر باشندہ کا حق ہے، اور اصولی اعتبار سے حکومت کو اس کا نظم کرنا چاہئے، لیکن اگر حکومت کم شرح سود کے بغیر نظم نہیں کرتی ہے، تو اپنے جائز حق تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے مسلم طلبہ کا سود کی رقم دینا جائز ہوگا، اس صورت میں گناہ سود خور پر ہوگا، نہ کہ سود دینے والے پر، چنانچہ فقہاء نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے یا ظلم و ضرر کو دور کرنے کے لئے رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۳۵۸/۸، نہایۃ المحتاج للربی ۳۳۶/۸)۔

۴۔ طالب علم کے والد صاحب کی معاشی حالت جدید اعلیٰ تعلیم دلانے کی متحمل ہے، تو ایسی صورت میں سودی قرض جائز نہ ہوگا، فقہ حنفی میں یہ جزئیہ موجود ہے کہ اگر بچہ علم میں مشغول ہو، خواہ بالغ ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب ہے، جبکہ اس کے پاس مال نہ ہو، الدر المختار میں ہے: ”وکذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنشی مطلقا، وزمن... وطالب العلم لا يتفرغ لذلك“ (الدر المختار ۵۰۲۲)۔

(ایسے ہی بالغ اولاد جو کمانے سے عاجز ہوں، ان کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے، جیسے ہر حال میں لڑکی کا نفقہ واجب ہے، اور اپنا حج کا بھی واجب ہے، اور طالب علم جو کمائی کے لئے خود کو فارغ نہیں کر پارہا ہو، اس کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے)۔

اور رد المحتار میں اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وحاصله أن السلف قالوا بوجوب نفقته على الأب، لكن أفتى أبو حامد بعدمه لفساد أحوال أكثرهم، ومن كان بخلافهم، نادر في هذا الزمان، فلا يفرد بالحكم، دفعا لخرج التمييز بين المصلح والمفسد، قال صاحب ”القنية“: لكن بعد الفتنة العامة: يعني -فتنة التتار- التي ذهب بها أكثر العلماء والمتعلمين، نرى المشتغلين بالفقه والأدب، الذين هما قواعد الدين، وأصول كلام العرب، يمنعهم الاشتغال بالكسب عن التحصيل، ويؤدي إلى ضياع العلم، والتعطيل، فكان المختار الآن قول السلف، وهنوات البعض لا تمنع الوجوب“ (رد المحتار ۵۰۲۲-۲۲۲)۔

(حاصل کلام یہ ہے کہ سلف نے باپ پر بالغ طالب علم لڑکے کا نفقہ واجب قرار دیا ہے، لیکن ابو حامد نے اکثر طالب علم کے حالات کے بگاڑ کی وجہ سے عدم وجوب کا فتویٰ دیا ہے، کیونکہ سوجھ بوجھ رکھنے والے طلبہ اس زمانہ میں نادر ہیں، چنانچہ ان کے لئے الگ سے حکم نہیں دیا جاسکتا ہے، اس وجہ سے کہ مصلح اور مفسد میں شناخت دشوار ہے، صاحب ”قنیہ“ کا کہنا ہے کہ ہمہ گیر فتنہ یعنی فتنہ تاتار کے بعد جس کے شکار بیشتر اہل علم اور طلبہ ہو گئے، ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ و ادب جو کہ دین کے قواعد اور کلام عرب کے اصول ہیں، ان میں مشغول رہنے والوں کو کسب معاش، تحصیل علم سے روکتا ہے، اور علم کے ضائع اور معطل ہونے کا سبب بنتا ہے، لہذا اس وقت سلف کا قول ہی مختار ہے، اور بعض کی باتیں وجوب نفقہ سے مانع نہیں ہے)۔

لیکن صاحب ”البحر الرائق“ نے سمجھ داری اور صالح طالب علم کے لئے نفقہ واجب قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مصلح اور مفسد میں تمیز دشوار نہیں ہے، قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے۔

میری رائے میں صاحب ”قنیہ“ کا موقف مضبوط معلوم ہوتا ہے، لہذا اسے ہی اختیار کرنا مناسب ہے کیونکہ جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ عام طور سے سوجھ بوجھ اور صلاح رکھنے والے ہوتے ہیں، اور شاذ و نادر کا اعتبار نہیں ہے۔

لہذا باپ کی ذمہ داری ہے کہ اولاد کو دین و دنیا اور صنعت و حرفت کی تعلیم سے آراستہ کرے، فقہاء نے بھی تعلیم کی اس ذمہ داری کی صراحت کی ہے: ”التاج والإكليل لمختصر خليل“ میں ہے:

”إذا كان الابن في حضانة أمه، لم يمنعه من الاختلاف لأبيه يعلمه؛ لأن للأب تعليمه وتاديبه وإسلامه في المكتب والصنائع“ (التاج والإكليل للمواق ۲۱۵)۔

(اگر لڑکا ماں کی پرورش میں ہو، تو اسے باپ کے پاس جانے سے روکا نہیں جائے گا، جو اسے علم کے زیور سے آراستہ کرے گا، اس لئے کہ باپ کا حق ہے کہ اسے علم و ادب سے آراستہ کرے، اور کتب اور صنعت کے حوالہ کرے)۔

معنی المحتاج میں ہے: ”وان اختارها- أي الأم- ذكر، فعندها ليلا، وعند الأب نهارا، يعلمه الأمور الدينية والدينية، على ما يليق به، ويسلمه للمكتب- وهو اسم للموضع الذي يتعلم فيه- وذي حرفة، يتعلم من الأول الكتابة، ومن الثاني الحرفة على ما يليق بحال الولد“ (معنى المحتاج للشربيني الخطيب ۲۵۸)۔

(اگر لڑکا ماں کو اختیار کرے، تو رات میں اس کے پاس رہے گا، اور دن میں باپ کے پاس، جو اسے اس کے مناسب حال دین و دنیا کی تعلیم دے گا، اور ادب سے آراستہ کرے گا، اور کتب اور پیشہ ور کے حوالہ کرے گا، کتب سے وہ تحریر اور پیشہ ور سے اپنے حسب حال پیشہ کا علم حاصل کرے گا)۔

اور رد المحتار میں ہے: ”وإذا استغنى الغلام عن الخدمة أجبر الأب أو الوصي أو الولي على أخذه؛ لأنه أقدر على تأديبه و تعليمه“ (رد المحتار، نقلا عن شرح المجمع ۵۰۲۶۸)۔

(لڑکا اگر خدمت سے بے نیاز ہو جائے، تو باپ یا وصی یا ولی کو اس کے لینے پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ باپ اس کی تادیب و تعلیم پر زیادہ قادر ہے)۔

۵۔ اس سوال کی دو شقیں ہیں:

۱۔ طالب علم صاحب استطاعت ہو، تو اس صورت میں اس کے لئے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، کیونکہ ایجوکیشنل لون لینے کا جواز مجبوری کی صورت میں ہے، اور جب وہ خود صاحب استطاعت ہے تو پھر جواز کی اساس ہی منہدم ہوگئی، لہذا اس پر لازم ہے کہ اپنا پیسہ لگا کر اپنے مستقبل کو روشن کرے۔

۲۔ والد صاحب استطاعت ہو، اور وہ اپنی ذمہ داری سے غفلت برت رہا ہو، تو ایسی صورت میں طالب علم کے لئے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، کیونکہ اسلامی ملک نہیں کہ باپ کو اخراجات تعلیم پر مجبور کیا جاسکے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض اور اس کے مسائل

مولانا عبداللہ خالد لوناناواڑی

عصری تعلیم اسلامی نقطہ نظر..... اسلام میں تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی اس میں تعلیم کا حکم دیا گیا، "اقرا باسم ربك الذی خلق" (سورہ علق)، اسی طرح "وقل رب زدنی علماً" (طہ: ۱۱۳)۔

علم سے مراد کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں "علماً" کو اسم نکرہ فرمایا ہے اور نکرہ عموم کا فائدہ دیتا ہے، یعنی کوئی بھی علم، البتہ اس کی تفسیر احادیث میں ملتی ہے کہ اس سے مراد نفع بخش علم ہے، تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے میرے پروردگار میرے نفع بخش علم کو بڑھا دیجئے، خواہ یہ نفع دنیوی زندگی تک محدود ہو یا آخرت تک کام آنے والا ہو، سب کو شامل ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم نافع کی دعا فرماتے تھے (ابن ماجہ حدیث نمبر: ۳۸۳۴)۔

علم کی دو قسمیں ہیں: علم نافع، علم غیر نافع۔

علم نافع سے مراد علم ہوگا جو انسان کے لئے مفید ہو وہ عام ہے خواہ عصری ہو یا دینی، اس اعتبار سے جہاں خالص اسلامی علوم و فنون (قرآن و حدیث، فقہ) ان علوم کے حصول کے ذرائع (زبان و ادب، نحو و صرف، بلاغت) داخل ہیں وہی عصری علوم و فنون (سائنس، انجینئرنگ، میڈیکل، جغرافیہ، حساب وغیرہ) داخل ہیں، بشرطیکہ وہ انسان کے لئے مفید و نفع بخش ہو، اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عصری تعلیم ممنوع نہیں ہے، بلکہ اسلام اس کی اجازت اور ترغیب دیتا ہے بلکہ اس کی ضرورت پر زور بھی دیتا ہے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بھی ملتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو استعمال فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں جو لوگ قید ہو کر آئے ان کے بارے میں فرمایا کہ ان میں جو لوگ پڑھے لکھے ہوں وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں حکم دیا "علموہن الغزل" (ان کو کاتنا سیکھاؤ)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الحکمة ضالة المؤمن" یعنی جو علم و حکمت کی بات حاصل ہو اور وہ انسانیت کی مفاد میں ہو اس کو اس رغبت و اشتیاق کے ساتھ حاصل کرنا چاہئے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں منجیق کا استعمال فرمایا، گویا کہ وہ اس زمانہ کی توپ تھی جس کے ذریعہ پتھر کی چٹانیں دور سے دشمن کے قلعوں پر پھینکی جاسکتی تھیں مکہ کے بعد جب بنو لقیف کی ماہرانہ تیر اندازی نے مجاہدین کو بڑی دشواری میں ڈال دیا اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی گاڑیاں بنوائی جس پر چڑے کا غلاف ڈالا گیا تاکہ دشمن کے تیر چڑے میں پھنس کر رہ جائیں۔

اسی طرح غزوہ خندق کا واقعہ تو مشہور ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کی پشت پر پہاڑیوں کو رکھتے ہوئے آگ کی سمت میں طویل و عرض خندقیں کھدوائی یہ عربوں کے لئے نیا تجربہ تھا، اور اس حسن تدبیر کے نتیجے میں اعداء اسلام کی متحدہ قوت جو تقریباً بیس ہزار کے قریب تھی ذلیل ہو کر واپس ہوئی۔

اس سیرۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جدید ٹکنالوجی حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا، اور اس کو کبھی تقاضہ دین کے منافی تصور نہیں فرمایا، اسی لئے اسلامی عہد میں قدیم سائنسی علوم کو نہ صرف قبول کیا گیا بلکہ ان کا ترجمہ بھی کیا گیا، اور ہر فن میں مسلمان سب سے آگے نظر آتے ہیں، چنانچہ مسلمان سائنسدان میں حکیم صحیحی منصور (۲۱۴ھ) نام کا سب سے پہلا فلکیاتی مصنف کا نام ملتا ہے، اسی طرح خالد بن عبدالملک مروزی، ابو عبداللہ محمد

مدار العلوم لوناناواڑی، بیچ محل گجرات۔

بن جابر بنانی (۳۰۵ھ) علی بن عیسیٰ اصطرلابی (۲۲۳ھ)، ابوالوفاء بوزجانی (۸۷۸ھ) وغیرہ کے نام سے تاریخ روشن ہے۔

علم طب جس کے بارے میں امام شافعیؒ نے فرمایا: ”العلم علمان علم الفقہ للأدیان وعلم الطب للأبدان“ (مفتاح السعادة، ۲۰۲) اس میں بھی مسلمانوں کی خدمات نمایاں ہیں اس میں اہم ترین نام ابوالحسن بن علی اہل طبری (۲۵۱ھ) جنہوں نے فردوس الحکمت کے نام سے کتاب لکھ کر جو پہلی طبی انسائیکلو پیڈیا ہے، علم طب پر ایک زبردست احسان کیا ہے، اسی طرح سب سے پہلے طب کی تاریخ کے سرچن ابوالقاسم زہراوی (۳۹۵ھ) کے نام ملتے ہیں۔

اسی طرح ابوبکر محمد زکریا رازی (۳۰۸ھ) سنان بن ثابت جرائی (۳۲۰ھ)، شیخ حسین ابوالعلی سینا (۴۲۸ھ) اس فن میں نمایاں خدمات ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عصری علوم میں کبھی کوتاہی نہیں کی، بلکہ سب سے فائق نظر آتے ہیں، عصری علوم کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں ہر وقت مستعد رہنے کا حکم دیا ہے، یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مسلمان ہر فن میں کفار سے آگے ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوا الله وعدوكم“

اس کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں: ”مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سامان جہاد فراہم کریں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی، اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا سامان جہاد تھا۔

آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آب دوز کشتیاں وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنون حربیہ کا سیکھنا، بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب سامان جہاد ہے۔

اسی طرح آئندہ جو اسلحہ و آلات حرب و ضرب تیار ہو وہ سب آیات کے منشاء میں داخل ہے (شیخ الہند: ۲۳۳)۔

مسلمانوں کے لئے عصری تعلیم اس لئے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں اسے نیابت و خلافت کے فرائض انجام دینے ہیں، اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

”إذ قال ربك للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا ایک اہم مقصد نیابت و خلافت کے فریضہ کی ادائیگی ہے، اسے نیابت کے فرائض کیسے انجام دینے ہیں؟ تو اس کے لئے دین کے علم کے ساتھ دنیا کا علم بھی ضروری ہے، وہ تمام چیزیں جو دنیا میں نظر آتی ہے کسی نہ کسی علم سے جڑی ہوئی ہے، اور وہ تمام انسانی زندگی سے مربوط ہے، اس لئے ان کے بارے میں معلومات ناگزیر، اس سے معلوم ہوا کہ ان علوم کا حصول ضروری ہے، اس کا دوسرا نام عصری علوم ہے، افسوس کہ مسلمان اس میں بہت پیچھے ہیں، مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان علوم کو حاصل کریں اور یہ فرض کفایہ ہے۔

لیکن افسوس کہ یہ تعلیم اتنی مہنگی ہے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اس کا حصول آسان نہیں بلکہ بہت ہی دشوار ہے، اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے حکومت تعلیمی قرض دیتی ہے، جس کا مقصد تعلیم کو فروغ دینا ہے، لیکن حکومت اس قرض کو سود کے ساتھ دیتی ہے، اور سود کی شرح بہت کم ہوتی ہے، قرض طویل مدت ہوتا ہے اور اس کا مقصد قطعی نفع کمانا نہیں ہوتا، تو کیا اس کو سود چارج پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

اسلام میں سود حرام ہے، اس کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں، اور اس کے لینے والے کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے، جس طرح لینے کو حرام کیا ہے اسی طرح دینے کو بھی حرام کیا ہے۔

”لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه وقال هو سوا“ (مسلم)۔

”كل قرض جر نفعاً فهو ربوا“ (قرض جس میں نفع حاصل ہو رہا ہے)۔

ہدایہ میں ہے: ”الربوا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي من عوض شرط فيه“ (ہدایہ ۲۰۷۷)۔

امام حصص ”ربوا“ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”هو القرض المشروط فيه الأجل و زيادة مال على المستقرض“ (احکام القرآن ۱۰۳۶)۔

اسی طرح علامہ ابن عربی اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”الربا في اللغة الزيادة والمراد في الآية كل زيادة لا يقابلها عوض الربوا“، اسی طرح عنایہ میں ہے:

”وفي شرع عبارة عن فضل ما لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال“ (عناية متن الفتنم)۔

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت جو قرض کے مقابلہ میں زائد رقم لیتی ہے اگرچہ وہ کم ہوتی ہے اور دیر تک کے لئے ہوتی ہے اور حکومت کا مقصد اگرچہ منافع حاصل کرنا نہیں ہوتا ہے اور مدد کرنا مقصود ہوتا ہے، لیکن وہ اس سود کی تعریف میں داخل ہوتا ہے، لیکن شریعت نے ضرورت کے وقت سود لینے کی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشباه والنظائر)۔

اسی طرح اصولیین کی اصطلاح میں بھی حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی چیز کا مقصد موقوف تو نہ ہو لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت و حرج پیدا ہو جائے۔

”وأما الحاجيات معناها أنها مفتقر إليها من حيث الوسع ورفع الضيق المؤدى في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب“ (الموافقات ۳، ۵)۔

اور کبھی حاجت کو ضرورت کے درجہ میں رکھا جاتا ہے، جیسے ضرورت کی بنا پر ناجائز بقدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح حاجت کی بنا پر بھی سہولت پیدا ہو جاتی ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة“ (الاشباه والنظائر ۱۸۰)۔

کبھی ضرورت انفرادی اور شخصی ہوتی ہے اور کبھی اجتماعی و قومی ہوتی ہے، تو ان دونوں کا حکم یکساں ہوگا، چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں:

اضطرار دو قسم کا ہوتا ہے، ایک اضطرار انفرادی و شخصی، اور ایک اضطرار اجتماعی و قومی، پس جس طرح ”ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ اضطرار شخصی اور انفرادی میں سودی قرض لے کر سودینے یا اسی طرح اضطرار اجتماعی و قومی میں بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی (جدید فقہی تحقیقات ۲۵۷/۲)۔

تعلیم بھی ایک ضرورت ہے، یہ ضرورت اجتماعی اور فردی ضرورت ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کو ہر فن میں چاہے جنگی فن ہو یا معاشی، ہر ایک میں کفار کے مقابلہ میں آگے رہنے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوا الله وعدوكم“ (الانفال: ۶۰)۔

اور مسلمانوں کے اکثر طبقہ کو اس تعلیم کے حصول کے لئے اخراجات مہیا ہونا مشکل ہے، اور یہ ایک اجتماعی ضرورت ہے اور غیر مسلم ملک میں نہ تو اسلامی نظام بیت المال اور خیر و خراج اور زکوٰۃ و صدقات وغیرہ ہیں اور نہ ہی اسلامی معاشرہ و ایثار، اس لئے نہ بطور ملک آسانی ملنے کا سوال اور نہ بطور قرض، اس لئے سودی قرض کے بغیر جو معمولی اور دیر پا ہوتا ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں اس لئے ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لئے زیادہ خرچ ہوتا ہے، جس کی پوری کارروائی بینک کے ماتحت ہوتی ہے، اس لئے اگر اپنا خرچہ کرنے میں انکم ٹیکس وغیرہ کا اندیشہ رہتا ہے اور ایک بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے معروف بعض علماء نے جیسے مفتی نظام الدین صاحب، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی وغیرہ نے حکومت کے ترقیاتی قرض وغیرہ میں جس میں کچھ سود ہوتا ہے، اس کو ملازمین بینک کی اجرت مان کر اس کی اجازت دی ہے، اس لئے اگر خود طالب علم اس کا تحمل نہیں ہے تو سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی، اور اس کے جائز و ناجائز ہونے کے سلسلہ میں طالب علم کے حالات کا اعتبار کیا جائے گا، نہ کہ اس کے والد کا، اس لئے کہ طالب علم خود احکام کا مکلف ہے والد کا مالدار ہونا نہ ہونا طالب علم پر کوئی اثر نہیں ڈالتا لیکن اگر طالب علم صاحب استطاعت ہے تو اس کو اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ صرف ضرورت کے وقت سودی قرض جائز ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض اور اس کے شرعی احکام

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی

جدید علوم کے تین پہلو ہیں: ۱۔ علمی، ۲۔ صنعتی، ۳۔ اقتصادی اور معاشی۔

اور تینوں پہلوؤں کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، اس لئے ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ جدید علوم کا حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، جب تک کہ مسلمان جدید علوم میں مہارت حاصل کر کے ان علوم میں قیادت کے لائق نہیں ہو جائیں گے، مسلمانوں کی پسماندگی اور در ماندگی دور نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف جدید علوم کا حصول ہی اس امت مسلمہ کے لئے کافی ہے، بلکہ سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بننا پڑے گا۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ جدید علوم کی اہمیت کو سمجھیں، اپنے تمام بچوں کے لئے ضروری علوم دینیہ کا انتظام کریں، ہر بچے کے لئے ضروری علوم دینیہ کا حاصل کرنا فرض عین ہے، پھر اس کے بعد کچھ بچوں کو علوم دینیہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے لگا دیں، اور کچھ بچوں کو جدید علوم اور علوم عصریہ کے حصول اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے لگا دیں، جو بچے جدید علوم حاصل کر رہے ہیں، ان کو ان کی ضرورت اور سمجھ کے مطابق علوم دینیہ یعنی عقیدہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے درس کا بھی انتظام کریں، اور جو بچے علوم دینیہ میں مہارت کے حصول میں لگے ہوئے ہیں ان کو بھی جدید علوم میں سے ضروری معلومات کا خزانہ بہم پہنچاتے رہیں۔

جس طرح دینی مدارس کے قیام کو ضروری سمجھیں اسی طرح ضرورت کے مطابق عصری اور جدید علوم کے ادارے، کالج، اور یونیورسٹیوں کے قیام کو بھی ضروری سمجھیں، اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی ہر ممکن کوشش کریں، یہ بات یاد رکھیں کہ ہمیں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے اپنے اندر قابلیت بلکہ بے پناہ قابلیت پیدا کرنی ہوگی۔

آج مسلمانوں کو ہزاروں ماہر انجینئروں کی ضرورت ہے، ہزاروں ڈاکٹروں کی ماہرین زراعت، قانون اور وکلاء، سائنس دان، صحافی، اور ملٹی میڈیا کے ماہرین کی ضرورت ہے، دور حاضر میں میڈیا کی بہت بڑی اہمیت ہے، میڈیا پر اسلام دشمنوں کے قبضے کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی صورت مسخ کر کے پیش کی جا رہی ہے اس لئے میڈیا میں مسلمانوں کی شرکت لازمی اور واجب ہوگئی ہے، کمپیوٹر اور ایٹمی میٹن میں مہارت پیدا کر کے ایسی فلمیں، سیریل اور بچوں کے لئے کارٹون فلمیں بنائی جاسکتی ہیں، جو لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کرتی ہوں، یا اسلامی دائرے میں رہتے ہوئے جائز سامان تفریح پیش کرتی ہوں۔

۲۔ سرکاری بینک کم شرح سود لیں یا زیادہ کم مدت کے لئے قرض دیں یا زیادہ مدت کے لئے، وہ خدمت کا دعویٰ کریں یا نہ کریں، شرح سود کو اجرت خدمت پر محمول نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ بینکوں کا پورا کاروبار سود پر مبنی ہوتا ہے، اور اگر کم شرح سود کو اجرت خدمت پر محمول کیا جائے تو زیادہ شرح سود کو کیوں اجرت خدمت پر محمول نہ کیا جائے؟ اس لئے اجرت کم بھی ہوتی ہے اور زیادہ بھی۔

سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم ہے یا نامناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شرح اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے (فیصلہ دوسرا فقہی سیمینار (دہلی) بتاريخ ۸-۱۱-۱۳۱۰ھ، نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۳۰)۔

۳۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں تو پہلے اس پر واجب ہے کہ کہیں سے بھی قرض بلا سود حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور اگر کہیں سے بھی اس کو قرض بلا سود نہ ملے تو اس کے لئے جائز ہے کہ اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھائے، مگر یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھے کہ سود دینا حرام ہے، اس لئے جس قدر ممکن ہو اس لعنت سے بچنے کی کوشش کرتا

جامعہ اسلامیہ، شان پورم کیرالا۔



رہے، اپنے مصارف کو کم سے کم کرے، فضول خرچی نہ کرے، جتنی مقدار میں بلا سودی قرض مل جائے، حاصل کرے اور جس مقدار کی رقم بلا سودی قرض سے حاصل ہو جائے اس مقدار کی رقم اس قرض اسکیم سے نہ لے، مثلاً اس کو تعلیم کے لئے چار لاکھ روپے کی ضرورت ہے اور اس کو ایک لاکھ کی رقم کہیں سے بطور ہدیہ یا مدد اعانت یا بلا سودی قرض کے طور پر مل جاتی ہے تو وہ صرف تین لاکھ روپے اس قرض اسکیم سے حاصل کرے۔

اس لئے کہ یہاں دو باتوں کا خیال ضروری ہے: "لا یكلف الله نفسا الا وسعها" (بقرہ: ۲۸۶) (ہر نفس اپنی وسعت کے بقدر مکلف ہے)۔

اب اگر وہ آدمی جو اعلیٰ تعلیم کا اہل ہے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے امت کی تعمیر و ترقی میں ایک اہم رول ادا کر سکتا ہے یا تعمیر و ترقی کی ایک اینٹ بھی بن سکتا ہے، اور وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کوشش نہیں کرتا تو وہ گنہگار ہوگا۔

"وأحل الله البيع و حرم الربوا" (بقرہ: ۲۷۵) (ربو یعنی سود حرام ہے)۔

ان دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے امت کو جدید علوم کی ضرورت پر غور کریں تو بدرجہ مجبوری "الضرورات تبیح المحظورات بقدر الضرورات" کے قاعدہ کلیہ کے پیش نظر بقدر ضرورت بینکوں کے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔

۴۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے مگر اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو والد صاحب کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ دونوں کی ذات الگ الگ ہے، جس طرح شوہر کے صاحب استطاعت ہونے سے بیوی صاحب استطاعت نہیں ہوتی یا بیوی کے صاحب استطاعت ہونے سے شوہر صاحب استطاعت نہیں ہوتا اسی طرح باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بیٹا صاحب استطاعت نہیں ہوگا، اور نہ بیٹے کے صاحب استطاعت ہونے سے باپ صاحب استطاعت ہوگا، مثلاً اگر بیوی کے پاس زکوٰۃ کے نصاب کے بقدر مال ہو تو صرف بیوی کو ہی صاحب نصاب مانا جائے گا اور اسی پر زکوٰۃ واجب ہوگی نہ کہ شوہر پر، اسی طرح اگر باپ کے پاس زکوٰۃ کے نصاب کے بقدر مال ہو تو صرف باپ کو ہی صاحب نصاب مانا جائے گا اور اسی پر زکوٰۃ واجب ہوگی نہ کہ بیٹے پر قرض کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا مگر حرام (یعنی سودینے) سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کے طور پر طالب علم کے لئے واجب ہوگا کہ وہ اپنے مالدار باپ سے مدد طلب کرے اور صاحب استطاعت باپ پر واجب ہوگا، کہ وہ علم کے حصول جیسے فرض کفایہ کی ادائیگی میں اپنے لخت جگر کی مدد کرے۔

فقہاء نے باپ کے اوپر بچوں کے نفقہ کے وجوب کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے:

"لأنهم جزء منه وإحياءهم واجب لإحياء نفسه" (الفقہ الإسلامی وأدلته ص ۸۴۵ الجزء العاشر)۔

"لا یكلف الله نفسا الا وسعها" (بقرہ: ۲۸۶)۔ "لا تکلف نفس الا وسعها" (البقرہ: ۲۳۳)۔

"لینفق مما اتاه الله لا یكلف الله نفسا الا ماء اتاها" (الطلاق: ۷)۔

مذکورہ بالا آیات کا خلاصہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنی وسعت کے بقدر مکلف ہے، جس طرح معسر سے چھوٹے نابالغ بچوں کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، فقیر پر زکوٰۃ اور حج واجب نہیں ہوتا، اسی طرح عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جس قدر مال کی وسعت بڑھتی جائے اسی قدر اس کے اوپر واجب خرچوں کا دائرہ بھی بڑھتا جائے۔

۵۔ اگر طالب علم خود صاحب استطاعت ہے تو اسے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس قرض اسکیم میں سود دینا پڑتا ہے اور جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، سود ادا کرنے کی حرمت بذات خود نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ سود خواری کا ذریعہ ہے، اس لئے بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۳۸)۔

اور اگر والد صاحب استطاعت ہوں اور وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں تو طالب علم بدرجہ مجبوری اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لئے کہ بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۳۸)۔

اور اس لئے بھی کہ اگر انسان جاہل اور بے ہنر رہتا ہے تو مال کی کمی اور فقر کی وجہ سے کئی حرام کاموں میں مبتلا ہو سکتا ہے نہ اپنے لئے کچھ کر سکتا ہے اور نہ اپنی قوم کے لئے، بلکہ ملک و ملت پر وہ ایک بوجھ بن جاتا ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ سودیئے کو حرام سمجھتے ہوئے بدرجہ مجبوری اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے اور مدد و محنت و جانفشانی سے علم و ہنر حاصل کر کے اپنا اور ملک و ملت کا نام روشن کرے۔

☆☆☆

## سودی قرض لے کر تعلیم حاصل کرنا

مولانا عبدالستوب اناری مل

گزشتہ قومنوں میں جب تعلیم کا عروج ہوا تو وہ قومیں بھی ترقی پر ترقی کرتی گئیں، اور جب کوئی قوم تعلیم سے بے نیازی اور لاپرواہی کرنے لگی تو وہ ترقی کا شمار ہوتی گئی حتیٰ کہ اس کا کوئی قومی شعار تک محفوظ نہ رہ سکا، چہ جائیکہ اس کا رعب و بدبیر۔

آج امت مسلمہ کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہے، دنیا کے مختلف مقامات پر ان کی حکومت تو ہے لیکن جدید اعلیٰ تعلیم کی قلت کے باعث نفسیاتی طور پر ہر ایک حکومت ان کے پاس نہیں ہے، اور جہاں ان کی حکومت ہی نہیں وہاں تو بس اللہ حافظ و نگہبان۔

اب جبکہ تعلیم کی طرف دو توجہ اور دلچسپی جو ہونا چاہئے نہ خود حکومت ہی دے رہی ہے اور نہ حکام حکومت کو جو نظام حکومت چاہ رہے ہیں وہ یقیناً علوم کا فقدان ہے لہذا ضرورت ہوئی پرائیویٹ نظام تعلیم کے قیام کی، لوگوں نے اسی بات کو محسوس کیا اور پرائیویٹ نظام تعلیم عمل میں آیا، ظاہر ہے تمام تعلیمی و تحقیقی اور ساتھ ہی اقتصادی اخراجات طالب علم کے ذمہ لازم ہوں گے، اور یقیناً یہ وہ شرح فیس ہوگی جس کا برداشت کرنا ہر کس و نامکس کی دسترس سے باہر ہوگا۔

عصر شرعی کا وہ حصہ جس کا حصول تمام افراد مسلمہ کے لئے لازمی اور ضروری ہے اس کو حاصل کر لینے کے بعد تمام علوم شرعیہ و دینیہ کا جس طرح حاصل کرنا فرض کفایہ ہے ٹھیک اسی طرح علوم عصریہ جدیدہ کا حاصل کرنا بھی فرض کفایہ ہے۔

اہل بیت دونوں کے درمیان علت حصول کا فرق ضرور ہے، علوم دینیہ کو برائے ضروریات دین حاصل کیا جاتا ہے اور علوم عصریہ جدیدہ کو برائے ضروریات معاشرہ حاصل کیا جاتا ہے، ہر دو عموماً بھی ہیں اور مقصود بھی۔

۱۔ لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو اولاً ضروریات دین سے واقف کرائیں اور تعلیمات اسلامیہ سے بہرہ ور کریں پھر جن بچوں کا ذہن اور طبیعت عصریات اور جدید اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل نظر آئے ان کو جدید اعلیٰ تعلیم کی طرف اور جن بچوں میں علوم دینیہ کی طرف رغبت محسوس ہو انہیں دینی اداروں میں داخل کرنا چاہئے تاکہ معاشرہ کو بوقت ضرورت ہر طرح کے افراد مہیا ہو سکیں۔

۲۔ اگر واقعہ حکومت کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ بنام تعلیم زیادہ مدت تک کے لئے عام معمول سے کم شرح سود پر طلباء علوم عالیہ جدیدہ کو قرض دے رہی ہے تو طلبہ علوم عالیہ جدیدہ کو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا چاہئے، حکومت کا قول کم شرح سود خود اس کے دوسرے قول اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں، کے متنازعہ ہے کیونکہ سود کے معنی ہیں قرض پر نفع لینا جو کل قرض جرنفعا کے تحت حرام ہے، اور یہاں خود حکومت یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع لینا نہیں ہے بلکہ طلبہ کی اعانت مقصود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے طویل مدت تک کے لئے دیا جاتا ہے، اور جب مقرر شدہ خود یہ دعویٰ کرے کہ میں مستقرض سے قرض پر نفع نہیں لوں گا اور تعامل اس کا شاید ہو کہ مدتی اپنے دعویٰ سے منحرف نہیں ہے تو اس کی بات لائق قبول ہوگی، اب چونکہ قرض لینے والے ایک دو تو ہوں گے نہیں کہ ان کو یا داشت میں محفوظ کر لیا جائے اور مزید اعلیٰ اخراجات کی ضرورت پیش نہ آئے بلکہ یہاں تو قرض لینے والوں کی تعداد غیر محدود ہوگی ایسی صورت میں باضابطہ ایک ادارہ و آفس کی ضرورت ہوگی کاغذات اور دیگر لوازمات اور یہ ایسی ضروریات ہیں جن کے بغیر مذکورہ تعاون ناممکن محسوس ہوتا ہے اور اخراجات کا بار جو قسطی ہے قرض دینے والے پر ڈالنا

لے جاوے یہ اسلامیہ تصور باطل ہے۔

خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے، لہذا اخراجات کو بدرجہ مجبوری الضرورات تبيح المحظورات کے قاعدہ سے قرض لینے والوں کے ذمہ ہی متقاضی قیاس مفہوم ہوتا ہے، لہذا اسے سروس چارج یعنی اجرت خدمت پر محمول کیا جانا چاہئے۔

اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا کہ پرائیوٹ اداروں میں جہاں تعلیمی نظام اچھا ہے وہیں پر یہ بات بھی ہے کہ ان کے یہاں تعلیمی فیس اور دوسرے اخراجات بھی کم نہیں ہیں کیونکہ ہر کس ونا کس برداشت کر لے بلکہ حکومت کے اس اسکیم کے جاری کرنے کی وجہ ہی یہی ہے کہ ہر خواہش مند طالب علم اتنی خطیر رقم کہاں سے لائے جو ان اداروں میں تعلیم حاصل کرے، اور یہ بات پیش نظر ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کا مقصد تعمیر معاشرہ ہے اور تعمیر معاشرہ تعمیر بیت سے کہیں زیادہ اہم ہے، حالانکہ فقہاء کرام نے تعمیر بیت کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، لہذا تعمیر معاشرہ کے واسطے جدید اعلیٰ تعلیم کے خواستگار طالب علموں کے لئے بدرجہ اولیٰ سودی قرض لینے کی اجازت ہونی چاہئے۔

اور مذکورہ شکل میں جب سود کا شبہ اجرت خدمت کے تحت دور ہو جاتا ہے تو مذکورہ اسکیم سے استفادہ میں عموم ہونا چاہئے۔

مفتی نظام الدین صاحب نے حکومت سے قرض لینے کا ایک جملہ اس طرح ذکر فرمایا ہے:

”مجبور غریب کا حکومت سے بطور امداد قرض لینا کہ اس میں سے کچھ رقم بینک کے کسی ایسے کھاتہ میں جمع کر دی جائے جس سے ملنے پر سود پورے قرضہ کے سود کی ادائیگی کے لئے کافی ہو اور بقیہ رقم اپنے کاروبار میں لگا دی جائے جس کو الگ سے نہ ادا نہ کرنا پڑتا ہو تو شرعی حیلہ درست ہے“ (نظام الفتاویٰ ۱/۳۲۲)۔

مستحق طالب علم اگر اس طرح حیلہ سے استفادہ کرنا چاہے تو اس کے لئے بہتر ہوگا، مفتی محمود حسن گنگوہی فرماتے ہیں: ناقابل برداشت مجبوری کے وقت سودی قرض لینے سے گناہ نہ ہونے کی توقع ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۵/۳۷۹)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اہل بہ لغیر اللہ فمن اضطر باء ولا عاد فلا اثم علیہ ان اللہ غفور رحیم“ (بقرہ: ۱۷۳)۔

ضروریات دینیہ کے تکفل کے واسطے علوم دینیہ حاصل کرنے والے طلباء مدارس اسلامیہ بصورت محتاج جب مستحقین زکوٰۃ و صدقات قرار دیئے جاتے ہیں، اور یہ علوم بھی باعتبار تحصیل فرض کفایہ ہیں تو علوم فرض کفایہ کی قسم ثانی کے طالبین کی محتاجی اپنے استحقاق سے مستفاد کیوں کر نہ ہو۔

”وفی الاشبہ والنظائر قال: یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (ص ۱۳۹)۔

”قال الحموی فی شرح الاشبہ: فهو أن یقرض عشرة دنانیر مثلا ویجعل لربها شیئا معلوما فی کل یوم ربا۔“ (ہامش اشبہ والنظائر من فن الاولی ص ۱۳۹)۔

وفیہ۔ ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة وهذا جوزت الإجارة علی خلاف القیاس للحاجة“ (اشبہ ص ۱۳۹)۔

سوالنامہ میں مذکور تعلیمی قرض پر شرح سود کو اگر اجرت خدمت مان لیا جائے تو بھی کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پر لکھنے پڑھنے کاغذات وغیرہ کی حفاظت پیسوں کے لین دین کا عمل خود موجود ہے اور عمل پر اجرت دینا کوئی معیوب بات نہیں ہے بلکہ اجرت عمل بہر حال جائز ہے۔

صورت مسئلہ کو خواہ قاضی کی اجرت کتابت و تالیق اور مفتی کی کتابت فتویٰ پر قیاس کیا جائے یا اسے اجرت دلال پر قیاس کیا جائے بہر دو صورت عمل پائے جانے کی وجہ سے صورت مسئلہ کو اجرت خدمت پر محمول کیا جانا چاہئے، کیونکہ اجرت دلال کا جواز بھی عمل ہی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: شامی ۲/۶۲، المنی لابن قدامہ ۳/۶۶، عمدۃ القاری ۸/۶۲۲، اعلاء السنن ۱۵/۳۸۹، ہندیہ ۳/۳۵۰-۳۵۱، البسوط للسرخسی ۱۵/۱۱۵)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی شامی کی عبارت ”أجرة القاضي علی الكتابة“ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ آڑھت میں عمل

اور مشقت موجود ہے اس لئے اجرت درست ہے، خواہ عمل بیع کا ہو یا شراء کا مشقت اور عمل دونوں میں ہے اس لئے دونوں کی اجرت لینا درست ہوگا (امداد الفتاویٰ ۳/۳۶۳)۔

مفتی محمود حسن گنگوہی فرماتے ہیں: دونوں طرف سے دلالی جائز ہے جبکہ عرف ہو اصالۃ دلالی کا معاملہ ناجائز ہے، مگر حاجت اور عرف کی بنا پر فقہاء نے اجازت دی ہے اور یہ اجازت اپنے عموم کی حیثیت سے یک طرفہ دو طرفہ سب کو شامل ہے۔ خواہ اس طرح کی فی صد دس روپیہ یا فی صد پچاس روپیہ ایک آنا اجرت مقرر کی جائے وہ اجرت درست ہے جس قدر بھی ہو (فتاویٰ محمودیہ ۱۸/۶۱۷، ۶۱۹)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

دلال کی اجرت میں مفتی بہ قول یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اور فی صد کے حساب سے بھی مسمرة کی اجرت لینا جائز ہے (انعام الباری

۶/۴۵۷)۔

مذکورہ عبارات و فتاویٰ سے مستفاد ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں قرض پر بڑھی ہوئی رقم کو اجرت عمل، اجرت خدمت (سروس چارج) پر محمول کیا جائے گا، اسے سود کہنا ہی غلط ہے کیونکہ سوال نامہ میں درج حکومت کا پہلا قول قول ثانی سے باطل ہو جاتا ہے، لہذا وہ سود ہے ہی نہیں اسے سود نہیں کہا جائے گا۔

۳۔ جو طالب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کا اہل ہے، لیکن معاشی کمزوری کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم کے حصول پر عائد ہونے والے اخراجات کا متحمل نہیں ہے اسے اجازت ہے کہ وہ مذکورہ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھائے۔

۴۔ جدید اعلیٰ تعلیم کا وقت عموماً ہر آدمی کے حق میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس کی عمر کا وہ حصہ گزر چکا ہوتا ہے جس کی کفالت والد کے ذمہ ہوتی ہے، یعنی عامۃً بالغ ہونے کے بعد ہی کوئی طالب علم علوم عالیہ جدیدہ کے درجات تک پہنچتا ہے اور بالغ لڑکے کی کفالت باپ کے ذمہ واجب نہیں ہے، البتہ بالغ لڑکیوں کی کفالت قبل از نکاح ضرور باپ کے ذمہ ہوتی ہے، لہذا اعلیٰ تعلیم کے حصول پر عائد ہونے والے اخراجات کا متحمل نہیں ہے کہ مذکورہ تقسیم باحوال عام ہے، صورت مسئولہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، کیونکہ صورت مسئولہ میں اس وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس اسکیم سے تو ہر طالب علم استفادہ کر سکتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اسی طرح خواہ وہ غنی ہو یا محتاج، اس لئے کہ اس اسکیم مذکورہ سے استفادہ سے روکنے والی جو کبیر بنائے شہہ پیدا ہو گئی تھی جب وہ اجرت عمل و خدمت (بنام سروس چارج) پر محمول ہو گئی تو اب تمام طلبہ علوم عالیہ جدیدہ کے لئے راستہ بالکل صاف ہے۔ غنی و محتاج، مذکور و موث بالغ و نابالغ سب مساوی ہیں، بلا فرق مراتب۔

۵۔ اسی طرح اگر کوئی طالب علم یا اس کے والدین ذی حیثیت ہیں یعنی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے خرچ سے جدید اعلیٰ تعلیم دلوا سکتے ہیں مگر وہ اپنا مال بچا کر اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انہیں بھی اجازت ہوگی کیونکہ قرض کا لین دین کوئی امر ممنوع نہیں ہے، رہی مزید کی بات تو وہ اجرت عمل شمار کی جائے گی اور حصول قرض میں غنی و محتاج میں مساوات ہے، اس لئے قباحت کا کوئی پہلو معلوم نہیں ہوتا۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کا حکم

مفتی شیری علی گجراتی دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات۔

۱۔ نصوص قطعہ سے سود کا حرام ہونا بالکل واضح ہے، اور اس کی حرمت میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن سود کا مسئلہ مجمل رہ گیا، مطلب یہ ہے کہ چھ چیزیں ذکر کر دیں، اب سوال یہ ہے کہ ان چھ چیزوں کے ساتھ ہی سود متحقق ہوگا یا ان کے علاوہ کے ساتھ بھی۔

۲۔ سود کو حرام کرنے سے شریعت کا منشا یہ تھا کہ سرمایہ دار سرمایہ داری کے بل بوتے پر غریبوں کا خون نہ چوسے، اور غریبوں پر ظلم نہ ہو، زیر بحث مسئلہ حکومت اور پبلک کے درمیان سود کا ہے، حکومت پبلک سے زکاۃ، خراج وغیرہ طریقے سے روپیہ وصول کرتی ہے، وصول کردہ رقم رفاہ عام میں خرچ کرتی ہے، نیز احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے بطور قرض کوئی چیز لیتے تھے اور دوبارہ زائد اچھے طریقے پر ادا فرماتے تھے، حالانکہ بظاہر یہ سود ہے اس لئے حکومت اور پبلک کے درمیان سود کے تحقق ہونے میں شبہ ہے کیونکہ حکومت اور پبلک کے درمیان ہونے والا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شرکت میں دو شریکوں کے درمیان ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کمی بیشی کے ساتھ اپنا مال بیچ سکتے ہیں اس کو شریعت میں ربا نہیں کہا گیا ہے، جیسا کہ شامی کی اس عبارت ”ولا ربا بین متفاوضین وشریکی عنان اذا تبايعا من مالها أي من مال الشركة... ثمہ“ (۴۲۲/۷) سے واضح ہے۔

۳۔ احادیث میں سود کی حرمت چھ چیزوں میں بیان کی گئی ہے، موجودہ دور میں سونا چاندی کی جگہ نوٹوں نے لے لی ہے، نوٹ کو سونا چاندی کے قائم مقام بنانا محل نظر ہے، نیز نوٹ کا سونے کی ایک خاص مقدار کی رسید ہونا بھی محل نظر ہے، کیونکہ ایک ہزار کا نوٹ لے کر حکومت سے کہو کہ اس نوٹ کا سونا دے دو تو حکومت کے لئے سونا دینا مشکل ہے۔

۵۔ حنفیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دارالاسلام کے علاوہ کہیں سود نہیں ہے، اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی کوئی سود نہیں ہے ”ولا ربا بین حربی و مسلمہ“ (شامی ۴۲۲/۷)۔ بطور خاص جبکہ ہم غیر مسلم جمہوریہ ملک میں رہ رہے ہیں ہمارا کوئی قانون نہیں چلتا، اور ہم مکلف ہیں کہ ان کے قوانین کو تسلیم کریں، اور ان کے اصولوں کو رد نہ کریں، ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جب حکومت یہ کہہ رہی ہے کہ ہم خدمت کر رہے ہیں، ہمارا مقصد تعلیم کو ترقی دینا ہے تو جب تمام اصول میں ان کی باتوں پر عمل کرنے پر مجبور ہیں تو یہ بھی (سود کے طریقہ پر قرض لینا) ضرورت کی وجہ سے جائز ہونا چاہئے، فقہ کا قاعدہ ہے: ”الضرورات تبیح المحظورات“ نیز فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ محتاج آدمی سود کے طریقہ پر قرض لے سکتا ہے، جیسا کہ ”الاشباہ والنظائر“ کی اس عبارت ”یحوز للمحتاج الاستقرار بالربح“ (ص ۱۳۹) سے واضح ہے، اور جہالت بھی ایک قسم کا احتیاج ہے، شریعت نے ہمیں جہالت سے روکا ہے، ترقی کرنے کی ترغیب دی ہے، پس ماندہ رہنے سے منع کیا ہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا مردیا ہے، اور پس ماندہ ہونا ہی غریب بنانا ہے، یہ احتیاج کے مراد ہے، قاعدہ ہے ”الضرر يزال“ اور نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرام ہے: ”لا ضرر ولا ضرار“ (الاشباہ والنظائر ص ۳۰۵)۔

۶۔ لیکن اس کے باوجود یہ قرض حاصل کرنا مسلم غریبوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، اولاً تو مسلم غریبوں کو اس کے اصول معلوم نہیں ہے، اگر وہ معلوم کر بھی لیں تو اس کو حاصل کرنے میں بڑی مشقت کا سامنا ہے، قانون کے باوجود مسلمانوں کی رسائی وہاں تک بہت مشکل ہے، بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے رشوت وغیرہ دے کر ان کو راضی کرنا پڑتا ہے لہذا حل یہی ہے کہ مسلم پرائیویٹ اداروں کو یہ کام کرنا چاہئے، اور غریبوں کی مدد کرنا چاہئے، لیکن وہ بھی مفاد پرست ہیں، غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا، ادارے کیا ہیں بلکہ ایک بزنس ہیں۔ حالانکہ یہ ذمہ داری حکومت کی ہے کہ اقلیتوں اور غریبوں کی تعلیم کا مفت انتظام کرے، اور اولیاء اپنے نوجوان کو بھی تربیت دیں اور نوجوان خود محنت کرے اور کوشش کرے، اب حل یہی ہے کہ خود مسلم ادارے ایمان پوری کے ساتھ ادارے شروع کریں، اور غریب طلبہ کی مدد فرمائیں، اہل ثروت حضرات غریبوں کے بچوں کی فیس کا انتظام کریں۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت

مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی سابق مفتی اعظم پنجاب، مالیر کولہ، پنجاب۔

اسلام نے علم کی اہمیت کو جس انداز میں اجاگر کیا ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے، وحی الہی کا اقرار سے آغاز اور نوع انسانی کے سب سے پہلے (حضرت آدم علیہ السلام) کو خود رب العالمین کا تعلیم دینا اور یہ فرمانا کہ "علّمہ آدمہ الاسماء کلہا" یہ سب چیزیں روشن دلیل ہیں کہ اسلام نے علم کی اہمیت کو سب سے آگے بڑھ کر محسوس کیا ہے، امت محمدیہ کی دیگر تمام امتوں کے مقابلے میں یہ خصوصیت ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد مبارک میں علم کو فرض سے بڑھ کر فریضہ قرار دیا ہے، اور ارباب علم خوب سمجھتے ہیں کہ فرض اور فریضہ میں کیا فرق ہے، فرض کبھی ساقط بھی ہو سکتا ہے لیکن فریضہ کسی حال میں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک الفاظ میں بارگاہ الہی میں یہ دعا فرما کر "اللہم انی اعود بک من علمہ لا ینفع" اس دعا سے واضح ہوتا ہے کہ علم غیر نافع کو چھوڑ کر علم نافع کے حصول میں دینی اور دنیاوی کی کوئی تحدید نہیں ہے۔

یہ ضرور ہے کہ وہ بنیادی علم جس کا تعلق تخلیق انسانی کے مقصد کے ساتھ ہے وہ ہر شخص پر کم سے کم اتنا ضرور لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ذمہ داریوں کو جن کا تعلق حقوق اللہ سے بھی ہے اور حقوق العباد سے بھی سمجھ سکے اور انجام دے سکے۔

امت محمدیہ کا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے منصب کے اعتبار سے خیر امت، قوموں کا امام اور رہنما بنایا ہے، یہ منصب جتنا عظیم ہے اس کے لحاظ سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کم سے کم ایک قابل ذکر حصے پر دینی اور دنیاوی علوم کے حاصل کرنے میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ اپنے علمی معیار، فہم و فراست اور وسعت و بصیرت کے اعتبار سے امت محمدیہ کو اس مقام پر ہونا چاہئے کہ وہ دوسری قوموں کے لئے ایک نمونہ اور باعث تقلید بن جائے۔ یہ معاملہ صرف ایک فرد کی علمی قابلیت کا نہیں ہے، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے امت محمدیہ کے ایک اچھے خاصے حصے کا علمی مقام کیا ہونا چاہئے، تاکہ وہ دوسری قوموں کے رہبر و رہنما ہو سکے۔

کاروان تہذیب کی قیادت اگرچہ عملاً اس وقت امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نہیں ہے مگر یہ امت محمدیہ کا حق بھی ہے، مقام بھی ہے اور اسکی ذمہ داری بھی ہے۔

۱۔ ہم اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ قرآن وحدیث میں گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ ہمیں جدید اعلیٰ تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہئے، شریعت کا نقطہ نظر اس کے بارے میں یہی ہے اور مسلمانوں کا رویہ بھی اس سلسلے میں سمٹنے والا نہیں بلکہ پھیلنے والا ہونا چاہئے۔

۲۔ اس میں شک نہیں کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے آج کل اخراجات بہت بڑھ چکے ہیں، حتی الامکان یہ کوشش ہو کہ تعلیمی قرض کی ضرورت پڑے تو بلا سودی قرض حاصل ہو سکے، لیکن اگر بدرجہ مجبوری اس کے سوا چارہ کار نہ ہو تو سرکاری کم شرح سود کو اجرت خدمت سمجھ کر گوارا کیا جاسکتا ہے۔

بشرطیکہ طالب علم یہ سمجھ کر اس کو گوارا کر رہا ہو کہ میں آگے چل کر اس معاشی نظام کو بدلنے کی کوشش کروں گا تاکہ دنیا میں سودی معاشی نظام کے بجائے غیر سودی اور اسلامی معاشی نظام قائم ہو سکے۔

۳۔ اعلیٰ تعلیم کی اہلیت کے ساتھ اگر معاشی حالات تعلیمی اخراجات اٹھانے کے متحمل نہیں ہیں تو قرض اسکیم سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی۔

۴۔ عام طور پر تعلیم کی ذمہ داری والدین ہی اٹھاتے ہیں اور جب تک طالب علم اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر کسی روزگار سے واسطہ نہیں ہو جاتا والد ہی اس کے ذمہ دار سمجھے جائیں گے، اس لئے اگر والد صاحب استطاعت ہیں تو اس تعلیمی قرض سے بچنا چاہئے جس میں کچھ نہ کچھ سود دینا پڑتا ہے۔

۵۔ اگر والد اپنی ذمہ داری سے گریز کرتے ہیں اور باصلاحیت طالب علم اپنے شوق کی وجہ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اس کو قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مفتی محبوب علی وجہی علیہ

۱۔ شریعت اسلامی میں جس سختی کے ساتھ سود کے لین دین کی ممانعت کی گئی ہے وہ آپ پر روشن ہے، لیکن حالات کے تغیر و تبدل ہو جانے کی وجہ سے قوم و ملت کے مصالح کو بھی دیکھنا پڑتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ آج کل جو تعلیم ترقی حاصل کرنے کے لئے اور دشمنان اسلام کا جواب دینے کے لئے لازم ہے اسے ایک غریب بچہ حاصل نہیں کر سکتا، اسی لئے مسلمان تعلیم کے میدان میں پسماندہ ہیں اور دوسری قومیں اپنی ٹیکنیکل اور سائنس میں اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے اتنی آگے بڑھ گئی ہیں کہ مسلمان کا باعزت جینا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے، اس لئے دشمن طاقتوں کا جواب دینے کے لئے جدید تعلیم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے نہایت ضروری ہے اگر مسلمانوں کو توفیق ہوتی تو اپنے مال کی پوری زکوٰۃ نکالتے اور ذہین غریب بچوں پر خرچ کرتے تو ہمیں کسی قرض لینے کی ضرورت نہیں پڑتی، لہذا اگر بچے کے والدین اس کی تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے اور بغیر سود کے اسے قرض بھی نہیں ملتا تو پھر بدرجہ مجبوری وہ بینک سے قرض لے سکتا ہے، اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہے، الاشباہ والنظائر (حصہ ۱۱۵) پر ہے: ”یحوز للمحتاج الاستقراض بالربح و ذلک نحو ان یقترض عشرة دنانیر مثلا ویجعل لربہا شیئا معلوما فی کل یوم رجحا“ اس قاعدے سے معلوم ہوا کہ ضرورت مند سودی قرض لے سکتا ہے۔

۲۔ حکومت کا دعویٰ خواہ کچھ بھی ہو وہ سود ہی کہلائے گا کیونکہ اس نے رخ کو مقرر کر دیا ہے اور قرض دینے پر رخ کی شرط لگائی ہے جیسا کہ الاشباہ کی عبارت سے اوپر معلوم ہوا، ہاں اگر بغیر تعین و شرط کے قرض لینے والا اجرت خدمت سمجھ کر کچھ بڑھا کر دے دے تو یہ سود نہیں ہوگا بلکہ حکومت کی خدمت کے عوض تبرع ہوگا جو درست ہے مگر مذکورہ اضافہ کو اجرت خدمت پر محمول نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ اضافہ سود کہلائے گا۔

۳۔ ایسے طالب کے لئے مذکورہ اسکیم سے فائدہ حاصل کرنا درست ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

۴۔ اگر طالب علم بالغ ہے تو والدین کے صاحب استطاعت ہونے سے وہ طالب علم صاحب استطاعت نہیں ہوگا، لہذا والدین اس کی تعلیم پر خرچ کریں تو اسے اس اسکیم سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر والدین خرچ نہ کریں تو پھر اس اسکیم سے اسے فائدہ اٹھانا جائز ہے اور چونکہ نابالغ بچہ والدین کی کفالت میں ہوتا ہے اس لئے اس کے والدین صاحب استطاعت ہیں تو اسے اس اسکیم سے استفادہ کرنا درست نہیں ہے، اور اگر ماں و باپ صاحب استطاعت نہیں ہیں تو نابالغ طالب علم کو مذکورہ اسکیم سے استفادہ کرنا درست ہے، اور اس صورت کو زکوٰۃ کے مسئلہ پر قیاس کیا جائے گا کہ جس بچے کے والد صاحب استطاعت ہوں اور وہ بالغ ہو لیکن وہ صاحب نصاب نہ ہو تو اسے زکوٰۃ دینا درست ہے اور اگر بچہ نابالغ ہے لیکن اس کے والد صاحب نصاب ہیں تو پھر بچہ بھی صاحب نصاب مانا جائے گا اور اسے زکوٰۃ دینا درست نہیں لیکن اگر بچے کے والدین اس کی کفالت نہ کریں تو اسے زکوٰۃ دینا بھی درست ہے اور اس بچے کو سود پر قرض لینا تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھی جائز ہے، شامی (۱۵/۲) پر ہے: ”وإذا کان ولدہ صغیرا فلا بد عن کوئہ فقیرا ایضا، لان الصغیر یعد غنیا یغنی ایہ“، اور زکوٰۃ میں مسئلہ یہ بھی ہے کہ طالب علم اگر صاحب نصاب ہو تو اسے جب بھی زکوٰۃ لینا جائز ہے لیکن سود پر قرض لینا جائز نہیں ہوگا، پہلے وہ اپنا مال خرچ کرے اس کے بعد بدرجہ مجبوری سود پر قرض لے سکتا ہے، جیسا کہ الاشباہ والنظائر کے حوالہ سے اوپر گزر چکا۔

۵۔ مذکورہ صورت میں اگر والدین صاحب استطاعت ہوں تو پھر انہیں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے پہلے اپنا سرمایہ بچہ پر خرچ کریں اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو اس اسکیم سے استفادہ کرنا درست ہوگا، ہاں اگر والدین بچے کی تعلیم پر خرچ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اسے پڑھانا چاہتے ہیں اور بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو پھر اس صورت میں جبکہ وہ خود صاحب استطاعت ہو تو مسئلہ کا وہی حکم ہے جو نمبر ۴ میں گزر چکا ہے، یعنی پہلے اپنا سرمایہ خرچ کرے اس کے بعد ضرورت ہو تو سود پر قرض لے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض - مسائل و احکام

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی قاضی شریعت امارت شرعیہ، پبلواری شریف، پٹنہ۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، وہ اس کا مکلف ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کرے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے جہاں ایک طرف اس پر یہ واجب ہے کہ اس کو کتاب و سنت کا علم ہو وہیں دوسری طرف یہ بھی اس پر واجب ہے کہ انسانی تمدن سے متعلق علوم پر بھی اس کی گہری نگاہ ہو، خواہ اس کا تعلق حکومت و سیاست سے ہو، یا طب و سائنس سے ہو، تاریخ و جغرافیہ سے ہو یا صنعت و حرفت سے ہو۔

شریعت کی نگاہ میں تعلیم کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وحی جو نازل ہوئی اس میں انسان کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم میں اضافہ کی دعا کرنے کا حکم دیا، اہل علم کے درجات کو بلند کیا، آفاق و انفس میں غور کرنے کی دعوت دی۔

شریعت میں ہر علم نافع کو حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، احادیث میں کثرت کے ساتھ اس قسم کے احکام مذکور ہیں، ایک جنگ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی قیدیوں کا فدیہ ہی یہ مقرر کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔

اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ میں زندگی گزارنے کے لئے جن چیزوں کا جاننا انسان کے لئے ضروری ہے ان کا جاننا انسان پر فرض عین ہے، اور جن امور کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے نہیں ہے لیکن دنیا کا قائم رکھنا ان پر منحصر ہے ان کا جاننا بھی فرض کفایہ ہے۔

”من فرائض الإسلام تعلم ما يحتاج إليه العبد في إقامة دينه وإخلاص عمله لله تعالى و معاشرۃ عباده، وفرض على كل مكلف ومكلفة بعد تعلمه علم الدين والهداية، تعلم علم الوضوء والغسل والصلوة... والبيوع على التجار ليحترزوا عن الشبهات والمكروهات في سائر المعاملات وكذا أهل الحرف وكل من اشتغل بشيء يفرض عليه عمله وحكمه ليمنتنع عن الحرام فيه...“

وأما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب والنحو واللغة... وأصول الصناعات والفلاحة كالحياكة والسياسة والحجامة...“ (ردالمحتار ۱۱۲۵، ۱۱۲۶)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کا حاصل کرنا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور مسلمانوں کو حاصل کرنا چاہئے لیکن یہ بہر حال فرض عین نہیں ہے، بلکہ فرض کفایہ ہوگا۔

۲۔ سود کی مقدار کم ہو یا زیادہ بہر حال سود ہے، اور اس کی حرمت قطعی ہے، سود کی کم مقدار کو سود چارج قرار دینا محل غور ہے، اس لئے کہ اگر وہ خدمت کی اجرت ہو سکتی ہے تو قرض کے دس ہزار روپے ہونے یا بیس ہزار روپے ہونے میں محنت کم و بیش نہیں ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اجرت میں فرق ہو جاتا ہے، نیز وقت میں اضافہ کے ساتھ چارج میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو خدمت کی اجرت قرار دینا انتہائی مشکل ہے۔

۳۔ جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شرعاً مطلوب ہونے کے باوجود اس کو زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ کہا جاسکتا ہے، اس کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، کیونکہ کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے ذریعہ بھی اچھا ہونا چاہئے۔

فرض کفایہ کو ادا کرنا ان ہی لوگوں پر ضروری ہوتا ہے جو اس کو ادا کرنے کے اہل ہوں، مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ہونے والے اخراجات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس لئے جو طالب علم اخراجات کا تحمل نہ ہوگا اس پر اس کا حصول واجب نہ ہوگا، لہذا اس کو سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

۵، ۴۔ طالب علم اگر صاحب استطاعت نہ ہو اس کے باوجود اس کو سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہے، تو صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں تو بدرجہ اولیٰ سودی قرض لینا جائز نہ ہوگا۔

☆☆☆



## تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مولانا سلطان احمد اصلاحی مدظلہ

۱- جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول امت پر فرض کفایہ ہے اور یہ اسی طرح فرض کفایہ ہے جس طرح علوم دینیہ میں مہارت امت پر فرض کفایہ ہے، اسی کے لحاظ سے مسلمانوں کو جس طرح علوم دینیہ کے ماہرین و اختصاصیین کے پیدا کرنے میں دلچسپی لینا چاہئے، اسی طرح اسے جدید علوم کے ماہرین پیدا کرنے کے لئے بھی پر عزم رہنا چاہئے، اور اس کے لئے شریعت کے حدود کی پابندی کرتے ہوئے جملہ وسائل کو روکا جانا چاہئے۔

۲- تعلیمی قرض کے لئے سرکاری بینکوں سے استفادہ کرنے میں حکومت کی اس وضاحت کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے کہ اس پر لیا جانے والا اضافہ سود نہیں بلکہ سروس چارج ہے، بینکوں کے موجودہ نظام میں دیئے جانے والے قرض رفرضوں پر جو اضافی رقم سود یا انٹرسٹ وصول کی جاتی ہے اس میں ان کو چلانے کا سروس چارج کا معمولی صرفہ تو شامل ہوتا ہی ہے، اس سے ہٹ کر ان بینکوں کی پالیسی کا یہ مستقل حصہ ہے کہ وہ ہر نوع کے قرض پر کم یا زیادہ متعین انٹرسٹ وصول کرتے ہیں، اس لئے ان بینکوں سے استفادے میں سروس چارج کے نکتے سے جواز حاصل کرنے کا کوئی خاص وزن نہیں ہے، ان سے استفادہ میں ان کی مذکورہ اصل حیثیت کو مد نظر رکھا جانا مناسب ہے۔

۳- فرض کفایہ کے سلسلے میں یہ نکتہ معلوم و معروف ہے کہ وہ متعین افراد کی نسبت سے فرض عین بن جاتا ہے، سو امت کے جو افراد اعلیٰ تعلیم میں مہارت اور اپنے اندر خصوصی رجحان اور اہلیت محسوس کرتے ہوں ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر ان کے خود کے وسائل اس کے مصارف کا تحمل نہ کرتے ہوں۔

۴- صحیح بات تو یہ ہے کہ حدود کی رعایت سے مسلمان باپ کی اولاد کو اعلیٰ تعلیم میں بھرپور دلچسپی لینا چاہئے، لیکن اگر کسی وجہ سے استطاعت کے باوجود وہ اس میں دلچسپی نہ لے تو باپ کی استطاعت کو اولاد کی استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، اور طالب علم کے لئے ایسی قرض سے استفادہ جائز ہوگا، بالغ ہونے پر اولاد زینہ کا نفقہ باپ کے اوپر واجب نہیں رہ جاتا، البتہ حالات کے لحاظ سے یہ اس کے لئے مندوب و مستحسن ضرور رہتا ہے، اعلیٰ تعلیم میں مدد اس سے بھی آگے کا مندوب ہے جس کا اس کو پابند نہیں کیا جاسکتا، اس کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم کا خواہشمند لڑکا اس کے لئے اپنے آپ ذمہ دار ہوگا، باپ اس کی ذمہ داری میں لازمی شریک نہیں ہوگا۔

۵- باپ بیٹے کے صاحب استطاعت ہوتے ہوئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا اسی صورت میں جائز ہوگا جبکہ ان کے اوپر بیٹی کی شادی یا اس جیسی کوئی دوسری ذمہ داریاں ہوں جو تعلیم سے اہم تر ہوں، دوسری صورت میں ان کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ محذور سے استفادہ کے جواز کے لئے شرط ہے کہ اس سے بقدر ضرورت ہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت

مولانا ابوسفیان مفتاحی

۱۔ حصول علم کے باب میں شریعت کا نقطہ نظر ملاحظہ کیا جائے، اس سلسلہ میں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ رہنمائی فرمائی ہے، ”طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم“ الحدیث رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان (یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے) اس سے مراد مطلق علم نہیں ہے بلکہ علم شرعی ہے اور اس کا فرض ہونے کے باب میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں علماء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر علم دین نہ ہو بلکہ دنیاوی ہو تو اس کو اس مقصد کے لئے حاصل کرنا کہ اسے حصول دنیا کے لئے وسیلہ اور ذریعہ معاش بنایا جائے، کوئی برائی نہیں ہے لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ علم ایسا نہ ہو جس کے حصول کو شریعت درست قرار نہیں دیتی جیسے علم نجوم وغیرہ یا دوسرے ایسے علوم جو عقیدہ و عمل پر اثر انداز ہوتے ہوں تو ایسے علوم کے حاصل کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ جدید تعلیم جو آج کی دنیا میں رائج ہے اور علم سائنس سے معروف و مشہور ہے، وہ شریعت کے نقطہ نظر سے رخصت کے درجہ میں ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس میں حرام علوم کی آمیزش نہ ہو۔

۲۔ سود بہر حال سود ہے کم لیا جائے یا زیادہ وہ بنص قطعی حرام ہے، نیز زیادہ مدت کے لئے دیا جائے یا کم مدت کے لئے وہ سود ہی رہے گا، گو حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس قرض کا مقصد کمانا نہیں ہے پھر بھی وہ سود ہی ہے، تو اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

اگر بغیر سود کے قرض لینا ممکن نہ ہو تو یہ یاد رہنا چاہئے کہ اسلامی نقطہ نظر سے جدید اعلیٰ تعلیم کا حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض نہیں ہے کہ اس کو ضرورت کے درجہ میں رکھ کر ضابطہ ”الضرورات تنج المحظورات“ سے اس سودی قرض کو جائز کرنے کی کوشش کی جائے، لہذا اس کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اس میں تو غیروں سے مرعوب ہو کر حرام کو حلال کرنے کی کوشش ہے جو حرام ہے، اگر جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر مسلمانوں کو ابھارنا ہے تو اس کے لئے کوئی فلاحی ادارہ قائم کیا جائے جس سے مسلمان طلبہ کی تعلیمی کفالت کی جائے۔

۳۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس خرچہ کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تو علماء کرام و مفتیان عظام نے اس قرض کی اس اسکیم سے جس میں مبلغ چار لاکھ روپے ہیں اور اس میں قرض نہیں ہوتا فائدہ اٹھانے کی اجازت دے سکتے ہیں لیکن سودی قرض کی اجازت نہ دیں۔

۴۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت تعلیم کے خرچ کی متحمل نہیں لیکن اس کے والدین میں اس کی صلاحیت ہے تو والد صاحب کے صاحب استطاعت ہونے سے لڑکے کو صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ شریعت اسلامیہ نے اصول و فروع کو زکاۃ دینے سے منع کیا ہے، لہذا ایسی صورت میں باپ اپنی اولاد سمجھ کر اس کی تعلیم میں اس کی امداد کرے، اور قرض کے جائز ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا تو اس کے متحمل نہ ہونے کی وجہ سے ارباب افتاء اس کو اس قرض کی اس اسکیم سے جو چار لاکھ روپے ہیں، سے بغیر سود کے فائدہ اٹھانے کی رخصت دے سکتے ہیں، یا پھر کوئی مسلم تنظیم اس کی تعلیم کے خرچ کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے۔

۵۔ اگر طالب علم صاحب استطاعت ہو اس کے باوجود فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہے تو ایسا کرنا درست نہیں ہے اور اس کے لئے اس قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، کیونکہ قرض لینے کے لئے وہ مجبور نہیں ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مولانا نور الحق رحمانی ۷

انسان کو اللہ رب العزت نے روئے زمین کی خلافت عطا کی ہے، وہ اس روئے زمین کی آباد کاری اور اس کے نظام کو اللہ تعالیٰ کے منشا و مرضی اور اس کے احکام کے مطابق چلانے کا مکلف ہے، اس کے لئے ایک طرف دینی و شرعی علم ضروری ہے تو دوسری طرف وہ تمام علوم و فنون بھی شرعاً مطلوب ہیں جن کی ضرورت انسانی تمدن کو ہے، اس لئے کتاب و سنت کے علم کے ساتھ طب، سائنس، سیاسیات، اقتصادیات و معاشیات، سماجیات، ارضیات، فلکیات، تاریخ، جغرافیہ، حساب، صنعت و حرفت اور دیگر تمام مفید اور عصری علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے، شریعت کا اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے جس سے وہ اپنی ذات سے متعلق اللہ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کر سکے اور اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کو انجام دینے کا اہل بن سکے، اس کے علاوہ دیگر مفید علوم و فنون اور پیشہ و رانہ تعلیم حسب استطاعت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، اس لئے ہر وہ علم جس کو انسان کو ضرورت ہے، ملک اور سماج میں ان کے جاننے والوں کی ایک جماعت کا ہونا فرض کفایہ ہے، تاکہ کائنات کا نظام صحیح طور پر چل سکے اور ہر طرح کے ضروری امور انجام پاسکیں۔

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول شرعاً مطلوب ہے اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو اپنی وسعت و استطاعت کے بقدر ان کے حصول کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن جو لوگ وسائل کی کمی اور معاشی حالت کی کمزوری کی وجہ سے جدید اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے شرعاً ان کے لئے اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ وہ سرکاری سودی قرض لے کر جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، اگر مذہبی و ملی مصالح اس کے متقاضی ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس مقصد کے لئے کوئی اجتماعی فنڈ قائم کریں اور اس سے ایسے ہونہار مسلم طلبہ کی اعانت کریں جو اس میدان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا کم از کم انہیں ایسی تعلیم کے لئے غیر سودی قرضے فراہم کریں جنہیں وہ برسر روزگار ہونے کے بعد ادا کریں۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں اور یہ قرض زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے، حکومت کا یہ دعویٰ بھی صحیح ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں، لیکن شرح سود کے کم یا زیادہ ہونے کی وجہ سے حکم شرعی نہیں بدلتا، شرح سود کم ہو یا زیادہ بہر حال وہ سود ہے اور سرکاری بینک سود ہی کے نام پر لین دین کرتا ہے اور سود از روئے شرع نہ صرف حرام ہے بلکہ وہ سب سے بدتر کمائی ہے، شرعی اصول کی رو سے بطور قرض جو رقم لی گئی ہے، اس راس المال پر کوئی اضافہ خواہ وہ ایک فیصد ہو یا ایک فی ہزار ہو یا ایک فی لاکھ ہو وہ سب سود ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ، فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تَبتم فلكم رؤس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون“ (سورہ بقرہ: ۲۷۸-۲۷۹) (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم سچ بچ ایمان والے ہو، اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، ہاں اگر توبہ کر لو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

معلوم ہوا کہ قرض دینے والے کا راس المال کی واپسی کے علاوہ کوئی حق نہیں جتا اور اگر وہ کوئی اضافی رقم لیتا ہے تو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کم ہو وہ شرعاً

سود ہے اور بینک سود ہی کے نام پر اضافی رقم وصول کرتا ہے تو پھر اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر کیسے محمول کیا جاسکتا ہے؟ بلاشبہ یہ ایک سودی معاملہ ہے جس کی اجازت شرعاً نہیں دی جاسکتی۔

۳۔ کسی اچھے مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بھی صحیح ہونا چاہئے اس لئے ایسا شخص جو تعلیم کے لئے کسی شعبے میں داخلہ کا اہل ہے یا وہ بیرون ملک جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس خرچ کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تو ایسے شخص کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد سود جیسی خبیث اور قبیح معصیت پر ہو جس کے ارتکاب پر اللہ رب العزت کی طرف سے اعلان جنگ ہے، جن لوگوں کی معاشی حالت اس قابل ہو کہ وہ اس خرچ کو برداشت کر سکیں انہیں اس کے لئے آگے بڑھنا چاہئے، جو لوگ ذاتی اعتبار سے اس کے متحمل نہیں ہیں وہ شرعاً اس کے مکلف بھی نہیں ہیں، ایسے علوم کا حصول زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے، فرض عین بہر حال نہیں ہے کہ اس کے لئے سود کی لعنت مول لی جائے۔

۴۔ والد اگر اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی استطاعت رکھتے ہوں اور وہ بطیب خاطر اس خرچ کے لئے تیار ہوں تو فیہا ورنہ یہ ایسی ضرورت نہیں ہے کہ جس کے لئے طالب علم کو سودی قرض لینے کی اجازت دی جائے۔

۵۔ صاحب استطاعت ہونے کی صورت میں اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی تو کسی صورت میں اجازت نہیں دی جاسکتی۔



## تعلیمی قرض کی حقیقت

مفتی انور علی اعظمی

۱- جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسلمان اپنے بنیادی عقائد اور شرعی احکام کی رعایت و حفاظت کرتے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے سارے علوم حاصل کر سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ علم میں کوئی تقسیم نہیں اور علم کسی کی میراث نہیں ہے، شریعت مطہرہ نے ضروری علوم حاصل کرنے پر کہیں روک نہیں لگائی ہے، قرآن و حدیث میں اس کے اشارے موجود ہیں، سیدنا داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

”وعلمناء صنعة لبوس لكم لتحصنكم من بأسكم فهل أنتم شاكرون“ (ہم نے داؤد کو زرہ سازی کا فن سکھایا تاکہ وہ تم کو لڑائی سے بچائے تو کیا تم لوگ شکر ادا کرو گے)۔

اس کے ساتھ ”أعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوا الله وعدوكم“ کو بھی ملا لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے لئے ہر وہ علم حاصل کرنا ضروری ہے جس سے وہ دنیا میں بڑی بڑی عسکری قوت کا مقابلہ کرنے کے اہل بن سکیں، اگر غیر مسلم ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی کے بل ایٹم بم، بی باون اور ایف سولہ وغیرہ بنا کر اپنی دھاک دنیا پر جما سکتے ہیں تو مسلمانوں کو اس سے طاقتور سامان بنانے کے لئے ان سے زیادہ اونچا علم حاصل کرنا چاہئے اور علم و تحقیق کے میدان میں ان سے زیادہ محنت کرنی چاہئے تب جا کر وہ اللہ کے دشمنوں کو ڈرانے کی پوزیشن میں آسکتے ہیں، امریکہ اور روس نے ۱۹۴۹ء سے پہلے ایٹمی راز حاصل کر لئے اور ہم نے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے اس علم سے کنارہ کشی اختیار کر لی، علمی اور عسکری کمزوری کی وجہ سے ہم بجائے ڈرانے کے ڈرنے کی پوزیشن میں مبتلا ہیں۔

اسی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی کا گہرا ربط صنعتی امور سے ہے، مغرب کے صنعتی انقلاب نے ساری دنیا کو متاثر کیا، اس انقلاب میں بنیادی دخل برقی توانائی اور مشینوں کی ایجادات کا ہے اور اس کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم ہی بنیاد ہے، سائنس سے لے کر ہوائی جہاز تک بنانے کے لئے ان علوم کی ضرورت ہے۔

آج کے صنعتی اور مشینی دور میں لوہا بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس دھات کا ذکر کیا اور حضرت داؤد کے لوہے کو موم کر دیا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن پاک میں الحدید کے نام سے ایک سورہ ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دھات اس دو میں کچھ خاص اہمیت رکھتی ہے۔

عسکری، اقتصادی، اور صنعتی میدانوں کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جدید تعلیم کا پورا پورا دخل ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس کے بغیر چارہ نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ مسلمان قرون اولیٰ کے سائنسدانوں کی طرح یہ سارے علوم اسلام کے دائرہ میں رہ کر حاصل کریں، ان کے حصول کے لئے دین و ایمان کی قربانی نہ دیں۔

۲- اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے یہ عرض ہے کہ سو فیصد قطعاً حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو منانے کا اعلان کیا ہے، حدیث پاک

مفتی دارالعلوم منو، منو۔

میں جان بوجھ کر ایک درہم سود کھانے کو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت گناہ کہا گیا ہے، مشکوٰۃ شریف میں ہے:

”عن عبد اللہ بن حنظلہ غسیل الملائکة قال: قال النبی ﷺ: درہم ربوا یا کله الرجل وهو یعلم أشد من ستة وثلاثین زنیہ“ (رواہ احمد، دارقطنی وروی البیہقی فی شعب الإیمان عن ابن عباس ۱۰۲۳۶-۱۰۲۳۵)۔

اس صورت حال میں معمولی شرح سود کو سروس چارج قرار دے کر سود کا دروازہ کھولنا ایک بہت بڑا فساد ہے اور اس کی اجازت دینا اسلام اور مسلمانوں کے لئے کسی طرح مفید نہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی کاروباری ترقی کے لئے جہاں سودی کاروبار کو اپنایا، ان کی صنعت تباہ ہو گئی، گورکھپور کے علاقہ میں مسلمانوں نے سرکاری لون لے کر پاور لوم لگایا، وہاں کی پوری صنعت ختم ہو گئی، سو کے مسلمانوں نے ۱۹۷۰ء کے آس پاس بڑے پیمانے پر بینکوں سے لون لئے علما کے روکنے پر ان کا مذاق اڑایا نتیجہ کے طور پر ان کا سارا کاروبار تباہ ہو گیا، اس لئے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ضرورت کے لئے سودی قرض کے بجائے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

سوال میں یہ کہا گیا ہے کہ تعلیمی قرض میں سرکاری بینک بہت کم سود لیتے ہیں جبکہ آپ کے مرسلہ مضمون میں انجینئر طارق سجاد صاحب لکھتے ہیں: چار سے دس لاکھ میں بینک کی شرح ۱۲ فیصد اور ۱۰ فیصد ہوتی ہے، اور دس لاکھ سے اوپر قرض لینے پر ۱۲ فیصد اور ۱۴ فیصد تک ہو جاتی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیمی قرض میں شرح سود بھر پور ہوتی ہے، اور بینک سرکار کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔  
الغرض شرح سود کم ہو یا زیادہ ہم دونوں صورت میں مسلمانوں کے لئے اس کو جائز نہیں سمجھتے۔

۳۔ اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تو بھی اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

۴۔ طالب علم کے معاشی حالات اس کے متحمل نہیں لیکن اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو والد کے صاحب استطاعت ہونے سے طالب علم صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ طالب علم کی ذاتی حالات کو دیکھا جائے گا کیونکہ شریعت میں بالغ ہو جانے کے بعد غنی اور فقیر ہونے کے مسئلہ میں لڑکے اور لڑکی مستقل حیثیت رکھتے ہیں، البتہ نابالغ بچے فقر و غنی کے معاملہ میں باپ کے تابع ہوتے ہیں، لیکن تعلیم کے مسئلہ میں سودی قرض کا حکم وہی ہوگا جو اوپر مذکور ہے یعنی طالب علم اس کے لئے غیر سودی قرض حاصل کرے، مسلم تنظیمیں ہونہار غریب طالب علموں کے لئے وظیفہ کا بندوبست کریں کیونکہ یہ ایک ملی ضرورت ہے، یا سرکار سے مطالبہ کریں کہ مسلمان لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے غیر سودی قرض دیئے جائیں۔

۵۔ اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں اس کے باوجود فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں تو اس اسکیم سے اٹھانا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا۔



## قرض لے کر تعلیم حاصل کرنا

قاضی محمد ہارون مینگل

۱۔ شرعاً کسی بھی کمال کے حصول میں کوئی ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ وہ کمال یا علم دین اور شریعت سے بے گانہ کرنے کا سبب نہ بنے، خدا فراموشی اور دین اسلام سے تشرف تک پہنچانے والے علوم کے حصول کی اسلام اجازت نہیں دیتا ہے۔

لارڈ میکالے کے لائے ہوئے نظام تعلیم کا مقصد وحید ایک خاص قسم کی ذہنیت کے سرکاری ملازم پیدا کرنا تھا، اس لئے اس نظام اور نصاب کے تحت تعلیم پانے والے افراد کا مقصد ملازمتوں کے سوا کچھ نہیں وہ اس تعلیم کے ذریعہ ایک اچھا ذریعہ معاش پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں، انہیں اپنے عقائد اور دین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے، حالانکہ تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش نہیں بلکہ تعلیم کا مقصد ذات کی تکمیل، اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول، پوشیدہ صلاحیتوں کا نکھار اور حقائق اشیاء (انس و آفاق) پر غور و تدبر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اگر یہ نظریہ مسلمان طالب علم کے مد نظر ہو تو اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے اسلام نہیں روکتا۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دین اور انسانی خدمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، نہ صرف معاش یا ملازمت حاصل کرنے کی خاطر۔

۲۔ ساری دنیا کے نہ صرف علماء کرام بلکہ ماہرین معاشیات اور مسلم بینکرز اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح عام قرضوں کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی کے تقریباً ۴۵ ممالک کے علماء نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے اور اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہ بھی ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ "ما حرم کثیرہ حرم قلیلہ"۔

اور شریعت ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتی ہے جو ناگزیر ہو۔ "لا یكلف الله نفساً الا وسعها"۔

اگر اس قسم کی ضروریات کی بنیاد پر حرمت قطعاً کوہم جائز قرار دیں تو ایک لائسنس دروازہ کھل جائے گا۔

جہاں تک سود چارج کا معاملہ ہے تو وہ ان قرضوں کے وجود اور عدم وجود سے قطع نظر وہ مقرر ہے، جو علاحدہ وضع کیا جاتا ہے، لہذا میرے نزدیک یہ حیلہ درست نہیں ہے۔

۳۔ ہرگز نہیں، اعلیٰ دنیوی تعلیم کے لئے بیرون ملک جانا نہ شرعی ناگزیرات میں سے ہے اور نہ ہی شرعاً اعلیٰ دنیوی تعلیم حاصل کرنا لابدی ہے، آج کل دنیوی تعلیمات کی اکثریت معاشی ضروریات میں ہیں نہ کہ دینی، اس لئے ان کے لئے محرمت کے جواز کی تلاش درست نہیں ہے۔

۴، ۵۔ کا جواب بھی آگیا کہ اس سے جواز ثابت نہیں ہوتا ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض اور اسلام

مولانا عبدالحی مفتاحی ط

جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول قاعدہ فقہیہ "الاصول فی الاشیاء الاباحۃ" (قواعد الفقہ ص ۵۰) کے پیش نظر بغرض صحیح مباح بلکہ مستحسن ہے، نیز یہ تعلیم معاشرتی زندگی میں خوشگوااری اور روشن مستقبل کا پیش خیمہ ہے، اس لئے مسلمانوں کو اسے حاصل بھی کرنا چاہئے۔

جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے تعلیمی قرض چاہے کم شرح سود کے ساتھ ہو یا زیادہ شرح سود کے ساتھ، بیرون ملک جا کر ہو یا اندرون ملک طالب علم کی معاشی حالت تعلیم کے اخراجات کے تحمل ہو یا نہ ہو سہرپرست صاحب استطاعت ہوں اور تعلیمی اخراجات کا تحمل کر سکیں یا نہ کر سکیں بہر صورت یہ ربوۃ النسیہ ہی کی ایک شکل ہے اور ربوۃ النسیہ مطلقاً (بلا کسی تفصیل قلیل و کثیر اور شرط) قرآن و حدیث کے فیصلے کے مطابق حرام ہے اس لئے سوالنامہ میں مذکور اسکیم سے فائدہ اٹھانا حرام اور ناجائز ہوگا۔

مقدمہ لول کی دلیل ربوۃ النسیہ کی حقیقت پر موقوف ہے، اس لئے پہلے ربوۃ النسیہ کی تعریف درج کی جاتی ہے:

۱۔ محمد علی الصابونی ربوۃ النسیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فهو الذی کان معروفا فی الجاہلیۃ وهو ان یقرضه قدرا معینا من المال الی زمن محدد کشهر أو سنة مثلا مع اشتراط الزیادة فیہ نظیر امتداد الاجل" (روائع البیان ۱، ۲۹۱)۔

۲۔ علامہ ابن قیم الجوزیہ ربوۃ النسیہ کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

"فربوا النسیۃ وهو الذی کانوا یفعلونه فی الجاہلیۃ مثل ان یؤخر دینہ ویزیدہ فی المال وکلما أخره زادوا فی المال حتی تصیر المأة عنده آلاف مؤلفۃ" (اعلام الموقعین ۲، ۱۲۹)۔

۳۔ امام فخر الدین رازی ربوۃ النسیہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"أما ربوا النسیۃ فهو الأمر الذی کان مشهورا فی الجاہلیۃ وذلك أنهم کانو یدفعون المال علی أن یاخذوا کل شهر قدرا معینا ویكون رأس المال باقیائهم إذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال إن تعذر علیہ الأداء زادوا فی الحق والاجل" (التفسیر الکبیر ۴، ۷۵)۔

مذکورہ بالا تعریفات سے مشترکہ طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ربوۃ النسیہ کے لئے عقد قرض کے وقت زیادتی کی شرط ہونی چاہئے اور زیر بحث مسئلہ تعلیمی قرض میں بھی یہ بات موجود ہے۔

مقدمہ ثانی کی دلیل ملاحظہ ہو:

۱۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أحل الله البیع و حرم الربوا" (بقرہ: ۲۷۵)۔

اس آیت میں بلا کسی تفصیل قلت و کثرت اور شرط کے ربوۃ کی حرمت وارد ہوئی ہے اور ربوۃ سے مراد ربوۃ النسیہ ہے، جیسا کہ امام فخر الدین رازی آیت مذکورہ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:



”إنما يتناول العقد المخصوص الذي كان مسمى فيما بينهم بأنه ربوا وذلك هو ربوا النسبة فكان قوله تعالى ”حرم الربوا“ مخصوصا بالنسبة“ (التفسير الكبير ۴: ۴۵)۔

۲۔ ”يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذرُوا ما بقى من الربوا إن كنتم مؤمنين“ (بقرہ: ۲۷۸)۔

۳۔ ”يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربوا أضعافا مضاعفة واتقوا الله لعلكم تفلحون“ (آل عمران: ۱۲۳)۔

۴۔ عن عبد الله بن حنظلة قال قال رسول الله ﷺ: ”درہم ربا یا کله الرجل وهو یعلم أشد من ستة وثلاثین زنیة“ (مسند احمد ۶: ۲۹۳ رقم حدیث ۲۱۴۵۰)۔

۵۔ ”عن جابر قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله و كاتبه و شاهده و قال وهم سواء“ (رواه مسلم اکمال المعلم بفوائد مسلم ۵: ۲۸۳)۔

۶۔ قال محمد رحمه الله تعالى في كتاب الصرف: ”أن أبا حنيفة كان يكره كل قرض جر منفعة۔ قال الكرخي: هذا إذا كانت المنفعة مشروطة في العقد“ (المحيط البرهاني ۸: ۲۲۳)۔

مذکورہ بالا تمام قرآنی نصوص احادیث کریمہ اور فقہی روایات ربوا النسبة کے مطلقاً (بلا کسی تفصیل قلت و کثرت) حرام ہونے کو بتاتی ہیں لہذا زیر بحث اسکیم سے فائدہ اٹھانا خواہ کم شرح سود ہو جائز نہیں ہوگا اور کم شرح سود کو اجرت خدمت پر محمول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ ربوا النسبة کا قلیل و کثیر سب حرام ہے۔  
عبداللہ بن حنظلہ کی حدیث کے لفظ ”درہم ربا الخ“ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قلیل و کثیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور جہاں تک علامہ ابن نجیم مصری کے قول ”يجوز للمحتاج بالبرخ الاستقراض“ (الاشباه مع الغمز ۱: ۱۰۳) سے استدلال کرتے ہوئے جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کو حاجت قرار دے کر زیر بحث مسئلہ کو جائز قرار دینے کی بات ہے تو وہ درست نہیں ہے، کیونکہ جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول حاجت نہیں ہے جیسا کہ حاجت کی فقہی تعریف سے سمجھ میں آتا ہے۔

حاجت کی تعریف میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی عبارت یوں درج ہے:

”حاجت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیز استعمال نہ کرے تو ہلاک نہیں ہوگا مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی (اور ظاہر ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے عدم حصول سے مشقت اور تکلیف شدید نہیں ہے، لہذا یہ حاجت میں سے نہیں ہے)، یہ صورت اضطراب کی نہیں اس لئے اس کے واسطے روزہ، نماز، طہارت وغیرہ کے بہت سے احکام میں رعایت اور سہولت تو دی گئی ہے مگر اس حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی“ (جواہر الفقہ ۲: ۲۸۲ بحوالہ شرح الاشباه والنظائر للمحوی)۔

معلوم ہوا کہ نشان زدہ اسکیم سے فائدہ اٹھانا سوالنامہ میں مذکور تمام صورتوں میں ناجائز اور حرام ہے۔

☆☆☆

## تعلیم کے لئے قرض حاصل کرنا

مفتی سراج احمد علی ؒ

- ۱۔ شریعت اسلامیہ کسی بھی شعبہ میں اختصاص رکھنے والے اسکالر کی رائے کا اس کے شعبہ اختصاص میں اعتبار کرتی ہے، اور ضرورت و اہمیت کے مطابق کبھی اس اسکالر میں مسلم و متدین ہونے اور کبھی ایک سے زائد کی رائے کے تطابق کی قید لگاتی ہے اور کبھی نہیں لگاتی، مثلاً پانی کی مقدار کے بارے میں ”فیوخذ بقول رجل له بصارة في الماء“ کی نظیر کتب فقہ میں موجود ہے۔
- ۲۔ فقہاء کرام کا یہ موقف اس امر پر شاہد ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر نہ صرف جواز کا ہے، بلکہ ایک طرح سے ان کی اہمیت افزائی کا ہے، اس لئے کسی بھی جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول میں جبکہ وہ عام انسانیت کے لئے مدد و معاون ہو اور اسلامی تعلیمات و نظریات سے متصادم نہ ہو مسلمانوں کا رویہ موافقانہ ہی ہونا چاہئے۔
- ۳۔ محض اس بنا پر اسے سروس چارج قرار دینا مناسب نہیں ہے، وہ سود ہے سود ہی قرار دیا جائے، معاملے کو سودی تسلیم کرتے ہوئے بھی ضرورت مندوں کے لئے راہ ”ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ موجود ہے، سروس چارج قرار دینے میں دیگر امور میں بھی اس علت کا تعدیہ کیا جائے گا، اس طرح حرمت ربوا جو اسلام کا ایک امتیازی حکم ہے کا ختم کرنا لازم آئے گا۔
- ۴۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کے متحمل نہ ہوں اور کہیں سے اس مقصد کے لئے اتنی مدت تک کے لئے غیر سودی قرض نہ مل سکے تو اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔
- ۵۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے، اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر وہ اس خرچ کو برداشت کرنے سے انکار کر دیں تو چونکہ یہ طالب علم شرعاً بالغ ہے، اس لئے اس کے والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے طالب علم کو صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، یعنی والد کے انکار پر قرض کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا۔
- ۶۔ اگر کوئی قانونی دشواری ہو کہ ٹیکس کی بہتات ہو جائے گی اس سے بچنے کے لئے ایسا کریں، یا مستقبل قریب میں کسی اور معاملہ کے لئے روپیہ کو مختص کر رہے ہوں، اس لئے فی الحال اس کام میں روپیہ نہ لگانا چاہ رہے ہوں تو بھی اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہونا چاہئے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض سے فائدہ حاصل کرنا

مولانا عطاء اللہ قاسمی جامعہ عربیہ امداد العلوم، کوپانج، بنو

بلاشبہ افراد و اقوام کی عزت و سر بلندی تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے، اسلام دین فطرت ہے وہ اس حقیقت کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ اسلام میں دینی تعلیم تو مطلوب ہے، ہی ساتھ ہی ہر علم نافع، نفع بخش علم و ہنر اور باعزت پیشہ کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، اور ان کے حصول کی ترغیب اوروں سے زیادہ ہی دی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا سکہ چل رہا ہے، سرمایہ دارانہ ذہنیت کا چلن عام ہے، ہر چیز ہر کام یہاں تک کہ تعلقات کو نفع نقصان کے معیار سے ناپنا اور اس کا خاصہ ہے، کسی بھی چیز کی اچھائی اور برائی نفع نقصان کی بنیاد پر ہی طے ہو رہی ہے، موجودہ دور کی تعلیم جو درحقیقت پیشہ و ہنر کسب و تجارت کی تعلیم ہے اگر اس ذہنیت نے تجارت کی تعلیم کو تجارت بنا دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، جو اسے بد قسمتی کہا جائے۔

یہ تعلیم اگر تجارت نہ ہوتی تو بینک اس میں ہاتھ کیوں ڈالتے؟ بینک تعلیم کے لئے جو قرض دیتے ہیں چاہے وہ کسی نام سے دیں وہ بہر حال سودی قرض ہے، تعلیم کے لئے سودی قرض ضرورت و اضطرار کے دائرہ میں نہیں آتا، اس لئے اس کے جواز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، سودی قرض کے جواز کی بنیاد ہی شرط ضرورت و اضطرار ہے، بیجوز للمحتاج الاستقرار بالربح (الاشباہ والنظائر)۔

تعلیمی قرض کے جواز عدم جواز سے قطع نظر حصول قرض کے مختلف مراحل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے جو امیدوار کی تعلیمی حرج کا سبب بن سکتا ہے نہ کہ مسئلہ کا حل۔

حصول قرض کی اسکیموں کی جانکاری حاصل کی جائے پھر بینکوں سے رجوع کیا جائے، بینک مسلم امیدواروں کے معاملہ میں نال مٹول کرتے ہیں، کوشش پیروی سے درخواست منظور ہوگی تو پھر ضمانت دار (جو اولاً کہ اس کے والدین ہی ہوں گے) کی آمدنی کی تحقیق و تفتیش ہوگی، اس مرحلہ میں درخواست عموماً نامان منظور ہو جاتی ہے، خوش قسمتی سے یہ مرحلہ سر ہو گیا اور قرض حاصل ہو گیا اور امیدوار تعلیم مکمل کرنے کے بعد قرض کی ادائیگی نہیں کر پاتا ہے تو بینک اس کے ضمانت دار سے وصولی قرض کا حقدار ہوگا۔

کیا ہماری ملی غیرت و حمیت اس کی اجازت دیتی ہے کہ ہم اپنے بہترین دماغ اور اعلیٰ استعداد کے ہونہاروں کو یونہی بے یار و مددگار چھوڑ دیں اور سو خواری بینک ان کا استحصال کریں، کھلی ہوئی بات ہے کہ ملت اسلامیہ میں جدید اعلیٰ تعلیم کے ماہرین کا وجود ایک ملی ضرورت ہے تو ملی تنظیموں کو مخصوص چندوں سے یا پھر اوقاف کو منظم کر کے انہیں مہنگی لیکن ضروری تعلیم کا انتظام کرنا چاہئے اور کم از کم ان طلبہ کی بھرپور مدد کرنی چاہئے۔

### جوابات:

- ۱۔ انسانیت کے لئے نفع بخش اور مفید اعلیٰ تعلیم کا حصول ایک ملی ضرورت (فرض کفایہ) ہے، اس کے تئیں مسلمانوں کا رویہ مثبت ہونا چاہئے۔
- ۲۔ بینک اور سود لازم و ملزوم ہیں، بغیر سود کے بینک کا تصور نہیں ہو سکتا، سود کو سروس چارج پر ہرگز محمول نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ حق المحنت محنت کے مطابق ہوا کرتی ہے، نہ کہ ہر حال میں یکساں، جبکہ سود کی شرح متعین اور ہر حال میں یکساں رہتی ہے۔
- ۳۔ اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، اس لئے وہ بیرون ملک تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تب بھی اس کے لئے اس قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ سودی قرض ہے، اور اس صورت میں اس کے جواز کی شرطیں مفقود ہیں۔
- ۴۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں لیکن اس کے والد صاحب استطاعت ہیں تو اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کے لئے والد کا صاحب استطاعت ہونا متبادل موجود ہے، اس کی موجودگی میں سودی قرض جائز نہیں ہوگا۔
- ۵۔ اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود تعلیم میں پیسہ نہیں لگانا چاہتے تو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ مبتلی بہ صاحب استطاعت ہونے کے سبب اضطراری صورت حال کے دائرہ سے باہر ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض

مفتی اسماعیل بھٹو کو دروی ط

۱۔ دینی اور دنیوی روحانی اور جسمانی ضرورتوں سے متعلق جتنے علوم رائج ہیں ان کا حصول مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ کے درجہ میں ہے اور اس سلسلے میں ہر علاقہ کے مسلمانوں میں چند افراد ایسے ہونے چاہئے جو ان علوم کو حاصل کریں تاکہ فرض کفایہ کی ادائیگی بھی ہو جائے اور مسلمانوں کی ضرورتیں بھی پوری ہوں۔

”واعلم ان تعلم العلم یكون فرض عین وهو بقدر ما یحتاج لدینہ وفرض کفایہ وهو ما زاد علیہ لشفع غیرہ (در) قوله و فرض کفایة الخ عرفه فی شرح التحریر بالمتحتم المقصود حصوله من غیر نظر بالذات إلى فاعله قال فیتناول ما هو دینی کصلاة الجازه و دنیوی کالصنائع المحتاج الیها... قال فی تبیین المحارم واما فرض الكفایة من العلم فهو كل علم لا یتغنی عنه فی قوام أمور الدنیا کالطب والحساب والنحو واللغة والكلام والقراءات و أسانید الحدیث وقسمه الوصایا والموارث والكتابة والمعانی والبديع والبیان والأصول ومعرفة النسخة والمنسوخ العام والخاص والنص والظاهر وكل هذه آله لعلم التفسیر والحدیث وكذا علم الآثار والأخبار والعلم بالرجال و أسامیهم و أسامی الصحابة وصفاتهم والعلم بالعدالة فی الروایة والعلم بأحوالهم لیتمیز الضعیف من القوی والعلم بأعمارهم وأصول الصناعات والفلاحة كالحیاكة والسیاسة والحجامة“ (شامی نعمانیہ ۱، ۲۹، ۳۰ مطلب فی فرض الكفایة و فرض العین)۔

۲۔ سود کی قرآن و حدیث میں صریح حرمت وارد ہوئی ہے اور اس پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں اور اس وجہ سے ربا اور شہ زبوا سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے اور سود کی قلیل و کثیر مقدار کی حرمت میں شریعت نے کوئی فرق بیان نہیں کیا ہے، لہذا امر کار کے تعلیمی قرض کے قلیل شرح سود کو سروس چارج پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ تعلیمی قرض پر سود کے نام سے دی جانے والی زائد رقم پوری انتظامی خرچ میں استعمال ہو جاتی ہے یا کچھ بچ بھی جاتی ہے، قرض لینے والے کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔

۳۔ چونکہ یہ اسکیم سودی قرض پر مشتمل ہے اور اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند کے لئے اعلیٰ تعلیم اس کی ضرورت شدیدہ نہیں ہے، لہذا اس کے لئے سودی قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

۵، ۴۔ اس کا جواب۔ نمبر ۳ سے واضح ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کا حصول اور اس سے استفادہ

قاضی محمد زاہد حسین قاسمی <sup>ع</sup>

مذہب اسلام نے علم کا حاصل کرنا ہر انسان کے لئے فرض قرار دیا ہے جبکہ دوسرے مذاہب نے حصول علم کو ہر انسان کا بنیادی حق قرار دیا ہے، حق اور فرض کے درمیان جو فرق ہے اسے ہر ذی شعور جانتا اور سمجھتا ہے کہ حق کو صاحب حق چھوڑ بھی سکتا ہے مگر فرض کو نہیں چھوڑا جاسکتا ہے۔

حصول علم کی اس اہمیت کے باوجود آج قوم مسلم کا تعلیمی میدان میں جو حال ہے وہ ناقابل بیان ہے، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دعا کر کے امت کو سبق دیا کہ ہر وہ علم جو نافع ہو اسے حاصل کرو۔

بد قسمتی سے اس دور مادیت نے ہر شے کو مادیت کا جامہ پہنا دیا جس سے تعلیم و تعلم کا شعبہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا، نتیجہ علم کا حصول مشکل اور دشوار ہو گیا کہ کیا دینی علوم کیا جدید اعلیٰ تعلیم دونوں کا حصول درجہ بدرجہ دشوار ہے۔

آج دنیا جس کو جدید اعلیٰ تعلیم کہہ رہی ہے مثلاً انجینئرنگ، میڈیکل، زراعت، مینجمنٹ، کمپیوٹر سائنس وغیرہ ان سب کے حصول کا مقصد طلب معاش ہے، اور اسلام نے طلب معاش کی نہ صرف ترغیب دی ہے بلکہ حکم دیا ہے کیونکہ معاشی زندگی میں خوش گواری کے اثرات انسان کے عبادات، عقائد و معاملات اور اعمال و اخلاق پر پڑتے ہیں:

”کاد الفقر ان یکون کفرا“ (مشکوٰۃ شریف ۴۲۹)۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ”اذا صلیتمہ الفجر فلا تنوموا عن طلب أرزاقکم“ (کنز العمال)۔

(جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی طلب کو چھوڑ کر سونے کی کوشش نہ کرو)۔

دوسری طرف ملکی وغیر ملکی سطح پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا رویہ جدید علوم کے حصول کے تئیں بیجا افسوسناک ہے، جس کی جہاں بہت ساری وجوہات ہیں ان میں ایک بہت بڑی وجہ مالی دشواری ہے۔

اس لئے میری ناقص رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے جدید علوم کو حاصل کرنا چاہئے جو نفع بخش ہوں اور مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے سرکاری بینک سے تعلیمی قرض لینا چاہئے۔

اب رہی بات یہ کہ اس قرض پر جو زائد رقم بینک لیتی ہے وہ سود ہے یا سروس چارج۔

تو میری ناقص رائے یہ ہے کہ اس زائد رقم کو سود پر محمول نہ کیا جائے بلکہ اسے سروس چارج اور اجرت خدمت پر محمول کیا جائے، کیونکہ تعلیم کی اصل ذمہ داری تو حکومت کی ہے، جس سے وہ راہ فرار اختیار کرتے ہوئے صرف رقم کا انتظام بہ طور طویل المیعاد قرض کے کرتی ہے، جس کی فراہمی و ادائیگی وغیرہ کے لئے دفاتر کا قیام اور ملازمین کا انتظام کرنا پڑتا ہے جس پر اخراجات آتے ہیں جس کو پورا کرنے کے لئے مدیون سے کچھ زائد رقم بینک وصول کرتا ہے، لہذا یہ زائد رقم اجرت خدمت ہے نہ کہ سود۔

چنانچہ مفتی نظام الدین فرماتے ہیں:

ط امارت شرعیہ، پلانٹ سائٹ روڈ، راور کیلا۔

”آج کل حکومت نے اقتصادی ترقیات کے لئے جو مختلف محکمے کھول رکھے ہیں ان میں عموماً حکومت کا مقصد سودی کاروبار کرنا یا زراندوزی وغیرہ کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ محض عوام کا اقتصادی و معاشی سدھار اور عوامی بے روزگاری اور پریشان حالی دور کرنے میں سعی کے درجہ کی ایک چیز ہے، جیسے پروجیکٹ وغیرہ کے محکمے اور اسی وجہ سے جب کوئی شخص محکمہ سے قرض طلب کرتا ہے جب بھی بسا اوقات محکمہ نقد قرض نہیں دیتا بلکہ اس کے کاروبار اور روزگاری تحقیق و تفتیش کے بعد اس کے مناسب حال مشین و دیگر سامان وغیرہ بہت سے داموں پر چھوٹی قسطوں پر ادھار دیتا ہے اور نقد بہت تھوڑی مقدار کام چلانے کے لئے دیتا ہے جیسا کہ آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے پھر اس شخص کے کاروبار کی نگرانی بھی محکمہ کرتا ہے اور اس کا کاروباری کورنمنائی اور مفید مشورے بھی کاروبار کے سلسلے میں دیتا رہتا ہے پھر ان کاموں کے لئے اور اپنی دی ہوئی رقم ٹھکانے لگتی ہے کہ نہیں اس کا انتظام درست رکھنے کے لئے بہت سے ملازمین کلرک انسپکٹر وغیرہ بھی رکھنے پڑتے ہیں دفاتر بھی قائم کرنے پڑتے ہیں پھر ان اخراجات کو پورا کرنے اور درست رکھنے کے لئے دیئے گئے ادھار سامان کی قسطوں کے ساتھ کچھ رقم سود کے نام سے وصول کرتی ہے۔

پس اگر یہ بات صحیح ہے تو اس زائد رقم کو سود کا نام دینا شرعاً ضروری نہ ہوگا، بلکہ انتظامی اخراجات کی فیس بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ محکمہ چونکہ مسلم نہیں ہے اس لئے وہ شرعی اصطلاحی الفاظ بولنے کا نہ تو پابند ہے اور نہ اس کا پابند کیا جاسکتا ہے (منتجات نظام الفتاویٰ ۲۱۸)۔

اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تو اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، اگرچہ اس کے والد صاحب استطاعت ہوں، اور قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا۔

البتہ اگر طالب علم صاحب استطاعت ہو، اس کے باوجودنی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہتا ہو تو اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

جیسا کہ الاشباہ والنظائر مع الحموی مطبوعہ مکتبہ فقیہ الامت دیوبند کے اس قاعدہ ”الحاجۃ تنزل منزل الضرورة“ (الاشباہ والنظائر مع الحموی ص ۳۲۷) سے معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو طالب علم صاحب استطاعت نہ ہو اس کے لئے تعلیمی قرض لینا جائز ہوگا اور جو صاحب استطاعت ہو اس کے لئے ناجائز ہوگا۔



## تعلیمی قرض کا حکم

مولانا اشتیاق احمد اعظمی

۱۔ کوئی بھی مسلمان اپنے بنیادی عقائد اور شرعی فرائض و واجبات کی مخالفت کرتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کر سکتا ہے، علم میں کسی طرح کی تقسیم نہیں اور نہ علم کسی کی میراث ہے، شریعت نے ضروری علوم حاصل کرنے پر کہیں کوئی پابندی نہیں لگائی ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”وعلمناه صنعة لبوس لكم لتحصنكم من بأسكم“ (سورہ انبیاء، ۸۰)، اس آیت میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو آلات حرب کی صنعت کا علم حاصل کرنا چاہئے، دوسری جگہ قرآن میں وارد ہے:

”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم“ (انفال: ۶۰)، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھرپور جنگی تیاری کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے جس کے ذریعہ وہ اللہ اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کر سکیں۔

حدیث میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے: ”قال: سمعت رسول الله ﷺ وهو على المنبر يقول: وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة، ألا إن القوة الرمي، ألا إن القوة الرمي، ألا إن القوة الرمي“ (رواه مسلم)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے صحابہ کو جنگی قوت حاصل کرنے پر کافی زور دیا اور من قوتہ کی تفسیر اپنے زمانہ کے لحاظ سے رمی ((تیر اندازی)) سے کی اور تاکید تین بار فرمائی، آج کے دور میں جو جدید اسلحے اور جدید ٹیکنالوجی ہے جنگی ہوائی جہاز، ایٹم بم کی قوت حاصل کرنا، یہ سب امور مسلمانوں کو حاصل کرنا نہایت ضروری ہیں، اس کے بغیر دشمن کو مرعوب نہیں کیا جاسکتا۔

صنعتی انقلاب نے دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے، مسلمانوں کو اس فائدہ میں بھی آگے آنے کی ضرورت ہے، صنعتی اور حربی میدانوں کے علاوہ دیگر جدید تعلیمی میدانوں میں مسلمانوں کو گھسنا ضروری ہے مگر ایک چیز ضروری ہے وہ جو کچھ پڑھیں یا سیکھیں اپنے آپ کو مسلمان رکھتے ہوئے سیکھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں۔

۲۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ سود نوص قطعاً حرام ہے، قرآن پاک میں سود لینے اور دینے والوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے، اور اس کو مٹانے کا اعلان کیا ہے: ”أحل الله البيع وحرم الربوا“، دوسری جگہ ارشاد ہے: ”يمحق الله الربوا ويبيرى الصدقات“۔

حدیث میں ایک درہم سود جان بوجھ کر کھانے کو ۳۶ بار زنا کرنے سے زیادہ سخت قرار دیا ہے، مشکوٰۃ شریف (۲۴۵/۱) پر یہ روایت مذکور ہے:

”عن عبد الله بن حنظلة غسيل الملائكة۔ قال قال النبي ﷺ: درهم ربوا يأكله الرجل وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية“، ایسی صورت میں معمولی شرح سود کو سروس چارج قرار دے کر سود کا دروازہ کھولنا بالکل ناجائز ہے، مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ضرورت کے لئے سودی قرض کے بجائے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

۳۔ چونکہ یہ قرض سود پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے کسی بھی صورت میں اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز نہیں ہے۔

۴۔ قرض کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے ذاتی حالات سے ہوگا نہ کہ اس کے والد کے صاحب استطاعت ہونے یا نہ ہونے سے ہوگا، کیونکہ بلوغت کے بعد غنا اور فقر کے تعلق سے لڑکا اور لڑکی مستقل حیثیت کے مالک شرعاً ہوا کرتے ہیں، البتہ نابالغ بچہ فقر و غنی کے معاملہ میں باپ کے تابع ہوا کرتا ہے۔

بنائیں مذکورہ صورت میں بھی طالب علم کے لئے سودی قرض لینا ناجائز نہیں، کہیں سے غیر سودی قرض لے کر تعلیم کو جاری رکھے، مسلم تنظیمیں ایسے غریب اور نادار طلبہ کے لئے وظیفہ کی اسکیمیں جاری کریں اور ملت کی خدمت کریں، یا کم از کم سرکار سے یہ مطالبہ کریں کہ مسلمان طالب علموں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے غیر سودی قرض کا بندوبست کیا جائے۔

☆☆☆

۵۔ چونکہ یہ قرض اسکیم سود پر مشتمل ہے، اس لئے کسی بھی صورت میں اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز نہیں ہوگا۔

## تعلیمی قرض اور اس کے احکام

مولانا ارشد مدنی چمپارنی

۱۔ مذہب اسلام کی نگاہ میں تعلیم کی اہمیت دیگر چیزوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اسلام کی نظر میں تعلیم خود مقصود ہے۔ وسیلہ اور سبب نہیں۔ اسلام پہلا مذہب اور تمدن ہے، جس نے تعلیم کو ہر انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔ مولانا سید عزیز الرحمن نے مختلف حوالوں کی روشنی میں لکھا ہے کہ تعلیم کے متعلق اسلام کا جو نظریہ ہے وہ اس سے قبل متصور نہ تھا۔ اسلام کے قبل ہر معاشرہ اور قبیلہ صرف اپنے اعلیٰ طبقے کی تعلیم پر قانع تھا، اور وہ قبیلے کے سردار اور امراء وغیرہ اور مذہبی پیشواؤں کی تعلیم و تربیت کو ضروری قرار دیتا اور اس کا اہتمام کرتا تھا۔ عام افراد اس تعلیمی نظام سے خارج سمجھے جاتے تھے، انہیں طبقہ اشرافیہ کی طرح تعلیم حاصل کرنے کا حق نہ تھا۔ یہاں تک کہ یونان اور چین کے ہاں بھی، جنہوں نے علم و تمدن کے میدان میں نمایاں بلکہ غیر معمولی ترقی کی، تمام انسانوں کی تعلیم کا کوئی تصور نہ تھا۔ بلکہ وہ اہل علم کے ایک خاص طبقے کی تعلیم کے محرک اور داعی تھے، افلاطون بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس امتیاز سے نوازتا ہے (تعلیمات نبوی اور آج کے زندہ مسائل ۲۵۶، بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا ۱۹۸۳ء، ۱۸/۶: ۳۱۷، اسلامی نظریہ حیات ۴۲۰)۔

مذہب اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے، جس نے سب سے پہلے بلا تفریق طبقات و قبائل و بلا تخصیص مرد و زن سب کے لئے بلا امتیاز و بلا اختصاص عام تعلیم کی آواز بلند کیا۔ اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے)۔

اس حدیث میں تعلیم حاصل کرنا ہر چھوٹے بڑے، امیر و غریب، مرد و عورت اور کالے و گورے پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں ہر وہ علم و فن حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، جس کی مسلمانوں کو ضرورت ہو، اسلام کی نگاہ میں ہمہ وقت ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو تعلیم و تربیت یافتہ ہو اور وہ انسانی ضروریات کی تکمیل کرے۔ اس ضمن میں تمام وہ علوم و فنون آتے ہیں، جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہو۔

اسلام کی نگاہ میں عام تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ قرآن کریم نے اس کی اہمیت کی جانب توجہ دلائی ہے۔ "فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیثقفھوا فی الدین" (التوبة: ۱۲۲)۔

بلاشبہ اس آیت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور مخصوص فنون میں اختصاص پیدا کرنے کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

عصر حاضر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ آج ضرورت کے مطابق مختلف علوم و فنون کے ماہرین تیار کرنا امت مسلمہ کی ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ جہاں امت مسلمہ کو اعلیٰ تعلیم کے حاملین کے ذریعہ بہت سی خدمات لینے کی ضرورت ہے، وہیں دفاعی پوزیشن سنبھالنے کی ذمہ داری موجودہ زمانے میں عظیم ہے۔

جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ یہ نقطہ یقیناً رباب دانش و بینش کی توجہ کا طالب ہے۔ عصر حاضر میں چونکہ عصری فکر و ثقافت کی وسیع تر معلومات کو دعوت و تبلیغ کے میدان کے لئے بھی ضروری قرار دیا جاتا رہا ہے۔ لہذا چند ایک کوچھوڑ کر ہندوستان کے تقریباً سارے اہم مدارس نے عصری علوم کو اپنے نصاب کا جزء بنایا ہے اور پچھلی صدی کی آخری دہائی میں قائم ہونے والے بعض اداروں نے تو تقریباً



مساوی طور پر عصری و اسلامی علوم کو اپنے نصاب میں جگہ دی ہے اور کامیابی کے ساتھ اس کا تجربہ بھی کیا جا رہا ہے۔

۲۔ سرکاری بینک ہو یا غیر سرکاری، اس کے کاروبار کا دار و مدار سود پر ہے۔ یہ مختلف ہو سکتا ہے کہ بعض کاروبار میں سود کی شرح کم ہو اور بعض میں زیادہ۔ کم شرح سود کے کاروبار میں سے ایک تعلیمی قرض بھی ہے۔ گرچہ یہ قرض زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے۔ اسلام میں قرض لینے اور دینے کی اجازت موجود ہے۔ مگر اسلام ہر اس کاروبار سے منع کرتا ہے، جس میں سود ہو اور چونکہ تعلیمی قرض میں واضح طور پر سود دیا جاتا ہے، لہذا ایک مسلمان کے لئے سود پر مشتمل معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔ حکومت کا یہ دعویٰ کہ تعلیمی قرض کے اجراء کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے۔ جھوٹ ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ کفالت عامہ کے تمام فرائض سرانجام دے، جن میں سے ایک اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ بھی ہے۔ اب اپنی اس ذمہ داری کو نہ ادا کر کے بینک سے تعلیمی قرض دینا اور اس پر سود (چاہے شرح سود کم ہی کیوں نہ ہو) وصول کرنا اور یہ کہنا کہ اس کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے۔ بینک تعلیمی قرض پر جو شرح سود لیتا ہے، اس کو سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بینک بھی اس کو سروس چارج نہیں سمجھتا۔

۳۔ مذہب اسلام میں تعلیم حاصل کرنے کی تاکید آئی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ برابر نہیں ہو سکتے ”قل ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون“ رسول کریم ﷺ نے متعدد احادیث کے اندر حصول علم کی تاکید فرمائی ہے۔ مگر واضح رہے کہ دینی علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

”طلب العلم فریضة علی کل مسلم“ (ابن ماجہ: ۲۲۳) یعنی علم (دین) کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ وغیرہ نے باضابطہ صراحت کی ہے کہ علم دین کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ اور علم دین کے علاوہ دیگر وہ سارے علوم، جن کی تحصیل کی ضرورت قیامت تک مسلمانوں کو پڑے، ان کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔

اس نظریہ کی رو سے ایسے اشخاص، جن کے معاشی حالات ان کے اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کے برداشت کرنے کے متحمل نہ ہو تو اولاً ان پر اعلیٰ تعلیم کا حصول فرض نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر وہ حاصل کرنا چاہتے ہوں تو تعلیمی قرض (جو سودی کاروبار پر مشتمل ہے) سے استفادہ کئے بغیر سماجی ورفاہی تنظیموں اور جمعیتوں سے ان کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا از روئے شرع جائز نہیں۔

۴۔ طالب علم کے والد اس کے تعلیمی اخراجات کو برداشت کرنے کی استطاعت رکھتا ہو تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلانے، اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو اس کا ذمہ دار باپ ہوگا، البتہ باپ کے صاحب استطاعت ہونے پر بیٹے کو صاحب استطاعت نہیں سمجھا جاسکتا۔ کیونکہ شریعت میں باپ کے مال کا حقدار بیٹا باپ کے انتقال کے بعد ہوتا ہے۔ لہذا قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا۔

۵۔ چون کہ تعلیمی قرض سے فائدہ اٹھانے میں سود کا معاملہ کرنا لازم آتا ہے۔ جو شریعت میں جائز نہیں، لہذا طالب علم کا صاحب استطاعت ہونے کے باوجود اپنے مال کو تعلیمی اخراجات پر نہ لگا کر اسکیم سے فائدہ اٹھانا کسی بھی طور پر جائز نہیں۔



## تعلیمی قرض کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے

مولانا محمد ذکاء اللہ شاہی، اندور

- ۱۔ یہ امر مسلم ہے کہ علم تو اصل معرفت الہی کا علم ہے جو صرف اور صرف علوم دینیہ اور اسلامیہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اس کے علاوہ جتنے علوم ہیں وہ اصلاً علم نہیں بلکہ وہ ہنر اور معلومات کے زمرے میں آتا ہے۔  
اس لئے اہل علم نے علم کی دو قسمیں کی ہیں: ۱۔ علم الادیان، ۲۔ علم الابدان۔  
لیکن علم دینی ہو یا دنیاوی شرعاً دونوں کا سیکھنا سکھانا درست اور مستحسن ہے، علم دین کے علاوہ دیگر علوم و فنون و ہنر کے میدان میں اہل ایمان کا ہونا ضروری ہے، تاکہ ان کے ذریعہ اسلام کا تعارف اور دین کی تبلیغ ہو۔
- ایمان کی حفاظت کے ساتھ عصری علوم میں ترقی و کمال کی اسلام میں کوئی ممانعت نہیں اور نہ کوئی حد، بلند سے بلند مقام اور اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔
- ۲۔ علم و ہنر سے ہر شخص کو فائدہ پہنچے تاکہ جہالت و غربت دور ہو اور خوشحالی آئے حکومت نے اس پالیسی کے تحت ایسے طلباء کو جو اپنی پڑھائی جاری رکھنا چاہتے ہیں لیکن معاشی حالت درست نہ ہونے کی بنا پر وہ رک جاتے ہیں ان کے لئے یہ سہولت و مدد کی شکل جاری کی ہے۔
- الف۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ قرض دے کر اس کا ایک حصہ حکومت معاف کر دیتی ہے، لیکن وصولیابی کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں سود جوڑ کر وصول کرتی ہے، لیکن وہ شرح سود منہا کرنے کے بعد بھی وہ رقم اسی مقدار کے برابر ہوتی ہے جتنی دی تھی، اس کے درست و جائز ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔
- ب۔ مذکورہ صورت جس میں بینک وہ قرض ایک مدت کے بعد وصول کرتا ہے لیکن اس میں وہ سود بھی جوڑتی ہے، اس لئے عام مسلم طلباء کے لئے یہ درست نہیں، اگرچہ شرح سود انتہائی قلیل ہو۔
- ۳۔ اگر معاشی حالت اس کا متحمل نہ ہو تو اس قرض سے سود مند ہونا شرعاً درست ہوگا، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے تحریر فرمایا ہے: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"۔
- ۴۔ مالی استطاعت و معاش میں شرعاً عاقل بالغ طالب علم کی حالت کا اعتبار ہوگا۔
- ۵۔ اگر بفضلہ تعالیٰ خود صاحب استطاعت و حیثیت ہونے یا والدین و اولیاء کی طرف سے مکمل اخراجات کی پیش کش ہو یا مطالبہ پر والدین برداشت کر سکتے ہوں تو سود کی لعنت سے بچنا و بچانا ضروری ہے، اس صورت میں فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کے مسائل

مولانا حافظ شیخ کلیم اللہ عمری ۱

- ۱- ”قال النبی ﷺ طلب العلم فریضة علی کل مسلم“ (ابن ماجہ) (علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔  
اسلام کا نقطہ نظر علم کے تعلق سے یہ ہے کہ افضل العلوم و اشرف العلوم علوم شریعت ہیں جن کا حاصل کرنا اولین فریضہ ہے۔  
اسی طرح ہر وہ علم جو کائنات اور انسانیت کے لئے اور خدمت خلق کے لئے مفید ہو اس علم کا حاصل کرنا بھی مشروع ہے لیکن فرق مراتب کے ساتھ، علوم شریعت پہلے نمبر پر ہیں اور عصری علوم جن سے اسلام اور انسانیت کا فائدہ مقصود ہو دوسرے نمبر پر، دور حاضر میں عصری علوم کی ضرورت و افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔
- ۲- سرکاری بینک کا سود پر قرض دینا خواہ کم شرح ہی میں کیوں نہ ہو سود ہی ہے اور ہر وہ قرض جس سے نفع کمایا جاتا ہو وہ سود کے حکم میں ہی داخل ہے، ”کل قرض جر نفعاً فهو ربا“، سودی قرض کو اجرت خدمت پر محمول نہیں کیا جاسکتا جبکہ سود کی حرمت پر نصوص شرعیہ صریحہ وارد ہیں، لہذا تاویل نہ کرنا تقویٰ کا عین تقاضا ہے۔
- ۳- اعلیٰ تعلیم کا حصول فرض کفایہ ہے وسائل و ذرائع مہیا ہوں تو ضروری تعلیم حاصل کی جائے ورنہ نہیں، سود کا حکم سب کے لئے عام ہے، البتہ لوگوں سے تعاون حاصل کر کے یا لوگوں کی زکاۃ و صدقات کے ذریعہ یا بیت المال کے تعاون سے یا مراکز اسلامیہ یا تحریکات اسلامیہ کی طرف رجوع کرے اور سود سے ہر حال میں دوری لازم ہے۔
- ۴- طالب عالم کی کفالت بلوغت تک اس کے والدین پر ہے اور یہ کفالت واجبی ہوگی، البتہ بلوغت کے بعد والد کے ذمہ تطوعاً یہ ذمہ داری ہوگی اور والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے طالب علم کو صاحب استطاعت نہیں خیال کیا جائے گا۔
- ۵- اگر والد صاحب استطاعت ہوں تو بھی شرعاً والد کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ والد کی کفالت بلوغت تک ہی لازم ہے، اس لئے طالب علم کا مستطیع ہونے کے باوجود اپنا پیسہ نہ لگا کر اس قرض اسکیم سے مستفید ہونا شرعاً و عقلاً درست نہیں ہے کیونکہ یہ قرض سود پر مبنی ہے جو کہ حرام ہے۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض اسلامی نقطہ نظر سے

مولانا محمد سلمان (کھلی) پانپوری ۱

۱- اسلام بنیادی طور پر علم و فن کا حامی ہے نہ کہ مخالف، اسلام میں دینی تعلیم تو مطلوب ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ ہر علم نافع کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اسلام نے اس کے حصول کی ترغیب دی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مذاہب عالم میں اس کا امتیاز ہے تو غلط نہ ہوگا، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ علم انسانیت کے لئے نفع بخش اور مفید ہو، عصری اور جدید علوم بھی زیادہ تر نفع بخش اور فائدہ مند ہے، اور ان کے ذریعہ انسانیت کی خدمت سرانجام پاتی ہے، اس لئے ایسی عصری علوم جو نافع ہوں، اگر شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ مسلمان حاصل کریں تو کچھ حرج نہیں، بلکہ اچھے مقاصد اور نیک نیتی کے ساتھ ان کی تحصیل نہ صرف جائز بلکہ مستحسن اور باعث اجر و ثواب ہے۔

۲- قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، سرکاری بینک کے لئے اپنے قرض داروں سے بطور "سروس چارج" کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، جو قرض کے اجراء کے لئے پیش آتے ہیں اور اگر قرض کے اجراء کے لئے پیش آنے والے واقعی اخراجات کا اندازہ مشکل ہو، تو اس صورت میں بینک کے لئے ان واقعی اخراجات کے طلب کرنے کے بجائے قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی دفتری کارروائی کی اجرت وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اس لئے کہ قرض دینے کا عمل بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس پر نفع کا مطالبہ کرنا یا اجرت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں، لہذا قرض جاری کرنے پر آنے والے مصارف کو اندازے سے کم وصول کرنا یا اجرت خدمت، اجرت مثل سے زیادہ لینا کسی طرح جائز نہیں ورنہ "کل قرض جرنفعاً" کے تحت داخل ہو کر یقینی طور پر حرام ہو جائے گی۔

یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ بینکوں کا بنیادی مقصد سودی کاروبار ہے، حکومت نے تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کے لئے جس خصوصی قرض (ایجوکیشن لون) کا نظم کیا ہے یقیناً اس قرض پر عام قرضوں کے مقابلہ میں کافی کم شرح سود عائد کی گئی ہے، نیز حکومت کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس کا مقصد سود حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ تعلیم میں تعاون کرنا ہے، لیکن پھر بھی اس کم شرح سود کے قرض کے اجراء کے لئے پیش آنے والے واقعی اخراجات یا اجرت مثل سے زیادہ ہونے کا بہر حال احتمال باقی رہتا ہے، اس کم شرح سود کو "سروس چارج" پر محمول کرنے سے یہ احتمال ختم نہیں ہوتا، محض نام و صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی ہے اور فقہاء کرام کی یہ صراحت موجود ہے:

"الشبهة كالحقيقة في باب الربا" (سود کا احتمال بھی حقیقی سود کی طرح حرام ہے)، لہذا اس کم شرح سود کو بغیر تحقیق کے (کم شرح سود واقعی اخراجات یا مثل کے برابر ہے یا زائد) سروس چارج پر محمول کر دینا درست نہیں ہے۔

۳- اعلیٰ تعلیم کی تحصیل ایسی ضرورت و مجبوری نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے اس قرض اسکیم سے جس میں احتمال سود موجود ہے، فائدہ اٹھانا جائز ہو، لہذا اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا، جائز نہیں ہے۔

۵۰۴- ان جزئیات کا جواب جز ۵۲ و ۵۳ کے جواب سے واضح ہے۔

☆☆☆

۱ مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی، پانپور، تحصیل دوگام، ضلع بناس کا نٹھان، شاہی گجرات۔

## تعلیمی قرض کا حکم

مفتی شاہد علی قاسمی ع

۱۔ کسی صاحب نظر اور اہل دانش پر یہ بات مخفی نہیں کہ فی زمانہ جدید اعلیٰ تعلیم کی بڑی اہمیت ہے، اس کی اپنی ایک طاقت ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم جدید اعلیٰ تعلیم سے لیس ہے آج اس کی حکمرانی ہے، یہ دور دور علم و تحقیق ہے، جو قوم اس میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے وہ ترقی کی سمت گامزن ہے، آج امریکہ اور برطانیہ اس لئے حاکم اعلیٰ مانا جاتا ہے کہ اس کے پاس ایڈوانس سائنس و ٹکنالوجی ہے، اور اس کی مدد سے اس نے عسکری طاقت میں بے پناہ اضافہ کر لیا ہے۔

فی زمانہ عسکری طاقت میں بالادستی اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جو سائنس و ٹکنالوجی میں پیشوائی کا مقام رکھتی ہو، اور جو قوم اس سے تہی دامن ہو وہ ہرگز اقوام عالم پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، اس لئے یہ تقاضا آیت کریمہ "واعبدوا اللہ ما استطعتم من قوۃ" مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جدید اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں آگے آئیں، اس کے علاوہ دوسرے جدید علوم چاہے میڈیکل سے متعلق ہو یا انجینئرنگ سے، ان سب میں مسلمانوں کو بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بہر حال اراقم المحروف کے نزدیک جدید اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنا اگر واجب لعیبہ نہیں تو کم از کم "واجب لغیرہ" ضرور ہے۔

۲۔ تعلیمی قرضوں پر بینک جو معمولی سود لیتا ہے اس کو سروس چارج قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ وہ سود ہی سمجھا جائے گا، کیونکہ جتنا زیادہ قرض لیا جاتا ہے اسی حساب سے سود میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے، مثلاً بکرنے اگر پانچ ہزار روپے قرض لئے اور بینک نے شرح سود ایک فیصد ماہانہ کے اعتبار سے لگایا تو بکرو ایک مہینہ میں پچاس روپیہ بہ طور سود دینا پڑے گا، اور اگر خال ایک لاکھ روپے قرض لئے تو بینک اس سے پچاس روپیہ کے بجائے ایک ہزار روپے لے گا، اگر بینک تمام قرض خواہ سے ایک متعین رقم لیتا قرض کی مقدار میں کمی زیادتی کا اعتبار نہیں کرتا تو اسے سروس چارج کہا جاسکتا تھا، لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے، اس لئے کم شرح سود ہونے کے باوجود وہ سود ہی رہے گا، جو بہ نص قطعی حرام ہے۔

۳۔ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، اور مسلمانوں کو اس میدان میں ضرور آگے بڑھنا چاہئے، اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ فی زمانہ اعلیٰ جدید تعلیم کی تحصیل "واجب لغیرہ" کے درجہ میں ہے، یہ ایک ایسی مصلحت ہے جس کے لئے ہندوستان جیسے ملک میں قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، فقہاء نے اصول پیش کیا ہے:

"إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما" (الاشباه والنظائر ۱۳۵)۔

(جب دو مفسدہ کا تعارض ہو جائے تو ان میں بڑے مفسدہ کی رعایت کرتے ہوئے کم تر مفسدہ کا ارتکاب کیا جائے گا)۔

۴۔ اگر خود طالب علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے اور اس کے والد کو اس کی صلاحیت ہے تو ایسے طالب علم کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر لڑکا طلب علم میں لگا ہو اور اس کی وجہ سے کمائی نہ کر پاتا ہو تو باپ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، چنانچہ علامہ حصفلی فرماتے ہیں:

"وكذا تجب (النفقة) لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنشى مطلقاً... وطالب العلم لا يتفرغ لذلك كذا في الزيلعي والعيینی" (الدر المختار ۱۰۲۳)۔

لہذا صورت مسئلہ میں باپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اس بیٹے کی تعلیم پر خرچ کرے اور اسے سود میں ملوث ہونے سے بچائے۔

۵۔ اگر طالب علم یا والد صاحب استطاعت ہو اور فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ لگانا نہ چاہتے ہوں اور اس کے بجائے قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے خواہش مند ہوں تو اس کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا آخری مجبوری کے درجہ میں ہے۔ ☆☆☆

## تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مفتی مظہیر احمد قاسمی

- ۱- جدید اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی فرض کفایہ ہے، اور مچو جو وہ دور میں ضرورت کے درجہ میں ہے، جس کے حصول کے بغیر چارہ نہیں، ورنہ مسلمان ہر میدان میں تھکے کا شکار ہو جائیں گے، اس لئے مسلمانوں کو پوری تندرہی کے ساتھ دینی تعلیم کے علاوہ دنیاوی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی بھی پوری کوشش کرنی چاہئے، اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کو اپنے لئے لازم سمجھنا چاہئے۔
- ۲- سودی معاملہ بہر حال سودی معاملہ ہے اس کو سروس چارج پر محمول نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں رقم پر اضافہ مدت کے مقابلہ میں ہوتا ہے، جو ربوا النسیہ ہے، شرح سود چاہے زیادہ ہو یا کم وہ بہر حال سود ہی کہلائے گا۔
- ۳- ان حالات میں اس کو قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا بالکل درست ہے۔
- ۴- طالب علم کے اپنے حالات کے اعتبار سے ہو گا نہ کہ والدین کے احوال کے اعتبار سے جیسا کہ اور دیگر معاملات میں۔
- ۵- اگر طالب علم صاحب استطاعت ہے تو اس کو پھر بغیر حاجت اور ضرورت کے سودی قرض لینا درست ہوگا، لیکن اگر اس کے والد تو صاحب استطاعت ہیں مگر وہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تو پھر طالب علم حصول تعلیم کے لئے سودی قرض لے سکتا ہے، اگر وہ خود صاحب استطاعت نہ ہو۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مولانا اقبال احمد قاسمی

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر:

شرعی نقطہ نظر سے جدید اعلیٰ تعلیم فرض کفایہ ہے، اور مسلمانوں کو اس میں پیش قدمی کرنا وقت کا تقاضا ہے، امام نووی فرماتے ہیں:

”واما ما لیس علما شرعا ویحتاج الیہ فی قوام امرالدنیا کالطب والحساب ففرض کفایہ ایضا نص علیہ الغزالی“ (کتاب المجموع للنووی ۱:۵۱) اور جو علوم شرعیہ نہیں ہیں ان کی ضرورت دنیاوی معاملات کے نظام میں ہوتی ہے، مثلاً فن طب، حساب وغیرہ تو یہ بھی فرض کفایہ ہے، امام غزالی نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی معاشرہ میں جو افادیت ہے اور ہر لائن میں ماہرین کی جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر ایسے فرض کفایہ کے حصول میں شرکت دین و دنیا دونوں اعتبار سے نہایت ضروری ہو جاتی ہے، جیسا کہ علامہ نووی لکھتے ہیں:

”واعلم ان للقائم بفرض الکفایة مزیة علی القائم بفرض العین لانه أسقط الحرج عن الامة“ (المجموع للنووی ۱:۵۲) (جاننا چاہئے کہ فرض کفایہ کی بجائے آوری کی زیادہ فضیلت ہے بہ نسبت فرض عین کے بجالانے کے، کیونکہ فرض کفایہ کو انجام دینے والا پوری امت سے حرج کو دور کر رہا ہے۔)

یہاں یہ شبہ نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ یہ علوم پہلے کہاں تھے، جس کو آج فرض کفایہ ثابت کیا جا رہا ہے وجہ یہ ہے کہ علوم جدیدہ کا ارتقاء ہر زمانہ میں حسب ضرورت ہوتا رہا اور ماضی میں بھی یہ علوم ہتھنمائے وقت موجود تھے اور قرآنی اشارات ہر زمانہ کے لئے مؤید رہے ہیں، اس لئے گذشتہ صدیوں میں ہر قسم کے علوم و انکشافات اور تحقیق و ایجادات میں مسلمان سرگرم عمل رہے ہیں، غلام احمد کالمی نے اپنی کتاب مسلمانوں کے سائنسی ایجادات و انکشافات میں ثابت کیا ہے کہ کوئی ایسی ایجاد نہیں ہے جس میں مسلمانوں نے سبقت نہ کی ہو مگر عالم اسلام کے انتشار اور اغیار کی سازشوں نے مسلمانوں کو اس میدان میں بھی پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔

۲۔ تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت:

چونکہ حکومت غیر مسلم ہے اور وہ سود کی قباحت تو کیا اس کی تعریف سے بھی نا آشنا ہے، ورنہ اس تعلیمی قرض پر ملنے والی مزید رقم کو وہ سود نہ کہتی اور تعلیمی قرض کے ضابطے بھی سود جیسے نہ بنائے جاتے، لہذا یہاں اس معمولی شرح سود کو ”الأمور بمقاصدھا“ کے تحت سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کر لیا جائے تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

لیکن احقر کے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ قرض کے طور پر فراہم کی گئی رقم کی واپسی کے موقع پر جو زائد رقم حکومت وصول کرتی ہے وہ سود ہی ہے اور ”کل قرض جبر نفعاً فہو ربا“ کے تحت داخل ہے لیکن چونکہ معاملہ یہاں سود کھانے کا نہیں بلکہ سود لینے کے بجائے دینے کی نوبت ہے اور اس معمولی سودی معاملہ کے ذریعہ ایک فرض کفایہ کی انجام دہی مقصود ہے جو عام حالات میں اس قرض کے بغیر ناممکن ہے اس لئے اس قرض کو حاصل کرنے کی شرعاً گنجائش ہوگی، جیسا کہ بہت سی ضرورتوں کے تحت لون حکومت سے لینا مجبوری ہوگئی ہے، مثلاً گاڑی یا مہنگا مکان وغیرہ بغیر لون کے

۱۔ صدر مدرس و مفتی مدرسہ مظہر العلوم یکن گنج کا پور۔

لیا جائے تو مشکل کھڑی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی اجازت دی گئی ہے، ایسے ہی اس مسئلہ میں ضرورت و مجبوری کے پیش نظر اجازت دی جائے گی۔  
۳۔ تعلیمی قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا:

اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے معاشی حالات اخراجات کے برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں تو ایسی صورت میں قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز رہے گا۔

کیونکہ تعلیم انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے اور اعلیٰ تعلیم بھی فرض کفایہ ہے، اس لئے لائق حضرات جو سرمایہ سے مجبور ہیں تو وہ اعلیٰ تعلیم موقوف کرنے کے بجائے مذکورہ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، بشرطیکہ نیت فرض کفایہ کے قیام و حصول کی ہو۔

”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشاہ)

(محتاج شخص کے لئے نفع (شرح سود) کے ساتھ قرض حاصل کرنے کی اجازت ہے)۔

اس مسئلہ کی تائید مولانا تقی عثمانی صاحب کے اس فتویٰ سے بھی ہوتی ہے جس میں ضروری اعلیٰ تعلیم جو مخلوط اجتماع مردوزن کے درمیان میں حاصل ہو سکتی ہے، اس کے ترک کرنے کے بجائے بدرجہ مجبوری اس کو گوارا کرنے اور احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے، فرماتے ہیں:

”مسلم معاشرہ کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کے بجائے لڑکوں کے لئے الگ اور لڑکیوں کے لئے الگ تعلیمی ادارے قائم کریں لیکن جب تک ایسا انتظام نہ ہو تو چونکہ میڈیکل تعلیم حاصل کرنا ایک ضرورت ہے اور اس میدان میں متدین افراد کی کمی ہے جسے دور کرنے کا یہی راستہ ہے کہ متدین افراد میڈیکل تعلیم حاصل کریں، اس لئے اگر اس تعلیم کے حصول کا وہ راستہ نہ ہو جو اوپر ذکر کیا گیا تو اس شرط کے ساتھ تعلیم کے حصول کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بے پردہ نامحرم خواتین سے دور رکھیں اور اپنی نگاہ و دل کی حفاظت کریں (فتاویٰ عثمانیہ ۱۹۲)۔

۴۔ اگر طالب علم کی خود معاشی حالت اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کی متحمل نہیں تو محض اس کے والد کے مستطیع ہونے سے طالب علم کو صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ جس طرح قربانی، زکوٰۃ، فطرہ میں بالغ اولاد باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے مستطیع نہیں ہوتی اسی طرح یہاں بھی باپ کی مالداری سے اولاد مالدار نہیں کہلائے گی بلکہ مالدار باپ کے بالغ (غریب) بیٹے کو زکوٰۃ دینا جس طرح جائز ہے اسی طرح یہاں قرض کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا، چنانچہ اگر وہ غریب ہے اور تعلیم کے لئے قرض کا محتاج ہے تو باپ کی استطاعت کے باوجود وہ قرض اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

☆☆☆



## تعلیمی قرض کی شرعی حیثیت

مولانا محمد ابو بکر قاسمی مدظلہ

جن اوصاف و کمالات کی وجہ سے انسان کو دوسرے مخلوقات پر خصوصی امتیاز، تفوق اور برتری حاصل ہے ان میں تعلیم کو بنیادی حیثیت اور سب سے نمایاں مقام حاصل ہے، تعلیم ہی کی وجہ سے انسان وجود ملائکہ ہوا، نیز تعلیم ہی کے سبب انسان دینی و دنیاوی حقوق و فرائض کو ادا کر سکتا ہے، اسی لئے مذہب اسلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی سب سے پہلی وحی میں سب سے پہلا حکم "اقرا باسم ربک" نازل فرما کر تعلیم ہی کا حکم صادر فرمایا، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کے ذریعہ حکم دیا گیا کہ "قل هل یتسوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر اولوالالباب" (سورہ زمر: ۹)۔

تعلیم کی ضرورت و اہمیت انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے مسلم ہے، اور مذہب اسلام کی رو سے ایک مسلمان کے لئے تعلیم کا حاصل کرنا صرف مطلوب و محبوب اور مرغوب ہی نہیں بلکہ اس کے اوپر سب سے اولین فریضہ ہے، اسی لئے ایک حدیث میں صاف فرمایا گیا: "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" (ابن ماجہ ۲۰/۱)۔

ضروری تعلیم دینا علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر خواہ مرد ہو یا عورت شہری ہو یا دیہاتی فرض ہے۔

کیونکہ بغیر تعلیم کے کوئی مسلمان خدائے تعالیٰ کا محبوب و مکرم بندہ نہیں بن سکتا، کتابی تعلیم ہو یا زبانہ تعلیم، الفرض جو بھی صورت ہو اس کو اختیار کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

۱۔ جدید اعلیٰ تعلیم اگر مفید ہو معاشی و اقتصادی اعتبار سے یا دینی و سماجی اعتبار سے بہر حال اس کی تحصیل شرعاً درست ہے، اور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینا چاہئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کلمۃ الحکمۃ ضالۃ الہومن حیثما وجدھا فهو احق بہا" (ابن ماجہ ۳۰۷)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے قیدیوں سے جو فدیہ کی رقم ادا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے ان سے مالی فدیہ لینے کے بجائے دس دس بچوں کو لکھانے و پڑھانے کا کام لیا، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم اساتذہ سے مفید تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔

۲۔ سرکاری بینک کے ذریعہ کم شرح سود پر جو زیادہ مدت کے لئے تعلیمی قرض دیا جاتا ہے، وہ بھی شرعاً سود ہے، اگرچہ حکومت کا ادعاء ہو کہ اس قرض کا مقصد سود کمانا نہیں ہے، کیونکہ حدیث نبوی ہے: "کل قرض جرم منفعۃ فهو ربا" (جامع صغیر)۔

مندرجہ حدیث نبوی کی روشنی میں بلاشبہ تعلیمی قرض بھی شرعی سود کے دائرہ میں آتا ہے، لہذا اس شکل میں شرح سود کو سروس چارج قرار دینا درست نہیں ہے، البتہ جو شخص پریشان ہو اس کے پاس اگر اتنی رقم نہ ہو کہ وہ خود اپنی رقم سے جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے تو اس کے لئے حکومت کی تعلیمی قرض والی اسکیم سے فائدہ اٹھانا درست ہے، رہا اس تعلیمی قرض پر جو سود کی رقم وصول کی جاتی ہے اس کو کیا نام دیا جائے تو اس سلسلہ میں کفایت المفتی جلد ہشتم جواب ۱۵۵ کے تحت قرض دینے کو کاغذ خریدنے کے ساتھ معلق کرنے کی ایک صورت کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھئے: کفایت المفتی ۱۳۰۸، ۱۳۱، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)۔

کفایت الفتی کی مندرجہ بالا فتویٰ کی روشنی میں اگر بینک مدیون سے سند قرض کو فروخت کرے، اور پھر سند قرض کو مدیون کے خریدنے کے بعد اس کو ایک خاص مدت کے لئے بلا سودی قرض دے، اور پھر مقررہ مدت کے پورا ہونے پر دیئے گئے تعلیمی قرض کو وصول کر لے اور سند قرض کی فروختی کے منافع کو بینک کے عملہ کے سروس چارج ادا کرنے کے بعد غریب پر تقسیم کر دے تب تو بینک کے وصول کردہ شرح سود کو سند قرض کی قیمت قرار دے کر بیع جرنفعا کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن مندرجہ بالا شرائط پر حکومت غیر مسلمہ میں عمل کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے بینک کا وصول کردہ شرح سود قرض جرنفعا کی ایک شکل ہے، جو شرعاً تو جائز نہیں لیکن ضرورت مند اشخاص کے لئے قرض کی اس شکل سے فائدہ اٹھا کر اپنی ضرورت کی تکمیل کرنا جائز ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص جدید اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا امیدوار ہے، یا بیرون ملک جا کر جدید تعلیم حاصل کرنے کا متمنی ہے لیکن اس کے معاشی حالات اس تعلیم کے اخراجات کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، اور وہ اس سلسلہ میں بے حد پریشان ہے تو ایسے پریشان شخص کے لئے کم شرح سود پر تعلیمی قرض کی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا شرعاً جائز ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصری نے الاشبہ والنظائر میں یہ صریح جزیئہ لکھا ہے:

”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشبہ ص ۹۲) (محتاج شخص کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے)۔

۴۔ اگر اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کے متمنی طالب علم کے والد کے حالات تو بہتر ہیں لیکن خود طالب علم کی معاشی حالت بہتر نہیں ہے، اور تعلیم کے اخراجات کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہے تو جواز قرض کے لئے شریعت میں مہنتی بہ کے حال کا اعتبار کیا جائے گا، اس کے والد کے احوال کو نہیں دیکھا جائے گا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ”لا يكلف الله نفسا إلا وسعها“ (بقرہ: ۲۸۶) (اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر کام کرنے کا مکلف نہیں بنایا ہے)۔

اسی طرح خداوند قدوس کا فرمان ہے: ”لينفق ذو سعة من سعته“ (طلاق: ۷) (گنجائش والے شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق نان و نفقہ اور خرچہ کی ادائیگی کرے)۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر کسی ذمہ داری کے عائد کرنے میں اس کی گنجائش کا لحاظ کیا ہے۔

۵۔ اگر خود طالب علم کو استطاعت ہو اور وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا متمنی بھی ہے تو اس پر لازم ہے کہ خود اپنی ذاتی رقم خرچ کر کے تعلیم حاصل کرے، لیکن اگر وہ اپنا پیسہ خرچ نہ کرنا چاہتا ہو اور ساتھ ہی تعلیم حاصل کرنے کا آرزو مند بھی ہو تو ایسے شخص کے لئے سودی قرض لے کر اپنی تعلیم کے اخراجات کو پورا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ سودی قرض لے کر ضرورت کو پورا کرنے کی اجازت حالت اضطرار میں ہے حالت اختیار میں نہیں، جیسا کہ اوپر الاشبہ والنظائر کا صریح جزیئہ پیش کیا گیا۔

اور استطاعت کی صورت میں قرض دے کر سود حاصل کرنا یا قرض لے کر سود دینا دونوں صورتیں شرعاً ناجائز ہیں، حضور ﷺ کا فرمان ہے:

عن جابر مرفوعاً ”لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهده وقال هم سواء“ (رواه مسلم، مشکوٰۃ ۱: ۲۲۳)۔

☆☆☆



## عصری تعلیم کا شرعی حکم

مولانا محمد فاروق علی

- ۱- جدید تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظریہ ہے کہ وہ تمام علوم عصریہ جو امور دنیویہ کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اس کا حصول فرض کفایہ ہے، اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کو عموماً اور اہل حل و عقد کو خصوصاً متشکر رہنا چاہئے۔
  - ۲- کم شرح سود والے بینک سے تعلیمی قرض لینا جبکہ دیگر جائز صورتیں مفقود ہوں شرائط مذکورہ کے مطابق درست ہے اور اس کم شرح سود کو بعض ارباب افتاء کے مطابق سروس چارج قرار دیا جاسکتا ہے۔
  - ۳- ایسا طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کا اہل ہو، لیکن معاشی حالات اس کے صرفہ کو برداشت نہ کر سکتے ہوں تو اس قرض اسکیم سے کچھ شرائط کے ساتھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔
  - ۴- صاحب استطاعت والد کے ہوتے ہوئے، طالب علم کی ذاتی حالت معتبر نہیں، بلکہ اس صورت میں نفقات والد پر واجب ہونے کی وجہ سے طالب علم کو بھی صاحب استطاعت سمجھا جائے گا،
- ”کما فی البحر من کان منهم حسن السیرة، مشتغلاً بالعلوم النافعة یجیر الآباء علی الانفاق علیہم“۔
- ۵- اگر والد یا طالب علم صاحب استطاعت ہوں اس کے باوجود اپنا پیسہ نہ لگانا چاہتے ہوں تو ان کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، کیونکہ فائدہ اٹھانے کی اجازت ضرورہ ہے، اور یہاں ضرورت مفقود ہے۔



## تعلیمی لون کی گنجائش ہے

مفتی عبدالرشید قاسمی <sup>ط</sup>

تعلیمی لون کے بازے میں بھی ضرورت کچھ اس قسم کی محسوس ہو رہی ہے، دور حاضر کی طاقت تعلیم ہی ہے، اس کے حصول کے لئے انشورنس کی طرح گنجائش ہونی چاہئے، خصوصاً جبکہ خود حکومت یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ اصل مقصد سود حاصل کرنا نہیں بلکہ تعلیم میں توازن پیدا کرنا ہے گویا انہوں نے سود نام رکھ دیا ورنہ اس کا نام سروس چارج بھی رکھا جاسکتا تھا، لہذا "الأموار بمقاصدھا" کے تحت اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

سوالات کے جوابات:

- ۱۔ شرعی نقطہ نظر سے جدید اعلیٰ تعلیم قرض کفایت کا درجہ رکھتی ہے، اور مسلمانوں کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے، یہ خدشہ کہ علوم جدیدہ کے ماہر بعض مسلمان گمراہ نظر آتے ہیں، درست نہیں کیونکہ یہ خود ان کا تصور ہے، ورنہ تعلیم گمراہ یاد ہر یہ نہیں بناتی۔
- ۲۔ حکومت غیر مسلم ہے، وہ سود کی قباحت کا اعتقاد نہیں رکھتی ورنہ شاید اس کا نام سود نہ رکھا جاتا، اور تعلیمی قرض کے ضابطے بھی سود جیسے نہ بنائے جاتے نیز خود حکومت کا ادنا ہے کہ اس قرض کا مقصد سود کمانا نہیں ہے، ایسے حالات میں اگر اس کم شرح سود کو "الأموار بمقاصدھا" کے تحت سروس چارج (اجرت خدمت) پر محمول کر لیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کے خلاف ان کو ہر میدان میں کمزور اور پیچھے رکھنے کی منصوبہ بند کوششیں ہو رہی ہوں۔
- ۳۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہے، یا وہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے قائل نہیں ہیں تو اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔
- ۴۔ قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالب علم کے اپنے حالات سے ہوگا، والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے بیٹے کو شرعاً صاحب استطاعت نہیں سمجھا جائے گا۔
- ۵۔ اگر طالب علم خود صاحب استطاعت ہے لیکن وہ فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ لگانا نہیں چاہتا تو ایسی صورت میں اس کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، البتہ اگر باپ صاحب استطاعت ہے اور وہ اپنا پیسہ لگانا نہ چاہے تو طالب علم کے لئے اس قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ باپ کے صاحب استطاعت ہونے سے بالغ بیٹا از روئے شرع صاحب استطاعت نہیں سمجھا جاتا۔

☆☆☆

## تعلیمی قرض کا شرعی حکم

مولانا محمد اشرف

- ۱- وہ تمام علوم عصریہ نافعہ جو امور دنیویہ کی انجام دہی میں معین ہوں، ان کا حصول مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔
- ۲- دیگر جائز صورتوں کے فقدان کی صورت میں کم شرح سود والے بینک سے شرائط کے مطابق تعلیمی قرض لینا جائز ہے، اور اس کم شرح سود کو سروس چارج قرار دیا جاسکتا ہے۔
- ۳- ایسا طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کا اہل ہو، لیکن اس کی معاشی حالت اخراجات کی متحمل نہ ہو تو چند شرائط کے ساتھ قرض اسکیم سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔
- ۴- طالب علم کی ذاتی حالت معتبر نہیں، چونکہ نفقات والد پر واجب ہوتے ہیں، اس لئے والد کے صاحب استطاعت ہونے کی وجہ سے طالب علم بھی مستطیع سمجھا جائے گا۔
- ۵- صاحب استطاعت ہونے کے باوجود اگر پیسہ نہیں لگانا چاہتے تو اس قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں

☆☆☆

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالات و مباحث اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

## سلسلہ جدید فقہی مباحث

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ  
”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ، ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو“ سورہ نساء: ۲۹

# علم معاشیات اور اسلامی معاشیات

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان

## پیش لفظ

کسی بھی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی افرادی قوت ہے اور افرادی قوت صرف تعداد اور مقدار کا نام نہیں ہے بلکہ یہ افراد کی استعداد اور ان کے معیار سے عبارت ہے، جس قوم میں باصلاحیت افراد نہ ہوں وہ صالح اور دانش مند قیادت سے محروم ہو جاتی ہے اور پھر بے سمتی، منزل سے محرومی اور زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سب سے زیادہ توجہ شخصیت اور کردار سازی پر دی اور صحابہ کرام کی فکری، علمی اور عملی تربیت فرمائی، چنانچہ قرآن مجید نے امت سے آپ کے ربط و تعلق کو زیادہ تر جس نسبت سے نمایاں کیا ہے، وہ تعلیم و تزکیہ ہے، "يَتْلُو عَلَيْنَهُم آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ".

علماء چونکہ اس امت کے فکری اور دینی رہنما ہیں اور ان کی حیثیت صراط مستقیم کے لئے قبلہ نما کی سی ہے، اس لئے ان کی فکری تعمیر نہایت اہم کام ہے، موجودہ حالات میں جیسے جیسے دنیا سمٹی جا رہی ہے اور فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں، علماء کی ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی ہیں اور یہ بات ضروری ہو گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی لحاظ سے تیار کریں، ماضی قریب کے اہل علم حضرات میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو اس کی خاص فکر تھی، چنانچہ جب انہوں نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم فرمائی تو اس کے مقاصد میں دو باتوں کو خصوصی اہمیت دی گئی، ایک عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا حل جس کے لئے خاص طور پر فقہی سمیناروں کا سلسلہ شروع کیا گیا، دوسرے نوجوان فضلاء کی تربیت۔ بانی اکیڈمی کی نظر میں اس کام کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں تھی، چنانچہ تیسرے فقہی سمینار جو بنگلور میں ۱۹۹۰ء میں منعقد ہوا باضابطہ تجویز منظور کی گئی کہ دینی مدارس میں محاضرات رکھے جائیں اور علمی و تحقیقی کاموں کے لئے فضا بنائی جائے۔

چنانچہ اکیڈمی نے حسب موقع و سہولت دینی مدارس میں محاضرات اور علمی مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا، جو اب تک جاری ہے، ان محاضرات و مذاکرات (ورکشاپ) کے ذریعہ ایک طرف طلبہ کو اسلام کے اصول قانون، احکام شریعت کے بنیادی مقاصد اور نئے مسائل کے حل کے سلسلہ میں اصول و قواعد سے روشناس کیا گیا اور دوسری طرف معاشیات، سماجیات، سیاسیات اور عالمی حالات و تحریکات سے متعلق مفید، ضروری اور جدید معلومات فراہم کی گئیں، تاکہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں، ضرورتوں اور ان کے فکری پس منظر کو سمجھ سکیں اور شریعت کے اصول و مقاصد کی روشنی میں انہیں حل کر سکیں، اس مقصد کے تحت دینی مدارس کی منتہی جماعتوں کے طلبہ کے لئے کئی تربیتی کیمپ رکھے گئے، جن میں عصری علوم کے ماہرین نے خطبات دیئے، متعدد ورکشاپ رکھے گئے جن میں عالم عرب کے بعض معروف علماء و اساتذہ نے شرکت فرمائی اور وقف کے موضوع پر ایک بین المدارس مذاکرہ بھی رکھا گیا۔

موجودہ دور میں یوں تو ہر شعبہ زندگی میں تبدیلیاں آئی ہیں، لیکن خاص کر نظام معیشت میں دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، نئے مالیاتی ادارے وجود میں آئے ہیں، گلوبلائزیشن کے عمل نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے، پوری دنیا معاشی اعتبار سے باہم مربوط ہو گئی ہے، اور معاشیات کے میدان میں بہت سے نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، جن کے بارے میں علماء پر دو طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ ان نئے مسائل کا شرعی حل پیش کریں، دوسرے موجودہ معاشی نظام میں جو ادارے ضرورت کا درجہ اختیار کر گئے ہیں، لیکن جن کی تشکیل اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہوئی ہے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا متبادل پیش کریں؛ کیونکہ اس کے بغیر ہم



قانون شریعت کی ابدیت اور اس میں رواں دواں زندگی کی ضرورتوں کو پوری کرنے کی صلاحیت کو ثابت نہیں کر سکتے۔

محترم جناب ڈاکٹر اوصاف احمد اس وقت ہندوستان کے ان چند اصحاب دانش میں سے ہیں، جو موجودہ عالمی نظام معیشت پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، اور اقتصادیات کے بارے میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ ہیں، نیز اسلامک بینک کاری اور جدید مالیاتی نظام پر ان کی تحریریں ملک کے مؤثر جرائد و رسائل میں طبع ہوتی رہی ہیں۔ اکیڈمی نے ڈاکٹر صاحب سے خواہش کی کہ وہ معاشی موضوعات پر دینی مدارس کے طلبہ کے لئے نہ صرف محاضرات دیں، بلکہ انہیں مرتب بھی کر دیں تاکہ یہ ایک رہنما کتاب کی حیثیت سے ان کے سامنے رہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں ان محاضرات کا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مجموعہ میں پانچ محاضرات شامل کئے گئے ہیں، پہلے تین لیکچرز علم معاشیات اور جدید مالیاتی نظام کے موضوع پر ہیں، جس میں اختصار کے ساتھ علم معاشیات اور اس کے مبادی اصولوں کے بیان کے ساتھ اسلامی معاشیات کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں اسلامی مفکرین کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز جدید معاشی نظاموں کے پس منظر میں اسلام کے اقتصادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے۔

چوتھا خطبہ ہندوستان میں غیر سودی مالیاتی نظام سے متعلق ہے، اس کا عنوان ہے: ”ہندوستان میں اسلامی مالیات، موجودہ مسائل اور امکانات“، یہ خطبہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے خاص ہندوستان کے پس منظر میں ہے، جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتصادی حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے، نیز اس ملک میں اسلامی بینک کاری کے امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، اور اس ضمن میں بعض اداروں کا تعارف بھی آگیا ہے۔

پانچواں محاضرہ ”اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک“ کے عنوان سے ہے، اس محاضرہ میں اقلیت کی تعریف، مسلم اقلیتی ممالک میں اسلامی بینک کاری کی کوششیں اور اس راہ میں حائل دشواریوں کا تجزیہ کیا گیا ہے، نیز موجودہ عہد میں ’دار‘ یعنی نظام حکومت کی تقسیم کی گئی ہے، اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی حقیقت کیا ہے اور موجودہ جمہوری ممالک کس زمرہ میں آتے ہیں؟ پھر دارالحرب میں سود کے فقہی حکم پر بحث کی گئی ہے اور اہل علم کے نقاط نظر کا تجزیہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ بات ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کو ایک عالم کے فتویٰ کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، تاہم جو موقف انہوں نے اختیار کیا ہے، علماء ہند کا فتویٰ اس کے مطابق ہے، اور اکیڈمی نے بھی اپنے تیسرے سمینار میں یہی فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان جیسے ممالک میں بھی سود حرام ہے۔

یہ مجموعہ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ مدارس کے نوجوان فضلاء اس سے استفادہ کریں، نیز مدارس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنے یہاں منتہی جماعتوں کے طلبہ کے لئے مطالعاتی نصاب میں شامل کر دیں، تاکہ ہمارے فضلاء اپنے عہد کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہو سکیں، اکیڈمی کوشاں ہے کہ جیسے اس نے ماضی میں علماء اور دینی مدارس کے طلبہ کی رعایت سے عصری موضوعات پر بعض رسائل پیش کئے ہیں، اسی طرح دوسرے عصری موضوعات پر بھی محاضرات کا نظم کرے اور انہیں مرتب کر کے شائع بھی کرے تاکہ ان سے مستقل طور پر فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اکیڈمی اس بات کے لئے بھی کوشاں ہے کہ عصری درسگاہوں میں بھی اسلامی زندگی کے مختلف شعبوں پر محاضرات رکھے جائیں؛ تاکہ وہاں تعلیم پانے والے طلبہ میں دینی شعور پیدا ہو اور وہ عصری علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی بنیں، قارئین دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی ان کوششوں کو قبول فرمائے اور نتیجہ خیز بنائے۔ واللہ هو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ / ۱۳ اپریل ۲۰۰۹ء

## دیباچہ

یہ مختصر سا کتابچہ ۵ مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف وقتوں میں لکھے گئے اور اردو کے علمی رسالوں بالخصوص تحقیقات اسلامی (علی گڑھ) اور مطالعات (نئی دہلی) کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔

گذشتہ دنوں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے بعض مدارس میں معاشی موضوعات پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا تو انہیں مضامین پر تکیہ کیا گیا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ دار حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے فرمائش کی کہ اگر ان لیکچروں کو شائع بھی کر دیا جائے تو طلباء ان کو ”رہنما کتاب“ کی حیثیت سے استعمال کر سکیں گے۔ ناچیز کا جرم صرف اتنا ہے کہ اُس نے اس فرمائش سے سرتابی کرنے کی جرأت نہیں کی بلکہ حکم کی تعمیل کو اپنا فرض جانا۔

اگر اس مختصر مجموعے میں کوئی خوبی نظر آئے تو اس کے لئے مولانا نے مذکور دعائے خیر کے بجائے مستحق ہوں گے۔ خامیوں کے لئے خادم ذمہ دار ہے۔

تاہم اگر ان خامیوں کی اطلاع دے دی جائے تو انشاء اللہ اگلی اشاعت میں تصحیح کی کوشش کی جائے گی۔

اوصاف احمد

۱۲ اپریل ۲۰۰۹ء

B-89Sector-27

Noida

## علم معاشیات

### تعریف، مقصد اور منہاج

موجودہ زمانہ میں معاشیات کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور معاشیات سے تعلق رکھنے والے موضوعات ہماری روزمرہ کی گفتگو، بات چیت اور بحث مباحثے کا مرکز بنتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے گرد و پیش کی زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ سمجھ لینا غالباً چنداں دشوار نہ ہوگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ گھروں کی چار دیواری میں رہنے والی خواتین اکثر حیران رہتی ہیں کہ قیمتوں میں مسلسل اضافہ کیوں ہوتا رہتا ہے۔ آج سے تیس چالیس سال قبل آلو کی قیمت 50 پیسے فی کلو ہوا کرتی تھی لیکن آج اس کی قیمت 8 روپے فی کلو ہے۔ اس زمانے میں شکر ایک روپیہ فی کلو ہوا کرتی تھی آج اس کی قیمت 30 روپیہ فی کلو ہے، اسی طرح دوسری ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں اور روپے کی خریدنے کی طاقت کم ہو گئی ہے۔ بعض اوقات انھیں یہ جان کر بھی حیرانی ہوتی ہے کہ کچھ چیزیں بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔ کبھی صابن غائب ہے تو کبھی بنا پستی گھی نہیں مل رہا ہے۔ ایسے مواقع پر معمول سے زیادہ رقم دے کر چیز لینا پڑتی ہے۔

کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کے سامنے روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ آپس میں اس بات پر بحث مباحثہ کرتے رہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد کس قسم کی زندگی گزارنا پسند کرے گا۔ کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو کوئی قانون دان، کوئی آئی اے ایس بننا چاہتا ہے تو کوئی یونیورسٹی میں لیکچرار ہونا چاہتا ہے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بے روزگاروں کے دفتر میں نام کھوانے پہنچتے ہیں تو اپنے ہی جیسے سیکڑوں لوگ روزگار کی تلاش میں لائن لگائے ہوئے ملتے ہیں۔ اول تو انٹرویو کے لئے بلاوے ہی نہیں آتے۔ اور اگر آتے بھی ہیں تو روزگار نہیں ملتا۔ وہ بس یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بے روزگاری زیادہ ہے۔

بعض دوسرے ممالک میں بے روزگاری کی یہ صورت حال نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہاں کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے ملکوں سے کام کرنے والے منگاتے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ ہمارے ملک سے بہت سے لوگ مشرق وسطیٰ کے ممالک، سعودی عرب، عراق، شام، لیبیا اور خلیج فارس کے ممالک، جیسے بحرین، قطر، دوئی، ابوظہبی وغیرہ ہجرت کر گئے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن ہنرمند ہیں۔ کوئی لکڑی کا کام جانتا ہے، کوئی فرنیچر بناتا ہے، کوئی مشین مین ہے، کوئی بینٹر ہے، کچھ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کوئی ڈاکٹر ہے۔ کوئی انجینئر ہے، کوئی کمپیوٹر کا ماہر ہے، آپ نے بھی اس بات پر غور کیا ہے کہ یہ صورت حال کیسے پیدا ہو سکتی ہے کہ بعض ملکوں میں روزگار کی اس قدر کمی ہو اور دوسرے ممالک میں اس قدر فراوانی ہو؟

آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مختلف پیشوں میں تنخواہ کی شرح الگ الگ ہوتی ہے، عمارتوں کی تعمیرات میں کام کرنے والا مزدور عام طور پر 10-20 روپے روز سے زیادہ نہیں کماتا جبکہ اس کے ساتھ ہی کام کرنے والا راج گیر پچاس روپے روز کماتا ہے، اسی پروجیکٹ پر کام کرنے والے انجینئر کی تنخواہ کئی ہزار روپے ماہوار ہوتی ہے، تنخواہ کے علاوہ بھی اسے مختلف طرح کی سہولیات مل سکتی ہیں مثلاً رہنے کے لئے مفت بنگلہ، کمپنی کی کار اور گھر میں کام کرنے کے لئے خدمت گار وغیرہ، کیا آپ نے بھی اس بات پر غور کیا ہے کہ مختلف پیشوں کے درمیان آمدنی میں یہ تفاوت کس بنا پر ہے؟

شائد یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ ہندوستان میں ہم اپنی ضرورت کی تمام چیزیں نہیں بنا پاتے ہیں اور بہت سی چیزیں ہمیں دوسرے ممالک سے خریدنا پڑتی ہیں۔ یعنی ہم دوسرے ملکوں سے درآمد کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی چیزیں ہم دوسرے ملکوں کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں، اس قسم کی تجارت کو غیر ملکی تجارت یا بین الاقوامی تجارت کہتے ہیں، ہم کو کئی وجوہات کی بنا پر درآمد کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنی درآمد کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی ملک بین الاقوامی تجارت کے بغیر رہ سکے اور ترقی کر سکے؟

اور پھر ترقی کا کیا مفہوم ہے، کیا آزادی کے بعد سے ہم نے کچھ ترقی کی ہے یا نہیں؟ معاشی ترقی کا معیار کیا ہے۔ دنیا میں کون سے ملک ہیں جو ترقی یافتہ کہے جاسکتے ہیں، ان ممالک نے ترقی کا یہ زینہ کیونکر طے کیا؟ اس راہ میں ان کو کون کون سی دشواریاں پیش آئیں، کیا اب ان ترقی یافتہ ممالک کے تمام معاشی مسائل حل ہو گئے یا اس ترقی کے باوجود معاشی مسائل ان ممالک میں باقی ہیں؟ اگر معاشی مسائل باقی ہیں تو معاشی ترقی کا حاصل کیا ہے، ان موجودہ مسائل کی نوعیت کیا ہے اور کس طرح ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟

غیر ترقی یافتہ ممالک کے معاشی مسائل کیا ہیں؟ یہ ممالک ترقی کیوں نہیں کر سکے، ان کی معاشی ترقی کی راہ میں کون سی دشواریاں حائل ہیں اور ان کو کس طرح سے دور کیا جاسکتا ہے؟ معاشی ترقی میں کون سے عوامل مدد دے سکتے ہیں، کیا ان ممالک کا سماجی ڈھانچہ، رسم و رواج اور طرز زندگی معاشی ترقی کے منافی ہیں؟

حکومت اور معاشی زندگی کا کیا تعلق ہے؟ کیا حکومت کے افعال و اعمال ہماری معاشی زندگی پر کس طرح کا اثر ڈالتے ہیں؟ حکومت کو کس طرح کا کام اپنے ذمہ لینے چاہیے اور کس طرح کی سرگرمیوں سے احتراز کرنا چاہیے؟ حکومت اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے اپنے اخراجات کس طرح پورے کرے؟ اس کی آمدنی کن ذرائع سے حاصل ہو؟ کیا معاشی زندگی کی کارکردگی کے لئے حکومت پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا نہیں؟

یہ وہ چند سوالات ہیں جو علم معاشیات کے دائرے میں آتے ہیں اور جنہوں نے ہمارے زمانے میں ماہرین معاشیات کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی ہے، معاشی نظریات، کسی نہ کسی طور پر انہیں سوالات کے تشفی بخش جوابات پانے کی جستجو اور کوشش کرتے ہیں۔

علوم کی تقسیم۔ قدرتی اور سماجی علوم

دنیا میں جو کچھ بھی 'معلومات' (Knowledge) انسانوں نے اپنے پیش روؤں سے سیکھ کر اور بذات خود جمع کی ہے اس کو عام طور پر دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- فنون

۲- علوم

علوم اور فنون کے درمیان فرق مثالوں کے ذریعہ بہتر طریقے پر واضح کیا جاسکتا ہے، مصوری، موسیقی، اداکاری، شاعری، فن تعمیرات، وغیرہ فنون کی مثالیں ہیں، ان فنون میں کارنامے انجام دینے کے لئے انسان میں کسی حد تک خداداد قابلیت کا ہونا ضروری ہے، گوکہ دور جدید میں ان فنون کو سکھانے کے لئے بھی ادارے (مثلاً آرٹس کالج وغیرہ) کھل گئے ہیں لیکن وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص میں ان فنون کو سمجھنے کی زیادہ اہلیت پیدا کر دیں۔ لیکن ایک مصور بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس شخص کی طبیعت کو مصوری سے فطری مناسبت ہو۔ اگر یہ فطری مناسبت اس کی طبیعت میں ودیعت نہیں کی گئی تو کئی اعلیٰ درجہ کے ادارے مل کر بھی اس شخص کو مصور نہیں بنا سکتے۔ یہی بات موسیقی، اداکاری، رقص اور شاعری کے لئے کہی جاسکتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جاتے۔ یہ فنون لطیفہ کی مثالیں ہیں۔ کچھ دوسرے فنون بھی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے فن نہیں سمجھے جاتے جیسے فن طباطخی (مشہور ہے کہ عمدہ کھانا پکانا بھی ایک آرٹ ہے) فن خیاطی، فن خطاطی وغیرہ۔

علم، ہماری معلومات کا وہ حصہ ہے جس کو سائنسی انداز پر منضبط کیا گیا ہو۔ ان علوم کو سیکھنے کے لئے کسی خاص قابلیت یا فطری مناسبت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اوسط درجہ کی ذہانت اور مناسب تربیت کی ضرورت ہے۔ علوم کی دو بڑی قسمیں کی جاسکتی ہیں:

(i) قدرتی علوم

(ii) سماجی علوم

قدرتی علوم وہ ہیں جن میں انسان اس کائنات، اور اس دنیا کے بارے میں تفتیش کرتا ہے جس کا ایک جزوہ خود بھی ہے، طبیعت میں اشیاء کی طبعی ماہیت اور کائنات کے طبعی پہلو سے بحث کی جاتی ہے، علم کیمیا اشیاء کی کیمیائی ترکیب کی تفتیش کرتا ہے، حیوانیات، دنیا میں پائے جانے والے حیوانوں کا مطالعہ کرتا ہے، علم نباتات میں مختلف قسم کے پودوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ارضیات، زمین کی بناوٹ کی چھان بین کرتا ہے، فلکیات میں اجسام فلکی، ستاروں اور سیاروں کی

صفات کی تفتیش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اس کائنات سے متعلق کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے مطالعہ کی خاطر انسانوں نے کسی نہ کسی علم کو مختص نہ کر دیا ہو۔

قدرتی علوم کے برعکس، سماجی علوم وہ ہیں جس میں انسانوں کی تنظیم جسے ہم سماج کہتے ہیں کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ قدرتی علوم کا موضوع کائنات ہے لیکن سماجی علوم کا موضوع خود انسان ہے۔ جس طرح قدرتی علوم کی مختلف شاخیں ہیں اور ہر شاخ قدرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سماجی علوم کی بھی مختلف شاخیں ہیں جو سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ علم سیاسیات انسانی زندگی کے سیاسی پہلو پر زور دیتا ہے، یہ اس بات کی کھوج کرتا ہے کہ ریاست اور حکومت کا آغاز کب ہوا۔ ریاست کے مختلف روپ کیا ہیں۔ اچھی ریاست کسے کہتے ہیں، ریاست میں شہریوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علم سماجیات کا موضوع انسانی زندگی کا سماجی پہلو ہے۔ یہ اس بات کی تفتیش کرتا ہے کہ سماج کیسے قائم ہوا۔ اچھے سماج کی صفات کیا ہیں۔ سماج کے مختلف عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ کسی سماج کے رسم و رواج کیسے ہیں؟ کس قسم کی سماجی اقدار، اس سماج میں رائج ہیں، اقدار کا یہ نظام فرد اور سماج کی ترقی میں مدد و معاون ہے یا متحارب؟

سماجیات اور سیاسیات کی طرح معاشیات بھی ایک سماجی علم ہے۔ جس طرح سیاسیات انسان کی سیاسی زندگی اور سماجیات انسان کی سماجی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشیات کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشیات، انسان کی معاشی زندگی کا مطالعہ ہے۔ لیکن صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ معاشیات، انسان کی معاشی زندگی کا احاطہ کرتا ہے کیونکہ بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم انسان کی معاشی اور غیر معاشی زندگی یا اس کے معاشی اور غیر معاشی افعال کے درمیان حد فاصل کس طرح قائم کریں۔ معاشی اور غیر معاشی سرگرمیوں کے درمیان امتیاز اس لئے ضروری ہے تاکہ معاشیات کا وجود ایک علیحدہ علم کی حیثیت سے قائم ہو سکے۔ اگر ہم سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق معلومات اور اعداد و شمار جمع کر دیں اور اس بات کی قطعی پروا نہ کریں کہ مفید اور متعلق معلومات کون سی ہیں نیز غیر متعلق اور غیر مفید معلومات کون سی۔ تو ہم اعداد و شمار یا معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ اکٹھا کر دیں گے جو اپنے حجم کے لحاظ سے تو چاہے جتنا عظیم کیوں نہ ہو لیکن چنداں با معنی نہ ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم مفید اور غیر مفید، متعلق (Relevant) اور غیر متعلق معلومات کے درمیان تفریق کریں۔ یکساں معلومات کو ایک جگہ جمع کریں۔ معلومات کی درجہ بندی علمی انداز فکر کا پہلا اصول ہے، یکساں معلومات کو ایک جگہ جمع کرنے کے بعد ہم ان کی چھان بھینک اور ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ تجزیہ کے بعد ہم ان میں سے عام اصول اخذ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم معاشیات کی ایک تعریف مقرر کریں تاکہ یہ تعریف ہمیں انسان کی معاشی اور غیر معاشی سرگرمیوں میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی بنیاد فراہم کر سکے۔ تب ہی ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انسان کی سماجی زندگی سے متعلق مختلف قسم کی تفصیلات میں سے کون سی ہمارے لئے مفید اور متعلق ہیں اور کون سی غیر مفید اور غیر متعلق۔

## معاشیات کی تعریف

دوسرے علوم کی بہ نسبت معاشیات ایک جدید علم ہے گو کہ معاشی خیالات اور معاشی افکار کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم خود موجودہ تہذیب، مختلف قسم کے معاشی افکار و تصورات ہمیں پہلی بار افلاطون کی ”ریاست“ میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد سے مختلف فلسفی، دانشور، اور اہل فکر حضرات جن میں بسا اوقات تاجر، ملازمت پیشہ اور حکام بھی شامل ہیں، مختلف اوقات میں معاشیات کے موضوعات کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ تیرہویں سے پندرہویں صدی عیسوی تک یہ خیالات تجارت پسندی کے فلسفہ میں اور اس کے بعد زراعت پسندی کے فلسفہ میں ظاہر ہوئے لیکن نہ تو تجارت پسندوں نے اور نہ زراعت پسندوں نے بہ حیثیت علم معاشیات کی تدوین میں کامیابی حاصل کی۔ معاشیات کی پہلی کتاب ایڈم اسمتھ نے ”دولت اقوام کے اسباب و علل کی ایک جستجو“ [An Inquiry into Nature and Causes of Wealth of Nations] کے عنوان سے 1776ء میں شائع کی۔ (۱)

یہ کتاب ”دولت اقوام“ (Wealth of Nations) کے مختصر نام سے ہی مشہور ہے۔ اس طرح معاشیات کی تاریخ کم و بیش دو سو سال کی تاریخ ہے۔ اس عرصے میں معاشیات کی مختلف طرح سے تعریفیں کی گئیں، کبھی اسے ”دولت کا علم“ کہا گیا۔ (۲)

کبھی اسے ”چٹنی روٹی کا علم“ (Butter Silence Bread)، کا طعنہ دے کر اس کی تحقیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ (۳)۔

مارشل اور پیکو جیسے ماہرین معاشیات نے اس افراط و تفریط کے درمیان متوازن نقطہ نظر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر الفریڈ مارشل نے معاشیات کی تعریف اس طرح کی ہے:

”سیاسی معیشت یا معاشیات، زندگی کے روزمرہ معمولات کے طور پر انسانی اعمال کا مطالعہ ہے۔ یہ اس بات کی تفتیش کرتا ہے کہ انسان کس طرح اپنی

آمدنی حاصل کرتا ہے اور کس طرح اس کا استعمال کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو یہ دولت کا مطالعہ ہے اور دوسری طرف، جو زیادہ اہم ہے، یہ انسان کے مطالعہ کا ایک حصہ ہے۔ (۴)

معاشیات کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر پیگو لکھتے ہیں:

”معاشیات انسان کے مادی بہبود کا علم ہے..... مادی، بہبود، سماجی بہبود کا وہ حصہ ہے جس کو زر کے ذریعہ ناپا جا سکتا ہے۔“ (۵)

تاہم عہد جدید کے ماہرین معاشیات کے نزدیک، کسی نہ کسی سبب سے یہ تعریفیں قابل قبول نہیں ہیں۔ جدید عہد میں معاشیات کی جس تعریف کو قبول عام حاصل ہوا، اور جس کو جدید ماہرین ماہرین معاشیات عام طور پر تسلیم کرتے ہیں وہ لارڈ رائس کی تعریف ہے۔ اس مضمون میں ہم بھی اس تعریف کی پیروی کریں گے۔ لارڈ رائس کے مطابق:

”معاشیات، مقاصد اور قلیل وسائل، جن متبادل استعمال ہو سکتے ہیں، کے رشتہ کے طور پر انسانی برتاؤ کا مطالعہ ہے۔“ (۶)

اس تعریف کو سمجھنے کے لئے ہمیں بعض اصطلاحات کے معنی سمجھنے ہونگے جن کا استعمال اس تعریف میں کہا گیا ہے۔

### مقاصد:

ہر عمل کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، اسی طرح معاشی اعمال کا بھی کوئی مقصد ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک صارف مختلف چیزوں کے استعمال سے زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایک فرم زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے، ایک ملک اس بات کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ اس کی قومی آمدنی میں جتنا ممکن ہو اضافہ ہو سکے وغیرہ، اس لئے معاشی اعمال کے مقصد کی نشان دہی ضروری ہے۔

### وسائل:

کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ہم بھوک کی تسکین چاہتے ہیں تو روٹی ایک وسیلہ ہے۔ روٹی تیار کرنے کے لئے گیہوں کی ضرورت ہے تو گیہوں بھی ایک وسیلہ ہے، گیہوں خریدنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے تو روپیہ بھی ایک وسیلہ ہے، کوئی فرم اگر اپنی پیداوار میں اضافہ کرنا چاہتی ہے تو اس کو زیادہ مشینوں زیادہ مزدوروں اور زیادہ کپے مال کی ضرورت ہے، یہ سب وسائل ہیں۔ اس طرح وسیلہ کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ وہ اشیاء ہیں جن کے ذریعہ براہ راست کسی ضرورت کی تسکین ہو سکتی ہے یا وہ ایسی اشیاء کے پیدا کرنے میں مدد دے سکتی ہیں جو ضرورت کی براہ راست تسکین کے کام آسکیں۔

### قلیل وسائل:

معاشی زندگی کی سب سے اہم حقیقت یہ نہیں ہے کہ ضروریات کی تسکین کے لئے وسائل مہیا ہیں بلکہ یہ ہے کہ وسائل قلیل مقدار میں مہیا ہیں۔ قلت، یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر مختلف اشیاء میں یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ وہ معاشی اشیاء ہیں یا نہیں۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے سانس لینے کی ضرورت ہے۔ سانس لینے کے لئے صاف ہوا ضروری ہے۔ لیکن ہوا کی خرید و فروخت کہیں بھی نہیں ہوتی، کیونکہ فطرت نے اس زمین کے گرد جو کرہ ہوائی بنایا ہے اس میں ہوا وافر مقدار میں موجود ہے۔ انسانی زندگی کی بقا کے لئے سورج کی روشنی اور حدت بھی ضروری ہے لیکن یہ بھی وافر مقدار میں موجود ہے اس لئے یہ اشیاء ”مفت“ اشیاء کہلاتی ہیں، ان کے برعکس دوسری اشیاء جو قلیل مقدار میں ہیں وہ ”معاشی اشیاء“ کہلاتی ہیں، زمین قلیل مقدار میں ودیعت کی گئی ہے، کرہ زمین پر 3/4 حصہ پانی ہے اور صرف 1/4 حصہ زمین، اس میں سے ریگستان، پہاڑوں اور بجز زمین کی مقدار نکال دی جائے تو قابل استعمال زمین کی مقدار اور بھی کم ہو جائے گی۔ اس لئے زمین، روشنی اور ہوا کی طرح ”مفت“ نہیں ہے بلکہ اس کے استعمال کے لئے ”قیمت“ دینی پڑتی ہے، یہی حال تمام معاشی اشیاء کا ہے، اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قلیل وسائل کا مطلب فی الحقیقت ”معاشی وسائل“ سے ہے اور معاشی وسائل وہ وسائل ہیں جن کی مقدار محدود اور قلیل ہے۔

### متبادل استعمال:

متبادل استعمال کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک وسیلہ کو ایک سے زیادہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ زمین ایک معاشی وسیلہ ہے۔ لیکن اس کا استعمال

ایک سے زیادہ ضروریات کے لئے ممکن ہے، ایک قطعاً آراضی پر رہنے کے لئے مکان تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اس پر ایک صنعتی کارخانہ بھی کھڑا کر سکتے ہیں، یا اس پر کسی فصل کی کاشت کی جاسکتی ہے۔ یا اسے سڑک بنانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سب زمین کے متبادل استعمال ہیں۔ یہی حال کم و بیش تمام معاشی وسائل کا ہے کہ ان کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اب اس کو کس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے؟ علم معاشیات اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے، یہ تو بدیہی ہے کہ زمین کے اس ٹکڑے (یا کسی دوسرے معاشی وسیلہ) کو یہ یک وقت تمام مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہمیں اپنی ضروریات میں سے کچھ یا بعض ضرورتوں کا انتخاب کرنا پڑے گا جس کے پورا کرنے کے لئے کسی دئیے گئے معاشی وسیلہ (یا وسائل) کا استعمال کیا جاسکے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو معاشیات، انتخاب کا علم (Science of Choice) بن جاتا ہے، معاشیات کا منصب یہ ہے کہ وہ ہمیں ایسا انتخاب کرنے میں مدد دے جو عقلی (Rational) ہو اور وسائل کو بہترین طریقے پر استعمال کرتا ہو۔

آئیے اس مسئلہ کو ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کریں۔ فرض کر لیجئے کہ ایک طالب علم کو 3000 روپیہ ماہانہ جیب خرچ ملتا ہے۔ اس کی یہ آمدنی محدود ہے، یہ آمدنی اس طالب علم کے لئے معاشی وسیلہ ہے جن کی مدد سے اسے اپنی چند یا ممکنہ طور پر تمام ضروریات کی تسکین کرنی ہے۔ لیکن طالب علم کی ضروریات بے شمار ہیں۔ اسے کالج کی فیس ادا کرنی ہے۔ کتابیں خریدنی ہیں۔ اپنی قیامگاہ کا کرایہ ادا کرنا ہے، ایک ماہ کے لئے خورد و نوش کا انتظام کرنا ہے۔ لیکن ان محدود معاشی وسائل کے متبادل استعمال بھی ہیں، وہی طالب علم ان روپیوں سے ایک موبائل فون بھی خرید سکتا ہے۔ گرمی سے بچنے کے لئے بجلی کا ایک پنکھا خرید سکتا ہے، یا اس رقم کو مختلف قسم کے اعلیٰ ریستورانوں میں ناشتہ کرنے، فلمیں دیکھنے اور تفریح کرنے میں صرف کر سکتا ہے، محض اس حقیقت کے باعث کہ اس کے وسائل محدود یا قلیل ہیں وہ اپنی تمام ضروریات کی تسکین یہ یک وقت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے اپنی ضرورتوں میں سے چند اہم ضرورتوں کا انتخاب کرنا ہوگا جن کی وہ تسکین کر سکتا ہے اور بقیہ تمام ضرورتوں کی تسکین کو ملتوی کر دے گا، اس طرح اس کے سامنے انتخاب کا مسئلہ ہے یعنی وہ کن چیزوں اور خدمات کی خریداری کرے۔ اس سے طالب علم کو بیش ترین افادہ یا فلاح حاصل ہو سکے۔

اس طالب علم کی طرح ہی کسی سماج کے معاشی وسائل بھی قلیل ہوتے ہیں، ہر ملک کے پاس مشینوں، خام مواد، اور محنت کی ایک محدود مقدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ اسے ہر اس چیز کی پیداوار کرنی ہے جس کی اسے ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ کوئی ملک ان تمام چیزوں کی اتنی مقدار میں پیداوار نہیں کر سکتا جتنی کہ اسے ضرورت ہے، یا جتنی مقدار میں وہ پیداوار کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ وسائل جن کی مدد سے یہ پیداوار کی جاسکتی ہے اپنی نوعیت کے لحاظ سے محدود ہیں۔ فرض کیجئے کہ بعض چیزوں کی اشد ضرورت ہے لیکن ایسا کرنے کے لئے ملک کے پاس ضروری تکنیکی لیاقت، خام مواد، مشینری وغیرہ نہیں ہے تو بھی اس کے سامنے یہ راستہ کھلا ہے کہ ان اشیاء کو کسی دوسرے ملک سے درآمد کر لے۔ لیکن اس صورت میں بھی اسے ان اشیاء کی قیمت غیر ملکی زرمبادلہ میں ادا کرنی ہوگی لیکن غیر ملکی زرمبادلہ کے وسائل بھی محدود ہوتے ہیں جب درآمد کی جانے والی اشیاء کی تعداد اور مقدار خاص ہو سکتی ہے اس لئے کوئی ملک لامحدود اشیاء کی لامحدود مقدار میں درآمد بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں پھر ہمارا سامنا انتخاب کے مسئلہ یعنی معاشی مسئلہ سے ہے کہ کوئی ملک کن اشیاء کی پیداوار اندرون ملک کرے، اور کن اشیاء کو کتنی مقدار میں بیرونی ممالک سے درآمد کرے۔

معاشی زندگی کی بنیادی حقیقت قلت (Scarcity) ہے۔ قلت کی وجہ سے ہی معاشی مسائل وجود میں آتے ہیں۔ وہ تمام اشیاء جو قلیل مقدار میں ودیعت کی گئی ہیں معاشی اشیاء کہلاتی ہیں۔ اس طرح زمین، محنت، سرمایہ، مختلف قسم کی اشیاء صرف، مشینیں، مختلف قسم کی لیاقتیں معاشی اشیاء کی مثالیں ہیں کیونکہ یہ سب ہی قلیل مقدار میں فراہم ہیں۔ معاشی اشیاء کی ایک خاصیت یہ ہے کہ صرف ان ہی کے لئے بازار میں قیمت ادا کی جاتی ہے۔ اگر کسی صورت سے معاشی اشیاء بھی سورج کی روشنی اور ہوا کی طرح وافر مقدار میں مہیا ہو جائیں تو وہ بھی مفت اشیاء بن جائیں گی اور کوئی بھی شخص ان کے لئے کسی قیمت کی ادائیگی کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

ہوا اور سورج کی روشنی صرف اس لئے مفت اشیاء ہیں یہ وافر مقدار میں مہیا ہیں۔ (حالانکہ بہت سے صنعتی مراکز میں آج کل صاف ہوا بھی قلیل مقدار میں ہی مہیا ہے) ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ قلت کسی معاشی شے کی ذاتی خاصیت نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص صورت حال کی خاصیت ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی خاص شے ایک صورت حال میں قلیل نہ ہو اور اس لئے معاشی شے نہ ہو لیکن ایک دوسری صورت حال میں اسی شے میں قلت کی خاصیت پیدا ہو جائے اور معاشی شے کی طرح اس کی خرید و فروخت ہونے لگے۔ مثلاً پانی کو عام طور پر ایک مفت شے خیال کیا جاتا ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں لیتا کیونکہ یہ وافر مقدار میں موجود ہے لیکن ہندوستان میں گرمی کے موسم میں ٹھنڈا پانی ایک معاشی شے بن جاتا ہے اور اس کی قیمت وصول کی جاسکتی ہے۔ بہشت کے سلسلے

میں کہا جاتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی خواہش کرے گا وہ چشم زدن میں اسے حاصل ہو جائے گا۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے بہشت میں کسی معاشی مسئلہ کا وجود نہ ہوگا۔ ہندو یو مالا میں ایک ایسے درخت کا تذکرہ ملتا ہے کہ جس کے نیچے بیٹھ کر جو خواہش ظاہر کی جائے پوری ہو جائے گی۔ اگر حسن اتفاق سے ایسے درخت جا بجا پیدا ہو جائیں تو دنیا میں کوئی معاشی مسئلہ باقی نہ رہے گا اور غالباً جس روز یہ وقوعہ ظہور پذیر ہو اس کے دوسرے ہی دن سے یونیورسٹیوں میں معاشیات کی تدریس ختم ہو جائے گی۔ (اس سے ماہرین معاشیات کے بے روزگار ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی ان درختوں سے ہی اپنی تمام خواہشات کی تسکین کر سکتے ہیں اس لئے اس چھوٹے سے گروہ کے لئے بھی فی الحقیقت معاشی مسئلہ کا خاتمہ ہو جائے گا)۔

اس لئے ہم بجاطور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاشی مسائل کے وجود کا سبب قلت ہے۔ اگر قلت ختم ہو جائے تو معاشی مسائل کا وجود نہ رہے گا۔ رکارڈو کے الفاظ میں ”فطرت کی بخلت“ (niggardliness of nature) معاشی مسائل کے وجود کی ذمہ دار ہے اگر فطرت بخیل ہونے کے بجائے فیاض ہوتی اور تمام وسائل لامحدود اور بے انتہاء ہوتے تو معاشی مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

### معیشت کا مفہوم

ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ انسانوں کے معاشی اعمال، ایک سماجی تنظیم کے دائرے کے اندر رہ کر ہی منتظم کیے جاسکتے ہیں، انسانوں کی معاشی تنظیم کو معیشت کہتے ہیں۔

ہر علم میں بعض ایسے بنیادی تصورات ہوتے ہیں جن کا وجود بدیہی تسلیم کیا جاتا ہے اور شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس قسم کے تصورات کو مبادی (Primitive) کہتے ہیں۔ طبعیات میں مادہ، سیاسیات میں ریاست، اور سماجیات میں سماج ایسے ہی مبادی ہیں۔ اسی طرح معاشیات میں معیشت بھی مبادی ہے۔ علم معاشیات کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بحث کرنے سے پہلے ہمارے لئے یہ مفید ہوگا اگر ہم معیشت کا مفہوم سمجھ لیں۔

ایک اصطلاح کے طور پر معیشت سے ہمارا مفہوم ایک ایسے مربوط نظام سے ہے جس کے ذریعہ سماج مختلف معاشی اعمال انجام دیتا ہے۔ یعنی مختلف قسم کی اشیاء اور خدمات کی پیداوار کرتا ہے اور پھر انھیں اپنے نمبروں کے درمیان صرف کے لئے تقسیم کرتا ہے، اس طرح معاشیات اس بات کا مطالعہ ہے کہ معیشت کیسے کام کرتی ہے۔

معیشت افراد، گھرانوں اور یو پیاری فرموں سے مل جل کر بنی ہے۔ ایک فرد معیشت کی سب سے چھوٹی اکائی ہے، ایک فرد کو اپنی زندگی میں بعض اہم ترین فیصلے کرنا ہوتے ہیں مثلاً وہ کس قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کرے گا؟ کس پیشے کو اختیار کرے؟ کس جگہ کام کرے؟ کس جگہ اور کیسے مکان میں رہائش اختیار کرے وغیرہ۔ عام طور پر یہ فیصلے معاشی عوامل کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ معیشت کی دوسری بڑی اکائی گھرانہ ہے۔ ایک گھرانہ ان افراد کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی ضروریات کی تسکین کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس تسکین کا سامان بھی مل جل کر فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گھرانہ کی عام تعریف یہ ہے کہ ایک گھرانہ ان افراد سے مل کر بنتا ہے جو ایک دوسرے سے شادی یا خون کے رشتہ سے بندھے ہوں اور ایک مشترکہ باورجی خانہ سے منسلک ہوں۔ مردم شماری کمیشن ہر دس سال پر ملک کی مردم شماری کرتا ہے اور بہت سی مفید معاشی و سماجی معلومات بھی جمع کرتا ہے۔ مردم شماری کمیشن نے گھرانہ کی مندرجہ بالا تعریف پر عمل کرتے ہوئے یہ معیار مقرر کیا ہے وہ تمام لوگ جن کا کھانا ایک چولہے پر پکتا ہے وہ مردم شماری کے مقاصد کے خاطر ایک گھرانہ تصور کیے جائیں گے۔ اس طرح دو خاندان جو ایک چھت کے نیچے رہتے ہوں، لیکن اگر ان کے چولہے الگ الگ ہیں تو وہ دو گھرانے تصور ہوں گے۔ یا ایک خاندان کے افراد بھی، خواہ وہ خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اور ایک ہی مکان میں مقیم کیوں نہ ہوں، اگر دو یا دو سے زیادہ چولہے رکھتے ہوں تو وہ الگ الگ گھرانے سمجھے جائیں گے۔ گھرانہ بنیادی طور پر صرف کرنے والی اکائی ہے۔ دوسری طرف فرم بھی ایک گھرانہ ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ پیداواری اکائی ہے۔ ایک فرم ان افراد یا افراد کے گروہوں کا مجموعہ ہے جو ان اشیاء یا خدمات کی پیداوار کرتے ہیں جن کی افراد یا گھرانوں کو صرف کے لئے ضرورت ہوتی ہے، فرم اپنے معاشی وظائف، سماجی خدمت کے بجائے کاروباری اصول پر انجام دیتی ہے۔ فرم کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ پیداوار کا انتظام کرتی ہے۔ مزدوروں کو روزگار دیتی ہے، کچا مال اور مشین فراہم کرتی ہے اور ان سب کی مدد سے کسی خاص شے کی پیداوار کرتی ہے۔ وہ خرچ جو ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے مثلاً مزدوروں کی مزدوری، خام مال کی قیمت، مشینوں اور بلڈنگ کا کرایہ وغیرہ، پیداواری لاگت کہلاتا ہے۔ اس طرح پیداواری لاگت سے ہمارا مفہوم اس لاگت سے ہے جو متعلقہ چیز کے تیار کرنے پر آئی۔ فرم اس چیز کو ایسی قیمت پر فروخت کرنا پسند کرے گی جو عام طور پر پیداواری لاگت سے کافی زیادہ ہو، ہر کل لاگت کے درمیان جو فرق ہوتا ہے وہ منافع کہلاتا ہے۔ یہ ہی



فرم کی آمدنی ہے۔ جو اس کو عالمین پیداوار کی تنظیم کے سماجی طور پر مفید کام انجام دینے کے صلہ میں ملتا ہے۔ معاشیات میں ہم عام طور پر یہ مفروضہ قائم کر کے چلتے ہیں کہ ہر فرم بیش ترین منافع حاصل کرنا چاہتی ہے۔

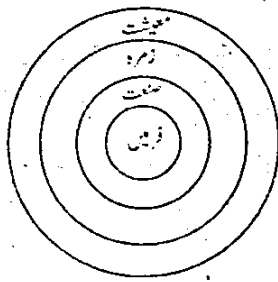
معیشت کی تیسری بڑی اکائی صنعت ہے۔ ایک صنعت کئی فرموں کا مجموعہ ہے جو کسی یکساں یا تقریباً یکساں شے کی پیداوار کرتی ہیں۔ اس طرح سوئی کپڑے کی صنعت ان تمام فرموں کا مجموعہ ہے جو سوئی کپڑے کی پیداوار کرتی ہیں۔ اور حسن افزا مصنوعات کی صنعت ان تمام فرموں کا مجموعہ ہے جو مختلف قسم کی حسن افزا اشیاء (لب اسٹک، غازہ، پوڈر، کریم وغیرہ) تیار کرتی ہیں، صنعت کے تصور سے جڑا ہوا بازار کا تصور ہے۔ معاشیات میں بازار کا مفہوم عام مفہوم سے جدا ہے۔

عام بول چال کی زبان میں بازار کا مفہوم کسی ایک خاص جگہ سے ہوتا ہے جہاں چیزوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے جیسے کنٹاٹ ہیلس، چاندنی چوک، ہسبزی منڈی وغیرہ دہلی کے مختلف بازاروں کے نام ہیں۔ معاشیات میں بازار کا استعمال ایک اصطلاح کے طور پر کیا جاتا ہے۔ (۷) اور اس کے مخصوص معنی ہیں۔ بازار سے ہمارا مفہوم ایک ایسے علاقہ سے ہے جہاں کسی شے کے خریدنے والے اور بیچنے والے پھیلے ہوئے ہوں اور باہمی مسابقت اور بھاؤ تاؤ کے ذریعہ اس شے کی قیمت کا تعین کرتے ہوں۔ اس طرح معاشیات کے نقطہ نظر سے بازار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہاں قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک بازار میں ایک ہی قیمت رائج ہوتی ہے، کسی چیز کا بازار مقامی، علاقائی، قومی یا بین الاقوامی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف قسم کے پھلوں، ترکاریوں، دودھ اور دہی کا بازار مقامی بازار ہوتا ہے کیونکہ یہ اشیاء جلد برباد ہونے والی ہیں اور انھیں تیز رفتاری سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکا میں انھیں اشیاء کا بازار قومی بازار ہوتا ہے کیونکہ وہاں ان کو متحد کیا جاسکتا ہے، تیزی سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کیا جاسکتا ہے اور پھر مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ دوکانوں میں فروخت کیا جاتا ہے، اس مثال سے ایک دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے میں آتی ہے کہ تکنیکی ترقی کے ذریعہ بازار کے حدود میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، ایسی اشیاء جو ایک علاقے میں فروخت کی جاسکتی ہے لیکن دوسرے علاقے میں ان کی کوئی مانگ نہ ہو۔ علاقائی بازار کھتی ہیں مثلاً کشمیر میں لوگ اپنا بدن گرم رکھنے کے ایک خاص قسم کی انگلیٹھی کا استعمال کرتے ہیں، اس انگلیٹھی کو کانگری کہتے ہیں، کانگری کا بازار خالص علاقائی ہے کیونکہ اس کی مانگ صرف وادی کشمیر کی حدود میں ہے، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اتنی سردی نہیں پڑتی کہ کانگری کی ضرورت پڑے۔ جن اشیاء کی خرید و فروخت کسی ملک کی قومی حدود میں ہی کی جاسکتی ہے ان کا بازار قومی بازار کہلاتا ہے، اس کی ایک عمدہ مثال حکومت ہند کی جاری کئے ہوئے سرکاری تمسکات ہیں جن کی خرید و فروخت سارے ہندوستان میں ہوتی ہے لیکن بیرون ہند، یہ سرکاری تمسکات قابل قبول نہیں ہیں۔ اسی طرح مختلف ملکوں کی قومی کرنسی کا بازار بھی قومی ہوتا ہے۔ (کرنسی بھی ایک شے ہے) روپیہ سارے ہندوستان میں چلتا ہے۔ پونڈ صرف انگلینڈ میں قابل قبول ہے۔ ڈالر سارے امریکا میں چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض اشیاء کا بازار بین الاقوامی ہوتا ہے۔ گینہوں، چاول، سونا، ادویات، فولاد، ہوائی جہاز، ٹینک اور ٹریکٹرو وغیرہ ایسی اشیاء ہیں جن کا بازار بین الاقوامی ہوتا ہے کیونکہ قومی حدود کے باہر بھی ان کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔

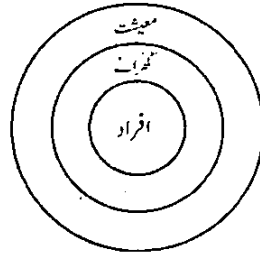
معیشت کی اگلی بڑی اکائی زمرہ ہے۔ زمرہ ایسی صنعتوں کا مجموعہ ہے جو ایسی اشیاء کی پیداوار کرتی ہوں جن میں کوئی مشترک خصوصیت پائی جاتی ہو، زمرہ کی تعریف اس پر منحصر ہے کہ کس مقصد کے تحت کسی اکائی کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ مثلاً صارفین کے استعمال میں آنے والی اشیاء کی پیداوار کرنے والا زمرہ، اشیاء صرف کا زمرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ صنعتوں کی ملکیت کا کیا نظام رائج ہے صنعتوں کو نجی زمرہ اور عوامی زمرہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ تمام صنعتیں جو برآمد کے لئے پیداوار کرتی ہیں برآمدی زمرہ میں شامل کی جاسکتی ہیں، جن صنعتوں میں درآمد شدہ کچا مال یا مشینیں استعمال ہوتی ہیں درآمدی زمرہ کا حصہ بنائی جاسکتی ہیں، وہ تمام فرمیں، جو درآمد اور برآمد کا کاروبار کرتی ہیں غیر ملکی تجارت کا زمرہ کہی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ایک معیشت کو مختلف بنیادوں پر مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

فی الحقیقت ہم جس اصول کا استعمال کرتے آئے ہیں اسے ماہرین معاشیات اصول تجميع (Aggregation Procedure) سے تعبیر کرتے ہیں، صنعت فرموں کا مجموعہ ہے۔ اور زمرہ صنعتوں کا مجموعہ، اسی طرح معیشت مختلف زمروں کا مجموعہ ہے۔ معیشت کی مختلف اکائیوں کے درمیان تعلق کو شکل نمبر 1- میں واضح کیا گیا ہے۔

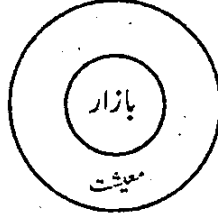
## شکل نمبر-1: معیشت کے مختلف رخ



(ب) پیداوار کے نقطہ نظر سے



(الف) صرف کے نقطہ نظر سے



(ج) تبادلہ کے نقطہ نظر سے

شکل (الف) صرف کے نقطہ نظر سے معیشت کی بناوٹ کو واضح کرتی ہے کہ معیشت مختلف گھرانوں سے مل کر بنتی ہے اور گھرانے افراد سے مل کر بنتے ہیں، شکل کا جز (ب) پیداوار کے نقطہ نظر سے معیشت کا جائزہ ہے۔ معیشت مختلف زمروں سے مل کر بنتی ہے، زمرے صنعتوں کا مجموعہ ہیں، اور صنعتیں فرموں کا مجموعہ ہیں۔ شکل کا جز (ج) تبادلہ کے رخ سے معیشت کا جائزہ ہے کہ معیشت مختلف قسم کے بازاروں کا مجموعہ ہے، مثلاً اشیاء صرف کا بازار، محنت کا بازار، سرمایہ کا بازار وغیرہ۔

### علم معاشیات کی مختلف شاخیں

علم معاشیات کو دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1- نظری معاشیات (Theoretical Economics)

2- اطلاقی معاشیات (Applied Economics)

اطلاقی معاشیات کی ماہیت، اس کی حدود اور دائرہ مطالعہ نیز نظری معاشیات سے اس کے تعلق کو سمجھنے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہم نظری معاشیات کی ماہیت، اور اس کی حدود نیز استعمال سے واقفیت حاصل کریں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کو نظریہ سازی کے عمل، کے مختلف پہلوؤں اور اس کی افادیت کا بھی احساس ہو۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ معاشیات ایک طرح سے اس بات کا مطالعہ ہے کہ معیشت کس طرح سے کام کرتی ہے۔ معیشت کا مطالعہ مختلف سطحوں پر کیا جاسکتا ہے، نظری معاشیات کو، اس سطح کے مطابق، جس پر وہ معاشی اعمال کی تفتیش کرتی ہے، مندرجہ ذیل دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1- معاشیات جزئیاتی (Micro Economics)

2- معاشیات کلّی (Macro Economics)

نظری معاشیات کی وہ شاخ جو معیشت کا مطالعہ جزئیاتی سطح پر کرتی ہے معاشیات جزئیاتی کہلاتی ہے۔ اس کا انگریزی مرادف (Micro) یونانی زبان سے مستعار ہے جس کے معنی ہیں چھوٹا یا مختصر، اس لئے معاشیات جزئیاتی، معیشت کے چھوٹے چھوٹے حصوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتی ہے، معاشیات کلّی کا انگریزی مرادف یونانی زبان کے لفظ (Macro) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بڑا یا ضخیم۔ لہذا کلّی معاشیات میں ہمارا موضوع معیشت کے اجتماعی تغیرے (Aggregate Variables) ہوتے ہیں جیسے قومی آمدنی، قیمتوں کی سطح، اور روزگار کی سطح وغیرہ، اس کا تعلق اس قسم کے مسائل سے ہے جیسے: کسی معیشت میں آمدنی کی سطح کا تعین کیسے ہوتا ہے؟ اس میں اتار چڑھاؤ کیوں ہوتے ہیں؟ ایسا کیوں کر ہوتا ہے کہ تمام اشیاء کی قیمتیں بعض اوقات میں بڑھتی رہتی ہیں اور بعض دوسرے اوقات میں گھٹتی رہتی ہیں؟ صنعتوں اور معیشت میں زائد صلاحیت (Excess

(Capacity) کیوں اور کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟ ان تمام مسکلوں کے تجزیہ کی بنیادی اکائی پوری معیشت ہے۔ اس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

دوسری جانب ہمارے سامنے ایک دوسری نوعیت کے معاشی مسائل بھی آتے ہیں جیسے: کسی فرد کو اپنی آمدنی کیسے صرف کرنا چاہیے؟ وہ اپنے قلیل وسائل کو مختلف النوع اور متبادل ضروریات کی تسکین کے لئے کس بہترین طریقے سے تقسیم کرے؟ کسی جنس کی انفرادی مانگ کو بازار مانگ میں کس طرح تبدیل کیا جاتا ہے؟ کسی جنس کی قیمت کا تعین بازار کی مختلف حالتوں میں کیسے ہوتا ہے؟ کوئی فرم یہ فیصلے کیسے کرتی ہے کہ کس شے کی پیداوار کرے، کتنی مقدار میں کرے، اور پیداوار کی کس تکنیک کو استعمال کرے؟ کسی صنعت میں مسابقت کا ہونا بہتر ہے یا اجارہ داری کا؟ ان تمام مختلف النوع مسائل میں صرف ایک عنصر مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سب کا تعلق کسی ایک فرد، کسی ایک فرم، یا کسی ایک بازار کے معاشی اعمال اور معاشی فیصلوں سے ہے۔ اس لئے ان کا مطالعہ جزئیاتی معاشیات میں کیا جاتا ہے۔

نظری معاشیات کی جزئیاتی اور کلی معاشیات میں تقسیم کو سخت اور مصنوعی تقسیم گردانا درست نہیں ہے۔ ان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ اور دونوں شاخیں کئی طرح سے ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ درحقیقت معاشیات کی جزئیاتی اور کلی معاشیات میں تقسیم اس بات کا اعتراف ہے کہ انسانوں کا اجتماعی برتاؤ ہمیشہ ان کے انفرادی برتاؤ جیسا نہیں ہوتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تجزیاتی مقاصد کی خاطر انھیں ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اجتماعی برتاؤ انفرادی برتاؤ سے ہمیشہ مختلف ہوگا۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ انفرادی برتاؤ کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ اجتماعی برتاؤ کے بارے میں بھی سچ ہوتی ہیں۔ لیکن اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ چند جدید ماہرین معاشیات جن میں گیری بیکر سب سے نمایاں ہیں، کلی اور جزئیات معاشیات کی اس تفریق کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں، ان کے خیال میں کلی اور جزئیاتی مسائل کا تجزیہ کرنے کے لئے الگ الگ نظریہ سازی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ نظری معاشیات جو کلی اور جزئیاتی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو، ہر قسم کے معاشی مسائل کے تجزیہ سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ (۸) تاہم بعض وجوہات کی بنا پر ہم اس تفریق کو برقرار رکھیں گے۔ دوم: کلی اور جزئیاتی معاشیات کی تفریق معاشی تجزیہ میں ایک محترم روایت کی صورت اختیار کر چکی ہے اور جب تک اس روایت سے بغاوت کے لئے مناسب وجوہات اور کافی فائدہ کی امید نہ ہو، ایسا کرنا بے سود ہوگا۔ سوم: یونیورسٹیوں میں معاشیات کے نصاب عام طور پر کلی اور جزئیاتی معاشیات کے درمیان منقسم رہتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلی اور جزئیاتی مسائل کے درمیان امتیاز کو قائم رکھا جائے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس جگہ کلی اور جزئیاتی معاشیات کی اضافی اہمیت کے بارے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے جو کہ معاشیات کے طالب علموں میں اکثر صرف اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ درسی کتابوں میں مصنفین یا تدریس کے دوران مدوسین ان باتوں کو بدیہی یا بعض حالتوں میں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کلی معاشیات جزئیاتی معاشیات سے زیادہ مفید، زیادہ موزوں، یا زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دونوں یکساں طور پر مفید یا غیر مفید ہیں۔ موقع و محل کے اعتبار سے دونوں یکساں طور پر موزوں یا ناموزوں ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح دونوں یکساں طور پر حقیقت پسندانہ یا غیر حقیقت پسندانہ ہو سکتی ہیں۔ اس قسم کے اعتراضات اگر معاشیات کی کسی ایک شاخ کے خلاف عامہ کیے جائیں تو وہ دوسری شاخوں پر بھی اسی طرح وارد ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظری نوعیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور فی الواقع دونوں شاخیں تقریباً یکساں طریقہ تحقیق اپناتی ہیں جس کی مختصر وضاحت ذیل میں کی جائے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ کلی اور جزئیاتی معاشیات معاشی عمل کے مطالعہ اور تجزیہ کے لئے دو مختلف انداز نظر ہیں۔ کسی وقت ایک باسٹنی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جزئیاتی طریقہ اپنانا ضرورت ہوتی ہے، لیکن دوسرے مسائل حل کرنے کے لئے یہ طریقہ ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ اس وقت کلی طریقہ تجزیہ کام آتا ہے، اس سے یہ نتیجہ کہیں سے نہیں نکلتا ایک طریقہ تحقیق نے دوسرے کو باطل کر دیا ہے اور وہ غیر ضروری، غیر متعلق، یا غیر مفید ہو گیا ہے، اس قسم کی غلط فہمیاں وہ تحفظات ذہنی پیدا کر دیتی ہیں جو اس سائنسی انداز فکر کے منافی ہے جو بالآخر ایک علم کے حیثیت سے معاشیات کا رخ نظر ہے۔

نظری معاشیات کی ماہیت

کلی اور جزئیاتی معاشیات، دونوں نظری معاشیات کی قسمیں ہیں، اطلاقی معاشیات کی جداگانہ حیثیت، اور نظری معاشیات سے اس کے رشتہ کو

واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم آگے بڑھنے سے قبل نظریہ کی ماہیت کو واضح کر دیں۔ نظریہ کیا ہے؟ نظریاتی طریقہ کیا ہے؟ اس کے کیا مضمرات اور حدود ہیں؟ کسی نظریہ کو کس وقت رد کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب پانا ضروری ہے تاکہ ہم نظریہ کی اہمیت کو جان سکیں اور اس کا صحیح استعمال سیکھ سکیں۔ اس ضمن میں اس سے بہتر کچھ نہ ہوگا اگر ہم لفظ نظریہ کے معنی کسی اچھی لغت میں تلاش کریں، (Webster's Seventh New Collegiate Dictionary)۔ میں نظریہ (Theory) کے مندرجہ ذیل معنی بتائے گئے ہیں:

”نظریہ: (1) ایک دوسرے سے رشتہ کے طور پر حقائق کے کسی مجموعہ کا تجزیہ (2) کسی سائنس یا کسی فن سے متعلق حقائق کے عام یا مجرد اصول (3) کسی عمل کی وضاحت کرنے والے ممکنہ، یا سائنسی طور پر قابل قبول عام اصول یا اصولوں کا مجموعہ (4) ایک مفروضہ جسے کسی دلیل یا تفتیش کے لئے فرض کر لیا گیا ہو۔ (5) مجرد خیال“۔ (9)

نظریہ کے لغوی معنی سے بھی اس کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ (الف) نظریہ ایک عام بیان ہے۔ (ب) یہ حقیقی دنیا کی تجرید ہے (ج) یہ حقیقی دنیا کے کسی مظہر کا تجزیہ کرتا ہے (د) یہ سائنسی طریقہ استعمال کرتا ہے (ه) اس کے ذریعہ حقیقی دنیا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

امور بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نظریہ کی مندرجہ ذیل تعریف بیان کر سکتے ہیں:

”نظریہ ایک ایسا عام بیان ہے جو حقیقی دنیا کی تجرید ہے، اور حقیقی دنیا کے کسی مظہر سے تعلق رکھنے والے مختلف حقائق کی، ایک دوسرے سے رشتہ کے طور پر تشریح یا تجزیہ کرتا ہے۔“ (10)

چونکہ نظریہ بالذات مجرد ہے اس لئے کسی نظریہ پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ وہ مجرد یا غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ اصلی دنیا مختلف قسم کے حقائق اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر ہم تمام ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم، متعلق اور غیر متعلق حقائق کو ایک جگہ جمع کر دیں تو ہمیں کسی بھی چیز کے بارے میں چنداں علم حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ ہم حقائق کے اس گھنے اور پرخطر جنگل میں اپنی راہ گنوا بیٹھیں گے اور ہمیشہ اسی جنگل میں بھٹکتے رہیں گے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اہم، ضروری، اور مفید معلومات کو غیر اہم، غیر ضروری اور غیر مفید معلومات سے علیحدہ کریں، کسی خاص نظریاتی تفتیش کے لئے متعلق اور مفید معلومات یا حقائق کا مجموعہ کون سا ہی یہ بہت کچھ اس تفتیش کی نوعیت اور نظریہ ساز (Theoretician) کے وجدان پر منحصر ہے۔ متعلق حقائق کے انتخاب کے لئے کوئی اصول متعین نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے لئے نظریہ ساز اپنی قوت فیصلہ اور وجدان کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظریاتی تفتیش کے ابتدائی مراحل میں ہی کچھ داخلی اور غیر معروضی عناصر اس میں شامل ہو جاتے ہیں، خصوصاً سماجی علوم کے نظریات میں داخلیت کا کافی امکان ہے کیونکہ ایک نظریہ ساز کا وجدان اور فیصلہ دوسرے سے قطعی مختلف ہو سکتا ہے، اس صورت میں کسی نظریہ کو، محض ان معلومات کی بناء پر بھی چیلنج کیا جاسکتا ہے جن کو متعلق اور مفید سمجھ کر نظریہ سازی کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو کسی ایک مخصوص نظریہ کے بارے میں یہ اعتراض ہے کہ اس نظریہ میں تمام متعلقہ حقائق کو پیش نظر نہیں رکھا گیا تو وہ اس کے لئے مکمل طور پر آزاد ہے کہ حقائق کا کوئی دوسرا مجموعہ جو اس کے خیال میں زیادہ متعلق اور موزوں ہو، پیش نظر رکھ کر کوئی دوسرا نظریہ پیش کرے۔

نظریاتی تفتیش کا بنیادی نقطہ اصلی دنیا ہے جس میں ہم زندہ رہتے ہیں نظریاتی اور تجرباتی تفتیش میں پیش آنے والے مختلف مراحل کی نشان دہی شکل نمبر-2 میں کی گئی ہے۔

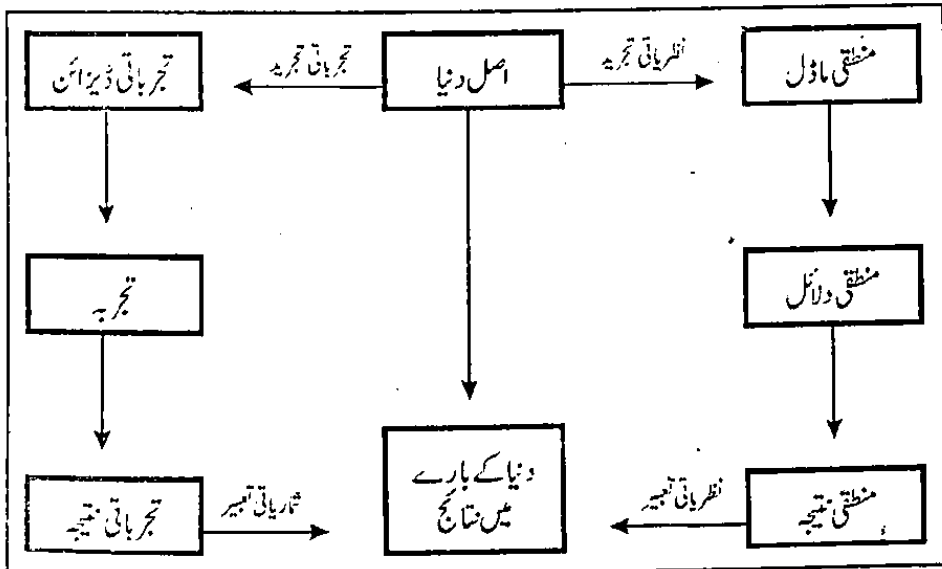
سب سے پہلے تو ہم اصل دنیا کا براہ راست مشاہدہ کر کے کچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح حاصل کیا گیا علم سائنسی نہیں کہلایا جاسکتا کیونکہ اس میں کسی علمی طریقہ تفتیش کا استعمال نہیں کیا گیا۔ اس میں ہمارے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور جذبات کو دخل ہو سکتا ہے، ہمارے تعصبات اور ذہنی تحفظات نتائج کو منحرف کر سکتے ہیں۔ یہ علم معروضی نہیں ہوگا۔ سائنسی طریقہ تفتیش میں ہمارے جذبات، تعصبات اور خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، براہ راست مشاہدے کے ذریعہ حاصل کئے گئے علم کی افادیت مشاہدہ کرنے والے کی ذاتی بصیرت اور وجدان کی مرہون منت ہے۔ اس کا تجربہ یا مشاہدہ بالکل ذاتی ہے، اس کے نتائج کی پرکھ کرنے کے لئے کوئی معروضی بنیاد اور معیار مہیا نہیں ہیں۔

اس کے برعکس نظریاتی طریقہ تفتیش ہمیں سائنسی اور یقینی علم عطا کرتا ہے کیونکہ یہ ایک سائنسی طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ شکل نمبر-2 میں داہنی طرف نظریاتی تفتیش میں پیش آنے والے مراحل دکھلائے گئے ہیں، اصلی دنیا کے مظاہر کا مشاہدہ کرنے کے بعد نظریہ ساز نظریاتی تجرید کا استعمال کرتے ہوئے ایک منطقی ماڈل کی تشکیل کرتا ہے۔ منطقی ماڈل، فی الحقیقت بیانات اور دعوؤں کے مجموعہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ معاشیات کے تمام نظریات فی الحقیقت منطقی ماڈل ہیں چاہے ان کو قدیم رنگ میں صرف زبان کے وسیلہ سے ظاہر کیا جائے یا جدید فیشن کے مطابق ریاضیاتی علامتوں کے ذریعہ مدون کیا جائے۔ بیانات اور دعاوی کی بنیاد پر کچھ منطقی دلائل دیئے جاتے ہیں، اور ان دلائل سے کوئی عام نتیجہ یا نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، یہی نظریاتی طریقہ تفتیش ہے اور نظری معاشیات میں اسی طریقہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

شکل نمبر-2 کے بائیں جانب تجرباتی تفتیش میں پیش آنے والے مراحل ظاہر کئے گئے ہیں سب سے پہلے تو محقق اصلی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں سے زیر تحقیق مسئلہ سے متعلق حقائق جمع کرتا ہے، اس مرحلہ کو تجرباتی تجرید کہتے ہیں، یہ اس لئے ضروری ہے کہ محقق اپنی تجربہ گاہ میں اصل دنیا کی صورت حال کو بخوبی سمجھتا ہو، تاہم پھر بھی وہ تجربہ گاہ میں وہ ایک ایسی صورت حال پیدا کرنا چاہے گا جو کم از کم حد تک اصل دنیا کی صورت حال سے ملتی جلتی ہو، یہیں سے تجرید کا دخل شروع ہو جاتا ہے، اس کے بعد محقق ایک تجرباتی ڈیزائن تیار کرتا ہے اور اس کے مطابق تجربہ کرتا ہے، تجربہ کے نتائج کچھ اعداد و شمار (یا مشاہدات) کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ محقق ان کا تجزیہ کرتا ہے، اس تجربہ کے ذریعہ محقق جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ ہمیں اصل دنیا کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ دنیاوی حقائق کی شمار یاتی یا احتمالی تعبیر ہے۔ یہ طریقہ تفتیش عام طور پر قدرتی علوم میں اپنایا جاتا ہے، چونکہ سماجی علوم اور معاشیات میں تجربہ گاہ کی صورت حال کا پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے اس طریقہ تفتیش کا استعمال صرف محدود پیمانہ پر ہی ممکن ہے۔

ہم اس بات کا اوپر تذکرہ کر چکے ہیں کہ نظری معاشیات میں منطقی دلائل کا استعمال کیا جاتا ہے، منطقی دلائل دو قسم کے ہوتے ہیں: (1) استقرائی یا قیاسی (Inductive) (2) استخراجی یا استنباطی (Deductive) استقرائی دلائل میں ہم جزو سے کل کی طرف مراجعت کرتے ہیں، اس قسم کے دلائل عام طور پر تجرباتی علوم میں استعمال کئے جاتے ہیں، بعض علماء فلاسفہ مثلاً ڈیوڈ ہیوم کا خیال ہے کہ استقرائی دلائل مکمل طور پر جائز نہیں ہیں کیونکہ ان کی بنیاد فطرت کے قانون یکسانیت (Law of Uniformity of Nature) پر ہے جو خود ثابت شدہ نہیں ہے، دوسری طرف استخراجی دلائل کو منطقی طور پر صحیح اور جائز تصور کیا جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ علم منطق اور ریاضیاتی علوم میں استخراجی دلائل کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے، نظریاتی معیشت میں بھی اسی طریقہ تفتیش کا استعمال کیا جاتا ہے اور غالباً یہ استخراجی دلائل ہی ہیں جن کے استعمال کے باعث بعض ماہرین معاشیات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ”..... علم معاشیات استخراجی حقائق کا ایک نظام ہے۔ یہ عقل محض (Pure Reason) کی پیداوار ہے..... مختلف قسم کے دعاوی سے خالص استخراج کا نظام ہے“۔ (11)

استخراجی دلائل میں بعض بیانات اور دعاوی کی بنیاد پر کچھ نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ اگر یہ بیانات اور دعاوی صحیح ہیں اور ان سے اخذ کیا گیا نتیجہ بھی صحیح



ہونا چاہیے بشرطیکہ دلیل دینے میں کسی منطقی غلطی کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو۔ استخراجی دلائل کی ایک عمدہ مثال قیاس منطقی (Syllogism) ہے جس میں ایک بیان کبریٰ (General Premise) اور دوسرا صغریٰ (Minor Premise) ہوتا ہے۔ مثلاً:

تمام انسان فانی ہیں کبریٰ  
زید ایک انسان ہے صغریٰ  
زید فانی ہے نتیجہ

یہ نتیجہ صرف اسی صورت میں غلط ہو سکتا ہے کہ صغریٰ اور کبریٰ میں سے کم سے کم ایک یا دونوں بیانات غلط ہوں۔ بدیہی طور پر یہ ظاہر ہے کہ کبریٰ درست ہے، اور صغریٰ بھی درست ہے، اس لئے نتیجہ بھی لازماً درست ہونا چاہیے۔ آئیے اب ایک دوسری مثال لیں:

تمام انسان احمق ہیں کبریٰ

زید ایک انسان ہے صغریٰ

زید احمق ہے نتیجہ

اس مثال میں ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نتیجہ درست ہے، کیونکہ ہم نے ایک ایسے بیان سے اپنی دلیل شروع کی ہے جو صریحاً صحیح نہیں ہے، اس لئے نتیجہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا، ہو سکتا ہے کہ زید احمق ہو۔ ہو سکتا ہے کہ نہ ہو۔ اگر زید واقعاً احمق ہے تو بھی یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ زید کے احمق ہونے سے تمام انسانوں کا احمق ہونا لازم نہیں آتا۔

نظری معاشیات میں جن استخراجی دلائل کا استعمال کیا جاتا ہے وہ اتنے زیادہ آسان نہیں ہوتے جتنی آسان اوپر دی گئی مثالیں ہیں، معاشیات میں کہیں زیادہ پیچیدہ دلائل سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہاں پر صرف اس طریقہ استدلال کو واضح کرنا مقصود تھا۔

## معاشی نظام: اقسام، وظائف اور ماہیت

یہ تو معروف ہے کہ معیشت ایک سماجی تنظیم ہے جس کے ذریعہ کوئی سماج اپنے معاشی اعمال انجام دیتا ہے۔ یہ معاشی اعمال کسی ملک کے سماجی اور آئینی قوانین کے حدود کے اندر رہ کر ہی انجام پذیر ہوتے ہیں۔ سماجی قوانین سے مراد ان رسم و رواج، اور ان معمولات سے ہے جن کو سماج کی پشت پناہی حاصل ہے۔ مثلاً یہ ایک سماجی قانون ہے کہ آپ جھوٹ نہ بولیں اور وعدہ خلافی نہ کریں۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے یا وعدہ خلافی کرتا ہے تو ایک سماجی جرم کا ارتکاب کرتا ہے لیکن یہ جرم قابل تعذیر نہیں ہے یعنی اس کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن بعض قوانین ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو سماج کے ساتھ ساتھ آئین کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے قوانین، آئینی قوانین کہلاتے ہیں مثلاً چوری کرنا صرف ایک سماجی جرم نہیں ایک قانونی جرم ہے اور ایسے شخص کو جس نے چوری کا ارتکاب کیا ہو تو قانوناً سزا دی جاسکتی ہے۔

معاشی نظام سے ہماری مراد سماجی اور قانونی اداروں (Social and Legal Institutions) کے اس مجموعہ سے ہے جن کے اندر رہ کر معیشت کام کرتی ہے۔ معاشیات میں، ہم صرف ان قانونی یا سماجی معاشی اعمال سے بحث کرتے ہیں جن کو قانون اور سماج تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ہر ملک میں سماجی اور قانونی ادارے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان اداروں کے درمیان فرق کی بنیاد پر مختلف قسم کے معاشی نظاموں میں بھی تفریق کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم مختلف قسم کے معاشی نظاموں کا تذکرہ کریں، ان کی تعریف مقرر کریں، ان کی ماہیت کا تجزیہ کریں اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیں، مناسب یہ ہوگا کہ ہم ایک عام معیار کا تعین کریں جن کی بنیاد پر مختلف معاشی نظاموں کا موازنہ ممکن ہو۔

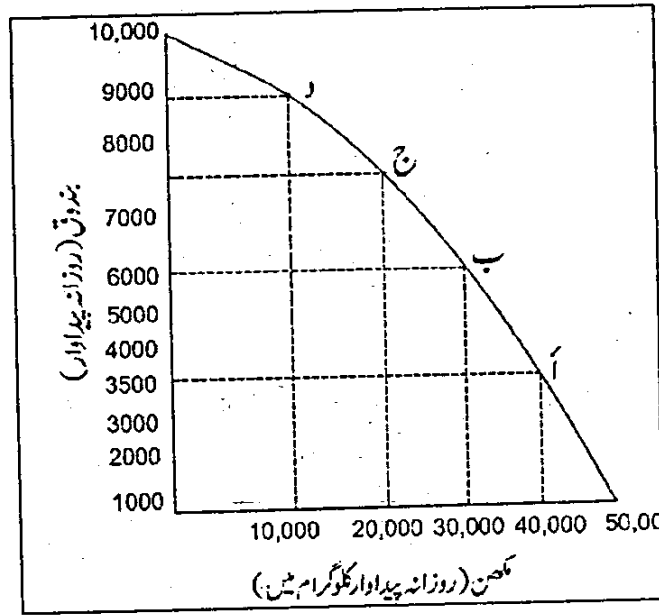
پروفیسر سیویلیسن نے کسی معاشی نظام کی کارکردگی کا مطالعہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تین عام معیار مقرر کیے ہیں۔

### ۱- کن چیزوں کی پیداوار کی جائے؟

ہر معاشی نظام کو اس بات کا کسی نہ کسی طرح فیصلہ کرنا ہوگا کہ پیداوار کن چیزوں کی کی جائے اور کتنی مقدار میں ہر چیز کی پیداوار کی جائے، اس مسئلہ کا سبب یہ ہے کہ پیداواری وسائل محدود ہیں اور سماج کو جن اشیاء اور خدمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ بے شمار ہیں، اس لئے سماج کو کسی نہ کسی طرح یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کن اشیاء کی پیداوار پر وسائل صرف کرے اور کن چیزوں کی پیداوار نہ کرے۔ چونکہ پیداواری وسائل کو مختلف تناسبوں میں لگایا جاسکتا ہے اس لئے انتخاب کے لامحدود امکانات مہیا ہیں۔ لیکن کل پیداوار جو واقعتاً کی جائے گی اب بھی محدود ہی رہے گی۔

اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ ہماری معیشت میں مکمل روزگار (Full Employment) کی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی بے روزگاری عام نہیں ہے۔ اور کسی قسم کے وسائل بھی بے کار نہیں ہیں۔ صنعتوں میں زائد صلاحیت نہیں ہے اور تمام وسائل پوری طرح استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک چیز کی پیداوار میں اضافہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ کسی دوسری چیز کی پیداوار گھٹادی جائے۔ فرض کیجئے کہ کسی معیشت میں اس قدر وسائل مہیا ہیں کہ وہ 50 ہزار کلوگرام مکھن کی روزانہ پیداوار کی جاسکتی ہے لیکن اگر یہ پیداوار کی جائے تو بندوق کی پیداوار کے لئے کچھ بھی وسائل باقی نہیں رہیں گے۔ دوسری جانب اگر مکھن کی پیداوار نہ کی جائے اور صرف بندوقیں پیدا کی جائیں تو دس ہزار بندوقوں کی روزانہ پیداوار ممکن ہے، اس طرح معیشت کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ چاہے وہ 50 ہزار کلوگرام مکھن کی پیداوار کرے یا 10 ہزار بندوقوں کی پیداوار کرے۔ اس طرح 50 ہزار کلوگرام مکھن کی لاگت وہ 10 ہزار بندوقیں ہیں جو پیدا کی جاسکتی تھیں لیکن پیدا نہیں کی گئیں۔ معاشیات میں اس قسم کی لاگت کو متبادل لاگت (Opportunity Cost) کہتے ہیں۔

## شکل نمبر ۱: پیداوار کا خط امکان



عام طور پر معیشت کے سامنے انتخاب کے جو مسئلے ہوتے ہیں وہ اتنے آسان نہیں ہوتے۔ ایسے مسئلہ کی نوعیت کی وضاحت شکل-1 کی مدد سے کی جاسکتی ہے، اس شکل میں عمودی سطح پر مکھن کی روزانہ پیداوار کلوگرام میں اور افقی سطح پر بندوقوں کی روزانہ پیداوار تعداد میں دکھائی گئی ہے۔ چونکہ معیشت کے لئے یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ صرف مکھن یا صرف بندوقیں پیدا کی جائیں اور دوسری چیز کی پیداوار بالکل نہ کی جائے اس لئے معیشت کی پیداوار الف، ب، ج، اور د میں سے کسی ایک نقطہ پر ہوگی جو یہ بالترتیب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مکھن اور بندوقوں کی کتنی مقدار کی پیداوار کی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر نقطہ ”ب“ پر تیس ہزار کلوگرام مکھن کی پیداوار اور روزانہ کی جاتی ہے اور چھ ہزار بندوقیں پیدا کی جاتی ہیں، اب اگر مکھن کی پیداوار میں اضافہ مقصود ہے اور اس کی پیداوار 30 ہزار کلوگرام سے بڑھا کر 40 ہزار کلوگرام کر دی جائے تو اس کے لئے وسائل کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ بندوقوں کی صنعت سے سرمایہ اور محنت کو نکالنا ہوگا تاکہ مزید مقدار میں مکھن فراہم کیا جاسکے۔ اس کے نتیجہ میں بندوقوں کی پیداوار گھٹ جائے گی۔ شکل-1 میں دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق مکھن کی پیداوار میں 15 ہزار کلوگرام کے اضافہ کے لئے 2500 بندوقوں کی قربانی دینا ہوگی، اگر ہم الف، ب، ج، اور د نقطوں کو آپس میں ملا دیں تو اس طرح جو خط وجود میں آئے گا وہ پیداوار کا خط امکان (Production Possibility Curve) کہلاتا ہے، پیداوار کا خط امکان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ دو چیزوں کے درمیان معیشت کی پیداوار صلاحیت کتنی ہے اور ایک چیز میں ایک اکائی کے اضافہ کے لئے دوسری چیز کی کتنی اکائیوں سے درگزر کرنا ہوگا۔ خط امکان کی اونچائی معیشت کی ترقی کی سطح اور تکنیکی ترقی پر منحصر ہے، اس طرح ایک غیر ترقی یافتہ معیشت میں پیداوار کا خط امکان، ایک ترقی یافتہ معیشت پر نسبت کم اونچا ہوگا۔

## ۲- پیداوار کس طرح کی جائے؟

کسی معیشت کو ایک بار یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ فلاں فلاں چیزوں کی پیداوار کی جائے، دوسرا مسئلہ یہ درپیش ہوگا کہ ان کی پیداوار کس طریقے سے کی جائے، یہ مسئلہ پیداوار کی تکنیک کے انتخاب کا مسئلہ ہے اور ہر معاشی نظام کو کسی نہ کسی طرح اس مسئلہ پر فیصلہ سازی کا کوئی طریقہ وضع کرنا ہوگا۔ اصولاً ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جیسے سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے لگانا۔ یہ بجلی کے کھمبے لکڑی سے بھی بنائے جاسکتے ہیں، سینٹ سے بھی، اور لوہے سے بھی، اگر معیشت میں لوہا کمیاب ہے تو یہ زیادہ مفید ہوگا کہ بجلی کے کھمبے لکڑی یا سینٹ سے بنائے جائیں اور اس طرح جو لوہا کھمبوں کے بنانے میں کام آتا اس کی بچت ہو جائے گی اور اس بچے ہوئے لوہے کو سینٹ بنانے کے کارخانے میں یا لکڑی چیرنے کے کارخانوں میں مشینری بنانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یا ایک دوسری مثال لیجئے، کپڑے کی پیداوار کے لئے مختلف طرح کی پیداواری تکنیک فراہم ہیں۔



کپڑا ہتھ کر گھوں اور (Power Loom) سے بنایا جاسکتا ہے یا اس کے بجائے کپڑا ملوں میں بھی اس کی پیداوار کی جاسکتی ہے جہاں اعلیٰ درجہ کی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوگی۔ اب ان میں سے فی الواقع کس طریقے کا انتخاب کیا جائے؟ اور اس فیصلہ سازی کی صورت کیا ہوگی؟

۳- پیداوار کس کے لئے کی جائے؟

کسی معاشی نظام کو یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ جن چیزوں کی پیداوار کی جائے گی وہ بالآخر کن لوگوں کے استعمال میں آئے گی، یعنی معیشت کے مختلف لوگوں، گروہوں اور طبقوں میں اس کو کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ یہ مسئلہ اس بات سے تعلق رکھتا ہے کہ پیداواری وسائل کے مالکان کو ان کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ملے گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ سماج میں رہنے والے لوگوں کا رول دوہرا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ لوگ صارفین ہیں جو اشیاء صرف کا استعمال کرتے ہیں، لیکن یہی لوگ کسی نہ کسی ذریعہ پیداوار کے مالک بھی ہیں۔ یا تو وہ محنت کے مالک محنت کش ہیں اور مزدوری کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتے ہیں، یا پھر سرمایہ کے مالک ہیں اور سود حاصل کرتے ہیں، یا زمین کے مالک ہیں اور لگان حاصل کرتے ہیں، یہی ان لوگوں کی آمدنی ہے جس کو یہ لوگ دوبارہ ان چیزوں کے خریدنے پر صرف کرتے ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کسی سماج کی کل پیداوار ان لوگوں کے درمیان تقسیم ہو جاتی ہے جنہوں نے اپنے پیداواری وسائل کے توسط سے اس دولت (اشیاء اور خدمات) کی پیدائش میں حصہ لیا، یہ مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا مسئلہ ہے، اور ہر معاشی نظام کو اس مسئلہ کے حل کے لئے بھی فیصلہ سازی کا طریقہ متعین کرنا ہوگا۔

مندرجہ بالا تین بنیادی مسائل کے علاوہ جاریہ ہام نے معاشی نظاموں کے کارکردگی کے مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل مسائل کا بھی اضافہ کیا ہے۔ (1)

۴- ایک ایسی معیشت میں جو نمونہ پذیر ہو کچھ وسائل، اس بات کے لئے بھی مخصوص کرنے ہوں گے کہ وہ اشیاء سرمایہ (Capital Goods) کی پیداوار کے کام آسکیں، ان اشیاء سرمایہ کی مدد سے طویل مدت میں مزید اشیاء صرف کی پیداوار کی جاسکتی ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح ہر معاشی نظام کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ موجودہ صرف کو کس طرح محدود کیا جائے کہ کچھ بچت ہو سکے جس کو اشیاء سرمایہ کی پیداوار یعنی آئندہ صرف (Future Consumption) کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ فی الحقیقت یہ مسئلہ اوپر درج کئے گئے مسئلہ-1 (کن چیزوں کی پیداوار کی جائے) کا ہی ایک جز ہے۔ لیکن اس کا تعلق مسئلہ-2 (پیداوار کیسے کی جائے) سے بھی ہے کیونکہ پیداوار میں اشیاء سرمایہ اور محنت دونوں استعمال کیے جاتے ہیں۔

۵- مسئلہ-1، 2، 3، 4، کا حل اس طرح کیا جائے کہ سماجی پیداوار کے عمل اس کے مختلف مراحل اور مختلف اجزاء میں ایک مناسب توازن پایا جائے۔ اگر ان میں سے ایک مرحلہ یا جز میں تاخیر ہوگئی تو انجام کار، اس کا اثر مکمل پیداوار پر پڑے گا۔ اس لئے خام اشیاء کی فراہمی، اشیاء سرمایہ کی فراہمی، محنت کی فراہمی، اور یہاں تک کے اشیاء صرف کی فراہمی میں بھی ایک مخصوص توازن کا ہونا ضروری ہے ورنہ ان کی فراہمی میں تاخیر کی وجہ سے پیداوار میں رکاوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے۔

۶- معاشی نظام کو ان مسائل اس انداز میں حل کرنا چاہیے کہ معیشت میں موجود تمام معاشی وسائل کا بہترین استعمال ہو سکے۔ اور کسی وسیلہ کا زیاں نہ ہو۔ کام کرنے لائق تمام محنت کشوں کو ان کی لیاقت کے اعتبار سے روزگار مہیا ہو۔ اشیاء کی پیداوار اتنی مقدار میں ہو کہ کارخانوں میں لگی ہوئی مشینیں خواہ وہ اشیاء کے صرف کی پیداوار کرتی ہو یا اشیاء سرمایہ کی۔ بے کار نہ رہیں یعنی کارخانوں میں زائد صلاحیت نہ ہو بلکہ وہ اپنی پوری صلاحیت پر کام کریں، مختصر آئیہ کہ مکمل روزگار کی صورت حال کو معیشت حاصل کر سکے۔

## معاشی نظاموں کی تقسیم

فی زمانہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہیں ان کو ہم تین بڑی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- سرمایہ دارانہ معیشت

۲- اشتراکی معیشت

۳- مخلوط معیشت

آئیے اب ہم ان مختلف معاشی نظاموں کے بنیادی خدوخال اور ان کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ، ان معیاروں کی روشنی میں لیں جو ہم نے اوپر مقرر کیے ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت

سرمایہ دارانہ معیشت (Capitalist Economy) کو بازار معیشت (Market Economy) یا آزاد معیشت (Free Economy) بھی کہتے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے ہی ظاہر ہے کہ یہ معیشت بازار کے نظام پر قائم ہے۔ اور اس پر حکومت کا کنٹرول اگر صفر نہ ہو تو کم از کم ضرور ہو۔

ہم عصر دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی بہترین مثال ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا معاشی نظام ہے لیکن امریکہ میں بھی سرمایہ داری اب اپنی خالص شکل میں باقی نہیں رہی، اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اس لئے ہم امریکہ یا برطانیہ یا کسی اور ملک کی مثال لئے بغیر خالص سرمایہ دارانہ نظام کا ایک مجرد تصور قائم کریں گے اور اس کے سیاق و سباق میں سرمایہ داری کا مطالعہ کریں گے۔

سرمایہ دارانہ نظام سے ہماری مراد معیشت کے ایک ایسے نظام سے ہے جس میں افراد کو ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کا حق حاصل ہو، اور معاشی افعال کو سرانجام دینے کے لئے حکومت کی جانب سے کوئی منصوبہ نہ بنایا جاتا ہو بلکہ یہ افعال، آزاد قیمتوں کے نظام کی وساطت سے انجام پذیر ہوتے ہوں۔ ایسی معیشت میں کن چیزوں کی پیداوار کی جائے، کے مسئلہ کا حل افراد خود کرتے ہیں لیکن وہ یہ فیصلہ براہ راست نہیں کرتے بلکہ اس کا فیصلہ قیمتوں، لاگوں اور منافع کا ایک پیچیدہ نظام کرتا ہے۔ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کی وجہ سے ہر فرد، اور افراد کے گروہوں کو کاروبار کا حق ہے یعنی انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جس چیز کی چاہیں پیداوار کریں لیکن ہر فرد کا عمل، اس کی خودداری، یا خودسری سے متعین ہونے کے بجائے اس کے مفاد سے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے افراد صرف ان اشیاء کی پیداوار کریں گے جس میں ان کو معقول منافع حاصل ہو سکے، چیزوں کی پیداوار کے لئے مختلف وسائل کی خدمات کی ضرورت پڑے گی، چونکہ یہ تمام خدمات معاشی اشیاء ہیں اس لئے ان کی قیمت بھی چکانی پڑے گی، کسی چیز کی پیداوار میں جتنے وسائل استعمال ہوئے اور ان کے لئے مجموعی طور پر جو قیمت ادا کی گئی وہ اس چیز کی لاگت ہے، پیدا کار (Producer) یہ چاہیں گے کہ ان کو جو قیمت اس چیز کی فروخت سے حاصل ہو وہ لاگت سے زیادہ ہو۔ قیمت فروخت اور لاگت کے درمیان یہ فرق منافع کہلاتا ہے۔ اس لئے پیدا کار صرف ان اشیاء کی پیداوار کرنا پسند کریں گے جن میں منافع کا امکان زیادہ ہو۔ اب صرف یہ مسئلہ رہ گیا کہ پیدا کاروں کو یہ اندازہ کس بات سے ہو کہ کن اشیاء کی پیداوار میں انہیں منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں پر آزاد قیمتوں کا نظام ایک بار پھر پیدا کاروں کی اعانت کرتا ہے، صارفین جن اشیاء کی مانگ کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو قیمتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ جن اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لازماً ان کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہوگا اس لئے پیدا کار انہیں اشیاء کی پیداوار کریں گے تاکہ ان کی پیداوار فروخت ہو جائے اور وہ اس فروخت کے نتیجے میں منافع کما سکیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت دوسرے مسئلہ یعنی پیداوار کس طرح کی جائے، کا حل بھی نظام قیمت کی مدد سے ہی کرتی ہے۔ پیداوار کے لئے جو وسائل

استعمال ہوتے ہیں ان کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، سرمایہ اور محنت۔ پیدا کاران دونوں ذرائع پیداوار کی متناسب قیمتوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے ایسی پیداواری تکنیک کا انتخاب کرتے ہیں جس میں پیداواری لاگت کم ترین ہو۔

تیسرا مسئلہ (یعنی پیداوار کس کے لئے کی جائے) بھی سرمایہ دارانہ معیشت میں نظام قیمت کے ذریعہ ہی سے حل ہوتا ہے، اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ ہر فرد کسی نہ کسی ذریعہ پیداوار کا مالک ہے۔ نظام قیمت درحقیقت دو عناصر سے مل کر بنتا ہے۔ (1) پیدا شدہ اشیاء کا بازار (Product Market) (2) ذرائع پیداوار کا بازار (Factor Market) جس طرح پیدا شدہ اشیاء (خواہ وہ اشیاء صرف ہوں یا اشیاء سرمایہ) کی قیمتیں ہر شے کی طلب اور رسد سے متعین ہوتی ہیں اسی طرح ذرائع پیداوار کے بازار میں ہر ذریعہ پیداوار کی قیمت اس کی طلب اور رسد سے متعین ہوتی ہے۔ محنت کی مزدوری کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ محنت کی رسد کتنی ہے اور طلب کتنی ہے۔ مزدوری کی جس شرح پر محنت کی طلب اور رسد برابر ہوگی وہیں متوازن مزدوری کی شرح (Equilibrium Wage Rate) کا تعین ہوگا، اسی طرح سرمایہ کے بازار (Capital Market) میں سرمایہ کی طلب اور رسد کی برابری کے ذریعہ متوازن شرح سود کا تعین ہوگا اسی اصول پر متوازن شرح لگان کا تعین کیا جاسکتا ہے، اس طرح کل پیداوار محنت، سرمایہ اور زمین کے مالکان میں مزدوری، سود اور لگان کی شکل میں تقسیم ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا خا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی کارکردگی کی ایک مجمل اور آسان ترین وضاحت ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یہ بڑا پیچیدہ اور مشکل نظام ہے کیونکہ اس میں معاشی فیصلوں کی حیثیت لامرکزی ہے۔ خیال تو کیجئے کہ معیشت میں کروڑوں کی تعداد میں افراد ہوتے ہیں۔ ہر فرد اپنے طور پر اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کتنی مقدار میں کتنی اشیاء صرف کرے گا، اسی اعتبار سے وہ اپنی انفرادی طلب کرتا ہے، لاکھوں پیدا کار ایک دوسرے سے جدا گانہ اور علاحدہ طور پر اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کن اشیاء کی کتنی مقدار میں پیداوار کریں گے اور اس پیداوار کو بروئے کار لانے کے لئے کس تناسب اور کتنی مقدار میں پیداواری وسائل کی طلب کریں گے۔ ہر ذریعہ پیداوار کا مالک انفرادی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنے وسیلہ کو کس طرح کے استعمال میں لانا پسند کرے گا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ جدید معیشت اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مختلف قسم کی اشیاء اور خدمات کی پیداوار کرتی ہے اس لئے ان تمام اشیاء اور خدمات کی پیداوار کے لئے کیے جانے والے انفرادی فیصلوں کی تعداد کا بہ مشکل تمام ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ان تمام فیصلوں میں ترتیب اور توازن نظام قیمت کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ چونکہ انفرادی فیصلے زیادہ تر انفرادی مفادات کے پیش نظر کیے جاتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ مجموعی طور پر یہ فیصلے اجتماعی مفادات اور مصالح سے بھی مطابقت رکھتے ہوں۔ اس امکان کو سرمایہ دار ممالک کے ماہرین معاشیات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ جارج ہام لکھتے ہیں:

”بلاشبہ یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ یہ فیصلے، اندازے اور ان کی تطبیق ہمیشہ درست ہوں گے، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) کن چیزوں کی پیداوار کی جائے، کس طرح کی جائے اور کس کے لئے کی جائے، یہ مسائل نجی اعمال کے ذریعہ محرک منافع (Profit Motive) کی بنیاد پر آزمائش اور غلطی (Trial and error) کی حکمت عملی (Strategy) سے طے کیے جاتے ہیں۔“

### سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی خدوخال

سرمایہ دارانہ معیشت کے مندرجہ بالا مختصر تعارف کے بعد ہم ذیل میں سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی خدوخال اور اس کے سماجی اور قانونی اداروں کے ذریعہ اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں گے۔ اس امر کا اعادہ ایک بار پھر ضروری ہے کہ یہ کسی خاص ملک کی سرمایہ دارانہ معیشت کا تجزیہ نہیں ہے بلکہ کسی بھی آزاد معیشت کا جس کی بنیاد بازار کا نظام ہو ایک مجرذ نمونہ ہے۔

### (الف) ذاتی جائداد کا حق

ایک سرمایہ دارانہ معیشت کی بنیاد ذاتی جائداد کے حق پر ہوتی ہے، افراد اور ان کے گروہوں کو اس بات کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اشیاء صرف بلکہ تمام ذرائع پیداوار کو جن میں اشیاء سرمایہ، محنت اور زمین شامل ہیں، اپنی ذاتی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے مجرذ نمونہ میں جائداد کی ذاتی ملکیت کا حق لامحدود ہے اور نجی ملکیت پر کسی طرح کی روک ٹوک یا پابندی نہیں ہوتی۔

افراد کو صرف اس بات کا ہی حق نہیں ہوتا کہ وہ ذرائع پیداوار یا دولت یا جائیداد اپنی نجی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں بلکہ اس حق سے ہی مشتق ایک اور بنیادی حق ہے کہ وہ اس دولت یا جائیداد میں اضافہ کرنے کے لئے نجی کاروبار کر سکتے ہیں۔ نجی کاروبار کے حق کے بغیر ذاتی جائیداد کا حق چنداں با معنی اور مفید نہ ہوگا۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کو اس بات کا بھی حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کو استعمال کر سکتے ہیں۔ فروخت کر سکتے ہیں، سرمایہ کاری کے ذریعہ مزید آمدنی حاصل کر کے اس میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی حق ہوتا ہے اگر وہ چاہیں تو اپنے وسائل کو بروئے کار نہ لائیں یا انھیں ضائع کر دیں۔

جائیداد کی ذاتی ملکیت کے حق کے ذیل میں ہی مندرجہ ذیل حقوق بھی آتے ہیں:

(۱) افراد کو وراثت کا حق بھی ہے یعنی جائیداد کے مالکان اپنی وفات کے بعد اپنی ملکیت کو اپنے ورثا کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کی ملکیت کو ورثہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حق کے مضمرات معاشی نظام کے لئے نہایت اہم ہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں، جائیداد اور ذرائع پیداوار یا دولت کا مالک بننے کا صرف یہی ذریعہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی محنت اور قابلیت کے ذریعہ دولت پیدا کرے اور اس کو بڑی مقدار میں جمع کر لے، اگر دولت کا مالک بننے کا صرف یہی ایک طریقہ رائج ہو تو غالباً بہت سے لوگ اس کو معقول خیال کریں گے اور نامناسب نہ سمجھیں گے۔ لیکن حق وراثت کی موجودگی کی وجہ سے ایک شخص صرف اس لئے بھی بے اندازہ دولت کا مالک بن سکتا ہے کہ اس نے کسی راک فیلر، فورڈ، ٹاٹا، یا برلا خاندان میں جنم لیا ہے اور اس کے آباؤ اجداد نے یہ دولت اس کے نام منتقل کر دی ہے۔ بالفاظ دیگر سرمایہ دارانہ معیشت میں یہ ایک ایسا طریقہ موجود ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص محض اپنی قابلیت یا محنت صرف کیے بغیر بھی دولت کا مالک بن سکتا ہے، عہد جدید میں حق وراثت کو ایک طرح سے لامحدود حق نہیں مانا جاتا کیونکہ بعض سماجی مصالحوں کی خاطر حکومت ورثہ کے طور پر منتقل کی جانے والی جائیداد اور دولت پر ٹیکس لگاتی ہے۔ اور اس طرح منتقل ہونے والی جائیداد کا کچھ حصہ حکومت کو مل جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ حق وراثت، جائیداد کی ذاتی ملکیت کے حق کا جزو لاینفک ہے۔

(۲) آزاد کاروبار کا حق کا بھی جائیداد کی ذاتی ملکیت کے حق سے جزا ہوا ہے، اس کے تحت مندرجہ ذیل امور آتے ہیں:

(الف) افراد کو کاروبار کرنے کی آزادی ہے اور وہ اپنی نجی جائیداد جس کاروبار میں چاہے لگا سکتے ہیں، اس بات کا فیصلہ کہ وہ اپنے وسائل کا کاروباری استعمال کس طرح کریں، بنیادی طور پر افراد کے ہاتھ میں ہے۔ حکومت یا کوئی اور سماجی تنظیم یا ادارہ وسائل کے مالکان کو اس بات کا حکم نہیں دیتا کہ ان کو اپنے وسائل فلاں کاروبار میں لگانے ہوں گے یا فلاں شخص کو لازماً فلاں قسم کا کاروبار کرنا چاہیے۔ مالکان وسائل محرک منافع (Profit Motive) کی بنیاد پر اپنے وسائل کاروبار میں لگاتے ہیں اور اسی بنیاد پر مختلف کاروباروں میں سے کسی ایک یا چند کا اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں، سرمایہ دارانہ معیشت کے لئے آزاد کاروبار کا حق اتنا اہم ہے کہ اس نظام معیشت کا متبادل نام ”آزاد کاروباری معیشت“ (Free Enterprise Economy) بھی ہے۔

(ب) سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کو ”معاہدوں کی آزادی“ بھی حاصل ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ مختلف قسم کے معاشی معاہدے کرنے کے لئے آزاد ہیں، یہ معاہدے سرمایہ داروں اور محنت کشوں یا دو مختلف سرمایہ داروں کے مابین ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معاہدے کی آزادی، آزاد کاروبار کے شروع ہونے اور جاری رہنے کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ محض مادی وسائل یا جائیداد (یا مشینوں) کی مدد سے پیداواری عمل تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا، اس کے لئے محنت کی بھی ضرورت ہے جو مشینوں کو بروئے کار لائے، محنت کے مالکان یعنی محنت کش، سرمایہ دارانہ نظام کے تحت سرمایہ داروں کے غلام نہیں ہیں۔ (جیسا کہ جاگیر دارانہ نظام میں ہوتا ہے کہ جاگیر دارانہ صرف یہ کہ زمین کا مالک ہوتا ہے بلکہ ان پر کام کرنے والے کاشتکاروں کا بھی مالک ہوتا ہے) کم از کم نظریاتی طور پر محنت کشوں کو سرمایہ داروں کی ہم سہری کا مقام حاصل ہے، سرمایہ دار، کیا ہے؟ محض ایک ذریعہ پیداوار سرمایہ کا مالک ہے۔ اسی طرح محنت کش، ایک دوسرے ذریعہ پیداوار محنت کا مالک ہے، دونوں اپنے طور پر آزاد ہیں کہ اپنے وسیلہ کو جس کاروبار میں چاہے استعمال کریں یا نہ کریں۔ اس لئے نظریاتی طور پر دونوں فریق

برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، چونکہ پیداواری عمل، بغیر سرمایہ یا بغیر محنت کے، جاری رکھنا، اگر ناممکن نہیں، تو مشکل اور غیر کار گزار (Inefficient) ضرور ہے اس لئے معاہدے کی آزادی، ضروری ہو جاتی ہے تاکہ سرمایہ اور محنت ایک دوسرے سے باہمی تعاون کے ذریعہ پیداوار کے سماجی عمل کو جاری رکھ سکیں۔

یہ امر ماہرین معاشیات کے مابین تنازعہ فیہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کا حق ملکیت جائیداد لا محدود ہے یا نہیں۔ بعض جدید ماہرین معاشیات کا خیال ہے، ہم عصر سرمایہ دارانہ نظام میں حق ملکیت لا محدود نہیں ہے اور حکومت اس حق کو محدود کرنے کے لئے مختلف قسم کے مالیاتی اقدامات کر سکتی ہے۔ اور اس کے لئے قوانین بھی بنا سکتی ہے، گوکہ اس قسم کے براہ راست قوانین تو سرمایہ دار ممالک میں نہیں بنائے گئے لیکن اس کے نظری امکان کو تو بہر حال رد نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد کاروبار کے حق کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ حق بھی لا محدود نہیں ہے، بہت سے ایسے کاروبار ہیں جن کو حکومت اپنے لئے محفوظ رکھتی ہے لیکن خالص سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں یہ اعتذار درحقیقت درست نہیں ہے کیونکہ ایسے نظام میں حکومت جو معاشی افعال انجام دیتی ہے وہ درحقیقت سماجی اشیاء کی فراہمی کے لئے ہے۔

### (ب) صارفین کی حاکمیت (Consumer's Sovereignty)

سرمایہ دارانہ معیشت کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں صارفین کی حاکمیت قائم ہوتی ہے۔ حاکمیت کا تصور دراصل سیاسیات سے مستعار لیا گیا ہے۔ سیاسیات میں جمہوری نظام میں رائے دہندگان کو اصل حاکم (Sovereign) تصور کیا جاتا ہے کیونکہ عام انتخابات کے وقت رائے دہندگان ہی حکومت کا انتخاب کرتے ہیں اور وہی اُن کو اگلے انتخاب کے وقت تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس لئے حاکمیت اس فرد یا طبقے کے پاس ہوگی جس کے سب تابع ہوں لیکن جو خود کسی کا تابع فرمان نہ ہو۔ چونکہ جمہوریت میں رائے دہندگان سے بالا کوئی نہیں اور حکومت کا وجود بھی اس پر منحصر ہے کہ رائے دہندگان کی مسلسل حمایت اسے حاصل رہتی ہے یا نہیں۔ اس لئے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حاکمیت ان ہی کے پاس ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے حامی مفکرین سرمایہ داری کو ”معاشی جمہوریت“ (Economic Democracy) کہنا پسند کرتے ہیں۔ پیداوار جو اصل پیداوار کرتے ہیں۔ وہ حکومت کے ان نمائندوں کے مماثل ہیں جن کا انتخاب، رائے دہندگی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، رائے دہندگان کی جگہ صارفین نے لے لی ہے۔ جس طرح رائے دہندگان (Voters) اپنی جگہ حاکمیت کے حامل ہیں اسی طرح معاشی دائرہ کار میں صارفین بھی حاکمیت کے حامل ہیں، اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کوئی پیداوار، کسی بھی چیز کی پیداوار اپنی مرضی سے نہیں کرتا، چونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار بازار کے لئے کی جاتی ہے اور پیداوار کا مقصد یہ ہے کہ وہ بازار میں فروخت ہو اس لئے پیداوار اپنے من کی موج کے بجائے بازار کے احکامات، بجالانے پر مجبور ہیں۔ وہ صرف ان ہی اشیاء کی پیداوار کریں گے جن کی صارفین مانگ کرتے ہوں اور جن کی خریداری کے لئے وہ تیار ہوں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جن چیزوں کی پیداوار ہوتی ہے اس کا آخری فیصلہ صارفین کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر صارفین کسی چیز کا استعمال بند کر دیں، تو پھر پیداوار زیادہ دن تک اس چیز کی پیداوار جاری نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ فروخت نہ ہونے کے باعث اس کو مسلسل نقصان ہوگا جس کو وہ کچھ عرصہ تک برداشت کر لے گا لیکن طویل مدت تک برداشت نہیں کر پائے گا۔ چاروناچار اس کو اس چیز کی پیداوار ختم کرنا پڑے گی۔ صارفین کی حاکمیت کا مفہوم یہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ حاکمیت عمل میں کس طرح آتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت میں تو ”ایک شخص ایک ووٹ“ کا اصول ہے، معاشی جمہوریت میں اس کا مماثل ”ایک روپیہ ایک ووٹ“ کا اصول ہے۔ (امریکی ماہرین معاشیات اسے ”ڈالر بیلٹ“ کہتے ہیں) ہم کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں صارفین ان اشیاء کا انتخاب خود کرتے ہیں جن کو وہ صرف کرنا چاہتے ہیں، یہ انتخاب مندرجہ ذیل عاملین سے متاثر ہوتا ہے۔ (۱) صارفین کے انفرادی حالات و رجحانات مثلاً عمر، جنس، تعلیم، تہذیبی پس منظر، خاندان کا سائز اور اس کی بناوٹ وغیرہ، (۲) صارفین کی ذاتی آمدنی، (۳) آمدنی کا وہ حصہ جو وہ صرف پر خرچ کرنا چاہتا ہے، (۴) ان اشیاء اور خدمات کی قسمیں جن کو وہ فی الواقع خریدنا چاہتا ہے، (۵) دوسری اشیاء اور خدمات کی قسمیں جن کو وہ ممکنہ طور پر خرید سکتا ہے۔

اشیاء کا انتخاب عمل میں لانے کے لئے صارفین ڈالر بیلٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ صارفین کے ذریعہ خرچ کیا گیا ہر ایک روپیہ ایک ووٹ کے

مثل ہے، جس طرح سیاسی میدان میں وہ امیدوار کامیاب ہوتا ہے جس کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں اسی طرح یہاں صرف ان اشیاء کی پیداوار ہوگی جن پر صارفین اپنی آمدنی خرچ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بادی انٹرنر میں صارف کا یہ عمل کسی غیر معمولی اہمیت کا حامل نہ معلوم ہو لیکن لاکھوں افراد کے فیصلے مل کر اس امر کا تعین کرتے ہیں کہ کن اشیاء اور خدمات کی پیداوار کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو، جب صارفین بعض اشیاء پر زیادہ خرچ کرتے ہیں تو ان کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ان کی قیمت فروخت بڑھتی ہے۔ اور منافع بھی زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ پیدا کاران چیزوں کی زیادہ پیداوار کرتے ہیں، اگر صارفین کچھ دوسری چیزوں پر کم خرچ کرتے ہیں۔ تو ان کی مانگ گھٹتی ہے، جس کی باعث قیمت فروخت کم ہو جاتی ہے اور منافع کا حاشیہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیدا کاران اشیاء اور خدمات کی پیداوار میں کمی کر دیں گے۔

اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ سرمایہ داری کو معاشی جمہوریت قرار دے کر سیاسی جمہوریت سے اس کی جو تمثیل کی جاتی ہے وہ مکمل طور پر صحیح نہیں ہے۔ سیاست میں تو ”ایک شخص ایک ووٹ“ کا اصول تمام بالغ رائے دہندگان کے لئے نافذ ہو سکتا ہے اور اس کے نفاذ میں رنگ، نسل، امیر و غریب کی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ”ایک روپیہ ایک ووٹ“ کا اصول۔ ایک شخص ایک ووٹ کے اصول کا صحیح اور مکمل متبادل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ معیشت کے بہت سے لوگ جو قوت خرید نہیں رکھتے اس کے دائرے سے باہر ہو جاتے ہیں، امیر لوگوں کو ان کے تناسب کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، ایسے لوگ اگر غیر ضروری اور غیر مفید سامان تیش کی بھی مانگ کرتے ہیں تو آزاد بازار معیشت اس کی تسکین کے لئے پیداواری وسائل مختص کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے لیکن ضروری، مفید اور کبھی کبھی سماجی نقطہ نظر سے اہم ترین اشیاء اور خدمات بھی وافر مقدار میں صرف اس لئے مہیا نہیں ہو یا تیں کہ ”ایک روپیہ ایک ووٹ“ کے اصول کے تحت لوگ ان پر زیادہ رقم خرچ نہیں کرتے اور اس طرح بازار معیشت ان اشیاء و خدمات کے لئے کم ترجیح دیتی ہے۔

چنانچہ یہ جانی مانی حقیقت ہے کہ بعض سرمایہ دار ممالک میں قومی آمدنی کا جتنا حصہ شراب پیدا کرنے پر صرف ہوتا ہے اتنا حصہ تعلیم یا صحت سے متعلق سہولیات فراہم کرنے پر صرف نہیں ہوتا۔

### (ج) انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice)

آزاد بازار کی بنیاد پر قائم سرمایہ دارانہ معیشت اسی وقت کامیابی سے کام کر سکتی ہے جبکہ مندرجہ بالا خصوصیات کے ساتھ افراد کو انتخاب کی آزادی بھی حاصل ہو، اس آزادی کے تحت مندرجہ ذیل قسم کے امور آتے ہیں:

- ۱- اشیاء صرف میں انتخاب کی آزادی
- ۲- صرف اور بچت میں انتخاب کی آزادی
- ۳- سرمایہ کاری کی آزادی
- ۴- پیشوں کے انتخاب کی آزادی

صارفین کی حاکمیت کی بحث میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پیدا کاروں کی رہنمائی، اس امر میں کہ وہ کن اشیاء کی پیداوار کتنی مقدار میں کریں، صارفین کی ترجیحات سے ہوتی ہے کیونکہ ہر صارف (Consumer) مختلف اشیاء پر اسی تناسب سے خرچ کرتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں ان ضروریات کی ترجیحات کی بابت مقرر کرتا ہے۔ پیدا کاروں کی یہ رہنمائی اسی وقت ممکن ہے کہ جبکہ افراد کو صارفین کی حیثیت سے مختلف اشیاء صرف میں سے انتخاب کی آزادی ہو۔ اس آزادی کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کا کامیابی سے کام کرنا مشکل ہے۔

جاندار کی ذاتی ملکیت کے حق کے ساتھ افراد کو پیشوں کے انتخاب کی آزادی بھی ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جس قسم کا پیشہ چاہے اختیار کر سکتا ہے، پیشوں کی آزادی کو سرمایہ دارانہ نظام کے حامی مفکرین، اس کو فطرت انسانی سے ہم آہنگ نظام ہونے کے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، ان کا نکتہ یہ ہے ہر فرد کی آرزو میں اور امتگیس مختلف ہوتی ہیں، کسی کا مقصد علم کی خدمت کرنا ہے اور وہ یونیورسٹی میں پروفیسر بننا چاہتا ہے۔ کسی اور فرد کا مقصد دولت کمانا ہے اور وہ صنعت کار بننا چاہتا ہے، کوئی ڈاکٹری کا پیشہ اپنانا چاہتا ہے اور کوئی سپر گری کا۔ کوئی آہن گر بننا چاہتا ہے اور کوئی زرگر، کوئی بینکار بننا چاہتا ہے تو کوئی پیشہ ورانہ نتیجہ۔ معاشی نظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا مناسب اور بہترین موقع فراہم کرے۔ تاکہ وہ اپنی قابلیت، صلاحیت اور امتگیسوں کے مطابق پیشے کا انتخاب کر کے اپنی آرزوؤں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اپنے خواہوں اور حوصلوں کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کر سکے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جبکہ افراد کو پیشوں کے انتخاب میں آزادی کا حق حاصل ہو۔ واضح رہے کہ یہ آزادی سرمایہ

دارانہ نظام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اس سے قبل زمین دارانہ اور جاگیر دارانہ نظاموں میں پیشہ، ذات اور جنم سے ہی متعین ہو جاتا تھا۔ جاگیر دار کا بیٹا جاگیر دار تھا اور کسان کا بیٹا کسان، لوہار کا بیٹا لوہار تھا اور بڑھئی کا بیٹا بڑھئی، بڑی حد تک پیشوں کا انتخاب سماجی ریت رواج پر منحصر تھا اور انفرادی ترجیح کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھتے تو سرمایہ دارانہ نظام کی پیش رفت جاگیر دارانہ نظام پر کچھ زیادہ فوجیت نہیں رکھتی کہ سرمایہ دار کا بیٹا سرمایہ دار اور محنت کش کا بیٹا محنت کش ہی بنتا ہے، فی الواقع اس کا بہت کم امکان ہے کہ سرمایہ دار کا بیٹا محنت کش اور محنت کش کا بیٹا سرمایہ دار بن جائے۔ (یاد رہے کہ سرمایہ دارانہ نظام حق وراثت اور ذاتی ملکیت کی بناء پر ممتاز و متمیز کیا جاتا ہے) جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہائے معیشت میں اس بابت میں جو فرق ہے وہ ان کی جدلیاتی ترکیب کے باعث ہے۔ جاگیر دارانہ نظام میں پیشوں کی تعداد محدود ہوتی ہے لیکن ہم عصر سرمایہ داری نظام لا تعداد قسم کے پیشوں کی ضرورت پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ اس اعتبار سے پیشوں کے انتخاب کے امکانات میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کو جاگیر دارانہ نظام پر ایک اور اعتبار سے فوجیت حاصل ہے کہ اس نے پیشوں کے انتخاب کو رسم و رواج اور ذات پات کی زنجیروں سے آزاد کر کے بازار کی قوتوں یعنی طلب و رسد کا پابند بنا دیا ہے۔

ذاتی جائیداد اور پیشہ دونوں سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ فی الحقیقت اس نقطہ نظر سے ہم آمدنی کی بھی دو قسمیں کر سکتے ہیں:

الف۔ کسی آمدنی یا کمائی آمدنی (Earned Income) جو انسان کی کسی کوشش کے ذریعہ کمائی گئی۔ مزدوری، تنخواہیں اور وہ تمام ادائیگیاں جو کسی انسانی خدمت انجام دینے کے صلہ میں حاصل کی گئیں، اس قسم کی آمدنی میں شامل ہیں۔

ب۔ غیر کسی یا غیر کمائی آمدنی (Unearned Income) جو محض کسی معاشی وسیلہ کی ملکیت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً زمین دار کو لوگان محض اس وجہ سے ملتا ہے کہ وہ زمین کا مالک ہے، سرمایہ دار کو ”سود“ اس وجہ سے ملتا ہے کہ وہ سرمایہ کا مالک ہے۔ اس قسم کی آمدنی کو حاصل کرنے کے لئے کسی خاص قسم کی معاشی کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔

اس تخصیص کا ذکر برسبیل تذکرہ یوں آگیا کہ ہم یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ آمدنی ذاتی جائیداد اور پیشہ دونوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ فی الوقت آمدنی کا جو مصرف زیر بحث ہے اس میں اس تخصیص سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کمائی آمدنی ہے یا غیر کمائی۔ آمدنی کسی طرح بھی حاصل کی گئی ہو اس کو مندرجہ ذیل دو مصارف میں سے کسی ایک یا دونوں پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ آمدنی کو مختلف ضروریات کی تسکین کے لئے مختلف قسم کی اشیاء صرف اور خدمات کے خریدنے پر خرچ کیا جائے۔ اصطلاحاً ہم ایسے خرچ کو (Consumption) ”صرف“ سے تعبیر کریں گے۔

۲۔ آمدنی کا دوسرا استعمال یہ ہو سکتا ہے کہ موجودہ ضروریات پر خرچ کرنے کے بجائے اس کو بچالیا جائے اور مستقبل میں آئندہ پیدا ہونے والی ضروریات پر صرف کیا جائے۔ آمدنی کے ایسے حصے کو جو موجودہ صرف پر خرچ نہ کیا جائے ہم ”بچت“ سے تعبیر کریں گے۔

اس طرح سے آمدنی کے دو متبادل استعمال ہوئے۔ صرف اور بچت۔ نظری طور پر دو انتہائی صورتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کہ کل آمدنی کو موجودہ صرف پر خرچ کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں بچت صفر ہوگی اور آئندہ برس، صرف کے لئے کچھ آمدنی نہ ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ زمانے (Period) میں کچھ صرف نہ کیا جائے اور پوری موجودہ آمدنی بچت کی صورت میں رکھ لی جائے۔ اس سے موجودہ زمانے (Current Period) میں تو صرف ”صنفر“ ہو جائے گا لیکن آئندہ زمانے میں صرف کے لئے خاصی بڑی آمدنی حاصل ہو سکے گی۔ یہ دونوں صورتیں قابل عمل نہیں ہیں۔ افراد اور معاشرہ دونوں کے لئے قابل عمل بات یہ ہے کہ موجودہ آمدنی کا کچھ حصہ موجودہ زمانے میں صرف کے لئے خرچ کیا جائے اور جو کچھ خرچ نہ ہو اس کو بچت کی صورت میں آئندہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔

آمدنی میں بچت اور صرف کا کیا تناسب ہو؟ کتنی آمدنی موجودہ زمانے میں صرف پر خرچ کی جائے اور کتنی بچت کی جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اس کا فیصلہ بھی افراد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ افراد اور گھرانے، اس بات کا فیصلہ خود کرتے ہیں کہ ان کی ضروریات کیا ہیں؟ ان ضروریات کی تسکین کے لئے ان کو اپنی آمدنی کا کتنا حصہ صرف پر خرچ کرنا چاہیے، ظاہر ہے کہ اس فیصلے کا انحصار بہت سی باتوں پر ہوگا۔ گھرانہ کا سائز کتنا بڑا ہے۔ اس کی بناوٹ کیسی ہے، اس کی فی آمدنی کتنی ہے۔ اس میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں۔ کتنے منتمولین (Dependants) ہیں۔ ان کی عمریں کتنی

لیکن اہم بات یہ ہے کہ بچت اور صرف میں سے انتخاب کا حق افراد کے پاس ہے اور وہ خود اپنے ذاتی حالات و عوامل کے پیش نظر اپنے صرف کا منصوبہ تیار کرتے ہیں۔ کوئی سرکاری ایجنسی اس سلسلے میں ان کی رہنمائی نہیں کرتی۔

ایک بار یہ طے کر چکنے کے بعد کہ افراد اپنی آمدنی کا کتنا حصہ صرف کریں گے، یہ طے کرنے کی باری آتی ہے کہ فی الواقع وہ صرف کن اشیاء اور خدمات پر مشتمل ہوگا اور جملہ اشیاء صرف اور خدمات کی کتنی مقدار کون سا گھرانہ یا کون سا فرد استعمال کرے گا۔ یہ اشیاء صرف کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام میں اس انتخاب کی آزادی کا حق بھی افراد کے پاس ہے۔ صارفین کی حاکمیت کے اصول کی بحث میں ہم اس حق اور اس کی کارکردگی پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس حق کے استعمال کی وجہ سے ہی صارفین اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کن اشیاء اور خدمات کی پیداوار کی جائے۔ کیونکہ پیدا کار (Producer) انھیں اشیاء اور خدمات کی پیداوار کرتے ہیں جن کی صارفین مانگ کرتے ہیں اس لئے اس جگہ پر اس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے تاہم، اس امر پر زور دینا ضروری ہے کہ افراد کے انتخاب کو محض معاشی انتخاب کی حیثیت حاصل ہے۔ ضروری نہیں کہ سماجی اور اخلاقی معیاروں پر بھی یہ انتخاب درست ہی ہو۔ اس کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔ فرض کیجئے عبدال نام کا ایک مزدور ہے جس کے گھر میں بیوی اور بچے ہیں۔ وہ اپنی تنخواہ کے دن، بیوی اور بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی شراب کی دوکان پر جاتا ہے اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ شراب پر خرچ کرتا ہے۔ اخلاقی اور سماجی نقطہ نظر سے یہ کوئی مستحسن فعل قرار نہیں پائے گا لیکن سرمایہ دارانہ معاشیات اس فعل پر کوئی اخلاقی فیصلہ دینے سے احتراز کرے گی۔ عبدال شراب خریدتا ہے اور شراب بیچنے والا بیچتا ہے۔ اس کے لئے عبدال محض ایک خریدار ہے۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کا فیصلہ خود عبدال کو کرنا ہے کہ وہ شراب پئے گا یا نہیں۔ اس کے لئے شراب زیادہ ضروری ہے یا اس کے بیوی بچوں کے لئے روٹی۔ اس سے شراب بیچنے والے کو کوئی غرض نہیں۔ وہ تو عبدال سے شراب کی قیمت وصول کرے گا اور اس کو شراب دے دے گا، اگر اس کی ترجیحات غلط ہیں تو ہوا کریں۔ معیشت تو ان ترجیحات کے مطابق ہی کام کرے گی۔

جب افراد یہ طے کر لیں کہ وہ آمدنی میں کتنا صرف کریں گے اور کتنی بچت کریں گے تو ان کو سرمایہ کاری کی آزادی بھی ہونا چاہیے۔ تمام معاشی وسائل کی طرح بچت بھی افراد کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس لئے یہ طے کرنا بھی افراد کا کام ہے کہ وہ اپنی بچت کو کس شکل میں رکھنا پسند کریں گے۔ وہ اس کو بینک میں میعاد کی کھاتے میں رکھیں گے یا اس کے سرکاری تمسکات خریدیں گے یا اس کے مختلف کمپنیوں کے حصص (Shares) خریدیں گے یا کسی صنعت میں سرمایہ کاری کریں گے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ سرمایہ کاری کی مختلف متبادل اشکال میں متوقع منافع (Expected Profit) کی شرح کتنی ہے، مختلف صنعتوں میں جس تناسب سے سرمایہ کاری کی جائے گی اسی اعتبار سے اس صنعتوں کی پیداواری صلاحیت متعین ہوگی اور اسی فیصلے سے اس امر کا تعین بھی ہوگا کہ مختلف چیزوں کی پیداوار کس مقدار میں ہو۔

سرمایہ کاری، چیزوں کی پیداوار اور ان کی فروخت کے نتیجہ میں افراد کو پھر آمدنی حاصل ہوگی اور اس آمدنی کے بارے میں انکو پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس کا کتنا حصہ صرف کے لئے استعمال کریں گے اور کتنا حصہ بچت اور سرمایہ کاری کے لئے مختص کریں گے۔ سرمایہ کاری کے ذریعہ جانکد میں بھی اضافہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ آمدنی میں مزید اضافہ ممکن ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انتخاب کی آزادی کے ضمن میں آنے والے چاروں حقوق، یعنی پیشوں کے انتخاب میں آزادی کا حق، اشیاء صرف میں انتخاب کی آزادی کا حق، صرف اور بچت میں انتخاب کی آزادی کا حق اور سرمایہ کاری کی آزادی کا حق ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کے ذریعہ کئے جانے والے معاشی فیصلوں کے ذریعہ ہی معیشت اپنے وسائل کو تقسیم کرتی ہے اور اپنے دیگر فرانس انجام دیتی ہے۔

## (د) محرک منافع (Profit Motive)

سرمایہ دارانہ معیشت میں معاشی اعمال کو چلانے والی قوت منافع کی قوت ہے۔ اس کو اصطلاحاً محرک منافع (Profit Motive) کہتے ہیں، یعنی معاشی اعمال کی تحریک زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے مقصد سے ہوتی ہے۔ اس مفروضہ کے پس پشت بعض تاریخی عوامل بھی ہیں۔ ایک



معاشی نظام کے طور پر سرمایہ داری کا ارتقا اس وقت ہوا جب کہ یورپ میں انفرادیت (Individualism) نشاط پرستی (Hedonism) افادہ پرستی (Utilitarianism) مادہ پرستی (Materialism) اور روشن خیالی (Liberalism) کے مختلف النوع اور اکثر متضاد نظریہ رکھنے والے فلسفیانہ مکتبہ ہائے فکر پر وادان چڑھ رہے تھے، سرمایہ داری کے مختلف پہلوؤں پر ان فلسفوں کا اثر پڑا اور ان کے زیر اثر مختلف قسم کے مفروضے سرمایہ دارانہ معاشیات میں در آئے۔ محرک منافع کے مفروضہ کی تہہ میں یہ خیال کار فرما ہے کہ ہر فرد اپنے مفاد کو بخوبی جانتا ہے اور وہ صرف اس قسم کے اعمال میں دلچسپی رکھتا ہے جس سے اس کا کسی قسم کا مفاد وابستہ ہو۔ ایڈم اسمتھ کا خیال تھا کہ اپنے مفاد کا خیال، انسانی عمل کے لئے بہترین محرک ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے اپنے مفاد کی نگہبانی کرے اور اس کے لئے کوشاں رہے تو یہ حیثیت مجموعی پورے سماج کا مفاد نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ بیش ترین بھی ہوگا۔ معاشیات کے قسمن میں مفاد کا مفہوم منافع سے لیا گیا۔ جو پیدا کاروں کے عمل کے لئے تحریک کا باعث ہے لیکن دوسرے طبقات بھی اپنے اپنے مفاد کی نگہداری کرتے ہیں۔ سرمایہ دار کا مفاد اس میں ہے کہ وہ مزدور کو کمترین مزدوری کی شرح دینے کی کوشش کرے، مزدور کا مفاد اس میں ہے کہ وہ بیش ترین مزدوری حاصل کرنے کی کوشش کرے، تا جہر طبقہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی اشیاء کے لئے زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کر سکے لیکن خریدار اس کے برعکس کم سے کم قیمت پر اشیاء حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان متضاد مقاصد کے درمیان مفاہمت اور تامل، میل، بازار کی قوتوں، طلب اور رسد کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے جس کو ایڈم اسمتھ نے غیر مرئی ہاتھوں (Invisible Hands) سے تعبیر کیا ہے گویا کچھ نظر نہ آنے والے ہاتھ ہیں جو ان مخالف اور متضاد قوتوں کے درمیان توازن پیدا کرتے ہیں اور ان سے سماجی فلاح کے وہ کام لیتے ہیں جو ابتداءً ان کا مقصود نہ تھا۔ اس طرح سرمایہ دار اور مزدور دونوں ایک متوازن شرح مزدوری، پر مشفق ہو جاتے ہیں کیونکہ اتفاق نہ ہونے کی صورت میں دونوں کا نقصان ہے۔

### حکومت کی عدم مداخلت یا کمترین مداخلت

سرمایہ دارانہ معیشت کا کلاسیکی تصور معاشی دائرہ کار میں حکومت کی عدم مداخلت کے اصول پر قائم تھا۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے اولین فلسفیوں اور پیغامبروں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ نظام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ اگر ہر شخص اپنے اپنے مفاد کی تحریک سے عمل پذیر ہو تو اس کے ذریعہ بیش ترین سماجی فلاح اپنے آپ ہی حاصل ہو جائے گی۔ اس صورت میں انفرادی فلاح اور سماجی فلاح میں تصادم نہ ہوگا اور آزاد قیمتوں کا نظام تمام معاشی وسائل کی بحسن و خوبی تقسیم اور مختلف اشیاء و خدمات کی کارگزار پیداوار میں کامیاب ہوگا۔ ہر معاشی وسیلہ کو اس کی خدمت کا بیش ترین معاوضہ حاصل ہوگا۔ ہر شے اور خدمت کمترین لاگت پر پیدا کی جائے گی۔ تمام معاشی وسائل بروئے کار لائے جائیں گے، ہر شخص کو روزگار ملے گا، اس صورت حال میں حکومت کی جانب سے معاشی دائرہ کار میں مداخلت کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ اگر حکومت کی جانب سے کوئی مداخلت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آزاد قیمتوں کے نظام میں بے ترتیبی اور گڑبڑی پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ بے ترتیب ہونے کے بعد نظام قیمت وہ تمام وظائف بحسن و خوبی انجام نہیں دے سکتا جو اس نظام معیشت کے تحت اسے تفویض کئے گئے ہیں۔ چنانچہ آزاد کاروباری معیشت کی عمدہ ترین کارکردگی کے لئے بہتر یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت یا تو بالکل نہ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کمترین ہو۔ اس پالیسی کو ایک لاطینی لفظ Laissez Faire (یعنی آزاد چھوڑ دو) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ریاست کو انفرادی معاشی اور تجارتی اعمال میں مداخلت سے احتراز کرنا چاہیے اور بازار میں طلب و رسد کی قوتوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔

آزاد کاروبار کی پالیسی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکومت کسی بھی قسم کے معاشی کام انجام نہیں دے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت قیمتوں اور مزدوری، شرح سود، شرح لگان وغیرہ پر کسی طرح کا کنٹرول نافذ نہیں کرے گی اور اپنے اعمال کو صرف ان وظائف تک محدود رکھے گی جو ناگزیر سمجھے جاتے ہیں۔ ایڈم اسمتھ نے اپنی کتاب ”دولت اقوام“ میں حکومت کے معاشی افعال و اعمال کے لئے مندرجہ ذیل امور کی نشان دہی کی ہے۔

۱- آزاد سرمایہ دارانہ معیشت میں حکومت دفاعی ذمہ داریاں سنبھالے گی اور ملک کے دفاع کے لئے انتظام کرے گی، اسی طرح میں ملک میں امن و امان قائم رکھنا اور قانون و انتظام (Order Law) کی عمل داری کے وظائف کو سرانجام دینے کے لئے بنائے رکھنا بھی حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔ ان تمام وظائف کو انجام دینے کے لئے وسائل کی ضرورت ہوگی تاکہ فوج، پولیس، جیل خانے اور عدالتی نظام قائم کیا جائے اور ان کو جاری رکھا جاسکے، فوج اور پولیس کے لئے ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی۔ حکومت یا تو یہ ہتھیار اور اسلحہ جات خود پیدا کرے گی یا ان کو بازار سے خریدے گی، دونوں صورتوں میں حکومت کو ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے معاشی وسائل درکار ہوں گے۔ اور ان وسائل کے

حصول کی خاطر حکومت کو معیشت میں مداخلت کرنا پڑے گی۔

۲- سرمایہ دارانہ معیشت میں نجی کاروباری زمرہ بہت سی سماجی ضروریات کو پورا نہ کر سکے گا کیونکہ یہ ضروریات کسی ایک فرد کی نہیں ہوتی ہیں بلکہ سارے سماج کی ہوتی ہیں۔ جیسے سڑکوں کی تعمیر، شہر کی سڑکوں پر روشنی اور صفائی کا انتظام، دریاؤں پر پل اور باندھ کی تعمیر، سیلاب اور دوسری ارضی و سماوی آفات سے بچاؤ کی تدابیر وغیرہ۔ یہ تمام ضروریات سماجی ضروریات ہیں اور ان کی تسکین کرنے والی سہولیات کو ہم سماجی اشیاء (Social Goods) کہتے ہیں۔ چونکہ ان اشیاء سے کسی خاص شخص یا کسی خاص علاقے کو فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ سارے سماج، یا سارے علاقے کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے کوئی ایک شخص ان تمام سہولیات کی لاگت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اہم ضروریات پوری نہ ہو سکیں گی۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری قبول کرے اور ان کی فراہمی کی خاطر مناسب معاشی وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے۔

۳- مندرجہ بالا وظائف کے ساتھ ساتھ حکومت کو وہ تمام معاشی اعمال بھی سرانجام دینے چاہیے جو افراد اپنے نجی کاروبار کی وجہ سے نہ کر سکیں یا اتنی مقدار میں نہ کر سکیں جتنی کہ اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو۔ مثلاً یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ تعلیم ضروری چیز ہے اور انسانوں کو امیر و غریب کی تفریق کیے بغیر تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے تو ریاست کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کا بندوبست کرے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر عوامی ذرائع سے تعلیم کا بین قائم کرے۔ اسی طرح اگر کسی چیز کی پیداوار کے لئے نجی سرمایہ دار اس سبب سے کارخانہ نہیں لگا سکتے کہ اس کے لئے جتنی بڑی تعداد میں وسائل کی ضرورت ہے ان کا مہیا کرنا ممکن نہیں ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔

### سرمایہ دارانہ معیشت کی خرابیاں

سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات کو جان لینے کے بعد یہ امر ہمارے لئے آسان ہو گیا ہے کہ اس معاشی نظام میں کون کون سی خرابیاں اور کمیاں ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

#### الف- آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم

سرمایہ دارانہ معیشت میں آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم پائی جاتی ہے۔ چونکہ ذرائع پیداوار افراد کی نجی ملکیت میں رہ سکتے ہیں اور حق ملکیت پر کسی طرح کی حد عائد نہیں کی جاتی، اس لئے چند افراد یا چند صنعتی گھرانے ملک کی دولت کے بڑے حصے پر قابض ہو جاتے ہیں اور ملک کی اکثریت کے حصے میں نہایت قلیل وسائل آتے ہیں۔ وراثت کے حق کے ذریعہ آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کو قائم رہنے میں مزید مدد ملتی ہے اور بسا اوقات اس تفاوت میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

#### ب- اجارہ داریوں کا ظہور

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی مسلمات میں سے ایک مسئلہ مکمل مسابقت کا وجود ہے۔ یعنی اشیائے پیداوار اور ذرائع پیداوار، دونوں بازاروں میں مکمل مسابقت پائی جاتی ہو۔ لیکن مسابقتی بازار بہت دنوں تک قائم نہیں رہتے۔ تاریخی طور پر یہ ہوتا رہا ہے کہ غیر کارگزار کاروباری ادارے (Inefficient Business) بازار سے ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور صرف کارگزار ادارے ہی باقی رہتے ہیں۔

ان کارگزار اداروں میں سے بہترین اداروں کو زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں، تکنیکی ترقی کرتے ہیں جس سے ان کی فی اکائی لاگت کم ہوتی جاتی ہے۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے وہ بازار پر حاوی ہوتے جاتے ہیں تا آنکہ وہ اجارہ دار بن جاتے ہیں، مختلف بازاروں میں اجارہ داریوں کے ظہور کے بعد سرمایہ دارانہ معیشت اور نظام قیمت کے حق میں دیئے گئے وہ دلائل کمزور پڑ جاتے ہیں جن کی بنیاد مکمل مسابقت پر رکھی گئی ہے۔

#### ج- سماجی فلاح کا زیاں

سرمایہ دارانہ معیشت کے ناقد اس پہلو پر بہت زور دیتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں بیش ترین سماجی فلاح کا حصول نہیں کیا جاسکتا۔ اس

کے دو سبب بیان کیے جاسکتے ہیں، اول تو اجارہ داری کے باعث اجارہ دار کو معمولی منافع کے بجائے ”خالص اجارہ دارانہ منافع“ (Net Monopoly Profits) حاصل ہوتے ہیں جن سے اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور اجارہ دار استحصال کرنے کی پوزیشن میں آجاتا ہے، دوم یہ کہ محرک منافع کے باعث نظام قیمت، وسائل کی تقسیم صرف نفع آور کاروباروں میں کرتا ہے اور اس کے لئے سماجی فلاح کی چنداں پروا نہیں کی جاتی، اس طرح سماجی نقطہ نظر سے ضرر رساں معاشی اعمال کی سرپرستی ہو سکتی ہے اگر وہ نفع آور ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے نقاد کہتے ہیں کہ نظام قیمت اور محرک منافع سماج کے وسائل کی صحیح تقسیم نہیں کرتے بلکہ ان کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ بہت سی بنیادی ضروریات تشہہ تکمیل رہ جاتی ہیں۔ اور وسائل غیر ضروری تیشات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں وسائل کا صحیح اور بھرپور استعمال نہیں ہو پاتا جس سے سماجی فلاح کا زیاں ہوتا ہے۔

## د- تجارتی چکروں کا وجود

سرمایہ دارانہ معیشت کی ایک بڑی خرابی تجارتی چکروں کا وجود ہے، تجارتی چکر سے ہماری مراد معاشی عمل میں متدائرا تار چڑھاؤ (Cyclical Fluctuations in Economic Activity) سے ہے۔ مختلف ممالک میں سرمایہ دارانہ معیشت کا تاریخی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کی ترقی ہموار، سطری (Linear) اور یکساں نہیں ہوتی ہے بلکہ مختلف زمانوں میں رفتار ترقی کم اور تیز ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ کبھی کبھی معاشی پس روی کار جان بھی پیدا ہو جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں معیشت، اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتی رہتی ہے، کبھی خوش حالی (Prosperity) کا دور آتا ہے اور کبھی بد حالی (Depression) کا۔ خوش حالی کے دور میں روزگار، آمدنی، مانگ، قیمتیں، مزدوری اور دوسرے معاشی اشاریے (Indicators) تیزی سے اضافہ کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں، لیکن بد حالی کے دور میں مانگ کم ہو جاتی ہے جس سے پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ روزگار کم ہو جاتا ہے اور بے روزگاری میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

آمدنی، منافع، قیمتیں، اور مزدوری بھی گھٹنے لگتی ہیں۔ اس طرح خوش حالی اور بد حالی کے دور پلٹ پلٹ کر آتے رہتے ہیں اور ان کے سہارے ہی سرمایہ دارانہ معیشت ترقی کرتی رہتی ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت اپنی تمام تر تکنیکی ترقیوں اور معاشی پالیسی کے نئے نئے طریقوں کے باوجود بھی، اضافہ قیمت (Inflation) اور بے روزگاری (Unemployment) جیسے سماجی مسائل کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

## اشتراکی معیشت

اشتراکی معیشت، سماجی معیشت کی دوسری قسم ہے۔ اس کی امتیازی خاصیت مرکزی منصوبہ بند معیشت (Centrally Planned economy) یا منصوبہ بندی کا قیام ہے۔ اشتراکیت کے فلسفہ کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ سماج میں جاگد اد کی نجی ملکیت ہونے کے بجائے مشترکہ ملکیت ہونا چاہیے۔ گو کہ فلسفہ اشتراکیت کی ابتدائی بنیادیں افلاطون کی خیالی ریاست میں تلاش کی جاسکتی ہیں لیکن سائنسی اشتراکیت کی بنیاد کارل مارکس اور اینگلس کے معاشی افکار کے ذریعہ پڑی۔ کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کی سائنسی تنقید کی اس کے نزدیک سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ نجی ملکیت اور محرک منافع کے ذریعہ مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ مارکسی مکتبہ خیال کے مطابق کسی چیز کی قدر کا تعین صرف محنت سے ہوتا ہے اور جملہ ذرائع پیداوار میں صرف محنت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں قدر کی تخلیق کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پیدا شدہ ذرائع پیداوار مثلاً مشین وغیرہ اس قدر کو صرف منتقل کر سکتے ہیں تخلیق نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا صرف محنت کے لئے ممکن ہے، اس لئے کل پیداوار پر (یعنی وہ قدر جس کی تخلیق دوران پیداوار کی گئی) صرف محنت کا حق ہے۔ لیکن سرمایہ دار، مزدوروں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ (یعنی کل پیداوار) نہیں دیتے۔ اس کے برعکس وہ مزدوری کی شکل میں کل پیداوار کا ایک نہایت قلیل حصہ نکالتے ہیں اور بقیہ منافع کی شکل میں خود رکھ لیتے ہیں۔ مارکس اس منافع کو فاضل قدر کہتا ہے۔ اس کو فاضل قدر اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ یہ قدر کی اس مقدار سے زیادہ ہے جس کی مزدور کو اپنا جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے ضرورت ہے، چنانچہ منافع کی شکل میں سرمایہ دار محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں، اور اپنا منافع بیش از بیش کرنے کے لئے محنت کشوں کی مزدوری کی شرح میں کمی کرتے ہیں۔ ان کے اوقات کار میں اضافہ کرتے ہیں، نئی مشینیں لا کر محنت کشوں کی تعداد میں تخفیف کرتے ہیں تاکہ اجرت کے طور پر دی جانے والی کل رقم میں کمی کی جاسکے۔ اس طرح مختلف طریقوں سے سرمایہ دار محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں۔

سرمایہ دار اور محنت کش دو مختلف طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کے مفادات ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس طرح طبقاتی آویزش کی راہ کھل جاتی ہے۔ دوسری جانب سرمایہ داروں کے بیش ترین منافع حاصل کرنے کی تحریک اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنے کی خواہش کے سبب پیداواری نظام بھی ابتری اور بے نظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مارکس کے خیال میں محنت کشوں کے استحصال کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ محنت کش طبقہ، سرمایہ دار طبقہ کے خلاف طبقاتی جدوجہد کی راہ اپنائے اور انقلاب کے ذریعہ سرمایہ دار طبقہ کی حکومت کو اکھاڑ پھینکے۔ انقلاب کے بعد اشتراکی معیشت قائم کی جائے گی جس میں معاشی وسائل اور جائیداد کی انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے گا کیونکہ اشتراکی مفکرین کی نظر میں وسائل پیداوار کی انفرادی ملکیت ہی سرمایہ دارانہ نظام کی بے تربیتی اور خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

مارکس نے اپنی تحریروں میں اس بات کی چنداں وضاحت نہیں کی کہ ایک اشتراکی معیشت کس طرح کام کرے گی کیونکہ ان کے سامنے اشتراکی معیشت کا کوئی اصل نمونہ موجود نہ تھا۔ مارکس کے عرصہ حیات میں ساری دنیا میں سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہی نافذ تھا، دنیا کی پہلی اشتراکی معیشت روس میں اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے بعد قائم ہوئی جس کی نظریاتی بنیادیں کارل مارکس کے سماجی و معاشی فلسفے نے فراہم کی تھیں۔ گوکہ بیسویں صدی میں بہت سی اشتراکی ریاستیں وجود میں آئیں لیکن ان کے درمیان اشتراکیت کی تفصیلات اور اشتراکی فلسفہ کی تعبیرات میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا تھا، ایک زمانہ تک سوویت روس اشتراکی ریاست کا ایک مکمل نمونہ رہی، ذیل میں ہم اشتراکی ریاست کا جو تجربہ کریں گے وہ سوویت روس کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اشتراکی ریاست کے ایک مجرد تصور کی بنیاد پر قائم ہوگا۔

## اشتراکی معیشت کے بنیادی خدوخال

اشتراکی معیشت کو سرمایہ دارانہ معیشت سے ممتاز و ممیز کرنے کے لئے ہم یہ فرض کریں گے حکومت منصوبہ بندی کے مقاصد تعین کرتی ہے۔ تمام وسائل پیداوار حکومت کی ملکیت میں ہیں اور مختلف صنعتوں کے درمیان محنت کی تقسیم حکومت کے حکم سے ہوتی ہے، اس قسم کی معیشت میں کسی معیشت کے بنیادی مسائل منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کیے جاتے ہیں مثلاً کن چیزوں کی پیداوار کی جائے، اس کا فیصلہ مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کرتا ہے، صارفین کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی ترجیحات کے ذریعہ پیداوار کی ترجیحات طے کریں، کس طریقے سے پیداوار کی جائے اور پیداوار کس کے لئے کی جائے اس کا فیصلہ بھی حکومت منصوبہ کمیشن کے ذریعہ سے ہی کرے گی، اشتراکی معیشت کے بنیادی خدوخال مندرجہ ذیل ہیں۔

### ۱- وسائل پیداوار کی سماجی ملکیت

سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع پیداوار کی ملکیت انفرادی ہوتی ہے لیکن اشتراکی معیشت میں کسی فرد کو ذرائع پیداوار کا مالک بننے کا حق نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام ذرائع پیداوار پورے سماج کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں، چونکہ حکومت سماج کا سب منظم نمائندہ ہے اس لئے وسائل پیداوار حکومت کے زیر نگرانی ہی رہتے ہیں۔ اس طرح تمام کارخانوں، کھیتوں اور پیداواری اکائیوں پر کسی نہ کسی قسم کا اجتماعی کنٹرول ہوتا ہے، اشتراکی معیشت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ پیداواری اکائی پر براہ راست حکومت کا ہی کنٹرول ہو۔ اجتماعی ملکیت کی دوسری شکلیں، مثلاً امداد باہمی اور اجتماعی کمیٹی وغیرہ بھی بعض اشتراکی ممالک میں رائج ہیں۔ لیکن کسی فرد کو بذات خود ذرائع پیداوار کا مالک بننے کا حق اشتراکی معیشت میں نہیں ہوتا۔

### ۲- منافع کے بجائے سماجی فلاح کے لئے پیداوار

سرمایہ دارانہ نظام میں منافع حاصل کرنے کے لئے پیداوار کی جاتی ہے۔ اس طرح پیداوار کا محرک ہی منافع ہے، اشتراکی معیشت میں چونکہ وسائل پیداوار پورے سماج کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے اس معاشی نظام میں پیداوار کا مقصد منافع حاصل کرنے کے بجائے سماجی فلاح کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ضمن میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس طرز معیشت میں ہر اس چیز کی پیداوار کی جائے گی جس میں منافع کمانے کا امکان ہو۔ لیکن اشتراکی معیشت میں ایسا نہیں ہوگا اور صرف انہیں اشیاء کی پیداوار کی جائے گی جن کی پیداوار کو سماجی نقطہ نظر سے ضروری سمجھا جائے۔ مثلاً یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف قسم کے سامان تعیش مثلاً رنگین ٹیلی ویژن یا ریفریجریٹر یا دوسری اشیاء صرف کی پیداوار کم کی جائے یا بالکل نہ کی جائے کیونکہ منصوبہ بندی کمیشن کا خیال یہ ہے کہ ملک کو اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لئے بھاری مشینوں کا کارخانہ لگانا چاہیے یا فولاد اور سمنٹ کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنا چاہیے وغیرہ، مختصر یہ کہ تمام معاشی فیصلوں کی بنیاد، انفرادی منافع کے بجائے سماجی فلاح و بہبود پر ہوتی ہے۔

## ۳- مرکزی معاشی منصوبہ بندی

سرمایہ دارانہ نظام میں تو تمام معاشی فیصلے لامرکزی (Decentralized) ہوتے ہیں کیونکہ یہ افراد کے ذریعے کیے جاتے ہیں، اشتراکی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام میں معاشی فیصلوں کی مرکزیت ہوتی ہے، اس مقصد کے لئے ملک میں ایک مرکزی منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا جاتا ہے، (اس کو مرکزی کہنا اس لئے ضروری ہے کہ ایک ہی ملک میں مختلف علاقوں میں علاقائی منصوبہ بندی کمیشن بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے اور ان کے تمام فیصلے مرکزی منصوبہ کمیشن کے فیصلوں کے تابع رہتے ہیں) مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کا خاص کام ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے منصوبہ تیار کرنا ہوتا ہے، یہ منصوبہ کسی خاص مدت کے لئے تیار کیے جاتے ہیں، جیسے پانچ سالہ منصوبہ، سات سالہ منصوبہ، دس سالہ منصوبہ یا بیس سالہ منصوبہ، منصوبہ ایک ایسی معاشی دستاویز ہے جس کے ذریعہ اشتراکی ریاست کی معاشی زندگی میں ترتیب اور نظم و ضبط پیدا کیا جاتا ہے۔

ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں قلیل وسائل کی تقسیم کا کام نظام قیمت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اشتراکی معیشت میں یہی کام منصوبہ بندی کے ذریعہ سرانجام پاتا ہے۔

ہر منصوبہ کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں، مثلاً تیز رفتار معاشی ترقی، صنعت کا پھیلاؤ۔ درآمد میں کمی، برآمد کا فروغ وغیرہ۔ ان مقاصد کا تعین حکومت کرتی ہے۔ منصوبہ بندی کے ماہرین ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص حکمت عملی وضع کرتے ہیں جس کے ذریعہ ان اعلان شدہ مقاصد کو حاصل کیا جاسکے۔ ان تمام مقاصد کو ٹھوس نشانوں (Targets) میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ پوری معیشت کے لئے پھر ہر زمرے کے لئے، بعد میں ہر صنعت، اور ہر صنعتی اکائی کے لئے الگ الگ نشانے مقرر کئے جاتے ہیں۔ ان نشانوں کو حاصل کرنے کے لئے مختلف زمروں اور صنعتوں میں وسائل وقف کیے جاتے ہیں، اس طرح منصوبے کے ذریعہ یہ اہم معاشی مسائل کہ کن چیزوں کی پیداوار کی جائے اور کس طرح کی جائے طے کیے جاتے ہیں، پیداوار کی تقسیم کا مسئلہ بھی منصوبے کے اندر یہی طے ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کتنے مزدی لوگوں کو اس منصوبہ میں روزگار فراہم کیا جائے گا اور ان کی اجرتوں اور آمدنیوں کی سطح کیا ہوگی۔ اس طرح اشتراکی معیشت کا مرکزی معاشی منصوبہ ملک کی پوری معاشی زندگی اور اس کے مختلف جہتوں کا احاطہ کرتا ہے، منصوبہ بندی کو اشتراکی طرز زندگی میں واقعی ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

## ۴- معاشی مساوات

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بڑی خرابی دولت اور آمدنی کی تقسیم میں عدم مساوات کی موجودگی ہے۔ اس عدم مساوات کا سب سے بڑا سبب ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ہے۔ اشتراکی معیشت میں ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہے اس لئے آمدنی اور دولت میں نابرابری کا ایک بڑا سبب ختم ہو جاتا ہے، اجتماعی ملکیت کے سبب اگر آمدنی کی نابرابری کا مکمل خاتمہ نہیں ہو جاتا تو بھی اس میں بڑی حد تک مساوات لے آئی جاتی ہے۔ اشتراکی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح یہ ناہمواری نہیں پائی جاتی کہ معاشی طاقت کا ارتکاز صرف چند ہاتھوں یا چند گھرانوں میں ہو۔ چند افراد کروڑ پتی اور ارب پتی ہوں لیکن لاکھوں دوسرے افراد غربت اور محرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے جائیں۔ اشتراکی طرز معیشت، سماج کے ہر فرد کو ایک کم از کم معیار زندگی حاصل کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ ہر اس شخص کو روزگار فراہم کرنے کی ذمہ داری ریاست اپنے سر لیتی ہے جو کام کرنے کے لائق ہے اور کام کرنا چاہتا ہے، سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح اشتراکی معیشت میں بے روزگاروں کی فوج نہیں بنتی۔ چونکہ ہر شخص کو روزگار فراہم کیا جاتا ہے اس لئے وہ آمدنی بھی حاصل کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے کنبہ یا دوسرے لوگوں کی جو اپنی ضروریات کے لئے اس پر منحصر ہوں، کفالت کر سکتا ہے۔ ریاست ایک لائق تماش بین کارول اپنانے کے بجائے ایک مربیانہ اور فلاحی نقطہ نظر اپناتی ہے۔ ریاست ہر اس شخص کی کفالت کا ذمہ لیتی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنی روزی کمانے کے لائق نہیں ہے۔ اس طرح چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور معذور لوگوں کی دیکھ بھال ریاست خود کرتی ہے۔

اشتراکی معیشت کے سلسلے میں معاشی مساوات کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس طرح کے معاشی نظام میں مکمل معاشی مساوات نہیں ہوتی۔ یہ فرض کر لینا غلط ہوگا کہ اشتراکی نظام میں ایک صنعتی مزدور اور ایک ایٹمی سائنس دان کو یکساں تنخواہ ملتی ہوگی۔ صنعتی مزدور اور ایٹمی سائنس دان الگ الگ کام کرتے ہیں۔ ان کے کاموں کی نوعیت مختلف ہے۔ ان کاموں کو کرنے کے لئے جس لیاقت اور تربیت کی ضرورت ہے

ووجہی مختلف ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کو اپنی اپنی لیاقت اور کارکردگی کے اعتبار سے تنخواہ دی جائے گی اور اس میں کسی مصنوعی یکسانیت اور برابری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ان کی آمدنیوں میں کسی مصنوعی طریقے سے مکمل برابری پیدا کر دی بھی جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ بات معاشی منطق اور عقل سلیم کے خلاف ہوگی بلکہ اس کے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو زیادہ پیچیدہ اور مشکل کام کرتا ہے اور جس کو اس کی اہلیت اور لیاقت کی مناسبت سے معاوضہ نہیں دیا جا رہا ہے، کام میں دلچسپی لینا چھوڑ دے گا، اس کی پیدا آوری گھٹتی جائے گی اور بالآخر اس سے قومی پیداوار کا نقصان ہوگا۔ اس طرح مصنوعی برابری بجائے سود مند ثابت ہونے کے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس لئے معاشی نظام کے چلانے والوں کے لئے اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ فطرت نے انسانوں کو یکساں نہیں پیدا کیا بلکہ ان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں تفاوت اور نا برابری پیدا کی ہے، معاشی مساوات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی فطری مناسبت، رجحان اور لیاقت کے لحاظ سے اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی شخصیت کا پورا ارتقا کر سکے، اور اس عمل کے دوران سماجی فلاح میں بھی اضافہ کرے۔

## ۵۔ معاشی نمو اور معاشی ترقی

اشتراکی معیشت میں مرکزی معاشی منصوبہ بندی کا عام طور پر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کو معاشی نمو اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ اشتراکی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح معاشی اتار چڑھاؤ نہیں ہوتے کیونکہ مانگ اور فراہمی کی قوتیں آزادانہ ہو کر منصوبہ کے تابع رہتی ہیں، منصوبہ بندی کے ماہرین معیشت کے مستقبل کے لئے ایک راہ متعین کرتے ہیں اور ایسی حکمت عملی وضع کرتے ہیں کہ معیشت اسی راہ پر گامزن رہے۔ اس لئے آئندہ برسوں میں معیشت کی رفتار ترقی کی شرح کیا ہوگی۔ اس شرح کو حاصل کرنے کے لئے کئی کتنی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔ یہ سرمایہ کاری مختلف صنعتوں کے درمیان کس طرح منقسم ہوگی۔ ان تمام سوالوں کا جواب منصوبہ میں رہتا ہے۔ اس لئے معاشی ترقی۔ بجائے آزادانہ چھو بڑی کے منصوبہ بند طریقہ سے ہوتی رہتی ہے۔

معاشی ترقی کے سلسلے میں اشتراکی معیشت کو منصوبہ بندی سے ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ معیشت کی ترقی ناہموار طریقے سے نہیں بلکہ متوازن طریقے سے ہوتی ہے۔ مختلف زمروں اور مختلف علاقوں کے درمیان کسی طرح عدم توازن (Imbalance) نہیں رہتا۔ اگر کچھ عدم توازن رہتا بھی ہے تو اس کی حیثیت منصوبہ بند عدم توازن (Planned Imbalance) کی ہوتی ہے جس کو کسی آئندہ منصوبہ میں مناسب پالیسی اختیار کر کے آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے۔

## ۵۔ اشتراکی معیشت میں انفرادی آزادی

بعض ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے اشتراکی معیشت میں انفرادی آزادی اور بالخصوص انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) کی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے۔ اگر اشتراکی معیشت کا معروضی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس نظام معیشت میں بھی انتخاب کی آزادی موجود ہے لیکن فرق یہ ہے کہ انتخاب کی آزادی، مطلق ہونے کے بجائے محدود ہوتی ہے اور ہنگامی حالات کی صورت میں ہمیشہ سماجی مصالح کے تابع رہتی ہے۔ اشتراکی معیشت کا ایک اصول یہ ہے کہ ایسے تمام فیصلے، جن کا اثر دوسرے افراد پر پڑتا ہو، اجتماعی طور پر کیے جانے چاہیے تاکہ دوسرے افراد کے مفادات کا تحفظ ہو سکے اور کوئی ایک فرد، دوسرے افراد کو ان کے جائز حقوق سے محروم نہ کر دے، چنانچہ اس اصول کے تحت کسی فرد کو دوسرے فرد کے معاشی استحصال کی آزادی نہیں ہے، وہ خود محنت کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے فرد کی محنت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ معاشی استحصال کے خاتمہ کی خاطر ہی وسائل پیداوار اجتماعی ملکیت میں رکھے جاتے ہیں تاکہ سماج کا ہر فرد بشران کی برکات سے متمتع ہو سکے اور کوئی بھی محروم نہ رہے۔

مثال کے طور پر صرف کے انتخاب کی آزادی (Freedom to Choose Consumption) کو ہی لیجئے۔ اشتراکی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح صارفین کو حاکمیت تو حاصل نہیں ہے لیکن پیدا شدہ اشیائے صرف میں سے کن اشیاء کا اور کتنی مقدار میں انتخاب کریں، یہ حق صارفین کو حاصل ہے۔ لیکن کن چیزوں کی پیداوار کی جائے۔ اس کا تعین صارفین کی ترجیحات سے ہونے کے بجائے منصوبہ کے مقاصد سے ہوتا ہے۔ اس طرح انتخاب کا حق محدود ہے کہ وہ صرف مہیا شدہ اور پیدا شدہ اشیاء میں سے ہی انتخاب کر سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر اس حق کو بھی سلب

کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جنگ کے زمانہ میں مکمل راشننگ نافذ کر دی جائے اور صارفین کو اس بات کا حکم دیا جائے کہ وہ صرف فلاں فلاں اشیاء مقررہ مقدار میں استعمال کریں۔ (لیکن زمانہ جنگ میں ایسا تو سرمایہ دارانہ ممالک میں بھی کیا جاتا ہے)۔ اسی طرح افراد اپنی آمدنی میں سے کتنا صرف کریں اور کتنی بچت کریں۔ اس کا حق بھی انھیں ہے۔ لیکن وہ اپنی بچت کو صرف اپنے اوپر خرچ کر سکتے ہیں، اس سے مزید آمدنی حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کاری نہیں کر سکتے۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اشتراکی معیشت میں انفرادی آزادی تو ہے لیکن وہ مطلق ہونے کے بجائے محدود ہے۔

### مخلوط معیشت (Mixed Economy)

ایک معاشی نظام کے طور پر مخلوط معیشت، سرمایہ دارانہ معیشت اور اشتراکی معیشت کے انتہا پسندانہ راستوں کے مقابلہ میں ایک درمیانہ راہ ہے۔ ایک مخلوط معیشت میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی، دونوں طرح کی معیشتوں کی کچھ نہ کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ نظری طور پر ایک مخلوط معیشت کی تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ خصوصیات کس تناسب سے ملائی گئی ہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی معروضی معیار مقرر نہیں ہے، یہ بین ممکن ہے کہ کسی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی صفات حاوی ہوں اور اشتراکی معیشت کی صفات نسبتاً کم ہوں۔ لیکن یہ مخلوط معیشت کہلائے گی، دوسری جانب یہ بھی ممکن ہے کہ کسی معیشت میں اشتراکی معیشت کی صفات غالب ہوں اور سرمایہ دارانہ معیشت کی صفات نسبتاً کم ہوں۔ لیکن ان دونوں قسم کی مخلوط معیشتوں کے درمیان تمیز و امتیاز دوسرے معیاروں کی بناء پر کیا جاسکے تو وہ دوسری بات ہے ورنہ دونوں مخلوط معیشت کہلانے کی مستحق ہیں۔ اس طرح صرف مخلوط معیشت کہہ دینے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کس نظام کی خصوصیات اس معیشت میں ممتاز ہیں اور یہ معیشت کس اعتبار سے کام کرتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ امریکہ اور چین کی معیشتیں بھی کسی نہ کسی حد تک مخلوط قرار دی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ یہ معیشتیں بھی درسی کتابوں کے معاشی نمونوں (Models) کی طرح جامع نہیں ہیں بلکہ تغیر پذیر، متحرک، نامیاتی اکائیاں ہیں جن میں ارتقائی عمل مسلسل جاری ہے۔ اس لئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکی معیشت میں بہت سی ایسی خصوصیات شامل ہو گئی ہیں جو ”خالص سرمایہ دارانہ نمونہ“ (Pure Capitalist Model) سے میل نہیں کھاتیں بلکہ اشتراکی نظام کا خاصہ ہیں۔ اسی طرح اشتراکی معیشت بھی معاشی دباؤ اور تجربہ کی روشنی میں بعض ایسی چھوٹیں دینے پر مجبور ہوئی ہے جن کا رابطہ اشتراکیت کے کلاسیکی فلسفہ سے کم ہی ہے، ان رجحانات کے پیش نظر نوبل انعام یافتہ سویڈش ماہر معاشیات جان ٹن برجن نے تو یہاں تک پیش گوئی کر دی ہے کہ اگر اشتراکی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام اسی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھتے رہے تو مستقبل میں یہ دونوں نظام ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں گے۔ ان کا یہ نظریہ ”نظریہ انضمام“ (Convergence Theory) کے نام سے مشہور ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا مباحث اور اس حقیقت سے قطع نظر کہ مخلوط معیشت کی ایک صحیح، جامع اور علمی تعریف کی راہ میں بہت سی منطقی دشواریاں حائل ہیں، ہم ذیل مخلوط معیشت کی صرف وہ خصوصیات بیان کریں گے جو ان ممالک میں عام طور پر پائی جاتی ہیں جنہوں نے اس طرز معیشت کو اپنا رکھا ہے۔

### مخلوط معیشت کے بنیادی خدوخال

مخلوط معیشت کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

#### ۱۔ حق ملکیت کا محدود ہونا

زیادہ تر ممالک میں جہاں مخلوط معاشی نظام رائج ہے، سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح جائیداد کی نجی ملکیت کا بھی حق ہے۔ افراد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کے مالک بنیں، اور اپنے وسائل کو کام میں لا کر اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں، لیکن مخلوط معیشت میں یہ حق لامحدود اور مطلق نہیں ہے۔ حکومت اس بات کا حق محفوظ رکھتی ہے کہ عوامی مفاد کی خاطر وہ نجی ملکیت کو قومی ملکیت میں لے لے۔ بعض ممالک میں خاص طور پر ان ممالک میں جہاں زراعت پر آبادی کا زیادہ دباؤ ہے، ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ زرعی زمینوں کی حق ملکیت کو محدود کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص مقررہ مقدار سے زیادہ زمین نہیں رکھ سکتا۔ موجودہ زمانے میں بہت سے ممالک میں اس طرح کی زرعی اصلاحات کی جارہی ہیں اور زرعی قابل

کاشت زمینوں کی ملکیت یا خرید و فروخت کے معاملہ کو بازار کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے حکومتوں کے ذریعہ حق ملکیت پر حد مقرر کرنے کی تجویز کافی عرصے سے زیر بحث رہی ہے گوکہ اب تک ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ریاست ایسا کرنا چاہے تو اسے اس بات کا حق ہے۔

## ۲- نجی اور عوامی زمرہ کار کا امتزاج

سرمایہ دارانہ معیشت میں اگر تقریباً سارا کاروبار نہ سہمی، تو اس کا ایک بہت بڑا حصہ نجی زمرہ میں ہوتا ہے، دفاعی اور اسی نوعیت کی دوسری معاشی سرگرمیاں جو حکومت سرانجام دیتی ہے استثنائی امور میں شامل کیے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایک معاشی نظام کے طور پر سرمایہ داری کے لئے نجی زمرہ کار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب اشتراکی معیشت میں ساری معاشی سرگرمیاں عوامی زمرہ میں ہوتی ہیں اور نجی زمرہ کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی، بالفرض محال، اگر افراد کو ان کی نجی حیثیت میں کسی پیداواری سرگرمی کی اجازت بھی دی جاتی ہے تو ان کو کسی نہ کسی اجتماعی شکل میں منظم کر دیا جاتا ہے۔ مخلوط معیشت کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس طرز معیشت میں نجی اور عوامی زمرہ ہائے کار شانہ بہ شانہ کام کرتے ہیں۔ عوامی زمرہ کار کا مفہوم ان معاشی سرگرمیوں سے ہے جن کی پیداواری اکائیاں، نجی ملکیت میں نہ ہو کر عوامی ملکیت میں ہوں۔ اس کی سب سے غالب شکل یہ ہے کہ حکومت ان اداروں کی ملکیت رکھتی ہو اور اپنے تنخواہ دار ملازمین سے ان کا انصرام کراتی ہو۔ عوامی زمرے کے وجود کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت اپنے آپ کو کلاسیکی ذمہ داریوں مثلاً دفاع، زری انصرام (Monetary Manegement) اور شہری سہولتوں (Civil Amenities) تک محدود رکھے۔ عوامی زمرہ کے وجود کا جواز یہ ہے کہ حکومت ایسی تمام صنعتوں کو اپنی تحویل میں رکھے جن کے لئے ایسا کرنا سماجی یا قومی نقطہ نگاہ سے ضروری ہو۔ بابا الفاظ دیگر جن سے سماجی فلاح کو فروغ ہو۔ ریاست کو وہ ضروری صنعتیں بھی عوامی زمرہ میں قائم کرنا چاہیے جن کے لئے نجی سرمایہ دار وسائل نہ مہیا کر سکیں۔

عوامی زمرہ کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت میں اضافہ ہو۔ اس نظام میں حکومت اپنے آپ کو صرف امن و امان قائم رکھنے، انصاف دلانے، یا ملک کا دفاع کرنے تک ہی محدود نہیں رکھتی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر پیداواری سرگرمیوں میں شریک ہوتی ہے۔ عام طور پر عوامی زمرے میں ایسی صنعتیں رکھی جاتی ہیں جو بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جیسے بھاری انجینئرنگ کا سامان، لوہا اور فولاد، سیمنٹ، تیل صاف کرنے کے کارخانے، ہوائی جہاز بنانے کا کارخانہ وغیرہ، بعض مالیاتی ادارے بھی عوامی زمرہ کار میں شامل ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی مخلوط معیشت قائم ہے۔ چنانچہ مخلوط معیشت کے فلسفہ سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے مندرجہ بالا بنیادی اور کلیدی اہمیت کے کارخانے عوامی زمرہ میں ہی شامل ہیں، نہ صرف یہ بلکہ حکومت نے بعض ایسی کمپنیاں بھی بنائی ہیں جن کی ملکیت اس کے پاس ہے، جیسے آئل انڈیا۔ انجینئرنگ انڈیا لمیٹڈ، بھارت ہیوی الیکٹریکلز وغیرہ، ہندوستان میں تو عوامی زمرہ کار نے اپنے آپ کو صرف بھاری اور کلیدی صنعتوں تک محدود نہ رکھ کر اشیائے صرف کی پیداوار میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ عوامی زمرے کے کارخانوں میں گھڑیوں، ڈبل روٹی، ٹھنڈے مشروبات اور دودھ جیسی روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی پیداوار بھی ہونے لگی ہے۔

نجی زمرے میں جو کمپنیاں ہوتی ہیں ان کا منافع ان کمپنیوں کو جاتا ہے، لیکن عوامی زمرے میں جو کمپنیاں ہوتی ہیں ان کا منافع حکومت کو ملتا ہے اور وہ اس منافع کی سرمایہ کاری کے لئے پروگرام وضع کرتی ہے۔

## ۳- ریاست کے فلاحی وظائف

مخلوط معیشت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ریاست بہت سے فلاحی وظائف انجام دیتی ہے، بہت سی ایسی ضروریات ہیں جن کی تکمیل نظام قیمت کے ذریعہ ہو سکتی ہے مثلاً تعلیم اور طبی سہولتیں، لیکن قیمتوں کا نظام اس بات کی ضمانت نہیں دے پاتا کہ ان خدمات کی پیداواریاتی مقدار میں ہو سکے جتنی کہ ضرورت ہے، چنانچہ ریاست اس بات کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ ان خدمات کے مہیا کرنے کے لئے اپنے وسائل وقف کرے اور ہر شخص کو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مواقع بہم پہنچائے۔ اسی نقطہ نظر کہ پیش نظر حکومتیں اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور اسپتال قائم کرتی ہیں کہ جو لوگ اپنے ذرائع سے تعلیم اور طبی دیکھ بھال جیسی خدمات نہیں خرید سکتے ان کو یہ ریاست کی جانب سے مفت مہیا کی جائے۔ (خیال رہے کہ معاشیات کے نقطہ نظر سے کوئی معاشی شے یا خدمت مفت نہیں ہو سکتی۔ فرق صرف اس بات کا ہے کہ اس کی قیمت کوئی اور ادا کرتا ہے۔ اس



مثال میں قیمت حکومت کی طرف سے ادا کی جاتی ہے۔ اسی طرح حکومت مختلف ایسے گروہوں کی دیکھ رکھ بھی اپنے ذمہ لیتی ہے جو معاشی طور پر خود کفیل نہ ہوں۔ مثلاً چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے مخصوص مراکز قائم کرنا، معذور افراد کی مدد کرنا، غریب طالب علموں کو تعلیمی وظائف دینا، ضعیفوں کو بڑھاپے کی پنشن دینا، بے کار لوگوں کو یونس دینا وغیرہ ان وظائف میں شامل ہیں۔

## ۴۔ آزاد کاروبار پر پابندیاں اور اجارہ داری کا کنٹرول

مخلوط معیشت میں عام طور پر کاروبار کی آزادی دی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت آزاد کاروبار پر مختلف قسم کی پابندیاں بھی عائد کرتی ہے تاکہ نجی کاروبار سماجی مقاصد کو بھی پورا کر سکیں۔ حکومت کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ بازار میں مسابقت کا خاتمہ نہ ہو جائے اور اجارہ داریوں کا ظہور ہو، جہاں کہیں اجارہ داریاں ظہور میں آجاتی ہیں حکومت ایسے قانون بنانے کی کوشش کرتی ہے کہ اجارہ دار اپنی پوزیشن کا غلط فائدہ نہ اٹھانے پائیں۔

## ۵۔ جمہوری منصوبہ بندی

گوکہ منصوبہ بندی مخلوط معیشتوں کی ایک لازمی خصوصیت نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے ممالک نے جن میں ترقی پذیر ممالک ممتاز ہیں، منصوبہ بند ترقی کی راہ کو اپنا لیا ہے۔ یہ منصوبہ بندی، سوشلسٹ ممالک کی مرکزی منصوبہ بندی سے قدرے مختلف ہوتی ہے کیونکہ اشتراکی ممالک کی منصوبہ بندی میں جبر (Coercion) کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اس کے برعکس مخلوط معیشتوں کی منصوبہ بندی جمہوری انداز کی ہوتی ہے اور منصوبہ کو صرف مشیرانہ (Advisory) حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

## ہندوستان کا معاشی نظام

آئیے اب ہم ان اصولوں کی روشنی میں اپنے ملک ہندوستان کے معاشی نظام کا جائزہ لیں، آپ یہ بات جانتے ہی ہوں گے، اور ہم بھی پچھلے صفحات میں نہیں اس کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ ہندوستان کا معاشی نظام بنیادی طور پر ایک مخلوط معیشت ہے جس میں سرمایہ دارانہ اور اشتراکی، دونوں قسم کے نظام ہائے معیشت کی خصوصیات کا امتزاج ہے، ذیل میں ہم ان خصوصیات کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں گے:

۱۔ ہندوستان کا آئین ہر فرد کو نجی جائیداد رکھنے کی آزادی دیتا ہے۔ اب تک اس پر کسی قسم کی حدود نہیں عائد کی گئیں۔ ہر فرد کو اپنی جائیداد کو استعمال کرنے، کاروبار کرنے، جائیداد خریدنے اور بیچنے کا بھی حق حاصل ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری معیشت کا ایک بڑا حصہ نجی زمرہ کار پر مشتمل ہے۔ اس نجی زمرہ کار میں زراعت اور صنعت کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ خدمات کے زمرے میں بھی نجی زمرہ کا خاصا بڑا حصہ ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خصوصیت سرمایہ دارانہ نظام کی ہے۔

۲۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ہماری معیشت میں بھی قیمتوں کے نظام کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے، اور نجی زمرہ کار کے لئے محدود معاشی وسائل کی تقسیم نظام قیمت کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، نجی زمرہ کار جس میں زراعت اور صنعت کا ایک بڑا حصہ شامل ہے، پیداوار کیسے کی جائے، کتنی مقدار میں کی جائے اور کس طرح کی تکنیک استعمال کی جائے یہ تمام فیصلے محرک منافع کی بنیاد پر نظام قیمت کے ذریعہ ہوتے ہیں۔

۳۔ ہندوستانی نظام معیشت میں، افراد کو صارفین کی حاکمیت حاصل ہے۔ وہ کن اشیاء کا صرف کریں، کتنی آمدنی صرف کریں، کتنی بچت کریں، اس بچت کی سرمایہ کاری کس طرح کریں، یہ سارے فیصلے افراد خود کرتے ہیں، یہ خصوصیت بھی سرمایہ دارانہ نظام سے لی گئی ہے۔

۴۔ سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح ہندوستان کی مخلوط معیشت میں افراد کو پیشوں کے انتخاب کی آزادی ہے۔ اشتراکی معیشت کی طرح یہاں پیشوں کا انتخاب ریاست نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس افراد پر یہ فیصلہ مبنی ہے کہ وہ کام کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر وہ کام کرنا چاہتے ہیں تو کس طرح کا کام کرنا چاہتے ہیں اور کون سا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔ ابھی چند برس پہلے تک ہندوستانی معیشت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ نجی زمرہ کار کی کارکردگی پر حکومت کا کافی حد تک کنٹرول ہے۔ صنعتی اداروں اور صنعت کاروں کو صنعت شروع کرنے سے پہلے حکومت سے لائسنس کی شکل میں اجازت لینا پڑتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ کسی نئی چیز

کی پیداوار بھی حکومت سے اجازت لئے بغیر شروع نہیں کر سکتے، نہ ہی اپنے پرانے کارخانے/کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں کوئی قابل لحاظ اضافہ کر سکتے تھے، حکومت کی منظوری کے بغیر وہ غیر ممالک سے کسی قسم کی مشینری بھی درآمد نہیں کر سکتے۔ معاشی اصلاحات کے زمانہ میں لائسنس کی شرط ختم کر دی گئی ہے۔

اس قسم کے براہ راست کنٹرول کے علاوہ حکومت معاشی سرگرمیوں میں مختلف بالواسطہ طریقوں سے بھی دخل دیتی ہے، مثلاً کسانوں کو امداد دینا، ان کو رعایتی داموں پر بیج، کھاد اور کیمیاوی کمادیں مہیا کرنا، کسانوں اور معاشی طور پر کمزور طبقات کو کم شرح سود پر قرضے دلوانا۔ مختلف صنعتوں کو مالی اور ٹیکنیکی امداد دینا، وغیرہ۔

۶- ہندوستانی معیشت میں سوشلسٹ نظام کا سب سے بڑا عنصر مرکزی منصوبہ بندی کا قیام ہے۔ اشتراکی ملکوں کی طرح یہاں بھی ایک مرکزی منصوبہ بندی کمیشن قائم ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کا کام یہ ہے کہ وہ ملک کی ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً طویل مدتی اور اوسط مدتی منصوبے تیار کرے۔ منصوبہ بندی کمیشن ملک کی معاشی صورت حال اور ملک میں ہونے والی معاشی تبدیلیوں کے متعلق معاشی تحقیقات کا کام بھی انجام دیتا ہے، ہمارے ملک میں معاشی پالیسی طے کرنے کا سب سے بڑا ادارہ قومی ترقیاتی کونسل (National Development Council) ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن منصوبہ تیار کرنے کے بعد قومی ترقیاتی کونسل کو پیش کرتا ہے جو اسے منظور کرتی ہے۔

منصوبہ بندی اور عوامی دونوں زمرہ ہائے کار کے لئے تیار کیا جاتا ہے، لیکن نجی زمرہ کار کے لئے صرف نشانے (Target) مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے کوئی مشینری مقرر نہیں ہے۔ عوامی زمرہ کار کے لئے جو منصوبے تیار کیے جاتے ہیں ان کو مختلف پروجیکٹوں میں تقسیم کر کے، متعلقہ وزارتوں اور ریاستی حکومتوں کو بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ ان پر عمل درآمد کرائیں۔

ہندوستانی منصوبہ بندی اور اشتراکی منصوبہ بندی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں منصوبہ ملک کی پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا ہے جو اس کو منظور کر کے ایک قانون (Act) کی شکل دے دیتی ہے چنانچہ اگر کسی فرم کا منیجر اس کے کارخانے کے لئے مقرر کردہ نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اس کو قانون کے تحت سزا دی جاسکتی ہے، اس کے ذریعہ منصوبہ بندی میں جبر کا عنصر داخل ہو جاتا ہے، ہمارے ملک میں منصوبہ بندی قطعی طور پر برضا کارانہ اور مشیرانہ ہے۔ اور اس کو قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اشتراکی ممالک میں تمام معاشی تغیرات (Economic Variable) جیسے سرمایہ کاری، آمدنی، بچت، صرف، شرح مزدوری، قیمتیں وغیرہ حکومت کے کنٹرول میں ہوتے ہیں، ہماری حیثیت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس بہت سے معاشی تغیرات آزاد ہیں اور نجی زمرے کو قومی معیشت میں ایک اہم رول دیا گیا ہے۔

۷- ہندوستانی معیشت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں آزاد قیمتوں کے نظام کے ساتھ ساتھ کنٹرول شدہ قیمتوں کا ایک نظام بھی کام کرتا ہے، زیادہ تر اشیاء کی قیمتیں تو کھلے بازار میں طلب اور رسد کے ذریعہ متعین ہوتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ بعض اہم اشیاء صرف کی قیمتیں حکومت مقرر کرتی ہے۔ مثلاً کم داموں پر غلہ فراہم کرنے کے لئے سستے غلے کی دوکانیں حکومت کی طرف سے چلائی جاتی ہے۔ حکومت بعض اہم تعمیراتی اشیاء مثلاً سینٹ اور فولاد وغیرہ کی قیمتیں بھی مقرر کرتی ہے، اس کے علاوہ عوامی زمرے میں پیدا ہونے والی اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرنا تو حکومت کی ذمہ داری میں شامل ہی ہے۔

## اسلامی معاشیات

### ایک تعارف

اسلامی معاشیات، علم معاشیات کی ایک واضح، متبادل اور ممتاز شاخ کے طور پر تیزی سے درجہ استناد حاصل کرتی جا رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں بعض مسلم ممالک نے اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی معاشی نظام کے قیام کو اپنی ریاستی پالیسی کا حصہ قرار دیا ہے، اس کے ساتھ ہی کچھ دوسرے متعلق میدانوں میں بھی اہم تبدیلیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک میں متعدد اسلامی مالیاتی اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ مغربی ایشیا میں واقع مسلم ممالک کی کئی یونیورسٹیوں نے اسلامی معاشیات کی باقاعدہ تدریس کا اہتمام کیا ہے۔ بعض برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں نے بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی خاطر لکھے جانے والے مقالات کے لئے اسلامی معاشیات سے متعلق موضوعات قبول کیے ہیں اور مکمل ہو جانے پر ان مقالات پر ڈگریاں عطا کی ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اسلامی معاشیات پر اعلیٰ درجہ کی تحقیقات کرنے کی غرض سے قومی اور بین الاقوامی تحقیقاتی اداروں کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔

اس ساری سرگرمی اور ہماہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں لوگوں کی دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اسلام، اس کے طرز زندگی اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں، لیکن معاشیات سے علمی دلچسپی رکھتے ہیں، اس قسم کے سوالات اٹھانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ کیا اسلام واقعی ایک متبادل سماجی و معاشی نظام پیش کرتا ہے جو سرمایہ داری اور سوشلزم سے مختلف ہے؟ کیا یہ موجودہ صنعتی تہذیب کی پیچیدگیوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ان سنگین مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے، جن کے سامنے ہم عصر سماجی فلسفے اپنے آپ کو مجبور محض پاتے ہیں؟ کیا اسلامی معاشیات جیسے کسی علم کا واقعی وجود ہے، یا ہو سکتا ہے، یا اس کی ضرورت ہے؟ وغیرہ۔

اس مقالہ کا مقصد اردو داں طبقہ کے سامنے اسلامی معاشیات اور اس کے موضوعات کا ایک تعارف پیش کرنا ہے کیونکہ اسلامی معاشیات پر جو تحقیقی اور فنی کام ہوا ہے وہ بیشتر انگریزی، عربی اور کسی حد تک ترکی زبانوں میں ہے جن تک اردو داں طبقہ کی رسائی محدود ہے۔

### اسلامی معاشیات کا ظہور

صرف اسلامی معاشیات بلکہ علم معاشیات کو بھی نسبتاً ایک جدید علم تصور کیا جاتا ہے۔ اگر "ایڈم اسمتھ" کی کتاب "دولت اقوام کے اسباب و علل کی جستجو" (An Enquiry into Nature and Causes of Wealth of Nations) کی اشاعت کو نقطہ آغاز مان لیا جائے (جیسا کہ تاریخ معاشیات کی بیشتر درسی کتابوں میں کیا جاتا ہے) تو معاشیات کی تاریخ دو، سوادو سو سال سے کچھ ہی زیادہ بنتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ریاضیات، طب، طبیعیات، کیمیا، فلکیات، فلسفہ اور تاریخ جیسے علوم کی تاریخ کئی ہزار سال پر محیط ہے۔ اس لئے معاشیات کو ان علوم کی بہ نسبت ایک جدید علم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں معاشیات کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک اینگلو سیکسن علم ہے، کیونکہ معاشیات کے بیشتر اصول و قوانین اینگلو سیکسن اقوام کے افراد کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ بہ حیثیت علم، معاشیات کی تدوین جس زمانہ میں ہوئی وہ اینگلو سیکسن تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر معاشیات کے علمی کارناموں میں ان کا حصہ دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں قدرے زیادہ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری عالمی تہذیبوں اور دوسرے زمانوں میں معاشی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی غور و فکر ہی نہیں کیا گیا اور ان کا دامن ان کارناموں سے خالی ہے۔ دراصل معاشی افکار کی تاریخ اس طرح مرتب کی جاتی رہی ہے کہ اس کو خالص اینگلو سیکسن اقوام کا کارنامہ قرار دیا

جاسکے۔ اس کلیہ سے اگر کوئی استثناء ہے تو وہ ابن خلدون (808-732ھ مطابق 1404-1332ء) ہے جن کے خیالات کو معاشی افکار کی تاریخ میں جگہ دی گئی ہے۔ مشہور جرمن ماہر معاشیات جوزف شوپ پیٹر (Joseph Schumpeter) نے اپنی کتاب ”معاشی تجزیہ کی تاریخ“ (History of Economic Analysis) میں ابن خلدون کے کارناموں کا خصوصی تذکرہ کیا ہے، اس ایک استثناء کے ساتھ غالباً یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ عام طور پر معاشی مورخین اور ماہرین معاشیات نے معاشی فکر کی اسلامی روایت اور معاشیات کے ضمن میں مسلم مفکرین کے علمی کارناموں کو نظر انداز کیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ طرز عمل ارادی ہے یا غیر ارادی، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ (150ھ مطابق 1738ء) امام مالکؒ (479ھ مطابق 768ء) امام ابو یوسفؒ (182ھ مطابق 801ء) شیبانیؒ (181ھ مطابق 804ء) ابو عبیدہؒ (224ھ مطابق 838ء) ماوردیؒ (450ھ مطابق 1085ء) ابن حزمؒ (456ھ مطابق 1064ء) غزالیؒ (505ھ مطابق 1110ء) اور ابن تیمیہؒ (728ھ مطابق 1328ء) کے معاشی افکار کا سنجیدگی سے گہرا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اگر ان کے اور دوسرے مسلم مفکرین کے معاشی افکار کا تفصیلی اور عمیق مطالعہ کیا جائے اور مرد و معاشی تصورات کے ارتقاء سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو نہ صرف یہ ہوگا کہ ان مفکرین کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ معاشی تصورات کے ارتقاء کی تاریخ میں بھی قابل لحاظ زمانی اضافہ کی امید کی جاسکتی ہے۔

عام طور پر معاشیات کی تاریخ جس طرح بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ معاشی تفکر کا آغاز ارسطو (384-322 قبل مسیح) سے ہوا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں کلاسیک مکتب فکر (Scholastic School) کے علماء نے ارسطو کی فکر کو آگے بڑھایا، پھر چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں تجارت پسند (Mercantilist) اور سولہویں و سترہویں صدی عیسوی میں زراعت پسند (Pysiocrats) مفکرین نمودار ہوئے، اس پورے عہد میں معاشی تفکر کی صورت حال یہ رہی کہ اہم معاشی مسائل کے بارے میں جہاں جہاں اظہار خیال کیا گیا اور سماجی فلسفہ کے ضمن میں بعض معاشی تصورات کا استعمال کیا گیا۔ جس کتاب میں علم معاشیات کو منضبط اور مربوط شکل میں پیش کیا گیا وہ آدم اسمتھ کی ”دولت اقوام“ (Wealth of Nations) تھی جو 1776ء میں شائع ہوئی۔ ارسطو سے لے کر کلاسیک اسکول کے علماء کے نظریوں کے درمیان ایک بڑا زمانی فاصلہ ہے جس میں کسی طرح کی علمی تحریک نظر نہیں آتی۔ مغربی مورخین نے یہ کہہ کر اس زمانی خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ ایک تاریک عہد تھا جس میں یورپ جہالت اور غفلت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، درست! لیکن کیا اس زمانے میں پوری نسل انسانی کا ذہن اتنا بچھا ہوا تھا کہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی معاشی موضوعات جیسے پیداوار، تقسیم، تبادلہ، بازار، قیمت اور زر کے بارے میں کوئی سوچ بچار نہیں کیا گیا؟ غالب گمان یہی ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہونا چاہیے، فکر انسانی میں تو ایک تسلسل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جب دنیا کا کوئی حصہ تاریک عہد (Dark Ages) میں داخل ہو جاتا ہے تو دانشوری کے مراکز دوسرے حصوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، اس لئے منطقی بنیاد پر معاشی افکار کی تاریخ میں بھی تسلسل ہونا چاہیے، لیکن جس طرح یہ تاریخ لکھی جاتی رہی ہے اس میں تسلسل کے بجائے ایک بڑا تاریخی خلاء پایا جاتا ہے۔

اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ جب یورپ ”تاریک عہد“ میں تھا اور اس کی ذہنی توتیں سوئی پڑی تھیں اس وقت اسلامی دنیا علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اس کی یونیورسٹیاں طلبہ اور اساتذہ سے آباد تھیں۔ اس کے علماء، دانشور، فلاسفہ، مفکرین اور فقہاء مختلف علوم کی آخری سرحدوں پر علمی تحقیق اور چھان بین میں مصروف تھے، انسانی اعمال کے معاشی پہلو بھی ان کی توجہ و تحقیق سے محروم نہیں رہے اور اس میدان میں بھی انھوں نے دوسرے علوم کی طرح اہم اور درویش کام سرانجام دیا۔ جس وقت یورپ میں معاشی فکر انتشار کا شکار تھی اس وقت اسلامی دنیا میں کتاب الخراج اور کتاب الاموال جیسی کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔

مسلم علماء اور مفکرین نے اپنے عہد کے اہم معاشی مسائل پر اسلامی اقدار اور شریعت کے فراہم کردہ بنیادی ڈھانچہ کی روشنی میں غور و خوض کیا۔ اس وقت اسلامی ممالک کی معاشی تنظیم بھی اسلامی اقدار سے ہم آہنگ تھی۔ اس لئے اسلامی مفکرین کے افکار و تصورات معیشت کی عملی کارکردگی میں مدد و معاون تھے۔ بد قسمتی سے دوائیہ واقعات نے اس عمل میں رخنہ اندازی کی جن کا تعلق خارجی دنیا سے تھا اور جن کے باعث علمی ارتقاء کا یہ تسلسل نہ صرف یہ کہ برقرار نہ رہ سکا بلکہ زوال پذیر ہو گیا۔ ان میں سے پہلا واقعہ تو سقوط بغداد (1258) تھا جس نے علمی ترقیوں کی راہ مسدود کر دی۔ تخلیقی فکر اور اجتہاد و تحقیق سے ہٹ کر توجہ صرف علمائے سلف کی تحریروں کی شرح و تعبیر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور تقلید کی راہ کھل گئی۔ ”پابستگی رسم و رہ عام“ علمی فکر کا معراج قرار پائی۔ طرز فکر کے مروجہ سانچوں کے خلاف ہٹ کر کوئی بات کہنا ”طعن عام“ کا سبب بننے لگا۔ یہ صورت

حال کئی سو برس تک قائم رہی بلکہ اس رویت کے باقیات اب تک مختلف مسلم ممالک اور معاشروں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ دوسرا سانحہ جس کے مضمرات پہلے واقعہ سے کم ضرر رساں اور دور رس نہ تھے، اٹھارہویں صدی میں وقوع پذیر ہوا، جب بہت سے مسلم ممالک نوآبادیاتی تسلط کا شکار ہو گئے۔ سقوط بغداد نے صرف مسلم اقتدار پر ضرب لگائی تھی۔ مغربی ممالک کے نوآبادیاتی تسلط نے نہ صرف یہ کہ سیاسی اقتدار کو نشانہ بنایا بلکہ اسلامی اقتدار اور اداروں کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا اور اسلامی معاشروں میں اجنبی اقتدار کو رواج دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ تر مسلم ممالک نوآبادیاتی تسلط سے آزاد ہو گئے۔ لیکن سیاسی آزادی سے قبل ہی بیشتر مسلم ممالک میں اسلامی اقتدار کی دریافت نو اور اسلامی تخصص کی بازیافت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ مختلف مسلم ممالک میں ایسے مفکر اور علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی نظام کے عناصر اور اس کی برکتوں پر از سر نو زور دیا اور اسلامی تعلیمات کی تعبیر عصری مسائل کے حوالے سے کی۔ مفتی محمد عبدہ، رشید رضا، محمد جمال الدین افغانی اور ان کے کچھ بعد علامہ اقبال کی نگارشات میں جملہ تہذیبی امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب اور اس کے تخصص کو ابھارنے کی کوشش کی گئی، پھر زمانہ کے تقاضہ کے مطابق علماء کی توجہ موجودہ عہد کے معاشی مسائل کی جانب گئی اور انہوں نے موجودہ صنعتی نظام کے حوالے سے اسلام کی معاشی تعلیمات اجاگر کیں۔ 1940ء کے لگ بھگ اور اس کے بعد کے برسوں میں مولانا حفیظ الرحمن، بیہاروی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، حسن البنا اور سید قطب کے ایسے افکار سامنے آئے جن میں اسلام کے اقتصادی نظام کے نمایاں پہلو اجاگر کیے گئے تھے۔ 1946ء میں ایک مسلم ماہر معاشیات ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی کتاب ”اسلام اور نظریہ سود“ (Islam and Theory of Interest) منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں پہلی بار ایک جدید تعلیم یافتہ ماہر معاشیات نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ معاشی نظریات کی قدر و قیمت کا تعین اسلامی اقتدار کے تناظر میں کیا جائے۔ 1967ء میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتاب ”غیر سودی بینک کاری“ شائع ہوئی جس میں غالباً پہلی بار تجارتی بینک کاری کو غیر سودی بنیادوں پر قائم کرنے کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا، اس وقت سے آج تک ان مسلم ماہرین معاشیات کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو چکا ہے، جو معاشی عمل اور معاشیات کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی معاشیات کے موضوع پر انگریزی اور عربی میں قابل لحاظ علمی سرمایہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اسلامی معاشیات کے نام پر اس وقت جو لٹریچر موجود ہے اس کا انداز مناظرانہ نہیں ہے بلکہ اس کا طریق کار تجزیاتی ہے، کیونکہ اس میں معاشی تجزیہ (Economic Analysis) کے متداول اور معروف فنی طریقہ کار سے کام لیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشیات کے اس روز افزوں لٹریچر کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ اسلامی اقتدار پر مشتمل اقتصادی نظام کیوں قائم کیا جاسکتا ہے اور قائم ہونے کے بعد یہ نظام کس طرح کام کرے گا؟

تاریخی اعتبار سے اسلامی اقتصادی نظام کی جانب توجہ غیر سودی نظام بینک کاری کے توسط سے مبذول ہوئی۔ موجودہ زمانے کی معیشت میں بینک کاری کی اہمیت اور معاشی زندگی کی ترقی میں اس کے کردار سے خاص و عام سبھی کسی نہ کسی طور پر واقف ہیں۔ یہ حقیقت بھی عام طور پر معروف ہے کہ جدید بینک کاری نظام سود کی بنیاد پر قائم ہے جبکہ اسلام سود یا ربا کو حرام قرار دیتا ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی نظام کے تحت جدید بینک کاری کا نظام کس طرح عمل پذیر ہوگا؟

اس سوال کا جواب دینے کی کوششوں کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اسلامی بینک کاری کا نظریہ وجود میں آیا بلکہ اس سے متعلق دوسرے اہم مسائل کی جانب بھی توجہ مبذول ہوئی، مثلاً تخلیق قرض (Credit Creation)، مرکزی بینک کاری، مالی پالیسی کے اغراض و مقاصد وغیرہ، پھر مسلم ماہرین کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ مالی پالیسی (Monetary Policy) کسی خلا میں قائم نہیں ہوتی، اس کا تعلق مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy)، ملک کی نام معاشی پالیسی، معیشت میں حکومت کے کردار اور معاشی نظام کے اغراض و مقاصد سے بھی ہے، چنانچہ اسلامی معاشیاتی نقطہ نظر سے ان تمام موضوعات پر خاصا تحقیقی کام ہو چکا ہے، اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ اس معتد بہ علمی ذخیرے کے نمایاں نقوش سے اردو داں طبقے کو روشناس کرایا جائے۔

اسلامی معاشیات کی ماہیت

اسلامی نقطہ نظر سے جدید معاشیات کی سب سے بڑی خامی اس کی غیر اخلاقی (amoral) ماہیت ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں بھی

اقتصادیات اور اخلاقیات کا جنم ساتھ ساتھ ہوا اور ان کو ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ چونکہ معاشیات انسانی اور سماجی رشتوں سے بحث کرتی ہے اس لئے یہ سماجی اقدار اور اخلاقیات سے بالاتر نہیں ہو سکتی، جدید معاشیات ایک سماجی علم ہونے کے باوجود یقین کے اس درجہ پر پہنچنے کا دعویٰ کرتی ہے جو قدرتی علوم کو حاصل ہے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قدرتی علوم بالخصوص جدید طبیعیات، کامل یقین کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اپنے نتائج کی ظنی حیثیت اور قیاسی نوعیت کو علی الاعلان بیان کرتے ہیں)۔ اس درجہ یقین پر پہنچنے کے لئے جدید معاشیات اپنی مثبت ماہیت اور اقدار سے بے گانگی پر زور دیتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشیات بعض اہم مگر فراموش شدہ تصورات، جیسے صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب، جائز اور ناجائز وغیرہ کو تجزیہ میں شامل کرنا چاہتی ہے، جدید معاشیات کا محور کارکردگی (Efficiency) کا حصول ہے۔ اسلامی معاشیات میں کارکردگی کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشی انصاف پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ جدید معاشیات میں تجزیہ کی بنیاد فرد اور انفرادی مفاد ہے، وہ اس مفروضہ کو مسلم مان کر چلتی ہے کہ انفرادی مفاد معاشی اعمال کا واحد طاقتور محرک ہے۔ اسلامی معاشیات کے ماہرین اس پر اصرار کرتے ہیں کہ فرد کے ساتھ جماعت اور انفرادی مفاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی مفاد کا خیال رکھنا بھی فرد کی اخلاقی (اور مذہبی) ذمہ داری ہے۔ مزید یہ کہ بعض غیر معاشی جذبات جیسے ہمدردی، حب الوطنی اور خوف خدا وغیرہ بھی معاشی افعال کے محرک ہو سکتے ہیں۔ اسلامی معاشیات اس بات کی منکر نہیں ہے کہ انفرادی مفاد کا جذبہ بہت سے معاشی افعال کا ایک بڑا اور حتمی محرک ہے، لیکن وہ انفرادی مفاد کو اس قدر بے قید اور آزاد نہیں چھوڑنا چاہتی کہ دوسرے افراد کے مفادات معرض خطر میں پڑ جائیں۔ اس لئے سماجی فلاح کا تقاضہ ہے کہ انفرادی مفاد اور انفرادی محرکات اجتماعی مصالح، ذمہ داری اور اخلاقیات کے تابع فرمان رہیں۔ معاشی عقلیت اور انفرادی مفاد کسی اخلاقی اور قانونی دائرہ میں رہ کر ہی بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں۔ اسلامی معاشیات کے سلسلہ میں یہ اخلاقی اور قانونی دائرہ شریعت کا عطا کردہ ہے۔

معاشیاتی تجزیہ میں سماجی اور اخلاقی اقدار اسی دائرہ کے ذریعہ داخل ہوتی ہیں۔ نظریاتی معاشیات کی سطح پر، یہ اقدار چار طریقوں سے تجزیہ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ مفروضات کے اختیار کے ذریعہ، معاشی قضایا کے اختیار کے ذریعہ، ان قضایا کی نفیث کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جائیں ان کے ذریعہ اور تجزیہ کے طریق کار کے ذریعہ، اس طرح اقدار سے فرار کا کوئی امکان نہیں۔ مغرب میں مثبت معاشیات کی اقدار سے بے گانگی کے جو دعوے کیے جاتے ہیں ان کی کوئی ٹھوس علمی بنیاد نہیں ہے۔ مثبت معاشیات میں بھی اقدار ان ہی چار طریقوں سے داخل ہوتی ہیں۔ چونکہ مغربی معاشیات کا ارتقاء مغربی تہذیب کے تناظر میں ہوا ہے اس لئے اس میں پائی جانے والی اقدار مغربی تہذیب سے مستعار لی گئی ہیں، لیکن مثبت معاشیات اپنے معیاری (Normative) پس منظر کو اجاگر کرنے کے بجائے معروضیت کے بلند بانگ دعوے کرتی ہے۔

دوسری طرف اسلامی معاشیات علی الاعلان یہ تسلیم کرتی ہے کہ اس کی اقدار کا منبع اسلامی مصادر ہیں اور وہ اس کے طریق کار کا جزء لاینفک ہیں۔ اسلامی معاشیات میں مفروضات اور سماجی اقدار اسلامی مصادر سے، اور مثبت بیانات جدید معاشیات اور اسلامی مصادر دونوں سے لئے جاتے ہیں، اس طرح اقدار، مثبت بیانات اور سماجی رشتوں کو معروف طریق ہائے تجزیہ سے ایک منضبط و مربوط شکل دی جاتی ہے۔

ایک منضبط علم کی حیثیت سے اسلامی معاشیات کی زمانی عمر کم سہی اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسلامی معاشیات ابھی اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہی ہے، لیکن اس کے مندرجات اور اس کے فلسفیانہ پس منظر کے بارے میں بھی یہی بات نہیں کہی جاسکتی۔ اس کے پس منظر میں اسلامی فکر کی ایک صحت مند اور طاقتور روایت ہے۔ ماضی میں اسلامی مفکرین، فقہاء اور صوفیاء نے بھی قیمتوں کے نظام، زر، تجارت، تبادلہ، بازار، تجارتی چکر، عوامی مالیات، حکومت کے حقوق و فرائض اور مالیاتی پالیسی جیسے موضوعات پر غور و فکر کیا ہے۔ اسلامی فکر کی یہ وراثت اسلامی معاشیات کا سرمایہ ہے، لیکن اس ورثہ کو از سر نو دریافت کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ عصر حاضر کی ضروریات کی روشنی میں ان کی افادیت کا فیصلہ کیا جاسکے اور اگر مناسب ہو تو اس روایت کو آگے بڑھانے کے لئے اقدامات کیے جائیں۔

### اسلامی معاشیات اور فقہ اسلامی

ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلامی معاشیات کی جڑیں اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاقیات میں پیوست ہیں، اس لئے فطری ہے کہ اس کا اسلامی علوم سے بھی گہرا رشتہ رہا ہو۔ اسلامی علوم کو عام طور پر چار مختلف علوم میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) علوم القرآن (۲) علوم الحدیث (۳) اصول فقہ (۴) فقہ۔ ضروری ہے کہ اس مرحلہ پر شریعت اور فقہ کے درمیان امتیاز کو واضح کر دیا جائے، شریعت کا مفہوم ان تمام خدائی احکامات

سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کی جانب وحی کے ذریعہ نازل فرمائے۔ اس طرح قرآن پاک اور سنت رسول اللہ ﷺ شریعت کا جزو ہیں۔ یعنی قرآنی احکامات اور سنت رسول ﷺ کو تشریحی درجہ حاصل ہے۔ شریعت مستقل، ناقابل تسیخ و تردید اور زمان و مکان سے ماورا ہے، اس کی ماہیت غیر تاریخی ہے۔ فقہ، الہی احکامات کے انسانی فہم و ادراک کا نام ہے، اس لئے اس میں زمان و مکان کے ساتھ تبدیلی کے امکانات پوشیدہ ہیں، فقہ کی نوعیت بنیادی طور پر انسانی ہے، الوہی نہیں، گو کہ اس کے احکامات کا استنباط شریعت سے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لئے فقہ کی ماہیت تاریخی ہے، یہ زمان و مکان کی پابندیوں کے تابع ہے۔ قرآن اور سنت سے احکامات کا استنباط چند اصولوں کے مطابق کیا جاتا ہے، ان اصولوں کا مطالعہ اصول فقہ میں کیا جاتا ہے۔

اسلامی فقہ کے چار بنیادی مصادر ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس یا اجتہاد، اسلامی علوم کے وہ ماہرین جو احکام اعلیٰ کی تشریح کرتے ہوئے اجتہاد کر سکتے ہیں مجتہد کہلاتے ہیں، لیکن ہر کوئی نہ مجتہد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی توقع کی جاتی ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ماہرین معاشیات اور سماجی علوم کے دوسرے ماہرین، جو اہم، ہم عصر مسائل کے اسلامی حل دریافت کرنا چاہتے ہوں اور اپنے اپنے علوم کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہوں، اسلامی فقہ کا ضروری علم حاصل کریں۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ فقہ اسلامی میں اختصاص حاصل کریں یا فقیہ بن جائیں اور ہر کس و نا کس اجتہادی رائے دینے لگ جائے۔ فی الحقیقت سماجی علوم کے اسلامی تناظر میں تحقیقی کام کرنے کے لئے فقہ کا صرف اتنا علم ضروری ہے کہ سماجی علوم کے ماہرین فقہی اور غیر فقہی آراء اور بیانات کی اسلامی نوعیت کا صحیح صحیح تعین کر سکیں۔

اسلامی فقہ کو دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فقہ عبادات اور فقہ معاملات، اول الذکر کا تعلق خالق اور مخلوق کے مابین تعلقات سے ہے جبکہ موخر الذکر کا محور انسانوں کے باہمی تعلقات ہیں، گو کہ تمام مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ فقہ عبادات کا کچھ علم حاصل کریں (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مسائل، تاکہ وہ ان عبادات کو صحیح طور پر انجام دے سکیں)، ماہرین معاشیات اور سماجی علوم کے دوسرے ماہرین کے لئے فقہ معاملات خاص اہمیت کا حامل ہے۔

## اسلامی معاشی نظام

اسلامی معاشیات دراصل اسلامی معاشی نظام کے مطالعہ کا نام ہے، بالکل اسی طرح جیسے سرمایہ دارانہ معاشیات سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی معاشیات، اشتراکی نظام کا مطالعہ ہے، اس لئے اسلامی معاشیات کی ماہیت کی وضاحت کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم اسلامی معاشی نظام کی ماہیت کو واضح کر دیں اور مختلف پہلوؤں سے اس کی کارکردگی کا مطالعہ کریں۔

معاشی نظام سے ہماری مراد ان تمام اداروں، اور ان اداروں کے پس پشت کارفرما اصولوں سے ہے جو کوئی معاشرہ اپنے معاشی مقاصد کو عمل کرنے کے لئے قائم کرتا ہے، کسی بھی معاشی نظام کے اجزائے ترکیبی میں ان عناصر کا ہونا ضروری ہے: (۱) معاشی نظام کے مقاصد کا تعین (۲) ان مقاصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کا تعین (۳) ان اداروں کا قیام جن کے ذریعہ معاشی نظام اپنی کارکردگی انجام دے۔ اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ بھی انہیں اجزائے ترکیبی کے حوالہ سے کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک معاشی اداروں کا سوال ہے، کسی بھی معیشت میں معاشی وسائل کی ملکیت کے سوال کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً سرمایہ دارانہ معیشت کی ممتاز خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں افراد کو نجی ملکیت کا حق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشی نظام میں ملکیت کے حق کے ساتھ ساتھ وسائل کے مالکوں پر کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد کی جاتی ہیں۔

اسلامی معاشی نظام میں جائیداد کی ملکیت کے تین بڑے اور معروف طریقے ہیں: نجی ملکیت، عوامی ملکیت اور رضا کارانہ اجتماعی ملکیت (ادقاف)۔ نجی ملکیت کے سلسلہ میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اسلام نہ صرف نجی ملکیت کا حق دیتا ہے، اسے تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کا احترام بھی کرتا ہے، لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کے برعکس اسلامی نظام میں جائیداد کی نجی ملکیت کا حق ایک مطلق حق نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے نجی جائیداد، افراد کے پاس اللہ کی ایک امانت ہے، کیونکہ آخری تجزیہ کے طور پر وہی ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو اس نے پیدا کی ہیں، پس افراد کا فرض ہے کہ وہ اس امانت کا استعمال اس طور پر کریں جو معاشرے میں شر کے بجائے خیر کا باعث ہو، سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح اسلامی معاشی نظام میں افراد کو اس بات

کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی جائداد کا کوئی غلط استعمال کر سکیں یا اسے برباد کر سکیں۔ فی الحقیقت اسلام جائداد اور دیگر معاشی وسائل کے بہترین استعمال کی نہ صرف تعلیم دیتا ہے بلکہ ضروری احکام کے ذریعہ اسے ناگزیر بھی بنا دیتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص اپنی جائداد کا صحیح انتظام نہیں کرتا (یعنی فقہی اصطلاح میں سفیہ ہے) تو ریاست کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اس کی جائداد کے مناسب انتظام و انصرام کے لئے کسی متولی کا تقرر کرے، اسی طرح اہل ثروت کو اپنی دولت کے زیاں، اس کے ناجائز استعمال، اور اس کو تباہ و برباد کرنے کا حق نہیں ہے، اسلام اہل ثروت پر بعض اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے وسائل کا صحیح استعمال کریں، کیونکہ روز آخرت اہل ثروت کو اس بات کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی دولت کا استعمال کس طرح کیا۔

اسلامی معاشی نظام میں عوامی ملکیت جائز ہے، لیکن نجی ملکیت کی طرح عوامی ملکیت کا تصور بھی مطلق نہیں ہے۔ اگر انفرادی ملکیت کے حقوق محدود ہیں تو ریاستی ملکیت کے حقوق بھی محدود ہونے چاہئیں۔ اگر افراد خدا کے سامنے جواب دہ ہیں تو اسی طرح ریاست اور اس کے چلانے والے بھی عوام اور خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ معیشت میں ریاست کی دخل اندازی کا فیصلہ اور معیار مصلحت عامہ کے مطابق ہوگا، جس کا تصور امام غزالی اور شاطبی نے پیش کیا ہے۔

اسلامی معاشی نظام کا ایک مخصوص اور ممتاز ادارہ وقف کا نظام ہے جو رضا کارانہ اجتماعی ملکیت کی ایک شکل ہے۔ اس ادارہ کے ذریعہ اہل ثروت مسلمان اپنی دولت اور جائداد یا اس کا کوئی حصہ عام معاشرتی فلاح و بہبود یا کسی ایسے مقصد کے لئے جو اپنے آپ میں اخلاقی یا مذہبی نقطہ نظر سے قابل قدر ہو، محفوظ کر سکتے ہیں۔ نظام اوقاف کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ حکومت کی دخل اندازی کے بغیر رضا کارانہ اجتماعی اقدام کے ذریعہ فلاحی سرگرمیوں کے منظم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ماضی میں ایک ادارہ کے طور پر اوقاف نے اسلامی ممالک میں فلاح و بہبود خاص کر تعلیم، طبی سہولتوں اور سماجی تحفظ کے میدانوں میں ایک نہایت مفید کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادارہ موجودہ اسلامی معاشروں کی تعمیر نو اور ترقی میں بھی ممد و معاون ہونے کے بے پناہ امکانات رکھتا ہے۔

نظام ملکیت کے علاوہ معاشی نظام کا مطالعہ کرنے کے لئے معیشت کے مقصد، منہاج و محرکات، فیصلہ سازی کے نظام اور حکومت کے کردار کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے۔ جزئی سطح پر صرف، پیداوار، تبادلہ اور تقسیم کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ کی بنیاد پر بھی مختلف معاشی نظاموں کے درمیان تمیز کی جاسکتی ہے۔ اسلامی معاشی نظام میں محرک کا تعین صرف دنیوی بنیادوں پر نہیں کیا جاسکتا بلکہ نجات اخروی کا احساس بھی معاشی افعال کا محرک ہو سکتا ہے۔ عوامی اہمیت کے مسئلوں پر فیصلہ شوریٰ کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ دوسرے تمام معاشی فیصلے اصولی طور پر بازار میں کیے جاسکتے ہیں جب کہ حکومت ان فیصلوں میں توازن لانے اور برقرار رکھنے کا کام انجام دے سکتی ہے۔

مسلم ماہرین معاشیات کے درمیان اس پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں حکومت کا کردار کیا اور کتنا ہونا چاہیے۔ کچھ ماہرین، معیشت میں حکومت کی بیش از بیش مداخلت چاہتے ہیں، جبکہ دوسرے معیشت میں حکومت کے فعال کردار کے مخالف ہیں اور اس کا کردار محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں موافق کی حمایت میں تاریخی اور فقہی دلائل دیے جاسکتے ہیں، تاہم اسلام کی اصل راہ توازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ اس لئے شاید بیشتر لوگ اس بات سے اتفاق کر لیں گے کہ اسلامی معیشت میں حکومت کا کردار نہ تو خالص سرمایہ دارانہ نظام کی طرح بہت محدود ہے اور نہ اشتراکی نظام کی طرح کلیت پسند۔ اس کے برعکس حکومت اسلامی نظام میں، نگہبانی اور رہنمائی دونوں فرائض انجام دے گی۔ اسلامی معیشت میں اگر نجی اور عوامی مصالح کے درمیان ٹکراؤ کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان مصالح کے درمیان توازن لانے کی غرض سے معیشت میں مداخلت کرے۔ بصورت دیگر حکومت کی عام نگہبانی اور رہنمائی میں نجی معیشت اپنے فیصلوں کے لئے آزاد ہوگی۔

اسلامی معاشیات کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے دولت و ثروت کی تقسیم میں عدل و انصاف کو غایت درجہ اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں بعض مسلم ماہرین معاشیات کا خیال یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی، عدل اور احسان کے اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کرے گی۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ معاشرہ میں ہر فرد کو سماجی و معاشی انصاف حاصل ہو، اسلامی ریاست اپنی حدود میں رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کی تسکین کے لئے مناسب اور ضروری اقدام کرے گی۔ اس مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ معیشت دوسرے شرعی مقاصد کے حصول کے



لئے بھی کوشاں ہوگی، مثلاً آمدنی اور دولت کی نابرابری میں تخفیف، افراد کے نفس باطنی اور اموال ظاہرہ کا تزکیہ اور عوام میں جذبہ خیر سگالی کا فروغ۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لئے اسلامی معیشت کئی ذرائع استعمال کر سکتی ہے، فطری طور پر ان ذرائع میں زکوٰۃ کے نفاذ اور حاصل زکوٰۃ کی تقسیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ان مقاصد کے حصول میں زکوٰۃ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی معیشت میں تقسیم دولت پر اثر انداز ہونے والے دوسرے ادارے اور ذرائع کم اہمیت کے حامل ہیں یا سرے سے مفقود ہیں۔ فی الواقع یہ نقطہ نظر حقیقت سے بعید ہے، کیونکہ اسلامی معاشرہ میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایسے کئی ادارے ہیں، مثلاً ربا کی حرمت، مشارکت اور مضاربت کا فروغ، نفع میں شریکت کی عام ترغیب، اجارہ داری کی ممانعت، وراثت کے قوانین، فطری ذرائع پیداوار میں عوام کے مساوی حقوق وغیرہ بعض ایسے ادارے ہیں جو معاشرے میں آمدنی اور دولت کی نابرابری کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں تاکہ "لَا يَكُونُ دُولًا بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مُتَكَلِّمًا" (اور یہ دولت تم میں سے اہل ثروت کے درمیان ہی چکر نہ کٹتی رہے) کا قرآنی مقصد حاصل ہو سکے۔

## جزئی معاشیات

اسلامی معاشیات کے تشکیلی عناصر میں سے جزئی معاشیات (Micro Economics) غالباً سب سے کم ترقی یافتہ ہے، تاہم اسلامی معاشیات کے کئی ماہرین نے اسلامی تصورات اور اسلامی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظری معاشیات (Economic Theory) کی تشکیل نو کی قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ اس ضمن میں ان علماء کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ انہوں نے معاشیات کے متداول اصول تحلیل و تجزیہ کا استعمال کرتے ہوئے انسانی برتاؤ اور معاشی رویہ کا مطالعہ ایسی حالت میں کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی اقدار اسلامی مصادر سے مستعار لی گئی ہوں۔

تاہم اس بات کو واضح کر دینا چاہیے کہ اس طریق استدلال کا استعمال کرتے ہوئے جن نتائج کا استنباط کیا جائے، ضروری نہیں وہ مسائل کے ایسے اسلامی حل ہوں کہ ان کے سوا دوسرا حل ممکن نہ ہو، فی الحقیقت یہ نتائج ان تمام اعتراضات کی حد میں آسکتے ہیں جو نظریاتی طریق استنباط پر عام طور پر عائد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اس طرح کے نتائج مفروضات کی تبدیلی کے تین کافی حساس ہوتے ہیں، اگر مفروضات میں ذرا بھی تبدیلی کر دی جائے تو ضروری نہیں کہ منطقی طور پر دوبارہ انہیں نتائج کا استنباط کیا جاسکے جو پہلے اخذ کیے گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ جن ماہرین معاشیات نے نظریاتی سطح پر اس طرح کی کوششیں کی ہیں ضروری نہیں کہ ان سب کو شریعت کا کماحقہ علم ہو۔ اس لئے اس امر کا بھی کافی احتمال ہے کہ ان کی تعبیریں ہر حلقہ فکر کے لئے یکساں طور پر قابل قبول نہ ہوں۔

تاہم ان دشواریوں کے باوجود اسلامی تناظر میں جزئی معاشیات کی نشوونما، اسلامی ماہرین معاشیات کے لئے اور مستقبل میں اسلامی معاشیات کے ارتقاء اور فروغ کے لئے غالباً سب سے بڑا چیلنج ہے، کیونکہ بالآخر یہ جزئی معاشیات ہی ہے جو نہ صرف کلی معاشیات بلکہ معاشی پالیسیوں کے لئے بھی نظریاتی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اس چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے بعض ماہرین معاشیات نے کچھ قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے چند کا اجمالی تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

جزئی معاشیات کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کوئی فرد (یا معاشیات کی اصطلاح میں صارف) کسی چیز کی طلب کیوں کرتا ہے؟ معاشیات میں اس سوال کا روایتی جواب یہ ہے کہ صارف ان اشیاء کی طلب کرتا ہے جن میں اسے افادیت محسوس ہوتی ہے اور جو اس کی کسی ضرورت (Wants) کی تسکین کرتی ہیں۔ بعض اسلامی ماہرین معاشیات کی تجویز یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں نظریہ صرف (Theory of Consumer behavior) کی بنیاد ضرورت کے بجائے حاجت (Need) پر ہونی چاہیے۔ اس طرح افادیت کے نظریہ (Utility Theory) کو مصلحت سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مصلحت سے مراد کسی چیز یا خدمت کی وہ خاصیت ہے جس کے ذریعہ انسانی زندگی کے کسی مقصد یا بنیادی عنصر کو فروغ ملتا ہو۔ حیات، مال، ایمان، عقل اور نسل کا تحفظ یا فروغ انسانی وجود کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس چیز کے استعمال میں مصلحت ہے یا نہیں۔ افادیت کی طرح مصلحت کا تصور داخلی ہو سکتا ہے، لیکن افادیت کے برعکس اس تصور میں بڑی حد تک معروضیت (Ojectivity) پائی جاتی ہے۔ تاہم ان تصورات کا استعمال کرتے ہوئے بازار میں اشیاء کی خرید و فروخت اور قیمتوں کے تعین جیسے اعمال کی وضاحت کے لئے ابھی مزید تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

اسلامی معاشیات کے بعض وکلاء نے ذرائع پیداوار اور ان کی قیمتوں کے تعین کی بھی نئی تعبیرات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ روایتی معاشیات میں تین اہم ذرائع پیداوار کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ زمین یا قدرتی ذرائع پیداوار (Land)، سرمایہ (Capital) اور محنت (Labour)، بعض اوقات تنظیم کو ایک چوتھا ذریعہ پیداوار متصور کیا جاتا ہے۔ ساری پیداوار ان ذرائع کے مالکوں کے درمیان تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسے نظریہ تقسیم کہا جاتا ہے۔ اس طرح کرایہ یا لگان زمین یا قدرتی ذرائع پیداوار کا معاوضہ قرار پائیں گے۔ روایتی معاشیات میں محنت کا معاوضہ اجرت یا مزدوری اور سرمایہ کا معاوضہ سود ہے، لیکن اسلامی نظام میں سود (ربا) حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے لازم ہوا کہ پیداوار کی تقسیم پر از سر نو نظر ڈالی جائے، اس کے ساتھ ہی ذرائع پیداوار کی نئی تعریف کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ جہاں تک محنت کے لئے اجرت کا سوال ہے اس پر تو کسی قسم کے نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بات پر اتفاق رائے کچھ مشکل نہیں کہ محنت کی اجرت اس کی پیداواری کے تناسب سے ہونی چاہیے اور اس کا پیداوار میں حق ہے۔ لیکن سود، اجارہ دارانہ منافع اور غیر متناسب لگان کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے شدید شبہات موجود ہیں۔ سود کے حرام ہونے کے باعث بعض اسلامی ماہرین معاشیات نے ”سرمایہ“ کی تعریف ایسی شکل میں کرنے کی کوشش کی جس میں ”نقد سرمایہ“ شامل نہ ہو۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اسلام میں سرمایہ کے معاوضہ کی کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ اس معاوضہ کی ایک خاص شکل کو، جس کا مظہر سود ہے، حرام قرار دیا گیا ہے۔ سود، سرمایہ کے لئے پہلے سے طے شدہ معاوضہ ہے جس کی شرح بھی پیداوار کے نتیجہ (نفع یا نقصان) سے الگ ہو کر مقرر کی جاتی ہے۔ اسلامی معاشیات میں نقد سرمایہ کو پیداوار کے ایک حصہ کا مستحق اسی وقت قرار دیا جاتا ہے جب وہ کاروبار کی خطر انگیزی (Risk) میں شریک ہو۔ اسلامی نقطہ نظر سے نقد سرمایہ کا معاوضہ، سود نہیں بلکہ نفع کا ایک حصہ ہے جو اس خطر انگیزی کے عوض ملتا ہے۔

اسی طرح زمین کے لگان کے متعلق بھی واضح اسلامی اصول موجود ہیں، فقہ کی کتابوں میں عشر اور خراج عائد کرنے کے لئے عشری اور خراجی زمینوں کی تفریق اور ان کے متعلقہ خصائص تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

روایتی معاشیات میں پیداوار کا محرک ”منافع“ قرار دیا جاتا ہے۔ گوکہ اسلامی معاشیات میں منافع کا حصول ممنوع نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ تحریک اسلام کے اخلاقی اصولوں کی پابند رہے۔ کچھ ماہرین معاشیات کا یہ خیال ہے کہ اسلامی معیشت میں مختلف قسم کے کاروبار اور صنعتوں کے چلانے کو فرض کفایہ کی حیثیت حاصل ہے۔

## کلی معاشیات

جزئی معاشیات کی نسبت کلی معاشیات (Aggregate Economics or Macro Economics) نے اسلامی ماہرین معاشیات کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ رہا ہے کہ اسلامی ماہرین معاشیات اس سوال کا جواب دینے کے لئے کوشاں رہے ہیں کہ عصر حاضر میں جب تمام معاصر معاشی نظام اور جدید معیشتیں سودی بنیادوں پر قائم ہیں، اسلامی نظام معیشت اپنے غیر سودی نظام، زکوٰۃ، منافع میں شرکت اور دوسری اسلامی خصوصیات کے ساتھ کس طرح کام کرے گا؟ اس لئے ان کی توجہ اس مسئلہ پر مرکوز ہوئی کہ غیر سودی بینک کاری نظام کس طرح قائم کیا جائے؟ اس کے عملی مسائل کیا ہوں گے اور ایک غیر سودی نظام کا نظریاتی جواز کیا ہے؟ سود کی عدم موجودگی میں زر کے بازار میں توازن کا حصول کس طرح ہوگا؟ کیا سود کی عدم موجودگی بچت اور خواہش بچت کے رجحان پر اثر انداز ہوگی۔ اگر ہاں تو کس طرح؟ معیشت میں وظیفہ بچت اور وظیفہ سرمایہ کاری کس طرح سرانجام پائیں گے؟ قومی آمدنی کا تعین کیسے ہوگا اور اس ضمن میں زر پالیسی اور مالی پالیسی کا کردار کیا ہوگا؟

کلی معاشیات میں نظریہ اخراجات صرف، وظیفہ بچت، و صرف اور عوامی اخراجات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ ہی قومی آمدنی کا تعین ہوتا ہے۔ اخراجات صرف کے سلسلہ میں اسلامی معاشیات کے بعض ماہرین نے رجحان صرف (Propensity to Consume) پر زکوٰۃ کے اثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں عام رائے یہی ہے کہ معیشت میں زکوٰۃ کے نفاذ کے اثرات مثبت ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے ذریعہ دولت کی دوبارہ تقسیم عمل میں آتی ہے اور وہ دولت ان لوگوں کی طرف سے جن کی خواہش بچت زیادہ ہے ان لوگوں کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کی خواہش صرف زیادہ ہے، اس لئے اخراجات صرف میں اضافہ ہوگا، جو آمدنی میں اضافہ کا باعث بھی بنے گا۔

جہاں تک بچت اور سرمایہ کاری کا تعلق ہے، تو ملحوظ رہے کہ جدید معیشت میں بچت کار اور سرمایہ کار ایک ہی لوگ نہیں ہوتے۔ موجودہ زمانہ میں صنعتی پراجیکٹوں کو لاگو کرنا اور چلانا ایک پیچیدہ عمل ہے، جس کو ہر وہ شخص انجام نہیں دے سکتا جس کے پاس تھوڑا بہت سرمایہ ہو، جدید صنعتی زندگی کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بچت کاروں کی ایک بڑی تعداد بہت چھوٹی چھوٹی بچتوں کی مالک ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرمایہ کاری کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ بچت کاروں اور سرمایہ کاروں کے گروہوں میں تفریق پیدا ہوگئی ہے، جو لوگ بچت کاری کرتے ہیں وہ خود سرمایہ کاری نہیں کرتے اور جو لوگ سرمایہ کاری کرتے ہیں وہ خود بچت نہیں کرتے۔ اس طرح بچت اور سرمایہ کاری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مالی ثالثی (Financial Intermediation) کی ضرورت پڑتی ہے۔ روایتی معیشت میں یہ کام سود کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور اسلامی معیشت میں یہ وظیفہ منافع میں شرکت کی شرح (Profit Sharing Ratio) کے ذریعہ انجام پائے گا، اس سلسلہ میں یہ اندیشہ پایا جاتا ہے کہ ایک غیر سودی نظام معیشت، جس میں سود کے بجائے نفع میں شرکت کا نظام رائج ہو، ہو سکتا ہے کہ اتنی بچت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، جو سرمایہ کاری کے لئے درکار ہو۔ اس طرح بچت اور سرمایہ کاری میں ہم آہنگی نہ ہو سکے۔

اسلامی ماہرین معاشیات کی بعض تازہ ترین تحقیقات اس کی شاہد ہیں کہ یہ اندیشے بے بنیاد ہیں۔ اسلام میں سرمایہ (بچت) کا معاوضہ ممنوع نہیں ہے بلکہ سود کی شکل میں یہ ممنوع ہے۔ منافع میں شرکت کی شکل میں بچت کا معاوضہ شرعاً بالکل جائز ہے، کیونکہ سود کی طرح نہ تو یہ پہلے سے طے شدہ ہے اور نہ ہی غیر تغیر پذیر۔ اس طرح ماہرین معاشیات اسلامی معیشت کے لئے ایسے وظیفہ بچت اور وظیفہ سرمایہ کاری کی تشکیل کر سکتے ہیں کہ بچت کا انحصار تو منافع میں شرکت کی شرح پر ہو اور وظیفہ سرمایہ کاری اس سے آزاد ہو۔ بعض مسلمات کے تحت یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی مالی نظام میں خطر انگیزی میں اضافہ کے بغیر بچت کے لئے معاوضہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی مالی نظام میں سودی نظام کے مقابلہ میں استحکام اور نمو کی صلاحیت بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔

بعض ماہرین نے اسلامی معیشت میں آمدنی کے تعین کے لئے مختلف ماڈل بھی تشکیل دیے ہیں، جن میں زکوٰۃ اور منافع کی شرکت کو شامل کیا گیا ہے۔

## زر پالیسی اور مالیاتی پالیسی

ربا کی حرمت، زکوٰۃ کے قیام اور منافع میں شرکت کے اصول کے نفاذ کی روشنی میں اسلامی معیشت میں زر پالیسی اور مالیاتی پالیسی کی خاص اہمیت ہے۔ ان موضوعات پر جدید ترین تحقیقات سے یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ روایتی نظام بینکوں میں جمع رقم کی ظاہری قدر، یا ان جمع کھاتوں پر شرح معاوضہ کی ظاہری قدر (Nominal Value) کی ضمانت نہیں دیتا، جیسا کہ منافع میں شرکت کے اصول پر قائم اسلامی بینک کاری نظام میں ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی بینک کاری نظام میں کھاتہ داروں کو متعین معاوضہ نہ دیے جانے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی بینک کاری کا نظام استحکام کی وہ خاصیت رکھتا ہے، جو روایتی نظام میں موجود نہیں۔ ان نتائج کی روشنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک زر پالیسی کے مقاصد اور کارکردگی کا تعلق ہے، اسلامی بینک کاری اور روایتی بینک کاری کے نظام میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس لئے روایتی بینک کاری سے اسلامی بینک کاری نظام کی طرف سبقت کرنے میں کسی مالی بحران کا اندیشہ نہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس میں کسی طرح کے مسائل پیش ہی نہیں آئیں گے۔

اسلامی معاشیات کے موضوع پر ہم عصر لٹریچر کا ایک بڑا حصہ اسلامی بینک کاری، اس کے نفاذ، اثرات، اور دوسرے متعلقات پر مشتمل ہے۔ اسلامی بینک کاری میں بیع کے متعدد طریقوں و معاہدوں کا اطلاق کیا گیا ہے جو کلاسیکی عہد میں رائج تھے۔ لیکن ان معاہدوں کی تفصیل میں عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق کچھ نہ کچھ کتر بیوت ضرور کی گئی ہے۔ ان معاہدوں میں مضاربت، مشارکت، مرابحہ، اجارہ اور بیع مؤجل وغیرہ شامل ہیں۔ فی الحقیقت مالی زریں ان کا استعمال بھی عہد جدید کا اجتہاد ہے، ورنہ اصلاً تو یہ معاہدے اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے وضع کیے گئے تھے۔

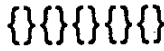
عوامی مالیات تو اسلامی معاشیات کا وہ جزو ہے جس کا ارتقاء اسلامی عہد کی ابتداء میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ عصر حاضر میں عوامی مالیات میں مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy) کے مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مالیاتی پالیسی کے مقاصد کی رو سے اسلامی معیشت کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام

شہریوں کے لئے بنیادی ضروریات فراہم کرے اور اس مقصد کے لئے وسائل مہیا کرے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اسلامی معیشت کی مالیاتی پالیسی میں مرکزی کردار ادا کرے گا۔ اسلامی ممالک میں موجودہ اقتصادی پس ماندگی اور وسیع پیمانہ کی غربت کے پیش نظر زکوٰۃ اور مالیاتی پالیسی کی اہمیت میں دوچند اضافہ ہو جاتا ہے۔

### اختتامیہ

مندرجہ بالا صفحات میں اسلامی معاشیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ چوتھائی صدی میں کی گئی علمی کوششوں کے خدوخال نمایاں ہو جائیں۔ اسلامی معاشیات کو ابھی ترقی کے بہت سے مراحل طے کرنے ہیں۔ اس سلسلہ میں تکنیکی دشواریاں چاہے کتنی بھی ہوں لیکن وہ قابل عبور ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دشواری عملی مثالوں کی کمی ہے۔ اب تک جن مسلم ممالک نے اسلامی اقتصادی نظام کی راہ پر بڑھنے کا فیصلہ کیا ہے ان کی تعداد بہت کم ہے۔

معاشیات ایک ایسا علم ہے کہ عملی معاشی زندگی اور نظری معاشیات کی ترقی ساتھ ساتھ ہوتی، جب عملی زندگی میں مسائل پیش آتے ہیں اور ان کے قابل عمل حل دریافت کئے جاتے ہیں تب نظریہ ساز اس کا نظریاتی جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح نئے نظریے وجود میں آتے ہیں۔ نظریہ ہمیشہ اصل زندگی کے حقائق سے پرکھا جاتا ہے۔ معاشیات کی تاریخ نے اسی مرحلہ وار ترقی کو اختیار کیا ہے۔ درحقیقت تمام سماجی علوم، جو مصنوعی تجربہ گاہ سے محروم ہیں، اسی طور پر آگے بڑھتے ہیں، یہاں تک کہ ایک علم کی حیثیت سے فقہ کی ترقی بھی اسی طور پر ہوئی ہے، اس لئے اسلامی معاشیات کی آئندہ ترقی، دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کر صرف اس ایک نکتہ پر منحصر ہے کہ اسلامی ممالک کہاں تک اپنی معیشتوں کو اسلامی قالب میں ڈھالتے ہیں اور اسلام کے عالمگیر اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔



## ہندوستان میں اسلامی مالیات

### موجودہ مسائل اور امکانات

ہندوستان دنیا میں آبادی کے لحاظ سے چین کے بعد دوسرا بڑا ملک ہے۔ اس کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان ایک کثیر المذہب اور کثیر الثقافت ملک ہے۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد 150 ملین (15 کروڑ) تھی۔ یہاں کی آبادی 82 فیصد ہندوؤں، 12 فیصد مسلمانوں، 3.2 فیصد عیسائیوں اور 9.1 فیصد سکھوں پر مشتمل ہے۔ ان بڑے مذہبی گروہوں کے علاوہ یہاں جین، بودھ، پارسی وغیرہ دوسرے مذاہب بھی موجود ہیں، لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ شمار یاتی نقطہ نظر سے چنداں اہمیت کی مستحق نہیں۔ ہندوستانی قبائل کی ایک خاصی بڑی تعداد قدیم مذہب کی پیروکار ہے جو آدی واسی (قدیم باشندے) کہلاتے ہیں، لیکن ہندوستانی مردم شماری آدی واسیوں کو ایک مختلف گروہ تسلیم نہیں کرتی، انہیں ہندوؤں میں ہی شامل سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایک سیکولر آئین نافذ ہے جس کے تحت مختلف گروہوں کو اپنی علاحدہ مذہبی، تہذیبی، لسانی اور نسلی شناخت قائم رکھنے، اور اسے فروغ دینے کا حق بھی حاصل ہے۔

مسلم ممالک کو چھوڑ کر، دنیا کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں آباد ہے، گو کہ تازہ ترین سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد 15 کروڑ سے کچھ زیادہ ہے، لیکن غیر سرکاری تخمینوں کے مطابق یہ تعداد 20 کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ تاہم ان غیر سرکاری تخمینوں پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ مزید برآں، اس معاملہ کے دونوں فریق صحیح اعداد و شمار کو بگاڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا الزام یہ ہے کہ سرکاری ادارے ان کی تعداد کم کر کے بتاتے ہیں تاکہ ان کے جائز حقوق غصب کئے جاسکیں۔ سرکاری ادارے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان اپنی تعداد میں مبالغہ انگیز اضافہ کا دعویٰ کرتے ہیں، جس کا ان کے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں۔ اب اس قضیہ میں حق خواہ کسی کی طرف ہو، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اسلامی دنیا سے باہر، ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد قیام پذیر ہے جس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں موجود نہیں۔

اس مقالہ میں ہم اس امر کی تفتیش کرنا چاہتے ہیں کہ ایک اقلیت کی حیثیت سے، جو اتنی بڑی تعداد کی مالک ہے، لیکن جسے کسی حد تک بے حد پیچیدہ تاریخی، سماجی اور سیاسی صورت حال کا سامنا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اسلامی بنک کاری اور مالیات کی معنویت کیا ہے اور وہ اس سے کس حد تک استفادہ کر سکتے ہیں؟ تاہم ضروری ہوگا کہ اس مرکزی نکتہ پر گفتگو سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی اور معاشی حیثیت کا کچھ اندازہ قائم کر لیا جائے۔

### جغرافیائی تقسیم

ہندوستانی مسلمان کسی ایک ہندوستانی ریاست میں مرکوز نہیں ہیں، وہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں آباد ہیں۔ ان کی جغرافیائی تقسیم دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں پھیلے ہوئے ہیں، تاہم ان کی خاصی بڑی تعداد شمالی ہند میں آباد ہے۔ آزاد ہندوستان میں صرف تین ریاستیں ایسی ہیں جن میں ہندوستان میں کل مسلمانوں کی تعداد کا 10 فیصدی سے زائد آباد ہے، اتر پردیش (22%)، مغربی بنگال (14%) اور بہار (12%)۔ اس طرح ان تین ریاستوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی کل تعداد کا 48 فیصد مرکوز ہے، بقیہ 52 فیصد ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں منتشر ہیں [یہ اعداد و شمار 1991 کی مردم شماری پر مشتمل ہیں، لیکن 2001 کی مردم شماری میں تناسب میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ بہار کا تناسب 12% سے گھٹ کر 9.9% رہ گیا ہے، کیونکہ بقیہ آبادی جھارکھنڈ کی تشکیل شدہ ریاست میں آگئی ہے۔ دیکھئے سچر کمیٹی رپورٹ ر 272]۔

## شہری ارتکاز

ہندوستانی مسلمانوں کو عام طور پر شہری خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر کے بہت سے مشہور اور تاریخی شہران سے وابستہ ہیں، اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ اعداد و شمار بھی اس خیال کی تائید کرتے ہیں، کل شہری آبادی میں مسلمانوں کا تناسب، کل دیہی آبادی میں مسلمانوں کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ شہری مسلمانوں کی تعداد دیہی مسلمانوں سے زیادہ ہے، (طباعی اور کھربائی ذرائع ابلاغ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی احساس ہو جائے گا کہ شہری مسلمانوں کے مسائل کو دیہی مسلمانوں کے مسائل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے)۔ اگر کل مقامی آبادی میں مسلمانوں کے تناسب کا لحاظ کیا جائے تو ہندوستان میں ۱۹ ایسے اضلاع ہیں جہاں مسلمان ۷۵ فیصد یا زائد ہیں، ۱۱ ضلعوں میں ان کی تعداد ۵۰ فیصد یا اس سے زائد ہے، بقیہ ۵۷۱ اضلاع میں ان کی تعداد ایک فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک کے درمیان ہے۔ ریاست اتر پردیش میں، جہاں مسلمانوں کا سب سے زیادہ ارتکاز ہے، ایک سروے سے بھی انہیں رجحانات کی تصدیق ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اتر پردیش میں ۱۲ اضلاع ایسے ہیں جن کی کل شہری آبادی میں کل مسلم آبادی کا تناسب ۱۳-۲۴ فیصد ہے، لیکن ایسے ۱۸ اضلاع ہیں جہاں یہ تناسب ۲۵-۴۰ کے درمیان ہے۔ (دیکھیے جدول ۱)

## غیر زرعتی روزگار

اسی طرح ہم یہ بھی نوٹ کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں میں غیر زرعتی پیشوں کا تناسب نسبتاً زیادہ ہے اور اس خاصیت میں دیہی و شہری کا کوئی فرق نہیں۔ نیشنل سپیل سروے (N.S.S.) کے جمع کردہ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ کل دیہی مسلم آبادی کا صرف ۳۶ فیصد حصہ اپنا روزگار زرعتی زمروں سے حاصل کرتا ہے، جبکہ ہندوؤں میں یہی تناسب ۴۴ فیصد ہے۔ دوسری اقلیتوں مثلاً عیسائیوں اور دوسرے مذہبی گروہوں میں بھی یہ تناسب مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اسی اعتبار سے غیر زرعتی زمروں میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ”خود روزگاری“ (Self employment) کا تناسب زیادہ ہے کیوں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ”خود روزگاری“ کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتی ہے۔ شہری علاقوں میں مسلمانوں میں خود روزگاری کا تناسب ۵۳ فیصد ہے جبکہ ہندوؤں میں یہ تناسب صرف ۳۶ فیصد ہے (۱)۔

## سماجی اور معاشی ترقی کی سطحیں

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان سماجی اور معاشی ترقی کی سطح عام قومی سطح سے کم ہے۔ اب تو اس قیاس کی تصدیق کرنے والے کئی تحقیقی مقالے بھی دستیاب ہیں (۲)۔ گو کہ قابل اعتماد اعداد و شمار کا اب بھی قسط ہے، کیونکہ سرکاری اعداد و شمار کی درجہ بندی مذہبی فرقوں کے اعتبار سے نہیں کی جاتی، اس لئے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ مسلم نوجوانوں کے درمیان بے روزگاری کی شرح کتنی ہے اور ہندو، سکھ یا عیسائی نوجوانوں کی نسبت کم ہے یا زیادہ۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مسلم نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح قومی شرح کے مقابلہ میں کم ہے یا زیادہ۔ فی الحقیقت، متعلقہ اور قابل اعتبار اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں اس قسم کے بیانات کو قیاسات سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ (۳)

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کی زیادہ تر وجوہات تاریخی ہیں، اول تو یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جدید مغربی تعلیم اور ٹکنالوجی کو اس سرعت سے اختیار نہیں کیا جیسے ملک کے دوسرے طبقات بالخصوص ہندوؤں نے اسے اختیار کیا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے دوران مغربی تعلیم کے اختیار کرنے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کم از کم ۶۰ سال کا فرق تو ضرور تھا۔ سرسید کا ایم اے ادا کالج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا، لیکن بنارس کا ہندو کالج اس سے قبل ہی قائم ہو چکا تھا۔ بنگال میں راجرام موہن رائے کی برہمن سماج تحریک، جو ہندوؤں میں اصلاح سماج کا ہر اول دستہ سمجھی جاتی ہے، اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہی کافی زور پکڑ چکی تھی۔ اس تاریخی فرق کے نتائج آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ دوم: ایک بڑا تاریخی دھچکہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم تھا، جب ہندوستان اور پاکستان آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں آئے۔ تعلیم یافتہ، باصلاحیت، ہنرمند اور فارغ البال مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کر گئی۔ ہندوستان میں جو مسلمان باقی رہ گئے وہ معاشی طور پر کمزور اور سماجی طور پر پس ماندہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ سوم: ہندوستان میں خاتمہ زمینداری نے رہی سہی کسر پوری کر دی، مسلم زمین داروں کی زمینیں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ چونکہ ان کو متبادل روزگار نہ مل سکا، اور نہ ہی انھوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیا تھا، اس طرح ایک بظاہر ترقی پسندانہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی اور معاشرتی زوال کا پیش خیمہ بنا۔

ان سماجی، سیاسی اور دوسرے اسباب کی بنیاد پر آزاد ہندوستان میں بھی مسلمان، مجموعی طور پر ترقیاتی پروگراموں سے کما حقہ مستفید نہیں ہو پائے۔ (۴)

## قرض کی دستیابی

قومی کمیشن برائے اقلیات [National Commission on Minorities] نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا کہ ”لا علمی کی وجہ سے اقلیتی فرقہ کے افراد حکومت کی مختلف ترقیاتی اسکیموں سے کافی استفادہ نہیں کر پاتے، بینکوں سے قرضوں کے حصول میں بھی اچھے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ (5) اپنے اس بیان کی تصدیق کے لئے کمیشن نے ضلع سہارنپور میں اقلیتی فرقوں کو قرضوں کی فراہمی کے بارے میں کچھ اعداد و شمار جمع کئے۔ ملحوظ رہے کہ ضلع سہارنپور میں خاصی بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ کمیشن کو ان اعداد و شمار کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ”1990-91ء کے مالی سال کے دوران سہارنپور شہر میں اقلیتوں کو 66 ملین روپے قرض دیئے گئے، جب کہ کل قرض کی مقدار 07.506 ملین روپے تھی۔ اس طرح مسلمانوں کے حصے میں کل قرض کا صرف 13 فیصد آیا، جبکہ سہارنپور شہر کی کل آبادی میں ان کا حصہ 31 فیصدی تھا۔“ (6) (دیکھیے جدول: 2)

## بینکوں کی خدمات کا کم استعمال

جدول 2 میں دیئے گئے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمان تجارتی بینکوں کا استعمال کم کرتے ہیں۔ قومی کمیشن برائے اقلیات نے ریزرو بینک آف انڈیا سے دریافت کیا کہ مسلمان اور دوسری اقلیات کس حد تک بینکوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ریزرو بینک آف انڈیا کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر جدول 2 ترتیب دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 91-1990ء کے مالی سال میں بینکوں کے کل حسابات کی تعداد 30 کروڑ 450 لاکھ 21 ہزار 120 تھی۔ ان میں سے صرف 32 لاکھ 54 ہزار دو سو چھپاسی حسابات مسلمانوں کے تھے جو کل تعداد کا 9.34 فی صدی ہوتا ہے۔ کل قرضوں کا تقریباً 5 فیصد مسلمانوں کو دیا گیا۔ ان اضلاع میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد ہیں یہ تناسب کچھ زیادہ ہے۔

اس صورت حال کی دو وضاحتیں ممکن ہیں:

۱- اس کا امکان ہے کہ مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہو اور قرض کے لئے ان کی درخواستوں کو عام طور پر رد کر دیا جاتا ہو، تاکہ انہیں ان مالی وسائل سے محروم رکھا جاسکے۔

۲- اس کا بھی امکان ہے کہ مسلمان قرض حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، ظاہر ہے ایسی صورت میں ان وسائل تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ رسائی تو ان لوگوں کی ہی ہو سکتی ہے جو ان وسائل کو پانے کی کوشش کریں اور بینک کے ضابطوں کے مطابق درخواستیں دیں۔

اب موجودہ اور دستیاب اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں سے کون سا عامل اس صورت حال کے لئے ذمہ دار ہے۔ قیاساً اغلب یہ ہے کہ شاید دونوں عامل ایک ساتھ کارفرما ہوں۔ ان میں کس عامل کا کنٹراڈیکشن ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے مزید تفصیلی اعداد و شمار درکار ہوں گے۔ تاہم جدول 2 میں دیئے گئے اعداد و شمار کی بنیاد پر اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں بینک کے استعمال کی شرح بہت زیادہ اونچی نہیں ہے، اس صورت حال کے کئی سبب ہو سکتے ہیں مثلاً کسی آمدنی کا کم ہونا، عام خواندگی کی کم شرح، اقتصادی پسماندگی اور مذہبی اسباب۔

بہت سے مسلمان اب بھی تجارتی بینکوں سے معاملہ کرنا اس لئے پسند نہیں کرتے کہ تجارتی بینک سود پر لین دین کرتے ہیں اور سود کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے 15-20 کروڑ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس بنا پر بینکوں سے احتراز کرتی ہے۔ اندازہ لگایا ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمان بینکوں کا استعمال کرنے لگیں تو تخمیناً 150 ٹریلین ڈالر کی رقم مالیاتی نظام میں واپس آسکتی ہے، بالفاظ دیگر اگر ہندوستان میں کوئی اسلامی بینک قائم ہو جائے یا اسلامی بینک کاری کی طرف کسی دوسری شکل میں پیش رفت ہو سکے، تو اس رقم کے ایک بڑے حصہ کو معاشی نظام میں واپس لایا جاسکتا ہے۔

## اسلامی بینک کاری کی معنویت

اب تک ہندوستان اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات میں ہونے والی تبدیلیوں سے دور دور رہی رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ آئندہ بھی یہ صورت حال بعینہ برقرار رہے۔ ہندوستان کے لئے اسلامی بینک کاری اور مالیات کی اہمیت (Significance) اور معنویت (Relevance) مندرجہ ذیل نکات کے ذریعہ واضح کی جاسکتی ہے:

۱- اسلامی بینک کاری کا آغاز اسلامی ممالک میں ہوا، اس وقت اس کا ارتکاز خلیج عربی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ان ممالک میں ہے جو اسلامی کانفرنس تنظیم کے ممبر ہیں۔ مسلمان ہندوستان کی کل آبادی کا ایک معتدبہ اور اہم حصہ ہیں۔ فی الحقیقت ہندوستان کی مسلم آبادی کئی مسلم ممالک کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی، مسلم ممالک میں ہونے والے سب سے اہم اور دور رس نتائج کی حامل تبدیلی سے مکمل طور پر بے گانہ نہیں رہ سکتی۔

۲- ان ملکوں سے قطع نظر، جہاں اسلامی بینک کاری پورے ملک کی سطح پر حکومت کی طرف سے شروع کی جا رہی ہے، اسلامی بینک کاری اور مالیات کے زیادہ تر تجربے نجی زمرہ کار میں ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں 1969ء سے تجارتی بینک کاری زمرہ کار کا ایک بڑا حصہ عوامی زمرہ کار میں لے آیا گیا تھا، جب 14 بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا۔ تاہم 1990ء کی دہائی میں عالمیت (Globalization) اور کھلے پن (Liberalization) کی پالیسیوں کے تحت غیر ملکی نجی بینکوں اور دیسی نجی بینکوں کو کافی اختیارات دیئے جا رہے ہیں، بینک زمرہ کار کی نجکاری ہندوستان میں کافی عرصہ سے معرض التوا میں ہے۔ نجی زمرہ کار میں اسلامی بینک کاری کے آغاز سے ہندوستان میں نجی بینک کاری کو فروغ حاصل ہوگا۔

۳- فی الحال ہندوستان میں کسی قابل لحاظ بیمانہ پرسرمایہ کاری بینک (Investment Banks) نہیں ہیں۔ برطانوی روایت کی پیروی کرتے ہوئے نجی زمرہ کار کے بینک بھی اپنے اعمال کو بینکوں کے روایتی کردار تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اگر ایک اسلامی سرمایہ کاری بینک (Islamic Investment Bank) قائم کیا جاسکے تو اس سے ملک میں سرمایہ کاری بینکنگ (Investment Banking) کو فروغ حاصل ہوگا۔

۴- ہندوستان نے حالیہ زمانہ میں بینک کاری زمرہ کار کے لئے کھلے پن کی پالیسی اپنائی ہے اور متعدد غیر ملکی بینکوں نے یہاں کام کرنا شروع کر دیا ہے، جیسے ہانگ کانگ بینک (ہانچ ایس بی سی)، سٹی بینک، اسٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک وغیرہ۔ اگر نجی ممالک میں کام کرنے والے اسلامی بینکوں کو ہندوستان میں کام کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے تو ہندوستان میں کافی غیر ملکی سرمایہ مہیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو معروف ہے کہ 1995 میں دلہ البرک گروپ کو ممبئی میں البرک فنانانس ہاؤس قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کا منظور شدہ سرمایہ 50 ملین روپیہ تھا، جس میں سے 30 ملین روپیہ ادا شدہ سرمایہ تھا۔ اس میں 51 فیصد سرمایہ البرک نے لگایا تھا اور بقیہ 49 فی صد دیسی سرمایہ کاروں نے مہیا کیا تھا۔ البرک فنانانس کارپوریشن کو ہندوستانی قانون کی حدود میں ایک انوسٹمنٹ بینک کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ گوکہ اب ہندوستانی مالی بازار میں اس کا وجود نہیں ہے، تاہم اسلامی بینک، وسیع ہندوستانی بازار میں داخل ہونے کے لئے اس نظیر کا استعمال کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی اہمیت کی کئی کمپنیوں جیسے HSBC، سٹی بینک، ANZ Grindley وغیرہ نے اسلامی بینک کاری میں دلچسپی لینا شروع کی ہے (اے این زی گریڈ لے بینک اب اسٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک کے نام سے کام کر رہا ہے)۔ انھوں نے اسلامی بینک کاری کے لئے بعض ذیلی کمپنیاں قائم کی ہیں، خاص اسلامی سرمایہ کاری فنڈوں کا اجراء کیا ہے، یا اسلامی شاخیں قائم کی ہیں۔ سٹی بینک نے تو بحرین میں باقاعدہ ایک مکمل اسلامی بینک بھی قائم کر دیا ہے۔ HSBC کا HSBC امانت بینک برطانیہ میں فعال ہے۔ ان میں سے بعض کمپنیوں کو ہندوستان میں بھی اس قسم کے اعمال کی اجازت دی جاسکتی ہے، اس قسم کے اقدام سے اسلامی بینک کاری اور ہندوستانی معیشت دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

۵- اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسلامی بینک کاری غیر سودی بنیادوں پر کام کرتی ہے، معاشی طور پر پسماندہ، غریب اور کمزور طبقات کے لئے اس کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کچھ (Micro Credit Institution) اسلامی بنیادوں پر قائم کئے جاسکتے ہیں اور وہ ہندوستانی سماج کی ضروریات پوری کرنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

۶- اسٹیٹ بینک آف انڈیا (SBI) ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی بینک ہے، جو زرعی زمرہ کار کو مناسب اور کم شرح سود پر قرض فراہم کرتا ہے۔ ایسی اطلاعات بھی ملی ہیں کہ بعض حالتوں میں SBI نے صفر شرح سود پر قرض فراہم کئے ہیں۔

۷- ہندوستانی حالات میں غیر سودی امداد باہمی قرض انجمنیں (Interest Free Cooperative Credit Societies) بھی لوگوں کو سود خور مہیا جنوں کے چنگل سے بچانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔



## ہندوستان میں اسلامی مالیاتی ادارے

ہندوستان میں بینک کاری کا موجودہ منظر نامہ پیچیدہ، متنوع اور مختلف اقسام کے کنٹرول کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ ہندوستانی بازار زر (Money Market) دور وایتی حصوں میں بنا ہوا ہے، منظم اور غیر منظم، منظم بازار زر، نجی، عوامی اور غیر ملکی زمرہ ہائے کار میں فعال تجارتی بینکوں پر مشتمل ہے، ایک حالیہ سروے کے مطابق ملک میں 97 تجارتی بینک ہیں جن میں سے 32 عوامی زمرے کے بینک ہیں، 27 نجی زمرے کے بینک ہیں اور 38 غیر ملکی بینک ہیں، گوکہ غیر ملکی بینک تعداد میں کافی ہیں، لیکن بازار زر میں ان کا حصہ قدرے قلیل ہے، بازار میں شراکت کے نقطہ نظر سے عوامی زمرے کے بینکوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے (83 فیصد) ان کے بعد نجی بینکوں (9 فیصد) اور غیر ملکی بینکوں (8 فیصد) کا نمبر آتا ہے۔ جمع حاصل کرنے (Deposit mobilization) اور اثاثہ جات کی ملکیت (Ownership of Assets) میں بھی ایسے ہی رجحانات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی بینک کاری کا نظام، انڈین بینکنگ ریگولیشن ایکٹ 1949، ریزرو بینک آف انڈیا ایکٹ (Negotiable Instrument Act) 1881، 1935، کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ 1861، اور بینکنگ ریگولیشن ایکٹ 1969 کے ضابطوں کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی قانون میں غیر سودی بینک کاری کے امکان کو تسلیم نہیں کیا گیا، اس لئے جب کبھی بھی ہندوستان میں غیر سودی بینک کاری کا آغاز ہو تو متعلقہ قوانین کی بعض ششوں میں ترمیم لازمی ہوگی۔

ان حالات میں ہندوستان میں فی الحال کسی اسلامی بینک کا وجود نہیں، تاہم اسلام میں حرمت سود کے پیش نظر، ہندوستانی مسلمانوں نے غیر سودی متبادل کی تلاش اپنا فرض سمجھا اور اس سمت میں بہت سی کوششیں کیں۔ بیشتر ان کوششوں نے مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک شکل اختیار کی۔

- ۱- غیر سودی قرض انجمنیں (Interest Free Credit Societies)
- ۲- غیر سودی مالیاتی کمپنیاں (Interest Free Financial Companies)
- ۳- سرمایہ کاری فنڈ (Investment Funds)

## غیر سودی قرض انجمنیں (Interest Free Credit Societies)

اسلامی بینکوں کے عدم وجود کی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے مالیاتی ادارے قائم کئے ہیں، خواہ ان کا پیمانہ کسی قدر چھوٹا کیوں نہ ہو، اور ان کا حجم کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ تخمیناً اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں کم از کم دو سو ایسے ادارے کام کر رہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان اداروں کے بارے میں قابل اعتماد مالیاتی اور شماریاتی تفصیل کا فقدان ہے، معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی سائنٹفک نظام کا وجود نہیں۔ بعض افراد نے انفرادی طور پر سروے کرنے اور معلومات جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں، لیکن ان کوششوں کو بہت کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً ڈاکٹر رحمت اللہ نے 1150 اسلامی مالیاتی اداروں کے پتے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ان تمام اداروں کو ایک سوالنامہ ارسال کیا۔ ان میں سے صرف 34 نے جوابات دینے کی زحمت گوارا کی۔ ڈاکٹر رحمت اللہ نے ان نتائج کو ایک تحقیقی مقالہ کی شکل میں شائع کر دیا ہے، جس سے ان اداروں کے بارے میں خاصی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ (8)

ڈاکٹر رحمت اللہ نے اپنے مقالہ میں ان اداروں کو ”اسلامی بینک“ قرار دیا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ ”ہندوستان میں یہ غیر سودی ادارے بیشتر وہی اعمال انجام دے رہے ہیں جو عام طور پر روایتی بینک اور بعض ملکوں میں اسلامی بینک انجام دیتے ہیں، اس لئے ان کو ”اسلامی بینک“ کہنا غلط نہیں ہوگا۔“ (9) اس نکتہ پر اوصاف احمد نے اختلاف کیا اور یہ دلیل پیش کی ”ان غیر سودی اداروں کو اسلامی بینک قرار دینا درست نہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان اداروں کے لئے یہ ایک غلط نام ہے (Misnomer)، بلکہ اس سے ہندوستان میں غیر سودی مالی اداروں کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے۔“ (10) اوصاف احمد نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ اسلامی بینک صرف منافع کمانے والے ادارے نہیں ہیں، وہ قانونی ادارے بھی ہیں جو متعلقہ ممالک کے کسی قانون کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ جن ملکوں کے قوانین میں اسلامی بینک کاری کی گنجائش نہیں تھی وہاں نئے قوانین بنائے گئے، یا موجودہ قوانین میں ہی مناسب تبدیلیاں کی گئیں، لیکن ہندوستان میں یہ صورت حال نہیں ہے، جہاں یہ ادارے کسی قسم کی قانونی حمایت کے بغیر ہی کام کرتے ہیں۔ ان کو بینک کہنا اس لئے بھی درست نہیں کہ ہندوستان میں ریزرو بینک آف انڈیا کی اجازت کے بغیر کوئی بینک قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ ادارے بینکوں کے اعمال انجام دیتے ہیں تو

مرکزی بینک ان کے خلاف یہ کہہ کر اقدام کر سکتا ہے کہ یہ بینک غیر قانونی ہیں۔

بہر حال دستیاب معلومات اور اعداد و شمار کے پیش نظر ہندوستان میں غیر سودی مالی اداروں کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں کہی جاسکتی ہیں:

۱- گوکہ غیر سودی بینک کاری کی نظریاتی تشکیل برصغیر میں بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں ہی ہو چکی تھی، لیکن غیر سودی مالیاتی اداروں کا وجود بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں ہی عمل آیا۔ عموماً ان اداروں کا قیام برصغیر سے باہر ہی ہوا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب جلیجی ممالک اور اسلامی کانفرنس تنظیم سے وابستہ دوسرے ممالک میں اسلامی بینک قائم کرنے کی ایک لہر چل رہی تھی۔

۲- موجودہ اطلاعات کے مطابق ہندوستان میں غیر سودی مالی ادارے زیادہ تر جنوبی ریاستوں میں قائم کئے گئے ہیں، جن میں آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا اور تامل ناڈو شامل ہیں۔ شمالی ہند، جہاں ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، ابھی بھی اس تحریک سے مستفید ہونے کو ہے۔

۳- ان اداروں کے قیام کا اصل محرک مذہبی ہی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ادارے ان لوگوں نے قائم کئے ہیں جن کا کسی نہ کسی مذہبی جماعت سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق تھا۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ ان اداروں کے قیام اور مسلسل کارکردگی کے پیچھے عام مسلمانوں کی یہ خواہش بھی کارفرما رہی ہے کہ وہ اپنے مالی اعمال غیر سودی بنیادوں پر سرانجام دینا چاہتے ہیں، تاکہ وہ ربا سے آلودہ ہو کر گناہگار نہ ہوں۔ ان میں سے بیشتر ادارے فلاحی بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔ ان کو تجارتی یا مالیاتی ادارے تسلیم کرنا مشکل ہے، کیونکہ منافع کا حصول، ان اداروں کا بنیادی محرک نہیں ہے۔

۴- ان سوسائٹیوں کا رجسٹریشن مختلف قوانین کے تحت کرایا گیا ہے، بعض کار رجسٹریشن خیراتی اداروں کے طور پر کرایا گیا ہے، بیشتر اداروں کا رجسٹریشن سوسائٹی ایکٹ کے تحت ہوتا ہے، اس لئے وہ رجسٹرڈ سوسائٹی کے نام سے جانی جاتی ہیں، بعض ادارے خیراتی ٹرسٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، جبکہ بعض نے اپنا رجسٹریشن کو آپریٹو سوسائٹی کی حیثیت سے کرایا ہے۔ ان میں تجارتی کمپنیوں کی تعداد بہت کم ہے۔

۵- ان اداروں کے مالیاتی ذرائع میں اداروں کی نوعیت کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً خیراتی اداروں کو ان کے مالیاتی وسائل زکوٰۃ، صدقہ اور دوسرے خیراتی کاموں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔ امداد باہمی انجمنوں کو ان کے مالی وسائل ممبروں سے فیس اور جمع کی شکل میں حاصل ہوتے ہیں۔ صرف وہ تجارتی کمپنیاں، جن کو اس کی قانونی اجازت ہے، جمع قبول کر کے مالی وسائل حاصل کر سکتی ہیں۔

۶- متعلقہ اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان اداروں کے تحت کتنا سرمایہ موجود ہے، اور کتنی جمع رقم ان کے پاس ہے، اسی سبب سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی زندگی میں ان اداروں کا کیا رول اور کردار ہے۔

۷- ان سوسائٹیوں اور اداروں کا اصل کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممبروں یا عام لوگوں سے رقوم جمع کے طور پر وصول کرتے ہیں اور ان کو ضرورت پیش آنے پر غیر سودی قرض فراہم کرتے ہیں۔ ان اعمال کی تفصیل میں مختلف اداروں میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ قرض دینے کے معاملہ کو ہی لیجیے، بعض ادارے یہ خدمت بالکل مفت انجام دیتے ہیں، کچھ ادارے حق خدمت (Service Charge) وصول کرتے ہیں، کچھ ادارے قرض دیتے وقت زیورات یا کوئی دوسری قیمتی چیز رہن رکھ لیتے ہیں، جب کہ کچھ دوسرے ادارے شخصی ضمانت کو ہی کافی سمجھتے ہیں، کچھ ادارے بعض اسلامی مالیاتی طریقوں مثلاً اجارہ اور مشارکت وغیرہ پر بھی عمل کرتے ہیں، گوکہ ان اعمال کا دائرہ کار اور سطح معروف وجوہات کی بنیاد پر محدود ہی رہتا ہے۔

ان اداروں کی کارکردگی کے بارے میں بعض معروضات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں، تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان معروضات کو اسلامی مالیاتی اداروں کی کارکردگی کی قدر و قیمت کا تعین نہیں سمجھنا چاہیے، جس کے لئے تفصیلی اعداد و شمار اور معلومات کی کہیں زیادہ مقدار میں ضرورت ہوگی۔ تاہم محدود معلومات کی بنیاد پر کم از کم یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ:

۱- ان اداروں نے غیر سودی بینک کاری کے تصور کو ایک ایسے ماحول میں مقبول بنانے کا مفید کردار انجام دیا ہے، جو اگر مخالفانہ نہیں ہے تو موافقانہ بھی نہیں ہے۔

۲- ان میں سے بیشتر ادارے غیر منظم زمرہ کار میں فعال ہیں، جب کہ غیر منظم زمرے کی دیکھ ریکھ اچھی طرح نہیں کی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوام الناس کے دلوں میں ان اداروں کی بابت پورا اعتماد بحال نہیں ہوتا اور وہ اپنی جمع رقوم کے تحفظ کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی انجمنیں

رجسٹرڈ بھی نہیں ہیں۔ بعض اوقات کچھ طالع آزمائوں کو اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر مالی منافع کے حصول میں لگ جاتے ہیں اور دوسروں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں، ان اداروں کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ کسی مناسب قانون کے تحت اپنا رجسٹریشن کرائیں اور اپنے اعمال میں شفافیت (Transparency) اور جواب دہی (Accountability) کے عناصر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

### غیر سودی مالیاتی کمپنیاں

غیر سودی مالیاتی تجارتی اداروں کی ایک دوسری شکل مالیاتی اور سرمایہ کاری کمپنیاں ہیں، جو اپنا کاروبار غیر سودی بنیادوں پر کرتی ہیں، ہندوستان میں یہ کمپنیاں منظم بازار میں کام کرتی ہیں اور ان کا رجسٹریشن ضروری ہے۔ اس رجسٹریشن کے باعث، ان کمپنیوں کو اپنے پیش روؤں کی بہ نسبت عوام کا زیادہ اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ فی الحال اس قسم کی کمپنیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے تاہم ذیل میں دو اہم کا تذکرہ کیا جاتا ہے گوکہ ان میں سے اول الذکر (الامین کارپوریشن) اب بند ہو چکی ہے:

۱- الامین اسلامک فنانشیل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ

۲- انجیب ملی میچوکل بین فٹ فنڈ لمیٹڈ

الامین اسلامک فنانشیل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن

### [Al-Ameen Islamic Financial Investment Corporation]

الامین اسلامک فنانشیل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن (AIFIC) ایک زمانے تک ہندوستان میں سب سے بڑا اور اہم اسلامی مالیاتی ادارہ تھا۔ اس کا صدر دفتر جنوبی ہند میں ریاست کرناٹک کے صدر مقام بنگلور میں واقع تھا۔ ہندوستان میں یہ واحد مالیاتی کمپنی تھی جو ایک شرعی بورڈ کی نگرانی میں اپنے اعمال انجام دیتی تھی، اس کمپنی کا منظور شدہ سرمایہ 100 ملین روپیہ رکھا گیا تھا جس کو دس دس روپے کے 10 لاکھ حصص میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں سے 52,390.00 کے حصص جاری کئے گئے، خریدے گئے اور ادا شدہ بنے۔

کارپوریشن کا رجسٹریشن 1956ء کے کمپنی ایکٹ کے تحت کرایا گیا، کارپوریشن کا خاص کاروبار گاڑیوں، صنعتی اوزار و مشینری اور عمارتوں کو کرائے پر دینا تھا، اس کمپنی کو ریزرو بینک آف انڈیا نے ایک لیزنگ کمپنی (Leasing Company) کے طور پر تسلیم کر رکھا تھا۔ اس کمپنی کو غیر بینک کاری مالیاتی ادارے (NBFI, Non-Banking Financial Institution) کی حیثیت حاصل تھی، NBFI ہونے کی حیثیت سے کارپوریشن کو جمع قبول کرنے کا اختیار ہے، ایک لائسنس یافتہ جمع قبول کرنے والے (Licensed Deposit Taker) ادارے کی حیثیت سے کارپوریشن نے اپنے گاہکوں کے درمیان جو عام طور پر غریب مسلمان ہیں، بچت اور سرمایہ کاری کی عادت کو فروغ دینے کے لئے مختلف قدم اٹھائے ہیں۔

### کمپنی کے اعمال

گوکہ الامین کمپنی کی عملی تجارت اب بند ہو چکی ہے تاہم اس کے تجارتی اعمال کو یہاں قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان کی حد تک یہ واحد تجارتی کمپنی تھی جو مزعومہ طور پر یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کے تجارتی اعمال شریعت سے متصادم نہیں ہیں:

۱- کمپنی عام طور پر ”کرایہ“ کو ایک مالیاتی آلے (Financing Tool) کی حیثیت سے استعمال کرتی تھی، اس مقصد کے لئے کئی لیزنگ اسکیمیں وضع کی گئی تھیں، کرایہ کا بنیادی معاہدہ 3-5 برس کا ہوتا تھا۔ بعض حالتوں میں اثاثہ کے لین دار (Lessee) کو اثاثہ کی قیمت کا کچھ فیصد حفاظتی جمع (Security Deposit) کے طور پر جمع کرنا ہوتا تھا۔ کرایہ کی مدت کے دوران اثاثہ کا لین دار، دین دار کو طے شدہ ماہانہ کرایہ ادا کرنے کا پابند تھا۔

۲- کمپنی مراجمہ کی بنیاد پر دیر پا اشیاء صرف (Durable Consumer Goods) کی خریداری کے لئے مالیات کا انتظام کرتی ہے، چنانچہ کمپنی مراجمہ کے معروف طریقہ کے مطابق دیر پا اشیاء صرف خریدتی اور طے شدہ منافع پر گاہکوں کے ہاتھ ادھار فروخت کرتی تھی۔

۳- کمپنی صنعتی، تجارتی اور دوسرے مشروعات کو نفع میں شرکت (Profit Sharing) کی بنیاد پر مالی اعانت فراہم کرتی ہے۔ مشروع کے مختلف

پہلوؤں کی چھان بین کے بعد کمپنی گا ہوں سے منافع کی شرح اور اعانت کی مقدار طے کرتی ہے۔ عموماً یہ مذاکرات براہ راست سرمایہ کاری یا مشارکت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

۳- ایک منصوبہ کے تحت غریبوں اور معاشی طور پر کمزور طبقات کے لئے گھر بنانے کی خاطر مالیات کا اہتمام کیا جاتا تھا، اس منصوبہ کے تحت گا ہک کے نام پر ایک بچت کھاتہ کھولا جاتا تھی، اور تین سال تک اس کی بچت اس کھاتے میں جمع کی جاتی تھی، تین سال بعد گا ہک ادارے سے اپنی کل جمع رقم کا دو گنا قرض کے طور پر حاصل کر سکتا تھا۔ قرض کی حدود لا کھ روپے مقرر کی گئی تھی۔ قرض کو سات سال کے عرصہ میں یکساں ماہانہ قسطوں میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ قرض پر کوئی اور رقم وصول نہیں کی جاسکتی۔

۵- کمپنی ہندوستانی کمپنی ایکٹ 1956ء کے ضابطوں کے تحت رقم جمع کے لئے قبول کرتی تھی، جمع کنندہ کو کمپنی کے منافع اور ہر اس بونس میں شرکت کا حق تھا جس کا اعلان کمپنی وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھی۔

۶- دستیاب اعداد و شمار کے مطابق 1994-95ء میں مضاربت جمع کی مقدار 94.1 بلین روپے تھی۔ 1995-96 میں یہ جمع رقم بڑھ کر 104.5 بلین روپے ہو گئی، لیکن 1996-97ء میں جمع رقم گھٹ کر 100.6 بلین ہو گئی تھی، جب کہ 1995-96 میں بڑھ کر 104.5 بلین ہو گئی، ایک بار پھر گھٹاؤ کا رجحان دیکھا گیا لیکن 1997-98 میں جمع رقم 131.0 بلین تک پہنچ گئی۔

۷- الایمن کارپوریشن میں جمع ہونے والی رقم کو کئی طرح کے کھاتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا مثلاً: بچت کھاتے، مسلسل کھاتے (Recurring Deposit)، ثابت کھاتے (Fixed Deposit) مضاربت کھاتے، بزرگ شہری کھاتے، (Senior Citizen Deposit) پیش کھاتے، منافع نقد سرٹیفیکٹ، دوبارہ سرمایہ کاری (Reinvestment) کھاتے، قرض سے بڑے کھاتے، وغیرہ۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ کسی ایک وقت میں سارے کھاتے چالو ہوں۔

۸- کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اختیار تھا کہ وہ جمع کے لئے نئی اسکیمیں جاری کر سکے۔ بورڈ نے اختراعات کے ذریعہ نئی اسکیمیں وضع کی تھیں، مثلاً حج اور عمرہ کھاتے، ان کھاتوں میں رقم اس لئے جمع کی جاتی تھی کہ بعد میں بچت کاران سے حج اور عمرہ کے اخراجات پورے کر سکیں۔ اسی طرح الایمن نے اقراء ڈپازٹ اسکیم کے نام سے ایک جمع اسکیم جاری کی تھی جس کا مقصد تعلیمی اخراجات کی کفالت تھا۔ تحفہ ڈپازٹ اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بچت اور سرمایہ کاری کی طرف رغبت دلائی جائے۔

۹- الایمن کارپوریشن چھوٹے اور غریب بچت کاروں کے لئے بھی وقتاً فوقتاً مختلف اسکیموں کا اجراء کرتا رہتا تھا۔ مثلاً آٹورکشادالوں کے لئے ایک اسکیم جاری کی گئی، جو شخصی ضمانت پر 15,000 روپیہ تک کا قرض حاصل کر سکتے تھے۔ یہ رقم ایک آٹورکشا خریدنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ خریداری کے بعد ڈرائیور کو آٹورکشا الایمن کے پاس رہن (Mortgage) کرنا ہوتا تھا۔ ڈرائیور کو یہ رقم ایک ہزاروں (33 ماہ) میں -/15 Rs. یومیہ کے حساب سے ادا کرنا ہوتی ہے۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ ڈرائیور اتنی رقم اپنی روزانہ آمدنی میں سے آسانی سے دے سکتے ہیں۔ پوری رقم کی ادائیگی کے بعد آٹورکشا کی ملکیت ڈرائیور کے نام کر دی جاتی تھی۔

النجیب ملی میچوئل بینیفٹ فنڈ لمیٹڈ

(Al-Najeeb Milli Mutual Benefit Fund Ltd.)

یہ ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی ہے جس کا قیام 1990ء میں عمل میں آیا۔ 1993ء میں حکومت ہند نے اسے ایک میچوئل فنڈ کمپنی کی حیثیت سے تسلیم کیا (جسے ہندی میں بندھی کہتے ہیں)۔ اس طرح اب اس کمپنی کو بغیر کسی حد اور رکاوٹ کے جمع رقم قبول کرنے کے اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ اس فنڈ کی شاخیں یوپی، دہلی اور ممبئی میں قائم ہیں اور اس کی جمع رقم 165 بلین روپے تک پہنچ چکی ہیں۔ فنڈ نے مختلف قسم کی جمع اسکیمیں جاری کی ہیں۔ مثلاً فوری جمع کھاتہ (Spot Deposit Account) اور جمع منافع کھاتہ (Deposit Benefit Account)۔ ان اسکیموں میں کھاتہ کھولنے کے لئے انجیب کا ممبر بننا ضروری ہے۔ فوری جمع کھاتہ چھوٹے بچت کاروں کے لئے ہے، اس کا مقصد چھوٹے بچت کاروں میں بچت کے رجحان کو فروغ دینا ہے۔ کمپنی کے مقرر کردہ نمائندے بچت کاروں سے براہ راست جمع وصول کرتے ہیں، بچت کاروں کے لئے کھاتہ میں ایک کم از کم رقم (Minimum Balance) کارکھنا

ضروری ہے۔ بچت کاروں کو ان کی جمع رقوم پر کسی طرح کا منافع نہیں ادا کیا جاتا۔ جمع منافع کھاتا اسکیم (Deposit Benefit Scheme) کے تحت بچت کار -/40 Rs. یومیہ یا ایک ہزار روپیہ ماہانہ ساڑھے پانچ مہینہ کے لئے جمع کر سکتے ہیں۔ جب یہ رقم ساڑھے پانچ ہزار -/5500 Rs. یا اس کی کئی گنا (جیسے دو گنا، تین گنا) ہو جائے تو اس کو اسٹاک مارکٹ میں کمپنیوں کے حصص میں لگا دیا جاتا ہے، کمپنی سونے کے زیورات رہن رکھ کر معمولی حق الخدمت کے عوض غیر سودی قرض بھی فراہم کرتی ہے۔

### سرمایہ کاری فنڈز (Investment Funds)

گذشتہ بیس پچیس سال سے مالیاتی بازاروں میں اس رجحان کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بینکوں میں رکھی گئی جمع رقوم میں اس تیزی سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے جس تیزی سے میچوکل فنڈ، سرمایہ کاری فنڈ، اور پنشن فنڈ وغیرہ میں ہو رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں اسلامی سرمایہ کاری فنڈ کی تعداد اور ان کی رقوم میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک کسی اسلامی انوسٹمنٹ فنڈ کا وجود نہیں آنا نہیں سنا گیا۔ اس کا بنیادی سبب ہندوستانی مسلمانوں کی عام اقتصادی پسماندگی ہو سکتی ہے، جس نے انھیں مالیاتی بازاروں میں کسی اہم رول کی ادائیگی سے روک رکھا ہے، حالانکہ گذشتہ برسوں میں بیرون ملک روزگار خصوصاً ممالک میں روزگار کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک حصہ مالیاتی بازاروں میں سرمایہ کاری کے لائق بن چکا ہے، لیکن عام مسلمانوں کی طرح اس طبقہ کو بھی موجودہ مالیاتی بازار کے بارے میں شدید تحفظات ہیں کہ زیادہ تر مالیاتی طریقے ربا سے ملوث ہیں۔ بجا طور پر ان کی خواہش ہے کہ وہ اپنے مال کی سرمایہ کاری ایسے انداز میں کریں کہ ان کے مال سے حاصل ہونے والا فائدہ جائز ہو اور حرام طریقوں سے اس کا مس نہ ہو۔

تاہم بازار میں کچھ زیادہ غیر سودی متبادل بھی نہ تھے، عرصہ دراز تک مالی سرمایہ کاری (Financial Investment) کے صرف دو طریقے ہندوستانی بازار میں موجود تھے، یا تو بینکوں کے ثابت کھاتوں میں جمع رقم کروائی جائے (Fixed Deposit) اور نہ بازار حصص (Stock Market) سے کمپنیوں کے حصص خریدے جائیں۔ چھٹی دہائی کے وسط میں حکومت ہند نے ایک اسکیم کا اجراء کیا جو اپنی شکل اور کارکردگی میں میچوکل فنڈ سے ملتی جلتی تھی۔ اس اسکیم کا نام یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا (Unit Trust of India) تھا، لیکن اس کو UTI کے مخفف نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ کمپنی اپنے Units پبلک کو فروخت کرتی اور یافت کی سرمایہ کاری مختلف دوسری کمپنیوں کے حصص میں کی جاتی، اس طرح یونٹ میں لگنے والے سرمایہ کا منافع دراصل ان صنعتوں کی کارکردگی پر منحصر ہوگا جن میں یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا نے سرمایہ کاری کی ہے۔ چونکہ UTI سے ملنے والا منافع تغیر پذیر (Variable) ہے، اس لئے بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ UTI میں سرمایہ کاری اسلامی سرمایہ کاری کے بے حد قریب ہو سکتی ہے۔ گوکہ اس ضمن میں بعض اہم قضایا کا پتہ لگانا باقی ہے۔ شروع میں تو UTI متوقع منافع کا اعلان نہیں کرتا تھا، لیکن جلد ہی UTI نے گذشتہ سال کے تجربہ کی روشنی میں آئندہ سال کے لئے متوقع منافع کی شرح کا اعلان کرنا شروع کر دیا، ایک دوسری دشواری یہ ہے کہ UTI کی سرمایہ کاری کو ان صنعتوں اور ان اشیاء سے دور رکھنے کی کوئی صورت نہیں جن کو اسلامی شریعت ممنوع قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ان اسباب کی بناء پر مسلمانوں کے ذہنوں میں یونٹ میں سرمایہ کاری کے بارے میں بھی شبہات اور تحفظات پیدا ہو گئے۔

حصص کی سرمایہ کاری اور اسٹاک مارکٹ میں وسعت کے ساتھ صورت حال اب کسی قدر بہتر ہوئی ہے، اسلامی اقدار میں ایمان رکھنے والے سرمایہ کار کے لئے حصص میں سرمایہ کاری (Equity Investment) ایک بہتر متبادل سمجھا جاتا رہا ہے۔ گوکہ گذشتہ کئی برسوں میں ہندوستانی مالیاتی بازار میں سرمایہ کاری فنڈوں اور باہمی فنڈز کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ فنڈ بھی مسلم سرمایہ کاری کی مشکلات کے حل میں چنداں مفید نہیں ثابت ہوئے، اول تو ان میں سے بیشتر فنڈ اپنے مالی وسائل کا معتدبہ حصہ سرکاری تمسکات (Government Securities) میں لگاتے ہیں، جن میں گوسود کی شرح کم ہوتی ہے لیکن حکومتی ضمانت کے باعث پیسہ محفوظ رہتا ہے۔ دوم یہ کہ ان فنڈز کو ان صنعتوں سے ابھی کوئی گریز نہیں ہے جن کو مسلمان اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے ممنوع سمجھتے ہیں۔

1995ء میں نانا میچوکل فنڈ نے نانا کوریٹرا کیوٹی فنڈ کا اجراء کیا۔ مختلف اسلامی مالیاتی اداروں نے اس فنڈ کے فروغ اور بازار کاری (Marketing) میں حصہ لیا۔ ان اداروں کی کوششوں کے نتیجے میں نانا نے اس فنڈ کو اس طرح وضع کیا کہ مسلم سرمایہ کاروں اور دوسرے اخلاقی سرمایہ کاروں (Ethical Investors) کے تحفظات کا خیال رکھا جائے۔ فریقین میں یہ طے پایا کہ اس فنڈ کے ذریعہ حاصل ہونے والے سرمایہ کی سرمایہ کاری، سودی قرضہ دینے کے لئے یا ان کمپنیوں میں نہیں کی جائے گی جو اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرتی ہوں، مثلاً جو شراب سازی یا لحم خنزیر کی پیداوار وغیرہ میں شریک ہوں۔ یہ بھی طے پایا کہ اس فنڈ کے ذریعہ حاصل ہونے والا سرمایہ بنیادی ڈھانچہ اور کلیدی اہمیت کی صنعتوں میں ہی لگایا جائے گا، جیسے سمینٹ، لوہا، فولاد، قوت، کیمیادی اشیاء،

انجینئرنگ، کیسادی کھاد، پٹرولیم، موٹر کار، اتصالات وغیرہ۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر خلیجی ممالک میں بھی مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر اس فنڈ کی خریداری کی۔ شروع کے برسوں میں معیشت کی کساد بازاری کے سبب اس فنڈ کی کارکردگی امیدوں کے مطابق نہیں رہی، تاہم بعد کے برسوں میں اس میں خاصی بہتری واقع ہوئی۔

### ہندوستان میں اسلامی مالیات کے امکانات

ہم اس کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ ملک میں اس وقت کئی طرح کے اسلامی مالیاتی ادارے موجود ہیں، مثلاً کریڈٹ سوسائٹی، یا قرض انجمنیں، اسلامی مالیاتی کمپنیاں اور سرمایہ کاری فنڈ وغیرہ، اس ضمن میں اب یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی بینک کاری اور مالیات کے امکانات کیا ہیں، اور اس کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟

ہندوستان میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہاں کے مسلمان بہت دن تک اسلامی مالیات سے بے گاندرہ سکیں گے۔ اس مقالہ کے پہلے حصہ میں بیان کئے گئے اداروں اور ان کے اعمال سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان، غیر سودی مالیات اپنانے کی خواہش میں کسی دوسرے ملک کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فی الوقت ہندوستان میں کسی اسلامی بینک کا وجود نہیں ہے، بجز اس کے کہ خلیج کے ایک اسلامی بینک کو ممبئی میں ایک شاخ کھولنے اور چلانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی بینک کاری کے لئے ہندوستان کے دروازے مستقلاً بند ہیں کبھی کبھی نہیں سکتے۔ بیرونی ممالک میں اسلامی بینک کاری کی کامیابی، اور اندرون ملک مسلمانوں کی بڑی تعداد، دو ایسے عوامل ہیں جو ہندوستان میں اسلامی مالیات کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور اس امکان کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہندوستان میں غیر سودی بینک قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جہاں اگر کسی اقدام کے حق میں عام رائے (Public opinion) معتدبہ تعداد میں ہموار کی جائے تو حکومت کو اس مجوزہ اقدام کے حق میں قانونی انتظام کرنا ہی ہوگا۔ ابھی اس امکان کے بارے میں مزید پیش قیاسی کرنا قبل از وقت ہوگا، تاہم دو امکانات تو واضح ہیں، یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں حکومت کی اجازت سے مناسب قانونی تحفظ کے ساتھ ایک اسلامی بینک قائم ہو اور اس بینک کو مجاز کیا جائے کہ وہ مختلف علاقوں میں اپنی شاخیں قائم کر سکے۔ دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ ملیشیا کا تتبع کرتے ہوئے موجودہ تجارتی بینکوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ ایک غیر سودی کاؤنٹر قائم کریں۔

اس کے ساتھ ہم یہ بات زور دے کر کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملک کے نظام بینک کاری کا جزء بنایا جانا چاہیے۔ اب تک وہ اس نظام سے باہر ہی رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترقی کی کوششوں سے وہ بے گاندرہ جاتے ہیں اور مالیات (Finance) سے محروم رہتے ہیں جو کہ پیداوار کا ایک اہم عامل (Factor) ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے 200 سے زائد غیر سودی قرض انجمنیں (Credit Societies) قائم کی ہیں جو ملک کے طول و عرض میں موجود ہیں۔ یہ انجمنیں مالی وسائل مہیا کرنے اور غیر سودی قرض فراہم کرنے کے میدان میں فعال ہیں۔ ان میں سے بعض انجمنیں مثلاً مسلم فنڈ منجیب آباد، اور بیت النصر سوسائٹی کافی بڑے اداروں میں تبدیل ہو چکے ہیں (انسوس کہ بیت النصر سوسائٹی بوجہ اپنے اعمال بند کر چکی ہے)، ان تمام مالیاتی اداروں کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ یہ مناسب قانونی اجازت اور قانون کی حمایت کے بغیر کام کرتے ہیں، چنانچہ جب ان پر برا وقت پڑتا ہے تو ان کے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ اپنے دروازے بند کریں اور عوام الناس سے اجازت چاہیں۔ ان انجمنوں کے حق میں بہتر یہ ہوگا کہ وہ پہلی فرصت میں اپنا رجسٹریشن کرائیں، خواہ یہ رجسٹریشن آف سوسائٹیز ایکٹ کے تحت ہو یا کوآپریٹو سوسائٹیز کے تحت۔

اسی طرح ان فنانس کمپنیوں کو بھی، جو اسلامی انوسٹمنٹ کمپنیوں کے طور پر کام کر رہی ہوں، قانونی حفاظت اور حمایت درکار ہے۔ فی الحقیقت ہندوستان جیسے ممالک میں کام کرنے والی اسلامی انوسٹمنٹ کمپنیوں کو دوسرے قانونی نظام کی ضرورت ہے۔ اول تو ان کو شرعی نگران بورڈ کی ضرورت ہوگی جو اس بات کا خیال رکھے کہ اس کمپنی کے اعمال شریعت کے مطابق ہیں، اس سے عوام کے درمیان اس کمپنی کے بارے میں اعتماد بحال ہوگا، دوم کمپنیوں کو ملکی قاعدہ و قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔ جو بھی کمپنی قائم ہو وہ ملکی قانون کے تحت قانونی طریقہ سے قائم ہو، تا کہ اگر ضرورت پڑے تو کمپنی قانون کا سہارا لے سکے۔ قانونی حمایت سے کمپنی کے دوسرے مفادات کا تحفظ بھی ہو سکے گا۔

اس ضمن میں ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان اداروں کی مناسب اور صحت مند ترقی اور افزائش کے لئے ایک اچھا ماحول پیدا کرنے کی غرض سے مالیاتی حکام، پالیسی سازوں اور فیصلہ سازوں کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کرانا مفید ہوگا:

۱- مالیاتی حکام اور پالیسی سازوں نے اب تک غیر بینکی مالیاتی کمپنیوں (Non-banking Financial Institution) کے بارے میں کسی مربوط پالیسی کا اظہار نہیں کیا۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں غیر سودی بنیادوں پر کام کرنے والوں کو NBFIs ہی قرار دیا جاتا ہے۔ ان غیر بینکی مالیاتی اداروں پر نافذ ہونے والے قانونی ضابطے اب سے کئی سال پہلے جاری کئے گئے تھے۔ گذشتہ برسوں کے اندر ان کمپنیوں کی تعداد اور ان کے اعمال میں کافی اضافہ ہو گیا ہے جس کے باعث ان ضابطوں کی جدید کاری ضروری ہو گئی ہے۔

۲- ان غیر بینکی مالیاتی اداروں کی نگرانی ریزرو بینک آف انڈیا کے سپرد ہے، جو ان سے نسبتاً سختی سے معاملہ کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ ان اداروں سے متعلق ضابطوں میں کچھ نرمی لائی جائے۔

۳- قانون کا تقاضہ ہے کہ یہ ادارے اپنی کل سرمایہ کاری کا کم از کم 15 فیصد سرمایہ سرکاری تمسکات (Government Securities) میں لگائیں۔ یہ سرکاری تمسکات عام طور پر سودی ہوتے ہیں، ان کمپنیوں کو جو غیر سودی بنیادوں پر کام کرتی ہیں، اس شرط سے بری کر دینا چاہیے، یا ان اداروں سے ایسی سرمایہ کاری کرائی جائے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر سودی ہو، مثلاً ان کمپنیوں سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بنیادی اور کلیدی اہمیت کی صنعتوں کے سرمایہ میں شرکت کریں۔

۴- غیر بینکی مالیاتی اداروں (NBFIs) کو عام طور پر اراضی میں سرمایہ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ غالباً اس کا مقصد اراضی میں سٹے بازی کو روکنا ہے، جس کا ہندوستان میں خاصا رواج ہے، تاہم اس پابندی سے ان اداروں کے منافع کمانے کا ایک موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مناسب تحفظات کے ساتھ ان اداروں کو اراضی میں سرمایہ کاری کی اجازت ہونی چاہیے۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ اقدامات ان غیر بینکی مالیاتی اداروں کے لئے بھی مفید ہوں گے جو اپنا کاروبار غیر سودی بنیادوں پر چلاتے ہیں، خواہ وہ منظم زمرے میں ہوں یا غیر منظم زمرے میں، تاہم ان اداروں کو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

### شفافیت (Transparency)

تمام اسلامی مالیاتی اداروں کو اپنے گاہکوں اور عام لوگوں کے تئیں شفاف ہونا چاہیے، اس سے عوام الناس میں ان اداروں کے لئے اعتماد بحال ہوگا۔ اس ضمن میں شفافیت کا رول دوہرا ہونا چاہیے، اول تو یہ یقین دہانی کرنے کے لئے کہ شرعی اصولوں کی فی الواقع پابندی کی جارہی ہے اور اس سلسلہ میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا جا رہا، دوسرے اس یقین دہانی کے لئے کہ محفوظ مالیاتی انصرام (Sound Financial Management) کے تمام اصولوں کی پابندی بھی کی جارہی ہے اور جمع کاروں کی رقم محفوظ رہے گی۔ ان مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے اپنے حسابات کی باقاعدہ جانچ پڑتال (Audit) کسی اچھے Auditor سے کرائیں اور ہر سال اپنے مالی حسابات (Financial Accounts) شائع کریں۔

### پیشہ ورانہ انصرام (Professional Management)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض پر جوش نوجوان ربا سے نجات پانے کی غرض سے کوئی اسلامی مالیاتی ادارہ قائم کر بیٹھتے ہیں، لیکن ان کے پاس مالی معاملات کو چلانے یا سلجھانے کی پیشہ ورانہ تعلیم اور تجربے کا فقدان ہوتا ہے، اس لئے اکثر و بیشتر وہ ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جن کا انجام ادارہ کی تباہی ہوتا ہے، اس تباہی کے لئے اسلامی بینک کاری اور اسلامی اصولوں کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری نا تجربہ کاری اور مہم جوئی پر ہے نہ کہ اسلامی اصولوں پر۔

چونکہ بینک کاری اور مالیات میں دوسرے لوگوں کا مال لگا ہوتا ہے، اس لئے ان معاملات میں حد درجہ احتیاط اور تحمل سے کام لینا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو سکے مالی معاملات کو ایسے لوگوں کے مشورے سے چلایا جانا چاہیے جن کو ایسے معاملات کا پیشہ ورانہ تجربہ ہو اور انھوں نے اس کی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی ہو، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مالیاتی ادارہ کی کارکردگی اور پیدا آوری میں اضافہ ہوگا۔

اسلامی مالیاتی اداروں کے لئے ان اصولوں کی پاسداری اور پابندی اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ادارے اسلام کے پاک نام پر چلائے جاتے ہیں۔ اگر

یہ ادارے ان اصولوں اور اقدار کی پابندی نہ کریں اور مالی تباہی کا شکار ہو جائیں تو اس کی کچھ ذمہ داری اسلامی بینک کاری و مالیات کے سر بھی جاتی ہے۔ (15) اس قسم کے احتمالات سے سختی سے گریز لازم ہے۔

### خلاصہ کلام

اسلامی بینک کاری اور مالیات کی بنیاد حرمتِ ربا پر قائم ہے، دوسرے تمام اسلامی احکامات کی طرح حکمِ ربا بھی زمان و مکان سے ماورا ہے، اس کا اطلاق دنیا کے تمام ممالک کے مسلمانوں پر ہر حال میں ہوگا۔ بعض ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں پائے جاتے ہیں اکثر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اقلیت میں ہونے کے سبب مسلمانوں کو ان ممالک میں مالی پالیسیوں اور مالیاتی اداروں کا رخ تبدیل کرنے کا اختیار نہیں، اس لئے اقلیتی ممالک میں حرمتِ ربا کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔

تاہم یہ دلیل قابل قبول نہیں، ان ممالک میں جہاں مسلم اقلیتیں موجود ہیں، وہ صدیوں سے حرمتِ ربا کے حکم کو سر و چشم تسلیم کرتی آرہی ہیں۔ علماء کی رائے میں فقہ میں ایسی کوئی بنیاد نہیں جس کی بناء پر مسلم اقلیتی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو بڑی معاملات کرنے کی اجازت دی جاسکے۔ مسلم اقلیتی ملکوں میں رہنے والے مسلمان شریعت کے اسی طرح پابند (مکلف) ہیں جیسے مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمان۔

اس اصول کو تنظیم اسلامی کانفرنس کے باہر بھی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مسلم اقلیتیں بھی ربا سے احتراز کرنے اور نجات پانے کی اتنی ہی متمنی ہیں جتنے کہ مسلم اکثریتی ممالک کے مسلمان یہ خواہش رکھتے ہیں۔ گذشتہ دو دہائیوں میں یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں اسلامی بینک کاری کے ارتقاء سے بھی اس خواہش کو تقویت پہنچی ہے، اب اقلیتیں بھی اسلامی بینک قائم کرنے کی خواہش مند ہیں تاکہ وہ بھی ربا سے نجات حاصل کر سکیں۔

ہندوستانی مسلمان اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، وہ بھی اپنے مالی معاملات میں ربا کا عمل دخل نہیں چاہتے۔ ہندوستان میں کم و بیش 20-15 کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے، گو کہ تاریخی اسباب کی بناء پر ہندوستانی مسلمانوں کو اتنی سماجی اور معاشی قوت حاصل نہیں ہے جو اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے ان کو حاصل ہونی چاہیے۔ اندیشہ ہے کہ ان کی فی کس آمدنی، قومی فی کس آمدنی سے کافی نیچے ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی شرح خواندگی، دوسرے طبقات سے کہیں کم ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کہ ایک وجہ من جملہ دوسری وجوہات کے، یہ بھی ہے کہ عام طور پر بینک کاری سہولیات تک ان کی رسائی نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ربا کے اندیشہ کی وجہ سے وہ موجودہ بینکوں سے بھی کما حقہ استفادہ نہیں کر پاتے۔

ربا سے احتراز کرنے اور نجات پانے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے مختلف علاقوں میں مقامی سطح پر بہت سے ادارے قائم کئے ہیں۔ ان اداروں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، کہیں ان کو کریڈٹ سوسائٹی کہا جاتا ہے اور کہیں بچت ایسوسی ایشن یا مسلم فنڈ، یا اسلامی فنڈ یا بیت المال وغیرہ، لیکن ان کا بنیادی کام ایک ہی ہے: ان لوگوں سے جو ربا میں نہیں پڑنا چاہتے، جمع وصول کرنا، انھیں بچت کی ترغیب دینا، اور ضرورت پڑنے پر ان کے لئے غیر سودی قرض کا انتظام کرنا، ان میں سے بہت سی انجمنیں یہ کام صرف اپنے ممبروں کے لئے ہی انجام دیتی ہیں۔ اس طرح یہ امداد باہمی انجمنوں کے منماثل بن جاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سی انجمنوں نے اپنا رجسٹریشن، رجسٹریشن آف کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ کے تحت نہیں کر رکھا ہے۔ اگر یہ انجمنیں اپنے آپ کو کوآپریٹو نظام کے تحت پھر سے منظم کر سکیں تو ان کو بعض ایسے حقوق اور فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جن سے وہ فی الوقت محروم ہیں۔ ان میں سے بعض انجمنیں تو ایسی ہیں جنہوں نے کسی بھی قسم کا کوئی رجسٹریشن نہیں کرایا، اپنے اس طرز عمل سے ان انجمنوں نے اپنے آپ کو مختلف خطروں سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ ان کے اپنے مفاد میں ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی مناسب قانون کے تحت رجسٹریشن کرالیں تاکہ فریقین کو اعتماد حاصل ہو۔

یہ انجمنیں عام طور پر جو قرض فراہم کرتی ہیں وہ کسی نہ کسی مصیبت یا ناگہانی آفت کے وقت ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے قرض کو انگریزی میں Distress Loan کہتے ہیں، یہ قرض فراہم کر کے ایسی انجمنیں معاشرہ کی ایک اہم خدمت سرانجام دیتی ہیں۔ اگر غیر سودی بنیادوں پر یہ قرض مہیا نہ ہوں تو یہ یقینی ہے کہ قرض دار کسی نہ کسی مہاجن کے چنگل میں پھنس جائے گا، جہاں اسے بے حساب سود دینا پڑتا ہے، ان قرضوں میں سے بہت کم قرضے تجارتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ان میں سے بعض ادارے اسلامی مالیاتی طریقوں، یعنی مضاربت، مشارکت، مرابحہ اور اجارہ کے استعمال کا بھی تجربہ کر رہے ہیں، تاہم ان تجربوں کی نوعیت محدود ہی کہی جاسکتی ہے، کیونکہ ان اداروں کا سائز خود بہت بڑا نہیں ہوتا، نہ ہی متاثر کن وسائل تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے۔



ان میں سے بعض ادارے مثلاً مسلم فنڈ نجیب آباد وغیرہ کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ ان اداروں کی کئی شاخیں ہیں اور بل چل کر یہ مزید فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں فعال ان اداروں کو مضبوط بنایا جائے اور ان کی کارکردگی میں بہتری لائی جائے۔ کچھ عرصہ قبل بعض اداروں کی جانب سے غیر سودی قرض انجمنوں کی ایک باہمی انجمن تشکیل دی گئی تھی، تاہم اس انجمن کے اعمال بوجہ محدود ہی رہے اور کچھ عرصہ کے بعد وسائل کی کمی کے باعث انجمن کو اپنے دروازے بند کرنا پڑے، اس انجمن کی تجدید کی جاسکتی ہے تاہم چٹروں کو یہ احساس کرنا ہوگا کہ ان کی تائید و حمایت کے بغیر رضا کارانہ ادارے کسی طویل مدت تک نہیں چل سکتے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اداروں کو سوسائٹیز ایکٹ یا کوآپریٹو سوسائٹیز کے تحت رجسٹرڈ کرایا جائے۔

فی الحقیقت ان انجمنوں کی نوعیت اور کارکردگی کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ایک سماجی محقق نے ان اداروں کا سروے کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کچھ مفید معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اداروں کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کی جائیں، تاکہ ان کا معاشی اور مالی تجزیہ ممکن ہو سکے۔ تب ہی ہندوستانی ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی میں ان اداروں کے رول اور کردار کا تعین کیا جاسکے گا۔

اس بات کو ذہن میں رکھا جانا چاہیے کہ ہندوستان دنیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جہاں تحریک امداد باہمی گہری جڑیں پکڑ چکی ہے، اور ابھی بھی اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے حکومت کی جانب سے ہمت افزائی کے مختلف اقدامات کئے جاتے ہیں، اگر ہندوستانی مسلمان اپنی غیر سودی انجمنوں کی تنظیم نو، امداد باہمی کے خطوط پر کر سکیں تو اس سے مختلف فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، کوآپریٹو بنیادوں پر کریڈٹ سوسائٹیز، ہاؤسنگ سوسائٹیز، مارکیٹنگ سوسائٹیز یہاں تک کہ کوآپریٹو بینک بھی قائم کئے جاسکتے ہیں (16)۔ تجارتی بینکوں کے مقابلہ میں کوآپریٹو حکام کو شائد زیادہ آسانی سے قائل کیا جاسکے کہ بینک غیر سودی ہونے کے باوجود امداد باہمی کے اصولوں کی پابندی کر سکتے ہیں۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ غیر سودی کوآپریٹو بینکوں کے قیام کا واضح امکان ہے۔

ہندوستان میں اسلامی بینک کاری اور مالیات کے لئے ایک دوسرا مناسب میدان قلیل ترین قرضوں (Micro Financing) کا ہے۔ روایتی دست کاریوں کے علاوہ بعض جدید طرز کی صنعتیں بھی ہیں جو چھوٹے پیمانے پر کام کرتی ہیں، مثلاً برقی قوت سے چلنے والے کرگھے، ریفریجریشن اور کشاپ، ٹی وی مرمت وغیرہ، ان کاموں کے لئے قلیل ترین مقدار میں مالیات درکار ہو سکتی ہیں، چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں، دستکاریوں اور خورد روز کارزمروں میں مسلمانوں کا تناسب کافی قابل لحاظ ہے، اگر صرف اتر پردیش کی ہی مثال لیں تو بہت سے ایسے کاروبار اور دستکاریاں ہیں جو اپنی ترقی و ترویج کے لئے مسلم کاریگروں اور ماہرین فن کے مرہون منت ہیں۔ مثلاً چوڑیوں کی صنعت (فیروز آباد) ہتھ کرگھا (اعظم گڈھ) قالین بانی (منو) زری ساڑیاں (بنارس) چکن (لکھنؤ) دباغت اور چتر سازی (کانپور) تالا (علی گڈھ) اور برتن (مراد آباد)۔ غیر سودی کریڈٹ سوسائٹیوں اور غیر سودی کوآپریٹو بینکوں کے ذریعہ ان صنعتوں کو قرض فراہم کیا جاسکتا ہے، تاکہ جدید کاری اور ترقی کے ذریعہ ان صنعتوں کی کاپلٹ کی جاسکے۔

گذشتہ دوروں میں ہندوستان میں بعض ایسی مالی کمپنیاں بھی وجود میں آئی ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر کام کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں، یہ رجسٹرڈ کمپنیاں ہیں جن کو ریزرو بینک آف انڈیا غیر بینکی مالی کمپنیوں (Non-banking Financial Company) کے طور پر تسلیم کرتا ہے، یہ کمپنیاں عوام سے رقوم جمع کرتی ہیں، پھر ان کی سرمایہ کاری نفع میں شرکت کی بنیاد پر کرتی ہیں۔ تاہم عوام الناس کا پورا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ابھی ان کو اپنے کام کاج میں مزید شفافیت لانے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی قانونی ضابطہ کے تحت کام کریں۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ ان میں سے بعض کمپنیوں کو ضروری قوانین اور قواعد کی عدم پیروی کے الزام میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس سے یہ احساس عام ہونا چاہئے کہ مکمل قوانین کی پابندی کس قدر ضروری ہے، اسلامی مالیات کے ماہرین کو بھی اس جانب توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسا قانونی نظام وضع کرنے کی جانب توجہ دیں جو ہندوستانی ماحول میں اسلامی مالیات کے فروغ کے لئے مدد و معاون ہو۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اسلامی بینک کاری اور مالیات کے فوائد صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔ ایک مخلوط معاشرہ میں اسلامی بینک کاری کے فیوض و برکات سے غیر مسلموں کو محروم نہیں رکھا جاسکتا اور نہ ہی ایسا کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر سود ایک لعنت اور ایک برائی ہے تو ایسا پوری انسانیت کے لئے ہے، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لئے، مختصر یہ کہ اگر مناسب طریقہ سے اس کی پیروی کی جائے اور صحیح طریقہ سے اس پر عمل درآمد کیا جائے تو ہندوستان میں اسلامی بینک کاری اور مالیات کے لئے ایک درخشاں مستقبل ممکن ہے۔!

## جدول-1 اتر پردیش کے ضلعوں میں مسلمانوں کی تعداد

کل شہری آبادی کے تناسب کے طور پر		کل آبادی کے تناسب کے طور پر	
ضلعوں کی تعداد	مسلمانوں کی فیصد تعداد	ضلعوں کی تعداد	مسلمانوں کا فیصد تناسب
7	زیادہ-40.01	8	زیادہ-24.01
12	25.01 - 40.0	12	13.01-24.01
29	11.0 - 25.0	29	3.01 - 13.0
7	11.0 سے کم	7	کم-3.0

## جدول-2

### ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعہ بینکوں کا استعمال فقط عوامی زمرے کے بینکوں کے لئے

اقلیتی اور ناکاروا لے اضلاع		تمام اضلاع		
قرض دیا گیا (ملین روپے)	حسابات کی کل تعداد	قرض دیا گیا (ملین روپے)	حسابات کی کل تعداد	گروہ
107, 5707 (23.80)	105, 8320 (23.66)	2138.18 (4.99)	325, 4286 (9.34)	مسلم
20, 6868 (4.57)	20, 5198 (4.58)	2727.96 (6.36)	225, 3381 (6.47)	مسلمانوں کے سوا دوسری اقلیتیں
128, 2575 (28.37)	126, 3518 (71.72)	4866.09 (11.36)	550, 7667 (15.82)	کل اقلیتیں
323, 7171 (71.62)	320, 8129 (71.72)	37,968.78 (88.64)	293, 134, 53 (84.18)	دوسرے
451, 9746 (100.0)	447, 1647 (100.0)	42, 834.87 (100.0)	348, 211, 20 (100.0)	کل جمع

## اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک

ایک علمی نظریہ کے طور پر اور بعض مسلم ممالک میں ابھرنے والے مالیاتی ادارہ کی شکل میں اسلامی بینک کاری نے گذشتہ کئی دہائیوں میں قابل لحاظ ترقی کی ہے۔ علم کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس ترقی کا اظہار ان بیسیوں کتابوں اور سیکڑوں تحقیقی مقالوں میں ہوا جو اس دوران منظر عام پر آئے ہیں۔ ایک ادارہ کی حیثیت سے بھی اسلامی بینک کاری نے خاصی ترقی کی ہے۔ کئی مسلم ممالک بالخصوص پاکستان، ایران، سوڈان، اور ملیشیا نے اپنے اپنے ملک میں اسلامی بینک کاری نظام شروع کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس کے لئے بعض اقدامات بھی کیے ہیں۔ ملیشیا نے دوسرے نظام بینک کاری کے ارتقاء کی خاطر کچھ اہم اقدامات کئے ہیں، اس مجوزہ نظام میں اسلامی نظام بینک کاری، اور دنیا میں مروج تجارتی بینک کاری نظام ایک دوسرے کے شانہ بشانہ عمل پذیر ہوں گے۔ مزید برآں، دنیا کے مختلف حصوں میں تین سے زائد طرح کے اسلامی مالیاتی ادارے کامیابی سے کام کر رہے ہیں، جن میں اسلامی بینک، اسلامی انشورنس کمپنیاں، اسلامی سرمایہ کاری کمپنیاں وغیرہ شامل ہیں۔

تاہم بڑی حد تک یہ تمام ترقیاں، تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے ممبر ممالک یعنی مسلم دنیا تک محدود ہیں۔ ایک حالیہ مطالعہ کے بموجب جہاں تک اسلامی مالیاتی اداروں کی تعداد کا تعلق ہے، 42 فی صدی اسلامی مالیاتی ادارے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک میں مرکوز ہیں۔ (1) لیکن اگر مالی وسائل کے استعمال پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے کل مالی وسائل کا 80 فی صدی استعمال خلیج عربی میں قائم شدہ اسلامی مالیاتی اداروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ (2)

اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مسلمان صرف ان ملکوں میں نہیں رہتے جہاں ان کی اکثریت ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی کل تعداد کا ایک معتد بہ حصہ مختلف ممالک میں اقلیتوں کی حیثیت سے قیام پذیر ہے، قیاس کیا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد ایک ارب سے کچھ اوپر ہی ہے جن میں تقریباً ایک تہائی (تقریباً 30 کروڑ) مختلف ممالک میں اقلیتی حیثیت میں رہتے ہیں۔ اس میں بھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اپنے اقلیتی کردار میں بھی، مسلمان کثیر تعداد میں ہیں، یہاں تک کہ ان کی تعداد بعض مسلم ممالک کی کل آبادی سے بھی بڑھ کر ہے۔ مثلاً ہندوستان میں، ہی 12-15 کروڑ مسلمان آباد ہیں، بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کل تعداد بیس کروڑ کے آس پاس ہے۔ مسلمانوں کی معتد بہ تعداد چین میں بھی آباد ہے جس کا دنیا کی آبادی میں پہلا نمبر ہے۔ بد قسمتی سے چینی مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں صحیح اور قابل اعتبار اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ سوویت یونین اور سابق یوگوسلاویہ کے انہدام کے بعد مرکزی ایشیا اور مشرقی یورپ میں کئی مسلم ممالک ظہور میں آگئے ہیں۔ گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مسلم ممالک سے ہجرت کے نتیجے میں مغربی یورپ، اور امریکا میں بھی مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادیاں وجود میں آگئی ہیں۔ اس لئے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے باہر بھی مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادیاں موجود ہیں، ان آبادیوں کا وجود اب دنیا کے تمام براعظموں ایشیا، افریقہ، یورپ، شمالی امریکا، کناڈا، آسٹریلیا، اور لاطینی امریکا میں ہے۔

### مسلم اقلیتوں کی تعریف

یہ اعتراف ابتداء میں ہی کر لیا جانا چاہیے کہ اکثریت اور اقلیت، بنیادی طور پر عددی تصورات ہیں۔ لوگوں کے ایسے گروہ کو جن کے درمیان کچھ مشترک نسلی، مذہبی، لسانی یا تہذیبی خصائص ہوں اور جو کسی بڑی آبادی کا جز ہوں، عام طور پر اقلیت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف زمانوں میں اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ عام طور پر اقلیتوں کو اکثریت کی بہ نسبت کم حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اقتدار میں بھی ان کا حصہ کم ہی ہوتا ہے۔ اقلیتوں کے وجود کا ایک اہم سبب کثیر الجہات آبادیوں کا وجود ہے جو عام طور پر ہجرت کے ذریعہ کسی ملک میں قیام پذیر ہوتی ہیں۔

تاہم اکثریت اور اقلیت صرف عددی تصورات نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ اہم سماجیاتی اور تہذیبی مضمرات وابستہ ہوتے ہیں، گو کہ لفظ اقلیت سے مراد، لوگوں

کا ایک ایسا گروہ ہے جو کچھ مشترکہ نسلی، مذہبی، تہذیبی یا لسانی خصائص رکھتا ہو، ایک بڑی آبادی سے منسلک ہو، اقلیت ہونے کے لئے کسی گروہ کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ضروری ہوں گی:

● یہ گروہ، اپنی مطلق شکل میں کسی بڑی آبادی کی نسبت کم تعداد میں ہو۔

● اس گروہ میں کچھ ایسے مشترکہ خصائص ہوں جن کی بنیاد پر اس گروہ کی امتیازی شناخت کی جاسکے۔

ان میں سے پہلی شرط کو، اقلیت کے وجود کی ضروری شرط (Necessary Condition) اور دوسری شرط کو کافی شرط (Sufficient Condition) خیال کیا جاسکتا ہے، اگر کسی گروہ کی تعریفی خاصیت نسل ہے تو وہ گروہ نسلی اقلیت قرار پائے گا اور اگر یہ لسانیات ہے تو وہ لسانی اقلیت (Linguistic Minority) قرار پائے گا۔ بدیہی طور پر مسلم اقلیات کے لئے تعریفی خاصیت (Defining Characteristic) اسلام کا اتباع ہے جو مسلم اقلیات کو ان کی علیحدہ شناخت عطا کرتا ہے۔ تاہم، اس مرحلہ پر ہم کو یہ بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے کہ مسلم اقلیات کے لئے ان کی مذہبی شناخت ہی واحد شناخت نہیں ہے۔ بہت سے مسلم اقلیتی گروہوں میں بعض دوسری تہذیبی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جن کی بنیاد پر ان کی امتیازی شناخت کی جاسکتی ہے مثلاً سنکیانگ میں رہنے والے چینی مسلمان جن کی شناخت میں مذہب اور نسل دونوں شامل ہیں۔ اسی طرح شمالی ہند کے مسلمان بالخصوص اردو بولنے والے مسلمانوں کو ایک مذہبی اقلیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور ایک لسانی اقلیت بھی۔

تاہم اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، خواہ وہ اکثریت سے تعلق رکھتے ہوں یا اقلیت سے، اپنی اجتماعی شناخت مذہب کی بنیاد پر کرتے ہیں، مسلمانوں کے لئے ان کی اسلامی شناخت ہی اصل شناخت ہے۔ ان کے تہذیبی وجود کے دوسرے پہلو، جن کی شناخت علاقہ، زبان، رنگ، نسل، یا ثقافت کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے، ان کی اصل شناخت کے تابع ہیں۔ یہ اسلام کا اتباع ہی ہے جس نے انہیں ایک رشتہ میں پروردگما ہے، اسی کے طفیل وہ نہ صرف مشترکہ عقیدے، اقدار، برتاؤ اور سماجی و معاشی آدرشوں کے حامل ہیں بلکہ ایک مشترکہ تاریخ اور مشترکہ مستقبل بھی رکھتے ہیں۔

اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات کے موضوعات پر گذشتہ کئی دہائیوں میں جو لٹریچر وجود میں آیا ہے ایک مشترکہ اور زیریں مفروضہ پر قائم ہے، وہ مفروضہ یہ ہے کہ اس کے لحاظ سے ممالک ہیں جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، چنانچہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ان کو ایسے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ ملک کی زر پالیسی (Monetary Policy) اور نظام بینک کاری کی صورت، کارکردگی، اور نظام عمل میں حسب خواہش تبدیلیاں کر سکتے ہیں اور ان کا نفاذ بھی کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کو ان ممالک میں معاشی اقتدار اعلیٰ (Economic Sovereignty) حاصل ہے، لیکن مسلم ممالک سے باہر رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسرے ممالک میں اقلیات کے طور پر رہنے والے مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی پسند کا نظام بینک کاری ملک میں نافذ کریں، یا ملک کے موجودہ نظام میں اپنی پسندیدہ تبدیلیاں کریں، خواہی ننخواہی ان کو ایسے سماجی، سیاسی و معاشی نظام میں رہنا ہوگا جو ملک کے اکثریتی باشندوں نے ملک کے لئے وضع کیا ہے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات کی ان ملکوں کے لئے کیا اہمیت ہے جو مسلم اکثریتی ممالک نہیں ہیں، اور ان ملکوں کے مسلمان ان سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ زیر نظر مقالہ میں انہیں سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحقیقی مقاصد

اس مقالہ کے مقاصد درج ذیل ہیں:

● مسلم اقلیتی معاشروں کے لئے اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات کی معنویت کو دریاقت کرنا۔

● اس نقطہ نظر کا تنقیدی جائزہ لینا کہ غیر مسلم ممالک میں ربا (سود) جائز ہو سکتا ہے۔

● غیر مسلم ممالک میں اسلامی بینکوں کے اعمال کا جائزہ لینا۔

● مسلم اقلیتی معاشروں میں اسلامی مالیات کے کردار کا مطالعہ کرنا۔

● ایسے طریقے تجویز کرنا جن کے ذریعہ اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات، مسلم اقلیات کی معاشی ترقی میں زیادہ موثر اور کارگر کردار ادا

کر سکیں۔

گوکہ گذشتہ دو تین دہائیوں میں اسلامی بینک کاری کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے بارے میں خاصا علمی مواد جمع ہو گیا ہے، لیکن مشکل سے ہی کوئی ایسا تحقیقی مقالہ ہوگا جس میں مسلم اقلیات کے نقطہ نظر سے ان مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہو۔ اسلامی بینک کاری پر لکھنے والوں نے مسلم اقلیات کے مسائل سے عموماً غماض کیا ہے۔ اسلامی بینک کاری اور اسلامی معاشیات میں بین السطور ایک عام مفروضہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ اسلامی بینک کاری پر عمل درآمدان ملکوں میں ہی کیا جائے جو عرف عام میں اسلامی ممالک یا مسلم ممالک کہلاتے ہیں، کیونکہ ان ملکوں میں مسلم عوام کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے اور وہ ملک کی مالیاتی اور بینک کاری پالیسیوں، ان کے کردار، اور رخ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اگر ضروری مقدار میں سیاسی قوت ارادی موجود ہو تو ان ملکوں میں اسلامی اقتصادیات اور اسلامی مالیات پر عمل درآمد ممکن ہے، اور فی الحقیقت بعض مسلم ملکوں نے اس رخ پر کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں، اس طرح اسلامی نظام بینک کاری کے قائم کرنے کی سمت میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، زیادہ تر اسلامی بینک مسلم ممالک میں ہی واقع ہیں، لیکن مسلم اقلیتی ممالک کے حوالہ سے اسلامی بینک کاری پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی۔

اگر اس ضمن میں کوئی استثناء ہے تو صرف یہ کہ جرنل انسٹی ٹیوٹ آف مسلم مائنارٹیز ان فیروز (Journal Institute of Muslim Minorities Affairs) نے جولائی 1992 میں اپنے شمارے کا ایک گوشہ مسلم اقلیتوں اور اسلامی بینک کاری کے عنوان سے مخصوص کیا، جس میں اس عنوان کے تحت چار مضامین شائع کئے گئے۔ محمد عمر چھا پرا نے اپنے مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مسلم اقلیتی ممالک میں، مسلم اقلیتوں کی مالی ضروریات کی تکمیل کے لئے، اسلامی بینک کاری میں جزئی قرض (Micro Credit) کا تصور شامل کیا جاسکتا ہے، تاکہ چھوٹے پیمانے کے تاجروں، دست کاروں، خردہ فروشوں اور کاشتکاروں کو سرمایہ کاری فراہم کی جاسکے (3)۔ ملائی نے ناٹجیریا کی مثال سامنے رکھتے ہوئے ایک مسلم اقلیتی ملک میں اسلامی بینکوں کے قیام کے امکانات کا جائزہ لیا ہے، حالانکہ بعض لوگوں کو اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ ناٹجیریا کو مسلم اقلیتی ملک کیوں قرار دیا گیا (4)۔ رحمت اللہ نے اپنے مضمون میں ہندوستان میں اسلامی بینکوں کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے (5)۔ اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے اوصاف احمد نے یہ نکتہ اٹھایا کہ ہندوستان میں کام کرنے والے ان اداروں کو جن کا جائزہ رحمت اللہ نے پیش کیا ہے، اسلامی بینک قرار دینا درست نہ ہوگا، کیونکہ زیادہ تر ادارے غیر منظم زمرے (Unorganized Sector) میں عمل پذیر ہیں اور اپنی پشت پر کسی طرح کی قانونی ضمانت نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ ان اداروں کو غیر سودی قرض دینے والی انجمنیں قرار دیا جاسکتا ہے (6)۔ ایک اسلامی بینک کاری کی حیثیت سے شیخ صالح عبداللہ کامل نے غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیات کی ترقی کے لئے اسلامی بینکوں کے پیش نظر مسائل کا جائزہ لیا ہے (7)۔

### حرمت ربا اور مسلم اقلیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی مسلم اقلیات حرمت ربا کا بہت احترام کرتی ہیں، چنانچہ بہت سے مسلمانوں کے ذہن میں، حرمت ربا کے پیش نظر، تجارتی بینکوں سے معاملات کے سلسلہ میں سنگین تحفظات پائے جاتے ہیں، ان میں سے بھی جو تجارتی بینکوں سے معاملہ رکھتے ہیں، انتہائی مجبوری میں اور شدید ضرورت کے باعث ایسا کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں بھی بیشتر حالتوں میں، یا تو وہ جاری حساب کھولنے کو ترجیح دیتے ہیں، یا پھر بینک سے ملنے والا سود لیتے ہی نہیں، پھر بھی بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ غیر مسلم علاقوں میں رہنے والوں پر حرمت ربا کا اطلاق نہیں ہوتا، اس لئے سودی نظام بینک کاری سے معاملت کی جاسکتی ہے، یہ دلیل ایک فقہی رائے پر منحصر ہے جس کے مطابق ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سودی معاملہ جائز ٹھہرایا جاتا ہے، بشرطیکہ معاملہ دارالحرب میں کیا جا رہا ہو۔ (8)

گوکہ اس نقطہ نظر کو قبول عام حاصل نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اچھی طرح چھان بچھان ضروری ہے۔

یہ تو عام طور پر معروف ہے کہ شرعی قوانین کی بنیاد وحی الہی ہے جو قرآن پاک اور سنت رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، قرآن اور سنت زمان و مکان کے اعتبار سے ناقابل تغیر و تبدل ہیں، قرآنی احکامات اپنی نوعیت کے لحاظ سے عام، غیر تاریخی اور ناقابل تغیر ہیں، لیکن علم کا وہ حصہ جو فقہی علوم یافتہ کے طور پر جانا جاتا ہے، وحی الہی کے انسانی فہم و ادراک کا نتیجہ ہے۔ (9) چونکہ شرعی قوانین قرآن اور سنت کی عمومیت کا نتیجہ ہیں اس لئے مکانی تبدیلی کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں یکساں طور پر نافذ رہیں گے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلامی قوانین تعزیری بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ اگر غیر مسلم علاقوں میں اسلامی قوانین کا تعزیری پہلو نہ بھی نافذ ہو تو بھی اس کا اخلاقی پہلو قابل نفاذ رہے گا۔ چنانچہ غیر مسلم علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کو صرف اس لئے

اسلامی قوانین سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ ایسے علاقوں میں قیام پذیر ہیں جو اسلام کے تعزیری قوانین کے محیطہ عمل سے باہر ہے، غیر مسلم علاقوں میں، ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں خود مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی اور سماجی زندگی میں اسلامی طرز زندگی کا اتباع کریں اور اس طرح وہ اپنے اعمال کے لئے براہ راست اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے، اس لئے یہ بات قدرے تعجب انگیز ہے کہ کوئی اس بات کی وکالت کرے کہ غیر مسلم علاقوں میں رہنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے سودی معاملہ کر سکتے ہیں۔

### مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربا پر فقہی آراء

مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربا کے مسئلہ پر مسلم فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے، اس میں سے ایک گروہ، جس میں امام ابوحنیفہؒ، امام ابن تیمیہؒ اور امام محمدؒ جیسے عظیم فقہاء شامل ہیں، یہ رائے رکھتا ہے کہ غیر مسلم ممالک میں ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربوی معاملہ جائز ہے، دوسرا گروہ، جس میں امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور حنبلی و شافعی علماء کی کثیر تعداد شامل ہے، اس بات کا کوئی امکان نہیں دیکھتا، اس کا کہنا ہے کہ ربا جسے قرآن و سنت نے صریحاً حرام قرار دیا ہے، کسی بھی حالت میں جائز کیسے ہو سکتا ہے۔ فریقین نے اپنے موقف کی حمایت میں وزنی دلائل دیئے ہیں، ذیل میں ان دلائل کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

### جواز کے حق میں دلائل

روایت ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا:

”ربا مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں حرام ہے، سوائے اس کے کہ معاملہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم کے درمیان ہو اور ان کے درمیان معاہدہ امن موجود نہ ہو“ (10)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر معاہدہ امن موجود نہ ہو تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سودی معاملہ، مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں جائز قرار پائے گا۔ یہ نقطہ نظر مندرجہ ذیل دلائل پر مبنی ہے:

مشہور فقہی امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب مبسوط میں لکھا ہے:

”مکحول سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں اور دارالحرب کے لوگوں کے درمیان کوئی ربا نہیں ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے، مکحول ایک قابل اعتبار فقہیہ تھے۔ ان کی بیان کردہ روایت قابل قبول ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے اپنے دلائل کی بنیاد اس حدیث پر رکھی ہے“۔ (11)

کہا جاتا ہے کہ زمانہ جنگ میں غیر مسلم کا مال معصوم نہیں ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے ایسے مال پر قبضہ کرنا جائز ہے، فقہی اصطلاح میں ایسا مال مباح ہے (یعنی حرام یا ممنوع نہیں ہے)۔ کاسانی نے بدائع الصنائع میں کہا ہے:

”مال الحربی مباح؛ لأنه لا عصمة لمال الحربی“

(حربی کا مال مباح ہے کیونکہ اس کا مال (زمانہ جنگ میں) معصوم نہیں ہے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ (زمانہ جنگ میں) اس کی اجازت ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربا اور دوسرے ممنوع عقود قرار پائیں۔ ربا اور ممنوع عقود کی حرمت صرف ان معاملات کے درمیان ہوگی جن میں فریقین مسلم ہوں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے ممنوع عقود، مثلاً ربا اور قمار کی اجازت ان معاملات میں دی جاسکتی ہے، جن میں ایک فریق غیر مسلم علاقہ کا رہنے والا ہو (حربی) اور دوسرا مسلم ہو، جو چند خاص شرائط کے تحت غیر مسلم علاقہ میں داخل ہوا ہو۔ اس موقف کی تائید میں دو تاریخی آثار پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب اسلام لانے کے بعد بھی مکہ میں مقیم تھے اور مکہ کے رہنے والے (غیر مسلموں) کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے حج واداع کے موقع پر سود کے خاتمہ کا اعلان کیا تو عباسؓ بن عبدالمطلب کے سود کا تذکرہ نام لے کر کیا۔ دوسرا واقعہ قمار سے متعلق ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قدیمی رفیق اور یار غار حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کفار مکہ میں سے کسی کے ساتھ ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ کے نتیجہ پر شرط لگائی اور یہ شرط سواؤنوں کی تھی، اس وقت تک قمار ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا، لیکن قمار منع ہو جانے کے بعد بھی حضرت ابو بکرؓ کو اونٹ لینے دیا گیا کہ وہ شرط جیت گئے تھے۔

یہاں بین السطور میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ جو غیر مسلم ذمی نہیں ہیں (یعنی اسلامی ریاست نے ان کے جان و مال کی ذمہ داری قبول نہیں کی) ان کا مال

مباح ہے۔ اسی طرح بادی النظر میں یہ مفروضہ بھی موجود ہے کہ غیر مسلم علاقوں کو جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہیں دارالحرب قرار دیا جائے۔

اس طرح یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ غیر مسلم علاقوں (دارالحرب) میں رہنے والے اقلیتی فرقہ کے مسلمان تجارتی بینکوں (غیر مسلم) سے ربا (سود) وصول کر سکتے ہیں (12)۔ کہا جاتا ہے کہ مغلوں کی حکومت کے خاتمہ اور انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے کے بعد ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے دیا گیا تھا۔ اس نقطہ نظر کی سب سے پر زور دکانت جناب مناظر احسن گیلانی نے کی تھی جو اپنے وقت کے ایک اہم عالم تھے اور جامعہ عثمانیہ میں ناظم دینیات بھی تھے۔ (13) گیلانی صاحب کی دلیل یہ تھی کہ برطانوی ہنداب دارالکفر ہے، اس لئے غیر مسلموں کے مال و متاع پر ان عقود کے ذریعہ بھی قبضہ مالکا نہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جن کو عام طور پر اسلام میں جائز تصور نہیں کیا جاتا۔ ایک طرح سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ عقود جو اسلامی ریاست میں جائز نہیں ہیں، غیر اسلامی ریاست میں جائز ہو جاتے ہیں، ربا ایک ایسا عقد ہے جس کے ذریعہ (قرض کی ادائیگی کے وقت) قرض لینے والے (borrower) کا کچھ مال (سود کی شکل میں) قرض دینے والے (Lender) کو منتقل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں اس کی ممانعت ہے، لیکن ملحوظ رہے کہ یہ اسلام کا قانون ہے اور اس کا نفاذ اسلامی ریاست میں ہی ممکن ہے، غیر اسلامی ریاست اسلامی قوانین پر تو چلتی نہیں۔ یہ اس دلیل کا خلاصہ ہے۔

### عدم جواز کے حق میں دلائل

اوپر بیان کئے گئے موقف کے برعکس دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ربا کا لینا اور دینا، دونوں قطعی طور پر حرام ہیں اور اس کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں یکساں طور پر ہوگا۔ یہ نقطہ نظر امت مسلمہ میں عام طور پر رائج ہے۔ شافعی، حنبلی، مالکی اور دوسرے مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے بہت سے فقہاء اس نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ ایک معاصر اسلامی مفکر زبیرہ حماد اس ضمن میں امام نووی کی ایک رائے کا حوالہ دیتے ہیں:

”علماء اس بات پر متفق ہیں کہ حرمت ربا کا اطلاق مردوں اور عورتوں، آقا اور غلام سب پر یکساں طور پر ہوتا ہے، حرمت ربا کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں کوئی امتیاز نہیں برتنا جائے گا۔ جو کچھ مسلم علاقوں میں حرام ہے، وہ غیر مسلم علاقوں میں بھی حرام رہے گا، اس سے قطع نظر کہ معاملہ صرف مسلمانوں کے درمیان ہے یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہے، یا یہ کہ ان کے درمیان معاہدہ امن ہے کہ نہیں۔ اس معاملہ میں یہ ہماری رائے ہے، اور مالک، احمد، ابو یوسف اور دوسرے بہت سے فقہاء کا موقف بھی یہی ہے (14)۔“

آئیے اب ان دلائل کا جائزہ لیں جو غیر مسلم علاقوں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربوی معاملہ کے عدم جواز کے بارے میں دیئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام احمد اور امام ابن تیمیہ اور دوسرے تمام فقہاء، جو دارالحرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملے کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، ان سب نے اپنے استدلال کی بنیاد اس حدیث پر رکھی ہے جس کی روایت مکحول نے کی ہے۔ خیال رہے کہ مکحول کے سوا کسی اور محدث نے اس حدیث کو بیان نہیں کیا۔ محدثین کی اصطلاح میں مکحول کی روایت کردہ اس حدیث کو ”غریب“ قرار دیا گیا ہے، احادیث کے رد و قبول کے معاملہ میں تو اترا کو ایک اہم نکتہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک حدیث صرف ایک راوی نے بیان کی ہے تو اس حدیث کا درجہ بہت اونچا نہیں سمجھا جاتا۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

1- یہ استدلال کہ غیر مسلم کا مال مباح ہے اور اسے شریعت کا تحفظ حاصل نہیں، عام نہیں ہے۔ ایسا صرف حالت جنگ میں ہی ہو سکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ برسر جنگ غیر مسلم میں، اور ایسے غیر مسلم میں امتیاز کیا جائے جو برسر جنگ نہیں ہے۔ حالت جنگ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاملات، جو ابی تعال (Reciprocity) کی بنیاد پر طے ہوں گے۔ زمانہ قدیم میں جب دو ملک ایک دوسرے سے برسر جنگ ہوتے تو وہ ایک دوسرے کے مال و متاع اور لوگوں پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ ”مال الحربی مباحاً نہ لاعصمہ لمال الحربی“ کی تعبیر و تحلیل اسی منظر میں کی جانی چاہیے۔ حالت امن میں ان تمام غیر مسلموں کو جو برسر جنگ نہیں ہیں اتنا ہی تحفظ اور امن فراہم کیا جائے گا، جتنا کہ مسلمانوں کو، اس لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملہ کے جواز کے بارے میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کا تعلق حالت جنگ سے ہے نہ کہ حالت امن سے، یہ اصول سے ایک استثناء ہے نہ کہ خود اصول۔

2- یہ دلیل درست نہیں ہے کہ ممنوع عقود جیسے میسر، قمار، اور ربا، دارالحرب میں جائز ہو جاتے ہیں، گو کہ یہ درست ہے کہ وہ قوانین جن کے تحت یہ اعمال ممنوع قرار دیئے گئے ہیں، اسلامی ریاست کے قوانین ہیں، اسلامی ریاست کو دیگر تمام ریاستوں کی طرح اپنے قوانین اپنے سیاسی اور انتظامی حدود کے باہر نافذ

کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ تاہم اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ اسلامی قوانین کا ایک قانونی اور تعزیری پہلو ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا ایک اخلاقی اور معاشرتی پہلو بھی ہے۔ ان قوانین کا تعزیری پہلو اسلامی حکومتوں کی حدود کے باہر بھلے ہی قابل تنفیذ نہ ہو، لیکن اس کے اخلاقی پہلو کے نفاذ کے لئے کسی تعزیری یا قانونی اختیار کی ضرورت نہیں۔ اسلامی قوانین کے اخلاقی پہلو کے نفاذ کی ذمہ داری ہر مسلمان کی ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اسلام کے ضابطہ اخلاق کی پابندی کرے اور وہ اس امر کے لئے اللہ عزوجل کے سامنے جوابدہ ہے، اگر وہ اس ضابطہ اخلاق کی پابندی نہیں کرتا تو اللہ کی نظر میں گنہگار ہوگا، اسلام کے ضابطہ اخلاق کی پابندی زمان و مکان سے قطع نظر ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے۔

3- غیر مسلم علاقوں (دارالہرب) میں ربوی معاملوں کے حق میں جو دو تاریخی آثار پیش کئے جاتے ہیں ان پر بھی تحقیقی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پہلے ہم حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب والا واقعہ لیتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے واقعہ سے اس موقف کو تقویت پہنچتی ہے کہ غیر مسلم علاقوں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربوی معاملہ کی گنجائش نکلتی ہے، کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب مکہ میں مقیم تھے اور ربوی معاملہ کیا کرتے تھے، جس کو بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دوران اپنے خطبہ میں باطل قرار دیا، اس بیان میں یہ وضاحت سامنے نہیں آئی کہ جب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب مکہ میں مقیم تھے اور سوڈی کاروبار میں ملوث تھے اس وقت تک ربا کو قطعی طور پر حرام نہیں قرار دیا گیا تھا۔ بیشتر اسلامی مؤرخین اور مفسرین قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ ربا کو حرام قرار دینے والی آیات بالخصوص سورہ بقرہ کی آیت 279 قرآن کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات تھیں، گو کہ اس سے قبل بعض ایسی آیات نازل ہو چکی تھیں جن میں ربا کی مذمت کی گئی تھی، لیکن اس کو قطعی طور پر حرام نہیں قرار دیا گیا تھا جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت 279 میں کیا گیا۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ جب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا سوڈی کاروبار مکہ میں جاری تھا اس وقت تک ربا مکمل اور قطعی طور پر حرام نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ ربا ایک لحاظ سے چھوڑ دیں، یہ حکم سورہ بقرہ کی آیت 279 میں ہی نازل ہوا۔ اس لئے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے واقعہ سے دارالہرب میں سوڈی کاروبار کو جواز دھونڈنا صحیح نہیں، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق کا شرط لگانے والا واقعہ صحیح ہے، لیکن پوری روایت میں یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ شرط جیتنے کے بعد وصول کیے گئے اونٹ صدقہ کر دیئے گئے تھے۔ اسی لئے ان دو واقعات سے دارالہرب میں عقود فاسدہ کے جواز کے لئے کافی بنیاد فراہم نہیں ہوتی۔ بیشتر علماء کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی بھی حالت میں عقود فاسدہ کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے، خواہ یہ معاملہ مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلموں سے، خواہ یہ معاملہ مسلم علاقہ میں ہو یا غیر مسلم علاقہ میں، ان کی ممانعت زمان و مکان سے ماوراء ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے مطلق! امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور دیگر کئی ائمہ نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔

### علاقوں کی فقہی درجہ بندی

مندرجہ بالا تجزیہ مسلم اور غیر مسلم علاقوں کے حوالہ سے کیا گیا ہے، فقہ اسلامی کے قدیم ماخذ میں علاقوں کی درجہ بندی اس طرح کی گئی ہے:

۱- اسلامی علاقے یا دارالاسلام

۲- وہ علاقے جو دارالاسلام کی عمل داری سے باہر ہوں۔

دوسرے درجہ کو قدیم فقہی کتابوں میں کئی ناموں سے پکارا گیا۔ ان میں سے سب سے معروف نام دارالہرب ہے جس کا ایک عام ترجمہ غیر مسلم علاقہ بھی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ترجمہ پوری طرح صحیح نہیں۔ شاید دشمن علاقہ "دارالہرب" کا ایک بہتر ترجمہ ہو، بعض مصنفین علاقوں کی تقسیم دارالاسلام (اسلامی علاقہ) اور دارالکفر (غیر اسلامی علاقہ) میں کرتے ہیں، دارالکفر کو دوبارہ دو درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: دارالہرب اور دارالامان۔ دارالہرب وہ غیر مسلم علاقہ ہے جو اسلامی علاقے سے برسر پیکار ہے، اس کے برعکس دارالامان وہ غیر اسلامی علاقہ ہے جو اسلامی علاقہ سے معاہدہ امن رکھتا ہو۔ ظاہر ہے ہر غیر مسلم ملک کو دارالہرب نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی ایک اچھی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے دوران حبش کی ہے، جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت اور منظوری سے اصحاب رسولؐ نے پناہ حاصل کی تھی، گو کہ اس وقت بھی حبش ایک غیر مسلم ملک تھا لیکن وہاں مسلمانوں کو پناہ دی گئی تاکہ وہ امن سے رہ سکیں اور آزادی سے اپنے دین کی اتباع کر سکیں۔ موجودہ زمانہ کی اصطلاح کے مطابق اس وقت حبش میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی، اسی لئے بعض فقہاء نے حبش کو دارالامان قرار دیا ہے۔



## درجہ بندی کی بنیاد

علاقوں کو دارالاسلام کس بنیاد پر قرار دیا جاتا ہے، مختلف فقہی کتابوں کے تجزیہ کے بعد مندرجہ ذیل عوامل کی نشان دہی کی جاسکتی ہے:

● اسلامی قوانین کا اعلان

● مسلم آبادی

● مسلم حکمرانوں کا اقتدار اعلیٰ

مسلم علاقوں کو غیر مسلم علاقوں سے ممتاز و میز کرنے کے لئے فقہاء نے ان تمام خصوصیات کا استعمال کیا ہے، لیکن ان میں سے نمایاں ترین اور سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ آیا اس علاقہ میں اسلامی قوانین کا اطلاق کیا جاتا ہے اور کیا اس علاقے کے رہنے والے اسلامی طرز زندگی اپنا چکے ہیں؟ اگر ان سوالات کے جوابات اثبات میں ہیں تو اس کو دارالاسلام قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آبادی اور مسلم اقتدار کو بھی اہم عوامل قرار دیا جاتا ہے، گو کہ یہ ممکن ہے کہ بعض اوقات انہیں اہم اور فیصلہ کن عامل نہ قرار دیا جائے، مثلاً مسلم دور حکومت کے دوران ہندوستان کو دارالاسلام سمجھا جاتا رہا گو کہ اس وقت بھی، جیسا کہ اس وقت ہے، اپنی عددی قوت کے اعتبار سے ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس لئے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلمان اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے، اس کے باوجود کہ یہاں شرعی قوانین کبھی بھی اپنی مکمل صورت میں نافذ نہیں رہے۔ جب اس اقتدار کا خاتمہ ہو گیا، اور انگریز اقتدار اعلیٰ کے مالک بن گئے تو برطانوی ہند کو دارالحرب قرار دینے میں کوئی تامل نہیں کیا گیا۔

ایک دار کا دوسرے میں تبدیل ہونا

کلاسیکی فقہاء نے اس امکان کا اعتراف کیا ہے، بعض تبدیلیوں کے سبب یہ ممکن ہے کہ کوئی علاقہ دارالاسلام کا درجہ گنوا بیٹھے، اگر کوئی ملک دارالاسلام تصور کیا جاتا ہے، لیکن جن بنیادوں پر اس علاقہ کو دارالاسلام قرار دیا گیا تھا ان میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس فیصلے میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے، اس طرح یہ ممکن ہے کہ دارالاسلام، دارالکفر یا دارالحرب میں تبدیل ہو جائے۔

اس سلسلہ میں کاسانی لکھتے ہیں:

”ان دار الإسلام لا تعتبر دار الكفر إلا بفلات شرائط: أحدها ظهور أحكام الكفر فيها، الثاني أن لا تكون ملحقة بدار الإسلام، والثالث ألا يبقى فيها مسلم أو ذمی آمننا بالأمان الأول“ [کاسانی: بدائع الصنائع ج ۱۳]

(ایک مسلم علاقہ (دارالاسلام) غیر مسلم علاقہ (دارالکفر) میں تبدیل نہیں ہو سکتا، سوائے ان تین شرائط کے: اول، اس علاقے میں غیر اسلامی قوانین رائج ہو جائیں۔ دوم، وہ علاقہ دارالکفر سے ملحق ہو۔ سوم، یہ کہ اس میں کوئی ایسا مسلمان یا ذمی باقی نہ بچے جس کو اس کی ابتدائی امان حاصل ہو)۔

ابتدائی امان سے مراد وہ استحقاقات ہیں جو مسلمانوں کو اسلام کی رو سے اور ذمیوں کو عقد الذمہ کی رو سے حاصل ہیں، مثلاً اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے جان و مال محفوظ ہیں، یہ حق ان کو شریعت کی طرف سے حاصل ہے، فقہی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال معصوم (یا محفوظ ہیں) اور کسی فرد یا ریاست کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس حق کو سلب کرے، ذمیوں کو یہ حقوق ریاست سے ایک معاہدہ کے تحت حاصل ہوتے ہیں، جس کی رو سے وہ (ذمی) اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرتے ہیں اور اسلامی ریاست ان کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے، یہ عہد عقد الذمہ کہلاتا ہے، بعض صورتوں میں اہل الذمہ کو لازمی فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے، ان حقوق کے عوض ہی ذمی ریاست کو جزیہ ادا کرتے ہیں، کیونکہ ریاست ان کے حقوق کی محافظ ہے۔

جدید دنیا میں داروں کی درجہ بندی اور اس کی معنویت

دنیا کی دو حصوں، دارالاسلام اور دارالحرب میں کی گئی تقسیم، جو عہد قدیم کے فقہاء میں قدرے مقبول تھی، عہد جدید میں کچھ زیادہ مفید نہیں معلوم ہوتی۔ ذیل

میں ان ملکوں کی وضاحت کی جاتی ہے جن کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوئے ہیں:

1- قدیم فقہاء دارالاسلام کو ایک مکمل سیاسی وحدت تصور کرتے تھے۔ یہ سیاسی وحدت اپنی جغرافیائی حدود سے جانی جاتی تھی۔ اب عالم اسلام کسی ایک سیاسی وحدت کے بجائے پچاس سے زائد آزاد اور مقتدر ریاستوں (Independent and Sovereign States) پر مشتمل ہے، اس لئے اقتدار اعلیٰ کی بنیاد پر ان میں سے ہر ملک اپنے طور پر دارالاسلام متصور کیا جاسکتا ہے، لیکن بعض دوسری بنیادوں پر مثلاً اسلامی قوانین کے اطلاق کی بنیاد پر ان میں سے کوئی ملک دارالاسلام قرار دیئے جانے کا مستحق نہیں۔

2- مسلم ممالک میں سے بیشتر ایک دوسرے سے جغرافیائی طور پر ملحق نہیں ہیں۔

3- دارالاسلام کے اندر مسلمانوں کو آزادانہ نقل و حرکت کا حق حاصل ہوتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ بالحقہ غیر مسلم علاقوں سے مسلمانوں کو دارالاسلام میں ہجرت کا حق ہونا چاہیے، لیکن موجودہ زمانہ میں بیشتر ملکوں نے آزادانہ نقل و حرکت پر مختلف طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور غیر ممالک کے مسلمان، ان ملکوں میں آزادانہ طور پر داخل نہیں ہو سکتے۔

4- زیادہ تر مسلم ممالک میں اسلامی قوانین رائج نہیں ہیں۔

اس کے ساتھ ہی فی زمانہ ہر غیر مسلم ملک کو دارالحرب بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔

1- فی زمانہ بیشتر غیر مسلم ممالک، عالم اسلام سے برسر جنگ نہیں ہیں۔

2- موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک سے غیر مسلم ممالک کی طرف نقل آبادی ہوتی ہے۔ یعنی نقل آبادی کا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔ زمانہ قدیم میں نقل آبادی کا سلسلہ غیر مسلم ممالک سے مسلم ممالک کی طرف تھا۔

3- (مغرب کے) ان ممالک میں مسلمانوں کو ایسے قوانین کے تحت جان و مال کا تحفظ حاصل ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مشترک ہیں۔

4- مسلمانوں کو ان ممالک میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ ان میں سے بیشتر ممالک نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلامیہ (Universal Declaration of Human Rights) کی توثیق کی ہے جو انسانوں کے ذاتی، شہری، سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔ ان حقوق کی حد بندی صرف اس بات سے ہوتی ہے کہ دوسرے افراد کے حقوق کا بھی احترام کیا جائے اور عام طور پر معاشرتی اخلاق، عوامی نظم و انتظام اور معاشرے کی بہبود کا خیال رکھا جائے۔ اس طرح موجودہ زمانہ میں عام طور پر اقلیتوں کو جن میں مسلم اقلیت بھی شامل ہے، اپنے متعلقہ ممالک میں زندگی، آزادی، تحفظ، شخصی آزادی، گرفتاری سے آزادی، منصفانہ عدالتی کارروائی، تخلیہ (Privacy)، نقل و حرکت کی آزادی، رہائش کی آزادی، آزادی فکر، آزادی اظہار، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب وغیرہ کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر موجودہ زمانہ کے غیر مسلم ممالک کو دارالحرب قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ اس لئے دارالحرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ریوی معاملات پر دی گئی فقہی آراء ان مسلمانوں پر منطبق نہیں ہوتیں جو موجودہ زمانہ میں کسی غیر مسلم ملک میں اقلیت کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان فقہی آراء کا استخراج اس زمانہ میں کیا گیا تھا جب مسلمانوں کو ان ممالک کا سفر درپیش ہوتا تھا جو مسلم ملک سے برسر جنگ ہوں۔ کسی ہنگامی صورت حال میں ان کی تجارت اور مال کو مختلف قسم کی خطر انگیزیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ان خطر انگیزیوں (Risks) کا تقریباً خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں مسلمان اب ان ملکوں میں مستقل باشندوں کی طرح قیام پذیر ہیں نہ کہ عارضی مسافروں کی طرح۔ وہ ان ممالک میں یا تو اپنی مرضی سے قانونی طریقہ پر مقیم ہیں یا پھر وہ ان ہی ممالک میں پیدا ہوئے ہیں اور دوسرے شہریوں کی طرح رہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان پر ان فقہی آراء کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا جن کا استخراج اب سے کئی سو سال پہلے کسی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ کے غیر مسلم ممالک کو جہاں مسلمان اقلیتوں کی حیثیت سے قیام پذیر ہیں دارالامان قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کے اصحاب کفار مکہ کے ظلم و ستم سے نجات پانے کے لئے بادشاہ حبش کی پناہ میں گئے تھے۔ موجودہ زمانہ میں بھی مسلمان غیر مسلم ممالک (بالخصوص مغربی ممالک میں) ان ملکوں کی حکومتوں کی باضابطہ اجازت سے قیام کے لئے گئے ہیں۔ وہ ان ملکوں میں رائج قوانین کے تحت وہاں قیام پذیر ہیں، جہاں ان

مسلمانوں کا ایک طرف یہ فرض ہے کہ وہ ان غیر مسلم ممالک میں پرامن اور پابند قانون (Law Abiding) شہریوں کی طرح رہیں، وہاں ان پر یہ بھی لازم ہے کہ اسلام کے اخلاقی قوانین کی پابندی کر کے وہ اپنی شناخت کو قائم رکھیں۔ اس کو ایک مثال سے بھی واضح کیا جاسکتا ہے۔ قانون کی رو سے تقریباً تمام مغربی ملکوں میں اور بہت سے مشرقی ملکوں میں بھی خمر (شراب یا الکحل) کے استعمال کی اجازت ہے، تاہم کوئی ایسا قانون نہیں جو کسی مسلم یا غیر مسلم فرد کو الکحل کے جبراً استعمال پر مجبور کرے۔ مغربی جمہوریوں میں یہ فرد کے ذاتی انتخاب کا معاملہ ہے، اگر کوئی شخص ذاتی، اخلاقی یا مذہبی بنیادوں پر الکحل سے دور رہنا چاہتا ہے تو ریاست یا کوئی دوسرا فرد اس کی مرضی کے خلاف اسے اس کے استعمال پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی رہا کا معاملہ بھی ہے، گو کہ وہ اس مثال سے ذرا زیادہ پیچیدہ ہے، کیونکہ موجودہ مغربی جمہوریوں میں رہا سے محفوظ رہنے کے لئے صرف انفرادی اقدام یا فیصلہ کافی نہیں۔ اس کے لئے کسی نہ کسی حد میں اجتماعی اقدام بھی ضروری ہے، تاہم اگر جرات آزما اور خیال انگیز اقدامات کئے جائیں تو رہا سے گریز بھی ممکن ہے۔ اس مقالہ کے باقی ماندہ حصے میں ہم ایسے ہی اقدامات اور تجاویز کا جائزہ لیں گے۔

### مسلم اقلیتی ممالک میں اسلامی بینک کاری: قضا یا اور مسائل

ہم اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کی حیثیت سے قیام پذیر ہے۔ یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ اس جدید عہد میں بھی بیشتر ممالک میں اقلیتوں کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لئے وافر سیاسی قوت میسر نہیں، تاہم ان کو بعض سیاسی اور سماجی حقوق ضرور حاصل ہوتے ہیں، جن کا سرسری تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کی حیثیت سے رہنے والے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک علیحدہ مذہبی اور ثقافتی گروہ کی شکل میں وہ اپنی سماجی اور ثقافتی شناخت کو کس طرح قائم رکھیں اور اس کا تحفظ کیسے کریں، یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اور اس کا تعلق سماجی اور معاشی عوامل سے ہے۔ مسائل کی شدت اور نوعیت میں بھی مختلف ملکوں کی صورت حال کے اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے۔ بعض ملکوں میں مخصوص سماجی اور معاشی حالات اور انسانی حقوق کی جانب بہتر رویہ کی وجہ سے اقلیتوں سے نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا ہے، بعض دوسرے ملکوں میں مختلف متحارب گروہوں کے مابین رقابت اور مختلف مفادات رکھنے والے طبقات کے درمیان ٹکراؤ کی باعث صورت حال زیادہ مشکل ہو سکتی ہے۔ محل اور رواداری کی سطح اور گہرائی بھی مختلف سماجوں میں الگ الگ ہوتی ہے۔ بعض مخلوط سماجوں میں مختلف ہونا کوئی نئی یا مجبوبات نہیں، ایسے سماج اقلیتوں کے ان خصائص کے ساتھ جو مرد و جرد و احوال سے مختلف ہوں، محل اور رواداری سے پیش آتے ہیں، اس کے برعکس ایک رخ اور ایک رنگ سماجوں میں، جہاں اقلیتوں کی تعداد بہت ہی کم ہو، مختلف خصائص کو معیوب سمجھا جاتا ہے، ان سماجوں میں توقع کی جاتی ہے کہ سب لوگ ایک جیسے ہو جائیں اور اگر نہ ہو پائیں تو اقلیتوں پر اکثریت کا غضب نازل ہوتا ہے، ایسے ملکوں میں محل اور رواداری کم پائی جاتی ہے۔ سوویت یونین کے انہدام سے کچھ پہلے مشرقی یورپ کے بعض ممالک میں مسلم اقلیتوں کو متعلقہ اکثریتوں کی جانب سے مختلف قسم کی جارحیتوں کا سامنا تھا، جس سے ان کے تہذیبی تشخص کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔

گذشتہ صفحات میں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ مسلم اقلیت کو کتنے ہی دشوار حالات کا سامنا کیوں نہ ہو، لیکن اسلامی طرز اخلاق اور اسلام کے اخلاقی قوانین کی پابندی ہر مسلم کے لئے لازمی ہے، تحریم رہا بھی ایسی ہی ایک پابندی ہے جس کا احترام غیر مسلم ممالک میں رہنے والے اقلیتی مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے، تاہم ضروری مالیاتی اداروں کی غیر موجودگی میں یہ امر کچھ زیادہ ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کے سلسلہ میں کیا دشواریاں حائل ہیں۔

### اسلامی مالیاتی اداروں کی راہ میں دشواریاں

اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دشواریوں کا سامنا کیا جاتا رہا ہے۔

#### ۱- سیاسی حمایت کی کمی

عام طور پر اقلیتی گروہ کے پاس اس قدر سیاسی اقتدار نہیں ہوتا جتنا کہ اکثریتی گروہ کے پاس ہوتا ہے، یہاں تک کہ جمہوری ممالک میں بھی سماجی، سیاسی اور معاشی اداروں کی تشکیل اکثریتی گروہ کے ثقافتی مزاج کے مطابق کی جاتی ہے، اور اس سلسلے میں اقلیتی گروہوں کی ضروریات، ترجیحات، پسند اور ناپسند کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اقلیتی گروہ بے گنا گنہیت کا احساس کر کے علیحدگی پسندی کے خول میں بند ہو جاتا ہے۔ ہم عصر دنیا میں مختلف جگہوں پر اس قسم کے حالات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

## ۲- مہارت کی کمی

غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے عدم وجود کا ایک بڑا سبب اسلامی مالیات سے متعلق مہارت اور علم رکھنے والوں کی کمیابی، بلکہ نایابی ہے، اسلامی مالیات کا علم رکھنے والے لوگ مسلم ممالک میں تو کسی حد تک مل بھی جاتے ہیں، لیکن غیر مسلم ممالک میں اسلامی علوم کی تعلیم کا مناسب اور کا حقہ انتظام نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنی فلاح اور ترقی کے لئے مالیاتی ادارے قائم بھی کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔

## ۳- ادارہ جاتی مالیات کی عدم موجودگی

اسلامی بینک کاری اور مالیات سے متعلق زیادہ تر سرگرمیاں پرائیویٹ سیکٹر میں ہوتی ہیں، خواہ ان کا تعلق مسلم ممالک سے ہو یا غیر مسلم ممالک سے۔ ایک بڑی بینکنگ کارپوریشن کے قیام کے لئے بڑے سرمایہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے، گوکہ عہد جدید میں اسلامی بینک کاری کا تجربہ ایک چھوٹے پیمانہ کے بینک سے شروع ہوا جو مصر کے ایک گاؤں مت عمر میں قائم کیا گیا تھا، اور اس کے قیام میں مقامی وسائل سے ہی کام لیا گیا تھا۔ وسائل کی کمی کے باعث مختلف غیر مسلم ممالک میں مسلمان اپنا مالیاتی ادارہ قائم نہیں کر سکتے، حالانکہ ان حلقوں میں بھی تحریم رہا کے احترام کی خواہش کسی سے کم نہیں۔ غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کی راہ میں ایک دوسری رکاوٹ بازار کا محدود سائز ہے، کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان نہ صرف اقلیت میں ہوں بلکہ دور دراز علاقوں میں منتشر بھی ہوں، یورپ میں کئی اسلامی بینکوں کی ناکامی میں جزوی طور پر جغرافیائی عدم ارتکاز کا بھی دخل تھا۔

## ۴- نامناسب سیاسی ماحول

غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام میں ایک رکاوٹ نامناسب سیاسی ماحول بھی ہے۔ اسلامی بینک اور دوسرے اسلامی مالیاتی اداروں کو تشفی بخش طور پر کام کرنے کے لئے ایک خاص ادارہ جاتی اور قانونی نظام درکار ہوتا ہے۔ کئی مسلم ممالک نے، جہاں کسی نہ کسی شکل میں اسلامی بینک کاری موجود ہے، یا تو اسلامی بینک کاری کے لئے نئے قوانین تشکیل دیئے ہیں، یا پھر قدیم قوانین میں ایسی ترمیمات کی ہیں کہ اسلامی بینک کاری کے لئے جگہ بنائی جاسکے۔ مسلم اقلیتی ممالک میں بیشتر حالتوں میں ان میں سے کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔ مزید برآں بیشتر ممالک میں پالیسی سازوں اور مرکزی بینک کاروں کے ذہنوں میں اب تک غیر سودی بینک کاری کی افادیت اور عملیت کے بارے میں شدید تحفظات اور شکوک موجود ہیں، اس لئے وہ غیر سودی مالیاتی اداروں کو مناسب تحفظ فراہم نہیں کرتے۔ فی الوقت بہت سے غیر مسلم ممالک میں کسی غیر سودی مالیاتی ادارہ کا قیام قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ ایسے ممالک میں مرکزی بینک کی طرف سے جمع قبول کرنے والے اداروں پر سخت شرائط عائد کی جاتی ہیں، جو اسلامی بینک کاری کے فروغ میں رکاوٹ ہو سکتی ہیں، مثلاً کئی ممالک میں مراجمہ سودی مالیات کے بدل کے طور پر نمودار ہوا ہے، لیکن بہت سے دوسرے ممالک میں بینکوں کو براہ راست تجارت سے دور رکھا جاتا ہے، ان ملکوں میں اسلامی مالیاتی ادارے مشکل سے ہی پنپ سکتے ہیں۔

## مسلم اقلیتوں کی مالی ضروریات

اگر مسلم اقلیتیں ربا سے دور رہنا چاہتی ہیں تو ان کی مالی ضروریات رفع کرنے کے کچھ ایسے طریقے ہونے چاہئیں کہ ان ضرورتوں کو غیر ربوی بنیادوں پر رفع کیا جاسکے، بنیادی طور پر یہ ضروریات چار اہم میدانوں میں ہو سکتی ہیں۔

## ۱- ذاتی مالیات

سب سے پہلی ضرورت ذاتی مالیات (Personal Finance) کے میدان میں ہے، یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کسی فرد کی ذاتی آمدنی (Personal Income) اس کے اخراجات اور ضروریات سے کم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس فرد کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ذاتی مالیات کی دوسری ضروریات صارفین کے قرض کے میدان میں ہوتی ہیں، تاکہ صارفین دیرپا اشیاء صرف (Durable Consumer goods) کی خریداری کر سکیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ ضروریات بیشتر فنانس کمپنیوں کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں، جو دیرپا اشیاء کی خریداری کے لئے مال فراہم کرتی ہیں، بعض اوقات تجارتی کمپنیاں اور کریڈٹ کارڈ کمپنیاں بھی دیرپا اشیاء صرف کی خریداری کے لئے قرض فراہم کرتی ہیں۔ تجارتی کمپنیاں یہی کام فروخت بالا قسط یا Hire Purchase Schemes کے ذریعہ کرتی ہیں۔ اس کو صارفین کو دیا جانے والا قرض Consumer

Credit بھی کہتے ہیں، قرض کی اس قسم میں سود کی شرح سب سے زیادہ پائی جاتی ہے جو 18 فیصد سے لیکر 30 فیصد یا کئی بار اس سے بھی زیادہ پائی گئی ہے، چونکہ ان تمام طریقوں میں کسی نہ کسی شکل میں رہا پایا جاتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے غیر ربوی طریقے تلاش کئے جائیں۔

## ۲- چھوٹے پیمانے کی صنعت و تجارت

بہت سے غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے خاص پیشوں میں زراعت، چھوٹے پیمانے کی صنعت و تجارت اور مختلف قسم کی دستکاریاں ہیں، ان پیشوں کو تجارتی بینکوں سے زیادہ قرض نہیں دیئے جاتے، جب ان کی مالی ضروریات معقول طریقوں سے بینکوں کے ذریعہ پوری نہیں کی جاتیں تو یہ کاروباری، سودی کاروبار کرنے والوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

## ۳- رہائشی مالیات (Housing Finance)

رہائش، انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ آبادی، شہریت (Urbanization) اور صنعت (Industrialization) میں اضافہ کے ساتھ ساتھ رہائش کی طلب میں بھی اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس کی رسد میں اسی تناسب سے اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ رہائش کی قلت بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی قیمتوں میں بھی اس قدر اضافہ ہو رہا ہے، کہ اب لوگ محض اپنی بچت کے ذریعہ رہائش کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے مالیات (Finance) کی ضرورت ہے۔ تجارتی بنیادوں پر مالیاتی اداروں کے ذریعہ فراہم کی جانے والی مالیات، خواہ یہ مالیاتی ادارے نجی ذمہ دار کے ہوں یا عوامی ذمہ دار کے، اکثر و بیشتر سودی مالیات ہوتی ہے، بیشتر مسلم ممالک میں، متبادل انتظامات کی عدم موجودگی میں، مسلم صارفین سودی اداروں کی مدد لینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں، تاہم وہ اس سلسلہ میں اطمینان محسوس نہیں کرتے، اگر رہائشی مقاصد کے لئے غیر سودی بنیادوں پر مالیات فراہم کی جاسکے تو غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیتوں کی خود اعتمادی اور حوصلہ میں قابل لحاظ اضافہ ممکن ہو سکے گا۔

## ۴- سرمایہ کاری کی ضروریات

ان لوگوں کے لئے جن کے پاس سرمایہ کاری کے لئے کچھ مالی وسائل موجود ہیں، سرمایہ کاری کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، تاہم وہ ان وسائل سے کچھ حلال آمدنی حاصل کر سکیں۔ بین الاقوامی سرمایہ کاروں کے لئے اب یہ مسئلہ اتنا شدید نہیں رہا، کیونکہ بین الاقوامی سطح پر اب متعدد ایسے اسلامی بینک، فنانس کمپنیاں، وغیرہ نمودار ہو گئے ہیں جو اسلامی طریقہ پر سرمایہ کاری کرتے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اب تو بہت سے کثیر قومی بینک (Multinational Banks) بھی اسلامی سرمایہ کاری کرنے لگے ہیں، ان کے ذریعہ ان لوگوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں، گذشتہ دو دہائیوں کے دوران سرمایہ کاری فنڈ (Investment Fund) میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے، لوگ اب بینکوں میں اپنا سرمایہ ”جمع“ (deposits) کی شکل میں رکھنے کے بجائے ان فنڈز کے ذریعہ سرمایہ کاری کرنا پسند کرتے ہیں، خواہ ان فنڈز کا انتظام و انصرام بینکوں کے ہاتھ میں ہو یا سرمایہ کار کمپنیوں کے ہاتھ میں۔ چونکہ ان میں سے بیشتر فنڈز ربوی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، اس لئے ایسے فنڈز کی ضرورت ہے جو غیر سودی بنیادوں پر کام کریں، ظاہر ہے غیر مسلم ممالک میں بھی ایسے فنڈز کی شدید ضرورت ہے، چنانچہ شاید اسی ضرورت کے پیش نظر بیشتر اسلامی سرمایہ کاری فنڈز لندن میں شروع کئے گئے ہیں جو بین الاقوامی مالیاتی بازار کا ایک اہم مرکز ہے، اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان فنڈز کی کامیابی اور توسیع میں بڑا دخل ان مسلمان سرمایہ کاروں کی دلچسپی کا ہے جو مغرب میں مقیم ہیں، تاہم اب کئی مسلم ممالک میں بھی اسلامی سرمایہ کاری فنڈز کا آغاز کیا جا چکا ہے۔

## غیر سودی متبادل

اگر غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیات رہا سے بچنے کی اپنی خواہش میں مخلص ہیں، تو اپنے اپنے متعلقہ ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کو ایک ایسی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی کہ وہ اپنے ہر مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لئے الگ حکمت وضع کریں، یقیناً ایک اسلامی مالیاتی ادارہ، جیسے اسلامی بینک، کا قیام ان مسائل کا یقینی حل ہے۔ اس ادارہ کی شاخیں ان علاقوں میں کھولی جاسکتی ہیں جہاں مسلمانوں کا ارتکاز ہو۔ اس ضمن میں حکومت وقت اور مرکزی بینک سے اس اسلامی مالیاتی ادارہ کے دائرہ کار اور اس پر کنٹرول کے طریق کار کے بارے میں گفت و شنید کی جاسکتی ہے۔

تاہم یہ ممکن ہے کہ بعض غیر مسلم ممالک میں یہ متبادل ممکن نہ ہو، مثلاً بعض غیر مسلم ممالک میں مسلمان اتنی قلیل تعداد میں ہو سکتے ہیں کہ کسی اسلامی مالیاتی

ادارہ کا قیام ممکن نہ ہو، یا یہ کہ اکثریت اور حکومت وقت کا رویہ تعاون پر مبنی نہ ہو، ایسے حالات میں اقلیت کے سامنے اس کے سوا دوسرا چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ بعض دوسرے متبادل تلاش کرے۔

### جذبہ تعاون

مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے "وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورہ مائدہ: ۲) یعنی نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں ایک دوسرے کا ساتھ دو اور برائی و گناہ (کے کاموں) میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو، مسلمانوں کے لئے، خواہ وہ کسی ملک میں اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، تمام اجتماعی کاموں میں یہ آیت ایک رہنما اصول کی طرح ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ مسلم اقلیتوں کو امداد باہمی تحریک سے استفادہ کرنا چاہیے اور اپنے اجتماعی کاموں کی شیرازہ بندی، اور باہمی اصول پر کرنا چاہیے۔ (۱۷) ذیل میں مالیاتی زمرہ کار میں امداد باہمی کے اصولوں کے اطلاق کی نشاندہی کی جا رہی ہے:

### ۱- جمہوری شراکت (Democratic Participation)

امداد باہمی انجمنیں جمہوری شراکت کے اصول پر کام کرتی ہیں جس میں ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تجارتی کمپنیوں میں ہر حصے (Share) کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ انجمن امداد باہمی میں افراد کے مابین مساوات قائم ہوتی ہے جس کو مالی وسائل کی ملکیت سے علاحدہ کر دیا گیا ہے۔ مسلم اقلیتوں کے ممالک میں اجتماعی اور سماجی کاموں کی شیرازہ بندی کے لئے امداد باہمی کے اصول مناسب معلوم ہوتے ہیں، ان کے ذریعہ اجتماعی تنظیم بھی ممکن ہے اور کسی کو ان کے خلاف انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہیں ہوگا، کیونکہ مختلف جمہوری ممالک میں امداد باہمی کے اصولوں کو مسلمہ طور پر قبول کیا جا چکا ہے۔

### ۲- عام ممبر شپ (Open Membership)

امداد باہمی کے اصولوں کے مطابق انجمن امداد باہمی کی ممبری عام ہوتی ہے اور کسی بھی فرد کو، جو انجمن امداد باہمی کے عام مقاصد اور طریقہ کار سے اتفاق رکھتا ہو، ممبر بنایا جاسکتا ہے۔ ممبر بناتے وقت رنگ، نسل، مذہب، فرقہ، طبقہ، یا سیاسی رجحانات کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ امداد باہمی اصولوں کی یہ شق مسلم اقلیتوں کے لئے خاص طور پر مناسب ہو سکتی ہے جو اپنے اجتماعی کاموں میں غیر مسلموں کو شریک کر سکتے ہیں اور اس طرح انھیں اسلام کی برکتوں میں شریک کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک اسلامی کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹی قائم کی گئی تو سوسائٹی کے اصول و ضوابط کے تحت، اس کے اغراض و مقاصد سے متفق لوگوں کو عام طور پر ممبر بنایا جاسکتا ہے اور اس طرح غیر سودی مالیات (Interest Free Finance) کے حق میں فضا ہموار کی جاسکتی ہے۔

### ۳- امداد باہمی کی تعلیم (Cooperative Education)

تمام کوآپریٹو سوسائٹیز کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممبروں، افسروں، اور ملازموں کے لئے ایسی تعلیم کا انتظام کریں جس سے امداد باہمی تحریک کے طریقوں کے بارے میں ان کا علم بڑھ سکے۔ اسی طرح وہ عام پبلک کے لئے بھی امداد باہمی کے اغراض و مقاصد اور طریق کار کے بارے میں اور خاص اس انجمن کے اغراض و مقاصد کو فروغ دینے کے لئے بھی اقدامات کر سکتی ہیں، اگر مسلم اقلیتیں اسلامی مالیات کو فروغ دینے کے لئے امداد باہمی کے طرز پر انجمن قائم کریں تو اس اصول کا استعمال بھی اسلامی مالیات اور اس کے اصولوں کے فروغ کے لئے کیا جاسکتا ہے۔

### ۴- امداد باہمی کا فروغ (Promotion of Cooperation)

امداد باہمی کا ایک اور اصول یہ ہے کہ انجمن امداد باہمی اپنے ممبروں کے مفاد کے لئے سرگرم عمل ہو، اور امداد باہمی کے اغراض و مقاصد کے لئے دوسری انجمنوں سے مقامی، علاقائی، قومی، اور بین الاقوامی سطحوں پر تعاون کرے، اسلامی مالیاتی اداروں کے لئے جو امداد باہمی کی بنیاد پر کام کرتے ہوں یہ تعاون دوہرا ہو سکتا ہے، ایک طرف تو دوسرے اسلامی مالیاتی اداروں سے تجارتی بنیادوں پر متعلق اور متعلق کر سکتے ہیں، دوسری جانب یہ تعاون امداد باہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے۔ (۱۸)

اسلامی مالیات کے لئے امداد باہمی کے اصولوں کے اطلاق سے چند بین فائدے حاصل ہوں گے جن کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

۱- اگر اسلامی مالیاتی اداروں کو امداد باہمی کی بنیادوں پر منظم کیا جائے تو یہ ادارے کارپوریٹ سیکٹر میں کام کرنے والے مالیاتی اداروں کی نامناسب اور نابرابر مسابقت سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ تو بدیہی ہے کہ کارپوریٹ سیکٹر کے اداروں کے پاس زیادہ سرمایہ ہوتا ہے، وہ بازار کی وسعت اور اعلیٰ تکنالوجی کی برکتوں سے بھی مستفیع ہوتے ہیں، دوسری جانب اسلامی مالیاتی ادارے، اگر ان کو مسلم یا غیر مسلم ممالک میں موجودہ قوانین کے تحت قائم کیا جاسکے، اپنے نئے پن کی وجہ سے سرمایہ اور تکنیک کی کمی سے دوچار ہوں گے۔ چنانچہ نو تشکیل شدہ اسلامی مالیاتی اداروں اور روایتی مالیاتی اداروں کے مابین مسابقت غیر مساوی ہوگی۔ اگر اسلامی مالیاتی اداروں کو امداد باہمی کی بنیاد پر منظم کیا جائے تو وہ اس عدم مساوات اور نامناسب مسابقت سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

۲- زیادہ تر ممالک میں زمرہ امداد باہمی Cooperative Sector پر کارپوریٹ زمرہ کے مقابلہ میں کم پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیتوں کے لئے امداد باہمی زمرہ میں اسلامی مالیاتی ادارے قائم کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہو، عام طور پر امداد باہمی ادارے قائم کرنے کے لئے قلیل سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ کارپوریٹ سیکٹر میں ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس کا تعین اس ملک کے تجارتی قانون (Company Law) میں کیا جاتا ہے۔ اپنی اس خاصیت کی وجہ سے امداد باہمی نظام میں ایسی چلک پائی جاتی ہے جو دوسرے نظاموں میں نہیں ہے۔

۳- امداد باہمی نظام میں چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں، عام طور پر امداد باہمی میں بیگانے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور ایک امداد باہمی ادارہ بہت تھوڑے سرمایہ سے شروع کیا جاسکتا ہے۔

۴- امداد باہمی نظام میں مختلف مقاصد کے لئے مختلف طرح کے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں، جیسے صارفین کی انجمن (Consumers Cooperative)، پیدا کنندگان کی انجمن امداد باہمی (Producers Coop)، تقسیم کنندگان کی انجمن امداد باہمی (Distributors Cooperative)، انجمن امداد باہمی برائے قرض (Cooperative Credit Society) وغیرہ، تاہم ان کی کامیابی کا ریکارڈ مختلف زمروں میں مختلف رہا ہے۔

۵- امداد باہمی اداروں کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ ان میں خاصی لامرکزیت (Decentralization) لائی جاسکتی ہے اور ان کے ذریعہ ایسی آبادیوں کو نفع پہنچایا جاسکتا ہے جن کا سائز خاصاً مختصر ہو۔

گوکہ اسلامی مالیات، تحریک امداد باہمی کے تمام امکانات سے ابھی پوری طرح بہرہ مند نہیں ہوئی، تاہم بعض مسلم اقلیتی ممالک میں اس جانب کچھ قدم اٹھائے گئے ہیں۔ مثلاً آف ٹری نیڈز میں 1983 میں ایک مسلم کریڈٹ یونین کو آپریٹو سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جو اس وقت سے سرگرم عمل ہے۔ (19) اسی طرح ہندوستان، انڈونیشیا اور بلیشیا میں بڑے پیمانہ پر غیر سودی انجمنیں کام کر رہی ہیں جو قرض فراہم کرتی ہیں، گوکہ ان میں سے بیشتر امداد باہمی کے اصولوں پر قائم نہیں کی گئیں۔ (20)

### غیر سودی، امداد باہمی قرض انجمنیں (Interest Free Coop. Credit Societies)

ذاتی مالیاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے غیر سودی قرض انجمنیں، امداد باہمی کے اصولوں پر قائم کی جاسکتی ہیں، تاہم ممبران کو ضرورت پڑنے پر غیر سودی قرض فراہم کیا جاسکے۔ غیر سودی ذاتی قرضوں کی ضرورت دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں پڑسکتی ہے۔ غیر سودی قرض فراہم کرنے والی کسی سہولت کی عدم موجودگی میں لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنی ضروریات رفع کرنے کے لئے روایتی یا غیر روایتی سودی ذرائع میں جا بچھنیں۔ اگر امداد باہمی کی بنیاد پر قرض فراہم کرنے والی انجمنیں موجود ہوں تو یہ ضرورتیں آسانی سے پوری کی جاسکتی ہیں اور سود خوروں کے چنگل سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

ضروری نہیں کہ غیر سودی امداد باہمی انجمنوں کا دائرہ کار صرف قرض فراہم کرنے تک محدود رہے، مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ان انجمنوں کو ممبران کی قصیر مدتی اور طویل مدتی مالیاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان انجمنوں کے ذریعہ دیرپا اشیائے صرف (Durable Consumer Goods) اور نیم دیرپا اشیائے صرف (Semi-durable Consumer Goods) مثلاً فرنیچر اور برقیاتی سامان کی خریداری کے لئے مال فراہم کیا جاسکتا ہے۔

فی الحقیقت غیر سودی کریڈٹ سوسائٹی، اور غیر سودی بچت و سرمایہ کاری انجمن (Interest Free Saving and Loan)

(Associations) ان ملکوں میں، اس وقت بھی سرگرم عمل ہے جہاں اسلامی بینک کاری کی سہولتیں موجود نہیں ہیں، مثلاً فلپائن اور تھائی لینڈ میں ایسی انجمنوں کے وجود کی خبر موجود ہے جو عموماً غیر منظم زمرہ میں کام کر رہی ہیں (21)۔ عام طور پر یہ انجمنیں اس طرح کام کرتی ہیں کہ ہر ماہ ہر ممبر ایک متعین رقم جمع کراتا ہے، اپنی باری آنے پر اس کو ایک غیر سودی قرض مل جاتا ہے، اگر اس کی ضرورت شدید ہو تو باری آنے سے قبل وہ کسی ایسے ممبر سے باری تبدیل کر سکتا ہے، جس کی باری ہے۔ اس طرح کے سیکٹروں ادارے ہندوستان کے طول و عرض میں بھی کام کر رہے ہیں۔ اس طرز کے غیر سودی ادارے صرف ان ملکوں میں ہی نہیں ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں پائے جاتے ہیں، بلکہ انڈونیشیا جیسے ملک میں بھی اس قسم کی انجمنیں موجود ہیں، جو نہ صرف ایک مسلم اکثریتی ملک ہے بلکہ وہاں بینک معاملات جیسا کامیاب اسلامی بینک بھی موجود ہے۔

غیر سودی امداد باہمی انجمنوں کی سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ نہ تو یہ اسلامی بینک کی طرح کام کر سکتی ہیں اور نہ ہی اسلامی بینکوں کا متبادل بن سکتی ہیں، یہ انجمنیں اسلامی مالیاتی طریقوں (Islamic Financing Techniques) کے پورے امکانات سے بھی مستفید نہیں ہو سکتیں، کیونکہ یہ بنفسہ بینک نہیں ہیں۔ تجارتی بینکوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ بہت سے افعال انجام دیئے جاسکتے ہیں، جب کہ کوآپریٹو سوسائٹی کے سامنے بیشتر صرف ایک مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔

### ہاؤسنگ سوسائٹی

رہائشی مقاصد کے لئے مالیات کی ضرورت، تمام معاشروں اور تمام زمانوں میں انسانوں کی بنیادی ضرورت رہی ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں مکانوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث اس نوع کی مالیات کی اہمیت میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔ مغربی ممالک میں مکانوں کی تعمیر اور خرید و فروخت کے لئے اختصاصی مالیاتی ادارے وجود میں آگئے ہیں، جو مکانوں کی تعمیر اور خریداری کے لئے مالیات فراہم کرتے ہیں، جیسے تجارتی بینک، رہن کمپنیاں (Mortgage Companies)، بچت اور سرمایہ کاری انجمنیں (Saving Loan Associations) جنہیں امریکا میں LB کہا جاتا ہے، اور اختصاصی مالیاتی ادارے جیسے ہاؤسنگ بینک وغیرہ، طبعی طور پر یہ سب ادارے سودی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، چنانچہ ان ممالک میں مقیم مسلمانوں کے لئے یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ یا تو وہ سودی بنیادوں پر ان اداروں سے معاملہ کریں یا اپنے ذاتی مکان سے محروم رہیں۔

تاہم اگر ان ممالک کے مسلمان امداد باہمی کی بنیاد پر ہاؤسنگ سوسائٹی کا تجربہ کریں تو اس مسئلہ کے غیر سودی حل کی جانب پیش رفت ہو سکتی ہے۔

### سرمایہ کاری کا مسئلہ

مسلم اقلیتوں کے لئے سرمایہ کاری کا معاملہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کا اسلامی حل ڈھونڈنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مسلم افراد اپنی بچت کی سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں اور اس سرمایہ کاری سے مثبت اور حلال آمدنی کی توقع رکھتے ہیں تو یہ ایک بجا اور فطری خواہش ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام سرمایہ سے آمدنی کو ناجائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام میں سرمایہ سے ایک خاص قسم کی آمدنی (یعنی سود) حرام قرار دی گئی ہے۔ اسلامی بینکوں کی عدم موجودگی میں مسلم اقلیت کے افراد اپنی بچت کی سرمایہ کاری کس طرح کریں کہ ان کو حلال آمدنی حاصل ہو سکے؟

اس سوال کا جزوی جواب تو اسلامی سرمایہ کاری فنڈز (Islamic Investment Funds) کے ذریعہ مل سکتا ہے۔ گذشتہ دو تین دہائیوں میں ساری دنیا میں سرمایہ کاری فنڈز کو خاص طور پر عروج حاصل ہوا ہے۔ لوگ اب اپنا پیسہ بینک کے جمع کھاتوں (Bank Deposits) میں رکھنے کے بجائے ان فنڈز میں لگاتے ہیں۔ بہت سے بینک، مالیاتی کمپنیاں (Finance Companies)، سرمایہ کاری کمپنیاں (Investment Companies) اور دوسرے مالیاتی ادارے اس طرح کے فنڈز چلاتے ہیں، چونکہ اس طرح کے بیشتر فنڈز نہ صرف سودی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، بلکہ اکثر زیادہ آمدنی کی لالچ میں ایسے اعمال میں بھی اپنا سرمایہ لگانے سے نہیں ہچکچاتے جن کو اسلامی اخلاقی معیاروں سے قابل قبول نہیں سمجھا جاتا، مثلاً شراب، قمار بازی، یا فحشیات سے متعلق صنعتوں میں سرمایہ کاری۔

اس صورت حال میں اسلامی سرمایہ کاری کی ضرورت بدیہی ہے اور اسی ضرورت کے احساس کی بنا پر اسلامی سرمایہ کاری فنڈز کا وجود عمل میں آیا ہے۔ زیادہ تر ایسے فنڈز لندن میں قائم کئے گئے ہیں جو اب بھی بین الاقوامی مالیاتی بازار کا ایک اہم مرکز ہے (22)۔



## حواشی

### علم معاشیات: تعریف، مقصد اور منہاج

1) غالباً یہ تذکرہ یہاں پر دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ 1776 میں تین خاص واقعات تین مختلف دائروں میں ظہور پذیر ہوئے اور غالباً دنیا کی شکل تبدیل کرنے میں اور موجودہ صنعتی تہذیب کو جنم دینے میں جتنا ان تین واقعات نے حصہ لیا ہے اتنا کسی اور چیز نے نہیں۔ 1776 میں جیمس واٹ نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا۔ 1776 میں ہی ریاستہائے متحدہ امریکا میں اعلان آزادی پر دستخط کئے گئے اور اسی سال ایڈم اسمتھ کی کتاب ”دولت اقوام“ شائع ہوئی۔ پہلے واقعے نے ٹکنالوجی میں ان تبدیلیوں کا آغاز کیا جن کا نقطہ عروج موجودہ دور کی خود کار مشینوں کا نظام ہے۔ دوسرا واقعہ سیاسیات کی حدود میں تھا۔ اور امریکا کے صفحہ ہستی پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے نمودار ہونے سے بین الاقوامی سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ تیسرے واقعے نے بہ حیثیت علم معاشیات کی بنیاد ڈالی جس نے 2 سو سال کے اندر اتنی ترقی کر لی کہ اسے ”سماجی علوم کی ملکہ“ کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ٹکنالوجی، سیاسیات اور معاشیات، میں ہونے والے ان بظاہر غیر متعلق تین واقعاتوں نے جن تبدیلیوں کا آغاز کیا وہ ایک دوسرے سے متعلق اور مربوط تھیں اور ان سب عوامل نے مل جل کر موجودہ صنعتی تہذیب کی تشکیل کی۔

2) جے، بی، سے (J.B. Say)، نے کہا کہ (معاشیات دولت کا علم ہے)۔

3) کارلائل نے اسے Dismal Science اور Bread & Butter Science کے خطابات سے نوازا ہے۔

4) الفرید مارشل ”اصول معاشیات“

5) ایضاً

6) ایضاً

7) آپ غالباً جانتے ہو گئے کہ جب کسی عام لفظ کو کسی علم میں کسی خاص معنی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اسے اصطلاح کہتے ہیں اور ایسے معنی کو اصطلاحی معنی کہتے ہیں۔

8) See Gery S Becker: Economic Theory Alfred A Knopf. Ine New York. 1971, p.viii.

9) Theory: The analysis of a set of facts in their relation to one another, The general or abstract principles of a body of fact, a science or an art. 3. A plausible or scientifically acceptable general principle or body of principle offered to explain a phenomenon 4, A hypothesis assured for the sake of argument or investigation. 5. Abstract thought".

C.F. Webster's New Collegiate Dictionary G & C Mirram Co, Springfield, Massachusset.

10) فی الحقیقت تجربہ اور عمومیت ایک دوسرے سے گھٹتے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک مجرد تصور سے ہماری مراد ایسے تصور سے ہے جو مخصوص صفات سے عاری ہو۔

11) Fritz Machlup "The Problem of Verification in Economics. Southern Economic Journal Vol. xxii, (1955) pp. 1-21.

## حواشی: معاشی نظام: اقسام، وظائف اور ماہیت

1. George N. Halm: Economic Systems: A Comparative Analysis (Oxford of IBH) P. 13.

### حواشی: ہندوستان میں اسلامی مالیات

1. Ausaf Ahmad, Indian Muslim: Issues in Social and Economic Development, New Delhi: Khama Publishers, 1993, p\ 11.
2. Omar Khalid, Indian Muslims Since Independence, New Delhi: Vikas Publishing House, 1995, p. 66.
3. مثال کے لئے دیکھیے اوصاف احمد اور عمر خالدی کی کتابیں، رفیق زکریا نے بھی اپنی کتاب کا ایک معتد بہ حصہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی صورت حال کی تفتیش میں صرف کیا ہے۔
4. یہ صرف قیاس نہیں ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ " اس عام احساس کے پیش نظر کہ ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی مالیاتی پالیسیوں کے فوائد، اقلیتوں، مندرجہ فہرست ذاتوں، مندرجہ فہرست قبائل اور دوسرے کمزور طبقوں تک نہیں پہنچ سکے " حکومت ہند نے ایک اعلیٰ اختیاراتی پینل کی تشکیل کی تاکہ وہ اس مسئلہ کی تفتیش کر سکے۔ اس اعلیٰ اختیاراتی پینل کو اس کے چیئرمین ڈاکٹر گوپال سنگھ کے نام پر گوپال سنگھ پینل کہا جاتا ہے۔ پینل نے گوکہ اپنی رپورٹ 1983ء میں حکومت کو سوپ دی تھی لیکن اس کو 1991ء میں ہی جاری کیا جاسکا، رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کی کہ اقلیتوں کو ملک کی ترقیاتی کوششوں میں سے ان کا جائز حق نہیں مل پاتا۔
5. Annual Report, National Commission on Minorities, 1992, p. 321.
6. Ibid, p. 249.
7. "India's Best Banks" Business India Dated January, 11-24, 1999, p. 76.
8. Rahmatullah "Islamic Banks in India" Journal Institute of Muslim Minority Affairs, Vol. 13, No.2, July 1992, p. 317-24
9. Rahmatullah, Ibid, p. 318.
10. Ausaf Ahmad, Comment on Islamic Banks in India, Journal of Institute of Muslim Minority Affairs, Vol. 14, No.1, p. 256.
11. ایک طویل عرصہ تک ہندوستان میں غیر سودی اداروں کے بارے میں شہریاتی حقائق فراہم کرنے کا واحد ذریعہ یہ مضمون تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ آل انڈیا کونسل آف مسلم اکنامک اپ لفٹ منٹ (AICMEU) نے ہندوستان کے غیر سودی اداروں کے بارے میں ایک دوسرا سروے کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے نتائج تا حال مہیا نہیں ہیں۔ پہلے سروے کے نتائج بھی کچھ زیادہ ہمت افزا نہیں تھے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ڈاک کے ذریعہ کئے جانے والے سروے کے نتائج یوں بھی متاثر کن نہیں ہوتے۔
12. الایمن فنانشل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن کا منظور شدہ سرمایہ 10 کروڑ تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس سے قبل اس کا منظور شدہ سرمایہ صرف 5 کروڑ روپیہ تھا۔ جس کو 10 روپے والے 50 لاکھ حصص میں تقسیم کیا گیا تھا۔ منظور شدہ سرمایہ میں اضافہ کمپنی کی کامیابی کی ایک دلیل ہے۔
13. یہ معلومات کمپنی کے شائع کردہ ایک کتابچے سے حاصل کی گئی ہیں۔

14. اسلامی انوسٹمنٹ فنڈ کے بارے میں معلومات درج ذیل مضمون سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

Osman Babikir, "Islamic Investment Funds: The Made of Resource Mobilization" Jeddah Islamic Research and Training Institute, 1998.

15. ان معیاروں کا خیال نہ رکھنے کے باعث کئی تجارتی کمپنیاں جو بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں ناکامی کا شکار ہو چکی ہیں، مثلاً تامل ناڈو کی الیمیز ان کمپنی، حیدرآباد میں بھی ایک مالیاتی کمپنی بحران کا شکار ہونے کے بعد بند ہو چکی ہے، اس کا مینجنگ ڈائریکٹر فریب دی کے الزام میں گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔ دیکھیے سعودی گزٹ، مورخہ 28 فروری 1999۔

16. ہندوستان میں کوآپریٹو بینک خاصی بڑی تعداد میں ہیں۔ اب ہندوستانی مسلمان بھی اس میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور انہوں نے کئی کوآپریٹو بینک قائم کئے ہیں، مثلاً بمبئی مرکز نائل کوآپریٹو بینک (ممبئی) امانت کوآپریٹو بینک (بنگلور) اور جامعہ کوآپریٹو بینک (نئی دہلی)۔ مؤخر الذکر جدید ترین ہے، یہ سب ادارے سودی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، ان میں سے امانت بینک بعض وجوہ کی بناء پر بند کیا جا چکا ہے۔

### حواشی: اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک

1. Munawwar. Iqbal, Ausaf Ahmad and Taqiullah Khan, "Challenges Facing Islamic Banking", Jeddah Islamic Research and Training Institute, 1998, P.1.
- 2۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے بین الاقوامی مالیاتی بازار کا کتنا بڑا حصہ کنٹرول کرتے ہیں۔ اس کا صرف تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور تخمینے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں اور معقولیت کی حد میں رہ کر ان پر یقین کرنا مشکل بھی ہو سکتا ہے، تاہم بین الاقوامی مالیاتی بازار کے پنڈتوں کا اندازہ ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے اس وقت 80 بلین ڈالر کا کاروبار کر رہے ہیں اور عنقریب یہ رقم 100 بلین ڈالر تک پہنچ جائے گی۔
3. M. Umar Chapra, "The Role of Islamic Banks in Non-Muslim countries" *Journal of the Institute of Muslim Minority Affairs*, JIMMA, Vol. XIII, No. 2, July 1992, P. 308-316.
4. Husaini U. Malami, "Prospects of Islamic Banking in Muslim Minority Countries" *Journal Institute of Muslim Minority Affairs*, JIMMA, Vol. VIII, No. 2, July 1992, PP. 308-316.
5. Rahmatullah, "Islamic Banking in India" *Journal Institute of Muslim Minority Affairs*, JIMMA Vol. XIII, NO.2, July 1992, PP. 317-324.
6. Ausaf Ahmad, "Islamic Banking in India: A Comment" *Journal Institute of Muslim Minority Affairs*, JIMMA, Vol. XIV, No.1-2, 1993, P.256.
7. Saleh Abdullah Kamel, "Islamic Banking in Practice: The Al-Barkah Group in Muslim Minority Countries" *Journal Institute of Muslim Minority Countries*, JIMMA, Vol. XIII, No.2, July 1992, PP. 325-36.
- 8۔ فقہی نقطہ نظر سے فقہاء نے ساری دنیا کو دو علاقوں میں تقسیم کیا تھا، دارالحرب اور دارالاسلام، موٹے طور پر ان کو مسلم اور غیر مسلم علاقوں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مسلم علاقوں کی تمیزی خصوصیت (Distinguishing Feature) اسلامی قوانین کا اطلاق اور اسلامی طرز زندگی کا رائج ہونا ہے۔ ایک مشہور فقہی کاسانی کے مطابق ایک مسلم علاقہ (دارالاسلام) اس وقت غیر مسلم علاقہ (دارالحرب) میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب وہاں غیر اسلامی قوانین کا ظہور ہو۔ کاسانی مزید کہتے ہیں کہ دارالاسلام، دارالحرب میں تبدیل نہیں ہو سکتا، سوائے تین حالتوں کے۔
- (1) غیر اسلامی قوانین کا اطلاق (2) دارالحرب سے الحاق (3) مسلم اور ذمی اصل امان سے محروم ہو جائیں، جو مسلمانوں کو اسلام کے سبب اور ذمیوں کو عقد الذمہ کے سبب حاصل تھی۔ (دیکھیے کاسانی: بدائع الصنائع، جلد 7، صفحہ 13)
9. M. N. Siddiqi, "Sources of Islamic Jurisprudence" in Hasmet Basar (ed.) *Development of Awqaf Properties*, Jeddah Islamic Reserch and Training Institute, 1984.
- 10۔ المحرر۔ بحوالہ نزیہ حماد: "احکام التمويل بالربا بين المسلمين وغير المسلمين في ظل العلاقات الدولية المعاصرة (معاصرین الاقوامی تعلقات کی روشنی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملات کے احکامات) (جدہ: دارالوفا للنشر والتوزيع۔

11. Justice Tanzeelur Rahman: "The Judgement That Could Not Be Delivered, p. 64.

12۔ اس دعویٰ کا تجزیہ بعد میں کیا گیا ہے۔

13۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ مقالہ اصلاً اردو زبان میں دسمبر 1936 میں ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ یوں تو اس مقالے کو اب نایاب ہو جانا چاہیے تھا، خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا، کیونکہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب میں یہ پورا مقالہ اپنے جوابی مقالہ کے ساتھ شائع کر دیا۔ دیکھئے ابوالاعلیٰ مودودی، (سود) اردو، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، 1993 اس کتاب کے عربی اور انگریزی ترجمے بھی اب دستیاب ہیں۔ چنانچہ مولانا گیلانی کا اصل مقالہ بھی ان زبانوں میں بھی دستیاب ہے۔

14۔ النووی: المجموع بحوالہ نزیہ حماد، حوالہ سابق، ص 10

15۔ ابوالاعلیٰ مودودی: سود

16۔ اب سے کچھ سال قبل بینک آف انگلینڈ کے گورنر نے اپنی ایک تقریر میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ برطانوی بینک کاری قوانین اور اسلامی بینک کاری باہمی طور پر متناقض ہیں۔

17۔ امداد باہمی تحریک کا تجربہ برطانیہ، جرمنی، فرانس، بلجیم، آسٹریلیا، اٹلی، ڈنمارک، فن لینڈ، ناروے اور سویڈن وغیرہ میں مختلف میدانوں میں کامیابی سے کیا جا چکا ہے۔ خاص طور پر سویڈن میں پیداوار اور تقسیم کے میدان میں امداد باہمی انجمنیں اتنی کامیاب ہوئیں کہ ان کو سویڈن کی معیشت میں ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ بین الاقوامی اتحاد برائے امداد باہمی (International Cooperative Alliance) کے مطابق ساری دنیا کے 355 ملین لوگ امداد باہمی تحریک سے وابستہ ہیں۔

18۔ اسلامی طرز کی امداد باہمی انجمنوں کے بین الاقوامی وفاق کی تجویز کے لئے دیکھئے Imtiaz Ali, "Islamic Cooperatives: Pathway in

Islamic Finance" Conference Islamic Banking & Finance Organized by ISNA, July 17-18, 1998.

20۔ ان انجمنوں کا تذکرہ آگے آئے گا۔

21. Mohammed Arif, *Islamic Banking in Southeast Asia* Singapore: Institute of Southeast Asian Studies, 1988.

22. Rodoney Wilson, *"Challenges and Opportunities for Islamic Banking and Finance in the West! The U.K. Experience"* Jeddah: Islamic Research and Training Institute, 1998. (Unpublished).

{...}{...}

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# تفریح و سیاحت

اس کے جائز وسائل و شرعی ضوابط

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بیسویں فقہی سمینار منعقدہ جامع العلوم فرقانیہ راجپور میں مورخہ ۵-۷ مارچ ۲۰۱۱ء کو پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات و مناقشات کا مجموعہ جس میں مزاح، لطیف گوئی، مزاحیہ کہانیاں اور ڈرامے، سیر و سیاحت پر کثیر رقم خرچ کرنا، مختلف کھیل اس کے اصول، کھلاڑیوں کے لباس و پوشاک، کھیلوں پر سٹلگانا، تاریخی اور تعلیمی مقاصد کے لئے فلمیں اور کارٹون بنانا وغیرہ شامل ہیں۔

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان

تقریر  
میں  
"تقریر"  
ہے  
میں  
چونکہ  
کیا  
پہلے  
تقریر  
میں  
تقریر

## پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کے لئے دو عالم بنائے ہیں: ایک عالم اس دنیائے ارضی کا ہے، جس میں راحت و تکلیف اور خوشی و غم کو پہلو بہ پہلو رکھا گیا ہے، شاید ہی انسان پر کوئی دن ایسا گذرتا ہو، جس میں خوشیوں نے اس کے دامن مراد کو بھرا ہو؛ لیکن غم نے اس پر اپنا سایہ نہ ڈالا ہو، یا اس کے برعکس اس پر رنج و الم کی ایسی بارش ہوئی ہو کہ کوئی خوشی اسے میسر نہ آسکی ہو، رزق میں وسعت کے ساتھ تنگی، صحت کے ساتھ بیماری اور عزت و توقیر کے ساتھ رسوائی سے انسان قدم قدم پر دوچار ہوتا ہے، دوسرا عالم، عالم آخرت ہے، یہاں انسان کے لئے یا تو صرف راحتیں ہی راحتیں ہیں، یہ ان لوگوں کا حصہ ہے، جن کا ٹھکانہ جنت ہے، یا پھر رنج ہی رنج ہے، ایسی تکلیف جو ختم نہ ہو اور ایسی مصیبت جس سے نجات کا کوئی راستہ نہ ہو، یہ ان لوگوں کا مقدر ہے، جن کو جہنم میں داخل کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

انسان اتنا عاجز ہے کہ اس دنیا میں اسے جو راحت حاصل ہوتی ہے، اس کی لذت بہت جلد ختم ہو جاتی ہے؛ لیکن جب تکلیف پہنچتی ہے تو انسان اسے بھلائے نہیں بھلا پاتا، بقول ایک شاعر:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب!  
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

پھر انسان کی لامتناہی خواہشات کے لحاظ سے یہ دنیا بہت چھوٹی ہے؛ اس لئے لوگوں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ بھی ہوتا ہے اور اس ٹکراؤ کی وجہ سے انسان ذہنی تناؤ اور ٹینشن کا شکار ہوتا رہتا ہے، اس صورت حال کا تقاضہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے کچھ اوقات ہر طرح کے افکار سے آزاد ہو کر سکون کے ماحول میں گزارے؛ تاکہ اسے تناؤ سے نجات ملے اور تاکہ وہ اپنے غم کے لمحات کو بھلا سکے، اسی کو ”تفریح“ کہتے ہیں، یعنی دل و دماغ کے لئے کچھ لمحات فرحت و سکون کے فراہم ہوں، اس سے انسان کے ذہن میں تازگی پیدا ہوتی ہے، کام کے لئے نئی اُمنگ حاصل ہوتی ہے اور آدمی ایک نئے حوصلہ کے ساتھ کام شروع کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے قدرتی طور پر انسانی زندگی میں تفریح طبع کے اسباب رکھ دئے ہیں، انسان دن بھر محنت کرتا ہے اور تھکا ماندہ اپنے گھر پہنچتا ہے، پھر جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے تو گہری اور میٹھی نیند اس کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، چند گھنٹے سونے کے بعد جب وہ بیدار ہوتا ہے تو تھکن کے سارے اثرات ختم ہو جاتے ہیں اور ایک نئی توانائی کے ساتھ پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہے، اگر عمدہ سے عمدہ غذا بھی اسے کھلائی جاتی اور اچھے سے اچھے مناظر بھی اسے دکھائے جاتے تو وہ ایسی فرحت و مسرت حاصل نہیں کر پاتا، جو چند گھنٹے کی نیند سے حاصل ہوتی ہے، پھر اس کائنات میں ہرے بھرے درخت، خوش رنگ و خوشبودار غنچے و گل، ندیوں اور چشموں کا صاف و شفاف پانی، سمندر کی لہریں، باد صبا کی اکھیلیاں، روشن صبحیں اور سانولی شاہیں، یہ ساری چیزیں جہاں انسان کی مختلف ضروریات کو پوری کرتی ہیں، وہیں اس کے لئے تفریح طبع کا سامان بھی ہیں؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ تفریح انسانی فطرت ہے اور خود قدرت نے انسان کے لئے تفریح کے وسائل فراہم کئے ہیں۔

لیکن قدرت نے اپنے دست فیاض سے انسان کو عقل و شعور کی جو دولت عطا کی ہے، اس کے تحت یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ تفریح کے قدرتی وسائل پر اکتفا کر لے؛ اس لئے انسان نے اس کے لئے مصنوعی وسائل بھی پیدا کر لئے ہیں، ان مصنوعی وسائل میں کچھ جائز ہیں اور کچھ ناجائز، کچھ وہ ہیں جو شریعت کے مزاج کے مطابق ہیں اور کچھ وہ ہیں جو شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ صنعتی ترقی کے بعد انسان غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور سا ہو گیا ہے، معیار زندگی کی مسابقت میں شکست نہ کھانے کا جذبہ کچھ ایسا مسلط ہے کہ صبح دم بیدار ہونے سے لے کر رات کو بستر پر دراز ہونے تک مشین کی طرح کام کرنا پڑتا ہے؛ اس لئے بمقابلہ پہلے کے اس دور میں تفریحات ایک طرح کی ضرورت بن گئی ہیں، مشینی ترقی، مواصلات کی سہولت، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ تشہیر اور حکومتوں کی طرف سے سیاحتی اور تفریحی شعبوں کی سرپرستی اور ایک وسیلہ آمدنی کی حیثیت سے اس کو فروغ دینے کی کوشش، ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے تفریحات کو بے حد فروغ حاصل ہوا ہے۔

پھر یہ کہ اس دور میں تفریحات میں بہت تنوع بھی پیدا ہوا ہے، سیر و سیاحت، کھیل کود، لطیفہ و مذاق، ڈرامہ، کہانی نویسی، کارٹون سازی اور نہ معلوم کتنے طریقے ہیں، جو آج تفریحی مقصد کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، ان مختلف صورتوں کے لئے ظاہر ہے کہ شرعاً ایک ہی حکم نہیں ہو سکتا، اس پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے بیسویں فقہی سیمینار منعقدہ رامپور کے لئے، تفریحات کے وسائل اور ان سے متعلق شرعی احکام و ضوابط کا موضوع بھی رکھا تھا، غالباً کسی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پہلی بار سیمینار کے لئے یہ عنوان متعین کیا گیا تھا، بحمد اللہ اس سیمینار میں ۲۹ مقالات پیش ہوئے اور بڑی مفید، مدلل اور تفصیلی تحریریں فاضل مقالہ نگاروں نے لکھیں۔

اکیڈمی کے فقہی سیمیناروں کے معمول کے مطابق مقالات کی تلخیص شرکاء میں تقسیم کی گئی، عرض مسئلہ عارضین کی طرف سے پیش کیا گیا، بھرپور مناقشہ ہوا اور کافی غور و خوض کے بعد تجویزیں منظور کی گئیں، جن میں شریعت کے مقاصد و مصالح اور انسانی فطرت و طبیعت دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ان ہی مقالات، عرض مسئلہ، تلخیص، سیمینار کے لئے جاری ہونے والے سوالنامہ، سیمینار کے دوران ہونے والے مناقشات اور فیصلہ کا مجموعہ قارئین کے سامنے پیش ہے، اکیڈمی کے رفیق شعبہ علمی عزیز ی مفتی محمد سراج الدین سلمہ نے بہتر طریقہ پر اسے مرتب کیا ہے، امید ہے کہ اکیڈمی کے دوسرے مجلات کی طرح اسے بھی اہل علم کی بارگاہ میں قبولیت حاصل ہوگی، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی علمی اور فقہی خدمات کو ثبات و دوام عطا فرمائیں اور امت کے لئے صواب و سداد کی رہنمائی کا ذریعہ بنائیں۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری)

۱۴ محرم ۱۴۳۳ھ ۱۰ دسمبر ۲۰۱۱ء

☆☆☆



## پہلا باب تمہیدی امور

سوالنامہ:

### تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کام کی بے پناہ صلاحیت اور جدوجہد کا جذبہ رکھا ہے، انسان جو کچھ سعی و کوشش کرتا ہے، اس میں مختلف اعضاء کا استعمال ہوتا ہے، خاص کر انسان کا دماغ ہر عمل کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے، اس لئے جسم کے دیگر اعضاء کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے اور خاص کر دماغ کو بھی، جسم کے دوسرے اعضاء کو راحت پہنچانے کے مختلف ذریعے ہیں، مجملہ ان کے نیند بھی ہے؛ لیکن دماغ ہر وقت متحرک رہتا ہے، اگر وہ کام کرنا چھوڑ دے تو زندگی سے انسان کا رشتہ ٹوٹ جائے؛ اس لئے دماغ کی راحت اور اسے تناؤ سے بچانے کے لئے نفسیاتی طور پر پرسکون ماحول فراہم کرنا، فرحت کے اسباب مہیا کرنا نیز تناؤ سے خالی لمحات کی فراہمی ضروری ہوتی ہے؛ اسی لئے اس مشینی دور میں - جس میں انسان قدم قدم پر ذہنی تناؤ سے دوچار ہوتا ہے، تفریح کی زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

چنانچہ موجودہ دور میں ”تفریح“، فکر و تحقیق کا مستقل موضوع بن گیا ہے، اسے نفسیاتی علاج کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اس کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جا رہے ہیں، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، جو انسان کی فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اس نے اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے تفریح کی اجازت دی ہے، قرآن مجید نے ”سید فی الأرض“ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض اوقات مزاح فرمایا کرتے تھے، آپ نے جسم کو صحت مند اور نشیط رکھنے والے بعض کھیلوں کی نہ صرف اجازت دی ہے؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے؛ لیکن اس کے لئے اسلام کچھ حدود متعین کرتا ہے مثلاً یہ کہ اس کا عمل دوسروں کو نقصان پہنچانے والا یا خود اس کے لئے مضرت رساں اور اخلاقی تقاضوں کے مغائر نہ ہو، اس پس منظر میں چند سوالات پیش خدمت ہیں، امید کہ تفصیل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں گے:

۱- تفریح کا ایک طریقہ مزاح اور لطیفہ گوئی ہے، مزاح نثر میں بھی ہوتا ہے اور نظم میں بھی، آج کل بعض پیشہ ور لطیفہ گو بھی ہوا کرتے ہیں، اور مزاح کے لئے مستقل مجلس یا مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد کیا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف- کیا شریعت میں مزاح جائز ہے، اور جائز ہے تو اس کی حدود کیا ہیں؟

ب- مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا کیا جائز ہوگا؟

ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انھیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے کیسا عمل ہے؟

د- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟

ه- تفریح طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام بھی منعقد کئے جاتے ہیں، جن کا مقصد ہنسا ہنسانا ہوتا ہے، کیا اس طرح کے ڈرامے

لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا درست ہے؟

۱- موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہنسنا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے بہت معاون فعل ہے؛ اس لئے خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں، جس میں بہت سے لوگ بہ تکلف تہقہ لگاتے ہیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں، اس عمل کا شرعی حکم کیا ہے؟

۲- تفریحی مقصد کے لئے مختلف قسم کے کھیل بھی مروج ہیں، جن میں بعض کھیل گھنٹہ دو گھنٹہ کے ہوتے ہیں، اور بعض کھیل زیادہ وقت لیتے ہیں، بعض ایسے کھیل بھی ہوتے ہیں، جو انسان کی جان کے لئے خطرناک ہوتے ہیں، جیسے: باکسنگ، بعض کھیلوں میں جانوروں کو سخت تکلیف پہنچتی ہے، جیسے جانوروں کا باہمی مقابلہ، موجودہ زمانے میں کھیل نے مستقل فن کی صورت اختیار کر لی ہے، سرکاری سطح پر اس کی مستقل وزارت ہوتی ہے اور خاصا بجٹ اس مقصد کے لئے منظور کیا جاتا ہے، اس پس منظر میں واضح کیا جائے کہ:

الف- کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے کیا اصول ہیں؟

ب- لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

ج- شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے کن کو جائز، کن کو ناجائز، کن کو مکروہ اور کن کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے؟

د- کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو کون سی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہوگی؟

ھ- جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو؛ لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی دت ضائع ہوتا ہو تو ان کا کیا حکم ہوگا؟

و- کھیل دیکھنے نیز اس کے لئے ٹکٹ خریدنے کا کیا حکم ہوگا، کیا اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات بھی ہیں؟

۳- موجودہ دور میں سیاحت ایک مستقل صنعت بن چکی ہے، بلکہ بعض ممالک کی آمدنی کے لئے سیاحت بنیادی وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے؛ اس لئے موجودہ دور میں سیاحت کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اس تناظر میں حسب ذیل امور دریافت طلب ہیں:

الف- تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے یا نہیں، جبکہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ بھی ہوتا ہے؟

ب- کیا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا درست ہے؛ جبکہ بعض علاقوں کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے نقطہ نظر سے پُر خطر ہوتا ہے؟

ج- جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیائے خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کا کیا حکم ہے؟

د- آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم ہیں، جو آمد و رفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرتے ہیں۔ سفر کرنے والے حضرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو سیاحتی مقامات پر داد عیش دینے کے لئے جاتے

ہیں، نیز شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، بعض کا مقصد مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کرنا ہوتا ہے، کیا اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے؟

۴- تفریحی مقاصد کے لئے جن وسائل کا استعمال کیا جاتا ہے، ان میں فلمیں بھی ہیں، فلموں سے فوراً ذہن ان فلموں کی طرف جاتا ہے جو آج کل سینما ہالوں میں دکھائی جاتی ہیں، ان کا ناجائز اور حرام ہونا ظاہر ہے، کیونکہ یہ فحشاء و منکرات کو پھیلانے کا ذریعہ ہیں، لیکن فلم اصل میں تصویر کشی یا ٹیکس بندی کا نام ہے، اور ان کا استعمال مخرّب اخلاق مقاصد کے علاوہ کے لئے بھی ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، چنانچہ دستاویزی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں، اسی طرح تاریخی فلمیں بھی ہوتی ہیں، تعلیمی مقاصد کے لئے بھی فلمیں بنائی جاتی ہیں، مثال کے طور پر قرآن میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، اگر متعلقہ آیات کو پڑھتے ہوئے ان مقامات کو طلبہ اسکرین پر دیکھیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے ان کے اندر اس مضمون کا زیادہ ادراک پیدا ہو سکتا ہے، اس پس منظر میں اس امر کی وضاحت فرمائیں کہ کیا مذکورہ مقاصد کے لئے فلمیں بنائی جاسکتی ہیں، نیز تعلیمی مقاصد کے لئے ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اگر کیا جاسکتا ہے تو اس کے لئے کیا شرائط ہوں گی؟

۵- موجودہ دور میں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں، کارٹون کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس کی طرف ہے، لیکن انسانی صورت کے خدوخال اس میں پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، کارٹون میں ایک پہلو تفریح اور مزاح کا بھی ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف: کیا کارٹون بنانا جائز ہے، یا اس کا بھی تصویر میں شمار ہوگا؟

ب: کارٹون بنانا اس وقت ایک نفع بخش ذریعہ آمدنی بھی ہے، تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

۶- جیسے کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور فرضی حکایتیں مرتب کی جاتی ہیں، اسی طرح ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ ڈراما بھی ہے، جس میں مختلف افراد بطور کردار کے شامل ہوتے ہیں اور وہ متعین جملوں کو ادا کرتے ہیں، آج کل دینی مدارس کے پروگراموں میں بھی مکالمات کی صورت مردج ہو گئی ہے، یہ بھی اس میں شامل ہے، ڈرامہ غیر اخلاقی مقاصد کے لئے بھی کیا جاسکتا ہے اور بہتر مقاصد کے لئے بھی، لیکن اس میں جو کچھ کہا جاتا ہے یا ڈرامہ میں شامل مختلف لوگوں کے درمیان جو رشتے ظاہر کئے جاتے ہیں وہ عام طور پر فرضی ہوتے ہیں؛ البتہ سامعین کو اس سے دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ بھی اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں؟



## اکیڈمی کا فیصلہ

### تفریح و سیاحت اور شرعی احکام و ضوابط

(۱) مزاج:

- الف- مزاج جائز ہے، بشرطیکہ وہ جھوٹ، فحش نیز استہزاء و ایذا رسانی پر مشتمل نہ ہو۔  
 ب- ایسے مزاجیہ پروگرام یا مزاجیہ مشاعرے --- جن سے دینی یا دنیوی مصالح متاثر ہوں --- جائز نہیں ہیں۔  
 ج- لطیفہ گوئی یا مزاج نویسی کو ذریعہ معاش بنا لینا مناسب نہیں ہے۔  
 د- ایسے پروگرام جن کا مقصد صرف ہنسا ہنسانا ہو، شریعت کے مزاج کے خلاف ہیں؛ البتہ بہ غرض علاج اس کی گنجائش ہے۔
- (۲) کھیل کود:

- الف- ایسے کھیل جو انسان کے وسیع تر مفاد میں ہوں، جن سے جسمانی قوت حاصل ہوتی ہو، چستی و نشاط کی بحالی میں مدد ملتی ہو، جائز ہیں؛ بشرطیکہ وہ منکرات سے خالی ہوں، نیز دینی یا دنیوی حقوق و فرائض سے غفلت یا کسی بھی جاندار کی اذیت کا باعث نہ ہوں۔  
 ب- عام حالات میں شریعت نے مرد و عورت کی ستر پوشی کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں، کھلاڑیوں کے لئے بھی ان کی پابندی ضروری ہے۔  
 ج- جن کھیلوں کے بارے میں احادیث میں ترغیب آئی ہے وہ مستحب ہیں، ان کے علاوہ مروجہ کھیلوں میں جو مذکورہ بالا اصول کے مطابق ہوں، وہ جائز ہیں۔  
 د- کھیل کی ہارجیت میں پیسے کی شرط اگر ایک طرف ہو یا کسی تیسرے فریق کی جانب سے ہو تو جائز ہے اور اگر جانین سے شرط ہو تو ناجائز ہے۔  
 ہ- وقت انسانی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے؛ لہذا از روئے شرع کوئی بھی ایسا کھیل کراہت سے خالی نہیں، جو اپنے طریقے اور کھلاڑیوں کے لباس کے اعتبار سے تو محرمات پر مشتمل نہ ہو؛ لیکن اس میں کھیلنے یا دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو۔  
 و- جو کھیل جائز ہیں، انہیں دیکھنے کی اور ان کے لئے ٹکٹ خریدنے کی بھی گنجائش ہے۔  
 ز- جو لوگ کھیل میں شریک نہیں ہیں؛ لیکن کسی فریق یا فرد کے جیتنے پر آپس میں پیسوں کی بازی لگائیں تو یہ بھی قمار میں داخل ہے اور حرام ہے۔  
 ح- کھیل کی وقتی تفریح کی حد تک تو گنجائش ہے؛ مگر اس کو زندگی کا مقصد بنا لینا جائز نہیں ہے، نیز تعلیم اور کسب معاش کی جائز سرگرمیوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو کھیل کے لئے وقف کر دینا، مناسب نہیں ہے۔  
 ط- سیمینار حکومت ہند سے اپیل کرتا ہے کہ وہ کھیل کو کو اتنی اہمیت نہ دے کہ نوجوانوں کی بہترین اختراعی صلاحیت ملک کی تعمیر و ترقی کے بجائے کھیل کود میں صرف ہونے لگیں، نیز خاص کرا امتحانات کی تیاری کے زمانہ میں کھیل کے پروگرام رکھنے سے احتراز کیا جائے؛

تاکہ طلبہ کی تعلیم متاثر نہ ہو اور مقابلہ کے دوران یہ کو بھی زیادہ سے زیادہ مختصر رکھا جائے؛ تاکہ یہ شائقین کے ضیاع وقت کا سبب نہ بنے۔

### (۳) سیاحت:

- الف- اسراف سے بچتے ہوئے تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے۔  
 ب- ایسے مقامات جہاں جان یا عزت و آبرو کا تحفظ خطرے میں ہو، وہاں نہ خود جانا درست ہے اور نہ اہل و عیال کو ساتھ لے جانا درست ہے۔  
 ج- محض تفریح کے لئے ایسی جگہوں میں جانا جہاں غیر شرعی امور کا غلبہ ہو، جائز نہیں ہے؛ البتہ ایسے مقامات پر جانے والوں کو سواری کرائے پر دینے یا اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کی گنجائش ہے۔  
 د- جائز مقاصد کے لئے ٹراویس کمپنیوں کا قیام درست ہے۔

۵- سیاحت کا تعلق مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کو مضبوط کرنے، اپنے گزرے ہوئے لوگوں کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور مذہبی و قومی تاریخ سے روشناس کرانے سے ہے؛ اس لئے جو مسلمان اس پیشہ سے جڑے ہوئے ہیں، ان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اسلامی نقطہ نظر سے ان مقاصد کو پورا کرنے والے پیکیج تیار کریں؛ تاکہ مسلمان نوجوانوں کو بے راہ روی اور احساس کمتری سے بچایا جاسکے اور غیر مسلم بھائیوں کے سامنے بھی مسلمانوں کی صحیح تصویر آسکے۔

### (۴) عکس بندی، کارٹون اور تمثیلی ڈراما:

- ۱- غیر ذی روح اشیاء مثلاً تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کی عکس بندی جائز ہے۔
- ۲- تفریحی مقاصد کے لئے ذی روح کی عکس بندی جائز نہیں ہے۔
- ۳- تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی مقاصد کے لئے عکس بندی اور اس سے استفادہ کی گنجائش ہے، خواہ اس میں ضمنی ذی روح کا عکس آ گیا ہو۔
- ۴- ایسی عکس بندی جن میں کسی عورت کی تصویر ہو یا انبیاء و صحابہ کی تمثیل ہو یا کوئی اور شرعی منکر ہو، بنانا اور ان کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔
- ۵- ایسے کارٹون..... جن میں خدوخال واضح ہوں..... تصویر میں شمار ہوں گے؛ اس لئے یہ ناجائز ہیں۔
- ۶- ایسے کارٹون بنانا جس سے کسی کی اہانت مقصود ہو جائز نہیں ہے، اگرچہ اس میں خدوخال واضح نہ ہوں۔
- ۷- ایسے کارٹون جو عریانی پر مشتمل ہوں یا برائی کی ترغیب دے رہے ہوں، وہ بھی جائز نہیں ہیں۔
- ۸- تربیتی مقصد سے بچوں کے لئے ایسے کارٹون بنانا جن میں خدوخال واضح نہ ہوں اور بچوں کے لئے نفسیاتی، اخلاقی اور لسانی نقطہ نظر سے مفید ہوں، جائز ہے
- ۹- کارٹون سازی کی جو شکلیں جائز ہیں، ان کو ذریعہ آمدنی بنانے اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنے کی گنجائش ہے۔
- ۱۰- اچھے کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے تمثیلی مکالمات اسٹیج کئے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان میں موسیقی، کردار کشی، مردوزن کا اختلاط یا انبیاء، ملائکہ اور صحابہ کی تمثیل نہ ہو، نیز غیر شرعی اور غیر اخلاقی امور سے پاک ہوں۔



## تلخیص مقالات

## تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

مفتی محمد سراج الدین قاسمی علیہ

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا بیسواں فقہی سمینار ہندوستان کے تاریخی شہر رامپور میں منعقد ہو رہا ہے، اس سمینار کے موضوعات میں سے ایک موضوع تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط سے متعلق ہے۔

اس موضوع سے متعلق جن حضرات کے مقالات موصول ہوئے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

[مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی حنیف صاحب، مفتی داؤد، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی اشرف عباس سعادت، مفتی طارق انور قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا محمد یوسف علی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مفتی رضوان الحسن، مولانا شوکت شاہ قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا ظفر الاسلام صاحب، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا رمضان علی، مولانا خالد نیوی، مولانا اسرار الحق سیلی، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۱- تفریح کا ایک طریقہ مزاح اور لطیفہ گوئی ہے، مزاح نشر میں بھی ہوتا ہے اور نظم میں بھی آج کل بعض پیشہ ور لطیفہ گو بھی ہوا کرتے ہیں اور مزاح کے لئے مستقل مجلس یا مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد کیا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف:- کیا شریعت میں مزاح جائز ہے اور جائز ہے تو اس کے حدود کیا ہیں؟

اس سلسلہ میں عموماً مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ فی نفسہ مزاح جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع امور نہ پائے جائیں، مقالہ نگاروں نے مزاح کے جواز پر متعدد روایات سے استدلال کیا ہے، نیز ان شرائط کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے جو کہ مزاح کے جائز ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ مقالہ نگاروں کی جانب سے پیش کئے گئے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حضرت عائشہ سے روایت ہے: ”أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَمْزَحُ وَيَقُولُ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْخُذُ الْمَزَاحَ الصَّادِقَ فِي مَزَاحِهِ“ (کنز العمال ۲، رقم الحدیث: ۲۲۶) [مفتی اشرف عباس]۔

۲- حضرت انس سے روایت ہے کہ میرے چھوٹے بھائی گوریے سے کھیل رہے تھے، وہ گوریا مر گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”يا أبا عمير ما فعل النخیر“ (بخاری باب الانبساط إلى الناس حدیث: ۶۱۲۹، ترمذی ۱۹۸۹) (اے ابوعمیر تمہارے گوریے کو کیا ہوا)۔ [ذیکھئے مقالہ: مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مفتی لطیف الرحمن، ولایت علی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی رضوان الحسن]۔

۳- حضرت انس سے روایت ہے: ”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ أَفْكَه النَّاسِ مَعَ نِسَائِهِ“ (قاموس الفقہ ۵، ۸۲) [مفتی لطیف الرحمن]۔

۴- ایک صاحب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے سواری عنایت فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اونٹنی کا بچہ دے سکتا ہوں، سائل پریشان ہوئے کہنے لگے: میں اونٹنی کا بچہ لیکر کیا کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے: ”إِنَّ رَجُلًا أُنِيَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَحْمَلْنِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنْ حَامَلْتُكَ عَلِيٌّ وَلَدٌ نَاقَةٌ، قَالَ: مَا أَصْنَعُ بَوْلِدَ النَّاقَةِ؟“ فقال:

۱۔ رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

”وہل تلد الإبل إلا النوق“ (ابوداؤد باب ماجاء فی المزاح ۳۹۹۸، ترمذی ۱۹۹۱)۔

[مولانا محمد حسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی ممتاز احمد خاں ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی رضوان الحسن، مولانا شوکت شائقی]۔

۵- ایک بوڑھی خاتون حضور پاک ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور آپ سے دعا کی درخواست کی، آپ نے جواب فرمایا: جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہیں ہوگی، بوڑھی خاتون رو پڑی تو آپ نے ارشاد فرمایا: جنت میں عورت بوڑھا پے کی حالت میں نہیں جائے گی۔

”أنت عجوز النبی ﷺ فقالت: یا رسول اللہ! ادع اللہ أن یدخلنی الجنة فقال: یا أم فلات! إن الجنة لا یدخلها عجوز قال: فقلت تبکی، قال: أخبروها أنها لا تدخلها وهي عجوز، أما تقرئین من القرآن: إنا أنشأناهن إنشائً فجعلناهن أبکاراً“ (مشکوٰۃ: ۲۱۶، شمائل ترمذی بشرح تحفة الأحوذی ۱۰، ۳۶۳)۔

[مولانا محمد حسن عبدالحق ندوی، مفتی محمد حنیف، مفتی ممتاز ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی محمد عارف باللہ، مولانا شوکت شائقی]۔

۶- آپ ﷺ اپنے خادم خاص حضرت انس سے بھی مزاح فرمایا کرتے، چنانچہ فرماتے: اے دوکان والے۔

”عن أنس أن النبی ﷺ قال له: یا ذا الأذنین! قال أبو أسامة: یعنی مازحه“ (مشکوٰۃ: ۲۱۶)۔

[مفتی محمد حنیف، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی رضوان الحسن، مولانا شوکت شائقی]۔

۷- حضرت ام ایمن اپنے شوہر کے لئے کسی چیز کا سوال کرنے کی غرض سے دربار رسالت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے اس سے فرمایا: تمہارا شوہر کون ہے؟ اس نے جواب دیا: فلاں، آپ نے فرمایا: اچھا وہ جس کی آنکھ میں سفیدی ہے، تو وہ کہنے لگی ان کی آنکھوں میں سفیدی نہیں ہے، آپ نے فرمایا: کیوں نہیں ان کی آنکھ میں سفیدی ہے، جب وہ خاتون گھروٹی تو اپنے شوہر کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی تو شوہر نے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے بتلایا کہ حضور ﷺ نے مجھے خبر دی ہے کہ آپ کی آنکھ میں سفیدی ہے تو شوہر نے کہا: کیا تو دیکھتی نہیں کہ میری آنکھوں کی سفیدی ان کی سیاہی سے زیادہ ہے۔ (البرکات فی المزاح لأبی البرکات ص: ۱۳، قضا یا اللہ والترفیہ ۱۱۰)، [مفتی محمد جعفر علی رحمانی]۔

۸- اسی طرح حضرت زاہر سے رسول اللہ ﷺ مزاح فرمایا کرتے تھے، چنانچہ حضرت انس سے روایت ہے؟ ”أن رجلاً من أهل البادية كان اسمه زاهراً كان يهدى للنبي ﷺ الهدية من البادية فيجهره رسول الله ﷺ إذا أراد أن يخرج، فقال للنبي ﷺ: إن زاهراً باديتنا ونحن حاضروه، وكان النبي ﷺ يحبه وكان رجلاً دميماً فأتاه النبي ﷺ يوماً وهو يبيع متاعه فاحتضنه من خلفه وهو لا يبصره، فقال الرجل: أرسلني من هذا؟ فالتفت فعرف النبي ﷺ فجعل لا يالو ما ألصق ظهره بصدر النبي ﷺ حين عرفه، وجعل النبي ﷺ يقول: من يشتري العبد، فقال: يا رسول الله! إذا والله تجدني كاسدا فقال النبي ﷺ: لكن عند الله لست بكاسد“ (مسند احمد ابن حنبل: ۱۲۱۸۷، السنن الكبرى للبيهقي باب المزاح ۲۱۷۰۳)، [مولانا شوکت شائقی]۔

۹- غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت عوف بن مالک اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ چمڑے کے خیمہ میں تشریف فرما تھے، حضرت عوف کہتے ہیں کہ میں نے سلام کیا آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آ جاؤ میں نے کہا کیا پورا آ جاؤں؟ آپ نے فرمایا: ہاں پورے آ جاؤ۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: ”عن عوف ابن مالك الأشجعي قال: أتيت النبي ﷺ في غزوه تبوك وهو في قبي من أدم فسلمت فرد قال: أدخل فقلت: أكلی؟ قال: كلك فدخلت“ (ابوداؤد باب فی المزاح ۳۰۶۸۲)، [مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا شوکت شائقی]۔

جس طرح حضور ﷺ صحابہ سے مزاح فرمایا کرتے صحابہ کرام بھی آپ سے مزاح کر لیا کرتے تھے چنانچہ لعات السخّیہ میں ہے: کما كان رسول الله ﷺ يمازح الصحابة كذلك كانوا يمازحونه (حاشیہ مشکوٰۃ ۳۱۷)، [مفتی اشرف عباس]۔

چنانچہ حضرت نعمان بن عمرو انصاری اور سہب بن جرمہ رسول اللہ ﷺ سے مزاح کیا کرتے تھے (سنن ابن ماجہ: ۳۷۱۹)، [مفتی عارف باللہ]۔

صحابہ کرام بھی آپس میں مزاح کیا کرتے تھے۔ عن قتادة قال: سئل ابن عمر هل كان أصحابه رسول الله ﷺ

یضحکون؟ قال: نعم. والإيمان في قلوبهم أعظم من الجبل (مراقبة باب الضحك)، [مفتی اقبال احمد قاسمی، مفتی محمد حنیف]۔

چنانچہ حضرت نافع فرماتے ہیں: عبد اللہ بن عمر اپنی آزاد کردہ باندی سے فرمایا کرتے تھے: "خلقتی خالق الكرام وخلقك خالق اللئام" مجھے شریفوں کے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے اور تجھے کمینوں کے پیدا کرنے والے نے، تو وہ خاتون غصہ ہوتی، اور رویا کرتی تھی، تو حضرت ابن عمر فرماتے: دونوں کا خالق تو اللہ ہی ہے (المزاح فی المزاح: ۳۱، قضایا اللہ والہو والترغیہ: ۱۹۳) [مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی محمد عارف باللہ]۔

الفتاویٰ الہندیہ میں ہے: "ولا باس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الانسان فيه بكلام ياتر به أو يقصد به إضحاك جلسائه" (۳۵۲/۵)، [مفتی محمد حنیف، مولانا محمد مغفور باندوی]۔

بعض روایات میں ہنسنے اور ہنسانے اور مزاح سے ممانعت بھی آئی ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا تمار أخاك ولا تمارحه" [مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا احسن عبدالحق، مفتی محمد حنیف، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد یوسف علی]۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا تكثر من الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب (ترمذی، کتاب الزهد) [مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد یوسف علی، مولانا عارف باللہ]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حضرات صحابہ کو زور سے ہنسنے دیکھا تو فرمایا:

"أكثروا ذكر هازم اللذات يعني الموت" (ترمذی باب ماجاء في ذكر الموت)، [مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد یوسف علی]۔

ان روایتوں کے درمیان شارحین حدیث نے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ابن حجر فرماتے ہیں: "أن المنهى عنه مافيه إفراط أو مداومة عليه لما فيه من الشغل عن ذكر الله والتفكير في مهمات الدين ويثول كثيرا إلى قسوة القلب والإيذاء والحقد وسقوط المهابة والوقار والذي يسلم من ذلك فهو مباح" (فتح الباری ۱۰، ۶۱۲) [مولانا احسن عبدالحق، مفتی ممتاز خان ندوی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی لطیف الرحمن]۔

ملا علی قاری امام ندوی سے مزاح کے سلسلہ میں نقل فرماتے ہیں:

"إعلم أن المزاح المنهى عنه هو الذي فيه إفراط ويدهاوم عليه، فإنه يورث الضحك وقسوة القلب ويشغل عن ذكر الله والفكر في مهمات الدين ويؤول في كثير من الأوقات إلى الإيذاء ويورث الأحقاد، ويسقط المهابة والوقار، فأما من سلم من هذه الأمور فهو المباح الذي كان رسول الله ﷺ يفعل على الندرة لمصلحة تطيب نفس المخاطب وموانسته وهو سنة مستحبة" (مراقبة المفاتيح ۸، ۶۱۲، باب المزاح)، [مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا شوکت ثنائی، مفتی اشرف عباس، مولانا محمد یوسف علی]۔

مذکورہ روایات و آثار سے یہ مسئلہ تو واضح ہو گیا کہ شریعت مطہرہ آپس میں تفریح طبع کے لئے مزاح کرنے کی اجازت دیتی ہے، البتہ کیا مطلقاً مزاح جائز ہے، یا اس کے جواز کے لئے شرائط و قیودات بھی ہیں؟ تو اس سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات نے لکھا ہے کہ مطلقاً مزاح جائز نہیں ہے بلکہ اس کے جواز کے لئے کچھ شرطیں ہیں جن کا ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے، ذیل میں وہ شرائط ذکر کئے جا رہے ہیں جن کو مقالہ نگاروں نے تحریر کیا ہے:

شرائط:

۱- مزاح سچ پر مبنی ہو، جھوٹ کی آمیزش نہ ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ہم لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یا رسول اللہ انک تداعبنا؟ قال إني لا أقول إلا حقا" (ترمذی باب ماجاء في المزاح)، [مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مولانا شوکت ثنائی، مفتی حنیف، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا محمد یوسف علی]۔

نیز حضرت بہز بن حکیم اپنے دادا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہلاکت ہو اس شخص کے لئے جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ



بولے۔ عن بهز بن حکیم قال حدثني أبي عن أبيه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: ويل للذي يحدث فيكذب ليضحك القوم ويل له ويل له (ابوداؤد باب في التشديد في الكذب: ۴۲۳۸) [مولانا محمد شوکت ثاقاکی، مولانا محمد یوسف علی]۔  
۲- دوسرے کے لئے باعث تکلیف اور وجہ اذیت نہ ہو۔

[مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد احسن عبدالحق، مفتی محمد حنیف، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد یوسف علی]۔

۳- مزاح میں افراط اور مداومت نہ ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”لا تکثر من الضحک فان کثرة الضحک تمیت القلب“ (ترمذی کتاب الزبد) [مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد یوسف علی، مولانا عارف باللہ، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد احسن عبدالحق، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد یوسف علی]۔

۴- حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: مزاح میں افراط یا مداومت ناجائز ہے اور اگر یہ بات نہ ہو تو مباح ہے اور اگر کسی کی دلداری اور اس کو مانوس کرنا مقصود ہو یا شریعت میں معتبر مصلحت پیش نظر ہو تو مستحب ہے، ”فان صادف مصلحة مثل تطيب نفس المخاطب وموانسته فهو مستحب“ (فتح الباری ۱۰، ۶۱۳)، [مقالہ: مولانا محمد احسن عبدالحق، مفتی رضوان الحسن]۔

۴- کسی کو ڈرانا مقصود نہ ہو:

حضرت عبدالرحمن بن ابی یعلیٰ فرماتے ہیں: لا یحل لمسلم أن یروع مسلماً (ابوداؤد باب من یاخذ الشيء علی المزاح)، (مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا شوکت ثاقاکی)۔

۵- مزاح و مذاق کے لئے جگہ اور وقت کی رعایت کی جائے:

اختیار الوقت والمكان المناسبین: هناك أوقات وأماكن لا يجوز فيها الضحك والمزاح واللغو مثل: أوقات الصلاة، وعند زیارة القبر وعند ذکر الموت وعند قراءة القرآن وعند لقاء الأعداء وفي أماكن العلم،<sup>۴</sup> (موسوعة الأسرة المسلمة ۱۳، ۲۲۵) [مولانا شوکت ثاقاکی]۔

۶- مزاح کا تعلق شریعت، شعائر اسلامی اور مقدس شخصیات انبیاء و رسل اور فرشتوں سے نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولئن سئلتهم ليقولن إنما نخوض ونلعب قل أبا الله وآياته ورسوله كنتم تستهزئون (سورہ توبہ: ۶۵)، [مولانا شوکت ثاقاکی]۔

ب- مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا کیا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تفریح طبع کے لئے مزاحیہ یا تفریحی مشاعرہ منعقد کرنا جائز ہے، بشرطیکہ شرعی اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے۔

ان حضرات نے درج ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

۱- عن عائشة رضی اللہ عنہا أن أبا بكر دخل عليها والنبي ﷺ يوم فطر أو أضحى وعندما قينتان تخنيان بما تقاولت الأنصار يوم بعث، فقال أبو بكر: مزمار الشيطان مرتين، فقال النبي ﷺ: دعهما يا أبا بكر إن لكل قوم عيد وإن عيدنا هذا اليوم (بخاری: ۳۲۳۸)، [مفتی عارف باللہ]۔

مولانا عبید اللہ ندوی لکھتے ہیں: شعر فی نفسہ ایک ذریعہ اظہار ہے اگر صحیح مقاصد کا اظہار پیش نظر ہو تو عین بہتر ہے اور اگر غلط افکار کی نمائندگی کی جائے تو مذموم ہے، حضور سے بھی اشعار سننا ثابت ہے، چنانچہ حضرت شریک فرماتے ہیں:

۲- ردفت رسول الله ﷺ يوماً، فقال: هل معك من شعر أمية بن أبي الصلت شيء؟ قلت: نعم، قال: هيه فأنشدته بيتاً فقال: هيه، ثم أنشدته بيتاً فقال: هيه حتى أنشدته مائة بيت (مسلم کتاب الشعر) [مولانا عبید اللہ ندوی]۔

- ۳۔ عن جابر بن سمرة قال: جالست النبي ﷺ أكثر من مائة مرة فكان أصحابه يتناشدون الشعر ويتذاكرون أشياء من أمر الجاهلية وهو ساكت فربما تبسم معهم (ترمذی: باب ما جاء في انشاد الشعر) [مولانا شوکت ثنائی، مفتی عارف باللہ]۔
- ۴۔ نیز غزوہ خندق کے موقع سے خود حضور کا بھی اشعار کا پڑھنا ثابت ہے، واللہ لولا اللہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا (بخاری کتاب المغازی)۔
- ۵۔ اسی طرح حضرت عامر بن الاکوع سے بھی جنگ خیبر کے موقع سے اشعار کا پڑھنا ثابت ہے، اور آپ نے ان کے اشعار کو سنا تو فرمایا: "رحمہ اللہ" (بخاری کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر)، [مولانا عبید اللہ ندوی]۔

بعض مقال نگاروں نے مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد کے جواز کے سلسلہ میں ان واقعات کو بھی ذکر کیا ہے جن کو صحابہ کرام تفریح و طبع کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کبھی کبھار ذکر کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولانا شوکت ثنائی، ملا علی قاری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں صحابہ زمانہ جاہلیت کی بعض باتوں کا تذکرہ کر رہے تھے، ایک صحابی نے عرض کیا کہ میں نے دو لومڑیوں کو دیکھا کہ وہ دونوں آئے اور بت کے سر پر بیٹھ کر پیشاب کرنے لگے، تو میں نے کہا کہ پروردگار کے سر پر لومڑی پیشاب کر رہے ہیں؟ پھر میں نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا، صحابہ اس بات پر ہنسنے لگے اور آپ بھی ہنس پڑے (مرقاۃ المفاتیح باب الشحک)۔

نیز حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال پہلے بغرض تجارت بصرہ گئے، ساتھ میں نعیمان و سوبیط بن حرمہ تھے، نعیمان کے پاس زادراہ تھا، حضرت سوبیط نے زادراہ کا مطالبہ کیا تو نعیمان نے کہا: جب تک حضرت ابو بکر نہ آجائیں، نہیں دوں گا، تو انہوں نے کہا: میں تجھے سخت غصے میں ڈال دوں گا، پھر وہ لوگ ایک قوم کے پاس سے گزر رہے تھے کہ حضرت سوبیط نے ان لوگوں سے کہا کہ ایک غلام خریدو گے؟ وہ لوگ رضامند ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ میرا غلام باتونی ہے وہ اپنے آپ کو آزاد ظاہر کرے گا، لیکن تم لوگ اس کی اس بات پر اعتماد مت کرنا ان لوگوں نے دس اونٹ کے بدلے حضرت نعیمان کو خرید لیا اور ان کی گردن میں رسی ڈالنے لگے تو انہوں نے کہا کہ میں تو آزاد ہوں، میرا ساسھی تم سے مذاق کر رہا ہے، لیکن ان لوگوں نے کوئی بات نہ سنی اور ان کو لیکر چلے گئے جب حضرت ابو بکر تشریف لائے تو حضرت سوبیط نے سارا واقعہ سنایا، تو حضرت ابو بکر ان لوگوں کے پاس جا کر دس اونٹ واپس کیا اور حضرت نعیمان کو آزاد کر لائے؛ جب یہ لوگ سفر سے واپس مدینہ آئے اور اس واقعہ کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ایک سال تک اس واقعہ کو یاد کر کے ہنسا کرتے تھے (ابن ماجہ باب المزاح: ۳۷۰۹)، [مولانا شوکت ثنائی]۔

البتہ مقالہ نگاروں نے اس کے جواز کے لئے یہ شرطیں لگائی ہیں کہ اس کی وجہ سے فرائض و واجبات وغیرہ میں خلل نہ ہو، اسی طرح عریانیت و بے پردگی اور مردوزن کے اختلاط سے پاک ہو اور کوئی شرعی مفسدہ نہ ہو [مفتی عارف باللہ، مولانا اقبال احمد قاسمی]۔

جبکہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کے مشاعرے کا انعقاد مکروہ ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک ناجائز ہے۔ مفتی ممتاز احمد ندوی لکھتے ہیں: مزاحیہ پروگرام یا مزاحیہ مشاعروں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے، لہذا اس طرح کے پروگرام مکروہ ہیں۔

مفتی اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: فقہاء کرام نے شطرنج اور چوسر کھیلنے کو مکروہ لکھا ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے: یکرہ اللعب بالشطرنج والنرد (ہندیہ: ۴۱۱)۔ مذکورہ کھیلوں کی کراہت کی دو علتیں ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ یہ غیر مفید کھیل ہیں، دوسرے یہ کہ ان میں وقت کا ضیاع ہے۔

نیز مزاحیہ مشاعرہ عموماً رات میں ہوتا ہے اور دیر رات تک ہوتا ہے، جس سے نماز فجر کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے [مفتی مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا ممتاز احمد قاسمی]۔

مولانا جعفر علی رحمانی لکھتے ہیں: کئی گھنٹوں کے لئے مزاحیہ پروگرام یا مشاعرہ کو منعقد کرنا درست نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس طرح کے لمبے اور طویل مزاحیہ پروگرام کی وجہ سے انسان اپنے بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں سے غافل بھی ہو جاتا ہے، جبکہ اسلام نے ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کرنے کا حکم نہ صرف حکم دیا ہے، بلکہ حقوق تلفی اور اس میں کوتاہی پر سخت وعید بیان فرمائی ہے۔

ویل للمطففين الذين إذا اكتالوا على الناس يستوفون (سورہ تطفیف: ۱-۲)۔

نیز حضور کا ارشاد ہے: فأعط كل ذي حق حقه (بخاری: ۱۰۲۳)، [نیز دیکھئے مقالہ مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی]۔

مفتی لطیف الرحمن صاحب لکھتے ہیں: مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا ناجائز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن العاس من يشترى لهو الحديث" (سورہ لقمان)۔

حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں: لہو کے لفظی معنی غفلت میں پڑنے کے ہیں جو چیزیں انسان کو ضروری کاموں سے غفلت میں ڈال دیں اور کہلاتی ہیں، اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی لہو کہا جاتا ہے، جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک لہو الحدیث عام ہے، تمام ان چیزوں کے لئے جو انسان کو اللہ کی عبادت سے غفلت میں ڈال دے، اس میں غنا و مزامیر بھی داخل ہیں اور یہودہ قصے و کہانیاں بھی (۲۰۷)۔

مولانا اقبال قاسمی لکھتے ہیں: مرد و مزاحیہ مشاعرے، یا دیگر مزاحیہ محفلیں مندرجہ ذیل مفاسد کی وجہ سے درست نہیں:

۱۔ ہنسی مذاق ہی مقصود ہوتا ہے اور کوئی جائز مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔

۲۔ مزاح میں گھنٹوں کا وقت ضائع ہوتا ہے جو کہ زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

۳۔ دیر رات تک مزاح کو مشغلہ بنانے کے سبب قلب میں قسوت و غفلت پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ عموماً یہ پروگرام اہل باطل اور غفلت شعار لوگوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اس لئے اس میں شرکت اہل باطل کی تقویت و تائید کا سبب ہوتی ہے۔

۵۔ ایسے پروگرام لایعنی اور عبث باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۶۔ معاشرہ میں مزاحیہ باتوں کا چلن ہو جاتا ہے، اوباش قسم کے لوگ اس کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ نیز مزاحیہ مشاعروں میں فحش اشعار ہوتے ہیں یا لوگوں کو اس میں نشانہ بنا کر تضحیک و تذلیل ہوتی ہے۔

ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے کیا عمل ہے؟ اس سوال کے جواب میں مولانا خالد نیوی لکھتے ہیں:

مزاحیہ کہانیاں جو موعظت اور پند و نصیحت پر مشتمل ہوں اور مزاح اس میں ضمنی طور پر ہو یا مزاح کے پہلے پہلو بہ پہلو حکمت و موعظت اور سبق آموز باتیں بھی ہوں تو ایسی کہانیاں لکھنے کی گنجائش ہے، جب لکھنے کی گنجائش ہے تو پڑھنے، شائع کرنے خرید و فروخت کرنے کی بھی گنجائش ہوگی۔ مولانا ممتاز احمد ندوی نے ایسی کہانیوں کے لکھنے، پڑھنے اور شائع کرنے کو تعاون علی البر کی قبیل سے قرار دیا ہے۔

مولانا عارف باللہ اور مولانا شوکت ثنا قاسمی لکھتے ہیں: صرف تفریح و طبع اور دل بہلانے کے لئے ہو تو بھی جائز ہے۔

البتہ تمام مقالہ نگاروں نے یہ شرط ذکر کی ہے کہ فرائض و واجبات اور دیگر امور ضروریہ سے غفلت کا باعث نہ ہو، [تیز دیکھئے مقالہ: مفتی جعفر علی رحمانی]۔

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: حد جواز میں رہتے ہوئے کہانیاں لکھنا، پڑھنا اور ان کتابوں کی خرید و فروخت جائز ہے [مولانا احسن عبدالحق، مولانا عبد الجبار طیب ندوی، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

دلائل:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "الحكمة ضالة المؤمن فأينما وجدها فهو أحق بها" (مولانا خالد نیوی)۔

۲۔ "عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: تحذثوا عن بني إسرائيل فإنه كانت فيهم أعاجيب" (ابن ابی شیبہ مع تحقیق الشیخ محمد عوام ۲۰۱۷ء) [مولانا شوکت ثنا قاسمی]۔

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب مزاحیہ کہانیوں پر مشتمل کتابوں کی خرید و فروخت پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے پالنے سے منع کرنے کے باوجود چند مقاصد کے تحت ان کا رکھنا جائز قرار دیا ہے، اور جن کتوں سے انتفاع درست ہے، فقہاء نے اس کی خرید و فروخت کو درست قرار دیا ہے، تو اسی طرح مزاح کی جائز صورتوں میں مزاحیہ کتابوں کی خرید و فروخت درست ہونی چاہئے۔

مولانا عارف باللہ علامہ حصکفی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”وحدیث: حدثوا عن بنی اسرائیل یفید حل سماء الأعاجیب والغرائب من کل ما لا یتیقن کذبہ بقصد الفرحة لا الحجة بل وما یتیقن کذبہ لکن بقصد ضرب الأمثال والمواظ و تعلیم نحو الشجاعة علی لسان الآدمیین والحيوانات“ (درمختار ۶۰۴) [مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی]۔

نیز دکتور عبداللہ الفقیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”أما إذا كانت هذه القصص لا فائدة من قرائتها وأما المقصود منها التسلية فلا مانع منها أيضاً ما لم تشتمل علی ضرر لکن ینبغی الإقلال منها حفاظاً علی الوقت“ (فتاویٰ الشبكة الاسلامیہ)۔  
جب ان کہانیوں کو لکھنا اور پڑھنا جائز ہے، تو ان پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا بھی جائز ہوگا اور ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہوگی۔ [مولانا عارف باللہ، مولانا شوکت ثناء قاسمی]۔

بعض مقالہ نگاروں نے موجودہ زمانے کے ناول و افسانوں کی کتابوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کی ہے: چنانچہ مفتی حنیف صاحب لکھتے ہیں: موجودہ دور کی ناول کی کتابیں جن میں محبوبانہ و معشوقانہ باتیں مکالماتی انداز میں پیش کی جاتی ہیں جن میں قاری اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ فراموشی و واجبات سے اور دیگر ضروری امور سے بھی غافل ہو جاتا ہے، لہذا ایسی کہانیوں پر مشتمل کتابوں میں لکھنا، ان کو پڑھنا اور ان کتابوں کی خرید و فروخت جائز نہ ہوگی۔

مفتی اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: مزاحیہ لٹریچر جو حقائق سے لبریز ہو، محض انداز کلام مزاحیہ اور تفریح آمیز ہو تو اس کی گنجائش ہوگی، البتہ بیہودہ چٹکوں اور مسخرہ پن سے پر کہانیوں کی کتابوں کو خریدنا اور تیار کرنا شاعت فاحشہ کے حکم میں ہو کر ناجائز ہوگا، [نیز دیکھئے مقالہ: مولانا ممتاز احمد ندوی]۔

مفتی اشرف صاحب لکھتے ہیں: حقائق سے عاری مزاحیہ کہانیاں پڑھنا، لکھنا اور ان کو خریدنا اور الوداعیہ کے تحت داخل ہے، ارشاد باری ہے: ”ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذہا ہزواً أولئک لہم عذاب مہین“ (لقمان: ۶)۔

بعض مقالہ نگاروں نے مفتی شفیع صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے: اس زمانے میں بیشتر نوجوان فحش ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں، یہ سب چیزیں اسی قسم ہوا حرام میں داخل ہیں (معارف القرآن ۲۱/۷-۲۳) [مولانا ممتاز احمد ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی لطیف الرحمن مبین]۔

مفتی شاہد صاحب لکھتے ہیں: صاحب درمختار ”من یشتری لہو الحدیث“ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ومن السحت ما یؤخذ علی کل مباح کملح وکلاً و ماء و معادن و ما یؤخذہ غاز لغزو و شاعر لشعر و مسخرة و حکواتی قال اللہ تعالیٰ: ”ومن الناس من یشتری لہو الحدیث“ (درمختار ۹۰، ۶۱) [مقالہ مولانا محمد یوسف علی]۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں مفتی خالد نیومی صاحب لکھتے ہیں: مستقل لطیفہ گوئی کرنا اور اس کو ذریعہ معاش بنا لینا یا اس مقصد حیات کے خلاف ہے جو اسلام افراد اور معاشرہ میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اس سے انسان فکر آخرت، ذکر اللہ، عبادت وغیرہ سے غافل ہو جاتا ہے، انہیں اسباب کی بنیاد پر شعر و شاعری کی خدمت کی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ”لأن یمتلی جوف رجل قیحاً یریبہ خیر من أن یمتلی شعراً“۔ امام بخاری فرماتے ہیں: میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ شعر جب ذکر اللہ، قرآن کی تلاوت اور علم کے اشتغال پر غالب آجائے اور اگر شعر مغلوب ہو تو پھر برائے نہیں، اور لطیفہ گوئی و مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا انہماک کی دلیل ہے۔

مفتی اشرف عباس صاحب فرماتے ہیں: یہ قباحت لغیرہ ہے، لہذا اس کی اجرت مکروہ ہوگی اور انہوں نے درج ذیل عبارتوں کو اپنا استدلال بنایا ہے:

۱۔ ولکن من الغلط العظیم أن یتخذ الإنسان المزاح حرفة و یواظب علیہ و یفرط فیہ ثم یتمسک بفعل رسول اللہ ﷺ فهو کمن یدور مع الزنوج أبداً لینظر إلی رقصہم و یتمسک بأن رسول اللہ ﷺ أذن لعائشة فی النظر إلیہم و ہم یلعبون (مرآة المفاتیح ۷۲/۹) [نیز دیکھئے مقالہ: مفتی رضوان الحسن بحوالہ فتح الباری ۱۰/۵۴۳]۔

۲۔ لا تجوز الإجارة على شيء من اللهو لأنه معصية (مبسوط ۱۲۰۲)۔

۳۔ ہندیہ میں ہے: لا تجوز الإجارة على شيء من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشيخ من اللهو (الفتاوى الهندية ۳۰۴۴)۔

۴۔ مولانا یوسف لدھیانوی صاحب تحریر فرماتے ہیں: لطیفہ گوئی اگر حدود میں ہو تو اس کو پیشہ بنانا مکروہ ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱۵۶/۱)۔

مفتی اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: موجودہ دور میں لطیفہ گو اور مزاح نویس بہت مقبول شخصیات شمار ہوتی ہیں، پاکستان کے عمر شریف جیسے مسخرہ لوگوں کی دھوم ہے، حدیث پاک میں مضحکہ خیزی کی خاطر سخن پروری پر تنبیہ فرمائی گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”إن العبد يقول الكلمة لا يقولها إلا ليضحك به الناس يهوى إليها العبد مما بين السماء والأرض وأنه ليزل عن لسانه أشد مما يزل عن قدمه“ (مرقاۃ ۴۰۳۱)۔ لہذا مضحکہ اور بطور پیشہ کے لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی میں مشغولیت مکروہ اور اگر مضامین بیہودہ ہوں تو حرام ہوگی، جائز مضامین کی صورت میں فعل عبث ولا یعنی عمل میں مبتلا رہنا بجائے خود کراہت کا سبب ہے۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی نے اس کے عدم جواز پر درج ذیل دلائل ذکر کئے ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی کوئی ایسی بات کہتا ہے جس کو وہ گناہ نہیں سمجھتا اور وہ اس کی وجہ سے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے (ترمذی: ۲۳۳۶)۔

۲۔ ”من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيراً أو ليصمت“ (باب الحث على إكرام الجار والضيف والصمت)۔

۳۔ ولا تكسر الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب (ترمذی: ۲۲۲۷)۔

۴۔ أكثروا الكلام بذكر الله فإن كثرة الكلام بغير ذكر الله تقسي القلب وإن أبعد الناس من الله القلب القاسی۔

مولانا ممتاز احمد ندوی صاحب کا خیال ہے کہ آج کل کی لطیفہ گوئی و مزاح نویسی عموماً جھوٹ اور طعن و تشنیع پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے ان کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست نہیں ہے، اور اگر ان چیزوں پر مشتمل نہ ہو تب بھی اس سے احتیاط بہتر ہے۔ [مولانا احسن عبدالحق]۔

جبکہ مولانا شاہ جہاں ندوی صاحب لکھتے ہیں: ان کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے، اگر شرعی ضوابط ملحوظ ہوں، البتہ یہ گھٹیا کمائی کے ذرائع میں سے ہے، جیسا کہ پچھنہ لگانے والے کی کمائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھٹیا قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: افراط کے بغیر اگر لطیفہ گوئی و مزاح نویسی ہو تو اس کی اجرت درست ہوگی [مقالہ مولانا عارف باللہ مولانا جعفر علی رحمانی]۔

۵۔ تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام بھی منعقد کئے جاتے ہیں، جن کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے، کیا اس طرح کے ڈرامے لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا درست ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس طرح کے ڈراموں میں عموماً جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے دوسروں کا تمسخر و استہزاء ہوتا ہے یا کسی کی نقالی کی جاتی ہے، اس لئے اس طرح کے ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا اور ان کو دیکھنا جائز نہ ہوگا، جبکہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر ان ڈراموں میں منکرات وغیرہ نہ ہوں تو پھر جائز ہوگا، اس خلاصہ کے بعد مقالہ نگار حضرات کی آراء و دلائل پیش خدمت ہیں:

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب صدیقی ڈرامہ نگاری کی ابتدائی و ارتقاء پر شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ عرب میں سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں مارون النقاش الملبانی نے ڈرامہ پیش کیا جو نصرانی تھا، آگے مولانا ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ بکر بن عبداللہ اس کے عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی مشروعیت علی سبیل التعبد ہوگی یا علی سبیل الاعتیاد امر تعبدی نص پر موقوف ہے اور اس سلسلہ میں کوئی نص نہیں اس لئے یہ امر محدث ہوگا۔ اور اس کی حرمت اس حدیث سے واضح ہے، ”من أحدث فی أمرنا هذا ما لیس مننا فهو رد“، اور اگر علی سبیل الاعتیاد ہو تو تشبہ باعداء اللہ پائے جانے کی وجہ سے حرام ہوگا۔

۲۔ علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ”ومنها زی المكفرات لو حضر جماعة و جلس أحدہم علی مكان رفیع تشبہا بالمذکرین فسالوا المسائل و هم یضحکون أو تشبہ بالمعلمین فأخذ خشبة و جلس القوم حوله كالصبيان فضحكوا

واستہزؤا“ (الاعلام بقواطع الاسلام ۳۱۲)۔ [مولانا ظفر الاسلام، مولانا عارف باللہ]۔

۳۔ حدیث پاک: ”ویل للذی یحدث فیکذب لیضحک بہ القوم ویل له ویل له“ (ترمذی، احمد، حاکم) [مولانا ظفر الاسلام صاحب، مولانا عارف باللہ]۔

محاکاۃ کے سلسلہ میں علامہ نووی لکھتے ہیں: ”ومن ذلك المحاکاة بأن یشئ متعارجاً أو مطاطناً أو غیر ذلك من الهیئات مریداً حکایة هیئته من ینتقصه بذلك فکل ذلك حرام بلا خلاف“ [مولانا عارف باللہ]۔

۴۔ کبھی شخص متعینہ کے کسی عیب کو محاکاۃ کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے جس کے غیبت و استہزاء ہونے میں کوئی شبہ نہیں یا خود کو اسی نام سے موسوم کرتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ ہے [مولانا ظفر الاسلام صاحب، مولانا عارف باللہ، مولانا شوکت ثناء قاسمی]۔

۵۔ کبھی مار پیٹ اور جرائم کی اداکاری کی جاتی ہے، جو لوگوں کو جرائم کے نت نئے طریقے کی تعلیم اور جرائم پر لوگوں کو ابھارتا ہے۔ [مولانا ظفر الاسلام]۔

۶۔ ڈرامہ نگاری حیاء کے پردہ کو زائل کر دیتی ہے جبکہ حدیث میں ہے: ”لا ایمان لمن لا حیاء له“ [مولانا ظفر الاسلام صاحب، مولانا شوکت ثناء قاسمی]۔

۷۔ مولانا ظفر الاسلام صاحب ابن حجر کے حوالہ سے لکھتے ہیں: محاکاۃ و ڈرامہ نگاری بندروں کی خصوصیات ہیں، ابن حجر لکھتے ہیں: ”ومن خصاله أی القرد: أنه یضحک ویطرب ویحکی مارأه“ (فتح الباری ۱۶۰/۷)۔

مفتی اقبال قاسمی صاحب مولانا یوسف لدھیانوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: مولانا لدھیانوی وراثی شو، اسٹیج ڈرامے وغیرہ میں کام کرنا اور دیکھنا کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: گناہ کے کام میں شرکت کرنے والے سبھی گناہ گار ہیں گورجات کا فرق ہو اور غلط کام سے روزی کمانا بھی غلط ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳۳۱/۷)۔

مفتی اشرف عباس صاحب نے اس کو ہولناک حدیث کا مصداق قرار دیا ہے۔ (نیز دیکھئے مقالہ مفتی لطیف الرحمن صاحب)۔

البتہ بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اگر ان ڈراموں میں منکرات و منہیات شرعیہ موجود نہ ہوں تو پھر ایسے ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا، لکھنا اور دیکھنا جائز ہے، مثلاً کسی کے ساتھ استہزاء نہ ہو، کسی کی عیب جوئی نہ ہو، کسی کو خوف زدہ نہ کیا جائے، لوگوں کو ہنسوانے کے لئے دروغ گوئی سے کام نہ لیا جائے، غیر اقوام کی مشابہت اختیار نہ کی جائے، مردوزن کا اختلاط نہ ہو [مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عارف باللہ]۔

۸۔ موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہنسنا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے بہت معاون فعل ہے، اس لئے خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں جس میں بہت سے لوگ متکلف تقہیر لگاتے ہیں اور یرتک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا عمل کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مستقل ہنسنے اور ہنسوانے کی محفل منعقد کرنا یا متکلف ہنسوانا یا اس قدر ہنسوانا کہ امات قلب کا سبب بن جائے درست نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں مقالہ نگاروں نے درج ذیل دلائل ذکر کئے ہیں:

۱۔ مولانا ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: یہ مسلم ہے کہ رب کائنات نے جس چیز کا جتنا حکم دیا ہے اس میں ہمہ جہت خیر ہے، چنانچہ اللہ کا فرمان ہے: ”فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً“ (التوبہ: ۸۲) [ڈاکٹر ظفر الاسلام، مفتی خالد نیوی، مولانا عبد الجبار ندوی]۔

ابن حاتم حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”الدنیا قلیل فلیضحکوا فیها ما شاؤا فإذا انقطعت الدنیا وصاروا إلى اللہ فلیستأنفوا البکاء بکاء لا ینقطع أبداً“۔

۲۔ عن أبی ہریرة قال قال رسول اللہ ﷺ: لا تکثر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب (ابن ماجہ: ۳۲۱۵) [مولانا ظفر الاسلام، مفتی خالد حسین نیوی، مولانا عارف باللہ، مفتی اشرف عباس، مفتی جعفر علی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد یوسف علی]۔

۳۔ عن سماک قال قلت لجابر بن سمرہ: أکنت تجالس رسول اللہ ﷺ قال: نعم فكان طویل الصمت، قلیل

الضحك، وكان أصحابه يذكرون عنده الشعر وشيئا من أمورهم فيضحكون وربما يتبسمون (مسند احمد: ۲۰۸۹)۔ [مولانا ظفر الاسلام، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی اشرف عباس]۔

شرح حدیث نے اس دلچسپ گفتگو کے بعض اجزاء بھی نقل کئے ہیں، چنانچہ ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”من جملته أنه قال واحد: ما نفع أحداً صنمه ما نفعني، قالوا: كيف هذا؟ قال: صنعته من الحيس فجاء القحط فكنت آكله يوما فيوما، وقال آخر: رأيت ثعلبين جانا وصعدا فوق رأس صنم لي وبالا عليه فقلت: أرب يبول ثعلبان برأسه فجئتك يا رسول الله ﷺ وأسلمت“ (مرقاة المفاتيح: ۹۰۵) [مفتی اشرف عباس]۔

۳۔ ”أقل الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب“ (الادب المفرد للبخاري: ۲۵۲، مسند احمد: ۸۰۹۵) [مولانا ظفر الاسلام، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۵۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طور پر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے کہ آپ کے دہن مبارک کا اندرونی حصہ نظر آجائے، کبھی نہیں دیکھا، آپ ﷺ تو صرف تبسم فرمایا کرتے تھے (بخاری، مشکوٰۃ: ۳۰۶) [مفتی خالد حسین نیوی]۔

۶۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تبسمك في وجه أخيك لك صدقة“ (ترمذی: ۱۹۳۶) [مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۷۔ ما كان ضحك رسول الله ﷺ إلا تبسما (ترمذی: ۳۶۳۳) [مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ بہت زیادہ ہنسنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں: ”الذموم منه أن يستغرق ضحكاً، والمحمود منه التبسم الذي ينكشف فيه السن، ولا يسمع له صوت“ (احياء العلوم: المزاج) [مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

البتہ مفتی الطیف الرحمن صاحب لکھتے ہیں کہ بطور علاج اور بطور دوا بہ تکلف تہقیر لگانا اور ایسے پروگرام دیکھنا جائز ہوگا، لیکن بحالی صحت کے بعد پھر اس کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

جبکہ مفتی اقبال قاسمی لکھتے ہیں: تہقیر یا دیر تک ہنسنے کو کسی مرض کے لئے مفید سمجھنا محل تامل ہے (بحوالہ فتاویٰ شیخ صالح العثیمین)۔

اسی طرح مفتی محمد جعفر ملی رحمانی لکھتے ہیں: ڈاکٹروں کی آراء و نصوص شرعیہ سے ثابت، کثرت ضحک کی ممانعت کا مقابلہ دلیل نہیں بن سکتیں۔

۲۔ تفریحی مقصد کے لئے مختلف قسم کے کھیل بھی مروج ہیں، جن میں بعض کھیل گھنڈ دو گھنڈ کے ہوتے ہیں، اور بعض کھیل زیادہ وقت لیتے ہیں، بعض ایسے کھیل بھی ہوتے ہیں، جو انسان کی جان کے لئے خطرناک ہوتے ہیں، جیسے: باکسنگ، بعض کھیلاؤں میں جانوروں کو سخت تکلیف پہنچتی ہے، جیسے جانوروں کا باہمی مقابلہ، موجودہ زمانے میں کھیل نے مستقل فن کی صورت اختیار کر لی ہے، سرکاری سطح پر اس کی مستقل وزارت ہوتی ہے اور خاصا بجٹ اس مقصد کے لئے منظور کیا جاتا ہے، اس پس منظر میں واضح کیا جائے کہ:

الف۔ کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے کیا اصول ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ ایسے کھیل جو انسان کے وسیع تر مفاد میں ہوں، ان سے اس کی جسمانی قوت، چستی و نشاط کی بحالی اور طاقت و قوت کی فراہمی میں مدد ملتی ہو، جائز ہیں، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

”اللعب منه ما هو مباح ومنه ما هو مستحب ومنه ما هو مكروه ومنه ما هو محرم“ (اصطلاح: لعب) [مولانا عارف باللہ]

بعض مقالہ نگاروں نے ایسے مفید کھیل کے جواز پر احادیث رسول و سنت نبوی بھی ذکر کی ہیں، چند احادیث پیش خدمت ہیں:

۱۔ ”الھوا والعبوا، فإنی أكره أن أرى فی دینکم غلظة“ (کنز العمال: ۱۵، ۲۱۲) [مفتی اشرف عباس، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۲۔ حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ سے منقول ہے: ”القلب یمل كما تمل الأبدان فاطلبوا لها طرائق الحكمة“ (احکام

۳۔ وليس من اللهو إلا ثلاث: ”تاديب الرجل فرسه، وملاعبته أهله، ورميه بقوسه ونبله“ (ابوداؤد: ۲۵۱۲) [مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۴۔ نبی کریم ﷺ سے حبشیوں کی نیزہ بازی کا کھیل دیکھنا ثابت ہے [مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۵۔ أن عمر بن الخطاب مر بساحل البحر وهو محرم، فقال لابن عباس: تعال أباقيك في الماء أينا أطول نفسا فقال ابن عباس: ونحن محرمون (مقاله اهداف الترويخ والترفيه من منظور اسلامي) [مولانا ظفر الاسلام]۔

۶۔ ایک روایت میں ہے کہ عاصم بن عمر اور عبدالرحمن بن زید دونوں پانی میں تھے اور ایک دوسرے کی گردن پکڑ کر پانی میں ڈبکی دے رہے تھے، حضرت عمر یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن آپ نے کوئی نکیر نہیں کی (مقاله اهداف الترويخ والترفيه من منظور اسلامي) [مولانا ظفر الاسلام]۔

۷۔ حضرت عمر نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو لکھا کہ اپنے بچوں کو تیرا کی اور تیرا انداز سیکھائیں (مسند احمد: ۳۲۳) [مولانا ظفر الاسلام صاحب]۔

۸۔ عن سلمة بن الأكوع قال: مر النبي ﷺ على نفر من أسلم ينتضلون فقال النبي ﷺ: ارموا بني إسماعيل فإن أباكم كان رامياً ارموا وأنا مع بني فلان، قال: فأمسك أحد الفريقين بأيديهم، فقال رسول الله ﷺ: مالكم لا ترمون؟ قالوا: كيف نرمي وأنت معهم؟ فقال النبي ﷺ: ارموا فأنا معكم كلكم“ (بخاری: ۲۷۲۳) [مولانا ظفر الاسلام صاحب]

۹۔ عن عقبه بن الحارث قال: خرجت مع أبي بكر الصديق بعد وفاة النبي ﷺ بليال وعلى يمى إلى جنبه فمر بجن بن على يلعب مع غلمان فاحتمله على رقبته وهو يقول: وبأبي شبيه النبي ﷺ ليس شبيها بعلى وعلى يضحك“ (بخاری: ۲۷۵۰)۔

فقہاء کرام نے بعض کھیلوں کو جائز قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو عبارتیں:

۱۔ قاضی خاں فرماتے ہیں: ”ویجوز السبق فی أربعة أشياء: فی الخف یعنی البعیر و فی الحافر یعنی الفرس والنصل یعنی الرمی والمشی بالأقدام“ (خانیہ علی الہندیہ ۳، ۲۲۸)۔

۲۔ ”قال القاضي: اللعب الذي يلعب الشباب أيام الصيف بالبطيخ بأن يضرب بعضهم بعضاً مباح غير منكر“ (ہندیہ ۵، ۲۵۲)۔

۳۔ صاحب خانہ فرماتے ہیں: روى عن ابن عمر أنه كان يشتري الجوز لصبيانه يوم العيد يلعبون بها وكان يأكل منه وهذا إذا لم يكن على وجه المقامرة (خانیہ علی الہندیہ ۳، ۲۲۸) [دیکھیے: مقالہ مولانا مغفور بانڈوی]۔

بعض مقالہ نگاروں نے ان روایات کو بھی ذکر کیا ہے جن میں اہولعب کو مطلقاً منع کیا گیا ہے یا جن میں بعض کھیلوں کو اہولعب قرار دیا گیا ہے، ضروری ہے کہ اس طرح کی روایات اور فقہاء کی عبارتیں ذکر کر دی جائیں، تاکہ استنباط حکم میں آسانی ہو۔

۱۔ كل لعب حرام إلا ملاعبة الرجل امرأته وقوسه وفرسه (مستدرک حاکم ۲، ۹۵) [مولانا محمد مغفور، مولانا عبد الجبار طیب ندوی]۔

۲۔ كل ما يلهو به المرء المسلم باطل، إلا رميه بقوسه وتاديبه فرسه وملاعبته امرأته فإن من الحق (مشکوٰۃ ۲، ۲۲)۔ [مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا خالد نیوی]۔

۳۔ كل ما يلهو به المرء المسلم باطل (فتح الباری ۱۱، ۹۱) [مفتی اقبال احمد قاسمی]۔

صاحب درمختار لکھتے ہیں: وكره كل لهو لقوله عليه السلام: ”كل لهو المسلم حرام إلا ثلاثة، ملاعبة أهله، وتاديبه



لفرسہ، و مناقضتہ بقوسہ (الرد مع الرد ۹، ۳۸۱) [مولانا محمد مغفور]۔

صاحب بنایہ فرماتے ہیں: کل لہو، اوی ویکرہ کل اللعب بكل اللہو، وهذا یعم سائر أنواع اللعب والملاہی ما خلا الاشیاء العالئۃ اوی استثنایا فی الحدیث (البنایہ علی الہدایہ ۱۲، ۲۵۳) [مولانا محمد مغفور]۔

مذکورہ بالا جن حدیثوں میں لہو و لعب کو حرام قرار دیا گیا ہے، بعض حضرات نے ان کا مصداق بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان حضرات نے لکھا ہے کہ لہو و لعب کا مصداق صرف وہی صورتیں اور وہی کھیل ہیں، جن میں کسی قسم کا کوئی خاص فائدہ نہ دین کا ہو نہ دنیا کا، البتہ لہو و لعب کی وہ صورتیں جن سے کوئی غرض صحیح وابستہ ہو، یا کسی مقصد کی تکمیل یا منفعت کی تحصیل ان پر موقوف ہوں تو ان کا شمار ممنوع لہو و لعب میں نہ ہوگا [مقالہ مفتی اقبال قاسمی]۔

جن اسباب و علل کی بنیاد پر بعض کھیلوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، بعض مقالہ نگاروں نے ان علتوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، ذیل میں مختصر ان علتوں کو ذکر کیا جا رہا ہے:

- ۱۔ ایسے کھیل جن کی حرمت و کراہت مخصوص ہو مثلاً شطرنج، چوسر وغیرہ۔
- ۲۔ اللہ کی یاد سے غفلت کا سبب ہو، امام بخاری نے مستقل ایک باب مقرر کیا ہے: باب کل لہو باطل إذا شغلہ عن طاعة اللہ۔
- ۳۔ کھیل حرام و محصیت پر مشتمل ہو۔
- ۴۔ کھیل میں کھیلے جانے والے آلات اور اس کا طریقہ کار کفار سے ماخوذ ہوں، حضرت علی سے روایت ہے: ”کانت ید رسول اللہ ﷺ قوس عربیۃ فرأی رجلاً یدہ قوس فارسیۃ، قال: ما هذه؟ ألقها وعلیکم هذه وأشباهها“ (مشکوٰۃ باب اعداد الجہاد)۔
- مولانا تھانوی فرماتے ہیں: اس روایت سے معلوم ہوا کہ بلا ضرورت شدیدہ غیر مسلم قوموں کے آلات ورزش کا استعمال بھی مکروہ ہے، اگرچہ حرمت کی کوئی دلیل نہیں (امداد الفتاویٰ ۳، ۳۷۷)۔
- ۵۔ کھیل میں کسی قسم کا کوئی فائدہ مضر نہ ہو، ہدایہ میں ہے: یکرہ کل لہو لأنه إن قامر بہا فالیسر حرام بالنص وإن لم یقامر فہو عبث ولہو (بدایہ ۲، ۳۵۹)۔
- ۶۔ ایسا کھیل جس میں لوگوں کے لئے مصلحت و فوائد نہ ہوں مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہو کہ یہ کھیل جسمانی صحت کے لئے مضر ہے۔
- ۷۔ ایسا کھیل جس میں فائدہ تو ہو لیکن اس کو محض لہو و لعب کی نیت سے کھیلا جائے۔
- ۸۔ ایسا کھیل جو دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہو۔
- ۹۔ مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل کھیلا نا جائز ہے۔
- ۱۰۔ جو کھیل فرائض اور حقوق واجبہ سے غافل کرنے والے ہوں۔

اس سلسلہ میں مقالہ نگاروں نے درج ذیل کتابوں کا حوالہ دیا ہے، (احکام القرآن للشفیعی، رسالۃ الناہی عن النساء، مصنف مفتی شفیع صاحب، مکملۃ فتح الملہم، قاموس الفقہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب)۔

[دیکھئے: مقالہ مفتی اقبال قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا احسن عبدالحق، مفتی غلام اللہ، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا عبدالجبار طیب ندوی، مولانا ظفر الاسلام، مفتی اشرف عباس، مفتی جعفر علی رحمانی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب نے ان شرائط کا اضافہ کیا ہے:

- ۱۔ کھلاڑیوں کے درمیان عمر میں یکسانیت ہو۔ ۲۔ معیار تعلیم میں یکسانیت ہو۔ ۳۔ اقتصادی اعتبار سے بھی ہم آہنگی ہو۔
- خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی کھیل کے اندر مذکورہ بالا علتیں یا ان میں سے کوئی ایک علت پائی جائے تو وہ کھیل ناجائز ہوگا۔

چنانچہ مفتی اقبال صاحب مفتی شفیع صاحب کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

سلف و خلف میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ کھیل کو عدلی الاطلاق جائز ہے، روایات حدیث یا تو مطلقاً کھیل کو ممنوع قرار دیتی ہے یا چند کو مباح قرار دے کر باقی کو ممنوع قرار دیتی ہے..... فقہاء نے یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ جائز کھیل بھی اس وقت تک جائز ہیں جب کہ ان کا مقصد اور ان کی غرض صحیح ہو ورنہ اگر مقصد محض کھیل برائے کھیل ہو تو یہ مباح کھیل بھی جائز نہیں، چنانچہ کوئی شخص کشتی، تیراکی، دوڑ، نشانہ بازی محض لہو و لعب کی نیت سے کرے تو یہ بھی مکروہ ہوں گے (احکام القرآن ۱۳/۱۹۲، حوالہ رسالہ اشرف محمود عثمانی)۔

۲- ب: لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

مولانا ظفر الاسلام صاحب قاموس الفقہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: کھیل کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو یعنی مرد، تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کے حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو، اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیونکہ حصہ ستر چھپانا واجب ہے (قاموس الفقہ ۱۳/۵۸۷)۔

بعض مقالہ نگاروں نے لباس کے چند صفات بھی بتائے ہیں، مثلاً:

- ۱- لباس قابل ستر اعضاء کے لئے ساتر ہو۔
- ۲- لباس ایسا ہو کہ اعضاء کے ابھار کو ظاہر نہ کرتا ہو۔
- ۳- لباس کے اندر جسم کی کھال نظر نہ آتی ہو۔
- ۴- لباس زیادہ پرکشش و جاذب نظر نہ ہو۔
- ۵- عورت کا لباس مرد کے لباس اور مرد کا لباس عورت کے لباس کے مشابہ نہ ہو۔
- ۶- دوسری قوموں کے مشابہ لباس نہ ہو۔
- ۷- مرد ریشمی لباس نہ پہنے۔

[مولانا شاہ جہاں ندوی، مفتی شاہد، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا احسن عبدالحق، مفتی غلام اللہ، مفتی عارف باللہ، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا محمد یوسف علی، مفتی لطیف الرحمن میمن، مفتی رضوان الحسن، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی خالد حسین نیوی قاسمی]۔

بعض مقالہ نگاروں نے پردہ سے متعلق کچھ احادیث اور فقہاء کی عبارات بھی نقل کی ہیں، مثلاً:

۱- "إياكم عن التعري فإن معكم من لا يفارقكم إلا عند الجماء وعند ما يقضى الرجل حاجته، غط فخذك" (مسند احمد) [مولانا ظفر الاسلام صاحب]۔

۲- حضور ﷺ نے حضرت معمر سے فرمایا: غط فخذك فإن الفخذين عورة (مسند احمد: ۲۲۲۹۵) [مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۳- لا ينظر الرجل إلى عورة الرجل، ولا تنظر المرأة إلى عورة المرأة (بخاری کتاب الصلاة باب ما يستر من العورة) [مفتی اشرف عباس]۔

۱- ففي الدر الرابع: ستر عورته، ووجوبه عام ولو في الخلوة على الصحيح إلا لغرض صحيح، قال ابن عابدين: قوله: ولو في الخلوة: إذا كان خارج الصلاة يجب الستر بحضرة الناس إجماعاً ولو في الخلوة على الصحيح (حاشية ابن عابدين ۴، ۵) [مفتی اشرف عباس]۔

۲- الضوابط الشرعية للترويج کے مصنف لکھتے ہیں: لا ينبغي أن تتزيا بالكفار في لباسها عند الترويج وعند اللعب [مقالہ مولانا ظفر الاسلام صاحب]۔

۳- قال الدكتور ناصر الغامدي: فإن كشفها أمام الناس والتساهل في ذلك من المنكرات العظيمة وما حل البلاء بالمسلمين إلا بسبب التعري الذي يعيشه كثير منهم رجالاً ونساء (لباس الرجل أحكامه وضوابطه ۲، ۸۱۲) [مفتی اشرف عباس]۔  
مفتی اشرف عباس العثمین لکھتے ہیں:

۴۔ أما إذا كان الممارس للرياضة ليس عليه إلا سروال قصير، يبدو منه فخذه أو أكثره فإنه لا يجوز فإن الصحيح أنه يجب على الشباب ستر أفضأهم وأنه لا يجوز مشاهدة اللاعبين وهم بهذه الحالة من الكشف عن أفضأهم (فتاویٰ العثمینین ۲، ۹۸۶) [مفتی اقبال صاحب]۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے کھیل کے لئے کوئی خاص یونیفارم مقرر نہیں کیا ہے، بلکہ شرعی پردہ پوشی کے لئے اسلام نے جو اصول و ضوابط مقرر کئے ہیں، کھلاڑیوں کو بھی ان کی پابندی کرنی ہوگی، چنانچہ مفتی اقبال صاحب لکھتے ہیں:

کھلاڑیوں کے لئے شریعت نے کوئی لباس وضع نہیں کیا ہے، حدود کی رعایت کرتے ہوئے وہ اپنا یونیفارم خود تجویز کر سکتے ہیں۔

ج۔ شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے کن کو جائز، کن کو ناجائز، کن کو مکروہ اور کن کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جن کھیلوں کے بارے میں احادیث میں ترغیب آئی ہے وہ کھیل مستحب ہیں، اسی علت مطردہ کی بنیاد پر ہر وہ کھیل مستحب ہوں گے جن سے تفریح قلب کے ساتھ ساتھ شریعت کے کسی مقصد کی تکمیل ہو رہی ہو، جیسے دوڑ کا مقابلہ، تیر اندازی، نشاندہ بازی، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ، کرانا وغیرہ۔

[مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا اقبال صاحب، مولانا ممتاز احمد ندوی، مفتی لطیف الرحمن]۔

بعض حضرات نے کبڈی کا اضافہ کیا ہے (مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی خالد ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عارف باللہ)۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں، حضور ﷺ کا ارشاد: لیس من اللہو إلا ثلاث: کی تفسیر میں ابن معن لکھتے ہیں: ای لیس من اللہو المستحب لہذا ان کے علاوہ کھیلوں کو ان ہی پر قیاس کرتے ہوئے یا تو مستحب قرار دیا جائے گا، یا جائز یا مکروہ و حرام۔

مذکورہ بالا کھیلوں کے علاوہ ان کھیلوں کو بھی بعض مقالہ نگاروں نے مستحب قرار دیا ہے، تیراکی، اور غوطہ خوری کا مقابلہ، کشتی چلانے کی مشق، بری و بحری ڈرائیونگ کی مشق، کشتی کا مقابلہ۔ مولانا ظلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں: والمدافع وغير ذلك من آلات الحرب الجديدة المتعلقة في المآخذ الزمان، فإنها أغنت عن رمي السهام بالقوس وعطلته (بذل المجهود ۷۸)۔

البتہ ان کھیلوں کے مستحب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں لباس وغیرہ کسی لائن سے شرعی اصول کی خلاف ورزی نہ ہو۔ [دیکھئے: مقالہ مفتی خالد ندوی، مفتی اقبال، مولانا عبید اللہ ندوی]۔

۲۔ کون کون سے کھیل جائز ہیں:

اس کے جواب میں مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:

۱۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”الہوا والعبوا فانی أکره أن یری فی دینکم غلظة“ (شعب الایمان: ۵۱۲۲)۔ امام بیہقی لکھتے ہیں: یہ حدیث منقطع ہے، اور اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس کا اعلق مباح کھیل سے ہے۔

۲۔ حضور ﷺ سے حبشیوں کی نیزہ بازی کا کھیل دیکھنا ثابت ہے جو اباحت کی دلیل ہے۔

ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں کہ جو کھیل قمار سے خالی ہو وہ جائز ہے، جیسے ٹیبل ٹینس، بلیارڈ، فٹ بال، والی بال، وغیرہ [مفتی غلام اللہ صاحب]۔

مفتی اقبال صاحب لکھتے ہیں: مروجہ کھیلوں میں جسمانی ورزش والے کھیل جس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو، جائز ہوں گے، اگرچہ وہ جسمانی ورزش کے کھیل غیروں کے ایجاد کردہ ہوں، بشرطیکہ ان کا شعار نہ ہو، مثلاً: ہاکی، فٹ بال، والی بال، لان ٹینس، بیڈمنٹن، اور ٹیبل ٹینس، اسی طرح تعلیمی تاش، کیرم بورڈ وغیرہ۔

[نیز دیکھئے مقالہ: مولانا ظفر الاسلام، مفتی نوشاد علی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد حسن عبدالحق، مفتی لطیف الرحمن، مولانا عمران، مفتی خالد صاحبان]۔

مولانا عارف باللہ لکھتے ہیں کہ اگر کرکٹ مختصر وقت کے لئے ہو تو وہ بھی جائز ہے۔

مقالہ نگاروں نے اپنی رائے کی تائید میں موجودہ زمانے کے اہم مفتیان کرام کی تصنیفات سے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں۔

چنانچہ مفتی اقبال صاحب حلال و حرام کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

موجودہ زمانہ کے وہ تمام کھیل جن سے آدمی اپنی حفاظت کے لائق ہو سکے، نہ صرف درست بلکہ مستحسن ہوں گے، مثلاً کشتی کھیلنا، کرائے، لاشی چلانا، مکابازی وغیرہ۔ فقہاء شافعیہ نے صحیح لکھا ہے کہ تیرنا اور بندوق کا نشانہ وغیرہ کھیل جائز ہیں، تاہم خیال رہے کہ کھیل کو دائرہ ورزش کا یہ جواز اس وقت ہے جب کہ شریعت کے احکام ستر کی پوری پوری رعایت ہو اور لڑکوں کے لڑکیوں کا اختلاط نہ ہو۔

مولانا تاقی عثمانی صاحب کے حوالہ سے موصوف لکھتے ہیں:

”کما سبق فی الأحادیث المذكورة من إباحة السباحة والرمایة والانتضال بالقوس والسابقة بالإبل والبہائم وإجراء الخیل وملاعبة الأهل فإها وإن كانت فی صورة اللہو ولكنها لها کانت الاشتغال فیها علی غرض صحیح ومصالح معاشیة أو معادیة خرجت عن اللہویة حقیقة فأبیحت وربما استحببت، نعم من فعلها بقصد التلهی والتلعب کانت حراماً أو مکروها فی حقه صرح به الفقہاء“ (تکملة فتح الملهم ۴۳۳)۔

مولانا عارف باللہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

”والأصل فی هذه الألعاب کلها الجواز والمشروعية ما لم تشتمل علی مخطور أو مفسدة فیطر علیها التحريم، وبعض هذه الألعاب قد ثبتت مشروعيتها بأحادیث صحاح حسان، مثل العدو والسباحة واللہو بالسہام واللعب بالخراب وركوب الخیل والمصارعة وبعضها مباح بناء علی المبدأ الشرعی المعروف وهو أن الأصل فی الأشياء والأعمال الدنیویة هو الإباحة“۔

ناجائز کھیل:

۳۔ وہ تمام کھیل ناجائز ہیں جن کی حدیث میں ممانعت آئی ہے یا قمار میسر پر مشتمل ہوں، خواہ عوض دونوں جانب سے ہو یا ایک جانب سے، یا جو کھیل معصیت پر مشتمل ہو (بدائع، کتاب الاحسان)۔

[مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا ظفر الاسلام، مفتی لطیف الرحمن، مفتی اشرف عباس]۔

مولانا عارف باللہ نے اس سلسلہ میں مفتی رشید صاحب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جس کھیل میں ذہنی ورزش ہوگی وہ ناجائز ہوگا اور جو ذہنی ورزش سے پاک ہو وہ جائز ہے، خواہ اس میں جسمانی ورزش ہو یا محض دل و دماغ کی تفریح جیسے لٹو، چٹائی، بچوں کے کھلونے (احسن الفتاویٰ ۲۴۱/۸)۔ [نیز دیکھئے مقالہ مفتی اقبال صاحب]۔

چنانچہ مقالہ نگاروں نے درج ذیل کھیلوں کو ناجائز قرار دیا ہے: نزد شیر، شطرنج، جانوروں کے باہمی مقابلہ کا کھیل، باکسنگ، البتہ تعلیمی تاش کا کھیل اگر جوا سے خالی ہو تو اس کو بعض حضرات نے جائز قرار دیا ہے۔ [مقالہ مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا عارف باللہ، مولانا محمد حسن عبدالحق، مفتی لطیف الرحمن، مفتی خالد ندوی]۔

مفتی خالد ندوی اور مولانا ظفر الاسلام صاحبان نے مذکورہ بالا کھیلوں کے علاوہ پتنگ بازی کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، مفتی غلام اللہ صاحب نے پتنگ کے ساتھ ویڈیو گیم کا بھی ذکر کیا ہے۔

مولانا عارف باللہ نے لوڈو، موبائل اور کمپیوٹر پر کھیلے جانے والے گیس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب نے کرکٹ، کیرم، بورڈ، لوڈو کو شطرنج کے حکم میں رکھا ہے، جو ضروری اور اہم مسائل سے غافل کرنے میں شطرنج سے بڑھ کر ہیں۔

[نیز دیکھئے مقالہ: مولانا ممتاز احمد ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا عمران، مفتی اشرف صاحبان]۔

مولانا یوسف صاحب لکھتے ہیں: دور حاضر کے مرد و تمام کھیل لہو و لعب ہی کی نیت سے کھیلے جاتے ہیں، لہذا دور حاضر کے تمام کھیلوں کو حرام کہنا ہی اولیٰ ہے، الفقہ علیٰ الحدیث اب الاربعہ (۵۰/۶) میں ہے: "إنما يجوز كل ذلك بشرط قصد الرياضة وتقوية البدن لا بقصد التسلية وقطع الوقت".  
مکروہ کھیل:

مولانا عمران صاحب نے درج ذیل کھیل کو مکروہ قرار دیا ہے:

ویڈیو گیم، لوڈو، کیرم بورڈ، ناش، اسکلٹنگ، کرکٹ۔

مولانا عارف باللہ لکھتے ہیں: ناش اور کیرم بورڈ، اسنوکر پن بال، گولی کھیلنا، وغیرہ میں اگر ہارجیت پر مال کی شرط ہو یا عبادت سے غفلت کا سبب ہو تب تو حرام ہے، ورنہ مکروہ ہے، انہوں نے فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

د۔ کھیل کی ہارجیت میں اگر پیسے کی شرط ہو تو کون سی صورت جائز اور کون سی صورت ناجائز ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ کھیل میں پیسے کی شرط کی بنیادی طور سے تین صورتیں ہیں: شرط کسی اجنبی کی طرف سے ہو، جانبین میں سے کسی ایک جانب سے ہو، جانبین کی طرف سے ہو، بعض حضرات نے ان ہی صورتوں کی مختلف شکلوں کو ذکر کیا ہے اور چار پانچ شکلیں ذکر کی ہیں، بعض حضرات نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کیا اصولی طور پر ان ہی کھیلوں میں مسابقتہ جائز ہے، جو مخصوص ہیں یا ان کے علاوہ جو جائز کھیل ہیں ان میں بھی علت مشترکہ کی وجہ سے مسابقتہ جائز ہے؟ اس وضاحت کے بعد مقالہ نگاران کی آراء پیش خدمت ہیں:

پہلی صورت کے متعلق مفتی اشرف صاحب لکھتے ہیں: اگر اس کے ذریعہ تعلیم کو عام کرنا اور اسباب جہاد کی تیاری اور فروست مقصود ہو تو انتہائی محمود ہے۔

ہندیہ میں ہے: "وما يفعله الأمراء فهو جائز أيضا بأن يقولوا لاثنين: أيكما سبق فله كذا" (ہندیہ کتاب الکرامیہ)  
[مولانا محمد رمضان علی، مفتی غلام اللہ]۔

درمختار میں ہے: "حل الجعل إن شرط المال في المسابقة من جانب واحد، قال الشافعي: أو من ثالث بأن يقول أحدهما لصاحبه: إن سبقتني أعطيتك كذا وإن سبقتك لا أخذ منك شيئا أو يقول الأمير لفارسين أو راميين: من سبق منك فله كذا وإن سبق فلا شيء له" (الدر المختار مع حاشیہ ابن عابدین ۹۰۵۷۷)۔

[مفتی اشرف عباس، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا یوسف، مفتی خالد نیوی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا محمد رمضان علی، مولانا اسرار الحق سیبیلی]۔

دوسری صورت: یعنی دونوں کھلاڑیوں میں سے ایک کی طرف سے انعامی رقم ہو۔

مفتی اشرف صاحب اس صورت کے بارے میں لکھتے ہیں: ما لکیرہ نے اس صورت کے جواز کو اگرچہ بعض شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے تاہم مجموعی اعتبار سے تمام فقہاء اس کے جواز پر متفق ہیں۔ [مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا اسرار الحق سیبیلی، مفتی خالد نیوی، مولانا محمد رمضان علی، مفتی اقبال صاحب]۔

تیسری صورت: شرط جانبین سے ہو۔

یہ صورت قمار میں داخل ہے اس لئے یہ صورت جائز نہیں ہوگی۔

[مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی اشرف عباس، مولانا یوسف صاحب، مفتی خالد نیوی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا اسرار الحق سیبیلی]۔

مفتی ممتاز احمد ندوی فتاویٰ عالمگیری کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

أما إذا كان البدل من الجانبين فهو قمار حرام (ہندیہ ۵۰۲۲۳)۔

علامہ حصکشی لکھتے ہیں: وحرم لو شرط فيها من الجانبين لأنه يصير قمارا قوله من الجانبين بأن يقول: إن سبق فرسك فلك علي كذا وإن سبق فلي عليك كذا (رد المختار مع الدر المختار كتاب الحظر والإباحة) [مولانا محمد رمضان علی]۔

البتہ اس تیسری صورت کے اندر دونوں کے درمیان اگر کوئی تیسرا شخص محلل آجائے تو پھر یہ صورت جائز ہوگی، ہندیہ میں ہے: ”ثم إذا كان المال مشروطاً من الجانبين فادخلا بينهما ثالثاً وقالاً للثالث: إن سبقتنا فالمال لك وإن سبقتك فلا شيء لنا يجوز استحساناً“ (ہندیہ کتاب الکرایہ) (مولانا محمد رمضان علی)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وحرر لو شرط فيها من الجانبين لأنه يصير قماراً إلا إذا ادخلا ثالثاً محلاً بينهما بفرس كفاء لفرسيهما يتوهم أن يسبقهما، وإلا لم يجز ثم إذا سبقهما أخذ منهما، وإن سبقه لم يعطها وفيما بينهما أيهما سبق أخذ من صاحبه (۹، ۵۷۸)۔

[مفتی اشرف عباس، مولانا یوسف، مفتی خالد نیوی، مولانا محمد رمضان علی، مولانا اسرار الحق سہیلی]۔

البتہ اس صورت کے سلسلہ میں بعض مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس تیسرے محلل شخص کے جیتنے کی امید ہو، اگر یہ ایسا شخص ہو کہ اس سے جیتنے کی امید ہی نہ ہو تو وہ شخص محلل نہ بن سکے گا، بلکہ یہ صورت بھی حرام ہوگی، [دیکھئے مقالہ: مولانا ممتاز احمد ندوی، مفتی خالد نیوی]۔

مولانا ممتاز احمد ندوی مسند احمد کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”من أدخل فرساً بين فرسين وهو لا يأمن أن يسبق فلا بأس به ومن أدخل فرساً بين فرسين وهو آمن أن يسبق فهو قمار“ [نیز دیکھئے مقالہ: مولانا محمد رمضان علی]۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی لکھتے ہیں: ”ومنها أن يكون الخطر فيه من أحد الجانبين إلا إذا وجد فيه محلاً حتى لو كان الخطر من الجانبين جميعاً ولم يدخل فيه محلاً لا يجوز لأنه في معنى القمار نحو أن يقول أحدهما لصاحبه: إن سبقتني فلك على كذا، وإن سبقتك فلي عليك كذا فقبل الآخر، ولو قال أحدهما لصاحبه: إن سبقتني فلك علي كذا وإن سبقتك فلا شيء عليك فهو جائز، لأن الخطر إذا كان من أحد الجانبين لا يحتمل القمار فيحمل على التحريض على استعداد أسباب الجهاد في الجملة بما ل نفسه وذلك مشروع كالتنفيل من الإمام وببل أولى لأن هذا يتصرف في مال نفسه بالبدل، والإمام بالتنفيل يتصرف فيما لغيره فيه حق في الجملة وهو الغنيمة فلما جاز ذلك فهذا بالجواز أولى، وكذلك إذا كان الخطر من الجانبين ولكن أدخل فيه محلاً بأن كانوا ثلاثة لكن الخطر من الاثنين منهم ولا خطر من الثالث بل إن سبق أخذ الخطر وإن لم يسبق لا يغرم شيئاً، فهذا مما لا بأس به أيضاً وكذلك ما يفعله السلاطين وهو أن يقول السلطان لرجلين: من سبق منكما فله كذا فهو جائز لما بينا أن ذلك من باب التحريض على استعداد أسباب الجهاد خصوصاً من السلطان فكانت ملحقة بأسباب الجهاد، ثم الإمام إذا حرض واحداً من الخزاة على الجهاد بأن قال: من دخل هذا الحصن أولاً فله من النفل كذا ونحوه جاز كذا هذا، وببل أولى لما بينا (بدائع الصنائع كتاب السبق ۹۵، ۱۳) [نیز دیکھئے مقالہ: مولانا اسرار الحق سہیلی]۔

مولانا ظفر الاسلام قاموس الفقہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: اگر دو ہی آدمی میں مقابلہ ہو رہا ہو تو شرط یک طرفہ ہو، اگر دونوں طرف سے شرط ہو تو یہ صورت قرار کی ہوگی جو ناجائز ہے، انعام کی شرط اسی وقت درست ہوگی جب مقابلہ ایسی دو چیزوں میں ہو کہ کسی درجہ میں ان دونوں ہی کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کامیابی اور شکست کی توقع کی جاسکتی ہو، مقابلہ کے وقت ابتدائی اور انتہائی حد متعین کر دی جائے، جو انعام مقرر یا عوض مقرر ہوا ہے وہ معلوم و متعین ہو (قاموس الفقہ ۱۱۶، ۱۱۸) [نیز دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہد بحوالہ کتاب الفتاویٰ]۔

اس تفصیل کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ مروجہ کھیلوں میں ہارجیت کی بازی لگانا جائز ہے یا نہیں، نیز ہارجیت پر انعام مقرر کرنا اور انعام کی شرط لگانا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟ بہر دو صورت یہ حکم خاص ہے یعنی سارے کھیل حکم کے اعتبار سے مساوی ہیں یا کھیلوں کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے احکام جدا گانہ ہیں، اور اگر چند قسم کے ہی کھیلوں میں انعام مقرر کرنا درست ہے تو وہ کون کون سے کھیل ہیں؟

اس ناحیہ سے گفتگو کرتے ہوئے مفتی اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ جائز کھیلوں میں سے کسی بھی کھیل میں بغیر کسی شرط و انعام کے محض ہارجیت کی بازی لگانا جائز ہے تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ کے درمیان دوڑ کا مقابلہ اس کی دلیل ہے۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: جن چیزوں پر شرط رکھی گئی اس کا بدل العوض جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں شیخ ابن علی نے تین اقوال نقل فرما کر احناف وابن تیمیہ وغیرہ کے قول کو ترجیح دی ہے:

”الأول: أن جواز بذل العوض في السبق مختص بهذه الثلاثة وإلى ذلك ذهب جمهور العلماء كالمالكية والشافعية والحنبلية واستدلوا بقولهم بهذا الحديث، الثاني أنه يجوز بذل العوض في السبق في كل أمر مباح، الثالث: أنه يجوز بذل العوض في السبق في كل ما يقوى البدن في مجال الجهاد أو مجال العلم والتعليم وهذا قول الحنفية وغيره من أهل العلم وهو اختيار ابن تيمية وابن القيم وابن مفلح والمرداوي وابن القاسم وغيره۔ [نیز دیکھئے مقالہ مفتی اقبال صاحب]۔  
مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: کھیل کی ہارجیت میں اگر پیسے کی شرط ہو تو گھوڑ دوڑ، اونٹوں کا مقابلہ، دوڑ اور نیزہ بازی کے علاوہ تمام صورتیں ناجائز ہیں، دیگر آلات حرب کو تیر پر ہی محمول کیا جائے گا، علامہ شامی لکھتے ہیں: لا يجوز الاستباق في غير هذه الأربعة كالبلغل بالجعل وأما بلا جعل فيجوز في كل شيء (رد المحتار كتاب الحظر والاباحة)۔

خلاصہ الفتاویٰ میں ہے: السباق يجوز في أربعة أشياء في الخف يعني البعير وفي الحافر يعني الفرس، والنصل يعني الرمي والمشي بالأقدام يعني العدو (ماخوذ جواهر الفقه ۳/۱۱۵) [مفتی غلام اللہ صاحب]۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: وأما شرائط جوازه فأنواع: منها أن يكون في الأنواع الأربعة: الحافر، والخف، والنصل، والقدم لا في غيرها، لما روى أنه عليه الصلاة والسلام قال: لا سبق إلا في خف (بدائع الصنائع ۶/۲۰۶)۔ [مفتی اقبال صاحب]۔  
بعض مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جن کھیلوں میں مسابقتہ جائز ہے، ان میں درج ذیل تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ مقابلہ تیر اندازی، گھوڑ سواری، اونٹ سواری یا پیدل دوڑ کا ہو یا مباح کھیلوں میں ہو۔

۲۔ کھیل میں مال یا انعام اس طرح مقرر ہو کہ اس میں قمار کی شکل نہ ہو پائے۔

۳۔ مقابلہ کا ابتدائی اور انتہائی وقت وحد متعین کر دی جائے۔

۴۔ جو انعام مقرر ہو وہ معلوم متعین ہو (تاسوس الفقہ شرح المہذب) [مقالہ مفتی اقبال صاحب، مولانا شوکت ثنا قاسمی]۔

۵۔ جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو ان کا کیا حکم ہوگا؟

۶۔ کھیل دیکھنے نیز اس کے لئے ٹکٹ خریدنے کا کیا حکم ہوگا، کیا اس میں کچھ تفصیلات بھی ہیں؟

ان دونوں سوالوں کے جواب میں عموماً مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ اصولی طور پر جو کھیل جائز ہے، حدود شرع میں رہتے ہوئے تشییط اذہان کے لئے اس کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا فی نفسہ جائز ہے، اور جو کھیل مکروہ ہے اس کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا مکروہ ہوگا، اور جو کھیل ناجائز ہے، اس کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا ناجائز ہے۔

چنانچہ مولانا رمضان علی صاحب نے فی نفسہ جائز کھیل دیکھنے کے جائز ہونے پر درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے:

عن عروة بن زبير قال: قالت عائشة: والله لقد رأيت رسول الله ﷺ يقوم على باب حجرقي والحبشة يلعبون بحرابهم في مسجد رسول الله ﷺ يسترني بردائه لكي أنظر إلى لعبهم ثم يقوم من أجلي حتى أكون أنا التي انصرف فاقدروا قدر الحاجة الحديث السن حريصة على اللهو (مسلم شريف فصل في جواز لعب الجوارى ۱۱/۲۹۰)۔

البتہ اکثر حضرات کی رائے ہے کہ جو کھیل فی نفسہ جائز بھی ہے موجودہ زمانہ میں حدود شرع میں رہتے ہوئے اس کا اسٹیڈیم وغیرہ میں دیکھنا ممکن نہیں ہے، نیز ان کھیلوں کے دیکھنے میں کافی وقت ضائع ہوتا ہے، جبکہ وقت خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اس لئے قبح لغیرہ کی وجہ سے ایسے کھیلوں کا بھی دیکھنا اور ان کے لئے ٹکٹ خریدنا ناجائز نہ ہوگا۔

چنانچہ مفتی محمد جعفر علی رحمانی لکھتے ہیں: اگر کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو وہ کھیل ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ مال کے اسراف کی طرح تصبیح اوقات بھی حرام ہے (الالعاب الریاضیۃ لعلی حسین امین یونس)۔

[نیز دیکھئے مقالہ ڈاکٹر ظفر الاسلام، مفتی اشرف عباس، مفتی ممتاز احمد ندوی، مفتی اقبال، مولانا اسرار الحق سبیلی، مفتی لطیف الرحمن مبین، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا عارف باللہ صاحبان]۔  
مقالہ نگاروں نے درج ذیل آیات سے استدلال کیا ہے:

۱- ”ولا ترکوا إلى الذین ظلموا“ [مفتی اقبال صاحب]۔

۲- ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب“ (سورہ مائدہ: ۲) [مفتی اقبال قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی]

۳- ”أفحسبتم أنما خلقناکم عبثاً وأنکم إلینا لا ترجعون“ (المومنون: ۱۱۵) [مولانا اسرار الحق سبیلی]۔  
بعض مقالہ نگاروں نے درج ذیل احادیث ذکر کی ہیں:

۱- ”نعمتان مغیبتان کثیر من الناس: الصحة والفراغ“ (ترمذی: ۲۲۰۴) [مفتی ممتاز احمد ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مولانا ثناء جہاں ندوی]۔

۲- ”من حسن إسلام المرأ ترکہ ما لا یعنیه“ (ترمذی: ۲۳۱۸) [مفتی اشرف عباس، مفتی جعفر علی رحمانی]۔

۳- ”من تکثر سواد قوم فهو منهم“ [مفتی اقبال صاحب]۔

۴- ”لا تزول قدما عبد حتی یسأل عن عمره فیما أفناه، وعن علمه فیما فعل وعن مالہ من أین اکتسبه و فیما أنفقہ وعن جسمه فیما أبلاه“ (سنن الترمذی: ۲۰۶۷)۔ [مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ثناء جہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن مبین]۔

جہاں تک ٹکٹ کے خریدنے کے جواز اور عدم جواز کی بات ہے تو اس سلسلہ میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ ٹکٹ خریدنے کا حکم خود کھیل کھیلنے اور اس کے دیکھنے کے جواز و عدم جواز پر منحصر ہے، چنانچہ جو کھیل دیکھنا جائز ہے، اس کے لئے ٹکٹ خریدنا جائز ہوگا، اور جو کھیل دیکھنا مکروہ ہے اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی مکروہ ہوگا، اور جس کھیل کا دیکھنا جائز نہیں اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

[دیکھئے مقالہ ڈاکٹر ظفر الاسلام، مولانا محمد رمضان علی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ثناء جہاں ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا محمد یوسف علی، مفتی لطیف الرحمن مبین صاحبان]۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: ٹکٹ خریدنے اور کھیل دیکھنے کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ خود کھیل کے جواز و عدم جواز پر منحصر ہے۔

مفتی جعفر علی رحمانی ٹکٹ کی خریداری سے متعلق لکھتے ہیں: ٹکٹ لے کر اسٹڈیم میں جانا اور بیچ دیکھنا اس وقت جائز ہوگا جب کہ اسٹڈیم میں خلاف شرع امور انجام نہ دیے جا رہے ہوں، اور اگر اسٹڈیم میں خلاف شرع امور انجام دیئے جا رہے ہوں تو پھر اس میں جانے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز نہ ہوگا [دیکھئے مقالہ مفتی اشرف عباس، مفتی عارف باللہ]۔

مقالہ نگاروں نے استنبہاد میں فقہاء کی درج ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

۱- حضرت قتادہ سے روایت ہے: لو أنفق درهماً فی معصیة اللہ کان مسرفاً [مقالہ مولانا محمد رمضان علی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مفتی عارف باللہ]۔

۲- إن الوسيلة أو الذریعة تكون محرمة إذا کان المقصد محرماً وتكون واجبة إذا کان المقصد واجباً (المقاصد الشریعة للخادمی: ۴۶) [مقالہ مفتی جعفر علی رحمانی]۔

۳- ولا تجوز الإجارة علی شیء من الغناء والنوح والمزامیر والطبل وشیء من اللہو (ہندیہ: ۴۲۹) [مفتی لطیف الرحمن مبین]۔

۴- ولا تصح الإجارة لأجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی (الدر المختار مع حاشیہ ابن عابدین: ۱۰۷۵) [مقالہ مفتی اشرف عباس، مفتی جعفر علی رحمانی]۔

مفتی خالد حسین نے ناجائز کھیل کے لئے ٹکٹ خریدنے کو بشرطیہ طور پر ایجاز کا مصداق قرار دیا ہے۔



مفتی غلام اللہ صاحب لکھتے ہیں: بکثرت خریدنا اجارہ ہے، اجارہ میں معقود علیہ معلوم ہونا چاہئے اور یہاں معقود علیہ مجہول ہے، اس لئے کہ کھلاڑیوں کے عمل کو ضبط کرنا مشکل ہے لہذا بکثرت خریدنا جائز نہیں ہوگا۔

۳۔ موجودہ دور میں سیاحت ایک مستقل صنعت بن چکی ہے، بلکہ بعض ممالک کی آبادی کے لئے سیاحت بنیادی وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے موجودہ دور میں سیاحت کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اس تناظر میں حسب ذیل امور دریافت طلب ہیں:

الف۔ تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے کا سفر جائز ہے یا نہیں جبکہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ بھی ہوتا ہے؟

مولانا ظفر الاسلام صاحب سیاحت کی لغوی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لسان العرب میں ہے: السیاحة مفارقة الأمصار والذہاب فی الأرض، السیاحة الذہاب فی الأرض للعبادة والترہیب.

اس کے بعد اس کا استعمال ان صوفیوں کے لئے ہونے لگا جو مخلوقات سے یکسو ہو کر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گوشہ نشین ہو گئے اور انہیں جمود و جماعات سے کوئی سروکار نہ رہا، ابن تیمیہ کے حوالہ سے مولانا موصوف لکھتے ہیں: وكذلك السیاحة فی البلاد لغیر مقصود مشروع كما یعانیہ بعض الناسک أمر منہی عنہ (مجموع الفتاویٰ ۱۰، ۶۳۳)۔

اس سوال کے تعلق سے اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے:

قدرتی مناظر اور تاریخی مقامات کے لئے سفر کرنا جائز ہے، کیونکہ ان چیزوں کا دیکھنا فی نفسہ مباح ہے، تو ان چیزوں کے لئے سفر کرنا بھی مباح ہونا چاہئے، اس لئے کہ بذات خود سفر کرنا مباح ہے، الایہ کہ کوئی عارضہ لاحق ہو جائے جو اس کی اباحت کو ختم کر دے۔

[مولانا رمضان علی، مولانا اسرار الحق قاسمی، مولانا شاجہاں ندوی، مولانا شوکت شائق قاسمی، مفتی خالد نیوی، مولانا محمد عارف باللہ]۔

البتہ مفتی اقبال صاحب کی رائے یہ ہے کہ صرف سیاحت کے لئے دور دراز کا سفر جس میں کافی رقم کا صرفہ ہو، اسراف کے سبب ممنوع ہوگا۔

اسی طرح مولانا ظفر الاسلام صاحب ابن تیمیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: تلذذ کی خاطر خوبصورت مناظر دیکھنا ممنوع ہے اور استدلال میں آیت: ”لا تمدن عینک إلی ما متعنا بہ أزواجاً منهم“ کو پیش کیا ہے۔

سفر سیاحت کے مباح ہونے پر مقالہ نگاروں نے درج ذیل آیات، احادیث، فقہاء کی عبارتیں اور عمل اسلاف کو استشہاد میں پیش کیا ہے:

۱۔ ”إن طلقکن أن یدلہ أزواجاً خیراً منکن مسلمات مؤمنات قانتات ثابتات عابدات سائحات“ (تحریم: ۵)۔

۲۔ ”التائبون العابدون السائحون“۔ (توبہ: ۱۱۳)۔

شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین اپنی کتاب ”احکام السیاحہ: ۳۸“ میں لکھتے ہیں:

اختار بعضهم الجہاد واختار أنہا الصیام واحتج کل فریق بالحديث والأثر واختار ابن القيم مسلکاً ثالثاً فی تفسیر السیاحۃ وفق بہ بین ما ورد فی ذلك من أحادیث وآثار۔ وقال قوله تعالیٰ: السائحون وفسرت السیاحۃ بالصیام وفسرت بالسفر فی طلب العلم وفسرت بالجہاد وفسرت بدوام الطاعة، والتحقیق فیہا أنہا سیاحۃ القلب فی ذکر اللہ ومحبتہ والإنباء إلیہ والشوق إلی اللہ تعالیٰ۔

۳۔ ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین“ (النمل: ۶۹) [مولانا ظفر الاسلام، مفتی تہال، مفتی خالد نیوی صاحبان]۔

۴۔ ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف بدء الخلق“ (عنکبوت: ۲۰) [مولانا شوکت شائق قاسمی، مولانا ظفر الاسلام صاحبان]۔

۵۔ ”أولم یسیروا فی الأرض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم“ (روم: ۹) [مولانا ظفر الاسلام صاحب]۔

۶۔ ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبل“ (روم: ۴۲) [مولانا ظفر الاسلام صاحب]۔

۷۔ ”قل سیروا فی الأرض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین“ [مولانا شوکت ثنائی]۔

حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

مولانا رمضان علی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کائنات اور اس کی چیزیں اللہ کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں، اسی لئے سیر فی الارض کا حکم دیا گیا ہے کہ انسان زمین کی سیر و سیاحت کر کے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں کا مشاہدہ کرے۔

مفتی اقبال صاحب معارف القرآن (۲۷۴/۶) کے حوالہ سے لکھتے ہیں: زمین کی سیر و سیاحت اگر عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مطلوب دینی ہے، بشرطیکہ ان حالات کو تاریخی سوانح کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبرت کی نظر سے دیکھے تو ہر واقعہ ایک بصیرت کا سبق دے گا۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب ابن جریرین کے حوالہ سے لکھتے ہیں: سلف کے یہاں سیاحت یا تو سفر فی طلب العلم یا صلحاء و عابدین کی زیارت یا رزق حلال کے حصول کے لئے سفر پر بولا جاتا تھا، چنانچہ خطیب بغدادی چالیس سال تک حصول علم کی غرض سے وطن سے باہر رہے، اسی طرح ابوعدہ نے ابن مندہ کا قول نقل کیا ہے: طفت الشرق والغرب مرتین، نیز ابو حاتم رازی، حافظ ابن طاہر مقدسی، ابو عبد اللہ اصفہانی، ابو الخطاب اندلسی، امام کسائی وغیرہ نے حصول علم ہی کی خاطر اپنے اپنے وطنوں کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ [مولانا مفتی خالد نیوی، مفتی محمد عارف باللہ]۔

اس خلاصہ کے بعد مقالہ نگار حضرات کی آراء ملاحظہ ہو:

۱۔ حصول علم کی خاطر اپنی مملکت میں بلند پہاڑیوں، مسطح مکانات، جنگلات، غاروں و وادیوں کی سیاحت جائز ہوگی [مولانا ظفر الاسلام و مفتی اقبال صاحبان]۔

۲۔ معذب علاقے اور بستیوں کی سیاحت بطور عبرت جائز ہوگی، مفتی اقبال صاحب نے ایسے علاقوں کے سفر کو مفید بتایا ہے [مقالہ مولانا ارشد]۔

۳۔ تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے لئے سفر کرنا جائز ہونا چاہئے کیونکہ ان چیزوں کا دیکھنا فی نفسہ مباح ہے تو ان کو دیکھنے کے لئے سفر کرنا بھی مباح ہونا چاہئے [مولانا محمد رمضان علی، مولانا سعید اللہ ندوی]۔

۴۔ ملک و بیرون ملک پہاڑیوں کی چوٹیوں، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر وغیرہ قدرتی مناظر کی سیاحت کی بھی فی نفسہ اجازت ہونی چاہئے، البتہ چونکہ ان جگہوں میں فواحش و منکرات عام طور سے ہوتے رہتے ہیں اس لئے اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے۔

۵۔ بلاد کفر میں سیاحت کی غرض سے جانے میں اگر صلابت ایمانی اور چنگی عمل نہیں تو طرح طرح کے محرکات میں اور شعائر کفر میں ملوث ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے شخص کے لئے اجتناب اولیٰ ہے۔ (مولانا ظفر الاسلام صاحب)۔

مفتی جعفر ملی رحمانی لکھتے ہیں: ضرورت داعیہ اور غرض صحیح کی بنا پر بلاد کفر اور ایسے اسلامی ملک (جہاں منکرات و فواحش ہوں) کا سفر کرنا مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ درست ہے:

۱۔ شعائر اسلام کی حفاظت ہو۔ ۲۔ قامت دین بلاد کفر میں ممکن ہو۔ ۳۔ بقدر ضرورت ہی بلاد کفر میں مقیم رہے۔ ۴۔ انسان کے پاس اتنا علم ہو جس کے ذریعہ وہ شکوک و شبہات کو دور کر سکے۔ ۵۔ انسان کے پاس اتنا دین ہو جو اس کو شہوات سے روکے۔ ۶۔ سفر کی سخت ضرورت درپیش ہو، مثلاً علاج یا تحصیل علم وغیرہ۔ ۷۔ اگر سیاحت کا مقصد تفکر فی خلق اللہ ہے تو ان اسلامی ممالک کا سفر اختیار کیا جائے جہاں پر منکرات کا ارتکاب نہ ہوتا ہو۔

بعض مقالہ نگاروں نے سفر کے اقسام بھی ذکر کئے ہیں کہ سفر کی تین قسمیں ہیں: سفر طاعت، مثلاً حج یا جہاد کے لئے سفر کرنا، سفر مباح، مثلاً تجارتی سفر، سفر معصیت، رہزنی کے لئے سفر وغیرہ۔

علامہ طحاوی لکھتے ہیں: السفر علی ثلاثہ اقسام: سفر طاعة کالج، وسفر مباح کالتجارة وسفر معصية کقطع الطريق

(طحاوی علی مراق الفلاح باب صلاة السافر)۔ [مقالہ مولانا محمد رمضان علی، مفتی اقبال صاحب، مولانا سعید اللہ ندوی]۔

۳- ب: کیا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا درست ہے جبکہ بعض علاقوں کا سفر جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کے نقطہ نظر سے پرخطر ہوتا ہے؟

اس سوال کے سلسلہ میں تقریباً تمام مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ سیاحت مباح ہے، لیکن جان و عزت و آبرو کی حفاظت فرض ہے، اس لئے ایسی جگہوں میں جہاں جان یا عزت و آبرو کا تحفظ خطرہ میں ہو نہ خود جانا درست ہے اور نہ اہل و عیال کو ساتھ لے جانا درست ہے۔

[مولانا خالد نیوی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا اسرار الحق سیبلی، مفتی اقبال، مولانا رمضان، مولانا محمد عمران صاحبان]۔

مقالہ نگاروں نے اس سلسلہ میں درج ذیل قرآن کی آیت سے استدلال کیا ہے:

”ولا تعلقوا بأیدیکم إلی التهلكة“ [دیکھیے: مقالہ مفتی خالد نیوی، مولانا عارف باللہ، مفتی اقبال، مفتی جعفر علی رحمانی صاحبان]۔

مولانا شوکت ثنا قاسمی نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر علامہ شوکانی کے حوالہ سے ان الفاظ میں کی ہے:

”فکل ما صدق علیہ أنه تهلکة فی الدین أو الدنیا فهو داخل فی هذا“ (فتح القدیر للشوکانی)۔

مفتی اشرف عباس صاحب لکھتے ہیں کہ ایسے پرخطر علاقوں کے سفر سے خود بھی گریز کرے اور بیوی بال بچوں کو ساتھ نہ رکھے، انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

”لا ترکبن أحد البحر إلا غازیاً أو معتمراً أو حاجاً“ (ابوداؤد، تلخیص الحبیبر ۳۰۸۳۳)۔

البتہ بعض حضرات نے خطرات کے درجات کے اعتبار سے حکم لگایا ہے۔

مولانا شاجہاں ندوی لکھتے ہیں: تفریحی مقصد کے لئے چونکہ سیاحت جائز ہے، لہذا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا بھی درست ہے، اور اگر سفر کرنے والوں کو جان و مال اور عزت و آبرو کے خطرہ کا گمان ہو تو ایسی صورت میں مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر گمان غالب ہو تو مکروہ تحریمی اور یقینی ہو تو حرام ہوگا۔

مولانا رمضان علی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر سفر پر خطر ہو تو ایسی صورت میں بال بچوں کو ساتھ میں رکھنا مکروہ ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ آدمی ایسی صورت حال میں خود بھی سفر نہ کرے، اور اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو پھر درست ہے، انہوں نے بدائع الصنائع کی اس عبارت کو استشہاد میں پیش کیا ہے:

”کذلک حکم إخراج النساء مع أنفسہم إلی دار الحرب علی هذا التفصیل إن کان ذلک فی جیش عظیم مامون علیہ غیر مکروہ لأفہم یحتاجون إلی الطبخ والغسل ونحو ذلک، وإن کانت سریة لا یؤمن علیہا یکرہ إخراجہن لما قلنا“ (بدائع الصنائع؛ کتاب السیر ۶۶۶)۔ [مفتی جعفر علی رحمانی]۔

مولانا نظیر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: اگر خطرات درجہ یقین کو پہنچے ہوئے ہوں تو خود بھی نہیں جانا چاہئے اور اگر منظوں ہوں تو کچھ شرطوں کے ساتھ جانا درست ہے، اور بہر صورت بہتر یہ ہے کہ بال بچوں کو ساتھ نہ لے جائیں کہ کفار و یہود و نصاریٰ کے مشاعر کو دیکھ کر بچے بہت جلد متاثر ہو جائیں گے۔

البتہ مفتی لطیف الرحمن صاحب نے آیت حجاب اور آیت ”وقرن فی بیوتکم“ سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عورتوں کو سیاحت کے لئے گھر سے نکلنا درست نہیں ہے، انہوں نے مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی کے حوالہ سے لکھا ہے: قرآن و حدیث میں عورت کو پردے کی سخت تاکید آئی ہے، اور عورت کے باہر نکلنے میں مفاسد کثیرہ کے پیش نظر عورت کا تفریح کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں، اگر نکلے گی تو اس کے علاوہ اس کا شوہر اور دوسرے اولیاء بھی سخت گناہ گار ہوں گے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱۸۷/۹)۔

ج۔ جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کا کیا حکم ہے؟

اس سوال میں دو شکیں ہیں: (۱) سیاحت کے لئے ایسی جگہوں میں جانا جہاں غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں، (۲) ایسی جگہوں میں جانے والوں کے

لئے کرایہ پر سواری دینا، اور اشیاء خورد و نوش فروخت کرنا، مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ دونوں شقوں کے احکام جدا گانہ ہیں، اس لئے دونوں سے متعلق مقالہ نگاروں کی آراء کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ سیاحت کے لئے ایسی جگہوں میں جانا جہاں غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں؟ اس شق سے متعلق اکثر مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ ایسی جگہوں میں جانا برائی کو بڑھا دینا ہے، اور یہ از قبیل تعاون علی الاثم ہے، اس لئے ایسی جگہوں میں جانا جائز نہ ہوگا، بعض مقالہ نگاروں نے ایسی جگہوں میں جانے کو مکروہ قرار دیا ہے، البتہ بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ برائی اور غیر شرعی امور سے دامن بچاتے ہوئے ایسی جگہوں میں جانا جائز ہوگا۔

جن لوگوں نے تعاون علی الاثم اور فتح لغیرہ کی بنیاد پر ایسی جگہوں میں جانے کو ناجائز قرار دیا ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

[مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا ظفر الاسلام، مفتی شاہد، مفتی اشرف عباس، مولانا محمد رمضان علی، مولانا عارف باللہ، مفتی طارق انور قاسمی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مفتی شوکت ثنائی

صاحبان]۔

مفتی اقبال اور مفتی غلام اللہ صاحبان نے ایسی جگہوں میں جانے کو مکروہ قرار دیا ہے، جبکہ مفتی خالد نیوی اور مولانا اسرار الحق سہیلی صاحبان کی رائے ہے کہ غیر شرعی امور سے بچتے ہوئے اور نظر کی حفاظت کرتے ہوئے ایسی جگہوں میں جانے کی اجازت ہوگی، البتہ مفتی خالد صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حکومت کی طرف سے بے حیائی کی روک تھام کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

مولانا شاہ جہاں ندوی صاحب لکھتے ہیں: ایسے سیاحتی مقام پر ازراہ تفریح جانا جہاں غیر شرعی باتوں کا غلبہ نہ ہو جائز ہے اسی طرح وہاں خورد و نوش فروخت کرنا جائز ہے، اور اگر غیر شرعی باتوں کا غلبہ ہو تو وہاں ازراہ تفریح جانا ناجائز ہے، اور اگر لاعلمی میں چلا جائے تو اس پر لازم ہے کہ لوٹ آئے، انہوں نے استدلال میں درج ذیل عبارت کو پیش کیا ہے:

در مختار میں ہے: ”وان علم اولاً باللعب لا یحضر أصلاً سواء كان ممن یقتدی به أولاً“، وفي رد المحتار (۹۰۵۰۲):  
 أن علیاً رضی اللہ عنہ قال: صنعت طعاماً فدعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجاء فرأی فی البیت تصاویر فرجع، ومفاد الحدیث أن یرجع ولو بعد الحضور۔

مقالہ نگاروں نے اس مسئلہ میں درج ذیل آیات قرآنیہ سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ”وإذا رأیت الذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض عنهم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ“ (انعام) [مفتی اشرف عباس]۔

۲۔ ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ [مفتی جعفر ملی رحمانی، مفتی شاہد، مولانا محمد رمضان علی، مفتی ممتاز احمد ندوی]۔

۳۔ ”فلا تقعدوا بعد الذکری مع القوم الظالمین“ (سورہ انعام) [مفتی اقبال صاحب]۔

۴۔ ”وقد نزل علیکم فی الکتاب أن إذا سمعتم آیات اللہ یکفر بها ویستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ إنکم إذا مثلهم“ (نساء: ۱۳۰)۔ [مولانا شوکت ثنائی، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

۲۔ دوسری شق یہ ہے کہ ایسی جگہوں میں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر دینا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کا شرعی کیا حکم ہے؟

اس شق سے متعلق مقالہ نگاروں کی آراء مختلف ہیں، بعض حضرات نے ان کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، بعض حضرات نے مطلقاً جائز قرار دیا ہے، جبکہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جائز تو ہے البتہ بہتر نہیں، اور بعض نے سواری کرایہ پر دینے اور اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے حکم میں فرق کیا ہے۔

جن لوگوں نے ان چیزوں کو بھی تعاون علی الاثم کی بنیاد پر ناجائز یا مکروہ قرار دیا ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

[مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا عارف باللہ، مفتی طارق انور قاسمی، مفتی ممتاز احمد ندوی]۔

مفتی جعفر ملی رحمانی صاحب نے استدلال کے طور پر اس آیت کو ذکر کیا ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“۔

درج ذیل حضرات کی رائے یہ ہے کہ دوکان وغیرہ لگانا جائز ہے، [مفتی خالد نیوی، مفتی اقبال، مولانا شوکت ثنائی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی]۔

درج ذیل حضرات کا خیال یہ ہے کہ جائز تو ہے، البتہ بہتر نہیں، ان کے اسما گرامی یہ ہیں:  
[مفتی شاہد، مفتی اشرف عباس، مولانا محمد رمضان علی صاحبان]۔

مولانا اسرار الحق سہیلی کی رائے یہ ہے کہ ایسی جگہوں میں اشیاء خورد و نوش فروخت کرنا درست ہے، البتہ ایسی جگہوں پر جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا بالواسطہ تعاون علی الاثم کی بنیاد پر جائز نہ ہوگا۔ انہوں نے بزازیہ کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے: أجز نفسه ليعصر لذی خمر یکره ولو لبناء بیعة لا (فتاویٰ بزازیہ ۶۷۰ ۶۷۱)۔

مولانا شاہ جہاں ندوی کی رائے یہ ہے: اگر سیاحت پر جانے والوں کا قصد معلوم نہ ہو اور اس کا ارادہ معصیت پر تعاون دینا بھی نہ ہو تو ایسے شخص کو سواری کرایہ پر دینا اور اس سے اشیاء خورد و نوش فروخت کرنا درست ہے۔

رد المحتار میں ہے: قوله: ممن يعلم فيه إشارة إلى أنه لو لم يعلم لم يكره بلا خلاف (كتاب الحظر والاباحة في البيعة) [مفتی غلام اللہ صاحب]۔

جن مقالہ نگاروں نے ایسی جگہوں میں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر دینے اور اشیاء خورد و نوش کے فروخت کرنے کو جائز قرار دیا ہے ان لوگوں نے مجموعی طور سے فقہ حنفی کی کتابوں سے درج ذیل اقتباسات پیش کئے ہیں:

وجاز بیع عصیر عنب ممن يعلم أنه يتخذ خمرًا، لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغیره، قوله لا تقوم بعينه أن المراد لا تقوم المعصية بعينه وما يحدث له بعد البيع وصف آخر يكون فيه قيام المعصية وقيل: يكره لإعانتة علی المعصية (رد المحتار ۹۰۵۶۱) [مفتی محمد شاہد، مفتی جعفر علی رحمانی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی صاحبان]۔

اگر کوئی کافر کسی مسلمان کی سواری کو شراب لے جانے کے لئے یا کسی مسلمان کو کرایہ پر رکھے تو امام صاحب کے نزدیک جائز ہے، علامہ زلیعی اس کے تحت لکھتے ہیں: قال الزیلعی: وهذا عنده وقال: هو مکروه، لأنه علیه الصلاة والسلام لعن فی الخمر عشرة وعد منها حاملها وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولا سبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار وليس الشراب من ضرورات الحمل لأن حملها قد يكون للإراقة وللتخليل فصار كما إذا استاجر لعصر العنب أو قطعه والحديث محمول على الحمل المقرون بقصد المعصية زاد في النهاية وهذا قياس وقولهما استحسان ثم قال الزیلعی: وعلى هذا الخلاف لو آجره ای الكافر دابته لينقل عليها الخمر أو آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الاجر عنده وعندهما يكره (رد المحتار كتاب الحظر فصل في البيعة) [مولانا محمد رمضان علی، مولانا شوکت ثاقفی]۔

۱۔ آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم ہیں، جو آمد و رفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرتے ہیں، سفر کرنے والے حضرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو سیاحتی مقاصد پر ادائش دینے کے لئے جاتے ہیں، نیز شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، بعض کا مقصد مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کرنا ہوتا ہے، کیا اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے؟

اس سوال کا جواب بعض نے تفصیل سے تو بعض نے اختصار کے ساتھ دیا ہے، مقالہ نگاروں کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹور پر لے جانے والی کمپنیاں اگر ایسے لوگوں کے لئے ٹکٹ و دیگر سہولیات کا انتظام کرتی ہیں جو اچھے اور جائز مقاصد کے لئے سفر کرتے ہیں تو ایسی کمپنیوں کا قیام اور ان کا انتظام و انصرام بالاتفاق جائز و درست ہے، اور اگر کمپنیاں صرف ان لوگوں کو سہولت، بہم پہنچاتی ہو جو ادائش دینے کے لئے سیر و تفریح پر نکلتے ہیں تو یہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے حرام ہوگا، لیکن اگر کمپنیوں کا مقصد تجارتی نقطہ نظر سے صرف زائرین اور سیاحوں کو ٹکٹ فراہم کرنا ہو، اور موضع زیارت و سیاحت پر قیام و طعام کے لئے سہولتوں کا نظم کرنا ہو تو کیا ایسی کمپنیوں کا قیام جائز ہوگا یا نہیں؟ اس صورت مسئلہ میں مقالہ نگاروں کے درمیان اختلاف ہے، اکثر حضرات کی رائے جواز کی ہے جبکہ بعض حضرات نے اس کو بھی ناجائز اور بعض نے مکروہ قرار دیا ہے، اس خلاصہ کے بعد مقالہ نگار حضرات کی آراء پیش خدمت ہیں:

ایسی کمپنیوں کا قیام اچھے مقاصد کے لئے ہو مثلاً زائرین کے لئے یا تاجروں کے لئے قیام کا انتظام و انصرام وغیرہ تب تو ایسی کمپنیوں کا قیام جائز ہے۔

[مولانا شوکت شائقی، مولانا عارف باللہ، مولانا ظفر الاسلام، مفتی ممتاز احمد ندوی، مفتی طارق انور قاسمی صاحبان وغیرہم]۔

اور اگر ایسی کمپنیوں کا قیام سیاحتی مقامات پر واقعہ عیش دینے والوں کے لئے سہولیات کی فراہمی یا مندر و تیر تھ گاہوں پر جانے والوں کے لئے گاڑی بک کرانا ہو تو ایسی کمپنیوں کا قیام بالاتفاق ناجائز ہے۔

[مولانا سرالحمق سبیلی، مولانا شوکت شائقی، مفتی اشرف عباس، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا ارشد رحمانی، مفتی غلام اللہ، مفتی ممتاز احمد ندوی، مفتی طارق انور قاسمی صاحبان وغیرہم]۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب نے اس طرح کے ٹور سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بلا نیت ثواب واجب التصدق قرار دیا ہے۔

مولانا سرالحمق سبیلی نے درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے:

استدل الذمی مسلما عن طریق البيعة لا يدلها (فتاویٰ بزازیہ ۶۲۵۹)۔

مفتی جعفر علی رحمانی نے "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" سے استدلال کیا ہے، [نیز دیکھئے: مقالہ مولانا ارشد رحمانی، مفتی ممتاز احمد ندوی صاحبان]۔

بعض مقالہ نگاروں نے اس قاعدہ سے بھی استدلال کیا ہے:

الأمور بمقاصدها۔ [مولانا شوکت شائقی، مفتی جعفر علی رحمانی]۔

مفتی غلام اللہ صاحب، مفتی شفیع صاحب کے حوالہ سے لکھتے ہیں: سئل عطاء بن أبي رباح عن أخ له كاتب فقال له: إن أخی لیس له من أمور السلطان شیء إلا أن یکتب له بقلمه ما یدخل وما ینخرج فإن ترک قلمه صار علیه دین واحتاج وإن أخذ به کان له فیه غنی، قال لمن یکتب؟ قال: لخالد بن عبد الله القسری، قال: ألم تسمع إلی ما قال العبد الصالح: "رب بما أنعمت علی فلن أکون ظهیرا للمجرمین" فلا یهتم أخوک بشئی... فإن الله تعالی سیأتیہ برزق (تفصیل الکلام فی مسئلة الإعانة علی الحرام)۔

البتہ مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: ٹور پر جانے والے غیر مسلم کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، خواہ اس کا مقصد مندروں، تیر تھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا ہو اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کرنا ہو یا تفریح مقصود ہو، یہ کفر یا معصیت پر مدد دینا نہیں ہے، اس لئے کہ معصیت فاعل مختار کے فعل سے حاصل ہوگی اور عبادت، پہنچانے کا لازمی تقاضا نہیں ہے اس لئے کہ سیاحت پر جانے والے کو پہنچانا کبھی تفریح کے لئے بھی ہوتا ہے، انہوں نے در مختار کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے:

وجاز تعمیر کنیسة وحمل خمر ذمی بنفسه أو دابته بأجر، لا عصرها لقیام المعصية بعینه... لیتخذ بیت نار أو کنیسة أو بیعة أو بیاع فیه الخمر وقالوا: لا ینبغی ذلك لأنه إعانة علی المعصية وبه قالت الثلاثة (الدر المختار مع الرد کتاب الحظر والاباحة)۔

تیسری صورت کہ ٹور کمپنی کا مقصد تجارتی نقطہ نظر سے صرف مسافروں کو ان کی منزل تک چھوڑنا اور قیام و طعام کا نظم کرنا ہو تو کیا اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اکثر مقالہ نگاروں نے اس کو جائز قرار دیا ہے [دیکھئے مقالہ مفتی اقبال قاسمی، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا شاہ قاسمی، مولانا محمد ارشد رحمانی پٹنہ، مفتی غلام اللہ، مولانا عبد الجبار طیب ندوی، مولانا سرالحمق سبیلی]۔

مقالہ نگاروں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں درج ذیل فقہی عبارات پیش کی ہیں:

و علامہ شامی لکھتے ہیں: ولو أجر نفسه لیعمل فی الكنيسة ویعمرها لا بأس به، لأنه لا معصية فی عین العمل (رد المحتار ۹۰۴۷۷) [مولانا رمضان علی، مولانا سرالحمق سبیلی، مولانا ارشد رحمانی، مولانا شاہ جہاں ندوی]۔

مفتی اقبال صاحب نے درج ذیل عبارت پیش کی ہے:

وإذا استاجر الذمی من المسلم دارا لیسکنها فلا بأس بذلك وإن شرب فیه الخمر أو عبد فیه الصلیب أو

أدخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم في ذلك بأس لأن المسلم لا يواجرها لذلك وإنما أجرها للسكنى (عالمگیری ۴۵۰، ۴)۔ [یزدیکھی: مقالہ مولانا راشد رحمانی]۔

مفتی جعفر علی رحمانی نے اس عبارت کو پیش کیا ہے:

ثم المكاسب أربعة: الإجارة والتجارة والزراعة والصناعة وكل ذلك في الإباحة سواء عند جمهور الفقهاء (كتاب الكسب للإمام محمد بن حسن الشيباني)۔

مولانا شاہ جہاں ندوی نے یہ عبارت پیش کی ہے:

قوله... وحمل خمر نهي، قال الزيلى: وهذا عنده وقالوا: هو مكروه، وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولا سبب لها، وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار وليس الشرب من ضرورات الحمل، ولأن حننها قد يكون للإراقة أو للتخليل فصار كما إذا استاجر أجيده لعصر العنب أو قطعه والحديث محمول على الحمل المقرون بقصد المعصية، زاد في النهاية: وهذا قياس وقولهما استحسان (رد المحتار ۹۰۵۲)۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: اگر ٹور کمپنی دھوکہ و خداع سے کام نہ لے، مرد و عورت کا اختلاط نہ ہو، شراب و کباب اور محرّمات سے پاک ہو تو اجازت دی جانی چاہئے۔

البتہ مولانا رمضان علی صاحب کی رائے یہ ہے کہ اعانت علی المعصیۃ ہونے کی وجہ سے ایسی کمپنیوں کا قائم کرنا مکروہ ہے جیسا کہ تعمیر کنیسہ کے سلسلہ میں صاحبین کا قول ہے۔

مولانا عارف باللہ لکھتے ہیں کہ حضرات صاحبین کے نقطہ نظر کے مطابق ایسی کمپنیوں کو قائم کرنے سے منع کیا جائے گا کہ معصیت کے راستے کچھ تو دشوار ہوں۔ مفتی لطیف الرحمن صاحب لکھتے ہیں: کسی معصیت کی اعانت جواز روئے قرآن حرام ہے وہ ہے جس میں معصیت کا قصد و نیت حقیقہ یا حکماً شامل ہو۔ حقیقہ یہ ہے کہ دل ہی میں یہ ہو کہ اس کے ذریعہ عمل معصیت کیا جائے اور حکماً یہ ہے کہ وہ چیز بجز معصیت کے کسی دوسرے کام میں نہ ہو جیسے آلات معارف طلبہ، سارنگی وغیرہ اور جہاں قصد معصیت نہ حقیقہ ہو نہ حکماً وہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل نہیں، البتہ اعانت سے ملتی جلتی ایک اور چیز ہے جس کو اصطلاح میں ”سبب“ کہتے ہیں وہ بھی از روئے قرآن حرام ہے خواہ ہیئت معصیت ہو یا نہ ہو، پھر سبب قریب اور بعید مثلاً: کپڑا بنانا، مکان بنانا، ظرف اور استعمال کی چیزیں بنانا ان سبب میں بھی ظاہر ہے کہ ہر ایک برد و فاجران کو خریدتا اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا شمار سبب بعید میں ہے، اور بنانے والا بڑی الذمہ ہے، اور ایک سبب قریب کی وہ ہے کہ ہے تو سبب قریب مگر معصیت کے لئے محرک نہیں بلکہ صدور معصیت کسی دوسرے فاعل مختار کے اپنے فعل سے ہوتا ہے جیسے بیع عصیر عنب ممن ریثخذ خمراً۔ ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد اس معصیت ہی کا ہو تو یہ اعانت معصیت میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہوگا اور اگر اس کا قصد و نیت شامل نہ ہو تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس کو علم بھی نہ ہو کہ یہ شخص گھر خرید کر اس میں فسق و فجور کرے گا، اس صورت میں یہ بیع یا اجارہ بلا کراہت جائز ہے اور اگر اس کو علم ہے تو اجارہ اور بیع مکروہ ہے پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو بغیر کسی تغیر اور تصرف کے دوسرے یہ کہ کچھ تصرف و تغیر کے بعد وہ معصیت کام میں آئے۔ پہلی صورت میں مکروہ تحریمی ہے دوسری مکروہ تنزیہی (تفصیل جواہر لفقہ ۱۶/۲۵۳)۔ اس تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی ٹور کی کمپنیاں قائم کرنا سبب بعید میں شامل ہو کر بغیر کراہت کے جائز ہوگا۔

مفتی اشرف عباس صاحب لکھتے ہیں: مفتی شفیع صاحب نے اس طرح کے مسائل پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سبب کی تین قسمیں ہیں:

”فهذه ثلاثة أقسام للسبب: قريب محرك وقريب موصل غير محرك وبعيد، فالقسم الأول من السبب القريب حرام بنص القرآن، قال تعالى: ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم

(الأنعام الآیة) والقسم الثاني من السبب القريب أعني ما لم يكن محرکاً وباعثاً بل موصلاً مخافاً حرمة وإن لم تكن منصوبة ولكنه داخل فيه باشتراك العلة وهي الإفضاء إلى الشرع المعصية ومن هذا القبيل بيع الأسلحة لأهل الفتنة وأهل الحرب فإنه سبب قريب وصورة إعانة للمعصية، وأما السبب البعيد كبيع الحديد من أهل الفتنة وبيع العنب ممن يتخذة خمرًا وبيع الآجر والحطب ممن يتخذها كنيسة أو بيعة وكذا إجارة الدابة لمن يريد سفر معصية وأمثالها إذا علم فتكون تنزيهاً (تفصيل الكلام في مسألة الإعانة على الحرام جواهر الفقه ۲۰۲۵-۲۰۲۴).

مولانا شاہ جہاں ندوی نے دیگر دیستان فقہ سے بھی استفادہ کیا ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک: ”کل ما هو سبب لمعصية محققة أو مظنونة فهو حرام“ (حاشیة البجیری علی السنہاج، کتاب البیوع، فصل فیما غنی عنه من البیوع“ (۴، ۲۸، ط: الشاملة) (ہر وہ چیز جو یقینی یا ظنی معصیت کا سبب ہو، تو وہ حرام ہے)۔

اس پر قیاس کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ اس مقصد کے لیے سیاحت کرنے والے کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں کفار اور اہل بدعت کا مقدس مقامات تک پہنچنے میں تعاون کرنا ہے، اور یہ کفر یا کم از کم معصیت پر مدد دینا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے، چنانچہ فرمان الہی ہے: ”وتعاونوا علی البر والتقوی، ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان، واتقوا اللہ، إن اللہ شدید العقاب“ (سورہ مائدہ: ۲)۔

اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف سو دکھانے اور کھلانے والے کو گناہ گار نہیں قرار دیا ہے، بلکہ تحریر یا گواہی کے ذریعہ ان کی مدد کرنے والے کو ان ہی کی طرح گناہگار قرار دیا ہے، اور اسی طرح شراب بیچنے اور خریدنے والوں ہی پر لعنت نہیں کی ہے، بلکہ نچوڑنے، نچروانے اور ڈھونڈنے والے پر بھی لعنت کی ہے۔ اور علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی سے پوچھا گیا کہ: ”اس کافر سے مشک بیچنے کا کیا حکم ہے، جس کے بارہ میں معلوم ہے کہ وہ اسے اس لیے خرید رہا ہے تاکہ اسے اپنے بت پرٹے، اور اسی طرح اس حربی سے جانور بیچنے کا کیا حکم ہے جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اسے ذبح کے بغیر کھانے کے لیے مار ڈالے گا؟ تو انہوں نے جواب دیا: ”یحرم البیوع فی الصورتین، کما شملہ قولہم: کل ما یعلم البائع أن المشتري یحیی بہ، یحرم علیہ بیعہ، لہ، وتطیب الصنم، وقتل الحیوان المأكول بغیر ذبح معصیتان عظیمتان، ولو بالنسبة إلیہم، لأن الأصح أن الکفار مخاطبون بفروع الشریعة کالمسلمین، فلا تجوز الإعانة علیہما بیع ما یمکون سبباً لفعلہما، وکالعلم هنا غلبۃ الظن“ (فتاویٰ ابن حجر الہیثمی ۲، ۲۶۰، ط: دار الفکر، بیروت)۔

نیز ان سے اس کافر کے بارہ میں پوچھا گیا جو اپنے بت کا راستہ بھٹک جائے، اور کسی مسلمان سے اس کا راستہ معلوم کرے تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے اس کی رہنمائی کرے، تو انہوں نے جواب دیا: ”لیس لہ أن یدلہ لذلك؟ لأننا لا نقر عابدی الأصنام علی عبادتہا، فإرشادہ للطریق إلیہ إعانة لہ علی معصية عظيمة، فحرم علیہ ذلك“ (مرجع سابق ۹، ۲۲۲)۔

موصوف اس تفصیل کے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ اختلاف سے بچتے ہوئے، اس مقصد سے کافر کے ساتھ معاملہ نہ کرے، بلکہ صرف تفریح کے مقصد کے لیے معاملہ کرے۔

۳۔ تفریحی مقاصد کے لئے جن وسائل کا استعمال کیا جاتا ہے، ان میں فلمیں بھی ہیں، فلموں سے فوراً ذہن ان فلموں کی طرف جاتا ہے جو آج کل سنیما ہالوں میں دکھائی جاتی ہیں، ان کا ناجائز اور حرام ہونا ظاہر ہے، کیونکہ یہ فحشاء و منکرات کو پھیلانے کا ذریعہ ہیں، لیکن فلم اصل میں تصویر کشی یا عکس بندی کا نام ہے، اور ان کا استعمال خراب اخلاق مقاصد کے علاوہ کے لئے بھی ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، چنانچہ دستاویزی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں، اسی طرح تاریخی فلمیں بھی ہوتی ہیں، تعلیمی مقاصد کے لئے بھی فلمیں بنائی جاتی ہیں، مثال کے طور پر قرآن میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، اگر متعلقہ آیات کو پڑھتے ہوئے ان مقامات کو طلبہ اسکرین پر دیکھیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے ان کے اندر اس مضمون کا زیادہ اور اک پیدا ہو سکتا ہے، اس پس منظر میں اس امر کی وضاحت فرمائیں کہ کیا مذکورہ مقاصد کے لئے فلمیں بنائی جاسکتی ہیں، نیز تعلیمی مقاصد کے لئے ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اگر کیا جاسکتا ہے تو اس کے لئے کیا شرائط ہوں گی؟

اس سوال کے جواب میں عموماً مقالہ نگاروں نے ذی روح جاندار چیزوں کی فوٹو گرافی اور تصویر کشی کی حرمت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں



احادیث و آثار نقل کئے ہیں، تقریباً تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ کوئی بھی فلم جو ذی روح کی تصویر پر مشتمل ہو تو اس کو دیکھنا اور اس طرح کی فلم سازی قطعاً ناجائز ہے، لیکن ایسی دستاویزی و تاریخی معلومات پر مشتمل فلمیں جن میں ذی روح کی تصویریں نہ ہوں اور نہ دیگر محرکات شرع امور پائے جائیں ان کو دیکھنا اور ان فلموں کو تیار کرنا درست ہے یا نہیں؟ مقالہ نگاروں نے اس جہت سے زیادہ گفتگو نہیں کی ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے بارہویں و تیرہویں سمینار میں انٹرنیٹ اور جدید ذرائع ابلاغ کو موضوع بحث بنایا تھا، اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگاروں نے تصویر کشی اور فوٹو گرافی کو بھی بحث کا موضوع بنایا تھا، ان مقالات اور سمینار میں ہونے والے مناقشات و مباحث کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، اس لئے اس جگہ ہم صرف ان ہی مقالہ نگاروں کی تحریروں سے استفادہ کریں گے جو براہ راست ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، مقالہ نگاروں کے آراء ملاحظہ ہوں:

مفتی اقبال صاحب لکھتے ہیں: خاص عنوان پر معلومات فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی فلمیں یا تعلیمی مصلحت سے مقالات وغیرہ دکھلانے کی غرض سے فلم سازی و فلم بینی الامور بمقاصد ہا کے تحت جبکہ مفاسد و موانع سے خالی ہوں اور ان سے عدم جواز کے اسباب ختم کر دیئے جائیں تو اس کی گنجائش ہوگی جیسا کہ تعلیمی ہتاش کا استعمال بچوں کی تعلیم کی غرض سے جائز ہے۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب محمد بن احمد علی کی کتاب: "احکام تصویر بینی الفقہ الاسلامی" کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں: مخلوقات کو نیہ، شمس و قمر، نجوم، جبال، بحار و اشجار و ادویہ کے تصویر سے متعلق چار اقوال ہیں: پہلا قول جواز کا ہے جو جمہور علماء و ائمہ اربعہ کا مذہب ہے۔ دوسرا قول حرمت کا ہے، ابو عبد اللہ قرطبی اور شرمہ قلیہ اس کے قائل ہیں، تیسرا قول: ان چیزوں کی تصویر کشی کی اجازت نہیں جن کی جاہلیت کے دور میں پوجا کی جاتی تھی، جیسے سورج، چاند، اور بعض درخت، اس کے قائل علامہ ابو محمد الجوبینی ہیں، چوتھا قول تمام کی کراہت کا ہے یہ قول ابو سلیمان خطابی کا ہے۔ مولانا موصوف، مفتی شفیع صاحب کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جن چیزوں کی خود تصاویر پوجی جاتی ہیں ان کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے اگرچہ غیر ذی روح میں سے ہوں لیکن جن کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی اگرچہ خود ان چیزوں کی پرستش ہوتی ہے تو ان کی تصویر جائز ہے مثلاً شمس و قمر وغیرہ۔

مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: اس وقت فلم کا انسانی ذہن و دماغ پر زبردست اثر ہے اور خیالات و جذبات پر اس کی گہری چھاپ پڑ رہی ہے اور اس سلسلہ میں عام ابتلا ہے، لہذا ہلکے ضرر کا ارتکاب کرتے ہوئے اور بڑے فساد کو دفع کرنے کی خاطر اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لئے فلم سازی کی گنجائش ہے اگرچہ یہ گھنیا کمائی ہے، البتہ ایسی فلموں میں درج ذیل شرعی ضابطوں کا پایا جانا ضروری ہے: وہ فلم تخریب کاری اور فساد انگیزی کا ذریعہ نہ ہو، اس کے مناظر شہوت بھڑکانے والے نہ ہوں، عورت کی عریاں یا نیم عریاں تصویر سے خالی ہو، عورت نامناسب کردار میں ظاہر نہ ہو، اوقات کے برباد کرنے کا ذریعہ نہ ہو، جعل سازی اور گمراہی کی تعلیم کا ذریعہ نہ ہو، کائنات کے واقعات میں کسی کو متصرف نہ دکھایا گیا ہو، عشقیہ کہانی پر مشتمل نہ ہو، اس کا مضمون جھوٹ اور فریب پر مشتمل نہ ہو، رقص سے خالی ہو، انبیاء، ملائکہ وغیرہ کی تمثیل پر مشتمل نہ ہو، حقائق کو سخ کر کے پیش نہ کیا گیا ہو وغیرہ۔

مولانا عمران ندوی لکھتے ہیں: جن چیزوں کو فلمی دنیا سے باہر دیکھنا اور سننا ممنوع ہے ان کا فلم کے اندر بھی دیکھنا اور سننا ممنوع ہوگا۔ کلام فحسندہ حسن و قبیحہ قبیح۔

مفتی جعفر علی رحمانی لکھتے ہیں: دستاویزی، تاریخی اور تعلیمی مقاصد کے لئے فلم بنانا اور تاریخی مقالات کو اسکرین پر دکھانا اس وقت جائز و درست ہے جبکہ اس میں ذی روح اور جانداروں کی تصویر سازی و تصویر کشی نہ کی گئی ہو۔

مولانا محمد رمضان علی صاحب نے ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ ان فلموں کا استعمال محض اہو و لعب اور تفریح و تماشہ کے مقصد کے لئے نہ کیا جائے، مولانا نے امام نووی کی درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے:

”وأما الشجر ونحوه مما لا روح فيه فلا يحرم صنعته ولا التمسك به سواء الشجر المثمر وغيره وهذا مذهب العلماء كافة إلا مجاهد فانه جعل الشجر المثمر من المكروه وقال القاضي: لم يقله أحد غير مجاهد“ (شرح مسلم للنووی باب تحريم تصوير صورة الحيوان)۔

مفتی اشرف عباس نے درج ذیل شرائط ذکر کئے ہیں:

۱۔ جاندار کی تصویر کشی نہ ہو۔ ۲۔ اگر آواز ہو تو صرف مرد کی آواز ہو، عورت کی آواز نہ ہو۔ ۳۔ ساز، میوزک اور گانے سے پاک ہو۔ ۴۔ اس میں حقائق کی ترجمانی ہو (نیز دیکھئے مقالہ مولانا ارشد رحمانی)۔

۵۔ موجودہ دور میں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں، کارٹون کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس طرف ہے، لیکن انسانی صورت کے خدو خال اس میں پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، کارٹون میں ایک پہلو تفریح اور مزاح کا بھی ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف: کیا کارٹون بنانا جائز ہے، یا اس کا بھی تصویر میں شمار ہوگا؟

ب: کارٹون بنانا اس وقت ایک نفع بخش ذریعہ آمدنی بھی ہے، تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

اکثر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ موجودہ دور میں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے جو کارٹون بنائے جاتے ہیں ان کے ذریعہ یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس طرف ہے، لہذا صورت بگاڑنے کے باوجود تصویر ہی ہے، چنانچہ تصویر سازی ہی کی طرح کارٹون سازی بھی حرام ہے، مزید یہ کہ اس میں استہزاء و تمسخر وغیرہ مفاسد بھی پائے جاتے ہیں جن کی حرمت خود نص قطعی سے ثابت ہے، لہذا جب کارٹون سازی حرام ہوئی تو اس کو حصول آمدنی کا ذریعہ بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا بھی شرعاً درست نہیں ہوگا۔

[دیکھئے مقالہ: مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا محمد رمضان علی، مفتی اشرف عباس، مفتی خالد نیوی، مفتی اقبال، مولانا ارشد رحمانی، مفتی رضوان الحسن، مفتی ممتاز احمد ندوی، مولانا ظفر الاسلام، مفتی عارف باللہ، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شاہد، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا مغفور باندوی اور مولانا شوکت شاکتاسی صاحبان وغیرہم]۔

البتہ بعض حضرات نے چند شرائط کے ساتھ کارٹون سازی اور اس کے ذریعہ حصول آمدنی کو جائز قرار دیا ہے، تاہم ان کے نزدیک بھی حصول آمدنی کا ذریعہ بنانا بہتر نہیں، اس رائے کے حاملین میں [مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا ناصر اللہ ندوی اور مولانا عمران صاحبان ہیں]۔

اس خلاصہ کے بعد مقالہ نگاروں نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ پیش خدمت ہیں:

مولانا ظفر الاسلام صاحب نے کارٹون کی تعریف بھی ذکر کی ہے، چنانچہ عبداللہ بن محمد الطیار کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

کارٹونسٹ کی اصطلاح میں اظہار ناراضگی کی غرض سے کسی شخص کی ایسی تصویر کر کے دیکھتے ہی ذہن ذی تصویر کی طرف چلا جائے اور لوگ ہنسنے لگیں۔

مفتی اقبال صاحب نے کارٹون سازی، اس کو فروخت کرنا اور اس کی آمدنی کے ناجائز ہونے پر درج ذیل آیات سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ویل لكل همزة لمزة الذي جمع ما لا وعدده۔

۲۔ یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسی أن یکونوا خیرا منهم۔

متعدد مقالہ نگاروں نے ان روایتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں تصویر سازی یا تصویر ساز سے متعلق وعیدیں آئی ہیں، مثلاً:

عن نافع ابن عمر أخبره أن رسول الله ﷺ قال: "الذین یصنعون الصور یعذبون یوم القیامة، یقال لهم: أحيوا ما خلقتم" (مسلم شریف باب تحریم تصویر صورة الحیوان)۔

نیز متعدد مقالہ نگاروں نے تصویر سازی کی حرمت پر فقہاء کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں: چنانچہ مولانا رمضان علی صاحب لکھتے ہیں:

"قال أصحابنا وغيرهم من العلماء: تصویر صورة الحیوان حرام شدید التحريم وهو من الكبائر، لأنه متوعد علیه بهذا الوعيد الشديد المذكور فی الأحادیث وسواء صنغہ بما یمتنه أو بغیره فصنغته حرام بكل حال لأن فیہ مضاهاة خلق الله تعالى وسواء ما كان فی ثوب أو بساط أو درهم أو دینار أو فلس أو اناء أو حائط أو غیرها" (شرح مسلم للنووی باب تحریم تصویر صورة الحیوان)۔

تصویر سازی کی ملازمت کے حرام ہونے پر مولانا رمضان علی صاحب نے علامہ شامی کی یہ عبارت پیش کی ہے:

”ولو استاجر مصورا فلا أجر له لأن عمله معصية، كذا عن محمد، ولو هدم بيتا فيه تصاویر ضمن قيمته خاليا عنها“ (رد المحتار مکروہات الصلاة)۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب عبداللہ بن محمد الطیار کے حوالہ سے لکھتے ہیں: اس طرح کی تصویر غایت درجہ حرام ہے، جس کی دو وجہیں ہیں: اول یہ کہ یہ تصویر ذی روح کی ہے، دوسرے یہ کہ اس سے خلق اللہ کی اہانت، ان کا مذاق اور استہزاء لازم آتا ہے (منہجہ الصورة: ۲۷)۔  
نیز موصوف لکھتے ہیں:

اور اگر ذی روح ایسا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی تو اس کے کارٹون کی بھی اجازت نہ ہوگی، نہایت المحتاج (۲۷۵، ۲۱) میں ہے: ”وحرّم تصوير حيوان وإن لم يكن له نظير“ موصوف ابن حجر اشقی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”ولو صورة لا ينظر لها كفرس لها أجنحة“ نیز عبد اللہ نقیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”ولو كان الصورة خيالية لاحقيقة لها كرجل له منقار أو فرس له جناحان أو ما يشبه الدببية وبعض الحيوانات أو غير ذلك مما يتخيل لعموم الأدلة الدالة على تحريم التصوير“۔

مفتی اشرف عباس صاحب لکھتے ہیں کہ عموماً کارٹون میں ایک دوسرا پہلو تفریح اور مزاح بلکہ بسا اوقات تنقیص اور تذلیل کا ہوتا ہے جو کہ شرعاً حرام ہے، ”ویکره التعريض بالكذب كقولك لرجل: كل فيقول: أكلت يعني أمس فإنه كذب“ (الهنديّة ۵۰۵۲)۔

”وكما تكون الغيبة باللسان صريحا تكون أيضا بالفعل وبالتعريض وبالكتابة وبالحرارة وبالرمز وبغمز العين والإشارة باليد وكل ما يفهم منه المقصود فهو داخل في الغيبة وهو حرام“ (حاشیہ ابن عابدین ۹۰۶۰۸)۔  
البتہ اگر کارٹون ایسا ہو جس میں صرف خاکے ہوں، چہرہ، سر وغیرہ نہ ہو یا موضع سر پر دائرہ یا اس کے مشابہ کوئی نشان وغیرہ لگایا جائے تاکہ چہرہ کے نشانات و علامات زیادہ تصویر انسان و حیوان کی ہیئت پر نہ بنائی گئی ہو تو بعض حضرات کے نزدیک اس طرح کے کارٹونس بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت عکرمہ کا ارشاد ہے: إنما الصورة الراس فإذا قطع فلا باس (المصنف لابن أبي شيبة ۲۰۳۷) [مفتی جعفر علی رحمانی، مفتی خالد نیوی]۔  
مفتی اشرف عباس نے اس کو بھی غیر مناسب قرار دیا ہے۔

اسی طرح مفتی اقبال صاحب کی رائے یہ ہے کہ ایسے چھوٹے کارٹون جو محض بچوں کے کھیل کے مقصد سے بنائے جاتے ہیں اور ان میں تصویر بھی نمایاں نہیں ہوتی اس طرح کے کارٹون بنانے، بیچنے اور ان سے کھیلنے کی گنجائش ہوگی اور ایسے کارٹون بنانے کی اجرت و ملازمت جائز ہوگی۔

”ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتأمل لا يكره“ (عالمگیری ۱۰۷، ۱)۔

جن مقالہ نگاروں نے چند شرائط کے ساتھ کارٹون سازی اور اس کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کو جائز قرار دیا ہے، ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:  
مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا ناصر اللہ ندوی۔ ان حضرات کی آراء درج ذیل ہیں:

مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: کارٹون بنانا جائز ہے کیونکہ کارٹون میں حقیقی تصویر کے خدو خال پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، نیز اس لئے کہ کارٹون کی عبادت اور تعظیم نہیں ہوتی ہے، چنانچہ جس طرح بے جان تصویر کا استثناء کیا گیا ہے، اس کا بھی استثناء کیا جاسکتا ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: والذی يظهر من كلامهم أن العلة إما التعظيم أو التشبيه والتعظيم أثم (رد المحتار كتاب الصلاة)۔

مولانا ناصر اللہ صاحب لکھتے ہیں: کارٹون اور تصویر میں ایک فرق ہے، تصویر نمایاں ہوتی ہے، اور بلا تکلف پہچان میں آ جاتی ہے جبکہ کارٹون بادی النظر میں پہچان میں نہیں آتا ہے، ان لئے کارٹون بنانا جائز ہوگا۔ موصوف قاموس الفقہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: چھوٹی تصویریں جو بتکلف پہچان میں آتی ہوں جائز ہیں، لو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتأمل لا يكره“۔

البتہ کارٹون سازی کے لئے مولانا شاہ جہاں ندوی کے نزدیک درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ سماج یا حکومت کی برائیوں پر نقد کرنے کا مقصد اصلاح ہو۔

۲۔ کسی شخص کو اذیت پہنچانا مقصود نہ ہو۔

۳۔ ایسا کارٹون نہ ہو جو متعین شخص کی غیبت یا تحقیر کی طرف اشارہ کرے۔

۴۔ عورت کے کارٹون میں اس کی عریاں یا نیم عریاں جھلک نہ ہو۔

۵۔ وہ کارٹون بد اخلاقی اور بے حیائی کو دعوت دینے والا نہ ہو۔

جہاں تک اس کو ذریعہ آمدنی بنانے اور اس کام کے لئے ملازمت کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں مولانا نصر اللہ ندوی اور مولانا شاہ جہاں ندوی صاحبان کی رائے یہ ہے کہ یہ گھٹیا ذرائع آمدنی میں سے ہے، اس لئے اس کو ذریعہ آمدنی بنانا بہتر نہیں۔

۶۔ جیسے کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور فرضی حکایتیں مرتب کی جاتی ہیں، اسی طرح ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ ڈراما بھی ہے،

جس میں مختلف افراد بطور کردار کے شامل ہوتے ہیں اور وہ متعین جملوں کو ادا کرتے ہیں، آج کل دینی مدارس کے پروگراموں میں بھی مکالمات کی صورت مروج ہو گئی ہے، یہ بھی اس میں شامل ہے، ڈرامہ غیر اخلاقی مقاصد کے لئے بھی کیا جاسکتا ہے اور بہتر مقاصد کے لئے بھی، لیکن اس میں جو کچھ کہا جاتا ہے یا ڈرامہ میں شامل مختلف لوگوں کے درمیان جو رشتے ظاہر کئے جاتے ہیں وہ عام طور پر فرضی ہوتے ہیں؛ البتہ سامعین کو اس سے دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ بھی اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ ایسے ڈرامے اسٹیج کرنا جن میں محرمات شرعیہ نہ پائے جائیں صالح مقاصد کے تحت جائز ہیں، البتہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایسے ڈرامے اسٹیج کرنا بھی درست نہیں۔

مقالہ نگار حضرات کی تحریریں پیش خدمت ہیں:

مولانا اسرار الحق سبیلی لکھتے ہیں: ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا، اس میں زندگی کے واقعات محض بیان کرنے کے بجائے کر کے دکھائے جاتے ہیں (ڈاکٹر سید عابد حسین۔ انشائیات)۔

مولانا رمضان علی لکھتے ہیں: فرضی کہانی یا اشعار کا سننا درست ہے جبکہ اس سے سامعین کو دھوکہ نہ ہو مگر ان فرضی کہانیوں کو ڈرامہ اسٹیج کی شکل میں پیش کرنا چند شرائط کے ساتھ درست ہے:

۱۔ کوئی امر خلاف شرع نہ ہو، ۲۔ رول ادا کرنے والوں میں کوئی لڑکی یا اجنبی عورت نہ ہو، ۳۔ ڈرامے میں کسی عالم یا صوفی کا رول ادا نہ کیا جائے۔

مولانا رمضان علی صاحب نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں قصیدہ بردہ کو پیش کیا ہے کہ آپ ﷺ کا حضرت کعب بن زہیر سے اس قصیدہ کو سننا ثابت ہے۔

مفتی اقبال صاحب لکھتے ہیں: ڈرامہ یا مکالمہ اگر کسی واقعی موضوع کو اس میں اختیار کیا جائے اور سامعین کو لطف اندوز کرنے کے لئے اس میں ڈرامائی انداز اختیار کیا جائے بشرطیکہ اس میں حق اور اہل حق کا استہزاء نہ ہو، بلکہ باطل یا اہل باطل کی تضحیک مقصود ہو تو ایسے جائز موضوع کو تفریحی انداز میں پیش کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ یہ ڈرامے و مکالمے بنی بر حقیقت ہوں اور کوئی شرعی مفسدہ نہ ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

مفتی خالد نیوی لکھتے ہیں: بہتر مقاصد کے لئے اگر ڈراما اسٹیج کیا جائے تو ان شرائط کے ساتھ اس کی اجازت ہے: ۱۔ دھوکہ نہ ہو۔ ۲۔ موسیقی کا استعمال نہ ہو۔ ۳۔ کسی مومن کی کردار کشی نہ کی گئی ہو۔ ۴۔ شکلیں نہ بگاڑی جائیں۔ ۵۔ انہماک نہ ہو۔ ۶۔ مردوزن کا اختلاط نہ ہو۔

مفتی جعفر علی رحمانی لکھتے ہیں: آج کل دینی مدارس اور اصلاحی پروگراموں میں جو مکالمات اور ڈرامے منعقد کئے جاتے ہیں ان میں معاشرے کے مفاسد پر تنقید اور خرابیوں پر مطلع کر کے ان کے اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے، شرعاً اس طرح کے مکالمات اور ڈرامے جائز ہونے چاہئیں، بشرطیکہ ان میں ضروریات دین و عقائد پر زور نہ پڑتی ہو، اور محرمات شرعیہ میں سے کسی محرم کار تکاب نہ ہوتا ہو، مثلاً تالییاں پیٹنا، بیٹیاں بچانا اور کسی کی تحقیر و تذلیل کرنا۔

موصوف نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں درج ذیل آیت و فقہی عبارتیں پیش کی ہیں:

۱۔ وما كان صلواتهم عند البيت إلا مكاء وتصدية (سورہ انفال: ۳۵)۔

کرہ کل لہو، ائی کل لعب وعبث... والإطلاق شامل لنفس الفعل كالرقص والسخرية والتصفیق فإفها کلها مکروهة لأفها ذی الکفار (رد المحتار المظفر والاباحه)۔

مولانا شاہ جہاں ندوی متعدد دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فرضی ڈرامہ لکھنا اور اسٹیج کرنا جائز ہے، جبکہ اخلاق فاضلہ کی تعلیم، اچھائی کی عادت ڈالنے، بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید جیسے اچھے مقاصد کے لئے ہے۔

مولانا اسرار الحق سیبلی لکھتے ہیں: بہتر کاموں کی ترغیب، حق و باطل کی تمیز اور معاشرہ کے مفاسد و منکرات پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے، دینی مدارس میں اس کی مثال مناظرہ کی مشق اور مکالمات ہیں۔ [مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا لطیف الرحمن ولایت علی]۔

مولانا اسرار الحق سیبلی نے استدلال میں یہ آیت پیش کی ہے: ۱۔ "و جادلہم بالتی ہی أحسن" (النمل: ۱۲۵)۔

مفتی اشرف عباس نے ڈرامہ کے جواز کے لئے درج ذیل شرائط ذکر کئے ہیں:

۱۔ مکالمے کا مرکزی خیال خیال شرعی ہو۔ ۲۔ تاریخی واقعے کی منظر کشی میں ہو، ہوتا رہنمائی میں کی جائے کذب یا مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا جائے۔ ۳۔ ڈرامہ محرمانہ پر مشتمل نہ ہو۔ ۴۔ مقدس ہستیوں کی تمثیل نہ کی جائے (الفتاویٰ الاسلامیہ ۲۰۰۷، ۲۰۰۸)۔ [مفتی لطیف الرحمن، مولانا عبید اللہ ندوی]۔

مفتی اشرف عباس صاحب نے تمثیل کے جواز پر الفتاویٰ الاسلامیہ کے حوالے سے متعدد دلائل ذکر کئے ہیں:

۱۔ سورہ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وھل أتاک نبؤ الخضر الخ۔ ان آیات میں ملائکہ سے جو کچھ بھی صادر ہوا وہ محض ایک تمثیل تھا۔

۲۔ حضرت جبریل علیہ السلام بسا اوقات حضرت وحیہ کی شکل میں یا کسی اور مسائل کی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے تھے۔

مولانا محمد عمران ندوی نے مسجد نبوی کے صحن میں حدیثوں کی نیزہ بازی کو استدلال میں پیش کیا ہے کہ اس میں جنگی مقابلہ کی تمثیل ہے، [مفتی طارق انور قاسمی] البتہ بعض عرب عالم مثلاً احمد بن صدیق الغماری الحسینی وغیرہ تمثیل کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ کذب محض ہے۔ [مفتی اشرف عباس]۔

مولانا ظفر الاسلام صاحب کی رائے یہ ہے کہ ڈرامے اسٹیج کرنے میں کلام ہے چنانچہ موصوف لکھتے ہیں: مقاصد اگر صالح ہوں لیکن وسائل حرام ہوں تو اس صورت میں وہ مقاصد بھی حرمت کے دائرہ میں آجاتے ہیں، اس طرح کے پروگرام سے عبرت یا اصلاح تو دور رہی صرف ایک مضحکہ کی صورت ہوتی ہے، لہذا اس کے جواز میں کلام ہے۔ [مفتی شاہ صاحب]۔

مولانا عبید اللہ ندوی لکھتے ہیں کہ ایسے ڈرامے اور فلم میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ فلم میں تصویر ہوتی ہے اور ڈرامہ جیتے جاگتے انسانوں کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے ڈرامہ میں تصویر کشی کا گناہ نہیں ہوتا باقی وہ سب گناہ پائے جاتے ہیں جو فلم کے بارے میں بیان کئے گئے۔

البتہ وہ ڈرامے جو محرمانہ پر مشتمل ہوں اور شرعی حدود و قیود سے آزاد ہوں تو اس کی تحریم پر اہل علم کا اتفاق ہے، مثلاً اس میں غلط افکار کی آمیزش ہو یا وہ غلط عقائد کی طرف داعی ہو وغیرہ، ایسا ڈرامہ تیار کرنا یا اس میں معاون بننا اور اس کو دیکھنا جائز نہیں ہے (الفتاویٰ المصریہ ۱۰/۳۵۳۶-۳۵۳۷-۳۵۳۸-۳۵۳۹)۔

☆☆☆

## عرض مسئلہ:

تفریح۔ اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط  
(سوال نمبر: ۱)

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی علیہ

الحمد لله وحده والصلوة والسلام على من لا نبى بعده وبعد!  
حضرت صدر علمائے اجلہ اکابرین امت۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس عاجز کو تفریح۔ اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط سے متعلق سوالنامہ (۱) کے تحت پیش کردہ مقالات پر عرض کی ذمہ داری دی گئی تھی، اس موضوع کی بابت کل بیس حضرات کے مقالات موصول ہوئے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں: مولانا محمد حسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی حنیف، مفتی محمد داؤد، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی ممتاز احمد خان ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی، مفتی لطیف الرحمان، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی اشرف عباس، مفتی طارق انور قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا محمد یوسف علی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی اقبال احمد قاسمی، ظفر الاسلام، مولانا خالد حسین نیوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عبد الجبار طیب ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی۔

پہلا سوال چھ شقوں الف، ب، ج، د، ہ، و پر مشتمل ہے۔

پہلی شق یوں ہے: کیا مزاح جائز ہے اور جائز ہے تو اس کے حدود کیا ہیں؟

تمام مقالہ نگار حضرات قیود و شرائط کے ساتھ مزاح کے جواز کے قائل ہیں، ان کے یہاں ایسا مزاح مباح ہوگا جس میں جھوٹ، مبالغہ، افراط، مداومت، ایذا رسانی، کذب، فحش، سخریہ وغیبیت و استہزاء اور صرف مقصد ہنسنا ہنسانا اور تضحیح اوقات نہ ہو۔ نیز جس میں معارف و مزامیر و اختلاط مرد و زن نہ ہو، گذشتہ لوگوں کے قصے جن کی کوئی اصل نہ ہو اس سے استہزاز ہو اور جن کی اصل تو ہو اور اسے بطور مثال یا نصیحت یا تعلیم کی غرض سے سنایا جائے تو حتی الامکان ہو، ہونقل کیا جائے، زینت کی غرض سے کسی زیادتی نہ کرے، تمام حضرات نے اپنے اپنے طور پر جو شرائط لکھی تھیں انہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ مولانا شوکت ثناء قاسمی نے کچھ شرطیں بحوالہ موسوعۃ الاسرة المسلمہ ۳۵۵/۱۲ لکھی ہیں، وہ یہ ہیں: ”اختیار الوقت والمكان هناك اوقات وأماكن لا يجوز فيها الضحك والمزاح واللغو مثل أوقات الصلوة وعند زيارة المقابر وعند ذكر الموت وعند قراءة القرآن وعند لقاء الأعداء وفي أماكن العلم“ اور اگر کوئی دینی مصلحت، دلجوئی اور مانوس کرنا مطلوب ہو تو مستحب ہوگا اکثر حضرات نے تحدید کے سلسلہ میں فتح الباری ۶۳۵/۱۰ کی عبارت ”فان صادف مصلحة مثل تطيب نفس المخاطب وموانسته فهو مستحب“ پیش کی ہے۔ مفتی ممتاز احمد ندوی نے فتح الباری ہی کی دوسری عبارت ”قلت بجمع بينهما بان المنهى عنه مافيه افراط ومداومة عليه... والذي يسلم من ذلك فهو مباح“ (۱۶۹/۲۲) تحریر فرمائی ہے۔ مفتی غلام اللہ کاوی نے ”الاول... وانه من اشتغل به الهاء عن ذكر الله وحده وعن الصلوة والمساجد التحق ذلك بالمنهى عنه لاشتراك العلة فكان حراما أو مكروها والغاي ماليس كذلك فهو أيضا ان اشتغل به بنية التلهي والتلاعب فهو مكروه وان اشتغل به لتحصيل تلك المنفعة وبنية استجلاب المصلحة فهو مباح بل قد يرتقي الى درجة الاستحباب أو اعظم منه“ (تكملة فتح الملهم ۲۲۵، ۲۲۶) کی عبارت اور مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد یوسف علی،

۱۔ شیخ الحدیث و پرنسپل جامعہ دارالعلوم منو۔

مفتی اشرف عباس، مولانا عبید اللہ ندوی لاکھنؤوی کی عبارت ”المزاح المنہی عنہ هو الذی فیہ إفراط ویداوم علیہ فإنہ یورث قسوة القلب ویشغل عن ذکر اللہ تعالیٰ ویوؤل فی کثیر من الأوقات إلی الایذاء ویورث الأحقاد ویسقط المہابة والوقار فأما من سلم من هذه الأمور فهو المباح الذی کان رسول اللہ ﷺ یفعلہ علی الندرۃ لمصلحة تطیب نفس المخاطب وموانستہ وهو سنة مستحبة فاعلم هذا فإنہ مما یعظم الاحتیاج إلیہ“ سے استدلال کرتے ہیں، نیز مولانا محمد مغفور باندوی ہندیہ کی عبارت ”لابأس بالمزاح بعد أن لا یتکلم الإنسان بکلام یأثم بہ أو یقصد بہ إضحاک جلسانہ کذا فی الظہیریۃ“ (۳۵۳/۲) کو مستدل بناتے ہیں، نیز مولانا موصوف نے دوروایات، بحوالہ کنز العمال ”روحوا القلوب ساعة فساعة، الہوا والعبوا فإنی أکرہ أن یرى فی دینکم غلظة“ پیش فرما کر ان پر فطلی روایت کا اطلاق کیا ہے جبکہ کنز العمال ۱۸۳۳ کتاب الاخلاق قسم الاقوال اور دوسری کے متعلق ۱۵/۹۲ پر کتاب اللہو والتغنی من قسم الاقوال کی صراحت موجود ہے۔

جزء ”ب“ تھا کہ مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا کیا جائز ہوگا؟

مولانا محمد عمران ندوی نے جواز کا قول فرمایا ہے جبکہ مولانا عارف باللہ قاسمی محرمات سے خالی کر کے چند گھنٹوں کی اجازت دیتے ہیں اور استدلال میں مسند احمد بن حنبل کی روایت ”عن عائشة أبی أبی بکر دخل علیہا والنبی عندها یوم فطر أو أضحیٰ وعنده قینتان تغنیان بما تقاولت الانصار یوم بعثت“ (۲۱۰/۱۰) پیش فرماتے ہیں۔ مولانا محمد شاہ جہاں ندوی کے یہاں شرعی ضوابط جو مذکور ہوئے ان کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی کبھار کئی کئی گھنٹوں یہ پروگرام منعقد کرنا جائز ہے، مولانا مفتی محمد حنیف و مفتی محمد داؤد کی بھی یہی رائے ہے مگر فی زمانہ اجازت نہیں دیتے، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی کے نزدیک جھوٹ، ٹھٹھا، غفلت سے خالی ہو تو جائز ہے، مفتی ممتاز احمد ندوی اور مفتی اقبال احمد نے کراہت کا قول فرمایا ہے، اول الذکر نے جدید فقہی مسائل حصہ دوم ۱۹۲ سے استدلال کیا ہے تو ثانی الذکر نے وجہ کراہت سات مفسد کا پایا جانا قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی مقالہ نگار حضرات عدم جواز کے قائل ہیں عارض کی بھی یہی رائے ہے۔ لہذا اس سلسلہ میں کل چار نقاط نظر ہیں: (۱) جائز ہے (۲) ناجائز ہے (۳) کبھی کبھار منعقد کیا جاسکتا ہے (۴) کراہت ہے۔ عدم مجوزین کے دلائل اس طرح ہیں: مفتی غلام اللہ کاوی نے روح القلوب سلمۃ فسلمۃ، مفتی لطیف الرحمان نے ”ومن الناس من یشتری لہو الحدیث“ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے ”فأعط کل ذی حق حقہ“ (بخاری ۲۶۳۱) اور امام مالک کے قول ”لکل شیء وفاء وتطفیف“ سے استدلال کیا ہے، مولانا محمد یوسف علی کے یہاں اس میں اسراف اشحاک انفاق کثرت مال ہے۔ اس لئے بنی علی الفاسد فاسد ہے، مفتی خالد حسین نیوی ”من حسن اسلام المرء ترک ما لا ینعیہ“ (ترمذی) سے استدلال کرتے ہیں، مولانا عبدالجبار طیب ندوی لکھتے ہیں: ”مباح ہوتے ہوئے مفسدہ کا باعث ہے درء المفسدہ اولیٰ من جلب المصلح“ مفتی محمد شاہ قاسمی لکھتے ہیں: ”صرف مردوں کے پروگرام ہوں اور مفسد سے خالی ہوں تو گھنٹہ دو گھنٹہ کی اجازت ہو سکتی ہے گھنٹوں پروگرام چلانے کی اجازت نہیں کہ نماز، تلاوت قرآن و ذکر اللہ سے غافل کر دے۔“

اب عرض ہے کہ اس طرح کے پروگرام میں پیہم مفسد پائے جاتے ہیں: (۱) عموماً یہ رات میں منعقد کئے جاتے ہیں جن میں اکثر پوری رات گزر جاتی ہے جبکہ سمر بعد العشاء کی امر مباح میں بھی کراہت ہے، امام بخاری نے ایک باب ہی مایکرہ من السمر بعد العشاء قائم فرمایا ہے، جس کے تحت علامہ عینی رقم طراز ہیں: ”ومرادہ من السمر ما یکون فی امر مباح واما المحرم فلا اختصاص لہ بوقت بل ہو حرام فی جمیع الاوقات“ (عمدة القاری ۵۰۹۵) گو کہ عینی چند مقامات پہ سہر کی اجازت دیتے ہیں وذلک لان السهر فی التی لا مصلحة فیہا اما مافیہ مصلحة خیر فلا کراہة فیہ وذلک کمدارسة العلم وحکایات الصالحین ومحادثة الضیف والعروس للتانیس ومحادثة الرجل اہلہ وأولادہ للملاطفة والحاجة ومحادثة المسافرین لحفظ متاعہم أو أنفسہم والحديث فی الاصلاح بین الناس والشفاعۃ إلیہم فی جزء الامر بالمعروف والنہی عن المنکر والارشاد إلی مصلحة ونحو ذلک وکل ذلک لا کراہة فیہ“ (عمدة القاری ۵۰۲۹) (۲) کئی کئی گھنٹوں پروگرام کے باعث مہمات دین و امور دنیوی کا متاثر ہونا یقینی ہے، اس لئے اس کے لہو الحدیث ہونے اور فیصل یا دوسری قرأت فیصل خود بھی ضلالت میں جا پڑنے اور دوسروں کی ضلالت میں ڈالنے کا باعث بن سکتا ہے۔

(۳) مزاح وسیلہ ہے نہ کہ مقصد اس کی ضرورت کے تحت اجازت ہے اور جو چیز بوقت ضرورت ہوتی ہے وہ بقدر ضرورت رہتی ہے ”لیبتن اقوام من امتی علی اکل ولہو وغناء ثم یصبحون وقد مسخوا قردة وخنزیر“ (رواہ احمد فی مسندہ) مذکورہ حدیث بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

(۴) مباحات جب حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتے ہیں تو حرمت و کراہت کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں "مایو دی الی الحرام فهو حرام" اور اسلامی تعلیمات نے جو ڈھانچہ نظام انسانی کا قائم فرمایا ہے وہ معطل ہو کر رہ جائے گا اسی نظام انسانی کی بقا کی غرض سے عبادات شرعیہ کی انواع امر و وجوب و استحباب بیان کر کے حد بندی کر دی گئی ہے تاکہ اعتدال باقی رہے۔

(۵) درء المفسد جلب منافع سے مقدم ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر کئی کئی گھنٹوں کی میرے خیال میں گنجائش نہیں ہونی چاہئے کیوں کہ اس صورت میں جملہ خرابیاں لازم آئیں گی جن کا تذکرہ بعض مقالہ نگار حضرات نے کتاب الاذکار للنووی ص ۳۲۶ کے حوالہ سے کیا ہے اور راقم نے بھی دیگر حوالوں سے تحریر کیا ہے۔ ہاں وقت قلیل میں اس کے انعقاد کی اجازت دینی چاہئے کیوں کہ فقہاء کے یہاں قلیل و کثیر کے احکامات جدا گانہ ہیں ہندیہ میں ہے: ولو خلط لبن الادمی بلبن الشاة لبین الادمی غالب تثبت الحرمة (ہندیہ مع خانہ ۱۲۲۲)۔ وان خرج من نفس الفم تعتبر الغلبة بينه وبين الریق فإن تساویا انتقض الوضوء ويعتبر ذلك من حيث اللون (ہندیہ مع خانہ ۱۲۲۲)۔ اسی طرح میت پر عم منانے کی اجازت ہے، فرقع الی رسول اللہ الصبی ونفسه تنقطع ففاضت عيناه، فقال سعد: يا رسول الله ما هذا؟ قال: هذه رحمة يجعلها الله في قلوب عباده، ليس منا من ضرب الحدود وشق الحیوب" لیس منا من سکن وحلق وخرق (نملی، ۲۰۶، بخاری و مسلم و ترمذی نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ایک عالم نے ۲۴ عجیب و غریب سوالات بھیجے جن کے جوابات مطلوب تھے۔ جب حضرت ابن عباسؓ کے پاس یہ سوالات پہنچے تو پڑھ کر متحیر رہ گئے جن میں ایک سوال یہ بھی تھا خبرنی عن شیء قلیلہ حلال و کثیرہ حرام تو آپ نے اس کا جواب دیا: أما الشیء الذی قلیلہ حلال و کثیرہ حرام فهو نھر طالوت الذی ابتلاهم اللہ به (مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر ۱۲، ۲۱۷)۔ رئیس المفسرین نے اس کا جواب آیت قرآنی: فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ متبلیکم بنهر فمن شرب منه فليس مني ومن لم يطعمه فانه مني الا من اغترف غرفة بيده (سورۃ البقرہ آیت: ۲۴۹) کی روشنی میں دیا۔

(۱) ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنا انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے کیسا عمل ہے؟

سبھی مقالہ نگار حضرات لکھنے پڑھنے، شائع کرنے اور ان کی خرید و فروخت کو جواز و عدم جواز کی بابت ایک درجہ میں رکھتے ہیں جبکہ مفتی شاہد حسین قاسمی مزاحیہ کہانیوں کے پڑھنے کی تو اجازت دیتے ہیں لیکن اس کے لکھنے، شائع کرنے و خرید و فروخت کی اجازت نہیں دیتے۔ موصوف نے در مختار علی الرد ۶۸/۹ کی عبارت ومن السحت مایؤخذ علی کل مباح، اور ومن الناس من يشتري لهو الحديث سے استدلال کیا ہے۔ مولانا محمد احسن عبداللہ ندوی مولانا شوکت ثناء قاسمی کے یہاں اگر کہانیاں نصیحت آمیز و عبرت آموز ہوں اور فرائض منصبی سے غفلت نہ ہو تو درست ہے، مفتی محمد خالد حسین نیوی مزاحیہ کہانیاں جو موعظت و نصیحت پر مشتمل ہوں، مزاح اس میں فنی طور پر ہو یا مزاح کے پہلو بہ پہلو حکمت و موعظت اور سبق آموز باتیں ہوں تو ایسی کہانیاں لکھنے کی گنجائش ہے الحکمة ضالة المؤمن فاینما وجدها فهو احق بها بشرطیکہ فرائض و واجبات و سنن و دیگر امور سے غفلت کا سبب نہ بنیں موصوف نے مشہور حدیث ام زرع بھی پیش فرمائی ہے نیز آپ نے ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی حاظی کی کتاب الجلاء اور عبداللہ بن مقفع کی کلیلہ و دمنہ کے مطالعہ کی ترغیب بھی دلائی ہے، مفتی محمد حنیف و مفتی محمد داؤد کے یہاں عورت و مرد کو موضوع بنا کر عشقیہ گفتگو کی گئی، تو درست نہیں، مفتی ممتاز احمد ندوی کے یہاں جھوٹ کی آمیزش کی وجہ سے درست نہیں ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان مولانا محمد مغفور باندوی بھی عدم جواز کے قائل ہیں اور ما ألهاکم عن ذکر الله فهو میسر (طبری ۳۶۰/۲) سے استدلال کرتے ہیں۔ مفتی محمد طارق کہتے ہیں چونکہ اس میں مقصد صرف اضحاک ہے اس لئے درست نہیں۔ ڈاکٹر بہاء الدین، مولانا رضوان احسن، مفتی اشرف عباس اور مولانا عبید اللہ ندوی عدم جواز کی دلیل امام غزالی کی عبارت ومن الغلط العظیم أن يتخذ الإنسان المزاح حرفة وغيره پیش کرتے ہیں۔ مفتی اقبال احمد لکھتے ہیں: مزاحیہ لٹریچر جو حقائق سے لبریز ہو محض انداز کلام مزاحیہ اور تفریح آمیز ہو تو اس کی گنجائش ہوگی جس کا لکھنا پڑھنا جائز ہوگا اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہوگی۔ آپ نے کتاب الحمقاء و کتاب الاذکیاء و حضرت تھانوی کی الطائف و ظرائف کے مطالعہ کا مشورہ دیا ہے۔ مفتی غلام اللہ کادی لکھتے ہیں: حدود شریعت کی رعایت کرتے ہوئے لکھنا پڑھنا شائع کرنا خرید و فروخت سبھی درست ہے۔ راقم کا بھی یہی خیال ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی کی بھی یہی رائے ہے مگر وہ ایسا پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جس میں اس کا سماج کا اور پوری قوم کا فائدہ ہو۔ عبدالجبار طیب ندوی کا بھی یہی خیال ہے مگر وہ فی زمانہ ذہنی عیاشی اور ضیاع وقت کے باعث عدم جواز کے قائل ہیں، مفتی عارف باللہ قاسمی کے یہاں اس بابت بڑا توسع ہے، ان کے یہاں اگر ضرور ضروریات



دین و دنیا سے غفلت نہ ہو تو محض تفریح و تفریح کے لئے یقینی طور پر چھوٹی بات بطور ضرب الامثال و مواعظ وغیرہ اور ایسے قصے جن میں کوئی فائدہ نہ ہو صرف تسلی مقصود ہو تو وقت کا لحاظ کرتے ہوئے قلیل کی اجازت ہے حدثوا عن بنی اسرائیل یفید حل سماء الأعاجیب والنرائب من کل ما لایتقین کذبہ بقصد الفرجة لا الحجة بل وما یتقین کذبہ لکن لقصد ضرب الامثال والمواعظ وتعلیم نحو الشجاعة علی لسان الآدمیین والحيوانات (در مختار علی مامش الرد ۶، ۴۰۳) وأما اذا كانت هذه القصص لافائدة من قرائتها وإنما المقصود منها التسلية فلا مانع منها ایضا ما لم تشتمل علی ضرر لکن ینبغی الاقلال منها حفاظا علی الوقت (فتاویٰ الشبكة الاسلامیة للشیخ دکتور عبد اللہ الفقیہ نمبر ۲۵۲۹۱)۔

اس عاجز کے نزدیک ان حضرات کی رائے انب معلوم ہوتی ہے جنہوں نے حدود شرع کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھنے پڑھنے، شائع کرنے اور خرید و فروخت کی اجازت دی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے کتوں کے پالنے سے منع کرنے کے باوجود چند مقاصد کے تحت ان کا رکھنا جائز قرار دیا ہے۔ من اتخذ کلبا لالکلب صید اوزرغ اوماشیہ انتقص من أجره کل یوم قیراط (بخاری کتاب الحرث باب اقتناء الکلب ۲۳۲۳۔ صحیح مسلم کتاب المساقاة باب الامر تقبل الکلاب ۱۵۷۵، سنن ابی داؤد، کتاب الصيد باب اتخاذ الکلب للصيد وغیرہ ۲۸۴۳)۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ عینی کی تحریر ملاحظہ ہو ”فیہ اختلاف العلماء فقال الحسن وریعة وحماد بن ابی سلیمان والاوزاعی والشافعی واحمد وداؤد ومالک فی روایة ثمن الکلاب حرام وقال عطاء بن ابی رباح وابراہیم النخعی وأبو حنیفة وأبو یوسف ومحمد وابن کنانة وسحنون من المالکیة والکلاب التي تنتفع بها یجوز بیعها وبیاع اثمها ... واجاب الطحاوی عن النہی فی هذا الحدیث وغیره انه کان کان حین کان حکم الکلاب أن تقتل وكان لا یجمل امساکها ... فما کان علی هذا حکم فثمنه حرام ثم لما ابيح الانتفاع بالکلاب للاصطياد ونحوه ونهی عن قتلها نسخ ما کان من النہی عن بیعها وتناول ثمنها“ (عمدة القاری ۱۲، ۵۹)۔ لہذا جس طرح شرعی اجازت سے کتوں کا سن مباح ہو گیا، اسی طرح حدود شرع میں رہتے ہوئے ان کے لکھنے پڑھنے، شائع کرنے اور خرید و فروخت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

(۱)۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟

مفتی الطیف الرحمان ومولانا محمد یوسف علی ان دونوں حضرات نے شامی کی عبارت من السحت ما یؤخذ علی کل مباح کملح وکلاً وماء ومعاون وما یأخذہ غاز لغز و وشاعر لشعر ومسخرة وحکواتی (الدر المختار علی الرد ۶، ۹۰۷)۔ سے استدلال کرتے ہوئے حرام قرار دیا ہے نیز من الناس من یشتری لہو الحدیث کے تحت لہو میں داخل فرمایا ہے، مفتی رضوان الحسن، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عبدالجبار طیب ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا محمد مغفور باندی ومفتی غلام اللہ کاوی کے یہاں بھی درست نہیں۔ آخر الذکر لکھتے ہیں، تمنع الخلو والافہامک فیہا بیعت یضر المعاش والمعاد (تکملہ فتح الملہم ۴، ۴۲۳)۔ مفتی ممتاز احمد ندوی لکھتے ہیں: پیشہ بنانا جائز نہیں، جھوٹ طنز و تشنیع سے خالی ہوتی ہے احتیاط بہتر ہے، مفتی طارق انور کے یہاں بھی عدم جواز ہے اتخاذ النشاطات المزاحیة حرفة ووظيفة واخذ الاجرة علیہا غیر جائز لکونھا محرمة والاجرة علی الحرام حرام۔ مولانا محمد احسن عبداللہ ندوی، مفتی اقبال احمد، مفتی اشرف عباس کا خیال ہے کہ پیشہ بنالینا مکروہ ہے اور اس کی اجرت بھی مکروہ ہوگی، آخر الذکر لکھتے ہیں پیشہ بنالینے میں قباحت ہے البتہ یہ قباحت لغیرہ ہے لہذا اس کی اجرت مکروہ ہوگی موصوف نے بھی امام غزالی کی تحریر ومن الغلط العظیم الخ نیز مرقاۃ المفاتیح ۲/۲۹۹ کی عبارت سے استدلال فرمایا ہے، ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی کی تحریر اس طرح ہے: اگر ذکر کردہ شرائط کے مطابق ہو تو پیشہ بنالینا درست ہے مگر اس کی کمائی گھٹیا ہے موصوف نے اسے حجامت سے تشبیہ دیکر بحوالہ بخاری ۵۶۹۶، مفتی لابن قدامہ کتاب الاجارة ۵/۵۳۰، بدائع ۱۹۰۴ غیر مستحسن قرار دیا ہے نیز کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، مفتی عارف باللہ قاسمی مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی محمد حنیف ومفتی محمد داؤد اور اس عاجز کا خیال ہے کہ حد جواز میں رہتے ہوئے پیشہ بنالینے اور اس کی اجرت وصول کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ آگے مولانا مفتی محمد حنیف ومفتی محمد داؤد لکھتے ہیں کہ البتہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس میں کذب کی آمیزش نہ ہو لہذا جائز نہیں۔

(۱) تفریح و تفریح کے لئے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام بھی منعقد کئے جاتے ہیں جن کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے۔ کیا اس طرح کے ڈرامے لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا درست ہے؟

مقالہ نگاروں کی آراء اس طرح ہیں: مولانا محمد مغفور باندوی کے یہاں جائز نہیں وہ ہندیہ کی عبارت لا بأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلامه يأنثر به أو يقصد به اضحاح جلسائه كذا في الظهيرية (۳۵۴/۲) سے استدلال کرتے ہیں، مفتی ممتاز احمد کی بھی یہی رائے ہے، موصوف اپنے مدعا پر (مجمع الزوائد ۸/۸۹) کے حوالہ سے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے کوئی بات کہی جائے تو آدمی اس کی وجہ سے آسمان سے بھی زیادہ دوری پر گر جاتا ہے، مفتی اشرف عباس بھی محض تفریح طبع کے لئے اس کا لکھنا، پروگرام کرنا اور دیکھنا درست قرار نہیں دیتے، مفتی عارف باللہ کی بھی یہی رائے ہے، کیوں کہ ان میں بے شمار محرمات ہیں البتہ وہ ڈرامے جو ان ممنوعات سے خالی ہوں، اور انہیں وعظ و تبلیغ کے پیش نظر کیا جائے اور اس کے ذریعہ کسی اخلاق یا کسی عمل کی تعلیم دی جائے وہ جائز ہیں جیسا کہ مدارس میں مکالمے اور محادثے، مفتی رضوان الحسن مظاہری لکھتے ہیں: نئی نسل کے ذہن کو بگاڑنے اور ان میں مجرمانہ ذہنیت پیدا کرتے ہیں اس میں رقص و سرور ہوتا ہے ان الذین یحبون أن تشیع الفاحشة في الذين آمنوا لهم عذاب أليم (سورہ توبہ)، مفتی شوکت ثناء قاسمی ان میں پائے جانے والے سات مفاسد کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں، البتہ اگر کوئی ایسا مزاحیہ پروگرام پیش کیا جائے جو غیر شرعی امور پر مشتمل نہ ہو تو اس کی گنجائش ہوگی، اسی مفاسد کے باعث مفتی اقبال احمد نے اشد کراہت کا قول فرمایا ہے۔ مفتی خالد حسین نیوی کے نزدیک یہ مجلس تہنہ کی مجلس قائم کرنا درست نہیں۔ ظفر الاسلام کے خیال میں یہ پروگرام چند در چند خباثت و مفاسد پر مشتمل ہے، اس لئے عدم جواز کا قول ہونا چاہئے۔ راقم الحروف نے شیخ بکر بن عبداللہ ابو زید کی کتاب حکم التمثیل حقیقہ و تارتخ و حکمہ نیز شیخ شریف بن علی الراجھی کی کتاب طوفان البلاء التمثیل والغنا کے حوالہ سے اس کی قباحت اپنے مقالہ میں تحریر کر دیا ہے۔ مفتی محمد حنیف و مفتی محمد داؤد کے نزدیک محرمات سے اگر خالی ہو تو دیکھنا اور سننا درست ہے۔ مفتی غلام اللہ کاوی قلیل مدت میں یہ سب درست ہیں۔ نیز ایک دوسری تحریر (تکملة فتح الملہم ۴/۲۲۲) ترویح القلب و تفریحہ کذا تمرین البدن من الارتفاقات المباحة و المصالح البشرية التي لا تمنعها الشريعة السمحة برأسها نعم تمنع الغلو و الإفراط و یضر المعاش و المعاد سے استدلال کیا ہے، موصوف آگے لکھتے ہیں: مزاحیہ ڈراموں کے پروگرام میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ مستحب اور مستحسن ہے مگر اتنا طویل نہ ہو کہ معاش و معاد کے لئے مضر ہو۔ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے پانچ شرطوں کے ساتھ جواز کا حکم فرمایا ہے، اس پر استہزاء و سخریہ نہ ہو عیب جوئی، سخت تنقید، تہمت، برے القاب سے پکارنا کسی کو خوف زدہ یا دہشت زدہ کرنا نہ ہو، ہنسانے کے لئے دروغ گوئی سے کام نہ لیا گیا ہو، غیر اقوام کی مشابہت اختیار نہ کی گئی ہو۔ موصوف نے قضا یا عیاض ص ۲۰۰ اور فتح الباری ۱۰/۵۳۳ سے استدلال کیا ہے، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی اور مفتی محمد شاہد قاسمی کے نزدیک مزاح کے جواز کی جو شرطیں بیان کی گئی ہیں اس کے مطابق ہو تو درست ہے۔

(۱)۔ موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہنسانا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے بہت معاون فعل ہے، اس کے خاص طور پر بننے کے پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں جس میں بہت سے لوگ متکلف تہنہ لگاتے ہیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں اس عمل کا شرعی حکم کیا ہے؟

اس بابت مقالہ نگاروں کی آراء درج ذیل ہیں:

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی لکھتے ہیں: ڈاکٹروں کی رائے فی نفسہ صحیح ہے لیکن ہنسنے میں مبالغہ نہ کیا جائے، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی ممتاز احمد ندوی کی بھی یہی رائے ہے، ندوی صاحب یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ محض احتمال کی وجہ سے حدیث کے خلاف کرنا صحیح نہیں، نیز موصوف صحت کی برقراری کے لئے دیگر تدابیر اپنانے مثلاً چہل قدمی کرنے، ہری بھری جگہوں میں رہنے اور بل جل کر زندگی گزارنے کا مشورہ دیتے ہیں، مفتی غلام اللہ کاوی بھی ان فراط و مبالغہ سے منع کرتے ہیں، یہی رائے مفتی اشرف عباس، مفتی طارق انور، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا محمد یوسف علی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی رضوان الحسن، مولانا محمد شوکت ثناء قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی اور راقم الحروف کی بھی ہے۔ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی کے یہاں ڈاکٹروں کی آراء نص کے مقابل حجت نہیں، موصوف نے تفسیر مظہری ۳/۲۵۲ کی عبارت الدنيا قليل فليضحكوا فيها ماشائوا فإذا انقطعت الدنيا وصاروا إلى الله فليستأنفوا البكاء بكانا لا ينقطع أبدا (كشف الخفاء للمجلوني ۲، ۹۸ اتحاف السادة المتقين للزيدي ۵، ۱۳۷، ۷، ۲۹۳)۔ پیش کرتے ہوئے کثرت ضحک کے نقصانات فإذا انضم إليه استجلاب الضحك الذي يبيت القلب ويجلب النسيان ويورث الرعونة ومن ثم قال الحكماء إيراد المضحكات على سبيل السخف نهاية القباحة (فيض القدير للناوي ۶، ۳۷۸)۔ ”وان الاحتف قال قال لي عمر: يا احنف من كثر ضحكك قلت هييته“ (كشف الخفاء للمجلوني ۲، ۲۵۲)۔ ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی مکروہ تنزیہی لکھتے ہیں جبکہ مولانا عبید اللہ الجبار طیب ندوی، مفتی اقبال احمد، مفتی لطیف الرحمان کے یہاں بغرض علاج جائز ہے، مفتی اقبال احمد لکھتے ہیں: ”اگر واقعہ اس طرح کے ہنسنے ہنسانے سے مراد کو فائدہ و صحت کا تجربہ

یا گمان غالب ہو تو بطور علاج کے اجازت ہوگی، کیوں کہ علاج کے باب میں شرعاً توسع سے کام لیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض مواقع میں محرمات سے علاج کی بھی گنجائش ہے۔ موصوف نے غم دور کرنے کے لئے ابن عثیمین کے فتاویٰ ۹۸۱/۲ سے یہ حدیث و من ادویتهما الحدیث الصحیح عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ انہ ما من مومن یصیبه هم او غم او حزن فیقول: اللہم انی عبدک وابن عبدک وکذالک ایضا ان یقول الانسان لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین پیش کی ہے، مفتی لطیف الرحمان لکھتے ہیں: اگر ایک شخص نفسیاتی مریض ہے یا ڈپریشن کا شکار ہے اور اس کی صحت کا مدار اسی پر ہے تو بطور دوا و علاج مختلف قہقہہ لگانے اور ایسے پروگرام دیکھنے کی اجازت ہوگی لیکن صحت بحال ہونے کے بعد پھر گنجائش نہ ہوگی، مفتی محمد حنیف و مفتی محمد داؤد مطلقاً اجازت دیتے ہیں، استدلال میں مشکوٰۃ (ص ۴۰۶) کی روایت عن قتادة قال سئل عن ابن عمر هل کان اصحاب رسول اللہ ﷺ یضحکون قال: نعم والایمان فی قلوبہم اعظم من الجبل وقال بلال ابن سعد ادرکتہم یشدون بین الاغراض ویضحک بعضهم الی بعض فاذا کان اللیل کانوا رہباناً پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ان دونوں صاحبان کی دلیل سے ان کا مقصد ثابت نہیں ہوتا، کیوں کہ اس حدیث سے ضحک کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ قہقہہ کا جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے: حیث لم یتجاوزوا فی حال الضحک وغیرہ عن دائرة الامور الدینیة وقال الطیبی هو من باب الرجوع والقول بالموجب ای نعم کانوا یضحکون لکن لا یتجاوزون الی مایمیت قلوبہم ویتزلزل بہ ایماہم من کثرة الضحک کما ورد ان کثرة الضحک یمیت القلوب (مرقاۃ ۹، ۱۰۳، مکتبہ امدادیہ، ملتان، پاکستان، ای لایضحکون کما یضحک الغافلون یمیت قلوبہم ویطفئ نور الایمان، حاشیہ مشکوٰۃ ص ۴۰۶ بحوالہ لمعات)۔

عرض ہے کہ قہقہہ بذات خود مستحسن نہیں کیونکہ امام ابو منصور ثعالبی نے نکتہ سے نقل کے دور جوں افترا اور والظلال کو ابو عبید کے حوالہ سے حسن میں شمار کیا ہے لیکن اس کے بعد کے درجات نکتہ قہقہہ قرقرہ طخ زہزہ بیان کرتے ہوئے زہزہ کی بابت ابو زید اور ابن الاعرابی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ زہزہ عقل و شعور ہی کو کھودیتا ہے۔ الافترا والظلال و هما الضحک الحسن (عن ابی عبید) ثم الکتکتہ اشد منها ثم القہقہہ ثم القرقرہ ثم الکرکرہ ثم الاستغراب ثم الطخطخہ ثم الزہزہ وہی ان ینذهب الضحک بہ کل مذهب (عن ابی زید وابن الاعرابی وغیرہما)

ڈپریشن کے شکار مریض اور بیمار کے لئے جبکہ یقین طور پر یا ظن غالب کے درجہ میں شفا ممکن ہو تو بقدر ضرورت اس وقت محظورات کی اجازت ہوتی ہے جبکہ طبیب حاذق مسلم رائے دے کہ اس کی شفا اسی میں مضمر ہے، کوئی دوسری مباح دوا یا کوئی دوسرا طریقہ علاج یا تونہ ہو یا ہوگر سو مند نہ ہو ”و کذا کل تداو لا یجوز الا بطاہر وجوزہ فی النہایة بمحرم اذا اخبرہ طبیب مسلم ان فیہ شفاء ولم یجد مباحا یقوم مقامہ“ (رد المحتار علی الدر ۹، ۵۵۸)۔ اس لئے مریض کو اجازت ایک استثنائی صورت ہے، اس میں تو بعض حالات میں رفع حرمت بھی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹروں کی رائے رض کے خلاف ہے: علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کو اقلیل کی تفسیر میں لکھتے ہیں: امر معناه معنی التہدید ولس امر بالضحک ...

وکان الصحابة یضحکون إلا ان الاکثار منه وملازمته حتی یغلب علی صاحبه مذموم منہی عنہ وهو من فعل السفہاء والبطالة (القرطبی ۸، ۱۳۸)۔ فاذا انضم إلیہ استجلاب الضحک الذی یمیت القلب ویجلب النسیان ویورث الرعونۃ (فیض القدیر للمنادی ۲، ۳۶۸)۔ وان الاحنف قال قال لی عمر رضی اللہ عنہ: یا احنف من کثر ضحکہ قلت ہیبتہ (کشف الخفاء للعجلونی ۲، ۲۵۳)۔

اما الضحک قہقہہ فقد کرہہ الفقہاء ونہوا عن کثرته (موسوعة فقیہہ ۲۸، ۱۶۴)۔ والإباحة ضد الکراهة (غمر عیون البصائر شرحہ الاشیاء والنظائر: ۱، ۲۳)۔

مذکورہ اقوال و اثر سے معلوم ہوا کہ کثرت ضحک بیوقوفوں اور بیکاری کا مشغلہ ہے، دل کو مردہ، نسیان اور ڈھیلا پن، ہیبت و وقار کو ختم کرتی ہے، اللہ اس کے رسول کے ارشادات تو الگ رہے محدثین و فقہاء نے کثرت ضحک سے جو خرابیاں ذکر کی ہیں وہ ان ڈاکٹروں کی تحقیقات سے کہیں زیادہ قطعی اور یقینی ہیں، اس لئے تمام حالات میں صرف قہقہہ کی مجلس مقصد بنا کر قائم کرنا میرے خیال میں اباحت کی بھی گنجائش نہیں رکھتی۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

## تفریح اور اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط (سوال نمبر: ۲)

مفتی اشرف عباس قاسمی ع

کھیل کود کے شرعی احکام:

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين ومن تبعهم  
ياحسان إلى يوم الدين۔ اما بعد!

”تفریح“ اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط کے سوال نمبر ۲ رجو کھیل کود سے متعلق احکام پر مشتمل ہے، اس پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری احقر کو سونپی گئی تھی اور اس سلسلہ میں موضوع سے متعلق ۲۱ مقالات احقر کو اکیڈمی نے ارسال کیے، جن کی روشنی میں یہ تحریر پیش خدمت ہے۔

کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے کیا اصول ہیں؟

تمام مقالہ نگاروں نے اس کے جوابات دیئے ہیں مفتی اقبال احمد قاسمی صاحب نے اس ضمن میں لہو و لعب کے مصداق، کھیلوں کے مکروہ و ممنوع ہونے کی علتیں اور جائز کھیلوں کی حدود و شرائط پر تفصیلی کلام کرنے کے بعد، جدید کھیلوں کے جواز و عدم جواز کے سلسلہ میں تکمیل فتح المسئلہم سے ضابطہ نقل کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے کھیلوں کے تعلق سے مختلف احادیث و آثار کا جائزہ لیتے ہوئے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک والی کو اس بنیاد پر کہ وہ بچوں سے کھیل نہیں کرتے تھے معطل و معزول کر دیا تھا۔ حجاج بن یوسف نے اپنے بچوں کے اتالیق سے کہہ رکھا تھا کہ ان کو کتابت سے پہلے تیرا کی سکھائیں کیونکہ اگر کتابت نہیں آئی تو اس کا بدل مل جائے گا، لیکن تیرا کی کا بدل نہیں ملے گا (دیکھئے مقالہ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

مختلف مقالہ نگاروں نے کھیل کے جائز و ناجائز ہونے کے جو اصول پیش کیے ہیں وہ قدرے مشترک درج ذیل ہیں:

- ۱۔ وہ کھیل کود جن کو آثار و احادیث میں صراحتاً ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ ناجائز ہیں جیسے: نرد، کبوتر بازی اور جانوروں کو آپس میں لڑانا وغیرہ۔
- ۲۔ جو کھیل کسی حرام کام یا معصیت پر مشتمل ہوں وہ بھی حرام قرار پائیں گے جیسے کہ اس میں کشف عورت ہو، یا موسیقی کا نظام ہو، یا مردوزن کا مخلوط اجتماع ہو، یا اس میں قمار اور جوئے کی آمیزش ہو۔ (مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممینی، مفتی طارق انور قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی رضوان الحسن احمد نگری، مولانا شاہ جہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی حنیف جونا گڑھ، مولوی عبدالجبار طیب ندوی، مفتی اقبال احمد قاسمی، اشرف عباس قاسمی)۔
- ۳۔ وہ کھیل بھی حرام ہوں گے جو فرائض یا واجبات کی ادائیگی سے غافل کرنے والے ہوں، حقوق اللہ یا حقوق العباد کی تضحیح کا ذریعہ بنتے ہوں (مفتی غلام احمد کادی، مفتی اقبال احمد قاسمی وغیرہم)۔
- ۴۔ وہ کھیل بھی ناجائز ہیں جو محض وقت گزاری کے لیے ہوں اور ان سے دین یا دنیا کا کوئی معتدبہ فائدہ نہ ہو۔ (مفتی عبداللہ کادی، مفتی خالد حسین نیوی وغیرہم)۔
- مختلف مقالہ نگار حضرات نے اپنے مدعا کے اثبات کے لیے دلائل فراہم کیے ہیں اور عام طور سے مسلمات اور اصول و کلیات سے استدلال کیا ہے اور بہت حد تک مقالہ نگاران اصول کے انضباط میں متحد ہیں، اس لیے عارض دلائل سے تعرض نہیں کر رہا ہے۔
- ۵۔ جس کھیل سے کوئی معتدبہ نفع وابستہ ہو، اور صراحتاً یا دلالتاً اس کے خلاف نص وارد نہ ہو نیز قمار اور دوسری خرابیوں سے پاک ہو، اس کھیل کی گنجائش ہے بلکہ

جامعہ مظہر سعادت، ہانوٹ، بھروچ۔

بعض مرتبہ صالح مقاصد کے لیے شریعت میں ایسے کھیلوں کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔

مفتی اقبال احمد قاسمی کہتے ہیں: ”جنسانی ورزش والے کھیل جس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو جائز ہوں گے اگرچہ وہ جسمانی ورزش کے کھیل غیروں کے ایجاد کردہ ہوں بشرطیکہ ان کا شعار نہ ہو“ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے اضافہ کیا ہے کہ کھیل عام انسانوں کی گزرگاہ پر نہ ہو، کیوں کہ حدیث پاک ہے: ”من اذی المسلمین فی طرقتهم وجبت علیہ لعنتہم“ (رواہ الطبرانی) مولانا شاہ جہاں ندوی نے جواز کے لیے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ وہ کھیل انسان کا زیادہ وقت نہ لیتا ہو، مفتی رضوان الحسن نے ان منگے کھیلوں کو بھی ناجائز قرار دیا ہے جن سے متوسط الحال بچے استفادہ نہ کر سکیں۔ ”مفتی عارف باللہ قاسمی نے ”الموسوعۃ الفقہیہ“ کے حوالے سے کسی بھی کھیل کے جواز کے لیے یہ شرط ذکر کی ہے کہ وہ کھیل انسانی شرافت اور مروت کے مغاثر نہ ہو، اس کے کھیلنے سے آدمی گھٹیا اور خسیس نہ سمجھا جاتا ہو۔“

مفتی شوکت ثاقبی اور مفتی لطیف الرحمن ممبئی وغیرہ متعدد مقالہ نگاروں نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ مردوں کے لیے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لیے مردانہ کھیل جیسے کشتی، بڈی درست نہیں ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، نیز وہ ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یاد دوسروں کے لیے ایذا رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا امکان ہو جیسے: فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ ایسے کھیل جائز نہیں ہیں، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی شاہد صاحب قاسمی نے یہ شرط بھی ذکر کی ہے کہ کھیل سے مقصود محض ورزش یا تفریح ہو، خود اس کو مقصد نہ بنا لیا جائے، مولانا عبید اللہ ندوی نے دور حاضر کے مروجہ کھیلوں میں درآئی خامیوں کا بھی عمومی جائزہ لیا ہے۔

ب۔ لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لیے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

تمام مقالہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ کھلاڑیوں کے لیے بھی ستر عورت ضروری ہے، یعنی ناف سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک کا حصہ ڈھکا ہونا چاہیے: ”وينظر الرجل من الرجل إلى جميع بدنه إلا من سرقته إلى ركبته قال صاحب النهاية أن السرقة أحد إحدى العورة فتكون من العورة كالركبته“ (تكملة فتح القدير ۱۰/۲۲) جب کہ خواتین کا مردوں کے درمیان کھیلنا ہی جائز نہیں ہے، اور خواتین کے لیے خواتین کے سامنے پردے کے حدود وہی ہیں جو مردوں کے لیے ہیں، اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے یعنی پیٹ اور پشت کے ساتھ ناف سے گھٹنے تک کا ستر ضروری ہے، مفتی شوکت ثاقبی نے اس سلسلہ میں بھی یہ وضاحت کی ہے کہ فقہاء کرام نے کافرہ اجنبی عورتوں کا حکم اجنبی مردوں کی طرح قرار دیا ہے، یعنی مسلمان عورتوں کے لیے کافرہ اجنبی عورت کے سامنے بے حجاب ہونے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ”موسوعۃ فقہیہ“ میں ہے: ”ذهب جمهور الفقهاء إلى أن المرءة لا جنسية الكافرة كالرجل لا جنسية للمسلمة“ (۳۱/۳۷-۳۸) مفتی غلام احمد کادوی اور مفتی خالد حسین قاسمی کہتے ہیں مردوں کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ لباس نخوں کے نیچے نہ ہو۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”ما أسفل من الكعبين من الإزار في النار“ (بخاری / مشکوٰۃ ۳۷۲) اور نہ وہ ایسا لباس ہو جو غیر مسلموں کا شعار ہو۔ ارشاد نبوی ہے: ”من تشبه بقوم فهو منهم“ (أحمد / ابوداؤد مشکوٰۃ ۳۷۲)۔

مفتی طارق انور قاسمی نے وضاحت کی ہے کہ ”کبھی کھلاڑیوں کے لباس میں صلیب وغیرہ کے نشانات ہوتے ہیں ان سے احتراز ضروری ہے۔“

مفتی حنیف صاحب کے بقول ”شرعی لباس کی رعایت فقط کرکٹ میں ہوتی ہے، ہاکی، فٹ بال، کشتی اور ریس وغیرہ میں عموماً نہیں ہوتی ہے۔“

مفتی محمد شاہد قاسمی نے کہا ہے کہ ”کھیل میں ڈھیلے ڈھالے کپڑے کے بالقابل تنگ و چست کپڑے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس سے جسم کے اندرونی اعضاء نمایاں نہ ہوں، کیوں کہ رسول اکرم ﷺ سفر میں تنگ آستین والے کپڑے استعمال کرتے تھے اور جس طرح سفر میں بھاگ دوڑ اور جسم کو تیزی سے حرکت دینا لازم ہے اسی طرح کھیل میں بھی ضروری ہے۔“

”مفتی ممتاز احمد ندوی نے لکھا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں ایک شخص کا دوسرے کے سامنے ضرورت کے وقت ستر کھولنے کی اجازت ہے (دیکھئے: رد المحتار ۲/۵۹۳-ہندیہ ۵/۳۲۳) اور ظاہر ہے کہ کھیل ایسی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا کھیل میں ستر پوشی کے عام ضوابط کو برتنا ضروری ہوگا۔“

”مفتی محمد جعفر بلبل رحمانی نے کھلاڑیوں کے ایسے لباس پہننے کو بھی شرعاً ناجائز کہا ہے جس سے حلیہ اور وضع قطع اس طرح بدل جائے کہ غیر مسلموں سے بظاہر کوئی امتیاز باقی نہ رہ جائے۔ موصوف نے آیت کریمہ: ”ولا تزنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار“ سے استدلال کرتے ہوئے آیت کی تفسیر میں قاضی بیضاوی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ شکل و صورت، فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا، سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔“

(دیکھئے مقالہ) ”مفتی طارق انور القاسمی نے اپنے عربی مقالے میں اس مسئلہ کو فقہ شافعی کے نقطہ نظر سے دیکھا ہے کہ ناف کا استر ضروری نہیں ہے تاہم ناف کے نیچے سے گھٹنے کے نیچے تک کی ستر پوشی ضروری ہے۔“

ج۔ شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں کن کو جائز، کن کو ناجائز، کن کو مکروہ اور کن کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے؟ متعدد مقالہ نگاروں نے اس شق کا جواب دیتے ہوئے بھی ان اصول و ضوابط کا اعادہ کیا ہے جو الف کے ذیل میں آچکے ہیں، اس لیے ان سے صرف نظر کرتے ہوئے الگ الگ عناوین کے تحت سیدھے طور سے مختلف کھیلوں کے متعلق مقالہ نگاری کی آداء کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(۱) مستحب کھیل: مفتی اقبال احمد قاسمی کہتے ہیں: ”کھیلوں کی بعض وہ قسمیں جو صورتہ تو کھیل ہیں لیکن درحقیقت اپنے مقصد کے پیش نظر ایک ضرورت ہیں مثلاً دفاع میں معاون کھیل، جہاد میں کارآمد کھیل، یہ نہ صرف جائز بلکہ اس کا کھیلنا حسن نیت کے ساتھ ہو تو مستحب اور باعث ثواب ہے۔“ اس کے بعد مقالہ نگار نے درج ذیل کھیلوں کو شرعی اصول کی رعایت کے ساتھ مستحب قرار دیا ہے۔

(۱) پیدل دوڑنا یا دوڑ کا مقابلہ۔ (۲) تیراندازی یا دیگر نشانہ بازی کا کھیل اسی طرح لاٹھی چلانا وغیرہ۔

(۳) گھوڑ سواری یا بری و بحری ڈرائیونگ کی مشق۔ (۴) تیراکی یا پیراکی اور غوطہ خوری کا مقابلہ، کشتی چلانے وغیرہ کی مشق۔

(۵) کشتی لڑنا، کھیلنا اور کشتی کا مقابلہ اسی طرح کراٹے، مکہ بازی وغیرہ، مولانا شاہ جہاں ندوی نے اس طرح کے کھیلوں کے استحباب پر ابوداؤد شریف کی حدیث نمبر ۲۵۱۳ ”لیس من اللہوا الاثلاث: تأدیب الرجل فرسہ، وملاعبتہ اہلہ ورمیہ بقوسہ ونبلہ“ سے استدلال کرتے ہوئے ابن معن کا قول نقل کیا ہے کہ ”رہا ان کے علاوہ کھیل تو انہیں انہی پر قیاس کرتے ہوئے یا تو مستحب قرار دیا جائیگا، یا کھیل کی رخصت کی دلیل کی بنا پر وہ درجہ اباحت میں رہیں گے۔“

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے ترمذی سے اس روایت کو نقل کیا ہے جس میں ”فاھن من الحق“ کا لفظ ہے پھر اس کی تشریح میں خطابی، ابن الاثیر اور ابن العربی کے اقوال نقل کر کے آخر الذکر کے قول کو ترجیح دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تین کے ماسوا سب حرام ہی ہیں۔

(۲) چند جائز اور مباح کھیل:

مفتی اقبال احمد قاسمی نے مندرجہ ذیل مروج کھیلوں کو جائز اور مباح قرار دیا ہے:

(۱) ہاکی (۲) فٹ بال (۳) والی بال (۴) لان ٹینس (۵) بیڈمنٹن (۶) ٹیبل ٹینس (۷) کبڈی (۸) لکڑی کھیلنا (۹) تعلیمی تاش (۱۰) لٹو کھیلنا (۱۱) بچوں کا چھنجھنا غلبہ وغیرہ کھیلنا (۱۲) مختصر وقت کے لیے کیرم بورڈ کھیلنا (۱۳) تھوڑی دیر کے لیے لوڈ کھیلنا (۱۴) موبائل پر بلا تصویر کیم کھیلنا (۱۵) موبائل پر کوئی تفریحی چٹکلہ سن لینا۔ البتہ آخر الذکر یعنی موبائل پر تفریحی چٹکلہ سننے کا جواز عارض کے خیال میں محل نظر ہے۔

مولانا شاہ جہاں ندوی کہتے ہیں: ”جو کھیل قمار سے خالی ہو وہ جائز ہے جیسے: بیڈمنٹن، بلییارو، فٹ بال، والی بال وغیرہ کیونکہ ان سے جسمانی یا ذہنی ورزش ہوتی ہے۔“ مولانا محمد عمران ندوی نے لانگ چپ اور ہائی چپ کو بھی جائز کھیلوں کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ مفتی لطیف الرحمن بمبئی کے مطابق فٹ بال، والی بال، ہاکی، بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس جیسے کھیلوں کے بارے میں بعض علماء نے تشبیہ کی وجہ سے کراہت کا حکم لگایا ہے لیکن اب چونکہ یہ علت نہیں رہ گئی ہے۔ لہذا ان کھیلوں کو بھی مفید کھیلوں میں شمار کیا جانا چاہیے، مولانا محمد معذور باندوی نے لکھا ہے وہ کھیل جو شرعاً مباح ہو اور اس کے اندر کوئی غیر مشروع شرط نہ ہو تو اس کا کھیلنا جائز اور مباح ہے۔

(۳) مکروہ کھیل:..... مولانا محمد عمران ندوی نے مکروہ کھیلوں کی فہرست اس طرح دی ہے: (۱) ویڈیو گیم (۲) لوڈو (۳) کیرم بورڈ (۴) تاش جس میں جوانہ ہو (۵) اسکیٹنگ (۶) کرکٹ۔

”مفتی اقبال احمد قاسمی نے پتنگ بازی اور کبوتر بازی کو بھی اسی ضمن میں شمار کیا ہے، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عموماً ویڈیو گیمز اپنی حد تک باقی نہیں رہتا ہے، اذلاً کراہت پھر اس کا شوق حد حرمت تک لے جاتا ہے، اس لیے ابتدا ہی سے یہ مکروہ کہلائے جانے کا مستحق ہے، کرکٹ کے بارے میں

وہ لکھتے ہیں: کرکٹ کی موجودہ صورت حال میں اس کو کم از کم مکروہ کہا جائیگا اور جس درجے کی قباحتیں ہوں گی اس درجہ کراہت میں شدت بلکہ حرمت کا حکم بڑھتا جائے گا۔“

(۳) حرام اور ناجائز کھیل:

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی کہتے ہیں: ”ایسا کھیل جو اپنے یاد دوسروں کے لیے ایذا رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کافی امکان ہو جیسے فری اسٹائل کشتی، باسنگ وغیرہ، ایسے کھیل ناجائز ہیں۔“

”مفتی غلام اللہ کاوی نے ویڈیو گیم، پتنگ بازی، شطرنج، بوٹر بازی، مرغ بازی نیز آتش بازی کو ناجائز قرار دیا ہے، کرکٹ اور فٹ بال کو اصلاً مباح قرار دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں ”مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کھیلوں میں منہک شخص فرائض منصبی میں کوتاہیاں کرنے لگتا ہے، اور ایسا انہماک کھیلوں کو حرام بنا دیتا ہے۔“

مفتی شاہد قاسمی کے بقول: ”تاش، لوڈو، کیرم بورڈ، ویڈیو گیم اور کرکٹ کو ناجائز ہونا چاہیے۔“

مفتی خالد حسین کے بقول: ”مروج کھیل مثلاً ہاکی، فٹ بال، والی بال، ٹینس، بیڈمنٹن، کشتی، کرکٹ کی بعض شکلوں پر عدم جواز کا حکم لگے گا۔ چند وجوہ: (۱) کثرت انہماک (۲) فرائض سے غفلت (۳) اضاعت اموال و وقت (۴) ستر پوشی کا عدم اہتمام (۵) اختلاط مردوزن وغیرہ۔ انہی وجوہ کے پیش نظر مفتی لطیف الرحمن نے بھی کرکٹ کو ناجائز لکھا ہے۔ مفتی حنیف صاحب کا نظریہ بھی دینی مضرت کو دیکھتے ہوئے کرکٹ کے عدم جواز کا ہی ہے۔“

ویڈیو گیم کے عدم جواز کی وجوہ مقالہ نگار حضرات نے یہ لکھی ہے: ”اس کھیل سے کوئی دینی یا جسمانی فائدہ مقصود نہیں ہوتا ہے اس میں وقت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے اور ذکر اللہ سے غافل کرنے والا ہے، اس کھیل کی عادت پڑنے پر اس کا چھوڑنا دشوار ہوتا ہے، بعض گیم فوٹو اور تصویر پر مشتمل ہوتے ہیں جو کہ شرعاً ناجائز ہیں۔“

مفتی اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: ”ویڈیو گیم، کیرم بورڈ وغیرہ کی کراہت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے کھیلنے کے بعد تفریح طبع حاصل ہونے کے بجائے مزید ذہنی تکان بڑھ جاتی ہے، گویا یہ کھیل دماغ کے لیے مضرت ہیں اور جسمانی فرحت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ تاش اگر جوئے سے خالی ہو تو بھی اکثر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک مکروہ ہے تاہم مولانا شاہ جہاں ندوی نے وضاحت کے ساتھ اس کو مکروہ تنزیہی کہا ہے۔ مفتی طارق انور القاسمی نے کرکٹ سمیت کئی دوسرے مروج کھیلوں کو العاب محرم میں شمار کیا ہے، اس طرح کرکٹ کے بارے میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے عدم جواز کی ہے، تاہم سب نے وضاحت کی ہے کہ عدم جواز اس میں درآنے والی خرابیوں کی وجہ سے ہے ورنہ اصلاً مباح ہے، مقالہ نگاروں نے تفصیل کے ساتھ ان خرابیوں پر روشنی ڈالی ہے۔“

د۔ کھیل کی ہار جیت میں اگر پیسہ کی شرط ہو تو کوئی صورت جائز اور کوئی ناجائز ہوگی؟

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی اقبال احمد قاسمی اور مولانا شاہ جہاں ندوی نے اپنے مقالات میں اولاً اسی پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، مولانا شاہ جہاں ندوی نے ابو داؤد شریف کی حدیث نمبر ۶۷۲۷/۱ (السبق الا فی خف أو نصل أو حافر) (شرط کی رقم جائز نہیں مگر اونٹ یا تیر یا دیگر آلات حرب یا گھوڑے کے مقابلہ میں) سے استدلال کرتے ہوئے مال کے عوض مقابلے کے جواز کو گھوڑ دوڑ، اونٹوں کے مقابلے، تیراندازی اور نیزہ بازی میں منحصر کر دیا ہے اور تائید میں ردالمحتار کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے ”ولا یجوز الاستباق فی غیر ہذہ الأربعة کالبغل بالجعل، وأما بلا جعل فیجوز فی کل شیء“ (ردالمحتار ۶/۱۷۵)۔

مفتی اقبال احمد قاسمی کہتے ہیں: ”فقہاء کی اس تصریح سے باقی کھیلوں کے مقابلوں میں انعام وغیرہ کی شرط ناجائز ہوگی تاکہ خواہ مخواہ لوگ کھیلوں کے حریص نہ ہو جائیں اور انعام کی لالچ میں لہو و لعب مقصد زندگی نہ بن جائے۔ البتہ از روئے قیاس دیگر وہ کھیل جن سے جسمانی ورزش ہوتی ہے اور کسی صحیح مقصد سے کھیلے جائیں جیسے گاڑیوں کی ریس، بندوق کا نشانہ، کبڈی، فٹ بال وغیرہ ان کے احکام بھی اس طرح کے ہوں گے جو گھوڑ دوڑ وغیرہ کے ہیں جیسا کہ بعض علماء عصر نے لکھا ہے“ ملاحظہ ہو (حلال و حرام ص/۲۴۱ قاسموس الفقہ ۳/۱۱۷۷ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)۔

مفتی طارق انور القاسمی نے لکھا ہے کہ ”شوافع کی تصریحات کی روشنی میں وہ تمام نئے کھیل جو جہاد اور دفاع میں معاون ہوں، عوض کے ساتھ جائز ہیں ان کے علاوہ دوسرے کھیل بالعوض جائز نہیں ہونگے۔“ اس کے بعد تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں نے پیسے کی شرط کے تعلق سے چار صورتیں ذکر کی ہیں: سب کا نقطہ نظر چونکہ یکساں معلوم ہوتا ہے اس لیے دلائل سے قطع نظر فقط چار صورتیں اور ان کے احکام کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ دو شخص یا چند اشخاص میں مقابلہ ہو اور ہر شخص پر یہ بات لازم قرار دی گئی ہو کہ وہ ہارنے کی صورت میں جیتنے والے کو رقم دے گا اور اگر وہ جیت جائے تو دوسرے

لوگ اسے دیں گے، یہ صورت جو ہونے کی وجہ سے قطعاً حرام ہے۔

۲۔ دو شخصوں میں مقابلہ ہو ایک پر انعام کی شرط ہو دوسرے پر نہ ہو یعنی ”الف“ اگر جیتے گا ”ب“ اسے ایک ہزار روپے دیگا لیکن ”ب“ جیتے گا تو ”الف“ اسے کچھ نہیں دیگا، مقابلہ کی یہ صورت جائز ہے۔

۳۔ دو آدمیوں کے درمیان جیت ہار پر دو طرفہ شرط ہو لیکن تیسرے آدمی کو بغیر کسی شرط کے شریک کر لیا گیا ہو کہ اگر وہ ہارے تو اسے کچھ نہیں دینا پڑیگا اور اگر وہ جیتے تو باقی دونوں اسے حسب معاہدہ انعام دیں گے اور تیسرا شخص بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اس کے جیتنے کی توقع کی جاسکتی ہو، یہ صورت جائز ہے۔

۴۔ دو شخص گھوڑ دوڑ میں شریک ہوں اور جیتنے والے کو انعام حکومت یا کوئی اور شخص دے اس صورت میں بھی مضائقہ نہیں ہے۔

مفتی اقبال قاسمی نے یہاں اس کا بھی اضافہ کیا ہے کہ جو انعام یا عوض مقرر ہوا ہے وہ معلوم و متعین ہونی چاہیے، ہونیز انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ جیتنے کے باوجود فاتح کا اس انعام پر استحقاق ثابت نہیں ہوتا ہے کہ جس کی ادائیگی پر دوسرے فریق کو مجبور کیا جاسکے ”حتی لو امتنع المغلوب من الدفع لایجبره القاضي ولا یقضی علیہ بہ“ (شامی ۵/۲۵۸) البتہ بلا عذر وعدہ خلائی باعث گناہ ضرور ہے۔

(۵) جو کھیل طویل وقت لیتا ہو؟

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی ممتاز احمد ندوی اور مولانا شاہ جہاں ندوی نے اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث بھی پیش کی ہے: ”نعمتان مغبون فیہما کثیر من الناس الصحة و الفراع“ (صحیح البخاری ۱۳۱۲) مفتی غلام اللہ کاوی کہتے ہیں ”اس صورت میں ضیاع وقت کا گناہ لازم ہوگا۔“

مفتی شاہد قاسمی کا خیال ہے کہ ”ایسا کھیل مزاج شرع کے خلاف ہے، البتہ کبھی کبھار نماز کی حفاظت کے ساتھ کھیلا جائے تو گنجائش ہونی چاہیے“ و لہذا اذا لم یقامر ولم ید او م ولم یخل بواجب“ (شامی ۱/۶۶۶)۔

مفتی عارف باللہ قاسمی کہتے ہیں ”اگر اتنا وقت لگے کہ اس سے فرائض و واجبات اور دیگر ذمہ داریوں میں خلل پڑے تو یہ کھیل جائز نہیں لیکن اگر وقت زیادہ لگے تاہم اس سے فرائض و واجبات نہ چھوٹیں تو ایسا کھیل جائز ہے مگر کراہت سے خالی نہیں۔“

مفتی محمد جعفر علی رحمانی نے ایسے کھیلوں کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، مولانا محمد عمران ندوی نے لکھا ہے کہ غالباً سوال میں کرکٹ کی طرف اشارہ ہے تو اس کے تعلق سے ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ کھیل ہی نہیں بلکہ یہ کمپنیوں کے پروڈکشن کے اشتہار کا ذریعہ ہے۔

(د) کھیل دیکھنے اور اس کے لیے ٹکٹ خریدنے کا حکم:

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی طارق انور القاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مفتی انور حسین قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی حنیف، مولانا محمد یوسف علی صاحبان کے تصریح کے مطابق جو کھیل جائز ہے اسے دیکھنا اور اس کے لیے ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہے اور جو ممنوع ہے اسے دیکھنا اور اس کے لیے ٹکٹ خریدنا بھی ممنوع ہے اور جو مکروہ ہے اس کو دیکھنا اور اس کے لیے ٹکٹ خریدنا بھی مکروہ ہے۔

”مفتی غلام اللہ صاحب کاوی نے جائز کھیلوں کے دیکھنے کو اگرچہ مباح کہا ہے لیکن ٹکٹ خریدنے کو ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ اجارہ ہے جس میں معقود علیہ مجہول ہے، وقت کی تعیین بھی مفقود ہے اور اگر اسے تفریح مطمح کی اجرت شمار کریں تو یہ غیر مقدر التسلیم ہے۔“

مفتی محمد جعفر علی رحمانی اور مفتی عارف باللہ قاسمی کھیل دیکھنے کے جواز کے قائل ہیں جب کہ وہ مفاسد سے بالکل خالی ہو۔ لیکن موجودہ مفاسد مثلاً ان کھیلوں میں بے انتہاء مجہولیت، فرائض سے غفلت، مردوزن کا مخلوط اجتماع، عداوت کا ماحول اور اضاعت وقت وغیرہ کے پیش نظر بیچ دیکھنے کا عدم جواز ہی راجح ہے۔ ظاہر ہے کسی چیز میں مفاسد کے ساتھ منافع بھی ہوں تو شریعت مفاسد کے پیش نظر منفعت موجود ہونے کے باوجود اس کو ناجائز قرار دے دیتی ہے۔ مفتی محمد جعفر کے بقول: ”من حسن اسلام المرء تر کہ ما لایعنیہ“ کے پیش نظر اسٹیڈیم میں نہ جانا ہی بہتر اور ادنیٰ ہے۔ مفتی الطیف الرحمن بمبئی کے مطابق شرعاً جس کھیل کی اجازت ہو اور اس میں وقت کی تعیین عملاً ممکن ہو تو اس کا ٹکٹ خریدنا جائز ہے ”یصح العقد علی مدۃ معلومۃ ای مدۃ کانت قصرت المدۃ کالیوم ونحوہ أو طالت کالسینین (ہندیہ ۲/۱۱۵)۔ واللہ أعلم بالصواب وعلمہ اتم وأكمل۔“

☆☆☆



## عرض مسئلہ:

## تفریح اور اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

(سوال نمبر: ۳)

ڈاکٹر مفتی محمد شہ جہاں ندوی استاذ حدیث و فقہ جامعہ اسلامیہ شاناپورم، مالاپورم، کیرالہ۔

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه والتابعين، لهم بإحسان إلى يوم الدين۔

احقر کو "تفریح" اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط کے سوال نمبر ۳ پر عرض مسئلہ کا حکم دیا گیا ہے جو کہ تفریحی سیاحت سے متعلق ہے، اور اس میں کئی شقیں ہیں:

تفریحی سیاحت کے سلسلے میں شریعت کا نقطہ نظر:

پہلی شق ہے: تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے یا نہیں، جبکہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ بھی ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں:

(۱) پہلا نقطہ نظر جس کی وکالت بیشتر مقالہ نگار حضرات نے کی ہے وہ یہ ہے کہ تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر مباح ہے اور اگر اسی کے ساتھ عبرت کی نیت شامل کر لی جائے تو یہ مطلوب دینی بن جائے گا، البتہ ایسے مقامات کو سیر و تفریح کے لیے اختیار کرے جو فحاشی، منکرات اور عریانیّت سے خالی ہوں، نیز حتی الامکان کثیر رقوم خرچ کرنے سے اجتناب کرے، اور چونکہ موجودہ دور میں عام طور سے سیاحت شرعی ممنوعات پر مشتمل ہوتی ہے اور اس میں کثیر رقوم کا بھی صرفہ آتا ہے جبکہ مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس سے مسلمانوں اور انسانیت کے بہت سے فلاح و بہبود کے کام انجام دیئے جاسکتے ہیں، لہذا اپنے شہر یا گاؤں کے سیاحتی جگہوں میں سیر و تفریح کرنے پر اکتفا کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے اور یہ مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی حنیف، مفتی داؤد، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی طارق انور قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا خالد حسین نیومی قاسمی، ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا عبد الجبار طیب ندوی اور مفتی محمد شاہد قاسمی کی رائے ہے۔ مولانا اقبال احمد قاسمی تحریر کرتے ہیں: محض تفریح طبع کے لیے بھی سفر جائز ہے، مولانا اشرف محمود عثمانی نے مفتی محمد شفیع صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تفریح طبع کے لیے مناسب سفر کی بھی گنجائش ہے (رفیق سفر)، لیکن ان کے نزدیک محض تفریح طبع کے لیے قریب مقام کو چھوڑ کر طویل سفر اختیار کرنا اور کثیر رقوم صرف کرنا اسراف و فضول خرچی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اور مفتی حنیف اور مفتی داؤد تحریر کرتے ہیں: "سیاحت جائز ہے، اور عبرت کی نیت سے، تو زیادہ بہتر ہے، اور اس پر آنے والا صرفہ اسراف نہیں ہے، کیونکہ اسراف وہ صرفہ ہے جو بلا مقصد صالح ہو" مولانا شوکت ثنا قاسمی تحریر کرتے ہیں "البتہ ایسی جگہیں جو فحاشی و منکرات اور عریانیّت سے خالی ہوں وہاں سیر و تفریح کے لیے جائز و درست ہے"۔ اس نقطہ نظر کے حاملین حضرات، کے دلائل کم و بیش مشترک ہیں، ایک تو یہی کہ "الأصل في الأشياء الإباحة، حتى يدل الدليل على التحريم" (الاشیاء ص ۹۷، غمز عیون البصائر ۱، ۴) (اشیاء میں اصل اباحت ہے یہاں تک کہ کوئی دلیل حرمت پر دلالت کرے) دوم یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "روحوا القلوب ساعة بعد ساعة، فإن القلوب إذا كلت عميت" (مسند الفردوس للدیلمی حدیث نمبر ۱۲۸۱، و ابوداؤد فی المراسیل عن الزہری مرسلکما فی (تحفة الاشراف) للمزی رقم ۱۹۳۵۲ (دلوں کو وقتاً فوقتاً راحت پہنچاؤ، کیونکہ دل جب تھک جاتے ہیں تو بے بصیرت ہو جاتے ہیں)۔ اس حدیث کی سدا گرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہ سے فرمایا: "ساعة وساعة" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۷۵۹) (اے حنظلہ، یہ ربانی کیفیت کبھی کبھی حاصل ہوتی ہے)۔

سوم یہ کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: "روحوا القلوب وابتغوا لها طرائف الحكمة، فإنها تمل كما تمل الأبدان" (الجامع لآخلاق الراوی و آداب السامع للخطیب البغدادی ۳، ۱۰۹)۔

(دلوں کی راحت کا سامان کرو، اور اس کے لئے عمدہ حکمت تلاش کرو کیونکہ وہ بھی اوب جاتے ہیں جس طرح بدن تھکتے ہیں) اور جب تفریح مباح ہے تو تفریحی مقصد سے سفر کرنا بھی مباح ہے۔

(۲) دوسرا نقطہ نظر مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی ممتاز احمد خاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی اشرف عباس سعادت اور مفتی محمد عارف باللہ قاسمی کا ہے کہ ایسی سیاحت جس میں کثیر رقوم کا صرفہ ہو، ممنوع ہے، ان حضرات کے دلائل بھی کم و بیش مشترک ہیں ایک تو یہی کہ ایسی سیاحت میں تضييع مال و تضييع وقت جیسے بڑے گناہوں کا ارتکاب ہے اور ارشاد الہی ہے: "إن المبدئين كانوا إخوان الشياطين" (الاسراء: ۲۰) (پیشک فضولیات میں مال اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں)۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تسرفوا" (الاعراف: ۳۱) (اور حد سے تجاوز نہ کرو)۔

قول راجح: لیکن یہ دلائل سیاحت کے ممنوع ہونے پر صریح نہیں ہیں، اور چونکہ تفریح انسان کی جائز خواہشات میں سے ہے، لہذا اس پر آنے والے صرفہ کو جب کہ حد معقول میں ہو اسراف نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ سبکی کبیر نے کہا ہے: "الضابط في إضاعة المال أن لا يكون لغرض ديني، ولا دنيوي، فإن انتفيا حرم قطعاً" (فتح الباری ۵۰۱۸۰-۵۰۲، تحت رقم ۵۹۷۵)۔

اور چونکہ سیاحت اور سفر سے غم و فکر کا ازالہ ایسا مقصد ہے جو شرعاً مطلوب اور جائز ہے لہذا اس مقصد سے مال خرچ کرنا جائز ہے جب کہ حد معقول میں ہو اور سیاحت میں انہماک نہ ہو اور اسے ہی مطلوب نہ بنا لیا جائے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس، الصحة والفراغ" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۶۳۱۲) (دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے سلسلے میں بہت سے لوگ خسارے میں ہیں، صحت اور فرصت کے اوقات)

پر خطر مقامات کی سیر و سیاحت میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا:

دوسری شق ہے: کیا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا درست ہے؟ جب کہ بعض علاقوں کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے نقطہ نظر سے پرخطر ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ اگر خطرات یقین یا گمان غالب کے درجے کے ہوں تو بال بچوں کے ساتھ ایسا سفر کرنا درست نہیں ہے۔ اس سے متعلق مقالہ نگار حضرات کے دلائل بھی کم و بیش مشترک ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ مقاصد شریعت میں داخل ہے، شاطیہ تحریر کرتے ہیں: "ومجموع الضروريات خمسة: وهي حفظ الدين، والنفس، والنسل والمال، والعقل" (الموافقات ۲/۲)۔

۲۔ ارشاد باری ہے: "ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة" [البقرة: ۱۹۵] (اور تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو) اور علامہ آلوسی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: "واستدل بالآية على تحريم الاقدام على ما يخاف منه تلف النفس" (روح المعاني ۱/۲۵۵) (اس آیت سے ایسی چیز پر اقدام کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے جس میں جان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو)، اور علامہ شوکانی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "فكل ما صدق عليه انه تهلكت في الدين او الدنيا فهو داخل في هذا" (فتح القدير للشوکانی ۱/۲۵۶) (ہر وہ چیز جو دین یا دنیا میں باعث ہلاکت ہو وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے) (دیکھئے: مقالہ مولانا شوکت ثناء قاسمی)۔

۳۔ جب حج کے جوہر کے لئے راستہ کا پر امن ہونا شرط ہے تو سیر و تفریح جو کہ ایک مباح چیز ہے راستہ کے پر امن نہ ہونے کی صورت میں کیسے درست ہو سکتی ہے؟

جبکہ کچھ مقالہ نگاروں کی رائے مختلف ہے مفتی محمد عارف باللہ قاسمی "علامہ احمد بن یوسف حلبی" کے حوالہ سے لکھتے ہیں: "التهلكة ما أمكن التحرز منه، والهلكات ما لا يمكن" (الدرر الصوت في علم الكتاب المكنون ۲/۲۹۲) (تھلکہ وہ خطرہ ہے جس سے بچنا ممکن ہو اور ہلاک وہ ہے جس سے بچنا ناممکن ہو) اس لئے جہاں خطرہ درجہ امکان میں ہو وہاں کا سفر سیاحت بھی جائز نہیں۔ اور مفتی لطیف الرحمن، مفتی رشید احمد لدھیانوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: "عورت کے باہر نکلنے میں مفاسد کثیرہ کے پیش نظر عورت کا تفریح کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں، اگر نکلے گی تو اس کے علاوہ اس کا شوہر اور دوسرے اولیا بھی سخت گنہگار ہونگے ان سب پر ایسے فسق و فجور سے توبہ کرنا فرض ہے" اور بحوالہ مفتی محمود لکھتے ہیں: "تو پھر شوہروں کے ساتھ گھومنا تو کوئی دینی ضرورت نہیں بلکہ نصاریٰ کا شعار اور طریقہ ہے وہ کیسے جائز ہو سکتا ہے" (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۱۸۷)۔

ایسے مقام تفریح پر جانے، جانے کے لئے سواری فراہم کرنے اور اسٹال لگانے کا حکم جہاں برائی ہو:

تیسری شق ہے: جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر ایشیائے خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کا کیا حکم ہے؟ اس شق کی کئی صورتیں ہیں: ۱۔ برائی کے مقامات پر سیر و تفریح:

اس کے جواب میں دو مقالہ نگار کوچھوڑ کر سارے ہی مقالہ نگار کی رائے ہے کہ ایسے مقام تفریح پر جانا جہاں برائی کا غلبہ ہو جائز نہیں ہے، اور اس موضوع پر مقالہ نگار حضرات کے دلائل کم و بیش مشترک ہیں جو حسب ذیل ہیں: ۱۔ حدیث پاک: ”من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يجلس على مائدة يدار عليها الخمر“ (ترمذی ۲۷۲۵)۔ (جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جہاں پر شراب کا دور چل رہا ہو)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”واذا رأيت الذين يخوضون في آياتنا فأعرض عنهم حتى يخوضوا في حديث غيره“ [۷، الانعام: ۶۸] (اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں)۔

نیز اللہ پاک کا فرمان ہے: ”فلا تقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين“ [۶، الانعام: ۶۸]۔ (تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھے رہئے) نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”وقد نزل عليكم في الكتاب ان اذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهنأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره إنكم اذا مثلهم“ [۳، النساء: ۱۳۰]۔

(اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر کا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو)۔

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”فدل بهذا على وجوب اجتناب أصحاب المعاصي، إذا ظهر منهم منكر؛ لأن من لم يجتنبهم فقد رضی فعلهم، والرضا بالكفر كفر، قال الله عز وجل: ”إنكم إذا مثلهم“ فكل من جلس في مجلس معصية، ولم ينكر عليهم يكون معهم في الوزر سواء، وينبغي أن ينكر عليهم إذا تكلموا بالمعصية، وعملوا بها، فإن لم يقدر على النكير عليهم فينبغي أن يقوم عنهم حتى لا يكون من أهل هذه الآية“ (الجامع لاحكام القرآن للقرطبي ۵، ۴۱۸) (دیکھئے: مقالہ مولانا شوکت ثاقبی)۔

۲۔ دوسری صورت ہے: جس مقام تفریح پر غیر شرعی حرکات ہوتی ہوں وہاں جانے کے لئے سواری کرایہ پر فراہم کرنا: اسکے جواب میں چند کوچھوڑ کر تقریباً سارے ہی مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ ایسے مقام پر جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا جائز ہے اور انکے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ براہ راست گناہ میں تعاون نہیں ہے، اور نہ ہی اسکا گناہ سے بہت قریب کا تعلق ہے، کیونکہ سواری کا کام سوار کو اسکی منزل پر پہنچا دینا ہے، لہذا یہ صورت صاحبین کے نزدیک بھی تعاون علی الاثم میں داخل نہیں، اور شراب کی منتقلی پر قیاس نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ اسکا گناہ سے قریبی تعلق ہے۔

۲۔ ہدایہ میں ہے: يكره بيع السلاح في أيام الفتنه، ولا باس ببيع العصير ممن يعلم أنه يتخذ خمرًا؛ لأن المعصية لا تقام بعينه“ (الهدایہ ۳، ۲۵۶)۔

البتان حضرات کے نزدیک اگر پہلے سے معلوم ہو کہ یہ لوگ مقام تفریح پر جا کر غیر شرعی حرکتیں کریں گے تو بہتر ہے کہ ان لوگوں کو سواری کرایہ پر نہ دے جیسا کہ مفتی شفیع نے معصیت کی خاطر سفر کرنے والے کو جانور کرایہ پر دینے کو سبب بعید میں قرار دیکر لکھا ہے کہ اگر معصیت کا علم ہو تو مکروہ تنزیہی ہے (جواہر المفقہ ۲، ۲۵۳) اور ”رد المحتار“ میں ہے: ”قوله: ”ممن يعلم“: فيه إشارة الى انه لو لم يعلم لم يكره بلاخلاف“ (رد المحتار ۹، ۵۶۰)۔

جبکہ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی ممتاز احمد خان ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد جعفر طلی رحمانی، مفتی طارق انور قاسمی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی اور مفتی رضوان الحسن مظاہری کے نزدیک جہاں ناشائستہ امور کھلے عام ہوتے ہوں وہاں جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا جائز ہے، ان سب حضرات کی مشترک

دلیل یہ کہ اس میں اگرچہ نفس فعل میں معصیت نہیں ہے، لیکن اعانت علی المعصیۃ تو ضرور ہے اور قرآن کریم میں ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (المائدہ: ۲) (اور گناہ میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

۳۔ تیسری صورت ہے: "غیر شرعی حرکات پر مشتمل مقام تفریح پر سامان خورد و نوش کی دکان لگانا":

اس کے جواب میں بھی چند کوچھوڑ کر سارے ہی مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ دکان لگانا جائز ہے اور ان حضرات کے دلائل وہی ہیں جو دوسری صورت کے جواب میں گذرے ہیں۔

نیز مولانا شوکت ثنا قاسمی نے فقیہ الامت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ سنیما ہال کے سامنے فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ کھانے پینے کی اشیا کا چونکہ اصلاً سینما سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جبکہ دوسری صورت کو ناجائز کہنے والے حضرات اس صورت کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی لکھتے ہیں: برائیوں پر مشتمل مقام تفریح پر سامان خورد و نوش کی دکان لگانا تین وجوہ سے کراہیت سے خالی نہیں:

۱۔ مقام معصیت سے دوری مطلوب ہے۔ ۲۔ بعض مرتبہ اپنی دکان کا اشتہار دے کر لوگوں کو ادھر بلائے گا جو درحقیقت مقام معصیت کی طرف بلانا ہوگا۔

۳۔ عام طور پر تفریحی مقامات پر سامان خورد و نوش کی دکانوں پر اوباش اور بے حیوانوں جو ان لڑکے اور لڑکیاں جمع ہوتے ہیں اور وہاں پر کھانے پینے کے بہانے بیٹھ کر غلط حرکتیں بھی کرتے ہیں، تو اس اعتبار سے یہ بھی اعانت علی المعصیت کی ایک شکل ہے، جب کہ مفتی محمد شاہد قاسمی کے نزدیک درست تو ہے لیکن برے ماحول میں لگانے کی بنا پر بہتر نہیں۔

ٹور کمپنی قائم کرنے کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر:

اس سلسلے کی آخری شق ہے: آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم ہیں جو آمد و رفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لیے سہولتوں کا نظم کرتی ہیں، سفر کرنے والے حضرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو سیاحتی مقامات پر داد عیش دینے کے لئے جاتے ہیں نیز شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، بعض کا مقصد مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کرنا ہوتا ہے، کیا اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے؟

اسکے جواب میں سارے مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ جائز مقاصد اور مسافروں کی سہولت کے لئے ٹور کمپنی قائم کرنا درست ہے، کیونکہ ٹور و ٹریولس کے کام میں کوئی معصیت اس کی ذات میں موجود نہیں، اور نہ ہی مالک ٹور کمپنی کی نیت معصیت پر تعاون دینے کی ہوتی ہے، اب اگر کچھ لوگ اپنے طور سے اس کے ذریعے معصیت کا ارتکاب کر رہے ہوں، تو شرعاً ٹور کمپنی بری الذمہ ہے، کیونکہ لوگ ان امور کا ٹور کمپنی کی وجہ سے ارتکاب نہیں کرتے ہیں، ہر کسی تحریر کرتے ہیں: "ولا بأس بأنت یواجر المسلم داراً من الذمی لیسکنھا فإن شرب فیھا الخمر، أو عبد فیھا الصلیب، أو أدخل فیھا الخنازیر، لم یلحق المسلم إثم فی شیء من ذلك؛ لأنه لم یواجرها لذلك، والمعصیۃ فی فعل المستاجر" (البسوط ۱۶، ۲۲، عالمگیری ۴، ۲۵۰)۔ البتہ اگر ٹور کمپنی تشکیل دیتے وقت ہی سیاحوں کو داد عیش دلانا، مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا کمپنی کے مقاصد میں شامل ہو، یا معصیت پر تعاون دینے کی نیت ہو تو ایسی ٹور کمپنی قائم کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ إنما الأعمال بالنیات، وانما لكل امری ما نوى" (بخاری حدیث نمبر ۱) اور تشریحی قاعدہ ہے "الأمور بمقاصدها"۔

اسی طرح اگر بدرجہ یقین یا گمان غالب ٹور کمپنی کو معلوم ہو کہ سارے مسافر معاصی کا ارتکاب کرنے جا رہے ہیں تو ایسی صورت میں ان کے ساتھ معاملہ کرنا مکروہ تنزیہی ہے جیسا کہ مفتی شفیع صاحب سبب بعید کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: "و کذا إجارة الدابة لمن یرید سفر معصیۃ، وأمثالها إذا علم فتكون تنزیہاً" (جواہر الفقہ ۲، ۴۵۳) (اسی طرح معصیت کی خاطر سفر کرنے والے کو جانور کرایہ پر دینا اور اس جیسی دیگر صورتیں، اگر ان میں استعمال فی المعاصی کا علم ہو تو مکروہ تنزیہی ہے)، اور مولانا اقبال احمد قاسمی نے مفتی محمود کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ "شامیانہ، میز، کرسی، گیس، فرش، وغیرہ ان اشیا کو کرایہ پر دینا اور کرایہ وصول کرنا حرام نہیں ہے، اگرچہ کرایہ پر لینے والے اپنی محفل میں کچھ غلط قسم کے کام بھی کرتے ہوں، مگر اسکی وجہ سے وہ کرایہ کی آمدنی حرام نہیں" جبکہ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کے نزدیک اگر معلوم ہو کہ سیاح مندر کی زیارت کرنے جا رہے ہیں تو ٹور کمپنی کا اس کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں۔

☆☆☆

## تفریح اور اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

(سوال نمبر: ۶،۵،۴)

مفتی اقبال احمد قاسمی ع

مجھے ”تفریح“ اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط کے موضوع پر نصف آخر کے سوالات: سوال نمبر ۶،۵،۴ سے متعلق عرض مسئلہ کا حکم ہوا ہے، اس سلسلے کے سوالنامہ میں چوتھا سوال تاریخی دستاویزی فلموں سے متعلق ہے۔

فلموں سے متعلق سوال کے جواب اور اس کے جواز و عدم جواز کی بحث میں تصویر کی بحث بھی آجاتی ہے، اور چونکہ فلموں کو تصویر کے دائرے میں شامل کئے جانے اور نہ کئے جانے پر پہلے سے اختلاف موجود ہے، اس لئے اس کا اثر فلموں پر حکم لگانے میں بھی پڑا ہے، اسی لئے وہ فلمیں جن میں کسی قسم کی ذی روح تصاویر کا وجود ہی نہ ہو اس کے جواز میں سبھوں کا اتفاق ہے، زیر بحث مسئلہ با تصویر فلموں سے متعلق ہے، جس میں اختلاف واقع ہوا ہے، مندرجہ ذیل ۱۲ مقالہ نگار حضرات نے تصاویر کی بنیاد پر مذکورہ تعلیمی مقاصد پر مشتمل یا تاریخی دستاویزی فلموں وغیرہ پر بھی عدم جواز کا حکم لگایا ہے، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا عبدالجبار ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا طارق انور قاسمی، مولانا مغفور باندوی، مولانا محمد احسن الحق ندوی، مولانا اشرف عباس قاسمی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی خالد حسین نیوی قاسمی۔

تصویر کی حرمت کے ساتھ فلموں کی ممانعت کے کچھ اور دلائل بھی ذکر کئے گئے ہیں، مثلاً مولانا مغفور باندوی فلم کو دین کے استخفاف و توہین کا سبب مانتے ہیں، جیسا کہ اکابرین کے فتاویٰ میں موجود ہے، مولانا خالد حسین نیوی قاسمی کہتے ہیں کہ تعلیمی مقاصد و تہذیبی مقاصد ضرورت میں شامل نہیں، مولانا شوکت ثنا قاسمی کہتے ہیں کہ فلم سازی میں قیاسات و تصورات کی آمیزش ناگزیر ہے، نیز خواتین کا رول بھی ضرور ہوتا ہے، یہ بھی عدم جواز کا کافی سبب ہے، اسی طرح مفتی اشرف عباس قاسمی کہتے ہیں کہ عام طور پر تاریخی یا دستاویزی یا تعلیمی مقاصد کے لئے بنائی جانے والی فلموں میں بھی شرعاً کئی طرح کی قباحتیں ہوتی ہیں، تاہم اگر کوئی فلم ایسی ہو جو ان قباحتوں سے پاک ہو تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

مقالہ نگار حضرات میں سے ۷ رقم کاروں نے جائز مقاصد کے لئے جائز فلموں کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، جائز فلموں سے مراد وہ پروگرام اور وہ مناظر ہیں جن کو خارج میں بغیر آلہ کے واسطہ کے دیکھا جاسکتا ہے، ان کی فلم بندی کرنا، ان کو دیکھنا، سننا، سمجھنا، سمجھانا، جائز ہے، یہ رائے راقم السطور اقبال احمد قاسمی، مفتی مختار احمد ندوی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا عمران ندوی، مفتی غلام اللہ کاوی، مولانا عبید اللہ ندوی اور مولانا محمد شاہ جہاں ندوی کی ہے، البتہ مؤخر الذکر دونوں حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ سدا لئذ ریہ ایسی فلمیں نہ بنائی جائیں، تاکہ بات دیگر فلموں تک متعدی نہ ہو، مولانا عمران ندوی نے جن تصاویر کی فقہاء کے یہاں گنجائش ہے، ”ہدایہ“ وغیرہ کے حوالہ سے اس کو ذکر کرنے کے بعد موجودہ فلموں کی تصاویر کے جواز پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل تصاویر کے استعمال کے اس قدر نئے طریقے اور ان کی مختلف ضرورتوں کے اس قدر اہم پہلو نکل آئے ہیں کہ جن سے بے اعتنائی نہیں کی جاسکتی، کتابوں اور رسالوں میں تصاویر ہمارے سامنے مختلف مجالس، جنگی معرکوں کی منظر کشی کرتی ہیں، مختلف قوموں کے خدو خال اور تمدن و معاشرت کے نقشے، ہم کو دکھاتی ہیں، اعضاء انسانی کی تشریح، جسم کی ساخت اور دیگر ضروری طبی نقشے نمایاں کرتی ہیں، بلکہ پورے میڈیکل سائنس ان تصویروں کے سہارے پڑھائی اور سمجھائی جاتی ہے، لغت کی کتابوں میں حیوانات کی تمیز، اور ان کے معنی سمجھانے میں ان سے مدد لی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مفتی عارف باللہ قاسمی نے عرب و عجم کے متعدد علماء کے حوالہ سے ڈیجیٹل ویڈیو کو تصویر سے خارج ثابت کر کے جواز کو مدلل کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ اگر ویڈیو

کو اصل یا عکس نہ مانا جائے، بلکہ تصویر کی ترقی یافتہ شکل ہی مانی جائے تو بھی تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کے تحت اس کے جواز کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ خود تصویر کے حرام ہونے کے باوجود، موقوف ضرورت اس کی اجازت دی گئی ہے اور موجودہ دور میں جبکہ اسلام دشمن طاقتیں غیر اسلامی زہریلے مواد ان آلات نشر کے ذریعہ لوگوں تک بآسانی پہنچا رہے ہیں، اس بات کی یقیناً شدید ضرورت ہے کہ ان آلات کو اسلامی زبان دی جائے، کیونکہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان آلات سے گھروں کو پاک کر دیا جائے، البتہ ان کے ذریعہ صحیح اسلامی تعلیم دی جاسکتی ہے، اس لئے اس عمومی ضرورت کے پیش نظر اصلاحی، تعلیمی اور دینی واقعات پر مشتمل ویڈیو کا جواز راجح معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ ان میں تمثیل کی شرطوں کو ملحوظ رکھا جائے، جو تمثیل کے جواز میں ملحوظ ہے، جواز کے رجحان میں تقبیل منفا سدا اور مکہ حد تک شرکی تخفیف بھی ہے، جو مصالح شریعت میں سے ہے، احقر نے لکھا ہے کہ خاص عنوان پر معلومات فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی دستاویزی فلموں سے استفادہ "الأمور بمقاصدھا" کے تحت دیگر موانع نہ ہونے کی صورت میں جائز ہے، جیسا کہ تعلیمی تاش اس کی نظیر ہے، جس کو محتاط فقہاء نے بھی جائز لکھا ہے (امداد الفتاویٰ ۲۵۲/۳، کنفایت المفتی ۲۶۸/۹)، اس لئے فلمی دستاویزات کی مدد سے اساتذہ کی نگرانی میں استفادہ کیا جائے تو یہ جدید آلات کا صحیح استعمال ہوگا، جن حضرات نے جواز کی راہ اپنائی ہے انہوں نے شرعی مفاسد سے فلم کے پاک ہونے کی شرائط بھی اپنے مقالات میں قلم بند کی ہیں، مثلاً: ۱۔ کسی عورت کی تصویر یا آواز کا استعمال بیجا نہ ہو، ۲۔ ساز میوزک اور گانے کی آواز سے پاک ہو، ۳۔ اس میں حقائق کی ہی ترجمانی ہو، ۴۔ اس میں کسی نبی یا صحابی یا بزرگان دین کی تمثیل نہ کی گئی ہو، ۵۔ اسی طرح اس میں کفار و شرکین اور شیاطین کی بھی تمثیل نہ کی جائے، ۶۔ مرد کا لباس بھی ساتر ہو، ۷۔ شریعت کی کسی بھی پہلو سے توہین کا شبہ تک نہ ہو، ۸۔ عشقیہ کہانی یا بے حیائی اور منکرات و زنا کی پر مشتمل نہ ہو، ۹۔ جعل سازی اور گمراہی کی تعلیم کا ذریعہ نہ ہو، ۱۰۔ کسی جائز مقصد کے لئے بقدر ضرورت ہی اس کو دیکھا جائے۔

مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا اشرف عباس، مفتی عارف باللہ قاسمی وغیرہ نے ان شرائط کو ذکر کیا ہے، احقر کا خیال ہے کہ ان شرائط کی موجودگی میں تصویر کے علاوہ باقی ممانعت کے اسباب ختم ہو کر جواز کی راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے۔

زیر بحث موضوع سے متعلق سوالنامہ میں پانچواں سوال کارٹون سے متعلق ہے، سوال یہ ہے کہ موجودہ دور میں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں، کارٹون کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس طرف ہے، لیکن انسانی صورت کے خدو خال اس میں پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، کارٹون میں ایک پہلو تفریح اور مزاح کا بھی ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف۔ کیا کارٹون بنانا جائز ہے، یا اس کا بھی شمار تصویر میں ہوگا۔

ب۔ کارٹون بنانا اس وقت ایک نفع بخش ذریعہ آمدنی بھی ہے تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تین نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں:

۱۔ مطلقاً جواز، یعنی کارٹون بنانا، نیز اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہے، اس کا شمار تصویر میں نہیں ہے، یہ رائے ہے: مولانا مغفور باندوی، مولانا محمد عمران ندوی صاحب کی، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ان کارٹونوں کے خدو خال تصویر کی طرح واضح نہیں ہوتے اور ان میں تعظیم و عبادت کا تصور حاشیہ خیال تک میں نہیں ہوتا۔

مطلقاً جائز، یعنی کارٹون چونکہ تصویر کی حقیقت سے خارج نہیں، لہذا اس کا پیشہ بنانا اور اس کی ملازمت درست نہیں، یہ رائے ہے: ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا عبدالجبار طیب ندوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا شاکت شاکا قاسمی، مفتی ممتاز احمد ندوی، مفتی شاہد قاسمی۔

ان حضرات نے عدم جواز کی دو وجہیں بیان کی ہیں: ایک تصویر کشی، دوسرے مشارالہ کی ہتک و اہانت یا استہزاء و تمسخر، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے "صناعة الصورة" (ص ۲۷) کے حوالہ سے بھی اپنی بات کو مزین کیا ہے، نیز ایسے کارٹون جس میں خیالی حیوانات کی تصویر کشی ہوتی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ان سب پر بھی تصویر کا حکم لگا کر حرمت کو ثابت کیا ہے، اور "نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج" (۲۷۵/۲۱) کی عبارت بھی تائید میں ذکر کی ہے، عبارت یہ ہے: "وحرم تصویر حیوان وإن لم یکن له نظیر (وغیر ذلک)"، نیز "مضاہاة بخلق اللہ" یا "تغییر خلق اللہ" بھی حرمت کی ایک دلیل ہے۔

کارٹون کی کچھ صورتیں جائز کچھ ناجائز، یعنی کارٹون کی نوعیت کے اعتبار سے حکم الگ الگ ہوگا، کارٹون کی ایک قسم تو وہ ہے جس میں آنکھ، کان، ناک اور

چاندرا کی شکل واضح نہ ہو، اس قسم کے کارٹون جائز ہیں، اور واضح شکل والے کارٹون تصویر ہو کر ناجائز ہوں گے، یہ رائے ہے: مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی جعفر علی رحمانی، مفتی خالد حسین قاسمی، مولانا طارق انور قاسمی، رانم السطور اقبال احمد قاسمی نے بھی کارٹون کے حکم میں تفصیل ذکر کی ہے، اور ایسے چھوٹے کارٹون جو محض بچوں کے کھیل کے مقصد سے بنائے جاتے ہیں اور ان میں تصویر بھی اکثر نمایاں نہیں ہوتی کھلونے کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے گڑیا وغیرہ سے بچے کھیلا کرتے ہیں، اس طرح کے کارٹون بنانے، بیچنے اور ان سے کھیلنے کی شرعا گنجائش ہوگی، ”عالمگیری“ میں ہے: ”ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتامل لا يكره“ (عالمگیری ۱۰۷)؛ مفتی خالد حسین قاسمی نے بھی نابالغ بچوں کے لئے کارٹون یا تصویر کھلونوں سے کھیلنے کو مفتی شفیع احمد صاحب کے حوالہ سے جائز لکھا ہے، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی نے کارٹون کے جواز کی ۵ شرائط لکھی ہیں: ۱۔ کوئی جائز مقصد ہو، ۲۔ کسی شخصیت کو اذیت پہنچانا مقصود نہ ہو، ۳۔ شخص معین کی غیبت و تحقیر نہ ہو، ۴۔ عریانیت نہ ہو، ۵۔ بد اخلاقی بے حیائی کا داعی نہ ہو۔

زیر بحث موضوع کا آخری سوال ڈراموں سے متعلق ہے جس میں مختلف افراد بطور کردار کے شامل ہوتے ہیں اور وہ متعین جملوں کو ادا کرتے ہیں، اس کی ایک شکل مدارس کی مروجہ مکالمات بھی ہیں، ڈرامے یا مکالمے اپنے مقاصد کے اعتبار سے اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے ہو سکتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرے کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈراموں یا ڈرامہ کے ہم شکل مکالموں کے بارے میں ایک رائے ہر طرح کے مروجہ ڈراموں اور مکالموں کے عدم جواز کی ہے، عدم جواز کے قائلین میں: ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شاہد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا طارق انور قاسمی ہیں۔

عدم جواز کی دلیل میں ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے لکھا ہے کہ ڈرامہ نگاری بے حیائی ہے، فرضی پاٹ ادا کرنے کی وجہ سے یہ جھوٹ بھی ہے، بھلا کوئی قاضی شریعہ یا امیر المؤمنین کا مدعی بنے گا تو سچ کیسے ہوگا، ڈرامہ (حماکہ) بندروں کی خصوصیت ہے، ”ومن خصاله أي القردة أنه يضحك ويضطرب ويحكي ما رآه“ (فتح الباری ۱۶۰، ۱۶۱)، فرضی میاں بیوی بننا، پھر ان کا نکاح و طلاق ہونا، اسی طرح بزرگان دین و علماء کا بھیس بدلنے کیلئے مصنوعی دائھی وغیرہ کا مذاق بنانا وغیرہ مفاسد کے علاوہ سب سے بڑھ کر یہ نصاریٰ و اہل یونان کا اختراع ہے اور تشبیہ بأعداء الاسلام ہے، ڈرامہ کی ابتداء اور ارتقاء پر شیخ بکر ابن عبداللہ ابو زید کے مقالہ ”حکم التمثیل حقیقة تاریخہ و حکمہ“ کے کئی اقتباسات بھی ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے نقل کئے ہیں۔

مولانا طارق انور اور مفتی عارف باللہ قاسمی صاحب نے ”اقلیة الدلیل علی حرمة التمثیل“ کے حوالہ سے لکھا ہے: ”إن التمثیل نشاء عن اليونان فالنصاری فالحضارة الغریبة الکافرة. وأنه من خصائصهم وشعائهم“، پھر ڈراموں کے مفاسد شمار کرانے کے بعد لکھتے ہیں کہ تفریحی ڈرامے کئی محرکات و ممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں، اور ان کا کردار کرنا یا ان کے کردار کو تحریر کرنا جائز نہیں، البتہ وہ ڈرامے جو ان ممنوعات سے خالی ہوں، اور انہیں وعظ و تبلیغ کے پیش نظر کیا جائے اور اس کے ذریعہ کسی اختلاف یا کسی عمل کی تعلیم دی جائے، جیسا کہ مدارس میں مکالمے اور حادثے ہوتے ہیں، کیونکہ اس ڈرامہ کی حقیقت عملی تعلیم کی ہے۔

مفتی شاہد قاسمی کہتے ہیں کہ اگرچہ ڈراموں میں سننے والوں کو اشتباہ نہ ہو تب بھی یہ جھوٹ ہی کے حکم میں ہوگا اور کسی اچھے مقصد کے لئے بھی جھوٹ کو ذریعہ بنانا جائز نہیں، اس لئے ڈرامہ مطلقاً ناجائز ہے۔

مولانا مغفور باندوی کہتے ہیں کہ ڈراموں، مکالموں کا وہی حکم ہے جو پہلے زمانے میں تھیٹروں میں چلنے والے ڈراموں کا تھا، یعنی ناجائز ہے، ان کے علاوہ باقی مقالہ نگار حضرات نے بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرے کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈراموں کے اسٹیج کرنے کی اجازت کا رجحان ظاہر کیا ہے۔



## دوسرا باب مقالات

### تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی علیہ السلام

جوابات رقم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفریح کی تعریف اور اس کی شرائط کے تعلق سے مختلف ارباب قلم کی آراء پیش کر دی جائیں۔  
ڈاکٹر نور الدین مختار الخادمی اپنے مقالہ ”فی ضوابط الترفیہ“ صفحہ ۲ میں ”ویجمل لهم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث ویضع عنہم إصرہم والأغلال التي كانت علیہم“ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

”ومن الطیبات مناظر الطبیعة ومدخراتها ومنافعها كالمیاء التحذیة والبحریة والمغروسات والمزروعات والحدائق والبساتین والهواء النقی والبیئة السویة والمحیط الجمیل هذا فضلاً عن طیبات الطعام والشراب واللباس وفضلاً عن مباحات فردیة وأسریة واجتماعیة كخیرة كمزاولة ألوان من أنشطة الجسدیة والعقلیة والنفسیة ومن ذلك ملاعبة الأبناء ومسابقة المنافس ومنافسة الأقران فی فنون معرفیة وعقلیة وحركیة“ (طیبات سے مراد قدرتی مناظر اور اس کے پوشیدہ خزانوں و منافع ہیں جیسے پانی کے سوتے، سمندر، اشجار، کھیتیاں، باغات، بہترین عمدہ ہوا، کھانے پینے اور پہننے کی پاکیزہ و حلال اشیاء نیز اجتماع و انفرادی مباح چیزیں، اسی طرح جسمانی، عقلی اور نفسیاتی نشاط بخش اشیاء اور انہیں میں سے بچوں سے کھیل کود اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی غرض سے دوڑ اور اپنے ہم جنسوں سے عقلی و تحریری فنون میں مسابقت ہے۔)

نیز صفحہ مذکورہ پر ڈاکٹر خادمی تفریح کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”الترویج فعل مضبوط بجملة ضوابط تقیده و متحدہ وترشده وتنیره وتصححه إذ هو لیس علی إطلاقه وعمومه ولا یؤدی بكیفیة عاریة عن قواعد الدین ومقاصده وأحكامه ولا یمارس بطریقة مطلقة وعاریة عن مراعاة القیم والأخلاق الإنسانیة والأعراف والتقالید والأنظمة السویة والقویمة“ یعنی ترویج وہ فعل ہے جو مرتب ہوتا ہے ایسے امور پر جو مقید و محدود ہیں، اس سے اطلاق و عموم مراد نہیں اور نہ ہی وہ صورت مراد ہے جس سے قواعد دین و مقاصد و احکام شرع متخلل ہو جائیں۔

شیخ فیصل بعدانی نے اپنے مقالہ ”الترویج عن النفس فی الاسلام“ صفحہ ۳ پر قرآن کی آیت: ”ما فرطنا فی الكتاب من شیء“ (الانعام: ۳۸) پیش کرنے کے بعد ترویج کی تعریف مختلف لغات و کتب کے حوالے سے نقل فرمایا:

”وقال اللیث: الراحة وجدانتك روحاً بعد مشقة: تقول: ارحنی إراحة فاستریح“ (تہذیب اللغة للازمهری ۲۰۱۷۷)۔

”وقال ابن الاثیر: یقال: أراح الرجل واستراح إذا رجعت نفسه إلیه بعد الإعیاء“ (نہایة فی غریب الحدیث ۲۰۶۵۸)۔

”وقال الفیومی: الراحة زوال المشقة والتعب وأرحته أقطت عنه ما یجد من تعب فاستراح“ (المصباح النیر

للفیومی ۱۰۲۲۲)۔

جملہ تعریفات کا حاصل یہی ہے کہ نفس تکان کے بعد جب نئی تازگی کی جانب عود کرے تو اس وقت اراح الرجل واستراح کہتے ہیں۔

بعدانی نے ذکر کردہ تعریفات کے علاوہ دکتور وکیل، دکتور الفخر، دکتور سالوطی، دکتور درویش اور مغربی مفکرین کراؤس Kraus برابر باتیں

علیہ السلام شیخ الحدیث و پرنسپل دارالعلوم سنو۔



Barbarabates پتھر Petler تشارلز بیوشو، تشارلز برائٹیل Bright Billckarles کی تعریفات بھی بحوالہ الترویج و اوقات الفراغ فی المجتمع المعاصر لدرویش والحوالی صفحہ ۲۱-۲۲ ذکر کی ہیں (الترویج عن النفس فی الاسلام ۴)۔

سید ابوالخیر اپنے مقالہ الترویج میں المشروع والممنوع کے صفحہ پر لکھتے ہیں: ”الرحلات والسیاحة الحلال للتنشيط والتدبر فی خلق الله ومعرفه أخبار الأمر الخالية كما حرم الإسلام العديد من وسائل وأدوات اللهو والترویح لمخالفتها مقاصد الشریعة الإسلامية الغراء مثل الأغاني الخلیعة والموسیقی والنرد“ (النردشیں) أوراق اللعب والرحلات والسیاحة التي فیها المفساد وتصد عن ذکر الله“ اسلام نے معذب و تباہ و برباد قوموں کے حالات جاننے اور مخلوقات میں تدبر و فکر و نظر کے ارادہ سے سیاحت حلال قرار دیا ہے برخلاف اس کے بہت سارے وسائل ترویج (جیسے نخش گانے، موسیقی، نرد تاش اور وہ سیاحت جس میں محرّمات ہوں اور ذکر اللہ سے غافل کر دینے والی ہو) کو حرام قرار دیا، کیوں کہ یہ ترویج مقاصد شرع کے ہم آہنگ نہیں۔

ڈاکٹر الحدادی صفحہ ۲ پر ترویج کی اباحت کی شرطوں کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں: ”عدم إخلال الترویج بمصالح الدنيا والآخرة فلا یبغی أن یؤدی هذا الترویج إلى تضييع واجب دینی كإقامة صلوة وأمر بمعروف وإنفاق واجب الخ“ تفریح ایسی نہ ہو جس سے دنیا و آخرت کی مصالح محض ہو جائیں، نہ ہی مناسب ہے کہ اس میں پڑ کر واجب دینی جیسے فریضہ نماز، امر بالمعروف، و ضروری اخراجات اور اہل و عیال کی ذمہ داریاں متاثر ہو جائیں۔

۲- ”عدم الاعتداء على الآخر سواء في بدنه أو عقله أو نفسه أو ماله“ (جسم، عقل و نفس و مال میں ایک دوسرے پر زیادتی لازم نہ آئے)۔  
 ۳- ”أن لا یؤدی الترویج إلى تضييع الشخصية وتضييع الأوقات وتعطيل التكاليف والالتزامات الشریعية والحضارية“ شخصیت، اوقات، تکالیف شرعیہ اور تہذیبی و شہری ذمہ داریوں کا ضیاع لازم نہ آئے، قرآن ناطق ہے: ”ولا تعتدوا إن الله لا یحب المعتدین“ (البقرہ: ۱۹۰)، ”تلك حدود الله فلا تعتدوها“ (البقرہ: ۲۲۹)، ”تلك حدود الله فلا تقربوها“ (البقرہ: ۱۸۷)۔  
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده وقال: لا یجمل لمسلم أن یروء مسلماً“ (ابوداؤد: ۵۰۰۳، دیکھئے: مقالہ نور الدین مختار الحدادی ”فی ضوابط الترویج“ صفحہ ۳) (ایک مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ دوسرے مسلمان کو خوفزدہ کرے)۔

اب ہر ایک کے جوابات ملاحظہ ہوں:

الف- متعدد روایات سے مزاح کا ثبوت ملتا ہے جو عرض ہیں:

۱- ”كان رسول الله ﷺ یمازح أصحابه الكرام ویمازحونه ویمازحون فیما بینهم“ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے مزاح فرماتے اور صحابہ کرام صحابہ کرام سے، اسی طرح صحابہ کرام آپ سے)۔

۲- ”عن أنس بن مالك أن رجلاً استحمل رسول الله ﷺ فقال: إني حاملك على ولد الناقة. فقال: يا رسول الله! ما أصنع بولد الناقة، فقال رسول الله ﷺ: وهل تلد الإبل إلا النوق“ (ابوداؤد: ۴۹۹۸، ترمذی: ۱۹۹۱) (انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سواری مانگی تو آپ نے فرمایا: میں تمہیں اونٹ کا بچہ دوں گا، سائل نے کہا: اونٹ کا بچہ کیا کام آئے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے)۔

۳- ”عن عوف بن مالك الأشجعی قال: أتیت رسول الله ﷺ في غزوة تبوك وهو في قبة من آدم فسلمت فیرد وقال: أدخل فقلت: أكلی یا رسول الله! قال: كلت فدخلت“ (ابوداؤد: ۵۰۰۰، ابن ماجہ: ۴۰۲۲، احمد: ۲۲۰۱۷) (عوف بن مالک اشجعی کہتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غزوة تبوک میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چڑے کے ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے آیا اور آپ کو سلام کیا تو آپ نے فرمایا: آجاؤ، میں نے کہا: پورا؟ فرمایا: ہاں پورا)۔

۵- ”عن بكر بن عبد الله قال: كان أصحاب النبي ﷺ يتبادحون بالبطحاء فإذا كانت الحقائق كانوا هم

الرجال“ (الادب المفرد للبخاری: ۲۶۶) مگر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام خریز ایک دوسرے پر پھینکتے تھے۔

ایک حدیث عرض ہے جس سے عدم جواز کا پتہ چلتا ہے: ”قال رسول اللہ ﷺ: لا تمار أخاك ولا تمازحه ولا تعده موعدة فتخلفه“ (ترمذی: ۱۹۹۵) (آپ ﷺ کا ارشاد ہے اپنے بھائی سے جدال نہ کرو، مزاح نہ کرو اور نہ ایسا وعدہ کرو جس میں وعدہ خلافی لازم آئے)۔

اب عاجز علماء اسلام کی تحریرات پیش کر رہا ہے جس سے اس تعارض کا دفعیہ ہو جائے گا، شیخ فیصل بن علی البعدانی اپنے مقالہ ”الترویح عن النفس فی الاسلام“ صفحہ ۲۳-۲۵ پر لکھتے ہیں:

”ولا يجوز الإفراط في المزاح وال مداومة عليه، لأنه يشغل عن مهمات الحياة دنیا وأخرى ويؤذي الناس ويسقط المهابة والوقار وينتهي إلى الهذر“ (مزاح میں زیادتی و مداومت جائز نہیں، اس لئے کہ ایسا کرنا دنیاوی و آخروی ذمہ داریوں سے غافل کر دیتا ہے، لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے، رعب و وقار کو ختم کر دیتا ہے، بیہودہ گوئی و لغویات کی طرف لے جاتا ہے)۔

موصوف ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

”الفكاهة والمزاح الكريم الخالي من الكذب والفحش والسخرية (ايضا، ۱) فلا مزاح ولا مداعبة بقول محرم أو بما يشير الأحقاد والعداوة بين الأصدقاء فقد كان رسول الله ﷺ يمزح ولكنه لا يقول إلا حقا“ (ایضا، ۵۰۱) (خوش طبعی و مزاح کذب محس و خریہ سے خالی ہونا چاہئے، ایسے مزاح جو حرام ہوں یا جس سے احباء کے درمیان عداوت و دشمنی پیدا ہوتی ہو اور کینہ کا باعث ہو جائز نہیں، آقا ﷺ بطور مزاح جو جملے ارشاد فرماتے وہ سراسر حق و صداقت پر مبنی ہوتے تھے، مشہور فقیہ اور عالم دین حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجرہ بحوالہ مجمع الزوائد ۸/۸۹ باب ماجاء فی المزاح ابوداؤد شریف: ۴۹۹۸، بخاری: ۶۱۲۹، باب الانبساط إلى الناس، احیاء العلوم ۱۲۸۳ لکھتے ہیں کہ مزاح کے معنی خوش طبعی کے ہیں، اس کے مقابلہ میں خریہ اور استہزاء کے الفاظ ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مزاح تو کرتا ہوں لیکن حق و سچائی کے سوا نہیں کہتا، آگے حضرت رحمانی لکھتے ہیں: مزاح میں افراط یا مداومت ناجائز ہے، افراط سے مراد بہت زیادہ ہنسا ہنسانا اور مداومت سے مراد یہ ہے کہ زیادہ وقت ہنسی و مذاق میں گزارے (قاموس اللغة ۵/۸۲-۸۳)، اگر یہ بات نہ ہو تو مباح ہے اور اگر کسی کی دلداری اور اس کو مانوس کرنا مقصود ہو اور شریعت میں معتبر مصلحت پیش نظر ہو تو مستحب ہے (قاموس اللغة ۵/۸۳)۔

فیصل بن علی البعدانی الترویح عن النفس فی الاسلام صفحہ ۱۹-۲۰ پر لکھتے ہیں: ”أن لا يكون في النشاط الترویحی أذية للآخرين من سخرية أو لمز أو نيز أو ترویح أو غيبة أو اعتداء على ممتلكاتهم بإتلاف أو استخدام ونحو ذلك ومن النصوص الدالة على ذلك، يا أيها الذين آمنوا لا يسخر قوم من قوم عسى أن يكونوا خيرا منهم ولا نساء من نساء عسى أن يكن خيرا منهن، ولا تلمزوا أنفسكم ولا تنابزوا بالألقاب بئس الاسم الفسوق، يا أيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن إن بعض الظن إثم ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضاً أوجب أحدكم أن يأكل لحم أخيه ميتاً فكرهتموه واتقوا الله إن الله تواب رحيم (الحجرات: ۱۱۳)۔ وقال رسول الله ﷺ: لا يأخذ أحدكم متاع أخيه لأعبا ولا جادا“ (ابوداؤد: ۵۰۰۳) (آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا سامان نہ تو مذاقاً لے اور نہ حقیقتاً) ساتھ ہی نصوص قرآنیہ سے معلوم ہوا کہ خریہ کسی کی جانب گوشہ چشم سے اشارہ (بغرض تنقیص) برے ناموں سے پکارنا، تعریض، غیبت، سوء ظنی ساری چیزیں ایذا کا سبب ہیں، اس لئے احتراز ضروری ہے۔

اب انیر میں بعدانی کے مقالہ صفحہ ۷۷ سے ایک اقتباس نقل کر کے ختم کرتا ہوں، ”وإذا تجاوز النشاط الترویحی هذا الحد وأصبح هدفاً وغاية في ذاته فإنه يخرج من دائرة المستحب أو المباح إلى دائرة الكراهة أو الحرمة وبهذا الضابط يخرج الاحتراف لبعض الأنشطة الترویحية عن دائرة المباح أو المشروع، لأن فيه إخلالاً ببيته النظام الاجتماعي وهيكله القائم على تعاليم الإسلام وفيه قيادة أفراد الأمة إلى الهزل أن الإسلام رفض الإفراط في كمية العبادات الشرعية التي جاء أمراً بنوعها أمر وجوب أو استحباب إذا خرجت عن حد المألوف المستطاع“ جب ترویح حد سے تجاوز ہو کر مقصد بن جائے تو وہ مستحب کے دائرہ سے نکل کر کراهت یا حرمت کی حد میں داخل ہو جائے گی جس سے اسلامی تعلیمات نے جو ڈھانچہ نظام انسانی کا قائم فرمایا ہے معطل ہو کر رہ

جائے گا، اسی نظام انسانی کی بقا کی غرض سے عبادات شرعیہ کی انواع امر و وجوب و استحباب بیان کر کے حد بندی کر دی گئی ہے تاکہ اعتدال باقی رہے۔  
 ازب۔ اولاً رجز و اشعار کی اباحت سے متعلق چند روایات عرض ہیں:

۱۔ ”ما جاء عن عمرو بن الشريد قال: ردف رسول الله ﷺ يوماً فقال: هل معك من شعر أمية بن الصلت؟ قلت: نعم، فقال: هيه فأشدته بيثا فقال: هيه حتى أنشدته مائة بيت“ (مسلم: ۲۲۵۵)۔

۲۔ ”وعن سلمة بن الأكوع قال: فجعل عمي عامر يرتجز بالقوم تالله لولا الله ما اهتدينا، ولا تصدقنا ولا صلينا، ونحن عن فضلك ما استغينا، فثبت الأقدام إن لاقينا، وأنزلن سكينه علينا، فقال رسول الله ﷺ: من هذا؟ فقال: أنا عامر قال: غفر لك ربك“ (مسلم: ۱۸۰۷)۔ لیکن بخاری کی روایت بتاتی ہے کہ یہ اشعار آپ نے خود ہی اس وقت پڑھے ہیں جبکہ خندق کھودی جا رہی تھی اور آپ مٹی منتقل کر رہے تھے اور شکم مبارک غبار آلود تھا ایک شعر: إن الأولى قد بغوا علينا، إذا أرادوا فتنة أبينا زائد ہے ویرفع بها صوته أبينا أبينا، أبينا أبينا پر آپ ﷺ آواز بلند کرتے تھے (بخاری: ۴۱۰۴)۔

۳۔ ”عن جندب قال: بينما النبي ﷺ يمشي إذ أصابه حجر فعثر فدميت أصبعه فقال: هل أنت إلا أصبع دميت، وفي سبيل الله ما لقيت“ (بخاری: ۲۱۲۶)۔

۴۔ ”عن عائشة رضي الله عنها قالت: دخل أبو بكر رضي الله عنه وعندي جاريتان من جواري الأنصار تغنيان بما تقاولت به الأنصار يوم بعاث، قالت: وليستا بمغنيتين فقال: أبو بكر أبعز مور الشيطان في بيت رسول الله ﷺ وذلك يوم عيد فقال: رسول الله ﷺ: يا أبا بكر إن لكل قوم عيداً وهذا عيدنا“ (مسلم: ۸۹۲) (حضرت عائشة فرماتی ہیں کہ میرے والد ابو بکر میرے گھر تشریف لائے جبکہ میرے پاس انصار کی دو بچیاں اوس و خزرج کے درمیان ہونے والی مشہور جنگ جنگ بعاث کے واقعات گارہی تھیں۔ درحقیقت وہ پیشہ ور گانے والیاں تھیں یہ سن کر حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے گھر میں بھی شیطانی گانے)۔

امام مسلم نے ایک دوسری سند سے تخریج کی ہے: ”جاريتان تلعبان بدف“ (مسلم: ۲۰۹۹)۔

۵۔ ”عن الربيع بنت معوذ بن عفراء قالت: جاء النبي ﷺ يدخل حين بنى علي فجلس علي فراشي كمجلسك مني فجعلت جو يريات لنا يضر بن بالدف ويندبن من قتل آبائي يوم بدر، إذ قالت إحداهما: وفينا نبي يعلم ما في غد، فقال: دعي هذا وقولي بالذي كنت تقولين“ (بخاری: ۵۱۳۷) (ربیع بنت معوذ بن عفراء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس شب زفاف کی صبح تشریف لائے اور میرے بستر پر اس طرح بیٹھ گئے جیسے تم بیٹھے ہو، پس ہمارے گھر کی بچیاں دف بجا کر میرے ان آباء پر جو جنگ بدر میں کام آگئے تھے ندبہ کرنے لگیں، ان میں سے ایک نے کہا: ہم میں ایسے نبی ہیں جو آئندہ کل کی بات جانتے ہیں، اس پر آنحضرت ﷺ نے تکبیر فرمائی اور کہا وہی کہو جو اس کے پہلے کہتی تھی)۔

۶۔ خوات امین جبیر فرماتے ہیں کہ ہم عمر فاروقؓ کے ہمراہ ایک قافلہ میں حج کے لئے روانہ ہوئے جن میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی شامل تھے، راستہ میں لوگوں نے فرمائش کی کہ اے خوات کچھ اشعار ترنم سے سناؤ، میں نے اشعار سنائے کچھ لوگوں نے فرمائش کی کہ ضرار کے اشعار سناؤ حضرت عمر فاروقؓ بولے خوات کو اپنے دل کی آواز سنانے دو (یعنی اپنے اشعار) چنانچہ میں ساری رات اشعار سناتا رہا یہاں تک کہ صبح ہونے لگی تو حضرت عمر فاروقؓ بولے اے خوات اب اپنی زبان روک لو کیوں کہ اب صبح ہو رہی ہے (کنز العمال ۱۵/۲۲۸، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/۲۲۳)، ایک اور روایت سنن الکبریٰ للبیہقی (۱۰/۲۲۵) کی اس طرح ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے اشعار پڑھنے کی بابت پوچھا تو جواب ملا اگر اشعار خوش نہ ہوں تو میں ان کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔

اب عرض ہے کہ مزاحیہ پروگرام و مزاحیہ مشاعروں کے منعقد کرنے میں چند شرطیں ملحوظ ہونی چاہئیں، کچھ شرطیں بالکل شروع میں مزاح و ترویح کے تحت نقل کی جا چکی ہیں مزید برآں یہ کہ مردوزن کا اختلاط نہ ہونے پائے، ”أف لا يكوون في النشاط الترويجي اختلاط بين الرجال

والنساء لما يقضى إليه ذلك من النظر المحرم والخلوة المحرمة بالإضافة إلى أنه قد يكون ذريعة لمخالفات شرعية أكبر قال الله تعالى: وإذا سألتهم عن متاعاً فاسألوهم من وراء حجاب“ (الاحزاب: ۵۳)، ”قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم إن الله خبير بما يصنعون۔ وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن“ (النور: ۳۱-۳۰) (دیکھئے: مقالہ فیصل بن علی السعدانی ۲۰)۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”ایاکم والدخول على النساء، فقال رجل من الأنصار: يا رسول الله! أفرأيت الحمى؟ قال: الحمى الموت“ (مسلم: ۲۱۷۲) (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورتوں کے پاس آمدورفت سے خود کو بچاؤ، ایک انصاری صحابی نے فرمایا: یا رسول اللہ دیور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دیور تو موت ہے)۔

۲- معازف و مزامیر و موسیقی و جام و سبوسے خالی ہو، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”لیکونن من امتی أقوام یتستحلون الحر والحریر والخمر والسعازف“ (بخاری: ۵۵۹۰) (میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو زنا کاری، ریشمی لباس پہننے، شراب نوشی اور گانے بجانے کو حلال کر دیں گے)۔

۳- وہ اشعار سبج، فسق و فجور کے داعی اور غیرت دینی میں رخنہ ڈالنے والے نہ ہوں۔

سید ابوالخیر رقم طراز ہیں: ”کالدعوة إلى الفجور وإماتة الخيرة الدينية والشهادة وتمثل على ذلك بالغناء بالأشعار الغزلية والهزلية التي تثير الغرائز وتهمج الشهوات وتسعر في النفس نار الشوق إلى موقعة الفعل الحرام وانتهاك الأعراض والاعتداء على الحرمات ويتمثل أيضاً في الآلات الموسيقية والمعازف التي هي من أعظم الدوافع إلى وقوع الإنسان في الخييض وتنزل به إلى الحياة البهيمية وتهمج فيه الغرائز الحيوانية ويدعوه الشيطان بها إلى الفجور ذلك أن الغناء رقية الزنى ومدخل إلى الشر والإثم والضلال والصد عن سبيل الله قال تعالى: ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله“ (لقمان: ۶)، قال ابن عباس وابن عمر وابن مسعود رضوان الله عليهم أجمعين: هو الغناء وأشباهه“ (الترويح بين المشروع والمنعوق ۶۶)۔

وہ اشعار فجور کی دعوت دینے والے، غیرت دینی کو سر د کرنے والے نہ ہوں، ہم اس کی مثال غناء سے دیتے ہیں، غزل و ہزل کے وہ اشعار جو غریزی قوتوں کو ابھارنے، شہوتوں کو مشتعل کرنے، نار شوق میں گرمی پیدا کرنے حتیٰ کہ فعل حرام میں جا پڑنے اور عزت و ناموس کو چاک کرنے کے باعث نہ ہوں۔ یہ پروگرام ممتد اور دیر پانہ ہو کہ انفرادی حد تک جا پہنچے۔

اسلام میں تفریح کا یہ مقصد نہیں ہے کہ مکمل طور پر اسے مقصود بنا لیا جائے اور اس درجہ انہماک ہو کہ وہ اس کا عادی ہو جائے اور عبادات و طاعات کی فکر نہ رکھے، اسلام نے اس طرح کے امور پر قدغن لگایا ہے، ”إن الترويح في الاسلام ليس بهدف ملء الفراغ ولا قتل الوقت ولا ممارسة اللهو... عدم الإسراف في الترويح حتى لا يصل إلى درجة الأدمان ويصبح لاشياء النفس الأماراة بالسوء ويخرج من مجال العبادات والطاعات والإسراف في كل شئ محرم في الإسلام، قال الله تعالى: كلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا يحب المسرفين“ (مقالہ الترويح بين المشروع والمنعوق ۵۴)۔

”ومن ذلك عدم إهدار أوقات الليل كلها في السمر وفي العبث وفي الأمور المحرمة فقد قال النبي ﷺ: لا سمر إلا لمصل أو مسافر“ (رواه احمد)، ويقول محذراً من السمر الطويل إلى الفجر في عبث وهو كما في مسند الإمام أحمد: لبيتن أقوام من امتي على أكل ولهو وغناء ثم يصبحون وقد مسخوا قرودة وخنازير“ (دیکھئے مقالہ: الضوابط الشرعية للترويح ۲) (میری امت کے کچھ لوگ کھانے، لہو و لعب و غنائ میں اس درجہ مصروف رہیں گے کہ صبح کر دیں گے نتیجہً انہیں سور و بندر بنا دیا جائے گا)۔

حدیث میں آتا ہے کہ بندہ اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا محشر کے دن جب تک اس سے چار چیزوں کی بابت سوال نہ کیا جائے گا جس میں سے ایک زندگی اور وقت بھی ہے، حضور اکرم ﷺ نے حضرت حنظلہؓ سے فرمایا: ”يا حنظلہ ساعة وساعة“ یہ روایت کنز العمال ۱۵/۲۱۲ پر اس طرح ہے، ”روحوا القلوب ساعة فساعة“ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا ارشاد: ”القلب ممل كما تمل الأبدان فاطلبوا لها طرائق الحكمة“ (احکام

القرآن (۳، ۱۹۵)، (دل اسی طرح آکتا نے لگتا ہے جیسے بدن تھک جاتے ہیں تو اس کے لئے حکمت کے راستے تلاش کیا کرو)۔

اس میں شریک ہونے والے، منتظمین، معاونین سبھی صالح و دیندار ہوں، آقا کا ارشاد ہے کہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، ”مثل المجلس الصالح وجليس السوء كحامل المسك ونافخ الكير الخ“۔ احقر ایک شعر پیش کرتا ہے:

یہ مثل سچ ہے کہ پڑ جاتا ہے صحبت کا اثر  
آدمی کیا درود یو ار بدل جاتے ہیں

”إذا أراد الإنسان أن يروح عن نفسه فلا بد أن يختار من يعينونه على الطاعة فالمرء على دين جليسه فلا ينبغي للإنسان أن يختار في الترويح من لا يصلى ومن لا يذكر الله“ (دیکھئے مقالہ: الضوابط الشرعية للترويح (۲) (انسان جب تفریح کا ارادہ کرے تو سادھی ایسا منتخب کرے جو دین میں اس کا معاون ہو، کیونکہ سادھی اپنے دوسرے سادھی کی روش اختیار کرتا ہے، لہذا ایسے لوگوں کی مصاحبت اختیار نہ کرے جو بے نمازی یا اذکار و شغل نہ ہوں)۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ ہمیں اور ہم آپ کو ہنساتے رہتے، لیکن جو نبی اذان سنتے ہم نماز کے لئے اس طرح چلے جاتے گویا ایک دوسرے کو پہنچاتے ہی نہیں، ”كان النبي ﷺ يضحكنا ونضحكنا فإذا سمع الأذان فكأنه لا يعرفنا ولا نعرفه“۔

اج- جن شرطوں کے ساتھ مزاح کی اجازت دی گئی ہے، حد جواز میں رہتے ہوئے کہانیاں لکھنا پڑھنا اور ان کتابوں کی خرید و فروخت جائز ہے، حضور اکرم ﷺ نے کتوں کے پالنے سے منع کرنے کے باوجود چند مقاصد کے تحت ان کا رکھنا جائز قرار دیا ہے، ”من اتخذ كلباً إلا كلب صيد أو زرع أو ماشية انتقص من أجره كل يوم قيراط“ (البخاری کتاب الحرث باب ائناء الكلب: ۲۲۲۲، صحیح مسلم کتاب المساقاة باب الامر بتقبل الكلاب: ۱۵۴۵، سنن ابی داؤد کتاب الصيد باب اخذ الكلب للصيد وغيره: ۲۸۴۴)۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ عینی کی تحریر ملاحظہ ہو، ”فيه اختلاف العلماء فقال الحسن وربيعة وحماد بن أبي سليمان والأوزاعي والشافعي واحمد وأبو داؤد ومالك في رواية: ثمن الكلاب حرام، وقال عطاء بن أبي رباح وإبراهيم النخعي وأبو حنيفة وأبو يوسف ومحمد وابن كنانة وسحنون من المالكية: والكلاب التي تنتفع بها ويجوز بيعها وبياح أماتها وعن أبي حنيفة أن الكلب العقور لا يجوز بيعه ولا يباح ثمنه وأجاب الطحاوي عن النهي في هذا الحديث وغيره أنه كان حين كان حكم الكلاب أن تقتل وكان لا يحل إمساكها... فما كان على هذا الحكم فثمنه حرام ثم لما أبيع الانتفاع بالكلاب للاصطياد ونحوه ونهى عن قتلها نسخ ما كان من النهي عن بيعها وتناول ثمنها“ (عمدة القاری ۱۲، ۵۹)، ”بيع الكلب المعلم عندنا جائز... كذا في فتاوى قاضي خان وبيع الكلب الغير المعلم يجوز إذا كان قابلاً للتعليم وإلا فلا هو الصحيح كذا في جواهر الأخلاط“ (ہندیہ ۳، ۱۱۳)۔

ان دلائل کی روشنی میں احقر کی رائے ہے کہ جب کتوں کا چند مقاصد کے تحت امساک جائز ہو گیا تو ان کی بیچ و خرید بھی حلال ہو گیا، اسی طرح مزاح کی جائز صورتوں میں مزاحیہ کتابوں کی خرید و فروخت درست ہونی چاہئے۔

از- اس کا جواب (اج) کے ضمن میں موجود ہے۔

اہ- شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید اپنے مقالہ ”التمثيل“ صفحہ ۲۳ پر ڈرامہ کی ابتداء اور اس کے ارتقا پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عرب میں موجودہ شکل میں ۱۸۳۰ء میں سب سے پہلے ڈرامہ مارون النقاش الملبانی نے پیش کیا جو نصرانی تھا پھر ۱۳۲۰ھ میں ابوخلیل قبانی کے ذریعہ خود اس کے ملک میں اور مصر میں پہلا ڈرامہ منعقد کیا گیا۔ اس کے عدم جواز پر موصوف نے سیر حاصل، بحث فرماتے ہوئے رقم کیا ہے کہ زمانہ خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ دوسری بحث یہ کی ہے کہ اس کی مشروعیت علی سبیل التبعید ہوگی یا علی سبیل الاعتیاد، امر تبعیدی نص پر موقوف ہے اور اس میں کوئی نص نہیں، اس لئے سراسر یہ امر محدث ہوگا اور اس کی حرمت اس حدیث سے واضح ہے، ”من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد“ اور اگر علی سبیل الاعتیاد ہو تو اس میں تشبہ باعداء اللہ پایا جاتا ہے اور آیات ربانی: ”كالذين من قبلكم كانوا أشد منكم قوة وأكثر أموالاً وأولاداً فاستمتعوا بخلاقهم فاستمتعتم بخلاقهم كما استمتع الذين من قبلكم بخلاقهم وخضتم كالذين خاضوا أولئك حبطت أعمالهم في الدنيا والآخرة وأولئك

هم الخاسرون“ (التوبہ: ۶۹) کا مصداق ہوگا، اس لئے اس جہت سے بھی درست نہیں۔

علامہ ابن حجر پیشی نے اپنے رسالہ الاعلام بقواطع الاسلام ۳۶۲ پر اسے کفر یا امور میں شمار فرمایا ہے ملاحظہ ہو: ”ومنها أى المكفرات لو حضر جماعة وجلس أحدهم على مكان رفيع تشبيها بالمذكرين فسلوا المسائل وهم يضحكون ثم يضربونه بالمجراف أو تشبه بالمعلمين فأخذ خشبة وجلس القوم حوله كالصبيان فضحكوا واستهزؤوا“ (واعظوں اور نصیحت کرنے والوں کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے ایک شخص اونچی جگہ پر بیٹھے اور حاضرین اس سے مسائل دریافت کریں کسی مذاق کے لئے پھر اس کو جھاڑو سے مارنے لگیں، یا کسی نے استاذ کی نقل اتاری اس نے اپنے ہاتھ میں چھڑی لی اور لوگ اس کے پاس بچوں کی طرح بیٹھ گئے پھر لوگ ہنسنے لگے اور مذاق اڑانے لگے۔

”وعن معاوية أن رسول الله ﷺ قال: ويل للذي يحدث فيكذب ليضحك به القوم ويل له ويل له“ (رواه احمد والترمذى والحاكى) (ہلاکت ان کے لئے ہے جو بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں، اس مقصد سے کہ قوم کو ہنسائیں، ہلاکت ان کے لئے ہے ہلاکت ان کے لئے ہے) کبھی شخص متعینہ کے کسی عیب کو مثلاً اس کے لنگڑے پن، اس کی ہکلاہٹ کو محاکاۃ کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے جس کے غیبت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، سراسر ایذا پہنچانا ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں، قال رسول الله ﷺ: ”وكل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه“ (ایک مسلمان کا خون، عزت و مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے)۔

کبھی کبھی باہم مقابلہ آرائی میں، مار پیٹ کارول ادا کیا جاتا ہے، اس سے لوگوں پر برا اثر پڑتا ہے، لوگوں کو جرائم پر ابھارتا ہے، اسی مجرمانہ ذہن سازی کے باعث آج جرائم کی کثرت ہے، فرضی کہانیاں بنا کر اسے اچھے ڈھنگ سے مرتب کر کے ایک دوسرے کے خلاف ماحول بنایا جاتا ہے، اس لئے بلا قیل و قال کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایذا رسانی، تحریہ، تجاسر ہتھیاب پر مشتمل ہے، ایک بات یا ایک فعل کسی نے نہ تو کیا اور نہ کہا قول و فعل کی استناد اس کی طرف کی جاتی ہے۔

کردار دیا پاتا کرنے والوں سے یہ پوچھا جائے کہ کیا وہ اسے گوارہ کر سکتا ہے کہ اس کی بھی جب وہ اپنی بیوی سے بات کر رہا ہو یا جب وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو تو اس کی تصویر کشی کر لی جائے تو وہ راضی رہے گا۔

ابوزید کہتے ہیں کہ دعبیل الخزاعی کہتا ہے: ”وما غلبني إلا مخنث قلت له: والله لأهجونك قال: والله لئن هجوتني لأخرجن أملت في الخيال“ (التمثيل ۳۲) (مجھ سے کوئی شخص کامیاب نہیں ہوا سوائے ایک مخنث کے، میں نے اس سے کہا خدا کی قسم میں تمہاری ضرور ہجو کروں گا وہ کہنے لگا تب تو ہم ضرور ضرور تمہاری ماں کو خیال میں لائیں گے) واضح ہو کہ تمثیل کا ایک نام خیال النظم بھی ہے، معلوم ہوا کہ ڈرامہ جذبہ انتقام کی ایک کڑی بھی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ سے اس شخص کے متعلق جو لوگوں سے جھوٹے قصے و حکایات بیان کرتا ہے حکم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ”فإنه عاص لله ولرسوله وقد روى بهز بن حكيم عن أبيه عن جده عن النبي ﷺ قال: إن الذي يحدث فيكذب ليضحك القوم ويل له ويل له ثم ويل له“ (مجموع الفتاوى ۲۲، ۲۵۵، ۲۵۶) ”وقال ابن مسعود ﷺ: إن الكذب لا يصلح في جد ولا بهزل ولا يعد أحدكم حبيبه شيئاً ثم لا ينجزه“ (کذب نہ تو حقیقت کا فرد بن سکتا ہے نہ ہزل کا اور نہ وعدہ کر کے کوئی اپنے حبيب سے کسی چیز کا پھرا سے پورا نہ کرے)۔

ابوزید لکھتے ہیں ایسا شخص مستحق عقوبت ہے، ”ولكل حال ففاعل ذلك مستحق للعقوبة الشرعية الخ“ (التمثيل ۳۱)۔

بکر بن عبد اللہ کی ایک عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا کوئی عقل سلیم اسے گوارہ کر سکتی ہے کہ ایک شخص فرضی قاضی شریح بن کرانا القاضی شریح اور فرضی امیر المؤمنین عمر بن الخطاب بن کرانا امیر المؤمنین عمر بن الخطاب کہے، فرضی زوجین بن کر طلاق کا پاٹ ادا کرے یا نکاح کا رول ادا کرے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا تقوم الساعة حتى تظهر الفتن ويكشر الكذب“ (رواه احمد في السند في رواية ابى هريرة)۔

انہیں گھڑے ہوئے اور مخلوق قصوں کے باعث امیر المؤمنین عمر بن الخطاب نے قصاص و دواعظین پر شدت سے نکیر فرمائی تھی۔

ڈرامہ (محاکاۃ) تو بندروں کی خصوصیت ہے، حافظ ابن حجر فتح الباری (۱۶/۷) پر لکھتے ہیں: ”ومن خصاله أى القرد أنه يضحك ويطرب ويحكي ما رآه“، حیاء الحیوان (۲۷۸/۲) پر کمال الدین دیرمی نے ان کے خصائص پر تفصیلی گفتگو کی ہے، نیز اس میں مردوزن، امر و غیر امر و

اجنبی و اجنبیہ کا اختلاط، مصافحہ، معانقتہ و سفر بلا محرم، مصنوعی داڑھیاں، مصنوعی جوڑے و بال، عورت و مرد کی عورت غلیظہ یا غیر غلیظہ کا کشف، گالی گلوچ، پتھر بازی، فرضی بیوی و شوہر بننا پھر ان کا نکاح و طلاق شعائر کفر، کنیہ، معاہدہ و ثنیہ و بیوت نار کی عظمت، رعب و خوف، امید و یاس، بزرگان دین و علماء کے بھیس میں ان کی ہیبت، صورت و سیرت کی تمثیل ہوتی ہے، یہ بھی ایک طرح کی فلم ہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ فلم میں تصویر ہوتی ہے اور ڈرامہ جیتے جاگتے انسانوں کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”الأشهر شر“ والأشيرة العنت۔ شیخ شریف بن علی الراحی نے اپنی کتاب ’طوفان البلاء التمثیل والغناء‘ صفحہ ۹ پر پندرہ محرمات کا بالتفصیل تذکرہ فرمانے کے بعد لکھا ہے: ”ویقول أحد الکفار کأس وغایة تفعلا ن فی أمة محمد أشد ما یفعله ألف مدفع فاغر قوها بالشهوات فاغرقت الأمة بالشهوات والتمثیل والغناء هما أشد سلاح فی إثارة الشهوة وإشعال لهیبها“ (ایک غیر مسلم کا قول ہے کہ ایک مغنیہ اور شراب کا ایک پیالہ امت محمدیہ کے لئے ہزار راتوں کے نقصان سے بڑھ کر ہے تم مسلمانوں کو خواہشات نفسانی میں ڈبو دو، چنانچہ امت محمدیہ شہوتوں اور برائیوں میں گھر گئی اور یہ دونوں چیزیں (گانا و شراب) شہوتوں کے ابھارنے اور اسے بھڑکانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں)۔

نیز موصوف کتاب مذکور کے صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں: ”سلوا التاریخ هل أفل نجمنا إلا یوم سطعت نجوم المغنین وقویت دولة الراقصات فی سماء حضارتنا“ (گانے بجانے اور ناچنے والیوں کا ستارہ عروج پر ہوا بھی سے اسلام کا ستارہ غروب ہوا تاریخ سے پوچھ لو)۔ خلاصہ یہ کہ تمثیل حرفت، آرٹ، کمانے، عرض و مشاہدہ کسی بھی غرض سے درست نہیں، کیونکہ اس کے جواز پر کوئی نص نہیں، تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ نصاریٰ و اہل یونان کی اختراع ہے اگر اس کے سوا ہوتو یہ لہو محرم ہے، اس لئے کہ تشبہ باعداء الاسلام پایا جاتا ہے، نیز اس میں وہ چیزیں ہیں جو آداب شرع و ناموس کی ترقی کی معارض ہیں۔ دین و دنیا دونوں میں سراسر نقصان ہے، ایک سوچی سمجھی یہودی سازش کے تحت انسانی اخلاق کو تباہی کے غار میں دھکیلنے کے مراد ہے۔ ان معروضات کے بعد احقر کی رائے ہے کہ تمثیل خواہ لذتہ محرم ہو یا موضوعہ یا لاسبابہ بھی درست نہیں ہونی چاہئے۔

۱- یہ مسلم ہے کہ رب کائنات نے جس چیز کا جتنا حکم دیا ہے اسی میں ہمہ جہت خیر ہے اللہ کا فرمان ہے: ”فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً“ (ہنسو کم روؤ زیادہ)، نبی صادق و صدوق علیہ السلام کا ارشاد ہے: ”عن أبی ہریرة أن رسول الله ﷺ قال: لا تکثر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (ابن ماجہ: ۲۲۱۷)، ”عن سماک قال قلت لجابر بن سمرة: أکنت تجالس رسول الله ﷺ قال: نعم فكان طویل الصمت قلیل الضحک وكان أصحابه یذکرون عنده الشعر وشیئاً من أمورهم فیضحکون وربما یتبسم“ (مسند احمد: ۲۰۸۲۹)، ”أقل الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (الادب المفرد للبخاری: ۲۵۸)، نص قرآنی و روایات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمیں کم ہنسنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ زیادہ ہنسی دل کو مردہ کر دیتی ہے اور تجربہ بھی یہی ہے، بسا اوقات آدمی کسی موقع سے زیادہ ہنستا ہے تو متصلاً پڑ مردگی و مردنی سی چھا جاتی ہے۔

بعدانی کی تحریر ملاحظہ ہو: ”إذا کان فی النشاط الترویجی ضرر علی ممارسه آیا کان نوع الضرر ولم یوجد فیہ نفع یفوق ذلك الضرر فإنه یحرم علی ذلك الممارس مزاولته لقوله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار وقاعدة درء المفسد مقدم علی جلب المصلح“ (مقالہ الترویج عن النفس فی الاسلام ۲۰۲۱) (ترویج اگر مفضی الی الضرر ہو خواہ کوئی بھی ضرر اور نفع معدوم ہو تو اس ترویج کو روک دیا جائے گا کیوں کہ آقا کا ارشاد ہے: ”لا ضرر ولا ضرار“، اور اہل فقہ کا ضابطہ ہے کہ مفسدہ کو دور کرنا جلب مصلحت پر مقدم ہوگا)۔

۲- الف: ستر کا لحاظ رکھا جائے، اختلاط عورت و مرد کے درمیان نہ ہو، ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسروں کے لئے ایذا رسانی یا جسم کو شدید نقصان یا موت تک پہنچا دے، جو کھیل مردانہ ہے وہ مرد ہی اور جو زنانہ ہے وہ عورتیں ہی کھیلیں۔

بعدانی لکھتے ہیں: ”إذ تختلف الأنشطة الممارسة من فرد إلى آخر باختلاف الجنس فالذکر له أنشطة ترویجیة تناسبه كما أن للأنثی أنشطة أخرى تناسبها“ (الترویج عن النفس فی الاسلام ۱۰)۔

نیز کھیل میں قمار کی صورت نہ ہونے پائے، وہ کھیل ایسا ہو جس سے جسمانی ریاضت اور قوت مدافعت پیدا ہو، منصوبات سے جن کی ممانعت ہے وہ کھیل نہ ہوں، شرعی، دینی اخلاقی و اہل و عیال کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے والا نہ ہو، وقتی و عارضی و کم سے کم وقت میں کھیلے جانے والا ہو ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑ کر عادی

بن جائے، وسیلہ وسیلہ کی حد تک ہو غایت و مقصد نہ بن جائے، عمر میں یکسانیت ہو، ”إذ يؤثر العمر في تحديد النشاط الترويحي الذي يمارسه الأفراد فالأطفال لهم أنشطتهم الخاصة... في حين تكثر الأنشطة الثقافية والقراءة بين كبار السن بينما تمتاز أنشطة فئات الشباب بالتنوع“ صفحہ ۱۰، ملعب کا انتخاب صحیح ہو، غیر شرعی و عام گذرگاہ نہ ہو، معیار تعلیم میں یکسانیت ہو، ”إذ يتدخل المستوى التعليمي بشكل كبير في تحديد النشاط الترويحي الذي يمارسه الأفراد فلأصحاب المستوى العالي من التعلم في الغالب برامج وأنشطته ترويحية تختلف عن الفئات التي تعاني منها الداعية“، اقتصادی اعتبار سے بھی ہم آہنگی ہو۔ ہر ایک کی تفصیلات و دلائل ۲-ج میں پیش کئے جا چکے ہیں۔

کھیلوں کے اصول، جواز و عدم جواز و شرائط لباس کے بعد عرض ہے کہ اس حدیث ”ليس من اللهو إلا ثلاث: تأديب الرجل فرسه وملاعبته أهله ورميه بقوسه ونبله“ (ابوداؤد: ۲۵۱۲، النسائی: ۲۵۸۷)، وکل ما يلهو به الرجل المسلم باطل إلا رميه بقوسه وتأديبه فرسه وملاعبته أهله فإنهن من الحق“ (ترمذی: ۱۶۲۷) کا کیا مطلب و منشا ہے، اس کے متعلق شیخ فیصل بن علی البعدانی نے علماء کے تین اقوال نقل فرمائے ہیں جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

پہلا قول خطابی کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ لہو و لعب کی ساری اقسام بجز تین کے ممنوع ہیں، اور ان تین کی حلت بایں معنی ہے کہ یا تو وہ حق پر معین ہیں یا حق کا ذریعہ و وسیلہ ہیں، لہذا جن جن کھیلوں میں یہ علت پائی جائے گی وہ کھیل بھی مباح ہوں گے، جیسے ہتھیاروں سے کھیلنا، دوڑ لگانا تاکہ بدن میں قوت و طاقت اور دشمن پر شمشیر زنی کے وقت غلبہ حاصل ہو، رہ گئے وہ کھیل جسے بیکار لوگ کھیلتے ہیں صرف وقت گزاری کے لئے جیسے زرد شیر و شطرنج وغیرہ اس میں نہ تو اعانت علی الحق ہے اور نہ ذریعہ حق ہیں، اس لئے یہ سب ممنوع ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان تین کے ماسوا بھی جو ان صفات پر مشتمل ہوں مباح ہوں گے۔

دوسرا قول ابن الاثیر کا ہے وہ کہتے ہیں: ليس شيع من اللهو إلا في ثلاث كما مطلب ای ليس منه مباح إلا بدمية. ”ويقول إبراهيم الحلبي والكل حرام إلا ما استثنى الشارع... ويميل القرطبي إلى حرمة اللهو فيما سوى هذه الثلاثة... ويقول: كل ما يتلعب به الرجل لا يفيد في العاجل ولا في الآجل فائدة فإنه باطل“، ابراہیم حلبي اور قرطبي ان تین کے ماسوا کو حرام کہتے ہیں، حدیث میں نفع و عدم نفع کی کوئی قید نہیں ہے، اس لئے سبھی باطل ہیں۔

تیسرا قول ابن العربي مالکی کا ہے: ”كل ما يلهو به الرجل باطل ليس يريده حرام وإنما يريده به إنه عارض الثواب وإنه للدنيا محض لا تعلق له بالآخرة أو المباح منه لأنه باق والباقي كل عمل له ثواب“ (لہو باطل سے حرام مراد نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی ثواب نہ ہوگا یہ محض دنیا کے لئے ہے آخرت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا، اس لئے اباحت تو ان کے ماسوا کی ثابت ہوگئی۔

لیکن شمس الحق عظیم آبادی عمون العبود (۱۹۰۷ء) میں لہو کی وضاحت لیس من المستحب سے کرتے ہیں اور علامہ مبارکپوری (تحفة الاحوزی ۲۶۶/۵) میں کل ما يلهو به الرجل المسلم کی وضاحت بایں الفاظ کرتے ہیں: ”أى يشتغل به ويلعب به باطل لا ثواب له إلا رميه بقوس احترام عن رميه بالحجر والخشب وتأديبه فرسه أى تعليم إياه بركض والجولان على نية الغزو وملاعبة أهله فإنها من الحق“۔ عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ حرام نہیں ہاں ان تین کے علاوہ میں ثواب نہیں ملے گا۔

اس کے بعد بعدانی نے مزید تائید کی غرض سے فتح الباری (۹۱، ۱۱) سے یہ تحریر ”وقال الحافظ ابن حجر: وإنما أطلق على ما عداها البطولات من طريق المقابلة لا أن جميعها من الباطل المحرم“ پیش فرمائی ہے، یعنی باطل محض مقابلہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ماسوا سبھی حرام ہیں، پھر مزید تائید کے لئے شیخ نے کئی روایتیں پیش کی ہیں بندہ صرف ایک روایت کو پیش کرتا ہے: ”عن عطاء بن أبي رباح قال رأيت جابر بن عبد الله وجابر بن عمر الأنصاري يرتميان فمل أحدهما فجلس فقال له الآخر: كسلت؟ سمعت رسول الله ﷺ يقول: كل شيع ليس من ذكر الله عز وجل فهو لهو أو سهو إلا أربع خصال: مثنى الرجل بين الغرضين وتأديبه فرسه وملاعبته أهله وتعلم السباحة“ (المعجم الكبير للطبراني: ۱۷۸۵، الترغيب والترهيب للمنزدي ۲، ۲۷۹، الهيمى فى مجمع الزوائد ۵، ۲۶۹) وصححه الألباني فى صحيح الجامع الصغير: ۴۳۱۰، مذکورہ روایت سے شیخ نے ثابت کیا کہ صرف تین میں حصر



نہیں بلکہ اس کے ماسوا کھیل بھی جائز ہیں، کیوں کہ مذکورہ روایت میں تین کے بجائے چوتھا کھیل تعلم السباحۃ بھی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ: الترویج عن النفس فی الاسلام ۱۳-۱۵)۔

۲:ب- حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہ رقم طراز ہیں:

”کھیل کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو سائز ہو یعنی مرد ہو تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی حد وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو، اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیونکہ حصہ ستر چھپانا واجب ہے“ (قاموس الفقہ ۴/۵۸۷)۔

اس کے متعلق چند احادیث پیش ہیں: ”وایاکم عن التحری فإنت معکم من لا یفارقکم إلا عند الجماع وعند ما یقفی الرجل حاجتہ، غط فخذک فإنت فخذ الرجل من عورتہ“ (رواہ احمد)۔

”قال رسول اللہ ﷺ: لا تنظر إلی فخذ حی أو میت“۔ صاحب مقالہ الضوابط الشرعیہ للترویج ۳ پر لکھتے ہیں: ”لا ینبغی أن تتزیا بالکفار فی لباسها عند الترویج وعند الاستجمام وعند اللعب“۔

۲:ج- ارشاد ربانی ہے: ”ما جعل علیکم فی الدین من حرج“ (سورہ الحج: ۷۸)، ”یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر“ (سورہ بقرہ: ۱۸۵)، ”قل بفضل اللہ وبرحمته فبذلک فلیفرحوا“ (سورہ یونس: ۵۸)۔

ایک بار حضرت عمر بن الخطابؓ ساحل سمندر کے پاس سے گزرے تو حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا: آؤ پانی میں ڈبکی لگائیں دیکھیں ہم میں سے کس کی سانس بڑی ہے تو ابن عباس نے فرمایا: ”و نحن مخرمون“، ہم تو حالت احرام میں ہیں، ”إنت عمر بن الخطاب مر بساحل البحر وهو محرم فقال لابن عباس: تعال أباقیک فی الماء أینا أطول نفسا؟ فقال ابن عباس: ونحن مخرمون“ (دیکھئے مقالہ اہداف الترویج والترفیہ من منظور اسلامی ۶ للذغیث)۔

ایک دوسری روایت ابن عمرؓ سے ہے کہ عاصم بن عمر اور عبدالرحمن بن زید دونوں پانی میں تھے اور ایک دوسرے کی گردن پکڑ کر پانی میں ڈبکی دیتے تھے، حضرت عمرؓ یہ منظر دیکھ رہے تھے مگر انہوں نے کوئی نکیر نہیں فرمائی، ”وجاء عن ابن عمر أن عاصم بن عمر وعبد الرحمن بن زید وقعا فی البحر یتمالقان (یتغاطسان) ینغیب أحدهما رأس صاحبه وعمر ینظر إلیهما فلم ینکر ذلك علیهما“ (دیکھئے: مقالہ اہداف الترویج والترفیہ من منظور اسلامی للذغیث)۔

مذکورہ تمام آیات و روایات سے کھیل کی مشروعیت ہوتی ہے، شیخ بعدانی لکھتے ہیں: ”ما ورد من الأحادیث الدالة علی جواز أنواع من اللهو بل مشروعیتہ بعضها کضرب الدف والغناء فی العیدین والنکاح والسباقۃ بالأقدام والإبل والصيد والمصارعة والسباقات العلمیة ونحو ذلك“، وہ احادیث جو کھیل کی نوع بنوع قسموں کے جواز کو ہی نہیں بلکہ بعض کی مشروعیت پر بھی دلالت کرتی ہیں، جیسے عیدین و نکاح کے موقع پر دف اور غنا، دوڑ لگانے، اونٹ کی دوڑ، شکار کھیلنے، کشتی لڑنے اور علمی مسابقت وغیرہ۔

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ وجابر بن عمر کو دیکھا کہ وہ دونوں تیر اندازی کر رہے ہیں ان میں سے ایک تھک کر بیٹھ گئے، ”عن عطاء بن أبی رباح قال: رأیت جابر بن عبد اللہ وجابر بن عمر یرتمایان فمل أحدهما فجلس الخ“ (دیکھئے مقالہ: الترویج عن النفس فی الاسلام للبعدانی ۱۵)۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے پاس لکھا کہ اپنے بچوں کو تیراکی و تیر اندازی سکھائیں، ”وعن أبی أمامة بن سهل قال: کتب عمر ﷺ إلی أبی عبیدة بن الجراح أن علموا غلمانکم العوم ومقاتلتکم الرمی“ (احمد: ۲۲۲)، مشہور صاحب افتاء حضرت رحمانی مدظلہ ہندوق سے نشانہ لگانے کو بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیتے ہیں (قاموس الفقہ ۴/۵۸۹)۔

”عن سلمة بن الأكوع قال: مر النبی ﷺ علی نفر من أسلم ینتضلون فقال النبی ﷺ: ارموا بنی اسماعیل“

فین اباکم کان رامياً، ارموا وأنا مع بنی قلات قال: فأبكت أحد الضريقتين بأيديهم قتال رسول الله ﷺ: مالكم لا ترمون قالوا: كيف نرى وأنت معهم؟ فقال النبي ﷺ: ارموا فأنا معكم كلكم“ (بخاری: ۳۷۳۳)۔

”عن طاؤس قال: مر النبي ﷺ بقوم يرفعون حجراً يريدون الشدة“ كشف الأستار للبهیسی (۳۰۷)۔

”عن عقبه بن الحارث قال: خرجت مع أبي بكر الصديق ﷺ من صلاة الحصر بعد وفاة النبي ﷺ ليلاً وعلي يمشي إلى جنبه فمر بحسن بن علي يلعب مع ثلمان فاحتمله على رقبته وهو يقول ويألي شيء النبي ليس شيءا يعلى وعلى يضحك“ (بخاری: ۳۰۷۰، احمد: ۳۰)۔

”قال محمود بن الربيع إني لأعقل مجة مجبا رسول الله ﷺ في وجهي وأنا ابن خمس سنين من دلو“ (بخاری: ۳۰۷۱)۔  
(مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے جبکہ میں پانچ سال کا تھا حضور نے میرے چہرے پر کئی فرمائی تھی) تیز یا ابا میرا فعل الخیر والی حدیث تو اکثر حضرات کے علم میں ہے جس سے حضرت امام شافعی نے سو سے زائد مسائل مستنبط فرمائے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر ایک راستے سے گذرے تو بچے کھیل رہے تھے آپ نے ان بچوں کو دیکھا اور فرمایا: ”وہا الخاری فی الایام الخریہ“ (۳۰۷۲)۔

شیخ عبدالعزیز الدغیر بحوالہ عقیقہ عمر سے لکھتے ہیں: ”وقد عزل عمر والیا لا یلعب أطفاله“ (صفحہ ۵) (امیر المومنین عمر بن الخطاب نے تو ایک والی کو بھی اس بنیاد پر کہ وہ بچوں سے کھیل نہیں کرتے تھے معطل و معزول کر دیا)، شیخ مذکور ایک جگہ اور نظر آتے ہیں: ”ولذا أوصی الحجاج مؤدب بنیه بقوله: علمهم السباحة قبل الكتابة فإهم یجدون من یکتب عنهم ولا یجدون من یشیر عنهم“ (صفحہ ۶) (اسی لئے حجاج بن یوسف نے اپنے بچوں کے اتالیق سے یہ کہہ رکھا تھا کہ ان کو کتابت سے پہلے تیرا کئی سکھائیں کیوں کہ اگر کتابت نہیں آتی تو اس کا بدل مل جائے گا لیکن تیرا کئی کا کوئی بدل نہیں)۔

تفریح و کھیل کود کے جواز پر یہ حدیث بھی ہمیش ہے: ”لتعلم ینود أن فی دیننا فسحة إنی بعثت بحتیفة مسحة“ (رواہ احمد: ۱۱۱۱) ”وقال الشعبي: كانت قریش تحب عثمان بن عفان حتی أن المرأة كانت ترقص اینها وتقول: أحيك والرحمان حب قریش عثمان“ شیخ عبدالعزیز و دیگر بحوالہ ابن ابی الدنیانی الخیال (۳۳۶) لکھتے ہیں کہ شعبی نے فرمایا کہ قریش کو خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی، اسی لئے عورتیں اپنے بچوں کو نچاتے وقت یہ یوری پڑھتی تھیں کہ خدا کی قسم ہم تم سے اسی طرح محبت رکھتے ہیں جس طرح قریش کو عثمان سے محبت ہے۔

ان معروضات کے بعد عرض ہے کہ وہ کھیل جن کی شریعت میں ممانعت ہے جائز نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”من لعب بالشرط شد فکانما غمس یدہ فی حمر الخنزیر“ (مسلم: ۲۲۶۰) (جس نے نرہ کھیلا گویا کہ اپنے ہاتھ کو خنزیر کے گوشت میں ڈال دیا)۔

آیت ربانی مانع ہے: ”إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان“ (مائدہ: ۹۰) اسی طرح بہائم کو ایک دوسرے کے خلاف برا بھلا کہنا، ”فی رسول اللہ ﷺ عن التحریش بین الیہائم“ (مسلم: ۱۹۵۷) شیخ بعدائی لکھتے ہیں: ”وہذا تظهر حرمة أنواع من الریاضة فی عصرنا کالملائکة والمصارعة بوضعهما الخالی، واللہ اعلم، لما تؤدیا إلیہ من أضرار فی الجسد بل وربما أدى بعضها إلی الوفاة أو الإعاقة کما هو مشاہدہ فی حیاة کثیر“ (الترویج عن النفس فی الاسلام: ۳۴) (اس سے ریاضت کی وہ انواع بھی حرام ہو جاتی ہیں جو ہمارے اس جسد پر ضرر فرمائی مسائل جوڑو کرانا یا اسٹگ کہلاتے ہیں ان دونوں سے کبھی قوموت ہو جاتی ہے اور نہیں تو کم از کم کھیلنے والے مشتقت شدید و کاوشکار ہو جاتے ہیں)، مشہور عالم دین اور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی زید مجروح لکھتے ہیں: ”غری مسائل کشتی اور جوڑو کرانے کا ایسا مقابلہ جس میں فریقین کو ہر طرح کے نقصان پہنچانے کی اجازت ہو جائز نہیں (۴۵ میں صفحہ ۱۸۴)۔

مولانا محمود اشرف عثمانی لکھتے ہیں کہ حضرت تھانوی اپنے رسالہ ”جانوروں کے حقوق“ میں اتریش میں بہائم کی ممانعت والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (ف) اس میں مرغ یا زری، شیر یا زری اور مینڈھے لڑانا اسی طرح کسی جانور کو لڑانا سب داخل ہے اور سب حرام ہے کہ خود بخود جانور کو تکلیف دینا ہے

اور اسی کے حکم میں ہے گاڑی بانوں کا بیلوں کو بھگانا کہ وہ ہانپ جائیں اور بسا اوقات سوار یوں کو چوٹ بھی لگ جاتی ہے اور بجز تقابل و تقاضا کے اس میں کوئی مصلحت نہیں (دیکھئے کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت ۶۱-۶۲)، نیز کبوتر بازی بھی درست نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک کبوتر کے پیچھے دوڑا جا رہا ہے، آپ نے فرمایا: ایک شیطان دوسرے شیطان کے پیچھے جا رہا ہے (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی، مشکوٰۃ المصابیح ۳۸۶)۔

شامی (۴۰۱/۶) پر یہ جزئیہ موجود ہے کہ محتسب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ (بعض صورتوں میں) کبوتر بازی کے ان کبوتروں کو ذبح کر ڈالے، ”وفی الدر فیات کان یطیرھا فوق السطح مطلقاً علی عورات المسلمین ویکسر زجاجات الناس برمیة تلک الحمامات عزز ومنع اشد المنع فإت لم تمنع بذلک ذیحھا المحتسب وصرح فی الوهبانیة بوجوب التعزیر وذب الحمامات ولم یقیده ولعله اعتمد عاد اھم“، اسی طرح شیخ علی مقلی کی کتاب کنز العمال (۲۲۲/۱۵) پر موجود ہے کہ سیدنا حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں ایسا ہی کیا تھا بعینہ یہی حکم پتنگ بازی کا بھی ہوگا۔

اس میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کی پتنگ کاٹ دوں اور لوٹ لوں، اکثر دیکھا جاتا ہے کہ پتنگ لوٹنے کے چکر میں جانیں تک چلی جاتی ہیں، بچے چھتوں سے گر کر مر جاتے ہیں، ایک ڈنٹ ہو جاتے ہیں، ہندوؤں کا ایک تہوار بسنت منجی ہے، اس میں پتنگ اڑائی جاتی ہے مسلمان بھی اب اس میں کثرت سے حصہ لینے لگے ہیں جس کے باعث ”من تشبه بقوم فهو منهم“ کی وعید میں وہ بھی شامل ہیں، پتنگ لوٹنے کی فکر میں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ پتنگ کہاں گری، کس کے گھر میں گری، گرتے ہی کود کر اسے ہتھیانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے اہل خانہ کے نقصان کے ساتھ ساتھ بے پروگی بھی ہوتی ہے۔ اب تو حد ہو گئی یہ عمل رات میں بھی انجام پاتا ہے جس میں لائٹنگ، لاؤڈ اسپیکر، دعوت وغیرہ کے انتظامات، گانے بجانے پر بے حساب پیسے خرچ ہوتے ہیں، الامان الحفیظ۔ مزید برآں مخلوط اجتماع ہوتا ہے جتنے والوں کی طرف سے لوگ ہوائی فائرنگ کرتے ہیں، اس لئے ان خباثت و مفاسد کی وجہ سے پتنگ اڑانا، اسے لوٹنا اور بچنا سب ناجائز ہونا چاہئے۔ بچوں کو جو ان قیود و صفات کے ساتھ نہ ہوں اہل علم نے اجازت دی ہے۔

مولانا محمود اشرف صاحب عثمانی لکھتے ہیں: ”اگر کوئی بچہ رنگین کاغذ دھاگے میں باندھ کر پتنگ کی طرح ہوا میں اڑالے تو پھر اس کا وہ حکم ہوگا جو چھوٹے بچے کے غبارہ اڑانے کا ہے کہ گو وہ مفید نہ ہی مگر نا سمجھ بچوں کے لئے اس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہیں“ (کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت ۶۵)۔

مولانا رحمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ”مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی کبڈی درست نہیں ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا (قاموس الفقہ ۵۸۸/۳)۔

ایسا کھیل نہ ہو جو آدمی کی شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے جیسے شطرنج اور فی زمانہ کرکٹ، تاش، لوڈو، (قاموس الفقہ ۵۸۷/۳-۵۸۸) البتہ ایسے کھیل جو مختصر وقت میں پورے کئے جاسکتے ہوں جیسے فٹ بال، والی بال، ہاکی، لان ٹینس، بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس شرعی و متعلقہ ذمہ داریوں کا لحاظ کرتے ہوئے کھیلے جاسکتے ہیں، کشتی بھی جائز ہے لیکن فری اسٹائل نہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کیوں کہ آپ ﷺ نے رکانہ سے کشتی لڑی اور اسے شکست دیا، کیرم اور تعلیمی تاش کی بھی اجازت اس شرط کے ساتھ دی جاسکتی ہے کہ اس میں ممنوعات کا ارتکاب اور غیر معمولی انہماک نہ ہو۔ اسی طرح مکالمہ و تعلیمی تاش کی بھی اجازت کی گنجائش آنے والی حدیث سے نکل سکتی ہے، ”عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال: إن من الشجر شجرة لا یسقط ورقها وهي مثل السلم حدثونی ما هی؟ قال: فوقہ الناس فی شجر البادیة ووقع فی نفسی أنھا النخلة، قال عبد اللہ: فاستحییت فقالوا: یا رسول اللہ! أخبرنا بها، فقال رسول اللہ ﷺ: ہی النخلة، قال عبد اللہ فحدثت أبی بما وقع فی نفسی فقال: لأن تکون قلتها أحب إلي من کذا وکذا“ (بخاری: ۱۲۱)۔

لیکن وہ مکالمہ جو ان دنوں رائج ہو گیا ہے اس کی صحت مخدوش ہے۔ اسی طرح ہیلی کاپٹر، ریوٹ گاڑیاں، جہاز، بحری و دھانی جہاز اگر جاندار کی شبیہ اختیار نہ کئے ہوں اور دیگر محرمات سے خالی ہوں تو ان سے کھیلنے کی اجازت ملنی چاہئے، نیز کھیل عام انسانوں کی گذرگاہ پر بھی نہ ہو ایسے لوگوں پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، ”من آذى المسلمین فی طرفھم ووجهت علیہ لعنتھم“ (رواہ الطبرانی)، ”ایاکم والجلوس فی الطرقات الخ“ (رواہ البخاری فی الادب المفرد) (تم اپنے آپ کو راستوں پر بیٹھنے سے بچاؤ)۔

۲- اس کے جواب کے لئے اولاً تفسیر ابن کثیر (۱۳۱۷ھ) اور احیاء التراث العربی بیروت لبنان کے حوالہ سے ایک اثر پیش ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ جب فارس رومیوں پر غالب آگئے تو مسلمانوں کو تکلیف ہوئی، کیوں کہ مسلمان چاہتے تھے کہ رومی غالب ہوں کیونکہ مشرکین کے مقابلہ اہل کتاب کی مسلمانوں سے قربت تھی اور مشرکین چاہتے تھے کہ فارس غالب آئیں بہر حال جب سورہ روم کی آیت نازل ہوئی کہ چند ہی سال بعد روم فارس پر غالب آجائیں گے تو مشرکین نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا کہ تمہارے صاحب کہتے ہیں کہ بضع سنین میں رومی فارس پر غالب آجائیں گے تو آپ نے فرمایا: صدق، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سچ ہے اس پر مشرکین نے کہا: آپ اس پر شرط رکھیں گے، چنانچہ چار جوان اونٹنیوں پر سات سال تک کی شرط رکھ دی گئی، سات سال گزرنے کے باوجود رومی غالب نہیں آئے تو مشرکین خوش ہو گئے اور مسلمانوں کو غم ہوا، جب اس کا تذکرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بضع سنین سے کیا مراد لیتے ہو، صحابہ نے عرض کیا دس سے کم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ دو سال کی شرط اور بڑھا دو، دو سال گزرنے بھی نہ پائے تھے کہ رومی فارس پر غالب آگئے تب مسلمانوں کو اس سے بے حد خوشی ہوئی۔

جن چیزوں پر شرط رکھی گئی اس کا لینا (بذل العوض) جائز ہے یا نہیں۔ شیخ ابن علی نے اس کے متعلق تین اقوال نقل فرما کر احناف و ابن تیمیہ وغیرہ کے قول کو ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں: ”الاول اب جواز بذل العوض في السبق مختص بهذه الثلاثة“ اس سے ابو ہریرہؓ کی روایت قولی کی جانب اشارہ ہے، ”لا سبق الا في نصل أو خف أو حافر“ (ترمذی: ۱۷۰۰) (مسابقت نہیں مگر تیر زنی، اونٹوں اور گھوڑوں کے دوڑانے میں)، آگے لکھتے ہیں: ”والی ذلك ذهب جمهور العلماء كالمالكية والشافعية والحنبلية واستدلوا لقولهم بهذا الحديث، الثاني أنه يجوز بذل العوض في السبق في كل أمر مباح، الثالث أنه يجوز بذل العوض في السبق في كل ما يقوى البدن في مجال الجهاد أو مجال التعليم وهذا قول الحنفية وغيره من أهل العلم وهو اختيار ابن تيمية وابن القيم وابن المفلح والمرداوی وابن قاسم وغيرهم“، اس کے بعد تیسرے قول کو ترجیح دی ہے، ”والذي يظهر والله أعلم هو رجحان القول الثالث لقوة أدلته وإمكان مناقشته“۔

مشہور صاحب افتاء حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کی تحریر بھی ملاحظہ ہو جن سے ان شرطوں کی مشروعیت و عدم مشروعیت کا علم ہو سکتا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

- ۱- اگر دو ہی آدمی میں مقابلہ ہو رہا ہو تو شرط ایک طرف ہو۔
  - ۲- اگر دونوں طرف سے شرط ہوگی تو یہ صورت قرار کی ہوگی جو ناجائز ہے۔
  - ۳- انعام کی شرط اسی وقت درست ہوگی جب مقابلہ ایسی دو چیزوں میں ہو کہ کسی درجہ میں ان دونوں ہی کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کامیابی اور شکست کی توقع کی جاسکتی ہو۔
  - ۴- مقابلہ کے وقت ابتدائی اور انتہائی حد متعین کر دی جائے۔
  - ۵- جو انعام یا عوض مقرر ہو ہے وہ معلوم و متعین ہو (قاموس الفقہ ۱۱۶، ۱۱۸)۔
- حضرت نے ہر ایک کے دلائل حاشیہ پر رقم فرمائے ہیں طوالت کے خوف سے چھوڑا جا رہا ہے۔
- شیخ محمد بن صالح العثیمین نے بھی اپنے فتویٰ میں یہی لکھا ہے کہ اگر شرط ایک طرف سے ہو تو درست ہوگی۔

۲- ایسا کھیل بھی درست نہ ہوگا، کیونکہ اس میں وقت جیسی اہم ترین نعمت کا ضیاع ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: دو نعمتیں ہیں جن میں اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں، ایک تندرستی دوسرے وقت، ”قال رسول الله ﷺ: نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس: الصحة والفراغ“ (بخاری شریف باب: ۳۸)۔

ایسے کھیل جو محض اہو و لعب کے قبیل سے ہوں اور ان پر کثیر وقت ضائع ہوتا ہو مکروہ ہے (قاموس الفقہ ۱۱۸، ۱۱۸) اس کے تحت کچھ تفصیلات اب کے ذیل میں گزر چکی ہیں۔

۲- نکت خریدنے، کھیل دیکھنے کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ خود کھیل کے جواز و عدم جواز پر منحصر ہے، گذشتہ سطور سے اس کے احکام بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں۔  
۳- الف- تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے یا نہیں جبکہ اس میں کثیر رقم کا صرفہ بھی ہے۔

قرآن عزیز کی آنے والی آیتوں میں سیاحت کا لفظ آیا ہے، ”إِن طَلَقَكَ ابْنُ يَدِلَّةٍ أَوْ زَوْجًا خَيْرًا مِنْكَ مَسْلَمًا مَوْمِنًا قَانَتَاتٍ تَائِبَاتٍ عَابِدَاتٍ سَائِحَاتٍ“ (التحریم: ۵)۔ ”التائبون العابدون الحامدون السائحون“ (التوبہ: ۱۱۳)۔ شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین اپنی کتاب ”احکام السیاحۃ“ میں لکھتے ہیں: ”اختار بعضهم أهما الجهاد واختار آخرون أهما الصيام واحتج كل فريق بالحديث والأثر واختار ابن القيم مسلماً ثالثاً في تفسير السیاحۃ وفق به بين ما ورد في ذلك من أحاديث وآثار... قال رحمه الله تعالى عنه: قوله تعالى: السائحون وفسرت السیاحۃ بالصيام وفسرت بالسفر في طلب العلم وفسرت بالجهاد وفسرت بدوام الطاعة والتحقيق فيها أهما سیاحۃ القلب في ذكر الله ومحبه والإجابة إليه والشوق إلى لقائه“ (صفحہ ۲)۔

شیخ عبداللہ بحوالہ ابن جریر لکھتے ہیں: سلف کے یہاں سیاحت یا تو سفر فی طلب العلم یا صلحاء و عابدین کی زیارت یا رزق حلال اور کسب مباح کے حصول کے لئے سفر پر بولا جاتا تھا اس کے بعد جبرین اپنے مدعا پر دلائل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خطیب بغدادی چالیس سال تک حصول علم کی غرض سے اپنے وطن بغداد سے باہر رہے۔ موصوف کی تحریر پیش ہے: ”وانما المعروف السفر لطلب العلم أو لزيارة الصالحين أو لالتماس الرزق الحلال والكسب المباح وقد كثر النقل عن السلف في تنقلهم وكثرة أسفارهم للتعلم كما ذكر عن الخطيب البغدادي حيث غاب عن بغداد نحو أربعين عاماً“ (صفحہ ۱)۔

اس کے بعد لکھتے ہیں: ”وهكذا فعل ابن مندة وذلك في التزود من العلم وهكذا من هرب من بلدہ إذا كثر فيها الفساد كما فعل الخرق في انتقاله من العراق لما كثر فيها سب الصحابة رضي الله عنهم“، (مشہور محدث ابن مندہ نے بھی حصول علم کے لئے سفر کیا۔ مشہور حنبلی فقیہ خرقی نے اپنا وطن عراق چھوڑ دیا جب وہاں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو گالیاں دی جانے لگیں)۔  
احقر عرض کرتا ہے کہ عالم اسلام کے مشہور روز بردست عالم شیخ عبدالفتاح ابو غندہ اپنی تصنیف صفحات من صبر العلماء، ۶۵ پر ابن مندہ کا قول نقل کرتے ہیں: ”قال ابن مندة: طفت الشرق والغرب مرتين“۔

علامہ سمعانی نے تو اتنے ممالک و بلاد کا سفر حصول علم کی غرض سے کیا کہ حروف معجم کے اعتبار سے اس کی فہرست تیار ہو گئی موصوف نے سات ہزار شیوخ سے کسب فیض کیا اور ۶۸ کتابیں مختلف موضوعات پر جن میں سے بعض بعض ۳۰، ۴۰، ۵۰ طاقت میں تھیں یا دیگر چھوڑیں (تفصیل کے لئے صفحات من صبر العلماء، ۷۸-۹۱ دیکھیں)۔

مختلف کتب کی مراجعت سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ محدث ابو حاتم رازی، حافظ ابن طاہر مقدسی، حافظ ابو عبداللہ صفہانی، حافظ ابو الخطاب اندلسی فن ادب کے مشہور امام کسائی، اندلس کے طبیب ابن رومیہ کا سفر ان نباتات و جزئی بوٹیوں کے حصول کے لئے جو مغرب میں نہیں ہوتی تھیں اپنے اپنے وطنوں کو خیر باد کر دینا حصول علم کی ہی غرض سے تو تھا۔ ضیاء الدین ابن بیطار نے خاص نباتات کی تحقیق کی غرض سے روم و اسپین و یونان کو چھان مارا (دیکھیے صفحات من صبر العلماء، ۷۸) شیخ عبدالفتاح ابو غندہ، ۲۲۸-۲۳۰ وغیرہ، نیز علماء سلف و تالیف علماء از مولانا حبیب الرحمن شیروانی، ۲۰-۲۶) قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر مجمع البحرین و ذوالقرنین کے سفر کا تذکرہ واضح الفاظ میں فرمایا، جو دعوتِ رالی اللہ کی غرض سے ہوا، اپنے دین کے بچانے اور فتنہ سے الگ ہو جانے کا تذکرہ بخاری میں موجود ہے، رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے: ”یوشك أن یکون خیر مال أحدکم غنماً یتبعہ بها شعف الجبال ومواقف القطر یضر بدینہ من الفتن“ (حدیث: ۱۹) (حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دن قریب ہے جب مسلمان کا سب سے بہتر مال ایسی بکریاں ہوں جنہیں وہ لے کر پہاڑ کی چوٹیوں یا پانی گرنے کی جگہوں پر چلا جائے تاکہ فتنوں سے اپنے دین کی حفاظت کر سکے)۔

رزق حلال کی غرض سے سیاحت قرآن کی اس آیت: ”وآخرون یضربون فی الأرض یتبتغون من فضل الله“ سے ثابت ہوتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

وسافر فقی الأسفار خمس فوائد  
تفرجہم واكتساب معيشة وعلم وأداب وصحبة ماجد

(سفر کرو سفر میں پانچ فائدے ہیں: ایک تفریح دوسرے حصول رزق تیسرے علم، چوتھے ادب، پانچویں اچھے لوگوں کی صحبت)۔

بہر کیف قرآن کی بہت ساری آیات سیاحت پر دلالت کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبة المؤمنین“ (سورہ نمل: ۶۹)، ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف بدأ الخلق“ (عنکبوت: ۲۰) ”اولم یسیروا فی الأرض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلہم“ (روم: ۹) ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبل“ (روم: ۳۲)۔

ابن منظور مکرم لسان العرب میں لکھتے ہیں: ”السیاحة: الهاب فی الأرض للعبادة والترهب، وساح فی الأرض ینسج سیاحة وسیوحاً وسیحاً وسیحاناً ہی ذهب، وفی الحدیث ”لا سیاحة فی الإسلام“ أراد بالسیاحة مقارقة الأمصار والذهاب فی الأرض“ (۳۵۲/۶)، اس کے بعد اس کا استعمال ان صوفی حضرات پر ہونے لگا جو مخلوقات سے یکسو ہو کر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گوشہ نشین ہو گئے، اور انہیں جمعہ و جماعت سے کوئی سروکار نہ رہا، ایسے ہی حضرات کے متعلق علامہ ابن تیمیہ مجموع الفتاویٰ ۱۰/۶۳۳ میں لکھتے ہیں: ”وکذلك السیاحة فی البلاد بغیر مقصود مشروع کما یعانیہ بعض النساك أمر منھی عنه“ (بعض صوفیاء کے اس عمل کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں وہ ممنوع ہے)، امام احمد بن حنبل نے فرمایا: ”لیست السیاحة من الإسلام فی شیء ولا من فعل النبیین ولا الصالحین“ (نتو اسلام میں اور نہ ہی انبیاء و صالحین کے عمل سے اس کی گنجائش ہے) (دیکھئے: احکام سیاحت ۱۲)۔

علامہ ابن الجوزی نے بھی تلمیسیں ایلیس ۳۲۰/۱ میں ایسے صوفیوں پر جو ظاہری زارادہ و اسباب کے بغیر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں نقد کرتے ہوئے لکھا ہے: سیاحت کا معنی بہت سارے لوگوں پر گنڈ بٹ ہو گیا ان لوگوں نے بدون طلب علم و مکان مخصوص نیز زارادہ لئے بغیر گوشہ تہائی اختیار کر لی اور اسے توکل کہنے لگے، انہوں نے کتنے فریضے اور کتنی فضیلتیں ضائع کر دیں وہ لوگ خوش گمان ہیں کہ اس کے ذریعہ تقرب الی اللہ حاصل ہو گیا، حالانکہ وہ لوگ رب کائنات کے نافرمان اور سنت رسول کے تارک ہیں، کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے بدون حاجت و ضرورت سفر سے منع فرمایا ہے، بالفاظ دیگر بے مقصد سفر سے منع فرمایا ہے (تلمیسیں ایلیس ۲۹۹ مطبوعہ دار ابن خلدون)۔

علامہ ابن تیمیہ نے تلذذ کی خاطر خوبصورت مناظر کو دیکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور استدلال میں آیت ربانی: ”لا تمدن عینک إلی ما متعنا به أزواجاً منهم“ کو پیش فرمایا ہے۔ شیخ جبرین فرماتے ہیں کہ یہ کراہت مطلق نہیں بلکہ ناشکری سے بچنے کی غرض سے ممنوع ہے، اس کی تائید میں مسلم شریف کی حدیث (۲۹۶۳) ”انظروا إلی من هو أسفل منکم ولا تنظروا إلی من هو فوقکم فهو أجدر أن لا تزددوا نعمة الله علیکم“ پیش فرمایا ہے (دیکھئے: احکام السیاحة ۱۶)۔

شیخ جبرین سے ترویج عن النفس کی غرض سے اندرون ملک جانے کے متعلق پوچھا گیا تو شیخ نے اثبات میں جواب دیا: ”لا حرج فی ذلک فان النفس قد تحس بضیق واکتئاب وقد یقع الإنسان فی هم وغم وشدّة فهو یجب أن یروح عن نفسه“ (انسان پر مختلف حالات، غم، مشقت، تنگی وغیرہ آتے رہتے ہیں، اس صورت میں وہ اس سے نکلنے کی غرض سے تفریح کا خواہاں ہوتا ہے، اس لئے سیاحت میں کوئی حرج نہیں)۔

اس عاجز نے بخاری کی حدیث بحوالہ کتاب العلم پہلے ہی پیش کر دی ہے اور علم کی غرض سے سفر کا جواز ثابت ہو چکا ہے، لہذا اپنی مملکت میں بلند پہاڑیاں، مطح مکانات، جنگلات، غاروں، وادیوں، لوگوں کے عقائد و اعمال اور اخلاق ان کی معاشرتی زندگی اور معیشت و اکتساب کے نت نئے طریقوں کی معرفت کی غرض سے سفر جائز ہونا چاہئے۔

اسی طرح عجائب خانوں اور آثار قدیمہ دیکھنے کی غرض سے درست ہونا چاہئے بشرطیکہ وہاں پہنچ کر انسانی صنعت و حرفت کا مظاہرہ کر کے اللہ کی قدرت اور اس کی صنایع مقصودہ ہو، اور یہ سوچے جب ایک مخلوق کی صنعت کا یہ حال ہے تو مالک الملک کی صنعت کا کیا حال ہوگا۔

عبداللہ الجبرین لکھتے ہیں: ”لابأس بزیارتها لما فیها من الآثار التي تدل علی حالة السابقین وما کانوا علیہ من قوة

وفكرة ومعرفة وتصور حالتهم التي عاشوا فيها فإن تلك المتاحف كثيراً من الأدوات والأواني والأسلحة والألبسة والحلى والأحذية التي توصف في الكتب ولا يمكن تصورها حقيقة إلا بمشاهدتها“ (احكام السياحة ۲۵)۔

ادوات قتال، ادوات زراعت، متقدمین کی صنعت و حرفت، مشقت و جدوجہد کا اندازہ مشاہدہ ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ کتابوں میں پڑھ کر۔ تنکھے، زنبیل، کھجور کی چھال سے بنے ڈھکن طرح طرح کی پلیٹیں اور برتن، جوتے، زیورات، لوہے کی نت نئی چیزیں دیکھ کر تجارتی اور حدادی کی صنعت پر انسان وہاں پہنچ کر آگشت بدندان رہ جاتا ہے۔

واقعہ سچ ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں یہ عاجز جب سالار میوزیم حیدرآباد پہنچا تو اس طرح کی چیزوں کو دیکھ کر عقل متحیر ہو گئی۔

بلاد کفار میں سیاحت کی غرض سے جانے میں اگر اس میں صلابت ایمانی اور پختگی عمل نہیں تو طرح طرح کے محرمات ہیں اور شعائر کفر میں ملوث ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے شخص کے لئے اجتناب اولیٰ ہے۔ شیخ بدرالدین عینی ”یوشک أن یکون خیر مال المسلم“ والی حدیث کے تحت لکھتے ہیں: ”الأصل فیہ فضل العزلة فی أيام الفتن إلا أن یکون الإنسان ممن له قدرة علی إزالة الفتنة، فإنه یجب علیہ السعی فی إزالتها إما فرض عین وإما فرض کفایة بحسب الحال والأحوال وأما فی غیر أيام الفتنة فاختلف العلماء فی العزلة والاختلاط أيهما أفضل؛ قال النووي: مذهب الشافعی والأکثرین إلى تفضیل الخلطة لما فیها من اکتساب الفوائد وشهود شعائر الإسلام وتکثر سواد المسلمین وإیصال الخیر إليهم... وذهب آخرون إلى تفضیل العزلة لما فیها من السلامة المحققة لکن بشرط أن یکون عارفاً بوظائف العبادة التي تلزمه وما یکلف به، قال: والمختار تفضیل الخلطة لمن لا یغلب علی ظنه الوقوع فی المعاصی“ (عمدة القاری ۱۰۱۳)۔

عینی کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ اگر معاصی میں ملوث ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو عزلت بہتر نہیں۔ اس عبارت کو سیاحت کے لئے متدل بنایا جاسکتا ہے۔ اور اسے اس شرط پر اجازت دینی چاہئے کہ قدرت ہونے پر دعوت و شعائر اسلامی غیروں کے سامنے پیش کرے گا۔ نیز معذب علاقے اور بستوں کی سیاحت بطور عبرت اور خدا کی قدرت و حاکمیت کے مشاہدہ کی غرض سے بھی دی جاسکتی ہے اور انہیں شرطوں کے ساتھ جس کا ذکر حدیث رسول میں موجود ہے کہ ان علاقوں میں نہ جاؤ مگر روتے ہوئے، ”وقد روی عن ابن عمر قال: لما أمر النبی ﷺ بالحجر قال: لا تدخلوا مساکن الذین ظلموا أنفسهم أن یصیبکم ما أصابهم إلا أن تكونوا باکین ثم قنع رأسه وأسرع السیر من جانب الوادی“ (بخاری: ۲۳۱۹، مسلم: ۲۹۸۰)، ”وعنه ﷺ أن الناس نزلوا أرض ثمود فاستقوا من آبارها وعجنوا به العجین فأمر النبی ﷺ أن یهریقوا ما استقوا أو یعلفوا الإبل العجین وأن یتقوا من البئر التي كانت تردھا الناقة“ (بخاری: ۲۳۷۸، مسلم: ۲۹۸۱)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ لوگ ارض ثمود پر اترے اور اس کے کنویں سے پانی پیا اور اس سے آٹا گوندھا تو حضور اکرم ﷺ نے پانی پھینکنے اور گوندھے ہوئے آٹے کو اونٹ کو کھلانے کا حکم فرمایا۔ قرآن عزیز نے قوم ثمود کی نافرمانی اور صالح علیہ السلام کی ناکہ کی کوئیں کاٹنے اور عذاب کا تذکرہ فرمایا ہے: ”فحقروا الناقة وعتوا عن أمر ربهم وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا إن كنت من المرسلین فأخذهم الرجفة فأصبحوا فی دارهم جاثمین“ (الاعراف: ۷۸)۔

شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین بحوالہ البدایہ والنہایہ ۱۸۱۲ لکھتے ہیں کہ عبرت کے ارادہ سے اہرام مصر دیکھنے کی بھی اجازت ہے، وہ لکھتے ہیں: ”فقد ذکر ابن کثیر قصة سبور ذو الأکتاف... کیف ہلک ولم یحصنه ما بناہ من الحصون التي أصبحت بعده مأوی للظیور ونظم ذلك بعضهم فی شعر یقول فیہ:

وافوا الحضرا ذبنا دجل  
شادة مرمر او شیده کل  
ة تجبی إليه والمخابور  
سا فلظیر فی ذراہ وکور

(وہ قلعہ جسے سبور ذوالاکناف نے مرمر سے مزین کر کے اور اس کے کنگوروں کو انتہائی مستحکم بنایا تھا جس کی زیارت کے لئے لوگ کشاں کشاں جاتے تھے اور اس نے سمجھ رکھا تھا کہ یہ قلعہ ہماری حفاظت کرے گا وہ تو دنیا سے چلا گیا اور آج اس قلعہ کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ چڑیا چنگل کا آشیانہ بنا ہوا ہے) (احکام

(سیاحت ۳۳)

البتہ شیخ الجبرین احتیاطاً منع کرتے ہیں اور بدون فائدہ تجول سے اجتناب کا مشورہ دیتے ہیں، ”فالواجب الاحتیاط والبعث والتوقی عن الأخطار“، دوسری جگہ لکھتے ہیں: ”وكان الواجب أن يشتغل حياته ووقت فراغه في طلب العلم المفيد في العقائد والأحكام والآداب وفي الذكر والشكر والعبادة والأعمال الصالحة فمتى أضاعوها في هذا التجول والتقلب في البلاد ذهبت بدون فائدة“، آدمی کو چاہئے کہ اپنے اوقات فائدہ مند علوم، عقائد اور احکام و آداب ذکر و شکر، اچھے اعمال میں گزارے، جب شہروں کی سیاحت میں وہ وقت گزار دے گا تو یہ وقت بامقصد نہ رہے گا۔

ساتھ ہی بہت ساری دولت بے مقصد خرچ ہو جاتی ہے، اگر وہ رہتی تو اپنے اہل و عیال، اقرباء و اصدقاء، محتاجوں، عمیالداروں کے کام آتی (احکام سیاحت ۲۷)

سبب- اگر خطرات درجہ یقین کو پہنچے ہوئے ہوں تو بال بچوں کو کیا خود بھی نہیں جانا چاہئے، لیکن اگر مظنون درجہ میں ہوں تو ان کو انہیں شرطوں کے ساتھ جو ما قبل میں بیان کی جا چکی ہیں، ساتھ رکھنا درست ہونا چاہئے لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ساتھ نہ لے جائیں، کیونکہ کفار و بدو نصاریٰ کے مشاعرہ دیکھ کر بچے بہت جلد متاثر ہو جائیں گے اور یہ بھی امکان ہے کہ اسلام کی عظمت پر انہیں شبہ ہونے لگے۔

۳:ج- ایسے مقامات پہ جانے سے احتراز مناسب ہے، ہاں گاڑیوں کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے۔

۳:د- بعض محرمات تو سوال میں مذکور ہیں، محرمات میں یہ بھی ہے کہ ٹور پر لے جانے والی کمپنیاں بڑھا چڑھا کر مبالغہ کر کے ایڈوائز کرتی ہیں لیکن عمل اس کے خلاف ہوتا ہے جو سراسر کذب و خداع ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں، اس عاجز نے ٹور پر لے جانے والی کمپنیوں سے رابطہ کر کے حقیقت معلوم کرنا چاہا تو آخر میں خلاصہ یہی نکلا کہ کوئی بھی ٹور شرعی نہیں، بجز حج و عمرہ کے یا متدین و متشرع حضرات کا کوئی ٹور ہو۔ میرے خیال میں اگر ٹور کمپنی دھوکہ و خداع سے کام نہ لے، اور مقصد صرف اسلامی مقامات مقدسہ کی زیارت ہو یا جائز مقاصد، شراب و کباب و محرمات سے پاک ہو تو ٹور کمپنیوں کے قیام کی اجازت دینی چاہئے۔

۴- ولید بن راشد السعیدان اپنی کتاب ”حکم التصوير الفوتوغرافی“ صفحہ ۶ پر لکھتے ہیں: ”فأما تصوير شيء لاروح فيه كالشجر والماء والثمار والجبال والسيوت ونحوها فلا كلام لنا فيه ولا أعلم فيه خلافاً إلا خلافاً شاذاً“، جن میں روح نہیں ان کی تصویر کشی میں کفر نہیں، بجز اختلاف شاذ کے یہی رائے شیخ ابن عثیمین کی بھی ہے۔

جاندار کی تصویر کی حرمت پر دلائل پیش ہیں: ”قال رسول الله ﷺ: من صور صورة في الدنيا كلف يوم القيامة أن ينفخ فيها الروح وليس بنافع“ (بخاری: ۵۹۳۳، مسلم: ۵۵۲۱)، ”فمر برأس التمثال ينقطع فيصير كهيئة الشجرة“ (ابوداؤد: ۲۱۵۸، ترمذی: ۲۸۰۶)، ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ میں تصویر بنانا ہوں، مجھے اس کے متعلق آپ سے فتویٰ چاہئے آپ نے فرمایا: قریب ہو جاؤ میں تم کو جو میں نے حضور سے سنا، سنا تا ہوں، پھر کہا: میں نے حضور سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر مصور جہنم میں ہوگا ہر تصویر کو جو اس نے بنایا ہوگا اسے جاندار بنا کر اس کے ذریعہ سے عذاب دیا جائے گا اگر بدرجہ مجبوری تصویر بنانا ہو تو درخت کی اور جس میں جان نہ ہو اس کی بناؤ۔ ”سمعت من رسول الله ﷺ يقول: كل مصور في النار يجعل له بكل صورة صورها نفس يعذب بها في جهنم، ثم قال ابن عباس: فإني كنت لا بد فاعلاً فاصنع الشجر وما لا نفس له“ (بخاری: ۲۲۲۵، باب في التصوير التي ليس فيها روح، مسلم: ۵۵۲۰)۔

معلوم ہوا تصویر میں اصل سربہ ہے سر کے بغیر جواز نکل سکتا ہے، ”الصورة الرأس فإذا قطع فلا صورة“ (صحیح ۲۷۰/۷)۔ محمد بن احمد علی الواصل اپنی کتاب احکام تصویر فی الفقه الاسلامی میں مخلوقات کوئیہ (شمس، قمر، نجوم، جبال و بحار، انہار و ادویہ) کے تحت چار اقوال نقل کرتے ہیں، پہلا قول جواز کا ہے جو جمہور علماء و ائمہ اربعہ کا مذہب ہے۔

دوسرا قول حرمت کا ہے، ابو عبد اللہ قرطبی اور شرمزمرہ قلیلہ اس کے قائل ہیں۔

تیسرا قول: ان چیزوں کی تصویر کشی کی اجازت نہیں جن کی جاہلیت کے دور میں پوجا کی جاتی تھی جیسے سورج، چاند اور بعض درخت اس کے قائل علامہ ابو محمد



الجوبنی ہیں۔

چوتھا قول: تمام کی کراہت کا، یہ قول ابوسلیمان خطابی کا ہے، اگرچہ شیخ دراصل اس چوتھے قول کے متعلق لکھتے ہیں: ”وان كان جملة هذا الباب مكروهاً وداخلاً فيما يلهى ويشغل القلب بما لا يعنى“ یعنی کراہت کی وجہ صرف یہ ہے کہ دل غیر مفید اور لایعنی چیزوں کی طرف مائل ہو جائے گا۔

مفتی شفیع صاحب اپنی کتاب التصویر الاحکام التصویر ۶۳ پر لکھتے ہیں: ”وہ چیزیں جو غیر ذی روح نباتات یا جمادات میں سے ہیں لیکن ان کی عبادت کی جاتی ہے جیسے شمس و قمر اور ہندوستان میں پیتل کا درخت اور دریائے گنگ وغیرہ ان کی تصویر بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، علامہ شامی روایت میں اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور شیخ ملا علی قاری شرح مشکوٰۃ میں باقتضائے قواعد اس کو بھی ناجائز فرماتے ہیں، عبارت شامی کی یہ ہے: ”أو بغیر ذی روح لا یکره لأهلها لا تعبد“ (در مختار) ”فإن قيل: عبد الشمس والكواكب والشجرة الخضراء قلنا بعينه لا تمسالة فعلی هذا یبغی أن یکره استقبال عين هذه الأشياء مواج أى لأهلها عين ما عبد بخلاف ما لو صورها واستقبل صورها“ (شامی مکروہات الصلوٰۃ ۱۰۶، اور عبارت مرقاۃ شرح مشکوٰۃ یہ ہے: ”وأما ما عبد من دون الله ولو كان من الجمادات كالشمس والقمر فيبغى أن يحرم تصويره“ (مرقاۃ ۳۰۲، ۳۰۳) اس کے بعد مفتی صاحب لکھتے ہیں: لیکن از روئے قواعد علامہ شامی کا فیصلہ زیادہ واضح اور مختار للفتویٰ ہے اور خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جن چیزوں کی خود تصاویر پوچی جاتی ہیں ان کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے، اگرچہ غیر ذی روح میں سے ہوں لیکن جن کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی اگرچہ خود ان چیزوں کی پرستش ہوتی ہے تو ان کی تصویر جائز ہے مثلاً چاند، سورج یا پیتل اور گنگا کی پرستش کی جاتی ہے، مگر ان کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی تو ان چیزوں کی تصویر بنانا جائز ہے گا اور صلیب کی تصویر بھی پوچی جاتی ہے، اس لئے اس کی تصویر بنانا اور پاس رکھنا جائز نہیں اگرچہ وہ غیر ذی روح کی تصویر ہے کما فی رد المحتار ”والظاهر أنه يلحق به الصليب وإن لم يكن تمثال ذی روح لأنه فيه تشبهاً بالنصاری ويكره التشبه بهم في الزی وإن لم يقصد“ (شامی استنبول ۱۰۶، ۱۰۷) اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، ”إن رسول الله ﷺ كان لا يترك في بيته شيئاً فيه صليب“ (بخاری، ابوداؤد، نسائی کتاب اللباس) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسی قسم کی چیزوں کے متعلق فرمایا ہے، ”فإن كل ما عظم بالباطل من مكان أو زمان أو حجر أو شجر أو نية يجب قصد إهانته كما تهاون الأوثان المعبودة“ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲، ۴۵)۔

ایک روایت مسند احمد و بخاری و ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے اس طرح ہے: ”عن عائشة أن النبي ﷺ لم يكن يترك في بيته شيئاً من الأصنام“ ہے جس کی بابت ابن حجر کی تحریر ملاحظہ ہو، ”والذي يظهر أنه استنبط من نقض الصليب نقض الصورة التي تشترك معها في المعنى وهو عبادتها من دون الله“، ابن حجر فرماتے ہیں مذکورہ حدیث سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ صلیب اور صلیب کے ہم معنی (یعنی صلیب کی طرح وہ شیء مجبور بنائی جاتی ہو) تو اس کا توڑنا بھی اس میں شامل ہوگا۔ اس لئے بندہ عرض کرتا ہے کہ مخلوقات کو نبی کی تصویر کشی مطلقاً جائز نہیں، صرف انہیں کی تصویر کشی کی اجازت ہوگی جن کی اصل کی پرستش تو کی جاتی ہے مگر تصویر کشی نہیں اور وہ مخلوقات کو نبی جن کی اصل اور تصویر دونوں کی پرستش کی جاتی ہے ان کی عکس بندی جائز نہیں، یہیں سے ان اماکن و اراضی و جبال و اشجار و مناظر قدرت کی تصویر کشی کی بھی اجازت نکل آئی جن کی سرے سے پرستش ہی نہیں کی جاتی ہے اس لئے تعلیمی مقاصد کے لئے ان کا استعمال بلا ریب درست ہونا چاہئے۔

۵: الف- سب سے پہلے کارٹون کی تعریف عرض ہے، ڈاکٹر عبداللہ بن محمد الطیار کارٹون کی باریں الفاظ تعریف کرتے ہیں: ”الرسو الكاريكاتوري تعريفه في نظري هو: رسو يقوم به من يسمي بالفنان بالتعبير عن سخطه لشخص ما ونحو ذلك فيقوم برسو هذا الشخص بطريقة فيها نوع سخريه منه وذلك لإضحاك الآخرين عند رؤيتهم صورة هذا الشخص“، کارٹونسٹ کی اصطلاح میں اظہار ناراضگی کی غرض سے کسی شخص کی ایسی تصویر کہ دیکھتے ہی ذہن ذوقی تصویر کی طرف چلا جائے اور لوگ ہنس لگیں۔

اس کے حکم کی بابت ڈاکٹر عبداللہ بن محمد الطیار کی تحریر ملاحظہ ہو: ”الأول أنه رسو لذی الروح وقد جائت الأدلة على تحريم ذلك كما ذكرنا ثانياً أنه فيه نوع سخريه من خلق الله تعالى وإهانة لهم ولذا كان التحريم فيه أشد“ (صناعة الصورة ۲۴)۔

(اس طرح کی تصویر غایت درجہ حرام ہے، جس کی دو جہیں ہیں: اول یہ کہ یہ تصویر ذی روح کی ہے جس کی حرمت بیان کی جا چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ خلق اللہ کی اہانت ان کا مذاق اور استہزاء لازم آتا ہے)۔

واضح ہو کہ وہ ذی روح اگر ایسا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی تو اس کے کارٹون کی بھی اجازت نہ ہوگی، ”وحرمة تصویر حیوان وان لم یکن له نظیر“ (نہایت المحتاج الی شرح المنہاج ۲۱، ۲۵)، ”قال ابن حجر الہیثمی فی الزواجر: ولو صورة لا نظیر لها کفرس لها أجنحة“ (فی حاشیة البجیری علی الخطیب ۲، ۲۲۵): ”ولو لما لا نظیر له کبقر له منقار أو جناح“ جیسے گھوڑا جسے پر ہو یا تیل جس کے چونچ یا پر ہوں، ”ولو كانت الصورة خیالیة لا حقیقة لها کرجل له منقار أو فرس له جناحان أو ما یشبه الدببۃ وبعض الحيوانات أو غیر ذلك مما یتخیل لعموم الأدلة الدالة علی تحریم تصویر“ (المفتی مرکز الفتویٰ باشراف ڈاکٹر عبد اللہ الفقیہ) (اگر صورت خیالی ہو اس کی کوئی حقیقت نہ ہو جیسے کوئی آدمی جس کے چونچ ہو یا گھوڑا جس کے دو پر ہوں یا زمین پر ریگنے والوں اور بعض حیوانات کی تصویر ہو یا اس کے علاوہ خیالی تصویر ہوں، سب پر تصویر کا حکم لگے گا اور حرمت کا قول ہوگا)۔

اس لئے اس عاجز کی رائے ہے کہ تشوہہ (صورت بگاڑنا) کے باوجود وہ تصویر ہے خواہ ممتہن ہو یا غیر ممتہن اور مضامینہ مخلق اللہ و استہزاء وغیرہ مفاسد پر مشتمل ہو کر درست نہیں ہونا چاہئے۔

۵:ب- کارٹون کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست نہیں ہونا چاہئے۔

۶:الف- جواب اجزاء کے تحت مفصلاً گفتگو ہو چکی ہے، مقاصد اگر صالح ہوں لیکن وسائل حرام ہوں تو اس صورت میں وہ مقاصد بھی حرمت کے دائرہ میں آجاتے ہیں، احقر نے بارہا سنا کہ اس طرح کے پروگرام سے عبرت یا معاشرہ کی اصلاح تو دور رہی صرف ایک مضحکہ کی صورت ہوتی ہے، حاضرین پاٹ ادا کرنے والوں کے حلیے، ہیئت اور ناز و ادا و اسلوب بیان پر ہی لٹو ہو جاتے ہیں، اور جن مقاصد کی غرض سے یہ ڈراما مرتب ہو اس کی طرف توجہ یا توبالکل نہیں ہوتی یا ہوتی ہے تو اس کی حیثیت صرف ضمنی اور جزوی، اس لئے اس عاجز کے نزدیک جواز میں کلام ہے۔ ہاں اگر وسائل بھی درست ہوں اور ان محرّمات سے خالی ہوں جن کی بابت احقر با قبل میں گفتگو کر چکا ہے تو معاشرہ کے مفاسد پر تنقید اور بہتر کاموں کی ترغیب کی غرض سے ڈرامہ سٹیج کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

## سیر و تفریح - جائز وسائل اور شرعی ضوابط

ڈاکٹر سید اسرار الحق سیال علی

۱- مزاح، لطیفہ گوئی اور مزاحیہ مشاعرہ:

الف- مزاح کا حکم:

شریعت میں مزاح جائز ہے، کئی احادیث میں آنحضرت ﷺ کا اپنے اصحاب سے مزاح کرنا ثابت ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ سے ایک صحابی نے سواری کا جانور مانگا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دوں گا، وہ صحابی کہنے لگے: میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وہل تلد الإبل إلا النوق“ (رواہ الترمذی و ابوداؤد، مشکاة ۲۰۲۱۶ باب المزاح) (اونٹ کو بھی تو اونٹنیاں ہی جنم دیتی ہیں، یعنی جوان اونٹ بھی تو اپنی ماں کا بچہ ہوتا ہے)۔

البتہ اس کی کچھ حدود ہیں:

۱- مزاح میں جھوٹ نہ بولا جائے، جیسا کہ روایت میں ہے: ”عن أبي هريرة قال: قالوا: يا رسول الله! إنك تداعبنا؟ قال: إني لا أقول إلا حقاً“ (رواہ الترمذی، مشکاة المصابیح ۴۱۶) (سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ بھی ہم سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں حق کے سوا کچھ نہیں بولتا ہوں)۔

۲- مزاح میں کسی کی دل آزاری نہ ہو، حدیث میں ایسے مزاح سے منع کیا گیا ہے جس میں کسی کی دل آزاری اور اذیت پہنچانے کا ارادہ ہو:

”عن ابن عباسؓ عن النبي ﷺ قال: لا تمار أخاك ولا تمازحه، ولا تعده موعداً فتخلفه“ (ترمذی، مشکاة ۴۱۷)۔

(سیدنا ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی سے نہ جھگڑو، اس کے ساتھ (تکلیف دہ) مزاح نہ کرو، اور اس سے وعدہ کر کے وعدہ خلافی نہ کرو)۔

۳- مزاح میں فحش گوئی اور گناہ کی بات نہ ہو، آج کل کچھ لوگوں نے فحش گوئی اور بے حیالی کی بات کو مزاح سمجھ لیا ہے، یہ درست نہیں ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”لا بأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلام يائمه به“ (الفتاویٰ الہندیہ ۵۰۲۵) (مزاح گوئی میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ آدمی ایسی بات نہ کہے جس میں گناہ ہو)۔

ب- مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعرہ:

مذکورہ حدود کے ساتھ مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعرہ درست ہوگا، بشرطیکہ اتنا لہذا پروگرام نہ ہو کہ نماز، روزہ اور فرائض دین و دنیا میں کوتاہی ہو، مسلم اور ترمذی کی روایت میں ہے:

”عن جابر بن سمرة قال: كان رسول الله ﷺ لا يقوم من مصلاه الذي يصلي فيه الصبح حتى تطلع الشمس، فإذا طلعت الشمس قام، وكانوا يتحدثون فيأخذون في أمر الجاهلية فيضحكون ويتبسمون“ (رواہ مسلم و فی روایۃ للترمذی: يتناشدون الشعر“ (مشکاة المصابیح ۴۰۶)۔

(سیدنا جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز کے بعد مصلیٰ سے نہیں اٹھتے، جب تک سورج نہ نکل جاتا، جب سورج نکل جاتا تو اٹھتے، اور دوسرے حضرات گفتگو کرنے لگتے، اور زمانہ جاہلیت کی بات میں لگ جاتے، تو ہنسنے لگتے، اور آپ ﷺ مسکراتے، یہ مسلم کی روایت ہے، اور ترمذی کی روایت میں ہے اشعار پڑھتے۔)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”وإنشاد ما هو مباح من الأشعار لا بأس به، وإذا كان في الشعر صفة المرأة إن كانت امرأة بعينها وهي حية يكره، وإن كانت ميتة لا يكره، وإن كانت مرسله لا يكره، وفي النوازل: قراءة شعر الأديب إذا كان فيه ذكر الفسق والخمر والغلام يكره، والاعتماد في الغلام على ما ذكرنا في المرأة، كذا في المحيط: قيل: أن معنى الكراهة في الشعر أن يشتغل الإنسان به فيشغله عن قراءة القرآن والذكر، أما إذا لم يكن فلا بأس به“ (الفتاوى الهندية ۵۰۲۵)۔

(مباح قسم کے اشعار پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور جب شعر میں عورت کا وصف ہو، اگر متعینہ عورت ہو اور زندہ ہو تو مکروہ ہے، اگر مردہ ہو تو مکروہ نہیں، اگر نامعلوم عورت ہو تو بھی مکروہ نہیں، ”نوازل“ میں ہے کہ اديب کا شعر پڑھنا جب کہ اس میں فسق، شراب اور غلام کا ذکر ہو تو مکروہ ہے، اور غلام کو عورت پر قیاس کیا گیا ہے، جیسا کہ ”محیط“ میں ہے، کہا گیا ہے کہ شعر میں کراہت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس میں مشغول ہو کر قرآن کی تلاوت اور ذکر سے غافل ہو جائے، البتہ جب ایسا نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔)

ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا اور خرید و فروخت کرنا:

مزاحیہ کہانیاں یا مضامین لکھنے کا مقصد مندرجہ ذیل ہوتا ہے:

تفریح و طبع، ملک کے سیاسی، معاشی، سماجی، عدالتی اور تعلیمی نظام پر طنز، جہالت اور اندھی تقلید پر تنقید، برائی اور بے حیائی کے کاموں سے نفرت دلانا، اس کے لئے فن کار سنجیدہ مضمون لکھنے کے بجائے طنز و مزاح کا سہارا لیتا ہے، جیسے: اکبر الہ آبادی، رشید احمد صدیقی، بطرس بخاری اور شوکت تھانوی وغیرہم نے مذکورہ مقاصد کے حصول کے لئے مزاح و طنز کا سہارا لیا ہے، اور موجودہ دور کے تقریباً مزاحیہ قلم کار جاتز تفریح و طبع اور اصلاح و تنقید کے لئے مزاحیہ نظم، نثر یا کہانی لکھتے ہیں، اس لئے اگر ان میں گناہ اور بے حیائی کی باتیں نہ ہوں تو انہیں لکھنے، پڑھنے، شائع کرنے اور خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے، علامہ حصفلی لکھتے ہیں:

”وأشعار العرب لو فيها ذكر الفسق تکره، انتهى، أو لتخليط الذنب كما في الاختيار، أو للاستحلال كما في النهاية“ (عرب کے اشعار میں اگر گناہ کی باتوں کا ذکر ہو تو مکروہ ہے، یا گناہ کی شدت ہو جیسا کہ ”اختیار“ میں ہے، یا گناہ کو حلال سمجھا گیا ہو، جیسا کہ ”نہایہ“ میں ہے)۔

اور علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: جان لو کہ ان اشعار کا کہنا حرام ہے جن میں فحش کلامی یا کسی مسلم کی جھوٹ، یا اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، یا صحابہ پر بہتان ہو، یا خود ستائی، جھوٹ، مذموم تفاخر، یا نسب پر اعتراض ہو، اسی طرح جس میں کسی متعین امر یا عورت کا وصف بیان کیا گیا ہو، جب کہ وہ زندہ ہوں، کیوں کہ کسی متعین زندہ عورت اور کسی متعین زندہ خوب رومرد کا وصف بیان کرنا نہ مردوں کے درمیان جائز ہے، نہ تنہائی میں، البتہ مردہ یا غیر متعینہ عورت کا وصف بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (رد المحتار ۹/۳۲۶)۔

د- لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی کو پیشہ بنانا:

لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا درست نہیں ہے، حدیث میں ہے: ”عن بهز بن حکيم عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: ويل لمن يحدث فيكذب ليضحك به القوم، ويل له، ويل له“ (رواه احمد والترمذی، وابوداؤد والدارمی، بشكاة المصابيح ۴۱۳)۔

(بہز بن حکیم اپنے والد اور دادا کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جو جھوٹ بیان کرے، تاکہ اس سے لوگوں کو ہنسائے، اس کے لئے ہلاکت ہے، اس کے لئے ہلاکت ہے)۔

اس حدیث کے تحت ملا علی قاری لکھتے ہیں:

”قال الغزالی: وحينئذ ينبغي أن يكون من قبيل مزاح رسول الله ﷺ، فلا يكون إلاحقا، ولا يوذى قلباً، ولا يفرض فيه، فإن كنت أيها السامع تقتصر عليه أحياناً على الدور فلا حرج عليك، ولكن من الغلط العظيم أن يتخذ الإنسان حرفة ويواظب عليه ويفرض ثم يتمسك بفعل رسول الله ﷺ“ (المرقاة على هامش المشكاة: ۴۱۲)۔

(امام غزالی نے فرمایا: مناسب ہے کہ مزاح، رسول اللہ ﷺ کے مزاح کے قبیل سے ہو، جو بالکل سچ ہو، دل آزاری نہ ہو، اور اس پر کوئی حرج نہیں، لیکن بڑی غلطی ہوگی کہ لوگ اس کو پیشہ بنالیں، ہمیشہ اسے اختیار کریں، اس میں زیادتی کریں اور پھر رسول اللہ ﷺ کے عمل سے استدلال کریں)۔

اسی طرح مزاح نویسی یا لطیفہ گوئی پر معاوضہ طے کر لیا گیا ہو تو درست نہیں ہوگا، لیکن بلا شرط اگر خوشی سے دیا گیا ہو تو لینا جائز ہوگا۔

”امراة نائحة أو صاحب طبل أو مزارا اكتسب ما لأقال: إن كان على شرط رده على أصحابه إن عرفهم، يريد بقوله: على شرط، إن شرطوا لها في أوله ما لأ يازاء النياحة أو يازاء الغناء، وهذا لأنه إذا كان الأخذ على الشرط كان المال بمقابلة المعصية، فكان الأخذ معصية، والسبيل في المعاصي ردها... أما إذا لم يكن الأخذ على شرط لم يكن الأخذ على معصية والدفع حصل من المالك برضا فيكون له ويكون حلالاً“ (الفتاوى الهندية ۵: ۲۳۹)۔

(نوحہ کرنے والی عورت، یا طبلہ یا موسیقی بجانے والے نے مال کمایا تو اگر مطالبہ کر کے حاصل کیا ہو تو اس کے مالکوں کو لوٹائے، جب کہ ان کو پہچانتا ہو، یعنی شروع میں شرط لگا کر نوحہ اور گانے کے مقابلہ مال کا مطالبہ کیا ہو، کیوں کہ جب شرط لگا کر لیا تو مال گناہ کے مقابلہ میں ہو، تو لوٹنا گناہ ہوا اور گناہ کی صورت میں اس کو لوٹانا ضروری ہوا، البتہ جب شرط کے ساتھ لینا نہ ہو تو گناہ کے کام پر لینا نہیں ہوا، بلکہ مالک کی رضامندی سے حاصل ہوا، تو وہ اس کے لئے حلال ہوگا)۔

۵- مزاحیہ ڈرامہ اور ہنسی کی محفل:

تفریح طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کا پروگرام منعقد کیا جاتا ہے، اس کا مقصد صرف ہنسا اور ہنسانا ہوتا ہے، ایسے ڈرامے کا لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اس کا دیکھنا درست نہیں ہے۔

اسی طرح خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام رکھے جاتے ہیں، اور لوگ بہ تکلف تہنقہ لگاتے ہیں، اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے پروگرام منعقد کرنا بھی جائز نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”فليضحكوا قليلاً وليبكوا كثيراً“ (التوبة: ۸۲) (چاہئے کہ وہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنسنے سے انسان کی صحت پر اچھا اثر قائم ہوتا ہے، اور غم میں گھٹنے سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، اس کا علاج انفرادی طور پر خوش رہ کر اور خوش مزاجی کو اپنا کر کیا جاسکتا ہے نہ کہ باضابطہ ہنسی کی محفل منعقد کر کے، ”زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے“ بعض مرتبہ زیادہ ہنسنے سے ہارٹ فیل ہو کر موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

۲- کھیل کود- اصول اور احکام:

الف- کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے اصول:

حدیث میں تین طرح کے کھیلوں کے سوا تمام کھیلوں کو باطل قرار دیا گیا ہے: ”كل شيء يلعب به الرجل باطل، إلا رميه بقوسه وتاديبه فرسه وملاعبته امرأته، فإنهن من الحق“ (رواه الترمذی وابن ماجہ... مشكاة: ۳۲۷)۔

(ہر وہ چیز جس سے آدمی کھیلتا ہے، باطل ہے، سوائے تیر اندازی، گھوڑے کی تربیت اور بیوی کے ساتھ کھیلنے کے، کیوں کہ یہ حق ہیں)۔

احادیث اور فقہ کی روشنی میں کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اصول واضح ہوتے ہیں:

(۱) ایسا کھیل ہو جس سے نشانہ بازی کی مشق ہو۔

(۲) جس کھیل سے آلہ جہاد کی تیاری ہو۔

(۳) اپنے گھروالے کے ساتھ کھیل ہو، غیر محرم کے ساتھ نہ ہو۔

(۴) کھیل سے جسمانی ورزش مقصود ہو، محض لہو و لعب اور سرمستی کا ارادہ نہ ہو: ”إن أراد بها التلهي يكره ذلك ويمنع عنه، وإن أراد تحصيل القوة ليقدر على المقاتلة مع الكفرة فإنه يجوز ويشاب عليه“ (الفتاوى الهنديه ۵۰۲۵۲)۔

(۵) ایسا کھیل ہو جو مختصر وقت میں مکمل ہو جائے، جس سے جماعت کی نماز اور دوسری عبادت نہ چھوٹے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ جو چیز تم کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے وہ جو ہے: ”ما ألهاكم عن ذكر الله فهو ميسر“ (أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۵۰۲۲۲، احمد في كتاب الزهد، وطبری في تفسيره ۲۰۲۶۰)۔

(۶) ایسا کھیل نہ ہو جس میں انسان یا جانور کو اذیت پہنچانے کا ارادہ ہو، جیسے مرغ بازی، بئیر بازی، بھینس کی لڑائی، بل فائٹنگ اور فری اسٹائل کشتی وغیرہ ناجائز کھیل ہیں، حدیث میں جانور کو باندھ کر نشانہ بازی سے منع کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے:

عن سعيد بن جبیر قال: ”مر ابن عمر رضي الله عنهما بفتيان من قريش قد نصبوا طيراً وهم يرمونه، وقد جعلوا لصاحب الطير من خاطئة من نبلهم، فلما رأوا ابن عمر تفرقوا، فقال ابن عمر: من فعل هذا، لعن الله من فعل هذا، إن رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن من اتخذ شيئاً فيه الروح غرضاً“ (صحيح مسلم ۲۰۱۵۳)۔

(سیدنا سعید بن جبیر روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضي الله عنهما کا گزر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے ہوا، وہ لوگ پرندے کو باندھ کر اس پر تیر اندازی کر رہے تھے، انہوں نے پرندے کے مالک کے لئے ہر غلط نشانہ پر ایک تیر مقرر کیا تھا، انہوں نے جب سیدنا ابن عمر رضي الله عنهما کو دیکھا تو منتشر ہو گئے، ابن عمر نے فرمایا: کس نے ایسا کیا؟ جس نے ایسا کیا اس پر اللہ کی لعنت ہے، اللہ کے رسول صلى الله عليه وسلم نے ایسے شخص پر لعنت بھیجی ہے جو کسی ذی روح کو نشانہ بنائے)۔

(۷) مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جائز نہیں ہے، کیوں کہ حدیث میں مرد و عورت کو ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کرنے پر لعنت کی گئی (بخاری ۸۷۴۲/۲ کتاب اللباس باب التثبيح بالنساء) جیسے عورتوں کا کبڈی، کرکٹ اور ہاکی کھیلنا۔

(۸) کھیل میں جو اسٹہ بازی اور میچ فلکسنگ نہ ہو، جو اس کی حرمت قرآن مجید میں صاف طور پر بیان کی گئی ہے (المائدہ: ۹۰)۔

ب۔ کھیل میں ساتر لباس کی رعایت:

آج کل کھیلوں کے لئے مخصوص یونی فارم لازم ہے، جس میں ستر کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے، مسلمانوں کے لئے کھیلوں میں حصہ ستر کو چھپانا لازم ہے، کھیل کے وقت بھی ستر کا کچھ حصہ کھولنے کی گنجائش نہیں ہے، مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے تک ہے، جب کہ عورت کا ستر پورا جسم ہے، عورت کے لئے مردوں کے سامنے یا مردوں کے ساتھ کھیلنا جائز نہیں، عورتیں دوسری عورتوں کے درمیان کھیل سکتی ہیں، جب کہ ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو، ستر کے حصہ کو چھپائے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیوں کہ ستر کا چھپانا فرض ہے، اور یہ اللہ کے حق کے ساتھ بندہ کا بھی حق ہے (دیکھئے: ہدایہ ۹۲/۱-۹۶)۔

ج۔ مستحب اور مکروہ کھیل:

مستحب کھیل:

(۱) تیر اندازی: حدیث میں تیر اندازی سیکھنے کی بڑی تاکید آئی ہے، اور اس کو سیکھ کر چھوڑ دینے پر وعید آئی ہے، ”ألا إن القوة الرمي رواه مسلم: من علم الرمي ثم تركه فليس منا أو قد عصى، (رواه مسلم؛ مشكاة: ۳۲۶)۔

تیر اندازی میں بندوق وغیرہ سے نشانہ بازی بھی شامل ہوگی۔

(۲) گھوڑ دوڑ: آنحضرت صلى الله عليه وسلم نے گھوڑ دوڑ کو پسند فرمایا ہے اور گھوڑ دوڑ کا مقابلہ کروایا ہے:

عن عبد الله بن عمر ”إن رسول الله صلى الله عليه وسلم سابق بين الخيل التي أضرمت من الخفياء وأمدھا ثنية الوداع،

وبینہما سببہ أمیال، وسابق بین الخیل التي لم تضمر من الثنیة إلى مسجد بنی زریق، و بینہما میل“ (متفق علیہ؛ مشکاة: ۲۳۶)۔  
 (سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیز اور چھریرے قسم کے گھوڑوں کی مقام حفیہ سے ثنیۃ الوداع تک دوڑ لگوائی، ان کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہے، اور جو گھوڑے چھریرے نہیں تھے، ان کے درمیان ثنیۃ سے مسجد بنی زریق تک دوڑ لگوائی، ان کے درمیان ایک میل کا فاصلہ ہے)۔  
 (۳) اونٹ کی دوڑ: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا سبق إلا فی نصل أو خف أو حافر“ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی؛ مشکاة: ۲۳۷) (تیر، خف (اونٹ کا) یا کھر (گھوڑے کا) کے علاوہ دوسری چیزوں میں مقابلہ جائز نہیں ہے)۔

(۴) دوڑ: آنحضرت ﷺ کا خود دوڑ لگانا ثابت ہے (دیکھئے: ابوداؤد، باب اسبق علی الرجل)۔

(۵) کشتی: اسلام میں کشتی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، رکاز عرب کے مشہور پہلوان تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو مقابلہ کی دعوت دی، مقابلہ میں رکاز کو شکست ہوئی اور اسی سے انہوں نے اسلام قبول کر لیا (دیکھئے: نیل الاوطار ۸/۹۲، رد المحتار ۹/۴۹۳)۔

لیکن کشتی سے مراد یہاں صرف ایسی کشتی ہے جس میں مقابل کوزمین پر چت کر دیا جائے، مروجہ فری اسٹائل کشتی مراد نہیں، جس میں مخالف پر آزادانہ تکلیف دہ حملہ کیا جاتا ہے، یہ جائز نہیں۔

(۶) تیراکی: آپ ﷺ نے بچوں کو تیراکی سکھانے کی ترغیب دی ہے، اور ایک روایت میں تین کھیلوں کے ساتھ تیراکی کی بھی اجازت ہے (دیکھئے: الجامع الصغیر مع فیض القدر ۵/۲۳ بحوالہ قاموس الفقہ ۴/۵۸۹)۔

### جائز کھیل:

کبڈی، فٹ بال، ہاکی، لوڈو، کرائے، بیڈمنٹن، ٹینس اور ٹیبل ٹینس وغیرہ، کیوں کہ ان کھیلوں سے عموماً دوڑ اور جسمانی ورزش کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

”وأما السابقة بالبقر والسفن والسباحة فظاهر كلامهم الجواز، ورمی البندق والحجر كالرمی بالسهم، وأما إشالة الحجر باليد وما بعده فظاهر أنه إن قصد به التمرن والتقوى على الشجاعة لا بأس به“ (رد المحتار ۹/۴۹۳)۔  
 (بہر حال گائے، کشتی اور تیراکی میں مقابلہ جائز ہے، اور غلیل اور پتھر کا پھینکنا تیر پھینکنے کی طرح ہے، بہر حال ہاتھ سے پتھر بلند کرنا تو بظاہر اس سے مشتق اور بہادری کی قوت پیدا کرنا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

### مکروہ اور ناجائز کھیل:

شطرنج، کیرم بورڈ، تاش، کرکٹ، فری اسٹائل کشتی، مرغ بازی، تیر بازی، بھینسوں کی لڑائی اور قرض وغیرہ ناجائز کھیل ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون“ (المائدہ: ۹۰)۔

(اے ایمان والو! بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے، یہ سب ناپاک اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچتے رہو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)۔

اس آیت کے تحت علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ”هذه الآية تدل على تحريم اللعب بالنرد والشطرنج قماراً أو غير قمار“ (الجماع لاحكام القرآن ۶/۱۸)۔ (یہ آیت نرد اور شطرنج کھیلنے کی حرمت کو بتاتی ہے، چاہے اس میں جوا ہو یا نہ ہو)۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”ويكره اللعب بالشطرنج والنرد، وثلاثة عشر وأربعة عشر، وكل لهو ما سوى الشطرنج حرام بالإجماع“ (الفتاویٰ الہندیہ ۵/۲۵۲) (شطرنج، نرد، تیرہ، چودہ سے کھیلنا مکروہ ہے، اور شطرنج کے سوا تمام کھیل بالاتفاق حرام ہیں)۔

د- کھیل میں پیسے کی شرط:

کھیل میں ہارجیت کے وقت پیسے کی شرط ہو تو اس کے جائز ہونے کی صورت درج ذیل ہے:

(۱) جائز کھیل ہو۔

(۲) کھیل کے فریقین میں جیتنے کا احتمال ہو، یعنی وہ کھیل کھیلنے کی صلاحیت ہو، تاکہ شرط بازی اور فریق مخالف کو فائدہ پہنچا کر اس سے رشوت حاصل کرنے کا امکان نہ ہو۔

(۳) شرط یک طرفہ ہو، اگر دو طرفہ شرط ہو تو یہ صورت ناجائز اور قمار میں شامل ہے۔

(۴) شرط دو طرفہ ہو، لیکن ایک تیسرے شخص کو کھیل میں شامل کر لیا جائے گا اگر وہ جیت جائے تو دونوں فریق کی طرف سے اسے رقم ملے گی، لیکن اگر تیسرا شخص ہار جائے تو اسے کچھ بھی دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(۵) انعام حکومت یا کھیل منعقد کرنے والے کی طرف سے ہو تو یہ مطلق جائز ہے، چاہے صرف جیتنے والے کو انعام دیا جائے یا ہارنے والے کو بھی کچھ دیا جائے۔ غلامہ کا سانی وضاحت کرتے ہیں:

”... ومنها: أن يكون الخطر فيه من أحد الجانبين، إلا إذا وجد فيه محلاً، حتى لو كان الخطر من الجانبين جميعاً ولم يدخل فيه محلاً لا يجوز، لأنه معنى القمار، ... وكذلك إذا كان الخطر من الجانبين ولكن أدخل فيه محلاً بأن كانوا ثلاثة، لكن الخطر من الاثنين منهم ولا خطر من الثالث، بل إن سبق أخذ الخطر، وإن لم يسبق لا يغرم شيئاً، فهذا مما لا بأس به أيضاً، وكذلك ما يفعله السلطان... ومنها: أن تكون المسابقة فيما يحتمل أن يسبق... حتى لو كانت فيما يعلم أنه ”لا“ يسبق غالباً لا يجوز، لأن معنى التحريض في هذه الصورة لا يتحقق فبقی الرهان التزام المال بشرط لا منفعة فيه فيكون عبثاً ولعباً“ (بدائع الصنائع ۶/۵۲۰۵۴)۔

(اس کے جائز ہونے کی شرطوں میں سے ہے کہ شرط دو فریقوں میں سے کسی ایک کی طرف سے ہو، مگر یہ کہ کسی تیسرے کو شامل کر لے، یہاں تک کہ اگر شرط دو طرفہ ہو اور درمیان میں کوئی نہ ہو تو ناجائز ہے، کیوں کہ یہ قمار کے معنی میں ہے، اسی طرح جب شرط دو طرفہ ہو، لیکن ایک آدمی کو شامل کر لیا اور رقم ان میں سے دو آدمیوں کی طرف سے ہو، تیسرے کی کوئی رقم نہ ہو، اگر تیسرا شخص جیت گیا تو وہ رقم لے لے گا، اگر وہ ہار گیا تو اس کو کچھ دینا نہ ہوگا، اس صورت میں بھی کوئی حرج نہیں، اور اسی طرح سلطان رقم کا اعلان کرے، اور ایک شرط یہ ہے کہ مقابلہ میں جیتنے کا احتمال ہو، یہاں تک کہ معلوم ہو کہ ایک فریق غالباً نہیں جیت سکتا تو جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں ترغیب کا مقصد حاصل نہیں ہوگا، اور مال کو ایسی شرط کے ساتھ مربوط کرنا ہوگا جس میں کوئی فائدہ نہیں ہے، تو یہ بے کار اور محض کھیل ہوگا)۔

ہ- کافی وقت ضائع کرنے والا کھیل:

ایسا کھیل جو اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، ایسا کھیل کھیلنا اور دیکھنا جائز نہیں ہوگا، جیسے: کرکٹ میچ اور خاص طور پر کرکٹ کا ٹیسٹ میچ جو کم و بیش ایک ماہ چلتا رہتا ہے، کسی صورت میں جائز نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أفحسبتم أنما خلقناكم عبثاً وأنكم إلينا لا ترجعون“ (المؤمنون: ۱۱۵) (کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس لوٹائے نہیں جاؤ گے؟)۔

اور حدیث میں ہے: عن أبي برة الأسلمي قال: قال رسول الله ﷺ: ”لا تزول قدما عبد حتى يسأل عن عمره فيما أفناه وعن علمه فيما فعل وعن ماله من أين اكتسبه وفيما أنفقه وعن جسمه فيما أبلاه“ (سنن الترمذی ۲۰۶۷)۔

(سیدنا ابو برة اسلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بندہ کے دونوں قدم (قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سے) ہٹ نہیں سکیں گے، یہاں تک کہ اس کی عمر کے بارے میں اس سے نہ پوچھا جائے کہ عمر کس کام میں صرف کیا؟ اور علم کے بارے میں کہ علم پر کتنا عمل کیا؟ اور مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور جسم کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا کہ جسم کو کس مصروفیت میں لگایا؟)۔



و- کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا:..... جس کھیل کا دیکھنا جائز ہو، اس کھیل کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہوگا، اور جس کھیل کا دیکھنا جائز نہ ہو اس کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

### ۳- سیر و سیاحت:

الف- تفریحی مقصد کے لئے سفر:

تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر جب کہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ ہوتا ہے، جائز ہوگا، کیوں کہ سفر کرنا فی نفسہ مباح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اولم یسیروا فی الارض“ (المومن: ۲۱) (کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا)۔

سفر سے بے شمار فائدے ہیں جو بغیر سفر کے حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً:

(۱) تاریخی، جغرافیائی، معاشی، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی معلومات و مشاہدات۔ (۲) زندگی کے تجربات اور انسانوں کی پہچان۔ (۳) بچوں اور بڑوں میں

خود اعتمادی اور سلیقہ مندی۔

آج کل تاریخی اور مشہور مقامات کی سیر تعلیم کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے، اور تعلیمی ادارہ کی طرف سے بچوں کو مشہور مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے، لیکن ادارہ کی طرف سے دور مقامات کی سیر مشکل اور بعض مرتبہ خطرناک ہوتی ہے، اس لئے والدین اگر اپنی گنجائش کے پیش نظر بچوں کو اپنے ساتھ مشہور مقامات کی سیر کرائیں تو یہ سفر زیادہ محفوظ اور سود مند ہوگا۔

### ب- پرخطر مقام کا سفر:

جس جگہ کے سفر میں جان و مال اور عزت و آبرو کا خطرہ ہو، ایسے سفر میں بال بچوں کو لے جانا اور خود جانا بھی جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ شریعت کے اہم مقاصد ہیں، حدیث میں ہے:

عن أسامة بن زيد قال: قال رسول الله ﷺ: ”الطاعون رجز أرسل على طائفة من بني إسرائيل أو على من كان قبلكم، فإذا سمعتم به بأرض فلا تقدموا عليه وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا فراراً منه“ (متفق عليه؛ مشكاة ۱۳۵)

(سیدنا اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر یا تم سے پہلے لوگوں پر بھیجا گیا تھا، جب تم کسی علاقہ میں طاعون کے بارے میں سنو تو وہاں مت جاؤ، اور جس علاقہ میں تم ہو وہاں طاعون آجائے تو طاعون سے بھاگتے ہوئے وہاں سے نہ نکلو)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: جب تجارت وغیرہ کے لئے سمندر میں کشتی پر سوار ہونے کا ارادہ ہو، تو اگر حالت یہ ہو کہ اگر کشتی ڈوب جائے تو خود کو کسی طرح غرق ہونے سے بچانا ممکن ہو، تو کشتی میں سوار ہونا جائز ہے، اور اگر کسی طرح بھی غرق سے بچنا ممکن نہ ہو تو سوار ہونا جائز نہیں ہے، اسی مسئلہ پر ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے دارالحرب میں امان کے ساتھ داخلہ کو قیاس کیا ہے، چنانچہ انہوں نے کہا کہ اگر داخل ہونے والا اس پوزیشن میں ہو کہ اگر مشرکین اس کو قتل کرنے کا ارادہ کریں، اور اس کے لئے قتل کا دفاع ممکن ہو تو داخل ہونا جائز ہے، اور اگر دفاع ممکن نہ ہو تو داخل ہونا جائز نہیں ہے، جیسا کہ ”ذخیرہ“ میں ہے (الفتاویٰ الہندیہ ۳۶۱/۵)۔

### ج- تفریح کے مقام پر دکان لگانا:

جس مقام پر لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں غیر شرعی باتوں سے بچتے ہوئے ازراہ تفریح جانا درست ہوگا، جب کہ اصلاً وہ جگہ سیاحت گاہ ہو، نہ کہ برائیوں کا ڈھ، اگر وہ برائیوں کا ڈھ بن جائے تو وہاں جانا درست نہیں ہوگا۔

اسی طرح وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانا درست ہوگا، کیوں کہ دکان لگانے پر نہ براہ راست معصیت پر تعاون ہے نہ بالراست، اگر ایسے مقام پر خورد و نوش کی چیزیں فروخت نہ کی جائیں تو لوگ اشیاء خورد و نوش دوسری جگہ سے خرید کر لے جائیں گے، البتہ وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانے میں بالواسطہ تعاون ہے، جو بہت سے فقہاء کے نزدیک جائز ہے، علامہ ابن بزاز کوروی

(م: ۸۲۷ھ) لکھتے ہیں: ”آجر نفسه ليعصر لذي خمرأ يكره ولو لبناء بيعة لا، لأن المعصية في العصر يقام بعينه لا في الثاني“ (الفتاوى البزازية مع الهنديه ۶: ۲۵۹)۔ (کسی نے ذمی کے لئے شراب پھونکنے کی نوکری قبول کی، تو مکروہ ہے، اگر یہودی کی عبادت گاہ کی تعمیر کے لئے مزدوری کی تو مکروہ نہیں، کیونکہ پھونکنے میں معصیت بعینہ اس چیز کے ساتھ قائم ہے، جب کہ دوسری صورت میں نہیں)۔

۱۔ ٹور کمپنیاں قائم کرنا:

چوں کہ ٹور والوں کا مقصد تجارتی نقطہ نظر سے مسافروں کو ان کی منزل تک چھوڑنا ہوتا ہے، اس لئے اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہوگا، علامہ شامی لکھتے ہیں: ”قال في الخانية: ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به، لأنه لا معصية في عين العمل“ (رد المحتار ۹: ۴۷۷) فتاویٰ خانہ میں ہے کہ اگر خود کو مزدوری پر رکھا تاکہ کلیسا میں کام کرے اور اس کی تعمیر کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ معصیت بعینہ اس عمل سے نہیں ہے البتہ خاص مندر، تیر تھ گاہوں اور چروں کے لئے پوری گاڑی بک کرائی جائے تو ان زائرین کو لے جانا مناسب نہیں ہوگا، علامہ ابن بزاز لکھتے ہیں: ”استدل الذمی مسلماً عن طريق البيعة لا يدل عليه“ (الفتاوى البزازية ۶: ۲۵۹) (ذمی نے کسی مسلمان سے یہودیوں کی عبادت گاہ (بیعہ) کا راستہ پوچھا تو وہ اس کی رہنمائی نہ کرے)۔

۳۔ فلم بندی کا حکم:

تاریخی اور دستاویزی فلمیں، قرآن میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، ان مقامات کی فلم بندی، نیز تعلیمی مقاصد کے لئے فلم بندی کی گنجائش ہو سکتی ہے، تاکہ بچوں کو سمجھنے میں آسانی ہو، جیسا کہ بچوں کے لئے گڑیا کی اجازت ہے، علامہ نووی نے لکھا ہے: ”وأجمعوا على منعه ما كان له ظل ووجوب تخييره. قال القاضي: إلا ما ورد في اللعب بالبنات لصغار البنات والرخصة في ذلك“ (شرح مسلم للنووي ۲: ۱۹۹)۔ (سایہ دار تصویر کی حرمت پر علماء کا اجماع ہے، اور اس میں تفسیر واجب ہے، مگر چھوٹی بچیوں کی گڑیوں کے بارے میں جو رخصت وارد ہوئی ہے)۔ البتہ اس میں ضروری ہے کہ: (۱) ساز اور موسیقی نہ ہو۔ (۲) خواتین کی تصویر نہ ہو۔

۵۔ کارٹون کا حکم:

الف۔ کارٹون بنانے کا حکم:..... کارٹون دراصل شخصیات و واقعات کی ایک علامت ہوتی ہے، اس کا مقصد حالات حاضرہ پر طنز و مزاح اور تنقید ہوتا ہے، اس میں لوگوں کی بعینہ تصویر کے بجائے شخصیت کا عکس اور علامت ظاہر کی جاتی ہے، اور غور کرنے پر اصل شخصیت سمجھ میں آتی ہے، اس لئے یہ جائز ہونا چاہئے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے: ”لو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتأمل لا يكره“ (الفتاوى الهندية ۱۰: ۱۱۰) (اگر تصویر اتنی چھوٹی ہو کہ دیکھنے والے کو غور کرنے کے بعد نظر آئے تو مکروہ نہیں)۔

ب۔ کارٹون بنانے کی ملازمت:..... آج کل کارٹون صحافت کا ایک حصہ بن گیا ہے، اور سیاسی، سماجی، معاشی مسائل اور نا انصافی پر طنز و تنقید کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اس لئے صالح تنقید اور حق و انصاف کے اظہار کے جذبہ کے تحت اس پیشہ کو اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں، حدیث میں ہے: ”أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر“ (ابوداؤد: ۴۲۳۳) (ظالم بادشاہ کے پاس انصاف کی بات کہنا افضل جہاد ہے)۔

۶۔ ڈرامہ کا حکم:

”ڈراما“ یونانی زبان کا لفظ ہے، اور ایک مصور سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ”کر کے دکھانا“، اس میں زندگی کے واقعات کو محض بیان کرنے کے بجائے کر کے دکھائے جاتے ہیں (ڈاکٹر سید عابد حسین - انشائیات)۔

جس طرح صالح مقاصد کے حصول کے لئے تقریر اور تحریر، کا سہارا لیا جاتا ہے، اس سے موثر، واضح اور دل نشین ذریعہ ڈراما ہے، لہذا بہتر کاموں کی ترغیب، حق و باطل کی تمیز اور معاشرہ کے مفاسد و منکرات پر تنقید کے لئے ڈرامے آج کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے، ہمارے دینی مدارس میں اس کی مثال مناظرہ کی مشق اور مکالمات ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وجادلهم بالتي هي أحسن“ (النحل: ۱۲۵) (اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے) واللہ اعلم بالصواب ☆☆☆

## تفریحی امور اور کھیل کود کے شرعی احکام

مفتی اقبال احمد قاسمی

تفریح کی حقیقت اور اس کی ضرورت:

تفریح کسی مخصوص عمل یا کھیل کا نام نہیں بلکہ دل کو بہلانے والا کوئی کام یا کلام خوش کن کوئی فعل و حرکت، فرحت و نشاط پیدا کرنے والا کوئی عمل تفریح کا مصداق ہے۔

فیروز اللغات میں ہے: تفریح: دل لگی، ہوا خوری، سیر، فرحت، تفریح طبع، دل بہلاوا، خوشی (فیروز اللغات/۲۹۲)۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: "الفرح: لذة فی القلب بإدراك المحبوب" (تفسیر قرطبی ۵۳) (کسی محبوب و مرغوب چیز سے حاصل ہونے والی لذت کا نام فرحت و خوشی ہے)۔

مفتی محمود اشرف عثمانی لکھتے ہیں: "تفریح کے ٹھیک ٹھیک معنی فرحت حاصل کرنے اور جسم و روح کو فرحت پہنچانے کے ہیں" (محض ابولعب اور لغو حرکات کا نام تفریح نہیں) (تفریح کی شرعی حیثیت ۱۳)۔

تفریح کے مقاصد:

قرآن و حدیث میں تفریح طبع کے جن مقاصد کو صراحتاً یا اشارتاً ذکر کیا گیا ہے ان کا خلاصہ نمبر وار ذکر کیا جا رہا ہے، ان مقاصد کی روشنی میں تفریح کا مقام اور شریعت میں تفریح برائے تفریح کے بجائے با مقصد تفریح کا پیغام، اس کا جواز اور استحباب بھی واضح ہو جاتا ہے۔

۱- تفریح کا پہلا مقصد "راحت قلب" ہے۔ حدیث میں ہے: "روحوا القلوب ساعة فساعة" (جامع صغیر بحوالہ احکام القرآن ۱۹۵۳ للمفتی شفیع) (قلوب کو وقتاً فوقتاً راحت و فرحت پہنچاتے رہا کرو)۔

۲- تفریح کا دوسرا مقصد "دفع حرج" ہے، اگر تفریح کی اجازت بالکل منقطع ہو جائے تو بڑا حرج واقع ہو جبکہ ارشاد خداوندی ہے:

"ما جعل علیکم فی الدین من حرج" (سورہ حج) (اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کی)۔

۳- تفریح کا تیسرا مقصد "سہولت و آسانی" کا مظاہرہ کرنا ہے۔ کڑوی دوا بھی شہد کے ساتھ با آسانی پیٹ میں پہنچائی جاسکتی ہے۔ تفریح میں دشواریات کی تلقین حکماء کا شیوہ رہا ہے اللہ رب العزت بھی "یسر" کو پسند فرماتا ہے، ارشاد ہے:

"یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (البقرہ: ۱۸۵) (اللہ پاک تم پر آسانی برتنا چاہتا ہے تم پر سختی نہیں چاہتا)۔

۴- تفریح کا چوتھا مقصد "دین کو خشونت سے بچانا" ہے، جیسا کہ اس مقصد کی صراحت کرتے ہوئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشی بچوں کو اپنا کھیل جاری رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، ارشاد ہے: "خذوا یا بنی ارفدة حتی تعلم الیہود والنصارى ان فی دیننا فسحة" (بحوالہ جامع صغیر: تفریح کی حیثیت از محمود اشرف ۱۵) (اے حبشی بچو! مجھے دیکھ کر کھیل چھوڑنے کی ضرورت نہیں [کھیلو تا کہ یہود و نصاریٰ کو پتہ چل جائے کہ ہمارے دین میں وسعت ہے)۔

بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں: "الہوا والعبوا فانی اکرہ ان یری فی دینکم غلظة" (بحوالہ فیض القدر شرح الجامع الصغیر ۳۶۳، ایضاً مسند احمد ۱۱۶، کنز العمال ۱۵، ۲۱۳) (کھیلنے کودتے رہو کیونکہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تمہارے دین میں سختی نظر آئے)۔

۱۔ صدر مدرس مدرسہ مظہر العلوم بیکین منج، کانپور، یوپی۔

- ۵- تفریح کا پانچواں مقصد ”اکتاہٹ دور کرنا“ ہے، ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”القلب حمل کما تمّل الأبدان فاطلبوا لها طرائق الحکمة“ (بحوالہ احکام القرآن للشفیع ۱۹۵۳ء) (دل اسی طرح اکتانے لگتا ہے جیسے بدن تھک جاتے ہیں تو اس کے لئے حکمت کے راستے تلاش کیا کرو)۔
- ۶- تفریح کا چھٹا مقصد ”کسی مغموم دل کو خوش کرنا“ ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے کسی صحابی کو مغموم دیکھتے تو دل لگی کے ذریعہ اسے خوش فرماتے تھے، ملا علی قاری نے علامہ نووی شارح مسلم کے حوالہ سے لکھا ہے:

”فیه نذب مثل هذا، وإن الإنسان إذ رأى صاحبه حزیناً أبجدته، حتی یفحل أو یشغله ویطیب نفسه، اه. وفي آداب المریدین للسهروردی عن علیؓ أنه قال: کان النبی ﷺ یسر الرجل من أصحابه إذا راہ مغموماً بالمداعبة“ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۱، ۲۶۸، ایضاً تکملة فتح الملہم ۱۵، ۴۵)۔

(اس میں اس بات کا استحباب ہے کہ انسان جب کسی ساتھی کو مغموم پائے تو اس سے ہنسی اور تفریح کی کوئی بات کرے یا اس کو کسی کام میں مشغول کر دے اور اس کے جی کو خوش کرے۔ علامہ سہروردی نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے صحابہ میں کسی کو مغموم دیکھتے تو تفریح وغیرہ سے اس کو خوش کر دیتے)۔

۷- تفریح کا ساتواں مقصد ”چستی اور نشاط کے ساتھ باہمت و توانا رہنا“ ہے۔ حدیث میں ہے: ”مومن قوی کمزور مومن کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے“ (مشکوٰۃ)، اسی طرح ارشاد نبوی ہے کہ مسرت و خوشی اللہ کے انعامات میں سے ایک نعمت ہے، اسی لئے حکم ہے کہ جب کسی مومن کو خوش دیکھو تو اس کو یوں دعا دو ”أضحک اللہ“ (اللہ پاک تم کو ہنستا رکھے خوش و خرم رکھے)۔

۸- تفریح کا آٹھواں مقصد ”اظہار محبت“ ہے، کنز العمال میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ مرد اپنی بیوی کے ساتھ کھیلے اور اس کی وجہ سے جب مرد اپنی بیوی کو محبت سے دیکھتا ہے اور بیوی محبت سے شوہر کو دیکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں (کنز اعمال ۲۷۶/۱۶)۔

۹- تفریح کا نواں مقصد ”تنشیط اذہان“ اور ذہانت کا امتحان ہے، حدیث کی کتابوں میں بطور تفریح کے ایسے جوابات منقول ہیں جس سے انسان کی ذہانت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے، ایک شخص نے رسالت مآب ﷺ سے ایک سواری کی درخواست کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ دے سکتا ہوں، سائل نے عرض کیا کہ اونٹنی کے بچے سے بھلا کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے (ترمذی عن انس باب ماجاء فی المزاج ۲۰۱، اسی طرح ایک بوڑھی خاتون سے آپ کا یہ فرمانا کہ بوڑھی عورت جنت میں داخل نہ ہوگی، اس پر وہ بوڑھی رونے لگی آپ نے اس کی وضاحت فرمادی (ابوداؤد باب المزاج)، دراصل یہ جوابات ذہن کو ورزش کرانے میں بھی اہم رول ادا کر رہے ہیں تفریح کی تفریح ہے اور سبقت ذہنی اور سرعت انتقال ذہنی کی مشق بھی۔

۱۰- تفریح کا دسواں مقصد ”بے تکلفی اور شفقت“ کا اظہار کر کے جھجک کو دور کرنا ہے، بڑوں کا اپنا رعب ہوتا ہے، ان کی ہیبت چھوٹوں کو استفادہ میں مشکل پیدا کرتی ہے، تفریح کے ذریعہ یہ حجاب ٹوٹتا ہے اور جھجک ختم ہو کر چھوٹے بڑے باہم بے تکلف استفادہ کے لائق ہو جاتے ہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ اپنے چھوٹوں سے تفریحی جملے کہہ دیا کرتے تھے، مثلاً ایک صاحب سے آپ نے مزاحاً فرمایا: ”اے دوکانوں والے“ (ابوداؤد عن انس باب المزاج)۔

آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ میں وقتاً فوقتاً مثالیں تفریح کی ملتی ہیں اس میں یہ پہلو بھی ملحوظ نظر آتا ہے کہ صحابہ بے تکلف ہو کر اپنی بات کہہ سکیں، واللہ اعلم۔

تفریح کی حقیقت اور اس کی ضرورت نیز اس کے مقاصد بالاکالی روشنی میں تفریح کا جواز و استحباب ثابت ہوا لیکن تفریحی امور کی تفصیل اور تفریحی امور میں کون سے امور جائز اور کون نا جائز ہیں اس کی بحث انشاء اللہ آگے آ رہی ہے۔

احادیث مبارکہ میں سستی و کاہلی دور کر کے چستی و نشاط پیدا کرنے والی کچھ ایسی تفریحوں کا ذکر بالتفصیل ملتا ہے جس میں جسم قوی و مضبوط ہوتے ہیں اور اس میں جسم کی پوری ورزش کے ساتھ انسان میں مہارت، ہمت و جرأت اور بلند صلیگی جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں اور آدمی جہاد و عبادت اور خدمت خلق کے لئے تیار ہوتا ہے، مثلاً ریس (دوڑ) کا مقابلہ اور پیدل دوڑنے کی مشق اسی طرح گھوڑ سواری کی مشق، کشتی، تیراکی اور نشاندہ بازی وغیرہ ذیل میں ایسے ہی جسمانی تفریحی ورزش کو بالا اختصار ذکر کیا جا رہا ہے۔

الف- پیدل دوڑنا:..... اپنی صحت و قوت کے مطابق ہلکی یا تیز دوڑ بہترین جسمانی ورزش اور تفریح ہے جس کے فوائد محتاج بیان نہیں، ہلکی پھلکی بیماریوں سے لے کر بڑی بڑی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو پیدل تیز چلنے یا دوڑنے کا ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں گویا اس کی افادیت پر سارے اطباء متفق ہیں، اگر سنت کی نیت سے پیشگی اس کو اپنایا جائے تو ثواب بھی اور بیماری سے حفاظت بھی ہے کیونکہ صحابہ کرام کا بھی عمل دوڑنے کی مشق کا اور اس میں مقابلہ کا ملتا ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوڑ میں حضرت عائشہؓ سے [دبجوں کے لئے] مقابلہ کا ذکر احادیث میں موجود ہے، صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ میں دوڑ کا مقابلہ ہوا، حضرت زبیر آگے نکل گئے تو فرمایا: رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا، پھر کچھ عرصہ بعد دوبارہ دوڑ کا مقابلہ ہوا تو حضرت عمر فاروق آگے نکل گئے تو انہوں نے بھی وہی جملہ دہرایا "فزت ورب الکعبة" (احکام القرآن مفتی شفیع ۳/۱۹۰ رسالہ محمود عثمانی)۔

### ب- نشانہ بازی:

نشانہ بازی کی مشق خواہ وہ تیر اندازی کی شکل میں ہو یا نیزہ چلانے کی صورت میں یہ اسلام کا پسندیدہ کھیل اور بامقصد تفریح کا مصداق ہے جسے نہ صرف سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ سیکھنے کے بعد اس کی مشق جاری رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور سیکھنے کے بعد اسے بھولنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ محض کھیل اور شوقیہ تفریح نہیں بلکہ یہ جہاد میں کام آنے والی ایک قسم کی قوت ہے جس کی فراہمی کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، ارشاد ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة" (الانفال: ۶۰) (اور جہاں تک ہو سکے ان کے مقابلہ کے لئے قوت فراہم کرو)۔

اس کی وضاحت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ألا إن القوة الرمي ألا إن القوة الرمي ألا إن القوة الرمي" (مسلم، مشکوٰۃ ۲۳۶) (سنو، قوت تیر اندازی میں ہے، سنو قوت تیر اندازی میں ہے، سنو! قوت تیر اندازی میں ہے)۔

مذکورہ حدیث میں "قوت" کی تفسیر رمی سے کی ہے رمی کے معنی پھینکانا ہے اس پھینکنے کے مفہوم میں جس طرح تیر اندازی شامل ہے، اسی طرح اس لفظ میں گولی نشانہ پر پھینکنے کی مشق، راکٹ، میزائل، بم کو ٹھیک ٹھاک نشانہ تک پہنچانا بھی داخل ہے اور ان میں سے ہر ایک کی مشق جہاں جسم و اعصاب کی ریاضت ہے وہاں حسن نیت اور مقصد صحیح کے پیش نظر ہونے پر باعث اجر و ثواب بھی ہے جیسا کہ حضرت مولانا ظلیل احمد محدث سہارنپوری نے تفصیل کے ساتھ اپنی تصنیف بذل الجہود فی حل ابی داؤد (۱۱/۴۲۸) میں روشنی ڈالی ہے، البتہ بے مقصد کنکریوں یا غلیل وغیرہ کی نشانہ بازی محض فضول حرکت ہے جس کا کوئی صحیح مقصد نہیں ہوتا، اسی طرح نشانہ بازی میں پالتو جانوروں وغیرہ کو نشانہ بنانے یا مادہ کسی ذی روح کو ہدف بنانے سے سختی سے روکا گیا ہے یہ تفریح نہیں بلکہ ضیاع مال اور ایذاء محض ہے اور خواہ مخواہ جان کو ضائع کرنا یا اس کو تکلیف پہنچانا ہے، حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ کنکریوں سے نشانہ لگا رہا ہے، آپ نے فرمایا کہ کنکر بازی نہ کرو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں پھینکنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا ہے نہ دشمن زخمی ہو سکتا ہے، ہاں یہ کنکریاں کسی کادانت توڑتی ہیں اور کسی کی آنکھ پھوڑتی ہیں (متفق علیہ مشکوٰۃ ۳۰۵)۔

### ج- گھوڑ سواری وغیرہ:

گھوڑ دوڑ یا اس کی سواری کی مشق اسی طرح ہر وہ سواری جو جہاد وغیرہ کسی مقصد میں کام آئے اس کا سیکھنا سکھانا ایک طرف جسمانی ورزش اور تفریح بھی ہے دوسری طرف ٹریننگ اور تربیت بھی، اگرچہ قرآن وحدیث میں باہموم گھوڑوں کا ذکر آیا ہے اس کی خصوصیت کی وجہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں یہ لکھی ہے:

"سامان جنگ میں سے خصوصیت کے ساتھ گھوڑوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ اس زمانہ میں کسی ملک و قوم کو فتح کرنے میں سب سے زیادہ موثر و مفید گھوڑے ہی تھے اور آج بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو گھوڑوں کے بغیر فتح نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھ دی ہے" (تفسیر معارف القرآن ۴/۲۷۲)۔

لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا احادیث میں سواری کی مشق کے فضائل گھوڑوں تک محدود نظر آتے ہیں مگر گھوڑ سواری کی فضیلت کی جو علت ہے وہ گھوڑے پر ہی موقوف نہیں ہے، اس لئے علت کے اشتراک سے حکم دوسری سواریوں کو بھی شامل ہوگا یعنی جس طرح گھوڑ سواری کے فضائل ہیں اسی طرح ہر وہ سواری جو جہاد کے کام آتی ہو یا آسکتی ہو اگر اسے بہ نیت جہاد چلانے کی مشق کی جائے تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوگی جیسے بمبار اور لڑاکا طیارے، بمبلی کا پٹر، آبدوز، بحری جہاز، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، جیپ کار، موٹر سائیکل، سائیکل وغیرہ ان سب سواریوں کی مشق اور ٹریننگ اسلامی نقطہ نظر سے اسلام کے پسندیدہ کھیل اور بامقصد جسمانی

ورزش شمار ہوگی جبکہ جائز اور نیک مقاصد کے تحت ان کو سیکھا اور استعمال کیا جائے۔ حدیث میں ہے: "ارمو او ار کبوا" (مسلم) (تیر چلاؤ اور سواری کرو)۔

ایک حدیث میں ہے: "قال رسول اللہ ﷺ: من خیر معاش الناس لہم رجل ممسک عنان فرسہ فی سبیل اللہ یطیر علی متنہ کلما سمع ہیعة أو فزعة طار علیہ یبتغی القتل والموت مظانہ" (مشکوٰۃ: کتاب الجہاد فی سبیل اللہ، ۳۲۹)۔

(لوگوں کی زندگیوں میں بہترین زندگی اس آدمی کی ہے جس نے اپنے گھوڑے کی لگام اللہ کے راستہ میں تھام رکھی ہو، اس کی پشت پر اڑا جا رہا ہو جب کبھی کوئی چیخ یا دہشت کی آواز سنے اڑ کر وہاں پہنچتا ہو اور قتل اور موت کی جگہوں میں موت کو تلاش کر رہا ہو)۔

اس حدیث کی مقصدیت کو ذہن میں رکھنے کے بعد آسانی اس فضیلت کا دیگر معروف سوار یوں کے ضمن میں متحقق ہونا واضح ہو جاتا ہے، اس لئے سبھی سوار یوں کی ٹریننگ خواہ وہ بطور تفریح کے ہو خالی از فائدہ نہیں۔

## د۔ تیراکی کی مشق:

ایک مسلم نوجوان کے لئے تیراکی جہاں تفریح و طبع اور جسمانی ورزش کا عمدہ ذریعہ ہے وہاں یہ کھیل بوقت ضرورت اپنی اور دوسروں کی جان بچانے اور جہاد کی بہترین تیاری بھی ہے، حدیث میں اس کی ترغیب دی گئی ہے، ارشاد نبوی ہے:

"مومن کا بہترین کھیل تیراکی ہے اور عورت کا بہترین کھیل سوت کا تپا ہے" (بخاری کنز العمال ۱۵/۱۱۱، تفریح کی شرعی حیثیت ۳۰)۔

صحابہ کرام میں تیراکی کے مقابلہ بھی ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم حالت احرام میں تھے کہ مجھے عمر فاروقؓ کہنے لگے آؤ، میں تمہارے ساتھ غوطہ لگانے کا مقابلہ کروں، دیکھیں ہم میں سے کس کا سانس لمبا ہے (عوارف المعارف للسیر دردی ۱۳۲، بیروت از رسالہ عثمانی ۳۰)۔

## ہ۔ کشتی لڑنا یا کھیلنا:

"مصارع" یعنی باہم پچھڑانے کے لئے کھیل اور کشتی لڑنا بھی اسلام میں ایک با مقصد تفریح ہے جس کی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے، حدیث میں حضرت رکانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ زبردست پہلوان تھے ان سے کوئی جیت نہیں پاتا تھا، انہوں نے آپ ﷺ کو بھی "بل من مبارز" کی دعوت دے ڈالی، آپ ﷺ نے مقابلہ کی دعوت قبول فرمائی، کشتی ہوئی اور آپ جیت گئے، رکانہ کی یہی شکست حضرت رکانہ کے قبول اسلام کا سبب بن گئی (نیل الاوطار ۸/۱۹۲ از قاموس الفقہ ۴/۵۸۸)۔

مگر کشتی سے مراد یہاں صرف وہ کشتی ہے جس میں فریق مخالف کوزمین پر گرا دیا جائے اسے چت کر دیا جائے وہ فری اسٹائل کشتی مراد نہیں جس کا آج کل رواج ہے اور جس میں فریق مخالف پر آزادانہ تکلیف دہ وار کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ شدید جسمانی نقصان پہنچایا جاتا ہے، اخلاقی اور انسانی حدود سے متجاوز ایسی کشتی اور لڑائی کی مشق بالکل جائز نہیں، موجودہ زمانہ میں جوڈو کرائے بھی کشتی کے حکم میں ہے، کیونکہ اس کا مقصد بھی جسمانی ورزش اور مدافعتی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے، البتہ کرائے کا ایسا مقابلہ جائز نہیں جس میں دوسرے فریق کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے کی اجازت ہو (قاموس الفقہ ۴/۵۸۸)۔

غرضیکہ کشتی کے بھی اپنے حدود ہیں نیت کی درستگی اور طریقہ کار کی تصحیح کی اس میں بھی ضرورت ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

"مصارع" یعنی کشتی لڑنا جبکہ جہاد کی نیت سے ہو تو جائز ہے۔ بخاری مصارع رکانہ، اور ہمارے زمانہ میں جو اباش لوگ اکھاڑہ وغیرہ لڑتے ہیں اور بے ستر حرکات مکروہ کرتے ہیں اور اس سے (محض) تن پروری مقصود ہے، بدون سامان جہاد کے تو یہ مکروہ تحریمی ہے (میں البدایہ ۳/۵۸۳ کتاب الکرامیہ)۔

مذکورہ تفریحی امور کو مشغلہ بنانے کے حدود:

خیر القرون میں راج قلب و دماغ کو فرحت بخشنے والی تفریحیات اور جسم کو قوت و صحت فراہم کرنے والے کھیل اور دفاع میں معاون تفریحی ورزش جن کا ذکر اوپر گذرا اس سے ان تفریحی امور کا جواز بلکہ استحباب ثابت ہوا (بلکہ بعض حالات میں وجوب کہنا بھی سچا ہوگا جبکہ یہ کسی واجب و فرض کا مقوف علیہ ہو جائے) کہ ان چیزوں کے لئے انسان کچھ وقت نکالے لیکن شرط ان سب چیزوں میں جواز کی یہ ہے کہ نیت ان مقاصد صحیح کی ہو جو ان کھیلوں میں پائے جاتے ہیں کھیل برائے کھیل مقصد نہ ہو، اور وہ بھی بقدر ضرورت ہو، اس میں توسع اور غلو نہ ہو کہ انہی کو مشغلہ بنا لیا جائے اور ضروری کاموں میں ان سے حرج پڑنے لگے تو ایسے کھیل

وتفریح شرعاً مباح اور دینی ضرورت کی نیت سے ہوں تو ثواب واجز کا ذریعہ ہیں۔ اور اگر ان چیزوں میں ایسی مشغولیت ہو جائے کہ آدمی کو ضروری کام یہاں تک کہ نماز اور دوسری عبادت سے بھی غافل کر دے تو یہی امور ناجائز اور گناہ کا ذریعہ بن جائیں گے۔

علامہ ابن حجرؒ نے امام بخاری کے قائم کردہ باب ”کل لہو باطل إذا شغلہ عن طاعة اللہ“ کے تحت لکھا ہے:

”سواء كان ما ذوناً في فعله أو منهيّاً عنه كمن اشتغل بصلاة نافلة أو بتلاوة أو ذكر أو تفكير في معاني القرآن مثلاً حتى خرج وقت الصلاة المفروضة عمداً فإنه يدخل تحت هذا الضابط وإذا كان هذا في الأشياء المرغوب فيها المطلوب فعلها فكيف حال ما دونها“ (فتح الباری کتاب الاستیذان ۱۱۰۹)۔

(کوئی شخص کسی بھی چیز میں ایسی مشغولیت اختیار کرے جس سے فرائض سے غفلت ہو جائے خواہ وہ چیز شرعاً جائز ہو یا ناجائز مثلاً کوئی شخص عمداً نفل نماز، تلاوت قرآن، ذکر اللہ یا معانی قرآن میں غور و فکر کے اندر اس طرح مشغول رہا کہ فرض نماز کا وقت جا تارہا تو وہ بھی اس ضابطہ کے تحت داخل ہے، جب نقلی عبادت کا یہ حال ہے جن کے فضائل داروہیں اور جو شرعاً مطلوب ہیں تو پھر اس سے کم درجہ کی اشیاء کا کیا حکم ہوگا؟)۔

یعنی جب جائز اشیاء، حقوق و فرائض کی ادائیگی سے غفلت میں ڈالیں تو وہ بدرجہ اولیٰ حد جواز سے حد کراہت و حرمت میں داخل ہو جائیں گی۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ”کھیل کے جواز کے لئے تین شرطیں ہیں: ایک یہ کہ کھیل سے مقصود محض ورزش یا تفریح ہو، خود اس کو مستقل مقصد نہ بنالیا جائے، دوم یہ کہ یہ کھیل بذات خود جائز بھی ہو، اس کھیل میں کوئی ناجائز بات نہ پائی جائے، سوم یہ کہ اس سے شرعی فرائض میں کوتاہی یا غفلت پیدا نہ ہو“ (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳۳۰/۷)۔

ناجائز تفریحات:

خیر القرون میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں جس طرح تفریحی امور کا ذکر ملتا ہے جس کو ہم ”تفریح طبع کی پسندیدہ صورتوں“ کے ضمن میں ذکر کر آئے ہیں، اسی طرح بعض تفریحی امور کی ممانعت اور اس کی شاعت کی صراحت بھی کتب حدیث میں دیکھنے کو ملتی ہے، ذیل میں ایسے ہی ”تفریح کی ممنوع صورتوں“ کا ذکر بالا اختصار کیا جاتا ہے تاکہ جائز و ناجائز تفریحات کی تفصیل معلوم ہونے کے بعد غیر مخصوص تفریحات کا حکم پہچاننے میں دشواری نہ رہے۔

۱- شطرنج: حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اسے کھیلنے سے صراحتاً منع فرمایا ہے، ایک حدیث میں ہے: ”ملعون من لعب بالشطرنج والناظر إليها كآكل لحم الخنزير“ (کنز العمال حدیث: ۳۰۶۳۶) (شطرنج کھیلنے والا ملعون ہے اور جو اس کی طرف دیکھے اس کی مثال خنزیر کھانے والے جیسی ہے)۔

۲- زرد شیر (چوسر) اس کی بھی حدیث میں صراحتاً ممانعت ہے۔ ”عن أبي موسى الأشعري أن رسول الله ﷺ قال: من لعب بالنرد فقد عصى الله ورسوله“ (ابوداؤد: مشکوٰۃ؛ کتاب اللباس: ۳۸۶) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ”زرد شیر“ کھیلا اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی)۔

۳- کبوتر بازی: اپنے یا بچوں کی انسیت کے لئے کبوتر یا دیگر پرندے پال لینا تو شرعاً جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ پنجرہ آرام دہ اور کشادہ ہو اور ان کے دانے پانی کا خیال رکھا جائے لیکن چھتوں پر چڑھ کر جو کبوتر اڑانے کے مقابلے ہوتے ہیں اور کبوتر بازی کے شوقین گھنٹوں ان کا مشغلہ رکھتے ہیں تو یہ کوئی جائز تفریح نہ ہوئی، احادیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ ”عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ رأى رجلاً يتبع حمامة فقال شيطان: يتبع شيطانة“ (رواه احمد و ابوداؤد وابن ماجه والبيهقي في شعب الایمان، مشکوٰۃ: ۲۸۶ کتاب اللباس والتساویر) (حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک کبوتر کے پیچھے دوڑا جا رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شیطان دوسرے شیطان کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے)۔

۴- پرندوں یا درندوں کو لڑانا: دیہات و قصبات میں اب باضابطہ فیہن بن گیا ہے کہ جانوروں کو آپس میں لڑاتے اور خود تفریح کرتے ہیں، کبھی مرغ کبھی شیر، کبھی اور دوسرے جانوروں کے لڑانے کا بھی رواج ہے یہ لڑانا شرعاً ناجائز ہے، دیگر مفاسد نہ بھی ہوں تب بھی صرف یہ جانوروں کو لڑانا ہی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے

صریح حکم کے خلاف ہے۔

ترمذی والبوداؤد کی حدیث ہے: ”فھی رسول اللہ ﷺ عن التحریش بین البہائم“ (مشکوٰۃ ۲۵۹) (رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو لڑانے سے منع فرمایا ہے)۔

۵- گانا سنانا، رقص و موسیقی: وقتی تفریح کے لئے اچھے اشعار کا پڑھنا، سنانا، سنانا، سنانا صرف جائز بلکہ حضرات صحابہ اور سلف صالحین سے مروی ہے جیسا کہ ”تفریح طبع کی پسندیدہ صورتوں“ کے بیان میں گذر چکا مگر گانا بجانا جس میں آلات موسیقی استعمال کئے جائیں یا نامحرم عورت کی آواز ہونے پر صرف حرام ہے بلکہ حضور اقدس ﷺ کی بعثت کے مقصد کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مؤمنین کے لئے ہدایت اور رحمت بنا کر بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں باجوں اور تانتوں کو مٹاؤں اور صلیب اور جاہلیت کی رسوم کو ختم کروں (ابوداؤد طیالسی بحوالہ احکام القرآن از مفتی شفیع ۲۰۸/۳)۔

۶- تصویر کشی اور فوٹو گرافی کا شوق: تصویروں کا موجودہ سیلاب بلکہ طوفان، مغربی و نصرانی تہذیب کا نتیجہ ہے، تمام مذاہب میں صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے تصویر سازی اور بت تراشی کو بدترین گناہ قرار دیا ہے، اور ایسے لوگوں کو ملعون قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہی چیزیں بت پرستی اور شخصیت پرستی کا زینہ ہیں اور اسلام مسلمانوں کو نہ صرف بت پرستی سے بلکہ اس کے اسباب و ذرائع سے بھی باز رکھنا چاہتا ہے۔

”عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما قال: سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: أشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون“ (متفق علیہ؛ مشکوٰۃ ۲۸۵) (عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ عذاب دیئے جانے والے لوگ تصویریں بنانے والے ہیں)۔

باقی یہ بحث کہ تصویر سازی کے زمرہ میں کیمرہ کی تصویر، فوٹو وغیرہ آتے ہیں یا نہیں؟ یہ ایک مستقل بحث ہے برقیاتی تصویریں، اسکرین پر رونما تصویریں یا تصویر کھلونے وغیرہ اس پر مفصل کلام کی ضرورت ہے اپنے اکابرین میں مفتی محمد شفیع صاحب نے اس موضوع پر مفصل رسالہ ”تصویر کے شرعی احکام“ میں اس موضوع پر احادیث اور شرعی احکام، ان پر شبہات اور ان کے جوابات جمع کر دیئے ہیں، من شاء فلیطالع۔

مندرجہ بالا اصولی گفتگو کے بعد اسی کی روشنی میں سوال نامہ میں اٹھائے گئے نکات پر بحث شروع کرتے ہیں:

۱- مزاحیہ امور اور ان کے شرعی احکام:

الف- مزاح (مذاق) اور اس کے حدود:

مزاح کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، یہ نہ سب جائز ہیں نہ ہی سب ناجائز، اس لئے جہاں سیرت نبوی میں مزاح و ظرافت کی مثالیں ملتی ہیں وہیں ہنسائے کی خاطر جھوٹی باتیں گڑھنے پر وعیدیں بھی ملتی ہیں جہاں ”روحوا القلوب سلمۃ فلسفۃ“ کا حکم ہے، وہیں ”لائمازح“ (ترمذی) کے ذریعہ بھی موجود ہے۔

عین الہدایہ میں ہے: مزاح، دل لگی، یعنی ایسا کلمہ جس سے طبیعت کو ظرافت و خوشی ہو تو مزاح میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ ایسا کلام نہ بولے جس سے آدمی گنہگار ہوتا ہے یا یہ قصد نہ ہو کہ ساتھیوں کو ہنساوے (ظہیر یہ)، اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ آدمی زبان سے ایسا کلمہ بول جاتا ہے جس کی جانب بے پرواہی کی وجہ سے توجہ نہیں ہوتی، حالانکہ وہ اس کے عوض چالیس برس کی دوری تک جہنم میں گرتا چلا جاتا ہے، پھر آنحضرت ﷺ مزاح فرماتے تھے، اور فرمایا کہ میں سوائے سچ کے نہیں بولتا ہوں ”لا أقول إلا حقاً“ (ترمذی فی الشمائل عن ابی ہریرہ ۱۶)، اور حضرت انسؓ اس وقت کم عمر اور آپ کے خادم تھے ایک روز آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ”یا ذا الأذنین“ (ابوداؤد عن انس باب المزاح ۲۰۶۸۳) (اے دوکان والے)۔

اور ایک مرتبہ حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کو جو صغیر بچہ تھا فرمایا کہ یا ابا عمیر ما فعل النخیر (اے ابو عمیر تیرا لال کیا ہوا) اس بچہ کا نام دوسرا تھا مگر اپنی طرف سے ابو عمیر سے اس کی کنیت فرمائی حالانکہ وہ ابھی عمیر کا باپ ہونے کے لائق نہ تھا، اس سے معلوم ہوا کہ بچہ کی کنیت جائز ہے اور معلوم ہوا کہ بچوں کو لال وغیرہ چیزوں کی اجازت ہے اور ایک مرتبہ ایک بڑھیا کو فرمایا کہ جنت میں بڑھیا نہ ہوگی، جب وہ گھبرائی تو تنبیہ کی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا ہے کہ ہم ان کو باکرہ کر کے داخل جنت کریں گے (مشکوٰۃ عن انس باب المزاح ۳۱۶، عین الہدایہ ۴، ۳۱۸، کتاب الکراہیہ)۔

ملا علی قاری نے مزاح کے حدود و شرائط کے سلسلہ میں لکھا ہے:



”قال النووي: اعلم أن المزاح المنهي عنه هو الذي فيه إفراط ويداول عليه فإنه يورث الضحك وقسوة القلب ويشغل عن ذكر الله والفكر في مهمات الدين ويؤل في كثير من الأوقات إلى الإيذاء ويورث الأحقاد ويسقط المهابة والوقار فأما ما سلم من هذه الأمور فهو البباح الذي كان رسول الله ﷺ يفعل على الندرة لمصلحة تطيب نفس المخاطب وموانسته وهو سنة مستحبة فاعلم هذا فإنه مما يعظم الاحتياج إليه“ (مرقاۃ ۳۰۶۳۸ مطبوعه بمبئی)۔

(وہ مزاح جس سے منع کیا گیا ہے ایسا مزاح ہے جس میں افراط ہو اور کثرت دوام ہو، اس کی وجہ سے کثرت سے ہنسی آئے، قلب میں سختی پیدا ہو، اللہ کی یاد اور دین کی اہم باتوں میں فکر ہٹ کر غفلت کا سبب بن جائے، بسا اوقات یہ مزاح ایذا اور حسد کا باعث ہو جاتا ہے اور رعب و وقار کو ختم کر دیتا ہے، بہر حال ایسا مزاح جو ان مفاسد سے خالی ہو وہ مباح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے اور مقصود مخاطب کی تالیف اور ان سے انس کا اظہار ہوا کرتا تھا جو کہ محبوب سنت ہے۔ مزاح کے سلسلہ میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے کیونکہ اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے)۔

علامہ یوسف القرضاوی کی ”الحلال والحرام فی الاسلام“ میں ہے: ”ہنسی مذاق کی باتیں کرنے میں جس میں انبساط کی کیفیت پیدا ہو کوئی حرج نہیں ہے اور نہ اس بات میں کوئی حرج ہے کہ مباح کھیل کے ذریعہ اپنے دل کو اور اپنے ساتھیوں کے دل بہلانے کا سامان کیا جائے بشرطیکہ اس کو مستقل عادت نہ بنا لیا جائے کہ صبح و شام کا مشغلہ یہی بن کر رہ جائے اور جس کے نتیجے میں آدمی اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے لگے، نیز جہاں سنجیدگی اختیار کرنے کی ضرورت ہو وہاں ہنسی مذاق کرنے لگے، اسی لئے کسی نے کہا ہے: ”بات چیت میں مذاق اسی قدر ہونا چاہئے جس قدر کہ کھانے میں نمک“۔

اسی طرح مسلمان کا یہ کام بھی نہیں کہ وہ لوگوں کی عزت اور ان کی قدر و منزلت کا خیال نہ کرے اور ان کا مذاق اڑانے لگے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسی أن یکونوا خیراً منهم“ (الحجرات: ۱۱) (اے ایمان والو! لوگ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں)۔

اور نہ یہ بات روا ہے کہ وہ لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹ سے کام لے، اس سے بچنے کی ہدایت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

”ویل للذی یحدث بالحديث لیضحک منه القوم فیکذب ویل له ویل له“ (ترمذی، حلال و حرام اردو ترجمہ مطبوعہ بمبئی ۳۷۰) (تباہی ہے اس شخص کے لئے جو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹی باتیں کرتا ہے، اس کے لئے تباہی ہے، اس کے لئے تباہی ہے)۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں مزاح اور ہنسی مذاق کے حوالہ سے مندرجہ ذیل اصول و قواعد ثابت ہوئے:

- ۱- مزاح اپنے حدود کے اندر جائز ہے، البتہ استہزاء و تمسخر بہر حال میں ناجائز ہے۔
- ۲- گناہ کی بات یا غیبت یا کوئی خلاف حق بات کہنا مزاح بھی جائز نہیں۔
- ۳- ہنسانے کی خاطر جھوٹی باتیں گھڑنا اور مزاحاً من گھڑت باتیں بولنا بھی جائز نہیں۔
- ۴- ایسا مزاح جو کسی کی ایذا کا سبب ہو اور کسی تکلیف کا باعث ہو جائز نہیں۔
- ۵- مزاح میں افراط اور غلو جس سے آدمی کا وقار جاتا رہے جائز نہیں۔
- ۶- مزاح میں اٹہناک اور اس کو وقت گزاری کا مشغلہ بنانا جس سے اصل مقاصد دینیہ یا دنیویہ میں غفلت پیدا ہو جائز نہیں۔
- ۷- جو مزاح مذکورہ خرابیوں سے خالی ہو وہ مباح ہے۔
- ۸- مباح ہنسی مذاق کو اگر دوسرے کی دلجوئی یا کسی حسن نیت سے اختیار کرے تو مستحب ہے۔

ب- مزاحیہ مشاعرہ یا دیگر مزاحیہ پروگراموں کا انعقاد:

مزاح کے جواز اور اس کے حدود و قیود کی جو بحث ابھی گذری اس کے پیش نظر مروجہ مزاحیہ محفلوں کے انعقاد یا مزاحیہ مشاعروں کی مجلسوں کا حکم بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس طرح کے پروگرام شرعاً کم از کم مکروہ قرار دیئے جانے کے لائق ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آج کل جو قسم قسم کی تفریحات کا رواج بڑھ رہا ہے اور ہنسی

مذاق کے پروگرام طرح طرح کے عام ہو رہے ہیں، یہ معاشرہ کو تن آسانی اور عیاشی کی طرف لے جا رہے ہیں، خرافات کی طرف ذہنوں کا میلان اور اصل مقاصد دینیہ و دنیویہ سے مجرمانہ غفلت کا سبب بن رہے ہیں، نوجوان بہک رہے ہیں سخی جذبات بھڑک رہے ہیں، مرد و چہ مزاحیہ مشاعرے ہوں یا دیگر مزاحیہ محفلیں اس میں مندرجہ ذیل خرابیاں و مناسد عموماً پائے جاتے ہیں:

- ۱- ہنسی مذاق ہی مقصود ہوتا ہے اور کوئی جائز مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔
- ۲- مزاح میں گھنٹوں وقت کا ضیاع ہوتا ہے جو کہ زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔
- ۳- دیر تک مزاح کو مشغلہ بنانے کے سبب قلوب میں قسادت و غفلت پیدا ہوتی ہے۔
- ۴- عموماً یہ پروگرام اہل باطل اور غفلت شعار لوگوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، لہذا ان میں شرکت اہل باطل کی تقویت و تائید کا سبب ہوتی ہے۔
- ۵- دین و دنیا کے امور میں کوتاہی کا سبب ہوتے ہیں اس کے علاوہ خود ایسے پروگرام لالچینی اور عبت باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔
- ۶- معاشرہ میں مزاحیہ باتوں کا چلن ہو جاتا ہے، اوباش قسم کے لوگوں کی نقالی اور ان کی باتیں عام ہونے لگتی ہیں جس کی وجہ سے ذہنوں میں بری چیزوں کی برائی باقی نہیں رہتی۔

عین الہدایہ میں ہے: ”حرام خبیث میں سے وہ مال ہے جو شاعر اپنی شعر گوئی پر لیتا ہے اور مسخرہ گو اپنے تمسخر پر لیتا ہے (جیسے بھانڈ) اور وہ لوگ جو رستم و اسفندیار وغیرہ کے قصص بیان کر کے لیتے ہیں“ (عین الہدایہ ۲۳۶، ۲۳۷ کتاب الکراہیہ)۔

البتہ اگر جائز اشعار کی کوئی مجلس ہو اور سننے و سنانے والے لوگ بھی معتبر ہوں اور کوئی شرعی مفسدہ بھی نہ ہو تو ایسے مشاعرہ کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ ہم مختلف احادیث سے شعر و شاعری کے ذریعہ تفریح طبع حاصل کرنا اور اشعار سے لطف اندوز ہونا ”جائز تفریحات“ کے ذیل میں ثابت کر آئے ہیں، لیکن یہاں بحث طنز و مزاح اور تمسخر و ہنسی مذاق پر مشتمل گھنٹوں چلنے والے پروگرام کی ہے تو شرعاً اس قسم کے پروگرام کراہت در کراہت سے خالی نہیں۔

ج- تفریحی چٹکلوں اور مزاحیہ کہانیوں کا لکھنا پڑھنا اور ان کی اشاعت و خرید و فروخت:

تفریح اور ہنسی و مذاق جس طرح زبان سے کیا جاتا ہے اسی طرح تحریر اور خط و کتابت اور آج کل ایس ایم ایس اور ای میل وغیرہ کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، لیکن اصول تو ایک ہی ہے، لہذا زبانی تفریح کے جو حدود و قیود اور پر گزدرے وہی حدود و قیود دیگر مزاح کے طریقوں کے ہوں گے، الکتابۃ کا مخاطبہ مسلمانوں کے لیے ہے، لہذا خطابت اور زبانی مزاحیہ گفتگو کا جو حکم تھا وہی کتابت اور تحریری چیزوں کے مزاح کا حکم ہوگا۔

آج کل مزاحیہ چٹکلوں اور ایس ایم ایس کے ذریعہ تفریح کے مضامین اور تفریحی قصے کہانیوں پر مشتمل کتابوں کا چلن ہے لیکن ہمیں ان چیزوں کو برتنے سے پہلے ان چیزوں سے ہنسی مذاق کا جواز سمجھ لینا چاہئے، مثلاً وہ مزاحیہ کہانیاں محض جھوٹی اور بنا دی نہ ہوں، اس لئے کہ حدیث میں اس پر وعید آئی ہے۔

”ورد عنه ﷺ أنه قال: ویل لمن کذب لیضحک به القوم، ویل لمن کذب لیضحک به القوم، ویل له ویل له“ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۳۱، ۳۲ مبنی) (نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے شخص کے لئے بڑی ہلاکت ہے جو لوگوں کو ہنساتے کے لئے جھوٹ بولے اس کے لئے ہلاکت ہی ہلاکت ہے)۔

اس طرح مزاحیہ کہانیوں میں کسی شخص یا قوم کی تضحیک نہ ہو کہ وہ بھی حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ”لا یسخر قوم من قوم عسی أن یکونوا خیراً منهم الخ“ (الحجرات: ۱۱) (کوئی کسی پر نہ ہنسنے ممکن ہے کہ وہ ہنسنے والے سے بہتر ہو)۔

نیز دیگر مفاسد سے بھی وہ مزاحیہ چیزیں خالی ہوں تو مضائقہ نہیں۔

بہر حال مزاحیہ لٹریچر جو حقائق سے لبریز ہو محض انداز کلام مزاحیہ اور تفریح آمیز ہو اس کی تو گنجائش ہوگی یا تو یہ پودہ چٹکلوں اور شرمناک مسخرہ پن کی کتابیں کہانیاں تیار کرنا اشاعت فاحشہ کے حکم میں ہو کر ناجائز ہوگا۔

جائز تفریح اور دلچسپی کے لئے لطائف و ظرائف پر مشتمل قصے کہانیوں کا تحریری مواد اکابر کے کتب خانوں میں ملتا ہے، مثلاً علامہ جوزی کی کتاب الحجۃ،

کتاب الجلاء، کتاب لادکیاء، حضرت تھانوی کی لطائف و ظرائف وغیرہ۔

پھر جس چیز کا لکھنا پڑھنا بولنا جائز ہوگا اس کو شائع کرنا پھر اس کی خرید و فروخت کرنا بھی جائز ہوگا، یعنی اشاعت اور خرید و فروخت کا مسئلہ مزاحیہ کہانیوں کی صحت و فساد اور ان کے جواز و عدم جواز پر موقوف ہے، صحیح چیز کی اشاعت اور ان کا کاروبار درست ہے اور غلط لٹریچر کی اشاعت اور کاروبار ممنوع ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے لکھا ہے:

”لطیفہ گوئی اور طنزیات میں زبان کو ذریعہ بنایا جائے یا قلم کو ان ہی اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے، اور ہاں ایسا مزاح جو تعمیری مقصد کے لئے نہ ہو بلکہ وقتی تفریح کے لئے، کو مستقل مشغلہ بھی نہ بنانا چاہئے، نیز لطیفہ گوئی کو ذریعہ معاش بنانا اور اس کی اجرت وصول کرنا فقہاء کی نگاہ میں مکروہ اور ارشاد خداوندی ”من یشتری لہو الحدیث“ کا مصداق ہے (در مختار رد المحتار ۵، ۲۷۲، جلال و حرام ۲۳۹)۔

بہر حال جس طرح اہل بدعت کی کتب اور مخرب اخلاق لٹریچر کا بیچنا خریدنا جائز نہیں، اسی طرح مزاحیہ کہانیوں میں سے جو حد جواز میں نہ ہوں ان کا خریدنا بیچنا بھی مکروہ ہے، باقی فقہاء نے محض کرایہ پر کتابوں کے لین دین کو مطلقاً منع کیا ہے، خواہ وہ کتابیں کسی ہی ہوں، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”ولو استأجر كتباً ليقراً فيها شعراً كان أو فقهاً أو غير ذلك لا يجوز له وإن قرأ“ (عالمگیریہ؛ کتاب الاجارۃ الباب الخامس عشر) (اگر کتابیں پڑھنے کے لئے کرایہ پر لی خواہ وہ کتابیں شاعری کی ہوں یا مسائل کی یا اس کے علاوہ تو ان کتابوں کا اجرت پر لینا دینا جائز نہیں خواہ کتاب کو لے کر پڑھ لیا ہو)۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کا پیشہ اور اس کی اجرت کا حکم:

عصر حاضر میں بہت سی وہ خرافات، آرٹ اور فنکاری شمار ہونے لگی ہیں جنہیں خیر القرون میں عبث اور لایعنی مکروہ مشغلہ سمجھا جاتا تھا انہیں میں مزاح و تمسخر کافن بھی ہے، موجودہ دور میں لطیفہ گو اور مزاح نویس بہت مقبول شخصیات شمار ہوتی ہیں، پاکستان کے عمر شریف اور انڈیا کے رمپت حرامی جیسے مسخرہ لوگوں کی دھوم ہے، لیکن یہ سب مقصد حیات سے غفلت اور اپنی عمر شریف کو بیہودہ مشغلوں میں برباد کر کے وقت عزیز کو لوہو و لجب میں جھونک دینا ہے، حدیث پاک میں مضحکہ خیزی کی خاطر سخن پروری پر تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

”إن العبد ليقول الكلمة لا يقولها إلا ليضحك به الناس يهوى بها العبد مما بين السماء والأرض وإنه ليزل عن لسانه أشد مما يزل عن قدمه“ (رواه البيهقي في شعب الایمان؛ مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ۲۳۱۳ بیہقی)۔

(جو شخص کوئی کلمہ (بات) اس لئے بولے تاکہ بس اس کی بات پر لوگ ہنس پڑیں، تو اس بیہودہ بول کی وجہ سے وہ بندہ زمین و آسمان سے دور پھینک دیا جاتا ہے اور انسان اپنی زبان سے اتنی لغزش کھاتا ہے جتنا اپنے قدم سے نہیں پھسلتا [قدم سے زیادہ زبان سے پھسل جاتا ہے]۔)

اور جب لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی مکروہ ہے تو اس کا پیشہ اختیار کرنا اور اس کی اجرت وصول کرنا بھی مکروہ ہوگا۔

ہ۔ مزاحیہ ڈرامے اسٹیج کرنا اور ان میں شرکت کرنا:

مزاح و تمسخر کے لئے ڈراموں کے پروگرام کا مسئلہ ”مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعروں کے انعقاد“ کے تحت گذر چکا ہے۔ راموں کی صورت حال اسی کے قریب قریب ہے، البتہ اگر شرعی حدود کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے حقائق کو تفریحی انداز میں اس طرح پیش کیا جائے جس میں باطل کی تضحیک ہو اور اس میں عبرت کا پہلو نمایاں ہو تو ”الأمور بمقاصدها“ کے تحت اس کی گنجائش ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ نایاب شکل ہے، مروجا اسٹیج ڈراموں کی صورت حال بڑی شرمناک اور خطرناک ہے، مولانا محمود اشرف عثمانی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ فلم کے تمام مناظر ابتداء سے لے کر انتہا تک طرح طرح کے کبیرہ گناہوں سے پُر ہوتے ہیں، ڈرامہ اور فلم میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں کہ فلم میں تصویر ہوتی ہے جبکہ ڈرامہ جیتے جاگتے انسانوں کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے ڈرامہ میں تصویر کشی کا گناہ نہیں ہے، البتہ باقی وہ سب گناہ پائے جاتے ہیں جو اوپر ذکر کئے گئے ہیں“ (۷۳)۔

مولانا یوسف لدھیانوی شہید کی مشہور کتاب ”آپ کے مسائل اور ان کا حل“ میں ”ورائٹی شو، اسٹیج ڈرامے وغیرہ میں کام کرنا اور دیکھنا“ کے عنوان کے تحت

جواب تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گناہ کے کام میں شرکت کرنے والے بھی گناہ گار ہیں، گودرجات کا فرق ہو اور غلط کام سے روزی کمانا بھی غلط ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱/۳۳۱)۔  
الغرض مزاحیہ ڈراموں کا لکھنا، اسٹیج کرنا، ان کو دیکھنا طرح طرح کے مفاسد کا پیش خیمہ ہے، تزیین اوقات اور لالیعنی امور میں اشتغال کا سبب ہے، لہذا اس قسم کے ڈراموں میں کسی طرح سے شمولیت کراہت سے خالی نہیں جس درجہ اس میں ملوث ہوں گے اسی قدر اس کی کراہت اشد ہوگی، فقط۔  
و۔ بہ تکلف قہقہہ لگانے اور زیادہ ہنسنے ہنسانے کے لئے پروگرام:

آج کل اطمینانِ قلب کا فقدان ہے، اور اطمینانِ قلب کا جو حقیقی سامان ہے ”الابذ کر اللہ تطمئن القلوب“ اس کی طرف نہ دھیان ہے، نہ ایمان و ایقان جس کا نتیجہ یہ ہے ٹینشن، ڈپریشن، جیسے امراض سے انسان ہے بے انتہا پریشان، آخرت کی فکر کو چھوڑنے کی بنا پر ہر طرح کی فکروں نے انسان کو گھیرا ہوا ہے، اب اس الجھی ہوئی زندگی کو سنبھالنے کے لئے آخرت فراموش اور خدا نا آشنا ڈاکٹروں نے حقیقی علاج سے مجرمانہ غفلت برتتے ہوئے کثرت الضحک پر مشتمل پروگرام کی دہائی دینی شروع کر دی۔

یقیناً یہ حقیقت ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی کہ قلوب اکتا جاتے ہیں ان کو وقتاً فوقتاً راحت و فرحت پہنچایا کرو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ ہنسا بجائے خود مضر ہے درحقیقت فرط غم اور فرط خوشی دونوں کے لئے نقصان دہ اور خطرناک ہے، حدیث پاک میں کثرت ضحک اور قہقہہ لگانے کی ممانعت موجود ہے۔  
”قال: إياك وكثرة الضحك فإنه يبيت القلب ويذهب بنور الوجه“ (مشکوٰۃ: مرقاة ۴/۶۳۲ مطبوعہ ممبئی) (زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے اور چہرہ کی رونق جاتی رہتی ہے)۔

لہذا قہقہہ یا دیر تک ہنسنے کو کسی مرض میں مفید سمجھنا ٹال ہے۔

شیخ صالح العثیمین اپنے فتاویٰ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ”لا شك أن الإنسان يصاب بالأمراض النفسية بالهم للمستقبل والحزن على الماضي وتفعل الأمراض النفسية بالبدن أكثر مما تفعله الأمراض الحسية البدنية. ودواء هذه الأمراض بالأمور الشرعية، أي الرقية، أنجح من علاجها بالأدوية الحسية. ومن أدويتها الحديث الصحيح عن ابن مسعود رضي الله عنه إنه ما من مومن يصيبه هم أو غم، أو حزن فيقول: اللهم إني عبدك وابن عبدك الخ، فهذا من الأدوية الشرعية وكذلك أيضاً أن يقول الإنسان لا إله إلا أنت سبحانك إني كنت من الظالمين، لكن مما ضعف الإيمان ضعف قبول النفس للأدوية الشرعية وصار الناس الآن يعتمدون على الأدوية الحسية أكثر من اعتمادهم على الأدوية الشرعية ولما كان الإيمان قوياً كانت الأدوية الشرعية مؤثرة تماماً بل إن تأثيرها أسرع من تأثير الأدوية الحسية الخ“ (فتاوى الشيخ العثيمين ۲/۹۸۱)۔

(بلاشبہ انسان کو بعض دفعہ مستقبل کی فکر اور ماضی کے غم سے نفسیاتی امراض لاحق ہو جاتے ہیں اور یہ نفسیاتی مرض بدن پر اس سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں جتنا کہ ظاہری جسمانی امراض سے بدن پر اثر پڑتا ہے، اور ان امراض کا علاج شرعی تدابیر دعاء و وظیفہ سے زیادہ کامیاب طریقہ سے ہو جاتا ہے بہ نسبت ظاہری ادویہ کے، چنانچہ صحیح حدیث میں عبداللہ بن مسعود رضي الله عنه سے ایک نسخہ اس کا یہ وارد ہوا ہے کہ جس مومن کو کوئی فکر غم و رنج پیش آئے تو یہ دعا مانگا کرے، ”اللهم إني عبدك وابن عبدك ناصيتي بيدك إلى آخره“، گویا یہ شرعی علاج ہے، اسی طرح ”لا إله إلا أنت سبحانك إني كنت من الظالمين“ ایسے لوگوں کو کثرت سے پڑھنا چاہئے، لیکن چونکہ ایمان کمزور ہو چکا ہے، اس لئے عام نفوس دعا و وظیفہ وغیرہ کے ذریعہ علاج کو قبول نہیں کرتے بلکہ بس اب تو ظاہری مادی دواؤں پر ان کا سہارا ہے، اسی کو ترجیح دیتے ہیں، شرعی تدابیر کے مقابلہ میں اسی پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جب لوگوں کے ایمان قوی تھے تو یہ شرعی علاج ان کے لئے پوری طرح پرتاثر تھا بلکہ حسی دواؤں کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر اور قابل اعتماد تھا)۔

بہر حال بہ تکلف قہقہہ لگانا اور لگوانا، ہنسنے ہنسانے میں دیر تک جے رہنا شرعاً ناپسندیدہ اور از روئے حدیث ممنوع ہے، البتہ اگر واقعہ اس طرح کے ہنسنے ہنسانے سے مریض کو فائدہ و صحت کا تجربہ ہو یا گمان غالب ہو تو بطور علاج کے اجازت ہوگی، کیونکہ علاج کے باب میں شرعاً توسع سے کام لیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض

مواقع میں محرمات سے علاج کی بھی اجازت منقول ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

کھیلوں کی بحث:

لہو و لعب کی حقیقت اور اس کی ممانعت:..... اسلام میں تفریح کا تصور اور با مقصد تفریح کی ترغیب کا ذکر اوپر کی سطور میں گذرا، اسلام تفریحی کھیلوں کی بھی اجازت دیتا ہے، البتہ جائز کھیلوں کی ترغیب اور حدود و شرائط کے بیان سے پہلے کھیل کود کے سلسلہ میں جو اسلام کا مزاج ہے اور وہ کھیل کود والی زندگی سے اجتناب کا ہے اس کی تفصیل ضروری ہے۔ کھیل کود جس کو ”لہو و لعب“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ لہو و لعب اسلام کی نظر میں کبھی پسندیدہ چیز نہیں رہی۔ قرآن پاک میں ایک درجن سے زائد مقامات میں ”لہو و لعب، لغو، عبث“ جیسے الفاظ آئے ہیں سبھی جگہ یہ کافروں کی صفات، یا فاسقوں کی حرکات، اور غیر مومنانہ افعال میں شمار کیا گیا ہے (سورہ لقمان: ۴، سورہ معارج: ۳۳، سورہ زخرف: ۸۳، سورہ توبہ: ۶۵، سورہ انعام: ۹۱، سورہ اعراف: ۹۸، سورہ انبیاء: ۲، سورہ دخان: ۹، سورہ طور: ۱۲، سورہ مائدہ: ۵۸، سورہ انبیاء: ۵۵، سورہ محمد: ۳۶، سورہ عنکبوت: ۶۳، سورہ جمعہ: ۱۱)۔

لہو کی تعریف:

لہو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو قابل توجہ یا ہم امور سے غافل کر دے۔

”اللہو ما يشغل الإنسان عما يعينه ويهمه“ (مفردات القرآن راعب) (لہو: وہ چیزیں جن کی مشغولیت انسان کو اپنے دینی و دنیاوی مقاصد اور ضروری امور سے غافل کر دے)۔

قاموس الفقہ میں ہے: لہو ایسی چیز یا کام کو کہتے ہیں جو آدمی کے ذہن کو مشغول کر دے، ”کل ما شغلك“ اسی لئے گانے بجانے وغیرہ کے آلات کو ”ملاہی“ کہا جاتا ہے (قاموس الفقہ ۱۴/۵۹۷)۔

مفتی شفیع صاحب نے لہو کی تعریف کا حاصل ذکر کیا ہے کہ لہو اس کام کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی دینی و دنیاوی فائدہ معتد بہانہ ہو (معارف القرآن لقمان ۸۳)۔

لہو و لعب کے ناجائز ہونے کی چند علتیں:

لہو و لعب کی مذکورہ تعریفات و تفصیلات نیز قرآن و حدیث کی مقتضیات سے کھیل کود کا ناجائز و ممنوع ہونا واضح ہوتا ہے، البتہ کچھ کھیلوں کا استثناء بلکہ ترغیب بھی معلوم ہوتی ہے اب جو کھیل جائز ہیں ان کے جواز کی علت اور بقیہ کھیلوں سے مستثنی ہونے کی وجوہات کی تحقیق ضروری ہے، تا کہ وجہ جواز واضح ہونے کے بعد غیر منصوص کھیلوں کا حکم نکالا جاسکے، اسی طرح کھیلوں کے عموم کے ساتھ جو ممانعت ہے اور عام کھیل کود کی جو مذمت و حرمت ہے اس کی علتیں بھی معلوم کرنا ضروری ہے تا کہ جہاں جہاں وہ علت پائی جائے اشتراک علت سے حکم متعدی کیا جاسکے اور جہاں وہ علتیں نہ پائی جائیں تو اصل اباحت کا حکم اس پر لگایا جائے بلکہ اس کو لہو و لعب کا درجہ ہی نہ دیا جائے، محض وہ صورت لہو و لعب رہ جائے گا۔

محدثین و فقہاء کرام نے کھیلوں کے مکروہ و ممنوع ہونے کی جو علتیں ذکر کی ہیں ان کی مختصر تفصیل نقل کی جاتی ہے:

پہلی علت:

لہو و لعب کے ممنوع ہونے کی اہم اور بنیادی علت اللہ کی یاد سے غفلت ہے، لہذا کسی بھی کھیل میں ایسا انہماک اور ایسا شغف جو اس کو نماز اور دوسرے ضروری کاموں سے بھی غافل کر دے ایسا کھیل خواہ اپنے اندر کتنے ہی فوائد و منافع رکھتا ہو ”غفلت عن ذکر اللہ“ کے سبب ناجائز و حرام ہوگا۔

امام بخاری نے ایک باب مقرر فرمایا ہے، ”باب کل لہو باطل إذا شغله عن طاعة اللہ“ (اللہ کی اطاعت سے غفلت میں ڈالنے والا ہر کھیل باطل ہے)، شارح بخاری علامہ عینی اس کے تحت لکھتے ہیں:

”کل لہو باطل“ وہی لفظ الحدیث قید بقولہ إذا شغله الخ، لأنه إذا لم يشغله عن طاعة اللہ یکون مباحاً وعلیہ اهل الحجاز (عمدة القاری ۱۸/۲۲۲) (ہر کھیل غلط ہے، یہ حدیث کے الفاظ ہیں، امام بخاری نے کھیل غلط ہونے کے لئے قید لگائی ہے کہ وہ کھیل جب اللہ کی یاد سے غافل کر دے، چنانچہ جو کھیل اللہ کی اطاعت سے غفلت کا سبب نہ بنے وہ مباح رہے گا اہل حجاز کی یہی رائے ہے)۔

دوسری علت: ..... ابوولعب کی ممانعت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر کھیل خود شرعی مفندہ یا کسی نہ کسی معصیت پر مشتمل ہوتے ہیں، لہذا کسی کھیل کا اس طرح کھیلا جانا جس میں معصیت کا ارتکاب کرنا پڑے حرام ہوگا، مثلاً ایسا کھیل جو قمار اور جوا کی صورتوں پر مشتمل ہو یا ایسا کھیل جو بے پردگی اور بے حیائی پر مشتمل ہو، غرضیکہ کھیل کے اندر معصیت کا عنصر پایا جانا اس کی ممانعت کے لئے کافی علت ہوتا ہے، جیسا کہ واضح ہے (کھیل کو اور تفریح کی شرعی حیثیت ۴۳)۔

### تیسری علت:

کسی کھیل کو دے ممانعت کی ایک علت یہ ہوتی ہے کہ کھیل میں کھیلے جانے والے آلات اور اس کا طریقہ کفار سے ماخوذ ہو، یہود و نورو کا ایجاد کردہ ہو جبکہ اس کا صحیح بدل ہمارے پاس موجود ہو ایسی صورت میں بلا ضرورت جدید کھیل کو اپنانا اور غیروں کا طرز اختیار کرنا اسلامی غیرت و حمیت کے خلاف ہے، البتہ جدید طرز کی ورزشوں اور کھیل کو دے ان وسائل کو اپنانا جس میں فوائد اور آسانیاں موجود ہوں اور اسلام کے کسی حکم سے متصادم بھی نہ ہو اگر ہمارے درمیان رائج دوسرے کھیلوں سے وہ مقاصد حاصل نہ ہوں تو غیروں کے ان کھیلوں سے ایک حد تک استفادہ کرنا "خذ ما صفا ودع ما کذب" اور "الأمور بمقاصدھا" کے تحت اس کی گنجائش ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی کے فتاویٰ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”فی مشکوٰۃ عن علیؑ قال: کانت بید رسول اللہ ﷺ قوس عربیۃ فرآی رجلاً بیدہ قوس فارسیۃ قال: ما هذه القوسا وعلیکم بهذه وأشباهها“ (الحديث: مشکوٰۃ باب اعداد الجهاد فصل ثالث ۲۳۸) (مشکوٰۃ میں حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ایک عربی کمان تھی، پھر ایک شخص پر آپ کی نگاہ پڑی، اس کے ہاتھ میں فارسی کمان تھی، آپ ﷺ نے اس کو ٹوکا اور فرمایا کہ اس کو ہٹا دو اور عربی کمان یا اسی کی طرح اور کمانوں کو استعمال کیا کرو)۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ بلا ضرورت شدیدہ غیر مسلم قوموں کے آلات ورزش کا استعمال بھی مکروہ ہے اگرچہ حرمت کی کوئی دلیل نہیں اور اعانت ہر فعل کی اسی کے حکم میں ہے (امداد الفتاویٰ ۴/۲۵۷)۔

### چوتھی علت:

کسی بھی کھیل کا فائدہ اور بے مقصد ہونا بھی اس کے ممنوع ہونے کی علت ہوتا ہے، کیونکہ ایسا لایعنی کھیل فعل عبث ہے اور فعل عبث شرعاً ممنوع ہے، لہذا ہر ایسا کھیل جس میں دین و دنیا کا کوئی معتد بہ فائدہ اس سے متعلق نہ ہو اس قسم کے تمام فعل اور کھیل، عبث ہونے کی وجہ سے مکروہ و ممنوع ہوں گے۔ ہدایہ میں ہے:

”یکره کل لہو لآئہ إن قامر بہا فالیسر حرام بالنص وإن لم یقامر فہو عبث ولہو“ (ہدایہ ۲۵۹)،

”لأن العبث خارج الصلوٰۃ حرام“ (ہدایہ ۱۰۱۱۸، کبیری ۲۳۸)، ”وعلی هذا یکرہ خارج الصلوٰۃ أيضاً“ (کبیری ۲۳۸) (ہر لایعنی کھیل مکروہ ہے، کیونکہ اگر اس کے ساتھ جوا شامل ہے تو وہ جو انص صریح سے حرام ہے اور اگر جوا نہ بھی ہو تو وہ عبث اور ابوولعب تو ہے، ہی لہذا پھر بھی مکروہ ہے، کیونکہ عبث فعل خارج نماز بھی ناجائز ہے۔ جیسا کہ ہدایہ اور کبیری میں مصرح ہے)۔

خلاصہ یہ کہ فعل عبث کا ہونا خود مستقل ممانعت کی علت ہے، یہ جس کھیل میں بھی پائی جائے گی اس کو مکروہ و ممنوع کر دے گی، مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

مذموم و ممنوع وہ کھیل ہے جس میں کوئی دینی و دنیوی فائدہ نہیں، بلکہ ایک بے فائدہ کام میں اپنی توانائی اور وقت کو ضائع کرنا ہے (معارف القرآن، لقمان ۲۱۸)

پانچویں علت: ..... ابوولعب کی ممانعت کی ایک علت جسمانی صحت اور دل و دماغ کے لئے اس کا مضر ہونا ہے جیسا کہ شطرنج وغیرہ کی حرمت یا کراہت کے سلسلہ میں اس علت کا ذکر فقہاء نے کیا ہے۔ صاحب احسن الفتاویٰ مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں: ”حرمت شطرنج کی علت صرف تصاویر اور جوا ہی نہیں، اگر تصاویر اور جوا کا وجود شطرنج کے لئے لازم ہوتا تو امام شافعیؒ اس کی کراہت تنزیہیہ کا قول نہ فرماتے (بلکہ) قاعدہ یہ ہے کہ جس کھیل میں بھی ذہنی ورزش ہوگی وہ ناجائز ہوگا اور جو ذہنی ورزش سے پاک ہو وہ جائز ہے خواہ اس میں جسمانی ورزش ہو یا محض دل و دماغ کی تفریح جیسے لٹو، بچوں کے کھلونے اور سیر و تفریح وغیرہ۔

## چھٹی علت:

کھیل کود کو ممنوع کے دائرہ میں لانے والی ایک علت ”فسادیت“ ہے یعنی اگرچہ کھیل جائز اور دوسری قباحتوں سے خالی ہو لیکن خود کھیلنے والا اس کو فسادیت سے کھیلتا ہے، مثلاً اس واسطے کھیلتا ہے تاکہ اپنی ہمت کا مظاہرہ کرے اور اس کی شہرت ہو، یا فخر و تکبر کا اظہار ہو یا اپنی چلاقت کی نمائش ہو تو نیت کے بگاڑ کی وجہ سے جائز کھیل بھی ناجائز اور مکروہ ہو جائے گا اور کھیل تو کھیل ہے کوئی عبادت و طاعت بھی فسادیت سے کرنا ممنوع ہوتا ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”أما إذا قصد التلهي أو الفخر أو الثري شجاعته فالظاهر الكراهة، لأن الأعمال بالنيات فكما يكون المباح طاعة بالنية تصير الطاعة معصية بالنية“ (شامی ۵۰۲۵۸) (جب کھیل کود سے مقصود فخر و تکبر اور اپنی بہادری دکھلانا ہو تو ایسے کھیل کھیلنا مکروہ ہے، کیونکہ اعمال کا دائرہ مدانیت پر ہوتا ہے، جس طریقہ سے مباح حسن نیت سے طاعت بن جاتا ہے، اسی طرح طاعت بھی فسادیت سے معصیت بن جاتی ہے)

البتہ ہر وہ کھیل جو شرعی مفدہ سے خالی ہو کر کسی اچھی نیت اور جائز مقصد سے کھیلا جائے اور ان کھیلوں کے جو صحیح مقاصد ہیں ان کا حصول پیش نظر ہو اور بقدر ضرورت ہو، توسیع و غلو نہ ہو تو ایسے تمام کھیل جائز ہوں گے اور وہ ان سب کھیلوں کے جواز کی وہی ہے کہ درحقیقت یہ جب اپنی حد کے اندر ہوں تو لہو کی تعریف میں یہ داخل ہی نہیں گو صورت کے اعتبار سے ان کو بھی لہو و لعب کا مصداق قرار دیا جائے۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے احکام القرآن عربی میں روایات حدیث اور عبارات فقہاء کا خلاصہ لکھا ہے، اردو رسالہ کے حوالہ سے مندرجہ ذیل ہے:

”سلف و خلف میں سے کوئی عالم اس بات کا قائل نہیں کہ کھیل کود علی الاطلاق جائز ہے، روایات حدیث یا تو مطلقاً کھیل کود کو ممنوع قرار دیتی ہیں یا چند کو مباح قرار دے کر باقی کو ممنوع قرار دیتی ہیں، اور اگر آپ ان جائز کھیلوں کا بنظر غائر جائزہ لیں جنہیں شریعت نے ممنوع کھیلوں میں سے مستثنیٰ کر کے جائز قرار دیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ حقیقتاً یہ کھیل ”لہو“ میں داخل ہی نہیں، انہیں صرف ہم شکل ہونے کی وجہ سے لہو فرمایا گیا ہے جیسا کہ اصحاب السنن نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: ”ليس من اللهو ثلاث“ الحدیث، یعنی یہ تین کھیل نشانہ بازی، گھوڑے کو سدھانا اور اپنی بیوی کے ہمراہ کھیلنا لہو میں سے نہیں ہیں، ویسے یہ کھیل لہو میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں جبکہ لہو میں یہ مفہوم لازمی ہے کہ وہ بیکار کی مشغولیت ہو جس کی نہ کوئی صحیح غرض ہو اور نہ صحیح مقصد جبکہ حدیث میں ذکر کردہ یہ مباح کھیل ایسے اغراض و منافع کے لئے کھیلتے جاتے ہیں جن کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں، اسی لئے فقہاء نے یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ جائز کھیل بھی اسی وقت تک جائز ہیں جبکہ ان کا مقصد اور ان کی غرض صحیح ہو اور نہ اگر مقصد محض کھیل برائے کھیل ہو تو یہ مباح کھیل بھی جائز نہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص کستی، تیراکی، دوڑ، نشانہ بازی، محض لہو و لعب کی نیت سے کرے تو یہ بھی مکروہ ہوں گے (احکام القرآن عربی ۱۹۲/۳ از رسالہ شرف محمود عثمانی ۳۸)

جدید کھیلوں کے جواز و عدم جواز کا ایک اہم ضابطہ:

مندرجہ بالا تفصیلات سے کھیلوں کے تمام ہی قسموں کے جائز و ناجائز ہونے پر اصولی بحث آچکی ہے، اور اب یہ طے کرنا مشکل نہیں رہا کہ کونسا کھیل جائز ہے اور کونسا ناجائز، مزید وضاحت کے لئے اسی سلسلہ میں ایک اہم ضابطہ مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے قلم سے نقل کیا جا رہا ہے جس سے نئے نئے کھیلوں سے متعلق اصول اور مخ ہوجاتا ہے، مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں:

کھیل کود کے باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ محض کھیل کود جس کے تحت کوئی فائدہ نہیں اور اس کھیل کا کوئی صحیح مقصد نہیں نہ ہی کوئی دنیا و آخرت کا فائدہ تو ایسا کھیل حرام یا کم از کم مکروہ تحریمی ہوگا۔ اور ہر وہ کھیل جس میں کوئی غرض اور دین و دنیا کی کوئی مصلحت ہو تو دیکھا جائے گا اگر کتاب و سنت میں اس کے متعلق کوئی ممانعت وارد ہوئی ہے تو وہ کھیل بھی حرام یا مکروہ ہوگا۔ اور اگر شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہے اور اس میں لوگوں کا کوئی فائدہ اور مصلحت اس سے متعلق ہے تو فقہی نقطہ نظر سے ایسے کھیلوں کی دو قسمیں ہیں: اول وہ کھیل جن کے متعلق تجربہ شاہد ہے کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑھا ہوا ہے اور منافع کے مقابلہ میں مفاسد زیادہ ہیں، اور یہ کہ جو اس میں مشغول ہوتا ہے وہ اللہ کی یاد سے، نماز سے، مسجد سے غافل ہوجاتا ہے تو ایسے کھیل بھی ممنوع کھیلوں کے ساتھ لاحق ہوں گے، علت کے مشترک ہونے کی وجہ سے، لہذا وہ بھی حرام ہوں گے یا مکروہ، اور ثانی قسم کھیلوں کی وہ ہے جس میں یہ خرابیاں نہ ہوں تو ان کا حکم یہ ہے کہ اگر محض کھیل تماشہ کے طور پر دیکھیں تو مکروہ ہے اور اگر اس کھیل کے ذریعہ کسی خاص نفع کا حصول اور کوئی جائز مصلحت پیش نظر ہو تو وہ مباح ہے، بلکہ اپنے مقصد و مصلحت کے اعتبار سے وہ کھیل مستحب یا اس سے بھی آگے کا درجہ رکھتے ہیں، لہذا وہ کھیل جن کے ذریعہ جسمانی یا ذہنی ورزش مقصود ہوتی ہے فی نفسہ جائز ہیں جب تک کہ کسی دوسری معصیت پر مشتمل نہ ہوں اور جب تک کہ اس میں انہماک کسی دینی یا دنیاوی ضروری امور میں مخل نہ ہو تو ایسے (جدید) کھیل جائز ہوں گے

## ب۔ کھیل کی پوشاک اور کھلاڑیوں کا لباس:

کھیل ہو یا شادی بیاہ کی محفل، اسکول کی ڈریس ہو یا کھلاڑیوں کا یونیفارم، ستر پوشی کے احکام سے یہ شعبے مستثنیٰ نہیں ہیں، اسلام نے ہر مسلم مرد و عورت پر واجب کیا ہے کہ وہ اپنے جسم کے قابل ستر حصے کو چھپائے حتیٰ کہ خلوت میں بھی ستر کو چھپائے رکھے، بیماری پھوڑا پھنسی اور آپریشن وغیرہ کے مواقع میں مریض و معالج کو بدرجہ مجبوری حصہ ستر کھولنے اور دیکھنے کی بقدر ضرورت گنجائش ایک اضطراری حالت ہے۔ کھیل یا تعلیم میں لباس ناقص پہننے کی کوئی ایسی مجبوری نہیں اسی طرح ورزش اور پہلوانی میں بے لباس ہونے کی کوئی واقعی ضرورت نہیں، اس لئے پہلوانوں، کھلاڑیوں، کالج کے طلبہ و طالبات کے لئے لباس کے وہی اصول ہوں گے جو دوسرے عام مسلمان کے لئے ہیں یعنی مرد کا ستر از ناف تا گھٹنہ، عورت کا ستر کل بدن (سوائے چہرہ و ہتھیلی کے) حدیث میں ستر سے متعلق ایک صحابی کا سوال و جواب ملاحظہ ہو:

”قلت یا رسول اللہ ﷺ! عوراتنا ما نأقی وما نذر؟ فقال: احفظ عورتک إلا من زوجتک أو ما ملکت یمینک قلت: یا رسول اللہ! فإذا کان القوم بعضهم فی بعض؟ قال: فإن استطعت أن لا یراہا أحد فلا یرینہا، فقلت فإذا کان أحدنا خالیاً؟ قال: فاللہ تبارک وتعالیٰ أحق أن یرتجی عنہ“ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی)۔  
(بہر بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! ہم اپنے ستر کا کس حد تک خیال رکھیں اور کس حد تک نہیں؟ فرمایا بجز بیوی اور باندی کے باقی سے اپنی ستر چھپاؤ، میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ! جب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہوں تو! آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں تک ہو سکے ستر پوشی ضرور کرو کہ ستر پر کسی کی نگاہ نہ پڑے، میں نے کہا جب ہم میں کوئی شخص تخلیہ میں ہو تو؟ فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آدمی اس سے شرم کرے)۔

مفتی الشیخ صالح العثیمین اپنے ایک فتویٰ میں رقمطراز ہیں: ”أما إذا کان الممارس للریاضة لیس علیہ إلا سوال قصیر یدو منه فخذہ أو أكثرہ فإنه لا یجوز فإن الصحیح أنه یجب علی الشباب ستر أفخاذهم وإنه لا یجوز مشاهدة اللاعین وھم بہذہ الحالة من الکشف عن أفخاذهم“ (فتاویٰ العثیمین ۲، ۹۸۶) (بہر حال جب جسمانی ورزش کرنے والے کے بدن پر بس تھوڑا ہی سا کپڑا پڑا ہو کہ اس کی موجودگی میں اس کی ران کا حصہ یا اس سے زیادہ نظر آ رہا ہو تو ایسے ناقص کپڑے کے ساتھ ورزش جائز نہیں، کیونکہ صحیح بات یہی ہے کہ جوان آدمی کو اپنی رانوں کا چھپانا واجب ہے اور کھیل دیکھنے والوں کا ایسی حالت میں کہ کھلاڑیوں کی ران کھلی ہو کھیل دیکھنا ہی جائز نہیں ہے)۔

## ج۔ مروجہ کھیلوں کے احکام:

مروجہ کھیلوں میں اغیار کے غلبہ سے فی نفسہ جائز کھیل بھی غیروں کی کرم فرمائوں سے بہت سے مفاسد پر مشتمل ہو گئے ہیں۔ مولانا محمود اشرف عثمانی نے اپنے رسالہ ”کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت“ میں ”دور حاضر کے کھیلوں کا اجمالی جائزہ“ اس عنوان کے تحت تفصیل سے وہ قباحتیں لکھی ہیں جو آج کل کے کھیلوں میں عموماً موجود ہیں، مولانا لکھتے ہیں: ”دور حاضر میں جو کھیل رائج ہیں ان میں درج ذیل خرابیاں تو بالعموم مشترک ہیں:

- ۱- ان کھیلوں کو بذات خود مقصود سمجھا جانے لگا ہے، کھیل اگر کھیل کے بجائے مقصد بن جائے تو وہ شرعاً اور عقلاً معیوب اور ناپسندیدہ ہے۔
- ۲- ان کھیلوں میں کھلاڑیوں اور ان کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کا انہماک بہت زیادہ ہونے لگا ہے حتیٰ کہ ضروری کاموں پر اس کو ترجیح دی جاتی ہے جس سے بسا اوقات بندوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔
- ۳- ان کھیلوں کے کھیلنے میں بالعموم فرض نمازوں کے اوقات، جمعہ کے مبارک دن اور رمضان المبارک کے فرض روزوں کے ایام کا خیال نہیں رکھا جاتا جبکہ یہ ایک مسلمان کے لئے فرض عین ہیں۔
- ۴- یہ کھیل بالعموم اس قدر مہنگے ہیں کہ امراء اور ان کے بچے ہی صحیح طور پر ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ غریب بچے حسرت سے دیکھتے ہیں اور متوسط الحال بچے بمشکل ان کھیلوں کے اخراجات برداشت کرتے ہیں جس سے اسراف اور تبذیر تک نوبت پہنچتی ہے۔



۵- بالعموم ان کھیلوں میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے، بلکہ اب ان میں قوم کے وقت کا جتنا ضیاع ہونے لگا ہے وہ قوم کے صاحب فکر حضرات کے لئے بہت قابل توجہ ہے۔

۶- ان کھیلوں میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کو جس طرح قومی اور ملی ہیرو بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور نئی نسل کے بچے اب مجاہدین، علماء، سائنسدان اور قومی و ملی خدمات انجام دینے والوں کو اپنا آئیڈیل بنانے کے بجائے جس طرح ان کھلاڑیوں کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں وہ بھی قوم کے سنجیدہ اور سمجھ دار حضرات کے لئے بہت زیادہ قابل تنبیہ اور تشویشناک ہے۔

۷- اکثر کھیلوں میں ”سٹر“ کا اہتمام نہیں کیا جاتا یعنی جسم کے ان حصوں کو ڈھانپنے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی جن کا ڈھانپنا شرعاً ضروری ہے، مثلاً مرد کے لئے ایسی نیکر پہن کر کھیلنا جائز نہیں جس سے ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ کھلتا ہو جبکہ عورت کا تو پورا جسم ”سٹر“ ہے۔

۸- اکثر کھیلوں میں مردوزن کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے اور چونکہ یہ مردوزن محض تفریح اور کھیل برائے کھیل کی نیت سے جمع ہوتے ہیں، اس لئے ہونٹنگ، بھنگڑا، ڈانس، موسیقی اور دیگر نازیبا اور ناشائستہ امور کھلے عام ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب ایسے اجتماعات میں کسی شریف آدمی کا جانا اپنی بے عزتی کو دعوت دینا ہے۔

۹- ان کھیلوں میں (جو محض تفریح طبع کے لئے ہونے چاہئیں) اب ایسی محاذ آرائی اور ذہنی تناؤ ہونے لگا ہے کہ جس سے ان کھیلوں کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، اب کھیلوں کے میدان کو محاذ جنگ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ہارجیت کو قومی شکست اور قومی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے میچوں کے لئے اس طرح دعائیں مانگی اور نذریں قبول کی جاتی ہیں جیسے بیت المقدس کی آزادی یا جہاد کشمیر کا معاملہ سر پر آن پڑا ہو۔ سربراہان مملکت اس سلسلہ میں جہنمی اور تعزیتی پیغامات جاری کرتے ہیں۔ فی اللجب اور اب یہ خبریں بھی عام ہونے لگی ہیں کہ فلاں میچ کا دیکھنا بلڈ پریشر اور دل کے مریضوں کے لئے نامناسب ہے اور یہ کہ فلاں میچ میں اتنے سامعین اور ناظرین دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

اب ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے کہ وہ کھیل جن کا مقصد محض تفریح طبع ہونا چاہئے تھا وہ حدود شرع کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ فہل من مد کو!

۱۰- ان کھیلوں میں بعض اوقات جو اکیلا جاتا ہے، شرطیں رکھی جاتی ہیں اور لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کی رقوم ان میں ہاری جیتی جاتی ہیں، بڑے جوئے بازوں کے علاوہ چھوٹی سطح پر محلہ اور گھروں میں ناظرین اور سامعین کھیل دیکھتے سنتے ہیں اور آپس میں شرطیں لگاتے ہیں اور بلاوجہ نا کھلی میں قمار یعنی جوئے کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو شرعاً گناہ کبیرہ ہے اور قرآن کریم کی کئی آیات میں اسے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے (کھیل کو دار تفریح کی شرعی حیثیت ۵۳-۵۶)۔

مردجہ کھیلوں کی مذکورہ قباحتوں سے تطہیر کر دی جائے تو اکثر کھیل حد جواز میں نظر آتے ہیں اور مذکورہ خرابیوں کی آمیزش ہو تو جس طرح کی خرابیاں شامل ہوں گی اسی کے مطابق حرمت، کراہت تحریمی یا تنزیہی کا حکم ہوگا۔

باقی ہر کھیل کا تفصیلی جائزہ پھر اس کا شرعی حکم کافی طویل موضوع ہے اصولی بحث آچکی ہے، بعض کھیلوں کی صراحت کے ساتھ شرعی درجہ کی بات بھی گذر چکی ہے، اب اختصار کے ساتھ مستحب، جائز، مکروہ اور حرام کھیلوں پر بھی اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے، واللہ هو الموفق والمعین۔

۱- مستحب کھیل:

کھیلوں کی بعض وہ قسمیں جو صورتہ تو کھیل ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے مقصد کے پیش نظر ایک ضرورت ہیں، مثلاً دفاع میں معاون کھیل، جہاد میں کارآمد کھیل، ورزشیں، مشقیں، نشانے وغیرہ یہ نہ صرف جائز، بلکہ اس کا کھیلنا حسن نیت کے ساتھ ہو تو مستحب اور باعث ثواب ہے۔ ایسے کھیلوں کی مشہور صورتیں وہ ہیں جن کا ذکر مقالہ کے شروع صفحات میں گذر چکا ہے۔ یعنی:

الف- پیدل دوڑنا، یادوڑ کا مقابلہ۔

ب- تیراندازی، یاد دیگر نشانہ بازی کا کھیل، اسی طرح لاشی چلانا وغیرہ۔

ج- گھوڑسواری یا بری و بحری ڈرائیونگ کی مشق۔

د- تیراکی یا پیراکی اور غوطہ خوری کا مقابلہ، کشتی چلانے وغیرہ کی مشق۔

۵۔ کشتی لڑنا، کھیلنا اور کشتی کا مقابلہ اسی طرح کرائے، مکہ بازی وغیرہ۔

ان سب کھیلوں کے استحباب کی شرط یہی ہے کہ ان میں لباس وغیرہ کسی لائن سے شرعی اصول کی خلاف ورزی نہ ہو۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: ”موجودہ زمانہ کے وہ تمام کھیل جن سے آدمی اپنی حفاظت کے لائق ہو سکے نہ صرف درست بلکہ مستحسن ہوں گے، مثلاً کشتی کھیلنا، کرائے، لاٹھی چلانا، مکہ بازی وغیرہ، فقہاء شافعیہ نے صحیح لکھا ہے کہ تیرنا اور بندوق کا نشانہ کرنا وغیرہ کھیل جائز ہیں (درمختار علی ہاشم اردو ۱۵۵۹/۲۵۹) تاہم خیال رہے کہ کھیل کود اور ورزش کا یہ جواز اس وقت ہے جبکہ شریعت کے احکام ستر کی پوری پوری رعایت ہو اور لڑکے کے لڑکیوں کا اختلاط نہ ہو (حلال و حرام ۲۳۲)۔

مروجہ جائز اور مباح کھیل:

مروجہ کھیلوں میں جسمانی ورزش والے کھیل جس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو جائز ہوں گے، اگرچہ وہ جسمانی ورزش کے کھیل غیروں کے ایجاد کردہ ہوں بشرطیکہ ان کا شعار نہ ہوں، اس قسم کے سب کھیل فی نفسہ جائز ہوں گے، مثلاً ہاکی، فٹ بال، والی بال، لان ٹینس، بیڈ ٹینس، اور ٹیبل ٹینس وغیرہ کو فقہاء جائز لکھتے ہیں۔

مولانا محمود اشرف عثمانی (پاکستان) نے لکھا ہے: ”یہ وہ کھیل ہیں جن میں پیسہ اور وقت کا خرچ نسبتاً کم ہوتا ہے، ان کھیلوں میں جسمانی ورزش بھی بہت اچھی ہوتی ہے اور کھیل میں شامل تمام کھلاڑی بالعموم یکساں طور پر محفوظ ہوتے ہیں، ان کھیلوں میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں عمدہ تفریح ہو جاتی ہے اور کھلاڑی عصر کی نماز کے بعد سے لے کر مغرب کی اذان تک باسانی انہیں کھیل سکتے ہیں، ان کھیلوں میں مرد حضرات اگر ”ستر“ یعنی ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا جسم چھپانے کا خیال رکھیں اور ان خرابیوں سے بچتے رہیں جو پہلے تحریر کی جا چکی ہیں تو یہ کھیل جسمانی طور پر مفید بھی ہیں اور انہیں کھیلنے کی شرعاً گنجائش ہے (کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت ۵۸)۔

جائز کھیلوں میں بچوں کی لائن کے کھیل کھلوانے بھی آتے ہیں جیسے بچوں کا لٹو کھیلنا، جھنجھنا، بانا، وغیرہ کہ یہ کھیل بچوں کے حق میں جائز ہیں جیسا کہ فنادی محمودیہ میں ہے (۱۹/۵۴۰ گجرات)۔

مباح کھیلوں میں کیرم بورڈ ولوڈ وغیرہ کو بھی بعض علماء نے شمار کیا ہے بشرطیکہ انہماک نہ ہو، کبھی کبھی کچھ وقفہ کے لئے کھیل لیا جائے جیسا کہ مفتی محمود اشرف عثمانی اپنے رسالہ میں لکھا ہے (کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت ۶۶)۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی نے بھی احتیاط کے مشورہ کے ساتھ اس کھیل کو جائز قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: اگر ہار جیت نہ ہو اور احکام شرعیہ میں اس کی وجہ سے خلل نہ آئے تو کبھی کبھی وحشت دور کرنے اور دل بہلانے کے لئے اس کھیل (کیرم) کی گنجائش ہے تاہم اس کی عادت نہ ڈالی جائے اور اس کو چھوڑنے کی کوشش کی جائے (فنادی محمودیہ ۱۹/۵۳۶ گجرات)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کیرم بورڈ اور لوڈ کو شطرنج کے حکم میں رکھتے ہیں، فرماتے ہیں: ”مجھے خیال ہوتا ہے کہ فی زمانہ کرکٹ کا مروجہ کھیل شطرنج ہی کے حکم میں ہے، اور یہی حکم کیرم بورڈ اور لوڈ وغیرہ کا ہونا چاہئے (حلال و حرام ۲۳۳)۔

لیکن کرکٹ کی خرابیاں اور کھیل کی نوعیت کو حد جواز میں لانا واقعہً مشکل ہے جبکہ کیرم بورڈ اور لوڈ کو مختصر وقت کے لئے گھرا کر کرہ میں بیٹھ کر کھیل لیا جائے تو مضائقہ نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ اوپر گذرا۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ ذیل کھیل مروجہ کھیلوں میں جائز ہیں: (۱) ہاکی، (۲) فٹ بال، (۳) والی بال، (۴) لان ٹینس، (۵) بیڈ ٹینس، (۶) ٹیبل ٹینس، (۷) کبڈی کھیلنا، (۸) لکڑی کھیلنا، (۹) تعلیمی تاش، (۱۰) لٹو کھیلنا، (۱۱) بچوں کا جھنجھنا، غبارہ وغیرہ کھیلنا، (۱۲) مختصر وقت کے لئے کیرم بورڈ کھیلنا، (۱۳) تھوڑی دیر کے لئے لوڈ کھیل لینا، (۱۴) موبائل پر بلا تصویر کیرم کھیلنا، (۱۵) موبائل پر کوئی تفریحی چٹکلہ سن لینا۔

مروجہ مکروہ کھیل:

وہ کھیل جو شرعاً منع ہیں لیکن ان کی ممانعت حد حرمت تک نہیں پہنچی ہے، اس قسم کے کھیل مکروہ ہیں مثلاً تاش، شطرنج، پتنگ بازی، مرغ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ یہ کھیل اگر ہار جیت کے بغیر کھیلے جائیں تو مکروہ ہی رہیں گے:

۱- شرط: اس کی ممانعت کے دلائل ناجائز تفریحی مباحث کے ذیل میں آچکے۔ ۲- نزد شیر: (چوسر) ایضاً۔ ۳- کبوتر بازی وغیرہ اس کا بیان بھی وہیں گزر چکا۔  
۴- تاش کھیلنا: بلا شرط و جوا کے محض دل بہلانے کے لئے جو تاش کھیلے جاتے ہیں وہ مکروہ ہیں، اس میں جوا کی شرط ہو یا نماز وغیرہ کے فوت ہونے کا سبب ہو تو حرام ہوں گے۔ کتاب الفتاویٰ میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

اگر جوان بھی ہو تو تاش کھیلنے سے وقت ضائع ہوتا ہی ہے اور وقت اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ پھر اس سے انسان بتدریج جوئے کی طرف بڑھتا ہے، اس لئے تاش کھیلنا بہر حال کراہت سے خالی نہیں، کرہ کل لہو لقولہ علیہ السلام: ”کل لہو المسلمہ حرام“ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۱۹: ۵۲۶، کتاب الفتاویٰ ۶: ۱۵۸)۔

۵- ویڈیو گیمز: جس کا آج کل بہت رواج ہے اگر ان میں جاندار کی تصاویر نہ ہوں بلکہ بے جان اشیاء کی تصاویر سے وہ کھیلا جائے مثلاً ہیلی کاپٹر، جہاز، موٹر سائیکل، کار وغیرہ چلانے یا انہیں نشانہ کرنے کا کھیل ہو یا جاندار کی غیر واضح تصویر ہو یعنی صرف خاکہ پر مشتمل ہونا، کان، منہ وغیرہ نہ ہو تو ایسے گیمز کھیلنے میں اگر نیت وقتی تفریح طبع یا ذہن کی تیزی اور حاضر دماغی اور نشانہ بازی کی ہو تو تھوڑی دیر تک اس کو کھیل لینے کی گنجائش ہوگی جیسا کہ مولانا محمود اشرف عثمانی نے اپنے رسالہ میں صراحت کی ہے (۶۷)، لیکن عموماً ویڈیو گیمز اپنی حد تک باقی نہیں رہتا، اس لئے وہ اولاً کراہت پھر اس کا شوق حد حرمت تک لیجاتا ہے، اس لئے ابتداء سے ہی یہ مکروہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ مولانا یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں:

۶- کرکٹ: دور حاضر کا مقبول ترین کھیل ہے، اس کو اگر بڑے پیمانے پر کھیلا جائے جیسا کہ آج کل رواج ہے تو اس میں اخراجات بہت زیادہ ہیں اور وقت کا ضیاع بھی بہت زیادہ جس میں چند افراد جو کھیل میں نفس نفیس ملوث ہوتے ہیں وہ تو متاع دنیا لوٹتے ہیں، بقیہ لاکھوں تماش بینوں کی متاع آخرت لٹ جاتی ہے اور متاع دنیا بھی ہاتھ نہیں آتی بلکہ کھیل کے دیکھنے میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ اعمال آخرت سے غفلت کے ساتھ دنیا کے کاموں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، اس لئے کرکٹ مردوجہ کو ”کرکٹ“ کہنا بجا ہوگا، بہر حال کرکٹ کی موجودہ صورتحال میں کرکٹ کو کم از کم مکروہ کہا جائے گا اور جس درجہ کی قباحتیں ہوں گی اس درجہ کراہت میں شدت بلکہ حرمت کا حکم بڑھتا جائے گا۔ البتہ کرکٹ کو اگر باضابطہ منصوبہ بنا کر نہ کھیلا جائے بلکہ اس کو کھیل کی حد تک صرف چند منٹ یا ایک آدھ گھنٹہ بطور تفریح اور جسمانی ورزش یا نشانہ بازی وغیرہ کی مشق کی خاطر کھیل لیا جائے تو بلاشبہ گنجائش ہوگی ورنہ وہی حکم ہوگا جو اوپر گزرا۔

۷- پتنگ بازی: عام طور پر شہروں میں پتنگ اڑانے کا رواج ہے بعض دفعہ اس میں مقابلہ اور ہارجیت کی بھی شکل ہوتی ہے، اور کہیں اجتماعی کھیل کی شکل میں پتنگ باز بڑے خرچ کے ساتھ مقابلوں کا انعقاد کراتے ہیں، ظاہر ہے ان کا کوئی جواز نہیں ہے اس کے علاوہ پتنگ بازی میں جو عمومی خرابیاں ہیں، مثلاً:

(۱) پتنگ کے پیچھے بے تحاشہ دوڑنا، (۲) پتنگ دوسروں کی لوٹنا، (۳) ڈور لوٹ لینا، (۴) جانی مالی نقصان کے واقعات کا اندیشہ، (۵) بے پردگی۔

ان خرابیوں کی وجہ سے پتنگ بازی ممنوع ہے، البتہ بعض پتنگ بازی کے شوقین مذکورہ خرابیوں سے بچتے ہوئے وقت گذاری کے لئے چھتوں پر چڑھ کر تھوڑی دیر پتنگ اڑا کر جی بہلاتے ہیں تو یہ تفریح کی شکل ایک عبت نفل ہونے کے سبب صرف مکروہ رہے گی اور عام فساق و فجار کے ساتھ مشابہت بھی کراہت کا سبب ہوگا۔

مردوجہ ناجائز کھیل:

۱- بیلوں کے ساتھ کشتی: بعض ممالک میں بیلوں کے ساتھ کشتی کا رواج ہے، اس میں تربیت یافتہ مسلح انسان اپنی مہارت سے مد مقابل بیل کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، اسلام کی نظر میں یہ بھی شرعاً حرام ہے کیونکہ اس میں جانور کو ایذا پہنچا کر اور جسم میں نیزہ بھونک کر قتل کیا جاتا ہے اور بیشتر اوقات خود بیل بھی اپنے مقابل انسان کو ختم کر دیتا ہے یہ لڑائی ایک وحشیانہ عمل ہے جسے اسلامی شریعت تسلیم نہیں کرتی۔

۲- باکسنگ: یا مکار بازی کا خطرناک مقابلہ: ورزشی کھیلوں کے نام پر جو مقابلے ہوتے ہیں ان میں باکسنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے اس میں فریق مقابل کو ایسی شدید جسمانی اذیت پہنچانے کو بالکل جائز تصور کیا جاتا ہے جس سے ہوسکتا ہے کہ مد مقابل اندھے پن، سخت نقصان، دماغی چوٹ یا گہرے ٹوٹ پھوٹ بلکہ موت سے بھی دوچار ہو جائے اس میں مارنے والے پر اس نقصان کی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی، بلکہ جیتنے والے کے حامیوں کو اس کی جیت پر خوشی اور مد مقابل کی اذیت پر مسرت ہوتی ہے جو اسلام میں ہر اعتبار سے حرام اور قابل احتراز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ولا تلتقوا بأیدیکم إلی التہلکة“ (البقرہ: ۱۹۵)، نیز ارشاد ہے: ”ولا تقتلوا أنفسکم“ (النساء: ۲۹)، حدیث میں ہے: ”لا ضرر ولا ضرار“ (نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ)۔

۳- فری اسٹائل فائٹنگ یا کشتی: باکسنگ کی طرح فری اسٹائل کشتی یا فائٹنگ میں بھی لڑنے والے ایک دوسرے کی ایذا رسانی کو مباح سمجھتے ہیں، اس لئے ظاہری شکلوں میں فرق کے باوجود وہ تمام شرعی ممنوعات جن کا باکسنگ کے تحت ذکر ہوا فری اسٹائل فائٹنگ میں بھی پائی جاتی ہیں، لہذا یہ بھی شرعاً حرام ہیں (فقہی فیصلے مکہ مکرمہ ۲۰۰۷)۔

۴- خواتین کے کھیلوں کا ذکر بھی بجا نہ ہوگا، زنانہ ہاکی ٹیمیں، ٹینس کے مقابلے اور فٹبال وغیرہ کھیل میں جس طرح خواتین نے مردانگی دکھائی ہے بلکہ کہنا چاہئے مردوں کے کان کاٹنے ہیں اس طرح کھیل کا مشغلہ تو مردوں کے لئے شرعاً درست نہیں ہے۔ چہ جائیکہ صنف نازک دعوت نظارہ دے۔ عریاں لباس کے ساتھ میدان میں کسی بھی قسم کا کھیل کھیلنا اور مردوں کو اپنا کھیل دکھانا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے اس قسم کے خواتین کے سبھی کھیل ناجائز ہیں، صرف پردوں کی حد میں رہتے ہوئے خواتین اپنے درمیان کوئی جائز کھیل کھیل لیا کریں یا دیکھ لیا کریں تو اس کی گنجائش ہوگی۔

۵- کھیل میں ہارجیت پر پیسے یا انعام مقرر کرنے کی صورتیں اور ان کا حکم:

جائز کھیلوں میں سے کسی بھی کھیل میں بغیر کسی شرط و انعام کے محض ہارجیت کی بازی لگائی جائے تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں، احادیث میں حضور ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان دوڑ اور اس میں سبقت و بازی لے جانے کا ذکر اور پرتفریح کے بیان میں آچکا ہے وہ ہارجیت اسی نوعیت کی تھی کہ اس میں کسی قسم کی شرط یا انعام کی قید نہیں تھی، اس لئے بغیر کسی شرط کے ہر کھیل میں ہارجیت کی بازی لگانا شرعاً درست ہے، مفتی شفیع صاحبؒ نے بھی احکام القمار ۱۳ میں جواز کی تصریح فرمائی ہے۔

البتہ کسی کھیل میں ہارجیت کی بازی پر اگر کوئی معاوضہ یا انعام دیا جائے تو اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں: ایک شکل تو یہ کہ وہ انعام یا معاوضہ پہلے سے مقرر و مشروط نہ ہو بلکہ بغیر کسی تقرر و شرط کے کسی فرد یا جماعت کی طرف سے کھلاڑیوں کو بطور انعام کے کچھ دیا جائے یہ شکل تو بلاشبہ جائز ہے۔

دوسری صورت یہ کہ کسی کھیل میں معاوضہ یا انعام کو پہلے سے مقرر و مشروط کر دیا جائے کہ جو شخص بازی لے جائے گا وہ مستحق انعام ہوگا، اسی کو فقہاء کرام مسابقت اور سباق سے تعبیر فرماتے ہیں اور ”سبق“ وہ مال ہے جو بطور انعام کے مقابلہ میں جیتنے والے کے لئے ہو (قاموس الفقہ)۔ مسابقت میں مال و انعام کی شرط لگانا تین شرطوں کے ساتھ فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ شرط اول یہ کہ مقابلہ تیر اندازی، گھوڑ سواری، اونٹ سواری یا پیدل دوڑ کا ہو، ان چار چیزوں کے سوا انعامی شرط کے ساتھ مسابقت جائز نہیں۔

”وأما شرائط جوازه فأنواع منها أن يكون في الأنواع الأربعة الحافر، والحف، والنصل والقدم لا في غيرها، لما روى أنه عليه الصلاة والسلام: لا سبق إلا في خف الخ“ (بدائع الصنائع ۶: ۲۰۶)۔

(مسابقت یعنی کھیل کو دہرا انعام مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ مسابقت صرف چار کھیلوں میں ہو ان کے علاوہ کسی اور کھیل میں نہ ہو اور وہ چار کھیل یہ ہیں: اونٹوں کی دوڑ، گھوڑ دوڑ، پیادہ دوڑ، تیر اندازی (نشانیہ بازی)، حدیث سے یہی مروی ہے)۔

مذکورہ عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان چار کھیلوں کے علاوہ کسی اور کھیل میں پہلے سے انعام مقرر و مشروط کرنا جائز نہیں، فقہاء کی اس تصریح سے باقی کھیلوں کے مقابلوں میں انعام وغیرہ کی شرط ناجائز ہوگی، البتہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جو کھیل بھی مستحب ہیں ان میں ہارجیت کی کوئی انعامی شرط لگانا بھی درست ہوگا، دیگر کھیلوں میں انعام یا مال کی شرط مقرر کرنا درست نہ ہوگا تا کہ خواہ مخواہ کھیلوں کے لوگ حریص نہ ہو جائیں اور انعام کی لالچ میں لہو و لعب مقصد زندگی نہ بن جائے، البتہ مذکورہ چار کھیل چونکہ جہاد و قوت میں معاون ہیں اس لئے انعام کے ساتھ ان کی ترغیب بھی درست ہوگی، زائد سے زائد از روئے قیاس دیگر وہ کھیل جن سے جسمانی ورزش ہوتی ہے اور کسی صحیح مقصد سے کھیلے جائیں جیسے گاڑیوں کی ریس، بندوق کا نشانہ، کبڈی، فٹ بال وغیرہ ان کے احکام بھی اسی طرح کے ہوں گے جو گھوڑ دوڑ وغیرہ کے ہیں، جیسا کہ بعض علماء عصر نے لکھا ہے، ملاحظہ ہو: (حلال و حرام، ۲۴۱، قاموس الفقہ ۱۱: ۱۱۷، از خالد سیف اللہ رحمانی)۔

خلاصہ یہ کہ مال یا انعام مقرر کرنا سب کھیلوں میں جائز نہیں، بعض کھیلوں میں جائز ہے کما مر۔

کھیل میں مال یا انعام مقرر کرنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ: کھیل میں مال یا انعام اس طرح مشروط و مقرر ہو کہ اس میں قمار (جوا) کی شکل نہ ہونے پائے اس کے لئے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔

(۱) کھیل کے شرکاء میں سے سبقت لانے والے کے لئے انعام کا اعلان حکومت یا کسی ایسے ادارہ یا فرد کی طرف سے ہو جو مقابلہ میں شریک نہ ہو، اس طرح کا انعامی مقابلہ درست ہے۔

(۲) دو شخص میں مقابلہ ہو ایک پر انعام کی شرط ہو دوسرے پر نہ ہو مثلاً ”الف“ جیتے گا تو ”ب“ اس کو ایک ہزار روپے دے گا لیکن ب جیتے گا تو الف اس کو کچھ نہیں دے گا مقابلہ کی یہ صورت بھی درست ہے۔

(۳) دو فرد یا دو پارٹیوں کے درمیان ہار جیت کی دو طرفہ شرط اس طرح ہو کہ تیسرے فرد یا پارٹی کو بغیر کسی شرط کے شریک کر لیا گیا ہو کہ وہ تیسرا ہارے تو اسے کچھ دینا نہ پڑے گا اور اگر وہ جیتے تو باقی دونوں اسے حسب معاہدہ انعام دیں گے تو یہ صورت بھی جائز ہے بشرطیکہ تیسرا شخص بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اس کے جیتنے کی توقع ممکن ہو۔ اس کے علاوہ جو صورت مقابلہ کی عام طور پر ہوتی ہے کہ ہر شخص پر یہ بات لازم قرار دی جاتی ہے کہ وہ ہارنے کی صورت میں جیتنے والے کو اتنی رقم دے گا اور اگر وہ جیت جائے تو باقی دوسرے اس کو دیں گے، یہ دو طرفہ شرط صریح جواز ہے، اس لئے یہ صورت ناجائز اور قطعاً حرام ہے۔

مذکورہ تفصیلات بدائع الصنائع (۶۰۶/۶) اور شمسی (۲۵۸/۵) وغیرہ میں بصراحت مذکور ہیں طوالت کے سبب صرف منہا ہم کو ذکر کیا گیا ہے (بکذا فی الفتاویٰ العالمگیریہ، کتاب الکراہیہ ۳۲۴/۵ فصل فی المسابق)۔

کھیل میں مال یا انعام مقرر کرنے کی جواز کی تیسری شرط یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ابتدائی اور انتہائی حد متعین کر دی جائے (تاموس الفتحہ بحوالہ شرح مہذب ۱۳۶/۱۵)۔

اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ جو انعام یا عوض مقرر ہوا ہے وہ معلوم و متعین ہو جیسا کہ واضح ہے (حوالہ بالا)۔

۵۔ کھیلوں کے دیکھنے، سننے اور اس کے لئے ٹکٹ کی خرید و فروخت کا حکم:

کھیل کھیلنے کی بحثوں سے فراغت کے بعد اب رہا مسئلہ کھیلوں کے دیکھنے، سننے اور ان کے لئے ٹکٹ خریدنے و بیچنے کا تو اس سلسلہ میں بنیادی اصول یہی ہے کہ جو کھیل کھیلنے جائز ہیں اور جن شرائط کے ساتھ جائز ہیں ان ہی شرائط و تفصیلات کے ساتھ ان کا دیکھنا یا سننا بھی جائز ہوگا اور جن علتوں کی بنا پر اوپر بعض کھیلوں کو ناجائز کہا گیا ہے وہی علتیں اگر کھیل دیکھنے و سننے میں پائی جائیں گی تو اس کا دیکھنا و سننا ناجائز ہو جائے گا، مثلاً بلا فائدہ محض لہو و لعب کے طور پر اس کو دیکھنا و سننا یہ عیب ہونے کے سبب ممنوع ہوگا و بکذا۔

البتہ اس نیت سے کسی جائز کھیل کا دیکھنا اور سننا تا کہ دماغ میں تازگی، طبیعت میں نشاط پیدا ہو تو بطور تفریح طبع بہ قدر حاجت اس کا سننا دیکھنا جائز ہوگا جیسا کہ دماغ کی تازگی کے لئے شعر و شاعری کا سننا جائز ہے نیز بعض صحابہ سے یہ بات ماثل میں نقل کی جا چکی ہے کہ وہ فرصت کے اوقات میں یا طبعی تکان دور کرنے کے لئے تاریخ اور شعر گوئی سے اور اس کو سن کر جی بہلا لیا کرتے تھے۔

لیکن آج کل جس طرح عموماً لوگوں کا مزاج ہے کہ گھنٹوں میچ دیکھنے اور کو منٹری سننے میں ضائع کئے جاتے ہیں جس سے ندین کا فائدہ ہوتا ہے نہ دنیا کا، نہ اپنی خبر رہتی ہے نہ ماہیوں کی، اس قدر انہماک کے ساتھ کھیلنا بھی ممنوع ہے اور اس کا اس طرح دیکھنا اور سننا بھی ناجائز ہوگا جیسا کہ کرکٹ کے بند و پاک کے مقابلوں میں کچھ ایسے ہی صورت حال ہوتی ہے، اہل بصیرت فقہاء اس قسم کے کھیل کھیلنے دیکھنے اور سننے کو ناجائز کہتے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ”مجھے خیال ہوتا ہے کہ فی زمانہ کرکٹ کا مروجہ کھیل شطرنج ہی کے حکم میں ہے اور ضروری اور حقیقی مسائل سے غفلت پیدا کرنے میں کہا جاسکتا ہے کہ شطرنج سے بھی بڑھ کر ہے اور یہی حکم کیرم بورڈ اور لوڈو وغیرہ کا ہونا چاہئے (حلال و حرام ۲۳۳)۔

خلاصہ یہ کہ جائز کھیلوں کا ضرورت کے وقت اچھی نیت سے حدود میں رہتے ہوئے دیکھنا اور سننا تو جائز ہے، باقی ناجائز کھیلوں کا یا ایسے کھیلوں کا جس میں مخلوط اجتماع ہو یا کھلاڑی ستر کے حصوں کو برہنہ کر کے کھیلتے ہوں یا خواتین کا کھیل ہو یہ سب کھیل میں شرکت ان کا دیکھنا سننا ناجائز ہوگا باقی مردانہ کھیل خواتین دیکھیں اور زنانہ کھیل مرد دیکھیں شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے اگرچہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے جس میں ہے کہ کسی عید کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو اپنے آڑ میں کھڑا کر کے حبشیوں کے نیزہ کا کھیل دکھلایا (بخاری کتاب العیدین ۱۳۰)۔

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء کا خیال ہے کہ خواتین مردوں کا تماشا دیکھ سکتی ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ خواتین کے لئے مردوں کے کھیل تماشا دیکھنے کی اجازت نہیں ہے، فتح الباری میں حدیث کے معنی و مطالب کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”قال عیاض: وفيه جواز نظر النساء إلى فعل الرجال الأجانب، لأنه إنما يكره لهن النظر إلى المحاسن والاستلذاذ بذلك، أما النظر بالشهوة وعند خشية الفتنة فحرام اتفاقاً وأما بغیر شهوة فالأصح أنه محرم وأجاب عن هذا الحديث بأنه يَحتمل أن يكون ذلك قبل بلوغ عائشة رضی اللہ عنہا، أو كانت تنظر إلى لعبهم جرابهم لا إلى وجوههم وأبدانهم“ (فتح الباری کتاب العیدین باب الحراب والورق یوم العید ۲۰۵۲)۔

(قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں عورتوں کو اجنبی مردوں کی طرف دیکھنا جائز معلوم ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے لئے مردوں کے محاسن دیکھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا مکروہ ہے۔ بہر حال شہوت کے ساتھ دیکھنا اور فتنہ کے اندیشہ کے وقت نگاہ ڈالنا تو یہ بالاتفاق حرام ہے اور بہر حال بغیر شہوت کے دیکھنا تو صحیح قول یہی ہے کہ یہ بھی حرام ہے اور حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس میں احتمال ہے کہ یہ حضرت عائشہ کے بلوغ سے قبل کی بات ہو یا حضرت عائشہ کی نگاہ ان کے کھیل اور اوزار کی طرف پڑتی ہو ان کھلاڑیوں پر نہیں)۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب لنگوٹ ہی فرماتے ہیں: ”اس حدیث میں حضرت عائشہ کا ان نامحرموں کو دیکھنا ہے، اس کے متعلق یہ ہے کہ بالاصالہ اجنبی کے چہرہ کی طرف دیکھنا شرعاً اس وقت درست ہے جبکہ ہر قسم کے فتنوں سے امن ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقام پر امن تھا اس لئے کوئی اشکال نہیں، حتیٰ کہ حضرت ابن مکتوم ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ام سلمہ وغیرہ کو پردہ کرنے کا حکم فرمایا، وہاں سے اشکال بھی کیا گیا کہ صحابی تو نابینا ہیں ان سے کیا پردہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تو نابینا نہیں ہو (ہذا حدیث حسن صحیح، جامع الترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی احتجاب النساء مع الرجال ۱۰۶۲)۔

اب رہا مسئلہ ٹکٹ کی خرید و فروخت کا تو حقیقت یہ ہے کہ کوئی کھیل، بحیثیت کھیل کے اس وقت ایسا نہیں ہے کہ اس کے لئے پیسوں کو خرچ کر کے اس کھیل کی ترغیب دی جاسکے، رہی بات جواز کی تو صرف وہ کھیل جو نہ صرف یہ کہ شرعی قباحتوں سے خالی ہوں بلکہ وہ جائز ہونے کے ساتھ معلومات افزاء ہوں، تو کسی جائز مصلحت و نیت کے ساتھ ہی صاحب استطاعت حضرات کے لئے اجازت ہوگی کہ وہ تھوڑی دیر اس جائز پروگرام سے لطف اندوز ہو سکیں مثلاً شعری نشست، کشتی، نشاندہ بازی وغیرہ کے کھیل، باقی عام کھیلوں میں ٹکٹ کی خرید و فروخت، فضول خرچی کہلائے گی، کیونکہ اوپر سابقہ عنوان میں یہ بات آچکی ہے کہ دو چار کھیلوں کے علاوہ اکثر کھیلوں میں ہار جیت کے اندر انعامی معاوضہ یا مالی شرط لگانا شرعاً درست نہیں، اس لئے اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محض کھیل دیکھنے کے لئے مال لٹانے و خرچ کرنے کا جواز ہر کھیل کے لئے کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لئے کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ اور پھر گراں قیمت کے ٹکٹ جیسا کہ آج کل مروج ہے شرعاً اسراف اور معصیت ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔

نیز ٹکٹ کو بلیک کرنا یا بلیک شدہ ٹکٹ خریدنا بچپانہ صرف قانون شکنی ہے بلکہ شرعاً اسراف و معصیت کو فروغ دینا اور غبن فاحش کا ارتکاب ہے اور کھیل جیسی مفت بلکہ بیہودہ چیز کو قیمتی بنا دینا جو کہ انسانیت بلکہ خود اپنے آپ پر ظلم ہے بلکہ کھیل کے ساتھ بھی ظلم ہے، ”لأن الظلم وضع الشئ فی غیر محلہ“ فقط۔

۳۔ تفریحی مقصد کے لئے سفر و سیاحت:

سفر عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں: سفر عبادت، سفر مباح، سفر معصیت۔

(۱) سفر عبادت مثلاً سفر حج، سفر برائے تعلیم و تبلیغ، سفر برائے عیادت مریض وغیرہ۔

(۲) سفر مباح جیسے سفر تجارت، سفر ملازمت یا روزگار کی تلاش وغیرہ کے لئے سفر۔

(۳) سفر معصیت، چوری، ڈکیتی اور بدکاری وغیرہ کی نیت سے سفر (شرف الہدایہ)۔

سفر عبادت تو باعث اجر و ثواب ہے اور سفر معصیت گناہ و عذاب ہے، اب رہا سفر مباح تو اس میں نہ ثواب ہے نہ عذاب، نہ حکم نہ منع، نہ عبادت نہ معصیت۔ سیاحت و تفریح والا سفر جائز نیت اور جائز طریقوں کی حد میں رہے تو یہ بھی سفر مباح کی قسم ہے، جائز نیت مثلاً آب و ہوا کی تبدیلی، ذہن و مزاج کو کچھ دن کے لئے جھمیلوں سے فارغ کرنا تاکہ دوبارہ شیطاں ہو کر لگا جاسکے۔ موسم کی شدت میں جسم و صحت کی خاطر سفر کرنا۔ اسی طرح تاریخی اور دلائل ویز مناظر و مقامات

کی زیارت و مشاہدہ کے لئے سیر و سیاحت میں جانا وغیرہ، بلاشبہ جائز ہے۔ اس طرح پر لطف اسفار بھی اللہ کی نعمت ہے، قال اللہ تعالیٰ: "سیروا فیہا لیالی وایاماً آمنین" (سبا: ۲۲، دیکھئے معارف القرآن ۷/ ۲۷۸ آیت ہذا) (تم ان گزر گاہوں میں شب و روز اطمینان سے سیر کرو)۔

اگر قابل عبرت مقامات اور قوموں پر گذرے واقعات جنہیں "ایام اللہ" کہا جاتا ہے ان جگہوں پر عبرت کے لئے جایا جائے تو بھی نہ صرف جائز بلکہ مفید ہے، قال اللہ تعالیٰ: "فسیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین" (تم روئے زمین میں چلو پھرو پھرو دیکھو کیسار ہا جھلانے والوں کا انجام)۔

وقال: "أفلم یسیروا فی الأرض فتکون لہم قلوب یعقلون بہا" (کیا وہ زمین میں نہیں چلتے پھرتے تاکہ ان کے جودل ہیں اس سے وہ واقعات کو سمجھتے)۔

معارف القرآن میں ہے: "زمین کی سیر و سیاحت اگر عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مطلوب دینی ہے، اس آیت (الحج: ۴۶) میں اس کی طرف ترغیب ہے۔ بشرطیکہ ان حالات کو بعض تاریخی سوانح کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبرت کی نظر سے دیکھے تو ہر واقعہ ایک بصیرت کا سبق دے گا (معارف القرآن ۶/ ۲۷۴، سورہ حج: ۴۶)۔

بہر حال مذکورہ مقاصد کے لئے سفر جائز ہے اور محض تفریح و طبع کے لئے بھی سفر جائز ہے۔ مولانا اشرف محمود عثمانی نے مفتی محمد شفیع صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے:

"تفریح و طبع کے لئے مناسب سفر کی بھی گنجائش ہے" (رفیق سفر)۔

سیر و سیاحت اور دنیا بھر میں گھومنے والے سیاحوں کی بدولت بیش بہا معلومات لوگوں کو ہاتھ لگی اور کتنے ہی علوم کے باب کھلے اور طرح طرح کی معلومات ان کی قلم سے رقم ہوئیں۔ ابن بطوطہ، شیخ سعدی، شیرازی، ابن خلدون وغیرہ سیاحوں کے کارناموں سے اور ان کی کتابوں سے بھی اہل علم واقف ہیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں: "بسیار سفر باید تا پنجنہ شود خائے" اور یہ حقیقت ہے کہ سفر بڑے تجربات کا سبب ہوتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے: "السفر وسیلۃ الظفر" (یعنی سفر سفر ہوتا ہے مگر وسیلہ ظفر ہوتا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ سیر و سیاحت کی غرض سے سفر جائز ہے، محض تفریح و طبع کے لئے تفریحی اور خوشنما مقامات کے لئے سفر کرنا بھی صاحب حیثیت کے لئے جائز ہے، البتہ قریب تفریحی مقام کو چھوڑ کر اسی مقصد کو طویل سفر اور کثیر صرفہ کے ذریعہ حاصل کرنا اسراف و فضول خرچی کے سبب منع ہوگا، لیکن دیگر جائز مقاصد پیش نظر ہوں تو بلبے سے لبا سفر بھی اپنی استطاعت کے مطابق جائز ہوگا۔ بشرطیکہ سفر سے کوئی اور مانع نہ ہو اور کسی کے حقوق اس کے سفر کی وجہ سے متاثر نہ ہوں۔

ب۔ پرخطر مقامات میں بال بچوں کے ساتھ سفر کرنا:

دینی اور جائز دنیاوی مقاصد کے لئے سفر کرنے کی مشروعیت کا ذکر آچکا ہے، تفریح و طبع بھی جائز مقصد ہے لیکن ایسا ضروری بھی نہیں کہ جہاں خطرات و حوادث متوقع ہوں وہاں بھی محض جائز تفریح کی خاطر جان کو جو کھوں میں ڈال کر جایا جائے۔ پر امن سفر خود مشقتوں کا مجموعہ ہوتا ہے، راستہ میں خطرات و خدشات سفر کا حصہ ہیں، دینی معمولات کا بھی کما حقہ ادا ہونگی دشوار ہو جاتی ہے، شب و روز کے جسمانی نظام پر بھی خلل پڑتا ہے، لیکن جائز مقاصد کے لئے ان سبھوں کو برداشت کیا جاتا ہے اب اس پر اگر جان و مال اور عزت و آبرو کے خطرات مستزاد ہو جائیں اور عام سفر کے حالات سے مزید پرخطر حالات کا سامنا کرنا پڑے تو بلاشک ضرورت کے ایسے سفر کی اجازت نہ ہوگی اور جب خود ایسے سفر کی بلا ضرورت شدید اجازت نہیں ہے تو پھر بال بچوں کی زندگی سے کھیلنا کہاں جائز ہو سکتا ہے؟ قرآن میں ہے: "ولا تعلقوا بأیدیکم إلی التہلکة" (البقرہ) (اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

عام سفر کے بارے میں حدیث ہے: "عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: السفر قطعۃ من العذاب یمنع أحدکم نومہ و طعامہ و شرابہ فإذا قضی نھمتہ من وجہہ فلیعجل إلی أهلہ" (متفق علیہ: مشکوٰۃ، ۳۳۹ آداب السفر) (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو ہمیں نہ تو راحت و آرام سے سونے دیتا ہے اور نہ ڈھنگ سے کھانے پینے دیتا ہے، لہذا تم اپنے سفر کی غرض جب پوری کر لو تو اپنے گھر والوں کے پاس واپسی میں جلدی کرو)۔

خلاصہ یہ کہ اگر تجربہ اور واقعات سے ایسے تفریحی اسفار میں جانی و مالی نقصانات کا گمان غالب ہو اور عزت و آبرو کا خطرہ ہو تو پھر بال بچوں کو ایسی جگہ لیجانا جائز نہیں اگر خود کو اندیشہ ہو۔

## ج۔ سیاحت کے وہ مقامات جہاں غیر شرعی باتیں پائی جائیں:

ارشاد باری ہے: ”فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین“ (انعام) (تو نہ بیٹھے رہئے یاد آنے کے بعد ایسے گنہگار لوگوں کے ساتھ)۔ معارف القرآن میں ہے: امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت کا اصل منشا گناہ کی مجلس اور مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی ہے جس کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے، لیکن اگر وہاں سے اٹھنے میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا خطرہ ہو تو عوام کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ کنارہ کشی کی کوئی دوسری صورت اختیار کر لیں، مثلاً کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں اور ان لوگوں کی طرف التفات نہ کریں، مگر خواص جن کی دین میں اقتدا کی جاتی ہے ان کے لئے وہاں سے بہر حال اٹھ جانا ہی مناسب ہے (معارف ۳/۳۷۱)۔

اب رہا مسئلہ وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کا حکم تو گرچہ وہاں جانا اور سیر کرنا جائز ہے، لیکن وہاں کاروبار کرنے میں کوئی معصیت نہیں ہے یہ وہاں گھومنے والوں کا فعل ہے کہ وہ فاسد نیتوں کے ساتھ ناجائز طریقہ پر سیر و تفریح کر رہے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کافر یا فاسق اپنی فسق و فجور کی مجلس سجانے کے لئے کسی مسلمان کی دوکان سے سارا سامان خرید کر یا اجرت پر لیجائے تو یہ جائز ہے۔ احسن الفتاویٰ میں اسی قسم کا ایک سوال و جواب ملاحظہ ہو:

سوال: کافر کو اپنا ڈیکوریشن کا سامان مثلاً ڈیگ، پلیٹ، گلاس وغیرہ دینا ان کی تقریب میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جائز ہے، ”قال العلامة الحسکفی: و جاز بیع عصیر عنب ممن یعلم أنه یتخذ خمرًا لأن المعصیة لا تقوم بعینہ الخ“ (رد المحتار ۵/۲۵۰، احسن الفتاویٰ ۸/۲۰۲)۔

خلاصہ یہ کہ ایسے تفریحی مقامات میں سیر و سیاحت کے لئے جانا جہاں بے دین اہل فسق و فجور کا غلبہ ہو شرعاً کراہت سے خالی نہیں، اس لئے اس سے احتراز لازم ہے بالخصوص علماء و صلحاء کا وہاں جانا زیادہ قبیح ہے، البتہ ہر قسم کے سیاحوں سے کاروبار کرنا ان کے لئے سواریاں مہیا کرنا وغیرہ جائز ہے اور اس کی آمدنی حلال ہے، فقط۔

د۔ ٹورز اینڈ ٹراویلس کا پیشہ اور سیاحوں کے لئے قیام و طعام کا انتظام اور اس کا حکم:

چونکہ مسافروں اور سیاحوں کے لئے آمد و رفت کا ٹکٹ بنانا اور ان کے لئے قیام و طعام کی سہولتوں کا نظم کرنا اسی طرح ٹور کو منظم کرنا فی نفسہ جائز ہے اور ٹورز ڈراویلس کے کام میں کوئی معصیت اس کی ذات میں موجود نہیں ہے، اس لئے کوئی کسی نیت سے کہیں جائے آئے اس کا نظم کرنا، کرایہ لینا دینا اور اس کے لئے ٹور کمپنی قائم کرنا سب جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”وإذا استاجر الذمی من المسلم داراً لیسکنها، فلا بأس بذلك وإن شرب فیها الخمر أو عبد فیها الصلیب، أو أدخل فیها الخنازیر ولم یلحق المسلم فی ذلك بأس، لأن المسلم لا یوآجرها لذلك وإنما آجرها للکفی“ (کتاب الاجارة ۲/۲۵۰، فصل ۲)۔

(اور جب کوئی کافر کسی مسلمان سے کوئی گھر رہائش کے لئے اجرت پر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے خواہ اس میں وہ شراب پیئے یا صلیب کی پوجا کرے یا اس میں خنزیروں کو داخل کرے، اور مسلمان کو اس میں حرج نہ ہونا اس لئے ہے کہ اس نے ان کاموں کے لئے اجرت پر نہیں دیا ہے بلکہ اس کو رہائش کے لئے اجرت پر دیا ہے) (اب یہ اس کافر کا فعل ہے کہ وہ کر وہ کیا کرے)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: ”شامیانہ، میز، کرسی، گیس، فرش وغیرہ ان اشیاء کو کرایہ پر دینا اور کرایہ وصول کرنا حرام نہیں ہے، اگرچہ کرایہ پر لینے والے اپنی محفل میں کچھ غلط قسم کے کام بھی کرتے ہوں مگر اس کی وجہ سے کرایہ کی آمدنی حرام نہیں (محمودیہ ۱۷/۱۷۱ طبع گجرات)۔

۴۔ فلموں کی مختلف قسمیں اور ان کا حکم:

فلم بینی، سنیما اور پکچرز وغیرہ میں طرح طرح کے مفاسد ہوتے ہیں، عام طور پر فلموں میں گانا بجانا، رقص و سرور، مرد و عورت کا اختلاط، نامحرم کی تصاویر، مخرب



اخلاق مناظر وغیرہ پائے جاتے ہیں، اس لئے یہ گناہ درگناہ کا مجموعہ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اس کو ناجائز و حرام کہا جاتا ہے اور جب تک ان مفاسد کا اختلاط رہے گا اچھے سے اچھے موضوع پر بنائی گئی فلم حرام ہی رہے گی، کیونکہ اچھے برے کا مجموعہ برا ہی ہوتا ہے، مشہور قاعدہ ہے: ”تبیح ازل کے تابع ہوتا ہے۔“ اسی بنا پر فقہاء عصر نے فلم حج اور اذان خانہ خدا اور نکاح وغیرہ کے عنوان سے بنائی گئی ہر قسم کے فلم کی مخالفت کی اور سنیما ہالوں میں جو گناہ و فواحش بینی کا مرکز ہے کسی بھی فلم کو سجانے و دکھانے کی سختی سے مخالفت کی اور اس کو اسلام کی توہین و استخفاف اور استہزاء قرار دیا، مفتی محمود صاحب اپنے فتویٰ میں لکھتے ہیں:

”سنیما دیکھنا شرعاً ناجائز ہے، اس عدم جواز کی چند وجوہ ہیں: گانا بجانا، ناچ، رنگ، مرد و عورت کا اختلاط، کپلے چہروں اور ننگے بازوؤں کی نمائش، لہو و لعب، اصاعت وقت و مال ان سب پر طرفہ اس پر علی الاعلان اظہار ان میں ہر وجہ عدم جواز کے لئے مستقل ہے، کتب فقہ میں ہر ایک کی ممانعت بصراحت موجود ہے“ (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۵۲۲ ذابھیل گجرات)۔

لیکن اب عصر حاضر میں مذکورہ مفاسد و خرابیوں سے پاک حسب منشا معلومات افزاء چیزوں کو فلما یا جانے لگا ہے اور ان کو سی ڈیز وغیرہ کے ذریعہ نیز دیگر جدید آلات کے ذریعہ ان فلموں کو دیکھنا سنا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کی فلموں کا کیا حکم ہوگا؟

اصول یہ ہے کہ جو چیزیں اور پروگرام، باہر و خارج میں دیکھے و سنے جاسکتے ہیں ان کو آلات کے واسطے سے بھی دیکھا و سنا جاسکتا ہے جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحب نے نظام الفتاویٰ میں اس کی صراحت کی ہے۔ اگرچہ بعض علماء و فقہاء محض تصویر سازی کے واسطے سے بنائے گئے پروگرام کو بھی دیکھنا ناجائز کہتے ہیں ان کے نزدیک برقی تصویر بھی تصویر ہے جس کا دیکھنا بنانا ناجائز ہے یہ ایک لمبی بحث ہے۔

خلاصہ یہ کہ خاص عنوان پر معلومات فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی فلمیں، یا تعلیمی مصلحت سے مقامات وغیرہ دکھلانے کی غرض سے فلم سازی و فلم بینی الامور بمقاصد ہا کے تحت جبکہ مفاسد و موانع سے خالی ہوں۔ اس وقت اس کی گنجائش ہوگی۔ جیسا کہ تعلیمی تاش کا حکم ہے کہ تاش کا کھیل لہو و لعب اور شطرنج کے مشابہ ہونے کی بنا پر مکروہ و ممنوع ہے لیکن تعلیمی تاش کی اجازت محتاط فقہاء و مفتیان ہند نے بھی دیئے ہیں۔

حضرت تھانوی، مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مفتی محمود صاحب وغیرہ کی آراء ملاحظہ ہوں:

”اگر ہار جیت نہ ہو تو جائز ہے بلکہ مبتدیوں کے حق میں شاید مفید ہے“ (امداد الفتاویٰ ۲۵۲/۳ کتاب الخطر والا باح)۔

”تعلیمی تاش بچوں کی تعلیم کے لئے استعمال کرنا مباح ہے“ (کفایت الفتی ۲۶۸/۹ باب ۲)۔

بچوں کو حروف کی شناخت کے لئے یہ تاش استعمال کرایا جائے تو فی نفسہ درست ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۵۳۵ گجرات)۔

۵۔ کارٹون بنانا، اور کارٹونسٹ کی آمدنی کا حکم:

الف۔ شخصیت کی طرف اشارہ کرنے والے کارٹون حقیقتاً تصویر ہی ہوتے ہیں، ہر دیکھنے والا شخص اس کو ایک جاندار کی تصویر ہی کی حیثیت سے نگاہ میں لاتا ہے البتہ تصویر کو بالقصد کسی زاویہ سے ٹیڑھا تر چھا کر کے بنایا جاتا ہے تاکہ مزاحیہ شکل ہو جائے اس بنا پر یہ تصویر سے خارج نہیں بلکہ وہ مکمل تصویر ہے جس میں مذاق کی خاطر کچھ اجزاء کو بگاڑ کر بنایا جاتا ہے، لہذا ایسا بڑا کارٹون جس میں پوری شخصیت جھلک رہی ہو تصویر سازی کے زمرہ میں شامل ہونے کے باعث ناجائز ہوگا پھر تصویر بنانے کے گناہ کے ساتھ یہ کارٹون چونکہ کسی مخصوص شخص کی چغلی کھا رہے ہوتے ہیں ان کا تسخر و استہزاء مقصود ہوتا ہے، لہذا کارٹون کے ذریعہ کسی شخصیت کا مذاق و استہزاء کرنا بھی جائز نہیں، جیسا کہ زبان و اعضاء کے اشارہ سے غیبت و چغلی و استہزاء اور تسخر منج ہے اس کا بھی وہی حکم ہوگا اور آیت کے عموم میں یہ کارٹون بھی داخل ہوگا:

”ویل لكل همزة لمزة الذي جمع مالا وعدده“ (بڑی خرابی ہے ہر طعن و تشنیع کرنے والے اور زبان یا اشارہ سے غیبت و چغلی کھانے والے کے لئے جو مال جمع کرتا اور شمار کر کے رکھتا ہے)۔

نیز تسخر و استہزاء کی ممانعت میں یہ کارٹون بھی اس کے تحت شامل ہوں گے:

”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسی أن یکونوا خیراً منهم“ (اے ایمان والو! کوئی کسی پر نہ ہنسے ممکن ہے ہنسنے والوں سے وہ جس پر ہنسا جا رہا ہے بہتر ہو)۔

خلاصہ یہ کہ مکمل کارٹون جو کسی شخصیت کی طرف مشیر ہوتے ہیں، چونکہ ان میں شخصیت کا مذاق و استہزاء ہوتا ہے نیز وہ تصویر بھی ہے ساتھ ہی تو بین آئینز بھی، اس لئے ایسے کارٹون بنانا، بیچنا، شائع کرنا اس کی آمدنی لینا سب ناجائز ہوگا۔

ب۔ ایسے چھوٹے کارٹون جو محض بچوں کے کھیل کے مقصد سے بنائے جاتے ہیں اور ان میں تصویر بھی نمایاں نہیں ہوتی بطور تفریح اور کھلونے کی حیثیت سے رکھتے ہیں، جیسے گڑیا وغیرہ سے بچے کھیلا کرتے ہیں، اس طرح کے کارٹون بنانے، بیچنے اور ان سے کھیلنے کی شرعاً گنجائش ہوگی اور ایسے کارٹون بنانے کی اجرت و ملازمت بھی جائز ہوگی۔

”ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناس إلا بتأمل لا يكره“ (عالمگیری، ۱۰۱۰۷) ”أو محووة عضو لا تعيش بدونه“ (شافی، درمختار، ۲۳) (چھوٹی تصویریں جو بے تکلف پہچان میں نہ آتی ہوں وہ جائز ہیں (اسی طرح) وہ تصویر جس کا کوئی اہم عضو محو کر دیا گیا ہو کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہ رہ سکے)۔

## ۶۔ تفریحی ڈراموں اور مکالموں کا حکم:

ڈرامہ یا مکالمہ میں اگر کسی واقعی موضوع کو اختیار کیا جائے اور دلچسپی اور سامعین کو لطف اندوز کرنے کے لئے اس میں ڈرامائی انداز اختیار کیا جائے بشرطیکہ اس میں حق اور اہل حق کا استہزاء نہ ہو بلکہ باطل یا اہل باطل کی تضحیک مقصود ہو تو ایسے جائز موضوع کو تفریحی انداز میں پیش کرنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ ناول و افسانہ کے رنگ میں، اسی طرح حکایات و لطائف کے انداز میں عبرت آموز اور نصیحت خیز باتوں کو کہا سنا لکھا اور پڑھا جاتا ہے، اس لئے اس طرح کے مبنی بر حقیقت ڈراموں اور مکالموں میں جبکہ اس میں صداقت بھی ہو اور کوئی شرعی مفسدہ نہ ہو تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مدارس میں جو مکالموں کا سلسلہ ہے وہ بلا تکلیف شائع ہے، اسی طرح مدارس میں مناظرہ میں ایک فریق اہل باطل کی نقل اتارتا ہے اور کبھی اہل حق کے مقابل قادیانی یا پرویزی کے روپ میں باطل کی دکالت کرتا ہے اس کو کبھی ناجائز نہیں کہا جاتا، کیونکہ مقصد پر نگاہ ہے یعنی باطل کے ہتھکنڈوں سے واقفیت اور پھر ان کا توڑ کرنا وغیرہ تو اگر ڈراموں یا مکالموں میں بھی فرضی طور پر کسی شخص کو کوئی غلط رول ادا کرتے ہوئے دکھایا جائے تو جب مقصد صحیح ہو تو ”نقل کفر کفر نباشد“ کے تحت اس طرح کی نقالی مانع جواز نہیں، لیکن مدارس اور جلسوں وغیرہ کے پروگرام چھوڑ کر جو بازاروں میں ڈرامے رچے جا رہے ہیں ان میں لغو حرکات، مخرب اخلاق، حیا سوز مناظر، قصص و سرور اور مرد و عورت کا اختلاط وغیرہ قباحتیں موجود رہتی ہیں، ایسے ڈراموں کا شریعت میں کوئی جواز نہیں بلکہ ایسے شوقین لوگوں کے لئے وعید شدید ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

”إِنَّ الَّذِينَ يَجْبُونَ آبَ تَشِيَعِ الْفَاحِشَةِ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“ (النور: ۱۹) (جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی چیزیں مسلمانوں میں پھیلیں ان کے لئے دنیا و آخرت میں سزائے دردناک ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے تم نہیں جانتے)۔

خلاصہ یہ کہ جائز مقاصد اور احقاق حق و ابطال باطل کو تفریح کے انداز میں پیش کرنا یا بہتر کاموں کی ترغیب اور برے کاموں پر تبدی نیز معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے سنج کرنا (جبکہ کوئی اور مفسدہ اور مانع اس پروگرام میں نہ ہو) شرعاً جائز ہوگا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلیہ اتم وأحکم۔

☆☆☆

## تفریح کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

مولانا شاجہاں ندوی علیہ

۱- شریعت میں مزاح جائز ہے، جس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”انی لا مزح ولا أقول إلا حقاً“ (المعجم الکبیر للطبرانی حدیث نمبر: ۱۲۷، ۵۱، ۱۳۲۹، ۵۶۸، ۱۳۲۶۲، اور اس حدیث کی سند حسن درجہ کی ہے) (میں مزاح کرتا ہوں اور حق بات ہی کہتا ہوں)۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے مزاح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”یا ذا الأذنین“ (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۵۰۰۳، اور یہ حدیث صحیح ہے) (اے دوکان والے)۔

اور ایک دوسرے شخص سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح فرماتے ہوئے کہا: ”إنا حاملوك على ولد العاقبة“ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۵۰۰۰، اور منہ احمد حدیث نمبر: ۱۳۸۱۷، اور اس کی سند صحیح ہے) (ہم تجھے اونٹنی کے بچہ پر سوار کریں گے)۔

اور ایک بڑھیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”إنه لا يدخل الجنة عجوز“ ثم قرأ: ”إنا أنشأناهن إنشاء فجعلناهن أبكاراً“ (الواقعة: ۳۵-۳۶، اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ۱۷۷، اور البعث والشور للبیہقی حدیث نمبر: ۳۳۵، مرسلہ، اور یہ حدیث انشاء اللہ تعالیٰ حسن درجہ کی ہے)۔ (یقیناً جنت میں بڑھیا داخل نہ ہوگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی: ”إنا أنشأناهن...“ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے)۔

اور ایک دوسری عورت سے فرمایا: ”زوجك الذي في عينيه بياض“ (عراقی نے اس کی نسبت ”کتاب الفکاہة والمزاح“ طلوز بیر بن بکار کی طرف کی ہے، دیکھئے: المغنی عن حمل الاسفار حدیث نمبر: ۲۹۲۱) (تیرا شوہر وہ ہے جس کی دونوں آنکھوں میں سفیدی ہے)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص دوکان والا، اور ہر سواری کا اونٹ اونٹنی کا بچہ ہے، اور ہر بڑھیا جنت میں دوشیزہ بن کر داخل ہوگی، اور ہر شخص کی دونوں آنکھوں میں سفیدی ہوتی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح بھی فرمایا اور حق سے سرمو متجاوز بھی نہیں کیا، لہذا اس طرح کا مزاح جائز ہے۔ چنانچہ مزاح کے جائز ہونے کے حدود و ضوابط درج ذیل ہیں:

۱- مزاح میں جھوٹ سے بچے، جس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لا یؤمن العبد بالإیمان کله، حتی یترتک الکذب من المزاحة ویترتک المراء وان کان صادقاً“ (مسند احمد حدیث نمبر: ۸۶۳۰، ۸۷۶۶، ۸۷۷۱، اس کی تخریج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے، لیکن اس کی تائید آگے آنے والی حدیث سے ہو رہی ہے، لہذا متن مقبول ہے) (بندہ مومن کامل نہیں بن سکتا، یہاں تک کہ مزاح سے جھوٹ کو ترک کر دے، اور جھگڑے کو چھوڑ دے اگر چہ سچا ہو)۔

اور معاویہ بن حیدرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ویل للذی یحدث بالحديث لیفصلت به القوم، فیکذب ویل له ویل له“ (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۴۹۹۲، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (تباہی ہے اس شخص کے لئے جو کوئی بات کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے، سو وہ جھوٹ بولے، تباہی ہے اس کے لئے، تباہی ہے اس کے لئے)۔

۲- مزاح میں کسی کو قول یا فعل کے ذریعہ اذیت نہ پہنچائے، کیونکہ مومن کو اذیت پہنچانا بہت سخت برائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ط جامعہ اسلامیہ شامتا پورم، مالا پورم، کیرالا۔

”والذین يؤذون المؤمنين والمؤمنات بغير ما اكتسبوا فقد احتملوا بهتاناً وإثماً مبيناً“ (الاحزاب: ۵۸) (اور جو لوگ مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ان چیزوں کے باب میں ایذا دیتے ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب نہیں کیا، انہوں نے اپنے سرسرخ بہتان اور گناہ کا بار اٹھایا) سو اگر اس شخص نے تصریح کر دی جس سے مزاح کیا جا رہا ہے، یا اس کے حال سے معلوم ہو گیا کہ اسے مزاح سے تکلیف ہو رہی ہے، تو اس وقت مزاح جائز نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده“ (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۶۳۸۳، ۱۱، ۱۰) (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں)۔

۳- مزاح میں دوسروں کے ساتھ تمسخر و استہزاء، یا طنز و طعن یا دوسروں کو دہشت زدہ کرنا نہ ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”يا ايها الذين آمنوا لا يسخر قوم من قوم عسى أن يكونوا خيراً منهم ولا نساء من نساء عسى أن يكن خيراً منهن ولا تلمزوا أنفسكم ولا تنابزوا بالألقاب بئس الاسم الفسوق بعد الإيمان ومن لم يتب فأولئك هم الظالمون“ (الحجرات: ۱۱) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مردوں اور نہ عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو، ایمان لانے کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے، اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے، تو وہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں گے)۔

اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ولا يغتب بعضكم بعضاً أجب أحدكم أن يأكل لحم أخيه ميتاً فكرهتموه“ (الحجرات: ۱۲) (اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا، دیکھو، تم خود اس سے سخن کھاتے ہو)۔

اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا يحل لبسلم أن يروع مسلماً“ (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۵۰۰۴، اور اس کی سند صحیح ہے) (کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو خوفزدہ کرے)۔

۴- مزاح میں افراط نہ ہو: ہنسی مذاق میں افراط مناسب نہیں ہے، کیونکہ کثرت مزاح آدمی کے لئے مضرت رساں اور اس کے وقار و بدمذہبیت میں کمی کا باعث ہے اور کبھی یہ کثرت اسے لوگوں کی نگاہوں سے گرا دے گی، اور دل کی پرشردگی کا ذریعہ بن جائے گی، اسی لئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے فرمایا: ”وایاکم والمزحة، فإنها تجر إلى القبيح، وتورث الضغينة“ (شعب الایمان للبیہقی حدیث نمبر: ۴۸۷۱) (اور مزاح سے بچو، کیونکہ یہ قبیح عمل کا ذریعہ اور کینہ کپٹ کا باعث بن جاتا ہے)۔

اور حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے: ”من كثر مزاحه استخف به“ (شعب الایمان حدیث نمبر: ۴۸۶۷) (جو مزاح میں افراط سے کام لے گا، اس کی حقارت کی جائے گی)۔

اور امام غزالیؒ تحریر فرماتے ہیں: ”فاعلم أن المنهي عنه الإفراط فيه أو المداومة عليه، أما المداومة؛ فلأنه اشتغال باللعب والهزل فيه، واللعب مباح، ولكن المواظبة عليه مذمومة، وأما الإفراط فيه فإنه يورث كثرة الضحك، وكثرة الضحك تميم القلب، وتورث الضغينة في بعض الأحوال، وتستقط المهابة والوقار، فما يخلو عن هذا الأمور فلا يذم“ (الاحياء ۳، ۱۱۵، ط: دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الثالثة ۲۰۰۲ء) (پس جان لو کہ جس مزاح سے روکا گیا ہے، وہ اس میں افراط سے کام لیتا ہے، یا اس پر مداومت اختیار کرتا ہے، بہر حال مداومت تو وہ کھیل میں مشغول ہونا اور اس میں غیر سنجیدگی اختیار کرنا ہے، اور کھیل مباح ہے، لیکن اس پر مداومت مذموم ہے، اور کثرت ہنسی دل کو مرده کر دیتی ہے، اور بعض حالتوں میں کینہ کپٹ پیدا کر دیتی ہے اور ہیبت اور وقار ختم کر دیتی ہے، سو جو مزاح ان باتوں سے خالی ہو، تو وہ مذموم نہیں)۔

اور ”البحر الرائق“ میں ہے: ”وأما في غيره غير مجلس الحكم فلا يكسر منه؛ لأنه يذهب بالمهابة“ (البحر الرائق، كتاب القضاء، فصل في التقليد، قبيل فصل في الحبس ۶، ۲۷۲، ط: الهند) (رہا مجلس قضاء کے علاوہ میں تو بکثرت مزاح نہ کرے، کیونکہ کثرت مزاح رعب و بدمذہبیت ختم کر دیتی ہے)۔

اور ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں: ”فقد اتفق في مزاحه ﷺ ثلاثة أشياء؛ أحدها: كونه حقا، والثاني كونه مع النساء

والصیبات، ومن يحتاج إلى تأديبه من ضعفاء الرجال، والثالث: كونه نادراً، فلا ينبغي أن يحتج به من يريد الدوام عليه، فإن حكم النادر ليس كحكم الدائم، ولو أن إنساناً دار مع الحبشة ليلاً ونهاراً، ينظر إلى لعبهم، واحتج بأن النبي ﷺ وقف لعائشة، وأذن لها أن تنظر إلى الحبشة، لكان غلطاً تدور ذلك، فالإفراط في المزاح، والمداومة عليه منهي عنه؛ لأنه يسقط الوقار، ويوجب الضغائن والأحقاد، وأما اليسير كما تقدم من نحو نوع مزاح رسول الله ﷺ فإن فيه انبساطاً وطيب نفساً (ابن قدامة المقدسي "مختصر منهاج القاصدين" الربع الثالث: ربع المهلكات ۲۰۲، ط: المكتبة الشاملة)۔

(چنانچہ آپ ﷺ کے مزاح میں تین باتیں جمع ہو گئی ہیں: (۱) وہ حق پر مشتمل ہے، (۲) وہ عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں کے ساتھ ہے، جنہیں تادیب کی ضرورت ہوتی ہے، (۳) وہ ندرت کے ساتھ ہے۔ تو مناسب نہیں کہ اس سے وہ استدلال کرے جو اس پر مداومت کرنا چاہتا ہے، کیونکہ نادر کا حکم ہمیشہ ہونے والے کی طرح نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص حبشیوں کے ساتھ رات و دن گھومے، اور ان کے کھیل دیکھے، اور اس بات سے استدلال کرے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ کے لئے کھڑے ہوئے، اور انہیں اجازت دی کہ حبشیوں کی طرف دیکھیں، تو وہ غلطی پر ہوگا، کیونکہ یہ بطور ندرت ہے، چنانچہ مزاح میں افراط سے کام لینا اور اس پر مداومت کرنا ممنوع ہے، اس لئے کہ وہ وقار کو ختم کر دیتا ہے، اور کینہ کپٹ کا ذریعہ بنتا ہے، اور رہا تھوڑا بہت مزاح رسول اللہ ﷺ کے مزاح کی قسم سے تو اس میں فرحت قلبی اور مسرت ہے)۔

باطل مزاح نہ ہو، جیسے چغلی وغیرہ پر مشتمل نہ ہو۔ مزاح میں اپنی خوبی بیان کرنے سے پرہیز کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فلا تزكوا أنفسكم" (النجم: ۳۲) (سوائے نفس کی پاکی کے دعویٰ نہ کرو)۔

مزاح، گالی گلوچ، بے حیائی اور فحش گوئی کا ذریعہ نہ بنے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "إن المؤمن ليس باللعان ولا الطعان، ولا الفاحش ولا البذيء" (الادب المفرد للبخاری، حدیث نمبر: ۳۱۲، وسند احمد حدیث نمبر: ۳۹۳۸، اور یہ حدیث صحیح ہے)۔

ذکر کردہ تفصیلات کی روشنی میں درج ذیل باتیں بالکل واضح ہیں:

ب۔ مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو جائز ہے، اسی طرح مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا جائز ہے، جبکہ کبھی کبھار ہو، اور پیچھے ذکر کردہ شرعی ضوابط کے دائرہ میں ہو۔

ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا، اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے مباح عمل ہے۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے، جبکہ پیچھے ذکر کردہ شرعی ضوابط کی رعایت کے ساتھ ہو، لیکن یہ گھٹیا کمائی کے ذرائع میں سے ہے، ایک مسلم کو اس طرح کی کمائی کے ذرائع سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔

اور گھٹیا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مزاحیہ کہانیاں کہنا اس وقت بنیادی مقصد بن چکا ہے، جبکہ اس کا مقصد قلب کو فرحت پہنچانا تھا، تاکہ تفریح سے فرصت پا کر اس کی عملی سرگرمی مزید بڑھ جائے۔

لہذا ایک مسلم کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے لیے ایسا پیشہ اختیار کرے، جس میں اس کا، اس کے سماج اور اس کی پوری امت کا بہتر فائدہ ہو۔

ہ۔ پیچھے ذکر کردہ شرعی ضوابط کے دائرہ میں رہتے ہوئے تفریح طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا جن کا مقصد ہنسا ہنسانا ہو، جائز ہے، ایسے ہی اس طرح کے ڈرامے لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا بھی درست ہے۔

اور محض ہنسنے ہنسانے کے لئے فرضی ڈرامہ لکھنا اور اسے سننا کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ جھوٹ ہے، اس لئے کہ جھوٹ واقع کے خلاف خبر دینا ہے، جو فرضی ڈرامہ پر صادق آتا ہے، اس وجہ سے کہ فرضی ڈرامہ لکھنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ ایسا ہوا اور ایسا ہوا، حالانکہ حقیقت میں ویسا نہیں ہوا، اور جھوٹ کے ذریعہ لوگوں کو ہنسانا ایسی مصلحت ہے، جس کا شریعت نے اعتبار نہیں کیا ہے، جیسا کہ حدیث پاک پیچھے گزری۔

و۔ محض تفریح اور فرحت قلب کے لئے ہنسا درست ہے، کیونکہ ہنسا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے بہت معاون فعل ہے،

لیکن یہ فوائد بے تکلف ہنسی سے حاصل ہوتے ہیں، تکلف کے ساتھ تہقہ لگانے سے یہ فائدہ نہیں نکلتے ہیں، اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں حد معقول سے تجاوز کرنے والی ہنسی مکروہ تہذیبی ہے، چنانچہ بکثرت ہنسا اور بے تکلف تہقہ لگانا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یا ابا ہریرہ! کن ورعاً، تکن أعبد الناس، وکن قنعاً، تکن أشکر الناس، وأحب الناس ما تحب لنفسك، تکن مؤمناً، وأحسن جوار من جاورك تکن مسلماً، وأقل الضحك، فإن كثرة الضحك تمیت القلب“ (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۳۰۵، مسند احمد حدیث نمبر: ۸۰۹۵، اور اس کی تخریج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک ”عمدہ حدیث“ ہے) (اے ابو ہریرہ! پرہیز گار ہو جاؤ، تم لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار ہو جاؤ گے، اور قناعت سے متصف ہو جاؤ، تم لوگوں میں سب سے زیادہ شکر گزار ہو جاؤ گے، اور اپنے لئے جو پسند کرتے ہو وہی لوگوں کے لئے پسند کرو، مومن کامل ہو جاؤ گے، اور اپنے پڑوس میں رہنے والے کی ہمسائیگی کا خیال رکھو، مسلم کامل بن جاؤ گے، اور کم ہنسو، کیونکہ زیادہ ہنسا دل کو مردہ کر دیتا ہے)۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ زیادہ ہنسا دل میں پائے جانے والے مادہ حیات کا خاتمہ کر دیتا ہے، جس کے سبب دل مردہ ہو جاتا ہے اور مذموم ہنسی وہ ہے جس کے ساتھ آواز ہو، جیسے تہقہ، اور اس طرح بکثرت ہنسا پسندیدہ نہیں ہے، رہی وہ ہنسی جو مسکراہٹ کی شکل میں ہو، تو وہ پسندیدہ ہے، بلکہ بعض جگہوں پر اس کا حکم ہے جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے، جو حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تبسمك في وجه أخيك، لك صدقة“ (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۹۵۶، اور صحیح حدیث ہے) (تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتا تمہارے لئے صدقہ ہے)۔

اور عبداللہ بن الحارث بن جزیءؓ کہتے ہیں: ”ما كان ضحك رسول الله ﷺ إلا تبسماً“ (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۳۶۳۲، اور ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے) (رسول اللہ ﷺ کی ہنسی صرف مسکراہٹ تھی)۔

اور نیز انہوں نے کہا: ”ما رأيت أحداً كان أكثر تبسماً من رسول الله ﷺ“ (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۳۶۳۱، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۷۷۰۳، اور یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے) (میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی کو مسکرانے والا نہیں پایا)۔

اور جریر بن عبداللہؓ نے کہا: ”ما حجبني النبي ﷺ منذ أسلمت، ولا رأيت إلا تبسماً في وجهي“ (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۳۸۲۲) (میں جب سے اسلام لایا رسول اللہ ﷺ نے مجھے اندر آنے سے نہیں روکا، اور مجھے جب بھی آپ نے دیکھا تو مسکرا دیا)۔

چنانچہ مذموم ہنسی یہ ہے کہ ہنسی میں ڈوب جائے، جیسا کہ امام غزالی نے فرمایا: ”المذموم منه أن يستغرق ضحكاً، والمحمود منه التبسم الذي ينكشف فيه السن، ولا يسمع له صوت“ (الاحياء، الآفة العاشرة: المزاج ۱۱۶) (مذموم ہنسی یہ ہے کہ ہنسی میں ڈوب جائے، اور پسندیدہ ہنسی مسکراہٹ ہے، جس میں دانت کھل جائیں اور اس کی آواز نہ سنی جائے)۔

چنانچہ مسکراہٹ اور بے بلند آواز ہنسی سے ہی دل کو فرحت و شادمانی حاصل ہوتی ہے، اور انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و شیط رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ رہا بے تکلف تہقہ، تو وہ مفید نہیں اور نہ اس سے قلبی فرحت اور چستی حاصل ہوتی ہے، لہذا میری رائے میں بے تکلف تہقہ لگانے کے پروگرام منعقد کرنا مکروہ تہذیبی ہے، حکیموں کا قول ہے: ”إيراد المضحكات على سبيل السخف نهاية القباحة“ (فيض القدير ۶، ۲، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الاولى ۱۳۱۵ھ/۱۹۹۳ء) (ہنسانے والی چیزوں کو حماقت کے طور پر لانا نہایت قبیح ہے)۔

۲: الف - کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز ہونے کے اصول درج ذیل ہیں:

- ۱- وہ کھیل واجب سے غافل کرنے والا، یا حقوق اللہ یا حقوق العباد کی تضحیح کا ذریعہ نہ ہو۔
- ۲- اس کھیل پر دینی یا دنیوی مضرت مرتب نہ ہو۔
- ۳- وہ کھیل جو اسے خالی ہو۔
- ۴- اس میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط نہ ہو۔
- ۵- وہ کھیل جھگڑے، عصبیت یا سب و شتم کا ذریعہ نہ ہو۔

۶- میوزک اور عریاں یا نیم عریاں تصویروں سے خالی ہو۔

۷- مرد و عورت کے کھیل کا مشاہدہ نہ کرے، اور حدیث پاک میں جو یہ بات آئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابہ نے جنسی عورتوں کا کھیل دیکھا، تو وہ سادہ کھیل پر محمول ہے، جسے بدوی عورت انجام دیتی ہے، لہذا عصر حاضر میں عورتوں کے فنی کھیل کا مشاہدہ مردوں کے لئے درست نہیں ہے، کیونکہ یہ کافی دیر تک چلتا ہے، اور لباس کا حقدہ نہیں ہوتا ہے۔

۸- کھیل میں انتہاک نہ ہو۔

۹- اس کھیل سے تفریح اور جسمانی ورزش کا مقصد پورا ہوتا ہو۔

۱۰- وہ کھیل انسان کے قیمتی وقت میں سے زیادہ وقت لینے والا نہ ہو۔

ب- لباس کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے درج ذیل باتوں کی رعایت ضروری ہے:

۱- لباس ستر کو ڈھانکنے والا ہو، اور مردوں کے لئے ”ستر“ ناف سے گھٹنہ تک ہے، اس لئے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معمر کی دونوں رانوں کو کھلا پایا تو فرمایا: ”یا معمر! غط فخذیک فان الفخذین عورة“ (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۲۳۹۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (اے معمر! اپنی دونوں رانیں ڈھانپ لو کیونکہ دونوں ران ستر ہیں)۔

اور عورت کا ستر اجنبی مردوں، بازاروں، تعلیم گاہوں اور مخلوط عمل گاہ میں پورا بدن ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”المرأة عورة وإنها إذا خرجت استشر فيها الشيطان، وإنها أقرب ما تكون إلى الله، وهي في قعر بيتها“ (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۱۷۳، اور ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۵۹۹، اور شعب الازود کا کہنا ہے کہ اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے) (عورت مکمل ستر ہے، اور وہ جب گھر سے باہر نکلتی ہے، تو شیطان اسے جھانک کر دیکھتا ہے، اور وہ اللہ سے زیادہ قریب اس حال میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر کے اندرون میں ہو)۔

الف- لباس ایسا ہو کہ اعضاء کے ابھار کو ظاہر نہ کرتا ہو۔ ب- لباس کے اندر سے جسم کی کھال نظر نہ آتی ہو۔ ج- لباس بہت زیادہ پرکشش نہ ہو کہ سب کی توجہ اسی کی طرف ہو جائے۔ د- عورت کا لباس مرد کے لباس اور مرد کا لباس عورت کے لباس کے مشابہ نہ ہو۔

۱- وہ کھیل مستحب ہے جس سے تفریح قلب کے ساتھ شریعت کے کسی مقصد کی تکمیل ہو رہی ہو جیسے دوڑ، تیر اندازی، نیزہ بازی، گھڑ دوڑ وغیرہ کہ اس میں جہاد کی تیاری اور اعمال جہاد کی مشق ہے، اسی طرح ”کرانا“ کہ وہ اپنے نفس کے دفاع کے لئے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”لیس من اللہو الا ثلاث: تادیب الرجل فرسه، وملاعبته أهله، ورميه بقوسه ونبله“ (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۵۱۳، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۷۳۲۱، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (مستحب کھیل سے نہیں، مگر تین طرح کے کھیل: (۱) آدمی کا اپنے گھوڑے کو سدھانا، (۲) اور مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا، (۳) اور آدمی کا اپنے تیر و کمان کے ساتھ تیر اندازی کرنا)۔

ابن معن کا کہنا ہے: ”لیس من اللہو المستحب“ (عون المعبود ۱۵۴، ط: دار الفکر بیروت، الطبعة الاولى ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۳ء) (مستحب کھیل سے نہیں)، رہا ان کے علاوہ کھیل تو انہیں ان ہی پر قیاس کرتے ہوئے یا تو مستحب قرار دیا جائے گا، یا تو کھیل کی رخصت کی دلیل کی بنا پر وہ درجہ اباحت میں رہیں گے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”الہوا والعبوا، فإني أكره أن يیری فی دینکم غلظة“ (شعب الایمان حدیث نمبر: ۶۱۲۲، اور بیہقی کا کہنا ہے کہ یہ منقطع ہے، اور اگر یہ حدیث صحیح ہو، تو اس کا تعلق مباح کھیل سے ہے) (کھیل کو کوڑو، کیونکہ مجھے ناپسند ہے کہ تمہارے دین میں سختی دیکھی جائے)۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشیوں کی نیزہ بازی کا کھیل دیکھا، جو کھیل کی اباحت کی دلیل ہے (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۳۵۵)۔

جو کھیل قمار سے خالی ہو وہ جائز ہے، جیسے بیلی بیلیس، بلیارڈ (Billiards) فٹ بال، والی بال وغیرہ، کیونکہ ان سے جسمانی یا ذہنی ورزش ہوتی ہے۔

۲- ناجائز کھیل وہ ہے جو قمار پر مشتمل ہو، جیسے زرد شیر، شطرنج، یعنی جس میں ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو، کیونکہ یہ میسر یعنی قمار میں داخل ہے، جس سے بچنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، ارشاد باری ہے: ”إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه“ (المائدہ: ۹۰) (یہ شراب اور جو اور نیہ آستانے اور پانے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو)، خواہ عوض دونوں جانب سے ہو یا

ایک جانب سے (البدائع: کتاب الاستحسان ۱۲/۵)۔

اسی طرح جانوروں کے باہمی مقابلہ کا کھیل ناجائز ہے، سرکارِ دو عالم ﷺ نے ”نہی عن التحریش بین البہائم“ (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۵۶۲) (جانوروں کو ایک دوسرے پر بھڑکانے سے منع فرمایا ہے)۔

لہذا ہر وہ کھیل جس میں جانور کو نشانہ بنایا جائے، یا جانوروں کو تکلیف پہنچائی جائے ناجائز ہے۔

ایسے ہی ”باکسنگ“ بھی ناجائز ہے، کیونکہ وہ انسانی جان کے لئے خطرناک ہے، اور اس کی بنیاد جسم انسانی اور خاص طور سے انسان کے چہرہ کو مباح ٹھہرانے اور باکسر کے اپنی انتہائی قوت کے ساتھ اس پر ضرب لگانے پر ہے، بلکہ چہرہ پر ضرب لگانے کو جسم کے دیگر حصوں پر ضرب لگانے کے مقابلہ میں زیادہ پوائنٹ حاصل کرنے والا قرار دیا جاتا ہے، اور اس میں آپ ﷺ کے اس قول کی صریح مخالفت ہے کہ ”إذا قاتل أحدكم فليجتنب الوجه“ (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۵۵۹) (جب تم میں سے کوئی قتال کرے تو چہرہ سے بچے)، اسی کے ساتھ باکسنگ فریقین کے درمیان جھگڑے اور نفرت کا ذریعہ ہے، خلاصہ کلام یہ کہ اسلامی اصول اس طرح کے مکروہ کھیل کو ممنوع قرار دیتے ہیں، جو جارحیت اور نفرت پر لوگوں کی تربیت کرتے ہیں۔

اگر ”ڈومینو“ (Dominoes) اسی طرح تاش کا کھیل ”تارو جو“ سے خالی ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ اس میں نفسانی حظ کے ساتھ ذہن و فکر کا استعمال اور اس کی ورزش ہے۔

۴۔ کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو، تو گھوڑ دوڑ، اونٹوں کا مقابلہ، دوڑ اور تیر و نیزہ بازی کے علاوہ ہر صورت ناجائز، خواہ ایک جانب سے مال ہو یا دونوں جانب سے، کیونکہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا سبق إلا في خف أو نصل أو حافر“ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۵۷۶، اور اس حدیث کی سند صحیح ہے) (شرط کی رقم لینا جائز نہیں، مگر اونٹ یا تیر یا گھوڑے کے مقابلہ میں)، اور دیگر آلات حرب کو تیر پر ہی محمول کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں دشمن سے جنگ لڑنے کی تیاری میں سے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں مال خرچ کرنے میں جہاد کی ترغیب اور اس پر آمادہ کرنا ہے۔ رد المحتار میں ہے: ”لا يجوز الاستباق في غير هذه الأربعة، كالبغل بالجعل، وأما بلا جعل فيجوز في كل شيء“ (رد المحتار، کتاب الحظر والاباحہ، فصل فی البیعة ۱، ۵۶۶) (ان چاروں یعنی اونٹ، گھوڑ دوڑ اور تیر اندازی کے علاوہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مقابلہ جائز نہیں جیسے مال کے عوض کے ساتھ چرخ کا مقابلہ، اور رہا مال کے عوض کے بغیر تو ہر چیز میں مقابلہ جائز ہے)۔

۵۔ جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، تو وہ نامناسب اور خلاف اولیٰ ہے، جیسے کرکٹ کھیلنا خلاف اولیٰ ہے، جبکہ واجبات اور حقوق سے غافل کرنے کا ذریعہ نہ ہو، اور نہ ہی تمار و جو پر مشتمل ہو، کیونکہ وقت انتہائی قیمتی ہے بلکہ وہی زندگی ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس، الصحة والفراغ“ (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۶۴۱۲) (دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے سلسلہ میں بہت سے لوگ خسارہ میں ہیں؛ صحت اور فرصت کے اوقات)، نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”لا تنزل قدما عبد يوم القيامة حتى يسأل عن عمره فيم أفتناه، وعن عمله فيم فعل، وعن ماله من أين اكتسبه وفيم أنفقه، وعن جسمه فيم أبلاه“ (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۴۱۷، اور ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے) (قیامت کے دن بندہ کے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے، یہاں تک کہ اس سے پوچھا لیا جائے کہ اس کی عمر کے بارہ میں اسے اس نے کس چیز میں فنا کیا، اور اس کے علم کے سلسلہ میں کہ اس نے اس پر کیا عمل کیا، اور اس کے مال کے بارہ میں کہ اس نے کہاں سے کمایا اور کس چیز میں اسے خرچ کیا، اور اس کے جسم کے بارہ میں کہ اس نے کس چیز میں بوسیدہ کیا)۔

۶۔ کھیل دیکھنے نیز اس کے لئے ٹکٹ خریدنے کے سلسلہ میں تفصیلات یہ ہیں:

- (۱) جو کھیل جائز ہے، اسے دیکھنا اس کے آلات بیچنا اور اسے دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہے۔
- (۲) اور جو کھیل ممنوع ہے اسے دیکھنا، اس کے آلات بیچنا اور اس کے دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی ممنوع ہے۔
- (۳) جو کھیل مکروہ ہے اسے دیکھنا، اس کے آلات بیچنا اور اس کے دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی مکروہ ہے۔

۳: الف۔ سیر و تفریح اپنی ذات کے اعتبار سے مباح ہے، نبی کریم ﷺ نے حضرت حنظلہ سے فرمایا: ”سلة وسلة“ (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۷۵۰) (اے



حفظہ! یہ ربانی کیفیت کبھی کبھی حاصل ہوتی ہے۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ دل کی فرحت کا سامان کرنا روحانیت کے خلاف نہیں ہے، اور حضرت علیؑ نے فرمایا: ”روحوا القلوب وابتغوا لها طرائف الحكمة فإنها تمل كما تمل الأبدان“ (الجامعة لاخلاق الراوی و آداب السامعہ ۱۰۹۶، ط: المكتبة الشاملة) (دلوں کی فرحت و راحت کا سامان کرو اور اس کے لئے عمدہ حکمت تلاشو، کیونکہ وہ بھی اوب جاتے ہیں، جس طرح بدن تھک جاتے ہیں)۔

خونہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”روحوا القلوب ساعة بعد ساعة، فإن القلوب إذا كلت عميت“ (مسند الفردوس للمدنی حدیث نمبر: ۳۱۸۱، مسند القنای حدیث نمبر: ۶۲۹) (دلوں کو وقتاً فوقتاً راحت پہنچاؤ، کیونکہ دل جب تھک جاتے ہیں تو بے بصیرت ہو جاتے ہیں)۔ اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن اس کی تائید حضرت حفظہ والی حدیث سے ہوتی ہے جو ابھی چند سطور پہلے گزری ہے۔

جب تفریح و مباح ہے تو تفریح کی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر، اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا بھی اپنی ذات کے اعتبار سے جائز ہے، لیکن ایک عقلمند مسلمان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے شہر یا گاؤں کے سیاحتی جگہوں میں ہی سیر و تفریح کرے، کیونکہ موجودہ دور میں عام طور سے سیاحت شرعی ممنوعات پر مشتمل ہوتی ہے، اسی طرح اس میں کثیر رقوم کا بھی صرفہ ہے، اور ایسے ہی اس میں قیمتی اوقات اور انسانی طاقت کا ضیاع ہے، جس کا استعمال ایسے عمل میں ہو سکتا تھا جو امت اور سماج کے لئے مفید ہو۔

ہاں اگر سیاحتی مقام پر عریانیت اور فحاشی کا کھلے عام مشاہدہ ہو، تو اس جگہ کے لئے سفر درست نہ ہوگا، موصلاً حنفی تحریر کرتے ہیں:

”ومن دعى إلى وليمة عليها لهو وإن علم به لا يجيب“ (الاختیار، کتاب الکراہیہ ۱۸۹، ط: الشاملة) (جسے ایسے ولیمہ میں شرکت کی دعوت دی جائے، جس میں ممنوع لہو و لعب ہو، اگر اسے اس بات کا علم ہو، تو دعوت قبول نہ کرے)۔

ب۔ تفریح کی مقصد کے لئے چونکہ سیاحت جائز ہے، لہذا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا بھی درست ہے، ہاں اگر سفر کرنے والے کو اس سیاحتی مقام پر جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے خطرہ کا گمان ہو، تو ایسی صورت میں اس سیاحتی مقام کا سفر مکروہ تنزیہی ہے۔ اور اگر اسے اس خطرہ کا گمان غالب ہو، تو ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔

اور اگر اس سفر میں جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے خطرہ کا یقین ہو، تو ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا حرام ہے، اس لئے کہ جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ مقاصد شریعت میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة“ (البقرہ: ۱۹۵) (اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)، نیز اللہ رب العزت کا فرمان ہے: ”ولا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيماً“ (النساء: ۲۹) (اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں جمرہ کے نزدیک لوگوں کے ازدحام کو دیکھ کر ارشاد فرمایا: ”أيها الناس! لا تقتلوا أنفسكم ارموا بمثل حصي الخذف“ (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۶۰۸۹، اور یہ حدیث صحیح ہے) (لوگو! اپنے آپ کو قتل نہ کرو، اور ایسی کنکری کے ساتھ رمی کرو جو انگلی پر رکھ کر پھینکی جاسکتی ہو)۔

چنانچہ اس حدیث سے پتہ چلا کہ آدمی کو ایسی چیز کے درپے نہیں ہونا چاہئے جو ہلاکت کا سبب ہو۔

ج۔ ایسے سیاحتی مقام پر ازراہ تفریح جانا جہاں غیر شرعی باتوں کا غلبہ نہ ہو، جائز ہے، اور وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا بھی جائز ہے، اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانا بھی درست ہے۔

الدر المختار میں ہے: ”وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرًا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه، بل بعد تغيره، وقيل: يكره لإعانتته على المعصية“، وقال في رد المحتار: ”وجاز أي عنده لا عندهما بيع عصير عنب: أي معصوره المستخرج منه، فلا يكره بيع العنب والكرم منه بلا خلاف كما في المحيط، لكن في بيع الخزانة أن بيع العنب على الخلاف... يؤخذ منه أن المراد بما لا تقوم المعصية بعينه ما يحدث له بعد البيع وصف آخر يكون فيه قيام المعصية، وأن ما تقوم المعصية بعينه ما توجد فيه على وصفه الموجود حالة البيع كالأمرد والسلاح“ (رد المحتار مع

الدر المختار. کتاب الحظر والاباحہ فصل فی البیہۃ (۹۰۵۶۰۵۶۱۶)۔

(انگور کا رس ایسے شخص سے بیچنا جائز ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ اسے شراب بنائے گا، اس لئے کہ معصیت اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوگی، بلکہ اس کے بدلنے کے بعد ہوگی، اور کہا گیا ہے کہ مکروہ ہے اس کے معصیت پر مرد دینے کی وجہ سے، اور ”رد المحتار“ میں ہے: اور امام صاحب کے نزدیک، نہ کہ صاحبین کے نزدیک انگور سے نکالا ہو اس بیچنا جائز ہے (ایسے شخص سے جو اسے شراب بنائے)، چنانچہ ایسے شخص سے انگور اور انگور کی تیل بیچنا بغیر اختلاف کے جائز ہے، جیسا کہ الحیظ میں ہے، لیکن خزانة المفتین کی کتاب البیوع میں ہے کہ انگور بیچنا بھی اسی اختلاف پر ہے..... اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس کی ذات کے ساتھ معصیت قائم نہ ہو، اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے لئے بیع کے بعد دوسری صفت پیدا ہو جائے، جس میں معصیت کا قیام ہو، اور جس کی ذات کے ساتھ معصیت قائم ہو، اس سے مراد وہ چیز ہے جس میں بیع کی حالت میں پائی جانے والی اس کی صفت پر معصیت کا قیام ہو، جیسے امر اور تھیاری)۔

اور اگر سیاحتی مقام پر غیر شرعی باتوں، عورتوں، مردوں کے اختلاط اور فحاشی کے مشاہدہ کا غلبہ ہو تو وہاں ازراہ تفریح جانا جائز نہیں ہے، اور اگر علمی میں چلا جائے، تو اس پر لازم ہے کہ وہاں سے چلا آئے۔

الدر المختار میں ہے: ”وان علم أولاً باللعب لا یحضر أصلاً، سواء كان ممن یقتدی به أولاً“، وقال فی رد المحتار: ”أن علیاً رضی اللہ عنہ قال: صنعت طعاماً، فدعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجاء فرأى فی البیت تصاویر فرجع“ ومفاد الحدیث أن یرجع ولو بعد الحضور“ (رد المحتار کتاب الحظر والاباحہ، قبیل فصل فی اللبس (۹۰۵۰۲)۔

(اور اگر پہلے سے ناجائز کھیل کا علم ہو تو ولیمہ میں شرکت نہ کرے، خواہ اس کی شخصیت کی پیروی کی جاتی ہو یا نہیں اور ”رد المحتار“ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے کہا کہ میں نے کھانا تیار کیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی چنانچہ آپ آئے، اور گھر میں تصویریں دیکھ کر واپس چلے گئے حدیث پاک سے یہ بات نکلتی ہے کہ حاضری کے بعد بھی لوٹ جائے)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وقد نزل علیکم فی الکتاب أن إذا سمعتم آیات اللہ یکفربہا ویستہزأ بہا فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ إنکم إذا مثلتم“ (النساء: ۱۳۰) (اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر کا جارہا ہے، اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، وہاں نہ بیٹھو، جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں، اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی ان ہی کی طرح ہو)۔

اور اگر اسے سیاحت پر جانے والے کا قصد معلوم نہ ہو، اور اس کا ارادہ معصیت پر تعاون دینا بھی نہ ہو، تو ایسے شخص کو سواری کرایہ پر دینا، اور اس سے اشیاء خورد و نوش فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

رد المحتار میں ہے: ”قوله ”ممن یعلم“: فیہ إشارة إلى أنه لو لم یعلم لم یکرہ بلا خلاف“ (رد المحتار کتاب الحظر والاباحہ، فصل البیہۃ (۹۰۵۶۰۵۶۱۶) (مصنف کا قول جس کے بارے میں معلوم ہو اس میں اشارہ ہے کہ اگر معلوم نہ ہو تو بغیر کسی اختلاف کے مکروہ نہیں ہے)۔

اسی طرح پبلک پارکوں کے قریب دکان کھولنا بھی درست ہے، جبکہ اس کی نگاہ برائیوں اور فحاشیوں پر نہ پڑتی ہو۔

۵- آمد و رفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرنے کے لئے ٹور کمپنی قائم کرنا جائز ہے، جبکہ سیاحت پر جانے والے کے قصد کا علم نہ ہو، اور معصیت پر تعاون دینے کا ارادہ نہ ہو، کیونکہ وسائل کے لئے مقاصد کے احکام ہیں، چنانچہ ہر وسیلہ جو حرام اور معصیت تک پہنچانے والا ہو حرام ہے، سوا اگر سیاحت پر جانے والے کا قصد معلوم نہ ہو، تو اس کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہے، جیسا کہ علامہ شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوا جو ابھی چند سطریں پہلے گزری ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں اجارہ اور بیع کا معاملہ ہر شخص کے ساتھ جائز ہے۔

ہاں البتہ اگر کمپنی کو گمان غالب یا یقین ہو کہ یہ شخص سیاحت پر زنا کاری یا شراب نوشی یا رقص یا ناجائز گانے کے لئے جا رہا ہے، تو ایسی صورت میں اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح ٹور پر جانے والے غیر مسلم کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، خواہ اس کا مقصد مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کرنا ہو، یا تفریح مقصد ہو، اور اس میں کفر یا معصیت پر مرد دینا نہیں ہے، اس لئے کہ معصیت فاعل مختار کے فعل سے حاصل ہوگی، اور عبادت پہنچانے کا لازمی تقاضا نہیں ہے، اس لئے کہ سیاحت پر جانے والے کو پہنچانا کبھی تفریح کے لئے بھی ہوتا ہے۔

الذرا المختار میں ہے: اور کنیسہ کی تعمیر کرنا اور اپنی ذات یا اپنے جانور کے ذریعہ اجرت پر ذمی کی شراب ڈھونا جائز ہے، شراب نچوڑنا جائز نہیں، اس لئے کہ معصیت اس کی ذات کے ساتھ ہے، اور کوفہ کے گاؤں میں گھر کرایہ پر دینا جائز ہے، صحیح قول کے مطابق دوسرے گاؤں میں دینا جائز نہیں، رہا کوفہ کے علاوہ دیگر شہر اور گاؤں تو وہاں ان کو قدرت نہیں دی جائے گی، اس لئے کہ وہاں اسلام کے شعائر غالب ہیں، اور کوفہ کے گاؤں کو اس لئے خاص کیا گیا، کیونکہ وہاں کے اکثر باشندے ذمی ہیں، تاکہ وہ ذمی اس میں آتش کدہ یا گرجا گھر یا عبادت خانہ بنائے، یا اس میں شراب پیتی جائے، اور صاحبین کا قول ہے کہ یہ مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ یہ معصیت پر اعانت ہے، اور یہی ائمہ ثلاثہ کا قول ہے (الذرا المختار مع رد المحتار، کتاب الحظر والاباحہ ۵۶۲/۹-۵۶۳)۔

اور ”خانہ“ کے حوالہ سے ”رد المحتار“ میں ہے: ”ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل“ (رد المحتار کتاب الحظر والاباحہ فصل في البيع ۵۶۳/۹) (اور اگر اپنے آپ کو اجرت پر دے تاکہ کنیسہ میں کام کرے، اور اس کی تعمیر کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اس کام کی ذات میں کوئی معصیت نہیں ہے)۔

مصنف کا قول: ”اور ذمی کی شراب ڈھونا جائز ہے“ زلیعی کا کہنا ہے کہ یہ امام صاحب کے نزدیک ہے، اور صاحبین کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔

جب کہ امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک ”کل ما ہو سبب لمعصية محققة أو مظنونة فهو حرام“ (خاشية البجيرمي على المنهاج، کتاب البيوع، فصل فيما نهي عنه من البيوع ۲۸۶، ط: الشاملة) (ہر وہ چیز جو یقینی یا ظنی معصیت کا سبب ہو، تو وہ حرام ہے)۔

اس پر قیاس کرتے ہوئے ان کے نزدیک اس مقصد کے لئے سیاحت کرنے والے کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں کفار اور اہل بدعت کا ان کے نزدیک مقدس مقامات تک پہنچنے میں تعاون کرنا ہے اور یہ کفر یا کم از کم معصیت پر مدد دینا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے، چنانچہ فرمان الہی ہے: ”وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان واتقوا الله ان الله شديد العقاب“ (المائدہ: ۲) (اور نیک اور خدا ترسی کے کام میں سب سے تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی کے کام میں کسی سے تعاون نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے)۔

اور اس لئے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف سوکھانے اور کھلانے والے کو گناہ گار نہیں قرار دیا ہے، بلکہ تحریر یا گواہی کی ذریعہ ان کی ہمدرد کرنے والے کو ان ہی کی طرح گناہ گار قرار دیا ہے، اور اسی طرح شراب بیچنے اور خریدنے والے ہی پر لعنت نہیں کی ہے، بلکہ نچوڑنے، نچروانے اور ڈھونے والے پر بھی لعنت کی ہے۔

اور علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی سے پوچھا کیا گیا کہ ”اس کافر سے مشک بیچنے کا کیا حکم ہے جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اسے اس لئے خرید رہا ہے تاکہ اسے اپنے بت پرلے، اور اسی طرح اس حربی سے جانور بیچنے کا کیا حکم ہے، جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اسے ذبح کے بغیر کھانے کے لئے مار ڈالے گا؟ تو انہوں نے جواب دیا: ”يجرم البيع في صورتين، كما شمله قولهم: كل ما يعلم البائع أن المشتري يعصيه به، يجرم عليه بيعه له، وتطيبب الصنم، وقتل الحيوان المأكول بغير ذبح معصيتان عظيمتان، ولو بالنسبة إليهم، لأن الأصح أن الكفار مخاطبون بفروع الشريعة كالمسلمين، فلا تجوز الإعانة عليهما ببيع ما يكون سبباً لفعلهما، وكالعلم هنا غلبة الظن“ (فتاویٰ ابن حجر الہیتمی ۲۰۲۶، ط: دار الفکر بیروت)۔

(دونوں صورتوں میں بیع حرام ہے، جس طرح فقہاء شوافع کا یہ قول اسے شامل ہے کہ ”ہر وہ چیز جس کے بارے میں بیچنے والے کو معلوم ہو کہ خریدار اس کے ذریعہ معصیت کرے گا تو اس پر اس چیز کو اس کے ساتھ بیچنا حرام ہے، اور بت کو خوشبو لگانا، اور جس جانور کا گوشت کھایا جائے اسے ذبح کے بغیر مار ڈالنا، دو بڑی معصیت ہیں، خواہ کفار کے لحاظ سے، کیونکہ صحیح قول کے مطابق کفار مسلمانوں کی طرح شریعت کے جزئیات کے مخاطب ہیں، تو اس چیز کو بیچنے کے ذریعہ جو ان دونوں کے کرنے کا سبب ہو، ان دونوں پر اعانت کرنا جائز نہ ہوگا، اور یقین کی طرح اس جگہ گمان غالب ہے)۔

نیز ان سے اس کافر کے بارے میں پوچھا گیا، جو اپنے بت کا راستہ بھنگ جائے، اور کسی مسلمان سے اس کا راستہ معلوم کرے تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اس کی رہنمائی کرے، تو انہوں نے جواب دیا: ”ليس له أن يدلّه لذلك؛ لأننا لا نقر عابدي الأصنام على عبادتها، فإن شأده للطريق إليه إعانة له على معصية عظيمة، فحرم عليه ذلك“ (مرجع سابق ۲۲۲/۳)۔

(اس کے لئے اس مقصد سے رہنمائی کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ ہم بت پرستوں کو بت پرستی پر برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں، تو اس کا اسے اس کی جانب راستہ بتانا بڑی معصیت پر مدد دینا ہے، لہذا اس پر یہ حرام ہے)۔

میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اختلاف سے بچتے ہوئے، اس مقصد سے کافر کے ساتھ معاملہ نہ کرے، بلکہ صرف تفریح کے مقصد کے لئے معاملہ کرے۔

۴۔ تصویر کشی یا عکس بندی اپنی ذات کے اعتبار سے حرام ہے، اسے انجام دینا جائز نہیں ہے، جبکہ انسان یا جانور کی تصویر کشی ہو، اس سلسلہ میں احادیث پاک میں سخت وعیدیں آئی ہیں، یہاں ان تمام احادیث شریفہ کو جمع کرنا مقصود نہیں کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، صرف ایک حدیث پاک درج ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُونَ“ (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۹۵۰ صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۱۰۹) (قیامت کے دن تصویر کشی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سب سے سخت عذاب والے ہوں گے)۔

حدیث پاک سے مطلق تصویر کشی کی حرمت ظاہر ہوتی ہے، خواہ ہاتھ سے کی گئی ہو، یا آلہ سے، بلکہ آلہ سے لی گئی تصویر بالکل اصل کے مطابق ہوتی ہے، لہذا اسے ہاتھ سے بنائی گئی تصویر کے مقابلہ زیادہ حرام ہونا چاہئے۔

البتہ غیر جاندار جیسے درخت اور پتھر وغیرہ کی تصویر کشی مباح ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث میں ہے:

”إِنَّ كُنْتَ لَا بَدَ فَاعْلَأْ فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَمَا لَانَفْسَ لَهُ“ (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۲۲۵، صحیح مسلم ۲۱۱۰) (اگر تیرے لئے تصویر کشی ضروری ہے تو درخت اور بے جان کی تصویر کشی کرو)۔

لیکن اس وقت فلم کا انسانی ذہن و دماغ پر زبردست اثر ہے، اور خیالات و جذبات پر اس کی گہری چھاپ پڑ رہی ہے، اور فلموں کے سلسلہ میں عام ابتلاء ہے، اور لوگوں کو ان سے باز رکھنا آسان نہیں رہا، چنانچہ وہ فحش فلموں کے مشاہدہ میں غرق ہیں، اور صرف حرمت کا بیان اب مفید نہیں رہا، لہذا میری حقیر رائے میں اصلاحی اور تعلیمی مقاصد سے فلم سازی کی گنجائش ہے، دو ضرر میں سے ہلکے ضرر کا ارتکاب کرتے ہوئے، اور بڑے فساد کو دفع کرنے کی خاطر اور لوگوں کو گناہوں سے باز رکھنے کی مصلحت کو جو دو میں لانے کے لئے، لیکن ایسی فلم میں درج ذیل شرعی ضابطے کا پایا جانا لازمی ہے:

۱۔ وہ فلم تخریب کاری اور فساد انگیزی کا ذریعہ نہ ہو۔ ۲۔ ایسے مناظر سے خالی ہو جو شہوت بھڑکانے والے ہوں۔ ۳۔ عورت کی عریاں یا نیم عریاں تصویر سے خالی ہو۔ ۴۔ عورت نامناسب کردار میں ظاہر نہ ہو۔ ۵۔ وہ فلم اوقات کو بر باد کرنے کا ذریعہ نہ ہو۔ ۶۔ میوزک اور فحش گانے سے خالی ہو۔ ۷۔ جعل سازی اور گمراہی کی تعلیم کا ذریعہ نہ ہو۔ ۸۔ اس میں کائنات کے واقعات میں کسی طاقت کو متصرف نہ دکھایا گیا ہو، کیونکہ یہ سخت برائی ہے اور خالق کا انکار یا مخلوق کو اس کے مشابہ قرار دینا ہے، اور مشاہدہ کرنے والے کو خالق کے خلاف سرکشی اور اس کا انکار کرنے کی دعوت ہے۔ ۹۔ عشقیہ کہانی پر مشتمل نہ ہو۔ ۱۰۔ حقوق اللہ یا حقوق العباد کی تضحیح یا اہمال کا ذریعہ نہ ہو۔ ۱۱۔ کفر و بدعت کے رموز کی تقدیس پر مشتمل نہ ہو۔ ۱۲۔ بے حیائی، فحاشی، منکرات اور زنا کی تعلیم پر مشتمل نہ ہو۔ ۱۳۔ اس کا مضمون دھوکہ، فریب، جھوٹ اور افتراء پر دازی کی تعلیم پر مشتمل نہ ہو۔ ۱۴۔ رقص سے خالی ہو۔ ۱۵۔ حرمتوں کی پامالی کا ذریعہ نہ ہو۔ ۱۶۔ انبیاء، ملائکہ، عشرہ مبشرہ، امہات المؤمنین، نبی اکرم ﷺ کی صاحبزادیوں، حضرت امام حسن اور حسین کی تمثیل پر مشتمل نہ ہو۔ ۱۷۔ اس میں حقائق کو مسخ نہ کیا گیا ہو، اور تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے اجتناب کیا گیا ہو۔

اور جب اس طرح کی فلم سازی کی گنجائش ہے تو اس کا مشاہدہ بھی جائز ہے، اور اسے پیشہ بنانا بھی درست ہے، لیکن یہ گھٹیا کمائی کے ذرائع میں سے ہے، جیسا کہ گذرا، چنانچہ ایک مرد مسلم کو ایسا عمل اختیار کرنا چاہئے جو اس کے لئے اور اس کے سماج و امت کے لئے زیادہ مفید ہو۔

رہی وہ فلم جو بے جان کی تصویر اور قرآنی مقامات کو سمجھانے کے لئے اس کی تصویر پر مشتمل ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس کا بنانا، دیکھنا، حاصل کرنا اور اسے پیشہ بنانا اور اس کے ذریعہ کمائی کرنا سب جائز اور حلال ہے۔

۵: الف۔ کارٹون بنانا جائز ہے، کیونکہ کارٹون میں حقیقی تصویر کے خدوخال پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، اور اس لئے کہ کارٹون کی عبادت اور تعظیم نہیں ہوتی ہے، چنانچہ جس طرح بے جان تصویر کا استثناء کیا گیا ہے، اس کا بھی استثناء کیا جاسکتا ہے، علامہ شامی تحریر کرتے ہیں: ”الذی یظہر من کلامہم أن العلة إما التعظیم أو التشبیہ... والتعظیم أعم...“ (رد المحتار کتاب الصلاة باب ما یفسد الصلاة وما یکرہ فیہا ۲۰۲۱۹) (ان فقہاء کے کلام سے جو چیز ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ تصویر کی حرمت کی علت یا تعظیم یا تشبیہ ہے۔ اور تعظیم زیادہ عام ہے)۔

لیکن جواز کے لئے درج ذیل ضوابط کا پایا جانا شرط ہے۔

الف۔ سماج یا حکومت کی برائیوں پر نقد کرنے کے ذریعہ حکومت یا سماج کی اصلاح مقصود ہو، یا کسی اہم مفید شئی کی طرف توجہ مبذول کرنا ہو، یا برائیوں سے

اجتناب پر ابھارنا ہو، یا معلومات میں اضافہ کرنا یا غور و فکر کی تعلیم دینا مقصود ہو۔ کسی شخصیت کو اذیت پہنچانا مقصود نہ ہو۔ ایسا کارٹون نہ ہو جو متعین شخص کی نسبت یا تحقیق کی طرف اشارہ کرے۔ عورت کے کارٹون میں اس کی عریاں یا نیم عریاں جھلک نہ ہو۔ وہ کارٹون، بد اخلاقی، بے حیائی اور زرائع کی دعوت دینے والا نہ ہو۔

ب۔ جب کارٹون بنانا جائز ہے، تو اس کو دیکھنا، اسے پیشہ اور ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا سب درست ہے، لیکن یہ گھٹیا ذرائع آمدنی میں سے ہے، جیسا کہ گزرا، چنانچہ ایک مرد عاقل کو چاہئے کہ ایسا پیشہ اختیار کرے جو اس کے اور اس کے سماج اور امت کے لئے نفع بخش ہو۔

- بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کرنے کے لئے ڈرامے اسٹیج کرنا جائز ہے، جبکہ درج ذیل شرعی ضوابط کے دائرہ میں ہو:

- اس ڈرامہ میں غیبیات کا تمسخر، یا حلال و حرام کے مسائل کا استہزاء، یا بدعت کی دعوت نہ ہو، اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام، ملائکہ، عشرہ مبشرہ، امہات المؤمنین، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں، حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہم، جمعین کا کردار ادا نہ کیا گیا ہو۔

- حق اور صحیح بات کا التزام ہو۔ یا مقصد ڈرامہ ہو، جس کا مقصد درست خیال کی ترسیل ہو۔ عورت پر کشت لباس میں ظاہر نہ ہو، اور نامناسب کردار ادا نہ کرے۔

نیز فرضی ڈرامہ لکھنا بھی جائز ہے جس طرح ایسی کتاب لکھنا درست ہے جو خیالی کہانیوں پر مشتمل ہو، جبکہ قاری کو اس کا علم ہو، اور اس کا مقصد نیک ہو، جیسے

تعلیم، اور وعظ و نصیحت کے لئے کہانیاں کہنا، مثالیں بیان کرنا، اور اچھائیوں کو ذہن میں بٹھانا، جیسے مثال کے طور پر مقامات حریری میں ہے، اور یہ بات معلوم نہیں

کہ کسی اہل علم نے اس پر تنقید کی ہو، جبکہ تمام علماء اس سے واقف اور اس کی حقیقت سے باخبر ہیں، اور ان کو واقفیت ہے کہ یہ خیالی قصے ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی

تعلق نہیں ہے، اسی طرح علماء نے ”کلید و دمنہ“ کے پڑھنے پر تنقید نہیں کی، جبکہ وہ خیالی قصے ہیں، جو جانوروں کی زبان پر گھڑے گئے ہیں، یہی رائے ابن حجر عسقلانی

شافعیؒ کی ہے، وہ امام نووی کا کلام تحریر کرتے ہیں: ”ویؤخذ من کلامہ هذا أيضا حل أنواع اللعاب الخطرة من المذاق بها الذین

تغلب سلامتهم منها، ويحل التفرج عليهم حينئذ، ويؤيده قول بعض أئمتنا في الحديث الصحيح؛ ”حدثوا عن بني

إسرائيل ولا حرج“، وفي رواية: ”فإنه كانت فيهم أعاجيب“، وهذا دال على حل سماع تلك الأعاجيب للفرحة لا

للحجة“ (شيخ الاسلام شهاب الدين ابو العباس احمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي (۵۹۷۲) ”تحفة المحتاج بشرح المنهاج“، كتاب

السابقة ۲۸۲، ۴، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الاولى ۱۳۲۱ھ (۲۰۰۱ء)) (اور مصنف کے اس کلام سے کھیل کی خطرناک قسموں کی حلت بھی معلوم

ہوتی ہے، جبکہ اس کے ماہرین کے ذریعہ ہو، جن سے ان کی سلامتی غالب ہو اور اس وقت اس کا تماشا دیکھنا بھی حلال ہے، اور اس کی تائید حدیث صحیح: بنو اسرائیل

کے بارے میں بیان کرو اور کوئی حرج نہیں“ اور ایک روایت میں ہے: ”کیونکہ ان کے اندر حیرت ناک باتیں تھیں“ کے سلسلہ میں ہمارے بعض ائمہ کے قول سے

ہوتی ہے کہ یہ حدیث ان تعجب خیز امور کو تفریح کے طور پر نہ کہ دلیل کے طور پر سننے کی حلت پر دلالت کرتی ہے)۔

اس کے بعد ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں: ”ومنه يؤخذ حل سماع الأعاجيب والغرائب من كل ما لا يتيقن كذبه بقصد

الفرحة، بل وما يتيقن كذبه، لكن قصد به ضرب الأمثال والمواعظ، وتعليم نحو الشجاعة على السنة آدميين أو

حيوانات“ (مرجع سابق ۲۸۲، ۴، ۲۸۳) (اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حیرت ناک و تعجب خیز امور کا سننا حلال ہے، ان چیزوں سے بھی جن

کے جھوٹ کا یقین نہ ہو بطور تفریح، بلکہ ان چیزوں سے بھی جن کے جھوٹ کا یقین ہو، لیکن اس سے مثالیں اور وعظ و نصیحت بیان کرنا اور بہادری جیسی

صفت کی تعلیم آدمی یا جانوروں کے زبان پر مقصود ہو)۔

جبکہ حنفیہ کے نزدیک ایسی کہانی بیان کرنا متقدمین کی باتوں میں سے جس سے کوئی اصل معروف نہ ہو، یا کہانی کو مزین کرنے کے لئے گھٹانا بڑھانا مکروہ

ہے (الدر المختار مع رد المحتار فی آخر کتاب الخطر والاباحہ تحت فروع ۶۰۵۹)۔

اور علامہ شامی تحریر کرتے ہیں: ”فهل يقال عندنا بجوازہ إذا قصد به ضرب الأمثال ونحوها؟ بجزر“ (رد المحتار ۹۰۵۸۰) (تو کیا

ہمارے فقہاء احناف کے یہاں کمی بیشی کے جواز کا قول اختیار کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس سے مثالیں وغیرہ بیان کرنا مقصود ہو، اس کی نتیجہ کر لی جائے)۔

علامہ شامیؒ کی عبارت سے واضح ہے کہ جب فرضی کہانی یا اصل کہانی میں کمی بیشی نیک مقصد سے ہو، تو اس صورت میں انہیں مکروہ ہونے پر جرم نہیں ہے۔

لہذا ہماری رائے میں فرضی ڈرامہ لکھنا اور اسٹیج کرنا جائز ہے، جبکہ اخلاق فاضلہ کی تعلیم، اچھائی کی عادت ڈالنے، بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے

مفاسد پر تنقید جیسے اچھے مقاصد کے لئے ہو۔ اور جب نیک مقصد سے فرضی ڈرامہ لکھنا اور اسٹیج کرنا جائز ہے تو اسے دیکھنا اور پیشہ بنانا بھی جائز ہے، لیکن یہ حقیر

ذرائع آمدنی سے ہے، چنانچہ ایک عقلمند مسلمان کو چاہئے کہ وہ ایسا ذریعہ آمدنی اختیار کرے جس کا فائدہ اس کے ساتھ پوری امت کو بہتر طریقہ سے پہنچے۔ ☆☆☆

## تفریح، سفر و سیاحت کے وسائل اور شریعت کا موقف

مفتی حنیف حسین و مفتی محمد اودما گروہی علیہ

سوال نمبر (۱) الف۔ شریعت میں مزاج جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ کسی کی ہتک نہ ہو اور جو بھی کلام ہو وہ مبنی برحقیقت ہو چنانچہ آپ سے مزاج ثابت ہے بچے بوڑھے اور نوجوانوں سے۔ عن ابي هريرة قال: قالوا يا رسول الله ﷺ انك تداعبنا قال: ايني لا أقول إلا حقا (مشکوٰۃ ص ۲۱۶)۔ عن أنس ابن النبي ﷺ قال له: يا ذا الأذنين (ايضا ص ۲۱۶)۔ وعنه عن النبي ﷺ قال لأمرأة عجوز: إنه لا تدخل الجنة عجوز فقالت وما لهن وكانت تقرأ القرآن فقال لها: اما تقرئين من القرآن إنا أنشأناهن إنشاء فجعلناهن أبكارا (ايضا)۔

عن ابن عباس عن النبي ﷺ قال لا تمار أخاك ولا تمازحه ولا تعده موعدا فتخلفه (ايضا ص ۲۱۶)۔ ولا بأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلام ياتر به أو يقصد به إضحاك جلسائه (عالمگیری جلد ۵ ص ۲۵۲)۔

ب۔ مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو میرے نزدیک اسکے جائز ہونے کیلئے ضروری ہے کہ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہو اور اسمیں علمی مواد ہو اسمیں کسی کی ہتک نہ ہو اور مبنی برحقیقت ہو، غیر شرعی لباس نہ استعمال کئے جائیں، اسکے ساتھ ساتھ اسکی وجہ سے نماز وغیرہ سے غفلت نہ ہو، مزید برآں اسمیں نامحرم عورتیں شامل نہ ہوں یہ بھی یاد رہے کہ اس میں مردوں کو کوئی رول نہ ادا کرنا ہو اور اسمیں فحش الفاظ کا استعمال نہ ہو اس کے علاوہ دوسری ممنوعہ چیزیں استعمال نہ کی جائیں جیسے بینڈ باجہ وغیرہ اور رہا مشاعرہ تو اسکا بھی منعقد کرنا فی نفسہ جائز ہے، لیکن اسکے لئے ضروری ہے کہ اشعار میں کسی زمدہ عورت کا وصف نہ بیان کیا جائے اسمیں نامحرم نہ ہو، اس میں حقیقت کی ترجمانی ہو محض طائرانہ پرواز نہ ہو نیز دوسری فحش چیزیں موجود نہ ہوں، کیونکہ آپ سے شعر وغیرہ کا سننا ثابت ہے اور اسمیں عدلی اور وجودی دونوں شرطیں موجود تھیں نیز آپ نے اشعار کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: إن من الشعر حکمة (مشکوٰۃ ص ۲۰۹)۔ نیز آپ نے لبید شاعر کے اشعار کی بھی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

أصدق كلمة قالها الشاعر كلمة لبید: ألا كل شیء ما خلا الله باطل (ايضا ص ۲۰۹)۔

لیکن ہمارے اس دور میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اسکی مضرت کو دیکھتے ہوئے ناجائز ہونا چاہئے، کیونکہ اسمیں نماز وغیرہ سے غفلت اور نامحرموں کی شرکت ہوتی ہے بلکہ مشاعرہ میں تو نامحرم عورتیں ہی توجہ کا مرکز ہوا کرتی ہیں چنانچہ کیا جوان کیا بوڑھے بھی کی توجہ ہوتی ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس مشاعرہ میں شاعرات نہیں ہوتیں لوگ اسمیں اپنی شرکت پسند نہیں کرتے اور نتیجہً مجمع قلیل ہوتا ہے۔

ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنا انہیں پڑھنا جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ کہانیاں مبنی برحقیقت ہوں نیز ان کی خرید و فروخت کرنا ان کو شائع کرنا جائز ہے، لیکن یہ بات ہے کہ آج کے دور میں اسطرح کی جو کتابیں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں اسمیں دلچسپ جھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں، ایک کتاب وہ ہوتی ہے جس کو ہم ناول سے تعبیر کرتے ہیں پھر اس میں دو طرح کی کتابیں ہوتی ہیں ایک تاریخی ناول جس میں کچھ تاریخی معلومات دلچسپ انداز میں پیش کی جاتی ہیں ساتھ ساتھ اس میں کسی مرد اور کسی عورت کو فرض کر کے اس کو موضوع بنا کر اس کے محبوبانہ کلام اور معشوقانہ گفتگو کو پیش کیا جاتا ہے، نتیجہً یہ ہوتا ہے کہ تاریخی معلومات سے ذہن ہٹ کر اسی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بعض مرتبہ نماز بھی اسکے زد میں آجاتی ہے، دوسری وہ ناول جس میں تاریخ کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا بلکہ صرف محبوبانہ اور معشوقانہ گفتگو ہوا کرتی ہے، بہت ہی دلچسپ انداز میں اس کا تذکرہ ہوا کرتا ہے، آدمی اس کو پڑھتا ہے عجیب لطف محسوس کرتا ہے جس کو احساس تو کیا جاسکتا ہے لیکن بیان کرنا مشکل اور عجیب بات یہ ہے کہ اسکو پڑھنے کے بعد افسوس ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ اسکا نتیجہً ظاہر نہیں ہوتا اور بعض مرتبہ تو (لفظ جاری) کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے اس وقت اور بھی

ط نائب مفتی و صدر مفتی جامعہ کاشف العلوم، گجرات۔

افسوس ہوتا ہے کیونکہ وقت بھی برباد کیا نتیجہ بھی نہ ملا مزید یہ کہ اگلی کتاب کیلئے مالی نقصان بھی اور ایسا نہیں ہے کہ ایک کے بعد دوسری کتاب لے لی جائے تو پریشانی دور ہو جائے بلکہ بے درپے کتابوں کی خریدنے اور پڑھنے کے بعد بھی (لفظ جاری) جاری ساری رہتا ہے جیسے خاتون مشرق اور مشرقی آنچل وغیرہ اور اسکے علاوہ ایک کتاب وہ ہے جس میں صرف جرائم ہی کا تذکرہ ہوتا ہے اور ایک وہ جسمیں صرف خیریں ہوا کرتی ہیں علاقائی اور عالمی۔ نیز ایسی تصویریں ہوتی ہیں جسکے دیکھنے کے بعد انسان کا اپنے آپ کو قابو میں رکھنا اور اسپر بری نظر نہ لگانا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن اگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اس سے بڑھکر اگر مجال کہا جائے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا اس وجہ سے بندہ کے نزدیک شمار کرائی گئی اس طرح کی تمام کتابیں انکا پڑھنا لکھنا اور خرید و فروخت اور ان کا شائع کرنا ممنوع ہے۔۔۔ اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو مزاحیہ کتابوں کی خرید و فروخت اور ان کی اشاعت جائز ہے۔

۴- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مبنی بر حقیقت ہو اور کسی کی ہتک نہ ہو جب یہ جائز ہے تو اسکو پیشہ بنانا بھی جائز ہے البتہ اب بہت کم ہوتا ہے کہ اس طرح کی چیزوں میں کذب کی آمیزش نہ ہو لہذا اس صورت میں ناجائز ہوگا۔

۵- جائز ہے جبکہ اس میں عورتوں اور مردوں کو شامل نہ کیا جائے جس سے مذہب اسلام پر کوئی اعتراض یا تحقیر و تخفیف کی شکل نہ بننے پائے۔ جب ان تمام شرائط کیساتھ یہ جائز ہے تو اس کا دیکھنا اور اس کا سننا بھی جائز ہے۔

۶- جائز ہے: عن قتادة قال سئل عن ابن عمر هل كان أصحاب رسول الله ﷺ يضحكون قال: نعم والإيمان في قلوبهم أعظم من الجبل وقال بلال بن سعد: أدرکتهم يشدون بين الأغراض ويضحك بعضهم إلى بعض فإذا كان الليل كانوا رهباناً (مشکوٰۃ ص ۲۰۶)۔ لیکن ان کا ہنسنا ہنسنا ہے تکلف ہوتا تھا نہ کہ بتکلف۔ اور ڈاکٹروں کا یہ مشورہ کہ ضحک وغیرہ سے صحت اچھی رہتی ہے یہ تسلیم ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اسکے لئے باقاعدہ مجلسیں منعقد کی جائیں جہاں تک میرا خیال ہے کہ ڈاکٹروں کے مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ حتی الامکان ہنس کھو اور ہنساں ہنساں رہنا چاہئے، باقاعدہ اسکے لئے مجلس کا منعقد کرنا ضروری نہیں البتہ اگر اس طرح مجلسیں منعقد کی جائیں تو اسکے لئے عورتیں اور مرد نہ ہوں اور نہ ہی ذکر اللہ سے غفلت ہو لیکن آج کے دور میں وہ مجلس کوئی مجلس نہیں جن میں عورت نہ ہو تو گویا کہ اس طرح کی مجلسوں میں مجاہسی کا ارتکاب ہوتا ہے لہذا ممنوع وغیرہ ہوگی اسکے علاوہ صحت کو برقرار رکھنے کیلئے ورزش کو کبھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے بلکہ صحت کی برقراری کیلئے ورزش بہترین چیز ہے اسکے مقابلے میں دوسری چیزیں پیچھے ہیں۔

(۲) (الف) المصارعة بدعة وهل تترخص للشبان قال رحمة الله تعالى: ليست ببدعة وقد جاء الأثر فيها الا انه ينظر إن أراد بها التلهي يكره له ذلك يمتنع عنه وإن أراد تحصيل القوة ليقدر على المقاتلة مع الكفرة فإنه يجوز ويشاب عليه وهو كشرب المثلث، إذا أراد التطرب والتلهي يمتنع عنه ويزجر وإن كان مقاتلاً وأراد به القوة والقدرة عليها جاز ذلك كذا في جواهر الفتاوى (عالمگیری جلد ۵ ص ۲۵۲)۔ ويكره اللعب بالشطرنج والردو الأربعة عشروكل لهو لأنه إن قام بها فاليسر حرام بالنص وهو اسم لكل قمار وإن لم يقام بها فهو عبث (مدایہ رابعہ ص ۲۵)

ان مذکورہ عبارت سے جو اصول واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بروہ کھیل جسمیں باقاعدہ شرط نہ ہو اور نہ لہو کے مقصد سے ہو اور نہ ہی اسکے کوئی دینی نقصان ہو اور نہ ہی دنیا کا نقصان ہو تو اس طرح کا کھیل جائز ہوگا، لیکن یہ بھی دھیان میں رہے کہ جس کھیل میں نہ کوئی فائدہ ہو اور نہ کوئی نقصان ہو وہ بھی منفر کے تحت داخل ہے جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے اور وہ کھیل جسمیں دینی فائدہ یا دنیوی فائدہ ہو لیکن اسپر نہی وارد ہو کسی صورت میں جائز نہ ہوں گے، کیونکہ نبی کے مقابلے میں سارے فائدے پیچھے ہیں۔ ان اصول کی رعایت کرتے ہوئے اگر کوئی کھیل کھیلا جاتا ہے تو وہ جائز ہے چاہے وہ کفار کا ایجاد کیا ہو، چاہے مسلمان کا و علیٰ هذا الأصل فالألعاب التي يقصد بها رياضة الأبدان أو الأذهان جائزة في نفسها ما لم تشتغل على معصية أخرى وما لم يؤد الأهمالك فيها إلى الإخلال بواجب الإنسان في دينه ودينه، والله سبحانه أعلم (تكملة فتح الملهم جلد ۲ ص ۴۲۶)

ب۔ لباس وپوشاک میں کھلاڑیوں کو اس بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ ستر کا افشاء نہ ہو چنانچہ اس کا لحاظ کرکٹ میں تو ہوتا ہے بقیہ کھیلوں میں شاید باید جیسے ہاکی، فٹبال، کشتی، ریس وغیرہ۔

ج۔ اگر معصیہ کا ارتکاب نہ ہو تو ہر طرح کے کھیل کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس پر نہی نہ وارد ہوئی ہو کیونکہ اس دور میں ہر طرح کے کھیل

باقاعدہ پیشہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں البتہ کرکٹ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناجائز ہے، کیونکہ تجربہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس میں فائدہ سے زیادہ نقصان ہے کہ اس میں تمام کھیلوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ وقت لگتا ہے اور جسمانی ورزش کا بھی فائدہ اتنا نہیں ہوتا علاوہ اس میں جو لوگ ملوث ہوتے ہیں ان کو جنون کی حد تک دلچسپی ہو جاتی ہے اور دل و دماغ میں بھی یہی سوار رہتا ہے خاص کر طلبہ میں یہ بات زیادہ ہوتی ہے پھر اگر کہیں کرکٹ دیکھنے جانا ہو یا کھیلے جانا ہو اس وقت کا جنون تو دیکھنے کے لائق ہوتا ہے، جہاں تک کھیلنے والوں کا سوال ہے تو ان میں کم بلکہ دیکھنے والوں میں زیادہ جنون ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ہمارے ایشیائی ملکوں میں کرکٹ میں پیسہ زیادہ ہے دوسرے کھیلوں کے مقابلہ میں لیکن دینی مضرت کو دیکھتے ہوئے میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے، البتہ اگر حدود کا لحاظ کیا جائے اور ذکر اللہ وغیرہ سے غفلت نہ ہو تو یہ فی نفسہ جائز ہے اور جہاں فضیلت کا رواج زیادہ ہو وہاں فضیلت سے منع کرنا چاہئے۔

۱- اگر شرط کھیلنے والی پارٹیاں اور ٹیمیں آپس میں لگائیں تو یہ قمار ہے جو نص کی وجہ سے حرام ہے: ”إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون“ اور میسر کے معنی قمار کے ہیں (ہدایہ راجعہ ۲۷۵)۔ اور اگر جانین کے علاوہ کسی غیر جانبدار نے شرط لگائی ہے تو یہ جائز ہے کیونکہ اگرچہ یہ شرط ہے لیکن صورت شرط ہے ورنہ معنی و حقیقت یہ انعام ہے جو کہ جائز ہے۔

۲- اس کا جواب (ج) کے تحت گذر چکا ہے، اس طرح کے کھیلوں سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو اور اپنے اہل خانہ کو روکنا چاہئے کیونکہ نفع پر مضرت غالب ہے۔

۳- کھیل دیکھنے کیلئے ٹکٹ کا خریدنا جائز ہوگا، کیونکہ اس کا معاوضہ یعنی نمائش میں شرکت موجود ہے اور خرید و فروخت کیلئے ایسے معاوضہ کا ہونا ضروری ہے جس کو لوگ معاوضہ یا مال شمار کرتے ہیں چاہے وہ اعراض کے قبیل سے ہو یا وہ جوہر کے قبیل سے ہو، یا یوں کہا جائے کہ وہ منافع کی شکل میں ہو یا ایمان کی شکل میں ہو، البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بعض مرتبہ نمائش کے منتظمین یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً اس ہزار کا ٹکٹ ایک مشت خریدے گا (جبکہ ایک ٹکٹ پانچ سو روپے کا ہے) تو اس ٹکٹ میں عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہو سکے گا اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قریب عائد آزی کچھ انعام مقرر ہوتے ہیں جس کا نمبر نکل آئے اس کو انعام بھی ملتا ہے یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے لیکن اب دار و مدار نیت پر رہ جاتا ہے جو شخص موہوم انعام کی نیت سے ٹکٹ خرید کرتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کرتا ہے اور جس کے پیش نظر صرف نمائش میں جانا ہے اور انتہائے انعام کی ہوس پیش نظر نہیں ہوتی اتفاقاً انعام بھی مل گیا وہ تو اعد کے رو سے قمار کے حکم سے نکل گیا۔

(نوٹ) میرے نزدیک جو کھیل جائز ہے وہ مشروع نفسہ ہے اور جن کھیلوں کو ناجائز کہا ہے وہ ممنوع لغیرہ ہے دوسری بات یہ کہ عورتوں کے لئے میں کسی بھی کھیل کو جائز نہیں سمجھتا، کیونکہ ان میں مفاسد ہی مفاسد ہے رہی بات ورزش کی تو گھریلو کاموں کو انجام دینا ہی ان کے لئے بہترین ورزش ہے دوسرے ورزش کی انہیں ضرورت ہی نہیں۔

(۳) (الف)۔ تفریحی مقاصد کیلئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر جائز ہے اگرچہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ آتا ہو اور یہ جو اسراف کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إن البذرین كانوا إخوان الشياطين اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا صرفہ جو بلا مقصد صالح ہو کیونکہ اسراف اسی کا نام ہے اور اسی طرح کلو اور اثر بولوا لترفوا جو آیا ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے اس کے علاوہ دوسری طرف اولہ یسیروا فی الأرض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلہم بھی آیا ہے لیکن صرف تفریح ہی مقصد نہ ہو بلکہ اس سے عبرت بھی مقصود ہو قال تعالیٰ: قل سیروا فی الأرض“ ای سافر فی الأرض لتعرف أحوال الأمم الماضية ثم انظروا کیف کان عاقبة الکذبین ای تفکر فی أنهم کیف أهلک بعذاب الاستئصال و ثم لتفاوت ما بین الواجبین فان وجوب السیر لیس إلا لکونه وسیلة إلى النظر ومثله قوله تو ضاً ثم صل (روح البیان - جلد ۳ ص ۱۳ سورۃ انعام)۔

ان مذکورہ تشریحات سے عبرت گاہوں کے سفر کا جواز معلوم ہوتا ہے اس کے لئے کتنا ہی صرفہ آتا ہو اور ایسے سفر میں اپنے بال بچوں کو ساتھ رکھنا فی نفسہ درست ہے جبکہ کوئی خاص ضرورت ہو فلما قضی موسی الاجل وسار باہلہ الآیۃ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مرد اپنے بال بچوں کو جہاں چاہے لے جاسکتا ہے چونکہ اسکو قوامیت اور زیادتی درجہ کی فضیلت حاصل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا مہر ادا کر دیا ہو اور سفر کیلئے عورت کی رضاء و رغبت ہو، ابن عربی نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر عورت کو سفر میں نہ لے جانے کی شرط لگا رکھی تھی تو اس کو نبھانا چاہئے فقال ابن العربی فی احکام القرآن فلما قضی موسی الاجل وسار بأہلہ دلیل علی أن للرجل أن ینهب بأہلہ حیث شاء لما له علیہا من فضل قوامیة و زیادة الدرجة إلا أن ینتزم لها أمرا



فالمؤمنون عند شروطهم وأحق الشرط أن يوفى به ما استحلتموه به الفروج (احکام القرآن لشیخ عثمانی جلد ۳ ص ۹۷)۔  
اس سے یہ بات واضح ہوگی کہ مالکیہ کے نزدیک مرد اپنے اہل کو لیکر سفر کر سکتا ہے جبکہ عورت کو اسکے باپ کے گھر رہنے کی شرط نہ لگائی گئی ہو۔ البتہ حنفیہ کے نزدیک اگر مہر مہر مہر ادا کر دیا ہو تو اس کو لیکر سفر کر سکتا ہے ورنہ نہیں، حنفیہ میں سے ابو القاسم الصغار اور ابو الیث فرماتے ہیں کہ فساد زمان کی وجہ سے عورت کی رضا مندی کے بغیر مطلقاً اس کو لیکر سفر کرنا جائز نہیں و فی الحانیة والواجیة الفقیہین ابی القاسم الصغار و ابی الیث انه لیس له السفر مطلقاً بلا رضاهما لفساد الزمان (ایضاً)۔

ایک طرف یہ عبارت ہے جس میں چند شرائط کے ساتھ عورت کو سفر میں لے جانے کی اباحت معلوم ہوتی ہے تو دوسری طرف بہت سی نصوص ایسی ہیں جن سے ممانعت ثابت ہوتی ہے قولہ تعالیٰ: وَقُرْنِ فِي بِيوتِكُن وَلَا تَبْرَجْنَ تَبْرَجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقْسَمَ الصَّلُوةُ وَآتَيْنَ الزَّكُوَّةَ وَأَطَعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ الْآيَةَ۔ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ الْآيَةَ قَوْلَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: الْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَإِذَا خَرَجَتْ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ (ترمذی جلد ۱ ص ۲۲۲۔ آخر کتاب الرضاعي باب قبيل ابواب الطلاق واللعان)۔ ان نصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے سفر جائز نہیں ہے، اسی طرح دوسرے نصوص اور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے بلا ضرورت شدید سفر کرنا جائز نہیں قولہ تعالیٰ: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسَأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ۔ قَوْلَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنْ الْمَرْأَةَ تَقَبَّلَ فِي صُورَةِ الشَّيْطَانِ وَتَدَبَّرَ فِي صُورَةِ الشَّيْطَانِ۔ عَنْ ابْنِ عَمْرِو لَيْسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ فِي الْخُرُوجِ إِلَّا مَضْطَرَةً (حسن الفتاوی جلد ۸ ص ۳۹۹ بحوالہ الطبرانی فی الکبیر) اسکے علاوہ عورت کے گھر سے باہر نکلنے میں مفاسد بہت ہیں۔

(ج) ایسی جگہوں پر بلا ضرورت شدید جانا درست نہیں، البتہ سواری کرایہ پر لگانا اور دکان لگانا درست ہے، لیکن تفریح کے لئے جانا درست نہیں خاص طور پر جب کہ کفار کی مذہبی جگہ ہو، اس لئے کہ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب حق ہے ہم حق پر ہیں سچی تو یہ مسلمان اس کی زیارت کیلئے آتے ہیں اور دکان وغیرہ لگانا فی نفسہ درست ہے۔ جاز تعمیر کنیسة وحمل خمر ذمی بنفسه أو دابته بأجر لا عصرها لقيام المعصية بعينه و جاز اجارة بيت بسواد الكوفة ای قزیها لا یغیرها علی الاصح (در مختار جلد ۹ ص ۷۷-۷۸-۷۹-۸۰ ہدایہ راجع باب اکراہیہ)۔

(د) اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا درست ہے، لیکن اس سے ایسی جگہ سفر نہ کرایا جائے جہاں جانے سے مذہب کفار یا شعائر کفار کے وقار میں اضافہ ہوتا ہو، البتہ اگر ٹور کمپنیاں مسلمانوں کی ہیں اور کفار کو لے جانا ہو اور وہ اپنی اپنی تیرتھ گاہوں پر چوں اور مندروں یا مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی زیارت کیلئے جانا ہو تو انکو لے جایا جاسکتا ہے، ہاں مسلمانوں کو ایسی جگہ نہ لے جایا جائے اور نہ ہی مسلمانوں کو دوسرے کے عبادت خانوں کی زیارت کیلئے جانا چاہئے۔ و جاز تعمیر کنیسة الخ۔ ایضاً۔ ۷۶-۷۷ (امداد الفتاوی جلد ۳ ص ۱۵۱)۔

(۴) تاریخیں فلمیں تیار کرنا اور تعلیمی مقاصد کیلئے فلمیں تیار کرنا اور تعلیمی مقاصد میں استعمال کرنا نہ صرف جائز بلکہ میرے نزدیک مستحسن ہے، لیکن یہ شرط ہے کہ اس میں کسی جاندار کی تصویر نہ آنے پائے اور نہ کسی دف یا نماز امیر وغیرہ ہو اور نہ کسی طرح کی میوزک ہو۔

(۵) (الف) عن أبي طلحة قال قال النبي ﷺ: لا تدخل الملائكة في كلب ولا تصاوير مشكوة ۲۸۵۔ وعن عائشة أن النبي ﷺ لم يكن يترك في بيته شيئاً فيه تصاليب إلا نقضه۔ ایضاً۔ عن عبد الله ابن مسعود قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: أشد الناس عذاباً عند الله المصورون۔ ایضاً، وأما فعل التصوير فهو غير جائز مطلقاً لأنه مضاهاة لخلق الله تعالى (رد المحتار جز ۲ ص ۲۶۲ باب ما یفسد الصلوة وما یکرهها)۔

ان مذکورہ احادیث اور شامی کی عبارت سے صاف واضح ہے کہ تصویر بنانا کسی بھی طرح ہونا جائز ہے بس شرط یہ ہے کہ بیچانی جاتی ہو، کیونکہ تصویر کے سارے مقاصد معرفت سے ہی حاصل ہوتے ہیں لہذا کارٹون بنانا بھی جائز نہ ہوگا۔

(ب) اس میں ملازمت کرنا درست نہیں ہے، اگر پہلے سے اس میں ملازمت کر رہا ہو تو دوسری ملازمت تلاش کرے اسکے بعد ملازمت کو چھوڑے، دوسری ملازمت ملنے سے پہلے نہ چھوڑے، کیونکہ ناجائز ملازمت اختیار کرنا فسق اور معصیت ہے، لیکن ملازمت چھوڑ کر بیٹھ جانے میں بعض مرتبہ کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

(۶) کئے جاسکتے ہیں لیکن اس میں مردوں کو شامل نہ کیا جائے اور نہ ہی لباس میں کفار و فساق کی مشابہت اختیار کی جائے اور نہ ہی عورتوں کی مشابہت اختیار کی جائے۔ ☆

## تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرائط و ضوابط

مفتی غلام اللہ کاوی خادم الافتاء والحدیث، دارالعلوم لکھنؤ، بھارت۔

۱: الف - مزاج: لطافت و ظرافت کو کہتے ہیں، اہل لغت نے ”الملاطفة فی القول بالمزاج“ گھر والوں کے ساتھ اسی طرح احباب و متعلقین کے ساتھ ایسا مزاج جس میں شرعی حدود کی رعایت ہو، یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحب و مستحسن ہے، خود آقائے کی ومدنی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کا مزاج ثابت ہے، البتہ مزاج کو معمول و مشغلہ بنا لینا پسندیدہ نہیں، اسی طرح ایسا مزاج جس میں کسی کی دل آزاری ہو تو یہ بڑا گناہ ہے، اسی طرح ایسا مزاج جس میں کسی کی توہین ہو۔

امام بخاریؒ نے مستقل ایک باب قائم کیا ہے، ”باب الانبساط الی الناس“ پھر عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے، قال ابن مسعودؓ: ”خالط الناس و دینک لا تکلمنہ“ (ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہو، مگر اپنے دین کو بچائے رکھا ہے زخمی نہ کر)۔

مزاج کے کئی واقعات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش آئے ہیں، امام ترمذیؒ نے ”باب ما جاء فی المزاج“ کے تحت چار حدیثیں پیش فرمائی ہیں، اس پر حضرت مفتی سعید صاحب مدظلہ تحفۃ الامحی میں تحریر فرماتے ہیں: ”معاشرہ کی خوبی میں خوش طبعی کا بھی بڑا دخل ہے، کبھی کبھی حدود میں رہ کر انسی مذاق کرنا طبیعتوں میں فرحت پیدا کرتا ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں خوش طبعی تھی، آپ کبھی کبھی دل لگی کی باتیں بھی کرتے تھے، حدیثوں میں اس سلسلہ میں متعدد واقعات پیش آئے ہیں، اور امام بخاریؒ نے کتاب الادب میں باب ۸۱ الانبساط الی الناس قائم کیا ہے، یعنی کبھی سنجیدگی ختم کر دینا، اور لوگوں سے بے تکلف ہو جانا بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے (۳۲۷/۵)۔

البتہ شرط یہ ہے کہ مزاج کو مستقل مشغلہ نہ بنائیں، ایسی مزاج جس سے کسی کا دل نہ دکھے، اور توہین نہ ہو۔

ب - الف کے جواب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاجیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، مزاج شریعت کے خلاف ہے، اس میں تفسیح اوقات کا مرتکب ہونا ہوتا ہے، ہاں قلیل وقت میں ہو تو گنجائش ہے، جیسا کہ روح القلوب سلمۃ فسلمۃ سے صاف معلوم ہوتا ہے، تکلمۃ فتح الملہم میں ہے: ”نعم تمنع الغلو والانهماک فیہا بحیث یضر المعاش والمعاد“ (۴، ۲۲۲)۔

ج - حدود شرع کی رعایت کرتے ہوئے یہ کہانیاں شائع کی جائیں تو اس کی خرید و فروخت درست ہے۔

د - لطیفہ گوئی، اور مزاج نویسی کا پیشہ بنا لینا درست نہیں، ”تمنع الغلو والانهماک فیہا بحیث یضر المعاش والمعاد“ (۴، ۲۲۲)۔

ہ - مزاجیہ ڈرامے کے پروگرام قلیل وقت میں ہو تو شرعاً جائز ہے، مگر گھنٹوں پر دو گرام کرنا جس میں معاش و معاد کا ضرر ہے، شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے۔

”قال علی کرم اللہ وجہہ: اجمعوا هذه القلوب فإتھا تمل کما تمل الأبدان“ (فیض القدر شرح الجامع الصغیر ۴، ۲۲۲) ان عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تفریح طبع کے لئے مزاجیہ ڈراموں کے پروگرام کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں بلکہ مستحب و مستحسن ہے، مگر اتنا طویل جس میں معاد و معاش کے لئے مضر ہوں شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

و - مذکورہ بالا جواب سے واضح ہوتا ہے کہ معاش و معاد میں مضر نہ ہو، قلیل مقدار و قلیل وقت میں یہ پروگرام ہو تو درست ہے، قرآن میں ہے: ”للیضحکوا قلیلاً“ قلیل ضحک کی گنجائش ہے، زیادہ ضحک دل کو مردہ بنا دیتا ہے، تکلمۃ فتح الملہم میں ہے: ”هذا هو السر فی إباحة بعض السلاھی فی بعض الأعیان، فإن هذا اللہو علی هذه النسبة والغرض لمر یبق لہوا، بل عاد مصلحة وفائدة“۔

مذکورہ تمام امور کا حاصل یہ ہے کہ معاد و معاش کے لئے جو مضر نہ ہو تو وہ تفریح اور لہو و لعب میں سے نہیں ہے، اگر معاش و معاد کے لئے مضر ہو وہ منہی عنہ ہے۔

۱: الف - لہو محض جس میں کوئی فائدہ نہ ہو اور نہ اس میں کوئی صحیح غرض ہو اور نہ معاش و معاد کے لئے مفید ہو تو ایسا لہو و لعب ہو گا یا مکروہ تحریمی۔

۲ - وہ کھیل جس میں کوئی فائدہ تو ہے، اور دینی یا دنیوی کوئی مصلحت بھی ہے مگر وہ کھیل شرعاً کتاب اللہ سے یا سنت رسول اللہ میں نبی وارہ وئی ہے وہ بھی حرام یا مکروہ تحریمی ہو گا۔

۳ - وہ کھیل جس میں فوائد تو ہیں، اور لوگوں کی اس میں مصلحتیں بھی ہیں، اور کتاب و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نبی بھی وارہ نہیں ہے، فقہی نقطہ نظر سے اس میں

دو قسمیں ہو جاتی ہیں، اول: تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہو کہ اس کا فائدہ کم نقصان زیادہ ہو، اور جو بھی اس میں مشغول ہوتا ہے، اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، نماز میں غفلت، فرائض شرعی میں غفلت، یہ کھیل منی عنہ میں شمار ہوں گے، اور حرام یا مکروہ تحریمی کی شمار ہوں گے۔

ثانی: جو کھیل ایسے نہیں ہیں مگر بولوبول کے ارادہ سے کھیلتے ہیں وہ بھی مکروہ میں شمار ہوں گے، اگر اسی منفعت کے حاصل کرنے کے لئے کھیلیں گے تو وہ مباح و مستحب شمار ہوں گے، تکمیلۃ فی الفہم میں ان اصول کی تفصیل موجود ہے۔

فالضابط في هذا الباب ... إن اللهو المجرد الذي ليس له غرض صحيح مفيد في المعاش ولا المعاد حرام أو مكروه تحريماً... وما كان فيه غرض ومصلحة دينية أو دنيوية، فإن كان ورد النهي من الكتاب والسنة كان حراماً أو مكروهاً تحريماً... أما ما لم يرد فيه النهي عن الشارع، وفيه فائدة أو مصلحة للناس، فهو بالنظر الفقهي على نوعين: الأول: ما شهدت التجربة بأن ضرره أعظم من نفعه، ومفاسده أغلب على منافعه وأنه من اشتغل به ألهاء عن ذكر الله وحده، وعن الصلوة والمساجد التحق بالمنهي عنه، لا اشتراك العلة، فكان مكروهاً أو حراماً. والثاني: ما ليس كذلك فهو أيضاً إن اشتغل به بنية التلهي والتلاعب فهو مكروه، وإن اشتغل به لتحصيل تلك المنفعة وبنية استجلاب المصلحة فهو مباح، بل قد يرتقى إلى درجة الاستحباب أو أعظم منه... وعلى هذا الأصل فالألعاب التي يقصد بها رياضة الأبدان أو الأذهان جائزة في نفسها، ما لم تشتمل على معصية أخرى. وما لم يؤد الأثمات فيها إلى الإخلال بواجب الإنسان في دينه ودينه، (تكملة فتح الملهم ۲، ۴۲۵، كذا في احكام القرآن للثانوي ۲، ۱۹۹، وما بعد)۔

ب- لباس جسمن غیر قوم اور فساق و فجار کی مشابہت نہ ہو، قال القاری: ”من شبه نفسه بالكفار مثلاً في اللباس وغيره أو بالفساق والفسجار أو بأهل التصوف الصلحاء الأبرار فهو منهم أي في الإثم والخير“ (مرقاة المفاتيح رقم الحديث: ۲۲۲۷، ۸، ۱۵۵)۔

”عن ابن عمر رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: من تشبه بقوم فهو منهم“ (سنن ابی داؤد ۲، ۵۵۸، مشکوٰۃ ۳۷۵)۔

پینٹ، سلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہوں، ٹخنوں سے نیچے پینٹ، پاجامہ، سلوار، لنگی، لٹکانے والوں کے بارے میں حدیثوں میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

”عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: ما أسفل من الكعبين من الإزار في النار“ (مشکوٰۃ ۳، ۴۲)۔

”فما نزل عن الكعبين فهو ممنوع، فإن كان للخيلاء فهو ممنوع منع تحريم وإلا فمنع تنزيه“ (شرح النووي على الصحيح مسلم ۲، ۱۹۵)۔

۳- ناف کے نیچے سے گھٹنوں کے نیچے تک بدن ڈھکا ہوا ہونا چاہئے، ”والصحيح قولنا لما روى عن رسول الله ﷺ أنه قال: ما تحت السرّة عورة، والرکبة ما تحتها فكانت عورة“ (بدائع الصنائع ۶، ۳۹۶، کذا في تبیین الحقائق ۴، ۴۱)۔

ج- فٹ بال یا کرکٹ قلیل وقت میں کھیلا جائے، اور صحیح نیت سے تو مباح ہے، مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہو کہ ان کھیلوں میں مشغول ہونے والا ذکر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے، اور فرائض منصبی میں کوتاہیاں کرنے والا بن جاتا ہے، ایسا انہماک ان کھیلوں کو حرام بنا دیتے ہیں، اگر ذکر اللہ سے غافل نہ ہو، اور ایسا انہماک نہ ہو جس سے فرائض منصبی میں کوتاہی نہ ہوتی ہو، اور ورزش کی نیت ہو، قلیل وقت کے لئے ہو تو مباح ہوں گے۔

ہاکی کا کھیل مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ہو تو مباح ہوگا، ویڈیو گیم اسی طرح پتنگ اڑانا جو غیر محرم کے تہوار کے لئے معاون ہے، ناجائز ہوں گے۔

شطرنج وغیرہ: حدیث میں ہے، جو شخص مزد سے کھیلا، اس نے اللہ ورسول کی نافرمانی کی روایت کیا اس کو احمد و ابن ماجہ نے اور مالک نے۔ اور حدیث میں ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جو شخص مزد سے کھیلے، پھر اٹھ کر نماز پڑھے اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص بیب اور خنزیر کے خون سے وضو کرے، اور پھر اٹھ کر نماز پڑھے، روایت کیا احمد نے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ شطرنج اہل عجم کا قمار ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری کا ارشاد ہے: شطرنج کھیلنا مگر گنہگار..... ہدایہ و در مختار میں شطرنج کو صریح حرام قرار دیا ہے۔

ریس اور گھوڑ دوڑ: رسول اللہ ﷺ نے گھوڑ دوڑ کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، اور عبد اللہ بن عمر رضي الله عنهما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی ہے، ریس کی مروجہ صورت جس میں ہر کھلاڑی کو خاص فیس ادا کرنی ہوتی ہے، انعامی رقم سبقت کرنے والے کھلاڑی کو ملتی ہے، اور دوسروں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے، میں قمار پایا جاتا ہے، اس لئے اس طرح ہر شریک ایک بہم نفع و نقصان کے درمیان رہتا ہے، اور اسی کا نام قمار ہے۔

ہاں اگر مقابلہ کرایا جائے، اور کوئی تیسرا شخص انعام دے تو درست ہے، ملک العلماء علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”کذا ما يفعله السلاطين وهو ان يقول لرجلين: من سبق منكما فله كذا فهو جائز“ (بدائع الصنائع ۶: ۲۰۶)۔

۵- سوال میں ہی جواب درج ہے، ضیاع وقت کا گناہ لازم ہوگا۔  
۶- کھیل اگر ایسے ہوں جو محرمات پر مشتمل نہ ہوں، تو دیکھنے میں حرج نہیں، مگر فرائض منصبی میں غفلت نہ ہو، انہماک نہ ہو، قلیل وقت میں ہو۔  
رہا ٹکٹ خریدنا سو یہ درست نہیں ہے، کیونکہ ٹکٹ خریدنا اجارہ ہے، اجارہ میں معقود علیہ معلوم ہونا چاہئے، اور یہاں معقود علیہ مجہول ہے، اس لئے کہ کھلاڑی کے عمل کو ضبط کرنا مشکل ہے، وقت کی تعیین ہو یہ بھی مفقود ہے، اس لئے کہ کھیل کبھی وقت مقررہ سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے، اگر تفریح طبع کی اجرت شمار کریں تو یہ غیر مقدور تسلیم ہیں، اس لئے ٹکٹ خریدنا بیچنا درست نہیں۔  
۳- الف- ایسی تفریح جس میں کثیر رقم خرچ ہو تفریح مال و تفریح وقت جیسے بڑے گناہوں کا ارتکاب ہے۔

ب- ایسا سفر جس میں کثیر رقم خرچ ہو اور اس میں کافی وقت بھی درکار ہو وہ سفر مزاج شرع کے سراسر خلاف ہے، تفریح مال و تفریح وقت جیسے بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔  
لہذا بچوں کو ساتھ رکھنا کیسے درست ہوگا، جبکہ بعض علاقوں کا سفر جہاں جان مال، عزت و آبرو محفوظ نہ ہو، قرآن میں ہے: ”لا تلتقوا بأیديکم الى التهلكة“، لہذا ایسا سفر (جس میں کوئی دینی، دنیوی غرض نہ ہو، سوائے سیر و تفریح کے) نہ کرے۔

ج- ایسی جگہیں جہاں معاصی کے اڈے ہوں، اسی طرح مشرکین کے تہواروں میں شرکت کراہت سے خالی نہیں، الدر المنصور علی سنن ابی داؤد میں حضرت مولانا محمد عاقل صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ علماء نے اس حدیث ”عن انس قال: قدم رسول اللہ ﷺ المدينة وله يومان يلعبون فيهما الخمر“ (ابوداؤد مع بئذ المسجود ۵: ۲۰۱) کے ذیل میں لکھا ہے کہ کفار کے تہوار اور خوشی کے دنوں میں مسلمانوں کا خوشی منانا سخت ترین معصیت ہے، ابوحنیفہ کبیر الحنفی تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص نیروز میں کسی مشرک کو کوئی معمولی سا ہدیہ مثلاً بیضہ اس یوم کی تعظیم کے اعتقاد کے ساتھ بھیجے تو وہ کافر ہو جائے گا، اور اس کے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے، اور اگر تعظیم یوم کے طور پر نہیں بلکہ صرف اظہار محبت و تعلق کے لئے ایسا کرے تب کفر نہ ہوگا، البتہ تشبہ کی وجہ سے مکروہ ضرور ہوگا، احتراز اس سے بھی ضروری ہے (۲/ ۵۳)۔

رہا پیشہ تجارت، کشتا لے کر جانا (اگر یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ مسافر معاصی ہی کے لئے وہاں جاتا ہے تب یہ تعاون علی الاثم کی وجہ سے جائز نہیں، اگر ایسا نہیں ہے تو جائز ہے۔  
۲- ٹور کمپنیاں قائم کرنا درست ہے، مگر جس ٹور میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ سارے مسافر معاصی کا ارتکاب کرنے جا رہے ہیں، تو انہیں لے جانا درست نہ ہوگا، یہ تعاون علی الاثم میں شامل ہوگا، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کوئی اثم لازم نہ ہوگا۔

مفتی شفیع صاحب نے ایک رسالہ ”تفصیل الکلام فی مسئلۃ الاغانة علی الحرام“ تحریر فرمایا ہے، اس میں ظلم و معصیت میں معاون امر کو تعاون علی الاثم کے زمرہ میں داخل فرما کر منع فرمایا ہے، قال اللہ تعالیٰ: رب بما أنعمت علی فلن أکون ظہيراً للمجرمین“ احتج اهل العلم بهذه الآية علی المنع من معونة الظلم وخدمتهم، أخرجه عبد بن حميد، وابن المنذر وابن أبي حاتم، عن عبيد الله بن الوليد أنه سئل عطا بن أبي رباح عن أخ له كاتب فقال له: إن أخی ليس له من أمور السلطان شیئ إلا أنه یکتب له بقلم ما یدخل وما یمخرج، فإن ترک قلمه صار علیه دین واحتاج وإن أخذ به کاتب له فیه غنی، قال: لمن یکتب؟ قال: لخالد بن عبد الله القسیری قال: ألم تسمع إلی ما قال العبد الصالح ”رب بما أنعمت علی فلن أکون ظہيراً للمجرمین“ فلا یهتم أخولک بشیئ، ولیرم بقلمه فإن اللہ تعالیٰ سیأته برزق (جواہر الفقہ ۲: ۲۲۲)۔

۳- جائز مقاصد کے لئے فلمیں بنانا اور اس کے بیچنے و خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔  
رجل آجر بیتا لیتخذ فیه ناراً، أو بیعة أو کنیسة أو بیاع فیه الخمر فلا بأس به کذا کل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار“ (خلاصة الفتاوی ۲: ۲۷۳)۔

۵- الف- ذی روح تصویر والا کارٹون کی شرعاً اجازت نہیں، ہاں اگر بلا اس ہوتو اس میں گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ ب- شرعاً قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے۔  
۶- جب مقصد بہتر کاموں کی ترغیب ہو، معاشرہ کے مفاسد پر تنقید ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے، جبکہ محرمات شرعی پر مشتمل ہو۔ ☆

## تفریح و مزاح سے متعلق شرائط و ضوابط

مفتی عبداللہ کاوی والی

۱: الف - شریعت میں مزاح جائز ہے، لیکن دو باتوں کا خیال ضروری ہے ایک یہ کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، دوسرے یہ کہ کوئی خلاف واقعہ بات نہ کہی جائے، ان دو شرطوں کے ساتھ مزاح جائز ہے۔

ایک ہوتا ہے مزاح اور ایک ہوتا ہے استہزاء، ایک مطلوب ہے تو دوسرا ممنوع۔ مزاح کی شریعت میں گنجائش ہے، استہزاء کی نہیں۔ دونوں میں قدرے فرق ہے، مزاح کا مقصد خوش کلامی، دلداری، بے تکلفی کا اظہار اور ہنسانا ہوتا ہے، اور استہزاء کا مقصد مخاطب کی ایذا رسانی اور دوسرے کے سامنے اس کی توہین ہوتی ہے۔

ب - مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا جو گھنٹوں بھر چلتا ہو، تو اس میں سب سے پہلا نقصان تضحیح وقت ہے، اور دوسرا نقصان غیر شرعی امور کا پایا جانا، اور تیسرا نقصان نماز کا فوت ہونا اور بھی بہت سارے نقصانات ہیں، اس لئے مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جائز نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ مزاح تفریح طبع کے لئے جائز ہے، لیکن اس کو مشغلہ بنانا اور اس کے لئے باقاعدہ طور پر جلسہ منعقد کرنا اور فضول خرچی کرنا یہ ساری چیزیں شرعی حدود کے باہر ہیں، اس لئے یہ ناجائز ہے۔

ج - مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے۔

د - لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنانا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں بے جا باتیں بھی ہوتی ہیں اور وقت کی ناقدری بھی ہوتی ہے اور لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی یہ اللہ کی یاد سے غفلت کا سبب بھی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: ”من حسن إسلام المرأ ترکه ما لا یعنیه“ اور اس کی اجرت بھی وصول کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں کذب اور دل آزاری کا احتمال رہتا ہے۔

ہ - تفریح طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام بھی منعقد کئے جاتے ہیں، جن کا مقصد ہنسانا ہوتا ہے، اس طرح کے ڈرامے لکھنا اور اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا درست نہیں ہے۔

فقہ کا قاعدہ ہے: ”الضرورة تنقذ بقدر الضرورة“ شریعت نے تفریح طبع کے لئے مزاح کی اجازت تو دی ہے لیکن اس کو مشغلہ بنا لینا اور خاص اس کے لئے پروگرام کرنا شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، اور یہ ساری چیزیں مشرکین مکہ کے مشابہ ہیں، کیونکہ وہ بھی اس کی محفلیں قائم کرتے تھے اور دیر رات تک یہ سب کچھ چلتا رہتا تھا۔

اور ہنسنے ہنسانے کے متعلق قرآن کریم میں ہے: ”فلیضحکوا قليلاً ولیبکوا کثیراً“، اور زیادہ ہنسانا سموت سے غفلت کا سبب بھی ہے اور آخرت سے بھی، لہذا ان سارے نقصانات کی بناء پر مزاحیہ ڈرامے کرنا اور پروگرام منعقد کرنا درست نہیں ہے، تفریح طبع صرف انہی چیزوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ دوسری بھی چیزیں ہیں ان کو اختیار کر لے، جیسے دوڑ کرنا، تیر چلانا، تلواری بازی کرنا وغیرہ۔

و - موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہنسا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے بہت معاون فعل ہے، اس لئے خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں، جس میں بہت سے لوگ بہ تکلف قہقہے لگاتے ہیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں ایسا کرنا درست نہیں ہے، صرف ہنسا ہی انسانی صحت کی برقراری کے لئے معاون نہیں ہے بلکہ دوسری اور بھی چیزیں ہیں ان کو اختیار کیا جاسکتا ہے، دوسری بات یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ ہنسنے اور قہقہے لگا کر ہنسنے سے منع فرمایا ہے، ترمذی شریف کی روایت ہے: ”ولا تکثر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (تحفة

۱۷۱ (۶۹۳)۔ اس میں زیادہ ہنسنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ بیان فرمائی کہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، وہ اس طور پر کہ دل آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور اللہ کی یاد سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔

۲: الف۔ کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے پانچ اصول ہیں جو مفتی شفیع صاحب نے احکام القرآن میں بیان فرمائے ہیں:

(۱) لہو محض۔

(۲) وہ کھیل جس میں فائدہ بھی ہے نقصان بھی، لیکن شریعت میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

(۳) وہ کھیل جس میں فائدہ تو ہے اور شریعت میں اس کی صریح ممانعت بھی نہیں آئی، لیکن تجربے سے اس کے ضرر کا نفع سے زیادہ ہونا ثابت ہو چکا ہو تو وہ بھی ممنوع کے حکم میں ہے۔

(۴) ایسے کھیل جن میں فائدہ ہے اور شریعت میں اس کی صریح ممانعت بھی نہیں آئی اور اس کا ضرر بھی اس کے نفع سے زیادہ نہیں لیکن ان میں محض بنیت لہو مشغول ہوتا ہے۔

(۵) ایسے کھیل جن میں منفعت مقصودہ ہے اور شریعت میں اس کی صریح ممانعت بھی نہیں آئی اور ان میں کوئی دینی نقصان بھی نہیں ہے اور ان میں مطلوبہ فائدہ حاصل کرنے کی غرض صحیح سے مشغول ہوتا ہے، بغرض لہو نہیں۔ ان پنجگانہ اقسام میں سے آخری پانچوں قسم کے علاوہ کوئی قسم جائز نہیں ہے، وہ بھی لہو کے جواز کی قبیل سے نہیں ہے بلکہ ایسی چیز مباح کی جارہی ہے جو صورت لہو ہے لیکن نیت صالحہ اور غرض صحیح کی وجہ سے وہ لہو نہیں رہا (احکام القرآن بحوالہ محمود الفتاویٰ ۳/۱۳۳)۔

ب۔ لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے چند باتوں کی رعایت ضروری ہے، اول یہ کہ مرد کے جسم کا وہ حصہ چھپ جائے جن کا ستر اور پردہ واجب ہے، اور اتنا باریک اور چست بھی نہ ہو کہ جسم کے اعضاء نمایاں ہوں، دوم یہ کہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو اور شوخی رنگ کا بھی نہ ہو (کتاب الفتاویٰ ۶/۹۵)۔

ج۔ اس دور کے مرد و عورت کھیلوں کے نام درج کئے جاتے ہیں، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس بال، باسکٹ بال، ہاکی، والی بال، دوڑ ریس، گھوڑ سواری، تیر اندازی، تیراکی وغیرہ، یہ سارے کھیل فی نفسہ جائز ہیں، کیونکہ ان سے تفریح و طبع اور ورزش و تقویت ہوتی ہے، جو دنیاوی اہم فائدہ ہے اور دینی فوائد کے لئے سبب بھی، لیکن شرط یہی ہے کہ یہ کھیل اس طرح پر ہوں کہ ان میں کوئی امر خلاف شرع اور تخریب بالکفار نہ ہو، نہ لباس اور طرز وضع میں انگریزیت ہو اور نہ کھٹنے کھلے ہوں نہ اپنے اور نہ دوسروں کے اور نہ اس طرح اشتغال ہو کہ ضروریات اسلام نماز وغیرہ میں خلل آئے۔

اگر کوئی شخص ان شرائط کے ساتھ کرکٹ، ٹینس وغیرہ کھیل سکتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے ورنہ نہیں، لیکن چونکہ آج کل عموماً یہ شرائط موجودہ کھیلوں میں موجود نہیں اس لئے ناجائز کہا جاتا ہے (احکام القرآن للتحفانوی، کھیل کو اور تفریق کی شرعی حیثیت)۔

د۔ کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو اس کی چار شرطیں ہیں، ان میں سے ایک صورت ناجائز ہے اور تین صورتیں جائز ہیں:

(۱) جانبین سے پیسے کی شرط ہو تو یہ ناجائز ہے۔

(۲) جانبین میں سے ایک کی طرف سے شرط ہو دوسرے کی طرف سے نہیں تو یہ صورت جائز ہے۔

(۳) جانبین میں سے دونوں کی طرف سے شرط ہو لیکن تیسرے آدمی کو بغیر کسی شرط کے شریک کر لیا گیا ہو کہ اگر وہ ہارے تو اسے کچھ دینا نہ ہوگا اور اگر وہ جیتے تو باقی دونوں اسے حسب معاہدہ انعام دیں گے اور تیسرا شخص بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اس کے جیتنے کی توقع کی جاسکتی ہو، یہ صورت بھی جائز ہے۔

(۴) دو شخص کھیل میں شریک ہوں اور جیتنے والے کو انعام، حکومت یا کوئی اور شخص دے تو یہ صورت بھی جائز ہے (کتاب الفتاویٰ ۶/۱۵۹)۔

” (إن شرط المال) فی المسابقة (من جانب واحد لو شرط) فیها (من الجانبین) لأنه یصیر قماراً (إلا إذا أدخلوا ثلاثاً) محللاً (بینهما) بفرس کفاء لفرسیهما یتوہم أن یسبقهما وإلا لم یجز، ثم إذا سبقهما أخذ منهما، وإن سبقوا لم یعطهما، و فیما بینهما أبیہما سبق أخذ من صاحبه (و) کذا الحکم (فی المتفقہ) فإذا شرط لمن معہ الصواب صح، وإن شرطاه لكل علی صاحبه لا: (درر) ومجتبی“ (شامی ۹۰، ۹۱، ۹۲)۔

و۔ جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، تو اس طرح وقت کو ضائع کرنا دنیا و آخرت کا خسارہ ہے اور وقت کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کے متعلق اور پوری زندگی کے متعلق کل قیامت میں پوچھ ہوگی، جیسے ابن مسعودؓ کی حدیث ہے: ”عن النبی ﷺ قال: لا تزول قدما ابن آدم یوم القیامة من عند ربہ حتی یسأل عن خمس: عن عمرہ فیما أفناه، وعن شبابہ فیما أبلاه، وعن مالہ من این اکتسبہ و فیما أنفقہ وماذا عمل فیما علم“ (ترمذی شریف ۶۳۷۲)۔

(حضرت ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کے دونوں قدم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس سے نہیں ہٹ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہ کر لیا جائے: (۱) اس کی عمر کے متعلق کہ کن کاموں میں اسے ختم کی، (۲) اس کی جوانی کے متعلق کہ کن مشغلوں میں اسے خرچ کی، (۳) اس کے مال کے متعلق کہ کہاں سے مال حاصل کیا، (۴) اور کن کاموں میں مال خرچ کیا، (۵) اور اپنے علم پر کتنا عمل کیا)۔

لہذا جو وقت ملتا ہے اسے بہت بڑا قیمتی سرمایہ سمجھے اور بڑی ذمہ داری اور فکر کے ساتھ موت اور آخرت کی تیاری میں خرچ کرے، بے کار اور لغو کاموں میں ضائع نہ کرے، شیخ سعدی نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے: یاد الہی کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا عمر ضائع کرنا ہے، عشق الہی کے سوا جو کچھ کیا جائے بے کار ہے (مجموع الفتاویٰ ۱۳۰۳-۱۳۱۱)۔

و۔ شریعت میں تفریح طبع کے لئے کھیل کود کی اجازت دی ہے، لیکن بعض مرتبہ تفریح دیکھنے سے بھی ہوتی ہے اگر تفریح کی نیت سے تھوڑی دیر کھیل دیکھے تو اس کی گنجائش ہے جیسے ایک مرتبہ کچھ حبشی غلام کھیل دکھا رہے تھے تو آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو اپنے پیچھے سے کھیل دکھایا تھا تو معلوم ہوا کہ جو کھیل کھیلنا جائز ہے اس کا دیکھنا بھی جائز ہے مگر محدود وقت میں اگر اس میں زیادہ وقت ضائع ہوتا ہو تو اس سے بچنا چاہئے، ہاں کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا تو یہ فضول خرچی ہے، اور فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی کہا ہے، اور مفتی شفیع صاحب نے قرطبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں: فضول خرچی کرنا حرام ہے، اس لئے بے جا پیسہ خرچ کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

۳: الف۔ تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا درست ہے، تفریح جس طریقہ سے کھیلنے سے اور کھیل دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے، اسی طریقہ سے سیر و تفریح سے بھی حاصل ہوتی ہے، بعض مرتبہ آدمی ایک جگہ رہنے سے اکتا جاتا ہے اور اس کو بے چینی ہونے لگتی ہے تو وہ تفریح کے لئے گھومنے نکلتا ہے تو بعض مرتبہ تفریح گاہوں میں گھومنے جاتا ہے اور بعض مرتبہ دوسرے شہر جاتا ہے، اسی طریقہ سے دوسرے ملک بھی جاتا ہے اگر اس میں غیر شرعی امور نہ پائے جاتے ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ اس میں کثیر رقم کا صرفہ ہو جیسے آدمی اگر زینت اور آرائش کے لئے مہنگے کپڑے پہنے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ آپ ﷺ نے بھی ایک مرتبہ خوب مہنگا کپڑا پہنا تھا، اسی طریقہ سے علامہ تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اگر آدمی نعمت کے اظہار کے خاطر مہنگے سے مہنگے کپڑے پہنے تو کوئی حرج نہیں ہے تو اسی طریقہ سے اپنی آرائش اور سیر و تفریح کے خاطر جس سے اس کو قلبی سکون ہو جس میں کثیر رقم کا صرفہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہاں مگر اسراف نہ ہو، لیکن اگر ریا اور دکھلاوے کے لئے ہو تو ممنوع ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے: ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین، قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف بدأ الخلق، قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبل“۔

ان آیات میں اللہ کی قدرت میں غور و خوض اور عبرت حاصل کرنے کو کہا ہے تو اگر کوئی اس نیت سے تفریح کرے تو یہ تفریح باعث اجر و ثواب بھی ہوگی، اگر سیر و تفریح میں اسراف ہو اور غیر شرعی امور پائے جائیں تو یہ تفریح ناجائز ہے۔

لیکن اگر تفریح کے خاطر دوسرے ملک اور دوسرے شہر نہ جائے بلکہ اپنے ہی علاقہ میں گھوم پھر کر تفریح حاصل کرے تو اس میں پیسہ بھی کم خرچ ہو اور یہ بہتر بھی ہے۔

ب۔ ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا درست ہے، لیکن جہاں پر جان و مال اور عزت و آبرو کا خطرہ ہو وہاں لے جانا بہتر نہیں، اسی طریقہ سے وہاں لے جانا جہاں کا ماحول اچھا نہ ہو جس سے بچوں کے اخلاق میں بگاڑ آوے اور بال بچوں میں بے حیائی جنم لیوے ایسی جگہوں پر لے جانے سے پرہیز کرے۔

ج۔ جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں پر عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں آج کوئی جگہ ایسی نہیں ہے

جہاں پر غیر شرعی امور نہ پائے جائیں، ہاں کہیں پر زیادہ کہیں پر کم، کہیں پر بچنا ممکن ہے اور کہیں پر نہیں، اگر ایسی جگہ ہے جہاں پر غیر شرعی امور تو پائے جاتے ہیں لیکن اس سے بچنا ممکن ہے تو ایسی جگہ پر جانے میں کوئی حرج نہیں، اور وہ جگہیں جہاں پر اس قدر پائے جائیں جن سے بچنا ممکن نہیں جیسے وہاں پر گانا وغیرہ مسلسل بجتا ہے اور غیر محرم عورتیں بکثرت پائے جاتے ہیں اور بے پردگی زیادہ ہوتی، تو ایسی جگہوں پر تفریح کی غرض سے جانا درست نہیں ہے، کیونکہ ”انہما اکبر من نفعہما“، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش خریدنے کے لئے دکان لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا غیر شرعی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱- آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے مختلف کمپنیاں قائم ہیں، جو آمدورفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرتے ہیں، تو ایسی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے، کیونکہ ایسی چیزوں کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، جیسے اگر کوئی شخص بس چلا تا ہے اور وہ بس کئی جگہوں سے ہو کر گذرتی ہے ان میں شراب کے اڈے بھی آتے ہیں مندر بھی آتی ہے قحبہ خانہ بھی آتا ہے سینما ہال بھی آتے ہیں تو کئی لوگ ان جگہوں پر اترتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بس چلانا جائز نہیں ہے، اسی لئے ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے، ”وجاز بیع عصیر عنب ممن علم انه يتخذ خمرًا، لأن المحصية لا تقوم بعینہ بل بعد تغیرہ“ (الدر المختار ۹۵۶۰۵۶۱)۔

۲- ایسی فلمیں بنانا جائز ہے جس میں بے حیائی، فحاشی، عورتوں کا زیب و زینت کے ساتھ یا نیم برہنہ حالت میں سامنے آنا اور اس کے علاوہ فسق و فجور کے دوسرے اسباب پر مشتمل نہ ہو، اگر چاہے وہ دستاویزی فلمیں ہوں یا تاریخی فلمیں ہوں یا تعلیمی مقاصد کے لئے بنائی گئی فلمیں ہوں جیسے قرآن میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے متعلقہ آیات کو پڑھتے ہوئے ان مقامات کا دکھانا ان کا استعمال تعلیمی مقصد کے لئے کیا جاسکتا ہے۔

مگر وہ فلمیں جو قرآن میں یا احادیث میں ذکر کردہ واقعات کے مطابق بنائی جاتی ہیں جنگ بدر، جنگ احد ای طریقتہ سے دوسری جنگیں، اور نبیوں کے واقعات جیسے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا فرعون کے سامنے جانا اور اپنے عصا کو ڈالنا، یہ ایسی فلمیں ہیں جن سے صحابہ کرام اور انبیاء کرام کی توہین ہوتی ہے، اس لئے ایسی فلمیں بنانا جائز نہیں ہے، اسی طریقہ سے وہ فلمیں جن میں بے حیائی و عریانیت عورتوں کا زیب و زینت کے ساتھ یا نیم برہنہ حالت میں آنا اور اس کے علاوہ دوسرے فسق و فجور کے دوسرے اسباب پر مشتمل ہو، بنانا جائز اور حرام ہے (فقہی مقالات)۔

۵: الف- جاندار اشیاء کے کارٹون بنانا اور ان کو اخبارات میں چھاپنا تو ان کا حکم یہ ہے کہ اگر کارٹون اس طرح بنایا جائے کہ چہرہ، آنکھیں، ناک، کان وغیرہ واضح ہوں اور اس سے ان کی شناخت ہو رہی ہو تو ایسے کارٹون بنانا اور ان کا استعمال جائز نہیں، البتہ اگر ایسے کارٹون بنائے جائیں جن میں جاندار کی شکل واضح نہ ہو یعنی اس کی ناک، کان، آنکھیں، منہ وغیرہ واضح نہ ہوں تو ایسے کارٹون بنانے کی گنجائش ہے، تاہم مناسب نہیں، کیونکہ وہ بھی تصویر کے مشابہ ہیں (تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام ۱۶۳)۔

ب- کارٹون اگر اس طرح ہو کہ اس کے کان، آنکھ، ناک، چہرہ واضح نہ ہو تو اس کو ذریعہ آمدنی بنانا جائز ہے اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہے اور اگر اعضاء نمایاں ہوں تو اس کو ذریعہ آمدنی بنانا جائز نہیں ہے اور اس مقصد کے لئے ملازمت بھی جائز نہیں ہے (تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام ۱۶۳)۔

ج- جس طرح ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ ڈرامہ ہے جس میں مختلف افراد بطور کردار کے شامل ہوتے ہیں اور وہ متعین جملوں کو ادا کرتے ہیں، آج کل دینی مدارس میں بھی مکالمات کی صورت میں مروج ہو گئی ہے، یہ بھی اس میں شامل ہے، اگر ڈرامہ غیر اخلاقی مقاصد کے لئے ہو تو ڈرامہ کرنا درست نہیں ہے، اور اگر بہتر مقاصد کے لئے جیسے عوام میں موجود خرافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو دور کرنے کے لئے مکالمات کئے جائیں تو اس طرح کے ڈرامے کرنا درست ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی غیر شرعی امور نہ پائے جائیں، واللہ اعلم بالصواب (بحوالہ محمود الفتاویٰ)۔



## تفریح کے ذرائع اور ان کا استعمال

مفتی محمد جعفر علی رحمانی

۱- الف - آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہم مسلمانوں کے لیے زندگی کے ہر موڑ پر ایک کامل آئیڈیل ڈیٹا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں راتوں کی تاریکیوں اور خلوتوں میں اپنے رب ذوالجلال کے سامنے اتنا لمبا قیام فرمایا کرتے تھے کہ قدمہائے مبارک پر روم آجایا کرتا تھا، وہیں آپ جلوتوں میں طیبات کو پسند بھی فرماتے تھے، بسا اوقات فرحت و بشاشت کا اظہار بھی کر دیا کرتے اور کبھی کبھی دل لگی و مذاق بھی فرماتے تھے، جیسا کہ امام ترمذی نے ”شمال“ میں اس حدیث کی تخریج فرمائی ہے کہ.....

”ایک بوڑھی عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: اے اللہ کے رسول آپ میرے لیے دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمادے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ”اے ام فلاں! جنت میں بوڑھی عورت داخل نہیں ہوگی“، جس پر وہ بوڑھی خاتون (اپنے متعلق یہ گمان کر کے کہ وہ ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگی) بیقرار ہو گئی اور رونے لگ گئی۔ جب آپ نے اسے بیقرار اور روتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اس کے سامنے اپنے کلام کی غرض بیان کر دی کہ میرے کلام کی مراد یہ ہے کہ بوڑھی عورت، بوڑھی ہونے کی حالت میں ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ پیدا فرمائیں گے، اور وہ جوان و باکرہ ہو کر جنت میں داخل ہوگی، اور آپ نے اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا: ”إنا أنشأناهن إنشائي، فجعلناهن أبكاراً، عرباً أتراباً“ (الواقعة: ۳۵-۳۷) (ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو ایک اچھی اٹھان پر، پھر کیا ان کو کنواریاں، پیار دلانے والیاں، ہم عمر) (ص ۱۶، باب ماجاء فی صفۃ مزاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قضایا اللہ و الترفیۃ: ص ۱۹۳، ۱۹۵، فصل فی الملاہی النفسیۃ)۔

علامہ ابوالبرکات نے ”کتاب المراح فی المزاج“ میں اسی طرح کی ایک حدیث تخریج فرمائی ہے کہ.....

”ایک خاتون جسے ”ام ایمن“ کہا جاتا تھا، اپنے شوہر کے لیے کسی چیز کا سوال کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، تو آپ نے اس سے فرمایا: تمہارا شوہر کون ہے؟ اس نے جواب دیا: فلاں، تو آپ نے فرمایا: اچھا وہ جس کی آنکھ میں سفیدی ہے؟ تو وہ کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! ان کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: کیوں نہیں، ان کی آنکھ میں سفیدی ہے، اب وہ خاتون گھرا کر اپنے شوہر کی آنکھوں پر غور کرنے لگ گئی، تو شوہر نے اس سے کہا: کیا بات ہے؟ تو اس نے عرض کیا: مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ آپ کی آنکھوں میں سفیدی ہے، تو شوہر نے کہا: کیا تو نہیں دیکھتی کہ میری آنکھوں کی سفیدی ان کی سیاہی سے زیادہ ہے؟“ (کتاب المراح فی المزاج: ص ۱۳، قضایا اللہ و الترفیۃ: ص ۱۹۵، فی الملاہی النفسیۃ)۔

اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ کی ایک دوسری روایت میں وارد ہے کہ ”ام سلیم“ کا بیٹا جسے ”ابوعمیر“ کہا جاتا تھا، بسا اوقات جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ اس سے مزاح فرماتے تھے، ایک دن کا واقعہ ہے کہ.....

”آپ نے ان کو حزن و غمگین حالت میں پایا، تو آپ نے فرمایا: کیا بات ہے آج میں ابوعمیر کو غمگین دیکھتا ہوں، تو لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس کا وہ چڑیا کا بچہ مر گیا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یہ کہہ کر آواز دینے لگے: ”یا ابا عمیر ما فعل النخیر؟“

و عن أنس قال: ... وكان لي أخ يقال له أبو عمير ... وكان إذا جاء قال: ”يا أبا عمير ما فعل النخير؟“ الخ (ص ۱۱۰۹، الرقم: ۶۲۰۳، کتاب الأدب، باب الکتیۃ للصبی قبل أن یولد للرجل، دار احیاء التراث العربی بیروت، سنن الترمذی: ۲/۱۹، أبواب البر والصلة، باب ما جاء فی المزاج، مکتبہ بلال دیوبند، قضایا اللہ و لترفیۃ: ص ۱۹۷)۔

الغرض ذخیرہ احادیث پر نظر کرنے اور حضرات صحابہ کی سیرت کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب، مذاق و مزاح فرمایا

مدارالافتاء جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اہل کوا، ہندربار، مہاراشٹر۔

کرتے تھے، جس سے اس کی اباحت و اجازت ثابت ہوتی ہے۔..... لیکن مزاح و مزاق کی حدود ہیں:

۱- حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ایسی مزاح و مذاق منع ہے جس میں افراط ہو، یا ایسی مزاح منع ہے جس پر مداومت ہو، کیوں کہ اس طرح کی مزاح انسان کو اللہ کی یاد اور مہمت دین میں تفکر سے مشغول کر دیتی ہے، اور ایسے مذاق کا ثمرہ قساوت قلبی، ایذاء، کینہ اور سقوط تعظیم و توقیر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، (بخاری، الباری لابن حجر عسقلانی: ۱۰/۵۳۳، قضایا اللہ والہو والترقیۃ لمادون رشید: ص ۲۰۰)۔

۲- اسی طرح ایسی مزاق جس میں کذب بیانی اور دروغ گوئی ہو شرعاً جائز نہیں ہوگی، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ کے اصحاب نے آپ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہم سے مذاق فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: میں آپ لوگوں سے مذاق ضرور کرتا ہوں، مگر مذاق میں سچ بات ہی کہتا ہوں۔

وعن أبي هريرة قال: قالوا: يا رسول الله! إنك تداعبنا؟ (يعني تمازحنا) قال: "إني لا أقول إلا حقاً" (شمائل الترمذي: ص ۱۶، باب ما جاء في المزاح، الأدب المفرد للبخاري: ص ۲۶۰، قضایا اللہ والہو والترقیۃ: ص ۱۹۶، الملاحی النفسیۃ)۔

ب- کئی کئی گھنٹوں کے مزاحیہ پروگراموں، یا مشاعرہ کو منعقد کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً مزاح فرمایا، لیکن اس کے لیے مستقلاً اس طرح کی مستقل کئی کئی گھنٹوں پر مشتمل مجلس منعقد نہیں کی، نیز اس طرح کے اتنے لمبے اور طویل مزاحیہ پروگرام منعقد کرنے میں انسان اپنے بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں سے غافل بھی ہو جاتا ہے، جب کہ اسلام نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دینے کا نہ صرف حکم دیا بلکہ حقوق تلفی، اور اس میں کوتاہی پر سخت وعید بیان فرمائی، ارشاد ربانی ہے: "وويل للمطففين الذين إذا اكتالوا على الناس يستوفون" (خرابی ہے گھٹانے والوں کی، وہ لوگ کہ جب ناپ کر لیں لوگوں سے، تو پورا بھر لیں) (سورۃ اطفیف: ۱-۲)۔

اسی طرح فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "فأعط كل ذي حق حقه" کہ ہر صاحب حق کو اس کا حق دینا واجب ہے (بخاری: ۱۱/۲۶۳)۔

ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مشتمل کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت شرعی نقطہ نظر سے جائز عمل ہے، مگر اس کی حد یہ ہے کہ آدمی وقتاً فوقتاً اس طرح کی کہانیاں لکھیں اور پڑھیں، انہیں مستقل اپنا مشغلہ نہ بنائیں، کیوں کہ یہ ہماری زندگی کا مقصد اصلی نہیں ہے، بلکہ تفریحی چیز ہے، اور تفریحی چیزیں بقدر تفریح ہی ہونی چاہیے، نہ یہ کہ وہ مقصد اصلی پر غالب آجائیں۔

د- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی جب فی نفسہ جائز ہے تو اس کو پیشہ یا ذریعہ آمدنی بنانا جائز ہونا چاہیے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ پیشہ انسان کو یا خدا اور فرائض منصبی سے غافل نہ کر دے، جیسا کہ ہر پیشہ میں شرط اولین ہے: "رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله" (ایسے لوگ جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈال دیتی ہے نہ خرید و فروخت) اللہ کی یاد سے، اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے) (سورۃ النور: ۳)۔ ورنہ جائز پیشہ بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔

ھ- تفریح طبع کے لیے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا، لکھنا، اور اسے دیکھنا چند شرائط کے ساتھ درست ہے:

۱- اس ڈرامے میں کسی کے ساتھ تخریب و استہزاء نہ کیا گیا ہو:

"يأيها الذين آمنوا لا يسخر قوم من قوم عسى أن يكونوا خيراً منهم ولا نساء من نساء عسى أن يكن خيراً منهن، ولا تلمزوا أنفسكم ولا تنابزوا بالألقاب، بئس الاسم الفسوق بعد الإيمان، ومن لم يرتب فأولئك هم الظالمون" (سورۃ الحجرات: ۱۱)۔

علامہ عبد الماجد دریا بادی فرماتے ہیں: "یعنی کسی کو کیا خیر کہ اللہ کے نزدیک بہتر اور قابل عزت کون ہے، ہنسنے والا ہے یا وہ جس پر ہنسا جا رہا ہے، اس احساس کو بیدار کر کے قرآن نے گویا معاشرہ اسلامی کے اندر تسخیر و تضحیح کی جڑ ہی کاٹ دی ہے، تعلیم ہمارے ہاں کی یہ تھی اور عمل یہ ہے کہ دوسرے پر ہنسا، بنانا، علانیہ یا سوائی کرنا، عیب نہیں، بلکہ داخل ہنر ہو گیا (تفسیر ماجدی مع ترجمہ قرآن: ص ۱۰۳۲)۔

۲- کسی کی عیب جوئی کرنا، سخت تنقید کا نشانہ بنانا، تہمت لگانا، اور کسی کو برے القاب سے پکارنا اس میں نہ پایا جاتا ہو۔

۳- کسی کو دہشت زدہ و خوفزدہ نہ کیا جائے ترویج المسلم و إرفاعہ..... مسلمان کو خوفزدہ و دہشت زدہ کرنا۔

حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا یحل لمسلم أن یروی عن مسلمة“ کہ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو خوفزدہ و دہشت زدہ کرے (ابوداؤد، الرقم: ۵۰۰۳، کتاب الأدب، باب من أخذ شیء علی المزاح، و أحمد: ۵/۳۲۶، غایۃ المرام: ص ۲۵۷)۔

مجموعہ مزاح محرم کی اقسام میں یہ بھی ہے کہ مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرے، خواہ وہ چھری ہو یا تلوار، یا نیزہ ہو یا بندوق، یا اس کے علاوہ کسی تیز دھار دار آلات میں سے ہو، جن کو لڑائی کے وقت یا کسی چیز کے کاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ

”عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے صحابہ رسول ﷺ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں جا رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب سو گئے تو بعض لوگوں نے ان کو جا کر پکڑ لیا تو وہ صحابی گھبرا گئے، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”لا یحل لمسلم أن یروی عن مسلمة“ (حوالہ سابق)۔

۴۔ لوگوں کو ہنسانے کے لیے دروغ گوئی سے کام نہ لیا گیا ہو، لکن لایضحاک الناس۔ لوگوں کو ہنسانے کے لیے دروغ گوئی سے کام لینا۔

حضرت بہز بن حکیم اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ویل للذی یحدث بالحديث لیضحک به القوم فی کذب، ویل له! ویل له!“ (کہ ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے دروغ گوئی سے کام لیتا ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے) (ابوداؤد، الرقم: ۴۹۹۰، کتاب الأدب، باب فی المتشدیدی الکذب، الترمذی، کتاب الزہد، باب ماجاء من تکلم بالکذبة لیضحک الناس، الذاری: ۲/۲۰۶، الرقم: ۲۷۰۵، الاستئذان، باب فی الذی ینکذب لیسضحک به القوم، أحمد: ۵/۳۱۳، فیض القدر للناویدی: ۶/۳۶۸، الرقم: ۹۶۳۸، دار المعرفۃ بیروت)۔

حدیث مذکورہ ایسے حرمت افعال و اقوال پر نص صریح ہے، جو لوگوں کو ہنسانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

نیز اس طرح کی مزاحیہ مجالس اور ڈرامے کے پروگراموں میں جب معینہ اشخاص کی جھوٹ موٹ برائیاں اور ان کے عیوب افشاء کیے جائیں تو اشاعت کذب کی بناء پر حق و باطل کا اختلاط لازم آئے گا، اسی مصلحت کے پیش نظر اسلام نے جھوٹ کو بالکل حرام قرار دیا اور اس پر انجام بد کی سخت وعید بھی سنائی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”(علیکم بالصدق)، إن الصدق ینھدی الی البر، وإن البر ینھدی الی الجنة، وإن الرجل لیصدق حتی ینکذب حتی ینکذب عند اللہ کذاباً“ (صحیح البخاری: ص ۱۰۹۳، برقم: ۶۰۹۳، کتاب الأدب، باب قوله تعالیٰ: یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین، وما ینھی عن الکذب، مسلم: ۸/۲۱۰، الرقم: ۲۶۰۷، کتاب البر والصلۃ، باب قبح الکذب وحسن الصدق وفضله، دار احیاء التراث العربی بیروت، قضایا اللہ والہو والترقیۃ: ص ۲۱۰، ۲۱۱)۔

۵۔ غیر اقوام کی مشابہت اختیار نہ کی گئی ہو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”من تشبه بقوم فهو منهم“ کہ ”جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ بھی انہیں میں سے ہے“ (ابوداؤد میں ۵۹۹، کتاب اللباس باب لباس الشمرۃ، قدیمی)۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں: ”مزاح محمود کے متعلق احادیث پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا مزاح جس کی وجہ سے دلوں میں کینہ و حسد، نفرت و عداوت پیدا ہو، اور وہ مزاح گالی گلوں اور فحش باتوں پر مشتمل ہو، یا اس کے ذریعے کسی آدمی کی عزت نفس و آبرو اور جان و مال پر حملہ کیا جائے، تو وہ مزاح غیر محمود و مذموم ہے، اور اس مزاح سے ہٹ کر ہے جو مزاح آپ ﷺ (بعض مواقع پر) فرمایا کرتے تھے“ (قضایا: ص ۲۰۰)۔

ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ہنسا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لیے معاون فعل ضرور ہے، مگر ڈاکٹروں کی آراء و نصوص شرعیہ سے ثابت، کثرت ضحک کی ممانعت کا مقابلہ دلیل نہیں بن سکتیں، کیوں کہ شریعت نے ہنسنے کی ایک حد مقرر کر دی ہے، اور اس کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً“ (سورۃ التوبۃ: ۸۲) (سو تھوڑے دن ہنس لیں اور پھر (آخرت میں) بہت دن روتے رہیں) علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ کثرت کلام بغیر ذکر اللہ کے دل کو سخت کر دیتا ہے: ”کثرة الکلام بغیر ذکر اللہ تقسی القلب“ (۴۲۶/۱۰)، اور ایک جگہ فرماتے ہیں: ”بہت زیادہ ہنسا اور ہنسنے میں غلو کرنا و قار کو ختم کر دیتا ہے، والمکروه من ذلک إنما هو الإكثار منه أو الإفراط فیہ، لأنه ینذهب الوقار (۶۲۱/۱۰)، اور ضابطہ ہے کہ ”ذریعہ محذور بھی محذور ہوتا ہے“ (ہدایہ ۳/۳۶۶، بدائع ۶/۱۰۳۸۸، ۶۶۸، شامی ۵/۲۲۳، فتح الباری ۱۰/۵۰۱، تحت رقم: ۵۹۷۵)، اس لیے ہنسنے ہنسانے کے پروگرام منعقد کرنا، اس میں بتکلف قہقہے لگانا اور یرتک ہنسنے کی کوشش کرتے رہنا شرعاً جائز اور درست نہیں ہونا چاہیے۔

۲- الف - شریعت اسلامیہ میں وقت کی حفاظت اور با مقصد زندگی کے قیام کا حکم دیا گیا، اور ولعب اور لغو کی ممانعت کی گئی، ممانعت کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ تفریح کی بھی ممانعت ہے، بلکہ شرعاً ایک حد تک مستحسن و مطلوب ہے، تا کہ اس تفریح کے ذریعے جسم و روح کی سستی دور ہو کر طبیعت میں نشاط و جستی، جو صلہ و ہمت پیدا ہو، اور انسان مکمل طور پر زندگی کے علی مقصد عبادت کی طرف متوجہ ہو سکے، لہذا تفریح کی کھیل کود کے سلسلے میں فقہاء و علماء نے قرآن و حدیث سے چند ضوابط اخذ کئے ہیں:

۱- ایسا کھیل جس میں کوئی دینی و دنیوی کوئی مصلحت و مقصد نہ ہو، نہ اس کی غرض، غرض صحیح ہو، بلکہ محض وقت گزاری ہو تو ایسا کھیل ناجائز ہے۔

۲- ایسا کھیل جس میں کوئی مصلحت دنیوی یا اس کی غرض، غرض صحیح تو ہو، مگر اس کی ممانعت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو، تو وہ بھی ناجائز ہے۔

۳- ایسا کھیل جس میں لوگوں کے لیے مصلحت و فوائد تو ہوں، مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہو کہ اس کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں، اور ان کا کھیلنا انسان کو اللہ کی یاد، نماز اور فرائض شرعیہ سے غافل کر دیتا ہے، تو یہ کھیل بھی ناجائز ہے۔

۴- ایسا کھیل جس کا مقصد دینی یا دنیوی مصلحت و فوائد کو حاصل کرنا ہو تو مباح ہے، بشرطیکہ یہ کھیل کفار و فاسق کا شعار نہ ہو، اور اس میں ہارجیت پر مال کی شرط نہ ہو۔

”اعلم أن الشريعة المصطفوية السمحة البيضاء لا تمنع الارتفاقات والمصالح التي فطرت عليها الطبيعة البشرية ولا تترضي الرهبانية والتبتل بل تقتضي التذنية والمعاشرة الصالحة ... ومن المعلوم أن من الحاجة المفقور عليها الإنسان تمرين البدن وترويح القلب وتفريجه ساعة فساعة ومن هنا قال عليه الصلاة والسلام: ”روحوا القلوب ساعة فساعة“ [أخرجه أبو داود في مراسيله] ... وحاصل الكلام أن ترويح القلب وتفريجه وكذا تمرين البدن من الارتفاقات المباحة والمصالح البشرية التي لا تمنعها الشريعة السمحة برأسها - نعم - تمنع الغلو والاهتمام فيها بحيث يضر بالمعاش أو المعاد ... فالضابط في هذا الباب عند مشايخنا الحنفية المستفاد من أصولهم وأقوالهم: ... أن الله المجرد الذي لا طائل تحته وليس له غرض صحيح مفيد في المعاش ولا لمعاد حرام أو مكروه تحريماً - وهذا أمر مجمع عليه في الأمة متفق عليه بين الأئمة ... وما كان فيه غرض ومصلحة دينية أو دنيوية فإن ورد النهي عنه من الكتاب أو السنة [كما في الردشير] كان حراماً أو مكروهاً تحريماً ... وألغيت تلك المصلحة والغرض لمعارضتها للنهي الماثور حكماً بأن ضرره أعظم من نفعه - وهذا أيضاً متفق عليه بين الأئمة ... وأما ما لم يرد فيه النهي عن الشارع وفيه فائدة ومصلحة للناس فهو بالنظر الفقهي على نوعين: الأول: ما شهدت التجربة بأن ضرره أعظم من نفعه ومفاسده أغلب على منافعه وأنه من اشتغل به ألهاه عن ذكر الله وحده وعن الصلوات والمساجد التحق ذلك بالمنهي عنه لاشتراك العلة فكان حراماً أو مكروهاً - والثاني: ما ليس كذلك فهو أيضاً إن اشتغل به بنية التلهي والتلاعب فهو مكروه وإن اشتغل به لتحصيل تلك المنفعة وبنية استجلاب المصلحة فهو مباح بل قد يرتقي إلى درجة الاستحباب أو أعظم منه“ (كتاب الشرع، باب تحريم اللعب بالنردشير، حكم الألعاب في الشريعة، أحكام القرآن للتهانوي: ۳/۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، سورة لقمان: ۶، معارف القرآن: ۲/۲۲، كھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت: ص ۱۳)۔

ب- لباس و پوشاک کے سلسلے میں کھلاڑیوں کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کی رعایت ضروری ہے:

۱- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا جس میں مرد و عورتوں اور عورتوں کی مردوں کی مشابہت اختیار کریں، شرعاً جائز نہیں ہے۔

”عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: ”لعن رسول الله ﷺ المتشبهين من الرجال بالنساء، والمتشبهات من النساء بالرجال“ (صحيح البخاري ص: ۱۰۶۲، كتاب اللباس، باب المشبهون بالنساء والمتشبهات بالرجال، الرقم: ۵۸۵)۔

۲- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا جس سے حلیہ اور وضع قطع اس طرح بدل جائے کہ غیر مسلموں سے بظاہر کوئی امتیاز باقی نہ رہے، یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

”إن اللباس الذي يتشبه به الإنسان بأقوام كفرة، لا يجوز لبسه لمسلم إذا قصد به التشبه بهم“ (موسوعة

تکملة فتح الملهم ۱۰، ۴۴، کتاب اللباس والزينة)۔

۳- نیز کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا بھی شرعاً جائز نہیں ہے، جس میں ستر دکھائی دے۔

ج- شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے وہ کھیل جو آپسی جھگڑوں، تضييع اوقات، جوا اور قمار کا ذریعہ ہیں، سختی کے ساتھ منع کیے گئے ہیں، مثلاً چوسر، شطرنج، کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، تحریش بین البہائم یعنی جانوروں کو آپس میں لڑانا، ویڈیو گیم، گوٹی، لوڈ اور تاش وغیرہ، ان تمام کھیلوں میں سوائے نقصانات کے دینی یا دنیوی کوئی فائدہ نہیں، اس لیے یہ سب ممنوع ہیں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ“ (المائدة: ۹۰) (اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانے تو بس نری گندی باتیں ہیں شیطان کے کام سواس سے بچے رہو تاکہ فلاح پاؤ) مفسر زحشری نے لکھا ہے کہ حرمت خمر و میسر کے متعدد طریقے قرآن نے اسی آیت میں جمع کر دیئے:

۱- آیت کی ابتدا کلمہ ”إنما“ سے کی، یعنی ان چیزوں کی بس یہی کل حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ ۲- ان دونوں چیزوں کا ذکر انصاب و ازلام جیسی مسلم گندی چیزوں کے ساتھ کیا۔ ۳- انہیں ”رجس“ قرار دیا۔ ۴- انہیں عمل شیطان ٹھہرایا۔ ۵- صاف صاف ان سے اجتناب کا حکم دیا۔ ۶- ان سے احتراز کو موجب فلاح بتلادیا۔ ۷- ان کی دینی و دنیوی مضرتوں کا ذکر کیا (ماجدی، ص ۲۶۹)۔

”والمحرم المكروه من الملاهي الرائجة في عمرناهي كل لهو اشتمل على القمار أي لهو كالت، فإن القمار والميسر حرام بنص القرآن والند والشطرنج والأربعة عشر (بالهندية جوسر) واللعب بالحمام وما يقال له (تاش) إذا لم يكن فيه تعليم علم مفيد أو كالت ينفضي إلى الإلهاء، أو اشتمل على القمار، وما يلعب به الصبيان من الجواز والبوتام والكرات الزجاجية (كوليان) وأمثالها فإنها تشتمل على القمار، فالواجب على أوليائهم أن يمنعوه عنها، وكذلك ما يقال له في عرفنا (كنكوا) سواء تشتمل على القمار أم لا، وكذا التحريش بين البهائم والطيور واللعب بالناريات (آتشبازی) وأمثالها فإنها كلها لولم يتضمن معاصي ومنكرات لا تخلو عنها عادة فهي في نفسها من اللهو المجرد الذي وقع الإجماع على تحريمه أو كراهته“ (احكام القرآن ۳/۲۰۲)۔

(اسی طرح) آج کل تانگے دوڑانے، کتوں کی دوڑ وغیرہ پر ہزاروں لاکھوں روپے کی شرطیں لگائی جاتی ہیں جو خاصہ قمار بازی ہیں، لہذا جائز نہیں (فضل العبود: ۳/۶۵، ۶۶، رقم: ۲۵۷۴)۔

د- جس صورت میں شرکاء کھیل، شرکت کے لیے متعین رقم جمع کرتے ہیں اور جو جیت جاتا ہے وہ اس رقم کا حقدار ہوتا ہے، اور ناکام ہونے والے کو اپنی جمع کردہ رقم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، تو پیسوں کی یہ شرط بوجہ قمار و خطر ناجائز اور ممنوع ہے۔ لیکن اگر کھلاڑیوں کو دیا جانے والا انعام وغیرہ تھرڈ پارٹی یعنی کسی شخص ثالث کی طرف سے ہو، مثلاً کوئی ادارہ، یا انجمن، یا تنظیم (Unions) تو یہ شرط درست و جائز ہوگی۔

علامہ حصکفی فرماتے ہیں: ”اگر کھیل میں جانبین سے شرط لگائی جائے تو یہ حرام ہے، کیوں کہ یہ قمار ہے، ہاں! اگر فریقین کسی تیسرے شخص (ادارے، تنظیم یا انجمن) کو اپنا محل بنالیں (جو جیتنے والے کو انعام دے گا) تو یہ درست ہے۔“

”قال العلامة الحصكفي: وحرم لو شرطاً فيها من الجانبين، لأنه يصير قماراً، إلا إذا أدخلوا محلاً بينهما بفرض كفاء لفرسيهما“ (الدر المختار مع الشامي: ۵۷۸، ۹/۵۷۷، المحيط البرهاني في الفقه النعماني: ۶/۵۲)۔

اسی طرح علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: ”بعض نے ہارجیت کی صورت میں شرط کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ وہ کھیل میں شرکت کرنے والوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص ہو، مثلاً امام، جب کہ خود اس کا گھوڑ سوار اس کھیل میں شریک نہ ہو، اور جمہور نے جائز قرار دیا ہے کہ اگر کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کی طرف سے شرط ہو تو درست و جائز ہے، اسی طرح کسی ثالث یعنی تھرڈ پارٹی کی طرف سے بھی درست ہے، بشرطیکہ اس کا کوئی کھلاڑی اس کھیل میں شریک نہ ہو، ورنہ پھر یہ صورت قمار کی ہو جائے گی۔“

”واتفقوا علی جوازها بعض بشرط أن یکون من غیر المتسابقین کالامام حیث لا یکون له معہم فرس، وجوز الجمهور أن یکون من أحد الجانبین من المتسابقین، وكذا إذا كان معهما ثالث محلل بشرط أن لا یخرج من عنده شيئاً لیخرج العقد عن صورة القمار۔ الخ“ (فتح الباری ۶/۸۹، الرقم: ۲۸۷، کتاب الجہاد والسير، باب ۵۸)۔

۵۔ اگر کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو وہ کھیل ناجائز و مکروہ تحریمی ہے، کیوں کہ شریعت اسلامیہ اپنے ماننے والوں کو اس طرح کا کھیل کھیلنے سے منع کرتی ہے، ”احکام القرآن للتمھانوی“ میں کھیلوں کے سلسلے میں جو ضابطہ منقول ہے وہ یوں ہے:

”برایا کھیل جو انسان کو اس پر واجب حقوق (خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد)، سے غافل کر دے، یا منکرات و منہیات شرعیہ پر مشتمل ہو، یا اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہوں، ناجائز و مکروہ تحریمی ہے، اور شریعت اسلامیہ اپنے ماننے والوں کو اس طرح کا کھیل کھیلنے سے منع کرتی ہے“ (۲۰۱/۳)۔

نیز جس طرح مال کے سلسلے میں اسراف و فضول خرچی حرام ہے، ایسے ہی تضييع اوقات بھی شرعاً حرام ہے، بلکہ علامہ یوسف قرضاوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”وقت کو ضائع کرنا مال کے ضائع کرنے کی حماقت و سفاہت سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے، کیوں کہ مال دوبارہ حاصل ہو سکتا ہے، لیکن وقت نکل جانے کے بعد دوبارہ نہیں لوٹتا“۔

”يقول الدكتور يوسف القرضاوي حفظه الله: والحق أن السفه في إنفاق الأوقات أشد خطراً من السفه في إنفاق الأموال ... لأن المال إذا ضاع قد يعود، والوقت إذا ضاع لا عوض له“ (الألعاب الرياضية لعلى حسين أمين يونس: ص ۲۲۰، دار النفائس الأردن)۔

۶۔ اگر اسٹیڈیم میں غیر محرم کھیل رہے ہوں، یا ان کی ستر ڈھکی ہوئی نہ ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور خلاف شرع امور انجام دیئے جا رہے ہوں، یا اسٹیڈیم میں کھیل کے علاوہ کوئی اور خلاف شرع پروگرام ہو رہا ہو، تو پھر ایسی صورت میں اسٹیڈیم کے ٹکٹ لینا اور دینا دونوں جائز نہیں ہیں، لیکن چونکہ اب یہ سب ممکن نہیں، اس لئے کہ وہاں تالیاں بجائی جاتی ہیں، سیٹیاں کسی جاتی ہیں، مذاق اڑایا جاتا ہے، ایک دوسرے کی دل آزاری کی جاتی ہے، عورتیں اعل بغل میں نیم برہنہ لباس میں ہوتی ہیں، اور سب سے اہم بات یہ کہ وقت ضائع ہوتا ہے، جبکہ وقت سب سے قیمتی سرمایہ ہے، لہذا یعنی کام میں آدمی مصروف رہتا ہے، نیز وہاں فاسقوں اور فاجروں کا اجتماع ہوتا ہے، اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه“ آدمی کے عمدہ اخلاق میں یہ ہے کہ وہ لایعنی (فضول، بے سود، بے کار و غیر مفید) امور کو ترک کر دے۔

### ۳۔ سیاحت و تفریح:

تفریحی مقصد کے لیے آدمی جس شہر یا ملک کا سفر اختیار کر رہا ہے، وہ دو حال سے خالی نہیں، وہ شہر یا ملک کافر ہوگا یا اسلامی،..... اگر وہ کافر ملک ہے تو بغرض سیاحت و تفریح اس کا سفر اختیار کرنا درست نہیں ہے، اور اگر اسلامی ملک ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں،..... وہ اسلامی ملک یا تو منکرات و فواحش اور برائیوں کا اڈہ ہوگا یا نہیں،..... اگر وہاں پر منکرات و فواحش اور جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، تو اس کا سفر اختیار کرنا درست نہیں ہے، ورنہ مباح ہے، بشرطیکہ کثیر رقوم کا صرفہ نہ ہوتا ہو، کیوں کہ اضاعت مال سے اسلام نے ہمیں منع کیا ہے،..... لیکن ضرورت داعیہ اور غرض صحیح (مثلاً حصول علم و فن، تجارت اور علاج وغیرہ) کی بناء پر بلا و کفر یا ایسے اسلامی شہر و ممالک (جہاں منکرات و فواحش ہوں) کا سفر کرنا مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ درست ہے:

۱۔ شعائر اسلام کی حفاظت ہو۔ ۲۔ اقامت دین بلا و کفر میں ممکن ہو۔ ۳۔ بقدر ضرورت ہی بلا و کفر میں مقیم رہے، بعد از انقضاء حاجت و ضرورت اپنے ملک یا شہر واپس لوٹ جائے۔ ۴۔ انسان کے پاس اتنا علم ہو جس کے ذریعہ وہ (دین کے متعلق) مشکوک و شبہات کو دور کرے۔ ۵۔ انسان کے پاس اتنا دین ہو جو اس کو شبہات سے روکے۔ ۶۔ سفر کی سخت ضرورت پیش آئی ہو۔

جن اعذار کی بناء پر سفر کی ضرورت پیش آئے وہ یہ ہیں: مثلاً علاج، جب کہ وہ اس کے ملک یا شہر میں نہ ہو سکتا ہو۔ تحصیل علم و فن جب کہ وہ اس ملک میں مہیا اور دستیاب نہ ہو۔

۷۔ اگر سیاحت کا مقصد تفکر فی خلق اللہ ہے تو ان اسلامی ممالک کا سفر اختیار کیا جائے جہاں پر منکرات و فواحش کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، کیوں کہ بہت سے اسلامی ممالک میں سیر و تفریق اور سیاحتی مقامات بن چکے ہیں۔

الف۔ تفریق کا مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا بلا ضرورت و داعیہ و بلا غرض صحیح جائز نہیں ہے، جب کہ اس میں کثیر رقم کا صرفہ ہوتا ہو، کیوں کہ شریعت اسلامیہ نے ہمیں اضعاف مال سے منع فرمایا ہے، بلکہ قرآن مجید میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے، یعنی ناشکری اور کفرانِ نعمت میں شیطان کے مشابہ وہم سطح ہوتے ہیں..... اور انسان کی مذمت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے شیطان سے تشبیہ دیدی جائے، جو ساری برائیوں کا سرچشمہ ہے (کشاف بحوالہ ماجدی، تحت الآیہ - ۲۷، سورۃ ال اسراء) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور مال کو فضولیات میں نہ اڑا، بیشک فضولیات میں اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں۔“

”ولا تبذر تبذیراً، ان المبدّرین كانوا اخوات الشیاطین“ (سورۃ الإسراء: ۲۷، ۲۸)

ب۔ شق (الف) میں مذکور تفصیل سے شق (ب) کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جن ملکوں یا شہروں کی طرف سفر کرنا درست ہے، اگر وہ علاقے جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کے اعتبار سے پر اعتماد ہیں، تو ان کی طرف خود بھی سفر کرنا اور اپنے بال بچوں کو لیجانا درست ہے۔ اور اگر وہ علاقے پر خطر ہیں تو خود سفر کرنا اور بچوں کو لیکر جانا بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنا مقصد شرعیہ خمسہ میں سے ایک مقصد ہے، جیسا کہ علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں: ”ومجموع الضروریات خمسۃ: وهي حفظ الدین، والنفس، والنسل، والمال، والعقل“ (الموافقات فی اصول الأحکام للإمام الشاطبی: ۲/۳، کتاب المقاصد، المسئلۃ الأولى)۔

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”ولا تلقوا بأيديکم الى التهلكة“ (سورۃ البقرۃ: ۱۹۵) (کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ ”ولا تقتلوا انفسکم“ (سورۃ النساء: ۲۹) (اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو)۔

ج۔ جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں ازراہ تفریق جانا درست نہیں ہے، نیز وہاں جانے والوں کے لیے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لیے دوکان لگانا فی نفسہ تو جائز ہے۔

گرتن غیر یعنی تعاون علی الاثم کی بناء پر جائز نہ ہوگا، ”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (سورۃ المائدہ: ۲) نیز ذریعہ معصیت بھی معصیت ہوتا ہے۔

”ان الوسيلة أو الذریعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرماً، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجباً“ (المقاصد الشرعیة للخادمی ص: ۳۶)۔

”وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم أنه یتخذہ خمراً، لأن المعصیة لا تقوم بعینہ بل بعد تغیرہ۔ وقیل: یکره لإعانتہ علی المعصیة۔ درمختار۔ قوله: (وجاز) أي عنده لا عندهما۔ اب“ (درمختار ۹/۲۷۶، ۲۷۷، کتاب الحظر والإباحة، فصل فی البیع، دار الکتب دیوبند)۔

د۔ تجارتی کمپنیوں کا ٹورائینڈ ٹراویس قائم کر کے، سیاحین اور مسافریں کو ایک شہر یا ایک ملک سے دوسرے شہر یا دوسرے ملک لیجانا فی نفسہ جائز ہے۔

”الأصل فی الأشياء الإباحة حتی یدل الدلیل علی عدم الإباحة“ (الأشیاء والنظائر ۱/۲۵۲، ۲۵۳)۔

”وقوله: (الأصل فی الأشياء النج) ذکر العلامة قاسم بن قطلوبغا فی بعض تعالیقہ أن المختار أن الأصل الإباحة عند جمهور أصحابنا..... ودلیل هذا القول قوله تعالیٰ: ”خلق لكم ما فی الأرض جمیعاً“ (ہامش الأشیاء ۱/۲۵۲، ۲۵۳، مکتبہ فقیہ الامت دیوبند)۔

لیکن اگر ان کمپنیوں کا مقصد ہی ان سیاحین و مسافریں کو دائرہ عیش دلانا، شراب نوشی اور محرّمات کا ارتکاب کرنا اور کروانا وغیرہ، اور مندروں اور تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا ہو، تو تعاون علی المعصیت: ”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (سورۃ المائدہ: ۲) (اور گناہ میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔ اور قاعدہ: ”الأمور بمقاصدها“ (الأشیاء والنظائر لابن نجیم المحنفی رحمہ اللہ: ۱/۱۱۳) کے پیش نظر اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

## ۴- دستاویزی و تاریخی فلم:

دستاویزی، تاریخی اور تعلیمی مقاصد کے لیے فلم بنانا، تاکہ مشہور و عبقری شخصیات اور تاریخی مقامات کو اسکرین پر دیکھ کر طلباء کو اس مضمون میں زیادہ سے زیادہ ادراک پیدا ہو سکے، اس وقت جائز اور درست ہے جب کہ اس میں ذی روح اور جانداروں کی تصویر سازی و تصویر کشی نہ کی گئی ہو، کیوں کہ ذی روح کی تصویر کشی اور تصویر سازی بلا ضرورت شدید حرام ہے۔

”قال رسول الله ﷺ: ”إن أشد الناس عذاباً عند الله المصورون“ (صحیح بخاری و صحیح مسلم ۲/۸۰، کتاب

اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة. الصحیح لمسلم: ۲/۲۰۱، کتاب اللباس والزينة، باب تحريم تصوير صورة الحيوان).

”قال القرطبي: يدل على المنع من تصوير شئ من شئ كان“ (الجامع لاحكام القرآن ۱۳/۲۷۲).

## ۵- کارٹون:

اولیہ بات واضح ہو کہ تصویر کشی و تصویر سازی بلا ضرورت شدید حرام ہے، رہی بات کارٹونی تصویر کی..... تو کارٹون دو طرح کا ہوتا ہے:

۱- وہ کارٹون جس میں ذوی الارواح میں سے کسی کی ہیئت بنائی جائے، مثلاً انسان یا حیوان، اس کا حکم ذوی الارواح کی تصویر کی طرح ہے، لہذا اس طرح کے کارٹونوں کو دعوت و تبلیغ، تعلیم و تادیب اور شخصیات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بنانا اور شائع کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ کسی غایت صالحہ و مقصد صالح کی خاطر وسیلہ فاسدہ کا سہارا نہیں لیا جاسکتا، جیسا کہ کسی شخص کا انفاق فی سبیل اللہ کی خاطر سودی کاروبار کرنا، یا چوری اور ڈاکہ زنی کرنا شرعاً و عقلاً جائز نہیں ہے۔

۲- ایسی تصویر بنائی جائے جو مقطوع الرأس ہو یا موضع سر پر دائرہ یا اس کے مشابہ کوئی نشان وغیرہ لگایا جائے، تاکہ چہرے کے نشانات و علامات مٹ جائے، یا وہ تصویر انسان و حیوان کی ہیئت پر نہ بنائی گئی ہو تو اس طرح کے کارٹونس بنانے میں کوئی حرج و مضائقہ نہیں ہے، کیوں کہ حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں: ”إنما الصورة الرأس، فإذا قطع فلا بأس“۔ کہ اصل تصویر سر ہے، جب سر کو قطع کر دیا جائے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ (المصنف لابن ابی شیبہ: ۱۳/۶۳۷، رقم: ۲۵۸۰۸، مجلس العلمي افریقیہ)۔

## ۶- ڈرامہ:

آج کل دینی مدارس اور اصلاحی پروگراموں میں جو مکالمات اور ڈرامے منعقد کیے جاتے ہیں، ان میں معاشرے کے مفاسد پر تنقید اور خرابیوں پر مطلع کر کے، ان کے اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے، شرعاً اس طرح کے مکالمات اور ڈرامے جائز اور درست ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس میں ضروریات دین و عقائد پر زور نہ پڑتی ہو، اور محرمات شرعیہ میں سے کسی محرم کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، مثلاً تالیاں پیٹنا، بیٹیاں بجانا، اور کسی کی تحقیر و تذلیل کرنا وغیرہ۔

”وما كان صلواتهم عند البيت إلا مكاء وتصدية“ (سورة الأنفال: ۲۵) (اور) (خود) ان کی نماز (ہی) خانہ (کعبہ) کے پاس کیا تھی بجز بیٹھی بجانے اور تالی بجانے کے، اس آیت میں صاف تشبیہ اعمال مشرکین کے ساتھ ہے (ماجدی: ص ۳۸۱)۔





## تفریح اور کھیل کود کے جائز وسائل اور اس کے شرعی ضابطے

مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی ؒ

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين۔

کیا شریعت میں تفریح اور مزاح جائز ہے؟

تفریح عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو ”فرح“ ماذہ سے مشتق ہے۔ فرح کے بارے میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ”الفرح لذّة في القلب بآذارك المحبوب“ (تفسیر قرطبی) کہ محبوب چیز کے پالینے سے جلدت حاصل ہوتی ہے، اسی کو فرحت اور خوشی کہتے ہیں۔ اگر یہ فرحت محض قلبی خوش ہو اور اللہ کی نعمتوں کے احساس اور اس کے فضل و کرم کے استحضار پر مبنی ہو، تو وہ شرعاً مطلوب، مستحسن اور پسندیدہ عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحوا“ (یونس ۵۸) (آپ کہہ دیجئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور مہربانی سے ہے، تو چاہیے کہ وہ لوگ خوش ہوں)۔

اسی طرح ”مزاح“ مزح سے بنا ہے، مزاح کے بارے میں ملا علی قاری ”مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح“ میں تحریر فرماتے ہیں: المزاح انبساط مع الغیر من غیر ایذاء فان بلغ الإیذاء یکون سخریة (حاشیہ مشکاۃ المصابیح ص ۴۱۶) کہ مزاح ایسے عمل کو کہتے ہیں، جس کے ذریعہ دوسرے کے ساتھ مل کر خوش طبعی حاصل ہو سکے۔ اس طور پر کہ اس عمل سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور اگر وہ خوش طبعی کسی کے لیے باعث تکلیف ہو جائے، تو اسے مزاح نہیں؛ بلکہ ”سخریہ“ یعنی مذاق اڑانا کہیں گے۔

مزاح اور زندہ دلی و خوش طبع انسانی زندگی کا ایک خوش کن عنصر ہے۔ اور جس طرح اس کا حد سے متجاوز ہونا نازیبا اور مسخر ہے، اسی طرح اس لطیف احساس سے آدمی کا باہل خالی ہونا بھی ایک نقص ہے۔ جو بسا اوقات انسان کو خشک محض بنا دیتی ہے۔ بسا اوقات ہجولیوں اور ہمنشینوں اور ماتحتوں کے ساتھ لطیف ظرافت و مزاح کا برتاؤ ان کے لیے بے پناہ مسرت کے حصول کا ذریعہ اور بعض اوقات عزت افزائی کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر عظمت و رفعت اور شان و شوکت کے باوجود، بسا اوقات اپنے جاں نثاروں اور نیاز مندوں سے مزاح فرماتے تھے۔ ذیل کی احادیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ آپ کا پر شفقت مزاح کس طرح ہوا کرتا تھا۔

۱۔ عن أبي هريرة ربه قال: قالوا يا رسول الله انك لتداعبنا قال إني لا أقول إلا حقاً (ترمذی ۲۰۲۰)۔

۲۔ عن أنس ربه قال: إن كان النبي ﷺ ليخالطنا حتى يقول لأخ لي صغير يا أبا عمير! ما فعل الصغير. كان له نخير يلعب به فمات“ متفق عليه (مشکوٰۃ المصابیح ۴۱۶، ترمذی ۲۰۱۹)۔

۳۔ عن أنس أن النبي ﷺ قال لامرأة عجوز انه لا تدخل الجنة عجوز فقالت وماهين وكانت تقرأ القرآن فقال لها اما تقرئين القرآن ”إنا أنشأناهن إنشاء فجعلناهن أبكارا“ (مسند زین بہ حوالہ مشکوٰۃ ص ۴۱۶)۔

۴۔ عن أنس أن رجلاً استحمل رسول الله ﷺ فقال: إني حاملك على ولد ناقة فقال ما أصنع بولد الناقة؟ فقال رسول الله ﷺ: وهل تلد الإبل إلا النوق (ترمذی ۲۰۲۰، ابوداؤد ص ۶۸۲)۔

۵۔ عن أنس بن مالك أن النبي ﷺ قال له يا ذا الأذنين! (ترمذی ۲۰۲۰)۔

۶۔ عن عوف بن مالک الأشجعی قال أتیت رسول اللہ ﷺ فی غزوة تبوک وهو فی قبة من آدم فسلمت فرزة وقال: ادخل فقلت: اکلّی یا رسول اللہ! قال: کلّک فدخلت (ابوداؤد ۶۸۲)۔

۷۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص دیہات کے رہنے والے تھے، ان کا نام زاہر بن حرام تھا۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں دیہات سے ہدیہ و تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ تو اس حضرت بھی بازار سے ان کی ضرورت کی چیزیں انھیں دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان حضرت نے فرمایا کہ زاہر ہمارا دیہاتی ہے اور ہم لوگ اس کے شہری ہیں۔ اس حضرت کو ان سے بڑی محبت تھی، حالانکہ وہ بد شکل تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے سامان بازار میں فروخت کر رہے تھے، کہ ان کی نظر سے بچکر آس حضرت نے اسے پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ زاہر نے کہا کوئی ہے، جو مجھے ان سے پھڑائے۔ ذرا پیچھے دیکھا تو آنحضرت ﷺ کو پہچان لیا۔ جوں ہی پہچانا، پوری طاقت سے اپنی پشت کو حضور ﷺ کے سینے سے چمٹانے لگے۔ اور حضور اکرم ﷺ فرماتے لگے کہ اس غلام کو کون خریدے گا؟ زاہر نے کہا یا رسول اللہ مجھے آپ فروخت کرتے وقت کھوٹا پائیں گے۔ رسول اکرم نے فرمایا مگر اللہ کی بارگاہ میں تو کھوٹا نہیں ہے۔

مزاح کے جواز کے حدود:

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ آداب کی رعایت کرتے ہوئے کبھی کبھار مزاح کی نہ صرف گنجائش ہے؛ بلکہ مستحسن ہے اور اسوۂ نبوی کی اتباع ہے؛ لیکن اگر مزاح دوسرے آدمی کے لیے ناگواری اور اذیت کا باعث بن جائے، یا حد سے زیادہ ہنسی کا ذریعہ بن جائے یا مزاح کا عمل کبھی کبھار کے بجائے کثرت سے ہونے لگے، تو ایسے مزاح کی ممانعت ہوگی اور اس کی حوصلہ شکنی کی جائے گی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فلیضحکوا قليلا ولیسکوا کثیرا (التوبہ، ۸۲) (وہ ہنس لیں تھوڑے دن اور وہ روئیں گے بہت دنوں تک) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”فارت کثرة الضحک تمیت القلب“ (ترمذی، مشکوٰۃ ۲۲) (زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے)۔

آپس میں مذاق کرنا اگر دوسرے کے لیے باعث تکلیف نہ ہو۔ معاملہ برابر کا ہو؛ تو اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: ایک روز حضور اکرم ﷺ میرے گھر تشریف فرما تھے اور حضرت سودہ بھی تھیں، میں نے سان پکایا اور حضرت سودہ سے کہا آؤ کھانا کھائیں؛ انہوں نے انکار کیا۔ نشست اس طرح واقع ہوئی تھی، کہ ایک طرف وہ تھیں، دوسری طرف میں اور بیچ میں سرور کائنات ﷺ۔ جب حضرت سودہ نے انکار کیا؛ تو میں نے کہا کہ کھاتی ہو تو کھاؤ؛ نہیں تو منہ پر مل دوگی۔ انہوں نے نہ کھایا، میں نے ان کے منہ پر مل دیا۔ حضور ﷺ نے اپنے پاؤں بیچ میں سے ہٹا دیے تاکہ حضرت سودہ اپنا بدلہ مجھ سے لے سکیں، چنانچہ انہوں نے بھی ایسا کیا اور آپ ﷺ مسکراتے رہے (نسائی، ابن ماجہ)۔

مسلمانوں کو تکلیف دینے، ان کا مذاق اڑانے، ان کی تحقیر کے سلسلے میں سخت ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ ارشاد نبوی ہے: المسلم أخو المسلم لا یظلمه ولا یخذله ولا یحقره (مسلم) (ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس پر کوئی ظلم و زیادتی نہ کرے، اس کو بے مدد نہ چھوڑے اور اس کو حقیر نہ جانے اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرے)۔ پھر آپ نے فرمایا: بحسب امر من الشرائع یحقر أخاه المسلم (آدمی کے برا ہونے کے لیے اتنا ہے کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کے ساتھ حقارت سے پیش آئے)۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری تحریر فرماتے ہیں: یعنی کثرت سے مستقل مزاح اور خوش طبعی میں لگے رہنا ممنوع ہے، اس لیے کہ وہ بہت زیادہ ہنسنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے، قلب میں فساد پیدا کرتا ہے، ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے اور ہیبت کو ختم کرتا ہے۔ رسول ﷺ کا معمول یہ تھا کہ کبھی کبھار آپ کسی مصلحت یا مخاطب کو مانوس کرنے کے لیے مزاح فرمایا کرتے تھے اور اس طرح کا مزاح پسندیدہ سنت ہے (حاشیہ ترمذی)۔

تکلیف دہ مزاح کی ممانعت کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے: عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال: لا تمار أخاک ولا تمازحه ولا تعدہ موعدا فتخلفه (ترمذی ۲۰۲۰)، یعنی حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرنا اور اس سے مذاق نہ کرو اور اس سے تم ایسا وعدہ نہ کرو جس کی وعدہ خلافی کرو۔

معلوم ہوا کہ مزاح میں اگر جھوٹ یا تمسخر و استہزاء کا پہلو ہو، تو وہ موجب ہلاکت ہے۔ تمسخر و استہزاء کفار کا شیوہ ہے، جو وہ اہل ایمان؛ بلکہ انبیاء کرام سے کرتے تھے، اہل ایمان کے لیے اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ مزاح سے ایک درجہ آگے مذاق کا معاملہ ہے، مذاق کرنا اور مذاق اڑانا دو الگ چیزیں ہیں، مذاق اڑانے کی اجازت کسی حالت میں نہیں ہے، البتہ بعض حالات میں مذاق کرنے کی اجازت ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے کسی

صحابی کو منگوں دیکھتے تو دل لگی کے ذریعہ اسے خوش فرماتے (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ۲۶۸)۔ ایک مرتبہ حضرت ابو بکرؓ نے حضور اکرم ﷺ کو منگین دیکھا تو اپنا ایک واقعہ سنا کر خوش کیا (تکملہ فتح الملہم جلد ۱ صفحہ ۱۷۸)۔

مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعرہ:

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ مزاح فی نفسہ اگر آداب و اخلاق کے دائرہ میں ہو تو درست ہے، یہی حال مزاح پر مشتمل اشعار اور مزاحیہ شعر گوئی کا بھی ہے۔ وزن اور قافیہ کی رعایت کرتے ہوئے بالارادہ کہے گئے کلام کو شعر کہتے ہیں ”ثم استعمل فی الکلام المقفی الموزون قصداً“ (فتح الباری ۱۰: ۶۲۸) اصل لغت میں شعر ہر اس کلام کو کہا جاتا ہے، جس میں محض خیالی اور غیر تحقیقی مضامین بیان کے گئے ہوں، فن منطوق میں بھی ایسے ہی مضامین کو ”تضایا شعرية“ یا اولہ شعر یہ کہا جاتا ہے۔

عن عائشہ قالت: ذکر رسول اللہ الشعر فقال رسول اللہ ﷺ: هو کلام فحسہ حسن وقبیحہ قبیح (رواہ الدارقطنی، مشکوٰۃ ۱۱: ۴۱۰)۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے شعر کے بارے میں ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ شعر بھی کلام ہے، اس میں جو اچھا ہے، وہ اچھا ہے اور جو برا ہے، وہ برا ہے۔

عن ابی ابن کعب قال: قال رسول اللہ ﷺ ان من الشعر حکمة (بخاری مع فتح الباری جلد ۱۰ ص ۶۲۷) حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعض اشعار (اپنے مضمون کے لحاظ سے) سراسر حکمت ہوتے ہیں۔ اچھے اشعار کی تعریف کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر بے ساختگی میں بعض اشعار بطور رجز پڑھے بھی ہیں اور بعض صحابہ سے اچھے اشعار سنانے کی فرمائش بھی کی ہے اور بعض متعین شعراء کے اشعار کی تعریف بھی کی ہے۔

۱۔ عن ابی ہریرہؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: واصدق کلمة قالها الشاعر کلمة لبید: ألا کل شیء ما خلا اللہ باطل (بخاری) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے، وہ لبید بن ربیعہ شاعر کی یہ بات (مصرع) ہے ”الاکل شیء ما خلا اللہ باطل“ کہ آگاہی ہو! اللہ کے علاوہ ہر چیز فانی ہے۔

عبدالرحمن بن ابی بکر کہتے ہیں کہ: کنت أجالس أصحاب رسول اللہ مع أبي في المسجد فيتناشدون الأشعار کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اپنے والد کے ساتھ ہمنشین اختیار کرتا تھا؛ تو وہ لوگ آپس میں شعر گوئی کیا کرتے تھے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کے صحابہ اشعار کا مذاکرہ کیا کرتے تھے اور زمانہ جاہلیت کا تذکرہ رسول اللہ کے موجودگی میں کیا کرتے تھے؛ لیکن آنحضرت انہیں اس سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ بسا اوقات اس پر مسکراتے تھے (فتح الباری ۱۰: ۶۳۱)۔

روایتوں کی جستجو سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشعار کا کہنا نہ صرف قابل تعریف ہے؛ بلکہ دشمنوں کے لیے بعض اشعار تلوار کا کام کرتے ہیں اور مومن اشعار کے ذریعہ بھی جہاد کرتا ہے۔ حضرت کعب بن مالکؓ نے حضور اکرم ﷺ سے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شعر گوئی کے حوالے سے جو حکم نازل فرمایا ہے؛ اس کے بعد ہمارے لئے کیا گنجائش ہے؟ آپ نے فرمایا: ان المومن یجاہد بسیفہ ولسانہ کے بیشک مومن جس طرح تلوار سے جہاد کرتا ہے؛ اسی طرح اپنی زبان سے بھی جہاد کرتا ہے (شرح السنہ، مشکوٰۃ ص ۳۱۰)۔

مذکورہ روایتوں کے پیش نظر علماء کرام اور فقہائے امت نے شعر گوئی کے تعلق سے متعدد مسائل مستنبط کیے ہیں۔ علامہ ابن بطلالؒ فرماتے ہیں کہ جس شعر میں اللہ کا ذکر اس کی وحدانیت اور اسلام سے الفت کا بیان ہو وہ شعر قابل تعریف ہے اور جس شعر میں جھوٹ اور فحش گوئی ہو وہ مذموم ہے (فتح الباری ۱۰: ۶۳۱)۔

شرائط و آداب کے ساتھ فی نفسہ مزاح کا درست ہونا (چاہے وہ نظم میں ہو یا نثر میں) الگ چیز ہے اور باضابطہ مزاحیہ پروگرام منعقد کرنا یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا الگ چیز ہے، ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ پروگرام کا انعقاد ہتماً تمام زمانہ کی علامت ہے۔ اور مباح چیزوں کا ضرورت سے زمانہ ہتماً کرنا، اسے زمرہ کراہت میں داخل کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہتماً مزاح اور تفریح کے لیے ہو رہا ہے اور تفریح جب حد اعتدال سے بڑھے گی؛ تو وہ لہو و لعب میں داخل ہو جائے گی اور لہو و لعب سے قرآن کریم میں ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ومن الناس من يشتري لهو الحديث

ليضل عن سبيل الله بغير علم ويتخذها هزوا أو لثك لهر عذاب مهين (لقمان ۴) یعنی اور کچھ لوگ وہ ہیں، جو خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے، تاکہ اللہ کے راستے سے بے سوچے سمجھے گمراہ کریں اور اس کی ہنسی اڑائیں ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ایسی مجلسوں میں اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ عام طور پر نماز دو دیگر فرض کا پاس و خیال بھی نہیں رہتا، شور و شغب ہوتا ہے، تالیاں پیٹی جاتی ہیں، مردوزن کا بے محابا اختلاط ہوتا ہے، ہنسانے کے لیے جھوٹی باتوں کا سہارا لیا جاتا ہے، لہذا ایسی مجالس کا انعقاد کراہت سے خالی نہیں اور اگر عملی طور پر ایسی مجالس میں محرمات و ناجائز امور کا ارتکاب ہو؛ تو اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کسی ختنہ میں بلائے گئے آپ نے انکار فرمایا، کسی نے وجہ دریافت کی؛ تو آپ نے فرمایا کہ پیغمبر خدا ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہم لوگ ختنہ میں نہیں جاتے تھے اور نہ اس کے لیے بلائے جاتے تھے (احمد، اصلاح الرسوم ۱۱۰)

معلوم ہوا کہ جس کام کا اہتمام سلف صالحین سے ثابت نہیں اس کے لیے اہتمام کرنا اور بلانا پسندیدہ نہیں ہے۔ اتفاقاً طور پر حسب موقع مزاحیہ گفتگو کر لینا اور تفریحی اشعار کہہ سن لینا اگرچہ جواز کا پہلو رکھتا ہے؛ لیکن اس کے لیے اہتمام سے اجتناع کرنا اور اس میں گھنٹوں لگانا کسی طرح بھی درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنہ (ترمذی) یعنی آدمی کے اچھے اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی امور کو ترک کر دے۔ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری کے حوالہ سے یہ بات آچکی ہے کہ مستقل طور پر مزاح میں لگا رہنا ممنوع ہے؛ اس لیے کہ وہ زیادہ ہنسنے کا سبب، قلب کے بگاڑ کا ذریعہ اور ذکر اللہ سے اعراض کا موجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی کبھار ہی مزاح فرماتے تھے، وہ بھی کسی خاص مصلحت کے لیے یا مخاطب کو مانوس کرنے کے لیے (حاشیہ ترمذی ۲۰۲)۔

### مزاحیہ کہانی کا شرعی حکم:

مزاحیہ کہانیاں جو موعظت اور پند و نصیحت پر مشتمل ہوں اور مزاح اس میں ضمنی طور پر ہو۔ یا مزاح کے پہلو بہ پہلو حکمت و موعظت اور سبق آموز باتیں بھی ہوں؛ تو ایسی کہانیاں لکھنے کی گنجائش ہے، جب لکھنے کی گنجائش ہے؛ تو پڑھنے، شائع کرنے اور خرید و فروخت کرنے کی بھی گنجائش ہوگی، لیکن شرط یہ ہے کہ تمام امور فرض و اجبات، سنن اور دیگر ضروری امور سے غفلت کا سبب نہ بنیں۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: الحکمة ضالۃ المومن فاینما وجدھا فهو احق بہا کہ حکمت و دانائی کی باتیں مومن کے لیے متاع گمشدہ ہے، وہ جہاں مل جائے؛ تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔

اس کے علاوہ ادب کے نام پر ہمارے پاس جو اسلاف کے زمانے سے ذخیرے چلے آ رہے ہیں؛ وہ بھی کچھ نہ کچھ مزاحیہ حکایتوں پر مشتمل ہیں اور اکابر کے نزدیک ان کے پڑھنے پڑھانے کا کسی نہ کسی حد تک سلسلہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ابوالفرج اصفہانی کی ”کتاب الاغانی“ جاہظ کی کتاب الجلاء، اور عبد اللہ ابن المقفع کی ”کلیہ و دمنہ“ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ بلکہ موخر الذکر کتاب تو بہت سے مرکزی مدارس و جامعات میں داخل درس ہے۔ اسی طرح مشہور محقق عالم دین علامہ ابوالفرج ابن الجوزی نے تفریحی مضامین پر مشتمل ایک مستقل کتاب ”اخبار الحقیقی و المفقولین“ کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب کے نائل پر کتاب کے مقاصد پر روشنی ٹالتے ہوئے یہ الفاظ تحریر ہیں: صنف هذا الكتاب ليروح القاري عن نفسه بعض الشيء اذ ليس المذموم بعض الضحك بل كثيره والاضحالك بالكذب۔

لہذا اگر مزاح کے پہلوؤں کا حامل، مفید امور پر مشتمل کوئی کہانی ہو؛ تو اسے افاد یاتی نقطہ نظر سے انگیز کیا جاتا سکتا ہے۔ ایک بار آں حضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو عرب کی تیرہ عورتوں اور ان کے شوہروں کا قصہ سنایا جو ”حدیث ام ذرع“ کے نام سے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے (دیکھئے شامی ترمذی)۔

### لطیفہ گوئی اور مزاح کو ذریعہ معاش بنانا:

کبھی کبھار لطیفہ کہہ دینے یا مزاح اور تفریح کر لینے کی تو گنجائش ہے؛ لیکن مستقل لطیفہ گوئی کرنا اور اس کو ذریعہ معاش بنالینا، یہ اس مقصد حیات کے برخلاف ہے، جو اسلام افراد اور معاشرے میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور مستقل لطیفہ گوئی اور مزاح و تفریح میں مشغول رہنا انسان کو فکر آخرت، ذکر اللہ، عبادت اور تلاوت قرآن سے غافل کر دیتا ہے۔ زیادہ ہنسنے ہنسانے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ انہیں اسباب کی بنیاد پر شعر و شاعری کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں: لأن یمتلی جوف رجل قیحا یریه خیر من أن یمتلی شعرا کہ انسان اپنا پیٹ پیپ سے بھرے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اشعار سے اپنا پیٹ بھرے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ شعر جب ذکر اللہ، قرآن کریم کی

تلاوت اور علم کے اشتغال پر غالب آجائے اور اگر شعر مغلوب ہے تو پھر برائیں۔ یہی حال لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی کا ہے۔ اس کو مستقل پیشہ بنالینا انہماک کی دلیل ہے اور ایسی چیزوں میں غالب انہماک ممنوع ہے، لہذا اس کی اجرت وصول کرنا بھی درست نہیں ہے، از خود کوئی بطور انعام کے دیدے، تو اس کے لینے کی گنجائش ہے۔ ملا علی قاریؒ نے حدیث: قَالَ فَقُلْتُ لِأَقُولَنَّ شَيْئاً أَضْحَكُ النَّبِيَّ ﷺ (کہ میں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ضرور ایسی باتیں کروں گا جس سے آپ ہنسنے لگیں) کی تشریح میں علامہ نوویؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے بذنظر اس طرح کے امور کا مستحب ہونا سمجھ میں آتا ہے کہ انسان جب اپنے کسی ساتھی کو غمگین دیکھے، تو اس سے باتیں کریں، اسے ہنسائے، اس کو مشغول کرے اور اسے خوش کرنے کی کوشش کرے (مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۶۸)۔

بہ تکلف قہقہہ لگانے کی مجلسوں میں شرکت:

ہنسی کے مواقع پر ہنسا اور مسکرانا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور بلا موقع اور محل تکلف سے ہنسا اور قہقہہ لگانا فطرت کے خلاف عمل ہے۔ موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے میں اگرچہ ہنسا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لیے معاون فعل ہے، اس کے لیے خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، جن میں لوگ بہ تکلف قہقہہ لگاتے ہیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ عمل شرعی طور پر مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا (التوبہ ۸۲) اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَا تَكْشُرُ الضَّحْكَ فَيَأْتِ كَثْرَةَ الضَّحْكَ تَمِيتُ الْقَلْبَ (ترمذی، مشکوٰۃ ص ۳۲) کہ تم زیادہ مت ہنسا کرو اس لیے کہ زیادہ ہنسا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ قہقہہ لگانا یہاں تک کہ کھکھلا کر ہنسا بھی نبی کریم ﷺ (جو بالیقین ایمان والوں کے لیے ہر عمل میں بہترین اسوہ ہیں) سے ثابت نہیں ہے؛ بلکہ آپ خوشی کے مواقع پر صرف زیر لب مسکرایا کرتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طور پر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے کہ آپ کے دہن مبارک کا اندرونی حصہ نظر آجائے، کبھی نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ تو صرف تبہم فرمایا کرتے تھے (بخاری، مشکوٰۃ ص ۳۰۶)۔

لہذا موجودہ دور کے ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق عمل کرتے ہوئے بہ تکلف قہقہہ لگانے کی مجلس منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے؛ بلکہ بے تکلف فطری انداز میں جس قدر انسان ہنس لے، وہی اس کی صحت و تندرستی کے لیے کافی ہے، اس لیے کہ زیادہ ہنسا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق صحت و تندرستی کا سبب نہیں؛ بلکہ دلوں کے مردہ ہونے کا سبب ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لَا تَكْشُرُ الضَّحْكَ فَيَأْتِ كَثْرَةَ الضَّحْكَ تَمِيتُ الْقَلْبَ کہ تم زیادہ ہنسا مت کرو، اس لیے کہ زیادہ ہنسا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

**کھیل کود سے متعلق احکام:**..... شرعی نقطہ نظر سے ہر وہ کام قابل تعریف ہے؛ جو انسان کو مقصد اصلی پر گامزن رکھے۔ ہر اس کام کی اجازت ہے، جس میں دنیا و آخرت کا یقینی فائدہ ہو، یا کم از کم دنیا و آخرت کا خسارہ نہ ہو۔ کھیلوں میں سے بھی صرف انہیں اقسام کی اجازت ہے، جو جسمانی یا روحانی فوائد کا حامل ہوں۔ وہ کھیل جو محض تزیین اوقات کا ذریعہ ہوں، فکر آخرت سے غافل کرنے والے ہوں؛ وہ کھیل جو دوسروں کے ساتھ دھوکہ فریب یا ضرر رسانی پر مبنی ہوں؛ ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: كُلْ مَا يَلِيهِوْهُ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ بَاطِلٍ إِلَّا رَمِيَهُ بِقَوْسِهِ وَتَادِيَهُ فَرْسُهُ وَمَلَاعِبَتُهُ أَمْرَاتُهُ فَأَيُّنَ مِنْ الْحَقِّ (ترمذی، ابن ماجہ، فتح الباری ۱۱/۹۱) یعنی مرد مومن کا ہر کھیل بیکار ہے سوائے تین چیز کے (۱) تیر اندازی کرنا (۲) خورٹے سدھانا (۳) اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا، کیوں کہ یہ تینوں کھیل حق ہیں۔

**(ب) لباس و پوشاک سے متعلق:**..... لباس اور پوشاک کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ کھلاڑی کھیل کے درمیان ایسا لباس پہنے، جو کہ ساتر ہو یعنی جسم کا وہ حصہ چھپ جائے، جن کا چھپانا اور پردہ کرنا واجب ہے، یعنی مرد کے لیے ناف سے لیکر گھٹن تک اور عورت کے لیے ہتھیلی اور چہرہ کو چھوڑ کر پورا جسم ستر ہے، ان کا ڈھکا ہوا ہونا ضروری ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے: وَيَنْظُرُ الرَّجُلُ مِنَ الرَّجُلِ سَوِي مَا بَيْنَ سَرْتِهِ إِلَى مَا تَحْتَ الرَّكْبَةِ، فَالرَّكْبَةُ عَوْرَةٌ لَا السَّرَّةَ، وَيَنْظُرُ مِنَ الْأَجْنِبِيَّةِ إِلَى وَجْهِهَا وَكَفْيَيْهَا فَقَطْ (۹۰۵۲۱) اور لباس اتنا باریک اور چست بھی نہ ہو کہ جسم کے اعضاء نمایاں ہوں، اسی طرح اس لباس میں کفار کے ساتھ ایسی مشابہت نہ ہو کہ اس لباس کو دیکھنے سے کوئی خاص قوم سمجھ میں آتی ہو اور نہ اس لباس کا تعلق غیر اسلامی شعار سے ہو۔ مردوں کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ لباس ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْإِزَارِ فِي النَّارِ (بخاری، مشکوٰۃ ص ۲۴۳) کہ جو شخص بھی ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنے گا، اسے جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن عمرو

بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو زعفرانی رنگ کا کپڑا پہنے دیکھا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ کفار کا لباس ہے، اس لیے اسے مت پہنو (مسلم، مشکوٰۃ ۳۷۴)، حضرت عبداللہ بن عمر بن خطابؓ سے منقول روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من تشبه بقوم فهو منهم (احمد، ابو دائود، مشکوٰۃ ۳۷۴) کہ جس نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی اس کا تعلق اسی قوم کے ساتھ سمجھا جائے گا۔

ج- پسندیدہ کھیل: ۱..... تیر اندازی اور نشانہ بازی: اصول شریعت کی روشنی میں مرد و بچہ کھیلوں میں سے مندرجہ کھیل مستحب اور پسندیدہ ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے بعض کی اہمیت و وجوب تک پہنچ جاتی ہے، نشانہ بازی (چاہے وہ تیر کے ذریعہ ہو یا نیزہ، بندوق اور پستول یا کسی اور ہتھیار کے ذریعہ ہو، احادیث میں اس کے فضائل بیان کیے گئے ہیں اور اس کے سیکھنے کو باعث اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ کھیل انسان کے ذاتی دفاع اور ملکی دفاع کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ کھیل جہاں جسم کی پھرتی، اعصاب کی مضبوطی اور نظر کی تیزی کا ذریعہ ہے، وہیں یہ خاص حالات میں، مثلاً بھیڑ کے وقت یا جہاد کے موقع پر دشمنوں سے مقابلہ آرائی کے کام آتا ہے، قرآن کریم میں باضابطہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے: وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (الانفال) کہ اے مسلمانوں! تمہارے بس میں جتنی قوت ہو، اسے کافروں کے لیے تیار کر رکھو۔ رسول کریم ﷺ نے اس ”قوت“ کی تفسیر (تیر اندازی) سے کی ہے۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا: أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّحْمِيَّةَ لَتَعْنِي خَيْرُ دَارٍ ”قوت“ پھینکنا ہے (مسلم، مشکوٰۃ ۳۳۶) اس پھینکنے میں جس طرح تیر کا پھینکنا داخل ہے، اسی طرح اس میں کسی بھی ہتھیار کے ذریعہ مطلوبہ چیز کو نشانہ بنانا، راکٹ، میزائل کو ٹھیک نشانہ تک پہنچانا بھی داخل ہے اور ان میں سے ہر ایک کی مشق جہاں جسمانی لحاظ سے بہتر یں ورزش ہے، وہیں باعث اجر و ثواب بھی ہے (بذل الجہود ۱۱/۲۸) لیکن یہ اسلحہ چوں کہ ہلاکت خیز بھی ہیں؛ اس لیے حکومتیں ان پر بندش لگا کر قابل اعتماد افراد و ادارے کے لیے اس کا لائسنس جاری کرتی ہیں، بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھنے کو جرم سمجھا جاتا ہے، اس لیے حکمت کا تقاضا اور اتقوا مواضع الشہم (تہمت کی جگہوں سے بچو) کے پیش نظر حکومت کی اجازت سے ہی ممنوعہ اسلحہ کی مشق کرنی چاہیے، ورنہ ایسے اوقات میں جب کہ دہشت گردی کے حوالہ سے اسلام کو بدنام کیا جا رہا ہے، اسلام دشمنوں کو بدنام کرنے کا مزید حربہ مل جائے گا۔ تیر اندازی کے زمرے ہی میں شمشیر زنی، تیر بازی، بندوق، لائچی بازی بھی ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت نے ارشاد فرمایا: بے شک ایک تیر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تین افراد کو جنت میں داخل کر دیتا ہے: ایک تیر بنانے والا جب کہ وہ تیر بنانے میں ثواب کی نیت رکھے۔ دوسرا تیر پھینکنے والا اور تیسرا پکڑنے والا، پس اے لوگو! تیر اندازی سیکھو (سنن دارمی، مشکوٰۃ ۳۳۷)۔

۲- سواری کی مشق: یہ کھیل بھی اسلام کا پسندیدہ کھیل ہے، اس سے بھی جسم کی پوری ورزش کے ساتھ انسان میں مہارت، ہمت و جرات اور بلند حوصلہ جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں اور سفر میں اور جہاد میں بھی خوب کام آتا ہے، اگرچہ قرآن وحدیث میں عام طور پر گھوڑے کا ذکر آیا ہے؛ مگر اس سے ہر وہ سواری مراد ہے؛ جو جہاد میں کام آسکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُوَّكُمْ وَأَخْرِيْنَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُوهُمْ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (اور ان کافروں سے مقابلہ کے لیے تیار رکھو جس قدر تم سے ہو سکے، ہتھیار سے ہو یا گھوڑوں سے کہ اس کے ذریعہ تم رعب جمائے رکھو ان پر جو اللہ کے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں سے بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ ان کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے)۔

جہاد کے اس اعلیٰ مقصد کے پیش نظر جو شخص گھوڑا پالے اس کے لیے بڑی بشارتیں ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے اللہ کے راستے میں گھوڑے باندھ کر رکھا، اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے، تو اس گھوڑے کا تمام آب و کھانا حتیٰ کہ گوبر، پیشاب، قیامت کے دن اس شخص کے نامہ اعمال میں نیکی کے طور پر شمار ہوگا (بخاری، مشکوٰۃ ۳۳۰)۔

احادیث طیبہ میں اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اگرچہ گھوڑوں کے فضائل مذکور ہیں، مگر اشتراک علت کے پیش نظر ہر وہ سواری جو جہاد میں کام آتی ہو، یا ذاتی تحفظ اور اچھے مقاصد کے لیے آمد و رفت کے کام آتی ہو، اگر اسے بھی اچھی نیت سے چلانے کی مشق کی جائے؛ تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوگی، جیسے: پہلی کاپڑ، ہوائی جہاز، بحری جہاز، لڑاکا طیارہ، ٹینک، ٹرک، بکتر بند گاڑیاں، جیپ کار، بس، منور سائیکل، سائیکل وغیرہ۔ ان سب سواریوں کے چلانے کی مشق اور ٹریننگ اسلامی نقطہ نظر سے پسندیدہ کھیل ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ جائز اور نیک مقاصد کے لیے انہیں سیکھا جائے اور استعمال کیا جائے۔

۳- دوڑ لگانا:

اپنی صحت اور توانائی کے مطابق، ہلکی یا تیز دوڑ بہترین جسمانی ورزش ہے، اس کی افادیت پر سارے علماء اور ڈاکٹر متفق ہیں، احادیث سے بھی اس کا جواز

بل کا استحباب مفہوم ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ کی یاد سے تعلق نہ رکھنے والی ہر چیز لہو و لعب ہے، سوائے چار چیزوں کے: (۱) آدمی کا اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا (۲) اپنے گھوڑے سدھانا (۳) دونشانوں کے درمیان پیدل دوڑنا اور (۴) تیراکی سیکھنا سیکھانا (کنز العمال ۲۱۱/۱۵، الجامع الصغیر ۲۳/۵)۔

پیدل دوڑنے کی اسی افادیت کی وجہ سے صحابہ کرامؓ عام طور پر دوڑ لگایا کرتے تھے اور ان میں آپس میں پیدل دوڑ کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ سابق میں مشکوٰۃ المصابیح کے حوالہ سے شرح السنہ کی یہ روایت آچکی ہے کہ بلال بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے کہ وہ نشانوں کے درمیان دوڑتے تھے اور بعض بعض سے دل لگی کرتے تھے، ہنستے تھے، ہاں! جب رات آتی تو عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے (مشکوٰۃ ۴۰۷)۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اور زبیر العوامؓ میں دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ حضرت زبیر آگے نکل گئے تو فرمایا رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا، کچھ عرصہ بعد دوبارہ دوڑ کا مقابلہ ہوا، تو حضرت فاروقؓ آگے نکل گئے، انہوں نے وہی جملہ ہرایا رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا (کنز العمال ۲۲۳/۱۵)۔

۴- بیوی کے ساتھ بے تکلفانہ کھیل:

مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ مختلف بے تکلفی کا کھیل بھی اسلام کی نظر میں مستحسن ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، میں نے آپ سے دوڑ لگائی اور آگے نکل گئی، کچھ عرصہ بعد پھر ایک سفر میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوڑ لگائی اب میرے جسم پر گوشت چڑھ گیا تھا تو آپ مجھ سے آگے نکل گئے اور آپ نے فرمایا یہ اس کے بدلہ میں ہے (سنن ابی داؤد)۔

مذکورہ حدیث نبوی سے بیوی کے ساتھ تفریح کرنے اور دوڑ لگانے دونوں کی افادیت سمجھ میں آتی ہے۔

۵- نیزہ بازی:..... نیزہ زنی اور بھالا چلانا ایک مستحسن کھیل ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ خدا کی قسم میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ میرے حجرے کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے، جب کہ کچھ جوشی مسجد کے باہر صحن میں نیزوں سے کھیل رہے تھے، رسول اللہ مجھے اپنی چادر سے چھپا رہے تھے اور میں آپ کے کان اور کندھوں کے درمیان جیشپوں کو کھیلتے دیکھ رہی تھی (صحیح بخاری مع الفتح)۔

۶- تیراکی:..... تیرنے کی مشق ایک بہترین اور مکمل جسمانی ورزش ہے، جس میں جسم کے تمام اعضاء و جوارح کی بھرپور ورزش ہوتی ہے، یہاں تک کہ سانس کی بھی ورزش ہوتی ہے، سیلاب آنے کی صورت میں ایک ماہر تیراک انسانیت کی بہترین خدمت کر سکتا ہے۔ نشیبی علاقوں میں عام طور پر قریب میں ندی نالے تالاب وغیرہ ہوتے ہیں اور ان میں کسی کے ڈوبنے کے واقعات بھی عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں، ایسے حادثاتی مواقع پر ماہر تیراک لوگوں کی جان بچانے کی کامیاب کوشش کر سکتا ہے، اس سے جہادی تربیت کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے؛ کیوں کہ کسی بھی جنگ میں ندی نالے، تالاب اور دریا کو عبور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ ایک طبعی امر ہے۔ آج کل کی جنگوں میں سمندر کی ناکہ بندی کو دفاعی نقطہ نظر سے بنیادی اہمیت حاصل ہے، لہذا تیراکی جہاں تفریح و طبع اور جسمانی ورزش کا عمدہ ذریعہ ہے، وہیں بہت سے دیگر سماجی و دفاعی فوائد کا حامل بھی ہے، اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کا بہترین کھیل تیراکی ہے اور عورت کا بہترین کھیل سوت کا تانا (کنز العمال ۲۱۱/۱۵)، اسی لیے صحابہ کرامؓ نہ صرف تیراکی کے ماہر تھے بلکہ بسا اوقات تیراکی کا مقابلہ بھی کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم حالت احرام میں تھے کہ مجھ سے حضرت عمرؓ کہنے لگے آؤ! میں تمہارے ساتھ غوطہ لگانے کا مقابلہ کروں دیکھیں ہم میں سے کس کی سانس لمبی ہے (عوارف العارف للسمر وردی)۔

۷- کشتی بازی:..... اس کھیل میں ورزش کا بھرپور سامان ہے، اگر ستر کی رعایت اور انہماک کے بغیر کھیلا جائے، تو جائز ہوگا؛ بلکہ نیک مقاصد کے لیے مستحسن قرار دیا جائے گا۔ عرب کا ایک مشہور پہلوان رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی ٹھیرائی، تو آپ نے اس کو کشتی میں پچھاڑ دیا۔ (ابوداؤد فی المراسیل) مذکورہ تمام کھیل چوں کہ احادیث و آثار سے ثابت ہیں، اس لیے اس کے جواز؛ بلکہ استحباب میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔

۸- کبڈی:..... اس کا حکم بھی کشتی کی طرح ہے۔

ناپسندیدہ کھیل:

ان کے علاوہ جو کھیل کو درانج ہیں؛ ان کی شرعی حیثیت کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ جن کھیلوں کی احادیث و آثار میں صریح ممانعت کی گئی ہے وہ سب

ناجائز ہیں۔ جیسے نرد، شطرنج، کبوتر بازی، اور جانوروں کو لڑانا۔

۱- نرد: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرد یعنی چوسر کھیلنے سے سختی سے منع فرمایا: آپ نے ارشاد فرمایا: جس نے نرد شیر کا کھیل کھیلا، تو گویا اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون سے رنگ لیے (مسلم، مشکوٰۃ ۳۸۶) ایک دیگر روایت میں آپ نے فرمایا: جس نے نرد یعنی چوسر کھیلا اس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی (ابوداؤد)۔

۲- شطرنج: صحابہ کرام نے شطرنج کھیلنے سے صراحتاً منع فرمایا اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام نے شطرنج کی ممانعت رسول اللہ سے سنی ہوگی (مرقاۃ المصابیح ۳۸۷)، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: شطرنج عجمیوں کا جو ہے (یعنی، مشکوٰۃ ۳۸۷)، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ: شطرنج گناہ گاروں کا کھیل ہے، انہیں سے ایک شخص نے شطرنج کھیلنے کے بارے میں دریافت کیا: تو انہوں نے فرمایا: یہ باطل (بیکار چیز) ہے اور اللہ باطل کو پسند نہیں کرتا ہے (یعنی، مشکوٰۃ ۸۷)، ان ہی آثار و روایات کی وجہ سے حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اس کے کھیلنے کو ناجائز کہتے ہیں، امام شافعیؒ کی طرف اگرچہ جواز کی نسبت ہے؛ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی مکروہ ہے۔ علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں صراحت فرمائی ہے: انا الشطرنج فمکروہ عندنا للاحرام، اور یہ کراہت بھی مشروط ہے چند شرائط کے ساتھ کہ نماز اور جو اب سلام سے غافل نہ کرے اور بہت نہ کھیلے (التفسیر الاحمدی، بحوالہ امداد الفتاویٰ ۲۳۱/۳)۔

۳- کبوتر بازی: احادیث کی روشنی میں یہ بھی ممنوع ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کبوتر کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: شیطان تین شیطانوں کے ایک شیطان دوسرے شیطان کے پیچھے دوڑا جا رہا ہے (ابوداؤد)۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ کبوتر پالنا انڈیا بچوں کے حصول کے لیے درست ہے؛ لیکن کبوتر بازی کرنا اگر جوئے کے ساتھ ہو، تو مکروہ و ناشائستہ ہے (حاشیہ مشکوٰۃ)۔

۴- مرغ بازی، بطیر بازی: ..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح سے جانوروں کو آپس میں لڑانے کی ممانعت فرمائی ہے، چاہے مرغیوں کو لڑایا جائے یا بطیر کو یا مینڈھے کو جس کے لڑانے کا معاشرے میں عام رواج ہے، یا کسی اور جانور کو لڑایا جائے۔ نہی رسول اللہ ﷺ عن التحریش بین البہائم (ترمذی، ابوداؤد)، موجودہ زمانے کے چند کھیل:

۱- پتنگ بازی: جو حکم کبوتر کے پیچھے دوڑنے کا ہے وہی حکم پتنگ کے پیچھے دوڑنے کا ہے؛ یعنی ناجائز ہے حدیث میں ایسے شخص کو شیطان قرار دیا گیا ہے (ابوداؤد)۔

۲- تاش بازی: یہ کھیل بھی شرعی نقطہ نظر سے ممنوع ہے؛ اس لیے کہ تاش عام طور پر بالتصویر ہوا کرتے ہیں، تاش کھیلنا عام طور پر فاسق و فاجر لوگوں کا معمول ہے یا عوم جو اور قمار کی شمولیت ہوتی ہے۔ اس کھیل میں تفریح کی جگہ پر التازہ ہنی نکان ہوتا ہے، اگر جوئے کے بغیر بھی کھیلا جائے، تو شطرنج کے حکم میں ہو کر مکروہ تحریمی کہلائے گا؛ بعض احادیث میں شطرنج کی ممانعت آئی ہے، جو مصلحت شطرنج کو منع کرنے میں ہے، وہی بات تاش کھیلنے میں پائی جاتی ہے، جہاں تک معاملہ تعلیمی تاش کا ہے؛ تو یہ کھیل اگر جوئے اور انہماک زائد سے پاک ہو، تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بلکہ مبتدیوں کے لیے ایک گونہ مفید بھی ہے (امداد الفتاویٰ)۔

۳- باکسنگ، فائٹنگ: موجودہ زمانہ میں باکسنگ، مکہ بازی، فری اسٹائل فائٹنگ کے جو مقابلے منعقد ہوتے ہیں، وہ شریعت اسلامی میں بالکل حرام ہیں، اسے جائز ورزش کا نام نہیں دیا جاسکتا، ایسے باکسنگ مقابلوں کوئی دی پر براہ راست نشر کرنا بھی جائز نہیں؛ کیوں کہ اس میں فریق مقابل کو شدید جسمانی اذیت پہنچانے کو جائز تصور کیا جاتا ہے؛ جس سے ہو سکتا ہے کہ دم مقابل اندھے پن، سخت نقصان، دماغی چوٹ یا گھرے ٹوٹ پھوٹ؛ بلکہ موت سے بھی دوچار ہو جائے۔ اس میں مارنے والے پر اس نقصان کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، جیتنے والے کے حامیوں کو اس کی جیت پر خوشی اور مقابل کی اذیت پر مسرت ہوتی ہے، جو اسلام میں ہر حال میں حرام اور ناقابل قبول ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا (النساء ۲۹) یعنی تم اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑا مہربان ہے۔

۴- بیلوں کے ساتھ کشتی: اسی طرح بیلوں کے ساتھ کشتی جس میں تربیت یافتہ مسلمان افراد اپنی مہارت سے بیل کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں، یہ بھی حرام ہے؛ کیوں کہ اس میں جانور کو ایذا پہنچا کر اور جسم میں نیزے بھونک کر قتل کیا جاتا ہے اور بعض اوقات بیل بھی دم مقابل انسان کو ختم کر دیتا ہے یہ عمل کسی بھی حال میں درست نہیں، اس لیے کہ روایت میں ایک بلی کو بھونکا مارنے پر جہنم میں ڈالنے کا مضمون آیا ہے۔

۵- کیرم بورڈ: یہ کھیل بھی اگر انہماک اور جوئے کے بغیر بھی کھیلا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

۶- بوڈو: اگر اس میں ذی روح کی تصویر نہ ہو اور مذکورہ خرابیوں سے پاک ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے۔



۷- ویڈیو گیمنگ: اس کھیل کی مختلف شکلیں رائج ہیں: (۱) جس میں جاندار کی تصویریں نہ ہوں؛ بلکہ بے جان اشیاء مثلاً: پہلی کاپٹر، جہاز، موٹر سائیکل، بس ٹیکسی وغیرہ چلانے یا انہیں شکار کرنے کا کھیل ہو، یا جاندار کی تصویریں ہوں؛ مگر وہ اس قدر غیر واضح ہوں کہ انہیں تصویر نہ کہا جاسکے؛ بلکہ وہ محض ایک خاک کی شکل ہوں؛ تو ان دونوں شکلوں میں وقتی تفریح و طبع کے لیے یا ذہن کی تیزی اور حاضر دماغی کے لیے اس کھیل کی اس شرط کے ساتھ گنجائش ہے کہ مذکورہ ممانعتوں سے پاک ہو۔ (۲) وہ بڑے ویڈیو گیمنگ، جن میں جانداروں کی تصویریں واضح ہوں، یہ کھیل تصویر کی حرمت کی وجہ سے ناجائز ہوں گے۔

ہاکی، فٹ بال، والی بال، ٹینس، بیڈمنٹن، کرکٹ:

اوپر ذکر کیے گئے کھیلوں کے علاوہ جو بھی کھیل ہے اگر وہ کسی معصیت، حرام یا ناجائز کام پر مشتمل ہوں وہ بھی اس مقصد حرام کی وجہ سے ناجائز ہوں گے، مثلاً کسی کھیل میں ستر کھولا جائے، یا اس کھیل میں جو بازی ہو، یا اس میں مرد و عورت کا مخلوط اجتماع ہو، یا اس میں موسیقی کا اہتمام ہو، یا کفار کی خاص مشابہت ہو، یا اس کی وجہ سے فرائض و واجبات میں غفلت ہو رہی ہو۔

اسی طرح وہ کھیل جو بلا مقصد محض وقت گزاری کے لیے کھیلے جائیں، وہ بھی ناجائز ہوں گے، اس لیے کہ قرآن کریم میں تو مومنوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے: الذین هم عن اللغو معرضون (المومن ۱۳) یعنی مومنوں کی صفت یہ ہے کہ وہ بیکار باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

اس طرح کے کھیلوں کا اصولی طور پر حکم جاننے کے لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ فتویٰ چشم کشا ہے: ”(الف) وہ کھیل جس سے دینی یا دنیوی معتد بہا فائدہ مقصود نہ ہو وہ ناجائز ہے اور وہی حدیث کا مصداق ہے۔“

ب۔ جس کھیل سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ معتد بہا مقصود ہو، وہ جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی امر خلاف شرع ملا ہو نہ ہو اور منجملہ امور خلاف شرع تشبہ بالکفار (کفار کی نقالی) بھی ہے۔

جیت ہار میں پیسے کی شرط:

کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک صورت ناجائز ہے باقی تین صورتیں جائز ہیں:

(۱) دو یا چند افراد کے مابین مقابلہ ہو اور ہر شخص پر یہ بات لازم قرار دی گئی ہو کہ وہ ہارنے کی صورت میں جیتنے والے کو متعین رقم دے گا اور اگر وہ جیت جائے تو

دوسرے لوگ اسے رقم دیں گے، یہ صورت حرام ہے، ارشاد باری ہے: إنما الخمر والميسر الخ

(۲) دو آدمیوں میں جیت ہار پر دو طرفہ شرط ہو؛ لیکن تیسرے آدمی کو بغیر کسی شرط کے شریک کر لیا گیا ہو کہ اگر وہ ہار جائے تو اسے کچھ دینا نہ پڑے گا اور اگر وہ جیتے تو باقی دونوں اسے حسب معاہدہ انعام دیں گے اور تیسرا شخص بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اس کے جیتنے کی توقع کی جاسکتی ہو؛ یہ صورت بھی جائز ہے۔

(۳) دو شخص مقابلہ میں شریک ہوں اور جیتنے والے کو انعام کوئی کمپنی، حکومت، ادارہ یا کوئی اور شخص دے، یہ صورت بھی جائز ہے (بدائع الصنائع، کتاب اسباق ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸)۔

کھیل دیکھنے کے لیے ٹکٹ خریدنے کا حکم:..... کھیل دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم اور میدان میں داخل ہونے کے لیے ناظرین کو داخلہ کارڈ، یا ٹکٹ کی خریداری کرنی پڑتی ہے، اس کا شرعی حکم کھیل کی نوعیت سے وابستہ ہے۔ جائز کھیلوں کے لیے ٹکٹ کی خریداری اور انہیں دیکھنے کی گنجائش ہے اور ناجائز و مکروہ کھیل کے لیے نہ ٹکٹ خریدنے کی گنجائش ہے، نہ دیکھنے کی، کیوں کہ یہ آیت کریمہ: ”یشترى لھو الحدیث“ کے وعید میں شامل ہے۔

سیر و سیاحت:

الف۔ شرعی نقطہ نظر سے سیر و سیاحت جائز مقاصد اور جائز طریقہ پر درست ہے؛ بلکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں ”سیر فی الارض“ کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ نمل میں ارشاد ہے: قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین (۴۹) (اے نبی کہہ دیجئے کہ روئے زمین پر سیر کرو اور دیکھو کہ جرم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا)، سورہ روم میں ارشاد ہے: قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبل، کان اکثرھم مشرکین (۳۲) (اے نبی کہہ دیجئے! کہ تم روئے زمین پر گھومتے پھر اور دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو پہلے ہوا کرتے تھے، ان میں سے اکثر مشرک تھے)۔

مذکورہ آیات اور اس مفہوم کی دوسری آیتوں میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”سیر فی الارض“ یا سیاحت نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بلکہ مطلوب ہے، لیکن یہ سیر با مقصد ہونا چاہیے، ”منعہ علیہم“ کے علاقوں اور ان کے آثار کو دیکھ کر اسباب انعام کی رغبت پیدا ہو، نیکی اور بھلائی کا شوق پیدا ہو اور ”مغضوب علیہم“ کے مقامات اور ان کے آثار کو دیکھ کر اسباب غضب سے بچنے کا داعیہ پیدا ہو، قلب میں رقت پیدا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک غزوے کے موقع پر قوم عاد

کے علاقہ سے گذر رہے تھے تو آپ نے سوار یوں کو تیز ہکانے کا حکم فرمایا اور چہرے پھیر لیے اور استغفار کی کثرت کا حکم دیا۔ مطلق سیر کی کوئی ممانعت نہیں ہے اس کا جواز یا عدم جواز مقصد سفر سے وابستہ ہے، اگر مقاصد درست ہوں، تو سفر بھی درست ہوگا، اگر مقاصد غلط ہوں تو سفر بھی غلط ہوگا۔ حدیث نبوی: لا تشد الرحال الا الی ثلاثہ مساجد (بخاری مع الشرح ۱۱۸۹) کی تحقیق میں بھی علماء نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ علامہ بدر الدین عینی نے عمدہ القاری (۳۳) میں اپنے شیخ زین الدین عراقی سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں مساجد کے حکم کو بیان کرنا مقصود ہے، جہاں تک مساجد کے علاوہ دوسرے مقامات کے قصد کا تعلق ہے، جیسے طلب علم کیلئے سفر کرنا، رشتہ داروں سے ملاقات کیلئے سفر کرنا، تفریح یا مبارک آٹار اور مقابر کی زیارت کے لیے سفر کرنا اور اس طرح کے دوسرے اسباب سے ممانعت میں داخل نہیں ہیں (مدار السنہ ۳۲۶)۔

ب۔ جن علاقوں میں جان، مال، عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہو، ان علاقوں کا تو خود سفر کرنا درست ہے، نہ اہل و عیال کو لے جانا درست ہے، ارشاد باری ہے: ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکة (بقرہ ۱۹۵) (اور تم اپنے آپ کو بلاکت اور تباہی میں مت ڈالو)۔ بخاری کی ایک روایت میں رات کے اوقات میں تمہا سفر کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کیوں کہ اس میں خطرہ ہے۔

ج۔ جن مقامات پر مختلف ممالک کے سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے وہاں بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسے مقامات پر نظر کی حفاظت کرتے ہوئے، جانے کی گنجائش ہے، لیکن چوں کہ ماحول کا اثر مسلم ہے، لہذا ایسے مقامات پر نہ جانا بہتر ہے، ایسے مقامات پر آداب کی رعایت کے ساتھ جس طرح جانے کی گنجائش ہے، فی نفسہ وہاں کے لیے سواری کرایہ پر لینے اور وہاں کاروباری نقطہ نظر سے دکان لگانے کی بھی گنجائش ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ حکومتوں اور تنظیموں کی طرف سے بے حیائی کے روک تھام کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

د۔ ٹور کمپنیاں قائم کرنے کا جواز یا عدم جواز مقاصد سے وابستہ ہے، جائز مقاصد کے لیے ٹور کمپنیاں قائم کرنا اور اسے چلانا درست ہے۔

۴۔ تعلیم و تذکیر کے لیے فلموں کا استعمال:

فلم درحقیقت عکس بندی کا نام ہے، یہ عکس بندی جاندار چیزوں کی بھی ہوتی ہے اور بے جان چیزوں کی بھی، کسی بھی جاندار کی تصویر کھینچنا اور کھینچنا کسی حال میں بھی درست نہیں ہے، خواہ ہاتھ کے ذریعہ ہو، یا قلم سے یا کیمرہ کے ذریعہ ہو یا پرنس پر چھاپ کر، یا سانچہ اور مشین میں ڈھال کر، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ المصورون (بخاری حدیث ۵۹۵۳ باب التصاویر) قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا، اس کے علاوہ اور بھی متعدد صحیح احادیث ہیں، جن میں تصویر سازی کی مذمت کی گئی ہے، ویڈیو اور کیمرہ کی تصویر بھی درحقیقت تصویر ہی ہے، اس سلسلہ میں عرب کے بعض غیر محتاط علماء کے ضعیف اقوال کو جوہر جواز نہیں بنایا جاسکتا؛ لہذا جاندار چیزوں کی فلم بندی کسی حال میں درست نہیں ہے، ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں، تعلیمی مقاصد و تذکیر مقاصد ضرورت میں شامل نہیں ہیں۔

۵۔ کارٹون دو طرح کے ہوتے ہیں، محض خاکہ جس میں چہرہ سر وغیرہ نہیں ہوتا ہے، دوسرا کارٹون، جو اخباروں اور ٹیلیویژن میں مروج ہے، جس میں سر بھی ہوتا ہے، چہرہ بھی ہوتا ہے اگرچہ وہ نمایاں نہیں؛ بلکہ مسخ شدہ ہوتا ہے، پہلے قسم کے کارٹون؛ بلکہ خاکہ بنانا درست ہے۔

دوسرے قسم کے کارٹون جو موجودہ زمانے میں مروج ہیں؛ وہ بھی تصویر کے حکم میں داخل ہیں اگرچہ وہ تصویر بگڑی ہوئی ہوتی ہے، لہذا اس طرح ذی روح کا کارٹون بنانا درست نہیں ہوگا؛ بلکہ تصویر سازی کے گناہ پر بھلی صورتوں کو بگاڑ کر مذاق بنانے کا گناہ مستزاد ہوگا۔

(۵) کارٹون بنانا چوں کہ گناہ کا کام ہے، اس لیے اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لیے ملازمت کرنا گناہ کے کاموں پر تعاون ہونے کی وجہ سے ممنوع ہوگا، ارشاد باری ہے: "تعاونوا علی البرّ والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" بعض فقہاء نے نابالغ بچوں کے لیے با تصویر کھلونوں سے کھیلنے کو درست قرار دیا ہے، نابالغ بچے اگر کارٹون کے پروگرام دیکھیں؛ تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بچوں کا وقت ضائع نہ ہو اور ان کے دلوں سے تصویر کی کراہت نہ نکلے (تصویر کے شرعی احکام، از: مفتی محمد شفیع)۔

اسٹیج ڈرامہ: بہتر مقاصد کے لیے اگر اسٹیج ڈرامہ کیا جاتا ہے؛ تو اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت ہے کہ اس میں (۱) دھوکہ نہ ہو (۲) موسیقی کا استعمال نہ ہو (۳) کسی مومن کی کردار کشی نہ کی گئی ہو (۴) شکلیں بگاڑی نہ جائیں (۵) انہماک زائد نہ ہو (۶) مردوزن کا اختلاط نہ ہو؛ لیکن موجودہ زمانے میں جو اسٹیج شو کے نام سے ڈرامے مروج ہیں، وہ مفاسد سے پر ہوتے ہیں، اس لیے ممنوع ہیں۔

مدارس میں منعقد ہونے والے مکالمے، محادثے بالعموم اصلاحی و تذکیری ہوتے ہیں اور مذکورہ مفاسد سے پاک ہوتے ہیں، اس لیے ان کی گنجائش ہے۔ تمام تفریحات اور کھیل کود میں اصل یہ ہے کہ انسان کسی حال میں اپنے مقصد حیات اور فکر آخرت سے غافل نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب ☆☆☆

## تفریح و مزاح - احکام و مسائل

مولانا محمد نصر اللہ ندوی

- ۱- مزاح گاہے بگاہے ہو، اس میں افراط اور مداومت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ کثرت مزاح سے انسان زیادہ ہنستا ہے اور زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے: "فإن كثرة الضحك تميت القلب" (البیہقی، رقم الحدیث: ۳۴۲۲)۔
- ۲- مزاح میں کوئی گناہ کی بات شامل نہ ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں مذاق میں بھی حق و سچائی کے سوا کچھ نہیں کہتا ہوں، "عن أبي هريرة قال: قالوا: يا رسول الله! إنك تداعبنا قال: إني لأقول إلا حقاً" (ترمذی، رقم الحدیث: ۱۹۹۰)۔
- حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص محض ہنسانے کے لئے کوئی بات کہے تو اس کی وجہ سے آسمان سے بھی زیادہ دوری پر جا گرتا ہے (ذکرہ الالبانی فی الصحیح، رقم الحدیث: ۵۴)۔
- ۳- مذاق ایسا نہ ہو جو کسی کے لئے باعث تکلیف ہو، اگر اس سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہو تو پھر یہ ہرگز جائز نہ ہوگا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لا يسخر قوم من قوم عسى أن يكونوا خيراً منهم، ولا نساء من نساء عسى أن يكن خيراً منهن" (الحجرات: ۱۱)۔
- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا تمار أخاك ولا تمارحه" (ترمذی، رقم الحدیث: ۱۰۰۰)۔
- ب- ایسا مزاحیہ پروگرام جو کوئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، اسی طرح مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اس طرح کے پروگرام آخرت سے غفلت اور دنیا میں انہماک کا سبب بنتے ہیں، نیز یہ انسان کے فرائض و واجبات اور دیگر ذمہ داریوں سے بھی غفلت کا موجب ہیں۔
- قرآن کریم میں ہے: "ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله بغير علم ويتخذها هزوا أولئك لهم عذاب مهين" (لقمان: ۲)۔
- حضرت حسنؓ لہو الحدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے ہٹانے والی ہو، مثلاً فضول لہو و لعب، فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں وغیرہ (روح المعانی ۱۲/۹۰۲)۔
- ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت کرنا انہیں حدود و قیود کے ساتھ درست ہوگا جن کا تذکرہ اوپر مزاح کے جائز ہونے کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔
- ۴- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس پر اجرت وصول کرنا درست نہ ہوگا، اس لئے کہ حدیث شریف میں گاہے بگاہے تفریح کی اجازت دی گئی ہے: "روحوا القلوب ساعة فساعة" (کنز العمال، رقم الحدیث: ۵۴۵۳)۔
- اس سے اشارہ ملتا ہے کہ مزاح نویسی کو پیشہ بنانا درست نہیں ہے، کیونکہ انسان جب کسی چیز کو پیشہ بنالیتا ہے تو ہر وقت اسی خیال میں غرق رہتا ہے، اور اس کی تک و دو اسی کے ارد گرد گردش کرتی رہتی ہے، ظاہر ہے کہ مزاح اور تفریح میں اس قدر انہماک کیسے درست ہو سکتا ہے؟
- امام غزالیؒ رقمطراز ہیں: "ومن الغلط العظيم أن يتخذ الإنسان المزاح حرفة يواظب عليه ويفرط فيه" (احیاء العلوم ۲۰۳)۔

۵- تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کا پروگرام کرنا اور اس کو دیکھنے کی گنجائش مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ ہو سکتی ہے:

الف- یہ پروگرام مختصر وقت کا ہو۔ ب- اس طرح کا پروگرام گاہے بگاہے منعقد کیا جائے۔ ج- پروگرام سبق آموز اور تعلیمی و تربیتی نقطہ نظر سے مفید ہو۔ د- پروگرام میں خلاف شرع کوئی چیز نہ ہو۔

واضح رہے کہ اس طرح کے پروگرام بہر حال شرافت و تہذیب کے منافی اور دنائت و سطحیت کا مظہر ہیں، اس لئے حتی الامکان ان سے اجتناب کرنا چاہئے، ان میں کسی طرح سے شمولیت کراہت سے خالی نہ ہوگا، رہی بات مزاحیہ ڈرامے لکھنے کی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔

۶- اسلام دین فطرت ہے اس میں انسانوں کے تمام بنیادی تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ہنسنا بھی انسان کی ایک فطری اور طبعی ضرورت ہے، لہذا اسلام نے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے، مگر اس میں مبالغہ اور افراط بہر حال پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے ہنسنے ہنسانے کا باضابطہ پروگرام منعقد کرنا اور اس میں بہ تکلف قہقہہ لگانا بہر حال کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے: ”وایاک وکثرة الضحک، فإھا تمیت القلب وتذهب بنور الوجه“ (آخرجہ البیہقی فی شعب الایمان، رقم: ۳۹۳۲)۔

### کھیل کود سے متعلق مسائل:

کھیل کود انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اس کے علاوہ جسمانی قوت میں اضافہ کا بھی اہم سبب ہے، اس لئے اسلام نے ایسے کھیلوں کی ترغیب دی جن سے انسانی طاقت و قوت میں اضافہ ہوتا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”ارموا بنی اسماعیل فإن أباکم کان رامیاً“ (فتح الباری ۱۰۹۰)۔ قرآن کریم میں ہے: ”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخیل ترهبون به عدو اللہ وعدوکم“ (الانفال: ۶۰) اسلام دین عدل ہے، وہ کسی بھی چیز میں بے اعتدالی اور افراط و تفریط کو پسند نہیں کرتا ہے، اس لئے اس نے کھیل کے لئے بھی شرطیں متعین کر دی ہیں، وہ شرطیں یہ ہیں:

۱- کھیل میں پردہ کے شرعی حدود کی رعایت کی جائے، آج کل مرد جس طرح کھٹنے سے اوپر والا لباس پہن کر اور خواتین نیم برہنہ ہو کر اپنے کھیل سے زیادہ اپنے جسم کا مظاہرہ کرتی ہیں، شریعت میں ایسے کھیلوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کے کھیل بے حیائی و بے پردگی اور فحاشی کو پھیلانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: ”إن الذین یحبون أن تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا لهم عذاب الیم فی الدنیا والآخرة واللہ یعلم وأنتم لا تعلمون“ (النور: ۲۹)۔

۲- کھیل ایسا ہو جو مختصر وقت میں پورا ہو سکے، ایسا نہ ہو جس سے انسان اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے غافل ہو جائے: ”کل ما یلہو بہ الرجل المسلم باطل“ (الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۵، ۳۶۸)۔

۳- ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یاد دہوں کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہو، یا جس سے شدید جسمانی نقصان پہنچنے کا امکان ہو، الموسوعة الفقهية میں کھیل کے مباح ہونے کی شرطوں کے ضمن میں لکھا ہے:

”بشرط أن لا یتضمن ضراراً، فإن تضمن ضرار الإنسان أو حیوان کالتحریش بین الدیوک والکلاب ونطاح الکباش والتفرج علی هذه الأشياء فهو حرام“ (الموسوعة الفقهية ۳۸، ۳۶۶)۔

۴- ہر جنس کے لئے کھیل الگ الگ ہو جو اس جنس کے مناسب ہو، لہذا مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جائز نہیں ہے، حضور اکرم ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع کیا ہے: ”لعن رسول اللہ ﷺ المتشبهین من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال“ (البخاری، رقم الحدیث: ۵۸۸۵)۔

۵- کھیل میں کسی طرح کا جواز نہ ہو، کیونکہ جوا کا حرام اور ممنوع ہونا محتاج بیان نہیں ہے۔

ب- کھلاڑیوں کا لباس شرعی حدود کے اندر ہو، یعنی مردوں کا لباس ناف سے گھٹنے تک ساتر ہو، عورتیں مردوں کے سامنے کھیل کا مظاہرہ نہ کریں، اور اگر عورتیں صرف عورتوں کے سامنے کھیلیں تو پردہ کے ان حدود کا خیال رکھیں جو عورت کے لئے عورت کے سامنے متعین ہیں، اس کے بغیر کھیلنا جائز نہ ہوگا۔

مرد و بچہ کھیلوں میں فٹ بال، والی بال، بیڈمنٹن وغیرہ کو مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا جاسکتا ہے، فیزی اسٹائل کشتی، باکسنگ وغیرہ ایسے کھیل ہیں جو ناجائز ہیں۔

کرکٹ، لوڈو، تاش، کبوتر بازی، ویڈیو گیم وغیرہ کا کھیلنا مکروہ ہوگا۔

۴- کرائے بازی، نشاندہ بازی، گھوڑ سواری (بشرطیکہ اس میں جوان نہ ہو) کبڈی، تیراکی، وغیرہ ایسے کھیل ہیں جو جسمانی اور جہادی نقطہ نظر سے بھی کافی مفید ہیں، اس لئے اس طرح کے کھیل نہ صرف جائز بلکہ مستحب قرار دیئے جاسکتے ہیں۔  
۵- کھیل کی ہارجیت کے سلسلہ میں پیسے کی شرط کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) اگر مقابلہ دو گروہوں میں ہو رہا ہو تو شرط یک طرفہ ہو، دوطرفہ نہ ہو، مثلاً خالد اور محمود کے درمیان مقابلہ ہو اور خالد یہ کہے کہ اگر محمود آگے بڑھ جائے تو میں اس کو اتنے روپے دوں گا، لیکن محمود نے جیتنے کی صورت میں کچھ دینے کا وعدہ نہیں کیا تو یہ صورت جائز ہوگی (الموسوۃ الفقہیہ ۱۲۸/۲۳)۔ لیکن اگر معاہدہ دونوں طرف سے ہو جائے کہ فریقین میں سے جو بھی شکست کھائے وہ فاتح کو اتنا ادا کرے گا تو اب یہ صورت قمار کی ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگی (بدائع الصنائع ۲۰۶/۶)۔

(۲) اگر شرط میں کسی ایسے آدمی کو داخل کر لیا کہ ہارنے کی صورت میں اس پر کچھ دینے کی ذمہ داری نہ ہو تو یہ صورت جائز ہوگی، فرض کیجئے کہ زید، بکر اور خالد میں مقابلہ ہو، زید اور بکر نے طے کیا کہ ان دونوں میں سے ہارنے والا جیتنے والے کو اتنے پیسے دے گا، اور خالد کے متعلق یہ طے ہوا کہ اگر وہ جیت جائے تو دونوں اسے مشروط انعام دیں گے، لیکن اگر ہار جائے تو اس کو کچھ نہیں دینا ہوگا، تو یہ صورت بھی جائز ہوگی، ”فیما أدخلنا بینہما ہو ثالث لہ یخرج شیئاً جاز، وبهذا قال الجمهور“ (الموسوۃ الفقہیہ ۲۲/۱۲۸)۔

(۳) مقابلہ دو آدمیوں میں ہو اور انعام امام یا کسی تیسرے شخص کی جانب سے دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ”إذا کان العوض من الإمام أو غیرہ من الرعیۃ وبذا جائز لا خلاف فیہ“ (حوالہ بالا)۔

(۴) مقابلہ کی ابتدائی اور انتہائی حد متعین کر دی جائے (شرح مہذب ۱۳۶/۱۵ بحوالہ قاموس الفقہ ۱۱۷/۲)۔

(۵) انعام اور عوض معلوم و متعین ہو۔

”ویجوز العوض بشرط أن یکون معلوماً لأنه عقد فی مال عقد فلا بد أن یکون معلوماً کسائر العقود“  
(بدائع الصنائع ۲۰۶/۶)۔

۵- جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، تو یہ لہو و لعب کے حکم میں ہوگا، نیز ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

۶- اگر کھیل جائز ہو (جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے) تو اس کا دیکھنا اور نکت خریدنا بھی جائز ہوگا، بشرطیکہ مہنگے نہ ہوں، ورنہ اسراف کی حد میں شامل ہو جائے گا، اور اگر کھیل ناجائز ہو تو اس کا دیکھنا اور اس کے لئے نکت خریدنا بھی تعاون علی الاثم کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔

سیر و سیاحت:

سفر انسان کی بنیادی ضرورت ہے، لیکن سفر میں انسان کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں، اس لئے بلا ضرورت سفر کرنے کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند کیا ہے، تاہم دنیوی و دینی مقاصد مثلاً تجارت، کسب معاش، حصول علم، جہاد وغیرہ کے لئے سفر کرنا درست ہے، لیکن تفریح و طبع کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا اور اس میں خطیر رقم صرف کرنا درست نہ ہوگا، اس کی چند وجوہات ہیں:

۱- بغیر کسی اہم دینی و دنیوی ضرورت کے خطیر رقم صرف کرنا اسراف ہے، اور اسراف کا ممنوع ہونا ظاہر ہے۔ قرآن کریم میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے، ”إن المبذورین کانوا إخوان الشیاطین“ (بنی اسرائیل: ۲۷)۔

۲- یہ وقت اور جان و مال کا ضیاع ہے، ایک مسلمان کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ زندگی کی متاع گرانمایہ کو فضول چیزوں میں ضائع کر دے۔ حدیث شریف میں ہے:

”لا تزول قدما عبد حتى يسأل عن أربع: عن عمره فيما أفناه، وعن شبابه فيما أبلاه، وعن ماله من أين اكتسب وفيما أنفق، وعن علمه بما عمل به“ (ترمذی، رقم الحديث: ۲۳۱۲)۔

امام غزالی نے ایسے لوگوں کو جنگل میں بھٹکنے والے چوپایوں سے تشبیہ دی ہے:

”فالسائحون في غير مهم الدين والدنيا بل لمحض التفرح في البلاد كالبهائم المترددة في الصحارى“ (احیاء علوم الدین ۳۰۲۲)۔

ب۔ ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ میں رکھنا مناسب نہیں ہے، بالخصوص آج کے حالات میں جبکہ ہر طرف زنا کاری، بدکاری اور فحاشی کا بازار گرم ہے، اور تقریباً ہر روز اخبارات کے ذریعہ روح فرساں واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔

ج۔ ایسی جگہوں پر ازراہ تفریح جانا بہتر نہیں ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری کا قول ہے: ”اتقوا مواضع التهم“؛ البتہ وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر دینا اور اشیاء خورد و نوش فروخت کے لئے دکان لگانا جائز ہوگا، کیونکہ یہ کام فی نفسہ معصیت نہیں ہیں، رد المحتار میں ہے:

”وعلم من هذا أنه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة، والعصير الخشب ممن تتخذ منه المعازف“ (رد المحتار ۹۰۴۷)۔

تاہم ایک مسلمان کے لئے ایسی تجارت سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

د۔ مذکورہ بالا جوذب کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ کمپنیاں صرف سفر کی اجرت وصول کرتی ہیں، اور سفر کرنا بذات خود کوئی معصیت نہیں ہے۔ علامہ شامی نے ایسے گھروں کو جہاں گناہ کے کام ہوتے ہوں، کرایہ پر لگانے کے ضمن میں لکھا ہے:

”لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فينقطع نسبه عنه“ (رد المحتار ۹۰۴۸)۔

لیکن یہ کاروبار کراہت سے خالی نہ ہوگا، ”والمنقول في كثير من الفتاوى أنه يكره“ (حوالہ بالا)۔

۳۔ تعلیمی و تربیتی مقاصد کے لئے فلموں کا بنانا اور ان کا مشاہدہ کرنا مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہو سکتا ہے:

(۱) فلم ساز و مضرب سے بالکل خالی ہو۔

(۲) کسی عورت کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔

(۳) فلم کا مقصد صرف تعلیم و تربیت ہونے کہ تفریح وغیرہ۔

(۴) کارٹون سازی بھی تصویر کشی کی ایک قسم ہے، تاہم کارٹون اور تصویر میں ایک فرق ہے:

وہ یہ کہ تصویر نمایاں ہوتی ہے اور بلا تکلف پہچان میں آجاتی ہے، جبکہ کارٹون بادی النظر میں پہچان میں نہیں آتا ہے، اس لئے کارٹون بنانا جائز ہوگا، قاموس الفقہ میں ہے:

الف۔ چھوٹی تصویریں جو بہ تکلف پہچان میں آتی ہوں جائز ہیں، ”لو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتأمل لا يكره“ (قاموس الفقہ ۲۰۴۷)۔

کارٹون سازی کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا بہتر نہ ہوگا۔

ب۔ بہتر کاموں کی ترغیب اور سماجی بگاڑ پر تنقید کے نقطہ نظر سے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں مگر انہیں شرطوں کے ساتھ جو مزاحیہ پروگرام کے جواز کے ضمن میں آغاز بحث میں گذر چکی ہیں: مثلاً ڈرامہ مختصر ہو، گاہے بگاہے ہو، اس میں کوئی منکر نہ ہو، تاہم ڈرامہ شرافت و تہذیب کے منافی اور دناوت و سطحیت کا مظہر ہے، اس لئے اس میں شمولیت کراہت سے خالی نہ ہوگا۔

☆☆☆

واللہ اعلم بالصواب۔

## سیر و تفریح سے متعلق ضابطے

مولانا اشرف عباس قاسمی ؒ

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين أما بعد!

۱- مزاح اور لطیفہ گوئی:

الف- مزاح کی شرعی حیثیت اور اس کی حدود:

طبیعت کی پزیردگی دور کرنے، اور دل و دماغ کے نشاط و قوت کو بحال کرنے کے لیے رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور سلف سے وقتاً فوقتاً مزاح ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ”إن النبي ﷺ كان يمزح ويقول: إن الله لا يؤاخذ المزاح الصادق في مزاحه“ (کنز العمال ۲/رقم ۸۲۲۶) یعنی رسول اکرم ﷺ مزاح فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے کہ اللہ پاک سچے مزاح کرنے والے کا مزاح پر مواخذہ نہیں کرتے ہیں۔

لمعات الفتح میں ہے: ”كما كان رسول الله ﷺ يمازح الصحابة كذلك كانوا يمازحونه“ (حاشية المشكاة ص: ۲۱۷) (جس طرح رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام سے مزاح فرماتے تھے، اسی طرح صحابہ کرام بھی رسول اکرم ﷺ سے مزاح کرتے تھے)۔

مشہور محدث سفیان بن عیینہ سے کسی نے کہا: مزاح بے ہودگی ہے، انہوں نے فرمایا: بالکل نہیں، مزاح تو سنت ہے، البتہ اسے اچھی طرح برتنا اور بر محل استعمال کرنا سب کے بس کا روگ نہیں، ابن قتیبہ کہتے ہیں: رسول اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے اور لوگوں کو آپ کی حیات طیبہ کو اسوہ بنانے اور آپ کے طریقے کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے کہ خندہ روئی اور بشاشت کو چھوڑ کر ہر وقت چہرے پر غم و اضمحلال کے آثار سے لوگ غیر معمولی تعب اور مشقت میں پڑ جائیں گے (ہدایۃ المحدثی لشمائل الترمذی: ۲/۷۵)، البتہ اس مزاح کی بھی حدود ہیں تاکہ یہ خوش طبعی کے بجائے دل آزاری کا سبب نہ بن جائے، اس لیے ایک دوسری روایت میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا تمارأ خاک ولا تمازحہ“ (الترمذی فی سننہ رقم ۱۱۹۹) (اپنے بھائی سے نہ جھگڑو اور نہ اس کے ساتھ مذاق کرو) دونوں طرح کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے شرح حدیث فرماتے ہیں کہ اس مزاح کی اجازت نہیں ہے جس میں افراط ہو یا مداومت ہو، کیونکہ حد باقی نہ رکھنے سے ہنسی مذاق کا ایسا ماحول بنتا ہے جس سے مساوت قلبی پیدا ہوتی ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”المزاح انبساط مع الغیر من غیر ایذاء فإن بلغ الإیذاء یکون سخریة“ (مرقاۃ المفاتیح ۹/۱۰۵) (مزاح نام ہے تکلیف پہنچانے بغیر کسی کے ساتھ خوش طبعی کا، اور اگر معاملہ ایذا رسائی تک پہنچ جائے تو وہ مذاق اڑانا بن جاتا ہے)۔

ب- مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعرے:

تصریحات بالا کی روشنی میں اس کی گنجائش نہیں نظر آتی ہے، اس لیے کہ مزاحیہ مشاعرہ یا مزاحیہ پروگرام منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، اس میں حق و صداقت کا دامن تھامے رکھنا، فرد یا جماعت پر اشارہ یا کنایہ طعن و تشنیع سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا، من گھڑت اور جھوٹے واقعات کا سہارا نہ لینا عملاً انتہائی مشکل ہے اور ان سب خرابیوں کے برتنے کے پیش نظر دینی اور شرعی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ فقط ہنسا ہنسانا ہوتا ہے، اور حدیث پاک میں اس کی صراحتاً ممانعت وارد ہے: ”عن بهز بن حکیم عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: ويل لمن يحدث فيكذب ليفضحك به القوم ويل له ويل له“ (أخرجه أبو داود في سننه رقم ۲۹۹۰ والترمذی رقم ۲۲۱۵) (ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو صرف لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ

جامعہ مظہر سعادت ہانوت، بھروچ، گجرات۔

بولتا ہو اس کے لیے ہلاکت ہے اس کے لیے ہلاکت ہے۔

فقہاء فرماتے ہیں: ”لابأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلام يأثم به أو يقصد به إضحاك جلسائه“ (الفتاویٰ الہندیہ: ۶/۲۵۶) (اسی مزاح کی اجازت ہے جس میں کوئی ایسی بات شامل نہ ہو جس میں گناہ ہو یا جس کا مقصد محض حاضرین کو ہنسانا ہو)۔

ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنے اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کی اشاعت اور خرید و فروخت:

مزاحیہ کہانیاں لکھنا انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت شریعت کے نقطہ نظر سے درست نہیں ہے، کیونکہ یہ ظاہر لھو الحدیث کے تحت داخل ہے، ارشاد باری ہے: ”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ“ (سورہ لقمان آیت ۶) (اور بعض آدمی ایسے ہیں جو ان باتوں کے خریدار بنتے ہیں جو غافل کرنے والی ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے ہو جھے گمراہ کریں اور اس کی ہنسی اڑائیں، ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے)۔

مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں تصریح کی ہے کہ مکہ کا ایک بڑا کافر نصر بن حارث ملک فارس سے بے سرو پا حکایات پر مبنی کتابیں خرید لاتا اور مکہ کے لوگوں کو سنایا کرتا تھا (تفصیل کے لیے دیکھئے: روح المعانی ۱۲) اور ظاہر ہے کہ یہ مزاحیہ کہانیاں بھی عموماً حقائق سے دور ہوتی ہیں۔

مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں: ”لھو الحدیث میں لفظ حدیث باتوں اور قصے کہانیوں کے معنی میں ہے اور لہو کے معنی غفلت میں پڑنے کے ہیں، جو چیزیں انسان کو غفلت میں ڈالیں وہ لہو کہلاتی ہیں اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی لہو کہا جاتا ہے جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو محض وقت گزاری کا مشغلہ اور دل بہلانے کا سامان ہو، اس زمانہ میں بیشتر نوجوان فحش، ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں، یہ سب چیزیں اسی قسم لہو حرام میں داخل ہیں“ (معارف القرآن ۷/۲۱/۲۳)۔

و۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنانے اور اس کی اجرت اصول کرنے کا حکم:

شریعت مطہرہ نے مزاح کی حدود مقرر کر دی ہیں ان حدود سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ گاہے بگاہے کسی کی ایذا رسانی اور تحقیر کے بغیر موقع محل کی مناسبت سے اس کی گنجائش ہے، لہذا عام حالات میں جب عمل ناجائز ٹھہراتو اس کو مستقل پیشہ بنالینے میں تو قباحتیں مزید بڑھ جاتی ہیں، امام غزالی نے اس پر سخت نکیر فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں: ”ولكن من الغلط العظيم أن يتخذ الإنسان المزاح حرفة ويوآذب عليه ويفرط فيه ثم يتمسك بفعل رسول الله ﷺ فهو كمن يدور مع الزنوج ابداً لينظر إلى رقصهم ويتمسك بأن رسول الله ﷺ أذن لعائشة رضي الله عنها في النظر إليهم وهم يلعبون“ (مراقبة المفاتيح ۹/۷۲)۔

مولانا یوسف لدھیانوی فرماتے ہیں کہ لطیفہ گوئی اگر حدود میں ہو تو گنجائش ہے مگر اس کو پیشہ بنانا مکروہ ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱/۱۵۶)۔

۱۔ تفریح و طبع کے لیے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام:..... وہ تمثیل یا ڈرامہ جس میں ممنوع چیزوں کا ارتکاب کیا جائے اور جو شرعی آداب و قیود سے آزاد ہو وہ بالاتفاق مقاصد شریعت اور نصوص صریحہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے، (القرضادی فتاویٰ معاصرة ۶۹۳- الفتاویٰ المصریہ ۱۰/۳۵۳۶) اور ظاہر ہے کہ محض تفریح و طبع کے لیے منعقد ہونے والے ڈرامے ان قباحتوں سے خالی نہیں ہوتے جن کا تذکرہ شق (الف) میں گذر چکا ہے اور قرآن کریم میں (سورہ لقمان الآیہ ۶) جس لہو الحدیث کی ممانعت ہے اس کے عموم میں رئیس المفسرین حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے ہنتے ہناتے رہنے کو بھی داخل مانا ہے: ”ولهو الحدیث کل ما شغلك عن عبادة الله وذكره من السمر والأصاحيك والخرافات والغناء ونحوها ولهذا العموم هو المروى عن ابن عباسؓ أخرجه البخاری فی الأدب المفرد (المفتی محمد شفیع: أحكام القرآن ۳، ۱۸۵) (لہو الحدیث کا مصداق ہر وہ چیز ہے جو آپ کو اللہ کی عبادت اور ذکر سے غافل کر دے خواہ وہ قصہ گوئی یا ہنسنے یا ہنسانے کی بے سرو پایا تیں ہو یا گانا بجانا ہو۔ امام بخاری نے الادب المفرد میں ابن عباسؓ سے اسی عموم کو نقل کیا ہے)۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ محض تفریح و طبع کے لیے اس طرح کے ڈرامے لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا درست نہیں۔



و- ہنسنے کے پروگرام:

یقیناً انسانا انسانی صحت کی برقراری اور دماغ کی تازگی کے لیے معین ہے اور شریعت مطہرہ نے ہنسنے پر قدغن نہیں لگایا ہے۔ روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی باوقار موجودگی میں بھی بسا اوقات صحابہ کرامؓ دلچسپ باتیں کر کے ہنستے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے مکارم اخلاق کی وجہ سے ان کا ساتھ دیتے، اور اس دوران آپ ﷺ کے ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ بکھری رہتی تھی، حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کے الفاظ ہیں: ”کان رسول اللہ ﷺ لا يقوم من مضلاه الذي يصلي فيه الصبح حتى تطلع الشمس فإذا طلعت الشمس قام وكانوا يتحدثون فيأخذون في أمر الجاهلية فيضحكون ويتبسم رسول الله ﷺ“ (آخرجه مسلم برقم ۲۲۲۲، والترمذی برقم ۲۸۵۰) (رسول اکرم ﷺ جس جگہ فجر کی نماز ادا فرماتے وہاں سے سورج طلوع ہونے سے پہلے نہیں اٹھتے تھے، طلوع شمس کے بعد ہی کھڑے ہوتے تھے، صحابہ کرامؓ دور جاہلیت کی بات کر کے ہنستے تھے اور رسول اکرم ﷺ بھی مسکراتے تھے)۔ شرح حدیث نے اس دلچسپ گفتگو کے بعض اجزاء نقل کئے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے فرمایا کہ میرے بت نے جتنا میرا بھلا کیا اتنا نفع کسی کو اس کے بت نے نہیں دیا ہوگا، ہوا یوں کہ میں نے جیس (ایک قسم کا کھانا جو بھور گھی، اور ستو سے تیار کیا جاتا ہے) کا بت بنا رکھا تھا، قحط سالی آئی تو میں اس میں سے روزانہ تھوڑا تھوڑا کھاتا رہا، ایک دوسرے صحابی نے بتلایا کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ دو لومڑیاں آئیں اور میرے بت کے سر پر بیٹھ کر پیشاب کرنے لگیں، میں نے دل میں کہا کہ یہ بھی کوئی معبود ہے جس کے سر پر لومڑی پیشاب کر جائے، یا رسول اللہ ﷺ ہی واقعہ میرے قبول اسلام کا سبب بن گیا (ملا علی قاری: مرآة الفناج ۵/۹)۔

لیکن شریعت ہر چیز میں اعتدال کی تعلیم دیتی ہے اور ایسی حد تجاوزی سے منع کرتی ہے جو انسان کے ضرر کا باعث ہو، شریعت کی نظر میں مسکرانا مستحسن چیز ہے، گاہے بگاہے ہنسنے کی بھی اجازت ہے، لیکن باضابطہ ہنسنے کے پروگرام منعقد کرنا اور اس میں اتنا ہنسا کہ دل مردہ ہو جائے از روئے شرع جائز نہیں ہے۔ ایک مرتبہ رسول رحمت ﷺ نے ایک مجلس میں لوگوں کو دانت کھول کر بے تحاشا ہنسنے دیکھا تو آپ نے فوراً انہیں تنبیہ فرمائی اور انہیں لذتوں کو توڑنے والی چیز موت کو یاد کرنے کی تلقین کی (الترمذی فی السنن برقم ۲۳۶۰، والنسائی برقم ۱۸۲۳) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں صراحتاً کثرت خشک سے ممانعت وارد ہے، کیونکہ اس سے قلوب مردہ ہو جاتے ہیں: ”لا تكشروا الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب“ (الترمذی برقم ۲۳۰۵) (زیادہ مت ہنسو کیونکہ زیادہ ہنسی دل کو مردہ کر دیتی ہے)۔

۲- کھیل کود کی شرعی حیثیت:

الف- کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے اصول:

وہ کھیل کود جن کو احادیث و آثار میں صراحتاً ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ ناجائز ہیں جیسے زرد شطرنج، کبوتر بازی اور جانوروں کو آپس میں لڑانا وغیرہ۔ ”عن أبي موسى الأشعريؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: من لعب بالنرد فقد عصى الله ورسوله“ (ابوداؤد، کتاب الأدب، باب فی النهی عن اللعب بالنرد رقم ۴۹۴۸) وعن بريدةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من لعب بالنرد شير فكأنما صبغ يده في لحم خنزير ودمه (مسلم، کتاب الشعر، باب تحريم اللعب بالنرد شير رقم ۲۲۲۰) عن ابن عباسؓ قال: نهى رسول الله ﷺ عن التحريش بين البهائم (ابوداؤد، کتاب الجهاد، التحريش بين البهائم رقم ۲۵۶۲)۔

نیز اس میں بلاوجہ جانوروں کو ہتلائے عذاب کرنا ہے، ”وعن علي رضي الله عنه: ”الشطرنج هو ميسر الأعاجم“ (البيهقي، السنن الكبرى، کتاب الشهادات، وقال لهذا مرسل لكن له شواهد ۱۰/۲۱۲)۔

ب- جو کھیل کسی حرام کام یا معصیت پر مشتمل ہوں وہ بھی حرام قرار پائیں گے، جیسے کہ اس میں کشف عورت ہو، یا موسیقی کا نظام ہو، یا مردوزن کا مخلوط اجتماع ہو، یا اس میں قمار اور جوئے کی آمیزش ہو، چنانچہ ایک عرب محقق نے دنیا کے سب سے مقبول کھیل فٹ بال کی حرمت کے اسباب کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ”عدم التقيد باللباس الشرعي الساتر للعودة، وهي ما بين السرة والركبة، إذ يكتفي اللاعب بتياب قصير تظهر منه عوراته (عبد الصمد بن محمد بلجاسی: السابقات ص ۲۸۱/۲۸۰) (شرعی لباس کا اہتمام نہ کرنا جو ناف سے گھٹنے تک کے لیے ساتر ہو، اس لیے کہ کھلاڑی صرف لنگوٹ یا نیکر پہن کر کھیلتا ہے جس سے ستر پوشی نہیں ہوتی ہے)۔“

ج۔ وہ کھیل بھی حرام ہونگے جو فرائض اور واجبات کی ادائیگی سے غافل کرنے والے ہوں، ”وسائر اللعب، إذا لم يتضمن ضرراً ولا شغلاً عن فرض، فالأصل إباحته“ (ابن قدامہ: المغنی ۱۵۷/۱۳)، امام بخاری نے کتاب الاستئذان کے اخیر میں ایک باب قائم کیا ہے: ”کل لہو باطل اذا شغله عن طاعة الله“ (کوئی بھی کھیل جو اللہ کی اطاعت سے غفلت کا سبب بنے، درست نہیں ہے)۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: خواہ وہ کسی بھی طرح کا کھیل ہو، وہ مشروع ہو یا ممنوع ہو، مثلاً کوئی شخص نفل میں یا تلاوت میں یا ذکر میں یا معانی قرآن میں تدبر کرنے میں لگا رہے حتیٰ کہ وہ عمدہ فرض نماز کا وقت فوت کر دے وہ بھی اس ضابطے کے تحت داخل ہے، اور جب پسندیدہ اور مستحسن چیزوں کا حکم یہ ہے تو اس سے کمتر چیزوں کا تو پوچھنا ہی کیا (احمد تقانی: فتح الباری ۱۱/۱۰۸)۔

د۔ محض وقت گزاری کے لیے بھی ناجائز ہیں: ”أما سائر ما يتلحق به البطالون من أنواع اللهو كالنرد والشطرنج والمزاجلة بالحمام وسائر ضروب اللعب مما لا يستعان به في حق ولا يستجمر به لدرك واجب فمحظور كله“ (معالم السنن ۲/۲۷۱) (کھیل کی وہ تمام قسمیں جنہیں بے کار لوگ کھیلتے ہیں مثلاً نرد، شطرنج، کبوتر بازی اور دیگر وہ تمام کھیل جن سے نہ تو صحیح غرض وابستہ ہے اور نہ کسی واجب کی ادائیگی میں معین ہیں، ایسے تمام کھیل ممنوع ہیں)۔

ہ۔ جس کھیل سے کوئی نفع وابستہ ہو اور صراحتاً یا دلالتاً اسکے خلاف کوئی نص وارد نہ ہو اور وہ تمار اور دوسری خرابیوں سے پاک ہو، اس کھیل کی گنجائش ہے، بلکہ بعض مرتبہ صالح مقاصد کے لیے شریعت میں ایسے کھیلوں کی ترغیب وارد ہوئی ہے، ”عن عقبہ بن عامر قال قال رسول الله ﷺ: ”إن الله يدخل بالسهم الواحد ثلاثة الجنة: صانعه يحتسب في صنعه الخير، والرامي به، ومنبله، إرموا واركبوا، وإن ترموا أحب إلى من أن تتركبوا، وليس من اللهو إلا ثلاث: تأديب الرجل فريسه، وملاعبته أهله، ورميه بقوسه ونبله“ (ابو داؤد، کتاب الجناد باب في الرمي رقم ۲۵۱۳) (یعنی تین چیزیں لہو و لعب میں داخل نہیں ہیں، کسی شخص کا اپنے گھوڑے کی تربیت کرنا، بیوی کے ساتھ دل لگی اور تیر چلانا)۔

امام خطابی فرماتے ہیں: اس میں اس امر کی وضاحت ہے کہ ہر قسم کے کھیل کو ممنوع ہیں، رسول اکرم ﷺ نے ان محرمات میں سے تین چیزوں کا استثناء فرمایا ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک میں جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ حق کے سلسلہ میں معین یا اس کا ذریعہ ہے، اسی معنی میں ہے، ہتھیار چلانے کی مشق اور پیدل دوڑنا وغیرہ جس سے جسمانی ورزش ہوتی ہے اور دشمن کی مدافعت میں قوت ملتی ہے (معالم السنن: ۳/۷۱)۔

خلاصہ یہ کہ کتاب و سنت اور فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں کھیلوں کے جواز یا عدم جواز کے سلسلہ میں اصولی طور پر درج ذیل تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

الف۔ جن کھیلوں کی احادیث و آثار میں صراحتاً ممانعت ہے وہ ناجائز ہیں، جیسے نرد، شطرنج، اور کبوتر بازی وغیرہ۔

ب۔ جس کھیل سے دینی یا دنیوی کوئی معتد بہ فائدہ مقصود نہ ہو وہ ناجائز ہے۔

ج۔ جن کھیلوں کی ترغیب احادیث میں وارد ہے، ان کو صحیح نیت کے ساتھ برتنا نہایت مستحسن عمل ہے، مثلاً تیر اندازی اور گھوڑ سواری وغیرہ۔

د۔ جس کھیل سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ معتد بہ مقصود ہو، مثلاً بدن کی ورزش، صحت و تندرستی باقی رکھنا یا کم از کم طبیعت کا مکان دور کرنا مقصود ہو اور اس میں نہ غلو ہو اور نہ ضروری کاموں میں حرج پڑے، اور خلاف شرع امر کا بھی ارتکاب نہ ہو تو ایسے کھیل شرعاً مباح اور دینی ضرورت کی نیت سے ہوں تو ثواب بھی ہے۔

ہ۔ کوئی کھیل اگر چاہے اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہے لیکن اس میں کوئی خلاف شرع امر مل جائے، مثلاً ستر کھولنا، یا مال کی شرط لگانا وغیرہ تو ایسا کھیل بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔

و۔ جس کھیل کا کوئی مقصد نہ ہو بلا مقصد محض وقت گزاری کے لیے کھیلا جائے تو یہ لغو ہونے کے سبب ناجائز ہوگا، اسی طرح اگر وہ کھیل فرائض یا واجبات سے غفلت کا سبب بنے تو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

ب۔ لباس و پوشاک کے سلسلے میں کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

لباس کے جواکام نماز کے لیے ہیں، وہی خارج صلاۃ بھی ہیں، یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک کی ستر پوشی ضروری ہے، لہذا کوئی کھیل اگرچہ وہ بظاہر

بامقصد ہو اور تمار وغیرہ سے خالی ہو اس میں اگر اس شرط کی ان دیکھی کی جائے تو اس کا کھیلنا یا دیکھنا بالکل جائز نہیں ہوگا۔ ”فی الدر: والرابع ستر عورتہ، ووجوبہ عام ولوفی الخلوۃ علی الصحیح، الا لغرض صحیح، قال ابن عابدین: قوله ولوفی الخلوۃ: أى إذا كانت خارج الصلاة يجب الستر بحضرة الناس إجماعاً ولوفی الخلوۃ علی الصحیح (حاشیة ابن عابدین ۲/۷۵)۔

”وقال رسول اللہ ﷺ: لا ينظر الرجل إلى عورة الرجل، ولا تنظر المرأة إلى عورة المرأة“ (البخاری، کتاب الصلاة، باب ما یستر من العورة، رقم ۳۶۹) (رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی مرد کسی مرد کی شرمگاہ کو نہ دیکھے، اور عورت عورت کی شرمگاہ نہ دیکھے)۔

قال الدكتور ناصر الغامدي: فإن كشفها أمام الناس والتساهل في ذلك من المنكرات العظيمة وما حل البلاء بالمسلمين إلا بسبب لتعري الذي يعيشه كثير منهم، رجالاً ونساءً (لباس الرجل، أحكامه وضوابطه مكة المكرمة ۲۰۱۲) (لوگوں کے سامنے ستر کھولنا اور اس سلسلہ میں تساہل برتنا بہت بڑی برائی ہے، مسلمانوں پر جو عام مصیبت آپڑی ہے اس کا سبب وہ عریانی ہے جس میں مسلمان مرد اور عورت زندگی گزار رہے ہیں)۔

ب- مروجہ کھیلوں میں بھی بعض وہ ہیں جن کی احادیث میں باضابطہ ترغیب ہے، جس سے دین و دنیا کا معتد بہ فائدہ وابستہ ہے، چنانچہ نشانہ بازی کو حدیث پاک میں نہ نظر اتھمان دیکھا گیا ہے، بلکہ اس کی تاکید بھی ہے، کیونکہ اس سے جسم میں چستی و پھرتی کے علاوہ دشمنوں کے خلاف ایک زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے: ”عن سلمة بن الأكوع قال قال رسول الله ﷺ: إرموا بني اسماعيل فإن أباكم كان راحياً“ (البخاری فی کتاب الجهاد والسير باب التحريض علی الرمي رقم ۲۷۲۳)۔

(اے اولاد اسماعیل! نشانہ بازی کرو، کیونکہ تمہارے باپ اسماعیل نشانہ باز تھے)، اسی رمی اور نشانہ بازی کے حکم میں دوسرے تمام ہتھیاروں کی تعلیم و مشق ہے جو جہاد میں کام آسکیں۔ ”قال السمرقندي: وتفسير المسابقة في النصل هو الرمي بالسهم والرمح وكل سلاح يمكن أن يرمى به (تحفة الفقهاء، ۲/۵۰۲، المسابقات ص ۷۲)۔

گھوڑ سواری کی بھی شریعت میں بڑی ترغیب آئی ہے، اس سے بلند حوصلگی پیدا ہوتی ہے، اور زمانہ قدیم میں دشمنوں کو زیر کرنے میں اس کا بڑا اہم رول ہوتا تھا، قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلموهم الله يعلمهم (سورة الانفال الآية ۶) (اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو، اور اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں، ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے، ان کو اللہ ہی جانتا ہے)۔

اشتراک علت سے اشتراک حکم کے پیش نظر جس طرح گھوڑ سواری کے فضائل حدیث سے ثابت ہیں، اسی طرح ہر وہ سواری جو جہاد میں کام آتی ہو اگر اسے بہ نیت جہاد چلانے کی مشق کی جائے تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوگی، جیسے بمبار اور لڑاکا طیارے، ہیل کاپٹر، آبدوز، بحری جہاز، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، جیپ، کار، موٹر سائیکل، سائیکل وغیرہ، ان سواریوں کی مشق اور ٹریننگ اسلامی نقطہ نظر سے اسلام کے پسندیدہ کھیلوں میں شمار ہوگی جب کہ جائز اور نیک مقاصد کے لیے انہیں سیکھا اور استعمال کیا جائے“ (کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت ص ۲۹)۔

جسمانی اور دفاعی لحاظ سے تیراکی کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، اس لیے حدیث پاک میں اس کی ترغیب موجود ہے، ارشاد نبوی ہے: ”خير لهو المؤمن السباحة وخير لهو المرأة المغزل (مؤمن کا بہترین کھیل تیراکی ہے اور عورت کا بہترین کھیل سوت کا تبا ہے) (کنز العمال ۲۱۱/ج ۱۵)۔

حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں: ہم حالت احرام میں تھے کہ مجھے عمر فاروقؓ کہنے لگے، آؤ میں تمہارے ساتھ غوطہ خوری کا مقابلہ کروں، دیکھیں ہم میں سے کس کی سانس لمبی ہے (عوارف المعارف، اسہر وردی ص ۱۳)۔

دور حاضر کے اطباء دسیوں بیماریوں کے خاتمے کے لئے آہستہ یا تیز دوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں، اور ٹکنالوجی کے اس دور میں ایسی جدید مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں کہ اس کی مدد سے ایک چھوٹے سے روم میں کئی کلومیٹر کی مسافت کے بغیر دوڑا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اس حوالے سے اہتمام کتب حدیث میں مصرح ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق اور حضرت زبیر بن العوامؓ میں دوڑ کا مقابلہ ہوا، حضرت زبیرؓ آگے نکل گئے تو فرمایا: رب کعبہ کی قسم! میں جیت گیا، پھر کچھ عرصہ بعد دوڑ کا مقابلہ ہوا تو حضرت عمرؓ آگے نکل گئے، انہوں نے بھی فرمایا: رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا (کنز العمال ۱۵/۲۲۴)۔

مذکورہ بالا کھیلوں کو اگر شرائط مثلاً ستر پوشی، فرائض کے اہتمام وغیرہ کے ساتھ کھیلا جائے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن اور شرعاً مطلوب و محمود ہیں، ان کے علاوہ راج کھیل کرکٹ اور فٹ بال پر اختصار کیساتھ روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

کرکٹ: الف - کرکٹ کے کھیل یا میچ عموماً ناظرین اور کھلاڑیوں کی فرائض سے غفلت کا سبب بنتے ہیں، کرکٹ کے پیچھے دیوانگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ فرض نمازیں بھی بہت آسانی سے ضائع ہو جاتی ہیں، حالانکہ ہم انہی (۱۳/۱۵۷) کے حوالے سے تحریر کر چکے ہیں کہ کسی بھی کھیل کے مباح ہونے کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ کسی فریضہ کے ضیاع کا سبب نہ بنے۔

ب - اس کھیل کے سبب ہر ٹیم کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان ایسی رسہ کشی بلکہ عداوت رہتی ہے کہ کبھی وہ آپسی مار پیٹ، اور طویل المیعاد دشمنی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، کئی بار شہروں اور دیہاتوں میں کرکٹ کے نام پر شروع ہونے والا جھگڑا، پورے علاقے کے امن و امان کو غارت کر دیتا ہے، ڈاکٹر احمد شہلی کے مطابق: کبھی ایسے کھیل کا انجام انتہائی تلخ اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میدان میں کھیل ہو رہا ہوتا ہے، دوسری طرف لوگ غش کھا کر گرتے ہیں یا دورہ قلب کے سبب موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں (احیاء الایمان ص: ۲۲۱-۲۲۱-۲۸۱)۔

ج - اس کھیل کی تنظیم و ترقی کے لیے اتنی بڑی رقم مختص کی جاتی ہے جس سے ملک کے غریب عوام کی تعمیر و ترقی کا کام بڑے پیمانہ پر لیا جاسکتا ہے، اس لیے اسے بھی معصیت کا سبب بننے والے لہو و لعب میں داخل کر کے حرمت کا نہیں تو فریب بہ حرمت کراہت کا ضرور فیصلہ لیا جانا چاہیے۔

فٹ بال: - اس میں کرکٹ کے مقابلہ میں جسمانی ورزش کا سامان زیادہ ہے، نسبتاً وقت بھی کم لگتا ہے، تاہم عمومی طور سے اس میں ستر عورت کا لحاظ نہیں ہوتا ہے، اس لیے اس کیفیت کے ساتھ اسے نہ کھیلا جائے اور نہ دیکھنا جائز ہے، اگر اس طرح کی خرابی سے پاک ہو، ستر پوشی کا اہتمام ہو اور قمار وغیرہ سے بالکل خالی ہو، فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بننا، تو گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عصر حاضر کے درج ذیل ملاہی کو شرط معتبرہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے: ”سواری، کشتی رانی، پیدل دوڑنے میں مقابلہ آرائی، تعلیم و تعلم کی خاطر طلبہ کے مسابقتی پروگرام، کشتی بشرطیکہ ستر پوشی ہو اور بہت انتہاک نہ ہو، بے کھیل، بندوق چلانا، نشانہ سادھنا، تیراکی، پتھر پھینکنا، ہاتھ سے دزنی پتھر کو اٹھانا، پنچہ کرنا، ایک پیر پر کھڑے رہنا وغیرہ، جس میں بدن کی ورزش یا بلند حوصلگی یا حساب جیسی چیزوں کی تعلیم ہے، مثلاً ”تعلیمی تاش“ کی بھی گنجائش ہے، جبکہ تجربے سے معلوم ہو جائے کہ وہ انسان کے لیے غفلت اور معصیت کا سبب نہ بنے ورنہ وہ بھی محرمات میں داخل ہے“ (الانہی عن الملاہی - احکام القرآن ۳/۲۰۱/۲۰۲)۔

د - ہار جیت میں پیسے کی شرط:

اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) شرط کسی اجنبی کی جانب سے ہو (۲) دو کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کی طرف سے ہو (۳) شرط جانین سے ہو۔

پہلی صورت: فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر امام المسلمین، یا اس کا نائب، یا کوئی عام شہری یا کوئی خاص کمپنی اگر کسی جائز کھیل یا مسابقتی پروگرام کا انعقاد کرتی ہے اور کامیاب ہونے والوں کے لیے خاص انعامات کا اعلان کرتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اس کے ذریعہ اگر تعلیم کو عام کرنا، اور اسباب جہاد کی تیاری اور فروست مقصود ہو تو انتہائی محمود ہے: ”حل الجعل إن شرط المال فی السابقتہ من جانب واحد قال الشامی: أو من ثالث بأن یقول أحدهما لصاحبه: إن سبقتنی أعطیتک کذا، وإن سبقتک لا آخذ منک شیئا، أو یقول الأمير لفارسین أو رامین من سبق منكما فله کذا وإن سبق فلا شیء له (الدرمہ حاشیة ابن عابدین: ۹/۵۷۷)۔“

دوسری صورت: دونوں کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کی طرف سے انعامی رقم ہو، مثلاً ایک دوسرے سے کہے: اگر تمہاری جیت ہوگی تو میں اتنا انعام دوں گا، اور اگر میں جیت گیا تو تم پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، مالکیہ نے اس صورت کے جواز کو اگرچہ بعض شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے، تاہم مجموعی اعتبار سے تمام فقہاء اس کے جواز پر متفق ہیں (دیکھئے: المنتہی للبابی ۳/۲۱۶ روضۃ الطالبین للذہبی ۱۰۹/۳۵۴، شرح الزکری علی مختصر الخرقی ۷/۵۹)۔

تیسری صورت: شرط جائزین سے ہو، مثلاً گھوڑ دوڑ کے مقابلے میں ایک دوسرے سے کہے: اگر میرا گھوڑا آگے نکل گیا تو تم اتنا دو گے اور اگر تمہارا آگے نکل گیا تو میں اتنا دوں گا، ظاہر ہے یہ صورت قمار میں داخل ہے، اس لئے جائز نہیں، لیکن اگر ان دونوں کے درمیان اگر کوئی تیسرا محلل ہو، احناف و شوافع، حنابلہ اور مالکیہ کی ایک روایت کے مطابق جائز ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ تین یا اس سے زیادہ آدمی شریک ہوں، دو آدمیوں میں یہ شرط ہو کہ ہم دو میں سے جو سبقت لے جائے اس کو دوسرا شرط رقم ادا کریگا، بقیہ دوسرے اشخاص کے لیے کوئی شرط نہ ہو۔

اگر تمام شرکاء کے ساتھ اس طرح کی شرط ہو کہ سبقت لے جانے والے کو شرط رقم ادا کریں گے، تو یہ حرام ہوگا اور ناجائز ہوگا، الحسکفی: و حرم لوشروط فیہا من الجانبین لأنه یصیر قمارًا إلا اذا ادخلا ثالثا محلا بینہما بفرس کف لفرسہما یتوہم أن یسبقہما، وإلا لم یجز ثم اذا سبقہما أخذ منها، وإن سبقا لم یعطها، وفيما بینہما أيہما سبق أخذ من صاحبه (۹/۵۷۸)۔

۵۔ جس کھیل میں کھلاڑی اور ناظرین کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو:..... ایک ایک گھڑی، انسان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے، لہذا ایک ایک لحظہ اور سیکنڈ کو تول تول کر گزارنا چاہیے، زندگی کے ان لمحات کے سلسلے میں کل کو خالق کائنات کے سامنے جواب دہ ہونا ہے، لہذا ہر وہ کھیل جس سے متاع وقت کا ضیاع لازم آتا ہو، غفلت بڑھتی ہو، اس کی از روئے شرع اجازت نہیں دی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ شرط خراج اگر دیگر محرمات پر مشتمل نہ ہو تب بھی فقہاء اس کی اجازت نہیں دیتے، شکار عام حالات میں درست ہے، لیکن اس کا ایسا اشتغال جس سے آدمی اس میں منہمک ہو جائے، شریعت اسے کبھی بہ نظر استحسان نہیں دیکھتی۔ ”من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ“ (أخرجه الترمذی فی الزہد رقم: ۲۳۱۸)۔

۶۔ کھیل دیکھنا اور اس کے لیے ٹکٹ خریدنا اور کھیل دیکھنا اس وقت جائز ہوگا جب کہ وہ کھیل شرعاً درست ہو اور اس میں کوئی محرم شرعی موجود نہ ہو، لیکن عام طور سے آج کل کھیل کے نام پر طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے، اسٹیڈیم میں نامحرم کھیلتے ہیں، خلاف شرع پروگرام ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہے، عورتیں عریاں لباس میں مردوں کے پہلو پہ پہلو بیٹھی ہوتی ہیں، فساق اور فجار کا اجتماع ہوتا ہے، کم از کم لایعنی چیزوں میں وقت کا ضیاع تو ہوتا ہی ہے، گویا خلاف شرع امور کا غلبہ رہتا ہے، لہذا کھیل کود کے لیے ٹکٹ خریدنا اور بیچنا دونوں ناجائز ہیں، اگر کہیں واقعہ ان تمام شرعی قباحتوں سے پاک کوئی کھیل ہو رہا ہو تو وہاں گنجائش ہے، ولا تصح الإجارة لأجل المعاصی مثل الخناء والنوح والملاھی (الدرمہ حاشیة ابن عابدین ۹/۷۵)۔

### ۳۔ سیاحت کے احکام:

الف۔ تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک جانا:

اگر کوئی خاص شرعی غرض یا مصلحت وابستہ نہ ہو، مثلاً حج، عمرہ، جہاد، طلب علم، تجارت، ملازمت، وغیرہ تو محض سیر و تفریح کے لیے کثیر رقم صرف کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی اجازت نہیں ہوگی ”من حسن اسلام المرأ ترکہ ما لا یعنیہ“ (الترمذی فی الزہد ۲۳۱۸) رسول اکرم ﷺ نے سفر کو قطعاً من العذاب فرمایا ہے، اگر کسی ضرورت سے سفر میں نکلنا ہی پڑے تو کام نہ مٹنا کر فوراً اپنے اہل کی طرف واپسی کا حکم دیا ہے: ”عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه؛ أن رسول الله ﷺ قال: السفر قطعاً من العذاب، يمنع أحدكم نومه وطعامه وشرابه، فإذا قضى أحدكم همته فليجعل إلى أهله (متفق عليه: أخرجه البخاري برقم ۳۰۰۱ ومسلم برقم ۱۹۲۷) اگر صالح مقاصد مثلاً طلب صحت کے لیے ہو تب بھی وہ سفر محمود ہے: ارشاد نبوی ہے: ”سافروا تصحوا“ (الذیلمی فی مسند الفردوس، غنیة المعارف بتخریج احادیث عوارف المعارف ص ۷۳۱)۔

ب۔ بال بچوں کے ساتھ پر خطر علاقوں کا سفر:

احناف کے یہاں شوہر کو بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے شہر یا ملک کے سفر کی اجازت ہے بشرطیکہ کوئی صحیح غرض ہو (الدر المختار ۴/۳۹۵) مثلاً وہاں ملازمت ہو یا اس نے سرمایہ کاری کر رکھا ہو، نیز بیوی کی جان اور عزت و آبرو محفوظ ہو، لیکن اگر عورت کی جان یا آبرو کو خطرہ ہو، تو وہ خود بھی شوہر کے ساتھ جانے سے انکار کر سکتی ہے اور اس صورت میں وہ ناشزہ بھی شمار نہیں ہوگی: ”للزوج السفر بزوجه إلى بلد آخر لغرض صحيح، كالتوظيف في بلد غير بلده أو استثمار ماله... فإذا لم يكن مأموناً عليها أو قصد إضرارها، فلها الحق في الإمتناع من السفر منه، ولا تعد

ناشزۃ“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱: ۷۹۷) مالکیہ کے یہاں بھی بیوی کو دوسرے شہر یا ملک میں لے جانے کی تین شرطیں ہیں: (۱) شوہر کو وہاں کوئی خطرہ نہ ہو (۲) اس ملک کا راستہ مأمون ہو (۳) وہ شہر یا ملک اس طرح نہ ہو کہ بیوی اپنے اقارب سے رابطہ ہی نہ رکھ سکے۔ ”أَنْ يَكُونَ الزَّوْجُ مَأْمُونًا وَأَنْ يَكُونَ الطَّرِيقُ إِلَى الْبَلَدِ مَأْمُونًا وَأَنْ يَكُونَ الْبَلَدُ قَرِيبًا بَحِثْ لَا يَنْقَطِعُ خَبْرُ أَهْلِهَا عَنْهَا وَلَا خَبْرُهَا عَنْ أَهْلِهَا“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲: ۷۹۷)۔

یہ شرطیں اگرچہ اس صورت کے ساتھ مختص ہیں جب کہ وہاں بیوی کے ساتھ قیام کا ارادہ ہو، لیکن سیر و سیاحت کے سفر میں بھی وہاں کچھ نہ کچھ دن تو قیام کرنا ہی ہوتا ہے، اس لیے بہ ظاہر یہی کچھ میں آ رہا ہے کہ جن علاقوں کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے نقطہ نظر سے پرخطر ہو وہاں کے سفر سے خود بھی گریز کرے اور بیوی بچوں کو بالکل ساتھ نہ رکھے، اس سلسلے میں درج ذیل حدیث پاک سے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے: ”لَا تَرْكِبُنَّ أَحَدَ الْبَحْرِ إِلَّا غَازِيَا أَوْ مَعْتَمِرًا وَحَاجًّا“ (روہ ابو داؤد: دیکھئے! تخصیص الجہیر ۳/ ۸۳۳) اس لیے کہ سمندر کا سفر پرخطر ہوتا ہے، آج کونسا ہوائی یا سمندری سفر ہے جو خطرات سے خالی ہوتا ہے؟

ج۔ ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا جہاں غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں:..... محض تفریح اور سیر و سیاحت کے لیے ایسے علاقوں کا ہرگز سفر نہیں کرنا چاہیے، قرآن کریم میں ہے: ”وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ“ (الأنعام: الآیۃ) (اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جاویں)، لہذا جہاں فحاشی اور معصیت کا بول بالا ہو وہاں کا رخ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، رسول اکرم ﷺ نے تو دوران سفر بھی کتے اور آلات ابو سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے تو جہاں یہ ساری قباحتیں موجود ہوں، اس کے جواز کی کوئی شکل کیسے بن سکتی ہے: ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةَ رَفَقَةً فِيهَا كَلْبٌ وَلَا جَرَسٌ“ ”فرشتے ان مسافرین کے ہمراہ نہیں ہوتے جن کے ساتھ کتیا گھنٹی ہو (آخر جہ مسلم رقم ۳۹۰۵) البتہ وہاں جانے والوں کے لیے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر ایشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لیے دوکان لگانا جائز ہے اگرچہ اجتناب اولیٰ ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق براہ راست ان معاصی سے نہیں ہے، اور نہ یہ سبب قریب کے درجے میں ہے۔

د۔ ٹور کمپنیاں قائم کرنے کے احکام:

ان تجارتی کمپنیوں کی طرف سے اگر معصیت کے ان کاموں کا قصد اور نیت ہو، اور کمپنی تشکیل دیتے وقت ہی معصیت کے یہ کام مقاصد میں شامل ہو تو ایسی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر اس نے مباح مقصد کے لیے کمپنی کی تشکیل دی ہے، اور کچھ لوگ اپنے طور سے اس کے ذریعہ معصیت کا ارتکاب کر رہے ہیں، تو شرعاً ٹورز والے بری الذمہ ہوں گے، کیونکہ یہ سب قریب محرک للمعصیۃ نہیں ہے، کہ اس کی اس کمپنی کی وجہ سے ہی لوگ ان امور کا ارتکاب کر رہے ہیں: مفتی شفیع صاحبؒ نے اس طرح کے مسائل پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سبب کی تین قسمیں ہیں:

(۱) سبب قریب محرک: اس کی حرمت نص قرآنی سے ثابت ہے، سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۰۸ میں کہا گیا ہے: اور دشنام مت دو ان کو جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔

(۲) سبب قریب موصل غیر محرک: یعنی جو محرک اور باعث نہ ہو بلکہ موصل محض ہو، اس کی حرمت اگرچہ فصوص میں نہیں تاہم اشتراک علت کی وجہ سے یہ بھی پہلی صورت میں داخل ہے، کیونکہ یہ بھی شر اور معصیت تک پہنچانے والا ہے، اسی قبیل سے ہے باغیوں اور برسر پر کار لوگوں کو ہتھیار فروخت کرنا، اس لیے کہ یہ اعانت علی المعصیت اور اس کے لیے سبب قریب ہے۔

(۳) سبب بعید: جیسے باغیوں کو لوہا فروخت کرنا، شراب بنانے والوں کے ہاتھ انگوڑی بچپنا، کسی چرچ وغیرہ بنانے والے کے ہاتھ لکڑی یا اینٹ فروخت کرنا، اسی طرح معصیت کی خاطر سفر کرنے والے کو جانور کرایہ پر دینا، ان صورتوں میں اگر استعمال فی المعاصی کا علم ہو تو مکروہ ہے۔

۴۔ دستاویزی، تاریخی اور تعلیمی مقاصد کے لیے بنائی جانے والی فلمیں:

عام طور پر تاریخی یا دستاویزی یا تعلیمی مقاصد کے لیے بنائی جانے والی فلموں میں بھی شرعاً کئی طرح کی قباحتیں ہوتی ہیں، تاہم اگر کوئی فلم ایسی ہو جو ان

قباحتوں سے پاک ہو یعنی اس میں درج ذیل شرطیں پائی جاتی ہوں تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

(۱) اکثر علماء کی رائے کے مطابق چونکہ جاندار کی تصویر کشی اور اس کا استعمال اور تصویر کو دیکھنا دکھانا شرعاً ناجائز ہے، اس لیے یہ فلمیں جان دار کی تصاویر سے بالکل پاک ہونی چاہیے۔

(۲) اگر آواز ہو تو فقط مرد کی ہو اس میں اناؤنسریا تعارف کرانے والی آواز عورت کی نہیں ہونی چاہیے۔

(۳) ساز، میوزک اور گانے کی آواز سے پاک ہو۔

(۴) اس میں حقائق کی ہی ترجمانی ہو۔

۵- کارٹون کے احکام:

الف- کارٹون بنانا:

اگر کارٹون اس طرح بنایا جائے کہ چہرہ، آنکھیں، ناک وغیرہ واضح ہوں اور اس سے ان کی واضح شناخت ہو رہی ہو جن کی طرف اشارہ مقصود ہے تو ایسے کارٹون بنانا اور ان کا استعمال جائز نہیں، البتہ اگر ایسا کارٹون بنایا جائے جس میں جاندار کی شکل واضح نہ ہو یعنی اس کی ناک کان، آنکھیں وغیرہ واضح نہ ہوں تو ایسے کارٹون بنانے کی گنجائش ہے، تاہم مناسب نہیں، کیونکہ وہ بھی تصویر کے مشابہ ہے (البحر الرائق ۲/۲۸- الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۰۷)۔

عموماً کارٹون میں ایک دوسرا پہلو تفریح اور مزاح بلکہ بسا اوقات تنقید اور تذلیل کا ہوتا ہے اور جس طرح کسی کے پس پشت زبان سے غیبت ناجائز ہے، اس طرح اس سے اس طرح مزاح کرنا یا اس کی مخصوص صفات کی طرف اشارہ کرنا جس سے اس کی دل آزاری ہوتی ہو یہ بھی غیبت محرمہ میں شامل ہے، ”ویکرہ التعریض بالكذب إلا لحاجة كقولك لرجل كل فيقول: اكلت يعني امس فإنه كذب“ (الہندیہ ۵/۲۵۲) ”و كما تكون الغيبة باللسان صريحًا تكون أيضًا بالفعل وبالتعريض وبالكتابة وبالحرارة وبالرمز وبغمز العين والإشارة باليد وكل ما يفهم منه المقصود فهو داخل في الغيبة وهو حرام (حاشیة ابن عابدین ۹۰۵۸۹)۔“

ب- کارٹون کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس کے لیے ملازمت:..... اوپر کی تفصیلات سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ کارٹون میں ایسی قباحتیں موجود ہیں جو اسے بسا اوقات معصیت تک پہنچا دیتی ہیں، لہذا اسے ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست نہ ہوگا اور اس میں شدت یا خفت کارٹون کی نوعیت کے اعتبار سے ہوگی، ”لا تصح الإجارة لعسب التيس ولأجل المعاصي مثل الغناء والنوح والملاهي (حاشیہ ابن عابدین ۹/۴۵) قال الحسكفي: ومن السحت ما يأخذ غاذا لغزو وشاعر لشعر ومسخرة وحكواتي (المرجعة السابق ۹۰۶۰۸)۔“

۶- ڈرامے کے شرعی احکام:

وہ ڈرامہ جو محرمات پر مشتمل ہو اور شرعی حدود و قیود سے آزاد ہو اس کی تحریم پر اہل علم کا اتفاق ہے، کیونکہ یہ شریعت کے مقاصد اور نصوص کے خلاف ہے، مثلاً اس میں غلط افکار کی آمیزش ہو یا وہ غلط عقائد کی طرف داعی ہو یا جرائم اور معصیت پر ابھارے یا جذبات کو برا بیچیتہ کرے تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسا ڈرامہ تیار کرے یا اس میں معاون بنے، اسی طرح دیکھنا یا اس پر حوصلہ افزائی کرنا بھی جائز نہیں ہے (الفتاویٰ المصریہ ۱۰/۳۵۳۶- المسابقات ص: ۲۳۹)۔

اگر کوئی ڈرامہ ان محرمات اور قبائح سے پاک ہو تو اکثر علماء حضرات نے اسکو مباح قرار دیا ہے۔ دارالافتاء المصریہ نے بھی اس کے جواز کا قول کیا ہے (الفتاویٰ ال اسلامیہ ۲۰/۷۷۸۹) ان حضرات نے تمثیل کے جواز پر متعدد دلائل دیئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- سورہ ص کی وہ آیات جن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک فیصلہ کا ذکر ہے ”وهل اثلث نبؤ الخضم“ (متعلقہ آیات ۲۳ تا ۲۴ کا ترجمہ یہ ہے) (اور بھلا آپ کو ان اہل مقدمہ کی خبر پہنچی ہے، جب کہ وہ لوگ) (جو درحقیقت فرشتے تھے) عبادت خانے کی دیوار پھانڈ کر داؤد علیہ السلام کے پاس آئے، تو داؤد گھبرا گئے، وہ لوگ کہنے لگے کہ ڈریں نہیں، ہم دو اہل معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی، سو آپ ہم میں انصاف کر دیجئے، اور ہم کو سیدھی راہ بتا دیجئے، یہ شخص میرا بھائی ہے، اس کے پاس نناؤے ذنبیاں ہیں، اور میرے پاس صرف ایک ذنبی ہے، سو وہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھ کو دے ڈال اور باہت چیت میں

مجھ کو دباتا ہے، داؤد نے کہا: یہ جو تیری دنیٰ اپنی ذہنیوں میں ملانے کی درخواست کرتا ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کرتا ہے، اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں، مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، اور نیک کام کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں، داؤد کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان کیا ہے، سو انہوں نے اپنے رب کے سامنے توبہ کی، اور سجدہ میں گر پڑے اور رجوع ہوئے، سو ہم نے ان کو معاف کر دیا۔

ان آیات میں ملائکہ سے جو کچھ بھی صادر ہوا وہ محض ایک تمثیل تھا جس کے ذریعہ اللہ پاک نے اپنے نبی داؤد علیہ السلام کو ایک خاص حکم کی رہنمائی کی، دیکھئے! (احکام القرآن للجصاص ۵/۲۵۴) اور شرع من قبلنا اگر بطریق صحیح ثابت ہو اور کوئی دلیل گنج بھی نہ ہو تو ہمارے لیے حجت ہے، اکثر حضرات اسی کے قائل ہیں (دیکھئے! التعمید للاسنوی ص: ۲۴۱- غایۃ الوصول الی علم الاصول ص: ۱۴۱) زخشریٰ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: ”کان تحاکمهم فی نفسہ تمثیلاً وکلامہ تمثیلاً، لأن التمثیل ابلغ فی التوہین“ (الکشاف ۵/۲۵۵)۔

۲- حدیث جبرئیل جس میں جبرئیل علیہ السلام کا انتہائی صاف ستھرے لباس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا اور اسلام، ایمان، اور احسان کے متعلق سوال کرنا مذکور ہے۔ (رواہ مسلم فی کتاب الایمان برقم ۸، ورواہ البخاری فی خیر انبی کتاب الایمان برقم ۵) اس حدیث پاک میں گفتگو نقل کی گئی کہ ایک سائل ہیں اور ایک مسئول ہیں، عام سائلین کی عادت سے ہٹ کر یہاں سوال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سائل کو ایک چیز کا علم ہو جائے، اصل مقصد یہ ہے کہ حاضرین کی معلومات میں اضافہ ہو، اور وہ حاضرین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب باصفا ہیں اور ظاہر ہے یہی تو تمثیل ہے، ڈرامہ انجام دینے والے کا مقصد مشاہدین تک ایک فکر کو پہنچانا ہوتا ہے، بلکہ مکرم نے یہاں وہی رول انجام دیا ہے اور اس مکالمے اور بات چیت کا ایک طرف خود نبی مرسل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو مکالمے کے جواز کی واضح دلیل ہے (صالح الغزالی: حکم مہارت الفہن ص: ۲۹۵)۔

۳- تمثیل، تشبیہ کی طرح ہوتی ہے، جب تشبیہ جائز ہے تو تمثیل بھی جائز ہوگی۔

بعض حضرات مثلاً احمد بن صدیق النعماری الحسینی وغیرہ تمثیل کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ کذب محض ہے، لیکن صحیح یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ کذب محض نہیں ہے، کیونکہ مکالمہ پیش کرنے والے یہ نہیں کہتے کہ میں بعینہ فلاں ہوں، ان کے کردار عام طور پر فرضی ہوتے ہیں، البتہ سامعین کو اس سے دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ حقیقت حال سے باخبر ہوتے ہیں، لیکن اباحت تمثیل کے لیے چند شرائط کا خیال ضروری ہے تاکہ یہ مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو جائے۔

الف- مرکزی خیال اور فکر جس کے ارد گرد وہ پورا مکالمہ گردش کر رہا ہوتا ہے، ضروری ہے کہ وہ خیال شرعی ہو، اس سے اسلامی عقیدے پر زد نہ پڑتی ہو، اس سے کسی منکر یا فحاشی کی دعوت نہ دی جائے، یعنی مکالمے کا مقصد دین، اخلاق یا علم و ادب ہو۔

ب- اگر تاریخی واقعات کی منظر کشی مکالمے کے ذریعہ کی گئی ہو تو ضروری ہے کہ وہ ہوتا تاریخ پیش کی جائے، کذب یا مبالغہ آرائی سے کام لے کر ایک فرضی اور خیالی چیز کو اسلامی تاریخ کا حصہ بنانے کی بالکل کوشش نہ کی جائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ماہرین تاریخ کے زیر اشراف ہی ایسے مکالمے اسٹیج کیے جائیں۔

ج- ڈرامہ محرمات پر مشتمل نہ ہو، مثلاً عورت، آلات، موسیقی کا استعمال اور گانا بجانا وغیرہ۔

د- ان مقدس ہستیوں کی تمثیل بالکل نہ پیش کی جائے جن کی عظمت و قدراست مسلمانوں کے قلوب میں راسخ ہو، جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام وغیرہ، کیونکہ اس سے ان عظیم المرتبت شخصیات کی دلوں میں وقعت کم ہو جاتی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا کردار ہو جو ان کے مقام عالی کے بالکل مناسب نہ ہو (المساہات ص: ۳۶۰)۔

ہ- فساق، کفار، اور شرکین کی وضع نہ اختیار کی جائے، اور ان لوگوں کا رول ادا کرتے ہوئے ایمان اور عقیدے، اور مسلمان کو چوٹ پہنچانے والا ایک کلمہ بھی نہ بولا جائے، کیونکہ مذاق میں بھی کفر اختیار کرنے والے پر حقیقتاً کفر کا حکم لگایا جاتا ہے۔

مدارس میں جو مکالمے ہوتے ہیں ان میں ان شرائط و آداب کا خصوصیات کے ساتھ لحاظ رکھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلیہ اتم وأحکم

☆☆☆



## تفریح و سیاحت - احکام و مسائل

مولانا شوکت ثناء قاسمی ع

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی اپنے اصحاب سے اور آپ کے اصحاب آپ سے گاہے مزاح کیا کرتے تھے، تاہم مزاح کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ اس کی اجازت و جواز چند شرائط و قیود کے ساتھ مقید ہے:

۱- مزاح و مذاق کا تعلق شریعت، شعائر اسلام اور مقدس شخصیات انبیاء اور فرشتوں کے ساتھ نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”وَلَمَّا سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ، لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ“ (التوبہ: ۶۵-۶۶) (اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے، ان سے کہو کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ﷺ ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذر نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔)

۲- مزاح و مذاق میں جھوٹی اور غلط بات نہ کہی جائے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ سے تعجب کے ساتھ عرض کیا: آپ بھی ہم لوگوں سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہر حال میں میری زبان سے سچ کے سوا کچھ اور نہیں نکلتا۔ ”عن أبي هريرة قال: قالوا: يا رسول الله! إنك تداعبنا قال: إني لا أقول إلا حقاً“ (ترمذی؛ باب ما جاء في المزاح: ۱۹۱۳، السنن الکبریٰ: ۲۱۷۰۵)۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ہلاکت ہو اس شخص کے لئے جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے۔

”عن بهز بن حكيم قال حدثني أبي عن أبيه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: ويل للذي يحدث فيكذب ليضحك به القوم ويل له ويل له“ (سنن ابی داؤد؛ باب فی التشدید فی الکذب: ۴۲۳۸، مسند احمد: ۱۹۱۹، سنن کبریٰ للنسائی: ۱۱۶۵۵)۔

۳- مزاح و مذاق کا مقصد کسی کو پریشان کرنا اور ڈرانا اور دھمکانا نہ ہو۔

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے اصحاب نبی ﷺ نے بیان کیا کہ وہ لوگ نبی ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ان میں ایک شخص سو گیا، بعض ساتھیوں نے اس کی رسی لے لیا جب وہ بیدار ہوا تو گھبرا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے کسی مسلمان کو ڈرانا درست نہیں۔

”عن عبد الرحمن بن أبي ليلي قال: حدثنا أصحاب محمد ﷺ أنهم كانوا يسرون مع النبي ﷺ فنام رجل منهم فانطلق بعضهم إلى حبل معه فأخذه ففزع فقال رسول الله ﷺ: لا يحل لسلم أن يروء مسلماً“ (ابوداؤد؛ باب ما يأخذ الشيء على المزاح: ۴۳۵۱، ترمذی؛ باب ما جاء لا يحل لسلم أن يروء مسلماً: ۲۰۸۲)۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی کوئی چیز نہ حقیقتاً لے نہ مذاقاً لے اور اگر لے لے تو واپس کر دے۔

”عن عبد الله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: لا يأخذن أحدكم متاع أخيه لآعباً ولا جاداً أو قال سليمان: لعباً ولا جاداً ومن أخذ عصاً أخيه فليردها“ (ابوداؤد؛ باب من يأخذ الشيء على المزاح: ۴۳۵۰)

مفتی و استاذ شعبہ تربیت و افتاء، جامعہ عائشہ نسواں، داراب جنگ کالونی، نادا پیٹ، حیدرآباد۔

۴- مزاج و مذاق کے لئے مناسب جگہ اور وقت کی رعایت کی جائے، اس لئے کہ بعض مقامات اور اوقات میں مزاج کرنا درست نہیں ہے، مثلاً نماز کے اوقات، قبرستان، تذکرہ موت، تلاوت قرآن اور دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت وغیرہ۔

”اختیار الوقت والمكان المناسبین: هناك أوقات وأماكن لا يجوز فيها الضحك والمزاح واللهو، مثل: أوقات الصلوة، وعند زيارة المقابر، وعند ذكر الموت، وعند قراءة القرآن، وعند لقاء الأعداء، وفي أماكن العلم“ (موسوعة الاسرة المسلمة ۱۳، ۲۳۵)۔

ملا علی قاری اور علامہ عبدالرحمن مبارک پوری نے امام نووی سے مزاج کے سلسلہ میں شریعت کے نقطہ نظر کو بڑے سچے تلے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے: وہ مزاج جس سے منع کیا گیا ہے ایسا مزاج ہے جس میں افراط ہو اور کثرت و دوام ہو اس کی وجہ سے کثرت سے ہنسی آتی ہے، قلب میں سختی پیدا ہوتی ہے، اللہ کی یاد اور دین کی اہم باتوں میں غور و فکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے، بسا اوقات ایذا اور حسد کا باعث ہو جاتا ہے، اور رعب و وقار کو ختم کر دیتا ہے، ایسا مزاج جو ان باتوں سے خالی ہو مباح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے اور مقصود و مخاطب کی تالیف اور ان سے انس کا اظہار ہوا کرتا تھا جو کہ محبوب سنت ہے (مرقاۃ المفاتیح: باب المزاج ۱۳ / ۱۵۳، تحفۃ الاحوذی: باب ما جاء فی المزاج ۲۳۲ / ۵)۔

### ب- مزاحیہ پروگراموں کا انعقاد:

دل بستگی اور تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ پروگرام یا مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد اگر چند گھنٹوں کے لئے ہو تو اس کی گنجائش ہے، اور اس میں شرکت کی بھی اجازت ہوگی، بشرطیکہ شرعی اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے۔

”عن جابر بن سمرۃ قال: جالست النبی ﷺ أكثر من مائة مرة فكان أصحابه يتناشدون الشعر ويتذاكرون أشياء من أمر الجاهلية وهو ساكت فربما تبسم معهم“ (ترمذی؛ باب ما جاء فی انشاد الشعر: ۲۶۶۷، مسند احمد: ۲۰۱۰۲)۔

(حضرت جابر بن سمرہ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو مرتبہ سے زائد بیٹھنے کا اتفاق ہوا، آپ کے اصحاب اشعار پڑھا کرتے تھے اور زمانہ جاہلیت کی بعض باتوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے، آپ خاموش رہا کرتے کبھی کبھی صحابہ کے ساتھ مسکرا دیا کرتے تھے)۔

چنانچہ ملا علی قاری نے زمانہ جاہلیت کی بعض باتیں جن کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوا کرتا تھا، کو مرقاۃ المفاتیح میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں صحابہ زمانہ جاہلیت کی بعض باتوں کا تذکرہ کر رہے تھے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ میں نے دو لومڑی کو دیکھا کہ وہ دونوں آئے اور میرے بت (معبود) کے سر پر بیٹھ گئے اور اس پر دونوں نے پیشاب کر دیا تو میں نے کہا: کیا پروردگار کے سر پر لومڑی پیشاب کر رہے ہیں؟ پھر میں آپ کے پاس آ کر اسلام قبول کر لیا، صحابہ اس بات پر ہنس پڑے اور آپ نے بھی تہمس فرمایا (مرقاۃ المفاتیح: باب الضحک)۔

ان روایتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی مجلسوں میں بھی کبھی کبھی مزاحیہ باتیں اور واقعات کا تذکرہ ہوتا تھا اور ان سے سارے حضرات لطف اندوز ہوا کرتے تھے، اور ظاہر ہے اس کے لئے مجلس ہوا کرتی ہوگی خواہ کچھ دیر کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔

### ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا اور پڑھنا:

مزاحیہ کہانیاں لکھنا اور پڑھنا اگر عبرت و نصیحت اور پند و نصائح کے لئے ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں، اسی طرح تفریح و طبع اور دل بہلانے کے لئے بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں ضرور نقصان کا پہلو نہ ہو، اور فرائض منصبی سے غفلت کا باعث نہ بنے، لیکن ان میں اپنا قیمتی وقت صرف کرنا مناسب نہیں ہے۔

”عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: تحدثوا عن بني إسرائيل فإنه كانت فيهم أعاجيب“ (ابن ابی شیبہ مع تحقیق الشیخ محمد عوامہ: ۲۶۰۱۷، وقد صحح الالبانی هذه الزیادة)۔

(حضرت جابر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل سے حدیث نقل کرو، اس لئے کہ ان کے یہاں انوکھے اور دلچسپ واقعات ہوتے ہیں)۔

”وحدیث حدثوا عن بنی اسرائیل یفید حل سماء الأعاجیب والغرائب من کل ما لا یتیقن کذبہ بقصد الفرجة لالحجة بل وما یتیقن کذبہ، لکن بقصد ضرب الأمثال والمواعظ وتعلیم نحو الشجاعة علی السنة آدمیین أو حیوانات“ (کتاب المحظر والاباحة: فصل فی البیہ)۔

حدیثا عن بنی اسرائیل: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حزن و ملال کو دور کرنے کے لئے ہر ایسے عجائبات اور دلچسپ انوکھے واقعات کا سننا مفید ہے جن کے جھوٹے ہونے کا یقین نہ ہو، اور اسی طرح ایسے واقعات جن کے جھوٹے ہونے کا یقین ہو، لیکن مثال یا وعظ و نصیحت اور شجاعت و بہادری کی تعلیم کے لئے ہونے چاہئے انسانوں کی زبانی ہو یا حیوانوں کی۔

فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ میں ہے: ”أما إذا كانت هذه القصص لا فائدة من قرائتها وإنما المقصود منها التسلية، فلا مانع منها أيضا ما لم تشتمل على ضرر، لکن ینبغی الإقلال منها حفاظاً علی الوقت الذی ہو رأس مال المرء“ (فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ، رقم الفتویٰ: ۴۶۲۹۱)۔

جن مزاحیہ کہانیوں کو لکھنا اور پڑھنا درست ہے، ایسی کہانیوں پر مشتمل کتابیں شائع کرنا اور خرید و فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا:

لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو مستقل پیشہ بنا لینا حسب ذیل وجوہات کی بنا پر شرعاً درست نہیں۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی کوئی ایسی بات کہتا ہے جس کو وہ گناہ نہیں سمجھتا اور وہ اس کی وجہ سے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے (ترمذی: باب نہیں تکلم بکفر۔ مشکوٰۃ بہا الناس: ۲۲۳۶، بخاری: باب حفظ اللسان: ۵۹۹۶، مسلم: ۵۳۰۳)۔

جو شخص لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو مستقل پیشہ بنا لے گا اس کے لئے اپنی زبان کو ان جیسی باتوں سے روکنا بہت مشکل ہے، بلکہ اس صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ مزاح و مذاق کے دوران اس کی زبان سے ایسی بات نکل جائے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور جہنم میں جانے کا سبب ہو جائے، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں زبان کی حفاظت کی ترغیب دی گئی ہے، لہذا کوئی شخص کوئی بات یا جملہ کہنا چاہتا ہے تو پہلے اپنے دل میں غور و فکر کرے اور اگر اس گفتگو میں مصلحت معلوم ہو تو کہے ورنہ خاموش رہ جائے (شرح مسلم للنووی: باب التحکم بالکفر بیہی بہانی النار: ۵۳۰۳)۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان و یقین رکھتا ہو وہ خیر و ثواب کی بات کہے یا خاموش رہے۔

”من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیراً أو لیصمت“ (باب الحث علی إکرام الجار والضيف ولزوم الصمت إلا عن الخیر: ۶۷، بخاری: باب حفظ اللسان)۔

علامہ نووی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بات کرنا چاہے اور وہ بات یقینی طور پر اجر و ثواب کا ہو خواہ واجب ہو یا مندوب تو وہ بات کہے اور اگر اس بات کا خیر و ثواب کا ہونا واضح نہ ہو تو ایسی باتوں سے اپنی زبان کو روک لے، مزید لکھتے ہیں کہ مباح گفتگو میں بھی ترک پسندیدہ ہے تاکہ کلام مباح، کلام حرام اور مکروہ تک پہنچانے والا نہ ہو (شرح مسلم للنووی: باب الحث علی إکرام الجار والضيف ولزوم الصمت إلا عن الخیر: ۶۷)۔

لطیفہ گوئی یا مزاح کو مستقل پیشہ بنانے والے اشخاص کثرت کلام کے بغیر اپنے فن میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے بغیر اس کو دلچسپ و جاندار بنا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا خرابیوں کی وجہ سے لطیفہ گوئی یا مزاح کو مستقل پیشہ بنانے کی اجازت نہیں ہوگی، اور یہی حکم باضابطہ ہنسنے اور ہنسانے کی محفلوں کے قیام کا بھی ہوگا۔

تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے:

مزاحیہ ڈرامے کا مقصد ہنسنے اور ہنسانے کے ساتھ وقت گزاری بھی ہوا کرتا ہے، جس میں حسب ذیل خرابیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے اس کی اجازت و گنجائش نہیں ہوگی:

۱۔ بسا اوقات مزاحیہ ڈرامے کا پروگرام مرد و عورت دونوں ایک ساتھ پیش کرتے ہیں، اور اس طرح کسی عورت کا بے حجابانہ مردوں کے مجمع میں آنا اور مزاحیہ

پروگرام پیش کرنا جس میں عورت کے چہرہ کے ساتھ جسم کے دوسرے حصے کے بھی نمائش ہوا کرتی ہے، جو قطعاً درست نہیں ہے۔

۲- مزاحیہ ڈرامے پیش کرنے والا مرد ہو یا عورت پروگرام پیش کرتے وقت شرم و حیا، انسانی کرامت و شرافت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ناظرین کے لئے تقبہ لگانے کا موقع فراہم کرتا ہے، خواہ اس کے لئے مرد کو عورت اور عورت کو مرد کا، بلکہ انسان کو حیوان کا بھی رول ادا کیوں نہ کرنا پڑے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جب تمہارے اندر شرم و حیا ہی نہ ہو تو جو چاہو کرو، ”اذا لم تستح فاصنع ما شئت“ (بخاری؛ کتاب الانبیاء، باب بدون ترجمہ: ۲۳۸۲، وفی کتاب: الادب باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت: ۶۱۲۰، وفی الادب المفرد، باب الحیاء: ۵۹۷)۔

۳- عام طور پر مزاحیہ ڈرامے جھوٹ، کذب بیانی، افتراء پر دازی، بہتان اور استہزاء و تمسخر پر مشتمل ہوا کرتا ہے، جس کی شریعت میں قطعاً گنجائش نہیں۔

۴- مزاحیہ پروگرام اور ڈراموں میں مرد و عورت کا اختلاط، مال اور وقت کا ضیاع کے علاوہ اور مختلف غیر شرعی امور کا ارتکاب کیا جاتا ہے؛ اس لئے ان ساری نقائص و خرابیوں اور غیر شرعی امور کے ساتھ اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

لہذا ایسے پروگرام پیش کرنے کی اجازت ہوگی اور نہ اس کو دیکھنا درست ہوگا، البتہ اگر کوئی ایسا مزاحیہ پروگرام پیش کیا جائے جو غیر شرعی امور پر مشتمل نہ ہو، اور اس پر کوئی رقم معاوضہ کی مقرر نہ ہو۔

### کھیل کود کے احکام:

الف- جن کھیلوں میں کچھ دینی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ جائز ہیں، بشرطیکہ ان کو انہیں فوائد کی نیت سے کھیلا جائے محض لہو و لعب اور تائم پاس کی نیت نہ ہو، اور اس پر کوئی رقم معاوضہ کی مقرر نہ ہو۔

”ولا یجوز الاستباق فی غیر هذه الأربعة کالبلغل بالجعل وأما بلا جعل فیجوز فی کل شیء، وقال بعد ذلك، لأن جواز الجعل فیما مر إنما ثبت بالحديث علی خلاف القیاس، فیجوز ما عداها بدون الجعل، وفی القهستانی عن الملتقط من لعب بالصولجان یرید الفروسية یجوز وعن الجواهر قد جاء الأثر فی رخصة المصارعة لتحصيل القدرة علی المقاتلة دون التلهی فإنه مکروه“ (حاشیہ ابن عابدین: فصل فی البیع)۔

۲- ایسے کھیل کود جس میں دین و دنیا کا قابل لحاظ فائدہ نہ ہو وہ ممنوع ہے، خواہ اس پر بازی لگائی جائے یا انفرادی طور پر کھیلا جائے اور رقم بھی دو طرفہ ہو یا یک طرفہ بہر حال ایسے لغو کھیل شرعاً ممنوع ہیں۔

نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ”کل ما یلہو بہ الرجل المسلم باطل إلا رمیہ بقوسہ وتادیبہ فرسہ وملاعبتہ أہلہ فإھن من الحق“ (ترمذی؛ باب ما جاء فی فضل الرمی فی سبیل اللہ: ۱۲۳۷، ابوداؤد: ۲۱۵۲)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: لغو و بیکار کھیل کود مکروہ ہے، ”وکرہ کل لہو أی کل لعب وعبث“ (حاشیہ ابن عابدین: فصل فی البیع)۔

۳- ایسا کھیل جو اپنے یا دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا امکان ہو، جیسے: فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ ایسے کھیل بھی جائز نہیں ہیں۔

۴- مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل، جیسے: کشتی، کبڈی درست نہیں ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے (ترمذی؛ باب ما جاء فی المشبہات بالرجال من النساء: ۲۷۰۸، ابوداؤد: ۳۵۷۳)۔

### ب- کھلاڑیوں کا لباس و پوشاک:

کھلاڑی اگر مرد ہو تو ناف سے گھٹنہ تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہونا ضروری ہے۔

”قال وینظر الرجل من الرجل إلی جمیع بدنہ إلا ما بین سرتہ إلی ركبته لقوله علیہ الصلاة والسلام: عورة الرجل ما بین سرتہ إلی ركبته“ (الهدایہ شرح البدایہ ۲۰۸۵، فصل فی الوطء والنظر واللمس)۔

اگر کھلاڑی عورت ہو تو اس کے لئے مردوں کے درمیان کھیلنا ہی جائز نہیں، کیونکہ غیر محرم مردوں سے پردہ کرنا واجب ہے۔

”ذهب جمهور الفقهاء إلى أن جسم المرأة كله عورة بالنسبة للرجل الأجنبي عدا الوجه والكفين؛ لأن المرأة تحتاج إلى المعاملة مع الرجال وإلى الأخذ والعطاء، لكن جواز كشف ذلك مقيد بأمن الفتنة“ (موسوعه فقهيہ: ماده عورة ۲۱،۲۲)۔

اگر خواتین خواتین کے درمیان کھیلیں تو اس کے لئے پردہ کی حدود پیٹ اور پشت کے ساتھ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے، بلکہ فقہاء کرام نے کافرہ اجنبی عورتوں کا حکم اجنبی مردوں کی طرح قرار دیا ہے، یعنی مسلمان عورتوں کے لئے کافرہ اجنبی عورت کے سامنے بے حجاب ہونے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے: ”ذهب جمهور الفقهاء: (الحنفية والمالكية وبو الاصح عند الشافعية) إلى أن المرأة الأجنبية الكافرة كالرجل الأجنبي بالنسبة للمسلمة، فلا يجوز أن تنظر إلى بدنها، وليس للمسلمة أن تتجرد بين يديها“ (موسوعه فقهيہ: ماده عورة ۲۱،۲۴)۔

مذکورہ بالا شرائط کی رعایت کے بغیر کھیلنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حصہ ستر کو چھپانا شرعاً واجب ہے۔

### ج- جائز و ناجائز کھیل کی تفصیل:

۱- کھیل خواہ کوئی بھی ہو اگر اس میں جوا ہو تو وہ کھیل شرعاً ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اسلام میں جوا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون إنما يريد الشيطان أن يوقع بينكم العداوة والبغضاء في الخمر والميسر ويصدكم عن ذكر الله وعن الصلاة فهل أنتم منتهون“ (سورہ مائدہ: ۹۰-۹۱)۔

(اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی، شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز ہو گے؟)۔

۲- ایسا کھیل جو اپنے یا دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کافی امکان ہو، جیسے: فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ ایسے کھیل بھی شرعاً جائز نہیں ہیں۔

”عن أبي صرمة صاحب النبي ﷺ عن النبي ﷺ أنه قال: من ضار أضر الله به ومن شاق شاق الله عليه“ (ابوداؤد؛ باب من القضاء: ۲۱۵۱، سنن ابن ماجہ؛ باب من بنى في حقه ما يضر مجاره: ۲۲۲۲)۔

۳- کھیل ایسا طویل نہ ہو جو آدمی کو اپنے شرعی فرائض اور اپنے متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے، ایسا کھیل مکروہ ہے، جیسے: ہتاش، کرکٹ، کیرم بوریڈ اور لوڈو وغیرہ یہ سب ایسے کھیل ہیں جس میں انسان کی جسمانی توانائی صرف نہیں ہوتی اور انسان گھنٹوں کھیل میں لگا رہتا ہے، یہ چیز انسان کو نکما بنا دیتی ہے، اور اپنے اصل مقصد سے غافل کر دیتی ہے، فقہاء کرام نے شطرنج کی ممانعت کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ انسان کو جمعہ، جماعت اور اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے، چنانچہ علامہ زلیعی اس کی ممانعت پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ولأنه لعب يصد صاحبه عن الجمعة والجماعات، وعن ذكر الله عزوجل غالباً وهل رئى من يلعب بالشطرنج يصلى فضلاً عن الجماعة، وإن صلى فقلبه متعلق“ (تبیین الحقائق: فصل في البيعة)۔

(اس لئے کہ شطرنج ایسا کھیل ہے جو کھیلنے والے کو جمعہ، پنج وقتہ جماعت اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے عام طور پر غافل کر دیتا ہے، (مزید لکھتے ہیں): جماعت تو بہت دور کی بات ہے کیا شطرنج کھیلنے والے کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا گیا، اور اگر نماز بھی پڑھے تو اس کا دل کھیل میں انکار ہوتا ہے)۔

۴- ایسا کھیل جو صحت انسانی کے لئے مفید ہو اور اس سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو اور جس سے انسان کے اندر قوت مدافعت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہو ایسا کھیل

مستحب ہے، مثلاً فٹ بال، کرائے، کشتی اور لائٹھی وغیرہ۔

د۔ کھیل کی جیت و ہار میں جائز و ناجائز شرطیں:

پہلی شرط: الف۔ اگر مقابلہ دو آدمی کے درمیان ہو تو انعام کی شرط یک طرفہ ہو و دوسری طرفہ نہ ہو، مثلاً: الف اور ب میں مقابلہ ہو، الف یہ کہے کہ اگر ب جیت گیا تو میں اتنی رقم ب کو دوں گا، لیکن الف کے جیتنے کی صورت میں ب نے کچھ دینے کا وعدہ نہ کیا ہو، اور اگر دونوں طرف سے معاہدہ ہو کہ جو جیتے گا اس کو ہارنے والا متعین رقم ادا کرے گا تو یہ صورت قرار کی ہوگی جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

ب۔ مقابلہ دو آدمیوں میں اور انعام حکومت یا کسی تیسرے شخص کی طرف سے دیا جائے۔

ج۔ فریقین میں دوسری طرفہ شرط کے باوجود اگر اس میں تیسرے ایسے شخص کو شامل کر دیا جائے جس پر شکست کی صورت میں کچھ دینا نہ پڑے، تو پھر یہ صورت جائز ہو جائے گی، مثلاً مقابلہ تین آدمی زید، عامر اور عمیر میں ہو، زید اور عامر میں معاہدہ ہوا ہو کہ ہارنے والا جیتنے والے کو اتنی رقم ادا کرے، اور عمیر کے متعلق یہ طے ہوا ہو کہ اگر وہ جیت گیا تو اس کو متعین انعامی رقم دی جائے گی، لیکن ہارنے کی صورت میں اس کو کچھ رقم دینی نہیں پڑے گی، تو یہ صورت بھی درست ہو جائے گی۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ”(ومنها) أن يكون الخطر في أحد الجانبين إلا إذا وجد فيه محللاً حتى لو كان الخطر من الجانبين جميعاً ولم يدخل فيه محللاً لا يجوز، لأنه في معنى القمار نحو أن يقول أحدهما لصاحبه: إن سبقتني فلك علي كذا، وإن سبقتك فلي عليك كذا فقبل الآخر، ولو قال أحدهما لصاحبه: إن سبقتني فلك علي كذا وإن سبقتك فلا شيء عليك فهو جائز؛ لأن الخطر إذا كان من أحد الجانبين لا يحتمل القمار فيحمل على التحريض على استعداد أسباب الجهاد في الجملة بمال نفسه، وذلك مشروع كالتنفيل من الإمام وبل أولى، لأن هذا يتصرف في مال نفسه بالبدل، والإمام بالتنفيل يتصرف فيما لغيره فيه حق في الجملة وهو الغنيمه فلما جاز ذلك فهذا بالجواز أولى، وكذلك إذا كان الخطر من الجانبين ولكن أدخل فيه محللاً بأن كانوا ثلاثة لكن الخطر من الاثنين منه ولا خطر من الثالث، بل إن سبق أخذ الخطر وإن لم يسبق لا يغرم شيئاً، فهذا مما لا بأس به أيضاً“ (بدائع الصنائع؛ كتاب السباق ۹۵/۱۳)۔

دوسری شرط: مقابلہ کا ابتدائی اور انتہائی وقت اور حد متعین ہو (شرح المہذب؛ کتاب السبق والرمی)۔

تیسری شرط: انعام اور جو عوض مقرر ہو وہ معلوم و متعین ہو (شرح المہذب؛ کتاب السبق والرمی)۔

مذکورہ بالا شرائط کی رعایت کے بغیر کھیل میں ہار جیت کی شرط کی صورت قرار میں داخل ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

۱۔ ایسا کھیل جو اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن کھیلنے اور کھیل دیکھنے والوں کا اس میں کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو ایسا کھیل بھی مکروہ ہوگا۔  
و۔ کھیل دیکھنے اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنے کا حکم:

جو کھیل جائز اور مباح ہے اس کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہوگا، اور جو کھیل ناجائز و حرام ہے، اس کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی ناجائز ہوگا، اور جو مکروہ ہے اس کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی مکروہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ”وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان واتقوا الله ان الله شديد العقاب“ (سورہ مائدہ: ۲) (جو کام سبکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو، اور جو کام گناہ اور زیادتی کے ہیں ان میں کسی کا تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرو ان کی سزا بہت سخت ہے)۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی قوم کے اضافہ کا سبب بنے وہ اسی میں داخل ہے، اور جو شخص کسی قوم کے کسی عمل سے راضی ہو وہ اس عمل میں شریک سمجھا جائے گا۔

”من کثر سواد قوم فهو منهم، ومن رضی عمل قوم کان شریکاً لمن عمله“ (المطالب العالیہ: ۱۶۶۰)۔

### سیر و سیاحت کا حکم:

الف- تفریحی مقصد کے لئے ایک ملک یا ایک شہر سے دوسرے ملک یا دوسرے شہر کا سفر: سلف صالحین کے میں دورا گرچہ صرف ذہنی تناؤ دور کرنے کے لئے سیر و سیاحت کی مثالیں نہیں ملتی ہیں، مگر اس کے باوجود ذہنی تناؤ اور جسمانی تھکان دور کرنے کے لئے سیاحت جائز و مباح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں غور و فکر کرنے اور گزشتہ قوموں کی تاریخ اور انجام جاننے اور عبرت حاصل کرنے کے لئے روئے زمین میں سیر و سیاحت کی دعوت دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”قل سیروا فی الأرض فانظروا کیف بدأ الخلق ثم اللہ ینشی النشأة الآخرة این اللہ علی کل شیء قدیر“ (سورہ عنکبوت: ۲۰) (ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے، پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے: ”قل سیروا فی الأرض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین“ (انعام: ۱۱) (ان سے کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حلال قرار دیا، اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حرام کر دیا اور جس سے سکوت اختیار فرمایا وہ قابل عفو ہے (ترمذی باب ماجاء فی لبس الفراء: ۱۶۳۸، سنن ابن ماجہ: باب اکل الخنثین: ۳۳۵۸)۔

اور اصول فقہ کا ضابطہ ہے: اشیاء میں اصل ان کا مباح و جائز ہونا ہے یہاں تک کہ اس کی حرمت پر کوئی دلیل قائم ہو جائے: ”الأصل فی الأشیاء الإباحة حتی یدل الدلیل علی التحريم“ (غمر العیون البصائر: ۱۰۴، شرح المعتمد: ۱۰۸۳، البحر المحیط فی اصول الفقہ: ۱۰۲۲)۔ مذکورہ بالا دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ فی نفسہ سیر و تفریح جائز و مباح ہے، لیکن یہ اباحت اس وقت ہے جب کہ سیاحت کا مقصد تفریح و طبع اور بار خاطر ہلکا کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیق کائنات میں غور و فکر اور قوموں کے عروج و زوال اور انقلاب زمانہ سے عبرت حاصل کرنا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ویتفکرون فی خلق السماوات والأرض ربنا ما خلقت هذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار“ (سورہ آل عمران: ۱۹۱) (اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے)۔

موجودہ دور کی تفریح کا ہیں خاص طور پر مغربی ممالک اور مغربیت سے متاثر ممالک کی مقامات تفریح عموماً بے حیائی، بے شرمی، فحش و منکرات کے مراکز میں تبدیل ہو چکے ہیں جہاں شراب و کباب اور مفاسد ہوا کرتے ہیں، ایسے مقامات پر سیر و سیاحت، عبرت اور نظام کائنات میں غور و فکر کے لئے نہیں بلکہ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی خاطر ہی ہو سکتی ہے، جس کی شریعت قطعاً اجازت نہیں دیتی؛ کیونکہ اس میں مسلمان کا قیمتی سرمایہ وقت اور مال کو گناہ کے کاموں میں ضائع کرنا ہے جو عند اللہ قابل مواخذہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”أولم نحصرکم ما یتذکر فیہ من تذکر“ (فاطر: ۳۵) (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر ندی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا)۔

اس لئے بلا ضرورت شدیدہ ایسے مقامات اور ممالک کا سفر درست نہیں ہوگا، جہاں گناہوں کی کثرت ہو اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا مشکل و دشوار ہو اگرچہ کہ وہاں سفر کرنے میں جسمانی تھکان اور بار خاطر ہلکا ہوتا ہو اور قدرے دنیوی منفعت بھی ہو؛ کیونکہ شریعت کا ضابطہ ہے، مفاسد اور گناہوں سے بچنا منفعت حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔

”إن طلب الاجتناب عن المفسدة أهم من جلب المنفعة“ (فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت: ۲۰۲۲)۔

خلاصہ بحث یہ کہ ایسے مقامات کی سیر و تفریح جہاں گناہوں اور منکرات سے بچنا مشکل ہو درست نہیں، البتہ ایسی جگہیں جو فحش و منکرات اور عریانی سے خالی ہوں وہاں سیر و تفریح کے لئے جائز و درست ہے۔

ب۔ پرخطر مقامات کی سیر و سیاحت میں اہل و عیال کو ساتھ رکھنا:

ایسے مقامات کی سیر و تفریح جہاں جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہو درست نہیں اور نہ ایسے علاقوں کے سفر میں اپنے اہل و عیال کو ساتھ رکھنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

”ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة وأحسنوا إن الله يحب المحسنين“ (سورہ بقرہ: ۱۹۵) (اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے)۔

علامہ آلوسی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس آیت سے ایسی چیز پر اقدام کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے جس میں جان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ ”واستدل بالآية على تحريم الإقدام على ما يخاف منه تلف النفس“ (روح المعاني)۔

اور علامہ شوکانی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ہر وہ چیز جو دین اور دنیا میں باعث ہلاکت ہو وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

”فكل ما صدق عليه أنه تهلكت في الدين، أو الدنيا، فهو داخل في هذا“ (فتح القدير للشوکانی)۔

ج۔ برائی کے مقامات پر سیر و تفریح:

مسلمانوں کے لئے ایسے مقامات اور جگہوں پر جانا درست نہیں ہے جہاں برائیاں ہوں اور وہ شخص برائی کے روکنے پر قادر نہ ہو اگرچہ کہ وہ وہاں جا کر گناہ کے کاموں میں شریک نہ ہو، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ بھی برائی میں مبتلا ہو جائے گا، برے لوگوں کی صحبت اور بری جگہوں کی آمد و رفت سے انسان برے نتائج اور غلط اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے، اور شریعت نے مسلمانوں کو ایسی جگہ جانے سے سختی سے منع کیا ہے جہاں پر شریعت کی خلاف ورزی اور گناہ کا ارتکاب کیا جاتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ”وقد نزل عليكم في الكتاب أن إذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره إنكم إذا مثلهم“ (النساء: ۱۳۰)۔

(اللہ تعالیٰ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر کا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں)۔

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گناہگاروں سے اجتناب جب کہ ان سے گناہ کا صدور ہو رہا ہو ضروری ہے، اس لئے کہ جو ان سے علاحدگی اختیار نہیں کرے گا گویا کہ وہ ان کے فعل سے راضی ہے، اور کفر سے راضی رہنا بھی کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”إنكم إذا مثلهم“ ہر وہ شخص جو گناہ کی مجلس میں شریک ہو اور گناہوں پر نکیر نہ کرے تو وہ گناہ میں برابر کا شریک ہے۔ اگر اس کے اندر نکیر کرنے کی استطاعت نہ ہو تو ایسی مجلسوں میں شرکت نہ کرے (جامع الاحکام للقرطبی)۔

ایسے مقام سیاحت جہاں غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کیا جاتا ہو وہاں جانے کے لئے سواری کا نظم کرنا:

سیر و تفریح کی ایسی جگہیں جہاں غیر شرعی حرکتیں اور باتیں ہو کرتی ہوں وہاں جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا حسب ذیل وجوہات کی بناء پر جائز ہے:

۱۔ یہ براہ راست گناہ میں تعاون نہیں ہے..... جس کو قرآن کریم میں ممنوع قرار دیا گیا ہے..... معصیت میں تعاون سے مراد ایسی شئی ہے کہ جس سے بعینہ معصیت کا ارتکاب کیا جاتا ہو، سواری کا چوں کہ سیر و تفریح کے مقامات کی برائیوں سے اصلاً کوئی تعلق نہیں۔

علامہ حسکفی لکھتے ہیں: ”وجاز تعمیر کنيسة و (حمل خمر ذی) بنفسه أو دابته (بأجر)، لا عصرها لقيام المعصية بعينه“۔ اور اگر گناہ کی تعمیر اور ذمی کی شراب اٹھانے کے لئے اپنے آپ کو یا اپنی سواری کو اجرت پر دینا جائز ہے، البتہ شراب چوڑنے کے لئے اجرت پر دینا درست نہیں کیونکہ بعینہ اس سے معصیت متعلق ہے۔

۲۔ ایسی جگہیں جہاں غیر شرعی حرکتیں اور باتیں ہو کرتی ہوں وہاں جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینے کو تعاون علی الاثم والعدوان میں شامل مانتے ہوئے



اس کو ناجائز و حرام قرار دینے میں ٹراویس کے کاروبار کرنے والے مسلمان کے لئے بڑا حرج ہے، کیونکہ سواری کرایہ پر لینے والے افراد سے اس بات کی تحقیق کرنا بہت مشکل ہوگا کہ وہ گاڑی کو لے کر کہاں کہاں جائے گا، اسی طرح ہر آنے والے شخص سے اس کے دورے کی تفصیلات معلوم کرنا ٹراویس والوں کے لئے کیا آسان ہوگا؟ اسی طرح ایرپورٹ سے کہاں جا رہا ہے اس کی تفصیل کسٹرسے معلوم کرنا مشکل ہے، اس لئے صورت مذکور میں میری ناقص رائے ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو رائج قرار دیا جائے، اور مطلق سواری کرایہ پر دینا جائز ہو۔

البتہ اگر پہلے سے معلوم ہو کہ یہ لوگ مقام تفریح پر جا کر غیر شرعی حرکتیں کریں گے تو بہتر ہے کہ ان لوگوں کو سواری کرایہ پر نہ دیا جائے۔

غیر شرعی حرکات پر مشتمل مقام تفریح پر خورد و نوش کی دوکان:

سیر و تفریح کی ایسی جگہیں جہاں غیر شرعی حرکتیں اور باتیں ہوا کرتی ہوں وہاں پر خورد و نوش کی دوکان لگانا جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو حلال کیا اور سوکونا جائز و حرام قرار دیا: ”أحل الله البيع وحرم الربا“ (بقرہ: ۲۷۵)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فرائض کے بعد سب سے اہم فریضہ حلال روزی تلاش کرنا ہے۔

”طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ“ (بیہقی: ۱۲۰۳)۔

ٹور پر لے جانے کے لئے کمپنیوں کا قیام:

ٹور پر لے جانے کے لئے کمپنیوں کا قیام جس کا مقصد مختلف جگہوں پر جانے والوں کے لئے آمد و رفت، ٹکٹ اور قیام کا نظم کرنا ہوتا ہے، اگر جائز و درست مقصد اور کام کے لئے ہو مثلاً: حج و عمرہ یا دیگر جائز مقاصد کے لئے تو ایسی کمپنیوں کا قیام بلا کسی کراہت کے جائز و درست ہے، اگر ٹور و ٹراویس کمپنیوں کے قیام کا مقصد عام اور ہمہ جہت ہو وہ اپنی خدمات حج و عمرہ اور دیگر جائز مقاصد کے لئے فراہم کرتے ہوئے اور کبھی کوئی ایسا شخص بھی آجاتا ہو جو سیر و تفریح یا کسی اور مقصد کے لئے ان کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہتا ہو اور کمپنی اس کو آمد و رفت، ٹکٹ اور قیام کا نظم کر دیتی یا کراہتی ہو تو یہ صورت بھی ناجائز نہیں ہوتی چاہئے؛ کیونکہ اس کمپنی کے قیام کے مقاصد میں صرف یہی ایک مقصد شامل نہیں ہے، اور نہ خالص اسی مقصد کے لئے ٹور و ٹراویس کمپنی کا قیام عمل میں آیا ہے اور شریعت کا یہ ضابطہ: ”الأمور بمقاصدھا“ کے پیش نظر بھی یہ صورت جواز کا متقاضی ہے۔

اور اگر ٹور و ٹراویس کمپنیوں کے قیام کا مقصد ہی مندرروں، تیرتھ گاہوں، چرچوں اور سیاحتی مقامات پر ادائیش دینے اور مئے نوشی کرنے والے افراد کی رہنمائی اور ان کی سہولیات فراہم کرنے کے لئے ہو تو ”إنما الأعمال بالنیات وإنما لكل امرئ ما نوى“ (بخاری: باب بدء الوحی: ۱) (اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے، اور ہر انسان کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے)۔ اور الامور بمقاصدھا کے مد نظر درست نہیں ہوتی چاہئے۔

تاریخی اور دستاویزی فلمیں:

فلم خواہ تاریخی ہو یا دستاویزی ہو تعلیمی مقصد کے لئے ہو یا قرآن کریم کی افہام و تفہیم کے لئے بہر صورت حسب ذیل وجوہات کی وجہ سے جائز نہیں ہے:

۱- عام طور سے فلم جاندار کی تصویر سے خالی نہیں ہوتی، اور جاندار کی تصویر بنانا، دیکھنا اور دکھانا شرعاً جائز نہیں ہے، اور خاص طور پر اگر قرآن کے واقعات کی فلم سازی کی جائے تو قرآن کی بے حرمتی کی بنا پر اس عمل پر شدید وبال کا اندیشہ ہے، اور قرآن کے واقعات کی مصنوعی نقلی کرنا آیات قرآنی کے کھیل و تماشہ بنالینے کے مرادف ہوگا، جو ناجائز و حرام ہے۔

۲- فلم کی کہانی و واقعات اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اس میں عورت کا کردار و رول نہ ہو، اور خواتین کا بے حجاب مردوں کے سامنے آنا یا ان کی تصاویر کو بلا ضرورت غیر محرموں کو دکھانا قرآن و سنت کی رو سے بالکل جائز و درست نہیں، اور اگر اس ناجائز کام کو قرآن مجید کے واقعات و مضامین کو بیان کرنے کے لئے ذریعہ بنایا جائے تو ناجائز ہی نہیں، بلکہ قرآن کریم کی توہین کے مترادف ہوگا جو قطعاً حرام ہے۔

۳- جب کسی واقعات اور مضامین کو فلم کی شکل دی جاتی ہے تو فلم ساز کے فرضی تخیلات و تصورات کی آمیزش ناگزیر ہے، اس کے بغیر عموماً فلم تیار نہیں ہوتی ہے، فلم ساز کو ایک مروط فلم بنانے کے لئے لامحالہ واقعات کے خلاء کو اپنے فرضی قیاسات سے پر کرنا پڑتا ہے، اور کچھ نہیں تو متعلقہ اشخاص کی شکل و شہادت، ان کی تعداد، ان کے انداز نشست و برخاست، ان کے ارد گرد پائے جانے والے ماحول، پس منظر اور ان کے عادات و خصائل کو لازمی قیاسی مفروضات کی بنیاد پر پیش کرنا پڑتا ہے۔

یہ لازمی قیاسی مفروضہ اگرچہ تاریخی اور دستاویزی واقعات و مضامین میں قابل تحمل ہو سکتی ہے، لیکن قرآن کریم کے واقعات و مضامین کی توضیح و تشریح کے لئے قطعاً قابل قبول نہیں، کیونکہ یہ سارے قیاسات قرآن کریم ہی کی طرف منسوب کئے جائیں گے اور یہ قرآن مجید کی معنوی تحریف کے مشابہ ہے۔  
کارٹون کی شرعی حیثیت:

اسلام میں جاندار چیزوں کی تصویر حرام ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو تصویر بنائے گا اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کو عذاب دے گا جب تک کہ وہ روح نہ پھونک دے اور ظاہر ہے کہ انسان روح نہ پھونک سکے گا۔

”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ: من صور صورة عذب حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها“ (سنن النسائی: ۵۳۵، ذکر ما يكلف أصحاب الصور يوم القيامة، بخاری ۲۰۴۲؛ باب بیہ التصاویر التي ليس فيها روح)۔

اس کے علاوہ اور مختلف احادیث سے تصویر کشی کی حرمت و ممانعت ثابت ہے، کارٹون میں اگرچہ کہ انسانی صورت کی خدو خال پوری طرح واضح نہیں ہوتی ہے، لیکن اتنی غیر واضح بھی نہیں ہوتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ سمجھ میں نہ آئے، بلکہ جس کا کارٹون بنایا جاتا ہے، اس کی خدو خال قدرے نمایاں ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کو پہچانا آسان ہوتا ہے، اس لئے تصویر کشی کی حرمت و ممانعت کے پیش نظر انسان اور حیوانات کا کارٹونی خاکہ بنانا بھی جائز و درست نہیں ہوگا، البتہ غیر ذی روح مثلاً درخت یا گاڑی وغیرہ کی ہوں تو اسے تیار کرنے اور اس کا مشاہدہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

کارٹون سازی کا پیشہ:..... ذی روح انسان اور حیوانات کی تصویر کشی حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، جس پر نبی اکرم ﷺ سخت عذاب کی تشبیہ فرمائی ہے، کارٹون سازی کا پیشہ اختیار کرنے اور اس کو ذریعہ آمدنی بنانے میں ایک گناہ کا تعاون ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ گناہ میں تعاون کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے کارٹون سازی کا پیشہ اختیار کرنا اور اس کو ذریعہ آمدنی بنانا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب“ (سورہ مائدہ: ۲)۔

فرضی حکایتیں:

اگر یہ مفروضہ کہانیاں عبرت آموز اور نصیحت خیز ہوں، صالح مقصد کی حامل ہوں اور تعمیری ہوں تو نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہیں..... لیکن اگر ان کا مقصد سفلی جذبات کو برا بھحیثہ کرنا، اباحت اور اخلاقی انارکی پیدا کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ سخت گناہ اور ناجائز ہیں..... اس لئے کہ نہ صرف تو ذائقہ نگاری کے لئے استعمال کی جاتی ہے، اور کبھی مفروضہ کردار اور واقعات کے لئے جو آج کی زبان میں ناول اور افسانے کہلاتے ہیں، زمانہ قدیم میں بھی اس قسم کی کہانی نویسی کی مثالیں موجود ہیں، شیخ سعدی کی گلستان اور مولانا روم کی مثنوی کہا جاتا ہے کہ ایسی کہانیوں کا شاہکار اور معراج کمال ہے، اسی طرح مقامات حریری وغیرہ۔

”عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: حدثوا عن بني إسرائيل ولا حرج“ (مسند احمد: ۱۰۶۴۶، ابوداؤد باب الحدیث عن بني اسرائيل ۳۱۷۷)۔ (حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل سے حدیث نقل کرو، اس لئے کہ اس میں کوئی حرج نہیں)۔

”عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: تحدثوا عن بني إسرائيل فإنه كانت فيهم أعاجيب“ (ابن ابی شیبہ مع تحقیق الشیخ محمد عوامہ: ۲۷۰۱۷)۔ (حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل سے حدیث نقل کرو، اس لئے کہ ان کے یہاں انوکھے اور دلچسپ واقعات ہوتے ہیں)۔

”قال أهل العلم: وهذا دال على حل سماع تلت الأعاجيب للفرحة لا للحجة، أي لإزالة الهم عن النفس، لا للاحتجاج بها، والعمل بما فيها“ (الفتاویٰ الشبکیة الاسلامیہ رقم الفتویٰ: ۱۳۲۷۸)۔  
اہل علم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غم و فکر کو دور کرنے کے لئے نہ کہ دلیل و حجت اور اس پر عمل کرنے کے لئے دلچسپ اور انوکھے واقعات کا سننا مباح ہے۔

دینی مدارس میں مکالمات کے پروگرام صالح اور تعمیری مقاصد پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحتیں نہیں ہوا کرتی ہیں، اس لئے ان مکالمات میں کوئی حرج نہیں، ہذا ما ظہری والله أعلى وأعلم بالصواب۔

## سیر و تفریح سے متعلق اصول و قواعد

مولانا عبدالجبار طیب ندوی

الف - کیا شریعت میں مزاح جائز ہے اور جائز ہے تو اس کی کیا حدود ہیں؟

مزاح تھکے دماغ اور دل رنجور کو فرحت و انبساط اور نشاط بخشتا ہے، اور اس سے دل و دماغ میں طراوت و تازگی پیدا ہوتی ہے، کام کرنے میں معاون و مددگار ہوتا ہے، لہذا جب ہم اس مسئلہ کے لئے حدیث کے اوراق الٹتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ کے اقوال ملتے ہیں، عملی احادیث بھی موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے مزاح فرمایا ہے، اور مزاح کرنے کا حکم بھی دیا ہے، چنانچہ سنن ابوداؤد میں عوف بن مالکؓ سے منقول ہے کہ یہ خود غزوہ تبوک کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت عوف کہتے ہیں کہ میں نے سلام کیا، آپ ﷺ نے جواب مرحمت فرمایا اور کہا کہ آ جاؤ، میں نے کہا کہ پورا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ”پورے آ جاؤ پس میں داخل ہو گیا“ (رواہ ابوداؤد: باب فی المزاح ۶۸۲/۲)۔

اسی طرح ایک بوڑھی خاتون خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہیں ہوگی، وہ بے چاری رونے لگی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ اس دن تم بوڑھی نہیں رہو گی، بلکہ سارے لوگ جوان ہو کر جنت میں جائیں گے (شمائل ترمذی: ۱۶)۔

اسی طرح اگر آپ ﷺ کے قول کو دیکھیں تو کنز العمال میں آپ ﷺ سے ایک حدیث منقول ہے، جس میں آپ ﷺ نے صیغہ امر کے ساتھ حکم دیا کہ ”لوں کو وقتاً فوقتاً خوش کرتے رہا کرو“، چنانچہ کنز العمال میں ہے: ”روحوا القلوب ساعةً فساعة“ (رقم الحدیث: ۵۲۵۲، کنز العمال ۱۰۲۷)۔

اس کے علاوہ بھی بڑی تعداد میں محدثین نے مزاح والی احادیث کو جمع فرمایا ہے، یہاں اس کا احصاء مقصود نہیں ہے، مذکورہ احادیث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مزاح جائز اور مباح ہے، تاہم شریعت نے اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق اس میں مسلمانوں کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کی کچھ حد بندی بھی کر دی گئی ہے، چنانچہ ترمذی شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں مزاح کرتا ہوں، لیکن جو بھی بولتا ہوں وہ حق بات ہی ہوتی ہے“ (ترمذی بحوالہ احیاء علوم الدین ۱۷۳/۳)۔

اس حدیث اور ان جیسی دوسری احادیث کی روشنی میں فقہاء نے اس کی کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- یہ کہ حق بات ہو، کوئی ایسی جھوٹی بات نہ ہو کہ موجب گناہ ہو اور معصیت کے دروازہ تک پہنچا دیتی ہو۔

۲- یہ کہ اس سے ہم جلیسوں کو ہنسانا مقصود نہ ہو، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”لا بأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلام يأثم به أو يقصد به إضحاك جلسائه كذا في الظهيرية“ (ہندیہ ۵۰۲۵۲: کتاب الکراہیہ؛ الباب السابع عشر فی الغناء واللہو وسائر المعاصی والأمر بالمعروف، نیز دیکھئے: الموسوعة الفقہیہ ۳۶، ۳۳، احیاء علوم الدین ۳، ۱۷۲)۔

امام غزالی رقمطراز ہیں: ”فاعلم أن المنهى عنه الإفراط فيه أو المداومة عليه، أما المداومة فلأنه اشتغال باللعب والهزل فيه، واللعب مباح ولكن المواظبة عليه مذمومة“ (احیاء علوم الدین ۳، ۱۷۲)۔

الغرض مزاح جائز ہے، البتہ کچھ شرطوں کی پابندی ضروری ہے:

الف - حق بات ہو، جھوٹی بات نہ ہو کہ باعث گناہ و معصیت ہو۔

ب - مقصد اس سے لوگوں کو ہنسانا نہ ہو (جھوٹی بات بول کر)۔

ج- افراط نہ ہو اور نہ ہی اس پر مواظبت اور مداومت ہو۔

د- اسی طرح دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہو، کیوں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا تمار أخاک ولا تمازحہ“ (ترمذی ۲۰۲۰)۔

ب- مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، یا مزاحیہ مشاعرہ کرنا کیا جائز ہے؟

مزاحیہ پروگرام منعقد کرنا یا مزاحیہ مشاعرہ رکھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں کئی غیر شرعی باتیں پائی جاتی ہیں:

۱- کسی بھی پروگرام کے انعقاد کے لئے کافی عرصہ اور وقت لگتا ہے جو کہ ضیاع وقت میں شمار ہے۔

۲- ایک بڑی رقم کا صرفہ جو کہ اسراف میں داخل ہے۔

۳- یہ ایک مباح عمل ہے، فقہ کے اصول کے مطابق اگر مباح عمل مفسدہ کا باعث ہو تو پھر ایسا مباح عمل ناجائز ہے، سد ذرائع کے مطابق ”درء المفساد اولی من جلب المصالح“۔

۴- پھر یہ کہ کئی گھنٹوں پر مشتمل یہ پروگرام پیش کئے جاتے ہیں خواہ مزاحیہ مشاعرہ ہی کیوں نہ ہو۔

لہذا احقر کے نزدیک ان وجوہ کی بنیاد پر مزاحیہ پروگرام یا مشاعرہ منعقد کرنا ناجائز ہوگا۔

مذکورہ بالا شرطوں کی رعایت کے ساتھ مزاحیہ کہانیاں لکھنا ایک مباح عمل ہوگا، اور اس کا پڑھنا بھی صحیح ہوگا، اور ایسی کہانیوں کی اشاعت بھی درست ہوگی، نیز خرید و فروخت بھی دائرہ جواز میں آجائے گی، لیکن موجودہ زمانہ کی مزاحیہ تحریروں کو پڑھیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ پورا دار و مدار جھوٹی اور فرضی کہانیوں پر ہوتا ہے، ذہنی عیاشی اور ضیاع وقت کے سوا کچھ نہیں ہے، سب سے اہم یہ کہ مقصد تخلیق سے ہٹا دیتا ہے، اور اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے، اور اسی کو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”ما ألتاکم عن ذکر اللہ فهو مینسر“ (طبری ۳۶۱۲)، لہذا احقر کے نزدیک مذکورہ بالا وجوہ کی بنیاد پر مزاحیہ کہانی لکھنا اور انہیں پڑھنا، شائع کرنا اور اس کی خرید و فروخت ناجائز ہوگی۔

لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا، اور اس کی اجرت وصول کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ امام غزالی لکھتے ہیں: ”ولکن من الغلط

العظیم أن يتخذ الإنسان المزاح حرفة یواظب علیہ ویفرض فیہ“ (احیاء علوم الدین ۲، ۱۷۳)۔

کھیل کے احکامات:

اسلام مذہب فطرت ہے، فطرت انسانی کا خیال رکھتا ہے، زندگی کے جس شعبہ میں بھی افراط و تفریط ہو، اور بے اعتدالی ہو اسے ختم کرتا ہے، ایک متوازن اور معتدل طریقہ کی رہنمائی کرتا ہے، کھیل کود کو شریعت مکمل منع نہیں کرتی ہے، بلکہ ایک حد تک قید و بند لگا کر اس کی اجازت دیتی ہے، چنانچہ کھیل کے جو بنیادی اصول ہیں، ہم انہیں ذکر کرتے ہیں:

الف: ۱- ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسروں کے لئے ایذا پہنچانے کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچانے کا کافی امکان ہو۔

۲- نماز یا کسی فریضہ کی ادائیگی یا کسی واجب اور ضروری مہم میں رکاوٹ نہ ہو۔

۳- جھوٹی قسمیں کھانے کی نوبت نہ آتی ہو۔

مذکورہ تینوں شرطوں کے لئے حوالہ دیکھئے: (بدائع ۲۶۹/۶، مغنی المحتاج ۳/۱۱۸، نیز ۳۲۲۳۲۸، المغنی لابن قدامہ ۶۵۱/۸)۔

۴- مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے: کشتی، کبڈی درست نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے (ابوداؤد)۔

۵- اسی طرح کھیل میں جو آنہ ہو یعنی قمار نہ ہو (سورہ مائدہ)۔

۶- ایک ہی کھیل میں مرد و زن کا اختلاط نہ ہو۔

مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ ہی کھیل کھیلا جائز ہوگا، ورنہ جائز نہ ہوگا۔

ب: جہاں تک لباس کا تعلق ہے تو مردوں کے جو قابل ستر اعضاء (ناف سے لے کر گھٹنے تک) ہیں، بہر صورت اس کا چھپانا ضروری ہوگا، تاہم اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کپڑا جسم سے اتنا چپکا ہو نہ ہو کہ جسم کے ساخت نظر آئیں، ساتھ ہی اتنا باریک بھی نہ ہو کہ اعضاء ستر صاف نظر آئیں، نیز عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ پورا بدن ڈھکنے والا لباس استعمال کریں، البتہ چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں اور دونوں قدم کھلے رکھنے کی اجازت ہوگی، یہ احکامات زندگی کے تمام مرحلوں میں ضروری ہیں، چنانچہ صاحب نتائج الافکار علامہ شمس الدین احمد بن عود رقمطراز ہیں: ”وینظر الرجل من الرجل جميعه بدنه إلا ما بین سرته إلى ركبته فإن صاحب النهاية: إن السرة إحدى العورة، فتكون من العورة كالركبة“ (نتائج الافکار فی كشف الرموز والاسرار وحی تکملة شرح فتح القدير ۱۰۰۳)۔

کھیل کے اصول و شرائط طے ہو جانے کے بعد اب ہم مروجہ کھیلوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، مگر اس سے قبل ہم اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں مروجہ کھیلوں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

احادیث کے حوالے سے جب ہم اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ کے کھیلوں کو دیکھتے ہیں تو اس میں وہی کھیل ملتے ہیں جو کہ صحت و جسم سے تعلق رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جسم کو پھرتی دینا اور نشاط دینا اس لئے تھا، تا کہ جنگ کی نوبت آئے تو میدان ان ہی کے ہاتھوں میں رہے، مثلاً تیر اندازی، گھوڑ سواری، اسی طرح اپنی اولاد اور بیوی کے ساتھ کھیلنا تفریح طبع کے لئے، یہ وہ کھیل ہیں جو جائز ہیں اور حدیث میں اس کا تذکرہ بھی آیا ہے، مندرجہ ذیل حدیث کو دیکھئے:

”کل لعب حرام إلا ملاعبة الرجل امرأته وقوسه وفرسه“ (اخرجه الحاكم في المستدرک ۲۰۹۵)۔

کشتی بھی جائز ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت رافعؓ کو تیر انداز ہونے کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دیدی، تو حضرت سمرہؓ نے بھی اجازت چاہی مگر اجازت نہیں مل سکی، اور یہ کہہ کر کہ ”إن رافعاً رام“ آپ ﷺ نے حضرت سمرہؓ کو واپس کر دیا تو حضرت سمرہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! رافع اگر ہم سے کشتی لڑیں تو ہم ان کو پچھاڑ سکتے ہیں، لہذا ایسا ہی ہوا، چنانچہ پھر ان کو بھی اجازت مل گئی۔ کشتی کا ثبوت ایک دوسری روایت سے بھی ملتا ہے، ”أن النبی ﷺ صارع ركانة فصرعه“ (ابوداؤد)۔

اس طرح کشتی کا کھیل کا مباح ہونا متعین ہو جاتا ہے، شریعت نے اسے غیر مباح قرار نہیں دیا ہے، چنانچہ الاقناع میں ہے:

”من اللهو المباح في الشريعة الإسلامية المصارعة، فقد قال جماهير أهل العلم: إن المصارعة مباحة وغير محرمة“ (الاقناع ۵۰۵، ۲ جوالہ احکام اللہو والترویح، حسین جاسم الکوید لاوی)۔

علامہ شامی نے حدیث کے حوالے سے کشتی کی رخصت نقل فرمائی ہے، اور اس کا مقصد یہ بتایا کہ مقابلہ میں قدرت حاصل کرنا ہی مقصود نہ ہو، تلمی مقصود نہ ہو، کیونکہ اگر کشتی میں تلمی پائی گئی تو وہ کشتی پھر مکروہ ہو جائے گی، چنانچہ علامہ شامی رقمطراز ہیں: ”وقد جاء في الأثر في رخصة المصارعة ليحصل القدرة على المقابلة دون التلهي، فإنها مكروهة“ (الرد مع الدرر ۲۸۱۲۸۲)۔

لہذا علامہ شامیؒ کی اس چشم کشا عبارت کے ذیل میں احقر کی رائے یہ ہے کہ کشتی میں اگر دشمن کے خلاف قدرت حاصل کرنا مقصود ہو تو جائز ہے، اور یونہی تلمی مقصود ہو تو کشتی بھی زمرہ مکروہ میں شمار ہوگی۔

۴- اور اسی طرح وہ کھیل جو جنگ میں معاون و مددگار ہو مباح ہے اور جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی استطاعت کے بقدر ہر زمانہ میں اور تمام حالات میں جنگ کی تیاری کا حکم دیا ہے، ”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة“ (سورہ توبہ)۔

مباح کھیل: ..... جو ڈو کرانا: احقر کے نزدیک کشتی پر قیاس کرتے ہوئے یہ بھی مباح کھیل میں شامل ہے، کیونکہ کشتی کا مقصد قوت و دفاع حاصل کرنا ہے، اور جو ڈو کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے، لہذا یہ مباح کھیلوں میں شمار ہوگا، والی بال، فٹ بال، اور بیڈمنٹن بھی مباح کھیلوں میں ہی شمار ہوگا، کیونکہ ان کھیلوں سے تفریح طبع بھی ہو جاتی ہے، اور جسمانی ورزش بھی، البتہ مذکورہ شرطوں کی پابندی ضروری ہوگی۔

## مکروہ کھیل:

وہ تمام کھیل جو کہ عبادات سے مشغول کر دیں، اور یہ کہ سلیم الفطرت انسان ان کھیلوں کو ناپسند کرتے ہوں تو ایسے کھیل مکروہ ہوں گے، ان میں پتنگ بازی، کبوتر و فاختہ کے کھیل شامل ہیں، یہ ایسے کھیل ہیں جس کو اصحاب مروت ناپسند کرتے ہیں، اس سے دنیا کا کوئی فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے اور نہ دین کا کوئی فائدہ، ضیاع وقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

”ومن اللعب المكروه اللعب بالظير والحمام لأنه لا يليق لأصحاب المروءة والادمام عليه قد يؤدي إلى إهمال المصالح ويشتغل عن العبادات والطاعات“ (۳۵، ۲۶۸)۔

مکروہ کھیلوں میں طویل الوقت کھیل بھی آئے گا جیسے: شطرنج، اور کرکٹ، تاش وغیرہ اور لوڈو بھی اسی میں شامل ہوگا، کیونکہ یہ بھی ایک طویل اور لمبا وقت لیتا ہے، بسا اوقات شرعی فرائض اور اپنی اہم ذمہ داریوں سے بھی غفلت ہو جاتی ہے۔

## حرام کھیل:

فقہاء کے نزدیک ہر وہ کھیل جو قمار (جوا) پر مبنی ہو وہ ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قمار سے منع فرمایا ہے، قرآن میں ہے: ”يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان“ (سورہ مائدہ)۔

سوال: کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو کونسی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہوگی؟

اگر کھیل جائز اور مباح ہو، لیکن اس میں شرط رکھی گئی ہو تو غور طلب امر اس میں یہ ہے کہ اگر شرط فریق اول سے متعلق ہو تو کھیل جائز ہوگا، اور اگر شرطوں کا تعلق طرفین سے ہو تو پھر ناجائز ہوگا، شرط کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

- ۱- یہ کہ ایک فریق کہے کہ اگر میں سبقت لے گیا تو مجھے اتنا دے گا، اور اگر تم سبقت لے گئے تو پھر کچھ بھی نہیں۔
- ۲- یہ کہ ان دونوں کے علاوہ تیسرا یہ کہے کہ اگر تم میں سے کوئی جیتے گا تو اس کو اتنا ملے گا اور جو ہارے گا اس کو کچھ بھی نہیں، تو یہ دونوں صورتیں بالاتفاق جائز ہیں۔

ناجائز صورتیں بھی دو ہو سکتی ہیں:

- ۱- ایک یہ کہ دو فریق آپس میں یہ شرط رکھیں کہ ہارنے پر میں تمہیں دوں گا اور اگر میں جیت گیا تو تم مجھے دو گے۔
- ۲- یہ کہ تیسرا فریق ان دونوں سے کہے کہ جو تم میں سے جیتے گا اسے میں اتنا دوں گا، اور جو ہارے گا، یہ دونوں صورتیں بالاتفاق ناجائز ہیں، چنانچہ کسی جائز اور مباح مقابلہ میں شرط لگانے کے سلسلہ میں علامہ شامی کی چشم کشا عبارت ملاحظہ کیجئے:

”من جانب واحد أو من ثالث بأن يقول أحدهما لصاحبه: إن سبقتني أعطيتك كذا، وإن سبقتك لا آخذ منك شيئاً، أو يقول الأمير لفارسين أو راميين من سبق منكما فله كذا“ (الرد مع الدرر ۹، ۴۹۲)۔

جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، جس کی وجہ سے شرعی فرائض کی ادائیگی متاثر ہوتی ہو تو ایسا کھیل کھیلنا اور دیکھنا مکروہ ہوگا اور کسی شرعی فرائض کی ادائیگی کے لئے مانع نہ ہو تو پھر مباح ہوگا۔

سفر کے حکم کے اعتبار سے حنفیہ نے اس کی تین قسمیں کی ہیں:

- (۱) سفر طاعت، جیسے جہاد اور حج وغیرہ، (۲) سفر مباح، جیسے تجارت کی غرض سے سفر کرنا، (۳) سفر معصیت جیسے ڈاکہ ڈالنے کے لیے اور عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا، اور امام مالک کے نزدیک صرف دو قسمیں ہیں: (۱) سفر طلب یعنی کسی بھی چیز کی اگر انسان کو طلب و خواہش ہو اس کے لیے سفر کرنا، (۲) اور سفر ہرب، چنانچہ الموسوعۃ میں ہے: ”قسم الحنفية السفر من حيث حكمه إلى ثلاثة أقسام: سفر طاعة والحج والجهاد، وسفر مباح كالتيجارة، وسفر معصية كقطع الطريق وحج المرأة بلا محرم... وقال المالكية السفر على قسمين: سفر طلب وسفر هرب، وسفر الهرب واجب“ (الموسوعة الفقہیہ ۳۵، ۲۷۷)۔

حنفیہ کی تقسیم کے مطابق سفر سیاحت نہ تو سفر طاعت ہے اور نہ ہی سفر معصیت، لہذا یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہ سفر مباح ہے ناجائز نہیں ہے، دوسری دبستان فقہ میں بھی سفر سیاحت کو جائز اور مباح قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ایک سوال کے جواب میں سیاحت کی رخصت نقل کیا ہے: ”وقد رخص بعض المتأخرین فی السفر إلی المشاهد ولم ینقلوا ذلک من أحد من الأئمة ولا احتجوا بحجة شریعة“ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۷۰۹)۔

سفر سیاحت کے سلسلہ میں حنابلہ اور شوافع کی رائے بھی اباحت کی ہے، چنانچہ الموسوعة الفقهیہ میں ہے: ”وقد صرح الشافعیة والحنابلة بأن السفر لرؤية البلاد والنزهة فیها مباح“ (الموسوعة الفقهیہ ۲۵۰۲۸)۔

لہذا احقر کی رائے کے مطابق سفر سیاحت مباح ہونا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں، ”سنریہم آیاتنا فی الآفاق وفی أنفسهم“ (فصلت)، ”وفی الأرض آیات للموقنین“ (ذاریات)۔

لہذا ان نشانیوں کا مشاہدہ بغیر سفر سیاحت کے ناممکن ہے، اور اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان میں پوشیدہ چیزوں کو عیاں کرتا ہے، اس کے لئے ذوالقرنین کے سفر سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

جس سفر میں جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہ ہو اس میں خود جانا بھی جائز نہیں ہوگا، چہ جائیکہ اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے جائے، کیونکہ جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت واجب ہے، اور سفر سیاحت واجب نہیں ہے، لہذا کسی غیر واجب کے لئے واجب کو ترک نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جس مقام پر سیاحت کی غرض سے مختلف علاقوں کے لوگ آتے ہیں اور اس موقع سے بعض غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں، تو ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا تو جائز ہوگا، البتہ مناسب نہیں ہے، نیز وہاں جانے والوں کے لئے سواری کو کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر ایشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دوکان لگانا اور ٹکٹ کی خرید و فروخت کی ایجنسی اور ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز اور درست ہوگا۔ مندرجہ ذیل جزئیات بطور استدلال پیش ہے:

”وجاز تعمیر (کنیسة) قال فی الخانیة: ولو آجر نفسه لیعمل فی الكنیسة ویعمرها فی العمل“ (الردمعة الدرر ۹۰۴)۔ علامہ شامی کی ایک واضح عبارت سپرد قلم کی جاتی ہے: ”وعلم من هذا أنه لا یکره بیع ما لم تقم المصیة به کیبہ الجاریة المغنیة والکبش النطوح والحمامة الطیارة والعصیر والخشب ممن یتخذ منه المعازف“ (رد المحتار: کتاب الکراهیة فصل فی البیعة ۵۰۲۵) (اس سے معلوم ہوا کہ اس چیز کی بیع مکروہ نہیں ہے جس کی ذات سے معصیت نہ ہو مثلاً گلوکارہ باندی، سینگ مارنے والا مینڈھا، تیز اڑنے والا کبوتر، پھول کے رس اور وہ لکڑی جس سے بانسری بنائی جاتی ہے)۔

تاریخی و دستاویزی فلم کا حکم:

مذکورہ مقاصد کے لئے فلمیں بنانا اس وقت جائز ہوگا جب کہ اس میں ذی روح کی تصاویر نہ لی جائے، اگر تاریخی یا دستاویزی فلموں میں ذی روح کو دیکھا گیا ہے تو فلم بنانا حرام ہوگا، ہاں اگر فلم براہ راست دکھایا جائے تو اس کی نشر و اشاعت بھی جائز ہوگی اور دیکھنا جائز ہوگا۔ کارٹون سازی کا حکم:

کارٹون کا بنانا بھی جائز نہیں ہوگا اور اس کا شمار احقر کے نزدیک تصویر میں ہوگا، یہ کہنا کہ انسانی صورت کے خدو خال اس میں پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، صحیح ہے، لیکن انسانی شکل کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے، اس لئے تغیر خلق میں شمار ہوگا، لہذا نہ اس کا بنانا جائز ہوگا اور نہ ہی اس شعبہ میں ملازمت کرنا درست ہوگا۔



## مزاح و تفریح سے متعلق احکام

مفتی محمد شاہد قاسمی ع

۱- شریعت اسلامیہ میں وقت کی حفاظت اور بامقصد زندگی کے قیام کا حکم دیا گیا ہے اور لہو و لعب اور لغو کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "والذین هم عن اللغو معرضون" اور وہ لوگ لغو چیزوں سے اعراض کرتے ہیں لیکن فقہاء کرام اور مفسرین عظام رحمہم اللہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ ممانعت مطلقاً نہیں بلکہ اس وقت ہے جبکہ ان چیزوں ہی کو مقصد بنالیا جائے یا اس میں کچھ اور خرابیاں پائی جائیں جسے فقہاء کرام کی عبارتوں کے نقل کے بعد ترتیب وار ذکر کیا جائے گا، اگر ان چیزوں کو مقصد نہ بنایا جائے اور تفریح ان مقاصد سے خالی ہو جن کی فقہاء نے صراحت کی ہے اور مقصد تفریح سے یہ ہو کہ اس کے ذریعہ بامقصد زندگی میں مدد ہو جائے کہ ان کے ذریعہ جسم اور روح کی سستی دور ہو کر طبیعت میں نشاط اور چستی حوصلہ اور ہمت پیدا ہو تو ایسی تفریح شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ ایک حد تک مستحسن اور مطلوب ہے فرمان خداوندی "سیروا فی الأرض" اور اس معانی کی دیگر آیات اسی طرح فرمان نبوی علیہ السلام "روحوا القلب سائمة فسامة" کہ تم کبھی کبھی اپنے دل کو آرام دیا کرو اور آپ علیہ السلام کا اپنے اصحاب سے مزاح فرمانا اس کا واضح ثبوت ہے۔

۲- نفس مزاح کے ثبوت کے بعد ان مناسد کا جاننا ضروری ہے جن سے تفریح کا خالی ہونا ضروری ہے، اولاً فقہاء رحمہم اللہ کی ان عبارتوں کو نقل کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے تفریح اور لہو و لعب کی شرائط ذکر کی ہے پھر ان شرائط کو ترتیب وار ذکر کیا جائے گا۔

علامہ نووی علیہ الرحمہ جمع الوسائل میں تحریر فرماتے ہیں: إعلم أن المنهى عنه هو الذى فيه افراط يدام عليه فإنه يورث الضحك وقسوة القلب ويشغل عن ذكر الله والشكر من مهمات الدين ويؤل في كثير من الأوقات إلى الإيذاء ويوجب الاحتقاد ويسقط المهابة والوقار فأما ما سلم من هذه الأمور فهو المباح الذى كان رسول الله ﷺ يفعل على الندرة لمصلحة تطيب النفس وموانسته وهو سنة مستحبة۔

فقہاء کرام کی ان پیش کردہ عبارتوں سے جو اصول اور حدود و تفریح کے جواز کے لئے متعین ہوتے ہیں اسے ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے:

۱- تفریح شرعاً و نظماً دونوں میں جائز ہے۔

۲- تفریح میں افراط نہ ہو کہ اسی کو مشغلہ بنالیا جائے اور دیگر دینی امور سے غافل ہو جائے یا آدمی کا دل سخت ہو جائے کہ کثرت تفریح کثرت شحک کا سبب بنتی ہے اور کثرت شحک قساوت قلب کا سبب ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "كثرة الضحك تميئ القلب"

۳- دل کے بہلانے کے لئے اور علوم دینیہ کی مدد کی غرض سے اشعار کے ذریعہ تفریح کی جاسکتی ہے۔

۴- تفریح کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو یا حسد کا سبب نہ بنے۔

۵- اس کثرت سے یا اس کیفیت سے تفریح نہ ہو کہ اس سے آدمی کا وقار، اس کی عزت و مجروح ہو اور آدمی لوگوں کی نگاہ میں مسخرہ بن جائے یا ذلیل بن جائے۔

۶- تفریح میں جھوٹ یا کوئی خلاف شرع بات نہ ہو۔

۷- تفریح میں گذشتہ لوگوں کے قصے جن کی کوئی اصل موجود نہ ہو بیان نہ کیا جائے اور جن کی اصل موجود ہو انہیں اگر بطور مثال یا نصیحت یا تعلیم کی غرض سے سنایا جائے تو حتی الامکان ہو بہو نقل کرے، زینت کی غرض سے کسی زیادتی نہ کرے۔

۸ مدرسہ بیت العلوم کوئٹہ واخروہ بہار اشرف۔



۸- تفریح کا مقصد تفریح کا قلب ہو دوسروں کو ہنسانا نہ ہو۔

ب- تفریح کی جس مقصد کے تحت اجازت دی گئی ہیں، اگر اس مقصد کے لئے مزاحیہ پروگرام کا انعقاد کیا جائے اور مذکورہ مفاسد سے خالی ہونے کے علاوہ مزید یہ پروگرام صرف مردوں کے لئے منعقد کیے جائیں کہ جس طرح مرد کے لئے عورت کی طرف دیکھنے سے نگاہوں کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح خوف فتنہ کے وقت یا فتنے پر اطمینان نہ ہونے کے وقت عورت پر بھی مرد کی طرف دیکھنے سے نگاہوں کی حفاظت ضروری ہے، گھنٹہ دو گھنٹہ اس کی گنجائش ہو سکتی ہے، گھنٹوں پر پروگرام چلانے کی اجازت نہیں کہ نماز، تلاوت قرآن، ذکر اللہ اور دیگر دینی کاموں سے غافل کرنے کا سبب بنے گا۔

ج- مزاحیاں کہانیاں پڑھنا جب کہ تفریح کے سلسلہ میں ذکر کردہ شرائط کے موافق لکھی گئی ہو گنجائش ہے، اس کے علاوہ مزاحیہ کہانیاں لکھنا، اس کو شائع کرنا، ان کی خرید و فروخت کرنا جائز نہیں کہ کہانیاں لکھنے میں انسان کو کافی وقت اپنے ذہن کو اس میں مشغول رکھنا پڑتا ہے اور مشغولیت کبھی دنوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینوں تباہ کرتی ہے، اس طرح وقت اور ذہن کو مہینوں ان میں صرف کرنا وقت اور جان کی ناقدری ہے اور انسان کو دین کے اہم کاموں سے غافل کرنے والی ہے، حدیث میں ہے: قیامت کے دن سوال ہوگا کہ تم نے اپنی عمر کہاں اور کن کاموں میں خرچ کی (مشکوٰۃ شریف)۔

کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت کرنا ایسے امور ہیں جن پر بیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے یا جس کے ذریعہ بیسہ کمایا جاتا ہے جسے صاحب درمختار نے ناجائز لکھا ہے، ”ومن الناس من يشتري لهو الحديث“ کے تحت شامل کیا ہے، عبارت اس طرح ہے: ”ومن السحت ما يؤخذ على كل مباح كملح وكلاء ووعاء ومعادن وما يؤخذ غاذا لغزو وشاعر شعر ومسخرة وحكواتي قال الله تعالى: ومن الناس من يشتري لهو الحديث“ (درمختار علی رد المحتار ۶۸، ۹)

د- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست نہیں، وجوہات (ج) کے تحت ذکر کی گئی ہیں، نیز مشغلہ اور پیشہ اختیار کرنے میں انسان لوگوں کی نگاہ میں مسخرہ بن کر اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔

ہ- جس طرح کہانیاں لکھنا درست نہیں اسی طرح ڈرامے لکھنا بھی درست نہیں کہ اس میں کافی وقت تک دل و دماغ جسم اور وقت کو مشغول رکھنا ہوتا ہے جو کہ شرعاً پسندیدہ نہیں البتہ ایسے ڈرامے منعقد کرنا یا اسے دیکھنا ان شرائط کے ساتھ جن کا ذکر (ب) میں ہے گنجائش ہے۔

و- تفریح کے سلسلہ میں ذکر کردہ شرائط اسی طرح (ب) میں ذکر کردہ شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

۲- کھیل کے سلسلہ میں موجودہ دور کے نظریہ اور اسلامی نظریہ میں بنیادی اختلاف ہے، دور حاضر میں کھیل برائے کھیل اور کھیل بحیثیت ایک فن والا نظریہ رائج ہے کہ اسلام نہ تو کھیل برائے کھیل کا قائل ہے اور نہ ہی اس کی نئی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، دور حاضر کے نظریہ کے اعتبار سے کھیل مقصود بنتا ہے جبکہ اسلام کسی بھی ایسی صورت کی اجازت نہیں دیتا جس میں کھیل کو مقصود قرار دیا گیا ہو، قرآن مجید میں کھیل کا تذکرہ عموماً مذمت کے انداز میں کیا گیا ہے، پورے قرآن مجید میں ابو ولعب کے الفاظ کا استعمال موقع مذمت میں کیا گیا ہے: ”وما الحیوة الدنیا الا لعب ولهو“ اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا (معارف القرآن ج ۳ ص ۳۰۵)۔

البتہ بعض وہ کھیل جو صورتہ کھیل ہے لیکن اپنے دینی اور دنیوی فوائد کے لحاظ سے مقاصد شرع کے حصول میں مانع بننے کے بجائے اس کے حق میں مدد و معاون ہے اس کا کھیل والا پہلو مغلوب ہو کر ایسا اب گیا اب وہ کھیل نہ رہا بلکہ مقاصد شرع کے حصول کا ذریعہ بن گیا، چاہے اپنی ظاہری شکل و صورت کی وجہ سے اس کو کھیل کا نام دیا جائے اس تمہید کے بعد کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے سلسلہ میں وہ اصول لکھے جاتے ہیں جسے حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ”الناہی عن المناہی“ میں ذکر کیا ہے، طوالت کی وجہ سے عبارت نہ ذکر کرتے ہوئے عبارت سے حاصل شدہ اصولوں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

۱- ابو شخص جس میں کھیل مقصود ہو، جسم کی ورزش مقصود نہ ہو بلا مقصد محض وقت گذاری کے لئے کھیلا جائے ناجائز ہے۔

۲- جن کھیلوں کی احادیث و آثار میں صریح ممانعت آگئی ہے وہ ناجائز ہے جیسے نرد شطرنج، کبوتر بازی اور جانوروں کو لڑانا وغیرہ۔

۳- جو کھیل کسی حرام و معصیت پر مشتمل ہوں وہ اس معصیت یا فعل حرام کی وجہ سے ناجائز ہوں گے، ان کی کئی صورتیں ممکن ہیں مثلاً کسی کھیل میں ستر کھول دیا جائے یا اس کھیل میں جو کھیلا جائے یا اس میں مردوزن کا مخلوط اجتماع ہو یا اس میں موسیقی کا اہتمام کیا گیا ہو یا اس میں کفار کی نقالی کی جا رہی ہو۔

۴- جو کھیل فرائض اور حقوق واجبہ سے غافل کرنے والے ہوں وہ بھی ناجائز ہوں گے، کیونکہ جو چیز بھی انسان کو اس کے فرائض اور حقوق واجبہ سے غافل کرنے والی ہے وہ لہو میں داخل ہو کر ناجائز ہے۔

۵- وہ کھیل جس میں فائدہ تو ہے اور شریعت میں اس کی صریح ممانعت بھی نہیں آئی لیکن تجربہ سے اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہونا ثابت ہو چکا ہے وہ بھی ممنوع ہے۔

۶- ایسے کھیل جن میں فائدہ ہے اور اس کی صریح ممانعت بھی نہیں آئی اور اس کا ضرر بھی اس کے نفع سے زیادہ نہیں لیکن ان میں محض نیت لہو مشغول ہونا جائز ہے۔

۷- ایسے کھیل جن میں منفعت مقصودہ ہے اور شریعت میں ممانعت بھی نہیں آئی اور ان میں کوئی دینی نقصان بھی نہیں اور ان میں مطلوبہ فائدہ حاصل کرنے کی غرض صحیح سے مشغول ہو تو یہ جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔

۸- وہ کھیل جن کی شریعت میں اجازت آئی ہے وہ جائز ہے۔

ب- کھیل کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے لازم ہوگا کہ سادہ لباس پہنے، جسم کا اتنا حصہ ضرور چھپا رہے جو مرد کے لئے ستر ہے یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک۔  
۲- ایسے کپڑے سے بچے جو دیگر قوموں کا شعار ہو۔

۳- ایسے تنگ و چست کپڑے نہ پہنے جس کے پہننے سے انسان کے بناوٹی اعضاء ظاہر ہوتے ہوں، البتہ چست لباس پہننا کہ جس سے بناوٹی اعضاء ظاہر نہ ہو جائز ہوگا کہ کھیل میں ڈھیلے ڈھالے کپڑے کے بالمقابل تنگ و چست کپڑے بہتر ہے، کھیل میں بھاگ دوڑ اور جسم کو تیزی سے حرکت دینا لازم ہے جس میں چست کپڑے پہننا بہتر ہے، رسول اللہ ﷺ کا تنگ آستین کپڑے پہننے کے سلسلہ میں شارحین مجملہ دیگر باتوں کے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ آپ علیہ السلام یہ کپڑے سفر میں استعمال فرمایا کرتے تھے اور جس طرح سفر میں بھاگ دوڑ اور جسم کو تیزی سے حرکت دینا لازم ہے اسی طرح کھیل میں بھی ضروری ہے۔

ج- مرد و بچہ کیوں میں تاش لوڈ و کیم ویڈیو گیم کرکٹ یہ کھیل ناجائز ہونے چاہئے اور جن کھیلوں میں جسمانی ورزش ہوتی ہو اور وہ ان خرابیوں سے پاک ہو جو ذکر کی گئی تو جس قدر جسمانی ورزش زیادہ اور بہتر طریقہ سے ہوگی اسی اعتبار سے جائز اور مستحسن ہوگی مثلاً کبڈی کشتی سائیکل ریس فٹ بال وغیرہ۔

د- کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو اس کی چار شرطیں ہیں جسے حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم نے کتاب الفتاویٰ میں عربی کتابوں کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے:

۱- دو شخص یا چند اشخاص میں مقابلہ ہو اور ہر شخص پر یہ بات لازم قرار دی گئی ہو کہ وہ ہارنے کی صورت میں جیتنے والے کو رقم دے گا اور اگر وہ جیت جائے تو دوسرے لوگ اسے دیں گے یہ صورت جو ہونے کی وجہ سے قطعاً حرام ہے۔

۲- دو شخصوں میں مقابلہ ہو ایک پر انعام کی شرط ہو دوسرے پر نہ ہو یعنی جو الف جیتے گا تو ب اسے ایک ہزار روپے دے گا لیکن ب جیتے گا تو الف اسے کچھ نہیں دے گا مقابلہ کی یہ صورت جائز ہے۔

۳- دو آدمیوں کے درمیان جیت ہار پر دو طرفہ شرط ہو لیکن تیسرے آدمی کو بغیر کسی شرط کے شریک کر لیا گیا ہو کہ اگر وہ ہارے تو اسے کچھ دینا نہیں پڑے گا اور اگر وہ جیتے تو باقی دونوں اسے حسب معاہدہ انعام دیں گے اور تیسرا شخص بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اسے جیتنے کی توقع کی جاسکتی ہو یہ صورت بھی جائز ہے۔

۴- دو شخص گھوڑ دوڑ میں شریک ہوں اور جیتنے والے کو انعام حکومت یا کوئی اور شخص دے اس صورت میں بھی مضائقہ نہیں (کتاب الفتاویٰ ج ۶ ص ۱۵۹)۔

۵- جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو لیکن کھیلنے اور دیکھنے والوں کا کافی وقت اس میں ضائع ہو تو وہ بھی مزاج شرع کے موافق نہ ہونے کی بناء پر ناجائز ہوگا کہ مزاج شرع کھیلوں کے سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھیل بہت طویل نہ ہو کہ جس سے کھیل ہی مقصد بن جانے کا اندیشہ ہو اور ذکر اللہ سے غفلت ہو، وقتی طور پر کھیل کھیلا جائے کہ جس سے جسم میں تروتازگی پیدا ہو اور ذکر اللہ میں مدد ملے نہ یہ کہ کھیل میں اتنا وقت لگے کہ ذکر اللہ سے غافل ہو جائے، عموماً اس طرح کے کھیل میں کھلاڑی نمازوں کو ضائع کر دیتے ہیں، البتہ کبھی کبھار نماز کی حفاظت کے ساتھ اس طرح کے کھیل کھیلے جائیں تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے "وہذا اذا لم یقامر ولم یداور ولم یخل یواجب" (در مختار علی رد المحتار ج ۶ ص ۵۶۶)۔

د- جو کھیل شرعاً جائز ہے اس میں اگر دو فریق ہو تو عوام سے جو فریق جیت جائے اس کا انعام کہہ کر ٹکٹ کی رقم لے اور لوگ بخوشی اس ٹکٹ کو لیں تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے اور جو کھیل شرعاً جائز تو ہے لیکن ان میں دو فریق نہیں صرف ایک فریق ہو اس کا انعام درختار کے ذکر کردہ عبارت کی بناء پر کہ مباح چیزوں پر مثلاً شعر و شاعری، قصے کہانی پر رقم وصول کرنا جائز نہیں اسی طرح یہ بھی ناجائز ہوگا۔

۳- تفریح کے سلسلہ میں جیسا کہ لکھا جا چکا کہ تفریح فی نفسہ مباح ہے اور موجودہ مشینی دور میں مسائل اور فکروں کی کثرت کی وجہ سے تفریح ایک مستقل علاج

کی صورت اختیار کر چکا ہے، اس لئے جسم اور دماغ کو راحت پہنچانے اور تفکر فی خلق اللہ کی غرض سے سفر کیا جائے تو شرعاً جائز ہونا چاہئے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت "سیدوا فی الارض" سے بھی اشارہ ملتا ہے، البتہ اس میں اس کا خیال رکھیں کہ جو مالی حقوق انسان کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی نہ ہو اور بہت زیادہ دور کے مقامات کا سفر نہ کیا جائے کہ جس سفر میں بہت زیادہ رقم صرف ہو، قریبی مقامات کا سفر کیا جائے کہ مال اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اس سے مسلمانوں اور انسانیت کے بہت سے فلاح و بہبود کے کام انجام دیئے جاسکتے ہیں اور اسے بڑی مقدار میں اس طرح سفر و تفریح کی غرض سے خرچ کرنا مناسب نہیں بلکہ فرمان خداوندی "ان المبذورین کانوا اخوان الشیاطین" کے تحت مکروہ معلوم ہوتا ہے۔

ب- سیر و تفریح کے جس سفر میں جان، مال، عزت آبرو کو خطرہ ہو ایسی جگہوں پر تنہا یا بال بچوں کے ساتھ سفر کرنا درست نہ ہوگا کہ شریعت کا مشہور قاعدہ ہے کہ جس چیز میں نفع اور نقصان دونوں ہو اور اس کام کا کرنا ضروری بھی نہ ہو تو اسے نہ کیا جائے، اسی طرح حج جیسی اہم اور ضروری عبادت کی وجوہیت راستہ پر اس نہ ہونے کی بناء پر انسان کے ذمہ نہیں آتی تو سیر و تفریح جو کہ ایک مباح چیز ہے کیسے درست ہو سکتی ہے، نیز یہ ارشاد خداوندی: "ولا تلقوا بأیدیکم إلی التہلکة" کی بناء پر بھی ناجائز ہوگا۔

ج- جن مقامات پر سیر و تفریح میں غیر شرعی باتیں ہوتی ہوں ایسی جگہوں پر سیر و تفریح کے لئے جاننا درست نہیں کہ سیر و تفریح کو ایسی واجبی چیز نہیں کہ اس کے لئے غیر شرعی ماحول کو اختیار کیا جائے، حدیث شریف میں برے ماحول، برے ساتھی اور تہمت کی جگہوں سے بچنے کی سخت تاکید آئی ہے، ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے کہ بہتر ہم نشین کی مثال مشک والے آدمی کی سی ہے اگر تجھے مشک نل سکا تو اس کی خوشبو کہیں گئی نہیں اور بدتر ہم نشین کی مثال آگ کی بھٹی والے کی طرح ہے کہ اگر سیاہی نہ پہنچے تب بھی دھواں تو کہیں گیا نہیں (فضائل اعمال ص ۳۹۸)۔

د- سیر و تفریح کے لئے ٹور کمپنی قائم کرنا درست ہے جو لوگ سیر و تفریح غلط مقاصد کے لئے کرتے ہیں وہ ان کا اپنا عمل ہے، ٹور سے نہ معصیت کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور نہ بذات خود یہ تعاون کا ذریعہ ہے البتہ جن جگہوں کے تعلق سے یہ علم ہو کہ لوگ اس جگہ سوائے غلط مقصد کے کسی اور مقصد کے لئے نہیں جاتے ایسی جگہوں پر ٹور کی سہولت کرنا بہتر نہیں کہ غیرت ایمانی کے خلاف ہے (حوالہ بالا)۔

۴- فلمیں چاہے دستاویزی ہو یا تاریخی ہو یا تعلیمی مقاصد کے لئے بنائی جائے جاندار کی تصاویر سے اس کا خالی ہونا ضروری ہے، اگرچہ یہ اچھے مقاصد ہیں لیکن ناجائز ذرائع کے ساتھ جائز نہیں کہ شریعت کا مشہور ضابطہ ہے کہ جائز کام کے لئے ذرائع بھی جائز ہو "أشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون" (صحیح البخاری باب التماویں)۔ اگر یہ چیزیں تصاویر سے خالی ہوں تو اس کی گنجائش ہے۔

ب- کارٹون بنانا جائز نہیں یہ بھی تصویر کے حکم میں ہے جو حکم تصویر کے سلسلہ میں ہوگا وہی کارٹون میں ہوگا، کارٹون اگر اس طرح ہو کہ اس کا صرف دھڑ ہوسر نہ ہو یا ہوتو برائے نام ہو تو اس طرح بنانا درست ہوگا اور اگر دھڑ کے ساتھ سر بھی موجود ہو کہ منہ ناک وغیرہ بھی واضح ہو تو اس کا بنانا جائز نہ ہوگا چنانچہ مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے عمدۃ المفقہ ج ۳ ص ۲۲۸ پر سرکئی تصویروں کا حکم تفصیل سے ذکر کیا ہے جس میں یہی حکم تحریر کیا ہے جو اوپر تحریر کیا گیا ہے۔

ب- کارٹون چاہے سروالہ ہو یا بغیر سروالہ دونوں کا بنانا احقر کے نزدیک جائز نہیں کہ اولاً اس پیشہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں وقت ضرورت بنا لینے کی تو گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اسے مستقل پیشہ بنا لینا جائز نہیں "الضرورات تنقذ بقدرہا" نیز سد ذرائع جو کہ احناف کے نزدیک حجت ہے سد ذرائع کی چار صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو ذریعہ جائز ہو لیکن غالب گمان کے مطابق کسی مفسدہ کا ذریعہ بنے گا تو وہ بھی ناجائز ہے، اسی طرح یہاں بھی غالب گمان یہی ہے کہ جو شخص اس پیشہ کو اختیار کرے گا اگرچہ وہ ناقص تصویریں بنائے لیکن رفتہ رفتہ مکمل تصویریں بنانے لگے گا، سوال نامہ میں تحریر کیا گیا ہے کہ کارٹون کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اشارہ کس طرف ہے اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اگر کارٹون کے ذریعہ اشارہ کسی متعین شخص کی طرف ہو تو اگرچہ یہ کارٹون ناقص و نامکمل ہو احقر کے نزدیک غیبت کے حکم میں معلوم ہوتا ہے اس طرف بھی توجہ کی جانی چاہئے۔

۶- جس طرح مذاق میں اور فرضی قصے کہانیوں میں جھوٹ جائز نہیں، اسی طرح احقر کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اگرچہ ڈراموں میں سننے والوں کو اشتباہ نہ ہو تب بھی یہ جھوٹ ہی کے حکم میں ہوگا اس لئے جائز نہیں، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اچھے مقصد کے لئے جائز ذریعے اختیار کئے جائیں، اصلاح معاشرہ اگرچہ اچھا مقصد ہے لیکن اس کے لئے ذریعہ ناجائز یعنی جھوٹ استعمال کیا جائے ناجائز ہے "عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قالوا یا رسول اللہ! إنک تداعبنا قال: إنی لا أقول إلا حقاً، تداعبنا یعنی تمازحنا" (شمائل ترمذی ص ۱۶)۔

☆☆☆

## سیر و تفریح کے جائز ذرائع اور شرعی ضوابط

مولانا محمد عارف باللہ قاسمی علیہ

ہنسی، مزاح اور لطیفہ گوئی کا جواز اور اس کے شرعی حدود:

۱- الف - تفریح کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہنسی مزاح اور لطیفہ گوئی ہے، ہنسی انسان کی فطری خاصیت ہے، جس سے اسلام کیوں کر منع کر سکتا ہے؟! جبکہ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، اور اس میں انسانی ذوق و طبیعت اور فطرت کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے، اور تنگی و سختی کے بجائے وسعت و آسانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”لتعلم یتھود أن فی دیننا فسحة إنی أرسلت بجنیفة سمحة“ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۸۵۵، واسنادہ قوی)۔

”یہود کو یہ جان لینا چاہئے کہ ہمارے دین میں گنجائش ہے، مجھے وسعت و آسانی والے دین خنیف کے ساتھ بھیجا گیا ہے“

البتہ زیادہ ہنسنے کے منفی اثرات انسان پر پڑتے ہیں، اس لئے اسلام اس میں اعتدال کی تعلیم دیتا ہے، اور اسی سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

”لا تکثروا الضحک؛ فإن كثرة الضحک تمیت القلب“ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۱۹۳، سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۳۰۵، والحدیث صحیح) (زیادہ مت ہنسو؛ کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کرتا ہے)۔

بہر حال ہنسی انسان کی مقبول فطرت ہے اور جائز ہے اور اس سے انسانی روح کی تھکاوٹ دور ہوتی ہے، اس لئے شریعت اسلامیہ میں اس کی خاطر مزاح بھی جائز ہے اور نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے اصحاب سے مزاح فرما کر اس کے جواز کو عملی طور پر بیان کیا ہے، اور یہ بتا دیا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اس کے احکام قوانین انسانی مزاج سے مکمل ہم آہنگ ہیں، چنانچہ کتب احادیث کی متعدد روایات میں رسول اللہ ﷺ کے مزاح کو نقل کیا گیا ہے، حضرت حسنؓ فرماتے ہیں:

”أتت امرأة إلى النبي ﷺ فقالت: يا رسول الله! أذع الله لي أن يدخلني الجنة، فقال: يا أم فلان إن الجنة لا تدخلها عجوز، قال: فولت تبكي، فقال: أخبروها أنها لا تدخلها وهي عجوز إن الله تعالى يقول: إنا أنشأنا من إنشاء فجعلنهن أبكارا عربا أترابا“ (شمائل ترمذی: ۲۳۸)۔

(ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے لئے اللہ سے دعا کر دیجئے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمادے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ام فلان: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بوڑھی عورت جنت میں داخل نہیں ہوگی، حضرت حسن فرماتے ہیں کہ یہ سن کر وہ رونے لگی، نبی ﷺ نے فرمایا کہ اسے بتا دو کہ یہ بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گی (بلکہ جوان صورت ہو کر جنت میں جائے گی) کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے، اور ہم نے انہیں کنورایاں بنایا ہے، محبت کرنے والی ہیں اور ہم عمر ہیں)۔

اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سواری کے لئے اونٹ کی درخواست کی، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا: اِنی حاملک علی ولد ناقۃ (میں تمہیں اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا) تو اس نے کہا: یا رسول اللہ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اونٹ کو اونٹنی ہی تو جنتی ہے۔ (شمائل ترمذی: ۲۳۶)۔

اسی طرح صحابہ کی جماعت میں کئی ایسے صحابہ کا نام ملتا ہے جو مزاح پسند طبیعت کے حامل تھے اور صحابہ میں وہ اس حوالے سے مشہور تھے، حضرت نعیمان

بن عمرو انصاری اور سہیل بن حرملہ رضی اللہ عنہم ان ہی صحابہ میں سے ایک ہیں، جو رسول اللہ ﷺ سے بھی مزاح کیا کرتے تھے (سنن ابن ماجہ: ۱۹: ۳)۔ ان تفصیلات سے مزاح کے حوالے سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ہنسی اور اس کی خاطر مزاح، لطیفہ گوئی اور کومیڈی جائز ہے، البتہ اس کے حدود بھی شریعت میں متعین ہیں جو اس کے جواز میں ملحوظ ہیں۔

۱- پہلی شرط یہ ہے کہ ہنسی مزاح اور لطیفہ میں جھوٹ کا عنصر شامل نہ ہو بلکہ جو بات کہی جائے وہ بالکل حقیقت کے موافق ہو، کیونکہ اسلام میں جھوٹ انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے، اور لوگوں کو ہنسائے کی غرض سے جھوٹ بولنے کی احادیث میں سخت مذمت کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”ویل للذی یحدث فی کذب لیضحک القوم، ویل له ویل له“ (سنن ابوداؤد: باب فی التشدید فی الکذب، مسند احمد: ۲۰۰۶۷، حسن)۔ (اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جو بات کرتے ہوئے جھوٹ بولے تاکہ لوگ ہنسیں، اس کے لئے ہلاکت ہے، اس کے لئے ہلاکت ہے)۔

۲- ہنسی مزاح اور لطیفہ گوئی کے جائز ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے کسی انسان کی تحقیر و تذلیل نہ ہوتی ہو اور نہ اس سے کسی کا استہزاء مقصود ہو؛ کیونکہ اسلام میں کسی کی تحقیر و تذلیل اور استہزاء ناجائز ہے۔ قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسی أن یکونوا خیرا منهم ولا نساء من نساء عسی أن ینکن خیرا منهن ولا تلمزوا أنفسکم ولا تنابزوا بالألقاب بئس الاسم الفسوق بعد الإیمان ومن لم یتب فأولئک هم الظالمون“ (سورہ حجرات: ۱۱)۔ (اے ایمان والو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو، ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے، اور جو بازنہ آویگئے تو وہ ظلم کرنے والے ہیں)۔

۳- اس مزاح سے کسی پر خوف و درہشت طاری نہ ہو، اور وہ مزاح کسی کی الجھن اور بے چینی کا سبب نہ بنے؛ کیونکہ کسی کو خوف زدہ کرنا یا کسی کو بے چینی اور الجھن سے دوچار کرنا اسلام میں ممنوع اور ناپسندیدہ عمل ہے، چاہے ہنسی، مزاح کے قصد ہی سے کیوں نہ ہو، حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ صحابہ کرام سے نقل کرتے ہیں کہ چند صحابہ نبی ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے، تو کسی ایک صحابی کی رسی ایک صحابی نے بطور مزاح ان کو پریشان کرنے کے لئے لے لی، جس سے وہ صحابی تھوڑے پریشان ہو گئے، تو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا یجیل لمسلم أن یروع مسلما“ (ابوداؤد: باب من یاخذ الشیء علی المزاح)۔ (کسی مسلمان کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو خوف زدہ کرے)۔

۴- مزاح میں لوگوں کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھا جائے؛ اس لئے کہ اسلام ہر ایک کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھنے کی تعلیم دیتا ہے اور بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت کا حکم دیتا ہے، اس لئے مزاح ایسا نہ ہو کہ وہ بڑوں کی تعظیم یا چھوٹوں کی شفقت کے مغاثر ہو، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویوقر کبیرنا“ (سنن ترمذی: ۱۸۴۲)۔ (وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے)۔

۵- مزاح اور لطیفہ گوئی میں افراط نہ ہو کہ ہر وقت مزاح ہی کرتا رہے، اور لطیفے چھوڑتا رہے، بلکہ یہ صرف کھانے میں نمک کے برابر ہو، اور مناسب وقت پر ہو۔

۶- مزاح اور لطیفہ گوئی میں کسی کی غیبت نہ ہو؛ کیونکہ غیبت کبیرہ گناہ ہے، اور اسلام میں اس کی بڑی مذمت کی گئی ہے۔

۷- اس مزاح یا لطیفہ گوئی سے قرآن و سنت، یا امور دین اور حکم شریعت کا استہزاء ظاہر نہ ہوتا ہو، کیونکہ قرآن و سنت یا امور دین اور حکم شریعت کا استہزاء موجب کفر ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”قل أباللہ وآیاتہ ورسولہ کذتم تستهزؤن۔ لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم“ (سورہ توبہ: ۶۵-۶۶) (آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کے ساتھ، اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی کرتے ہو، تم اب ضد مت کرو، تم تو اپنے کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے)۔

مزاحیہ پروگراموں اور مزاحیہ مشاعروں کا انعقاد:

ب- تفریق طبع کے لئے چند گھنٹوں پر مشتمل مزاحیہ اور تفریحی پروگرام منعقد کرنا یا مزاحیہ یا تفریحی مشاعرہ منعقد کرنا جائز ہے اور اس میں شرکت بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس میں اس کے شرعی حدود و ضوابط کو ملحوظ رکھا گیا ہو، اس کا جواز اس روایت سے معلوم ہوتا ہے:

”عن عائشة رضی اللہ عنہا أن أبا بکر دخل علیها والنبی ﷺ عندها یوم فطر أو أضحی وعندهما قینتان تغنیان بما تقاولت الأنصار یوم بعث، فقال أبو بکر: مزار الشیطان مرتین، فقال النبی ﷺ: دعهما یا أبا بکر! إن لكل قوم عید، وإن عیدنا هذا الیوم“ (بخاری: ۳۴۸۸)۔

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے دن ابو بکرؓ ان کے پاس آئے جبکہ نبی ﷺ ان کے پاس تشریف فرما تھے، اور ان کے پاس دو بچیاں وہ گیت گارہی تھیں جو انصار نے جنگ بعثت کے موقع پر گایا تھا، پس ابو بکر نے دو مرتبہ (غصہ سے) کہا: شیطان کی گیت تم سب پڑھ رہی ہو؟ یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا: ابو بکر! تم نے پڑھنے دیجئے؛ کیونکہ ہر قوم کے لئے عید ہے اور ہماری عید آج کا دن ہے)۔

مزاحیہ کہانیاں لکھنا اور پڑھنا:

ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا اور پڑھنا چاہے عبرت و وعظ کے لئے ہو یا محض تفریح و طبع اور دل بستگی کے لئے ہو جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ضرر کا پہلو موجود نہ ہو، اور یہ ضروریات دین و دنیا سے غفلت کا ذریعہ نہ ہو، اس کا جواز فقہاء کی ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔

دکٹر عبداللہ الفقہیہ لکھتے ہیں: اور جب ان کہانیوں کو لکھنا اور پڑھنا جائز ہے تو ان پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا بھی جائز ہوگا اور ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہوگی۔

لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا اور اس کی اجرت وصول کرنا:

د- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی کے جواز کی جو شرطیں ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئی لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنانا اور اس کی اجرت وصول کرنا جائز ہے؛ کیونکہ جواز کی شرطوں کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے اس کا یہ عمل جائز ہے اور جائز عمل کو پیشہ بنانے اور اس پر اجرت وصول کرنے سے شریعت منع نہیں کرتی، نیز اس میں وقت اور محنت دونوں لگتے ہیں اور انسان کی محنت اور وقت کا بدلہ شریعت میں جائز ہے۔

مزاحیہ ڈراموں کا انعقاد:

ہ- تفریح و طبع کے لئے عام طور پر جو ڈرامے کئے جاتے ہیں ان میں بے شمار محرمات و ممنوعات کا ارتکاب ہوتا ہے، اس لئے وہ جائز نہیں ہیں۔

۱- سب سے پہلی چیز تو اس میں یہ ہے کہ یہ غیر مسلمین کے اطوار و اعمال اور ان کے خصائص میں سے ہے۔ شیخ احمد بن صدیق اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

”إن التمثیل نشأ عن اليونان، فالنصارى، فالحضارة الخریة الکافرة، وإنه من خصائصهم وشعائرهم وإن العرب لم یعرفوه إلا بعد الانفتاح علی العالم الغربی والإعجاب بحضارته وتقییم الأفعال والأخلاق بمیزانه“ (اقامة الدلیل علی حرمة التمثیل)۔

(ڈراما کی ابتداء یونان سے ہوئی پھر نصاریٰ نے اور اس کے بعد مغربی تہذیب نے اس کو اپنایا، اور یہ اس کی خصوصیات اور شعائر میں ہے، اس سے عرب کی واقفیت تب ہوئی جب کہ مغربی دنیا سے ان کے روابط ہوئے اور وہ ان کی تہذیب کو اچھا سمجھ کر اپنے اعمال و اخلاق کو ان کے میزان پر تولنے لگے)۔

۲- عموماً ڈراما پیش کرنے والے جن کی نقل اتارتے ہیں خود کو اسی کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اپنا نام غلط ظاہر کرنے میں جھوٹ کا ارتکاب ہوتا ہے جو ممنوع ہے، کیونکہ مزاح و تفریح میں بھی جھوٹ بولنا حرام ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے: لا یصلح الکذب فی جد ولا هزل (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ۲۶۱۱۳، تحقیق الدكتور محمد عوامہ) (جھوٹ نہ حقیقت میں درست ہے اور نہ مزاح میں)۔

۳- عام طور پر ڈراما کرنے والے ڈراما میں خود کو کسی ایسے شخص کا بیٹا بتاتے ہیں جو حقیقتاً ان کے والد نہیں ہوتے، اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی اپنے والد کے علاوہ کسی اور کی طرف خود کو منسوب کرے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”من ادعی إلی غیر آئیہ وهو یعلم أنه غیر آئیہ فالجنة علیه حرام“ (مسلم: باب بیان حال ایمان من رغب عن آئیہ وهو یعلم أنه غیر آئیہ) (جس نے خود کو اپنے والد کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ یہ جانتا ہے کہ وہ اس کا والد نہیں ہے، تو اس پر جنت حرام ہے)۔

۴- ڈراما میں غیبت کا پہلو بھی ہے، کیونکہ عام طور پر ڈراما پیش کرنے والے کسی کی جب حکایت کرتے ہیں تو ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے اس شخص کی کسی اخلاقی یا بدنی نقص کو وہ ظاہر کرتے ہیں، اور یہ غیبت ہے، جو کہ حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی کی کوئی حکایت کی گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ما أحب إني حكيبت إنساناً وإن لي كذا وكذا“ (سنن ابی داؤد: ۷۷۷۷، ۴۸۷۷، در صحیح) (مجھے یہ پسند نہیں کہ میں بطور تنقیص کسی کی نقل اتاروں اور اس کے بدلے میں مجھے اتنی دنیاوی جانی)۔

۵- بسا اوقات کسی مردہ کی نقل اتاری جاتی ہے، مثلاً کسی بادشاہ کا رول کیا جاتا ہے، اور پھر اس کے ذریعہ اس کی کئی خامیوں کو پیش کیا جاتا ہے جس پر لوگ ہنستے ہیں، جب کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مردوں کے کمزوریوں اور ان کی زندگی کے ناپسندیدہ پہلوؤں کو اجاگر نہ کیا جائے، بلکہ اس کی پردہ پوشی کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اذكروا محاسن موتاكم وكفوا عن مساويهم“ (ترمذی: ۱۰۱۹، وقال الترمذی: حدیث غریب) (اپنے مردوں کی خوبیوں کو ذکر کرو اور ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کرو)۔

۶- عام طور پر ڈراموں میں ایسی حرکتوں کو اختیار کرنے پر توجہ دی جاتی ہے جس سے ناظرین زیادہ سے زیادہ ہنسیں اور اس کے لئے یا تو کسی کا استہزاء کیا جاتا ہے، یا کسی کے عیب کو نمایاں کیا جاتا ہے یا کوئی صریح جھوٹ بولا جاتا ہے، اور یہ ساری چیزیں ہر حال میں ممنوع ہیں، اور لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے تو ان کی قباحت اور بڑھ جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنسانے کے مقصد سے جھوٹ بولنے والوں کو دلیل کی وعید سنائی ہے۔

۷- بسا اوقات ڈراموں میں جھوٹی قسم کھائی جاتی ہے، اور جھوٹی قسم کھانے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکبر الکبائر اور مہلک بتایا ہے۔

۸- ڈراموں میں بہت سی مرتبہ مرد عورت کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں، اور مردوں عورتوں کا ایک دوسری کی مشابہت اختیار کرنا ممنوع ہے۔ ”لعن رسول اللہ ﷺ المتشبهات بالرجال من النساء والمتشبهين بالنساء من الرجال“ (ترمذی: ۲۷۸۳، وقال: هذا حدیث حسن صحیح)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت فرمائی ہے۔

۹- بعض ڈراموں میں دین اور دیندار لوگوں کا استہزاء بھی کیا جاتا ہے؛ کیونکہ ان کی اس طرح تمثیل کرنا کہ اس سے لوگوں کو ہنسی آئے ان کا استہزاء ہی ہے، اسی لئے علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس طرح کی تمثیل کو ”مکفرات“ میں شمار کیا ہے، لکھتے ہیں:

”ومنها (المكفرات) لو حضر جماعة وجلس أحدهم على مكان رفيع تشبها بالمدكرين فسألوا المسائل وهم يضحكون أو تشبه بالمعلمين فأخذ خشبة وجلس القوم حوله كالصبيان فضحكوا واستهزؤا“ (الإعلام بقواطع الإسلام) (اور مکفرات میں سے یہ ہے کہ ایک جماعت آئے اور ان میں کا ایک داعظ و مذکر کی نقل اتارتے ہوئے کسی بلند جگہ پر بیٹھ جائے، پھر لوگ اس سے مسائل پوچھیں اور ہنسیں، یا معلمین کی مشابہت اختیار کر کے ایک لکڑی لے لے اور بچوں کی طرح لوگ اس کی اطراف بیٹھ جائیں، اور پھر سب ہنسیں اور استہزاء کریں)۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تفریحی ڈرامے کی محرمات و ممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں اور ان کا کردار کرنا یا ان کے کردار کو تحریر کرنا ناجائز نہیں ہے۔

البتہ وہ ڈرامے جو ان ممنوعات سے خالی ہوں اور انہیں وعظ و تبلیغ کے پیش نظر کیا جائے اور اس کے ذریعہ کسی اخلاق یا کسی عمل کی تعلیم دی جائے تو وہ جائز ہیں جیسا کہ مدارس میں مکالمے اور محاذ ثے ہوتے ہیں (اور جس کے بارے میں سوال نمبر ۶ میں پوچھا گیا ہے) کیونکہ اس ڈرامے کی حقیقت عملی تعلیم کی ہے۔

لوگوں کو ہنسانے کا پروگرام:

۱- گرچہ اطباء نے ہنسا انسانی صحت کے لئے مفید کہا ہے اور واقعی اس کے مفید اثرات بھی انسان پر مرتب ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر جو اس کے پروگرام ہوتے ہیں اس میں لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ، اور غیبت کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس میں مردوزن کا اختلاط بھی ہوتا ہے، اس لئے ممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایسی محفلیں جائز نہیں ہیں، جیسا کہ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ ہنسنے یا ہنسانے کے لئے جھوٹ و غیبت حلال نہیں ہے۔

نیز ایسی محفلوں میں عموماً ہنسی کا ماحول بھی ہنسی کی اس حد میں داخل ہو جاتا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، آپ کا ارشاد ہے: ”لا تکشر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (سنن ترمذی: ۲۳۰۵ حسن) (زیادہ مت ہنسو؛ کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے)۔  
۲- کھیل:

اسلام نے کھیل کو کلی الاطلاق جائز نہیں کہا، بلکہ اس کے طریقوں کے اعتبار سے جائز اور ناجائز کے اصول مقرر کر کے کھیلوں کے ان اصول پر پورا اترنے کے اعتبار سے اس پر استحباب، جواز، عدم جواز یا کراہیت کا حکم لگایا ہے۔  
کھیل کے سلسلے میں بنیادی اصول یہ ہیں:

(۱) وہ کھیل انسانی شرافت اور مروت کے مغاثر نہ ہو، اس کے کھیلنے سے آدمی گھٹیا اور خسیس نہ سمجھا جاتا ہو۔

(۲) ایسا کھیل ہو جسے مختصر وقت میں پورا کیا جاسکتا ہو، اور وہ شرعی فرائض اور متعلقہ ذمہ داریوں سے غفلت کا ذریعہ نہ بنے۔ قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق فرماتے ہیں: ”کل ما اُلہی عن ذکر اللہ وعن الصلاة فهو میسر“ (شعب الایمان ۳۶۹/۸، حدیث نمبر: ۶۰۹۸) (ہر وہ چیز جو تمہیں ذکر اللہ سے اور نماز سے غافل کر دے وہ میسر ہے)۔

(۳) ایسا کھیل نہ ہو جو دوسرے انسان یا حیوان کے لئے ایذا رسانی اور تکلیف کا باعث ہو، کیونکہ اسلام میں اپنے عمل سے دوسروں کو تکلیف پہنچانا حرام ہے۔ لا ضرر ولا ضرار۔

(۴) اس کھیل میں دیگر ممنوعات اور محرمات کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو، اور اس میں کوئی امر خلاف شرع نہ ملا ہو، جیسے موجودہ زمانہ میں کھیلنے والے کو اچھا کھیلنے کی ترغیب و تحریض کی خاطر میدان میں نیم برہنہ لڑکیاں ڈانس کرنی ہیں۔

(۵) کھیلنے والے کا لباس ایسا ہو کہ اعضاء ستر نہ کھلیں، مرد ہو تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو اور عورتیں مردوں کے درمیان نہ کھیلیں اور اگر وہ عورتوں کے سامنے کھیلیں تو پردہ کا اتنا اہتمام کریں جتنا ایک عورت کو کسی عورت کے سامنے کرنا ہے؛ کیونکہ پردہ کا اہتمام ہر مسلمان پر فرض ہے اور لوگوں کے سامنے اعضاء ستر کو کھولنا حرام ہے، نیز لباس ساتر ہونے کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے، لباس اتنا چست اور تنگ نہ ہو کہ اس سے بدن کی ساخت نمایاں ہوتی ہو، کیونکہ ایسا لباس بھی ممنوع ہے۔

(۶) ایسا کھیل نہ ہو جس میں کھیلنے والے کے جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا امکان ہو، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”لا تعلقوا بأیدیکم إلی التهلكة“ (سورہ بقرہ: ۱۹۵) (تم خود کو ہلاکت میں مت ڈالو)۔

(۷) کھیل ایسا ہو جس سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو اور انسانی صحت کے لئے مفید ہو، اور اس کھیل سے دینی یا دنیوی معتد بہ فائدہ مقصود ہو۔

(۸) مرد و زنانہ کھیل نہ کھیلیں اور عورتیں مردوں کا کھیل نہ کھیلیں، کیونکہ عورتوں کی مشابہت کرنے والے مردوں پر اور مردوں کی مشابہت کرے والی عورتوں پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

لعن رسول اللہ ﷺ المتشبهات بالرجال من النساء والمتشبهین بالنساء من الرجال (سنن ترمذی: ۲۷۸۴)۔  
(رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے)۔

(۹) اس کھیل میں جو یعنی دو طرفی شرط نہ ہو کہ ہارنے والا جیتنے والے کو شرط کے مطابق مال یا کوئی چیز دے گا، کیونکہ جو اسلام میں حرام ہے، البتہ شرط جانیبن سے نہ ہو بلکہ صرف ایک جانب سے ہو جو مثلاً یہ ہو کہ ٹیم اے جیتے گی تو ٹیم بی اس کو اتنی رقم دے گی اور اگر ٹیم بی جیتے گی تو ٹیم اے سے کچھ نہیں دے گی، تو یہ جائز ہے اسی طرح اگر جیت پر کسی تیسرے کی جانب سے رقم یا کسی چیز کے دینے کا اعلان ہو تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ یہ جو انہیں بلکہ انعام ہے (بائع اصناف: ۲۰۷/۶)۔

(۱۰) وہ کھیل کسی کافر قوم کا مخصوص اور ان کا شعار نہ ہو، چنانچہ وہ تمام کھیل ناجائز ہوں گے جو کسی قوم کے مخصوص کھیلوں میں سے ہوں، جیسے، پتنگ بازی، ہندوؤں کا شعار ہے، یا جیسے کسی مخصوص دن کو منانے سے متعلق کھیل۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لیس منا من تشبه بغیرنا (ترمذی: ۳۶۹۵)۔



ترمذی: ضعیف، البانی: حسن) (وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے علاوہ کسی اور کی مشابہت اختیار کرے)۔

## کھلاڑیوں کا لباس و پوشاک:

ب- لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کا لباس ساتر ہو اور جن اعضاء کا پردہ لازم ہے وہ اعضاء کھلے نہ ہوں، مردوں کے لئے یہ لازم ہے کہ ان کا لباس ایسا ہو کہ ناف سے گھٹنے تک کے اعضاء مکمل چھپے ہوئے ہوں؛ کیونکہ مردوں کے ان اعضاء کا ستر لازم ہے، اور پردہ بھی ایسا ہو جو شرعاً مطلوب اور مقبول ہو، یعنی یہ اعضاء لباس سے ایسے چھپے ہوں کہ لباس کے اوپر سے ان کی ساخت نظر نہ آئے۔ چنانچہ اگر کپڑا اعضاء ستر کو محیط تو ہو مگر بہت چست ہو جس کے اوپر سے اعضاء نمایاں ہوتے ہوں تو اس کو پہن کر کھیلنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس لباس سے ستر کا مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

احادیث میں عورتوں کو قبایلی نام کا لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے، اس کپڑے میں خامی یہ تھی کہ اس کے سارے اعضاء ستر کو محیط ہونے کے باوجود اعضاء نمودار ہوتے تھے، اور اعضاء کی ساخت نظر آتی تھی (مصنف ابن ابی شیبہ: باب ما جاء فی لبس القباہی)۔

## کھیل کے اصولوں کے مطابق جائز و ناجائز کھیل:

ج- شریعت کے ان اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال، ہاکی، گولف، ٹینس، بیڈ مینٹن، کشتی، کبڈی، نشاندہ بازی، دوڑ، گھوڑ سواری، کشتی بانی وغیرہ جائز کھیل ہیں، کیونکہ ان کے طریقوں میں کوئی امر منکر نہیں ہے۔ اور ان تمام میں ریاضت پائی جاتی ہے، جو دینی اور دنیوی اعتبار سے مطلوب ہے، علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں: ”والأصل فی هذه الألعاب كلها الجواز والمشروعية ما لم تشمل علی مفسدة فیطر علیها التحريم، وبعض هذه الألعاب قد ثبت مشروعيتها باحاديث صحاح حساب، مثل العدو والسباحة واللهمو بالسهام، واللعب بالخراب وركوب الخيل والمصارعة... وبعضها مباح بناء علی المبدأ الشرعی المعروف وهو أن الأصل فی الأشياء والأعمال الدنیویة هو الإباحة“ (فقہ اللہم والترویج، علامہ یوسف قرضاوی)۔

## چند مستحب کھیل:

چند کھیلوں کو ان سے حاصل ہونے والے فوائد کے پیش نظر فقہاء نے مستحب قرار دیا ہے، مثلاً تیر اندازی، نیزہ بازی، اور وہ کھیل جن سے دفاعی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور وہ جنگ کے لئے نافع ہے، جیسے کہ موجودہ دور میں لاشی چلانا، یا بندوق یا ٹھیل سے نشاندہ پروار کرنا۔ یہ سب اس لئے مستحب ہیں کہ ان سے وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو مطلوب ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلموهم الله يعلمهم (سورہ انفال: ۶۰)۔ (تم ان کے مقابلہ کے لئے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کو تیار رکھنے کی، کہ اس سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انہیں خوب جانتا ہے)۔

کشتی بھی پسندیدہ کھیلوں میں سے ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی کھیلنا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ سے کشتی میں مقابلہ کیا اور آپ غالب آگئے جس کے بعد رکانہ پہلوان مشرف بہ اسلام ہو گئے (نیل الاوطار ۸/ ۹۲)۔

اسی طرح تیراکی بھی اسلام میں پسندیدہ کھیلوں میں سے ہے، جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا ہر چیز پہلو ولعب ہے، سوائے دو مقرر نشانوں کے درمیان چلنا اور تیراکی کا فن سیکھنا (الجامع الصغیر ۲۳/ ۵) نیز ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھانے کی ترغیب دی ہے۔

حضرت عمرؓ نے اہل شام کو خاص طور پر تیراکی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری سیکھنے کی نصیحت فرمائی (فیض القدر ۳/ ۳۲)۔

لیکن موجودہ زمانہ میں عموماً تیراکی سونٹنگ پول میں سیکھی جاتی ہے اور کی جاتی ہے، بعض جگہوں پر مرد و عورت کا امتیاز نہیں رہتا تو بعض جگہوں پر صرف مرد ہوتے ہیں لیکن وہ صرف ہاف پینٹ یا ”انڈر ویر“ پہنے ہوتے ہیں، اس لئے ایسے سونٹنگ پول میں جہاں برہنہ عورتیں بھی تیراکی کرتی ہوں یا جہاں مرد کے ران کھل رہتے ہوں تیراکی جائز نہیں ہے؛ کیونکہ مقام ستر کو کھولنا یا کسی کے کھلے ہوئے مقام ستر کو دیکھنا حرام ہے، اور یہاں کی تیراکی اس حرام کے ارتکاب کے بغیر نہیں

ہو سکتی ہے۔ ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لعن اللہ الناظر والمنظور إليه (سنن کبریٰ للبیہقی، حدیث: ۱۳۹۵۰ مرسل)۔

(کسی کے اعضاء ستر کو دیکھنے والے پر اور شخص پر جس کی طرف دیکھا جائے اللہ کی لعنت ہے)۔

ماضی میں لوگوں کے غسل کے لئے سوئمٹنگ پول کی طرح حمام کے حوض ہوا کرتے تھے، جہاں لوگ پیسے دے کر غسل کیا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ سے ایسے حمام میں غسل کرنا ثابت ہے، اس لئے فقہاء نے ایسے مشترک حمام کے حوض میں غسل کے لئے جانا جائز لکھا ہے، لیکن جب وہاں بے پردگی اور اعضاء ستر کا کھولنا عام ہو گیا تو بعد کے فقہاء نے ایسے حمام میں جانا مکروہ تحریمی قرار دیا، علامہ حصکفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

ولا شئ فی الکراهۃ لتحقق کشف العورة (درمختار علی ہامش الرد)۔

(کشف عورت کے تحقق ہونے کی وجہ ایسے حمام میں جانا بلاشک مکروہ ہے)۔

کھیل میں ہار جیت کی شرط: .....۔ جائز کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو اگر یہ شرط جانبین سے ہو کہ جو ٹیم ہارے گی وہ جیتنے والے کو کچھ رقم یا کوئی چیز دے گی تو یہ جائز نہیں ہے، لیکن اگر شرط صرف ایک جانب سے ہو کہ اگر ٹیم "الف" جیتے گی تو ٹیم "ب" اس کو کوئی چیز دے گی لیکن برعکس ہونے پر ٹیم "الف" ٹیم "ب" کو کچھ بھی نہ دے گی، یا کسی تیسرے کی جانب سے کوئی چیز جیتنے والے کو دینے کا اعلان ہو تو یہ شکل جائز ہے، جیسا کہ ما قبل میں یہ بات علامہ کاسانی علیہ الرحمۃ کے حوالے سے کھیل کے جواز کے اصولوں کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔

وہ کھیل جس میں وقت بہت لگتا ہو اس کا حکم: .....۔ وہ کھیل جو اپنے اصل کے اعتبار سے محرمات سے خالی ہو لیکن اس کے کھیلنے میں وقت بہت لگتا ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اتنا وقت لگے کہ اس سے فرائض و واجبات اور دیگر ذمہ داریوں میں خلل پڑتا ہو تو ایسا کھیل جائز نہیں ہے، لیکن اگر وقت زیادہ لگے، تاہم اس سے فرائض و واجبات نہ چھوٹیں تو ایسا کھیل جائز ہے مگر کراہیت سے خالی نہیں ہے، کیونکہ خود وقت بھی مومن کا قیمتی اثاثہ ہے، جسے گھنٹوں کھیلوں میں ضائع کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا، اسی لئے کھیل کے جواز کے بنیادی اصولوں میں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ کھیل ایسا ہو جس میں زیادہ وقت نہ لگے اور وہ فرائض و واجبات میں خلل نہ ہو۔

کھیل دیکھنا: .....۔ (۱) اگر کھیل ایسا ہو جو شرعاً جائز ہو اور کھیلنے والوں کے بدن پر اعضاء کا ساتر لباس موجود ہو تو اس کو دیکھنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کھیل کے دیکھنے سے فرائض نہ چھوٹیں اور اس سے شرعی ذمہ داریوں میں خلل نہ ہو، اس صورت میں کھیل دیکھنا اس لئے جائز ہے کہ اہل حبشہ نے نیزہ بازی کا مقابلہ مسجد میں کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو دیکھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی آپ کے پیچھے پردہ میں کھڑی ہو کر اس کھیل کو دیکھا (بخاری: ۴۸۹۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھیلنے والے اگر اس حد میں ہیں کہ ان کا کھیلنا جائز ہے تو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اس کا دیکھنا بھی جائز ہے، لیکن عورتوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے ان کی بے پردگی نہ ہوتی ہو، موجودہ زمانہ میں عورتوں کا کھیل دیکھنے کے لئے اسٹیڈیم میں جانا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں ان کی بے پردگی ہوتی ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔

کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا:

(۲) ٹکٹ درحقیقت کھیل گاہ میں داخل ہونے اور اس کی نشست کو مختص کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، گویا وہ ٹکٹ کے ذریعہ مخصوص مدت تک اس نشست، اور اس مکان سے استفادہ کا عوض ادا کرتا، اور ٹکٹ بیچنے والوں کی طرف سے اسے دیئے جانے والے ٹکٹ کی حیثیت اس مکان میں داخل ہونے کے لئے مفتاح کی سی ہے، اور کسی مکان یا نشست سے استفادہ کا عوض دینا یا لینا حلال ہے، گویا اس نے مکان سے استفادہ کرنے کا معاملہ کیا اور اس کا عوض دیا اور مالک نے اسے مفتاح حوالے کر دیا، فتاویٰ ہندیہ میں ہے: قال لآخر: هذه الدار بدینار فی سنة هل رضیته فقال: نعم ودفع الیہ المفتاح فهو اجارة (فتاویٰ ہندیہ: کتاب الاجارة، الباب الاول)۔ (کسی سے کہا: یہ گھر ایک دینار میں ایک سال کے لئے ہے، کیا تمہیں منظور ہے اس نے کہا ہاں، اس کے بعد اس نے اسے مفتاح حوالے کر دیا تو یہ اجارہ ہے)۔

اس لئے جائز کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا جائز ہے، لیکن موجودہ زمانے میں اسٹیڈیم جہاں عموماً نام کھیلوں کے کھیلنے میں شرعی حدود کی رعایت نہیں کی جاتی نیز بے حجاب عریاں عورتیں بکثرت موجود رہتی ہیں، وہاں جانا مقام معصیت میں جانے کے برابر ہو چکا ہے، اس لئے وہاں جانے کے لئے خرچ کیا جانے والا مال معصیت میں خرچ کرنے کے زمرہ میں آئے گا، اور اسراف ہوگا؛ کیونکہ وہاں جا کر وہ معصیتوں ہی کا مرتکب ہوگا اور معصیتوں میں مال خرچ کرنا اسراف ہے جو اسلام میں حرام ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

ولا تسرفوا إنه لا يحب المرففين (سورہ انعام: ۱۳۱) (اسراف مت کرو، وہ (اللہ) اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

### ۳- سیاحت:

اسلاف میں تفریحی سیاحت کے مثال نہ ملنے کے باوجود تفریحی سیاحت جائز ہے، کیونکہ اس کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، جب کہ امور دنیویہ میں اصل ان کا مباح ہونا ہے۔ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ (البحر المحیط للذکر شی ۴۲۲)۔ نیز یہ انسانی طبیعت کے لئے مفید بھی ہے، چنانچہ امام شافعی علیہ الرحمۃ نے سفر و سیاحت کی اہمیت کو ان اشعار میں بیان کیا ہے:

تغرب عن الاوطان فی طلب العلا  
وسافر ففی الاسفار خمس فوائد  
تفرج هم واكتساب معیشتہ  
وعلم و آداب وصحبة ماجد  
(بلندی کی طلب میں وطن سے دور جاؤ اور سفر کرو کیونکہ سفر میں پانچ فوائد ہیں:

(۱) غم و فکر کا دور ہونا (۲) کسب معاش (۳) حصول علم (۴) حصول ادب (۵) بزرگی کی صحبت)۔

چونکہ سیاحت اور سفر سے غم و فکر کا ازالہ ہوتا ہے اور غم و فکر کا ازالہ ایک ایسا مقصد ہے جو شرعاً مطلوب اور جائز ہے، اس لئے اس مقصد سے سیاحت جائز ہے، نیز اللہ نے قرآن کریم میں وحدائق ذات بہجۃ کہہ کر دنیا کے خوبصورت مناظر کو مقام امتنان میں ذکر کیا ہے گویا دنیا کے خوبصورت مناظر انسانوں کے لئے ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، اور یہ فائدہ اٹھانا گھریٹھے تو ہو نہیں سکتا بلکہ اس کے لئے ان خوبصورت مناظر تک سفر کر کے جانا ہوگا، جو سیاحت ہے، اس لئے اس سے بھی تفریحی سیاحت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس کے جواز میں یہ شرط ملحوظ ہونی چاہئے کہ یہ سیاحت تفریح و طبع کے لئے ہو، نیز اس کا مقصد دنیا میں پھر کر دنیا کے عجائبات اور باکمال خدائی تخلیق کا نظارہ کر کے اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرنا اور انقلابات جہاں سے عبرت حاصل کرنا ہو، محض دنیا کے مشاہدے اور اس کی دیدہ زیبی سے متحیر ہونے اور اس سے تملذذ کے لئے نہ ہو، کیونکہ سیاحت کا یہ مقصد انسان کو فتنہ میں مبتلا کرنے والا ہے اور دنیا کو ایسی نگاہ سے دیکھنے سے شریعت نے منع کیا ہے کیونکہ یہ نگاہ اس کو دار آخرت سے غافل کر کے دنیا میں جو کر دے گی۔

سفر سیاحت میں اہل و عیال کو ساتھ رکھنا جب کہ خطرات کا اندیشہ ہو:..... ب۔ ایسی جگہ سیاحت کے لئے اکیلے جانا یا اہل و عیال کو ساتھ لے جانا جائز نہیں ہے جہاں کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے نقطہ نظر سے پرخطر ہو، کیونکہ جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لا تلقوا بأیدیکم إلی التہلکة" (سورہ بقرہ: ۱۹۵) (تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

ایسی مقام تفریح پر جانا جہاں برائی ہو:

ج۔ (۱) شریعت اسلامیہ میں انسانوں کو ایسے مقام پر جانے سے منع کیا گیا ہے جہاں برائیاں ہوں، اور وہ اس جگہ جا کر ان برائیوں کو روکنے پر قادر نہ ہو؛ کیوں کہ وہ اس جگہ جا کر خود بھی کسی نہ کسی برائی میں مبتلا ہو سکتا ہے، اس لئے ایسے مقام تفریح پر جانا جائز نہیں ہے جہاں پر برائیاں ہوں، اس کا حکم اس روایت سے معلوم ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یجلس علی مائدة یدار علیہا الخمر (سنن ترمذی: ۲۸۰۱، عن جابر، مسند احمد: ۱۲۶ عن عمر بن الخطاب) (جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا دور چل رہا ہو)۔

محمدت عصر علامہ کشمیری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ان ترک مکان المعصیۃ من مکملات التوبۃ (فیض الباری: باب المعصیۃ الطیب وضوء المسلم) (بے شک مقام معصیت کو چھوڑ دینا توبہ کے مکملات میں سے ہے)۔

جس مقام تفریح پر غیر شرعی باتیں ہوتی ہوں وہاں جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا؟

ج- (۲) جس مقام تفریح پر غیر شرعی باتیں ہوتی ہوں وہاں جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے اصول کے مطابق جائز ہے، جیسا کہ ان کے نزدیک کافر یا ذمی کے شراب کی منتقلی کے لئے سواری کرایہ پر دینا یا اس کا شراب ایک جگہ سے دوسری جگہ اجرت پر لے جانا جائز ہے؛ یا جیسا کہ ان کے نزدیک شراب پیچنے کے لئے یا عبادت گاہ کے طور پر استعمال کرنے کے لئے گھر کرایہ پر دینا جائز ہے؛ کیونکہ یہ اعمال جن پر عقدا جارہے ہوئے ہیں یعنی حمل و نقل یا منفعت مکان وہ بذات خود فعل معصیت نہیں ہیں۔

لیکن حضرات صاحبین کے اصول کے مطابق مکان معصیت پر جانے کے لئے سواری کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ ان کے نزدیک شراب کی منتقلی کے لئے سواری کرایہ پر دینا یا بذات خود اجرت پر شراب کو منتقل کرنا یا شراب پیچنے یا عبادت گاہ بنانے کے لئے گھر کرایہ پر دینا مکروہ (تحریمی) ہے؛ کیونکہ اگرچہ یہ افعال بذات خود معصیت نہیں ہیں، لیکن معصیت میں معاون و مددگار ہیں (مجموع الانہر ۴/ ۱۸۸، ط: دارالکتب العلمیۃ بیروت)۔

برائیوں پر مشتمل مقام تفریح پر سامان خورد و نوش کی دکان لگانا:

ج- (۳) ایسے مقام تفریح پر جہاں برائیاں ہوتی ہیں وہاں سامان خورد و نوش کی دکان لگانے میں کئی قباحتیں ہیں، ایک تو اسے اس مقام پر وقت گزارنا ہوگا، جب کہ اس کے مقام معصیت ہونے کی وجہ سے اس سے دوری ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ موجودہ زمانہ اشتہار کی کثرت کا ہے اور معمولی چیزوں کی اشتہار کے لئے بڑی رقم خرچ کی جاتی ہے، اور ہر ایک اپنی دکان یا مصنوعات کا اشتہار دیتا ہے، ان حالات میں بعض مرتبہ اس جگہ پر دکان لگانے والا اپنے دکان کا اشتہار دے کر لوگوں کو ادھر بلائے گا جو درحقیقت مقام معصیت کی طرف بلانا ہوگا۔ اس لئے ان قباحتوں اور مفاسد کے پیش نظر ایسی جگہوں پر دکان خورد و نوش لگانا کراہیت سے خالی نہیں ہوگا۔

ٹورز کمپنیوں کا قیام:

جائز مقامات پر آنے جانے کی خدمات فراہم کرنا جائز ہے تو اس مقصد سے ٹورز کی کمپنی قائم کرنا بھی جائز ہے، جیسا کہ حج و عمرہ ٹورز وغیرہ، لیکن سیاحتی مقامات پر داعیہ دینے کے لئے جانے، اور وہاں شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہونے کی سہولت فراہم کرنا یا مندروں، تیرتھ گاہوں اور جہ چوں کی زیارت کے لئے آمدورفت اور قیام و طعام کی سہولت فراہم کرنا اور اس مقصد سے ٹورز یا ٹراویلس کی کمپنی قائم کرنا حضرات صاحبین کے نقطہ نظر کے مطابق جائز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ اعانت علی المعصیۃ ہے، لیکن حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نقطہ نظر کے مطابق جائز ہے؛ کیونکہ نفس فعل جو اس سے صادر ہو رہا ہے اس میں معصیت موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے۔

ان دونوں اقوال کے مابین محتاط طریقہ یہی ہے کہ ایسی خدمات فراہم کرنے اور اس مقصد سے ٹورز یا ٹراویلس کی کمپنی قائم کرنے سے حضرات صاحبین کے نقطہ نظر کے مطابق منع ہی کیا جائے جس سے معصیت کے کرنے والے کے ارادے میں مدد ملتی ہو، تاکہ معصیت کے راستے کچھ تو دشوار ہوں اور خدمات فراہم کرنے والے اعانت علی المعصیت سے محفوظ رہیں، جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے۔

۴- دینی، تعلیمی اور دستاویزی ویڈیو اور فلمیں بنانا:

فلموں کے ذریعہ جو باتیں پیش کی جاتی ہیں وہ دیکھنے والوں کے ذہن و دماغ میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہیں؛ کیونکہ اس کے ذریعہ واقعہ عملی صورت میں دیکھنے والوں کے سامنے آجاتا ہے، اسی لئے آج برائیوں کے پھیلانے والوں نے اسے اپنا ایک قیمتی آلہ بنایا ہے اور اس کے ذریعہ وہ برائیوں کے پھیلانے میں کامیابی سے ہمکنار ہو رہے ہیں، اس کی اس واقعی حقیقت کے پس منظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو ٹیکوں کے پھیلانے کے لئے استعمال کرنا یا اس کے ذریعہ قرآن و سنت کی تعلیم دینا یا کسی تاریخی واقعہ کو اس کے ذریعہ بیان کرنا اور ان مقاصد سے فلمیں بنانا اور ویڈیو گرافی کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر ان مقاصد کے لئے ایسی فلمیں بنائی گئیں جن میں انسان یا کسی جاندار کی فلم نہیں بنائی گئی اور اس کی ویڈیو گرافی نہیں کی گئی تو اس کے جواز میں تو کسی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے؛ کیونکہ اگر ویڈیو کو تصویر کے حکم میں شامل بھی کرتے ہیں تو بھی یہ جائز ہے، جیسا کہ غیر ذی روح کی تصویر جائز ہے۔ لیکن اگر اس میں انسان یا کسی جاندار کی ویڈیو ریکارڈ کی گئی تو اس میں دو نقطہ نظر ہیں، اکثر حضرات اس کو تصویر کی ترقی یافتہ شکل مانتے ہیں اور وہ اسے ناجائز قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ جاندار کی تصویر کشی حرام ہے، چاہے وہ کسی آرٹسٹ کے قلم سے ہو یا موجودہ ترقی یافتہ کمروں سے ہو۔

لیکن ماضی قریب اور حال کے بہت سے محققین علماء کرام ویڈیو کی اصل حقیقت کے پیش نظر اس کو تصویر سے مختلف مانتے ہیں، اور اس کو مانند عکس قرار دیتے ہوئے جائز قرار دیتے ہیں اور ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تصویر ایسی صورت گری کا نام ہے جو کسی چیز پر مستقل طریقہ سے نقش ہو جائے، جیسا کہ دیوار یا کاغذ یا کپڑے پر ہوتی ہے، چنانچہ جامع الوسیط میں تصویر کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

صورة: جعل له صورة مجسمة، والشیء أو الشخص: رسمه على الورق أو الخائط ونحوهما بالقلم أو الفرجون أو بآلة التصوير (المعجم الوسیط: ماده: صورة ۱۰۵۲۸)۔

(”صورہ“: اس نے اس کی مجسم تصویر بنائی، اشیء، یا الشخص: اس نے اس کی تصویر کاغذ یا دیوار وغیرہ پر قلم سے یا برش یا آلہ تصویر سے بنائی)۔

اور ڈیجیٹل ویڈیو پر تصویر کی یہ تعریف منطبق نہیں ہوتی ہے؛ کیونکہ اس کی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی جماد اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا بلکہ جوں ہی اس کو متحرک کرنے والا آلہ بند کر دیا جاتا ہے اسکرین سفید ہو جاتی ہے، اور اس پر کوئی تصویر باقی نہیں رہتی، رہ گئی ہی ڈی یا میموری ڈسک یا میموری کارڈ جن کے ذریعہ صورتیں اسکرین پر آتی ہیں تو ان میں کوئی صورت نظر نہیں آتی اور نہ بالفعل صورت موجود رہتی ہے؛ بلکہ الیکٹرانک ذرات موجود ہوتے ہیں، جب انہیں متحرک کیا جاتا ہے تو وہ حرف یا شکلوں کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، جیسے دوات میں روشنائی رکھی ہو یہ تصویر نہیں ہے، لیکن یہ صورت گری میں استعمال کی جاسکتی ہے، یہی حال ان ذرات کا ہے جن کو مشینی حرکت دے کر صورتوں کی شکل دی جاتی ہے، غرض جو صورت نظر آتی ہے اس میں ٹھہراؤ نہیں اور اس سے پہلے جو کیفیت ہے اس میں صورت کا وجود نہیں ہوتا اور نہ اسے دیکھا جاسکتا ہے، اس لئے اس کی حیثیت عکس اور سائے کی ہے نہ کہ تصویر کی، چنانچہ مولانا برہان الدین سنہجلی صاحب لکھتے ہیں: ”ٹیلی ویژن پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ دراصل بجلی اور مشین کے ذریعے لے کر دکھایا جانے والا عکس یا ظل ہے، لہذا اس کا حکم وہی ہوگا جو اصل مناظر کا ہے“ (موجودہ زمانہ کے شرعی مسائل کا حل: ۱۳۵)۔

عالم عرب کے متعدد علماء کی بھی یہی رائے ہے اور وہ لوگ اس کو تصویر سے خارج مانتے ہیں، اور اس پر اس کے استعمال کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔

اس تفصیل کے مطابق چونکہ ڈیجیٹل ویڈیو مانند ظل اور مثل عکس ہے، اس لئے یہ جائز ہوگی، اور اس کی حقیقت تصویر کی حقیقت سے مختلف ہے اور تصویر کی تعریف اس پر منطبق نہیں ہوتی ہے، اس لئے تصویر کی ممانعت اور وعید میں یہ داخل نہیں ہوگی، اور جب ذی روح کی ویڈیو جائز ہے تو تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کے پیش نظر ایسی فلموں کی ویڈیو گرافی بھی جائز ہوگی جن میں ذی روح کی ویڈیو ریکارڈ کی جاتی ہے بشرطیکہ ان میں دیگر محرکات و منکرات نہ ہوں۔

اور اگر ویڈیو کو ظل یا عکس نہ مانا جائے بلکہ تصویر کی ترقی یافتہ شکل مانی جائے تو بھی تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کے تحت اس کے جواز کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ خود تصویر کے حرام ہونے کے باوجود بموقع ضرورت اس کی اجازت دی گئی ہے اور موجودہ دور میں جب کہ ٹکنالوجی کے عروج نے دنیا کو ایک بستی کے مانند کر دیا ہے اور اسلام دشمن طاقتیں غیر اسلامی ذہریلے مواد ان آلات نشر کے ذریعہ لوگوں تک آسانی سے پہنچا رہے ہیں اور علماء اور مصلحین کی ہزار ہا تقریروں اور نصیحتوں کے باوجود ٹیلی ویژن، ویڈیو پیلیئرس اور کمپیوٹرس ہر گھر کی زینت بن چکے ہیں جن میں لوگ ویڈیو وغیرہ دیکھتے ہیں، اور غیر اسلامی ویڈیو سے اپنے ذہن و دماغ کو بگاڑتے ہیں اور عقائد و اعمال کے حوالے سے شکوک و شبہات اور کوتاہیوں کے شکار ہوتے ہیں، اس بات کی یقیناً شدید ضرورت ہے کہ ان آلات کو اسلامی زبان دی جائے اور ان کے ذریعہ دینی استفادہ کی شکلیں لوگوں کے سامنے رکھی جائیں؛ کیونکہ یہ تو نہیں سکتا کہ ان آلات سے گھروں کو پاک کر دیا جائے، البتہ ان کے ذریعہ صحیح اسلامی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

لیکن دینی، تعلیمی اور دستاویزی ویڈیو اور فلموں کے جواز میں یہ شرطیں ملحوظ رہیں گی:

۱- اس میں کسی بھی مرحلہ میں کسی عورت کی ویڈیو اس کیفیت میں نہ ہو جس کیفیت اور حالت میں کسی عورت کا غیر محرم مردوں کے سامنے آنا حرام ہے، کیونکہ ویڈیو

۴۳۰ بننے کے بعد اس کو محرم اور غیر محرم دونوں دیکھیں گے، اجنبی مردوں کے سامنے عورتوں پر چہرہ کا پردہ لازم ہے، اس لئے اس میں کسی عورت کا چہرہ بھی کھلا ہوا نہ ہو، چہرہ کے پردہ کے سلسلہ میں علامہ محمود بن مازہ لکھتے ہیں:

إن المرأة منهية عن إظهار وجهها للرجال من غير ضرورة (المحيط البرهانی فی الفقه النعمانی ۵۰۶۳) (عورتوں کو بلا ضرورت مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے منع کیا گیا ہے)۔

۲- اس میں کسی عورت کی آواز ایسے لہجہ اور ترنم میں نہ ہو جو کسی سننے والے کے لئے باعث لذت بن سکے، اسی لذت کے اندیشہ کو ختم کرنے کے لئے قرآن نے عورتوں کو اجنبی لوگوں سے بات کرنے کا طریقہ یہ سکھلایا ہے:

ان اتقین فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض وقلن قولا معروفا (سورہ احزاب: ۳۲)۔

(اگر تم پر ہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات مت کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ برا خیال کرے اور ہاں قاعدہ کے مطابق کلام کرو)۔

۳- مرد کا لباس بھی ایسا ہو جو شرعاً ستر ہو، یعنی مرد کے جن اعضاء کا ستر لازم ہے وہ کھلے نہ ہوں۔

۴- اس میں کسی نبی یا صحابی یا بزرگان دین کی تمثیل نہ کی گئی ہو، اسی طرح اس میں کفار و مشرکین اور شیاطین کی بھی تمثیل نہ کی جائے۔

۵- اس میں کسی بھی قسم کے میوزک کا عنصر شامل نہ ہو، کیونکہ میوزک سننا سنانا حرام ہے۔

۶- قرآنی آیات، احادیث اور قصص انبیاء کے بیان کرنے میں ان کی عظمت کا بھرپور خیال ہو، کسی بھی پہلو سے توہین کا شبہ تک نہ ہو۔

۵- کارٹون بنانے کا حکم:

الف- موجودہ دور میں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے جو کارٹون بنائے جاتے ہیں، ان کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس طرف ہے، اور اس میں گرچہ کسی انسان کی صورت کی یعنی نقل نہیں اتاری جاتی بلکہ بگڑی شکل میں کسی انسان کو پیش کیا جاتا ہے لیکن تصویر کی حقیقت سے وہ خارج نہیں ہوتا؛ اس لئے کہ عموماً جو کارٹون ہوتے ہیں اس میں وہ سارے اعضاء موجود ہوتے ہیں جو کسی تصویر کے ممنوع ہونے میں بنیاد بنتے ہیں، مثلاً چہرہ، سر، پیٹ وغیرہ عموماً کارٹون میں موجود ہوتے ہیں، اس لئے یہ تصویر ہی کے حکم میں ہیں جس کی اسلام میں شدید حرمت بیان کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من صور صورة فان الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح و ليس بنافخ (بخاری: ۲۲۲۵)۔

(جس نے کوئی تصویر بنائی تو اسے اللہ عذاب دیتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونکے، اور وہ اس میں کبھی بھی روح ڈال نہیں سکتا)۔

ب- اور جب کارٹون اپنی حقیقت کے اعتبار سے تصویر کے حکم سے مختلف نہیں ہے تو اس کو پیشہ بنانا اور اس کی ملازمت کرنا ایسا ہی حرام ہوگا جیسا کہ صورت گری اور فوٹو گرافی کو پیشہ بنانا اور اس کی ملازمت کرنا حرام ہے؛ کیونکہ ایسے عمل کو پیشہ بنانا درست نہیں ہے جو حرام ہو اور اس پر شدید وعید وارد ہوئی ہو، تصویر سازی کرنے والوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: إن أشد الناس عذابا عند الله يوم القيامة المصورون (بخاری: ۵۶۰۶) (قیامت کے دن اللہ کے پاس سب سے سخت عذاب میں مبتلا ہونے والے وہ لوگ ہیں جو تصویر سازی کرتے ہیں)۔

☆☆☆

## سیاحت و تفریح سے متعلق شرعی احکامات

مولانا محمد یوسف علی ؒ

شریعت میں مزاح کے حدود:

جہاں تک روایات حدیث کا تعلق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح کا جواز چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اگر شرائط کا لحاظ کیا جائے تو مزاح جائز ہے ورنہ ناجائز، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے مزاح کرنا منقول و ثابت ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا مزاح شریعت کے دائرہ میں ہوتا تھا، نہ اس میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی نہ اس میں کوئی ایسی بات ہوتی جس سے دوسروں کو تکلیف ہو، نہ مبالغہ ہوتا اور نہ اس کو مشغلہ بناتے کہ ہر وقت مزاح ہی کرتے ہوں، بلکہ گاہ بگاہ تائیس و تالیف کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرماتے تھے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت انسؓ کو ایک مرتبہ ”یا إذا الأذنین“ سے اور انسؓ کے بھائی کو ”یا أبا عمیر! ما فعل النخیر“ سے خطاب فرمانا اسی قبیل سے ہے، اس کے علاوہ اور بھی مختلف روایات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح اور دل لگی کرنا ثابت ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں جھوٹ اور مبالغہ کی آمیزش نہ ہوتی تھی، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے:

”قالوا: یا رسول اللہ ﷺ انک تداعبنا قال: إني لا أقول إلا حقاً“ (تداعبنا یعنی تمازحنا) (ترمذی؛ باب ما جاء فی صفة مزاح رسول اللہ ﷺ)۔

ہاں! اگر ہر وقت مزاح کو مشغلہ بنائے ہوئے ہو کہ ہر وقت ہنسی مذاق کی بات کرتا رہے اور لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ کہنے سے بھی گریز نہ کرے تو ایسا مزاح جائز نہیں، جیسا کہ روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ویل للذی یحدث بالحديث لیضحک بہ القوم فیکذب، ویل له ویل له“ (رواہ الترمذی عن بہزین حکیم باب ما جاء من تکلّم بالکلمة لیضحک الناس)۔ (ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو کوئی ایسی بات کہے جس سے لوگوں کو ہنسانے بس جھوٹ بولے ہلاکت ہے ہلاکت ہے اس کے لئے)۔

”لا تکثر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (ترمذی ۲۰۵۶)۔

علامہ نووی نے اس بارے میں فرمایا: ”اعلم أن المزاح المنہی عنه هو الذی فیہ إفراط و یداوم علیہ فإنہ یورث الضحک وقسوة القلب ویشغل عن ذکر اللہ والفکر فی مهمات الدین ویؤول فی کثیر من الأوقات إلى الإیذاء ویورث الأحقاد ویسقط المہابة والوقار، فأما ما سلم من هذه الأمور فهو المباح الذی کان رسول اللہ ﷺ یفعله علی البندرة لمصلحة تطیب نفسن المخاطب وموانسته وهو سنة مستحبة فاعلم هذا فإنہ مما یعظم الاحتیاج الیہ“۔

نیز کثرت مزاح اور اس کا مشغلہ بعض مرتبہ بغض و عداوت کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے جس مزاح سے ایذا ہو وہ جائز نہیں، اس لئے کہ ایذا مسلم حرام ہے اور جس مزاح سے دوسرے کی تحقیر لازم آئے وہ بھی ممنوع ہے۔ آیات و روایات میں تحقیر مسلم کی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: ”لا یسخر قوم من قوم“۔

الحاصل جہاں تک حق بات ہو غلط نہ ہو کسی کا تسخر نہ ہو، حد اعتدال سے تجاوز نہ ہو، ایسی دل لگی سے کوئی مضائقہ نہیں (کذا فی الرقاة شرح مشکوٰۃ ۱۰۵۰۹، الکوکب الدرّی ۲۵۰۲)۔

ب، ج، د، ہ۔ جہاں تک ان سوالات کا تعلق ہے کہ تفریح و طبع کے واسطے مزاحیہ پروگراموں اور مشاعرہ منعقد کرنا، مزاحیہ کہانیاں لکھنا، اور شائع کرنا، اس کو پیشہ

۱۔ مہتمم مدرسہ دیورائیل ٹائٹل، بدر پور، کریم گنج، آسام۔

بنا کر اجرت حاصل کرنا اور اس قسم کے ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا، یہ تمام امور خصوصاً دور حاضر میں مختلف مفاسد اور حرام چیزوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام معلوم ہوتا ہے، مثلاً ان چیزوں کا اول مقصد ہنسنا ہنسانا ہی ہوتا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے لقولہ تعالیٰ: "فلیضحکوا قليلاً ولیبکوا کثیراً"۔

نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "لا تکثر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب" (ترمذی ۲۰۵۶)۔

یہ چیزیں ذکر اللہ سے رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں، اور یہ بشارہ آیت قرآنی حرام ہے، قال تعالیٰ: "ومن الناس من یشتري لهو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ... أولئك لهم عذاب مهین" (سورہ لقمان)۔

نیز ان چیزوں سے اکثر تفریح اوقات و مال اور اسراف لازم آتا ہے، اور یہ سب بخش قرآن و احادیث حرام ہے، کقولہ تعالیٰ: "لا تسرفوا إن اللہ لا یحب المسرفین"۔

مذکورہ قاعدہ کی رو سے مطلوبہ مسائل مذکورہ تمام مفاسد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، نیز ان چیزوں کو مشغلہ اور پیشہ بنا کر اجرت حاصل کرنا ممنوع ہونے کے بارے میں شامی میں ہے: "من السحت ما یؤخذ علی کل مباح کملح وکلاً وماء و معادن وما یأخذہ غاز لغزو وشاعر لشعر و مسخرة و حکواتی، قال تعالیٰ: ومن الناس من یشتري لهو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ" (درمختار ۹۰۶۰۵)۔

۱- ڈاکٹروں کی رائے اور ہنسنے ہنسانے کے پروگراموں کا شرعی موقف:..... ہنسانے کا پروگرام مذکورہ بالا امور منہی عنہ اور مفاسد پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، لہذا ڈاکٹر کی رائے کے مطابق انسانی صحت کی برقراری اور اس کو شیط و چست رکھنے کے لئے مزاحیہ پروگراموں کے نسخہ میں اگر نفع اور فائدہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ نفع "شہما اکبر من نفعہما" کے درجہ میں ہونے کی وجہ سے ایسا نسخہ قابل ترک ہے، کتب فقہ میں تصریح ہے کہ جب کسی معاملہ میں نفع اور ضرر دونوں جمع ہو جائے تو جلب نفع کو چھوڑ کر دفع ضرر پر عمل کرنا ضروری ہے، چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے: "الضرر یزال"، "درء المفاسد اولی من جلب المنافع" (الاشباہ والنظائر ۹۱)۔

## ۲- کھیل کود کی شرعی حیثیت:

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ زندگی گزارنے کے لئے انسان کو جتنی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ریاضت بدنی، خوش طبعی اور تفریحی اوقات کو ایک اہم درجہ حاصل ہے، اسی بنا پر حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "روحوا القلوب ساعةً فساعة" (رواہ ابو داؤد فی مراسیله) وکذا روی عن النبی ﷺ أنه قال: "الہوا والعبوا فإنی أکره أن أری فی دینکم غلظة" (رواہ البیہقی)، "عن عائشة رضی اللہ عنہا أن النبی ﷺ قال: هل کان معکم من لہو؟ فإن الأنصار یحبون اللہو" (رواہ المحکم)۔

اس قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت مطہرہ میں تفریح قلب اور جسمانی ورزش کی بھی اجازت دی گئی ہے، لیکن شریعت محمدیہ ایک معتدل شریعت ہونے کی وجہ سے اس کی ہر چیز میں اعتدال کی رعایت کی گئی ہے، اس لحاظ سے تفریح قلب اور جسمانی ورزش کے لئے کھیل کود میں بھی اعتدال ملحوظ رہنا چاہئے، پس بعض اہول و لعب کو بعض وقت کے لئے حلال قرار دیا گیا ہے، کیونکہ نیت صحیحہ کی وجہ سے یہ چیزیں اہول و لعب نہیں رہتی، بلکہ مفید لاجسام ہو جاتی ہے، لیکن اگر ان چیزوں میں منہمک ہو جانے کی وجہ سے معاشی زندگی اور اخروی مقاصد میں خلل پیدا ہو جائے تو یہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، اسی نظریہ سے احادیث میں سیاحت، رمایت، انتضال بالقوس اور مسابقتہ بالابل و اہمہائم وغیرہ بعض اہول و لعب کو بعض فوائد کی وجہ سے مباح قرار دیا گیا ہے، لیکن اگر یہ چیزیں صرف اہول و لعب ہی کی نیت سے کی جائے تو یہ حرام اور مکروہ ہے۔

## شرعی ضابطہ:

فقہاء کرام کی عبارات سے کھیل کود کے بارے میں شرعی ضابطہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیل جس میں نہ کوئی دینی فائدہ ہو اور نہ کوئی دنیوی فائدہ وہ بالا جماع حرام یا مکروہ تحریمی ہے، اور جس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ ہو وہ دو طرح کے ہیں: ایک تو یہ کہ جن کے بارے میں شریعت میں نہی وارد ہوئی ہو وہ بھی بالا جماع حرام ہے، جیسے زرد شیر اور شترنچ کا کھیل۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "من لعب بالنرد شیر فکانما صبع یدہ فی لحم خنزیر ودمہ" (مسلم شریف)۔



عالمگیری میں ہے: ”ویکره اللعب بالشطرنج والنرد شیر... وأما الشطرنج فاللعب به حرام عندنا“ (۵،۲۵۲)۔

”ویکره تحزیماً عند الحنفیة اللعب بالنرد والشطرنج۔ الخ“ (کتاب الفقہ ۲،۲۲)۔

دوسری قسم: یعنی وہ کھیل جس کے بارے میں نہی وارد نہ ہوئی ہو۔

پس شرعی نقطہ نظر سے اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

- ۱- جس میں نفع سے ضرر زیادہ ہو اور تجربہ سے معلوم ہو کہ اس میں مشغول ہونے والا نماز اور ذکر اللہ وغیرہ دینی امور سے غافل ہو جاتے ہوں تو یہ قسم ”اہمہما اکبر من نفعہما“ کے قاعدہ کی رو سے اور نہی عنہ کھیل کے ساتھ علت میں مشترک ہونے کی وجہ سے یہ قسم بھی حرام یا مکروہ تحریمی ہوگی۔
- ۲- جن کھیلوں میں نفع زیادہ ہو کہ اس میں کوئی دینی یا دنیوی نفع موجود ہو اور شریعت میں اس کے بارے میں نہی وارد نہ ہوئی ہو، ایسے کھیل کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ان سے مقصد صرف لہو و لعب ہی ہو تو مکروہ ہے اور اگر ان سے وابستہ مفادات کو حاصل کرنے کی نیت سے کھیلا جائے تو مباح ہے بلکہ بسا اوقات اس کا درجہ استحباب تک پہنچ جاتا ہے یا اس سے بھی بڑھ جاتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ”الفقہ علی المذاهب الاربعہ“ میں حنفی نے فرمایا: ”... وإنما يجوز کل ذلك بشرط قصد الرياضة وتقوية البدن لا بقصد التسلية وقطع الوقت“ (الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲،۵۰)۔

## ب- کھلاڑیوں کے لباس و پوشاک:

لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے ان تمام امور کی رعایت ضروری ہے جو عام طور پر لباس پہننے میں کی جاتی ہے کہ اولاً یہ لباس ساتر عورت ہو یعنی ناف سے گھٹنے تک چھپائے ہوئے ہو۔

”اعلم أن الكسوة منها فرض وهو ما يستر العورة“ (رد المحتار ۹،۵۰۵ زکریا)۔

نیز یہ لباس ریشم کا نہ ہو، تنویر الابصار میں ہے: ”یحرم لبس الحریر ولو بجائل علی المذہب“ (تنویر الابصار ۹،۵۰۶ زکریا) حدیث میں ہے: ”إنما نهي النبي ﷺ عن الثوب المصمت من الحریر الخ“ (رواہ ابن عباس، رد المحتار ۹،۵۰۶)۔

## ج- مروجہ کھیلوں کا شرعی حکم:

دور جدید میں مختلف قسم کے کھیل ایجاد ہو گئے ہیں جن میں سے کرکٹ، ٹینس، ہاکی، گیند، ریسنگ مشہور ہیں، ان سب کھیل کے بارے میں تجربہ شاہد ہے کہ خصوصاً دور حاضر میں یہ سب کھیل لہو و لعب ہی کی نیت سے کھیلے جاتے ہیں اور عام طور پر کھیل دیکھنے یا کھیلنے کے وقت نماز وغیرہ دینی امور کا خیال نہیں رکھا جاتا، لہذا (الف) کے تحت بیان کردہ ضابطہ کے مطابق دور حاضر کے تمام کھیلوں کو حرام کہنا ہی اولیٰ ہے۔

الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں ہے: ”وإنما يجوز کل ذلك بشرط قصد الرياضة وتقوية البدن لا بقصد التسلية وقطع الوقت“ (۲،۵۰) اس اصول کی بنا پر سوال (ہ) کے بارے میں کہا جائے گا کہ جو کھیل لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو ایسے کھیل قطع الوقت اور تضييع اوقات کی وجہ سے حرام ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

## د- کھیل کی جیت ہار میں پیسے کی شرط:

کھیل کی جیت ہار میں پیسے کی شرط لگانے میں اگر قمار، مخاطرہ، یا میسر کی صورت پیدا ہو جائے تو ایسی شرط حرام ہے اور ایسا کسب کسب خبیث ہے، مخاطرہ اس کو کہا جاتا ہے کہ ایسا معاملہ کرنا جو نفع اور ضرر کے درمیان دائرہ یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت ساماں مل جائے اور یہ بھی احتمال ہو کہ کچھ نہ ملے، اور میسرہ یا قمار اس کو کہا جاتا ہے کہ کسی معاملہ میں کسی مال کے مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں اور اسی بنیاد پر نفع خالص یا تادان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں برابر ہوں، جیسے تجارتی لائٹی کی عام صورتیں، اس لحاظ سے فقہاء کرام نے فرمایا کہ کھیل کی جیت ہار میں اگر کھلاڑیوں کی دو پارٹی ہو اور دونوں پارٹی کی طرف سے پیسہ مقرر کیا جائے تو یہ قمار کی صورت ہونے کی وجہ سے حرام ہے، ہاں! اگر صرف ایک جانب سے یا کسی

تیسرے شخص کی جانب سے پیسہ کی شرط ہو یا جانبین سے تو پیسہ کی بازی ہو لیکن ان دونوں کے درمیان اگر تیسرا شخص بغیر پیسہ کی شرط کے مسابقہ میں شامل ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں معاملہ نفع اور ضرر کے درمیان دائر نہیں ہوتا، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہوتا ہے، اس کے جواز میں فقہاء کی عبارات مندرجہ ذیل ہیں:

”لا بأس بالسابقة في الرمي والفرس والإبل والاقدام حل الجعل إن شرط المال من جانب واحد، وحرم لو شرط من الجانبين إلا إذا أدخل ثالثاً بينهما“ (تنوير الابصار ۹۵۷۷)۔

قوله: ”من جانب واحد أو من ثالث، بأن يقول أحدهما لصاحبه: إن سبقتني أعطيتك كذا وإن سبقتك لا آخذ منك شيئاً، أو يقول الأمير لفارسين أو راميين: من سبق منكما فله كذا وإن سبق فلا شيء له“ (رد المحتار ۹۵۷۷)، ”إلا إذا أدخل ثالثاً محلاً بينهما بفرس كفاً لفرسيهما يتوهم أن يسبقهما وإلا لم يجز ثم إذا سبقهما أخذ منهما وإن سبقاه لم يعطهما وفيما بينهما أيهما سبق أخذ من صاحبه“ (الدر المختار ۹۵۷۸)۔

و- کھیل دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا:

اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ جواب (الف) کے تحت بیان کردہ ضابطہ کے مطابق جو کھیل کھیلنا مباح ہے، اس کو دیکھنا اور اس کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی مباح ہوگا اور جو کھیل حرام یا مکروہ تحریمی ہوگا ان کے لئے ٹکٹ خریدنے میں تعاون علی الاثم لازم آنے کی وجہ سے ٹکٹ خریدنا اور دیکھنا بھی حرام ہوگا، جیسا کہ کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں ہے: ”ویجرم نطاح الكباش وصرع البقر ومهارشة الديكة ونحو ذلك مما فيه تعذيب للحيوان وضياع للوقت بدون فائدة تعود على الإنسان، ومن اتخذ ذلك وسيلة لكسب المال من ضعاف العقول وفاسدى الأمزجة كان كسبه خبيثاً“، ”وكل ما يحل فإن الفرجة عليه تحل أما ما لا يحل فإنه يجرم مشاهدته والتفرج عليه“ (الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۳۰۵۰)۔

پس معلوم ہوا کہ حرام کھیل کو وسیلہ بنا کر جو مال کسب کیا جاتا ہے، وہ مال مال خبیث اور حرام ہے، اور قاعدہ ہے: ”ما حرم أخذہ حرم إعطائه“ (الاشباہ ۱۰۸۵)، لہذا حرام کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسہ خرچ کرنا اور ٹکٹ خریدنا حرام ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔



## سیر و تفریح سے متعلق شرعی ضابطے

مولانا محمد عمران ندوی علیہ

سوال: ۱- الف - کیا شریعت میں مزاج جائز ہے، اور اگر جائز ہے تو اس کے حدود کیا ہیں؟

لفظ مزاج کی تحقیق اور اس کے حدود:

لفظ مزاج اپنی حد خود ہی بیان کرتا ہے، اس لئے کہ ”مزاجاً“ باب مفاعله کا مصدر ہے، مزاج یمازح مزاجاً و ممازحہ، ہنسی مذاق کرنا، اور باب مفاعله کی ایک خاصیت تشارک بھی ہے جس کو الاستاذ شیخ احمد الحملاوی نے اپنی مشہور کتاب شذ العرف میں یوں بیان کیا ہے: ”التشارک بین اثنتین فأكثر وهو أن يفعل أحدهما بصاحبه فعلا فيقابله الآخر بمثله، وحينئذ فينسب للبادی نسبة الفاعلية، وللمقابل نسبة المفعولية“ (شذ العرف ۲۸)۔

(دو یا دو سے زائد لوگوں کا اشتراک اور وہ اس طرح کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ کوئی فعل کرتا ہے تو دوسرا شخص پہلے والے کے ساتھ وہی فعل دہرائے، لہذا اس وقت فعل شروع کرنے والے کی طرف فاعل کی نسبت کر دیتے ہیں اور مقابل کی طرف مفعول کی نسبت کر دیتے ہیں)۔

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مزاج میں دونوں فریق برابر کے شریک ہوتے ہیں، اور دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ابتداء ایک کی طرف سے ہوتی ہے، دوسرے بعد میں شریک ہو جاتے ہیں، یہی اس کی حد بھی ہے لیکن جب یہ مزاج ایک طرف ہو جائے اور سامنے والے کو تکلیف دینے لگے تو یہ مزاج کی حد سے نکل کر سخریہ (مذاق اڑانے) کی سرحد میں قدم رکھ دیتا ہے، جیسا کہ ملا علی قاری اپنی کتاب مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں رقمطراز ہیں، وہ فرماتے ہیں: ”انبساط مع الخیر من غیر ایذاء فإن بلغ الإیذاء یكون سخریة“ (مرقاۃ ۹۰۱۰۵، کتاب الآداب، باب السزاج) (دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا ایذا پہنچانے بغیر اگر ایذا پہنچنے کی تو وہ مذاق اڑانا ہے)۔

اور سخریہ کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسی أن یکونوا خیرا منهم ولا نساء من نساء عسی أن یکن خیرا منهن“ (حجرات: ۱۱) (اے ایمان والو! تمہارا کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے وہ مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہو، اسی طرح عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں، ممکن ہے وہ مذاق اڑانے والیوں سے بہتر ہوں)۔

دوسری چیز جو مزاج کے جواز کے لئے ضروری ہے وہ ہے غلط بیانی سے اجتناب، اس لئے کہ نبی پاک ﷺ کا پاک ارشاد ہے:

”عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قالوا یا رسول اللہ! انک تداعبنا قال: انی لا أقول إلا حقاً“ (رواه الترمذی؛ مشکوٰۃ ۲۰۴۱۶) (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں صحابہ کرام نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! آپ ہم سے کسی مذاق فرماتے ہیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں مذاق میں بھی حق بات ہی کہتا ہوں)۔

گویا کہ صحابہ کرام نے آپ کی شان کے منافی سمجھا تھا مذاق کو، جس کی آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی۔

مذکورہ شرائط کا خیال رکھتے ہوئے مزاج جائز ہوگا، جیسا کہ ہمارے نبی ﷺ کا مزاج مذکور ہے۔

اب بات رہی سوال نمبر کے ”ذ“ کی یعنی بہ تکلف تہقیر لگانے کی محفلوں کا انعقاد اور بیٹھ کر دیر تک ہنستے رہنا، یہ تو ایک عبث فعل ہے، جس کی شریعت میں گنجائش نہیں، اس لئے کہ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: ”ولا تکسر الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (رواه الترمذی؛

باب من التقی المحارم فهو عبد الناس، رقم: ۲۲۰۵) (آپ ﷺ نے فرمایا زیادہ نہ ہنسنا اس لئے کہ اس سے دل مرجاتا ہے)۔

سوال نمبر ۲، الف - کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے کیا اصول ہیں؟

کھیل کے تعلق سے بنیادی بات ذہن میں یہ رکھنی چاہئے کہ کھیل فی نفسہ نہ تو محمود ہیں اور نہ مقصود ہیں، اصل چیز ورزش ہے، اس لئے کہ انسانی صحت پر ورزش کے کافی خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان چست اور شاداب رہتا ہے، اس کے تمام اعضاء صحیح ڈھنگ سے کام کرتے ہیں جب کھیل کا مقصد اصلی ورزش ٹھہرا تو جس کھیل میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ورزش ہو جائے تو وہ اچھا مانا جائے گا، جیسے فٹ بال، باسکٹ بال، والی بال اور ہاکی وغیرہ، پھر مسلمان ہونے کی وجہ سے حسب موقع ہم پر جہاد فرض ہوتا ہے، لہذا وہ کھیل جس کے اندر کھیل کے ساتھ ساتھ جہاد کی تیاری بھی ہو جائے تو پھر وہ سب سے اچھا شمار کیا جائے گا بلکہ وہ تو عبادت کا درجہ حاصل کر لے گا جیسے نشانہ بازی، گھوڑ سواری، تیراکی اور کشتی وغیرہ۔

ب - لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

جواب: لباس و پوشاک کے سلسلہ میں اسلام زیادہ تنگی کرنے کے حق میں نہیں ہے، وہ لباس کے کسی خاص شکل کو مخصوص نہیں کرتا، بلکہ وہ تو ایک Universal Religion ہے، لہذا اس کے اندر تمام دنیا کے لباسوں کی گنجائش ہونی چاہئے، لہذا اسلام لباس کے متعلق چند موٹے موٹے اصول فراہم کر کے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔

۱- لباس ستر کو چھپانے کا کام کرے نہ کہ نمایاں کرنے کا۔

۲- مرد لباس میں عورتوں کی مشابہت نہ کریں اور نہ ہی عورتیں مردوں کی مشابہت کریں۔

۳- مردوں کے لئے قید ہوگی کہ کپڑاٹخنوں سے نیچے نہ آئے۔

۴- مرد ریشمی کپڑے سے اجتناب کریں، لہذا مرد کھلاڑیوں کے لئے اپنے ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصہ کو چھپانا ضروری ہوگا، باقی میں ان کو اختیار ہوگا۔

ج- شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے جائز ناجائز اور مستحب و مکروہ کی نشاندہی۔

مستحب کھیلوں کی فہرست:..... (۱) نشانہ بازی، (۲) گھوڑ سواری، (۳) تیراکی، (۴) کشتی، (۵) دوڑنا، (۶) کراٹہ، (۷) کبڈی، (۸) کھوکھو۔

جائز کھیلوں کی فہرست:..... (۱) فٹ بال، (۲) والی بال، (۳) باسکٹ بال، (۴) ہاکی، (۵) بیٹمنٹن، (۶) لانگ چپ، (۷) ہائی چپ، (۸) گولہ پھینکانا۔

مکروہ کھیلوں کی فہرست:..... (۱) ویڈیو گیم، (۲) لوڈو، (۳) کیرم بورڈ، (۴) تاش، (۵) اسکیننگ، (۶) کرکٹ۔

ناجائز کھیلوں کی فہرست:..... (۱) شطرنج، (۲) ڈبلیو ڈبلیو ایف، (۳) باسنگ۔

۵- جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہو جاتا ہو تو ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: غالباً سوال میں کرکٹ کی طرف اشارہ ہے تو اس کے تعلق سے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ کھیل ہی نہیں ہے یہ تو کمپنیوں کے پروڈکشن کے اشتہار بازی کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ سب سے زیادہ موقع اشتہار کے لئے اسی میں ملتا ہے۔

سوال نمبر ۳: موجودہ دور میں سیاحت:

الف - تفریحی مقصد کے لئے سیاحت کرنا جبکہ اس میں کثیر رقم کا صرفہ بھی ہوتا ہے۔

جواب: تفریحی مقصد کے لئے سیاحت پر حرمت کے فتوے تو نہیں دیئے جاسکتے اس لئے کہ قرآن کریم کا حکم موجود ہے، "سیدوا فی الأرض۔"

ب - بعض علاقوں میں جان و مال اور عزت و آبرو کا خطرہ ہوتا ہے ایسی جگہوں پر بال بچوں کو لے کر جانا کیسا ہے؟

جواب: سیاحت کرنا مباح ہے اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت فرض ہے، لہذا مباح پر فرض کو ترجیح دیں گے۔

ج- سیاحت پر آنے والوں کے لئے سواری فراہم کرنا اور اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: سیاحت پر آنے والے حضرات کو چاہے جس نیت سے بھی آئیں وہ ہمارے مہمان ہیں اور مسلمانوں پر مہمان نوازی ضروری چیز ہے، لہذا ان کے لئے مناسب قیمتوں پر چیزوں کو فراہم کرنا ایک مسلمان کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

د- ٹورا اور ٹراپول کمپنیاں قائم کرنا؟

عام طور پر ہمارے جو ہندو بھائی مندروں، تیرتھ گاہوں پر جاتے ہیں ان کے اندر ایک پیاس اور خدا کو پالنے کی تمنا ہوتی ہے، اور وہ اپنے مذہب کے متعلق سنجیدہ ہوتے ہیں اور مذہبی بات سننے کو تیار بھی ہوتے ہیں، اگر یہ ٹورا والے گائڈ کی شکل میں ہر ٹرپ کو ایک ایک داعی فراہم کر دیں جو ان کو متعلقہ مقامات کے گائڈس کے ساتھ ساتھ مذہب کی صحیح تعلیم سے آگاہ کرتے رہیں اور حکمت کے ساتھ اسلام کے قریب کرتے رہیں تو بہت بڑا کام ہو جائے۔

سوال نمبر ۴۲، مذکورہ اور تعلیمی مقاصد کے لئے فلمیں بنائی جاسکتی ہیں؟ تو ان کے شرائط کیا ہوں گے؟

سوال نمبر ۵، الف: کیا کارٹون بنانا جائز ہے یا اس کا بھی شمار تصویر میں ہوگا؟

ب- تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

ان دونوں سوالوں کے جواب سے پہلے تھوڑی بات تصویر کے تعلق سے عرض کرنا مناسب ہوگا اور بات بھی ذرا واضح ہو جائے گی۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابو طلحہ انصاری، حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے صریح صحیح احادیث، بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے گھروں میں تصویروں کے لٹکانے سے منع فرمایا اور مصوروں کے لئے سخت سے سخت تہدیدیں الفاظ فرمائے، چونکہ تمام کتب حدیث میں ایک ہی قسم دہنی کی سب حدیثیں ہیں اس لئے صرف چند احادیث جن سے تصویروں کے متعلق مطلقاً امتناعی احکام مفہوم ہوتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- "قال رسول اللہ ﷺ: إن أشد الناس عذاباً يوم القيامة المصورون" (بخاری و مسلم) (آنحضرت ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے بڑا عذاب مصوروں کو ہوگا)۔

۲- "قال رسول اللہ ﷺ الذين يصنعون الصور يعذبون يوم القيامة يقال لهم: أحيوا ما خلقتم" (مسلم و بخاری) (آپ ﷺ نے فرمایا: جو تصویر بناتے ہیں قیامت میں ان پر عذاب ہوگا، ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے پیدا کیا ہے اس میں روح چھوگو)۔

صحاح میں ان معنوں کی اور بھی حدیثیں ہیں جن میں الفاظ کا گو کسی قدر اختلاف ہے لیکن مطلب سب کا یہی ہے، ان کے علاوہ ایسی حدیثیں بھی ہیں جن میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ جس گھر میں کوئی تصویر یا مجسمہ ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، ایسی بھی حدیثیں ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ جہاں تصویروں کو دیکھتے تھے ان کو بگاڑنے کا حکم فرماتے تھے، یہ تمام حدیثیں صحاح ستہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

لیکن ان کے برخلاف ان کے مقابل میں ایسی بھی حدیثیں ہیں جن میں بعض خاص قسم کی تصویریں حرمت سے مستثنیٰ کر دی گئی ہیں، بعض حدیثوں میں ہے کہ صحابہ کے گھروں میں یا استعمال میں ایسے فرش یا کپڑے تھے جن میں تصویریں بنی تھیں، حالانکہ تصویروں کی ممانعت کا حال انہیں معلوم تھا۔ متعدد صحابہ سے روایت ہے کہ غیر ذی روح کی تصویر منع نہیں، اسی طرح کپڑے میں تصویر ہو تو اس کا استعمال جائز ہے، اب اس موقع پر پہنچ کر، روایت اور تحدیث کے علاوہ فہم، فقہ اور استنباط کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ائمہ حدیث اور فقہاء مجتہدین نے دونوں طرح کی روایتوں میں تطبیق کس طرح دی ہے۔

علامہ بدر الدین عینی بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں: ابتداء شارح نے ہر قسم کی تصویروں کو گو وہ نقش ہی کیوں نہ ہوں، اس لئے منع کیا کہ اہل عرب کو اصنام پرستی چھوڑے ہوئے بہت ہی کم زمانہ گزرا تھا اس بنا پر جملہ تصاویر منع کی گئیں، لیکن جب ممانعت ان کے دلوں میں خوب گھر کر گئی تو کپڑے میں جو نقش ہو تصویر ہو وہ ضرورہ جائز کر دی گئی، بس جو تصویریں محل عظمت میں نہ ہوں ان کو مباح کر دیا، کیونکہ جاہل سے بھی یہ خطرہ نہیں ہے کہ جو چیز ذلیل سمجھی جائے اس کی وہ تعظیم کرے، ممانعت ان تصویروں میں باقی رہی جو محل عظمت میں ہوں۔

سوال نمبر ۶: ذرا غیر اخلاقی مقاصد کے لئے بھی کیا جاسکتا ہے اور بہتر مقاصد کے لئے بھی، لیکن اس میں جو کچھ کہا جاتا ہے یا ذراہ میں شامل مختلف

لوگوں کے درمیان جو رشتے ظاہر کئے جاتے ہیں وہ عام طور پر فرضی ہوتے ہیں، البتہ سنا معین کو اس سے دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ بھی اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرے کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں؟

جواب: اچھے کاموں کی ترغیب کے ساتھ ساتھ تفریح و طبع کے لئے بھی ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں، اور اس کی مثال عہد نبوی میں ملتی ہے بلکہ حضور پاک ﷺ کا اسوہ موجود ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں وہ فرماتی ہیں: ”واللہ لقد رأیت النبی ﷺ یقوم علی باب حجری والحبشة یلعبون بالحراب فی المسجد ورسول اللہ ﷺ یسترنی بردائه لأنظر إلی لعبهم بین أذنه وعاتقه ثم یقوم من أجلي حتی أكون أنا التي أنصرف فاقدروا قدرًا لجارية الحدیفة السن الحریصة علی اللہو“ (متفق علیہ؛ مشکوٰۃ باب عشرة النساء وما لکل واحد من الحقوق ۲۸۰)۔

مذکورہ بالا حدیث کے اندر ہمارے لئے رہنمائی کا بہت سارا سامان موجود ہے، نمبر وار عرض کرتا ہوں:

- ۱- یہ حدیث ڈرامہ کے لئے جواز فراہم کرتی ہے اور فرضی رشتے کے اظہار پر دلیل فراہم کرتی ہے۔
  - ۲- ایسے پروگرام دیکھنے اور پردے کے اہتمام کے ساتھ گھر کی عورتوں کو دکھانے کا بھی جواز فراہم ہوتا ہے۔
  - ۳- ایسے پروگرام کافی دیر تک چلائے جاسکتے ہیں، اس لئے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کھیل کود دیکھنے کے شوقین ہونے کے باوجود اتنا دیکھیں کہ اکتا گئیں اور لوٹ گئیں، ظاہر بات ہے کہ شوقین آدمی اپنی مرغوب چیز سے دس بیس منٹ میں اکتا نہیں ہے، بلکہ گھنٹوں بعد ہی اکتائے گا۔
  - ۴- حضرت عائشہ کا حکم ہے کہ اپنی کم سن عورتوں کو اس طرح کے کھیل تماشے دکھایا کرو، اس لئے کہ یہ کام تقویٰ کے منافی نہیں ہے، دیکھو آپ ﷺ نے میرے لئے کتنی زحمت گوارا کی جبکہ آپ سے بڑا کوئی متقی نہیں ہو سکتا۔
  - ۵- آپ کی موجودگی میں مسجد یا مسجد کے صحن میں ایسے پروگرام کا انعقاد اس بات پر سند جواز فراہم کرتا ہے کہ اس طرح کے فائدہ مند کھیل اور ڈرامے اسٹیج کرنا اس لہو و لعب میں شامل نہیں جس پر وعیدیں آئی ہیں۔
  - ۶- صرف تفریح کے لئے بھی اس طرح کے پروگرام دیکھے جاسکتے ہیں، اس لئے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا دیکھنا جنگی مہارت کے مقصد سے تو نہیں ہو سکتا بلکہ تفریح و طبع کے لئے تھا، جس پر حدیث کے الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں۔
- نیز حضرت زاہر بن حرام والی حدیث کو بھی فرضی رشتہ کے اظہار پر دلیل بنایا جاسکتا ہے، کہ آپ ﷺ نے حضرت زاہر کو غلام بنا دیا حالانکہ وہ آزاد تھے اور اس بات سے کبھی واقف تھے۔

لہذا ان احادیث کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں۔



## تفریح کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

مولانا محمد عفتان منصور پوری

۱- الف - مزاج یعنی دل لگی، ہنسی مذاق، خوش طبعی شریعت کی رو سے جائز عمل ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات اپنے رفقاء اور ازواج مطہرات کے ساتھ خوش طبعی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی نے ایک بیٹا پال رکھی تھی جس سے وہ کھیلا کرتے تھے اسکو عربی زبان میں ”نغیر“ کہتے ہیں، اتفاق سے وہ مینا گرگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاج فرمایا: ”یا ابا عمیر ما فعل النغیر“ (ترمذی شریف: ۴۸۴، بخاری شریف حدیث ۶۱۲۹)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک صاحب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے سواری عطا کیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ دے سکتا ہوں، وہ صاحب پریشان ہوئے اور کہنے لگے میں اونٹنی کا بچہ لیکر کیا کرونگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اونٹ بھی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ ”عن أنس أن رجلا استحمل رسول الله ﷺ قال: إني حاملت علي ولد ناقه، فقال يا رسول الله! ما أصنع بولد الناقه، فقال رسول الله ﷺ: وهل تلد الإبل إلا النوق؟“ (ترمذی شریف: ۴۸۴/۱۹۹۲)۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ مزاج جائز ہے، لیکن یہ صرف تفریح اور سکون قلب کی حد تک جائز ہے، کثرت اور مداومت اس میں بھی ممنوع ہے، مداومت کا مطلب یہ ہے کہ دل ہمیشہ کھیل اور ہنسی میں لگا رہے، لہذا مزاج میں مبالغہ نہ ہونا چاہئے کیوں کہ اس سے ہنسی زیادہ آتی ہے، زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے: ”وعن أبي هريرة في حديث طويل ولا تكسر الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب“ (ترمذی شریف ابواب الزہد ۵۶۲)۔

شرائط مزاج: (۱) مزاج میں کوئی خلاف واقعہ بات شامل نہ ہو یعنی جھوٹ وغیرہ پر مشتمل نہ ہو ورنہ تو گناہ ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں مزاج تو کرتا ہوں لیکن سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہتا، قال رسول الله ﷺ: ”إني لأمزح ولا أقول إلا حقا“ (مجموعہ الزوائد ۸۰۱۱)۔

۲- ایسا مزاج جو دوسروں کے لئے باعث تکلیف اور وجہ اذیت ہو جائز نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے: ”عن ابن عباس عن النبي ﷺ: لا تمار أخاك ولا تمازحه“ (ترمذی شریف بیروت ۴۸۴ حدیث ۱۹۹۵) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ: مزاج سے بچو، اس لئے کہ مزاج سے دلوں میں کینہ پیدا ہوتا ہے وہ برائی کی طرف لے جاتا ہے (احیاء العلوم ۳۲۶/۳)۔

بعض بزرگوں کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ ہر چیز کا ایک ثمرہ ہے، مزاج کا ثمرہ عداوت ہے (احیاء العلوم ۳۲۶/۳)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مزاج سے متعلق تمام روایتوں کو سامنے رکھ کر اپنی تصنیف ”فتح الباری“ شرح بخاری میں تحریر فرمایا ہے کہ مزاج کی تین حیثیتیں ہیں: (۱) ناجائز (۲) مباح (۳) مستحب۔

ناجائز: مزاج میں اگر افراط یا مداومت ہو تو ناجائز ہے کیونکہ یہ چیز تفکر فی امور الدین، ذکر اللہ سے غفلت، قساوت قلبی، ایذا رسانی، بغض، کینہ، رعب و دبدبہ اور وقار کے زوال کا سبب بنتی ہے۔

مباح: اگر مزاج افراط اور مداومت سے پاک ہو تو مباح ہے۔

مستحب: اور اگر کسی کی دلداری، اسکو مانوس کرنا اور شریعت میں معتبر مصلحت پیش نظر ہو تو مستحب ہے۔

”فالجمعة بينهما أن المنهى عنه مافيه إفراط أو مداومة عليه، لما فيه من الشغل عن ذكر الله والتفكر في مهمات

جامعہ اسلامیہ، جامع مسجد، امر وہد (یو پی)۔

الدين ويؤول كثيرا إلى قسوة القلب والإيذاء والحقد وسقوط المهابة والوقار، والذي يسلم من ذلك هو النباح، فإن صادف مصلحة مثل تطيب نفس المخاطب وموانسة فهو مستحب“ (فتح الباری ۱۰، ۶۳۵ حدیث ۶۱۲۹)۔

ب۔ مزاحیہ پروگرام یا مشاعرے، اگرچہ ایک جانب طبیعت کو فرحت و سکون بخشتے ہیں جو کہ انسان کے تمام امور کی انجام دہی کے لئے معاون ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر طبیعت سے انبساط کی کیفیت رفع ہو جائے تو پھر انسان بڑے سے بڑے امر کو بھی ترک کر دیتا ہے اور اسکو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا پاتا مگر پھر بھی اس کیفیت کے حصول کیلئے کئی کئی گھنٹوں اور پوری پوری راتوں پر مشتمل پروگراموں کے منعقد کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس مقصد کے حصول کے لئے چند لمحات بھی کافی ہیں، جبکہ موجودہ زمانے میں مزاحیہ پروگرام اور مشاعروں کا انعقاد اس کے برخلاف ہے، کیونکہ اس میں چند لمحات نہیں بلکہ رات کا معتد بہ حصہ گزار جاتا ہے۔ نیز یہ بات بھی مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اس طرح کے پروگراموں میں مصالح کم ہیں اور مفاسد زیادہ، مثلاً عورتوں اور مردوں کا بے جا اختلاط، اوقات کا ضیاع، نمازوں سے بے توجہی، موت سے غفلت اور باری تعالیٰ کے سامنے جو ابد ہی کا احساس نہ ہونا وغیرہ۔ اور جس چیز میں نقصان زیادہ ہو اور نفع کم ہو وہ ناجائز اور حرام ہوتی ہے، لہذا اس طرح کے پروگراموں کا انعقاد کرنا بھی ناجائز ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں جو اور شراب کی حرمت کے متعلق ارشاد باری ہے: وإثمهما اکبر من نفعهما“ (البقرہ: ۲۱۰)۔

ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنے، انھیں پڑھنے، ایسی کتابوں کو شائع کرنے اور ان کی خرید و فروخت کرنے میں اگر نیت یہ ہو کہ ان سے زبان سیکھنا اہل ہو جائے تاکہ اس زبان میں تحریر کردہ کتب و رسائل سے استفادہ کیا جاسکے، علم و عمل، ایمان و توحید کی دعوت کو اس زبان سے متعلق لوگوں تک پہنچانا آسان ہو جائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی ہوتی رہے تو ”الأمور بمقاصدها“ کے تحت یہ امور جائز ہوں گے۔

لیکن اگر یہ مقصد نہ ہو، محض ہنسنا اور ہنسانا ہی پیش نظر ہو تو ظاہری بات ہے کہ یہ چیز مزاج شریعت کے خلاف ہوگی اور جو شخص اس کا داعی اور مروج ہوگا وہ اپنے دامن کو گناہوں سے نہیں بچا پائے گا۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس پر اجرت وصول کرنا از روئے شرع درست نہیں ہے، اس لئے کہ ہنسی مذاق کو پیشہ بنانا کثرت کلام کے بغیر ممکن نہیں اور کثرت کلامی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہوتی، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی شان تھی کہ خوش طبعی اور دل لگی کے مواقع پر بھی زبان سے کلمہ حق ہی نکلتا، دوسرے لوگ خواہ وہ زہد و تقویٰ کے کتنے ہی اعلیٰ درجہ پر فائز کیوں نہ ہوں مذاق کے کوچہ میں پہنچنے کے بعد کذب سے اپنا دامن بچانے پر قادر نہیں رہتے ان کا مقصد لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے خواہ کسی بھی طرح ہو اور اسی کا نام پیشہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جھوٹ کا سہارا لئے بغیر ہنسی و دل لگی کو پیشہ بنانا ممکن نہیں ہے (مستفاد از احیاء العلوم ۳/ ۳۲۳)۔

ہ۔ مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مزاح حصول نشاط کی حد تک جائز ہے، لیکن باقاعدہ اس کے لئے وقت کو فارغ کر کے ڈرامے لکھنا اور اس کے پروگرام ترتیب دینا جائز نہیں، کیونکہ اس میں ضیاع وقت کا پہلو غالب ہے، حالانکہ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے، بایں طور کہ وقت کا ضیاع عمر کا ضیاع ہے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن جب تک پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہیں کرے گا، اس وقت تک قدم اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا، انہیں میں سے زندگی کے قیمتی اوقات بھی ہیں: ”عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تزال قدما ابن آدم يوم القيامة من عند ربه حتى يسئل عن خمس عن عمره فيما أفناه وعن شبابه فيما أبلاه الخ“ (ترمذی شریف ابواب الزہد ۲/ ۶۷۲)۔

و۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ تفریح اور دل لگی سے دل کو راحت ملتی ہے، بقول اطباء کے ہنسانا صحت کی برقراری کیلئے معاون فعل ہے، نظرات کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، جیسا کہ اہل مدارس کیلئے جمعہ کے دن کی چھٹی پورے ہفتہ کیلئے نشاط کا سبب ہوتی ہے، جس طرح تعطیل سے عمل میں مدد ملتی ہے، اسی طرح ہنسنے ہنسانے سے سکون میسر آتا ہے، اس لحاظ سے تو اس کے مباح ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن باقاعدہ اس کے لئے گھنٹوں پر مشتمل پروگرام بنانا، اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرنا، بتکلف تہنہ لگانا درست نہیں، جس طرح دوا کی زیادتی مریض کو صحت نہیں دے سکتی بلکہ بسا اوقات زیادتی مرض کا سبب بن جاتی ہے، ایسے ہی ہنسی کی کثرت سے بھی بجائے فرحت و انبساط کے دل مردہ ہو جاتا ہے، اسلئے ہر چیز میں میاندہ روی ہی شریعت میں مطلوب ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل: ”ولا تکثر الضحک، فإن کثرة الضحک تمیت القلب“ (ترمذی شریف ۵/ ۵۶۲)، قرآن کریم میں ہے ”فلیضحکوا قليلا ولیبکوا کثیرا“ (التوبہ: ۸۴)۔

۲- الف۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو ایک مقصد کے تحت دنیا میں بھیجا ہے، جو چیز بھی اس میں مخل ہو اس سے اجتناب ضروری ہے۔ تفریح و طبع کے لئے



فرصت کے لمحات میں کھیلنا کو دنا جو فرائض و واجبات سے غافل نہ کرے، شریعت کی نظر میں مباح ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں مستحسن بھی ہوں گے لیکن حدود شرع کا خیال رکھنا ضروری ہے مثلاً:

- ۱- ایسا کھیل ہو جو مختصر وقت میں پورا کیا جاسکے، جیسے فٹبال، والی بال، ایسا طویل الوقت کھیل نہ ہو جو آدمی کو شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے جیسے شطرنج، تاش اور لوڈو وغیرہ۔
- ۲- ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسروں کیلئے ایذا رسانی کا باعث ہو، اور جس سے جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا امکان ہو، جیسے فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ، ایسے کھیل بھی جائز نہیں ہیں۔

۳- مردوں کے لئے زنانہ کھیل جیسے گڑیا گڈے کا کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی، کبڈی وغیرہ درست نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مردوں اور مردوں کو عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے: ”قال النبی ﷺ: لعن اللہ المتشبهین من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال“ (مشکوٰۃ شریف، ۳۸۰)۔

۴- کھیل کو خواہ کوئی سے بھی ہوں اگر ان میں جو اپنے توجہ ناز ہے، کیونکہ جو احرام ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطن“ (المائدہ: ۹۰)۔

۵- ایسے کھیل جن سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو، جو صحت انسانی کیلئے مفید ہوں اور جن سے انسان کے اندر قوت مدافعت بہم پہنچتی ہو مستحب ہیں اور اسلام ایسے کھیل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے (قاموس الفقہ ۳/ ۵۸۳)۔

ب- مذکورہ اصولوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ کھیل کو مطلقاً حرام و ناجائز نہیں ہیں، بلکہ شرعی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے تفریح و طبع کے لئے بعض کھیل جائز ہیں۔ شرعی حدود میں سے ایک اہم رکن ستر عورت ہے، لیکن فی زمانہ کھیل کود کے دوران عموماً کھلاڑی اس کا خیال نہیں کرتے، بلکہ اسکو فیشن کے خلاف اور رفتار زمانہ کے مخالف تصور کرتے ہیں، جب کہ شریعت میں کشف عورت حرام ہے: ”وإذا كان الستر فرضاً كان الانکشاف مانعاً“ (بدائع ۱۲۰۶)۔

لہذا کھیلنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ کھیل کے دوران بھی ایسا لباس اختیار کریں جو ستر بدن ہو، یعنی مرد تو نواف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو اور خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، اس لئے کہ ان کی تو ہر چیز ستر ہے، البتہ خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی وہی حدود ہیں جو مردوں کیلئے ہیں یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو، اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے (قاموس الفقہ ۱/ ۵۸۷)۔

وينظر الرجل من الرجل سوى ما بين سرته إلى ما تحت ركبتيه وتنظر المرأة المسلمة من المرأة كالرجل من الرجل (در مختار ۲/ ۲۲۱ کتاب الحظر والاباحه)۔

ج- فی زمانہ کھیل آہ تفریح سے نکل کر آلہ معاش کی شکل اختیار کر چکا ہے اور وسیع پیمانہ پر کھیلوں کا دور دورہ ہے، اور ان میں اتنی انواع و اقسام ہو گئیں ہیں کہ ہر ایک کو شمار کرنا، اور ان کے بارے میں جائز و ناجائز، مباح و مستحب ہونے کا حکم لگانا بہت ہی دشوار امر ہے، کتب احادیث میں محدود چند کھیلوں کے متعلق صراحتاً مباح و مستحب ہونے کا حکم ملتا ہے، مثلاً تیر اندازی کرنا، گھوڑا سداھانا، بیوی کے ساتھ کھیلنا ”کل شئی یلھو بہ الرجل باطل إلا رمیہ وتادیہ فرسہ وملاعبتہ امرأۃ فإھن من الحق“ (مشکوٰۃ شریف باب اعداد الجہاد)۔ ایسے دوڑ لگانا جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑ فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پہلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ گئی، جب میرا بدن بھاری ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر سبقت لے گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یا اس کا بدلہ ہو گیا ”ھذا بتلك السبقۃ“ (ابوداؤد شریف بحوالہ قاموس الفقہ ۳/ ۵۸۸)۔

بہر حال مرد و عورتوں میں سے چند کا حکم احادیث میں ملتا ہے، بعض کے جواز اور بعض کے عدم جواز پر کتب فقہ میں اشارہ ملتا ہے، البتہ تمام کی تحدید نہیں ہے، لہذا کھیلوں کے جواز و عدم جواز کے سلسلہ میں ایک ضابطہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے تاکہ ہر ایک پر حکم لگانا سہل ہو جائے۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ”تکملہ فتح الملہم“ میں تحریر فرماتے ہیں: ہر وہ کھیل جس کی دینی یا دنیاوی اعتبار سے صحیح اور مفید غرض نہ ہو تو وہ کھیل حرام یا مکروہ تحریمی ہے، یہ علماء امت کا منفقہ فیصلہ ہے اور اگر دینی یا دنیاوی مفاد اس سے وابستہ ہے، لیکن شریعت میں اس کے متعلق نہی وارد ہوئی ہے تو وہ

بھی حرام اور مکروہ تحریمی ہی رہے گا۔ جیسے ”زرد شیر“ یہ بھی متفق علیہ فیصلہ ہے، البتہ بعض کھیل ایسے ہیں جن میں نہیں متکلم فیہ ہے کہ بعض علماء کے نزدیک ان کے متعلق نہیں کا ثبوت ہو گیا تو انہوں نے ان کو ناجائز کہہ دیا ہے اور جن کے نزدیک نہیں ثابت نہیں ہوئی انہوں نے اس کو جائز قرار دے دیا، جیسے شطرنج چنانچہ احناف اور عام فقہاء نے اس کو مکروہ کہا۔ ابن مسیب، ابن مغفل اور فی روایت امام شافعی نے اس کو مباح قرار دیا۔ بہر حال جن کھیلوں کے متعلق شارع کی جانب سے کوئی نہیں وارد نہیں ہوئی اور اس میں لوگوں کے لئے کوئی مصلحت اور مفاد وابستہ ہو تو فقہی نقطہ نظر سے ایسے کھیل دو طرح کے ہیں:

۱- مشاہدہ اور تجربہ سے ان کے متعلق یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کا نقصان نفع سے زیادہ بڑھا ہوا ہے اور اس کے مفاسد خوبیوں سے زیادہ ہیں، نیز وہ مساجد، ذکر اللہ اور نماز سے دوری کا سبب ہیں تو وہ کھیل بھی حرام اور مکروہ ہوں گے۔

۲- اور جن کھیلوں میں یہ مفاسد نہیں تو اگر ان کو محض کھیل کی حیثیت سے کھیلا جائے تو وہ بھی مکروہ ہوں گے اور اگر حصول مصلحت اور منفعت پیش نظر ہو تو مباح ہے بلکہ کبھی کبھی مستحب یا اس سے بھی ایک درجہ اوپر پہنچ جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ریاضت اذہان و ابدان کے مقصد سے کھیل کھیلا جائے تو وہ فی نفسہ جائز ہے، جب تک کہ کسی دوسری معصیت پر مشتمل نہ ہو اور اس میں انہماک دینی و دنیاوی واجبات کی ادائیگی میں خلل نہ ہو۔

۳- کھیل کی ہار یا جیت میں اگر پیسے کی شرط ایک جانب سے ہو تو جائز ہے اور اگر جانبین سے ہو تو ناجائز ہے، یعنی جو جیتے گا دوسرا اس کو شرط رقم دے گا، ”حل الجعل إن شرط المال فی المسابحة من جانب واحد و حرم لو شرط من الجانبین“ (درمختار ۲: ۲۴۹ کتاب الحظرو الاباحہ)، کیونکہ اس صورت میں یہ جوا ہو جائے گا اور جوئے کی حرمت قرآن میں صراحتاً مذکور ہے۔

۴- اسلام میں وقت کی بڑی اہمیت ہے اور وہ اپنے ماننے والوں کو وقت کی قدر دانی کی ترغیب دیتا ہے، لہذا وہ کھیل جس میں کوئی مفاد نہ ہو، البتہ وقت ضائع ہوتا ہو یا کھیل کھیلا اور دیکھا دونوں ہی درست نہیں ”من حسن إسلام المرء ترکہ ما لا یعنہ“ (مشکوٰۃ ۲۱۳)۔

۵- کھیل کود کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اگر ایسا کھیل ہے جسکو دیکھنے سے فائدہ ہو یعنی سیکھنا مقصود ہے اور پھر وہ کھیل بھی ایسا ہے کہ جس سے دینی یا دنیاوی مفاد وابستہ ہو تو اسکو ٹکٹ لیکر دیکھنے کی اجازت ہوگی، لیکن اہل و لعاب اور مومج و مستی کی حیثیت سے دیکھنا درست نہیں اور ٹکٹ لینا تو بدرجہ اولیٰ درست نہیں کیونکہ یہ فضول خرچی ہے، اور فضول خرچی کی شریعت میں ممانعت وارد ہوئی ہے، ”إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين“ (بنی اسرائیل: ۲۶)۔

۳- الف- شریعت مطہرہ میں اگرچہ سیر و سیاحت کا جواز ملتا ہے، مثلاً اللہ عزوجل فرماتے ہیں: ”سیروا فی الأرض فانظروا“ (الانعام: ۱۱)، نشاط طبع اور زوال کسل و ملال کے لئے سیر و تفریح جائز بھی ہے بلکہ امر مستحسن ہے جس کا حکم تفصیلات سے معلوم ہو گیا، مگر تفریح کے لئے سفر کرنا اور ایک ملک سے دوسرے ملک جانا ہی ضروری نہیں، بلکہ تفریح اپنے مقام پر رہتے ہوئے بھی ہو سکتی ہے۔ مفسرین کرام مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کسی بھی طرح کی منفعت کے حصول کی نیت کے بغیر سیر و سیاحت جائز نہیں ہے، البتہ اگر منفعت مقصود ہو تو جائز ہے۔ تفسیر ”کشاف“ میں ہے: ”فمعناه إباحة السیر فی الأرض للتجارة وغيرها من المنافع“ (تفسیر کشاف ۸/۱۲، تفسیر مظہری ۲/۱۹۳)۔

ب- سفر خواہ کوئی بھی ہو (بامقصد ہو یا بے مقصد) اس میں اس بات کا خیال رکھنا نہایت ہی ضروری ہے کہ وہ سفر خطرات سے پر امن ہے یا نہیں، جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ممکن ہے یا نہیں، تو اگر کسی جگہ ان کے عدم تحفظ کا خدشہ ہو تو ایسے مقامات کے لئے نہ تو خود ہی سفر کرے اور نہ ہی اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے جائے، کیونکہ اسلام میں ان کا تحفظ نہایت ہی ضروری ہے، چنانچہ تحفظ عصمت کے لئے حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سعی کسی پر مخنی نہیں اور قرآن کریم میں اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، ”ولا تلقوا بأیدیکم إلی التهلكة“ (البقرہ: ۱۹۵)۔

ج- اگر کسی جگہ غیر شرعی باتیں پائی جاتی ہوں، مثلاً عورتوں اور مردوں کا اختلاط، بے پردگی، تو ایک مومن کا فریضہ یہ ہے کہ ان کو ختم کرنے کی کوشش کرے، خواہ وہ ہاتھ سے ہو یا زبان کے ذریعہ ہو، لیکن اگر ختم نہیں کر سکتا تو کم از کم دل سے برا سمجھے اور سوال مذکور میں برا سمجھنے کی کم سے کم مقدار یہی ہوگی کہ وہاں نہ جائے، ان کے ساتھ شریک نہ ہو، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ”من رأى منکم منکرًا فلیغیرہ یدہ، فإن لم یستطع فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ وذلک أضعف الإیمان“ (ترمذی شریف ۳۰۱۲)۔

البتہ سواری کرایہ پر لگانا، اشیاء خورد و نوش کی دکان لگانا، چونکہ یہ اسکا ذریعہ معاش ہے، اور فی نفسہ شرعی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے تو وہ شخص غیر شرعی باتوں سے احتراز کرتے ہوئے یہ کام کر سکتا ہے، کیونکہ ہر آدمی اپنے کئے کا خود مددگار ہے، اللہ عزوجل فرماتے ہیں کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا متحمل نہیں ہوگا، ”ولا تزر وازرة وزر اخرى“ (سورۃ الزمر: ۶)۔

البتہ جہاں غیر شرعی باتوں کا دور دورہ ہو، عیاشی و فحاشی کے اڈے بنے ہوئے ہوں، سرعام شراب نوشی اور زنا کاری ہوتی ہو، جیسے بعض ساحلی علاقے، تو وہاں احتیاط اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں ایک گونہ معاونت علی اللائم ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (سورۃ مائدہ: ۲)۔

۴- ٹور پر لے جانے کیلئے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے، جبکہ نیت درست ہو، حلال کمائی مقصود ہو۔

اس کا مقصد غیر شرعی کاموں میں معاونت نہ ہو اور حرام کاموں پر مشتمل سہولیات فراہم نہ کی جاتی ہوں، اب اگر وہ لوگ (سیاح) اسکو ناجائز کام کے لئے استعمال کرتے ہیں تو وہ اپنے فعل کے خود مددگار ہوں گے اور قائم کرنے والوں پر اسکا گناہ نہیں اور نہ ہی یہ کمائی حرام ہوگی: ”من عمل صالحاً فلنفسه ومن أساء فعليها“ (حر سجدہ: ۳۶)، وإذا استاجر الذمی من المسلم داراً لیسکنها فلا بأس بذلك وإن شرب فیها الخمر، أو عبد فیہ الصلیب أو أدخل الخنازیر لم یلحق المسلم فی ذلك بأس لأن المسلم لا یؤاجرها لذلك وإنما أجرها لسنکنی“ (ہندیہ ۲، ۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارہ)۔

۳- فلم اصل میں تصویر کشی یا عکس بندی کا نام ہے اور حدیث میں تصویر بنانے کی مذمت آئی ہے: ”عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ”أشد الناس عذاباً عند الله المصورون“ (مشکوٰۃ ۲، ۴۸۵ باب التصاویر)۔

البتہ اگر تصویر غیر ذی روح کی ہو تو اس کی اجازت ہے، ”سعید بن الحسن فی حدیث طویل: ویحک أن أیبت أن لا تصنع فعلیک بهذا الشجر وکل شیء لیس فیہ روح“ (مشکوٰۃ ۲، ۴۸۶)۔

ان دونوں حدیثوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ تعلیمی اور تاریخی فلموں میں اگر غیر ذی روح کی تصویر کا سہارا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر ذی روح کی تصاویر پر مشتمل فلم سازی کی گئی تو وہ حرام اور ناجائز ہے، البتہ اگر دعوت و تعلیم کے لئے دیگر ذرائع اختیار کرنا دشوار ہو جائے تو ضرورتاً اسکی بھی گنجائش ہو سکتی ہے، ”الضرورات تبیح المحظورات“ (الاشیاء ۱۳۸) لیکن کچھ شرائط کی پاسداری کرنا ضروری ہے۔ مثلاً ناچ، گانا بجانا، ہود لوب، مردوں اور عورتوں کا اختلاط، کھلے چہروں اور بازوؤں کی نمائش نہ ہو، اجرد و امرد کی شمولیت نہ ہو، کیونکہ ان کے حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں ان کی حرمت نصوص سے ثابت ہے، اور ضرورت کا اعتبار غیر مخصوص مسائل میں ہوتا ہے۔ اگر موضع نص میں حاجت نص کے متصادم ہو، تو اسکا اعتبار نہ ہوگا۔ ”الاشیاء والنظائر“ میں ہے: المشقة والمخرج انما یعتبر فی موضع لا نص فیہ إما مع النص بخلافہ فلا (الاشیاء والنظائر ۱۳۸)، البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ ”سد المذرائح“ اس کو اختیار نہ کیا جائے، کیونکہ اگر اس میں نفع ہے تو اس کے ساتھ ساتھ نقصان زیادہ ہے، اور ہر وہ چیز جس میں نفع ہو اسکا حلال ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ جو شراب کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے حالانکہ اللہ عزوجل نے خود فرمایا: کہ اس میں نقصان کے ساتھ ساتھ نفع بھی ہے، اور اسکا نقصان نفع سے زیادہ ہے، اور یہی چیز اس میں بھی ہے، لہذا عدم جواز ہی میں احتیاط ہے: ”یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیہما إثم کبیر ومنافع للناس وإثمہما اکبر من نفعہما“ (البقرہ: ۲۱۹)۔

۵- کارٹون کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ جن کارٹونوں کے سر موجود ہوں، اگر چہ ان کے چہروں کے خدو خال ظاہر نہ ہو رہے ہوں وہ شرعاً تصویر کے دائرہ میں داخل ہیں، انکا بنانا اور ان کو ذریعہ آمدنی کے طور پر اختیار کرنا جائز نہیں ہے، نیز عام تصویر کے مقابلہ میں اس میں اور بھی زیادہ برائی ہے، کیونکہ اس میں ایک آدمی کی صورت بگاڑ کر اس کی توہین و تدلیل کی جاتی ہے، اور قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے صراحتاً اس سے منع فرمایا ہے، وقید بالرأس لأنه لا اعتبار بإزالة الحاجبین أو العینین (شامی ذکر یا ۲، ۲۱۸)۔

۶- بہتر کاموں کی ترغیب، سچے تاریخی واقعات کی منظر کشی اور معاشرہ میں پھیلنے والی غیر اسلامی رسوم و رواج پر تنقید کرنے کے لئے اگر کوئی ایسا مکالمہ یا ڈرامہ اسٹیج کیا جائے، جس میں اسلامی وضع سے انحراف، احکام شریعت کا استہزاء اور شعائر اسلامیہ کا تمسخر جیسے مفاسد اور خرابیاں لازم نہ آتی ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں، ہاں اگر مکالمات اور ڈراموں میں غیروں کی نقالی اور ان کے کردار کو پیش کرنے میں مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی جائے جس سے مضمون اور پیغام کی اصل روح فوت ہو جائے تو یہ مفضی الی المعصیۃ ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

## تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط

مولانا محمد رمضان علی ع

جواب (۱)

(الف) - کیا شریعت میں مزاح جائز ہے، اور جائز ہے تو اس کی حدود کیا ہیں؟

مزاح کی لغوی تعریف:

المزاح بالضم في اللغة اسم من مزح يمزح، والمزح الدعابة والصرار بالكسر مصدر مازحه وهما متمازحان (لسان العرب، بحوالہ موسوعہ)۔

وفي الاصطلاح المزاح بالضم المباسط الى الخير على وجه التلطف والاستعطاف دون اذية (قواعد الفقه للبرکتي، بحوالہ موسوعہ)۔

در اصل مزاح کا مفہوم و مقصد خوش کلامی، دلداری، مخاطب کو مانوس کرنا، بے تکلفی کا اظہار اور ہنسا ہنسانا ہوتا ہے۔ مخاطب کی ایذا رسانی اور دوسروں کے سامنے اس کی توہین مقصد نہیں ہوتا، اگر ایذا رسانی مقصد ہو تو وہ مزاح نہیں بلکہ استہزاء ہے جو قطعاً جائز ہے المزاح انبساط مع الخير من غير اذياء فان بلغ الايذاء يكون سخريه (مرقات، باب المزاح ۹، ۱۵۱، مکتبہ اشرفیہ)۔

مرقات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزاح سے منع فرمایا: اعلم انه ورد عنه ﷺ لا تمار أخاك ولا تمازحه وأخرجه الترمذی في جامعه من حدیث ابن عباس وقال: هذا حدیث غریب لا نعرفه إلا من هذا الوجه وقال الجزری: إسناده جيد (مرقات، باب المزاح ۹، ۱۵۱، مکتبہ اشرفیہ)۔

(جان لو کہ رسول اللہ ﷺ سے وارد ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑا مت کرو اور اس سے مزاح مت کرو، اس حدیث کی تخریج امام ترمذی نے اپنے جامع میں ابن عباس سے کی ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے اس کو، ہم صرف اسی صورت سے جانتے ہیں اور الجزری نے فرمایا کہ اس حدیث کی اسناد جید ہے) اس حدیث کی رو سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مزاح جائز نہیں ہے، لیکن دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ خود مزاح فرمایا کرتے تھے چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث اس پر شاہد ہے:

عن أنس بن مالك قال قال النبي ﷺ قال: يا ذا الأذنين قال محمود قال أبو أسامة يعني يمازحه (شمائل ترمذی، باب ماجاء في صفة مزاح النبي ﷺ ۱۵)۔

(حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ذالاذنین (دو عدد کان والے) فرمایا کرتے تھے محمود نے فرمایا کہ ابو اسامہ نے فرمایا یعنی ان سے مزاح فرمایا کرتے تھے)۔

امام نووی نے ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی صورت نکالی ہے: قال النووي اعلم ان المزاح المنهي عنه هو الذي فيه افراط و يداوم عليه فانه يورث الضحك وقسوة القلب ويشغل عن ذكر الله والفكر في مهمات الدين ويؤول في كثير من الأوقات إلى الايذاء ويورث الاحقاد ويسقط المهابة والوقار فاما ما سلم من هذه الامور فهو المباح الذي كان

استاذ شعبہ عربی، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

رسول اللہ ﷺ يفعلہ على الندرة لمصلحة تطيب نفس المخاطب وموانسته وهو سنة مستحبة فاعلم هذا فإنه مما يعظم الاحتياج إليه (مرقات، باب المزاح ۹، ۱۵۱، مکتبہ رشیدیہ دیوبند)۔

امام نووی کے مذکورہ بالا قول سے معلوم ہوا کہ جو مزاح نماز و ذکر اللہ سے غافل کر دے اور اس میں کوئی گناہ کی بات پائی جائے تو ناجائز ہے اور جس مزاح میں یہ باتیں نہ پائی جائیں تو وہ جائز ہے جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا: وفي هذا الحديث فوائد كثيرة جدا... وجواز المزاح فيما ليس اثمًا (شرح مسلم للنووی ۲، ۲۱۰) (جس میں گناہ نہ ہو وہ مزاح جائز ہے)۔

قال البرکوی والخاصی: شرط المزاح قولاً أو فعلاً أن لا يكون فيه كذب ولا روع مسلم ولا في حرم (بريقة محمودیة فی شرح طریقة محمیدیة ۲، ۱۴، جوالہ موسوعہ)۔ (برکوی اور خاصی نے کہا کہ مزاح کی شرط یہ ہے کہ اس میں جھوٹ نہ ہو اور کسی مسلم کو پریشان کرنا نہ ہو، چاہے وہ مزاح قولاً ہو یا فعل کے اعتبار سے ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ حرام ہے)۔

ولا بأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلام يأتى به أو يقصد به إضحاك جلسائه (ہندیہ ۵، ۲۵۲)۔ اگر کوئی مسلمان مزاح کے لئے جھوٹ بولتا ہے۔ جھوٹی باتیں کر کے مخاطب کو ہنساتا ہے تو ایسا مزاح ہرگز جائز نہیں ہے)۔

خلاصہ کلام:

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو مزاح جھوٹ پر مشتمل ہو، نماز اور ذکر اللہ، اور دین کے اہم کاموں سے غافل کر دے تو وہ جائز نہیں ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ جائز ہے۔

ب۔ مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا کیا جائز ہوگا؟

احادیث مبارکہ اور حضرات سلف کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یا سلف صالحین نے کبھی بھی صرف مزاح ہی کے لئے کوئی پروگرام منعقد نہیں کیا، البتہ حدیث پاک سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک صحابہ کرام کی طرف رخ کر کے مصلی پر بیٹھ جاتے پھر صحابہ کرام سے گفتگو ہوتی حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کی باتیں بھی سامنے آتیں جن کو سن کر صحابہ کرام ہنستے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے چنانچہ مسلم میں ہے: عن سماك بن حرب قال قلت لجابر بن سمره أكنت تجالس رسول الله ﷺ؟ قال: نعم كثيرا لا يقوم من مصلاه الذي يصلي فيه الصبح أو الخداة حتى تطلع الشمس فإذا طلعت قام وكانوا يتحدثون فيأخذون في أمر الجاهلية فيضحكون ويتبسم (مسلم ۱، ۲۲۵، مکتبہ اصح المطابع)۔

(حضرت سماک بن حرب سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے جابر بن سمرہ سے کہا کہ کیا تم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھتے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہاں! اکثر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس مصلی پر صبح کی نماز ادا فرماتے تھے وہاں سے نہیں اٹھتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا۔ جب سورج طلوع ہوتا تب آپ وہاں سے اٹھتے اور وہ حضرات (صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ) گفتگو کرتے یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کی باتیں بھی کرتے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہنستے اور رسول اللہ ﷺ تبسم فرماتے)۔

”جزء الف“ سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ شریعت میں مزاح جائز ہے تو ایسا مزاحیہ پروگرام یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا جو دماغ میں تازگی اور طبیعت میں چستی پیدا کرے تاکہ درس و تدریس یا دوسرے جائز امور میں اس سے مدد ملے تو ایسے پروگرام چند شرطوں کے ساتھ (جو آگے آرہی ہیں) منعقد کرنا جائز ہوگا حضرت ملا علی قاری رحمہ الباری نے تفریح طبع اور دماغ کو تازگی بخشنے کے لئے سماع کو بھی جائز قرار دیا ہے جب کہ وہ آلات محرّمہ سے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ سماع کے لئے ابتداءً پروگرام منعقد کیا جاتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ کوئی دینی بات چل رہی ہو اور بیچ بیچ میں کبھی کبھی سماع ہو۔

وفي معناها كل ما يعين على الحق من العلم والعمل إذا كان من الأمور المباحة كالسابقة بالرجل والخيال والإبل والتمشية للتنزه على قصد تقوية البدن وتطرية الدماغ ومنها السماء إذا لم يكن بالآلات المطربة المحرمة (مرقات، باب اعداد الة الجهاد ۱، ۲۱۸، مکتبہ اشرفیہ)۔

(یعنی حدیث پاک کل شی یلھو بہ الرجل باطل إلا رمیہ بقوسہ وتادیبہ فرسہ وملاعبتہ امرأۃ فیأھن من الحق، میں جن تین باتوں کا استثناء کیا گیا ہے، اس میں ہر وہ عمل (لہو وغیرہ) بھی داخل ہے جو حق یعنی علم و عمل کے واسطے مددگار و مفید ہو بشرطیکہ امور مباحہ میں سے ہو (یعنی کسی معصیت پر مشتمل نہ ہو) مثلاً اونٹ اور گھوڑ دوڑ اور مثلاً جسمانی صحت و قوت اور دماغی تازگی کے لئے سیر و تفریح اور چہل قدمی کرنا اور اسی طرح سماع جب کہ وہ آلات محرّمہ سے نہ ہو۔)

ملا علی قاری رحمہ الباری کے اس قول سے یہ ثابت ہوا کہ جب انسان تعلیم و تعلم کے مشاغل اور دوسرے امور کے مشاغل میں تھک جائے تو تفریح و تفریح طبع اور دماغی تازگی کے لئے مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا جائز ہے تاکہ حصول علم وغیرہ میں مدد ملے۔ نیز ایک حدیث میں ارشاد ہے: روحوا القلوب ساعة فساعة اخرجہ ابو داؤد فی مراسیلہ عن ابن شہاب مرسلًا (بحوالہ معارف القرآن ۷/ ۲۳۷) (تم اپنے قلوب کو کبھی کبھی آرام دیا کرو)۔

انعتاد کی شرطیں: لیکن مزاحیہ پروگرام اور مزاحیہ مشاعرہ کا منعقد کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب کہ وہ محض مشغلہ کے طور پر نہ ہو اور اس میں اس قدر انہماک نہ ہو کہ ضروری کاموں سے بھی غفلت ہو جائے بلکہ اس کا مقصد دماغ میں تازگی، طبیعت میں نشاط پیدا کرنا ہو یعنی سستی اور تنکان دور کرنے اور تفریح طبع کے لئے بہ قدر حاجت مزاحیہ پروگرام کا منعقد کرنا جائز ہوگا۔

ج۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے کیسا عمل ہے؟

زمانہ قدیم میں کہانیاں لکھنے کا رواج نہیں تھا، اس لئے علمائے کرام کی کتابوں میں اس کے متعلق کوئی تشفی بخش تحریر نہیں ملتی البتہ موجودہ زمانہ میں مزاحیہ کہانیاں لکھنے کا رواج عروج پر ہے، مزاحیہ کہانیاں نثر و نظم دونوں میں ملتی ہیں۔ مزاحیہ کہانیاں لکھنے کا مقصد کبھی قارئین کو ہنسانا ہوتا ہے اور سماج کی برائیوں پر ضرب لگانا ہوتا ہے جیسے کہ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا  
کئی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اس شعر کے ذریعہ ان لوگوں پر ضرب لگائی گئی ہے جو اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہتے ہیں حالانکہ وہ لوگ ماں باپ کی عظیم تربیت سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر اسی طرح کوئی کہانیاں لکھتا ہے جن میں کوئی غیر اخلاقی اور غیر شرعی بات نہ ہو اور لکھنے والے کا مقصد قارئین کے ذہنی تناؤ کو دور کر کے ان کو دماغی تازگی فراہم کرنا ہو کہ وہ اپنے جائز امور کو بخوبی انجام دے سکیں تو بلاشبہ ایسی کہانیوں کا لکھنا، ان کا شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت کرنا جائز ہوگا۔

وعلم من هذا انه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنّية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف (رد المحتار کتاب الحظر، فصل فی البیع ۹، ۵۶۱۶۔ مکتبہ زکریا)۔

اور اگر ان کہانیوں میں غیر شرعی اور غیر اخلاقی باتیں ہوں اور ان کہانیوں کے ذریعہ کسی خاص انسان کو ایذا پہنچانا ہو، یا ان کہانیوں کو لکھنے کا مقصد قارئین کو دینی کتابوں کے مطالعہ سے برطرف کرنا، ہوتوان صورتوں میں ان مزاحیہ کہانیوں کا لکھنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله (سورہ لقمان رکوع ۱)۔

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ نصر بن حارث ایک بڑا تاجر تھا وہ شاہان عجم کسری وغیرہ کے تاریخی قصے خرید کر لایا اور مشرکین مکہ سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو عباد و شمود کے قصے سناتے ہیں اور میں تم کو ان سے بہتر رسم وغیرہ کے قصے سناتا ہوں، لہذا بہت سے مشرکین جو اس سے قبل قرآن کریم کے اعجاز کی وجہ سے اس کو سننے کی رغبت رکھتے تھے ان کو اعراض کا بہانہ مل گیا۔ اگر ان مقاصد کے تحت ان کہانیوں کو لکھا جائے تو وہ بھی ابو میں شامل ہوگا جو کہ ناجائز ہے اس لئے ان کہانیوں کا لکھنا بھی ناجائز ہوگا۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نوہی کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین طبعاً مزاح گو تھے جیسے کہ حضرت ام سلمہ نے فرمایا کہ حضرت سہبؓ بہت زیادہ مزاح فرمایا کرتے تھے (ابن ماجہ، باب المزاح ۲۶۳)۔ لیکن کسی صحابی رسول کے متعلق یہ نہیں ملا کہ انہوں نے مزاح گوئی کو پیشہ بنایا ہو۔ کتب فقہ کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ لطیفہ گوئی یا مزاح نوہی کو پیشہ بنالینا یا اس پر اجرت لینا درست نہیں ہے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ نے فرمایا: ومن السحت... ما ياخذہ غاز

لغزو وشاعر لشعر ومسخرة وحكواقي قال تعالى: ومن الناس من يشتري لهو الحديث (الدر المختار مع الرد، كتاب المنهل، باب الاستبراء وغيره ۹۰۶۰۸، مكتبة زكريا)۔ كسب حرام (يعني حرام كمائى وهه هه جس كو) غازى جنگ كے لئے لے اور شاعر شعر كے لئے لے اور مسخرة كرنے والا اور قصه بيان كرنے والا لے۔

علامہ حصكفى اور علامه شامى كے عبارتوں سے ظاهراً ہوتا ہے كه جو شخص لوگوں كو ہنسائى كراياں كو كہانیاں سنا كر روپے ليتا ہے تو وہ حرام ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے كه لطيفه گوئى يا مزاح نويسى كو پيشه بنا لينا اور اس كى اجرت وصول كرنا جائز نہیں ہے، ليكن علامه شامى نے صراحت كى ہے كه جو غازى جبرالوگوں سے روپے وصول كرتا ہويا جس شاعر كو اس كے شر سے بچنے كے لئے روپے ديئے جاتے ہوں تو ایسے روپوں كا غازى اور شاعر كے لئے لینا حرام ہے، اس كے برخلاف جس كے شر سے لوگ مامون ہوں تو ایسے شاعر كو روپے دينا اور اس كے لئے ان روپوں كا لینا جائز ہے كيونكه كعب بن زهير نے جب حضور اكرم ﷺ كے سامنے اپنا قصيدہ پيش كيا تو آپ نے ان كو انعام میں پانى چادر مبارك عطا فرمائی۔

فلو كان ممن يومن شره فالظاهر انما يدفع له حلال بدليل دفعه عليه الصلوة والسلام بردائه لكعب لما امتدحه بقصيدته المشهورة (رد المحتار، باب الاستبراء وغيره، فصل فى البيعة ۹۰۶۰۸ مكتبة زكريا)۔

۵- تفریح و طبع كے لئے مزاحیہ ڈرامے كے پروگرام بھی منعقد كئے جاتے ہیں، جن كا مقصد ہنسا ہنسا ہوتا ہے، كيا اس طرح كے ڈرامے لكھنا، اس كا پروگرام كرنا اور اسے ديكھنا درست ہے؟

”جزء“ كو جن شرائط كے ساتھ ہم نے جائز قرار ديا ہے انہیں شرائط كے ساتھ ”جزء“ میں مزاحیہ ڈرامے لكھنا، اور پروگرام كا انعقاد كرنا اور اسے ديكھنے كا بھی جواز ثابت ہوگا، البتہ ڈرامے میں اگر كوئى اداكارہ عورت ہو تو اس كا انعقاد كرنا اور اس كو ديكھنا دونوں نا جائز ہوگا۔

۶- مزاحیہ پروگرام كا انعقاد كرنا كى شرائط كے ساتھ جائز ہے اور كى شرائط كے ساتھ نا جائز اس كو ہم ”جزء ب“ میں لكھ چكے ہیں البتہ مزاحیہ پروگرام میں لوگوں كا بہ تكلف تہنيد لگانا زور سے شرع كيا ہے، یہ امر تفصیل طلب ہے احادیث مباركہ سے صحابہ كرام كا ہنسا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم كا مسكرانا ثابت ہے چنانچہ ذیل كى حدیثوں میں اس كو ديكھا جاسكتا ہے:

عن عبد اللہ بن الحارث بن جزء قال: ما رأيت أحداً أكثر تبسماً من رسول اللہ ﷺ رواه الترمذى (مشكوة، باب الضحك، الفصل الثالث ۳۰۶)۔

(حضرت عبد اللہ بن حارث بن جزء سے مروى ہے كه میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تبسم فرماتے كسى كو نہیں ديكھا)۔  
اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم كے تبسم فرمانے كا ثبوت ملتا ہے۔

۲- عن قتادة قال: سئل ابن عمر هل كان أصحاب رسول اللہ ﷺ يضحكون قال: نعم والإيمان في قلوبهم أعظم من الجبل وقال بلال بن سعد: أدرکتهم يشدون بين الإغراض ويضحك بعضهم إلى بعض فإذا كان الليل كانوا رهباناً رواه في شرح السنة (مشكوة، باب الضحك، الفصل الثالث ۳۰۷)۔

اس حدیث سے واضح ہے كه صحابہ كرام ہنستے تھے ليكن اخلاق اور آداب شرعیہ كے دائرہ میں رہ كر ہنستے تھے اتنا زیادہ نہیں ہنستے تھے كه جس سے دل مردہ ہو جائے جيسا كه ملائلى قارى رحمہ البارى نے تحریر فرمایا ہے:

مذكوره عبارت سے واضح ہے كه صحابہ كرام اتنا نہیں ہنستے تھے جس سے وقار گر جائے اور دل مردہ ہو جائے بلکہ دوران گفتگو كوئى بات آتى تو صحابہ كرام ہنس دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرمادیتے (مرقاة، باب الضحك، الفصل الثالث ۹، ۱۰۳)۔

بہر حال مزاحیہ پروگرام میں مسكرانا اور ہنسا دونوں جائز و درست ہے ليكن تہنيد لگانا یعنی زور سے ہنسا، ٹھٹھا مار كر ہنسا خصوصاً بہ تكلف تہنيد لگانا اگرچہ درست ہے ليكن اس سے وقار گر جاتا ہے اس لئے احتیاط كرنا بہتر ہے۔

جواب (۲) الف- كھیل كے طریقہ كے اعتبار سے كھیل كے جائز اور نا جائز ہونے كے كيا اصول ہیں؟

## کھیل کا شرعی حکم:

کھیل کود کے سلسلہ میں فقہائے کرام عام طور پر مندرجہ ذیل حدیث کو پیش کرتے ہیں:

عن عبد الله بن عبد الرحمن بن ابي حسين ان رسول الله ﷺ قال... كل ما يلهو به الرجل المسلم باطل الا رميه بقوس وتاديبه فرسه وملاعبته أهله فإنهن من الحق (ترمذی، باب ما جاء في فصل الرمي في سبيل الله ۱۰۲۹۳)۔

قال رسول الله ﷺ... كل ما يلهو به الرجل المسلم باطل الا رميه بقوسه وتاديبه فرسه وملاعبته امرأته فإنهن من الحق (ابن ماجه، باب الرمي في سبيل الله ۲۰۲)۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ..... ہر وہ کھیل جس سے ایک مرد مسلم کھیل کرے وہ باطل ہے مگر یہ کہ وہ کمان سے تیر چلائے، اور اپنے گھوڑے کو سدھائے، اور اپنی بیوی کے ساتھ کھیل کرے کیونکہ یہ سب درست ہے)۔

مذکورہ بالا احادیث سے تو واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لہو و لعب کو باطل فرمایا: البتہ کچھ کھیلوں کا آپ نے استثناء فرمایا اور جن امور کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثناء فرمایا وہ ایک غرض و علت پر مبنی ہیں، لہذا وہ غرض و علت جس قسم کے کھیل میں بھی پائی جائے گی وہ بھی مستثنیات کی فہرست میں داخل ہو کر جائز ہوگا۔ لہذا استثنائی صورتوں کے علاوہ ہر کھیل شرعی طور پر ایک مکروہ عمل ہے جیسا کہ فقہائے کرام کی عبارتوں سے واضح ہے: وكره كل لهو لقوله عليه الصلوة والسلام: كل لهو المسلم حرام الا ثلاثة ملاعبته أهله وتاديبه لفرسه ومناصلته بقوسه (الدر المختار مع الرد كتاب الحظر، فصل في البيعة ۹۰۵۶۶)۔

بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ شطرنج کے علاوہ ہر کھیل بالا جماع مکروہ تحریمی ہے اور شطرنج کے بارے میں اختلاف ہے۔ قمار (جو) نہ پائے جانے کی صورت میں امام شافعی نے اس کو مباح قرار دیا ہے اور اگر قمار وغیرہ پایا جائے تو بالا جماع حرام ہے (الدر المختار مع الرد کتاب الحظر، فصل في البيعة ۵۶۶۹)۔

الغرض استثنائی صورتوں کے علاوہ ہر کھیل کا حکم یہی ہے کہ وہ ممنوع و مکروہ ہوگا مگر یہ واضح رہے کہ حدیث پاک میں لہو کو باطل قرار دے کر جن تین امور کا استثناء کیا گیا اور اصل یہ تینوں چیزیں لہو و لعب میں داخل ہی نہیں ہیں صرف لہو و لعب سے مشابہ ہونے کی وجہ سے ان کو صورتاً لہو و لعب قرار دے دیا گیا ہے، کیونکہ لہو اس کام کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ لائق اعتبار نہ ہو اور یہ تینوں فوائد دینی و دنیوی سے وابستہ ہیں کیونکہ تیر اندازی اور گھوڑے کو سدھانا جہاد کی تیاری میں داخل ہیں اور بیوی کے ساتھ کھیلنا تو والد و تناسل کے مقصد کی تکمیل ہے، اس لئے یہ تینوں امور یعنی تیر اندازی وغیرہ حقیقی طور پر لہو و لعب میں داخل ہی نہیں ہیں محض صوری مشابہت کی وجہ سے لہو قرار دے دیا گیا ہے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ تیر اندازی کو لہو اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کے سیکھنے کی طرف لوگوں کا میلان ہو (حقیقی طور پر وہ لہو نہیں ہے) (فتح الباری ۱۰۸۱۱)۔

لہذا وہ کھیل جو کسی دینی یا دنیوی فائدہ سے وابستہ ہو، مثلاً ایسے کھیل جو جہاد کی تیاری میں مددگار ہو یا جسمانی صحت اور ورزش کے لئے کھیلا جائے تو وہ حقیقی طور پر لہو و لعب میں داخل نہیں ہوگا اور اگر اس کو ظاہری طور پر لہو و لعب قرار بھی دیا جائے تو وہ مستثنیات کی فہرست میں شامل ہو کر جائز ہوگا۔

وملاعبته امرأته فإنهن من الحق أي وليس من اللهو الباطل فيرتب عليه الشواب الكامل (مرقات ۷۰۲۱۸)۔

(اور اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا درست ہے یعنی وہ لہو و باطل میں سے نہیں ہے لہذا اس پر ثواب کامل مرتب کیا جائے گا)۔

الغرض جس کھیل سے کوئی دینی یا دنیوی یا جسمانی فائدہ وابستہ ہو اس کا کھیلنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے جس کی تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔

کھیل کے ناجائز ہونے کی علتیں: لہو و لعب کے ناجائز اور اس کے مکروہ و ممنوع ہونے کی علتیں جو فقہائے کرام نے بیان کی ہیں یا ان کی عبارتوں سے سمجھ میں آتی ہیں ان کا تذکرہ مندرجہ ذیل کیا جا رہا ہے۔

کھیل کے ناجائز ہونے کی ایک علت فسادیت ہے۔ کوئی آدمی اپنی بہادری اور جواں مردی دکھانے کے لئے اور اپنی شہرت کے لئے کھیلتا ہے تو فسادیت کی وجہ سے وہ کھیل ناجائز و مکروہ ہوگا، اگرچہ وہ کھیل جائز اور دوسری قباحتوں سے خالی ہو۔ علامہ شامی رقمطراز ہیں:



إذا قصد التلهي أو الفخر أو لتري شجاعته فالظاهر الكراهة لأب الأعمال بالنيات فكما يكون المباح طاعة بالنية تصير الطاعة معصية بالنية (رد المحتار، كتاب الحظر، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيعة ۹۰۵۷۷)۔

(اگر کھیل کا مقصد تلبی، فخر اور اپنی بہادری دکھانا، ہوتو ایسا کھیل کھیلنا مکروہ ہے، کیونکہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے، لہذا جس طرح مباح اچھی نیت کی وجہ سے طاعت بن جاتا ہے اسی طرح طاعت بھی فساد نیت کی وجہ سے معصیت (گناہ) بن جاتی ہے)۔

کھیل کے ناجائز ہونے کی دوسری علت: ہر وہ کھیل جس میں کوئی دینی یا دنیوی لائق اعتبار فائدہ نہ ہو اگرچہ وہ ممانعت کی علتوں سے خالی ہو مگر فعل عبث ہونے کی وجہ سے ایسا کھیل مکروہ ہوگا۔

کھیل کے ناجائز ہونے کی تیسری علت: فقہائے کرام کے نزدیک وہ کھیل بھی ناجائز ہے جس کے آلات اور جس کا طریقہ کافروں کا ایجاد کیا ہوا ہو اور اس کا صحیح بدل ہمارے پاس موجود ہو یعنی اس کھیل سے جو فوائد اور منافع حاصل ہوں ان کو ہم دوسرے کھیل سے بھی آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں اس کے باوجود اس کھیل کو اختیار کرنا ممنوع ہے اور اگر دوسرے کھیل سے وہ فوائد و منافع حاصل نہ ہوں تو ضرورت کی وجہ سے اس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کھیل کے ناجائز ہونے کی چوتھی علت: جو کھیل خود کسی گناہ و معصیت پر مشتمل ہو وہ ناجائز ہوگا یعنی ایسا کھیل جو قمار (جو) پر مشتمل ہو یا بے پردگی اور کشف عورت کو مستلزم ہو بلاشبہ ایسا کھیل ناجائز و حرام ہوگا کیونکہ جو اکی حرمت قرآن سے ثابت ہے اللہ کا فرمان ہے:

يأياها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه (سورہ مائدہ رکوع ۱۲)۔  
(اے ایمان والو! شراب اور جو اور انصاب و ازلام ناپاک چیزیں ہیں اور شیطانی عمل ہے تو اس سے بچو)۔

کھیل کے ناجائز ہونے کی پانچویں علت: کھیل کے ناجائز ہونے کی ایک اہم علت غفلت عن ذکر اللہ ہے۔ کھیل کے ناجائز ہونے کی بنیادی علت علماء کے نزدیک یہی ہے، لہذا جو کھیل آدمی کو نماز اور ذکر اللہ اور دوسرے ضروری کاموں سے غافل کر دے ایسا کھیل شرعی اعتبار سے ناجائز اور حرام ہوگا چاہے وہ کھیل کتنے ہی فوائد پر مشتمل ہو۔ امام بخاری نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے: ”باب کل لہو باطل اذا شغل عن طاعة اللہ“ یعنی جب کہ وہ اللہ کی طاعت سے غافل کر دے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

مصنف علیہ الرحمہ کا قول: ہر وہ کھیل باطل ہے جب کہ اس سے کھیلنے والا اللہ کے ذکر سے غافل ہو جائے۔۔۔ برابر ہے کہ جس سے وہ کھیل رہا ہے اس کھیل کو کھیلنے کی اجازت ہو یا وہ کھیل ممنوع ہو، یعنی اس سے کھیلنا منع ہو اس شخص کی طرح جو عمداً (جان بوجھ کر) نفل عبادت میں مشغول ہو جائے یا تلاوت یا ذکر یا معانی قرآن میں غور و فکر کرنے میں مشغول ہو جائے اور فرض نماز کا وقت نکل جائے تو وہ بھی اسی ضابطہ میں شامل ہوگا (یعنی وہ بھی باطل ہوگا) جب عبادت کا یہ حال ہے تو جو شرعی طور پر مطلوب ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے تو عبادت کے علاوہ چیزوں کا کیا حال ہوگا (یعنی کھیل کو بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا) (فتح الباری، کتاب الاستئذان، باب کل لہو باطل اذا شغل عن طاعة اللہ ۱۰۸/۱)۔

ب۔ لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے جن کو مندرجہ ذیل تفصیل سے لکھا جا رہا ہے:

اول: کھلاڑی کے جسم کا وہ حصہ چھپ جائے جس کا چھپانا واجب ہے۔ مرد کے لئے ناف کے نیچے سے گھٹنے کے نیچے تک کا حصہ چھپانا واجب ہے۔

وہی للرجل ما تحت سرقته الى ما تحت ركبته (الدر المختار مع الرد، باب شروط الصلوة ۲۰۷۶)۔

(اور وہ (شرمگاہ) مرد کے لئے ناف کے نیچے سے گھٹنے کے نیچے تک کا حصہ ہے)۔

فالسرة ليست من العورة (رد المحتار، باب شروط الصلوة ۲۰۷۶) یعنی ناف شرمگاہ نہیں ہے۔

عورت کے لئے موضع ستر:

عورت کے لئے موضع ستر اس کا پورا بدن واجب الستر ہے یعنی اس کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنے پورے بدن کا پردہ کرے علاوہ چہرہ کے، لیکن محرم اور

شوہر کے علاوہ دوسرے مردوں کے سامنے چہرہ کا چھپانا بھی ضروری ہے، کیونکہ وہی فتنہ کا سبب ہے۔ غیر کے سامنے ستر کا کھولنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ تنہائی میں بھی بے وجہ اس کو کھولنا جائز نہیں ہے۔

يجب الستر بحضرة الناس إجماعاً وفي الخلوة على الصحيح (الدر المختار مع الرد، باب شروط الصلوة ۲۰۵)۔  
(لوگوں کے سامنے ستر پوشی بالاجماع واجب ہے اور صحیح قول کے مطابق تنہائی میں بھی)۔

۲- لباس کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے اس بات کی رعایت بھی ضروری ہے کہ ان کا لباس اتنا باریک نہ ہو کہ اعضاء کارنگ ظاہر ہو یعنی لباس پہننے کے بعد بھی یہ معلوم ہو کہ بدن کارنگ کالا ہے یا سفید۔ حدیث میں ہے:

عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: ... نساء كاسيات عاريات مائلات رؤسهن كأنسمة البخت المائلة لا يدخلن الجنة ولا يجدن ريحها (مسلم، باب النساء الكاسيات العاريات ۲۰۵)۔  
امام نووی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

وقيل: معناه تلبس ثوبا رقيقا يصف لون بدنها (شرح مسلم للنووي ۲۰۵)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اتنا باریک کپڑا پہننا جائز نہیں ہے جس سے بدن کارنگ معلوم ہو۔ لباس اتنے چست بھی نہ ہو کہ اعضاء کی ساخت ظاہر ہو جس لباس میں واجب الستر اعضاء کی بناوٹ ظاہر ہو چاہے وہ کتنا ہی موٹا ہو اس لباس کو مرد اور عورت دونوں کے لئے پہننا حرام ہے اور اس کی طرف دیکھنا بھی حرام ہے۔ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

مفاده أن رؤية الثوب بحيث يصف حجم العضو ممنوعة ولو كثيفا لا ترى البشرة منه... منه قوله حتى يتبين حجم عظامها - وعلى هذا لا يحل النظر الى عورة غيره فوق ثوب ملتزق بها يصف حجمها فيحمل ما مر على ما إذا لم يصف حجمها فليتأمل (رد المحتار ۹۰۲۶)۔

مذکورہ عبارت سے ظاہر ہے کہ اتنا چست کپڑا جس سے واجب الستر اعضاء کی ساخت ظاہر ہو یا اتنا باریک کپڑا جس سے بدن کارنگ ظاہر ہو ایسا کپڑا مرد اور عورت دونوں کے لئے حرام ہے۔

۳- کھلاڑیوں کے لئے اس امر کی رعایت بھی ضروری ہے کہ لباس میں تشبہ نہ پایا جائے کہ اس لباس کو دیکھتے ہی کسی خاص قوم یا جماعت کا خیال ذہن میں آئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک مرتبہ ایسا کپڑا پہنا جس کو کفار استعمال کرتے تھے تو آپ نے اس کپڑے کو پہننے سے منع فرمایا۔ چنانچہ مسلم میں ہے:

عبد الله بن عمرو بن العاص أخبره قال: رأى رسول الله ﷺ علي ثوبين معصفرين فقال: إن هذه من ثياب الكفار فلا تلبسها (مسلم، كتاب اللباس، باب النهي عن لبس الرجل الثوب المعصفر ۲۰۱۹۳)۔

(حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے بدن پر دو معصفر کپڑوں کو دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کافروں کا کپڑا ہے اس کو مت پہنو)۔

۴- اس امر کی رعایت بھی ضروری ہے کہ مرد کا کپڑا ٹخنہ سے نیچے نہ ہو کیونکہ اس عمل پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ حدیث میں ہے:

”ما أسفل من الكعبين من الإزار ففي النار“ (بخاری ۲۰۸۶۱)۔ (جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو جائے وہ حصہ جہنم میں ہے)۔

ج- شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے کن کو جائز، کن کو ناجائز، کن کو مکروہ اور کن کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے؟

۱- جو کھیل ذکر اللہ، نماز اور دوسرے فرائض سے غافل کر دے وہ حرام ہے باطل ہے اگرچہ وہ ظنی عبادت ہو۔

۲- نزد (چوسر) شطرنج کھیلنا حرام ہے، اسی طرح ہر وہ کھیل حرام ہے جس میں جو اکی شکل پائی جائے۔

۳- کبوتر بازی، شیر بازی، مکروہ تحریمی ہے۔ پتنگ بازی، تاش کھیلنا بھی ناجائز ہیں، کیونکہ اس میں عموماً مشغولیت ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو ضروری کام یہاں

تک کہ نماز جیسی فرض عبادت سے بھی غافل کر دیتی ہے۔

۴- باکسنگ ناجائز ہے، کیونکہ اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے اور وہ کھیل جس میں جانوروں کا باہمی مقابلہ کرایا جاتا ہے وہ ناجائز ہے۔

۵- کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس وغیرہ کھیلنا جائز ہے بشرطیکہ ان میں ممانعت کی علتوں میں سے کوئی علت نہ پائی جائے اور اس خلاف شرع اور تشبہ بالکفار نہ ہو، اور لباس کے سلسلہ میں جن امور کو بیان کیا گیا کھلاڑی ان میں ہر ایک امر کی رعایت کرے یعنی واجب الاستراعت کو چھپا کر کھیلے، کپڑا ٹخنہ سے نیچے نہ ہو وغیرہ اگر کوئی شخص ان شرائط کے ساتھ کرکٹ وغیرہ کھیل سکتا ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

۶- جس کھیل میں ممانعت کی علت ختمہ میں سے کوئی علت نہ پائی جائے وہ جائز ہے اور اگر اس نیت سے کھیلا جائے کہ جائز امر میں مثلاً درس و تدریس میں معاون ثابت ہو تو وہ مستحب ہے اور حسن نیت کی وجہ سے ثواب دیا جائے گا۔

۷- کھیل کی ہارجیت میں اگر پیسے کی شرط ہو تو کون سی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہوگی؟

کھیل کی ہارجیت میں اگر پیسے کی شرط ہو تو اس کی چار صورتیں ہیں جن میں سے صرف ایک صورت ناجائز ہے بقیہ تین صورتیں جائز ہیں۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱- اگر دو ٹیم میں کھیل کا مقابلہ ہو یا دو شخص یا چند اشخاص میں کھیل کا مقابلہ ہو اور ہر ٹیم پر یا ہر شخص پر یہ بات لازم قرار دی گئی ہو کہ وہ ہارنے کی صورت میں جیتنے والے کو اتنی رقم دے گا اور اگر وہ جیت گیا تو دوسرے لوگ اس کو اتنی رقم دیں گے تو یہ صورت قمار (جوا) ہونے کی وجہ سے قطعاً حرام ہے۔ اور عام طور پر کھیل کی ہارجیت میں یہ شکل پائی جاتی ہے۔ ہارجیت کی یہ شکل جس کھیل میں بھی پائی جائے گی وہ کھیل حرام ہوگا۔ مندرجہ ذیل فقہائے کرام کی عبارتوں کا یہی مطلب ہے۔

وحرم لو شرط فیہا من الجانبین لآنہ یصیر قمارا (الدر المختار مع الرد، کتاب الحظر، باب الاستبراء وغیرہ ۹۰۵۷۷)۔

من الجانبین بأن یقول: إن سبق فرسك فلتك علی كذا وإن سبق فرسی فلی علیك كذا (رد المحتار، کتاب الحظر، باب الاستبراء وغیرہ ۹۰۵۷۷)۔

أما إذا كان البدل من الجانبین فهو قمار حرام (ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، الباب السادس فی المسابقة ۵۰۲۲۲)۔

مذکورہ بلا صورت کے علاوہ بقیہ ہارجیت کی شکلیں جائز ہیں مثلاً:

۲- دو شخص میں یا دو ٹیم میں مقابلہ ہو۔ ایک پر انعام کی شرط ہو اور دوسرے پر نہ ہو تو یہ صورت جائز و درست ہوگی مثلاً راشدیہ کہے کہ اگر میں جیت گیا تو مجھے خالد دس ہزار روپیہ دے گا لیکن خالد جیت گیا تو میں اس کو کچھ بھی نہیں دوں گا، اسی طرح مثلاً جنید کی ٹیم کہے کہ اگر میری ٹیم جیت گئی تو دو سیم کی ٹیم، میری ٹیم کو دس ہزار روپیہ دے گی لیکن دو سیم کی ٹیم جیت گئی تو میری ٹیم اس کو کچھ نہیں دے گی۔ کھیل کی ہارجیت میں پیسے کی یہ شکل جائز و درست ہوگی (الدر المختار مع الرد، کتاب الحظر، باب الاستبراء وغیرہ ۵۷۷۹)۔

۳- دو شخص یا دو ٹیم کے درمیان ہارجیت کی دو طرفہ شرط ہو، لیکن کسی تیسرے شخص یا تیسری ٹیم کو بغیر کسی شرط کے شریک کر لیا گیا ہو کہ اگر تیسری ٹیم، تیسرا شخص ہارے گا تو اسے کچھ دینا نہ پڑے گا اور اگر وہ جیتے گا تو باقی دونوں شخص اسے حسب معاہدہ رقم دیں گے اور تیسرا شخص بھی ایسا ہو کہ اس سے جیتنے کی امید کی جاسکتی ہو تو ہارجیت کی یہ صورت بھی جائز ہوگی اگر تیسرے شخص کے ہارنے یا جیتنے کا یقین ہو جائے تو پھر یہ صورت ناجائز ہوگی کیونکہ اس وقت یہ صورت قمار (جوا) کی ہو جائے گی اس لئے یقین کی صورت میں یہ شکل جائز و درست نہیں ہے۔

إذا أدخلنا ثالوثاً محلاً بینہما بفرس كفاء لفرسیہما یتوہم أن یسبقہما وإلا لم یحجز (الدر المختار مع الرد، کتاب الحظر، باب الاستبراء وغیرہ ۹۰۵۷۸)۔

۴- دو ٹیم یا دو شخص ہارجیت کے مقابلہ میں شریک ہوں اور جیتنے والے کو انعام کوئی اور شخص دے یا حکومت دے یا کوئی تنظیم یا ادارہ دے تو یہ صورت بھی جائز ہوگی جیسا کہ آج کل مختلف دینی اداروں میں تقریر، نعت، قرأت کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس مقابلہ میں جو جیت جاتا ہے، اچھی پوزیشن سے پاس ہوتا ہے ادارہ اس کو انعام دیتا ہے یہ شکل بھی جائز ہے۔

يقول الأمير لفارسين أو راميين: من سبق منكما فله كذا وإن سبق فلا شيء له (رد المحتار، كتاب الحظر، باب

الاستبراء وغيره ۹۰۵۷۷)۔

۵۔ جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا تو ان کا کیا حکم ہوگا؟ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ شرعی اعتبار سے تضييع وقت خود ایک مکروہ و ممنوع چیز ہے، اس لئے کہ جس کھیل میں کوئی دینی یا دنیوی لائق اعتبار فائدہ نہ ہو اور اس کو کھیلنے یا دیکھنے میں وقت ضائع کیا جائے تو اس کا شمار بھی فعل عبث میں ہوگا اور شریعت میں فعل عبث مکروہ تنزیہی ہے۔ لہذا جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو لیکن اس میں کھیلنے والوں اور دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو شرعی طور پر وہ کھیل بھی مکروہ ہوگا چنانچہ کتاب الفقہ میں ہے:

وانما يجوز كل ذلك بشرط قصد الرياضة وتقوية البدن، لا بقصد التسلية و قطع الوقت (كتاب الفقه ۲۰۵۰)۔

۶۔ کھیل دیکھنے نیز اس کے لئے ٹکٹ خریدنے کا کیا حکم ہوگا، کیا اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات بھی ہیں؟

کھیل دیکھنے کے متعلق بھی وہی احکام و تفصیلات ہوں گے جو کھیل کے جواز و عدم جواز کے متعلق گذر چکے ہیں، یعنی کھیل کے ناجائز ہونے کی جو علتیں وہاں تھیں وہی یہاں پر کھیل دیکھنے کے ناجائز کی ہوں گی۔ اسی طرح جن شرائط کے ساتھ کھیل کھیلنا جائز ہے انہیں شرائط کے ساتھ اس کا دیکھنا بھی جائز ہوگا، لہذا اگر کسی کھیل میں کوئی امر خلاف شرع یا تشبہ بالکفار نہ ہو اور لباس کے معاملہ میں بھی اس میں پوری طرح رعایت کی جائے اور اس کھیل کو اس نیت سے دیکھا جائے کہ اس کے دیکھنے سے دماغ میں تازگی پیدا ہوگی، تکان دور ہوگا تو اس نیت سے اس کھیل کا بقدر ضرورت دیکھنا جائز ہوگا اور اگر کھیل دیکھنے کا مقصد محض تفریح و تماشا ہو تو پھر اس وقت جائز کھیل کا بھی دیکھنا ناجائز ہوگا کیونکہ جائز چیز اگر معصیت پر مشتمل ہو تو وہ بھی ناجائز ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کھیل دیکھنے کے لئے دلی یا ممبئی یا دوسرے شہر یا ملک کا سفر کرتے ہیں ان کے لئے سفر کرنا اور اس کھیل کو دیکھنا دونوں ناجائز ہیں کیونکہ اس کا مقصد صرف لہو و لعب اور تفریح و تماشا ہوتا ہے، البتہ اگر کسی کھیل میں عدم جواز کی کوئی صورت نہ پائی جائے تو اس کے لئے سفر کرنا اور دیکھنا دونوں جائز ہوگا۔

اب رہا مسئلہ ٹکٹ خریدنے کا تو اس کی بھی وہی تفصیل ہے جو کھیل دیکھنے کی ہے یعنی جس کھیل کا دیکھنا جائز ہے اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہے مگر ان تمام باتوں کا خیال رکھنا ہوگا جو ہم نے کھیل دیکھنے کے متعلق بیان کی یعنی جن شرائط کے ساتھ کھیل دیکھنا جائز ان کے ساتھ ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہے اور جو علتیں اس کے عدم جواز کی ہیں وہ اس کے عدم جواز کی بھی ہوں گی نیز جو کھیل حرام ہیں اس کا ٹکٹ خریدنا بھی حرام ہوگا۔ جو کھیل مکروہ ہے اس کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی جائز ہوگا۔

جواب (۳) الف۔ تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے یا نہیں جب کہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ بھی ہوتا ہے؟

تفریح کا مقصد اگر ندری، جمیل، جھرنائی جیسی قدرتی چیزیں یا تاریخی عمارتیں دیکھنا ہو تو ان مباح چیزوں کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا مباح ہے، چاہے اس میں کثیر رقوم کا صرفہ ہو، البتہ اگر تفریح کا مقصد کوئی کھیل تماشا یا زنا جیسی معصیت کا ارتکاب ہو تو اس وقت سفر کرنا ناجائز و حرام ہوگا۔

ب۔ کیا ایسے سفر میں بال بچوں کا ساتھ رکھنا درست ہے جب کہ بعض علاقوں کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے نقطہ نظر سے پرخطر ہوتا ہے؟

جس علاقہ کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے لئے پرخطر ہو اس سفر میں بال بچوں کا ساتھ رکھنا مکروہ ہے اور آدمی کو چاہئے کہ ایسے علاقہ کا وہ خود بھی سفر نہ کرے اور اگر جان و مال کا خطرہ نہ ہو تو ایسے سفر میں بلا کراہت بال بچوں کا رکھنا جائز ہے کیونکہ سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنے سے کافی مدد ملتی ہے نیز ان سے انسیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ بعض سفر میں امہات المؤمنین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں۔ بدائع الصنائع میں ہے:

كذلك حكم إخراج النساء مع أنفسهن إلى دار الحرب على هذا التفصيل إن كان ذلك في جيش عظيم، مأمون عليه غير مكروه لأنهم يحتاجون إلى الطبخ والغسل ونحو ذلك وإن كانت سرية لا يؤمن عليها بكرة إخراجهن لما قلنا والله تعالى أعلم (بدائع الصنائع، كتاب السير ۶۰۶)۔

(اسی طرح اپنے ساتھ دارالحرب کی طرف عورتوں کو لے جانا اسی تفصیل کی بنیاد پر ہے کہ اگر وہ پر امن عظیم لشکر میں ہوں تو عورتوں کو ساتھ لے جانا مکروہ نہیں ہے کیونکہ کھانا پکانے اور کپڑے دھونے وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر ایسے دستے میں ہوں کہ جس میں خطرہ ہو تو اس وقت ان کو لے جانا مکروہ ہے)۔

ج۔ جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر ایشیائے خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کا کیا حکم ہے؟

وہ جگہ جہاں پر غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہوں وہاں جانے کے لئے کرایہ پر سواری لگانا جائز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی کافر کسی مسلمان کی سواری شراب لے جانے کے لئے کرایہ پر لے یا کسی مسلمان کو مزدوری پر رکھے تو امام صاحب کے نزدیک یہ صورت جائز ہے اور اس کا کرایہ لینا جائز ہے مگر صاحبین کے کے نزدیک ناجائز ہے، چنانچہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

قال الزيلعي: وهذا عنده وقال هو مكروه، لأنه عليه الصلاة والسلام لعن في الخمر عشرة وعد منها: حاملها، وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولا سبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار وليس الشرب من ضرورات الحمل، لأن حملها قد يكون للإراقة وللتخليل فصار كما إذا استاجر لعصر العنب أو قطعه والحديث محمول على الحمل المقرون بقصد المعصية اهـ۔ زاد في النهاية وهذا قياس وقولهما استحسان ثم قال الزيلعي وعلى هذا الخلاف لو أجره (أي الكافر) دابته لينقل عليها الخمر أو أجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده وعندهما يكره (رد المحتار كتاب الحظر، فصل في البيعة ۵۰۲۷۶، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ پاکستان)۔

مذکورہ عبارت، جسے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہوں اس کے لئے سواری کرایہ پر لگانا جائز ہے کیونکہ کرایہ پر سواری دینا گناہ نہیں ہے اور نہ گناہ کا سبب اس لئے جائز ہونا چاہئے مگر اس میں اعانت علی المعصیت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان (سورہ مائدہ رکوع آیہ نمبر ۲) یعنی گناہ اور سرکشی پر مدد مت کرو۔ اس لئے اس سے احتراز لازم ہے۔

ایشیائے خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کا مقصد اگر غیر شرعی باتوں کو فروغ دینا ہو تو ناجائز ہوگا اور من کثر سواد قوم فهو منہم کے حکم میں ہوگا اور اگر تجارت کی نیت سے دوکان لگائے تو پھر بھی مکروہ تر یہی ہوگا، لیکن ایسی جگہ سے احتیاط مناسب ہے اس لئے کہ اس میں اعانت علی المعصیت ہے۔

مکرمات کو دور کرنا حکومت کے ہاتھ میں ہے کسی عام آدمی کے قبضہ میں نہیں ہے لہذا اگر اس کو گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی جگہ جانا جائز ہوگا اور نہ نہیں۔

د۔ جو کمپنیاں قیام کے سہولتوں کا نظم کرے اور وہاں ٹھہرنے والے لوگ شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے قیام کے لئے نظم کرنا درست ہوگا، کیونکہ فی نفسہ قیام کا نظم کرنا گناہ نہیں ہے جیسا کہ کوئی آدمی اپنا گھر کسی کو شراب بنانے کے لئے کرایہ پر دے، کیونکہ اس نے گھر کی منفعت کا پیرہ لیا اور اس میں کوئی معصیت کی بات نہیں ہے، معصیت تو کرایہ کے فعل کی وجہ سے ہے (رد المحتار کتاب الحظر، فصل فی البیع ۲۷۷۱۵، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ پاکستان)۔ اسی طرح اگر کسی نے انگور کا پھول ہوا پانی کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ اس پانی کا شراب بنائے گا تب بھی اس کا بیچنا جائز ہوگا، کیونکہ انگور کا پانی فی نفسہ گناہ نہیں ہے لیکن بعض علماء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ و جاز بیع عصیر عنب ممن يعلم انه يتخذہ خمرًا لان المعصية لا تقوم بعینه بل بعد تخیره وقیل: یکره لإعانتہ علی المعصية (رد المحتار کتاب الحظر، فصل فی البیع ۲۷۷۱۵، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ پاکستان)۔

اسی طرح اگر کوئی کمپنی مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کے لئے ٹکٹ یا سواری کا نظم کرے تب بھی یہ جائز ہونا چاہئے، کیونکہ بعض علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے چرچ کی تعمیر کی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے مزدوری کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ شامی میں ہے:

قوله: و جاز تعمير كنيسة قال في الخانية: ولو أجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به، لأنه لا معصية في عين العمل (رد المحتار كتاب الحظر، فصل في البيعة ۵۰۲۷۶، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ پاکستان)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹور کمپنیاں جو آمد و رفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرتے ہیں جس میں بعض مسافر شراب اور دوسری برائی میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض کا مقصد مندروں، اور چرچ وغیرہ کا زیارت کرنا ہوتا ہے ایسی کمپنیوں کا قائم کرنا جائز ہے، کیونکہ فی نفسہ قیام کی سہولت کا مہیا کرنا یا ٹکٹ

فروخت کرنا یا سواری کرنا یہ پر لگانا جائز ہے لیکن صاحبین کا قول ہے کہ اس میں اعانت علی المعصیت ہے اس لئے ایسا کرنا مکروہ ہے: وقالا: لا ینبغی ذلک لانه إعانة علی المعصیة وبه قالت الثلاثة (الدر المختار مع الرد کتاب الحظر، فصل فی البیعة ۵۰۲۸، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ پاکستان)۔

۳- اگر فلم اس طرح بنائی جائے کہ کیسٹ یا سی ڈی وغیرہ میں قاری قرآن کی آواز بھی ریکارڈ ہو اور مقامات مقدسہ کی فلم بھی، اور متعلقہ آیات کو سنتے ہوئے ان مقامات کو اسکرین پر دیکھا جائے یا متعلقہ آیات کو پڑھتے ہوئے ان مقامات کو طلبہ اسکرین پر دیکھیں تاکہ ان کے اندر اس مضمون کا زیادہ ادراک پیدا ہو تو ان مقاصد کے لئے ایسی فلمیں بنائی جاسکتی ہیں، کیونکہ احادیث مبارکہ میں جن تصویروں کی مذمت بیان کی گئی ہے ان سے مراد جاندار کی تصویریں ہیں۔ غیر جاندار کی تصویریں اس سے مستثنیٰ ہیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر جاندار کی تصویر بنانے کی اجازت فرمائی ہے:

قال: إن كنت لا بد فاعلا فاصنع الشجر وما لا نفس له (مسلم شریف، باب تحريم تصوير صورة الحيوان ۲۰۲۰)۔  
(اگر تمہیں تصویر بنانی ہے تو درخت کی بنا اور ان چیزوں کی بنا جن میں روح نہیں)۔

تمام علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر جاندار کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے نیز اس سے کمائی کرنا بھی حرام نہیں ہے مگر مجاہد کے نزدیک پھلدار درخت کی تصویر بنانا مکروہ ہے چنانچہ امام نووی نے فرمایا:

وأما الشجر ونحوه مما لا روح فيه فلا يحرم صنعه ولا التكسب به سواء الشجر المشمر وغيره وهذا مذهب العلماء كافة إلا مجاهد فإنه جعل الشجر المشمر من المكروه وقال القاضي لم يقله أحد غير مجاهد (شرح مسلم للنووی، باب تحريم تصوير صورة الحيوان ۲۰۲۰)۔

مذکورہ حدیث اور امام نووی کے قول سے تو صاف ظاہر ہے کہ غیر جاندار کی تصویر بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے لہذا تعلیمی مقاصد کے لئے اگر ان مقامات کی فلم بنائی جائے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں آیا ہے تو ان فلموں کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح اگر تاریخی فلمیں بنائی جائیں یعنی ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے آثار قدیمہ کی فلمیں بنائی جائیں تو وہ بھی جائز ہوں گی مگر ان فلموں کو بنانے اور انہیں استعمال کرنے کی چند شرطیں ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱- پہلی شرط یہ ہے کہ ان فلموں میں کسی جاندار کی تصویر نہ ہو، کیونکہ حدیث پاک میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔
- ۲- دوسری شرط یہ ہے کہ ان فلموں کا استعمال محض اہو و لعب اور تفریح و تماشا کے مقصد کے لئے نہ کیا جائے۔ ان شرطوں کے ساتھ ان فلموں کا استعمال کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

۵- الف- موجودہ دور میں کارٹون کے بنانے کا رواج عروج پر ہے۔ روزنامہ اخبارات کے فرنٹ پیج پر کارٹون ضرور ملتے ہیں۔ کارٹون بنانے کا مقصد شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جس سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس طرف ہے یہ صحیح ہے کہ کارٹون میں انسانی شکل کے خدو خال پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے لیکن اتنا بھی غیر واضح نہیں ہوتے کہ مشارالہ (جس کی طرف اشارہ کیا جائے) کچھ میں نہ آئے، لہذا کارٹون کا شمار تصویر میں ہی ہوگا اس لئے تصویر سے متعلق جو احکام احادیث و کتب فقہیہ میں وارد ہیں وہ اس پر بھی مرتب ہوں گے۔ حدیث میں ہے:

عن أبي طلحة قال قال النبي ﷺ: لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا تصاوير (بخاری شریف، باب التصاوير ۲۰۸۰)۔

(حضرت ابو طلحہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے ہیں جس میں کتا اور تصویریں ہوں)۔

بہر حال مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے اور جب کارٹون کا شمار بھی تصویر میں ہو گیا تو وہ بھی اسی کے حکم میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا چاہے دستی اور قلمی بنایا جائے یا پریس سے چھاپ کر بنایا جائے ہر طرح سے حرام ہے

ب- کارٹون بنانا اس وقت ایک نفع بخش ذریعہ آمدنی بھی ہے تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

اوپر ”جزء الف“ میں جب یہ معلوم ہو گیا کہ کارٹون تصویر کا ہی ایک حصہ ہے اور اس کا شمار تصویر میں ہی ہے تو اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ کارٹون بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا حرام ہے۔

ولو استاجر مصورا فلا أجر له لأن عمله معصية، كذا عن محمد، ولو هدم بيتا فيه تصاویر ضمن قيمته خاليا عنهما (رد المحتار، مکروهات الصلوة ۲۰۲۰)۔

(اگر کسی نے تصویر بنانے والے کو مزدوری پر لیا تو اس کی کوئی اجرت نہیں ہے، اس لئے کہ تصویر بنانا گناہ ہے۔ اسی طرح کی روایت امام محمد سے ہے کہ اگر کسی نے ایسا گھر منہدم کر دیا جس میں تصویریں بھی ہوں تو صرف گھر کو ڈھانے کا تاوان دے گا تصویروں کا نہیں دے گا)۔

۶- فرضی اشعار یا فرضی کہانیاں جو سامعین کے سامنے پیش کی جائیں اور ان سے سامعین کو دھوکہ نہ ہو، ایسی کہانیوں اور اشعار کا سننا اور سنانا دونوں جائز ہے کیونکہ فرضی اشعار کا سننا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ کعب بن زہیر کا شمار ممتاز مخضر مین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا ”قصیدہ بانٹ سعاد“ اپنی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے ادب عربی میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے جسے سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی چادر مبارک اتار کر ان کو اڑھادی اور شاعر و شعر دونوں کو عمر جاوید عطا فرمائی اور اسی وجہ سے اس قصیدہ کا امتیازی نام ”قصیدہ بردہ“ پڑ گیا۔ قصیدہ کا مطلع ہے

بانٹ سعاد فقلبی الیوم متبول متیم اثره لم یفد مکتبول

(آج سعاد داغ مفارقت دے گئی تو میرا دل بے چین ہے میں اس کے پیچھے ایسا محبت کا غلام ہوں جس کے پیر میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور جس کی رہائی کے لئے کوئی فدیہ نہیں دیا گیا)۔

حضرت کعب بن زہیر نے اس قصیدہ کو جاہلی ریت کے مطابق تشبیہ سے شروع کیا اور اپنی ایک فرضی محبوبہ کا ذکر کیا ہے جس کا نام انہوں نے ”سعاد“ رکھا کیونکہ جاہلی اور قدیم شعراء کا یہ دستور تھا کہ وہ اصل مضمون کو بیان کرنے سے پہلے کسی خیالی محبوبہ اور اس کے عارض کا ذکر یا محبوب کو یاد دلانے والے اور اس سے نسبت رکھنے والے مقامات کا ذکر کرتے تاکہ آتش شوق تیز ہو اور جس وقت اصل مضمون پر آئیں اس وقت بیان کرنے والے کا جوش اور سننے والوں کا اشتیاق نقطہ کمال پر پہنچ چکا ہو، قدیم شعراء اس کو تشبیہ سے تعبیر کرتے تھے۔ تشبیہ کا یہ مضمون عام طور سے قصیدہ کے ایک تہائی یا نصف ہوتا ہے۔ کعب بن زہیر نے بھی اس قصیدہ کی ابتداء قدیم عربی شاعری کے روایتی انداز سے کی اور مطلع میں اپنی فرضی محبوبہ سعاد کا ذکر کیا اور اس کے بعد کے اشعار میں اس کی صفات بیان کیں اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعر کی فرضی محبوبہ کے سلسلے میں اشعار پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ ان کو اپنا پیرا، بن مبارک عطا فرما کر شاعر اور شعر دونوں کو عمر جاوید عطا فرمائی۔

معلوم ہوا کہ فرضی کہانی یا اشعار کا سننا درست ہے جب کہ اس سے سامعین کو دھوکہ نہ ہو، مگر ان فرضی کہانیوں کو ڈرامہ اسٹیج کی شکل میں پیش کرنا چند شرائط کے ساتھ درست ہے:

- ۱- کوئی امر خلاف شرع نہ ہو مثلاً فحش کلامی وغیرہ نہ ہو۔
- ۲- رول ادا کرنے والوں میں کوئی لڑکی یا اجنبی عورت نہ ہو۔
- ۳- ڈرامے میں کسی عالم یا صوفی کا رول ادا نہ کیا جائے، کیونکہ کسی عالم یا صوفی کا رول ادا کرنا علم، عالم اور تصوف کا مزاق اڑانا ہے جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔ مذکورہ شرائط کے ساتھ ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

## تفریح - اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی ع

الف - حدود میں رہتے ہوئے مزاح جائز ہے ورنہ ممنوع ہوگا، مزاح کے لغوی معنی خوش طبعی کے ہیں اور یہ خوش طبعی جناب رسول اللہ ﷺ بھی بعض اوقات اپنے رفقاء اور ازواج مطہرات کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، حضرت انسؓ راوی ہیں کہ میرے بھائی گوریے سے کھیل رہے تھے، اتفاق سے وہ گوریا مر گیا، آپ ﷺ نے ان سے مزاح فرمایا: اے ابوعمیر! تمہارے گوریے کا کیا ہوا؟ "یا ابا عمیر ما فعل بك النغیر" (بخاری، باب الانبساط إلی الناس)۔

ایک بوڑھی خاتون خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہیں ہوگی، وہ بے چاری رونے لگی، آپ ﷺ نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ اس دن تم بوڑھی نہیں ہوگی، بلکہ سارے لوگ جوان ہو کر جنت میں جائیں گے (شمائل ترمذی)۔

خاص طور پر ازواج مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ زیادہ مزاح کرتے تھے، حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ لوگوں میں سب سے زیادہ مزاح کرنے والے تھے: "کان من أفكہ الناس مع نسائه" (قاموس الفقہ ۵۰۸۲)۔

معلوم ہوا کہ اس طرح کا مزاح جائز ہے اور آپ ﷺ سے ثابت بھی ہے، لیکن اگر اس مزاح میں پانچ چیزیں یا ان پانچ میں سے کوئی ایک بھی چیز شامل ہوگی تو پھر یہ مزاح ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

۱- اس مزاح میں کوئی گناہ کی بات شامل ہو جائے یعنی اس میں جھوٹ بولا جائے تو پھر گناہ ہوگا، چنانچہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مزاح تو کرتا ہوں لیکن حق و سچائی کے سوا نہیں کہتا، حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے کوئی بات کہے تو آدمی اس کی وجہ سے آسمان سے بھی زیادہ دوری پر گر جاتا ہے۔ اس حدیث کا منشا یہی ہے کہ محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولا جائے تو جائز نہیں۔

۲- اسی طرح ایسا مزاح جو دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث اور وجہ اذیت ہو تو جائز نہیں۔

۳- اسی طرح اس میں مبالغہ کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

۴- اسی طرح اس میں مداومت اور مواظبت بھی ممنوع اور ناجائز ہوگا، اس طرح کہ آدمی اس کو اڑھنا بچھونا بنا لے۔

۵- اور اسی طرح افراط بھی منع ہوگا، افراط سے مراد بہت ہنسانا ہے اور مداومت سے مراد یہ ہے کہ زیادہ وقت ہنسی مذاق میں گزارے (قاموس الفقہ ۸۲/۵، وھکذا فی احیاء العلوم ۱۹۹/۳)۔

ب- مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا ناجائز ہوگا، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن الناس من یشتري لھو الحدیث... الخ" (سورہ اہقان) (اور ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے)۔

اور پھر ایسے پروگراموں میں گھنٹوں اوقات ضائع ہوتے ہیں اور وقت کا ضیاع بالکل حرام ہے، اسی طرح یہ مزاحیہ پروگرام اس وقت تک قبولیت حاصل نہیں کر پاتا جب تک اس میں جھوٹ کی آمیزش اور ملاوٹ نہ ہو اور پہلے حدیث گذر چکی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے تو اس کی وجہ سے آسمان سے بھی زیادہ دوری پر گر جاتا ہے۔

ج- یہ تینوں چیزیں بھی ناجائز اور حرام ہیں، ومن الناس من یشتري لھو الحدیث کے ذیل میں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں: اس زمانے میں بیشتر نوجوان فحش ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں، یہ سب چیزیں اسی قسم کے حرام میں داخل ہیں (معارف القرآن ۱۳/۷)۔

ملہ دارالافتاء والارشاد، چونا بھٹی مسجد، منٹا کروڑ، ممبئی۔



اور ان تینوں میں اپنے اوقات عزیزہ کو بھی ضائع کرنا ہے اور دوسروں کے بھی اور جھوٹ باتیں لکھنا ہے اور پھر اس کی نشر و اشاعت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گناہ پر تعاون کرنا ہے، اور قرآن میں ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (سورہ مائدہ)۔

۱- ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص نفسیاتی مریض ہے یا ڈپریشن کا شکار ہے اور اس کی صحت کا مدار ہنسنے ہنسانے پر ہے تو ایسے شخص کو بطور علاج اور بطور دوا بہ تکلف قہقہہ لگانا اور ایسے پروگرام دیکھنا جائز ہوگا تاکہ اس کی وجہ سے اس کی صحت برقرار رہے، لیکن صحت بحال ہونے کے بعد پھر گنجائش نہیں رہے گی۔

۲- الف- کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ جو کھیل بدن کی ورزش، صحت و تندرستی باقی رکھنے کے لئے یا کسی دوسری دینی و دنیوی ضرورت کے لئے یا کم از کم طبیعت کا تزکان دور کرنے کے لئے ہوں اور ان میں غلو نہ کیا جائے کہ انہی کو مشغلہ بنا لیا جائے اور ضروری کاموں میں ان سے حرج پڑنے لگے تو ایسے کھیل مباح اور دینی ضرورت کی نیت سے ہو تو ثواب بھی ہے (معارف القرآن ۷/ ۲۳۱)، اور آپ تحریر فرماتے ہیں کہ کھیل ایسا ہو جو مختصر وقت میں پورا کیا جاسکتا ہو جیسے فٹ بال، والی بال، ایسا طویل کھیل نہ ہو جو آدمی کو شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دیں، جیسے شطرنج اور فی زمانہ کرکٹ، تاش۔

۲- ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا امکان ہو جیسے فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ۔ ایسے کھیل جائز نہیں ہیں۔

۳- مردوں کے لئے زمانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی، کبڈی درست نہیں ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

۴- کھیل خواہ کوئی بھی ہو اگر اس میں جوا ہو تو جائز نہیں کہ جو احرام ہے، کھیل کے بارے میں یہ چند بنیادی باتیں ملحوظ رکھنی ہوں گی (مستفاد راہ عمل ۱۷۶-۱۷۷)۔

ب- لباس کے بارے میں شرعی اصول یہ ہے کہ کھلاڑی ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو، یعنی مرد تو نواف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں اور خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ نواف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیونکہ حصہ ستر کو چھپانا شرعاً عاوا جب ہے، اور پھر اس بات کا بھی (مرد و عورت دونوں کھلاڑی کو) خیال رکھنا ہوگا کہ اگرچہ لباس تو دونوں کا ساتر ہے کہ ان کے حصہ ستر کو چھپا رہا ہے لیکن اتنا تنگ ہے کہ دونوں کے اعضاء مستورہ اگر نمایاں ہوتے ہیں تو یہ بھی بے پردگی کے حکم میں ہوگا، اور یہ لباس بھی حرام ہوگا اور دونوں گنہگار ہوں گے۔

ج- چند جائز اور مستحب کھیل:

کچھ کھیل جن کا احادیث سے ثبوت ہے، یہاں ان کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) دوڑ: دوڑ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑ فرمائی ہے، حضرت سلمہ بن اکوع راوی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ مدینہ تک دوڑ کا مقابلہ کرے؟ اور یہ شخص اتنا تیز دوڑتا تھا کہ لوگ اس پر سبقت حاصل نہیں کر پاتے تھے، میں نے اس سے کہا: تم کو کسی کی عزت و شرافت کا بھی خیال نہیں؟ اس نے کہا: سوائے رسول اللہ کے میں کسی اور کو دعوت مقابلہ دینے سے باز نہیں آسکتا، حضرت سلمہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی اور مقابلہ کیا تو سبقت حاصل کر لی (نیل الاوطار ۸/ ۹۲، حوالہ راہ عمل ۱۷۷)۔

(۲) کشتی: اسلام کشتی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے، رکانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت مقابلہ دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا کشتی ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیت گئے اور یہی شکست حضرت رکانہ کے قبول اسلام کا سبب بنی (حوالہ بالا)۔ موجودہ زمانہ میں ”کرائے“ بھی کشتی کے حکم میں ہے کیونکہ اس کا مقصد بھی جسمانی ورزش اور مدافعتی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے۔

(۳) تیراکی: اس کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ذکر کے علاوہ ہر چیز لہو و لعب ہے، سوائے چار چیزوں کے: شوہر اپنی بیوی سے دل لگی کرے، اپنے گھوڑے کی تربیت کی جائے، دو مقبرہ نشانوں کے درمیان چلنا اور تیراکی کا فن سیکھنا (الجامع الصغیر ۱۵/ ۳۳۱)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کو تیراکی اور تیراندازی سکھانے کی ترغیب دی۔

(۴) گھوڑ دوڑ: یہ بھی جائز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے کی دوڑ کا مقابلہ کراتے جو گھوڑے چھبر برے اور ہلکے بدن کے ہوتے ان کے لئے موازنے کی جگہ اور اس کی حد حفیہ سے ثنیۃ الوداع تک ہوتی اور جو بھاری بدن کے ہوتے ان کی ثنیۃ الوداع سے مسجد بنور ریت تک (بخاری مع الفتح ۲۱۴)، لیکن آج کل جو گھوڑ دوڑ ہوتی ہے جس کا اصل مقصد جوابی ہوتا ہے یہ جائز نہیں۔

(۵) تیر اندازی: اس کی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر کام کا تفریح طبع کے طور پر کیا جانا ناروا ہے سوائے تین باتوں کے ان میں ایک تیر اندازی کا ذکر فرمایا (ترمذی)، موجودہ زمانے میں بندوق وغیرہ کی نشاندہ بازی بھی اسی حکم میں ہے (مستفاد از راہ عمل ۱۷۳-۱۷۹)۔

حضرت مفتی شفیع صاحب جوہر الفقہ میں مفید کھیل کے عنوان سے چند کھیل ذکر فرمائے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ جن کھیلوں سے کچھ دینی یا دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ جائز ہیں بشرطیکہ انہیں فوائد کی نیت سے کھیلا جائے، محض لہو و لعب کی نیت سے نہ ہو لیکن اس کی بازی پر کوئی معاوضہ یا انعام و شرط مقرر کرنا جائز نہیں، مثلاً گیند کھیل کہ اس سے جسمانی ورزش ہوتی ہے، یا لانٹھی وغیرہ کے کھیل یا پہلوانوں کی کشتی وغیرہ جو قوت جہاد میں معین ہو سکتے ہیں، اسی طرح معمرہ بازی، شعر بازی، تعلیمی تاش وغیرہ، ہارجیت کی بازی لگانا جائز ہے، مگر اس پر کوئی رقم معاوضہ کی مقرر کرنا جائز نہیں، بلکہ قمار حرام ہے (۳۵۱/۲)۔

ج - چند ناجائز اور بے فائدہ کھیل:

ایسے کھیل تماشے جن کے ماتحت میں کوئی معتدبہ فائدہ نہ ہو نہ دین کا نہ دنیا کا وہ سب ممنوع اور ناجائز ہیں خواہ ان پر بازی لگائی جائے یا انفرادی طور پر کھیلا جائے پھر بازی پر کوئی رقم لگائی جائے یا نہیں اور رقم بھی دو طرفہ ہو یا یک طرفہ، بہر حال ایسے لغو کھیل شرعاً مطلقاً ناجائز ہیں اور ان کھیلوں میں پتنگ بازی، کبوتر بازی، بیٹر بازی، مرغ بازی، چوسر، شطرنج، تاش، کتوں کی ریس وغیرہ تمام کھیل شامل ہیں (جوہر الفقہ ۳۵۲/۲)۔

گھوڑ دوڑ: پہلے ثابت ہو چکا کہ گھوڑ دوڑ بے مستحب کھیل ہے، چونکہ حدیث میں اس کا ذکر ہے، لیکن اگر گھوڑ دوڑ کی بازی محض کھیل تماشیا روپیہ کی طبع کے لئے ہو اور استعداد قوت جہاد کی نیت نہ ہو تو یہ صورت ناجائز ہوگی۔ اسی طرح معاوضہ یا انعام کی شرط فریقین میں دو طرفہ ہو اور کسی تیسرے کو اپنے ساتھ (چند مخصوص شرائط پر) نہ ملایا جائے تو یہ قمار حرام ہے، اسی طرح ریس کی مروجہ شکل کہ گھوڑوں کی دوڑ کسی کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے، گھوڑے کمپنی کی ملک اور سوار کمپنی کے ملازم اور دوسرے لوگ گھوڑوں کے نمبر پر اپنا داؤ لگاتے ہیں جس کی فیس ان کو داخل کرنا ہوتی ہے، جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اس پر داؤ لگانے والے کو انعامی رقم مل جاتی ہے، باقی سب لوگوں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے یہ صورت مطلقاً قمار حرام ہے، (تفصیل کے لئے دیکھئے: جوہر الفقہ ۳۵۲/۲)۔

لاٹری ٹکٹ خریدنا: مفتی کفایت اللہ صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ شہروں میں لاٹری ٹکٹ خریدے جاتے ہیں، یہ جائز ہے یا ناجائز، جواب میں آپ نے فرمایا: لاٹری ٹکٹ خریدنا ناجائز ہے، قمار ہے اور قمار حرام ہے (کفایت المفتی ۲۶۲/۹)۔

اخباری معمرے: آج کل وبا کی طرح قمار کی یہ صورت بھی عام ہو گئی ہے جو صل معمرے کے عنوان سے بہت سے اخباروں اور رسالوں کا بڑا کاروبار بنا ہوا ہے یہ بھی قمار ہے اور حرام ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: جوہر الفقہ ۳۴۳/۲)۔

تاش، شطرنج، چوسر، یہ تینوں کھیل بھی ناجائز اور حرام ہے، عالمگیری میں ہے: ”ویکرہ اللعب بالشطرنج والسرود وثلاثة عشر وأربعة عشر وكل لهما سوى الشطرنج حرام بالإجماع، وأما الشطرنج فاللعب حرام عندنا“ (۵۰۲۵)۔

۱- اس کھیل میں دینی اور جسمانی کوئی فائدہ مقصود نہیں ہوتا۔ ۲- اس میں وقت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے اور ذکر اللہ سے غافل کرنے والا ہے۔ ۳- سب سے شدید ضرر یہ ہے کہ اس کھیل کی عادت پڑنے پر چھوڑنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ۴- بعض گیم تصویروں اور فوٹو پر مشتمل ہوتے ہیں جو کہ شرعاً ناجائز ہے (تفصیل: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳۲۶)۔

ج - مکروہ کھیل:

بطور تفریح کے کیرم بورڈ مکروہ ہوگا اور پھر یہی کھیل آئندہ ہارجیت کا ذریعہ بن جاتا ہے، لہذا احتیاط مناسب ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۵۳، آپ کے مسائل ۳۲۹)۔

د - کھیل کے ہارجیت میں اگر پیسہ کی شرط ہو تو اس کے جائز ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ فریقین جو بازی لگا رہے ہیں آپس میں کسی کو کسی سے کچھ لینا دینا نہ ہو بلکہ حکومت وقت یا کسی تیسرے شخص کی طرف سے بطور انعام کوئی رقم مقرر ہو تو یہ جائز ہے اور قمار نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آگے بڑھنے والے کے لئے یا کھیلنے والے کے لئے معاوضہ یا انعام فریقین ہی کی جانب سے ہو مگر صرف ایک طرف سے دو طرفہ شرط نہ ہو اور نہ دو طرفہ شرط قمار کی صورت ہوگی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی بھی کھیل کوئی خاص کمپنی شروع کرائے اور مثال کے طور پر گھوڑ دوڑ، اس میں گھوڑے کمپنی کی ملک اور سوار کمپنی کے ملازم اور

اب دوسرے لوگ گھوڑے کے نمبر پر اپنا داؤ لگاتے ہیں جس کی فیس ان کو داخل کرنا ہوتی ہے جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اس پر داؤ لگانے والے کو انعامی رقم مل جاتی ہے باقی سب لوگوں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے یہ صورت بھی قمار کی ہے اور حرام ہے (تفہیم جواہر الفقہ ۲/۳۲۸-۳۵۰)۔

۵- اگرچہ لباس اور طریقہ کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو لیکن وقت کا ضیاع یہ خود مستقل کبیرہ گناہ ہے، نہ کھیلنے کی اجازت ہوگی اور نہ دیکھنے کی۔ اسلام وقت کے ضیاع کو سخت ناپسند کرتا ہے، کل قیامت میں وقت کے بارے میں سوال ہوگا، تم نے اپنے اوقات کو کہاں پر لگایا؟ اور قیامت میں عمر اور خاص کر اپنی جوانی کے زمانہ کا حساب دینا ہوگا کہ اسے کن کاموں میں خرچ کیا (ترمذی)۔

۶- جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل ہو تو ایسے کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا بھی ناجائز ہوگا، اس لئے کہ یہ گناہ پر اجارہ ہے اور گناہ پر اجارہ درست نہیں ہے۔

عالمگیری میں ہے: ”ولا تجوز الإحارة على شيئ من الغناء والنوح والزمير والطبل وشيئ من اللہو“ (۳/۲۳۹) اور اگر وہ کھیل محرمات اور خرافات سے پاک ہو اور شرعاً اس کھیل کی اجازت ہو اور اس کھیل میں وقت کی تعیین عملاً ممکن ہو تو پھر اس کی ٹکٹ خریدنے کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ اجارہ میں وقت کی تعیین ضروری ہے، عالمگیری میں ہے: ”يصح العقد على مدة معلومة أى مدة كانت قصرت المدة كالليوم وغوه أو طالت كالسنتين كذا في المضمرات“ (۲/۲۱۵)۔

۳: الف- ایک حدیث میں ارشاد ہے: ”روحوا القلوب ساعة فساعة“ (ابوداؤد) یعنی تم اپنے قلوب کو کبھی کبھار آرام دیا کرو، اسی طرح بعض صحابہ کرام سے منقول ہے کہ جب وہ قرآن وحدیث کے مشاغل میں تھک جاتے تو بعض اوقات عرب کے اشعار یا تاریخی واقعات سے دل بہلاتے تھے۔

ان روایات کے پیش نظر گھر کے اندر کوئی تفریحی مشغلہ کچھ دیر کے لئے اختیار کر لیا جائے، اسی طرح باہر ہوا خوری یا کچھ دیر ٹہلنے کے لئے اگر نکلا جائے تو اجازت ہوگی، لیکن صرف تفریحی مقصد کے پیش نظر ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک باقاعدہ سفر کرنا اور ہزاروں روپے (جو درحقیقت اللہ پاک کی دی ہوئی نعمت ہے) اس لائسنسی کام کی خاطر پھونک دینا اس کی اجازت نہیں ہوگی، گویا تفریح اب مقصود بن گئی، حالانکہ یہ ایک وقتی ضرورت تھی دل و دماغ کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانے کے لئے اور ان دونوں باتوں سے کام لینے کے لئے۔

ب- شریعت کا مزاج یہ ہے کہ وہ ایک عورت کو بغیر ضرورت شدیدہ کے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا، اور جب اجازت بھی ملتی ہے تو شریعت بہت ساری حدود و قیود کے ساتھ اجازت دیتی ہے، بغیر زیب و زینت کے اور پورے شرعی پردے کے ساتھ۔ قرآن میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ”وقربن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولى“ (احزاب)، وہ حج و زیارت، تعزیت و تیمارداری، والدین اور قرابت داروں سے ملاقات کے لئے اور علاج و معالجہ کے لئے نکل سکتی ہے، وہ بھی بغیر بناؤ سنگھار کے، ایک نوجوان عورت کو جب نماز جو اہم عبادت ہے اور جہاد جو انشاء کلمۃ اللہ کے لئے سب سے اہم کوشش ہے، اس کے لئے نکلنے کو ناپسند کیا گیا تو پھر تفریحی مقصد سے نکلنے کی اجازت کیسے اور کیونکر ہو سکتی ہے؟

اس بارے میں حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کا تفصیلی جواب احسن الفتاویٰ (۸/۲۸) پر موجود ہے، اس کے اقتباسات ملاحظہ ہوں، قرآن وحدیث میں عورت کو پردے کی سخت تاکید اور عورت کو باہر نکلنے میں مفاسد کثیرہ کے پیش نظر عورت کا تفریح کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں، اگر نکلے گی تو اس کے علاوہ اس کا شوہر اور دوسرے اولیاء بھی سخت گنہگار ہوں گے، ان سب پر ایسے فسق و فجور سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

- ۱- عورت کو بلا ضرورت برقع اوڑھ کر بھی گھر سے نکلنا حرام ہے، ”وقربن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولى“۔
- ۲- عورت برقع وغیرہ میں لپیٹ کر بھی باہر نکلے گی تو غیر محرم پر نظر پڑے گی، حدیث میں امہات المؤمنینؓ کو ایک متقی نابینا صحابیؓ کی طرف دیکھنے سے منع کیا گیا۔
- ۳- باہر نکلنے میں منکرات و فواحش، عمریاں عورتوں اور تصاویر پر نظر پڑے گی جس کا قلب پر برا اثر پڑے گا۔
- ۴- گانوں اور باجے کی آوازیں کان میں پڑیں گی اور قلب پر اثر کرے گی، مفاسد مذکورہ اگرچہ مردوں کے خروج میں بھی پائے جاتے ہیں مگر مرد و عورت کے خروج میں دو وجہ سے فرق ہے۔

- (۱) مرد کا خروج ضرورت دینیہ و دنیویہ کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتے ہیں اور عورت کا تفریح کے لئے نکلنا ضرورت میں داخل نہیں۔
- (۲) حفظ صحت کے لئے بھی مردوں کو باہر نکلنے کی ضرورت ہے، عورتوں کو اس کی ضرورت نہیں، عورتوں کو دقرن فی بیوتکن کا حکم ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے گھر کے اندر کا ماحول ان کے لئے سازگار بنایا ہے، ان کی صحت گھر کے اندر ہی ٹھیک رہتی ہے، جس عورت کو صحت کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس ہو تو یہ اس کی

دلیل ہے کہ کثرت معاصی سے اس کی فطرت تبدیل ہو گئی ہے یہ اس کے بے دین ہونے کی علامت ہے، دیندار عورتوں کی حمت گھر ہی میں ٹھیک رہتی ہے۔ حضرت فقہ الامت "فتاویٰ محمودیہ میں تحریر فرماتے ہیں: اضطراب کی حالت میں نفیر عام کے وقت عورتوں کو جہاد کے لئے نکلنا درست ہے، بشرطیکہ ان کو قتال کی قدرت بھی ہو اور لشکر بڑا ہو، مرہم پٹی وغیرہ کے لئے بوڑھی عورتوں کا نکلنا جائز ہے جو انوں کو نہیں، جب جہاد کے لئے نکلنے کا حکم یہ ہے تو پھر شوہروں کے ساتھ گھومنا تو کوئی عبادت بھی نہیں۔ آج فتنہ و فساد کے غلبہ کی وجہ سے مساجد میں نماز کے لئے عورتوں کا آنا بوجہ اولیٰ ممنوع ہوگا، جبکہ دینی امور میں عورتوں کے نکلنے کا یہ حکم ہے تو پھر شوہروں کے ساتھ گھومنا تو کوئی دینی ضرورت نہیں بلکہ نصاریٰ کا شعار اور طریقہ ہے وہ کسے جائز ہو سکتا ہے (۱۸۷/۱۹)۔

ج۔ معصیت اور گناہ کے کاموں میں تعاون اور مدد بھی گناہ ہے، اور فقہاء کے نزدیک حرام ہے، لیکن معصیت میں تعاون سے مراد ایسی شئی ہے کہ جس سے بعینہ معصیت کا ارتکاب کیا جاتا ہو، اسی لئے فقہاء نے اہل فتنہ سے اسلحہ فروخت کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، اور ایسے مقام پر سواری کرنا یہ پر لگانا اسی طرح ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دوکان لگانے کا تعلق ان غیر شرعی باتوں اور جگہوں سے نہیں ہے اس لئے ایسی جگہ پر دوکان لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے: "ویکرہ بیع السلاح فی ایام الفتنة ولا بأس بیع العصیر بمن یعلم انه یتخذ خمرًا، لأن المعصية لا تقام بعینہ" (۲، ۴۵۶)۔

د۔ آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم ہیں، درحقیقت ان کے قیام کی بنیاد اور مقصد صرف لوگوں کے سفر کا بہتر سے بہتر انتظام کرنا ہے، کھانے پینے اور قیام کے اعتبار سے اور ٹکٹ کی سہولت فراہم کرنے کے اعتبار سے اور پھر ان سفروں میں اشخاص اور افراد کے احوال بھی مختلف ہوتے ہیں اور لوگوں کی نیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ ایسے اسفار پر داعش دینے کے لئے جاتے ہیں اور کچھ لوگ مندر اور چرچوں کی زیارت اور عبادت کی غرض سے جاتے ہیں، حالانکہ ان کمپنیوں کے قیام کا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے۔ اب کسی معصیت کی اعانت جواز قرآن حرام ہے، وہ ہے جس میں معصیت کا قصد و نیت حقیقتہً یا حکماً شامل ہو۔ حقیقتہً یہ کہ دل میں یہ ہو کہ اس کے ذریعہ عمل معصیت کیا جائے اور حکماً یہ ہے کہ وہ چیز بجز معصیت کے کسی دوسرے کام میں نہ آتی ہو، جیسے آلات معارف، طلبہ سارنگی وغیرہ۔ اور جہاں قصد معصیت نہ حقیقتہً ہو نہ حکماً وہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل نہیں، البتہ اعانت سے ملتی جلتی ایک اور چیز ہے جس کو اصطلاح میں "تسبب" کہتے ہیں وہ بھی از روئے قرآن حرام ہے، خواہ ہیئت معصیت ہو یا نہ ہو، پھر سبب قریب اور بعید کا بھی فرق ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اگر دونوں سبب کی حرمت کو عام کر دیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی بھی کام جائز نہ رہے، اس لئے سبب قریب ممنوع ہوگا اور سبب بعید مباح، کپڑا بنانا، مکان بنانا، ظروف اور استعمالی چیزیں بنانا ان سبب میں بھی ظاہر ہے کہ ہر ایک برونفاجران کو خریدنا اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا شمار سبب بعید میں ہے اور بنانا والا بری الذمہ ہے، اور ایک سبب قریب ہے اور وہ یہ ہے کہ ہو تو سبب قریب مگر معصیت کے لئے محرک نہیں بلکہ صدور معصیت کسی دوسرے فاعل مختار کے اپنے فعل سے ہوتا ہے، جیسے بیع عصید و عنب ممن یتخذ خمرًا۔ ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد اس معصیت ہی کا ہو تو یہ اعانت معصیت میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہوگا اور اگر اس کا قصد و نیت شامل نہ ہو تو پھر اس کی دوسری صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس کو علم بھی نہ ہو کہ یہ شخص گھر خرید کر اس میں فسق و فجور کرے گا اس صورت میں یہ بیع یا اجارہ بلا کراہت جائز ہے، اور اگر اس کو علم ہے تو اجارہ اور بیع مکروہ ہے، پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو بغیر کسی تغیر اور تصرف کے دوسرے یہ کہ وہ کچھ تصرف و تغیر کے بعد وہ معصیت کام میں آئے، پہلی صورت میں مکروہ تحریمی ہے دوسری مکروہ تنزیہی (تخصیص جواہر لفقہ ۲، ۴۵۳-۴۵۶)۔

اس تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی ٹور کی کمپنیاں قائم کرنا "سبب بعید" میں شامل ہو کر بغیر کراہت کے جائز ہوگا۔

۴۔ آج ٹیلی ویژن اور سنیما ہالوں میں زیادہ تر فحاشی اور عریانیات اور خراب اخلاق پر رگرا گاموں کا غلبہ ہے، ۲۴ گھنٹے اس کے مختلف چینلوں میں قص و سرور اور حد درجہ شرمناک مناظر دکھائے جاتے ہیں، پھر اگر اس کے ذریعہ دینی مقاصد ظاہر فرمائے گئے ہیں تو بھی اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ "ٹی وی" کے پردے پر ظاہر ہونے والی صورتیں "تصاویر" ہیں جن کو اسلام میں ناجائز قرار دیا گیا ہے، اور متعدد احادیث اس کی حرمت پر دال ہیں، لہذا اس کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی (تخصیص جواہر لفقہ ۲، ۴۹۰)۔ لہذا صرف کمپیوٹر کے ذریعہ سے جدید تعلیم دی جاسکتی ہے لیکن تعلیمی مقاصد کے لئے تصاویر کا استعمال درست نہیں (محمود الفتاویٰ ۱۶۵)۔

۵: الف، ب۔ "کارٹون" بھی تصویروں میں شامل ہے، اس کا بنانا، دیکھنا اور اس کو ذریعہ آمدنی بنانا سب ناجائز ہوگا۔

۶۔ ڈرامے اور کمالات اگر دینی ہو اور بہتر مقاصد کے لئے اگر کرائے جاتے ہوں تو شرعی حدود اور قیود میں رہتے ہوئے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (محمود الفتاویٰ ۱۶۶)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

## تفریح اور اس کے جائز وسائل

مولانا محمد ارشد علی رحمانی ۱

سوال: کیا شریعت میں مزاح جائز ہے اور جائز ہے تو اس کی حدود کیا ہیں؟

جواب: حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح کرنا ثابت ہے، مختلف مرحلوں میں الگ الگ انداز میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح فرمایا ہے، لہذا شرعاً مزاح جائز و درست ہے، ترمذی شریف میں حضرت انسؓ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح کرتے ہوئے فرمایا: "یا ذا الأذنین" (اے دوکان والے) اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مزاح فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یا آبا عمیر ما فعل النخیر" اے ابو عمیر تو نے زنجیر پر بندہ کیا کیا اور ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا کہ کوئی بوڑھی جنت میں داخل نہیں ہوگی یہ سن کر وہ عورت رونے لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ ہر بوڑھی کو جو ان بنا کر جنت میں داخل کرے گا۔

مزاح جائز ہے، البتہ اس کی شرعاً حد یہ ہے کہ آدمی شریعت کا لحاظ و خیال رکھتے ہوئے سچی باتوں کے ذریعہ مزاح کرے، جھوٹ اور غلط باتوں کے ذریعہ بالکل مزاح نہ کرے، اسی طرح مزاح کبھی کبھار مصلحت کی بنیاد پر کرنا درست ہے، اب اگر کوئی اس کی عادت بنا لے اور ہمیشہ مزاح کرتا رہے تو پھر یہ مزاح چونکہ ہنسی کا ماحول اترتا ہے اللہ کے ذکر سے غافل رکھتا ہے اور بسا اوقات لوگوں کو ایذا پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے، انسان کے وقار کو گھٹاتا ہے، اس لئے اس درجہ مزاح کرنا درست نہیں ہے۔

سوال: مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا کیا جائز ہوگا؟

جواب: مزاح کو شریعت نے بہت محدود طریقہ پر انسانی طبائع کی فرحت و انبساط کے لئے جائز قرار دیا ہے، اب اگر کوئی اسے جائز سمجھ کر اس کا غلط فائدہ اٹھائے اور اس کے لئے اتنا لمبا پروگرام منعقد کرے جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو تو چونکہ یہ اللہ کے ذکر سے دور کرنے کا ذریعہ، دوسروں کو ایذا رسانی کا ذریعہ، انسانی وقار کو گھٹانے کا ذریعہ اور سب سے بڑھ کر یہ محض لوگوں کو ہنسانے کا ذریعہ ہے، جس سے قرآن کریم نے منع کیا: "فلیضحکوا قليلاً ولیبکوا کثیراً" (القرآن) تو اس طرح کا پروگرام شرعاً ممنوع و مکروہ ہے اور اس طرح کے پروگرام سے احتراز بہتر ہے۔ اسی طرح شریعت نے ایسے اشعار کے پڑھنے کی اجازت دی ہے جو اسلام کی علوشان پر دلیل ہو یا اسلامی فوج کو ہمت دلانے کی خاطر ہو یا پھر وہ اشعار ایسے ہوں جو خش اور بری باتوں سے پاک ہو، اب اگر کوئی ایسے اشعار پڑھے جو اسلامی نقطہ نگاہ کے خلاف ہو یا ایسے اشعار پڑھے جو برائی و منکرات سے بھرے ہوں، اسی طرح اشعار پڑھنے کے لئے اتنا لمبا پروگرام بنا لیا جائے کہ اس سے ذکر اللہ سے غفلت، دوسروں کی ایذا رسانی اور انسانی وقار مجروح ہوتا ہو تو شرعاً یہ بھی مکروہ ہے، اسی طرح اگر طنز و مزاح کے مشاعرے اتنے لمبے منعقد کئے جائیں جو ضیاع وقت، محض ہنسنے ہنسانے اور دین سے غفلت کا ذریعہ بنیں تو یہ سب مکروہ ہیں۔

”قال عليه السلام: لهو المؤمن باطل ولقوله عليه السلام: ما ألهات عن ذكر الله فهو ميسر“ (ہدایہ ۴۲۳)۔

سوال: مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت کرنا شرعی نقطہ نظر سے کیسا عمل ہے؟

جواب: مزاح کو دراصل انسانی طبائع کو خوش رکھنے اور بعض دینی مصلحت کی بنیاد پر جائز قرار دیا گیا اور اس میں افراط و تفریط کو فقہاء نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے، لہذا مزاح میں اس قدر مشغول ہو جانا کہ دن رات اسی کی لگن ہو، اس کے لئے مزاحیہ کہانیاں لکھے، اسی سے متعلق کہانیاں پڑھے، اسی کی طباعت اور نشر و اشاعت کرنے، اسی کی خرید و فروخت میں لگا رہے یعنی مزاح کے کاموں میں اس طرح منہمک ہو جائے کہ اسی کو زندگی گزارنے کا ذریعہ بنا لے تو پھر ایسا کرنا شرعاً مکروہ

۱۔ المجد العالی، پھولاری شریف پٹنہ۔

و ناپسندیدہ ہے، چونکہ مزاج پر مداومت اختیار کرنا مختلف نقصانات کا ذریعہ ہے، ایک نقصان تو یہ ہے کہ مزاج پر ہمیشگی اختیار کرنا لہو و لعب میں مشغول ہونے کے مترادف ہے جو شرعاً ناپسندیدہ ہے، قرآن کریم نے ایسے کاموں کے بارے میں اس کی وضاحت لہو و لعب سے کی۔

**سوال:** لطیفہ گوئی یا مزاج نویسی کو پیشہ بنا لینا اور اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟

**جواب:** لطیفہ گوئی یا مزاج نویسی فی نفسہ ان دونوں میں کوئی قباحت نہیں اگر یہ دونوں جھوٹ اور کسی فحش و منکرات پر مشتمل نہ ہو، جہاں تک لطیفہ گوئی اور مزاج نویسی پر اجرت لینے کی بات ہے تو یہ اجرت لینا شرعاً درست ہے، البتہ اگر اس طرح کے پیشہ سے احتراز کیا جائے تو یہ ماحوط اور افضل ہے چونکہ فقہ کا اصول ہے: ”درء المفسد اولیٰ من جلب المنفعة“، درمختار میں ہے: ”وجاز بیع عصیر عنب ممن يعلم انه يتخذہ خمرًا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغديره“ (درمختار مع الرد ۶۱۹/۲) (اور انکور کے رس کی بیع جائز ہے، اس شخص کے ساتھ جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ اس سے شراب بنائے گا، کیونکہ معصیت انکور کے ساتھ قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے تغیر کے بعد واقع ہوتی ہے)۔

**سوال:** تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام بھی منعقد کرنا شرعاً کیسا ہے؟

**جواب:** مزاح کا جواز حق باتوں کے ساتھ برہنہ مصلحت مخاطب کے حسن طبائع کے لئے مطلقاً مباح ہے، اب اگر حدود مباح کو عبور کر کے اس کے لئے باضابطہ ڈرامے کے پروگرام منعقد کئے جائیں جس کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہی ہو جب کہ زیادہ ہنسنے سے قرآن کریم میں منع کیا گیا ہے: ”فلیضحکوا قليلاً ولیسکوا کثیراً“ اور پھر محض ہنسنے ہنسانے کی خاطر اگر باضابطہ مزاحیہ باتوں پر بھی مشتمل ہوگا جو بڑے گناہ کا ذریعہ ہے، اس کے علاوہ آج کل ڈراموں کی جو شکل منظر عام پر دکھی جاتی ہے جس میں لڑکے لڑکیوں کا کردار اور رول ہوتا ہے، اگر اس طرح سے مزاحیہ ڈرامہ کے پروگرام پیش کئے جائیں تو یہ بالکل ناجائز ہے ہاں اگر لڑکے لڑکیوں کے اختلاط اور دیگر غیر شرعی امور سے پاک رکھ کر دینی جلسوں کی طرح سادہ پروگرام رکھا جائے جس میں سچی اور درست باتوں کے ذریعہ مزاح ہو تو شرعاً یہ درست ہے اور اس کی وضاحت اس بات سے خوب ہوتی ہے کہ مناظرہ اگر حق کی مدد کے لئے ہو تو درست ہے، لیکن اگر اہل ایمان کو مغلوب کرنے یا اپنے علم کا اظہار کرنے یا دنیا کی دولت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ہو تو حرام ہے (درمختار ۶۰۸/۹)، لہذا مزاحیہ ڈراموں کے پروگرام کا منعقد کرنا اگر مخاطب کے حسن طبائع کے بجائے محض ہنسنے اور ہنسانے کے لئے ہو تو اگرچہ حرام نہیں البتہ کراہت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

**سوال:** موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہنسنا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے بہت معاون فعل ہے، اس لئے خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں، جس میں بہت سے لوگ بہ تکلف تہقیر لگاتے ہیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں، اس عمل کا شرعی حکم کیا ہے؟

**جواب:** ہنسنا شرعاً جائز و مباح ہے، البتہ قرآن کریم نے ذلیل مقدار میں ہنسنے کی اجازت دی ہے، ”فلیضحکوا قليلاً ولیسکوا کثیراً“، آیت کریمہ میں کم ہنسنے کی اجازت ہے، اب اگر ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق زیادہ ہنسنے کی اجازت دی بھی جائے تو وہ فقہ کے اصول ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے پیش نظر ہی اجازت دی جائے گی اور پھر اجازت دوسرے اصل کے تحت بقدر ضرورت ہی ہوگی، ”الضرورات تنقذ بقدر الضرورة“ (الاشیاء والنظائس)، لہذا ان دونوں فقہی اصول کو سامنے رکھ کر ہنسنے کی اجازت ہوگی، لیکن اب اگر باضابطہ اس کے لئے پروگرام منعقد کر کے بہ تکلف تہقیر لگائے جائیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً یہ قرآنی نقطہ نگاہ اور اصول فقہ کی روشنی میں درست نہیں ہوگا۔

**سوال:** کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے کیا اصول ہیں؟

**جواب:** انسان دنیا میں جو بھی کام کرتا ہے وہ کام اس انسان کے لئے دینی اور دنیوی اعتبار سے یا تو فائدہ مند ہوگا یا نقصان دہ ہوگا، یعنی اس کے اس عمل میں دین و دنیا و روح و جسم کا فائدہ ہوگا یا نقصان یا پھر وہ فائدہ و نقصان دونوں کو جامع ہوگا، یعنی اس عمل میں ایک جہت سے فائدہ ہوگا تو دوسری جہت سے بڑا نقصان بھی ہوگا یا پھر وہ عمل ایسا ہوگا کہ اس میں نہ دینی فائدہ ہوگا نہ دنیوی، اسی طرح کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا، بلکہ وہ فعل فقط عبث اور لغو ہوگا۔

مذکورہ افعال کی طرح انسان کا ایک فعل کھیل بھی ہے، اب اس کے جائز و ناجائز ہونے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: اگر کھیل ایسا ہو جو اللہ کے ذکر مثلاً روزہ جیسے ضروری اعمال سے مانع ہو تو پھر یہ کھیل ناجائز ہوگا، اسی طرح اگر کھیل مانع ذکر تو نہ ہو البتہ کسی شرعی مفسد کو ملتزم ہو یا پھر اس سے کوئی معصیت لازم آتی ہو تو یہ

کھیل بھی ناجائز ہوگا، اور اگر کھیل ان کے علاوہ محض لہو و لعب اور لالہ یعنی ہو اس سے کوئی دینی یا دنیوی غرض وابستہ نہ ہو تو یہ کھیل بھی فعل عبث ہونے کی وجہ سے ممنوع ہوگا، اور اگر کھیل ایسا ہو جس سے کھیلنے والے کا مقصد فخر و غرور اور مکرور یا ہویا اپنی بہادری اور شہرت ہو تو ایسا کھیل بھی مکروہ و ممنوع ہوگا، اسی طرح اگر کھیل کے آلات و ذرائع غیر سے مشابہت رکھتے ہوں تو یہ بھی تشبیہ بالغیر کی وجہ سے مکروہ ہوگا، البتہ اگر کھیل جسمانی ورزش، ذہنی تفریح، دماغ کی تازگی اور طبیعت کے نشاط کے لئے کھیلا جائے تو ایسا کھیل بلاشبہ جائز و درست ہوگا اور دراصل اس پر لہو کا اطلاق ہی درست نہیں اور اگر ظاہری مشابہت کی بنیاد پر لہو کہا بھی جائے تو یہ کھیل استثناء کی اس فہرست میں شامل ہوگا جن کا تذکرہ حدیث پاک میں مذکور ہے۔

”وأما اللعب فلقوله عليه الصلاة والسلام: كل لعب حرام إلا ملاءبة الرجل امرأته وقوسه وفرسه“ (بدائع ۲۰۶، ۲۰۷)۔ ”وأما اللعب فإن المباح منه ما كان خالياً من التكلم بالفحش والكذب وكشف العورة والاستهزاء“ (كتاب الفقه ۲۰۲)۔ ”وفى معناها كل ما يعين على الحق من العلم والعمل إذا كان من أمور المباحة كالسابقة بالرجل والخيول والتمشية للتنزه على قصد تقوية البدن وتطرية الدماغ ومنها السماء إذا لم يكن بالآلات المطربة المحرمة“ (مرقاۃ ۴۰۵، ۴۰۶)۔

سوال: لباس وپوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

جواب: شریعت اسلامی میں مرد و عورت دونوں کے لئے لباس کا حکم الگ الگ ہے، مردوں کے لئے تو شرعاً ایسے لباس کا استعمال جو ناف سے گھٹنے تک کو ڈھک لے فرض ہے اور عورتوں کے لئے تو چہرہ، ہتھیلی اور پاؤں کے علاوہ پورے جسم کا ڈھکنا فرض ہے، لہذا اب اگر کھلاڑی مرد ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا لباس استعمال کرے جس سے مقدار فرض کی ادا ہوگی، جو جائے یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپ جائے، یہی وجہ ہے کہ اگر کھلاڑی اتنا تنگ اور باریک لباس استعمال کرے جس سے اندرونی اعضاء کی بناوٹ بالکل ظاہر ہوتی ہو تو ایسے لباس کا پہننا بھی شرعاً درست نہیں، اسی طرح اگر اتنا چھوٹا کپڑا استعمال کرے کہ ران تک نظر آتی ہو تو ایسے کپڑے کا استعمال بھی درست نہیں ہوگا، البتہ اگر کھلاڑی لڑکی ہو تو اس کے لئے پورے جسم کا ڈھکنا، چہرہ، ہتھیلی اور پاؤں کے علاوہ فرض ہے، اگر کوئی لڑکی اس سے چھوٹے لباس میں رہ کر کھیلے تو یہ شرعاً درست نہیں ہے، اسی طرح اگر لڑکی پورے جسم کو ڈھک لے لیکن لباس اتنا چست اور تنگ ہو کہ اندرون جسم کی پوری ساخت نظر آتی ہو تو شرعاً ایسے لباس کا استعمال بھی درست نہیں ہوگا، اور موجودہ دور میں دوران کھیل جو لباس لڑکیوں کے لئے متعین کیا گیا ہے، شریعت اسلامی میں ایسے لباس کی کوئی گنجائش نہیں ملتی، الغرض کھلاڑی چاہے مرد ہو یا عورت بہر حال لباس کی جو مقدار فرض ہے اس کی رعایت لازم و ضروری ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

سوال: شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے کن کو جائز کن کو ناجائز کن کو مکروہ اور کن کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے؟ مروجہ کھیلوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- تاش اور شطرنج یہ دونوں کھیل شرعاً ناجائز و حرام ہیں، حدیث پاک میں ہے: ”عن سليمان بن بريدة عن أبيه عن النبي ﷺ قال: ومن لعب بالنردشير فكأنما غمس يده في لحم خنزير ودمه“ (حضرت سليمان بن بريدة اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے نردشیر (تاش) کھیلا اس نے گویا اپنے ہاتھ کو خنزیر کے گوشت اور خون میں ڈبوایا)۔

۲- کرکٹ: دراصل کوئی بھی کھیل ہو اگر اس سے جسمانی ورزش ہوتی ہے اور صحت پر اس کا مفید اثر پڑتا ہے ساتھ ہی وہ کھیل فرائض سے غفلت کا ذریعہ بھی نہ بنے تو ایسا کھیل جائز و مباح ہے، لیکن کرکٹ چونکہ آج کل ایسا کھیل بن گیا ہے کہ لوگ اس کے دیوانے ہو گئے ہیں اور اس کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے اور حد تو یہ ہے کہ سڑکوں اور گلیوں کو کرکٹ کا میدان بنا لیا ہے اور اس صورت حال میں فرض سے کوتاہی ظاہر ہے ساتھ ہی دوسرے کے ایذا کا خطرہ بھی ہے، اس لئے یہ ممنوع و مکروہ ہے البتہ اگر فرائض میں کوتاہی نہ ہو تو پھر اس کا کھیلنا جسمانی ورزش اور دماغ کی تازگی طبیعت کے نشاط کے لئے جائز ہے: ”مکرہ کل لہو لقوله عليه الصلاة والسلام: كل لهو المسلم حرام“ (درمۃ الردۃ ۹۰، ۹۱)۔

۳- فٹ بال: فٹ بال بھی مروجہ کھیلوں میں ایک اہم کھیل ہے، موجودہ دور میں فٹ بال کھیلنے کا جو طریقہ رائج ہے، اس میں فٹ بال کھیلنے والے کھلاڑی غیر شرعی لباس پہن کر کھیلتے ہیں جس کی وجہ سے یہ بھی ناجائز ہے، البتہ اگر اس طریقے میں تبدیلی لائی جائے اور کھلاڑی شرعی لباس پہن کر کھیلیں اور دیگر محرمات سے

بھی اجتناب کریں تو چونکہ یہ جسمانی ورزش کا بڑا ذریعہ ہے اس لئے یہ جائز ہوگا۔ ”وفی معناها کل ما یعیین علی الحق من العلم والعمل إذا کان من أمور المباحة کالمسابقة بالرجل والخیل والإبل والتمشیة للتنزه علی قصد تقویة البدن وتطریة الدماغ“ (مرقاۃ ۴/۲۱۸)۔

۴- ویڈیو گیم: آجکل کمپیوٹر اور موبائل پر ویڈیو گیم کھیلنے کی سہولت پیدا ہو گئی ہے اس میں بعض گیم تو ایسا ہوتا ہے جس میں تصویر کی آمیزش ہوتی ہے، تو یہ گیم تو یقیناً ناجائز ہوگا، لیکن اگر گیم سادہ ہو اور تصویر کی آمیزش سے خالی ہو تو اس کی بھی عادت اگر اتنی لگ جائے کہ آدمی ہمیشہ اسی میں مشغول رہے جو ذکر اللہ سے غفلت اور محض تزیین اوقات کا ذریعہ ہو تو فقہاء نے ایسے لہو و لعب کو جو تزیین اوقات کا ذریعہ ہو مگر وہ قرار دیا ہے، لہذا یہ بھی مکروہ ہوگا، البتہ اگر تنشیت اذہان کے لئے تھوڑا کھیل لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

۵- کرانا بازی: کرانا کا سیکھنا، اس کا استعمال کرنا اگر اچھے مقصد اور حق کی مدد کے لئے ہو، اسی طرح ذہنی و جسمانی فائدہ کے لئے ہو تو یقیناً اس کو جائز و مباح قرار دیا جائے گا (مرقاۃ ۴/۳۱۸)۔

ان کے علاوہ کھیل کے بہت سارے اقسام مثلاً کیرم، لوڈو وغیرہ بہت سے کھیل آج کل رائج ہیں ان سب میں اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر حکم لگایا جائے گا کہ اگر وہ کھیل کسی دینی یا دنیوی فائدہ کا ذریعہ ہو، ساتھ ہی ساتھ کسی حرام کے ارتکاب اور ذکر اللہ سے غفلت کا ذریعہ نہ بنے تو جائز ہوگا بصورت دیگر ناجائز ہوگا۔

”حدثنا ابن نمیر حدثنا حفص عن عبد اللہ بن عمر عن القاسم بن محمد قال: کل ما ألهی عن ذکر اللہ وعن الصلاة فهو میسر“ (اعلاء السنن ۴/۹۳)۔

سوال: کھیل کی حیثیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو تو کون سی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہوگی؟

جواب: فی نفسہ کھیل کی تو شریعت نے مختلف شرطوں کے ساتھ اجازت دی ہے، اب اگر اس میں اس کا پاس و لحاظ رکھنے کے بجائے اتنا غلو کیا جائے کہ شرط کے ساتھ کھیلنا شروع کر دے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ دو کھیلنے والے کھلاڑی آپس میں شرط لگائیں کہ اگر مقابلہ میں جیتوں تو تم اتنا روپیہ دو گے، اور اگر تم جیتو گے تو میں اتنا روپیہ دوں گا، تو یہ دو طرفہ شرط ہے جس کی شرعاً گنجائش نہیں یہ حرام ہے، لہذا اگر کھیل میں شرط کی ایسی صورت ہو تو یہ ناجائز و حرام ہوگا۔

”حل الجعل إن شرط المال من جانب واحد وحرر لو شرط فیها من الجانبین لأنه یصیر قماراً“ (درمۃ الرد ۲/۲۰۲)۔

البتہ اگر شرط کی صورت یہ ہو کہ دو کھیلنے والے کھلاڑی ہوں اور ایک تیسرا آدمی یہ کہے کہ تم دونوں میں سے جو جیت حاصل کرے گا اسے میں اتنا روپیہ دوں گا یا فلاں چیز دوں گا اور جو ہارے گا اسے جیتنے والے سے کم دوں گا یا کچھ نہیں دوں گا تو شرط کی یہ صورت جائز ہے، لہذا اگر کھیل کی صورت یہ ہے کہ کھلاڑی کا شرط سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شرط لگانے والا کوئی تیسرا آدمی ہے تو پھر یہ جائز و مباح ہے۔

اسی طرح اگر شرط لگانے والا کوئی تیسرا آدمی نہ ہو لیکن کھلاڑی ہی میں سے دونوں شرط لگانے والے نہ ہوں بلکہ کوئی ایک یہ کہہ دے کہ اگر تم جیت جاؤ گے تو میں تمہیں یہ چیز دوں گا تو پھر یہ صورت بھی جائز ہے (بحوالہ شامی)۔

سوال: جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والے اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو ان کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: ایسا کھیل جو لباس اور طریقہ کے اعتبار سے مکمل طور پر شرعی حدود میں ہو اور کسی طرح کے محرمات پر مشتمل نہ ہو تو اس کے جائز ہونے میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اگر اس کے برعکس کھیل ہو جو شرعی لباس سے عاری ہو کر ہو یا غیر شرعی طریقہ پر ہو یا پھر اس کے ارتکاب سے کوئی برائی اور معصیت لازم آتی ہو تو پھر یہ شرعاً ناجائز ہے۔

اسی طرح اگر کھیل تو شرعی حدود کی پوری رعایت، شرعی لباس و پوشاک کے ساتھ ہو، لیکن اس کھیل کے کھیلنے اسی طرح دیکھنے میں کافی وقت کھیلنے اور دیکھنے والوں کا ضائع ہوتا ہو تو چونکہ فقہاء کرام نے تزیین اوقات کو مکروہ قرار دیا ہے، اس لئے ایسا کھیل جو تزیین اوقات کا ذریعہ ہو اس کا کھیلنا اسی طرح دیکھنا دونوں مکروہ



و ممنوع ہے اور کیوں نہیں جب کہ وقت اللہ کی جانب سے ملی ہوئی بڑی نعمت ہے جس کی مکمل طریقے پر ناکداری ہوتی ہے۔

سوال: کھیل دیکھنے نیز اس کے لئے ٹکٹ خریدنے کا کیا حکم ہوگا، کیا اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات بھی ہیں؟

جواب: ایسے کھیل جو شرعاً مباح ہیں اگر ان میں محرمات کا دخل نہ ہو اور نہ ہی کوئی ذریعہ معصیت ہو یعنی ایسا کھیل جو ہر طرح کے گناہ اور شبہ گناہ سے خالی ہو، ضیاع وقت کا ذریعہ بھی نہ ہو ساتھ ساتھ ذکر اللہ سے غفلت کا ذریعہ بھی نہ بننا ہو، ایسے کھیل کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا دونوں جائز ہوگا، کیونکہ حدیث پاک میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے حبشیوں کے تیر اندازی کا مقابلہ دکھایا تھا جو اس بات پر واضح ثبوت ہے کہ اگر کھیل ہر طرح کے گناہ اور معصیت سے پاک ہو ساتھ ہی ذکر اللہ سے غفلت اور ضیاع وقت کا ذریعہ نہ بننا ہو تو ایسے کھیل کے دیکھنے اور اسی طرح اس کے دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔

البتہ اگر کھیل ایسا ہو جو شرعی نقطہ نگاہ سے جائز نہ ہو بلکہ مختلف طرح کے محرمات اور گناہ پر مشتمل ہو یا پھر ذکر اللہ سے غفلت اور ضیاع وقت کا ذریعہ ہو تو پھر ایسے کھیل کا دیکھنا اور اس کے لئے ٹکٹ خریدنا فعل عبث اور لہو ہونے کی وجہ سے شرعاً درست نہیں۔

سوال: تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے یا نہیں، جبکہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ بھی ہوتا ہے؟

جواب: اگر اپنی جان اور اپنے دین پر خطرہ نہ ہو بلکہ تفریح کے ذریعہ تفریح کرنے والے کی طبیعت بحال رہتی ہو جیسا کہ بعض حضرات اس کے عادی ہوتے ہیں، گھر میں رہ کر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، لیکن باہر تفریح کرنے کے بعد ان کی صحت ٹھیک رہتی ہے تو ایسی صورت میں تفریحی غرض سے ایک شہر سے دوسرے شہر اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر جائز ہے اور اگر تفریح کا مقصد بچھلی امتوں کے حالات سے واقفیت ہو یعنی مقصد یہ ہو کہ ایک شہر سے دوسرے شہر اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک جا کر یہ دیکھیں گے کہ بچھلی امتیں جو کفر و شرک میں مبتلا تھیں اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب کس طرح آیا اور کس طرح ان کی بستیوں کو برباد کر دیا گیا تو پھر اس مقصد سے تفریح کے لئے کہیں بھی جانا نہ صرف جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے، البتہ اصول فقہ کا قاعدہ ہے: "الضرورات تنقذ بقصد الضرورة" (الاشباہ والنظائر)، لہذا ہنی مون منانے، پنک منانے اور اس جیسے غیر شرعی ضرورتوں کے لئے شرعاً دور دراز کے سفر کرنے اور بے فائدہ پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

سوال: کیا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا درست ہے، جبکہ بعض علاقوں کا سفر جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے نقطہ نظر سے پرخطر ہوتا ہے؟

جواب: تفریح کے لئے تو خود سفر کرنا بطور ضرورت جائز ہے، یعنی اگر کسی کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ تفریح کے ذریعہ درست رہتی ہے تو ایسے لوگوں کے لئے سفر کرنا جائز ہے اب اگر اس کے بچوں کا ماحول بھی ایسا ہو گیا ہے کہ وہ تفریح کے ذریعہ ہی مستیاب رہتے ہیں تو پھر بقدر ضرورت اس کے لئے بھی سفر اس وقت جائز ہوگا جب کہ جان و مال اور عزت و آبرو کا خطرہ نہ ہو، واضح رہے کہ یہ سفر صرف مردوں کے لئے جائز ہے عورتوں اور لڑکیوں کے لئے جائز نہیں ہوگا، کیونکہ قرآن کریم میں عورتوں کو باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے، "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولى"۔

سوال: جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں ازراہ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقام پر اشیاء خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ایسے مقامات جہاں غیر شرعی باتیں ہوتی ہیں وہاں ازراہ تفریح جانا چونکہ تعاون علی الاثم والعدوان کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے، اس لئے ایسے مقامات پر ازراہ تفریح جانے سے پرہیز ہی کرنا چاہئے، چونکہ ہر وہ کام جو معصیت پر معاون و مددگار ثابت ہو وہ بڑا گناہ ہے، اور شریعت نے ایسے کاموں سے رکنے کا حکم دیا ہے، "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (القرآن)، اسی طرح ایسی جگہوں پر جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا بھی بالواسطہ معصیت پر تعاون ہے اس سے بھی احتراز ہی کرنا چاہئے، البتہ ایسے مقامات پر اشیاء خورد و نوش کا فروخت کرنا یہ بھی چونکہ معصیت کرنے والوں کو تقویت

پہنچانے کا ذریعہ ہے جس کی وجہ سے یہ بھی تعاون علی المعصیت کے زمرے میں آجاتا ہے جس سے پرہیز لازم ہے، لیکن ان تمام تر تفصیلات کے باوجود چونکہ ایسے مقامات پر ازراہ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لئے سواری کرایہ پر لگانا اور ایسے مقامات پر اشیاء خورد و نوش کا فروخت کرنا فی نفسہ گناہ نہیں ہے بلکہ گناہ کے لئے معاون ہے، اس لئے یہ سب جائز ہے لیکن جواز مع الکرہت ہے، چونکہ تعاون علی المعصیت بھی شرعاً بڑا گناہ ہے، لہذا اگر کوئی یہ کام انجام دے تو اس کے لئے جائز تو ہوگا لیکن تعاون علی الاثم کی وجہ سے گنہگار ہوگا (ہدایہ ۴/۲۳۳)۔

**سوال:** آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم ہیں جو آمد و رفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرتے ہیں، سفر کرنے والے حضرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو سیاحتی مقامات پر داد عیش دینے کے لئے جاتے ہیں، نیز شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، بعض کا مقصد مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا اور وہاں اپنے طور پر عبادت کرنا ہوتا ہے، کیا اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے؟

**جواب:** کسی بھی کمپنی کا قیام جو آمدنی کا ذریعہ ہو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں، البتہ کمپنی کے قیام کے مقاصد مختلف النوع ہو سکتے ہیں اور مقاصد کے تحت احکام میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے، چونکہ فقہ کا مشہور اصول ہے: ”الأمور بمقاصدھا“ (الاشیاء والنظائیں)، لہذا آج کل ٹور پر لے جانے کے لئے جو کمپنیاں قائم ہیں اور قائم ہو رہی ہیں اگر ان کمپنیوں کے قیام کا مقصد مطلقاً مسافروں کو لانے جانا ان کے قیام کے لئے سہولتوں کا نظم کرنا ہو، اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ مسافر کس طرح کا ہے، محض تفریح کے لئے جا رہا ہے یا شراب نوشی اور داد عیش دینے جا رہا ہے، یا پھر مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت و عبادت کے لئے جا رہا ہے تو اس صورت میں اس طرح کی کمپنی کا قائم کرنا درست ہوگا اور کمپنی قائم کرنے والے گنہگار بھی نہیں ہوں گے ہاں جو لوگ وہاں جا کر مختلف برائیوں میں مبتلا ہوں گے وہ ان برائیوں کی وجہ سے گنہگار ہوں گے اور ان کا یہ سفر معصیت پر مبنی ہوگا۔

البتہ اگر اس طرح کی کمپنی کے قیام کا مقصد ہی یہی ہو کہ ایسے لوگوں کے آمد و رفت اور قیام و طعام کی سہولتوں کا نظم کریں گے جو مقام سیاحت پر داد عیش دینے یا شراب نوشی کرنے کے لئے یا پھر مندروں تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت و عبادت کے لئے جاتے ہوں تو اس صورت میں چونکہ اس کمپنی کے ذریعہ تعاون علی المعصیت ہو رہا ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے، ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ اس لئے اس صورت میں اس طرح کی کمپنی کا قائم کرنا جائز تو ہے لیکن اس کے قائم کرنے والے معصیت پر مدد کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے اور ایسے کاموں سے احتیاط بہر حال لازم ہے۔

”وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم أنه یتخذہ خمراً، لأن المعصیة لا تقوم بعینہ بل بعد تغیرہ“ (در مع الردۃ: ۹۰۶)۔

”ومن آجر بیتاً لیتخذ فیہ بیت نار أو کنیسة أو بیعة أو بیاع فیہ الخمر بالسواد فلا بأس بہ“ (ہدایہ ۴/۲۴۲)۔

**سوال:** تاریخی و دستاویزی فلموں کے بنانے اور ان کو دیکھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

ایسی فلمیں جو دستاویزی ہیں، اسی طرح بعض فلمیں تاریخی بھی ہیں اور بعض فلمیں ایسی بھی ہیں جو صرف اور صرف تعلیمی ماحول اور انسان کے اندر علمی ذوق پیدا کرنے کے مقصد سے بنائی جاتی ہیں، مثلاً آج کل ہجرت کے بعد کے زمانہ کی تاریخ پر فلمیں آرہی ہیں جس میں موجودہ دور کے انسانوں کو صحابہ کرام کی شکلوں میں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں عہد نبوی کے زمانہ کی تاریخی باتیں اور آپ ﷺ کے غزوات کے حالات کو منظر عام پر لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر بھی فلمیں آرہی ہیں وغیرہ تو ان کے جواز کی گنجائش یقیناً شریعت اسلامی میں نہیں مل سکتی، چونکہ یہ کھلم کھلا شریعت اسلامی کا استہزاء اور مذاق ہے جس کی بنا پر اس طرح کی فلموں کے دیکھنے اور اس کے بنانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔

”وذر الذین اتخذوا دینہم لعباً ولہواً وغرقتہم الحیاة الدنیا و ذکر بہ أن تبسل نفس بما کسبت لیس لہا من دون اللہ ولی ولا شفیع“ (سورہ انعام: ۷۰)۔

اور پھر ظاہر ہے کہ کوئی بھی فلم جاندار کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتی جبکہ جاندار کی تصویروں کا بنانا ایک نہیں بیکڑوں احادیث سے حرام ہے، ”عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: أشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون“ (مشکوٰۃ شریف: ۳۸۵)۔

اور جب تصاویر کی اس قدر مذمت احادیث میں بیان کی گئی ہے، تو پھر ایسے ذرائع سے جس میں تصاویر کی آمیزش ہو، قرآن کریم کے مضامین کو پیش کرنا

قرآن کے توہین کے مترادف ہے، جس کی گنجائش شرعاً نہیں ہو سکتی۔

ہاں تعلیمی مقاصد کے لئے قرآن کریم کی آیتوں کو بچے کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ اتارنے کے لئے مضامین کو آسان سے آسان بنا کر پیش کرنے کے لئے اگر یہ باتیں کی جاتی ہیں تو یہ اس وقت جائز ہوگا جبکہ مندرجہ ذیل باتیں اس میں نہ پائی جائیں:

۱- وہ فلم کسی بھی جاندار کی تصویر پر مشتمل نہ ہو چونکہ جاندار کی تصویر سازی شرعاً حرام ہے۔

۲- وہ فلم گیت گانا اور مینڈا جا سے بالکل خالی ہو کیونکہ یہ بھی شرعاً ممنوع ہے۔

۳- وہ فلم قرآنی آیات کے علاوہ دوسری غیر شرعی باتوں پر مشتمل نہ ہو۔

۴- وہ فلم کسی بھی شعائر اسلامی کی بے حرمتی پر مشتمل نہ ہو۔

۵- وہ فلم تمام تر لہو و لعب سے پاک ہو۔

لیکن جو باتیں اوپر ذکر کی گئی ہیں موجودہ دور میں کسی بھی فلم کا ان باتوں سے خالی ہونا مشکل ہے، اس لئے کتب فقہ و احادیث کی روشنی میں احقر کی رائے تو یہی ہے کہ بے جا تعلیم و تبلیغ کو بہانہ بنا کر اس کے جواز کی شکلیں نہ نکالی جائیں ورنہ یہ بگڑی ہوئی امت اور بگڑ جائے گی، اللہ تعالیٰ اس امت کو منوعات سے بچائے۔

”وفی التاتارخانیة عن العیون: إن کان السماء سماء القرآن والموعظة یجوز وإن کان سماء غناء فهو حرام بإجماع العلماء“ (شامی ۹۰۳)۔

سوال: کیا کارٹون بنانا جائز ہے یا اس کا بھی تصویر میں شمار ہوگا؟

جواب: مجسمہ سازی اور تصویر کشی کی ایک بگڑی ہوئی شکل کارٹون ہے اور کتب فقہ و حدیث میں مجسمہ سازی اور تصویر کشی کی حرمت ظاہر ہے، لہذا کارٹون جو تصویر یا مجسمہ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے شرعاً اس کا بنانا حرام ہے اس کا شمار تصویر میں ہوگا اور اس کی حرمت اسی طرح ہوگی جس طرح شریعت میں تصویر کی حرمت ہے، اور تصویر کی حرمت کا اندازہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عذاب کے لحاظ سے زیادہ سختی میں تصویر بنانے والے ہوں گے، اور ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تصویر جس گھر میں ہو فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے ان دونوں حدیث اور اس کے علاوہ سینکڑوں احادیث تصویر کی حرمت پر عیاں ہے، لہذا کارٹون جو تصویر کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے، اس کی حرمت میں کیا کلام ہو سکتا ہے، اور چونکہ کارٹون سازی بسا اوقات لوگوں کی ایذا رسانی کا بذریعہ نبتی ہے جو شرعاً ممنوع ہے، حدیث میں صراحت ہے کہ ایذا مسلم حرام ہے، اس وجہ سے بھی اس کی حرمت ہی سامنے آتی ہے، بہر صورت اس کے جواز کی صورت شرعاً نظر نہیں آتی، لہذا کارٹون سازی درست نہیں ہو سکتی۔

سوال: کارٹون بنانا اس وقت ایک نفع بخش آمدنی کا ذریعہ ہے تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

جواب: کارٹون بنانا اس وقت رائج ہے جو یقیناً تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی ایک ترقی یافتہ نئی شکل ہے اور یہ بات واضح ہے کہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی بالکل یہ طور پر مکروہ ہے تو کارٹون سازی جو تصویر کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اس کی حرمت میں کیا شبہ ہے اور جب کارٹون سازی ہی حرام ہے تو پھر ایک حرام کام کو ذریعہ آمدنی بنانا کیسے درست ہوگا؟ حدیث پاک میں اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے فتویٰ طلب کیا کہ میں ایک انسان ہوں اور اپنی روزی کے لئے تصویر سازی کا کام کرتا ہوں تو کیا میرا یہ کام درست ہے اس پر آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کوئی تصویر بنائے تو اللہ اس کو عذاب دینے والے ہیں یہاں تک کہ وہ مصور اس میں روح ڈالے اور وہ اس میں روح کبھی نہیں ڈال سکتا، اس کے بعد اس شخص کی حالت بدل گئی اور چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تو یہ دیکھ کر حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تیری بربادی ہو اگر تو نے اس کا انکار کیا اور اگر تو تصویر سازی ہی کرنا چاہتا ہے تو بے جان چیزوں کی تصویر بنا۔ اس حدیث میں صراحتاً تصویر سازی سے منع کیا گیا ہے اور اس کے ذریعہ سے روزی حاصل کرنے کو منع کیا گیا، لہذا موجودہ دور میں کارٹون بنانا اور اس کو ذریعہ آمدنی بنانے کی جو صورت رائج ہے شرعاً اس کی گنجائش نہیں یہ حرام ہے اور جہاں تک بات ہے اس مقصد کے لئے ملازمت کرنے کی تو چونکہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ ایسی ملازمت کرے کہ خود ملازم

بن کر تصویر اور کارٹون بنائے تو پھر یہ تو یقیناً ناجائز و حرام ہے، البتہ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ تصویر تو نہیں بنائے البتہ تصویر بنانے والوں کو مدد اور اس کا تعاون کرے تو یہ بھی چونکہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے جس سے صراحتاً منع کیا گیا ہے، ”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“، لہذا یہ دوسری صورت بھی شرعاً ممنوع ہے، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ دوسرا حلال طریقہ اپنائیں اور اس سے اپنی روزی تلاش کریں چونکہ فقہ کا اصول ہے: ”درء المفسد اولی من جلب المصلح“ اور اس ملازمت میں مفسد کا ایک بڑا اجتماع ہے جس سے احترازی ہی احوط ہے۔

سوال: ڈرامہ اسٹیج کرنے کا شرعی حکم

جواب: موجودہ دور میں ڈرامے کی جو شکلیں رائج ہیں جس میں بلا مبالغہ مرد و عورت کا اختلاط ہوتا ہے اور دونوں مل کر ڈرامہ کے کردار کو پورا کرتے ہیں تو اس طرح کے ڈرامے تو بہر حال درست نہیں چونکہ اختلاط کی اجازت شریعت کبھی نہیں دے سکتی اور اگر عورتوں کے ساتھ مرد نہ بھی ہوں پھر بھی محض عورتوں کے ہونے کی صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں ہو سکتی چونکہ عورتوں کی آواز کو بھی فقہاء نے پردہ قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے تو اس کی وضاحت کی ہے کہ عورتیں گھر سے باہر ہی نہ نکلیں، تو پھر اس صریح حکم کے بعد جو سورہ احزاب میں اللہ نے نازل فرمایا عورتوں کا باہر نکلنا ہی درست نہیں تو پھر اس کا ڈرامہ کے لئے اسٹیج پر جانا کیسے درست ہوگا، ہاں اگر عورتوں کی محفل ہو اور پھر اس میں عورتیں بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرے کی اصلاح کی خاطر ڈرامہ کی شکل میں کچھ اصلاحی باتیں پیش کریں تو اس کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوگی کہ ان کی آواز اس محفل سے باہر نہ جاتی ہو اور نہ ہی اس کے جسم کے وہ حصے کھلتے ہیں، جس سے شریعت نے عورتوں کے سامنے کھولنے سے منع فرمایا ہے، ”وتقدم فی شروط الصلاة أن صوت المرأة عورة علی الراجح“ (شامی ۹۰۵۲۱)، ”وتنظر المرأة المسلمة من المرأة كالرجل من الرجل“ (درمختار مع الرد ۹۰۵۲۲)۔

البتہ مدارس میں ڈرامے کی شکلیں، بہتر باتوں کی ترغیب اور معاشرے کی اصلاح کی غرض سے رائج ہیں جس میں طلباء مدارس مختلف رول میں مختلف کردار ادا کرتے ہیں جس کی وجہ کر عوام الناس دلچسپی کے ساتھ اس پروگرام میں شامل ہو کر اس سے استفادہ کرتی ہے اور اس کے اچھے اثرات لوگوں کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے جو بہت حد تک آج دینی باتوں کو عوام کے دلوں میں بٹھانے کے لئے ایک حاجت کی شکل بن گئی ہے اور اصول فقہ میں ایسی چیز جو حاجت کے درجے میں ہو اس کی رعایت کی جاتی ہے، ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة“ (اشیاء ونظائر ۱۳۹)۔

اور پھر یہ کہ مدارس میں جو اس طرح کے ڈرامے ہوتے ہیں اس کا مقصد اچھائی کی تبلیغ و ترویج ہوتی ہے اور طلباء کے مابین مقابلہ کرانا ہوتا ہے جس کی اجازت آیت کریمہ میں دلالت ملتی ”فاستبقوا الخیرات“ (القرآن) اور چونکہ یہ ڈرامے اصلاح معاشرہ اور دین کی باتوں کی اشاعت کے لئے ہوتے ہیں اور اس میں کسی طرح سے جھوٹ، فحش، برائی، دھوکہ اور کسی طرح کی معصیت کا ارتکاب بھی نہیں ہوتا اس لئے شرعاً یہ جائز ہوگا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا پورا خیال رہے کہ اس میں کسی بھی طرح غیر شرعی چیزوں کا استعمال نہ ہو۔

☆☆☆

## تفریح - اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط

مولانا محمد مقفور باندوی دہلی

جواب (۱)

الف: مزاح کے جواز کے سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی قولی اور فعلی روایات منقول ہیں:

عن أنس ابن رجلاً أتى النبي ﷺ فقال يا رسول الله ﷺ: احملني فقال النبي ﷺ: إنا حاملوك على ولد ناقه فقال: وما أصنع بولد الناقه فقال النبي ﷺ: وهل تلد الا بل الا النوق (رواه ابو داؤد، باب في المزاح، ۸۲/۶۲)۔

عن عوف ابن مالك الاشجعي رضي الله عنه قال: أتيت النبي ﷺ في غزوة تبوك وهو في قبي من أدم فسلمت فرد قال: ادخل، فقلت: أكلی؟ قال: كلت فدخلت (رواه ابو داؤد، باب في المزاح ۲/۶۸۲)۔

اس کے علاوہ بھی سنن ابوداؤد اور دوسری کتب حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولی روایات منقول ہیں۔ مزاح کی حدود کے تعلق سے ہندی کی عبارت بہت ہی واضح ہے:

لا بأس بالمزاح بعد أن لا يتكلم الإنسان فيه بكلام يأتى به أو يقصد به إضحاح جلسائه كذا في الظهيرية (فتاویٰ ہندیہ ۲/۲۵۳)

ب، ھ - آج کے اس دور میں جتنے بھی مزاحیہ پروگرام یا مشاعروں یا ڈراموں کا انعقاد ہوتا ہے ان تمام کا مقصد سامعین کے ہنسانے اور ان کی دلجوئی کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، نیز ان میں خلاف شرع گناہ پر مشتمل گفتگو بھی ہوتی ہے اور وقت کا ضیاع اظہر من الشمس ہے، اور یہ تمام چیزیں درست نہیں ہے، جیسا کہ ہندی کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہے۔ احقر کے نزدیک مزاحیہ پروگرام، مشاعرہ، ڈراموں کا انعقاد اور اس میں شرکت اور ان کا لکھنا جائز نہ ہوگا۔

ج، د - علامہ طبری نے اپنی معرک ال آرا تفسیر تفسیر طبری میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: ما ألهأكم عن ذكر الله فهو ميسر (طبری، ۲/۳۱۰)

ایک مباح اور جائز عمل جب کسی گناہ کا سبب بن جائے تو وہ جائز عمل بھی ایسی صورت میں ممنوع ہو جاتا ہے، نیز الاشباہ والنظائر میں ایک قاعدہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے: درء المفسد أولى من جلب المصالح (الاشباہ)۔

اس گفتگو کے بعد اب جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مزاحیہ کہانیوں کے لکھنے اور ان کو پڑھنے میں ذہنی عیاشی اور وقت بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور یہ دونوں چیزیں مقصد تخلیق بنی نوع آدم کے خلاف ہیں، لہذا احقر کی رائے یہ ہے کہ مزاحیہ کہانیوں کا لکھنا، پڑھنا، ان کی خرید و فروخت، اور ان کی نشر و اشاعت از روئے شرع جائز نہ ہوگی اور اس کو پیشہ بنا کر اس پر اجرت وصول کرنا مزید قبیح عمل ہوگا۔

و - ہنسی فطرت انسانی کا ایک حصہ ہے، جس کو جدا کرنا ممکن نہیں اور شریعت نے بالکل اس کو ممنوع بھی قرار نہیں دیا، البتہ کثرت سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، ارشاد نبوی ہے: لا تكسر الضحك فإنه تميت القلب۔

ڈراموں کے تعلق سے بات اوپر گزر چکی۔

جواب (۲) کھیلوں کے تعلق سے جو بات عام طور پر مذکور ہے وہ تین طرح کے کھیل ہیں، جنکی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے اور یہ تینوں کھیل وہ ہیں جو جہاد کی تیاری میں معاون ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مستدرک حاکم کی ایک روایت ہے:

کل لعب حرام إلا ملاعبة الرجل امرأته وقوسه وفرسه (اخرجه الحاكم في المستدرک ۲/۹۵)۔  
عام کتب فقہ میں انہی تین قسم یا کشتی کی گنجائش ہے۔

کشتی کے سلسلہ میں علامہ شامی رقم طراز ہیں: ”وقد جاء الأثر في رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقابلة دون التلهي فإنها مكروهة“ (الرد مع الدر ۹/۲۸۱، ۲۸۲)۔

کھیل کے شرائط:

(۱) کھیل فی نفسہ جائز اور مباح ہو اور شرعاً اس میں کوئی ممنوع عمل نہ ہو۔

(۲) اس کھیل کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے اور نہ ہی اسکو بطور پیشہ کے اختیار کیا جائے۔

(۳) اس کھیل کا انہماک اس درجہ نہ ہو کہ آدمی مقصد تخلیق کو ہی فراموش کر دے اور وہ فرائض و واجبات کے ترک کا ذریعہ بن جائے، کیونکہ علامہ شامی نے شطرنج کی کراہت کی جو علت ذکر کی ہے وہ: شطرنج کا انہماک دنیاوی امور میں دلچسپی اور آخرت سے بے رغبتی ہے، اور اس عمل کو انہوں نے حرام کہا ہے اور اس عمل کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔

چنانچہ علامہ شامی رقم طراز ہیں: إنما كره لأن من اشتغل به ذهب عناؤه الديني وجاء العناء الأخرى، فهو حرام

وكبيرة عندنا (الرد على هامش الدر ۹/۲۸۱)

(۳) ان کھیلوں میں پیسہ کا اسراف نہ ہو کیونکہ اللہ نے اپنی مقدس کتاب میں ایسے لوگوں کو شیطان کا بھائی کہا ہے، ارشاد خداوندی ہے: إن المبذرين

كانوا إخوان الشياطين (الاسراء: ۱۷)۔

(۴) وقت کا حد درجہ ضیاع نہ ہو۔

(۵) مردوزن کا اختلاط نہ ہو۔

(۶) اگر مذکورہ بالا شرائط کی رعایت کسی کھیل میں ہو تو ایسی صورت میں اس کا کھیلنا جائز ہوگا اور اگر ان شرائط کی رعایت نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کا کھیلنا جائز نہ ہوگا۔

ج۔ کھیل کی تقسیم احکامات کے اعتبار سے (جائز، مکروہ، حرام)

(۱) وہ جائز اور مباح کھیل جنکو تلبی اور لہو و لعب کے طور پر کھیلا جائے وہ مکروہ ہیں۔ جیسا کہ صاحب الدر کشتی کے تعلق سے تحریر فرماتے ہیں: والمصارعة

ليس ببدعة إلا للتلهي فتكره (الدر مع الرد ۹/۲۹۳)۔

(۲) اور وہ کھیل جن میں کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہ ہو، یا ایسے کھیل جن کا کھیلنا شرعاً مباح نہیں ہے، یا وہ کھیل جو مذکورہ شرائط کے خلاف ہو ان تمام طرح کے

کھیلوں کا کھیلنا جائز و حرام ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔

(۳) اور وہ کھیل جو شرعاً مباح ہو اور ان کے اندر کوئی شرط غیر مشروع نہ ہو ان کا کھیلنا جائز اور مباح ہے (الرد علی ہاشم الدر ۹/۲۹۲)۔

۷۔ کھیلوں کا جواز ان کھیلوں کے متعلق ہے جن میں اخروی یا دنیاوی فائدہ ہو۔ اخروی فائدہ مثلاً جہاد کی تیاری وغیرہ، اور دنیاوی فائدہ مثلاً حفظان صحت

وغیرہ، اور اگر انہی کھیلوں کو تلبی کے طور پر کھیلا جائے تو ان کا کھیلنا بھی مکروہ ہے جیسا کہ دون التلهي فانه مكروهة (الرد مع الدر ۹/۲۸۱) کے حوالہ

سے اوپر گزرا۔ لہذا کھیلوں کا دیکھنا جبکہ اسکے فائدہ ہونا اور تلبی میں شمار ہونا نظر من الشمس ہے۔ مزید اسکے دیکھنے پر پیسہ کا خرچ کر تم بالائے تم ہے، لہذا احترام

کی رائے میں نہ تو کھیل کا دیکھنا جائز ہے اور نہ بیچ کے لئے نکت خریدنا ہی جائز ہے۔

جواب ۳: الف۔ حنفیہ نے سفر کی احکامات کے اعتبار سے تین قسمیں کی ہیں:

(۱) سفر طاعت جیسا کہ حج اور جہاد (۲) سفر مباح جیسا کہ سفر تجارت (۳) سفر معصیت جیسا کہ ڈاکا ڈالنے کیلئے اور عورت کا اپنے محرم کے بغیر سفر کرنا، جبکہ

مالکیہ نے سفر کی دو قسمیں کی ہیں: (۱) سفر طلب (۲) اور سفر ہرب اور انہوں نے سفر ہرب کو واجب قرار دیا ہے (الموسوع الشفیعہ ۲۷/۲۵)

اور سفر سیاحت کے سلسلہ میں حنابلہ اور شوافع کی رائے اباحت کی ہے۔

وقد صرح الشافعية والحنابلة بأن السفر لرؤية البلاد والزهة فيها مباح (الموسوعة الفقهية ۲۸/۲۵)  
 شیخ الاسلام ابن تیمیہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: وقد رخص بعض المتأخرين في السفر الى المشاهد ولم ينقلوا  
 ذلك من احد من الائمة ولا احتجوا بحجة شريعة (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۷/۹)

ان عبارات کے جائزہ سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ سفر سیاحت ناجائز نہیں ہے، کیونکہ حنفیہ کی تقسیم کے مطابق یہ سفر معصیت نہیں ہے، لہذا احقر کی  
 رائے کے مطابق شوافع اور حنابلہ کا قول زیادہ بہتر ہے۔ اللہ اعلم بالصواب

ب- سفر طاعت میں سے حج بھی ہے اور صاحب بدائع علامہ کاسانی نے حج کے شرائط میں راستہ کا مامون ہونا بھی ذکر کیا ہے (بدائع الصنائع ۲/۲۹۸)  
 لہذا ایسی کسی جگہ کا سفر تفریح جو جان اور مال کے خطرہ کا باعث ہو کیسے جائز ہوگا؟

ج- کسی گناہ کی جگہ جانا یا کسی گناہ کی مجلس میں شرکت کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: من كثر سواد قوم  
 فهو منهم، الحدیث۔

البتہ ایسی جگہوں پر اشیائے خورد و نوش کی دکانیں لگانا اور ایسی جگہیں جانے والوں کیلئے ٹکٹ وغیرہ کا نظم کرنا جائز و درست ہے اس سلسلہ میں کچھ فقہی  
 جزئیات درج ذیل ہیں:

”وجاز تعمير كنيسة) قال في (الخانية) ولو اجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها في عين العمل (الرد مع الدر  
 -۹/۲۷۷-

اور علامہ کاسانی نے اسی قسم کا ایک جزئیہ تحریر کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ”مسلم باع خمرًا واخذ ثمنها وعليه دين يكره لصاحب الدين ان ياخذ منه ولو كان  
 البائع نصرانياً فلأبأس بأخذه (بدائع الصنائع ۴/۳۰۸)

ان مثالوں سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ ایسی جگہوں پر اسٹال لگانا اور ٹکٹ وغیرہ کی ایجنسی چلانا جائز ہے۔

جواب (۴) مفتی شفیع صاحب نے ایک رسالہ ”تصحیح العلم فی تصحیح الفلم“ کے نام سے تحریر فرمایا اس رسالہ میں مفتی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ جاندار کی تصویر خواہ  
 مجسم ہو یا غیر مجسم مطلقاً معصیت ہے اور دلیل کے طور پر حضرت عائشہؓ کی روایت جمع الفوائد کے واسطے سے نقل کرتے ہیں: عن عائشة ؓ قدم ﷺ من  
 سفر وقد سترت بقرام على سهوة لى فيه تصاویر فنزعه وقال أشد الناس عذابا يوم القيامة الذين يتظاهرون بخلق  
 اللہ۔ نیز وہ آگے تحریر کرتے ہیں: کسی مسلمان کی تصویر کشی اور بھی زیادہ معصیت ہے کیونکہ وہ اس کو بیچ سجتا ہے (جواہر الفقه ۳/۲۵۶)۔

اور حضرت مفتی محمود الحسنؒ نے بھی شق القرو وغیرہ کی فلم وغیرہ دیکھنے کے سلسلہ میں ممانعت ذکر کی ہے (فتاویٰ محمودیہ ج ۲۹) اور حضرت مفتی شفیع صاحب نے حضرت  
 تھانویؒ کے حوالہ سے حج وغیرہ کی فلم کے سلسلہ میں بھی ممانعت نقل کی ہے اور ان حضرات نے اس ممانعت کے سلسلہ میں ایک بڑی علت استخفاف ذکر کی ہے۔

جواب (۲) - صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانیؒ تصویر کی حرمت کی علت ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ولأن إمساکها تشبه بعبدۃ  
 الأوثان إلا إذا كانت على البسط أو الوسائد الصغار التي تلقى على الارض ليجلس عليها لا تكره (بدائع الصنائع ۴/۳۰۴)۔

مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو کارٹونوں میں عبادت کا کوئی تصور بھی حاشیہ خیال تک میں نہیں ہوتا۔ ۲: کارٹون کے خدوخال بھی عام تصویروں کی  
 طرح واضح نہیں ہوتے، اور حیثیت شخص ایک نقش کی سی ہوتی ہے، لہذا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جواب (۶) - اس دور میں مکالمات کی شکل بعینہ وہی ہوتی ہے خواہ وہ مدارس میں ہو یا عام مقامات پر جو ایک زمانہ میں ٹھیڑوں میں چلنے والے ڈراموں کی  
 ہوتی تھی اور ان کے سلسلہ میں عام زائے ہندوستان کے اکابر کی عدم جواز کی ہے، کیونکہ اس میں تبدیل ہیئت کے ساتھ ساتھ کردار کشی کے لئے ویسا ہی روپ اپنایا  
 جاتا ہے، لہذا احقر کے نزدیک یہ عمل مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆

## سیر و تفریح سے متعلق شریعت کے ضابطے

مولانا عبید اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ

تفریح کی تعریف:..... تفریح کا لفظ فرحت سے ماخوذ ہے اور فرحت کی تعریف کرتے ہوئے علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ”الفرحة لذة في القلب يادراك المحبوب“ (تفسیر قرطبی) (یعنی محبوب چیز کے پالینے سے جو قلبی لذت نصیب ہوتی ہے اسی کا نام فرحت اور خوشی ہے)۔  
تفریح کے وسائل اور طریقے:

موجودہ دور میں ”تفریح“ فکر و تحقیق کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے، اسے نفسیاتی علاج کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اس کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جا رہے ہیں، مثلاً:

۱- تفریح کا ایک طریقہ مزاح اور لطیفہ گوئی ہے، مزاح شریعت میں جائز ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”أب رجلاً أتى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! احملني، فقال رسول الله ﷺ: إنا حاملوك على ولد ناقة، قال: ما أصنع بولد الناقة؟ فقال النبي ﷺ: وهل تلد الإبل إلا النوق“ (ابوداؤد الترمذی باب ما جاء في المزاح رقم الحديث: ۳۹۹۸، ترمذی: ۱۹۹۸) (ایک صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لئے سواری کا نظم فرمادیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں سواری کے لئے تمہیں اونٹ کا بچہ دوں گا تو انہوں نے کہا: میں اونٹ کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھائی ہر اونٹ تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے)۔

مزاح کے اصول و ضوابط:..... ۱- مزاح حق و صداقت کا خیال رکھے۔ ۲- فحش قول سے پرہیز کرے۔ ۳- قولاً یا عملاً جھوٹ اور غلط نہ بولے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ”يا رسول الله إنك تداعبنا؟ قال: إني لا أقول إلا حقاً“ (ترمذی باب ما جاء في المزاح، رقم: ۱۹۹۷) (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تعجب کے ساتھ عرض کیا، آپ بھی ہم لوگوں سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یقیناً میں تم سے مزاح کرتا ہوں لیکن مزاح میں سچ ہی بولتا ہوں)۔ ۴- روع مسلم (کسی مسلمان کو ڈرانا) نہ ہو، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

”حدثنا أصحاب محمد ﷺ أنهم كانوا يسيرون مع النبي ﷺ فقام رجل منهم فأنطلق بعضهم إلى جبل معه فأخذه، ففرع، فقال رسول الله ﷺ: لا يحل لمسلم أن يروع مسلماً“ (ابوداؤد باب من يأخذ الشيء على المزاح، رقم: ۵۰۰۲) (مجھ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جا رہے تھے (سفر میں) ان میں سے ایک شخص سو گیا تو ان میں سے بعض اس کی رسی کی طرف چلے جو اس کے ساتھ تھی اور اسے لے لیا وہ آدمی گھبرا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے مسلمان کو گھبراہٹ میں مبتلا کرے)۔

۵- افراط اور مداومت نہ ہو، کیونکہ افراط زیادہ ہنسنے کا سبب ہے، اور زیادہ ہنسانا دل کو مرده کر دیتا ہے اور بعض حالات میں کینہ پیدا کرتا ہے، ہیبت و وقار کو ختم کرتا ہے (احیاء علوم الدین للامام الغزالی باب آفة اللسان نمبر: ۳، ج ۳، ص ۱۳۷)۔

تفریح طبع کے لئے نغمہ سرائی اور شعر و شاعری:

شعر گوئی اور شعر سے دلچسپی ایک حد تک علم اور زبان کی فطرت میں داخل ہے، یہ حقیقت ہے کہ اشعار کلام کی نہایت زود اثر صنف ہے اور اس کے ذریعہ کم الفاظ میں زیادہ موثر ڈھنگ سے بات کہی جاسکتی ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعراء نے اپنی زبردست صلاحیت کا استعمال ذہن و اخلاق کی تعمیر کے لئے

ط استاد دارالعلوم ماٹلی والا، سمرات۔



کم اور اپنے ریک جذبات کے لئے زیادہ کیا ہے، غالباً انہیں دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر حضور ﷺ نے کہیں اس کی تعریف کی ہے اور کہیں اس کی مذمت، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعر فی نفسہ ایک ذریعہ اظہار ہے، اگر صحیح مقاصد کا اظہار پیش نظر ہو تو عین بہتر ہے، اگر غلط افکار کی نمائندگی کی جائے تو مذموم ہے، خود حضور ﷺ کے عمل سے تفریح و طبع کے لئے اشعار سننا ثابت ہے، چنانچہ حضرت عمرو بن شریک اپنے والد شریک سے روایت کرتے ہیں:

”رَدَفْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَوْمًا فَقَالَ: هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ أُمِيَّةَ بْنِ أَبِي الصَّلْتِ شَيْءٌ قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: هِيَ، فَأَنْشَدْتَهُ بَيْتًا فَقَالَ: هِيَ، ثُمَّ أَنْشَدْتَهُ بَيْتًا فَقَالَ: هِيَ، حَتَّى أَنْشَدْتَهُ مِائَةَ بَيْتٍ“ (مسلم کتاب الشعر، رقم: ۱۱۸۰)۔

(میں ایک دن آنحضرت ﷺ کے پیچھے سوار تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کیا تجھے امیہ بن الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: سناؤ، میں نے ایک شعر پڑھا، آپ نے فرمایا اور پڑھ، میں نے اور پڑھا، آپ ﷺ نے فرمایا اور پڑھ، یہاں تک کہ میں نے سوا شعر پڑھے)۔

نیز اچھے اشعار کبھی کبھی آپ ﷺ خود بھی پڑھتے، بلید کا شعر: اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللَّهَ بَاطِلٌ  
وَكُلُّ نَعِيمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ  
(خدا کے سوا ہر چیز باطل (فانی) ہے، اور ہر نعمت یقیناً زائل ہونے والی ہے) (مسلم کتاب الشعر، رقم: ۱۱۸۰)۔

نیز بعض صحابہ کرام کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ قرآن وحدیث کے مشاغل سے تھک جاتے تھے تو بعض اوقات عرب کے اشعار یا تاریخی واقعات سے دل بہلاتے تھے، خصوصاً کام کاج کے وقت، بوجھ اٹھاتے وقت، مسافت طے کرتے وقت، طبیعت میں نشاط و جستی پیدا کرنے کے لئے اشعار پڑھتے اور سنتے تھے، مثلاً جنگ یاجج کے موقع پر (دیکھئے: بخاری؛ کتاب الغازی: باب غزوة خیبر، مسلم کتاب الجہاد و اسیر، باب قتل کعب ابن الاشرف)۔

ان آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اشعار فحش نہ ہوں، ان میں محرم کی ہجو، شراب کی تعریف، عورتوں یا امارت کا تذکرہ، ظالم کی مدح سرائی اور افتخار نہ ہو تو فرصت کے لمحات میں تفریح و طبع کے لئے ان کے پڑھنے اور سننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن باقاعدہ مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا، مزاحیہ پروگرام رکھنا، مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید و فروخت کرنا، لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنانا اور تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے منعقد کرنا جن کا مقصد صرف ہنسا ہنسانا ہو سو وہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنیاد پر حرام ہوگا اور اس کو بطور پیشہ اختیار کرنا بھی حرام ہوگا۔

۱- آیت: ”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ“ (سورہ لقمان) میں داخل ہیں، چنانچہ مفتی شفیع صاحب پاکستان لکھتے ہیں:

۲- اس میں مرد و عورت کا اختلاط ہوتا ہے جو کسی بھی طرح سے درست نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ نے ایسے لوگوں پر سخت وعید فرمائی ہے، چنانچہ طبرانی کی روایت ہے، حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لَأَنْ يَزْحَمَ رَجُلٌ خَنْزِيرًا مُتَلَطِّخًا بِطِينِ وَحْمَاءِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَزْحَمَ مَنكِبَهُ مَنكِبَ امْرَأَةٍ لَا تَحِلُّ لَهُ“ (طبرانی، والبیہقی) (کوئی آدمی مٹی اور کچھڑ سے لت پت خنزیر سے لگ جائے وہ اس کے لئے اس بات سے بہتر ہے کہ اس کا کندھا کسی نامحرم سے لگائے)۔

۳- ایسے پروگراموں میں معنی کے ساتھ مغنیہ بھی شریک ہوتی ہیں، جن کی آواز سننا از روئے شرع درست نہیں ہے۔

۴- نیز ایک لایعنی کام کے لئے مال اور وقت دونوں ضائع ہوتے ہیں۔

۵- زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، وقار مجروح ہوتا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ”لَا تَكْشِرُ الضَّحْكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحْكَ تَمِيتُ الْقَلْبَ“ (ترمذی کتاب الزہد)۔

ان چیزوں کو بطور پیشہ اختیار کرنا اور ایسے پروگراموں میں شرکت کے لئے ٹکٹ لینا بھی حرام ہوگا، چنانچہ حضرت بہز بن حکیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وَيْلٌ لِلَّذِي يَجِدُ بِالْحَدِيثِ لِيُضْحِكَ بِهِ النَّاسَ فَيَكْذِبُ وَيَلُ لَهْ وَيَلُ لَهْ“ (ترمذی کتاب الزہد؛ باب ما جاء من تكلم بالكلمة ليضحك به الناس) (تباہی ہے اس شخص کے لئے جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے بات کرے پھر جھوٹ بولے، اس کے لئے تباہی ہے، تباہی ہے)، نیز حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ لَا يَرِي بِهَا بَأْسًا يَهُوِي بِهَا سَبْعِينَ خَرِيفًا فِي النَّارِ“ (حوالہ سابق) (آدمی بسا اوقات کوئی بات بولتا ہے اور بولنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا حالانکہ اس کی وجہ

سے وہ ستر سال جہنم میں گرے گا۔

شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ کھیل:

۲- تفریحی مقصد کے لئے مختلف قسم کے کھیل بھی مروج ہیں، موجودہ زمانہ میں کھیل نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے، سرکاری سطح پر مستقل اس کی وزارت ہوتی ہے اور اس مقصد کے لئے خاصا بجٹ منظور کیا جاتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مروجہ کھیلوں کو شریعت کس نظر سے دیکھتی ہے، نیز ائمہ و فقہاء کے خیالات و آراء کیا ہیں؟

اسلام کے پسندیدہ کھیل تیراندازی، شمشیر زنی، گھوڑ دوڑ، پیدل دوڑ، اونٹ کی دوڑ میں مسابقت ہے۔ احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فضائل بیان فرمائے ہیں، اور اس کے سیکھنے کو باعث اجر و ثواب قرار دیا ہے، کیونکہ یہ کھیل جہاں جسم میں نشاط و چستی، اعصاب میں چنگلی، اور نظر میں تیزی پیدا کرتے ہیں وہیں آڑے وقت میں اپنی حفاظت کے اور جہاد کے موقع پر کافروں کے مقابلہ میں کام آتے ہیں، چنانچہ ترمذی، نسائی، مسند امام احمد وغیرہ کی معروف حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کل شیء یلھو بہ الرجل باطل إلا رمیہ بقوس و تادیبہ فرسہ و ملاعبتہ امرأۃ فانھن من الحق“ (ترمذی؛ فضائل الجہاد) (آدمی کا ہر کھیل باطل ہے، سوائے تین کے، تیراندازی کرنا، گھوڑا سداھانا، اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت کرنا، کیونکہ یہ تینوں کھیل حق میں سے ہیں یعنی کارآمد ہیں)۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت: ”وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ“ میں ”قوت“ کی تفسیر تیراندازی سے کی اور تین مرتبہ فرمایا: ”أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمِيَّ، أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمِيَّ، أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمِيَّ“ (مسلم کتاب الامارہ، ابوداؤد؛ کتاب الجہاد) (سن لوطاقت قوت تو تیراندازی میں ہے)، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثننیۃ الوداع اور مسجد خیف کے درمیان گھوڑ دوڑ کرائی ہے (نسائی باب انصار انیل للسنیق ۱۲۴۲)، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیراندازی اور شمشیر زنی، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی دوڑ میں مسابقت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے (نسائی باب اسبق ۱۲۵، ۲)، اور موجودہ زمانہ میں گولی چلانا، راکٹ، میزائل، بم وغیرہ ٹھیک ٹھیک نشانوں پر لگانا بھی لفظ ”رمی“ میں داخل ہے، چنانچہ صاحب بذل المجہود حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے اس کی تصریح فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

”ولم یکن فی زمان رسول اللہ ﷺ فی الحرب إلا رمی السہام، فیدخل بل یعوض عنہ فیہ ما یرمی بہ من الرصاص بالبندقیۃ والمدافع وغیر ذلک من آلات الحرب الجدیدۃ المستعملۃ فی هذا الزمان، فإنھا أغنت عن رمی السہام بالقوس، وعطلتہ“ (ابوداؤد؛ کتاب الجہاد، بذل المجہود ۷۰۶۸)۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جنگوں میں سوائے تیر کے کچھ نہیں تھا، لہذا موجودہ زمانہ میں جدید آلات حرب کا حکم وہی ہوگا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تیر کا تھا مثلاً بندوق، اور توپ چلانا اور جدید آلات حرب کا استعمال کرنا، اس لئے کہ ان چیزوں نے تیر سے بے نیاز کر دیا ہے، اور اس کو بالکل معطل کر دیا ہے)۔

اسی طرح جن کھیلوں سے جسمانی ورزش ہوتی ہے، قوی مضبوط ہوتے ہیں اور بوقت ضرورت اپنی اور دوسروں کی جان بچانے میں اس سے مدد لی جاسکتی ہے اور جہاد کی تربیت کا فائدہ حاصل ہو تو ان کے احکام بھی اسی طرح ہوں گے جو گھوڑ دوڑ وغیرہ کے ہیں، مثلاً کرائے، لالچی چلانا، مکابازی، کبڈی، فٹ بال، والی بال، گاڑیوں کی ریس، بمبار اور لڑاکا طیارے، ہیلی کاپٹر، بحری جہاز ٹینک، بکتر بند گاڑیاں جیپ کار وغیرہ کی مشق، بشرطیکہ بے نیت جہاد اس کی مشق کی جائے، اور جائز ہی نہیں، بلکہ بعض حالات میں مستحسن اور مندوب ہوں گے۔

یہ تو چند وہ کھیل تھے جن کا احادیث و آثار میں باقاعدہ ذکر آیا ہے، اس کے علاوہ باقی کھیلوں میں شرعی ضابطہ یہ ہے:

۱- جن کھیلوں کی احادیث و آثار میں صریح ممانعت آئی ہے وہ ناجائز ہیں، جیسے زرد، شطرنج، کبوتر بازی، جانوروں کو لڑانا وغیرہ (باب النبی عن الخریش بین الجہائم، اغتہ الاسلامی وادلت)۔

نیز موجودہ زمانہ میں کرکٹ، کیرم، لورڈ، لوڈو وغیرہ کا بھی حکم مثل شطرنج ہوگا، کیونکہ ضروری اور حقیقی مسائل سے غافل کرنے میں یہ شطرنج سے بھی بڑھ کر ہیں۔

۲- جو کھیل کسی حرام اور معصیت پر مشتمل ہوں وہ بھی ناجائز ہوں گے اگرچہ فی نفسہ وہ کھیل مباح ہوں، مثلاً کسی کھیل میں ستر کھولا جائے یا اس میں جوا کھیلا۔

جا رہا ہو، یا مردوزن کا مخلوط اجتماع ہو، یا اس میں موسیقی کا اہتمام کیا گیا ہو، یا اس کھیل میں کفار کی نقالی کی جا رہی ہو۔

۳- جو کھیل فرائض اور حقوق واجبہ سے غافل کرنے والے ہوں وہ بھی ناجائز ہوں گے، کیونکہ جو چیز بھی انسان کو اس کے فرائض سے اور حقوق واجبہ سے غافل کرنے والی ہو وہ ”لہو“ میں داخل ہے، اور ”لہو“ باطل ہے، چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الاستیذان میں باب قائم کیا ہے، ”کل لہو باطل اذاً شغلہ عن طاعة اللہ“، یعنی ہر لہو جب وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اطاعت سے غافل کر دے تو وہ باطل (گناہ) ہے۔

۴- جس کھیل کا کوئی مقصد نہ ہو بلا مقصد محض وقت گزاری کے لئے کھیلا جائے وہ بھی ناجائز ہوگا، کیونکہ یہ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو ایک ”لغو“ کام میں ضائع کرنا ہے (کاسانی بدائع الصنائع، کتاب المساق)۔

البتہ وہ کھیل جو مذکورہ بالا خرابیوں سے پاک ہوں ان کے کھیلنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن دور حاضر کے مروجہ کھیلوں میں درج ذیل خرابیاں پائی جاتی ہیں:

الف- کھلاڑیوں اور ان کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کا انہماک اتنا بڑھ گیا ہے کہ ضروری کاموں پر اسے ترجیح دی جاتی ہے جس سے بسا اوقات بندوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔

ب- ان کھیلوں میں عموماً فرض نمازوں کے اوقات، جمعہ کے مبارک دن، رمضان کے فرض روزوں تک کا خیال نہیں رکھا جاتا جب کہ یہ ایک مسلمان کے لئے فرض عین ہیں۔

ج- ان کھیلوں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔

د- اکثر کھیلوں میں ”ستر“ کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے جسم کے جن حصوں کو شرعاً ڈھانپنا ضروری ہے ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

ہ- اکثر کھیلوں میں مردوزن کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے اور چونکہ مرد و عورت محض تفریح کے لئے اور کھیل برائے کھیل کی نیت سے جمع ہوتے ہیں، اس لئے ہونٹنگ، ڈانس، گانا اور دیگر نازیبا حرکتیں کھلے عام کرتے ہیں۔

و- ان کھیلوں میں جو محض تفریح و طبع کے لئے ہونے چاہئیں، اب ایسی محاذ آرائی اور ذہنی تनावل ہونے لگا کہ جس سے ان کھیلوں کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، اب کھیل کے میدان کو محاذ جنگ سمجھا جاتا ہے، اس کی ہارجیت کو قومی شکست اور قومی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے، میچوں کے لئے دعائیں مانگی اور نذریں مانی جاتی ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سربراہان مملکت اس سلسلہ میں تعزیتی و تهنیتی پیغامات جاری کرتے ہیں۔

سیر و سیاحت شریعت کی نظر میں:

سفر کے اقسام باعتبار احکام:

ائمہ نے سفر کی تین قسمیں کی ہیں: (۱) سفر طاعت، (۲) سفر مباح، (۳) سفر معصیت، سفر طاعت جیسے حج و عمرہ، جہاد، دعوت و تبلیغ دین وغیرہ، مباح: جیسے تلاش معاش، تجارت وغیرہ، معصیت جیسے رہزنی، بلا حرم عورت کا سفر کرنا۔

شہروں اور ملکوں کی طرف زیارت اور سیر و تفریح کی غرض سے سفر کرنا مباح ہوگا، چنانچہ حنابلہ اور شوافع کے یہاں اس کی صراحت ہے (ملاحظہ ہو: العنای علی البدایہ بہامش فتح القدر ۲.....)۔

البتہ ایسے ملک اور شہر میں تفریح کے لئے جانا جہاں حرام کام زیادہ ہوتا ہو، منکرات کی کثرت ہو، مثلاً شراب نوشی یا بدکاری یا عریانی وغیرہ کا رواج ہو تو درست نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں سے تو خروج کا حکم ہے، چنانچہ مالکیہ نے سفر کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (۱) سفر طلب، (۲) سفر ہرب واجب۔

پھر سفر طلب کی پانچ قسمیں ہیں: واجب جیسے حج و عمرہ اور جہاد، مندوب، جیسے بر الوالدین، صلۃ الرحم، طلب العلم، تفکیر فی خلق اللہ، مباح: جیسے سفر تجارت، ممنوع: جیسے معصیت کے لئے سفر کرنا (الموسوۃ الفقہیہ ۲۶/۳۵)۔

سفر ہرب واجب: مثلاً آدمی کسی ایسی جگہ مقیم ہے جہاں برائیاں زیادہ ہوں، دین و ایمان خطرہ میں ہو، فرائض میں کوتاہیاں ہوتی ہوں، شعائر اسلام پر عمل

دشوار ہو تو ایسی جگہ سے نکلنا واجب ہے۔

کفریہ ممالک کی طرف بغرض تفریح سفر کا حکم:

کفریہ ممالک کی طرف بامقصد سفر کے لئے علماء نے تین شرطیں بیان کی ہیں:

۱- اس کے پاس اتنا وسیع و عمیق علم ہو جس سے وہ کفار کے شبہات کا ازالہ کر سکے۔

۲- ایسا دیندار اور مذہبی ہو کہ وہاں جا کر اپنے کو خواہش پرستی اور شہوات نفسانیہ سے محفوظ رکھ سکے۔

ج- کسی سخت ضرورت و حاجت کے بغیر سفر نہ کرے اور سخت ضرورت سے مراد یہ ہے کہ ایسا علاج اور ایسا علم حاصل کرنے کے لئے وہاں جائے جو اسلامی مملکت میں میسر نہ ہوں۔

اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو جانا ممنوع اور ناجائز ہے اور سیر و تفریح کوئی اسلامی ضرورت نہیں ہے اس لئے درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں فتنہ یا خوف فتنہ ہے، اضاعت مال ہے، نیز اس سے کفار کی اقتصادی حالت مضبوط ہوتی ہے (فتاویٰ علماء البلد الحرام ۱/۳۲)۔

۴- دستاویزی اور تاریخی فلمیں بنانے کا حکم:

فلم اصل میں تصویر کشی کا نام ہے اور اسلام میں جاندار کی تصویر کشی ناجائز اور حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے: ”إن أشد الناس عذاباً عند الله يوم القيامة المصرون“ (بخاری؛ کتاب اللباس، باب عذاب المصرون، مسلم کتاب اللباس) قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو دیا جائے گا۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہے: ”إن الذين يصنعون هذه الصور يعذبون يوم القيامة يقال لهم: أحيوا ما خلقتم“ (بخاری ایضاً الباب السابق) (جو لوگ تصویر بناتے ہیں قیامت کے دن ان کو عذاب دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ جو صورت تم نے پیدا کی ہے اس میں جان بھی ڈالو)۔

البتہ غیر ذی روح بے جان چیزوں کی تصویر بنا سکتے ہیں، اسی طرح سرکئی ہوئی تصویر جو درخت کے مشابہ ہو جائے، پامال تصویر جو جوتے کے تلے یا فرش وغیرہ میں ہو، بہت چھوٹی تصاویر جیسے انگوٹھی اور بنٹن کی تصاویر وہ بھی عام نقش و نگار کے حکم میں ہے، علماء نے ان کی اجازت دی ہے (تصویر کے شرعی احکام)۔ اور فلم میں چونکہ تصویر کشی ہوتی ہے، گانا بجانا، رقص و سرور، نامحرم کو دکھانا، مرد و عورت کا اختلاط، مخرب اخلاق مناظر کا بیان، مجرمانہ ذہن سازی ہوتی ہے، اس لئے حرام ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔

۵- موجودہ دور میں تفریح و مزاح کا ایک پہلو یہ ہے کہ شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں، کارٹون کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس طرف ہے، لیکن اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

اس سلسلہ میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں: ”اسی طرح فلم جو کسی کاغذ یا کسی اور مادے پر اس طرح ثابت ہو کہ اسے معمولی آنکھ سے بھی دیکھا جاسکے اس کے تصویر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لئے اس کی تجارت ناجائز اور آمدنی حرام ہے“ (جواہر الفقہ ۲/۴۴)۔

نیز دوسری جگہ لکھتے ہیں: جیسے قلم سے تصویر کھینچنا جائز نہیں ایسے ہی فوٹو سے تصویر بنانا یا پریس پر چھاپنا یا سانچہ اور مشین وغیرہ ڈھالنا بھی ناجائز ہے (تصویر کے شرعی احکام)۔

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کارٹون بھی تصویر میں داخل ہے، لیکن چونکہ اس میں انسانی صورت کے خط و خال پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، اس لئے اس کے تصویر ہونے میں ذرا تردد ہوتا ہے، اگر کارٹون اس طرح بنایا جائے کہ ان کا چہرہ، آنکھیں، ناک وغیرہ واضح ہوں اور اس کی شناخت ہو رہی ہو تو ایسے کارٹون تصویر کے حکم میں ہوں گے اور ان کا بنانا اور استعمال کرنا ناجائز اور حرام ہوگا، البتہ اگر ایسے کارٹون بنائے جائیں جن میں جاندار کی شکل، مثلاً آنکھ، کان، ناک وغیرہ واضح نہ ہوں تو ایسے کارٹون بنانے کی اجازت و گنجائش ہوگی، تاہم اس کو مستقل ذریعہ آمدنی بنانا، اس کے لئے ملازمت کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ وہ

بہر صورت تصویر کے مشابہ ہیں، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”إن الحلال بین والحرام بین، و بینہما أمور مشتبہات لا یعلمہن کثیر من الناس، فمن اتقى بالشبہات استبرأ لدينہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام“ (بخاری؛ کتاب الایمان، ومسلم؛ کتاب الساقاۃ) (حلال واضح ہے حرام بھی واضح ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں، سو جو شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور اپنی عزت محفوظ کر لی اور جو شبہات میں پڑا وہ حرام میں مبتلا ہوگا)۔

لہذا جس کسی نے اس کو ذریعہ آمدنی بنایا ہو یا اس میں ملازمت اختیار کی ہو، اس پر لازم ہے کہ اس کا بدل تلاش کرے اور جب بدل فراہم ہو جائے تو اس کو چھوڑ دے، چنانچہ حضرت سعید بن ابوالحسن سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ”كنت عند ابن عباس إذ جاءه رجل فقال: يا ابن عباس! إني رجل وإنما معيشتي من صنعة يدي وإني أصنع هذه التصاوير، فقال ابن عباس: لا أحدثك إلا ما سمعت من رسول الله ﷺ يقول: من صور صورة فإن الله معذبه حتى ينفخ فيه الروح وليس بنافع أبداً فربما الرجل ربوة شديدة واصفر وجهه فقال: ويحك إن أبيت إلا أن تصنع فعليك بهذا الشجر وكل شيء ليس فيه روح“ (بخاری؛ کتاب البیوع)۔

۶- ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ ڈراما بھی ہے، جس میں مختلف افراد بطور کردار شامل ہوتے ہیں اور وہ معین جملوں کو ادا کرتے ہیں، ڈرامہ غیر اخلاقی مقاصد کے لئے بھی کیا جاتا ہے اور بہتر مقاصد کے لئے بھی، اگر ڈرامہ اچھے مقاصد کے لئے ہو مثلاً معاشرہ میں موجود خرابیوں اور عیوب کی اصلاح تو جائز ہوگا، بشرطیکہ شریعت کے خلاف کوئی چیز نہ ہو، محرمات سے پاک ہو، حقوق و فرائض کی پامالی کا ذریعہ نہ ہو، اور اگر غیر اخلاقی مقصد کے لئے ہو مثلاً اجتماعی عیوب کی اصلاح مقصود نہ ہو یا کسی سیاسی یا اسلام مخالف تحریک اور پارٹی کی ترجمانی مقصود ہو یا کمیونزم کی دعوت دینا ہو، یا ڈرامہ کے میدان میں عورتوں کی ہمت افزائی کرتا ہو، یا اس فن کے ماہرین کی تعظیم کا سبب بنتا ہو، یا اس میں ادب مکشوف (نگاہ ادب) پایا جاتا ہو تو حرام ہوگا، کیونکہ ڈرامہ اور فلم میں، بجز اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ فلم میں تصویر ہوتی ہے جبکہ ڈراما جیتے جاگتے انسانوں کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے ڈرامہ میں تصویر کشی کا گناہ نہیں ہے، البتہ باقی وہ سب گناہ پائے جاتے ہیں جو فلم کے سلسلہ میں بیان کئے گئے۔

البتہ دینی مدارس کے پروگراموں میں مکالمات کی جو صورت مروج ہو گئی ہے، وہ چونکہ ان تمام خرابیوں سے پاک ہوتی ہے، اس لئے وہ جائز ہو سکتی ہے تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے حتی الامکان گریز کیا جائے، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

## سیر و تفریح - شرعی تناظر میں

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی علیہ

الف - اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں جہاں متانت و سنجیدگی کا عنصر رکھا ہے، وہیں گاہے گاہے ہنسی مذاق اور خوش طبعی کرنے کا بھی، اس سے دل و دماغ کو نشاط پہنچتا ہے، اور باہمی بے تکلفی اور محبت میں بھی اضافہ ہوتا ہے، نیز ایک دوسرے سے وحشت دور ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض اوقات اپنے رفقاء اور ازواج مطہرات سے خوش طبعی فرمایا کرتے تھے، حضرت انسؓ راوی ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی گوریے سے کھیل رہے تھے، اتفاق سے وہ گوریا مر گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مزاح فرمایا: اے ابو عمیر تمہارے گوریے کا کیا ہوا، ”یا ابا عمیر ما فعل النخیر“ (بخاری؛ باب الانبساط إلى الناس ۶۱۲۹، ترمذی: ۱۹۸۹)

ایک صاحب خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے اور درخواست کی کہ مجھے سواری عطا فرمائی جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ دے سکتا ہوں، وہ صاحب پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے، ”وہل تلد الإبل إلا النوق“ (ابوداؤد؛ باب ما جاء في المزاح، ۴۹۹۸، ترمذی، ۱۹۹۱)۔

اسی طرح ایک بوڑھی خاتون حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہیں ہوگی، وہ بے چاری رونے لگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ اس دن تم بوڑھی نہیں ہوگی، ”إن الجنة لا تدخلها عجوز“ (شمائل ترمذی بشرح تحفة الاحوذی ۱۰، ۴۶۲)۔

حافظ ابن حجر نے مزاح سے متعلق تمام روایتوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ مزاح میں افراط یا مدامت ناجائز ہے، اور اگر یہ بات نہ ہو تو مباح ہے، اور اگر کسی کی دلداری اور اس کو مانوس کرنا مقصود ہو اور شریعت میں معتبر مصلحت پیش نظر ہو تو مستحب ہے، ”فإن صادف مصلحة مثل تطيب نفس المخاطب ومؤانسته فهو مستحب“ (فتح الباری ۱۰، ۶۱۲)۔

مزاحیہ پروگراموں کا حکم:

ب - بعض مزاحیہ پروگرام محض من گھڑت قصوں، بے سرو پا حکایتوں اور جھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہوتے ہیں، جو محض اس لئے ہوتے ہیں کہ جس سے دیکھنے والے لذت محسوس کریں اور ہنسی تہقہوں سے مجلس گرم کی جائے، اس کے تحت وہ پروگرام بھی آجاتے ہیں جو ہنسانے کے لئے کئی گھنٹوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اسی طرح وہ بھی پروگرام آتے ہیں جو داہیانہ حرکتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اگر پروگراموں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے تین اجزاء و عناصر نکلتے ہیں: (۱) جھوٹ، (۲) ہنسی ٹھٹھا، (۳) غفلت۔

جھوٹ ناجائز ہے، لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے جھوٹ بولنا سخت حرام ہے اور جھوٹ کی بدترین قسم ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہلاکت ہے اس کے لئے جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے بیان کرے اور جھوٹ بولے، ”ویل للذی یحدث فیکذب لیضحک بہ القوم، ویل لہ ویل لہ“ (ابوداؤد باب التشدید فی الکذب، ۳۹۹۰)۔

لہذا مزاحیہ پروگرام یا مشاعرہ، ان کا منعقد کرنا اس وقت جائز ہوگا جب کہ ان میں مذکورہ تین عناصر نہ پائے جائیں، اسی طرح داہیانہ حرکتوں سے بھی خالی ہوں، اور اگر مذکورہ عناصر مزاحیہ پروگراموں یا مشاعرہ میں پائے جائیں تو اس طرح کے پروگراموں کا منعقد کرنا ناجائز نہیں ہوگا۔

ط مرکز الامام ابی الحسن الندوی، دار عرفات، ہیکہ کلاں، رائے بریلی، یوپی۔

ج۔ شعر و سخن کی طرح ادب کی دوسری اہم صنف نثر ہے، نثر تو کبھی وقائع نگاری کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور کبھی مفروضہ کردار اور واقعات کے لئے جو آج کل کی زبان میں ناول اور افسانے کہلاتے ہیں، قدیم زمانہ میں بھی اس قسم کی کہانی نویسی کی مثالیں موجود ہیں، شیخ سعدی کی گلستان اور مولانا رومی کی مثنوی کہا جاسکتا ہے، کہ ایسی کہانیوں کی شاہکار اور معراج کمال ہے، اگر یہ مفروضہ کہانیاں عبرت آموز اور نصیحت خیز ہوں، صالح مقصد کی حامل ہوں اور تعمیری ہوں تو نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہے، لیکن اگر ان کا مقصد جذبات کو برا بیچھتہ کرنا اور اخلاق میں فساد پیدا کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ سخت گناہ اور ناجائز ہیں (حلال و حرام ۲۳۳)، فحش اور فضول ناول یا فحش اشعار دیکھنا ناجائز ہے (معارف القرآن ۲۳/۷)۔

د۔ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو ذریعہ معاش بنانا اور اس کی اجرت وصول کرنا، فقہاء کی نگاہ میں مکروہ اور ارشاد خداوندی: ”من يشتري لهو الحديث“ (سورہ لقمان: ۶) کا مصداق ہے (حلال و حرام ۲۳۹)۔

چنانچہ لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو ایک صنعت و فن اور پیشہ بنالینا اور بار بار اس کو اختیار کرنا، اس میں مبالغہ کرنا اور جھوٹ کو اس میں شامل کرنا جائز نہیں بلکہ ممنوع ہے، اصول شرعیہ کی روشنی میں غفلت میں ڈالنے والی چیزیں جائز نہیں ہیں بلکہ ممنوع و حرام ہیں، کیونکہ ان سے اللہ کی عبادت اور ذکر میں خلل پڑتا ہے۔

ہ۔ اگر ڈرامے کا مقصد صرف ہنسا ہنسانا ہے اور اس کے اندر جھوٹ کی آمیزش اور ہجو اس ہے تو اس کا لکھنا اور اس طرح کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا صحیح نہیں ہے۔

و۔ ڈاکٹروں کی رائے فی نفسہ صحیح ہے، لیکن ہنسنے میں اتنا مبالغہ نہ کیا جائے، جس سے دل مردہ ہو جائے، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ہنسنے ہوئے دیکھا تو یہ ارشاد فرمایا: ”اکثروا ذکر ہا زمر اللذات“ (ترمذی: ۲۲۰۷)۔

تقریبی مقصد کے لئے مختلف قسم کے کھیل کود:

۲: الف۔ انسان کی فطرت میں قدرت نے جو دوامی اور تقاضے رکھے ہیں، ان میں ایک تفریح طبع بھی ہے، چاہے وہ شعر و ادب اور طنز و مزاح کے ذریعہ ہو یا کھیل کود کے ذریعہ، اس لئے کھیل کود بھی ایک حد تک انسانی فطرت کا حصہ ہے۔

اسلام مذہب فطرت ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں طبعی تقاضوں کی رعایت کی ہے اور جہاں کہیں بے اعتدالی پیدا ہوئی ہے وہاں افراط و تفریط کو دور کر کے ایک معتدل اور متوازن طریقہ کی رہنمائی کی ہے، اس لئے کھیل کود بھی بالکل نفی نہیں کی ہے بلکہ مناسب حدود و قیود کے ساتھ اس کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

کھیل کے جواز کے لئے تین شرطیں ہیں:

۱۔ کھیل سے مقصود محض ورزش یا تفریح ہو، خود اس کو مستقل مقصد نہ بنالیا جائے۔

۲۔ کھیل بذات خود جائز بھی ہو، اس کھیل میں کوئی ناجائز بات نہ پائی جائے۔

۳۔ اس سے شرعی فرائض میں کوتاہی یا غفلت پیدا نہ ہو، اس معیار کو سامنے رکھا جائے، تو اکثر و بیشتر کھیل ناجائز اور غلط نظر آئیں گے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳۳۰/۷)۔

ان اصولوں سے ہٹ کر اگر کوئی کھیل ہوگا تو وہ جائز نہیں ہوگا، جو کھیل بدن کی ورزش، صحت اور تندرستی باقی رکھنے کے لئے یا کسی دوسری دینی و دنیوی ضرورت کے لئے یا کم از کم طبیعت کا تھکان دور کرنے کے لئے ہو اور ان میں غلو نہ کیا جائے کہ انہی کو مشغلہ بنالیا جائے اور ضروری کاموں میں ان سے حرج پڑنے لگے تو ایسے کھیل شرعاً مباح اور دینی ضرورت کی نیت سے ہوں تو ثواب بھی ہے (معارف القرآن ۲۳/۷)۔

ب۔ کھیل کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو یعنی مرد، تو نواف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کے حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں، اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیونکہ حصہ ستر کا چھپانا شرعاً واجب ہے۔

”اعلم أن الكسوة منها فرض وهو ما يستر العورة“ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۹۰۵)۔

ج۔ ایسا کھیل جو مختصر وقت میں پورا کیا جاسکتا ہو جائز ہے، جیسے کشتی، نشاندہ بازی وغیرہ۔

ایسا کھیل جو اپنے یاد مردوں کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کافی امکان ہو، جیسے فری اسٹائل کشتی، باکسنگ وغیرہ، ایسے کھیل ناجائز ہیں۔

ایسا طویل الوقت کھیل جو آدمی کو اپنے شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے مکروہ ہیں، جیسے شطرنج، ہاکی، کرکٹ وغیرہ، لوڈو بھی کراہت سے خالی نہیں (قاموس الفقہ ۱۱۸/۴)۔

جو کھیل بدن کی ورزش، صحت اور تندرستی کو باقی رکھنے کے لئے ہو، وہ مستحب ہیں، اور اگر دین کی نیت سے ہوں تو ثواب بھی ہے۔

د- کھیل کی ہارجیت میں اگر پیسے کی شرط ہو تو کون سی صورت جائز ہے اور کون سی نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں تفصیل ہے اور بعض امور میں اختلاف بھی ہے، علامہ کاسانی نے انعام کی شرط کو تین شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے:

۱- مقابلہ تیر اندازی، گھوڑ سواری، اونٹ سواری یا پیدل دوڑ کا ہو، بندوق کی نشانی بازی بھی تیر اندازی کے حکم میں ہے۔

۲- دو آدمیوں میں مقابلہ ہو، ہاتھوں کی طرف سے ہو، دوطرفہ نہ ہو۔

۳- مقابلہ کے وقت ابتدائی اور انتہائی حد متعین کر دی جائے، اسی طرح جو انعام یا عوض مقرر ہو ہے وہ معلوم اور متعین ہو۔

ہارجیت کی شرط یہ کہ شرط لگانا صحیح اور جائز ہے، اور اگر دونوں طرف سے معاہدہ ہو جائے کہ فریقین میں سے جو بھی شکست کھائے وہ فاتح کو اتنا ادا کرے، تو یہ صورت تمارکی ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگی (قاموس الفقہ ۱۱۶/۳، بدائع الصنائع، کتاب اسباق ۳۴۵/۸-۳۵۰)۔

۵- کھیل میں اگر کوئی منافی شریعت بات نہیں ہے تو کھیلنے اور دیکھنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن اگر ایسے کھیل ہیں جن میں وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے، جیسے کرکٹ وغیرہ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ انسان ان کھیلوں سے اپنے فرائض سے غافل ہو جاتا ہے، اور جو چیز اپنے فرائض سے غافل کر دے، اسے ”لہو الحدیث“ میں شمار کیا گیا ہے، اور اگر کھیل ایسا ہے جو اپنے فرائض سے غافل کرنے والا نہیں ہے تو اسے کھیلنے اور دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

و- اگر مختصر وقت والا کھیل ہے، تو اسے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کھیل تفریح کا طبع کے لئے دیکھتا ہے، لیکن اگر کھیل دیکھنے میں فرائض میں کوتاہی آتی ہے، تو شرعاً کھیل کا دیکھنا اس کے حق میں جائز نہیں ہوگا، جہاں تک ٹکٹ خریدنے کا تعلق ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کھیلوں کا ٹکٹ خریدنا اس کے لئے جائز ہے، جن کھیلوں کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

تفریحی مقصد کے لئے سفر کا حکم:

۳: الف- انسانی زندگی کی ضروریات میں ایک اہم ضرورت سفر ہے، سفر میں انسان اپنی مانوس و مامون جگہ کو چھوڑ کر جاتا ہے، راستہ میں خدشات و خطرات درپیش آتے ہیں، صحت و زندگی کی بابت بھی خطرات رہتے ہیں اور دینی معمولات کی کما حقہ ادائیگی دشوار ہو جاتی ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ضرورت سفر کو پسند نہیں فرمایا، ”السفر قطعة من العذاب“ (بخاری؛ باب السفر قطعة من العذاب: ۱۸۰۴)۔

دینی اور جائز دنیوی مقاصد کے لئے سفر کرنا درست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد اور دعوت دین کے لئے اسفار فرمائے ہیں، صحابہ، تابعین، فقہاء و محدثین نے طلب علم کے لئے سفر کی مشقتیں برداشت کی ہیں، اسی طرح صحابہ اور سلف صالحین سے تجارت، کسب معاش، اقرباء سے ملاقات اور عیادت وغیرہ کے لئے کثرت سے اسفار منقول ہیں (قاموس الفقہ ۱۵۵/۴)۔

ب- جس جگہ کے سفر میں خدشات و خطرات لاحق ہو سکتے ہوں، اس جگہ کا سفر کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ جان اللہ کی امانت ہے اور اپنی جان کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے ایسا سفر جس میں جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ ممکن نہ ہو، خطرات درپیش ہوں، وہاں کا سفر نہ خود کرنا صحیح ہے اور نہ ایسی جگہ اپنے بال بچوں کو لے جانا صحیح ہے۔

ج- جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں پر غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، تو ایسی جگہ کا سفر کرنا اس کے لئے اس وقت درست ہوگا جبکہ اس کو اس جگہ کی برائی کے بارے میں پہلے سے علم نہ ہو، اگر پہلے سے اس جگہ کی برائی کے بارے میں علم ہے تو وہاں کا سفر کرنا جائز نہیں ہوگا۔

جہاں تک سواری کا کرایہ پر لگانے کا تعلق ہے، تو اس سلسلہ میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کو پہلے سے معلوم ہے کہ وہ سواری پر سوار ہو کر جانے کے بعد برائی کرے گا تو ایسی صورت میں سواری کرایہ پر لگانا جائز نہیں ہوگا، اور اگر دونوں طرح کا امکان ہو، یعنی (برائی، بھلائی) تو ایسی صورت میں سواری کرایہ پر لگانا درست ہوگا، ایسی جگہ پر دکان لگانے کا حکم یہ ہے کہ اگر صرف اس جگہ پر برائی ہی برائی ہوتی ہے بھلائی، اچھائی نہیں، تو اس جگہ دکان لگانا صحیح نہیں ہوگا، اور اگر



دونوں طرح کے امکانات ہیں تو پھر دوکان لگانے اور خورد و نوش کی اشیاء فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۲- ”تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۲)۔ کسی معصیت کی اعانت جواز روئے قرآن حرام ہے، وہ ہے جس میں معصیت کا مقصد و نیت حقیقتہً یا حکماً شامل ہو، حقیقتہً یہ ہے کہ دل ہی میں ہو کہ اس کے ذریعہ عمل معصیت کیا جائے اور حکماً یہ ہے کہ وہ چیز جو معصیت کے کسی دوسرے کام میں آتی ہی نہ ہو، جیسے آلات معارف وغیرہ (جوہر لفقہ ۲/ ۴۵۳)۔

اگر ٹور کمپنیاں تفریح و طبع کے لئے قائم کی جاتی ہیں اور سوال میں مذکور برائیوں کے تحت ان کا قیام نہیں ہے تو اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے، کیونکہ اس کا مقصد مذکورہ خرافات نہیں ہیں، لیکن اگر پہلے سے ہی یہ سب مقاصد پیش نظر ہیں تو ان کا قائم کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ایک طرح کی اعانت ہو جائے گی، جواز روئے قرآن حرام اور سخت گناہ ہے، اور ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ کے حکم سے بغاوت ہے (معارف القرآن ۶۰/۲)۔

تعلیمی مقصد کے لئے فلموں کا استعمال: ..... ۳۔ بعض فلمیں وہ ہیں جو صحیح واقعات، تاریخی حقائق، سائنسی تجربات، مفید خبروں پر مشتمل ہوتی ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ صحیح تاریخی واقعات، سائنسی تجربات، جدید معلومات اور اخبار و حوادث کا جاننا جائز بلکہ صحیح مقاصد کے لئے ہو تو درجہ عبادت بھی پاسکتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ آج کی ترقی پذیر تہذیب و تمدن میں اس کا اہم ترین مقام ہے۔

کارٹون بنانے کا حکم:

۵: الف۔ کارٹون بنانا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا شمار تصویر میں ہوتا ہے تصویر کے سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے، جس گھر میں کتابیا تصویر ہو، ”لا تدخل الملائکۃ بیتاً فیہ کلب ولا تصاویر“ (بخاری؛ باب التصوير: ۵۹۴۹)

اسی طرح تصویر بنانے والے کے سلسلہ میں فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب تصویر بنانے والے کو دیا جائے گا، ”إن أشد الناس عذاباً یوم القیامۃ المصورون“ (بخاری؛ باب عذاب المصورین یوم القیامۃ: ۵۹۵۰)۔

ان احادیث شریفہ کی بنا پر فقہاء امت نے فرمایا کہ کسی بھی جاندار کی تصویر کھینچنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے، خواہ ہاتھ کے ذریعہ یا قلم سے ہو یا فوٹو سے، پریس پر چھاپ کر ہو یا سانچہ اور مشین وغیرہ میں ڈھال کر (کتاب الفتاویٰ ۶/ ۱۶۷)۔

ناقص تصویر بنانے کا حکم:

کتب حنفیہ میں غیر مکمل اور ناقص تصویر کے استعمال کرنے اور گھر میں رکھنے کے متعلق احکام مفصل مذکور ہیں، لیکن اس کے بنانے اور کھینچنے کے متعلق کوئی صریح حکم نہیں ملتا، البتہ روایات حدیث کی تصریح اور عام کتب حنفیہ کی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناقص تصویر جس میں سر نہ ہو تصویر کے حکم میں نہیں رہتی، بلکہ نقوش و تزیین بوٹوں کے حکم میں ہو جاتی ہے، اور اس بنا پر اس کے استعمال کی اجازت سب کتب مذہب میں مصرح ہے، اس سے ظاہر یہی ہے کہ اس تصویر کے بنانے کا بھی حکم وہی ہوگا جو تزیین بوٹے اور عام نباتات کی تصویر بنانے کا ہے، یعنی جیسے وہ جائز ہیں یہ بھی جائز ہوں گی (جوہر لفقہ ۳/ ۲۷۷)۔

ب۔ شریعت میں کسی بات کے جائز ہونے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: اول یہ کہ اس کام کا مقصد درست ہو اور خلاف شرع نہ ہو، دوسرے اس مقصد کے لئے جو ذریعہ اختیار کیا جائے وہ بھی جائز ہو، اس لئے کارٹون بنانے کو ذریعہ آمدنی بنانا صحیح نہیں ہے، اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنا بھی درست نہیں ہے۔

۶۔ بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں جبکہ اس کے ذریعہ اصلاح ممکن ہو اور اس کے اندر جھوٹ کا شائبہ نہ ہو۔

☆☆☆

## شریعت میں تفریح و مزاح

مفتی ممتاز احمد ندوی علیہ

مزاح کے معنی خوش طبعی کے ہیں، اس کے مقابلہ میں سخریہ اور استہزاء کے الفاظ آتے ہیں، جس کے معنی مذاق اڑانے کے ہیں: ”المزاح بضم المیر علی أنه اسم وبكسرهما علی أنه مصدر مازحه ومعناه: الانبساط مع الخیر من غیر إيذاء“ (خصائل نبوی شرح ترمذی شیخ الحدیث ۲۹۸)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں جہاں متانت و سنجیدگی کا عنصر رکھا ہے، وہیں گاہے بگاہے ہنسی مذاق اور خوش طبعی کرنے کا بھی، اس سے دل و دماغ کو نشاط بہم پہنچتا ہے، اور باہمی بے تکلفی اور محبت میں بھی اضافہ ہوتا ہے، نیز ایک دوسرے سے وحشت دور ہوتی ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح ثابت ہے:

۱۔ ”عن أنس بن مالك قال: إن كان النبي ﷺ ليخالطنا حتى يقول لأخ لي صغير: يا أبا عمير ما فعل النغير“ (بخاری باب الانبساط إلى الناس)۔ (حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ میل جول میں مزاح فرماتے تھے، چنانچہ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ارے عمیر وہ نغیر (گوریا) کہاں جاتی رہی)۔

۲۔ ”عن أنس بن مالك أن رجلاً استحمل رسول الله ﷺ فقال: إني حاملت علي ولد ناقه، فقال: يا رسول الله! ما أصنع بولد الناقه فقال رسول الله ﷺ: وهل تلد الإبل إلا النوق“ (رواه ابو داؤد ما جاء في المزاح)۔

(حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کوئی سواری کا جانور مجھے عطا فرمایا دیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک اونٹنی کا بچہ تم کو دیں گے، سائل نے عرض کیا کہ حضور میں بچہ کیا کروں گا (مجھے تو سواری کے لئے چاہئے)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک اونٹنی کا بچہ ہوتا ہے)۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح سے منع فرمایا ہے، ترمذی کی روایت ہے: ”لا تمار أخاك ولا تمازحه“ (اخرجه المصنف في الجامع من حديث ابن عباس)۔

امام نوویؒ نے دونوں طرح کی روایتوں، مزاح کے ثبوت اور ممانعت والی روایتوں میں یوں تطبیق دی ہے کہ کثرت مزاح جو باعث قسوت قلب بن جائے یا اللہ کے ذکر و فکر سے روک دے یا ایذا مسلم کا سبب بن جائے یا وقار و ہیبت گرا دے یہ سب ممانعت میں داخل ہے، اور جو ان سب سے خالی ہو، محض دوسرے کی دلداری اور اس کے انبساط کا سبب ہو وہ مستحب ہے۔

”قلت: يجمع بينهما بأن المنهى عنه ما فيه إفراط أو مداومة عليه... والذي يسلم من ذلك فهو مباح“ (فتح الباری ۲۲، ۱۶۹)۔

مزاحیہ پروگرام منعقد کرنا:

مزاح میں اس قدر منہمک نہ ہو جائے کہ وقت کثیر ضائع ہو جائے، کیونکہ وقت اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، چنانچہ اسی وجہ سے حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا: مزاح میں مداومت جائز نہیں ہے، اور مداومت کا مطلب ہے کہ وقت زیادہ ہنسی مذاق میں گزرے، مزاحیہ پروگرام یا مزاحیہ مشاعرہ میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے، لہذا اس بابت احقر کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کے مزاحیہ پروگرام یا مزاحیہ مشاعرہ کمروہ ہے، فقہی عبارتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے: ”یکره اللعاب بالشطرنج والنرد“ (ہندیہ ۱۱۰، ۳) (شطرنج اور چوسر کھیلنا کمروہ ہے)، نیز اس طرح کی عبارتیں، شامی اور ہدایہ وغیرہ میں بھی

مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی۔

دیکھی جاسکتی ہیں (ہدایہ ۷۵۷)۔

عبارت مذکور میں کراہت کی دو علتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو شطرنج اور چوسر غیر مفید کھیل ہیں، اور دوسری علت یہ ہے کہ ان میں وقت کا ضیاع ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کی اس عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

”مفید کھیل میں بھی ایسا مصروف نہ ہو جائے کہ دینی فرائض سے بھی غفلت ہو جائے“ (جدید فقہی مسائل ۱۹۲/۲)۔

الف - مزاحیہ کہانیاں لکھنا:..... مزاحیہ کہانیاں اگر جھوٹی ہیں اور عموماً مزاحیہ کہانیاں جھوٹی ہوتی ہی ہیں، لہذا ایسی کہانیاں لکھنا جھوٹ کی وجہ سے جائز نہیں ہیں، کیونکہ جھوٹ حرام و ناجائز ہے۔

ب - مزاحیہ کہانیاں پڑھنا:..... مزاحیہ کہانیوں کو پڑھنا جھوٹ کی ملاوٹ کی وجہ سے جائز نہیں ہے، کیونکہ اسلام دین حق ہے، یہ لوگوں کو سچائی، حقیقت پسندی کی دعوت دیتا ہے، نہ کہ ایسی چیزوں کی جن میں کوئی حقیقت نہ ہو، محض تفریح و تطہیر ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ“ (لقمان: ۶) (اور ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے)۔

ج - مزاحیہ کہانیاں شائع کرنا:..... ایسی مزاحیہ کہانیوں کو شائع کرنا، اور ان کی خرید و فروخت کرنا، تعاون علی الاثم کی وجہ سے جائز نہیں ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے: ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانَ“ (مائدہ: ۲) البتہ اگر مزاحیہ کہانیاں صداقت اور حقیقت پر مبنی ہوں اور ان سے عبرت و نصیحت ہو رہی ہو تو ایسی کہانیاں لکھنا، پڑھنا، شائع کرنا اور خرید و فروخت، تعاونوا علی البر والتقوی کے سبب جائز ہے۔

لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنانا:

آج کل لطیفہ گو یا مزاح نویس اسی وقت کامیابی حاصل کر سکتا ہے، جب کہ لطیفہ گوئی، یا مزاح نویسی میں جھوٹ کی آمیزش کرے، اور دوسروں پر طنز و تشنیع کرے، شریعت میں ادنی جھوٹ بھی حرام ہے اور دوسروں کو طنز و تشنیع کرنا، ایذاء مسلم کی وجہ سے حرام ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: ”مَنْ سَلَّمَ الْمَسْلُومَ مِنْ لِسَانِهِ وَوَيْدَهُ“ (رواہ احمد فی المسند) (کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں)۔

لہذا لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنانا جائز نہیں ہے، اور اسی طرح اس کی اجرت وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے، اگر جھوٹ اور دوسروں پر تشنیع نہ ہو تو بھی اس سے احتیاط بہتر ہے۔

تفریح و طبع کے لئے مزاحیہ ڈرامے منعقد کرنا:

بہت زیادہ ہنسنے اور ہنسانے سے دل مردہ ہو جاتے ہیں، حدیث میں ہے: ”إِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الضَّحْكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحْكَ تَمِيتُ الْقَلْبَ“ (الحدیث) (تم لوگ زیادہ ہنسنے سے بچو، کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتے ہیں)۔

جب دل مردہ ہو جائے گا تو فرائض میں غفلت اور آخرت سے بے فکری ہو جائے گی، حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے: محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے کوئی بات کہے تو آدمی اس کی وجہ سے آسمان سے بھی زیادہ دوزی پر گر جاتا ہے (الحدیث: مجمع الزوائد ۸/۸۹ باب ماجاء فی المزاح)۔

لہذا مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام جن کا مقصد ہنسا ہنسانا ہو، ان کا دکھانا اور اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا جائز نہیں ہے۔

صحت کی برقراری کے لئے ہنسا:

یہ چیز یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی ہے کہ ہنسا اور قہقہہ لگانا صحت کے لئے مفید ہے، اس میں احتمال ہے، فقہاء کرام نے صحت کی برقراری کے لئے

ضرورت کے وقت ناجائز چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، جیسے کہ ضرورت کے وقت ڈاکٹر کے سامنے ستر کھولنا۔ لیکن صحت کی برقراری کے لئے ہنسنا اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے پروگرام کرنا، جس میں قبضہ لگائے جائیں، محض احتمال کی وجہ سے حدیث کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

”إياكم وكثرة الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب“ (الحديث) (تم لوگ زیادہ ہنسنے سے بچو کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتے ہیں)۔

(۱) کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے جائز و ناجائز اصول:

- ۱- کھیل کے دوران ستر چھپا ہوا ہو، مرد جس طرح آجکل جنگیہ پہن کر فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں یہ جائز نہیں ہے۔
- ۲- کھیل میں ایسا مشغول نہ ہو جائے کہ فرائض سے بھی غفلت ہو جائے۔
- ۳- جو ٹیمیں کھیلیں آپس میں گالی گلوں اور لڑائی جھگڑے سے بالکل اجتناب کریں۔
- ۴- کھیل ایمانداری کے ساتھ ہو، بے ایمانی وغیرہ نہ ہو۔
- ۵- جو ٹیمیں کھیلیں کپتان کے حکم کے پابند ہوں، اور اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔

(۲) لباس و پوشاک کی رعایت:

لباس کے اندر شریعت نے بڑی لچک رکھی ہے، اور امت کے لئے کوئی ایسا لباس لازم نہیں کیا کہ جس کی خلاف ورزی ناجائز اور حرام ہو، البتہ اسلام نے لباس کے بارے میں کچھ اصول بتادیئے ہیں اور یہ بتادیا کہ ان اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے انسان جس قسم کا بھی لباس پہنے وہ شرعاً جائز اور مباح ہے، اصول درج ذیل ہیں:

۱- مردوں کے لباس حریر (ریشم) کے نہ ہوں۔ ۲- لباس ساتر ہو یعنی جسم کا جتنا حصہ عورت ہے اس لباس کے ذریعہ وہ صحیح طور پر چھپ جائے۔

عالمگیری میں ہے: ”أمر غيره أن ينظر للضرورة“ (ہندیہ باب العین ۱۰۵۲)۔

لیکن ظاہر ہے کہ کھیل ایسی ضرورت نہیں ہے کہ دوسروں کے سامنے ستر کھولا جائے۔

(۳) مردوجہ کھیلوں کا حکم:

۱- جو کھیل صحت کے لئے مفید ہوں جائز ہیں، جیسے کہ مردوجہ کھیلوں میں والی بال، فٹ بال، بیڈمنٹن وغیرہ۔

۲- جن کھیلوں میں پیسوں کی شرط لگی ہوئی ہو، جیسے آج کل کرکٹ وغیرہ ہوتا ہے، ناجائز ہے، ”أما إذا كان البدل من الجانبين فهو قمار حرام“ (ہندیہ ۵۰۲۲، خلاصۃ الفتاویٰ ۲۰۲۴)۔

۳- جن کھیلوں سے کوئی جسمانی فائدہ نہیں ہے، اگر پیسوں کی شرط نہ بھی لگی ہوئی ہو تو ایسے کھیل مکروہ تحریمی ہیں جیسے کہ لوڈو، کیرم بورڈ، خطرناک وغیرہ۔ ”یکره اللعب بالشطرنج والند“ (ہندیہ ۳۰۱۱)۔

۴- جو کھیل جہاد میں معاون ہوں، ایسے کھیل مستحب ہیں، جیسے کہ آج کل کشتی، کڑائے وغیرہ، ایسے کھیل کے سلسلہ میں چند دلائل ملاحظہ ہوں:

الف- اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”ارموا یا بنی اسماعیل فإن أباکم راہم“ (بخاری: کتاب الجہاد: باب التحریض علی الروی ۳۸۹۹) (اے بنی اسماعیل تم تیرا انداز کر، تمہارے آباء و اجداد تیرا انداز تھے)۔

ب- اللہ کے رسول ﷺ کا رافع اور جناب میں کشتی کرانا۔

(۴) کھیل میں ہارجیت کی شرط- جائز اور ناجائز تشکیلیں:..... اس کی تین صورتیں ہیں: پہلی صورت: پہلی صورت یہ ہے کہ دو ٹیمیں آپس میں فیس

ادا کریں، انعامی رقم سبقت کرنے والی ٹیم ہی کو ملے، اور دوسری ٹیم کی فیس ضبط کر لی جائے۔ دوسری صورت: دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو ٹیموں میں مقابلہ کرائے اور کوئی تیسرا شخص انعام دیدے۔ تیسری صورت: تیسری صورت یہ ہے کہ دو ٹیمیں آپس میں فیس ادا کریں، اور ان میں سے جو جیت جائے، اسی کو انعامی رقم ملے، اور دوسری ٹیم کی فیس ضبط ہو جائے، یہ صورت ایک شرط کے ساتھ جائز ہے وہ یہ کہ ایک تیسری ٹیم بھی شریک ہو، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

پہلی صورت:..... جہاں تک پہلی صورت کا مسئلہ ہے تو چونکہ اس میں دونوں ٹیمیں آپس میں فیس ادا کرتی ہیں، اور جو ٹیم جیت جاتی ہے اسی کو انعامی رقم ملتی ہے، اور دوسری ٹیم محروم ہو جاتی ہے، اسی کا نام قمار ہے، اور قمار قرآن وحدیث کی رو سے حرام ہے۔

دوسری صورت:..... دو ٹیمیں آپس میں کھیلیں اور کوئی تیسرا شخص جیتنے والی ٹیم کو انعام دے دے تو یہ جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”کذا ما يفعله السلاطين وهو أن يقول لرجلين: من سبق منكما فله كذا فهو جائز“ (بدائع الصنائع ۶: ۲۰۶) (اسی طرح دوڑ کا حکم ہے، جیسے بادشاہ کرایا کرتے ہیں، کہ دو آدمیوں سے کہتے ہیں کہ تم میں سے جو سبقت لے جائے اس کے لئے یہ انعام ہے تو یہ جائز ہے)۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ دوسری صورت جائز ہے، اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ ہے کہ دو ٹیمیں (الف، ب) آپس میں فیس ادا کریں، اور ان میں سے جو جیت جائے اسی کو انعام ملے، یہ صورت ایک شرط کے ساتھ جائز ہے وہ یہ کہ دونوں ٹیمیں ایک تیسری ٹیم (ج) کو اپنے ساتھ شریک کریں، پھر اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- شرط کی صورت یہ ٹھہرے کہ اگر الف ٹیم جیت جائے تو ایک ہزار روپے اسی کو ملیں گے اور (ب) ٹیم کو کچھ نہیں ملے گا، اور اگر (ب) ٹیم جیت جائے تو ایک ہزار روپے اسی کو ملیں گے (الف) ٹیم کو کچھ نہیں ملے گا اور اگر (ج) ٹیم جیت جائے تو اس کو دینا الف اور ب ٹیم کے ذمہ کچھ نہ ہو۔

ب- شرط کی صورت یہ ٹھہرے کہ اگر (ج) ٹیم جیت جائے تو الف اور ب ٹیم ایک ہزار روپے اس کو بطور انعام دیں گے، اور اگر الف یا ب ٹیم میں سے کوئی ایک جیت جائے تو (ج) ٹیم کے ذمہ کچھ نہ ہو، لیکن الف اور ب ٹیم میں جو جیت جائے دوسرے کے ذمہ ایک ہزار ادا کرنا ضروری ہو۔

نوٹ: تیسری ٹیم (ج) کے سلسلہ میں یہ شرط ہے کہ ایسی کمزور ٹیم نہ ہو کہ اس کا ہارنا یقیناً نہ آیا تھی مضبوط اور ماہر نہ ہو کہ جیتنا یقیناً ہو، بلکہ جیت اور ہار دونوں احتمال مساوی ہوں۔

حدیث میں ہے: ”من أدخل فرساً بين فرسين وهو لا يأمن أن يسبق فلا بأس به ومن أدخل فرساً بين فرسين وهو آمن أن يسبق فهو قمار“ (رواه احمد في المسند)۔ یہ تیسری صورت بیان کردہ تفصیل کے مطابق جائز ہے۔

۵- کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا:..... میرے نزدیک ایسے کھیل جو جسمانی اعتبار سے مفید ہیں، تو اس کے لئے ٹکٹ خریدنا جائز ہوگا، تاکہ ایسے کھیلوں کو دیکھ کر آدمی کے اندر کھیلنے کا جذبہ پیدا ہو، اور اگر کھیل جسمانی اعتبار سے مفید نہیں ہیں، محض وقت کا ضیاع ہے تو ایسے کھیلوں کے لئے ٹکٹ خریدنا جائز نہیں ہے۔

تفریحی مقصد کے لئے سفر:

تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا میرے نزدیک تین وجہوں سے ناجائز ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱- وقت کا ضیاع ہے، ظاہر ہے کہ وقت اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، جیسا کہ گذر چکا ہے۔

۲- مال کا اسراف ہے، جیسا کہ سوالنامہ میں ذکر ہے، قرآن کریم میں اسراف سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، ”كلوا واشربوا ولا تسرفوا“ (اعراف: ۳۱) (تم لوگ کھاؤ، پیو اور اسراف نہ کرو)، ”إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين“ (بنی اسرائیل: ۲۷) (بیجا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں)، مال کو قرآن کریم میں خیر کہا گیا ہے: ”إنه لحب الخیر لشديد“، لہذا مال جو اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس کو خیر کے کاموں میں استعمال ہونا چاہئے، نہ کہ تفریحات میں۔

۳- تفریحی مقصد کے لئے اس طرح کا سفر مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ایک سازش ہے، تاکہ مسلمان غلط چیزوں میں پڑ کر اللہ اور فکر آخرت سے غافل

ہو جائیں۔ ”من تشبه بقوم فهو منهم“ (رواہ ابوداؤد: اللباس باب فی لبس الشمرۃ)، لہذا اس طرح کا تفریحی سفر شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔ جب ایسا سفر میرے نزدیک جائز ہی نہیں ہے تو اس میں جان و مال اور عزت و آبرو کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا ہے۔

سیاحت کے لئے ایسی جگہ جانا جہاں غیر شرعی چیزیں ہوں:

الف۔ سیاحت کی جگہوں میں جانا جہاں غیر شرعی چیزیں ہوتی ہوں، جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسی جگہوں میں جانے سے خود آدمی کے ملوٹ ہونے کا خطرہ ہے، اس کی تائید درج ذیل حدیثوں سے بھی ہوتی ہے:

۱۔ ”من رتق حول الحمی یوشک أن یقعہ فیہ“ (بخاری: السیوع: الحلال بین الحرام بین و بینہما مشتہات) (جو شخص چراگاہ کے ارد گرد چرے گا قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائے)۔

۲۔ ”اتقوا مواضع التہم“ (تم لوگ تہمتوں کی جگہوں میں جانے سے پرہیز کرو)۔

ب۔ اور ایسی جگہوں میں سواریاں کرائے پر لگانا اور خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے دوکان لگانا یہ تعاون علی الاثم کی وجہ سے ناجائز ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (مائدہ: ۲)۔

ٹور پر لے جانے کے لئے کمپنیاں قائم کرنا:..... ٹور پر لے جانے والی کمپنیاں اگر ایسے لوگوں کی آمدورفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کی سہولتوں کا نظم کرتی ہیں، جو دینی مقاصد کے لئے سفر کرتے ہیں، جیسے حجاج کرام وغیرہ، تو ظاہر ہے کہ یہ بہت نیک کام ہے، اور قرآن کریم میں نیک کاموں میں مدد کا حکم دیا گیا ہے، ”تعاونوا علی البر والتقوی“ (مائدہ: ۲) (تم لوگ نیک اور تقوی والے کاموں میں مدد کرو)، لیکن اگر لوگ غیر اللہ کی عبادت کرنے کے لئے سفر کر رہے ہیں جیسا کہ سوال میں ذکر ہے تو اس طرح کی کمپنیوں کو قائم کرنا، برائی کے کاموں میں مدد دینے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (مائدہ: ۲) (تم لوگ گناہ اور زیادتی کے کاموں میں مدد نہ کرو)۔

تاریخی و دستاویزی فلمیں بنانا:..... تاریخی دستاویزی اور تعلیمی مقاصد کے لئے فلمیں بنانا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، کیونکہ دینی تعلیم کے حصول اور اس کے سمجھنے اور لوگوں تک دینی دعوت کو پہنچانے کے لئے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے جو معاون ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر لوگوں کو دین کی دعوت دی، کیونکہ کوہ صفا سے آواز لوگوں تک پہنچ سکتی تھی۔

شرائط: ۱..... فلموں میں لڑکیوں وغیرہ کی تصویریں نہ ہوں۔ ۲۔ فحش اور منکرات کا گذر نہ ہو۔ ۳۔ مندر اور ان مقامات کی تصویریں نہ ہوں جو ہندوؤں کے یہاں مقدس ہیں۔ ۴۔ میوزک وغیرہ نہ ہو۔

کارٹون بنانا:

جس آدمی کا کارٹون بنایا جاتا ہے اس میں اس کے خدوخال پوری طرح نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اخباروں میں کارٹونوں سے مشاہدہ ہے، لہذا اس کا حکم تصویر کا ہے، اور جس آدمی کا کارٹون بنایا جاتا ہے، کارٹونسٹ کا مقصد اس کا مذاق اڑانا ہوتا ہے، ان دو قباحتوں کی وجہ سے میرے نزدیک کارٹون بنانا جائز نہیں ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے: ”أشد الناس عذاباً عند الله المصورون“ (صحیح البخاری باب التصوير) (اللہ کے نزدیک سب سے سخت عذاب صورت گری کرنے والوں کو ہوگا)۔

اور بخاری کی ایک روایت ہے: ”أشد الناس عذاباً يوم القيامة الذين یضاهون بخلق الله“ (مائدہ: ۲)۔

کارٹون بنانے کو ذریعہ آمدنی بنانا:..... چونکہ کارٹون بنانا تصویر کے حکم میں ہے، اور اس سے کارٹونسٹ کا مقصد مذاق اڑانا ہوتا ہے، لہذا کارٹون بنانے کو ذریعہ آمدنی بنانا میرے نزدیک جائز نہیں ہے، اور اس مقصد کے لئے ملازمت بھی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے، اور قرآن کریم میں تعاون علی الاثم سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (مائدہ: ۲) (تم لوگ برائی اور زیادتی کے کاموں میں مدد نہ کرو)۔

☆☆☆

## تفریح کے جائز وسائل

مولانا محمد امداد اللہ ندوی <sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup>

مزاح شریعت کی روح کے منافی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مزاح بالکل ناجائز ہے، رسول اکرم <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> نے بھی بعض اوقات مزاح کیا ہے۔ مزاح کے سلسلہ میں شارع اسلام حضرت محمد <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> نے اعتدال کو اختیار کیا ہے، نہ آپ نے مذاق سے بالکل منع کیا نہ اس میں افراط سے کام لیتے ہوئے سرے سے اس پر روک لگائی، آپ نے اپنے عمل سے امت کی اس بات کی طرف رہنمائی کی کہ دل لگی اور نسی مذاق ایک دائرے میں ہو تو وہ برائیاں نہیں، آپ <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> کے اقوال و افعال کی روشنی میں فقہاء امت نے کچھ شرائط کے ساتھ مزاح کی اجازت دی ہے۔

ذیل میں وہ شرائط ذکر کئے جا رہے ہیں: ۱- مزاح کسی کی ایذا رسانی یا آپسی محبت میں کمی کا ذریعہ نہ بنے۔ ۲- اس میں کوئی جھوٹ یا غلط بات نہ کہی جائے۔ ملا علی قاری نے امام نووی سے مزاح کے سلسلہ میں شریعت کے نقطہ نظر کو بڑے سچے تلے الفاظ میں اس طرح نقل کیا: ”وہ مزاح جس سے منع کیا گیا ہے ایسا مزاح ہے جس میں افراط اور کثرت و دوام ہو، اس کی وجہ سے کثرت سے ہنسی آتی ہے، قلب میں سختی پیدا ہوتی ہے، اللہ کی یاد اور دین کی اہم باتوں میں غور و فکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے، بسا اوقات وہ ایذا و حسد کا باعث ہو جاتا ہے، اور رعب و وقار کو ختم کر دیتا ہے، ایسا مزاح جو ان باتوں سے خالی ہو مباح ہے، رسول اللہ <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> بھی کبھی مزاح فرمایا کرتے تھے، اور مقصود مخاطب کی تالیف اور ان سے اظہار افسوس ہوتا تھا جو کہ محبوب سنت ہے (مرقاۃ ۱۰۵/۹۶)۔ اگر یہ شرط موجود نہ ہو تو مزاح مکروہ تحریمی ہے۔

ب- مزاحیہ پروگرام منعقد کرنا:

جہاں تک مزاحیہ پروگرام منعقد کرنے کی بات ہے جو کئی گھنٹے پر مشتمل ہو، اسی طرح مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنے کی بات ہے تو یہ بھی مکروہ تحریمی ہے کیونکہ: ۱- حدیث میں محض لوگوں کو ہنسانے کے مقصد سے جھوٹی بات کہنے سے منع کیا گیا ہے، اللہ کے رسول <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> کا ارشاد ہے: ”اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی بات میں جھوٹ ملائے تاکہ لوگوں کو ہنسانے“ (مسند احمد ترمذی، مرقاۃ ۷۱/۹۶)۔

ملا علی قاری نے اس حدیث کی تشریح کے ضمن میں لکھا ہے: ”اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر اس نے سچی بات نقل کی ہے تاکہ لوگوں کو ہنسانے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ حضرت عمر نے رسول اللہ <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> کو ہنسانے کے لئے ایسا کیا جب آپ <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> اپنی ازواج مطہرات پر غصہ ہو گئے تھے، امام غزالی کا قول نقل کرتے ہوئے وہ گویا ہیں: ”اس وقت مناسب یہ ہے کہ مزاح اس قبیل سے ہو جیسا رسول اللہ <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> نے کیا، وہ سچی بات پر مشتمل ہو، اور کسی کے قلب کو ایذا پہنچانے والا نہ ہو، اور اس میں افراط نہ کیا جائے۔ اے سامع! اگر آپ کبھی کبھار مذاق پر اکتفا کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں، لیکن بری بات یہ ہے کہ انسان مزاح کو پیشہ بنالے اور اس میں افراط سے کام لے“ (مرقاۃ ۷۱/۹۶)۔

علامہ ظفر احمد تھانوی اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ”جمہور صحابہ، تابعین اور عام مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ لہو الخدیث میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، جیسے قصہ گوئی، ہنسانے والے واقعات اور حیرت انگیز قصے اور گانا وغیرہ“ (احکام القرآن ۱۸۵)۔

۲- یہ لہو الخدیث کے قبیل سے ہو جائے گا۔ ۳- کیونکہ مزاح صرف ایک مقصد کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہے، مقصد نہیں، اس لئے مزاحیہ پروگرام منعقد کرنے سے ایک خرابی تو یہ لازم آئے گی کہ مزاح مقصد کی حیثیت حاصل کرنے کا، کیونکہ اس کے لئے افراد کا نظم کرنا پڑے گا جو ظاہر ہے بغیر مال خرچ کئے حاصل نہ ہو سکے گا، اور مال اللہ کی نعمت ہے، اسے ایسے راستہ میں خرچ کرنا شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتا، دوسرے ایسے مزاحیہ پروگرام بغیر جھوٹ کے مرتب

ط - استاذ جامعہ دارالاحسان بارڈولی، سورت گجرات۔

نہیں ہو سکتا، لہذا مزاج کے جواز کے لئے اوپر جو شرط بیان کئے گئے ان میں سے دوسری شرط منفقہ ہو جائے گی۔

۳- تیسرے کئی گھنٹہ ہنسنے سے اللہ کی یاد سے غفلت پیدا ہوگی اور دلوں میں سختی بھی، جو ظاہر ہے انسان کو دینی اعتبار سے نقصان پہنچانے والے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت میں عمومی اصول یعنی حرام تک پہنچانے والی چیزیں بھی حرام ہی کے حکم میں ہوتی ہیں، کی رو سے بھی اس کا عدم جواز ہی ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

### مزاحیہ مشاعرہ:

شاعر اسلام کے مختلف اقوال کی روشنی میں جن میں بعض اشعار کی مذمت اور بعض اس کے جواز کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اشعار بھی چند شرائط کے ساتھ جائز ہیں: اول: اشعار میں عورتوں کے حسن و جمال کا تذکرہ اس طرح نہ ہو کہ جس سے سخی جذبات برپا ہوتے ہو جائیں، دوم: متعین زندہ عورتوں کے اوصاف نہ بیان کئے جائیں۔

مزاحیہ اشعار میں چونکہ شعراء کا مقصد لوگوں کو ہنسانا اور ان کی ذہنی تفریح کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے، چنانچہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ کسی حد تک جاسکتے ہیں، بلکہ عام طور سے مشاہدے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ اس طرح کے مشاعرے میں صنف نازک سے متعلق اشعار زیادہ پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے سد ذرائع کے طور پر مزاحیہ مشاعرے کے انعقاد کو مکروہ تحریمی ہی کہا جائے گا۔

ج- مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابیں شائع کرنا مکروہ ہوگا (یعنی تنزیہی)۔

۲- کہانی لکھنے میں ذہنی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں، ذہانت بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اسے ایسی چیزوں میں خرچ کرنا کفران نعمت ہوگا، اور ”من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ“ کے تحت بھی مکروہ ہوگا، کیونکہ کہانی میں مزاج اسی وقت پیدا ہوگا جب اس میں کوئی غلط بات داخل کی جائے مثلاً جھوٹ شامل کیا جائے، یا کسی پر طنز و تعریض سے متعلق جملے داخل کئے جائیں، یا عورتوں کو موضوع بنایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اسلام کے مزاج سے میل نہیں کھاتیں، لہذا اس عمل کو اور اس سے متعلق دوسرے اعمال کو مکروہ ہی کہا جائے گا۔

۱- لطیفہ گوئی یا مزاحیہ کہانی نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا، یہ بھی مکروہ ہے خواہ یہ لطیفہ گوئی طبعی مقاصد کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب حلال و حرام میں اسے مکروہ لکھا ہے۔

کیونکہ یہ بھی ابو الحدیث کے قبیل سے ہے۔ علامہ ابن عابدین نے اسے حرام قرار دیا ہے (رد المحتار ۹/۶۰۸)۔

### تفریح طبع کے لئے ڈرامہ بنانا:

اگر عورتوں کی شمولیت ہو تو حرام ہوگا ورنہ مکروہ، کیونکہ اول تو ابو الحدیث کے قبیل سے ہوگا ہی خواہ صنف نازک کی شمولیت ہو یا نہ ہو، دوسرے اس میں تضحیح اوقات ہے، تیسرے اس میں تضحیح اختیار کرنا پڑے گا جو کہ ممنوع ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے ایسی چیز کے ذریعہ آسودگی ظاہر کی جو اس کے اندر نہیں ہے تو وہ شخص ایسا ہی ہے جیسے اس نے جھوٹ کے دو لباس کو زیب تن کیا (مشکوٰۃ بحوالہ مشفق علیہ)۔

چوتھے ڈرامہ بنانا ایک مستقل کام ہے جس میں باقاعدہ کام کرنے والے ہوتے ہیں، اس میں وہ اپنا وقت لگاتے، اپنی ذہنی صلاحیتیں خرچ کرتے ہیں، یہ سب اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، یہ ڈرامہ جس مقصد کے لئے اسٹیج کیا جا رہا ہے یعنی تفریح طبع اور ذہنی تناؤ کو دور کرنے کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ وہ مقصد بھی حاصل ہو جائے، اگر ہوگا بھی تو وقتی اور عارضی، دائمی فائدہ اس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا ایک احتمالی فائدے کے لئے اس کے نقصان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ بھی امکان ہے کہ اگر مزاحیہ ڈرامہ لکھنے کی اجازت دیدی جائے تو اس سے اندیشہ ہے کہ جو لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں رفتہ رفتہ وہ ایسے ڈرامے بھی لکھنے لگیں گے جو ناجائز اور حرام ہیں، لہذا سد ذرائع کے طور پر ڈرامہ لکھنا اور اس میں کام کرنا مکروہ تحریمی ہوگا، اور اس طرح کے ڈرامے کا دیکھنا مکروہ تنزیہی ہوگا۔

### ۱- ہنسنے کا پروگرام رکھنا اور بتکلف قہقہہ لگانا:

قبل اس کے کہ ہم اس کی حلت و حرمت یا کراہت کا حکم لگائیں، اس کے بارے میں شریعت کے مزاج کو پرکھنا ضروری ہے، قہقہہ لگا کر ہنسا شریعت کے مزاج سے متصادم ہے، اگر قہقہہ لگا کر ہنسا اچھی چیز ہوتی تو آپ ﷺ نہ صرف خود ہنستے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں



نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کھلکھلا کر ہنسنے ہوئے نہیں دیکھا کہ ان کے کوئے کا گوشت نظر آئے، آپ صرف مسکراتے تھے (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)۔

جہاں تک موجودہ دور کے ڈاکٹروں کے اس نظریے کا تعلق ہے کہ ہنسنا انسانی صحت کے لئے مفید ہے، تو محمد ﷺ سب سے بڑے طیب تھے، لیکن آپ ﷺ ساری عمر کھلکھلا کر نہیں ہنسے، اگر ہنسنا مفید ہوتا تو آپ ﷺ خوب ہنسنے اور صحابہ کرام کو بھی ہنسنے کا حکم دیتے، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ نے زیادہ ہنسنے سے منع فرمادیا، اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اپنے دنیاوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو، اس بنا پر اگر ماہر پیشہ دور اور متقی ڈاکٹروں کی رائے ہو کہ کسی شخص مثلاً زید کی ذہنی تناؤ اور نفسیاتی کشیدگی کا علاج زیادہ ہنسنے میں ہے اور کوئی دوسرا علاج بھی نہ پایا جائے تو اس کے لئے اس طرح کا عمل اسی وقت تک جائز رہے گا جب تک وہ بیمار رہے، بیماری کے دُفع ہوتے ہی اسے یہ عمل ترک کرنا پڑے گا، کیونکہ جو چیز معلول بالعلت ہوتی ہے وہ علت تک ہی محدود رہتی ہے، علت ختم ہونے کے بعد اس کی رخصت بھی جاتی رہتی ہے، پس ایسا مستحبی بہ شخص مضطر کے حکم میں ہوگا، جس کے لئے جان بچانے کے بقدر مردار کھانے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن بچنا افضل ہے، واللہ اعلم۔

### رانج کھیلوں کا حکم:

کھیل کی حلت و حرمت پر حکم لگانے سے پہلے اس کے اصول بیان کر دینا ضروری ہے:

۱- کھیل ایسا نہ ہو جس میں انسان کو کسی قسم کا مالی یا جسمانی نقصان پہنچے۔

۲- اس میں بہت زیادہ وقت نہ لگے۔

۳- اس میں روپے پیسے کی شرط نہ رکھی جائے۔

۴- آپسی عداوت کو بڑھانے کا سبب نہ بنے۔

۵- فراغ سے غفلت کا سبب نہ بنے۔

۶- اگر شرط ایک طرف سے ہو یا کوئی تیسرا آدمی جو کھیل میں شریک نہ ہو انعام مقرر کرے تو جائز ہے۔

۷- کھلاڑیوں کا لباس مکمل ساتر ہونا چاہئے، لباس ایسا نہ ہو جس میں گھٹنا وغیرہ کھلا رہے یا کفار سے مشابہت لازم آئے۔

۸- کھیل میں غیر محرم سے اختلاط کی نوبت نہ آئے۔

ایسا کھیل جس میں جانوروں کو آپس میں لڑایا جائے مکروہ ہوگا، کیونکہ اس میں جانوروں کو اذیت پہنچتی ہے، نیز آپ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔

مروجہ کھیلوں میں نشانہ بازی، وزن اٹھانا، دوڑ کا مقابلہ، تیر اندازی وغیرہ قسم کے کھیل جو دفاع میں معاون ہیں ان کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس میں ڈریس کوڈ کی پابندی لازم نہ ہو۔ باقی دوسرے کھیل جیسے کہ فٹ بال، ہاکی والی بال کو جائز کہا جاسکتا ہے لیکن ان سے بھی بچنا افضل ہے کیونکہ یہ کھیل غیروں کا ایجاد کردہ ہے، اور اس میں بھی کفار کی ایک گونہ مشابہت لازم آتی ہے، کیونکہ کھیل میں حکومت کے مقرر کردہ پوشاک کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

عصر حاضر کے رانج کھیلوں میں کرکٹ کو مکروہ تحریمی قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں زیادہ وقت لگتا ہے، اور یہ فراغ میں کوتاہی بلکہ اس کو ترک کرنے کا سبب بنتا ہے، اسی طرح اسے براہ راست دیکھنا یا اس کے رواں تہرے کو سننا بھی مکروہ ہوگا کیونکہ یہ لہو الحدیث کے قبیل سے ہو جائے گا۔ علامہ ظفر احمد تھانوی اپنی کتاب ”احکام القرآن“ میں لکھتے ہیں: ”اس اصول کی بنا پر ہم نے کہا کہ موجودہ زمانے میں رانج کھیلوں میں وہ کھیل جائز ہیں، جن میں جوان نہ پایا جائے، اور یہ کھیلنا تفریح اور دل لگی کے لئے نہ ہو بلکہ ورزش یا شجاعت حاصل کرنے کے مقصد سے ہو، جانوروں کے ذریعہ گھوڑ دوڑ، کشتیوں کی دوڑ (بوٹ ریس) اور پیر چلانے کی مشق، جیسے جوڈو کراٹے اور طلباء کے درمیان تعلیمی مقابلہ اور صولجان، ہندوق، تیر اندازی، پیراکی، پتھر پھینکنا، بڑے پتھر کو ہاتھ سے ہلانا، پنچر لٹانا، ایک پیر پر کھڑا ہونا، جس میں ورزش کا پہلو ہو وہ غافل کرنے والا نہ ہو (احکام القرآن ۲۰۱)۔“

اس اصل کی بنا پر کرکٹ کھیلنا یا ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنا مکروہ تحریمی ہوگا، کیونکہ مال اور وقت دونوں اللہ کی نعمتیں ہیں اسے ایسی چیزوں میں خرچ کرنا نعمت کی ناشکری اور اسراف و تبذیر ہوگا، جو کہ حرام ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے: ”إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ“ (سورہ بقرہ ۲۷۵)۔

کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ بیچنا اور کھیل کے لئے ٹکٹ کی فروخت سے ہونے والی آمدنی ناجائز ہوگی، کیونکہ مشتری نے ٹکٹ کی جو قیمت ادا کی ہے، اس کے بدلے اسے مالی منفعت یا ایسا منفعت جو مال کے قائم مقام ہو نہیں بل رہا ہے، اسی طرح کھیل اگر ناجائز ہو تو اس کا دیکھنا بھی ناجائز ہوگا، اور اگر جائز ہو تب بھی اس کا دیکھنا کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ مالی منفعت یہاں بھی مفقود ہے، لہذا ایسی بھی تہذیب میں داخل ہے۔

صرف تفریحی مقصد کے لئے سفر کرنا:

صرف تفریحی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرنا ناجائز ہوگا، بشرطیکہ جس شہر کا ارادہ کیا ہے وہ اتنی مسافت پر ہے کہ اسی میں انسان مسافر بن جاتا ہے، یہی حکم تفریحی مقصد کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرنے کا ہے۔ قرآن کریم میں "فسیروا فی الأرض" کا لفظ آیا ہے، اس آیت سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ زمین میں عبرت حاصل کرنے کے لئے اور اللہ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرنے کے لئے (اگر اس کا ظن غالب ہو کہ اس سے اللہ کی وحدانیت اور اس کی قدرت پر اس کا یقین اور پختہ ہوگا) سفر جائز ہے (معارف القرآن ۵/۳۳۰)۔

اس لئے اگر سفر کرنے والا متقی اور پرہیزگار ہو تو ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے سفر میں اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے کی نیت کرے پھر سفر کر لے، تو یہ جائز ہوگا، لیکن فی زمانہ ایسے شخص کا تعین مشکل ہے، اور اس دور میں ہر طرف گناہ کے اسباب مہیا ہیں، اس لئے "لا تشدوا الرحال إلا إلی ثلاثہ مساجد" (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم ۶۸۱) کے عموم کو سامنے رکھ کر نیز وہ حدیث جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب ایسے فتنوں کا ظہور ہوگا جس میں بیٹھنے والا چلنے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ ان جیسی دوسری احادیث کو سامنے رکھ کر یہ کہا جائے گا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک محض سیاحت کی غرض سے سفر کرنا جب کہ اس میں پیسہ بھی بہت زیادہ خرچ ہوتا ہو کر وہ تفریحی ہے، واللہ اعلم۔

ج۔ جس جگہ ناجائز کام ہوتے ہوں ایسی جگہ تفریح کے لئے جانا ناجائز ہوگا، اس جگہ جانے کے لئے کرایہ پر سواری لگانا جائز مع انکراہت ہوگا، لیکن وہاں دکان لگانا ناجائز ہوگا، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے تہمت کی جگہوں سے بچنے کا حکم دیا ہے، "اتقوا مواضع التہم"۔

دوسرے وہاں دکان لگانے کی صورت میں اسے مستقل طور سے وہاں رہنا پڑے گا، جس سے یہ اندیشہ ہے کہ اس کے دل سے منکر کی شاعت نکل جائے گی نیز اس سے معصیت میں مبتلا ہونے کا ظن غالب ہے۔

لہذا اسد ذرائع کے طور پر نیز اصول فقہ کے اس قاعدہ کو سامنے رکھ کر کہ "دفع المضرة أُولی من جلب المنفعة" اسے ناجائز ہی کہا جائے گا۔

ب۔ اس طرح کے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا ناجائز ہوگا، کیونکہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنا شریعت میں ممنوع ہے۔

د۔ ٹور کمپنیاں قائم کرنا:

صاحب رد المحتار نے اسی سے ملتا جلتا ایک مسئلہ "کتاب الحظر والاباحۃ" (۵۶۱/۹) میں ذکر کیا ہے: "اگر کسی مسلم نے کسی مسلم یا ذمی کے ہاتھ انگور کا رس بیچا جو مسلم یا ذمی اسے شراب بنانے میں استعمال کرے گا اور بیچنے والا اسے جانتا بھی ہے تو اس کے ہاتھ بیچنا مکروہ تحریمی ہوگا، اور اسی کو انہوں نے راجح قرار دیا ہے (رد المحتار ۵۶۱/۹)۔

لیکن صاحب الاشبہ والنظائر نے الأمور بمقاصدها (۱۱۴/۲) کے تحت فتاویٰ قاضی خان کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص انگور کے رس کو تجارت کی نیت کے ساتھ اس شخص کے ہاتھ بیچتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہے کہ یہ اس سے شراب بنائے گا تو یہ جائز ہوگا، لیکن بائع کی نیت یہ ہو کہ اسے شراب بنانے میں مدد دے تو ناجائز اور حرام ہوگا۔

لہذا اس اصول کے تحت ٹور کمپنیوں کا قیام ناجائز ہوگا، لیکن اس سے بچنا افضل ہے، واللہ اعلم۔

تعلیمی مقصد کے لئے فلم بنانا:

فلم مغربی تہذیب سے درآمد کی ہوئی ایک برائی ہے، جس کا استعمال اچھی چیزوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور بری چیزوں کے لئے بھی، کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کے سلسلہ میں فقہاء کے یہاں کچھ اصول ہیں:

۱- اس آلمہ سے کوئی دینی یا دنیاوی ضرر نہ پہنچے۔

۲- وہ آلمہ یا چیز اصالتاً آلمہ طرب یا لہو کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

۳- اس کے استعمال سے کوئی بڑا دینی یا دنیاوی فائدہ نہ ہو رہا ہو۔

۴- اس میں کسی ذی روح کی تصویر نہ ہو۔

دستاویزی، تاریخی فلمیں: یہ فلمیں بنانا ناجائز ہوگا، کیونکہ اول جس مقصد کے لئے اس طرح کی فلمیں بنائی جاتی ہیں، ان کو تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے اس میں جاندار کی تصویر لایا حالہ بنانی پڑے گی۔

تیسرے اس میں خطیر رقم کا صرف ہوگا، مال کو ان جیسے مقاصد کے لئے خرچ کرنا شریعت کی روح سے میل نہیں کھاتا۔

چوتھے آگے چل کر اس سے بڑے مفاسد کا خطرہ ہے، طوالت کے خوف سے ہم ان کو حذف کر رہے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص اپنے مکان یا دکان کی اس مقصد کے لئے ویڈیو گرافی کراتا ہے کہ اگر کسی نے اس پر ناجائز قبضہ کر لیا تو اس کے خلاف یہ ثبوت کا کام دے گا تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کسی جاندار کی تصویر نہ ہو۔

۲- تعلیمی مقاصد کے لئے جو فلمیں بنائی جاتی ہیں ان کے متعلق یہ معلوم ہونا چاہئے کہ طلبہ کو اس سے کتنا فائدہ ہوگا، مثلاً قرآن میں قوم عاد و ثمود کی تباہی کا ذکر ہے، اگر تفسیر کے درس کے دوران ان طلباء کو ان مقامات کی سی ڈی دکھائی جائے تو سوائے اس کے کہ طلباء کو ان ممالک کا علم ہو جائے جس میں یہ قومیں آباد تھیں کوئی اور فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ عرصہ دراز گزرنے کے بعد اس جگہ کی ہیئت بھی بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہے، اس لئے مذکورہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، اور حاصل ہو بھی جائے تو سوائے تفریح اور دل لگی کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا لہذا اتنے چھوٹے سے فائدہ کے لئے اتنے سارے لوازمات کو اختیار کرنے سے بہتر ہے کہ اس سے بچا جائے، نیز قرآن نے گذشتہ اقوام کے جو قصے بیان کئے ہیں وہ عبرت کے لئے ہے، جب کہ فلم بنانے سے یہ مقصد قوت ہونے کا پورا اندیشہ ہے، اس لئے اس طرح کی فلموں کے بارے میں جواز مع انکراہت کا حکم ہی مناسب ہے۔

۵: الف- کارٹون میں انسانی خدو خال پوری طرح واضح نہیں ہوتے، لہذا اس کا حکم سہل ہوئی ناقص تصویروں کا ہوگا، جو کہ بالاتفاق جائز ہیں، لیکن ”لا مور بمقاصدہا“ کے تحت جن مقاصد کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں، ان کو بھی پیش نظر رکھا جائے، اگر اس کا مقصد محض تفریح و طبع اور ہنسانا ہے تو اس کا حکم لطیفہ گوئی کا ہوگا یعنی مکروہ، اور اس کا مقصد کسی کی توہین یا مذاق اڑانا ہے اور وہ شخص جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے مسلم ہے تو ایذا مسلم کے ساتھ غیبت بھی ہوگا اور اگر غیر مسلم ہے اور اس کے اندر وہ چیز پائی بھی جا رہی ہے تو جائز ہوگا لیکن کراہت کے ساتھ، یہی حکم اس کو ذریعہ آمدنی بنانے اور اس کے لئے ملازمت کرنے کا ہے۔

اسلام نے مشتبہ چیزوں سے بھی بچنے کا حکم دیا ہے، اس لئے اس سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہئے۔

ب- اصلاحی مقاصد کے لئے ڈرامہ سٹیج کرنا:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں دفع مضرت جلب منفعت سے مقدم ہے۔

دوسرے ڈرامہ غیر مسلموں کا ایجاد کردہ طریقہ ہے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے، ”من تشبه بقوم فهو منهم“ (مشکوٰۃ عن احمد و ابوداؤد ۴۷۵)۔ غیر لوگ بھی ڈرامے کا یہی مقصد بتاتے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے ڈرامے سے کیا نتیجہ سامنے آیا؟ کتنے لوگوں نے اس سے متاثر ہو کر معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو دور کرنے کا عزم کیا؟

ڈرامہ میں زندگی کے مختلف شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی نقل اتاری جاتی ہے، اور اس میں تضخ سے کام لیا جاتا ہے اور یہ دونوں چیزیں شریعت کی روح کے منافی ہے۔

البتہ مکالمات کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔

## تفریح - اس کے جائز و مسائل اور شرعی ضوابط

مولانا محمد سرفراز ندوی

الف - کچھ حدود و قیود اور قواعد و ضوابط کے ساتھ مزاح و تفریح جائز ہے۔

### اصول و ضوابط:

۱- لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹی اور غلط بات کا سہارا نہ لے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے اس سے ڈراتے ہوئے فرمایا ہے: ”ویل للذی یحدث لیضحک بہ القوم فیکذب، ویل له ویل له“ (ملاحظہ فرمائیں: ترمذی کتاب الزبد باب فیمن تکلم بکلمة یضحک بہا الناس ۲۰۵۵) ناشر دار احیاء التراث العربی بیروت۔

۲- مزاح ایسا کلام نہ کہے جس سے لوگوں کی عزت و آبرو اور قدر و منزلت پر داغ و دھبہ لگ جائے، اس لئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسىٰ ان یتوبوا خیراً منهم“ (سورہ حجرات: ۱۱)۔

۳- اس مقام پر ہم ملا علی قاری کی کتاب مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح سے اس اقتباس کو ذکر کر دیتے ہیں جس میں انہوں نے مزاح کی حلت و جواز کے سلسلہ میں شریعت کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے اور جو بذات خود کئی ضوابط و اصول کا جامع اور متعدد شرائط پر مشتمل ہے:

جس مزاح سے منع کیا گیا ہے وہ مزاح ہے جس میں افراط اور دوام ہو، کیونکہ یہ ہنسی اور سنگ دلی کا موجب ہے، ذکر الہی اور دین کی باتوں میں غور و فکر کرنے سے غافل کر دیتا ہے، اکثر و بیشتر ایسا مزاح ایذا اور حسد و کینہ کا سبب بن جاتا ہے، رعب و ہیبت اور عزت و وقار کو ختم کر دیتا ہے، لیکن ایسا مزاح جو ان باتوں سے محفوظ ہو وہ مباح ہے، اللہ کے رسول ﷺ ایسا مزاح فرمایا کرتے تھے، اور اس کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہوتا تھا کہ مخاطب خوش ہو، اس سے انس و محبت کا اظہار ہو، اور یہی آپ ﷺ کی محبوب سنت بھی ہے (ملاحظہ فرمائیں: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ۷۰۹، ناشر مکتبہ امدادیہ بلتان پاکستان)۔

برکوی اور خادمی رحمہما اللہ فرماتے ہیں: ”شرط المزاح قولاً أو فعلاً ان لا یکون فیہ کذب ولا روع مسلم ولا فیحرم“ (ملاحظہ فرمائیں: الموسوعۃ الفقہیہ ۳۷، ۳۴، بحوالہ بریقہ محمودیہ فی شرح طریقہ محمدیہ ۷۳، ناشر وزارت الاوقاف و اشئون الاسلامیہ کویت، پہلا ایڈیشن ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء)۔

(مزاح خواہ قولی ہو یا فعلی کے جواز کی شرط یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی جھوٹ ہو اور نہ کسی مسلم کو ایذا پہنچانا مقصود ہو، اگر یہ باتیں پائی جا رہی ہیں تو حرام ہوگا)۔  
ب- جیسا کہ ما قبل کی تصریحات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام راہبوں، سادھوؤں اور سنیا سوں کی ہی خشک زندگی پسند نہیں کرتا جس میں لطف و لذت حتیٰ کہ مسکراہٹ پر بھی پابندی ہو، خود دوسرے کا رد و عالم ﷺ نے مسلمانوں کو واضح انداز میں ہدایت فرمادی کہ ”والہوا والحبوا فیانی اکرہ ان یری فی دینکم غلظۃ“ (ملاحظہ ہو: جامع الصغیر للامام محمد ۶۲، بحوالہ اسلام اور موسیقی تالیف حضرت مفتی شفیع شرح و تحقیق محمد عبدالعزیز ناشر مکتبہ دارالعلوم کراچی پاکستان، پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۳۰۳ھ مطابق نومبر ۱۹۸۲ء)۔ یعنی کھیلو کود، اس لئے کہ میں پسند نہیں کرتا کہ تمہارے دین میں سختی یعنی خشکی نظر آئے۔

لیکن جو تفریح و بھلائی، معاشرے یا دین و اخلاق کے لئے مضر ہوں، یا کم از کم ایسی تفریح و بھلائی میں وقت کا ضیاع ہو، اسلام ان کی اجازت نہیں دیتا، حضرت مفتی محمد شفیع اپنی تفسیر معارف القرآن (۲۳/۷) پر اشتراء ابوالمجدیث کے ذیل میں اقسام لعب ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”اور جن کھیلوں میں نہ کفر ہے نہ کھلی ہوئی معصیت وہ مکروہ ہیں کہ ایک بے فائدہ کام میں اپنی توانائی اور وقت کو ضائع کرنا ہے“۔

ج- مذکورہ باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا نیز ان کی خرید و فروخت بھی شرعی

نقطہ نظر سے ناپسندیدہ ہے، کیونکہ یہ بات علماء کرام کے مابین مسلم ہے کہ ہر وہ امر جس میں نہ دینی فائدہ ہو اور نہ اس میں کوئی کھلی معصیت ہو تو وہ عمل مکروہ ضرور ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ ایسا عمل جو تعمیری مقصد کے لئے نہ ہو بلکہ وقتی تفریح کے لئے ہو، سے اشتغال رکھنا فقہاء عظام نے ناپسندیدہ عمل بتایا ہے، جیسا کہ ”وقد کره جماعة من العلماء الخوض في المزاح“ سے واضح ہے، اور سوال میں دیئے گئے امور کو انجام دینا اس کے ساتھ اشتغال و انہماک کے بغیر ممکن نہیں، البتہ اگر ”یہ کہانیاں عبرت آموز، نصیحت خیز، صالح مقصد کی حامل اور تعمیری ہوں تو نہ صرف جائز بلکہ بہتر“ (ملاحظہ فرمائیں: حلال و حرام، تالیف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۲۳۳۳ شرفریڈ بکڈ پورہ دہلی) اور باعث اجر و ثواب بھی ہوگا۔

د- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا یا اس کی اجرت قبول کرنا فقہاء کرام کے بھی نگاہ میں مکروہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ومن الناس من يشتري لهو الحديث“ (حوالہ سابق) یہ آیت مزاح کے پیشہ اور اس سے اجرت حاصل کرنے جیسی چیزوں پر حاوی ہے۔

ہ- یہ بات پہلے ہی گذر چکی ہے کہ اسلام میں انسانی فطرت کی بھرپور رعایت کی گئی، اور اس کے تقاضوں کا خیال کیا گیا ہے، لیکن ان کی ایک حد اور ایک دائرہ ہے، اگر انسان اس حد سے تجاوز کر جائے تو وہی چیز جو اپنے دائرہ کے اندر جائز تھی وہ اب شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور ناجائز ہو جائے گی، انہی میں سے ایک تفریح طبع یا تفریح نفس بھی ہے، کیونکہ تفریح طبع کی اجازت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی ساری توجہ اسی کی جانب مبذول کر دے، اپنا قیمتی وقت ضائع کرے اور اس کی خاطر لہو و لعب کا ارتکاب کرے، بلکہ تفریح کی اجازت بھی شریعت وہیں دیتی ہے جہاں انسان کو جسمانی، روحانی یا عقلی فائدہ ہو، بشرطیکہ واجبات دینیہ، مثلاً فرائض وغیرہ یا دنیویہ مثلاً اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کسب حلال کا ترک لازم نہ آئے۔

جہاں تک مزاحیہ ڈراموں کی بات ہے تو اس میں منفعت اور مفسدہ دونوں پہلو ہیں، منفعت یہ کہ ایسے پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے انسان ہوموم عالم اور افکار جہاں سے آزاد، تازہ دم اور نشیط ہو جاتا ہے، کبیدہ خاطر اور ذہنی کوفت جس کا وہ شکار تھا جاتی رہتی ہے، لیکن مفسدہ یہ ہے کہ بسا اوقات بلکہ اکثر و بیشتر ایسے پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے نماز و تلاوت و دیگر فرائض کو ترک دینے یا کم از کم اپنے وقت سے موخر کر کے ادائیگی کی نوبت آ جاتی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو جو وقت و عمر، جسم و صحت، علم و عقل جیسی عظیم ترین نعمتوں سے نوازا ہے، اگر ان نعمتوں کا استعمال تعمیری و اصلاحی کاموں کے لئے ہوتا تو کتنا فائدہ ہوتا، لیکن ان نعمتوں کا استعمال عبث، بے سود اور ایسے کام میں ہو رہا ہے جو ذکر الہی سے غفلت کا سبب ہے، اس ڈراموں میں بے شمار خرابیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً دوسروں کی غیبت و استہزاء، مرد و عورت کا اختلاط، کذب و دروغ گوئی وغیرہ اور فقہی قاعدہ ہے کہ ”درء المفساد اولیٰ من جلب المصالح عند التعارض“ (ملاحظہ فرمائیں: شرح القواعد للورقاء ۲۰۳ بحوالہ فقہ المعاملات المالیه، تالیف: ڈاکٹر رفیق یونس مصری، ناشر دار القلم و دمشق، پہلا ایڈیشن سنہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۲۰۰۵ء)۔ یعنی جہاں دونوں پہلو (مفسدہ اور مصلحت) ہوں ایسی صورت میں دفع مفسدہ کو جلب منفعت پر ترجیح حاصل ہوگی۔

اسی طرح ایسے پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے کثرت سخک لازم آتی ہے اور حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے (ترمذی؛ باب الصحة والفراغ ۵۵۱/۴، حدیث: ۲۳۰۵)۔ مزید برآں علامہ ابن حجر نے ڈرامہ نگاری کو بندروں کی خصوصیات میں شمار کیا ہے، امام موصوف فرماتے ہیں: ”ومن خصائله أی القرد أنه يضحك ويطرب ويحكي ما يراه“ (ملاحظہ ہو: فتح الباری ۱/۱۶۰؛ قولہ باب أيام الجلبلية، ناشر دار المعرفہ بیروت ۱۳۷۹ھ)۔

امام نووی نے تو ڈرامہ نگاری کو حرام قرار دیا ہے، امام موصوف فرماتے ہیں: ”ومن ذلك المحاكاة بأن يمشي متعارجاً أو مطاطناً أو غير ذلك من الهيئات مزيداً حكاية هيئته من ينقصه بذلك فكل ذلك حرام“ (ملاحظہ ہو: الاذکار النوویہ ج ۱، بن شرف النووی ۱/۳۳۸)، لہذا سوال میں ذکر کردہ تمام باتیں ناجائز ہیں۔

د- اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ کھلکھلا کر ہنسنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے بہ تکلف اور قہمبے لگا کر دیر تک ہنسا شرعی نقطہ نظر سے جائز نہ ہوگا، جہاں تک انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے معالجین کا ہنسنے کی رائے دینے کا تعلق ہے تو بفضلہ تعالیٰ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ صحت کی برقراری اور اس کو چست و نشیط رکھنے کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک مقویات اور دوائیں یا غذا میں موجود ہیں جن سے یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

ہاں اگر کوئی مریض ہو جس کے لئے کوئی دوا موجود نہ ہو یا موجود ہو مگر اتنی مہنگی ہو کہ اس کو خریدنے سے عاجز ہو اور ماہر و صالح معالج کے مطابق اس مرض کا ازالہ اس عمل (ہنسنے) کے بغیر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں ”قصہ عربینہ“ (ملاحظہ ہو: سنن ابی داؤد باب ما جاء في المحاربة حديث: ۴۲۶۶، ترمذی؛ باب ما جاء في بول مايو كل لحمه حديث: ۵۲) کو نظیر بناتے ہوئے اور ”الضرورة تبیح المحظورات“ (ملاحظہ ہو: فقہ المعاملات المالیه ۳۱، تالیف ڈاکٹر رفیق یونس

مصری، مطبوعہ ۱۳۲۶ھ) کے مطابق اس پر عمل کی شرعاً اجازت ہوگی۔

۲: الف- موسوعہ فقہیہ میں کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے سلسلہ میں اصول متعین کئے ہیں، ہم اسے یہاں ذکر کر رہے ہیں، ”وإباحة اللغب إنما يكون بشرط أن لا يكون فيه دناءة يترفع عنها ذؤو المروقات، وبشرط أن لا يتضمن ضرراً، فإن تضمن ضرراً للإنسان أو حيوان كاللحريش بين الديوك والكلاب وتطاح الكباش والتفريح على هذه الأشياء فهذا حرام وبشرط أن لا يخرج به إلى الحلف الكاذب ونحوه من المحرمات“ (الموسوعۃ الفقہیہ ۷/۳۴، مطبع وزارة الاوقاف والشؤون الاسلامیة کویت، پہلا ایڈیشن ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء)۔

ب- لباس و پوشاک کے سلسلہ میں کھلاڑیوں کے لئے درج ذیل باتوں کی رعایت ضروری ہے۔

- ۱- کھیل کے اندر بھی احکام ستر کی پوری پوری رعایت ہو۔ ۲- اعضاء ممنوعہ النظر خارج سے نمایاں نہ ہو رہے ہوں۔
- ۳- لباس کے اندر کشش اور جاذبیت نہ ہو۔ ۴- مرد ریشمی اور زریں لباس نہ پہننے۔
- ۵- غیر اقوام کی مشابہت اختیار نہ کرے۔

لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ شریعت مقدسہ میں لباس کی کوئی خاص ہیئت اور وضع متعین نہیں ہے، البتہ چند چیزیں ہیں جن کی احادیث مبارکہ میں ممانعت آئی ہے، مثلاً مرد کے لئے ریشمی لباس، زریں لباس، دوسری قوموں کے مشابہ لباس، اس کے بعد ہر لباس اور ہر وضع مباح ہے (ملاحظہ ہو: کفایۃ المفتی ۹/۵۴ مطبع رحیمیہ دہلی)۔

جہاں تک پتلون، پینٹ، شرٹ وغیرہ لباس کا تعلق ہے جو عام طور سے کھیلوں میں پہنا جاتا ہے تو اگر یہ لباس اتنا چست، تنگ اور باریک ہوں کہ قابل ستر اعضاء باہر سے نظر آ رہے ہوں تو ایسے لباس کی شرعاً اجازت نہ ہوگی، لیکن اگر ڈھیلے ڈھالے ہوں اور ذکر کردہ قباحت پیدا نہ ہوں تو ایسے لباس سے زیب تن کرنا مباح ہوگا۔

اگر یہ سوال ذہن میں پیدا ہو کہ ایسے لباس کو پہننا گویا کہ غیر قوم کی مشابہت اختیار کرنا ہے جبکہ شریعت میں اس کی ممانعت آئی ہے، جیسا کہ ”من تشبه بقوم فهو منهم“ (ملاحظہ ہو: مصنف عبدالرزاق باب حلق التقاد الزہد ۱۱/۴۵۳، حدیث: ۲۰۹۸۶) سے بالکل واضح ہے، تو بندہ ناچیز کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے لباس میں اتنا شیوع و عموم ہو چکا ہے کہ اب کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص اور ان کا شعار نہ رہا، جبکہ ”تشبہ کا حکم اس صورت میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے دیکھ کر اس شبہ میں پڑ جائے کہ یہ شخص اس قوم کا فرد ہے“ (ملاحظہ ہو: کفایۃ المفتی ۹/۵۳)، اس لئے تشبہ کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، البتہ خلاف اولیٰ اور غیر محمود ہوگا، کیونکہ یہ ہمارے مقتدیان، پیشوایان ملت اور صلحاء دین کا شعار نہیں رہا ہے۔

ج- علماء کرام نے اقسام کھیل میں سے بعض کو مباح، بعض کو مستحب، بعض کو مکروہ اور بعض اقسام کو حرام قرار دیا ہے، دیکھئے الموسوعۃ الفقہیہ۔

مباح کھیل: غولف، باسکٹ بال، بیٹ منٹن، ٹیبل ٹینس، ریس، رسا کشی، اگر کم وقت کے لئے ہو تو کرکٹ اور تعلیمی ٹاش اور کیرم بورڈ کو بھی لے سکتے ہیں۔

لیکن واضح رہے کہ کھیل کی اباحت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ ذکر کردہ شرائط میں سے ایک بھی شرط فوت نہ ہو۔

د- شرط کے جائز ہونے کی تین صورتیں ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- کوئی تیسرا شخص جو دوڑ میں شامل نہ ہو، شرکاء میں سے جیتنے والے کے لئے انعام کا اعلان کرے اور ادا کرے۔

۲- دو شخص شریک ہوں لیکن شرکاء ایک ہی جانب سے ہو، مثلاً زید اور بکر میں سے اگر زید سبقت لے جائے تو بکر سے شرط کے مطابق انعام دے گا، لیکن اگر بکر جیت جائے تو زید کچھ دانہ کرے۔

۳- کھیل میں تین یا اس سے زیادہ آدمی شریک ہو، دو آدمیوں میں یہ شرط ہو کہ ہم دو میں سے جو جیت جائے، اس کو دوسرا شرط رقم ادا کرے گا، بقیہ دوسرے اشخاص کے لئے کوئی شرط نہ ہو، اگر تمام شرکاء کے ساتھ اس طرح کی شرط ہو کہ جیتنے والے کو شرط و مقرر مال ادا کریں گے تو یہ جوا ہوگا، اور اس طرح کا کھیل جائز نہیں ہوگا (ملاحظہ فرمائیں: درخت اللعلا مہ حصہ ۱/۲۵۸، بحوالہ حلال و حرام، رد المحتار: کتاب الخطر والاباۃ ۹/۵۷۸)۔

۵- حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن انسان سے جب تک چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ ہو جائے اس وقت تک ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا، انہیں میں سے ایک وقت اور عمر ہے۔

”لا تزول قدما عبد حتى يسأل عن عمره فيما أفناه، وعن عمره فيما فعل، وعن ماله من أين اكتسبه وفيما أنفقه، وعن جسمه فيما أبلاه“ (ملاحظہ ہو: سنن ترمذی ۲۰۶۷، باب فی القیامہ، حدیث: ۲۳۱۷، دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

دوسری حدیث میں ہے: ”نعمتات مغیبت کثیر من الناس الصحة والفراغ“ (ملاحظہ فرمائیں: سنن ترمذی؛ باب ما جاء فی أن الصحة والفراغ۔ ۲۰۵۳۹، حدیث: ۲۲۰۲)۔

ان روایات کی بنیاد پر معلوم ہوا کہ کھیل اگر چاہے طور طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن ایک بے سود امر میں وقت طویل کو ضائع (دیکھنے یا کھیلنے میں) کرنا حرام اور ناجائز ہوگا۔

۱۔ اس جزء کی تفصیل یہ ہے کہ جو کھیل حرام ہو، اس کا ٹکٹ خریدنا بھی حرام ہوگا اور جو کھیل مکروہ ہے، اس کا ٹکٹ خریدنا بھی مکروہ ہوگا، کیونکہ ٹکٹ خرید کر، ہم نے گویا کہ ایسے کھیل کھیلنے والوں کا تعاون کیا اور حوصلہ افزائی کی، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ اسی طرح جو کھیل مستحب یا مباح ہے، اس کا ٹکٹ خریدنا بھی مستحب یا مباح ہوگا، ”تعاونوا علی البر والتقوی“۔

۳: الف۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا تھا کہ نفس تفریح جائز ہے، بشرطیکہ ما قبل میں ذکر کردہ شرائط میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی نہ ہو، اسی طرح تفریحی مقصد کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنا جائز ہے، شریعت اس کے مخالف نہیں ہے، اگرچہ کثیر رقوم کا صرفہ آتا ہو، اس لئے کہ اس میں دینی یا دنیوی دونوں طرح کے مصالح ہیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے کسی دینی یا دنیوی امر واجب کا ترک اور خلاف شرع امر کا ارتکاب لازم نہ آئے، اسی طرح تفریحی سفر کو مقصد اصلی نہ بنالے، بلکہ عقلمندی اور دراندیشی کی بات یہ ہے کہ انسان اپنے اس سفر سے نصیحت و عبرت حاصل کرے، اپنے سفر کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ، ایمان و یقین اور معرفت و ثقافت میں اضافہ کا وسیلہ بنائے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”سیروا فی الأرض، فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین“ (سورہ آل عمران: ۱۳۷)۔ اور شرعی قاعدہ ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، جب تک کہ اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہ قائم ہو جائے۔

ب۔ چونکہ سیاحت و سفر مباح ہے، اس لئے اپنے ساتھ اپنے بال بچوں کو بھی سفر میں لے جاسکتے ہیں، جہاں تک سفر میں جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی بات ہے تو ہاں و عیال کیا خود بھی ایسے علاقہ کا سفر کرنا جائز نہ ہوگا جہاں عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ولا تعلقوا بأیدیکم إلی التہلکة“ (سورہ بقرہ: ۱۹۵)۔

اس آیت کریمہ میں خطرات کو مول لینے اور ہلاکت و تباہی کی راہ اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے، کوئی اگر یہ اشکال کرے کہ یہ آیت تو اس وقت نازل ہوئی تھی جب بعض صحابہ کرام نے اپنی توجہ کو کھیتی باڑی اور دیگر دنیاوی مشاغل میں مرکوز کر دیا تھا تو اللہ کی جانب سے انہیں تنبیہ کی گئی کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بلکہ دین کی جانب متوجہ ہو! تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت چونکہ مطلق ہے اور ”المطلق یجری علی إطلاقہ“ کی رو سے دینی و دنیوی دونوں طرح کی ہلاکت و خطرات کو شامل ہے، ہمارے اس جواب کی تائید علامہ شوکانی علیہ الرحمۃ کی اس تفسیر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اس آیت کے ذیل میں کی ہے، امام موصوف فرماتے ہیں: ”فکل ما صدق علیہ أنه تہلکة فی الدین أو الدنیا فهو داخل فی هذا“ (ملاحظہ ہو: فتح القدیر علامہ شوکانی ۱۹۳، تفسیر سورہ بقرہ: ۱۹۵)۔ البتہ خود سفر کرنے یا اہل و عیال کے ہمراہ سفر کرنے کو ہم چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ جہاں عزت و آبرو کو کسی طرح کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہو وہاں کا خود یا مع اہل و عیال سفر کرنا مباح ہے۔

۲۔ اور جہاں عزت و آبرو کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہونے کا گمان ہو وہاں مکروہ تریبی۔ ۳۔ جہاں غالب گمان ہو وہاں مکروہ تحریمی۔

۴۔ اور جہاں یقین کے درجہ میں ہو تو وہاں حرام ہوگا، لیکن واضح رہے کہ اس تقسیم کا تعلق دونوں جزء (الف، ب) سے ہوگا۔

ج۔ اس سوال کو ہم دو شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے۔

(۱) ذکر کردہ مقام میں ازراہ تفریح جانا شرعاً کیسا عمل ہے، (۲) اور وہاں اشیاء خورد و نوش فروخت کرنا یا سواری کرایہ پر لگانا۔ سب سے پہلے ہم (۱) کی وضاحت ذیل میں کرتے ہیں:

۱۔ ایسے مقام میں ازراہ تفریح جانا شرعاً ناجائز ہے، اس لئے کہ ایسے مقام میں جانا گویا مرتکبین امور غیر شریعہ کی حوصلہ افزائی اور معاصی کو بڑھا دینا ہے حالانکہ ارشاد خداوندی ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان، واتقوا اللہ“، ہاں اس وقت ایسی جگہوں میں جانا جائز ہوگا جبکہ انسان کو کامل

یقین ہو کہ ان برائیوں میں ملوث ہوئے بغیر ہم واپس آجائیں، جیسا کہ سورہ فرقان میں کامل مومنین کے اوصاف کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ”وَإِذَا مَرُوا بِاللَّغْوِ مَرُوا كِرَامًا“ یعنی یہ مسلمان ایسے ایمان والے ہیں کہ جب لغو چیز کے پاس سے گزرنے کی نوبت آتی ہے تو شریفانہ انداز میں ان برائیوں سے بچتے ہوئے گزر جاتے ہیں، اسی طرح اس وقت بھی ایسے مقام میں جانے کی شرعاً اجازت ہوگی جبکہ جانے والے کی نیت یہ ہو کہ ان برائیوں سے آگاہی کے بعد ان کی قباحت و شاعت اور وعید و عتاب قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کر کے لوگوں کی اصلاح کی جائے، ظاہری بات ہے کہ اگر یہ نیت ہے تو ایسی جگہوں میں جانا ازراہ تفریح نہیں بلکہ ازراہ اصلاح ہو۔ خلاصہ میں کہ صرف تفریح کی نیت سے ایسی جگہوں میں جانا بالکل جائز نہیں ہوگا۔

۲- اس شق میں قدرے تفصیل ہے، یعنی اس شق میں بھی دو شقیں ہیں، شق اول: ایسے مقام میں اشیاء خورد و نوش فروخت کرنا، اور شق ثانی ایسے مقام کے لئے سواری کرنا یا پر دینا، جہاں تک اشیاء خورد و نوش کی فروخت کی بات ہے تو ناچیز کے نزدیک یہ بھی تعاون علی الاثم کے قبیل سے ہوگی، کیونکہ ہم دوکان لگا کر گویا یہ تصور دے رہے ہیں کہ آپ حضرات ایسی جگہوں میں تشریف لائیں، اور آپ کو ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ داری ہماری ہے، جہاں تک امام ابوحنیفہ کی بات ہے تو وہ جواز کے قائل ہیں، علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

”وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم أنه یتخذہ خمرًا، لأن المعصیة لا تقوم بعینہ بل بعد تغیرہ، قوله: لا تقوم بعینہ أن المراد لا تقوم المعصیة بعینہ وما یحدث له بعد البیعة وصف آخر یرکون فیہ قیام المعصیة، وقیل: یرکون لإعانتہ علی المعصیة“ (ملاحظہ ہو: رد المحتار ۹۰۵۶۱ فصل فی البیعة ۲۶۰، ۲۷۷ فی الكمبيوتر)۔

بہر حال امام صاحب نے اپنے مسلک میں جو دلیل پیش کی ہے وہ عقلی ہے اور یہی قیاس کا تقاضا ہے، لیکن صاحبین دلیل استحسان کی بنیاد پر مکروہ قرار دیتے ہیں (ملاحظہ ہو: حوالہ سابق)، اور قاعدہ ہے کہ جب قیاس اور استحسان میں تعارض ہو جائے تو استحسان کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، ہاں وہاں اگر ہر طرح کے لوگ آتے ہوں، خریداروں میں بھی اچھے برے ہر طرح کے ہوں تو پھر بلا کراہت جائز ہے۔

اور یہی اختلاف سواری کرنا پر دینے میں بھی ہے، جیسا کہ رد المحتار میں ہے: ”وعلی هذا الخلاف لو آجره دابة لينقل عليها الخمر أو آجره نفسه لیرعی له الخنازیر یطیب له الأجر عنده وعندهما یرکون“ (ملاحظہ فرمائیں: رد المحتار، کتاب الحظر والاباحہ فصل فی البیعة ۲۶۰، ۲۷۷)۔  
 رد: ٹور پر جانے کے لئے تجارتی کمپنیاں قائم کرنا، آمدورفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کی سہولتوں کا نظم و نسق کرنا سب جائز ہے، اگرچہ معاملہ ایسے غیر مسلموں کے ساتھ ہو رہا ہو جن کا مقصد مندروں، چرچوں اور اپنے اپنے عبادت گاہوں کی زیارت ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ نفس عمل میں کوئی قباحت و معصیت نہیں ہے، ابن عابدین علامہ شامی اپنی کتاب رد المحتار میں فرماتے ہیں: ”ولو آجر نفسه لیعمل فی الكنيسة ویعمرها لا بأس به، لأنه لا معصیة فی عین العمل“ (ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق)۔

فقیر عصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب ”کتاب الفتاویٰ“ (۴۰۶/۵) میں ”غیر مسلم تہواروں میں اجرت پر اشیاء کا دینا“ عنوان کے ذیل میں غیر مسلموں کے ساتھ اس طرح کے معاملہ کو ناجائز اور غیر درست قرار دیا ہے، اور حضرت مولانا نے اپنے اس فتویٰ کے استدلال میں آیت ربانی: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ اور رد المحتار کی عبارت: ”لا تصح الإجارة لأجل المعاصی مثل الخنا“ (ملاحظہ ہو: رد المحتار؛ باب الاجارة الفاسدة ۲۴، ۲۹۱) کو پیش کیا ہے، اور یہی صاحبین کا بھی مذہب ہے، لیکن ناچیز نے اس سے قبل ذکر کیا تھا کہ حالات اور مصلحت کے پیش نظر امام اعظمؒ کے قول کو اپنایا جاسکتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ نفس عمل یعنی ٹور کمپنی قائم کرنا، آمدورفت کے لئے ٹکٹ اور قیام کی سہولت فراہم کرنے میں شرعی کوئی قباحت نہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ ایک سفر سے تشریف لائے، میں نے طاق پر تصویر دار پردہ لٹکایا تھا، آپ ﷺ نے جب اسے دیکھا تو چھاڑ دیا اور فرمایا کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو سخت ترین عذاب ہوگا جو صفت تخلیق میں اللہ کی نقل اتارتے ہیں (رواہ البخاری: ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، بحوالہ ڈیجیٹل تصویر روری ڈی کے شرعی احکام ۲۴ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

ان روایات کی بنیاد پر فقہاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ جاندار کی تصویر سازی باجماع امت حرام ہے، جو مذہب کی کتابوں میں مدلل مذکور ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں فلم نے انسانی ذہن و دماغ پر مکمل قبضہ اور لوگوں کے جذبات پر زبردست اثر چھوڑا ہے اور ایک عموماً بلوی کی شکل پیدا ہو گئی ہے، لہذا



”الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف“ یا ”یرتکب أخف الضررين لاتقاء أشدهما“ (ملاحظہ ہو: فقہ المعاملات المالیہ ۲۸-۲۹، تالیف: ڈاکٹر رفیق یونس مصری، مطبوعہ دار القلم دمشق ۱۳۲۶ھ) کے قاعدہ پر عمل کرتے ہوئے، دستاویزی، تعلیمی و اصلاحی اور دیگر مقاصد حسنہ کے لئے قلم بینی اور قلم سازی دونوں کی اجازت ہونی چاہئے، بشرطیکہ شرعی مفاسد نہ پائے جائیں، اور جن قباحت و شاعت کی بنیاد پر قلم کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، ان تمام عیوب سے پاک ہو، مثلاً میوزک نہ ہو، عاشق و معشوق کی کہانی نہ ہو، رقص نہ ہو، انبیاء و ملائکہ کی تمثیل نہ ہو، غلط مقاصد کی ترویج و اشاعت پر مبنی نہ ہو، حقائق کی غلط ترجمانی نہ کی گئی ہو، خواتین کی برہنہ تصویر نہ ہو، اور نہ ایسے مناظر کو پیش کیا گیا ہو جن سے انسانی شہوت بھڑک اٹھے، غرضیکہ محرمات شرعیہ پر قلم مشتمل نہ ہو، البتہ اس عمل سے حاصل شدہ کمائی بہتر نہیں ہوگی، جیسا کہ پچھنانگا کر حاصل شدہ کمائی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھٹایا بتایا ہے۔

۵: الف، ب۔ اگر کارٹون اس طرح بنایا جائے کہ چہرہ، آنکھیں، ناک وغیرہ واضح ہوں اور اس سے ان کی شناخت ہو رہی ہو تو ایسے کارٹون بنانا اور ان کا استعمال اور اس سے حاصل شدہ کمائی جائز نہیں، کیونکہ ایسا کارٹون کئی قباحتوں کا جامع ہے: (۱) تصویر کے حکم میں ہے، اور تصویر سازی کی حرمت باجماع امت ثابت ہے، (۲) جس شخصیت کی طرف اس کا اشارہ ہے اس کا تسخر اور استہزاء ہے، اور کسی کا مذاق اڑانا منہص قرآنی حرام ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسی اُن یکونوا خیراً منهم“ (سورہ حجرات: ۱۱)، لہذا کارٹون سازی اور اس عمل کو پیشہ بنالینا جائز نہ ہوگا۔

البتہ اگر ایسا کارٹون بنایا جائے جس میں جاندار کی شکل واضح نہ ہو تو ایسے کارٹون بنانے کی گنجائش ہے، تاہم مناسب نہیں، کیونکہ وہ بھی تصویر کے مشابہ ہے، ”وفی الدر المختار قال: لو كانت قدمیه إلى قوله أو مقطوعة الرأس والوجه أو مموحة عضوه لا تعیش بدونه“ (ملاحظہ ہو: رد المحتار لابن عابدین، مکروہات الصلوٰۃ ۶۳۸/۷ مطبوعہ کراچی پاکستان)۔

”ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو لناظر إلا بتأمل لا یکرہ“ (ملاحظہ ہو: فتاویٰ ہندیہ ۱۰۹/۱ مطبوعہ دارالعلوم کراچی پاکستان)۔

۶۔ اس سے ملتا جلتا سوال آج، ہاں سوال ہے، اس میں تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا کہ سماج یا معاشرہ کی اصلاح کی نیت سے اور معاشرہ میں پائے جانے والے مفاسد و منکرات پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ کسی فرد یا قوم مخصوص پر تنقید نہ ہو، اور منہیات شرعیہ میں سے کسی منہی عنہ فعل کا ارتکاب لازم نہ آئے، لیکن واضح رہے کہ ڈرامے کے بجائے مکالمے یا کوئی اور نام اگر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے، کیونکہ ڈرامہ سے ذہن فوراً اس طرف ملتفت ہوتا ہے کہ اس میں رقص و سرور یا دیگر مفاسد ہو، جہاں فرضی رشتے کے اظہار کا تعلق ہے تو یہ اس وقت جبکہ سامعین کو اس سے دھوکہ نہ ہو اور وہ حقیقت حال سے واقف ہوں تو جائز ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی کو مزاحاً غلام کہنا ثابت ہے، غرضیکہ بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرے کے مفاسد پر تنقید کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

## مزاح کے شرائط

ڈاکٹر بہاء الدین محمد ندوی علیہ

مزاح کے بارے میں شریعت کا حکم امام غزالی کے مندرجہ ذیل قول سے معلوم ہوگا:

”إن قدرت علی ما قدر علیہ رسول اللہ ﷺ وأصحابہ وهو أن تمزح ولا تقول إلا حقاً ولا تؤذی قلباً ولا تفرط فیہ وتقتصر علیہ أحياناً علی الندور فلا حرج فیہ“ (احیاء علوم الدین باب المزاح)۔

سخ الباری میں امام ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ”والمکروه من ذلك إنما هو الإكثار منه أو الإفراط فیہ“ باب الضحک۔

امام غزالی اور لکھتے ہیں: ”ولکن من الغلط العظیم أن یتخذ الإنسان المزاح حرفة یواظب علیہ“۔

☆☆☆

ڈاکٹر چائلر دارالہدی اسلامک یونیورسٹی۔

## مناقشہ

مولانا یاسر ندیم قاسمی (دیوبند):

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مجھے مختصر اُدوتین باتیں عرض کرنی ہے، سب سے پہلی بات جو دستاویزی فلموں اور ڈاکومنٹری سے متعلق ہے تو اس میں سوال یہ ہے کہ ڈاکومنٹری کی فلمیں جدید ذرائع ابلاغ یا جدید تعلیمی ذرائع کے تحت آتی ہیں یا تفریح کے تحت آتی ہیں۔ ایک بہت مشہور انگلش کی ڈکشنری ہے..... جس میں ڈاکومنٹری فلم کی جو تعریف دی ہے اس میں لکھا ہے کہ یہ ایک ایسی فلم یا وی پروگرام ہے جس میں صرف حقائق کو پیش کیا گیا ہو، جب کہ تفریحی ڈراموں میں یا تفریحی پروگراموں میں حقائق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا اس لئے یہ بات محل نظر ہے کہ ہم اس کو..... یا تفریح کے تحت رکھیں یا جدید ذرائع ابلاغ کے تحت اور ذرائع ابلاغ کے بارے میں سمینار اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے تو جس طرح بہت سے علماء کے نزدیک جدید ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنا بشرطیکہ شریعت کی مخالفت نہ ہو جائز ہے، اسی طرح ڈاکومنٹری فلمیں یا دستاویزی فلمیں بھی بنانا جائز ہونا چاہئے۔

دوسری بات جو کارٹون سے متعلق سوال ہے سوال نامہ میں، اس کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں نے صرف ایک پہلو پر غور کیا ہے۔ دوسرے پہلو پر مجھے تلخیص مقالات میں کوئی بات نہیں ملی۔ اخبارات میں سیاسی، سماجی موضوعات پر جو کارٹون وغیرہ بنائے جاتے ہیں تو ان کو بھی تفریح کے تحت مطلقاً نہیں رکھا جاسکتا بلکہ یہ فن صحافت کی ایک مستقل قسم بن چکی ہے۔ البتہ بچوں کے لئے جو کارٹون پر مبنی فلمیں بنائی جاتی ہیں ان کے تعلق سے بھی تلخیص مقالات میں کوئی بات نہیں آئی، البتہ مولانا بدر الحسن صاحب کے مقالہ کا ذکر آیا ہے جس میں انہوں نے اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس طرح کی فلموں کا استعمال آج کل ذہنی نشوونما کے لئے کیا جا رہا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ عالم عرب میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو عربی نہیں جانتے عرب ہونے کے باوجود، تو ان کو فصیح عربی سکھانے کے لئے بچوں کو ایسی کارٹون پر مبنی فلمیں دکھائی جاتی ہیں لیکن اس میں ایک بہت اہم پہلو یہ ہے کہ کارٹون فلمیں جو بنانے کا طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ کارٹونسٹ اپنے ہاتھ سے ایک اسٹیج بناتا ہے اور اس میں رنگ بھرتا ہے اور وہ ذی روح کی تصویر ہوتی ہے جس میں ناک، کان، آنکھ سب ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ذی روح کی اصل شکل سے تھوڑا مختلف ہوتی ہے اور اس طرح کی ہزاروں تصویریں بنائی جاتی ہیں کمپیوٹر کی مدد سے پھر ان تصویروں کو بڑی تیزی کے ساتھ کیمرے کے سامنے سے گزارا جاتا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ کارٹون کسی کام میں مشغول ہے بھاگ رہا ہے دوڑ رہا ہے تو اس کے ہر پہلو کی ایک ایک سکینڈ کے لحاظ سے تصویر بنتی ہے ہاتھ سے اور اس کو بڑی تیزی کے ساتھ کیمرے کے سامنے سے گزارا جاتا ہے یقیناً یہ عمل ڈیجیٹل تصویر سے بہت مختلف ہے تو یہ غور کرنے کا پہلو ہے یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کی فلمیں جو ہر مفید ہیں، بچوں کے لئے، ذہنی نشوونما کے لئے، لیکن چون کہ یہ ڈیجیٹل تصویر نہیں ہے بلکہ ہاتھ سے بنائی ہوئی اسٹیج ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ اس سلسلہ میں علماء حضرات کی میں توجہ دلانا چاہوں گا۔ ہذا معذرت۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مولانا عبدالرشید قاسمی (کانپور):

بسم اللہ الرحمن الرحیم، کرکٹ سے متعلق تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے اس کو اور کھیلوں سے ذرا الگ شمار کیا ہے اور ناراضگی کا اظہار بھی زیادہ کیا ہے، ایک کرکٹ کی قسم تو وہ ہے جو آج کل ہو رہی ہے جسے ہم ورلڈ کپ کہہ لیں یا اور کچھ کہہ لیں اور اس میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے اور یہ سٹہ بازی ہے اور اس کے بارے میں ظاہر ہے کہ ہم اسے مکروہ کہیں یا حرام کہیں، لیکن اصل میں جو کرکٹ کا فروغ ہے تھوڑا بہت بچوں میں، اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کرکٹ وہ تہا کھیل ہے جو چھوٹے سے میدان میں بھی اور حملہ کی گلی میں بھی اور گھر کے آگن میں بھی، حتی کہ بیڈروم میں بھی دو بچے کھیل لیتے ہیں دو بھائی، ایک تین سال کا بچہ ہے ایک پانچ سال کا بھائی ہے دونوں بھائی اپنا کھیل رہے ہیں اور کسی کھیل میں یہ امکان نہیں ہے بلکہ تہا شاید یہ دنیا کا

کھیل ہے جو تنہا بھی کھیلا جاسکتا ہے۔ آج کل مشینیں آئی ہیں جو گیند پھینکتی ہیں اور آدمی تنہا یا دوری میں باندھ دیا گیند اور اس میں مار رہے ہیں اور کوئی کھیل اس طرح کا نہیں ہے، تو یہ تو کھیل کی ایک شکل ہے جس میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے اس لئے اس کے بارے میں جو آپ حکم لگائیں، لگائیں۔ لیکن کرکٹ کے ساتھ کچھ چیز اور ہے کہ اس کے کچھ قانون خود ساختہ بھی ہوتے ہیں جیسے پچاس اور کا ہے، مدارس میں بچے عصر بعد کھیلتے ہیں دس اور کا کھیل لیتے ہیں، اسی طرح ایک ہوتا ہے گیارہ پلیئر لیکن دو دو تین بھی کھیل لیتے ہیں، تو اگر ہم اس طرح کرکٹ کو کوئی نیا حکم دیتے ہیں تو شاید پریشانی ہو جائے پھر اگر ہم اس میں مکروہ تحریمی کا حکم لگاتے ہیں تو میرٹھ میں فیکٹریاں قائم ہیں کرکٹ کی، شاید وہ آپ کے خلاف کھڑے ہو جائیں کہ صاحب ہماری فیکٹریاں بند ہو جائیں گی کہ کرکٹ کا استعمال بے لگتو سوائے اس کے اور مصرف ہے نہیں۔ ساری دکانیں کیا ہوں گی، تو جو تجویز تیار ہو اس اعتبار سے ہو کہ یہ ایک الگ فیشن ہے کرکٹ کا اور وہ بچے جو کھیلتے ہیں گلیوں میں یا مدارس میں عصر بعد کھیلتے ہیں یا گھر کے اندر آنگن میں کھیلتے ہیں اس کا حکم الگ ہو، اسی طرح جو ریس کے بارے میں ہے اس کو ہا کالیا گیا ہے، حالانکہ ریس کا معاملہ زیادہ خطرناک ہے اول تو ریس کی جو گاڑیاں ہوتی ہیں وہ کروڑوں کی گاڑیاں ہوتی ہیں، پٹرول کی اس مہنگائی میں پٹرول بھی اتنا مہنگا ہے اور اس میں انسان مرتا بھی ہے، سر بھی چکنا چور ہوتا ہے زیادہ نقصان دہ ہے اور اس میں کوئی جسمانی ورزش بھی نہیں ہے وہ صرف ہاتھوں کا کمال ہے اگر سائیکل کی ریس ہو تو سمجھ میں آتی ہے لیکن بانک کی ریس ہو، ٹو ویلر کی ریس ہو یا فورویلر اس کی ریس بھی سمجھ میں نہیں آتی، بعض مقالہ نگار نے تو ریس کو دوڑ میں شمار کیا ہے حالانکہ اسراف کے اعتبار سے اسے بالکل ناجائز ہونا چاہئے، بہر حال تجاویز کے وقت کرکٹ کے بارے میں بھی ذہن میں رکھا جائے یہ دو الگ الگ ہے ایک ورلڈ کپ یا اس طرح کے کھیل جو کہ بچوں میں گھروں کے کھیل ہوتے ہیں۔ جزا کہہ اللہ۔

### مولانا رمضان علی فرقانی:

تخصیص میں ایک بات آئی تھی سوال اجو ہے اس کا جزء (د) کہ لطفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنا لینا، اس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں ہے، تخصیص میں جتنی باتیں آئی ہیں اس میں اکثر یا تمام مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے لیکن ناجائز ہونے کی کوئی علت ہو وہ خاص بیان نہیں کی گئی ہے یا تو اس وجہ سے کہ فرضی لطفہ لکھے، اس وجہ سے ناجائز ہو یا کسی اور وجہ سے، اگر یہ چیز فرضی وجہ سے ہے تو اس میں ناجائز ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیوں کہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت کعب بن زہیرؓ نے اپنا مشہور قصیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا بابت سعادت جس کا مطلع یہ ہے: بابت سعادت فقلبی الیوم..... وہ فرضی اشعار پر مشتمل ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی اس رو سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

### مولانا عارف باللہ قاسمی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، پہلی بات تو کرکٹ کے حوالہ سے کہ آج سارا ستم کرکٹ پر ہی گرا ہے لیکن اس میں تفریق کرنی پڑے گی ایک تو پروفیشنل ہو، جس میں وضعی قوانین کا دخل ہوتا ہے کہ اس کی پابندی کی جاتی ہے جیسا کہ ابھی مولانا نے فرمایا، اس لئے مفتی عزیز الرحمن صاحب کا فتویٰ بھی اس سلسلہ میں ہے وہ لکھتے ہیں کہ گیند کا کھیل خواہ وہ کرکٹ وغیرہ ہو یا دوسرے دیسی کھیل فی نفسہ جائز ہے، کیوں کہ اس سے تفریح طبع اور ورزش و تقویت ہوتی ہے، اس لئے اس کو علی الاطلاق ناجائز نہ کہا جائے بلکہ شرائط کے ساتھ اس کو مقید کیا جائے۔ اسی طرح تیراکی کو جائز کھیلوں اور مستحب کھیلوں میں شمار کیا گیا ہے لیکن اس زمانے میں تیراکی کی جو صورت حال ہے وہ عام طور سے تیراکی سوئمنگ پول میں سیکھی جاتی ہے اور کی جاتی ہے۔ بعض جگہوں پر مرد و عورت کا امتیاز نہیں رہتا، تو بعض جگہوں پر صرف مرد ہوتے ہیں لیکن وہ ہاف پیٹ اور انڈر ویئر پہننے ہوتے ہیں، اس لئے ایسے سوئمنگ پول میں جہاں برہنہ عورتیں بھی تیراکی کرتی ہوں یا جہاں مرد کے ران کھلے ہوتے ہوں تیراکی جائز نہیں ہونی چاہئے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لعن اللہ الناظر والمنظور لہ، اسی طرح سے علامہ حصکفی نے بھی لکھا ہے: ولا شک فی الکراہۃ لتحقق کشف العورۃ، اسی طرح سے ایک بات آئی ویڈیو کے سلسلہ میں اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ عورت کی آواز نہ ہو مطلقاً عورت کی آواز تو مردوں کے لئے سننا ناجائز تو نہیں ہے، اگر عورت باپردہ ہے اور پردہ سے کوئی بات کر رہی ہے، تو خود قرآن کریم نے کہا: ”ان اتقین فلا تخضعن بالقول فی طمع الذی فی قلبہ مرض“، مطلقاً آواز تو ممنوع نہیں ہے، اس لئے اس میں یہ قید لگائی جائے کہ عورت کی آواز ایسے لہجے اور ترنم میں نہ ہو جو کسی سننے والے کے لئے باعث لذت ہو سکے ورنہ اگر اس کے بغیر ہے تو سن سکتے ہیں، جزا کہہ اللہ۔

## مفتی احمد نادر قاسمی (فقہ اکیڈمی):

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میں ڈرامے کے سلسلہ میں چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں، بہت سے ایسے ڈرامے ہیں جن میں بہت سے تاریخی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، اسی طرح ڈرامے کے ان اقسام میں جیسے سیریس وغیرہ ہیں، وہ بھی اسی کے زمرہ میں آتے ہیں۔ آج سے تقریباً چار سال پہلے حضرت ٹیپو سلطان شہید سے متعلق ایک سیریل آئی اس میں بہت سے ایسے تاریخی پہلو جو آزادی سے متعلق تھے وہ بھی سامنے آئے، تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ڈرامے کے بارے میں مطلقاً یہ نہ کہا جائے کہ وہ غلط ہے یا لغو ہے بلکہ ڈرامے میں اگر شرعی ضابطوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ڈرامے بھی اسٹج کئے جاسکتے ہیں اور اس کے پروگرام بھی مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ شکر یہ۔

## مولانا محمد شاہ جہاں ندوی

مجھے مختصر اذوباتیں عرض کرنی ہے: نمبر ایک یہ کہ فقہاء کرام نے شعر پر جو رقم دی جاتی ہے اور اس کے لینے کو من السحت قرار دیا ہے، دراصل وہ اس سیاق میں ہے کہ بادشاہوں اور حکمرانوں اور امراء کی تعریف پر بیت المال سے جو ان کو مال ملتا ہے اس بناء پر انہوں نے اس کو سحت قرار دیا ہے، کیوں کہ بیت المال کی رقم اور اس کے مال کا مقصد یہ نہیں ہے۔ دوسری چیز جو مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ کہ کھیل پر شرط کی رقم لگانا اس کا تعلق درحقیقت ان کھیلوں سے ہے جو جہاد کی تربیت میں معاون ہوتے ہیں ہر کھیل سے اس کا تعلق نہیں۔

## مولانا عبدالرحیم کشمیری:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، حمد و نصلی علی رسولہ الکریم، أما بعد! مجھے مختصر اذوبتیں چیزیں عرض کرنی ہے پہلی چیز سیاحت کے متعلق ہے، سیاحت کے بارے میں سوال میں بھی تشکیک ہے اور جوابات میں اس چیز کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ چوں کہ میرا تعلق کشمیر سے ہے وہاں پر بڑی انڈسٹری اور آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہے، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سیاحت میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بہت سارے لوگوں کا روزگار اس سے جڑا ہوا ہے اور ان کی آمدنی کا یہی ذریعہ ہے اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ان جگہوں پر نہیں جانا ہے جیسے ابھی عرض میں یہ بات بھی آئی ہے کہ یورپی ممالک یا غیر مسلم ممالک یا وہ مسلم ممالک جو ان کی تہذیب سے متاثر ہیں ان جگہوں پر نہ جایا جائے، تو لازماً اس کا نقصان ہوگا، اور وہ چیز بھی ہمیں پیش نظر رکھنی ہے نمبر ایک۔ نمبر دو یہ بات ہے کہ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے اور کشمیر کے حالات کے پس منظر میں ہم نے بہت سوچا ہے کہ وہاں غیر ملک سے اور تمام دنیا سے جو آنے والے سیاح ہیں ان کے مقاصد میں صرف تفریح نہیں ہے بلکہ ہم یقین کی حد تک یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اپنی تہذیب کو پھیلا نا اور اس کو نافذ کرنا اور جتنا ہو سکے اس کو آگے بڑھانا یہ بھی ان کے مقاصد میں شامل ہے۔

ایک واقعہ میں مختصر عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں ایک کونینٹ اسکول ہے اس نے ایک سفر کا اہتمام کیا، ہندوستان گھمانے کا مطلب مختلف شہروں کا تو وہ چوں کہ کونینٹ اسکول ہے عیسائی چرچوں میں ان کو دکھایا اور کہا کہ یہ ہمارے چرچ ہیں اس کے بعد مسلمان مراکز کے نام پر حضرت نظام الدین وغیرہ ان جگہوں پر لے گئے، جہاں شروع سے ہی جانے سے پہلے بھکاریوں کا استقبال شروع ہو جاتا ہے اور چھینا چھٹی شروع ہو جاتی ہے تو واپسی پر ان معصوم بچوں کے تاثرات یہ تھے کہ نعوذ باللہ ہم اسلام سے نفرت کرتے ہیں چوں کہ اسلام کے نام پر وہ مناظر دکھائے گئے اور عیسائیت کے نام پر وہ مناظر دکھائے گئے، یہ چیز سیاحت میں بہت اہم ہے کہ آج کل سیاحت، ٹورزٹریولس پروگرام وغیرہ ہوتے ہیں ان کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی تہذیب سے آشنا ہونا، کسی تہذیب سے متاثر ہونا یا کسی تہذیب کو آگے بڑھانا، یا خود متاثر ہونا یا اس کو پھیلا نا۔ اب میری گزارش ہے کہ مثلاً اگر ہم کشمیر کے اس میں کہیں، ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھیے کہ امر ناتھ یا ترا جو ہے اس کے اندر سیاحت کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی پہلو بھی ہے آج سے بیس سال پہلے وہاں یاتریوں کی تعداد بہت مختصر تھی اور وقفہ بھی بہت مختصر تھا پندرہ دن کا۔ اور آج وہی تعداد لاکھوں میں ہے لاکھوں سے متجاوز ہے اور وقفہ بھی تقریباً دو مہینے سے زیادہ کا ہو جاتا ہے۔ ریاستی سرکار اس پر دوایلا مچاتی ہے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سیاحت سے زیادہ مذہبی تیرتھ یا ترا سے زیادہ ایک احیاء پسندی ہے ایک خاص طبقہ کی اور ایک خاص نظریہ کی، اگر اس چیز کو مد نظر رکھا جائے تو اسلامی ممالک اور ایسی جگہوں پر جہاں مسلمانوں کے ہاتھ میں یہ چیزیں ہیں وہاں جانے کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے نہ کہ حوصلہ شکنی، البتہ یہ شرط لگا دی جائے کہ وہاں جانے کا مقصد سیر و تفریح ہی نہ ہو بلکہ دعوتی مقصد ہو، ہو سکتا ہے کہ ہمارے وہاں لٹریچر لے جانے سے، غیر مسلموں سے بات کرنے سے دعوت کا میدان ہمارے لئے کھل جائے اور ہم

دعوتی کام کر سکیں، ایک تو یہ گزارش ہے یہ پہلو سوال میں بھی تشنہ تھا، جو بات میں بھی اس کی طرف توجہ نہیں گئی۔

دوسری بات عرض ہے کہ کارٹون کے بارے میں، شاید آپ حضرات اس حقیقت سے واقف ہوں کہ قانونی لحاظ سے صدر جمہوریہ کا کارٹون بنانا ممنوع ہے، چوں کہ کارٹون کی بنیاد اور اصلیت جو ہے تقریباً توہین پر ہوتی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اخبارات میں جب کارٹون ہوتا ہے تو اس میں جو انسان کا حلیہ ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خود اس کو دیکھ کر ہنس پڑتا ہے اس میں پھر یہ بحث کہنا کہ بھائی اس میں یہ نہ ہو یہ نہ ہو، اس کے اصل ہی کو دیکھا جائے کہ اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ فلموں کے بارے میں جہاں دستاویزی فلموں وغیرہ کی بات آئی ہے وہاں یہ پیش نظر رکھا جائے کہ مغربی ممالک میں بعض فلمیں مثلاً ”دی میسج“ کے نام سے ایک فلم بنی ہے، جامعہ ازہرنے جو ہے اس کی اجازت بھی دی ہے، لیکن دیکھنے والوں کا تاثر یہ تھا کہ جب ہم نے اس فلم کو دیکھا تو یا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یا باقی انبیاء کے بارے میں فلمیں آئیں ہیں تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دیکھنے کے بعد جو ایک عظمت ہوتی اور قلوب میں ایک ہیبت ہوتی ہے انبیاء علیہم السلام کی دیکھنے کے بعد چوں کہ وہ تصور تصویر کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو پھر جب بھی موسیٰ علیہ السلام کا یا انبیاء علیہم السلام کا تصور ہوتا ہے تو وہی شکل سامنے آتی ہے جو کسی ہیرو نے ادا کیا ہے رول۔ اور اس سے اس عظمت میں فرق آجاتا ہے، ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ جزاکم اللہ۔

مولانا ظہیر احمد (کانپور)

مجھے جو بعض چیزیں کہنی تھی وہ ہمارے سابق ساتھی بات کہہ چکے ہیں، صرف ایک بات عرض ہے کہ جوڈراموں کی جو بات چل رہی تھی اس میں ایک چیز کو اور شامل کر لیا جائے، سوال میں وہ واضح نہیں ہے اور عام طور سے اس کا استعمال اکثر ہوتا ہے جس کو ٹکڑا ٹکڑا کہا جاتا ہے اس کے اندر بھی بعض تنقید یعنی حکومتوں پر اور اس کی پالیسیوں پر یا جو اصلاح کے بھی اس کے اندر مقاصد ہوتے ہیں اس کو بھی شامل کر لیا جائے اور اس پر غور کیا جائے۔

مولانا سیف الرحمن صاحب (الہ آباد)

بسم اللہ الرحمن الرحیم، سوال۔۔۔ (د) کے تحت تجارتی سامان یا کرایہ پر سامان دینے سے متعلق عرض میں جو باتیں آئی تھیں اس میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارا شہر الہ آباد جو ہے وہ کبھی شہر ہے تو وہاں ہر سال کنبہ کا میلہ ہوتا ہے تو اس کنبہ کے میلے میں بہت سے مسلم تاجر ہیں جو اپنا شامیانہ اور تخت اور سارے لائٹ کا سامان دینا چاہتے ہیں، اسی طرح سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو غیر مسلموں کے یہاں مزدور ہیں اور ان لوگوں سے دسہرے کی اور کنبہ کے میلے کی بلیوں کو کھدوایا جاتا ہے اور لائٹ لگوائی جاتی ہے تو کیا ان لوگوں کو ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز ہے اس کی وضاحت ہو جائے تو بہت بہتر ہے تجویز میں۔

مولانا ناصر اللہ ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم، سوال (۱) سے متعلق عرض کرنا ہے کہ اکثر مقالہ نگاروں نے مزاح کے جواز کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ اس میں جھوٹ نہیں ہونا چاہئے، جب کہ اکثر مقالہ نگاروں نے بلکہ تمام مقالہ نگاروں نے مزاحیہ کہانی لکھنے کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ مزاحیہ کہانیاں جو ہوتی ہیں وہ جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں تو مزاح کرنے میں جھوٹ نہ ہو اور مزاح لکھنے میں جھوٹ ہو یہ فرق کیوں ہے؟ اس کی دلیل کیا ہے اس کی وضاحت کر دو؟ جائے تو بہتر ہوگا۔ دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ جو سوانامہ میں نہیں ہے کہ ٹی وی پر مزاحیہ پروگرام دیکھنا، آج کل کامیڈی کے نام سے مزاح کا بہت رواج ہو گیا ہے اور اس کے باضابطہ چینل قائم ہو گئے ہیں تو کیا ٹی وی پر مزاحیہ پروگرام کا دیکھنا جائز ہے کہ نہیں ہے۔ تجاویز میں اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ اور تیسری بات کرکٹ سے متعلق ہے کہ کرکٹ دیکھنا اور کھیلنا اس میں فرق ہونا چاہئے۔ کرکٹ کی جو ساری خرابیاں ہیں وہ دیکھنے کی وجہ سے آگئی ہیں۔ کرکٹ اگر مختصر وقت کے لئے کھیلا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ جزاکم اللہ۔

مولانا مفتی محمد ساجد قاسمی (راپور)

بسم اللہ الرحمن الرحیم، کرکٹ سے متعلق جو بات آئی ہے اس میں بڑی شدت معلوم ہوتی ہے، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا کرکٹ فی نفسہ ناجائز ہے یا خارجی امور کی وجہ سے کرکٹ کو ناجائز قرار دیا گیا۔ اگر خارجی امور کی وجہ سے کرکٹ کو ناجائز قرار دیا جا رہا ہے تو ایسا کوئی کھیل شاید نظر سے نہیں گزرتا ہے جو خارجی امور کی وجہ سے ناجائز نہ ہو جائے، مثلاً موبائل فون کا استعمال ہے اگر اس کا صحیح نچ پر استعمال کیا جائے تو اس کا استعمال صحیح ہوگا اور اگر

اس کو چیس کے ساتھ غیر مناسب مناظر دیکھنے کے لئے یا ناجائز باتیں، یا ناجائز تعلقات کے لئے اس کو استعمال کیا جائے یا ڈرامے وغیرہ دیکھنے کے لئے یا چٹکلے وغیرہ دیکھنے کے لئے استعمال کیا جائے تو موبائل فون کا بھی اس طرح استعمال ناجائز ہو جائے گا۔ اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ جس طرح موبائل کو شرطوں کے ساتھ استعمال کی اجازت دی جاتی ہے اسی طرح کرکٹ کو بھی شرائط کے ساتھ کھیلنے کی اجازت ملنی چاہئے۔

ڈاکٹر ظفر انجم صاحب (امریکہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، کھیلوں کے..... جو ہو رہا ہے اور مسلمان جس بات کی فکر کر رہے ہیں میں اس کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں، آج کل جو نوجوان نسل ہیں وہاں امریکہ میں اور دوسرے مغربی ممالک میں ان کو اسلام سے جوڑے رکھنے کے لئے بہت بڑی فکر ہو گئی ہے اس لئے کہ وہ مسجدوں کو نہیں آتے اور پھر وہ کھیلنے کے لئے جاتے ہیں دوسرے گراؤنڈس میں۔ اپنے دوسرے اسکولوں کے میدان میں جاتے ہیں، کلبوں میں جاتے ہیں اپنے غیر مسلم دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہیں تو پوری طرح اسلامی ماحول سے دور ہیں تو وہاں کے بزرگوں کو والدین کو اور جوڈہ ہی لیڈر ہیں ان کو یہ بڑی فکر لاحق ہو گئی کہ ان نوجوانوں کو دین سے کیسے جوڑا جائے اور ان کو مسجدوں اور اسلامک سینٹروں میں کیسے لایا جائے تو اس وقت بڑی تحریک چل رہی ہے کہ جو بھی نئی مسجد بنتی ہے وہ صرف مسجد کے نام سے نہیں بنتی بلکہ اس کے لئے بہت بڑی زمین لی جاتی ہے تاکہ مسجد سے ملحق اور متصل ان کے لئے جمنایم بنائے جائیں تاکہ نوجوان مسلمان وہاں پر آئیں یوتھ وہاں باکس بال کھیلیں، وہاں پر دوسرے گیمس کھیلیں اور ایک ہمارے وہاں پر امام ہیں وہ تو کرکٹ کھیلتے ہیں ماشاء اللہ، مسجد کے باہر میدان ہے اس میں کرکٹ کھیلتے ہیں، تو اس طرح کے کھیلوں کو جائز کرنے میں اس وقت وسعت نظر سے کام لینا چاہئے کیوں کہ اس سے دوسرے بہت سے فائدے بھی شامل ہیں اس سیمینار سے انشاء اللہ مغربی ممالک میں جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم یہ سب پیغام لے کر پہنچیں گے تو کل جو تجاویز آئے گی تو اس سلسلہ میں میری عرض ہے اور گزارش ہے کہ اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ جزاک اللہ۔



علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# لیکچرشن کے شرعی مسائل

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بائیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۲۵-۲۷/۲/۲۰۱۳ء کو جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد  
الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۹ تا ۱۱ مارچ ۲۰۱۳ء کو جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد  
امروہہ، اتر پردیش میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

### مجلس ادارت

- ۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنہجلی
- ۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
- ۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- ۵- مولانا تقی احمد بستوی
- ۶- مفتی محمد عبید اللہ سعدی



## پیش لفظ

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے آزاد پیدا کیا گیا ہے، نہ اس کو یہ بات قبول ہوتی ہے کہ کسی کو اس پر اختیار حاصل ہو اور نہ اس کو یہ بات گوارا ہوتی ہے کہ اس پر اس کی جنس سے تعلق رکھنے والے کسی اور شخص کی حکومت ہو، اسی فطری جذبہ کی تکمیل کے لئے ریاستی نظام ترقی کرتے کرتے اس تصور تک پہنچا کہ عوام پر عوامی نمائندہ کے واسطے سے خود عوام کی حکومت ہونی چاہئے، اسی تصور کو جمہوریت کا نام دیا گیا، جس میں انسان اپنے آپ پر کسی شخص یا گروہ کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ کوئی فرد یا گروہ زبردستی اس پر مسلط ہو جائے یہ اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ ہوتا ہے، اور خود اس کے نمائندے اس پر حکومت کرتے ہیں۔

اس نظام حکومت میں ایکشن کو مرکزی حیثیت اور بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، ایکشن کے ذریعہ عوام اپنے حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہیں اور جو لوگ منتخب ہوتے ہیں ایک مقررہ مدت کے لئے ان کا حق حکمرانی ثابت ہوتا ہے، اسی لئے اگرچہ کہ جمہوری طرز حکمرانی کی خود کئی قسمیں ہیں، کہیں صدارتی نظام ہے، اور کہیں پارلیمانی، کہیں دو جماعتی نظام ہے، کہیں کثیر جماعتی، کہیں صدر کا انتخاب عوام کرتے ہیں، اور کہیں عوام کے منتخب نمائندے، لیکن بنیادی طور پر رائے عامہ کی تائید کا حصول ہر صورت میں ضروری ہوتا ہے اور حکومت کو وجود میں لانے کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ایکشن کے ذریعہ حکمرانوں کا انتخاب اسلامی نقطہ نظر سے بھی قابل قبول بلکہ مطلوب ہے، اسلام سے پہلے پوری دنیا میں خاندانی بادشاہت کا نظام جاری تھا، جزیرۃ العرب کے پڑوس میں روم و ایران اور یمن کی حکومتیں قائم تھیں اور ان سب میں طریقہ حکمرانی شاہی نظام پر مبنی تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کو نظام کو پسند نہیں کیا، بلکہ آپ نے قیصریت اور کسرویت پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اور مسلمانوں کو اپنے اختیار سے اپنا حکمران منتخب کرنے کا حق دینے کی غرض سے اپنے بعد اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا، اگرچہ آپ نے نماز میں امام بنا کر ایک لطیف اشارہ کر دیا کہ مسلمانوں کو حضرت ابو بکرؓ کو اس منصب پر لانا چاہئے، جن کی نہ صرف قربانیاں بڑھ کر تھیں، بلکہ وہ فہم و فراست، مزاج نبوت سے ہم آہنگی، امت کو مجتمع رکھنے کی صلاحیت، سختی کے موقع پر جرات و شجاعت، اور نرمی کے موقع پر لطف و مروت کے اعتبار سے بھی اپنے رفقاء میں سب سے ممتاز شخصیت کے حامل تھے، اگر آپ صراحتاً ان کی خلافت کا اعلان فرمادیتے تو صحابہ اسے ”حق بحق دارر سید“ ہی کا مصداق سمجھتے، لیکن بادشاہت کی جگہ خلافت اور آمریت کی جگہ شوراہیت کے طریق کو فروغ دینے کے لئے آپ نے خلافت صدیقی کی صراحت کرنے سے گریز فرمایا اور علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت خود بخود مستحق نہیں ہوئی بلکہ جب صحابہ نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کر لی تب آپ کی خلافت وجود میں آئی، اسی طرح حضرت عمرؓ کو اگرچہ حضرت ابو بکرؓ نے نامزد فرمایا لیکن صرف اس نامزدگی کی وجہ سے حضرت عمرؓ خلیفہ نہیں ہوئے بلکہ جب صحابہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تب آپ کی خلافت منعقد ہوئی۔

اس زمانے میں امت مسلمہ کے ارباب حل و عقد، ۸۰۰ سے ۸۰۰۰ میں جمع تھے، اس لئے ان کی جانب سے کسی حکمران کا انتخاب کافی تھا، لیکن آبادی کے پھیلاؤ اور ملت کی ذمہ دار شخصیتوں کے مختلف علاقوں میں بکھراؤ کے اعتبار سے موجودہ دور میں یقیناً کسی ایک شہر کے لوگوں کا اتنے اہم مسئلے پر رائے دیدینا کافی نہیں ہوگا، اس لئے اگر آج کسی خطہ میں اسلام کا مطلوب نظام خلافت قائم ہو تو اس کی شکل یہی

ہوگی کہ عوام اپنے نمائندے منتخب کریں، اور یہ نمائندے حکمران کا انتخاب کریں، البتہ اسلامی نقطہ نظر سے دوٹوں کی اکثریت کافی نہیں ہوگی، بلکہ یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ جس شخص کو منتخب کیا جائے وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے مقتدی بننے کے لائق بھی ہو، مغربی جمہوریت کا بنیادی نقص یہی ہے کہ اس میں مقدار کو تو اہمیت دی گئی ہے لیکن معیار کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے، دوٹوں کی اکثریت کو تو اہمیت دی گئی ہے، لیکن اخلاق و کردار کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھا گیا۔

ہندوستان میں سیاسی نظام جمہوریت پر مبنی ہے، بلکہ بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایک کثیر مذہبی معاشرہ میں اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہاں سیاسی و اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ شریعت اسلامی کے مطابق بنایا جائے گا، اس لئے ہمیں ملک کے مرد و جہ آئین و قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی ان مسائل پر غور کرنا ہوگا، اور ہمیں یقین ہے کہ کسی ملک میں حکومت اور قانون کی لگام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا اس سلسلے میں ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں ہر صورت اور ہر حال میں شریعت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

الیکشن کے موجودہ نظام میں کئی مسائل مسلمانوں کے لئے دینی اعتبار سے قابل توجہ ہیں، الیکشن میں عوامی نمائندوں کو خود امیدوار بننا پڑتا ہے، مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی جماعتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں، اور وہ قومی جماعتوں کا بھی حصہ بن سکتے ہیں، بعض ایسی فسطائی پارٹیاں بھی ہیں جنہوں نے اپنے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو شامل رکھا ہے، خود یہ مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ شرعاً ووٹ دینے کی کیا حیثیت ہے؟ ایک اہم مسئلہ خواتین کے الیکشن میں حصہ لینے کا ہے، اس طرح کے اور بھی مسائل ہیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ان میں سے بعض مسائل پر اپنے چودھویں سمینار منعقدہ حیدرآباد میں بحث کی تھی، لیکن کئی مسائل وہ تھے جن پر ابھی غور و فکر کی ضرورت باقی تھی، اسی لئے اکیڈمی کے بائیسویں سمینار منعقدہ امر وہہ میں ان موضوعات کو زیر بحث لایا گیا، بجز اللہ اس موضوع پر بڑی تعداد میں اور بڑے اہم مقالے آئے، سمینار میں بھی اس موضوع پر خوب مناقشہ ہوا اور اہل علم کی بڑی تعداد نے اس میں حصہ لیا، ان مقالات و مناقشات کی روشنی میں تجاویز منظور ہوئیں، ان ہی مقالات و مباحث اور تجاویز کا مجموعہ اس وقت قارئین کے سامنے ہے، جس کو اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفیق محب عزیز مولانا مفتی محمد سراج الدین قاسمی نے بڑی خوش اسلوبی اور محنت کے ساتھ مرتب اور ایڈٹ کیا ہے، دعا ہے کہ اکیڈمی کے سابق مجلات کی طرح اسے بھی قبولیت اور پزیرائی حاصل ہو، اللہ تعالیٰ اس کو امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔ وباللہ التوفیق وهو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکرٹری)

۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ / ۲۹ جنوری ۲۰۱۳ء

## خطبہ صدارت

(حضرت) مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی صدر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) و اسٹاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم!

محترم علماء کرام! ہم سب لوگوں کا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کو لیکر آئے وہی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور اس کے بندوں سے مطلوب ہے، دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، جو عقائد اور بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے؛ لیکن شریعت مختلف رسولوں کے ذریعے ان کے زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے بھیجی گئی، جو اپنی مکمل اور آخری شکل میں پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، دین و شریعت کا یہ مجموعہ قرآن و حدیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود و محفوظ ہے۔

انسانی زندگی میں کچھ مسائل تو ایسے ہیں، جن میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور کچھ ایسے امور بھی ہیں جن میں تبدیلیاں پیش آتی رہتی ہیں، انہیں کی وجہ سے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا، انبیاء کے ذریعہ یہ ضرورت پوری ہوتی تھی اور نئی شریعت پہلی شریعت کی جگہ لے لیتی تھی، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ مکمل ہو گیا اور آئندہ کی نئی شریعت کا امکان باقی نہیں رہا تب بھی یہ مسائل خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیدا ہوتے رہے، جب اس طرح کے مسائل پیدا ہوتے اور صحابہ آپ سے دریافت کرتے یا کسی بات میں تامل ہوتا اور وہ وضاحت چاہتے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی اس کا جواب وحی متلو کی شکل میں آتا اور کبھی وحی غیر متلو کی شکل میں؛ چنانچہ قرآن مجید میں ۱۳ مقامات پر ”یسئلونک“ کے ذریعہ صحابہ کے سوالات کا ذکر کرتے ہوئے، ان کے جواب دیئے گئے ہیں، تفسیر کی ذیل میں ایک مستقل علم ”اسباب نزول“ کا ہے، جس میں ان واقعات کو بیان کیا جاتا ہے، جن کے پس منظر میں قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی ہے، اسی طرح علم حدیث میں ایک مستقل فن ”اسباب درود“ کا ہے، جس میں ان واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کے پیش آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ہدایت دی، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آنے والے مسائل کے حل کا طریقہ یہی تھا کہ صحابہ سوال کرتے اور وحی کے ذریعے اس کا جواب دیدیا جاتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ ہی نے ہدایت فرمائی کہ جو نئے مسائل پیش آئیں، ان کو پہلے کتاب اللہ میں دیکھا جائے، پھر سنت رسول میں تلاش کیا جائے اور یہ نہ ملے تو اجتہاد سے کام لیا جائے، جیسا کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ کو کارقضاء سپرد کرتے وقت آپ کی گفتگو ہوئی، قرآن و حدیث میں اجماع کے حجت ہونے کی بھی وضاحت موجود ہے، اور حدیث میں متعدد مثالیں قیاس کی بھی موجود ہیں، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو طریقہ کار بتا دیا کہ اگر نئے مسائل پیش آئیں، تو اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے اجتہاد سے کام لیں، نیز کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس کی روشنی میں مسائل کو حل کریں اور جو لوگ خود اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں وہ مجتہدین کی اتباع کریں: ”فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون“ (سورۃ نحل: ۴۳)۔

چنانچہ صحابہ کرام کے عہد سے لیکر ائمہ مجتہدین کے عہد تک نئے مسائل کے حل کا یہی طریقہ رہا ہے اور اسی منہج پر اس زمانے تک مسائل

حل کئے جاتے رہے ہیں، طریقہ اجتہاد کو مزید واضح کرنے کے لئے اصول فقہ کی تدوین عمل میں آئی، اصول فقہ کے ذریعے ہمیں احکام کو اخذ کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے اور مختلف احکام کے مدارج بھی معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح اجتہاد میں ایک اور معاون فن "اصول حدیث" کا ہے، جس کے ذریعے احادیث کے مقبول و نامقبول ہونے کی تحقیق ہوتی ہے، ناسخ و منسوخ کی شناخت ہوتی ہے، نیز رفع تعارض اور ترجیح کے اصول معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح احکام شریعت کے سب سے بڑے مآخذ حدیث سے مجتہد استفادہ کر سکتا ہے۔

ائمہ مجتہدین کے بعد صلاحیت، صالحیت اور حفاظت دین کی حکمت و مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ گذشتہ فقہاء کے اجتہادات کو سامنے رکھتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور سلف صالحین کی تصریحات اور ان کے اجتہادات کو اپنے لئے نظیر بنایا جائے، اس وقت سے یہی طریقہ کار رائج ہے اور بحمد اللہ اسی طریقہ پر مسائل حل ہو رہے ہیں، غور کیا جائے تو اس طریقہ میں تقلید بھی ہے اور ایک طرح کا اجتہاد بھی، تقلید اس لحاظ سے کہ گذشتہ فقہاء کے اجتہاد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسائل کو حل کیا جاتا ہے اور اجتہاد اس لحاظ سے کہ ان مسائل کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے جن کے متعلق گذشتہ فقہاء کی صراحت موجود نہیں ہے، اگر عرف اور احوال بدل گئے ہوں، تو احکام میں تبدیلی بھی ہوتی ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارا یقین ہے کہ تمام ائمہ متبوعین اپنے اجتہاد میں مخلص تھے، حق پر تھے اور انہوں نے درست تر رائے تک پہنچنے کی بہترین کوشش کی ہے؛ اسی لئے اگرچہ تقلید واجب ہے؛ لیکن یہ بقول حضرت تھانوی انتظام دین کے نقطہ نظر سے واجب ہے؛ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

”سو ہم تقلید شخصی کوئی نفسہ فرض یا واجب نہیں کہتے؛ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے“ (خطبات حکیم الامت: ۱۷۲/۶)۔ اسی بنیاد پر قدیم زمانے سے اہل علم نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ بوقت حاجت مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کی طرف عدول بھی کیا جاسکتا ہے، اس کی بہت سی مثالیں اہل علم کے یہاں موجود ہیں۔ جیسے مسئلہ الطہر کی عدت کا مسئلہ، امامت اور تعلیم قرآن پر اجرت وغیرہ کے مسائل؛ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”والحاصل أنه إذا اتفق أبو حنيفة وصاحباہ علی جواب لم یجز العدول عنه إلا لضرورة“ (رسو المفتی: ۷۰)۔ اس کی بہت سی نظیریں فقہاء کے یہاں موجود ہیں، حضرت تھانوی نے اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اسباب تفریق سے متعلق الحیلۃ الناجزۃ للحیلۃ العاجزۃ مرتب فرمائی جس سے آپ سبھی حضرات واقف ہیں، غرض کہ نئے مسائل کو حل کرنے کے لئے جہاں شدید حرج ہو، دوسرے مجتہدین کے اقوال سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، عبادات میں عام طور پر اس کی ضرورت کم پڑتی ہے؛ لیکن معاملات میں اس کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، اسی لئے موجودہ دور میں ہمارے جو علماء اسلامی مالیاتی نظام پر علم و تحقیق کا کام کر رہے ہیں، انہوں نے حسب ضرورت دوسرے مذاہب سے استفادہ کیا ہے، اس سلسلے میں حضرت تھانوی کی یہ صراحت بہت ہی چشم کشا ہے:

”میرا ارادہ تھا کہ ایک رسالہ احکام معاملات میں ایسا لکھوں کہ جن معاملات میں عوام مبتلا ہیں، اگر وہ صورتیں کسی مذہب میں بھی جائز ہوں تو اس کی اجازت دے دوں؛ تاکہ مسلمانوں کا فعل کسی طرح سے توضیح ہو سکے، میں نے احتیاطاً اس کے بارے میں حضرت مولانا گنگوہی سے بھی دریافت کیا کہ ایسے مسائل میں دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرت نے بھی اجازت دے دی، مولانا بہت پختہ حنفی تھے (کلمۃ الحق: ۷۱)۔

اسی طرح اس بات کی بھی گنجائش نکلتی ہے کہ بوقت ضرورت مذہب غیر مفتی بقول کو بھی اختیار کر لیا جائے، چنانچہ علامہ شامی کا بیان ہے:

قلت: لكن هذا في غير موضع الضرورة فقد ذكر في حيز البحر في بحث ألوان الدماء أقوالاً ضعيفة ثم قال: وفي المعراج غن فخر الأئمة: لو أفتى مفت بشيء من هذه الأقوال في مواضع الضرورة طلباً للتيسير كان حسناً (رد المحتار: ۱۰۵۱)

نئے مسائل کو حل کرنا، خواہ یہ گذشتہ فقہاء کی عبارتوں کی روشنی میں ہو یا مذہب کے قول ضعیف کو لیکر ہو یا بوقت ضرورت دوسرے مکاتب فقہ کی طرف عدول کے ذریعہ ہو، ہر صورت میں غور کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ انفرادی ہے اور دوسرا طریقہ اجتماعی اور شورائی، یہ دونوں ہی طریقے عہد صحابہ سے جاری ہیں، جہاں ہمیں صحابہ کے انفرادی اقوال ملتے ہیں، وہیں حضرت عمر کی مثال بھی ملتی ہے کہ آپ نے بہت سے مسائل پر تنہا غور کرنے کے بجائے اکابر صحابہ کو جمع کیا اور ان کے مشورے اور ان کی مدد سے مسائل کو حل کیا، اسی طرح ائمہ متبوعین میں امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسی اجتماعی طریقہ اجتہاد کو اختیار کیا جس کی تفصیل تاریخ اور امام ابوحنیفہ کے مناقب سے متعلق کتابوں میں موجود ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی نے سلف صالحین کے اسی منہج کو اختیار کیا ہے، جس میں کتاب و سنت کی روح کو سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ گذشتہ فقہاء کے اجتہادات پیش نظر رکھے جاتے ہیں اور فقہی نظائر و امثال کی روشنی میں رائے قائم کی جاتی ہے؛ البتہ جن مجتہد فیہ مسائل میں احوال زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے حرج پیدا ہو جاتا ہے، ان میں مذہب کے قول ضعیف کو یا بعض دفعہ ائمہ اربعہ میں سے کسی اور کی رائے کو قبول کیا جاتا ہے، لیکن ایسے مسائل بہت کم ہیں، جن میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی، نیز یہ عمل انفرادی نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی غور و فکر اور بحث و مناقشہ کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے، انشاء اللہ آئندہ بھی اسی منہج پر اکیڈمی اس خدمت کو انجام دیتی رہے گی۔

حضرات! میں اپنی طرف سے بھی اور اکیڈمی کی طرف سے بھی آپ تمام حضرات کے تعاون کا بے حد شکر گزار ہوں، نیز ہمارے لئے سعادت کی بات ہے کہ یہ پروگرام اس ادارہ میں منعقد ہو رہا ہے جس کی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے رکھی ہے، جس میں حضرت نانوتوی کے سب سے زیادہ معتمد شاگرد حضرت مولانا احمد حسن امر وہوی نے سہا لہا سال حدیث کا درس دیا، اس ادارہ کا ہمیشہ دیوبند کے اکابر سے تعلق رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے اس اکٹھے ہونے کو قبول فرمائے اور امت کے لئے اسے نفع کا ذریعہ بنائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین



## پہلا باب تمہیدی امور

سوال نامہ:

### ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

انسان اپنی ضروریات کو پوری کرنے نیز اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے اپنے ہی جیسے بہت سے انسانوں کا محتاج ہوتا ہے، اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ سماج کو نظم و ضبط کی لڑی میں پرو دیا جائے، تنظیم کا ایک دائرہ تو نسبتاً محدود ہوتا ہے، جس کو ہم 'خاندان' کہتے ہیں، دوسرا دائرہ اس سے وسیع تر ہوتا ہے، جس کو سلطنت اور حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسے کسی نظام کے بغیر انسان کی تمام ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں؛ اسی لئے ہر مہذب سماج ریاست کے زیر سایہ زندگی گزارتا آیا ہے۔

حکومت کی تشکیل کے مختلف طریقے زمانہ قدیم سے مروج رہے ہیں، موجودہ عہد میں جس سیاسی نظام کو مشرق سے مغرب تک پوری دنیا میں غلبہ حاصل ہے، وہ ہے جمہوری نظام، جمہوریت کے بعض اصول اسلام کے طرز حکمرانی سے بہت قریب ہیں، اور بعض اسلامی تعلیمات کے مغایر بھی ہیں؛ لیکن چونکہ جمہوریت کی متنوع شکلیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور اس میں مختلف طرز حکومت کو سمو لینے کی گنجائش ہے؛ اس لئے بہت سے مسلمان ملکوں میں بھی ایسی جمہوریت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے، جو شریعت اسلامی سے ہم آہنگ ہو۔

جمہوریت کا ایک اہم عمل عوامی رائے سے حکمران کا انتخاب کرنا ہے، اب چونکہ ہر ملک میں آبادی کا پھیلاؤ غیر معمولی حد تک بڑھ گیا ہے، اس لئے ملک کے ہر بالغ شہری کی رائے حاصل کرنے اور اس کو انتخاب کے عمل میں شریک کرنے کے لئے ایکشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، ایکشن کے ذریعہ گاؤں اور شہر کی سطح پر بھی عوام اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں، صوبہ کی سطح پر بھی اور ملک کی سطح پر بھی، پھر ان منتخب نمائندوں کی رائے سے ہیئت حاکمہ وجود میں آتی ہے، ملک کا سربراہ منتخب کیا جاتا ہے اور تمام فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ایکشن کا مسئلہ ان مسلمانوں کے لئے بھی اہمیت کا حامل ہے جو کسی مسلمان ملک میں بستے ہوں اور ان مسلمانوں کے لئے بھی جو اقلیت کی حیثیت سے کسی خطہ میں مقیم ہوں، نیز اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایکشن کے موجودہ طریقہ کار میں بہت سے شرعی مفاسد بھی شامل ہو گئے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایکشن سے مسلمانوں کے وسیع ترویجی و ملی مفادات متعلق ہیں۔ اگر وہ جمہوری نظام میں ایکشن سے بے تعلق ہو جائیں تو اس سے ان کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے اور ان کے مفادات پر کاری ضرب لگ سکتی ہے، یہ صورت حال نہ صرف غیر مسلم اکثریتی ممالک میں ہے؛ بلکہ اکثر مسلمان ملک کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، گزشتہ ساٹھ سال کے عرصہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہمارا جمہوری نظام مستحکم بنیادوں پر قائم ہے، گرد و پیش کے جتنے ممالک ہیں..... جن میں ہمارے ساتھ اور ہمارے بعد آزاد ہونے والے ممالک بھی شامل ہیں کے یہاں جمہوری نظام کو وہ استحکام حاصل نہ ہو سکا جو ہمارے ملک میں ہے، مشکل حالات میں بھی ہم نے جمہوری طرز فکر پر اپنے بھرپور ايقان کا ثبوت دیا ہے، یہ مستحکم جمہوریت جہاں ملک کے لئے سلامتی کی ضامن ہے، وہیں مذہبی، لسانی اور تہذیبی اقلیتوں کے لئے بہت بڑی نعمت ہے، یہ جمہوریت اور جمہوریت کے زیر سایہ انتخابی عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں بار بار حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن یہ تبدیلی

نہایت پُر امن طریقہ پر کسی تشدد اور بغاوت کے بغیر وجود میں آتی ہے، اور عوام ووٹ کی طاقت سے اپنی ناپسندیدہ حکومتوں کو ہٹا کر پسندیدہ حکومتوں کو لاتے ہیں۔

موضوع کی اہمیت اور موضوع سے متعلق مذکورہ پس منظر کی روشنی میں چند سوالات عرض خدمت ہیں، امید کہ کتاب وسنت اور فقہاء سلف کے اجتہادات نیز معاصر اہل علم کی آراء کے حوالے سے جواب عنایت فرمائیں گے:

- ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟
- ۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟
- ۳۔ الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟
- ۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔
- ۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟
- ۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟
- ۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں؛ لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟
- ۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟
- ۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے، اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔
- ۱۰۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ الیکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہئے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہئے، کیا ان کے لئے الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں تیزی سے یہ رجحان پنپ رہا ہے کہ سیاست میں عورتوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جائے، اس کے لئے مختلف ریاستوں میں اور مختلف سطحوں پر خواتین کے لئے سٹیٹس ریزرو کی جارہی ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پنچایت کی سطح پر پچاس فیصد سٹیٹس عورتوں کے لئے ریزرو کر دی گئی ہیں اور لوک سبھا سے پارلیمنٹ میں خواتین کے لئے ۳۳ فیصد ریزرویشن کا بل پیش کیا جا چکا ہے، اور قومی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کر لے۔

☆☆☆

## تجاویز:

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

- ۱۔ جمہوری نظام میں ووٹ کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس حق کا بھرپور استعمال کریں۔
- ۲۔ ایکشن میں باصلاحیت اور اہل افراد کا اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا جائز و بہتر ہے۔
- ۳۔ قانون ساز اداروں میں ملٹی مفادات کے تحت مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے؛ البتہ اگر کوئی قانون ایسا بنایا جائے جو شرعی احکام یا انسانی مصالح کے خلاف ہو تو اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا مسلم ممبران کا دینی و ملی فریضہ ہے۔
- ۴۔ مسلم ممبران کا یہ بھی دینی و ملی فریضہ ہے کہ شرعی احکام یا انسانی مصالح کے خلاف جو قوانین پہلے سے بنے ہوں، ان میں تبدیلی کرانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔
- ۵۔ منتخب ممبران کے لیے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- ۶۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں مسلمانوں کے لیے ایکشن میں حصہ لینا ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ لہذا ایسی سیاسی پارٹیوں میں شرکت درست ہے جن کا منشور فرقہ واریت پر مبنی نہ ہو۔
- ۷۔ مسلم خواتین کے لیے شرعی احکام کی رعایت کے ساتھ ووٹ دینا درست ہے۔





## تلیخیص مقالات:

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

مولانا فخر عالم قاسمی و مفتی احمد نادر القاسمی

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بانیسویں فقہی سمینار کے موضوعات میں سے ایک موضوع ”ایکشن سے مربوط شرعی مسائل“ ہے، اس موضوع سے متعلق اکیڈمی کوکل ۷۰ مقالات موصول ہوئے، جن کی تلیخیص اور فاضل مقالہ نگاروں کی آراء و تحریر کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

سوال نمبر ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

تمام مقالات کی خواندگی کے بعد سوالنامے کی شق اول: ووٹ کی شرعی حیثیت کے تعلق سے کل چھ طرح کی آراء سامنے آئی ہیں (۱) شہادت (۲) وکالت (۳) شفاعت (۴) مشاورت/امانت (۵) سیاسی بیعت (بشرطیکہ اسلامی ملک ہو) (۶) تقلیل شرودفع ضرر:

۳۵ فاضل مقالہ نگاران ایسے ہیں جن کی حتمی رائے یا غالب رجحان شہادت کی طرف ہے۔ جبکہ ۱۳ حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اپنی رائے یا رجحان کا اظہار نہیں کیا بلکہ مذکورہ الصدر تینوں یا چاروں شکلوں کے ممکن ہونے کا اشارہ دیا۔ ان میں سے پانچویں شکل: سیاسی بیعت کا رجحان رکھنے والوں کی تعداد کل تین ہے۔ اور تقلیل شرودفع ضرر کے قائل ایک ہیں (مولانا عثمان بستوی)۔ ۶ روہ لوگ ہیں جنہوں نے کھل کر ووٹ کو مشاورت بلقظ دیگر امانت کا درجہ دیا ہے۔ ۱۳ مقالہ نگار ایسے ہیں جنہوں نے ووٹ کی کوئی شرعی حیثیت تسلیم نہیں کی، بلکہ اس کو محض ایک رائے اور جدید انتخابی عمل سے تعبیر کیا، نیز ایک مقالہ میں شق اول و ثانی سے متعلق کوئی چیز نہیں ہے (مفتی شیر علی گجراتی)، جبکہ ایک میں ووٹ کی شرعی حیثیت وکالت تسلیم کی گئی ہے (مولانا محبوب فروغ قاسمی)، اسی طرح ۱۱ مقالہ نگاران ایسے ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں میں مذکورہ بالا شکلوں کو تو جگہ دی، لیکن اپنی رائے درجحان کو پیش کرنے سے کلیتہً گریز کیا۔

پہلا موقف:

مندرجہ ذیل حضرات کے نزدیک ووٹ کی شرعی حیثیت ”شہادت“ کی ہے:

مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالرب اعظمی، مولانا اسماعیل بن محمد صالح، مفتی سلطان کشمیری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد ارشد علی رضانی، مولانا محمد ابرار خان ندوی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا شاہین جمال، مفتی خالد حسین ندوی قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی آکولہ، مولانا اشتیاق احمد اعظمی القاسمی، مفتی محمد نصر اللہ ندوی، مولانا عبدالخالق راجپور، مولانا عابد الرحمن بجنوری، مفتی اکمل یزدانی القاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی عارف باللہ القاسمی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا عبداللطیف پلپوری، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی صاحب، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا صادق مبارکپوری، مفتی جنید بن محمد، مولانا محمد مقصود فرغانی، مولانا عبدالرشید کانپور، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی۔

مذکورہ حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں ان دلائل کو پیش کیا ہے:

قائلین شہادت کے دلائل:

(د) ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت، تسلیم کرنے کی صورت میں مقالہ نگاروں نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

ولانکتھ شہادۃ اللہ إنا اذا لمن الاثمین (مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

(۱) ولانکتھوا الشہادۃ ومن یکتھما فإنه اثم قلبه (بقرہ آیت ۲۸۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد قمر الزماں ندوی وغیرہ)۔

(۲) وأقيموا الشهادة لله (سورہ طلاق) (از مقالہ مولانا عبدالرب اعظمی وغیرہ)۔

(۳) كونوا قوامين لله شهداء بالقسط (مائدہ: ۷)۔

(۴) كونوا قوامين بالقسط شهداء لله (نساء: ۱۳۵) (مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

(۵) ولا يَأْبُ الشَّهَادَةَ إِذَا مَا دَعُوا (سورہ بقرہ: ۲۸۲) (دیکھئے مقالہ: مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا عبدالسلام کوثری وغیرہ)۔

(۶) والذين هم بشهادتهم قائمون۔ أولئك في جنت مكرمون (سورہ معارج ۳۵-۳۳) (مفتی فیاض عالم قاسمی، مولانا مجیب الرحمن ندوی)

(۷) فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور (سورہ حج: ۳۰) (مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی فیاض عالم قاسمی، مولانا محمد مجیب الرحمن ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی وغیرہ)۔

(۸) والذين لا يشهدون الزور (الفرقان: ۷۲) (مولانا شاہ اکرام الحق ندوی، مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

(۹) عن خريم ابن فاتك صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الصبح فلما انصرف قام قائماً فقال: عدلت شهادة الزور بالإشراك بالله ثلاث مرات ثم قرأ فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور (ابوداؤد، کتاب القضاء، باب في شهادة الزور حديث نمبر: ۳۵۹۹) (مولانا شاہ اکرام الحق ندوی)۔

(۱۰) اكبر الكبائر الإشراك بالله وعقوق الوالدين وشهادة الزور (بخاری باب ائمة من اشراك بالله ۶۳۰۸) (مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی وغیرہ)۔

(۱۱) من كتم شهادة إذا دعي إليها كان كمن شهد بالزور (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ۶۲۱) (دیکھئے مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا اقبال قاسمی)۔

(۱۲) ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها (صحيح مسلم باب بيان خير الشهداء ۲۰۷۷، مشکوٰۃ: ۲۲۷، سنن ابی داؤد ۲۰۵۰۶) (مولانا محمد ارشد علی رحمانی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی وغیرہ)۔

(۱۳) الناس إذا رأوا الظالم فلم يأخذوا على يديه أو شك أن يعمهم الله بعقاب (جمع الفوائد ۵۱/۲ بحوالہ ابوداؤد والترغزی) (مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبدالسلام کوثری، مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی لطيف الرحمن ولايت علی)۔

مسلمانوں کے پاس منکر کو روکنے کی طاقت ہونی چاہئے ایکشن میں صحیح امیدوار کو روٹ دینا منکر کو روکنے کا پہلا عمل ہے۔

(۱۴) من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فمن لم يسطع فبلسانه ومن لم يسطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان (مسلم: ۷۸) (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری)۔

(۱۵) تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الأثم والعدوان (سورہ مائدہ: ۲) (مولانا عبدالرحمن بخوری، مولانا غلام رسول منظور القاسمی)۔

(۱۶) أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها (نساء: ۵۸) شہادت ایک امانت ہے اور امانت کا اس کے اہل کے پاس سپرد کرنا واجب ہے (مولانا عبدالرب اعظمی، مولانا ارشد علی رحمانی)۔

(۱۷) مولانا محمد ابرار خاں ندوی لکھتے ہیں کہ شہادت نہ دینے کی وجہ سے کسی حقدار کا حق مارا جائے اور دوسرا کوئی گواہ موجود نہ ہو یا گواہ تو موجود ہو مگر اس کی گواہی لائق اعتناء نہ ہو تو ایسے مواقع پر شہادت دینا واجب ہے اور شہادت نہ دینا باعث گناہ ہے دلیل میں فتاویٰ ہندیہ کی عبارت پیش کرتے ہیں: ”ویلزم أداء الشهادة

ويأثم بكتماها إذا طلب المدعي... وإن ادعى غيره ولم تقبل شهادته يأثم من لم يؤد إذا كان ممن تقبل شهادته، كذا في التبيين، وإن كان هو أسرع قبولاً من آخرين ليس له الامتناع عن الأداء“ (الفتاوى الهندی ۲۸۰۲۵۲)۔

(۱۸) وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل تربهون به عدو الله وعدوكم (الانفال: ۶۰)۔

بعض مقالہ نگار کا مذکورہ آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ

آیت کریمہ میں قوت کا لفظ بہت جامع ہے جو ان تمام قوتوں کو شامل ہے جو نتائج اور فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں، بالیقین جمہوری ملک میں ووٹ کی قوت دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے اہم طاقت ہے اسے ہر حال میں استعمال کرنا چاہئے (دیکھئے مقالہ: مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

(۱۹) علی الشاهد أن يشهد حیثما استشهد (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۳، ۴۱۵)، امام طبری نے اس ضمن میں اس کی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ گواہی چھپانے کی ممانعت اس شکل میں ہے جب کسی حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو (تفسیر طبری ۶/۹۹)، (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی)۔

دوسرا موقف: وکالت/ شفاعت/ مشاورت:

اس مسئلہ میں دوسرا موقف وکالت، شفاعت اور مشاورت کا ہے، اس موقف کو اختیار کرنے والے علماء میں مندرجہ ذیل اسمائے گرامی بھی شامل ہیں:

مولانا فاروق سورت، مفتی عبدالرحیم القاسمی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مولانا توقیر بدر القاسمی، مولانا فیاض عالم قاسمی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم، مفتی جعفر علی رحمانی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی سہیل اختر قاسمی، مولانا عثمان بستوی۔

دلائل قائلین شفاعت:

ووٹ کی شرعی حیثیت ”شفاعت“ تسلیم کرنے کی صورت میں مقالہ نگاروں نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

(۱) من يشفع شفاعتة حسنة يكن له نصيب منها، ومن يشفع شفاعتة سيئة يكن له كفل منها (النساء: ۸۵) (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی وغیرہ)

(۲) إذا جاء رجل يسأل أو طالب حاجةً أقبل علينا بوجهه فقال: ”اشفعوا فلتؤجروا وليقض الله على لسان نبيه ما شاء“ (صحیح بخاری ۲، ۸۹۰، کتاب الادب باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضاً) (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

تیسرا موقف: سیاسی بیعت: مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

چوتھا موقف: مشاورت: اس مسئلہ میں چوتھا موقف علماء کا یہ ہے کہ ووٹ کی حیثیت مشاورت کی ہے، اس رائے کو اختیار کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا انور علی اعظمی، مولانا عبدالشکور قاسمی کیرالا، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا شارح عالم ندوی۔

پانچواں موقف: پانچواں موقف اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ووٹ ایک رائے اور جدید انتخابی عمل ہے، اور بس، اس موقف کو مندرجہ ذیل تین حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد الاعظمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی نسیم اختر ندوی۔

دلائل قائلین مشاورت/ امانت: ووٹ کی شرعی حیثیت ”مشاورت/ امانت“ تسلیم کرنے کی صورت میں مقالہ نگاروں نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

(۱) وأمرهم شورى بينهم (دیکھئے مقالہ: مولانا توقیر بدر القاسمی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی)۔

(۲) وشاورهم في الأمر (دیکھئے مقالہ: مولانا توقیر بدر القاسمی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی)۔

حدیث شریف میں صحیح مشورہ دینے کا حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۳) المستشار مؤتمن (الترمذی، باب ان المستشار مؤتمن) (دیکھئے مقالات: مولانا عبدالشکور قاسمی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مولانا عبدالرحمن بجنوری، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا شارح عالم ندوی، مولانا ناریحان مبشر قاسمی، مفتی سہیل اختر قاسمی صاحبان)۔

(۳) إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها، (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری)۔

(۵) اد الأمانة إلى من ائتمنك ولا تخن من خانك (ترمذی حدیث: ۱۳۱۱)، (دیکھئے مقالہ: مفتی خالد قاسمی نیوی)۔

(۶) إذا استنصح رجل أخاه فليصحه له (بخاری ۲۸۹۱) (دیکھئے مقالہ: مولانا توقیر بدر قاسمی)۔

(۷) من قلد انساناً عملاً وفي رعيته من هو أولى فقد خان الله ورسوله وجماعة المسلمين (رد المحتار ۸۰۳۸، کتاب القضاء) (مولانا ریحان مبشر قاسمی)۔

(۸) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول الله ﷺ: من استعمل رجلاً من عصابة وفي تلك العصابة من هو أرضى لله منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المؤمنين (المستدرک علی الصحیحین للحاکم حدیث: ۷۰۲۳) (مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

(۹) عن أبي هريره رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: فإذا ضيعت الأمانة فانتظر الساعة قال: كيف إضاعتها؟ قال: إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة (صحیح بخاری حدیث نمبر ۵۹-۶۳۹۷، مسند احمد ۸۷۲۹) (مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا اشتیاق احمد الاعظمی)۔

(۱۰) عن النبي ﷺ: لا إيمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لا عهد له (مشکوٰۃ: ۱۵) (مفتی غلام رسول منظور القاسمی)۔

سوال نمبر ۲: اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا، یا مستحب یا واجب؟ اس سوال کے جواب میں تین طرح کی آراء سامنے آئیں ہیں:

پہلی رائے: ووٹ ڈالنا مطلقاً واجب ہے

اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اپنایا ہے: مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالرب اعظمی، مولانا محمد اسماعیل بن محمد صالح، مفتی سلطان کشمیری، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا توقیر بدر القاسمی، شاہ اکرام الحق ندوی، مولانا شامیر علی صاحب، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا شوکت شاہ قاسمی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبدالشکور قاسمی آکولہ، مولانا اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی، مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا عبدالخالق راجپور، مولانا عبدالرحمن بجنور، مفتی اکمل یزدانی القاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا عبداللطیف پانپوری، مولانا عمران ندوی، مولانا یوسف علی صاحب، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان، مفتی جنید بن محمد، مولانا عبدالرشید کاپور، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مفتی اشرف قاسمی، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا عثمان بستوی، مفتی اقبال احمد کاپور، ڈاکٹر محمد مبین سلیم، حافظ کلیم اللہ عمری۔

نیز اس مسئلہ میں مفتی خالد حسین نیوی واجب لغیرہ، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی واجب کفایہ اور مفتی فہیم اختر ندوی بعض حالات میں مطلوب اور بعض حالات میں وجوب کے قائل ہیں، جبکہ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ حقوق پامال ہونے کا خطرہ ہو تو ووٹ دینا واجب ہے، اور اگر ووٹ دے کر حقوق پامال ہونے کا خطرہ ہو تو نہ دینا واجب ہے۔

تیسری رائے: وجوب کے دلائل:

چونکہ مذکورہ حضرات نے ووٹ کے وجوب کے لئے انہیں دلائل کا سہارا لیا ہے جو سوال نمبر ۱ (شہادت) کے ضمن میں ذکر کئے گئے، اس لئے مزید ان کا دہرانا تحصیل حاصل ہوگا، حسب ضرورت سوال نمبر ۱ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری رائے: ووٹ ڈالنا صرف جائز یا مستحب ہے:

مندرجہ ذیل حضرات علماء نے یہ رائے دی ہے کہ ووٹ دینا صرف جائز اور مستحب ہے:

مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا ثناء عالم ندوی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد فاروق،

مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد قمر عالم قاسمی، مولانا ربیعان ہبشر قاسمی۔

تیسری رائے: فرض کفایہ و فرض عین ہے:

اس مسئلہ میں تیسری رائے یہ ہے کہ ووٹ دینا بعض حالات میں فرض کفایہ ہے، اور بعض حالات میں فرض عین بھی ہو جاتا ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مفتی سہیل اختر قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی۔

ضرورت کے لحاظ سے حکم شرعی متعین کیا جائے گا:

بعض حضرات کے نزدیک تینوں طرح کا رجحان پایا جاتا ہے، حالات کے حساب سے کبھی واجب، کبھی جائز اور کبھی مستحب ہوگا، اس رائے کو اختیار کرنے والے علماء میں مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مفتی سلمان قاسمی پلنپوری، مفتی مقصود فرحانی، مولانا محمد اعظمی، مولانا فیاض عالم قاسمی۔

جبکہ مولانا عامر ظفر ایوبی کے نزدیک ووٹ پر کوئی حکم لگانا مشکل ہے، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس مسئلہ پر اطمینان

نہیں ہے۔

دلائل:

عام طور سے ان حضرات نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کو بنیاد بنایا ہے اور مزید دلائل بھی دیئے ہیں، مثلاً:

”ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها، فإنه اثم قلبه“ (سورہ بقرہ: ۲۸۳) (دیکھئے مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

سوال نمبر ۳: ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال نمبر ۳ کے تعلق سے تقریباً تمام مقالہ نگاروں نے خود سے عہدہ قبول کرنے کو ناپسند کیا ہے لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر جائز ہی نہیں بلکہ امر مستحسن قرار دیا ہے۔

مقالہ نگاران نے اپنے موقف کی تائید میں بہت سے نقلی اور عقلی دلائل و وجوہات بیان کئے ہیں، مثلاً:

(۱) ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ایکشن میں شرکت سے بے شمار فائدہ قومی، ملی، مذہبی مفادات وابستہ ہیں بلکہ کہیں تو اس کے بغیر ملت کا تشخص اور دین اسلام کی حفاظت بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

(۲) جمہوری قانون میں بنے ہوئے دفعات و قوانین کو پارلیمنٹ میں چیلنج کرنا، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا، منسوخی کا مطالبہ کرنا اور پارلیمنٹ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بنائے گئے قانون کو روکنا وغیرہ ایکشن میں شرکت کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی موثر ذریعہ ہے۔

(۳) یہاں دو مفسدے جمع ہیں: الف: ایکشن میں شرکت کا مفسدہ کہ غیر اسلامی حکومت کے قیام میں تعاون، دستور و آئین سے وفاداری کا حلف، جس میں بعض دفعات ایسی ہو سکتی ہیں جو قرآن و حدیث سے صراحتاً متصادم ہوں۔

ب: دوسری طرف ایکشن میں مسلم امیدوار کھڑا ہونے کی صورت میں مفسدہ ہے کہ اسلام کے خلاف پارلیمنٹ میں قوانین پاس کیے جائیں گے اور اسلام کی طرف سے دفاع کرنے والا وہاں کوئی نہیں ہوگا وغیرہ (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ: مولانا عبید اللہ ندوی)۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل نقلی دلائل بھی پیش کئے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

دلائل:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے حکومت کی درخواست ان الفاظ میں کی تھی:

اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵) (دیکھئے مقالات: مفتی نصر اللہ ندوی، مفتی عبدالرحیم القاسمی، مولانا اشتیاق الاعظمی، مولانا عبد السلام کوشی، مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا ناشوکت ثناء قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

(۲) حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بارے میں دعا فرمائی تھی: ”رب ھب لی ملکاً لا ینبغی لأحد من بعدی“ (سورہ ص: ۳۵) (مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی جعفر علی رحمانی)۔

(۳) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من طلب قضاء المسلمین حتی ینالہ ثم غلب عدلہ جورہ فقلہ الجنة (سنن ابوداؤد، کتاب الاقضية، باب فی القاضی یخطی ویصیب حدیث: ۳۵۵۵) (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان، مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مفتی عارف باللہ القاسمی، مولانا عبدالرحمن بجنوری، مولانا توقیر بدر القاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی)۔

(۴) حضرت عثمان ابن العاص ثقفیؓ کی حدیث سے بھی اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، انھوں نے فرمایا: یا رسول اللہ اجعلنی إمام قومی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنت إمامہم واقصد بأضعفہم واتخذ مؤذناً لا یأخذ علی أذانه أجراً (مسند احمد ۱۵۶۶، ترمذی ۶۶۶)، (مفتی عارف باللہ قاسمی)۔

(۵) مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”ومن أجل هذه الدلائل اختار أكثر الفقهاء التفصيل فإن كان الطالب غیر أهل لذلك المنصب من الإمامة أو القضاء فإن طلبه محظور مطلقاً وكذلك إذا كان الطالب لحب المال والرئاسة والشرف فإنه منهي عنه علی الإطلاق وأما إذا كان للإصلاح بین الناس وإقامة العدل فليس بمنهي عنه“ (تکمله فتح الملہم، تقی عثمانی) (مولانا عامر ظفر ایوبی، مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مولانا عبدالرحمن بجنوری، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

(۶) أما إذا تعین بأن لم یکن أحد غیره یصلح للقضاء وجب علیہ الطلب صيانة لحقوق المسلمین ودفعاً لظلم الظالمین ولم أر حکم إذا تعین ولم یول إلا بمال بل یحل بذله وینبغی أن یحل بذله للمال كما حل طلبه (رد المحتار ۸۰۴۰، کتاب القضاء) (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

(۷) أھون البلیتین کے اعتبار سے جو شخص اھون ہو اسے اختیار کر لیا جائے ”ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ“ (مولانا عبدالرشید کانپوری)۔

(۸) اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار اس نیت سے پیش کرتا ہے کہ کامیابی کے بعد اپنی قوم اور وطن کے حقوق کی حفاظت اور حکومت کے ظلم و تشدد کا انسداد کروں گا تو اس کے لیے ایکشن لڑنا درست ہے نیز ایکشن جیتنے کے بعد رشوت خوری سے بچنے کا بھی یقین ہو (مستقار از کفایت الفتی ۳۵۰/۹) (مفتی حمید بن محمد)۔

(۹) ”عام اسلامی حکم یہی ہے کہ از خود کسی سرکاری عہدے کو یا منصب کو اپنے لیے طلب کرنا جائز نہیں اور ایسا شخص مطلوب منصب کا اہل نہیں ہوتا، لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نا اہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے (فتاویٰ عثمانی) (مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا صادق مبارکپوری)۔

(۱۰) حضرت عمرؓ زخمی ہونے کے بعد اس وقت کے سب سے زیادہ اہل اور موزوں ترین چھ افراد ”حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعد، حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہم کی مشاورتی و انتخابی کمیٹی بنادی تھی جو حقدار خلافت بھی ہوگی، چنانچہ حضرت زبیر بن العوام نے حضرت علی بن ابی طالب کے حق میں اپنے حق سے دستبرداری کر لی اور حضرت سعد ابن ابی وقاص نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کے حق میں اور طلحہ بن عبید اللہ نے حضرت عثمان بن عفان کے حق میں دستبرداری کر لی، اس کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف نے حضرت علی اور عثمان سے عرض کیا ”ایکما یدرأ من هذا الأمر فنفضوا الأمر الیہ، واللہ علیہ والإسلام لیولین أفضل الرجلین الباقین، فسکت الشیخان علی وعثمان، فقال عبد الرحمن بن عوف إنی أترک حتی من ذلك، واللہ علی والإسلام أن أجتهد فأولی أولا كما یالحق، فقالوا نعم“ (ابن کثیر، البدایة والنہایة ۱۲۵-۱۲۶، مطبوعہ بیروت ۱۹۸۸)۔ مذکورہ بالا عبارت خود کو منصب خلافت کے لیے نامزد کرنے کی ضمنی لیکن صریح دلیل ہے لیکن یہ نامزدگی منصب خلافت کی

حرس یا حکومت کو لذت و منفعت کا ذریعہ سمجھنے کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کے حق میں مفید اور ان کی خدمت کی اپنے اندر صلاحیت محسوس کرنے کی وجہ سے تھی (مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی نعیم اختر ندوی)۔

(۱۱) امام ماوردی رقم طراز ہیں: وإن لم یقر بہا۔ ائی بالإمامة۔ أحد خرج من الناس فریقان: أحدهما أهل الاختیار حتی یختاروا إماماً للأمة، والثانی أهل الإمارة حتی ینتصب أحدہم للإمامة (ماوردی امام ابو الحسن علی بن محمد، الأحكام السلطانیة فی الولايات الدینیة ص: ۳۰، مطبوعہ بیروت)، مذکورہ بالا عبارت سے بھی یہی ظاہر ہے کہ خود کو نامزد کرے (مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

(۱۲) مشہور حنفی مفسر قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اجعلنی علی خزائن الأرض کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

وفیہ دلیل علی جواز طلب الولاية والقضاء وإظهار أنه مستعد لها إن كان آمناً علی نفسه وعلی جواز أن یتولی الإنسان عملاً من ید سلطان جائز أو کافر إذا علم أنه لاسبیل إلى إقامة الحق وسياسة الخلق إلا بتمکین ذلك الکافر أو الجائر وقد كان السلف من هذه الأمة یتولون القضاء من جهة الظلمة (تفسیر مظہری مطبوعہ ذکر یا بکڈ پو، دیوبند) (مولانا صادق مبارکپوری، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا فیاض عالم قاسمی)۔

(۱۳) علامہ محقق محدث ظفر احمد صاحب عثمانی رقم طراز ہیں:

إن طلب الإمارة والقضاء من حيث الإمارة والحكومة لحب المال والرياسة والشرف منہی عنه مطلقاً سواء كان بالقلب وحده أو باللسان أيضاً لكونه من ناحية الدنيا لا الدين وأما طلبها لا من حيث الإمارة بل إرادة الإصلاح بین الناس وإقامة العدل فیهم والقضاء بالحق لما فی العدل من الأجر الجزيل فليس بمنہی عنه لا بالقلب ولا باللسان (إعلاء السنن ۱۵، ۳۷، مکتبہ اشرفیہ، دیوبند) (مولانا صادق مبارکپوری، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

(۱۴) من لكعب بن الأشرف فإنه قد أذى الله ورسوله فقام محمد بن مسلمة فقال يا رسول الله أئحب أن أقتله، قال نعم، (صحيح البخارى ۲، ۵۷۶)، اسی طرح غزوہ حنین کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من یحرسنا اللیلۃ قال انس ابن ابی مرثد الغنوی أنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابوداؤد ۳۳۸)، مذکورہ بالا دونوں روایتیں خود سے آگے بڑھ کر ذمہ داری سنبھالنے کے اوپر دلیل ہے (مولانا محمد عمران ندوی)۔

(۱۵) ضرورت کے وقت خدمت خلق کے ارادے سے، ظالموں کو ظلم سے روکنے اور مسلمانوں کی خیر خواہی و نفع رسانی کی غرض سے منصب اور عہدہ کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے دلیل مندرجہ ذیل احادیث ہیں: ”الناس إذا رأوا الظالم فلم يأخذوا علی یدیہ أو شک اللہ أن یعمہم اللہ بعقاب“ (جمع الفوائد ۲، ۵۱)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من أذل عنده مؤمن فلم یضره وهو یقدر علی أن ینصره أذله اللہ علی رؤوس الخلائق (جمع الفوائد ۲، ۵۱) (مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی اکمل یزدانی القاسمی، مولانا عثمان بستوی)۔

(۱۶) مفتی محمود حسن صاحب فرماتے ہیں:

اگر حصہ لینے میں احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور حصہ لیکر اہل اسلام کی خدمت کر سکے اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکے تو حصہ لینا جائز ہے (فتاویٰ محمودیہ ۳/۲۵) (مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی عارف باللہ القاسمی، مفتی اکمل یزدانی قاسمی)۔

(۱۷) اگر ایکشن میں امیدوار بننے سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہنچنے کا یقین یا گمان غالب ہو تو ایکشن میں امیدوار بننا واجب ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة (الانفال: ۶۰) (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی)

(۱۸) الموسوعة الفقهية کی مندرجہ ذیل عبارت سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ اگر ایک شخص کے سوا کوئی بھی مناسب اور موزوں نہ ہو تو اس پر اس عہدہ کو طلب کرنا واجب ہو جائے گا ”یختلف الحكم باختلاف حال الطالب، فإن كان لا یصلح لها إلا شخص وجب علیہ أن یطلبها۔ وإن كان هنالك من هو أولى منه کره له طلبها وإن كان غیر صالح لها حرم علیہ طلبها“ (الموسوعة الفقهية ۶، ۲۱۸)۔

تحفة المحتاج ۴۰۵۳۰، واسنی المطالب ۴۰۱۰۸ (مفتی عارف باللہ قاسمی)۔

(۱۹) ما لا یتحر الواجب إلا به فهو واجب (الاشباه والنظائر لابن نجیحہ ۹۱، الاشباه والنظائر للسيوطی ۹۷) (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی کیرالا، مولانا ابرار خان ندوی)۔

سوال نمبر ۴: غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ سوال نمبر ۴ کے تعلق سے مقالہ نگاران دو طبقوں میں منقسم ہیں:

پہلا طبقہ وہ ہے جو ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں بعض شرائط کے ساتھ مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر مخالف شریعت قانون ساز اداروں کی بھی ممبر شپ کو جائز قرار دیتا ہے گو کہ ان کی شمولیت و شرکت کسی بہت بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ نہ ہو، اس رائے کو اختیار کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا مخدوم الرحمن شاہین، جمالی، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا عبداللہ ندوی، مفتی اشرف قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا شاکت شاہ قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا محسن القاسمی الحسنی، مفتی سہیل اختر قاسمی، مولانا نجیب الرحمن ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبداللطیف پانچوری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی، ڈاکٹر سید سلیم، مفتی سلمان پانچوری، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد ارشد علی رحمانی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا تکلیف اللہ عمری، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مفتی نصر اللہ ندوی، مفتی اکمل یزدانی قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا اسماعیل بن محمد صالح، مفتی شیر علی گرات، مولانا محمد اعظمی، مولانا محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی شبیر احمد دیوبندی، مولانا عبدالرحمن بجنوری، مولانا غلام رسول منظور القاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ارشد حسین ندوی، مفتی عبدالرشید قاسمی کاپور، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا عبدالخالق راجپور، مفتی نسیم اختر ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا یوسف علی، مولانا عامر ظفر ایوبی، مولانا نثار عالم ندوی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی مقصود قاسمی، مفتی جنید بن محمد، مولانا محمد قمر عالم قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ابو نعیمان مفتاحی، مولانا ممتاز خاں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی۔

اس رائے کی تائید میں مذکورہ حضرات نے ذیل میں مذکورہ جوہات اور دلائل پیش کئے ہیں:

الف۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے کہا تھا ”اجعلنی علی خزائن الأرض“ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود مختار نہیں تھے بلکہ بادشاہ کے تابع تھے، حکومت میں کوئی بڑی اور بنیادی تبدیلی لانے کی پوزیشن میں نہیں تھے، بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دین پر نہیں تھا، یہ نص عام ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں۔

ب۔ نجاشی شاہ حبشہ کے واقعہ سے بھی اس کی دلیل نکلتی ہے کہ وہ اپنے اسلام لانے کے باوجود خدا کے نازل کردہ احکام سے ہٹ کر فیصلہ کرتے رہے اور ایک غیر مسلم قوم کے بادشاہ بنے رہے اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خارج از ملت قرار نہیں دیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی، حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک ڈھال اور بڑے نفع بخش تھے۔

ج۔ اگر مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ہو یا ایسے ارکان موجود ہوں جن کے انتخاب میں مسلم ووٹ اثر انداز رہا ہو تو ان کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں کے قومی بلکہ ان کے مذہبی مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہے، اگر مسلمان ایسے ممالک میں بالکل کنارہ کش ہو جائیں تو سیاسی اور قومی سطح پر ان کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہے گی بلکہ بعض حالات میں وہ مذہبی حقوق سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔

د۔ اگر ان اداروں کا۔ جو مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں۔ ممبر بننا درست نہ مانا جائے تو ووٹ دینا بھی جائز نہ ہوگا، کیوں کہ ووٹ دینے میں مفسدہ یہ ہے کہ کامیاب ہو کر یہ نمائندہ پارلیمنٹ تک پہنچے گا اور پارلیمنٹ میں ایسے قانون طے پائیں گے جو احکام شریعت کے مخالف یا مسلمانوں کے قومی یا ملی مفادات کے مغاثر ہوں۔ حالانکہ ووٹ نہ دینے میں اس سے بڑا مفسدہ ہے، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کے جمہوری نظام میں ووٹ ایک بہت بڑی طاقت ہے اور اسی طاقت کے اعتبار سے سیاسی اور سماجی زندگی میں قوموں کا درجہ متعین ہوتا ہے اور اس کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔

ہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ”من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فليذكره فإن لم يستطع فليقلبه“ سے بھی



گنجائش معلوم ہوتی ہے، بشرطیکہ یہ نیت لے کر جائے کہ حتی الامکان خلاف شریعت قانون کی تبدیلی کی کوشش کروں گا اگر وہ کامیاب ہو گیا تو بہت خوب ورنہ کم از کم آئندہ کے لئے اس کا وجود ایسے قوانین وضع کرنے میں سدباب بن سکتا ہے، اور اگر مسلم ممبران کئی ہوں تو سب متحد ہو کر اپنی بات منوا سکتے ہیں اور اس طرح کے آئین میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں، چنانچہ اس کی مثالیں خود ہندوستان کی تاریخ میں بھی موجود ہے۔

و۔ جہاں تک پارٹی کے وہیپ جاری کر دینے کے بعد ضمیر کے خلاف اس کی پالیسی کے حق میں ووٹ دینے کا سوال ہے تو یہ پارلیمنٹری قانون کی مجبوری میں ایک نادرا اور قلیل الوقوع معاملہ ہے عمومی طور پر ایسا نہیں ہوتا، اس لئے اس کو گوارا کرنے کی گنجائش ہے (مولانا شاہین جمالی، مفتی جعفر علی رحمانی)۔

بہر حال باطل کو حتی الامکان مسترد کرنے اور حق کے اعلان اور صحیح فیصلہ کی جدوجہد کی نیت کے ساتھ مخالف شریعت قانون ساز اداروں کا بھی ممبر بننا مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ درست ہے:

(۱) دین و شریعت کا پابند ہو، (۲) دینی غیرت و حمیت رکھتا ہو، (۳) دین میں مدہ انت بالکل گوارا نہ ہو، (۴) مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو اور ان کا خیر خواہ ہو، (۵) تحلیل و تحریم کے حوالہ سے مطلق قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اس کا اعتقاد رکھتا ہو (دیکھئے مقالہ: مولانا عبید اللہ ندوی)۔

اب ذیل میں مقالہ نگاران کی طرف سے پیش کردہ دلائل ملاحظہ ہوں:

”إذا ابتلی ببلیتین فاختر أھوھما“، ”لا یكلف اللہ نفساً إلا وسعها“۔  
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے۔

ان اداروں کا ممبر بننا درست ہے، ہاں ایسے فیصلے جو شرعی نقطہ نظر سے درست نہ ہوں مسلمانوں کو اس پر عمل نہ کرنے کی گنجائش ہے، ”الطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق“ اور جب یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ممبران آنے والے بل کے خلاف ووٹ دیں گے یا واک آؤٹ کر جائیں گے تبھی وہیپ جاری کیا جاتا ہے، بندہ کے خیال میں یہ اکراہ غیر ملکی ہے اور اس اکراہ (خصوصاً اس ملک میں) سے بھی تکلیف شرعی کے سقوط کی گنجائش ملنی چاہئے (ڈاکٹر ظفر الاسلام ندوی)۔

”إلا من أکره وقلبه مطمئن بالإیمان“ (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا یوسف علی)۔

”مالا یدرک کله لا یترک کله“ (مولانا عامر ظفر ایوبی، مولانا ثار عالم ندوی)۔

”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

طبقہ اول کے دلائل:

۱۔ ”لا یكلف اللہ نفساً إلا وسعها“ (بقرہ: ۲۸۶) (مولانا ارشد حسین ندوی، مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عثمان بستوی)۔

۲۔ ”من کفر باللہ من بعد إیمانہ إلا من أکره وقلبه مطمئن بالإیمان“ (سورہ نحل: ۱۰۶) (مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا ارشد حسین ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۳۔ ”فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا وأطیعوا“ (التغابن: ۱۶) (مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا شوکت قاسمی)

۴۔ ”لا ینہاکم اللہ عن الذین لہم یقاتلوکم فی الدین ولم ینخرجوکم من دیارکم أن تبروہم وتقسطوا إلیہم إن اللہ یحب المقسطین“ (ممتحنہ: ۸) (مصطفی عبدالقدوس ندوی، مولانا ریحان بشر قاسمی)۔

۵۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی سیرت کے مطالعہ سے ہمیں اس باب میں روشنی ملتی ہے، ان کا تعلق کفار کے قبیلہ سے تھا جب انہوں نے اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلایا تو لوگ آپ کے دشمن بن گئے اور چاہا کہ (نعوذ باللہ) آپ کو صفحہ ہستی سے مٹادیں، لیکن چونکہ آپ کا نسب تعلق ایک طاقتور قبیلہ سے تھا، اس لئے وہ اپنے منصوبے سے باز آگئے، قرآن کریم نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

”قالوا یا شعيب ما نفقه كثيرا مما تقول وإنا لنراك فينا ضعيفاً ولو لا رھطك لرجمناك وما أنت علينا بغزير“  
(ہود: ۱۹) (مفتی محمد نصر اللہ ندوی)۔

۶۔ ”من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلمه“ (ترمذی جلد دوم ابواب الفتن باب ما جاء في تخيير المنكر باليد أو باللسان أو بالقلب) (مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا توقیر بدر قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا ابراہار خان ندوی، ڈاکٹر نظیر الاسلام صدیقی، مفتی سہیل اختر قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی)۔

۷۔ پارلیمنٹ کے ممبر بننے کا مفدہ کمتر ہے عدم شرکت کے مفدے سے: ”إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“، ”إذا ابتلى ببليتين فاختر أهوئهما“ (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں، مولانا عبدالرشید قاسمی کانپور وغیرہ)۔

۸۔ ”الناس إذا رأوا الظالم فلم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله بعقاب منه“ (سنن ابوداؤد ۲۱۳۷/۳) (مولانا عبدالرحمن بجنوری، مولانا غلام رسول منظور قاسمی)۔

۹۔ ”أوفوا بجلف الجاهلية فإنه لا يزيده يعني الاسلام إلا شدة ولا تحذثوا حلفاً في الإسلام“ (ترمذی ۱۰۲۸۷) کتاب السير باب ما جاء في الحلف حديث حسن صحيح) (مولانا حسن القاسمی السنی، مذکورہ بالا حدیث میں وہی معاونت اور حلف مراد ہے جو حق کی بنیاد پر ہو، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۱۰۔ مفتی عارف باللہ قاسمی مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر مخالف شریعت قانون ساز ادارے کی ممبر شپ کو درست قرار دیتے ہیں:

(۱) اس میں مصالح مرسلہ کی رعایت ہے، چنانچہ اسی مصلحت اور ضرورت کے پیش نظر ”مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ“ نے اپنے انیسویں فقہی سمینار منعقدہ مکہ مکرمہ میں اس بات کو جائز قرار دیا کہ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان وہاں کے انتخابات میں شرکت کر سکتے ہیں فیصلے کے الفاظ یہ ہیں:

”يجوز للمسلم الذي يتمتع بحقوق المواطنة في بلد غير مسلم المشاركة في الانتخابات النيابية ونحوها لغلبة ما تعود به مشاركته من المصالح الراجحة مثل تقديم الصورة الصحيحة عن الإسلام والدفاع عن قضايا المسلمين في بلده، وتحصيل مكاسب الأقليات الدينية والديوية وتعزيز دورهم في مواقع التأثير والتعاون مع أهل الاعتدال والإنصاف لتحقيق التعاون القائم على الحق والعدل وذلك وفق الضوابط الآتية:

أولاً: أن يقصد المشاركون من المسلمين بمشاركته الإسهام في تحصيل مصالح المسلمين ودرء المفسد والأضرار عنهم۔  
ثانياً: أن يغلب على ظن المشاركين من المسلمين أن مشاركتهم تفضي إلى آثار إيجابية تعود بالفائدة على المسلمين في هذه البلاد من تعزيز مركزهم وإيصال مطالبهم إلى أصحاب القرار ومدیری دفة الحكم والحفاظ على مصالحهم الدينية والديوية۔

ثالثاً: أن لا يترتب على مشاركة المسلم في هذه الانتخابات ما يؤدي إلى تفریطه في دينه“۔

(۲) اس میں شرکت کے ذریعہ مسلمانوں پر آنے والے دینی اور دنیاوی ضرر کو کم کیا جاسکتا ہے اور تقلیل ضرر شریعت اسلامیہ میں مطلوب ہے۔

(۳) یہ ادارے صرف خلاف شرع قوانین ہی وضع نہیں کرتے بلکہ ان میں اکثر قوانین ملکی حالات کے پس منظر میں ملک و قوم کی فلاح و بہبود یا قومی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے وضع کئے جاتے ہیں جو اسلام سے تصادم نہیں ہوتے بلکہ زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے احکام کی تبدیلی کے قاعدے شرعی احکام میں مصالح عامہ کی رعایت کے موافق ہوتے ہیں اور ان جیسے قوانین کی اسلام میں حسب ضرورت گنجائش رہتی ہے تو اکثری حالت اور غلبہ کا اعتبار کرنے سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، ”لأن العبرة للغالب“۔

(۴) اس میں شرکت کے بعد بھی وہ بہت سی مرتبہ خلاف شرع قانون کے نفاذ میں رکاوٹ نہ بن سکے تو بھی اس کی وجہ سے اس میں شرکت ناجائز اور اس کے گناہ

گار ہونے کا باعث نہیں ہوگی، کیوں کہ نبی عن المنکر بقدر استطاعت واجب ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

”فمن ولی ولایة یقصد بها طاعة الله وإقامة ما یمكنه من الواجبات واجتناب ما یمكنه من المحرمات لم یؤاخذ بما یعجز عنه فإن تولیة الأبرار للأمة خیر من تولیة الفجار حتی وإن لم یستطیعوا أن یحکموا بكل ما أنزل الله إذا عجزوا عن ذلك“ (مجموع الفتاویٰ ۲۸، ۳۶۹) (مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی شاہ جہاں ندوی)۔  
۱۱۔ علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں:

”یحیب أن یعلم أن ولایة الناس من أعظم واجبات الدین بل لا یتقرب بها إلى الله“ (مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

۱۲۔ مولانا ظفر احمد تھانوی نے یہ لکھا ہے کہ اصحاب تحقیق علماء نے اسوہ یوسفی سے یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ کافرانہ قیادت کے تحت منصب قبول کرنا جائز ہے (اعلاء السنن ۱۳/۱۵) (مولانا انور علی اعظمی)۔

۱۳۔ متعدد صحابہ اور تابعین کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ ظالم یا فاسق قیادت کے تحت کوئی عہدہ قبول کرنا جائز ہے، چنانچہ حجاج کے دور میں ابو موسیٰ اشعری کے صاحبزادے ابو بردہ حجاج کی طرف سے قاضی بنائے گئے اور سعید بن جبیر کو ان کا معاون قرار دیا گیا (ذیلیعی ۲/۲۰۳) (مولانا انور علی اعظمی)۔

۱۴۔ فقہاء کے یہاں بھی اس سلسلہ میں نظیریں موجود ہیں: مثلاً زکوٰۃ کی تقسیم کا کام ایسے شخص کو لے لینا باعث اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے جو عدل کے ساتھ اس کام کو کر سکتا ہو تاکہ ظلم سے محفوظ ہو سکے۔

”ویوجر من قام بتوزیعها بالعدل بأن یحمل کل واحد بقدر طاقته لأنه لو ترک توزیعها إلى ذلك ربما یحمل بعضه ما لا یطیق فیصیر ظلماً علی ظلم ففی قیام العارف بتوزیعها بالعدل تقلیل للظلم فلذا یوجر“ (حوالہ رد المحتار جدید فقہی مسائل مصنف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۲۵۲) (مولانا انور علی اعظمی، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا عثمان بستوی)۔

۱۵۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو حبشہ ہجرت کرنے کا حکم دیا جبکہ خود حبشہ میں بھی کفار ہی کی حکومت تھی (مولانا ارشد علی رحمانی، مولانا شاہین جمالی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۱۶۔ ”إذا أمرتکم بأمر فأتوا منه ما استطعتم“ (متفق علیہ) (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا شوکت شاقاسی)۔

۱۷۔ مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی ”کل شیء أو لا شیء“ کے فلسفہ کو شرعاً و عملاً مسترد کرتے ہوئے ارتکاب أخف الضررین کے قائل ہیں، دلیل میں ذیل کی حدیث نقل کرتے ہیں:

”عن عائشة قالت: قال لی رسول الله ﷺ: لو لا حداثة قومک بالکفر لنقضت البیت ثم لبניתه علی أساس إبراهیم علیہ السلام“ (صحیح بخاری ۲، ۱۳۶ باب فضل مکة و بناءها حدیث ۱۵۸۵) کہ اللہ کے رسول ﷺ نے واجب کو اس اندیشے سے چھوڑ دیا کہ کعبہ کی تعمیر میں تبدیلی سے فتنہ برپا ہوگا۔

۱۸۔ مولانا شاہین جمالی صاحب تفسیر ”بحر محیط“ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

”جہاں معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے انصاف نہ ہو سکے گا وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلاف شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے“ (مولانا شاہین جمالی)۔

۱۹۔ ”لقد شهدت فی دار عبد الله ابن جدعان عهداً ما أحب أن لی به حمر النعم لو ادعی به فی الإسلام لأجبت“ (الاكتفاء لسليمان بن موسى الاندلسي ۱۰۵۲) (مولانا شاہین جمالی صاحب، مفتی خالد حسین نیوی)

۲۰۔ ”الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف“ (شرح ۱۱ جلد ۱۰۲۱)۔

۲۱۔ ”یتحمل الضرر الخاص لرفع الضرر العام“ (قواعد الفقہ ۸۹)۔

۲۲۔ ”الضرورات تبيح المحظورات، المشقة تجلب التيسير“ (الإشياء والنظائر: ۱۲۵) ”الضرر يزال“ (قواعد الفقه: ۸) (مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی وغیرہ)۔

۲۳۔ ”إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى“ (بخاری) (مولانا کلیم اللہ عمری)۔

۲۴۔ واقعہ امام یوسف (مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبدالشکور قاسمی کیرالہ، مولانا انور علی اعظمی، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا صادق مبارک پوری)۔

۲۵۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد ہے:

”لأن استنقاذ رجلاً من المسلمين من أيدي الكفار أحب إلى من جزيرة العرب“ (كتاب الخراج لابي يوسف: ۱۹۶) (مفتی خالد حسین نیوی)۔

۲۶۔ امام مالک فرماتے ہیں: ”على الناس أن يفتدوا الأسارى ولو استغرق ذلك جميع أموالهم“ عامتہ المسلمین پر فرض ہے کہ وہ اپنے قیدیوں کو چھڑائیں، حالانکہ یہ ایک خطیر رقم دشمنوں کو دینے میں ظالم کی مدد ہے، لیکن یہاں ظالم کی مدد مقصود نہیں ہے، (مفتی خالد حسین نیوی)۔

۲۷۔ علامہ عز بن عبدالسلام فرماتے ہیں: ”قد تجوز المعاونة على الإثم والعدوان والفسوق لا من جهة كونه معصية بل من جهة كونه وسيلة إلى مصلحة ومنها ما يبذل في افتكاك الأسارى فإنه حرام على آخذيه مباح لبأذليه“ ظاہر ہے یہاں کسی کافر دشمن کی مالی مدد کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس مال کے ذریعہ کسی بڑی مصلحت کا حصول مقصود ہے (قواعد الاحکام للعز بن عبدالسلام ۱۲۹، ۱) (مفتی خالد حسین نیوی، مفتی محمد نصر اللہ ندوی، مفتی سہیل اختر قاسمی)۔

۲۸۔ ”وقد كان النبي ﷺ وأصحابه يفرحون بانتصار الروم والنصارى على المجوس وكلاهما كافر لأن أحد الصنفين أقرب إلى الإسلام وأنزل الله في ذلك سورة الروم“ (الحسبة في الاسلام لابن تيمية: ۱۳ دار الفکر) (مفتی سلیم عالم قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی)۔

۲۹۔ ”فليس من الله في شيء إلا أن تتقوا منهم تقاة“ کے ذیل میں حضرت تھانوی رقم کرتے ہیں: ”تو وہ شخص (کافروں کا حمایتی) اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں اگر ایسی صورت میں کہ تم ان (کافروں) سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو (بیان القرآن ۲۱۶)۔

ابن کثیر رقم کرتے ہیں: ”أى من خاف في بعض البلدان والأوقات من شرهم فله أن يتقيهم بظاهره، بباطنه وبنيته، كما قال البخارى عن أبي الدرداء أنه قال إنا لنكثرفي وجوه أقوام وقلوبنا تلعنهم أيضا وقال ابن عباس ليس التقية بالعمل إنما التقية باللسان أيضاً“ (تفسیر ابن کثیر ۱۰۳۲)۔

مذکورہ بالا تمام عبارتوں کی روشنی میں اگر مسلم اقلیت اور ملکی حالات پر غور کریں تو مذکورہ سوال کے تناظر میں مسلمان ”اکراہ“ کی حالت میں نظر آتے ہیں، ”إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان“ (مولانا توقیر بدر قاسمی)۔

۳۰۔ معروف فقیہ قاضی خاں تحریر فرماتے ہیں: ”إذا رأى رجل منكراً من قوم وهو يعلم أنه لو فهم عنه قبلوا منه لا يسهه أن يسكت وإن كان يعلم أنه لو فهمه لا يمتنعون وسعه أن يترك والنهي أفضل“ (فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۳۰۶) (مولانا ابراہاں ندوی)۔

۳۱۔ امام ابو بکر جصاص رازی نے مقام منکر پر اپنے حق کی حصول یا بائیں کے لئے منکر پر نکیر کرتے ہوئے جانے کی اجازت دی ہے اور منکر کی وجہ سے اپنے حق کو ترک کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ احکام القرآن میں لکھتے ہیں:

”فإن قيل فهل يلزم من كان بمحضرته منكر أن يتباعد عنه وأن يصير بحيث لا يراه ولا يسهه؟ قيل له: قد قيل في هذا أنه ينبغي له أن يفعل ذلك إذا لم يكن في تباعده وترك سماعه ترك الحق عليه، من نحو ترك الصلاة في الجماعة لأجل ما يسمعه من صوت الغناء والملاهي فإذا لم يكن هناك شيء من ذلك فالتباعد عنه أولى وإذا كان

هنالك حق يقوم به لم يلتفت إلى ما هنالك من المنكر وقام بما هو مندوب إليه من حق بعد إظهاره لإنكاره وكرهيته“ (احكام القرآن للجصاص ۲: ۳۱۳) (مولانا محمد فاروق)۔

۳۲- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت اسلامی کے ابتدائی مرحلہ میں اپنے چچا ابوطالب کے جوار میں تھے جو کہ غیر مسلم تھے پھر آپ نے مطعم بن عدی کے جوار کو اختیار کیا (بخاری ۲۳۲، ۷) اسی طرح حضرت ابو بکرؓ نے ابن دغنے کے جوار کو اختیار کیا تھا (بخاری حدیث: ۲۲۹۷)۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے دفاع کے لئے غیروں کی پشت پناہی حاصل کی جاسکتی ہے (مفتی خالد حسین ندوی، مفتی نصر اللہ ندوی)۔

۳۳- انگریز کے دور حکومت میں مسلمانوں کو ممبر اسمبلی بن کر حکومت میں شامل ہونے کے تعلق سے ایک سوال کے جواب میں مفتی کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں: ”ہندوستان میں حکومت کا معاملہ بڑی نزاکت اختیار کر چکا ہے اس لئے اس کے متعلق احکام دینا بہت مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے، میرا خیال ہے کہ علماء اور مشائخ اسمبلیوں میں ممبر بن کر جائیں تو بہتر ہے اس کے لئے جواز کافی دیتا ہوں، اسمبلی میں جس عہد نامے پر دستخط کئے جاتے ہیں اس میں اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کئے جاسکتے ہیں (مولانا شوکت ثنائی)۔“

### دوسرا طبقہ:

اس مسئلہ میں دوسرا طبقہ وہ ہے جو ہر ادارے اور معاہدے میں شمولیت کو ناجائز قرار دیتا ہے، ان کے پیش نظر یہ ہے کہ ایسے ادارے کا ممبر بننا شرعی اعتبار سے تعاون علی الاثم کے مترادف ہے، جو شرعاً ناجائز ہے، اس کے لئے مندرجہ ذیل دلائل کا سہارا لیا ہے:

### دلائل:

۱- ”یا ایہا الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول“ (سورہ نساء) (مولانا عامر ظفر ایوبی)۔

۲- ”ألم تر إلى الذین یزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إلیک وما أنزل من قبلک یریدون أن یتحاكموا إلى الطاغوت“ (نساء: ۷۰)۔

۳- ”إنما کانت قول المؤمنین إذا دعوا إلى اللہ ورسوله لیحکم بینهم أن یقولوا سمعنا وأطعنا وأولئک هم المفلحون“ (سورہ نور: ۵۱) (مولانا عامر ظفر ایوبی)۔

۴- ”ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئک هم الکافرون“ (سورہ مائدہ: ۴۴) ”ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئک هم الظالمون“ (مائدہ: ۴۵)، ”ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئک هم الفاسقون“ (مائدہ: ۴۷) (مولانا عامر ظفر ایوبی، مولانا مقصود فرقانی، مولانا رشید حسین ندوی، مولانا عثمان بستوی)۔

۵- ”إن الحکم إلا للہ“ (الانعام: ۵۷) (مولانا عامر ظفر ایوبی، مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا رشید حسین ندوی)۔

۶- ”ولا تعاونوا علی الأثم والعدوان“ (مائدہ) (مولانا رحمان بھٹائی)۔

۷- ”فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموا فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی أنفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً“ (النساء: ۶۵) (مفتی محمد عارف باللہ قادری)۔

۸- ”وما کانت لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضی اللہ ورسوله أمراً أن یکون لهما الخیرة من أمرهم ومن یعص اللہ ورسوله فقد ضلّ ضلالاً مبیناً“ (احزاب: ۳۶) (مفتی عارف باللہ قادری)۔

۹- ”قل أرأیتم ما أنزل اللہ لکم من رزق فجمعتم منه حراماً وحلالاً قل آذن لکم أم علی اللہ تفترون“ (یونس: ۵۹)۔

۱۰- ”لهم شركاء شرعوا لهم من الدين ما لم يأذن به الله“ (الشورى: ۲۱)۔

۱۱- ”أفحکم الجاهلیة یبغون ومن أحسن من الله حکماً لقوم یوقنون“ (مائدہ: ۵۰)۔

۱۲- ”وَأَنْ أَحْكَمَ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتَنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ“ (المائدہ: ۴۹)۔

۱۳- ”وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ“ (جاثیہ: ۱۸)۔

۱۴- ”أَفْتُمُونُوا بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ“ (البقرہ: ۸۵-۸۶)۔

۱۵- ”وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتَ اللَّهِ يَكْفُرُ بِهَا وَيَسْتَهْزِئُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ“۔

۱۶- ”وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ“ (ہود: ۱۱۲)۔

۱۷- ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“ (آل عمران: ۲۸)۔

۱۸- ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوعًا وَلَجِبًا مِنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَافِرِ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ (مائدہ: ۱۷)۔

۱۹- ”الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَيْبَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا“ (نساء: ۱۲۹)۔

۲۰- ”لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“ (آل عمران: ۲۸)۔

۲۱- ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةَ مَنْ دُونِكُمْ“ (آل عمران: ۱۱۸)۔

۲۲- ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ“ (مائدہ: ۵۱)۔

۲۳- ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تَلْقَوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمُودَةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ“ (متحنہ: ۱)۔

حدیث:

۲۴- ”عن أوس بن شرحبیل أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: من مشى مع ظالم ليقويه وهو يعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام“ (مشکوٰۃ: ۳۳۶ شعب الایمان حدیث نمبر: ۷۵-۷۶ المعجم الكبير حدیث نمبر: ۶۱۹) (مولانا محمد فاروق، مولانا عبدالرحمن بجنوری)۔

۲۵- ”عن عبد الله ابن مسعود قال: سمعت رسول الله ﷺ من رضى عمل قوم فهو منهم ومن كثر سواد قوم فهو منهم“ (التفسير الكبير ۱۲، ۵۳) (مولانا غلام رسول منظور قاسمی)۔

۲۶- ”لا حلف في الإسلام“ (بخاری ۲، ۸۹۸ کتاب الآداب) (مولانا محسن القاسمی الحسنى، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۲۷- ”من رقع حول الحمى يوشك أن يقع فيه“ (رواه البخاری) (مولانا ممتاز خان ندوی)۔

۲۸- ”عن أبي موسى قال: قلت لعمر: إن لي كاتباً نصرانياً قال مالك: قاتلك الله، أما سمعت الله تعالى يقول: ”يا

أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى اولياء بعضهم اولياء بعض " الا اتخذت حنيفيا (يعنى مسلما) قال قلت يا امير المؤمنين لي كتابته وله دينه قال: لا اكرمهم اذ اهانهم الله ولا اعزهم اذ اذلهم الله ولا ادينهم اذ اقصاهم الله " (مسند احمد بروایت سيدنا ابوموسیٰ اشعریؓ) (مولانا عابد الرحمن بجنوری)۔

سوال نمبر ۵: جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاروں کی اکثریت نے جواز کی راہ اپنائی ہے جبکہ ایک معمولی تعداد عدم جواز کی بھی قائل ہے، ذیل میں آراء مع دلائل پیش خدمت ہیں:

آراء مع دلائل:

۱۔ مفتی سہیل اختر قاسمی لکھتے ہیں: ہندوستان یا اس جیسے دیگر ممالک میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ آزمائشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے وہاں ممبران پارلیمنٹ جو دستور سے وفاداری کا حلف اٹھا لیتے ہیں، اسے حلف یا قسم نہ قرار دیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ ان کی طرف سے ملکی قوانین کی پاسداری کا وعدہ ہے اور شریعت میں اگرچہ وعدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مگر ناجائز امور کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہذا دستور میں جو غیر اسلامی امور ہیں ان کے تعلق سے کیا گیا وعدہ واجب الوفاء نہ ہوگا، کیونکہ شریعت سے متصادم امور کی انجام دہی کا وعدہ یا قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہوگا۔

"إذا كلفت على يمين فرأيت غيرها خيراً منها فكفر عن يمينك وأت بالذي هو خير" (مشق علیہ) (مفتی سہیل اختر قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی)۔

۲۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کی رائے ہے:

اس صورت میں شریعت سے غیر متصادم دفعات سے ہی وفاداری کی نیت کے ساتھ کلمات حلف زبان سے ادا کرے، اس لئے کہ یہ ایک حاجت ہے: "والمحاجة تنزل بمنزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة والضرورات تبيح المحظورات" نیت کا اعتبار تو فقہاء نے دیانہ کیا ہی ہے "نية تخصيص العام تصح ديانة إجماعاً فلو قال: كل امرأة أتزوجها فهي طالق ثم قال: نويت من بلد كذا لا يصدق قضائي" (درمختار ۵۰۸۳) "اليمين على نية المحالف إن كان مظلوماً أو على نية المستحلف إن كان ظالماً" (قاموس الفقہ ۳، ۲۹۳) مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا فاروق، مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی سید باقر شہد قاسمی، مولانا محسن القاسمی آسٹی۔

۳۔ مفتی جعفر علی رحمانی فرماتے ہیں: حلف لیتے وقت دل میں وہ صرف ان ہی دفعات کی نیت (توریہ) کرے جو موافق شرع ہیں۔

"التورية: وهي أن تطلق لفظاً ظاهراً (قريباً في معنى تريد به معنى آخر) بعيداً) يتنا وله ذلك اللفظ لكنه خلاف ظاهره" (المصباح المنير ۶۵)۔

"إعلم أن الكذب وإن كان أصله محرماً فيجوز في بعض الأحوال بشروط: ومختصر ذلك أن الكلام وسيلة إلى المقاصد فكل مقصود محمود يمكن تحصيله بغير الكذب يحرم الكذب فيه وإن لم تكن تحصيله إلا بالكذب جاز الكذب ثم إن كان تحصيل ذلك المقصود مباحاً كان الكذب مباحاً، وإن كان واجباً كان الكذب واجباً" (رياض الصالحين للنووي) (مفتی جعفر علی رحمانی)۔

۴۔ مولانا شیر علی صاحب صلح حدیبیہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر مشرکین کے ساتھ صلح کی ہیں، لہذا مسلمانوں کا غیر مسلمین کے ساتھ پارٹی میں شریک ہونا اور غیر شرعی باتوں پر دستخط کرنا درست ہے، اس لئے کہ ہماری حیثیت مصالح کی ہے، ہم صلحاً ایسا کریں گے، مخالفت تو ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔

۵۔ مفتی اشرف قاسمی تحریر فرماتے ہیں: ہندوستان کے دستور میں جمہوری قانون کے تحت بہت سے دفعات ایسے ہیں جو اسلام سے ہم آہنگ ہیں، البتہ آئین ہند

سلسلہ جدید فقہی مباحث جلد نمبر ۱ / ایکشن کے شرعی مسائل

میں بھی بعض دفعات اسلام کے خلاف ہیں، لیکن پھر بھی دستور ہند کی وفاداری کا حلف اٹھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، جن دفعات میں ہم کو بنیادی طور پر مذہبی آزادی دی گئی ہے ان دفعات سے وفاداری کرتے ہوئے ان متضادم دفعات کو ناقابل اعتبار و مستثنیٰ سمجھیں گے (مفتی اشرف قاسمی)۔

۶۔ مولانا افتخار احمد مفتاحی صاحب کی رائے ہے: صورت مسئلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض قوانین خلاف شرع ہوتے ہیں اور بعض خلاف شرع نہیں ہوتے اسلئے ”بیجوز فی الضرورة ما لا یجوز فی غیرها“، ”الأمور بمقاصدا“، ”الضرورات تبیح المحظورات“، ”إنما الأعمال بالنیات“، ”أهون البلیتین“ وغیرہ قواعد کی بنیاد پر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بادل ناخواستہ ضرورۃ جائز ہوگا، اور حلف اٹھاتے وقت قلبی رجحان ان قوانین کی طرف ہو جو خلاف شرع نہ ہوں، اس کے جواز کو اس مسئلہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے ”وقالوا: الکافر اذا تترس بمسلم فإن رماه مسلم فإن قصد قتل المسلم حرم وإن قصد قتل الکافر لا“ (الاشیاء والنظائر: ۵۵) (مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد ارشد علی رحمانی، مولانا محمد فیاض عالم قاسمی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مفتی اکمل یزدانی قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی)۔

۷۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی فرماتے ہیں: غیر شرعی دفعات کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جائے اگر اس میں ناکامی ہو تو دل سے ان کو برا اور طاغوتی نظام سمجھتے ہوئے حلف برداری کا عمل انجام دیا جاسکتا ہے (ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عامر ظفر ایوبی)۔

۸۔ مولانا عبداللطیف پالنپوری کی رائے ہے: حلف اٹھاتے وقت خلاف شریعت دفعات کا اپنے حلف میں استثناء کر دے (مولانا عبداللطیف پالنپوری)، مصالح عامہ کے پیش نظر جائز ہے (مولانا عبدالرشید کانپور)۔

۹۔ مولانا ابرار خاں ندوی لکھتے ہیں: بدرجہ مجبوری قلبی ناگواری کے ساتھ دستور سے وفاداری کا زبانی اظہار کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ بحالت مجبوری شریعت نے کلمہ کفر کہنے کی بھی اجازت دی ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: ”ومن کفر باللہ من بعد ایمانه إلا من أکره وقلبه مطمئن بالإیمان“۔

پھر اس مسئلہ پر ذیل کے واقعہ سے بھی رہنمائی ملتی ہے، صاحب تہذیب القرآن نقل فرماتے ہیں: حضرت عمار بن یاسر کہ جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور والدہ کو سخت عذاب دے کر شہید کر دیا گیا پھر ان کو اتنی ناقابل برداشت اذیت دی گئی کہ آخر کار انہوں نے جان بچانے کے لئے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کفار ان سے کہلوانا چاہتے تھے پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ”ما تکرکت حتی سببتک و ذکرک الہتھم بخیر“ یا رسول اللہ! مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ”کیف تجد قلبک؟“ (اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو) عرض کیا: ”مطمئنا بالإیمان“ (ایمان پر پوری طرح مطمئن) اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”إب عادوا فعد“ (اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو پھر یہی باتیں کہہ دینا) (تہذیب القرآن ۲/۵۸۲) مذکورہ واقعہ میں فرد واحد کو اجازت ہے تو جہاں پوری ملت کے تحفظ کا مسئلہ ہو وہاں بدرجہ اولیٰ اجازت ہونی چاہئے (مولانا ابرار خاں ندوی)۔

۱۰۔ مولانا شوکت ثناء قاسمی کی رائے ہے: بوقت ضرورت شدیدہ اتباع شریعت کے پختہ عہد اور غیر شرعی دفعات پر حتی المقدور عمل نہ کرنے کی نیت کے ساتھ حلف لیا جاسکتا ہے (مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا یوسف قاسمی، مولانا منصور قاسمی)۔

۱۱۔ مولانا رحمت اللہ ندوی کی رائے ہے: مخالف شریعت دفعات کے ساتھ وفاداری کا پابند نہیں ہوگا، اس لئے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (مصنف ابن ابی شیبہ ۱۲/۵۲) (مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالرحمن بخوری، مولانا غلام رسول منظور قاسمی)۔

۱۲۔ مولانا اسماعیل بن محمد صالح کی رائے ہے: ”إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما“ (الاشیاء والنظائر لابن نجیم) کے پیش نظر جواز کی گنجائش نکلتی ہے (مولانا اسماعیل بن محمد صالح، مفتی سلطان کشمیری، مولانا ریحان مبشر قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا عبدالسلام کوثری، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب، مولانا ثناء عالم ندوی)۔

۱۳۔ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں: دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا اور قانون ساز ادارے کا رکن بننا جائز ہوگا۔

۱۴۔ مولانا عبدالرب اعظمی فرماتے ہیں: ایسے قانون ساز اداروں کا رکن بننا جن کے دستور کی بہت سی دفعات خلاف شریعت ہوں اور اس دستور کی وفاداری



کا حلف اٹھانا پڑے شرعاً درست نہیں کیونکہ یہ تعادان علی الاثم ہے اور غلط معاہدہ ہے، ”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (نامہ: ۲) (مولانا عبد الرب اعظمی، قاضی محمد حسن ندوی)۔

۱۵۔ ڈاکٹر مبین سلیم لکھتے ہیں: حلف اٹھانا تو درست ہے، البتہ مخالف شریعت و فعات کی چیزوں میں عملی طور پر نیت و عمل پر حرمت و حلت کا مدار مبتلی بہ پر ہے (ڈاکٹر مبین سلیم)۔

۱۶۔ مولانا عبدالخالق صاحب اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں: کسی بھی ملک میں ملکی دستور سے وفاداری کے بغیر کوئی وہاں کا باشندہ نہیں ہو سکتا چونکہ مقصد نیک ہے، اس لئے ”لایؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم“ یا ”فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ“ کے تحت کوئی حرج نہیں (مولانا عبدالخالق)۔

۱۷۔ مفتی نصر اللہ ندوی علامہ عز الدین بن عبدالسلام کے حوالہ سے لکھتے ہیں: اگر معصیت پر اعانت کسی عظیم مصلحت کا ذریعہ اور عدم اعانت کسی بڑے فساد کا سبب ہو تو ایسی صورت میں معصیت پر اعانت درست ہوگی، ”تجاوز الإعانة علی المعصية لا لكونها معصية بل لكونها وسيلة إلى تحصیل المصلحة الراجحة وكذلك إذا حصل بالإعانة مصلحة تربو علی مصلحة تفویت المفسدة“ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام: ۱۰۵۷) (مفتی محمد نصر اللہ ندوی)۔

۱۸۔ مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں: حلف وفاداری اس شرط اور نیت سے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا، اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں (کفایت المفتی: ۳۰۹، ۹) (مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا فاروق، مفتی سلمان پالنپوری، مفتی شبیر احمد دیوبند، مفتی جنید بن محمد، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۱۹۔ اگر اکثر دفعات مخالف شریعت نہ ہوں تو ”للاکثر حکم الکل“ کے تحت حلف لینا جائز ہے (مولانا عمران ندوی)۔

۲۰۔ مفتی نسیم اختر ندوی صاحب لکھتے ہیں: عدالت سے خلاف شرع فیصلہ یا اسلامی شریعت میں کسی بھی طرح مداخلت کی صورت میں اسی دستور کا سہارا لے کر ہم آواز اٹھاتے ہیں، لہذا اس دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا درست ہے، نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ خود دستور کے اندر بھی ترمیمات ہوتی رہتی ہیں اور اس میں اصلاح و تبدیلی کے قانونی طریقے موجود رہتے ہیں (نسیم اختر ندوی)۔

۲۱۔ مولانا عثمان بستوی صاحب کے رائے ہے: مقاصد شرع کی حفاظت کے پیش نظر دستور سے وفاداری کا حلف اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نیت صرف جائز و مباح قوانین کے پابندی کی ہو اور خلاف شریعت قوانین کا عہد صرف زبانی ورسی ہو (مولانا عثمان بستوی)۔

۲۲۔ مولانا توقیر بدر قاسمی حلف برداری کے لئے چند شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی لازم قرار دیتے ہیں کہ مسلم ممبران کی تعداد کم از کم پارٹی کی کل تعداد کے چوتھائی کے برابر ہو (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ)۔

۲۳۔ قابل اعتراض دفعات کو دل سے برا سمجھتے ہوئے دستور سے وفاداری کا حلف لینا بھی جمہوری حکومتوں اور غیر مسلم اقلیت والے ملکوں میں جائز ہوگا اس سے زائد کا یہ شخص مکلف بھی نہیں، ذیل کی حدیث پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

”قال رسول اللہ ﷺ: لا یبغی للمؤمن أن یذل نفسه، قيل: یا رسول اللہ! وکیف یذل علی نفسه؟ قال: یتحمل من البلاء ما لا یطيقه“ (رواه الترمذی) (مولانا اقبال احمد قاسمی)۔

سوال نمبر ۶: بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاروں نے (سوائے چند افراد کے) ضرورت کے پیش نظر کراہت خاطر کے ساتھ جواز کی رائے دی ہے۔

۱۔ مولانا غلام رسول منظور القاسمی تحریر فرماتے ہیں: اس کی تعظیم و توقیر اور احترام و اکرام کے اعتقاد کے بغیر دفع مضرت کی نیت سے ہاتھ رکھ کر حلف لینے کی گنجائش ہے۔

”إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطالب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب لطلبه يعتبر مكرها ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيماً“ (قرارات مجمع الفقہی الاسلامی سنہ ۱۴۰۲ھ بحوالہ جدید فقہی مسائل ۱/ ۴۷۰) (مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مولانا عبد اللہ ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا ثار عالم ندوی، مولانا عبد اللہ عبد الوہاب، مولانا قمر عالم قاسمی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا صادق مبارک پوری، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا شاہین جمالی، مفتی خالد حسین نیوی، مولانا عبد الرحمن بجنوری، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی، مولانا فیاض عالم قاسمی، مولانا ریحان مبشر قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد اسماعیل بن محمد صالح، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی سمیل اختر قاسمی، مولانا عثمان بستوی)۔

۲۔ مولانا عامر ظفر ایوبی صاحب کی رائے ہے: ”ضرورت“ کی بنا پر کراہت کے ساتھ حلف لینے کی رخصت ہوگی، ”الضرورات تبیح المحظورات“ (مولانا عامر ظفر ایوبی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محسن القاسمی الحسنی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا عبد السلام کوشری، مولانا ابرار خاں ندوی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

۳۔ مفتی محمد اشرف قاسمی لکھتے ہیں: بائبل پر حلف لینے سے مسلمان گنہگار نہ ہوگا، البتہ اس سے قسم منعقد نہ ہوگی، کیونکہ یہاں بائبل سے مراد اس کے اوراق اور جلد ہیں، ”ولو تبرأ من كل آية فيه“ (القرآن) ”أو من الكتب الأربعة فيمين واحدة وفي الرد المحتار إلا من المصحف أي فلا يكون التبري منه يمينا لأن المراد به الورق والجلد“ (رد المحتار ۵: ۲۸۵ مطبوعہ زکریا)، البتہ زبانی طور پر جو عہد کیا جا رہا ہے شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس سے عہد کا ایفا ضروری ہے، ”وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسؤولاً“ (بنی اسرائیل: ۲۳) (مفتی محمد اشرف قاسمی)۔

۴۔ مولانا احسن عبد الحق ندوی فرماتے ہیں: موجودہ بائبل جو تحریف شدہ ہے اس پر ہاتھ رکھ کر حلف لینا درست نہیں ہے (مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا رحمت اللہ ندوی)۔

۵۔ مولانا عبد الشکور قاسمی اپنے موقف کی وضاحت کے لئے تحریر کرتے ہیں: ”قال الإمام الرملي: وينعقد بكتاب الله وبالتوراة والإنجيل ما لم يرد الألفاظ كما هو واضح“ (نهاية المحتار ۸: ۱۷۷) (مولانا عبد الشکور قاسمی کیرالا)۔

۶۔ مفتی مقصود فرقانی لکھتے ہیں: بائبل پر حلف لیتے وقت یہ نیت کرے کہ جو انجیل اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری تھی میں اس کی قسم کھاتا ہوں اور اس کا حلف لیتا ہوں تو یہ جائز ہوگا (مفتی مقصود فرقانی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی اکمل یزدانی قاسمی، مولانا عبد الشکور قاسمی کیرالا، مولانا انور علی اعظمی، مفتی جعفر علی رحمانی)۔

۷۔ مولانا شیر علی گجراتی کی رائے ہے: بائبل پر حلف اٹھانا جائز ہے، یہ ہم صلح کے طور پر کرتے ہیں شریعت کی مخالفت ہمارا مقصود نہیں ہے، ”الأمور بمقاصدها“ (مفتی شیر علی گجراتی)۔

۸۔ مولانا محمد فاروق صاحب کی رائے ہے: اگر بائبل کی تصریح باللسان ضروری نہ ہو تو حلف کے لئے ظاہر بائبل اٹھانے اور قسم مشروع طریقہ سے کھانے کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ قسم کے لئے کسی کتاب کا صرف ہاتھ میں لینا کافی نہیں ہے بلکہ مثلاً قرآن کی یا قسم فلاں کتاب کی کہنا ضروری ہے ”كما في الدر المختار: وركنها اللفظ المستعمل فيها“ (الدر المختار مع الشامی ۷: ۲۷۲) (مولانا محمد فاروق)۔

۹۔ مفتی خالد حسین نیوی لکھتے ہیں: اس سلسلہ میں علامہ ابو الحسنات عبدالحی فرنگی علی کا فتویٰ قابل ذکر ہے، مسائل نے دریافت کیا کہ ”قسم کو پختہ کرانے کے وقت تورات خاص یہود کے ہاتھ میں دے کر اور انجیل خاص نصاریٰ کے ہاتھ میں دے کر اس کی طرف اشارہ کرنا چاہئے یا نہیں تو اس کے جواب میں علامہ نے فرمایا نہیں، اور استدلال کے طور پر ہندیہ کی یہ عبارت پیش فرمائی:

”لا يحلف بالإشارة إلى مصحف معين بأن يقول بالله الذي أنزل هذا الإنجيل وهذا التوراة لأنه ثبت تحريف

بعضہا فلا یؤمن أن الإشارة إلى المحرف فيكون التحليف به تغليظا ما ليس بكلام الله عز وجل“ (عالمگیریہ ۱۷، ۴)

(مفتی خالد حسین نیوی، مولانا عثمان بستوی)۔

جب عیسائی اور یہودی سے ایسا کروانا درست نہیں تو ایک مسلم کے لئے کیسے درست ہوگا، لیکن اگر کسی ملک کے ضابطہ کی وجہ سے مسلمان انجیل پر حلف لینے پر مجبور ہو تو اصل مذہب حنفیہ کے لحاظ سے یہ فتویٰ دیا جاسکتا ہے کہ اس کا حلف شرعاً معتقد ہی نہیں ہوا، اس لئے کہ متون حنفیہ کی روایت کے مطابق بائبل تو کجا خود قرآن کریم کی قسم بھی شرعاً معتبر نہیں ہوتی، علامہ فرنگی نعلی فرماتے ہیں: قرآن کی قسم اگرچہ بعض کے نزدیک معتبر ہے جیسا کہ در مختار میں ہے مگر اصحاب متون نے اس قسم کو شرعاً معتبر نہیں مانا ہے: ”قال محمد في الأصل: لو قال: والقراء لا يكون يميننا ذكره مطلقاً“ (فتاویٰ عبد الحسی ۴۵۲) (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی)۔

۱۰۔ مفتی جنید بن محمد فرماتے ہیں: اگر بائبل کو ہاتھ میں لے کر بائبل کی طرف اشارہ کے بغیر کہا: ”انجیل کی قسم“ یا ”کلام اللہ کی قسم“ تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور قسم توڑنے پر کفارہ بھی واجب ہوگا، ”قال في شرح التنوير قال الكمال: ولا يخفى أن الحلف بالقرآن الأت متعارف، إلى أن قال: نعم لو قال أقسم بما في هذا المصحف من كلام الله تعالى ينبغي أن يكون يميناً“ (رد المحتار ۵۳۳، ۵۳۴، مستقار حسن الفتاویٰ ۵، ۳۸۸، ۳۸۹) (مفتی جنید بن محمد)۔

۱۱۔ مولانا عبد الرشید صاحب قاسمی کی رائے ہے: مظلوم پر قیاس کرتے ہوئے بائبل پر حلف کی گنجائش ہونی چاہئے، بعد میں توبہ واستغفار بھی کرتا رہے، ”اليمين على نية الحالف إن كان مظلوما وعلى نية المستحلف إن كان ظالماً“ (الاشباه والنظائر ۲۱۲) ”إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان“ (بخل: ۱۰۶) (مولانا عبد الرشید کاپور، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی سید باقر رشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا رشید علی رحمانی، مولانا عبد الرب اعظمی)۔

۱۲۔ مفتی شاہ جہاں ندوی صاحب لکھتے ہیں: چونکہ بائبل بھی محرف ہونے کے باوجود کتاب الہی میں سے ہے تو اس پر حلف لینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”والذين يؤمنون بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك“ (بقرہ: ۴) (مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

۱۳۔ مولانا محمد اعظمی صاحب کی رائے ہے: بائبل کی قسم کھا کر اگر وفاداری کا عہد کیا جاتا ہے تو ناجائز اور اگر رسم وفاداری ادا کی جاتی ہے تو جائز ہے (مولانا محمد اعظمی، مفتی سلطان کشمیری)۔

۱۴۔ مفتی عارف باللہ قاسمی اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں: بائبل یا توراہ سے مقصود وہ کلام الہی ہے جو حضرت عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام پر اللہ نے نازل کیا تھا اور اسی نسبت کی وجہ سے اس پر حلف لیا جاتا ہے اور اللہ کی صفات میں سے ایک صفت کلام ہے اور جس طرح اللہ کے نام کی قسم کھانا درست ہے اسی طرح اللہ کی صفات کی قسم کھانا درست ہے، ”الحلف بصفة الذات يكون حلفاً بالله فيكون يميناً“ (بدائع الصنائع ۹۳)۔

اس لئے کسی عیسائی ملک میں منتخب مسلم رکن کو بائبل پر حلف لینا پڑے تو اس کے لئے یہ عمل درست ہوگا (مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین، جمالی، مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی)۔

۱۵۔ مولانا توقیر بدر قاسمی رقم فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”قال الزيلعي واليمين بغير الله تعالى أيضا مشروع وهو تعليق الجزاء بالشرط وهو ليس يمين وضعاً وإنما سمي يميناً عند الفقهاء لحصول معنى اليمين بالله تعالى وهو الحمل والمنع“ (شامی ۵، ۳۷۷) (مولانا توقیر بدر قاسمی)۔

۱۶۔ مولانا اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: بائبل پر حلف لینا انسان کے ایمان و کفر کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے بلکہ حلف برداری بھی ایک رسم ہے، اور وہ اس کتاب کو اٹھاتے ہوئے نہیں اپنے وفادار ہونے کا اعتماد دلارہا ہے اس میں موجودہ بائبل پر ایمان ہونا لازم نہیں ہوتا (مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین، جمالی، مولانا عبدالقادر)۔

۱۷۔ مولانا فیاض قاسمی علامہ شامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں غیر اللہ سے حلف لینا جائز ہے اور حدیث میں ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ ”بأبيك ولعمرك“ کے ذریعہ قسم نہ کھایا جائے، وثیقہ کے طور پر حلف کھانے کی ممانعت نہیں ہے، ”وهل يكره الحلف بغير

اللہ تعالیٰ قیل: نعم للنہی، عامتہم لا، وبہ أفتوا لاسیما فی زماننا وحملوا النہی علی الحلف بخیر اللہ لا علی وجہ الوثیقة کقولہم بأییک، ولعمرك، ونحو ذلك“ (شامی ۳/۵۲۷) (مولانا محمد فیاض عالم قاسمی)۔

۱۸۔ مفتی تہذیب اختر صاحب ندوی لکھتے ہیں: ہندوستان کے ایوانوں میں مسلم ممبران اللہ کے نام پر حلف اٹھاتے ہیں اور اس کی انہیں اجازت ہے۔

۱۹۔ مولانا عبید اللہ ندوی اپنے موقف کی وضاحت کے لئے ذیل کی حدیث نقل کرتے ہیں: ”رفع عن أمتی الخطاء والنسیان وما استکرہوا علیہ“ (ابن ماجہ ۲۰۲۵) (مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا عمران ندوی)۔

اس مسئلہ میں کچھ حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس طرح ایک ممبر کو حلف لینا جائز نہیں ہے، اس کے لئے انہوں نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

دلائل:

”عن سالم عن أبيه رضي الله عنه سمع النبي عمرو هو يقول: وأبي وأبي فقال: إن الله ينهاكم أن تحلفوا بأبائكم فقال عمر: فوالله ما حلفت بعد ذلك ذا كراً ولا أثراً“ (ترمذی)۔

”من كان حالفاً فليحلف بالله أو ليسكت (ترمذی) أو ليصمت (في الصحيحين) أو ليدر“ (ابوداؤد ۲۲۵۱)۔

”عن ابن عمر أن النبي ﷺ قال: من حلف بخير الله فقد أشرك“ (المغنی ۱۰۱۲)۔

”عن عبد الله عن رسول الله ﷺ أنه أدرك عمر بن الخطاب في ركب وعمر يحلف بأبيه فناداهم رسول الله ﷺ ألا إن الله ينهاكم أن تحلفوا بأبائكم فمن كان حالفاً فليحلف بالله أو ليصمت“ (رواه مسلم ۲۰۴۵، کتاب الأیمان)۔

”من حلف بخير ملة الإسلام فهو كما قال يعني فهو كاذب في يمينه“ (بخاری الأیمان، حدیث: ۵۲۶۶)۔

سوال نمبر: ۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں؛ لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں ۲ مقالہ نگاروں نے ایسی پارٹیوں میں شمولیت کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے جب کہ ایک نے جواز و عدم جواز کو حالات پر موقوف رکھا ہے، باقی تمام افراد نے مشروط و غیر مشروط طور پر جواز کی راہ اپنائی ہے۔

ذیل میں مقالہ نگاران کی طرف سے پیش کردہ آراء مع دلائل پیش خدمت ہیں:

مولانا غلام رسول منظور القاسمی تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ فی زمانہ ہندوستان میں کوئی بھی سیاسی جماعت مسلمانوں کے لیے مکمل اور کلی طور پر تحفظ کے لیے نہیں ہے، اس لیے ایسی پارٹی اور جماعت میں کسی بھی مسلمان کے لیے شرکت کرنا اور اس کی جانب سے ایکشن میں انتخاب لڑنا باعث گناہ عظیم اور حرام ہوگا اور تعاون علی الاثم والعدوان کے مترادف ہوگا۔

عن ابن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من رضي عمل قوم فهو منهم ومن كثر سواد قوم فهو منهم (تفسیر الرازی، سورۃ المائدہ ۱۵۳، ۱۲) (مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی)۔

۲۔ مولانا عامر ظفر ایوبی تحریر فرماتے ہیں: سوال ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲

۳۔ مولانا عبداللطیف پالنپوری کی رائے ہے: جمہوری ممالک میں ووٹ اسلام اور کفر کی بنیاد پر نہیں دیئے جاتے اور نہ ہی اس بنیاد پر الیکشن لڑائے جاتے ہیں، لہذا جس سیکولر پارٹی کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ صحیح خدمت کرے گی، نفع پہنچائے گی، حقوق دلوائے گی، ظلم کو روکے گی، مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرے گی، ایسی پارٹی میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہے، ساتھ ہی اسلام مخالف دفعات کو ختم کرنے کی سعی جاری رکھنا چاہئے (مولانا عبداللطیف پالنپوری)۔

۴۔ مفتی مقصود فرقانی کی رائے ہے: اسلام اور مسلم مخالف دفعات کو بدلنے کے عزم و ارادہ کے ساتھ شرکت کی گنجائش ہے، کلمۃ حق عند سلطان جائز افضل الجہاد (مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد مقصود فرقانی وغیرہ)۔

۵۔ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب رقم طراز ہیں: إذا تعارض مفسدتان الخ اور الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف اور أھون البلیتین وغیرہ کے پیش نظر مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے تعلق سے سنجیدہ پارٹیوں کو ترجیح دی جائے گی اگرچہ ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوں۔ (مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی لطیف الرحمن دلایت علی وغیرہ)۔

۶۔ مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی کی رائے ہے: مسلمانوں کو کسی ایک پارٹی کا بندھوا مزدور بننا مناسب نہیں ہے، بروقت جو پارٹی اپنے منشور میں ہمارے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرے اس پارٹی میں شریک ہو کر انتخاب لڑا جائے (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مفتی اشرف قاسمی)۔

۷۔ مفتی سید باقر ارشد قاسمی لکھتے ہیں: بیثاق مدینہ ۲ھ میں جاری ہوا، اس کی بنیادی شق ہے

اسی طرح مدینہ کے اطراف و اکناف میں غیر مسلمین کی بعض آبادیاں تھیں، ان کو جو داخل اسلام نہیں تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مراعات عطا فرمائی تھیں، چنانچہ بعض قبیلوں کو حضور نے لکھ کر دیا "من کان علی یہودیتہ أو علی نصرانیتہ فإنہ لایبیتلی عنہا"۔

مذکورہ بالا دونوں مثالوں سے اس بات کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا نثار عالم ندوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا عبدالسلام کوثری)۔

۸۔ مولانا راشد حسین ندوی تحریر فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر مسلمانوں کے مفاد کے لیے کفار سے معاہدہ کیا، تاکہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں، جب کہ ظاہر ہے کہ عقائد میں وہ دوسرے کفار ہی کی طرح تھے، مثلاً سیرت ابن ہشام میں ہے "ودخلت خزاعة فی عقد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعہدہ" (سیرت ابن ہشام ۲، ۲۹۰)، نیز اکیڈمی نے اپنے چودہویں سمینار میں "مسلم وغیر مسلم تعلقات کے تحت یہ تجویز منظور کی ہے: "جمہوری سیکولر پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کیے جاسکتے ہیں" (نفا اکیڈمی کے فیصلے ۱۰۸) (مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان)۔

۹۔ مفتی محمود صاحب فرماتے ہیں: اگر اس میں حصہ لینے سے آپ کو احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور آپ حصہ لے کر اہل اسلام کی خدمت کر سکیں اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکیں تو حصہ لے سکتے ہیں (فتاویٰ محمودیہ ۳، ۵۷۰) (مولانا شوکت ثناء قاسمی)۔

۱۰۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رقم طراز ہیں: "موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت (جو خالص اسلامی جماعت اور غلبہ قوت والی ہو) نہ موجود ہے اور نہ قریب میں اس کی توقع ہے (اس لیے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے اور) اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مسلمان موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شرعیہ کی رو سے ان میں جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان ہو اور دوسرے کی دشوار ہو تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق اس میں داخل ہو جائیں، جس کی اصلاح آسان ہو (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان، مولانا اقبال احمد قاسمی)۔

۱۱۔ مولانا عبدالرشید قاسمی تحریر فرماتے ہیں: مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جانے والی پارٹی میں شریک ہو کر ان کی طرف سے انتخاب لڑنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اگرچہ ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے خلاف ہوں (مولانا عبدالرشید کانپور)۔

مولانا صادق مبارکپوری کی رائے ہے:

۱۲۔ تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے شرکت کی اجازت ہونی چاہئے (مولانا صادق مبارکپوری)۔

۱۳۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی "أھون البلیتین" پر عمل کرتے ہوئے ایسی پارٹی میں شرکت کی اجازت کے قائل ہیں جو نسبتاً سیکولر اور مسلمانوں کے مفاد میں

کام کرنے والی ہو، استشہاد میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے حوالہ سے موصوف تحریر فرماتے ہیں:

ہندوپاک تقسیم سے قبل لیگ و کانگریس میں شمولیت پر علامہ شبیر احمد عثمانی کا رجحان لیگ کی طرف تھوڑی تاخیر سے ہوا، اس پر انہوں نے فقہی لحاظ سے ایک لطیف استدلال کیا، کہ خوارج جن کی بابت احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے صاف ارشادات موجود ہیں: یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة حضور ﷺ نے فرمایا: لئن أدرکتهم لأقتلنهم قتل عاد و ثمود۔ نیز فرمایا: ہم شرعاً خلق مسلمانوں کے تھے خوارج کے نظریات ہیں: یتحلون دماء المسلمین وأموالهم ویکفرون الصحابة، لیکن ان سب نصوص کے باوجود امام محمدؒ السیر الکبیر میں رقم طراز ہیں: کہ ان کا مقابلہ اگر بت پرستوں سے ہو جائے تو ساتھ خوارج کا دینا چاہئے کیونکہ کلمہ گو ہونے کے اعتبار سے انہوں نے اہل بیتین ہیں (تجلیات عثمانی: ۳۶۱) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۱۴۔ مفتی شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: سیکولر پارٹی میں شرکت کفر اور نظام باطل کی ہمدردی نہیں ہے بلکہ حالات اور مصلحت کا تقاضا ہے، چنانچہ فقیر عبداللہ محفوظ بن بیہ کی رائے ہے: إن مشاركة المسلمین الذین یعیشون فی الغرب فی العمل السیاسی هنالك سواء بالترشیح أو الانتخاب لاتعنی بأی حال من الأحوال ولائی للكفر، ولا خروجاً عن الإسلام بل هی مشاركة تقتضیها ظروف وجودهم فی هذه البلاد وحق من حقوق المواطنة المشروعة لهم وهنا لا شیء فیہ وهنالك أحداث فی السیرة النبویة تؤكّد ذلك (علی بن نایف شحود الخلاصة فی فقه الأقیات ۱۲۲)۔

۱۵۔ مولانا عمران ندوی کی رائے ہے: قاعدہ فقہیہ "للأكثر حکم الكل" کے تحت ایسی پارٹی میں شمولیت کی اجازت ہونی چاہئے، جس کی صرف بعض دفعات اسلام یا مسلمان مخالف ہوں، کیونکہ حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ فرمائی تھی اس کی تمام شقیں اسلام کے موافق نہیں تھیں (مولانا عمران ندوی، اشتیاق احمد اعظمی)۔

۱۶۔ مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب رقم طراز ہیں: سیاسی پارٹیوں کے منشور کو مذہب کی عینک سے دیکھنا اس دور میں الٹی گنگا بہانا ہے، سیاسی پارٹیوں کا منشور ووٹ بینک کے ارد گرد گھومتا ہے وہ مذہب کے قانونی دائرے میں رہنا پسند نہیں کرتا، اس لیے اگر اس کے منشور میں کوئی دفعہ مخالف اسلام ہو تب بھی اس کے عمومی مسلم مفادات کے تحفظ والی اکثر دفعات پر نظر رکھتے ہوئے اس میں شریک ہونا اور اس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا بالکل درست ہے (مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

۱۷۔ مفتی خالد حسین نیوی قاسمی کی رائے ہے: بہتر ہے کہ اس طرح کی سیکولر پارٹیوں میں شرکت باضابطہ تحریری طور پر معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آئے جیسا کہ بیٹاق مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ اور آس پاس کے یہود اور مشرک قبائل سے معاہدہ کیا تھا (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی)۔

۱۸۔ مفتی عبدالرحیم قاسمی لکھتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کو ان ہی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے تھے جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا تھا، لیکن فتنہ کے اندیشے سے ترک کر دیا اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا: اگر تمہاری قوم ابھی ابھی شرک سے نکلی ہوئی نہ ہوتی تو میں حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر کعبہ کی تعمیر کرا دیتا (صحیح بخاری ۶۳۷۲)۔ فقہاء نے منکرات پر سکوت کو اس وقت جائز قرار دیا ہے جب کسی منکر پر انکار اس سے بڑے منکر کا سبب بن سکتا ہو۔

مذکورہ بالا حدیث و اصول کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکولر پارٹیوں اور ان کی حکومتوں میں شمولیت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۱۹۔ مفتی نصر اللہ علامہ ابن قیمؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: ولہذا یجب علی کل ولی أمر أن یتعین فی ولایتہ بأہل الصدق والعدل والأمثل فالأمثل وإن کان فیہ کذب قال اللہ یؤید هذا الدین بالرجل الفاجر وبأقوام لاخلاق لهم، والغالب أنه لا یوجد الكامل فی ذلك فیجب تحری خیر الخیرین ودفع شر الشرین، وقد کان الصحابة رضی اللہ عنہم یفرضون بانتصار الروم والنصارى علی المجوس عباد النار، لأن النصارى أقرب إلیهم من أولئك، مذکورہ بالا عبارت دلیل ہے اس بات پر کہ جو پارٹی اسلام اور مسلمانوں کے لیے کم سے کم نقصان دہ ہو اس میں شمولیت اختیار کرنا، اس کی طرف سے انتخاب لڑنا نیز اس کی حکومت میں شامل ہونا درست ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام ایران پر روم کی فتح سے خوش ہوتے تھے، اس لیے کہ رومی عیسائی تھے، جبکہ ایرانی مجوسی اور عیسائیت مجوسیت کے مقابلے اسلام سے قریب تر ہے (مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا محمد اعظمی)۔

۲۰۔ مفتی کفایت اللہ صاحب رقم طراز ہیں: "کفار سے اشتراک یا دوستی کسی بھی دفعات میں درست نہیں، لیکن اگر مقصود دین کی حفاظت ہو تو اشتراک جائز ہے

(کفایت المفتی ۳۶۳)۔

۲۱۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں: ”اگر بعض دفعات جو مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاڑ ہیں اپنے منشور سے خارج کرنے پر راضی ہو جائیں تو ان کی حکومت میں شامل ہو سکتے ہیں اور اگر ظن غالب ہو کہ برابر کوشش کرنے سے مستقبل میں کامیابی مل سکتی ہے تو بھی شمولیت کی اجازت ملنی چاہئے، مگر ہاں پارلیمنٹ یا اسمبلی میں ایسا بل پیش ہو تو اس کی تائید ہرگز نہ کی جائے“ (ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۲۲۔ مولانا شاہ اکرام الحق ندوی قرطبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: قال بعض أهل العلم: في هذه الآية ما يبيح للرجل الفاضل أن يعمل للرجل الفاجر والسلطان الكافر، بشرط أن يعمل أنه يفوض إليه في فعل لا يعارض فيه، فيصلح منه ما شاء وأما إذا كان عمله بحسب اختيار الفاجر وشهوته وفجوره فلا يجوز ذلك (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۹، ۱۳۱)۔ مذکورہ بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ نیک سیرت انسان فاجر و کافر حکمران کے لیے کام کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے معلوم ہو کہ جو کام اس کے سپرد کیا جا رہا ہے اس میں وہ کافر حکمران اس کے مخالف نہیں تو جو کام چاہے وہ کر سکتا ہے، البتہ اگر اس کا عمل فاسق و فاجر حکمران کی خواہشات اور اس کے منشاء کے مطابق ہو تو یہ اس کے لیے جائز نہیں (شاہ اکرام الحق ندوی)۔

۲۳۔ لا ینہاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروہم وتقسطوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین (ممتحنہ ۸)۔

امام قرطبی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: هذه الآية رخصة من الله تعالى في صلة الذین لم یعادوا المؤمنین ولم یقاتلوہم۔

صاحب احکام القرآن تحریر فرماتے ہیں: وقد كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عاهد حين قدم المدينة أصنافاً من المشركين منهم النضير وبنو قينقاع وقريظة وعاهد قبائل من المشركين ثم كانت بينه وبين قريش هدنة الحديبية إلى أن نقضت قريش (احکام القرآن للجصاص ۴، ۲۵۴)۔

وقد صالح أصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم في زمن عمر بن الخطاب ومن بعده من الأئمة كثيراً من بلاد العجم على ما أخذوه منهم وتركوهم على ما هم فيه وهم قادرون على استئصالهم (تفسیر قرطبی ۱۰، ۶۳، انفال: ۶۱)۔

مذکورہ بالا تحریروں سے سیکلر پارٹیوں میں باعزت معاہدہ کے تحت شمولیت کا جواز ثابت ہوتا ہے (مولانا رحمان بشرقاسمی، مفتی سہیل اخترقاسمی، مولانا عبدالسلام کٹری)

۲۴۔ مفتی نسیم اختر صاحب ندوی لکھتے ہیں: سیکلر ازم کا مفہوم ہمارے ملک کے اندر دوسرے بعض ممالک سے علاحدہ ہے، یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کے نزدیک سارے مذاہب برابر ہوں گے، ایسی صورت میں یہاں مختلف اقوام و اہل مذاہب کے ساتھ پرامن بقائے باہم کے لیے سیکلر ازم ایک بہتر اور قابل عمل تصور ہے، نیز سیکلر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ زیادہ کرتی ہیں، اس لیے ایسی پارٹیوں میں شرکت، ایکشن میں حصہ اور حکومت میں شمولیت درست ہوگی، (مفتی نسیم اختر ندوی)۔

سوال نمبر ۸: جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت یہ ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں عموماً مقالہ نگاروں کی رائے عدم جواز کی ہے، تاہم کچھ لوگ مشروط طور پر اس کے جواز کے بھی قائل ہیں، چند لوگوں نے حالات کے اوپر اس کا حکم موقوف رکھا ہے، جبکہ کچھ افراد مصالح کے پیش نظر ایسی پارٹیوں میں شمولیت کو غیر مشروط طور پر جائز قرار دیتے ہیں، ذیل میں آراء اور دلائل ملاحظہ ہوں:

۱۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی تحریر فرماتے ہیں: قرآن کریم کی آیت: ”إن الذین توفاهم الملائكة ظالمی انفسہم“ کا سبب نزول بیان

کرتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں: ”إن أناساً من المشركين كانوا مع المشركين يكشرون سواد المشركين على رسول الله ﷺ فيأتي السهم فيرمي فيصيب أحدهم فيقتله فأنزل الله (إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم)“ (بخاری ۲، ۱۰۴۹، کتاب الفتن، باب من كره أن يكشروا سواد الفتن والظلمة) اسی حدیث سے استنباط کر کے حضرت عکرمہؓ نے ابوالاسود کو فوج میں شرکت سے منع کر دیا، وہ فوج مدینہ پر چڑھائی کے لئے جا رہی تھی، حافظ ابن حجر نے مسند ابی یعلیٰ سے اسی معنی کی ایک اور مروی روایت نقل کی ہے، جس کے راوی حضرت ابن مسعودؓ ہیں: ”من كثر سواد قوم فهو منهم ومن رضى عمل قوم كان شريك من عمل به“ (فتح الباری ۱۳، ۴۷، کتاب الفتن) علامہ عینی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”كان غرض عكرمة من نهيه أبا الأسود أن الله ذمهم بتكثير سوادهم مع أنهم كانوا لا يريدون بقلوبهم موافقتهم“ (عمدة القاری ۹، ۱۸۸، کتاب التفسیر باب إن الذين توفاهم الملائكة الخ)۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ”وفيه تخطية من يقيم بين أهل المعصية باختياره لا لقصد صحيح من إنكارا عليهم مثلاً أو رجاء من إنقاذ مسلم من هلكة كما وقع للذين كانوا أسلموا ثم كانوا يخرجون مع المشركين لا لقصد قتال المسلمين بل لإيهاهم كثرهم في عيون المسلمين فحصلت لهم المؤاخذة بذلك“ (فتح الباری ۱۳، ۴۷، کتاب الفتن)۔

ذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوا کہ تکثیر سواذ بذات خود ممنوع ہے۔

البتہ کوئی اپنے اندر اتنی قوت اور زور رکھتا ہے جو واقعتاً کچھ نہ کچھ مسلمانوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، نقصان کا خطرہ نہیں ہے تو نیک نیتی سے شرکت کی گنجائش نکلتی، لیکن ایسی نیک نیتی کا تحقق شاذ و نادر ہے، اس سب کے باوجود صرف شمولیت کی اجازت ہوگی اس کی ور کر کی اوپر چار کر کے تقویت پہنچانے کی اجازت نہیں ہوگی (دیکھئے: مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا حسن الحسن القاسمی)۔

۲۔ مولانا عبدالرشید قاسمی لکھتے ہیں: اعلانیہ طور پر جو پارٹی مسلمانوں کی دشمن ہو اور اس کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا جائز نہیں ہوگا، رہی یہ نیت کہ وہ پارٹی میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو یہ صرف ایک وہم ہے جس کا خارج میں وجود مشکل ہے (مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبداللطیف پانپوری، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی وغیرہ)۔

۳۔ مفتی جنید بن محمد صاحب کی رائے ہے: اقلیت مخالف ایجنڈے کو بدلوانے کی نیت اور اپنی بات نہ منوانے کی شکل میں احتجاجاً پارٹی سے اور وزارت سے مستعفی ہونے کے عزم کے ساتھ اعلانیہ طور پر مسلم دشمن پارٹیوں میں شمولیت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن اس دور میں یہ شاذ و نادر ہے (مفتی جنید بن محمد، مولانا مقصود قرظانی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی اکل یزدانی القاسمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی)۔

۴۔ مفتی محمد اشرف قاسمی لکھتے ہیں: دشمن کی صفوں میں شکاف پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے بیچ میں گھسا جائے، اگر ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے دفعات ہیں تو پھر قانونی طور پر ان کے خلاف چارہ جوئی کی جائے (مفتی محمد اشرف قاسمی)۔

۵۔ مفتی شیر علی گجراتی لکھتے ہیں: مصالح کا خیال کرتے ہوئے جائز ہے (مولانا شیر علی گجراتی)۔

۶۔ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی رقم طراز ہیں: بعض سیاسی پارٹیاں ایسی ہیں کہ ان کا خمیر ہی مسلم دشمنی اور اسلام کی مخالفت سے تیار ہوا ہے، یعنی وہ پارٹی بنائی ہی اس لئے گئی ہے کہ اسے اس ملک میں مسلمانوں کو رہنے دینا نہیں ہے اور اگر مسلمان رہیں تو اپنے شعار سے دست بردار ہو کر رہیں، ایسی پارٹیوں کے منشور کو بدلنا ممکن نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا کہ وہ اس پارٹی میں اس لئے شامل ہو رہا ہے کہ وہ ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا صرف بہلا دے کی بات ہے (مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا انور علی اعظمی)۔

۷۔ مولانا غلام رسول منظور القاسمی لکھتے ہیں: اس کی حسن نیت کے مطابق اس میں شمولیت کی اجازت بوقت ضرورت دی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ خود شریک ہو کر اس کا آلہ کار بن کر نہ رہ جائے اور اس کے ایجنڈے کے بدلنے کی طاقت و قوت ہو (مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا مجیب الرحمن ندوی)۔



حضرت اہل بن حنیف سے مندا احمد اور محکم کبیر وغیرہ میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من أذل غنדה مؤمن فله ينصره ويقدر على أن ينصره أذله الله على رؤوس الأشهاد يوم القيامة“ (المعجم الكبير ۲، ۷۳) (مولانا غلام رسول منظور، مولانا عبدالرحمن بجنوری)۔  
۸۔ مولانا حیدر علی قاسمی لکھتے ہیں:

ایسی پارٹیوں میں شرکت کے بعد اس کے ماحول اور کردار سے متاثر ہونے کا زیادہ امکان ہے، کیونکہ ”إذا تكدر الكلام على السمع تقرر في القلب“ (مفید الطالبین ۵) لہذا ”درأ المفسد أولى من جلب المنافع“ (قواعد الفقہ ۸۱) کے تحت اسلام مخالف پارٹیوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہونی چاہئے (مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا قمر عالم قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، تاضی حسن ندوی، مولانا عبدالسلام کوثری، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالرب اعظمی)۔

۹۔ ڈاکٹر مبین سلیم رقم طراز ہیں: اسلام دشمن پارٹیوں میں شریک ہونا جائز نہیں جبکہ اس کے ساتھ دوسری آنحضرتین والی پارٹیاں موجود ہوں، اگر اس طرح کی پارٹیوں میں سے کوئی نہ ہو تو پھر بھی ان کھلی دشمن پارٹیوں میں کم ضرر والی کو ترجیح ہوگی (ڈاکٹر مبین سلیم)۔

۱۰۔ مفتی عارف باللہ قاسمی تحریر کرتے ہیں: رہی یہ بات کہ ایجنڈے کو بدلنے کی نیت سے شامل ہونا تو یہ ناممکن ہے عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایسی جماعت میں شامل ہونے والا تھک ہار کر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے پر مجبور ہوتا ہے اور قوم کے مفاد کو بھول جاتا ہے، اس لئے شخص اس مفروضے کی وجہ سے اس کو جائز نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ مسلمانوں کے دشمن کا تعاون صریح حرام ہے اور ایسے ظالمین کے معاونین کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”إنما ستكون بعدى أمراء يكذبون ويظلمون فمن دخل عليهم فصدقهم بكذبهم وأعانهم على ظلمهم فليس مني ولست منه وليس بوارد على الحوض ومن لم يصدقهم بكذبهم ويعنهم على ظلمهم فهو مني وأنا منه وهو وارد على الحوض“ (مسند احمد ۱۸۱۲۶) (مفتی عارف باللہ قاسمی)۔

۱۱۔ مولانا عبدالخالق صاحب کی رائے ہے: ”الأمر بمقاصدها“ کے تحت اصلاح اور ایجنڈے کو بدلنے کی نیت سے ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا جائز ہے (مولانا عبدالخالق، مفتی نصر اللہ ندوی)۔

۱۲۔ مفتی عبدالرحیم قاسمی لکھتے ہیں: اگر مسلمان اس پارٹی میں شامل ہوں جس سے امید ہے کہ پارٹی مسلم دشمنی کے بجائے دکاس اور ملکی ترقی کو ایجنڈا بنائے گی تو جہاں ایسی پارٹی کی حکومت یا غلبہ ہو وہاں اس میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی، اس کی بہترین مثال حربی کافروں کی غالب اکثریت سے اپنی حیثیت تسلیم کرانے اور مراعات حاصل کرنے کا نمونہ صلح حدیبیہ کی روشنی میں ملتی ہے (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۱۳۔ مولانا توقیر بدر قاسمی کی رائے ہے: ایک معتد بہ تعداد کے ساتھ ایسی پارٹیوں میں شمولیت جائز ہونی چاہئے، ورنہ اکیلے کی بات سنی نہیں جاتی اور بسا اوقات مغلوب ہو کر اس کا ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے (مولانا توقیر بدر القاسمی)۔

۱۴۔ مفتی نعیم اختر صاحب ندوی تحریر کرتے ہیں: مسلم دشمنی کے لئے معروف پارٹیوں میں شرکت عمومی حالت میں درست نہیں ہوگی، یہ طے کرنا کہ ایسی پارٹیوں میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی، ایک نازک کام ہے، بہر حال ایسا کوئی فیصلہ مقامی حالات اور نفع و نقصان کے بارے میں موازنہ کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے (مفتی نعیم اختر ندوی)۔

دلائل مانعین جواز:

”ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار وما لكم من دون الله من أولياء ثم لا تنصرون“ (ہود ۱۱۳)  
(مولانا ثار عالم، مولانا اسماعیل بن محمد صالح، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں)۔

”يا ايها الذين آمنوا لا تتخذوا الذين اتخذوا دينكم هزوا ولعبا“ (المائدہ ۵۷) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

”ولا تعاونوا على الإثم والعدوان“ (المائدہ ۲) (مولانا ثار عالم ندوی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مولانا عبدالسلام کوثری، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں وغیرہ)۔

”ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا“ (نساء: ۱۳۱) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

”لو تزیلوا العذبتنا الذین کفروا منهم عذاباً ألیماً“ (الفتح ۳۵) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

”وقد نزل علیکم فی الكتاب أن إذا سمعتم آیات اللہ یکفربہا ویستہزأ بہا فلا تقعدوا معہم حتی ینحوضوا فی حدیث غیرہ إنکم إذا مثلہم الخ“ (نساء: ۱۳۰) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

”یأیہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون إلیہم بالمودة وقد کفروا بما جاء کم من الحق“ (ممتحنہ: ۱) (مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا کلیم اللہ عمری)۔

”من رضی عمل قوم فهو منهم ومن کثر سواد قوم فهو منهم“ (سبل السلام ۷۰۱۰۷) (مولانا عبدالرحمن بجنوری، مولانا توفیق بدران تاقی)

”من مٹی مع ظالم لیعینہ وهو یعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام“ (تفسیر القرآن العظیم ۲۰۱۱) (مولانا شاہ اکرام الحق ندوی) ”وأن احکم بینہم بما أنزل اللہ الخ“ (مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا یوسف علی)۔

”أفحکم الجاہلیة ینحون ومن أحسن من اللہ حکما لقوم یوقنون“ (المائدہ)۔

اس آیت کی تشریح میں سید قطب رقم طراز ہیں:

”واللہ سبحانہ یقول: إن المسألة فی هذاکله مسألة کفروا إیمان أو إسلام أو جاہلیة وشرع أو هووی وإنه لا وسط فی هذا الأمر ولا هدنة ولا صلح فالؤمنون هم الذین یحکمون بما أنزل اللہ ولا یحرفون منه حرفاً ولا یبدلون منه شیئاً والکافرون الظالمون الفاسقون هم الذین لا یحکمون بما أنزل اللہ وإنه إما أن یکون الحاکم قائمین علی شریعة اللہ کاملہ فی نطاق الإیمان وإما أن یکونوا قائمین علی شریعة أخرى مما لم یأذن به فهم الکافرون الظالمون الفاسقون“ (فی ظلال القرآن ۲۰۳۲) (مفتی نصر اللہ ندوی)۔

”لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذلك فلیس من اللہ فی شیء“ (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں)۔

”الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین أیتخون عندهم العزة فإن العزة لله جمیعاً“ (نساء: ۱۳۹) (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں)

”یا یہا الذین آمنوا لا تتخذوا بطانة من دونکم“ (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں)۔

”یا یہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصارى اولیاء بعضهم اولیاء بعض ومن یتولہم منکم فإنه منهم“ (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں، مفتی تنظیم عالم تاقی)۔

”إنما ینہاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاہروا علی إخراجکم أن تولوہم ومن یتولہم فأولئک هم الظالمون“ (مولانا ممتاز خاں ندوی)۔

”لا تجد قوماً یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسوله ولو كانوا آبائہم أو أبناءہم أو عشیرتہم“ (مولانا ثار عالم ندوی)۔

”إثمہما أكبر من نفعہما“ (مولانا ثار عالم ندوی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

اسلامک فقہا کیڈی انڈیا کے چودھویں فقہی سیمینار میں ووٹ سے متعلق جو تجاویز منظور ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ”جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں خواہ

وہ ذاتی طور پر نیک خلعت ہو (مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں، مولانا سید باقر ارشد قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔  
دلائل قائلین جواز:

”وان جنحوا للسلم فاجتہح لہا“ (الانفال: ۲۰) (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

”عن انس قال: قال النبی ﷺ: أنصر أخاك ظالماً أو مظلوماً قال رجل: يا رسول الله أنصره مظلوماً فكيف أنصره ظالماً؟ قال تمنعه من الظلم فذلك نصرتك إياه“ (متفق عليه)، ”الناس إذا رأوا الظالم فلم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله العقاب“ مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ کوئی پارٹی ظلم کر رہی ہے اور انتخابات میں حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجہ میں مٹانا اس کی قدرت میں ہے تو ان دونوں حدیثوں کی رو سے نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے انتخابات میں پوری دلیری سے حصہ لے اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی بھرپور کوشش کرے (فقہی مقالات ۲۸۶/۲) (مولانا ارشد علی رحمانی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی)۔

امام محمد السیر الکبیر میں فرماتے ہیں: ”ولا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك على أهل الشرك إذا كان حكم الإسلام هو الظاهر عليهم“ (جواب الفقہ ۲۰۸) (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

”قال الشافعي: أنه عليه الصلوة والسلام استعان في غزوة خيبر بيهود من بني قينقاع وفي غزوة حنين بصفوان بن أمية وهو مشرك“ (شامی ۳۳۵، ۳) (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

یہود کے ساتھ حضور ﷺ نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے اور درمختار میں ہے: ”ومفاده جواز الاستعانة بالكافر عند الحاجة وقد استعان عليه الصلوة والسلام باليهود على اليهود“ (درمختار علی ہامش ردالمختار ۳۰۵) (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

”من أذل عنده مؤمن فلم ينصره ويقدر على أن ينصره أذله الله على رؤوس الأشهاد يوم القيامة“ (المعجم الکبیر) (مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مولانا عابد الرحمن بجنوری)۔

سوال نمبر ۹: ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں مسلمانوں کے لئے علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکوز نہیں ہوتی ہے وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں تمام مقالات کی خواندگی کے بعد کل چار طرح کی آراء سامنے آئی ہیں:

۱۔ مطلقاً جواز، ۲۔ مطلقاً عدم جواز، ۳۔ مشروط جواز، ۴۔ جواز عدم جواز سیاسی ماہرین و حالات پر موقوف۔

ذیل میں مقالہ نگاران کی آراء اور ان کی طرف سے پیش کردہ دلائل پیش خدمت ہیں:

۱۔ مفتی نصر اللہ صاحب ندوی تحریر کرتے ہیں:

آج کے دور میں قوت نافذہ کے بغیر نہ تو ظلم کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور نہ عدل کو قائم کیا جاسکتا ہے، اس لئے ”کنتم خير أمة“ اور ”من رأى منكم منكراً منكم منكر“ کے تقاضے میں حکومت کا قیام بھی داخل ہے، رہا یہ سوال کہ سیاسی جماعت کے قیام کے بعد بھی انہیں سیکولر ایجنڈے ہی کے تحت کام کرنا پڑے گا تو یہ اپنی جگہ درست ہے لیکن مسلم سیاسی جماعت دوسروں کے مقابلے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ زیادہ کرے گی، رہا یہ شبہ کہ اس قدم سے مسلم مخالف ووٹ متحد ہو جائے گا جس سے فرقہ پرست طاقتوں کو بہت فائدہ ہوگا، تو یہ ایک خام خیالی ہے تجربات و مشاہدات اس کے برعکس ہیں، آسام میں مولانا بابر الدین اجمل اور کیرالہ میں مسلم لیگ کا کامیاب تجربہ ہمارے لئے واضح مثال ہے (مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا عبدالشکور قاسمی کیرالا، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مولانا قمر عالم قاسمی،

مفتی شاجہاں ندوی وغیرہ)۔

۲۔ مولانا عبدالحق صاحب رامپور کی رائے ہے: ہندوستان جیسے ملک میں مسلمانوں کا علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا دوراندیشی کے خلاف ہے، مسلم سیاسی جماعت کے قیام سے مسلمان مخالف ووٹ متحد ہو جائیں گے جس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھائیں گی، اس طرح ظالم و جاہر حکومت قائم ہونے کی راہ ہموار ہو جائے گی، جو کسی طرح درست نہیں، کیونکہ ہر وہ کام جس سے اسلام اور مسلمانوں کو ضرر و نقصان پہنچتا ہو اس کو کرنا جائز نہ ہوگا (مولانا عبدالحق رامپور، مولانا عبدالحق رامپور، مفتی اکمل یزدانی القاسمی وغیرہ)۔

۳۔ مولانا نثار عالم ندوی و مولانا فیاض عالم قاسمی بنیادی طور پر مسلم سیاسی جماعت کے قیام کے حق میں نہیں ہیں تاہم موجودہ صورت حال کے تناظر میں ایک ایسی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں جس کا ہائی کمان انتظامی امور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اس کا نام اسلامی نہ ہو، غیر مسلموں کو بھی اس میں شامل کیا جائے (مولانا نثار عالم ندوی، مولانا فیاض عالم قاسمی)۔

قاضی محمد حسن ندوی تحریر فرماتے ہیں: مسلم سیاسی جماعت کے قیام کا حکم اس کے اہداف و نتائج اور فوائد کی بنیاد پر ہوگا اس کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور فائدہ کی درج ذیل شکلیں ہیں:

ممالک میں ان کے وجود کو تقویت ملے گی، ان کی اجتماعیت میں مضبوطی اور دینی صورت حال کو پائیدار بنانے میں مدد ملے گی۔

اس سیاسی جماعت کی وجہ سے اسلام کے مستقل اور منفرد وجود کو تحفظ ملنے کا امکان رہے گا، نیز وہ دعوت الی اللہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کے تحت لوگوں کی اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

اسلامی قضایا کی نصرت و حمایت میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے جیسے فلسطین کا مسئلہ، امت مسلمہ کی ترقی و عروج کا مسئلہ، ہندوستان میں مسجد و مدرسہ کا مسئلہ۔ زندگی کے تمام شعبہ جات میں اسلامی شریعت کو فیصلہ بنانے میں بھی سیاسی پارٹی سے مدد مل سکتی ہے، بہر حال جلب منفعت اور دفع مضرت کے تحت سیاسی جماعت قائم کرنا درست ہے۔

سیاسی جماعت کے قیام کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کا سیاسی اعتبار سے نقصان ہے تو وہاں سیاسی جماعت قائم نہ کریں بلکہ سیکولر پارٹی میں شمولیت کر کے امانت دار شخص کو ووٹ دینا چاہئے، اپنے ووٹ کو ضائع ہونے سے بچانا چاہئے (قاضی محمد حسن ندوی)۔

۵۔ مولانا رحمت اللہ ندوی کی رائے ہے: جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں ملک اور ملت کے احوال و مصالح اور مفادات کو سامنے رکھ کر مناسب ہو تو کسی سیاسی جماعت کی تشکیل کر سکتے ہیں جبکہ اس کے قیام سے مسلمان مخالف ووٹ متحد نہ ہو اور فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ نہ اٹھائیں (مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالرب اعظمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

۶۔ مولانا محمد فاروق صاحب لکھتے ہیں: ایسا ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور آبادی کا اوسط بھی ہر جگہ مساوی نہ ہو تو وہاں مسلمانوں کی انفرادی پارٹی کس قدر مفید ہوگی، اس کا اندازہ سیاست کے ماہرین اور اس سلسلہ میں گہری بصیرت رکھنے والے لوگ جب کہ صحیح العقیدہ سلیم الفکر ہوں زیادہ کر سکتے ہیں (مولانا محمد فاروق، مولانا عامر ظفر ایوبی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی)۔

۷۔ مولانا عبداللطیف صاحب پالنپوری کی رائے ہے: وقت کے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر جو صورت مسلمانوں کے حق میں مفید ہو وہ اپنی اپنی چاہئے (مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

۸۔ مولانا عبید اللہ ندوی صاحب رقم طراز ہیں: مسلمانوں کو سیاسی پارٹی قائم کرنے کے بجائے سیکولر پارٹیوں سے ملی مفادات کی بنیاد پر مفاہمت کو ترجیح دینا چاہئے، ہاں جن علاقوں اور صوبوں میں مسلم اکثریت ہے وہاں الگ سیاسی پارٹی قائم کرنے کی گنجائش ہوگی (مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۹۔ مولانا ابرار خاں ندوی صاحب کی رائے ہے: اگر سیاسی جماعت اس مقصد سے قائم کرتے ہیں کہ اپنی قوم کو ان کے جائز حقوق دلوا سکیں، ملک میں جو کرپشن و استحصال اور لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ناانصافی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، اس کا خاتمہ ہو، قوم کے ساتھ ملک کی خدمت و ترقی کا ایک نمونہ پیش کریں تو یہ دعوتی نقطہ نظر سے بھی مفید ہوگا (مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری)۔

۱۰۔ مولانا ریحان مبشر صاحب قاسمی تحریر کرتے ہیں: ہر علاقے کے لحاظ سے مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کا حکم الگ ہو سکتا ہے، ایک ہی طریقہ کار ہر جگہ اپنا نامناسب نہیں ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں تو گنجائش ہے، لیکن جہاں ان کی تعداد بہت کم ہے، وہاں اس کی اجازت مناسب نہیں ہے (مولانا ریحان مبشر قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عثمان بستوی)۔

۱۱۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب فرماتے ہیں: جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں دیگر مذاہب کے عوام کی جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری لے کر اور ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے مسلمانوں کے لئے الگ سیاسی جماعت قائم کرنا درست ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہ ہو اور مسلمان مخالف ووٹ کے متحد ہونے کا خدشہ ہو وہاں مسلم سیاسی جماعت کے قائم کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئے (مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

۱۲۔ مفتی سلطان کشمیری صاحب کی رائے ہے: جمہوری ملک میں مسلم اقلیت کا الگ سے سیاسی جماعت کا قائم کرنا اگرچہ مسلم دشمن پارٹیوں کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے تاہم بندہ کے نزدیک مسلمانوں کی الگ سے سیاسی جماعت ہدف کے ساتھ فائدہ سے قطعاً خالی نہیں ہے، بالترتیب جماعت کو جب تقویت ملتی رہے تو مستقبل میں جماعت پوری وجود کے ساتھ اور اعتماد کے ساتھ سامنے آ سکتی ہے (مفتی سلطان کشمیری)۔

۱۳۔ مولانا اسماعیل بن محمد صالح لکھتے ہیں: علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ غیر مسلموں کو بالکل شریک نہ کیا جائے بلکہ ان کو اعتماد میں لے کر مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود بھی اپنی سیاسی جماعت قائم کر سکتے ہیں (مولوی محمد اسماعیل بن محمد صالح)۔

۱۴۔ مفتی نبیم اختر صاحب ندوی لکھتے ہیں: علاحدہ سیاسی جماعت اس طور پر قائم کرنا سیاسی مصلحت کے مطابق ہوگا کہ اس میں دیگر اقوام بالخصوص مظلوم طبقات کی بھی شرکت ہو، ایسی مخلوط سیاسی جماعت جس کی قیادت مسلم ہاتھ میں ہو اس خطرہ سے بھی محفوظ رہنے میں مدد دے گی کہ اس کے نتیجے میں مسلم مخالف ووٹ متحد ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے مسلم مصالح کی کار بر آری بہتر ہو سکے گی (مفتی نبیم اختر ندوی)۔

دلائل قائلین جواز:

”کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله“ (النساء) (مفتی نصر اللہ ندوی)۔

”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم“ (انفال ۶۰) (مفتی عبدالشکور قاسمی کیرالا، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی)۔

”ولا تكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءهم البينات“ (آل عمران: ۱۰۳) (مولانا قمر الزماں ندوی)۔

”واعصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا“ (آل عمران: ۱۰۳) (مولانا محمد فاروق، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا محمد ارشد علی رحمانی، مولانا ریحان مبشر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

”ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم“ (الانفال: ۳۶) (مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا محمد ارشد علی رحمانی)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ ہجرت فرما رہے تھے، اس وقت جو دعاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی گئی تھی وہ یہ تھی: ”واجعل لي من لدنك سلطانا نصيرا“ (بنی اسرائیل: ۸۰) (اس دعا کا مطلب اللہ کی طرف سے ایک مکمل سلطنت و حکومت کی طلب ہے) (مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

”من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان“ (مسلم) (مفتی نصر اللہ ندوی)۔

”عليكم بالجماعة وإياكم والفرقة فإن الشيطان مع الواحد وهو من الاثنين أبعد من أراد ببجوحة الجنة فليلزم الجماعة“ (ترمذی ۲۱۶۵) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

”من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقته الإسلام من عنقه“ (ابوداؤد ۳۷۵۸) (مولانا ریحان مبشر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”لا إسلام إلا بجماعة“ (مفتی سہیل اختر قاسمی، مولانا قمر الزمان ندوی)۔

”ما لا یتم الواجب إلا به فهو واجب“ (البحر المحیط للزرکشی ۱: ۲۲۲) (مولانا عبدالشکور قاسمی کیرالا)۔

حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے: البتہ اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہ ہو جو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کریں جیسا کہ اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ مجاہد دنیا دینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنا لیں جو عملاً و علماً سیاست و شریعت کے جامع ہوں مگر یہ حکم کچھ سیاست مدنیہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے (فرض کفایہ ہیں مثل تجارت و زراعت) ہیں سب کا یہی حکم ہوگا، البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اس میں دخل اصلاحی کا وجوب اقویٰ و آگاہ ہوگا اور ان سب مفاسد کی اصلاح کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں استطاعت کے ساتھ مشروط ہوگا (اعلم والعلماء ص ۲۷۲) (مولانا توقیر بدر قاسمی)۔

دلائل مانعین جواز:

”ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها“ (الاعراف: ۵۲) مسلمانوں کی علاحدہ سیاسی جماعت کا قیام فتنہ و فساد کا سبب بن سکتا ہے (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی)۔

”والفتنة أشد من القتل“ (البقرہ: ۱۹۱) (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی)۔

”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (مائدہ: ۲) مسلمانوں کی اپنی سیاسی جماعت سے فرقہ پرستوں کو فائدہ پہنچنے کا اندیشہ ہو تو یہ بھی تعاون علی الاثم ہے (مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

”درء المفسد اولی من جلب المصالح“ (الاشباہ والنظائر ۹۰، القاعدة الرابعة) (مولانا ارشد علی رحمانی، مفتی جعفر علی رحمانی)۔

”دفع المضرۃ اولی من جلب المنفعة“ مسلم سیاسی پارٹی کا قیام جلب منفعت ہے اور فرقہ پرستوں کا اتحاد مضرت ہے (سید باقر ارشد قاسمی، مفتی سلمان پالنپوری)۔

”إذا أمرتکم بشئ فاتوا منه ما استطعتم وإذا نھیتکم عن شئ فاجتنبوه“ (مولانا ارشد علی رحمانی)۔

میثاق مدینہ (مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شبیر احمد پولوی)۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھنؤ میں قوم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اب اپنی کوئی علاحدہ جماعت نہ بنائیں بلکہ ملک کی قومی جماعتوں میں جوان کے مفادات کے لئے کام کر رہی ہیں شامل ہو جائیں (مولانا عبید اللہ ندوی)۔

حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: موجودہ حالات میں افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت جو خاص اسلامی جماعت اور غلبہ و قوت والی ہونہ موجود ہے اور نہ قریب میں اس کی توقع ہے (اس لئے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے) اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مسلمان موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شرعیہ کی رو سے ان میں جو نقص ہے اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں سے ایک کی اصلاح آسان ہو اور جب کوئی جماعت مسلم منظم صاحب قوت و اثر تیار ہو جائے تو (اس کے ساتھ) مل کر کام کریں (اسلام کا سیاسی نظام از مولانا محمد اسحاق صدیقی مطبوعہ کراچی ص ۳۱۷، ۳۱۸) (مولانا عبدالرب عبد الوہاب خاں)۔

”إذا تعارضت المصالح والمفسد قدم الأرحم منها علی المرجوح“ (مولانا شاہ اکرام الحق ندوی)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی رائے قاموس الفقہ (۲۱۳/۱) پر درج ہے:

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی سرکوز نہیں ہے، مسلمانوں کی علاحدہ سیاسی جماعتیں مفید نہیں ہیں، بلکہ یہاں کے حالات میں سیکولر جماعتوں سے مسائل کی بنیاد پر معاہدہ کر کے سیاسی اشتراک زیادہ مناسب ہے (ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

”وقد کان النبی ﷺ عاهد حین قدم المدینة أصنافاً من المشرکین منهم النضیر وبنو قینقاع وقریظہ وعاهد

قبائل من المشرکین (احکام القرآن) (مولانا عبدالسلام کوثری)۔

سوال نمبر ۱۰ میں کل تین شقیں ہیں: ۱۔ ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہئے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہئے؟ ۲۔ کیا ان کے لئے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے؟ ۳۔ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟

اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگاروں نے مذکورہ تین شقوں کے علاوہ ایک چوتھی شق: عورت سربراہ مملکت بن سکتی ہے یا نہیں، پر بھی اپنی رایوں کا اظہار کیا ہے۔ شق اول کے متعلق دو مقالہ نگار کے علاوہ تقریباً تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ شرعی ضوابط کے ساتھ خواتین ووٹنگ میں حصہ لے سکتی ہیں۔ شق ثانی و ثالث کے تعلق سے مقالہ نگاران کی رائے جواز و عدم جواز دونوں طرح کی ہیں، جواز میں بھی مشروط اور غیر مشروط دونوں طرح کی آراء ہیں۔ نیز شق رابع کے تعلق سے تقریباً تمام مقالہ نگاروں کی رائے نفی میں ہے، اب ذیل میں مقالہ نگاروں کی آراء وان کے دلائل نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ ووٹ شہادت کے حکم میں ہے اور عورتیں بھی اہل شہادت میں سے ہیں، اس لئے عورتیں شرعی ضوابط و پردہ کے ساتھ ووٹ دے سکتی ہیں تاہم ان کا ممبر بننا یا سربراہ حکومت بننا درست نہیں (مولانا فاروق، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی شبیر احمد دیوادی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا مجیب الرحمن ندوی وغیرہ)۔

۲۔ مولانا ریحان مبشر قاسمی لکھتے ہیں: ان نکات کو نقل کرنے سے راقم الحروف عورتوں کو امیدوار بنانے کے حق میں نہیں ہے اور نہ ہی اس کو درست تسلیم کرتا ہے، لکھنے کا مقصد محض اتنا ہے کہ اس جاں کنی کے عالم میں کوئی ایسی تاشی راہ نکالی جائے جو دین اسلام کے مزاج کے خلاف نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کو ملکی سطح پر کامیابی کی راہ جو اب ہموار ہو رہی ہے مسدود بھی نہ ہو سکے (مولانا ریحان مبشر قاسمی)۔

۳۔ مولانا احسن عبدالحق ندوی لکھتے ہیں: ارشاد نبوی: "لن یفلح قوم ولوا أمرہم امرأۃ" کے تحت فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت امیر یا خلیفہ نہیں بن سکتی تو یہی حکم ممبر یا وزیر یا کسی بھی سیاسی نمائندہ بننے کے متعلق بھی ہوگا، البتہ ایک بات قابل غور ہے کہ جہاں عورتیں ایکشن میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیتی ہیں، وہاں عموماً سارے کام مرد انجام دیتا ہے، عورت صرف نام کی امیدوار ہوتی ہے جیسا کہ آج کل پردہانی اور دوسرے ایکشن میں ہوتا ہے، تو ایسی جگہوں پر عورتوں کا ایکشن میں حصہ لینا صحیح ہونا چاہئے (مولانا احسن عبدالحق ندوی)۔

۴۔ مولانا اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: خواتین کا ووٹنگ میں حصہ لینا ایک ناگزیر ضرورت ہے، لہذا جائز ہے البتہ نامحرم سے بچنے کے لئے خاتون انفر کی تعینات کا مطالبہ بھی کرنا چاہئے۔

جہاں مسلم مرد کو ایکشن میں امیدوار بنایا جاسکتا ہے اور وہ سیٹ خواتین کے نام پر مختص نہیں ہے، وہاں مسلم خواتین کا ایکشن میں کھڑا ہونا (منفاسد کثیرہ کے سبب) درست نہیں۔

ان حلقوں میں جہاں مرد کے ایکشن میں کھڑے ہونے پر پابندی لگا کر عورت کو ہی امیدوار ہونے کا موقع باقی رکھا گیا ہے تو "أھون البلیتین" کو اختیار کرتے ہوئے خواتین کو ریزرو سیٹ میں حصہ لینے کی گنجائش ہوگی (مولانا اقبال قاسمی، مولانا یوسف علی)۔

۵۔ مفتی شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینا واجب ہے اور سربراہ مملکت کو چھوڑ کر حکمرانی کے تمام عہدوں پر فائز ہو سکتی ہیں، اسی طرح قانون ساز اداروں کی ممبر بھی بن سکتی ہیں، بشرطیکہ یہ چیز ان کے اصل فرض منصبی یعنی گھر اور بال بچوں کی تربیت میں خلل انداز نہ ہو (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

۶۔ مفتی سید باقر ارشد قاسمی لکھتے ہیں: دشمنان اسلام مسلمانوں کو اقتدار سے دور رکھنے کے لئے مسلسل کوشاں ہیں، اگر یہ شاطر دماغ اقتدار میں حصہ داری کے تعلق سے ہماری عدم بیداری کی بنیاد پر اپنی چال میں کامیاب ہو گئے تو آنے والے دنوں میں اسلامی قوانین کا بھی مذاق اڑائیں گے اور پھر مذہبی آزادی کے تعلق سے بھی ہمارے لئے مسئلہ کھڑا ہوگا، لہذا وہ علاقہ جہاں کی نشست عورتوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہو یا پھر سیاسی اعتبار سے اس علاقہ میں عورت ہی کا انتخاب لڑنا کسی وجہ سے بہتر ہو یا پھر سوالنامہ میں مذکور وجوہات و حقائق پیش نظر ہوں تو ایسی صورت میں عورت کا سیاست میں حصہ لینا درست ہے بشرطیکہ پردہ کے تعلق سے شرعی احکام ملحوظ خاطر رہے، ہاں صرف اپنے اسٹیٹس کے اظہار کے لئے یا شوقیہ سیاست میں حصہ لینا اور انتخابات لڑنا عورت کے لئے جائز نہیں ہے (مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا شوکت شاہ قاسمی، ڈاکٹر سبین سلیم، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا فیاض عالم قاسمی، شاہ اکرام الحق ندوی، مفتی نعیم اختر ندوی)۔

۷۔ مولانا ممتاز خاں ندوی فرماتے ہیں: عورت کا ووٹ ڈالنے میں مردوں سے میل جول ضروری ہے، جبکہ شریعت نے اختلاط سے منع کیا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ عورتوں کے لئے ووٹ کے مراکز الگ قائم کئے جائیں ایسی صورت میں عورت ووٹ ڈال سکتی ہے (مولانا ممتاز خاں ندوی)۔

۸۔ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں: اصولی طور پر ایکشن میں خواتین کا حصہ لینا ہرگز جائز نہیں، اس میں بہت سی شرعی اور معاشرتی قباحتیں موجود ہیں، اگرچہ سوشل اور سماجی کاموں میں عورتیں شرعی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اپنے فرائض حیات پر کاربند رہتے ہوئے حصہ لے سکتی ہیں، لیکن ایکشن میں ان کا امیدوار بننا شرعی طور پر بھی جائز نہیں ہے (مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین، جمالی، مولانا اسماعیل بن محمد صالح، مفتی سلطان کشمیری)۔

۹۔ مولانا عامر ظفر ایوبی صاحب کی رائے ہے: مسلم خواتین کو امیدوار نہ بنانے کی صورت میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت حد تک کم ہو جائے گی، مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ غیر یقینی ہو سکتا ہے، اس لئے اس صورت میں ”اعظم ضرر یزال بلا خوف، الضرورات تبیح المحظورات“ پر عمل کرتے ہوئے مسلم خواتین کو امیدوار بنایا جاسکتا ہے اور وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں (مولانا عامر ظفر ایوبی، مفتی اکمل یزدانی القاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی انور علی اعظمی وغیرہ)۔

۱۰۔ مولانا حیدر علی قاسمی فرماتے ہیں: خواتین کے لئے ووٹنگ میں حصہ لینا، ایکشن میں امیدوار بننا اور قانون ساز اداروں کی ممبر بننا جائز اور درست نہیں ہے (حیدر علی قاسمی، مولانا عبدالسلام کوثری)۔

۱۱۔ مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی لکھتے ہیں: خواتین کے لئے محفوظ سیٹوں پر امیدوار بننے کی اجازت ہے اور اگر ایسی محفوظ سیٹوں پر مسلم خواتین کا کامیاب ہونا یقینی یا گمان غالب ہو تو وہاں سے کسی ایک مسلم خاتون کا امیدوار بننا واجب کفایہ ہے (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی)۔

۱۲۔ مفتی سہیل اختر قاسمی رقم طراز ہیں: عورت اہل الرائے و مشورہ اور اہل الشہادت والوکالت ہے، اس لئے عورت ووٹنگ کر سکتی ہے، بلکہ امور شرعیہ کا خیال کرتے ہوئے اپنے ووٹ کے حق کا استعمال کرنا ضروری ہے، ورنہ گنہگار ہوگی، رہا ایکشن لڑنا اور پارلیمنٹ میں رکنیت کا مسئلہ تو ہندوستانی معاشرہ و سماج کے حالات کے پیش نظر اگر خواتین کے لئے مردوں سے علاحدہ نشست کا انتظام ہو اور ان کی کاروائی و دیگر سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں شرعی حدود کی رعایت ہو تو وہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی ہے، اگر ان حدود شرعیہ کی رعایت نہ کر سکے تو ووٹ بھی دینا درست نہیں ہے (مفتی سہیل اختر قاسمی، مفتی محمد خالد حسین نیوی، مفتی جعفر علی رحمانی)۔

۱۳۔ مولانا مقصود فرقانی لکھتے ہیں: اگر عورت باپردہ رہ کر اور شریعت کے حدود پامال کئے بغیر دیانت داری اور عزت و عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے قوم و ملت کی خدمت کے لئے ایکشن یا دیگر چیزوں میں حصہ لیتی ہے تو یہ جائز ہے مگر ان شرائط کے ساتھ عورت کے لئے ان چیزوں میں حصہ لینا بہت دشوار ہے (مولانا مقصود فرقانی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

۱۴۔ مفتی عبدالرحیم قاسمی تحریر فرماتے ہیں: پردہ کا لحاظ رکھتے ہوئے خواتین ووٹ دینے جاسکتی ہیں اور جو سیٹ عورتوں کے لئے ریزرو کر دی گئی ہو اور مسلمانوں کی نمائندگی عورت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہو تو ایکشن میں کھڑے ہونے اور اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لئے ممبر بننے کی بھی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ وہ فرائض منصبی کی ادائیگی میں احکام شرعیہ کی پابندی کرے (مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

۱۵۔ مفتی سلمان پانپوری لکھتے ہیں: عام حالات میں عورتوں کے لئے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا درست نہیں، لیکن مخصوص اور غیر معمولی حالات میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکالی جاسکتی ہے (مفتی سلمان پانپوری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۱۶۔ مولانا راشد علی رحمانی تحریر کرتے ہیں: احقر کے نزدیک عورتوں کا ایکشن میں بطور امیدوار حصہ لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح عورتوں کا ممبر پارلیمنٹ بننا بھی شرعاً درست نہیں ہے، اب رہی بات کہ ووٹ ڈال سکتی ہے یا نہیں تو اگر حالات کچھ اس طرح کے ہوں کہ ووٹ ڈالنا بالکل ضروری ہو، مثلاً اگر ایک صالح اور دوسرا غیر صالح امیدوار ہو اور عورتیں ووٹ نہ دیں تو غیر صالح کے جینے کی امید ہو تو ایسی صورت میں شرعی پردے کے ساتھ اس کی گنجائش ہو سکتی ہے (مولانا راشد علی رحمانی)۔

دلائل قائلین جواز:

۱۔ حضرت عمرؓ نے شفاء بنت عبداللہ کو بازار کی نگرانی کی ذمہ داری حوالہ کی تھی۔

”وكان عمر يقدمها في الرأى ويرعاها ويفضلها، وربما ولاها شيئاً من أمر السوق“ (الاصابة لابن حجر ۸۰۲۰) (مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی سہیل اختر قاسمی)۔



نیز ابن حزم تحریر فرماتے ہیں:

”وجائز أن تلي المرأة الحكم - وهو قول أبي حنيفة - وقد روى عن عمر بن الخطاب أنه ولي الشفاء امرأة من قومه السومه: فإن قيل: قد قال رسول الله ﷺ: لن يفلح قوم أسندوا أمرهم إلى امرأة، قلنا إنما قال ذلك رسول الله ﷺ في الأمر العام الذي هو الخلافة، برهان ذلك: قوله عليه الصلاة والسلام المرأة راعية على مال زوجها وهي مسؤولة عن رعيته، وقد أجاز المالكيون أن تكون وصية ووكيلة، ولم يأت نص من منعها أن تلي بعض الأمور وبالله تعالى التوفيق“ (ابن حزم ظاهري، ابو محمد علي بن احمد، السحلي بالآثار، كتاب الشهادات، باب وجاز ولاية المرأة الحكم ۵۲۷/۸ مسئلہ نمبر ۸۰۳ بیروت دارالکتب العلمیہ) (مقالہ: مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا ابراہاں ندوی)۔

۲۔ حضرت عمرؓ کا وہ مشہور خطبہ جس میں انہوں نے چالیس اوقیہ سے زیادہ مہر مقرر نہ کرنے کا اعلان کیا تھا اس پر ایک خاتون نے ارشاد باری تعالیٰ: ”وان اردتم استبدال زوج مکات زوج و ایتتم احداهن قنطارا فلا تأخذوا منه شيئا الخ“ کے ذریعہ آپ کو متنبہ کیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اس خاتون کے اس معقول اعتراض کو تسلیم کیا اور دوبارہ خطبہ کے لئے لوگوں کو جمع کیا اور برملا اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا: ”امرأة أصابت ورجل أخطأ“ اور اپنا بیان واپس لے لیا۔

مذکورہ بالا واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات جس مسئلہ کی طرف بڑے بڑے صاحب علم مرد کی نظر نہیں پہنچتی وہاں تک ایک عورت کی نظر پہنچ سکتی ہے، اس لئے قانون ساز ادارے میں خواتین کی رائے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے اس کو ممبر بننے کی بھی گنجائش ہونی چاہئے (مولانا شوکت ثنائی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ سے سوال کیا کہ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے بغیر کتنے دنوں تک صبر کر سکتی ہے، تو انہوں نے جواب دیا چار ماہ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے تمام فوج کے ذمہ داروں کو حکم نامہ جاری کیا کہ کسی بھی فوجی کو چار ماہ سے زیادہ محاذ پر بندرہ رکھا جائے۔

اس واقعہ میں ایک عورت کی رائے کو باضابطہ قانون کی شکل دے دی گئی اور چاروں دیستان فقہ نے اس قانون کو تسلیم کیا ہے جب کسی عورت کی رائے کو قانونی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے تو پھر عورتوں کے لئے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا ناجائز کیونکر ہو سکتا ہے (مولانا شوکت ثنائی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔

۴۔ ارکان اسبلی و پارلیمنٹ کی حیثیت ارباب حل و عقد کی ہے، سیاست کے مشہور امام علامہ مادودی نے ارباب حل و عقد کی شرائط میں ذکر نہیں کیا ہے:

”فاما الاختيار فالشروط المعتبرة فيهم ثلاثة: أحدها: العدالة الجامعة لشروطها، والثاني: العلم الذي يتوصل به إلى معرفة من يستحق الإمامة على الشروط المعتبرة فيها، والثالث: الرأي والحكمة المؤديان إلى اختيار من هو للإمامة أصلح وبتدبير المصالح أقوم وأعرف“ (الاحكام السلطانية للمادودي ۶ الباب الاول في عقد الامامة) (مفتی سہیل اختر قاسمی)۔

۵۔ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: ”وأما سلطنتها فصحيحة وقد ولي مصر امرأة تسمى شجرة الدر جارية الملك الصالح بن أيوب“ (البحر الرائق ۸، ۵) (مولانا فیاض عالم قاسمی، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی)۔

۶۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت حد و قصاص یعنی فوجداری کے مقدمات کے علاوہ دوسرے تمام مقدمات میں جج بن سکتی ہے (ہدایہ کتاب القضاء بدائع الصنائع ۷، ۳ مطبوعہ بیروت) (مولانا عبدالخالق، مفتی سہیل اختر قاسمی)۔

۷۔ امام ابن جریر کے نزدیک بشمول حد و قصاص کے تمام مقدمات میں عورت جج بن سکتی ہے اور چاروں ائمہ کے نزدیک عورت فتویٰ دے سکتی ہے (المغنی لابن قدامة ۳۶۱) (مولانا عبدالخالق)۔

۸۔ امام ابن حزم نے بیس ایسی خواتین کے نام نقل کئے ہیں جو درصاحبہ میں فتویٰ دیا کرتی تھیں (جوامع السیر ابن حزم ۳۲۳)۔

مذکورہ بالا تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ جب عورت قاضی و مفتی بن سکتی ہے تو قانون ساز ادارے کی ممبر بھی بن سکتی ہے، کیونکہ قانون سازی کرنا فتویٰ کی ہی قسم ہے (مولانا عبدالخالق)۔

۹۔ سمرائے بنت نہیک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ امر بالمعروف کے اونچے عہدے پر فائز تھیں، بازاروں میں لوگوں کے پاس سے گزرتی تھیں، لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دیتیں، اور برائیوں سے روکتی تھیں، اور کوڑے سے لوگوں کو مارتی تھیں (الترتیب الاداریہ ۲۳۰) (مولانا کلیم اللہ عمری)۔

۱۰۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی جناب مولانا مہدی حسن صاحب نے اپنے فتویٰ (الف ۶۷۸) میں لکھا ہے:

جب عورت کے حصہ لینے میں دینی مصالح بھی مضر ہوں تو عورت کا حصہ لینا مباح ہے، بشرطیکہ پردے میں رہے..... اور دینی مصالح کا حصول یقین ہو ورنہ عورت کو بر بنائے حدیث مذکور کے حاکم بنانا جائز نہیں، صرف وہم پر بنانا حدیث مذکور کے خلاف ہے (نئے مسائل کے شرعی احکام ص ۲۱۵ مرتب ثناء الہدی قاسمی) (مولانا توقیر بدر قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۱۱۔ مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں: ایک جمہوری حکومت میں عورت کا صدر ہونا اسلامی روایات کے خلاف ہے، خاص حالات میں صدارت کی امیدواری کی حمایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (نئے مسائل کے شرعی احکام ص ۲۱۶، ۲۱۵، مرتب ثناء الہدی قاسمی) (مولانا توقیر بدر قاسمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۱۲۔ مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں: عورتوں کا کونسل میں جانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا، لیکن اگر جائیں تو حجاب کے ساتھ جانا ضروری ہوگا (کفایت المفتی ۳۱۹/۷) (مولانا شوکت ثناء قاسمی)۔

۱۳۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فریقین کے دلائل پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: بہر حال اس مسئلہ میں دونوں طرف کچھ دلائل ہیں لیکن کوئی ایسی واضح نص بھی موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ انہیں شوری میں شامل نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات طے ہے کہ اگر انہیں شوری میں شامل کیا جائے تو حجاب شرعی کے احکام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوگا (مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی سلطان کشمیری)۔

۱۴۔ مفتی سعید احمد پانپوری صاحب تحفۃ اللمعی میں تحریر فرماتے ہیں: رہی استیلاء و تغلب کی صورت میں تو اس میں بالا جماع عورت کی امارت درست ہے، اس کے احکام نافذ اور واجب الاطاعت ہوں گے، اور ایکشن پارٹی، ووٹ اور اکثریت تغلب ہی کی صورت ہے، کیونکہ جمہوریت میں سرگنے جاتے ہیں دماغ نہیں دیکھا جاتا (تحفۃ اللمعی ۶۳۹/۵) (مولانا عبداللطیف پانپوری)۔

۱۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں: یہ صحیح ہے کہ عورت کے طبعی حالات و فرائض امامت کے منافی ہیں، اور خود اسلام نے امام کے لئے جو ضروری شرائط قرار دیا ہے اس سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، اس لئے وہ امامت جمہوری اور خلافت الہی سے سبکدوش ہے، لیکن اس سے یہ غلط استدلال نہیں کرنا چاہئے کہ مسلمان عورت کو کسی بھی حالت میں پبلک کی سیاسی اور فوجی رہبری جائز نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب ساری ملت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی ہو اور اس کے خیال میں کوئی دوسرا اس فتنہ کو بجھانے والا نہ ہو (سیرت عائشہ ص ۱۲۶) (مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

۱۶۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: اسلامی نقطہ نظر سے عورت ایکشن میں امیدوار نہیں ہو سکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سینیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کم تر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی انتخابی امیدوار بنائیں (راہ عمل ۱۲۶/۳) (مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی سلمان پانپوری)۔

۱۷۔ عورت چونکہ اہل شہادت میں سے ہے، اس لئے اس کا قاضی اور حاکم بننا بھی جائز ہوگا، ”وتقضي المرأة في غير حدود ولا قود لانها اهل للشهادة في غيرهما فكانت أهلا للقضاء“ (البحر الرائق ۸۰۷)۔  
دلائل مانعین جواز:

۱۔ ”الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا“ (نساء: ۳۴) (مولانا حسن عبدالحق ندوی، مولانا عامر ظفر ایوبی وغیرہ)

۲۔ ”وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى“ (سورۃ احزاب: ۳۳) (مولانا قاضی محمد حسن ندوی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی وغیرہ)۔

۳۔ ”وللرجال عليهن درجة“ (بقرہ: ۲۲۸)۔

مذکورہ آیت میں فوقیت امارت و اطاعت کی ہے کہ مرد کو ایک گونہ عورت پر حاکمیت حاصل ہے (مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔

۳۔ ”ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن“ (نساء: ۳۲) (مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔

۵۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اسلام میں سربراہ حکومت کے لئے مرد ہونا شرط ہے، اس لئے کہ بخاری شریف کی روایت ہے: ”لما بلغ رسول الله ﷺ أن أهل فارس قد ملكوا عليهم بنت كسرى قال ”لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ (بخاری ۴۴۲۵) (مولانا فاروق، مولانا احسن عبدالقادر ندوی، مولانا قمر عالم قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین، جمال، مولانا ناکیم اللہ عمری، مفتی شبیر احمد دیوبندی، مولانا افتخار احمد نقاشی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی وغیرہ)۔

۶۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”إذا كان أمراءكم خياركم وأغنياءكم سمحاءكم وأموركم شوري بينكم فظهر الأرض خير من بطنها وإذا كان أمراءكم شراركم وأغنياءكم بخلائكم وأموركم إلى نساءكم فبطن الأرض خير لكم من ظهرها“ (ترمذی: ۲۲۶۶) (مولانا فاروق، مولانا قمر عالم قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی وغیرہ)۔

۷۔ جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شمولیت و قیادت پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے حسب ذیل تحریر لکھی تھی:

”فإنك خرجت غاضبة لله ولرسوله تطلبين أمرا كان عليك موضوعا ما بال النسوة والحرب وإصلاح بين الناس“ (الإمامة والسياسة لابن قتيبه ۷۰) (مولانا فاروق، مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۸۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی حضرت عائشہؓ کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار اس طرح فرمایا:

”إن بيت عائشة خير لها من هودجها“ (الإمامة والسياسة لابن قتيبه ۶۱) (مولانا فاروق، مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۹۔ ”عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لا يخلون رجل بامرأة ولا تسافرن امرأة الا ومعها محرماً“ (بخاری کتاب النکاح ۵۲۲۳، مسلم، کتاب الحج باب سفر المرأة مع محرماً ۴۴۲) (مولانا راشد حسین ندوی)۔

۱۰۔ ”لا يخلون رجل امرأة إلا كان ثالثهما الشيطان“ (ترمذی ۲۷۸۶) (مولانا ریحان بشر قاسمی)۔

۱۱۔ ”ما تركت بعدي فتنة أضر على الرجال من النساء“ (محقق علیہ) (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا ریحان بشر قاسمی)۔

۱۲۔ ”المرأة عورة فإذا خرجت من بيتها استشرها الشيطان“ (ترمذی ۲۲۱۱) (مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

۱۳۔ امام قرطبیؒ عورت کے حاکم بننے اور عہدہ قضا وغیرہ پر فائز ہونے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”فإن المرأة لا يتأق منها أن تبرز إلى المجلس ولا تخالط الرجال ولا تفاوضهم مفاوضة النظير للنظير“ (الجامع الأحكام القرآن ۷۱۳۰) (مولانا محمد فاروق)۔

۱۴۔ تفہیم القرآن میں حضرت سروق سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوت قرآن کرتے ہوئے اس آیت ”وقرب في بيوتكن الخ“ پر پہنچتیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں، یہاں تک کہ دوپٹہ بھیگ جاتا تھا، کیونکہ اس آیت پر وہ خطا یاد آجاتی تھی جو جنگ جمل میں ہوئی تھی، مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوا کہ عورتیں مطلقاً سیاست میں حصہ نہیں لے سکتیں (مولانا فاروق، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)۔

۱۵۔ علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں: ”ويجوز قضاء المرأة في كل شيء إلا في الحدود والقصاص، وقال الأئمة الثلاثة: لا يجوز، لأن المرأة ناقصة العقل ليست أهلاً للخصومة مع الرجال في محافل الخصوم، قال ﷺ: لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة رواه البخاري۔ والجواب أن ما ذكر غاية ما يفيد منع أن تستقضي وعدم حله، والكلام فيما لو وليت وأثم المقلد بذلك أو حكمها خصمان ففضت قضاء موافقا لدين الله أكان ينفذ أم لا؟ لم ينتهض الدليل على نفيه بعد موافقته

ما أنزل الله“ (فتح القدیر ۷: ۲۹۸) (مفتی عارف باللہ قاسمی)۔

۱۶۔ ”لا تصلح المرأة أن تكون إماما ولا قاضيا لأنهما محتاجان إلى الخروج للقيام بأمور المسلمين والمرأة عورة لا تصلح لذلك“ (مرقاۃ المفاتیح ۶: ۲۳۰) (مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۱۷۔ مشہور فقہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں: ”ولا تصلح للإمامة العظمى ولا لتولية البلدان، ولهذا لم يرول النبي ﷺ ولا أحد من خلفائه ولا من بعدهم امرأة قضاء ولا ولاية بلد في ما بلغنا، ولو جاز ذلك لم يخل منه جميع الزمان غالبا“ (المغنی لابن قدامہ ۱۳: ۱۳) (ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۱۸۔ ”وأخرج البزار عن أنس قال جئن النساء إلى رسول الله ﷺ فقلن يا رسول الله ذهب الرجال بالفضل والجهاد في سبيل الله تعالى فهل لنا عمل ندرک به فضل المجاهدين في سبيل الله تعالى فقال عليه الصلوة والسلام: من قعدت منكن في بيتها فإنها تدرک عمل المجاهدين في سبيل الله تعالى“ (روح المعانی ۱۸: ۸۸، ۸۹) (مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی)۔

۱۹۔ علامہ شامی امامت کبری کے شرائط کے ضمن میں لکھتے ہیں:

”ويشترط كونه مسلما حرا ذكرا عاقلا بالغاً قادراً قرشياً، ولأن النساء أمرن بالقرار في البيوت فكان مبنی حالهن على الستر وإليه أشار النبي ﷺ حيث قال: كيف يضلح قوم تملكهم امرأة“ (شامی ۲: ۲۸۰) كتاب الصلاة باب الامامة مطلب شروط الامامة (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا حسن القاسمی الحسني، مولانا ثناء عالم ندوی، مولانا عمران ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا ابرار خاں ندوی) ۲۰۔ ذیل کی عبارت عورتوں کو ملک کا حکمران اعلیٰ بنانے کے عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں:

”أما بخصوص تولی منصب الخليفة (رئيس الدولة) أو ما يقوم مقامه من سائر المسؤوليات الكبرى والولايات العامة فإن الذكورة فيه شرط مجمع عليه، قال الجويني: وأجمعوا أن المرأة لا يجوز أن تكون إماما وهو ما نص عليه ابن حزم في مراتب الإجماع“ (فتاویٰ شامی محمد علی فرکوس) (مولانا اشتیاق احمد عظیمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا ارشد علی رحمانی، شاہ اکرام الحق ندوی)۔

۲۱۔ عورت کی قیادت کی ممانعت صریح روایات سے ثابت ہے: ”هلكت الرجال حين أطاعت النساء“ (مستدرک للحاکم)۔

۲۲۔ مفتی شفیع صاحب ”معارف القرآن“ کے اندر ”الرجال قوامون على النساء“ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اجتماعی نظام کے لئے عقلا و عرفا یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیدوار حاکم ہو، تاکہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلے سے کام چل سکے،..... مزید آگے تم طراز ہیں: اس کام کے لئے اللہ نے مردوں کو منتخب فرمایا ہے، ان کی علمی عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں کی بچوں کے زیادہ ہیں (معارف القرآن ۳: ۳۹۵) (مولانا ثناء عالم ندوی)۔

۲۳۔ مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

مرد امیدواروں کی موجودگی میں جو بہترین نمائندگی کر سکتے ہوں عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اسے ووٹ دینا شرعاً جائز نہیں ہے (فتاویٰ عثمانی ۳: ۵۱۳)۔

۲۴۔ ایک حدیث میں ہے: ”أخروهن من حيث أخرهن الله“ (فتاویٰ محمودیہ ۱: ۳۵۹)۔

مذکورہ بالا حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مناصب اور عہدے عورتوں کے لئے صحیح نہیں ہے (مولانا حیدر علی قاسمی)۔

۲۵۔ ”قال عليه الصلوة والسلام: ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة“ (کنز العمال ۱۶: ۱۶۳) (مفتی جعفر علی رحمانی)۔

۲۶۔ مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں:

عورتوں کا ووٹ دینا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا، اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لئے مستحسن نہیں، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لئے مستحضر ہے (کفایت المفتی ۳: ۳۹۹) (مولانا محمد فاروق، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبد الرحمن

بجزوری، مولانا عبدالرشید کاپوری، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں، مفتی جنید بن محمد، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی سلمان پانچوری، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا عثمان بستوی۔

دلائل: شق اول: عورتیں ووٹ دے سکتی ہیں یا نہیں؟

چونکہ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کے ساتھ ساتھ مشورہ اور وکالت بھی تسلیم کی گئی ہے اور مندرجہ ذیل دلائل سے عورتوں سے مشورہ لیا جانا ثابت ہے، لہذا عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینا بھی صحیح ہے۔

۱۔ ”وأمرهم شورى بينهم“ (شوری: ۳۸) ”ہم“ ضمیر مذکر میں عورتیں بھی تبعا شامل ہیں (مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔  
ووٹ بحیثیت شہادت صادق مردوں کی طرح عورتوں پر بھی واجب ہونا چاہئے۔

۲۔ ”فإن لء یکوناً رجلین فرجل وامرأتان“ (سورہ بقرہ: ۲۳۰) (مولانا عبدالرب اعظمی)۔

۳۔ عورتیں مشورہ کی اہل ہیں، قرآن مجید میں ہے: ”عن تراض منہما وتشاور“ (مولانا عامر ظفر ایوبی، مولانا عبدالخالق)۔

۴۔ صاحب ابن کثیر رقم طراز ہیں: حضرت عبدالرحمن بن عوف نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب میں عورتوں سے بھی مشورہ کیا تھا۔

۵۔ ثقف نہض عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ يستشیر الناس فیہما حتی خلص إلى النساء المخدرات فی مجالهن“ (البدایۃ والنہایۃ ۷، ۱۶۴) (مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا شوکت شائق احمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیوی قاسمی، مفتی نعیم اختر ندوی)۔

۵۔ صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ کے مشورہ پر عمل کیا (مولانا عبدالخالق، مولانا شوکت شائق، مفتی سہیل اختر قاسمی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں، مولانا خالد حسین نیوی، مفتی سلطان کشمیری)۔

۶۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر سیاسی امور میں جہاں دوسرے صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے، وہیں اپنی حریم خانہ سے بھی مشورہ طلب کرتے تھے اور اچھے مشورہ کی ستائش کرتے تھے پھر قبول کرتے تھے (اسنن الکبریٰ للشیخ عیسیٰ بن ابی بکر، ۱۰/۱۱۳) (مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔

۷۔ بدایۃ المجتہد کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بعد کے نزدیک عورت کی وکالت صحیح ہے، صرف عقد نکاح میں امام شافعی و مالک کے نزدیک عورت وکیل نہیں بن سکتی۔

”وشروط الوکیل ان لا یکون ممنوعاً بالشرع من تصرفاته فی الشئ الذی وکل فیہ فلا یصح توکیل الصبی ولا المجنون ولا المرأة عند مالک والشافعی علی عقد النکاح“ (بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقصد ۲، ۲۹۶ کتاب الوکالہ) (مفتی سہیل اختر قاسمی)

۸۔ ”فإن مبدأ المشاركة فی الانتخابات یدور مع المصلحة... وإذا وجدت المصلحة فیہا فلا مانع أن تشارك المرأة فی الانتخابات والإدلاء فی اختیار أحد المرشحين إذا التزمت بالضوابط الشرعیة فی خروجها من بیتها والتزمت بالشرع فی اختیار من تدلی بصوتها لصالحه“ (فتاویٰ الشبکہ الاسلامیة مرکز الفتویٰ بإشراف الدكتور عبد اللہ الفقیہ) (مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۹۔ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی رقم طراز ہیں: ”وقد تقرر دفعا لذلك المحظور أن یحصل لهن مراكز للاقتراء خاصة لهن فتذهب المرأة وتودی واجباتهم تعود إلى بیتها دون أن تختلط بالرجال أو تقع فی المحرمات“ (المرأة بین الفقه والقانون، ۱، ۱۲۲) (قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب خاں)۔

۱۰۔ مفتی محمود صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسم العلوم ملتان کے ایک فتویٰ میں مذکور ہے: رفتن زنان بموضع ووٹ کے دریاں بے پردگی و مانع شرعی دیگر نہ باشند باذن شوہر جائز است (فتاویٰ مفتی محمود، ۱۱/۳۷۰)۔

۱۱۔ ”وما سوی ذلك من الحقوق یقبل شهادة رجلین أو رجل وامرأتین سواء كان الحق مالاً أو غیر مال“ (ہدایۃ ۱۵۴/۳) اگر ووٹ کو شہادت تسلیم کر لیا جائے تو مذکورہ بالا عبارت سے عورت کے ووٹ بننے کا جواز معلوم ہوتا ہے (مولانا فاروق)۔ ☆ ☆ ☆

## عرض مسئلہ:

ایکشن سے مربوط شرعی مسائل  
(سوال نمبر ۱ تا ۶)

مولانا رحمت اللہ ندوی علیہ

اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کے بانیسویں فقہی سمینار منعقدہ ۹-۱۱ مارچ ۲۰۱۳ء ضلع امر وہہ (یوپی) کا ایک اہم، حساس اور نازک موضوع ”ایکشن سے مربوط شرعی مسائل“ ہے، اس موضوع سے متعلق سوالنامہ میں کل دس سوالات ہیں، ابتدائی چھ سوالات کی تخصیص اور عرض کی ذمہ داری راقم پر ڈالی گئی تھی، جسے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

اس موضوع پر اکیڈمی کی طرف سے ارسال کردہ مقالات کی کل تعداد ۶۳ ہے، تین مقالات عربی اور بقیہ اردو زبان میں ہیں، بعض مقالات قدرے تفصیلی ہیں، جب کہ بعض اوسط اور کچھ بے حد مختصر، حتیٰ کہ دلائل کے بغیر ہی صرف سوالات کے جوابات پر اکتفا کیا گیا ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض حضرات نے کسی ایک سوال کا جواب بالکل نہیں دیا ہے، یا اپنی رائے واضح نہیں کی ہے، لیکن ان کے نقل کردہ اقتباسات اور حوالہ جات سے ان کی رائے اور رجحان کا پتہ چلتا ہے، تمام مقالات کا بالاستیعاب جائزہ لے کر ہر ایک کی رائے سے استفادہ کی حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے، تاکہ کسی مقالہ نگار کی حق تلفی نہ ہو، کیونکہ ہمارے نزدیک ہر مقالہ قیمتی اور ہر ایک کی رائے قابل قدر ہے۔

ذیل کی سطور میں ہر سوال سے متعلق فاضل مقالہ نگاروں کی آراء اور ان کے دلائل پیش خدمت ہیں:

## سوال نمبر ۱: ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں کی آراء متعدد ہیں، ووٹ کی کئی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے: مثلاً (الف) شہادت یا گواہی (ب) دکالت یا نمائندگی (ج) شفاعت یا سفارش (د) رائے یا مشورہ (ه) اسلامی ممالک میں بیعت اور معاہدہ کا ایک طریقہ (و) کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ ان حیثیتوں میں سے بعض مقالہ نگاروں نے صرف کسی ایک کو اور بعض نے کئی ایک کو تسلیم کیا ہے، تفصیل یہ ہے:

شہادت: اس کا مطلب یہ ہے کہ ووٹر جس امیدوار کو ووٹ دے رہا ہے گویا اس کے حق میں امانت دو یا نیت اور اہلیت کی گواہی دے رہا ہے، اسی وجہ سے ووٹ نہ ڈالنا کتمان شہادت، یا کسی اور کے نام پر ووٹ ڈالنا، یا رشوت لے کر ووٹ دینا، یا مکر ووٹ ڈالنا، یا نااہل کو ووٹ دینا، شہادت زور (جھوٹی گواہی) کے دائرہ میں آئے گا۔

ووٹ کو شہادت کا درجہ دینے والے حضرات یہ ہیں:

مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی قمر الزماں ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مفتی نصر اللہ ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی کانپور، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا شوکت شاہ قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین، جمالی، مولانا غلام رسول قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی آکولہ، مولانا عبدالرحمن بجنوری مظاہری، مفتی اکمل یزدانی قاسمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا یوسف علی آسام، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد فاروق بارڈولی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مولانا عبدالرب سعادت، مولانا محمد صادق مہا کپوری، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا شاہ اکرام الحق ندوی، مولانا عبدالسلام کوشری، مولانا عبدالخالق، مفتی سلطان کشمیری، مفتی سلمان پالنپوری۔

ط استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، بکھنؤ۔

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی نے چاروں حیثیت (شہادت، شفاعت، وکالت اور مشورہ) تسلیم کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری کے نزدیک جس مسئلہ میں ووٹ مطلوب ہے، اس کی نوعیت پر اس کا حکم مرتب اور حیثیت کا تعین ہوگا، لہذا ووٹ کبھی شہادت، کبھی وکالت، کبھی سفارش کی شرعی حیثیت رکھے گا، اور کبھی دو یا تین کی مجموعی حیثیت کا بھی حامل ہوگا۔

قاضی محمد حسن ندوی، مولانا مجیب الرحمن ندوی نے شہادت کا پہلو راج اور غالب قرار دیتے ہوئے شفاعت، وکالت اور مشورہ کی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی نے ووٹ کی مختلف حیثیتیں مثلاً: شہادت، شفاعت، وکالت، مشورہ اور اسلامی ممالک میں سیاسی بیعت قرار دی ہیں، لیکن ہندوستان جیسے ممالک میں اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی، اسے واضح نہیں کیا ہے، البتہ سوال نمبر ۲ کے جواب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ووٹ کو شہادت کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی محمد عبدالرحیم القاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مفتی محمد ممتاز خاں ندوی اور مولانا احسن عبدالخالق ندوی کے نزدیک ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت، شفاعت اور وکالت کی ہے۔

مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالشکور قاسمی آکولہ، مولانا محمد فاروق بارڈولی نے اگرچہ شہادت کو ترجیح دی ہے، لیکن وکالت و سفارش کی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے، اسی طرح مفتی اکمل یزدانی قاسمی شہادت کو ترجیح دے کر لکھا ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت بیک وقت شہادت، سفارش، وکالت اور سیاسی بیعت کی ہو سکتی ہے۔ ووٹ کو رائے اور مشورہ قرار دینے والے حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی راشد حسین ندوی، مولانا شیر علی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا ریحان مہشر قاسمی، مولانا عبدالعزیز اللہ ندوی، مولانا محمد مقصود عالم فرغانی، مفتی طارق انور قاسمی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد اشرف قاسمی اور رحمت اللہ ندوی۔

وکالت: اس رائے کے حامل تنہا مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ہیں، ان کو شہادت ماننے سے اتفاق اس لیے نہیں ہے کہ عوامی ایکشن میں ووٹ دینے کا حق ایسے شخص کو بھی ہوتا ہے جس کو اسلامی شریعت کی رو سے نااہل قرار دیا گیا ہے، اسی طرح ہر وہ شخص جو حکومت کے مقرر کردہ حدود میں بلوغ کو پہنچ گیا ہے اس کو بھی ووٹ کا حق ہے، خواہ وہ شریعت کی نگاہ میں کتنا ہی معتوب کیوں نہ ہو، حتیٰ کہ خود اپنے لیے اور اپنے اصول و فروع کے لیے بھی ووٹ دینے کا حق ہے، جبکہ شرعی قاعدہ میں شہادت اصول و فروع کے حق میں درست نہیں۔

”والزوجة لزوجها، وهو لها، والفرع لأصله وبالعكس، وسيد لبعده ومكاتبه والشريك لشريكه فيما هو من شركتها لأنها لنفسه من وجهه“ (الدر المختار ۸۰۱۹۵-۱۹۶)۔

شفاعت سمجھے جانے پر بھی ان کو شرح صدر اس لیے نہیں ہے کہ جمہوری ایکشن کا مدار عوامی اکثریت پر ہے، جس جانب اکثریت ہے وہی جانب حتمی و یقینی ہے، اس کے خلاف کرنا قانوناً جرم ہے بلکہ اس کی وجہ سے بڑی سے بڑی سزا کے لیے تیار ہونا چاہئے، جبکہ شفاعت اسلامی نقطہ نظر سے مطلوب و پسندیدہ ضرور ہے، لیکن اس کو قبول کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ حاکم و سربراہ کی صوابدید پر موقوف ہے، چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو رد کر دے، اس پر دو دلیلیں دی ہیں:

۱- ”إذا جاء رجل يسأل أو طالب حاجة، أقبل علينا بوجهه فقال: اشفعوا فلتؤجروا وليقض الله على لسان نبيه ما شاء“ (بخاری ۲/۸۹۰)۔

۲- حضرت بریرہؓ و حضرت مغیثؓ کا مشہور واقعہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت بریرہؓ سے بطور مشورہ کے رجوع کی بات فرمائی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو قبول نہیں، البتہ وکالت کا نظریہ ان کے نزدیک زیادہ صحیح ہے، کیونکہ کنڈیڈیٹ کو ”نمائندہ“ ہی کہا جاتا ہے۔ اور ”العرف قاض“ کے اصول پر یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

ووٹ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں:

اس رائے کے حامل تنہا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی ہیں، وہ لکھتے ہیں: میرے خیال میں غیر شرعی حکومت میں ووٹ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، بلکہ وہ ایک

رائے ہے اور رائے کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے، موصوف کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو غالب ہے، گویا کہ وہ کوئی حیثیت نہ دیتے ہوئے بھی رائے کی حیثیت دے چکے۔ وذلک ما کنا نبغ۔

مولانا محمد الاعظمی نے ووٹ کو جزوی طور پر بیعت سے مشابہ مانا ہے۔

اب ہم ووٹ کی شرعی حیثیت، شہادت اور مشورہ و رائے قرار دینے والے حضرات کے دلائل ذکر کرتے ہیں، پھر دونوں کا موازنہ کیا جائے گا۔

قائلین ”شہادت“ کے دلائل:

۱۔ شہادت کے اصل معنی حضور و معاینہ (حاضر و موجود ہونے اور مشاہدہ کرنے) کے ہیں، پھر قطعی و یقینی خبر میں اس کا استعمال ہونے لگا (لسان العرب ۸/۱۵۲)۔

۲۔ ابن فارس کا قول ہے: الشين والهاء والذال، أصل يدل على حضور وعلم وإعلام الخ (معجم المؤلفين ۳/۲۲۱)۔

۳۔ فمن شهد منكم الشهر فليصمه (بقرہ: ۱۸۵)۔

۴۔ وجعلوا الملائكة الذين هم عباد الرحمن إناثاً، أشهدوا خلقهم، ستكتب شهادتهم ويسألون (زخرف: ۱۹)۔

۵۔ وما شهدنا إلا بما علمنا (يوسف: ۸۱)۔

۶۔ شہادت کی اصطلاحی تعریف: ”إخبار صدق لإثبات حق بلفظ الشهادة في مجلس القاضي“ (تنوير الأبرار مع در مختار ۸۱۵۲)۔

الروض الصريح شرح زاد المستنقع ۱۰۴۳۶)۔

ان دلائل سے استدلال کرتے ہوئے مفتی شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں کہ شہادت کی یہ تعریف ووٹ پر بھی صادق ہے، لہذا ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی ہے، کیونکہ ووٹ بھی باختیار اتھارٹی کی موجودگی میں اپنی رائے، اہل اور مستحق شخص کے حق میں دینے کا نام ہے، عجیب بات ہے کہ مفتی صاحب ایک طرف اسے شہادت قرار دیتے ہیں دوسری طرف رائے۔

ووٹ نہ دینے یا اس کا غلط استعمال کرنے پر انہوں نے دلائل کے ساتھ تفصیلی بحث کی ہے اور ان آیات و احادیث کو بطور خاص اپنا متدل بنایا ہے جن میں صحیح گواہی کی ترغیب اور جھوٹی گواہی یا گواہی چھپانے کی وعیدیں آئی ہیں۔

۷۔ شہادت: یعنی مشاہدہ کی بنا پر کسی شے کے برحق اور صحیح ہونے کی خبر دینا (جامع الرموز جہانی ۳/۴۸۳)۔

۸۔ ق رآن وحدیث میں شرک اور جھوٹی گواہی، دونوں سے احتراز کا ایک ساتھ ذکر ہے، مثلاً:

(۱) فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور۔

(۲) یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط۔

(۳) لا تکتبوا الشهادة، ومن یکتبها فإنه آثم قلبہ۔

(۴) والذین ہم بشہاد اتهم قائمون۔

(۵) من یشفع شفاعۃ حسنة الخ۔

(۶) اکبر الکبائر الإشارات باللہ... وقول الزور۔ (حدیث)

(یہ دلائل مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی اور مولانا مجیب الرحمن ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا شوکت ثناء کاکی وغیرہ کے ہیں)

۹۔ ہندوستان میں ووٹ کی حیثیت محض شہادت کی ہے اور عند الاحتماف اگر گواہی کا مطالبہ کیا جائے تو گواہی دینا واجب بھی ہو جاتا ہے، ”الأصل عندنا

أن لا یشهد إلا أن یطلب منه الشهادة، ویجب أن یشهد بعد الطلب“ (حاشیہ مشکوٰۃ ۲۰۲۷) (مولانا محمد عمران ندوی)۔



۱۰۔ من ڪتم شهادة اذ ادعى اليها كان كمن شهد بالزور (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ۱/۶۲)۔

۱۱۔ حدیث میں گواہی کا مطالبہ کیے جانے سے پہلے گواہی دینے والے کو بہترین گواہ قرار دیا گیا ہے۔ (مولانا قمر ازماں ندوی)

۱۲۔ وأقيموا الشهادة لله۔

۱۳۔ فتاویٰ یوسف القرضاوی، جدید فقہی مسائل، جواب الفقہ، فقہی مقالات وغیرہ کے حوالے (مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

۱۴۔ الشهادة في اللغة: البيان والإظهار لما يعلمه۔ وشرعاً: إخبار عن ثبوت الحق للغير على الغير۔

۱۵۔ إخبار حاكم من علم ليقضى بمقتضاه۔ (الشرح الكبير ۴، ۱۶۴)۔

۱۶۔ اسلام اور سیاست حاضرہ، ص: ۸، از مفتی تقی عثمانی (مفتی محمد عارف باللہ قاسمی)۔

۱۷۔ ایکشن میں ووٹ دہندہ مندرجہ ذیل امور میں سے تمام یا اکثر یا بعض کی خبر دیتا ہے:

(۱) میرا امیدوار تمام امیدواروں میں سے سب سے زیادہ انصاف پسند، ایماندار اور لائق ہے۔

(۲) عوامی نمائندگی کا اہل ترین ہے۔

(۳) وزارت کے منصب پر فائز ہونے کا اہل ہے۔

(۴) عوام کا ہمدرد اور نمکسار ہے۔

(۵) اس کے ہارنے سے عوام کو دینی، جانی، مالی یا اخلاقی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

۱۸۔ ”الإخبار بحق للغير على الغير في مجلس القضاء“، یہاں مجلس قضاء ایکشن کمیشن ہے۔

۱۹۔ فقہاء کے بیان کردہ شہادت کے پانچ ارکان (شاہد۔ مشہود۔ مشہود علیہ۔ مشہود بہ۔ اور صیغہ شہادت) ایکشن میں پائے جاتے ہیں، ووٹر: شاہد، پسندیدہ امیدوار: مشہود، ناپسند امیدوار: مشہود علیہ، ووٹر کے امیدوار کی وہ قابلیتیں جن کی بنیاد پر ووٹر نے اسے ووٹ دیا، وہ مشہود بہ۔ اور آج کل ووٹنگ کے مختلف طریقے ہیں، ان میں جس کلمہ یا لفظ کا انتخاب کیا جائے وہ صیغہ شہادت ہے۔ (مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)

۲۰۔ مفتی عبداللہ الفقیہ کا یہ فتویٰ: ”فإن من يشارك في الانتخابات يعتبر شاهداً ومزكياً لمن يرشحه وينتخبه، وهو مسئول أمام الله عن تلك الشهادة، فيتعين أن لا ينتخب إلا من هو أصلح وأكثر كفاءةً لما يقوم به“ (مرکز الفتویٰ بإشراف الدكتور عبداللہ الفقیہ)۔

۲۱۔ فإذا ضيعت الأمانة فانتظر الساعة... قال: إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة (بخاری) (مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

”رائے یا مشورہ“ کے قائلین کے دلائل:

مفتی راشد حسین ندوی نے ووٹ کی تمام شرعی حیثیتوں کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے: ایکشن خواہ کسی اسلامی ملک میں ہو یا غیر اسلامی ملک میں، ووٹ کو اصطلاحی شہادت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ:

۱۔ نہ تو یہاں مجلس قضاء ہوتی ہے اور نہ لفظ شہادت ہوتا ہے، بلکہ پورا عمل خفیہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جبکہ فقہاء نے لفظ شہادت کو شہادت کا رکن قرار دیا ہے۔  
”ورکنها لفظ أشهد لا غير“ (شامی ۴/۴۴۵)

۲۔ اسی طرح شہادت کی تعریف صادق نہیں آتی، صاحب عنایہ لکھتے ہیں: ”وهي في اللغة: عبارة عن الإخبار بصحة الشيء عن مشاهدة أعيان، ولهذا قالوا: إنها مشتقة من المشاهدة التي تنبئ عن المعاينة، وهي في اصطلاح أهل اللغة: عبارة عن إخبار صادق في مجلس الحكم بلفظ الشهادة... الخ (عنایہ ۶، ۲۳۶۔ رد المحتار ۴/۴۱۱)۔

۳۔ فقہ اسلامی میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی جس کے لیے اتنی بڑی تعداد کے شہادت دینے کی ضرورت ہو، ہاں الغوی طور پر شہادت قرار دیا جاسکتا ہے۔

توکیل کی دو قسمیں: (۱) توکیل عام (۲) توکیل خاص۔ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ووٹ کو توکیل خاص قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ایک حلقہ کے کئی افراد مختلف جماعتوں کی طرف سے یا آزادانہ اپنی امیدواری پیش کرتے ہیں اور اس حلقہ کے لوگ الگ الگ آراء ظاہر کرتے ہیں، اگر یہ توکیل ہے تو تمام امیدواروں کو نمائندگی کا حق ملنا چاہئے، کیونکہ ہر نمائندہ کو کچھ نہ کچھ ووٹ ضرور ملتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی کا ووٹ ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ منتخب ممبر کو معزول یا بحال کرنے کا حق مخصوص اوقات تک کسی ووٹر کو نہیں ہوتا، جبکہ توکیل میں کسی بھی وقت موکل وکیل کو معزول کرنے کا اختیار رکھتا ہے: ”فللموکل العزل متى شاء، مالم يتعلق به حق الخیر“ (شامی ۴/۳۳۳) معلوم ہوا کہ یہ کلی طور پر توکیل نہیں، البتہ تشبہ ضرور ہے۔

شفاعت یا سفارش قرار دینے میں یہ اشکال ہے کہ سفارش اس سے کی جاتی ہے جس کو کلی اختیار حاصل ہو، جبکہ ایکشن یا کوئی دوسرا ادارہ یا فرد اپنے طور پر کچھ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے، بلکہ جسے زیادہ ووٹ حاصل ہوں اسے بہر حال منتخب قرار دیا جاتا ہے، یہ سفارش کے اصولوں کے خلاف ہے۔

مشورہ اور رائے ماننے میں بھی اگرچہ یہ تردد ہے کہ مشورہ لینے والے پر کثرت رائے کا ماننا لازم نہیں بلکہ وہ مختار ہے، چاہے تو مشورہ نہ مانے یا اکثر کے مشورہ کو چھوڑ کر اقل کے مشورہ کو اختیار کرے، لیکن دوسری جہات کے مقابلہ میں کچھ اشکالات کے باوجود یہ جہت نسبتاً زیادہ واضح ہے۔

۴۔ ووٹ کے لفظی معنی عربی اردو میں متبادل الفاظ (صوت، استصواب رائے وغیرہ) سے یہی جہت زیادہ واضح ہوتی ہے۔ (مفتی راشد حسین ندوی)

۵۔ مشورہ سے حکومت کا قیام اور امور مملکت کو انجام دینا اسلام طرہ امتیاز ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا: یا تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے خلافت کا معاملہ بلا نامزدگی مسلمانوں کے انتخاب پر چھوڑ دیں یا سنت صدیقی پر عمل کرتے ہوئے کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دیں یا سنت فاروقی کو اختیار کرتے ہوئے کوئی کمیٹی تشکیل دیں (تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ۴/۲)۔

۶۔ وشاورهم فی الامر۔ (آل عمران: ۱۵۹)۔

۷۔ واقعہ انک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی، اسامہ، زینب بنت جحش اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ لینا (بخاری ۲/۵۰۵/۵۹۶)۔

۸۔ غزوہ احد میں بعض صحابہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنا (فتح الباری ۷/۴۳۹)۔

۹۔ غزوہ احزاب کے موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کی کھدائی (حوالہ سابق، ص: ۴۹۹)۔

۱۰۔ اسیران بدر کے بارے میں مشورہ اور صدیق اکبرؓ کی رائے سے موافقت اور اس پر فیصلہ (تفسیر رازی ۱۳/۵۳۸/۵۳۹، سورہ انفال)۔

۱۱۔ وامرهم شورى بينهم۔ (شوری: ۳۸)۔

۱۲۔ خلافت راشدہ میں اکابر صحابہ کی ایک مجلس شوری تھی، جس میں عمر کے تفادت کا لحاظ کیے بغیر دانائی، قابلیت، علم و فضل، سیاسی سوجھ بوجھ اور ذہانت و ذکاوت کو اصل معیار بنایا جاتا تھا (بخاری ۲/۴۳۳۔ قرطبی ۲۰/۱۵۹) (مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا فیاض عالم قاسمی، مولانا توقیر بدر قاسمی)۔

مفتی انور علی اعظمی لکھتے ہیں: ہندوستان جیسے ملک میں ووٹ کو شہادت اور شفاعت اور وکالت بنانے میں بعض جگہوں پر بہت دشواری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ کہیں کہیں سارے ہی امیدوار نااہل ہوتے ہیں، اگر ہم ان کے حق میں شہادت دیتے ہیں تو یہ شہادت زور ہوگی، جو اکبر کبار میں سے ہے اور اگر سفارش کرتے ہیں تو غلط آدمی کی سفارش کرنا بھی گناہ ہے، ”من یشفع شفاعتہ سیئۃ یکن لہ کفل منہا“ اسی طرح وکالت کا مسئلہ بھی ہے، وہ بھی حقوق مشترکہ میں وکالت بحیثیت وکیل جیتنے کے بعد ہمارا امیدوار جو کام کرے گا، ہم بھی اس کے حصہ دار ہوں گے..... اس لیے تینوں جہات کے ساتھ ہندوستان جیسے جمہور ملک میں ایک چوتھے احتمال کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے، وہ ہے رائے مشورہ۔ ووٹ لغت میں رائے دینے کو کہتے ہیں اور ووٹر کو رائے دہندہ کہا جاتا ہے۔

مولانا شیر علی صاحب نے ووٹ کے شرعی اعتبار کا صراحتاً ذکر تو نہیں کیا ہے لیکن ان کی تحریر سے اشارہ ملتا ہے کہ ان کے نزدیک ووٹ اظہار رائے ہے۔

مفتی محمد اشرف علی قاسمی گونڈوی نے ووٹ کو رائے اور مشورہ کی حیثیت دیتے ہوئے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ کے انتخاب کے طریقہ سے استدلال کیا ہے، اور تفصیلی بحث کرتے ہوئے انھوں نے اپنا موقف اسلام اور جمہوریت ص: ۸۵، تاریخ الرسل والملوک للطبری ۵/۲۹۴۸، البدایہ والنہایہ لابن کثیر

۱۳۵-۱۳۶ سے مبرصن و مدلل کیا ہے۔

۱۳- المستشار مؤتمن۔ (ابوداؤد: ۱۵۵۷) صحیح و درست مشورہ امانت ہے۔

۱۴- إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها۔

۱۵- الأمانة في كل شيئ۔ (تفسیر قرطبی ۵/ ۱۶۶) (مولانا محمد فیاض عالم قاسمی)

۱۶- مولانا محمد توقیر بدر قاسمی لکھتے ہیں: اگرچہ ووٹ، شہادت، وکالت، شفاعت کا درجہ رکھتا ہے، مگر انگلش ڈکشنری سے ووٹ کی حیثیت فقہ اسلامی میں مشورہ کی ٹھہرتی ہے (بحوالہ شہور انگلش لغت جیمبر، ص: ۱۷۲۱)۔

۱۷- حضرت عمرؓ کفرمان: "لا خلافة إلا عن مشورة" (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/ ۵۷۳)۔

۱۸- مولانا ریحان مبشر منوی قاسمی نے ایکشن کاپس منظر اور ایکشن کی شرعی حیثیت کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے:

ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی نہیں ہے، جو حضرات شہادت مان کر "ولا تکتوا الشهادة" سے استدلال کرتے ہیں، مولانا موصوف نے ان کا رد اس طرح کیا ہے کہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ ووٹ شہادت ہے، کیونکہ یہ آیت محل شہادت، ادائیگی اور کتمان شہادت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے، اگر ہم اس کو بالفرض شہادت تسلیم کر لیں تب بھی یہ اشکال سے خالی نہیں، کیونکہ شہادت ماننے کی صورت میں یہ لازم ہوگا کہ اس سلسلہ میں عورتوں کے ووٹ کو بیس قرآنی اور باجماع امت نصف تسلیم کریں، "فإن لم يكن لرجلين فرجل وامرأتان" نیز "ونصابها لغيرها من الحقوق سواء كان الحقوق مالا أو غيره كنكاح وطلاق ووكالة ووصية..." رجالات أو رجل وامرأتان" (الدر المختار ۸/ ۱۷۸)۔

اسی طرح ووٹ دینے والے میں شاہد کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، مثلاً: عاقل، بالغ، آزاد، بینا قوت گویائی پر قادر ہونا نیز عادل وغیرہ ہونا، اسی طرح علامہ ابن نجیمؒ نے سترہ شرطوں کا ذکر کیا ہے: "وذكر أن ما يرجع إلى الشاهد السبعة عشر العامة والخاصة" (رد المحتار ۸/ ۱۷۳) لیکن دنیا جاتی ہے کہ ان شرائط کا قطعی لحاظ نہیں ہوتا، اور ایکشن کمیشن عورتوں کے ووٹ کو مردوں کے برابر قرار دیتی ہے۔

منفق طارق انور قاسمی کے نزدیک مشورہ اور رائے کی حیثیت راجح ہے، کیونکہ انتخاب کے زمانے میں گویا صدر جمہوریہ ہی کے ہاتھ میں تمام امور کا زمام ہوتا ہے، اور مناسب شخص کے لیے ووٹ کے ذریعہ رائے لیتا ہے، جہاں تک صدر جمہوریہ کے اکثریت کی رائے قبول کرنے پر مجبوری کا تعلق ہے تو یہ ایکشن کے مشورہ ہونے میں قابل قدر نہیں ہے، اس لیے کہ اکثریت کی رائے کی اپنی قیمت ہے، عزوہ احد کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثریت کی رائے پر عمل کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے باہر نکل کر جہاد فرمایا۔ موصوف نے کئی حدیثیں مثلاً: علیکم بالسواد الأعظم (ابن ماجہ: ۳۹۵۰) علیکم بالجماعة (ترمذی: ۲۱۶۵) ید اللہ علی الجماعة (نسائی الکبریٰ ۳۴۸۳) وغیرہ اولہ سے اپنی بات مدلل کی ہے (تفصیل کے لیے "الشوری و اثربانی الدیہ قرطبیہ"، عبد الحمید اسماعیل انصاری، ص: ۱۱۱/ ۲۲۵ دیکھیں) شہادت قرار دینے پر موصوف نے کئی اشکالات پیدا کیے ہیں، مثلاً ووٹ اگر شاہد ہے تو اس میں فقہاء کی بیان کردہ شرطوں کا منطبق نہ ہونا، یا اسی طرح فقہاء نے ان مقامات کی صراحت کی ہے، جہاں صرف مردوں کی شہادت قبول ہوتی ہے عورتوں کی نہیں۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں: "مضت السنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده بأنه لا تجوز شهادة النساء في حدود ولا نكاح ولا طلاق" (مصنف عبدالرزاق ۷/ ۳۳۲)۔

ووٹ کو وکالت ماننے میں یہ اشکال ہے کہ (۱) عقد وکالت میں موکل کا کوئی لفظ ایسا ہو جو اس کی رضامندی کا تقاضا کرے، انتخاب میں ایسا نہیں ہے، (مغنی المحتاج ۲/ ۲۸۸، النجم الوہاب ۵/ ۳۸) (۲) موکل کے لیے شرط یہ ہے کہ جس کام کا اس نے وکیل بنایا ہے، اس کے لیے خود انجام دینا درست ہو، لہذا عورت کا کسی شخص کو ایسے کام کا وکیل بنانا درست نہیں، جس کو وہ خود انجام دے سکے (النجم الوہاب ۵/ ۲۷، مغنی المحتاج ۲/ ۲۸۲)۔

ترجیح:

راقم نے ووٹ کے شہادت نہ ہونے پر دس دلائل ذکر کئے ہیں جن میں سے اکثر گزر چکے ہیں، رائے اور مشورہ پر بھی مختلف زاویے سے روشنی ڈالی ہے، تفصیل کا موقع نہیں، دلائل کی قوت، کثرت اور صراحت کے لحاظ سے ان حضرات کا نقطہ نظر زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو ووٹ کو محض رائے اور مشورہ کی حیثیت دیتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۲ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا، یا مستحب یا واجب؟ اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کے تین نقطہ ہائے نظر ہیں:

(الف) صرف واجب (ب) صرف جائز (ج) عام حالات میں جائز اور بعض مخصوص حالات میں واجب (د) جواز، واجب، استحباب میں مقامی اور شخصی حالت کا اعتبار اور اسی پر دار و مدار ہے۔

(الف) صرف جواز کے قائلین:

ووٹ کو محض جائز قرار دینے والے حضرات علمائے کرام یہ ہیں:

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد قمر عالم قاسمی، مولانا ریحان میسر موسوی قاسمی، راقم رحمت اللہ ندوی۔

(ب) عام حالات میں جائز اور بعض حالات میں واجب:

اس رائے کے حاملین حسب ذیل حضرات ہیں:

مفتی راشد حسین ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد جعفر علی رضانی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی۔

(ج) ایک سے زائد حکم:

ووٹ کو حالات کے تابع مان کر کبھی واجب، کبھی جواز، کبھی استحباب و استحسان کے احکام جاری کرنے والے حضرات یہ ہیں:

مولانا محمد مقصور عالم فرقانی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی نصر اللہ ندوی، مولانا نثار عالم ندوی، مفتی انور علی اعظمی، ڈاکٹر محمد سلیم سلیم ندوی ازہری۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ بقیہ مقالہ نگاروں کی رائے واجب کی ہے۔

ڈاکٹر محمد سلیم کے نزدیک ووٹ قانونی و شرعی مصلحت و اہمیت کے پیش نظر کبھی جائز، کبھی مستحب اور کبھی ناجائز ہوگا، یہ ان مسائل میں سے ہے جن کے احکام شرعی واقعات، حالات، زمان و مکان کے بدلنے سے مصالح و مضار کی بنا پر بدلتے رہتے ہیں۔

مولانا نثار عالم ندوی کا کہنا ہے کہ ووٹ کی چار مختلف شکلوں (شہادت، شفاعت، وکالت اور مشورہ) میں سے شہادت مان کر واجب کے دائرہ میں دیا جاسکتا ہے، لیکن باقی تین شکلوں میں، خاص کر مشورہ اور رائے ماننے والی شکل میں وجوب قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ جائز، مستحسن، مستحب اور لازم قرار دیا جاسکتا ہے، اور بوجہ یہی رائے بہتر معلوم ہوتی ہے: (الف) جمہوری نظام غیر اسلامی نظام ہے، اور بوقت ضرورت اس میں شرکت کی گنجائش ہے نہ کہ وجوب۔ (ب) دفع المضرة أولى من جلب المنفعة، من ابتلی ببلیتین فلیختر أھوھما، درء المفسد أولى من جلب المصلح وغیرہ قواعد فقہی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، واجب کہہ کر تکلیف مالا یطاق کا طوق گردن میں کیوں کر ڈالا جاسکتا ہے۔ (ج) موجودہ صورت حال اور ”ملی و مذہبی مفادات کی حفاظت“ والی موہوم صورت میں واجب نہیں کہا جاسکتا ہے۔ (د) ترک واجب پر جو وعیدیں وارد ہیں وہ ترک ووٹ پر منطبق ہوتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ ہاں! وقت کے حالات اور نزاکت کے لحاظ سے اس میں شدت لائی جاسکتی ہے، لیکن وجوب قرار دینا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مفتی انور علی الاعظمی ووٹ کے حکم کو امیدوار پر موقوف مانتے ہیں، اگر چند امیدواروں میں سب کے سب نا اہل، مال و دولت کے حریص اور اپنے عہدہ کا غلط استعمال کرنے والے ہوں تو ایسی صورت میں ووٹ شہادت زور ہوگا، اور اگر امیدوار اچھا ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ جیتنے کے بعد اپنے عہدہ کا صحیح استعمال کرے گا تو ووٹ دینا واجب ہوگا، اور جہاں امیدوار کی اچھائی کا ظن غالب تو نہ ہو، لیکن مجموعی طور پر اس کا جیتنا ملک و ملت کے حق میں مفید ہو تو اس کو ووٹ دینا

جائز ہونے کے ساتھ مستحب ہوگا۔

جواز اور وجوب کے قائلین:

مفتی راشد حسین ندوی لکھتے ہیں: ووٹ کو مکمل طور پر شہادت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، لہذا گواہی چھپانے کی کتاب و سنت میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کو یہاں پر منطبق نہیں کیا جاسکتا، بالفرض اس کو شہادت قرار بھی دیا جائے، تب بھی ووٹ دینے کو مطلقاً واجب قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ شہادت دینے کا وجوب خاص شرائط کے پائے جانے پر ہوتا ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

”ویلزم أداء الشهادة ويأثم بكتماها إذا طلب المدعي، وإنما يأثم إذا علم أن القاضي يقبل شهادته وتعين عليه الأداء. وإن علم أن القاضي لا يقبل شهادته أو كانوا جماعة فأدى غيره ممن تقبل شهادته فقبلت، قالوا: لا يأثم من لم يؤد إذا كان ممن تقبل شهادته... وإن كان موضع الشاهد بعيداً من موضع القاضي بحيث لا يمكنه أن يخدم إلى القاضي لأداء الشهادة ويرجع إلى أهله في يومه ذلك قالوا: لا يأثم“ - (ہندیہ ۳/۲۵۲)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: ”وسبب وجوبها طلب ذی الحق أو خوف فوت حقه بأن لم يعلم بها ذوالحق وخاف فوته، لزمه أن يشهد بلا طلب“ (شامی ۲/۲۱۱) معلوم ہوا کہ ہر حالت میں شہادت واجب نہیں ہوتی، لہذا ووٹ کو شہادت بھی مان لیں تو وجوب اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہر اعتبار سے لائق اور مستحق نمائندہ کھڑا ہو، اس کے مقابل بالکل غیر مستحق ہو۔

موصوف کے نزدیک ووٹ کو شہادت کے بجائے مشورہ یا رائے قرار دینے پر بھی بعض اوقات وجوب ہو سکتا ہے، اس لیے کہ یہ تعاون علی البر ہے ”وتعاونوا على البر والتقوى“ اور حدیث ”من رأى منكراً منكرًا“ - الخ دلیل ہے۔

اگر نمائندوں میں کوئی بھی مستحق نہ ہو تو انہوں نے لیلیٰ تین کو مدنظر رکھتے ہوئے نسبتاً بہتر نمائندہ کو ووٹ دینا بہتر یا جائز (الگ الگ حالات میں) تو ہو سکتا ہے، واجب نہیں قرار دیا جاسکتا، خواہ اسے شہادت قرار دیا جائے یا کچھ اور۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں: ووٹ دینا محض توکیل ہے اور توکیل کا عمل صرف جائز ہوتا ہے، اس لیے عام حالات میں ووٹ دینا جائز ہوگا، البتہ اگر ووٹ نہ دینے سے ملک و قوم کا نقصان اور ضرر عام ہو تو واجب ہوگا، لیکن اگر دونوں امیدوار ظلم و جور میں مساوی ہوں تو ووٹ نہ ڈالنے پر بھی کوئی ملامت نہیں ہے۔

مولانا اقبال احمد قاسمی وجوب کے قائل ہیں، البتہ بعض دفعہ بعض امیدواروں میں یا بعض علاقوں یا بعض ایکشنوں میں ایسی صورت حال ہوتی ہے کہ کسی کی شکست یا فتح سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، یا امیدوار ایسے ہوتے ہیں کہ ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے، اس طرح کی صورت حال میں ووٹ واجب نہیں بلکہ صرف جائز یا مستحب رہ جاتا ہے۔

دلائل وجوب:

ووٹ کو واجب قرار دینے والے حضرات وہ ہیں جنہوں نے اس کو شہادت کی حیثیت دی ہے اور ان کے دلائل بھی قرآن و احادیث سے وہی ہیں جو شہادت کی ترغیب یا کتبمان شہادت اور شہادت زور کی ترغیب میں ہیں، مثلاً:

۱- أقيموا الشهادة لله۔ (طلاق: ۲)۔

۲- ولا ياب الشهداء إذا ما دعوا۔

۳- يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله۔ (النساء: ۱۳۵)۔

۴- يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين لله شهداء بالقسط ولا يجرمنكم شنآن قوم۔ الخ (المائدہ: ۸)۔

۵- ولا تكتموا الشهادة من يكتمها فإنه آثم قلبه۔ (بقرہ)۔

۶۔ والذین لا یشہدوں الزور۔ (فرقان: ۷۲)۔

۷۔ والذین ہم بشہادۃہم قائمون۔ (معارج: ۳۲)۔

احادیث:

۸۔ عدلت شہادۃ الزور الإشرک باللہ، ثلاث مرات، ثم قرأ: فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور۔ (ابوداؤد: ۳۵۹۹)۔

۹۔ ألا أخبرکم بخیر الشہداء، الذی یأتی بشہادۃ قبل أن یسألہا۔ (ترمذی: ۲۳۹۵)۔

۱۰۔ ووٹ امانت ہے اور امانت کا کتمان معصیت اور اللہ کے حکم کی مخالفت ہے۔ إن اللہ یأمرکم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلہا۔ المستشار مؤتمن، معناه: أن المستشار أمين فيما یسأل من الأمور، فلا یبغی أن یخون المستشار بکتمان مصلحتہ۔ (تحفة الأحوذی ۸/۱۰۹)۔

۱۱۔ بعض فقہی عبارتیں مثلاً فتاویٰ بزازیہ، شامی وغیرہ۔

۱۲۔ مولانا توقیر بدقتی ووٹ کو اگرچہ مشورہ کی حیثیت دیتے ہیں، لیکن حکم و وجوب کا لگاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ محض مشورہ سمجھ کر اسے ٹالا نہیں جاسکتا، ”وشاورہم فی الأمر“، لا خلافة إلا عن مشورۃ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۵۷۲) إذا استنصح رجل أخاه فلینصح له، (رواہ البخاری تعليقاً ۱۰۲۸۹) وغیرہ دلائل سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سربراہان ملک و حاکموں کو ہر میدان کے ماہر و شعبہ کے ایکسپٹ سے لازمی طور پر مشورہ کا پابند بنایا جانا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر ووٹ دینے والا ایکسپٹ ہوتا ہے کہ اسے واجب کہا جائے؟

مفتی نصر اللہ ندوی، ووٹ کو جمہوری نظام میں حکومت اور ارباب حکومت کی اصلاح اور منکرات کی روک تھام کا ایک بہت بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ”من رأی منکر منکرأ... الخ“ کی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض منصبی بھی، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انتخابی مہم کے دوران امیدوار ہر ممکن طریقہ سے لوگوں سے رابطہ کرتا ہے، گھر گھر پہنچ کر ذاتی طور سے ملاقات کرتا ہے، پوسٹر، بیئر، ہنڈل، اشتہارات کے ذریعہ ووٹروں سے اپنے حق میں ووٹ ڈالنے کی اپیلیں کرتا ہے، گویا وہ ہر ووٹر سے اپنے حق میں گواہی طلب کرتا ہے، فقہی نقطہ نظر سے اگر گواہی طلب کی جائے اور اندیشہ ہو کہ اگر گواہی نہ دی جائے گی تو حقدار کی حق تلفی ہوگی تو گواہی دینا واجب ہے، اس لیے اگر کوئی امیدوار اس لائق ہو کہ اسے ووٹ دیا جائے اور نہ دینے کی صورت میں اس کی شکست کا ظن غالب ہو تو ووٹ ڈالنا واجب ہوگا (ولاء اب اشہد، وغیرہ آیات اور بدائع ۶/۲۸۲ کا حوالہ)۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین، جمالی کے نزدیک عمومی حالات میں واجب علی الکفایہ اور خصوصی حالات میں واجب علی العین ہے۔ مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی کے نزدیک بھی ووٹ واجب کفایہ ہے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی نے خلاصہ کلام میں لکھا ہے: عام حالات میں ووٹ دینا فرض کفایہ اور جب مسلم دشمن حکمران کا آنا یقینی یا ظن غالب ہو، جس سے مقاصد شریعت کا تحفظ نہ ہو سکے تو ووٹ دینا فرض عین ہوگا۔

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی کے نزدیک ووٹ ڈالنے کے وجوب کی وجوہات یہ ہیں:

۱۔ ایکشن اور ووٹ سے کنارہ کشی اور علاحدگی ناعاقبت اندیشی کے ساتھ ان سیاسی پارٹیوں کو کامیاب کرنا ہے جو مسلمان کو حق رائے دہی سے محروم کرنا چاہتی ہیں، اور اس سے عزت و آبرو اور جان و مال کا خطرہ ہے جبکہ ووٹ دے کر، ہم بادشاہ گر نہیں تو اس کا کردار ادائیگی کر سکتے ہیں۔

۲۔ جمہوری ملک میں ووٹ بھی ایک بڑی طاقت ہے اور ”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوۃ“ میں داخل ہے۔

۳۔ ووٹ ایک نعمت اور موثر ہتھیار ہے، لہذا ووٹ نہ دینا نعمت کو ضائع کرنا اور ناقدری کرنا ہوگا، اور نا اہل کو ووٹ دینا نعمت کا غلط استعمال ہوگا، اور نعمتوں کے

بارے میں اللہ کے یہاں سوال ہوگا، واشکروا نعمۃ اللہ إن کنتم إیاءہ تعبدون / من شکر فإنما یشکر لنفسه / ما یفعل اللہ بعدا بکم إن شکرتمہ الخ / لئن شکرتمہ لأزیدنکم الخ۔  
۴۔ برائی کارو کننا واجب ہے اور نا اہل کو ووٹ نہ دے کر ایک مفدہ سے قوم و ملک کو بچانا اور ایک شر کو روکنا ہے۔

۵۔ حضرت عمرؓ نے کسی سے پوچھا، علم کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ”معرفة الخیر من الشر“ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”معرفة خیر الشرین“ (الاشباہ لابن نجیم ۱/۸۹) ووٹ میں شرکت اور عدم شرکت دونوں ہی صورتیں شرف و فساد سے خالی نہیں، البتہ ووٹ دینا نہ دینے سے کم شر ہے، وإذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتکاب أخفهما (الاشباہ ۱/۸۹)۔ لو کان أحدهما أعظم ضرراً من الآخر، فإن الأشد یزال بالأخف (حوالہ سابق)۔ من ابتلی ببلیتین وهما متساویان يأخذ بأیتھما شاء، وإن اختلفا یختار أھونھما (حوالہ سابق)۔

۶۔ ایکشن اور حکومتی نظام کی شرعی قیاحتوں کے باوجود ان میں شرکت کی جائے گی، جس طرح اگر کفار مسلمانوں سے جنگ کے موقع پر مسلم قیدیوں یا بچوں کو ڈھال بنا لیں تو کافروں کو نشانہ بنانے کی نیت سے تیر چلانا درست ہوگا۔  
ترجیح:

سوال نمبر ۱ میں یہ تفصیلی ذکر آچکا ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت قرار دینا درست نہیں، کیونکہ شہادت اور شاہد اور ادائے شہادت کی شرطیں اس پر منطبق نہیں ہوتیں، لہذا شہادت کی بنیاد پر وجوب کا حکم لگانا بھی مناسب نہیں ہوتا، راقم الحروف کی رائے میں ووٹ کی حیثیت محض ایک حق رائے دہی کی ہے، جو صرف جائز اور درست ہے، ہر صاحب حق کو اپنا حق استعمال کرنا چاہیے اور اس کی اسے ترغیب بھی دی جاسکتی ہے، لیکن بہر حال وہ مختار ہے، کسی صورت میں اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ترک حق پر مؤاخذہ اور ملامت کا مستحق ہے، رائے اور مشورہ کی حیثیت وجوب کی نہیں ہوتی، نہ ہر معاملہ میں رائے لینا اور دینا واجب اور نہ ہر کس و ناکس سے طلب رائے یا اس کی طرف سے اظہار رائے مناسب، اگر کسی سے مشورہ لیا جائے تو مستشار پر صحیح اور درست رائے دینا تو واجب ہے لیکن اگر وہ طلب رائے کے بعد بھی رائے نہ دے یا اپنا یہ حق محفوظ رکھے تو اس کا اختیار ہے، اس کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ضرور رائے یا مشورہ دے۔ بایں وجوہ ناچیز کی ناقص رائے میں ان حضرات کا موقف اور نقطہ نظر زیادہ درست اور لفظ ووٹ کے معنی اور مفہوم سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے جو اس کو رائے کی حیثیت دیتے ہوئے محض جائز مانتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۳: ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

کسی منصب کا طالب اور خواہش مند ہونا یا کسی عہدہ کے لئے از خود پیش کش کرنا کوئی پسندیدہ بات اور مستحسن اقدام نہیں، بلکہ بہتر یہ ہے کہ کسی قابل اور اہل شخص کو دوسرے لوگ نامزد کریں، لیکن بصورت دیگر بشرط اہلیت، بحیثیت امیدوار خود کو پیش کرنے کے جواز پر مولانا محمد الاعظمی کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں، حتیٰ کہ بعض حضرات نے وجوب تک قرار دیا ہے، ہاں! اگر اہلیت نہ ہو، یا طلب حب مال و اقتدار، سلطنت کی ہوس اور لالچ ہو، یا عدل و انصاف قائم نہ رکھ پانے کا یقین یا ظن غالب ہو، یا عہدہ پر فائز ہو کر کسی سے انتقام لینا مقصد ہو تو ایسی صورت میں عہدہ طلب کرنا ممنوع اور حرام بھی ہو جاتا ہے۔  
مولانا محمد الاعظمی لکھتے ہیں: ایکشن میں یا کسی بھی دینی اور دنیاوی عہدہ کے لئے اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر پیش کرنے یا خود طلب گار ہونے کا شرعی حکم بالکل واضح ہے کہ یہ جائز نہیں، اس پر کئی شرعی دلائل قائم ہیں، مثلاً حضرت عبدالرحمن بن سمرہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہم کی حدیثیں۔  
(آگے ان حدیثوں کا ذکر آ رہا ہے)

مانعین جواز کے دلائل:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امارت یا منصب طلب کرنا یا اس کی خواہش کرنا شرعاً پسندیدہ اور غیر مستحسن بات ہے، مندرجہ ذیل احادیث سے یہی واضح ہوتا ہے:

۱۔ عن عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا عبدالرحمن بن سمرہ! لا تسئل الإمارة فإن أعطیتها عن مسألة وکلت إلیها وإن أعطیتها من غیر مسألة أعنت علیها (متفق علیہ)۔

۲۔ عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه قال: دخلت على النبي صلى الله عليه وسلم أنا ورجلات من بني عمي، فقال أحد الرجلين يا رسول الله! أمرنا على بعض ما وولاتك الله عزوجل، وقال الآخر مثل ذلك فقال: أما والله لا نولي على هذا العمل أحداً سألناه أو أحداً حرص عليه۔ (متفق عليه)

۳۔ عن أبي ذر رضي الله عنه قال: قلت يا رسول الله! ألا تستعملني؟ قال: فضرب بيده على منكبي ثم قال: يا أبا ذر! إنك ضعيف وإنها أمانة وإنها يوم القيامة خزي وندامة إلا من أخذها بحقها وأدى الذي عليه فيها۔ (مسلم شريف)

۴۔ عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إنكم ستحرصون على الإمارة وستكون ندامة يوم القيامة فنعمت المرصعة وبئست الفاطمة۔ (بخاری) (مولانا عبید اللہ ندوی اور رحمت اللہ ندوی وغیرہ)

لیکن ان احادیث میں ممانعت کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے، مثلاً حضرت ابو ذرؓ کو یہ فرمایا کہ تم کمزور ہو اور ذمہ داری تمہارے سنبھالنے نہ سنبھالے گی، پھر یہ خیر القرون کی بات ہے، جب ہر منصب اور عہدہ کے لئے ایک سے زائد اہل موجود ہوا کرتے تھے، اور ذمہ داریوں اور مناصب کی تقسیم میں اہل کو ترجیح دی جاتی تھی، تعلق و تعلق اور قربت داری اور دوستی کی بنیاد پر کسی کو ترجیح حاصل نہ تھی، آج کل کے حالات ماضی اور عہد نبوی سے بڑے مختلف ہیں۔

عہدہ طلبی کے مجوزین کے دلائل:

مانعین جواز کے دلائل کی توجیہ و تاویل کے بعد قائلین جواز کے دلائل ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول "اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ" یہ دلیل تقریباً تمام مقالہ نگاروں کی ہے۔

۲۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا: "رب هب لی ملکاً لا ینبغی لأحد من بعدی"۔

۳۔ قائلین جواز نے ان احادیث کی مناسب تاویل و توجیہ کی ہے جن میں عہدہ طلب کرنے کی ممانعت ہے۔ (مولانا عبید اللہ ندوی)

۴۔ حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے جب حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ آپ میں سے کون ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہوتا ہے؟ اس پر وہ دونوں خاموش رہے، یہ خاموشی خود کو منصب خلافت کے لئے نامزد کرنے کی ضمنی لیکن صریح دلیل ہے، کیونکہ ہر ایک اپنے کو مسلمانوں کے حق میں مفید اور ان کی خدمت کی صلاحیت رکھنے والا سمجھتا تھا (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۷/ ۱۳۵-۱۳۶)۔

۵۔ امام ماوردی رقمطراز ہیں: وإن لم یقر بہا۔ ای بالإمامة۔ أحد، خرج من الناس فریقان: أحدهما أهل الاختیار حتی یختاروا إماماً للأمة، والثانی: أهل الإمارة حتی ینتصب أحدہم للإمامة (الأحكام السلطانية فی الولايات الدینیة، ص: ۳۰)۔ حتی ینتصب أحدہم للإمامة کا مطلب خود کو نامزد کرنا ہے۔

۶۔ نظام کفر میں عہدہ کی طلب یا قبول مکروہ نہیں جب کہ ظلم و جور سے مامون ہونے کی امید ہو، "وإن تعین له أو أمنه لا یکره" (الدر المختار ۸/۲۲) (مفتی شاجہاں ندوی)۔

۷۔ ثم الولاية وإن كانت جائزة أو مستحبة أو واجبة، فقد يكون في حق الرجل المعين أوجب أو أحب، فيقدم حينئذ خير الخیرین وجوباً تارة واستحباً بأخری الخ (مجموع الفتاوى لابن تیمیہ، ۲۰/۵۶) (مولانا نصر اللہ ندوی)۔

۸۔ أما إن لم یکن فی البلد من یقوم مقامه فإنه یتعین علیه لكونه من فروض الكفایة۔ (مداہیہ ۳/۱۳۳)۔

۹۔ إن طلب الإمارة والقضاء من حيث الإمارة والحكومة لحب المال والرياسة والشرف منهي عنه مطلقاً سواء كان بالقلب وحده أو باللسان أيضاً لكونه من ناحية الدنيا لا الدين، وأما طلبها لا من حيث الإمارة بل لإرادة الإصلاح بين الناس وإقامة العدل فيهم والقضاء بالحق لما في العدل من الأجر الجزيل، فليس بمنهي عنه، لا بالقلب ولا باللسان بدليل قوله صلى الله عليه وسلم: لا حسد إلا في اثنين۔ الخ (اعلاء السنن ۱۵/۲۳) (مفتی عظیم عالم قاسمی، مولانا نظام رسول)



۱۰۔ وهذا لا يخالف ما فرض في الحديث الذي قبله من الحصول بالطلب وبغير طلب، بل في التعبير بالحرص إشارة إلى أن من قام بالأمر عند خشية الضياع يكون كمن أعطى بغير سؤال لفقد الحرص غالباً لمن هذا شأنه، وقد يحتضر الحرص في حق من تعين عليه لكونه يصير واجباً عليه (فتح الباری ۱۳/۱۱۲) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)

۱۱۔ اجعلني على خزائن الأرض کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: سأل العمل لعلمه بقدرته عليه ولما فيه من المصالح للناس (۲/۶۲۷)

۱۲۔ وصف يوسف عليه السلام نفسه بالأمانة والكفاية وطلب الولاية ليتوصل بها إلى إضفاء أحكام الله وإقامة الحق وبسط العدل مما يبعث لأجله الأنبياء إلى العباد... ومن هذا القبيل اشتغال الخلفاء الراشدين بأمر الخلافة... وفيه دليل على جواز طلب الولاية والقضاء۔ (تفسیر مظہری ۵/۱۷۳۔ ترجمہ شیخ البند ۳۲۱۔ معارف القرآن ۵/۹۱) (مولانا حیدر علی قاسمی)

۱۳۔ لو علم إنسان من نفسه أنه يقوم بالحق في القضاء أو الحسبة ولم يكن هناك من يصلح ولا يقوم مقامه لتعين ذلك عليه ووجبت أن يتولاها ويسأل ذلك۔ (قرطبي ۹/۱۳۲)۔

۱۴۔ حضرت عثمان بن العاص ثقفیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اجعلنی إمام قومی، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنت إمامهم، واقتد بأضعفهم، واتخذ مؤذناً، لا يأخذ على أذانه أجراً، (مسند امام ۱۵۶۷: ۱۵۶۸: ۶۲۶)۔

۱۵۔ من طلب قضاء المسلمين حتى يناله ثم غلب عدله جوره فله الجنة، ومن غلب جوره عدله فله النار۔ (ابوداؤد: ۳۱۰۶)۔

۱۶۔ يختلف الحكم باختلاف حال الطالب، فإن كان لا يصلح لها إلا لشخص وجب عليه أن يطلبها... وإن كان هناك من هو أولى منه كره له طلبها، وإن كان غير صالح حرم عليه طلبها۔ (الموسوعة الفقهية ۶/۲۸۱، تحفة المحتاج ۴/۵۳۰۔ اسنی الطالب ۳/۱۰۸) مفتی محمد عارف باللہ قاسمی۔

بعض مقالہ نگاروں نے عہدہ طلبی کو بعض شروط و قیود کے ساتھ مشروط بھی کیا ہے۔

مولانا عبید اللہ ندوی نے ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں بحیثیت امیدوار اپنے آپ کو پیش کرنے کو واجب قرار دیا ہے، ان کے دلائل و حجوب کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ایکشن میں شرکت سے بے شمار قومی، ملی، مذہبی مفادات اور فوائد وابستہ ہیں، جن کا حصول شرکت کے بغیر ممکن نہیں۔

۲۔ غیر اسلامی قوانین و دفعات کو چیلنج کرنے اور ان کی منسوخی کے لئے صدائے احتجاج بلند کرنے کا یہی موثر ذریعہ اور طریقہ ہے۔

۳۔ ایکشن میں شرکت اور عدم شرکت دونوں ہی مفسدہ ہیں، لیکن اہون شرکت ہے، اس کے بعد چند قواعد فقہیہ ذکر کئے ہیں۔

مفتی راشد حسین ندوی ایکشن میں ایسے شخص کے لئے امیدوار بننے کو جائز کہتے ہیں جو دیانتدار، امانتدار اور حوصلہ مند ہو، قوم کی نمائندگی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، اگر کسی وصف میں کمی ہو تو شرعاً اس کے لئے نمائندہ بننا جائز نہیں ہوگا، وہ مزید لکھتے ہیں کہ نمائندہ بننے کے بعد اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ انتخابی مہم چلانے میں کوئی خلاف شریعت بات نہ کرے، مثلاً ناقابل عمل جھوٹا وعدہ نہ کرے، مد مقابل پر بے جا الزامات لگا کر اس کی کردار کشی نہ کرے، نہ اپنی جھوٹی اور خلاف واقعہ تعریف کرے، الغرض انتخابی مہم چلانے میں کسی محظور شرعی کام تک نہ ہو۔ (یہ شرطیں مولانا حسن عبدالحق ندوی اور مفتی طارق انور قاسمی نے بھی ذکر کی ہیں)

مولانا قمر الزماں ندوی کا کہنا ہے کہ باشعور اور لائق افراد کا خود کو امیدواری کے لئے پیش کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے، اگر کوتاہی کریں گے تو عند اللہ ماخوذ ہوں گے۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے ایک اہم بات یہ ذکر کی ہے کہ غالباً موجودہ جمہوریت میں اسلامی نقطہ نظر کو اصولاً تسلیم کیا گیا ہے اور نامزدگی کا فارم

بھرتے وقت کم سے کم دو آدمیوں کے نام لکھے جاتے ہیں جو ان کو امیدوار بنانا چاہتے ہیں۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی کا خیال ہے کہ اگر صاحب اہلیت کو یہ محسوس ہو کہ عدل کے قیام و دفع شرک امکان ہے یا یہ کہ وہ وطن اور اہل وطن کے لئے واضح مصلحت سمجھتا ہو تو اپنے آپ کو پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی تائید نجاشی کے واقعہ سے ہوتی ہے کہ وہ اسلام لانے کے بعد بھی ایک غیر مسلم قوم کے بادشاہ بنے رہے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی اور مولانا شیر علی صاحب کی رائے میں صاحب استطاعت کا ایکشن میں بحیثیت امیدوار پیش کرنا واجب اور ضروری ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کے نزدیک عام حالات میں نامناسب لیکن استثنائی صورت میں جائز بلکہ بعض اوقات واجب تک پہنچ جاتا ہے، اگر کامیابی کا یقین یا ظن غالب ہو تو واجب (وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ)، اگر کامیابی کا یقین یا ظن غالب تو نہ ہو مگر امیدوار بننے سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہنچنے کی امید ہو تو مستحب (وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ)۔ اپنا کوئی ذاتی فائدہ ہو اور اسلام اور مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ ہو تو جائز (الأصل في الأشياء الإباحة)۔

مولانا مظاہر حسین قاسمی تینوں صورتوں کے قائل ہیں۔

مفتی طارق انور قاسمی کے نزدیک یہ جواز ضروری ہے، لہذا ضرورت کو بقدر ضرورت ہی رکھا جائے گا۔ الضرورة تقدر بقدرها (اشیاء للسیوطی، ص: ۸۴)، لہذا امیدواروں پر ضرورت کا پابند رہنا حتی الامکان واجب ہے اور بقدر ممکن شرعی مخالفتوں کو کم کرنے کی کوشش بھی۔

مولانا فیاض عالم قاسمی اور رحمت اللہ ندوی نے پانچ درجات متعین کئے ہیں:

۱۔ جائز۔ ہندوستان کے حالات کے تناظر میں جہاں مسلمانوں کو ان کی سیاسی حیثیت کمتر ہونے کی وجہ سے قدم قدم پر مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے حتی کہ ان کی جان و مال خطرے میں ہیں، عہدہ طلب کرنا یعنی بحیثیت امیدوار ایکشن میں کھڑا ہونا جائز ہے۔ بشرطیکہ عہدہ کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دینے کی قابلیت اور صلاحیت موجود ہو اور خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہو۔

۲۔ واجب۔ اس وقت ہے جب کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نہ ہو، اور اس کے ذریعہ حقوق کی حفاظت اور احکام شریعت کا نفاذ ممکن ہو، اس عہدہ پر دوسروں کے فائز ہونے سے مسلمانوں کا دنیوی اور اخروی نقصان ہو۔

۳۔ حرام۔ جب کہ بڑا بننے یا عہدہ سے غلط فائدہ اٹھانے اور دوسروں پر ظلم کرنے کے لئے ہو۔

۴۔ مستحب۔ اگر کئی اہل ہوں لیکن دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو نفع اور اصلاح سمجھتا ہو۔

۵۔ مکروہ۔ ایک ہی علاقہ میں کئی مسلم امیدواروں کا ایک دوسرے کو ہرانے کی نیت سے ایکشن لڑنا مکروہ تحریمی ہے (معین احکام، ص: ۱۰۔ رد المحتار مع الدرر، ۸/۴۰)۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی اور مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی نے مندرجہ ذیل شرائط جواز امیدواری کے لئے بیان کی ہیں:

(الف) اسپہلی یا پارلیمنٹ وغیرہ میں قابل و باصلاحیت مسلمان کے آگے نہ بڑھنے کی صورت میں فرقہ پرست ذہنیت کے حامل افراد کی کثرت ہو رہی ہو۔ (ب) یا فرقہ پرست شخص کی کامیابی کا امکان ہو۔ (ج) امانت و دیانت، جذبہ خدمت خلق اور قوم و ملت کے حق میں مفید شخص کے آگے نہ بڑھنے کی شکل میں کرپٹ اور رشوت خور، امانت و دیانت کے اوصاف سے عاری فرد کی جیت کا امکان ہو۔ (د) مذکورہ بالا دیانت کے اوصاف کے ساتھ عوام کی مشکلات و مسائل سے واقف اور ان کے حل کرنے کی صلاحیت، اور اپنی بات کو موثر انداز میں اور قانون و منطق کی زبان میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ (ه) جب مال و جاہ مقصود نہ ہو بلکہ اس بات کا اندازہ ہو کہ اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دے سکے گا، اور خلق اللہ کی صحیح اور انصاف کے ساتھ حقوق ادا کرے گا۔

ترجیح:

راقم الحروف کی رائے میں مذکورہ بالا دلائل ثبوت جواز کے لئے بہت کافی ہیں، مزید ایک دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کتب سیرت میں منقول مشہور واقعہ ہے کہ فتح خیبر کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لِأَخْذِنِ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلٌ يَجِبُهُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ يَفْتَحُ عَلَيْهِ" اس موقع پر اس سعادت کو حاصل کرنے اور علمبرداری کا منصب سنبھالنے کے لئے کبار صحابہ حتی کہ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے آپ کو نمایاں کیا تھا، یہ پیش کش کی علامت تھی۔

سوال نمبر ۴: غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

اس سوال کے دو جز ہیں: ایک جز مخالف شریعت قانون ساز ادارے کی مطلقاً ممبری کا مسئلہ ہے اور دوسرا مسئلہ کسی پارٹی کا اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر کے پالیسی کے مطابق ووٹ کا پابند کر دینے کا ہے، اکثر مقالہ نگاروں نے دونوں کا جواب ایک ساتھ دیا ہے، جبکہ بعض نے دونوں کو الگ الگ ذکر کیا ہے خلاف شریعت قانون ساز اداروں کی ممبری اور ان میں شرکت و شمولیت کو بنیادی اور اصولی طور پر ناجائز قرار دیتے ہوئے، عام و خاص اور اختیار و اضطرار کی حالت کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے، کچھ شروط و قیود کے ساتھ اکثر مقالہ نگاروں نے صریحاً جائز اور کچھ نے احتیاطاً گنجائش اور اجازت کا خیال ظاہر کیا ہے۔ جبکہ مفتی جنید بن محمد پالپوری، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری اور مولوی شاہ اکرام الحق ندوی نے وجوب کی بات کہی ہے۔

دوسری طرف مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی ممتاز خاں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا احسن عبدالحق ندوی اور رحمت اللہ ندوی نے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس طرح اس میں تین نقطہ نظر ہو گئے: وجوب، جواز اور عدم جواز۔

وجوب کے قائلین کے دلائل:

مفتی جنید محمد اور مولوی شاہ اکرام الحق ندوی کا کہنا ہے کہ ایسے قانون ساز ادارے جو خلاف شرع قوانین بناتے ہوں، خواہ غیر مسلم ملکوں میں ہوں یا مسلم ممالک میں، ممبر بننا ضروری اور لازم ہے تاکہ جو غیر شرعی قوانین پارلیمنٹ میں جاری ہوں ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا جاسکے، اور ضرورت ہو تو استغنیٰ دے دیں۔ اگر مسلم ممبران اس پر عمل پیرا ہوں تو شاید ہی کوئی حکومت یا پارٹی خلاف شریعت بل لانے کی ہمت کرے۔ ڈاکٹر محمد مبین سلیم اصل میں ناجائز مگر حالات حاضرہ کے پس منظر میں نہ صرف جائز بلکہ واجب کہتے ہیں۔

مانعین جواز اور ان کے دلائل:

مولانا احسن عبدالحق ندوی کے نزدیک ان اداروں کا ممبر بننا درست نہیں ہے، اس لئے کہ ہندوستان کے قانون کے مطابق جب پارٹی اپنے ممبر کے لئے وہیپ جاری کر دیتی ہے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں پارٹی بدل دے اور اپنے اختیار سے ووٹ دے۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد ممتاز خاں ندوی اور قاضی محمد حسن ندوی عدم جواز کی وجہ تعاون علی الاثم والعدوان بتاتے ہیں جو جنس قرآن کریم حرام ہے، خواہ یہ ادارے مسلم ممالک میں ہوں یا غیر مسلم ممالک میں، جب کہ مولانا عبدالرب اعظمی ایک وجہ شہادت کا ذبہ بھی بتاتے ہیں۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے لکھا ہے کہ خلاف شریعت قانون بنانے میں ایک مسلمان کی حصہ داری کسی طرح جائز نہیں، اپنا اختلافی نوٹ شامل کر دینا چاہئے، اور صاف طور پر کہہ دینا چاہئے کہ یہ قانون اسلام کے خلاف ہے، میں اس میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

عدم جواز کے دیگر دلائل:

۱۔ اللہ اور رسول کے علاوہ فیصلہ بہت بڑی معصیت اور کھلی گمراہی ہے:

(الف) فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم... ويسلموا تسليماً (نساء: ۶۵)۔

(ب) وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون لهم الخيرة... ضللاً مبيناً (احزاب: ۳۶)۔

(ج) اس آیت کی تفسیر میں مفسر طبری لکھتے ہیں: ”ولم يكن لمؤمن بالله ورسوله ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله في أنفسهم قضاءً أن يتخيروا من أمرهم غير الذي قضى فيهم، ويتخالفوا أمر الله ورسوله وقضاءهما، فيعصوهما، من يعص الله ورسوله فيما أمراً ونهياً (فقد ضل ضلالاً مبيناً) (جامع البيان للطبري ۲۰/۲۷۱) (مفتی محمد عارف باشتاکی)۔“

- ۲۔ تعاون علی الرثم والعدوان ہے۔ ولا تعاونا علی الاثم والعدوان (مفتی محمد متاز خاں مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی وغیرہم)۔
- ۳۔ یہ ادارہ آئندہ شرک اور خدا کی نافرمانی پر مجبور کر سکتا ہے جبکہ شرک اکبر الکبائر ہے، اللہ معاف نہیں کرے گا۔ ان الله لا یغفر ان یشرك به الذی... ان الشریک لظلم عظیم
- ۴۔ رکن اور ممبر بننے میں مختلف قسم کے اتہامات و الزامات اور شکوک شبہات پیدا ہوں گے۔ اور تہمت سے بچنے کا حکم ہے۔ (اتقوا مواضع التہم)
- ۵۔ ممبر بننے میں مذہبی اور دینی نقصان کا خطرہ ہے۔
- ۶۔ یہ کتمان شہادت کے مرادف ہے کیونکہ اس طرح کا ممبر سچی شہادت قائم کرنے اور عدل و انصاف پھیلانے سے عاجز رہے گا۔
- ۷۔ اس میں اتباع نفس اور اتباع ہوی ہے (ولا تتبع اہواء الذین لا یعلمون) (مولانا حیدر علی قاسمی)
- ۸۔ من مٹی مع ظالم لیقویہ وهو یعلم انه ظالم فقد خرج من الإسلام (مشکوٰۃ ۳۳۶) (مولانا فاروق بارڈولی)
- ۹۔ شمولیت دشمنان اسلام کے لئے استحکام و تقویت ہے اور یہ ممنوع ہے، ”یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ہزوا ولعبا من الذین اوتوا الكتاب من قبلکم والکفار اولیاء“ (مولانا ریحان مہر قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)
- ۱۰۔ عن ابي موسى رضی اللہ عنہ قال: قلت لعمر رضی اللہ عنہ، ان لی کاتباً نصرانیا، قال: مالک؟ قاتلتک اللہ، اما سمعت اللہ یقول: ”یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصارى اولیاء، بعضهم اولیاء بعض“ (السائدۃ) ألا اتخذت حنیفیاً (أی مسلماً) قال: قلت یا امیر المؤمنین! لی کتابتہ ولہ دینہ، قال: لا اکرہمہم اذ اہانہم اللہ ولا اعزہم اذ اذلہم اللہ، ولا ادنیہم اذ اقصاہم اللہ۔ (مسند احمد بسند صحیح)۔
- ۱۱۔ من رضی عمل قوم فهو منهم، من کثر سواد قوم فهو منهم (حدیث: تفسیر کبیر ۱۲/۵۳۔ رازی ۱/۱۶۹۶) (مولانا غلام رسول قاسمی)
- ۱۲۔ وان احکم بینہم بما انزل اللہ ولا تتبعہم اہوائہم... لفاسقون (مائدہ: ۴۹)۔
- ۱۳۔ افتؤمنون ببعض الكتاب وتکفرون ببعض... ولا ہم ینصرون (بقرہ: ۸۶-۸۵)۔
- ۱۴۔ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار... لا تنصرون (ہود: ۱۱۳) (مولانا مظاہر حسین)
- ۱۵۔ قد نزل علیکم فی الكتاب... فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ، الایۃ
- ۱۶۔ من رتہ حول الحمی یوشک ان یقعہ فیہ (بخاری) (مفتی محمد متاز خاں ندوی)۔
- ۱۷۔ لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین (آل عمران: ۲۸)
- ۱۸۔ لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء (ممتحنہ)۔
- ۱۹۔ لا تتخذوا بطانۃ من دونکم... (آل عمران: ۱۱۸) (مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی)۔

مفتی راشد حسین ندوی لکھتے ہیں: جمہوری نظام کی ایک نہایت سنگین اور خطرناک خرابی ممبروں کو قانون سازی کا بھی حق دینا ہے۔ یہ وضع کردہ قوانین کبھی شریعت کے موافق ہوتے ہیں اور کبھی کھلم کھلا متضاد، جو حضرات الیکشن میں مسلمانوں کی شرکت ناجائز قرار دیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ شارع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، ”ان الحکم الا للہ الا تعبدوا الا ایاہ“۔ (یوسف: ۲۰)۔

”ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئک هم الظالمون۔ (مائدہ)۔ ہم الکافرون (مائدہ: ۴۴)۔“

دلیل کے اعتبار سے ان حضرات کی رائے بہت مضبوط ہے، لیکن فی الوقت اسلامی حکومت کا خواب دیکھنا، خاص طور سے غیر مسلم اکثریت والے ممالک

میں شیخ چلی کے خیالی پلاؤ جیسی چیز ہے (لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرأ) یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی اسلامی ملک کی طرف ہجرت کی جائے۔ لہذا غور کرنا چاہئے کہ شرکت کرنے میں فائدہ ہے یا احتراز کرنے میں؟

مجوزین کے دلائل پر ایک نظر:

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ مجوزین نے اصولی طور پر مانعین جواز سے اتفاق کرتے ہوئے اضطراری حالت میں اس سے عدول کیا ہے اور مصلحت کا اعتبار کرتے ہوئے چند شرط اور کچھ قیود کے ساتھ جواز کا راستہ اختیار کیا ہے یا اس کی گنجائش نکالی ہے۔ چنانچہ:

مفتی راشد حسین ندوی کے نزدیک باصلاحیت اور حوصلہ مند افراد کے لئے ان اداروں کا ممبر بننا مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے:

۱۔ دل سے یہ عقیدہ رکھے کہ شارع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ انسان، اپنی شرکت کو ایک مجبوری اور اہول البلیتین سمجھے۔

۲۔ کوئی خلاف شریعت بل پارٹی کے زیر بحث آئے تو پارٹی سطح پر اس کو ہٹانے کی حتی الامکان کوشش کرے۔ پوری جرأت کے ساتھ اس کی مسزمتیں اور عدم افادیت ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ اگر اس کی بات نہ سنی جائے اور وہ سیپ جاری کر دیا جائے تو اچھی طرح غور کر لے کہ خلاف شریعت بل کے باوجود اس کا پارٹی میں رہنا ملت کے لئے مفید ہے یا پارٹی چھوڑ دینا، اگر پارٹی چھوڑنے سے ملت کو کوئی نقصان ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پارٹی چھوڑ دے۔

لیکن اگر پارٹی چھوڑنے سے ملت اسلامیہ کے نقصان کا اندیشہ ہو تو بدرجہ مجبوری اس آیت ”من کفر... إلا من أکثره وقلبه مطمئن بالإیمان“ کو سامنے رکھتے ہوئے بل پاس ہونے دے ”لا یكلف الله نفسا إلا وسعها“

مولانا عبید اللہ ندوی نے جواز پر حضرت یوسف علیہ السلام اور نجاشی شاہ حبشہ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، مزید دلیل کے طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں کی مکمل کنارہ کشی نقصان دہ اور حقوق سے محرومی کا باعث ہوگی، پھر جب دوٹ دینا جائز ہے تو ممبر بننا بھی درست ہے، کیونکہ دونوں ہی مفسدہ ہیں، البتہ ممبر کو دین و شریعت کا پابند اور دینی غیرت و حمیت کا حامل ہونا چاہئے۔ وہ دین میں مدہانت بالکل گوارا نہ کرتا ہو اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہو، مرد ہو۔

ڈاکٹر مفتی شاہ جہاں ندوی کا خیال ہے کہ معتبر شرعی مصلحت کا تقاضا ہے کہ اچھے اور نیک مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنی چاہئے۔ لیکن نیت باطل کو حتی الامکان مسترد کرنے یا اس میں کی لانے کی کوشش، حق کے اعلان اور صحیح فیصلہ کی جدوجہد ہو، سیکرٹری اور ادارے کی ہر چیز اسلام اور دین مخالف نہیں ہوتی، کتاب و سنت کے نصوص سے واضح ہے کہ قوم کو حکام مقرر کرنے اور ان کا محاسبہ اور نگرانی کرنے کا حق ہے۔ البتہ تحلیل و تحریم اور قانون سازی کا مطلق حق منتخب ممبران پارلیمنٹ اور لیجس لیٹیو اسمبلی (Legis Lative Assemle) کو دینا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں، اس پر کئی قرآنی آیات نقل کی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں: پارٹی کے وہ سیپ جاری کرنے کی صورت میں چونکہ وہ مجبور ہے، لہذا ضمیر کی آواز پر روٹ دینے کا اختیار رکھنے کی وجہ سے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ماخوذ نہ ہوگا۔ (الا من أکثره وقلبه مطمئن بالإیمان)

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی ایسی پارٹی کا ممبر بننا جائز قرار دیتے ہیں جو اسلام دشمن اور مسلم مخالف نہ ہو اور اس کی پالیسی شریعت کے خلاف نہ ہو، عام اور خاص حالات میں ممبری کا حکم مختلف ہوگا۔ شریعت نے بھی دونوں حالتوں کے درمیان فرق کیا ہے، جیسے شراب نوشی، مردار کھانا اور خون کا استعمال، عام حالات میں حرام اور اضطراری حالت میں مباح ہے، البتہ خلاف شریعت قانون کو دل سے برا سمجھنا اور اس کے خلاف آواز اٹھانا ضروری ہے۔

مفتی قمر الزماں ندوی نے مسلم ممبران پارٹی کے وہ سیپ کی مخالفت کرنے اور خلاف شریعت قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے اور بسا اوقات مستغنی ہونے پر جناب مولانا عتیق احمد قاسمی، بستوی کی ایک تحریر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مخالفت برائے نام نہ ہو بلکہ بھرپور ہو اور رکوانے کی پوری کوشش ہو، اگر مستغنی دینے کی ضرورت ہو یا ظن غالب میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہوں تو اس سے بھی دروغ نہ کیا جائے، لیکن یہ اقدام غور و خوض اور مشورہ کے بعد ہو۔

مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی کا خیال ہے کہ وہ سیپ جاری کرنے کی صورت میں پارٹی سے مستغنی ہو کر فوراً اس کی اس پالیسی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا ضروری ہے کیونکہ ضمیر کی آواز پر روک لگانا دستور ہند کے دفعہ ۲۵/۲۶ کے خلاف ہے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی نے صلح حدیبیہ (جس کے شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھے پھر بھی اسے فتح مبین کہا گیا ہے) سے استدلال کرتے ہوئے دو

مفسدوں میں سے کمتر مفسدہ کا ارتکاب گوارہ کرتے ہوئے جواز پیش کیا ہے۔ اور کچھ قواعد فقہیہ مثلاً ”الضرر الأشد یزال الضرر الأخف، یتحمل الضرر الخاص من الضرر العام وغیرہ“ پیش کئے ہیں۔

مفتی نصر اللہ ندوی نے ’فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ تعاونوا علی البر والتقوی۔ یا ایہا الذین آمنوا إن تنصروا اللہ ینصرکم۔ یا ایہا الذین آمنوا کونوا انصار اللہ۔‘ (تفصیل ان کے مقالہ میں ملاحظہ کریں) نیز حضرت شعیب علیہ السلام کے قول اور سیرت سے اور ان کی قوم ”ولارھطک لرجمناک وما أنت علینا بعزیز“ کے قول وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے جائز ہی نہیں بلکہ لازم قرار دیا ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں قانون ساز اداروں کی رکنیت اختیار کریں۔

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی مصالحوں کے پیش نظر چند اصول مثلاً ”تقلیل الشر والظلم مطلوب بقدر الاستطاعة“ ارتکاب اخف الضررین۔ سنت تدرج (آہستہ آہستہ احکام لگانا جیسے شراب کی حرمت کا حکم) وغیرہ سے جواز کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہیپ کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور اس ڈر سے پارٹی کا ممبر نہ بننا ایسے ہی ہے جیسے کوئی سانپ بچھو کے ڈر سے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے بطور خاص اس دلیل سے جواز کا ثبوت پیش کیا ہے کہ اگر کسی منکر پر انکار اس سے بڑھ کر منکر کا باعث بن سکتا ہو تو فقہاء نے اس منکر پر سکوت جائز قرار دیا ہے۔ نیز اس منکر کی تائید دل سے اسے مکروہ سمجھتے ہوئے کی جاسکتی ہے۔ وہیپ کے بارے میں اپنا خیال یوں ظاہر کیا ہے کہ یہ اکراہ غیر ملکی ہے اور اس اکراہ (خصوصاً اس ملک میں) سے بھی تکلیف شرعی کے سقوط کی گنجائش ملنی چاہئے۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی نے لکھا ہے کہ کسی بھی مخالف شریعت قانون ساز ادارے کی ممبری کے جواز کا فتویٰ علی الاطلاق نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس کی مخالفت وداخلت اور قوم وملت کی خیر خواہی کے ساتھ مشروط ہے، واضح رہے کہ ان کے ہاں وہیپ جاری کرنے کی صورت میں جواز نہ ہوگا۔

مولانا عبدالخالق نے قانون ساز اداروں اور سیاسی پارٹیوں کو بطور عقیدہ تسلیم کر لینے اور محض کام نکلانے کے لئے ناگزیر حالت میں ممبر بننے میں فرق کیا ہے، پہلی صورت جائز نہیں اور دوسری صورت کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔ (الأمور بمقاصدھا)

مولانا عبدالشکور آکولہ، مولانا عابد الرحمان بجنوری، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مولانا محمد الاعظمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محفوظ الرحمان شامین جمالی، مولانا رحمان مبشر قاسمی، مولانا فاروق بارڈولی اور مولانا توقیر بدر قاسمی وغیرہم کے نزدیک ازراہ مصلحت برائے دفع مضرت اور بنیت تخفیف ظلم واذیت ممبر بننے کی اجازت ہے۔ مولانا توقیر بدر قاسمی نے ایسے موقع پر مشورہ دیا ہے کہ مناسب ہے کہ قانون سازی کے دوران مسلم ممبران بظاہر بیمار کہہ کر غائب رہیں جو سیاسی اصطلاح میں ”بیرنی حمایت“ کہلاتی ہے۔ اور اس طرح وہ اپنی شرکت درج نہ کرائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول ”انی سقیم“ سے استدلال کیا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے اس آیت کے تحت لکھا ہے: ”وانما هو من المعارض فی الکلام لمقصد شرعی دینی، کما جاء فی الحدیث“ إن فی المعارض لہندوۃ عن الکذب (ابن کثیر ۱۳/۳)۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی نے مسلم یا غیر مسلم ممالک کے ایسے قانون ساز اداروں کی ممبری کو درست مانا ہے جو مختلف قوانین کے ساتھ بعض مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں بشرطیکہ حتی الامکان تبدیلی یا ترمیم کی کوشش ہو۔ لایکلف اللہ نفسا إلا وسعها۔ فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ إذا أمرتکم بأمر فأتوا منه ما استطعتم (مسلم ۲۲۸۰۔ بخاری ۶۷۲۳) کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مفتی کفایت اللہ دہلوی نے جو انگریزی حکومت سے برسر پیکار تھے۔ مسلمانوں کو ممبر اسمبلی بن کر حکومت میں شامل ہونے کی اجازت دی تھی (کفایت الفتی ۳۹۱/۹)۔

مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی شرکت کے جواز پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر مسلم ممبران پارلیمنٹ میں شریک نہ ہوں تب بھی ایسے قوانین منظور ہوں گے جو مخالف شریعت ہوں گے تو گویا مسلمانوں کی شرکت و عدم شرکت سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ لہذا یہ منظور چیز ہوئی، اور مکمل بائیکاٹ کے اتنے نقصانات ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اس لئے شرکت کی جائے۔ محض مفروضات و خدشات کی وجہ سے بے عملی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔

ترجیح:

اگرچہ ناچیز کی رائے عدم جواز کے قائلین کے ساتھ ہے، لیکن حالات کارخ، قوم و ملک کے مصالح و مفادات اور عدم شرکت سے پوری قوم کو لائق ہونے والے

مضرت و خطرات کے پیش نظر جواز کے قائلین یا مخصوص حالات میں جواز کی گنجائش قرار دینے والے حضرات کی بات زیادہ معقول اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ سوال نمبر ۵ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات، خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟ اس سوال کے جواب میں دو نقطہ نظر سامنے آئے: ایک جواز اور دوسرا عدم جواز کا۔

عام حالات اور اختیاری پوزیشن میں اور بلا کسی قید و شرط کے عدم جواز پر سب کا اتفاق ہے، البتہ مخصوص اور اضطراری حالت میں جواز کی اجازت کی گنجائش ہے، تین حضرات کے علاوہ یہ رائے عام مقالہ نگاروں کی ہے۔ عدم جواز میں بھی بعض نے بہر حال ناجائز قرار دیا ہے جبکہ کچھ نے اکثری اور کلی اور اس کے برعکس صورت میں فرق کیا ہے۔

ناجائز کے قائلین اور ان کے دلائل:

مطلق عدم جواز کے قائلین میں مولانا قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبدالرب اعظمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عابد الرحمان بجنوری مظاہری ہیں اور صرف اکثر دفعات خلاف شریعت ہونے کی صورت میں مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا توقیر بدر قاسمی اور رحمت اللہ ندوی ان کے ہم خیال ہیں۔

مولانا قاضی محمد حسن ندوی کے نزدیک اگر دستور میں بعض دفعات بھی خلاف شریعت ہوں تو حلف لینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ عمل قرآن اور شریعت کے خلاف ہے۔ اللہ نے ”خیر امت“ کی وجہ سے ”امر بالمعروف“ اور نہی عن المنکر“ کا فریضہ اس امت کے ہر فرد پر عائد کیا ہے۔ اسی طرح ”تعاونوا علی البر والتقوی“ کا حکم ہے۔ خلاف شرع دستور پر حلف لینا، ان دو آیات کے خلاف ہے نیز ”من رأى منكم منكرا فليغيره بيده الخ“

مولانا احسن عبدالحق ندوی لکھتے ہیں: جس ادارہ کا قانون شریعت کے خلاف ہو، اس کا رکن بنا درست نہیں لینا کیونکہ درست ہوگا۔ اگر دستور موافق شریعت ہو تو حلف لینا درست، ورنہ نہیں۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کا خیال ہے کہ دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت ہونے کی وجہ سے مسلم ممبران کے لئے مطلقاً دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے کا عمل درست نہیں ہوگا، کیونکہ تعاون علی الاثم ہے اور جنس قرآن حرام ہے۔

مولانا عبدالرب اعظمی بھی تعاون علی الاثم اور غلط معاہدہ کی وجہ سے ناجائز مانتے ہیں جب کہ بہت سی دفعات خلاف شریعت ہوں، لیکن اگر اکثر دفعات موافق اور چند خلاف شرع ہوں تو کیا حکم ہوگا؟ اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مولانا عابد الرحمان بجنوری مظاہری کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ادارے اور جماعت و پارٹی کے قوانین و اصول کے ساتھ وفاداری اس وقت تک جائز ہے جب تک وہ قرآن وحدیث کے مخالف نہ ہوں، اگر ادارہ یا جماعت و پارٹی کا کوئی حکم و قانون شریعت کے حدود سے متجاوز ہو اور اس پر عمل پیرا ہونے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور عدم اطاعت لازم آتی ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ وفاداری کا عہد کرنا یا اس کے لئے حلف اٹھانا کسی کلمہ گوشخص کے لئے جائز نہیں۔

موصوف نے حدیث: ”الاطاعة لخلق في معصية الخالق“ (شرح السنة ۱۰/۲۲، المعجم الكبير ۱۸/۱۰، مصنف ابن ابی شیبہ ۵۲/۱۷) اور حضرت علی سے مروی حدیث: ”الاطاعة لخلق في معصية إمامنا الطاعة في المعروف“ (بخاری ۲/۲۸۷) کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

مانعین جواز کے دیگر ادلہ:

۱۔ السمع والطاعة على الصرء المسلم فيما أحب وكره، مالم يؤمر بمعصية، فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة (بخاری ۶۷۲۵- مسلم ۲۷۳) (مولانا غلام رسول منظور قاسمی)

۲۔ حلف میں مخلوف بہ کی انگریز و تعظیم مقصود ہوتی ہے اور یہ اللہ کے سوا کسی کے لئے روا نہیں۔

۳۔ دستور کے قوانین کلام اللہ نہیں نیز بعض دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، اس اعتبار سے اس کی تائید و حمایت ایک غیر شرعی امر اور گناہ ہے۔ (مولانا مصطفیٰ

عبدالقدوس ندوی

## قائلین جواز کے ادلہ:

مفتی محمد اشرف قاسمی کا کہنا ہے کہ دستور ہند سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہے۔ جو دفعات خلاف شریعت ہیں وہ ان دفعات سے جن میں مذہبی آزادی دی گئی ہے، خود بخود مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔

مولانا شیر علی صاحب کا خیال ہے کہ ہماری حیثیت مصالح کی ہے۔ اور استدلال واقعہ صلح حدیبیہ سے کیا ہے کہ اس میں ایسی شرطیں تھیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تھیں، پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر مشرکین سے صلح کی، لہذا غیر مسلمین کے ساتھ پارٹی میں شریک ہونا اور غیر شرعی باتوں پر دستخط کرنا درست ہے۔

مفتی سید باقر اشرف قاسمی لکھتے ہیں: یہ ماننا کہ بعض دفعہ دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، مگر یہ ایک ایسے ملک میں جہاں شریعت کا نہیں بلکہ عوام کا قانون چلتا ہو، ناممکن سی بات ہے کہ تمام دفعات موافق شریعت ہوں، "الأمر بمقاصدھا" ملک کے دستور کو اسلامی شریعت کے تابع کرنے کی کوشش، اسلامی قانون کی بالادستی کے لئے جدوجہد کی شرط کے ساتھ مصالحتاً دستور کے نام پر حلف لینے کی اجازت ہے۔ حلف لیتے وقت یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ الفاظ کے مفہوم مخالف کی نیت و ارادہ کر لے "الیسین علی نية الحالف إن كان مظلوماً أو علی نية المستحلف إن كان ظالماً" (بدائع ۲/۲۱، قانون الفقہ ۱/۲۱۱)

مفتی راشد حسین ندوی کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص تا عمر کسی ادارہ کا ممبر نہ بنے، لیکن وہ کسی غیر مسلم ملک میں رہتا ہو تو صرف رہنا ہی اس کا گویا یہ عہد کرنا ہے کہ یہاں کے دستور اور قوانین کو تسلیم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خاموش معاہدہ بھی جائز نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے کہ مسلمانوں نے "لا الہ الا اللہ" پڑھ کر تمام وضعی قوانین کا انکار کر دیا ہے، لیکن دنیا کی مجموعی صورت حال کے پیش نظر اکثر علماء نے غیر مسلم ممالک میں رہائش کو جائز قرار دیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی قانون ساز ادارہ کا ممبر بنتا ہے تو یہی خاموشی معاہدہ زبان سے دہراتا ہے، مگر خاموش معاہدہ کے مقابلہ میں اس کی شاعت بڑھی ہوئی ہے لیکن "لا من اکرہ وقلبه مطمئن بالإیمان" کی شرط اور موقع ملنے پر خلاف شریعت قوانین پر خط منسوخ پھیرنے کے عزم اور ملت کے مفاد کے پیش نظر گنجائش ہے..... یہ بھی واضح رہے کہ ملکی قوانین میں ترامیم ہوتی رہتی ہیں۔ مجبوری کے تحت شرعاً حلف کی گنجائش ہوگی۔

مفتی محمد شاجہاں ندوی کے نزدیک غیر الہی قانون کی اکثر دفعات شریعت سے متصادم نہیں ہوتی ہیں، البتہ بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، ایسی صورت میں معتبر شرعی مصلحت کا تقاضہ ہے کہ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ مجبوری کی حالت ہے جس میں ہر طرف نظا مہائے باطل کا تسلط ہے، لہذا ایسے وقت میں آدمی اپنے امکان بھر ہی کا مکلف ہے۔ لا ینکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔

مولانا عبید اللہ ندوی نے مشروط جواز کی رائے اختیار کی ہے کہ اگر دستور کی اکثر دفعات خلاف شریعت ہوں تب تو وفاداری کا حلف اٹھانا بالکل درست نہیں ہوگا، وجہ تعاون علی المعصیۃ ہے، لیکن اگر کچھ دفعات خلاف شریعت ہوں تو حلف وفاداری کی اس شرط کے ساتھ گنجائش ہے کہ یہ نیت ہو کہ جہاں تک اللہ ورسول کی شریعت کی نافرمانی نہ ہو، وفاداری کروں گا۔ (کفایت المفتی ۳۰۹/۹) مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا فاروق بارڈولی، مفتی جنید بن محمد، مولانا مقصود فرحانی، مولانا عبید الرب سعادت، مولانا حیدر علی قاسمی، مولوی محمد اسماعیل بن محمد صالح جی، مولوی محسن حسنی قاسمی کی بھی یہی رائے ہے۔

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی ملی و مذہبی مفاد اور مصالح نیز "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" اور "الضرورات تبیح المحظورات" وغیرہ کی بنیاد پر مجبوراً جائز قرار دیتے ہیں۔

مفتی نصر اللہ ندوی لکھتے ہیں کہ بلاشبہ دستور سے وفاداری کا حلف لینا شرعاً جائز اور دینی نقطہ نظر سے معزز ہے، تاہم اس سے گریز کرنے کی صورت میں مسلمانوں کا جو نقصان ہوگا وہ ناقابل بیان ہے، لہذا اس بلائے عظیم کو دفع کرنے کے لئے اس سے انہوں کو گوارا کرنا جائز بلکہ واجب ہوگا، علامہ عزالدین بن عبد السلام فرماتے ہیں کہ:

تجوز الإعانة علی المعصية، لالکونھا معصية بل لکونھا وسيلة إلى تحصيل المصلحة الراجحة، وكذلك إذا حصل بالإعانة مصلحة تربو علی مصلحة تفويت المفسدة، كما تبذل الأموال فی فدی الأسارى الأحرار المسلمین من أیدی



الكفزة والفجرة“ (قواعد الأحكام في مصالح الأنام ۱/۵۷)۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی کا خیال ہے کہ جب قانون ساز ادارے کا رکن بننا جائز ہے تو دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بھی درست ہوگا۔ خواہ وہ دستور خلاف شریعت قوانین پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔ قاعدہ ”اذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه“ البتہ مسلم مہران بادل نا خواستہ ایسے دستور سے حلف لیں۔ قلبی رضامندی کے ساتھ خلاف شریعت قوانین پر مشتمل دستور سے حلف اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ ”الرضا بالكفر كفر“ حلف اٹھاتے ہوئے ان دفعات کی نیت کریں جو شریعت سے ہم آہنگ ہوں ”الأمور بمقاصدها“ ”إنما الأعمال بالنیات“۔ قالوا: الكافر إذا تترس بمسلم فإن رماء مسلم فإن قصد قتل المسلم حرام، وإن قصد قتل الكافر لا، (اشیاء: ۵۵) اسی طرح اھون البلیتین اور ”یحوز فی الضرورة مالا یحوز فی غیرھا“۔ دلائل دیئے ہیں۔

مصالح و مفادات کے پیش نظر: تقلیل شر اور تخفیف ظلم۔ اخف الضررین کا ارتکاب، بوجہ مجبوری اجتماعی مسائل میں دفع مضرت وغیرہ کو دلیل کے طور پر اکثر مقالہ نگاروں نے پیش کی ہے۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی اور مولانا لطیف الرحمن کہتے ہیں کہ وفاداری کے عہد نامہ پر اگر تحریری دستخط لئے جاتے ہوں تو اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کر دے اور اگر زبانی کہلوا یا جاتا ہو تو دل میں اس کی پختہ نیت کر لے کہ اتباع شریعت ہر صورت میں کروں گا۔ اور زبانی اقرار کر لے (الامن أکرة و قلبہ مطمئن بالإیمان) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی فرماتے ہیں: ”اسبلی میں جس عہد نامے پر دستخط کئے جاتے ہیں، اس میں اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کئے جاسکتے ہیں“ (کفایت المفتی ۹/۳۵۱)۔

مولانا عبدالخالق کی رائے میں حلف وفاداری کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ ناقابل عمل اور غلط دفعات باقی رہیں گے اور اس پر عمل بھی ہوگا، کیونکہ دستور بننے کے بعد اس کی متعدد دفعات جو ناقابل عمل یا غلط تھیں، ان میں ترمیمات ہوئی ہیں، غیر شرعی دفعات بدلنے اور ملک کا مفاد پیش نظر رکھ کر حلف وفاداری ہے، اور وفاداری کا صرف اتنا مطلب ہے کہ یہ دستور جب تک موجود ہے، ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ نہ کہ ہم اسے بالکل صحیح اور درست سمجھ کر اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ ورنہ دستور پر اعتراض یا اس میں ترمیم کی کوشش نہ کی جاتی، ”لا یواخذنکم اللہ باللغو فی ایمانکم“ ”فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ“ کے تحت حلف میں کوئی حرج نہیں۔

مولانا محفوظ الرحمان شاہین، جمالی کا خیال ہے کہ ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں تمام مذہبی قومی باشندوں کی برابر درجہ کی شرکت ہے اور اس کے دستور میں کسی مذہب کے خلاف خاص طور پر کوئی دفعہ شامل نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی اگر کوئی دفعہ کسی مذہب کے خلاف ہو تو خود اسی دستور کے تحت اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے، لہذا کسی خلاف شریعت دفعہ کی موجودگی کو کالعدم تصور کرتے ہوئے مجموعی طور پر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہے۔

مولانا کلیم اللہ عمری کی رائے میں بالحملہ حلف وفاداری لینا جائز ہوگا، کیونکہ جمہوری نظام میں دستور کے ہر دفعہ سے اتفاق و موافقت ضروری نہیں ہے۔

مفتی شبیر احمد دیوبندی، مولانا محمد یوسف علی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلطان کشمیری، مفتی محمد سلمان پالنپوری کے نزدیک جو خلاف شریعت قانون نہ ہو اس کی وفاداری کی نیت سے حلف درست ہے۔

مولانا توقیر بدر قاسمی اکثر دفعات کے مخالف شریعت ہونے کی صورت میں حلف کی قطعاً اجازت نہیں دیتے لیکن اگر کچھ دفعات خلاف شریعت ہوں تو ان شرطوں کے ساتھ اجازت دیتے ہیں:

الف۔ حتی الامکان مخالف شریعت دستور کو زائل کرنے کی تدبیر ہو۔

ب۔ نیت عوام کی فلاح و بہبود اور مذہب کی آزادی ہو۔

ج۔ اسے ایک آزمائش سمجھے اور بادل نا خواستہ اس کا نمبر بنے اور خلاف شریعت دفعہ کے ازالہ کے لئے کوشاں رہے۔

د۔ مہران کی تعداد کم از کم پارٹی کی کل تعداد کے چوتھائی ہونا کہ وہ فیصلہ پر موثر بھی ہو سکیں۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی بوقت شدیدہ اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ، مولوی اکرام الحق ندوی ”یحوز فی الضرورة مالا یحوز فی غیرھا“

کے تحت، مفتی طارق انور قاسمی اور مولانا فیاض عالم قاسمی مصالح کے پیش نظر "ارتکاب اخف الضررین" کے تحت، مولانا اقبال احمد قاسمی دفع مضرت کی خاطر حدیث "لا ینبغی للہو من أن ینذل نفسه، قیل: یا رسول اللہ! وکیف ینذل نفسه، قال: ینحیل من البلاء ما لا یطیقہ (ترمذی) سے استدلال کرتے ہوئے حلف کی اجازت دیتے ہیں۔

جبکہ مفتی محمد خالد نیوی قاسمی کا کہنا ہے کہ شرعاً حلف ایسے معاملہ کو کہتے ہیں جس سے کرنے یا نہ کرنے پر حلف لینے والے کے عزم کی پختگی کا اظہار ہوتا ہو۔ قسم اللہ کے ذاتی اور صفاتی نام کی کھائی جاتی ہے، اگر غیر اللہ کے نام کی قسم کھائی جائے تو شرعاً منعقد نہیں ہوتی (ہندیہ ۵۱/۲)۔ حدیث میں آیا ہے: "لا تحلفوا بآبائکم ولا بالطواغیت فمن کان منکم حالفاً فلیحلف باللہ أو لیدع" (مصنف عبد الرزاق ۱۵۹۳۵)، حضرت قتادہ فرماتے ہیں: ینکرہ أن یحلف إلا باللہ وکرہ أن یحلف بالمصحف" (ایضاً: ۱۵۹۳۲)۔

چونکہ اللہ کے نام یا اس کی صفات میں سے کسی ایک کا ذکر کرنا حلف کا رکن ہے، لہذا علماء کی ایک جماعت کے نزدیک اس کے بغیر نہ قسم شرعاً منعقد ہوگی اور نہ اس کے احکام جاری ہوں گے، یہ محض وعدہ ہوگا (ہدیہ ۲/۸۰) اور شریعت نے اگرچہ وعدہ کی پاسداری کے احکامات بھی دیئے ہیں: "أوفوا بالعقود" مگر ناجائز امور کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہذا دستور کے اس حصہ سے متعلق ممبران کا وعدہ واجب الوفا ہوگا جو شریعت سے متصادم نہیں ہے۔ ہاں! اگر اللہ کے نام پر قسم کھائی ہے تو قسم توڑ کر کفارہ دے (اذا حلفت علی یمین فرأیت غیبراً خیراً منہا فکفر عن یمینک وأت بالذی هو خیر" (متفق علیہ)۔

مفتی محمد عارف باللہ قاسمی دستور میں موجود دفعات خلاف شرع نہ ہونے کی صورت میں "العبرة للغالب" کے تحت حلف درست مانتے ہیں، چونکہ بہت سی دفعات خلاف شرع ہوتی ہیں اور معصیت کی قسم کھانا ناجائز نہیں، اگرچہ وہ قسم بھی منعقد ہو جاتی ہے، اس لئے توڑنا لازم ہے۔ (ہندیہ ۵۲/۲)

ترجیح: دستور سے وفاداری محض ایک رسم اور خانہ پری ہے، شاید حلف دلانے والا اور حلف لینے والا دونوں ہی اس کو محسوس کرتے ہیں، بحالت مجبوری حلف کے جواز کا رجحان رکھنے والے حضرات کی رائے اقرب الی الفہم والصلحہ معلوم ہوتی ہے۔ خلاف شریعت قانون کا حلف لینے والا مکلف اور پابند نہیں ہوگا۔ سوال نمبر ۶ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟ اس سوال کے جواب میں دو رائیں پائی جاتی ہیں: (۱) ناجائز، (۲) جائز۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مولانا محمد الاعظمی، مولانا محمد یوسف علی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، اور رحمت اللہ ندوی ناجائز قرار دیتے ہیں، جب کہ ان کے علاوہ تمام مقالہ نگاروں کی رائے جواز کی ہے۔

مانعین جواز اور ان کے دلائل:

مولانا حیدر علی قاسمی لکھتے ہیں کہ جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے اس کی تعظیم و تکریم ہوتی ہے، اور یہ صرف اللہ کے لئے ہے، غیر کی شرکت کی گنجائش اس میں نہیں ہے، حدیث میں ہے: "إن اللہ ہما کم أن تحلفوا بآبائکم، من کان حالفاً فلیحلف باللہ أو لیصمت"، بلا علی قاری اس ممانعت کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "الحکمة فی النہی عن الحلف بغیر اللہ تعالیٰ أن الحلف یقتضی تعظیم المحلوف بہ وحقیقة العظمتہ مختصہ بہ تعالیٰ، فلا یضاحی بہ غیرہ"۔ (مرقاۃ ۳/۵۵۳) اسی وجہ سے غیر اللہ کو سجدہ منع ہے، بائبل بھی غیر اللہ میں داخل ہے اور اس پر حلف تعظیم پر دل ہے، اس سے غیر کی اطاعت اور علم خدا کی نافرمانی ہوگی "لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق"۔ ایک حدیث میں ہے "من جامع المشرک وسکن معہ فإنہ مثلہ"۔ (ابوداؤد)

بائبل پر حلف لے کر عیسائی ملکوں کا ممبر بننے سے مذہب و دین کا خطرہ ہے کہ کہیں متاثر ہو کر اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے، اس لئے "درء المفاسد اولی من جلب المنافع" کی رو سے بائبل پر حلف لینا دھوکہ دینے کے مرادف ہے اور شریعت میں کسی بھی حال میں جائز اور درست نہیں، بائبل پر حلف سے ان سے دوستی کا شبہ ہوتا ہے، جب کہ اس سے صراحتاً منع کیا گیا ہے: "یا ایہا الذین آمنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء"۔

لہذا عام حالات میں عیسائی ممالک کے مسلم ارکان کے لئے بائبل پر حلف لینا ناجائز نہیں، البتہ شرعی ضرورت کا تقاضا ہو اور بائبل پر حلف نہ لینے سے کوئی چارہ نہ ہو بلکہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ناممکن ہو تو "الضرورات تبیح المحظورات"۔ "المشقة تجلب التیسیر"۔ "إلا ما اضطررتم

الیہ۔ کو سامنے رکھتے ہوئے گنجائش ہے۔

مولانا محمد الاعظمی کا خیال ہے کہ سابقہ کتب ساویہ اور شرائع ماضیہ منسوخ ہیں، اسلام میں ان کی حجیت یا ان پر عمل کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اس لئے یہ سوال کہ مسلم مہجران کو بائبل پر حلف لینا درست ہے؟ جواب کا محتاج نہیں ہے، موصوف کہتے ہیں: ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حلف لینے کے لئے کیا الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں؟ اگر بائبل کی قسم کھا کر وفاداری کا عہد کیا جاتا ہے تو یہ حلف بغیر اللہ ہوئی، جو سخت ممنوع ہے، ”من حلف بغیر اللہ فقد أشرك“ (ابوداؤد ۲۲۵۱، ترمذی ۵۲۶۶) ”من حلف بغیر ملة الإسلام فهو كما قال، یعنی فهو كاذب في يمينه“ (بخاری ۵۲۶۶)

اور اگر بائبل سامنے رکھ کر رسم وفاداری ادا کی جاتی ہے اور غیر ملت اسلام جیسے یہودیت و نصرانیت وغیرہ کے ساتھ حلف نہیں لی جاتی تو بظاہر اس کے عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

مفتی اعجاز الحسن قاسمی کی رائے صریح نہیں ہے، بظاہر عدم جواز معلوم ہوتا ہے، مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اگرچہ عدم جواز کی تصریح کی ہے، لیکن جدید فقہی مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے جو حوالے نقل کئے ہیں ان سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ موصوف بھی بصورت مجبوری جواز کی گنجائش رکھتے ہیں۔

مولانا احسن عبدالحق ندوی اور رحمت اللہ ندوی محرف ہونے کی وجہ سے جائز نہیں مانتے، جب کہ مولانا محمد یوسف علی صاحب ”من كان منكراً حالفاً فليحلف بالله أو ليذر“ (نسائی) اور ”إن الله ينهاكم أن تحلفوا بأبائكم فمن كان حالفاً فيحلف بالله أو ليسكت“ (متفق علیہ) سے استدلال کرتے ہوئے ناجائز جانتے ہیں۔

جواز کے قائلین اور ان کے دلائل:

۱۔ قرآن کی طرح بائبل اور تورات وغیرہ پر حلف لینا ائمہ اربعہ کے نزدیک درست ہے، فقہاء احناف کی کتابوں میں اگرچہ صراحت تو نہیں لیکن کلام الہی کی حیثیت سے قسم کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ إذا حلف المسلم بآية منسوخة من القرآن أو بالتوراة والإنجيل انعقدت يمينه، لأنه كلام الله ومن صفات الذات۔ (اسی المطالب ۲/۲۲۳)۔

۳۔ من حلف بالتوراة أو الإنجيل في كلمة واحدة فعلية كفارة واحدة (التاج والإكيل ۲/۲۰۰)۔

۴۔ وإن حلف بكلام الله أو بالمصحف أو بالقرآن أو بسورة منه أو بآية أو بحق القرآن فهي يمين، فيها كفارة واحدة، وكذا لو حلف بالتوراة أو الإنجيل ونحوهما من كتب الله (الاتفاق ۲/۳۳۱) (مفتی محمد عارف باللہ قاسمی)۔

۵۔ بدرجہ مجبوری، بلا نیت تعظیم اور ہاتھ رکھے بغیر حلف لینے کی اجازت اصل مذہب حنفیہ کے لحاظ سے دی جاسکتی ہے، اس کا حلف شرعاً منعقد نہیں ہوگا (فادائی عبدالحق جس: ۱۰۴، اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فیصلے جس: ۱۲۰) (مولانا مفتی محمد خالد نیوی قاسمی)۔

۶۔ عام حالات میں تو قرآن کی قسم کھانا بھی درست نہیں، چہ جائیکہ بائبل کی، بائبل پر حلف انسان کے ایمان و کفر کا مسئلہ ہرگز نہیں، کیونکہ غیر محرف تورات و انجیل کے آسمانی کتاب ہونے پر سبھی مسلمانوں کا ایمان ہے، حلف برداری محض ایک رسم ہے اور اسے دکھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا ہے کہ اس ملک کی اکثریت جس کتاب کو تسلیم کرتی ہے، وہ یہی کتاب ہے، اس سے بائبل پر ایمان ہونا لازم نہیں ہوتا، ”و كذلك ينعقد الحلف بالتوراة أو الإنجيل أو الزبور أو الفرقان أو صحف إبراهيم وموسى، فهي كلام الله تعالى وينصرف اليمين إلى غير المبدل منها“ (افتقہ علی اہدایہ الاربعۃ ۱۰۹/۳ شرح حتمی ال ارادات ۳/۳۹۳، ایضاً فتاویٰ الاسلام سوال و جواب ۱/۱۷۱) (مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عبدالرشید کانپور)

۷۔ مثل إجراء المکره بما فيه إلقاء كلمة الشرك على لسانه، وايضاً فيه والأخذ في العزيمة اولى۔ (حسامی، ص: ۶۱) (مولانا عبدالرب اعظمی)

۸۔ بائبل کا بمعنی کلام اللہ اور منزل من اللہ حلف درست ہے، کیونکہ کلام اللہ ایسی صفت ہے جس سے حلف لینا معروف ہے، ”ولا يقسم بصفة لم

یتعارف الحلف بها من صفاته، والحرف معتبر في الحلف بالصفات... وأما الحلف بكلام الله فيدور مع الحرف“ (شامی ۵/۳۸۳) جس طرح تورات، انجیل اور زبور پر من حیث کلام اللہ ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح بائبل بمعنی کلام اللہ کی نیت سے حلف لینا جائز ہے، اس صورت میں قسم منعقد ہو جائے گی، ”ولو قال: فهو برئ من القرآن وبرئ من التوراة وبرئ من الإنجيل وبرئ من الزبور فهي أربعة أيمان... والأصل في جنس هذه المسائل أنه متى تعددت صحيفة البراءة تعددت الكفارة وإذا التحدت التحدت“ (شامی ۵/۵۸۳- فتاویٰ قاضی خان علی الہندیۃ ۵/۴۲۲) (مولانا محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی جنید بن محمد)۔

لیکن بائبل سے حلف کے لئے دو شرطیں ہیں: (۱) جس ملک میں بائبل سے حلف لینا ضروری ہو وہاں مسلمانوں پر لازم ہے کہ حکومت سے بائبل کے بجائے قرآن سے حلف لینے کا مسلسل مطالبہ کریں (۲) بائبل سے مجبوراً حلف لیتے وقت اس کی تعظیم کی نیت نہ ہو (قرارات مجلس الفقہی ۱۳۰۲/۸۵)۔

۹۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں غیر اللہ سے حلف لینا جائز ہے اور حدیث میں مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ بائبل، اور لعمریک کے ذریعہ قسم نہ کھائی جائے، وثیقہ کے طور پر حلف کی ممانعت نہیں ہے (شامی ۵/۷۳) (مولانا فیاض عالم قاسمی)۔

۱۰۔ ومن يفعل ذلك فليس من الله في شيء إلا أن تتقوا منهم تقاة (آل عمران: ۲۷)۔

۱۱۔ وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم إليه (انعام: ۱۱۹) (مولانا عبدالسلام کوثری)۔

۱۲۔ حلف کا مطلب ہوتا ہے کہ پوری رازداری کے ساتھ حکومت اور اس کے متعلقہ شعبے وغیرہ جو اس کے سپرد ہیں، وہ کام پوری امانت کے ساتھ کرے گا، اس میں کوئی کوتاہی اور خیانت نہ کرے گا (مولانا توقیر بدر قاسمی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کے نزدیک اگر انصاف دلانا اسی پر موقوف ہو تو بادل ناخواستہ حلف کی گنجائش ہے، لیکن یہ بات کہ انصاف دلانا ان حالات میں اسی پر موقوف ہے، یہ فیصلہ مقامی علماء اور دانشوران کریں گے، اور حلف کے بعد توبہ واستغفار بھی کرے گا۔

مفتی راشد حسین ندوی نے لکھا ہے کہ یہ ان ممالک کے ارباب اقتدار کی آخری درجہ کی حماقت ہے کہ جو لوگ بائبل کے معتقد نہیں ہیں، ان سے بھی بائبل کی قسم لیتے ہیں، کسی سے بھی حلف ایسی چیز کی یعنی چاہئے جس کی عظمت اس کے دل میں ہو، ورنہ اس حلف کا وہ کیا خیال رکھے گا، البتہ مصالح کے پیش نظر بائبل پر ہاتھ رکھ کر کراہت کے ساتھ حلف لے لے اور دل میں اپنا عقیدہ پختہ رکھے کہ یہ کتاب محرف ہو چکی ہے، ایسا کرنے پر انشاء اللہ گناہ نہ ہوگا۔

مولانا عبید اللہ ندوی کا خیال ہے کہ اگر کسی غیر مسلم ملک میں توریت، انجیل یا بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا ضروری ہو اور عدالت سے قرآن کی قسم کا مطالبہ نہ مانا جائے تو بلا نیت تعظیم بحالت مجبوری قسم کھانے کی گنجائش ہے، ”رفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرهوا علیہ“ (ابن ماجہ: ۲۰۳۵، إرواء الخلیل ۲۵۶۶)۔

ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: یہود و نصاریٰ کا وطیرہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان کرتے رہے ہیں، چنانچہ بہت سی دل آزار چیزیں مسلمانوں کو ان کی طرف سے دیکھنی اور بہت سی اذیت رساں، تکلیف دہ اور دل دکھانے والی باتیں سنی پڑتی ہیں، ”ولتسمعن من الذین أوتوا الكتاب من قبلكم ومن الذین أشركوا أذى كثیراً، وإن تصبروا وتتقوا فإن ذلك من عزم الأمور“ (آل عمران: ۱۸۶)۔

لہذا مسلمانوں کو اجتماعی اور منظم کوشش کے ذریعہ اپنے اس حق کو تسلیم کرانا چاہئے تاکہ وہ اپنی مذہبی کتاب مقدس قرآن کریم پر حلف لیں۔ البتہ جب تک یہ نظم نہ ہو جائے تو چونکہ بائبل بھی محرف ہونے کے باوجود کتاب الہی میں سے ہے، تو اس پر حلف لینے کی گنجائش ہے، ”والذین يؤمنون بما أنزل إليک وما أنزل من قبلک“۔

نوٹ: مفتی محمد اشرف قاسمی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ہے، شاید اس سے پہلے والے سوال کے جواب کو کافی سمجھا ہے۔

ترجیح: ناچیز کے نزدیک عام حالات کو چھوڑ کر استثنائی اور اضطراری حالت میں جبر و اکراہ کے ساتھ، بلا نیت تعظیم، کلام اللہ مان کر حلف کی گنجائش دینے اور جواز کے قائلین کی رائے رکھنے والوں کی بات مناسب معلوم ہوتی ہے، اگرچہ میری رائے عدم جواز کی آچکی ہے۔ ہذا عندی واللہ اعلم بالصواب۔

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

(سوال نمبر ۱ تا ۱۰)

مفتی اقبال احمد قاسمی کانپوری علیہ

احقر کو ایکشن سے مربوط شرعی مسائل کے موضوع پر آخری چار سوالوں یعنی ۷ تا ۱۰ سے متعلق عرض معروض کرنے کا حکم ہوا ہے۔ احقر کے پیش نظر ۶۳ مقالات ہیں جن سے مقالہ نگار حضرات کی تحریری آراء واضح ہوتی ہیں۔

چنانچہ سوال ۷ کے تحت جس میں سیکولر پارٹیاں جو ایک طرف مسلمانوں کی حمایت کی بات کرتی ہیں اور دوسری پارٹیوں کی بہ نسبت مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے نسبتاً بہتر خیال کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہیں، ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت و شرکت اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا یا پھر ایسی حکومت میں شامل ہونے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں قدرے تعبیرات اور اسلوب کے فرق کے ساتھ تمام مقالہ نگار حضرات اس پر متفق ہیں کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں جو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور تمام سیکولر وغیر سیکولر بڑی پارٹیوں کی کمان غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمان اقلیت میں ہیں اور ملکی پیمانہ پر مسلمانوں کا مستقلاً اقتدار اور خاص سیاسی اثر و رسوخ نہیں ہے، ایسی صورت میں مسلم موافق سیکولر پارٹی میں شرکت ضرور ناہمکن جواز ہے، صرف تین حضرات کی رائے اس کے خلاف نظر آتی ہے: (۱) حسن عبدالحق ندوی جو اسلام مخالف دفعات کی بنیاد پر شمولیت کو ناجائز کہتے ہیں، مفتی اعجاز الحسن قاسمی جو شمولیت کو مسلمانوں کے لئے مضرت بتاتے ہیں کہ دشمن کو قوت پہنچے گی۔ (۲) مفتی اشرف قاسمی گوئندوی جن کے خیال میں یہ سیکولر پارٹیاں ہی مسلمانوں کے لئے زیادہ خطرناک ہیں) باقی سب کی رائے جواز کی ہے۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محسن القاسمی کیرانہ، مولانا عابد الرحمن المظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا مقصود فرقانی، مولانا قمر عالم قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی جعفر علی رحمانی، ڈاکٹر مبین سلیم وغیرہ کی تحریر کا حاصل یہ ہے کہ مسلم موافق پارٹیوں کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ یہ معاملہ ہونے والی اہلیتین کی روشنی میں دیکھا جائے گا کہ جو کم درجہ اور کم نقصان دہ چیز ہو اس کو اختیار کیا جائے۔ مولانا فیاض عالم قاسمی نے لکھا ہے کہ اگر ان پارٹیوں میں بھی شرکت نہ کی جائے تو مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی شکل نہیں ہے۔

مولانا ابوسفیان لکھتے ہیں: ہونے والی اہلیتین کی اصل کے مطابق ایسی پارٹیوں میں شامل ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونے میں کوئی حرج نہیں، اس شرط سے کہ علماء فقہ و ارباب افتاء سے رابطہ کے بعد ان کی متفقہ یا اکثریت کی رائے یہی قرار پائی ہو اور اس کی اجازت دے دیں اور تحریراً و تقریراً عام مسلمانوں سے اس کی اپیل کر دیں۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی نے فتاویٰ محمودیہ (۵۷۰/۳) کے ایک فتویٰ کو جواز کی تائید میں پیش کیا ہے۔

مولانا عبداللطیف پالنپوری نے بھی فتاویٰ محمودیہ کا بہم حوالہ دیا ہے۔

مولانا مجیب الرحمن ندوی نے کراہت قلب کے ساتھ ایسی پارٹیوں میں شرکت کو جائز لکھا ہے اور کفایت المفتی (۳۶۴) کا حوالہ دیا ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے ایسی پارٹیوں میں شرکت کی تائید میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی ایک تحریر و تقریر جو لیگ و کانگریس میں شامل ہونے سے متعلق ہے، اس کا اقتباس، تجلیات عثمانی ۳۶۰ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

ملا استاد مدرسہ مظہر العلوم کانپور۔

مفتی نصر اللہ ندوی اور مفتی شاہجہاں ندوی نے ابن تیمیہ کی الاستقامہ ص ۲۷۱ اور ابن قیم کی الطرق الحکمیہ ص ۱۳۳ اور مفتی تنظیم عالم قاسمی نے الحسب فی الاسلام لابن تیمیہ ص ۱۲ کی عبارت: "والواجب انما هو فعل البقدور الخ" کو متدل بنایا ہے۔

قاضی محمد حسن ندوی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا نور علی اعظمی، مولانا یوسف علی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا عبدالسلام کوثری کیرالہ، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا غلام رسول منظور قاسمی، مولانا عبدالخالق، مفتی محمد سلمان قاسمی، مفتی اکمل یزدانی نے الاشباہ والنظائر سے "إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما" اور اس کے ہم معنی عبارات دلائل میں لکھی ہیں، نیز آیت: "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (سورہ ممتحنہ) سے بھی استدلال کیا ہے۔

مولانا ریحان بشر قاسمی نے قبل نبوت حلف الفضول نامی معروف معاہدہ کو "البدایہ والنہایہ" (۲۰۲۹۱) کے حوالہ سے استدلال میں پیش کیا ہے کیونکہ بعد نبوت بھی آپ ﷺ نے اس کی تحسین فرمائی۔ اسی طرح عہد نبوت و عہد صحابہ میں یہودیوں و مشرکوں سے متعدد معاہدات کا بھی موصوف نے ذکر کیا ہے۔

مولانا شبیر علی صاحب و مفتی عبدالرشید کاپوری نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت مصالح کی قرار دی ہے اور صلح حدیبیہ کی طرح بر بنائے مصلحت صلح مسلمانوں کو غیر مسلم پارٹی میں شمولیت کو درست لکھا ہے۔

مفتی سید باقر ارشد قاسمی کے مطابق غیر مسلم پارٹیوں سے مفاہمت اور ان سے مصالحت کی بہترین مثال میثاق مدینہ کی بنیادی شق "للیہود دینہم وللمسلمین دینہم الخ" ہے۔

مولانا ثار عالم ندوی اور مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے بھی حلف الفضول، میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ کے واقعات سے استدلال کیا ہے، نیز جمالی صاحب نے لکھا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کا منشور ووٹ بینک کے ارد گرد گھومتا ہے۔ وہ مذہب سے ٹکراتا نہیں بلکہ بے تعلق رہتا ہے، ساتھ ہی اکابرین دیوبند اور اکابرین جمعیتہ العلماء کے طرز عمل سے سیاسی سیکولر پارٹیوں میں شرکت کی تائید فراہم کی ہے۔

بعض مقالہ نگاروں نے ایسی پارٹیوں میں شرکت کے شرائط اور ضوابط بھی ذکر کئے ہیں۔..... ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے حکومت میں شمولیت کی شرط ذکر کی ہے کہ جو دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہیں، وہ اپنے منشور سے خارج کرنے پر راضی ہو جائیں یا گمان غالب ہو کہ مستقبل میں دفعات بدلنے کی کوشش کامیاب ہوگی۔

مولانا فاروق سورتی، مولانا ارشد حسین ندوی، مفتی جنید بن محمد، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبداللہ ندوی، مولانا توقیر بذر قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس نے بھی شرکت کرنے والوں کے لئے شرائط و ہدایات کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) شرکت سے مقصود حصول اقتدار اور منفعت مال و جاہ نہ ہو، (۲) یہ شرکت اسلام اور مسلمانوں کو نقصانات سے بچانے کے لیے ہو، (۳) جو دستور کی دفعہ اسلام مخالف ہو، حتی الامکان اس کو بدلنے کی کوشش کرنے اور اس کے خلاف احتجاج کرے، (۴) اس عہدے کو آزمائش سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے حصول کا ذریعہ بنائے، (۵) حکمت کے ساتھ غیروں میں اسلام کا نمونہ پیش کرتا رہے اور اپنا اثر و رسوخ قائم کرے۔

مفتی خالد نیوی قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مفتی سلطان کشمیری نے بھی تصحیح نیت کے ساتھ یعنی مخالف اسلام دفعات کے خاتمہ کی نیت سے اور مصالح المسلمین کی خاطر شرکت کو جائز لکھا ہے۔

مولانا صادق مبارکپوری، مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی نے تقلیل الشر والظلم کی خاطر شرکت کو بعض صورتوں میں واجب قرار دیا ہے۔

مولانا حیدر قاسمی نے "إن لہد یدک الکل لہد یدک الکل" کا مقولہ ذکر کیا ہے اور یہ کہ شرکت سے نقصان میں کمی واقع ہوگی ورنہ نقصان زیادہ ہوگا۔

مولانا عمران ندوی "للا کثو حکمہ کلک" کے تحت دفعات کی صحت کی بنا پر شرکت کو جائز لکھتے ہیں جبکہ اس اصول کا اطلاق یہاں بے محل معلوم ہوتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرتے ہوئے سوال ۸ پر آتے ہیں کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے چودہویں فقہی سمینار منعقدہ حیدرآباد ۲۰۰۳ء میں یہ تجویز طے پا چکی ہے کہ جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں اور جن سیاسی جماعتوں نے اعلانِ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۱۲)۔

لیکن چونکہ سوال ۸ میں کھلے طور پر مسلم دشمن پارٹیوں میں شمولیت کے جواز کے سوال کے ساتھ یہ شق ہے کہ اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، تو اب اس میں شامل ہونا درست ہوگا یا نہیں؟ اس سوال پر مقالہ نگاران نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔

مولانا شیرعلی ایسی مسلم دشمن پارٹیوں میں شمولیت کو مطلقاً جائز کہتے ہیں اور صلح حدیبیہ کا حوالہ دیتے ہیں۔

مولانا عمران ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی نے بھی جائز لکھا ہے اور دلیل میں "انما الاعمال بالنیات" کو ذکر کیا ہے، نیز یہ کہ پارٹی کے اندر رہ کر ہی اس کے خلاف آواز مٹا رہا ہو سکتی ہے اور یہ کہ ان میں شامل ہونے سے مسلم دشمنی میں کمی آئے گی۔

مفتی اشرف قاسمی گونڈوی کہتے ہیں کہ تمام پارٹیوں میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، شرط یہ ہے کہ مسلم ممبران پارٹیوں کے زیادہ تر جان ہونے کے بجائے پارٹی میں مسلمانوں کی ترجمانی کریں۔ ان مذکورہ چار حضرات کے علاوہ باقی تمام مقالہ نگار علانیہ مسلم دشمن پارٹیوں میں شرکت کو ناجائز کہتے ہیں، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے۔ دوسرے ارشاد بانی ہے: "یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودۃ" (ممتحنہ)، نیز ارشاد نبوی ہے: "من کثر سواد قوم فہو منہم، ومن رضی عمل قوم کان شریکاً لمن عملہ" (المطالب العالیہ ص ۱۶۸۰)۔ چوتھے اس میں شرکت سے دین مذہب کا نقصان ہے، کیونکہ وہ ماحول سے متاثر ہوگا جبکہ حکم ہے: "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" (سورہ ہود: ۱۱۳)، پانچویں مسلم معاشرہ میں اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، وہ لوگوں کی نگاہ میں گر جاتا ہے جبکہ حکم ہے: اتقوا مواضع التہم، چھٹے اسلام دشمنوں سے دوستی اسلام سے دشمنی کے مرادف ہے۔ ایمان فرودشوں اور ضمیر فرودشوں میں اس کا شمار ہے۔ اب رہا مسئلہ کہ اس نیت سے شرکت کہ پارٹی کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو اکثر مقالہ نگار نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں کہ جن پارٹیوں کی بنیاد ہی مسلم دشمنی پر قائم ہے، اس کے منشور کو بدلنا ناممکن ہے، اس لئے اس میں شمولیت کسی نیت سے جائز نہیں۔

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا ریحان مبشر قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، فیاض عالم قاسمی، ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی جعفر علی رحمانی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محفوظ جمالی، مفتی خالد نیوی قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا اشتیاق اعظمی، مولانا نثار عالم ندوی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا قمر عالم قاسمی، مفتی سلمان پالنپوری، محمد صادق مبارکپوری، مولانا مقصود فرغانی، مفتی عبدالرشید قاسمی کانپوری..... کی بھی یہی رائے ہے کہ فرقہ پرست اسلام اور مسلم دشمن سیاسی پارٹیوں میں اس نیت سے بھی شرکت کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ اس صورت میں بھی مفاسد و نقصانات زیادہ ہیں، کیونکہ پارٹیاں خود ان کی شمولیت سے زیادہ فائدہ اٹھا لیتی ہیں بلکہ وہ بھی مسلم مخالف ہو جاتے ہیں، اس لئے بقول مولانا محمد الاعظمی نیت کی بات محض فریب اور باطل حیلہ ہے محض اس مفروضہ کی وجہ سے اس کو جائز نہیں کہا جاسکتا جبکہ مسلم دشمن کا تعاون صریحاً حرام ہے۔

مولانا مجیب الرحمن ندوی لکھتے ہیں: مسلم دشمن پارٹیوں میں شرکت سے مااجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام کے اصول کے پیش نظر احتراز لازم ہے، لیکن کوئی جرأت مندی کے ساتھ ان سیاسی پارٹیوں کو بدلنے کی امید کے ساتھ شرکت کرے تو جائز بھی ہے۔ اسی طرح تقابلاً ظلم

اور دفع شر وغیرہ کی نیت سے شمولیت کی اجازت مفتی اکمل یزدانی، مولانا عبدالسلام کوثری، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالخالق رامپوری نے بھی ذکر کی ہے، لیکن مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اسی کے ساتھ لکھا ہے کہ چونکہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے، لہذا اس کی گنجائش نہ بنائی جائے جبکہ مولانا قمر الزماں ندوی لکھتے ہیں: یہ گنجائش صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ واقعی موثر ہو سکے ورنہ پارٹی چھوڑنا واجب ہے۔

سیکولر اور غیر سیکولر پارٹی میں مسلمانوں کی شمولیت کے مسئلہ کے بعد اگلا نواں سوال مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی پارٹی بنانے کا ہے کہ کیا ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیم فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کے تین نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں:

مولانا فیاض عالم قاسمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا عبدالخالق رامپوری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی سلمان پالنپوری، مفتی لطیف الرحمن ولایتی، مولانا محمد الاعظمی، مولانا صادق مبارکپوری، شار عالم ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا غلام رسول منظور القاسمی، مولانا عابد الرحمن بجنوری..... کی رائے میں علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا حالات کے پیش نظر صحیح نہیں، دلیل میں مولانا فیاض قاسمی نے لکھا ہے کہ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے ولا تعلقو ابایدیم اری التہلکتہ۔ مفتی عارف باللہ قاسمی نے لکھا ہے کہ ماضی کے حالات اور مسلمانوں کے موجودہ باہمی اختلافات کے پس منظر میں ایسی سیاسی متحدہ جماعت کا وجود نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب ہے، کیونکہ ایسی کمزور جماعت کا فائدہ نہ ہوگا۔

مفتی سلمان پالنپوری نے فرمایا کہ مسلمان فروعی اختلافات میں بٹ چکے ہیں، ان حالات میں علیحدہ سیاسی جماعت پر اتفاق جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔

مولانا غلام رسول منظور قاسمی، مولانا عابد الرحمن نے دلیل ذکر کی ہے کہ اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے معاملہ میں تمام کفار ایک ملت ہیں، خواہ ان کے اندر کتنی ہی تنظیمیں کیوں نہ ہوں، اس لئے ان حالات میں خالص مسلم سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان شرارت پسند اور متعصب ہندو اور فرقہ پرست لوگوں کو آپس میں متحد و متفق کرنے کے موقع فراہم کرنے کے مترادف ہوگا جو مسلمانوں کے لئے خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوگا۔

مفتی شبیر احمد دیولوی لکھتے ہیں کہ جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں ہرگز مسلمان اپنی الگ جماعت قائم نہ کریں بلکہ جمہوری پارٹی کو ترجیح دیں، اس لئے کہ مسلمانوں کی حکومت تو حالات کے پیش نظر ایسے ملک میں بحال کے درجہ میں ہے، نیز الگ تنظیم قائم کرنے کی بنیاد پر اسلام دشمنی اور مخالفت میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور شریعت پر چلنا دشوار ہو جائے گا جو کہ اصل مقصود ہے، لہذا صرف اس نیت سے کہ اسلام پر چلنا نصیب ہو، جمہوریت کو ترجیح دی جائے اور اس طرح کا عمل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے جو یناق مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے لکھا ہے کل ہند سطح پر علیحدہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے لئے صرف ناکامی کے اعلان کے ہم معنی ہے، اس لئے جواز کی گنجائش نہیں۔

مولانا عبید اللہ ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا فرمان نقل کیا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں قوم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اب اپنی کوئی علیحدہ جماعت نہ بنائیں بلکہ ملک کی قومی جماعتوں میں جو ان کے مفادات کے لئے کام کر رہی ہے شامل ہو جائیں۔

مولانا انور اعظمی نے تحریر کیا ہے کہ یہ بات بہت مشکل ہے کہ کشمیر چھوڑ کر ہندوستان کے کسی صوبہ میں کوئی مسلم پارٹی اپنی سرکار بنا سکے۔ مرکز میں یہ معاملہ اور دشوار کن ہے، اس لئے ان حالات میں الگ سیاسی پارٹی بنا کر مسلمانوں کو متحد کرنا یہ ممکن بھی نہیں ہے اور ایسا کرنے میں مسلمانوں کے لئے نفع کی زیادہ امید بھی نہیں۔ سیاسی سوجھ بوجھ کے دو بڑے عالم حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا سید اسعد مدنی نے ایسے سیاسی تجربہ سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کا الگ پارٹی بنا کر ایکشن لڑنا کچھ زیادہ مفید نہیں۔



ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے خود مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ کی رائے بھی ”قاموس الفقہ“ کے حوالہ سے یہی ذکر کی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی جماعتیں ہندوستان جیسے ملکوں میں مفید نہیں۔

دوسری رائے بعض مقالہ نگاران کی اس کے برعکس ہے، ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے ان حالات میں بھی مسلم پارٹی کا قیام جائز و درست ہے بلکہ ملک گیر سطح پر پارٹی کی ضرورت ہے اور سیاسی جماعت کا قیام امت کا اہم تقاضہ ہے۔ یہ رائے ہے..... مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مفتی عبدالرحیم بھوپال، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی جنید پالنپوری، مولانا مقصود فرقتانی، مولانا قمر عالم قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا اشرف قاسمی، مولانا مجیب الرحمن ندوی، مولانا توقیر بدر قاسمی کی۔

مولانا ہلال عثمانی لکھتے ہیں کہ جبکہ سیاست پارٹی سسٹم پر ہے تو مسلمانوں کی کوئی جماعتی آواز نہ ہونا ان کے لیے سیاسی اعتبار سے سخت نقصان دہ ہے۔ رہا مخالف ووٹ متحد ہونے کا اندیشہ تو اس خطرہ سے مسلمانوں کو متحد ہونے سے روکنا کوئی حکمت کی بات نہیں۔ تقریباً یہی بات مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی نے بھی لکھی ہے۔

مولانا مجیب الرحمن ندوی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی نے لکھا ہے کہ اسلام میں سیاست اور دین کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موجودہ سیاست کے بجائے اسلام کی بنیادوں پر سیاسی پارٹی بنانا ضروری ہے۔ مولانا حیدر علی قاسمی نے مزید لکھا ہے کہ سیاسی پارٹی بنا نا وقت کا تقاضا ہے، چاہے مخالف ووٹ متحد ہو جائے اور فرقہ پرست فائدہ اٹھائیں۔

مفتی نصر اللہ ندوی کہتے ہیں کہ مسلم سیاسی جماعت کا قیام اس لئے ضروری ہے کہ باقی سب پارٹیاں دھوکہ باز ہیں۔ سیاسی جماعت کے قیام کے سلسلہ میں تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسلم پارٹی کی تشکیل کا حکم ہر علاقہ کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہوگا۔ کہیں اس کی افادیت غالب ہوگی اور کہیں مضرت کا غلبہ ہوگا۔ افادیت و مضرت کے غلبہ کے اعتبار سے اس کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ ہوگا اور یہ فیصلہ کرنا سیاسی مبصرین کا کام ہے کہ کہاں الگ سیاسی پارٹیوں کا قیام مناسب ہے اور کہاں دوسری سیکولر پارٹیوں میں شرکت۔ یہ رائے ہے..... مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا خالد قاسمی، مولانا فیاض عالم قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا ابوسفیان مقتاجی، مولانا اکمل یزدانی، مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا محمد فاروق اور راقم الحروف اقبال احمد قاسمی کی۔

مولانا راشد حسین ندوی نے ”الاشباہ والنظائر“ کے حوالہ سے قواعد کی دوسری نوع کے قاعدہ نمبر ۵ کی عبارت ”تصرف الإمام علی الرعیة منوط بالمصلحة“ ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ پوری طرح مصالح کے تابع ہے جس میں تبدیلیاں ہو سکتی ہے۔

مفتی ریحان مبشر قاسمی نے لکھا ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز ہو یا مسلم سیاسی پارٹی کے قیام سے مخالف ووٹ متحد ہونے سے نقصان نہ ہو تو ایسی جگہ علیحدہ سیاسی جماعت مفید ہوگی ورنہ سخت مضرت ہوگی۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی و مولانا شوکت قاسمی لکھتے ہیں: جن علاقوں میں مسلم آبادی کم ہے وہاں مصلحتاً کوئی سیاسی جماعت قائم کرنے کے بجائے سیکولر پارٹی کا تعاون ہی مناسب ہوگا۔

مفتی عبدالرشید قاسمی نے علیحدہ پارٹی تشکیل نہ دیے جانے کی صورتوں میں ایسے علاقوں کے مسلمانوں کو اپنا ایجنڈہ مرتب کر کے پارٹیوں کے پاس لے جانے اور جو ان کے مطالبات کو ماننے ان کو سپورٹ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے لیے بھٹکل کو بطور مثال بھی پیش کیا ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مولانا فیاض عالم قاسمی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو سیکولر ایجنڈے کے مطابق غیر مسلموں کو بھی ساتھ لے کر پارٹی تشکیل کرنی چاہیے اور نام بھی سیکولر ہو، البتہ کلیدی عہدے اور بالادستی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ مقالہ نگاروں نے ایسی پارٹیوں کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔

مولانا مظاہر حسن عماد قاسمی نے ان کا مکمل تعارفی خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی نے بھی جنوبی ہند کیرالہ اور تمل ناڈو کی مسلم لیگ اور حیدرآباد میں مسلم اتحاد المسلمین جیسی مسلم سیاسی پارٹیوں کے طرز پر پٹائی

کی تشکیل پر زور دیا ہے۔ اکثر نے آسام کی یو ڈی ایف کا بھی ذکر کیا ہے۔

مولانا عبدالرب اعظمی نے خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ اگر مسلمان اکثریت میں ہیں تو ان کو محکوم بننا درست نہیں۔ الإسلام یعلمو ولا یعلیٰ علیہ اور جہاں اقلیت میں ہیں اور وہاں الگ پارٹی تشکیل دینے میں کوئی نقصان نہ ہو تو درست ہے اور اگر پارٹی تشکیل دینے میں غیر مسلم اکثریت بھی ایک دم سے متحد ہو جاتی ہے اور فرقہ پرست عناصر کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے تو درست نہیں۔

اس سلسلہ کا آخری مسئلہ خواتین کے شریک سیاست ہونے کا ہے کہ خواتین کا الیکشن میں کیا کردار ہو اور وہ کس حد تک اس میں حصہ لے سکتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے لئے سیاست و قیادت حکمرانی و جہاں بانی میں حصہ لینے کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

۱۔ عورت کو حکومت کا سربراہ اور قائد اعلیٰ بنا دینا۔

۲۔ کسی عورت کا پارلیمنٹ کارکن یا اسمبلی اور کونسل کا ممبر ہو کر شریک اقتدار ہونا۔

۳۔ عام ووٹر کی حیثیت سے صرف ووٹنگ میں حصہ لینا۔

مؤخر الذکر صورت کہ عورت ووٹر کی حیثیت سے پولنگ بوتھ پر جا کر اپنے ووٹ کے حق کا استعمال کر سکے، اس کے جواز پر سبھی ہم خیال نظر آتے ہیں۔ مفتی رحمان بشر قاسمی اور مولانا عبید اللہ ندوی نے علماء کے باہمی اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، ساتھ ہی جواز کا رجحان بھی ظاہر کیا ہے چونکہ اس میں صرف اپنے گھر سے ووٹنگ روم تک آنے جانے کا مسئلہ ہے اور جمہوری الیکشن میں مرد و عورت کی قیمت یکساں ہے، اس لئے گھر سے باہر نکلنے کے اصول و آداب کی رعایت کے ساتھ مسلم خواتین کو ووٹ دینا نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے، کیونکہ اگر مسلم خواتین کو انتخابی عمل سے دور کر دیا جائے تو مسلم رائے دہندگان کا نصف حصہ ووٹ دینے سے محروم رہ جائے گا جس سے ناقابل تلافی نقصان ہوا، اس لئے پردہ کے اہتمام کے ساتھ عورتیں ووٹ دے سکتی ہیں۔

مفتی سید باقر ارشد لکھتے ہیں کہ جہاں تک ووٹنگ کا سوال ہے۔ یہ ایک عام انسانی حق ہے اور جمہوری بھی، جمہوریت کے لحاظ سے ملک کے ہر شہری سے ووٹ کا تقاضہ کیا جاتا ہے، لہذا جو حکم مرد کے لئے ووٹ کے بارے میں ہے یعنی وہ شہادت ہے اور اس کا ڈالنا ضروری و لازمی ہے، اسی طرح عورت کے لئے بھی ووٹ کا ڈالنا ضروری ہے۔ فرمان الہی: "واقیموا الشہادۃ للہ" اور اس جیسی دوسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے شہادت کا تقاضا صرف مردوں سے نہیں بلکہ مرد و عورت دونوں سے کیا ہے۔ موصوف نے (موسوع فقہیہ جز اول) کی عبارت کا بھی حوالہ دیا ہے۔

مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی نے شہادت کے وجوب کی بنا پر ووٹنگ کو خواتین پر بھی واجب قرار دیا ہے۔

مفتی جعفر ملی رحمانی نے کفایت المفتی (۳۲۹/۹) کے حوالے سے لکھا ہے کہ عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں ہے، نیز مولانا فاروق نے لکھا ہے کہ بجز چند امور محدود و قصاص کے وہ شہادت کی اہلیت رکھتی ہے، اس لیے اس کا ووٹر بننا بھی صحیح ہے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں: جمہوری نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہوتا ہے، اس سے صرف ووٹ ڈالنے والی عورت کا نہیں بلکہ پوری قوم کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے، اس لیے عورت کے لئے ووٹ ڈالنا نہ صرف جائز ہے بلکہ فتنہ سے مامون رہنے کی صورت میں مردوں کی طرح عورتوں پر بھی بعض صورتوں میں فرض کفایہ اور بعض مخصوص حالات میں فرض عین ہوگا۔

یہ گفتگو خواتین کو ووٹ میں اپنا کردار نبھانے کی تھی۔ اب بات یہ ہے کہ وہ امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو کر الیکشن لڑ سکتی ہے یا نہیں؟ اسی ضمن میں عورت کی سربراہی امامت کبریٰ اور قضاء کے اہل ہونے نہ ہونے کی بحث بھی چھیڑی گئی ہے، لیکن ہم انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے اور ان قیمتی مضامین اور دلائل سے صرف نظر کرتے ہوئے زیر بحث اصل نقطہ کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ عورت کا الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے یا نہیں؟

مولانا شوکت ثنا کے نزدیک چونکہ عورت کا سربراہ مملکت بننا درست ہے، لہذا امیدوار ہونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ مفتی اشرف قاسمی اور مولانا

فیاض عالم کے نزدیک بھی اگر مصلحت ہو تو جائز ہے، جبکہ دیگر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک ریزرو سیٹوں وغیرہ جیسی اضطرابی حالت کو مستثنیٰ کر کے عام حالت میں خواتین کا بحیثیت امیدوار ایکشن میں کھڑا ہونا جائز ہے جبکہ مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی کے نزدیک ریزرو سیٹوں کے موقع پر بھی خواتین کو امیدوار بننے کی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا عبدالرب اعظمی نے لکھا ہے کہ عورت کے امیدوار ہونے سے جہاں مرد کی حاکمیت فوت ہوتی ہے، وہیں بے پردگی کا مسئلہ، عورت کی عفت و عزت کا مسئلہ، ناجائز تعلقات پیدا ہونے کا مسئلہ دوسرے بہت سے ضمنی مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ ایک عورت جب ایکشن میں بحیثیت امیدوار کھڑی ہوگی تو دسیوں کام ایسے کرنے پڑیں گے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہوں گے، مثلاً وٹروں کے پاس جا کر خوشامد کرنا، انتخابی مہم چلانا، بازاروں، سڑکوں پر گھومنا، مردوں کے سامنے جانا، اپنے بیانات جاری کرنا، بیسٹروں پوسٹروں میں تصویر آویزاں کرنا وغیرہ، اس لئے یہ شوشہ ایک مغربی سازش ہے جس کی فقہی اعتبار سے بالکل گنجائش نہیں نکلتی۔

مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں: ایکشن میں ان کا امیدوار بننا شرعی طور پر جائز نہیں ہے اور یہ عمل ہمارے خاندانوں کو کمزور کر سکتا ہے۔ حکومت اگر سیٹیں ریزرو کرتی ہے تو کرتی رہے، لیکن ہمیں اپنی خواتین کی عزت و حرمت ریزرویشن سے کہیں زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں: جہاں تک مسئلہ ہے خواتین کے لئے سیٹیں ریزرو کئے جانے کا تو محض اس کی وجہ سے نصوص سے ثابت شدہ مسئلہ میں کوئی تسہیل نہیں کی جاسکتی، بلکہ جس طرح شاہ بانو کیس اور وندے ماترم، ہم جنس سے نکاح جیسے مسائل میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے کوشش کی تھی، اسی طرح حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ خواتین کے لئے سیٹیں ریزرو نہ کرے، کیونکہ اسلامی نقطہ نظر سے خواتین ممبر نہیں بن سکتی۔

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی نے ایکشن میں خواتین کے امیدوار بننے اور قانون ساز اداروں کی ممبر بننے کے سلسلہ میں علماء کے دو نقاط نظر ذکر کئے ہیں۔ ایک عدم جواز دوسرے جواز کا پھر مجوزین اور عدم جواز کے قائلین کے تفصیلی دلائل کو ذکر کر کے عدم جواز کو راجح قرار دیا ہے۔

مفتی سلطان کشمیری نے مفتی تقی عثمانی کی کتاب اسلام اور سیاسی نظریات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں دونوں طرف کچھ دلائل موجود ہیں، لیکن کوئی ایسی واضح نص موجود نہیں جس کی بنا پر کہا جائے کہ انہیں شوریٰ میں شامل نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات طے ہے کہ اگر شوریٰ میں شامل کیا جائے تو حجاب شرعی کے احکام کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

مفتی شوکت ثنا قاسمی نے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے عورت ایکشن میں امیدوار نہیں بن سکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کمتر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی انتخابی امیدوار بنائیں (حوالہ راہ عمل ۱۲۶۳)۔

احقر نے بھی حضرت تھانویؒ کے حوالہ سے حکم اصلی اور حکم عارضی کی تفریق کرتے ہوئے خواتین کی امیدواری کے جواز کو عارضی حکم قرار دیا ہے تاکہ دشمنوں اور اغیار کو ایسی سیٹوں پر قبضہ کی کھلی چھوٹ نہ مل جائے جس سے ملت کا زبردست خسارہ ہے، البتہ حتی الامکان ایسی منتخب خواتین جو امور مردوں کے ذریعہ انجام دے سکیں وہ اپنے محارم سے انجام دلائیں یا انہیں اپنا سکرٹیٹری مقرر کر لیں اور جہاں خود شرکت لازمی ہو وہاں بھی محارم کے ساتھ جائیں غرضیکہ مفسد کی تقلیل کے ساتھ اہون البلیتین کو اختیار کرتے ہوئے خواتین کو ریزرو سیٹ میں حصہ لینے کی گنجائش ہوگی۔

☆☆☆

## دوسرا باب تفصیلی مقالات

### ایکشن کے شرعی مسائل

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

ووٹ شرعی نقطہ نظر سے شہادت (گواہی) کے درجہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يا ايها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله (اے ایمان والو! انصاف کو قائم کرنے والے خدا کے واسطے گواہی دینے والے بن جاؤ)۔

کچھ اہل علم ووٹ کو سفارش اور کچھ دوسرے حضرات وکالت قرار دیتے ہیں اور ظاہری بات ہے کہ انسانی سماج سے ظلم و ناانصافی کے خاتمہ کے لیے حکومت عادلہ کو قائم کرنے کا سب سے مضبوط راستہ ”ووٹ“ ہے جو امیدوار کے حق میں ووٹ کی شہادت سے طے ہوتا ہے جس کے لیے وہ صحیح نمائندہ ہونے کی سفارش کرتا ہے یا اسے قوم کا وکیل بنا رہا ہے، بہر صورت اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الناس اذا رأوا الظالم فلم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمه الله بعقاب (جمع الفوائد ۵۱، ۲ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی) (اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں)۔

آپ کھلی آنکھ دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے اور انتخابات میں سرگرم حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجہ میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھرکوشش کریں۔

۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا شرعی حکم کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

جب ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی ہی ہے تو ضرورت کے وقت اس شہادت کو چھپانا یا الفاظ دیگر ووٹ کا صحیح استعمال نہ کرنا سخت گناہ ہے۔ قرآن میں ہے: ولا تكتموا الشهادة و من يكتمها فإنه آثم قلبه (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے)۔

اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من كتم شهادة إذا دعي إليها كان كمن شهد بالزور (جمع الفوائد ۶۲، بحوالہ طبرانی) (جس کسی کو شہادت کے لیے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے کوئی جھوٹی گواہی دینے والا)۔

قرآن و سنت کے اس فیصلے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ووٹ کا صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ عمومی حالات میں واجب علی الکفایہ اور خصوصی حالات میں واجب علی العین ہے۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

قوی، ملکی، انسانی، سماجی اور دینی ضرورت کے وقت میں ایکشن میں خود کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا بھی ایک دینی ضرورت ہے اور اس حیثیت کے اظہار

میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ صرف اقتدار کے حصول کے نقطہ نظر سے امیدوار بننا بلاشبہ مذموم اور شریعت کی نگاہ میں مردود ہے، لیکن سماجی برائی کے خاتمہ کے لیے اقتدار کی راہ سے منزل تک پہنچنے کی اہلیت و صلاحیت کا اظہار نہ صرف جائز بلکہ بعض حالات میں واجب ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں مصر کے حالات کی اصلاح کے پیش نظر قرآن حکیم نے یوسف علیہ السلام کا خود کو فائنانس منسٹر یا وزیر خزانہ کے عہدے کے قابل ہونے کی پیشکش کا ذکر کیا ہے (جس میں فوڈ منسٹری یا وزارت خوراک بھی شامل ہے)۔

قال اجعلنی علی خزائن الأرض اینی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵) (یوسف نے کہا کہ مجھے ملک کے خزانہ پر مقرر کرو دیکھ بان ہوں، خوب جاننے والا)۔

قرآن کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص دوسروں سے زیادہ بہتر طور پر عہدہ حکومت میں امانت و دیانت داری کے ساتھ اس کی ذمہ داری پوری کر سکتا ہے تو ایسی حالت میں عہدے کا خود طلب کر لینا جائز ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے مفسر قرآن امام قرطبی کے حوالے سے لکھا ہے:

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو دوسرا آدمی صحیح طور سے انجام دینے والا موجود نہیں اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لیے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدے کی خود درخواست کرے۔ مگر اپنے جاہ و مال کے لیے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لیے۔ جس کا تعلق قلبی نیت و ارادہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے (معارف القرآن ۱۳/۱۳۱ بحوالہ تفسیر قرطبی)۔

البتہ کسی عہدہ کے حصول کے لیے یا جاہ و مال اور اقتدار کے لالچ میں کھڑا ہوا تو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے ممنوع ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ سے فرمایا:

”کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدہ امارت حاصل کر بھی لیا تو اللہ کی تائید نہیں رہے گی جس کے ذریعہ لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو اور اگر بغیر طلب کیے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت رہے گی جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کر سکو گے۔“ صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے: ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا: انا لا نستعمل علی عملنا من ارادہ۔ یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو (معارف القرآن ۱۳/۱۳۱)۔

۲۔ غیر مسلموں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے خلاف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لیے وہیپ جاری کرے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا؟ ایسے غیر مسلم و مسلم ملکوں میں خلاف شریعت قوانین بنانے اور اس کے نفاذ کو حتی المقدور روکنے کی نیت سے ان اداروں کا ممبر بننا درست ہے بلکہ موجودہ وقت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔

خود قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیات کے ذیل میں مفسرین نے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں: تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر کی ملازمت (اور عہدہ حکومت) قبول فرمائی حالانکہ وہ کافر تھا جس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق حکمران کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے (معارف القرآن ۱۳/۱۳۱)۔

غیر مسلم حکومتوں یا مسلم غیر اسلامی سلطنتوں کے عہدے قبول کرنا اور بعض خلاف شریعت قانون سازی کے باوجود ان اداروں کا ممبر بننا اس لیے جائز ہے کہ ممبری قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

تفسیر ”بحر محیط“ میں ہے کہ جہاں معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے، انصاف نہ ہو سکے گا۔ وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلاف شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ”تفسیر قرطبی“ اور ”تفسیر مظہری“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلف صالحین، صحابہ و تابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم و جابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کر لینا ثابت ہے (معارف القرآن ۱۳/۴)۔

کتب سیرت کے اس تاریخی واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر شریف کے بیسویں سال میں حلف الفضول کے معاہدہ میں شرکت فرمائی جس میں بنو ہاشم اور بنو تمیم زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور سب نے مظلوم کی نصرت و حمایت خواہ مظلوم اپنا ہو یا پرایا، دیسی ہو یا پردیسی اور اس کی حتی الوسع امداد و اعانت کا عہد کیا (روض الانف ۱۲۰، طبقات ابن سعد ۸۲)۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس معاہدے کے وقت میں بھی عبداللہ بن جدعان کے گھر میں حاضر تھا، اس معاہدے کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو ہرگز پسند نہ کرتا اور اگر اب زمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدے کی طرف بلایا جاؤں تو بھی اس کو ضرور کروں گا (مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرت النبی ۹۵)۔

جہاں تک پارٹی کے وہیپ جاری کر دینے کے بعد ضمیر کے خلاف اس کی پالیسی کے حق میں ووٹ دینے کا سوال ہے تو یہ پارلیمنٹری قانون کی مجبوری میں ایک نادر اور قلیل الوقوع معاملہ ہے عمومی طور پر ایسا نہیں ہوتا، اس لیے اس کو گوارہ کرنے کی گنجائش ہے۔

حدیث رسول ﷺ میں آہوں ابلہتین کو اختیار کرنے کی بات ایسی ہی صورت حال کے لیے کہی گئی ہے۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

ہندوستان ایک ویلفیئر اسٹیٹ ہے، یعنی ایک ایسا امدادی ادارہ ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں ہندوستان کی تمام مذہبی قومی باشندوں کی برابر درجہ کی شرکت ہے اور اس کے دستور میں کسی مذہب کے خلاف خاص طور پر کوئی دفعہ شامل نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی اگر کوئی دفعہ کسی مذہب کے خلاف ہو تو اس دستور کے تحت اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے، لہذا کسی خلاف شریعت دفعہ کی موجودگی کو کالعدم تصور کرتے ہوئے مجموعی طور پر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہے۔ بد قسمتی سے دنیا کی تمام مذہبی قوموں نے بھی اپنے سیاسی دستور حکومت سے مذہب کو خارج کر رکھا ہے اور قومیت کو ہی اصل مذہب قرار دے رکھا ہے، ایسی صورت حال میں دستور سے وفاداری کا حلف اس ملک کی حکومت میں شرکت کا لازمی حصہ ہے، اس میں خلاف مذہب کسی دفعہ کی موجودگی کے باوجود دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے کی گنجائش ہے۔

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے خواہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

بائبل عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کا مجموعہ کہلاتا ہے جس میں تورات، زبور، انجیل سب شامل ہیں اور اسلام کی شریعت میں مسلمانوں کو ان سب اصل آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا پابند بنایا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: قل آمننا باللہ وما أنزل علینا وما أنزل علی إبراہیم وإسماعیل وإسحاق و یعقوب والاسباط وما أوتی موسیٰ و عیسیٰ والنبیون من ربهم لا نفرق بین أحد منهم ونحن له مسلمون (سورہ آل عمران: ۸۴) (آپ کہیے ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا ہے اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولادوں پر اتارا گیا سب پر ایمان لائے اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ان پر ایمان لائے ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں)۔

اس کے باوجود مسلمانوں کو قرآن پاک پر حلف اٹھانے کا طریقہ نہیں سکھایا گیا بلکہ حلف میں اللہ کی ذات پاک اور اس کی صفات پر حلف کو معتبر بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں عیسائی ملکوں میں اگر بائبل پر حلف اٹھانا ہر ممبر کے لیے قانونی مجبوری ہو تو یہ ایک مذہبی اور اسلامی مسئلہ کے بجائے خالص سیاسی رواجی مسئلہ ہے اور ان ملکوں کے مسلم ممبران کے لیے یہ تصور کرتے ہوئے کہ وہ خدا کے نازل کردہ احکام والے اور انجیل بائبل یا غیر منحرف اصل بائبل پر حلف اٹھا رہے ہیں۔ حلف اٹھانے کی گنجائش ہے۔

جیسا کہ بعض فقہانے صرف رواج بن جانے کی وجہ سے قرآن پاک پر حلف اٹھانے کو قسم کے حکم میں شامل کیا ہے۔

قال العینی، لو حلف بالمصحف أو وضع يده عليه أو قال: وحق هذا - فهو يمين، ولا سيما في هذا الزمان الذي كثر فيه الحلف به (شيخ محمد بن سليمان مجمع الاثر ۱، ۵۴۴) (علامہ عینی نے فرمایا کہ اگر قرآن کی قسم کھالے یا اس پر ہاتھ رکھ دے، یا یوں کہے کہ اس قرآن کے حق کی قسم تو یہ بھی قسم ہی ہے، خاص طور پر اس دور میں جبکہ قرآن پر حلف لینے کا رواج بن چکا ہے، یعنی اس طرح قسم کھانے کی کثرت ہو گئی ہے) بائبل پر حلف اٹھانے کے مسئلہ پر ایک زاویہ نظر وہ بھی ہے جس کا ذکر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مسلمان چونکہ ان کتابوں کو محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں، اس لیے یہ جائز نہیں کہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں، کیونکہ ان کتابوں کی تعظیم بحالت موجودہ ان کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے مترادف ہوگا۔ البتہ اگر وہ اس پر مجبور ہوں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ ہاتھ رکھا جاسکتا ہے۔

چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس منعقدہ ۸/۱۶/۱۹۸۸ رجب الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء اس مسئلہ میں جن نکات پر متفق ہوئے ان میں ایک یہ ہے کہ:

إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب لطلبه، يعتبر مكرها ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيما (قرارات مجلس المجمع الفقهي الإسلامي، ۱۴۰۲-۸۵)

(اگر کسی ملک میں غیر اسلامی حکومت ہو اور وہاں توریت یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کا حکم دیا جائے تو مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عدالت سے مطالبہ کرے کہ اس کے ہاتھ قرآن پر رکھوائے جائیں، اگر اس کا مطالبہ قبول نہ کیا جائے تو اب اسے مجبور سمجھا جائے گا اور اس کے لیے گنجائش ہوگی کہ وہ توریت یا انجیل یا دونوں پر دل میں تعظیم کا ارادہ کیے بغیر اپنا ہاتھ رکھے (جدید فقہی مسائل ۱، ۴۰۷)۔

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں تو کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

سیاسی پارٹیوں کے منشور کو مذہب کی عینک سے دیکھنا اس دور میں ایسی گناہ بھانا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا منشور ووٹ بینک کے ارد گرد گھومتا ہے وہ مذہب کے قانونی دائرے میں رہنا پسند نہیں کرتا، اس لیے اگر اس کے منشور میں کوئی دفعہ مخالف اسلام ہو تب بھی اس کے عمومی مسلم مفادات کے تحفظ والی اکثر دفعات پر نظر رکھتے ہوئے اس میں شریک ہونا اور اس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا بالکل درست ہے۔ ایک برائی کو اختیار کرنے سے اگر ہزاروں برائیوں کا دروازہ بند ہو جائے تو اسے گوارہ کیا جاسکتا ہے۔

صلح حدیبیہ میں معاہدے کی اس دفعہ کو منظور کرنا کہ اگر مکہ سے کوئی آدمی مدینہ جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے واپس کر دیں گے اگرچہ وہ مسلمان ہو اور اگر مدینہ سے کوئی مکہ چلا جائے تو قریش مکہ اسے واپس نہ کریں گے اور اس معاہدہ کے تحت ابو جندل رضی اللہ عنہ کا واپس کیا جانا گوارہ کیا گیا (صحیح بخاری ۱، ۳۷۲، باب الصلح مع المشرکین)۔

حلف الفضول سے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا: اگر زمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدے میں بلایا جاؤں تو ضرور قبول کروں گا (سیرۃ الصطفیٰ، ص: ۱۲۹۵)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ اچھے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسے لوگوں کے ساتھ شرکت جائز ہے جن کے عقیدے اور اصول ہمارے اپنے عقیدے اور اصول کے مخالف ہوں۔

سیکولر پارٹیوں کا منشور مذہب سے ٹکراتا نہیں بلکہ بے تعلق رہتا ہے اور اس بناء پر قومی اور ملکی مفادات کے پیش نظر اس کا ممبر بننا اور اس پارٹی کی طرف سے انتخاب لڑنا جائز ہے۔

ماضی میں دارالعلوم دیوبند جیسے مذہبی اسلامی ادارے کے فضلاء کی عملاً شرکت اس کی مزید واضح دلیل ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی مہاتما گاندھی کے ساتھ تحریک آزادی ہند کی قیادت اور شیخ الاسلام حسین احمد مدنی کی کانگریس کے ساتھ شرکت، مجاہد ملت مولانا حافظ الرحمن سیوہاری کا کانگریس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ کر پارلیمنٹ میں پہنچنا۔ مولانا محمد اسحاق سنبھلی کا جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی اور فاضل دیوبند ہونے کے باوجود ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر ایکشن لڑنا اور کامیابی حاصل کرنا، موجودہ دور میں مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی کا کانگریسی ممبر پارلیمنٹ ہونا اور مولانا بدرالدین اجمل قاسمی کا ممبر پارلیمنٹ اور آسام گورنمنٹ میں ۱۸ ممبروں کے ساتھ اپوزیشن کا رول ادا کرنا، ہمارے موقف کی تائید کے لیے کافی ہے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے عام طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

ایسی پارٹیاں جن کا منشور اور عمل سب اسلام دشمنی پر مبنی ہے۔ ان کا ممبر بننا اور ان کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا حرام ہے۔ یہ خود اپنے نقل کے فرمان پر دستخط کرنے کی طرح ہے اور یہ اسلام میں حرام ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تَلْقَوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمُودَةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تَأْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ (سورہ ممتحنہ: ۱) (اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو جبکہ انہوں نے تمہارے پاس آئے ہوئے دین حق کا انکار کر رکھا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمہیں بھی وطن سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں، صرف اس لیے کہ تم اللہ پر جو تمہارا رب ہے ایمان لے آئے ہو۔)

اس مضمون کی متعدد آیتیں صاف بتا رہی ہیں کہ دشمن خدا اور دشمن رسول اور اسلام و مسلمانوں سے عداوت رکھنے والی پارٹیوں میں شرکت اور ان کی طرف سے ایکشن لڑنا حرام ہے۔

رہا یہ کہ ان کی پارٹی پالیسی اور ایجنڈے کو بدلنے کی نیت سے شریک ہونا تو یہ صرف ایک خوش فہمی اور خام خیالی ہے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں بنا کر شرکت کا جواز ثابت کرتے ہیں ان میں سے آج تک کوئی ایک بھی ایجنڈے کو بدلنے میں کامیاب تو کیا ہوتا لٹا خود ہی بدل گیا اور انہیں کے ایجنڈے کا علمبردار بن گیا۔

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں قائم ہاٹھ اٹھتی ہیں۔

مسلمانوں کا ملک کے سیاسی سیکولر ڈھانچے میں رہتے ہوئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہے اور بعض صوبوں میں مسلمانوں نے اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا ہے، جیسے کیرالہ میں 'مسلم لیگ' اور آندھرا پردیش میں 'اتحاد المسلمین' اور آسام میں متحدہ ڈیموکریٹک فرنٹ (یو ڈی ایف) وغیرہ لیکن یہ حکم انہیں صوبوں کے لیے ہے جہاں مسلمان حکومت سازی کی پوزیشن میں ہوں اور زمینی حقیقت ان کی کامیابی کا پتہ دیتی ہو، مگر کل ہند سطح پر علیحدہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے لیے صرف ناکامی کے اعلان کے ہم معنی ہے، اس لیے اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے۔ الا یہ کہ علیحدہ متحدہ پلیٹ فارم تشکیل دے کر پہلے زمین تیار کی جائے پھر سیاسی قوت کا صحیح اندازہ لگا کر کوئی علیحدہ سیاسی جماعت بنائی جائے تو جائز ہے، اس کے بغیر جواز کو ثابت کرنا مسلمانوں کی خودکشی کا راستہ ہموار کرنا ہے۔

”صلح حدیبیہ“ کے واقعہ سے مصالحت اور مصلحت کو ایک ساتھ لے کر چلنے کا واضح اشارہ ملتا ہے اور حلف الفضول سے سیاسی، سماجی اور مذہبی مقاصد کے حصول کے لیے متحدہ سیاسی پلیٹ فارم بنانے کا جواز فراہم ہوتا ہے، لیکن داخلی خارجی سیاسی قوت حاصل کیے بغیر علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ اس سے مسلم مفادات کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہی وجہ عدم جواز بھی ہے۔

۱۰۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لیے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے۔ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں تیزی سے یہ رجحان پنپ رہا ہے کہ سیاست میں عورتوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جائے، اس کے لیے مختلف ریاستوں میں اور مختلف سطحوں پر خواتین کے لیے سٹیٹس ریزرو کی جارہی ہیں، یہاں تک کہ



ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پنجابیت کی سطح پر پچاس فیصد سٹیٹس عورتوں کے لیے ریزرو کردی گئی ہیں اور لوک سبھا سے پارلیمنٹ میں خواتین کے لیے ۳۳ فیصد ریزرویشن کا بل پیش کیا جا چکا ہے اور قوی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کر لے۔

اسلام میں حکومت کی سربراہی یعنی خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین بننے کے لیے تین طریقے مقرر ہیں: (۱) رائے عامہ سے انتخاب (۲) امام وقت کا ارباب حل و عقد کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا (۳) امیر المؤمنین کا مجلس شوریٰ کی تشکیل کے ذریعہ ان میں سے کسی ایک پر اتفاق کر لینا۔

لیکن موجودہ سیکولر ڈیموکریسی کے دور میں 'عوام کی حکومت عوام سے عوام کے ذریعہ سربراہ اعلیٰ کا انتخاب جسے Rule by the people یا اردو زبان میں جمہوریت کہا جاتا ہے، ایک طے شدہ طریق کار ہے اور اس میں اصل سیاسی قوت عوام کے ہاتھ میں تسلیم کی جاتی ہے، جس کا ذریعہ عوامی رائے یا ووٹنگ سٹم ہے یہ اسلامی طریقہ سے بالکل جداگانہ طریقہ ہے۔ اسلام میں قیام حکومت یا خلافت و امارت کے لیے ولایت یعنی شرعی حاکمیت کا پایا جانا بھی ضروری ہے اور یہ اسلام کے مطابق صرف مردوں کے لیے مخصوص ہے۔

قرآن پاک کے ارشاد: الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض کی تفسیر میں امام قرطبی فرماتے ہیں:

فإن فی الرجال الحکام والأمرء ومن یغزو و لیس ذلک من النساء (اس لیے کہ حاکم، امیر اور مجاہد ہونا مردوں کے لیے مخصوص ہے عورتوں میں یہ بات نہیں ہے)۔

امام بغوی لکھتے ہیں: فضل الرجال علی النساء بزیادة العقل والدين والولاية (مردوں کی عورتوں پر برتری عقل اور دین میں زیادتی اور ولایت ہونے کی وجہ سے ہے)۔

ایک روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو فارس (ایران) میں کسریٰ کی ہلاکت کے بعد اس کی بیٹی کی تخت نشینی کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لن یفلح قوم ولو أمرہم امرأة (بخاری حدیث: ۴۲۲۵، نسائی حدیث: ۵۳۸۸) (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے حکومت کی باگ ڈور عورت کو دی ہو)۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ ہوا بھی یہی کہ اس کے بعد حکومت ایران کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

باوجود اسے کہ اسلام میں عورت اور مرد کے معاشرتی حقوق میں مساوات کا قانون نافذ ہے۔ اجتماعی امور میں مثلاً حکومت و امارت اور جہاد میں عورت کو اس ذمہ داری کا اہل قرار نہیں دیا گیا، چنانچہ اسلامی دور نبوت سے لے کر دور خلافت و امارت تک اس کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ میں نظر نہیں آتی کہ عورت خلیفہ یا امیر و حاکم بنائی گئی ہو۔

مشہور محقق فقہ علامہ ابن نجیم مصری نے "الاشباہ والنظائر" میں احکام الانثی کے ذیل میں ۵۳ مسائل میں عورت و مرد کے درمیان عدم مساوات اور نابرابری کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورتوں کو قاضی بنانا مناسب نہیں اور جوان عورت کو سلام میں پہل کرنا اور اس کا جواب دینا درست نہیں بلکہ چھینک کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے (الاشباہ والنظائر: ص: ۲۵-۲۳)۔

قرآن وحدیث کے نصوص اور فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں خواتین اسلام کی عظمت کردار اور ان کی نسوانی عفت و عصمت کے تحفظ کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ موجودہ دور کے سیاسی فتنوں سے ہوشیار اور سیاست کی گلیاروں میں اپنی شخصیت کو داؤ پر لگانے سے خبردار رہیں اور ہر حال میں اپنے اسلامی مرتبہ و وقار اور قانون اسلام کی وفادار رہیں، وہ چراغ خانہ بننے کو شمع محفل بننے پر ترجیح دیں۔ خاص طور پر جوان عمر کی آخری حد تک نہ کوئی سیاسی انتخاب لڑیں نہ قانون ساز اداروں کی ممبر بنیں نہ پولیٹیکل میٹنگ اٹینڈ کریں۔

میرا احساس یہ ہے کہ یہی چند سطریں سوالات کے تمام گوشوں پر محیط جوابات فراہم کرنے کے لیے کافی ہیں۔



## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی

### ۱۔ ووٹ (Vote) کی شرعی حیثیت:

ووٹ کی شرعی حیثیت ”شہادت“ کی ہے، کیونکہ ”شہادۃ“ کے اصل معنی ”حضور و معاینۃ“ (یعنی حاضر و موجود ہونے اور مشاہدہ کرنے) کے ہیں، پھر قطعی و یقینی خبر میں اس کا استعمال ہونے لگا، کیونکہ یقینی خبر کے ذرائع میں سے حادثہ کے وقت موجود رہنا اور بہ چشم خود اس کا مشاہدہ کرنا بھی ہے، چنانچہ اہل عرب بولتے ہیں، ”شہد بكذا“ (اس نے فلاں چیز کی قطعی خبر دی)، اور ”شہد“ کے معنی معاینہ کرنے کے ہیں، اور ”أشہدته“ کے معنی ہیں (میں نے اسے حاضر کیا)، اور ”أشہدته الشیخ“ کے معنی ہیں (میں نے فلاں کو فلاں چیز کی جگہ حاضر کیا)، نیز مزید وسعت کے ساتھ اس کا استعمال، قسم، اقرار، کلمہ توحید، اللہ کے راستے میں نکل ہونا، اور عالم ظاہر جو عالم غیب کے مقابل ہے، ان معانی میں بھی ہوتا ہے (ابن منظور، لسان العرب ۱۵۲/۸، بیروت، دارصادر ۲۰۰۰ء)، اور ابن فارس تحریر کرتے ہیں: ”الشیخ والہاء والذال أصل یدل علی حضور و علم و إعلام، لا ینخرج شیئ من فروعه عن الذی ذکرناہ، من ذلک الشہادۃ، یجمع الأصول التي ذکرناھا من الحضور، والعلم، والإعلام، یقال: شہدیشہد، شہادۃ، والشہد: مضر الناس. والشہد: القتل فی سبیل اللہ، قال قوم: سہی بذلك؛ لأن ملائکة الرحمة تشہدہ أی تحضرہ وقال آخرون: سہی بذلك لسقوطہ بالأرض، والأرض تسمی الشاہدۃ، والشاہد: اللسان، والشاہد، الملک... وشہد اللہ: أعلم اللہ عزوجل و بین... کما یقال: شہد فلان عند القاضی، إذا بین وأعلم لمن الحق وعلی من هو“ (ابن فارس، أبو الحسین، أحمد بن فارس بن زکریاء (و: ۳۹۵ھ) ”معجم مقاییس اللغۃ“ ۳، ۲۲۱، دار الفکر ۱۹۶۹-۷۰ء) (شہد اور ہاء اور ذال ایک ماخذ ہے، جو حاضر ہونے، جاننے اور آگاہ کرنے کے معنی پر دلالت کرتا ہے، اس کی شاخوں میں سے کوئی شاخ اس اصل سے خارج نہیں جسے ہم نے ذکر کیا، اسی اصل سے لفظ ”الشہادۃ“ ہے جو ان تمام اصول کو جامع ہے جو ہم نے ذکر کیا یعنی حاضر ہونا، جاننا اور آگاہ کرنا، بولا جاتا ہے: ”شہد یشہد شہادۃ“ (وہ حاضر ہوا، حاضر ہوتا ہے، اور مصدر کے معنی ہیں حاضر ہونا) اور ”مشہد“ لوگوں کے حاضر ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں، اور ”شہید“ اللہ کی راہ میں مقتول کو کہتے ہیں، ایک جماعت نے کہا کہ اس کے ساتھ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کے فرشتے اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں، اور دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ اس کے ساتھ اس کا نام اس کے زمین پر گرنے کی وجہ سے رکھا گیا، اور زمین کا نام ”شہادۃ“ رکھا جاتا ہے، اور ”شہاد“ زبان کو بھی کہتے ہیں، اور ”شہاد“ فرشتہ کو بھی کہتے ہیں..... اور ”شہد اللہ“ کے معنی ہیں: اللہ عزوجل نے آگاہ کیا اور بیان کیا..... جیسا کہ بولا جاتا ہے: ”شہد فلان عند القاضی“ جبکہ وہ بیان کرے اور اس بات سے آگاہ کرے کہ کس کا حق ہے اور کس پر ہے، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”فمن شہد منکم الشهر فلیصمہ“ (البقرہ: ۱۸۵) (سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے)، اس جگہ ”شہد“ ”حضر“ یعنی حاضر ہونے کے معنی میں ہے۔

اور فرمان الہی ہے: ”وجعلوا الملائکة الذین هم عباد الرحمن إنائاً، أشہدوا خلقہم، ستکتب شہادتہم ویسألون“ (الزخرف: ۱۹) (اور انہوں نے فرشتوں کو جو رحمان کے بندے ہیں، بیٹیوں کا وجود رکھا ہے، انہوں نے ان کی ولادت کا مشاہدہ کیا، ان کی یہ گواہی نوٹ رہے گی، اور ان سے اس کی پرسش ہوگی)، اس جگہ ”شہدوا“ مشاہدہ اور بہر چشم دیکھنے کے معنی میں ہے، اور ”شہادتہم“ ”جھوٹی گواہی“ کے معنی میں ہے۔

”شہادت“ کی اصطلاحی تعریف:

ط استاذ حدیث و فقیہ اسلامی، جامعہ اسلامیہ ہشتا پورم، پی کاڈ، مالا پورم، کیرالہ۔

”شہادت“ کی اصطلاحی تعریف اس طرح ہے: ”إخبار صدق لإثبات حق بلفظ الشهادة في مجلس القاضي“ (تسرتاشی، محمد بن عبد اللہ (و: ۵۱۰۰۳) ”تنویر الأبصار“ مع الدر المختار، کتاب الشهادات ۸۰، ۱۶۲، ط: ۱، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۳۱۵ھ - ۱۹۹۳ء) (قاضی کی مجلس میں شہادت کے لفظ کے ذریعہ حق کو ثابت کرنے کے لئے سچی خبر دینے کا نام ”شہادت“ ہے)۔

اور منصور بن یونس، بن ادریس، بہوتی حنبلی (و: ۱۰۵۱ھ) تحریر کرتے ہیں: ”هی الإخبار بما علمه بلفظ ”أشهد“ أو ”شهدت“ (بہوتی حنبلی، ”الروض الربیع شرح زاد المستفیع“، کتاب الشهادات ۱۰، ۴۳، بیروت، دار الفکر) (”شہادت“ لفظ: ”میں گواہی دیتا ہوں“ یا ”میں نے گواہی دی“ کے ذریعہ اس چیز کی خبر دینا ہے جس کا اسے علم ہوا)۔

شہادت کی یہ تعریف دوٹ پر بھی صادق ہے، لہذا دوٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی ہے، کیونکہ دوٹ بھی بااختیار اتھارٹی (Authority) کی موجودگی میں اپنی رائے اہل اور مستحق شخص کے حق میں دینے کا نام ہے، تاکہ وہ شخص منتخب ہو کر امانت، ذمہ داری اور نشاط کے ساتھ حکومت کے اعمال انجام دے سکے، اسی وجہ سے نااہل اور غیر مستحق کو محض ذات برادری یا ذاتی تعلقات یا روپے کی بنا پر دوٹ دینا ناجائز اور گناہ ہے، کیونکہ یہ جھوٹی شہادت ہے، اور جھوٹی گواہی دینا ناجائز اور حرام ہے، چنانچہ اللہ رحمان کے مخصوص بندوں کی صفات میں سے ایک صفت ہے: ”والذین لا یشہدوں الزور“ (الفرقان: ۴۲) (اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے)، نیز ارشاد ہے: ”وإذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی“ (الانعام: ۱۵۲) (اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو، خواہ کوئی تمہارا قرابت دار ہی ہو)، اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ”فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور“ (الحج: ۳۰) (سو بتوں کی گندگی سے اجتناب رکھو اور جھوٹ بات سے بچو)۔

- اور حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”أكبر الكبائر: الإشراك بالله وقتل النفس وعقوق الوالدين، وقول الزور، أو قال: شهادة الزور“ (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۲۶۵۳، ۵۹۷۷، ۶۸۷۱، مسلم شریف حدیث نمبر: ۸۸، مسند احمد: ۱۲۳۲۶) (کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ، اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے اور جان مارنا ہے اور والدین کی نافرمانی ہے اور جھوٹی بات ہے، یا یہ فرمایا کہ جھوٹی گواہی ہے) اور حضرت ابو بکرؓ کی روایت میں ہے کہ ”شهادة الزور“ یا ”قول الزور“ کو برابر دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے (بخاری شریف حدیث نمبر ۲۶۵۳، ۲۶۷۷، ۶۹۱۹، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۲۳)۔

دراصل دوٹنگ میں شرکت شہادت کی ادائیگی ہے، جو اسلام میں مطلوب ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: ”وأقيموا الشهادة لله“ (الطلاق: ۲) (اور اللہ کے لئے گواہی کو قائم رکھو)، دوسری جگہ فرمان الہی ہے: ”وكذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس“ (البقرہ: ۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو)، نیز ارشاد ہے: ”ولا ياب شهداء إذا ما دعوا“ (البقرہ: ۲۸۲) (اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں)، اور فرمایا: ”يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله، ولو على أنفسكم أو الوالدين والأقربين“ (النساء: ۱۲۵) (اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہ بنو، اگرچہ یہ گواہی خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے)، نیز ارشاد ہے: ”ولا نكتم شهادة الله إنا إذا لمن الآثمين“ (المائدہ: ۱۰۶) (اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے، اگر ہم ایسا کریں، تو بے شک ہم گنہگار ٹھہریں گے)۔

درحقیقت دوٹنگ میں شرکت اس امانت کو ادا کرنے کے باب سے ہے، جس کی حفاظت اور مستحقین تک ادائیگی کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها“ (النساء: ۵۸) (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو)، آیت کے اندر ”امانت“ کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں ہے، اور تمام حقوق و فرائض، خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں، یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنے سے متعلق ہوں یا بے گانوں سے، مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے، صلح و امن کے دور کے ہوں یا جنگ کے، غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں، وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور مسلمانوں کو شریعت اور اقتدار کی امانت سپرد کرنے کے بعد اجتماعی حیثیت سے سب سے پہلے جو ہدایت ہوئی، وہ یہ ہے کہ تم جن حقوق و فرائض کے ذمہ دار بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا، چنانچہ ابن العربی مالکی (و: ۵۲۳ھ) تحریر کرتے ہیں: ”فهي عامة بقولها، شاملة بنظمها لكل أمانة، وهي أعداد كثيرة“ (ابن العربی،

ابوبکر، محمد بن عبد اللہ "احکام القرآن" ۱، ۵۷۱، ط: ۱، دار الکتب العربیہ، بیروت ۱۹۸۸ء۔ (سوا آیت اپنے لفظ کے ساتھ عام ہے اور اپنی نظم کے ساتھ ہر امانت کو شامل ہے، اور اس کی بہت ساری تعداد ہے)۔

اور ابن تیمیہ تحریر کرتے ہیں: "فیجب علی ولی الأمر أن یولی علی کل عمل من أعمال المسلمین أصلح من یجده لذلك العمل، قال النبی ﷺ: "من ولی من أمر المسلمین شیئاً فولی رجلاً، وهو یجد من هو أصلح للمسلمین منه، فقد خان الله ورسوله"، وفي رواية: "ومن ولی رجلاً علی عصابة وهو یجد فی تلك العصابة، من هو أرضی لله منه، فقد خان الله ورسوله وخان المؤمنین" رواه الحاکم فی صحیحہ، وروی بعضهم أنه من قول عمر لابن عمر روى ذلك عنه، وقال عمر بن الخطاب ﷺ "من ولی من أمر المسلمین شیئاً فولی رجلاً لمودة أو قرابة بينهما، فقد خان الله ورسوله والمؤمنین"... فإن عدل عن الأحق الأصلح إلى غیره لأجل قرابة بينهما أو ولاء عتاقة، أو صداقة أو مرافقة فی بلد أو مذهب أو طریقة، أو جنس العربیة والفارسیة والترکیة والرومیة، أو لرشوة يأخذها منه من مال أو منفعة أو غیر ذلك من الأسباب، أو لضغن فی قلبه علی الأحق أو عداوة بينهما، فقد خان الله ورسوله والمؤمنین، ودخل فیما نهي عنه فی قوله تعالی: "یا ایها الذین آمنوا لا تخونوا الله والرسول وتخونوا أماناتکم وأنتم تعلمون" (الانفال: ۲۷)

(سوا کام پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے کاموں میں سے ہر کام پر موجود لوگوں میں سے اس کام کی زیادہ صلاحیت رکھنے والے کو مقرر کرے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو مسلمانوں کے معاملات میں سے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنے، اور کسی شخص کو عہدہ پر مقرر کرے، حالانکہ وہ اس سے زیادہ مسلمانوں کے حق میں مفید شخص کو پائے تو اس نے اللہ اور رسول کی خیانت کی، اور ایک روایت میں ہے: "جس نے کسی جماعت پر کسی شخص کو حاکم بنایا، حالانکہ وہ اس جماعت میں اس شخص کو پارہا ہو، جو اس سے زیادہ اللہ کی نگاہ میں محبوب ہو، تو اس نے اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کی خیانت کی"، اس کی روایت حاکم نے اپنی صحیح میں کی ہے، اور بعض نے روایت کی ہے کہ یہ حضرت عمر کا ابن عمر سے ارشاد ہے، جسے انہوں نے ان سے نقل کیا ہے، اور حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا: جو مسلمانوں کے معاملات میں سے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنے، پھر کسی شخص کو باہمی محبت یا قرابت کی بنا پر عہدہ پر مامور کر دے، تو اس نے اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کی خیانت کی..... سوا گروہ (یعنی حاکم) باہمی قرابت یا آزادی کے رشتہ یا دوستی، یا شہر یا مسلک یا طریقت، یا عربی، فارسی، ترکی یا رومی قومیت میں شرکت یا رشوت کی بنا پر جو اس سے مال یا منفعت میں سے لے، یا دیگر اسباب کی بنیاد پر یا حق سے دل میں کینہ رکھنے یا باہمی عداوت کی وجہ سے زیادہ حقدار اور مفید سے ہٹ کر دوسرے کی طرف رجوع کرے، تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کی خیانت کی، اور اس دائرہ میں داخل ہو گیا، جس سے اس ارشاد الہی میں روکا گیا ہے "اے ایمان والو، اللہ ورسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جاننے بوجھتے نہ کرو)۔

اسی لئے ملک و ملت کے حق میں زیادہ مفید اور زیادہ حقدار سے ہٹ کر رشوت لے کر ووٹ ڈالنا درست نہیں ہے، چنانچہ حضرت ثوبانؓ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لعن الله الراشی والمرتشی والرائش الذی یشی بینہما" (السنن رک علی الصحیحین للحاکم حدیث نمبر: ۷۰۶۸، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۲۳۹۹، شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: ۵۵۰۳، شرح مشکل الآثار للطحاوی حدیث نمبر: ۵۶۵۶، اور یہ حدیث، لفظ "الرائش" کے علاوہ صحیح لغیرہ ہے) (اللہ تعالیٰ نے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے اور دونوں کے درمیان واسطہ بننے والے پر لعنت کی ہے)، چنانچہ مال مالک مال کو لوٹانا واجب ہے، اور اللہ کی نگاہ میں زیادہ محبوب اور با کردار کا انتخاب کرنا لازم ہے، کیونکہ اصلاح کا انتخاب امانت ہے، سوا اگر غیر صلح کا انتخاب کر کے اسے ضائع کر دے تو اس میں پوری جماعت کا ضرر و نقصان ہے، اور جو عمل پوری قوم و ملت کے لئے نقصان دہ ہو، شرعاً اس کی شاعت مزید بڑھ جاتی ہے۔

## ۲۔ ووٹ دینے کا وجوب:

ووٹ دینا واجب ہے، کیونکہ ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، اور ضرورت کے موقع پر شہادت کی ادائیگی سے باز رہنا حرام ہے، چنانچہ فرمان الہی ہے: "ولا تکتسوا الشهادة و من یکتسها فإنه آثم قلبه" (البقرہ: ۲۸۳) (اور شہادت کو مت چھپاؤ، جو اس کو چھپائے تو وہ یاد رکھے کہ اس کا دل گنہگار ہے)، اور ارشاد نبوی ہے: "من کتم شهادة إذا دعی إليها کان کمن شهد بالزور" (طبرانی، المعجم الاوسط، حدیث نمبر: ۴۱۶۷، مسند الشامیین، حدیث نمبر: ۱۹۳۲، ۳۳۶۲، اور اس کی سند میں کلام ہے، دیکھئے: بیہقی کی "مجمع الزوائد" ۳/۲۳۳) (جسے گواہی کے لئے بلا یا جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے

جیسے جھوٹی شہادت دینے والا)۔ ایک اور موقع سے آپ ﷺ نے فرمایا: ”ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها“ (امام مالک بن انس ”موطا“ حدیث نمبر: ۱۳۰۱، مسلم حدیث نمبر: ۱۷۱۹، واہم حدیث نمبر: ۱۷۰۳) (کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ یہ وہ شخص ہے جو اپنی شہادت کسی کے طلب کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے)۔

اور ایکشن کے موقع پر خود سے گواہی دینے کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ مروجہ جمہوری نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے، چنانچہ ایک نااہل، بدکردار اور اسلام دشمن امیدوار کے حق میں ”ایک ٹرانک ووٹنگ مشین“ میں صرف ایک ووٹ اہل امیدوار سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہو کر ملک کی باگ و ڈور پر مسلط ہو جائے گا۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے ووٹنگ میں کم حصہ لیا، اور نتیجتاً اسلام مخالف لیڈر کامیاب ہو گیا اور اس کے نتائج بد پوری مسلم قوم کو جھیلنے پڑے، چنانچہ جھوٹے الزام لگا کر ان کے نوجوانوں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا، اور کبھی ان کی معاش تباہ کرنے کے لئے ان کو فرقہ وارانہ فسادات کا نشانہ بنایا گیا، لہذا مسلمانوں کو سیاسی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے لازماً ووٹنگ میں حصہ لینا چاہئے، اور اس سلسلہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں ہے۔

۳۔ ایکشن میں خود کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم:

اصل یہ ہے کہ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش نہ کرے، اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے عبد الرحمن بن سمرہ سے فرمایا: ”لا تسأل الإمارة فإنك إن أوتيتها عن مسألة وكلت إليها، وإن أوتيتها من غير مسألة أعنت عليها“ (بخاری شریف حدیث نمبر: ۶۲۲۲، ۶۲۲۳، ۶۲۲۴، ۶۲۲۵، ۶۲۲۶، ۶۲۲۷، ۶۲۲۸، ۶۲۲۹، ۶۲۳۰، ۶۲۳۱، ۶۲۳۲، ۶۲۳۳، ۶۲۳۴، ۶۲۳۵، ۶۲۳۶، ۶۲۳۷، ۶۲۳۸، ۶۲۳۹، ۶۲۴۰، ۶۲۴۱، ۶۲۴۲، ۶۲۴۳، ۶۲۴۴، ۶۲۴۵، ۶۲۴۶، ۶۲۴۷، ۶۲۴۸، ۶۲۴۹، ۶۲۵۰، ۶۲۵۱، ۶۲۵۲) (حکومت طلب مت کرو، کیونکہ اگر طلب کے بعد تجھے ذمہ ملے گی تو تم اس کے حوالہ کر دینے جاؤ گے اور اگر بے طلب ملے گی، تو اس پر تیری مدد کی جائے گی)، لہذا آزاد اور شخصی حیثیت میں انتخابات میں کھڑے ہونے کی بجائے حلقہ کے ممتاز و نمایاں افراد پر مشتمل پنچایت کی طرف سے نامزدگی ہونا بہتر ہے۔ البتہ یہ اگر ممکن نہ ہو، اور کوئی شخص اپنے اندر پوری قدرت اور اہلیت محسوس کرتا ہو، اور ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہو، تو ایسا شخص خود کو نامزد کر سکتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے کے بعد اس وقت کے سب سے زیادہ اہل اور موزوں ترین چھ افراد حضرات (۱) علی (۲) عثمان (۳) زبیر (۴) طلحہ (۵) سعد (۶) عبد الرحمن رضی اللہ عنہم کی مشاورتی و انتخابی کمیٹی بنادی تھی جو حقدار خلافت بھی ہوگی، چنانچہ حضرت زبیر بن العوام نے حضرت علی بن ابی طالب کے حق میں اپنے حق سے دستبرداری کر لی اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضرت عبد الرحمن بن عوف کے حق میں، اور طلحہ بن عبید اللہ نے حضرت عثمان بن عفان کے حق میں دستبرداری کر لی، اس کے بعد حضرت عبد الرحمن بن عوف نے حضرت علی اور عثمان سے عرض کیا: ”ایکما یبرأ من هذا الأمر، فنفضوا الأمر إليه، والله عليه والإسلام لیولین أفضل الرجلین الباقیین؟ فسکت الشیخان علی وعثمان، فقال عبد الرحمن بن عوف: إني أترك حقي من ذلك، والله علي والإسلام أن أجتهد فأولی أولاكما بالحق، فقالا: نعم“ (ابن کثیر، البداية والنهاية ۱۳۵-۱۳۶، ط: ۱، بیروت، دار احیاء التراث العربی ۱۳۰۸ھ-۱۹۸۸ء) (تم دونوں میں سے کون اس معاملہ سے دستبردار ہو کہ ہم اسے معاملہ کا اختیار سپرد کر دیں، اللہ کی قسم، اس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اسلام کی رعایت کرتے ہوئے باقی رہنے والے دو شخص میں سے افضل کے حوالہ خلافت کی باگ و ڈور سونپ دے؟ اس پر حضرات یحییٰ بن علی اور عثمان خاموش رہے، تب حضرت عبد الرحمن بن عوف نے کہا کہ میں اس معاملہ سے اپنا حق چھوڑ رہا ہوں، بخدا میری ذمہ داری ہوگی کہ میں اسلام کا خیال رکھتے ہوئے کوشش کر کے آپ دونوں میں سے خلافت کا حق زیادہ رکھنے والے کو خلیفہ مقرر کر دوں، اس پر ان دونوں نے رضامندی ظاہر کی)۔

چنانچہ حضرت علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کی خاموشی خود کو منصب خلافت کے لئے نامزد کرنے کی ضمنی لیکن صریح اور کھلی دلیل ہے، لیکن یہ نامزدگی منصب خلافت کی حرص یا حکومت کو لذت و منفعت کا ذریعہ سمجھنے کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کے حق میں مفید اور ان کی خدمت کی اپنے اندر صلاحیت محسوس کرنے کی وجہ سے تھی۔

اور امام ماوردی رقمطراز ہیں: ”وان لم یقر بها أي بالإمامة - أحد، خرج من الناس فریقان: أحدهما أهل الاختیار... والثانی: أهل الإمارة حتی ینتصب أحدہم للإمامة“ (ماوردی، امام ابو الحسن، علی بن محمد (و) الاحکام السلطانیة فی الولايات الدینیة“ ص: ۳۰، ط: ۲، دار الکتب العربی، بیروت، ۱۳۲۰ھ-۱۹۹۹) (اور اگر امامت کی ذمہ داری کوئی انجام نہ دے، تو لوگوں میں سے دو جماعت ظاہر ہوں، (۱) ایک اہل انتخاب کی جماعت تاکہ وہ امت کے لئے امام کا انتخاب کر سکے (۲) دوم اہل امامت کی

چنانچہ امام ماوردیؒ کے قول ”ان میں سے کوئی امامت کے لئے کھڑا ہو“ کا مطلب ہی یہی ہے کہ کوئی خود کو نامزد کرے، تاکہ اہل انتخاب یعنی ارباب عقد و حل اس خود کو نامزد کرنے والے شخص کے اندر خلیفہ کی شرطوں کی موجودگی کا جائزہ لے سکیں، کیونکہ اہل عقد و حل کی شرائط میں سے ایک شرط علم کا ہونا ہے کہ جس کے ذریعہ وہ امامت کے حقدار کا فیصلہ اس کی شرائط کی روشنی میں کر سکیں، اور یہ ظاہری بات ہے کہ نامزدگی کے بعد ہی شرطوں کا حامل ہونا معلوم ہوگا۔

نیز حضرت یوسف صدیق علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کے سامنے تجویز رکھی کہ مجھے ملک کے ذرائع آمدنی و پیداوار پر مامور کیجئے، میں پوری احتیاط سے ہر چیز کی حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے علم بھی رکھتا ہوں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”قال اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم“ (یوسف: ۵۵) (یوسف نے کہا: ملک کے خزانے میرے پر دیکھیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں)۔

اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ یہ تجویز انہوں نے اس لئے رکھی تاکہ طاقت کے مطابق سرزمین مصر میں عدل و انصاف قائم کرنے کا انہیں موقع مل سکے، ابن کثیرؒ تحریر کرتے ہیں: ”وسأل العمل، لعلمه بقدرته عليه ولما فيه من المصالح للناس، وإنما سأله أن يجعله على خزائن الأرض،

وهي الأهرام التي يجمع فيه الغلات، لما يستقبلونه من السنين التي أخبرهم بشأنها، فيتصرف لهم على الوجه الأحوط والأصلح والأرشد، فأجيب إلى ذلك رغبةً فيه، وتكرمةً له“ (ابن کثیر، اسماعیل بن عمر (و: ۵۷۷) ”تفسیر القرآن

العظیم“ ۲، ۱۱۹۶، ط: ۲، مؤسسة الريان، بیروت ۱۳۲۸ھ-۲۰۰۷ء) (اور انہوں نے ملک کے خزانے پر مامور ہو کر کام کرنے کا مطالبہ کیا، کیونکہ انہیں اس پر اپنی قدرت کا علم تھا، اور اس لئے کہ اس میں لوگوں کی مصلحتیں تھیں، اور انہوں نے ملک کے خزانے پر مامور کرنے کا مطالبہ کیا جو کہ ”اہرام“ ہے، جس میں آمدنی جمع کی جاتی تھی، ایسا ملک کو پیش آنے والے لحظ میں سنبھالنے کی وجہ سے کیا، جس کی خبر لوگوں کو انہوں نے دی تھی، تاکہ پوری احتیاط اور بحسن و خوبی اس کام کو ان کے لئے انجام دے سکیں، سو ان کی تجویز ان کے اندر رغبت ہونے اور ان کے اعزاز میں قبول کر لی گئی)۔

اور یہ واضح ہے کہ یوسف علیہ السلام نے کافرانہ نظام سے حکومت طلب کی تھی۔

جس طرح قاضی بننے میں اگر ظلم و جور سے مامون ہونے کی امید کی صورت میں عہدہ قضا قبول کرنا مکروہ نہیں ہے جیسا کہ ”الدر المختار“ میں ہے:

”وان تعين له أو أمنه لا يكره“ (الدر المختار، كتاب القضاء، مطلب: طلب القضاء وأخذة وتقلده، ۸، ۴۲) (اور اگر وہ قضا کے لئے متعین ہو جائے، یا ظلم و عاجزی سے مامون ہو، تو قضا کی ذمہ داری سنبھالنا مکروہ نہیں ہے)، اسی طرح اچھی نیت سے نامزدگی کی گنجائش ہے، لیکن جیسا کہ گزرا۔ بہتر یہ ہے کہ علاقہ کے سربراہ اور وہ لوگوں کی پنچایت کسی کو نامزد کرے، تاکہ کسی طرح کی پیچیدگی نہ رہے، کیونکہ ”رد المحتار“ میں ہے: ”أفاد أنه كما لا يحل الطلب، لا يحل التولية كما في النهر، وأن ذلك لا يختص بالقضاء بل كل ولاية ولو خاصة كولاية علي وقف أو يتيم، فهي كذلك كما في البحر“ (رد المحتار، كتاب القضاء، مبحث طلب القضاء، ۸، ۴۰) (”الخلاصة“ کی عبارت اس بات کو مفید ہے کہ جس طرح طلب قضا حلال نہیں ہے، اسی طرح طالب کو عہدہ دینا بھی حلال نہیں ہے، جیسا کہ ”المنہج“ نامی کتاب میں ہے، اور یہ کہ طلب عہدہ کی حرمت صرف قضا کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر ولایت خواہ ولایت خاصہ ہی کیوں نہ ہو، جیسے وقف یا یتیم کی ولایت، تو اس کا بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ ”البحر“ میں ہے)۔

## ۴۔ قانون ساز ادارے کی ممبر شپ کا حکم:

قانون ساز اداروں کی ممبر شپ (Membership) موجودہ شرعی سیاست کے اہم مسائل میں سے ہے، جس کی بنیاد مصالح اور مفاسد کی معرفت اور ان کے درمیان صحیح موازنہ پر ہے، چنانچہ معتبر شرعی مصلحت کا تقاضا ہے کہ اچھے اور نیک مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنی چاہئے، لیکن نیت یہ ہونی چاہئے کہ ہم باطل کو حتی الامکان مسترد کریں گے یا اس میں کمی لانے کی کوشش کریں گے، حق کے اعلان اور صحیح فیصلہ کی جدوجہد کریں گے، ظاہری بات ہے کہ اگر تمام نیک مسلمان اس طرح کے اداروں میں شرکت کو ترک کر دیں، تو اس کے نتائج بد پوری ملت اسلامیہ کو بھگتنے پڑیں گے، اور بے دین، بد عقیدہ اور بد کردار لوگ ہی ملک پر مسلط رہیں گے، اور ملک و ملت کی قسمت کے فیصلے وہی کریں گے، اور اس طرح ملک و ملت کی تباہی کا سامان ہم خود فراہم کریں گے، جب ہم اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سیکولر ادارے، پارلیامنٹ اور اسمبلی وغیرہ میں مسلمانوں کی اچھی نیت، نیک ارادے اور صحیح مقصد سے شرکت میں شرعاً معتبر اور راجح مصلحت ہے، اور اس کے مقابلہ میں مفاسد مرجوح ہیں، کیونکہ سیکولر ادارے کی ہر چیز اسلام اور دین مخالف نہیں ہوتی ہے، چنانچہ ڈیموکریسی

(Democracy) کا یہ پہلو کہ قوم کو حکام مقرر کرنے اور ان کا محاسبہ کرنے اور ان کی نگرانی کا حق ہے، یہ نصوص کتاب و سنت میں واضح ہے، البتہ تحلیل و تحریم اور قانون سازی کا مطلق حق منتخب ممبران پارلیامنٹ، اور ایچ ایس ایس (Legislative Assembly) کو دینا یہ شریعت کی نگاہ میں درست نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: ”قل أرأيتم ما أنزل الله لكم من رزق فجعلتم منه حراماً وحلالاً. قل الله أذن لكم أم على الله تفترون“ (یونس: ۵۹) (ان سے کہو، بتاؤ اللہ نے تمہارے لئے جو رزق اتارا تو تم نے اس میں سے کچھ کو حرام ٹھہرایا اور کچھ کو حلال، پوچھو، کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا، یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو؟)۔

لہذا ایک مسلم ممبر پارلیامنٹ کو اس پہلو کو دل سے ناپسند کرنا چاہیے، اور حتی الامکان اپنی قدرت بھر یہ کوشش ہونی چاہئے کہ کوئی فیصلہ خلاف حق صادر نہ ہو، اور کوئی قانون ایسا نہ بن جائے جو شریعت کے اصول سے متصادم ہو، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو جس چیز سے وہ عاجز ہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ان سے مواخذہ نہیں فرمائے گا، کیونکہ غلط کار لوگوں کے ہاتھوں میں سیاست کو چھوڑ دینا اس سے زیادہ خطرناک ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں: ”يجب أن يعلم أن ولاية الناس من أعظم واجبات الدين. بل لا قيام للدين ولا الدنيا إلا بها... فالواجب اتخاذ الإمارة دينا وقربة يتقرب بها إلى الله“ (اس بات کا علم ہونا لازم ہے کہ لوگوں پر حکمرانی دین کے عظیم ترین واجبات میں سے ہے، بلکہ دین اور دنیا کا قیام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے، لہذا واجب ہے کہ حکومت کو دین اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے)۔ آگے مزید رقمطراز ہیں: ”فالواجب على المسلم أن يجتهد في ذلك حسب الوسع فمن ولي ولاية يقصد بها طاعة الله وإقامة ما يمكنه من دينه ومصالح المسلمين، وأقام فيها ما يمكنه من الواجبات واجتناب ما يمكنه من المحرمات، لا يؤاخذ بما يعجز عنه، فإن تولية الأبرار خير للأمة من تولية الفجار. ومن كان عاجزاً عن إقامة الدين بالسلطان والجهاد ففعل ما يقدر عليه من الخير، لم يكلف ما يعجز عنه، فإن قوام الدين بالكتاب الهادي والحديد الناصر“ (ابن تیمیہ، ”مجموع الفتاوى“ ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲) (مسلم پر واجب ہے کہ اپنی طاقت بھر اس حکمرانی کی کوشش کرے، سو جو کسی عہدہ حکمرانی پر فائز کیا جائے، جس کے ذریعہ اللہ کی طاعت کا قصد کر رہا ہو، اور جتنا ممکن ہو اس کے دین اور مسلمانوں کی مصلحتوں کو قائم کرنے کا ارادہ کر رہا ہو، اور اس میں اسے جتنا بس میں ہو واجبات قائم کرے اور وسعت بھر محرمات سے بچے، تو جس چیز سے عاجز ہو اس پر اس سے مواخذہ نہ ہوگا، کیونکہ نیک لوگوں کو حکمران بنانا، بدکاروں کو حکمران بنانے سے امت کے حق میں بہتر ہے، اور جو سلطنت اور جہاد کے ذریعہ دین قائم کرنے سے عاجز ہو، اور وہ اس بھلائی کو انجام دے جس پر قادر ہو، تو جس سے عاجز ہو اس کا مکلف نہ بنایا جائے گا، کیونکہ دین کا قیام ہدایت بخش کتاب (قرآن کریم) اور مدد کرنے والے لوہے یعنی ہتھیار سے ہے)۔ بلاشبہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبیلہ، خاندان اور ہم وطن کفار کو دفاع کا ذریعہ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام سے سنگساری ان کے کنبہ کے ذریعہ دفع کیا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”قالوا يا شعيب ما نفقه كثيراً مما تقول وإنا لنراك فينا ضعيفاً ولو لا رهطك لرجمنالك وما أنت علينا بعزيز“ (ہود: ۹۱) (اے شعیب، جو باتیں تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور وجود خیال کرتے ہیں، اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تو تم کو سنگسار کر دیتے، اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں)، اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے روابط پیدا کرنے کی کوشش کرنا جس سے اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہو سکے مطلوب ہے، کیونکہ اصلاح کی کوشش قدرت اور امکان بھر ہی مطلوب ہے اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى“ (بخاری شریف حدیث نمبر: ۱۰، ۵۳، ۲۵۲۹، ۵۰۷۰، ۶۲۸۹، ۶۹۵۳، مسلم شریف: ۱۹۰۷) (عمل کا دار و مدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو وہ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے)۔ لہذا حق کی تائید اور حتی الامکان باطل کی عدم موافقت کی نیت سے سیکور ادارے جیسے پارلیامنٹ وغیرہ کا ممبر بننا درست ہے، اس کی تائید ان فقہی قواعد سے بھی ہوتی ہے: (۱) ”ارتكاب أخف الضررين في سبيل التخلص من أشدهما“ (دو ضرر میں سے زیادہ ہلکے کا ارتکاب کرنا ان میں سے زیادہ سخت ضرر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے درست ہے)، (۲) ”بعض الشر أهون من بعض“ (بعض شر دوسرے بعض سے ہلکے ہوتے ہیں)، (۳) ”تحصيل المصلحة ودفع المضرة مطلوب“ (مصلحت کی تحصیل اور مضرت کا ازالہ مطلوب ہے)۔

اور پارٹی کے وہیپ (Whip) جاری کرنے کی صورت میں چونکہ وہ مجبور ہے، لہذا ضمیر کی آواز پر روٹ دینے کا اختیار کھونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نجات سے امید ہے کہ وہ ماخوذ نہ ہو، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ”من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان ولكن من شرح بالكفر صدراً فعليهم غضب من الله، ولهم عذاب عظيم“ (النحل: ۱۰۶) (جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ کا کفر کرے گا بجز

اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو، اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو کفر کے لئے سینہ کھول دے گا تو ان پر اللہ کا غضب اور ان کے لئے سنگین عذاب ہے۔

۵۔ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے کا حکم:

غیر الہی قانون کی اکثر دفعات شریعت سے متصادم نہیں ہوتی ہیں، البتہ بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، ایسی صورت میں معتبر شرعی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے میں مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ مجبوری کی حالت ہے جس میں ہر طرف نظامہائے باطل کا تسلط ہے، لہذا ایسے وقت میں آدمی اپنے امکان بھر ہی مکلف ہے جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے تحریر فرمایا ہے: ”فمن ولی ولایة یقصد بها طاعة الله وإقامة ما یمكنه من دینہ ومصالح المسلمین، وأقام فیہا ما یمكنه من الواجبات، واجتناب ما یمكنه من المحرمات، لایؤاخذ بما یعجز عنه، فإن تولیة الأبرار خیر للأمة من تولیة الفجار، ومن كان عاجزاً عن إقامة الدین بالسلطان والجهاد ففعل ما یقدر علیہ من الخیر، لعل ینکف ما یعجز عنه“ (ابن تیمیہ، ”مجموع الفتاویٰ“ ۲۸:۲۹۶) (جو سو کسی عہدہ حکومت پر فائز ہو، جس کے ذریعہ اللہ کی اطاعت کا قصد کر رہا ہو، اور جتنا ممکن ہو اس کے دین اور مسلمانوں کی مصلحتوں کو قائم کرنے کا ارادہ کر رہا ہو، اور اس میں اس کے امکان میں جتنا ہو، واجبات قائم کرے اور اپنی وسعت بھر محرمات سے بچے تو جس چیز سے عاجز ہو، اس پر اس سے مواخذہ نہ ہوگا، اس لئے کہ نیک لوگوں کو حکمراں بنانا، بدکاروں کو حکمراں بنانے سے امت کے حق میں بہتر ہے، اور جو سلطنت اور جہاد کے ذریعہ دین قائم کرنے سے عاجز ہو، اور وہ اس بھلائی کو انجام دے جس پر قادر ہو، تو جس سے عاجز ہو اس کا مکلف نہ ہوگا)۔

البتہ خلاف شریعت دفعات کو دل سے ناگوار جانے، جیسا کہ ارشاد الہی ہے: ”إلا من أکره وقلبه مطمئن بالإیمان“ (النحل: ۱۰۶) (سوائے اس شخص کے جس پر جبر کیا گیا ہو، اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو) اور چونکہ مظلوم حلف اٹھانے والے کی نیت ہی کا اعتبار ہوتا ہے لہذا اس سلسلہ میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے، چنانچہ ”ہندیہ“ میں ہے: ”ذکر عن إبراہیم النخعی أنه قال: الیمین علی نية الحالف إذا كان مظلوماً، وإن كان ظالماً فعلى نية المستحلف، وبه أخذ أصحابنا“ (عالمگیری ۲: ۵۹) (ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ قسم حلف اٹھانے والے کی نیت کے مطابق ہوگی جبکہ وہ مظلوم ہو، اور اگر ظالم ہو تو قسم طلب کرنے والے کی نیت کے مطابق ہوگی، اور ہمارے علماء کا اسی پر عمل ہے)۔

خلاصہ یہ کہ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا کفر کی ہمدردی اور اسلام سے خروج نہیں ہے۔

## ۶۔ بائبل پر حلف لینے کا حکم:

یہود و نصاریٰ کا تیرہ ہمیشہ پیر ہا ہے کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان کرتے رہتے ہیں، چنانچہ بہت سی دل آزار چیزیں مسلمانوں کو ان کی طرف سے دیکھنی اور بہت سی اذیت رساں، تکلیف دہ اور دل دکھانے والی باتیں سنی پڑتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ولتسمعن من الذین أوتوا الكتاب من قبلکم ومن الذین أشركوا أذی کثیراً، وإن تصبروا وتتقوا فإن ذلك من عزم الأمور“ (آل عمران: ۱۸۶) (اور تمہیں ان لوگوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی، اور ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے شرک کیا، بہت سی تکلیف دہ باتیں سنی پڑیں گی، اور اگر تم ثابت قدم رہے، اور تم نے تقویٰ کو ملحوظ رکھا، تو بے شک یہ چیز صبر و عزمیت کے حالات میں سے ہے)۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ اہل کتاب سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنا، ان کے طعن و تشنیع، ان کے الزامات، ان کے بیہودہ طرز کلام اور ان کی جھوٹی نشر و اشاعت کے مراحل سے گزرنا، اور شان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کی گستاخانہ گفتگو کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ سب ان کا پرانا حربہ ہے، لہذا مسلمانوں کو اجتماعی اور منظم کوشش کے ذریعہ اپنے اس حق کو تسلیم کرانا چاہئے کہ وہ اپنی مذہبی کتاب مقدس قرآن کریم پر حلف لیں گے۔

البتہ جب تک یہ نظم نہ ہو جائے، تو چونکہ بائبل بھی محرف ہونے کے باوجود کتاب الہی میں سے ہے، تو اس پر حلف لینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”والذین یدعون بما أنزل إلیک وما أنزل من قبلک“ (البقرہ: ۲) (اور جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر اتاری گئی ہے)۔



۷۔ سیکولر پارٹیوں میں شرکت کا حکم:

اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر جائز ذریعہ اور مشروع طریقہ سے فائدہ پہنچانا درست ہے، لہذا منشور کے اکثر دفعات پر نظر رکھتے ہوئے ایسی سیکولر پارٹی میں شریک ہونے کی گنجائش ہے جو مسلم مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہو، بشرطیکہ نیت انسانیت کی بھلائی، ملک و ملت کی فلاح و بہبود اور مسلمانوں کی خدمت اور ان کے حقوق کی تحصیل ہو، ساتھ ہی شریک ہونے والے لمبر کی حتی الامکان کوشش ہونی چاہئے کہ مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر دفعات کو بدلوائے، اور باطل کو مسترد کرے یا اس میں کمی لانے کی جدوجہد کرے، حتی الامکان حق کا اظہار کرے، نیز باطل کے فروغ یا کسی حق کو مسترد کرنے کے عمل میں اپنی طاقت بھر شرکت نہ کرے، یا کم از کم موافقت نہ کرے، یا دل سے ہی ناپسند کرے، چنانچہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں:

پھر حکومت و امارت اگرچہ جائز یا مستحب یا واجب ہو، لیکن کبھی متعین شخص کے حق میں اس کے علاوہ چیز زیادہ واجب یا مستحب ہوتی ہے، سو اس وقت دو بھلائی میں سے افضل کو کبھی وجوبی طور سے اور کبھی استحبانی طور سے مقدم رکھا جائے گا، اور اسی باب سے حضرت یوسف صدیق علیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مصر کے بادشاہ کے خزانہ پر مامور ہونا ہے، بلکہ ان کی یہ تجویز کہ انہیں سرزمین مصر کے خزانے پر مامور کر دیا جائے، جبکہ بادشاہ اور اس کی قوم کافر تھے، جیسا کہ ارشاد باری ہے (اور یوسف اس سے پہلے تمہارے پاس واضح تعلیمات کے ساتھ آئے، تو تم ان کی لائی ہوئی باتوں کی طرف سے برابر شک میں رہے)، اور اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی جانب سے فرمایا: (اے میرے جیل کے ساتھیو، کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری)، اور یہ بات معلوم ہے کہ ان لوگوں کی کفر کے ساتھ مال پر قبضہ اور اسے بادشاہ کے مصاحبین اور اس کے گھر والوں اور اس کے لشکر اور رعیت پر صرف کرنے کے سلسلہ میں کوئی عادت اور کوئی طریقہ رہا ہوگا، اور وہ طریقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقہ اور عدل کے مطابق جاری نہ رہا ہوگا، اور یوسف علیہ علیہ السلام کے لئے ممکن نہ تھا کہ ہر وہ چیز کڑا لیں جو چاہیں اور یہ وہی ہے جسے وہ اللہ کے دین کے مطابق خیال کرتے تھے، کیونکہ ان کی قوم نے ان پر ایمان لانا قبول نہیں کیا تھا، لیکن انہوں نے ممکنہ عدل و انصاف اور احسان کو انجام دیا، اور عہدہ کی وجہ سے اپنے گھر والوں میں سے اہل ایمان کی وہ عزت افزائی کر سکے، جو اس عہدہ کے بغیر نہ کر سکتے تھے، اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے (تو اللہ سے ڈرتے رہو جہاں تک ہو سکے)، سو جب دو واجب جمع ہو جائیں، اور ان کے درمیان تطبیق ممکن نہ ہو، اور زیادہ مؤکد واجب کو مقدم رکھا جائے، تو اس حالت میں دوسرا واجب نہ ہوگا، اور زیادہ مؤکد کو انجام دینے کی وجہ سے اسے ترک کرنے والا حقیقت میں واجب کو چھوڑنے والا نہ ہوگا، اور ایسے ہی جب دو حرام جمع ہو جائیں کہ ان دونوں میں سے بڑے حرام کا ترک ان دونوں میں سے کمتر کے ارتکاب کے بغیر نہ ہو، سو اس حالت میں کمتر حرام کو کرنا حقیقت میں حرام نہ ہوگا، اگرچہ مطلق حقیقت کے اعتبار سے واجب کا ترک اور اسے حرام کے ارتکاب کا نام دیا جائے، پھر بھی یہ نقصان دہ نہیں، اور اس صورت حال میں کہا جائے گا کہ یہ عذر کی وجہ سے واجب کا ترک ہے، اور راجح مصلحت یا ضرورت کی بنا پر حرام کا ارتکاب ہے، یا سخت حرام کو دور کرنے کے لئے کمتر حرام کا ارتکاب ہے، اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اس شخص کے حق میں کہا جاتا ہے جو نماز سے سوجائے یا بھول جائے کہ اس نے مطلق و کامل وقت کے علاوہ میں بہ طور قضاء نماز ادا کی ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جو نماز سے سوجائے یا اسے بھول جائے تو جب اسے یاد آجائے تو اسے پڑھ لے، کیونکہ یہی اس کا وقت ہے، اس کے لئے اس کے علاوہ کفارہ نہیں ہے۔“

اور یہ تعارض کا باب بہت ہی وسیع باب ہے، خاص طور سے ان اوقات اور جگہوں میں جہاں نبوت اور خلافت نبوت کے آثار کم ہو جائیں، تو وہاں یہ مسائل بکثرت رونما ہوتے ہیں، اور جب بھی نبوت کے آثار میں کمی میں اضافہ ہوگا تو ان مسائل میں اضافہ ہوگا، اور اس کا پایا جانا امت کے درمیان فتنہ کے اسباب میں سے ہے، کیونکہ جب نیکیاں برائیوں کے ساتھ گنڈ ہو جائیں، تو اشتباہ اور تلازم پیدا ہوگا، چنانچہ کچھ لوگ نیکیوں پر نظر کریں گے، اور اس پہلو کو ترجیح دیں گے، خواہ یہ سنگین برائیوں کو شامل ہو، اور کچھ لوگ برائیوں پر نظر کریں گے اور دوسرے پہلو کو ترجیح دیں گے، اگرچہ اس میں بڑی نیکیوں کا ترک ہو، اور معتدل حضرات جو دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں، کبھی ان کے یا ان کی اکثریت کے لئے منفعت اور مضرت کی مقدار واضح نہیں ہوتی ہے، یا ان کے لئے ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان حضرات کو نہیں پاتے جو ان کی نیکیوں پر عمل اور برائیوں کے ترک پر مدد کریں، کیونکہ خواہشات رایوں سے مل جاتی ہیں، اسی وجہ سے حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ شہادت رونما ہونے کے وقت دور رس نگاہ کو، اور خواہشوں اور شہوتوں کے پیش آنے کے وقت کامل عقل کو پسند فرماتا ہے۔“

سو ایک عالم کے لئے مناسب ہے کہ ان مسائل کی انواع و اقسام پر غور کرے، چنانچہ ان بعض مسائل میں کبھی جیسا کہ پہلے میں نے بیان کیا۔ بعض

چیزوں میں ممانعت اور حکم کے وقت سکوت واجب ہوگا، نہ کہ حلال اور حرمت کو ساقط قرار دینا، جیسے کسی شخص کو طاعت کا حکم دینے میں اس سے بڑی معصیت کا ارتکاب ہو، تو اس معصیت کے پیش آنے کو دور کرنے کے لئے اس کو طاعت کا حکم دینے کو چھوڑ دے، مثلاً تم کسی مجرم کو ظالم حکمران کے حوالہ کرو، تو وہ اس پر سزا میں ایسی زیادتی کرے جس کا ضرر اس کے گناہ سے زیادہ ہو، اور جیسے بعض برائیوں سے روکنے میں ایسی نیکی کا ترک لازم آئے، جس کا نفع ان برائیوں کے ترک سے زیادہ ہو، تو وہ روکنے سے خاموش رہے، اس اندیشہ سے کہ اس چیز کا ترک لازم آئے جس کے کرنے کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، جو اس کے نزدیک اس برائی کے محض ترک سے زیادہ سنگین ہے، چنانچہ عالم کبھی حکم دیتا ہے اور کبھی منع کرتا ہے، اور کبھی مباح قرار دیتا ہے، اور کبھی حکم دینے یا منع کرنے یا مباح قرار دینے سے خاموش رہتا ہے، جیسے خالص یا رائج نیکی کا حکم یا خالص یا رائج فساد سے ممانعت، اور تعارض کے وقت۔ جیسا کہ گزرا۔ بقدر امکان رائج کو ترجیح دی جائے گی (مسند الشہاب للقضاعی ۱۵۲/۲، انہدالکبیر للشیخ ص: ۳۳۹، اور اس کی سند میں کلام ہے، اور "انفاثہ لہامان" ۱۶۲/۲، میں ابن قیم نے اسے مرسل قرار دیا ہے (ابن تیمیہ احمد بن عبد الحلیم "مجموع الفتاویٰ" ۵۶۲۰-۶۰، ط: ۳، دارالوفاء ۱۳۲۶ھ-۲۰۰۵ء)۔

الغرض سیکولر پارٹی میں شرکت کفر اور نظام باطل کی ہمدردی نہیں ہے، بلکہ حالات اور مصلحت کا تقاضا ہے، چنانچہ فقہ عبداللہ محفوظ بن بیہ کی رائے ہے: "إن مشاركة المسلمين الذين يعيشون في الغرب في العمل السياسي هناك سواء بالترشيح أو الانتخاب لا تعني بأي حال من الأحوال ولاء للكفر، ولا خروجاً عن الإسلام، بل هي مشاركة تقتضيها ظروف وجودهم في هذه البلاد، وحق من حقوق المواطنة المشروعة لهم، وهذا لا شيع فيه، وهناك أحداث في السيرة النبوية تؤكد ذلك" (علی بن نایف شحود "الخلاصة في فقه الاقليات" ص: ۱۲۳) (مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کی سیاسی عمل میں شرکت خواہ نامزدگی یا انتخاب کے ذریعہ ہو، کسی حالت میں اس کا مطلب کفر کی ہمدردی اور اسلام سے خروج نہیں ہے، بلکہ یہ ایسی شرکت ہے جس کا تقاضا ان ممالک میں ان کے وجود و بقا کے حالات کرتے ہیں، اور بیان کی شہریت کے جائز حقوق میں سے ہے، اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ سیرت نبویہ میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو اس کی تاکید کرتے ہیں)۔

البتہ سیکولر نظام کی پارٹی میں شرکت کرنے والا جس چیز سے مجبور ہو، اور اس کے اختیار میں نہ ہو، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ نہ فرمائے گا، کیونکہ اس کی نیت مسلمانوں کو نفع پہنچانا، انسانیت کی خدمت اور ملت کے مصالح کا تحقق اور مفساد کا ازالہ ہے، لیکن مخالف اسلام دفعات کو اسے چاہئے کہ دل سے ناپسند کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" (النحل: ۱۰۶) (سوائے اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو، اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو)۔

خلاصہ یہ کہ اس طرح کی سیکولر پارٹیوں میں شرکت جائز ہے، البتہ اس کا جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ شریک ہونے والے کی نیت اپنا پیٹ بھرنا اور مسلمانوں کو ان پارٹیوں کا مہرہ بنا کر بے وقوف بنانا نہ ہو، بلکہ نیت اچھی ہو، مسلمانوں کے حقوق کا دفاع مقصود ہو، مظلومین سے ظلم کا خاتمہ مطلوب ہو، جہاں تک ہو سکے عدل و انصاف قائم کرنے کی کوشش ہو، شرک کو کم کرنے اور ظالموں، شریروں اور بد معاشوں کو قابو میں کرنے کا ارادہ ہو، چنانچہ ابن تیمیہ سے پوچھا گیا کہ ایک فوجی شخص ظالمانہ نظام کے تحت خدمت کرنے سے دستبردار ہونا چاہتا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: "إذا كان للمسلمين به منفعة وهو قادر عليها، لم ينبغ له أن يترك ذلك لغير مصلحة راجحة على المسلمين" (ابن تیمیہ، "إقامة الدليل على إبطال التحليل" ۳، ۲۳۹) (اگر اس کے ذریعہ مسلمانوں کا فائدہ ہو، اور وہ اس فائدہ کو پہنچانے پر قادر ہو، تو اس کے لئے مناسب نہیں کہ مسلمانوں کے حق میں رائج مصلحت کے بغیر اسے چھوڑ دے)۔

## ۸۔ مسلم دشمن پارٹیوں میں شرکت کا حکم:

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں، اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، اس پارٹی میں شریک ہونا اور اس کا ممبر بننا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ گناہ اور ظلم و استحصال میں اس کے ساتھ تعاون ہے، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدہ: ۲) (گناہ اور تعدی و زیادتی میں تعاون نہ کرو)، اور ارشاد الہی ہے: "يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الذين اتخذوا دينكم هزوا ولعباً من الذين أتوا الكتاب من قبلكم والكفار أولياء، واتقوا الله إن كنتم مؤمنين" (المائدہ: ۵۷) (اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور نہ کفار

کو، اور اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو، اور فرمان الہی ہے: ”وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا“ (النساء: ۱۲۱) (اور اللہ کافروں کو مؤمنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا)۔

اور اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ ایسی مسلم دشمن سیاسی پارٹی کے ایجنڈا ساز حضرات مسلم ممبران کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، اور نہ ہی ان کی بات کو قابل التفات سمجھتے ہیں، بلکہ الٹا ان کو مسلمانوں کو بہلانے اور بے وقوف بنانے کے لئے مہرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ بے چارہ اپنی کرسی کی فکر میں ملت کی ہمدردی، غمخواری اور فلاح و بہبود کو بھول جاتے ہیں، بلکہ اپنی پارٹی کی جعلی اچھائی اجاگر کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں، چنانچہ مسلم دشمن سیاسی پارٹی میں شامل نام نہاد مسلمانوں کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے، اور اس بات کی منہ بولتی تصویر کہ یہ حضرات ظالموں اور جاہلوں کی مجلس میں بیٹھ کر خود ان ہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ان کی نگاہ میں حق و باطل کی تمیز نہیں رہ جاتی ہے، اور کفر و سرکشی میں مبتلا لوگوں کی تاثیر سے اپنے فرض منصبی کو بھول جاتے ہیں، اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ملت کے مفاد کو قربان کر دیتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ملت کو ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ“ (ہود: ۱۱۳) (اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جو، جنہوں نے ظلم کیا کہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ پکڑے)۔

### ۹۔ مسلم اقلیت کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کا حکم:

اسلام ایک منظم دین ہے، لہذا مسلمانوں کا منظم، باشعور اور تحریر کی ذہن و فکر رکھنے والا ہونا بہت ضروری ہے کہ اسی کے ذریعہ مصالح اور مفاسد کے درمیان موازنہ کرنے کی قدرت ہوتی ہے اور مناسب صورت حال کو ترجیح دینے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”علیکم بالجماعة وایاکم والفرقة، فإن الشيطان مع الواحد، وهو من الاثنین أبعد، من أراد بجموحۃ الجنة فلیلزم الجماعة“ (سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۱۶۵، اور اس کی سند صحیح ہے) (تم پر جماعت کو لازم پکڑنا واجب ہے، اور افتراق و انتشار سے دور رہو، کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ رہتا ہے، اور وہ دو اشخاص سے زیادہ دور رہتا ہے، جو جنت کا درمیانی حصہ چاہے اسے جماعت کو لازم پکڑنا چاہئے)۔

اس لئے میری نظر میں مسلم اقلیت کے لئے علاحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل نہایت ضروری ہے، تاکہ ملک و ملت کی صحیح تعمیر و ترقی ہو سکے، کیونکہ موجودہ سیاسی پارٹیوں کے بس میں فساد کا ازالہ نہیں، چنانچہ ہر طرف لوٹ کھسوٹ، رشوت اور استحصال کی گرم بازاری ہے، امن و امان کا فقدان ہے، لہذا ایک ایسی سیاسی پارٹی کی تشکیل جو ملک و ملت کو صحیح راہ پر گامزن کر سکے، اور مسلمانوں کی تربیت کر کے انہیں ووٹ کی قیمت سمجھا سکے، اور منتشر اور بکھری ہوئی ملت کی شیرازہ بندی کر سکے، اور حتی الامکان حق کی تائید اور خیر و بھلائی کی اشاعت میں حصہ لے سکے نہایت ضروری ہے۔

البتہ مسلمانوں کو موجودہ صورت حال میں بڑی حکمت، دانائی اور دانشمندی سے کام لیتے ہوئے ملک کے مظلوم، دبے پچلے اور استحصال زدہ طبقات کو ساتھ لے کر کام کرنا ہوگا۔ رہا یہ اندیشہ کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقے میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے، اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھالیتی ہیں، تو یہ ہماری بے تدبیری، سیاسی شعور سے دوری اور سیاسی حکمت عملی سے محرومی کا نتیجہ ہے، اگر مسلمان سوجھ بوجھ، حکمت عملی، ہوشمندی اور دانشمندی کا ثبوت دیں تو ہم بھی غیر مسلم ووٹوں کو منتشر کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جہاں تک سیکولر ایجنڈے کے تحت کام کرنے کا تعلق ہے تو اس میں ہر چیز دین اور اسلام مخالف نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کے بڑے حصہ کا تعلق عدل و انصاف، سماجی مساوات اور خیر و بھلائی کی نشر و اشاعت سے ہوتا ہے، چنانچہ ہماری نیت یہ ہونی چاہئے کہ ہم حتی الامکان ملک کے اندر عدل و انصاف، امن و امان، حق پرستی اور باطل پرستی سے اجتناب کی فضا قائم کریں گے، استحصال اور ظلم کو دور کریں گے، سب کی خوشحالی اور سب کے ساتھ مساوی اور مبنی بر انصاف سلوک اور طرز عمل اپنائیں گے اور کسی کو ذلیل و خوار نہ ہونے دیں گے، اگر ہماری نیت خیر اور بھلائی کی ہوگی تو ہم جس چیز سے عاجز ہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں ہم سے اس کے بارہ میں مواخذہ نہ فرمائے۔

### ۱۰۔ الیکشن میں خواتین کا کردار و نمائندگی:

خواتین دونگ میں حصہ لے سکتی ہیں، کیونکہ حق رائے دی، جس طرح مرد کو حاصل ہے، اسی طرح خواتین کو بھی حق رائے دی حاصل ہے، اور اس کی دلیل ”وَأمرهم شورى بینہم“ (الشوری: ۲۳۸) (اور ان کا نظام شوری پر ہے) ہے، جو عورت اور مرد دونوں کو شامل ہے، نیز ووٹ شہادت ہے۔ جیسا کہ گزرا۔

اور شہادت کی اہلیت عورت میں بھی ہے، ساتھ ہی اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کی وفات کے بعد امیر المؤمنین کے انتخاب میں خواتین کی بھی رائے لی تھی، چنانچہ ابن کثیر رقمطراز ہیں: ”ثم هض عبد الرحمن بن عوفؓ يستشير الناس فيهما، حتى خلص إلى النساء المخدرات في حجالهن...“ (ابن کثیر، البداية والنهاية ۴: ۱۲۴، ط: ۱، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۸۸-۱۴۰۸ء) (پھر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ حضرت علی اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرنے لگے یہاں تک کہ جملہ عروسی پردہ نشین خواتین تک پہنچ گئے)۔ اگر انتخاب خلیفہ میں خواتین کی رائے کی کوئی تاثیر نہ ہوتی تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ان سے رائے نہ لیتے۔

### سیاست میں عورتوں کی حصہ داری:

خواتین قانون ساز اداروں، اسمبلی، پارلیامنٹ، اور پنچایت اور دیگر سیاسی اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں، کیونکہ ان اداروں کا کام ملک کے اجتماعی معاملات سے متعلق فیصلہ کرنا اور حکومت کا نظم و نسق چلانا، نیز قانون ساز اداروں کا کام قانون سازی کرنا ہے، اور یہ سب وہ امور ہیں جن میں عورت کی شرکت سے مانع کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ اجتہاد کرنا اور فتویٰ دینا عورت کے لئے بھی درست ہے، اس لئے کہ عورت ہونا افتاء اور اجتہاد کی اہلیت سے مانع نہیں ہے، چنانچہ امام ماوردی تحریر کرتے ہیں: ”فإن رد إلى المرأة تقليد قاض لم يصح؛ لأنه لما لم يصح أن تكون والية لم يجز أن تكون مولية، وإن رد إليها اختيار قاض جاز؟ لأن الاختيار اجتهاد لا تمنع منه الأنوثة كالفتيا“ (ماوردی، ابو الحسن علی بن محمد شافعی (و: ۴۵۰ھ) ”أدب القاضي“ ۱: ۲۲۸، تحقیق: محیی بلال السرحان، بغداد، مطبعة العاني ۱۹۴۲ھ) (سواگر عورت کو قاضی متعین کرنے کا اختیار دیا جائے تو یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ جب اس کا حاکم ہونا صحیح نہیں تو عہدہ حکومت پر کسی کو متعین کرنے والی ہونا بھی جائز نہیں ہے، اور اگر اسے قاضی کو منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ انتخاب کا تعلق منصب کی اہلیت رکھنے والے کے سلسلہ میں اجتہاد کرنے سے ہے اور عورت ہونا فتویٰ دینے کی طرح اجتہاد سے مانع نہیں ہے)۔

اگرچہ امام ماوردیؒ دیگر جمہور علماء اسلام کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ حاکم ہو، لیکن انہیں بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ عورت کے اندر فتویٰ دینے اور اجتہاد کرنے کی صلاحیت ہے، اور یہ ظاہری بات ہے کہ قانون سازی میں اسی کی ضرورت ہے، نیز اجتہاد و افتاء کے دائرہ میں حکومت کے معاملات اور رعایا کے ساتھ حاکم کے تعلقات بھی آتے ہیں، لہذا امیری رائے میں خواتین قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں، اسی طرح دیگر سیاسی اداروں کی ممبر بھی بن سکتی ہیں، کیونکہ ان اداروں کا کام ملک کی تعمیر و ترقی کے منصوبے بنانا اور ان کی تنفیذ کروانا ہے، اور اس سلسلہ میں باہم مشورہ سے صحیح لائحہ عمل طے کرنا ہے، چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع سے خود نبی کریم ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے مشورہ لیا (بخاری شریف حدیث نمبر: ۲۷۳۱-۲۷۳۲)، اور اس کی شرح میں ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں: ”وفي الحديث دلالة على فضل المشورة، وأن الفعل إذا انضح إلى القول كان أبلغ من القول المجرد، وفي الحديث دلالة على جواز مشاورة المرأة الفاضلة، وفضل أمر سلمة رضي الله عنها، ووفور عقلها“ (عسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی بن محمد (و: ۵۸۴ھ) ”فتح الباری بشرح صحيح البخاری“ ۵: ۲۳۷، بیروت، دار المعرفة، ۱۴۰۹ھ) (اس حدیث پاک سے مشورہ کی خوبی کا پتہ چلتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ قول کے ساتھ فعل و عمل کی شمولیت محض قول سے زیادہ مؤثر ہے، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باکمال عورت سے مشورہ کرنا جائز ہے، اور اس حدیث شریف سے حضرت ام سلمہؓ کی فضیلت اور کمال عقل کا بھی پتہ چلتا ہے)۔

نیز اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ”شفاء بنت عبد اللہ عدویہ“ کو مدینہ کے بازار میں احتساب کے عہدہ پر متعین کیا تھا (ابن حجر عسقلانی، ”الاصابة“ ۱۲/۷، بیروت، دار الکتب العلمیہ)۔

البتہ خواتین کے لئے شرعی پردے کی پابندی ضروری ہے، نیز لوچدار انداز گفتگو اختیار کرنے اور فاسقات و فاجرات کا طرز کلام اپنانے سے پرہیز، اور اجنبیوں سے بات کرنے میں پوری احتیاط، اور ہر اس حرکت سے اجتناب لازم ہے جو مردوں کے جذبات میں آگ لگائے، ساتھ ہی ان پر لازم ہے کہ ان اداروں میں بن ٹھن کر نہ آئیں اور مردوں سے خوب گھل مل کر بات چیت نہ کریں۔ ہاں، یہ خیال رہے کہ عورت پر گھر اور بال بچوں کی ذمہ داری واجب یعنی کادرجہ رکھتی ہے اور اسمبلی، پارلیامنٹ اور دیگر سیاسی اداروں کے اعمال میں شرکت واجب کفائی ہے، لہذا واجبات کے تصادم کے وقت واجب یعنی مقدم ہوگا۔

واضح رہے کہ بعض حضرات نے مجالس قانون ساز اور دیگر سیاسی اداروں میں عورت کی ممبر شپ کی صحت پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ احناف کے نزدیک عورت قاضی بن سکتی ہے، جیسا کہ ”البحر الرائق“ میں ہے: ”وتقضى المرأة في غير حد وقود؛ لأنها أهل للشهادة في غيرهما فكانت



## الیکشن میں شرکت کا حکم

مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں ووٹ کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے سے اس کی چار حیثیتیں سامنے آتی ہیں: اول: شہادت، دوسری: سفارش، تیسری: مشورہ، چوتھی: وکالت اور اگر اسلامی ملک ہو تو اس کی ایک حیثیت بیعت کی بھی ہوگی۔

پہلی حیثیت شہادت:

یعنی مشاہدہ کی بناء پر کسی شے کے برحق اور صحیح ہونے کی خبر دینا شہادت ہے، پس کسی امیدوار کو ووٹ دینا دراصل اس بات کی گواہی ہے کہ وہ فلاں منصب کا اہل ہے، دیانتداری کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو ادا کر سکتا ہے، اس میں قوم و ملت کا درد ہے، خدمت خلق کا جذبہ ہے، وہ ملک کا خیر خواہ ہے، ایسے امیدوار کو ووٹ دینا سچی گواہی ہے، اس کے برعکس نااہل، خائن، مجرم پیشہ، بلکہ پولیس کے نامزد اور نامور مجرم اور خود غرض امیدوار کو ووٹ دینا جھوٹی گواہی ہے اور جھوٹی گواہی دینا گناہ کبیرہ ہے۔

قرآن مجید اور حدیث پاک میں شرک اور جھوٹی شہادت دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح شرک اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور گناہ کبیرہ ہے، ویسے ہی جھوٹی شہادت بھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور“ (سورتوں کی گندگی سے بچتے رہو اور جھوٹی بات سے بچتے رہو)۔ ایک موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صحابہ رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”کیا میں تم لوگوں کو اکبر الکبائر (سب سے بڑا گناہ) نہ بتاؤں؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیوں نہ یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے، اور فرمایا: ”سنو! شہادت زور“ یعنی جھوٹی گواہی اور برابر دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم لوگوں کو خیال ہوا کہ کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جاتے“ (بخاری، باب ما قبل فی شہادۃ الزور، ج: ۱، ص: ۳۶۲)۔

سچی شہادت دینا جہاں اجر و ثواب اور احیاء حق کا باعث ہے، وہیں قومی و مذہبی فریضہ بھی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط“ (سورہ بقرہ: ۲۸۳) (اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے اور عدل کے ساتھ شہادت دینے والے بنے رہو)۔ ایک طرف سچی شہادت پر جنت کا وعدہ فرمایا گیا ہے، تو دوسری طرف سچی گواہی کے چھپانے کو جرم عظیم اور سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے۔

”ولا تکتبوا الشہادۃ ومن یکتبھا فإنه آثم قلبہ“ (سورہ بقرہ: ۲۸۳) (اور گواہی مت چھپاؤ، اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بیشک اس کا دل گنہگار ہے)۔

اس لئے نااہل امیدوار کو ووٹ دینے سے احتراز کرنا اور مستحق و لائق اور باصلاحیت امیدوار کو ووٹ دینا واجب ہے۔

دوسری حیثیت سفارش:

سفارش کی حقیقت یہ ہے کہ جس کی سفارش کی جائے، اس کو فائدہ پہنچے (تفسیر قرطبی ۱۹۰/۵)۔

سفارش کی دو قسمیں ہیں: اول: درست سفارش۔ دوم: ناحق و نادرست سفارش۔

پہلی قسم: یعنی درست سفارش جس کو قرآن کی زبان میں ”شفاعت حسنہ“ کہتے ہیں، اس میں سفارش کرنیوالا اور جس کے حق میں سفارش کی جاتی ہے،

۱۔ استاذ المعهد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

دونوں ماجور ہوتے ہیں، بلکہ ایک طرح کا یہ صدقہ جاریہ ہے کہ جب تک وہ شخص سفارش کردہ شی کو بروئے کار لاتا رہے گا تب تک سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

دوسری قسم: یعنی ناجائز و ناحق سفارش جس کو قرآن کی زبان میں ”شفاعت سیئہ“ کہتے ہیں۔ اس میں شفاعت حسنہ کے برعکس سفارش کرنے والا اس دوسرے شخص کے گناہ و جرم میں شریک متصور ہوتا ہے، جس کے حق میں اس نے سفارش کی ہے اور اللہ کے یہاں اس کا بھی مواخذہ ہوگا، ان ہی باتوں کو قرآن نے اپنے مجزا لفاظ و اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے:

”من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها، ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها، وكان الله على كل شيء مقبلاً“ (نساء: ۵۸) (جو کوئی اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی بری سفارش کرے گا اس پر اس میں سے بار رہے گا اور اللہ ہر چیز پر طاقت رکھنے والا ہے)۔

وہ جس امیدوار کو ووٹ دیتا ہے اس کے بارے میں ایکشن کمیشن بورڈ سے سفارش کرتا ہے کہ فلاں پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا اہل ہے اور وہ اس عہدہ کو بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے، پس جو ووٹر اچھے اخلاق و کردار کے مالک، خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار، ملک و ملت کے بہی خواہ، امانتدار اور باصلاحیت امیدوار کو ووٹ دے گا، وہ اللہ کے یہاں ماجور ہوگا، خواہ وہ امیدوار کامیاب ہو یا کامیاب نہ ہو۔ اگر وہ ایکشن میں کامیاب ہو گیا، تو وہ اپنے عہدہ پر فائز رہتے ہوئے جتنے بھی رفاہی کام اور کار خیر کرے گا اور اس سے متعلق لوگوں کے حقوق کو بروئے کار لائے گا، ان سب کا ثواب اس ووٹر کو بھی ملے گا۔ اس کے برعکس مجرم زمانہ، اخلاق و کردار سے بے بہرہ، خدمت خلق کے جذبہ سے عاری، ملک و ملت کے بدخواہ، خائن اور نااہل امیدوار کو ووٹ دے گا تو وہ گنہگار اور اللہ کے یہاں جو ابدہ ہوگا۔ اگر وہ امیدوار ایکشن میں کامیاب ہو گیا تو اس عہدہ پر وہ کر جو ظلم و زیادتی کرے گا اور لوگوں کے حقوق کو تلف کرے گا ان سب گناہوں میں وہ بھی سہیم و شریک ہوگا اور اس کی سزا پانے کا شق ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ”وكان الله على كل شيء مقبلاً“ (نساء: ۵۸) (اور اللہ ہر چیز پر طاقت رکھنے والا ہے) کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اگر اچھی اور برحق سفارش ہوگی تو اللہ اجر و ثواب سے نوازنے پر قادر ہے، اسی طرح جو ناحق اور نادرست سفارش کرے گا اس کو سزا دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

علامہ قرطبی نے شفاعت کا ایک معنی دعا کا بھی نقل کیا ہے۔ اس اعتبار سے جو شخص کسی باصلاحیت اور اہل امیدوار کے جینے کی دعا کرے گا، اس کو ثواب ملے گا اور جو نااہل امیدوار کے حق میں دعا کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔

### تیسری حیثیت مشورہ:

مشورہ سے حکومت کا قیام اور امور مملکت کو انجام دینا اسلام کا طرہ امتیاز ہے، اس سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ارباب حل و عقد خلیفہ منتخب کریں اور عوام ان کے تابع ہوں، ملک میں اصحاب رائے اور ارباب حل و عقد کی ایک مجلس مشاورت ہو جو امیر المؤمنین کا انتخاب کرے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے حضرت معاویہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”ہم آپ کے سامنے چند باتیں پیش کرتے ہیں۔ آپ ان میں سے جس کو چاہیں اختیار فرمائیں:

اول: یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کریں اور خلافت کے معاملہ کو ویسے ہی بلا نامزدگی مسلمانوں کے انتخاب پر چھوڑ جائیں کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ بنالیں اور اگر آپ کو یہ بات پسند نہیں ہے تو سنت صدیقی پر عمل کریں کہ ایسے شخص کو اپنا قائم مقام مقرر فرمائیں جو آپ کی قوم و خاندان کا نہ ہو، یہ بھی پسند نہ ہو، تو سنت فاروقی پر عمل ہوں کہ ایسے چھ شخصوں کو نامزد کر جائیں جو نہ آپ کے خاندان و قبیلہ کے ہوں، اور نہ ان میں آپ کا بیٹا ہو، وہ چھ شخص اپنے آپ میں سے جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں“ (تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ۴۱۲)۔

اللہ تعالیٰ نے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم امور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لینے کا حکم دیا: ”و مشاورهم في الأمر“ (آل عمران: ۱۵۹) یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ فک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اور حضرت بریرہؓ سے مشورہ لیا (بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الانک ۵۰۵، ۵۹۶) غزوہ احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ منورہ میں رہ کر دشمنان اسلام سے مقابلہ کی تھی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ کو قبول فرمایا کہ مدینہ منورہ سے باہر جنگ لڑی جائے (فتح الباری ۴۳۹)۔

غزوہ احزاب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے خندق کھودی گئی (جوالہ سابقہ ۷/۳۹۹) بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے سے موافقت فرمایا اور اسی پر فیصلہ فرمایا (تفسیر رازی ۱۳/۵۳۸، ۵۳۹، سورہ انفال: ۶۷)۔

آج کل پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ارکان کا حال آپ کے سامنے کھلی کتاب کی طرح عیاں ہے کہ وہ علم و دانش سے کس قدر غاری ہیں، بلکہ ہمارے ملک میں بعض ایسے ارکان مقننہ بھی تھے اور ہیں جو دستخط کی صلاحیت سے بھی بے نیاز ہیں اور نشان ابہام سے کام چلاتے ہیں۔ اب بات اس سے بھی آگے جا چکی ہے اور بڑی تعداد میں ایسے عناصر مجالس قانون ساز میں پہنچ رہے ہیں جو پولیس کے یہاں نامزد اور نامور مجرم ہیں، ان پر قتل، زنا، غصب اور ہزنی کے علاوہ جرم ہیں، پہلے پولیس ان کو گرفتار کرنے کے لئے ان کا پیچھا کرتی تھی، اب ان کی حفاظت و سلامتی کے لئے ان کے پیچھے پیچھے رہتی ہے۔ اس کے ذمہ دار ووٹرز ہیں؛ کیونکہ ان سے ایکشن کمیشن نے ان کے حلقہ سے حکومت کی تشکیل کے لئے ممبر منتخب کرنے کے بارے میں مشورہ کیا اور انہوں نے اپنی رائے دی کے ذریعہ مشورہ دیا کہ مذکورہ بالا صفات کے افراد کو حکومت کی تشکیل میں شامل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کیسی ہوگی؟

حدیث میں صحیح مشورہ دینے کا حکم ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”المستشار مؤتمن“ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی المشورۃ، ج: ۲، ص: ۶۹۹) یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے کے بارے میں امین ہے اور امانت کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح اور درست مشورہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ان تؤدوا الأمانات إلی أهلها“ (سورہ نساء: ۵۸) (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو سپرد کرو)۔

علامہ قرطبی نے امانت کے معنی وسیع تر بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ امانت کا لفظ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو شامل ہے، استدلال میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے: ”الأمانة فی کل شئی“ (تفسیر قرطبی، ۵/۱۶۶) (امانت کا تعلق ہر چیز سے ہے)۔

اس اعتبار سے حق رائے دی سے استفادہ کرتے ہوئے ووٹرز کو چاہیے کہ وہ ایسے امیدوار کے نشان انتخاب پر مہر لگائیں جو باصلاحیت، حسن اخلاق و کردار کا پیکر، فرض شناس، قوم و ملک کا ہمدرد اور ان کے لئے مفید ہو، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص نیک بات اور بھلائی کا راستہ درست بتائے، تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ کرنے والے کو ملے گا“ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الدال علی الخیر، ۲/۱۹۹) ورنہ از روئے شرع خائن اور اللہ کے یہاں جوابدہ ہوں گے۔

### چوتھی حیثیت و کالت:

وکالت میں انسان اپنے کام کا کسی کو نمائندہ اور وکیل بناتا ہے۔ ووٹ ایک حق ہے، جس کو لوگ استعمال کرتے ہوئے سیاسی امور میں کسی کو نمائندہ کرتا ہے کہ فلاں امیدوار اس حلقہ سے حکومت کی تشکیل کرنے اور وزیراعظم منتخب کرنے کے لئے وکیل ہے۔ واضح ہو کہ وکالت دو طرح کی ہوتی ہے:

اول یہ کہ اس کا فائدہ یا نقصان صرف موکل کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ اس کا فائدہ یا نقصان عام ہوتا ہے، یعنی موکل اور اس کے علاوہ تمام لوگوں تک متعدی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی نااہل امیدوار کو ووٹرز نے ووٹ دے کر کامیاب کیا اور اس امیدوار نے قوم و ملت کے حقوق کو پامال، یا کسی بھی طرح کا ظلم اور جرم کیا، تو چونکہ اس کے نقصان کا دائرہ وسیع ہے، اس لئے گناہ بھی اسی نسبت سے ہوگا اور ووٹرز بھی اس گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے۔

### ووٹ دینے کا حکم شرعی:

۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب، یا واجب؟

ووٹ دینا ایک گواہی بھی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اور سچی گواہی دینا واجب ہے، لہذا جب حق کو حاصل کرنے اور ظلم سے روکنے کے لئے گواہی دینی ضروری ہو جائے، جیسا کہ موجودہ صورت حال ہے، تو ووٹ نہ دینا قرآن کی زبان میں گواہی کو چھپانا ہوگا اور یہ گناہ اور حرام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فإنه آثم قلبه“ (سورہ بقرہ: ۲۸۳) (اور گواہی مت چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بیشک اس کا دل گنہگار ہے)۔

جہاں تک ووٹ دینے کی شرعی حیثیت کی بات ہے کہ آیا مستحب ہے یا واجب؟ تو مذکورہ بالا آیت شہادت اور درج ذیل وجوہات کی بناء پر واجب ہے۔



۱:- ایکشن میں اپنے آپ کو الگ کرنا اور ووٹ دینے سے گریز کرنا بڑی نا عاقبت اندیشی کی بات ہوگی اور جو تھوڑا بہت لوگ ایکشن کے وقت مسلمانوں کا آنسو پونچھے اور کچھ جھوٹے وعدے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ مسلمان اس ملک میں ذلیل اور مغلوب گروہ بن کر رہ جائیں گے، یہ عملاً سنگھ پر یوار کے منصوبہ کو کامیاب کرنے کے مترادف ہوگا جو چاہتے ہی ہیں کہ اقلیت کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیا جائے اور ظاہر ہے کہ دشمنان اسلام کے منشاء کو پورا کرنا کسی طرح درست نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”والذین كفروا أوليائهم الطاغوت يخرجونهم من النور إلى الظلمات أولئك أصحاب النار هم فيها خالدون“ (سورۃ بقرہ: ۲۵۷) (اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے حمایتی طاغوت ہیں، جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے)۔

نیز ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ممالک میں ایکشن سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرنے کی وجہ سے سیاسی اور قومی سطح پر ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی، وہ رہے ہے اپنے مذہبی تشخصات کی حفاظت بھی نہیں کر پائیں گے؛ بلکہ جان و مال اور عزت و آبرو بھی خطرہ میں رہے گی، جن کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے (دیکھئے: نظریۃ المقاصد عند الإمام الشاطبی، ص: ۵۶، ۶۳، ۶۴، المستصفی للغزالی، ج: ۱، ص: ۱۰۰)؛ اس لئے کہ ایکشن میں حصہ لینا اور ووٹ دینا مسلمانوں پر لازم ہے۔ اس طرح ہم بادشاہ گر نہیں بن سکتے تو کم از کم بادشاہ گر کا کردار تو ادا کر سکتے ہیں۔

۲- جمہوری ملک میں ووٹ بھی ایک بڑی طاقت ہے، جس کے ذریعہ بام اقتدار پر چڑھا جاتا ہے، لہذا ووٹ سے پہلو تہی برتنا بالفاظ دیگر اپنے آپ کو سیاسی طاقت کے اعتبار سے کمزور کرنا ہوگا، جبکہ قرآن نے مسلمانوں کو قوت بڑھانے کا حکم دیا، تاکہ دشمنان اسلام کو مرعوب کیا جاسکے:

”وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم، لا تعلمونهم الله يعلمهم“ (سورہ انفال: ۶۰) (اور ان سے مقابلہ کے لئے جس قدر بھی تم سے ہو سکے سامان درست رکھو، قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے جن کے ذریعہ سے تم اپنا رعب اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر رکھتے ہو اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی کہ تم انہیں نہیں جانتے کہ اللہ انہیں جانتا ہے)۔

۳- ووٹ ایک نعمت اور موثر ہتھیار ہے؛ کیونکہ وہ ممالک جو جمہوری نوعیت کے ہیں، جن میں انتخابات کے ذریعہ حکومت بنتی ہے، ان میں تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے، یہ حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت اور عطیہ ہے، پس جس طرح اور نعمتوں کے بارے میں اللہ کے یہاں بھی سوال ہوگا ”شہر لتسئلن يومئذ عن النعيم“ (سورہ ناکثر: ۸) (پھر پوچھیں گے تم سے اس دن نعمت کے بارے میں) اسی طرح ووٹ دینے کے حق کے صحیح اور غلط استعمال کے بارے میں سوال ہوگا، باصلاحیت مستحق امیدوار کو ووٹ دینا نعمت کا صحیح استعمال ہوگا اور نا اہل امیدوار کو ووٹ دینا نعمت کا غلط استعمال ہوگا اور سرے سے ووٹ نہ دینا حاصل شدہ نعمت کو ضائع کرنا اور ناقدری شمار ہوگا اور ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے یہاں جوابدہ ہوگا۔

زیر بحث مسئلہ میں ووٹ دینے میں شرکت کرنا اور ووٹ دینے سے گریز کرنا، دونوں ہی صورتیں شر و فساد سے خالی نہیں، البتہ ووٹ دینے کی صورت میں جو شر ہے، وہ ووٹ نہ دینے کی صورت کے شر سے کمتر ہے؛ کیونکہ ووٹ نہ دینے کی صورت میں دین، جان، مال اور عزت کی حفاظت مشکل ہو جائے گی اور ووٹ دینے کی صورت میں جزوی طور پر غیر اسلامی حکومت کے قیام میں تعاون ہے، ایسے موقعوں پر اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ برے شر اور ضرر سے بچنے کے لئے کمتر درجہ کے شر اور ضرر کو گوارا کیا جائے، چنانچہ فقہاء نے اس طرح کے اصول و قواعد کو مختلف الفاظ اور تعبیرات میں بیان کیا ہے:

”إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“ (سابقہ حوالہ: ۸۹: ۱) (جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی کو گوارا کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا)۔

”من ابتلي ببليتین وهما متساویان، بأخذ بأیتھما شاء، وإن اختلفا یختار أھوھما“ (سابقہ حوالہ) (کوئی شخص دو نقصانوں میں مبتلا ہو اور دونوں نقصان مساوی ہوں، تو جس نقصان کو گوارا کرنا چاہیے کر سکتا ہے، اور اگر دونوں نقصان باہم متفاوت ہوں، تو کمتر درجہ کے نقصان کو اختیار کر کے بڑے نقصان سے بچے گا)۔

## ایکشن میں امیدوار بننے کی شرعی حیثیت:

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

آج کل ایکشن کا نظام کچھ ایسا ہے کہ امیدوار کو ایکشن کمیشن میں نامزدگی کے کاغذات خود داخل کرنے ہوتے ہیں، پھر انتخابی مہم چلانے میں جہاں ان کے دوسرے رفقاء اور حمایتی شریک کار ہوتے ہیں، وہیں خود بھی سرگرم عمل ہوتے ہیں، جگہ جگہ جلسہ جلوس کرتے ہیں، ریلی نکالتے ہیں اور لوگوں سے ووٹ دینے کی اپیل کرتے ہیں، ہر امیدوار اپنی زبان سے خود اپنی تعریف اور کارنامے کی داستان بیان کرتا ہے، بالفاظ دیگر موجودہ انتخابی نظام میں امیدوار خود اپنے آپ کو عہدہ کے لئے پیش کرتا ہے اور منصب کا طالب ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مرتبہ بعض امیدوار عوام کے درمیان روپے اور پیڑھے وغیرہ بھی تقسیم کرتے ہیں تاکہ عوام ان کے حق میں ووٹ دیں، امیدوار کا یہ طریقہ کار اور اس ایک ذمہ دارانہ منصب کا مدعی اور طالب ہونا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے امت کو تعلیم دی ہے کہ منصب کے حریص و طالب کو منصب سے سرفراز نہ کیا جائے؛ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا ارشاد ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، میرے ساتھ میرے دو چچا زاد بھائی تھے، ان میں سے ایک نے کہا: یا رسول اللہ! مجھ کو کسی علاقہ کا گورنر بنا دیجئے، دوسرے نے بھی ایسا ہی کہا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم ہم اس شخص کو عہدہ نہیں دیتے جو اس کا طالب اور حریص ہو (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب الہمی عن طلب الامارۃ والحرم علیہا، ج: ۲، ص: ۱۲۰) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”لا تسأل الإمارة فإن أعطيتها عن مسألة، وكلت إليها، وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها“ (حوالہ سابق)

(عہدہ اور حکومت کی طلب مت کرو؛ کیونکہ اگر تجھے طلب سے ملے گا تو خدا تجھے چھوڑ دے گا، اور جو بغیر طلب کے ملے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر تیری مدد کرے گا)۔

معلوم ہوا کہ جب کسی کو کوئی منصب طلب کے بعد ملتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہیں ہوتی، اور وہ شخص لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ نہیں رہ پاتا؛ بلکہ منصب کے ساتھ بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے، مختلف نوع کی آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے اور طرح طرح کی مشکلات میں گھر جاتا ہے (دیکھئے تفسیر قرطبی، ج: ۹، ص: ۱۲۲)۔

”من ابتغى القضاء وسأل شفعاء، وكل إلى نفسه، ومن أكره عليه انزل الله عليه ملكا يسدده“ (رواہ الترمذی و ابو داؤد، ترغیب و ترہیب ۳، ۱۱۵) (جو شخص عہدہ قضا کا طالب ہو، اور اس کے لئے سفارشی مہیا کرے، تو اس کو اس کے نفس کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے اس کی کوئی مدد نہیں ہوتی) اور جسے عہدہ قضا کے لئے مجبور کیا گیا تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ نازل فرماتا ہے، جو اس کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے)۔

حدیث میں عہدہ قضا کا ذکر تمثیل کے طور پر ہے، تحدید مقصود نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی عہدہ ہو، اگر طلب، چاہت اور سفارش کے ذریعہ حاصل ہو تو ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی مدد نہیں ہوتی اور اگر بغیر چاہت و طلب اور سفارش کے عہدہ ملے تو اس پر اللہ کی مدد ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا معاون فرشتہ کو بنا دیتا ہے، جو اسے صحیح رائے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور درست راستہ بتاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ شخص اپنے فرض منصبی کو انجام دینے میں کامیاب رہتا ہے، اس کا بہترین نمونہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر کا درخشاں دور خلافت ہے۔

موجودہ دور کے امیدوار عموماً ایسے ہوتے ہیں کہ قوم و ملت اور ملک کی خدمت کے بجائے اپنے اور خاندان والوں کی خدمت ہی ان کا مقصود ہوتا ہے، ہمارے ملک میں انتخاب میں حصہ لینے اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے کے لئے نہ علم و دانش کی شرط ہے، نہ اخلاق و کردار اور امانت و دیانت کی۔

اسلامی نقطہ نظر سے امیدوار ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اپنی دیانت و امانت، جذبہ خدمت اور نمائندگی کی صلاحیت میں نسبتاً بہتر اور قوم و ملک کے لئے مفید ہو، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

مخالف شریعت قانون ساز ادارے کا ممبر بننا:

۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کرے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے

مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

مذکورہ صورت میں قانون ساز ادارے کا ممبر بننا اور کسی ممبر کا اپنی پارٹی کے جاری کردہ وہیپ کے مطابق ووٹ دینا، جبکہ اس پارٹی کی پالیسی مخالف شریعت ہو، اسلامی اصول کے اعتبار سے درست نہیں ہے؛ کیونکہ ایسی صورت میں شریعت پر عناصر پارٹی کو مضبوط و مستحکم کرنا لازم آئے گا اور بالواسطہ اس کے باطل عزائم و نظریات کی تائید کرنا ہوگا جس سے اسلام اور مسلمانوں کا نقصان ہوگا، اسی طرح مذکورہ قانون ساز ادارے کا ممبر بننا جو کہ مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، شریعت اسلامیہ کے خلاف مدد کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ دونوں ہی صورتیں معصیت پر مبنی ہیں اور معصیت پر تعاون کرنا شرعاً ناجائز و حرام ہے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب“ (مائدہ: ۲) اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

”یا ایہذا الذین امنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودة وقد کفروا بما جائکم من الحق“ (ممتحنہ: ۱) (اے ایمان والو! نہ بناؤ میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست، تم ان کو پیغام بھیجتے ہو دوستی سے اور وہ منکر ہوئے ہیں اس سے جو تمہارے پاس آیا سچا دین) معلوم ہوا کہ عام حالات میں غیر مسلموں سے گہری دوستی کرنا درست نہیں ہے، اسی طرح کسی ایسے قانون ساز ادارے کا ممبر بننا جو بعض اوقات مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہوں درست نہیں، اسی طرح ایسی پارٹی کا ممبر بن کر رہنا جس کی پالیسی مخالف شریعت ہو، یا جس نے اعلان اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا مقصد بنا لیا ہو، اور جس میں اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہ ہو، شرعاً صحیح نہیں ہے، مسلم ممبر کو چاہیے کہ اس طرح کی پارٹی سے نکل کر ایسی سیکولر پارٹی کا ممبر بنیں، جو اسلام دشمن اور مسلم مخالف نہ ہو، اس کی پالیسی ہماری اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو، ایسی سیکولر سیاسی پارٹی کے ممبر بننے کے جواز پر درج ذیل آیت دلالت کرتی ہے:

”لا ینہکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروہم وتقسطوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین“ (ممتحنہ: ۸) (اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑنے نہیں تم سے دین پر اور ان کا لانا نہیں تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک، بیشک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو)۔

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں: ”یہ آیت اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں سے تعلق کے بارے میں رخصت پر دلالت کرتی ہے، جن لوگوں نے مومنوں سے دشمنی نہیں کی، اور نہ ہی ان سے جنگ لڑی۔“

جہاں تک موجودہ حالات میں غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت رویہ اختیار کرتے ہیں اور مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا عام حالات سے مختلف ہوگا اور شرعی حکم بھی مختلف ہوگا، جیسا کہ اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ میں عام اور خصوصی حالات کے درمیان حکم میں فرق ہے، شراب نوشی، مردار کا کھانا اور خون کے استعمال کو عام حالات میں حرام قرار دیا گیا ہے اور اضطرار کی حالت میں مباح قرار دیا گیا ہے (مائدہ: ۳) یہاں بھی خصوصی حکم ہوگا، یعنی ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا؛ اس لئے کہ ان اداروں میں رہ کر جہاں تک ممکن ہو سکے مخالفت کی جاسکتی ہے اور مخالف شریعت قوانین بنائے جاتے وقت اس کے خلاف صدا بلند کر سکتا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”من رأى منکم منکرا، فلیغیرہ بیدہ، فإن لم یستطع فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ وذلك أضعف الإیمان“ (مسلم، کتاب الایمان، باب کون النہی عن المنکر ۱۰۵۱) (تم میں سے جو شخص خلاف شرع کوئی کام ہوتا ہو اچھے دیکھے تو چاہیے کہ اسے بزرور طاقت روکے، اگر بزرور طاقت روکنے پر قادر نہ ہو، تو اپنی زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی روکنے پر قادر نہ ہو، تو دل سے برا سمجھے)۔

ان اداروں سے باہر رہ کر صدائے مخالفت صدائے صحیح ادا ثابت ہوگی۔ نیز یہاں دو مفسدہ پائے جاتے ہیں: ایک ممبر بننے میں معصیت پر تعاون اور دوسرا ممبر نہ بننے کی صورت میں اسلام اور ملت کا نقصان کہ مخالف شریعت قوانین بنیں گے اور شریعت اسلامیہ کا اصول یہ ہے کہ جب کسی مقام پر دو مفسدے جمع ہو جائیں اور دونوں سے بچنا ممکن نہ ہو، بہر حال کسی ایک کا ارتکاب ناگزیر ہو جائے تو ان میں سے جو کمتر درجہ کا مفسدہ ہوگا اس کو گوارا کیا جائے گا۔

”إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما“ (الاشباه والنظائر، ابن نجيم ۱۰۸۹) ”لو كان أحدهما أعظم ضررا من الآخر، فإن الأشد يزال بالأخف“ (حوالہ سابقہ)۔

ظاہر ہے کہ ان اداروں کے ممبر بننے کا مفسدہ کمتر درجہ کا ہے؛ کیونکہ کسی حد تک مخالف شریعت قوانین بننے وقت اس کے خلاف احتجاج ممکن اور موثر بھی ہوگا۔ دستور سے وفاداری کی حلف برداری کا حکم:

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے، اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

حلف اٹھانا یا قسم کھانا دراصل جس چیز کی حلف برداری ہوتی ہے یا جس کی قسم کھائی جاتی ہے، اس سے مقصود اس کی تعظیم ہے اور اس کی شان کو بڑھانا اور اس کی عظمت کا اعتراف ہے اور اس قسم کی تکریم و تعظیم سوائے اللہ کے کسی اور کے لئے روا نہیں ہے۔

”وهذا النوع من التعظيم لا يستحقه إلا الله تعالى“ (بدائع الصنائع للکسانی ۳۰۱۷)۔

اس وجہ سے شریعت اسلامیہ نے غیر اللہ کی قسم کھانے اور اس کی حلف برداری کو ناجائز قرار دیا ہے؛ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے جو قسم کھانے چاہے تو وہ اللہ کی قسم کھائے یا چھوڑ دے“

”فمن كان حالفا فليحلف بالله أو ليده“ (مسلم، ایمان، باب من حلف باللات)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا“

”من حلف بغير الله فقد أشرك“ (ابوداؤد، کتاب الايمان والنذر، باب في كراهية الحلف بغير الله، حدیث نمبر: ۲۳۵۱)۔

مسند احمد ۲۰۸۶، ۸۷)۔

لہذا دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا اپنے اصل کے اعتبار سے درست نہیں ہے؛ کیونکہ یہ غیر اللہ کی حلف برداری ہے؛ اس لئے کہ دستور میں جو قوانین لکھے ہوئے ہیں وہ اللہ کا کلام نہیں ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، اس اعتبار سے اس کی تائید اور حمایت کرنا ہوگا اور یہ ایک غیر شرعی امر اور گناہ ہے۔ پس مسلم ممبروں کو اس سے بچنا چاہیے، اگر انہیں اس پر مجبور کیا جائے، تو ممکن حد تک قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، تاہم اگر ایسا ممکن نہ ہو، اس کے بغیر قانون ساز ادارے میں ممبر باقی رہنا خطرے میں ہو یا اس سے محرومی کا اندیشہ ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہوگا؛ اس لئے کہ یہ ایک حاجت ہے اور حاجت ضرورت کے درجہ میں آکر ناجائز چیزوں کے لئے وقتی اور عارضی طور پر وجہ جواز بن جاتی ہے، خواہ حاجت شخص و انفرادی ہو یا اجتماعی: ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة“ اور ”الضرورات تبيح المحظورات“ (الاشباه والنظائر لابن نجيم، ۱۰۸۶، ۹۳) نیز فقہی قاعدہ ہے: ”لا واجب مع العجز ولا حرام مع الضرورة“ (القواعد الفقهية بين الاصلية والتوجيه، ص: ۲، إعلام الموقعين ۲۰۲۱)۔

اور یہاں مذہبی اور ملی مفاد کی خاطر قانون ساز ادارے میں رہنا ہے۔

بائبل پر حلف لینا:

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟

اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ بائبل محرف اور تبدیل شدہ ہے، اپنی اصل حالت میں محفوظ نہیں ہے، خاص طور پر مسلمان اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کو اللہ پر چھوٹ اور بہتان گردانتے ہیں؛ اس لئے اصولی طور پر کسی مسلمان کے لئے بائبل لے کر حلف اٹھانا، اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا شرعاً جائز نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہ بائبل کی تعظیم اور بحالت موجودہ اس کے اللہ کی طرف سے ہونے کی تصدیق کے مترادف ہوگا۔ پس اگر عیسائی ملکوں میں مسلم ممبر سے بائبل پر حلف برداری کا مطالبہ ہو، تو وہ اولاً قرآن کا مطالبہ کرے اور قرآن پر قسم کھائے، اگر قرآن نہ دیا جائے اور بائبل پر ہی حلف کا مطالبہ اور اصرار ہو تو اس کے لئے بائبل کو

دل سے سچ اور حق نہ سمجھتے ہوئے کراہت خاطر کے ساتھ بائبل پر حلف لینے کی گنجائش ہوگی؛ اس لئے کہ ایسی صورت میں اس کے لئے یہ ایک حاجت ہے اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ حاجت و ضرورت کے وقت شرعاً ناجائز چیزیں وقتی طور پر مباح ہو جاتی ہیں (سابقہ حوالہ جات)۔

سیکولر پارٹیوں میں شرکت:

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں؛ لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی پارٹی میں شامل ہونا ضروری ہے، دور حاضر میں تمام پارٹیاں کچھ نہ کچھ ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ممالک میں کوئی سیکولر پارٹی ایسی نہ ہو جس کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف دفعات نہ ہوں تو ایسی سیکولر پارٹی میں شریک ہونا اور اس کی طرف سے انتخاب لڑنا اور اس کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا، جس کے منشور میں کم سے کم دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوں؛ اس لئے کہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی جگہ دو یا دو سے زیادہ مفاسد و شر جمع ہو جائیں اور کسی ایک مفسدہ کو رو بہ عمل لائے بغیر چارہ نہ ہو تو کتر درجہ کے مفسدہ اور شر کو اختیار کیا جائے اور بڑے مفسدہ و شر سے بچا جائے گا۔

”يتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام“، ”الضرر الاشد يدفع بالضرر الاخف“، ”يختار أهون الشرين“ (الاشياء والنظائر لابن نجيم ۱، ۸۸، ۸۹، ۹۰، مجلة الاحكام العدلية ۲، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱)۔

امام ابوحنیفہ نے مبتدئ بہ کے بارے میں فرمایا: کتر درجہ کی بلیہ کو اختیار کرے گا۔ ”يختار ما هو الأهون في زعمه“ (الاشياء والنظائر لابن نجيم ۱، ۹۱)۔

البتہ اس طرح کی سیکولر پارٹیوں میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو سب سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کا نمائندہ تصور کریں اور وہ عہد کریں کہ مخالف اسلام اور مسلم مفادات کے مغایر دفعات کی مخالفت کریں گے؛ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے جو شخص خلاف شرع کوئی کام ہوتا ہوا دیکھے تو چاہیے کہ اسے بزور طاقت روکے، اگر بزور طاقت روکنے پر قادر نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی روکنے پر قادر نہ ہو تو اپنے دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کتر درجہ ہے“ (مسلم، کتاب الایمان، باب کون الہی عن الکرار ۵۱، ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء في تقيير المنکر ۳۰۲)۔

اور اگر وہ بھی وہاں جا کر اسی رنگ میں ڈھل جائیں، اس کے ہاں میں ہاں ملانے لگیں، گویا پارٹی کی ہر پالیسی اور تمام تر دفعات کی تائید کرنے لگیں خواہ وہ اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے مفادات کے مغایر ہوں، تو وہ گنہگار ہوں گے اور اللہ کے یہاں ملی خیانت کی بابت جواب دہ ہوں گے؛ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص ظالم کے ساتھ چلے تا کہ اس کی مدد کرے یہ جانتے ہوئے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام (کے دائرہ) سے خارج ہو گیا“ (تعمیر طبرانی، حدیث نمبر: ۶۱۹، تاریخ کبیر امام بخاری ۲، ۲۵۰، حدیث نمبر: ۲۶۹۳)۔

اعلانیہ مسلم دشمن سیاسی پارٹی میں شمولیت کا حکم:

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

اس طرح کی اعلانیہ اسلام اور مسلم دشمن سیاسی پارٹیوں میں کسی مسلمان کے لئے شریک ہونا جائز نہیں ہوگا، جبکہ دوسری سیکولر پارٹیاں موجود ہوں جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے مناسب ہوں، یا اس کے مقابلہ میں کتر درجہ کا ضرر رساں ہوں، جیسا کہ اوپر بات آ چکی ہے کہ جب کسی کے سامنے کئی مفاسد اور ضرر جمع ہو جائیں تو ان میں بڑے مفسدے اور ضرر سے بچتے ہوئے کتر درجہ کے مفسدہ و ضرر کو اختیار کیا جائے گا۔

نیز جیسا کہ تفصیل سے پیچھے گزر چکا ہے اس طرح کی کھلے اسلام اور مسلم دشمن پارٹیوں میں شمولیت سے ان پارٹیوں کی تائید و حمایت اور ان کا حوصلہ افزائی کرنا لازم آئے گا جو کہ شرعاً معصیت ہے اور معصیت پر تعاون بھی گناہ اور ناجائز و حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کھلے الفاظ میں فرمایا:

”اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے“ (سورہ مائدہ: ۲، نیز دیکھیے: مائدہ: ۵۱، نساء: ۹، ۱۱)۔

اگر کسی مسلمان کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو بھی اس کے لئے اس پارٹی میں شرکت کی گنجائش نہیں ہوگی؛ کیونکہ اس پارٹی کے مقابلہ میں دوسری سیکولر پارٹیاں موجود ہیں جن کے ایجنڈے میں مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر دفعات سرے سے موجود نہیں ہیں، یا ہیں تو کم ہیں، یا اعلانیہ مخالف اسلام اور مسلم دشمن نہیں ہیں بلکہ بعض اعلانیہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کیلئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں۔ نیز ظاہر اسباب کے اعتبار سے مقتدر و متعصب اور کھلے طور پر مسلم دشمن پارٹی کے ایجنڈے میں تبدیلی لانے کی کوشش جوئے شیر کے مراد ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرم کا ظہور ہو اور اسلام کا حکم ظاہری اسباب اور قرآن قاطعہ پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ باطنی شی اور کرم و کرامات پر۔

### مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کا قیام:

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

ہندوستان اور اس جیسے غیر مسلم جمہوری ممالک میں مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے کی سعی کرنی چاہیے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے ملک میں مسلمانوں کی ایک ساخت بنے گی۔ اسلام اور مسلم مفادات کا تحفظ آسان ہوگا اور مسلمانوں کی ایک سیاسی طاقت ہوگی اور ملک میں ان کا سیاسی وزن محسوس کیا جائے گا، غیروں کو ان کے مذہب اسلام میں مداخلت کی جرأت نہیں ہوگی۔ اسلامی تشخصات اور مسلمانوں کے مصالح و مفادات کی حفاظت خود بخود ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَأَخْرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ اللَّهُ يَعْلَمُ هُمْ“ (انفال: ۶۰) (اور ان سے مقابلہ کے لئے جس قدر بھی تم سے ہو سکے سامان درست رکھو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے جن کے ذریعہ تم اپنا رعب اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر رکھتے ہو اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی کہ تم انہیں نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے)۔

قوت ایک جامع لفظ ہے جس میں وہ تمام طاقتیں بشامل ہیں جو تانج اور فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں، غیروں کو مرعوب کر سکیں، ان کو مسلمانوں کے ملی تشخصات اور ان کے پرسنل لاء میں مداخلت سے باز رکھیں، ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے ان کو دور رکھیں اور مخالف اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے مغایر قوانین وضع کرنے کے اقدامات کو روک سکیں۔

مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس پارٹی میں غیروں کا داخلہ ممنوع ہوگا۔ مصلحتاً سیکولر ذہن کے حامل غیر مسلم لیڈروں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، البتہ پارٹی میں کلیدی عہدوں پر مسلم لیڈر ہی فائز رہیں گے۔ جہاں تک یہ احساس کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

یقیناً یہ شبہ کیا جاسکتا ہے؛ لیکن چند امور قابل لحاظ ہیں، اور وہ یہ ہیں:

۱۔ فقہ اسلامی کا مشہور اصول وقاعدہ ہے: ”یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام“ یعنی شخصی ضرر یا کمتر درجہ کے ضرر کو برداشت کیا جائے گا اور اجتماعی و عام ضرر سے بچا جائے گا (الاشباہ والتموی، ج: ۱، ص: ۲۵۶، مطبوعہ: پاکستان)۔

۲۔ نیز فقہاء نے مزید دوسرے فقہی قواعد لکھے ہیں جن سے مذکورہ قاعدہ کی مزید تائید ہوتی ہے اور وہ قواعد یہ ہیں: ”الضرر الاشد يدفع بالضرر الاخف“ ”إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“، ”يختار أهون الشرين“ (الاشباہ والنظائر لابن نجيم ۱، ۸۸، ۸۹، ۹۰، مجلة الاحكام العدلية ۱، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹)۔

اوپر ذکر کردہ فقہی قواعد اور مقاصد شریعت کے باہم درجہ بندی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہے۔ جس شبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض وہم و شبہ ہی ہے؛ کیونکہ عملی طور پر ہندوستان کے کئی اسٹیٹ میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت قائم ہیں، مثلاً: آندھرا پردیش میں مجلس اتحاد

اسلمین، آسام میں ”یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فونڈ“ اور یوپی میں علماء کونسل، ان مسلم سیاسی جماعتوں سے مسلمانوں کے مذہب و ملت کو کافی فائدے ہو رہے ہیں، مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے نام پر گرفتاری کی بابت بڑا اثر پڑا ہے اور آئے دن مسلم انکاؤنٹر کے واقعات میں بڑی کمی واقع ہوئی ہے۔

یقیناً مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے کی بابت جہاں قدر شعور و وسعت قلبی، بیدار مغزی اور غیروں سے عبرت و موعظت اور سبق لینے کی ضرورت ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زیادہ تر سیاسی پارٹیاں غیر مسلموں کی ہی ہیں، اپنی جگہ ہمیں سب زندہ اور سرگرم ہیں، مزید برآں قائم بھی کر رہے ہیں اور مسلمان ابھی سوچ ہی رہے ہیں، آخر ان کے پاس کیا حکمت عملی ہے کہ ان کی پارٹی میں غیر مسلم اور مسلمان دونوں ہیں۔ دوسری طرف تھوڑی ہمت و حوصلہ کی ضرورت ہے، جیسا کہ شاعر نے سچ کہا:

عزم محکم ہوں تو ہوتی ہیں بلائیں پشیمائیں

۱۰۔ ایکشن میں خواتین کا کردار:

الف۔ ووٹنگ میں عورتوں کی شرکت:

پچھلے ووٹ کی پانچ حیثیتوں کا ذکر آیا ہے: شہادت، سفارش، مشورہ، وکالت اور بیعت۔

شہادت: حدود و قصاص کو چھوڑ کر بقیہ معاملات میں عورت شہادت دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔

”المرأة من اهل الشهادة في الجملة“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۳۹، مطبوعہ: نعیمیہ دیوبند)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”واستشهدوا شہیدین من رجالکم فان لم یكونا رجلین فرجل وامرأتان“ (بقرہ: ۲۸۲) (اور اپنے مردوں میں سے دو شخص کو گواہ بناؤ، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو)۔

سفارش: جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ووٹ کی ایک حیثیت سفارش کی ہے اور قرآن میں مرد و عورت کے درمیان فرق کیے بغیر حسن سفارش کا ذکر ہے۔

”من یشفع شفاعۃ حسنة یکن له نصیب منها“ (نساء: ۸۵)۔

لہذا عورت بھی کسی حسن سیرت و کردار کے حامل یا کمتر درجہ کے ضرر والے امیدوار کی سفارش ووٹ کے ذریعہ کر سکتی ہے۔

مشورہ: جہاں تک مشورہ دینے کی بات ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض امور میں ازواج مطہرات<sup>۱</sup> سے مشورہ کیا کرتے تھے (دیکھئے: قواعد نظام الحکم فی الإسلام: دکتور محمود خالدی، ص: ۱۸۰)۔

صحیح بخاری کی مشہور حدیث ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ<sup>۲</sup> سے مشورہ فرمایا تھا اور اس پر عمل بھی فرمایا تھا اور اس کا فائدہ بھی ہوا (بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد المصلح مع اہل الحرب و کتابہ الشرط حدیث نمبر: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲)۔

اسی طرح حضرات صحابہ کرام<sup>۳</sup> اپنی حرم خاتون سے مشورہ کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عمر<sup>۴</sup> کے بارے میں آتا ہے کہ وہ عورت سے مشورہ لیتے تھے اور بسا اوقات اس کے مشورہ کی ستائش فرماتے تھے (سنن بیہقی عن ابن سیرین ۱۰/۱۱۳)۔

پس ووٹ کی ایک حیثیت مشورہ ہونے کے اعتبار سے عورت ووٹ دینے کی اہل ہوگی، وہ امیدوار کے انتخاب میں اپنی رائے دینے کی حقدار ہوگی۔

وکالت: مرد کی طرح عورت کو بھی حق توکیل حاصل ہے (دیکھئے: المغنی لابن قدامة ۵، ۸۷، بدایۃ المجتہد لابن رشد ۲، ۳۳۳)۔

اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”انما النساء شقائق الرجال“۔

ایکشن میں لوگ اپنے ووٹ کے ذریعہ اپنے اپنے حلقہ سے حکومت کی تشکیل کے لئے امیدوار نامزد کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے ایکشن توکیل جیسا عمل ہے، لہذا جو شخص جس امیدوار کے چناؤ نشان پر مہر لگا کر ووٹ دے گا وہ اس کو اپنا وکیل بنا رہا ہے کہ اس کی طرف سے حکومت کی تشکیل اور وزیر اعظم کے انتخاب میں کردار ادا کرے۔

فقہاء نے لکھا ہے وہ پردہ نشین عورتیں جو مردوں کے اختلاط سے دور رہتی ہوں، ان کی مجلسوں میں شرکت سے گریز کرتی ہوں اور ان کے ساتھ ان کی

محفلوں میں بیٹھنے سے حیا کرتی ہوں وہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے یا اپنی طرف سے دفاع کے لئے کسی کو وکیل بنا کر دارالقضاء بھیج سکتی ہیں (بدائع الصنائع ۱۹/۵، درمختار و ردالمحتار ۲۳۳/۸)۔

ووٹ کے مسئلہ میں ظاہر ہے کہ وہ پارلیمنٹ نہیں بھیج سکتیں، ان کے لئے باعث سزا مردوں کے اختلاط سے بچنے کے لئے ووٹ موثر اور بہتر ذریعہ ہے کہ اس کے ذریعہ کسی امیدوار کو اپنا وکیل بنا کر پارلیمنٹ بھیج سکتی ہیں۔

بیعت: اگر اسلامی ملک ہو تو وہاں ووٹ کی ایک حیثیت سیاسی بیعت کی بھی ہو سکتی ہے کہ ووٹر اپنے ووٹ کے ذریعہ متعلقہ امیدوار کو وکیل بنا تا ہے کہ وہ اس کی طرف سے سربراہ مملکت کا انتخاب کرے۔ اوپر بات آچکی ہے کہ عورت کو وکیل کا حق شرعاً حاصل ہے، لہذا عورت اس حیثیت سے بھی ووٹ دینے میں شریک ہو سکتی ہے۔

نیز ملک میں امر بالمعروف (بھلائی کا حکم دینا) و النہی عن المنکر (برائی سے روکنا) کا فریضہ عورت ووٹ کے راستہ سے ادا کر سکتی ہے، اس طور پر کہ اچھے کردار کے حامل امیدوار کو ووٹ دے کر اسے جتائے تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کی سز زمین پر کار خیر انجام پائے۔ لوگوں کا بھلا ہو، ملک میں اچھائیاں پھیلیں، ملک سے کرپشن کا خاتمہ ہو اور فتنہ و فساد کا قلع قمع ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے مومن مرد اور عورت دونوں کو باہم ایک دوسرے کے دوست و مددگار اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں دونوں کے فریضہ کو یکساں بتایا ہے:

”والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض یأمرون بالمعروف وینہون عن المنکر ویقیمون الصلاة ویوتون الزکاة ویطیعون اللہ ورسولہ“ (توبہ: ۱۷) (اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں، نیک بات سکھلاتے ہیں اور بری بات سے روکتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکاة دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلتے ہیں)۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے جو شخص خلاف شرع کوئی کام ہوتا دیکھے، تو چاہیے کہ اسے بزور طاقت روکنے پر قادر نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے، اور اگر زبان سے بھی روکنے پر قادر نہ ہو تو اپنے دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کتر درجہ ہے (مسلم، ایمان، باب کون النہی عن المنکر ۵۱۸، ترمذی، فتن باب فی تغیر المنکر ۴۰۲)۔

ب۔ الیکشن میں امیدوار بننا اور قانون ساز اداروں کی ممبر بننے کی بابت خواتین کا کردار:

الیکشن میں کسی بھی عہدہ کے لئے امیدوار بننا، قانون ساز اداروں کی ممبر بننا اور اگر اسلامی ملک ہو تو وہاں کی مجلس شوریٰ کی ممبر بننا، اس طرح کے سیاسی امور اور سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بارے میں علماء کے دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں: ایک عدم جواز، دوسرے جواز کا۔ قدیم علماء میں امام حرین جوینی کا قول ملتا ہے، جس سے عدم جواز کی رائے کو تقویت ملتی ہے، ان کا بیان ہے:

”فما نعلمہ قطعاً ان النسوة لا مدخل لهن فی تخیر الإمام و عقد الإمامة، فانهن ما وجعن قط“ (الغیاتی غیث الام، ص: ۶۲) (ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ امام کے انتخاب میں اور امامت کے معاملہ میں عورتوں کا کوئی رول نہیں اور ماضی میں اس کی بابت عورتوں سے کبھی مراجعت نہیں کی گئی)۔

عدم جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ ان عہدوں کے لئے مرد ہونا بنیادی شرط ہے، البتہ عورتوں سے متعلق خصوصی امور میں ان سے مشورہ لیا جائے گا؛ کیونکہ اس میں مجبوری ہے کہ مرد حضرات اس طرح کے امور سے واقف نہیں ہوتے ہیں اور ان کے لئے اس سے آگاہی دشوار بھی ہے۔ اس کے برخلاف جواز کے قائلین اس طرح کے مناصب پر فائز ہونے کے لئے مرد کی شرطیت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

عدم جواز کے قائلین کی دلیلیں:

۱۔ مجلس شوریٰ، قانون ساز ادارے، لوک سبھا اور پارلیمنٹ وغیرہ کے ممبر بننے کے لئے مرد کا ہونا ضروری ہے؛ کیونکہ ان کی ممبری ولایت عامہ کے قبیل سے ہے اور عورت ولایت عامہ کی اہل نہیں ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض“ (النساء: ۳۴) (مرد عورتوں پر نگران ہیں؛ اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے)۔



اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر نگہبان، قوام، امراء اور حاکم بنایا ہے ”الامراء علیہن“ (تفسیر طبری ۵: ۵۷، ”الرجل قیمر علی المرأة ای هو رئیسها وکبیرها والحاکم علیها“ (تفسیر ابن کثیر ۱: ۲۶۵)۔

ایسی صورت میں اگر عورت حاکم بنتی ہے تو معاملہ الٹ جائے گا اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وللرجال علیہن درجة“ (بقرہ: ۲۲۸) یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت و فوقیت حاصل ہے، یہ فوقیت امارت و طاعت کی ہے کہ مرد کو ایک گونہ عورت پر حاکمیت حاصل ہے ”وقیل ان هذه الدرجة هي الامرة والطاعة“ (تفسیر طبری ۲: ۳۵۳)۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وقرب فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیة الأولى“ (احزاب: ۳۳) (اور قرآن پڑھنا اپنے گھروں میں اور دکھلائی نہ پھر جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں)۔

اس آیت میں راست خطاب ازواج مطہرات سے ہے، لیکن ان کے واسطے سے تمام مسلم عورتوں سے خطاب ہے؛ کیونکہ ازواج مطہرات کے ساتھ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں، پس تمام مسلم خواتین پر لازم ہے کہ وہ بلا شدید ضرورت کے گھروں سے باہر نہ نکلیں ”وان کان الخطاب للنساء النبی ﷺ فقد دخل غیرہن فیہ بالمعنی، هذا لولم یرد دلیل یخص جمیع النساء، کیف الشریعة طافحة بلزوم النساء بیوتھن، والانکشاف عن الخروج منها إلا ضرورة“ (تفسیر قرطبی ۱۳: ۱۱۷)۔

۴۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی جو عورت کو اپنا سربراہ بنائے“ (بخاری، مغازی، باب کتاب النبی ﷺ، رالی کسری و قیسر، حدیث نمبر: ۳۲۲۵، فتن، باب نمبر: ۱۸، حدیث نمبر: ۷۰۹۹، ترمذی، فتن، باب نمبر: ۶۲، حدیث نمبر: ۲۳۶۵)۔

معلوم ہوا کہ سیاسی امور عورتوں کے دائرے عمل سے خارج ہیں۔

۵۔ حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگرانی ہے اور وہ اس کے بارے میں ذمہ دار و جوابدہ ہے“ (بخاری، نکاح، باب ”توا نفسکم“ حدیث نمبر: ۵۱۸۸)۔

آپ ﷺ نے عورت کی ذمہ داری کا دائرہ گھر تک محدود فرمایا، مطلب یہ ہے کہ عورت شوہر کے مال، اولاد اور اس کی عزت کی حفاظت کرے، جیسا کہ ایک حدیث میں صراحت سے فرمایا گیا: ”اور جب تم اس کو گھر میں چھوڑ کر غائب رہو، تو وہ اپنی ذات اور تمہارے مال کی حفاظت کرے“ (ابن ماجہ، نکاح، باب افضل النساء، ۱۳۳، نسائی، نکاح، باب ای النساء غیر ۶۰: ۲)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”سونیک بیویاں اطاعت کرنے والی اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں“ (نساء: ۳۴)، لہذا گھر سے باہر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا عورت کو زیب نہیں دیتا ہے اور نہ ہی اس کیلئے مناسب اور شرعاً گنجائش ہے۔

۶۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو پارلیمنٹ، اسمبلی اور مجلس شوریٰ میں ممبروں کی نشستیں ایک دوسرے سے ملتی ہوتی ہوتی ہیں، مسائل پر گفتگو کے دوران ایک دوسرے کے آگے سامنے ہوتے ہیں، پارلیمنٹ کے ہنگامی اجلاس کے موقعوں پر کبھی تنہا بھی سفر کرنا پڑتا ہے، کبھی وفد کی شکل میں دوسرے ممالک کے بھی سفر کرنے پڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عورت ممبر کا اجنبی مردوں سے اختلاط لازم آتا ہے اور ان کے ساتھ خلوت کی بھی نوبت آتی ہے، اور شریعت اسلامیہ عورت کو اجنبی مرد سے اختلاط سے روکتی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: خطر مشارکت المرأة للرجل فی میدان عملہ لابن باز ج: ۴)۔

مجوزین کی دلیلیں:

مجوزین علماء نے شریعت کے عمومی اور مشترک احکام سے استدلال کیا ہے، جن میں دونوں صنفوں (مرد و عورت) سے خطاب ہے، اور دونوں ہی کو برابر درجہ کا مکلف بنایا گیا ہے اور ان احکام کو بروئے کار لانے کی صلاحیت و اہلیت دونوں میں مساوی درجہ کا تصور کیا گیا ہے، گو یہ ایہ حضرات عورت میں مرد کے مساوی اہلیت کا رہا کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مرد و عورت دونوں نوع انسانی اور انسانیت کی رو سے برابر ہیں، یہ ایک جنس بشر کے دو حصے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے“ (نساء: ۱۱۷، یزید کیجئے: اعراف: ۱۸۹، حجرات: ۱۳)۔

اسی طرح ان احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں دونوں کو بنو آدم (ترمذی، تفسیر، سورہ حجرات، حدیث ۳۳۱۴) اور عورتوں کو مردوں کے شقائق (ابوداؤد، طہارۃ، حدیث: ۲۳۳) قرار دیا گیا ہے۔

مزید ان کا استدلال ”وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ“ (شوری: ۳۸) ہے عام اصول کے مطابق ”ہم“ ضمیر مذکر میں عورتیں بھی تبتعا شامل ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات دوسری بعض آیات کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں، چنانچہ یہ آیت ”وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ“ کی تفسیر و توضیح دوسری آیت ”الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ“ سے ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عورتیں حکومت کی مجلس شوریٰ میں شرکت سے مستثنیٰ ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ اور خلفاء راشدین نے عورتوں کو مجلس شوریٰ میں شریک نہیں فرمایا۔

روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ سیاسی امور میں جہاں دوسرے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے تھے، وہیں اپنی حریم خانہ سے بھی مشورہ طلب کرتے تھے اور اچھے مشورہ کی ستائش کرتے تھے پھر قبول کرتے تھے (سنن الکبریٰ للبیہقی عن ابن سیرین، ج: ۱۰، ص: ۱۱۳)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ سے ایک خاتون صحابیہ نے مہر کے متعلق بحث کی تھی، آخر کار حضرت عمرؓ نے اپنی بات سے رجوع فرمایا۔ (مجمع الزوائد للبیہقی ۲۸۶/۴، امام بیہقی کا بیان ہے: رواہ ابو یعلیٰ فی الکبیر، وفیہ بحالہ بن سعید، وفیہ ضعف و قد وثق۔ سنن الکبریٰ للبیہقی ۲۳۳/۷، ابن اثیر)۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے پوچھا کہ ایک عورت اپنے شوہر سے کتنے دنوں علیحدہ صبر کے ساتھ رہ سکتی ہے، انہوں نے فرمایا: چھ سال، ایک روایت میں تین یا چار سال ہے) (مصنف عبدالرزاق، طلاق ۱۵۱/۷، ۱۵۲، حدیث نمبر: ۱۲۵۹۳، سنن الکبریٰ للبیہقی ۲۹۹/۷)۔

حضرت عمرؓ کے اثر سے خواتین سے مشورہ کرنا ثابت ہوتا ہے، اس سے مجلس شوریٰ میں شرکت و مہر بنانے کا ثبوت نہیں ملتا ہے اور نہ ہی سیاسی امور میں ان کے کردار ادا کرنے کی دلیل فراہم ہوتی ہے۔

علماء مجوزین حضرت عبدالرحمن بن عوف کے اثر سے بھی استدلال کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب میں عورتوں سے بھی مشورہ کیا تھا، حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ حتیٰ کہ وہ پردہ نشین خواتین کے پاس جا کر ان سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا، وہ پردہ میں رہ کر اپنی رایوں کا اظہار کیں (بدایہ نہایہ ۱۳۶/۷)۔

اس سے اور اس سے پہلے کے آثار سے عورتوں میں سیاسی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے، البتہ یہ آثار باضابطہ مجلس شوریٰ کی مہر بنانے جانے پر دال نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ملکہ سابلقیس کا واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کے بعد اللہ پر ایمان لے آئی۔

”رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ (نمل: ۲۴)۔

اس کے بعد قرآن خاموش ہے، آیا وہ اپنی حکومت سے معزول کر دی گئی تھی یا حاکم باقی رہی تھی، ظاہر ہے کہ سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حکومت باقی رہی اور وہ اپنے ملک کی حاکم برقرار رہی؛ کیونکہ قرآن نے ان کے ایمان لانے کے ذکر کے بعد اس کی مدح و تعریف کی، مذمت بیان نہیں کی (دیکھئے: منصب الحکومت والمرأة المسلمة از رفیع اللہ شہاب، ص: ۶۸، ۶۷، ”حکومت المرأة فی الاسلام از جاوید جمادی دکنوی، ص: ۴۹، المرأة ومسئولہ الامارة از رحمت اللہ طارق، ص: ۶۷، ۶۸)۔

قرآن نے جہاں ملکہ بلقیس کی معزولیت کا ذکر نہیں کیا، وہیں اس کی حاکمیت کی بقا کا بھی تذکرہ نہیں کیا؛ اس لئے محض احتمال و شک کی بناء پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو اس کے ملک پر حاکم کی حیثیت سے باقی رکھا ہو؛ لہذا اس آیت سے یہ استدلال کرنا درست نہیں ہوگا کہ عورت حاکم بن سکتی ہے۔ علامہ آلوسی کا بیان ہے: ”ولیس فی الآیة ما یبدل علی جواز أن تکون المرأة ملکہ، ولا حجة فی عمل قوم کفرۃ علی مثل هذا المطلب“ (روح المعانی ۱۹، ۸۸۹)۔ یا مجلس شوریٰ کی مہر بن سکتی ہے، یا غیر مسلم ممالک میں یا مسلم ممالک میں انتخاب میں حصہ لے سکتی ہے، جبکہ دوسری خصوص واضح طور پر عورت کے حاکم بننے کی ممانعت پر دلالت کر رہی ہیں۔

یہ واقعہ اسلام سے پہلے کا ہے اور شرائع من قبلنا کی حجیت کے بارے میں ہمارے علماء و فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، اس لئے اس واقعہ سے استدلال قرین صواب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

نیز حضرت عائشہؓ کے عمل سے بھی استدلال کیا ہے کہ انہوں نے جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے خلاف قیادت کی تھی، ظاہر ہے کہ انہوں نے سیاسی امور

میں مداخلت کیں، معلوم ہوا کہ امور حکومت میں عورت کو مداخلت کا حق ہے (دیکھئے: تاریخ نظری ۱۹۸۳ء، مبادی نظام الحکم فی الاسلام از عبدالحمید متولی، ص: ۴۲۸)۔

اس اثر سے سیاسی امور، مجلس شوریٰ اور پارلیمنٹ وغیرہ کے ممبر بننے کے جواز پر استدلال کئی وجوہ سے درست نہیں ہے:

۱۔ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے اور دو مسلم جماعتوں کے درمیان صلح کرانے کے ارادہ سے نکلی تھیں؛ تاکہ مسلمانوں کا خون ناحق نہ بہے، حکومت حاصل کرنے یا سیاسی میدان میں کوئی رول ادا کرنے کے ارادہ سے نہیں نکلی تھیں۔

۲۔ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی، جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ بعد میں وہ اپنے فعل پر نادم ہوئیں، ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، چنانچہ انہوں نے اللہ سے توبہ واستغفار کیا (تولی المرأة الامامة الکبریٰ للامامین الحان محمد احمد، ص: ۱۸، حقوق الانسان وحریاتہ لعبد الوہاب الشیشانی، ص: ۶۹۶، ۶۹۷، المرأة بین الفقه والقانون للذکور مصطفیٰ السباعی، ص: ۱۵۲)۔

مجوزین علماء نے سیاسی امور میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ وغیرہ کے ممبر بننے کو قضاء پر بھی قیاس کیا ہے، یعنی بہت سے فقہاء نے عورت کے قاضی بننے کو درست قرار دیا ہے۔ احناف کے نزدیک عورت مفتی، قاضی اور وقف کی نگران بن سکتی ہے، البتہ وہ حدود و قصاص کے علاوہ امور میں فیصلہ کرے گی، بلکہ اگر وہ حدود و قصاص میں بھی فیصلہ کرے اور یہ فیصلہ دوسرے قاضی کے پاس جائے، اور وہ قاضی عورت کے فیصلہ کو درست سمجھتا ہے تو وہ اس فیصلہ کو نافذ کر دے گا باطل قرار نہیں دے گا (در مختار ج ۸، ۱۳۲، ۱۳۳)۔

امام طبرانی نے عورت کی حاکمیت کو مطلق جائز قرار دیا ہے، امام محمد بن حزم ظاہری نے کہا: عورت حکمراں ہو سکتی ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے شفا بنت عبداللہ عدویہ کو بازار کی ذمہ دار و نگران بنایا تھا (الاحوال والعاملات المعاصرة فی الفقه الاسلامی للذکور راشد عبداللہ الفرکان، ص: ۱۵، ۱۴)۔

عہدہ قضا کو سنبھالنا ولایت عامہ کے قبیل سے ہے، لہذا اس پر قیاس کرتے ہوئے پارلیمنٹ اور اسمبلی وغیرہ کی ممبر بن سکتی ہے۔

امور مملکت، سربراہ مملکت اور پارلیمنٹ وغیرہ کی ممبری کو قضاء پر قیاس کرنا درست نہیں ہے؛ کیونکہ عورت کے قاضی بننے کا مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے، جمہور علماء جائز قرار نہیں دیتے ہیں؛ کیونکہ ان کے یہاں بنیادی طور پر قاضی مرد ہی بن سکتا ہے، عورت مطلق نہیں بن سکتی، اگر زبردستی بنا دی گئی تو اس کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا، خود اس کی ولایت قضا باطل ہوگی، اگر وہ فیصلہ کرتی ہے تو فیصلہ باطل ہوگا، یہ مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور فقہاء احناف میں امام زفر کا مذہب ہے ("تیسرے احکام لابن فرعون ج ۱، ۱۸، بدایہ الجہد ۵۳۱/۲، مواہب الجلیل للمطاب فی فقہ مذہب الامام الشافعی ج ۲، ۱۴۳، المجموع شرح المہذب للذکور ج ۲، ۱۲، دار الفکر، الکافی لابن قدامہ ج ۳، ۴۳۳، المغنی مع الشرح الکبیر ج ۱، ۳۸۰، کتاب الفروع لابن مفلح ج ۶، ۴۲۱، الاختیار للموصلی ج ۲، ۸۳)۔

## خلاصہ قول:

زیر بحث مسئلہ میں علماء کے دونوں نقاط نظر کے دلائل اور قدر تجزیہ اور مناقشہ اور ذکر کئے جا چکے ہیں۔ دونوں فریق کے دلائل پر غور کرنے سے عدم جواز کا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ عدم جواز اکثر علماء کی رائے ہے۔ اسلامی ممالک اور غیر مسلم ممالک میں عام حالات میں یہی حکم ہوگا؛ لیکن بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں جہاں عورتوں کے لئے مختلف مناصب اور زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتوں کے لئے نشستیں مختص کی جا رہی ہیں، جیسا کہ ہندوستان میں یہ رجحان بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے کہ سیاست کے میدان میں عورتوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جائے، اس کے لئے مختلف ریاستوں میں مختلف سطحوں پر خواتین کے لئے نشستیں ریزرو کی جا رہی ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پنچایت کی سطح پر پچاس فیصد نشستیں عورتوں کے لئے مختص کر دی گئی ہیں اور لوک سبھا سے پارلیمنٹ میں خواتین کے لئے ۳۳ فیصد ریزرویشن کا بل پیش کیا جا چکا ہے اور قوی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کر لے۔ ایسی صورت میں عدم جواز کا حکم نافذ کرنے میں بڑا حرج لازم آئے گا اور مسلم مفادات پر بڑا منفی اثر مرتب ہوگا، اس طرح مسلم قوم و ملت کی ساخت اس ملک میں کمزور پڑ جائے گی، سیاسی امور میں مسلمانوں کا کوئی اثر و رسوخ باقی نہیں رہے گا، غیروں کی نظر میں بے وزن ہو کر رہ جائیں گے۔ دشمنان اسلام ان کو کھلونا بنا لیں گے، لہذا اولاً مسلمانوں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ پارلیمنٹ، لوک سبھا میں اور پنچایت کی سطح پر خواتین کے لئے ریزرویشن کو ختم کیا جائے، اگر مسلمان اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکیں تو تقویٰ قواعد: "من ابتلی ببلیتین وھما متساویتان، یاخذ بأیھما شاء، وإن اختلفا یختار أھوھما"۔ "إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتکاب أخفهما"، "الأشد یزال بالأخف"، "الضرر الأشد یدفع بالضرر الأخف" (الاشیاء والنظائر لابن نجیم، ج: ۱، ص: ۹۱، ۹۰، ۸۹، مجلة الاحکام العدلیة: ۹، ص: ۲۸، ۲۷، ۲۶) کی رو سے مذکورہ مناصب

کے لئے امیدوار کی حیثیت سے ایکشن میں اٹھنے اور مہربانی کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ نیز امام طبری اور محمد بن حزم نے عورت کی حاکمیت کو مطلق درست قرار دیا ہے۔ فقہاء احناف نے قاضی بنے کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت شفاء بنت عبد اللہ عدویہ کے اثر سے استیناس کیا جاسکتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ حضرت بلقیس کی ولایت مملکت سے استثناء کیا جاسکتا ہے۔ البتہ درج ذیل امور کی رعایت حتی الامکان ضروری ہوگی تاکہ مزید دوسرے فتنوں کو مٹانے کی راہ نہ ملے۔ اور وہ ضروری امور یہ ہیں:

۱۔ گھروں سے باہر نکلنے وقت نقاب یا لمبی چادر سے اپنے پورے جسم کو چھپائے، راستہ دیکھنے کے لئے صرف آنکھیں کھلی رکھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولا یبدین زینتھن الا ما ظہر منها، ویضربن بخمرھن علی جیوبھن“ (نور: ۳۱) (اور سنگار ظاہر نہ ہونے دیں مگر جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے، اور اپنے دوپٹے سینوں پر ڈالے رہا کریں)۔

۲۔ مردانہ لباس و پوشاک نہ ہو؛ کیونکہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر اور ان مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے ہیں (بخاری، لباس، باب التمشیح من الرجال بالنساء والتشبیات من النساء بالرجال، ج: ۲، ص: ۸۷)۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں جیسا لباس پہنے، اور اس عورت پر جو مردوں جیسا لباس پہنے (ابوداؤد، لباس، باب فی لباس النساء، ج: ۲، ص: ۵۶۶)۔

۳۔ خوشبودار عطر نہ لگائے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو خوشبودار عطر لگانے سے منع فرمایا ہے؛ بلکہ خوشبودار عطر لگا کر نکلنے پر سخت وعید وارد ہوئی ہے کہ وہ بدکار عورت ہے؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مردوں کی خوشبو وہ ہے جس کی بو ظاہر ہو اور رنگ چھپا رہے، جبکہ عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ ظاہر ہو اور بو چھپی رہے“ (ترمذی، ادب، باب ماجاء فی طیب الرجال والنساء، ۱۰۷، امام ترمذی کا بیان ہے، یہ حدیث حسن صحیح ہے)۔

۴۔ بچنے والا زیور نہ ہو، پیروں کو زمین پر زور سے نہ رکھیں کہ جس سے آواز پیدا ہو اور مردوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولا یضربن بأرجلھن لیعلم ما یخفی عنھن“ (نور: ۳۱) (اور عورتیں اپنے پیروں سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے)۔

زیور سے یہاں مراد وہ زیورات ہیں جو از خود نہیں بچتے ہیں بلکہ کسی چیز کی رگڑ سے بچاؤ اٹھتے ہیں، مثلاً چھڑے، کڑے وغیرہ۔

۵۔ پرکشش چال نہ چلے، جیسا کہ اوپر کی آیت سے بھی واضح ہے؛ کیونکہ بچنے والا زیور نہ پہننے اور پیروں کو زمین پر زور سے رکھ کر چلنے کی ممانعت کی وجہ فتنہ کا اندیشہ ہے، اس کے مقابلہ میں پرکشش چال چلنے میں فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب میں فرمایا:

”ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولى“ (احزاب: ۳۳) (اور دکھلائی نہ پھر جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں)۔

علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ”تبرج“ میں وہ تمام صورتیں داخل ہیں جو فتنہ کا سبب بن سکیں۔ اسی میں حسن کا اظہار، شیریں ادا میں، ناز سے قدم اٹھانا اور پرکشش چال چلنا سب داخل ہیں؛ کیونکہ ان تمام صورتوں میں فتنہ کا اندیشہ ہے (تفسیر قرطبی ۱۱۷/۱۳، درمشورہ ۱۹۷/۵)۔

۶۔ راستہ چلتے خواہ پیدل ہو یا سواری پر، دور کا سفر ہو یا قریب، بس سے ہو یا ٹرین سے یا ہوائی جہاز سے جب بھی کہیں بھی جس حالت میں ہو، جب کسی اجنبی مرد سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہو تو انداز گفتگو پرکشش اور پکدار نہ ہو، ہونٹوں پر مسکان بھرتی ہوئی بات نہ کرے، بلکہ گفتگو کا لہجہ ٹیکھا ہو اور اسلوب ترش ہو؛ تاکہ اس کے دل میں کسی طرح کا شیطانی وسوسہ بھی تو وہ دب جائے گا اور اگلا قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا معروفا“ (احزاب: ۳۳) (سو تم دب کر بات نہ کرو پھر لالچ کرے کوئی جس کے دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول)۔

۷۔ اصل یہی ہے کہ عورت گھر سے باہر نہ نکلے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ“ (احزاب: ۳۳) (اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں)؛ لیکن ضرورت و حاجت کی بناء پر نکلنا اور پردہ کر کے گئی شرائط کے ساتھ درست ہے، تاہم اس میں بھی اصل یہ ہے کہ عورت گھر سے جتنا نہ نکلے؛ بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی محرم رشتہ دار ہو گا راستہ مامون ہو؛ کیونکہ عورت کا گھر سے نکلنا ہی فتنہ ہے۔

”لأن نفس خروج المرأة من بيتها ومشيها في الطريق فتنه“ (احکام النساء لابن الجوزی، ص: ۱۰۹)۔

۸۔ اسمبلی ہال یا پارلیمنٹ میں اس سائیز بیٹھے جدھر خواتین کی نشستیں ہوتی ہیں، مردوں کے بیچ میں نہ بیٹھے اور ایک ساتھ ایک سیٹ پر نہ بیٹھے؛ کیونکہ یہ بھی مردوں کے ہجوم میں بیٹھنے کے حکم میں داخل ہے، اس لئے کہ علامہ قرطبی نے ”ولا تبرزن تبرج الجاہلیة“ (احزاب: ۳۳) کی تفسیر میں ایک تفسیر یہ بھی نقل کی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں مردوں کے ہجوم میں چلا کرتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا کہ ایسا مت کرو (تفسیر قرطبی ۱۱۷/۱۳)۔

لہذا اگر خواتین کی علیحدہ سیٹیں مختص نہ ہوں تو ایک سائیز بیٹھے نہ کہ وسط کی سیٹ پر؛ تاکہ اختلاط سے بچا جاسکے اور بے جا گفتگو سے محفوظ رہ سکے۔

۹۔ کانفرنس ہال میں چہرہ پر نوز پینس لگائے رہے، کیونکہ سامنے اجنبی مرد ہوتے ہیں اور اجنبی مردوں ہی سے فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے اور اصلاً ان ہی سے پردہ ہے۔

۱۰۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی وغیرہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے لباس ایسا زیب تن کرے جو ساتر ہونے کے ساتھ ڈھیلا ڈھالا ہوا اور موٹا ہو؛ کیونکہ ایک مسلم خاتون کے لئے جائز نہیں ہے کہ ایسا باریک کپڑا پہنے جس سے جسم کا رنگ جھلکتا ہو، یا موٹا کپڑا پہنے، لیکن بالکل چست ہو جس کی وجہ سے جسم کے خلقی ڈھانچے نمایاں نظر آتے ہوں (دیکھئے: بدائع الصنائع ۲۹۷/۳، کبیری، ص: ۲۱۳، البحر الرائق ۲۶۵، فتح العزیز مع المجموع ۹۶، ۹۷)۔

☆☆☆

## ایکشن سے متعلق اہم مسائل - اسلامی تناظر میں

مفتی راشد حسین ندوی ؒ

انتخاب اور ایکشن جمہوریت کے تقاضے ہیں، جمہوریت ایک جدید نظام حکومت ہے، لہذا تمام نئے امور کی طرح اس کے لئے بھی کتاب و سنت میں صراحت سے کچھ نہیں مل سکتا، البتہ چونکہ اسلام آخری مذہب ہے، قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا اس میں حل ہے، لہذا غور کرنے سے کتاب و سنت سے جمہوریت، ایکشن اور اس کے تمام متعلقات کے احکام مل جاتے ہیں۔ البتہ دوسرے نئے مسائل کی طرح احکام تلاش کرنے والوں کے درمیان فقط نظر اور آراء کا اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے جیسا کہ آگے کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ فقہ اکیڈمی نے اپنے چودھویں سمینار میں ایک موضوع ”غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل“ کے تحت ایکشن سے متعلق بھی چند سوالات رکھے تھے۔ راقم نے اس موضوع پر کچھ طالب علمانہ گفتگو کی تھی، لیکن اس موضوع پر مرتب کی جانے والی تجاویز ان میں سے کئی سوالات کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اکیڈمی نے ان سوالات کو کچھ اضافہ کے ساتھ پھر چھیڑا ہے۔ ہم ذیل میں ان سوالات کے مختصر جوابات عرض کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۱): ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے، فیروز اللغات میں اس کے معنی رائے کے لئے گئے ہیں، عربی میں اس کو صوت کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایکشن کی سطح کے ہوتے ہیں، ان میں سے ایک کو جنرل ایکشن کہا جاتا ہے۔ اس ایکشن میں ممبران پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آتا ہے، دوسرا صوبائی ایکشن ہوتا ہے، جس میں صوبائی اسمبلی کے ارکان چنے جاتے ہیں، اس کے علاوہ بلدیہ اور گاؤں پانچایت کے ایکشن بھی ہوتے ہیں، جن میں میئر، چیئرمین اور گاؤں پردھان وغیرہ چنے جاتے ہیں۔ پارلیمانی اور صوبائی سطح کے ایکشن میں ایکشن کی جانب سے تاریخیں طے کر کے اعلامیہ جاری کیا جاتا ہے۔ پورے صوبہ یا ملک کو مختلف زون میں بانٹا جاتا ہے۔ خاص تاریخوں میں زرمنانت، چند دستاویزات اور کچھ دوسری شرائط کو پورا کرنے والا ان ایکشن میں امیدوار بن سکتا ہے، پھر مقررہ تاریخوں میں ایکشن ہوتا ہے، ووٹ دینے کے لئے لازمی ہے کہ ووٹر کا نام، ووٹر لسٹ میں موجود ہو اور اس کے پاس ایکشن شناختی کارڈ یا دوسری معتبر دستاویزات موجود ہوں، ورنہ اسے ووٹ دینے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے، سب شرائط موجود ہوں تو اسے خفیہ طور سے ووٹ دینا ہوتا ہے، چاہے بیلٹ پیپر پر دینا ہو، یا ایکشن کی مخصوص الیکٹرانک مشین پر، اگر کوئی ظاہر کر کے ووٹ دے، تو اسے خلاف قانون مان کر مسترد بھی کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تک ہندوستان میں یہی روایت ہے کہ جبری طور پر ووٹ نہیں دلا جاتا۔ یہ امیدواروں کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنے حامیوں کو ووٹ دینے پر آمادہ کریں، کوئی اگر ووٹ نہ دے تو حکومت کی طرف سے اس پر سختی نہیں کی جاتی ہے۔ ایکشن کے عمل کی مختصر تفصیل یہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس پورے عمل کو شرعی طور پر کیا نام دیا جائے؟ اس کے بارے میں کئی باتیں کہی جاتی ہیں:

الف۔ اس پورے عمل کو شہادت قرار دیا جائے، گویا ووٹر گواہی دے رہا ہے کہ میرے نزدیک مطلوبہ عہدہ کا زیادہ استحقاق فلاں کو ہے۔

ب۔ اس عمل کو توکیل کی ایک شکل سمجھا جائے، گویا ووٹر ووٹ دے کر اپنے پسندیدہ شخص کو اسمبلی میں اپنی نمائندگی دے رہا ہے اور اس کی آواز کو اپنی آواز قرار دے رہا ہے۔

ج۔ اسے شفاعت یا سفارش قرار دیا جائے۔

د۔ اس عمل کو رائے قرار دیا جائے، یعنی ووٹر کی رائے اور مشورہ یہ ہے کہ فلاں شخص اس عہدہ کا زیادہ مستحق ہے۔

ط۔ مدرسہ ضیاء العلوم، میدا پور، ہنگیہ کلاں رائے بریلی (یو پی)۔

ہ۔ اسے (اسلامی ملکوں میں) بیعت کا ایک طریقہ قرار دیا جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے: جواہر الفقہ (مفتی شفیع صاحب) ۲۹۱/۳، ۲۹۲، جدید فقہی مسائل (خالد سیف اللہ صاحب رحمانی) ۱/۴۵۷)۔

ذیل میں ان جہتوں پر ہم فقہی اعتبار سے نظر ڈالتے ہیں۔

شہادت کی تعریف: شہادت کی تعریف کرتے ہوئے صاحب عنایہ فرماتے ہیں: ”وہی فی اللغة عبارة عن الأخبار بصحة الشیخ، عن مشاهدة وعیان، ولهذا قالوا: انها مشتقة من المشاهدة التي تنبئ عن المعاينة، وهي فی اصطلاح اهل الفقه عبارة عن اخبار صادق فی مجلس الحكم بلفظ الشهادة (الی) وقوله فی مجلس الحكم بلفظ الشهادة یخرج الاخبار الصادقة غیر الشهادات“ (شرح العنایة علی هامش فتح القدیر ۶، ۴۳۲، وكذا فی رد المحتار ۴، ۴۱۱)۔

(شہادت لغت میں مشاہدہ اور پچھشم خود کچھ کر کسی چیز کی صحت کی خبر دینے کو کہتے ہیں، اسی لئے فقہاء کہتے ہیں: یہ لفظ مشاہدہ سے ماخوذ ہے جو کہ معاینہ کی خبر دینا ہے اور اہل فقہ کی اصطلاح میں شہادت لفظ شہادت کے ساتھ عدالت میں سچی خبر دینے کو کہتے ہیں (آگے فرماتے ہیں) اور لفظ شہادت کے ساتھ عدالت میں ہونے کی قید شہادتوں کو چھوڑ کر دوسری سچی خبروں کو مفہوم سے خارج کر دیتی ہے)۔

اس تعریف ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایکشن خواہ کسی اسلامی ملک میں ہو رہا ہو یا غیر اسلامی ملک میں، کہیں بھی ووٹ دینے کو اصطلاحی شہادت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ نہ تو یہاں مجلس قضاء ہوتی ہے، نہ لفظ شہادت ہوتا ہے، بلکہ پورا عمل خفیہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر فقہاء نے لفظ شہادت کو شہادت کارکن قرار دیا ہے: ”ورکنها لفظ اشہد لا غیر“ (اس کارکن لفظ شہادت ہے نہ کہ کوئی دوسرا لفظ) اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی بھی شی کا وجود اس کے رکن کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کے لئے دلائل بھی لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا ووٹ دینے کو اصطلاحی شہادت قرار نہیں دیا جاسکتا، نہ ہی فقہ اسلامی میں کوئی ایسی نظیر موجود ہے جس کے لئے اتنی بڑی تعداد کے شہادت دینے کی ضرورت ہو، البتہ اسے لغوی شہادت قرار دیا جاسکتا ہے۔

توکیل: دوسری جہت علماء عصر نے یہ بتائی ہے کہ اسے توکیل قرار دیا جائے، وکالت کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام بنانے کو کہتے ہیں: ”وهو إقامة الغير مقام نفسه ترها أو عجزا فی تصرف جائز معلوم“ (شامی ۴، ۴۳۵) پھر فقہاء نے اس کی دو قسمیں کی ہیں: توکیل عام اور توکیل خاص، ووٹ کو بھی توکیل خاص قرار دیا جاسکتا ہے، اس معنی میں کہ مخصوص سیاسی امور کے لئے اس کو نمائندہ بنا رہا ہے۔

لیکن ووٹ کو توکیل قرار دینے میں بھی اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک حلقہ میں کئی افراد مختلف جماعتوں کی طرف سے یا آزادانہ اپنی امیدواری پیش کرتے ہیں، اس حلقہ کے لوگ الگ الگ آراء ظاہر کرتے ہیں، اگر یہ توکیل ہے تو تمام امیدواروں کو نمائندگی کا حق ملنا چاہیے تھا، اس لئے کہ ہر نمائندہ کو کچھ نہ کچھ ووٹ ضرور ملنے ہیں۔ اس طرح ہر نمائندہ کچھ نہ کچھ افراد کا وکیل ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ جس کو زیادہ ووٹ ملیں اسے پورے حلقہ کا نمائندہ تسلیم کر لیا جاتا ہے، جبکہ ایک بڑی تعداد نے اس کو وکیل نہیں بنانا چاہا تھا، اگر یہ توکیل ہے تو ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔

پھر ایک شخص جب ممبر منتخب ہو جاتا ہے تو اس کو معزول یا بحال کرنے کا حق مخصوص اوقات تک کسی ووٹر کو نہیں ہوتا، جبکہ توکیل میں کسی وقت بھی موکل وکیل کو معزول کرنے کا اختیار رکھتا ہے، ”فللموکل العزل متى شاء ما لم يتعلق به حق الغير“ (شامی ۴، ۴۶۳) (جب تک حق غیر متعلق نہ ہو گیا ہو موکل جب چاہے معزول کا حقدار ہے)۔

اس طرح کے اور بھی احکام ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلی طور پر توکیل بھی نہیں ہے، البتہ توکیل سے کچھ تشبیہ ضرور ہے۔

شفاعت: تیسری جہت یہ ہے کہ اسے سفارش قرار دیا جائے، گویا ووٹر سفارش کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو ممبر بنا لیا جائے اور جس کے سفارشی زیادہ ہوتے ہیں، ایکشن کمیشن اس کو منتخب قرار دیتا ہے، لیکن اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ شفاعت یا سفارش اس ذات سے کی جاتی ہے جس کو کلی اختیار حاصل ہو، جبکہ یہاں ایکشن کمیشن، یا کوئی دوسرا ادارہ یا فرد اپنے طور سے کچھ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے، جس کو زیادہ ووٹ حاصل ہوں اسے بہر حال انہیں منتخب قرار دینا ہے۔ یہ سفارش کے اصولوں کے خلاف بات ہے۔ اس لئے اسے کلی طور پر سفارش بھی نہیں کہہ سکتے۔

مشورہ: چوتھی جہت یہ ہے کہ اسے مشورہ قرار دیا جائے، یعنی حلقہ میں صرف ایک ممبر منتخب ہو سکتا ہے، دعویٰ کئی نے پیش کر دیا ہے، لیکن ایکشن کمیشن اس

طرح کی صورت حال میں یہ فیصلہ نہیں کر پارہا ہے کہ حلقہ کی نمائندگی کے لئے کون زیادہ بہتر رہے گا۔ اپنے طور سے کسی کو منتخب بھی کرے تو اس پر طرح طرح کے الزامات لگ سکتے تھے، لہذا ایکشن کمیشن نے حلقہ کے مخصوص افراد سے (جن کی شرائط طے شدہ ہیں) خفیہ طور سے استفسار کیا کہ آپ کی رائے میں زیادہ بہتر کون ہے، ووٹ کے لفظی معنی، عربی اردو میں اس کے متبادل الفاظ (صوت، استصواب رائے وغیرہ) کو دیکھا جائے تو یہ چوتھی جہت زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ اسی لئے اگر کسی حلقہ میں ایک ہی نمائندہ سامنے ہو تو ووٹنگ کا عمل نہیں ہوتا، توکیل، شہادت یا سفارش قرار دیا جائے تو اس صورت حال میں ان کا اطلاق دشوار ہوگا، جبکہ رائے ماننے کی شکل میں اس کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اس صورت میں مشورہ لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی ضرورت تو امیدواروں کے تعدد کے وقت ہوتی ہے۔

لیکن اس جہت پر بھی ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ جس کو منتخب کرنے کا زیادہ ووٹ مشورہ اور رائے دیں اس کو منتخب قرار دیا جاتا ہے اور قانوناً یہ بات طے شدہ ہے، جبکہ مشورہ لینے والے پر کثرت رائے کو ماننے کا شرعاً لازم نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ چاہے تو کسی کا بھی مشورہ نہ مانے، اس جہت پر بھی کچھ تردد ہوتا ہے، لیکن اس کو اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ مشورہ لینے والے نے بہت سے مصالح کے پیش نظر یہ التزام کر رکھا ہے کہ اکثر کے مشورہ پر عمل کرے گا، دنیا کی صورت حال کے پیش نظر یہ چوتھی جہت کچھ اشکالات کے باوجود نسبتاً زیادہ واضح ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ووٹ میں شہادت، توکیل اور شفاعت کے کچھ اوصاف اگرچہ پائے جاتے ہیں، لیکن کلی طور سے نہ وہ شہادت سے نہ توکیل، نہ شفاعت، اسے مشورہ قرار دینے میں بھی کچھ اشکالات وارد ہوتے ہیں، لیکن فقہی طور سے اسے مشورہ قرار دینا نسبتاً زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

## (۲): ووٹ کا شرعی حکم:

پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ووٹ دینے کو مکمل طور سے شہادت نہیں قرار دیا جاسکتا، لہذا گواہی چھپانے کی کتاب وسنت میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں مثلاً: ”ولا تکتُموا الشہادۃ و من یکتُمہا فإنہ آثم قلبہ“ (سورۃ البقرہ: ۲۸۳) ان کو یہاں پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ بالفرض اس کو شہادت قرار بھی دیا جائے، تب بھی ووٹ دینے کو مطلقاً واجب قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ شہادت دینے کا وجوب خاص شرائط کے پائے جانے پر ہوتا ہے، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

”ویلزماً أداء الشہادۃ ویأثم بکتماہما إذا طلب المدعی، وإنما یأثم إذا علم أن القاضی یقبل شہادته، وتعمین علیہ الأداء وإن علم أن القاضی لا یقبل شہادته، أو كانوا جماعة فادی غیرہ ممن تقبل شہادته فقبلت، قالوا لا یأثم، وإن أدى غیرہ ولم تقبل شہادته یأثم من لم یؤد إذا كان ممن تقبل شہادته... وإن كان موضع الشاهد بعيداً من موضع القاضی بحيث لا یمكنه أن یغدو إلى القاضی لأداء الشہادۃ ویرجع إلى أهلہ فی یومہ ذلك قالوا: لا یأثم هكذا فی التبيين“ (ہندیہ ۳۰۴۲)۔

(جب مدعی مطالبہ کرے تو گواہی دینا لازم ہے اور اس کو چھپانے سے گنہگار ہوگا اور گنہگار اس وقت ہوگا جب اسے معلوم ہو کہ قاضی اس کی شہادت قبول کرے گا اور أداء شہادت اس پر متعین ہوگی ہو اور اگر اسے معلوم ہو کہ قاضی اس کی شہادت قبول نہیں کرے گا۔ یا گواہوں کی جماعت ہو اور دوسرا گواہی دے دے جس کی گواہی مقبول ہوتی ہو اور گواہی قبول کر لی جائے تو فقہاء کہتے ہیں: وہ گنہگار نہیں ہوگا اور اگر دوسرا گواہی دے اور اس کی گواہی قبول نہ کی جائے تو وہ شخص گنہگار ہوگا جو گواہی نہ دے بشرطیکہ ان لوگوں میں سے ہو جس کی گواہی قبول کی جاتی ہے اور اگر گواہ کی جگہ قاضی کی جگہ سے اتنی دور ہو کہ اس کے لئے ممکن نہ ہو کہ صبح قاضی کے پاس گواہی دینے جائے اور اسی دن اپنے گھر لوٹ آئے تو فقہاء کہتے ہیں وہ گنہگار نہیں ہوگا، تمہیں میں اسی طرح ہے)۔

”وسبب وجوبہا طلب ذی الحق او خوف فوت حقہ بان لم یعلم بہا ذو الحق وخاف فوہ لزمہ ان یشہد بلا طلب“ (شامی ۴۱۱)۔

(اس کے وجوب کا سبب صاحب حق کا مطالبہ یا اس کے حق کا فوت ہو جانا ہے بایں طور کہ صاحب حق اس کو نہ جانتا ہو اور اسے اس کے حق کے فوت ہو جانے کا خوف ہو تو اس پر بغیر مطالبہ کے گواہی دینا لازم ہوگا)۔

معلوم ہوا کہ شہادت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی، لہذا ووٹ کو شہادت مان بھی لیں تو وجوب اسی وقت ہو سکتا ہے، جب ہر اعتبار سے لائق اور مستحق



نمائندہ کھڑا ہو، اس کا مقابل بالکل غیر مستحق ہو اور اس کے (بیز دوسرے صحیح افکار لوگوں کے ووٹ نہ دینے سے) یقین ہو کہ مستحق اپنے حق سے محروم ہو جائے گا۔ اس طرح کی صورت حال پائی جا رہی ہو تو ووٹ کو شہادت کے بجائے مشورہ یا رائے قرار دینے پر بھی بعض اوقات وجوب ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ تعاون علی البر ہے، جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے:

”تعاونوا علی البر والتقوی“ (سورۃ المائدہ: ۲) (اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر)۔

اور حدیث شریف میں فرمایا گیا: من رأى منكراً منكرأ فليخبره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيماں“ (مسلم، کتاب الایمان باب بیان كون النبی عن المنكر من الایمان رقم الحدیث: ۷۸) (تم میں سے جو شخص کوئی منکر دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے کرے، یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے کرے اور یہ کمزور ترین ایماں ہے)۔ ظاہر بات ہے کہ رائے اور مشورہ دے کر نیکی میں تعاون کر سکتا ہے اور منکر کو مٹا سکتا ہے۔

اور جب نمائندوں میں کوئی بھی مستحق نہ ہو تو انھوں نے اہلیتین کو اختیار کرتے ہوئے نسبتاً بہتر نمائندہ کو ووٹ دینا بہتر یا جائز (الگ الگ حالت میں) تو ہو سکتا ہے، واجب نہیں قرار دیا جاسکتا، خواہ اسے شہادت قرار دیا جائے یا کچھ اور۔ واللہ اعلم۔

(۳): ایکشن میں امیدوار بننا:

ایکشن میں ایسے شخص کے لئے امیدوار بننا جائز ہے، جو دیانت دار، امانت دار اور حوصلہ مند ہو، قوم کی نمائندگی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، اگر کسی وصف میں کمی ہو تو شرعاً اس کے لئے نمائندہ بننا جائز نہیں ہوگا، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب عزیز مصر کے سامنے اپنی خدمات پیش کی تھیں تو فرمایا تھا:

”اجعلنی علی خزائن الأرض“ (مجھے مقرر کر ملک کے خزانوں پر) ”إنی حفیظ علیہ“ (میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا) (یوسف: ۵۵)۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا تھا: ”یا أبا ذر! إنك ضعيف، وإمنا أمانة، وإمنا يوم القيامة خزي وندامة، إلا من أخذها بحقها وأدى الذى فيها“ (مسلم، کتاب الامارة، باب كراهية الامامة بغير ضرورة: ۱۸۲۵) (اے ابوذر! تم کمزور ہو اور ولایت ایک امانت ہے اور قیامت کے دن یہ رسوائی اور ندامت ثابت ہوگی، سوائے اس کے جس نے اس کا حق رکھ کر اس کو لیا اور اس کی ذمہ داری نبھائی)۔

نمائندہ بننے کے بعد اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ انتخابی مہم چلانے میں کوئی خلاف شریعت بات نہ کرے، مثلاً ناقابل عمل جھوٹا وعدہ اور خلاف واقعہ تعریف کرے، خلاصہ یہ کہ انتخابی مہم چلانے میں کسی محظور شرعی کام مرتکب نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

(۴): خلاف شریعت قانون سازی:

جمہوری نظام کی نہایت سنگین اور خطرناک خرابی یہ ہے کہ ممبروں کو قانون سازی کا بھی حق ہوتا ہے، وضع کردہ یہ قوانین کبھی شریعت کے موافق ہوتے ہیں، کبھی کھلم کھلا متضاد ہوتے ہیں، جو حضرات ایکشن کے عمل میں مسلمانوں کی شرکت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ شارع حقیقی صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے: ”إن الحكم إلا لله، أمر ألا تعبدوا إلا آياه“ (سورہ یوسف: ۴۰) (حکومت نہیں کسی کی سوائے اللہ کے، اس نے فرمایا کہ نہ پوجو گراہی کو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ”ألہ ترالی الذین یزعمون“ (الآیۃ: سورہ نساء: ۶۰) (کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اترا تیری طرف اور جو اترا تجھ سے پہلے، چاہتے ہیں کہ تفسیہ لے جائیں شیطان کی طرف اور حکم ہو چکا ہے کہ ان کو کہ اس کو نہ مانیں)۔

ایک اور جگہ ہے: ”ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئك هم الظالمون“ (سورہ مائدہ: ۴۵) (اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا، سو وہی لوگ ہیں ظالم)۔

”ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئك هم الکافرون“ (سورہ مائدہ: ۴۴) (اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا، سو وہی لوگ ہیں کافر)۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس نظام میں بنیادی طور پر قانون سازی انسانوں کے حوالہ کر دی جاتی ہے، لہذا اس عمل میں کسی بھی اعتبار سے شرکت ناجائز ہے۔ دلیل کے اعتبار سے ان حضرات کی رائے بہت مضبوط ہے، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ فی الوقت اسلامی حکومت کا خواب دیکھنا، خاص طور سے غیر مسلم اکثریت والے ممالک میں شیخ چلی کے خیالی پلاؤ جیسی چیز ہے: "لعل اللہ یحدث بعد ذلك أمراً" پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی اسلامی ملک کی طرف ہجرت کی جائے۔ بظاہر ہمارا جینا مرنا نہیں ہے، اس کے بعد غور کرنا چاہیے کہ فائدہ اس عمل میں شرکت کرنے میں ہے، یا اس سے احتراز کرنے میں؟ صاف طور سے محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی عمل سے مکمل کنارہ کشی کرنے سے اسلام دشمن لابی کے حامی ہو جانے کا خطرہ ہے، جس کے بعد ہمارے لئے اپنی تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ فی الحال جو پارٹیاں اور جماعتیں مسلمانوں کی ہمنوائی کا دم بھرتی ہیں، خواہ یہ ظاہری طور پر اور منافقت کے طور پر ہی کیوں نہ ہو، اس کی وجہ صرف یہ لالچ ہے کہ مسلمانوں کے ووٹ انہیں حاصل ہو جائیں گے، اگر انہیں اندازہ ہو کہ اس تل میں تیل ہی نہیں بچا، تو پوری طرح الگ ہو کر دوسرا راستہ اختیار کر لیں گی۔

لہذا اصلاحیت اور حوصلہ مند افراد کے لئے ان اداروں کا ممبر بننا جائز ہے، لیکن اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہوں گی۔

۱۔ دل سے یہ عقیدہ رکھے کہ شارع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، نہ کہ انسان، اپنی شرکت کو ایک مجبوری اور اھوں البلیتین سمجھے۔

۲۔ کوئی خلاف شریعت بل پارٹی کے زیر بحث آئے، تو پارٹی سطح پر اس کو ہٹوانے کی حتی الامکان کوشش کرے، پوری جرأت کے ساتھ اس کی منہ تریں اور عدم افادیت ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ اگر اس کی بات نہ سنی جائے اور وہ پیپ جاری کر دیا جائے تو اچھی طرح غور کر لے کہ اس خلاف شریعت بل کے باوجود اس کا اس پارٹی میں رہنمائی کے لئے مفید ہے یا پارٹی چھوڑ دینا، اگر پارٹی چھوڑنے سے ملت کا کوئی نقصان ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پارٹی چھوڑ دے، لیکن اگر پارٹی چھوڑنے سے ملت اسلامیہ کے نقصان کا اندیشہ ہو تو بدرجہ مجبوری اس آیت کریمہ کے ارشاد کو سامنے رکھتے ہوئے بل پاس ہونے دے:

”من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان“ (الآیة (سورہ نحل: ۱۰۶) (جو کوئی منکر ہو اللہ سے یقین لانے کے پیچھے، مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے ایمان پر، لیکن جو کوئی دل کھول کر منکر ہو سو ان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے)۔ جس طرح مکہ کے لئے دل میں ایمان رکھتے ہوئے کلمہ کفر کی ادائیگی کی اجازت ہوتی ہے، اسی طرح اسے بھی امت مسلمہ کے مفاد عام کے تحت اس ادارہ میں شرکت کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ اس طرح کی صورت حال میں یہی اھوں البلیتین ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لا يكلف الله نفسا إلا وسعها“ (سورہ بقرہ: ۲۸۶)۔

اسی وجہ سے فقہ اکیڈمی کی تجویز میں ہے: ”اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے، لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم تلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے، لہذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا ایکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے“ (فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۰۸)۔

(۵): دستور کا حلف لینا:

اگر کوئی شخص تاعمر کسی ادارہ کا ممبر نہ بنے، لیکن وہ کسی غیر مسلم ملک میں رہتا ہو، تو صرف رہنمائی اس کا گویا یہ عہد کرنا ہے کہ یہاں کے دستور اور قوانین کو تسلیم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس طرح کے خاموش معاہدہ کو بھی جائز نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے کہ مسلمانوں نے ”لا الہ الا اللہ“ پڑھ کر تمام وضعی قوانین کا انکار کر دیا ہے، وہ اسلامی قوانین کے سوا کسی بھی قانون کے انکار کا پابند ہے، لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اس خاموش معاہدہ کی قباحت کے باوجود، دنیا کی مجموعی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اکثر علماء نے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

جب کوئی شخص کسی قانون ساز ادارہ کا ممبر بنتا ہے تو یہی خاموش معاہدہ اسے زبان سے بھی دہرانا پڑتا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خاموش معاہدہ کے مقابلہ میں اس کی شناخت بڑھی ہوئی ہے، لیکن اگر ملت اسلامیہ کے لئے کچھ کام کرنا ہے تو اس سے کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے، لہذا جس طرح دستور کی بہت سی دفعات کے خلاف شریعت ہونے کے باوجود ہم اس ملک میں رہائش اختیار کر کے گویا ایک طرح کی خاموش حمایت اور تائید کر رہے ہیں، جبکہ ہم دل سے اسلام

مخالف دفعات کے مخالف ہیں اور یہ عزم رکھتے ہیں کہ موقع ملا تو ان پر خط تشبیح پھیر دیں گے، اسی طرح اگر "الامن اکرہ" کے پیش نظر اس خاموش حمایت کو زبان سے بھی کہہ دیا جائے، جبکہ دل میں اس کی خرابی راسخ ہو اور موقع ملنے پر اس میں تبدیلی کر دینے کا عزم مصمم ہو تو شرعاً اس میں کوئی گناہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کے بغیر اس ناحیہ سے ملت کو فائدہ پہنچانا ممکن ہے۔

پھر بارہا ایسا ہوا ہے کہ ممبران حلف لیتے ہیں اور کچھ دفعات کو مٹانے کے درپہ ہو جاتے ہیں، ایمر جنسی کے بعد جب مرارجی دیسانی کی قیادت میں جنتا پارٹی کی حکومت بنی تو ظاہر ہے کہ تمام ممبران نے دستور سے وفاداری کا حلف لیا ہوگا، لیکن صرف ڈھائی سال میں بہت ساری دفعات میں تبدیلی کرائی گئی، چنانچہ عملی طور سے دستور بننے سے لے کر اب تک متعدد بار اس میں ترامیم ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔

اس طرح ایک مسلمان ممبر جب اس ارادہ کے ساتھ وفاداری کا حلف لے گا تو وہ ملکی قوانین کے بھی خلاف نہیں ہوگا اور مذکورہ بالا مجبوری کے تحت شرعاً بھی اس کی گنجائش ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(۶): بائبل پر حلف لینا:

احادیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: "إِنَّ اللَّهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، مَنْ كَانَتْ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللَّهِ أَوْ لِيصْمِتَ" (بخاری: ۲۴۳۶، کتاب الايمان والنذور ياب لا تحلفوا بآبائكم، مسلم: ۱۲۳۶، كتاب الايمان باب النهي عن الحلف بغير الله تعالى) (نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ تم کو اپنے آباء کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، جس کو قسم کھانا ہے، وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے)۔

اس سے قدرے زیادہ تفصیل حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے: قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: "لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، وَلَا بِأُمَّهَاتِكُمْ، وَلَا بِالْأَنْدَادِ، وَلَا تَحْلِفُوا بِاللَّهِ إِلَّا وَأَنْتُمْ صَادِقُونَ" (ابوداؤد: ۲۲۲۸، كتاب الايمان والنذور، باب كراهية الحلف بالآباء، نسائی: ۲۸۰۰، كتاب الايمان والنذور باب الحلف بالأمهات) (آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہ اپنے آباء کی قسمیں کھاؤ نہ ماؤں کی، نہ بیویوں کی اور اللہ کی قسمیں بھی اسی وقت کھاؤ جب تم سچے ہو)۔

شرح مشکوٰۃ ملا علی قاریؒ علامہ نووی کے حوالہ سے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال النووي: قالوا: الحكمة في النهي عن الحلف بغير الله تعالى: إن الخلف يقتضي تعظيم المحلوف به، وحقيقة العظمة مختصة به تعالى فلا يضاهاه به غيره" (مرقاۃ: ۵۲۶، فصل بلی کیشنز) (علماء فرماتے ہیں: غیر اللہ کی قسم کی ممانعت کی حکمت یہ ہے کہ قسم مقوم بہ (جس کی کھائی) کی عظمت و تعظیم کی تقاضی ہے اور عظمت کی حقیقت اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، لہذا کوئی اور اس سے مشابہ نہیں ہو سکتا) اسی لئے فقہاء نے اس سے منع کیا ہے:

"لا يقسم بغير الله تعالى، كالذبي والقرآن والكعبة" (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۲: ۵۶، مكتبة فيض القرآن) (غیر اللہ جیسے نبی، قرآن اور کعبہ کی قسم نہیں کھائے گا)۔

البتہ متاخرین نے قرآن کی قسم کو دو وجہوں سے معتبر قرار دیا ہے، ایک تو یہ کہ قرآن کلام اللہ ہے اور اللہ کی صفت کی قسم کھانا جائز ہے، دوسرے یہ کہ اس کا عرف پایا جاتا ہے، عرف کی بنیاد ہی پر قرآن مجید پر ہاتھ رکھنے کو بھی قسم قرار دیا گیا، صاحب الدر المختار فرماتے ہیں:

"قال الكمال: ولا يخفى أن الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يميننا (إلى) عبارته: وعندى: لو حلف بالمصحف يمين" (قوله وقال العيني) عبارته: وعندى: لو حلف بالمصحف او وضع يده عليه وقال: وحق هذا فهو يمين، ولا سيما في هذا الزمان الذي كثرت فيه الأيمان الخ (الدر المختار ورد المحتار ۲: ۵۶) (علامہ کمال ابن الہمام کہتے ہیں: یہ سچی نہیں ہے کہ اس وقت قرآن کی قسم متعارف ہے، لہذا وہ یمن ہوگی اور عینی فرماتے ہیں کہ مصحف کی قسم یمن ہوگی (قوله وقال العيني) علامہ عینی کی عبارت یہ ہے: "میرے نزدیک اگر مصحف کی قسم کھائے، یا اس پر اپنا ہاتھ رکھے اور کہے: اس کے حق کی قسم! تو وہ یمن ہے اور خاص طور سے اس زمانہ میں جس میں قسموں کی

کثرت ہے)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی قسم کھانا گویا اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص تعظیم دینا ہے، اس لئے فقہاء نے اس سے منع کیا ہے، یہاں تک کہ قرآن کی قسم کھانے اور اس سے حلف لینے میں بھی کئی اقوال ہیں، اگرچہ متاخرین نے اس کو قسم مان لیا ہے اور مکروہ قرار دیا ہے، لہذا اصل کے اعتبار سے بائبل پر حلف لینا بھی مکروہ ہوگا اور یہ ان ممالک کے ارباب اقتدار کی آخری درجہ کی حماقت بھی ہے کہ جو لوگ بائبل کے معتقد نہیں ہیں ان سے بھی بائبل کی قسم لیتے ہیں، کسی سے بھی حلف ایسی چیز کی یعنی چاہیے تھی جس کی عظمت اس کے دل میں ہو، ورنہ اس حلف کا وہ کیا خیال رکھے گا۔

البتہ اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی ملک میں ممبر منتخب ہو، تو ان مصالح کے پیش نظر جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ہو چکا ہے بائبل پر ہاتھ رکھ کر کراہیت کے ساتھ حلف لے لے۔ دل میں اپنا عقیدہ پختہ رکھے کہ یہ کتاب محرف ہو چکی ہے، ایسا کرنے پر انشاء اللہ سے گناہ نہیں ہوگا۔ رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی نے عیسائی ملکوں کی عدالتوں میں بائبل پر حلف اٹھانے کے بارے میں جو تجویز منظور کی ہے، اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے:

”إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة والإنجيل أو كليهما، فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن، فان لم يستجب لطلبه يعتبر مكرها ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيما“ (منقول از جدید فقہی مسائل ۱، ۲۶۹، ۳۷۰) (جب عدالت کسی غیر اسلامی ملک کی ہو جو جس پر یمن ہونا ہے اس پر تورات، انجیل یا دونوں پر ہاتھ رکھنے کو لازم قرار دیتی ہو تو مسلمان پر لازم ہے کہ عدالت سے مطالبہ کرے کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھے گا۔ اگر اس کی درخواست منظور نہ ہو تو اسے مکروہ مانا جائے گا اور اسے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کہ دونوں پر یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کئے بغیر ہاتھ رکھے)۔

(۷): سیکولر پارٹی میں شمولیت:

اوپر گزر چکا ہے کہ مسلمانوں کے مصالح اور مفادات کے پیش نظر، ایکشن میں ووٹ دینا اور امیدوار بننا جائز ہے، حالانکہ آئین کی بہت سی دفعات اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتیں اور جن اداروں کے ایکشن میں شرکت کی بات ہو رہی ہے ان کے نام یعنی ”مجلس قانون ساز“ ہی سے شرک کی بو آ رہی ہے، لیکن ان خاص مجبوریوں کے تحت جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ان کی ایکشن میں شرکت کی اجازت ہے، فقہ اکیڈمی اپنی تجویز میں بھی اس کی اجازت دے چکی ہے۔

اسی طرح اگر ایک پارٹی من حیث المجموع مسلمانوں کے لئے نسبتاً بہتر ہے، لیکن اس کے منشور کی بعض دفعات اسلامی ہدایات یا مسلمانوں کے مصالح سے مغایر ہیں اور مسلمانوں کے لئے اس پارٹی کا کوئی ایسا متبادل بھی موجود نہیں ہے، جس میں ایسی خرابی نہ ہو تو زمانہ کے حالات کے پیش نظر اس پارٹی میں شامل ہونا، اس کا ٹکٹ لے کر ایکشن لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا، البتہ دل میں ان دفعات کی قباحت اور شناخت کا عقیدہ رکھے اور عزم ہو کہ موقع ملنے پر ان دفعات کو ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ یہ نہ ہو کہ پارٹی قائدین کی چابلو سی میں ان دفعات کا دفاع شروع کر دے، جیسا کہ بہت سے بے دین مسلم لیڈمان کی طرف سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اس شمولیت کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر مسلمانوں کے مفاد کے لئے کفار سے معاہدے کیے، تاکہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں، جبکہ ظاہر ہے کہ عقائد میں وہ دوسرے کفار ہی کی طرح تھے، مثلاً سیرت ابن ہشام میں ہے:

”ودخلت خزاعة في عقد رسول الله ﷺ وعهده“ (سیرت ابن ہشام ۲، ۲۹۰) (خزاعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیمان میں داخل ہوئے)۔

سیرت ابن ہشام ہی میں یہودیوں سے بھی معاہدہ کا ذکر ہے: ”هذا كتاب من محمد النبي ﷺ الخ“ (ایضا ۱، ۵۰۱)۔ کسی پارٹی میں شرکت بھی دراصل ایک دوسرے کی مدد کا معاہدہ ہی ہوتا ہے، پارٹی کو مسلم ووٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمانوں کو اس پارٹی کے اقتدار میں آنے پر مسلم کا ذکی حمایت درکار ہوتی ہے۔

لہذا مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس طرح کی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا شرعاً جائز ہے۔ واللہ اعلم۔  
غالباً اسی لئے فقہ اکیڈمی نے اپنے چودھویں سیمینار میں ”مسلم وغیر مسلم تعلقات“ کے تحت یہ تجویز منظور کی:  
”جمہوری سیکولر پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں“ (فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۰۸)۔

(۸): مسلم دشمن پارٹی میں شمولیت:

جو پارٹیاں کھلم کھلا مسلمانوں کی دشمن ہیں، ان میں مسلمانوں کی شرکت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ پارٹیاں مسلمانوں کے خلاف ایجنڈا پیش کرتی ہیں، قوانین پاس کرتی ہیں، ہر محاذ پر ان کو زیر اور پست حوصلہ کرنے کے درپہ رہتی ہیں، کوئی سیکولر پارٹی مسلمانوں کے مفاد کی کوئی بات بھی چلائے تو چراغ پا ہو جاتی ہیں اور اس کو مسلمانوں کی منہ بھرائی سے تعبیر کرتی ہیں۔ ہر دیندار مسلمان ان کو دہشت گرد اور اسلامی مدارس دہشت گردی کے اڈے نظر آتے ہیں۔ ان کے بارے میں بلاشک و شبہ یہ آیت صادق آتی ہے:

”وقد بدت البغضاء من أفواههم وما تخفي صدورهم أكبر“ (سورۃ آل عمران: ۱۱۸) (نکلی پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو کچھ مخفی ہے ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے)۔

اگر ان پارٹیوں کا بس چلے تو سارے مدارس بند کر دیں، ہر داڑھی والے کو جیل میں ڈال دیں اور ہر مسلمان کو اس کے مول دھرم میں واپس لے آئیں۔  
لہذا ان پارٹیوں میں شرکت کرنا تعاون علی الاثم والعدوان ہونے کے ساتھ ساتھ ملی غیرت و حمیت کے بھی منافی ہے، بعض اوقات ان سے ملنے والے لے جڑ کی فوائد ”إثمہ أكبر من نفعہ“ کے تحت آتے ہیں، اس لئے کہ مصالح عامہ کے مقابلہ میں جڑ کی نفع کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان پارٹیوں میں شامل ہونے والے بعض بڑے مسلم ناموں سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، کیونکہ یہ ان پارٹیوں کی سیاسی مجبوری ہے اور اس کے لئے بھی جن جن کرایسے افراد لائے جاتے ہیں جو اسلام دشمن خیالات ظاہر کرنے میں دوسروں سے چار قدم آگے ہی ہوتے ہیں (الامام شاء اللہ)۔

اسی لئے فقہ اکیڈمی کی ”مسلم غیر مسلم تعلقات“ کے موضوع پر پیش کی جانے والی تجاویز میں ہے:

”جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنا لیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو“ (فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۰۸)۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت مناسب تجویز ہے اور ہم کو اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۹): علاحدہ مسلم پارٹی:

اوپر گزر چکا ہے کہ سیکولر پارٹیوں کا تعاون کرنا جائز ہے، دلائل اوپر گزر چکے ہیں، انہیں دلائل کے پیش نظر علاحدہ مسلم پارٹی کا قائم کرنا شرعاً ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ اس پر یہ بحث ہو سکتی ہے کہ ایسا کرنا مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا یا نہیں؟ اس کے بارے میں آراء مختلف ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہونا مشکل بھی ہے، بلاشبہ اگر ایک طاقتور مسلم پارٹی موجود ہو، خواہ اس کی سیٹیں محدود ہوں، لیکن لوگوں کو اندازہ ہو جائے کہ مسلم ووٹر ان کی طرف راغب ہیں، تو ہر سیکولر پارٹی اس مسلم پارٹی سے ہاتھ ملانے کے لئے بیتاب ہو جائے گی اور مسلمانوں کے ملی اور سماجی مصالح کی شرائط پر معاہدہ کرنے کو تیار ہو جائے گی۔

لیکن یہ البتہ ہی کہلائے گا کہ کیرل، آسام، اور شہر حیدرآباد کو چھوڑ کر کہیں بھی صحیح معنوں میں مسلم پارٹی کا قیام عمل میں نہیں آئے گا اور ہو بھی کیسے؟ کسی بھی پارٹی کو قائم کرنے کے لئے سخت میدانی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، مسلسل کام کیے جائیں، لوگوں کا اعتبار حاصل کیا جائے، دسیوں سال کے بعد جب لوگ سمجھ لیں گے کہ یہ لوگ سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آہستہ آہستہ ان کا کچھ ووٹ بینک بن سکتا ہے، جس سے مذکورہ بالا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو عین انکیشن کے وقت مسلم پارٹی کے قیام کا خیال آتا ہے، زور و شور سے دورے کئے جاتے ہیں، بڑے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں، فتح کا اتنا یقین ہوتا ہے کہ اندراندر اعلیٰ حکومتی عہدے بھی تقسیم کر لئے جاتے ہیں، پھر جب نتائج ان کو صفر دکھاتے ہیں تو یہ افراد امت مسلمہ سے بالکل

مایوس ہو جاتے ہیں اور اس کی بے شعوری کاروبار کو گوشہ گم نامی میں گم ہو جاتے ہیں، پھر اگلے الیکشن میں دوسرے نام اسی جوش سے سامنے آتے ہیں، اس طرح کی صورت حال میں اگر مسلمان ان برساتی مسلم پارٹیوں سے بے التفاتی دکھاتے ہیں تو میرے نزدیک یہ ان کی بے شعوری نہیں ہے، اس سے تو ان کے گہرے سیاسی شعور اور چنگنی کا احساس ہوتا ہے۔

سوال میں اس طرح کی پارٹیوں کی عدم افادیت بلکہ ان سے نقصان پہنچنے کی ایک خاص وجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکوز نہیں ہوتی ان پارٹیوں کے سبب مسلم مخالف ووٹ متحد ہو جاتا ہے اور مسلم دشمن پارٹیاں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

ان کا دوسرا نقصان ان علاقوں میں بھی دیکھنے میں آتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت یا غلبہ ہوتا ہے، وہاں اس طرح کی پارٹیوں کے میدان میں آ جانے سے مسلم (اور سیکولر) ووٹ بکھر جاتے ہیں اور دشمن پالامار لے جاتے ہیں، لہذا ذاتی طور پر میری رائے یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلم پارٹیوں کا قیام ملت کے لئے مفید نہیں ہے، اس سے گریز ہی مناسب ہے، پارٹی قائم بھی کی جائے، تو الیکشن سے اس وقت تک دوری اختیار کی جائے جب تک امت کا اعتبار نہ حاصل ہو جائے، اگر بیسیوں سال سماجی کام کیے جائیں، مسلم سماج میں جڑیں مضبوط ہو جائیں، تو الیکشن میں شرکت کیے بغیر بھی پارٹی کا اپنا اثر ہوگا اور ارباب اختیار کے لئے اس کی بات کا نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام کے تصرفات مصالح کے تابع ہونا چاہئے، چنانچہ الاشباہ والنظائر میں قواعد کی دوسری نوع کے قاعدہ ۵۰ میں ہے: "تصرف الامام علی الرعیۃ منوط بالمصلحة" (الاشباہ لابن نجیم، ص: ۴۰۸ مکتبہ فقہیہ الامت دیوبند)۔

میرے خیال سے اجتماعی کام کرنے میں بھی اس شرط کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ کہ موجودہ حالات میں (ہندوستان جیسے مسلم اقلیتی ممالک میں) مسلم سیاسی پارٹی کا قائم کرنا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے، ملت کا مفاد اس سے احتراز میں ہے، البتہ سیاسی پارٹی کا مطلب یہ ہو کہ سماجی کام کئے جائیں، مسلم مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن الیکشن سے بچا جائے جیسا کہ جمعیۃ العلماء یا علماء کونسل کرتی ہے تو انشاء اللہ ایسی پارٹی امت کے لئے مفید ہوگی، اس تفصیل کے باوجود میری رائے میں اس مسئلہ پر حتمی رائے ظاہر کرنا مناسب ہے، یہ مسئلہ پوری طرح مصالح کے تابع ہے جس میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۱۰): الیکشن میں خواتین کی شرکت:

عورتوں کے لئے پہلے درجہ کا اصل حکم یہ ہے کہ گھر کی بن کر گھر کے اندر رہیں، بلا ضرورت باہر نہ نکلیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وقرب فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولى“ (سورۃ الاحزاب: ۳۳) (اور قرآن پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھلائی نہ پھرو جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں)۔

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں: ”جو احکام ان آیات میں ..... بیان کئے گئے تمام عورتوں کے لئے ہیں، ازواج مطہرات کے حق میں چونکہ ان کو اہتمام زائد تھا، اس لئے لفظوں میں خصوصیت کے ساتھ مخاطب ان کو بنایا گیا“۔

اور حدیث شریف میں ارشاد ہے: ”المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان“ (ترمذی، کتاب الرضاء، باب استشراف الشيطان المرأة إذا خرجت، ص: ۱۱۷۳) (عورت پوری کی پوری واجب الستر ہے، چنانچہ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان تا تک جھانک کرتا ہے)

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ الیکشن میں کسی بھی اعتبار سے حصہ لینے پر گھر سے باہر نکلنا پڑے گا۔ البتہ صرف ووٹ دینے کے لئے نکلنا ہو تو اس کا دورانیہ چونکہ مختصر ہوتا ہے، لہذا عورت اپنے شوہر یا کسی محرم کے ساتھ جا کر پردہ کے ساتھ بھی اس کام کو انجام دے سکتی ہے، لہذا اگر ووٹ دینے میں مصلحت اور منفعت سمجھی جا رہی ہو تو اس کی گنجائش ہوگی، لیکن ووٹ دینے بھی تنہا نہ جائے، اس لئے کہ بعض اوقات ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسے سخت پریشانی ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ووٹ دینا امور سلطنت سے متعلق چیز ہے جس میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہئے، ان کی بات مسلم ممالک کے لئے ممکن ہے صحیح ہو، لیکن ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں عوام کا لانعام کو بھی کسی عالم فاضل اور گریجویٹ کی طرح ووٹ کا حق حاصل ہے، مسلم عورت کو اس سے روکنا خلاف مصلحت ہے۔

اور جہاں تک نمائندہ بننے اور قانون ساز اداروں کی ممبر شپ حاصل کرنے کا سوال ہے تو تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اوپر بیان کردہ ہدایات کو ترک کئے بغیر اس میدان میں کامیابی پانا ناممکن ہے، میرے علم میں ایسی خواتین نہیں ہیں جنہوں نے ان اداروں کی ممبری کے بعد بھی پردہ قائم رکھا ہو۔

ہندوستانی حکومت پارلیمنٹ اور اسمبلی کی نشستوں میں بھی خواتین کے لئے ریزرویشن لانا چاہتی ہے، لیکن اس کا بل ابھی تک پاس نہیں ہو سکا ہے، جہاں تک بلدیاتی اور پانچایتی سطح کے اداروں کا تعلق ہے تو وہاں ریزرویشن دیا جا چکا ہے۔ ان میں جو خواتین کامیاب ہوتی ہیں، اکثر تو صرف ان کا نام رہتا ہے، پورا کام ان کے شوہر یا کوئی دوسرا متعلق کرتا ہے، بہت کم ہی جگہ صحیح معنوں میں عورتیں فعال ہیں، لیکن جو فعال ہیں وہ پردہ کو خیر باد کہہ چکی ہیں، جو نام نہاد ہیں، ان کے گھروں سے بھی غیر محسوس طریقہ سے حیاء رخصت ہو رہی ہے، کثرت سے شریف گھرانوں کی باپردہ خواتین کے فوٹو انتخابی مہم کے دوران دیواروں پر چسپاں نظر آئے، جبکہ پہلے ان کا نام بھی باہر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر عورتوں کے لئے نمائندہ بننے کا جواز کچھ شرائط پر موقوف ہوگا، یہ شرائط پوری نہ ہو سکیں تو عورتوں کا نمائندہ بننا خلاف شریعت ہوگا:

۱۔ شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو۔

۲۔ ولی یا شوہر نے اجازت دی ہو۔

۳۔ باہر نکلنے وقت جاذب نظر لباس اور خوشبو وغیرہ سے پرہیز کیا جائے، ان شرائط کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں۔

۴۔ پارلیمنٹ، اسمبلی یا کسی اور جگہ جانا ہو اور وہ سفر کی مسافت پر ہو تو شوہر یا ولی ساتھ ہو۔

۵۔ مردوں کے اختلاط سے پرہیز کیا جائے اور تنہائی کی نوبت تو قطعاً نہ آنی چاہیے، ان آخری دو شرطوں کی دلیل یہ حدیث ہے: عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لا یخلون رجل بامرأة ولا تسافرن امرأة إلا ومعها محرم" (بخاری، کتاب النکاح، باب لا یخلون رجل بامرأة الا ذورحمہ: ۵۲۲۲، مسند کتاب الحج باب سفر المرأة مع محرم: ۲۲۲) (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز تنہائی اختیار نہ کرے اور محرم کے بغیر کوئی عورت ہرگز سفر نہ کرے)۔

میرے خیال سے جب عورت برائے نام نمائندہ ہو، پورا کام مرد کو کرنا ہو تب تو یہ شرائط پوری ہو سکتی ہیں، اس لئے کہ صرف خاص خاص موقعوں پر اصل نمائندہ کی ضرورت پڑے گی، جہاں یہ شرائط ممکن ہے پوری ہو جائیں، اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ممبری میں یہ ممکن نہیں ہے کہ نمائندہ بننے والی عورت کا کام اس کا شوہر کر سکے، لہذا ان شرائط کا حصول ناممکن ہے اور شرائط نہ پائے جانے کے سبب وہاں اجازت بھی نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا شرائط کے پائے جانے پر عورت کے لئے نمائندہ بننا جائز ہوگا، لیکن جب تک خاص حالات نہ ہوں، امت کے مصالح فوت نہ ہوتے ہیں اس وقت تک شرائط پائے جانے پر بھی اس کا نمائندہ بننا خلاف اولیٰ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط مسائل

مولانا نورالحق رحمانی

تمہید:

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے بائیسویں فقہی سیمینار کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں ”ایکشن سے مربوط شرعی مسائل“ کا موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جیسا کہ سوال نامہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ ان مسلمانوں کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے جو کسی مسلمان ملک میں رہتے ہوں اور ان مسلمانوں کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے جو اقلیت کی حیثیت سے کسی خطہ میں مقیم ہوں۔ اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوری نظام حکومت قائم ہے، خواہ وہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم۔ وہاں عوامی رائے اور ایکشن کے ذریعہ حکمرانوں کا انتخاب ہوتا ہے اور حکومتیں تشکیل پاتی ہیں۔

جمہوری نظام حکومت میں اگر کچھ خوبیاں ہیں تو کچھ خامیاں بھی ہیں۔ اس کے بعض اصول اسلام کے طرز حکمرانی سے بہت قریب ہیں تو بعض اسلامی تعلیمات کے مغاڑ بھی ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ جمہوری ممالک میں ایکشن کے موجودہ طریقہ کار میں بہت سے شرعی مفاسد شامل ہو گئے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہر پہلو سے اس مسئلہ کا جائزہ لے کر مسلمانوں کے لئے وہ راہ عمل متعین کی جائے جو شریعت کی روح اور مزاج سے زیادہ قریب ہو اور جن میں شرعی مفاسد کم سے کم ہوں۔

ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اگر وہ ایکشن سے بے تعلق ہو جائیں اور اپنے حق رائے وہی کا استعمال نہ کریں تو جیسا کہ سوال نامہ میں وضاحت کی گئی ہے اس سے ان کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے اور ان کے مفادات پر ضرب کاری لگ سکتی ہے۔ اسی بناء پر بعض وہ مسلم جماعتیں جو پہلے اس کی بالکلیہ روادار نہیں تھیں کہ مسلمان ہندوستان جیسے کسی غیر اسلامی ملک میں جس کا دستور و آئین کتاب و سنت سے منحرف ہوا ایکشن میں حصہ لیں، یا کسی بھی پارٹی کی طرف سے نمائندہ بن کر کھڑے ہوں۔ موجودہ حالات و تجربات کی روشنی میں اور اس کے انجام و عواقب پر غور کرنے کے بعد انہوں نے اپنی پالیسی تبدیل کی اور نہ صرف ایکشن میں شرکت کرنے اور ووٹ دینے کے جواز کا فتویٰ دیا بلکہ اپنے امیدوار بھی کھڑے کئے۔ اس لئے اس ملک کے مسلمانوں کے لئے انتخابات میں حصہ لینا اور ووٹ کا استعمال کرنا اپنی تہذیبی شناخت اور ملی تشخص کی حفاظت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ملک کے بعض وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا ان کی معتد بہ تعداد ہے ان میں مسلم امیدوار ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور مجموعی لحاظ سے چونکہ ان کی تعداد اس ملک میں بیس فیصد ہے، اتنی بڑی اقلیت کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حکومتوں کے بدلنے اور کسی پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں مسلمانوں کے ووٹ کی بڑی اہمیت ہے اور بعض دفعہ ان کا ووٹ فیصلہ کن ہوتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے ووٹ کی قدر و قیمت کو سمجھیں، باہم متحد رہیں، ایکشن کے موقع پر عقل و شعور سے کام لیں اور ذاتی مفاد پر ملت کے اجتماعی مفاد کو ترجیح دیں اور اپنے ووٹ کو بٹنے اور ضائع ہونے سے بچائیں۔

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم سوالات کے جواب کی طرف رخ کرتے ہیں۔ چونکہ سوال نامہ میں کتاب و سنت اور فقہاء سلف کے اجتہادات کے ساتھ معاصر اہل علم کی آراء کو بھی پیش نظر رکھ کر جواب دینے کی ہدایت کی گئی ہے، اس لئے کتاب و سنت کے نصوص کے ساتھ بعض معاصر علماء کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ سابق مفتی اعظم ہند اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ

ط استاذ المعتمد العالی للتدریس فی القضاء والافتاء، امارت شرعیہ، پھولاری شریف، پٹنہ۔



اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان کے فتاویٰ سے۔ مؤخر الذکر نے جوہر الفقہ کی دوسری جلد میں اس مسئلہ پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ بعد کے علماء کرام نے زیادہ تر اس کو بنیاد بنایا ہے اور اس پر کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے ووٹ کو شہادت، سفارش، اور وکالت قرار دیا ہے اور اس پر ان تینوں چیزوں کے احکام جاری کئے ہیں، دیگر علماء و مفتیان کرام کے نزدیک بھی یہ باتیں تقریباً مسلم ہیں۔ دلائل کی روشنی میں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

شہادت: پچائیت کی سطح سے لے کر اسمبلی اور پارلیامنٹ کی سطح تک جو امیدوار کھڑے ہوتے ہیں، ووٹرس اپنی صوابدید کی بنیاد پر ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ شہادت دیتے ہیں کہ فلاں امیدوار مجموعی طور پر اپنی لیاقت و صلاحیت کے لحاظ سے اس منصب کا زیادہ اہل اور مستحق ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی بہتر امیدوار کے ہوتے ہوئے کسی ایسے شخص کو ووٹ دیتا ہے جو اہلیت و صلاحیت کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے مگر پہلے کے مقابلے میں کمتر اور فروتر ہے تو وہ خیانت اور فعل حرام کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ ایک جھوٹی شہادت ہے جسے سات ہلاک کرنے والے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ خیانت اس لئے ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ من قلّد إنساناً عملاً وفي رعبته من هو أولى فقد خاب اللہ ورسولہ وجماعۃ المسلمین (حاشیہ رد المحتار للشامی ۴، ۲۲۲، البحر الرائق) یعنی اگر کوئی شخص کسی انسان کو کوئی ذمہ داری سپرد کرے جبکہ اس کی رعایا میں اس سے بہتر آدمی موجود ہو تو گویا اس نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ خیانت کی۔

اس سے پتہ چلا کہ جب دو آدمی اہل اور باصلاحیت موجود ہوں اور ان دونوں میں کام کرنے کی اور ملک و ملت اور انسانیت کی خدمت کی اہلیت و صلاحیت موجود ہو، لیکن ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے مقابلے میں فائق اور برتر ہو تو افضل کو چھوڑ کر مفضول اور برتر کو چھوڑ کر فروتر کو کسی اجتماعی خدمت کے لئے منتخب کرنا خیانت اور جھوٹی شہادت ہے۔ جس کا گناہ اور وبال شرک کے برابر ہے، اس سے یہ بات خود واضح ہوگئی کہ کسی عہدے پر نا اہل، خائن، بد کردار، بد قماش، خود غرض، لالچی، ظالم، مجرم اور اخلاق و انسانیت سے عاری شخص کو ووٹ دے کر فائز کرنا کتنا بڑا گناہ ہوگا اور کیا کسی مومن سے اس کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ پھر اس منصب پر فائز ہو کر وہ جو لوٹ کھسوٹ کرے گا، اپنے عہدے کا جتنا بے جا استعمال کرے گا، لوگوں پر ظلم و ستم ڈھائے گا اور پبلک اور رعایا کا جتنا استحصال کرے گا اور ان کے حقوق تلف کرے گا ان سب کا گناہ اسے اور ووٹ دینے والوں اور منتخب کرنے والوں کو بھی ہوگا۔

بہر حال جب ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہوگئی تو اس پر شہادت کے تمام احکام جاری ہوں گے۔ شہادت سے متعلق اور بہت سے احکام ہیں، مثلاً شہادت کے سلسلے میں شرعی حکم یہ بھی ہے کہ جب شہادت کے لئے بلایا جائے تو شاہد انکار نہ کرے بلکہ عدالت میں حاضر ہو کر گواہی دے۔ ارشاد باری ہے: "ولا یأب الشهداء إذا ما دعوا" (البقرہ: ۲۸۲)۔

ووٹ کے سلسلے میں یہ مسئلہ ہے کہ سرکار ہر علاقہ اور حلقہ کی پبلک اور جتنا کو کسی رسمی عدالت میں تو نہیں بلا رہی ہے، البتہ جس حلقہ میں جتنے امیدوار کھڑے ہوئے ہیں ان کے بارے میں ان سے رائے طلب کی جا رہی ہے کہ وہ سرکار کی طرف سے منتخب کردہ کسی مقام یا ادارے میں حاضر ہو کر ووٹ ڈالیں کہ ان سب میں اس عہدہ کا زیادہ حقدار اور اہل کون ہے، تاکہ سرکار اکثریت کی رائے پر فیصلہ کر کے کسی امیدوار کو منتخب کرے، اس لئے ووٹ دینے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی رائے اور علم و دانست اور تجربہ کی بنیاد پر جسے سب سے افضل سمجھ رہا ہے اس کے حق میں ووٹ ڈالے۔ لہذا بلا کسی معقول عذر کے ووٹ نہ دینا بھی اس آیت کی رو سے جائز نہ ہوگا، اس لئے اس صورت میں اس بات کا خطرہ ہے کہ اچھے افراد کے آگے نہ بڑھنے اور ووٹ نہ دینے کی وجہ سے مستحق امیدوار پیچھے رہ جائے اور نا اہل کامیاب ہو جائے۔

شہادت سے متعلق تیسرا حکم یہ ہے کہ اسے چھپانا حرام اور کتمان حق ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔ ارشاد باری ہے:

ولا تکتموا الشهادة و من یکتہما فانه آثم قلبہ (البقرہ: ۲۸۳)۔

لہذا بلا کسی عذر کے ووٹ نہ دینا گویا حق کو چھپانا ہے جو بڑا گناہ تو ہے ہی لیکن اسی کے ساتھ یہ کبھی ایسی سنگین غلطی بھی ہو سکتی ہے جس کا خمیازہ پورے ملک و ملت کو بھگتنا پڑے کہ غلط آدمی کے انتخاب کی بنیاد پر وہ ایک عرصہ تک قوم کی گردن پر مسلط رہ کر ان کا استحصال کرتا رہے اور اپنا الوسیدھا کرتا رہے۔

ووٹ دینا جب شہادت ہے تو شہادت کو انصاف کے ساتھ اللہ کے لئے قائم کرنے کا حکم ہے، چاہے یہ شہادت والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں کسی کی بیجا رعایت نہیں کی جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء للہ ولو علی أنفسکم أو الوالدین والأقربین إن یکن غنیاً أو فقیراً فاللہ اولیٰ بہما فلا تتبعوا ہویٰ ان تعدلوا (النساء: ۱۳۵)۔

اس لئے شہادت کی طرح ووٹ میں بھی یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کون ہمارا رشتہ دار اور صاحب تعلق ہے، جو شہادت اللہ کے لئے ہوگی وہ عدل و انصاف پر مبنی ہوگی۔ اس میں کسی ذاتی مصلحت اور مادی منفعت کی بنیاد پر انصاف کا خون نہیں کیا جائے گا اور نا اہل کو اہل پر ترجیح نہیں دی جائے گی، نیز حکم الہی ہے کہ شہادت اللہ کے لئے قائم کرو۔ وأقیموا الشہادۃ للہ ذلکم یوعظ بہ من کان منکم یؤمن باللہ والیوم الآخر (الطلاق: ۲)۔

سفارش: ووٹ کی دوسری حیثیت علماء کے نزدیک سفارش کی ہے۔ یعنی ووٹ دینے والا اس کی سفارش کرتا ہے کہ فلاں شخص کو حکومتی سطح پر اس علاقہ اور حلقہ کا نمائندہ منتخب کیا جائے۔ اب اگر ووٹر اس سفارش میں سچا ہے اور واقعی وہ امیدوار اس کی نظر میں اس حلقہ کے تمام امیدواروں میں سب سے اچھا ہے تو یہ سفارش درست ہے اور وہ اس پر اجر و ثواب کا مستحق ہوگا، لیکن اگر اچھے امیدوار کو چھوڑ کر اس سے کمتر شخص کو ووٹ دیتا ہے تو یہ غلط سفارش ہے جس کی بنیاد پر وہ معصیت اور خیانت کا مرتکب ہوگا۔ ارشاد باری ہے: من یشفع شفاعۃ حسنة یکن لہ نصیب منها ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منها (النساء: ۸۵)۔

جو شخص کسی بھلے کام کی سفارش کرے اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا اور جو بدی کی سفارش کرے اس کے لئے بھی اس میں سے ایک حصہ ہے۔ بہر حال ووٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ لائق، اہل، دیانت دار اور صاحب کردار امیدوار کی سفارش کرے اور اسے ووٹ دے کر کامیاب بنائے تاکہ وہ ملک اور عوام دونوں کے لئے مفید ہو۔

وکالت: علماء کرام کی تحقیق اور فتویٰ کی رو سے ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے۔ گویا ووٹر کسی امیدوار کو اپنا اور اپنی قوم کا وکیل اور نمائندہ نامزد کرتا ہے کہ وہ اس حلقے کی سرکار کے یہاں وکالت اور نمائندگی کرے اور حکومت اور عوام کے درمیان واسطہ بن کر عوام کے مسائل حکومت تک پہنچائے اور حکومت ہر علاقے میں رعایا کی فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی کے لئے جو تعلیمی، تعمیری اور فائمی خدمات انجام دینا چاہتی ہے اس نمائندے اور وکیل کے ذریعہ اس کی تنفیذ عمل میں آئے۔ دوسری طرف حکومت کی تشکیل اور اس کے کلیدی عہدوں پر اہل افراد اور انسانیت کی خدمت کے جذبے سے معمور اشخاص کو فائز کرنے کی کوشش کرے۔ ایک وکالت شخصی ہوتی ہے، یعنی موکل اپنے کسی نجی اور شخصی کام کے لئے کسی کو اپنا وکیل بناتا ہے، جس کا نفع و نقصان اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے، لیکن ایک وکالت عمومی نوعیت کی ہوتی ہے جس سے بہت سارے افراد بلکہ پوری قوم کا تعلق ہوتا ہے، یعنی سیاسی اور سماجی مسائل کے لئے کسی کو وکیل منتخب کیا جانا جس کا نفع و ضرر عام لوگوں تک متعدی ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی ایسی خدمت اور کام کے لئے جس میں ووٹر کے ساتھ تمام لوگ شریک ہوں کسی نا اہل کو وکیل منتخب کر لیا جائے تو اس سے پوری قوم کے حقوق پامال اور اس کے مصالح فوت ہوں گے اور اس غلط انتخاب کا خمیازہ سب کو جھگھکتا پڑے گا، اس لئے ایسے نا اہل، خائن، مجرم اور ظالم لوگوں کو وکیل منتخب کرنے والے بھی ظالم اور مجرم قرار پائیں گے اور ایسے لوگ جتنے مظالم ڈھا میں گئے اس کے گناہ میں یہ سب لوگ بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

معاصر علماء میں جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکرٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا جو معاصر علماء میں اپنے علم و تقہ کے لحاظ سے ممتاز ہیں اور جنہوں نے جدید فقہی مسائل کو خاص طور پر اپنی توجہ اور بحث و تحقیق کا موضوع بنایا ہے، انہوں نے بھی اپنی کتاب میں ”ووٹ کی شرعی حیثیت“ کے عنوان سے ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ البتہ اس میں انہوں نے اس کا اضافہ فرمایا ہے کہ ووٹ کی حیثیت مشورہ کی ہے۔ گویا حکومت ہر حلقہ کے عوام سے مشورہ لینا چاہتی ہے کہ اس حلقہ سے جو امیدوار کھڑے ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ اس عہدہ کا اہل کون ہے؟ اور المستشار مؤتمن (حدیث) یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے امانت سمجھ کر بالکل صحیح مشورہ دے، حق کے خلاف اور ضمیر کے خلاف مشورہ دینا حرام ہے، اس لئے اس میں حق و صداقت کا پاس و لحاظ رکھنا لازم ہوگا، اس کے خلاف کرنا گناہ کبیرہ ہوگا۔

۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

اس کا جواب ووٹ کی شرعی حیثیت کے ذیل میں گذر چکا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ووٹ دینا شہادت قرار پایا تو اس پر شہادت کے جملہ احکام جاری ہوں گے، لہذا جس طرح شہادت کی ادائیگی کے لئے بلایا جائے تو شہادت دینا واجب ہے، انکار کرنا، شہادت کو چھپانا یا جھوٹی شہادت دینا حرام ہے، اسی طرح ووٹ دینے کے لئے بلایا جائے تو اس پر لیک کہنا اور ووٹ دینا واجب ہوگا۔ اس سے بلا عذرا انکار کرنا اور حق و صداقت اور ضمیر کے خلاف ووٹ کا استعمال کرنا گناہ کبیرہ ہوگا، اس لحاظ سے کہ ووٹ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے لئے بڑی طاقت ہے کہ اس کے ذریعہ حکومت کو بدلا جاتا ہے، کسی حکمران پارٹی کی کارکردگی صحیح نہ ہو اور اس کی حکومت سے عوام مطمئن نہ ہوں تو اگلے ایکشن میں اسے بدل کر دوسری پارٹی کو برسر اقتدار لایا جاسکتا ہے، اسی طرح پنچایت کے کھیا اور سر پنچ سے لے کر اسمبلی، حکومت کے قانون ساز ادارے اور پارلیامنٹ تک کے ممبران و ارکان کو ہٹایا جاسکتا ہے، اس لئے اس میں مسلمانوں کو حصہ لینا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کے مذہبی تشخص، سیاسی قوت اور ملی مفادات و مصالح کا تحفظ مشکل ہے۔ مسلمانوں کا ایکشن میں حصہ نہ لینا مسلم دشمن طاقتوں اور فرقہ پرست عناصر کو تقویت پہنچانا اور ان کے اسلام مخالف منصوبوں اور سازشوں کو کامیاب کرنا ہے جو انہیں ووٹ کے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں جو خود کشی کے مترادف ہے۔

لہذا اس کی حیثیت واجب کی ہوگی، لیکن اسے نماز، روزہ کی طرح فرض عین نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ عام حالات میں واجب کفایہ کی ہوگی کہ اگر اتنی تعداد میں لوگ ووٹ دیں کہ اس سے مسلمانوں کا مقصد حاصل ہو جائے اور کچھ لوگوں کے ووٹ نہ دینے سے ملی مفادات فوت نہ ہوں تو نہ دینے والوں کو ترک واجب کا گناہ نہ ہوگا۔ ہاں جس حلقہ میں سخت مقابلہ آرائی ہو اور دشمن طاقتوں کے برسر اقتدار آجانے کا خطرہ ہو تو ایسے موقع پر مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ سب متحد ہو کر ووٹ دیں اور فرقہ پرست عناصر کو ناکام بنائیں۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم؟

جہاں تک کسی ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا مسئلہ ہے تو اصولی طور پر عام حالات میں شرعی نقطہ نظر سے کوئی عہدہ طلب کرنا اور اپنے آپ کو کسی منصب کے لئے پیش کرنا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں اس کی صریح ممانعت وارد ہوئی ہے۔ احادیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب ہے ”باب النهی عن طلب الإمارة والحرص علیہا“

عن عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: يا عبد الرحمن! لا تسأل الإمارة، فإنك إن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها، وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها (صحیح مسلم، باب النهی عن طلب الإمارة)۔

(حضرت عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عبد الرحمن! حکومت طلب نہ کرو، کیونکہ اگر وہ تمہیں طلب سے ملے گی تو تم اس کے سپرد کر دیئے جاؤ گے (یعنی اللہ کی مدد سے محروم رہو گے) اور اگر بغیر طلب کے ملے گی تو اس پر (اللہ کی طرف سے) تمہاری مدد کی جائے گی)۔

عن أبي موسى رضی اللہ عنہ قال: دخلت على النبي ﷺ أنا ورجلان من بني عبي، فقال أحد الرجلين: يا رسول الله! أمرنا على بعض ما ولاةك الله عزوجل، وقال الآخر مثل ذلك، فقال: إنا والله لا نولي على هذا العمل أحداً سألته ولا أحداً حرص عليه (حوالہ سابق)۔

(حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ عزوجل نے آپ کو جو حکومت عطا فرمائی ہے اس میں سے مجھے کسی حصہ کا امیر بنا دیجیے، پھر دوسرے نے بھی ایسا ہی کہا تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم، ہم اس کام کا کسی ایسے شخص کو ذمہ دار نہیں بناتے جو اس کی درخواست کرے اور نہ کسی ایسے شخص کو جو اس کی حرص کرے)۔

عن أبي ذر رضي الله تعالى عنه قال: قلت: يا رسول الله! ألا تستعملني؟ قال، فضرِب بيده على منكبي، ثم قال: يا أبا ذر! إنك ضعيف وإمّا أمانة وإمّا يوم القيامة خزي وندامة إلا من أخذها بحقها وأدى الذي عليه فيها (صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب كراهية الإمارة بغير ضرورة)۔

(حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھے خدمت نہیں دیتے؟ تو آپ نے اپنا دست مبارک میرے مونڈھے پر مارا اور فرمایا: اے ابو ذر! تم کمزور ہو اور یہ امانت ہے (یعنی اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق سب حاکم کو ادا کرنے پڑتے ہیں) اور قیامت کے دن خدمت اور حکومت سے سوائے رسوائی اور شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں، مگر جو اس کا حق ادا کرے اور راستی سے کام لے۔)

عن أبي ذر رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ قال: يا أبا ذر! إني أراك ضعيفاً وإني أحب لك ما أحب لنفسي، لا تأمررت على اثنين ولا تولين مال يتيم (حوالہ سابق)۔

(حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابو ذر! میں تم کو کمزور پاتا ہوں۔ میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، تم دو آدمی کے بھی حاکم اور امیر نہ بنو، اور نہ یتیم کے مال کے ذمہ دار بنو)۔

اسی طرح عہدہ قضاء جو حکومت اور سرداری کے ہی ذیل میں آتا ہے اور جس سے لوگوں پر اختیارات اور لوگوں کے بیچ وجاہت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے اس کے طلب کرنے کو بھی شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے (دیکھئے بدائع الصنائع، درمختار ۴/۳۲۵)۔

چنانچہ خادم رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من سأل القضاء وكل إلى نفسه، ومن أجبر إليه ينزل عليه ملك يسدده (ابودود، ترمذی)۔

یعنی جو شخص خود درخواست کرے کہ عہدہ قضاء حاصل کرے گا تو اس عہدہ کی ذمہ داری اسی پر آپڑے گی اور جسے (طلب اور خواہش کے بغیر) یہ عہدہ ملے گا اس پر ایک فرشتہ نازل ہوگا جو اسے سیدھی راہ پر قائم رکھے گا۔

ان احادیث کی بنیاد پر شرعی نقطہ نظر سے حکومت، وزارت، عہدہ قضاء یا اور کسی منصب کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا اور اس کی درخواست کرنا درست نہیں ہے۔ جو شخص کوئی عہدہ طلب کرنے سے اس پر مقرر کرنا امیر اور خلیفہ کے لئے درست نہیں ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن تمام امراء و حکام زنجیروں سے جکڑے ہوئے اللہ کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ اس قید اور بیڑی سے صرف ان ہی لوگوں کو نجات ملے گی جنہوں نے اللہ کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف سے حکومت کی ہوگی اور اس منصب کا حق ادا کیا ہوگا۔ باقی لوگ اسی قید و بند کے ساتھ جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جو شخص قاضی بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کیا گیا (ترمذی، ابوداؤد)۔

ابارت و حکومت اور عہدوں کے حصول کے سلسلے میں یہ وعیدیں اس لئے آئی ہیں کہ حکمرانی اور سرداری کے ذریعہ جب جاہ کی تکمیل ہوتی ہے، لوگوں کے بیچ انہیں اپنا قد و قامت بلند نظر آتا ہے، بالعموم اس کی وجہ سے انسان تکبر اور انانیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو کمتر سمجھتا ہے، اپنے مخالفین سے انتقام لیتا ہے، بلکہ بسا اوقات انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے اور اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتا ہے اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لئے اسے پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا تاکہ اس کی وجہ سے انسان کی آخرت تباہ نہ ہو۔

لیکن اگر سب لوگ اس سے کنارہ کش ہو جائیں تو پھر حکومت کا نظام کیسے چلے؟ اس لئے ان وعیدوں کا مقصد یہ ہے کہ ہر کس و ناکس اس خدمت کے لئے آگے نہ بڑھے، لوگوں کے درمیان اس سلسلے میں رسہ کشی اور ٹکراؤ نہ ہو، بلکہ لوگ اپنی عاقبت کی فکر کرتے ہوئے اس سے دور بھاگیں اور صرف ان ہی لوگوں کو کوئی منصب اور ذمہ داری سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہوں۔ دوسری طرف عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنے اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ انصاف و حکمران قیامت کے دن عرش الہی کے سایہ میں ہوگا اور حاکم کے اپنی رعایا کے درمیان پیٹھ کر عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کو ساہا سال کی عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر اہل

افراد کے فقدان کی وجہ سے کسی پر عہدہ قضاء متعین ہو جائے اور ناگزیر ضرورت بن جائے اور اس سے اعراض کی صورت میں اس کا خطرہ ہو کہ یہ عہدہ نااہل افراد کے ہاتھ میں چلا جائے گا جو اس کی وسیع ترمذ مدار یوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گا اور لوگوں کے حقوق ضائع ہوں گے تو حاکم کے حکم یا لوگوں کے اصرار پر اس کا قبول کرنا اس کے لئے نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جائے گا، ایسی ہی صورتوں کے لئے حدیث میں یہ بشارت سنائی گئی ہے کہ طلب در خواست اور حرص و طمع کے بغیر جو شخص اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہوتی ہے اور آسمان سے فرشتے نازل ہو کر اسے سیدھی راہ پر چلا تا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کا واقعہ خود قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے یہ درخواست کی کہ مجھے زمین کے خزانوں کا ذمہ دار مقرر کر دیجیے۔ قال: اجعلنی علی خزائن الأرض اِنی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵)۔

عزیز مصر نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر اس کے ارکان دولت کی سمجھ میں نہیں آئی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جو تعبیر بتائی وہ دل کو لگتی تھی، اس لئے سب نے اس کو قبول کر لیا۔ آگے سات برسوں کے بعد مصر میں جو سات سال سنگین قحط سالی آنے والی تھی اس کے خطرات سے ملک کو بچانا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یہ صلاحیت صرف اس وقت کے پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام کے اندر جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم و تجربہ اور صلاحیت و اہلیت کے ساتھ دیانت و امانت اور مخلوق کے حقوق کی حفاظت کے صفات سے آراستہ تھے، اس لئے انہوں نے ملک مصر کو تباہی سے بچانے اور عوام الناس کو سات سالہ قحط کے خطرات سے نکالنے کے لئے اپنے آپ کو پیش فرمایا۔ مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ اگر آج بھی کہیں اہل افراد کے فقدان کی بناء پر کوئی باصلاحیت آدمی یہ محسوس کرے کہ اگر وہ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے آگے نہ بڑھے تو بگاڑ و فساد اور مصالح کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اس کے لئے اس سنت یوسفی پر عمل کرنا اور اپنے آپ کو اس منصب کے لئے پیش کرنا درست ہوگا۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ عہدہ اس لئے طلب کیا کہ وہ اللہ کے سچے رسول تھے اور ممکن حد تک مخلوق کے مصالح کی رعایت ان پر لازم تھی۔ آپ کو وحی کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سخت قحط اور تنگی کا زمانہ آنے والا ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں۔ تو شاید انہیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ وہ لوگوں کو ہلاکت اور ضرر سے بچانے کے لئے مناسب تدبیر کریں اور مخلوق کے مصالح کی رعایت اس کے بغیر ممکن نہیں تھی کہ مالیات کا نظام ان کے ہاتھ میں آئے۔ اس لئے انہوں نے درخواست کی۔

بہر حال کتاب و سنت کے نصوص اور فقہاء کے اقوال میں عہدہ و منصب طلب کرنے کے سلسلے میں دونوں طرح کی باتیں مذکور ہیں اور یہ کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے بلکہ مختلف حالات پر محمول ہے۔ جب جیسی صورت حال ہوگی اسی کے مطابق حکم ہوگا۔ ظروف و احوال اور ملک و مکان کی تبدیلی سے شریعت کے احکام بدل جاتے ہیں۔

ان مقدمات و معروضات کی روشنی میں ہمیں جمہوری وغیر اسلامی ممالک خصوصاً ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں ایکشن اور انتخابات اور مختلف پارٹیوں کی طرف سے مسلمانوں کے لئے امیدوار بن کر کھڑے ہونے کے نازک مسئلہ پر غور کرنا ہوگا۔

عام حالات میں تو شریعت کا حکم وہی ہے کہ کوئی مسلمان کسی منصب کے لئے خود سے آگے نہ بڑھے، لیکن اس ملک کے حالات کے تناظر میں اگر اس اصول پر عمل کیا جائے اور مسلمان ایکشن میں حصہ نہ لیں اور امیدوار کی حیثیت سے کسی پارٹی کی طرف سے کھڑے نہ ہوں تو پارلیامنٹ، اسمبلی، کونسل اور پنجایت ہر میدان میں ان کی نمائندگی ختم ہو جائے گی۔ فرقہ پرست طاقتیں پورے ملک پر چھا جائیں گی اور مسلمانوں کے ہر میدان میں رکاوٹیں کھڑی کریں گی، ان کی جان و مال، عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان کا دین و ایمان، آئین و قانون، مساجد و مدارس، ملی تشخص اور مفاد سب کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا اور انہیں کفر و ارتداد پر مجبور کیا جائے گا، حکومت میں ان کے شریک رہنے سے ہی بہت سے فتنے سر نہیں اٹھائیں گے۔ جمہوری دستور و آئین جس میں اقلیتوں کے حقوق کی بڑی حد تک رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اسے ختم کرنا کسی فرقہ پرست پارٹی کے لئے ممکن نہ ہوگا اور کسی کی طرف سے اگر اس طرح کا اقدام ہو تو اس کے خلاف احتجاج کرنا ممکن ہوگا، ملک کی موجودہ صورت حال میں مسلمانوں کے لئے اہون اہلیتیں اور دوشر میں سے آسان کو اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوگا۔ البتہ جو شخص کسی منصب کے لئے کھڑا ہو اس کے لئے اس کی اہلیت بہر حال ضروری ہوگی۔ نااہل افراد کا اس مقصد کے لئے آگے بڑھنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

## ۴۔ ایسے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا جو خلاف شریعت قانون بھی بناتے ہوں؟

ایسے قانون ساز اداروں کا رکن بننا جو خلاف شریعت قانون بناتے ہوں مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون (المائدہ: ۴۴)۔

اس آیت کی رو سے کوئی ایسا قانون بنانا یا فیصلہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف ہو کفر ہے، لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایسے قانون ساز اداروں میں اگر مسلم ممبران نہ ہوں تو دھڑلے سے خلاف شرع قوانین بنائے جائیں گے اور کوئی ان پر تکبر کرنے والا اور ان کو روکنے والا نہ ہوگا، لہذا ایسے خلاف شرع قوانین کو روکنے کی نیت سے ایسے اداروں کا رکن بننا جائز ہوگا، لیکن اس کی ذمہ داری ہوگی کہ ایسے خلاف شرع قوانین بننے کی راہ میں رکاوٹ بنے اور بالفرض اگر کسی ایسے قانون پر اکثریت کا اتفاق ہو جائے جو شریعت سے متصادم ہو تو اس پر اپنا اختلافی نوٹ لکھنا اور اس کے نقصانات سے آگاہ کرنا ضروری ہوگا۔ انھوں اہلبیتین کو اختیار کرنے کا مشہور فقہی قاعدہ ایسے ہی حالات کے لئے ہے۔

من ابتلی ببلیتین وھما متساویتان یاخذن بأیھما شاء، وإن اختلفا یختار اھوئھما (الأشیاء والنظائر لابن نجیم)۔  
یعنی جو شخص برابر درجے کی دو مصیبتوں میں پھنس جائے تو وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ان دونوں میں ایک دوسرے کے مقابلہ آسان ہو تو اسے ہی اختیار کرے۔

یہاں بھی دو شر یا دو مفسدے ہیں: ایسے اداروں کا رکن بننا اسلامی غیرت وحمیت اور ایمانی روح کے خلاف ہے، لیکن رکن نہ بننے کی صورت میں صرف انفرادی نقصان ہی نہیں بلکہ پوری ملت کا خسارہ اور سب کے دین وایمان کا خطرہ ہے، اس لئے اس عظیم شر کو دفع کرنے کے لئے پہلے شر کو گوارا کیا جائے گا جو نسبتاً آسان ہے۔

اس اصول کو اس صورت میں بھی پیش نظر رکھا جائے کہ جب ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبران کے لئے وہیپ جاری کر دے اور اس پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند بنادے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ووٹ نہ دے سکیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جس پارٹی سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کرے گا وہ نسبتاً دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں ان کے لئے قدرے غنیمت ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پارٹی ہی کے منتخب کردہ امیدوار کو ووٹ دینا بہتر ہوگا، کیونکہ کسی دوسری پارٹی کا امیدوار اگر چہ ذاتی طور پر دوسرے کے مقابلہ میں بہتر ہو مگر وہ جس پارٹی کا امیدوار ہے اس کی پالیسی کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس سلسلے میں بھی کوئی ایک فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ حالات و مصالحوں کو دیکھ کر اور مسلم زعماء و قائدین کے مشورہ سے کوئی پالیسی طے کی جائے گی۔ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں کسی پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینا پڑے اور بعض صورتوں میں ووٹر اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ووٹ کا استعمال کرے، کیونکہ کسی پارٹی کے مسلم نمائندہ کے حکم کی تعمیل کرنا تمام مسلمانوں کے لئے ضروری نہیں ہے، یوں بھی ووٹ دینا ایک خفیہ عمل ہے جس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس پارٹی سے وابستہ افراد کا پارٹی کے ساتھ جو معاہدہ ہوا ہے ان افراد کے لئے اس معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہ ہوگی، کیونکہ یہ دھوکہ دہی ہے جسے اسلام حرام قرار دیتا ہے۔

## ۵۔ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جب کہ اس کے بعض دفعات خلاف شریعت ہوں:

اسے بھی انھوں اہلبیتین کے شرعی اصول کی روشنی میں برداشت کیا جائے گا، کیونکہ قانون ساز ادارے کی رکنیت کے لئے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا شرط ہے، اس کے بغیر کوئی اس ادارہ کا رکن نہیں ہو سکتا اور ایسے اداروں کی رکنیت سے مسلمانوں کا علیحدہ ہونا ان کے لئے نہایت مضر ہے، لہذا مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے اداروں کی رکنیت قبول کی جائے اور دستور کے جو دفعات خلاف شرع ہوں ان پر عمل نہ کرنے کی نیت کی جائے۔

## ۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں مسلم ممبران کے لئے بائبل پر حلف لینے کا مسئلہ:

ایسے ممالک کے مسلم ممبران کو چاہیے کہ وہ عدالت سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ اسے قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر حلف برداری کی اجازت دے، کیونکہ ان کی مذہبی کتاب وہی ہے اور ہر ملک کی مسلم اقلیتوں کے لئے اپنے دین و شریعت پر عمل کی آزادی کسی حد تک تسلیم کی گئی ہے، لیکن اگر عدالت اس

کے لئے آمادہ نہ ہو تو مجبوری کے درجہ میں ان پر ہاتھ رکھ کر حلف برداری کرے اور نیت یہ کرے کہ میں اصل آسمانی تورات و انجیل پر ہاتھ رکھ رہا ہوں جو اصل میں آسمانی اور الٰہی کتابیں ہیں اور موجودہ محرف بائبل کی تقظیم کا ارادہ نہ کرے۔ یہ بھی دراصل اہوں البلیتین پر عمل کرنا اور بڑے شرک و دفع کرنے کے لئے چھوٹے شرک کو اختیار کرنا ہے۔ ”رابطہ عالم اسلامی“ جو تمام عالم اسلام کی نمائندہ تنظیم ہے، اس کا فیصلہ اس مسئلہ میں یہی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب لطلبه يعتبر مكرماً، ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيماً (قرارات مجلس الجمع الفقہی الإسلامی ۱۴۰۲، ۸۵)

۷۔ ایسی سیکولر پارٹیوں میں شرکت جو مسلم مفادات کے لئے زیادہ مناسب ہوں مگر ان کے منشور کی بعض دفعات اسلام مخالف ہوں:

ایسی سیکولر پارٹیوں میں مسلمانوں کی شرکت و شمولیت اور ان کی طرف سے ایکشن لڑنا بحالت موجودہ مسلمانوں کے لئے درست ہے، البتہ ان کے منشور کی بعض دفعات جو مخالف اسلام ہیں یا مسلم مفادات کے مغاڑ ہیں انہیں بھی اہوں البلیتین کی حیثیت میں گوارا کیا جائے گا اور حکمت عملی کے ساتھ ان کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی۔

۸۔ جو پارٹیاں کھلے طور پر اسلام دشمن ہوں ان کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت؟

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہوں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو اس میں مسلمانوں کا شامل ہونا ناجائز اور حرام ہے، بلکہ یہ خودکشی اور ملت کشی کے مترادف ہے۔ ایسا کرنے والا دین و ایمان کا سودا کرنے والا شمار ہوگا۔ یہ تصور کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا پرلے درجہ کی حماقت اور سادہ لوحی ہے اور احمقوں کی جنت میں رہنا ہے۔

۹۔ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی پارٹی بنانا:

ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا، پارٹی بنانا شرعی نقطہ نظر سے تو درست ہے، لیکن تجربہ یہ ہے کہ مستقل مسلم سیاسی پارٹی قائم کرنا مسلم مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیموں کو ہی فائدہ پہنچتا ہے، جیسا کہ خود سوال نامہ میں بھی مذکور ہے۔ اس لئے اس سے بچنا ہی مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔

۱۰۔ ایکشن میں خواتین کا کردار، ان کا ووٹ دینا اور ایکشن میں امیدوار بننا:

خواتین کے سلسلے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ ان کا اصل دائرہ کار گھر کی چہار دیواری ہے، لہذا گھر سنبھالنا، اس کے نظام کو درست رکھنا، بچوں کی پرورش و پرداخت کرنا ان کا بنیادی فریضہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى (الاحزاب ۳۳) (اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو)۔

لہذا اپنے فرائض کی ادائیگی میں ان کا مصروف رہنا ضروری ہے، بلا ضرورت ان کا گھر سے باہر ہونا باعث فتنہ ہے۔ اسی بنا پر شریعت نے انہیں کسب معاش کی گراں بار ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا ہے۔

جہاں تک ووٹنگ میں حصہ لینے کا مسئلہ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ پردہ کے التزام کے ساتھ ووٹ دینے جائیں۔ جس طرح دوسری ضرورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں ان کے لئے پردہ کا حکم ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے، البتہ اس سے آگے بڑھ کر ان کا ایکشن میں امیدوار بن کر کھڑا ہونا اور قانون ساز اداروں کا ممبر بننا شرعی نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں ہے۔

لیکن موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں جب کہ سیاست میں عورتوں کی شرکت کو یقین بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کے لئے مختلف

ریاستوں میں اور مختلف سطحوں پر خواتین کے لئے سیٹیں ریزرو کی جا رہی ہیں، یہاں تک کہ بعض ریاستوں میں پچاس فیصد سیٹیں عورتوں کے لئے ریزرو کر دی گئی ہیں اور پارلیامنٹ وغیرہ میں بھی ان کے لئے سیٹوں کے ریزرویشن کا بل پیش ہے جس کی بنا پر اس کے قانون بن جانے کی قوی امید ہے، تو اس صورت میں اگر مسلمان عورتوں کو اس سے روکا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان پچاس فیصد تک ان اداروں اور کلیدی عہدوں سے محروم ہو جائیں گے اور فرقہ پرست طاقتوں کی یہ سازش کہ مسلمانوں کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیا جائے، پچاس فیصد تک یوں ہی کامیاب ہو جائے گی اور ان اہم حکومتی اداروں اور کلیدی منصبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی گھٹ کر نصف ہو جائے گی۔ پھر تو فرقہ پرست پارٹیاں اپنے ممبران کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کروائیں گی جس میں مسلمانوں کا عظیم نقصان ہے، ان اداروں میں رکن کی حیثیت سے مسلم خواتین کی شرکت سے بہت سے فتنوں کا سدباب ہوگا اور کھل کر اور آسانی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فیصلے نہیں ہو سکیں گے اور مسلمانوں کو اس کے خلاف احتجاج کرنے کا حق ہوگا، اس لئے ان مصالحوں کی بنیاد پر دفع ضرر کے لئے انہیں ایکشن میں حصہ لینے اور کسی پارٹی سے یا آزادانہ طور پر ایکشن میں امیدوار بن کر کھڑے ہونے کی اجازت دی جائے گی، لیکن ان تمام ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے ان کے لئے جو پردہ اور عفت و عصمت کی حفاظت کی شرعی پابندیاں ہیں انہیں ان کا پورا خیال رکھنا پڑے گا۔ اسی طرح شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہوگی۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند نے عورتوں کو ووٹ دینے وغیرہ کے مسئلہ سے متعلق لکھا ہے:

عورتوں کا ووٹ بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لئے مستحسن نہیں ہے، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لئے معتذر ہے (کفایت الفتویٰ ۳۰۸/۹)۔

اس فتویٰ میں مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو مسلم عورتوں کے ووٹ دینے کو پردہ شرعی کے التزام کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، لیکن کونسل و اسمبلی وغیرہ میں ان کے بطور امیدوار کھڑے ہونے کو غیر مستحسن کہا ہے، لیکن یہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ہے جب اس کی ضرورت نہیں تھی اور مسلم مردوں کا امیدوار بننا مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے کافی تھا، لیکن آج کے حالات میں جب کہ ایک سازش کے تحت مسلمانوں کو اس حق سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور تقریباً پچاس فیصد تک سیٹیں عورتوں کے لئے مخصوص کی جا رہی ہیں، ان حالات میں مسلم عورتوں کے اس میں حصہ نہ لینے سے پارلیامنٹ، اسمبلی، کونسل اور میونسپلٹی وغیرہ میں مسلمان پچاس فیصد نمائندگی سے محروم رہ جائیں گے، اس لئے موجودہ حالات میں بر بنائے ضرورت و مصلحت علماء و مفتیان کرام اس کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں۔

☆☆☆



## جمہوری حکومتوں میں الیکشن اور اس کے مسائل

مفتی اقبال احمد قاسمی

حکومت و سیاست بھی دنیاوی زندگی کی ایک ہم ضرورت اور اجتماعی زندگی کا اہم باب ہے اور حکمرانوں نے اس باب میں اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ حکومت کی تشکیل، تاسیس اور اصول حکمرانی کی بہت سی مثالیں خیر القرون بلکہ عہد صحابہ میں ملتی ہیں۔ حکومت کی توسیع و استحکام اور اس کے آئینی اصول و نظریات، نیز ان کی عملی جزئیات تک ہر مرحلہ پر اسلامی تعلیمات کا مرجع کتابوں کے ذخیروں میں موجود ہے۔ خلفاء راشدین خصوصاً حضرات شیخین رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد خلافت کا زریں دور اسلامی طرز حکومت کا وہ سنہرے دور ہے جس کا لوہا نہر وادرا گاندھی جی جیسے لیڈروں نے مانا ہوا ہے اور برملا اس کا نہ صرف اعتراف بلکہ اسکو اپنانے کی تلقین تک اپنے پیروکاروں کو کر چکے ہیں۔

(۱-۲) ووٹ کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم:

عام طور پر عرف و رواج میں ووٹ کو ایک "اختیاری حق" تصور کیا جاتا ہے جسے "حق رائے دہی" کہا جاتا ہے۔ اس حق رائے دہی کا استعمال لازم نہیں سمجھا جاتا، زائد سے زائد مذہنوں میں ووٹ کی اہمیت ایک سماجی فریضہ کی ہوتی ہے نہ کہ ملی دینی فریضہ کی۔

البتہ علماء کرام اور فقہاء امت نے ووٹ کی اہمیت اس کی قدر و قیمت کے پیش نظر شرعی اصطلاحات کے ذریعہ اس کو حل کیا ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ووٹ کی نوعیت "سفارش" جیسی ہے، گویا کسی کے حق میں ووٹ دینے والا اس بات کی سفارش کرتا ہے کہ یہ منصب کا اہل ہے اس کو موقع مل جائے تو بہتر ہے جبکہ بعضوں کا خیال یہ ہے کہ ووٹ ایک قسم کی "وکالت" کے مترادف ہے، یعنی ووٹ دینے والا امیدوار شخص کو اپنے حقوق کی وکالت کا ذمہ دار بناتا ہے اور اس کو اپنا وکیل تجویز کرتا ہے۔

ووٹ کو شفاعت یا وکالت قرار دینے کی صورت میں یہ نتائج مرتب ہوں گے کہ (۱) جس شخص کی سفارش کی جا رہی ہے وہ اس کا اہل ہو یا جس کو وکیل بنایا جا رہا ہے وہ اس ذمہ داری کو اٹھا سکتا ہو۔ بالفاظ دیگر نا اہل کو ووٹ دینا ایک غلط شخص کی سفارش اور نا اہل کو نمائندہ تجویز کرنا ہوگا۔

(۲) اہل کی سفارش باعث ثواب ہے "اشفعوا توجروا" اور نا اہل کی سفارش (اہل کو نظر انداز کر کے) گناہ ہے، اسی طرح وکیل ایسے کو تجویز کرنا جو نمائندگی کا فریضہ انجام نہ دے سکے، پوری قوم کو خسارہ میں ڈالنے کے مترادف ہے، لہذا نا اہل کو وکیل بنانا بھی گناہ سے خالی نہیں، کیونکہ یہ فرد کا وکیل نہ ہو کر پوری قوم یا اکثریت کا وکیل ہوتا ہے جس کا نفع اور نقصان دونوں ہی متعدی ہے اور ووٹ دینے والے کا اس میں حصہ ہے، اس لیے یہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

(۳) ووٹ کو شفاعت یا وکالت قرار دینے میں ایک اہم نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ پھر ووٹ دینے کو فرض و واجب نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ شفاعت یا وکالت شرعیاً یہ دونوں ہی چیزیں ضروری نہیں ہوتیں، سفارش کرنا اچھا ہے لیکن نہ کریں تو کوئی گناہ بھی نہیں۔ اسی طرح وکالت کے معاملے میں انسان با اختیار ہے، کسی کو وکیل اور نمائندہ تجویز کرے یا نہ کرے۔ شریعت اس کے لیے کسی کو پابند نہیں بناتی۔

غرضیکہ ووٹ کی بابت یہ دونوں رائے (شفاعت یا وکالت) یہ ووٹ کی قدر و قیمت میں اضافہ کے بجائے اس کے مقام کو کمتر کر رہی ہے۔ غور کیا جائے تو ووٹ کا معاملہ جمہوری حکومت میں ایک قسم کا جہاد ہے جس کے ذریعہ حکومتوں کو تہہ و بالا کیا جاتا ہے اور ارشاد بانی ہے: "وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ" (سورۃ الانفال ۶) کے بموجب مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے جان و مال، دین و ایمان کی حفاظت کے لیے مقدر بھر کوشش کریں اور پوری قوت کے ساتھ اس کے لیے تیار رہیں۔ آیت میں قوت کا لفظ ایک جامع لفظ ہے جس میں وہ تمام طاقتیں مراد ہو سکتی ہیں، جو مسلم معاشرہ کی اجتماعی زندگی پر اپنا اثر ڈال سکیں،

یہ طاقت فوج کی بھی ہو سکتی ہے، افرادی قوت اور تعداد کی بھی اور اقتصادی ترقی اور سیاسی استحکام کی بھی۔ اب جو ممالک جمہوری طرز حکومت کے حامل ہیں، ان ملکوں میں ووٹ ایک بڑی طاقت ہے بلکہ جمہوریت میں ووٹ سے بڑھ کر کوئی اور طاقت نہیں اور جمہوری حکومت میں معرکہ الجہاد، ایکشن کا ہی میدان ہے، جمہوریت میں ظالم کا مقابلہ توپ و تفنگ سے نہیں کیا جاسکتا، ووٹ کی تلوار سے ہی ظالم کو گرا یا جاسکتا ہے اور دشمن کو آگے بڑھنے نہ دینے کا فریضہ پورا کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً مسلم اقلیت والے ملکوں میں تو یہ بڑی نعمت ہے، اس لیے ووٹ کا معاملہ صرف سفارشات یا وکالت تک محدود نہیں رہ جاتا کہ ہم اس حق کا استعمال کریں یا نہ کریں، بلکہ ووٹ ڈالنے نہ ڈالنے کے جو اچھے یا برے نتائج کی توقعات یا خطرات ہوتے ہیں ان کے پیش نظر ووٹ کی اہمیت کم و بیش ہو جاتی ہے۔ ووٹ کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر ہی موجودہ دور کے جمہور فقہاء نے ووٹ کو سفارشات اور وکالت کے درجہ سے آگے ”شہادت“ کا درجہ بھی دیا ہے، مفتی محمد شفیع صاحب جواہر الفقہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”خلاصہ یہ کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسرے سفارشات، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملتے ہیں، اسی طرح نااہل غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارشات بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے“ (جواہر الفقہ ۲/۳۹۲)۔

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمٌ قَلْبًا“ (البقرة: ۲۸۲)۔

(اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے) اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”وَمَنْ كَتَمَ شَهَادَةً إِذَا دَعِيَ إِلَيْهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّورِ“ (صحیح الفوائد بحوالہ طبرانی ۶/۶۶۱) (جس کی کو شہادت کے لیے بلا یا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا)۔

ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن وحدیث کے تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے (فقہی مقالات ص ۸۲، ج ۲)۔

اب جبکہ ووٹ کی حیثیت شہادت کی ٹھہری اور ادائے شہادت واجب ہوتی ہے تو اس سے ووٹ دینے کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور یہ مسئلہ اختیاری نہیں رہ جاتا کہ دل چاہے تو ووٹ دے دل نہ چاہے تو ووٹ نہ دے بلکہ ووٹ ڈالنا واجب اور مذہبی فریضہ ہوگا۔ البتہ بعض دفعہ بعض امیدواروں میں یا بعض علاقوں میں یا بعض ایکشنوں میں ایسی صورت حال ہوتی ہے کہ کسی کی شکست یا کسی کی فتح سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا یا امیدوار ایسے ہوتے ہیں کہ ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے، اس طرح کے حالات میں ووٹ دینا واجب بھی نہیں رہ جاتا صرف جائز یا مستحب ہو سکتا ہے۔ ملفوظات فقیہ الامت میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے ووٹ نہ دینے کا واقعہ اسی پس منظر میں کبھی نظر سے گزرا تھا (ملفوظات فقیہ الامت ۲/۶۹، ۳۳)۔

بہر حال ووٹ نہ دینے کے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بھی حکم مختلف ہو سکتا ہے، البتہ تمام حالات اور عدم موانع کی صورت میں ووٹ دینا واجب العمل رہے گا۔

(۳) ایکشن میں امیدوار ہونا:

اسلامی نقطہ نظر سے کسی شخص کا اپنے کو حکمرانی کے لیے پیش کرنا اور اپنے کو مستحق و برتر ثابت کرنا اور عہدہ طلبی کی حرص و تمنا کرنا اور اقتدار کا خواہاں ہونا معیوب بات ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد ہے:

”یا عبد الرحمن بن سمرۃ لا تسأل الإمارة فإنک إن أوتیتها عن مسألة وکلت إليها وإن أوتیتها من غیر مسألة أعنت علیها“ (بخاری کتاب الاحکام باب من سال الامارة مطبوعہ قاعدہ ۲۰۳۰) (اے عبد الرحمن بن سمرۃ عہدہ مت طلب کرو، اس لیے کہ اگر طلب پر تم کو دیا جائے گا تو تم کو اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا اور بلا طلب ملے گا تو نصرت الہی شامل حال ہوگی)۔

دراصل زمام حکومت سنبھالنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ صرف عزیزانہیں بلکہ ایک آزمائش بھی ہے، اس لیے ہر کس و ناکس کو اس کی ہوس نہیں کرنا چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے:

الأكلكم راع واكلكم مسؤول عن رعيتہ، فالأمير الذي على الناس راع وهو مسؤول عن رعيتہ (مسلم)۔ كتاب الامارة (۱۲، ۲۰۹) (سنو ۱۳۰۹) میں سے ہر شخص جواب دہ ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھ ہوگی، پس حکمراں شخص بھی اپنی رعایا کے حق میں جواب دہ ہوگا۔

البتہ بعض خاص اسباب اور مخصوص ظروف و احوال میں جبکہ غیروں اور نا اہلوں کے ہاتھ میں عہدہ پہنچ جانے سے اجتماعی طور پر خطرہ ہو اور امیدوار شخص نسبتاً زیادہ بہتر ہو اور لوگوں کو نقصان سے بچا سکتا ہو تو پھر ایسے موقع پر آگے بڑھ کر عہدہ کو حاصل کرنا نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ قومی و ملی فریضہ ہوگا۔ بشرطیکہ نیت دفع ضرر کی ہو حصول اقتدار کی نہیں۔ اس کی بہت واضح مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا از خود مالیات کے شعبہ کا مطالبہ کرنا ہے جیسا کہ سورہ یوسف میں ہے: ”اجعلنی علی خزائن الأرض إني حفيظ عليہ“ (یوسف: ۵۵)۔

(۱) امیدوار اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہو جس کا وہ امیدوار ہے۔

(۲) دیانت اور امانت داری سے وہ متصف ہو یا کم از کم اس سلسلہ میں اس کی شبیہ صاف ہو۔

(۳) اس کے امیدوار ہونے کے ساتھ کوئی اہل امیدوار میدان میں نہ ہو جو تقسیم ووٹ کا سبب ہے۔

(۴) امیدوار جس حلقہ سے انتخاب لڑ رہا ہو وہاں کی اکثریت دیگر معاملات میں اس کو قابل اعتماد سمجھتی ہو۔

(۵) ایکشن جیتنے کا مقصد عہدہ و اقتدار کے بجائے قوم کو اجتماعی نقصان و خسارہ سے نکالنا ہو اور ملی و سماجی خدمت ہو۔

غرضیکہ اگرچہ قانونی اعتبار سے کوئی بھی شخص ایکشن میں اپنے کو بحیثیت امیدوار پیش کر سکتا ہے، دستور و قانون میں اس کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن کسی ایسے مسلمان کے امیدوار ہونے کے لیے جو شرعی تقاضہ کو بھی پورا کرنا چاہتا ہے یہی حکم ہوگا کہ مندرجہ بالا امور کے پیش نظر ہی اپنے کو میدان میں اتارے اور اگر اپنے اندر اس کی اہمیت و صلاحیت نہیں پاتا تو پھر کسی ایسے کو کھڑا کر کے اس کا سپورٹ کرے جو اس کا اہل ہو اور ایسے شخص کے نہ ملنے پر تقابل کیا جائے کہ نا اہلی کے باوجود اس کے امیدوار ہونے میں ملت کا نقصان ہوگا یا امیدوار نہ ہونے میں کم نقصان والی شق پر عمل کرنا لازم ہے۔

مطلوبہ مقاصد و شرائط کے ساتھ امیدوار بننا موجودہ حالات میں ملک و ملت کا تقاضا اور ملی و قومی فریضہ ہے اور اس میں جو موثر کردار ادا کرے اس کے لیے حسب استطاعت اپنا رول ادا کرنا واجب ہے، لیکن اگر مطلوبہ مقاصد و شرائط کے حامل افراد نادر ہیں اور یہ صفات اب عنقا ہو چکی ہیں تو اب جو نسبتاً بہتر ہیں وہیں غنیمت ہیں، اس لیے اگر امیدوار اہل اشخاص اور معزز افراد ایکشن میں کھڑے نہیں ہوتے تو پھر ہم بڑی خرابی کے مقابلہ میں کمتر برائی کو اپنانے پر مجبور ہوں گے۔ کینئر سے بچنے کے لیے نزلہ و زکام پر راضی ہو جائیں گے اور ایسے لوگوں کو امیدواری کی دکالت و حمایت ہی میں عافیت سمجھیں گے جو بڑے دشمنوں سے حفاظت کا ذریعہ بن سکیں، اس کے لیے فقہاء کے اصول ہیں: ”إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“ (جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی گوارہ کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا)۔

اور مالا یددك كله لا یتروك كله کے بمصداق کہ اگر کل نہ حاصل ہو سکے تو کل کو چھوڑ بھی نہ دینا چاہیے جبکہ جتنا ہاتھ لگ جائے وہی کل کے فوت ہونے سے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ کہ امیدواری کے مسئلہ میں ”أهون البليتين“ کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور جوش، اہون ہو اسے اختیار کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

(۵-۴) مخالف شرع قانون ساز اداروں کا ممبر بننا یا ایسے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جمہوریت میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کے بجائے پارلیمنٹ کی اکثریت کی رائے سے بنائے گئے قوانین کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت کا سب سے بڑا عیب ہے، خدا نخواستہ اگر کوئی مسلمان اسی کو برحق سمجھ بیٹھے کہ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون قرآن کریم کے کسی صریح حکم کے خلاف نافذ کر دے تو (معاذ اللہ) پارلیمنٹ کا قانون ہی برحق ہوگا تو الامان والحفیظ۔ ایسا اعتقاد رکھنے والا تو کافر ہی ہو جائے گا۔

جہاں جہاں مغربی جمہوریت قائم ہے وہاں مسلم ممبران کے لیے یہ مصیبت قائم ہے کہ وہ ایسے موقع پر جمہوریت سے دستبردار ہوتے ہیں تو قوم کو ایسی ناقابل تلافی تکلیف دہ صورتحال سے گزرنا پڑ سکتا ہے جس کو قوم کی اجتماعی خودکشی کے مترادف کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، لیکن اگر مخالف شرع قوانین کی وہ حمایت کرتے ہیں تو جمہوریت میں ان کی بقا تو ممکن ہے، لیکن خلاف شرع امور کی حمایت کا گناہ ان کے کھاتہ میں جاتا ہے، ایسی دوہری مصیبتوں کے وقت مسلمانوں کے لیے کیا لائحہ عمل ہو سکتا ہے؟

اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک اصولی تمہید ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ ”احکام شریعہ دو قسم کے ہیں: ایک اصلی، دوسرے عارضی یعنی احکام کبھی شی کی ذات پر نظر کر کے مرتب ہوتے ہیں اور کبھی عوارض پر نظر کر کے اور ان دونوں قسم کے احکام باہم مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔ امداد الفتاویٰ میں اس اصول کے تحت حکم اصلی اور حکم عارضی کی کئی مثالیں ذکر کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو (امداد الفتاویٰ ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰)۔

ان کے لیے احکام اصلیہ میں کچھ خصتیں ضرور ہوں گی اور عارضی حکم ان کے لیے کچھ اور ہوگا۔ ابتداء اسلام میں جبکہ ہجرت شرط ایمان تھی اور فرض تھی، لیکن شریعت نے ایسے موقع پر بھی چند معذور افراد کے لئے ہجرت سے رخصت کا اعلان کر دیا (سورہ نساء آیت ۷۹، ۸۰، ۸۱)۔

جمہوری حکومت میں قانون ساز اداروں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا مسلم اقلیت کے کمزور نمائندگان کے لیے تقریباً محال ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ جب جمہوری ملک ہو گیا اور جمہوری نظام چل پڑا تو حسب قاعدہ ”اذا ثبت الشيء ثبت بلوازمہ“ جمہوریت تو اپنے تمام لوازمات کے ساتھ مسلط ہوگی، اب جبکہ نظام کا بدلنا بھی اپنے قدرت میں نہیں اور نظام سے کنارہ کشی بھی ممکن نہیں کہ یہ دشمن کو میدان حوالہ کر دینے کے مترادف ہے۔ ایسی صورت میں حدیث نبوی کے بموجب صرف دل سے اس کو منکر سمجھنا اور کڑھ کر اصلاح کی دعا کرتے رہنا کافی ہے۔

غرضیکہ اس طرح کے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی ذمہ داریوں کا تعین ان کی استطاعت، امکانات اور ان کے حالات کی روشنی میں کیا جائے گا۔

سیاسی بصیرت رکھنے والوں کا تجزیہ یہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، کوششیں اندرون خانہ یہ جاری ہے کہ ان کو انتخاب میں امیدوار ہونے یا ووٹ کے حق دار بننے سے محروم کر دیا جائے اور نہ ہی سہی مسلم معاشرہ کی سادھ کو بالکل ختم کر دیا جائے، ایسی صورتحال میں بادل نخواستہ ہی صحیح امیدوار کو حکومت و سیاست سے جڑا رہنا خواہ وقتی طور پر پارٹی کی پالیسیوں کے مطابق شریعت کے خلاف یا اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ ہی کیوں نہ دینا پڑے، موجودہ حالات میں اس کی یقیناً گنجائش ہوگی ساتھ ہی توبہ و استغفار بھی لازم رہے گا۔

عموماً حکمراں پارٹی جب کوئی قانون بناتی ہے یا کوئی بھی پارٹی جب کوئی وہیپ جاری کرتی ہے تو مجموعی اعتبار سے وہ کلی طور پر صریح اسلام کے مغایر کم ہی ہوتا ہے، کیوں کہ انھیں یہ بھی باور کرانا ہوتا ہے کہ ہم اسلام مخالف نہیں بلکہ سیکولر ہیں، البتہ پارٹی کے وہیپ، دستور پالیسیاں جزوی اعتبار سے مخالف اسلام ہوتی ہیں، اب اگر مسلمان ان خرابیوں کے باعث بالکل بھی حصہ نہ لیں تو پھر یہ پارٹیاں مزید شتر بے مہار ہو جائیں گی اور کھل کر اسلام مخالف پالیسیاں مرتب ہوں گی جو کلی طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جائیں گی، اس لیے پارٹی میں بنے رہنے میں اخف ضرر ہے اور علاحدہ ہونے میں اشد ضرر ہے، لہذا اشد ضرر سے بچنے کی خاطر خلاف شرع قانون ساز اداروں کا ممبر بننا جائز ہی رہے گا۔

اسی طرح اگر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑا تو اگرچہ اس کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفاد کے مغایر ہوں تاہم مصالح عامہ کے پیش نظر اور دفع مضرت کی خاطر (ان قابل اعتراض دفعات کو دل سے برا سمجھتے ہوئے) دستور سے وفاداری کا حلف لینا بھی جمہوری حکومتوں اور غیر مسلم اقلیت والے ملکوں میں جائز ہوگا اس سے زائد کا یہ شخص مکلف بھی نہیں۔

(۶) بائبل پر حلف برداری کا حکم:

غیر اللہ کی قسم کھانا اگرچہ شرعاً ممنوع ہے، لیکن جیسا کہ خلاف شرع قوانین کے باوجود حکومت میں داخل رہنا اقلیت والے مسلمانوں کے لئے مصلحت عامہ کی خاطر اور بڑے مفدہ سے بچنے کے لیے درست قرار دیا گیا ہے۔ اسی پر بائبل پر حلف لینے کے مسئلہ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ اس سے بھی کتر اور ہلکے درجہ کا ضرر ہے، کیونکہ اگر بائبل پر حلف لینے کی صورت یہ ہو کہ صرف بائبل ہاتھ میں ہو اور قسم اللہ کی ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے ورنہ قسم تو عام حالات میں قرآن کی بھی کھانا درست نہیں چاہئے کیونکہ بائبل کی۔ لیکن بائبل پر حلف لینا انسان کے ایمان و کفر کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے، کیونکہ بائبل ہو یا کوئی اور دوسری مذہب کی کتاب اس

پر حلف لینے سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ حلف لینے والا اس کتاب پور جوں کا توں اعتقاد رکھتا ہے اور ہاتھ میں اٹھائی ہوئی کتاب کو ہی اصل آسانی کتاب خیال کر کے اس پر ایمان رکھتا ہے۔ بلکہ حلف برداری بھی ایک رسم ہے جس کو دکھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا ہوتا ہے کہ اس ملک کی اکثریت جس کتاب کو تسلیم کرتی ہے وہ اس کتاب کو اٹھائے ہوئے انھیں اپنے وفادار ہونے کا اعتماد دل رہا ہے۔ اس میں موجودہ بائبل پر ایمان ہونا لازم نہیں آتا۔

بائبل پر بدرجہ مجبوری حلف لینے میں اگرچہ حلف دلانے والے کا عقیدہ و نیت کچھ ہو، لیکن حلف اٹھانے والے کی نیت درست ہو تو فقہاء لکھتے ہیں کہ حالف کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ یہ مسئلہ مظلوم و مکرہ اور ظالم و مکرہ کی مخالف نیتوں کی صورت میں علامہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے، چنانچہ ”الاشباہ والنظائر“ میں فرماتے ہیں:

وكذا اختلفوا هل الاعتبار لنية الحالف، أو لنية المستحلف والفتوى على اعتبار نية الحالف إن كان مظلوماً لا إن كان ظالماً (ص ۶۰۱ الاشباه) (اہل قیاس نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ حالف کی نیت کا اعتبار ہے یا مستحلف کی نیت کا، فتویٰ اس پر ہے کہ حالف کی نیت معتبر ہوگی بشرطیکہ وہ مظلوم ہونے کا ظالم) (ص ۶۰۱ الاشباه)۔

مذکورہ اصول کے پیش نظر جہاں کہیں بھی مسلمانوں کو اقلیت میں ہونے کے سبب ایسے مسائل درپیش ہیں، بلاشبہ وہ مظلومین کے حکم میں ہوں گے اگر وہ مظلوم نہ ہوتے تو اس کی نوبت نہ آتی، اس لیے بائبل وغیرہ پر حلف لینا، جب ناگزیر ہو جائے اور حلف لیتے وقت موجودہ بائبل پر ایمان و اعتقاد نہ رکھتا ہو بلکہ بادل خواستہ حلف برداری کی رسم ادا کرتا ہو تو اگرچہ مستحلف کا عقیدہ و نظریہ بائبل پر ہو لیکن حالف اپنی نیت کی بنا پر اس سے بری ہوگا اور ایسی صورت میں مظلوم اور مکرہ پر قیاس کرتے ہوئے مذکورہ حلف برداری کی گنجائش ہوگی۔

### (۷-۸) سیکولر یا مسلم دشمن پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت کا حکم:

غیروں کے غلبہ اور مسلم اقلیت والے ملک میں جہاں سبھی بڑی پارٹیاں اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہوتیں، کیونکہ وہ کافروں اور سیکولر ذہن والوں کی بنائی ہوئی یا ان کے غلبہ والی پارٹیاں ہوتی ہیں ان سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ صد فیصد اسلامی اصول کی پاسداری کریں اور مسلمان اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ وہ اسلامی آئین اور شرعی قوانین کے مطابق سیاسی اقتدار اور غلبہ حاصل کر کے خالص اسلامی نظام نافذ کر سکیں۔ ایسی حالت میں ملک کی وہ سیکولر پارٹیاں جو نسبتاً جمہوری آئین کے مطابق سب کے حقوق تسلیم کرتی ہوں اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب ہوں۔ خواہ ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفاد کے خلاف ہی ہوں جبکہ اس کا نعم البدل موجود نہ ہو تو ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت، ان پارٹیوں کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل رہنا جائز و درست ہوگا اور یہ حکم غیروں کے غلبہ اور مسلمانوں کے مظلوم ہونے کے سبب عارضی حکم کہلانے کا جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے حوالے سے یہ بات عرض کی جا چکی ہے اس سلسلہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت نہ موجود ہے اور نہ قریب میں اس کی توقع ہے۔ (اس لیے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے) اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ موجودہ (سیاسی) جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شرعیہ کی رو سے ان میں جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان ہو اور دوسرے کی دشوار ہو تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ بس مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ ایسی جماعت میں داخل ہو جانا چاہیے، پھر ان میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے، اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں۔ (یہ حکم عارضی ہے) اور جب کوئی جماعت مسلمہ منظم، صاحب قوت، صاحب اثر تیار ہو جائے اس کے ساتھ مل کر کام کریں۔ موافق مخالف ہر ایک کے ساتھ اسلامی اخلاق کو اپنا شعار رکھیں“ (انادیب، اشرافیہ در مسائل سیاسیہ ص ۲۷)۔

خلاصہ یہ کہ پارٹیوں کے نقص و نقصانات اور ان کے اسلام مخالف منشور و دفعات کے پیش نظر کم سے کم تخریبی کا انتخاب کرتے ہوئے جب تک حالات مسلمانوں کے حق میں سازگار نہیں ہیں ان کے ساتھ مل کر حکومت سازی و ایکشن وغیرہ میں حصہ لیتے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس کے برعکس زیادہ مضر اور موذی پارٹیاں جو کھلے طور پر مسلم دشمنی پر آمادہ ہیں اور ان کے منشور و پروگرام میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، ایسی پارٹیوں میں شرکت ناجائز ہے اور اعلانہ طور پر تعاون علی الاثم ہے۔

## (۹) مسلمانوں کی علاحدگی اور سیاسی جماعت کا قیام:

مسلمانوں کا سیاسی حیثیت سے مستحکم و متحد ہونا اشد ضروری ہے اور اس کے لیے ممکنہ سعی و تدبیر اختیار کرنا بھی لازم ہے اور سیاسی طور پر تابع رہنے کے بجائے متبوع بننے کی کوشش بھی اسلامی فریضہ ہے، اس کے لیے مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے تمام مصالح و منافع کی حفاظت اور تمام مضار و مفسدات سے صیانت و حفاظت بھی اس تنظیم پر موقوف ہے، لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور مسلمان اگر اپنی الگ سیاسی پارٹی بھی بناتے ہیں تو ان کو بھی جمہوریت کی دہائی دینا لازم ہے، وہ سیکولر ایجنڈے سے باہر نہیں جاسکتے۔ ایسی صورت میں ان کی پارٹی سے مسلمانوں کا خاص بھلا نہیں ہو پاتا بلکہ بعض دفعہ سخت نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کا حکم ہر جگہ کے احوال و کوائف کے اعتبار سے علاحدہ ہوگا۔

در اصل یہ بحث جواز عدم جواز سے بڑھ کر سیاسی مبصرین کے تجربات پر موقوف ہے اور ہر مقام و علاقہ کے اعتبار سے مختلف حکم کی متقاضی ہے، کہیں اس کی افادیت غالب ہوگی اور کہیں مضرت کا غلبہ ہوگا۔ افادیت و مضرت کے غلبہ کے اعتبار سے اس کے جواز عدم جواز کا فیصلہ ہوگا۔

حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ”سیاست کے دو حصے ہیں: ایک سیاست کے شرعی احکام یہ بے شک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں، چنانچہ ابواب فقہیہ میں کتاب السیر کا ایک مستقل جزو ہے جس کی درس و تدریس کا پابندی سے اہتمام ہے۔

دوسرا حصہ سیاست کا تجرباتی تدبیریں ہیں جو ہر زمانہ کے حالات و واقعات اور آلات وغیرہ کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہیں، اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں ہے اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں، اسکی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ اور خاص مناسبت ہے (البدائع ص ۳۴۔ غیر اسلامی حکومت ص ۱۲۰، مرتبہ مفتی محمد زید صاحب)۔

غرضیکہ الگ پارٹی بنانے کا مسئلہ علاقوں کی نوعیت سے سیاسی مبصرین اور دردمندانہل تجربہ کی رائے اور صوابدید پر موقوف ہے۔

## (۱۰) ایکشن میں خواتین کا کردار:

خواتین کے سلسلے میں اسلام کا موقف ڈھکا چھپا نہیں ہے، اسلام چاہتا ہے کہ خواتین گھر کی چہار دیواری میں گھریلو نظام اور اولاد کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری کا نظام سنبھالیں، کیونکہ فطری اور خلقی وضع کے اعتبار سے مرد و عورت میں جو امتیاز ہے اسلام نے اس کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے اور معاشرے میں دونوں کی جداگانہ حیثیت متعین کر دی ہے اور اس حیثیت کے مطابق ان کے حقوق و فرائض بھی بیان کر دیئے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں عورت کی قیادت و سیادت اور سربراہی کے متعلق فیصلہ کن ارشاد ہے: ”لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأة“ (بخاری ۴، ۱۶۱) (وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو سکتی جو اپنے معاملات کی ذمہ داری کسی عورت کے سپرد کر دے)۔

یہی وجہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بے شمار غزوات ہوئے، لیکن کسی میں بھی عورت کو امیرانچیش بنا کر روانہ نہیں کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب خود جہاد میں تشریف لے گئے تو اپنی عدم موجودگی میں کسی خاتون کو اپنا جانشین نہیں مقرر فرمایا۔ اسی طرح کسی خاتون کو کبھی امیرانچ بھی نہیں بنایا گیا اور حد تو یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے نبوت و رسالت کے لیے بھی عورت کو منتخب نہیں فرمایا۔ غرضیکہ شریعت نے عورت کو کسی ایسے حکم کا پابند نہیں بنایا جو اس کے اصل مقام کے منافی ہو۔ اس کے کاندھے پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ڈالی جس میں اسے گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ اسی لیے اس پر جمعہ فرض نہیں، جہاد فرض نہیں، جماعت سے نماز پڑھنا واجب نہیں، اگر عورت تنہا ہے کوئی محرم نہیں ہے تو اس پر مالدار ہونے کے باوجود حج فرض نہیں ہے۔ عام اسفار بھی بلا محرم کے جائز نہیں۔ جنازے کی مشایعت بھی جائز نہیں اس کی اذان منع۔ امامت منع۔ اقامت منع۔ ولایت صحیح نہیں باپ ہی کو ولایت نکاح و وصیت وغیرہ حاصل ہے۔ غرضیکہ درجنوں مسائل و امثال سے یہ بات واضح ہے کہ خواتین کا دائرہ عمل مردوں سے بہر حال مختلف ہے اور مختلف رہنا ہی چاہیے اور اسی بنا پر فقہائے امت اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ کسی اسلامی حکومت میں سربراہی کے منصب کی ذمہ داری کسی عورت کے حوالہ نہیں کی جاسکتی۔ علامہ ابن حزم نے صاف لکھا ہے:

واتفقوا أن الإمامة لا تجوز امرأة“ (مراتب الاجماع: ۱۱۶) (فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی عورت کے لیے امارت و امامت جائز نہیں)

مذکورہ بالا تمہید سے یہ مسئلہ تو متحج ہو گیا کہ جہاں مسلم مرد کو ایکشن میں امیدوار بنایا جاسکتا ہے اور وہ سیٹ خواتین کے نام پر ریزرو نہیں ہے وہاں کسی مسلم

خاتون کا الیکشن میں کھڑا ہونا درست نہیں، اس سے جہاں عورت کا اپنے حدود سے تجاوز لازم آتا ہے، وہیں مردوں کی حق تلفی کو بھی مستلزم ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتاویٰ میں ہے:

”بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لیے مستحسن نہیں، کیونکہ اس ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لیے متعذر ہے“ (کفایت المفتی ۹ ص ۳۰۸)۔

جہاں تک ووٹنگ میں حصہ لینے کی بات ہے تو اس کے لیے فوٹو شناختی کارڈ ہونا اور اس کو دکھلا کر ووٹ دینا بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے، کیونکہ اگر مسلم خواتین کو انتخابی عمل سے دور کر دیا جائے تو مسلمان رائے دہندگان کا نصف حصہ ووٹ دینے سے محروم رہ جائے گا جس سے مستقبل میں ناقابل تلافی نقصانات اور اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

مسلم خواتین کا امیدوار ہونا اور ووٹنگ میں حصہ لینا دونوں کا حکم علیحدہ علیحدہ ذکر کیے جانے کے بعد اس سلسلے کا سب سے پیچیدہ مسئلہ ان حلقوں اور علاقوں کا ہے جہاں حکومت نے انتخاب کے لیے خواتین کو مختص کر دیا ہے یا تعداد کے اعتبار سے خواتین کی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے خواتین کا کوٹہ مقرر کر دیا ہے، ایسی جگہوں میں اور ایسی صورت حال میں مسلم خواتین الیکشن میں امیدوار ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اولاً اصولی بات تو یہی ہے کہ حکم اصلی عدم جواز کا ہے، کیونکہ عورت کا امیدوار ہونا بہت سے مفاسد کو بھی مشتمل ہے اور مرد و عورت کے لیے جو فطری تقسیم کار منجانب اللہ ہے اس کی بھی خلاف ورزی ہے۔ نیز عورتوں کے مرد کی جگہ لے لینے سے مردوں کی حق تلفی ہے پھر عموماً اہلیت کا فقدان ہونے کے سبب جس قانون ساز ادارہ یا کونسل یا میونسپلٹی وغیرہ کی رکن بننے کی وہ شعبہ بھی خلل کا شکار ہوگا۔ غرضیکہ خواتین کا الیکشن میں امیدوار بن جانا چند دو چند مفاسد پر مشتمل ہونے کے سبب شرعاً بالکل جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ الیکشن کی سرگرمی اور ہنگاموں میں جس طرح امیدوار سرٹوں پر بے آبرو نظر آتے ہیں، مسلم عورتوں کی یہ بے آبروئی اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس حکم اصلی کے ساتھ ہی ایک نظر ملکی و سیاسی حالت اور اغیار کی سازش پر کھنی ہوگی اور ان حلقوں میں جہاں مرد کے الیکشن میں کھڑے ہونے پر پابندی لگا کر عورت کو ہی امیدوار ہونے کا موقع باقی رکھا گیا ہے، اگر مسلم خواتین وہاں حصہ نہ لیں تو مرد تو پہلے ہی محروم کیے جا چکے، خواتین حکم شرع کی بنا پر اس میں حصہ نہ لیں گی تو آئندہ اس کے نتائج یہ ہوں گے کہ مسلم نمائندگی صفر کے برابر ہو جائے گی اور اپنی کوئی آواز اٹھانے والا اس محکمہ میں نہ ہوگا۔ کفار و اغیار کی اسلام کو اور مسلمانوں کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی جو سازشیں ہیں وہ بروئے کار لائیں گے، اس لیے حکم شرع کی خلاف ورزی کا نقصان اور الیکشن میں حصہ نہ لینے سے قومی و ملی اجتماعی نقصان دونوں کا موازنہ کیا جائے تو عارضی حکم یہی ہوگا کہ صرف دفع مضرت کی خاطر جب مردوں کو اس سیٹ کے لیے موقع باقی نہ رہے تو مسلم خواتین کے ذریعہ اس خلا کو پر کیا جائے، اغیار اور دشمنوں کے لیے وہ سیٹ بالکل نہ چھوڑ دی جائے اور اپنے حق سے بالکل دستبردار نہ ہو جائے، یہ رائے فقہاء کے اصول سے ہی مستنبط ہوتی ہے وہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے الفاظ میں یہ ہے:

”اور یہ شرعی و عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر (نقصان) جمع ہوں ایک اشد، دوسرا ہون، تو اہون کو اختیار کر لینا چاہئے، یعنی جہاں دونوں شقوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد ایک میں اخف تو اشد سے بچنے کے لیے یا اس کو دفع کرنے کے لیے اخف کو گوارا کر لیا جاتا ہے اور ہے تو یہ بھی برا، مگر دوسرے مفسدہ کے مقابلہ میں پھر بھی اخف ہے“ (ملفوظات اشرافیہ ص ۱۳)۔



## ایکشن میں حصہ داری - موجودہ تناظر میں

مفتی عبدالرحیم الحسنی لکھنوی

۲، ۱- الف۔ موجودہ جمہوری نظام کے مفاسد میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں انسان کو خود عہدہ و منصب کا طلبگار بننا پڑتا ہے اور چونکہ ہمارا قومی نظام بھی اسی اصول پر مبنی ہے، اس لیے نہ صرف سیاسی انتخابات، بلکہ مذہبی جماعتوں اور ملی تنظیموں میں بھی عہدہ و منصب کی طلب کا یہی رویہ عام ہو گیا ہے، جو نہایت ہی بد بختانہ بات ہے، تاہم موجودہ سیاسی نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ امیدوار خود ایکشن میں کھڑے ہوں، ان حالات میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ کم سے کم ایسا ہو کہ جب تک عام لوگ ایکشن میں امیدوار بننے کے لیے اصرار نہ کریں اور ان کی طرف سے مطالبہ نہ ہو، امیدوار بننے سے گریز کیا جائے۔

کسی شخص کو ووٹ دینا اس کو اپنا نمائندہ نامزد کرنا ہے، کیسے شخص کو اپنا نمائندہ بنایا جائے اور کس شخص کو کس عہدہ پر نامور کیا جائے؟ اس کے لیے قرآن نے ایک بنیادی بات بتائی ہے کہ جس کو ذمہ داری سپرد کی جائے اس میں دو باتیں ضرور پائی جانی چاہئیں: ایک تو صلاحیت و اہلیت دوسرے امانت و دیانت: ”ان خیر من استأجرت القوی الامین“ (القصاص: ۲۶)۔ صلاحیت سے مراد یہ ہے کہ مجالس قانون ساز میں پہنچنے کے بعد وہ شخص صحیح موقف کی رہنمائی کر سکے، صحیح موقف سے مراد یہ ہے کہ اس کی رائے قرآن و حدیث اور شریعت اسلامی کے مخالف نہ ہو، دوسرے اس میں مسلمانوں کے ملی مفادات کی رعایت ہو، تیسرے اس کی رائے ملک اور ملک کے تمام شہریوں کے لیے خیر خواہی پر مبنی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں شعور آگئی ہو، وہ ضروری حد تک شریعت کے احکام سے واقف ہو، زمانہ شناس اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہو، دوسرے اپنی بات کو مؤثر طریقہ سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ سنت نبوی بھی ہے کہ کسی بات کے کہنے کے لیے مناسب شخص کا انتخاب کیا جائے، افسوسناک بات یہ ہے کہ اکثر اوقات ایسے مسلمان منتخب ہو کر مجالس قانون ساز میں پہنچتے ہیں کہ خود ان کے شعور آگئی کی سطح بہت پست ہوتی ہے، ان میں مدلل طریقہ پر سوال اٹھانے اور مخالف سوال کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ عوام میں جذباتی تقریر کرنا آسان ہے، لیکن دلیل کی زبان میں اپنی بات کو ثابت کرنا اسی قدر دشوار۔

دوسرا ضروری وصف ”امانت و دیانت“ امانت ایک جامع لفظ ہے، یہ صرف مال ہی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر قول و فعل اس کی وسعتوں میں داخل ہے، فکر و سوچ میں بھی امانت مطلوب ہے، فکر کی امانت یہ ہے کہ انسان قومی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ذاتی مفاد کے بجائے قومی اور ملی مفاد کے پس منظر میں سوچے، امانت زبان سے بھی متعلق ہے، زبان کی امانت یہ ہے کہ سچی اور درست بات کہی جائے، جھوٹ، بہتان تراشی اور اپنی پارٹی اور حکومت کی خوشامد و چاپلوسی سے بچا جائے، قول و عمل میں تضاد نہ ہو، زبان اور دل ایک دوسرے کے رفیق ہوں اور یقیناً امانت و دیانت کا تعلق مال و متاع سے بھی ہے، ایک زمانہ میں چھوٹے درجہ کے ملازمین کو کرپٹ اور رشوت خور سمجھا جاتا تھا، لیکن آج لوگوں کو یقین ہے کہ سیاسی قائدین اس میدان میں سب پر سبقت لے گئے ہیں، اگر اسٹنڈل اور رشوت خوری بھی فن کہلانے کا مستحق ہے تو ہمارے ملک کے بعض وزراء، بلکہ وزیر اعظم تک ایسے گزرے ہیں کہ یقیناً وہ اس بات میں انعام کے مستحق ہیں (اسلام اور جدید فکری مسائل ص: ۳۳۰، ۳۳۱)۔

ب۔ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت:

۱۔ اپنے ووٹ کا استعمال کرنا شرعاً ضروری ہے:

پہلی غلطی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس کا منشاء اتنا برا نہیں، لیکن نتائج بہت برے ہیں، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آج کی سیاست مکر و فریب کا دوسرا نام بن چکی ہے، اس لیے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصہ لینا چاہیے، نہ ایکشن میں کھڑا ہونا چاہیے اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرچے میں پڑنا چاہیے۔

مک صدر مفتی و مہتمم دارالعلوم المصطفوی محلہ توحید پورہ مولہ کشمیر۔



یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو، لیکن بہر حال غلط اور ملک و ملت کے لیے سخت مضر ہے۔ ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے، لیکن جب تک کچھ صاف ستھرے لوگ اسے پاک کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھیں گے اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا، پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی، لہذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سیاست کی اس گندگی کو دور سے برا کہا جاتا رہے بلکہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے پھینکنے کی کوشش کی جائے جو مسلسل اسے گندہ کر رہے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”الناس إذا رأوا الظالم فلم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله بعقاب“ (جمع الفوائد ۵۱/۲ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی) (اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں)۔

اگر آپ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے اور انتخابات میں سرگرم حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

بہت سے دین دار لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے، تو اس سے کیا نقصان ہوگا؟ لیکن سنئے: کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں، حضرت اہل بن حنیفؓ سے مسند احمد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أذل عنده مؤمن فلم ينصره وهو يقدر على أن ينصره أذله الله على رؤوس الخلائق (جمع الفوائد ۵۱/۲ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی) (جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جا رہا ہو، اور وہ اس کی مدد کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے میدان میں برسرعام ذلیل کرے گا)۔

ووٹ نہ دینا حرام ہے:

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه آثم قلبه (جس کسی کو شہادت کے لیے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا)۔

بلکہ گواہی دینے کے لیے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا یہ فریضہ ادا کر دے، اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ کرے، حضرت زید بن خالدؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الأخیرکم بخیر الشهداء الذی یأتی بشهادته قبل أن یسألها (جمع الفوائد ۶۲/۱ بحوالہ مالک و مسلم وغیرہ) (کیا میں تمہیں نہ بتاؤں بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے)۔

ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن و سنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں ہے، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف، دیندار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسو ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پورا میدان شریروں، فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں، ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے، اگر دین دار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہو کر رہ جائیں تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا، کیوں کہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے اور ان کے حکام کا سارا عذاب و ثواب ان ہی کی گردن پر ہوگا اور خود ان کی آنے والی نسلیں اس شر و فساد سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

ایکشن میں حصہ لینا:

موجودہ انتخابی نظام کے غیر اسلامی ہونے اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جن کی نشاندہی کی جاتی ہے جب یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ غیر مسلم ممالک میں جہاں

مسلمان اقلیت میں ہیں اور اسلامی نظام حکومت برپا کرنے کے امکانات نہیں ہیں، مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مذہبی آمریت کے بجائے جمہوریت کی تائید کریں اور جمہوری نظام کا سب سے زیادہ بنیادی حصہ انتخابی سیاست ہے تو مسلمان انتخابی عمل اور ایکشن سے صرف نظر کیسے کر سکتے ہیں، لہذا ایکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا درست ہے (انتباس از مضمون مفتی عتیق احمد قاسمی صاحب در رسامہای "بحث و نظر" شماره ۱۳ / ۵۲ جنوری۔ مارچ ۲۰۰۱ء جلد ۴ / ۱۳ ص ۳۳)۔

حج: انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس کو محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں، کہ یہ شخص اپنے نظریہ اور علم و عمل اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں اس میں حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعہ جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا ان کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی۔ آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۲۔ اس معاملے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے ثواب و عذاب بھی محدود قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اور اس کا ادنی نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳۔ سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، اس لیے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل و دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے تو اسی کو ووٹ دیئے ہیں۔ کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

۴۔ جو امیدوار نظام اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵۔ ووٹ کو پیسوں کے معاوضے میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند نکوں کی خاطر اسلام اور ملک کے خلاف بغاوت ہے، دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں کوئی دانشمندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لیے اپنا دین کھو بیٹھے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم (ماخوذ از جواہر لائقہ ۲ / ۲۹۳، ۲۹۵)۔

ضروری وضاحت: لیکن یہاں پر یہ بات بھی خاص طور پر ملحوظ نظر رکھنی ضروری ہے کہ بعض مرتبہ استعماری و قابض قوتیں عالم اسلام کے مختلف ممالک اور مقامات میں اپنے خوفناک مظالم اور بھیانک تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اور جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے نیز اقوام عالم و انصاف پسند طبیبیتوں کو گمراہ کرنے کے لیے دھونس دباؤ، لالچ اور دیگر سامراجی ہتھکنڈے استعمال کر کے انتخاب اور ریفرنڈم وغیرہ کا ڈھونگ رچاتی ہیں جو صرف اپنے جابرانہ قبضے کو طور دینے اور اقوام عالم سے مظلومین و مستضعفین (کمزوروں) پر اپنے مظالم و جرائم کو بدستور جاری رکھنے کے لیے حمایت حاصل کرنے کی بدترین سیاسی چال ہوتی ہے، لہذا اس قسم کے انتخابات و ریفرنڈم یا استصواب رائے میں حصہ لینا بھی تعاون علی اللثم والعصوان کی بنا پر درج بالا وجوہات و دلائل کی روشنی میں حرام و ناجائز ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا استدلال غاصب برطانوی حکومت کے زیر سایہ قائم ہونے والی نام نہا کونسلوں کے متعلق فتاویٰ امارت شرعیہ میں درج شدہ ذیل کے اس ہم ترین فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ترک کونسل کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

الف۔ کونسل قانونی ہو یا انتظامی اس کا مقصد نظام حکومت کا استحکام و انصرام ہے جو کھلم کھلا حکومت کی معاوضت ہے۔

ب۔ کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں جن کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرت مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

قال رسول اللہ ﷺ: من رأى منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلمه۔

مگر مسلم ممبران کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شوہد و واقعات ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے۔

ج۔ کونسل میں قوم انگریزی بھی ہوتی ہے جو ظالم و دشمن دین ہے اور ایسی قوم کے ساتھ اعزازی نشست شرعاً حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فلا تقعد بعد الذکرئ مع القوم الظلمین (انعام) پس یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مل کر نہ بیٹھ۔

دکنسل میں ممبران کے لیے حکومت کی وفاداری اطاعت شعاری وہی خواہی کی قسم شرعاً حرام اور گنا کبیرہ ہے (فتاویٰ امارت شرعیہ ج ۱ ص ۲۷۵، ۲۷۴)۔

۳۔ الف۔ قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیہ (سورہ یوسف ۵۵) (یوسف علیہ السلام نے) کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مامور کر دیجئے میں دیانت بھی رکھتا ہوں، علم بھی رکھتا ہوں۔

یہ عہدہ آج کل کی اصطلاح میں ریونیونسٹر (وزیر محاصل و مال گذاری) اور فائننس منسٹر (وزیر مالیات و خزانہ) کا جامع معلوم ہوتا ہے۔

خزائن الارض: بعض مفسرین نے ارض کے معنی بجائے ملک کے زمین لے کر خزائن الارض کے معنی زمین کی پیداواروں کے لیے ہیں (روح المعانی)، فقہاء و مفسرین نے لکھا ہے کہ جب مقصود نفع رسائی ہونے کہ نفس پروری، اور خدمت خلق کی یہی ایک صورت کھلی رہ جائے تو اپنے کو عہدہ و منصب کے لیے پیش کر دینا ناجائز نہیں، یہاں تک کہ فاسق بلکہ کافر نظام حکومت کے ماتحت بھی عہدہ و منصب قبول کر لینا حرام نہیں رہ جاتا۔

وفیہ دلیل علی جواز طلب التولية والإظهار أنه مستعد لها والتولی من ید الکافر إذا علم أنه لا سبیل إلى إقامة الحق وسياسة الخلق إلا بالاستظهار به (بیضاوی) وفیہ دلیل علی أنه یجوز أن یتولی الإنسان عمالة من ید سلطان جائر، وقد کان السلف یتولون القضاء من جهة الظلمة وإذا علم النبی ﷺ أو العالم أنه لا سبیل إلى الحكم بأمر الله تعالى ورفع الظلم إلا بتمکین الملك الکافر أو الفاسق فله أن یتظاهر به (مدارک) فإن کان الملك کافر ولا سبیل إلى الحكم بأمر الله ورفع الظلم إلا بتمکینه فللمتولی أن یتظاهر به (بحر) وفي هذه الآية ما یبیح الرجل الفاضل أن یعمل للرجل الفاجر والسلطان الکافر بشرط أن یعلم أنه یفوض إليه۔ اور ایسے ہی اقوال کبیر وغیرہ میں بھی ملتے ہیں۔

توریت میں اس مقام پر ہے: ”فرعون نے یوسف سے کہا کہ دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں پہنادی..... تب اس کے آگے منادی کی گئی، سب ادب سے رہو، اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا، اور یوسف کو کہا: میں فرعون ہوں اور بغیر تیرے مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھائے گا“ (پیدائش۔ ۴۱، ۴۲۔ ۴۳)۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں دلالت ہے کہ منصب و حکومت کی درخواست جبکہ اس میں مخلوق کا نفع ہو، اور خود اپنا یہ ضرر نہ ہو کہ غیر اللہ میں مشغول ہو جائے، قادر کمال نہیں۔

ب۔ حکمرانی کی طلب ناجائز ہے:

چونکہ حکمرانی ایک مسؤلیت و ذمہ داری ہے، حق نہیں ہے، اس لئے اس کا طلب کرنا ناجائز نہیں ہے، یہ ایسی چیز ہے ہی نہیں جسے حاصل کرنے کے لئے انسان بڑھ چڑھ کر جدوجہد کرے کہ میں کسی طرح حاکم بن جاؤں، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبدالرحمان بن سمرہؓ سے ارشاد فرمایا:

”لا تسأل الإمارة فإنك إن أوتيتها عن مسألة وكلت إليها، وإن أوتيتها من غير مسألة أعنت عليها“ (بخاری حدیث نمبر ۶۶۲۲ کتاب الایمان)۔

(امیر بننے کی طلب نہ کرو، کیونکہ اگر تمہیں تمہاری طلب پر امارت دی گئی، تو تمہیں اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا) (یعنی تمہیں اس کی ذمہ داریاں خود چھگنی ہوں گی) اور اگر تمہیں یہ امارت طلب کے بغیر دی گئی تو (اللہ کی طرف سے) تمہاری مدد کی جائے گی)۔

اسی قسم کی بات حضور ﷺ نے قاضی کے عہدہ کے بارے میں بھی ارشاد فرمائی ہے جس سے مذکورہ بالا حدیث کی مزید تشریح ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”من ابتغى القضاء وسأل فيه شفعاء وكل الى نفسه، ومن أكره عليه انزل الله عليه ملكا يسده“ (ترمذی کتاب الاحکام حدیث نمبر ۱۳۳۲ کتاب القاضی، ابوداؤد حدیث نمبر ۳۵۷۸ ص ۳۵۷۸)۔

(جو شخص قاضی بننے کی طلب کرے، اور اس کام کے لئے سفارش کرنے والوں کو تلاش کرے، اسے خود اپنے حوالے کر دیا جاتا ہے، اور جس کسی کو اس منصب پر مجبور کیا جائے، اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ نازل فرمادیتے ہیں جو اسے سیدھے راستے پر رکھتا ہے)۔

اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میرے قبیلے کے دو آدمیوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ انہیں حکومت کا کوئی منصب عطا کر دیا جائے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

”إنا لا نولى هذا من سأله ولا من حرص عليه“ (بخاری باب ما یکره من الحرص علی الامارة حدیث نمبر: ۷۱۳۹) (ہم کسی ایسے شخص کو یہ منصب نہیں دیتے جو اس کی طلب کرے یا اس کی حرص کرے)۔

یہ احادیث بڑی صراحت کے ساتھ واضح کر رہی ہیں کہ امارت کو خود طلب کرنا ناجائز ہے، اور جو اس کا طالب ہو، وہ درحقیقت اس منصب کا اہل ہی نہیں ہے، نیز ایک حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے، یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

تجدون من خیر الناس أشدهم كراهية لهذا الشأن حتی یقع فیہ (بخاری شریف کتاب المناقب حدیث نمبر ۳۴۹۶) (تم بہترین انسان ان لوگوں کو پواؤ گے جو اس معاملے (یعنی امیر بننے) کو ناپسند کرتے رہیں، الا یہ کہ وہ اس میں مبتلا ہو جائیں)۔

ج۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایکشن میں امیدواری اور عوام سے ووٹ کی بھیک مانگنا اسلامی نقطہ نظر سے ایک ناروا بلکہ غیر شریفانہ حرکت ہے، رسول اللہ ﷺ نے عہدہ کے طلب کرنے کو منع فرمایا ہے، کہ جب کوئی شخص مانگ کر عہدہ حاصل کرتا ہے تو اس سے اللہ کی مدد اٹھ جاتی ہے اور جب بغیر طلب کے کوئی ذمہ سر پر آجائے تو اللہ کی مدد شریک حال ہو جاتی ہے (مسلم عن عبدالرحمان بن سرہ ج ۲ ص ۳۱)۔

لیکن اگر کوئی عہدہ طلب کے بغیر نہ حاصل ہونے پائے اور اس عہدہ سے دین و ملت کا مفاد وابستہ ہو، بلکہ بعض جائز مفادات و مصالح اس پر موقوف ہوں، تو یہاں بھی ازراہ ضرورت ان مفادات کے تحفظ کی نیت سے عہدہ طلب کرنا، امیدوار بننا اور ووٹ مانگنا جائز ہے، اور اس کی سب سے واضح نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے، جنہوں نے قحط کے حالات میں عامۃ الناس کے مفادات کے تحفظ کے لیے ملک کے خزانہ کی ذمہ داری طلب کی تھی اور فرمایا تھا:

”اجعلنی علی خزائن الأرض“ (سورہ یوسف: ۵۵)۔

چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”وإذا ثبت هذا القول: انه عليه السلام كان مكلفا برعاية مصالح الخلق في هذه الوجوه وما كان يمكنه رعايتها إلا بهذا الطريق ولا يتم الواجب إلا به فهو واجب فكان هذا الطريق واجبا عليه ولما كان واجبا عليه سقطت الأسئلة بالكلية“ (مفاتیح الغیب للرازی ۹۰۸۲)۔

(جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان امور میں بھی خلق کی مصلحتوں کی حفاظت کے مکلف تھے اور یہاں مصلحتوں کا تحفظ اسی طریقہ پر ممکن تھا، اور جس کے بغیر واجب حاصل نہ ہو سکتا، وہ بھی واجب ہوتا ہے، پس یہی صورت اختیار کرنی ان پر واجب تھی اور جب یہ بات ان پر واجب تھی تو اب کلیتاً کسی سوال کی گنجائش نہیں رہی)۔

پس چونکہ ہندوستان میں عوامی نمائندگی کے شعبہ میں جانے کی صورت ایکشن اور انتخابی قوانین کے تحت ایکشن میں اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کئے بغیر چارہ نہیں، اس لیے ان خصوصی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے ایکشن میں حصہ لینا اور قانونی ضرورت کی تکمیل کے لیے بدرجہہ مجبوری دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہوگا۔ موجودہ انتخابی نظام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں، لیکن مصالح کے تحت مسلمانوں کا ایکشن میں حصہ لینا اور امیدوار بننا جائز ہے (انتباس از مضمون مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب در سہ ماہی بحث و نظر شمارہ ۱۳/۱۵ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۰ رجب تارضان ۱۳۲۱ھ ص ۴۱، ۴۲)۔

د۔ موجودہ جمہوری نظام کے مفاسد میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں انسان کو خود عہدہ و منصب کا طلبگار بننا پڑتا ہے اور چونکہ ہمارا قومی نظام بھی اسی اصول پر مبنی ہے، اس لیے نہ صرف سیاسی انتخابات، بلکہ مذہبی جماعتوں اور ملی تنظیموں میں بھی عہدہ و منصب کی طلب کا یہی رویہ عام ہو گیا ہے، جو نہایت ہی بد بختانہ بات ہے، تاہم موجودہ سیاسی نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ امیدوار خود ایکشن میں کھڑے ہوں، ان حالات میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ کم سے کم ایسا ہو کہ جب تک

عام لوگ ایکشن میں امیدوار بننے کے لیے اصرار نہ کریں اور ان کی طرف سے مطالبہ نہ ہو، امیدوار بننے سے گریز کیا جائے (اسلام اور جدید فکری مسائل ص ۳۳۰) بشرطی بک ڈسریوشن اشاعت ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ نومبر ۲۰۱۱ء۔

۵۴۔ الف۔ یہ بات ”دو اور دو چار“ کی طرح واضح ہے کہ دور حاضر میں مردوجہ جمہوریت اور سیکولرزم کے تصورات و نظریات اسلامی تعلیمات سے جوڑ نہیں کھاتے، اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں ہوگی کہ انہیں اسلامی نظریات سمجھ کر قبول کر لیا جائے، لیکن یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ ”من یتلی بلیغین فلیشتر اھونھما“ اس قاعدہ کا حاصل یہ ہے کہ اگر دو برائیوں میں کسی ایک کو اختیار کر کرنا ناگزیر ہو جائے تو ضروری ہے کہ ان دونوں میں جو ہلکی برائی ہے اس کو اختیار کیا جائے۔

جمہوری اور سیکولر ملکوں میں جہاں مسلمان اسلامی نظام حکومت جاری کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور نہ مستقبل قریب میں اس پوزیشن میں آنے کی امید ہے، وہاں دو ہی امکان ہیں: (۱) سیکولر جمہوری حکومت قائم ہو (۲) مذہبی یا غیر مذہبی آمریت قائم ہو، ایسے ممالک کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنا وزن سیکولر جمہوری حکومت کے پلٹرے میں ڈالیں، کیونکہ دونوں برائیوں میں ہلکی برائی یہی ہے، اگر مسلمان تماشہ بین بنے رہے اور ان کے کنارے کھڑے رہنے کی وجہ سے مذہبی یا غیر مذہبی آمریت کو اقتدار میں آنے کا موقع مل گیا تو گویا انہوں نے بڑی برائی کو دعوت دی، سیکولر جمہوری حکومت کی تائید اس لئے نہیں ہے کہ سیکولرزم اور جمہوریت اسلامی چیزیں ہیں بلکہ صرف اس لیے اس کی تائید کی جائے گی کہ آمریت کے مقابلہ میں چھوٹی برائی ہے، جمہوری نظام میں مسلمانوں کو اس کا موقع ضرور ہے گا کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کریں اور تقریر و تحریر کی آزادیوں سے فائدہ اٹھا کر اسلامی معاشرتی اقدار کی ترویج کے لیے فضا کو ہموار کریں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ساتویں صدی ہجری کے ممتاز فقیہ و صلح سلطان العلماء شیخ عبدالدین ابن عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) کو، انہوں نے اپنی مشہور کتاب ”قواعد الاحکام فی مصالح الانام“ میں بڑی وضاحت کے ساتھ ایسے متعدد مشکل مسائل کی گرہ کشائی کی ہے، موصوف لکھتے ہیں:

”اذا تفاوت رتب الفسوق فی حق الأئمة قدمنا اقلهم فسوقا مثل ان كان فسق أحد الأئمة بقتل النفوس وفسق الآخر بانتهاك حرمة الأبياء وفسق الآخر بالتصرع للاموال: قدمنا المتصرع للاموال على المتصرع للدماء والابضاع فان تعذر تقديمه قدمنا المتصرع للابضاع على من يتعرض للدماء، وكذلك يترتب التقديم على الكبير من الذنوب والصغير منها والأصغر على اختلاف رتبها، فان قيل: أيجوز القتال مع أحدهما لإقامة ولاية وإدامة تصرفه مع اعانتة على معصيته؟ قلنا نعم دفعا لما بين مفسدتي الفسوقين من التفاوت ودرأ للفسد فالفسد وفي هذا وقفة واشكال من جهة إنا نعین الظالم على فساد الاموال دفعا لمفسدة الابضاع وهي معصية وكذلك نعین الآخر على فساد الابضاع دفعا لمفسدة الدماء وهي معصية، ولكن قد تجوز الاعانة على المعصية لا لكونها معصية بل لكونها وسيلة الى تحصيل المصلحة الراجحة، وكذلك اذا حصل بالاعانة مصلحة تربي على مصلحة تفويت المفسدة كما تبذل الاموال في فدى الاسرى الاحرار المسلمين من ايدي الكفرة والفسجرة“ (قواعد الاحکام ۴۵، ۴۶)۔

(امامت کے دعوے داروں میں اگر فسق کے مراتب متفاوت ہوں تو ان میں سے جس کا فسق سب سے ہلکا ہو اسے ہم آگے بڑھائیں گے، مثلاً ایک کے فسق کی نوعیت یہ ہے کہ وہ بے گناہوں کو قتل کرتا ہے، دوسرے کے فسق کی نوعیت یہ ہے کہ وہ عورتوں کی آبرو لوٹتا ہے، تیسرے کے فسق کی نوعیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقہ پر لے لیتا ہے، تو ہم مال لینے والے کو بے گناہوں کا خون کرنے والے عورتوں کی عزت لوٹنے والے پر مقدم کریں گے، اگر اسے اقتدار میں لانا دشوار ہو تو عورتوں کی آبرو لوٹنے والے کو بے گناہوں کا خون کرنے والے پر مقدم کریں گے۔ اگر سوال کیا جائے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی حکومت قائم کرنے یا حکومت باقی رکھنے کے لیے اس کے ساتھ قتال کرنا جائز ہوگا، حالانکہ ایسا کرنا اس کے گناہ میں اس کی اعانت ہوگی؟ تو میں کہوں گا ہاں قتال جائز ہوگا تا کہ زیادہ بڑے فساد کو روکا جاسکے، کیونکہ دونوں کے فسق کے مفسد میں تفاوت ہے، یہاں ایک توقف اور اشکال ہے، اس اعتبار سے ہم جنگ حرمت کے مفسدہ کو دور کرنے کے لیے اس ظالم کی مدد کر رہے ہیں جو لوگوں کا مال ناحق لیتا ہے اور یہ معصیت ہے، اسی طرح ہم بے گناہوں کے خون کے مفسدہ کو دور کرنے کے لیے جنگ حرمت کرنے والے کی اعانت کر رہے ہیں، حالانکہ یہ معصیت ہے، لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ کبھی کبھی معصیت پر اعانت جائز ہوتی ہے، اس کی معصیت ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ معصیت ایک راجح مصلحت کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اسی طرح اگر معصیت پر اعانت کرنے سے ایسی

مصلحت حاصل ہو رہی ہو جو مفسدہ کو فوت کرنے کی مصلحت سے بڑھ کر ہو، مثلاً کافروں اور فاجروں کے چنگل سے آزاد مسلمان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے بطور فدیہ مال دینا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

”اور یہ شرعی اور عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر (نقصان) جمع ہوں، ایک اشد (سنگین) دوسرا ہون (یعنی کم درجہ) تو اہون کو اختیار کر لینا چاہئے، یعنی جہاں دونوں شتوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد، ایک میں اخف تو اشد سے بچنے کے لیے یا اس کو دفع کرنے کے لیے اخف (ہلکے) کو گوارہ کر لیا جاتا ہے، اور ہے تو یہ بھی برا مگر دوسرے مفسدہ کے مقابلے میں پھر بھی اخف ہے (ملفوظات اشرفیہ ۴۱، بحوالہ مروجہ سیاست کے شرعی احکام ص ۳۳ مرتب محمد زید صاحب)۔

جمہوریت اور آمریت میں قابل ترجیح کون؟

کسی غیر مسلم ملک میں غیر مسلموں کی آمریت کو جمہوریت کے مقابلے میں ترجیح نہیں دینا چاہئے، کیونکہ جہاں دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے، وہاں مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں میں جو ہلکی ہو اس کو اختیار کرے اور جمہوریت بہر حال غیر مسلم مذہبی آمریت سے ہلکی برائی ہے۔ سیکولرزم کی اصطلاح اور اس کا حکم:

سیکولرزم کسی معنی اور تعبیر میں اسلامی نظریہ نہیں ہے، لہذا معتدل حالات میں جہاں مسلمان اسلام کا معنی بر عدل نظام حکومت برپا کر سکتے ہوں، سیکولرزم دینی اور شرعی اعتبار سے قابل قبول نہیں، ہاں غیر مسلم ممالک میں جہاں جمہوریت اور مذہبی (غیر مسلم مذہبی) آمریت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی مجبوری ہے، وہاں نسبتاً ہلکی برائی کے طور پر جمہوریت کو اختیار کیا جائے گا تا کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔

سیکولرزم کی پہلی تعبیر تو صاحب ایمان کے لئے کسی حال میں قابل قبول نہیں، ہاں دوسری تعبیر جو اس مفہوم میں ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا، ریاست مذہب کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی، مذہبی گروہوں کو اپنے مذہب پر عمل اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی حاصل ہوگی، غیر مسلم ممالک میں عبوری طور پر قابل قبول اور قابل عمل ہے، لیکن یہ بات ذہن میں واضح رہنی چاہئے کہ سیکولرزم اصلاً اسلامی نظریہ نہیں ہے، خواہ اس کی جو بھی تعبیر کی جائے، عبوری مرحلہ اور منزل کا فرق ذہن میں ملحوظ رہنا چاہئے (اقتباس از مضمون مفتی تھانوی صاحب در سہ ماہی بحث و نظر ص ۳۳ تا ۳۴ جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء)۔

ب۔ جمہوریت خواہ غیر جانبدارانہ ہو یا غیر مسلموں کی آمریت پر مبنی ہو، دونوں ہی ”نظام کفر“ میں داخل ہیں، لیکن جہاں مسلمان صورت حال کو بدلتے پر قادر نہ ہوں اور کسی نظام کی تبدیلی ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہو، وہاں اصول یہ ہے کہ دو برائیوں میں سے، کمتر برائی کو گوارا کیا جائے گا۔ قانون اسلام کے ماہرین نے اس سلسلے میں متعدد قاعدوں کا ذکر کیا ہے ”لو کان أحدہما أعظم ضرراً من الآخر فالأشد یزال بالأخف“ (اگر دو میں سے ایک ضرر دوسرے سے بڑھا ہو، تو کم تر ضرر کو گوارا کر کے نسبتاً شدید ضرر کو دور کیا جائے گا)۔

”اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمہما ضرراً بار تکاب أخفہما“ (جب دو خرابیوں کا ٹکراؤ ہو تو کم تر کا ارتکاب کر کے بڑے ضرر کی رعایت کی جائے گی)۔

من ابتلی ببلیتین و ہما متساویان یاخذ بایہما شاء فإن اختلفا اختار أھوھما“ (جو دو مصیبت سے دو چار ہو اور دونوں برابر درجے کے ہوں تو جسے چاہے اختیار کرے، اور اگر دونوں ایک درجے کی نہ ہوں تو کم تر ضرر کو اختیار کر لے)۔

ان اصولوں کی روشنی میں جمہوری نظام میں مسلمانوں کی شرکت کی بابت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان کے قلب کو اس نظام پر مطمئن نہ ہونا چاہئے اور اس کے دل میں ہمہ وقت یہ آرزو باقی رہنی چاہئے کہ اس زمین پر اللہ کی حاکمیت کا قانون نافذ ہو اور کبھی وہ وقت آئے کہ قرآن وحدیث کی بالادستی اس خطہ ارض پر بھی تسلیم کی جائے، لیکن جمہوریت کے درجہ میں جو نظام حکومت مروج ہے، ان میں سے ایسے نظام کو قبول کیا جائے جو دینی اور ملی اعتبار سے کم نقصان دہ ہیں، ظاہر ہے کہ ”لامذہبی جمہوریت“ بمقابلہ غیر مسلموں کی مذہبی حکومت کے کم نقصان دہ ہے، کیونکہ اس میں مسلمانوں کے ضمیر و اعتقاد و اظہار رائے اور تبلیغ دین کی آزادی حاصل ہونے کے مواقع زیادہ ہیں، نیز اس نظام کے تحت اسلام کے شخصی قوانین اور مذہبی مقامات کے تحفظ کی بھی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے، جس میں حضرات صحابہ کے قیام کو بھی اس کی نظیر بنایا جاسکتا ہے، کیونکہ جس کی حکومت بھی شاہی اور آمرانی نظام پر مبنی تھی اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا تصور وہاں بھی مفقود

تھا، لیکن چونکہ وہاں مسلمان امن و امان کی حالت میں تھے اور عبادت وغیرہ میں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے جہش کو مکہ سے زیادہ موزوں سمجھا اور حضرات صحابہؓ کو ہجرت جہش کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ فیصلہ یقیناً ”اختیار اہوں البیتین“ ہی کے اصول پر مبنی تھا۔

سیکولر طرز حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ بھی اسی اصول پر مبنی ہے، اگر مسلمان سیاست سے کنارہ کش ہو جائیں اور جمہوری اصولوں پر انہیں جو سیاسی حقوق حاصل ہیں ان سے اپنا رشتہ توڑ لیں تو اندیشہ ہے کہ مذہبی اور قومی سطح پر مسلمان اور بھی زیادہ پریشان ہو جائیں گے، پارلیمنٹ میں کوئی آواز نہ ہوگی جو ان کے حق میں اٹھے، وہ اپنے مذہبی، تعلیمی اور سماجی نیز معاشی حقوق کا تحفظ کرنے سے بالکل ہی معذور ہوں گے اور تمام تر دوسری قوموں پر انحصار ہوگا، خاص کر ہندوستان میں برادران وطن جس طرح مسلمانوں کو اپنی تہذیب اور کلچر میں جذب کر لینا چاہتے ہیں، اگر مسلمان سیاسی اعتبار سے مفلوج ہو جائیں تو مخالفین اسلام کے لیے اس مقصد کا حاصل کرنا آسان ہو جائے گا، اس لیے گویہ جمہوری نظام کفر پر مبنی ہے لیکن مسلمانوں کا اس حکومت میں دینی اور ملی مفادات کے تحفظ کی نیت سے شریک رہنا نہ صرف جائز بلکہ حق واجب ہے۔ اس پر اس معاہدے سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد یہودیوں اور دوسرے قبائل کے درمیان کیا تھا، یہ معاہدہ بقاء باہم کے اصولوں پر مبنی تھا کہ ہر طبقہ کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہوگی، البتہ مدینہ کی حفاظت اور دفاع تمام قبائل کی مشترک ذمہ داری ہوگی، بنو قریظہ کی جنگ تک عموماً اور بنو قریظہ کی جلا وطنی تک خصوصاً مدینہ کی حیثیت ایک اہم مذہبی ریاست کی تھی، اور یہودی نہ صرف عالمی قوانین بلکہ جرم و سزا کے قوانین میں بھی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد تھے، ان کی عبادت گاہیں تھیں، درس گاہیں تھیں، قلعے تھے اور مدافعت کا اپنا ایک انتظام تھا، گو مسلمان غالب تھے، مگر ظاہر ہے کہ جمہوری نظام میں ابھی اکثریت کو غلبہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے کثیر مذہبی اور تہذیبی جمہوریت میں شرکت پر ایک حد تک اس واقعہ سے بھی استدلال ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ اسلام سے پہلے حلف الفضول کی تحریک میں آپ ﷺ کی شرکت اور بعثت کے بعد بھی آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ اگر آج بھی مجھے اس کی طرف بلایا جائے تو میں اسے قبول کروں گا ”ولو ادعی بدنی الاسلام لاجبت“ (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۴) سے بھی فی الجملہ ایسے سماجی نظام پر استدلال کیا جاسکتا ہے جو کسی ایک مذہب کی بالادستی کے اصول پر قائم نہ ہو، بلکہ مختلف مذہبی اکائیاں بقاء باہم کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں (اقتباس از مضمون مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب درس ماہی، بحث و نظر اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۰ ص ۳۸ تا ۴۱)۔

ج۔ مصالحت اور آشتی کے ساتھ زندگی گزارنا اور تجارت، زراعت، صنعت اور سیاست میں اشتراک عمل کرنا جائز اور بعض حالات میں واجب بھی ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے مقامات میں جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مشترک ہو یا غیر مسلم آبادی کی کثرت ہو۔ بہر حال یہ لازم ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کے پابند رہیں اور مذہبی شعائر کی عزت و حرمت محفوظ رہے۔ ورنہ پھر مسلمان پر مذہب کے تحفظ اور اس کا احترام قائم رکھنے کے فرائض عائد ہوں گے۔ (محمد کفایت اللہ کان اللہ، دلی، کتاب سیاسیات کفایہ لفتی ج ۹ ص ۳۶)۔

حلف و فاداری کے سلسلہ میں بیثاق مدینہ کی درج ذیل دفعات میں بھی واضح رہبری موجود ہے مثلاً:

د۔ ۱۔ مسلمانوں کو پابندی عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکالمہ اخلاق کا ثبوت دینا لازمی فرض ہے۔

۱۲۔ جن مسلمانوں نے اس معاہدہ کو مان کر اس کی پابندی کا اقرار کر لیا ہے اور خدائے قدوس پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس کی دفعات میں تغیر یا کوئی نئی بات پیدا کریں اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے معاملہ رکھیں جو عہد نامہ ہذا کا احترام نہ کرتا ہو۔

۱۳۔ اگر کسی امر میں تمہارے آپس میں اختلاف ہو جائے تو خدا (قرآن مجید) اور رسول ﷺ (حدیث شریف) کی طرف رجوع کر کے اس کا فیصلہ کرا لو۔

(خطبہ صدارت بموقع اجلاس ہجرت جمعیتہ علمائے ہند بمقام پشاور بتاريخ ۲۲ تا ۲۳ دسمبر ۱۹۲۷ مطابق ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۴۶ھ از محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ص ۳۹ تا ۴۰) ایضاً عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۱۰۳)۔

۱۷۔ جو قوانین شریعت کے خلاف وضع کئے جائیں ان کی پوزیشن انگریزی موجودہ قوانین جیسی ہے، حکومت کے موجودہ قوانین میں کس قدر قوانین شریعت کے خلاف ہیں اور آئے دن جلیٹو اسمبلی میں قوانین غیر مشروعہ مسلم لیگ کی تائید و حمایت سے پاس ہو رہے ہیں۔ ابھی آرمی بل کا معاملہ سامنے ہے۔ جمعیتہ العلماء تو ہر خلاف شرع قانون کے خلاف انتہائی جدوجہد کریں گی اور کر چکی ہے اور کر رہی ہے اس کے ابھی حال کے جلسہ کی تجاویز پڑھئے اور دیکھئے کہ اس نے کانگریسی حکومتوں سے کس قدر سخت احتساب کیا ہے اور جمعیتہ کے محترم ارکان کا مدح صحابہؓ قضیہ میں طرز عمل سامنے رکھتے تو آپ کو جمعیتہ کا صحیح نظر صاف معلوم ہو جائیگا

(کتاب سیاسیات کفایۃ المفتی ۲۰۶۹)۔

ز۔ مسلمانوں کا جمہوری حکومت کا تعاون کرنا:

مسلمان نازدہی (سیکولر) جمہوری ملک میں حکومت کے جائز اقدامات کی تائید کریں اور ان کی عمل آوری میں تعاون کریں، اور حکومت کے ناجائز اقدامات کی تائید نہ کریں بلکہ جمہوری حدود میں انہیں روکنے کی کوشش کریں، حکومت کے ناجائز فیصلوں اور اقدامات کی تائید ہرگز جائز نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”لا طاعة لمخلوقا فی معصیة الخالق“ (خالق کی نافرمانی کرنے میں مخلوق کی اطاعت درست نہیں)۔

مسلمانوں کو حکومت کے ایسے اقدامات کی ضرورت مخالفت کرنی چاہئے جن کا مقصد مسلمانوں کا تہذیبی انضمام ہو، لیکن مخالفت میں جذباتیت اور اشتعال کا راستہ اپنانے کے بجائے وہ طریقے اپنانے چاہئیں جو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور مسلمانوں کے لئے کم سے کم ضرر سزاں ہوں۔

سیکولر ملک کی مخالفت کی حدود:

سیکولر ممالک کی مجالس قانون ساز، مقامی اداروں، کمیشنوں اور کمیٹیوں میں اگر اسلام یا مسلمانوں کے مخالف ظالمانہ قوانین کی تدوین کی جائے یا اسلام مخالف اقدامات کے فیصلے کئے جائیں تو ان میں شامل مسلم ارکان کی کم از کم ذمہ داری یہ ہے کہ ان قوانین اور اقدامات کی بھرپور مخالفت کریں، انہیں رکوانے کی کوشش کریں، برائے نام اظہار اختلاف کافی نہیں ہے، ان کے استعفاء دینے کے اگر اچھے نتائج برآمد ہونے کا ظن غالب ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کریں، لیکن استعفاء کا اقدام کرنے سے پہلے پوری طرح سوچ لیں اور مشورہ کر لیں کہ ان کا استعفاء دینا اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے یا استعفاء نہ دینا (اقتباس از مضمون عتیق احمد قاسمی صاحب در سہ ماہی بحث ۳۵ تا ۳۶ مارچ ۲۰۰۱)۔

اس بحث میں درج ذیل اہم اقتباس بھی بہت جامع اور بصیرت افروز ہے۔

ح۔ حکومت کے اقدامات کی موافقت اور مخالفت:

حکومت جو اقدامات کرے گی ان کی درج ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف۔ حکومت کا اقدام براہ راست مذہبی مسائل سے نہ ہو اور اس کا مقصد عوامی فلاح و بہبود ہو تو اس میں مسلمان تعاون کریں گے۔

ب۔ ایسا نظام جو مذہبی مسائل سے براہ راست تعلق نہ رکھتا ہو اور اجتماعی سطح پر مضرت اور نقصان کا اندیشہ ہو تو مسلمان ارکان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ان کی مخالفت کریں، کیونکہ ”لا ضرر ولا ضرار“ کے اصول کے تحت مسلمان تمام انسانیت کو ضرر سے بچانے کی سعی و کوشش کرنے کے مکلف ہیں۔

ج۔ ایسے اقدامات کہ جو کچھ لوگوں کے حق میں اور کچھ لوگوں کے خلاف ہوں، اس میں قرآن کا بنیادی اصول موجود ہے کہ مسلمان تقاضائے عدل پر عمل کرنے کا مکلف ہے اور عدل کے تقاضے یکساں نہیں ہوتے، بعض اوقات شخصی مفاد ایک گروہ کی خواہش کے مقابلہ میں زیادہ قابل احترام ہوتا ہے اور اکثر اوقات اجتماعی مفاد کی اہمیت شخصی مفاد سے زیادہ ہوتی ہے، بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس خاص معاملہ میں اپنے نور بصیرت اور شریعت کی ہدایت کی روشنی میں اس بات کو طے کریں کہ یہ اقدام تقاضائے عدل کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور اس کے لحاظ سے تائید یا مخالفت کا پہلو اختیار کریں۔

د۔ حکومت کے اقدامات ان مذہبی امور سے متعلق ہوں جن پر دارالکفر میں بھی مسلمانوں کے لیے عمل کرنا واجب ہے، تو اگر وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو مسلمانوں کو اس کی مخالفت اور اس کو پرامن طریقہ سے روکنے کی کوشش کرنا واجب ہے، اور اگر حکومت کے اقدامات اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتے ہوں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اس کی تائید کرنی چاہئے (اقتباس از مضمون مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب در سہ ماہی بحث و نظر شمارہ ۱۳/۱۵ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۰ء جلد ۴/۱۳ ص ۴۴، ۴۳)

سوال: بے۔ج۔ شوریٰ میں غیر مسلموں کی شمولیت:

”آیا مجلس شوریٰ میں کوئی غیر مسلم بھی رکن ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں ایک بات تو قرآن کریم نے ارشاد فرمائی ہے:

”یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألونکم خیالاً و دوا ما عنکم قد بدت البغضاء من



أفواھمہ وما تخفی صدورھم اکبر“ (آل عمران: ۱۱۸)۔

(اے ایمان والو! اپنے علاوہ دوسرے لوگوں (غیر مسلموں) میں سے کسی کو راز دار نہ بناؤ، یہ لوگ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، جس چیز سے تمہیں تکلیف ہو، یہ اسے پسند کرتے ہیں، بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے، اور جو کچھ انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھا ہے، وہ زیادہ سنگین ہے)۔

اس آیت کی بنا پر بعض حضرات نے استدلال فرمایا ہے کہ غیر مسلموں کو شوریٰ میں شامل نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ استدلال اتنا واضح نہیں ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کی دشمنی پر اترے ہوئے ہوں، ان کو اپنے خاص معاملات میں اپنا راز دار بنانا جائز نہیں۔ علامہ آلوسی نے اس آیت کے تحت جو روایتیں بیان فرمائی ہیں ان میں سے بعض میں فرمایا گیا ہے کہ کچھ مسلمان جاہلیت کی قدیم دوستیوں کی وجہ سے بعض یہودیوں سے ایسے تعلقات رکھتے تھے کہ ان پر مسلمانوں کے راز افشاء ہو جاتے تھے، اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کو منافقین سے راز دارانہ تعلقات رکھنے سے منع فرمایا ہے (روح المعانی ص ۷۴۷)۔

اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے دشمن ہوں، انہیں نہ راز دار بنانا جائز ہے اور نہ انہیں شوریٰ میں شامل کیا جاسکتا ہے، لیکن جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے پر امن باشندے ہوں، انہیں شوریٰ میں شریک کرنے کو فقہائے کرام نے جائز قرار دیا ہے۔

چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد مبارک میں بعض مرتبہ جب مجلس شوریٰ طلب فرمائی، تو اس میں کچھ ذمی بھی حاضر ہوئے اور یہ بات امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب مبسوط میں نقل فرمائی ہے۔ علامہ سرخسیؒ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کا ایک واقعہ نقل کر کے فرماتے ہیں کہ:

وفیہ دلیل علی انه لا یاس باحضار بعض اهل الکتاب مجلس الشوری، فان النصرانی الذی قال ما قالہ قد کان حضر مجلس عمرؓ للشوری، ولہ ینکر علیہ (المبسوط للسرخسی ج ۲۴ ص ۷)۔

(اس واقعے سے یہ دلیل ملتی ہے کہ بعض اہل کتاب کو مجلس شوریٰ میں بلایا جاسکتا ہے، کیونکہ اس نصرانی نے حضرت عمرؓ سے جو کچھ کہا وہ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ میں حاضر تھا اور اس بات پر کوئی نکیر نہیں کی گئی)۔

۸۔ الف۔ جن سیاسی جماعتوں کا خاص مقصد اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ہے اور جن کے ایجنڈے میں اسلام مخالف کا ذکر صراحتہ موجود ہے، کسی مسلمان کا ایسی جماعت کا امیدوار بننا درست نہیں (اقتباس از مضمون مولانا متیق احمد صاحب قاسمی درسہ ماہی، بحث و نظر مذکورہ ص ۳۳)۔

ب۔ کسی غیر مسلم ملک میں غیر مسلموں کی آمریت کو جمہوریت کے مقابلے میں ترجیح نہیں دینا چاہیے، کیونکہ جہاں دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے، وہاں مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں میں جو ہلکی ہو اس کو اختیار کرے اور جمہوریت بہر حال غیر مسلم مذہبی آمریت سے ہلکی برائی ہے (اقتباس از مضمون مولانا متیق احمد صاحب قاسمی درسہ ماہی، بحث و نظر مذکورہ ص ۳۳)۔

ج۔ جن سیاسی جماعتوں کا مقصد ہی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ہے، مسلمانوں کو ایسی جماعتوں میں شمولیت اور اس کا امیدوار بننا قطعاً درست نہیں ہے (اقتباس از مضمون مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب درسہ ماہی، بحث و نظر مذکورہ ص ۴۲)۔

د۔ فسطائی جماعتوں کا ساتھ دینا اور ان میں شرکت کرنا قطعاً جائز نہیں، اس سے ان کو مزید طاقت حاصل ہوگی اور ان کے اس مذموم پروگرام کہ ”مسلمانوں کو فکری اور تہذیبی اعتبار سے اکثریتی فرقہ کے ساتھ ضم کر لیا جائے“ کو تقویت پہنچے گی (اقتباس از مضمون مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب درسہ ماہی، بحث و نظر مذکورہ ص ۷)۔

یثاق مدینہ کی درج ذیل دفعات سے مسئلہ زیر بحث پر روشنی پڑتی ہے۔

ھ۔ دفعہ: ۴۔ مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ فتنہ و فساد برپا کرتا اور مخلوق سے ظلماً تناوان وصول کرتا اور خلق خدا کو ستاتا ہو، تمام مسلمانوں کو متفق ہو کر اس کے خلاف کام کرنا لازم ہے، اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

دفعہ: ۹۔ چونکہ تمام مسلمانوں کی صلح ایک ہے، اس لیے کسی مسلمانوں کو جائز نہیں کہ وہ صرف اپنی رائے سے کسی قوم کے ساتھ بدون مشورہ باقی مسلمانوں کے صلح کریں مگر جب کہ اس نے تمام قوم کے رجحان اور تمام قوم کے ساتھ انصاف اور مراعات اور حقوق کا لحاظ کر لیا ہو تو کرے (اقتباس از خطبہ صدارت بموقع اجلاس ہشتم

جمعیتہ علمائے ہند بمقام پشاور بتاريخ ۲۲ تا ۲۴ دسمبر ۱۹۲۷ء مطابق ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۴۶ھ از محدث عمر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ص ۳۸ تا ۳۹) ایضاً (اقتباسات از عہد نبوی میں

مسلمانوں کی علاحدہ سیاسی جماعت ہو یا عام سیاسی جماعت، جب دونوں کو ملک کے آئین کے ڈھانچے میں کام کرنا ہے اور وہ بنیادی نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتے تو میرے خیال میں ان دونوں کی نوعیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں، اور یہ مسلمانوں کی مفادات پر موقوف ہوگی کہ وہ کیا طریقہ اختیار کریں؟ دونوں صورتوں میں کچھ فوائد بھی ہیں اور کچھ نقصانات بھی، علاحدہ جماعت میں یہ فائدہ ہے کہ وہ ہمارے نقطہ نظر کی مکمل ترجمان ہوگی اور نقصان یہ ہے کہ ایسی جماعتوں سے منتخب ہونے والے افراد کی تعداد اتنی کم ہوگی کہ وہ حکومت پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی اور دوسری جماعتوں کو مسلمانوں کے مسائل سے کوئی سروکار نہ ہوگا، کیونکہ ان کو مسلم ووٹ ملنے کی امید ہی نہ ہوگی، عام جماعتوں میں شریک ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ چونکہ ان کو مسلمان ووٹ بھی ملیں گے، اس لیے اس جماعت میں اکثریتی فرقہ کے لوگ بھی اپنے سیاسی مفادات کے پیش نظر مسلم مسائل پر توجہ دیں گے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے، نقصان یہ ہوگا کہ مسلمان ارکان کو بھی پارٹی کے نقطہ نظر کا پابند رہنا ہوگا اور بعض اوقات وہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے سے قاصر رہیں گے۔

اس لیے میرے خیال میں یہ اپنے اپنے حالات پر موقوف ہے، جہاں علاحدہ سیاسی جماعت بنا کر مسلمان اپنا سیاسی توازن برقرار رکھ سکتے ہیں وہاں ان کو اپنی علاحدہ جماعت بنانی چاہیے، ہندوستان میں اس کی ایک مثال ریاست کیرلا ہے، اور جہاں مختلف سیاسی جماعتوں میں رہ کر زیادہ دباؤ بنائے رکھنے کا امکان ہو اور دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر اپنے ملی مفاد کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکتا ہو وہاں علاحدہ سیاسی تنظیم بنانا مناسب نہیں ہوگا (اقباس از مضمون مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب در رسالہ ماہی، بحث و نظر شمارہ ۱۳/ ۵۱ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۰ء جلد ۳/ ص ۴۲، ۴۳)۔

ب۔ غیر مسلم ممالک میں آباد مسلم اقلیتوں کی ذمہ داری ہے کہ اجتماعی زندگی گذاریں، اپنی اجتماعیت اور اتحاد کو مضبوط کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں، کسی صاحب علم، مخلص و با بصیرت شخص کو اپنا لیں جو ارباب حل و عقد کے مشورے سے زندگی کے تمام میدانوں میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی کوشش کریں۔

۱۰۔ عورت حکمران نہیں بن سکتی: اہل علم کی تصریحات:

امام قرطبی آیت کریمہ: ”انی جاعل فی الارض خلیفۃ“ کے ذیل میں خلیفہ کے شرائط ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”السابع: أن یکون ذکراً..... وأجمعوا علی أن المرأة لا یجوز أن تکون إماماً وان اختلفوا فی جواز کونها قاضیة فیما تجوز شہادتها فیہ“ (القرطبی: الجامع لاحکام القرآن ج: ۱ ص: ۲۷۰)۔

(ساتویں شرط یہ ہے کہ خلیفہ مرد ہو، اور اہل علم کا اجماع ہے کہ عورت امام (حکومت کی سربراہ) نہیں بن سکتی، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جن امور میں اس کی گواہی جائز ہے، ان میں قاضی بن سکتی ہے یا نہیں)۔

”شرح عقائد نسفی“ میں ہے: ”ویشترط أن یکون من أهل الولاية المطلقة الكاملة أی مسلماً، حراً، ذکراً، عاقلاً، بالغاً... إلى قوله... والنساء ناقصات عقل و دین“ (شرح عقائد ص: ۱۵۸، مطبوعہ مکتبہ خیر پھیر کراچی)۔

(امام حکمران اعلیٰ) کے لیے شرط ہے کہ وہ کامل و مطلق ولایت کا اہل ہو، یعنی مسلمان، آزاد، مرد، عاقل اور بالغ ہو، (اس کے بعد ہر شرط کے ضروری ہونے کی وجہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: عورت اس لیے امام نہیں بن سکتی، کیونکہ عورتیں دین و عقل میں ناقص ہیں)۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب ”در مختار“ میں ہے: ”ویشترط کونه مسلماً، حراً، ذکراً، عاقلاً، بالغاً، قادراً“ (در مختار ج: ۱ ص: ۵۳۸)۔

(اور امامت کبریٰ (ملک کی حکمرانی) میں امام کا مسلمان، آزاد، مرد، عاقل، بالغ اور قادر ہونا شرط ہے)۔

فقہ مالکی کی مستند کتاب ”مخ الجلیل شرح مختصر الجلیل“ میں ہے:

”(الإمام الأعظم) الخلیفۃ عن رسول اللہ ﷺ امامة الصلوة الخمس والجمعة والعیدین، والحکم بین المسلمین، وحفظ الاسلام، واقامة حدوده، وجهاد الکفار، والامر بالمعروف، والنہی عن المنکر فیشترط فیہ العدالة، والذکورة، والفضنة، والعلو“ (متح الجلیل ج: ۸ ص: ۲۶۲)۔

(امام اعظم (سربراہ حکومت) رسول اللہ ﷺ کا نائب ہے، نماز، حج، غنا اور جمعہ و عیدین کی امامت میں، مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں، اسلام کی پاسبانی اور اس کی حدود قائم کرنے میں، کفار سے جہاد کرنے میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجالانے میں، اس لیے اس میں درج ذیل اور صاف کاپایا جانا شرط ہے: عادل، ہو، مرد ہو، کھجدار ہو، عالم ہو۔)

فقہ شافعی کی کتاب ”مجموع شرح مہذب“ میں ہے: ”ولا يجوز أن يكون امرأة لقوله ﷺ: ”ما افلح قوم اسند و الامرهم الى امرأة.“ ولانه لا بد للقاضي من مجالسة الرجال من الفقهاء والشهود والمخضوم، والمرأة ممنوعة من مجالسة الرجال لما يخاف عليهم من الافتنان بها“ (تكملة، مجموع شرح مہذب ج: ۲۰ ص: ۱۲۷)۔

(اور جائز نہیں کہ قاضی عورت ہو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی اور اس لئے بھی کہ قاضی کے لئے مردوں کے ساتھ ہم نشینی لازم ہے، فقہاء کے ساتھ، گواہوں کے ساتھ اور مقدمے کے فریقوں کے ساتھ، اور عورت کو مردوں کی ہم نشینی ممنوع ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے حق میں فتنے کا اندیشہ ہے۔)

اہل ظاہر کے امام حافظ ابن حزم اندلسی ”مجلد“ میں لکھتے ہیں:

”وأما من لم يبلغ والمرأة فلقول النبي ﷺ: ”رفع القلم عن ثلاث“ وذكر الصبي حتى يبلغ، ولأن عقود الإسلام إلى الخليفة، ولا عقد لغيره ولا عقد عليه... وعن أبي بكر رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لن يفلاح قوم اسندوا امرهم الى امرأة“ (الحنبل، ۲۱۰، ۱)۔

(نابالغ اور عورت کو خلیفہ بنانا صحیح نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”تین شخصوں سے قلم اٹھایا گیا“ ان تین میں بچے کو ذکر فرمایا جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے، اور اسلئے بھی کہ اسلام کے عقود خلیفہ کے سپرد ہیں اور نابالغ بچے کا کوئی عقد صحیح نہیں، اور حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے حوالے کر دی۔“ (لہذا عورت کی خلافت بھی صحیح نہیں)۔

ان حوالوں سے واضح ہے کہ تمام اہل علم اور مذاہب اس پر متفق ہیں کہ حکومت و مملکت کی سربراہی کے لئے مرد ہونا شرط ہے، لہذا از امام حکومت کسی عورت کے ہاتھ میں تھما دینا ناجائز نہیں۔

مجلس شوریٰ میں خواتین کی رکنیت:

یہاں ایک سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ مجلس شوریٰ میں خواتین بھی رکن ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں بھی جن معاصر علماء نے سیاست اسلامیہ پر کلام کیا ہے، ان کی آراء مختلف ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ عورتوں کے مجلس شوریٰ کے رکن ہونے میں کوئی مانع نہیں اور وہ استدلال کرتے ہیں کہ بسا اوقات جناب نبی کریم ﷺ نے خواتین سے بھی مشورہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ وہ قربانی اور حلق کر کے احرام کھول دیں تو تین مرتبہ اعلان کرنے کے باوجود کوئی بھی نہیں اٹھا، یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ آپ ﷺ کے ایک اشارہ پر جان دینے والے صحابہؓ آپ ﷺ کے بار بار اعلان کے باوجود تعمیل کے لیے انہیں اٹھ رہے تھے۔ اس پر آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہؓ سے یہ بات ذکر فرمائی تو حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ دیا کہ آپ مزید کچھ کہنے کے بجائے خود اپنے جانوروں کو قربان کر کے حلق کرنے والے کو بلائیں اور حلق کروالیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اسی مشورہ پر عمل فرمایا، اور جب صحابہؓ نے آپ کو یہ عمل کرتے دیکھا تو سب صحابہؓ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قربانی اور حلق کرنے لگے (بخاری حدیث: ۲۷۳۲) اگرچہ اس واقعہ میں حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ پر آپ نے عمل فرمایا، لیکن اس سے خواتین کو مجلس شوریٰ کا باقاعدہ اور مستقل رکن بنانے پر استدلال کمزور ہے۔ دوسرا ایک استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب حضرت فاروق اعظمؓ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے یہ فرمایا کہ میں اپنی خلافت سے دستبردار ہو جاتا ہوں اور میں خود لوگوں کی آراء معلوم کر کے کسی کو متعین کروں گا۔ باقی سب نے کہا ٹھیک ہے تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ تین دن تک لوگوں کی رائے معلوم کرتے رہے، چنانچہ تاریخ میں ہے کہ:

”عبدالرحمن بن عوفؓ اٹھے اور ان دونوں (یعنی حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ) کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کیا اور مسلمانوں کی آراء جمع کرنی شروع کی..... یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں کے پاس بھی ان کے پردہ کے ساتھ گئے (الہدایہ والنہایہ ص: ۱۷۷/۲۷)۔

لہذا ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ خواتین شوریٰ کی رکن ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ خواتین حدود و حجاب کے ساتھ ہوں، لیکن یہ استدلال بھی اتنا مضبوط نہیں ہے، اس لیے کہ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ:

”وحتى سأل الولدان في المكاتب“ (یہاں تک کہ انہوں نے مکتبوں میں لڑکوں سے بھی جا کر سوالات کیے)۔

اب ظاہر ہے کہ اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ مکتب میں پڑھنے والے بچوں کو بھی شوریٰ کا رکن بنایا جاسکتا ہے۔

دوسرے حضرات کا یہ کہنا ہے کہ عورت کا شوریٰ کا رکن بننا شریعت کے مطابق نہیں ہے، اس کی وجوہ حدیث ہے جو پہلے گز چکی ہے اور جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”وأمركم إلى نساءكم فبطن الأرض خير لكم من ظهرها“ (ترمذی باب ۸۷، حدیث نمبر ۲۳۶۶، وقال هذا حديث غريب) (جب معاملات عورتوں کے حوالے ہو جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے زمین کی پشت سے بہتر ہے)۔

لیکن اس حدیث سے استدلال بھی محل نظر ہے، کیونکہ حدیث میں جس عورت کی مذمت فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ تمام تر فیصلے عورتوں ہی کے حوالے کر دے جائیں اور انہی کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے اور مرد ہر معاملہ میں عورتوں کے پیچھے چلنے لگیں، لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ ان سے کبھی مشورہ ہی لینا جائز نہیں۔

بہر حال! اس مسئلے میں دونوں طرف کچھ دلائل ہیں لیکن کوئی ایسی واضح نص موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ انہیں شوریٰ میں شامل نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات طے ہے کہ اگر انہیں شوریٰ میں شامل کیا جائے تو حجاب شرعی کے احکام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوگا (اسلام اور سیاسی نظریات از مفتی تقی عثمانی ص ۲۱۰، ۲۶۹-۲۶۷)۔

ج۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ تجویز (عورتوں کے ریٹرویشن برائے عوامی نمائندگی) قانون بن جاتی ہے تو مستقبل کی سیاست پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے، پسماندہ اقوام اور اقلیتوں کے لئے یہ ضرب کاری کا درجہ رکھتی ہے، ان طبقات میں خواتین کا تعلیمی تناسب اتنا معمولی ہے کہ یہ ظاہر مناسب خاتون امیدواروں کا ملنا دشوار ہے، پھر جو خواتین منتخب ہوں گی، وہ پارلیمنٹ میں کما حقہ ان کمزور طبقات کی ترجمانی کر سکیں، یہ اس سے زیادہ دشوار ہے، یہ بات بھی بعید نہیں کہ سیاست میں حصہ لینے والی خواتین کے خلاف جرائم کا رجحان بڑھ جائے، جیسا کہ پچھلے دنوں مغربی بنگال میں ہوا ہے، کیونکہ آج کل سیاست میں پڑھے لکھے اور باکردار افراد کے بجائے شریک عناصر اور کندہ ناتراش قسم کے لوگوں کا غلبہ ہے، بڑا لیڈر بننے کے لیے اسی درجہ کا غنڈہ اور مکر فریب کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، ایسے لوگ احساس محرومی کا شکار ہو کر ان خواتین کو اپنا نشانہ بنائیں جو سیاست میں ان کی رقیب بنتی ہوں تو کچھ عجیب نہیں۔

د۔ عورت کے ووٹ دینے اور ممبر اسمبلی بننے کا حکم:

عورتوں کا ووٹ بنانا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لیے مستحسن نہیں ہے، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لیے متعذر ہے (کفایت المفتی ص ۳۷۱)۔

ہ: اگر پولنگ اسٹیشن پر عورتوں کے لیے پردہ کا انتظام ہو اور غیر محرم مرد منتظم نہ ہوں بلکہ سپردینے لینے والی عورتیں کام کرتی ہوں تو عورتوں کو ووٹ دینے کے لیے جانا جائز ہے اور غیر محرم مرد ہوں تو عورتیں نہ جائیں بلکہ مطالبہ کریں کہ ان کے لیے زنانہ منتظم مقرر کیے جائیں (کفایت المفتی ص ۳۸۰)۔

۱۔ کونسلوں اور اسمبلیوں میں جہاں مسلم عورتوں کی نشست محفوظ ہو عورتوں کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ میونسپل کمیٹی کی مسلم امیدوار عورتوں کو ووٹ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: عورتوں کا کونسل میں جانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا، لیکن اگر جائیں تو حجاب کے ساتھ جانا ضروری ہوگا۔

۳۔ اگر اس کا اطمینان ہو کہ عورتیں حجاب شرعی کی رعایت رکھیں گی اور کسی نامشروع فعل کی مرتکب نہ ہوں گی تو ان کو ووٹ دینا مباح ہوگا (کفایت المفتی ج ۹ ص ۴۵۵، ۴۵۶ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

ز۔ ان احادیث اور نصوص شرعیہ کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ شریعت نے ہمارے مسائل میں ”بعض خاص حالتوں“ کی رعایت رکھی ہے، اسی رعایت کو اصول فقہ میں ”الضرورات تبیح المحظورات“ یعنی (ضرورتیں ناجائز امور کو جائز بنا دیتی ہیں) ”اعظم ضرور ایزال بالاحف“ (چھوٹے نقصان کے

ذریعے بڑے نقصان کو دور کیا جائے گا) اور یہ تحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام، عمومی ضرر اور نقصان کو دفع کرنے کے لئے خصوصی نقصان کو گوارہ کیا جائے گا وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ”صدق جدید“ میں لکھا: ”لیکن شریعت نے عورت کی حاکمانہ حیثیت کو پسند نہیں کیا ہے اور یہ مرتبہ اسلام کے عام مزاج و روح کے منافی ہے، لیکن حرمت قطعی بھی وارد نہیں ہوئی ہے، اس لئے مخصوص اور غیر معمولی حالات میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔“

دارالعلوم کے صدر مفتی جناب مولانا مہدی حسن صاحب نے اپنے فتویٰ الف ۶۷۸ میں لکھا ہے: ”جب عورت کے حصہ لینے میں دینی مصالح بھی مضر ہوں“ تو عورت کا حصہ لینا مباح ہے، بشرطیکہ عورت پردہ میں رہے اور دینی مصالح کا حصول یقینی ہو، ورنہ عورت کو برہنہ حدیث مذکورہ کے حاکم بنانا جائز نہیں، صرف وہ ہم پر بنانا حدیث مذکورہ کے خلاف ہے۔“

### فقہی کانفرنس شمالی امریکہ کا فیصلہ:

دنیا کی قیادت کا دعویٰ کرنے والے دیس امریکہ میں جب مسلمانوں کے سامنے مخصوص قسم کے جدید مسائل اٹھنے لگے تو وہاں کے علماء کی تنظیم ”رابطۃ علماء الشرعیۃ بامریکا الشمالية“ نے اپنی کانفرنس میں ”المجلس الفقہی“ کے قیام کا اعلان کیا، جس کی پہلی کانفرنس امریکا کے شہر ڈیٹروائٹ میں ۱۹ تا ۲۲ نومبر ۱۹۹۹ء کو منعقد ہوئی ہے۔

اس تین روزہ پہلی فقہی کانفرنس میں جو فیصلہ ”سیاست میں شرکت“ سے متعلق بافتتاح آراء طے پایا اس کا اردو ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے، زیر نظر فیصلہ شمالی امریکہ کی مجلس فقہی کا ہے جس کو اہل علم کی اطلاع کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

### سیاسی زندگی میں شرکت:

۱۔ امریکہ اور دیار مغرب کے مسلمانوں کے پاس لوگوں کی صحیح رہنمائی اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا ایک پیغام ہے، اور اس پیغام کے نفاذ کا ایک اہم ذریعہ شرعی آداب کے ساتھ سیاسی زندگی میں شرکت ہے۔

۲۔ اصل یہ ہے کہ ایسے تمام میدانوں میں سیاسی شرکت جائز ہے جن میں شمولیت سے شہریوں اور دیگر باشندوں بشمول مسلمانوں کو عمومی نفع پہنچتا ہے، جیسے اسمبلیوں، علاقائی حکومتوں، عوامی نمائندگان، ایگزیکٹیو اداروں، امدادی اور انٹرنیشنل کمیٹیوں کے لئے انتخاب میں حصہ لینا اور امیدوار بننا، کیونکہ اس طرح اندرون ملک مسلمانوں کے مصالح کی حفاظت ہوتی ہے اور عملی سرگرمیوں و طریقوں نیز اسلامی اور انسانی عادلانہ مسائل میں تعاون کے ذریعہ اسلام کی تہذیبی تصویر بھی واضح ہوتی ہے۔

۳۔ دیگر پارٹیوں، تنظیموں اور اداروں کے ساتھ گھٹ جوڑ اور ان میں شمولیت میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس کے ذریعہ مشترکہ مفادات کی تکمیل ہوتی ہو جیسے حقوق انسانی، آزادیاں، کمزور و محتاج طبقات کی نگہداشت، ماحولیات کا تحفظ، منشیات اور اخلاقی و سماجی انارکی کا مقابلہ اور مصیبت زدگان کی امداد و تعاون۔

۴۔ سیاسی زندگی میں شرکت کے لیے شرعی آداب بالخصوص مندرجہ ذیل امور کی پابندی ضروری ہوگی:

الف۔ شریعت کے غیر متبدل احکام اور چوک کو سیاسی رواج کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا جائے کہ ان احکام میں کہیں خلل نہ پیدا ہو۔

ب۔ مصالح کا حصول اور مفساد کا ازالہ مقصود ہو نہ کہ ذاتی مفادات کی تحصیل۔

ج۔ سیاسی شرکت کے مواقع میں وسائل اور مقاصد کے مشروع ہونے کا لحاظ رکھا جائے۔

د۔ سیاسی شرکت کے نتیجہ میں محرمات کی تائید یا مسلمانوں کے مصالح کو ضرر نہ پہنچتا ہو۔

۵۔ شرکت کی کوششوں کی کامیابی اور منزلت شرف و تکرار کے لئے منظم اور اجتماعی طور پر اجتماعی طریقہ اپنایا جائے، ناپسندیدہ انتشار و اختلاف سے بچا جائے۔

۶۔ غیر مسلموں سے سیاسی خطاب یا ذرائع ابلاغ میں تہذیبی اسلوب اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے گفتگو اور مناقشہ کا ایسا بہترین انداز اپنایا جائے جس سے ان کے دلوں میں جوڑ اور ان کے اندر اسلام کی رغبت پیدا ہو، اور وہ ہمارے ساتھ تعاون اور ہمارے منصفانہ مسائل میں حمایت کرنے پر آمادہ ہوں۔

۷۔ سیاسی زندگی میں شرعی آداب کے ساتھ شرکت کی اہمیت کا احساس عام مسلمانوں کے اندر پیدا کیا جائے اور سیاسی کارکنان کی قیادت کے لئے باشعور حکمت عملی کے

ذریعہ فراہم کی جائے (اقتباسات از بحث و نظر شمارہ ۳۲۸ تا ۳۳۸ مارچ ۲۰۰۰ء شوال تا ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ ج ۱۲ ص ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹) ☆☆☆

## الیکشن - اسلامی تناظر میں

مفتی محمد خالد حسین نیوی تاقی

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ (Vote) انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا عربی متبادل ہے: انتخاب، تصویب اور اس کا اردو متبادل ہے: نمائندہ چننا، حق رائے دہی کا استعمال کرنا، جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ، اسمبلی، کونسل، بلدیہ یا اس جیسے اداروں کے لیے عوام کے ذریعہ نمائندہ چننے کا عمل ووٹ پر منحصر ہوتا ہے، چونکہ یہ اصطلاح مستحدث اور نئی ہے، حکومت سازی کے لیے انجام دیا جانے والا یہ عمل چونکہ عہد سلف میں موجود نہیں تھا، اس لیے اس کا استعمال قرآن کریم اور احادیث میں نہیں ہوا ہے۔ لیکن معنوی اور اصولی طور پر اس کے لیے ذخیرہ شریعت میں ہدایتیں موجود ہیں۔

ووٹ کی شرعی نقطہ نظر سے متعدد حیثیتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) شہادت:

شہادت کا مفہوم ہے: یعنی مشاہدہ یا بصیرت کی بنیاد پر کسی چیز کے برحق ہونے کی گواہی دینا۔ قول صادر عن علم حاصل بمشاهدة بصر أو بصيرة (راغب، جرجانی) ایک لحاظ سے ووٹ کی حیثیت عرفی شہادت اور گواہی کی ہے، اس لیے کہ ووٹر ووٹنگ یا حق رائے دہی کے استعمال کے وقت یہ سمجھتا ہے کہ فلاں امیدوار اس عہدہ کے لائق ہے جس کے لیے اس نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے، یا پارٹی کی طرف سے اسے امیدوار نامزد کیا گیا ہے اور وہ پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے سکتا ہے وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ امیدوار اس مقصد کے لیے موزوں اور 'قوی اور امین' ہے۔ چاہے وہ دوسرے کاموں کے لیے موزوں نہ ہو۔

(۲) مشورہ:

ووٹ کی ایک حیثیت مشورہ کی بھی ہے، گویا کہ الیکشن کمیشن ہر حلقہ کے رائے دہندگان سے اس سلسلہ میں رائے اور مشورہ لیتا ہے کہ جو افراد ان کے حلقہ میں بطور امیدوار کھڑے ہیں، کیا وہ افراد اس لائق ہیں کہ پارلیمنٹ، اسمبلی اور کونسل یا اس جیسے اداروں کا رکن بن کر دیانت داری کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کر سکیں اور اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں؟ یا وہ اس لائق نہیں ہیں؟ اس کے مطابق ان کے اہل ہونے یا نااہل ہونے کے سلسلہ میں ووٹس اپنی رائے اور مشورہ کا اظہار کرتے ہیں۔

(۳) سفارش:

ووٹ کی ایک حیثیت سفارش کی بھی ہے۔ گویا کہ ووٹر کسی متعین امیدوار کے سلسلہ میں مجاز اتھارٹی سے یہ سفارش کرتا ہے کہ وہ ممبر پارلیمنٹ یا ممبر اسمبلی بننے کے لائق اور اہل ہے اور وہ اس عہدہ اور منصب کی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے، لہذا میں اس کے انتخاب کے لیے سفارش کرتا ہوں۔ سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا حکم یہ ہے: **من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها وكان الله على كل شئ مقبلاً (النساء: ۸۵)**۔

ووٹ دینے کا شرعی حکم:

ہندوستان کے آئین نے یہاں کے ہر شہری کو ووٹ دینے اور امیدوار بننے اور دیگر انتخابی عمل میں شرکت کا حق دیا ہے (بھارت کا آئین ص: ۸۰)۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ایک شہری کی حیثیت سے انتخابی عمل میں شرکت کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ووٹ دینا اور دوسرے

انتخابی عمل میں شرکت کرنے کا حکم حالات اور موقع محل کے لحاظ سے مختلف ہے۔ بعض حالات میں انتخابی عمل میں شرکت کرنا اور ووٹ ڈالنا محض جائز ہوتا ہے اور کبھی مستحب اور واجب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں ایکشن میں شرکت کرنا واجب لغیرہ ہے اور دنیا کے جن ممالک کے احوال ہندوستان سے مشابہ ہوں ان ممالک میں بھی ایکشن میں شرکت کرنا واجب لغیرہ ہوگا۔

وجوب کے دلائل:

۱۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہے، شہادت حق شریعت کا ایک اہم حکم ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں شہادت اور اس کے مشتقات کا استعمال ایک سو ساٹھ سے زیادہ مقامات پر ہوا ہے، ان میں سے مقصد کے لحاظ سے واضح چند آیات کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرہ: ۲۸۳) (اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جس نے گواہی کو چھپا دیا تو یقیناً اس کا دل گنہگار ہے)۔

اس آیت کے تحت امام قرطبی مالکی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شہادت اور گواہی کے چھپانے سے منع فرمایا ہے۔ متعدد قرائن کی بنیاد پر اس ممانعت کو وجوب پر محمول کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک قرینہ یہ ہے کہ اس پر گنہگار ہونے کی وعید آئی ہے۔ انہوں نے بطور استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول پیش فرمایا ہے: عَلِي الشَّاهِدُ أَنْ يَشْهَدَ حَيْثُمَا اسْتَشْهَدَ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳، ۴۱۵) یعنی گواہ کو جب گواہی کے لیے طلب کیا جائے تو اس کے لیے گواہی دینا ضروری ہے۔ امام طبرانی نے اس ضمن میں اس کی بھی وضاحت فرمائی کہ گواہی چھپانے کی ممانعت اس شکل میں ہے جب کسی حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو (تفسیر الطبری ۹۹، ۶)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَأْبَى الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا (البقرہ: ۲۸۳) اور گواہوں کو جب گواہی کے لیے مدعو کیا جائے تو چاہیے کہ وہ انکار نہ کریں۔ علامہ ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ جب گواہ کو معلوم ہو کہ گواہی میں اس کی تاخیر کی وجہ سے کسی کا حق تلف ہو جائے گا تو اس پر گواہی کی ادائیگی لازم ہے (تفسیر ابن عطیہ: ۵۱۳، ۲)۔

امام طبرانی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت میں امر استحباب کے لیے ہے، لیکن اخیر میں امام موصوف اس کی وضاحت بھی فرماتے ہیں کہ ”اگر انسان ایسی جگہ پر ہو جہاں اس کے علاوہ شہادت کے لیے کوئی اور شخص دستیاب نہ ہو تو اس کے لیے اداء شہادت فرض ہوگا۔“

ہندوستان کا پس منظر:

اس پس منظر میں اگر ہندوستان کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں حکومت کی بنیاد ایکشن پر ہے اور ایکشن میں فحیاب افراد سے پارلیمنٹ کی تشکیل ہوتی ہے اور حکومت سازی وہ پارٹی کرتی ہے جسے معمولی اکثریت یعنی نصف سے زائد کم از کم ایک ممبر کی تائید حاصل ہو جس طرح امیدواروں کی جیت بسا اوقات چند ووٹوں کے فرق سے ہوتی ہے، اسی طرح حکومت کا بننا اور بگڑنا بھی محض ایک ووٹ سے ہوتا ہے اور پارلیمنٹ میں محض ایک ووٹ کا فرق پوری حکومت کی فتح یا شکست کا ذریعہ بن جاتا ہے اور سال کار کبھی ایسی ناپسندیدہ پارٹی یا افراد مسند اقتدار پر فائز ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے سم قاتل کے مانند ہوتے ہیں اور مناسب اور موزوں افراد مقابلہ میں کچھڑ جاتے ہیں۔ واقعات گواہ ہیں کہ ہندوستان میں متعصب پارٹیوں کی گورنمنٹ محض چند ووٹوں کے فرق سے تختہ اقتدار پر فائز ہو گئی اور اس نے ایسے فیصلے کیے جو آج بھی مسلمانوں کے لیے سوہان روح ہیں۔ اور یہ حکومت کبھی گیارہ دن میں اور کبھی گیارہ مہینے میں چند ووٹوں کے ذریعہ گر بھی گئی۔ لہذا جمہوری ممالک میں ایکشن میں ووٹ ڈالنے کے عمل کو محض مباح نہیں بلکہ واجب سے کم درجہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر ووٹ کی دوسری حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو بھی ووٹ ڈالنا اور امیدواروں میں سے بہتر کا انتخاب کرنا شرعاً لازم ہوگا، اس لیے کہ ووٹ کی ایک حیثیت مشورہ کی ہے اور مشورہ دینے والے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ (ابوداؤد درقمہ الحدیث: ۵۱۳۰) یعنی جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے وہ امین ہے اور اس پر لازم ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ مشورہ دے۔ گویا مشورہ امانت ہے اور امانت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸) (یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو

عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔ حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اذ الامانة إلى من اتمنتك ولا تخن من خانك (ترمذی رقم الحدیث: ۱۲۱۱) یعنی جس نے تمہارے پاس امانت رکھا ہے اسے ادا کرو، لیکن اگر کسی نے تم سے خیانت کی ہے تو بھی تم اس کے ساتھ خیانت مت کیا کرو۔ لہذا دوونگ کے عمل کو بھی پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں کسی وقتی طمع، حرص اور لالچ کا شکار نہیں بننا چاہیے۔

اس کے علاوہ ووٹ دینا گویا امیدوار کے انتخاب کے لئے رائے اور مشورہ دینا ہے اور مسلمانوں کی صفت یہ ہے کہ اس کے تمام امور مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وأمر ہم شورى بينهم (شوری ۳۸) چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ خیر القرون میں مسلمانوں کے اہم معاملات خاص طور پر خلیفہ کا انتخاب ارباب حل و عقد کے مشورہ سے ہوا کرتا تھا۔ خود آنحضرت ﷺ اگرچہ مشورے کا محتاج نہیں تھے اس کے باوجود آپ امت کی تعلیم کے لیے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے، اسی طرح عہد خلفاء راشدین میں بھی اکابر صحابہ کی مجلس شوریٰ تھی جن سے حضرات خلفاء راشدین مشورہ کیا کرتے تھے۔

اسی پس منظر میں بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ سلف صالحین کے زمانے میں ارباب حل و عقد کی شناخت آسان تھی، اس لیے انتخاب کے لیے امیدواری اور دوونگ کی ضرورت نہ تھی، لیکن موجودہ زمانے میں یہ عمل مشکل تر ہو گیا ہے، لہذا ارباب حل و عقد کی شناخت کے لیے انیکشن اور دوونگ کی ضرورت پیش آئی اور انیکشن کی معنویت شوریٰ کی معنویت سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ علامہ یوسف قرضاوی فرماتے ہیں: عندنا شیء اسمہ اهل الحل والعقد۔ کیف نصل الی اهل الحل و العقد الذین ہم اهل الشوری؟ زمان کان ممکن تعرف اهل الحل والعقد۔ الناس اخترعوا وسیلة للمعرفة۔ هذه الوسيلة هی الانتخابات۔ الوسائل لها حکم مقاصدها مادمنانستخدامها فی مقصد نبیل فلا حرج۔ الاسلام أمر بالشوری ولكن لم یحدد کیفیتها، هذه من رحمة الله لو حددنا لجددنا (الخلاصة فقه الاقلیات ۱: ۱۲۲) یعنی ذخیرہ شریعت میں ایک چیز موجود ہے جسے ارباب حل و عقد کہتے ہیں: لیکن ارباب حل و عقد تک کیسے پہنچا جائے؟ جو اہل شوریٰ ہوتے ہیں، ایک زمانہ تھا جب کہ اہل شوریٰ کی شناخت آسان تھی۔ لوگوں نے اس شناخت کا طریقہ ایجاد کر لیا۔ اسی طریقہ کو انتخابات کہتے ہیں، وسائل کا حکم ان کے مقاصد سے وابستہ ہے، جب تک ہم اس کا نیک مقصد کے لیے استعمال کرتے رہیں گے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسلام نے مشورہ کا حکم دیا لیکن اس کی کیفیت کو مقرر نہیں کیا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے، اگر طریقہ مقرر شدہ ہوتا تو ہم حرج میں مبتلا ہو جاتے۔

ووٹ دینا اضافہ قوت کی ایک شکل:

جمہوری ممالک میں افرادی قوت کی بڑی اہمیت ہے اور اقلیتوں کے لیے ووٹ بہت بڑی طاقت ہے جس کے ذریعہ کوئی بھی قوم اقلیت میں ہونے کے باوجود بادشاہ نہیں تو بادشاہ گر بننے کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ مسلمان بہت سے ممالک میں مضبوط اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے ووٹ کی قوت کے ذریعہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں، لہذا ایسے حالات میں ووٹ سے کنارہ کشی اختیار کرنا درحقیقت اپنی سیاسی قوت کو کمزور کرنا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہر حال میں اپنی قوت بڑھانے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخیل ترهبون به عدو الله وعدوكم وأخیرین من دونهم لا تعلمونهم الله یعلمهم (الانفال: ۱۰) یعنی اور اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے جس قدر بھی ہو سکے سامان تیار رکھو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے جن کے ذریعہ سے تم اپنا رب اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر رکھتے رہو اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے پر اللہ ان کو جانتے ہیں۔

آیت کریمہ میں قوت کا لفظ بہت جامع ہے جو ان تمام قوتوں کو شامل ہے جو نتائج اور فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ یہ طاقت فوجی بھی ہو سکتی ہے، اسلحہ اور ساز و سامان کی بھی اور علم و دانش کی قوت بھی ہو سکتی ہے۔ بالیقین جمہوری ملک میں ووٹ کی قوت دشمنوں کے عزائم خاک میں ملانے کے لیے اہم طاقت ہے، اسے ہر حال میں استعمال کرنا ہے۔



ایکشن میں اپنے آپ کو بہ حیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم:

ایکشن میں اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر پیش کرنا چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے: اول یہ کہ کوئی دوسرا آدمی عوامی نمائندہ بننے کے لیے تیار ہے، لیکن وہ اس عہدہ کے لیے غیر مناسب یا غیر موزوں ہے اور اپنے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اس کام کے لیے فراہم افراد میں سب سے بہتر اور لائق ترین ہے اور وہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو ادا کر کے ملک و قوم کی بہتر خدمت انجام دے سکتا ہے اور ان امور کو انجام دیتے وقت اسے اپنے عقیدہ اور ایمان کی حفاظت کا پورا یقین ہو اور اس کام کے لیے آمادگی کا سبب جب مال اور حب جاہ نہ ہو بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق کو ادا کرنا مقصود ہو۔ تو ایسے افراد کے لیے اپنے آپ کو عہدہ کے لیے پیش کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہوگا۔ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: أمّا إذا تعین بأنت لہم یکن أحد غیرہ یصلح للقضاء وجب علیہ الطلب صیانة لحقوق المسلمین (رد المحتار: ۸۰۴) کہ اگر کوئی شخص عہدہ قضا کے لیے متعین ہو جائے یا اس طور کہ اس کے علاوہ کوئی شخص قضا کی اہلیت نہیں رکھتا ہو تو ایسے شخص پر عہدہ قضا کا طلب کرنا واجب ہے تاکہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے اور ظالموں کے ظلم کو دور کیا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں یہ بیان کیا کہ خشک سالی اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات سے نمٹنے کے لیے انہوں نے اپنی خدمات کو پیش کرتے ہوئے فرمایا: قال اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ (یوسف: ۵۵) کہ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے ملکی خزانوں پر مامور کر دیجئے میں نگہبان ہوں اور خوب واقف کار بھی۔

رہے وہ افراد جو ان اوصاف سے عاری ہوں، ان کے لیے عہدہ طلبی اور ایکشن میں امیدوار بننا مناسب نہیں ہے۔ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: بیوز تقلید الطالب لآ نہ یقدر علی القضاء بالحق لکن ینبغی أن یقلد لآ أن الطالب یکن مہتما (بدائع الصنائع ۳) یعنی عہدہ کے طلبگار کو بھی قضا کی ذمہ داری سونپنا درست ہے، اس لیے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے پر وہ قادر ہے، لیکن اسے ذمہ داری سونپنی مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ عہدہ کا خواہشمند مہتمم ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: انا واللہ لانولی علی هذا العمل أحدًا سألہ ولا أحدًا حرص علیہ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ رقم الحدیث: ۱۷۲۳) کہ خدا کی قسم ہم کسی حریص اور عہدہ کے خواہشمند کو عہدہ نہیں سونپیں گے۔ اس کے برعکس جسے غیر مانگے عہدہ مل جائے تو اس کے لیے تائید غیبی کی پیشین گوئی بھی آپ ﷺ نے فرمائی ہے۔ جابر بن سمرہؓ کو مخاطب بنا کر آپ نے فرمایا کہ: ”کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ خود سے طلب کر کے تم نے عہدہ حاصل بھی کر لیا تو اللہ کی تائید نہیں ہوگی جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تم کو عہدہ مل گیا تو اللہ کی طرف سے تمہاری تائید اور مدد ہوگی جس کی وجہ سے تم عہدہ کے سارے حقوق ادا کر سکو گے (مسلم، کتاب الامارۃ)۔

علامہ ماوردیؒ نے الاحکام السلطانیہ میں نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے حضرت یوسف علیہ السلام کے مذکورہ عمل کی بنا پر کافر اور ظالم حکمرانوں کا عہدہ قبول کرنا اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ خود اس کو کوئی کام خلاف شرع نہ کرنا پڑے، کیونکہ انہوں نے اس زمانہ سے فرعون کے عہدہ کو قبول کیا تھا اور بعض حضرات نے اس کو بھی جائز نہیں رکھا ہے مگر جمہور علماء اور فقہاء نے جواز کے قول کو ہی اختیار فرمایا ہے (الاحکام السلطانیہ: ۱۳۰/۱ تفسیر قرطبی)۔

اس کے علاوہ مشہور قاعدہ: ما لا یتجر الواجب الابہ فهو واجب (الاشیاء والنظائر لابن نجیم، ۹۱، الاشیاء والنظائر للسیوطی ۹۷) یعنی واجب کی تکمیل جس پر موقوف ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے۔ چونکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جس وطن میں انسان رہتا ہے اس وطن کی اصلاح کی کوشش کرنا ہر ایک مسلمان کے ذمہ واجب ہے اور ان امور کی انجام دہی کے لیے ایکشن کے عمل میں شرکت کرنا لازم ہے، لہذا ایکشن میں شرکت کو بھی واجب لغیرہ کہا جائے گا۔ اگرچہ برائیوں سے روکنے کے الگ الگ درجات ہیں جن کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے: من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وإن لم یستطع فبلسانہ وإن لم یستطع فبقلبہ وذلك أضعف الایمان (ابوداؤد: ۱۰۲۲) یعنی تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے اور اس کی صلاحیت نہ ہو تو پھر زبان سے اس کو بدلنے کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اس کو بدلنے کی کوشش کرے اور یہ ایمان کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔

## نظام طاغوت میں شرکت کا اعتراض:

اس ضمن میں بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایکشن میں شرکت کا مطلب ہے لادینی نظام میں شرکت اور امیدواروں کے فسق اور بعض اوقات ان کے کفر سے راضی ہونا، اور یہ شرعاً ممنوع ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ نظام باطل کے بعض اجزاء کا اختیار کرنا جو کسی مسلمان یا پوری مسلم قوم کے لیے نفع بخش ہو بالکل ممنوع نہیں ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کی اجازت ہے۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس طرح کا استفادہ کرنا ثابت ہے، مثلاً عربوں میں خاص کر مکہ کے کافرانہ نظام میں جوار یعنی کسی پڑوس میں رہ کر اسے پناہ دینے کا قانون رائج تھا جب کوئی شخص پناہ دے دیتا تھا تو پوری قوم کے لیے وہ معصوم الدم اور ان کی شرارتوں سے محفوظ ہو جاتا تھا اور جوار میں لینے والا بھی اس کی حفاظت کا ضامن ہوتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف کے المناک سفر سے واپس آ رہے تھے تو آپ نے منظم کا جوار حاصل کیا (طبقات ابن سعد: ۱/۱۳۲، ۱۳۶، ۱۳۷)۔

اسی طرح جب کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مکہ کو چھوڑ کر حبشہ ہجرت کرنا چاہی تو راستہ میں ان کی ملاقات ابن الدغنے سے ہوئی اور انہوں نے آپ کو اپنے جوار میں لے لیا، اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ کو عاص بن وائل سہمی نے اپنے جوار میں لیا اور انہوں نے ان کے جوار کو قبول کیا۔ معلوم ہوا کہ اگر کافروں کے غلبہ والے کسی ملک میں ایکشن منعقد ہو اور اس ملک کا دستور مسلمانوں کو ووٹ دینے کا اختیار دیتا ہو تو مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اس حق کا استعمال کرے اور پارلیمنٹ یا اسمبلی کی رکنیت کے لیے اگر کوئی مضبوط مسلم امیدوار نہ ہو تو غیر مسلم امیدوار کا انتخاب بھی صحیح ہوگا جب اس امیدوار یا پارٹی کے انتخاب سے اندرون ملک یا بیرون ملک مسلمانوں کے عمومی مصالح وابتہ ہوں کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرے گا یا ان کے حق کی آواز بلند کرے گا یا علی الاقل وہ ہمارے دشمنوں کی مدد نہیں کرے گا اور اگر اس حلقہ میں کوئی مضبوط مسلم امیدوار موجود ہو تو اس کے حق میں ووٹ دینا لازمی ہوگا۔ جہاں تک سرے سے ووٹ نہ دینے یا ایکشن سے بائیکاٹ کرنے کا نظریہ ہے تو اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی مصلحت نہیں ہے بلکہ بسا اوقات انتخابی عمل سے مسلمانوں کے الگ تھلگ رہنے کی صورت میں بعض ایسے متعصب افراد کے منتخب ہونے کا امکان ہوتا ہے جو موقع ملنے پر مسلم دشمنی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتے جو یقیناً مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے جلب منفعت اور دفع مضرت اور حرج اور تنگی کو دور کرنا مقاصد دین میں سے ہے۔

بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انتخاب میں بسا اوقات فاسق فاجر امیدوار نامزد ہوتا ہے اور انتخاب کے بعد ایسے افراد خلاف شریعت قوانین بناتے ہیں جس سے نظام طاغوت کی تائید ہوتی ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ فاسق و فاجر کے اندر بھی بسا اوقات مثبت پہلو اور بہتر اخلاق اور فنی بصیرت ہوا کرتی ہے جس کو بروئے کار لا کر وہ ملک و قوم کی اور اپنی جماعت کی بہتر خدمات انجام دے سکتا ہے اور بسا اوقات وہ کمزور نیک افراد کے مقابلہ میں بہتر انداز میں اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دیتا ہے، چنانچہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ: **إِنَّ اللَّهَ لِيُؤَيِّدَ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ** (صحیح بخاری، کتاب الجہاد رقم ۳۰۶۲) اللہ تعالیٰ فاسق و فاجر افراد کے ذریعہ اپنے دین کی مضبوطی کا سامان فراہم کرے گا۔

لہذا انتخابات کے موقع پر مناسب اور صالح افراد کی عدم موجودگی میں غیر صالح افراد کے انتخاب میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے جب اس امر کا ظن غالب ہو کہ جن مقاصد کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس کو پوری قوت اور امانت داری کے ساتھ ادا کرے گا۔ اس سلسلہ میں متعدد فقہی نظیریں ہیں، چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی تحریر فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا قائد فاسق و فاجر ہو تو اس کی قیادت میں بھی دشمنوں سے جنگ کی جائے گی تاکہ مسلمانوں کی عزت و آبرو اور ان کی زمین دشمنوں کے تسلط سے محفوظ رہے، اس لیے کہ قائد کے فسق و فجور کا حساب کسی اور سے نہیں بلکہ صرف قائد سے لیا جائے گا (مکمل: ۳۰۰/۷)۔

یہی مسلک امام محمد بن حسن شیبانی، ابن قدامہ مقدسی، ابن تیمیہ اور علامہ شاطبی کا ہے۔ (دیکھئے: السیر الکبیر للشیبانی، ۱/۱۶۵، المغنی ۸/۳۵۰، المسیاب الشریعہ ۸: ۱۰۱، الموائقات ۱۵/۲) امام جوینی شافعی فرماتے ہیں کہ جب کفار کی طرف سے کسی اسلامی علاقہ پر حملہ ہو جائے اور فوج کشی کے بغیر چارہ نہ ہو اور فوج کا امیر بننے کے لیے کوئی اور نہیں بلکہ فاسق و فاجر شخص دستیاب ہو تو ہم اسی کو امیر بنا لیں گے، اس لیے کہ اس کے امیر مقرر کرنے میں عامۃ المسلمین کی بھلائی ہے (الغیاتی للجوینی: ۲۲)۔

جہاں تک ممبران پارلیمنٹ کے ذریعہ مخالف شریعت قانون بنانے کا معاملہ ہے تو اگر مسلم ممبران پارلیمنٹ اس عمل میں شریک نہ ہوں تب بھی ایسے قوانین منظور ہوں گے، اسی طرح اگر بالکل ایکشن کا بائیکاٹ کر دیا جائے تو بھی جس انداز کا نظام یہاں نافذ ہے ایسے قوانین بن بھی سکتے ہیں اور پاس بھی ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی شرکت یا عدم شرکت سے اس میں چنداں فرق نہیں پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر مسلمان ایکشن میں حصہ لیتے ہیں بالفرض اگر اسلام کے خلاف کوئی قانون بنتا ہے تو مسلم ممبران پارلیمنٹ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اس کے خلاف ایوان کے اندر اور باہر بھرپور آواز بلند کریں اور اس کے باوجود اگر وہ قانون پاس ہو گیا تو اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہوگی اور وہ ان قوانین کی تشریح یا اس کی منظوری کا بنیادی عنصر نہیں ہوں گے۔ اگر پارٹی اپنے ممبران کو پابند بنانے کے لیے وہمپ جاری کرتی ہے تو بھی مسلمان ہونے کے ناطے ایم پی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ پارٹی لائن سے اوپر اٹھ کر وہمپ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مخالف شرع قانون کے خلاف ووٹ دے، اگرچہ اس کا ووٹ ضائع کیوں نہ ہو جائے، اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ کا مکلف نہیں ہے: لا یكلف الله نفسا الا وسعها (البقرہ: ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: یا قوم اعملوا علی مکانتکم اِنی عامل فسوف تعلمون من تکون له عاقبة الدار (الانعام: ۱۲۵) یعنی اے قوم تم اپنا کام کرو میں اپنا کام کر رہا ہوں۔ پس عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کا انجام بہتر ہوتا ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ محض مفروضات و خدشات کی وجہ سے بے عملی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ پر امید ہو کر اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا۔ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بہتر صورت حال پیدا فرمادے۔

اس سلسلہ میں دوسرا جواب قواعد فقہیہ اور دیگر شرعی نظائر سے اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ اسلام مخالف قانون سازی منکر ہے لیکن کسی مسلمان کا ممبر پارلیمنٹ بننا اس متوقع منکر میں شرکت کے لیے نہیں ہو رہی ہے بلکہ اپنی قوم کے وجود اور ان کے حقوق کی حفاظت اور انہیں درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے پارلیمنٹ میں شرکت ہوتی ہے۔ (یہاں ان حضرات سے بحث نہیں ہے جو سیاست میں آنے کے بعد اپنے دین، ایمان اور ضمیر کو فروخت کر چکے ہوتے ہیں) لیکن شرکت کے بعد اس کی خواہش کے علی الرغم بہر حال منکر کے ارتکاب کا خدشہ برقرار رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود شرکت کو ناجائز نہیں بلکہ جائز اور بسا اوقات واجب قرار دیا جائے گا۔ اس لیے کہ قاعدہ ہے: الضرر الاشد یزال بالضرر الاخف (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۸۸: وللسیوطی: ۹۶، والموقفات للنشاطی ۲۰۱۳) لہذا بادل خواستہ اسلام مخالف قانون کے حق میں دو ٹونگ پر مجبور ہونے کے خطرہ کے باوجود ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا، اس لیے کہ عدم شرکت کا ضرر بہت بڑھا ہوا ہے، اس متوقع ضرر سے خاص طور پر ان حالات میں جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عزت و آبرو ان کے ملی وجود، ان کی شناخت، ان کے شعائر، مذہبی مقامات اور دینی و عصری اداروں کو زبردست خطرات لاحق ہیں، یہ سارے امور "ضرر اشد" ہیں اور ان سے مقابلہ کے لیے اگر چھوٹے اور ہلکے ضرر کو برداشت کرنا پڑے تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ مسلمانوں کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت ہر حال میں ضروری ہے۔ حضرت عمر بن خطاب کا ارشاد ہے: لان استقذ رجلا من المسلمین من ایدی الکفار احب الی من جزیرة العرب (کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۹۶) کہ میں کسی مسلمان کو کفار کے زرعے سے بچالوں یہ مجھے زیادہ پسندیدہ ہے پورے جزیرہ العرب کے مقابلہ میں۔ امام مالک فرماتے ہیں: علی الناس ان یفدوا لاساری و لو استغرق ذلک جمیع اموالہم کہ عامۃ المسلمین پر فرض ہے کہ وہ اپنے قیدیوں کو چھراکیں اگرچہ اس میں ان کا پورا مال لگ جائے۔ حالانکہ ایک خطیر رقم دشمنوں کو دینے میں ظالم کی مدد ہے، لیکن یہاں ظالم کی مدد کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک مسلمان کی آزادی رہائی دلانا مقصود ہے۔ اسی بنیاد پر علامہ ابن عبد السلام نے فرمایا: قد تجوز المعاونة علی الإثم والعدوان والفسوق لامن جهة کونه معصية بل من جهة کونه وسیلة إلى مصلحة ومنها ما یبذل فی افتکالک الأساری فیانه حرام علی آخذیه مباح لبأذلیه (قواعد الاحکام للعزیز بن عبد السلام: ۱۲۹) (بعض اوقات گناہ یا ظلم پر تعاون درست بھی ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے نہیں کہ وہ گناہ ہے بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ اس سے بڑی کسی مصلحت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس کی ایک مثال وہ رقم ہے جو قیدیوں کو چھڑانے کے لیے صرف کیا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ لینے والے کے لیے حرام ہے اور دینے والے کے لیے مباح ہے، علامہ نے اس کی دوسری مثال ذکر فرمائی کہ اگر کوئی کسی پر مال چھیننے کے مقصد سے چڑھائی کر دے ورنہ وہ قتل کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کے لیے اسے مال دے کر اپنی جان بچانا ضروری ہوگا۔ یہاں کسی کافر دشمن کی مالی مدد کرنا مقصود نہیں ہوتا کہ اس مال سے اس کے فسق و فجور میں اور اضافہ ہوگا)۔

ممتاز عرب عالم شیخ محمد صالح المنجد کا فتویٰ ہے کہ بسا اوقات شرعی مصلحت ووٹ ڈالنے کا تقاضا کرتی ہے، تقلیل شر اور ضرر کو کم کرنے کے نقطہ نظر سے۔ مثال کے طور پر اگر امیدوار غیر مسلم ہے، لیکن ان میں سے ایک مسلمانوں کے لیے نرم پالیسی رکھتا ہے جبکہ دوسرا سخت دشمن ہے اور اس نرم خواہیدوار کے حق میں مسلمانوں کے ووٹ سے فائدہ ممکن ہو تو اس کو ووٹ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور کسی کے لیے درست نہیں کہ وہ یہ اعتراض کرے کہ ووٹنگ میں شرکت کے قائلین نظام کفر کی تائید کر رہے ہیں۔ نہیں ایسا محض مسلمانوں کی مصلحت کے لیے ہے، کفر اور کفار کی محبت میں قطعاً نہیں اور صحابہ کرام نے اہل فارس پر رویوں کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا تھا، نیز جو صحابہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے انہوں نے نجاشی کی اپنے دشمن ملک کی فتح پر خوشی منائی تھی جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں مشہور ہے (فتاویٰ الاسلام سوال جواب)۔

کیا دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا درست ہے؟

اس سے متعلق شرعی حکم جاننے سے قبل بہتر ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ حلف اور قسم کسے کہتے ہیں؟ حلف اور یمن مترادف الفاظ ہیں: الحلف والیمن من الأسماء المترادفة الواقعة علی مسمی واحد“ (بدائع ۶، ۹۹۱)، شرعاً حلف ایسے معاملہ کو کہتے ہیں جس سے کرنے یا نہ کرنے پر حلف لینے والے کے عزم کی پختگی کا اظہار ہوتا ہو۔ اسے پختہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ذاتی یا صفاتی نام میں سے کسی کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے، اگر غیر اللہ کے نام سے قسم کھائی جائے تو شرعاً قسم منعقد نہیں ہوتی ہے۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: أما الیمن بنخیر اللہ فنوعان أحدهما الیمن بالآباء والأنبیاء والصوم والصلاة وسائر الشرائع والكعبة والحرم والكعبة وزمزم ونحو ذلك، ولا يجوز الحلف بشيء من ذلك (۲، ۵۱) گویا اللہ کے نام یا اس کی صفات کا ذکر کرنا حلف شرعی کے لیے رکن ہے، اس کے بغیر اس حلف کا انعقاد ہی نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں احادیث و آثار میں ممانعت موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لا تحلفوا بأبائکم ولا بالطواغیت فمن کان منکم حالفاً فلیحلف باللہ أو لیدع (بدائع و مصنف عبدالرزاق رقم ۱۵۹۲۵)، حضرت قتادہ فرماتے ہیں: یکره أن یحلف إلا باللہ وکره أن یحلف بالمصحف (مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث ۱۵۹۳۲) أما رکن الیمن فذکر اسم اللہ أو صفاته (ہندیہ ۲، ۵۱)۔

شرعی نقطہ نظر سے حلف لینے کی کئی شکلیں ہیں: پہلی یہ کہ کسی گزشتہ چیز پر صحیح سمجھتے ہوئے قسم کھائے۔ حالانکہ وہ خلاف واقعہ ہو اسے یمن لغوی کہتے ہیں۔ دوسری شکل ہے جسے غموس کہتے ہیں، یعنی جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا اور تیسری صورت ہے یمن منعقدہ کی یعنی مستقبل میں کسی چیز کے کرنے یا نہیں کرنے پر قسم کھانا۔ پارلیمنٹ اور اس جیسے دوسرے اداروں میں حلف برداری کے وقت الگ الگ الفاظ اور الگ الگ جملوں کا استعمال کیا جاتا ہے اور عام طور پر صدق دل سے یہ اقرار کرتا ہوں کہ یہ عزم کرتا ہوں یا یہ عہد کرتا ہوں جیسے جملے استعمال کیے جاتے ہیں اور اس میں اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ہے اور کبھی کبھار اللہ کا نام لی بھی جاتی ہے۔ کیا اللہ کے نام کے بغیر محض اقرار یا عزم کو شرعاً حلف کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ اللہ کے نام یا اس کی صفات میں سے کسی ایک کا ذکر کرنا حلف اور قسم کے لیے رکن ہے لہذا علماء کی ایک جماعت جن میں امام زفر شامل ہیں، ایسے الفاظ کو شرعاً قسم نہیں قرار دیتی اور اس پر قسم کے احکام بھی جاری نہیں کرتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض وعدہ ہے قسم شرعی نہیں۔ وقیل: لا بد منها لاحتمال العدة (ای الوعد) والیمن بنخیر اللہ (ہدیہ ۲، ۸۰)۔

دوسرے حضرات جن میں ہمارے ائمہ ثلاثہ شامل ہیں اللہ کے نام یا صفات کے ذکر کو ضروری تو قرار دیتے ہیں، لیکن اگر کسی جملہ میں اللہ کا نام یا ان کی صفت لفظاً مذکور نہیں ہے تو وہاں وہ معنوی یا مجازی طور پر اسے مذکور مان لیتے ہیں: والاسم قد یکون مذکوراً وقد یکون محذوفاً والمذکور قد یکون صریحاً وقد یکون کنایة (بدائع)۔

لیکن جمہوری ملک میں جہاں آزمائشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ممبران پارلیمنٹ کے ان الفاظ کو اس وقت تک قسم نہ قرار دیا جائے جب تک وہ صراحتاً اللہ کے نام یا صفات کے ساتھ قسم نہ کھائیں۔ محض اقرار یا عزم کے الفاظ کو وعدہ قرار دیا جائے اور شریعت میں اگرچہ وعدہ کے پاس داری کے احکامات بھی دیے گئے ہیں: أو فوا بالعقود (الانعام)۔ مگر ناجائز امور کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہذا دستور کے اس حصہ کے متعلق ان کا وعدہ واجب الوفا ہوگا جو شریعت سے متصادم نہیں ہے اور اگر اللہ کے نام کے ساتھ قسم کھایا گیا ہے تو قسم تو منعقد ہوگا مگر شریعت سے متصادم حصوں کے سلسلہ میں ان کا قسم قابل نفاذ نہ ہوگا، بلکہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کریں۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا حلفت علی یمین فکفر عن یمینک وآت بالذی ہو خیر (بخاری، مسلم) اور اگر اس کے خلاف کرنا مصلحت عامہ کے خلاف ہو اور اس میں ضرر لاحق ہونے کا خدشہ ہو تو اس حال میں اس کے لیے بلا تفصیل حلف لینا درست ہوگا جیسا کہ قاعدہ ہے: لا ضرر و لا ضرار (ابن ماجہ رقم ۲۲۲۰) اور یہ بھی کہ إذا ابتلی ببلیتین یختار أھوھما (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱۰۸۹) الضرر الخاص یتحمل للضرر العام (ایضاً)۔

بائبل پر حلف لینے کا حکم:

تورات اور انجیل اپنی حقیقت کے لحاظ سے ان چار مقدس آسمانی صحیفوں میں شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا ہے، لیکن قرآن کریم کے نزول کے بعد یہ کتابیں منسوخ ہو گئیں۔ مزید یہ کہ مرور زمانہ کے ساتھ ان آسمانی کتابوں میں بے پناہ تحریفات بھی ہو گئیں، گویا ان کے تقدس کی حیثیت بھی مجروح ہو گئی، لہذا ایک مسلمان کے لیے اس پر ہاتھ رکھ کر حلف لینے کا مطلب ہے اس مجموعے کے تقدس کا اعتراف کرنا جو کسی بھی حال میں درست نہیں ہے، ہمارے لیے وہی حصے لائق تقدیس ہیں جو تحریف سے پاک ہیں، پورا مجموعہ نہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ ابو الحسنات عبدالحی فرنگی محلی کا بیان قابل ذکر ہے: مسائل نے دریافت کیا کہ ”قسم کو پختہ کرانے کے وقت تورات خاص یہود کے ہاتھ میں دے کر اور انجیل خاص نصاریٰ کے ہاتھ میں دے کر اس کی طرف اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں تو اس کے جواب میں علامہ نے فرمایا اور استدلال کے طور پر ہندیہ کی یہ عبارت پیش فرمائی: لا یحلف بالاشارة الی مصحف معین بأن یقول باللہ الذی أنزل هذا الإنجیل وهذا التوراة لانه مثبت تحریف بعضها فلا یؤمن ان الاشارة الی المحرف فیکون التحلیف به تغلیظا ما لیس بکلام اللہ عزوجل۔ جب عیسائی اور یہودی سے ایسا کروانا درست نہیں ہے تو ایک مسلم کے لیے کیسے درست ہوگا؟ اس سلسلہ میں اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے پانچویں سمینار میں صادر شدہ یہ فیصلہ بھی قابل ذکر ہے کہ اللہ کے سوا کسی چیز کی قسم کھانی جائز نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جسے قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔ قسم کھاتے وقت مصحف، توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھنا قسم کے صحیح ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھے، اس لیے کہ آج جو نسخے رائج ہیں وہ محرف ہیں“ (اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فیصلے ص: ۱۲۰)۔

لیکن اگر کسی ملک کے ضابطہ کی وجہ سے مسلمان انجیل پر حلف لینے پر مجبور ہو تو اصل مذہب حنفیہ کے لحاظ سے یہ فتویٰ دیا جاسکتا ہے کہ اس کا حلف شرعاً معتقد ہی نہیں ہوا، اس لیے کہ متون حنفیہ کی روایت کے مطابق بائبل تو کجا خود قرآن کریم کی قسم بھی شرعاً معتبر نہیں ہوتی، چنانچہ علامہ عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں: قرآن کی قسم اگرچہ بعض کے نزدیک معتبر ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے، مگر اصحاب متون نے اس قسم کو شرعاً معتبر نہیں مانا ہے۔ قال محمد فی الأصل: لو قال: والقرآن لا یكون یمینا ذکرہ مطلقاً (فتاویٰ عبدالحی، ص: ۲۵۲) اس سلسلہ میں اسلامی فقہ اکیڈمی کے مذکورہ فیصلہ میں یہ اضافہ بھی درج ہے کہ: اگر غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لیے توریت یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمان پر لازم ہے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا (اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فیصلے ص: ۱۲۰)۔

سیکولر پارٹی میں شرکت اور اس کی طرف سے امیدوار بننا:

سیکولر پارٹی میں شمولیت اور اس کی طرف سے پارلیمنٹ، اسمبلی یا بلدیہ کے انتخابات میں ممبر بننے کی مشروط اجازت ہے اور شرائط وہی ہیں جن کا تفصیل کے ساتھ گزشتہ سطور میں تذکرہ ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے ایمان اور عقیدہ کے تحفظ کا یقین ہو، اگر ان کے اختیار میں ہو تو پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے والے مسلمانوں کے لیے الگ دفعت وضع کر دیے جائیں، ممکن نہ ہو تو اس پارٹی میں تو شمولیت اختیار کی جائے اور اس کے اسلام مخالف دفعت سے برأت ظاہر کی جائے اور ان میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے۔ پارٹی کی وفاداری سے زیادہ قوم کی وفاداری اس کو عزیز ہو اور قوم کی خدمت کا جذبہ ہر جذبہ پر غالب ہو (دلائل گزر چکے ہیں) بہتر ہے کہ اس طرح کی سیکولر سیاسی پارٹیوں میں شرکت باضابطہ تحریری طور پر معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آئے جیسا کہ میثاق مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے اور آس پاس کے یہود اور مشرک قبائل سے معاہدہ کیا تھا۔

## مسلم دشمن سیاسی پارٹیوں میں شرکت:

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، کسی مسلمان کے لیے درست نہیں کہ ایسی پارٹی میں شامل ہو یا ان پارٹیوں کی طرف سے الیکشن کے موقع پر امیدوار بنے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایہا الذین آمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ہزوا ولعبا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین (المائدہ: ۵۷) یعنی اے ایمان والو جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے، یعنی تم سے پہلے کے اہل کتاب اور کفار ان کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود: ۱۳) یعنی اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں ورنہ تمہیں بھی جہنم کی آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز نہیں ہوگا اور تمہاری مدد بھی نہیں کی جائے گی۔ سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء (المائدہ: ۵۱) (اے ایمان والو نہ بناؤ میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست)۔

مذکورہ آیات میں اسلام کے دشمنوں کے ساتھ دوستی قائم کرنے کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، لہذا وہ سیاسی پارٹیاں جو اسلام اور مسلم دشمنی کو اپنا شعار بنائے ہوئی ہیں منظم فسادات بھڑکا کر مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے کھلواڑ کرتی ہیں، ان کے مقدس مقامات کو تباہ کرتی ہیں اور اس پر خوش بھی ہوتی ہیں، ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت احکام الہی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ رہے وہ افراد جو ایسی اسلام مخالف پارٹیوں میں شامل ہو کر ان کے ایجنڈے اور منشور کو تبدیل کرنا چاہیں تو تجربہ شاہد ہے کہ ایسے افراد اپنے مفروضہ مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ اپنے دین و ایمان اور غیرت ملی کا جنازہ بدست خود نکال لیتے ہیں، لیکن پارٹی کا ایجنڈہ اور مسلم دشمن عزائم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

## علیحدہ مسلم سیاسی جماعت کا قیام:

مسلمانوں کی ایک باکردار مثال سیاسی بصیرت رکھنے والے اور قربانی دینے والے افراد پر مشتمل ایک علاحدہ سیاسی جماعت ضرور ہونی چاہیے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے دروازے سیکولرزم میں یقین رکھنے والے ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے کھلے رہیں، لیکن اس کی قیادت اور نظریہ سازی ہر حال میں مسلمانوں کے عمل میں رہے اور اس پلیٹ فارم سے مسلمان اسلام کے مثالی عدل و انصاف، رعایا پروری، خدمت خلق اور مددِ اہنت فی الدین کے بغیر رواداری کا بھرپور مظاہرہ کریں، اس سے مسلم مخالف ووٹ کے مرکز ہونے کا خدشہ بھی معدوم ہو جائے گا یا کم ہو جائے گا اور ان اوصاف کا مظاہرہ کر کے دیگر محب وطن سیکولر شہریوں کے دل میں ایسی پارٹی کا وقار بھی پیدا ہوگا۔ فرقہ پرست جماعتیں اسی وقت اپنا شیطانی کھیل کھیلنے میں کامیاب ہوتی ہیں جبکہ پارٹی خود اپنی شبیہ بھی فرقہ پرستی والی بنا ڈالی اور بدعنوانی اور بے کرداری کا شکار ہو جائے، اگر اپنی شبیہ خدمت ملک و قوم ہو تو انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لاینہاکم اللہ عن الذین لہ یقاتلوکم فی الدین ولہ ینصرکم من دیارکم ان تبروہم وتقسطوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین (المستحین: ۸) یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منح نہیں فرماتے ان لوگوں سے جو تم سے نہیں لڑے دین کے معاملے میں اور تمہیں اپنے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرو۔ علامہ قرطبی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے ساتھ صلہ یعنی تعلق قائم کرنے کے بارے میں رخصت پر دلالت کرتی ہے جو لوگ اہل ایمان سے دشمنی نہیں کرتے، اور ان سے جنگ و جدال بھی نہیں کرتے ہیں۔ سورہ انفال میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان جنحوا للسلم فاجنح لہا (۶۱) کہ اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی ان کی طرف جھکنے۔

اس سلسلہ میں بانی امارت شرعیہ مولانا ابوالحسن محمد سجاد کے ذریعہ قائم کردہ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی اور الیکشن سے لیکر حکومت سازی تک کے تجربات کو بھی اپنایا جاسکتا ہے۔ جبکہ ریاست بہار میں آزادی سے قبل اس پارٹی نے الیکشن میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور مولانا سجاد کی نگرانی میں محمد یونس نے وزیر اعظم کے طور پر حلف برداری کی اور کامیابی کے ساتھ یہ حکومت ایک عرصہ تک حکومت کرتی رہی۔ اس تجربے سے اور حال میں مولانا بدرالدین اجمل قاسمی کے ذریعہ کیے گئے یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کے تجربات سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے:

بعض پیدائشی اور فطری اسباب کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے درمیان تقسیم کار کا اصول قائم کیا ہے اور اسی کے پیش نظر مردوں کو عورتوں پر قوامیت عطا کی گئی ہے اور اسے شرم و حیا کا جسم پیکر قرار دے کر ہر اس چیز کی ممانعت کی گئی ہے جو ان کی فطری حیا اور پیدائشی اوصاف سے متصادم ہو۔ باہر نکلنے، غیر محرموں کے سامنے جانے اور پردہ کرنے کے سلسلہ میں عورتوں کے خصوصی مسائل ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں خاص احکامات بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہ علی بعض (النساء: ۳۴) (مرد نگہبان ہیں عورتوں کے اس سبب سے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے)۔ سورہ احزاب میں اللہ کا ارشاد ہے: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولى (احزاب: ۳۳) (اور تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار کر کے مت نکلا کرو)۔ حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: المرأة عورة إذا خرجت من بیتها استشرفتھا الشیطان (خواتین مکمل طور پر پردہ کی چیز ہیں جب وہ گھر سے نکلتی ہیں تو شیطان ان کے پیچھے پڑ جاتا ہے)۔ ما ترکت بعدی فتنۃ أضر علی الرجال من النساء (متفق علیہ) (میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے حضرت رسالت رسالت عورت سے بڑھ کر کسی اور چیز کو نہیں چھوڑا)۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا سہرا بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا: لن یفلح قوم ولوا أمرھم امرأۃ (بخاری) (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو کسی عورت کو اپنا سربراہ بنا لے)۔

ان امور کے پیش نظر علماء امت نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی، لیکن وہ پردہ کی اور دیگر شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے وہ تمام گھریلو اور سماجی امور انجام دے سکتی ہے جن امور میں اجنبی مرد و عورت کے اختلاط کا امکان ہو ان امور کی ان کے لیے اجازت نہیں ہے۔ عورت حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات کو فیصلہ کرنے کے لیے امام ابوحنیفہ کی رائے میں قاضی بھی بن سکتی ہے۔ (المرأة بین الفقه و القانون: ۳۹) وہ پردہ میں رہ کر ووٹ بھی دے سکتی ہے اور حکومت کے اعلیٰ امور میں مشورہ بھی دے سکتی ہے۔ مثلاً صحابیاتؓ نے حضور اکرمؐ سے بیعت کی اور بیعت عقبہ میں باضابطہ شامل ہوئیں۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے بعد خلیفہ چننے کی ذمہ داری چھ افراد پر مشتمل ایک منتخب جماعت کے سپرد کیا جن میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بھی تھے جو اس معاملہ میں مستقل تین دنوں تک مشورہ لیتے رہے، اس درمیان پردہ نشین خواتین سے بھی مشورہ کیا۔ علامہ لکھتے ہیں کہ اجتہاد کرنا اور فتویٰ دینا مردوں پر منحصر نہیں بلکہ خواتین بھی ان اوصاف کی حامل ہوتی ہیں، چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ پر سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنے جانور کو ذبح فرمایا اور صحابہ کرامؓ نے آپ کی اتباع کی۔ اسی طرح حضرت خولہ بنت ثعلب نے حضرت عمر بن خطابؓ کو نصیحت فرمائی جبکہ آپ خلیفۃ المسلمین تھے (الانتخابات و احکامہانی الفقہ الاسلامی ۲/ ۳۹۴، منہاج السنۃ ۶/ ۹۰۵۳)۔

اگر خواتین کے لیے مردوں سے علاحدہ نشست کا انتظام ہو اور وہ مکمل پردے میں ایوان کی کارروائی اور دیگر سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں شرکت کر سکیں اور دیگر شرعی حدود کی رعایت کر سکیں یا غیر مناسب مقامات پر شوہر کے لیے ان کی نمائندگی کی اجازت ہو تو اس صورت میں ان کے لیے امیدوار بننا درست ہوگا (دیکھیں جن نمونہ کے استفتاء کے جواب میں دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کا فیصلہ) اور اگر وہ ان حدود شرعیہ کی رعایت نہ کر سکیں تو ان کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں شرکت درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

مفتی تنظیم عالم قاسمی

### ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت:

جمہوری حکومت کی تشکیل ووٹنگ کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لیے سب سے پہلے سوال یہ ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں اگر غور کیا جائے تو ووٹ کی مختلف حیثیتیں بنتی ہیں، تاہم بنیادی طور پر ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے، اس لیے کہ ووٹ دینے کا مطلب اس بات کی شہادت دینا ہے کہ وہ جس امیدوار کو ووٹ دے رہا ہے اس کے علم و دانست میں وہ قوم و ملت کا خیر خواہ، جذبہ خدمت خلق اور نمائندگی کی صلاحیت میں دوسروں سے بہتر ہے، وہ متعلقہ ذمہ داری کو نبھانے کی قابلیت رکھتا ہے اور اس میں امانت و دیانت داری بھی ہے، اگر ووٹ دینے والے نے جاننے کے باوجود کسی نااہل کو ووٹ دیا حالانکہ اس سے بہتر کوئی دوسرا شخص موجود تھا پھر بھی تعلق، قرابت، رشتہ داری یا اور کسی بنیاد پر غدار، خائن، ظالم اور نااہل شخص کو ووٹ دے دیا تو یہ جھوٹی گواہی ہوگی، جو سخت گناہ کبیرہ اور دنیا و آخرت کے لیے وبال جان ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

کیا میں تم کو سب سے بڑا گناہ نہ بتا دوں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے اور فرمایا: سنو! شہادت زور یعنی جھوٹی گواہی اور برابر دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم لوگوں کو خیال ہوا کہ کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جاتے (صحیح بخاری، باب ما قبل فی شہادۃ الزور: ۱/۳۶۲)۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں بتوں کی گندگی سے بچنے کی طرح اس سے بھی اجتناب کا حکم دیا۔ ارشاد باری ہے:

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (الحج: ۳۰) (سو بتوں کی گندگی سے بچتے رہو اور جھوٹی بات سے بچتے رہو)۔

ووٹ کی دوسری حیثیت شفاعت کی ہے۔ ووٹر جس کے حق میں ووٹ ڈال رہا ہے وہ گویا اس کے حق میں سفارش کر رہا ہے کہ اسے اس علاقہ کا نمائندہ بنا دیا جائے، اب اگر ووٹر نے صحیح سفارش کی ہے تو اسے ثواب ملے گا اور جان بوجھ کر غلط اور نااہل آدمی کو ووٹ ڈالا تو یہ بری سفارش ہوگی اور اس پر وہ گنہگار ہوگا بلکہ جس ظالم اور نااہل کو اس نے ووٹ ڈالا ہے، اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اس منصب اور نمائندگی کے عہدہ پر وہ کر جوم و زیادتی کرے اور لوگوں کے حقوق تلف کرے گا ان سب گناہ میں ووٹر برابر کا شریک رہے گا، اس لیے کہ سفارش جتنی اہم چیز کی ہوتی ہے اور جس قدر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی اعتبار سے سفارشی ثواب و عتاب کا مستحق ہوتا ہے۔

من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منها ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفۃ منها (النساء: ۸۵) (جو کوئی اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی بری سفارش کرے گا اس پر اس میں سے بار رہے گا)۔

ووٹس کو چاہیے کہ نااہل، نالائق، فاسق اور ظالم کو ووٹ نہ دیں، کیونکہ یہ بری سفارش ہوگی اور وہ گنہگار ہوں گے، اگر خدا نخواستہ وہ کامیاب ہو گیا تو جب تک وہ اس منصب پر رہتے ہوئے ظلم اور حق تلفی کرتا رہے گا ووٹس گنہگار ہوتے رہیں گے۔



ووٹ کی تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے، وکالت میں ایک انسان اپنے کام کا کسی کو نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ووٹ دینے والا اپنے حلقے کے لیے سیاسی امور میں وکیل بناتا ہے کہ فلاں امیدوار اس حلقے سے حکومت کی تشکیل کرنے اور وزیر اعظم منتخب کرنے کے لیے وکیل ہے، اب اگر وکالت کسی ایسی چیز کی ہوتی جس کا نفع اور نقصان موکل کی ذات تک محدود ہوتا تو کوئی حرج نہیں تھا، لیکن یہ ایسی چیز کی وکالت ہے جس کا نفع اور نقصان عام ہے اور پوری قوم پر اس کی اچھی اور بری وکالت کا اثر پڑنے والا ہے، اس لیے اگر اس نے عمد غلط ووٹ ڈالا تو اسے پوری قوم کے حقوق پامال کرنے کا گناہ ہوگا۔

ووٹ کی ایک چوتھی حیثیت مشورے کی بھی ہے، یعنی وہ جس کو ووٹ ڈال رہا ہے اس کے متعلق مشورہ دے رہا ہے کہ اسے اس حلقے کا نمائندہ منتخب کیا جائے جس سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے علم و تحقیق کے مطابق صحیح مشورہ دے، غلط مشورہ دینے پر مواخذہ ہوگا بالخصوص ایسی جگہ جہاں غلط مشورہ دینے سے بھاری نقصان اٹھانا پڑے، ایک ووٹ بھی کبھی کبھی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے، اس لیے جو باصلاحیت، اخلاق و کردار کا پیکر، فرض شناس، قوم و ملت کا ہمدرد ہو اس کو ووٹ دیا جائے، کسی خائن اور نااہل کو ہرگز ووٹ نہ دے کہ اس کا نقصان صرف اس کی ذات کو نہیں بلکہ پورے ملک اور پوری قوم کو اٹھانا پڑے گا اور اس میں چونکہ عمد کا دخل ہے، اس لیے اس غلط مشورے کا گناہ بھی ہوگا۔

ووٹ میں اگرچہ شہادت، سفارش، وکالت اور مشورہ کی حیثیتیں موجود ہیں، لیکن شہادت کی حیثیت سب سے نمایاں ہے، اسی لیے دور حاضر کے مشہور محقق اور ممتاز فقیہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے ووٹ کی شرعی حیثیت میں صرف شہادت کا ہی ذکر کیا ہے (دیکھئے: فقہی مقالات: ۲۸۷، ۲۸۸، طبع کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

۲۔ ووٹ اگر شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟

ادائے شہادت سے متعلق قرآن کریم میں مختلف آیات ہیں:

ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فإنه آثم قلبه (البقرہ: ۲۸۲) (اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ، جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے)۔

وأقیموا الشهادة لله (الطلاق: ۲) (اور (اے گواہ بننے والو!) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو)۔

ادائے شہادت بعض صورتوں میں فرض عین ہے اور یہ اس وقت ہے جبکہ حق کی بازیابی شاہد کی شہادت پر موقوف ہو، گواہی دینے میں اس کی شمولیت کے بغیر مقصد پورا نہ ہو سکے:

”وقد یکون أداء الشهادة فرض عین إذا کان لا یوجد غیره ممن یقع به الکفایة وتوقف الحق علی شهادته، فانه یتعین علیه الأداء لأنه لا یحصل المقصود إلا به“ (حوالہ سابق)۔

ووٹ دینا ادائے شہادت کے درجے میں ہے، اس لیے اس کا بھی حکم وہی ہوگا جو گواہی دینے کا ہے، یعنی عام حالات میں جبکہ ملک میں پر امن ماحول ہو، جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، دین و شریعت پر چلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور نہ ہی اسلام کے خلاف کوئی قانون وضع کیا جاتا ہو اور نہ کسی ایسی جماعت کے برسر اقتدار آنے کا یقین یا ظن غالب ہو جو اسلام اور مسلمانوں کا کھلم کھلا دشمن ہے تو ان صورتوں میں ووٹ دینا فرض کفایہ ہوگا، یعنی اگر کچھ لوگوں نے ووٹ دے دیا اور حکومت تشکیل پا گئی تو مقصد حاصل ہو گیا، لہذا سارے لوگ بری الذمہ ہو جائیں گے۔

لیکن اگر ملک کے حالات بہتر نہ ہوں، مسلمان اور ان کے دین و مذہب کو مٹانے کی سازشیں کی جاتی ہوں، اندیشہ ہو کہ اگر سارے مسلمان متحدہ طور پر ووٹ میں حصہ لے کر کسی پارٹی کو حکومت نہ سونپیں تو پارلیمنٹ اور حکومت پر اسلام دشمن طاقتوں کا قبضہ ہو جائے گا اور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت چلی جائے گی جو مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو سے کھلوٹ کر کریں گے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، ایسے وقت ووٹ ڈالنے میں شریک ہونا ہر مسلمان پر فرض ہوگا، تاکہ مقصد شریعت کی حفاظت ہو سکے۔ بستی اور شہر کے چند لوگوں کی دوننگ میں شرکت سے باقی

افراد سے ذمہ ساقط نہیں ہوگا، بلکہ وہ ترک فرضیت کے گنہگار ہوں گے۔

ہاں البتہ اگر کوئی شخص ووٹ میں شرکت سے معذور ہو جیسے کوئی بیمار یا نہایت ضعیف ہے، نابینا اور بے سہارا ہے، سواری کا انتظام نہیں اور ووٹ کا مرکز بہت دور ہے یا اور کوئی علت شرعی موجود ہو تو اس سے یہ فریضہ ساقط ہوگا۔

”وإذا وجب أداء الشهادة على إنسان ولكنه عجز لبعده المسافة كأن دعي من مسافة القصر أو كان سيلحقه ضرر في بدنه أو ماله أو أهله، فلا يلزمه الأداء لقول الله تعالى: ”ولا يضار كاتب ولا شهيد“ (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۰۲۲)۔

اسی طرح اگر امیدوار صحیح کردار کا حامل، نمائندگی کا اہل اور فرض شناس نہ ہو تو بھی ادائے شہادت فرض نہ ہوگا:

”كذلك قال بعض الفقهاء لا يجب الأداء إذا كان الحاكم غير عدل. قال الإمام أحمد: كيف أشهد عند رجل ليس عدلاً، لا أشهد“ (حوالہ سابق)۔

اسی لیے معاصر فقہاء کرام نے ووٹ دینے کو واجب قرار دیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار دیانت دار اور فرض شناس ہو۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ووٹ کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے بطور خلاصہ لکھتے ہیں:

”جی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، اس لیے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں، کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے“ (جواہر الفقہ: ۲۹۵/۲)۔

فقیر وقت حضرت مولانا محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ و رعایہ کا بھی یہی خیال ہے (فقہی مقالات: ۲۹۳/۲)۔

دونوں بزرگوں نے اگرچہ مطلقاً ووٹ کو شرعی فریضہ اور ادنیٰ کوتاہی کو گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، لیکن راقم الحروف کے خیال میں ان دونوں کے پیش نظر وہ حالات ہوں گے جن میں تمام مسلمانوں کے ووٹ میں شرکت نہ کرنے کی صورت میں اسلام دشمن قوت کا برسر اقتدار آنے کا ظن غالب یا یقین ہو، ورنہ عام حالات میں اسے واجب اور فرض کہنا شہادت سے متعلق فقہاء کے بیان کردہ مدارج کے خلاف ہے۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

امیدوار اپنے آپ کو عہدہ اور منصب کے لیے از خود پیش کرتا ہے اور منصب کا طالب ہوتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں کسی عہدہ کے طلب کرنے کو ناپسند کیا گیا ہے، چنانچہ عبدالرحمن بن سمرہ سے مروی ہے:

”قال لي رسول الله ﷺ: يا عبد الرحمن! لا تسأل الإمارة فإنك إن أعطيتها عن مسألة وكلت إليه وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليه“ (صحيح مسلم، كتاب الامارة: ۲۱۲۰) (عبدالرحمن! عہدہ اور حکومت کی طلب مت کرو، کیونکہ اگر تجھے طلب سے ملے گا تو خدا تجھے چھوڑ دے گا اور جو بغیر طلب کے ملے تو اللہ تعالیٰ اس پر تیری مدد کرے گا)۔

اقتدار کی ہوس اور حرص کے علاوہ اور بھی اس میں کئی منکرات ہیں، جیسے ایک دوسرے پر الزام تراشی اور بہتان طرازی، خود ستائی نام و نمود، اپنی خدمات کی بے جا تعریف، ہزاروں قسم کے جھوٹے وعدے، ووٹوں کی خرید و فروخت، اپنی تشہیر میں حد سے زائد اخراجات وغیرہ۔ ان منکرات کا تقاضا ہے کہ بحیثیت امیدوار اپنے آپ کو پیش کرنا درست نہ ہو، لیکن آج کی گندی سیاست کی یہ تمام چیزیں لازمی جز بن گئی ہیں، اگر ان گناہوں اور منکرات کو دیکھتے ہوئے مسلمان ایکشن میں حصہ لینا چھوڑ دیں تو ملک سے مسلمانوں کا وقار ختم ہو جائے گا۔ سیاسی و قومی سطح پر ان کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہے گی۔ پارلیمنٹ کے تمام ممبران غیر مسلم ہوں گے، قانون ساز مجالس پر غیروں کا قبضہ ہوگا۔ وہ جب اور جس طرح چاہیں گے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قانون بنا سکیں گے پھر یکساں سول کوڈ، تعدد ازدواج، وندے ماترم، شاہ بانو کیس اور ہم جنسی کے نکاح کی اجازت وغیرہ جیسے سیکڑوں اسلام کے خلاف مسائل جنم لیں گے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا نقصان ہے، اس لیے موجودہ حالات میں ایکشن کی گندگیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس سے دور رہنا اور کنارہ کش ہو جانا دانشمندی کے خلاف ہے۔

امیدوار بننا اور ایکشن کی راہ سے جمہوری ملک کے نظم و نسق پر اثر انداز ہونا اور قیادت تک پہنچنا بہت آسان ہے اور یہ بہت سے مسائل کا حل ہے، اس لیے امیدوار بننے اور انتخابی مہم میں شرکت درست ہوگی۔ البتہ امیدوار کو چاہیے کہ مذکورہ منکرات اور انتخابی مفادات سے اپنے آپ کو پاک رکھے، اخلاق و کردار کا پیکر، فرض شناس، قوم و ملک کا ہمدرد بن کر اخلاص کے ساتھ امیدوار بنے اور نیک جذبہ کے تحت اس میں شرکت کرے، جیسا کہ فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر کوئی مخلص بندہ کسی خاص موقع پر محسوس کرے کہ اس اہم خدمت کو اللہ کی توفیق سے اچھی طرح انجام دے سکتا ہے، اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے کو پیش کر دے۔

حضرات فقہاء نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول سے استدلال کیا ہے:

”قال اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم“ (يوسف: ۵۵) (يوسف عليه السلام نے کہا: مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر، میں نگہبان ہوں، خوب جاننے والا) (ترجمہ شیخ البند)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فيه دليل على جواز طلب التولية وإظهار أنه مستعد لها التولى من يد الكافر إذا علم أنه لا سبيل إلى إقامة الحق و سياسة الخلق إلا بالاستظهار به“ (تفسیر بیضاوی: ص: ۳۱۱، مطبوعہ: لبنان)۔

(ان آیات سے عہدے کا مطالبہ، اس کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار اور کافرانہ نظام کے تحت عہدے پر فائز ہونے کا جواز معلوم ہوتا ہے، جبکہ اس کے بغیر اقامت حق اور خدمت خلق کی کوئی گنجائش نہ ہو)۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ”ودلت الآية أيضا على جواز أن يطلب الإنسان عملا يكون له أهلا“ (انسان جس کام کی اہلیت رکھتا ہو اس کو طلب کر سکتا ہے)۔

اور آگے چل کر لکھتے ہیں: ”وهذا الحكم اليوم، لو علم إنسان من نفسه أنه يقوم بالحق في القضاء والحسبة ولو يكن هناك من يصلح ولا يقوم مقامه لتعين ذلك عليه، ووجب أن يتولاه و يسأل ذلك، ويخير بصفاته التي يستحقها به من العلم والكفاية وغير ذلك“ (تفسیر قرطبی: ۹۰۱۳۲)۔

(آج بھی یہی حکم ہے کہ اگر کوئی شخص قضا وغیرہ میں حق قائم کرنے پر قادر ہو اور اس کے علاوہ اس کام کو انجام دینے والا کوئی دوسرا نہ ہو تو وہ شخص اس کے لیے متعین ہو جائے گا اور ضروری ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کرے اور والی بن جائے اور اپنے ان صفات کو بیان کرے جن کی وجہ سے وہ مستحق عہدہ ہے)۔

صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ آیت سے ماخوذ مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وأما إن لم يكن في البلد من يقوم مقامه فإنه يتعين عليه لكونه من فروض الكفاية“ (الهداية: ۲۰۱۳۲) (اگر شہر میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اس کے امور کو انجام دے سکے تو وہ اس کے لیے متعین ہو جائے گا، فرض کفایہ کی وجہ سے)۔

ان اقوال کا حاصل یہ ہے کہ قضا، بادشاہت، خلافت یا کوئی اور عہدہ طلب کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں اس عہدہ کے فرائض نبھانے کی پوری صلاحیت موجود ہو، اور اس عہدے کے مطالبہ کا مقصد خدمت خلق، حقوق کی ادائیگی، غربا و مساکین کی خبرگیری وغیرہ ہو اور اگر مقصد نفس پروری، حب جاہ و مال وغیرہ ہو تو مطالبہ جائز ہے اور نہ ہی اس نیت کے ساتھ کسی عہدے کو قبول کرنا درست ہے، جن احادیث میں عہدے کے مطالبہ سے منع کیا گیا ہے ان سے مراد بدعتی اور فساد غرض ہے، چونکہ عام طور پر لوگوں سے عہدہ قبول کرنے کا مقصد حب جاہ و مال ہے، اس لیے عمومی احوال کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، لیکن اگر کوئی ایسا مخلص، اللہ کا نیک بندہ، خدا ترس ہو جو محض قوم و ملت کے فائدے کے لیے اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو بلا کراہت درست ہے بلکہ اگر اس کے علاوہ وہاں کوئی اس کا اہل نہ ہو تو مطالبہ واجب ہوگا۔

”إن طلب الإمارة والقضاء من حيث الإمارة الحكومة لحب المال والرياسة والشرف منهي عنه مطلقا سواء

كان بالقلب وحده أو باللسان أيضا لكونه من ناحية الدنيا لا الدين، واما طلبها لا من حيث الامارة بل لإرادة الإصلاح بين الناس وإقامة العدل فيهم والقضاء بالحق لما في العدل من الاجر الجزيل، فليس منهي عنه لا بالقلب ولا باللسان لقوله ﷺ: "لا حسد إلا في اثنين" ولما كان الغالب في العادة أن طلب الولاية وإرادتها والرغبة فيها لا تكون إلا من حيث الولاية والإمارة لحب المال والشرف والرياسة وطلبها لمصلحة الناس وحاجتهم لا لحفظ النفس نادرا أشد النكرة" (اعلاء السنن: ۱۵، ۴۳).

۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟

اس کا جواب جاننے کے لیے صلح حدیبیہ کے واقعہ اور اس سے ملنے والے پیغام پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ ۶ھ میں رسول اکرم ﷺ پندرہ سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ تشریف لے جا رہے تھے، اہل مکہ نے آپ ﷺ کو راستے میں ہی روک دیا، باہمی گفتگو کے بعد مقام حدیبیہ میں آپس میں صلح ہوئی۔ اس صلح میں کفار مکہ کی طرف سے جو شرطیں لگائی گئی تھیں، وہ بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں، اسی لیے حضرت عمرؓ کو اس پر اعتراض بھی ہوا، لیکن رسول اکرم ﷺ نے بظاہر ذلت و مغلوبیت کی اس صلح کو منظور کر لیا، کیونکہ مکہ میں ایسے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے، اگر جنگ ہوتی تو یہ لوگ بھی مارے جاتے اور مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوتا، اسی لیے بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹی مضرت قبول کر لی گئی اور اس کو قرآن نے 'فتح مبین' سے تعبیر کیا، اسی واقعہ سے استشہاد کرتے ہوئے فقہائے کرام نے بیان کیا ہے کہ اگر دو مفاسد سامنے ہوں اور دونوں سے بچنا ممکن نہ ہو تو پھر کمتر درجہ کے مفسدہ کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔ مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی نظیر میں سیرت بن ہشام کے واسطے سے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ:

"جس زمانہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے ہجرت کر کے حبشہ میں قیام کر لیا تھا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے کسی دشمن نے اسی زمانہ میں نجاشی کے خلاف فوج کشی کی، اس موقع پر صحابہ کرامؓ نے نجاشی کی فتیابی کے لیے بڑے اخلاص اور الحاح سے دعائیں کیں اور مہاجرین کے اس قافلہ کے سردار حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام دیا، جس کی وجہ سے نجاشی کے ہاں ان کا اعتماد اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس واقعہ سے متعلق حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مفصل روایت میں تصریح ہے کہ نجاشی کے ساتھ ہماری یہ ہمدردی اس لیے تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ نجاشی کا دشمن اگر کامیاب ہو گیا تو اس کا سلوک ہمارے ساتھ اتنا اچھا نہ ہوگا جتنا اچھا کہ نجاشی کا ہے" (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سیرت ابن ہشام: ۳۶۱/۱، بحوالہ دین و شریعت: ص: ۲۶۲)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر چند مفاسد جمع ہو جائیں تو نسبتاً جس میں کم خرابی ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جب ایران کے آتش پرستوں اور روم کے عیسائیوں میں جنگ ہو رہی تھی تو اگرچہ دونوں فریق کافر تھے، لیکن چونکہ رومی عیسائی بہ نسبت مجوسیوں کے اسلام سے قریب تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو عیسائیوں کی فتح کی خبروں سے خوشی ہوتی تھی۔ سورہ روم اسی سلسلہ میں نازل ہوئی، عبارت اس طرح ہے:

"وقد كان النبي ﷺ وأصحابه يفرحون بانتصار الروم والنصارى على المجوس وكلاهما كافر، لأن أحد الصنفين أقرب إلى الإسلام وأنزل الله في ذلك سورة الروم" (الحسبة في الإسلام لابن تیمیہ: ص: ۱۳، دار الفكر لبنان)۔ ان ہی واقعات کے پیش نظر ارباب علم و فقہ نے درج ذیل قواعد بیان کیے ہیں:

"إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما" (جب دو مفاسد کا تعارض ہو تو چھوٹے ضرر کا ارتکاب کرتے ہوئے بڑے ضرر سے بچنے کو ملحوظ رکھا جائے گا)۔

"الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" (کم تر نقصان کے ذریعہ بڑے درجہ کے نقصان کو دور کیا جائے گا)۔

”لو كان أحدهما أعظم ضررا من الآخر فإن الأشد يزال بالأخف“ (اگر دو ضرر درپیش ہوں اور ان میں سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑا ہو تو کمتر ضرر کو گوارا کر کے بڑے ضرر سے بچا جائے گا)۔

علامہ ابن تیمیہ اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”إذا تعارضت المصالح والمفاسد والحسنات والسيئات أو تزاحمت فإنه يجب ترجيح الراجح منها فيما إذا ازدحمت المصالح والمفاسد وتعارضت المصالح والمفاسد فإن الأمر والنهي وإن كان متضمنا لتحصيل مصلحة ودفع مفسدة فينظر في العارض له فإن كان الذي يفوت من المصالح أو يحصل من المفاسد أكثر لم يكن مأمورا به بل يكون محرما إذا كانت مفسدته أكثر من مصلحته“ (مجموع الفتاوى شيخ الاسلام: ۲۸۰، ۱۲۹)۔

(جب مصالح و مفاسد، خوبیوں اور خامیوں میں تعارض اور ٹکراؤ ہو جائے تو ضروری ہے کہ ترجیح سے کام لیا جائے، اس لیے کہ امر اور نہی اگرچہ کسی مصلحت کے حاصل کرنے اور کسی مفسدہ کے دور کرنے کو ہی شامل ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ جو عارض سامنے آ رہا ہے اس پر غور کیا جائے، چنانچہ اگر فوت ہونے والی مصلحتیں اور پیدا ہونے والے مفاسد زیادہ ہوں تو وہ مأمور بہ نہیں ہوں گے بلکہ حرام ہوں گے، بشرطیکہ اس کا مفسدہ مصلحت سے زیادہ ہو)۔

ان سارے قواعد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں نفع اور نقصان دونوں پہلو ہو، لیکن نفع کا پہلو غالب ہو تو کمتر درجہ کا نقصان نفع کے حصول کے لیے برداشت کر لیا جائے گا، قانون ساز اداروں کے ممبر بننے میں نفع زیادہ ہے اور نقصان کم۔ نقصان تو یہ ہے کہ ایسے ادارے کبھی کبھی شریعت کے خلاف قوانین بناتے ہیں، اس کا ممبر بننا بظاہر اس میں تعاون کرتا ہے، بالخصوص جبکہ پارٹی اپنی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند بنا دے اور نفع کا پہلو یہ ہے کہ وہ ایسے قوانین کی طرف توجہ دے گا جن سے مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ ہو سکے۔ مساجد، مدارس، عبادت گاہوں اور دین شریعت کی حفاظت ہو سکے۔ ایسے اصول و قوانین بنانے پر وہ زور دے گا جن سے سماج و معاشرہ سے براہیں ختم ہو کر اخلاق و انسانیت کا چراغ جلے، جو اسلام کی آمد کا مقصد ہے، مسلمان قانون ساز اداروں میں رہیں گے تو ملک میں مسلمانوں کا وقار بحال رہے گا، اگر قابل لحاظ تعداد میں مسلمان رہیں تو دوسرے لوگ آزادی کے ساتھ شریعت کے خلاف قوانین نہیں بنا سکیں گے اور اگر ان مجالس سے دوری اختیار کر لی جائے تو ان پر غیروں کا قبضہ ہوگا، پھر ان کے لیے مخالف شریعت قوانین بنانے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی نہیں ہوگی، اس لیے شریعت کی حفاظت ان قانون ساز اداروں کے ممبر بننے ہی میں ہے، محض شریعت کے خلاف قوانین وضع کیے جانے کے خدشہ اور وہم سے ان قانون ساز مجالس کا ترک ہرگز مناسب نہیں ہے، بلکہ اگر ممبر بننے ہوئے یقین بھی ہو کہ یہ قانون ساز ادارہ شریعت کے خلاف قانون بنائے گا تو بھی اس کا ممبر بننا درست ہے، کیونکہ اس ادارہ میں دخل ہو کہ ہی اس فساد کو دور کیا جاسکتا ہے، دور رہنے سے یہ مفسدہ بڑھتا جائے گا اور اس میں استحکام ہوتا جائے گا، ہاں البتہ ان ممبران کے لیے ضروری ہے کہ وہ حصول منفعت و مصالح کی نیت کریں اور قوم اور شریعت کی خدمت کا عزم رکھیں۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

جب قانون ساز ادارے کا رکن بننا جائز ہے تو دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بھی درست ہوگا، خواہ وہ دستور خلاف شریعت قوانین پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، اس لیے کہ قاعدہ ہے: ”إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه“ یعنی ”شیء اپنی تمام لوازمات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے“ البتہ مسلم ممبران بادل نخواستہ ایسے دستور سے حلف لیں، قلبی رضامندی کے ساتھ خلاف شریعت قوانین پر مشتمل دستور سے حلف اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ان دفعات سے رضامند ہونا لازم آئے گا جو شریعت کے خلاف ہیں اور ایک مسلمان کے لیے خلاف شریعت دستور و دفعات سے راضی ہونا ”الرضا بالكفر کفر“ کی وجہ سے جائز نہیں۔

مسلم ممبران کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے دستور سے حلف اٹھاتے ہوئے ان دفعات کی نیت کریں جو شریعت سے ہم آہنگ ہوں۔ ”الأمور بمقاصدها“ اور ”إنما الأعمال بالنيات“ جیسے ضابطہ شرعی کی وجہ سے یہ درست ہوگا اور کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، جیسا کہ یہ جزئیہ ہے:

”وقالوا الكافر إذا تترس بمسلم فإن رماه مسلم فإن قصد قتل المسلم حرم وإن قصد قتل الكافر لا“

(الاشباہ والنظائر، ص: ۵۵)۔

اسی طرح اس دستور سے حلف اٹھانے کا مفہدہ کم ہے اور مصالح زیادہ ہیں، اس لیے ”اہون البلیتین“ اور ”یحوز فی الضرورة ما لا یحوز فی غیرها“ (الامر: ۴، ۱۶۸) کی روشنی میں یہ درست ہوگا۔

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

قرآن کے علاوہ تمام آسانی کتابیں محرف ہیں۔ یہودی یا عیسائیوں کے پاس آج جو بھی تورات یا انجیل کا نسخہ ہے وہ اصل نہیں تحریف کردہ ہے، اس لیے اصلاً اس پر حلف لینا مسلم ممبران کے لیے جائز نہیں ہونا چاہیے، لیکن اگر حلف نہ لیا جائے اور اس مفہدہ سے دور رہا جائے تو بڑی خرابی پیدا ہوگی۔ سیاسی اور قومی سطح پر مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوگا، ان کی جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہیں رہے گی۔ دین و شریعت کی بھی حفاظت خطرے میں پڑ جائے گی، مسلمان عیسائی ممالک میں اقلیتوں میں ہوتے ہیں، ان کے تحفظ کے لیے خود مسلمانوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ وہ جمہوریت سے فائدہ اٹھا کر اگر وہاں کی حکومت میں اپنا اثر و رسوخ بنا سکیں تو ساری مسلم قوم کا فائدہ ہوگا، سب کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ مقاصد شریعت کا بھی تحفظ ہوگا اور اس طرح مسلسل سیاست سے وابستگی کی بنیاد پر غیر اسلامی ملکوں میں بھی رہ کر مسلمان اپنی قوت محسوس کریں گے۔ حکومت کی نظر میں ان کی اہمیت ہوگی اور حکومت آزادانہ طور پر اسلام کے خلاف قوانین وضع نہیں کر سکے گی۔ بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف لینا یقیناً غیر شرعی عمل ہے، لیکن اس کے مقابلے میں منفعت اور مصالح زیادہ ہیں، اس لیے اس چھوٹے مفہدہ کو قبول کر لیا جائے گا، البتہ مسلم ممبران کو چاہیے کہ وہ پہلے اس غیر اسلامی حکومت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کریں، اگر ان کا مطالبہ نہ مانا جائے تو بائبل کی تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھ کر حلف لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”الضرورات تبيح المحظورات“ ”یحوز فی الضرورة ما لا یحوز فی غیرها“ ”إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه“ ”یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام“ ”یختار اہون الشرین“ وغیرہ قواعد پر سوال نمبر ۴ کے جواب کے تحت تفصیلی طور پر ذکر کیے گئے ہیں، ان سے بھی اس کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ کی فقہ اکیڈمی نے منعقدہ ۸ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں با اتفاق آراء غیر اسلامی مملکت میں عدالت کی جانب سے مکلف بنائے جانے پر تورات یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو جائز قرار دیا ہے، فیصلہ کی عبارت یہ ہے:

”اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لیے توریث یا انجیل پر یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا“ (مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے، ص: ۱۲۰)۔

عدالت کی جانب سے پابند بنائے جانے پر حلف اٹھانا جائز ہے جبکہ اس میں صرف شخصی فائدہ ہے تو ملکی دستور کی جانب سے مکلف بنائے جانے پر بھی ان کتابوں کا حلف اٹھانا بدرجہ اولیٰ درست ہوگا، اس لیے کہ اس میں پوری قوم کے مفاد کا تحفظ ہے اور اس میں اسے مکرہ سمجھا جائے گا، حالت اکراہ میں اگر کوئی شخص زبان سے کلمہ کفریہ بھی کہے تو توحید پر قلب کے اطمینان کی صورت میں درست ہے، اسی طرح یہاں بھی بائبل پر حلف اٹھاتے ہوئے مسلم ارکان دل سے اسے ناپسند کریں اور محض دستور کی ایک رسم انجام دینے کی نیت سے اس پر ہاتھ رکھیں اور دل میں یہ یقین پیدا کریں کہ یہ تحریف شدہ کتاب ہے اور منسوخ ہے، خدا اور اس کی کتاب قرآن پر قلبی اطمینان ہو، ان شرائط کے ساتھ مسلم ارکان کے لیے بائبل پر حلف لینا درست ہوگا۔

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغائر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

کسی امیدوار یا سیاسی جماعت کی تائید کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ جس جماعت کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی بات نہ ہو اور اس کا گزشتہ ریکارڈ بھی اچھا ہو، مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرتی ہو، ان کے ساتھ متعصبانہ رویہ نہ ہو، ایسی پارٹی اور اس کے تحت کھڑے ہونے

وائے امیدوار کا بھرپور تعاون کیا جائے گا، ایسی سیاسی جماعت میں شرکت کی جائے گی، اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اور دوسری جماعت میں شرکت کرنا خیانت اور فریب ہے، یہ گناہ اور معصیت پر تعاون ہوگا جو کسی بھی حال میں جائز نہیں، اگر سیاسی میدان میں دو مختلف سیاسی پارٹیاں ہوں، لیکن دونوں کے ایجنڈے اور منشور میں اسلام مخالف دفعات موجود ہوں تو اس صورت میں 'اُہون البلیتین' پر عمل ہوگا جو پارٹی نسبتاً مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو اس کا تعاون کیا جائے گا اور یہ اس کے عزائم، منشور کے دفعات اور ماضی کے ریکارڈ سے معلوم ہو سکے گا کہ کون اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے، فرائض منصبی کون اچھی طرح انجام دے سکتی ہے، قرآن اور حالات کے اعتبار سے معلوم کرنے کے بعد جو مسلمانوں کے لیے نسبتاً مخلص ہو، اس پارٹی میں شرکت کی جاسکتی ہے، مسلمان اگر متحدہ طور پر ایسی پارٹی کا ساتھ دیں اور قابل لحاظ ارکان منتخب ہو کر آئیں تو پارٹی کا رویہ تبدیل ہوگا اور مسلمانوں کے حق میں اس کا معاملہ مزید بہتر ہوگا اور پھر رفتہ رفتہ اسلام مخالف دفعات بھی منشور سے ختم کیے جانے کی راہ ہموار ہوگی۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”والواجب انما هو فعل المقدور وقد قال النبي ﷺ أو عمر بن الخطاب رضي الله عنهما: من قلد رجلا على عصابة وهو يجدي تلك العصابة من هو أرضى منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المؤمنين فالواجب إنما هو الأرضى من الموجود“ (الحسبة في الاسلام لابن تیمیہ: ص: ۱۲)۔

لیکن اگر موجود تمام سیاسی پارٹیاں اپنے عزائم اور گزشتہ ریکارڈ کے اعتبار سے یکساں حیثیت کی حامل ہوں تو امیدوار کے بہتر اور غیر بہتر یا کم اور زیادہ ہونے کے اعتبار سے فیصلہ کیا جائے گا، مسلمانوں کے علاقے سے جتنے امیدوار کھڑے ہیں ان میں نسبتاً جو امیدوار بہتر، فرض شناس، قوم و ملک کا ہمدرد اور مسلمانوں کے حق میں بھلا معلوم ہو اس کو ووٹ دیا جائے، یہ آخری درجے کی بات ہے، ورنہ عام حالات میں امیدوار کے بجائے پارٹی اور اس کے منشور و ایجنڈے کو دیکھا جائے گا، اس لیے کہ ہر امیدوار اپنی پارٹی کے منشور کا پابند ہوتا ہے، کسی امیدوار کو ووٹ دینا گویا اس جماعت کو مستحکم کرنا ہے جس سے وہ وابستہ ہے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟

ایسی جماعتیں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اپنا نصب العین بنا لیا ہو ان کی رکنیت جائز نہیں، یہ گناہ اور معصیت پر تعاون ہے، قرآن نے اس سے صاف طور پر منع کیا ہے:

”ولاتعاونوا على الاثم والعدوان و اتقوا الله ان الله شديد العقاب“ (المائدہ: ۴) (اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

ان کے علاوہ متعدد نصوص ہیں جن میں مسلمانوں کو سختی سے منع کیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ، کفار اور اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو اپنا دوست نہ بنائیں، ان کے قریب نہ جائیں، ان کو اپنا رازدار یا شریک و سہم نہ بنائیں، اللہ کے نزدیک عزت اور خزانہ ہے، اسی کا سہارا تمام سہاروں سے بڑھا ہوا ہے، مسلمانوں کی سرگرمیوں کا مقصد اعلیٰ کلمۃ اللہ ہونا چاہیے۔ ایسی جماعت جس کی بنیاد ہی اسلام کی مخالفت پر رکھی گئی ہو، اس کے ساتھ شریک ہونا گویا اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی اسلام دشمنی میں تعاون کرنا لازم آئے گا جو مذکورہ نصوص کی بنیاد پر درست نہیں۔

اگر کوئی شخص پارٹی میں شریک ہو کر ایجنڈے میں تبدیلی لانے کی نیت کرتا ہے تو بھی اس پارٹی میں شرکت کی گنجائش نہ ہوگی، کیونکہ نیت اگرچہ ان کی صحیح ہے، لیکن وقوع کے اعتبار سے یہ محال ہے، کسی ایک فرد کے لیے پوری پارٹی ہی کے منشور کو بدل دینے کا عزم محض یہ ایک خواب ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے، ایسی جماعت بنتی ہی ہے اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں جو بھی اس میں آئے گا، یہی مخالفت کا عزم لے کر آئے گا، دوسری پالیسی پر عمل ناممکن ہے، اس لیے کہ اگر کوئی اچھی تبدیلی لائی جائے تو پارٹی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا، جیسا کہ امریکہ کا صدر جو بھی بنتا ہے وہ اسی پالیسی کا پابند ہوتا ہے جو وہاں متعین ہے، صدر کی شخصی صلاحیت کوئی کام نہیں دیتی اور یہ دیکھا بھی گیا ہے کہ جو بھی مسلمان بی جے پی اور اس کے حلیف پارٹیوں کے ممبر بنے دنیوی اعتبار سے اس کو عہدہ تول گیا لیکن وہ ایمان کھو بیٹھا، وہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بولنے کے بجائے ان کی مخالفت میں ہی

بولنے لگا، اس سے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے بجائے ان کو سخت نقصان پہنچا چونکہ ان ممبران کو پارٹی کے صدر اور اعلیٰ ذمہ داروں کی نظر میں سرخروئی حاصل کرنا مقصد ہوتا ہے اور ان کو اسی میں اپنی بقا نظر آتی ہے۔

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟

رسول اکرم ﷺ جب مکہ سے مدینہ ہجرت فرما رہے تھے اس وقت آپ ﷺ کو جو دعائیں سکھائی گئی وہ یہ تھی:

واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل: ۸۰) (اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے)۔

اس دعا کا مطلب ایک مکمل سلطنت و حکومت کی اللہ سے طلب ہے، اس لیے کہ جب سلطنت و حکومت رہے گی تو اس کی مدد سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر آسان ہوگا، خدا کے عادلانہ نظام کا نفاذ اور شرعی احکام کی پیروی آزادانہ طور پر ہو سکے گی۔ مقاصد شریعت کا تحفظ ہوگا اور جان و مال، عزت و آبرو کی مکمل حفاظت ہوگی، اگر مستقل حکومت و سلطنت حاصل نہ ہو تو حکومت میں موثر طریقے سے شرکت اور شمولیت سے بھی بہت سی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کا تحفظ ہو جاتا ہے، حکومت و سلطنت کی پشت پناہی کے بغیر فواحش و منکرات سے ملک کو پاک کیا جاسکتا ہے اور نہ دین و شریعت کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

اس لیے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہاں حکومت اسلامی کا قیام مشکل ہے، وہاں مسلمانوں کو چاہیے کہ علیحدہ سیاسی جماعت قائم کریں، یہ جائز ہی نہیں بلکہ موجودہ حالات میں مستحسن اقدام ہوگا۔ سارے مسلمان متحد ہو کر اس جماعت کو کامیاب کریں گے اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو غیر معمولی قوت حاصل ہوگی۔ پارلیمنٹ میں مخالف اسلام باتوں پر یہ آواز اٹھاسکیں گے اور اگر برسر اقتدار حکومت میں یہ شامل ہو جائیں تو مزید مسلمانوں کے وقار میں اضافہ ہوگا اور ان کے سماجی و شرعی مسائل حل ہو سکیں گے، اس کا تجربہ آندھرا پردیش کے باشندگان کو ہے۔ یہاں مجلس اتحاد المسلمین کے نام سے ایک مسلم سیاسی جماعت قائم ہے جس کے حیدرآباد میں سات ایم ایل اے اور ایک ایم پی ہیں۔ اکثریتی تعداد میں بلدیہ کے ممبران ہیں، اس کی وجہ سے پورے شہر میں مسلمانوں کی ایک شان و شوکت ہے، یہاں مسلمان اپنے آپ کو طاقتور محسوس کرتے ہیں۔ دشمنوں کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہاں کے مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور دین و شریعت محفوظ ہے اور اس مسلم سیاسی جماعت کے مقابلے میں تمام فرقہ پرست تنظیمیں متحد بھی ہو جاتی ہیں، اس کے باوجود اس کو شکست نہیں ہوتی اور بڑی تیزی سے یہ جماعت آندھرا پردیش اور دوسری ریاستوں میں فروغ پا رہی ہیں، اسی طرح حال ہی میں آسام میں مولانا بدرالدین اجمل قاسمی نے 'یو ڈی ایف' کے نام سے سیاسی جماعت قائم کی ہے جس کے بھی سیاسی اثرات مرتب ہوئے ہیں، کیرالہ میں بھی بعض مسلم سیاسی جماعتیں ہیں جن پر مسلمانوں نے اعتماد کیا ہے اور سیاسی میدان میں ان جماعتوں نے اچھا رول ادا کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جماعتوں کو ملکی سطح پر لایا جائے اور مسلم نمائندے ہمدرد و مخلص ہوں، اپنے عہدہ سے زیادہ اسلام اور مسلمان انہیں عزیز ہوں، مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جائے، ہاں البتہ جن علاقوں میں مسلم آبادی کم ہے وہاں مصلحتاً کوئی سیاسی جماعت قائم کرنے کے بجائے سیکولر پارٹی کا تعاون ہی مناسب ہوگا۔

۱۰۔ ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لیے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟

خواتین کو قرآن کریم میں بارہا ہدایت دی گئی ہے کہ وہ گھر میں رہیں اور بلا ضرورت شدیدہ گھر سے باہر نہ نکلیں، خدا کی طرف سے مرد اور عورتوں کے درمیان فطری طور پر یہ نظام تقسیم کیا گیا ہے کہ مرد گھر کے باہر کام کریں اور عورتیں امور خانہ داری کو انجام دیں، اسی میں حسن اور عزت کی حفاظت ہے، اسی لیے عورتوں سے کسب معاش کو وابستہ نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے ولی یا شوہر کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ابن جوزی لکھتے ہیں:

”ینبغی للمرأة أن تحذر من الخروج مهمما أمکنها فاتها أن سلمت فی نفسها لم یسلم الناس منها“ (کتاب احکام النساء: ص ۲۰۹) (جہاں تک ممکن ہو عورتوں کو باہر نکلنے سے گریز کرنا چاہیے، اگر وہ فی نفسہ محفوظ رہے بھی تو لوگوں کا اس سے محفوظ رہنا ضروری نہیں ہے)۔

فقہاء نے عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے جن میں سے چند یہ ہیں:



۱۔ ستر تام کے ساتھ گھر سے نکلے۔ یدنین علیہن من جلابیبہن (احزاب)۔

۲۔ اگر شادی شدہ ہو تو شوہر کی اجازت اور غیر شادی شدہ ہو تو والدین یا اولیاء کی اجازت ضروری ہے، خواہ مسافت قصر کے برابر دوری کے لیے نکلے یا اس سے کم، اجازت ہر حال میں ضروری ہے (کتاب احکام النساء: ۲۰۹)۔

۳۔ راستے کے ایک کنارہ سے جائیں اس طرح کہ اختلاط الرجال نہ ہو سکے، چونکہ اصل فتنہ اختلاط سے ہوتا ہے، جب اختلاط نہ ہوگا تو خوف فتنہ کم ہوگا۔

ان میں بنیادی طور پر دو شرطیں قابل لحاظ ہیں: ایک تو یہ کہ کام کرنے کی جگہ مردوں سے اختلاط نہ ہو، دوسرے یہ کہ ستر تام ہو۔

ووٹ دینے میں ان دونوں کا لحاظ رکھا جاسکتا ہے، اس لیے کہ ووٹ دینے میں عورتوں کا قطار الگ ہوتا ہے، حکومت کی جانب سے عورت کارندے موجود رہتی ہیں اور اس کا مکمل نظم ہوتا ہے اور جمہوری نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہوتا ہے، اس سے صرف ووٹ ڈالنے والی عورت کا ہی نہیں بلکہ پوری قوم کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے، اس لیے عورتوں کے لیے ووٹ ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ فتنہ سے مامون رہنے کی صورت میں مردوں کی طرف عورتوں پر بھی بعض صورتوں میں فرض کفایہ اور بعض مخصوص حالات میں فرض عین ہوگا۔

البتہ ایکشن میں امیدوار بننا یا قانون ساز اداروں کی ممبر بننا درست نہیں ہے، چونکہ امیدوار یا ممبر بننے کی صورت میں ان عورتوں کا مردوں سے اختلاط یقینی ہے، پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نمائندگی کے لیے ان کو بیٹھنا ہوگا، پھر ممبر بننے کے بعد اچھے اور برے، اپنے اور غیر، مسلم اور غیر مسلم سب ان کے پاس آئیں گے اور ہر ایک سے ملنا، سب کے مسائل کو سننا اور ان کی ضرورتوں کو پوری کرنا ان کا منصبی فریضہ ہے، میٹنگوں اور جلسہ و جلوس میں شرکت ان کے لیے لازم ہوگی، جس پارٹی کے تحت وہ ایکشن میں حصہ لیں گی اس کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقات اور ربط ضروری ہوگا، اس طرح بہت سے مفادات کا دروازہ کھل جائے گا، ان پر قابو پانا ممبری کے عہدہ پر رہتے ہوئے ناممکن ہے، امیدوار بننے کی صورت میں بھی اختلاط مع الرجال کے ساتھ تقریباً یہی خرابیاں موجود ہیں۔

امیدوار بننے یا ممبر بننے کی صورت میں ستر تام بھی نہیں ہو سکتا، اس میں چہرہ بہر حال کھولنا پڑتا ہے۔ ان کی آواز جو ستر ہے اور اسی ستر کی وجہ سے اذان و اقامت وغیرہ سے انہیں روکا گیا ہے، یہ آواز اجنبی مردوں تک پہنچے گی اور یہ تمام چیزیں نصوص سے ثابت ہیں، اس لیے کسی مصلحت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

رسول اکرم ﷺ نے عورتوں کی حکمرانی سے منع فرمایا، ارشاد فرمایا:

لن یفلح قوم أسندوا أمرهم إلى امرأة (مسند احمد بن حنبل: حدیث نمبر: ۲۰۴۷۴)

(وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنا معاملہ کسی عورت کے سپرد کر دیا)۔

جب اہل فارس نے کسریٰ کی لڑکی کو ملک کی سربراہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة (صحیح البخاری، باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ و قیصر، حدیث نمبر: ۲۰۴۷۴)

(جس قوم نے اپنے ملک کی حکومت عورت کو سپرد کر دیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی)۔

جہاں تک مسئلہ ہے خواتین کے لیے سٹیٹس ریزرو کیے جانے کا تو محض اس کی وجہ سے نصوص سے ثابت شدہ مسئلہ میں کوئی تسہیل نہیں کی جاسکتی، البتہ اس کا حل یہ نکلا جاسکتا ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ خواتین کے لیے سٹیٹس ریزرو نہ کرے، کیونکہ اسلامی نقطہ نظر سے خواتین ممبر نہیں بن سکتیں، جس طرح دیگر مسلم پرسنل لاء ہندوستان میں موجود ہے اور حکومت اسے قبول کرتی ہے۔ شاہ بانو کیس، وندے ماترم، ہم جنس کا نکاح اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن کی مسلمانوں نے بھرپور مخالفت کی اور وہ کامیاب ہوئے، اسی طرح اس معاملے میں بھی سنجیدگی کے ساتھ حکومت کو بتایا جائے اور مکمل کوشش کی جائے اور ان ہی خدشات اور مسائل سے حفاظت کے لیے تو کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو متحدہ طور پر کوئی سیاسی محاذ قائم کرنا چاہیے یا کسی سیکولر پارٹی کے ساتھ سیاست میں سرگرم حصہ لینا چاہیے تاکہ مسلمان کی عزت و آبرو محفوظ رہے۔

☆☆☆

## ایکشن میں شرکت خصوصی حالات کے تناظر میں

مولانا شوکت شاکر صاحب

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت و گواہی کی ہے، جب کوئی شخص کسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیتا ہے تو گویا وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا امیدوار تمام امیدواروں میں امانت و دیانت، جذبہ خدمت خلق اور قوم و ملت کے حق میں نسبتاً دوسروں سے بہتر ہے (کتاب الفتاویٰ: ۶: ۲۶۰) اس لیے کسی ایسے شخص کو ووٹ دینا جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ شخص کرپٹ اور رشوت خور، امانت و دیانت کے وصف سے عاری اور خدمت خلق کے جذبہ سے خالی ہے۔ جھوٹی شہادت کے مترادف ہے، جو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (سورۃ الحج: ۳۰) (پھر بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹی بات سے پرہیز کرو)۔

اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: والذین لا یشہدوں الزور (سورۃ الفرقان: ۷۲) (اور اور جس کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ اور جھوٹی گواہی کی سخت مذمت فرماتے ہوئے اس کو شرک کے ہم درجہ قرار دیا۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا:

أكبر الكبائر الإشرک باللہ وعقوق الوالدين وشهادة الزور وثلاثا أو قول الزور فما زال يكررها حتى قلنا ليته سكت (بخاری: باب اثم من اشرك باللہ وعقوبته في الدنيا والاخرة قال اللہ تعالیٰ: ان الشرك لظلم عظیم ۶۴۰۸)۔ کسی امیدوار کو نامناسب جانتے ہوئے صرف اس بنیاد پر ووٹ دینا کہ وہ اس کے خاندان کا یا رشتہ دار ہے یا اس کے علاقہ یا شہر کا یا اس سے اس کی شخصی ضروریات وابستہ ہیں یہ عمل بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وأقيموا الشهادة لله (سورۃ الطلاق: ۳) (اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو)۔

جس طرح جھوٹی گواہی دینا ناجائز، حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اسی طرح بوقت ضرورت گواہی نہ دینا بھی ناجائز و حرام اور کتمان حق ہے اور خاص طور پر جب کسی حلقہ سے کئی امیدوار میدان میں ہوں، اس میں ایک امیدوار دوسروں کے مقابلہ میں نسبتاً صالح کردار کا حامل ہو، اور اگر اس کو ووٹ نہ دیا جائے تو فرقہ پرست طاقت یا غیر صالح کردار کے حامل افراد کے جیت جانے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں ووٹ دینا واجب ہے اور بغیر کسی شدید عذر کے ووٹ دینے سے احتراز کرنا گناہ ہے، اور عند اللہ اس پر سخت مواخذہ کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تکتبوا الشهادة و من یکتبها فإنه آثم قلبه واللہ بما تعملون علیم (سورۃ البقرة: ۲۸۳) (اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ، جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے، اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے)۔

ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا:

قبل ازیں یہ بات آچکی ہے کہ لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنا اور اس بات کی خواہش کرنا کہ ہمیں اس عہدہ و ذمہ داری کے لیے منتخب کرو، ایک غیر اسلامی بلکہ غیر اخلاقی طریقہ ہے، لیکن موجودہ جمہوریت میں خود امیدوار بننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، کیونکہ عوام اس کو ووٹ دے سکتے ہیں، اپنی خواہش و مرضی سے کوئی اقتدار و عہدہ نہیں دے سکتے ہیں، اس لیے اگر کوئی قابل و باصلاحیت شخص اپنے آپ کو بذات خود امیدوار نہ بنے، تو سارے

مل جامعہ عائشہ نسواں، حیدرآباد۔

خراب لوگ سیاست کے میدان میں کود پڑیں گے اور سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

اسی لیے مندرجہ ذیل شرائط پائے جانے کی صورت میں ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کی گنجائش ہوگی:

الف۔ اسمبلی یا پارلیمنٹ میں قابل و باصلاحیت مسلمان کے آگے نہ بڑھنے کی صورت میں فرقہ پرست ذہنیت کے حامل افراد کی کثرت رہی ہو۔

ب۔ یا کسی حلقہ سے قابل و باصلاحیت مسلمان شخص کی امیدوار نہ بننے کی صورت میں فرقہ پرست شخص کی کامیابی کا امکان ہو۔

ج۔ امانت و دیانت، جذبہ خدمت خلق اور قوم و ملت کے حق میں مفید شخص کے آگے نہ بڑھنے کی شکل میں کرپٹ اور رشوت خور، امانت و دیانت کے وصف سے عاری فرد کی جیت کا امکان ہو۔

د۔ ایکشن میں بحیثیت امیدوار پیش کرنے والا امانت و دیانت، جذبہ خدمت خلق سے سرشار ہو، اور وہ عوام کی مشکلات و مسائل سے واقف اور ان کے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور اپنی بات کو موثر انداز میں اور قانون و منطق کی زبان میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔

ہ۔ ایکشن میں بحیثیت امیدوار پیش کرنے والے کو اس بات کا اندازہ ہو کہ وہ اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے سکے گا اور وہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق ان تک پہنچائے گا جب مال و جاہ مقصود نہ ہو۔

ان ہی مقاصد کے پیش نظر سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے ملکی خزانوں پر مامور کرنے کی درخواست کی تھی۔

قال اجعلنی علی خزائن الأرض اینی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵) (یوسف نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کر دو، میں نگہبان ہوں اور خوب جاننے والا)۔

رسول اللہ ﷺ سے عہدہ قضاء اور امارت کے طلب گاروں کی سخت مذمت کے باوجود غالباً ان ہی افراد کے لیے یہ بشارت و خوشخبری بھی

ثابت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مسلمانوں کا قاضی بنا طلب کیا پھر اس کا انصاف اس کے ظلم پر غالب رہا تو اس کے لیے جنت ہے اور اگر اس کا ظلم انصاف پر غالب رہا تو اس کے لیے دوزخ ہے: من طلب قضاء المسلمین حتی ینالہ، ثم غلب عدلہ جورہ، فله الجنة، و من غلب جورہ عدلہ فله النار (ابوداؤد: باب فی القاضی یحطی: ۲۵۴۵، السنن الکبری للبیہقی: ۲۰۱۶۵)۔

مخالف شریعت قوانین بنانے والے قانون ساز اداروں کی مہمبری:

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تکلیف مالا یطاق کا مکلف نہیں بنایا ہے، اس لیے ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حتی الامکان ظلم و زیادتی کو دفع کرنے یا کم کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے فریادری کرے، مظلوم کی مدد کرے، اور کمزوروں کا تعاون کرے، اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے غیر مسلم یا غیر مسلم ممالک کے ایسے قانون ساز ادارے جو مختلف قوانین بنانے کے ساتھ بعض مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، کا ممبر بننا درست ہوگا، البتہ جہاں تک ممکن ہو سکے ایسے قوانین کی تبدیلی یا ترمیم کی کوشش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: لایکلف اللہ نفساً إلا وسعها (سورہ بقرہ: ۲۸۶) (اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔ دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: فاتقوا اللہ ما استطعتم (سورہ التغابن: ۱۶) (پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرو)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وإذا أمرتکم بأمر فأتوا منه ما استطعتم (مسلم: باب فرض الحج مرة فی العمر: ۲۲۸۰، بخاری: ۶۴۲۳) (جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو حتی الامکان اس کو بجالاؤ)۔

مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ نور اللہ مرقدہ نے بھی غالباً مذکورہ بالا مقصد کے مد نظر انگریز کے دور حکومت میں جبکہ وہ خود جمعیت علماء کے ساتھ ان کے خلاف برسر پیکار تھے، نے مسلمانوں کو ممبر اسمبلی بن کر حکومت میں شامل ہونے کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ وہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہندوستان میں حکومت کا معاملہ بڑی نزاکت اختیار کر چکا ہے، اس لیے اس کے متعلق احکام دینا بہت مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے، میرا خیال ہے کہ علماء اور مشائخ اسمبلیوں میں ممبر بن کر جائیں تو بہتر ہے، اس کے لیے جواز کا فتویٰ دیتا ہوں، اسمبلی میں جس عہد نامے پر دستخط کیے جاتے ہیں اس میں اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کیے جاسکتے ہیں (کفایت الفتی: ۳۹۱/۹، کتاب سیاسیات)۔

دستور سے وفاداری کا حلف:

اگر دستور و منشور قرآن و سنت کے موافق ہو تو اس کی وفاداری کا حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر دستور قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی وفاداری کا حلف اٹھانا جائز نہیں ہوگا، البتہ بوقت ضرورت شدیدہ اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ حلف لیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان ولكن من شرح بالكفر صدرا فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم (سورة النحل: ۱۰۶) (جو کوئی ایمان لانے کے بعد اللہ سے منکر ہوا مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور لیکن وہ جو دل کھول کر منکر ہوا تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے)۔

مسلم ارکان کا بائبل پر حلف لینا:

غیر مسلم ممالک میں اگر مسلم ارکان کو حلف لینا پڑے تو ایسی صورت میں اس کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حلف اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف لے، لیکن اس کی اجازت نہ مل سکے تو بائبل پر حلف لینے کی گنجائش ہوگی، اور یہ حلف معتبر ہوگا اور واضح ہو کہ قرآن یا دیگر کتب سماوی پر ہاتھ رکھنا قسم کے لزوم و صحت کے لیے ضروری نہیں ہے۔

علامہ عبدالرحمن بن محمد عوض الجزیری لکھتے ہیں: وكذلك ينعقد الحلف بالتوراة أو الإنجيل أو الزبور أو الفرقان أو صحف إبراهيم وموسى فهى كلام الله تعالى وينصرف اليمين إلى غير المبدل منها (الفقه على المذاهب الأربعة: ۱۰۹/۳، نیز دیکھئے: شرح منتهى الإرادات: ۳۰۳۹۳)۔

(اور اسی طرح توراة، انجیل، زبور، فرقان، صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ کی قسم کھانے سے حلف منعقد ہو جائے گا۔ یہ سب کلام اللہ ہیں اور یمنیں غیر تبدیل شدہ کلام کی طرف لوٹے گا)۔

سیکولر پارٹی میں مسلمانوں کی شرکت:

وہ سیکولر پارٹیاں جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب و بہتر ہوں، ان میں مسلمانوں کی شرکت اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز و درست ہے، اگرچہ کہ ان کے منشور کی بعض دفعات مسلم مفادات کے مغائر ہوں۔

مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: حامد او مصليا: اگر اس حصہ لینے سے آپ کو احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور آپ حصہ لے کر اہل اسلام کی خدمت کر سکیں اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکیں تو حصہ لے سکتے ہیں (فتاویٰ محمودیہ: ۵۷۰/۳)۔

فرقہ پرست اسلام و مسلم دشمن پارٹیوں میں مسلمانوں کی شرکت:

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، ایسی پارٹی میں مسلمانوں کی شرکت خواہ اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی نیت سے ہی کیوں نہ ہو درست نہیں، اس لیے کہ عام طور پر مشاہدہ یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ایسی پارٹیوں میں شرکت کی انہوں نے اس پارٹی کے منشور و دستور کو تو نہ بدل سیکے، البتہ اسلامی حیثیت و غیرت سے محروم ہو گئے اور قوم و ملت کے لیے مفید ثابت ہونے کے بجائے مضر و نقصان دہ ثابت ہوئے اور غیر مسلم فرقہ پرست سے جتنا مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچتا جتنا کہ ان سے نقصان پہنچتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا:

جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا، البتہ اپنا امیدوار صرف انہی علاقوں سے کھڑا کرے جن علاقوں میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد ہو اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو وہاں دیگر سیکولر پارٹیوں کی مدد کریں تاکہ فرقہ پرست پارٹیوں کو فائدہ نہ پہنچے۔

ہندوستان کے اکابر علماء نے بھی مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی جماعت کی تائید و سرپرستی کی ہے اور مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت نے ان کی سرپرستی میں انتخاب میں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ جنگ آزادی سے قبل کے انتخابات میں بہار کا ایک انتہائی موقر ادارہ امارت شرعیہ کی انڈیپینڈنٹ پارٹی جس کے رکن ابوالحسن حضرت مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت نور اللہ مرقدہ تھے، نے ان کی نگرانی میں انتخاب میں حصہ لیا تھا، چنانچہ اس سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں:

امارت شرعیہ کی انڈیپینڈنٹ پارٹی یونائیٹڈ پارٹی سے بہتر ہے یونائیٹڈ پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دینا سرکار کی تائید کرنا ہے، ان دونوں پارٹیوں کے امیدوار کا مقابلہ ہو تو انڈیپینڈنٹ پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دینا لازم ہے (کفایت المفتی: کتاب سیاسیات: ۳۵۳/۹)۔

اگر پردیش وغیرہ میں شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں جمعیۃ علماء نے بھی ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں انتخاب میں حصہ لیا تھا، اس وقت ایک شخص نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا تھا کہ کانگریس، احرار، خاکسار، جمعیۃ علماء میں سے کس کو ووٹ دیا جائے تو آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جمعیۃ علماء جس شخص کو کھڑا کرے اس کو ووٹ دینا چاہیے، کیونکہ جمعیۃ علماء کا مقصد مسلمان قوم کی بہتری ہے ذاتی غرض کچھ نہیں (کفایت المفتی: کتاب سیاسیات: ۳۹۳/۹)۔

خواتین کا ووٹنگ میں حصہ لینا:

ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت و گواہی کی ہے اور جس طرح مرد کسی کے حق میں گواہی دے سکتا ہے، عورت بھی گواہی دے سکتی ہے۔

مفتی اعظم حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عورتوں کا ووٹ بنامنعونہ نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا (کفایت المفتی: کتاب سیاسیات: ۳۲۹/۹)۔

خواتین کا الیکشن میں شریک ہونا اور قانون ساز ادارے کا ممبر بننا:

خواتین شریعت کے مکلف، اقامت دین، فرائض کی ادائیگی، ممنوع و حرام چیزوں سے اجتناب، دعوت الی اللہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں وہ مردوں کی طرح ہیں اور شارع کے عمومی خطاب جیسے: ”یا ایہا الناس“ یا ”یا ایہا الذین آمنوا“ میں یہ بھی داخل ہیں۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ مرد و عورت کے لیے ایک ہی قانون ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

فاستجاب لہم ربہم انی لا اذیبع عمل عامل منکم من ذکر أو أنثی بعضکم من بعض (سورۃ آل عمران: ۱۹۵)  
(جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو)۔

اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنما النساء شقائق الرجال (سنن ابی داؤد: باب فی الرجل یجد البتہ فی منامہ ۲۲۹، سنن الترمذی: ۱۱۲) (عورتیں مردوں کے ہی مثل ہیں)۔

مذکورہ بالا نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام شریعت میں مرد و عورت یکساں ہیں، البتہ اگر کسی کے استثناء اور خصوصیت پر دلیل قائم ہو جائے تو پھر وہ حکم اسی کے ساتھ خاص ہوگا۔

علاوہ ازیں شریعت کے بعض احکام زمان و مکان، احوال و عرف کے بدلنے سے بھی بدل جاتے ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا خواتین کے لیے الیکشن میں شریک ہونا اور قانون ساز ادارے کا ممبر بننا درست ہے؟

بعض علماء کرام اس کے جواز اور بعض اس کے عدم جواز کے قائل ہیں:

**مانعین کے دلائل اور اس کا تجزیہ:**

جو حضرات خواتین کے لیے قانون ساز ادارے یا مجلس شوریٰ کے ممبر بننے کو جائز نہیں سمجھتے ان کی سب سے اہم دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (سورة الاحزاب: ۳۳)۔

اس آیت سے مانعین استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو قرآنی البیوت کا حکم دیا ہے، لہذا بلا ضرورت شدیدہ اور بلا کسی حاجت شرعی کے گھر سے باہر نکلنا درست نہیں اور خواتین کے لیے قانون ساز ادارے یا مجلس شوریٰ میں شرکت نہ ضرورت شدیدہ میں داخل ہے اور نہ حاجت شرعیہ میں، اس لیے ان کا ان محکموں میں شریک ہونا جائز نہیں ہے۔

اس آیت سے اس موقف پر استدلال کئی اعتبار سے مضبوط نہیں ہے۔

الف۔ آیات کا سیاق و سباق ازواج مطہرات سے متعلق غیر معمولی احکام و فضائل پر مشتمل ہے، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی البیوت کا حکم بھی انہیں کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ ایک عمل صالح پر دوہرا اجر اور ایک عمل بد پر دوہرا عذاب و سزا کا حکم کہ یہ صرف امہات المؤمنین کے ساتھ خاص ہے۔

ب۔ قرآنی البیوت کے حکم کے باوجود جب سیدۃ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کی شرعی واجبات میں سے سمجھا تو گھر سے ہی نہیں بلکہ مدینہ سے بصرہ کی طرف خروج کیا، اور اس فوج کی قیادت کی جس میں دو عشرہ مبشرہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے علاوہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

ج۔ خواتین آج کل مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہیں، شرعی حدود میں رہتے ہوئے خواتین کو تعلیم و تدریس اور طب کے میدان میں خدمات انجام دینے کی اجازت دی گئی۔ خود اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے عورتوں کے لیے ملازمت کو جائز قرار دیا ہے (اٹھارہواں فقہی سمینار (مدروائی) ۲ مارچ ۲۰۰۹ء)۔

**دوسری دلیل:**

الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم (سورة النساء: ۳۳) (مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں)۔

مانعین اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر حاکم قرار دیا ہے، خواتین کے قانون ساز ادارے یا مجلس شوریٰ میں شرکت کی وجہ سے قلب موضوع لازم آئے گا جو کہ جائز نہیں ہے۔

لیکن اس آیت سے استدلال تام نہیں ہے، کیونکہ آیت میں جس قوامیت کا تذکرہ ہے اس کا تعلق معاشرتی اور خانگی زندگی سے ہے، قانون ساز ادارے یا مجلس شوریٰ کے ممبر بننے کی وجہ سے خواتین کو مردوں پر قوامیت یا ولایت عامہ حاصل نہیں ہوتی ہے، اس لیے اس آیت سے مذکورہ بالا استدلال درست نہیں ہے۔

**تیسری دلیل:**

جو حضرات کہتے ہیں کہ عورتوں کا قانون ساز ادارے کا رکن بننا شریعت کے مطابق نہیں ہے، ان کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے جن میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وَأُمُورُكُمْ إِلَى نِسَائِكُمْ فَبَطْنِ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا (جامع الترمذی: ۲۲۲۵ قال ابو عیسیٰ: هذا

حدیث غریب)۔ ”یعنی جب معاملات عورتوں کے سپرد کر دیے جائیں تو زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے۔“

لیکن اس حدیث سے استدلال بھی محل نظر ہے، کیونکہ حدیث میں جس صورت کی مذمت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تمام تر فیصلے عورتوں ہی کے حوالے کر دیے جائیں اور انہی کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے اور مرد ہر معاملے میں عورتوں کے پیچھے چلے لگیں، لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ ان سے کبھی مشورہ لینا جائز نہیں۔

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بعض معاملات میں اور خاص طور سے ان کی شادی کے وقت ان کے شوہر کے سلسلہ میں مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے (سنن ابوداؤد: باب فی الاستیمار)۔

چوتھی دلیل:

لنا بلغ رسول اللہ ﷺ أن أهل فارس قد ملكوا عليهم بنت كسرى۔ قال: لن يفلح قوم و لو أمرهم امرأة (بخاری: باب الفتنة التي تموج كموج البحر) (جب نبی کریم ﷺ کو خبر ملی کہ فارس کے لوگوں نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی)۔

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مانعین نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فرمان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس قوم کو فلاح و کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی ہے جس کی سربراہی عورت کے سپرد ہو۔ اس لیے خواتین کے لیے قانون ساز ادارے یا مجلس شوریٰ میں شرکت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

مانعین کا اس روایت سے بھی استدلال ناقص ہے، کیونکہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنے ملک کا بادشاہ اور سربراہ اعلیٰ بنا لیا تھا اور اس دور کے بادشاہ دوسرے براہ اعلیٰ اپنے ملک کے سیاہ و سپید کے مالک ہوا کرتے تھے، وہ عام طور سے کسی قانون کے پابند نہیں ہوا کرتے تھے، وہ قانون سازی میں خود مختار اور اپنی مرضی کے مالک ہوا کرتے تھے۔ اسلام ایسی بادشاہت اور سربراہی کو نہ تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی اس کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام میں اسلامی قوانین کی پابندی ہر ایک کے لیے لازم و ضروری ہے۔

جمہوری ملک میں قانون سازی کا اختیار کسی ایک فرد شخص کو نہیں ہوتا بلکہ پارلیمنٹ کو ہوا کرتا ہے جو متعدد موافق و مخالف پارٹیوں کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی خاتون ممبر پارلیمنٹ یا ممبر اسمبلی یا قانون ساز ادارے کا ممبر بن جائے تو نہ ان کو تنہا قانون سازی کا اختیار حاصل ہوگا اور نہ ہی نفاذ قانون کا۔ زیادہ سے زیادہ قانون سازی کے وقت رائے دینے کا اختیار ہوگا، الحاصل یہ کہ خاتون کا پارلیمنٹ یا ممبر اسمبلی یا قانون ساز ادارے کا ممبر بننے سے اس کو ولایت کبریٰ و عامہ حاصل نہیں ہوتی ہے جس کی شرعاً ممانعت ہے۔

مجوزین کے دلائل:

بعض علماء کا خیال ہے کہ خواتین کے لیے شرعی حدود میں رہتے ہوئے پارلیمنٹ، اسمبلی اور قانون ساز ادارے کا ممبر بننا جائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بعض خواتین عقل و شعور کے لحاظ سے مردوں پر بھی فائق ہوتی ہیں اور ان کی رائے وقت و حالات اور ماحول سے زیادہ ہم آہنگ ہوا کرتی ہے اور بسا اوقات خود نبی اکرم ﷺ نے بھی عورتوں سے مشورہ لیا ہے اور اس پر عمل بھی کیا ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ مشہور ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ وہ قربانی اور حلق کر کے احرام کھول دیں تو تین مرتبہ اعلان کرنے کے باوجود کوئی بھی نہیں اٹھا۔ چونکہ بظاہر دہر کر کی گئی صلح کی وجہ سے صحابہ کرام مغموم و بے چین تھے، شدت غم کی وجہ سے ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس لیے ان سے یہ عمل سرزد ہوا، یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ آپ کے ایک اشارے پر جان دینے والے صحابہ آپ ﷺ کے بار بار اعلان کے باوجود تعمیل کے لیے فوراً نہیں اٹھ رہے تھے، اس پر آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ بات ذکر فرمائی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ آپ مزید کچھ کہنے کے بجائے خود اپنے جانوروں کو قربان کر کے حلق کرنے والے کو بلائیں اور حلق کر لیں، چنانچہ آپ نے اسی مشورے پر عمل فرمایا اور صحابہ نے آپ ﷺ کو یہ عمل کرتے

دیکھا تو سب صحابہؓ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قربانی اور حلق کرنے لگے (باب الشروط فی الجہاد والمصالحة مع الحرب و کتابہ الشروط)۔  
دوسری دلیل:

مجوزین کی طرف سے دوسرا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب حضرت فاروق اعظمؓ نے خلیفہ کے لیے چھ افراد پر مشتمل ایک ایک کمیٹی بنا دی تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے یہ فرمایا کہ میں اپنی خلافت سے دستبردار ہو جاتا ہوں اور میں خود لوگوں کی آراء معلوم کر کے کسی کو متعین کروں گا، باقی سب نے کہا ٹھیک ہے تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ تین دن تک لوگوں کی رائے معلوم کرتے رہے، چنانچہ تاریخ میں ہے:

”ثم نهض عبدالرحمن بن عوف رضى الله تعالى عنه يستشير الناس فيهما ويجمع راي المسلمين ... حتى خلص الى النساء المخدرات في حجابهن“ (البدایہ والنہایہ: ۷، ۱۶۷)، (عبدالرحمن بن عوفؓ اٹھے اور ان دونوں (حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) کے بارے میں لوگوں سے مشورہ شروع کیا اور مسلمانوں کی آراء جمع کرنی شروع کیں..... یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں کے پاس بھی ان کے پردے کے ساتھ پہنچ گئے)۔

لہذا ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر خواتین شوریٰ کی رکن ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ خواتین حدود حجاب کے ساتھ ہوں۔

تیسری دلیل:

مجوزین کی دلائل میں سے ایک اہم دلیل سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور خطبہ بھی ہے جس میں انہوں نے مہر کے سلسلہ میں یہ اعلان کیا تھا کہ کوئی بھی شخص چالیس اوقیہ سے زیادہ مہر مقرر نہ کرے، جو بھی اس سے زیادہ مہر مقرر کرے گا اس زیادتی کو میں بیت المال میں رکھ دوں گا۔ اس پر ایک خاتون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا عمر! تجھے یہ اختیار کیوں کر ہے؟ تو حضرت عمر نے فرمایا کیوں نہیں؟ تو اس خاتون نے کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَإِن أُرْتَدِمُوا فِئْتَانِ مِن مِّمَّنْ لَأُخَذُوا مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا** (سورۃ النساء: ۲۱-۲۲، کنز العمال: ۳۵۸۰۰، مصنف عبدالرزاق: ۱۰۲۲۰)۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے اس معقول اعتراض کو تسلیم کیا اور دوبارہ خطبہ کے لیے لوگوں کو جمع کیا اور برملا اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے فرمایا: **امراة أصابت و رجل اخطا** اور اپنا بیان واپس لے لیا۔ شاید یہ کہ اگر اس خاتون کی طرف سے یہ اشکال نہ ہوتا تو اس کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی، ظاہر ہے کہ اس مجمع عام میں اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہوگی لیکن اس کے باوجود اس کی طرف ایک عورت کی نگاہ گئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات جس مسئلہ کی طرف سے بڑے بڑے صاحب علم مرد کی نظر نہیں پہنچتی وہاں تک ایک عورت کی نظر پہنچ سکتی ہے، اس لیے قانون ساز ادارے میں خواتین کی رائے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے ان کو ممبر بننے کی بھی گنجائش ہونی چاہیے۔

چوتھی دلیل:

مجوزین کی ایک اہم دلیل سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ اور قانون بھی ہے جو انہوں نے فوجیوں کے بارے میں کیا تھا کہ کسی بھی فوجی کو محاذ جنگ پر چار ماہ سے زیادہ نہ روکا جائے، حسب معمول رات میں گشت کرتے ہوئے آپؓ کا گزر ایک مکان سے ہوا، اس مکان سے ایک خاتون کے عشقیہ اشعار پڑھنے کی آواز آرہی تھی، صبح میں جب آپؓ نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر کئی مہینوں سے اس سے دور جہاد میں مصروف ہے۔ اس لیے وہ شدت جذبات سے مفلوب ہو کر اشعار پڑھ رہی تھی۔ آپؓ نے اپنی صاحبزادی ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے بغیر کتنے دنوں تک صبر کر سکتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا چار ماہ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے تمام فوج کے ذمہ داروں کو حکم نامہ جاری کیا کہ کسی بھی فوجی کو چار ماہ سے زیادہ محاذ پر نہ روکا جائے۔ اس واقعہ میں ایک عورت کی رائے کو باضابطہ قانون کی شکل دے دی گئی اور چاروں دبستان فقہ نے اس قانون کو تسلیم کیا ہے، جب کسی عورت کی رائے کو قانونی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے تو پھر عورتوں کے لیے قانون ساز ادارے کا ممبر بننا جائز کیوں کر نہیں ہو سکتا ہے؟



## پانچویں دلیل:

خواتین منصب اجتہاد و افتاء پر بلا اختلاف فائز ہو سکتی ہے جیسا کہ سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس مقام پر فائز تھیں۔ لایشرط فی المفتی الحریة والذکورة والنطق اتفاقاً، فتصح فتیاء العبد والمرأة والأخرس (الموسوعة الفقهية: مادة فتوی) (مفتی کے سلسلہ میں مذکر ہونا، اور قادر علی الکلام ہونا بالاتفاق شرط نہیں ہے لہذا غلام، عورت اور گونگے کا فتویٰ دینا صحیح ہے)۔

اور سیدنا امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں قاضی بھی ہو سکتی ہے، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

وأما الذکورة فلیست من شرط جواز التقليد فی الجملة، لأن المرأة من أهل الشهادات فی الجملة إلا أنها لا تقضى بالحدود والقصاص (البدائع: کتاب ادب القاضی)۔

جب ایک عورت مفتی و قاضی کا عہدہ حاصل کر سکتی ہے تو اگر وہ شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے قانون ساز ادارے کا ممبر بنتی ہے تو اس کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔

## چھٹی دلیل:

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں بازار کے ایک محکمہ کی ذمہ داری حضرت شفاء بنت عبد اللہؓ کو دی تھی، بعض محققین اس واقعہ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، لیکن یہ بات تو مسلم ہے کہ حضرت شفاء بنت عبد اللہؓ اپنے زمانہ کے ایک انتہائی عقلمند باشعور خاتون تھیں اور سیدنا حضرت عمر فاروقؓ ان کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: وکان عمر رضی اللہ عنہ یقدمها فی الراى ویرضاها (اسد الغابة: ۷۱۷۷)۔

مجوزین حضرات کا خیال ہے کہ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے اکابر صحابہ کی موجودگی میں اس اہم ذمہ داری کے لیے ایک خاتون کا انتخاب درحقیقت ان کی قابلیت و عقل و شعور اور اس میدان کے مسائل سے آگہی اور اسلام میں اس کی گنجائش تھی اس لیے ہی کیا ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی عورت کے اندر صلاحیت و قابلیت ہو اور وہ شرعی حدود کی رعایت کر سکتی ہو تو اس کے لیے قانون ساز ادارے وغیرہ کا ممبر بننے کی گنجائش ہونی چاہیے۔

ہندو پاک کی بعض علماء کی تحریروں سے خاص حالات میں خواتین کے کونسل وغیرہ کے ممبر بننے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عورتوں کا کونسل میں جانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا، لیکن اگر جائیں تو حجاب کے ساتھ جانا ضروری ہوگا (کفایت المفتی: ۴۱۹)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

اسلامی نقطہ نظر سے عورت ایکشن میں امیدوار نہیں ہو سکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لیے سیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کم تر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو کبھی انتخابی امیدوار بنائیں (راہ عمل: ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸)۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فریقین کے دلائل پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

بہر حال اس مسئلہ میں دونوں طرف کچھ دلائل ہیں، لیکن کوئی ایسی واضح نص بھی موجود نہیں ہے، جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ انہیں شوری میں شامل نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات طے ہے کہ اگر انہیں شوری میں شامل کیا جائے تو حجاب شرعی کے احکام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوگا۔

☆☆☆

## ایکشن کے شرعی مسائل

مفتی محمد عارف بانڈا لٹا سٹی

ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جمہوری نظام میں عوام کے انتخاب سے حکومت قائم ہوتی ہے، اس لیے حکومت اور پارلیمنٹ میں عوامی نمائندگی کے طلبگار لوگوں کے بارے میں عوامی رائے معلوم کرنا جمہوری طرز حکومت کا ایک اہم عمل ہے اور اسی مقصد کی خاطر ایکشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ اس میں عوام اپنی مرضی اور اختیار کے مطابق ووٹ دے کر کسی کو اپنا نمائندہ منتخب کر لیں۔

ووٹ کے ذریعہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں شخص میری نظر میں اس عہدہ کے لیے مناسب اور موزوں ہے، اور ووٹ دینے والا ووٹ کے ذریعہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ یہ شخص میری نظر میں دوسروں کے بالمقابل آسبلی کی رکنیت یا حکومت کا زیادہ اہل ہے، اس لیے ووٹ شرعی اعتبار سے ایک شہادت ہے، کیونکہ شہادت کی حقیقت اس پر صادق آتی ہے۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

الشهادة في اللغة البيان والإظهار لما يعلمه، وشرعا: إخبار عن ثبوت الحق للغير على الغير (الموسوعة الفقهية ۱۲۳۵) (شہادت لغت میں اس بات کا بیان اور اظہار ہے جو وہ جانتا ہو، اور شرعاً کسی ایک کے بجائے دوسرے کے لیے حق کے ثبوت کی خبر دینا شہادت ہے)۔

إخبار حاكم من علمه ليقضي بمقتضاه (الشرح الكبير ۳، ۱۶۳) (علم کے مطابق حاکم کو خبر دینا تاکہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے)۔  
ظاہر ہے کہ ووٹ میں ووٹ دہندہ اسی بات کا اظہار کرتا ہے کہ فلاں امیدوار کے بالمقابل اس منصب کا حقدار میرے علم کے مطابق فلاں شخص ہے، اسی لیے میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ اس لیے ووٹ شرعی اعتبار سے شہادت ہے، اور اس پر شہادت کے احکام جاری ہوں گے، غصہ حاضر کے معروف فقہیہ حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

”شرعی اعتبار سے ووٹ ایک شہادت ہے، آپ جس کو ووٹ دیتے ہیں گویا اس کے بارے میں یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص آپ کی نظر میں آسبلی کی رکنیت یا حکومت کا اہل ہے اور آپ کے حلقہ انتخاب میں آپ کے نزدیک اس منصب کے لیے اس شخص سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہے، لہذا ووٹ پر شرعی اعتبار سے وہ تمام احکام جاری ہوتے ہیں جو شہادت پر جاری ہوتے ہیں“ (اسلام اور سیاست حاضرہ: ۸)۔

ووٹ دینے کا حکم:

ووٹ چونکہ ایک شہادت ہے اور ادائے شہادت کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ فرض کفایہ ہے، یعنی اگر چند لوگ جن سے مقصد شہادت کی تکمیل ہو جاتی ہے، اگر شہادت دے دیں تو یقینہ سارے لوگوں سے شہادت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔

الشهادة فرض تلزم الشهود ولا يسعهم كتمانها إذا طال بهم المدعى لقوله تعالى: ”ولا يَأْبُ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا“ وقوله تعالى: ”ولا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبِهِ“ (هدايہ: ۳۰، ۱۱۶)۔

(شہادت ایک فرض ہے جو گواہوں پر لازم ہے اور مدعی کی جانب سے مطالبہ کی صورت میں اس کو چھپانے کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: گواہان کو جب بلا یا جائے تو وہ انکار نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: شہادت کو مت چھپاؤ جو اس کو چھپائے وہ دل کا گنہگار ہوگا)۔

”اداء شہادت فرض کفایہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَأَقِمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ“ (اللہ تعالیٰ کے لیے شہادت قائم کرو، اور ارشاد ہے: ”وَلَا يَأْبُ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا“ (اور گواہان نہ انکار کریں جب ان کو بلا یا جائے)۔ جب ایک جماعت نے شہادت کا عمل کر لیا اور ان میں سے اتنے لوگوں نے گواہی دے دی جن کا گواہی دینا کافی ہے تو باقی لوگوں کے ذمہ سے اداء شہادت کا فریضہ ساقط ہو گیا، کیونکہ شہادت کا مقصد حقوق کی حفاظت ہے اور یہ مقصد بعض لوگوں کے گواہی دینے سے حاصل ہو جاتا ہے اور اگر سب لوگ گواہی دینے سے انکار کر دیں تو سب گنہگار ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شہادت کو مت چھپاؤ جو اس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا“ (الموسوعۃ الفقہیہ ۲، ۳۴۰)۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں جو حکومت بھی برسر اقتدار آتی ہے وہ انتخاب میں کثرت رائے کی بنا پر اقتدار کے منصب تک پہنچتی ہے اور اس میں ایک ایک ووٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، کیونکہ بہت سی مرتبہ ایک ووٹ کی کمی کی وجہ سے مناسب اور موزوں شخص منصب سے محروم رہ جاتا ہے اور نااہل کو منصب مل جاتا ہے، گویا عام قضا یا میں چند لوگوں کی گواہی سے حقدار کو حق مل جاتا ہے، لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے کہ یہاں ووٹ کا مقصد منصب کے لیے متعدد امیدواروں میں سے سب سے زیادہ موزوں کو منصب کا حقدار بتانا اور اس کو منصب دلانے کی کوشش کرنا ہے اور ایک ووٹ بھی موزوں شخص کو محروم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے، کیونکہ اس میں بقول اقبال ”بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لائیں کرتے“ گویا یہاں صورت حال یہ ہے کہ ووٹ دینے میں ایک شخص کی کوتاہی کی وجہ سے بھی مقصد کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر چند لوگوں کی شہادت سے مقصد حاصل نہ ہو تو پھر سارے لوگوں پر شہادت فرض عین ہو جاتی ہے۔

وقد يكون أداء الشهادة فرض عين إذا كانت لا يوجد غيره ممن يقع به الكفاية، و توقف الحق على شهادته فإنه يتعين عليه الاداء، لانه لا يحصل المقصود الا به (الموسوعۃ الفقہیہ: ۲، ۳۴۰)۔

(گواہی دینا کبھی فرض عین ہو جاتا ہے، جب اس کے علاوہ کوئی گواہ نہ ہو جس کی گواہی کافی ہو اور اس کی گواہی پر حق ثابت ہونا موقوف ہو تو ایسی صورت میں متعین طور پر اس کے لیے گواہی دینا لازم ہے، کیونکہ اس کے بغیر شہادت کا مقصد حاصل نہ ہوگا)۔

ظاہر ہے کہ ایک ایک ووٹ موزوں شخص کے آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے اور ایک ووٹ کی کمی بھی اس کی ناکامی کا ذریعہ بن سکتی ہے، اس لیے ووٹ دینا فرض عین ہے اور ہر ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ ووٹ دے کر موزوں شخص کو منصب تک لانے کی کوشش کرے، تاکہ ملک کی قیادت صحیح ہاتھوں میں جاسکے۔

البتہ اگر حالات سازگار ہوں اور ووٹ ڈالنے کے لیے جانے میں جان و مال کا خطرہ لاحق ہو جیسا کہ موجودہ زمانہ میں بعض مرتبہ ایسے حالات ہو جاتے ہیں تو پھر اس صورت میں یہ فریضہ ساقط ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اپنی جان کا خطرہ میں ڈال کر دوسروں کو نفع پہنچانا لازم نہیں ہے اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

ولا يضار كاتب ولا شهيد (سورة البقره: ۲۸۱) (کاتب اور گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: لا ضرر ولا ضرار (موطا امام مالک: ۲۸۹۵) (نہ ضرر پہنچانا ہے اور نہ ہی ضرر اٹھانا ہے)۔

ایشیئن میں بحیثیت امیدوار خود کو پیش کرنے کا حکم:

ایشیئن میں بحیثیت امیدوار خود کو پیش کرنا درحقیقت منصب و عہدہ کو طلب کرنا ہے اور شریعت اسلامیہ میں عام حالات میں منصب و عہدہ کی طلب ناپسندیدہ ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يا عبد الرحمن بن سمره! لا تسأل الإمارة فإن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها (بخاری: ۴۱۲۷) (اے عبدالرحمن بن سمرہ! امارت مت مانگو، کیونکہ اگر تمہیں مانگ کر امارت ملے گی تو تم اس کے حوالے کر دیے جاؤ گے اور اگر بغیر مانگے مل جائے تو اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تمہاری مدد کی جائے گی)۔

لیکن بعض ایسے احوال میں جبکہ مصلحت کا تقاضا ہو کہ انسان خود کو بحیثیت امیدوار پیش کرے اور وہ خود کو دوسروں کے بالقابل اس منصب کے لیے زیادہ بہتر سمجھتا ہو اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ اس کے بجائے کسی دوسرے کو اس منصب کے ملنے کی صورت میں قوم و ملت کا نقصان ہوگا اور یہ منصب پر آ کر لوگوں

کو نفع پہنچا سکے گا اور لوگوں کے حقوق کا تحفظ کر سکے گا تو ایسی صورت میں برائے مصلحت خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا شرعاً ناپسندیدہ نہیں ہے، بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے قرآن کریم میں اللہ عزوجل نے آپ کی اس بات کو نقل کیا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا (سورہ یوسف: ۵۵) (انہوں نے) (عزیز مصر سے) کہا: مجھے زمین کے خزانے پر نگراں مقرر کر دیجئے، میں حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں۔

نیز حضرت عثمان بن العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا:

يا رسول الله! اجعلني إمام قومي، فقال النبي ﷺ: أنت إمامهم، واقتد بأضعفهم، واتخذ مودنا، لا يأخذ على أذانه أجرا (مسند احمد: ۱۵۶۶۶، ترمذی: ۲۶۶۶)۔

(یا رسول اللہ مجھے میری قوم کا امام بنا دیجئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس کے امام ہو اور کمزوروں کی رعایت کرنا اور کسی ایسے شخص کو موزن بنا لینا جو اذان دینے کی اجرت نہ لے)۔

اور شاید ایسی حالت میں ضرورت و مصلحت کے تقاضے کے پیش نظر خود کو عہدہ و منصب کے لیے پیش کرے اور عہدہ ملنے کے بعد عدل و انصاف قائم کرنے والوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت ہے:

من طلب قضاء المسلمين حتى يناله ثم غلب عدله جوره فله الجنة ومن غلب جوره عدله فله النار (سنن ابی داؤد: ۱۰۶، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) (جس نے مسلمانوں کے عہدہ قضاء کو طلب کیا، اور اسے وہ عہدہ مل بھی گیا اس کے بعد اس کا عدل اس کے ظلم پر غالب رہا تو اس کے لیے جنت ہے، اور جس کا ظلم و جور اس کے عدل پر غالب ہو گیا تو اس کے لیے جہنم ہے)۔

اور الموسوعة الفقهية کی عبارت سے تو یہ وضاحت بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایک شخص کے سوا کوئی بھی مناسب اور موزوں نہ ہو تو اس پر اس عہدہ کو طلب کرنا واجب ہو جائے گا۔

يختلف الحكم باختلاف حال الطالب، فإن كان لا يصلح لها إلا شخص وجب عليه أن يطلبها... وإن كان هنالك من هو أولى منه كره له طلبها وإن كان غير صالح لها حرم عليه طلبها (الموسوعة الفقهية ۶: ۲۱۸، تحفة المحتاج ۷: ۵۳۰، واسنی المطالب ۱۰۸: ۴)۔

(عہدہ کو طلب کرنے کا حکم طالب کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہے، چنانچہ اگر اس کے لیے صرف ایک ہی شخص مناسب و موزوں ہو تو اس پر عہدہ کو طلب کرنا واجب ہے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس سے زیادہ موزوں ہو تو اس کے لیے اس کو طلب کرنا مکروہ ہے اور اگر اس میں اس کی صلاحیت نہیں ہے تو اس کے لیے اس کو طلب کرنا حرام ہے)۔

فقہی الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

”حقوق کی حفاظت اور ظلم سے بچاؤ کے لیے انتخابی ایکشن میں حصہ لینا بھی درست ہے“ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۱۰/۲۱)۔

مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

عام اسلامی حکم یہی ہے کہ از خود کسی سرکاری عہدے یا منصب کو اپنے لیے طلب کرنا جائز نہیں اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا، لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نااہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اجعلنی علی خزائن الارض کہنا اسی صورت پر محمول ہے، اس شرعی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ انتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلب اقتدار کی بنیاد پر پورا نظام حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں ہے اور اگر منشاء صرف طلب اقتدار ہو یا دوسرے اہل لوگ موجود ہوں یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظام انتخابات میں امیدوار بننا جائز نہیں، لیکن اگر موجودہ نظام کو بدلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو صالح اور اہل افراد اگر طلب اقتدار کے

جذبے کے بجائے اصلاح حال کی غرض سے اس میں شامل ہوں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفاسد سب و شتم، غیبت اور دوسرے محرمات و منکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو جو اس دور میں شاذ و نادر ہے (قادی عثمائی ۳۳/۵۰۷)۔

مخالف شریعت قانون بنانے والے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

جمہوریت کی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ اس میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس میں ایک ادارہ قانون ساز ہوتا ہے جو قانون بناتا ہے اور بنائے جانے والے بہت سے قوانین شریعت اسلامیہ کے صریح خلاف ہوتے ہیں جبکہ کسی مسلمان کے لیے کسی ایسی قانون سازی میں شرکت جائز نہیں ہے جو خلاف شرع ہو، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ بہت بڑی معصیت اور کھلی گمراہی ہے اور اللہ کے فیصلہ کو نافذ کرنا یا فریضہ ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما (النساء: ۶۵) (تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خلاف شریعت قانون سازی بہت بڑی معصیت ہے اور ایسی جماعت میں شامل ہونا جو معصیت کرتی ہو اور جس میں شرکت معصیت میں مبتلا کرنے والی ہو ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

لیکن یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ قانون ساز اداروں کے بنائے ہوئے قوانین تمام شہری کے لیے ہوتے ہیں اور بسا اوقات مسلمانوں کے لیے ناقابل عمل یا نقصان دہ ہوتے ہیں اور ایسے اداروں میں کوئی مسلمانوں کا نمائندہ ہو تو وہ اس طرح کے قوانین کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے اور اس قانون کی اصلاح کی کوشش کر سکتا ہے اور اس طرح قانون سازی کے دوران اس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور بڑے نقصان کو دور کیا جاسکتا ہے اور ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اسلامی قوانین کا نفاذ ممکن نہیں یا جہاں مسلم اکثریت ہونے کے باوجود وضعی قوانین کا تسلط ہے، وہاں اس کی اہمیت بہت ہی بڑھ جاتی ہے اور احوال و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اداروں میں نیک اور خداترس افراد کے نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات پوری قوم آزمائش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ایک شخص کی رکاوٹ بڑی راحت اور فائدہ کا باعث بن جاتی ہے۔ اس پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ اس مقصد کے تحت اس ادارے میں ایک مسلمان کی شمولیت جائز ہونی چاہیے، جیسا کہ کئی وجوہ سے اس کے جواز کا اشارہ ملتا ہے۔

۱۔ اس میں مصالح مرسلہ کی رعایت ہے، کیونکہ اس میں شرکت سے ہی مسلمانوں کے دین، جان و مال اور عزت و آبرو پر آنے والے خطرات کو نالنے کی کوشش کرنا یا خلاف شرع قانون کو قانون کا درجہ دینے سے روکنے کی سعی کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اسی مصلحت اور ضرورت کے پیش نظر مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ نے اپنے انیسویں فقہی سمینار منعقدہ مکہ مکرمہ میں اس بات کو جائز قرار دیا کہ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان وہاں کے انتخابات میں شرکت کر سکتے ہیں۔ فیصلہ کے الفاظ یہ ہیں:

يجوز للمسلم الذي يتمتع بحقوق المواطنة في بلد غير مسلم المشاركة في الانتخابات النيابية ونحوها لغلبة ما تعود به مشاركته من المصالح الراجحة مثل تقديم الصورة الصحيحة عن الاسلام والدفاع عن قضايا المسلمين في بلده، وتحصيل مكتسبات الاقليات الدينية والديوية، وتعزيز دورهم في مواقع التأثير، والتعاون مع أهل الاعتدال والانصاف لتحقيق التعاون القائم على الحق والعدل، وذلك وفق الضوابط الآتية:

أولاً: أن يقصد المشارك من المسلمين بمشاركته الإسهام في تحصيل مصالح المسلمين، ودرء المفاسد والإضرار عنهم  
ثانياً: أن يغلب على ظن المشاركين من المسلمين أن مشاركتهم تفضي إلى آثار إيجابية، تعود بالفائدة على المسلمين في هذه البلاد، من تعزيز مركزهم، وإيصال مطالبهم إلى أصحاب القرار ومدیری دفة الحكم والحفاظ على مصالحهم الدينية والديوية۔

ثالثاً: ألا یترتب علی مشاركة المسلم فی هذه الانتخابات ما یودی إلى تفریطه فی دینه۔

دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا:

جس طرح آئندہ کسی کام کے کرنے پر حلف اٹھانا جائز ہے، اسی طرح دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بھی جائز ہے، البتہ اس دستور میں بہت سی دفعات چونکہ خلاف شرع ہوتی ہیں ان کی وجہ سے اس حلف کے جواز پر سوالیہ نشان پیدا ہوتا ہے، کیونکہ کسی معصیت کے کرنے کی قسم کھانا جائز نہیں ہے، گرچہ کہ وہ قسم بھی منعقد ہو جاتی ہے، اور اس قسم کو پورا کرنے کے بجائے توڑنا لازم ہے۔

نوع منها یجب اتمام البر فیها و هو ان یعقد علی فعل طاعة امر به، او امتناع عن معصية، و ذلك فرض علیہ قبل اليمين، وباليمين یزداد وكادة، ونوع لا یجوز حفظها و هو ان یحلف علی ترك طاعة أو فعل معصية (الفتاویٰ الہندیہ ۲: ۵۲)۔  
(منعقد قسم میں ایک قسم وہ ہے جو پورا کرنا واجب ہے وہ کسی ایسی نیکی کے کرنے کی قسم کھانا ہے جس کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا کسی معصیت سے بچنے کی قسم کھانا، قسم سے پہلے بھی یہ چیز اس پر فرض تھی، قسم سے اس کی تاکید اور بڑھ جاتی ہے۔ منعقد قسم کی ایک نوع وہ ہے جو پورا نہ کرنا واجب ہے اور یہ کسی نیکی کے نہ کرنے یا کسی معصیت کے کرنے کی قسم کھانا ہے)۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ دستور میں موجود دفعات میں غالب دفعات خلاف شرع نہ ہونے کی صورت میں قاعدہ شرعیہ: العبرة للغالب (مجلد الاحکام العدلیہ: مادہ ۳۲) کے تحت غلبہ کا اعتبار کرتے ہوئے یہ حلف اٹھانا درست ہوگا، جیسا کہ بہت سے مسائل میں فقہاء نے مغلوب کے بجائے غلبہ کا اعتبار کرتے ہوئے جواز یا عدم جواز کا حکم نافذ کیا ہے۔

نیز یہاں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے میں منتخب مسلم رکن اس اعتبار سے ایک گونہ مظلوم ہے کہ ملکی قانون میں اسلامی قوانین کی رعایت نہ ہونے کی وجہ سے وہ خلاف شرع دفعات سے عدم وفاداری کا اظہار نہیں کر سکتا اور ایسا کرنے کی صورت میں وہ اس حق سے محروم کر دیا جائے گا جو صرف اس کی محرومی نہیں بلکہ پوری قوم کی محرومی ہوگی اور جس کے منفی اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں، اس لیے اس کے لیے اس بات کی گنجائش ہوگی کہ وہ شریعت سے غیر متصادم دفعات سے ہی وفاداری کی نیت کے ساتھ کلمات حلف زبان سے ادا کرے اور اگر مخالف مظلوم ہو تو فقہاء کے نزدیک حلف میں اس کی نیت کا اعتبار کیا گیا ہے۔

اليمين علی نية الحالف اذا كان مظلوماً (فتاویٰ ہندیہ ۵۹/۲) (قسم کھانے والے کی نیت کے مطابق قسم منعقد ہوگی اگر وہ مظلوم ہو)۔

بائبل یا تورات پر حلف لینا:

بائبل یا تورات سے مقصود وہ کلام الہی ہے جو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام پر اللہ نے نازل کیا تھا اور اسی نسبت کی وجہ سے اس پر حلف لیا جاتا ہے اور اللہ کی صفات میں سے ایک صفت کلام ہے اور جس طرح اللہ کے نام کی قسم کھانا درست ہے، اسی طرح اللہ کی صفات کی قسم کھانا درست ہے۔

الحلف بصفة الذات یكون حلفاً بالله فیكون یمیناً (بدائع الصنائع: ۳۰۹) (اللہ کی صفت ذاتی کی قسم اللہ کی قسم ہوگی اور وہ (منعقد قسم ہوگی)۔

قرآن کریم کی قسم کو فقہاء نے اسی لیے جائز مانا ہے کہ وہ کلام الہی ہے اور اس کی قسم درحقیقت اللہ کی صفت کی قسم ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

لو حلف بالمصحف أو وضع یدہ علیہ وقال: وحق هذا فهو یمین (مجموع الاثر ۱: ۵۲۳، شامی ۲: ۷۱۳)۔

(اگر کسی نے مصحف کی قسم کھائی یا اس پر ہاتھ رکھ کر کہا: اس کے حق کی قسم تو یہ قسم ہے)۔

علامہ عبدالرحمن بن محمد الجزیری لکھتے ہیں: والحلف بالقرآن وبكلام الله ینعقد به اليمين، لانه صفة من صفات الله تعالیٰ

كعزة الله وجلاله وقد تمورف الحلف به (الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲: ۶۸)۔

(قرآن کی اور اللہ کے کلام کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے، اس لیے کہ یہ اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، جیسے کہ اللہ کی عزت و جلال کی

قسم اور اس صفت کے ذریعہ قسم کھانا متعارف ہے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل یا تورات پر حلف لینا بھی درست ہے۔ فقہاء احناف کی کتابوں میں اس کی صراحت تو نہیں ملی، مگر چچ کلام الہی کی قسم کے جواز سے ان کے نزدیک بھی بائبل وغیرہ کی قسم کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کی کتابوں میں تورات اور انجیل کی قسم کے جواز کی صراحت مذکور ہے۔

علامہ زکریا بن محمد بن زکریا شافعی لکھتے ہیں: إذا حلف المسلم بآية منسوخة من القرآن أو بالتوراة أو بالإنجيل انحنقد يمينه، لأنه كلام الله ومن صفات الذات (اسنی المطالب فی شرح روض الطالب ۴۰۲۲)۔ (اگر مسلمان نے قرآن کی کسی منسوخ آیت یا تورات یا انجیل کی قسم کھائی تو قسم منعقد ہو جائے گی، اس لیے کہ یہ بھی اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی ذاتی صفات میں ہے)۔

علامہ بن یوسف بن ابوالقاسم مالکی لکھتے ہیں: ومن حلف بالتوراة والانجيل في كلمة واحدة فعليه كفارة واحدة (التاج و الاكليل ۴۰۰۰) (جس نے تورات کی یا انجیل کی ایک ہی کلمہ میں قسم کھائی تو اس پر ایک کفارہ ہے)۔

صاحب اقتاع موسیٰ بن احمد حنبلی لکھتے ہیں: وان حلف بكلام الله أو بالمصحف أو بالقرآن أو بسورة منه أو بآية أو بحق القرآن فهي يمين فيها كفارة واحدة وكذا لو حلف بالتوراة والانجيل ونحوهما من كتب الله (الإقناع ۴۰۲۲) (اگر کسی نے اللہ کے کلام کی یا مصحف کی یا قرآن کی یا اس کی کسی سورت یا آیت کی یا قرآن کے حق کی قسم کھائی تو یہ (منعقد) قسم ہوگی، ایسا ہی جبکہ تورات یا انجیل یا ان کی طرح اللہ کی کتابوں میں سے کسی کتاب کی قسم کھایا (تو قسم درست ہوگی)۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی طرح بائبل اور تورات وغیرہ پر حلف لینا امر اربعہ کے نزدیک درست ہے، اس لیے کسی عیسائی ملک میں منتخب مسلم رکن کو بائبل پر حلف لینا پڑے تو اس کے لیے یہ عمل درست ہوگا۔

مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والی سیکولر جماعت میں شمولیت کا حکم:

بعض سیاسی جماعتیں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی راہ میں مناسب اور موزوں سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات اسلام سے متصادم ہوتی ہیں، ایسی جماعت میں کسی مسلمان کی شرکت اور اس کی طرف سے انتخاب لڑنا جائز ہے، اس لیے کہ اس جماعت کے مسلم مفادات کو ترجیح دینے کی وجہ سے اس کی رکنیت قوم مسلم کے لیے مفید ہوگی، رہی بات اسلام مخالف بعض دفعات کی تو چونکہ عموماً ایسے دفعات میں غالب درجہ نہیں ہوتے، اس لیے ان کی وجہ سے شرکت ممنوع نہیں ہوگی، بلکہ شرکت کے ذریعہ یہ بھی ممکن ہے کہ مسلم رکن اپنی افادیت اور اہمیت کو ثابت کر کے اور مقام و مرتبہ حاصل کر کے منشور کی دفعات میں تبدیلی کی راہ ہموار کر لے، اس لیے ایسی جماعت میں شامل ہونا جائز ہے، کیونکہ قوم مسلم کی سیاسی مسائل کی قیادت کے لیے کسی نہ کسی جماعت سے وابستگی تو اختیار کرنی ہی ہوگی، اور یہ جماعت جو مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے، بہر حال اس جماعت سے تو بہتر ہی ہوگی جو مسلم دشمنی کے حوالے سے معروف ہو اور فقہی قاعدہ: الضرر يدفع بقدر الإمكان، يختار أهون الشرين، الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف وغیرہ سے اسلامی مزاج یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ضرر ہی ضرر ہو اور اسلام کی کامل موافقت کی کوئی راہ نہ ہو تو وہاں اسلام سے قریب تر جو راہ ہو اور جس میں ضرر کے اندیشے کم ہوں اس کو اختیار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے مشرکین کے خلاف یہود سے معاہدہ کیا، حالانکہ یہود بھی اسلام دشمن تھے، لیکن چونکہ ان سے معاہدہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید تھا کہ اس کی وجہ سے مدینہ میں اس کا ماحول پیدا ہوا اور ان کی دشمنی سے مسلمانوں کو راحت ملی اور مشرکین کے مقابلہ میں قوت میں استحکام پیدا ہوا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ کیا (الرحیق المختوم ۱۷۳)۔

مسلم دشمن سیاسی جماعت میں شمولیت کا حکم:

وہ سیاسی جماعت جو کھلے طور پر مسلم دشمن ہو، اور جس کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو اس میں شریک ہونا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں شرکت درحقیقت ضرر اخص کو چھوڑ کر ضرر اشد کو اور اہون الشرین کے بجائے اشد الشرین کو اختیار کرنا ہے، جو کہ مزاج اسلام کے بالکل برعکس ہے۔ نیز اس میں شامل ہونا درحقیقت ان کی مسلم دشمن پالیسیوں میں سے ان کی مدد کرنا ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو تکلیف پہنچائے یا تکلیف پہنچانے والوں کی مدد کرے۔ رہنما بات یہ کہ اگر کوئی ان کی پالیسیوں میں تبدیلی کی نیت سے شامل ہونا چاہے تو کیا حکم ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسی جماعتیں جو کھلم کھلا دشمنی پر اتاری ہوں ان کی دشمنی کو کم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ ایک گونہ ناممکن ہے اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایسی جماعت میں شامل ہونے والا تھک ہار کر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے پر مجبور ہوتا ہے اور قوم کے مفاد کو بھول جاتا ہے، اس لیے محض اس مفروضہ کی وجہ سے اس کو جائز نہیں کہا جاسکتا جبکہ مسلمانوں کے

دشمن کا تعاون صریح حرام ہے اور ایسے ظالمین کے معاونین کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

إنھا ستكون بعدی أمراء یكذبون ویظلمون، فمن دخل علیهم، فصدقهم بکذبهم، وأعانهم علی ظلمهم، فلیس منی، ولست منه ولیس بوارد علی الحوض، ومن لم یصدقهم بکذبهم ویعنهم علی ظلمهم، فهو منی وأنا منه. وهو وارد علی الحوض (مسند احمد: ۱۸۱۲۱)۔

(بے شک میرے بعد ایسے امراء ہوں گے جو جھوٹ بولیں گے اور ظلم کریں گے، جو شخص ان کے پاس جائے گا ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی میرا اس سے کوئی تعلق ہے اور اس کو حوض کوثر کی حاضری نصیب نہ ہوگی اور جو شخص ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا اور نہ ہی ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے گا تو اس کا مجھ سے تعلق ہے اور میرا اس سے تعلق ہے اور اس کو میرے حوض کوثر پر حاضری نصیب ہوگی)۔

مسلمانوں کے لیے علاحدہ سیاسی جماعت کا قیام:

اسلامی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کے جس کسی خطے میں بھی مسلمان مقیم ہوں، وہاں اپنے درمیان کسی کو اپنا حاکم و امیر مقرر کریں اور ایک امیر کے جھنڈے تلے سارے مسلمان جمع ہوں، اور ایک امیر کی نگرانی میں ان کا متحدہ پلیٹ فارم ہو۔

إنهم لم یختلفوا فی وجوب نصب إمام للمسلمین (الموسوعة الفقهیة ۲۰۱۴) (مسلمانوں کے لیے کسی امام کے انتخاب کے واجب ہونے میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے)۔

لیکن موجودہ زمانے میں امت کے مختلف بنیادوں پر افتراق و انتشار اور نظریاتی و مسلکی تناؤ نے امت کو اتحاد کی قوت سے محروم کر دیا ہے اور پورے عالم میں بالخصوص ان ممالک میں جہاں مسلم اقلیت میں ہیں مسلمانوں کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ الامان والحفیظ۔ اور پھر اس کا برا انجام ہر سال ایسا بھیانک ظاہر ہو رہا ہے جو توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ ان حالات میں واقعی اس بات کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی متحدہ سیاسی پلیٹ فارم ہو جو مسلمانوں کے مسائل کی نمائندگی کرے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کرے اور اس پلیٹ فارم کو اتحاد کی ایسی قوت حاصل رہے کہ اس کی آواز صدائے بازگشت کے بجائے موثر ہو۔

لیکن ماضی کے حالات اور مسلمانوں کے موجودہ باہمی اختلافات کے پس منظر میں ایسی کسی جماعت کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے اور نہ ہی مناسب ہے، کیونکہ کسی ایسی جماعت کو پوری امت کی تائید نہ حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو قوت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ جہاں مسلم اقلیت میں ہوں وہاں ایسی بے قوت جماعت کا کیا فائدہ جسے خود اپنوں کی تائید حاصل نہ ہو، بلکہ اس کا منفی اثر یہ یقیناً ہوگا (جیسا کہ ماضی میں ہوا) کہ مسلمان مخالف ووٹ متحد ہو جائیں گے اور پھر اس اتحاد سے فرقہ پرست طاقتیں ابھر کر سامنے آئیں گی اور سیکولر جماعتیں بھی اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کر کے اکثریت کے ووٹ کو حاصل کرنے والی شکل اختیار کریں گی۔ ظاہر ہے کہ صورت حال اس سے اور بھی ابتر ہوگی۔

ایکشن میں خواتین کا کردار:

اللہ نے مردوں اور عورتوں میں صنفی فرق رکھا ہے اور اس کے مطابق ذمہ داریاں دی ہے۔ مردوں میں طاقت و قوت رکھا ہے، اس لیے اس کے مناسب امور ان کے ذمہ لگائے ہیں اور عورتوں میں مردوں کے بہ نسبت طاقت و قوت کم رکھا ہے تو ان کو ان کی صنفی نزاکت کے مطابق ایسی ذمہ داریاں دی ہے جن میں طاقت و قوت کی ضرورت نہیں۔

لیکن موجودہ زمانہ میں آزادی نسواں کے پرفریب نعروں نے مختلف مسائل پیدا کیے ہیں اور ہر میدان میں (چاہے وہ عورتوں کی صنفی نزاکت سے کتنا ہی ناموافق کیوں نہ ہو) عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لاکھڑا کیا ہے، انہیں میدانوں میں سے ایک میدان میدان قیادت ہے جس میں عورتوں کو اتارا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ اس میں عورتوں کے آنے کے لئے جبری حالات پیدا کیے جا رہے ہیں جس کی ایک مثال خواتین کے لیے سیٹوں کا ریزرو کرنا ہے۔

اسلام میں جہاں مردوں کو اپنے امیر و حاکم، نگران اور رہبر و رہنما کے انتخاب کے سلسلہ میں اپنا ووٹ دینے کا حق ہے، وہیں عورتوں کو بھی اس شہادت اور ووٹ کا حق حاصل ہے اور انہیں بھی اس شرعی فریضہ کو ادا کرنے کے لیے ووٹ دینا چاہیے۔ بشرطیکہ اس سے کسی فتنہ اور ان کی عصمت و عفت پر آج آنے کا اندیشہ نہ ہو۔



عورتوں کو یہ حق اس لیے حاصل ہے کہ ووٹ شہادت کے حکم میں ہے اور عورتیں بھی اہل شہادت میں ہیں، کیونکہ اہل شہادت ہونے کے لیے مذکور ہونا شرط نہیں ہے اور قرآن کریم وحدیث میں ان کی شہادت کو معتبر مانا گیا ہے۔

امیر کے انتخاب میں عورتوں کی رائے کی اہمیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف سے نامزد اصحاب شوری نے جب حضرت عبدالرحمن بن عوف کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ عام لوگوں کی رائے معلوم کریں تو انہوں نے مردوں کے ساتھ عورتوں کی رائے بھی معلوم کی (نہض عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، يستشير الناس فيهما و يجتمع برئوس الناس و اجنادهم، جميعا و اشقاتا، مثنى و فرادى و مجتمعين، سرا و جهرا، حتى يخلص، الى النساء المخدرات في حجالهن، البداية و النهاية ۱۰: ۲۱۱)۔

اور ووٹ ڈالنے کے لیے عورت کا گھر سے نکلنا اور ووٹنگ سینٹر تک جانا بھی جائز ہوگا، بشرطیکہ وہ گھر سے نکلنے کے تمام شرعی آداب کا اہتمام کرے اور اس کے وہاں جانے میں کسی فتنہ و فساد کا امکان نہ ہو، فتویٰ مفتی محمود (شیخ الحدیث جامعہ قاسم العلوم ملتان) کے ایک فتویٰ میں مذکور ہے: ”رفتن زنان بموجب ووٹ کے دریاں بے پردگی و مانع شرعی دیگر نہ باشد باذن شوہر جائز است“ (فتاویٰ مفتی محمود ۷۰: ۳۷۰)۔

اب رہی بات کہ کیا عورتیں خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش بھی کر سکتی ہیں اور ان کو عہدہ و منصب دیا جاسکتا ہے؟

اس سلسلہ میں بخاری شریف میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے فرماتے ہیں:

لما بلغ رسول الله ﷺ أن أهل فارس قد ملكوا عليهم بنت كسرى، قال: ”لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ والمنع من أن تلى الامارة والقضاء قول الجمهور وأجازه الطبري وهي رواية عن مالك وعن أبي حنيفة تلى الحكم فيما تجوز فيه شهادة النساء (فتح الباری: ۸۰: ۱۲۸)۔

(جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جنہوں نے اپنا سربراہ عورت کو بنالیا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو امارت دینا اور عہدہ و منصب عطا کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ اسی کے مطابق علامہ خطابی اور بقول ابن حجر عسقلانی جمہور علماء اسی بات کے قائل ہیں کہ عورتوں کو امارت و قضا کا منصب دینا درست نہیں ہے، جبکہ طبری اور امام مالک کے نزدیک درست ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جن چیزوں میں عورتیں گواہی دے سکتی ہیں ان میں قاضی بھی بن سکتی ہیں (احکام القرآن: ۳: ۳۸۲)۔

یعنی ابن جریر طبری اور امام مالک علیہما الرحمۃ کے نزدیک مطلقاً ان کو امارت و قضا کا منصب دینا درست ہے اور امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ نے اس روایت کی ممانعت سے قضا وغیرہ کے مناصب کو جن میں وہ کسی کے تابع ہوتی ہے مستثنیٰ مانا ہے، لیکن علامہ ابوبکر ابن العربی اس کو متفقہ طور پر ناجائز قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اور امام طبری سے منقول جواز کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذا نص في أن المرأة لا تكون خليفة، ولا خلاف فيه، ونقل عن محمد بن جرير الطبري امام الدين أنه يجوز أن تكون المرأة قاضية، ولم يصح ذلك عنه، ولعله كما نقل عن أبي حنيفة أنها تقضى فيما تشهد فيه وليس بأن تكون قاضية على الإطلاق، ولا بان يكتب لها منشور بأن فلانة مقدمة على الحكم، إلا في الدماء والنكاح، وإنما ذلك كسبيل التحكيم، أو الاستبانة في القضية الواحدة، بدليل قوله ﷺ: لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ وهذا هو الظن بأبي حنيفة ابن جرير (رد المحتار ۵: ۴۴۰)۔

(یہ حدیث اس بات کی تصریح ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور امام محمد بن جریر طبری سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت کا قاضی ہونا صحیح نہیں ہے، شاید یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت جن امور میں شہادت دے سکتی ہے ان میں فیصلہ بھی کر سکتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علی الاطلاق قاضی بن جائے یا یہ کہ اس کے نام پر روانہ جاری کر دیا جائے کہ فلاں عورت کو حدود اور نکاح کے علاوہ اور دیگر امور میں منصب

عدالت پر مقرر کیا جاتا ہے، عورت کے فیصلہ کے صحیح ہونے کی بس یہی صورت ہو سکتی ہے کہ کسی معاملہ میں دو فریق اس کو حکم مان لیں یا کبھی کسی قضیہ میں اس کو نائب بنا دیا جائے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے امر حکومت عورت کے سپرد کر دیا، امام ابوحنیفہ اور امام جریر کے بارے میں یہی گمان کیا جاسکتا ہے۔

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ بھی اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں، اسی لیے درمختار میں حدود و قصاص کے علاوہ میں عورت کے فیصلہ کو قبول کیے جانے کی صراحت کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس کو قاضی اور والی بنانے والا گنہگار ہوگا۔

والمرأة تقضى في غير حد وقود وان اثم المولى لها، بخبر البخاری: لن يفلح قوم ولوا امرهم امرأة (فتح القدیر ۷: ۲۹۸) (عورت غیر حدود و قصاص میں فیصلہ کر سکتی ہے، اگرچہ عورت کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا، کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے: ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے امر حکومت عورت کے سپرد کر دیا۔“)

گو یا حدود و قصاص کے علاوہ امور میں عورت کو قاضی بنانا عمل معصیت اور باعث گناہ ہے، پھر بھی اگر ایسا کیا گیا تو اس کے فیصلہ کو اس لیے قبول کیا جائے گا کہ وہ اہل شہادت میں ہے، گو یا امام اعظم عورت کو منصب دیے جانے کے مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ سے الگ نہیں ہیں بلکہ ان کے نزدیک بھی یہ ایسا ہی ناجائز ہے جیسا کہ ان تینوں حضرات کے نزدیک ناجائز ہے، اختلاف صرف اس میں ہے کہ اگر غیر حدود و قصاص میں اتفاقاً کسی خاص حالت میں اس کو فیصلہ کرنا پڑا اور اس نے موافق شریعت فیصلہ کیا تو اس کا یہ فیصلہ جائز ہوگا یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ اس کو جائز مانتے ہیں جبکہ ائمہ ثلاثہ اس کو ناجائز مانتے ہیں۔ علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ کی عبارت سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے:

ويجوز قضاء المرأة في كل شيء إلا في الحدود والقصاص وقال الأئمة الثلاثة: لا يجوز لأب المرأة ناقصة العقل ليست أهلاً للخصومة مع الرجال في محافل الخصوم، قال عليه السلام: لن يفلح قوم ولوا امرهم امرأة رواه البخاری، والجواب أن ما ذكر غاية ما يفيد منع أن تستقضى وعدم حله، والكلام فيما لو وليت وأتم المقلد بذلك أو حكمها خصمان فقتت قضاء موافقا لدين الله أكان ينفذ أم لا؟ لم ينتهض الدليل على نفيه بعد موافقته ما انزل الله (فتح القدیر ۷: ۲۹۸)۔

(عورت کو قضا ہر چیز میں صحیح ہے مگر حدود و قصاص میں صحیح نہیں ہے اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ عورت ناقص العقل ہے اور وہ خصوم کی محفلوں میں مردوں کے ساتھ خصومت کی اہل نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے امر حکومت عورت کے سپرد کر دیا (بخاری) اور جواب یہ ہے کہ جو دلائل ذکر کیے گئے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کو قاضی بنانا ممنوع ہے، حلال نہیں ہے اور ہماری گفتگو اس صورت میں ہے کہ اگر عورت کو قاضی بنا دیا گیا اور بنانے والا گنہگار ہو، یا دو فریقوں نے اسے حکم بنا لیا، اور عورت نے ایسا فیصلہ کر دیا جو اللہ کے دین کے موافق ہے تو کیا اس کا فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟ اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی جبکہ وہ فیصلہ ما انزل اللہ (شریعت) کے موافق بھی ہو۔)

اس عبارت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ائمہ ثلاثہ کی طرح امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی عورت کو قاضی بنانا یا منصب دینا درست نہیں، اس لیے عورت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ خود کو منصب کی طلب کے میدان میں اتارے، جبکہ اس میدان میں آنے کے لیے اسے یقیناً بے شمار محرمات کا بھی ارتکاب کرنا پڑے گا، لازماً اسے بے پردہ ہونا پڑے گا، مردوں کی محفلوں میں بے محابا سے شرکت کرنی ہوگی اور بھی دیگر غیر شرعی امور کو اسے اختیار کرنا ہوگا جن میں قدم قدم پر اس کی عفت و عصمت کو یقینی خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ امور شریعت اسلامیہ میں قطعاً ممنوع ہیں، اس لیے عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کرے۔

☆☆☆

## الیکشن سے مربوط شرعی مسائل

مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی

۱۔ ووٹ شرعی اعتبار سے شہادت ہے، اس لیے کہ فقہائے کرام نے شہادت کی تعریف یوں کی ہے: الإخبار بحق للخیر علی الخیر فی مجلس القضاء (الموسوعة الفقهية ۱۶: ۲۱۶) (مجلس قضاء میں کسی دوسرے کے خلاف کسی اور دوسرے کے حق کی خبر دینا شہادت ہے)۔

الیکشن میں ووٹ دہندہ ووٹ دیتے وقت اپنے پسندیدہ امیدوار کے لیے مندرجہ ذیل امور میں سے تمام کے یا ان سے زائد کے یا ان میں سے بعض کے حقدار ہونے کی خبر دیتا ہے:

۱۔ میرا امیدوار موجودہ تمام امیدواروں میں سب سے زیادہ انصاف پسند، ایماندار اور لائق امیدوار ہے۔

۲۔ میرا امیدوار عوام کی نمائندگی کا اہل ترین امیدوار ہے۔

۳۔ میرا امیدوار وزارت کے منصب پر فائز ہونے کا اہل ہے۔

۴۔ میرا امیدوار عوام کا ہمدرد و غمگسار ہے۔

۵۔ اس امیدوار کے ہارنے سے عوام کو دینی، جانی، مالی یا اخلاقی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

اس طرح ووٹ الاخبار بحق للخیر علی الخیر فی مجلس القضاء ہے، یہاں مجلس قضاء الیکشن کمیشن ہے، اس لیے کہ وہی ووٹوں یعنی شاہدوں کے تعداد کی گنتی کرتا ہے اور ووٹ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے اور جب کوئی انتخابی مسئلہ الیکشن سے حل نہیں ہوتا تب ملک کی عدالتوں سے اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔

نیز فقہائے عظام نے شہادت کے پانچ ارکان بتائے ہیں۔ ارکان الشهادة عند الجمهور خمسة أمور: الشاهد، والمشهد له، والمشهد عليه، والمشهد به، والصيغة (مغنی المحتاج ۲: ۲۶۶ للامام النووي دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان)۔ شہادت کے یہ پانچوں ارکان الیکشن میں بھی پائے جاتے ہیں:

۱۔ الشاهد: انتخاب میں ووٹر شاہد ہے۔

۲۔ المشهد له: ووٹر کا پسندیدہ امیدوار المشهد له ہے۔

۳۔ المشهد علیه: وہ امیدوار ہیں جن کو امیدوار نے پسند نہیں کیا اور انہیں ووٹ نہیں دیا۔

۴۔ المشهد به: ووٹر کے پسندیدہ امیدوار کی وہ قابلیتیں اور لیاقتیں ہیں جن کی بنیاد پر ووٹرنے اسے ووٹ دیا ہے۔

۵۔ الصيغة: آج کل ووٹنگ کے مختلف طریقے ہیں اگر زبان سے ووٹنگ ہو رہی ہے تو ووٹنگ کے لیے جس کلمے کا یا جس لفظ کا انتخاب کیا گیا ہے وہی کلمہ یا لفظ شہادت کے صیغے کے قائم مقام ہوگا اور اگر تحریری طور پر ووٹنگ ہو رہی ہے تو ووٹنگ کے لیے متعین تحریر ہی شہادت کا صیغہ مانا جائے گا اور اگر بیٹن دبا کر ووٹنگ ہو رہی ہے (جو کہ فی زمانہ الیکشن کا عام طریقہ ہے) تو بیٹن دبانے کی زبان سے ادا کیے گئے شہادت کے صیغے کے قائم مقام ہوگا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان سورہ مائدہ کی آٹھویں آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ط الجامعہ الاسلامیہ شانتاپورم پشور، کیرالہ۔

”اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندے بننے کے قابل ہے۔

مولانا نے ووٹ کو شفاعت اور وکالت بھی کہا ہے اور ووٹ کے تینوں حیثیتیں بالتفصیل پیش کرنے کے بعد خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: خلاصہ یہ کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسرے شفاعت اور تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک صالح اور قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں۔ اسی طرح نااہل اور غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری شفاعت بھی ہے اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

اس لیے ہر مسلمان ووٹر پر فرض ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے اس کی تحقیق کر لے کہ جس کو ووٹ دے رہا ہے وہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور دیانت دار ہے یا نہیں (معارف القرآن ۳، ۲، بیت الحکمت دیوبند ۱۹۸۲ء)۔

۲۔ جب ہم نے ووٹ کو شہادت مان لیا تو ووٹ کے احکام بھی وہی ہوں گے جو شہادت کے ہیں، لہذا جس طرح شہادت فرض کفایہ ہے، اسی طرح ووٹ دینا بھی واجب کفایہ ہوگا اور جس طرح عدد کافی کی گواہی سے پوری جماعت گناہ سے بچ جائے گی، اسی طرح عدد کافی کی ووٹنگ سے پوری جماعت گناہ سے بچ جائے گی، مگر چونکہ ووٹنگ کے وقت یہ پتہ نہیں چلتا کہ کامیاب ہونے کے لیے کتنے ووٹوں کی ضرورت ہے، اس لیے ووٹ دینا ہر مسلمان پر واجب ہے اور جس طرح گواہی کی ادائیگی میں اگر ضرر ہو تو گواہی لازم نہیں ہوگی، اسی طرح ووٹ دینے میں اگر ضرر ہو تو ووٹ دینا لازم نہیں ہوگا مثلاً ماحول کشیدہ اور ووٹنگ بوتھ تک جانے اور وہاں ووٹ ڈالنے میں جان و مال یا عزت و آبرو کا خطرہ ہو تو ووٹ دینا واجب نہیں ہوگا۔

تحمل شہادت اور اس کی ادائیگی فرض کفایہ ہے:

تحمل شہادت اور اس کی ادائیگی فرض کفایہ ہے، اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولا یاب الشہداء اذا ماعوا (البقرہ: ۲۸۲) (جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: واقیموا الشہادۃ للہ (الطلاق: ۲) (اور اللہ کے واسطے گواہی سیدھی ادا کرو)، یعنی یہ گواہوں کو ہدایت ہے کہ شہادت کے وقت ٹیڑھی ترچھی بات نہ کریں، بلکہ صاف صاف اور حق بات کہیں۔ کسی دباؤ میں نہ آئیں، نیز حکم خداوندی ہے: ولا تکتموا الشہادۃ من یکتمہا فانہا آثم قلیہ (البقرہ: ۲۸۳) (اور گواہی کو مست چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بے شک اس کا دل گنہگار ہے) اور اس لیے کہ شہادت ایک امانت ہے جس کی ادائیگی دوسری امانتوں کی طرح لازم ہے، لہذا عدد کافی جب اس امانت کو ادا کر دے گا تو پوری جماعت سے اس کا ادا نہ کرنے کا گناہ ساقط ہو جائے گا اور اگر سب لوگ گواہی سے رک گئے تو سب لوگ گنہگار ہوں گے۔

ووٹ دینا واجب کفایہ ہے:

چونکہ ووٹ بھی شہادت ہے یا شہادت کے قائم مقام ہے، لہذا ووٹنگ بھی واجب کفایہ ہوگی، یعنی اگر کسی نیک اور قابل شخص کو اتنے لوگوں نے ووٹ دے دیا کہ وہ کامیاب ہو گیا تو سارے لوگوں کی طرف سے ووٹنگ نہ کرنے کا گناہ ساقط ہو جائے گا اور اگر کوئی نیک اور اہل ترین امیدوار ہار جاتا ہے تو ان لوگوں کو ووٹنگ نہ کرنے کا گناہ ہوگا جن لوگوں نے بغیر کسی عذر کے ووٹ نہیں ڈالا یا جان بوجھ کر اپنے ووٹ کو خراب کر دیا۔

ایماندار، متقی اور قیادت کے لائق امیدوار کو اتنے لوگوں کا ووٹ دینا واجب ہوگا جتنے لوگوں کے ووٹ دینے سے وہ کامیاب ہو جائے، باقی لوگوں کو ووٹ دینا مستحب ہوگا۔ مگر چونکہ انتخاب میں پہلے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کامیاب ہونے کے لیے کتنے ووٹوں کی ضرورت ہے، اس لیے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ایسے امیدوار کو ووٹ دے جو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سب سے بہتر ہو اور اس کے کامیاب ہونے کے امکانات بھی ہوں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی امیدوار فی نفسہ سب سے اچھا ہوتا ہے، مگر وہ بہت زیادہ مقبول نہیں ہوتا یا اس کی پارٹی عوام میں کوئی اثر نہیں رکھتی اور اس کو ووٹ دینے سے ایک ایسے امیدوار کے کامیاب ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی انتخابات میں کئی بار کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جہاں مسلمان تیس تا پچاس فیصد ہیں وہاں افضل اور بہتر کا صحیح انتخاب نہ ہو پانے اور مسلمانوں کے ووٹوں کے بکھراؤ کی وجہ سے ایسی پارٹی کے امیدوار کامیاب ہو جاتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی کھلی دشمن ہے۔

گواہی سے رک جانا گناہ ہے:

جب گواہ کی گواہی مشہودہ کے لیے مفید ہو اور گواہی دینے میں کوئی ضرر بھی نہ ہو تو گواہی سے رک جانا گناہ ہے، اس لیے کہ حکم خداوندی ہے: ولا تکتتموا الشهادة ومن یکتتمها فإنه اثم قلبه (البقرہ، ۲۸۳) (اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپائے تو بے شک اس کا دل گنہگار ہے)۔ اور جب بارگواہی اٹھانے یا اس کی ادائیگی میں ضرر ہو یا اس کی شہادت مفید نہ ہو، اس طرح کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جن کی شہادت قابل قبول نہیں ہوتی تو اس کے اوپر گواہی لازم نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولا یضار کاتب ولا شهید (البقرہ، ۲۸۲) نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو اور رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: لا ضرر ولا ضرار (ابن ماجہ ۲۰۷۸۴ ط الحلی)۔

۳۔ ایکشن موجودہ زمانہ کا جہاد ہے، جس طرح پہلے زمانے میں طاقت کا فیصلہ تلواروں سے ہوتا تھا اور آج بھی بندو قوں، توپوں، ٹینکوں، میزائلوں اور بمبار جہازوں کا بہت اثر ہے، مگر آج کے زمانے میں ہتھیاروں کے ذریعے بہت دنوں تک حکومت نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کے لیے عوامی حمایت یا دوسرے لفظوں میں عوامی گواہی کی ضرورت پڑتی ہے۔

جہاد کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ اگر ایکشن کا مقصد بھی اعلائے کلمۃ اللہ ہو جائے تو ایکشن بھی جہاد بن جائے گا اور چونکہ ایکشن جہاد کی ایک شکل ہے، لہذا جو احکام جہاد کے ہیں، وہی احکام ایکشن کے ہوں گے۔

ارشاد رسول اکرم ﷺ: إنما الأعمال بالنیات (فتح الباری ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱

یعملون محیط (الانفال ۴) (اور ان جیسے مت ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے نکلے اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے)۔

۴۔ اصل تو یہ ہے کہ جن جن اداروں اور حکومتوں میں مخالف شریعت قوانین بنائے گئے ہیں ان اداروں اور حکومتوں میں مسلمانوں کے لیے شامل ہونا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱۔ وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من أمرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضلّ ضلّالاً مبيناً (الاحزاب: ۳۶) (اور (دیکھو) کسی مؤمن مرد و عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے کسی امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا)۔

مگر مندرجہ ذیل چند مصالح کے پیش نظر اس اصل سے خروج کیا جاسکتا ہے:

تقليل الشر والظلم مطلوب بقدر الاستطاعة (بقدر استطاعت ظلم اور برائی کو کم کرنا مطلوب ہے)۔

(۱) فاتقوا الله ما استطعتم فاسمعوا وأطيعوا (التغابن: ۱۶) (پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور سنتے اور مانتے چلے جاؤ)۔

(۲) إذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم (متفق علیہ) (جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو بقدر استطاعت اسے بجا لاؤ)۔

(۳) لا يكلف الله نفساً إلا وسعها (البقرہ: ۲۸۶) (اللہ نے ہر جان کو اس کی وسعت کے بقدر ہی مکلف بنایا ہے)۔

(۴) نجاشی نے اسلامی نظام قائم نہیں کیا اور رسول اللہ نے اسے ناپسند نہیں کیا۔

(۵) کل شیء اولاشیء کافلسفہ شرعاً اور عملاً مفروض ہے۔

(۲) دوسری مصلحت ارتکاب اخف الضررین ہے۔

مندرجہ بالا اصولوں کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کے پیش نظر ان قانون ساز اداروں کا ممبر بننا بھی درست ہے جو مخالف شریعت قوانین بناتے ہیں۔

البتہ مسلمان ممبر پر واجب ہوگا کہ وہ حکمت کے ساتھ مخالف شریعت قوانین کو پاس ہونے سے روکے، یا جو مخالف شریعت قوانین بنے ہوئے ہیں ان کو حتی الامکان کالعدم کرنے کی کوشش کرے، اسے ہر وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مجاہد اسلام ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کب کتنی قوت سے کہاں ضرب لگانی ہے۔ اسلام کا بہترین مجاہد تو وہی ہوتا ہے جو دل میں بھی ایمان رکھتا ہے اور لڑنے کے فن سے بھی واقف ہوتا ہے۔

وہیپ کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور وہیپ سے ڈر کر کسی مناسب پارٹی کا ممبر نہ بننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سانپ، بچھو یا کتے سے ڈر کر گھر سے نہ نکلے اور روزی کمانا چھوڑ دے اور گھر میں بیٹھا بیٹھا بھوک سے مر جائے۔ ایک صاحب ایمان، باحیثیت اور عقلمند مسلمان ایسا نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ تو کوہ منزل میں آنے والے تمام خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرے گا اور حکمت و دانائی کے ساتھ اپنے ایمان و جان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دوسروں کے قلوب کو بھی ایمان کی روشنی سے منور کرے گا، نیز ان کی جانی و مالی حفاظت کے اسباب فراہم کرے گا۔

اس کے اوپر ضروری ہے کہ وہ حتی الامکان اسلام مخالف وہیپ جاری ہونے سے روکے اور اگر اسلام مخالف وہیپ جاری بھی ہو جائے تو یہ دیکھے کہ اس کا اس پارٹی میں رہنا اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا نہیں، اگر اس کا اسی پارٹی میں رہنا اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہو تو ضرورتاً تیجاً محظورات بقدر الضرورات کے پیش نظر وہیپ کے مطابق کام کرے، مگر دل سے اسے برا سمجھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان ولكن من شرح بالكفر صدراً فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم (النحل: ۱۰۶) (جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، بجز اس کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو۔ مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہیں کے لیے بہت بڑا عذاب ہے)۔

۵۔ خلاف شریعت دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا اصلاً جائز نہیں ہے اور اس کے دلائل بھی وہی ہیں جو میں نے سوال نمبر ۴ کے جواب میں تحریر کیا ہے۔

مگر تقلیل الشر و النظم مطلوب بقدر الاستطاعت، ارتکاب اخف الضررین اور سنت تدرج جیسے اصولوں کے پیش نظر بدرجہ مجبوری خلاف شریعت دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہے اور اس کے دلائل بھی وہی ہیں جو میں نے سوال نمبر ۴ کے جواب میں تحریر کیا ہے۔

۶۔ موجودہ بائبل پر حلف لینا گویا موجودہ بائبل کو صحیح سمجھنا اور اس کی تعظیم کرنا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بائبل محرف ہے، لہذا اصل کے اعتبار سے بائبل پر حلف لینا جائز نہیں ہے۔ مگر یہاں بھی بدرجہ مجبوری اخف الضررین اور اہون الیبتین پر عمل کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں بائبل پر حلف لینا بھی جائز ہے۔ مگر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اپنے اس عمل کو دل سے برا سمجھے اور حکمت و دانائی کے ساتھ حتی الامکان کوشش کرے کہ اس طرح کے جابرانہ اور ظالمانہ قوانین ختم ہو جائیں۔

۷۔ جو سیاسی پارٹیاں سیکولر ہیں اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، مگر ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا اسلامی مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں۔ ان پارٹیوں میں شریک ہونے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کے کن مفادات کی تحفظ کرتی ہیں اور کن کن اسلامی اور مسلم مفادات کی مخالفت کرتی ہیں۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹیاں مسلمانوں کی ہمدرد سمجھی جاتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ فکری اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان کمیونسٹوں نے پہنچایا ہے، اتنا نقصان کسی بھی غیر اسلامی تحریک سے اسلام اور مسلمانوں کو نہیں پہنچا ہے۔ مسلم قوم کے ہزاروں عقلاء اور دانشور کمیونزم کے دجالی فتنہ میں مبتلا ہوئے اور اپنی دنیا اور عقبی دونوں کو برباد کر لیا۔

کمیونسٹوں نے مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے بھی نقصان پہنچایا ہے۔ سوویت یونین، یوگوسلاویہ اور چین میں کمیونسٹوں نے مسلمانوں کو ہر طرح سے نقصان پہنچایا۔

خود ہمارے ملک کے صوبہ بنگال میں کمیونسٹوں کے ۳۵ سالہ دور اقتدار میں مسلمان ہر اعتبار سے کمزور ہوئے ہیں۔

نیز یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کیا اس پارٹی کا نعم البدل ہے یا نہیں؟ نیز یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس پارٹی میں شامل ہونے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات وابستہ ہیں یا نہیں؟

اگر اس طرح کی پارٹیوں میں شریک ہونے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات وابستہ ہوں تو ان کی طرف سے انتخاب لڑنا، اور حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا، ورنہ نہیں اور اس کے دلائل بھی وہی ہیں جو میں نے سوال نمبر ۴ کے جواب میں تحریر کیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں دائیں بازوں کی جماعتیں (ہندو فرقہ پرست پارٹیاں) اور بائیں بازوں کی جماعتیں (کمیونسٹ پارٹیاں) یہ دونوں طرح کی جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس طرح کی جماعتوں کی کوئی مدد نہ کریں بلکہ ان کے مقابلے میں ان سیکولر پارٹیوں کی حمایت کریں جو دین اسلام کو احترام کی نظروں سے دیکھتی ہوں اور جن کا منشور مسلم مخالف نہ ہو۔ نیز پارٹی کا اندرونی ماحول بھی ایسا ہو جو اسلام پسند مسلم لیڈروں کو اپنے اندر سمونے اور انہیں اسلامی اعتقادات کے مطابق قوم و ملت کی خدمت انجام دینے کے مواقع دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی ایک سیکولر پارٹی کا غلام اور بندھوا مزدور بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیشہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہنا چاہیے اور جو پارٹی موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب ہو اس پارٹی کی حمایت کرنی چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل کے اعتبار سے اس طرح کی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہیں اور ان پارٹیوں میں شامل ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا تعاون علی الاثم والعدوان ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان جائز نہیں، اس لیے کہ ارشاد خداوندی ہے: **تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (۳۱)** (نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

نیز ارشاد ہے: **ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لاتنصرون (ہود ۱۱۳)** (دیکھو ظالموں کی طرف ہرگز نہ جھکنا ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی اور اللہ کے سوا تمہارا مددگار نہ کھڑا ہو سکے گا ورنہ تم مدد کیے جاؤ گے)

مگر اگر اس طرح کی پارٹیوں میں شریک ہونے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے، اور ان کی حکومت میں شامل ہونے سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات وابستہ ہوں تو تقلیل الشر والظلم مطلوب بقدر الاستطاعة، ارتکاب اخف الضررین اور سنت تدرج جیسے اصولوں کے پیش نظر بدرجہ مجبوری اس طرح کی پارٹیوں میں شامل ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا، اور ان کی حکومت میں شامل ہونا نہ صرف جائز ہوگا بلکہ بعض حالات میں واجب بھی ہوگا۔ ذرا اندازہ لگائیے اگر آزادی کے وقت کانگریس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مجاہد ملت مولانا حفیظ الرحمن، مولانا حسرت موہانی، فریح احمد قدوائی جیسے لوگ نہ ہوتے تو کیا ہندوستان کے قوانین اتنے متوازن ہوتے جتنے متوازن آج ہیں۔ نیز ذرا غور کیجیے اگر آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مشہور ہندو فرقہ پرست پارٹی اینڈ کمیٹی کے زیر اقتدار صوبوں کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کیجیے۔ نیز کیرل کا تعلیمی نظام بھی دیکھئے جہاں کانگریس مجاز حکومت میں مسلم لیگ کا مسلمان ممبر اسبلی وزیر تعلیم ہوتا ہے جبکہ کمیونسٹ حکومت میں ہمیشہ کوئی عیسائی وزیر تعلیم ہوتا ہے اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے یہاں ہر پانچ سال میں حکومت بدل جاتی ہے۔ پانچ سال کانگریس مجاز (UDF) کی تو دوسرے پانچ سال کمیونسٹ مجاز (LDF) کی حکومت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس طرح کی پارٹیوں میں شامل ہونے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے، اور ان کی حکومت میں شامل ہونے سے مسلمانوں کی دینی، اخلاقی یا معاشی فائدہ پہنچنے کا یقین یا گمان غالب ہو تو اس طرح کی پارٹیوں میں شامل ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا واجب ہے۔ تاکہ تعاون علی البر اور تقلیل شر پر عمل ہو سکے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، ایسی سیاسی پارٹیوں کا ممبر بننا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودة وقد کفروا بما جائکم من الحق (الممتحنہ: ۱) (اے ایمان والو! میرے اور خود اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم تو دوسری طرف سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ اس سچے دین کے منکر ہیں جو تمہارے پاس آچکا ہے)۔

اگر کوئی مسلمان اسلام دشمن اور مسلم دشمن پارٹی میں اس نیت سے شامل ہوتا ہے کہ وہ اس کے اسلام اور مسلم مخالف ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا اگر وہ واقعہ اپنے اس نیت میں مخلص ہے اور اس کے اندر اس قدر ایمانی جذبہ ہے کہ وہ غیروں سے متاثر نہیں ہوگا اور اس کے اندر اس قدر سیاسی قابلیت ہے کہ وہ مسلم اور اسلام دشمن پارٹی پر کسی طرح بھی اثر انداز ہو سکتا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے تو تقلیل الشر والظلم مطلوب بقدر الاستطاعة کے اصول کے تحت اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پارٹی میں شامل ہو جائے۔ مگر وہ اپنے مقصد کو کبھی نہ بھولے۔ دشمن پارٹی میں شامل ہونے کی وجہ سے اگر قوم اسے برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے برداشت کرے، اس لیے کہ وہ بظاہر دشمن پارٹی میں ہے اور وہ کسی نہ کسی درجے میں اس دشمن پارٹی سے اپنی وفاداری کا اظہار بھی کرتا ہوگا، اس لیے کہ اظہار وفاداری کے بغیر پارٹی میں نہیں رہ سکتا، لہذا قوم کا اسے برا بھلا کہنا بھی جائز اور مناسب ہے۔

۹۔ جہاں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کا قیام خود مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہو اور مسلم سیاسی جماعت کے نتیجے میں اسلام دشمن طاقتیں متحد ہو جائیں اور ان کے متحد ہونے کے نتیجے میں مسلمانوں کے ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو پر خطرات کے بادل منڈلانے لگ جائیں تو وہاں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کا قیام جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ فتنہ و فساد کا سبب ہوگا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها (الاعراف: ۸۵) (زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پھیلاؤ)۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: والفتنة أشد من القتل (البقرہ: ۱۷۷) (اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے)۔

مسلم اقلیتی ممالک میں مسلمان کیا کریں؟

جہاں مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا ممکن نہ ہو تو وہاں مسلمان خاموش تماشائی نہ بنے رہیں بلکہ حتی الامکان سیاست پر اثر انداز ہونے کی کوشش کریں اور اگر ممکن ہو تو وہ اپنی قیادت میں ایک ایسی سیاسی پارٹی بنائیں جس کا منشور تو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو، مگر اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوتے ہوں اور اس پارٹی کو برادران وطن کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ یہ پارٹی صرف مسلمانوں کی نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کی ہے جو ظلم کا مخالف اور انصاف پسند ہے۔

ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں سرکاری اعداد و شمار کے حساب سے مسلمان صرف ساڑھے تیرہ فیصد ہیں، ایک ایسی سیاسی پارٹی ہی ملتی سطح



کامیاب ہو سکتی ہے۔ الحمد للہ بعض مسلم قائدین نے اس طرف توجہ دی ہے اور گزشتہ چند سالوں میں اس طرح کی کئی سیاسی پارٹیاں ہندوستانی سیاست کے افق پر نمودار ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور پارٹیاں یہ ہیں:

۱۔ پارٹی انڈیا یونائیٹڈ ڈیموکریٹک پارٹی (AIUDF)۔

۲۔ سول ڈیموکریٹک پارٹی (SDPI)۔

۳۔ ویلفیئر پارٹی آف انڈیا۔

۴۔ پیس پارٹی۔

۱۰۔ اگر خواتین کو ووٹ کا حق ہو اور خواتین کو ووٹنگ بوتھ تک جانے میں اور ووٹ دینے میں عزت و آبرو اور جان کا کوئی خطرہ نہ ہو تو جس طرح عام حالات میں مردوں پر ووٹنگ واجب ہے، اسی طرح عام حالات میں خواتین پر بھی ووٹنگ واجب ہے۔ اس لئے کہ جس طرح مردوں پر شہادت کا تحمل اور اس کی ادائیگی فرض کفایہ ہے، اسی طرح خواتین پر بھی شہادت کا تحمل اور اس کی ادائیگی فرض کفایہ ہے، اس لیے کہ اُقیسوا الشہادۃ للہ (الطلاق: ۲) اللہ کے واسطے گواہی قائم کرو کے مخاطب مرد و خواتین دونوں ہیں اور مردوں کے تخصیص کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور جیسا کہ میں سوال اول کا جواب میں تحریر کر چکا ہوں کہ ووٹ شہادت ہے اور سوال دوم کے جواب میں تحریر کر چکا ہوں کہ جس طرح شہادت فرض کفایہ ہے، اسی طرح ووٹ دینا بھی واجب کفایہ ہے۔

خواتین کے ایکشن میں امیدوار بننے کا حکم:

اسلام نے خواتین کا دائرہ عمل گھر کو بنایا ہے اور بلا کسی شرعی یا طبعی ضرورت کے ان کا باہر نکلنا پسند نہیں کیا ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں فرار سے رہیں۔

ارشاد خداوندی ہے: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (الاحزاب: ۳۳) (اور اپنے گھروں میں فرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو، اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت گزاری کرو)۔

مشہور مفسر علامہ آلوسی فرماتے ہیں: اور (قرن سے متعلق) تمام قرأتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے امہات المؤمنین رضی اللہ عنہما کو ہمیشہ گھر میں رہنے کا حکم دیا ہے اور یہ کام تمام عورتوں سے مطلوب ہے۔ ترمذی اور بزار نے ابن مسعودؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت مستور رہنے کے قابل چیز ہے، جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اس وقت ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے گھر میں ہو۔

بزار نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ عورتیں حضور اکرم ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ساری فضیلت تو مردوں کے لئے وہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر جہاد جہاد کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی“ (روح المعانی ۱/۸۸-۸۷ اور اکتب العلمیۃ بیروت لبنان)۔

مشہور اہل حدیث عالم علامہ صلاح الدین یوسف و قرن فی بیوتکن کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یعنی تک کر رہو اور بغیر ضروری حاجت کے گھر سے باہر نہ نکلو۔ اس میں وضاحت کر دی گئی کہ عورت کا دائرہ عمل امور سیاست و جہان بانی نہیں، معاشی جھمیلے بھی نہیں۔ بلکہ گھر کی چہار دیواری کے اندر رہ کر امور خانہ داری سرانجام دینا ہے“ (قرآن کریم مع ترجمہ از مولانا محمد جونا گڑھی و تفسیری حواشی از مولانا صلاح الدین یوسف پاکستانی۔ شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ پریس سعودیہ)۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں میرا موقف یہ ہے کہ خواتین کو صرف خواتین کے لیے محفوظ سیٹوں پر امیدوار بننے کی اجازت ہے اور اگر ایسی محفوظ سیٹوں پر مسلم خواتین کا کامیاب ہونا یقینی ہو یا کامیاب ہو جانے کا گمان غالب ہو تو وہاں سے کسی ایک مسلم خاتون کا امیدوار بننا واجب کفایہ ہے تاکہ وہ کامیاب ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکے، برائی کو کم کر سکے اور بھلائی کو عام کر سکے۔ اگر خواتین کے لیے محفوظ سیٹوں پر مسلم خواتین امیدوار نہیں بنیں گی تو لامحالہ غیر مسلم خواتین وہاں سے کامیاب ہوں گی اور اس کا دو نقصان ہوگا: پہلا نقصان یہ ہوگا کہ اسمبلی یا پارلیمنٹ وغیرہ میں مسلمانوں کا تناسب کم ہو جائے گا۔ مثلاً ہندوستانی پارلیمنٹ لوک سبھا ۵۴۳ رکنی ہے۔ اس میں اگر ایک تہائی سیٹیں خواتین کے لیے محفوظ ہو جائیں

تو ۱۸۱ سٹیٹس خواتین کے لیے محفوظ ہو جائیں گی جس میں مسلم خواتین کا حصہ ۲۵ ہوگا، اس لیے کہ سرکاری اعداد و شمار کے حساب سے مسلمان ہندوستان میں ساڑھے تیرہ فیصد ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کا عام تاثر یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان کم از کم پچیس فیصد ہیں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرکاری اعداد و شمار کے حساب سے بھی خواتین کے لیے ایک تہائی ریزرویشن ہونے کی صورت میں کم از کم ۲۵ فیصد مسلم خواتین کو پارلیمنٹ کا ممبر بننا چاہئے، اب اگر حقیقی اور متدین مسلم خواتین ۲۵ پارلیمانی حلقوں سے کامیاب نہیں ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیروں کو اپنا حق دے کر ان کو من مانی کرنے کی چھوٹ دے رہی ہیں اور جس طرح مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا کوئی سیاسی حق ان لوگوں کو دے دیں جو غیر اسلامی کام کرتے ہیں، یا اسلام دشمن اور مسلمان دشمن ہوں۔ اس لئے کہ مسلمان کو تعاون علی البر کا حکم دیا گیا ہے اور تعاون علی الاثم سے روکا گیا ہے اور اپنا سیاسی حق غیروں کو دے دینا بھی تعاون علی الاثم میں شامل ہے۔

دوسرا نقصان معاشی ہے۔ آج کل ممبران پارلیمنٹ کو بھی بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں، نیز ان کو بہت سارے سرکاری فنڈ ملتے ہیں جنہیں وہ اپنے حلقے کی ترقی کے لئے خرچ کرتے ہیں، لہذا جتنے مسلمان ممبران پارلیمنٹ کم ہوں گے اتنا کم مال مسلمانوں کے پاس آئے گا اور بے مانگی یا کم مانگی سے مسلمانوں کے اندر جہالت بڑھے گی، جس کے نتیجے میں مسلمان قوم تعلیم و تربیت میں دوسری قوموں سے پیچھے چھڑ جائے گی۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہندوستان میں آزادی سے پہلے دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کا تناسب سب سے زیادہ تھا، مگر آج سب سے کم ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو مسلمان معاشی اعتبار سے اور اعلیٰ تعلیم کے اعتبار سے آگے تھے وہ یا تو پاکستان چلے گئے یا فسادات کا شکار ہوئے۔ یا ہندوستانی سرکاری عتاب نے انہیں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا، اس لئے مسلم قائدین پر یہ بھی ضروری ہے کہ معاش کے حلال مراکز کی طرف امت کی رہنمائی فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر کامیاب ہونے کا یقین یا گمان غالب نہ ہو تو مسلمان خواتین کے لئے جائز ہے کہ وہ خواتین کے لئے محفوظ سیٹوں پر امیدوار بنیں اور اگر کامیاب ہونے کا یقین یا گمان غالب ہو تو امیدوار بننا واجب کفایہ ہے۔ مگر ہر دو صورت میں مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔ ولی یا شوہر کی اجازت شامل ہو۔

۲۔ شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو۔

۳۔ لباس دبیز اور مکمل ساتر ہو۔

۴۔ لباس اس قدر چھوڑا نہ ہو کہ مردوں کے لیے کشش کا باعث بنے۔

۵۔ خوشبو کے استعمال سے بچیں۔

۶۔ پائل یا چھلوں کے پہننے سے بچیں۔

۷۔ مردوں سے اختلاط بالکل نہ ہو۔

۸۔ اگر کبھی اجنبی اور غیر مردوں سے بات کرنے کی ضرورت آن پڑے تو لہجے میں کھنگلی ہو۔

۹۔ شوہر اور بچوں کے حقوق سے بے اعتنائی نہ ہو۔

۱۰۔ محارم میں سے کوئی ایک ہر وقت اس کے ساتھ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ سیاست کرنے والی اور ایکشن میں امیدوار بننے والی ہر عورت اپنے محارم یا شوہر میں سے کسی ایک کو اپنا پرسنل سکریٹری بنا لے جو عوامی مجالس اور مردوں کے درمیان اس کی وکالت کرے۔

۱۱۔ بلا ضرورت شدیدہ کے پوسٹروں اور پمفلٹوں پر اپنی تصویر کا استعمال نہ کرے۔

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط اہم مسائل

مولانا عبدالرب عبدالوہاب خان واپی سعادتی ع

(۱) ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے ووٹ کی متعدد حیثیتیں معلوم ہوتی ہیں:

پہلی حیثیت شہادت:

ووٹر جس شخص کو ووٹ دے رہا ہے، وہ دراصل اس کے متعلق یہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ شخص فلاں عہدہ کا اہل ہے، ملک و ملت کا خیر خواہ ہے، ساتھ ساتھ امانت دار و دیانت دار بھی، اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھی ہے، ایسے امیدوار کو ووٹ دینا سچی گواہی ہے، اس کے برعکس نااہل، ملک و ملت کے غدار، مجرم پیشہ اور خود غرض امیدوار کو ووٹ دینا جھوٹی گواہی ہے، جو سخت کبیرہ گناہ ہے اور نیا د آخرت میں وبال کا باعث ہے، چنانچہ قرآن وحدیث میں جھوٹی گواہی پر بے شمار وعیدیں بیان کی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور“ (سورۃ الحج: ۳۰) بخاری شریف کی روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبر الکبائر میں شمار فرمایا ہے (بخاری کتاب الشہادت، باب ما یل فی شہادۃ الزور ۳۶۲ حدیث نمبر ۲۶۵۳)۔

ایک طرف جھوٹی گواہی کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، تو دوسری طرف سچی گواہی کو واجب و لازم قرار دیا گیا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط“ (سورۃ المائدہ: ۸) بلکہ سچی گواہی کے چھپانے کو جرم عظیم قرار دیا گیا: ”ولا تکتبوا الشہادۃ، ومن یکتمہا فإِنَّہ أَمْرٌ قَلْبِہ“ (سورۃ البقرہ: ۲۸۳) اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من کتم شہادۃ اذا دعی الیہا کأن کمن شہد بالزور“ (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی مطبوعہ اداۃ القرآن پاکستان ۶۹۸/۲) چونکہ ووٹ بھی ایک شہادت ہے تو قرآن وسنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوں گے، لہذا نااہل امیدوار کو ووٹ دینے سے احتراز اور باصلاحیت امیدوار کو ووٹ دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

دوسری حیثیت سفارش:

ووٹر جس شخص کو ووٹ دے رہا ہے، اس کے بارے میں ایکشن کمیشن بورڈ سے سفارش کرتا ہے کہ یہ شخص پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا اہل ہے اور آیت کریمہ: ”من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منها، ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفیل منها وكان اللہ علی کل شیء مقیتا“ (سورۃ النساء الآیۃ ۵۸) کی رو سے جو ووٹر باصلاحیت اور امانت دار امیدوار کو ووٹ دے گا، وہ عند اللہ ماجور ہوگا، خواہ وہ امیدوار نا کام ہی کیوں نہ ہو، اس کے برعکس جو شخص نا لائق، فاسق و ظالم کو ووٹ دے گا تو وہ گنہگار اور عند اللہ مسئول ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پانچ سالہ دور میں جو نیک یا برے کام کرے گا، ہم بھی اس کے ثواب و عقاب میں شریک سمجھے جائیں گے۔

تیسری حیثیت مشورہ:

ووٹ کی تیسری حیثیت مشورہ کی ہے، گویا ایکشن کمیشن نے لوگوں سے اپنے اپنے حلقہ سے حکومت کی تشکیل کے لئے ممبرس منتخب کرنے کے بارے میں مشورہ کیا، تو ووٹر ووٹ کے ذریعہ حکومت کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ فلاں شخص کو حکومت کی تشکیل میں شامل کیا جائے، اس لیے کہ وہ زیادہ بہتر اور ایماندار ہے۔

ع خادم جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات۔

چونکہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کے متعلق ارشاد فرمایا: "المستشار مؤتمن" (ابوداؤد کتاب الادب باب فی المشورۃ ۲۰۶۹)۔

یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے کے بارے میں امین ہے، اور امانت کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: "إِن اللّٰهُ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُوَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا" (سورۃ النساء الآیۃ ۵۸۰) اور علامہ قرطبی نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ امانت کا لفظ تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کو شامل ہے، چنانچہ متعدد صحابہ کرام مثلاً: ابن عباس، ابی بن کعب وغیرہ نے فرمایا: "لِلْأَمَانَةِ فِي كُلِّ شَيْءٍ" کہ امانت کا تعلق ہر چیز سے ہے (تفسیر قرطبی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی لبنان ۲۵۶/۵)۔

لہذا ووٹس کو چاہیے کہ ایسے امیدوار کے انتخاب پر مہر لگائیں جو باصلاحیت، فرض شناس اور ملک و ملت کے لیے مفید ہو ورنہ نااہل کو ووٹ دینا امانت میں خیانت کے مترادف ہے۔

چوتھی حیثیت وکالت:

ووٹ دینے والا گویا امیدوار کو اپنا وکیل اور نمائندہ بناتا ہے کہ فلاں امیدوار اس حلقہ سے حکومت کی تشکیل کرنے اور وزیراعظم منتخب کرنے کے لیے وکیل ہے۔ اب اگر یہ وکالت کسی شخص کے حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع و نقصان صرف موکل کی ذات تک محدود ہوتا، تو اس کا یہ خود مزدار ہوتا، مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس اعتبار سے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب کیا اور اس امیدوار نے پوری قوم و ملت کے حقوق کو پامال کیا تو اس کا گناہ بھی اسی نسبت سے ووٹ کی گروٹ پر پڑے گا۔

پانچویں حیثیت سیاسی معاہدہ و بیعت:

اگر مسلم ملک ہو تو ووٹ کی حیثیت شہادت، سفارش اور وکالت کے علاوہ سیاسی معاہدہ اور بیعت کی بھی ہوگی، گویا ووٹ کسی پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دے کر اس کے ساتھ تحریری معاہدہ اور بیعت کرتا ہے کہ آپ واقعی اہل ہیں، میں آپ کی تائید کرتا ہوں کہ آپ کی پارٹی کی حکومت ضرور بننی چاہیے اور بیعت کے لئے ضروری نہیں کہ ہاتھ سے ہی بیعت کی جائے، چنانچہ امام بخاری نے عبد اللہ بن دینار سے دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن عمر نے عبد الملک بن مروان سے تحریری طور پر بذریعہ مراسلہ بیعت کی ہے (صحیح بخاری باب کیف ینایح الامام الناس ۱۰۹/۲)۔

لہذا ہمارا معاہدہ سب سے اچھی پارٹی کے امیدوار سے ہونا چاہیے، تاکہ لوگوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ووٹ کی حیثیت شہادت، سفارش، مشورہ اور حقوق مشترکہ میں وکالت کی ہے، جس طرح باصلاحیت، ایماندار امیدوار کو ووٹ دینا واجب اور موجب ثواب عظیم ہے، اسی طرح نااہل کو ووٹ دینا ناجائز اور حرام ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: جواہر المفقہ از مفتی شفیع ۲۹۱/۲ - ۲۹۳ - مطبوعہ مکتبہ تفسیر القرآن دیوبند اور فقہی مقالات از مفتی محمد تقی عثمانی ۲۸۷/۲ - ۲۹۰ اور جدید فقہی مسائل از مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی ۲۳۱)۔

(۲) - اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا، یا مستحب، یا واجب؟

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر آچکا ہے اور جب حق کو حاصل کرنے اور ظلم کو روکنے کے لئے گواہی دینی ضروری ہو جائے، جیسا کہ موجودہ صورت حال ہے، تو ووٹ دینا کتمان شہادت ہوگا، اس لئے موجودہ حالات میں بحیثیت مسلمان ووٹ دینا ہمارے لئے ایک مذہبی فریضہ کے درجہ میں ہے، ووٹ کے حق کا استعمال کرنا ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے۔

چنانچہ مفتی شفیع صاحب اپنے رسالہ "انتخابات میں ووٹ، ووٹ اور امیدوار کی شرعی حیثیت" میں رقمطراز ہیں: "جس طرح قرآن و سنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے، بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب و لازم بھی فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "كُونُوا قَوْمِ اللَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ" (سورۃ المائدہ: ۸۰) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "كُونُوا قَوْمِ اللَّهِ الَّذِينَ هُمْ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ" (سورۃ النساء: ۱۳۰) ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لیے ادا کیگی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں، تیسری جگہ سورہ طلاق میں ارشاد ہے: "وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ" (سورۃ الطلاق: ۲) یعنی اللہ کے لئے سچی شہادت کو قائم کرو، اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ سچی بشارت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے، ارشاد ہے: "وَلَا

تکتبوا الشہادۃ ومن یکتبہا فإنہ أثم قلبہ“ (سورۃ البقرہ: ۲۸۳) یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے۔

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ کبھی گواہی سے جان نہ چرائیں۔ ضرور ادا کریں (جوہر الفقہ مطبوعہ مکتبہ تفسیر القرآن دیوبند ۲۹۳-۲۹۴)۔

بلکہ گواہی (جس میں ووٹ بھی شامل ہے) دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا یہ فریضہ ادا کر دے، اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا اہتمام نہ کرے۔ حضرت زید بن خالدؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الأخبر کہ بخیر الشہداء الذی یأتی بشہادۃ قبل أن یسألہا“ (صحیح الفوائد بحوالہ مالک و مسلم، ج: ۲، ص: ۶۸۸) لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضہ نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ممالک میں انتخابات میں مسلمانوں کی شرکت اور ووٹ دینا شرعاً واجب ہوگا، کیونکہ موجودہ ہندوستان بلکہ عالمی حالات کے تناظر میں غیر مسلم جمہوری ممالک میں آباد مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات کی حفاظت اور جان و مال اور عزت کی صیانت، ووٹ دینے کے ساتھ وابستہ ہے اور مذہب، جان، مال اور عزت ان مقاصد شریعت میں سے ہیں، جن کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہے اور ان مقاصد شریعت کا حصول انتخابات میں شرکت اور ووٹنگ کے بغیر مشکل ہے۔ اور قاعدہ مسلمہ ہے: ”ما لایتم الواجب الا بہ فهو واجب“ (القواعد الفقہیۃ للدکتور علی احمد الندوی مطبوعہ دار القلم دمشق، ص: ۱۰۶) اس لیے انتخابات میں مسلمانوں کی شرکت اور ووٹ دینا شرعاً واجب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳)۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

موجودہ انتخابی نظام میں امیدوار ایکشن کمیشن کے پاس نامزدگی کے کاغذات داخل کرتا ہے، گویا کہ خود اپنے آپ کو عہدہ کے لئے پیش کرتا ہے اور منصب کا طالب ہوتا ہے۔

چونکہ منصب ایک مسؤلیت ہے، حق نہیں، اس لئے اس کا طلب کرنا اصولاً ناجائز ہونا چاہیے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ سے ارشاد فرمایا: ”لا تسأل الأمانة: فان أعطیتها عن مسئلة و کلت إليها، وإن أعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیہا“ (صحیح مسلم کتاب الامارة باب النهی عن طلب الامارة والحرض علیہا ۲۰۱۲) اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من ابتغی القضاء وسأل فیہ شعفاء وکل إلى نفسه ومن أکره علیہ أنزل اللہ علیہ ملکہ یسدہ“ (ترمذی کتاب الاحکام حدیث نمبر ۱۳۲۳، ابوداؤد الاصحیۃ حدیث نمبر: ۳۵۷۸، مسند احمد: ۱۲۱۸۳) اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: میرے قبیلہ کے دو آدمیوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ انہیں حکومت کا کوئی منصب عطا کر دیا جائے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”إنا لانوئی ہذا من سألہ ولا من حرض علیہ“ (صحیح البخاری باب ما یکرہ من الحرض علی الامارة حدیث نمبر: ۷۱۲۹)۔

ایک طرف یہ احادیث ہیں، جو طلب منصب کی ممانعت پر دال ہیں اور دوسری طرف ایک حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے: ”من طلب قضاء المسلمین حتی ینالہ، ثم غلب عدلہ جورہ فلہ الجنة“ (سنن ابی داؤد کتاب الأفضیۃ باب فی القاضی یخطی ویصیب حدیث نمبر: ۳۵۷۵) اس میں لفظ طلب سے صراحتہ طلب کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن اس روایت کی سند پر کلام ہے۔ بعض حضرات طلب کے جواز پر یوسف علیہ السلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا کرتے ہیں، جو انہوں نے فرعون مصر سے کہا تھا: ”جعلنی علی خزائن الأرض، رانی حفیظ عظیم“ (سورۃ یوسف ال آیت: ۵۵) چنانچہ مشہور مفسر علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”ودلت الآیۃ ایضاً علی جواز أن یطلب الإنسان عملاً ینکون له أهلاً“ (تفسیر قرطبی مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان ۳۱۶/۹)۔

الغرض بظاہر نصوص میں تعارض ہے، علماء نے دونوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ طلب منصب جائز نہیں، لیکن بعض مرتبہ ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ جس میں انسان کو بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں اس منصب کو طلب نہیں کروں گا، تو اس کے نتیجے میں ایسے لوگ اس منصب پر آ جائیں گے، جن سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوں گے اور بے دینی پھیلے گی، تو ایسی مجبوری کی حالت میں طلب کی بھی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ اس عہدہ کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دینے کی قابلیت و صلاحیت رکھتا ہو، طلب جاہ مقصود نہ ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی طلب اور ابوداؤد کی روایت اسی استثنائی

حالت پر محمول ہے۔

قاضی ابویعلیٰ حنبلی نے سیاست الشریعیہ میں یہی موقف اختیار کیا ہے، اور بعد کے علماء نے اس کی تائید کی ہے، چنانچہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی اعلیٰ اسٹن میں اس موقف کو ترجیح دی ہے (اسلام اور سیاسی نظریات، از مکتبہ اہل سنت، لاہور، ۲۰۱۷ء)۔

بہر حال عام حالات میں امیدوار بننا بظاہر درست نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آج کل تو انتخابات کا پورا ڈھانچہ امیدواری کے نظام پر مبنی ہے؟ اگر حکومتی مناصب کی طلب ناجائز ہو تو پھر کوئی امیدواری نہ رہا تو انتخابات کا طریقہ کیا ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بقول مولانا تقی عثمانی صاحب زید مجدہ: ”امیدواروں کا متبادل طریقہ یہ ہے کہ ہر حلقہ انتخابات کے عوام کو دعوت دی جائے کہ وہ اپنے حلقے کی نمائندگی کے لیے از خود افراد تجویز کریں۔ ان افراد کی صفات اہلیت بھی متعین کر دی جائیں..... پھر جس شخص کا نام حلقے کے لوگوں کی ایک متعین تعداد مثلاً پانچ سو یا ایک ہزار آدمیوں نے (صفات اہلیت کے مطابق) تجویز کیا ہے، الیکشن کمیشن اس کا جائزہ لے کر کہہ کر کیا یہ تجویز حقیقی ہے؟ اور کیا واقعی تجویز کرنے والے متعین تعداد میں پانچ سو سے ایک ہزار ہیں؟ اور اس میں کوئی جھلسازی تو نہیں ہوئی ہے؟ نیز جس شخص کا نام تجویز کیا گیا ہے وہ ان اوصاف کا حامل ہے، جو نامزدگی کے لیے طے کی گئی ہیں؟ ان باتوں کا اطمینان کرنے کے بعد اس کے کاغذات نامزدگی منظور کیا جائے..... اور مجوزہ افراد کو اجماع کے ساتھ متعارف کرانے کی ذمہ داری الیکشن کمیشن اٹھائے اور کسی کو الیکشن کمیشن کے ذرائع کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے تشہیر یا ترغیب کے مروجہ طریقے اختیار کرنے کی اجازت نہ ہو، پھر ان کے درمیان انتخابات کے لیے ان نامزد افراد کے بارے میں ووٹ ڈلوائے جائیں (اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۲۱۷-۲۱۹)۔

لیکن ہندوستان جیسے ممالک کے موجودہ حالات کے تناظر میں مسلم امیدواری کی شرکت الیکشن میں بحیثیت اجتماعی واجب ہونی چاہیے، اس لئے کہ عصر حاضر میں چونکہ ووٹ بہت بڑی طاقت ہے، اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ ایک موثر ہتھیار ہے، کیونکہ ووٹ ہی سے سیاسی اور سماجی زندگی میں قوموں کا درجہ و مقام متعین ہوتا ہے، ان کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے اور قرآن کریم نے مسلمانوں کو قوت بڑھانے کا حکم دیا ہے: ”وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ“ (سورۃ الانفال: ۱۰)۔

اور بقول مفتی خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم: ”قوت کا لفظ ایک جامع لفظ ہے جس میں وہ تمام طاقتیں شامل ہیں، جو نتائج اور فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں، یہ طاقت فوج کی بھی ہو سکتی ہے، افرادی قوت اور تعداد کی بھی اور علم و دانش کی بھی (شرح فروزاں حصہ اول ص: ۵۶)۔

الغرض! ہندوستان جیسے جمہوری ممالک میں الیکشن میں شرکت سے بے شمار قومی و ملی مفادات و مقاصد وابستہ ہیں اور کہیں تو اس کے بغیر ملت کا تشخص اور دین اسلام کی حفاظت بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جمہوری لاء میں اسلام کے خلاف بنے ہوئے دفعات قوانین کو پارلیمنٹ میں چیلنج کرنا، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور منسوخی کا مطالبہ کرنا اور پارلیمنٹ میں اسلام کے خلاف بنائے گئے نئے قوانین کو پاس ہونے سے روکنا یا اس کی کوشش کرنا، مجالس قانون سازی کی نمائندگی الیکشن میں شرکت کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور دوسری طرف الیکشن میں امیدوار کی حیثیت سے شرکت نہ کرنے کے مفاسد شرکت و شمولیت کے مفاسد سے بڑھے ہوئے ہیں اور اصول مشہور ہے: ”إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما“ (الاشباہ والنظائر لابن نجيم مطبوعه المكتبة المصرية بيروت لبنان، ص: ۱۱۱)۔

لہذا حفاظت دین اور خدمت کے جذبہ سے ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں از خود امیدوار بننا، دوسرے امیدوار کے لیے جائز حدود میں رہتے ہوئے انتخابی مہم چلانا جائز ہی نہیں بلکہ بحیثیت اجتماعی واجب ہونی چاہیے۔

چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے چودھویں فقہی سیمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد مورخہ: ۲۲/۲۰ جون ۲۰۰۳ء میں ووٹ سے متعلق جو تجاویز منظور ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تجویز یہ ہے: ”اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے، لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے، لہذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، مطبوعہ: ایٹا، بلی کیشنز، ص: ۳۹)۔

(۴)۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟

یہاں پر دو مفندے کا اجتماع ہے: ایک تو قانون ساز اداروں کے ممبر بننے کا مفندہ، اور وہ یہ ہے کہ ایسے ادارے کا تعاون، جو بعض دفعہ شریعت کے خلاف قانون بناتے ہیں بظاہر تعاون علی الاثم ہے جو ناجائز ہے اور دوسرا مفندہ ایسے قانون ساز اداروں یعنی پارلیمنٹ میں شرکت نہ کرنے کا مفندہ اور وہ یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پارلیمنٹ میں قوانین وضع ہوں گے اور مسلمانوں کی طرف سے دفاع کرنے والا وہاں کوئی نہیں ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کو اسلام کے خلاف قوانین پر عمل کرنے پر مجبور کیا جائے گا، نیز مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں رہیں گی، دوسروں کے ماتحت رہیں گے، انہیں مذہبی اور قومی حقوق سے محروم ہونا پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔

اگر غور کیا جائے تو پارلیمنٹ کے ممبر بننے کا مفندہ کمتر ہے، عدم شرکت کے مفندے سے اور فقہ اسلامی کا مشہور ضابطہ ہے: ”اذا تعارض مفسدان روعی أعظمهما ضرر ابار تکاب اخفهما“ (الاشباه والنظائر لابن نجيم مطبوعة المكتبة العصرية بيروت ص: ۱۳۹) لہذا بظاہر قانون ساز اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا، بشرطیکہ پارلیمنٹ میں جانے کی نیت بھی یہ ہو کہ میں اپنی قوم و ملت کے حقوق کی حفاظت کروں گا (کفایت المفتی مطبوعہ: مکتبہ امدادیہ بلتان پاکستان، ج: ۹، ص: ۲۷۳) اب اگر پارلیمنٹ میں شریعت کے خلاف قوانین پاس بھی ہوئے تو یہ اس کے روکنے کا موثر ذریعہ ہوگا کہ اس پلیٹ فارم سے اس کے برعکس کی وکالت کی جائے۔

(۵)۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

ما قبل میں گزر چکا ہے کہ مشہور قاعدہ: ”اذا تعارض مفسدان الخ“ کی رو سے پارلیمنٹ میں شرکت صالح مقاصد کے پیش نظر درست ہے۔

اب رہی یہ بات کہ پارلیمنٹ کے تمام اراکین کو ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے، جس میں بعض دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وفاداری کا حلف اس شرط اور نیت سے ہے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو، میں وفاداری کروں گا، اٹھالینے میں مضائقہ نہیں (کفایت المفتی ۲۹/۳۷ مطبوعہ: مکتبہ امدادیہ بلتان پاکستان)۔ ہندوستان جیسے ملکوں کے دستور کا حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اس کی بنیاد الٰہی اور انکار خدا پر نہیں ہے، بلکہ عقیدے اور مذہب پر عمل کی آزادی اس کی بنیادی دفعات میں سے ہے، مسلمان اس کا حلف مذکورہ بالا نیت سے اٹھائے گا (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ص: ۵۲۹)، اور حدیث مشہور ہے: ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ (صحیح بخاری باب کیف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ حدیث نمبر: ۱)

(۶)۔ بعض عیسائی ملکوں میں ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟

مجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے پانچویں سیدنا منعقدہ مکہ مکرمہ مورخہ ۸-۱۳ ربيع الثانی ۱۴۲۰ھ میں اکیڈمی عدالت میں حلف اٹھاتے وقت توریت یا انجیل یادوں پر ہاتھ رکھنے کے حکم کے سلسلہ میں جس نتیجہ پر پہنچی تھی وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اللہ کے سوا کسی اور چیز کی قسم کھانی جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”جسے قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے، ورنہ خاموش رہے۔“

۲۔ قسم کھاتے وقت صحف، توریت یا انجیل وغیرہ پر ہاتھ رکھنا قسم کی صحت کے لئے ضروری نہیں ہے، البتہ اگر حاکم قسم کو پختہ کرانا چاہتا ہو، تاکہ قسم کھانے والا جھوٹ بولنے سے ڈرے، تو ایسا کرنا جائز ہے۔

۳۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھے، اس لیے کہ آج جو نسخہ رائج ہیں، وہ محرف ہیں اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہونے والے اصل نسخے نہیں ہیں اور حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت نے پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

۴۔ اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لئے توریت یا انجیل پر یادوں پر ہاتھ رکھنے کو ضروری قرار دیتی ہے تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔

سلسلہ جدید فقہی مباحث جلد نمبر ۱ / ایکشن کے شرعی مسائل  
اس پر شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، صالح بن عثمان، محمد بن عبداللہ بن السبیل، مصطفیٰ احمد الزرقاء، حسین محمد مخلوف اور مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی وغیرہ علمائے کبار کے دستخط موجود ہیں (مجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے ترجمہ: مولانا محمد نعیم اختر ندوی، ناشر: ایف اے بی کیشنز نیوی)۔

خلاصہ یہ کہ اولاً مسلمان عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر نہ مانا جائے تو مجبوراً ابلانیت تعظیم بائبل پر ہاتھ رکھنا درست ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۷)۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

موجودہ حالات کے تناظر میں وہ غیر مسلم سیکولر سیاسی پارٹیاں، جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، ان میں شرکت اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا بظاہر درست ہونا چاہیے اور شرعی طور پر اس کو عہد اور معاہدے کی حیثیت حاصل ہوگی۔

اب حالات کے اعتبار سے کبھی معاہدہ کرنا واجب ہوگا اور یہ اس وقت جب کہ مسلمانوں کے ملی مفادات کی حفاظت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدہ کرنے پر منحصر ہو جائے، کیونکہ ایسی صورت میں مقاصد شریعت دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا مسئلہ پیدا ہوگا اور مقاصد شریعت کی حفاظت و حمایت واجب ہے (المصطفیٰ للغزالی مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت، ص: ۲۸۷، نظریۃ المقاصد عند الامام الشافعی للفقہ الاسلامی ص: ۱۳۶، المدکور احمد الریونی مطبوعہ المعجد العالمی للفقہ الاسلامی ص: ۱۳۶)، اور کبھی معاہدہ کرنا مستحب ہوگا جب کہ ملی مفادات کی حفاظت معاہدہ پر منحصر نہ ہو اور چونکہ یہ معاہدے مسلمانوں کے امور عامہ سے متعلق ہیں، لہذا مسلمانوں کے مفادات عامہ کے خلاف معاہدے کرنا درست نہیں ہوگا، بلکہ وہ معاہدے از روئے شرع غیر معتبر قرار پائیں گے، فقہ اسلامی کا مشہور اصول ہے: "تصرف الإمام علی الرعیۃ منوط بالمصلحة" (الاشیاء والنظائر لابن نجیم مطبوعہ المکتبۃ العصریۃ بیروت، ص: ۱۴۹)۔

اور اگر وہ پارٹی معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو ان سے الگ ہو جانا ضروری ہوگا، کیونکہ وہ خائن ہے، ان پر بھروسہ کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے اور گویا اپنی موت آپ مرنا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: "وإما تخافن من قوم خيانة فانبذ إليهم على سواء إن الله لا يحب الخائنين" (سورۃ الانفال: ۵۸)۔

اور اگر ان سیکولر پارٹیوں کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوں، تو ظاہر ہے کہ ایسی پارٹیوں میں شرکت اور عدم شرکت دونوں میں ضرر ہے، اس لئے کہ اگر شرکت کرتے ہیں تو مخالف اسلام دفعات کی بالواسطہ تائید لازم آتی ہے اور اگر شرکت نہ کی جائے تو سیاسی اور قومی سطح پر مسلم کشی کے مترادف ہوگا، ان کی جان، مال اور عزت محفوظ نہیں رہے گی، دوسروں کے سہارے جینے اور غلامانہ زندگی اپنانے پر مجبور ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ شرکت کا مفسدہ عدم شرکت کے مفسدہ سے کمتر ہے، اس لئے موجودہ حالات کے تناظر میں بقاعدہ مشہور: "إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما" (الاشیاء والنظائر لابن نجیم، ص: ۱۱۱) موجودہ سیکولر سیاسی جماعتوں میں سے کسی جماعت میں شمولیت اختیار کی جائے اور اس جماعت میں جو نقص ہوں، بقدر استطاعت ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے، لیکن یہ عارضی حکم ہے، پھر جب کوئی مسلمان جماعت (جو صاحب قوت اور صاحب اثر بھی ہو) تیار ہو جائے تو اس میں شمولیت اختیار کی جائے، چنانچہ حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رقم طراز ہیں:

"موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت (جو خالص اسلامی جماعت اور غلبہ قوت والی ہو) نہ موجود ہے اور نہ قریب میں اس کی توقع ہے، (اس لئے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے اور) اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مسلمان موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شریعیہ کی رو سے ان میں جو نقص ہو، اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان ہو اور دوسرے کی دشوار ہو تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق اس میں داخل ہو جائیں، جس کی اصلاح آسان ہو۔"

پھر ان میں جو اہل قوت اور اثر والے ہیں، ان کو اپنی قوت و اثر سے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور جو اہل قوت نہیں وہ اہل قوت کو قوتاً و قوتاً یا دودھانی کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح کی درخواست کرتے رہیں (مروجہ سیاست کے شرعی احکام مرتب: مولانا زبیر مظاہری ندوی، ص: ۳۳۷-۳۳۸، مستقداً زاد المعاد الفتاویٰ ص: ۶۳)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلم سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کرنا، ان میں شرکت کرنا اور ان کی حمایت کرنا درست ہے، چنانچہ



اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے چودھویں فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، مورخہ: ۲۰/۲۲ جون ۲۰۰۳ء کو ووٹ سے متعلق جو تجاویز منظور ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ”جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کیے جاسکتے ہیں“ (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ص: ۳۹)۔

(۸)۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونے کی گنجائش ہوگی؟

وہ سیاسی پارٹیاں جن کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو اور ان کی اسلام دشمنی واضح ہو تو ان میں مسلمانوں کی شرکت و شمولیت جائز نہیں، خواہ کسی کی نیت اس میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی ہو، کیونکہ افراد کی ذاتی رائے پارٹی کے منشور یا فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی، تنہا کوئی کچھ نہیں کر سکتا، بلکہ وہ خود بھی جماعت کے تابع ہو جاتا ہے۔ ”الاعتبار للآکثر لا للآقل“۔

بہر حال اسلام اور مسلم دشمن پارٹی میں شمولیت ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ شمولیت بالواسطہ کے باطل عزائم اور نظریات کی تائید کرنا ہے اور یہ شرعاً معصیت کی تائید اور اس پر تعاون ہے جو کہ ناجائز اور حرام ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان و اتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب“۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن (۲/۵۰، ۵۱) میں نہایت جامع انداز میں تعلقات کی مختلف شکلوں پر روشنی ڈالی ہے، جس کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ غیر مسلمین (خواہ وہ اشخاص ہوں یا جماعتیں) کے ساتھ تعلقات کے مختلف درجات ہیں:

- ۱۔ موالات: (قلبی مودت) یہ صرف مومنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مومنین کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔
- ۲۔ مواسات: (ہمدردی، خیر خواہی اور نفع رسانی) یہ بجز کفار اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں، باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔
- ۳۔ مدارت: (ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ) یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا ہو مقصود ہو۔
- ۴۔ معاملات: (مثلاً تجارت، ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات) یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ان کے کہ ان معاملات سے تمام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ وہ غیر مسلم سیاسی پارٹیاں جو اسلام اور مسلم دشمنی میں مشہور ہیں، ایسی سیاسی پارٹیوں سے معاہدے، کسی طرح کا سمجھوتہ، ان میں شمولیت اور ان کی حمایت کرنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔

چنانچہ اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے چودھویں فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد مورخہ: ۲۰/۲۲ جون ۲۰۰۳ء میں ووٹ سے متعلق جو تجاویز منظور ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

”جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنا لیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ص: ۳۹)۔

(۹)۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟

مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں شرکت تو سب کے نزدیک لازمی ہے، مگر طریقہ عمل کے سلسلہ میں رائے مختلف ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے، مگر کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

لہذا یہ موقف بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت سے فرقہ پرستوں کو فائدہ پہنچے گا اور مسلمانوں کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا، مسلمانوں کو

دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ مل کر سیاسی پلیٹ فارم تشکیل دینا چاہیے، اس لیے کہ ہمارے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، خاص طور پر ہندوستان میں فرقہ وارانہ صورت حال بڑی حساس ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ مسلمان متحد ہو کر اپنی علیحدہ سیاسی پارٹی بنائیں اور فرقہ پرست طاقتیں اس اتحاد کو غلط رخ دے کر اپنے حق میں استعمال نہ کریں، یعنی مسلمانوں کی اجتماعیت کا حوالہ دے کر ہندوؤں کو آسانی کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر لایا جاسکتا ہے، اور کچھ صوبوں کے ایکشن میں اس کا تجربہ بھی ہوا ہے، مجاذب بنا لیں گی اور اس طرح مسلمانوں کا اتحاد بظاہر بے اثر ہو جائے گا۔

اور یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب مکمل اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ ہو، کوئی ایک فرد بھی اس دائرے سے باہر کھڑا نظر نہ آئے، لیکن یہ محض تصور تاقی چیز ہے، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خود مسلمان ذات برادری میں بکھرا ہوا ہے، مسلکی تعصب اور گروہ بندی کا شکار ہے، ہر مسلم تنظیم کسی نہ کسی پارٹی کے ساتھ سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے وابستہ ہے۔ ظاہر یہ ممکن ہی نہیں کہ مسلمان مسلکی اور سیاسی اختلاف سے بالاتر ہو کر کسی ایک شخص کی قیادت پر متفق ہو جائیں۔ إلا ان یشاء اللہ۔

(۱۰) ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے؟ کیا ان کے لیے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے؟ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو مختلف مقاصد کے لئے پیدا فرمایا اور جس مقصد کے لئے کسی مخلوق کی تخلیق ہوئی، اس کے مناسب اسے صلاحیتیں عطا فرمائی، دیگر مخلوق کی طرح مرد و عورت کو بھی حق تعالیٰ نے جداگانہ صلاحیتوں سے نوازا اور دونوں کو جداگانہ مقاصد کے لئے پیدا فرمایا، مجملہ ان کے امور سلطنت، ملکی نظم و نسق اور قیادت و پیشوائی کا منصب مردوں کو عطا کیا گیا، چنانچہ ارشاد باری ہے: ”الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا“ (سورۃ النساء: ۳۴) اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: ”ولذا خصوا بالرسالة والنبوة على الأشهر. وبالأمانة الكبرى والصغرى وإقامة الشرائع والأذات والإقامة والخطبة والجمعة“ (روح المعانی ۵۰۲۳)۔

ظاہر ہے کہ یہ عظیم ذمہ داری مردوں کو ان کی عقل و فہم اور قوت فیصلہ نيزان کی اہم جو یا نہ فطرت کی وجہ سے دی گئی ہے اور عورتیں ان صفات سے عموماً عاری ہوتی ہیں، اس لئے وہ ملک کے نظم و نسق کو بہتر طریقے سے سنبھال نہیں سکتیں، یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ ایرانیوں نے کسری کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ (صحیح بخاری کتاب المغازی، باب کتاب الی کسری حدیث نمبر ۴۲۲۵)۔ اس کے علاوہ قرآن و سنت کے بہت سے دلائل اس پر موجود ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی کارسالہ ”عورت کی سربراہی کی شرعی حیثیت“ مطبوعہ: مکتبہ ادارۃ المعارف کراچی از ص: ۶۰ تا ۲۰ اور مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا رسالہ ”عورت کی سربراہی“ مطبوعہ مکتبہ بینات کراچی)۔

قرآن وحدیث کے انہی دلائل کی وجہ سے چودہ سو سال سے امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ عورت خلیفہ یا امیر نہیں بن سکتی، چنانچہ ابن حزم نے مراتب الایمان میں، امام الحرمین نے الارشاد میں، بغوی نے شرح السنۃ میں اور مشہور مفسر قرآن علامہ محمد بن شہنشاہی نے اضواء الیمن میں اور دیگر بہت سے حضرات نے اس پر اجماع نقل کیا ہے (حوالہ سابق)۔

اب سوال یہ ہے کہ خواتین مجلس شوریٰ یا قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں یا نہیں؟ ایکشن میں امیدوار بن سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں جن علماء نے سیاست اسلامیہ پر کلام کیا ہے ان کی آراء مختلف ہیں:

الف۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور وہ استدلال کرتے ہیں اس واقعہ سے جو بخاری شریف میں بالتفصیل مذکور ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب آپ ﷺ نے شرائط صلح کے مطابق واپسی کے لئے صحابہ کرام سے اعمال تحلیل یعنی قربانی اور حلق کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا، تو تین مرتبہ اعلان کرنے کے باوجود کوئی نہیں اٹھا، اس پر آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور ام سلمہؓ سے اس کا تذکرہ کیا تو ام سلمہؓ نے مشورہ دیا کہ آپ ﷺ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ خود حلق اور قربانی کر کے حلال ہو جائیں، آپ ﷺ نے یہ مشورہ قبول فرما کر اس پر عمل بھی کیا اور نتیجہ بھی خاطر خواہ ظاہر ہوا (صحیح بخاری کتاب اشروط باب اشروط فی الجہاد والمصائب حدیث نمبر: ۴۳۲۰)۔

لیکن اس حدیث سے خواتین کو قانون ساز اداروں کا باقاعدہ ممبر بنانے پر استدلال کمزور ہے جیسا کہ بعض علماء نے کیا ہے (اسلام کا سیاسی نظام از: مولانا محمد اسحاق صدیقی مطبوعہ مجلس دعوت و تحقیق اسلامی کراچی، ص: ۳۶۱، ۳۱۷)۔

ب۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عورتوں کا لیڈری کرنا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا درست نہیں اور وہ دلیل میں مشہور روایت پیش کرتے ہیں، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”إذا كان أمر أو كره شرار كره وأغنياؤكم بخلائكم وأموركم إلى نساءكم فبطن الأرض خير لكم من ظهرها“ (جامع الترمذی ابواب الفتن حدیث نمبر: ۲۲۶۶، وقال الترمذی هذا حدیث غریب)۔

لیکن اس حدیث سے بھی استدلال محل نظر ہے، کیونکہ حدیث میں جس صورت کی مذمت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تمام تر فیصلے عورتوں ہی کے حوالے کر دیئے جائیں اور انہیں کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے اور مرد ہر معاملہ میں عورتوں کے پیچھے چلے گئیں، لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ ان سے کبھی مشورہ لینا ہی جائز نہیں ہے۔

بہر حال اس مسئلہ میں دونوں طرف کچھ دلائل ہیں، لیکن کوئی ایسی واضح نص بھی موجود نہیں ہے، جس کی بناء پر یہ کہا جائے کہ انہیں قانون ساز اداروں میں شامل نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات طے ہے کہ اگر انہیں شامل کیا جاتا ہے تو حجاب شرعی کے احکام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ غیر مردوں کے ساتھ میل جول کی صورت میں انتخابات لڑنا، لیڈری کرنا وغیرہ ہرگز جائز نہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد واضح طور پر حدیث میں موجود ہے: ”المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان“ (جامع الترمذی ابواب النكاح حدیث نمبر: ۱۱۸۳)۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ خواتین کے لئے ایکشن میں امیدوار بننا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا، وزیر یا کوئی بھی سیاسی نمائندہ بننا، غیر مردوں کے ساتھ میل جول اور بے حجابی وغیرہ معاصی کو مستلزم ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے۔

البتہ عورت ووٹ ڈال سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں بھی فقہاء کی دونوں رائیں ہیں:

الف۔ بعض حضرات عورت کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتے ہیں، کیونکہ یہ عام انسانی حقوق میں سے ہے، لہذا کسی عورت کو اس سے محروم کرنا درست نہیں ہوگا (المرأة بین الفقه والقانون، ص: ۱۵۵ بحوالہ خواتین کے شرعی مسائل از: منور سلطان ندوی، ص: ۵۳۰)۔

ب۔ بعض دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ انتخاب گواہی اور وکالت کے ساتھ مذکورہ منصب کے لئے مناسب مرد کا چننا ہوتا ہے، اور یہ کام عورت سے نہیں ہو سکتا ہے، لہذا عورت کے لئے ووٹ ڈالنا درست نہیں ہوگا (ولایة المرأة، ص: ۵۷، بحوالہ خواتین کے شرعی مسائل، ص: ۵۳۰)۔

کفایت المفتی میں ہے کہ بظاہر درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا ووٹ دینا درست ہے، بشرطیکہ پولنگ اسٹیشن پر شرعی پردے کا خاص لحاظ رکھا گیا ہو، اگر بیپردے والے اور ووٹر کے ان پڑھ ہونے کی صورت میں انگوٹھا پکڑ کر نشان لگانے والے غیر محرم ہوتو جائز نہیں (کفایت المفتی، ۳۸۰/۹)۔

اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنی کتاب ”المرأة بین الفقه والقانون“ میں لکھتے ہیں: ”عورت کے ووٹ ڈالنے میں مردوں سے میل جول ضروری ہے، جبکہ شریعت نے اختلاط سے منع کیا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ عورتوں کے لئے ووٹ کے مراکز الگ قائم کیے جائیں، ایسی صورت میں عورت ووٹ دینے جاسکتی ہے“ (المرأة بین الفقه والقانون، ص: ۱۵۵ بحوالہ خواتین کے شرعی مسائل، ص: ۵۳۰)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردے کا لحاظ رکھنا لازم: وگا اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لئے مستحسن نہیں ہے، کیونکہ اس میں ضروریات شریعیہ کی رعایت کے ساتھ اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لئے متعذر ہے (کفایت المفتی، ۳۷۱/۹)۔

☆☆☆

## ایکشن اور اسلام

مولانا محمد ارشد علی رحمانی

سوال: ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

حامد اور صلیا: ووٹ کی شرعاً تین حیثیت ہو سکتی ہے، اولاً ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہے، قرآن کریم میں ارشاد باری ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فإِنَّهُ آثَمُ قَلْبِهِ“ (النساء: ۲۸۳) گویا جو لوگ ایکشن میں کھڑے ہوتے ہیں، وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اس عہدے کا حقدار ہوں، اس منصب کے لائق ہوں، اب ووٹ دینے والا اس کے حق میں ووٹ دیکر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ امیدوار واقعی اس عہدے کا حقدار ہے اور ظاہر ہے کہ کسی دعویٰ کی حمایت یہ گواہی ہے، لہذا ووٹ بھی اس اعتبار سے شہادت ہے (فقہی مقالات: ۲۸۸/۲، جواہر الفقہ: ۲۹۱/۲، کتاب الفتاویٰ: ۲۵۷/۶، وکھدانی تفسیر معارف القرآن: ۱/۶۲۵-۶۲۷)۔

ووٹ کی دوسری حیثیت شفاعت یعنی سفارش کی ہے، اس طور پر کہ ووٹ دینے والا اپنا ووٹ امیدوار کے حق میں ڈال کر اس کی سفارش کرتا ہے کہ واقعی یہ امیدوار اس کا اہل ہے کہ اس کو اس عہدے پر فائز کیا جائے اور اسے کامیاب بنایا جائے، اب یہ بات الگ سے کہ اگر وہ سفارش واقعی امیدوار کو دیکھ کر سچی اور صحیح سفارش کرتا ہے تو وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور اسے دین و دنیا میں اس کا فائدہ بھی حاصل ہوگا، لیکن اگر اس نے محض کسی دنیاوی غرض کی بنیاد پر امیدوار کی سفارش کی ہے جبکہ امیدوار کسی بھی طرح اس کا مستحق نہیں ہے، تو اسے اس کی غلط سفارش کا بہت برا بدلہ بھی بھگتنا پڑے گا، اور اگرچہ بظاہر اسے اس کی سفارش کی وجہ سے کچھ دنیاوی فائدہ حاصل ہو بھی جائے تو آخرت میں اسے اس کا بہت برا بدلہ ملے گا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمان باری ہے: وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةَ حَسَنَةٍ يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةَ سَيِّئَةٍ يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا (النساء: ۸۵، جواہر الفقہ: ۲۰۴۹۲)۔

ووٹ کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے، گویا ووٹ دینے والا اپنا ووٹ دے کر امیدوار کو اپنے معاملات کا وکیل بنا دیتا ہے، لیکن چونکہ اس وکالت کا تعلق محض ووٹ دینے والے کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری قوم و ملت کو عام ہے، لہذا اگر وہ امیدوار واقعی مستحق وکالت ہے تو اس ووٹ دینے والے کو اس کا اجر ملے گا اور دین دنیا کی بھلائی حاصل ہوگی، لیکن اگر وہ اس کا مستحق نہیں ہے تو پھر اس کے ووٹ کی وجہ سے پوری ملت کا نقصان ہے، اس لیے اس کو اس کا بدلہ بھی ملے گا (جواہر الفقہ: ۲۹۳/۲)۔

سوال: اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے، تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

ووٹ کی حیثیت تو شرعاً شہادت کی ہے، ہی چونکہ ووٹ دینے والا امیدوار کے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے جو اس نے قوم و ملت کے سامنے کیا ہے، البتہ چونکہ گواہی اتنی نازک شئی ہے اور اس قدر عظیم المرتبت کام ہے کہ اس میں بہت سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا چاہیے، اس لیے کہ قرآن و حدیث میں جہاں ایک طرف گواہی دینے کا حکم ہے، وہیں دوسری طرف غلط اور جھوٹی گواہی دینے پر بہت سخت وعیدیں بھی وارد ہوئی ہیں، کتب احادیث میں جھوٹی گواہی دینے والے کو مستحق جہنم تک بتایا گیا ہے، سنن ابوداؤد کی ایک روایت میں اللہ کے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جھوٹی گواہی اور شرک دونوں برابر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”عدلت شهادة الزور بالاشراك بالله ثلاث مرات“ (سنن ابی داؤد: ۲۰۵۰۷) بخاری شریف میں بھی اللہ کے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت سخت فرمان منقول ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ راوی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گناہ کبیرہ شاکر کو وار ہے تھے۔ شمار کرتے ہوئے جب جھوٹ کا ذکر آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرمانے لگے: ”ألا و قول الزور ألا و قول الزور يكررها حتى قلنا ليته سكت“ صدیق اکبر فرماتے ہیں کہ نبی کی حالت دیکھ کر ہم دل ہی دل میں کہنے لگے کاش کہ آپ خاموش ہو جاتے (صحیح البخاری: ۳۶۲۲)۔

حکامہ ابو بکر صدیق، جو دھپور۔

البتہ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاں جھوٹی گواہی کی بڑی قباحت و شاعت۔ بیان کی گئی ہے، وہیں سچی باتوں کی سچی اور صحیح گواہی کے سلسلے میں بہت سی آیات اور احادیث بھی وارد ہوئی ہیں، بطور استشہاد چند آیتیں اور روایتیں زیر بحث لائی جاتی ہیں، ایک مقام پر شہادت کے بارے میں ارشاد باری ہے: ”کونوا قوامین شهداء لله بالنقسط“ اسی طرح ایک اور مقام پر ہے: ”کونوا قوامین بالنقسط شهداء لله“ دونوں آیتوں میں شہادت کو فرض قرار دیا گیا ہے، ایسے ہی سورہ طلاق میں ہے: ”وأقیموا الشهادة لله“ اور سورہ بقرہ کی ایک آیت میں سچی شہادت کے چھپانے کو حرام قرار دیا گیا ہے: ”ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فإنه آثم قلبه“ (البقرہ: ۲۸۲) اسی طرح سورہ نساء میں فرمان باری ہے: ”ان الله یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی أهلها“ (النساء: ۵۸) اور حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین گواہ وہ ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ادا کر دے: ”ألا أخیرکم بخیر الشهداء الذی یأتی بشهادته قبل أن یسألها (الصحیح لمسلم، باب بیات خیر الشهداء: ۲۰۷۷، مشکوٰۃ: ۲۲۷، سنن ابی داؤد: ۲۰۵۰۶، فقہی مقالات: ۲۰۲۸) ایک دوسری حدیث میں ہے: ”من کتم شهادة اذا دعی الیها کان کمن شهد بالنزور“ (جمعة الفوائد: ۱۰۲۶) کہ جس کو شہادت کے لیے بلایا جائے پھر وہ اس کو چھپائے وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا (فقہی مقالات: ۲۸۸۲)۔

مذکورہ بالا آیات و احادیث کے پیش نظر کھل کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں پر سچی گواہی کا ادا کرنا ایک مکمل فریضہ ہے، لہذا اگر کوئی امیدوار واقعی ایماندار سچا اور دیانتدار ہے تو پھر ایسے امیدوار کو ووٹ دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے، چونکہ ایسی صورت میں ووٹر ایک سچی گواہی دے رہا ہے اور آیات و احادیث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ سچی گواہی کا ادا کرنا ضروری ہے: ”ومن ههنا استفيد أن تحمل الشهادة فرض كفاية (ولا یأب الشهداء إذا ما دعوا) للاداء لحقیقة قوله الشهداء والشاهد حقیقة فیمن تحمل فاذا دعی لأدائها فعلیه الاجابة اذا تعینت والا فهو فرض كفاية“ (تفسیر ابن کثیر: ۱۰۳۳۸) دوسری ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نبی علیہ السلام نے بھی سچی گواہی کے چھپانے پر سخت وعید فرمائی ہے جیسا کہ اوپر حدیث ذکر کی گئی ہے، ہاں اگر امیدوار جھوٹا، فاسق و فاجر، بے ایمان اور بددیانت ہو، ساتھ ہی دین کا دشمن بھی ہو تو پھر ووٹ نہ دینے میں بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اگر سب کے سب ایک ہی طرح کے فاسق و فاجر، بد معاش اور بے ایمان ہوں، لیکن ان سب میں کوئی ایسا ہو جو لوگوں کو اس کا حق دلاتا ہو، غریب، یتیم، مظلوم، بے بس اور بے سہارا لوگوں کی خبر گیری کرتا ہو، دین کی مخالفت بھی نہ کرتا ہو، تو اس امیدوار کو (ایسے امیدوار کے مقابلے میں ووٹ دینا جو لوگوں پر ظلم کرتا ہو، غریبوں اور مظلوموں کو ستاتا ہو) اسے ظلم سے روکنے کے لیے اور ایک امیدوار کو جو انصاف کا قائل ہو اسے آگے کرنے کے لیے تاکہ لوگوں کو ان کے حقوق ملیں اور غریب و بے بس لوگ بھی سکون سے زندگی گزاریں، اپنا ووٹ دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب علی الکفایہ ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: ”من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فليسهان وان لم يستطع فليقلبه لهذا هو أضعف الايمان“ (مشکوٰۃ: ۲۰۲۶، باب الامر بالمعروف) بیان القرآن میں حضرت تھانویؒ نے آیت کریمہ ”ولا تکتبوا الشهادة“ کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے کہ جب کسی حقدار کا حق بدون اس کی شہادت کے ضائع ہونے لگے اور وہ درخواست بھی کرے تو اس وقت ادا کی شہادت سے انکار کرنا حرام ہے (بیان القرآن: ۱۷۲) اسی طرح انوار البیان میں حضرت مولانا عاشق الہی بلند شہرئیؒ نے ”ولما أب الشهداء إذا ما دعوا“ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: تو گنہگار ہوں گے (انوار البیان: ۵۳۳) مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: کہ اس جمہوری ملک میں ووٹ اسلام اور کفر کی بنیاد پر نہیں دیئے جاتے ہیں، نہ ہی اس بنیاد پر الیکشن لڑائے جاتے ہیں، جس شخص کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ صحیح خدمت کرے گا، نفع پہنچائے گا، حقوق دلوائے گا، ظلم کو روکے گا اس کو ووٹ دیا جائے (فتاویٰ محمودیہ: ۶۱۸/۳) حضرت مفسر وقت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: ”سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، اسی لیے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظر یہ کا حامل و دیانتدار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے“ (جواہر لافقہ: ۲۹۵/۲) فقہ العصر حضرت مولانا تفتی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے کئی آیات و احادیث اس تعلق سے نقل فرمائی ہیں، پھر جمع الشواہد کی ایک حدیث: ”ألا أخیرکم بخیر الشهداء الذی یأتی بشهادته قبل أن یسألها“ (مسلم شریف: ۷۷۷/۲، جمع النوادر: ۲۶۱/۱) نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے۔ قرآن و سنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے (فقہی مقالات: ۲۸۸/۲) اسی کتاب میں مولانا ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مرد و جن نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے (فقہی مقالات: ۲۹۳/۲) اور کچھ اسی طرح کی تفصیل حضرت مولانا خالد

سیف اللہ رحمانی نے بھی اپنی کتاب کتاب الفتاویٰ میں لکھی ہے (۲۷۶/۶)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ تمام آیات و احادیث اور اقوال فقہاء و علماء کی روشنی میں دوٹ دینا شرعاً واجب ہے، اور ہندوستان جیسے ملک میں حالات کے پیش نظر ضروری ہے، کیونکہ یہ دوٹ ہی کی قوت ہے کہ اکثریتی فرقہ کے قائدین اور ارباب اقتدار مسلمانوں کا سامنا کرتے ہیں، ان کے آنسو پونچھنا چاہتے ہیں اور ان سے عہد و پیمانہ باندھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمان اگر اپنے آپ کو حق رائے دہی سے روک لیں اور اس کی خبر ارباب اقتدار کو ہو جائے کہ مسلمان صرف ان سے لینا چاہتے ہیں ان کو کچھ دینا نہیں چاہتے، تو پھر وہ مسلمانوں کی طرف پھٹک کر بھی نہ دیکھیں اور جو کچھ مسلمانوں کے مذہبی حقوق محفوظ ہیں ان سے بھی محروم ہونا پڑے، اس لیے ہندوستان میں بالخصوص دوٹ دینا نظر مصلحت ضروری ہے، یعنی واجب علی الکفایہ ہے۔

سوال ۲: ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

حامد ومصلیا: حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے صراحت کے ساتھ امارت کے طلب کرنے سے منع فرمایا ہے، صحیح بخاری اور دیگر تمام کتب احادیث میں روایت موجود ہے: "عن الحسن قال: حدثنا عبد الرحمن بن سمرۃ بن جندب قال: قال النبی ﷺ: یا عبد الرحمن بن سمرۃ! لا تسأل الإمارة فإنک إن تؤتیتهما عن مسألة وکلت إلیها وإن أوتیتها عن غیر مسألة أعنت علیها" (الصحيح البخاری: باب من تسأل الإمارة وکل إلیها، ۲۰۱۰۵۸، وھکذا فی سنن ابی داؤد: باب ماجاء فی طلب الإمارة، ۲۰۲۰۶، وھکذا فی سنن النسائی: باب النهی عن مسألة الإمارة، ۲۰۲۵۸، لہذا حدیث صریح کی روشنی میں بذات خود کسی عہدہ کا طلب کرنا یا کسی عہدے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا شرعاً درست نہیں ہے، البتہ اگر کسی کو کسی عہدہ کے لیے پیش کش کی جائے تو اس کے لیے قبول کرنا جائز و درست ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں حضرت معاذ بن جبل کا قاضی مقرر کیا جانا اور ان کا اسے قبول کرنا تمام کتب احادیث میں صراحتاً مذکور ہے، لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ اس کے اندر اہلیت موجود ہو، اسی لیے اگر اس کے اندر بالکل اہلیت نہ ہو تو پھر اس کے لیے اسے قبول کرنا بھی درست نہیں ہے، ہاں اگر اس شہر میں کوئی بھی اس عہدے کے لائق نہ ہو سب کے سب فاسق و فاجر ہوں اور کوئی آدمی اس امید پر اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش کرے کہ وہ اس عہدے کا حق ادا کر سکتا ہے، ظالم کو ظلم سے روک کر، مظلوم کو اس کا حق دلا کر، بے سہاروں کا سہارا بن کر اور ہر صاحب حق کو اس کے حقوق دلا کر تو پھر ایسی صورت میں اس کے لیے اس عہدہ کا طلب کرنا درست ہوگا تاکہ خدا کی اس زمین پر انصاف قائم ہو اور ظلم کا خاتمہ ہو۔

چنانچہ عہدہ قضا کے سلسلے میں کچھ اسی طرح کی تفسیر اسلامی عدالت میں کی گئی ہے، بطور استنبہاد عبارت پیش نظر ہے، مصنف تحریر فرماتے ہیں: "پس اگر حالات ایسے ہوں کہ صاحب صلاحیت لوگوں کا فقدان ہو اور ایک شخص یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ منصب قضا کی ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کا اہل موجود نہ ہو، یا اگر وہ کھڑا نہ ہو تو یہ منصب غیر اہل کے پاس چلا جائے گا تو ایسی صورت میں مصباح المسلمین کے اس اہم شعبہ کی بقا اور حقوق الناس کے تحفظ کی خاطر نیز اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ شخص جو اس کا اہل ہے اور حالات نے اس کو اس عہدہ کے لیے متعین کر دیا ہے، اس کے لیے نہ صرف یہ کہ اس عہدے کا طلب کرنا جائز ہوگا بلکہ واجب ہوگا (اسلامی عدالت، ۲۰۰۸) اور کچھ اسی طرح کی وضاحت علامہ شامی نے بھی کی ہے: "وأما إذا تعین بأن لہ یکن أحد غیرہ یصلح للقضاء وحب علیہ الطلب صيانة لحقوق المسلمین ودفعاً لظلم الظالمین" (شامی: ۴۲۵/۳) البتہ یہ اس وقت ہے جبکہ اس کے اندر اہلیت موجود ہو، لیکن اگر اس نے محض جاہ و منصب حاصل کرنے یا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش کیا ہے جبکہ وہ خود بھی اس کا اہل نہیں ہے تب تو شرعاً اس کے لیے طلب کرنا بھی جائز نہیں ہوگا (معیین احکام، ۱۱)، البتہ اس زمانے میں جبکہ اولاً لوگوں میں بہت کم ہی ایسے ملتے ہیں جو واقعی تقویٰ و طہارت کے پابند اور واقعی دیندار ہوں، آج تو پوری ملت فساق و فجار سے بھری ہے اور جو لوگ متقی ہیں بھی تو انہیں اس سیاسی لائن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اگر کوئی فاسق اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش کرے اور واقعتاً اس کے اندر یہ خوبیاں ہوں کہ وہ ظالم کو ظلم سے روکے گا، مظلوم کو اس کا حق دلائے گا اور شریعت کے کسی امر میں ناجائز مداخلت نہ کرے گا نہ کرنے دے گا، تو پھر ایسے آدمی کے لیے شرعاً اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش کرنے کی گنجائش ہوگی، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر واجب" (الاشیاء والنظائر) اور اگرچہ اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش کرنا درست نہیں لیکن مصلحتاً گنجائش ہو سکتی ہے۔

سوال: غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قوانین کے مطابق اگر کوئی پارٹی ایسے ممبروں کے لیے کوئی وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی

پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

حامد ومصلیا: ممالک خواہ مسلم کے ہوں یا غیر مسلم کے موجودہ دور میں تقریباً تمام ممالک میں جمہوری قانون کا اجراء اور نفاذ ہے، اور ظاہر ہے کہ جمہوری قانون کی شریعت اور مذہب کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ عوام الناس کو سامنے رکھ کر ان کے حالات کی مناسبت سے وضع کیا جاتا ہے، اب جس ملک میں عوام کی جو حالت ہوتی ہے اس کے مطابق قانون ساز ادارے قانون وضع کرتے ہیں، چونکہ شریعت یا مذہب ان کے پیش نظر نہیں ہوتا اس لیے کچھ قانون اس طرح کے بھی بن جاتے ہیں جو شریعت اور مذہب کے خلاف ہوتے ہیں، البتہ قانون کے جمہوری ہونے کی وجہ سے اگرچہ قانون نافذ ہو جائے پھر بھی شریعت کے ماننے والوں کی اپیل سنی جاتی ہے اور بسا اوقات اپیل کے مطابق رعایت بھی کی جاتی ہے، بالخصوص ہندوستان میں تو بہت حد تک شریعت اسلامی کی رعایت کی جاتی ہے اور ممکن حد تک مسلمانوں کو تحفظ ملتا ہے، اور اس کی واضح دلیل مسلم پرسنل لاء کا تحفظ ہے، جو محمد اللہ اپنی پوری جامعیت کے ساتھ ہندوستان میں باقی ہے، اور فقہ کا مشہور اصول ہے کہ خاص قسم کے نقصان کو عام نقصان سے بچنے کے لیے برداشت کیا جائے ”یتحمل الضرر الخاص لدفعة ضرر العام“ (الاشیاء والنظائر ۸۷) لہذا خاص طور پر ہندوستان جہاں مسلمانوں کی آبادی صرف پندرہ سے سولہ فیصد ہے، اس کے باوجود اتنی رعایتیں حکومت کی جانب سے ملتی ہیں جو اور ملکوں میں بہت مشکل ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ مسلمانوں کا ایکشن میں ووٹ ڈالنا اور ممبر سازی میں حصہ لینا ہے اور حکومت بھی مسلمانوں کو اسی وجہ سے اہمیت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور رعایت فراہم کرتی ہے، لہذا ایسی صورت حال میں جبکہ ملک کفار و مشرکین کی ۸۰ فیصد تعداد کو مشتمل ہے، پھر بھی ہمیں رعایتیں اور مکمل مذہبی آزادی مل رہی ہے، تو محض اس بنیاد پر کہ قانون ساز اداروں کے کچھ قانون مخالف شریعت ہیں، ممبر سازی کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اسے جائز سے آگے بڑھ کر ضروری کہنا چاہیے، چونکہ اگر ہم نے ممبر سازی کو بالکل ناجائز قرار دیا اور مسلمانوں کو اس سے روک دیا تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ ابھی تو کچھ قانون ہی مخالف شرع ہیں، بعد میں سارے قانون مخالف شرع بنیں گے اور پھر اس وقت ہمیں ان تمام قانون کو برداشت کرنا پڑے گا اور اس کے سامنے چارہ جوئی کا کوئی حق بھی نہیں ہوگا، ویسے اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وقت و حالات اور مصلحت کی بنیاد پر بعض وہ چیزیں بھی برداشت کی جاسکتی ہیں جو قانون شریعت کے خلاف ہوں، بالخصوص آپ صلح حدیبیہ کا پس منظر دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ صلح بالکل شریعت اسلامی کے خلاف ہوئی اور حد تو یہ ہوئی کہ کفار مکہ نے صلح نامہ پر نبی کا نام بھی رسول کے ساتھ نہیں لکھنے دیا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس صلح نامہ کو قبول کر لیا، اور کفار و مشرکین کی ساری باتیں تسلیم کر لیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام کو جب مشہور ہجرت کرنے کا حکم دیا جبکہ خود حبشہ میں بھی کفار ہی کی حکومت تھی، لیکن چونکہ وہاں کے بادشاہ نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے دی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں ہجرت کا حکم دیا تاکہ وہاں جا کر شریعت کے احکام پر عمل کر سکیں، اس لیے ہندوستان جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے اور تقریباً سارے قوانین بھی محفوظ ہیں، ایک دو یا چند قانون کے مخالف شرع ہونے کی وجہ سے ممبر سازی سے اپنے کو الگ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ احقر کی رائے تو یہ ہے کہ ممبر سازی میں اپنی تعداد جہاں تک ممکن ہو بڑھانی چاہیے، تاکہ ہمارا ایک رعب اور بدبہ حکومت کی نگاہ میں ہمیشہ قائم رہے۔ کچھ ایسی ہی تفصیل کتاب الفتاویٰ میں بھی موجود ہے۔

سوال: بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلمان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

حامد ومصلیا: شرعاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا درست نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ”لا تحلفوا الا باللہ“ (سنن ابی داؤد: ۲/۳۶۳) حضرات فقہاء نے بھی اس سلسلے میں واضح انداز میں فرمایا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا شرعاً ناجائز ہے، ”والقسم باللہ تعالیٰ اوباسم من اسمائه كالرحمن والرحيم والحق اوبصفة من صفاته تعالیٰ كعزة اللہ وجلاله وكبريائه وعظمته ولا يقسم بغير اللہ تعالیٰ كالنبي والقرآن والكعبة“ (الدر علی الرد: ۲/۲۹۱)، وھكذا فی فتاویٰ عالمگیری: ۱/۶۳۳، وھكذا فی البحر الرائق: ۳/۳۸۰، وھكذا فی مجمع الاثر. كتاب الايمان: ۲/۲۶۰، وھكذا فی فتاویٰ محمودیہ: ۱۳/۲۵، لہذا حدیث اور عبارات فقہاء کی روشنی میں بائبل کی قسم کھانا درست نہیں ہے، البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگر حکومت کی طرف سے اتنی پابندی ہو کہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو تو پھر بطور مجبوری دل میں یہ خیال رکھتے ہوئے کہ قسم تو صرف اللہ کی کھائی جاتی ہے، مگر مجبوری میں بائبل پر ہاتھ رکھ کر کھارہا ہوں، قسم کھا سکتا ہے اور اسے اگر پر محمول کرتے ہوئے جواز کی گنجائش ہے، لیکن قسم کھانے والا اس کے بعد توبہ واستغفار بھی کرے۔

سوال: بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کے بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

حامد اومصلیٰ: وہ سیکولر پارٹیاں جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہیں اور مسلمانوں کے خیالات سے حد درجہ اتفاق رکھتی ہیں، ایسی پارٹیوں میں اگرچہ بعض چیزیں مسلمانوں کے مفادات کے خلاف شامل ہوتی ہیں، لیکن وہ اس قدر نقصان دہ نہیں ہیں جس طرح وہ پارٹیاں نقصان دہ ہیں جن کے اکثر دستور و قوانین مسلم مخالف ہیں، اس لیے وہ پارٹیاں جو مسلم مفادات کا زیادہ خیال رکھتی ہیں اور جن کے دستور میں مسلمانوں کی زیادہ رعایت کی گئی ہے وہ اس پارٹی کے مقابلے بہتر ہے جس کے اکثر قوانین مسلم مخالف ہیں، اور پھر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں تقریباً ساری پارٹیاں غیر مسلموں کی ہیں اور ساری پارٹیوں کے سربراہان غیر مسلم ہیں، اور غیر مسلم ہونے کے ناطے تقریباً سب کا نقطہ نظر بھی ایک ہی ہے، تو ایسی صورت میں اگر کوئی ایسی پارٹی ابھر کر سامنے آتی ہے جو مسلم مفادات کا خیال رکھتی ہے، اپنے دستور و قوانین میں مسلمانوں کی رعایت کرتی ہے اور ممکن حد تک مسلمانوں کے مفادات میں کام کرتی ہے تو ایسی پارٹی کو سپورٹ کرنا، اس پارٹی میں شامل ہونا اور اس کے ساتھ مل کر ایکشن لڑنا اور اس کی حکومت میں شامل ہونا فقہ کے اصول جب دہ مفسدہ ایک جگہ جمع ہو جائیں تو بلکہ مفسدہ کو برداشت کر کے بڑے مفسدہ سے بچا جائے۔ "یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام (الاشباہ والنظائر)" کے تحت عمل کرنا ہوگا، اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان میں اکثر سیاسی پارٹیوں کے دستور زیادہ تر مسلم مخالف ہیں اور اس کی وجہ بھی صاف ہے کہ یہاں کا نظام جمہوری ہے اور ظاہر ہے کہ جمہوری نظام میں کسی ایک مذہب کی پوری رعایت نہیں ہو سکتی اور جب ایسا ہے تو پھر جس پارٹی کے زیادہ قوانین اسلام اور مسلمانوں کے مفادات میں ہوں اسے بلا ضرر سمجھتے ہوئے اسے سپورٹ کرنا ہی شرعی نقطہ نظر سے بہتر ہے، احتقر کی رائے بھی یہی ہے کہ ایسی پارٹی کو ہی اپنا رہنما بنایا جائے جو اپنی اور اپنے مذہب کی نمائندگی تک رعایت کرے۔

سوال: جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے ایسی پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونے کی گنجائش ہوگی؟

حامد اومصلیٰ: جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور جن کے دستور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہیں، ان کا تعاون کرنا اور ان کی حمایت کرنا یہ تعاون علی الاثم کے مترادف ہے جو بالکل ممنوع ہے، لہذا اگر تحقیق سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقعی اس پارٹی کے دستور مسلمان اور اسلام کے مخالف اور مغاڑ ہیں تو پھر اس پارٹی میں شامل ہونے سے احتراز کرنا ہی بہتر ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ کسی بھی ممبر کو پارٹی میں شریک ہونے کے بعد اسے پارٹی کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے، اور اس کے دستور کے مطابق کام کرنا ایک غلط کام پر اس کا تعاون اور حمایت کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ غلط اور ظلم پر تعاون بھی ظلم ہے جس کی شرعاً گنجائش نہیں ہے، قرآن کریم میں ہے: "ومن يشفع شفاعتة حسنة يکن له نصيب منها ومن يشفع شفاعتة سيئة يکن له كفيل منها" (النساء: ۸۵) دوسری بات یہ ہے کہ جب ایسی پارٹیاں موجود ہیں جس کے اکثر دستور میں مسلمانوں کی رعایت کی گئی ہے اور جو مسلمانوں کے مفادات میں کام کرتی ہیں تو ایسی پارٹی کے رہتے ہوئے اس پارٹی کی حمایت کرنا جس کے سارے دستور مسلمانوں کے خلاف ہوں اور جو کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف کام کرتی ہو اس کی حمایت کرنا بالکل ناانصافی ہے اور شریعت میں ناانصافی سے منع کیا گیا ہے قرآن کریم میں ہے: "ولا یجیر منکم شنات قوم علی أن لا تعدلوا اعدلوا هو أقرب للتقوی (المائدہ) کہ کسی قوم کے بھڑکانے پر تم ناانصافی نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

اس کے علاوہ حدیث پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری وضاحت فرمادی ہے کہ جو جیسے طریقے کو ایجاد کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا، اگر کوئی نیک کام کا ایجاد کرے گا تو اسے اس کا بدلہ ملے گا اور جو لوگ اس کے ایجاد کیے ہوئے راستے پر چلیں گے تو اس کے عمل کرنے کی وجہ سے جتنا اس کو ثواب ملے گا اتنا ہی ایجاد کرنے والے کو بھی ملے گا، اسی طرح اگر کوئی برائی کو ایجاد کرے گا تو اس کو اس کا بدلہ ملے گا اور جو لوگ اس راستے پر چلیں گے تو اس پر چلنے والے کے برابر گناہ اس ایجاد کرنے والے کو بھی ہوگا، تو اس حدیث کی روشنی میں بھی ایک ایسی پارٹی میں شریک ہونا جو مسلمانوں کا کھلا دشمن ہو اس کی گنجائش مشکل ہے۔ البتہ ایک حدیث جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر تمام کتب احادیث میں موجود ہے: عن انس رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انصر اخاک ظالماً ومظلوما قال رجل: یا رسول اللہ! انصره مظلوما فكيف انصره ظالماً؟ قال: تمنعه من الظلم فذلک نصرک ایاه متفق علیہ (الصحيح البخاری: ۱۰۲۲۰، مشکوٰۃ: ۲۰۲۲۲) اس حدیث میں اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مظلوم کی بھی مدد کرو اور ظالم کی بھی، ایک صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! ظالم کی مدد کیسے کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے ظلم سے روک کر اس کی مدد کرو، اسی طرح ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت ابو



صدقہ نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”الناس إذا رأوا الظالم فلم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله العقاب“ (جمع الغوائد: ۲۰۵)۔ کہ اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ ان سب پر عذاب عام نازل فرمادیں، مذکورہ بالا دونوں حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنا چاہیے اور روکنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، لہذا اگر کوئی کٹھن آٹکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ کوئی پارٹی ظالم کر رہی ہے اور انتخابات میں حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجہ میں مٹانا اس کی قدرت میں ہے تو ان احادیث کی رو سے نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے انتخابات میں پوری دلیری سے حصہ لے اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی بھرپور کوشش کرے (فقہی مقالات: ۲۸۶/۲)۔

سوال: ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے، اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

حادثاً و صلیاً: قرآن کریم میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا حکم دیا گیا ہے اور افتراق و انتشار، فرقہ پرستی اور اختلاف سے منع کیا گیا ہے ارشاد باری ہے: ”واعصموا بجللہ اللہ جمعاً ولا تفرقوا“ (القرآن) ایک اور جگہ ارشاد ہے: ”ولاتنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا ان اللہ مع الصابرين“ (الانفال: ۴۶) اسی طرح حدیث پاک میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”لاتباغضوا ولا تحاسدوا وكونوا عباد اللہ إخواناً“ (مشکوٰۃ: ۲۰۴) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بغض و حسد سے منع فرما کر بھائی بھائی بن کر رہنے کا حکم فرمایا، اور قرآن و حدیث میں مختلف مواقع پر مختلف انداز میں فرقہ پرستی سے بچنے اور اتحاد کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ایک موقع پر اللہ رب العزت نے ایک ساتھ رہنے کا طریقہ بھی بیان فرمایا: ”یا ایہا الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم“ کہ ایمان والو! تم ایک آدمی کو اپنا امیر منتخب کرو اور اس کے حکم پر ایک ساتھ زندگی گزارو، اسی طرح ایک حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم امیر کی اطاعت کرو اگرچہ تمہارا امیر جوشی غلام ہی کیوں نہ ہو، تو ان آیات و احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ایک سربراہ کی سربراہی اور ایک رہنما کی رہنمائی میں زندگی گزارنی چاہیے، اور مسلمانوں کو مستقل اپنی حکومت بنانی چاہیے، البتہ ہندوستان جہاں مسلمانوں کے لئے اپنی حکومت بنانا نہ صرف یہ کہ مشکل بلکہ ناممکن ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ملک جمہوری ہے اور اس کے دستور میں یہ بات شامل ہے کہ یہاں بسنے والے ہر شخص کو سیکولر ایجنڈا کے تحت رہ کر ہی کام کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ جب سیکولر ایجنڈا کے تحت رہ کر ہی کام کرنا پڑے گا تو پھر اپنی پارٹی الگ بنانے کا کوئی خاص فائدہ بھی نظر نہیں آتا، چونکہ اپنی پارٹی بنانے کا ایک خاص مقصد مسلمانوں کے ذہن میں جو ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کے مطابق قانون بنا سکے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ ہر پارٹی کو قانون بنانے کا اختیار کئی حاصل ہو، جبکہ کسی بھی جمہوری ملک میں ایسا کرنے کی گنجائش کسی پارٹی کے لیے نہیں ہے۔ ہر پارٹی سیکولر ایجنڈے کی پابند ہے اور اس کے تحت ہی قانون بنانا ہوتا ہے، لہذا اس نقطہ نظر سے کہ اپنے مذہب کے مطابق قانون بننے پارٹی بنانا بیکار ہے، اب ایک دوسری صورت یہ ہے کہ اس نیت سے پارٹی بنائی جائے کہ اپنی قوت ہوگی اور اپنی حکومت بنے گی تو اس سلسلے میں سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے، اگر آپ تحقیق کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی آبادی بمشکل سولہ سے سترہ فیصد ہے، اب ظاہر ہے کہ اتنی قلیل تعداد میں رہنے والی جماعت اگر پارٹی بنا کر اپنی قوت کا اظہار کرنا چاہے اور اپنی حکومت بنانے کا خواب دیکھے تو یہ ایک ایسا خواب ہے جو شرمندہ تعبیر نہ ہونے والا ہے، ایک تیسری صورت یہ ہے کہ محض اس نیت سے پارٹی بنائی جائے کہ اپنی بھی ایک پارٹی ہونی چاہیے تو پھر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اس میں ہمارا کتنا فائدہ ہے اور کتنا نقصان؟ اور ظاہر ہے کہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں تو ہم کامیاب ہو پاتے ہیں اور وہ بھی نہ کے درجے میں اور اس کے بالقابل جہاں ہماری آبادی کم ہے (اور اکثر علاقہ ایسا ہی ہے) تو وہاں ہمیں نہ صرف یہ کہ ناکامی ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات اتنا بڑا تاثر ہندوستانی عوام لیتی ہے کہ پوری قوم یکجا طور پر ہماری مخالفت پر اتر جاتی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں جو بری فضائیت ہے اس کو قلم بند کرنا بہت مشکل ہے، دو لفظوں میں اگر لکھا جائے تو یہ لکھنا بجا ہوگا کہ اپنی پارٹی الگ بنانے کی صورت میں وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی آبادی برائے نام ہے اور وہ غیر مسلم بھائیوں کے نظر کرم کے ساتھ ہی جیتے ہیں ان کے لئے نہ صرف یہ کہ خوف و ہراس اور بے چینی ہوتی ہے بلکہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا بھی کوئی محافظ نہیں ہوتا اور پھر ان کے لئے زندگی کا ہر لمحہ زہر بن جاتا ہے اور اتنی مشکلیں آتی ہیں کہ ان کا سامنا کرنا دشوار ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ کہ اپنی پارٹی بنانے کا جو ایک موبوم غرض اپنی قوت کا حصول اور اپنے مذہب کی بالادستی ہے وہ تو نہ حاصل ہوتی ہے اور نہ حصول کی امید ہے، البتہ اس کے نتیجے میں وہ رہے نتیجے جس کا خوف ہے وہ سامنے آ کر رہتا ہے اور شریعت مطہرہ میں

حصول منفعت کے مقابل مفاسد کو دور کرنا ضروری ہے حدیث پاک میں ہے: ”لذا أمرتکم بشئ فأتو منه ما استطعتم وإذا نهيتمكم عن شئ فاجتنبوه“ اور فقہ کا مشہور اصول ہے: ”درء المفاسد أولى من جلب المصالح“ الاشباه والنظائر ۱۰ القاعدة الرابعة لہذا مذکورہ بالا حدیث اور فقہ کے اس مشہور اصول کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اپنی پارٹی بنانے کے نتیجے میں مفاسد کا خطرہ ہے، وہاں پارٹی نہ بنانا ہی بہتر ہے۔

سوال: ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لئے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، کیا وہ قانون ساز اداروں کا ممبر بن سکتی ہیں؟

حامد اوصلیا: قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے عورتوں کے سلسلے میں جو احکام نازل فرمائے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت سراپا پردہ ہے اور اسے پردہ ہی میں رہنا ہے جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان“ کہ عورت سراپا پردہ ہے جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے (ترمذی: ۲۲۲) اسی طرح اللہ نے اپنے نبی کو مخاطب کر کے فرمایا: ”يا أيها النبي قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنین یدينن علیہن من جلابیبہن ذلک أدنی أن یعرفن فلا یؤذین“ (الاحزاب: ۵۹) (کہاے نبی اپنے بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر چادر اور گھونگھٹ ڈال لیا کریں، اس سے امید ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی، پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا)، اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد باری ہے: ”وقرأ فی بیوتکمن ولا تبرجن تبرج الجاہلیة الأولى“ (کہ تم اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ کرو) (الاحزاب: ۳۲) ایک مقام پر اللہ نے عورتوں کو زینت کے اظہار سے بھی منع فرمایا: ”ولا یضربن بأرجلہن لیعلم ما یخفین من زینتہن“ (النور: ۳۱) (عورتیں زمین پر پاؤں مارتے ہوئے نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے وہ معلوم ہو جائے)، اسی طرح حدیث پاک میں ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو اسی عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں اور ایسے مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں (ترمذی) (الغرض قرآن کریم کے زریں اصول اور حدیث پاک کے خوبصورت اسلوب سے اتنی بات تو کھل کر سامنے آتی ہے کہ عورت بہر حال پردہ کی چیز ہے، اسی لئے علماء امت کا اجماع ہے کہ سر برائے عورت کی جائز نہیں ہے۔ ”واتفقوا علی أن الإمامة لا تجوز لامرأة“ (جواہر الفقہ ۷: ۱۸۲، ۱۸۳) امام الحرمین علامہ جوینی لکھتے ہیں: ”وأجمعوا علی أن المرأة لا تكون إماماً“ کہ عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر اجماع ہے، انہوں نے اپنی دوسری کتاب غیاث الامم للجوینی میں سربراہی کرنے والے کی شرائط لکھی ہے، ”ومن الصفات اللازمة المعتبرة: الذکورة والحریة“ (۸۲، جوالہ جواہر الفقہ ۷: ۱۸۸) اسی طرح ادب وانشاء اور تاریخ کے امام علامہ نقشبندی بھی سربراہ کی شرط بیان کرتے ہوئے سب سے پہلی شرط لکھتے ہیں: ”الاول الذکورة... والمعنی فی ذلک ان الامام لا یستغنی عن الاختلاط بالرجال والمشاورۃ معہم فی أمور، والمرأة ممنوعة من ذلک، ولأن المرأة ناقصة فی امر نفسها حتی لا تملك النکاح فلا تجعل ایها الولاية لغيرها“ (جواہر الفقہ: ۷: ۱۸۹) اس کے علاوہ امام بغوی، قاضی ابوبکر ابن العربی، علامہ قرطبی، امام غزالی، علامہ تفتازانی جیسے عظیم علماء نے بھی سربراہ قوم کی بنیادی شرطوں میں یہ شرط لکھی ہے کہ وہ مرد ہو، یعنی عورت سربراہ نہیں ہو سکتی، اور عہد حاضر کے بعض محققین جنہوں نے اسلامی سیاست کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کے سربراہ بننے کے عدم جواز پر راحت کا اتفاق ہے (جواہر الفقہ: ۷: ۱۹۱) آج کل بعض حضرات عورت کی سربراہی کے جواز میں تاریخ کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں کہ فلاں فلاں موقع پر فلاں عورت سربراہ رہی، لیکن ظاہر ہے کہ تاریخ میں جائز و ناجائز ہر طرح کے واقعات ہوئے ہیں۔ یہ واقعات دین میں کوئی سند نہیں ہیں، سند قرآن و سنت ہیں، لہذا اگر کہیں اکا دکا واقعات عورت کی سربراہی کے پیش آئے ہیں تو ان کی بنیاد پر قرآن و سنت کے واضح احکام اور دلائل کو چھوڑا نہیں جاسکتا، اور پھر ان حکومتوں کے دور میں بھی کسی فقیہ یا عالم نے عورت کی سربراہی کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا (جواہر الفقہ: ۷: ۲۱۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں احقر کے نزدیک عورتوں کا ایکشن میں بطور امیدوار حصہ لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح عورتوں کا ممبر پارلیمنٹ بننا بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ اب رہی بات کہ ووٹ ڈال سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں تھوڑی تفصیل یہ ہے کہ اگر حالات کچھ اس طرح کے ہوں کہ ووٹ ڈالنا بالکل ضروری ہو، مثلاً اگر ایک صالح اور دوسرا غیر صالح امیدوار ہو اور عورتیں ووٹ نہ دیں تو غیر صالح کے جیتنے کی امید ہو تو ایسی صورت میں شرعی پردے کے ساتھ اس کی گنجائش ہو سکتی ہے، جیسا کہ صاحب احسن الفتاویٰ نے بھی وضاحت فرمائی ہے (احسن الفتاویٰ: ۳۱/۸)۔ ☆ ☆ ☆

## الیکشن سے مربوط چند مسائل

مولانا محمد فاروق غفرلہ

اسلام ایک کامل، جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے، جو اپنے دامن وسیع و عریض میں شئون عالم کو سمیٹے ہوا ہے، اور ہر وقت ہر طرح کی ضروری رہنمائی کرتا ہے، ان ہی شئون عالم میں سے سیاست بھی ایک اہم جزء ہے، جس سے اسلامیات کا ایک گہرا اور مضبوط رشتہ ہے، بلکہ اسلام میں اس کی حیثیت چوٹی دامن کی ہے، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیس سالہ چوکس قیادت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی امارت و خلافت شاہد عدل ہیں، بلکہ اسلامی سیاست کے اہم ترین ابواب ”کتاب السیر والجمہاد“ میں ہر صاحب فہم و فراست اس کی جھلک دیکھ سکتا ہے، لہذا سیاست اور اس کے اہم ترین حصے ”ووٹ و انتخاب“ کے ہر پہلو میں اسلام کا نقطہ نظر اور رہنمائی موجود ہے، جس کو بروئے کار لا کر طریقہ ناروا سے احتراز اور راہ راست سے سرفراز ہوا جاسکتا ہے۔

چونکہ اس موضوع پر ماضی قریب اور عصر حاضر میں متعدد تصنیفات مختصر اور مفصلاً معرض شہود پر آچکی ہیں، جیسے کہ حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار، حضرت مفتی شفیع صاحب کارسالہ جوہر الفقہ میں ووٹ کی شرعی حیثیت، مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجبرہ کی کتاب ”اسلام اور سیاسی نظریات“ مولانا عبدالرحمن کیلائی کی ”خلافت و جمہوریت“، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس صاحب کی کتاب ”ووٹ ووٹس، امیدوار کے آداب و احکام وغیرہ“ اس لئے بندہ سوال کے مطابق مختصر عرض جوابات پیش کرتا ہے:

ووٹ کا لغوی مفہوم:

ووٹ Vote یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کو عربی میں الصوت، یا الرائی فی الانتخاب اور ہندی زبان میں ernku کہتے ہیں، جس کا مفہوم کسی معاملہ کے لیے رائے دینا ہے (فیر اللغات)۔

عرفی مفہوم:..... عرف و عادت میں ایک منصب و عہدہ کے لیے متعدد امیدواروں میں سے کسی ایک لائق منصب کے لیے مستحق منصب ہونے کی رائے دینا، ووٹ دینا کہلاتا ہے۔

منصب و عہدہ کی حقیقت:

تعلیم اسلام کے مطابق حکومت کی سربراہی کرنا، منصب و عہدہ پر فائز ہونا، نہ کوئی حق ہے اور نہ مفاد خاص ہے کہ اس کے حصول کے لئے انسان جدوجہد اور کوشش کرے، بلکہ یہ ایک انتہائی سخت ذمہ داری کا بوجھ ہے، جس سے حتی الامکان علیحدہ رہنا بہتر ہے، الایہ کہ کسی ضرورت کی وجہ سے انسان پر آپڑے تو اسے ایک امانت اور ذمہ داری سمجھ کر نبھائے۔ جیسا کہ مسلم شریف میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خواہش ظاہر کی۔ انہیں کسی جگہ کی حکومت سونپ دی جائے تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”یا أباذر إنک ضعیف وإمنا أمانة وإمنا لیوم القیمة خزی وندامة إلا من أخذها بحقها وأدی الذی علیہ فیها“ (مسلم شریف ص ۱۸۲۵) (اے ابوذر تم کمزور ہو اور یہ حکومت ایک امانت ہے اور قیامت کے دن رسوائی و پشیمانی، الایہ کہ کوئی شخص برحق طریقے سے یہ امانت لے اور اس پر اس کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں، انہیں ٹھیک ٹھیک ادا کرے)۔

اور امام مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ”یا أباذر إنی أراک ضعیفا وإنی أحب لک ما أحب لنفسی لا تأمرت علی اثنین ولا تولین مال یتیم“ (مسلم شریف ص ۱۸۲۶) (اے ابوذر میں تمہیں کمزور دیکھتا ہوں اور میں

ملا جامعد دار الاحسان بارڈولی، سورت، گجرات۔

تمہارے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ تم کبھی دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بنا اور نہ کسی یتیم کے مال کی ذمہ داری قبول کرنا۔

اس مضمون کی بہت سی روایتیں ذخیرہ احادیث میں موجود ہیں جن میں اس منصب کی ذمہ داری اور آخرت میں سخت باز پرس کی بات واضح ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کا وہ زریں قول جو اپنے فرزند عبداللہؓ کے برسر اقتدار ہونے سے متعلق ارشاد فرمایا تھا، تاریخ کے اوراق نے اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے، جس سے اس عہدہ کی حقیقت اور اس کی ذمہ داری کا بخوبی ظہور ہوتا ہے، تاریخ طبری میں ہے:

”بِحسب آل عمر ان يحاسب منهم رجل واحد ويسأل عن أمة محمد لقد جهدت نفسي وحرمت أهلي، وإن نجوت كفافاً لا وزر ولا أجر إني لسعيد“ (۳۰۲۴)۔

(عمر کے خاندان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ان میں سے صرف ایک ہی شخص سے حساب لیا جائے اور امت محمدیہ کے بارے میں باز پرس کی جائے۔ میں اپنے آپ کو اس مشقت میں ڈال چکا ہوں..... اور میں نے اس کو اپنے گھر والوں کے لیے حرام کر دیا ہے اور اگر میں اس طرح برابر برابر چھوٹ جاؤں کہ نہ گناہ ہونے ثواب تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا) (اسلام اور سیاسی نظریات ص ۲۱۲)۔

مذکورہ اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ منصب حکومت اور سربراہی ایک سخت انتہائی ذمہ داری و امانت کی چیز ہے، جس سے حتی المقدور بچنے کی ضرورت ہے۔

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

جب منصب حکومت کی حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ ایک اہم ترین، حساس، نازک اور محتاط ذمہ داری کا نام ہے تو اس کے امیدوار کیسے ہونے چاہئیں اور ان میں کیا لیاقتیں ہونی چاہئیں، ان کا جاننا اور اس کے مطابق اپنے ووٹ کے ذریعہ اس امیدوار کی تشکیل کرنا پوری عوام کے لئے عموماً اور امت مسلمہ کے لیے خصوصاً ضروری ہے، لہذا جب کوئی آدمی کسی امیدوار عہدہ کو اپنے ووٹ کے ذریعہ دوسرے امیدواروں پر ترجیح دیتا ہے تو اس پر ترجیحی پہلو اور رائے دینے کو شریعت کے متعدد خانہ میں داخل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع نے اس کی تین حیثیتیں متعین فرمائی ہیں:

۱۔ شہادت، ۲۔ شفاعت، ۳۔ وکالت۔

ان تینوں حیثیتوں میں ایک ووٹر جس امیدوار کو ووٹ دے کر دیگر امیدواروں پر ترجیح دیتا ہے، گویا یہ شہادت دیتا ہے اور سفارش کرتا ہے کہ یہ نمائندگی کے لائق اور اس منصب کے مطابق ہے۔ اور ووٹر خود اپنی اور پوری قوم کی جانب سے اس کو حکومت کے روبرو ترجیح دینی کرنے کا وکیل بناتا ہے، لہذا مذکورہ تینوں صورتوں میں اگر وہ امیدوار واقعی منصب کے لائق، قوم و ملت کا ہمدرد اور امانت دار ہے تو اس کو ووٹ دینا جہاں موجب ثواب عظیم ہے وہیں اس کے کارہائے خیر اور امت کے فلاح و بہبود سے متعلق جملہ امور میں ووٹس بھی اس کے ساتھ برابر کے شریک ہیں، اس لئے کہ امیدوار کے جملہ اعمال خیر ووٹس کی رہنمائی اور ان کے انتخاب سے ہوئے ہیں، لیکن اگر امیدوار نااہل غیر متدین ہے، حفاظت، امانت اور اداکاری سے کوسوں دور ہے تو ایسے امیدوار کو ووٹ دینا جس طرح جھوٹی شہادت ہے، اسی طرح بری شفاعت اور ناجائز توکیل بھی ہے، لہذا ایسے امیدوار، منصب پر فائز ہو کر جو جور و ظلم، حق تلفی اور قوم و ملت کی مادی و دینی خیانت کریں گے، اس میں ووٹس بھی برابر کے شریک ہوں گے، کیونکہ بددیانتی کے یہ سب واقعات ووٹر کے مرہون منت ہیں اور حدیث پاک میں موجود ہے:

”من دعا إلى هدى كان له من الأجر مثل أجور من اتبعه لا ينقص من أجورهم شيئاً، ومن دعا إلى ضلالة فغلبه من الإثم مثل آثام من اتبعه لا ينقص ذلك من آثامه شيئاً“ (ابن ماجہ شریف ص ۲۰۶)۔

یعنی جس نے کسی کو ہدایت کی دعوت دی تو اس کے لیے اتباع کرنے والے کے ہم مثل اجر ہوگا اور اتباع کرنے والے کے اجر میں سے کچھ بھی کم نہ ہوگی، اور جس نے گمراہی کی دعوت دی تو اس کے لیے اتباع کرنے والے کے ہم مثل گناہ ہوگا اور ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ووٹ دیتے وقت امیدوار کی لیاقت کا مکمل خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ اس کے برے کرتوت کے وبال میں مبتلا نہ ہو۔

### ووٹ دینا ضروری ہے یا نہیں؟

جب اوپر ثابت ہو گیا کہ ووٹ شفاعت و وکالت کے ساتھ ساتھ شہادت بھی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام و ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے

”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَرَ قَلْبِهِ“ (سورۃ البقرہ: ۲۸۳)۔

نیز حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”من كتم شهادة إذا ادعى إليها كان كمن شهد بالزور“ (مجموع الزوائد ۴: ۲۵۹)۔

یعنی اداء شہادت کیلئے بلائے جانے کے وقت جس نے شہادت چھپائی وہ ایسا ہے جیسے کہ کسی نے جھوٹی گواہی دی، اس کے علاوہ حضرت زید بن خالد جہنی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها“ (مسلم شریف ۴: ۲۹۳)۔

کیا میں تمہیں بہترین گواہ کی خبر نہ دوں، وہ ہے جو طلب شہادت سے قبل شہادت پیش کر دے، معلوم ہوا کہ جب امانت دار امیدوار موجود ہو تو اس کو ووٹ دے کر لائق عہدہ ہونے کی شہادت دینا واجب و ضروری ہے، اگر ایسے وقت میں ووٹ کو محفوظ کر لیا اور اس سے احتراز کیا تو وہ گنہگار ہے (جوہر الفقہ ۲: ۲۹۳، فقہی مقالات ۲۸۷)۔

غیر متدین، نالائق امیدوار کی صورت میں ووٹ دینے کا حکم:

اگر تمام امیدوار غیر متدین، خائن اور نااہل ہوں جیسا کہ آج پارلیمنٹ اور اسمبلی میں اکثریت اس قسم کے لوگوں کی ہے، تو پھر ووٹ دینے میں بڑے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان امیدواروں میں سے جو مضرت کے اعتبار سے اشد ہو، اور جس کی بددیانتی اور خیانت حد سے بڑھی ہوئی ہو اس کو ترک کیا جائے اور اخف مضرت کے حامل کا تعاون کیا جائے، کیونکہ اس دور میں یہ تو بہت مشکل ہے کہ ایسے امیدوار میسر ہوں جو سو فیصد اہلیت کے حامل ہوں، اور ہمارا مذہبی شخص نزاکتوں کے پورے طور سے پاسدار ہوں، لیکن اگر ہم نے نااہل سمجھ کر کسی کو ووٹ نہیں دیا تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ منصب خالی رہ جائے گا بلکہ کوئی نہ کوئی اس منصب پر ضرور آئے گا، اور بہت ممکن ہے کہ ایسا جاہل و ظالم اسلام مخالف بیہیت صفت انسان اس پر آجائے جو ہمارے وہم و گمان سے کہیں بدتر ہو۔ پھر جو نتائج سامنے آئیں گے وہ الامان الحفیظ، اس لئے اس موقع پر ضروری ہوگا کہ ووٹ دینے میں جو ایک طرح کا مفسدہ اور مضرت ہے، اس کو برداشت کرتے ہوئے ووٹ نہ دینے میں جو زائد اور اشد مضرت ہے اس سے بچا جائے، اور ایسے امیدوار جو غیر متدین، بددیانت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خیر خواہ اور ان کے حقوق کی حفاظت کے اہل ہوں ان کو ترجیح دی جائے، اور اپنے ووٹ سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا جائے، تاکہ امیدوار اور پارٹی کو مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت معلوم ہو اور اس احسان میں مسلمانوں کے تحفظ کے تدابیر پر متوجہ ہوں الا شبہ والنظر میں ہے:

”إن من ابتي ببلتین وهما متساویان يأخذ بأیتها شاء. وإن اختلفتا یختار أهوھما. لأن مباشرة الحرام لا تجوز إلا للضرورة، ولا ضرورة فی حق الزیادة“ (الاشباه والنظائر لابن نجیم ۱: ۱۱۱، بیروت)۔

یعنی جو شخص دو آزمائشوں میں مبتلا ہو اور وہ دونوں مساوی ہوں تو اسے اختیار ہے جسے چاہے اختیار کر لے، لیکن اگر دونوں آزمائش شدت و خفت میں مختلف ہوں تو دونوں میں سے اخف کو اختیار کرے گا، اس لئے کہ حرام کا ارتکاب صرف ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، اور اخف پر عمل ممکن ہونے کی صورت میں زیادتی پر عمل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے اس معنی کے سلسلے میں یعنی متعدد قواعد ہیں، جن سے مفسد اخف کو اختیار کر کے مفسد اشد کو ختم کرنے کی اجازت دی گئی ہے جیسا کہ شرح الجملہ میں ہے:

الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف، إذا تعارض المفسدتان روعی أعظمهما ضرراً بارتکاب أخفهما. یختار أهون الشرین (شرح المجلة ۱: ۲۱، المادة ۲۸، ۲۹)۔

معلوم ہو گیا کہ مذکورہ صورت میں بھی ووٹ دینا ضروری ہے۔

## مخالف شرع قانون ساز ادارے اور پارٹی کی ممبری:

کسی بھی ادارہ یا پارٹی کی ممبری اختیار کرنے یا اسکی رہنمائی کرنے کا اسلامی اصول و ضابطہ قرآن کریم نے ”تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۲) کو قرار دیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسی پارٹی یا ادارہ جس کے بنیادی منشور پر تقویٰ پر مبنی ہو وہ لائق تائید و تقلید ہے، اور جس کے بنیادی اصول اثم و عدوان پر مبنی ہو وہ قابل احتراز و اجتناب ہے، کیونکہ ایسے ادارہ کی ممبری اختیار کرنا یا ووٹ کے ذریعہ تعاون کرنا، اس کے شانہ بشانہ رہنا اور اس کے جملہ اسلام مخالف قانون میں شریک ہونا ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من مشی مع ظالم ليعقوبه وهو يعلم إنه ظالم فقد خرج من الإسلام“ (مشکوٰۃ شریف ۳۳۶)۔

یعنی جو شخص ظالم کے ساتھ اس کی تائید و تقویت کے لئے چلے جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ لیکن مذکورہ نظریہ اسلام کی حقانیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ ایسے ممالک جہاں کے مسلمان اقلیت میں ہیں تاہم ان کی تعداد قابل اہمیت ہے کہ وہ بالافتقار جس پارٹی کے امیدوار کے ساتھ ہو جائے وہ ترجیح پا جائے، ایسے ملکوں میں ایسی پارٹی یا ادارہ کا وجود جس کے بنیادی دستور پورے اسلامی ہوں، اگرچہ مجال نہیں لیکن دشوار ضرور ہے، ایسی جگہوں پر اگر کسی پارٹی سے اپنا تعلق نہ ہو اور پارلیمنٹ و اسمبلی کی ممبری سے یا ووٹ دینے سے اجتناب ہو تو یقیناً مسلمانوں کے لیے ہر میدان میں غیر معمولی نقصان سامنے آئے گا۔ مسلمانوں کے حقوق پامال ہوں گے، ان کے دینی فکری نظریات پر یلغار ہوں گی، لیکن اگر مسلمانوں کا میدان سیاست میں شمول ہوگا خواہ ووٹ دینے کے ذریعہ ہو یا ممبر بننے کے ذریعہ تو ان کا ایک اثر ہوگا اور ایسے ادارہ آئندہ مغلوبیت کے خوف سے آواز نہیں گے اور نہ مکمل مگر قدر مرآت کی نظر سے ضرور دیکھیں گے اور اس واسطے سے مسلمان اپنے مذہبی تخصصات کی بہت حد تک حفاظت کر سکیں گے۔

نیز اگر اپنے ممبر ہوں گے تو وہ غیر اسلامی قانون کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور یقیناً یہ آواز جس قدر مضبوط ہوگی، اسی قدر اسلام مخالف منشور کمزور اور ضعیف نظر آئیں گے، جیسا کہ یہ بار بار دیکھا گیا ہے کہ جس علاقہ کے ممبران غیر مسلمان ہیں، وہاں دفاتر و حکامات میں مسلمانوں کے ساتھ کم سے کم بے جا معاملات سننے کو ملتے ہیں جبکہ جس علاقہ کے تمام ذمہ دار کٹر اسلام مخالف ہیں وہاں آئے دن دل دہلا دینے والے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔

اس لئے ایسے موقع پر فقہاء کے قواعد الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف وغیرہ سے سہارا لیتے ہوئے مخالف شرع قانون ساز ادارے اور پارٹی کی ممبری کی گنجائش ہوگی تاکہ سیاست میں نہ ہونے سے جو غیر معمولی ضرر پہنچ سکتا ہے، اس سے بچا جائے اور ایسی پارٹی کی شرکت سے نسبتاً کم ضرر کو برداشت کیا جائے، نیز اس قسم کی پارٹی و ادارہ کی شرکت ممبر کی حد تک خصوصی ضرر کا باعث ہوگی، لیکن اس سے امت مسلمہ کی ملی رفاہی حقوق محفوظ ہوں گے اور فقہاء کا قاعدہ ہے: ”یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام“ (شرح المجلة ۱۰۲، المادة ۲۶)۔

جبکہ حضرت امام ابو بکر جصاص رازی نے مقام منکر پر اپنے حق کی حصولیابی کے لئے منکر پر تکیہ کرتے ہوئے جانے کی اجازت فرمائی ہے اور منکر کی وجہ سے اپنے حق کو ترک کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، تو ظاہری بات ہے کہ مذکورہ ادارے اگرچہ منکر پر مشتمل ہیں مگر اس سے دوری اپنے حقوق کا گلا گھونٹنا ہے، اس لئے ایسے ادارہ سے تعلق رکھ کر اپنے حق کی آواز بلند کرنا اور اسلام مخالف منشور کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہے اور اس سے کسی بھی طرح علیحدہ رہنا درست نہیں۔ چنانچہ علامہ رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

”فإن قيل: فهل يلزم من كان بحضرة منكر أن يتباعد عنه وأن يصير بحيث لا يراه ولا يسمعه؟ قيل له: قد قيل في هذا أنه ينبغي له أن يفعل ذلك إذا لم يكن في تباعده وترك سماعه ترك الحق عليه، من نحو ترك الصلاة في الجماعة لأجل ما يسمع من صوت الغنا والملاهي (إلى قوله)، فإذا لم يكن هناك شيء من ذلك فالتباعد عنه أولى، وإذا كان هناك حق يقوم به، لم يلتفت إلى ما هناك من المنكر وقام بما هو مندوب إليه من حق بعد إظهاره لإنكاره وكرهته“ (احکام القرآن للجصاص ۲۰۲۳)۔

۱۰. (اگر یہ اشکال کیا جائے کہ کیا جس آدمی کی موجودگی میں کوئی منکر ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ وہاں سے دور ہو جائے اور ایسا ہو جائے کہ وہ اس کو نہ دیکھ سکے اور نہ اس کو سن سکے، اسے جواباً کہا جائے گا کہ اس سلسلہ میں یہی قول ہے کہ اس کے لیے دور رہنا مناسب ہے، بشرطیکہ اس سے دور رہنے اور اس کے ترک سماع سے واجب حق متروک نہ ہو، جیسے کہ بول و لعب اور غنا کی وجہ سے نماز باجماعت متروک نہ ہو، لیکن جب وہاں پر واجب حقوق میں سے کچھ بھی نہ ہو تو اس منکر سے دور رہنا۔

اولیٰ ہے اور جب وہاں ادائیگی کے لائق کوئی حق ہو تو منکر کی طرف توجہ کئے بغیر اس مندوب الیٰ حق کو پورا کرے گا۔ بعد اس کے کہ پہلے اس منکر پر انکار اور اظہار کراہت کرے۔

حاصل کلام یہ کہ ووٹ دینے یا ممبر بننے کیلئے اولاً ایسی پارٹی کا انتخاب ہو جس کا ضابطہ بز و تقویٰ پر مبنی ہو۔ ورنہ جس پارٹی کے قوانین اسلام اور مسلمانوں سے جتنے ہم آہنگ ہوں اس کو اختیار کیا جائے، البتہ مسلمانوں میں سے اگر کوئی ناگزیر حالت میں مذکورہ ادارے یا پارٹی کی شرکت کرے تو ان کے لئے حسب ذیل شرطوں کی رعایت ضروری ہوگی:

شرکت اسلام اور مسلمانوں کو نقصانات سے بچانے کیلئے ہو۔

دستور مخالف اسلام ہو اس کے خلاف احتجاج کرنے اور منکر پر نکیر کرنے کیلئے ہو۔

اسلام اور مسلمانوں کی دینی فکری ترجمانی کیلئے ہو۔

اپنی مصلحت اور منفعت مال و جاہ کیلئے نہ ہو۔

سیاسی جماعتوں اور حکومتوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کیلئے ہو۔

### خلاف شرع دفعات پر حلف:

حلف برداری کے سلسلے میں شریعت غزاء میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء و صفات سے حلف ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ حلف ان ہی امور پر ہو جو مشروع ہوں، اگر امر غیر مشروع پر حلف لی، تو اس کو فوراً ترک کرنا اور قسم کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من حلف علیٰ یمن فرأى خيراً منها فلیکفر عن یمینہ ویفعل (مشکوٰۃ شریف ۲۹۶)۔

لہذا اگر کوئی کسی ایسے قانون ساز ادارے کا رکن بنے جس کے بعض دستور غیر مشروع ہو تو اس سے وفاداری کا حلف لینا غیر مشروع پر حلف لینا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

تاہم اگر حالف اس شرط و نیت سے حلف لے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی کفایت اللہ نے اس طرح حلف کی اجازت دی ہے (کفایت الفتی ۵۰۹/۳۵۰ کریم)۔

نیز ہماری کتب فقہیہ میں موجود ہے کہ اگر حالف ظالم ہے تو مستحلف کی نیت معتبر ہے، اور اگر مستحلف ظالم ہے تو حالف کی نیت معتبر ہے، تو ایسے حالات جس میں اسبلی وغیرہ کی ممبری وقت کی ضرورت ہے، اور ہم اس کے غیر مشروع دستور میں ترمیم کرنے سے عاجز ہیں، جبکہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ہر ایک مکتبہ فکر کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے تو ہمیں غیر مشروع دستور سے حلف اٹھانے کا مکلف کرنا ہمارے اوپر ظلم کرنا ہے، اس لئے ہمیں ایسے وقت میں اپنی شریعت کے مطابق نیت کر کے حلف لینے کی اجازت ہوگی۔ جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”والحاصل أنه لو حلف ظالم ونوی تخصیص العام وغیر ذلك مما هو خلاف الظاهر و علم القاضي بحالہ لا یقتضی علیہ بل یرصدہ أخذاً بقول الخصاص“ (شامی ۵۰۸۶)۔

یعنی حاصل کلام یہ کہ اگر کسی سے کوئی ظالم قسم کھلائے اور حلف میں عام کی تخصیص یا اس کے علاوہ خلاف ظاہر کی نیت کر لے، اور قاضی کو اس کی حالت معلوم ہو تو قاضی امام خصاص کے قول کے مطابق اس کے خلاف فیصلہ نہیں کرے گا بلکہ اس کی تصدیق کرے گا، اسی طرح الاشباہ والنظائر میں ہے:

”والفتویٰ علی اعتبار نية الحالف إن كان مظلوماً، لا إن كان ظالماً كما في الولوالجية“ (الاشباہ والنظائر ۱۰۱۰، بیروت)۔

رہی بات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی اور چیز کی مثلاً قرآن، کعبہ، نبی وغیرہ کی قسم کھانا تو اس کی اجازت نہیں ہے، بلکہ یہ قسم موجب گناہ ہے جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”ولا ینعتقد القسم بغيره تعالى أي غير أسمائه وصفاته ولو بطريق الكناية كما مر. بل يحرم كما في القهستاني. بل يخاف عنه الكفر“ (شامی ۲، ۲۸۳)۔

البتہ فقہاء کی ایک جماعت نے قرآن پاک کی قسم کو تعارف اور صفت کلام ہاں کریمین قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ اگر کوئی آدمی قرآن پاک کی قسم کھائے تو معتبر ہے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے:

”قال محمد في الأصل: لو قال والقرآن لا يكون يمينا (إلى قوله) وقد قيل هذا في زمانه، أما في زماننا فيكون يمينا، وبه نأخذ ونأمر ونعتقد ونعتمد. وقال محمد بن مقاتل الرازي: لو حلف بالقرآن قال: يكون يمينا، وبه أخذ جمهور مشائخنا رحمهم الله كذا في المصمرات“ (ہندیہ ۲، ۵۹ اتحاد)۔

معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی قسم بالکل جائز نہیں اور قرآن مقدس کی قسم کو جن لوگوں نے منعقد مانا ہے وہ بھی اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے قرآن پاک کو اللہ کی صفات میں سے ایک صفت کلام ہاں لیا ہے، اور اس سے قسم کھانے کا تعارف بھی ہے، اور جس نے قرآن پاک کو صفت کلام قرار نہیں دیا، بلکہ الفاظ قرآن قرار دیا ہے ان کے نزدیک قرآن پاک کی قسم جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ تکلمہ فتح الہم میں ہے:

”أما الحلف بالقرآن فجوزه بعض الفقهاء لأنه صفة من صفات الله، وأنكر بعضهم لأنه يراد به ألفاظ القرآن وأنها ليست بصفة“ (تکلمة فتح الملہم ۸، ۱۵۸)۔

واضح ہو گیا کہ بائبل اور دیگر کتب سماویہ سے حلف اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ جس طرح محرف ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت کلام نہیں ہے، اسی طرح سے قسم کھانے کا تعارف بھی نہیں ہے، لہذا حلف قرآن کے جواز کی جو علت ہے اس سے بالاتفاق بائبل وغیرہ کی قسم کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔

البتہ اگر ایسا عیسائی ملک جس میں ممبر بننا وقت کی اہم ترین ضرورت ہو اور حلف اٹھانے کا وقت بائبل کی تصریح باللسان ضروری ہو تو حلف کیلئے ظاہر بائبل اٹھانے کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ قسم کیلئے کسی کتاب کا صرف ہاتھ میں لینا کافی نہیں ہے بلکہ قسم قرآن کی یا قسم فلاں کتاب کی کہنا ضروری ہے۔ کما فی الدر المختار و رکنها اللفظ المستعمل فیها (الدر المختار مع الشامی ۵، ۲۷۳)۔

خلاصہ یہ کہ قانون ساز اداروں میں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا اس نیت سے درست ہوگا کہ جہاں تک شریعت کی مخالفت نہ ہو وفاداری کروں گا، نیز حلف اٹھانے کیلئے اگر اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات جن سے قسم کھانے کی اجازت ہے ممکن نہ ہو تو قرآن پاک کی قسم کھائی جائے، تاہم بائبل یا دیگر دوسری کتاب سے حلف اٹھانا درست نہیں، الا یہ کہ بائبل پر ہاتھ رکھ کر دوسرے طریقہ مشروع کے مطابق حلف اٹھائے تو اس کی اجازت ہے۔

### مسلمانوں کا انفرادی سیاسی محاذ:

حق تو یہی ہے کہ مسلمان اسلامی سیاست کے اعتبار سے خود کفیل ہو، اور شرعی، معاشرتی اور اصلاحی ضرورتوں کو دفع کرنے اور حکومت پر اپنا رعب و دبہ ڈالنے کیلئے اپنی مستقل پارٹی رکھتے ہوں، تاکہ یہ پارٹی ترقیات انسانی کی ضامن اور ملک و ملت کیلئے صالح نظری نظام کا ذریعہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”واعصموا بجل الله جميعاً ولا تفرقوا“ (آل عمران: ۱۰۲)۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت مفتی شفیع احمد صاحب فرماتے ہیں: اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہو جائیں تو ہزاروں گروہی نسلی، وطنی اختلافات ایک لحظہ میں ختم ہو سکتے ہیں جو انسانیت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں (معارف القرآن ۱۳۰۲)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ایسا ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور آبادی کا اوسط بھی ہر جگہ مساوی نہ ہو ایسے ملک میں مسلمانوں کی انفرادی پارٹی کس قدر مفید ہوگی اس کا اندازہ سیاست کے ماہرین اور اس سلسلے میں گہری بصیرت رکھنے والے لوگ جب کہ صحیح العقیدہ سلیم الفکر ہوں، زیادہ کر سکتے ہیں، اس لئے کہ مسلم لیگ اپنی سیاست و نتائج کے اعتبار سے ہمارے سامنے ہے، جس کے ماضی کی کارکردگی تاریخ سے اور حال کے مشاہدہ سے کی جاسکتی ہے، اس لئے اس موقع پر اصول اسلامی کے مطابق پارٹی قائم کرنے کے لئے ماہرین کے مشورہ کی ضرورت ہے۔



## سیاست میں خاتون کا کردار:

مغربی تہذیب نے جہاں نسبت انسانی کے مختلف گوشوں کو متاثر کیا، وہیں مردوزن کو شانہ بشانہ ایک صف میں کھڑا کر دیا، اور پورے عالم کو یہ تصور دیا کہ عورت مرد ہی کی طرح ہر عہدہ و منصب کی حقدار ہو سکتی ہے، چنانچہ اس تصور کو دنیا کے بہت سے ممالک نے قبول کیا اور پارلیمنٹ سے لے کر نیچے تک کے عہدوں کی زینت عورتوں کی بنا دیا، لیکن یہ تصور اسلام کے تصور سے میل نہیں کھاتا، کیونکہ اسلام نے عورت و مرد کے مقاصد میں ایسا ہی فرق کیا ہے جیسا کہ شب و روز اور آتش و آب کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ نے مردوں کو نبی، امام، حدود و قصاص کے گواہ بننے اور جمعہ و اعیاد قائم کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، تو عورتوں کو فریضے، بچہ دینے اور امور خانہ داری یعنی تدبیر منزل کی ذمہ داریوں سے نوازا ہے، اسی فرق مقاصد کی وجہ سے فقہاء رحمہم اللہ نے دونوں کو مختلف جنس قرار دیا ہے اور دونوں کی داخلی و خارجی ذمہ داریوں میں غیر معمولی فرق رکھا ہے، قرآن وحدیث میں کچھ عبادت ضروریہ کے علاوہ عام طور سے دونوں کو یکساں اور مساوی قرار نہیں دیا، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں ممبر سازی کے لئے ووٹ دے سکتی ہیں؟ یا خود میدان سیاست میں ایک امیدوار ہو کر کھڑی ہو سکتی ہیں؟ تو بعض علماء نے کسی بھی طرح عورت کو شریعت کی اجازت نہیں دی، نہ تو ووٹ دینے کے لئے، اور نہ ممبر بننے کیلئے، جیسا کہ مولانا عبدالرحمن کیلانی فرماتے ہیں:

عہد نبوی سے لے کر خلافت راشدہ کی پوری تاریخ پڑھ جائے آپ کو کوئی ایسی مثال نہ مل سکے گی کہ عورت نے ووٹ دیا ہو مجلس شوریٰ کی ممبر ہو، یا کوئی کلیدی اسامی اس کے سپرد ہو، یا میدان امامت و سیاست میں اس کا کسی قسم کا عمل دخل ہو (خلافت و جمہوریت ۱۰۶)۔

ری بات حضرت عائشہؓ کی کہ جنگ جمل میں ان کی شمولیت و قیادت منقول ہے جس سے میدان سیاست میں کسی عورت کے حصہ لینے کا ثبوت ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شمولیت حضرت عثمانؓ کے قصاص کے لئے تھی، نہ کہ سیاسی معاملات میں دلچسپی کے لئے، جب کہ اکابر صحابہؓ نے اس شمولیت کو مناسب نہیں سمجھا اور بعد میں اس غلطی پر خود حضرت عائشہؓ روایا کرتی تھیں جیسا کہ ابن قتیبہ نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے، چنانچہ اس وقت حضرت علیؓ نے حسب ذیل تحریر کی تھی:

”فانك خرجت غاضبة لله ولرسوله تطلبين امرا كان عليك موضوعاً، ما بال النسوة والحرب واصلاح بين الناس“ (الامامة والسياسة، لابن قتیبہ ۷۰، بحوالہ خلافت و جمہوریت ۱۰۶)۔

یعنی آپ اللہ اور رسول کے احکام قصاص کے لیے غضب ناک ہو کر ایک ایسے مسئلہ کے لیے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں۔ بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں کی مصالحت سے کیا تعلق ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی برأت کا اظہار اس طرح سے فرمایا: ”ان بيت عائشة خير لها من هودجها“ (الامامة والسياسة ۶۱، بحوالہ خلافت و ولوکیت)۔ یعنی حضرت عائشہؓ کا گھرانے کے لیے ہودج سے بہتر ہے۔

نیز تفہیم القرآن میں حضرت مسروق سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ تلاوت قرآن کرتے ہوئے اس آیت پاک و قرن فی بیوتکن (احزاب ۴۳) پر پہنچتیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں، یہاں تک کہ دوپٹہ بھیک جاتا تھا، کیونکہ اس آیت پر وہ خطا یا دا جاتی تھی جو جنگ جمل میں ہوئی تھی (تفہیم القرآن)۔ معلوم ہوا کہ عورتیں مطلقاً سیاست میں حصہ نہیں لے سکتیں۔

البتہ دوسرے فریق کے نزدیک عورتیں سیاست میں بھی شریک ہو سکتی ہیں، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے شروط و قیود کے ساتھ عورتوں کو ووٹ دینے کی اجازت دی ہے، تاہم ممبر اسمبلی بننے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

عورتوں کا ووٹ بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لیے مستحسن نہیں، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لیے معتذر ہے (کفایۃ المفتی ۳۳۹/۹)۔

حاصل کلام یہ کہ عورت کے شریک سیاست ہونے کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ سربراہ حکومت ہونے کی حیثیت سے۔

۲۔ اسمبلی یا کونسل کی ممبر ہونے کی حیثیت سے۔

۳۔ ووٹر ہونے کی حیثیت سے۔

اس بات پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ اسلام میں سربراہ حکومت کے لیے مرد ہونا شرط ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لن یفلح قوم ولوا أمرہم امرأۃ“ (بخاری شریف ۴۳۲۵)۔

یعنی وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے اوپر کسی عورت کو حاکم بنا لیا ہو۔

یہ بات آپ ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کہ ایرانیوں نے ایک عورت کو بادشاہ بنا لیا تھا، نیز جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”إذا كانت أمراؤکم شرارکم وأغنیاءکم بخلائکم وأمورکم إلی نساءکم فبطن الأرض خیر لکم من ظہرها“ (ترمذی شریف ۲۲۶۶)۔

یعنی جب تمہارے اوپر تم میں سے بدترین لوگ ہوں اور تمہارے مالدار لوگ تم میں سے بخیل لوگ ہوں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے حوالہ ہو جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہے۔

اس کے علاوہ دلیل معقول یہ ہے کہ شریعت میں سربراہی کی حیثیت امامت کی ہے، اور امامت کی دو قسمیں ہیں: امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت، اور دوسری امامت کبریٰ یعنی حکومت کی سربراہی اور یہ بات متحقق ہے کہ عورت امامت صغریٰ انجام نہیں دے سکتی تو امامت کبریٰ کیسے کر سکتی ہے؟ (اسلام اور سیاسی نظریات ۲۲۵)۔

اسی لئے حضرت امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

”هذا نص في أن المرأة لا تكون خليفة ولا خلافة فيه“ (الجامع لاحكام القرآن ۷۱۳۰)۔

یعنی حدیث مذکورہ نص قویٰ اس باب میں صریح ہے کہ عورت خلیفہ نہیں بن سکتی، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں، خاص طور سے جب کہ اہل لیاقت مرد موجود ہو، اس لئے کہ عورت کا مردوں کے ساتھ زینت مجلس بننا اور ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر باتیں کرنا ایسا امر ہے جس میں شریعت کے احکام کی پابندی کرنا ممکن نہیں، جیسا کہ امام قرطبیؒ عورت کے حاکم بننے اور عہدہ قضا وغیرہ پر فائز ہونے کی ہونے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”فإن المرأة لا يتأتى منها أن تبرز إلى المجلس ولا تخاطب الرجال ولا تفاوضهم مفاوضة النظر للنظير“ (ایضاً ۷۱۳۰)۔

یعنی عورت سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مجلس میں جلوہ افروز ہو، اور مردوں سے اختلاط کرے، اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مردوں سے اس طرح بات کرے کہ جس طرح خود مرد مرد سے بات کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ عورت حدود شرع میں رہ کر ممبری کا حق ادا نہیں کر سکتی، اس لیے ممبری کے لیے کھڑا ہونا درست نہیں، البتہ عورت کا ووٹر بننا جس طرح حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے نزدیک چند شرطوں کے ساتھ درست ہے وہی بندہ کے نزدیک بھی راجح ہے، اس لیے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت ہے جیسا کہ ما قبل میں گذری اور عورت بجز چند امور حدود و قصاص کے شہادت کی اہلیت رکھتی ہے:

”وما سوى ذلك من الحقوق يقبل شهادة رجلين أو رجل وامرأتين سواء كان الحق مالاً أو غير مال“ (مداہ ۳۰۱۵۳)۔

یعنی حدود و قصاص کے علاوہ دیگر حقوق مالی میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔

معلوم ہوا کہ عورت ووٹر بن سکتی ہے، لیکن ضروری ہے کہ آمدورفت اور ووٹنگ میں مردوں سے اختلاط نہ ہو بلکہ عورتوں کا نظام مستقل طور سے الگ ہو۔

☆☆☆

## لیکشن سے مربوط شرعی مسائل اور ان کا حل

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ط

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

ایکشن میں ایک ایک ووٹ کی اہمیت ہے، اسی پر ہار جیت کا مدار ہے، ہر امیدوار انتخابی مہم کے دوران لوگوں سے ووٹ لینے کے لئے مختلف وعدوں سے کام لیتا ہے، اس نازک وقت میں راہ حق سے پھسلنے کے تمام ہی راستے کھل رہے ہیں۔ اس لیے علماء نے ووٹ کی شرعی حیثیت متعین کرتے ہوئے تین مختلف راہیں اختیار کی ہیں:

۱۔ پہلی راہ میں ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہے، گویا ہر ووٹر اپنا ووٹ استعمال کر کے اپنے کنڈیڈٹ کے سلسلے میں شہادت دے رہا ہے کہ ملکی مفاد پر کھرا اترنے والا عوامی دکھ درد کو دل و جان سے محسوس کرنے والا ہمارا نمائندہ ہے۔

لیکن راقم کو اس راہ سے اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ عوامی ایکشن میں ووٹ دینے کا حق ایسے شخص کو بھی ہوتا ہے جس کو اسلامی شریعت کی رو سے نااہل قرار دیا گیا ہے، عوامی ایکشن میں تو ہر انسان جو کہ حکومت کے مقرر کردہ حدود میں بلوغ کو پہنچ گیا ہے اس کو ووٹ دینے کا حق ہے خواہ وہ شریعت کی نگاہ میں کتنا ہی کیوں نہ معتوب ہو حتیٰ کہ خود اپنے لئے اور اپنے اصول و فروع کے لئے بھی ووٹ دینے کا حق ہے، جبکہ شریعت کا عام قاعدہ ہے: ”والزوجة لزوجها وهو لها والفرع لأصله وبالعكس وسيد لعبده ومكاتبه والشريك لشريكه فيما هو من شركتهما لأنها لنفسه من وجه“ (الدر المختار: ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴ کتاب الشہادت باب القبول وعدمہ)۔

(قبول نہیں ہوگی شہادت بیوی کی شوہر کے لئے، اور نہ شوہر کی بیوی کے لئے، نہ اولاد کی آباء کے لئے، نہ آباء کی اولاد کے لئے، نہ آقا کی غلام و مکاتب کے لئے، نہ ایک شریک کی اپنے شریک کے لئے ایسے معاملہ میں جس میں دونوں کی شرکت ہے۔ اس لئے کہ یہ من وجہ اپنے لئے ہی شہادت ہے)۔ لہذا اس کو شہادت ماننا مشکل ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ووٹ کے عمل کو، ووٹر کی جانب سے شفاعت سمجھا جائے کہ ہر ووٹر اپنے نمائندہ کے لئے مطلوبہ منصب کی سپردگی کی خاطر سفارش کرتا ہے، بظاہر یہ راہ اچھی معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ عوامی جمہوریت میں عوام کو پورا حق ہے کسی کے لئے سفارش کرے، لیکن اس پر بھی شرح صدر نہیں ہوتا، اس لئے کہ جمہوری ایکشن کا مدار عوامی اکثریت پر ہے، جس جانب اکثریت ہے وہی جانب حتمی و یقینی ہے، اس کے خلاف کرنا قانوناً جرم بلکہ اس کی وجہ سے بڑی سے بڑی سزا کے لئے تیار رہنا ہوگا حالانکہ شفاعت اسلامی نقطہ نظر سے مطلوب و پسندیدہ ضرور ہے لیکن اس کو قبول کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ حاکم و سربراہ کی صوابدید پر موقوف ہے چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو رد کر دے۔ بخاری کی روایت ہے: إذا جاء رجل يسأل أو طالب حاجة أقبل علينا بوجهه فقال: اشفعوا فلتوجروا وليقض الله على لسان نبيه ماشاء (بخاری ۲۰۸۹۰ کتاب الادب، باب تعاون المومنين بعضهم بعضاً) (جب کوئی حاجت مند یا سائل آتا تو رسول اللہ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوتے اور ارشاد فرماتے: تم لوگ سفارش کرو اور دیئے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہے گا فیصلہ کر دے گا)۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ فیصلہ شفاعت پر موقوف نہیں ہے، ہاں اجرت کا استحقاق ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ اس قربت میں بخل سے کام نہ لو، جہاں تک فیصلہ کا تعلق ہے تو وہ قوت دلیل کی بنا پر ہوگا، حضرت بریرہ و حضرت مغیث رضی اللہ عنہما کا واقعہ بھی شاہد عدل ہے کہ مشورہ کو قبول کرنا سربراہ کیا عام انسان کے لئے

ط استاذ حدیث و فقہ مدرسہ حسینہ کالم کمرالہ۔

بھی ضروری نہیں ہے۔ حضرت بریرہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قانونی حکم نہیں دیا تھا بلکہ مشورہ کے طور پر ہی فرمایا تھا کہ رجوع کر لو، لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو قبول نہیں کرتی۔

ظاہر ہے کہ جمہوری الیکشن کی روح، شفاعت کے اس مسلمہ ضابطہ کے بالکل خلاف ہے، اس لئے اس کو شفاعت کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔

۳۔ تیسری رائے یہ ہے کہ ہر ووٹر اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، کیونکہ ہر شخص کی رسائی پارلیمنٹ یا اسمبلی تک ہونا مشکل بھی ہے اور انتظامی لحاظ سے دشوار گزار عمل بھی، لہذا ہر حلقہ کے افراد اپنا اپنا نمائندہ بنا کر ایوان تک روانہ کرتے ہیں تاکہ ملک کا نقشہ اور اس کا انتظام ہر ووٹر کے منشاء کے مطابق کیا جائے اور اس طرح ملک کی ترقی و پستی میں ہر فرد برابر کا سہم و شریک ہو۔ رافٹ کا خیال ہے کہ یہ نظریہ زیادہ صحیح ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر کنڈیڈیٹ کو نمائندہ ہی کہا جاتا ہے، المعروف قاض کے اصول پر یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ووٹ دینا اپنا نمائندہ چننا ہے اور وکیل بنانا ہے۔

ووٹ دینے کا حکم:

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ووٹ دینا محض توکیل ہے اور نمائندہ بنانا ہے، نیز توکیل کا عمل صرف جائز ہوتا ہے، اس لئے عام حالات میں ووٹ دینا جائز ہوگا۔ لیکن ووٹ سے چونکہ ایوان اقتدار تک پہنچنے کا فیصلہ ہوتا ہے جو بعض اوقات حق رائے دہی سے گریز کے نتیجے میں ایسے شخص کے لئے میدان ہموار ہوتا ہے جو بالکل موزوں نہیں ہوتا بلکہ قوم و ملت کے لئے نقصان دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔ اگر صورت حال ایسی ہی ہو تو ہر مسلم ووٹر کے لئے اپنا حق استعمال کرنا واجب ہوگا تاکہ ضرر کو دور کیا جاسکے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے وجوہ سببہ کے ثبوت و جواز کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک وجہ پر سب کو جمع کر دیا گیا۔ "الضرر یزال" فقہ کا بہت اہم دفعہ ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ضرر عام سے بچنے کے لئے ضرر خاص کو برداشت کر لیا جائے۔ یہاں تو ووٹ دینے میں ضرر خاص بھی نہیں ہے، ہاں ایک ضرر کو دور کرنا ہے، لہذا بطریق اولیٰ ایسے حالات میں ووٹ ڈالنا واجب ہوگا۔ لیکن دونوں ہی امیدوار مساوی ظلم و جور سے متصف ہوں، قوم و ملت کو کچھ زیادہ فائدہ یا کچھ زیادہ نقصان سے دوچار نہ ہونا پڑتا ہو تو ایسے وقت میں اگر کوئی شخص اپنے حق کو استعمال نہ کرے تو کوئی ملامت بھی نہیں ہوگی ان شاء اللہ۔

الیکشن میں اپنے آپ کو امیدوار بنانا:

حکمرانی حق نہیں بلکہ امانت یا ذمہ داری ہے، اگر حق ہوتا تو اس میں دوڑ دھوپ کو سراہا جاسکتا تھا، لیکن ذمہ داری یا امانت کا مقضا تو یہی ہے کہ طلب کرنا خیر و برکت کو کھودیتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بڑی ہی وضاحت کے ساتھ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کو خطاب کر کے فرمایا: "لا تسأل الإمارة فإن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها الخ (بخاری: ۲۰۱۰۵۸ کتاب الاحکام، باب: من سأل الإمارة وكل إليها) (امارت کے طالب مت رہو، اس لئے کہ اگر سوال کے بعد امارت حاصل ہوگی تو تجھ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے گا، اور اگر بے غیر طلب حاصل ہوگی تو امانت شامل حال ہوگی)۔

لیکن ایسی بعض استثنائی صورت بھی ہے جس میں طلب منصب کو نظر استحسان دیکھا گیا۔ خاص طور پر جبکہ یقین ہو کہ اس ذمہ داری کو نبھانے کا اس سے زیادہ کوئی اور اہل نہیں، اگر کوئی اور اس منصب تک پہنچ گیا تو ظلم و عدوان سے کام لے گا تو ایسے موقع پر شرعاً اجازت ہوگی کہ اپنا نام بطور امیدوار پیش کرے۔ حضرت یوسف علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بادشاہ مصر سے کہا تھا: "اجعلنی علی خزائن الأرض" (مجھے وزیر مالیات بنا دیں)، لہذا ایسی استثنائی صورت میں امیدوار بننا صحیح ہوگا، علامہ شامی طلب قضاء پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: أما إذا تعین بأن لم یکن أحد غیره یصلح للقضاء وجب علیہ الطلب صيانة لحقوق المسلمین و دفعاً لظلم الظالمین ولم أر حکم ما إذا تعین ولم یول إلا بمال هل یحل بذله ویبغی أن یحل بذله للمال كما حل طلبه (رد المحتار: ۸۰۴۰ کتاب القضاء مطلب طریق التنقل عن المجتهد) (بہر حال جب عہدہ تقاضا متعین ہو جائے بایں طور کہ قضاء کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور نہ ہو تو مطالبہ کرنا واجب ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ظالموں کے ظلم کو دفع کرنے کے لئے، میں نے اس صورت کا حکم کہیں نہیں دیکھا جبکہ متعین ہو اور مال کے بغیر یہ عہدہ حاصل نہ ہو سکے تو کیا مال خرچ کرنا جائز ہے؟ جس طرح طلب کرنا جائز ہے۔ مال خرچ کرنا بھی جائز ہونا چاہیے)۔

شامی اختیار کے حوالہ سے لکھتے ہیں: لکن صرح فی الاختیار بأن من تعین له لافتراض علیہ ولو امتنع لا یجبر علیہ

(شامی: ۸، ۲۱: کتاب القضاء مطلب طریق التنقل عن المجتہد) (لیکن اختیار میں تصریح ہے کہ جو شخص قضاء کے لئے متعین ہو جائے اس کے لئے فرض ہو جاتا ہے، لیکن اگر نہ کرے تو جبر نہیں کیا جائے گا)۔

کسی بھی پارٹی کا ممبر بننا: آج کی ہر پارٹی زمانہ جاہلیت کی خاندانی و قبائلی عصبیت کی بنیاد پر بننے جتنے کا نمونہ ہے، جس میں حق خاندانی اور عہد مخالف کو ہر صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا، اسلام نے اس پر ضرب کاری لگاتے ہوئے اعلان کیا: لا حلف فی الاسلام (بخاری: ۲۰، ۸۹۸: کتاب الادب، باب الإخاء والحلف) اسلام میں جاہلی حلف کی گنجائش نہیں:

آج کی ہر پارٹی پر ہائی کمان کا حکم مسلط رہتا ہے، کسی کو اس کے خلاف خواہ ظلم و جور ہی کا ارتکاب کیوں نہ کرنا پڑے، کرنے کا حق نہیں، اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ جمہوری پارٹی میں شرکت کی اجازت ہی نہ ہو، لیکن بالکل کفارہ کئی بھی بہت سے طوفان کو دعوت دے گی بلکہ بسا اوقات اچھے افراد نہ ہونے سے اور بھی اعلیٰ کمان کو سن مانی کرنے کا موقع ملتا ہے، لہذا کسی میں اتنی طاقت ہو کہ پارٹی میں شامل ہو کر حق کی آواز کو بلند کرے گا، ناحق کی صدا کو دبائے گا تو کچھ بعد نہیں کہ ایسا شخص اگر پارٹی میں شامل رہا تو قوم کو فائدہ پہنچے گا، یا کم از کم نقصان سے بچایا جاسکے گا، تو اس طرح پارٹی میں شمولیت کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ اہل سنتین کے اصول پر ایسی پارٹی میں شمولیت اختیار نہ کرے جو مسلم دشمنی ہی کا مزاج رکھتی ہو، ظلم و بربریت ہی اس کا طرہ امتیاز ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اوفوا بحلف الجاہلیۃ فإنہ لایزیدہ یعنی الإسلام الا شدۃ ولا تحدثوا حلفاً فی الإسلام (ترمذی: ۱، ۲۸۵: کتاب السیر، باب ماجاء فی الحلف حدیث حسن صحیح) (جاہلیت کے معاہدہ کو پورا کرو، کیونکہ اسلام مزید کجی کو پیدا کرتا ہے اور اسلام میں زمانہ جاہلیت والا معاہدہ شروع مت کرو)۔ اس میں وہی معاونت اور حلف مراد ہے جو حق کی بنیاد پر ہو، اس کا تقاضا بھی ہے کہ پارٹی میں شمولیت تو جائز ہے لیکن پارٹی کی ہر آواز پر لیک کہنا اور آنکھ بند کر کے حمایت کرنا جائز نہیں۔

رکن منتخب ہونے پر حلف برداری:

جہاں دستور میں بہت سے دفعات خلاف شریعت ہوتے ہیں، اکثر وہ دفعات بھی ہوتے ہیں جو شریعت کی روح و مزاج سے ہم آہنگ ہوں، اب ایک ممبر بڑی ہی جدوجہد کے بعد ایوان تک پہنچا ہے، جو عام مسلمانوں کی ضرورت نہ تھی حاجت کے درجے میں یقیناً ہے۔ والحاجۃ تنزل منزلة الضرورة (اشباہ القاعدة السادسة: ۱۳) نیز الضرورات تبیح المحظورات (الاشباہ: ۱۰، النوع الاول من القواعد الكلية) سے ہدایت مل رہی ہے کہ ایسے شخص کے لئے حلف برداری جائز ہے، ہاں نیت ان دفعات کی کرے جو کہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ نیت کا اعتبار تو فقہاء نے دیا تھا کیا ہی ہے۔

نية تخصيص العام تصح ديانة إجماعاً، فلو قال: كل امرأة أتزوجها فهي طالق ثم قال: نويت من بلد كذا لا يصدق قضاء (درمختار: ۵، ۵۸۳: کتاب الايمان مطلب نية تخصيص العام تصح ديانة لا قضاء)۔

(عام میں تخصیص کی نیت فی ما بینہ و بین اللہ صحیح ہے پس اگر کہا: "کل امرأة أتزوجها فهي طالق" پھر اس نے کہا کہ میں نے فلاں شہر کی عورت کا قصد کیا تھا تو قضاء قصد بق نہیں ہوگی)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ظاہرہ أنه یرصدق ديانة اس کا ظاہر یہ ہے کہ دیناً تصدیق کی جائے گی۔ علامہ خصاف کی رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ قضاء بھی اس کی نیت معتبر ہوگی۔ یہ اس وقت جبکہ عام مذکور ہو اگر عام مذکور نہیں تو بھی خصاف کے نزدیک دیناً معتبر ہے۔ علامہ شامی رقم طراز ہیں: والحاصل أن نية تخصيص العام تصح في ظاهر الرواية ديانة فقط، وعند الخصاف تصح قضاء ايضاً وهذا إذا كان العام مذكوراً وإلا فلا تصح نية تخصيصه أصلاً في ظاهر الرواية وقيل: يدين... فصار حاصل ما اختاره الخصاف في المذكور أنه يصدق ديانة وقضاء وفي غيره ديانة فقط (ردالمحتار: ۵، ۵۸۵: کتاب الايمان مطلب نية تخصيص العام الخ)۔

(خلاصہ یہ ہے کہ عام کی تخصیص کی نیت ظاہر الروایۃ میں صرف دیناً صحیح ہے، علامہ خصاف کے نزدیک قضاء بھی صحیح ہے اور یہ اس وقت ہے جبکہ عام عبارت میں مذکور ہو، ورنہ تخصیص کی نیت ظاہر الروایۃ میں بالکل صحیح نہیں، اور کہا گیا ہے کہ دیناً صحیح ہے، پس خصاف کے اختیار کردہ مسلک کا خلاصہ یہ ہوا کہ عام مذکور میں دیناً و قضاء دونوں طرح معتبر ہے اور مذکور نہ ہونے کی صورت میں صرف دیناً معتبر ہے)۔

ظالم کے ظلم کے خوف کے وقت تو حاکمی و شامی دونوں کی رائے ہے کہ مفتی بقول خصاف ہی کا ہونا چاہیے۔

یہ اختلاف بھی اس وقت ہے جبکہ اس کی یمن سے حق العبد متعلق ہو رہا ہو، اگر حق العبد متعلق نہیں بلکہ اللہ کی قسم کھائی جو صرف کفارہ یا گناہ کی مقتضی ہے تو وہاں قضاء کی ضرورت ہی نہیں بلکہ مسئلہ صرف دیانت کا ہے ایسے وقت میں ضرورت کی وجہ سے حلف کرنے میں عند اللہ بھی مانو نہیں ہوگا ان شاء اللہ، علامہ شامی لکھتے ہیں: وأما الحلف باللہ تعالیٰ فليس للقضاء فيه دخل، لأن الكفارة حقه تعالیٰ لاحق فيها للعبد حتى يرفع الحالف إلى القاضي كما في البحر، لكنه إن كان مظلوماً تعتبر نيته فلا يآثم لأنه غير ظالم وقد نوى ما يحملة لفظه فلم يكن غموساً لا لفظاً ولا معنى (شامی: ۵۰۸۴، کتاب الایمان مطلب نیتہ تخصیص العام)۔

(بہر حال اللہ تعالیٰ کی قسم تو قضاء کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے کہ کفارہ اللہ کا حق ہے اس میں بندے کا حق نہیں کہ معاملہ قاضی تک لے جایا جائے (بحر)، لیکن اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی نیت معتبر ہوگی پس گنہگار نہ ہوگا، اس لئے کہ ظالم نہیں ہے، اور اس نے ایسی شئی کی نیت کی ہے لفظ جس کا احتمال رکھتا ہے، لہذا غموس بھی نہیں ہوگا نہ لفظاً نہ معنی)۔

بائبل پر حلف:

قسم کا مدار لفظ پر اور مخلوف بہ میں عرف پر ہے، صرف ہاتھ رکھ دینے سے قسم کا تحقق نہیں ہوتا ہے، لیکن حلف برداری میں خواہ حقیقتہ قسم نہ ہو لیکن صورت قسم کی ہوتی ہے، کیونکہ غیر اللہ کے نام پر حلف برداری کی صورت میں غیر اللہ کی تعظیم مستزہم ہوتی ہے جو کہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ قسم اللہ اور اس کے صفات کی کھائی جاتی ہے۔ غیر اللہ خواہ نبی ہی کیوں نہ ہو قسم کھانا جائز نہیں بلکہ اندیشہ کفر بھی پایا جاتا ہے۔

لا ینعقد القسم بخیرہ تعالیٰ ای غیر اسمائہ وصفاتہ ولو بطریق کنایۃ بل یحرم کما فی القہستانی بل یخاف منہ الکفر فی نحو حیاتی و حیاتیات (شامی: ۵۰۸۳، کتاب الایمان)۔

(قسم غیر اللہ کی منعقد نہیں ہوتی ہے، یعنی اللہ کے اسماء و صفات کے علاوہ کی اگرچہ کنایہ کے طور پر ہو، بلکہ حرام ہے جیسا کہ قہستانی میں ہے، بلکہ ”حیاتی و حیاتیات“ جیسے جملہ میں تو کفر کا اندیشہ ہے)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: أحدهما اليمين بالآباء والأبناء والملائكة والصوم والصلاة وسائر الشرائع والكعبة والحرم وزمزم ونحو ذلك، ولا يجوز الحلف بشئ من ذلك (ہندیہ: ۲۰۵۱، کتاب الایمان، الباب الاول) (ایک یہ ہے کہ یمن، آباء، انبیاء، ملائکہ، صوم و دیگر اشیاء کعبہ، حرم اور زمزم وغیرہ کی ہو تو اس میں سے کچھ بھی جائز نہیں ہے)۔

لہذا بائبل پر حلف برداری جائز نہیں ہوگی، اس میں جہاں یمن کی مطلوبہ شرط کا فقدان ہے، اہل کتاب کے ساتھ تشبیہ بھی ہے جس کی وجہ سے ناجائز ہی ہونا چاہیے۔

البتہ اگر انصاف دلانا اسی پر موقوف ہو تو بادل خواستہ اگر بائبل پر ہاتھ رکھ لے تو گنجائش ہونی چاہیے، لیکن یہ بات کہ انصاف دلانا ان حالات میں اسی پر موقوف ہے۔ مقامی علماء و دانشوران سے معلوم کر کے فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

نیز اس صورت میں بھی اولاً یہی کوشش ہو کہ کسی طرح عدالت سے اجازت لے لیں کہ وہ قرآن پہ ہاتھ رکھے گا اگر عزم مصمم ہو تو کچھ بعید نہیں کہ اجازت مل جائے شرط دل سوزی ہے محض ہوس اقتدار نہ ہو، لیکن اپنی پوری کوشش کر لینے کے بعد بھی اجازت نہیں مل سکی تو مکروہ و مجبور کے درجے میں رکھتے ہوئے اجازت ہونی چاہیے بعد میں توبہ و استغفار بھی کرتا رہے۔

سیکولر پارٹی میں شرکت:

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں ہر شخص کو اپنی پارٹی بنانے کا دستوری حق ہے جس کے لئے منشور، واغراض و مقاصد سیکولر ضابطے کے دائرہ میں وضع کئے جاسکتے ہیں، بلکہ بعض منشور تو عین ایکشن کے وقت بھی جاری کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آزادی سے لے کر آج تک کیڑے مکوڑوں کی تعداد میں پارٹی وجود میں آئی، بعض اس میں نسبتاً سیکولر ذہن و کردار کے حامل بھی ہیں، لیکن کچھ مسلم دشمن اور کٹر مخالف اسلام بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنی بیزاری کا اظہار گفتار

و کردار سے کرتی رہتی ہے۔ جب مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے کا حق ہے تو اس کے عوام اور باشندہ ہونے کے ناطے ملک کے دستوری عمل اور حکومت سازی میں بھی حصہ لینے کا پورا حق ہے، بلکہ عالمی قانون یا مذہبی آزادی میں رخنہ ڈالنے والوں کے خلاف کھل کر سامنے آنے کا بھی حق قانوناً اور عملاً ہے تو اب ایسے موقع پر مسلمانوں کو اہون البلیتین پر عمل کرنا چاہئے اور ایسی پارٹی میں شرکت کی اجازت ہونی چاہیے جو نسبتاً سیکولر اور مسلمانوں کے مفاد میں کام کرنے والی ہو، بلکہ اس کی طرف سے ایکشن لڑنا، اس پارٹی میں شامل ہو کر اس کو تقویت پہنچانا بھی جائز ہوگا، اس سلسلے میں بڑی ہدایت ہندو پاک تقسیم سے قبل لیگ و کانگریس میں شمولیت پر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی ایک تقریر سے ملتی ہے۔ حضرت کارجمان لیگ کی طرف تھوڑی تاخیر سے ہو اس پر انہوں نے فقہی لحاظ سے ایک لطیف استدلال کیا کہ خوارج جن کی بابت احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف ارشادات موجود ہیں: *مارقون من الدین کما یمرق السهم من الرمية* (وہ خوارج) دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کا جسم چھید کر صاف نکل جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: *لئن أدرکتہم لأقتلنہم قتل عاد و ثمود* (اگر میں نے ان کو پایا تو عاد و ثمود کی طرح استیصال کروں گا)، نیز فرمایا: *ہم شر الخلق* (وہ بدترین مخلوق ہیں)۔ مسلمانوں کے تیس ان کے نظریات ہیں: *یستحلون دماء المسلمین وأموالہم ویکفرون الصحابة* (خوارج مسلمانوں کے خون اور ان کے اموال کو حلال سمجھتے ہیں اور صحابہ کو کافر کہتے ہیں)، لیکن ان سب نصوص کے باوجود امام محمد رحمہ اللہ السیر الکبیر میں رقم طراز ہیں کہ ان کا مقابلہ اگر بت پرستوں سے ہو جائے تو ساتھ خوارج کا دینا چاہئے، کیوں کہ کلمہ گو ہونے کے اعتبار سے اہون البلیتین ہیں۔ حضرت کے الفاظ بعینہ نقل ہے:

”راقم الحروف خود ایک مدت دراز تک اسی شش و پنج میں رہا اور یہی وجہ ہے کہ خاصی تاخیر سے میں نے لیگ کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ میں نے اپنی قدرت کی حد تک مسئلہ کی نوعیت پر قرآن و سنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں غور و فکر کیا، اللہ سے دعا میں کہیں اور استخارے کئے بالآخر ایک چیز میرے اطمینان اور شرح صدر کا سبب بنی اور وہ حضرت امام محمد بن حسن شیبانی (تلمیذ امام اعظم ابوحنیفہ) رحمہ اللہ علیہ کی ایک تصریح ہے جو ان کی کتاب السیر الکبیر میں موجود ہے اور آپ جانتے ہوں گے کہ فقہ حنفی کا سارا مدار انہیں امام محمد کی تصنیفات پر ہے۔“

پھر خوارج کی تفصیل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں: اب خیال فرمائیے کہ ایسے فرقے سے کس طرح تعلقات رکھنا، ان کی مدد کر کے ان کی شوکت بڑھانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے، ان تمام امور کے باوجود حضرت امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر ان خوارج کی جنگ مشرکین بت پرستوں کے ساتھ ہو جائے تو اہل حق مسلمانوں کو کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کفار و مشرکین کے مقابلہ میں ان کی مدد کریں، کیونکہ وہ اس وقت کفر کے فتنہ کو فروغ کرنے اور نقش اسلام کو ظاہر کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ غور کیجئے کہ خوارج کی یہ امداد کیا ان کی تقویت کا سبب نہ بنے گی (تجلیات عثمانی، ۳۶۰-۳۶۱ مؤلف پروفیسر انوار الحسن انوشیر کوٹی، مطبوعہ: ادارہ نشر المعارف چمک مانان شہر ۱۹۵۷ء)۔

مسلم مخالف پارٹی میں شمولیت:

قرآن کریم کی آیت: *إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ كَأَسْبَابِ زُلُومٍ* بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عباس ارشاد فرماتے ہیں:

*إِنَّ أَنَسًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ كَانُوا مَعَ الْمُشْرِكِينَ يَكْفُرُونَ سَوَادَ الْمُشْرِكِينَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَيَأْتِي السَّهْمَ فَيُرِيهِمْ فَيَضْرِبُهُمْ فَيَقْتُلُهُمْ فَأَنْزَلَ اللَّهُ: إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ* (بخاری ۲۰۱۰۲۹ کتاب الفتن، باب من کرہ ان یکفیر سواد الفتن والظلم) (غزوہ بدر میں) کچھ مسلمان مشرکوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل تکشیر سواد کر رہے تھے، تو تیر آتا اور ان میں سے کسی کو لگتا اور قتل کر دیتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی)۔

اسی حدیث سے استنباط کر کے حضرت عکرمہ نے ابوالاسود کو فوج میں شرکت سے منع کر دیا وہ فوج مدینہ پر چڑھائی کے لئے جا رہی تھی۔

حافظ ابن حجر نے مسند ابویعلیٰ سے اسی معنی کی ایک اور مرفوع روایت نقل کی ہے جس کے راوی حضرت ابن مسعود ہیں: من کفر سواد قوم فہو منهم، ومن رضی عمل قوم کان شریک من عمل بہ (فتن الباری: ۱۳، ۴۳ کتاب الفتن، باب من کرہ ان یکفیر سواد الفتن الخ: ۱۰۸۵) (جس نے کسی قوم کی تعداد کو بڑھایا تو وہ انہی میں سے ہے اور جو کسی قوم کے عمل سے راضی ہے تو وہ عامل کے ساتھ شرکت کرنے والا ہے)۔

علامہ عینی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کان غرض عکرمہ من نھیہ أبا الأسود أن اللہ ذمہم بتکفیر سوادہم

مع انہم کانوا لایریدون بقلوبہم موافقتہم (عمدة القاری: ۹۱۸۸، کتاب التفسیر، باب ان الذین توافہم الملائکۃ الخ) (حضرت عکرمہ کا مقصود ابوالاسود کو روکنے سے یہ تھا کہ اللہ نے ان کی تکثیر سواد کی مذمت کی ہے۔ حالانکہ اپنے دل سے وہ ان کی موافقت کرنا نہیں چاہتے تھے)۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: وفيه تخطیة من یقیم بین اهل المعصیة باختیارہ لالقصہ صحیح من انکار علیہم مثلاً اور جاء إنقاذ مسلم من ہلکة۔ كما وقع للذین کانوا أسلموا... ثم کانوا یخرجون مع المشرکین لالقصہ قتال المسلمین بل لایہام کثرہم فی عیون المسلمین فحصلت لہم المؤاخذة بذلک (فتح الباری: ۲۷۱۳، کتاب الفتن، حدیث: ۲۰۸۵) (اس میں ان حضرات کو خطا کا بتانا ہے جو اہل معصیت کے مابین اپنی خوشی سے رہتے ہیں، کوئی صحیح مقصد نہیں ہوتا، مثلاً ان پر تکبیر کرنا یا کسی مسلمان کو ہلاکت سے بچانا، جیسا کہ ان مسلمانوں کو ہوا جو مشرکوں کے ساتھ قتال کی نیت سے نہیں بلکہ انکی کثرت مسلمانوں کی نگاہ میں زیادہ کرنے کی نیت سے نکلے۔ لہذا اس کی وجہ کران سے مواخذہ ہوا)۔

امام بخاری کا ترجمہ الباب اس بات کی طرف مشیر ہے کہ جو حکم کافروں کے ساتھ شرکت کا ہے، وہی حکم ظالموں کے ساتھ شرکت کا ہے، معلوم ہوا کہ تکثیر سواد، بذات خود ممنوع ہے الایہ کہ کوئی اس جذبہ سے ان کے مابین اپنائے تاکہ ان کی اصلاح کی جاسکے۔ یا مسلمانوں کو ان کے ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھا جاسکے۔ ظاہر بات ہے کہ زبان سے دعویٰ کرنا آسان ہے، عملی جامہ پہنانا مشکل ہے، پس فالعبرة للغالب اعتبار اکثریت وغالبیت کا ہے، اس لئے ایسی پارٹی میں شمولیت جائز نہیں۔

البتہ کوئی اپنے اندر اتنی قوت اور زور رکھتا ہے جو واقعتاً کچھ نہ کچھ مسلمانوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نقصان کا خطرہ نہیں ہے تو نیک نیتی سے شرکت کی گنجائش نکلے گی لیکن ایسی نیک نیتی کا تحقق شاذ و نادر ہے۔

اس لئے کہ اس میں تعاون علی المعصیت ہے اور وہ تعاون علی المعصیت جو بالقصد خواہ صریحاً ہو یا حکماً (جس کی تفصیل راہ پور مینار میں آچکی ہے) ممنوع و حرام ہے (احکام القرآن: ۳۷۷، مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ، انکلام فی الاعانة علی المعصیة)۔

بالقصد میں اس معصیت کی نیت کرنا اور حکماً میں بوقت شمولیت ظلم و زیادتی کا عہد و پیمان کرنا یا پھر اس کی شمولیت ہی ظلم و زیادتی کا عنوان بن جائے داخل ہے، نہ کہ ہر قسم کا تعاون۔

لیکن ان سب کے باوجود صرف شمولیت کی اجازت ہوگی، اس کی ورکری و پرچار کر کے تقویت پہنچانے کی اجازت نہیں ہوگی کہ یہ تعاون حکماً میں شمار ہوگا۔

### علاحدہ سیاسی جماعت کا قیام:

ہندوستان کے سیکولر ماحول میں قبل ازیں بھی مسلم سیاسی جماعت کا وجود ہوا لیکن نتیجہ کیا رہا۔ بدنامی و ناکامی کیونکہ مسلمان و اسلام کے نام پر بننے والی جماعت و پارٹی ذہنی طور پر اکثری فرقہ کو شتمیل کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دائرہ سمٹتا جاتا ہے، اور انجام کار نام و نشان تک باقی نہیں رہ پاتا، اس لئے ایسے ماحول میں کسی مسلم سیاسی جماعت کی تشکیل مناسب نہیں، ویسے اس سلسلے میں مسلم دانشوران و تجزیہ کرنے والوں سے مشورہ کرنا چاہیے، البتہ ایسا کیوں نہ ہو کہ مسلم سیاست دان اور باخبر دانشوران سامنے آئیں اور وہ اسلام کے نام پر نہیں بلکہ سیکولر نام پر ایسی پارٹی کی تشکیل دیں جس میں بالادستی مسلمانوں کی ہو شرکت کی اجازت سب کو، ذہنی و اصول و ضوابط ایسے مرتب ہوں جو سب کے لئے قابل قبول ہوں، ملک و وطن کا مفاد ہی بنیاد ہو، لیکن اس میں بھی ماحول کی سازگاری اور تجزیہ کاروں کے مشورہ ہی پر انحصار کرنا چاہئے۔

### ایکشن میں عورت کی حصہ داری:

ایکشن میں عورتوں کی شرکت و ذمہ داری کی ہے: (۱) بحیثیت ووٹر (۲) بحیثیت امیدوار، ووٹر کی حیثیت میں اگر حدود و شرعیہ کی رعایت کی جائے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ حق رائے دہی ہے اور اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا حق جس طرح مردوں کو ہے عورتوں کو بھی ہے کہ اپنا نمائندہ بنائے، خاص طور پر ہندوستانی ماحول میں جہاں ایک ایک ووٹ پر ملک کی قسمت معلق ہے۔

البتہ امیدوار بننا اور دنیا کی جہاں بانی کے لئے کمر کس لینا نہ یہ کہ بہت سے مفاسد و فتنوں کا سرچشمہ ہے، تخلیقی فطرت کی خلاف ورزی بھی ہے۔ حاکمیت



وسرداری تو مردوں کا حصہ ہے، قرآن نے کتنے کھلے لفظوں میں تشبیہ کیا ہے: "الرجال قوامون على النساء" عقل و خرد ہو یا قوت و طاقت سب میں تو عورتیں ناقص ہی قرار دی گئی ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے عقل کی پختگی مان لی جائے حالانکہ وہ عقل کی پختگی نہیں بلکہ تجربہ کی کثرت ہے تو بھی سربراہی ولیڈری جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے صنف نازک کو شرعی طور پر اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ جگہ جگہ اختلاط بلکہ مصافحہ و خلوت تک کی نوبت پہنچ چکی ہے، بے پردگی کو تو روکے بھی نہیں روک سکتے یہ سب چیزیں آئے دن مشاہدہ کی ہے علامہ شامی امامت کبریٰ کے شرائط کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ويشترط كونه مسلماً حراً ذكراً عاقلاً بالغاً قادراً قَرشياً، ولأن نساء أمرن بالقرار في البيوت فكان مبنی حالهن على الستر وإليه أشار النبي ﷺ حيث قال: كيف يفلح قوم تملكهم امرأة (شامی: ۲۰۲۸۰ کتاب الصلوٰۃ باب الإمام مطلب شروط الإمامة)۔

(سربراہ ہونے کے لئے شرط ہے کہ مسلمان آزاد، مرد، عاقل، بالغ، قادر اور قریشی ہو) مرد ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ عورتوں کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے، لہذا ان کے مناسب حال ستر ہے، اسی کی طرف رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مشیر ہے: کس طرح ایسی قوم فلاح پا سکتی ہے جس کا مالک ایک عورت ہو۔ حدیث کا ارشاد اس قصے سے متعلق ہے جبکہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حاکم بنایا تھا (بخاری شریف: ۲۰۲۷، ۲۰۲۸ کتاب الغازی باب کتاب النبی ﷺ)۔

ہوا بھی کچھ ایسا ہی، ہرمیدان میں فارس شکست کھا تا گیا، ایک تونبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدعا دوسرے عورت کی سربراہی کی خطا نے فارس کو بالخصوص 'بویت' مقام پر چور چور کر دیا، بالآخر اس عورت کو معزول کر کے بڑی مشکل سے اکیس سالہ نوجوان یزدجرد کو لایا گیا اور حکومت کی باگ ڈور حوالہ کی گئی۔ تاریخ کہتی ہے کہ فارس کو سنبھلنے کا موقع ملا، کمزوری پھر قوت میں تبدیل ہونے لگی، مملکت کا نظام مستحکم ہو گیا لیکن نبوی بدعا کے اثر سے دور عثمانی میں تباہ و برباد ہو گیا (الہدایہ والنہایہ ۳۰۷)۔

اس کے علاوہ خیر القرون سے کوئی مثال بھی تو نہیں پیش کی جاسکتی کہ کسی خاتون نے حاکمیت کا دعویٰ کیا ہو، یا اس کی حکومت و قیادت کے لئے کسی نے ادنیٰ کوشش بھی کی ہو، زیادہ سے زیادہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جنگ جمل کی حصہ داری سے دھوکہ ہو سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کبھی بھی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کی ساری کارروائی کے پیش نظر صرف اور صرف مطالبہ قصاص کی تقویت تھی، پھر صحابہ کرام نے اور خود دوسری ازواج مطہرات نے تو اس اقدام کو بھی پسند نہیں کیا، ابن عمر رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ نے خطوط لکھے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا خط تو بہت ہی دل سوزی پر مشتمل ہے۔ ان سب کو پڑھ کر حضرت عائشہؓ کی کیفیت ہوئی، علامہ ذہبی لکھتے ہیں: ولاریب أن عائشہ ندمت ندامة كلية على مسيرها إلى البصرة وحضورها يوم الجمل، وما ظنت أن الأمر يبلغ ما بلغ (سير اعلام النبلاء: ۲۰۱۷۷) (اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہؓ اپنے بصرہ کے سفر اور جنگ جمل میں شرکت پر بہت نادم ہوئیں، ان کا خیال یہ نہیں تھا کہ معاملہ وہاں تک پہنچ جائے گا جہاں تک پہنچا)۔ اس پر اتنا روتی تھیں کہ اوڑھنی آنسو سے تر ہو جاتی تھی۔

یہاں پر حضرت بلقیس کا قصہ چھیڑنا بالکل نامناسب ہے، کیونکہ ان کی سیادت کا زمانہ حالت شرک کا زمانہ ہے۔ نیز قصہ سابقہ شریعت کا ہے اس لیے استدلال صحیح نہیں ہوگا۔

اب اتنی شدید وعید کے ہوتے ہوئے عورتوں کی سربراہی کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے، اور ان کو لیڈر چننا، پنچایت کا ممبر، بکھیا، سرپنچ یا چیئر مین منتخب کرنا یا اس کے لئے کوشش کرنا سراسر غلط ہوگا۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل اور ان کا حل

مولانا غلام رسول منظور القاسمی ع

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

ماضی قریب کے فقہائے امت میں سے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اور ہم عصر فقہائے کرام میں سے شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی نے کسی امیدوار کو ایکشن میں ووٹ دینے کی از روئے قرآن و سنت تین حیثیتیں بیان کی ہیں:

۱۔ شہادت دگواہی: ووٹ دینے کی پہلی حیثیت شہادت و گواہی کی ہے کہ ووٹ دینے والا جس امیدوار کو اپنا قیمتی ووٹ دے رہا ہے گویا وہ اس کے بابت اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص میرے علم و دانش کے مطابق قوم و ملت اور ملک کے لیے خیر خواہ ہے اور یہ شخص صفت امانت و دیانت کے ساتھ متصف ہے، میرے نزدیک یہ شخص راست باز، پاک باز، حق گو اور صفت صداقت و حقانیت کے ساتھ متصف ہے اور اس کے لیے نہایت موزوں اور مناسب شخص ہے۔

۲۔ شفاعت و سفارش: شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی دوسری حیثیت شفاعت و سفارش کی ہے، گویا ووٹس امیدوار کے بارے میں اپنے ووٹ اس کے حق میں ڈال کر اس کے بارے میں شفاعت و سفارش کرتا ہے کہ یہ شخص ملک و قوم کے لیے خیر خواہ ہے اور وقت ضرورت قوم و وطن کی خدمت کے لیے اپنے تن من و دھن کی بازی لگایا کرے گا، لہذا اس کو اس خدمت کے لیے چانس دیا جائے اور میں اس کے حق میں سفارش کرتا ہوں، اس شفاعت و سفارش کے بارے میں ہر ووٹ ڈالنے والے کو اپنے ووٹ ڈالنے سے پہلے قرآن مجید کا یہ پاک فرمان عالیشان پیش نظر رہنا چاہیے، اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا (القرآن)، یعنی جو شخص نیکی اور اچھی چیز کے بارے میں شفاعت کرتا ہے تو اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور کوئی بری چیز کے بارے میں شفاعت کرتا ہے تو اس کی برائی میں سے بھی اس کا حصہ ہے، لہذا ووٹ ڈالنے سے قبل خوب غور و خوض کر لے جس امیدوار کے حق میں اپنا ووٹ ڈال رہا ہے آیا وہ امانت دار اور دیانت دار ہے بھی یا نہیں، اپنے رعایا اور ماتحتوں کے حقوق کو صحیح طور پر ادا کرے گا یا نہیں؟ اس ووٹ استعمال کرنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لیں ورنہ امیدوار کی کامیابی کے بعد اگر اس نے ظلم و ستم کا بازار گرم کیا، لوگوں کے حقوق تلف کیے تو اس جرم عظیم میں ووٹ بھی برابر کا شریک ہوگا، اس لیے نہایت عقل و دانش اور فہم و فراست سے کام لینے کی از حد ضرورت ہے۔

۳۔ وکالت: اگر دیکھا جائے تو ووٹ کی ایک شرعی اور اسلامی حیثیت وکالت کی بھی ہے۔ گویا ووٹس امیدوار کو اپنا وکیل اور نمائندہ منتخب کرتا ہے، لیکن یہ وکالت صرف اس کی شخصی حق کے ساتھ متعلق نہیں ہے اور اس کا نفع و نقصان صرف ووٹ کی ذات تک محدود نہیں رہتا ہے، بلکہ اس نفع و نقصان میں اس کے ساتھ ساتھ پوری قوم و ملت اور پورا ملک شریک ہے، اس لیے اگر کسی نا اہل اور نالائق، خائن، کذاب اور ظالم کو اپنا ووٹ دے کر نمائندہ بنایا تو پوری قوم کے حقوق تلفی کرنے کا اثم و گناہ ووٹ ڈالنے والے کی گردن پر بھی ہوگا، اس لیے اس میدان میں سوچ سمجھ کر حق ووٹ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

### بوقت ضرورت ووٹ دینا شرعاً واجب:

ماضی قریب اور حال کے اکثر فقہائے کرام نے چونکہ ووٹ کو شرعی نقطہ نظر سے ایک شہادت قرار دیا ہے کہ ووٹ ڈالنے والا شخص جس کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کر رہا ہے، گویا اس کے بارے میں شرعی اعتبار سے اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص ہر اعتبار سے موزوں اور منصب و عہدہ کے لائق و فائق ہے، امانت و دیانت کی صفت حسنہ سے متصف اور خدمت قوم و ملت کے جذبہ سے سرشار ہے، لہذا ووٹس جس کے بارے میں اپنے علم و فہم اور عقل و دانش کے اعتبار سے

طہ پھراوی، جامعہ کوثریہ کیرالا۔

اچھا سمجھے اور دوسروں کے مقابلے میں بہتر جائیں ان کے حق میں ووٹ دینا شرعی اعتبار سے لازم اور ضروری ہے، اس لیے کہ جس طرح جمہورٹی شہادت دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح بوقت حاجت و ضرورت شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبًا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ“ (البقرہ: ۲۸۳)۔

(اور نہ چھپاؤ تم گواہی کو اور جو کوئی چھپائے گا گواہی کو تو اس کا دل گنہگار ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو تم کرتے ہو)۔

قرآن وحدیث میں جس طرح سچی شہادت کو چھپانے کی حرمت کا بیان ہے، اسی طرح سچی شہادت ادا کرنے کی تاکید بھی متعدد مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أُولَىٰ بِهُمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا وَإِن تَلَوُوا أَوْ تَعْرَضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا“ (سورة النساء: ۱۲۵)۔

(اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ یا قرابت والوں کا، اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے، سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں اور اگر تم زبان ملو گے یا بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے) (ترجمہ شیخ الہند)۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ اس آیت کی تفسیر میں فوائد عثمانی میں لکھتے ہیں: یعنی گواہی سچی اور اللہ کے حکم کے موافق دینی چاہیے۔ اگرچہ اس میں تمہارا یا تمہارے کسی عزیز و قریب کا نقصان ہوتا ہو جو حق ہو اس کو صاف ظاہر کر دینا چاہیے۔ دنیوی نفع کے لیے آخرت کا نقصان نہ لو یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو، جو حق ہو سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح سے زیادہ واقف ہے اور اس کے یہاں کس چیز کی کمی ہے..... (تفسیر عثمانی صفحہ ۱۳۰)۔

**انتخابات میں بحیثیت نمائندہ از خود کھڑے ہونے کا حکم شرعی:**

رسول اکرم ﷺ نے از خود عہدہ و منصب طلب کرنے، اس کے واسطے سفارش کروانے اور اس کی خواہش کرنے سے منع فرمایا ہے۔ قرآن وسنت کا عام حکم یہی ہے کہ از خود کسی سرکاری عہدے اور منصب کو اپنے لیے طلب کرنا جائز نہیں ہے اور شریعت کی نظر میں ایسا شخص مطلوبہ عہدے کا اہل نہیں ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جواز خود اپنے لیے کسی خدمت و ذمہ داری اور عہدے کا طالب ہوتا اور آپ سے اس کا سوال اور درخواست کرتا تو آپ اس کو اس کام پر مقرر نہ فرماتے، کیونکہ کسی عہدہ و منصب کا طالب ہونا جب جاہ پر دلالت کرتا ہے جو آخر کار طالب کے حق میں خرابی کا باعث ہوتا ہے (مسلم کتاب الامارۃ باب انہی عن طلب الامارۃ والحرس علیہا ۱۲۰، رقم الحدیث، ۴۶۹۳)۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے کسی عہدے و منصب کی خواہش گزارا اور طلب گار ہوئے تو آپ نے ازراہ شفقت و محبت حضرت ابوذر غفاریؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ابوذر! تم کمزور اور ناتواں ہو اور یہ حکومت و سیادت خدا کی طرف سے ایک عظیم امانت ہے جس کے ساتھ بندوں کے حقوق متعلق ہیں، اس میں خیانت نہیں کرنی چاہیے اور یہ حکومت و سیادت اور قضا و امارت کل قیامت کے دن رسوائی و پشیمانی کا باعث ہوگی، اس لیے اے ابوذر! اس سے دور رہی رہو تو بہتر ہے اے ابوذر! میں تمہارے لیے اس چیز کو پسند کر رہا ہوں، جو میں خود اپنے لیے پسند کرتا ہوں تم کسی دو آدمیوں کا حاکم اور سردار نہ بننا اور نہ کسی یتیم کے مال کی نگرانی قبول کرنا (مسلم الامارۃ باب کربۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ ۱۲۰، رقم الحدیث: ۴۶۹۶)۔

**بوقت ضرورت منصب و عہدہ کی طلب:**

البتہ بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص از خود عہدہ و منصب طلب نہیں کرے گا تو نااہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائیں گے۔ ملک و ملت کو نقصان پہنچائیں گے، اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس عہدہ و منصب کے لائق اور اہل بھی نہیں ہے تو ایسی صورت

میں از خود عہدے کا طالب ہونا اور قوم و ملک کا نمائندہ بن کر کھڑے ہونے اور لوگوں سے ووٹ کا مطالبہ کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، بشرطیکہ محض اقتدار و کرسی اور جاہ و منصب کے حصول کے لیے نہ ہو بلکہ قوم و ملت کی خدمت کے جذبے اور سامان و معاشرہ میں پھیلے ہوئے مفاسد کو ختم کرنے کے حوصلہ سے ہو، اور اس کے اندر بھی یہ شرط ہے کہ اپنے حریف پارٹی کی غیبت، سب و شتم اور عیب جوئی نہ ہو (مستفاد فتاویٰ عثمانی ۳۳، ۵۰۷، درس ترمذی ۳۶۰/۳)۔

خلاف شریعت قانون سے وفاداری کا حلف اٹھانا:

اگر کسی ادارہ یا جماعت و پارٹی کے دستور و منشور اور اصول و قانون، روح شریعت اور قرآن و حدیث کے اصول کے بالکل خلاف ہو اور اس میں شمولیت و رکنیت اختیار کرنے والوں کے لیے خلاف شریعت قانون سے بھی وفاداری کا عہد و پیمانہ کرنا پڑے تو کسی صاحب ایمان کلمہ گوشخص کے لیے اس طرح کے دفعات و قوانین سے وفاداری کا حلف لینا اور اس کا عہد و پیمانہ کرنا کہ میں اس ادارے کے تمام قوانین کا پاس و لحاظ کروں گا خواہ وہ خلاف شریعت ہی کیوں نہ ہو جائز نہیں، اس لیے کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ جہاں قرآن و سنت اور دین اسلام کے قوانین کی پامالی اور بے عزتی ہو اور خالق کی نافرمانی لازم آئے وہاں کسی بھی مخلوق کی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

عن النّوأس بن سمعان قال قال رسول اللّٰه ﷺ: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق (شرح السنة ۱۰، ۲۲، رقم الحدیث ۲۲۵۵، المعجم الكبير ۱۸، ۱۶۰، رقم الحدیث ۲۸۱، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۲، ۵۳۶، رقم الحدیث ۲۲۲۰۶)۔

(حضرت نواس بن سمعانؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس مسئلہ میں خالق اللہ رب العزت کی نافرمانی لازم آتی ہو اس میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)۔

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ امیر و حاکم کی بات کو سننا اور اطاعت کرنا اسی طرح کسی ادارے اور جماعت و پارٹی کے قوانین و اصول کے ساتھ وفاداری اس وقت تک جائز ہے جب تک وہ قرآن و حدیث کے مخالف نہ ہوں، اگر ادارہ یا جماعت و پارٹی کا کوئی حکم و قانون شریعت مطہرہ کے حدود سے متجاوز ہو اور اس کی اطاعت سے اللہ رب العزت کی معصیت لازم آتی ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ وفاداری کا عہد کرنا یا اس کے لیے حلف اٹھانا کسی کلمہ گوشخص کے لیے جائز نہیں۔ حضرات فقہاء کرام و مجتہدین اسلام کے اقوال و عبارات بھی اسی کے مؤید ہیں، البتہ اگر مسلم ممبران کو دستور و قوانین کے حلف برداری اور وعدہ ایفاء سے مستثنیٰ رکھا جائے اور اس کو قوانین پر عمل کرنے کا پابند نہ بنایا جائے تو پھر اجمالی طور پر ایفاء قانون کا حلف لینے کی گنجائش ہے۔

مسلم ارکان کے لیے بائبل اور انجیل پر حلف لینا شریعت کی نظر میں:

کسی شی پر ہاتھ رکھ کر حلف لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حالف کے اعتقاد کے مطابق وہ مکرم اور قابل احترام ہے اور وہ اس کا دل و جان اور قلب و جگر کی گہرائیوں سے قابل تعظیم اور لائق احترام و اکرام ہونے کا یقین رکھتا ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں اور دلائل و براہین سے واضح ہو چکی ہے کہ موجودہ زمانے میں جو تورات اور انجیل اس روئے زمین پر موجود ہے وہ اصلی اور بحال نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس وقت روئے زمین کے کسی خطے پر بھی اصلی بائبل اور انجیل موجود نہیں ہے بلکہ جتنے بھی انجیل کے نسخے اس وقت پائے جاتے ہیں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہیں وہ سب کے سب محرف شدہ اور ردوبدل کردہ ہیں، کوئی ایک نسخہ بھی دنیا میں بالکل اصلی موجود نہیں ہے، بلکہ تمام نسخے افتراء علی اللہ اور تحریف و تغیر سے پر ہیں، اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں، اس لیے کہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کا مطلب ان کے مخائب اللہ ہونے اور ان کے برحق ہونے کی تصدیق کرنا ہے جو جائز نہیں، البتہ اگر کوئی مسلمان اس پر مجبور ہو اور اس کے بغیر حصول انصاف اور ظلم و ستم سے بچنا ناممکن ہو تو بادل نخواستہ کراہت خاطر کے ساتھ اس کی تعظیم و توقیر اور احترام و اکرام کے اعتقاد کے بغیر دفع مضرت کی نیت سے ہاتھ رکھ کر حلف لینے کی گنجائش ہے، چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی زیر نگرانی اسلامک فقہ اکیڈمی کی پانچویں سیمینار منعقدہ ۸-۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء امت جن نکات پر متفق ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے:

إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الانجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب لطلبه يعتبر مكرها ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيما (قرارات مجلس الجمعه الفقهي الاسلامي)

اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لیے تورات یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو ایسے کو مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا (اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فیصلے ص ۱۲۰)۔

### مسلم مخالف پارٹی میں مسلمانوں کی شمولیت اور اس کی طرف سے انتخاب لڑنا:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فی زمانہ ہندوستان میں کوئی بھی سیاسی جماعت مسلمانوں کے لیے مکمل اور کلی طور پر تحفظ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام پارٹیاں اور جماعتیں مسلمانوں کے دشمن اور سم قاتل ہیں، ایسی سیاسی جماعتوں اور پارٹیوں میں مسلمانوں کے لیے شرکت کوئی مفید اور کارآمد نہیں، اور نہ کوئی مسلمان اس میں شریک و شمولیت اختیار کرے اس کے اصول و قوانین کی اصلاح کر سکتا ہے اور نہ اس کی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ہی مسلم دشمنی پر رکھی گئی ہے، اس لیے اس پارٹی اور جماعت میں کسی بھی مسلمان کے لیے شرکت کرنا اور اس کی جانب سے ایکشن میں انتخاب لڑنا باعث گناہ عظیم اور حرام ہوگا اور تعاون علی الاثم والعدوان کے مترادف ہوگا اور مسلمانوں کی دشمنی میں کافروں کے ساتھ برابر کا شریک ہوگا (کفایت الفتی، ۲۵۶/۹)۔

اگر کوئی شخص اس نیت سے اس مسلم دشمن اور اسلام مخالف پارٹی میں شریک ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہو کر اس کے ایجنڈے اور اصول کو بدلنے کی سعی و کوشش کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کی حسن نیت کے مطابق اس میں شمولیت کی اجازت بوقت ضرورت دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ وہ خود اس میں شریک ہو کر اس کا آلہ کار بن کر نہ رہ جائے، اور اس کے اندر ایجنڈے کے بدلنے کی طاقت و قوت ہو۔ حضرت اہل بن حنیفؓ سے مسند احمد اور معجم کبیر وغیرہ میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أذل عندہ مؤمن فلم ینصرہ ویقدر علی أن ینصرہ أذله اللہ علی رؤوس الأشهاد یوم القیامۃ (المعجم الکبیر ۶، ۷۲، رقم الحدیث ۵۵۵۲، شعب الایمان ۶، ۱۱۰، رقم ۷۲۲، مسند احمد ۲۵، ۲۶۱، رقم الحدیث: ۱۵۹۸۵)۔

(جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل اور رسوا کیا جا رہا ہو اور وہ اس کی مدد پر قدرت رکھنے کے باوجود مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن (میدان محشر میں) رسوا ذلیل کرے گا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام مخالف ایجنڈے کے بدلنے پر قدرت رکھتا ہے اور وہ اس مسلم مخالف و اسلام دشمنی پر بنائی گئی پارٹی میں اصلاح کی نیت سے شریک ہوتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایسی وقت ممکن ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، ایک مسلمان جا کر کچھ بھی نہیں کر سکتا، پھر یہ کہ پارٹی کے قوانین اسلام دشمنی پر اس قدر سخت ہیں کہ اس میں ترمیم کی کوشش کرنا، آسمان سے ستارے توڑنے کے مترادف ہے، اس لیے اس طرح کی جماعت و پارٹی میں مسلمانوں کی شرکت سے اجتناب کرنا ہی اولیٰ ہے۔

### سیکولر سیاسی پارٹی میں مسلمانوں کی شرکت اور انتخاب لڑنا:

ہاں ہندوستان میں بعض سیاسی پارٹیاں ایسی ہیں جو اپنے آپ کو سیکولر کہلاتی ہیں اور ان کے دستور و دفعات میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ اور مسلمانوں کو اپنے دین و مذہب پر آزادانہ طور پر عمل کرنے کی باتیں اور اپنے حقوق رفتہ کی بازیابی کے لیے قانون کے دائرہ میں صدائے احتجاج بلند کرنے اور قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق دیا جاتا ہے، ان پارٹیوں کے دفعات و قوانین میں مسلمانوں کے تحفظ کے دفعات بھی اصولی اعتبار سے مکتوب ہوتے ہیں، ان کی بنیاد مسلم دشمنی اور اسلام مخالفت پر نہیں ہوتی ہے اور ان کے دستور اساسی میں اسلام دشمنی اور مسلمان دشمنی کا خمیر شامل نہیں ہوتا ہے۔ تاہم اس کے بعض جزوی قانون و اصول اسلام کے مخالف یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتے ہیں، کھلم کھلا اسلام دشمنی پر مبنی پارٹیوں کے مقابلے میں یہ پارٹیاں اہوں ہوتی ہیں، اس لیے کہ فقہ میں اس اصول، ”إذا ابتلیت فاختر أھو فھما“ کے پیش نظر اس میں مسلمانوں کے لیے شرکت کرنا جائز ہوگا اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت، ریاست اور وزارت میں شامل ہونا جائز ہوگا تا کہ جب کوئی قانون یا بل مسلمانوں کے خلاف پاس ہو تو وہ سینہ سپر ہو کر قانون کے دائرہ میں رہ کر اس کی مخالفت کر سکے گا، اگر بالکل طور پر مسلمان سیاسی پارٹیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور کسی بھی سیکولر پارٹی میں شرکت کو زہر بلائیں اور سم قاتل سمجھ کر علیحدگی اختیار

کر لیں تو یہ مسلمانوں کے حق میں زیادہ نقصان دہ اور خطرناک ہے، اس صورت میں غیروں کو زیادہ سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کے مواقع فراہم ہوں گے، اس لیے مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرنے اور مسلمانوں کی آواز کو ایوان حکومت اور باب اقتدار تک پہنچانے اور اسلام مخالف اور مسلم دشمنی پر مبنی قانون پر قدغن لگانے کے لیے سیکولر جماعت میں شرکت مسلمانوں کے لیے وقت کا اہم تقاضہ ہے اور شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

ہندوستان میں خالص مسلم سیاسی جماعت کا قیام غیر مناسب:

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، جہاں مختلف اور متعدد سیاسی سیکولر اور غیر سیکولر پارٹیاں اور جماعتیں موجود ہیں جن کی قیادت و سیادت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے اور اس ملک میں مسلمان نہایت اقلیت میں ہے اور ان کو کوئی خاص سیاسی اثر و رسوخ ملک کے اندر حاصل نہیں ہے، مزید برآں مسلمان مختلف اور متعدد جماعتوں، فرقوں، تنظیموں اور دھڑوں میں بکھرے ہوئے ہیں، کوئی جماعت دوسری جماعت کو اپنا مقتدا اور رہنما ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ ہر جماعت اور ہر فرقہ ڈیڑھ آنچ کی مسجد اپنی الگ بنانا چاہتا ہے اور دوسرے پر اپنا تفوق و برتری چاہتا ہے، مسلمانوں کے درمیان اجتماعیت، اتفاقیت اور شیرازہ بندی نہیں ہے، ایسی صورت حال میں خالص مسلم سیاسی اور اسلامی پارٹی کا قیام موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے نامناسب اور غیر موزوں ہوگا۔

ہاں اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے (خدا کرے ایسی صورت پیدا ہو) کہ تمام مسلم قوم تسبیح کے دانے کی طرح ایک لڑی میں پیروں دو یا جائے اور تمام مسلمان اتحاد و اتفاق اور یگانگت و بھائی چارگی کا نمونہ بن جائے اور کسی ایک قائد کے چھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور بکھرے ہوئے شیرازہ متحدہ و متفق ہو جائے اور کسی ایک امام کی آواز پر لیک کہیں اور ان کی آواز کو صداً صبحرا ہونے نہ دیں، کسی کے کہنے پر دائیں بائیں نہ دیکھیں تو اس وقت مسلمانوں کے لیے سیاسی جماعت کا علیحدہ قیام موزوں ہوگا اور جب سارے مل کر اپنے کسی ایک اور نمائندہ کو ووٹ ڈالیں گے اور اپنے ووٹ کو بکھرنے اور منتشر ہونے سے بچائیں گے تو اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ کامیابی و کامرانی مسلمانوں کے قدم چومے گی اور ان کا نمائندہ ممبر اسمبلی و ممبر پارلیمنٹ کی شکل میں ایوان اقتدار کے اندر نمایاں نظر آئیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

عورتوں کا ایکشن میں کسی پارٹی کی طرف سے امیدوار بن کر کھڑے ہونے کا شرعی حکم:

ولایت و حکمرانی کا اہل اور وزارت و امامت کے لائق مرد ہی ہو سکتا ہے، عورت منصب وزارت و امامت اور حکومت و سیاست کا اہل نہیں، عورتوں کو ولایت و حکمرانی دینے، منصب وزارت و قیادت پر فائز کرنے اور انتخاب میں امیدوار بن کر کھڑے ہونے میں بہت سارے شرعی مفسد اور امور منکرہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ مثلاً محرم مردوں کے ساتھ اختلاط، ایچ پر عوام کے سامنے خطاب، بلا محرم دور دراز کا سفر، کونسلوں اور اسمبلیوں میں غیر محرم اجنبی مردوں کے سامنے رو برو ہو کر بیٹھنا وغیرہ وغیرہ، اس لیے عورتوں کا انتخاب میں امیدوار بننا شرعاً ممنوع اور روح شریعت کے منافی ہے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں: عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لیے مستحسن نہیں، کیونکہ اس میں غیر ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا میونسپلٹی میں شرکت عورتوں کے لیے متعذر ہے (مستفاد از کفایت الفتی ۳۴۹/۹، فتاویٰ عثمانی ۱۳/۵۱۳)۔

عورتوں کا پولنگ پر جا کر ووٹنگ کرنا:

ہاں عورت شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے باپردہ ہو کر جس امیدوار کو اہل اور لائق سمجھے اپنا ووٹ ڈال سکتی ہے، ضروری ہے کہ پولنگ بوتھ پر باقاعدہ طور پر عورتوں کے لیے پردے کا معقول انتظام ہو، غیر محرم، اجنبی مرد حضرات منتظم نہ ہوں، بلکہ وہاں کاغذات دینے والی عورتیں ہی مقرر ہوں، تو اس صورت میں مسلمان عورتوں کے لیے ووٹ ڈالنے کے لیے جانا جائز ہے، اور اگر وہاں غیر محرم مرد ہوں تو اس صورت میں عورت کے لیے ووٹ ڈالنے کے لیے جانا جائز نہیں ہے، بلکہ وہ مطالبہ کریں کہ ان کے لیے زمانہ منتظم مقرر کیے جائیں اور اگر زمانہ منتظم نہ ہوں تو عورت کے ساتھ اس کا شوہر یا کوئی محرم شرعی ہو تو بھی جا کر ووٹ دے سکتی ہے بشرطیکہ اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو (مستفاد از کفایت الفتی ۳۵۷/۹)۔

☆☆☆

## ایکشن میں شرکت اور اسلام کا نقطہ نظر

مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کے مسئلہ پر قرآن وحدیث کی روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ووٹ کی چار حیثیتیں ہیں: ۱۔ شہادت، ۲۔ سفارش، ۳۔ وکالت، ۴۔ مشورہ۔

۱۔ ووٹ بحیثیت شہادت:

کسی مجلس کی ممبری کے لیے کوئی امیدوار کھڑا ہوتا ہے یا کسی پارٹی اور تنظیم کی طرف سے نامزد کیا جاتا ہے تو درحقیقت وہ دو چیزوں کا دعویدار ہوتا ہے: ایک یہ کہ اس کام کی لیاقت وصلاحیت اس میں ہے، دوسرے یہ کہ وہ اس کام کو امانت و دیانت کے ساتھ بخوبی انجام دے گا۔ ووٹ دینے والے اس کے بارے میں یہ شہادت دیتے ہیں کہ مفوضہ ذمہ داریوں کو بحسن و احسان ادا کرنے کی اہلیت اس میں ہے (جو کسی بھی منصب کے لیے شرط اول ہے) امانت و دیانت اس کی پہچان ہے، قوم و ملت کا بھی خواہ اور عوام کا ہمدرد و غم خوار ہے۔

اگر واقع میں امیدوار ان اوصاف کا حامل ہے تو ایسے امیدوار کو ووٹ دینا حقیقت میں سچی شہادت دینا ہے۔ اس کے برعکس ایسے امیدوار کو ووٹ دینا جس میں یہ صفات نہیں ہیں جھوٹی شہادت ہے۔

اس لیے نااہل غیر مناسب امیدوار کو ووٹ دینے سے گریز کرنا اور لائق و باصلاحیت امیدوار کو ووٹ دینا واجب ہے۔

۲۔ ووٹ بحیثیت سفارش:

سفارش کی حقیقت یہ ہے کہ جس سے سفارش کی جائے اس کے نزدیک سفارش کرنے والے کی اہمیت اور عزت و وقار کا اظہار ہو اور جس کی سفارش کی جائے اسے نفع پہنچے۔

علامہ قرطبی تحریر فرماتے ہیں: ”فہی علی التحقیق اظہار لمنزلة الشفیع عند المشفع وایصال المنفعة الی المشفوع له“ (تفسیر قرطبی ۵/

۱۹۰)

سفارش دو طرح کی ہوتی ہے: (۱) درست سفارش (۲) غیر درست سفارش۔

اس میں سفارش کرنے والا اور جس کے حق میں سفارش کی گئی دونوں ماجور ہوتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا اور اس کا حق دلانا ہے یا کم از کم اس کے لیے سعی کرنا ہے، اگر اس کی سفارش قبول نہیں ہوتی۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ”والشافع یوجر فیما یجوز وإن لم یشفع، لأنه تعالیٰ قال: من یشفع ولم یقل یشفع وفی صحیح مسلم: اشفعوا توجروا ولیقض اللہ علی لسان نبیہ ما أحب“ (تفسیر قرطبی ۱۹۱/۵)۔

۲۔ غیر درست سفارش: یعنی ایسی سفارش جس سے نقصان ہو اور جو ناجائز امور میں ہو اور اس سے حق تلفی ہوتی ہو۔

اس صورت میں سفارش کرنے والا بھی مجرم و گنہگار ہوگا اور اللہ کی بارگاہ میں ماخوذ۔

۱۔ استاد حدیث و صدر شعبہ افتاء جامعہ نور الہدیٰ، حیدرآباد۔

قرآن مجید میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها وكان الله على كل شئ مقبلاً“ (جو کوئی اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی بری سفارش کرے گا اس میں سے بار ہوگا اور اللہ ہر چیز پر طاقت رکھنے والا ہے)۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مجاہد، حسن اور ابن زید وغیرہ نے انسانی حاجتوں اور ضرورتوں میں کی جانے والی سفارشوں کو شامل مانا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”هي في شفاعات الناس بينهم في حوائجهم، فمن يشفع ينفعه فله نصيب ومن يشفع لبصر فله كفل“ (تفسیر قرطبی، ۱۹۰/۵) ووٹ کی ایک حیثیت سفارش کی ہے۔ ووٹ جس امیدوار کو ووٹ دیتا ہے اس کے بارے میں وہ الیکشن کمیشن سے سفارش کرتا ہے کہ یہ بلدیہ، اسمبلی، پارلیمنٹ یا کسی اور محکمہ کی ممبری کے لیے موزوں ہے۔ عہدہ کی ذمہ داریوں کو وہ بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے اور صلاحیت و لیاقت میں دوسروں پر فائق ہے۔

لہذا اگر ایمان دار، امانت پیشہ، اخلاق مند، خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار، قوم و ملت کا بھی خواہ عوام الناس کا خیر خواہ، امن و آشتی کا پیامبر اور باصلاحیت قابل و لائق امیدوار کو ووٹس ووٹ دیں تو اچھی سفارش کی بنا پر وہ عند اللہ ماجور ہوں گے خواہ امیدوار کامیاب ہو یا ناکام۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا اور اس نے رفاہی، سماجی، دینی اور نیکی کے کام کیے اور عوام کو ان کے جائز حقوق دلانے تو اس کے ثواب میں ووٹس بھی حصہ دار ہوں گے اور اگر کامیابی نہ مل سکی تب بھی ووٹس کو نیک کام کے لیے سہی کرنے کا ثواب ضرور ملے گا۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

”والشافع يوجز فيما يجوز وان لم يشفع، لانه تعالى قال: من يشفع ولم يقل يشفع“ (تفسیر قرطبی، ۱۹۱/۵)۔

اور مسلم شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”اشفعوا توجروا“۔

علامہ قرطبی نے سفارش کی ایک شکل دعا بھی ذکر کی ہے، یعنی قابل، حقدار اور اہل شخص کے حق میں کامیابی کی دعا کرنا بھی اچھی سفارش اور اجر و ثواب کا باعث ہے۔ نا اہل اور غیر مناسب امیدوار کے لیے دعا کرنا بری سفارش اور گناہ کا سبب ہے۔

اس لیے الیکشن میں اہل امیدوار کے حق میں دعا کرنا جائز اور کار ثواب ہوگا اور نا اہل امیدوار کے حق میں کامیابی کی دعا کرنا ناجائز اور گناہ کا ذریعہ ہوگا۔ ”وقيل: يعني بالشفاعة الحسنة الدعاء للمسلمين والسيئة الدعاء عليهم“ (تفسیر قرطبی، ۱۹۰/۵)۔

ووٹ بحیثیت وکالت:

جمہوری نظام میں حکومت کی تشکیل اور وزراء سمیت وزیراعظم کا انتخاب بھی عوام کا حق ہے اور عوام ہی اپنے ووٹوں سے یہ کام مرحلہ وار تنظیمی طور پر انجام دیتے ہیں اور تشکیل حکومت کے بعد نو منتخب شدہ اراکین حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں اور وہ عوام کے حقوق کے محافظ ہوتے ہیں اور ان کی ضروریات بہم پہنچاتے ہیں، اس لیے ووٹس جب کسی کے حق میں ووٹ ڈالتے ہیں تو گویا انہیں اپنے اور قوم و ملت کی طرف سے امور مملکت اور کارہائے حکومت میں وکیل نامزد کرتے ہیں کہ وزیراعظم کے تقرر سے لے کر دیگر فرائض حکومت انجام دینے، عوام کے حق میں بہتر فیصلے لینے، فلاح و صلاح کے لیے قوانین وضع کرنے اور اسکیمات تیار کرنے اور ان کے نفاذ تک میں وہ ان کے نمائندے اور وکیل ہیں۔

بنیادی طور پر معاملات میں وکالت کی اجازت شریعت نے دی ہے، فقہ کا مشہور ضابطہ ہے:

”الأصل عند أبي ليلين أن من ملك شيئاً بنفسه ملك تفويضاً إلى غيره. وعندنا يجوز أن يملك في بعض

المواضع ولا يملك في بعضها (اصول المسائل خلافية ص ۱۳)۔

وکالت کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی معاملات میں کسی کو وکیل بنائے، اس میں نفع و نقصان کا دائرہ محدود ہوتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اجتماعی معاملات اور قومی و ملی امور میں وکیل مقرر کرے، اس صورت میں نفع و نقصان کا اثر وسیع ہوتا ہے۔ ووٹ کا تعلق دوسری صورت سے ہے۔ اس لیے کسی قابل اور لائق امیدوار کو ووٹ دینا شرعاً جائز ہوگا اور کسی نا اہل امیدوار کو ووٹ دینا اور اس طریقے سے اسے وکیل بنانا جائز نہیں



### ووٹ بحیثیت مشورہ:

ووٹ کی ایک حیثیت مشورہ کی ہے، یعنی ایکشن کمیشن ووٹس سے اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے امیدواروں میں سے انتخاب اور نامزدگی کے بارے میں مشورہ کرتا ہے تو کثرت رائے کی بنیاد پر ہی سہی عوام کے جذبات کے رخ پر فیصلہ صادر کرتا ہے اور کسی ایک کو کامیاب قرار دیتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تشکیل حکومت اور امور مملکت کی انجام دہی میں ”مشورہ“ کی کافی اہمیت ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ الصلاۃ والسلام کو مشورہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ”وشاورہم فی الأمر“۔

یعنی اہم امور میں صحابہ سے مشورہ لیتے رہئے۔ علماء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ گو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کرنے کی حاجت نہیں تھی، لیکن صحابہ کی رائے جاننے اور تعلیم امت کے لیے آپ کو یہ حکم دیا گیا، چنانچہ بہت سے مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ اور مسلمانوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب آیت: ”وشاورہم فی الأمر“ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دیکھو خدا اور اس کا رسول مشورہ سے بالکل مستغنی ہیں، لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو اس امت کے لیے رحمت کا سبب بنایا ہے، میری امت میں سے جو شخص مشورہ سے کام کرے گا، رشد و ہدایات اس کے ساتھ رہے گی اور جو اسے چھوڑ دے گا، گمراہی و کجروی اس کے ہمراہ ہوگی (روح المعانی ۱۶۶/۳)۔

قرآن و احادیث میں جہاں مشورہ کے اہتمام کرنے کا حکم ہے، وہاں صحیح مشورہ دینے کا بھی حکم ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فرماتے ہیں: ”الاستشارة مؤتمن“ یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہے (ابوداؤد شریف ۹۹۶/۲ باب فی المشورۃ)۔ اور امانت کا تقاضا ہے کہ صحیح اور مفید مشورہ دے، اپنے ذاتی مفادات یا عداوتوں کو جگہ نہ دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا“ (سورہ نساء: ۸۵) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ذمہ داریاں ان کے اہل کو سپرد کرو۔

علامہ قرطبی نے امانت کے وسیع تر معنی بیان کیے ہیں کہ امانت کا لفظ تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کو شامل کرنا ہے۔ حضرت براء بن عازب، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس اور ابی بن کعب رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فرمان ہے: ”الأمانة فی کل شیء“ (امانت کا تعلق ہر چیز سے ہے) (تفسیر قرطبی ۶۶۱/۵)۔

### ووٹ دینا جائز، مستحب یا واجب؟

۱۔ ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ملکوں میں مسلمانوں کے لیے ووٹ دینا واجب ہوگا، اس لیے کہ جان و مال، عزت و آبرو اور ملی و مذہبی مفادات کا تحفظ اس کے بغیر ممکن نہیں اور جان و مال، عزت و نسل اور مذہب کی حفاظت مقاصد شریعت میں سے ہے اور ان کا تحفظ شرعاً واجب ہے۔ اصول ہے کہ جس کے بغیر واجب کا اتمام نہ ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے ”ما لا یتم الواجب إلا بہ فهو واجب“ لہذا ووٹ دینا بھی واجب ہوگا کہ اسی میں واجب کا اتمام ہے۔

نیز ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی ہے۔ حصول مقاصد، تحفظ حقوق اور دفع ظلم کے لیے اہل، قابل، دیانت دار، قوم و ملت کے ہی خواہ کو ووٹ دینا دراصل اس کے حق میں شہادت دینا ہے اور یہ واجب ہے اور ووٹ نہ دینا یا اس کے مخالف کو ووٹ دینا شہادت چھپانا یا جھوٹی گواہی دینا ہے جو گناہ اور ناجائز ہے۔

### ایکشن میں بحیثیت امیدوار کھڑا ہونا:

ایکشن میں خود کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا درحقیقت عہدہ و منصب کا مطالبہ ہے۔ اسلامی نظریہ سے کسی عہدہ یا منصب کی طلب درست نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ”لا تسأل الإمارة فإن أعطیتها عن مسألة وکلت إليها“

وان اعطیتها عن غیر مسألة أعنت علیها“ (مسلم شریف ۱۲۰۲، باب النبی عن طلب الامارة والحرص علیها) (عہدہ اور حکومت کا مطالبہ مت کرو، کیونکہ اگر عہدہ تجھے طلب سے ملے گا تو خدا تجھے چھوڑ دے گا اور اگر بغیر طلب کے دیا جائے گا تو اس پر تیری مدد کی جائے گی)۔

### مخالف شریعت قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

قانون سازی کا اختیار کلی طور پر اللہ تعالیٰ کا ہے اور انسان کی طرف سے کسی قانون کی تشریح یا تفصیل و تطبیق یا ایسے مباح اعمال و افعال سے متعلق اصول و قواعد کی تدوین جن کا تعلق دنیاوی اغراض و مقاصد سے ہے اور جن کا اختیار اللہ نے انسانوں کو دے رکھا ہے، اسی شرط پر معتبر اور قابل تقلید ہے کہ وہ شریعت کے متعین کردہ اصول و قواعد کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئک هم الکفروں“ (سورہ مائدہ: ۴۴) (اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ کافر ہیں)۔

قانون ساز اداروں میں جو قوانین بنائے جاتے ہیں وہ تمام شریعت کے خلاف نہیں ہوتے۔ اکثر کا تعلق از قبیل مباحات ہوتا ہے جو شرعاً جائز ہے۔ ہاں کچھ ایسے قوانین بھی وضع کیے جاتے ہیں جو اسلامی مزاج و مذاق اور روح شریعت کے مخالف ہوتے ہیں، اس طرح کی قانون سازی بالکل جائز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اس طرح کے اداروں کا ممبر بننا کیسا ہے؟ تو اس سلسلے میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس قسم کے اداروں کے قیام کا مقصد اسلام دشمن قوانین کی وضع نہیں ہے۔ یہ ادارے عام طور پر دنیاوی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے مباحات کے دائرے میں قانون سازی کرتے ہیں اور شریعت میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے۔ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ”الأمور بمقاصدھا“ اس لیے فی نفسہ ان اداروں کا قیام اور مسلمانوں کے لیے ان کی ممبری جائز ہوگی، البتہ مسلم ممبران کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اسلام متضاد قانون کی بھرپور مخالفت کریں اور اس قسم کے قوانین وضع کرنے سے اراکین و ممبران کو باز رکھنے کی ہمتن کوشش کریں۔

اگر پارٹی وہیپ جاری کر دے اور پارٹی کا تجویز کردہ قانون غیر اسلامی ہو، یعنی قانون الہی کے ہوتے ہوئے قانون سازی کی جارہی ہو تو مسلم ممبران کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ پارٹی کے اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے پارٹی کے نظریہ کی حمایت کریں، بلکہ اس کی مخالفت ضروری ہوگی۔ ”لا طاعة لخلق فی معصیة الخالق“ اگر نوبت پارٹی سے عملی علیحدگی یا معطلی کی آجائے تو اسے ترجیح دینا اور خود کو ایسی پارٹی سے الگ کرنا ضروری ہوگا، اس لیے کہ صاحب استطاعت کے لیے منکر پر نگیں واجب ہے اور یہ اس کی ایک صورت ہے۔

### جمہوری دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا:

جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں، انھیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بعض دفعات خلاف شریعت ہوتی ہیں لیکن اکثر دفعات موافق شریعت ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں جو دفعات شریعت کے موافق ہوتی ہیں ان سے وفاداری کا حلف لینا جائز ہے اور وہ دفعات جو شریعت کے خلاف ہوتی ہیں ان کو بروئے کار لانے کی قسم کھانا جائز نہیں، کیونکہ یہ معصیت ہے اور معصیت کی قسم کھانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے:

”من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیراً منها فلیأت بالذی هو خیر ولیکفر عن یمینہ“ (رواہ احمد فی مسندہ ومسلم عن ابی ہریرہ)۔ یعنی اگر کوئی خلاف شریعت چیز کی قسم کھاتا ہے تو اس کو پورا کرنا جائز نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ اس قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے۔

لہذا مذکورہ صورت میں بحالت مجبوری حلف اٹھاتے وقت ان دفعات کی نیت کرنے جو موافق شرع ہیں اور ان دفعات کی نیت نہ کرے جو خلاف شرع ہیں۔ جیسے حالت اکراہ میں ضرورتاً ایمان پر اطمینان قلب کے ساتھ زبان سے اظہار کفر کی اجازت ہے۔

### بائبل پر حلف لینا:

قسم دراصل عہد و پیمان کی توثیق کے لیے کھائی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قسم اس کی کھائی جائے جس کی تعظیم و حرمت قسم کھانے والے کی

نظر میں ہو، اسی لیے اللہ کے نام و صفات کے علاوہ کسی چیز کی قسم کھانا مستبر نہیں ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: ”فمن كان حالفاً فليحلف بالله أو ليذر“ اخرجہ اصحاب الکتب الستة، مالک و احمد والبیہقی عن ابن عمر (جامع الاصول ۲۱، ۲۹۲، نصب الراية ۵۹۲، ۳)۔

بائبل کو موجودہ حالت میں مسلمان محرف اور تبدیل شدہ سمجھتے ہیں۔ اس پر حلف لینا، گویا اس کے مضامین کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنا ہے اور اس کی تقدیس کو بھی مستلزم ہے، اس لیے کسی ممبر آف پارلیمنٹ کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ اس پر حلف اٹھائے بلکہ قرآن پر حلف اٹھانا ضروری ہوگا اور اگر انھیں اس کی اجازت نہ ہو اور بائبل پر حلف لینا ہی ضروری ہو جائے تو اگر اس کی حالت تصور کرتے ہوئے ہر اہمیت خاطر اس پر حلف اٹھانا جائز ہوگا۔

### سیکولر پارٹیاں اور مسلمان:

وہ سیکولر پارٹیاں جو مذہبی اعتبار سے متعصب نہیں سمجھی جاتی ہیں، تمام مذاہب کے اقدار و تہذیب اور تشخص و امتیاز کی قدر کرتی ہیں، بالخصوص مسلم مفادات کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہیں اور ان کے منشور کی بنیاد اسلام دشمنی پر نہیں ہے، گو منشور کی بعض دفعات اسلام یا مسلمان مخالف ہیں۔ فی الجملہ ان پارٹیوں میں مسلمانوں کی سیاسی بقا کا راز مضمر ہے اور متاثر شدہ شریعت کا تحفظ بھی اسی صورت میں ممکن ہے، چنانچہ صلح پسند اور بقائے باہم کے اصول پر مبنی نظریات کے حامل غیر مسلمین سے سیاسی و سماجی تعلقات قائم کرنے اور مصالحت کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے:

”لاینبہکم اللہ عن الذین لہم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروہم وتقسطوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین“ (سورہ ممتحنہ: ۸) (اللہ تم کو منح نہیں کرتا ان لوگوں سے جوڑے نہیں تم سے دین پر اور نکالائیں تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی اور انصاف و سلوک پیشک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو)۔

اسلام دشمن اور مسلم مخالف سیاسی پارٹیوں کے خلاف سیکولر پارٹیوں سے مصالحت اور ہمہ جہت شرکت اسی نوعیت کی ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے قریش مکہ کے خلاف (جن کی دشمنی ظاہر تھی) قبیلہ خزاعہ سے معاہدہ فرمایا تھا۔

### اسلام دشمن پارٹیاں اور مسلمان:

وہ سیاسی پارٹیاں جو کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے۔ اسلامی احکام و شعائر ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھنکنے ہیں اور مسلمانوں کا مذہبی وجود انھیں بالکل گوارہ نہیں۔ ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز نہیں، اس لیے کہ یہ عدوان اور سرکشی کی حمایت کرنا اور دشمنان اسلام کو اسلام کے خلاف مضبوط کرنا ہے، جو قطعاً ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب“ (سورہ مائدہ: ۲)۔

دیگر سیکولر پارٹیوں کی موجودگی میں مسلم دشمن پارٹیوں میں شمولیت مسلمانوں کے لیے نہ تو سیاسی مجبوری ہے اور نہ ہی اسلامی ضرورت، لہذا مسلمانوں کا ایسی سیاسی پارٹیوں سے مربوط ہونا جائز نہیں۔

مسلمانوں کے لئے علاحدہ سیاسی جماعت کا قیام:

گزشتہ اوراق میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ جمہوری ملکوں میں ووٹ کی طاقت مسلم ہے اور ہمارے ملک ہندوستان میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ووٹ ان کی سب سے بڑی طاقت ہے، مسلم ووٹ کا متحد رہنا نہایت ضروری ہے، اسی سے ان کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسلمان جہاں بھی ہوں انھیں کلمہ اور ایمان کی بنیاد پر متحد رہنے کا حکم ہے۔

”واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا“ اور حضور ﷺ نے فرمایا: ”المؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً“۔

لہذا سیاسی سطح پر ایسا کوئی قدم اٹھانا مسلمانوں کے لیے صحیح نہیں ہوگا جس سے ان کا شیرازہ بکھر جائے اور ان کی طاقت ٹوٹ جائے۔

## ایکشن میں خواتین کا کردار:

اسلامی یا شخصی اور بااختیار حکومت میں عورت کا سربراہ بننا بالاجماع جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن حزمؒ مراتب اجماع میں لکھتے ہیں: "واتفقوا أن الإمامة لا تجوز للمرأة" (مراتب الاجماع ص ۶۱)۔

جمہوری نظام حکومت میں کسی ایک فرد کو اختیار کل نہیں ہوتا، اراکین مملکت اور ممبران پارلیمنٹ کے مشورے سے احکام طے ہوتے ہیں، اراکین اور ممبران کی حیثیت مشیر کی ہوتی ہے اور اسلام میں عورتوں سے مشورہ لینا جائز ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کے مشورے پر عمل کیا۔ واقعہ انک کی تحقیق کے سلسلے میں آپ ﷺ نے زینب بنت جحش اور ابو ہریرہ سے مشورہ لیا۔ بہت سے مسائل میں صحابہ کرامؓ نے حضرت عائشہ اور دیگر ازواج مطہرات سے مشورہ فرمایا۔

اس لیے عورتوں کا شرعی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے سرکاری اداروں کا ممبر یا مشیر بننا اور اس کے لیے بحیثیت امیدوار خود کو پیش کرنا جائز ہوگا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جمہوری نظام حکومت میں اراکین کی مذکورہ حیثیت کے پیش نظر جمہوری حکومت میں عورت کی سربراہی و قیادت کو ممنوع صورت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور حدیث: "لن یفلح قوم ولوا أمرھم امرأة" کا اسے مصداق تسلیم نہیں کیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے امداد الفتاویٰ ۲۹/۵)۔

حضرت مفتی رفیع عثمانیؒ کے تنقید و تجزیہ کے مطابق جس کی تفصیل احسن الفتاویٰ (۸۷۱/۷) میں ہے۔

عورت کی قیادت کو جمہوری نظام میں بھی ناجائز قرار دیا جائے کہ بحیثیت وزیر اعظم سربراہ مملکت کو اختیار کلی ہوتا ہے اور ممنوع دائرہ میں آتا ہے، تو بھی کم از کم بحیثیت رکن و ممبر جمہوری نظام میں عورتوں کی شرکت جائز ہونی چاہیے۔

بطور خاص ہندوستانی ماحول میں جہاں عورتوں کے لیے پنچایت یا اسمبلی کی سطح پر سیٹیں ریزرو کی گئی ہیں، اگر پارلیمنٹ اور مقننہ کے لیے بھی سیٹیں ریزرو کی جائیں اور اسے قانونی درجہ حاصل ہو جائے تو یہ مسلمانوں کے لیے سیاسی مجبوری کے علاوہ شرعی عذر بھی ہوگا، لہذا "الضرورات تبیح المحظورات" کی روشنی میں شرعی شراعی (پردہ محرم وغیرہ) کا خیال کرتے ہوئے عورتوں کا ایکشن میں شریک ہونا پنچایت، اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے خود کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا جائز ہوگا۔



## ایکشن میں شرکت اور ووٹ کے شرعی احکام

مولانا ریحان مبشر منوی قاسمی ط

### ایکشن کا پیش منظر:

افراد کم ہونے کی وجہ سے پہلے ایکشن کا تصور اور طریقہ کار بہت محدود اور تنگ ہوا کرتا تھا اور معاشرہ کے ارباب حل و عقد اور دانشوران حکومت کی تشکیل میں پیش پیش رہتے تھے، اور صرف انہیں کی آراء کو قوت حاصل تھی جس سے رئیس قوم نامزد ہو جاتا تھا اور عمومی انتخاب اور عمومی ایکشن کی حاجت نہ ہوتی تھی، عورتیں، غلام اور اجنبی افراد اس سے محروم رہتے تھے، ادھر دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ زندگی تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اس کو ایک حالت پر قرار نہیں، آبادی میں بھی مسلسل اضافہ ہوا، ایسی صورت میں اس قدیم طرز کو اپنانے میں دقت ہوئی تب عوام کی آراء کو بھی اہمیت حاصل ہوئی تاکہ پر امن طریقہ سے کسی کو قوم کا امیر منتخب کر لیا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے انگلینڈ نے وسعت ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۲۶۵ء میں عوامی طور پر انتخابات منعقد کرائے اور اکثریت والی پارٹی یا حلقے کو امیر مقرر کر دیا، پھر فرانس نے اخوت و مساوات اور آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ۱۷۹۱ء میں اسے قانونی حیثیت دی، مگر عورتیں اس وقت بھی اپنی رائے ظاہر کرنے کی مجاز نہ تھیں۔ اس کو آگے بڑھاتے ہوئے نیوزی لینڈ نے ۱۹ ستمبر ۱۸۹۳ء کو عورتوں کو بھی حکومت ساز افراد میں شامل کرتے ہوئے انہیں حق انتخاب سے مالا مال کیا۔ اس طرح وہ دنیا کا پہلا ملک بنا جہاں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ملا اور آئندہ ہونے والے انتخاب میں نومبر ۱۸۹۳ء میں عورتوں نے اپنے اس حق کا مکمل طور پر استعمال کیا، اس کے بعد امریکہ نے ۱۹۱۲ء اور برطانیہ نے ۱۹۲۸ء میں عورتوں کو یہ حق دے دیا (روزنامہ انقلاب ۱۹ ستمبر ۲۰۱۲ء چار شنبہ)۔

### ایکشن کی شرعی حیثیت:

جمہوریت میں امیر کا طریقہ انتخاب ”ایکشن“ اسلامی افکار و اسلامی سیاسی نظام کے مغاثر و مخالف ہے، بلکہ ایک طبقہ سے ان عظیم مہلک اور سنگین فتنوں میں شمار کرتا ہے جو امت مسلمہ کے درمیان اتحاد و اتفاق کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی مستحکم اور ناقابل تسخیر دیواروں کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اس نظریہ کے حاملین نے اس کے مفاسد کی ایک طویل فہرست بنائی ہے، جن کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے، اس عقیدے کے حاملین لکھتے ہیں کہ جمہوریت کا ارتکاز تین چیزوں پر ہے: قانون سازی، قضا اور احکام کا نفاذ۔

قانون سازی: جمہوریت سے وابستہ حضرات قانون سازی کے مجاز ہوتے ہیں جبکہ قانون بنانے والی ذات صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ہے۔

إِنَّ الْحَكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (انعام: ۵۷، یوسف: ۴۰-۶۷)۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (اعراف: ۵۴)۔

قضا: دوسری بنیاد قضا ہے، اس نظام میں ارباب حل و عقد کو اسی کے دستور کے موافق فیصلہ کرنا لازم ہوتا ہے، اس کے خلاف فیصلہ کرنے سے فیصلہ کنندگان پر فرد جرم بھی عائد کر دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ فیصلہ اسلامی دستور سے میل نہ کھاتے ہوں اور یہ چیز نص قرآنی سے جائز نہیں:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (مائدہ: ۴۴)۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (مائدہ: ۴۵)۔

ط استاذ جامعہ گلزار حسینہ اجراڑہ، میرٹھ۔

تعمیلاً: تیسری چیز احکام کا نفاذ ہے، اس میں صرف انہیں احکام کا نفاذ ممکن ہے جو آئین جمہوریت کے موافق ہوں، اسلام سے موافقت رکھتے ہوں یا نہیں، اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

ظاہر بات ہے کہ مذکورہ بالا تینوں چیزیں اسلامی نصوص سے متصادم و معارض ہیں، اس لئے جزئیات سے مل کر جوئی مرکب ہوگی وہ بھی ناجائز ہوگی، کیونکہ ناجائز چیز کا مجموعہ بھی ناجائز ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایسے ملک میں ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد بیس فیصد سے متجاوز نہیں، یہ آبادی بھی بکھری ہوئی ہے، یہاں کے مسلمان یقیناً اس موقف میں نہیں ہے کہ بحالت موجودہ اس خطہ میں اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ اب دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، اول: جمہوری نظام سے کنارہ کش ہو جائیں اور مسلمان انیکشن میں حصہ ہی نہ لیں، اس صورت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا ملک ”ہندو راشٹر“ بن جائے گا اور پورا نظام ہندو اذہن طرز پر چلے گا۔ اس طرح نہ ہمارے عاقلی قوانین محفوظ رہ سکیں گے، نہ تبلیغ مذہب کی اجازت ہوگی اور کوئی بھی شرعی قانون جو ہندو ازم سے متصادم ہوگا وہ ممنوع قرار پائے گا اور سرکاری طور پر ہندو ازم کا ہی بول بالا ہوگا۔ جس کی واضح نظیر ہمارا پڑوسی ملک نیپال ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم جمہوریت کو اختیار کر لیں اور انیکشن میں حصہ لیں، جو فسطائی طاقتوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کا مؤثر ذریعہ ہے، اگرچہ اس صورت میں دستور قانون سازی کی لگام انسان کے ہاتھ میں دینا اور انسان کے لیے حاکمیت کا اعتراف کرنا ہے مگر یہ بمقابلہ پہلے کے ایہوں ہلکا اور کم درجے کی خرابی ہے اور قاعدہ یہی ہے کہ جہاں دوشتر ہوں وہاں کمتر درجہ کے شرک کو قبول کیا جائے۔ قرآن حدیث میں خود اس کی مثالیں موجود ہیں:

اکراہ کی صورت میں کلمہ کفر کی اجازت دی گئی (سورہ نحل: ۱۰۶)۔

اخطرہ کی حالت میں حرام کھانے کی اجازت ہے (سورہ بقرہ: ۱۷۳)۔

کفار مکہ سے آپ ﷺ کا حدیبیہ کے مقام پر صلح کرنا جو دس سال تک کے لئے کفار کو کعبۃ اللہ پر غلبہ دینا ہے (بخاری: کتاب الصلح، باب الصلح مع المشرکین صفحہ ۲۵۰۰) انہیں نصوص کے پیش نظر فقہائے کرام نے اس قاعدہ کا استخراج کیا ہے کہ جب دو برائیاں مقابل ہوں تو کم والے کا ارتکاب کر کے بڑے مفسدہ سے بچا جائے گا، چنانچہ الاشبہ میں ہے:

إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضرراً بارتکاب أخفهما (الاشبہ مع الحموی: ۱۰۲۶۱ الفن الاول فی القواعد الکلیہ)۔  
مسلمانوں کے لئے اس انیکشن میں حصہ لینا درج ذیل دلائل سے بھی ثابت ہوتا ہے:

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے ولایت طلب کی تھی: قال اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ (یوسف: ۵۵)۔

حضرت یوسف علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک کافر شخص سے ولایت طلب کی ہے جو بلاذغیر اسلامیہ میں مخالف اسلام طرز انتخاب میں شرکت کے جواز کی دلیل ہے۔

۲۔ جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو حکومت ترک کرنے یا حبشہ سے ہجرت کرنے کا حکم نہیں فرمایا، جبکہ آپ کو معلوم تھا کہ وہ اپنی نصرانی قوم پر اسلامی احکامات کو نافذ نہیں کر پائیں گے۔

۳۔ ان انتخابات میں شرکت نہ کرنے سے کسی حکم کافر کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا، ہاں اگر شرکت کی جائے تو مسلمانوں کے لئے کچھ مصالح اور فوائد ضرور بار آور ہو سکتے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ بعض مصالح کو ثابت کرنا جمیع مصالح کے ترک کر دینے سے بہتر اور احسن ہے۔

۴۔ شریعت کے اصول جلب مصالح اور دفع مناسد کے درمیان دائرہ ہوتے ہیں۔ ان انتخابات میں شرکت کرنے سے مصالح کی تحصیل ہو سکتی ہے اور مناسد کو بھی دور کیا جاسکتا ہے، اس لئے ان میں حصہ نہ لینے کی کوئی وجہ معقول نہیں معلوم ہوتی۔

اگر اسلامی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ”انیکشن“ ایک درجہ میں میل کھاتا نظر آتا ہے۔ گونیا دی طور پر فرق ہے، مگر اس سے بھی راہنمائی مل سکتی ہے:

۱۔ بیعت نقباء: مسند احمد میں اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مختصر یہ ہے کہ براء بن معرور اور کعب بن مالک اپنے اصحاب کے ساتھ ایک مسئلہ کے لئے دوبارہ نبوی میں حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے بیعت کی تمنا ظاہر کی تو آپ ﷺ نے ان سے اس وقت فرمایا تھا: أخرجوا إلی منکم اثنی عشر نقیباً

بیکونویٹ علی قومہہ بما فیہہ (مسند احمد: ۱۵۸۳۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے بارہ افراد کو منتخب کرنے کو کہا تھا، لیکن کسی طریقہ کی تخصیص نہیں فرمائی تھی اور نہ ہی نام لوگوں کو اس میں شرکت کرنے سے منع کیا تھا۔

۲۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ثالث کی تعیین کے لئے لوگوں کی آراء معلوم کی تھی، اکثریت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں تھی، اور انہیں کو لوگوں نے اپنا پیشوا منتخب کر لیا (بخاری: کتاب الاحکام، باب کیف یابح الامام الناس صفحہ ۶۷۸۱)۔

۳۔ مشورہ سے جس طرح لوگوں کا انتخاب ہوتا تھا، اسی طرح ارباب حکومت کی معزول بھی عمل میں آتی تھی، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ بن زیاد کو بصرہ کا والی مقرر کیا، کچھ دنوں کے بعد وہ معزول اور مشرف لوگوں کے ساتھ حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارے لوگوں نے ان کی تعریف کی سوائے اخف بن قیس رضی اللہ عنہ کے۔ یہ حلم و بردباری میں ضرب المثل تھے۔ ان کے سکوت پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ کو معزول کرتے ہوئے کہا: تم لوگ خود ہی ایسے والی کا انتخاب کرو جس سے تم راضی ہو (البدایہ والنہایہ: ۱۰۲/۸۱۰۲ دار احیاء التراث العربی)۔

ان سارے واقعات سے گواہ موجودہ نظام مکمل طور پر میل نہیں کھاتے ہیں مگر کچھ نہ کچھ ہم آہنگ ضرور معلوم ہوتا ہے، تاہم دونوں میں کئی وجوہ سے بنیادی فرق بھی ہے۔

موجودہ صدارتی انتخاب میں پوری عوام کی رائے کا سامنے آنا ضروری ہے، لیکن اسلامی سیاست میں صرف ارباب حل و عقد کا ہونا کافی ہوتا ہے، جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کے سلسلے میں ہوا۔

اسلامی سیاست کیت و افراد پر مبنی نہیں جبکہ موجودہ نظام میں ووٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی بنیاد پر فیصلے ہو جاتے ہیں۔

## ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ تزکیہ و شہادت ہے: ووٹ دینے والا یہ گواہی دیتا ہے کہ امیدوار ولایت اور عہدہ کا اہل ہے، لہذا اس ووٹ کا استعمال کرنا ہوگا، کیونکہ جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ ولا تکتوموا الشہادۃ و من یکتومها فإنہ آثمہ قلبہ (بقرہ: ۱۸۳)۔

حدیث شریف ہے: عن ابی موسی الأشعری قال قال رسول اللہ ﷺ: من کتم شہادۃ إذا دعی إلیہا، کان کمن شہد بالزور (کنز العمال: ۷۰۱۳)۔

جب یہ شرعی شہادت ہے تو قرآن و سنت کے سارے احکامات اس پر بھی جاری ہوں گے، پس ووٹ کو محفوظ رکھنا دین داروں کا تقاضہ نہیں بلکہ اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان پر فرض ہوگا۔

لیکن مذکورہ آیت تحمل شہادت، ادا بیگی اور کتمان کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے، آیت میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ ووٹ شہادت ہے، پس مدعی اور دلیل میں موافقت معلوم نہیں ہوتی، اگر ہم اس کو بالفرض شہادت تسلیم کر لیں تب بھی یہ اشکال سے خالی نہیں، کیونکہ شہادت ماننے کی صورت میں یہ لازم ہوگا کہ اس سلسلے میں عورتوں کے ووٹ کو بعض قرآنی آیات اور باجماع امت نصف تسلیم کریں۔

اسی طرح ووٹ دینے والے میں شاہد کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، مثلاً بلوغ، آزادی، بینائی، قوت گویائی پر قادر ہونا، نیز عادل ہونا وغیرہ۔

اسی طرح شہادت صرف قاضی کی مجلس میں ہوتی ہے، اس کے علاوہ مقامات پر نہیں: ہی اخبار صدق لإثبات حق بلفظ الشہادۃ فی مجلس القاضی (الدر المختار: ۸۰۱۲۴ کتاب الشہادات: زکریا)۔

اس طرح اسے تزکیہ و شہادت کہنا اشکال سے خالی نہیں۔

دوسری رائے: بعض لوگوں نے اس کو وکالت کہا ہے کہ ووٹ دینے والا امیدوار کو اپنا وکیل بناتا ہے۔ وکالت میں انسان اپنے کام کا کسی کو نمائندہ یا وکیل بناتا ہے: وهو إقامة الغير مقام نفسه فی تصرف جائز معلوم (الدر المختار مع رد المختار: ۸۰۲۴۱ کتاب الوکالت: زکریا)

ووٹ ایک حق ہے جس کو استعمال کرتے ہوئے سیاسی امور میں کسی کو نامزد کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارے حلقے سے حکومت کی تشکیل اور وزیر اعظم کے انتخاب میں ہماری طرف سے وکیل ہے۔

لیکن اس کو وکالت کہنا بھی اشکال سے خالی نہیں۔

موکل کو حق حاصل ہے کہ اپنے وکیل کو جب چاہے معزول کر دے، لیکن انتخاب میں ووٹ دینے کے بعد ممبر پارلیمنٹ کو عوام یا ووٹ دہندگان کو معزول کرنے کا حق نہیں ہوتا ہے۔

تیسری رائے: بعض لوگوں نے اس کی حیثیت سفارش کی بتلائی ہے۔

سفارش کہتے ہیں: هي السؤل في التجاوز عن الذنوب من الذي وقع الجنابة في حقه۔

جس امیدوار کو ووٹ دینا ہے اس کے بارے میں ووٹ دینے والا ایکشن کمیشن بورڈ سے سفارش کرتا ہے کہ فلاں شخص ممبر پارلیمنٹ کا اہل ہے اور اس میں اس عہدہ کی ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی نبھانے کی قابلیت و صلاحیت موجود ہے، قرآن کریم نے سفارش و شفاعت کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے:

شفاعت حسنة: بصورت دیگر درست سفارش اس میں شافع اور مشفوع دونوں ماجور ہوتے ہیں۔

شفاعت سيئة: دوسری قسم شفاعت سيئة بری سفارش ہے، اس میں سفارش کرنے والا مشفوع کے ساتھ جرم میں شامل متصور ہوتا ہے، اللہ کے یہاں دونوں کا مواخذہ ہوگا۔ من يشفع شفاعة حسنة يکن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يکن له كفل منها وكان اللہ علی کل شیء مقبلاً (نساء: ۸۵)۔

اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع و لالچ کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے، ووٹ کے سلسلے میں شفاعت حسنة یہی ہے کہ ایسے امیدوار کے حق میں سفارش کرے جو امانت داری اور دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو ادا کر سکتا ہو۔ اس میں قوم و ملت کے لیے درد ہو، خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو اور مخلوق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کر سکتا ہو۔ شفاعت سيئة یہ ہوگی کہ نااہل نالائق ظالم شخص کی سفارش کرے اس کو خلق خدا پر مسلط کر دے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے دور اقتدار میں جو نیک یا بد عمل کرے گا۔ اس میں شریک و مسامح سمجھا جائے گا۔

چوتھی رائے: ایک حیثیت اس کی مشورہ کی بتلائی گئی ہے۔ مشورہ سے حکومت کا قیام اور امور مملکت کو انجام دینا اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ارباب حل و عقد اپنا خلیفہ منتخب کر لیں اور عوام ان کے تابع ہوں۔ خلیفہ ثانی کے انتخاب میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ ثالث کے انتخاب کے لیے ارباب حل و عقد کی ایک کمیٹی چھ سات افراد پر مشتمل تشکیل دی تھی۔ جس میں حضرت عبدالرحمن بن عوف نے بعد میں لوگوں کی آراء کو بھی معلوم کیا تھا۔

ٹھیک اسی طرح عوام امیدواروں کے سلسلے میں ایکشن کمیشن کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ ہماری طرف سے یا ہمارے حلقے سے فلاں شخص کو منتخب کر لیا جائے۔

حدیث شریف میں صحیح مشورہ دینے کا حکم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الاستشارة مؤتمن (ابوداؤد، کتاب الادب باب فی المشورہ) یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے کے بارے میں ائمن ہے اور امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ صحیح اور درست مشورہ دیا جائے۔

ہندوستان کے موجودہ حقیقی تناظر میں ووٹ کی حیثیت شہادت کی نہیں بلکہ دو مفسدوں میں اخف کا ارتکاب کر کے ملی قومی اور مذہبی مفادات کے پیش نظر انتخاب میں حصہ لیتے ہوئے ووٹ دینا ضروری ہوگا۔

مفتاویٰ دارالعلوم کا یہ جزیہ اس بات میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے جس کو نقل کرنا یہاں فائدہ سے خالی نہیں۔

”گورنمنٹ کی کونسلوں کی ممبر میں ووٹ دینا اور ووٹ دلانے میں کوشش کرنا شرعاً نہ فرض ہے نہ واجب۔“

دوسری جگہ مذکور ہے: ”اہل محلہ کو ووٹ دینے پر مجبور کرنا اور ان سے حلف لینا درست نہیں۔“



خلاصہ کلام یہ کہ ہندوستان کے موجودہ رائج نظام میں ووٹ کی حیثیت شہادت کی نہیں، لیکن ملکی، قومی، ملی اور مذہبی تشخصات کی بقاء اور مذہبی مفادات کے پیش نظر ووٹ کا استعمال کرنا ضروری ہوگا۔

مجمع الفقہ الاسلامی نے ۱۲ شوال ۱۴۲۲ھ میں ایکشن کے تعلق سے ایک سمینار منعقد کیا تھا، اس میں جو قراہیوں اور پاس ہوئی تھی ان پر نظر ثانی کے لئے دوبارہ ۲۲ شوال ۱۴۲۸ھ سے مطابق ۸، ۳ نومبر ۲۰۰۷ء سمینار کا انعقاد کیا تھا، اس سابقہ تجویز پر بحث و مباحثہ اور پیش کردہ مقالے پر مناقشات کے بعد مجلس نے جو تجویز پاس کی تھی، اس کا نقل کر دینا افادیت سے خالی نہیں، اس لئے بقرض فائدہ نقل کی جاتی ہے:

غیر مسلم ممالک میں کفار کے ساتھ انتخابات میں مسلمانوں کا شریک ہونا ان سیاسی شرعی مسائل میں سے ہے جن کا حکم مصالح و مفاسد کے مابین موازنہ کی روشنی میں طے کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں فتویٰ زمانے، مقامات اور احوال کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔

غیر مسلم ممالک میں نیشنلسٹی سے بہرہ ور ہونے والے مسلم افراد کے لیے پارلیمانی یا دیگر ایکشنوں میں شرکت کرنا جائز ہے، جس میں شرکت کرنے سے یقینی منافع حاصل ہو سکتے ہوں۔ اسلام کا صحیح چہرہ پیش کرنا مسلمانوں کو اس ملک میں پیش آنے والے حادثات و مسائل کو یقینی بنانے کے لیے انصاف پسند لوگوں کی مدد کرنا اور ان ساری چیزوں کا حصول حسب ذیل قواعد کے موافق ہے:

۱۔ مسلمانوں کو اسمیں شرکت کرنے کا اولین مقصد، مسلمانوں کے فوائد کی تحصیل میں حصہ داری بنانا اور ان سے مفاسد اور نقصان کو دور کرنا ہو۔

۲۔ ان ایکشنوں میں شرکت کرنے سے مسلمانوں کو یہ یقین کامل ہو کہ ان کے اشتراک سے مثبت نتائج مثلاً مسلمانی مراکز کی تعظیم، اپنے مطالبات کو اعلیٰ افسران تک پہنچائے جانے کا امکان اور اپنے دینی و دیوبی مصالح کی حفاظت سے عظیم منافع مرتب ہوں گے۔

۳۔ ان انتخابات میں شرکت مسلمانوں کے اپنے دینی افراط کی طرف موڈی نہ ہو۔

ایکشن میں اپنے آپ کو پیش کرنا:

ہمارا ملک جمہوری نظام پر قائم ہے جس میں ایکشن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس نظام میں امیدوار از خود اپنے رفقاء اور حمایت کنندگان کے ساتھ ایکشن کمیشن بورڈ میں پرچہ نامزدگی داخل کرتے ہیں اور یہ ظاہر دعویٰ کرتے ہیں کہ اس منصب کے اہل ہم ہیں۔ اس کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی مکمل صلاحیت ہمارے اندر موجود ہے اور در پر وہ اپنے آپ کو اس عہدہ کے لیے پیش کر کے اس عہدہ کے طلب گار ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ امیدوار کا بزبان خود مدعی و طالب ہونا اسلامی تعلیمات کے مغائر و متصادم ہے، کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے امت کو تعلیم دی ہے کہ طالب عہدہ کو منصب سے سرفراز نہ کیا جائے، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

لا تسأل الإمارة فإن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها (مسلم: کتاب الامارة، باب النهی عن طلب الامارة صفحہ ۲۸۱۹)۔

اس لیے مناسب صورت اور بہتر طریق کاری یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کرے۔

ملک کی اس وقت جو سیاسی حالت ہے، یعنی جمہوری نظام کے موافق امور مملکت کو انجام دینا۔ ظاہر بات ہے اس جمہوری نظام کے عہدے اور مناصب اسلامی مملکت کے عہدوں سے من کل الوجہ میل نہیں کھاتے، البتہ ان مناصب عہدوں کے طلب کرنے کا حکم ضرور استخراج کیا جاسکتا ہے۔

ایکشن کے تعلق سے امیدوار کا اپنے آپ کو پیش کرنا جائز ہے یا نہیں، معاصر علماء کا اس سلسلے میں اختلاف ہے۔

عبدالکریم زیدان کہتے ہیں: ایکشن میں امیدوار بننا طلب ولایت کے قبیل سے ہے۔ چاہے وہ امامت عظمیٰ کا طلب گار ہو یا اس سے فروتر عہدہ کا، اس لیے یہ جائز نہیں۔

علامہ یوسف قرضاوی اور ان کے مثل کچھ دیگر معاصر علماء کہتے ہیں کہ ایکشن میں امیدوار بننا ممنوعہ طلب ولایت کے باب سے نہیں، اس لیے کہ یہ ایک

محدود دائرے میں رہ کر قوم و ملت کی ترجمانی ہے، لہذا اس کو اس طلب امارت پر قیاس نہیں کریں گے، جس کی احادیث میں مذمت بیان کی گئی ہے، کیونکہ نائب نہ تو امیر ہے نہ وزیر نہ والی حکمراں۔

لیکن احناف کے نزدیک چونکہ کسی بھی عہدہ کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا درست نہیں، جیسا کہ شامی کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا، اس لیے ایکشن میں بھی اپنے آپ کو پیش کرنا ممنوع ہوگا۔

البتہ اگر کوئی امیدوار ذاتی مفاد کے پرے قوم و ملت کے منافع و مصالح کو ترجیح دیتے ہوئے کھڑا ہو اور اس میں اس عہدہ کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی قابلیت موجود ہو اور اس کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر بھی قادر ہو تو اس کو امیدوار بن کے اپنے آپ کو پیش کرنا جائز ہے، اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فرمان ہے۔ جس کو قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے: قال: اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ (یوسف: ۵۵)۔

اس آیت کے اندر حضرت یوسف علیہ السلام نے کسی بھی عہدہ کو سنبھالنے کے لیے بنیادی طور پر دو خوبیاں بیان کی ہیں: حفیظ ہونا، علم ہونا، حفیظ سے حقوق کی حفاظت و نگہبانی اور امانت داری کی طرف اشارہ کیا اور علیم سے فرائض منصبی کو بروئے کار لانے کی صلاحیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

مخالف شریعت قوانین وضع کرنے والے اداروں کا ممبر بننا جب کہ منتخب ممبر کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق نہ ہو، اس کا ممبر بننا درست نہیں۔

اسی طرح قانون ساز اداروں کے منتخب ارکان جن کو وفاداری کا حلف لینا پڑے اور اس سلسلے میں وہ مجبور ہوں کسی قسم کا احتجاج، مخالفت یا اس قوانین کو بدلنے کے تئیں آواز اٹھانے کا حق نہ رکھتے ہوں تو اس کا ممبر بننا بھی صحیح نہیں ہوگا۔ دلائل درج ذیل ہیں:

اس میں شمولیت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعاون، دشمنان اسلام کے بازو کو مزید مستحکم و طاقت ور بنانا ہوگا اور ایسا کرنا ناجائز ہے اور یہ بالواسطہ اس کے باطل عزائم اور نظریات کی تائید کرنا ہے اور معصیت پر اعانت کرنا ہے جو نص قرآنی سے حرام ہے: ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان و اتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب (مانندہ: ۲)۔

البتہ اگر ممبر بننے سے اس بات کا امکان ہو کہ ان مخالف اسلام قوانین کے خلاف آواز اٹھانے اور ان کو تبدیل کرنے کا حق ہوگا تو اس کی اجازت ہوگی کیونکہ یہاں دو مفسدے ہیں:

۱۔ ممبر بننا جس کے ضمن میں وفاداری کا حلف، اسلام کے خلاف سازش رچنے میں شریک ہونا۔

۲۔ ایسے قانون کا پاس ہو جانا جس کے نتیجے میں سارے لوگوں کو اس پر عمل کے لیے مجبور ہونا پڑے۔ ظاہر بات ہے کہ ان میں ثانی بڑا مفسدہ ہے، اس لیے اس کی رعایت کرتے ہوئے اخف مفسدہ (شرکت کا جواز) کا ارتکاب کیا جائے گا۔

بائیل پر حلف لینا:

فقہ میں قرآن کے سوا دیگر کتب ساویہ، توریت اور زبور وغیرہ کے تعلق سے عموماً تین مسئلے آتے ہیں: جنابت کی حالت میں ان کا چھونا اور نماز میں قرأت قرآن کے بجائے زبور وغیرہ کی تلاوت کرنا۔ ان کے ذریعے سے قسم کھانا۔

پہلا مسئلہ: جنابت کی حالت میں ان کو مس کرنا۔ اس کے متعلق درمختار میں ہے:

یجرم بہ أي بالأكبر وبالأصغر مس مصحف، أي مافیہ آیة کدرهم وجدار، وهل مس نحو التوراة كذلك؛ ظاہر کلاهم لاو فی هامشہ لکن قدمنا آنفا عن المجتبیٰ أنه لا یجوز (الدرالمختار: ۱۰۲۱۵ کتاب الطہارۃ) نعم! ینبغی أن یحضر بائیل إذا ما یدبل کما سبقت نظیرہ (ردالمحتار: ۱۰۲۱۵ از کربا)۔

(حدث اکبر اور حدیث اصغر کے ساتھ مصحف کا چھونا حرام ہے، یعنی وہ جس میں قرآن کی آیت ہو جیسے: درہم دیوار وغیرہ اور کیا تورات کا چھونا ایسا ہی ہے فقہاء کے کلام کا ظاہر یہی ہے کہ یہ حرام نہیں۔ لیکن علامہ شامی لکھتے ہیں: ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کا چھونا بھی جائز نہیں۔

اور جنبی کے لیے تورات، انجیل اور زبور کی تلاوت مکروہ ہے، کیونکہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور جس حصے میں تحریف ہوئی ہے وہ غیر متعین ہے۔  
دوسرا مسئلہ: قرأت قرآن کے بجائے اگر کوئی زبور اور انجیل میں سے تلاوت کرے تو کیا یہ کلام الناس سے ہو کر نماز فاسد ہوگی یا نماز درست ہوگی، اس سلسلے میں درمختار میں ہے:

قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل إن قصة تفسد وإن ذكر لا (الدر المختار: ۲۰۱۸۵ ذکر کیا)۔  
(فارسی میں قرأت کی، یا تورات و انجیل سے پڑھا، اگر قصے ہوں تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر ذکر و اذکار ہوں تو نماز فاسد نہیں ہوگی)۔  
بحر میں یہی مسئلہ ہے، لیکن ابن نجیم نے اس کی قرأت کو مطلقاً کلام الناس میں شمار کیا ہے، اسی وجہ سے اسے مفید صلاۃ قرار دیا ہے۔

ودخل في التكلّم المذكور قراءة التوراة والإنجيل فإنه يفسد كما في المجتبى وفي جامع الكرخي: مفسدة (البحر  
ذکر کیا: ۲، ۵۰۳) (مذکورہ تکلم میں تورات اور انجیل کی قرأت بھی داخل ہے، کیونکہ یہ بھی نماز کو فاسد کر دیتی ہے)۔  
مگر علامہ شامی نے نہر الفائق سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم اس نئے کے ساتھ خاص ہے جس میں تحریف اور تبدیلی ہوگئی ہو، کیونکہ ماسبق میں یہ بات آچکی ہے  
کہ غیر محرف کا پڑھنا جنبی پر حرام ہے۔

قال في النصر أقول يجب حمل ما في المجتبى على المبدل منها إن لم يكن ذا ذكرا وقد سبق أن غير المبدل  
محرم على الجنب قرائته (رد المحتار ذکر کیا: ۲۰۲۴۱)۔  
تیسرا مسئلہ: اگر کوئی انجیل، تورات اور زبور کی قسم کھائے تو یمین منعقد ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلے میں شامی میں ہے:

ولو قال فهو برئ من القرآن وبرئ من التوراة وبرئ من الإنجيل وبرئ من الزبور، فهي أربعة أيمان  
(رد المحتار ذکر کیا: ۵۰۵۸۲)۔

(اگر کوئی کہے کہ وہ قرآن سے بری ہے اور تورات سے بری ہے اور انجیل سے بری ہے اور زبور سے بری ہے تو یہ کُل چار قسم ہو جائیں گی)۔  
مالکیہ کے نزدیک بھی تورات اور انجیل سے یمین منعقد ہو جاتی ہے۔

وقال المالكية: ينعقد القسم بالتوراة وبالإنجيل وبالزبور (موسوعه فقهية: ۷۰۲۵۶)۔  
شافعی کے نزدیک بھی قسم منعقد ہو جاتی ہے، بشرطیکہ ان کے الفاظ کو نہ مراد لیا جائے۔

وقال الشافعية: تنعقد اليمين بكتاب الله والتوراة والإنجيل ما لم ير الألفاظ (موسوعه فقهية: ۷۰۲۵۶)۔  
حنابلہ کے نزدیک کلام اللہ، تورات، انجیل اور زبور سے قسم کھانا یمین ہے۔

وقال الحنابلة: الحلف بكلام الله تعالى والمصحف والقرآن والتوراة والإنجيل والذبور يمين (موسوعه  
فقهية: ۷۰۲۵۶)۔

مذکورہ مسلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محرف اور غیر محرف میں فرق ہے، غیر محرف کو اہمیت و فوقیت حاصل ہے۔

لیکن موجودہ نسخ محرف اور مبدل ہیں، اس لیے ان پر کسی مسلمان کے لیے قسم کے وقت ہاتھ رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر کسی ملک میں تورات و انجیل پر ہاتھ  
رکھ کر قسم کھانا لازم ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کی جگہ قرآن کا مطالبہ کریں۔ اگر سنوائی نہ ہو تو ایسا شخص مکرہ ہوگا اور ایسے شخص کے لیے ان دونوں  
یا کسی ایک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا واجب کہ ان کی تعظیم و تقدیس کا ارادہ نہ ہو جائز ہوگا، تفصیل کے لئے دیکھئے: (موقع مجمع الفقہ الاسلامی / الفتاویٰ بحکم وضع الید علی التوراة تاریخ  
النشر: ۲۳ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ)۔

## غیر مسلم پارٹیوں میں شرکت کرنا:

ہندوستان، جمہوری ملک ہے جس میں بہت سی پارٹیاں ہیں، بعض پارٹیاں ایسی ہیں کہ جو اعلانیہ طور پر مسلم دشمنی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور ان کے منشورات بھی مسلم مخالف ہوتے ہیں۔ بعض سیکولر تصور کی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے تحفظ کے واسطے گاہے ڈھال بن جاتی ہیں، گواہ اپنے مفاد کی خاطر..... مگر ایسی پارٹیوں کے بھی بعض دفعات مغائر اسلام ہوتی ہیں، لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی ایسی مستحکم پارٹی نہیں جو ملکی سطح پر محیط ہو اور اس کی دفعات موافق اسلام ہوں اور جمیع افراد اس سے جڑے ہوں۔ اگر اس طرح کی کوئی شکل نکل آوے اور اللہ تعالیٰ مسلمانان ہند کو کسی ایک مسلم جھنڈے کے تحت جمع کر دیں تو یہ سب سے بہتر اور اعلیٰ بات ہوگی۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

پہلی قسم کی پارٹی جس نے اعلانیہ مسلمانوں اور اسلام مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنا لیا ہو اور ان کی اسلام دشمنی اور مسلم عداوت و بغض ظاہر ہو تو ان کی حمایت کرنا یا اس میں شمولیت اختیار کرنا یا کسی بھی نوع سے ان کی امداد کرنا ناجائز ہوگا، خواہ کسی کا ارادہ شمولیت کے ذریعے سے اس کے ایجنڈے تبدیل کرنے کا ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسے افراد کی شمولیت سوائے مسلم دشمنی بڑھانے کے اور کوئی فائدہ نہیں رکھتی، کیونکہ افراد کی وہ ذاتی رائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو وہ بھی ایسی پارٹی کے ساتھ جن کی بنا اور تعمیر اسلام کے مخالف ہو کوئی اہمیت و حیثیت نہیں رکھتی اور ایسی آواز صدائے بازگشت ہو کر کفار خانے میں طوطی کی آواز کے مانند ہو کر دیواروں سے اپنا سر ٹکراتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ نیک ارادہ سے ایسی پارٹیوں میں شمولیت سے جو خاطر خواہ فائدہ ہونا چاہیے وہ اب تک حاصل نہیں ہو پایا ہے اور نہ ایسے لوگوں کی ریشہ دوانیاں کم ہوتی نظر آتی ہیں، بلکہ لٹے اس میں دن بہ دن اضافہ ہوتا ہے، البتہ ایسی پارٹیوں کو شمولیت سے ضرور فائدہ ہوتا ہے اور افراد کی کثرت سے استحکام ہوتا ہے، اس لیے تعاون علی اللام کی وجہ سے شمولیت غیر درست ہوگی۔

البتہ جن پارٹیوں کا شیوہ مسلم مخالفت کا نہ ہو، وہ سیکولر ہوں اور محض بعض دفعات ہی متصادم اسلام ہو تو ایسی پارٹیوں میں باعزت معاہدہ کے تحت شمولیت جائز ہوگی، کیونکہ ان میں شمولیت اختیار کر کے سیاسی اعتبار سے مضبوط ہو کر ان بعض مخالف اسلام منشورات کی تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے۔

## مسلم پارٹی کی تشکیل کا حکم:

ہندوستان، جمہوری ملک ہے، جہاں ایکشن کے ذریعے حکومتوں کی تشکیل ہوتی ہے، چنانچہ جس پارٹی کو اکثریت حاصل ہوتی ہے وہی پارٹی حکمراں بنائی جاتی ہے، اس لیے اصولی طور پر ہونا یہ چاہئے کہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ پارٹی ہو اور تمام مسلمان متحد ہو کر ایسی ہی پارٹی بنا لیں جن کی بنیاد دین اسلام کی آب یاری و چین اسلام کی پاسبانی پر ہو اور جن کے اصول و اساس دین اسلام کے قواعد کے موافق ہوں، جن کے ذریعے سے مسلمانوں کو اپنی اجتماعی قوت و طاقت کے مظاہرہ کا موقع مل سکے، اس سلسلے میں قرآن کریم کی وہ آیات جس میں متحد رہنے اور تفرقہ بازی سے منع کیا گیا ہے۔ متدل بن سکتی ہیں۔

عصر حاضر کے بعض محققین نے غیر مسلم ممالک میں ایسی اسلامی پارٹیوں کے تاسیس کی اجازت دی ہے جن سے مسلمانوں کا مفاد وابستہ ہو اور جن سے ان کے حقوق کی نگہبانی ہو سکتی ہو۔ اس نظریے کے حاملین میں شیخ ابن سعدی ہیں۔

بعض حضرات نے اس کو مصلحت پر معلق کیا ہے، اگر مصلحت متقاضی ہو تو پارٹی بنائی جائیں ورنہ اس سلسلے میں توقف اختیار کیا جائے (الاتخاب للولایات العلمۃ: ۲۱۶)۔

لیکن صحیح بات یہ نظر آتی ہے کہ یہ حکم ہر علاقوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ہو، ہر جگہ ایک ہی طریقہ کار کو نہ اپنائیں ورنہ بہت دقت و دشواری پیش آ سکتی ہے۔ علیحدہ مسلم سیاسی پارٹی کا وجود انہیں علاقوں میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جہاں پر مسلمانوں کی آبادی مرکز ہو یا جہاں مسلم پارٹی کے قیام سے مخالف ووٹ متحد نہ ہوتے ہوں اور انہیں (برادران وطن کو) مسلم پارٹی پر اعتماد کامل ہو اور اس پارٹی کی حمایت کے وہ قائل ہوں، چنانچہ کیرل میں مسلم لیگ اور بعض شمالی ہند میں ایسی پارٹیوں سے مسلمانوں کو فائدہ ملا ہے، اسی طرح آسام میں حضرت مولانا الحاج بدرالدین اجمل صاحب کی پارٹی کو بھی زبردست پوزیشن حاصل ہوئی ہے، لیکن جہاں ایسی آبادی مرکز نہ ہو وہاں پارٹی کے قیام سے فائدہ کے بجائے نقصان کا زیادہ امکان ہوگا، کیونکہ ایک دو ممبران کے منتخب ہو جانے سے نئی تشکیل پانے والی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا، بلکہ اگر انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ انہیں مسلمانوں کا ووٹ ملا ہی نہیں تو اس قیام کا منفی اثر پڑے گا اور وہ مسلمانوں کو گزند پہنچانے کی سعی کریں گے۔ اب اگر وہ علیحدہ پارٹی تشکیل نہ دے سکیں تو ایسے علاقوں کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایک ایجنڈہ مرتب کر کے اپنے

مطالبات کو ایسی سیکولر پارٹیوں کے پاس لے جائیں اور ان کی حمایت کریں جو مذہب سے ہٹ کر ملک کی سالمیت کو ترجیح دیتی ہوں۔  
عورتوں کا ایکشن میں حصہ لینا:

ستر اور پردہ کی بنا پر عورتوں کو فرض عبادات میں بھی ان سارے مقامات سے دور رکھا گیا ہے، جس میں عورتوں کو گھروں سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور مردوں سے اختلاط کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے میں سٹائیس گناز یا دہ ثواب ملتا ہے (بخاری: ۶۳۵)۔

مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے عورتوں کے لیے فرمایا: گھر کے اندر تمہارا نماز پڑھنا اپنے قبیلہ کی مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے (مسند احمد: ۲۶۵۳۹) اسی لیے:

۱- عورت پر جماعت واجب نہیں۔

۲- اس پر جمعہ و عیدین واجب نہیں۔

۳- اذان و اقامت اور مردوں کے واسطے امامت کرنا جائز نہیں۔

۴- تنہا حج کو جانا (بغیر محرم کے) جائز نہیں۔

۵- اس پر جہاد فرض نہیں۔

۶- سب سے اہم اور مقدس عبادت نماز میں وہ صورتیں اختیار کرنے پر مامور ہیں جن میں تستر زیادہ ہو، ان تمام احکام کا منشا یہی ہے کہ عورتیں بلا ضرورت گھروں سے باہر نہ نکلیں، البتہ ضرورت اور حاجت کے مواقع ہر جگہ مستثنیٰ ہوتے ہیں، اس لیے عورتوں کو بھی اگر ایسی ضرورت پڑے جس میں نکلنا ناگزیر ہو اور نکلے بغیر سخت حرج و مشقت کا سامنا ہو یا نہ نکلنے میں مسلمانوں کے مفادات عامہ پر زبرد پڑتی ہو تو ایسے مواقع پر گنجائش ہوتی ہے، اسی کو ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا: إنه قد اذن لکن ان تخرجن لحاجتکمن (بخاری: ۴۷۹۵) (تم عورتوں کو ضرورت کی وجہ سے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے)۔

اسی مضمون کو دوسری حدیث میں بطور اصول یوں فرمایا: لیس للنساء نصیب فی الخروج الا مضطرة (کنز العمال: ۴۵۰۶۲) (عورتوں کے لیے گھروں سے نکلنے میں کوئی حصہ نہیں الا یہ کہ وہ نکلنے پر مجبور ہوں)۔

مثلاً معتدات الوفات کو تحصیل رزق کے لیے دن میں نکلنے کی اجازت ہے (الدر المختار: ۲۲۳ کتاب الطلاق باب العدة فصل فی الحداد: ذکر یا)۔

عورتوں کے ایکشن کے تعلق سے کردار اور دوٹنگ میں شرکت کرنے کے متعلق فقہاء کی دو آراء ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو دوٹ دینا جائز ہے اور وہ اپنے اس حق کا استعمال کرنے کی مجاز ہیں۔ اس نظریے کے حامل ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، نواد احمد وغیرہ ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ان کو دوٹنگ میں حصہ لینا جائز نہیں۔ اس کے قائل جامعہ ازہر کی افتاء کمیٹی کے کبار علماء اور عبدالمکریم زیدان وغیرہ ہیں۔

پہلے گروہ نے اپنے نظریے پر قرآن و احادیث و قیاس اور آثار سے استدلال کیا ہے، ارشاد باری ہے: یا ایہا النبی اذا جائت المؤمنات

یبايعنك علی ان لا یشرکن بالله (متحنہ: ۱۲)۔

یہ آیت مردوں کے مانند عورتوں سے بیعت پر دلالت کرتی ہے اور عمومی طور پر سارے احکام اس میں داخل ہیں، خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں اور مردوں کو دوٹ دینے کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ہوگی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ کو رائے دی تھی اور آپ انہیں کے کہنے پر احرام سے حلال ہو گئے تھے۔ اور دوٹ اپنی رائے کے اظہار کا نام ہے۔

دوٹ کی شرعی حیثیت مصطفیٰ السباعی کے نزدیک توکیل ہے اور شریعت میں کہیں ایسی نظیر نہیں کہ عورت وکیل نہیں بنا سکتی بلکہ مردوں کی طرح اس کو بھی اختیار دیا گیا ہے، اس لیے اس کو بھی دوٹ میں شرکت کرنا اور دوٹ ڈالنا جائز ہوگا۔

خليفة ثالث کے تعین میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا عورتوں سے مشورہ لینا بھی اس سلسلے کی ایک دلیل ہے:

ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة والله عزيز حكيم (بقرہ: ۲۲۸) (اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے، دستور کے موافق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے)۔

وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى (احزاب: ۳۲) (اور قرآن پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھانا دستور تھا۔ پہلے جہالت کے وقت میں)۔

ان آیات میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قیادت اور برتری محض مردوں کے لیے ہے اور عورتوں کو اپنے گھروں کو لازم پکڑنا ہے۔ یہ حکم اگرچہ ازواج مطہرات کو ہے، لیکن باجماع مفسرین اس میں عام عورتیں بھی داخل ہیں۔ اس لیے ان عورتوں کا نظرناظروریات اور مستثنیات میں سے ہوگا جس کا جواز بھی بہ قدر ضرورت ہوگا۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے کر ووٹ دینا کوئی شرعی ضرورت نہیں، اس لیے ان کا گھروں سے نکلنا جائز ہوگا۔

کسریٰ کے انتقال کے بعد جب اہل فارس نے اس کی بیٹی کو اس کا جانشین بنایا اور آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا: ایسی قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنے امور کا والی عورتوں کو بنایا ہو: لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة (بخاری: کتاب المغازی باب کتاب النبی الی کسریٰ و قیصر صفحہ ۶۱۲)۔

قوم کی عدم فلاح کا سبب مونث کا والی ہونا ہے۔ اس لیے عورتوں کو ولایت عامہ کے کسی بھی خانے میں رکھنا موجب خسران و ہلاکت ہے اور یہ بدیہی بات ہے کہ ووٹ دینا ولایت عامہ کے قبیل سے ہے۔

تعال صحابہ: نبی کریم ﷺ کے اس دارفانی سے کوچ کرنے کے بعد بنو ساعدہ میں لوگوں کا زبردست هجوم تھا اور انتخاب خلیفہ اول کا قضیہ تھا، امیر منہا و امیر منکھ جیسا ما حول بن گیا تھا، لیکن اس معاملے میں بھی عورتوں کو نہیں بلایا گیا اور نہ ہی بعد میں ان سے بیعت لی گئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مرض الوفا میں چھ لوگوں کو نامزد کر کے کہا تھا کہ یہی لوگ اپنا خلیفہ ثالث چن لیں گے، لیکن اتنے اہم معاملے میں بھی عورتوں کو دعوت نہ دی گئی۔

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جن میں عورتوں کو اس معاملوں سے دور رکھا گیا، اس لیے اصحابی کالنجوم۔ ما انا علیہ واصحابی کے پیش نظر ان حضرات کے افعال و اعمال کی بناء پر عورتوں کو پارلیمانی الیکشن میں بھی حق رائے دہی سے محروم رکھا جائے گا۔

لیکن ہندوستانی حالات کے تناظر میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان یہاں اقلیتی طبقے میں آتے ہیں، جن کی اہمیت و حیثیت محض ان کے ووٹ ہی کی وجہ سے قائم ہے، اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے ووٹ کو منتقل کرنے کے لیے ارباب حکومت مسلمانوں کے مفاد پر نگاہ رکھتے ہیں اور کچھ سیاسی وعدے کر لیتے ہیں، گو کہ ان میں سے کم ہی پورے کیے جاتے ہوں، ادھر دوسری طرف اس جمہوری نظام میں ووٹ ایک موثر ہتھیار بن چکا ہے جن کے ذریعہ فسطائی اور مسلم دشمن، تشدد آمیز جماعتوں کو زیر کیا جاسکتا ہے اور ملک کو انارکی و آمریت سے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر مسلمان عورتیں ووٹ ڈالنے سے باز رہیں تو ایک طرف جہاں مسلمانوں کے اقتدار و اہمیت میں کمی ہوگی، وہیں دوسری طرف ملک کی جمہوریت و سالمیت کو برباد کرنے والی جماعتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح مسلم قوم و ملت کو زبردست خسارے کا منہ دیکھنا پڑے گا اور پھر اسلام و مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی آواز سے نکل لینے والا کوئی نہ رہے گا، اس لیے اگر کوئی عورت الیکشن میں ووٹ ڈالنا چاہے تو اس کے لیے درج ذیل شرائط کے ساتھ اجازت ہوگی:

۱۔ مکمل پردہ میں ہو کر باہر نکلے۔

۲۔ معطر ہو کر نہ نکلے۔

۳۔ ایسا زیور پہن کر نہ نکلے جس سے آواز آتی ہو۔

۴۔ لباس جاذب نظر بھڑکاؤ اور پرکشش نہ ہو۔

۵۔ اگر کبھی اتفاقاً کسی مرد سے گفتگو کی نوبت آ جائے تو سخت لہجہ میں گفتگو کریں، نرم لہجہ میں کلام کرنے سے گریز کرے۔

۶۔ حتی الامکان مردوں کے اختلاط سے پرہیز کرے، مثلاً عورتوں کے مخصوص اہتھ کا ہی رخ کرے۔ اس باب میں احسن الفتاویٰ کا یہ مسئلہ بھی افادیت سے خالی

نہیں۔ اس لیے اس کو بھی زیب قرطاس کیا جاتا ہے۔

”عورتوں کے لیے ووٹ استعمال کرنا اور انتخابات میں حصہ لینا جائز نہیں، خواتین کو کسی عہدے کے لیے تجویز کرنا گناہ ہے، البتہ جب انتخابات اسلامی وغیر اسلامی نظریہ پر مبنی ہو، یا ایک امیدوار صالح اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا امیدوار فاسق ہو اور خواتین کا ووٹ استعمال نہ کرانے میں دین کو خطرہ ہو تو استعمال کرنا ضروری ہے (حسن الفتاویٰ، ۳۱/۱۳۱ دارالاشاعت، دیوبند)۔

عورتوں کا امیدوار اور قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

عورتوں کو جن عہدوں پر فائز کیا جاسکتا ہے اور جن کا تذکرہ فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ عمومی طور پر تین قسم کے ہیں:

(۱) امامت عظمیٰ، (۲) وزیر بنانا، (۳) عہدہ قضا کے لئے نامزد کرنا۔

امامت عظمیٰ کے لئے تین بنیادی شرطیں ہیں:

(۱) ولایت کاملہ کی اہلیت کا ہونا، (۲) عدالت کا ہونا، (۳) کفایت سیاسی کا ہونا۔

ولایت کاملہ کے ضمن میں درج ذیل شرائط آتی ہیں:

عاقل ہونا، آزاد ہونا، مذکر ہونا۔

دوسری بنیادی شرط عدالت ہے، مفہوم یہ ہے کہ اس منصب پر فائز ہونے والا شخص گفتار میں سچا ہو، امانت داری ظاہر ہو، محرمات سے دور رہنے والا ہو، حالت رضا و غضب میں معتدل ہو، جس کسی میں یہ اوصاف پائے جائیں تو وہ اس عظیم عہدہ کا اہل ہو سکتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک عدالت کا ہونا صحت و انعقاد دونوں کے لئے ضروری ہے۔ البتہ حنفیہ کے نزدیک کراہت کے ساتھ فاسق کی تولیت جائز ہے۔

موضوع کے تعلق سے جو شرط ہے وہ ہے مذکر ہونا، اس شرط کے تعلق سے بھی بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے:

جمہور فقہاء کے نزدیک لازم اور ضروری ہے کہ اس منصب کا اہل مذکر ہو، البتہ خوارج کا بعض فرقہ اور بعض معاصر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ عورت بھی امامت عظمیٰ کی مستحق بن سکتی ہے اور اس کو یہ عہدہ سپرد کیا جاسکتا ہے۔

جمہور کے دلائل: الرجال قوامون علی النساء (نساء: ۳۴)۔ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (بقرہ: ۲۲۸)۔

وقرن فی بیوتکن (احزاب: ۳۴)۔

بنیادی طور پر عورتوں کو گھروں میں قرار پکڑنے کا حکم ہے اور منصب امامت میں کھلے رہنے، معاشرہ و افواج کے سامنے آنے اور سیاسی امور میں ارباب حل و عقد سے مشورہ کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ عورتوں کو مردوں کے اختلاط سے منع کیا گیا ہے۔ نیز امامت عظمیٰ میں امت کی سیاسی اور شرعی گتھیوں کو سلجھانے، فوج کی نگہداشت، قابل صالح لوگوں کو عہدہ دینا، نااہل کو برخاست کرنا، دشمنوں باغیوں سے صف آرائی اور مقابلہ کرنا، اموال کو ان کے صحیح مصارف میں خرچ کرنا وغیرہ امور کو انجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان اہم امور کو مرد جس طرح بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔ عورتیں نہیں دے سکتیں۔

منصب وزارت:

وزارت: یہ شرعی ولایت ہے، اسی سے وزیر ہے اور یہ ایسے آدمی سے عبارت ہے جس کے دین پر اعتماد کیا گیا ہو اور خلیفۃ المسلمین، پیش آنے والے مسائل میں اس سے مشورہ لیتا ہے۔

پھر اس کی دو قسمیں ہیں: وزارت تفویض اور وزارت تنفیذ۔

وزارت تفویض امام المسلمین کسی آدمی کو وزیر بنانے جس کو اس بات کا اختیار ہو کہ وہ تدبیر امور میں اپنی رائے سے کام کو انجام دے سکے، ایسے شخص کی ذمہ داریاں ہیں قاضی اور والی مقرر کرنا۔ اموال کو ان کے مصارف میں خرچ کرنا، لشکر کو روانہ کرنا اور ان کے علاوہ دیگر امور سلطانی کی نگرانی ہوتی ہے جن کو انجام دے کر یہ بادشاہ کو مطلع کرتا ہے۔ پھر امیر اپنی صواب دید پر جس کو چاہتا ہے نافذ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ وزیر اور امیر المسلمین میں بنیادی طور پر کچھ فرق

بھی ہوتا ہے۔

صرف بادشاہ وقت کو ولی عہد مقرر کرنے کا اختیار ہوتا ہے وزیر کو نہیں۔ صرف حاکم وقت کو ائمہ کو معزول کرنے کا اختیار ہوتا ہے وزیر کو نہیں۔ وزیر نے جس آدمی کو عہدہ دیا ہے بادشاہ اس سے سلب کر سکتا ہے لیکن بادشاہ نے اگر کسی کو عہدہ دے دیا تو وزیر ہٹانے کا مجاز نہیں ہوتا۔ یہ عہدہ پارلیمانی طرز کی حکومتوں میں وزیر اعظم سے مشابہ ہوتا ہے (المرأة الحقوق: ۲۶۶)۔

دوسری قسم وزارت تنفیذ ہے۔ یہ ایسا شخص ہوتا ہے جس کو بادشاہ وقت نے اپنے اجتہاد سے کام کرنے کی اجازت نہ دی ہو، بلکہ اسے اپنی اطاعت اور فیصلے کے نفاذ اور اپنے احکام کا التزام کرنے کا پابند بنایا ہو۔ ایسا شخص عمومی کاموں کا نگران ہوتا ہے، امام ماوردی نے اس کے لیے درج ذیل شرائط بیان کی ہیں: امانت، راست گوئی، قلت طمع، بغض و عداوت سے محفوظ ہونا، تذکیر، ذکاوت، اہل ہوا میں سے نہ ہونا، عدالت و تجربہ، انہوں نے حریت اور اسلام کو شرائط میں نہیں لیا چنانچہ ان کے نزدیک ذمی کو وزیر تنفیذ بنانا جائز ہے۔

مگر فقہائے کرام کی ایک جماعت نے اس کو دلائل کی روشنی میں لازم قرار دیا ہے۔

عورتوں کو وزارت تنفیذ سپرد کرنے کے سلسلے میں جمہور متقدمین فقہاء کا یہ موقف ہے کہ اسے یہ عہدہ نہیں دیا جاسکتا ہے، اس کے لئے مذکورہ نا ضروری ہے۔ البتہ بعض معاصر علماء عبد الحمید اشوری، ظافر القاسمی کا نظریہ یہ ہے کہ عورت بھی اس عہدہ کی اہلیت رکھتی ہے۔ مذکورہ نا لازمی اور ضروری نہیں۔ جمہور کے دلائل اس سلسلے میں وہی ہیں جو امامت عظمیٰ میں گزر چکے ہیں۔

وزارت تنفیذ بھی عورتوں کو سپرد نہیں کیا جاسکتا اور یہی جمہور علماء کا موقف ہے۔ دلائل وہی ہیں جو سابق میں گزر چکے ہیں۔

عورت کا الیکشن میں امیدوار بننا:

عورت کے پارلیمانی الیکشن میں امیدوار بننے کے تعلق سے تین آراء ہیں: معاصر علماء میں ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ عورت قوم و ملت کے ترجمان کی حیثیت سے ممبر بن سکتی ہے۔ یہ رائے نواد احمد، عبد الحمید متولی اور عبد الحکیم عبد اللہ کی ہے۔

دوسری طرف مصر کی جامعہ ازہر کی افتاء کمیٹی اور معاصر علماء میں شیخ زکریا، عبد اللہ امیر الحجری، حسین مخلوف اس بات کی طرف گئے ہیں کہ ان کا امیدوار بننا جائز ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کا کہنا ہے کہ عورت کو نگران بننے کی ممانعت اسلام میں نہیں، کیونکہ نگران ہونے سے قبل معاشرہ کے احوال اور اس پر مطلع ہونے کے واسطے علم ساجیات سے واقف ہونا ضروری ہے، چنانچہ اسی کے نتیجے میں بہت ساری عورتیں عالمہ فاضلہ گزری ہیں، اس لئے عورت کا فی نفسہ نگران بننا جائز ہے، البتہ خارجی امور، مردوزن کا اختلاط، اسلامی آداب و اخلاق کی خلاف ورزی، گھروں میں تخلف و بغاوت کی ہوا کا جنم لینا، عورتوں کا گھروں اور بال بچوں کی نگہداشت میں کمی کے باعث عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس میں نگران بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

جن لوگوں نے منع کیا ہے، انہوں نے اپنے نظریہ پر ان آیات سے استدلال کیا ہے جن میں عورتوں کو پردہ میں رہنے اور اختلاط سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جن کا بیان امامت عظمیٰ میں ہو چکا ہے۔

نیز ان احادیث سے بھی استدلال کیا ہے:

لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة (بخاری: ۲۱۲۳)۔ إذا كانت أمورکم إلى نساءکم فبطن الأرض خیر من ظہرہا

(ترمذی: ۲۲۶۶)۔ المرأة راعیة علی أهل بیت زوجها وولده وہی مسئولة عنهم (ابوداؤد: ۱۹۲۸)۔

ولایت عامہ: جس میں ممبر پارلیمنٹ بھی شامل ہے، کی ذمہ داری شریعت نے صرف مردوں پر ڈالی ہے۔ عورتوں کو اس سلسلے میں دور رکھا ہے اور یہی دستور صدر اول سے چلا آ رہا ہے، جبکہ پچھلے زمانے میں عورتیں مہذب، زیرک، چالاک اور عقل مند ہوا کرتی تھیں، حتیٰ کہ بعض مردوں پر بھی فائق تھیں، مثلاً: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، لیکن اس وقت کسی عورت نے عہدہ کو طلب نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی، اگر یہ جائز ہوتا تو کسی نہ کسی مرحلے میں اس پر ضرور عمل ہوتا ہے، مگر تاریخ اسلامیہ اس کی نظیر سے خالی پڑی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناجائز ہے، اس لئے ان آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں عورت کا الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہوگا۔ قانون ساز اداروں کی مہر شپ کا بھی یہی حکم ہے۔

لیکن اس موقع پر جیلانی خان کا وہ مضمون جو خواتین ریزرویشن بل پر ہے نقل کرنے سے مذکورہ حکم پر کافی میانہ روی کے ساتھ رہنمائی مل سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:



اس بل کہ ابتداء یوگوا کی قیادت والی درجنوں چھوٹی بڑی پارٹیوں کے اشتراک سے بنی سرکار نے ۱۲ ستمبر ۱۹۹۶ء کو کی تھی۔ مگر اس بل پر اتنی مخالفت ہوئی کہ اس پر ڈھنگ سے بحث ہی نہیں ہو پائی، پھر ۱۲ ستمبر ۱۹۹۶ء کو گیتا کھرنجی کی صدارت والی کمیٹی نے اسے پیش کیا، مگر اس بار بھی ناکامی ہاتھ لگی۔ ۱۹۹۸ء میں جب بی جے پی اقتدار پر قابض ہوئی تو اس بل کے پاس ہونے کا امکان روشن ہو گیا تھا مگر واپسی حکومت اسے پاس نہ کرا سکی، یہی حشر ۲۳ ستمبر ۱۹۹۹ء کو ہوا جب وزیر قانون رام جیٹھ ملانی نے ایوان زیریں میں اسے پیش کیا۔ ۲۰۰۵ء میں حکومت کی باگ ڈور جب کانگریس کے ہاتھ آئی تو کچھ امید ہوئی کہ یہ بل پاس ہو جائے گا مگر اس بار بھی مخالفین غالب رہے۔ پھر ۲۰۰۹ء میں صدر جمہوریہ پر تمباہا بل نے ۱۵۵ لوگ سبھا سے صدارتی خطبہ میں اس بل کو منظور کرانے کا عزم کیا تو ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بار کانگریس پاس کرا کر دم لے گی، چونکہ سابقہ بل میں کئی نکات باعث تشویش تھے، اس لئے کانگریس نے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ فروری ۲۰۱۰ء میں کابینہ سے ہری جھنڈی لے لی۔ ۸ مارچ ۲۰۱۰ء کو جب وزیر قانون ویر پامونگی نے یہ بل پیش کیا تو پورا ایوان مخالفت میں شور سے گونج اٹھا۔ پھر ۹ مارچ ۲۰۱۰ء کو یہ بل دو تہائی ووٹوں سے منظور کر لیا گیا۔

لیکن حکومت کی یہ مکمل جیت نہیں بلکہ اس کو ابھی ایک اور مرحلہ سے گزرنا ہے، ایوان بالا سے گزرنے کے بعد اس بل کو ایوان زیریں میں پیش کیا جائے گا۔ پھر منظوری کے بعد صدر جمہوریہ سے دستخط کرانی ہوگی۔ ان کے دستخط کے بعد ایکشن کمیٹی اس نئے قانون کے مطابق پارلیمانی اور اسمبلی حلقوں کا کردار طے کرے گا، لیکن اس بل میں کئی ایسی بنیادی خامیاں بھی ہیں جن میں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے مثلاً: دولت، پسماندہ طبقات اور اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو حاشیہ پر ڈالنے کے لئے یہ ایک مؤثر ذریعہ اور کارآمد ہتھیار ثابت ہوگا، کیونکہ ان طبقات کے مردہی سیاسی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ عورتوں کا ذکر ہی کیا ہے اور یہ امکان اس وقت زیادہ بار آور ہوگا جب اعلیٰ ذات کے لیڈران اپنی بہو بیٹیوں کو نکٹ دلا کر ان کو مستحکم کریں گے، اور ان مٹھی بھر اقلیتوں کے لئے ان اعلیٰ ذات کی عورتوں سے جیت پانا بہت مشکل مرحلہ بن جائے گا، کیونکہ کوئی بھی پارٹی مسلمانوں کو اسی حلقے میں نکٹ دیتی ہے، جہاں پر ان کی تعداد ہار جیت میں اثر انداز ہوتی ہے، اگر وہ حلقے جہاں پر عورتوں کی سیٹ مختص ہو اور وہاں کوئی اعلیٰ ذات کی عورت کھڑی ہو تو کیا مسلم عورت کو کسی پارٹی کی طرف سے نکٹ ملنے کی امید رہے گی، یہ قضیہ بھی انتہائی قابل غور ہے۔

موجودہ ۱۵۵ لوگ سبھا میں صرف پچیس مسلم ارکان ہیں، جبکہ ۱۹۸۳ء میں یہ تعداد ۳۸ تک پہنچی ہوئی تھی۔ (جواب تک کی غالباً سب سے بڑی تعداد ہے) (ماخوذ از: مضمون "خواتین ریزرویشن بل: انقلابی قدم یا صرف سیاست از قلم: جیلانی خاں، عالمی سہارا ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۲ء)۔  
اولاً: اب آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس بل کے پاس ہونے کے بعد کیا مسلم ممبران کی تعداد پچیس کو بھی پہنچ پائے گی اور کیا مسلمانوں کا کھویا ہوا سیاسی وقار انہیں مل پائے گا، سیاسی سطح پر کمزور ہونے کے باعث مسلمانوں کے مسائل آج بھی جوں کا توں ہیں۔ سچر کمیٹی، رنگ ناتھ کمیٹی کی سفارشات پر حکومت چلی سادھے بیٹھی ہے۔

ثانیاً: اگر عورتوں کو منح کر دیا جائے تو یہ چیز مسلمانوں کی رہی سہی سیاسی قوت و طاقت کو بہت حد تک کمزور کر دینے کے مترادف ہوگی، کیونکہ اس جگہ پر یاسیٹ پر کسی پارٹی کی طرف سے مسلم عورتوں کو نکٹ ملنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ فسطائی طاقتوں کو برسر اقتدار آنے کا موقع اس وقت مزید متعین ہو جائے گا جب ممانعت کے بعد متدین افراد اس سے کنارہ کش ہو جائیں یا عورتوں کے امیدواری کے تعلق سے احتجاج شروع کر دیں۔

ثالثاً: ممانعت کا ایک نہایت خطرناک اثر ان علاقوں پر پڑے گا جہاں مسلمانوں کی تعداد اکثریتی ہو یا وہ علاقے مسلم شناخت و اسلامی تہذیب کے علمبردار مانے جاتے ہوں، جہاں پر غیر مسلموں نے ابھی کامیابی کا زینہ بننے نہیں کیا ہے۔ اس کی چھوٹی سی مثال مشرقی یوپی کا علم و ادب کا گہوارہ، دست کاری اور صنعتی تجارتی مرکز ضلع متو ہے۔ جس کی آبادی پانچ لاکھ سے تجاوز ہے۔ یہاں بلدیہ انتخابات میں تقریباً ۴۰ ہائیوں سے مسلم افراد ہی قابض رہے ہیں اور کوئی غیر مسلم چیئر مین نہیں بن سکا ہے۔ حالیہ بلدیہ انتخابات میں وہاں کی سیٹ عورت کے لئے مختص تھی، اس سال بھی الحمد للہ مسلمان ہی جیتے۔ اگر وہاں پر منع کر دیا جاتا تو بالیقین جیت کا سہرا غیر مسلموں کے سر بندھتا۔

لہذا اس جاں کنی کے عالم میں کوئی ایسی ثالثی راہ نکالی جائے جو دین اسلام کے مزاج کے خلاف نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کو ملکی سطح پر لگا میابی کی راہ جواب ہموار ہو رہی ہے، مسدود بھی نہ ہو سکے اجتماعی طور پر غور و فکر کرنے سے اللہ کی ذات سے کچھ بعید نہیں کہ ایسی ہی کوئی راہ نکل آئے۔ (وما ذلک علی اللہ بعزیز)



## تیسرا باب مختصر تحریریں

### ایکشن سے مربوط مسائل

قاضی عبدالجلیل قاسمی قاضی شریعت دارالقضا عمارت شریعہ چلواری شریف، پٹنہ۔

آج کل دنیا میں جو جمہوری نظام رائج ہے، اس کے بارے میں عام سوچ یہ ہے کہ جمہوریت دراصل عوام کے ذریعہ عوام پر حکومت کرنے کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ سارے لوگ حکمران نہیں ہو سکتے ہیں، اس لیے پارلیمنٹ یا اسمبلی وغیرہ میں نمائندگی کے لیے حلقے متعین کر دیے گئے ہیں، اس حلقہ کے لوگ اپنا ایک نمائندہ منتخب کر کے پارلیمنٹ یا اسمبلی میں بھیجتے ہیں پھر وہ نمائندے آپس میں کسی کو عہدیدار، صدر جمہوریہ یا وزیر اعظم وغیرہ کا انتخاب کرتے ہیں، اس لیے ووٹ کی اصل حیثیت وکالت کی ہے، منتخب شخص اس علاقہ کا وکیل اور نمائندہ ہوتا ہے۔

۱۔ اگر مسلمان انتخابات سے کنارہ کشی اختیار کر لیں تو اس سے ان کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے ضروری ہوگا کہ کسی اچھے دیانت دار شخص کو اپنا وکیل بنا لیں۔ کہا جاتا ہے کہ ووٹ کی حیثیت شہادت کی بھی ہے، یعنی ووٹر جس شخص کو ووٹ دیتا ہے، اس کے بارے میں گویا شہادت دیتا ہے کہ وہ اس عہدہ کا اہل ہے، لیکن میرے نزدیک اس کی اصل حیثیت وکالت کی ہے۔ اس تفصیل کے بعد جواب درج ذیل ہیں:

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت وکالت کی ہے، کسی درجہ میں اس کو شہادت بھی کہہ سکتے ہیں۔  
 ۲۔ وکالت، یا شہادت دونوں صورت میں ووٹ دینا واجب ہوگا، اس کو صرف مباح یا مستحب قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔  
 ۳۔ اصلاً عام حالات میں کسی منصب کو طلب کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے کہ منصب کے طالب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی ہے، اگر طلب کے بغیر کوئی عہدہ ملے تو اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوتی ہے، اس کے باوجود کبھی کبھی منصب کا طلب کرنا واجب بھی ہوتا ہے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے، اس لیے بہتر شکل یہ ہے کہ ارباب حل و عقد کی ایک جماعت اس کو نامزد کرے اور اس کو پرچہ نامزدگی داخل کرنے کو کہے، لیکن اگر کوئی شخص اس منصب کا اہل ہو اور وہ محسوس کرے کہ اگر وہ خود امیدوار نہیں بنے گا تو دوسرا کوئی نااہل منتخب کر لیا جائے گا تو ایسی صورت میں اس کے لیے اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہوگا۔

۴۔ قانون ساز ادارہ کارکن بننا جائز ہوگا، تاکہ وہ شریعت مخالف بننے والے قانون کی خرابیاں بتا کر اس طرح کی قانون سازی کو روکنے کی کوشش کر سکے، اگر کوئی مسلمان رکن نہیں ہوگا تو خلاف شریعت قانون سازی بغیر کسی رکاوٹ کے ہونے لگے گی جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچے گا۔  
 ۵۔ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے بغیر وہ قانون ساز ادارے کارکن نہیں بن سکتا ہے، رکن نہ بننے میں زیادہ نقصان ہے، اس لیے خلاف شریعت دفعات پر عمل نہ کرنے کی نیت کے ساتھ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھا سکتا ہے۔

۶۔ ایک ہے انجیل کی قسم کھانا، ایک ہے ہاتھ میں انجیل لے کر اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا، اگر انجیل ہاتھ میں لے کر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی جائے تو میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہ ہوگا، اس لیے کہ دراصل قسم تو اللہ تعالیٰ کی کھائی جاتی ہے، ہاتھ میں کسی کتاب کے رہنے کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اگر انجیل کی قسم کھانی ہے تو انجیل بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اگرچہ آج کل وہ صحیح حالت میں موجود نہیں ہے، لیکن قسم کھانے والا اللہ تعالیٰ کی کتاب انجیل کی نیت سے اس کی قسم کھا سکتا ہے۔

۷۔ جو سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہیں، ان کے منشور کے بعض دفعات اگر خلاف شرع یا مسلم مفادات کے خلاف ہوں تو ان دفعات کی وجہ سے اس پارٹی میں شرکت کو ممنوع نہیں کہا جائے گا، البتہ ان دفعات کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں، کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز نہ ہوگا۔

۹۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں ان کے لیے الگ سیاسی پارٹی بنانا جائز تو نہیں ہوگا، لیکن عام طور پر اس سے فائدہ نہیں ہوتا ہے، اس لیے بے سود ہے۔

۱۰۔ مسلم خواتین دو تہائی حصہ لے سکتی ہیں، امیدوار بھی بن سکتی ہیں، قانون ساز اداروں کی رکن بھی بن سکتی ہیں، البتہ پردہ کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ☆☆☆

## ایکشن میں شرکت کے مسائل

مولانا شیر علی گجراتی ع

الجواب هو الموفق: حامداً ومصلياً ومسلماً

۱۔ آج کل اسلامی ممالک تو نام کے ہیں، سب طرف جمہوریت غالب ہے اور اقتدار اکثر غیر مسلموں کے قبضہ میں ہے، خاص کر ہندوستان میں ایک بہت بڑی جمہوریت ہے اور اس میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اقتدار اعلیٰ پر غیر مسلم قابض ہیں، اس لئے ہمارے اختیارات کم اور ان کے اختیارات زیادہ ہیں، اب مسلمانوں کو ان کے ساتھ رہنا ہے اور مسلمانوں کا بھی ملک ہے اور مخالفت ہم کر نہیں سکتے، لہذا مسلمان یہ کوشش کریں کہ ان کے ساتھ رہ کر نرمی سے اور ترکیب سے اپنے مفادات حاصل کرتے رہیں اور یہ ایکشن کے ذریعہ سے اور کسی پارٹی کا جو مسلمانوں کے حق میں معتدل ہوں اس کا ممبر بننے سے ہو سکتا ہے اور یہ جائز ہے۔

۲۔ ہم ووٹ اس لئے دیں گے تاکہ ہم اپنے مفادات کو نرمی سے اور ترکیب سے حاصل کر سکیں، اس لئے ووٹ دینا ضروری ہوگا۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا ضروری ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے اپنے مفادات کو بحسن و خوبی حاصل کریں۔

۴۔ قانون ساز اداروں کے ہم ممبر بن سکتے ہیں، لیکن ان پارٹیوں کا ممبر بننا چاہیے، جو زیادہ مخالف نہ ہوں بلکہ معتدل ہوں اور جس کا مزاج جمہوریت کا ہو اس پارٹی کا ممبر بننا چاہئے، اس لئے کہ ہم اس ملک میں رہتے ہیں، ہماری حیثیت مصالح کی ہے، پس ہم ملک کے اور مسلم وغیر مسلمین کے مفادات کو کیسے حاصل کریں اس اعتبار سے ہمیں پارٹیوں کا ممبر بننا چاہئے۔

۵۔ جب ہماری حیثیت مصالح کی ہے تو ہمارا کردار وہی ہونا چاہئے جو کردار اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار کیا تھا کہ کفار و مشرکین نے دخول مکہ سے روک لیا تھا اور بالآخر صلح پر آمادہ ہوئے اور صلح میں ایسی شرطیں لگائیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تھیں، اس میں ایک شرط یہ تھی کہ مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس آئے گا تو تم اس کو لوٹا دو گے اور اگر کوئی مسلمان ہمارے پاس آیا تو ہم اسے نہیں لوٹائیں گے (بخاری شریف ۳۷۲)۔

اور یہ اسلام کے خلاف ہے کہ مسلمان کو دوبارہ مشرکین کے حوالہ کیا جائے پھر بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو قبول فرمایا، اس کے علاوہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر مشرکین کے ساتھ صلح کی ہیں، لہذا مسلمانوں کا غیر مسلمین کے ساتھ پارٹی میں شریک ہونا اور غیر شرعی باتوں پر دستخط کرنا درست ہے، اس لئے کہ ہماری حیثیت مصالح کی ہے، ہم صلحاً ایسا کریں گے، مخالفت تو ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔

۶۔ بائبل پر حلف اٹھانا جائز ہے یہ ہم صلح کے طور پر کرتے ہیں۔ شریعت کی مخالفت ہمارا مقصود نہیں ہے (الأمور بمقاصدھا)۔

۷۔ یہ جتنے بھی نظام ہیں اور سیاسی پارٹیاں ہیں ان میں ہم شامل ہو سکتے ہیں تاکہ ہم اپنے مفادات کو اور ملک کے مفادات کو حاصل کر سکیں اور ملک میں عدل و انصاف سے ہر فیصلہ ہو۔ حضور کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ بقیہ تفصیل نمبر ۵ پر ملاحظہ ہو۔

۸۔ جائز ہے نمبر ۵ پر گزر گیا۔

۹۔ مسلمانوں کے لئے سیاسی پارٹی کا قیام جائز ہے چاہے سیکولر ایجنڈے کے تحت رہ کر ہی کام کرنا پڑے، اس لئے کہ ہماری حیثیت مصالح کی ہے، ہمیں تو مفادات حاصل کرنا ہے اور یہ اس میں شامل ہو کر کرنے سے ہو سکتا ہے۔ مخالفت تو ہم نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ اصل تو عورت کے لئے گھر کا کام کاج کرنا ہے اور گھر میں بچوں کی تربیت کرنا ہے، لیکن اگر اس میں پردہ کے اہتمام کے ساتھ جواز کا فتویٰ دیا جائے تو اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہے، اس لئے کہ جب مسلمان عورتیں امیدوار بنیں گی تو مسلمانوں کو پیشیں زیادہ ملیں گی اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور قاعدہ ہے: 'الضرورات تبيح المحظورات' جس طرح عورتوں کے لئے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا عورتوں کے علاج کے لئے جائز ہے، اسی طرح یہ بھی جائز ہے اور اسی طرح جب وہ ووٹ دیں گی تو مسلمان امیدوار اور جو مسلمان کے حق میں معتدل ہیں وہ ایکشن جیتیں گے تو بھی مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ط فلاح دارین ترکیسر، گجرات۔ ☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی احکام

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی مد

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں، لیکن ان کی تقسیم انسانوں کی خواہش کے مطابق نہیں کی جاتی بلکہ مالک حقیقی اپنی مصلحت کے مطابق اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔

اس تقسیم کا اصول یہ رہتا ہے کہ بعض لوگوں کا درجہ بعض لوگوں پر بلند کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک دوسرے سے اپنا کام نکال سکیں۔

سیاسی اقتدار بھی اللہ کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کبھی اپنی مصلحت کے تحت یہ اقتدار ایمان والے بندوں کو عطا کر دیتا ہے۔

سورہ انبیاء میں ارشاد ہوا: ”وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ“ (سورہ انبیاء: ۱۰۵) (اور ہم نے زبور میں عام نصیحت کی باتیں بیان کرنے کے بعد یہ لکھا کہ زمین کا اقتدار اس کا مالک حقیقی اپنے نیک بندوں کو عطا کرتا ہے)۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ زمین کا وارث نہیں بنانا مگر اپنے بندوں کو۔ اللہ تعالیٰ حکومت ظالموں کو بھی عطا کرتا ہے جیسا کہ سورہ انعام میں ارشاد ہے: ”وَكَذَلِكَ نُوْتِي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ (سورہ انعام: ۱۲۹) (اور ہم اسی طرح بعض ظالموں کو سیاسی اقتدار دے کر بعض ظالموں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ان کے اعمال کی وجہ سے)۔

یعنی ایک ظالم کا زور توڑنے کے لئے دوسرے ظالم کو اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔

عالم اسباب میں اقتدار کی نعمت حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے لئے قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں عمل صالح کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

یعنی اسلامی زندگی کی فطرت اور اس کا مزاج یہی ہے کہ اسے سر بلندی کا مقام حاصل رہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو عمل میں صالح ہو یعنی ایمان و عمل کا تقاضا عزت و سر بلندی ضرور ہے، لیکن ایمان و عمل کی زندگی کی وہ مناسب حد جس پر یہ انعام و اکرام ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

ایمان والوں کا فرض یہ ہے کہ وہ عمل کی رفتار کو جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور اس کے علم کے مطابق جب وہ وقت آجائے گا اللہ کی طرف سے انہیں سیاسی قوت اور حکمرانی حاصل ہو جائے گی۔

اس راہ اور طریقے سے ہٹ کر دھاندلی اور دھوکے سے جو سیاسی اقتدار حاصل ہو وہ خلافت اور اسلامی حکومت نہیں ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلام کے بعض اصولوں میں جو مشابہت نظر آتی ہے وہ ظاہری مشابہت ہے۔

جمہوریت میں عوام اصل فرماں روا اور قانون ساز ہیں جب کہ اسلام میں اللہ کی حاکمیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

جمہوریت میں نظاہر انفرادی آزادی نظر آتی ہے، لیکن یہ مطلق آزادی فکری اور عملی انارکی کی طرف لے جاتی ہے۔

جمہوریت میں نظاہر مساوات کا پہلو نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں جمہوریت میں اکثریت کی حکومت کا قاعدہ چلتا ہے۔

مغربی جمہوریت میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ حکومت کی تشکیل براہ راست عوام کے ذریعہ ہوتی ہے جب کہ اکثر ملکوں میں عوام ناخواندہ ہیں۔

مغربی جمہوریت میں منتخب نمائندوں کے لئے کسی طرح کی عملی قابلیت اور اخلاقی خوبی ضروری نہیں ہے۔

جمہوریت میں جماعتی طریقہ انتخاب ہے جس میں سیاسی فرمانبردار ہوتے ہیں۔

جمہوریت میں سرمائے اور کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ ہوئے بغیر کامیابی نہیں مل سکتی، اس لئے وہی لوگ انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں جو خود سرمایہ دار ہوں یا کسی سرمایہ دار سیاسی جماعت کی انہیں حمایت حاصل ہو۔

ان کمزوریوں اور نقائص کے باوجود جمہوریت دوسرے نظاموں کے مقابلے میں قابل تریح ہے اور بعض لحاظ سے مفید سیاسی نظام ہے۔ اس تمہید اور تبصرے کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ میرے خیال میں غیر شرعی حکومت میں ووٹ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ ایک رائے ہے اور رائے کا استعمال سوچ سمجھ کر اس طرح ہونا چاہیے کہ مناسب امیدوار منتخب ہو سکے۔ اس میں برادری یا دوسرے عوامل شامل نہ ہوں بلکہ جس کا انتخاب کیا جا رہا ہے اور جس کے حق میں رائے استعمال کی جا رہی ہے وہ ملک و ملت کے لئے مفید ہو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُوَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا" (اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے سپرد کرو جو اس امانت کے صحیح دار ہوں)۔

ووٹ بھی ایک رائے ہے اور رائے میں یہ احتیاط لازم ہے کہ اس کا استعمال اس شخص کے حق میں ہو جو اس ذمہ داری کو جو اس کے سپرد کی جا رہی ہے، ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۲۔ آپ کا دوسرا سوال ہے کہ اگر ووٹ شہادت کے درجے میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا۔ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب اور واجب؟ جیسا کہ عرض کیا کہنا چیز کی رائے میں ووٹ کی حیثیت ایک رائے کی ہے، اس لئے اپنی رائے کا استعمال کرنا جائز ہوگا بلکہ کرنا چاہیے۔

۳۔ آپ کا تیسرا سوال ہے کہ انکیشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

اسلامی نقطہ نظر سے اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا خواہشمند نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا: "أَنَا وَاللَّهِ لَا نُولِي عَلِي هَذَا الْعَمَلُ أَحَدًا سِوَهُ وَلَا أَحَدًا حَرَصَ عَلَيْهِ" (صحیح بخاری و ابوداؤد)۔

(خدا کی قسم میں کسی ایسے آدمی کو انتظام حکومت میں کوئی عہدہ نہ دوں گا جو اس کا خواستگار ہو اور اس کی حرص رکھتا ہو)۔ غالباً موجودہ جمہوریت میں بھی اس بات کو اصولاً تسلیم کیا گیا ہے اور نامزدگی کے فارم بھرتے ہوئے کم سے کم دو آدمیوں کے نام لکھے جاتے ہیں جو ان کو امیدوار بنانا چاہتے ہیں۔

۴۔ آپ کا چوتھا سوال یہ ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لیے فہرست جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کا حل آسان نہیں ہے، خلاف شریعت قانون بنانے میں ایک مسلمان کی حصہ داری کسی طرح جائز نہیں ہے، اسے صاف طور پر کہہ دینا چاہیے اور اپنا اختلافی نوٹ شامل کر دینا چاہیے کہ یہ قانون اسلام کے خلاف ہے میں اس میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

۵۔ آپ کا پانچواں سوال یہ ہے کہ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

پانچویں سوال کا جواب یہ ہے کہ دستور کی دفعات بدلتی رہتی ہیں اور ان میں ترمیم ہوتی رہتی ہے، جو شخصی قانون ساز ادارے کا رکن منتخب ہو وہ اگر یہ ارادہ رکھتا ہے کہ میں دستور کی ان دفعات کو جو شریعت کے خلاف ہیں بدلنے کی جدوجہد کروں گا تو اس کا دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا اور قانون ساز ادارے کا رکن بننا جائز ہوگا۔

۶۔ آپ کا چھٹا سوال یہ ہے کہ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟

آپ کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بائبل اگرچہ تحریف شدہ ہے بلکہ اصل کتاب انجیل ہے اور بائبل مختلف کتابوں کا مجموعہ ہے اور اس میں کافی رد و بدل کر دیا گیا ہے مگر پھر بھی اس میں اللہ کا کلام بھی موجود ہے تو اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی ملک میں ممبر بنے اور اس کو بائبل پر حلف لینا پڑے تو ایسا کرنا جائز ہوگا۔

۷۔ آپ کا ساتواں سوال یہ ہے کہ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغائر ہوتی ہیں۔ کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

آپ کے اس ساتویں سوال کا جواب یہ ہے کہ ان پارٹیوں کو جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ میں سنجیدہ ہیں، اگر چنانچہ ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر بھی ہیں تاہم ان پارٹیوں کو ترجیح دی جائے گی اور یہ کوشش کی جائے گی کہ اپنے اثر و رسوخ اور پریشور کے ذریعہ وہ دفعات ختم کی جائیں جو اسلام کے مسلمانوں کے خلاف ہیں، کیونکہ یہ معاملہ ہونے کی روٹی میں دیکھا جائے گا کہ جو کم درجہ کی اور کم نقصان دہ چیز ہو اس کو اختیار کیا جائے۔

۸۔ آپ کا آٹھواں سوال یہ ہے کہ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

آپ کے اس آٹھویں سوال کا جواب یہ ہے کہ بعض سیاسی پارٹیاں ایسی ہیں کہ ان کا خمیر ہی مسلم دشمنی اور اسلام کی مخالفت سے تیار ہوا ہے، یعنی وہ پارٹی بنائی ہی اس لیے گئی ہے کہ اسے اس ملک میں مسلمانوں کو رہنے دینا نہیں ہے اور اگر مسلمان رہیں تو اپنے شعار سے دست بردار ہو کر رہیں، ایسی پارٹیوں کے منشور کو بدلنا ممکن نہیں ہے، اس لئے یہ تمنا کہ وہ اس پارٹی میں اس لئے شامل ہو رہا ہے کہ وہ ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا صرف بہلاوے کی بات ہے۔

۹۔ آپ کا نواں سوال یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، کیا مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

آپ کے اس نویں سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا یا نہ کرنا اس میں راسخ مختلف ہو سکتی ہیں اور مختلف ہیں اور ہر ایک اپنی رائے کے حق میں دلیل رکھتا ہے۔

مگر جیسا کہ سیاست پارٹی سٹیم پر ہے تو مسلمانوں کی کوئی جماعتی آواز نہ ہونا ان کے لئے سیاسی اعتبار سے سخت نقصان دہ ہے۔ رہا یہ خطرہ کہ مسلمانوں کے متحد ہونے سے یا ان کی جماعت بننے سے مخالف ووٹ متحد ہو جاتے ہیں اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں تو اس خطرے کی وجہ سے مسلمانوں کو متحد ہونے سے روکنا کوئی حکمت کی بات نہیں ہے۔ اب تک کا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اپنی جماعت نہ ہونے سے مسلمانوں کو نقصان زیادہ پہنچا ہے، فائدہ کم ہوا ہے۔ گاؤں کی سطح سے لے کر شہر کی سطح تک اس سیاسی پارٹی کا لیڈر ہونا چاہیے تاکہ مضبوط بنیاد پر قائم ہو سکے اس کے لئے پہلے چند سال محنت کرنی ہوگی۔

۱۰۔ آپ کا دسواں سوال یہ ہے کہ الیکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ کیا ان کے لئے الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے؟ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟ اس سلسلے میں قابل لحاظ یہ بات بھی ہے کہ ہندوستان میں تیزی سے یہ رجحان پنپ رہا ہے کہ سیاست میں عورتوں کی حصہ داری کو یقین بنایا جائے۔ اس کے لئے مختلف ریاستوں میں اور مختلف سطحوں پر خواتین کے لئے سیٹیں ریزرو کی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پچائیت کی سطح پر پچاس فیصد سیٹیں عورتوں کے لئے ریزرو کر دی گئی ہیں اور لوک سبھا میں پارلیمنٹ میں خواتین کے لئے ۳۳ فیصد ریزرویشن کا بل پیش کیا جا چکا ہے اور قومی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کر لے گا۔

آپ کے اس دسویں اور آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ اصولی طور پر الیکشن میں خواتین کا حصہ لینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس میں بہت سی شرعی اور معاشرتی قباحتیں موجود ہیں۔

اسلام میں عورت کا ایک دائرہ کار مقرر ہے اور وہ ہر لحاظ سے فطرت کے عین موافق ہے۔ اگر چہ سوشل اور سماجی کاموں میں عورتیں شرعی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اپنے فرائض حیات پر کار بند رہتے ہوئے حصہ لے سکتی ہیں، لیکن الیکشن میں ان کا امیدوار بننا شرعی طور پر بھی جائز نہیں ہے اور یہ عمل ہمارے خاندانوں کو کمزور کر سکتا ہے۔ حکومت اگر سیٹیں ریزرو کرتی ہے تو کرتی رہے، لیکن ہمیں اپنی خواتین کی عزت و حرمت ریزرویشن سے کہیں زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔

مضمون کے خاتمہ پر ایک بات عرض کرنی ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنالینا اور اپنے آپ کو سیاسی کشمکش میں مبتلا کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہمارے لئے خدمت خلق کا میدان اور سماج کے معاملات خاص طور پر تعلیم زیادہ اہم ہونی چاہئے۔ ہمارے سامنے عیسائی اقلیت کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے خدمت خلق اور تعلیم کا میدان سنبھال لیا اور اپنے آپ کو سیاسی کشمکش میں مبتلا نہیں کیا۔ وہ مسلمانوں سے زیادہ موثر ہیں اور قومی اعتبار سے فائدے میں ہیں۔☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی احکام

ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی

۱۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: ”شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے: ”ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فانه آثم قلبه“۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من کتم شهادة إذا دعی الیها کان کمن شهد بالزور“ (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی) اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں: ”اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے (فقہی مقالات ۲۸۸-۲۸۷) مشہور محقق اور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم کی تحریر ملاحظہ ہو: ”اگر ایک شخص غیر مستحق آدمی کو ووٹ دیتا ہے تو یہ شہادت زور بھی ہے شفاعت سیئہ بھی اور پوری امت پر ایک نااہل کو مسلط کرنا بھی ہے اور یہ سب کتنے گناہ کی باتیں ہیں وہ ظاہر ہے (قاموس الفقہ ۲۰۱۲)۔“

احقر کی رائے یہی ہے کہ ووٹ نہ دینے کی صورت میں تحفظ مسلمین نہ ہو سکے اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہونے کا ظن غالب ہو تو ووٹ دینا واجب ہے اور ووٹ دے کر عدم تحفظ یقینی ہو تو نہ دینا واجب ہے۔

۳۔ از خود کوئی عہدہ یا منصب طلب کرنے کی ممانعت حدیث میں موجود ہے۔ قال رسول اللہ ﷺ: لا تسأل الإمارة فإن أعطیتها عن مسألة وکلت الیها وإن أعطیتها عن غیر مسألة، أعنت علیها (بخاری شریف) (امارت طلب نہ کرو جس نے عہدہ طلب کیا خدا کی نصرت اس پر نہیں ہوتی برخلاف اس شخص کے جسے بدون طلب منصب ملے)۔ من سأل الإمارة وکل الیها (بخاری ۱۰۵۸، ۲) حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ”عام اصول تو یہی ہے کہ طلب قضاء درست نہیں، لیکن احوال کے تغیر یا نیت و مقصد کی وجہ سے اس کے احکام مختلف ہو جاتے ہیں، اگر ایک شخص یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ منصب قضاء کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کا اہل موجود نہیں یا اگر وہ نہیں کھڑا ہوگا تو یہ منصب غیر اہل کے پاس چلا جائے گا۔ تو ایسی صورت میں اس کے لئے نہ صرف یہ کہ اس منصب کی طلب جائز ہوگی بلکہ واجب ہوگی“ (اسلامی عدالت ۲۰۰۱)۔ مولانا بدر الحسن صاحب قاضی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: ”اس رائے کے مقابلے میں ایک دوسری رائے بھی ہے جو مشارکت کے جواز کی قائل ہے، اس کی دلیل یوسف علیہ السلام کا وہ مطالبہ ہے جو انہوں نے عزیز مصر سے کیا تھا: ”اجعلنی علی خزائن الأرض إني حفيظ علیہم“ بعدہ موصوف نے اسی آیت کے تحت علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی ۵۳۳ کا ترجمہ رقم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امیدوار کو عدل کے قیام اور دفع شرک امکان ہو یا یہ کہ وہ وطن اور اہل وطن کے لئے واضح مصلحت سمجھتا ہو تو مطالبہ درست ہے (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل صفحہ ۲۲۸-۲۲۹) دکتور نور الدین الحاددی لکھتے ہیں: ”غیر مسلم ممالک کی سیاست میں مسلمان شریک نہ ہوں تو موجودہ تقاضے سے شجابل برتنے اور ایک ضروری شرط سے عدا چشم پوشی کرنے کے مترادف ہوگا (حوالہ سابق صفحہ ۲۴۹) اسلامک فنڈ اکیڈمی انڈیا کا فیصلہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے“ غیر اسلامی نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے، لہذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا ایکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے (حوالہ سابق صفحہ ۴۹)۔

۴۔ اگر کسی منکر پر انکار اس سے بڑھ کر منکر کا باعث بن سکتا ہو تو فقہاء نے اس منکر پر سکوت جائز قرار دیا ہے، نیز اس منکر کی تائید سے منکر سمجھتے ہوئے

شیخ الحدیث و پرنسپل جامعہ دارالعلوم، متو۔

کی جاسکتی ہے ”إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان“، ”من رأى منكم منكرا فليغيره بيده ومن لم يستطع فليسانه وإن لم يستطع فليقلبه وذلك أضعف الإيمان“، ”ما لا يدرك كله لا يترك كله“ کل کا حصول نہ ہو سکے تو جزء کو بھی کھودینا دانشمندی نہیں۔ ان آیات و احادیث کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اداروں کا ممبر بننا درست ہے، ہاں ایسے فیصلے جو شرعی نقطہ نظر سے درست نہ ہوں مسلمانوں کو اس پر عمل نہ کرنے کی گنجائش ہے لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق (بخاری شریف ۲/۱۰۶۳)، بہر حال جب یہ اندیشہ ہو کہ ممبران آنے والے بل کے خلاف ووٹ دیں گے یا واک آؤٹ کر جائیں گے یہی وہیپ جاری کیا جاتا ہے۔ بندہ کے خیال میں یہ اکراہ غیر ملجی ہے اور اس اکراہ (خصوصاً اس ملک میں) سے بھی تکلیف شرعی کے سقوط کی گنجائش ملنی چاہئے۔

۵۔ اولاً غیر شرعی دفعات کے ختم کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اگر اس میں ناکامی ہو تو دل سے ان کو برا سمجھتے ہوئے حلف برداری کی گنجائش نکلنی چاہئے۔  
۶۔ اس کے جواب میں مکہ مکرمہ فقہ اکیڈمی کا فیصلہ عرض ہے: ”اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لئے توریٹ یا انجیل پر یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کریں، اگر ان کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہ ہوگا“ (اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے صفحہ ۱۲۰)۔  
۷۔ اگر بعض دفعات جو مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہیں، اپنے منشور سے خارج کرنے پر راضی ہو جائیں تو ان کی حکومت میں شامل ہو سکتے ہیں اور اگر ظن غالب ہو کہ برابر کوشش کرنے سے مستقبل میں کامیابی مل سکتی ہے تو بھی شمولیت کی اجازت ملنی چاہئے، مگر ہاں پارلیمنٹ یا اسمبلی میں ایسا بل پیش ہو تو اس کی تائید ہرگز نہ کی جائے۔

۸۔ ایک شخص یا چند اشخاص کی رائے سے پارٹی کا ایجنڈہ یا منشور نہیں بدلتا تا وقتیکہ اکثریت کی رائے نہ ہو۔ اس لئے میرے خیال میں یہ خیال خام ہے کہ وہ پارٹی میں شامل ہو کر ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا اور وہ بھی اس طرح کی پارٹیاں جن کے مقاصد سوال میں مذکور ہیں، اس لئے اس طرح کی پارٹی میں شمولیت درست نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا فیصلہ بھی اس کی تائید میں پیش ہے: ”جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنا لیا ہو ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل صفحہ ۳۹)۔“

مولانا محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی سپرد قلم فرماتے ہیں: ”بہت سارے غیر مسلم ممالک میں ایسے مسلمانوں کے تعاون کے مثبت نتائج نہیں نکلے ہیں بلکہ الٹا انہیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے“ (کتاب مذکور صفحہ ۳۲۰)۔

۹۔ ایسی سیاسی جماعتوں کی تشکیل سے فائدہ کی بہ نسبت نقصان زیادہ ہے۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم کی رائے ان کے شاگرد مفتی اشرف علی قاسمی استاذ المعہد العالی حیدرآباد قاسمی الفقه ۲۱۳ پر نقل کرتے ہیں کہ سیاسی پہلو سے آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکوز نہیں ہے، مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعتیں مفید نہیں ہیں، بلکہ یہاں کے حالات میں سیکولر جماعتوں سے مسائل کی بنیاد پر معاہدہ کر کے سیاسی اشتراک زیادہ مناسب ہے۔

۱۱۔ عورت کی قیادت کی ممانعت صریح روایات سے ثابت ہے: لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة (بخاری کتاب المغازی، ترمذی ابواب الفتن) ما أفلح قوم یلی أمرهم امرأة (مسند امام احمد بن حنبل)۔

مولانا سید جلال الدین انصاری دامت برکاتہم عورت اور سیاسی قیادت کے صفحہ ۲۸۵ پر رقم فرماتے ہیں: بعض مفسرین نے اس آیت ”انی وجدت امرأة تملکهم“ کے ذیل میں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ عورت کی سربراہی اسلام کی رو سے جائز نہیں، چنانچہ بخاری کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں: ”هذا نص في أن المرأة لا تكون خليفة ولا خلافة فيه“ سید صاحب موصوف نے اسی کتاب کے صفحہ ۲۸۶ پر علامہ آلوسی کی وہ تفسیر بھی پیش کی ہے جو مابقی کی موید ہے: ”ليس في الآية ما يدل على جواز أن



تكون المرأة ملكة ولا حجة في عمل قوم كفره على مثل هذا المطلب“۔

جو حضرات حضرت عائشہؓ کی جنگ جمل میں شمولیت سے استدلال کرتے ہیں ان کی تردید میں عمری صاحب دامت برکاتہم نے اپنی کتاب عورت اور سیاسی قیادت میں صفحہ ۲۷۰ تا ۲۸۱ پر ایک بحث (جس کی سرخی تاریخ سے ایک غلط استدلال ہے) فرمائی ہے اور اس موضوع کے تعلق سے مفصلاً بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”بہر حال واقعہ انتہائی ہنگامی حالات کا نتیجہ تھا، اس میں حضرت عائشہؓ کو ایسے اقدامات کرنے پڑے جن کی توقع عام حالات میں ان سے ہرگز نہیں کی جاسکتی تھی، اس ایک واقعہ سے قطع نظر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، شریعت کے مزاج، صحابہ کرام کے تعامل نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت منصب قیادت کی متحمل نہیں بعد کے ادوار میں بھی امت کا فی الجملہ یہی تعامل رہا ہے، اگر کچھ استثنائی مثالیں موجود بھی ہیں تو وہ حجت اور سند نہیں بن سکتیں۔ مشہور فقیہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں: ولا تصلح العظمی للإمامة العظمی ولا التولية البلدان ولهذا لم یول النبی ﷺ ولا أحد من خلفائه ولا من بعدهم امرأة قضاء ولا ولاية بلد فی ما بلغنا ولو جاز ذلك لم یخل منه جميع الزمان غالباً (الغنی لابن قدامہ ۱۳، ۱۲) عمری صاحب دامت برکاتہم مزید استثناء کے طور پر اپنی کتاب ”عورت اور منصب امامت“ کے صفحہ ۲۶۷ پر قاضی شوکانی کی تحریر پیش فرماتے ہیں: ”فیہ دلیل علی أن المرأة لیست من أهل الولايات، ولا یحل لقوم تولیتها، لأن تجنب الأمر الموجب لعدم الفلاح واجب“ نیز حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی عبارت بھی بحوالہ اشعة اللمعات ۳۰۹/۳ پیش کرتے ہیں: ”ازایں جا معلوم شد کہ زن قابل ولایت و امارت نیست (حوالہ سابق)۔“

ان آراء کی روشنی میں احقر کی یہ رائے ہے کہ خاص حالات میں ایسی خواتین کو جن میں حمیت دینی اور حمایت اسلامی موجود ہو جناب کی شرط کے ساتھ گنجائش نکلی چاہئے۔



## ایکشن سے مربوط مسائل

مولانا ابوسفیان مفتاحی ط

(۱) و باللہ التوفیق: ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں: (۱) اس کی حیثیت شہادت کی ہے کہ وہ جس ممبر کو ووٹ دے رہا ہے اس کے بارے میں گواہ ہے کہ اس کو ملک و قوم کے لیے مفید اور خیر خواہ سمجھتا ہے۔ (۲) اس کی حیثیت مشورہ کی ہے کہ وہ حکومت اور نظم و نسق کے سلسلہ میں اپنی لیاقت کا اظہار کرتا ہے کہ کون زیادہ بہتر اور ایمان دار و مددگار ہو سکتا ہے۔ (۳) اس کی حیثیت سفارش کی ہے کہ وہ اپنے اس امیدوار کے لیے ایک اہم عہدہ اور ذمہ داری کی سفارش کرتا ہے (۴) اس کی حیثیت وکیل نامزد کرنے کی ہے کہ وہ سیاسی مسائل میں اس کو اپنا وکیل اور نمائندہ نامزد کرتا ہے۔ (۵) نیز اگر مسلم ہو تو ان سب کے علاوہ ووٹ کی حیثیت سیاسی بیعت کی ہے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ متعلقہ امیدوار کو وکیل بناتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے سربراہ مملکت کا انتخاب کرے، آج اگر وہ خوش قسمت ساعت آئے کہ دنیا کے کسی خطہ میں خلافتِ نبوی منہاج السنوۃ قائم ہو تو بظاہر اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ علامتہ المسلمین کے بالغ و مکلف مرد اپنے ووٹ کے ذریعہ نمائندہ منتخب کریں اور پھر وہ باہمی رائے سے امیر کا انتخاب کریں اور تمام لوگوں کی طرف سے وکالت اور نیابت اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ بیعت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ہاتھ ہی سے بیعت کی جائے، چنانچہ امام بخاری نے عبداللہ بن دینار سے دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبدالملک بن مروان سے بذریعہ مراسلت بیعت کی ہے۔ ابن عمرؓ نے اس روایت میں اپنی طرف سے سمع و طاعت کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میرے بچوں نے بھی اس کا اقرار کیا ہے (بخاری عن ابن عمر ۱۰۹۲، باب کیف یباع الامام الناس)۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات کافی ہے کہ ہر کسی کو بیعت کے لیے وکیل بنائے یا بیعت کرنے والا کسی کو بطور وکیل بھیجے کہ وہ اس کی طرف سے اظہار وفاداری کرے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ عبادہ بن صامتؓ کو اپنی طرف سے بیعت لینے کا حکم فرمایا تھا (بخاری عن ابن شہاب ۱۰۷۱۲، باب بیعت النساء)۔ اپنے حق رائے وہی کے استعمال کی حیثیت بڑی نازک اور اہم ہے۔ ایک شخص کو غیر مفید سمجھنے کے باوجود اس کو ووٹ دینا شہادت زور، جھوٹا مشورہ اور غلط سفارش جیسے گناہوں کا حامل ہے۔

اسی طرح مکرر ووٹ دینا دھوکہ دینا ہے، اور رائے وہی کی جو عمر متعین ہے اس سے کم عمر کے لوگوں کا ووٹ دینا بھی جائز نہیں۔ اس کا اندازہ بعض روایات سے بھی ہوتا ہے: عبداللہ بن ہشامؓ کو ان کی والدہ زینب بنت حمیدؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں اور عرض کیا کہ ان کی بیعت فرمائیے، اس وقت وہ کم سن تھے، نبی ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں (بخاری عن عبداللہ بن ہشام ۷۱۲، باب بیعت الصغیر)۔

چونکہ وہ بالغ نہیں ہوئے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے بیعت نہیں لی۔ صرف دست شفقت پھیرنے پر اکتفا فرمایا (جدید فقہی مسائل ۱۷۷، ۳۵۵)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں: (۱) شہادت کی، (۲) مشورہ کی، (۳) سفارش کی، (۴) وکیل نامزد کرنے کی، (۵) سیاسی بیعت کی۔

(۲) و باللہ التوفیق: ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے، لہذا ووٹ کی شہادت سیکولرزم امیدوار اور شریف الطبع اور ملک اور عوام کے حق میں مفید امیدوار کے بارے میں یہ ہے کہ اس کو ووٹ دینا جائز ہے چونکہ وہ بنسبت اور امیدواروں کے بہتر ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام ہے، اس کو محض ایک سیاسی ہارجیت اور کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعہ جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا وہ اس سلسلہ میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا، ان کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی، آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۲۔ اس معاملہ میں یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے۔ ثواب و عذاب بھی

ط صدر مدرس جامعہ مفتاح العلوم، حنو۔

محدود قومی و ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳۔ سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، اس لیے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل اور دیانتدار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوئی کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

۴۔ جو امیدوار نظام اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵۔ ووٹ کو پیسوں کے معاوضہ میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند ملکوں کی خاطر اسلام و ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی رضا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلہ میں ہو کوئی دانشمندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لیے اپنا دین کھو بیٹھے (جو اہر لفقہ ۲/۲۹۳، ۲۹۵)۔

(۳) وباللہ التوفیق: کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیز کا مدعی ہے: ایک یہ ہے کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا امیدوار ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ دیانت و امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا۔ اب اگر وہ واقع میں اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا ہے تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے۔

اور بہتر طریقہ اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کرے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں، وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے۔

اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لیے کھڑا ہوتا ہے اگر اس کو آخرت کی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے اور یہ سمجھ لے کہ اس کی ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال ہی تک محدود تھی، کیونکہ بنص حدیث یہ شخص اپنے اہل و عیال کا بھی ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے، ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے اور دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے (جو اہر لفقہ ۲/۲۹۱)۔

معلوم ہوا کہ کوئی شخص ممبری کی امیدواری کا خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، اگر وہ مسلمان ہو تو مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے اور اگر وہ ہندو ہو اور اس کے ووٹر مسلمان بھی ہوں تو مسلم اور ہندوؤں کی سیکولر جماعت جو مذہبی عصبیت سے دور ہو اور ملک و قوم کے لئے فائدہ مند ہو اور شریفانہ ذہنیت رکھتا ہے، اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے، جیسے ہندوستان جیسے ہندو اکثریت کے ملک میں۔ اس صفت کے حامل شخص کو ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا درست ہے۔

(۴) وباللہ التوفیق: جن ملکوں میں قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے جو بنص قرآن کریم حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہی فرمائی ہے اور نہی تحریم کے لیے ہے وہ آیت کریمہ یوں ہے: ولا تعاونوا علی الاثم۔ اگر ہندوستانی حکومت ایسے قوانین وضع کرے اور مذہب اسلام کے خلاف پالیسی رکھے اور ووٹر کو اپنے مذہب کی بنیاد پر ووٹ دینے کا اختیار نہ ہو تو مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس حکومت یا پارٹی کا ممبر بنانے کے لیے ووٹ دے۔

(۵) وباللہ التوفیق: جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، ان کو دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، تو مسلم ممبر کے لیے مطلقاً دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے کا عمل درست نہیں ہوگا، کیونکہ اس میں تعاون علی الاثم ہے جو مسلمانوں کے لیے بنص قرآن کریم حرام ہے۔

(۶) وباللہ التوفیق: جن عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے تو مسلمان ارکان کے لیے بائبل پر حلف لینے کا عمل جائز نہیں ہے۔ چنانچہ جدید فقہی مسائل (۳/۶۹۱) میں ہے:

ہندوستان میں عدالتوں میں مسلمانوں سے قرآن اور ہندوؤں سے شاستر اٹھوایا جاتا ہے، لیکن بعض مغربی ممالک میں عدالت میں یہ شخص اس بات پر

مجبور ہوتا ہے کہ تورات یا انجیل پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا عہدہ کرے، مسلمان چونکہ ان کتابوں کو محرف اور تبدیل شدہ یقین کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں، اس لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں، کیونکہ یہ ان کتابوں کی تعظیم اور بحالت موجودہ ان کے من جانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے مرادف ہوگا، البتہ اگر وہ اس پر مجبور ہوں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ ہاتھ رکھا جاسکتا ہے۔

چنانچہ رابطہ اسلامی کے تحت اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس منعقدہ ۱۶ تا ۱۸ رجب الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء اس مسئلہ میں جن نکات پر متفق ہوئے ان میں ایک یہ ہے کہ ”اذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب بطلبه يعتبر مكرهاً، ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيماً (قرارات، مجلس الجمع الفقہی الاسلامی ۱۴۰۲ھ)۔“

(۷) وباللہ التوفیق: جو سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں اور اس کے متبادل پارٹیاں زیادہ گندمی اور خطرناک ہیں اور ان کو اسلام یا مسلم مفادات سے عناد ہے تو اصول فقہ کے اہوں البلیتین کی اصل کے مطابق ایسی پارٹیوں میں شامل ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس شرط سے کہ علماء و فقہاء اور ارباب افتاء سے رابطہ کے بعد ان کی متفقہ یا اکثریت کی رائے یہی قرار پائی ہو، اور وہ اس کی اجازت دے دیں اور تحریراً و تقریراً عام مسلمانوں سے اس کی اپیل کر دیں اور موجودہ ہندوستان میں اسی کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔

اور ایسی پارٹیوں میں شامل ہونے والے، انتخاب لڑنے والے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے والے کی نیت ہو کہ ساتھ ساتھ اصلاح کی کوشش ہو کہ جو دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے خلاف ہیں، رفتہ رفتہ نرمی سے مذاہب کی اہمیت ان کے دل و دماغ میں بیٹھا کر ان دفعات کو منشور سے نکلوا دیا جائے یا ان سے چشم پوشی کی جائے، موجودہ ہندوستان میں یہی صورت بہتر ہے۔

(۸) وباللہ التوفیق: جو پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت ہو تو کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز نہیں ہوگا، اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو اگر اس کو اپنی اس کوشش میں کامیابی کی غالب امید ہو تو اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے، کیونکہ ہندوستان میں مشاہدہ ہے کہ جو ایسی پارٹی میں شامل ہوتا ہے، وہ اسی پارٹی کا ہو کر ہی رہ جاتا ہے، لہذا اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش نہ بنائی جائے۔

(۹) وباللہ التوفیق: جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہیں جیسے ہندوستان وہاں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں تو اسلام کو ترجیح دینے کے ساتھ اور دیگر مذاہب عدم مخالفت کے ساتھ اور ان کی عوام کی جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری اور عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے تو مسلمانوں کے لیے الگ سیاسی جماعت قائم کرنا درست ہوگا اگر مسلمانوں کی آبادی مرکز ہو اور جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہ ہو وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کے قیام کی صورت میں مسلمان مخالف ووٹ کے متحد ہونے کا خدشہ ہو اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھالیں تو وہاں مسلم سیاسی جماعت کے قائم کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کی بربادی اور خطرہ ہے۔

(۱۰) یہ بات قابل لحاظ ہے کہ موجودہ ہندوستان میں بہت تیزی سے یہ رجحان پنپ رہا ہے کہ سیاست میں عورتوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جائے، اس کے لیے مختلف ریاستوں میں مختلف سطحوں پر خواتین کے لیے سیٹیں ریزرو کی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پنجائیت کی سطح پر پچاس فیصد سیٹیں عورتوں کے لیے ریزرو کر دی گئی ہیں اور لوک سبھا سے پارلیمنٹ میں خواتین کے لیے ۳۳ فیصد ریزرویشن کا بل پیش کیا جا چکا ہے اور قومی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کر لے، نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم اکثریت کے شہر و قصبہ اور گاؤں میں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ممبر منتخب ہونے کے لیے اور چیئر مین پردھان اور کھیلا ہونے کے لیے حکومتی سطح پر مہیلا (عورت کی) سیٹ مقرر کر دی جاتی ہے کہ ان میں ممبر عورت ہی ہو سکتی ہے مرد وہاں انیکشن نہیں لڑ سکتا، امیدوار نہیں ہو سکتا، اور کبھی اسی کو بدل دیا جاتا ہے۔ ان حالات کے مد نظر مسلمانوں کی جان اور عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے مصلحتاً خواتین کو اجازت دی جائے کہ ووٹنگ میں حصہ لے سکیں اور انیکشن میں امیدوار بنیں اور قانون ساز اداروں کی ممبر بنیں۔ ☆☆☆

## الیکشن سے مربوط احکام

مفتی انور علی الاعظمی ع

سوال (۱) ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

مفتی محمد شفیع صاحب نے ووٹ کے بارے میں تین حیثیتوں کا ذکر کیا ہے: (۱) شہادت (۲) شفاعت (۳) وکالت۔

ووٹ دینے والا شخص اپنے امیدوار کے حق میں یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ اس عہدہ کے لائق ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرے گا یا وہ اس کے لیے لائق و فائق ہونے کی سفارش کرتا ہے یا اسے اپنی طرف سے وکیل بنا تا ہے، ان تینوں حیثیتوں میں مفتی شفیع صاحب کے نزدیک زیادہ اہم حیثیت شہادت کی معلوم ہوتی ہے، چنانچہ وہ اپنے رسالہ ووٹ کی شرعی حیثیت میں لکھتے ہیں:

انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام ہے اور اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام (جواہر لائقہ ۱۲۹۳)۔

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے ووٹ کو ایک شہادت تسلیم کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَرَ قَلْبِهِ“ (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے)۔

ہندوستان جیسے ملک میں ووٹ کو شہادت، شفاعت اور وکالت کا درجہ دینے میں بعض جگہوں پر بہت دشواری پیش آتی ہے، کیونکہ کہیں کہیں سارے ہی امیدوار نااہل ہوتے ہیں، اگر ہم ان کے حق میں شہادت دیتے ہیں تو یہ شہادت زور ہوگی جو اکبر کبار میں ہے اور اگر سفارش کرتے ہیں تو غلط آدمی کی سفارش کرنا بھی گناہ ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كَفْلٌ مِنْهَا (اور جو شخص بری سفارش کرتا ہے اس میں اس کو حصہ ملتا ہے)، اسی طرح وکالت کا مسئلہ بھی ہے وہ بھی حقوق مشترکہ میں وکالت بحیثیت وکیل جینے کے بعد ہمارا امیدوار جو کام کرے گا، ہم بھی اس کے حصہ دار ہوں گے۔ چنانچہ مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں: تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح اور قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی ہے اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے (انتخابات میں ووٹ، ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت ۲۹۳)۔

اس لیے ان تینوں جہات کے ساتھ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ایک چوتھے احتمال کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے وہ ہے رائے اور مشورہ، یعنی ہم امیدواروں میں اپنی رائے کا استعمال فلاں کے حق میں کرتے ہیں اور ہم موجودہ امیدواروں میں ایمانداری کے ساتھ اس عہدہ کے زیادہ لائق یا نسبتاً زیادہ مناسب فلاں امیدوار کو سمجھتے ہیں، اس لیے اپنے حق رائے وہی کا استعمال اسی کے حق میں کرتے ہیں، ووٹ کا لفظی معنی بھی یہی ہوتا ہے، Vote for لغت میں رائے دینے کو کہتے ہیں اور ووٹر کو رائے دہندہ کہا جاتا ہے۔

سوال (۲) اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

اس سوال کا جواب اس بات پر موقوف ہے کہ امیدوار کیسا ہے؟ اگر چند امیدواروں میں سب کے سب نااہل ہیں، مال و دولت کے حریص ہیں، اپنے عہدہ کا غلط استعمال کرنے والے ہیں تو ایسی صورت میں ان کے حق میں شہادت دینا شہادت زور ہوگا، اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے اور اللہ کے رسول

صلوٰۃ و آلالہ علیہ و آلہ و سلم

مٹی تیار کرنے کے لئے شہادت زور کو اکبر کبائر میں شمار کیا ہے، لہذا اس صورت میں ووٹ دینا ناجائز ہوگا اور اگر ان میں کوئی امیدوار اچھا ہے، اس کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ جیتنے کے بعد اپنے عہدہ کا صحیح استعمال کرے گا تو اس کے حق میں ووٹ دینا واجب ہوگا، کیونکہ شہادت کو چھپانا بھی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ“ (اور تم شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا) اور جہاں امیدوار کی اچھائی کا گمان غالب تو نہ ہو لیکن مجموعی طور پر اس کا جیتنا ملک و ملت کے حق میں مفید ہو، اس کو ووٹ دینا ناجائز ہونے کے ساتھ مستحب ہوگا۔

سوال (۳) ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس سلسلے میں مفتی محمد شفیع صاحب کی تحریر میں یہ مذکور ہے کہ کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے جو امیدوار کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے، ایک یہ کہ وہ اس کی قابلیت رکھتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ دیانت اور امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا، اب اگر وہ اس دعوے میں سچا ہے اور اسی جذبہ کے ساتھ اس میدان میں آیا ہے تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے اور اس کا بہتر راستہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کرے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں ہے وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے (انتخابات میں ووٹ دینا اور انتخابات کی شرعی حیثیت، ص: ۲۹۱)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی آدمی کا عہدہ یا امانت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا شریعت میں ناپسندیدہ ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے: لا تسئل الامارة فانك ان اعطيتھا عن مسئلة وکلت اليھا وان اعطيتھا عن غير مسئلة اعنت علیھا (متفق علیہ مشکوٰۃ شریف: ص: ۳۲۰) (اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حکومت اور ولایت کا سوال مت کرو، اگر سوال کرنے پر دی جائے گی تو تم اس کے سپرد کر دے جاؤ گے اور اگر بغیر سوال کے دی جائے گی تو اس پر تمہاری مدد کی جائے گی) اس حدیث کی بنیاد پر کسی شخص کا اپنے آپ کو پیش کرنا تو درست نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کی کوئی جماعت کسی شخص کو اس کا اہل سمجھ کر بحیثیت امیدوار کھڑا کرے تو یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے، لیکن اگر کہیں سارے ہی امیدوار نااہل ہوں اور کوئی اہل اپنے آپ کو اس بنا پر پیش کرے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں دوسرے لوگ اس کام کو ضائع کر دیں گے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آپ کو پیش کرنا اس کی واضح دلیل ہے۔

سوال (۴) غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارہ مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لیے وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنی ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

جواب: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے غیر اسلامی مملکت کے کلیدی عہدوں پر (مثلاً ممبر پارلیمنٹ) وغیرہ پر فائز ہونے کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصولی طور پر تو ظاہر ہے کہ یہ بات جائز نہ ہوگی جبکہ ایسی ملازمتوں میں سیکور اور غیر مذہبی ریاست ہونے کے لحاظ سے اسلامی قانون اور مخصوص احکام کے خلاف فیصلوں میں شریک ہونا اور اس کی تنفیذ کا ذریعہ بننا پڑے گا، مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر مسلمان ایسی ملازمت سے یکسر کنارہ کش ہو جائیں تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اسلام کے بچے کچھے آثار اور مسلمانوں کے دینی، تہذیبی اور دیوبی مفاد کا تحفظ دشوار ہو جائے گا اور مسلمان اس مملکت میں سیاسی اعتبار سے مفلوج اور تہذیبی اور مذہبی لحاظ سے مجبور اور اچھوت شہری بن کر رہ جائیں گے۔ اس کی واضح نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون مصر کے خزانہ کی وزارت قبول کرنا ہے، بلکہ اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے، چنانچہ فقہاء کے یہاں بھی ایسی نظیریں موجود ہیں: ویوجر من قام بتوزیعھا بالعدل بأن یحمل کل واحد بقدر طاقتھ، لانه لو ترک توزیعھا لذلک ربما یحمل بعضھ ما لا یطیق فیصیر ظلما علی ظلما ففی قیام العارف بتوزیعھا بالعدل تقلیل لظلمہ فلذا یؤجر۔

(ہاں وہ شخص ماجور ہوگا جو عدل کے ساتھ تقسیم کا فریضہ انجام دے کہ وہ ہر ایک پر اس کی طاقت کے بقدر لازم کرے، اس لیے کہ وہ اس کی تقسیم کا کام کسی ظالم کو سونپ دے تو بسا اوقات وہ بعض لوگوں پر ان کی طاقت سے زیادہ لازم کر دے گا اور یہ ظلم بالائے ظلم ہو جائے گا، لہذا ایسے آدمی کا اس ذمہ داری کا قبول کرنا جو عدل کے ساتھ تقسیم سے واقف ہو، ظلم کو کم کرے گا اور اس لیے اجر کا حقدار ہوگا) (بحوالہ راجح جدید فقہی مسائل، مصنف: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ص: ۲۵۲)۔

مولانا ظفر احمد تھانوی نے یہ لکھا ہے کہ اصحاب تحقیق علماء نے اسوہ یوسفی سے یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ کافرانہ قیادت کے تحت منصب قبول کرنا جائز ہے (اعلاء

اسی طرح متعدد صحابہ اور تابعین کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ ظالم یا فاسق قیادت کے تحت کوئی عہدہ قبول کرنا جائز ہے، چنانچہ حجاج کے دور میں ابو موسیٰ اشعری کے صاحبزادے ابو بردہ حجاج کی طرف سے قاضی بنائے گئے اور سعید بن جبیر کو ان کا معاون قرار دیا گیا (زیلعی ۲/ ۲۰۳)۔

ابن المقطان کا بیان ہے کہ ابو محمد طلحہ بن عبداللہ بن عوف زید بن معاویہ کے عہد حکومت میں مدینہ کے قاضی تھے۔ طلحہ بن عبداللہ مشہور تابعی ہیں اور ابن عباس، ابو بردہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، جب قضاء جیسے نازک منصب قبول کرنا جائز ہے تو دوسرے عہدے قبول کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں محض ان خطرات کے پیش نظر مسلمان ان اداروں کا بائیکاٹ نہیں کر سکتے کہ یہ ادارے مخالف شریعت قوانین بناتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کی بڑی تعداد کے موجود رہنے پر یا حکومت میں موثر حیثیت بنانے کی صورت میں ایسے قوانین کو روکنا ممکن ہے اور الگ تھلگ رہ کر روکنے کی کوئی شکل نہیں۔

اگر اسمبلی یا پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران موجود ہوں تو شریعت مخالف بل کے خلاف احتجاج کر سکتے ہیں اور حصہ نہ لینے کی صورت میں اسلام مخالف پارٹیوں کے لیے ایسے بل پاس کرنا زیادہ آسان ہوگا۔

سوال (۵) جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت ہوتی ہے تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

جواب: کفایۃ المفتی میں ایک سوال ہے: سوال: کسی اسلامی انجمن کے کام کو نہایت اخلاص سے کرنے کے لیے آپس میں بدظنی کے خیال کو دور کرنے کے لیے کارکنوں کو حلف اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ کسی مشروع کام کرنے کا معاہدہ یا حلف کرنا جائز تو نہیں ہے لیکن بہتر نہیں ہے، کیونکہ وہ کام اگر ضروری (فرض یا واجب) ہے تو خود شریعت کا حکم اس کے لیے کافی ہے اور مسنون یا مستحب ہے تو معاہدہ یا حلف سے ایک قسم کی پابندی اور سختی عائد ہو جاتی ہے اور صورت خلاف عہد شکنی یا حلف شکنی لازم آتی ہے (کفایت المفتی ۲/ ۱۹۵)۔

ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ایکشن کا بائیکاٹ کرنا بھی ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اسمبلی اور پارلیمنٹ کی رکنیت سے علیحدہ رہنا مناسب ہے، اگر مسلمان قانون ساز اداروں سے قطع تعلق رہیں تو کافروں کی اکثریت بلکہ ان کی اجتماعیت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسے قانون بنائے گی کہ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں رہنا ہی مشکل ہو جائے گا، اس لیے مجبوری کے درجہ میں مسلمانوں کا اس ملک کے قانون ساز اداروں میں شریک ہونا ضروری ہے۔ اگر اس کے لیے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے تو یہ ایک اضطراری مجبوری ہے اور ہندوستان کا دستور بھی مجموعی طور پر سیکولر ہے، اس کے بعض دفعات اسلام کے خلاف ہیں، لیکن دستور کا بڑا حصہ تمام مذاہب کے لیے آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔

مزید برآں یہ کہ اگر اسلام مخالف کوئی قانون پارلیمنٹ پاس کرتی ہے تو مسلمانوں کو اس پر احتجاج کرنے کا پورا حق ہے اور چونکہ ملک کی اکثر پارٹیاں مسلمانوں کے ووٹ کے بغیر اپنی حکومت نہیں بنا سکتیں، اس لیے وہ مسلمانوں کے احتجاج کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔

سوال (۶) بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھانے سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن خطاب کو چند سواروں کے بیچ میں پایا اور حضرت عمر اپنے باپ کی قسم کھا رہے تھے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو پکار کر کہا کہ اللہ تم کو اپنے باپ کی قسم کھانے سے روکتا ہے۔ ”فمن كان حالفا فليحلف بالله أو ليصمت“ کہ لوگو! اپنے باپ کی قسم نہ کھاؤ جس کو قسم کھانا ضروری ہی ہے وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے (صحیح مسلم: ج: ۲، ص: ۳۶)۔ احناف کے یہاں اگر کوئی شخص قرآن کی قسم کھاتا ہے تو بعض حضرات کے یہاں منعقد نہیں ہوگی، لیکن علامہ ابن ہمام نے یہ کہا ہے کہ قرآن کی قسم کھانا لوگوں کے نزدیک متعارف ہے، اس لیے منعقد ہوگی۔

مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی نکتہ فتح الملہم میں تحریر فرماتے ہیں: واما الحلف بالقرآن فجوزہ بعض الفقہاء لأنه صفة من صفات اللہ تعالیٰ وانکرہ بعضهم لانه يراد به الفاظ القرآن وانما ليست بصفة، وكذلك اختلفوا في اليمين

بالقرآن فذكر صاحب الهداية ان اليمين لا ينعقد به لانه غير متعارف واستنبط ابن الهمام من هذا التعليل انه ينعقد عندما تعارف الناس باليمين به و لذلك افتي علماء الحنفية بانعقاد اليمين به في زماننا و راجع رد المحتار (تكملة فتح الملهم ۲۰۱۸)۔

اس عبارت کی روشنی میں یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں کے یہاں قرآن کے علاوہ دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ قسم کھانا متعارف نہیں ہے، اس لیے اگر کسی ممبر نے بائبل پر مجبوری میں حلف لے ہی لیا تو وہ منعقد نہیں ہوگی، البتہ غیر اللہ کی حلف نہیں لینا چاہیے، ایسا کرنے کی وجہ سے اس نے ایک فعل مکروہ کا ارتکاب کیا، مجبوری میں اگر ایسا کرنا پڑتا ہے تو بعد میں توبہ کرے اور حلف لینے والا اپنے دل میں اس بائبل کی نیت کرے جو منزل من اللہ ہے۔

سوال (۷) بعض سیکولر سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کے بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں، تو کیا ایسی پارٹی میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

جواب: ایسے ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے لیے بہت ساری نزاکتیں ہوتی ہیں، اقلیت میں ہونے کی بنا پر مسلمان اپنی حکومت نہیں بنا سکتے، بعض پارٹیاں کھلے طور پر مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں، مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو ان کے نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ملکی سیاست میں بے حیثیت اور بے وزن کر دیا جائے، اگر ایسی پارٹیاں ملک کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں تو وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن تدبیر کریں گی، ایسی صورت حال میں وہ سیکولر پارٹیاں جو مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کا وعدہ کریں اور تجربہ سے اس کی تائید بھی ہوتی ہو تو ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا مسلمانوں کے لیے جائز ہوگا۔ رہ گیا کہ اگر ان کے منشور کی بعض دفعات اسلام اور مسلم مفادات کے مخالف ہوں تو پارٹی میں رہ کر اس کے دفاع کی شکل اپنائی جاسکتی ہے؟ جس پارٹی کو مسلمانوں کے ووٹ ہی سے حکومت بنانے کی امید ہو، اگر بڑی تعداد میں اس میں مسلمان شامل ہیں تو وہ پارٹی مسلمانوں کا دباؤ قبول کرے گی، دنیا کے موجودہ حالات میں جب تک ذہن سازی نہ ہو پاکستان اور مصر جیسے مسلم ملکوں میں بھی مکمل اسلامی قانون نافذ کرنا مشکل ہے تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، کسی غیر مسلم سربراہ کو اسلام کے اصولوں کا پابند کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے، لہذا الضرر الاشد يزال بالاخف کے قاعدے سے مسلمانوں کے لیے ایسی سیکولر پارٹیوں میں شمولیت جائز ہوگی۔

سوال (۸) جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو تو کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

جواب: جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور سے مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو تو اس پارٹی میں کسی مسلمان کو شریک ہونا جائز نہ ہوگا اور ہاں ایسا شخص جس کی نیت ہو کہ اس میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو یہ کام بڑا مشکل ہے، ایک شخص یا چند اشخاص پارٹی کا منشور نہیں بدل سکتے اور جب پارٹی کا منشور ہی اسلام اور مسلمان کی مخالفت پر مشتمل ہو تو ایسی پارٹی کی مدد کرنا تعاون علی الاثم والعدوان کے مترادف ہے اور اسلام دشمن طاقتوں کو قوت پہنچانا ہے، لہذا اس کی گنجائش نہیں ہے۔

سوال (۹) ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقہ میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

جواب: ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اس وقت تمام ہندو تنظیمیں اور دوسری سیاسی پارٹیاں مل جائیں گی اور مسلمانوں کے خلاف متحدہ سیاسی محاذ بنا لیں گی، اس کی وجہ سے فرقہ واریت بڑھے گی۔ اس صورت میں مسلمانوں کے لیے بجائے نفع کے نقصان کا غالب اندیشہ ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے متعدد تجربے کیے گئے۔ اس وقت یوپی میں علماء کونسل، پیس پارٹی اور بھی چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیاں سرگرم عمل ہیں، لیکن مجموعی طور پر ان سے نفع کی شکل دکھائی نہیں دیتی ہے اور یہ بات تو بہت مشکل ہے کہ کشمیر چھوڑ کر ہندوستان کے کسی صوبہ میں کوئی مسلم پارٹی اپنی سرکار بنا سکے۔ مرکز میں یہ معاملہ اور بھی دشوار کن ہے، اس لیے ان حالات میں الگ سیاسی پارٹی بنا کر مسلمانوں کو متحد کرنا یہ



ممکن بھی نہیں ہے اور ایسا کرنے میں مسلمانوں کے لیے زیادہ نفع کی امید بھی نہیں ہے۔ ماضی قریب میں ہندوستان کے دو بڑے عالم جو سیاسی سوچہ بوجھ بھی رکھتے تھے فقہی ملت حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمہم اللہ ان حضرات نے اپنے سیاسی تجربہ کی بنا پر یہی نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کا الگ پارٹی بنا کر الیکشن لڑنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہے اور یہ بات تجربے سے ثابت ہو رہی ہے کہ اگر بھاری پیمانے پر مسلمان متحد ہو جائیں تو یقیناً تمام سیاسی پارٹیاں ان کے خلاف محاذ آرا ہو جائیں گی اور اس سے ملک کے فرقہ پرستوں کو مسلمانوں کے خلاف اپنے مقاصد پورا کرنے کا موقع ملے گا۔

سوال (۱۰) ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ الیکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، انہیں دو ٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لیے الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے؟ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں تیزی سے یہ رجحان پنپ رہا ہے کہ سیاست میں عورتوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جائے اس کے لیے مختلف ریاستوں میں اور مختلف سطحوں پر خواتین کے لیے سیٹیں ریزرو کی جارہی ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پنچایت کی سطح پر پچاس فیصد سیٹیں عورتوں کے لیے ریزرو کر دی گئی ہیں اور لوک سبھا سے پارلیمنٹ تک خواتین کے لیے ۳۳ فیصد ریزرویشن کا بل پیش کیا جا چکا ہے اور قومی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کر لے۔

جواب: جمہوری ملک میں اور وہ بھی ہندوستان جیسے ملک میں ووٹ میں حصہ نہ لینے کی صورت میں بہت ساری پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، بہت سی جگہوں پر اگر خواتین ووٹ میں حصہ نہ لیں تو مسلم امیدوار مسلم ووٹوں کی اکثریت کے باوجود بھی ہار جائیں گے اور اسمبلی یا پارلیمنٹ میں ہماری نمائندگی مفقود ہو جائے گی بلکہ ووٹ میں حصہ نہ لینے پر خواتین کی قومیت کا مسئلہ بھی خطرہ میں پڑ سکتا ہے، اس لیے دو ٹنگ میں حصہ لینا بہر حال ایک بہت بڑی مجبوری ہے اور انہیں دو ٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، البتہ ان کا الیکشن میں امیدوار بننا اور قانون ساز اداروں کا ممبر بننا ایک مشکل مسئلہ ہے، اس لیے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے کسریٰ کی بیٹی کے بادشاہ بنائے جانے پر یہ ارشاد فرمایا تھا: "کیف یفلیح قومہ ولو اعلینہ امر اۃ" فی الحال جب تک لوک سبھا سے پارلیمنٹ میں خواتین کے لیے ریزرویشن کا بل پاس نہیں ہو جاتا اس وقت تک تو مسلمانوں کو یہی دباؤ بنانا چاہیے کہ یہ بل پاس نہ ہو سکے، البتہ پنچایت کی سطح پر بہت ساری ریاستوں میں عورتوں کے لیے سیٹیں ریزرو ہو گئی ہیں، ایسی جگہوں پر مسلمانوں کے لیے امیدوار بنانا ایک مجبوری ہے۔ اگر مسلمان عورتیں الیکشن سے دور رکھی جائیں تو بہت سے شہروں میں مسلمانوں کا اجتماعی نقصان ہوگا، اس لیے عورتیں پنچایت کی سطح پر امیدوار بنیں اور وہ اپنے محرم کے ساتھ آئیں جائیں۔ اب تک جو چیز تجربہ میں آچکی ہے وہ یہی ہے کہ ایک چیئر مین عورت اپنے شوہر کو نمائندہ بنا کر نگر پالیس کی ذمہ داری پوری کر سکتی ہے، بعض بعض جگہوں پر اس کا جانا ضروری ہے وہاں اپنے شوہر یا کسی محرم کے ساتھ جا کر اپنی ذمہ داری پوری کر لے گی، اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں کسی اکثریتی مسلم شہر میں غیر مسلم عورت چیئر مین ہوگی اور مسلمانوں کو پانچ سال تک اس کو جھیلنا پڑے گا، اس لیے "الضرر الاشد یزال بالأخف" "الضرر یزال" "إذا ضاق الأمر اتسع" کے قواعد کی رو سے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور مسلمان اس طرح کے قانون بد لوہانے کی طاقت نہیں رکھتے تو مجبوری کے درجہ میں یہ جائز ہوگا۔ البتہ مسلمان عورت کو ان عہدوں پر رہتے ہوئے اسلامی اصولوں کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ بین الاقوامی طاقتیں اس طرح کے قانون دباؤ ڈال کر پاس کر داتی ہیں تاکہ مسلمان عورتیں باہر نکلنے کے لیے مجبور ہوں۔ مسلمانوں میں بے پردگی کا رجحان بڑھے اور مسلمانوں کا اسلامی معاشرہ اپنے روایتی طریقے سے ہٹ جائے، اس لیے مسلمان مردوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اپنی عورتوں کو آزاد اور بے مہار نہ چھوڑیں، ورنہ ایک پریشانی کو دور کرنے کے لیے دوسری بہت ساری پریشانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

## ووٹ کی شرعی حیثیت

مفتی محمد عبدالرحیم القاسمی

۲،۱۔ کسی امیدوار کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن وحدیث چند حیثیتیں ہیں:

ایک حیثیت شہادت گواہی کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے اسکے متعلق اسکی شہادت گواہی دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت وامانت بھی اور اگر اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اسکو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت دیتا ہے، جو سخت کبیرہ گناہ اور دنیا و آخرت کا وبال ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو شرک کے ساتھ اکبر کہا فرمایا ہے (بخاری و مسلم)۔

جس حلقہ میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اسکو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کہا (سب سے بڑے گناہ) میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔

دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اسکی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے: ”و من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منها و من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منها“ یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اسکو بھی حصہ ملتا ہے اور جو شخص بری سفارش کرتا ہے تو اسکی برائی میں اسکا بھی حصہ لگتا ہے، اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانتدار آدمی کی سفارش کرے جو خدا کی مخلوق کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بری سفارش یہ ہے کہ نا اہل، نالائق، فاسق اور ظالم کی سفارش کرے اسکو مخلوق پر مسلط کرے، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے بیخ سالہ دور میں نیک یا بد جو عمل کریگا ہم بھی اسکے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹ کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اسکے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی ہے اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا ہے تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا ہے مگر یہاں ایسا نہیں، کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اسکے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نا اہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دیکر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اسکی گردن پر پڑا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت گواہی، دوسرے سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک صالح اور قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اسکے ثمرات اسکو ملنے والے ہیں، اسی طرح نا اہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی گواہی بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اسکے تباہ کن ثمرات بھی اسکے نامہ اعمال میں لکھیں جائیں گے۔

مذکورہ صدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نا اہل ظالم وفاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے، بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے، قرآن کریم نے جیسے جھوٹی گواہی کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح اچھی شہادت کو واجب ولازم فرمایا ہے۔

جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانتدار نہ معلوم ہو مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی بنسبت

غنیمت ہو تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم (برائی کو کم کرنے اور ظلم کو کم کرنے) کی نیت سے اسکو بھی دوش دیدینا جائز بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم (ظلم کم کرنے) کو فقہار رحمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے (جواہر الفقہ ۱۲/۹۳-۹۴-۲۹۲)۔

۳۔ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں: عام اسلامی حکم یہی ہے کہ از خود کسی سرکاری عہدے یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا جائز نہیں اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا، لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کریگا تو نااہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اجعلنی علی خزائن الارض کہنا اسی صورت پر محمول ہے، اس شرعی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ انتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلب اقتدار کی بنیاد پر پورا نظام حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں اور اگر منشاء صرف طلب اقتدار ہو یا دوسرے اہل لوگ موجود ہوں یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظام انتخابات میں امیدوار بننا جائز نہیں، لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا اسکے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو صالح اور اہل افراد اگر طلب اقتدار کے جذبہ کے بجائے اصلاح حال کی غرض سے آسمیں شامل ہوں تو اسکی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفاسد سب و شتم، غیبت اور دوسرے محرمات و منکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو جو اس دور میں شاذ و نادر ہیں۔

حضرت مولانا نادر الحسن قاسمی نے تحریر فرمایا ہے: جو حضرات مشارکت کے جواز کے قائل ہیں، ان کی دلیل یوسف علیہ السلام کا وہ مطالبہ ہے جو انہوں نے عزیز مصر سے کیا تھا، "اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیہ" دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود مختار نہیں تھے بلکہ بادشاہ کے تابع تھے، حکومت میں کوئی بڑی اور بنیادی تبدیلی لانے کا اختیار نہیں رکھتے تھے اور بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دین پر نہیں تھا یہی نفس عموم رکھتی ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں، یوسف علیہ السلام کی یہ دلیل کہ وہ حفیظ علیہم ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ اگر صاحب اہلیت کو یہ محسوس ہو کہ عدل کے قیام و دفع شر کا امکان ہے یا یہ کہ وہ وطن اور اہل وطن کے لئے واضح مصلحت سمجھتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو پیش کرے یا حکومت میں شریک ہو خواہ حکومت اسلامی نہ ہو۔ اسکی تائید نجاشی والے واقعہ سے ہوتی ہے وہ اپنے اسلام لانے کے باوجود خدا کے نازل کردہ احکام سے ہٹ کر فیصلہ کرتے رہے اور ایک غیر مسلم قوم کے بادشاہ بنے رہے، اسکے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کافر اور خارج از ملت قرار نہیں دیا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خط بھیجا تھا کہ میں صرف اپنے نفس کا مالک ہوں، اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر اسلامی حکومت میں مشارکت جائز ہے، اگرچہ اس پر کوئی حالات میں بنیادی تبدیلی لانے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

مشہور مفسر قرآن امام شہاب آلوسی حضرت یوسف کا قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس میں منصب یا ذمہ داری کا مطالبہ کے جواز کی دلیل ہے، اگر طالب منصب اقامت عدل پر قدرت رکھتا ہو، خواہ کسی کافر یا ظالم سے ہی کیوں نہ مطالبہ کرنا پڑے (روح المعانی ص ۵۳)۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی وزارت یا سیاسی انتظامیہ میں مشارکت کا مقصد موجودہ پارلیمانی نظام یا جدید وزارتی انتظامیہ کے تحت نہ ظالموں کی ماتحتی ہے نہ موالات کفار اور نہ غیر شریعت الہی کی تحکیم ہے، بلکہ وضعی نظام میں شرکت سے شرکت کرنے والے کا مقصد اگر وہ اپنے دین کا پابند ہے تو عدل کا قیام اور حتی الامکان شریعت الہی کی تحکیم ہے، اس شرط کے ساتھ کہ دین کے ساتھ مدہانت نہ ہو۔ اس موقف کی تائید سلطان العلماء عز بن عبد السلام کے اس قول سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے قواعد میں بہت ہی سنجیدہ اور فقہی اسلوب میں کہا ہے۔

اگر مسلمانوں کے رسوخ کو پختہ کرنے اور انکے وجود کی حفاظت کے لئے غیر اسلامی حکومت میں مشارکت ہی واحد وسیلہ ہو تو اسکے جائز ہونے بلکہ بعض حالات میں واجب ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہ معاملہ قیام عدل، دین کی حفاظت اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح پر شرکت کرنے والے کی قدرت سے مربوط ہے (غیر مسلم مالک میں مسلمانوں کے اہم مسائل ۲۲۹)۔

۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بنا سکیں تو انکے خلاف آواز اٹھانا شرعاً فرض اور جمہوری حق ہے اور اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر دے تو اجلاس سے غیر حاضر ہو کر اپنی نفرت ظاہر کر دے اور اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل میں اس کی برائی اور نفرت ہونا بھی کافی ہوگا، اس کے باوجود اس قانون ساز ادارے یا اس پارٹی کی شرکت جاری رکھنے کی گنجائش ہوگی۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع

فقبلہ وذلک أضعف الإيمان (مسلم ۱۰۵۰) تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے اس کو روک دے، اگر اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا ہو تو اس کو دل سے برا سمجھے، حالانکہ یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

حضرت مولانا بدر الحسن قاسمی نے تحریر فرمایا ہے: اصل تو یہی ہے کہ انسان اس نظام میں شریک نہ ہو جو عدل کی بنیادوں پر قائم نہیں، لیکن جیسا کہ کہا گیا مالا بد رک کلا لایترک کلمہ اور اسلامی شریعت کے مقاصد میں حسب امکان ظلم اور برائی کو کم کرنا اور جرم و زیادتی کے دائرے کو تنگ کرنا شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فانقوا اللہ ما استطعتم (جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو) (تقوا بن ۱۶)، دوسری جگہ ارشاد ہے: لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها (بقرة: ۲۸۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو جتنا ممکن ہو اس پر عمل کرو۔ صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور قریش کے ظلم و زیادتی سے بچنے کے لئے نجاشی کے پاس پناہ گزین ہوئے، اس لئے کہ یہ معاملہ نسبتاً آسان تھا اور نجاشی اپنے اسلام لانے کے باوجود حکومت کرتے رہے حالانکہ انکی حکومت اسلامی نہیں تھی۔

## ۵۔ قانون ساز اداروں کا رکن منتخب ہونے پر دستور سے وفاداری کا حلف:

جہاں تک حلف برداری یا دستور کی قسم کھانے کا تعلق ہے تو وہ ایک قسم کا عہد ہے کہ دستور کے دفعات کی پابندی کی جائے گی اور منصب و عہدہ کے دوران پوری امانتداری اور باریکی کے ساتھ ذمہ داریوں کی ادا کیگی کی جائے گی، دقیق معنوں میں وہ شرعی حلف نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ بعض آمریت پسند حکومتوں میں حاکم کے نام کی قسم کھانے سے کم تر ہو، حلف برداری کے لئے تیار کی جانے والی عہدہ داروں میں تبدیلی کی جاسکتی ہے، اس کو صحیح عقیدہ کے مطابق بنایا جاسکتا ہے تاکہ وہ دین اسلام کی تعلیمات کے منافی نہ ہوں (غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے مسائل: ص ۲۳۳)۔

حلف وفاداری اس شرط اور نیت سے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو، میں وفاداری کروں گا، اٹھالینے میں مضائقہ نہیں (کتابت الفتی ۳۰۹)۔  
۶۔ مسلمان ہونا ظاہر کرنے کے باوجود عیسائی ملک میں بائبل پر حلف لینے پر ہی مبری موقوف ہو تو اسکی گنجائش ہے الا من اکره وقلبه مطمئن بالإیمان (مگر جس شخص پر کافروں کی طرف سے زبردستی کی جائے بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو) (نحل: ۱۰۶)۔  
یعنی عقیدہ میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول و فعل کو سخت گناہ اور برا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ظاہری طور پر کلمہ کفر یا فعل کفر میں مبتلا ہو جانا ایک عذر کی بنا پر ہے (معارف القرآن: ص ۳۰۵)۔

۷۔ سیکولر پارٹیوں اور انکی حکومتوں میں شمولیت اخف الضررین کو اختیار کرنا ہے، یہ ایک اصولی مسئلہ ہے اور عقل و شرع دونوں کے نزدیک مقبول ہے، فقہاء نے منکرات پر سکوت کو اس وقت جائز قرار دیا ہے جب کسی منکر پر انکار اس سے بڑے منکر کا سبب بن سکتا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو انہی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے تھے جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا تھا، لیکن فتنہ کے اندیشہ سے ترک کر دیا اور حضرت عائشہ سے فرمایا: اگر تمہاری قوم ابھی ابھی شرک سے نکلی ہوئی نہ ہوتی تو میں حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر کعبہ کی تعمیر کرا دیتا (صحیح بخاری ۲/۶۳)۔

اگر انسان سب سے بہترین عمل پر قادر نہ ہو اور حالات نامناسب ہوں تو کمتر پر اکتفاء کرنے کی گنجائش ہے، اس سلسلہ میں چند فقہی اصول یہ ہیں: المشقة تجلب التيسير (مشقت آسانی کو کھینچ لاتی ہے)۔ الضرورات تبیح المحظورات؛ (ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں)۔ الضرر يزال (تکلیف و نقصان کو دور کیا جائے گا)، یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ دشواری نہیں چاہتا)، وما جعل علیکم فی الدین من حرج (اور نہیں بنائی تمہارے اوپر دین میں تنگی اور حرج) (غیر مسلم ممالک: ص ۲۳۱)۔

مصالحات اور آشتی کے ساتھ زندگی گزارنا اور تجارت، زراعت، صنعت اور سیاست میں اشتراک عمل کرنا جائز اور بعض حالات میں واجب ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے مقامات میں جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مشترک ہو یا غیر مسلم آبادی کی کثرت ہو، بہر حال یہ لازم ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کے پابند رہیں اور مذہبی شعائر کی عزت و حرمت محفوظ رہے، ورنہ پھر مسلمان پر مذہب کے تحفظ اور اسکا احترام قائم رکھنے کے فرائض عائد ہوں گے (کتابت الفتی ۲۷۸)۔

۸۔ امام محمد نے سیر کبیر میں فرمایا ہے: ولا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك علی أهل الشرك إذا كان حکم الإسلام هو الظاهر علیهم (جو اہل الفقه ۲۰۸) (کوئی حرج نہیں کہ شرک والوں کے مقابلہ کے لئے مسلمان اہل شرک سے مدد طلب کریں جبکہ

وان جنحوا للسلم فاجنح لها (سورہ انفال: ۶۰) (اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی صلح کے لئے تیار ہو جائیں)۔

قال الشامی: إنه عليه الصلاة والسلام استعان في غزوة خيبر يهود من بني قينقاع وفي غزوة حنين بصفوان بن أمية وهو مشرك (شامی ۲۳۵/۳) (حضور ﷺ نے غزوہ خیبر میں بنی قینقاع یہودیوں سے اور غزوہ حنین میں صفوان ابن امیہ مشرک سے مدد طلب کی) یہود کے ساتھ حضور پاک ﷺ نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے اور درمختار میں ہے: ومفاده جواز الاستعانة بالكافر عند الحاجة وقد استعان عليه الصلوة والسلام باليهود على اليهود (در مختار علی ہامش رد المحتار ۲۰۲۵۵)۔

یعنی عبارت ما قبل کا مفاد یہ ہے کہ کافر سے حاجت کے وقت جنگ میں مدد لینا جائز ہے اور آنحضرت ﷺ نے یہود کی ایک جماعت سے دوسری جماعت کے خلاف مدد لی، اس کے بعد یہ ذکر کیا کہ آنحضرت ﷺ نے غزوہ بدر میں تو کافر کی مدد لینے سے انکار فرمایا تھا مگر اس کے بعد غزوہ خیبر میں یہودی بنی قینقاع سے اور غزوہ حنین میں صفوان ابن امیہ مشرک سے مدد لی تو غزوہ بدر میں استعانت سے انکار فرمانا اس لئے تھا کہ مدد لینا نہ لینا دونوں باتیں جائز تھیں، اس صورت میں غزوہ بدر اور غزوہ خیبر و حنین کے واقعات میں تعارض نہیں اور یا اس لئے کہ غزوہ بدر کے وقت مشرک سے مدد لینا جائز نہ تھا تو اسکے بعد غزوہ خیبر و حنین کے واقعات نے اس حکم کو منسوخ کر دیا (کفایت المفتی ۳۳۹/۹)۔

حضور ﷺ اور صحابہ کرام عمرہ کرنے کے لئے مدینہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے، حدیبیہ کے مقام پر قریش نے حضور پاک ﷺ اور صحابہ کرام کو مکہ کی طرف جانے سے روک دیا اور صلح کرنے پر مجبور کیا۔ صلح کی شرائط یہ تھیں:

۱۔ دس سال تک آپس میں جنگ بند رہے گی۔

۲۔ مکہ سے کوئی مدینہ آئے گا تو آپ اسکو واپس کر دیں گے اگرچہ مسلمان ہو کر آئے۔

۳۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص مدینہ سے مکہ جائے گا تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ اس دوران کوئی ایک دوسرے کے خلاف تلوار نہیں اٹھائے گا۔

۵۔ محمد ﷺ اس سال بغیر عمرہ واپس جائیں مکہ میں داخل نہ ہوں، آئندہ سال صرف تین دن مکہ میں رہ کر عمرہ کر کے واپس ہو جائیں، اس وقت سوائے تلواروں کے کوئی ہتھیار ساتھ نہ ہوں اور تلواریں بھی میان میں ہوں۔

شرائط معاہدہ میں نمبر ۲۔ نمبر ۳۔ نمبر ۵۔ مغلوبانہ شرائط تھیں، لہذا یہ صلح مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ اور مسلمانوں کے دلوں کو زخموں سے چور چور کرنے والی صلح تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے برحق نبی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں! حضرت عمرؓ نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: بیشک! حضرت عمرؓ نے کہا پھر ہم یہ ذلت کیوں گوارا کریں حضور ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول برحق نبی ہوں اس کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کے صدے کا یہ حال تھا کہ صلح کے بعد آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو سر منڈوانے کا حکم دیا تو رنج و غم کی وجہ سے کسی نے بھی تعمیل نہیں کی، پھر آنحضرت ﷺ نے سب کے سامنے بیٹھ کر سر منڈوایا اور احرام کھولا تو آپ ﷺ کی اتباع میں سب نے احرام کھول دیئے اور قربانی کر دیں (صلح حدیبیہ ص ۶۳)۔

مبسوط میں علامہ سرخسی نے لکھا ہے: إن النبي ﷺ صالح أهل مكة عام الحديبية على أن يضع الحرب بينه وبينهم عشر سنين (مبسوط سرخسی ۱۰۰/۲۷) (حضور ﷺ نے اہل مکہ سے حدیبیہ کے موقع پر دس سالہ جنگ بندی پر معاہدہ کیا)۔

الغرض معاہدہ حدیبیہ کی رو سے قریش نے مدینہ پر آپ ﷺ کی سیادت کو تسلیم کر لیا، اس سے پہلے قریش آپ کو ایک باغی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے (رسول اکرم کی سیاست خارج ص ۲۰۸)۔

معاہدہ حدیبیہ کی رو سے مسلمانوں کا حق زیارت کعبہ تسلیم کر لیا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کو بھی ایک مذہب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا (رسول اکرم کی سیاست خارج ص ۲۰۵)۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک مخصوص پارٹی کا ووٹر سمجھ کر ایک پارٹی نے نفرت و عداوت کا شکار بنایا یا باری مسجد کو شہید کرنے اور گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام سے اسکی دشمنی نقطہ عروج پر پہنچ گئی جس کی وجہ سے اس کی عوامی مقبولیت کم ہو گئی تو خود اس پارٹی نے اپنے تشدد لیڈروں کو کنارے کر دیا اور بھائی چارے والے لیڈروں کا تعارف کرانا شروع کر دیا، انتخابی منشور کو بھی فرقہ پرستی سے ملک کی ترقی کی طرف موڑنے کی کوشش کرنے لگی اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی تدبیریں کرنے لگی، ایسی حالت میں عدم تشدد کی بہترین مثال حربی کافروں کی غالب اکثریت سے اپنی حیثیت تسلیم کرانے اور مراعات حاصل کرنے کا نمونہ صلح حدیبیہ کی روشنی میں اگر مسلمان اس پارٹی میں شامل ہوں جس سے امید ہو کہ پارٹی مسلم دشمنی کے بجائے وکاس اور ملکی ترقی کو ایجنڈا بنا لے گی تو جہاں ایسی پارٹی کی حکومت یا غلبہ ہو وہاں اس میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی۔

۹۔ آزادی کے بعد سے پینسٹھ سالہ تجربہ سے ثابت ہے کہ سیکولر پارٹیاں فرقہ پرستوں سے خوفزدہ کر کے اور سنہرے خواب دکھا کر مسلمانوں کے ووٹ حاصل کر لیتی ہیں، پھر مسلمانوں کو غربت و جہالت کے دلدل میں دھکیل کر رخ پھیر لیتی ہیں، کسی مسلمان کو شخصی طور پر فائدہ پہنچانے کے علاوہ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل حل کرنے پر بالکل توجہ نہیں کرتیں اور مسلمان اپنے حقوق کی بھیک مانگتے ہیں تو ان کی آواز کو دبانے کے لئے غیر مسلموں کی تنظیموں کو کھڑا کر دیتی ہیں، اس لئے مسلمانوں کی تنظیم اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے سیاسی پارٹی بنانا ضروری ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی جماعت کسی پارٹی سے انتخابی اشتراک یا حکومت سازی کا معاہدہ کرتی ہے تو عزت و سہولت کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کی حصول یابی ممکن ہو جاتی ہے اور مسلم سیاسی پارٹی کے پریشور دباؤ کی وجہ سے دیگر پارٹیاں بھی مسلمانوں کو حقوق اور مراعات دینے پر مجبور ہوتی ہیں۔

جو لوگ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی سیاسی پارٹی بنانے سے فرقہ پرست ناراض ہو جائیں گے، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں انکی حق تلفی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے انکو مسلم سیاسی پارٹی بنانے کی ضرورت ہے جہاں مسلم سیاسی پارٹیاں ہیں وہاں مسلمان فریادوں کے ساتھ برادران وطن کی بھی خدمت کرتے ہیں، انکی سماجی، طبی و سیاسی خدمات سے متاثر ہو کر غیر مسلم بھی انکو ووٹ دیتے ہیں، جنوبی ہند کے کیرالا اور تملناڈو میں مسلم لیگ اور حیدرآباد میں مسلم اتحاد المسلمین مسلم سیاسی پارٹی کی افادیت کی بہترین مثالیں ہیں۔

حضرت تھانوی نے تحریر فرمایا ہے: اس میں تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دور حاضر میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور انکے تمام منافع و مصالح کی حفاظت اور تمام مضار و مفاسد سے صیانت اسی تنظیم پر موقوف ہے، مگر اسکے ساتھ ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم عمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شرعیہ کی موافق ہو جو آیت و اعتصوموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا سے ظاہر ہے، سو اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو واجب واضح تھا، لیکن موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے نہ قریب میں توقع، اس لئے بجز اسکے چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہوں اس کی اصلاح کریں اور اگر ان کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشوار ہو تو بقاعدہ عقلیہ و نقلیہ من ابتلی ببلیتین فلیختر اھو نہما اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو (امداد الفتاویٰ ۶۳۰/۴) اور اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمیشہ مذکورہ اس تنظیم کو ہمیشہ مستقل جاری و باقی رکھیں، کیونکہ اس کے شمرہ کی تو ہمیشہ ہی حاجت ہے۔

یہ خلاصہ تو ہے ہمارے انتظام کا باقی دوسروں کے ساتھ معاملہ سو اس انتظام کے بعد اگر کانگریس مسلم لیگ سے صلح کی طرف مائل ہو حسب ارشاد: وان جنحو للسلحہ فاجنح لھا اس سے اصول شرعیہ کے موافق تہیقظ و تدبر کے ساتھ اہل تجربہ و اہل علم و اہل فہم کے مشورہ سے صلح رکھیں مگر اپنی تنظیم مذکورہ کو اس وقت بھی قوت و استقلال کے ساتھ قائم رکھیں، اس کو کمزور نہ کریں اور نہ کانگریس میں مدغم کریں کہ یہ شرع اور تجربہ دونوں کے اعتبار سے نہایت مضر ہے اور اگر بالفرض مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ صاحب قوت اور صاحب اثر تیار ہو جاوے، اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہوں اور ان سب حالات میں قولاً و فعلاً و حالاً و تقریراً و تحریراً موافق و مخالف ہر ایک کے ساتھ اخلاق اسلامی کو اپنا شعار رکھیں (امداد الفتاویٰ ۶۳۰/۴)۔

۱۰۔ پردہ کا لحاظ رکھتے ہوئے خواتین ووٹ دینے جاسکتی ہیں اور جو سیٹ عورت کے لئے ریزرو کر دی گئی ہو اور مسلمانوں کی نمائندگی عورت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہو تو ایکشن میں کھڑے ہونے اور اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لئے ممبر بننے کی بھی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ وہ فرائض منصبی کی ادائیگی میں احکام شرعیہ کی پابندی کرے، کیونکہ یہ عورت مطلق بادشاہ یا امیر نہیں بنے گی، بلکہ صرف مشیر کی حیثیت سے منتخب ہوگی۔ ☆☆☆

## ایکشن سے متعلق مسائل

مولانا بدر احمد مجیبی

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بائیسویں فقہی سمینار کا ایک موضوع 'ایکشن سے مربوط مسائل' رکھ کر بہت ہی اہم کام انجام دیا ہے اور اس اہم ترین موضوع پر شریعت اسلامی کی روشنی میں فیصلہ لینے کی شرعی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، ذیل میں سوالنامہ سے متعلق سوالات کے جوابات پیش کیے جا رہے ہیں:

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

ایکشن میں دیا جانے والا ووٹ اس جدید دور کی چیز ہے، اس لیے فقہ کی قدیم کتابوں میں صراحت کے ساتھ اس کا شرعی حکم نہیں مل سکتا ہے۔ البتہ اس کی شرعی حیثیت پر موجودہ زمانے کے علماء و مفتیان کرام نے روشنی ڈالی ہے۔

شرعی اعتبار سے ووٹ میں مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں: بعض اعتبار سے ووٹ شہادت ہے، بعض اعتبار سے ووٹ وکالت ہے اور بعض اعتبار سے ووٹ سفارش ہے۔

ووٹ کی شہادت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے والے لوگ ووٹ کے ذریعہ یہ شہادت دیتے ہیں کہ فلاں امیدوار اپنی صلاحیت کے لحاظ سے دوسرے امیدواروں کی بہ نسبت اس عہدہ کا زیادہ مستحق ہے۔ اس کے وکالت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے والے لوگ اس امیدوار کو اپنی طرف سے وکیل اور نمائندہ متعین کرتے ہیں کہ وہ حکومت کے یہاں ان کی طرف سے نمائندگی کرے اور عوام کے مسائل حکومت تک پہنچائے۔ اس علاقے میں عوامی فلاح و بہبود کا کام اپنی نگرانی میں انجام دلائے۔ اس کے سفارش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے والے حضرات حکومت سے اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ فلاں امیدوار کو اس علاقہ کا نمائندہ منتخب کر دیا جائے۔

۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

جب ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہوئی اور ووٹ دینا شہادت دینے کے درجہ میں ہے تو اس پر شہادت کے احکام لگیں گے، چنانچہ جس طرح غلط اور جھوٹی شہادت دینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح غلط اور نااہل امیدوار کو ووٹ دینا بھی حرام ہوگا۔

عن أنس بن مالك رضي الله عنه أنه قال: ذكر عند رسول الله صلى الله عليه وسلم الكبائر، أو سئل عن الكبائر، قال: الشرك بالله وقتل النفس وعقوق الوالدين، فقال: ألا أنبئكم بأكبر الكبائر؟ قال: قول الزور أو قال: شهادة الزور (صحيح البخاري، كتاب الادب، باب عقوق الوالدين من الكبائر)۔

اور جس طرح شہادت کی ادائیگی کے لیے بلایا جائے اور شہادت نہ دینے سے کوئی نااہل اور ملک و ملت کے لیے ناپسندیدہ اور نقصان دہ فرد کے جیت جانے کا خطرہ ہو تو ووٹ دینا واجب ہوگا اور کسی عذر کے بغیر ووٹ نہ دینا ناجائز نہیں ہے۔

ولا ياب الشهداء إذا مادعوا (البقرة: ۲۸۲).... ولا تكتبوا الشهادة ومن يكتبها فإنه آثم قلبه والله بما تعملون عليم (البقرة: ۲۸۳)۔

البتہ اس صورت میں جب اہل اور صحیح امیدوار جیت رہا ہو اور اس ووٹ کے ووٹ نہ دینے سے اس پر کوئی اثر نہ ہو تو ایسی صورت میں وجوب نہیں رہے گا۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

احادیث میں کوئی عہدہ طلب کرنے یا کسی منصب کے حصول کی کوشش کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ عن عبد الرحمن بن سمره رضي الله

ع استاذ المعهد العالي امارت شرعیہ پھلواڑی شریف، پٹنہ۔

تعالیٰ عنہ أنه قال: قال النبی ﷺ: يا عبد الرحمن بن سمرّة! لا تسأل الإمارة. فإنك إن أوتيتها عن مسألة وكلت إليها. وإن أوتيتها عن غير مسألة اعنت عليها (صحیح البخاری، کتاب الامارات والنذور)۔  
اس لیے خود سے کسی عہدہ کی خواہش رکھنا اور اس کو طلب کرنا جائز نہیں ہے اور جو کسی عہدہ کا خواستگار ہو اس کو وہ عہدہ نہیں دینا چاہیے۔ حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو عہدہ طلب کرے اس کو ہم عہدہ نہیں دیتے ہیں۔

عن ابی موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنه قال: دخلت علی النبی ﷺ، انا ورجلات من بنی عمی، فقال أحد الرجلین: یا رسول اللہ! امرنا علی بعض ما ولاک اللہ عزوجل، وقال الآخر مثل ذلك، فقال: انا واللہ لآنولی علی هذا العمل أحداً سألہ ولا أحداً حرص علیہ (صحیح مسلم، باب النہی عن طلب الامارة والحرص علیہا)۔

اس بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدہ طلب کرنا ممنوع ہے اور طالب منصب کو منصب دینا بھی جائز نہیں ہے، اسی لیے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ جو قضاء کا عہدہ طلب کرے، اس کو قضاء کا منصب نہیں دیا جائے۔

لیکن اگر سب لوگ کنارہ کش ہو جائیں اور کوئی کسی عہدہ کو لینا نہیں چاہے تو حکومت کا نظام کیسے چلے گا؟ درحقیقت اس عہدہ کا مقصد یہ ہے کہ ہر آدمی عہدہ و منصب کے حصول کی کوشش میں نہ لگا رہے، بلکہ جتنا ہو سکے اس سے دور رہنے کی کوشش کرے تاکہ جو لوگ اس کے اہل ہوں اور صحیح معنوں میں اس ذمہ داری کو انجام دے سکتے ہوں، ان ہی کو عہدہ دیا جائے، اسی لیے اگر کوئی ایسا شخص ہو جو واقعی اس منصب کی ذمہ داری پوری کرنے اور بجا طور پر اس کے حق کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور وہاں کوئی دوسرا اس کی اہلیت نہیں رکھتا ہے تو اس شخص کے لیے اس عہدہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ممنوع نہیں ہوگا، اسی لیے قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو نقل کیا ہے جب انہوں نے بادشاہ مصر سے عہدہ کی خواہش ظاہر کی تھی۔ قال: اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵)۔

کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس اہم کام کو انجام نہیں دے سکتا ہے۔ سات سال کی طویل اور شدید قحط سالی کا انتظام کرنا جس میں مخلوق کی ہلاکت کا بڑا خطرہ تھا بہت اہم کام تھا۔

امام قرطبی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ عدل و انصاف کرنے اور ضرورت مندوں تک ان کے حق پہنچانے کی اہلیت وہاں ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں رکھتا ہے، اس لیے یہ ان پر فرض اور متعین ہے کہ وہ اس منصب کو حاصل کریں اور ان کاموں کو انجام دیں، یہ حکم حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ آج بھی اگر یہ صورت حال پیش آئے کہ کسی شخص کو یہ اچھی طرح معلوم ہو کہ مثلاً قضاء یا احتساب کے مناصب کی ذمہ داری صحیح طور سے ادا کرنے کی کسی میں صلاحیت نہیں ہے۔ صرف وہی اس کو انجام دے سکتا ہے تو ایسے شخص پر ضروری ہوگا کہ وہ اس منصب کو حاصل کرے۔

ان یوسف علیہ السلام انما طلب الولاية لأنه علم انه لا احد یقوم مقامه فی العدل والاصلاح وتوصیل الفقراء الی حقوقهم فرأی ان ذلك فرض متعین علیہ، فانه لم یکن هناك غیرہ، وهذا الحكم الیوم، لو علم انسان من نفسه انه یقوم بالحق فی القضاء أو الحسبة ولم یکن هناك من یصلح ولا یقوم مقامه لتعین ذلك علیہ ووجب أن یتولاهما، ویسأل ذلك (تفسیر القرطبی ۱۳۲، ۵، ۱۳۱)۔

فقہاء کرام نے بھی یہ تفصیل ذکر کی ہے، اس لیے حالات کے اعتبار سے حکم ہوگا۔ جیسے حالات ہوں گے، ان ہی کے اعتبار سے کسی عہدہ کی طلب اور اس کے لیے امیدوار بننے کا حکم ہوگا۔

ہندوستان میں ایکشن میں مسلمان نہ کھڑے ہوں تو پنجپزیرت سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ تک حکومت میں مسلمانوں کی حصہ داری ختم ہو جائے گی، دوسری تو میں مکمل طور سے چھاجائیں گی۔ اس سے مسلمانوں کے حقوق، ان کے مفادات اور مصالح سب پر شدید اثر پڑے گا اور مسلمانوں کی حیثیت جو پہلے سے ہی کمزور ہے، بالکل خاتمہ کے قریب پہنچ جائے گی، ان کے مساجد و مدارس، ان کے مقابر و اوقاف کچھ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ فرقہ پرست طاقتوں کا بول بالا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو کفر و ارتداد پر مجبور کیا جانے لگے گا، اس لیے ایسی حالت میں مسلمانوں کا ایکشن میں کھڑا ہونا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوگا، کیونکہ حکومت کے مختلف مناصب پر مسلمانوں کے فائز ہونے سے مجموعی اعتبار سے پوری ملت کا فائدہ ہے۔ اس منصب کے لیے جو کھڑا ہو اس کے لیے یہ بہر حال ضروری ہوگا کہ وہ اس منصب کی ذمہ داریوں کو انجام دے سکتا ہو۔



۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لیے وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

شریعت کے خلاف قانون بنانے والے اداروں کا ممبر بننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے، کیونکہ شریعت کے خلاف قانون بنانا یا شریعت کے خلاف فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو قرآن کریم میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے: **وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ: ۴۴)**۔

اصولی اعتبار سے یہی حکم ہے، لیکن حالات کے اعتبار سے کچھ فرق آئے گا۔ ہندوستان کے حالات میں اگر ان قانون سازی کرنے والے اداروں میں مسلمانوں کی شمولیت نہ ہو اور تمام مسلمان اس سے کنارہ کش ہو جائیں تو تمام قانون میں مسلمانوں کے حقوق ملحوظ نہیں رہیں گے، بلکہ اسلام مخالف قوانین کھلے عام بننا شروع ہو جائیں گے جس سے مسلمانوں کو شدید درد و رنج کا نقصان ہوگا اور اس کی تلافی کسی طرح سے ممکن نہ ہو سکے گی، اس لیے ایسے اداروں کے ممبر بننے کی اجازت ہوگی۔ مسلمان ممبر پر لازم ہوگا کہ اسلام مخالف قانون بننے سے روکے اور اگر اکثریت کی طاقت سے ایسا کوئی قانون پاس بھی ہو جاتا ہے تو مسلمان ممبر اس سے اپنا اختلاف ظاہر کرے۔

یہی حکم وہیپ جاری کرنے کے مسئلہ میں بھی ہوگا کہ اگرچہ وہیپ مجبوری میں پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دے گا اس سے وہ انحراف نہیں کر سکتا، لیکن اس کو وہ دل سے برا سمجھے اور اس سے زبانی طور سے اختلاف ظاہر کرے۔ اس طرح کے کچھ معاملات میں ہو سکتا ہے کہ اگر پارٹی کی پالیسی مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو تو اس مسلم ممبر کی بھی اس میں شرکت ہو جائے، لیکن ممبر ہونے کی وجہ سے اس کے علاوہ دوسرے بہت سارے معاملات میں وہ مسلمانوں کے مفادات کے مطابق کام کر سکے گا۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں۔ یہ عمل کہاں تک درست ہے؟

فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ دو خرابیوں میں کسی ایک کو لینا ضروری ہو جائے اور اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اس میں سے جو ہلکی اور آسان خرابی ہو اس کو اختیار کرنا لازم ہے۔ اس کو اہون البلیتین کو اختیار کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس قاعدہ کے پیش نظر قانون ساز اداروں میں شرکت کے مقصد سے مسلمانوں کے لیے دستور کا حلف اٹھانا درست ہوگا۔

کیونکہ اگر دستور کی حلف برداری کی وجہ سے ان اداروں کی رکنیت چھوڑ دی جائے تو مسلمانوں کا بے انتہا نقصان ہوگا، اس لیے ان ضرر سے بچنے کے لیے حلف اٹھایا جائے گا اور خلاف شریعت امور پر عمل نہ کرنے کی نیت کی جائے گی۔

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

ایسے ملکوں کے مسلم ارکان کو چاہیے کہ وہ ان ملکوں کے محاکم سے قرآن شریف پر حلف برداری کا مطالبہ کریں اور اس کی پوری کوشش کریں، اگر ان کی بات مان لی جاتی ہے تو بہتر ہے اور اگر ان کی بات نہیں مانی جاتی ہے تو مجبوری میں بائبل پر رکھ کر حلف اٹھا سکتے ہیں، البتہ وہ اس بائبل کی تعظیم کا ارادہ نہ کریں، یہ بھی اہون البلیتین پر عمل کرنا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی کا اس سلسلہ میں فیصلہ درج ذیل ہے:

إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب لطلبه يعتد مكرهاً ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيماً (قرارات مجلس المجمع الفقهي الإسلامي ۱۳۰۲ھ)۔

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات اسلام مخالف یا مسلم مفادات کے مغائر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

ایسی سیکولر پارٹیاں جو مسلم مفادات کا خیال رکھتی ہیں اور مسلم مسائل کے حل کے لیے زیادہ بہتر سمجھی جاتی ہیں، ان میں شرکت کرنا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور حکومت میں شامل ہونا جائز ہے، اگرچہ ان کے منشور کے بعض دفعات اسلام کے خلاف ہوں، یہ بھی ہندوستان کے حالات کے پس منظر میں اہون

البلیتین پر عمل کرنا ہے۔ پارٹی کے مسلم ممبران بعد میں یہ کوشش کریں کہ ایسی اسلام مخالف دفعات ان کے منشور سے نکال دی جائیں۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہوں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

ایسی پارٹیاں جو واضح طور سے اسلام دشمن ہیں ان میں مسلمانوں کی شرکت جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے ان فرقہ پرست پارٹیوں کو مزید طاقت ملے گی اور وہ مسلمانوں کے استیصال کے اپنے ایجنڈے پر زیادہ تیزی سے عمل کرنا شروع کر دیں گی، نیز یہ گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون دینا ہے۔ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کی ہے:

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب (المائدہ: ۲)۔

ان فرقہ پرست پارٹیوں میں شریک ہو کر ان کے منشور اور ایجنڈے کو بدلنے کی بات کرنا حماقت ہے۔ اس کا تصور کرنا بھی مضحکہ خیز ہے، کیونکہ ان پارٹیوں کا اصل اور حقیقی ایجنڈا ہی اسلام دشمنی ہے، اس کو چھوڑنے کے بعد ان کے پاس کوئی ایجنڈا باقی نہیں رہے گا، اس لیے وہ اس کو کبھی نہیں ترک کر سکتی ہیں۔

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اور حکومت میں ذمہ داری کے لیے مسلم سیاسی جماعت قائم کرنا جو مسلم مفادات میں کام کرے اور باقاعدہ الیکشن میں حصہ لے شرعاً جائز اور درست ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے حالات عمومی اعتبار سے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ کسی خاص صوبے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو یا مسلمان کثیر تعداد میں ہوں وہاں تو اس کا فائدہ ہو سکتا ہے مگر پورے ہندوستان کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسی سیاسی جماعت سے مسلمانوں کا نقصان ہی ہوتا ہے، کیونکہ کچھ خاص مسلم علاقے سے ایک دو سیٹ مل جانے سے کوئی بڑا فائدہ نظر نہیں آتا جبکہ فرقہ پرست پارٹیاں اس سے غیر مسلم ووٹ کو مسلمانوں کے خلاف متحد کر دیتی ہیں جس سے دوسری سیکولر پارٹیوں کے مسلم اور غیر مسلم امیدواروں کو اس سے شکست نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے ہندوستان میں مسلم سیاسی جماعت قائم کرنا مسلم مفادات کے خلاف ہے۔

۱۰۔ الیکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ کیا انہیں ووٹ میں حصہ لینا چاہیے؟ کیا ان کو الیکشن میں امیدوار بننا چاہیے؟ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟

اسلامی شریعت میں گھر کے باہر کی ذمہ داریاں خواتین کے سر نہیں ڈالی گئی ہیں، ان کو گھر کی ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔ حصول معاش کی ذمہ داری بھی ان کو نہیں دی گئی ہے اور مردوں پر ان کا نفقہ لازم کر کے ان کو اس سے بری الذمہ کر دیا گیا ہے۔ ان کے لیے حجاب کا وجوب بھی ہے، اس لیے ان کا زیادہ گھر سے باہر نکلنا بھی باعث فتنہ ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے اصولی طور سے تو یہی ہونا چاہیے کہ الیکشن میں خواتین کا امیدوار بننا درست نہ ہو، کیونکہ بہت سے مراحل ایسے آتے ہیں، جہاں ان کی شرعی پابندیاں حجاب وغیرہ قائم نہیں رہ سکتی ہیں۔

لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کو بہت حزم و تدبر اور احتیاط کے ساتھ رہنے اور دشمنوں کی چالوں پر گہری نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، جیسے کہ سرحد پر فوجیں ہوتی ہیں کہ تھوڑی سی بے توجہی بھی ضرر رساں ہو جاتی ہے اور دشمنوں کا وار چل جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو فرقہ پرستوں کی سازشوں پر گہری نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

پنچایت سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ تک تمام جگہوں میں خواتین کا ریزرویشن بھی مسلمانوں کے لیے یہی حیثیت رکھتا ہے، بعض ریاستوں میں پنچایت کی سطح پر پچاس فیصد سیٹیں خواتین کے لیے ریزرو کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح پارلیمنٹ میں ۳۳ فیصد سیٹیں خواتین کے لیے ریزرو کرنے کا مل لوک سبھا میں پیش ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسلم خواتین کو الیکشن میں امیدوار بننے کی اجازت نہیں دی جائے گی تو اتنی سیٹیں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گی، بقیہ سیٹوں پر بھی بہت کم ہی مسلمان آ پاتے ہیں۔ اس سے حکومت میں مسلمانوں کی حصہ داری کم سے کم ہوتی چلی جائے گی جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچے گا، اس لیے یہاں بھی اہوں البلیتین کے قاعدہ پر عمل کرتے ہوئے مسلم خواتین کو شرعی پردہ اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کے ساتھ الیکشن میں امیدوار بننے کی اجازت دی جائے گی، البتہ اس کے لیے ان کو اپنے شوہر یا ولی سے اجازت لینا ضروری ہے۔ ☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

ڈاکٹر محمد نعیم اختر ندوی علیہ

ایکشن موجودہ زمانے کی سماجی زندگی کا ایک اہم عنوان ہے۔ کم دیش پوری دنیا میں آج ایکشن اجتماعی زندگی کے ایک اہم مرحلہ کے طور پر آتا ہے جس میں پوری قوم شریک ہوتی ہے، بے انتہا سرگرمیاں انجام پاتی ہیں، اور اس کے نتائج سے ملک اور اس کی عوام کی تقدیریں وابستہ رہتی ہیں، اس سے ملکوں اور قوموں کے مستقبل طے ہوتے ہیں، بڑے بڑے فیصلے انجام پاتے ہیں اور ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے اثرات گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔ نہ صرف ملک کے اندر بلکہ بیرونی دنیا اور عالمی اقوام کے ساتھ اس ملک کے رشتہ اور پالیسی میں بھی ایکشن کے نتائج کا بڑا دخل ہوتا ہے، پھر ایکشن کا عمل اور اس کا نتیجہ صرف سیاسی سطح تک محدود نہیں رہتا کہ دلچسپی رکھنے والے لوگ تو اس سے متاثر ہوں اور دیگر باشندوں کو حکومت کی تبدیلی سے کوئی خاص واسطہ نہ ہو۔ موجودہ زمانے میں صورت حال بہت بدل چکی ہے، زندگی کے تمام شعبے اب ایکشن کے عمل سے متاثر ہو رہے ہیں، کیونکہ پالیسیاں اور قوانین بنانے کا اختیار ہاتھوں میں آجاتا ہے، جن کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی اور مذہبی معاملات کے ساتھ بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ملازمت و کاروبار، مالی لین دین، رہائش و آمدورفت اور نظم و انتظام سے ہوتا ہے بلکہ خانگی زندگی کے معاملات، احوال شخصیہ کے امور، عبادات اور مذہبی رسومات، عبادت گاہوں کے قیام اور نظم و انصرام، دینی و تعلیمی اداروں کی تشکیل و تعمیر اور سرگرمی حتیٰ کہ قربت و رشتہ اور عبادت و نجی عمل کے علاوہ بچوں کی تعلیم و تربیت بھی ان قوانین اور پالیسیوں کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ الغرض ایکشن موجودہ دور میں ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جس سے دنیا اور دین کے بیشتر مفادات وابستہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے خواہی خواہی اب ایکشن کے عمل سے اصحاب سیاست جس طرح دلچسپی لیتے ہیں، ارباب منبر و محراب کو بھی ان پر نظر رکھنی ضروری ہوتی ہے۔

جہاں تک اس سلسلہ میں اسلامی شریعت کی رہنمائی کی بات ہے اس بابت درج ذیل نکات محتاج توجہ ہیں:

اول:

دین کا حکم پوری زندگی کو محیط ہے۔ سیاست اور اس سے جڑے مسائل کو کہہ کر بیشتر نئے دور کی پیداوار ہیں، لیکن اس ضمن میں بھی ہمیں اسلام کی اصولی ہدایات اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے روشنی حاصل کرنی ہوگی۔ عہد نبویؐ میں ایسے متعدد واقعات پیش آئے ہیں جو موجودہ سیاسی عمل کی پیچیدگیوں میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں، پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے تربیت یافتہ تلامذہ نے تمدنی اور سیاسی ارتقاء کے ماحول میں جو زندگی مدینہ منورہ اور جزیرہ عرب میں گزاری، نیز دعوت اسلامی کو لے کر جب قرب و جوار کے مفتوحہ علاقوں بلکہ غیر مسلم ملکوں میں تشریف لے گئے اور وہاں بود و باش اختیار کر لی، تو سیاسی اتار چڑھاؤ کے مواقع پر ان کا جو طرز عمل زیادہ ہمارے درپیش سوالات کے لیے نشان راہ بنتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ واقعہ قابل ذکر ہے جو ہجرت حبشہ میں وہاں صحابہ کرامؓ کی جماعت کو پیش آیا تھا۔ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب ہم حبشہ میں تھے تو ایک مرتبہ بادشاہ نجاشی کے خلاف سیاسی بغاوت ہوئی، ایک دوسرے شخص نے حکومت چھیننے کی کوشش کی، اس موقع پر بخدا ہمیں جو شدید غم اور فکر لاحق ہوئی وہ کبھی نہ ہوئی تھی، اس اندیشہ کے تحت کہ دوسرا حاکم غالب آجائے تو نہ معلوم وہ ہم لوگوں کے ساتھ وہ حسن برتاؤ روا رکھے یا نہیں جو موجودہ بادشاہ نے ہمارے ساتھ رکھا ہے۔ ہم نجاشی کی کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے اور اللہ سے مدد چاہتے رہے، جب جنگ چھڑی تو صورت حال سے باخبر رہنے کے لیے ہم میں سے زبیرؓ جو سب سے کم عمر تھے، پانی کے راستہ موقع جنگ پر پہنچے اور جنگ میں شریک ہوئے، پھر جب نجاشی کو کامیابی حاصل ہوئی تو زبیرؓ خوشخبری لے کر لوٹے، اس موقع پر ہمیں نجاشی کی کامیابی سے جتنی خوشی ہوئی کبھی ویسی خوشی نہیں ہوئی (البدایہ والنہایہ، ۱۲۳/۳)۔

اس واقعہ میں قابل غور مقام یہ ہے کہ نجاشی کے ساتھ جو فوج تھی وہ غیر مسلم تھی، نیز وہ نظام بھی غیر اسلامی تھا، لیکن صحابہ کرامؓ نے نہ صرف ان کی کامیابی کے

مدرسہ سنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

لیے دعائیں کیں، بلکہ جنگ میں شریک ہوئے اور مدد پہنچائی۔ خود یہ بادشاہ جس کا نام اصحمہ تھا، اس نے باوجود مسلمان ہونے کے غیر مسلم عوام پر غیر اسلامی نظام و قانون کے مطابق دس برسوں سے زائد تک حکومت کی۔ بخاری شریف (حدیث نمبر ۳۸۷۷) کے مطابق نجاشی کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مات الیوم رجل صالح فقوموا علیٰ اخیکم اصحمہ“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی مسلمان تھا جبکہ اس کی حکومت ایک غیر مسلم قوم پر اور غیر اسلامی نظام کے تحت تھی۔

دور خلافت راشدہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے شرعی مصالحوں کی بنیاد پر متعدد اقدامات کیے، حضرت عثمانؓ نے جمع قرآن کے بعد دیگر مصاحف کے جانے کا حکم دیا، حضرت علیؓ نے زندیقوں کو جلوا دیا۔ یہ اقدامات اور فیصلے عموماً غالب مصالحوں کے پیش نظر کیے گئے۔

دوم:

ایکشن سے متعلق جو سوالات ہمارے سامنے درپیش ہیں ان کی بابت قرآن اور حدیث کے دونوں اور براہ راست احکام کی تلاش شاید نتیجہ خیز نہ ہو، کیونکہ سیاسی معاملات اور دنیاوی امور بیشتر مصالحوں عامہ کے حصول اور مفساد کے ازالہ یعنی جلب مصالح اور دفع مفساد پر مبنی ہوتے ہیں۔ سیاست ہر وہ عمل ہے جو لوگوں کو صلاح سے قریب اور فساد سے دور کرے۔ اس میں شریعت کے عمومی قواعد و اصول کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ امت مسلمہ کے مجموعی مفادات بسا اوقات فیصلہ میں موثر بنیں گے اور عمومی مصالح کی بنیاد پر اقدامات طے پائیں گے اور اس حوالے سے جو نظریں عہد اول میں پیش آئی ہیں ان سے روشنی حاصل ہوگی۔ یہ بات تو بیان سے مستغنی ہے کہ شریعت اسلامیہ سرِ ابا عدل و مصلحت کا نام ہے۔ امام عزالدین بن عبدالسلام نے فرمایا: الشریعة کلھا راجعة الی مصالح العباد فی دنیاہم و آخرتہم (قواعد الاحکام ۲: ۱۳۶) ابن تیمیہ نے فرمایا: الشریعة جائت بتحصیل المصالح و تکمیلہا و تعطیل المفساد و تعطیلہا (الفتاویٰ ۱: ۲۶۵) اور ابن قیم نے لکھا ہے: عدل کلھا و رحمة کلھا و مصالح کلھا و حکمة کلھا (اعلام الموقعین ۳: ۲) اور علامہ سخاوی نے تو بڑی معنی خیز بات لکھی ہے، فرماتے ہیں: من اعظم خطأ السلاطین و الامراء تسمية افعالهم الخارجة من الشرع سياسة، فان الشرع هو السياسة لاعمل السلاطین بهواه و رایہ (الاعلان بالتویخ لمن ذم التاريخ، صفحہ ۹۷)۔

سوم:

تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ سیاسی معاملات اور امور تدبیر میں توسیع کی روش اختیار کرنی ہوتی ہے۔ ان میں عموماً مصالح اور مفساد کی آمیزش کا معاملہ ہوتا ہے، خالص مصالح تو دوسرے امور میں بھی شاذ ہی ہوتے ہیں، لیکن سیاسی معاملات میں ایسی صورت زیادہ درپیش ہوتی ہے، لہذا ان میں مصلحت کا عموم اور غلبہ کے علاوہ دفع مفسدہ کی ترجیح فیصلہ کن بنتے ہیں۔ کبھی بڑے مصالح کے حصول کے لیے چھوٹے مفساد اور بدعات کو انگیز بھی کرنا ہوتا ہے۔ علامہ قرانی کی یہ بات کتنی چشم کشا ہے وہ فرماتے ہیں: اعلم ان التوسعة علی الحکام فی الاحکام السياسية لیس مخالفا للشرع، بل تشهد له القواعد الشرعية من وجوه (تبصرة الحکام ۲: ۳۳۱) اور علامہ بن تیمیہ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے، وہ لکھتے ہیں: فاذا تعذر اقامة الواجبات من العلم والجهاد وغير ذلك الا بمن فيه بدعة مضرتها اقل من مضرة ترك ذلك الواجب كان تحصيل مصلحة الواجب مع مفسدة مرجوحة معه خيرا من العکس (الفتاویٰ ۲۸: ۲۱۲)۔

ان تینوں قابل توجہ امور اور نکات کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ دور کے درپیش ان سیاسی معاملات اور ایکشن سے متعلق سوالات کے شرعی جوابات ڈھونڈتے وقت شریعت کی حکمت و مصلحت، امت مسلمہ کے وسیع تر مفادات اور بالخصوص برعکس صورت میں مرتب ہونے والے نقصانات اور مضرتوں کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہوگا۔ یہاں شریعت کے اصول و قواعد کے دائرہ میں رہ کر وسعت نظری اور مستقبل شناسی کے ساتھ فیصلوں کی ضرورت ہوگی۔

اس ضروری گفتگو کے بعد جو دراصل جوابات کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں، اصل سوالات کے براہ راست جوابات پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔  
والعلم عند الله و الصواب منه، فان اصبحت فمن الله، و ان اخطات فمني و من الشيطان و استخضر الله العظیم۔

## ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت

ووٹ (Vote) انگریزی زبان کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے: رائے اور رائے دہی۔ عربی زبان میں اس کے لیے 'صوت' اور 'تصویت' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جس کا معنی بھی اسی سے قریب یعنی آواز اور (رائے) دینا ہے۔ از روئے قانون مخصوص اوصاف اور شرائط کے حامل شخص کا متعدد امیدواروں میں سے کسی ایک کے حق میں اپنی رائے کا اظہار ووٹ دینا کہلاتا ہے۔ ووٹ کے ذریعہ کسی فرد یا افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے، اسی لیے اس پورے عمل کا نام 'الیکشن' (Election) یعنی انتخاب ہے۔ ووٹ دینا ہمارے ملک میں اختیاری عمل ہے۔ پھر یہ ووٹ اپنے قریبی اعزہ کے حق میں بھی دیا جاتا ہے۔

ووٹ کی اس مذکورہ نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل انتخاب کا ایک طریقہ ہے۔ ایک منصب کے لیے متعدد امیدوار سامنے ہیں تو ان میں سے کسی ایک فرد کو منتخب کرنے کے لیے اس کے حق میں ووٹ ڈالا جاتا ہے، جس فرد کے حق میں اکثریت کی رائے ہوتی ہے وہ 'منتخب' (Elected) قرار پاتا ہے۔ یہ پوری تشریح بتاتی ہے کہ ووٹ دینا فی الحقیقت کسی فرد کو منتخب کرنا ہے۔ یہ منتخب شخص اپنے منتخب کرنے والوں کے حلقہ کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ وہ ان کے مسائل و معاملات کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن وہ ان کے علاوہ اپنی پارٹی کا بھی پابند ہوتا ہے جس نے اسے اس حلقہ سے امیدوار بنایا تھا۔ اسی طرح اگر وہ منتخب فرد کسی وزارت کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں اپنے حلقہ کی نمائندگی سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس تناظر میں ووٹ کی شرعی حیثیت کے تعلق سے معاصر فقہاء کی رایوں میں اختلاف ہوا ہے۔ متعدد فقہاء نے جہاں ووٹ کو شہادت کے درجہ میں مانا ہے، جن میں شیخ ابو زہرہ، قحطان دوری، یوسف قرضاوی، نصر فرید اور صلاح سلطان وغیرہ ہیں تو وہیں کچھ دوسرے فقہاء جیسے مصطفیٰ سباعی، فتی دینی اور نواد عبدالعزیم وغیرہ نے اسے وکالت اور نیابت کے معنی میں لیا ہے، لیکن منتخب شخص کی جو نوعیت اوپر بیان کی گئی اس کے پیش نظر راقم کار حجاج اس جانب جاتا ہے کہ ووٹ نہ تو شہادت ہے اور نہ نیابت وکالت، کیونکہ شہادت اپنے اعزہ کے حق میں نہیں ہو سکتی، نہ ہی اس میں لفظ شہادت کا کہیں پر ذکر آتا ہے۔ پھر ووٹ کے ذریعہ منتخب شخص صرف اپنے ووٹرز (Voters) کی نمائندگی نہیں کر رہا ہوتا ہے، اور نہ وہ اپنے ووٹروں کی آراء کا پابند ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی پارٹی کی رائے کا پابند ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ووٹرز اسے اس کے منصب سے ہٹا سکتے ہیں۔ ووٹ راقم کے خیال میں صرف 'انتخاب اور چننا' ہے۔ لفظ بھی اسی تصور کی تائید کرتا ہے، ووٹ کی نوعیت اور منتخب شخص کے اختیارات و اعمال بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ پس ووٹ کی شرعی حیثیت اختیار اور انتخاب کی ہے۔

## ۲۔ ووٹ دینے کا شرعی حکم:

جیسا کہ ذکر کیا گیا، راقم کے خیال میں ووٹ شہادت نہیں ہے، یہ انتخاب اور اختیار ہے۔ اگرچہ موجودہ وقت میں اس کی نوعیت ایسی بنی ہوئی ہے کہ ووٹ دینے کو صرف جائز کہا جاسکے گا، لیکن الیکشن کے ساتھ امت مسلمہ کے جتنے عمومی مفادات وابستہ ہو چکے ہیں، ان کے پیش نظر اب اس کو صرف جائز اور مباح نہیں رہنا چاہیے بلکہ مستحب سے آگے بڑھ کر مطلوب اور بعض احوال میں بعض حلقوں کے اندر تو واجب ہونا چاہیے۔

## ۳۔ امیدوار بننا:

چونکہ الیکشن سے مسلمانوں کے اجتماعی مفادات، دینی مصالح کا قیام اور بہت سے مفاسد کا ازالہ وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر قانون ساز اور پالیسی ساز اداروں میں مسلمانوں کی موجودگی ہوگی تو مفاسد پر بالکل روک نہیں تو ان میں کمی ضرور آسکے گی اور امت کے حق میں بہت سے فیصلے ہو سکیں گے، جیسا کہ اب اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے، اس لیے ایسے افراد کے لیے الیکشن میں امیدوار بننا درست اور بسا اوقات مطلوب ہے جو سچائی، امانت و دیانت داری اور قابلیت کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں بہتر رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کی تائید حضرت یوسفؑ کے واقعہ سے ہوتی ہے، جنہوں نے غیر مسلم بادشاہ سے وزارت مالیات طلب فرمائی تھی۔ قرآن نے ان کے الفاظ نقل کیے ہیں: اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ (یوسف: ۵۵) نیز حضرت عمر فاروقؓ نے جن چھ صحابہ کے حق میں خلافت کا معاملہ چھوڑا تھا، امیدواری ان کی جانب سے بھی پائی گئی، کیونکہ بعد میں اس جماعت کے کنوینر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان سے پوچھا کہ کون کون اپنے حق سے دستبردار ہوتے ہیں اور نتیجتاً تین اصحاب بقیہ تین اصحاب کے حق میں دستبردار ہوئے تھے۔

## ۴۔ قانون ساز اداروں کی ممبری:

قانون ساز اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا، کیونکہ ان اداروں سے دوری اختیار کی جائے گی تو بتدریج پوری اسلامی شناخت اور امت مسلمہ کا وجود ہی محال

ہو جائے گا اور خدا نخواستہ اسپین اور وسط ایشیا کے ممالک کی افسوسناک تاریخ رقم ہونے لگ جائے گی۔

### ۵۔ دستور سے وفاداری کا حلف:

ہمارے ملک کا دستور ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کرنے کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے جمہوری حقوق اسی دستور کی وجہ سے حاصل ہیں جو بہت سے مزمومہ مسلم ممالک میں حاصل نہیں ہیں۔ اسی طرح ظلم اور حق تلفی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے ہم اسی دستور کا سہارا لیتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کسی عدالت سے کوئی خلاف شرع فیصلہ آتا ہے یا کوئی ایسا قانون بنانے کی تیاری ہوتی ہے جس سے مسلمانوں کے حق میں اسلامی شریعت میں مداخلت ہوتی ہے، تو ان مواقع پر بھی دستور ہند کے ذریعہ سے اصلاح یا مسلمانوں کے لیے استثناء کے مطالبات کو منوانے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ خود دستور کے اندر بھی ترمیمات ہوتی رہتی ہیں اور اس میں اصلاح و تبدیلی کے قانونی طریقے موجود رہتے ہیں۔ پس اس دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا درست ہے۔

۶۔ ہندوستان کے ایوانوں میں مسلم ممبران اللہ کے نام پر حلف اٹھاتے ہیں اور اس کی انہیں اجازت ہے۔

### ۷۔ سیکولر پارٹی کی شمولیت:

سیکلورزم کا مفہوم ہمارے ملک کے اندر دوسرے بعض ممالک سے علاحدہ ہے، یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کے نزدیک سارے مذاہب برابر ہوں گے۔ ایسی صورت میں یہاں مختلف اقوام و اہل مذاہب کے ساتھ پر امن بقائے باہم کے لیے سیکولرزم ایک بہتر اور قابل عمل تصور ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ زیادہ کرتی ہیں، ایسی پارٹیوں میں شرکت کے ذریعہ مسلم مفادات کے لیے زیادہ بہتر طور پر کام کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ایسی پارٹیوں میں شرکت، ایکشن میں حصہ اور حکومت میں شمولیت درست ہوگی۔

۸۔ مسلم دشمنی کے لیے معروف پارٹیوں میں شرکت عمومی حالت میں درست نہیں ہوگی۔ یہ طے کرنا کہ ایسی پارٹیوں میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی، ایک نازک کام ہے۔ بہر حال ایسا کوئی فیصلہ مقامی حالات اور نفع و نقصان کے باریک موازنہ کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔

### ۹۔ علاحدہ سیاسی جماعت کا قیام:

علاحدہ سیاسی جماعت اس طور پر قائم کرنا سیاسی مصلحت کے مطابق ہوگا کہ اس میں دیگر اقوام بالخصوص مظلوم طبقات کی بھی شرکت ہو۔ ایسی مخلوط سیاسی جماعت جس کی قیادت مسلم ہاتھ میں ہو، اس خطرہ سے بھی محفوظ رہنے میں مدد دے گی کہ اس کے نتیجے میں مسلم مخالف ووٹ متحد ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے مسلم مصالح کی کار برآری بہتر ہو سکے گی۔

### ۱۰۔ سیاست میں خواتین کی شمولیت:

جورجان ملک کے اندر تیزی سے ابھر رہا ہے اس میں ایسے مواقع پر جہاں مسلم مرد کی شمولیت ممکن نہ ہو۔ (مثلاً نشستیں خواتین کے لیے محفوظ کر دی گئی ہوں) ایکشن میں خواتین کی امیدداری اور قانون ساز اداروں کی ممبری حتیٰ الوسع تمام اسلامی احکام و آداب کی پابندی کے ساتھ درست ہوگی۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے سلسلہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے مدینہ منورہ میں بڑے پیمانہ پر مشاورت کی تھی، اور اس ضمن میں انہوں نے پردہ نشین خواتین سے بھی رائے لی تھی۔ علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے: حتی خلص إلى النساء المخدرات في حبالهن وإلى الولدان في المكاتب (منہاج السنہ ۶، ۲۵۰، البدایہ والنہایہ ۷، ۱۳۶)۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

## الیکشن سے متعلق چند مسائل و احکام

مولانا اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی ع

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، نیز ہندوستان کا جمہوری نظام نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ مستحکم جمہوریت جہاں ملک کے لیے سلامتی کی ضامن ہے، وہیں مذہبی، لسانی اور تہذیبی اقلیتوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ جمہوریت اور جمہوریت کے زیر سایہ انتخابی عمل کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں بار بار حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن یہ تبدیلی نہایت پر امن طریقہ سے، کسی تشدد اور بغاوت کے بغیر وجود میں آتی ہے اور عوام کو اپنے ووٹوں کی طاقت سے اپنی ناپسندیدہ حکومتوں کو ہٹا کر پسندیدہ حکومتوں کو لانے کا موقعہ ملتا رہتا ہے۔

اس پورے عمل میں ووٹروں کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، امیدوار حضرات انہیں لہجانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال میں لاتے ہیں، اس لیے اس نازک عمل میں مسلم ووٹروں کو اپنی حیثیت کو دین و شریعت کی روشنی میں رو بہ عمل لانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ من مانے انداز میں ووٹ دے کر اپنے آپ کو خسران میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

فقہائے امت اور مفتیان شرع متین نے ووٹ دینے کے عمل کو 'شہادت' کی حیثیت دی ہے۔ یعنی ووٹر جس شخص کو ووٹ دیتا ہے، گویا وہ اس کے بارے میں یہ شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی صلاحیت و لیاقت بھی رکھتا ہے اور اس کے اندر دیانت و امانت بھی موجود ہے۔

اگر وہ شخص ان مذکورہ بالا اوصاف کا حامل نہیں ہے اور ووٹر یہ جانتے ہوئے بھی اس کو ووٹ دیتا ہے تو یہ جھوٹی گواہی دینا ہے، اور جھوٹی گواہی دینا گناہ کبیرہ ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے۔ قال قال رسول اللہ ﷺ: ألا أنبئکم بأکبر الکبائر قلنا: یا رسول اللہ! بلی، قال: الإشرک باللہ و عقوق الوالدین و کان متکفراً فجلس فقال: ألا و قول الزور و شهادة الزور، ألا و قول الزور و شهادة الزور فما زال یقولها حتی قلت: لا یسکت (رقم الحدیث: ۵۹۶۶، صحیح البخاری) (رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا کبیرہ گناہ نہ بتلاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! تو آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، آپ نیک لگا کر بیٹھے تھے تو اٹھ گئے اور فرمایا: جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا، سنو! جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا آپ برابر یہی جملہ کہے جا رہے تھے، یہاں تک کہ میں نے اپنے جی میں کہا کہ آپ خاموش نہیں ہوں گے)۔

اس حدیث شریف سے جھوٹی گواہی کی کس قدر شاعت و قباحت ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

ووٹر کے حلقہ میں اگر چند امیدوار الیکشن لڑنے کے لیے کھڑے ہوں اور اسے یہ معلوم ہے کہ قابلیت، دیانت اور امانت کے اعتبار سے زید ہی قابل ترجیح ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ ڈالنا گویا جھوٹی گواہی دینا ہے اور یہ سخت گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

لہذا اچھے اوصاف کے حامل امیدوار کو چننا اور منتخب کرنا، مسلم ووٹر پر واجب ہے، ایک مسلمان شخص اس بابت اللہ کے سامنے جوابدہ ہوگا، اسی مناسبت سے مفتی عبداللہ الفقیہ اپنے ایک فتوے میں ارشاد فرماتے ہیں: فان من یشارك فی الانتخابات یعتبر شاهدا و مزکیا لمن یرشحه و ینتخبه و هو مسئول امام اللہ عن تلک الشهادة فیتعین ان لا ینتخب إلا من هو أصلح و أكثر کفاء لما یقوم به (جو شخص انتخابات میں شریک ہوتا ہے (یعنی ووٹ دیتا ہے) وہ اپنے منتخب کرنے والے امیدوار کے حق میں شہادت دے رہا ہوتا ہے اور

طدار العلوم مونا تھہ بھنجن۔

اس کا تزکیہ (یعنی اچھے اوصاف والا ہونے کا دعویٰ کبڑا ہوتا ہے) چنانچہ وہ اس شہادت کی بابت اللہ کے سامنے جوابدہ ہوگا، اس ووٹ دینے والے پر یہ متعین ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو ہی منتخب کرے، جس میں زیادہ صلاحیت اور کام کرنے کی زیادہ لیاقت پائی جا رہی ہو) (مرکز التوتوی باشراف الدکتور عبداللہ الشقیہ)۔

دوسرے یہ کہ غلط اور نااہل آدمی کا انتخاب جہاں جھوٹی گواہی دینے کے زمرہ میں آتا ہے، وہیں اس میں امانت کی تضحیح و بربادی بھی لازم آتی ہے اور امانت کا ضیاع، علامات قیامت میں سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: فاذا ضیعت الأمانة فانتظر الساعة قال: کیف إضاعتها؟ قال: اذا وسد الامر الی غیر اہلہ فانتظر الساعة (البیخاری) (جب امانت برباد کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، صحابی نے پوچھا: امانت کی بربادی (کا مطلب) کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب معاملہ نااہل کو حوالہ اور سپرد کیا جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو)۔

بہر کیف ووٹ کو جب 'شہادت' کے درجہ میں مان لیا گیا تو ووٹ دینا بدون عذر واجب ہوگا، کیونکہ قابل اور لائق و فائق امیدوار کا منتخب کیا جانا جب متعین ہو چکا ہے تو یہ امر بغیر وجوب کے حاصل ہی نہیں ہو سکتا، ہمارے اسی خیال کی تائید عصر حاضر کے معروف عربی ادارہ "لجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء" ریاض کے مفتیان کرام کے ایک فتوے سے ہو رہا ہے: لکھتے ہیں: ودخول الانتخابات فی هذا الظرف من أوجب الواجبات الشرعیة لمحاربة الباطل أو التقلیل من شره علی الأقل۔ ایک دوسرے عرب عالم دکتور احمد منصور اسی جیسے مسئلے میں تحریر فرماتے ہیں: انا اری أن الانتخابات واجبة، یجب ان نعین من نری ان فیہ خیر الا انه اذا تقاعس اهل الخیر من یجل محله؟

دوسرے یہ کہ جب گواہی دینے کا مطالبہ ہو تو اسے چھپانا جائز نہیں اور جب ووٹنگ کا رتبہ شہادت کا ہے تو گویا حکومت ووٹنگ کا نظم کرا کے لوگوں کو شہادت دینے کا مکلف بنا دیتی ہے، قرآن نے شہادت چھپانے کو ممنوع قرار دیا ہے: ولا تکتتموا الشهادة (اور گواہی کو نہ چھپایا کرو) انتخاب کے دوران مختلف امیدواروں کا میدان میں اترنا، اس بات کو واجب کرتا ہے کہ سچی گواہی اور مناسب ترین شخص کو ووٹ دے کر ایمان دار اور لائق و مناسب شخص کو اپنا نمائندہ چنا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کونوا قوامین للہ شهداء بالقسط (اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو) دوسری جگہ ارشاد ہے: کونوا قوامین بالقسط شهداء للہ (انصاف کو خوب قائم کرنے والے، اللہ کے واسطے گواہی دینے والے بن جاؤ) ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے سچی گواہی دینے کا امر فرمایا ہے کہ ایک مسلمان سچی گواہی دینے سے جی نہ جرائے اور اللہ کے لیے ادا نیگی شہادت کے لیے کھڑا ہو جائے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے: وأقیموا الشهادة للہ (اور اللہ کے لیے سچی گواہی کو قائم کرو)۔

ان تمام آیات اور مذکورہ صدر حدیث: اذا وسد الامر الی غیر اہلہ فانتظر الساعة کی روشنی میں سچی گواہی دینا واجب ہے، اس لیے ووٹنگ میں حصہ لینا واجب ہوگا تاکہ نااہل اور مناسب شخص ہماری نمائندگی کر سکے۔ لیکن اگر ووٹنگ کو "سفارش" یا "وکالت" تسلیم کیا جائے جیسا کہ مفتی محمد شفیع کی یہ بھی ایک رائے ہے تو اس صورت میں ووٹنگ میں حصہ لینا محض استجاب کے درجہ میں ہونا چاہیے۔

جواب (۳) ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا غیر مستحسن امر ہے، کیونکہ اسلام کا مزاج یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اقتدار کے حصول کے لیے پیش کرے، اسلام کی روح اور اس کا مزاج یہ چاہتا ہے کہ اقتدار اور منصب ایسے شخص کے حوالہ کیا جائے جو اس کو ایک مقدس امانت سمجھے اور اس کو ہمیشہ اس بات کی نگر دامن گیر رہے کہ کہیں مجھ سے اس عہدہ، منصب اور امانت کی ادا نیگی میں کہیں کوئی خیانت اور کوتاہی نہ ہو جائے۔ منصب ایسے شخص کے حوالہ کرنے کے حق میں نہیں جو اس کا لالچی، حریص اور خواہشمند ہو، اگر ایسا شخص عہدہ کو اپنی کوششوں سے حاصل بھی کرے تو اللہ کی طرف سے اس کی اس نصرت، مدد اور تائید نہیں ہوا کرتی۔

حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تسأل الإمارة فإنک إن أعطیتها عن مسألة وکلت الیہا وإن أعطیتها عن غیر مسألة أعنت علیہا (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح ص: ۲۲۰، کتاب الامارة) (عبدالرحمن بن سمرہ! تم کسی امارت (یعنی عہدہ یا منصب) کا سوال نہ کرنا، کیونکہ اگر وہ عہدہ تمہیں مطالبہ کے نتیجے میں مل گیا تو تم اس عہدہ کے حوالہ کر دینے جاؤ گے (اور اللہ کی طرف سے تمہاری کوئی مدد اور نصرت نہیں کی جائے گی) اور اگر عہدہ و منصب بدون مطالبہ تمہیں حوالہ کیا جائے تو اللہ کی طرف سے تمہاری مدد و اعانت ہوگی)۔



اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کچھ مشکل نہیں کہ کسی منصب یا عہدہ کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا نامناسب ہے بلکہ ایسا شخص اگر منصب حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو منجانب اللہ اس کی مدد اور اعانت نہیں ہو کرتی۔

لہذا بہتر یہ ہے کہ کسی لائق، ماہر، دیانت دار اور امین شخص کو حلقے یا وارڈ کے لوگ ایکشن لڑانے کے لیے کھڑا کریں، جو ایکشن جیت کر لوگوں کے مسائل کے حل میں پوری دلچسپی رکھنے والا اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا پورا خیال رکھنے والا ہو، جان بوجھ کر نا اہل، نالائق اور بددیانت شخص کو ووٹ دینا ہرگز جائز اور درست نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص واقعہً باصلاحیت، قومی، ملی اور سماجی امور کی قیادت کے سلسلے میں مہارت تامہ کا حامل اور خدا ترس ہو تو اسے اپنے آپ کو امیدوار بنائے جانے کے لیے پیش کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس حلقہ سے میں نہ اٹھایا اس عہدہ کو آگے بڑھ کر اگر میں نے نہ قبول کیا تو اس کے لیے نا اہل اور غلط قسم کے لوگ آگے آ سکتے ہیں اور اس منصب کا غلط استعمال کر سکتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں اس کی دلیل موجود ہے، کیونکہ آپ نے عزیز مصر سے ملک کے خزانہ کا مطالبہ کیا تھا جس کی حکایت قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے: اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ۔

جواب (۴) کسی بھی ایسے ادارہ کا ممبر بننے کا جہاں مخالف شریعت قوانین بھی بنائے جاتے ہوں، علی الاطلاق جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، ہاں جہاں امید ہو کہ ممبر بننے کے بعد میں کسی درجہ میں اپنی قوم و ملت اور مسلمانوں کی بہی خواہی اور ان کی خدمت انجام دے سکتا ہوں یا مخالف شریعت قوانین کے پاس نہ ہونے دینے میں مداخلت کر سکتا ہوں تو ایسی صورت میں ممبر بننے کا جواز ہو سکتا ہے۔ ایک عرب عالم اور مفتی کا یہ بیان اس سلسلے میں قابل غور ہے: لکن المسلم اذا دخل عضوا فی هذا المجلس یجب علیہ ان ینکر المنکر ویأمر بالمعروف وان غلبت آراء اهل الباطل عند التصویت فواجب المسلم ان یتحفظ ویستنح عن التصویت، حیثذ ولا شیء علیہ ان شاء اللہ، بل هو مثاب حیث اسمع کلمة الحق وان لم یعملوا بها، فاللہ یقول لرسوله ﷺ: ان علیک إلا البلاغ (الشوری ۲۸) ”انک لا تھدی من اُحیبت و لکن اللہ یھدی من یشاء“ (القصص ۵۶)۔

ایسی پارٹی جس کی پالیسیاں سراسر مخالف ہوں تو اولاً یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا، ایک مسلمان کے لیے جائز ہو سکتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ ہاں تمام سیکولر پارٹیاں اسلام مخالف بھی ہوں اور سیکولر ہونے کے ناطے کچھ نیوٹرل پالیسیاں بھی اپناتی گئی ہوں کہ جس کے بعض دفعات کی ضرب اسلام پر نہ پڑتی ہو تو ایسی پارٹی کا انتخاب ایک مسلمان کرے تو اہون اہلبیتین کے پیش نظر اس کے جواز کی گنجائش میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ باقی ایسی پارٹی جس کی پالیسیاں اسلام مخالف ہوں اور اس نے اپنے ممبران کے لیے وہیپ بھی جاری کر دیا ہو، جس کے بعد وہ اپنی ضمیر کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور ہو جاتا ہو تو ہمارے خیال میں ایسی پارٹی کی ممبر شپ جواز کے حدود میں نہیں آ سکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ولا تقوا نوا علی الاثم والعدوان (اور گناہ اور تعدی کے کام پر ایک دوسرے کا تعاون نہ کیا کرو)۔

(۵) قانون ساز اسمبلیوں اور اداروں کے ارکان منتخب ہونے کے بعد دستور کی وفاداری کا حلف اٹھانے کی صورت میں اگرچہ دستور کی بعض دفعات خلاف شریعت ہوں تو اس کی شکل یہ ہونی چاہیے کہ وفاداری کے عہد نامہ پر اگر تحریری دستخط لیے جاتے ہوں تو اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کر دے اور اگر زبانی کہلا دیا جاتا ہو تو دل میں اس کی پختہ نیت کر لے کہ اتباع شریعت ہر صورت میں کروں گا اور زبانی اقرار کر لے۔ الا من اکره و قلبه مطمئن بالإیمان (مگر یہ کہ کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو) تو اس کی شرعاً گنجائش ہے، اسی جیسے مسئلہ میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اسمبلی میں جس عہد نامے پر دستخط کیے جاتے ہیں اس میں اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کیے جاسکتے ہیں“ (کفایت المفتی: کتاب السیاسات ۳۵۱/۹)۔

(۶) بعض عیسائی ملکوں میں بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے تو مسلم ارکان کے لیے اس نیت کے ساتھ حلف لینا درست ہو سکتا ہے کہ میں اس انجیل میں جو حصہ صحیح اور منزل من السماء ہے، اسی حصہ پر حلف برداری کر رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ آج بھی انجیلوں میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور صحیح اور درست موجود ہے گرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ تحریف و تبدیل شدہ حصہ بھی کم نہیں اور یہ بھی مسلمات میں ہے کہ اللہ کے کلام کے ذریعہ حلف صحیح اور درست ہے، کیونکہ کلام الہی، اللہ کی صفت ہے اور صفات الہیہ میں کسی کے بھی ذریعہ قسم کھانا درست ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی قسم کھانا بھی اسی لیے جائز ہے کہ وہ بھی اللہ کی صفت

ہی ہے: يجوز الحلف بالقرآن لأنه صفة من صفات الله عزوجل (فقہ المزار عند الانمة ۱۰۱۳۹)۔

(۷) ہاں ایسی سیکولر پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت کی گنجائش ہو سکتی ہے جس کے منشور کی بعض دفعات اسلام مخالف یا مسلم مفادات کے مغاڑ ہوں، لیکن یہ سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں۔

(۸) جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہوں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو تو ایسی پارٹی میں ایک مسلمان کا شامل ہونا ہرگز جائز نہیں ہونا چاہیے، خواہ وہ نیت ہی کیوں نہ کرے کہ میں پارٹی میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کروں گا، اولاً تو ایسی پارٹیوں کے ایجنڈے میں کسی تبدیلی کا دور دور تک کوئی امکان ہی نہیں، عملاً ایسی پارٹیوں میں جو مسلمان شمولیت اختیار کرتے بھی ہیں تو وہ صرف نام کے مسلمان ہی ہو سکتے ہیں، ان کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل یا مفادات کے تحفظ سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا، ان کا تمام تر مذہب اور دھرم پارٹی کا عین منشور ہی ہوا کرتا ہے، وہ اس کے خلاف یا اس کی مخالفت کا بھی تصور نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ وہ اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کریں تو اب ایسی کسی پارٹی میں شامل ہونا اور یہ نعرہ بلند کرنا کہ ہم اس کے منشور میں تبدیلی کروائیں گے، محض ایک نعرہ ہی ہو سکتا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کے مسائل سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں، ایسی پارٹیوں میں شمولیت گویا: ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة کا مصداق ہوگا۔

(۹) تجربہ سے علیحدہ مسلم جماعت بنانا مفید نہیں معلوم ہو رہا ہے، خاص طور سے ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، کیونکہ اپنی علیحدہ جماعت بنا کر بھی انہیں سیکولر ایجنڈے پر ہی عمل کرنا ہوگا، ساتھ یہ احساس بھی ملحوظ خاطر ہونا چاہیے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکوز نہیں ہو کر تھی، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلم مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس کا فرقہ پرست طاقتیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں، جس کا مشاہدہ ہم ہندوستانی مسلمان عموماً اپنے ان علاقوں میں کرتے ہیں جہاں اس قسم کی صورت حال درپیش ہو کر تھی ہے۔

جواب (۱۰) عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینا اور ان کا الیکشن میں امیدوار بننا:

عورتوں کو ووٹنگ میں حصہ لینا جواز کی حدود میں آ سکتا ہے بشرطیکہ وہ شرعی ضوابط کے ساتھ اس عمل میں شرکت کریں، گھر سے باہر نکلنے کے جو اصول، شریعت میں متعین ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے، بناؤ سنگار، زیورات اور خوشبو استعمال کیے بغیر، پولنگ اسٹیشن جا کر ووٹ دینا چاہیں تو اس کی گنجائش ہو سکتی ہے، نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ مردوں کے ساتھ لائن میں لگ کر یہ کام نہ کیا جائے بلکہ عورتوں کی لائن بالکل علیحدہ ہو، ووٹ دلانے والے اور انگلی میں نشان لگانے والے مرد نہ ہوں، بلکہ یہ سارے کام عورتیں انجام دیتی ہوں تو ایسی صورت میں عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینا درست ہو سکتا ہے، کیونکہ جمہوریت میں اعداد کا شمار ہوا کرتا ہے، اس لیے مصلحت کا تقاضہ ہے کہ مسلمانوں کی حصہ داری اس عمل میں مکمل ہو۔ فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ میں ایک جزیئہ اسی نوعیت کا مذکور ہے: فإن مبدأ المشاركة في الانتخابات يدور مع المصلحة... واذا وجدت المصلحة فيها فلا مانع ان تشارك المرأة في الانتخابات والادلاء في اختيار احد المرشحين اذا التزمت بالضوابط الشرعية في خروجها من بيتها والتزمت بالشرع في اختيار من تدلى بصوتها لصالحه (فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ مرکز الفتویٰ باشراف الدكتور عبد الله الفقيه)۔

مسلمانوں کو جب عمر فاروقؓ کے بعد امیر المؤمنین کا انتخاب کرنا ہوا تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے جہاں مردوں سے اس بابت مشورہ لیا تھا وہیں عورتوں سے بھی مشورہ لیا تھا۔: ويدل على ذلك ان عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ استشار الناس في اختيار من يجعله أميرا للمسلمين حتى استشار النساء (فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ) ایک دوسری جگہ یہ عبارت موجود ہے: بقي عبد الرحمن يشاور الناس ثلاثة ايام... وانه شاور حتى العذاري في خدورهن (فتویٰ الشیخ محمد علی فرکوس)۔

رہا عورتوں کا الیکشن میں امیدوار بننے کا مسئلہ تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ شریعت میں عورتوں کو ملک کا حکمران اعلیٰ بنانا تو بالکل جائز نہیں۔ اما بخصوص تولی منصب الخلیفۃ (رئیس الدولۃ) او ما يقوم مقامه من سائر المسؤولیات الکبریٰ والولايات العامة فان الذکورة فيه شرط مجمع عليه، قال الجوينی: "وأجمعوا أن المرأة لا يجوز أن تكون إماماً" وهو مانص

علیہ ابن حزم فی 'مراتب الاجماع' (رہا خلیفہ ملک کا سربراہ اعلیٰ) یا اس کے قائم مقام مناصب پہ فائز کیے جانے کا مسئلہ تو اس میں مذکور ہونے کی شرط ہے جو مجمع علیہ ہے، چنانچہ امام جوینی نے کہا: اور فقہاء کا اجماع ہے کہ عورت کا امام (حاکم اعلیٰ) بنایا جانا جائز نہیں، امام ابن حزم نے بھی مراتب اجماع میں اس کی تصدیق کی ہے) (فتویٰ الشیخ محمد علی فرکوس)۔

عورتوں کے حاکم اعلیٰ بنائے جانے کے عدم جواز پر فقہاء نے اس روایت سے استدلال کیا ہے: لما بلغ رسول اللہ ﷺ ان اهل فارس ملكوا عليهم بنت كسرى قال: "لن يفلح قوم ولوا امرهم امرأة" (بخاری) قال الشوكاني: فيه دليل على ان المرأة ليست من اهل الولايات ولا يحل لقوم توليتها، لان تجنب الامر الموجب لعدم الفلاح واجب (رسول اللہ ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا کہ فارس کے لوگوں نے اپنے اوپر کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا: "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی، جس نے اپنے معاملہ کا ذمہ دار کسی عورت کو بنا رکھا ہو" امام شوکانی نے فرمایا: حضور ﷺ کے اس فرمان میں دلیل ہے کہ عورت ولایت عامہ اور حاکم اعلیٰ بنائے جانے کی مستحق نہیں اور نہ ہی کسی کے لئے حلال ہے کہ وہ انہیں ان مناصب پہ فائز کرے، کیونکہ جو چیز عدم فلاح کو مستلزم ہو اس سے اجتناب واجب ہے)۔

عورتوں کو ایکشن میں امیدوار بنائے جانے میں چند ممنوع امور کا ارتکاب ناگزیر ہے:

۱۔ عورتوں کے ذمہ گھر گریہستی کی ذمہ داری واجب یعنی ہے اور یہی اس کی اصل مسئلہ ہے اور باہر کی ذمہ داری اگر ہو بھی تو وہ واجب کفائی ہے اور واجب عینی اور واجب کفائی میں جب تعارض ہو تو واجب عینی مقدم ہوا کرتا ہے، کما ہو مقرر اصولیا اور یہاں تو واجب کفائی عورتوں کے ذمہ سے بالکل ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ مرد اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہی بات اس عربی فتویٰ میں مذکور ہے:

(تزامح اعمال المرأة في بيتها الذي هو الأصل المسؤولة عنه وهو في حقها من قبيل الواجب العيني مع ما هو واجب كفائي، وحال التعارض والتزامح يقدم العيني على الكفائي كما هو مقرر اصوليا، وخاصة الكفائي يسقط وجوبه بقيام الرجال به) (فتویٰ محمد علی فرکوس)۔

۲۔ کسی ایکشن میں کامیاب ہو کر قانون ساز مجلس میں عورت کے ممبر بن کر جانے کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے ایک قسم کی عام ملازمت حاصل ہوگئی ہے، جس کے ذریعہ اسے کمائی کرنے کا موقع ہاتھ لگ گیا ہے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت کو کمانے اور روزی حاصل کرنے سے مستثنیٰ کر رکھا ہے، کیونکہ شادی کے بعد اس کے خورد و نوش کی ذمہ داری اس کے شوہر کے ذمہ کر رکھی ہے اور شادی سے پہلے یہ ذمہ داری اس کے باپ یا ولی کی تھی و كذلك اعتبار العضوية في مجلس الشورى، وظيفة عامة يترزق منها ويكتسب والمرأة مكفية المؤنة إمام مع وليها أو مع زوجها (المرجع السابق)۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ قانون ساز مجلس میں مردوں کے ساتھ اختلاط کی نوبت بھی آئے گی اور کبھی کبھی اجنبی مردوں کے ساتھ خلوت بھی اور یہ چیز شرعاً بالکل درست نہیں فضلا عن اختلاطها بالرجال من اعضاء المجلس او الخلوة مع بعضهم۔

خلاصہ یہ کہ عورت کی ذات نہ تو مناصب عامہ (حاکم اعلیٰ) بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ ہی قانون ساز مجلسوں کی ممبر شپ حاصل کرنے کی مستحق ہے۔ فالاحص ان المرأة لا تصلح سياسيا في المشاركة لتولى منصب الخليفة (رئيس الدولة) ولا عضوية مستحقة لها في مجلس الشورى (المرجع السابق، ايضاً) هذا ما عندى والله اعلم بالصواب

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط فقہی مسائل

مفتی محمد ابو بکر قاسمی

اسلامی حکومت میں صرف دو شعبہ ہوا کرتا ہے ایک عدلیہ کا دوسرے منظمہ کا اور جمہوری حکومت میں تین شعبہ ہوا کرتا ہے۔ ایک مقننہ کا دوسرے عدلیہ کا تیسرے منظمہ کا۔

بذہب اسلام کی رو سے چونکہ ساری کائنات کا خالق و مالک اللہ اور صرف اللہ ہے، اس لئے وہی حاکم حقیقی ہے اور ہر انسان پر اصلاً اللہ رب العزت ہی کی حکمرانی قائم ہے، اس لئے اسلامی حکومت میں سربراہ مملکت کی حیثیت خلیفہ (نائب) کی ہوتی ہے، نہ کہ مالک و خود سر کی، قال اللہ تعالیٰ: **إِن الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا معتبر ہے)۔

اس کے برعکس غیر اسلامی حکومتوں میں جسے دور حاضر میں جمہوری حکومت کا نام دیا جاتا ہے، اس قسم کی حکومتوں میں انسان ہی کو مستقل مان کر کثرت رائے سے فیصلہ کیا جاتا ہے اور خود انسان ہی قانون وضع کرتا ہے، البتہ بعض جمہوری حکومتوں میں احوال شخصیہ سے متعلق بعض مسائل و معاملات میں قدرے مذہبی آزادی ہوا کرتی ہے، اجتماعی اور ملکی مسائل کے حل کے لیے، خود انسان ہی قانون بنایا کرتا ہے، اور ملک کا جو سربراہ اعلیٰ ہوتا ہے، اسی کو بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے، جمہوری ملکوں میں سربراہ کا انتخاب اگرچہ عوام کے ووٹ سے ہوتا ہے اور محدود مدت کے لئے لیکن اگر وہ خود سر اور مطلق العنان ہو تو بسا اوقات قوم و ملت کو بہت کچھ نقصان پہنچا دیتا ہے، اسی لئے جمہوری ملکوں میں اس کے اقتدار کی مدت چار پانچ سال تک کے لئے محدود کر دی جاتی ہے۔

مذکورہ تفصیل سے اسلامی حکومتوں اور جمہوری حکومتوں کے فرق کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلامی حکومتوں میں اصل قانون قرآن و حدیث ہے۔ البتہ اس کی تشریح و توضیح علماء و فقہاء کرتے ہیں۔

چنانچہ فقہی کتابوں میں جو مسائل درج ہیں ان میں جہاں احوال شخصیہ کا بیان ہے، وہیں اجتماعی و ملکی مسائل کی بھی تفصیل ہے۔ اس کے برعکس جمہوری حکومت میں قوانین آئے دن بدلتے رہتے ہیں اور ہر ملک کا علیحدہ علیحدہ قانون آئے دن بننا رہتا ہے اور جب کبھی کوئی قانون بنتا ہے تو غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور ارباب بصیرت علماء و فقہاء کو اس کا جائزہ لے کر اس کے حسن و قبح پر تبصرہ بھی کرنا پڑتا ہے، چنانچہ اس تناظر میں مروجہ ایکشن سے مربوط و متعلق چند فقہی مسائل کی شرعی حیثیت مندرجہ سطور میں تحریر کی جا رہی ہے۔ **وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ**۔

### ۱۔ ووٹ کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت:

ووٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی رائے و مشورہ دینے کے ہیں، گویا ووٹ ووٹ ڈال کر اور اپنے پسندیدہ امیدوار کے چناؤ نشان پر مہر لگا کر ایکشن کمیٹیشن کے سامنے تحریری طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ امیدوار میرے نزدیک متعلقہ کاموں کا اہل ہے، گویا ووٹ کی حقیقت تحریری مشورہ کی ہے اور حدیث نبوی ہے: **الاستشارة موتن** (ابن ماجہ کتاب الادب حدیث ۷۴۵، ۳، ترمذی ۲۸۲۲، ابوداؤد ۵۱۲۸) (مشورہ دینے والا شرعاً امانتدار ہے)۔

لہذا اگر کسی ووٹ کرنے والے شخص کو ووٹ دے کر جتاد یا تو شرعاً اس نے خیانت سے کام لیا، اور ایک حدیث نبوی کے مطابق کسی نااہل کو کسی کام کے لئے منتخب کرنا علامات قیامت میں سے ہے، جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ **إِذَا وَسَدَ الْأَمْرَ إِلَىٰ غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ** (رواہ البخاری

مفتی مدرسہ اسلامیہ شکر پور۔

کتاب العلم حدیث: (۵۹)۔

نیز ووٹ کی حیثیت شہادت کی بھی ہے، لہذا کسی نا اہل کو ووٹ دے کر جتنا گویا جھوٹی گواہی دینا ہے۔ جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: اجتنبوا قول الزور (سورۃ الحج: ۳۰) (اور جھوٹ بولنے سے بچو)۔

## ۲۔ ووٹ کا شرعی حکم:

الیکشن کے بعد جس کسی شخص کا سلیکشن ہوتا ہے، ملک کی قانون سازی میں اس کا عمل دخل ہوتا ہے اور انسان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اس کا اچھا خاصا اثر پڑتا ہے، اس لئے ووٹ دے کر کسی اچھے اہل الرائے کو قانون سازی کے لئے منتخب کرنا صرف مستحب ہی نہیں بلکہ شرعاً واجب ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ایک مستقل سورہ کا نام الشوریٰ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والوں کا یہ حال بیان کیا ہے کہ ان کے باہمی معاملات مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ وأمرهم شورئاً بینہم (سورۃ الشوریٰ: ۳۸) نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا: وشاورہم فی الأمر (سورہ آل عمران: ۱۵۹) یعنی آپ حضرات صحابہ سے مشورہ کیجئے۔

نیز خلافت کے متعلق حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے: لا خلافة إلا عن مشورۃ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰، ۵۷۲) نیز بخاری شریف کی ایک طویل حدیث میں خلافت کے متعلق حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے: من بايع رجلا من غير مشورۃ من المسلمين فلا يتابعه هو ولا الذي تابعه تغره أن يقتل۔ سيدنا عمر کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص کسی کو بغیر کسی مشورہ کے اپنا خلیفہ بنا کر اس کے ہاتھ پر بیعت ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کے ہاتھ پر (جیسے بغیر مشورہ کے امیر منتخب کیا گیا ہے) بیعت ہونا موجب ہلاکت ہے۔

## ۳۔ الیکشن میں خود کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا:

اسلامی حکومت میں خود کو امارت و خلافت کے لئے بحیثیت امیدوار پیش کرنا شرعاً درست نہیں ہے، چنانچہ صحیح مسلم کتاب الإمامت میں یہ حدیث نبوی ہے: والله لا نولي على هذا العمل أحدا سألہ ولا أحدا حرص عليه (مسلم ۲، ۱۲۰) لیکن جہاں غیر اسلامی حکومت ہو نیز جن جمہوری ممالک میں موجودہ پارلیمانی انتخاب کا طریقہ رائج ہو ویسے علاقہ میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے جو شخص اپنے قول و عمل کی بنیاد پر خود کو مجوزہ و مقررہ ذمہ داری والے کو حسن و خوبی انجام دینے کے لائق سمجھتا ہو، وہ بحیثیت امیدوار کے پیش کر سکتا ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر سے کہا تھا: اجعلنی علی خزائن الأرض إني حفيظ علیہم (سورہ یوسف: ۵۵)۔

چنانچہ مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر جامع الاحکام القرآن (۱۳۱/۵) میں لکھا ہے، ودلت الآية أيضاً علی جواز أن يطلب الإنسان عملاً یکون له أهلاً نیز امام ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہؓ کی سند سے مرفوعاً نقل کیا ہے: من طلب قضاء المسلمين حتی یناله ثم غلب عدله جورہ فله الجنة ومن غلب جورہ عدله فله النار (سنن ابی داؤد کتاب القضاء ۲، ۵۰۳)۔

اس حدیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عہدہ طلب کرنا اور اس کا امیدوار بننا مطلقاً ممنوع نہیں ہے، بلکہ جہاں ظلم کا اندیشہ ہو، یا ظلم کا غالب گمان ہو وہاں ممنوع ہے اور جہاں عدل کا پہلو غالب ہو اور اپنے اوپر پورا اعتماد ہو کہ وہ انصاف کو ملحوظ رکھے گا، وہاں شرعاً عہدہ طلب بھی کیا جاسکتا ہے۔

## ۴۔ مخالف شریعت قانون ساز ادارے کا ممبر بننا:

جن ممالک میں مخالف شریعت قانون بنانے والے ادارے قائم ہوں، ان کا ممبر بن کر مخالف شریعت قانون بنانے میں حمایت کرنا اور اس کی معاونت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: ولا تعاونوا علی اللہ والحدوان، البتہ جن لوگوں کو اپنے اوپر اعتماد ہو کہ وہ ایسے ادارہ کا ممبر بن کر اور ان کے پروگراموں میں شامل ہو کر اور مخالف شرع بنائے جانے والے قانون کو جان کر مسلمانوں کے بااثر لوگوں کو اس سے واقف کریں گے اور مخالف شرع بنائے جانے والے قانون کو سدھارنے کی کوشش کریں گے تو ان کے لئے تعاون بالذکر والتقویٰ پر عمل کرتے ہوئے ایسے اداروں کا ممبر بننا شرعاً درست ہے، البتہ جس مجلس میں مخالف شرع قانون پاس ہو رہا ہو، کوشش کرے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے

تو یہ سے کام لے کر اور خود کو بیمار ظاہر کر کے اس مجلس سے علیحدہ رہے، چنانچہ آل عمران کی آیت (۲۸) فلیس من اللہ فی شیء إلا أن تتقوا منهم تقاة اور سورہ صافات کی آیت (۸۹) إنی سقیم سے اس سلسلہ میں واضح رہنمائی ملتی ہے۔

سورہ آل عمران کی آیت (۲۹) کے تحت حضرات مفسرین نے کافروں سے دلی دوستی جسے موالات کہتے ہیں، کو ناجائز لکھا ہے، البتہ مواسات ظاہری خوش خلقی اور رواداری نیز تجارت و صنعت اور ملازمت وغیرہ کے دنیاوی معاملات کو جائز لکھا ہے (معارف القرآن جلد اول سورہ آل عمران کی تفسیر ملاحظہ ہو)۔

## ۵۔ خلاف شرع قانون ساز ادارے کا ممبر بن کر وفاداری کا حلف اٹھانا:

جن قانون ساز اداروں میں مخالف شرع قانون بنائے جاتے ہوں ان اداروں کا ممبر بن کر وفاداری کا حلف اٹھانا اس شخص کے لئے جائز ہے جو یہ نیت کر کے حلف برداری کرے کہ جو قانون شرع ہوگا ہم اس کو بدلنے کی کوشش کریں گے، اور جب تک نہ بدلے گا کم از کم ہم اس سے اپنے دل میں نفرت رکھیں گے، چنانچہ علامہ نووی علیہ الرحمہ نے قرآن کریم کی سورہ المائدہ: (۱۰۵) لا یضربکم من ضل إذا اھتدیتکم کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: المذھب الصحیح عند المحققین فی معنی الآیة إنکم إذا فعلتم ما کلفتم بہ فلا یضربکم تقصیر غیرکم (شرح صحیح مسلم ۱۰۵)۔

## ۶۔ بائبل کے ذریعہ حلف برداری کا مسئلہ:

حلف بغیر اللہ (یعنی ماسوی اللہ کی قسم کھانا) شرعاً ممنوع و ناجائز ہے، لہذا مسلمانوں کو حلف باللہ کا پابند ہونا چاہئے، لیکن اگر کسی غیر مسلم ملک میں بائبل کے ذریعہ حلف برداری کا رواج ہو اور کسی مسلمان نے بائبل کو محرف کتاب سمجھتے ہوئے اور توریہ کرتے ہوئے ہاتھ میں لے کر وفاداری کا حلف لے لیا تو شرعاً ایسا کرنے سے منع تو ضرور کیا جائے گا لیکن اس مسلمان کے کفر و فسق کا حکم نہ لگایا جائے گا۔ البتہ ایسی حالت میں مسلم ممبران کو چاہئے اس قسم کے حلف برداری کے مروجہ طریقے کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ امام ترمذی نے جہاں یہ حدیث ذکر کی ہے من حلف بغیر اللہ فقد کفر أو أشرت (ترمذی ۱۰۲۸۰) وہاں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: وتفسیر هذا الحدیث عند بعض أهل العلم أن قوله: فقد أشکر أو أشرت علی التغلیظ والحجة فی ذلك حدیث ابن عمر أن النبی علیہ السلام سمع عمر یقول: وابی وابی فقال: ألا إن اللہ ینہاکم أن تحلفوا آبائکم (ترمذی ۱۰۲۸۵)۔ علامہ شامی نے یحییٰ بغیر اللہ پر بحث کرتے ہوئے بقول بعض حدیث میں وارد ممانعت کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ دوسری طرف عام لوگوں کا یہ نظریہ نقل کیا ہے کہ مکروہ نہیں ہے، کیونکہ یحییٰ بغیر اللہ سے بھی یحییٰ کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ شامی کی عبارت ملاحظہ ہو: والیحییٰ بغیرہ مکروہة عند البعض للنبی الوارد فیہا وعند عامتهم لا تکرہ۔ لأھما یحصل بہا الوثیقة لا سیما فی زماننا (شامی ۵۰۲۷)۔

۷۔ ایسی سیکولر پارٹی کا ممبر بننا جو بظاہر مسلمانوں کی ہمدرد ہو، لیکن اس کا بعض قانون مخالف اسلام ہو:

بظاہر ہمدرد اور باطن مخالف اسلام سیکولر پارٹی کا ممبر اس نیت سے بننا جائز ہے کہ اس پارٹی کا جو مخالف اسلام قانون ہوگا اس کو اس پارٹی کے سربراہ اور اراکین سے مل کر ختم کرانے کی کوشش کریں گے۔ حدیث نبوی ہے: من رأى منکم منکرا فلیخبرہ بیده ومن لم یستطع فبلسانہ ومن لم یستطع فبقلبه وذلك أضعف الإیمان (مسلم شریف ۵۱۷)۔

## ۸۔ مسلم دشمن پارٹی کا ممبر بننا:

مسلم دشمن سیاسی پارٹی کا ممبر بننا عام لوگوں کے لئے تو درست نہیں ہے، البتہ اگر کوئی شخص اصلاح کی نیت سے شریک ہو کر اس کے نظام میں سدھار لائے تو شرعاً ایسے شخص کے لئے اس قسم کی سیاسی پارٹی میں شمولیت شرعاً درست ہے، کیونکہ فقہ کا مسلہ اصول ہے: الأمور بمقاصدھا۔

۹۔ جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں کے مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا کیسا ہے؟

جس ملک میں مسلمانوں کی تعداد اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں کم ہو، وہاں کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کے سلسلہ میں علماء

کے درمیان اختلاف ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو سیاسی، تعلیمی، تنظیمی، معاشی ہر لائن سے خود کفیل ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حدیث نبوی ہے: من لہ یتیم بأمر المسلمین فلیس منا (المعجم الاوسط للطبرانی حدیث ۷۴۷۲)، تیسرے حضور اکرم ﷺ پر سلسلہ نبوت کے اختتام کے بعد عام لوگوں کو اچھی باتوں کی ترغیب دینا اور بری باتوں سے روکنے کا فریضہ اسی امت محمدیہ کے باشعور افراد پر عائد ہوتا ہے۔ چوتھے قوی مسلمان کو کمزور مسلمان کے مقابلہ میں بہتر کہا گیا ہے، لہذا دین و دنیا کی ہر جائز لائن میں مسلمانوں کو اپنا اثر و نفوذ بڑھانا چاہئے، نیز باشعور افراد کی ایسی نمائندہ جماعت ضرور ہونی چاہیے جو بوقت ضرورت مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دے اور یہ سب کام اخلاص کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے کرنا چاہیے، خداوند قدوس کا فرمان واجب الاذعان ہے: ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے: انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ اسی مفہوم میں علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

آج ہم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

۱۰۔ ایکشن میں عورتوں کا حصہ لینا:

مرد کو اللہ تعالیٰ نے عورت کا محافظ و نگراں اور سردار بنایا ہے اور عورتوں کی سربراہی کو حدیث نبوی میں قوموں کی ناکامی و نامرادی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے: لمن یفلح قوم دلوا امرہم اسراة۔ لیکن اگر کسی غیر مسلم ملک میں کسی علاقہ کی نمائندگی کے لئے عورتوں کی نامزدگی کا قانون بنا دیا گیا ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی دوہری ذمہ داری ہے، پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ اس قسم کے قانون کو بدلوانے کی بھرپور کوشش کریں اور اگر اس میں ناکامی ہو تو پھر ادھیڑ عمر کی باشعور عورتوں کو اپنا نمائندہ منتخب کریں جن کے بہکنے اور بگڑنے کا کم سے کم امکان ہو، جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے: ”والقواعد من النساء اللاتی لایر جون نکاحا“ حالت اضطرار میں عورتوں کی سربراہی کی نظیر قرآن کریم میں مذکور ملکہ سبا کا قصہ ہے۔

☆☆☆

## ایکشن کے احکام

### کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا رحمت اللہ ندوی

#### ووٹ کی شرعی حیثیت:

ایکشن خواہ اسمبلیوں کا ہو یا کونسلوں، میونسپلٹیوں کا یا کسی بھی مجلس کی ممبری کا، اس میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے والا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہوتا ہے: ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا وہ امیدوار ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ دیانت و امانتداری سے اس کام کو انجام دے گا، اب اگر وہ اپنے اس دعوے میں واقعی سچا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا ہے تو یہ عمل کسی حد تک درست ہے، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود مدعی بننے کے بجائے کوئی جماعت اس کو نامزد کرے اور اگر وہ شخص کام کی صلاحیت نہیں رکھتا تو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا درست نہیں، وہ قوم کا خائن اور غدار ہے اور اس کا کامیاب ہونا ملک و ملت کے لئے نقصان دہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی حلقے سے چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا بھی اکبر الکبائر ہے، لہذا ووٹر کو چاہئے کہ اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت، یا کسی طمع اور خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔

ووٹ کی کئی حیثیتیں ذکر کی گئیں ہیں، مثلاً سفارش، کہ ووٹر جس کو ووٹ دے رہا ہے، اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانتدار آدمی کی سفارش کرے، جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، سفارش ایک اہم عہدہ اور ذمہ داری ہے۔

ایک حیثیت وکالت کی ذکر کی جاتی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے۔ ووٹ کی ایک حیثیت مشورہ کی ہے کہ وہ حکومت اور نظم و نسق کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کون زیادہ بہتر اور ایمان دار ہو سکتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہر الفقہ ۲/۲۹۵، فقہی مقالات ۲/۲۸۵، ۲۹۳، جدید فقہی مسائل ۱/۴۵)۔

مذکورہ بالا حیثیتوں میں سے ووٹ کی جو بھی حیثیت ہو، حق رائے دہی کے استعمال کی حیثیت بڑی نازک اور اہم ہے، ایک شخص کو غیر مفید سمجھنے کے باوجود اس کو ووٹ دینا شہادت زور، جھوٹا مشورہ اور غلط سفارش جیسے گناہوں کا حامل ہے، مگر ووٹ دینا، دھوکہ دینا ہے، اسی طرح رائے دہی کی جو عمر متعین ہے اس سے کم عمر کے لوگوں کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ اس کا اندازہ بعض روایات سے بھی ہوتا ہے (جدید فقہی مسائل، ج: ۱، ص: ۴۵۸)۔

بعض علماء اور فقہاء نے ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی بھی ذکر کی ہے، جن میں قابل ذکر حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی، ان کے نامور فرزند مفتی محمد تقی عثمانی، ممتاز فقیہ ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاوی اور ہندوستان کے عالم دین و فقیہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں۔ جن حضرات نے ووٹ کو شہادت کا قائم مقام مانا ہے وہ ادائے شہادت اور کٹمان شہادت کی آیات اور احادیث کو پیش کر کے ووٹ کو واجب یا فرض قرار دیتے ہیں، ورنہ دیگر حیثیتوں کو سامنے رکھ کر واجب یا فرض قرار دینا بغیر نص قطعی کے مشکل ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ووٹ کو شہادت کا قائم مقام قرار دینا درست ہے؟

کیا ووٹ شہادت ہے؟

ناچیز کے نزدیک ووٹ کو شہادت قرار دینا کئی وجوہ سے محل نظر ہے، چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

ط استاودار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)۔



۱۔ شہادۃ کے لغوی معنی لفظ ”شہد“ یا ”شہدت“ کے ذریعہ کسی چیز سے متعلق اپنی جانکاری کی خبر دینا ہے اور یہ مشاہدہ اور معائنہ سے ماخوذ ہے۔ شرعی معنی ”إخبار صادق للإثبات حق“ (کسی حق کو ثابت کرنے کے لئے کسی سچ کی خبر دینا) ہے۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ (۶۰۲۸/۸) پر ہے: ”الشہادۃ: لُغَةً: خبر قاطع، وشرعاً: إخبار صادق لإثبات حق بلفظ الشہادۃ فی مجلس القضاء“، دوٹ پر شہادت کی یہ لغوی اور شرعی تعریف صادق نہیں آتی۔

۲۔ تحمل شہادت کی ایک شرط صاحب عقل و تمیز ہونا ہے، بہت سے دوٹ دینے والوں میں یہ شرط مفقود ہوتی ہے۔ خصوصاً سن رسیدگی کی وجہ سے۔

۳۔ شہادت کا حکم فرض کا ہے، جو شہادت کا حامل ہے جب اس سے مدعی مطالبہ کرتے تو اس پر ادائے شہادت لازم ہے، چھپانا جائز نہیں۔

اگر دوٹ شہادت ہے تو ہر ایک مکلف (قانونی اعتبار سے جس کا دوٹ ہے) پر دوٹ ڈالنا فرض ہے اگر ایسا نہیں کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ ایک بڑی تعداد اور بسا اوقات آبادی کا آدھا حصہ دوٹ نہیں ڈالتا بلکہ ۵۰ فیصد سے کم و بیش پونگ ہوتی ہے، تو ہم اسے فرض کہہ کر کتنے لوگوں کو گنہگار بنا رہے ہیں۔

۴۔ شہادت کا صرف ایک رکن ہے اور وہ لفظ ”شہد“ کے ذریعہ شہادت کی ادا کیگی ہے۔ کیا دوٹ میں یہ رکن موجود ہے؟

۵۔ ادا کیگی شہادت کی صحت و درستگی کے لئے چند شروط ہیں، ان میں سے ایک شرط شاہد کا عادل ہونا ہے، فاسق کی گواہی قبول نہیں، کتنے فساق دوٹ ڈالتے ہیں، کیا ان کا دوٹ ڈالنا درست ہے؟

۶۔ ایک شرط یہ ہے کہ شاہد بیانا ہو، نایمان کی گواہی قابل قبول نہیں، جبکہ دوٹ بہت سے نایمان بھی بشن دبا کر ڈالتے ہیں۔

۷۔ ایک شرط یہ ہے کہ شاہد، مشہور دلہ کے اصول و فروع نہ ہو، باپ کی گواہی بیٹے کے لئے اور بیٹے کی باپ کے لئے قبول نہ ہوگی۔

جبکہ ایکشن میں دوٹ ڈالتے وقت اصول و فروع ایک دوسرے کو دوٹ دیتے ہیں۔

۸۔ ایک شرط یہ ہے کہ شاہد اور مشہور دلہ کے درمیان زوجیت کا رشتہ نہ ہو، لہذا زوجین میں سے ایک کی شہادت دوسرے کے حق میں قبول نہ ہوگی، لیکن دوٹ ڈالنے میں زوجین ایک دوسرے کو دوٹ دیتے ہیں۔

۹۔ ایک شرط یہ ہے کہ شاہد محرومی القذف نہ ہو، بہت سے دوٹ ڈالنے والے لات اور جوتا کھائے ہوئے ہوتے ہیں جو حد القذف کے مثل ہے۔

۱۰۔ جن لوگوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی ہے ان میں سے یہ بھی ہیں:

(۱) مخنث، (۲) نوحہ کرنے والی اور گانے والی، (۳) شرابی اور جواری، (۴) کبیرہ کا مرتکب، (۵) سود خور، جوا، تاش اور شرط خچ کھیلنے والا، (۶) راستہ میں کھانے اور پیشاب کرنے والا، (۷) اسلاف کو برا بھلا کہنے والا، وغیرہ وغیرہ۔

جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ بھی موجودہ قانون میں نہ صرف دوٹ ڈالنے کا استحقاق رکھتے ہیں بلکہ دوٹ ڈالتے ہیں عشرہ کاملہ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶۰۵۰۶۱۰۳۵/۸)۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی نے دوٹ اور وٹ کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

الف۔ جو حکومت اسلام کی یا کسی بھی مخصوص دین کی پابند نہیں، اس کے زیر اثر رہنے والے مسلمانوں کو ایسے امور میں تائید و حمایت کرنا شرعاً درست ہے، جن سے احکام اسلام منہدم نہ ہونے متصور ہوں۔

ب۔ حقوق کی حفاظت اور ظلم سے بچاؤ کے لئے انتخابی ایکشن میں حصہ لینا بھی درست ہے (فتاویٰ محمودیہ ۴۲۸/۲۰)۔

راقم السطور کے نزدیک دوٹ کی حیثیت محض ایک اظہار رائے اور مشورہ کی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، نہ واجب و فرض ہے اور نہ سنت و مستحب، البتہ بعض صورتوں اور خاص حالات میں دوٹ نہ ڈالنے کے مقابلہ میں ڈالنا پسندیدہ اور بہتر ہو سکتا ہے، لہذا اگر کوئی شخص بالکل ہی دوٹ نہ ڈالے اور کسی کو بھی اپنا نمائندہ نہ بنائے تو اس کا اختیار ہے۔ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی کا بھی نقطہ نظر یہی ہے (فتاویٰ محمودیہ ۴۳۱/۲۰)۔

## سیاسی پارٹی کی تشکیل:

مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ و انتشار پیدا کرنا یا مذہبی اور سیاسی پارٹیاں بنانا بڑا جرم ہے، مغربی جمہوریت جیسے لادینی نظام میں ایسی سیاسی پارٹیوں کا وجود، جو خلوص نیت سے دین کی سر بلندی کے لئے کوشاں ہوں، صرف اس حد تک اضطراب اگوارا کیا جاسکتا ہے کہ بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں کچھ نہ کچھ رکاوٹ پیدا کرتی رہیں اور یہ اھوں اہلبیتین میں سے ایک کم ضروری صورت کو اختیار کرنے کی شکل ہے۔

تمام جماعتیں اور جمعیتیں خواہ وہ کسی نام اور عنوان سے ہوں، سب کی ایک ہی حالت ہے۔ جمہوری نظام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جماعتیں اپنا تشخص برقرار رکھیں جب کہ اسلامی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی پارٹیاں اپنا تشخص ختم کر کے ایک ملت واحدہ میں مدغم ہو کر حزب اللہ بن جائیں اور حزب الشیطان کے مقابلہ میں ڈٹ کر صف آراء ہو جائیں (خلافت و جمہوریت، ص: ۹۷)۔

## نظام کفر کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی شرکت:

ایکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular)، جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدہ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے، لیکن اگر کسی وقت ملک کی رائے عامہ کو اس حد تک اپنے عقیدہ اور اپنے مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں تو یہ ہو کہ عظیم انسان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس طریقہ سے کام نہ لیں، مگر واضح رہے کہ ہم یہ طریقہ کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے، جبکہ:

۱۔ ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عامہ کا کسی نظام کے لئے ہمارا ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہو سکتا ہو۔  
۲۔ ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

۳۔ انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں، بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے (رسائل و مسائل حصہ اول، ص: ۳۱۱)۔  
فقہ اکیڈمی دہلی کے فیصلے:

آل انڈیا اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے چودہویں فقہی سمینار حیدرآباد بعنوان ”مسلم غیر مسلم تعلقات“ بتاریخ ۱-۳ جمادی الاول ۱۴۲۵ھ ۲۰-۲۲ رجون ۲۰۰۴ء میں جو فیصلے کئے ہیں، ابتداء کے پانچ دفعات موضوع کی مناسبت سے نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے، لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے، لہذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا ایکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات کا تقاضا ہے کہ وہ ووٹ دینے کا قانونی حق بھر پور طریقہ سے استعمال کریں۔

۳۔ جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ، اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنا لیا ہو ان میں مسلمانوں کی شرکت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو۔

۴۔ جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں۔

۵۔ ملک اور انسانیت کے نفع اور معاشرہ میں عدل و انصاف اور امن و سلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے اور ان کے اشتراک سے تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۱۰ غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل ص: ۴۹)۔

## حلف برداری:

حلف برداری ملک کے آئین کے ساتھ وفاداری کا ایک معاہدہ ہوتا ہے اور شرعاً ایسا معاہدہ پورا کیا جائے گا جس سے اسلام اور شریعت پر آج نئے آئے، لیکن جو معاہدہ رسماً یا جبراً کرہا ہو اور خلاف شریعت ہو اس کی پابندی لازم نہیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عمرؓ کو خطاب کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”وإذا حلفت على يمين فرأيت غيرها خيراً منها فأت الذي هو خير وكفر عن يمينك“ (متفق عليه) (اور جب تم کوئی قسم کھاؤ اور اس کے علاوہ میں خیر دیکھو تو جس میں خیر ہو اس کو بجالاً و اور اپنی قسم کا کفارہ دے دو)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ”والحلف بكتاب الله أو بالقرآن أو بالمصحف يمين باتفاق المذاهب الأربعة، والحلف بالتوراة أو الإنجيل ونحوهما من كتب الله المنزلة كالزبور يمين في رأى الحنابلة، لأن اطلاق اليمين ينصرف إلى المنزل من عند الله، دون المبدل“ (الفقه الاسلامي وادلتہ ۸۰۶۰۶۶)۔

(کتاب اللہ یا قرآن یا مصحف کی قسم مذاہب اربعہ کے اتفاق کے ساتھ یمن ہے۔ تورات یا انجیل اور ان دونوں کی طرح اللہ کی نازل کردہ کتاب جیسے زبور کا حلف حنابلہ کی رائے میں یمن ہے، کیونکہ جب مطلق یمن ہو تو اللہ کی طرف سے نازل کردہ کی طرف پھیرے گا نہ کہ تبدیل شدہ اور تحریف شدہ کی طرف)۔

اگر ایسی چیز کی قسم کھانے پر مجبور کیا جائے جس کی قسم شرعاً جائز نہیں تو اس کا حیلہ یہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ متصل انشاء اللہ کہہ لے، اس صورت میں یمن منعقد نہ ہوگی، ”من حلف، فقال إن شاء الله، لم يحنث“ (رواه احمد والترمذی وابن ماجہ)۔  
فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فیصلے:

اکیڈمی کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر غیر مسلم ممالک میں وہاں کے نظام کی رو سے ضروری ہو کہ عدالت کے سامنے حلف اٹھاتے وقت توریت یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھا جائے تو مسلمان کے لئے توریت یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنے کا کیا حکم ہے؟  
اجلاس نے اس سلسلہ میں کس چیز کے ذریعہ حلف لینا جائز ہے اور قسم میں بالعموم اور قاضی کے سامنے عدالتی حلف میں ممنوع امور سے متعلق مختلف مسالک کے فقہاء کی آراء کا جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے کئے:

- ۱۔ اللہ کے سوا کسی اور چیز کی قسم کھانی جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”جسے قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے“۔
- ۲۔ قسم کھاتے وقت مصحف، توریت یا انجیل وغیرہ پر ہاتھ رکھنا، قسم کے صحیح ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے، البتہ اگر حاکم قسم پختہ کرنا چاہتا ہو تو کہ قسم کھانے والا جھوٹ بولنے سے ڈرے تو ایسا کرنا جائز ہے۔
- ۳۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھے، اس لئے کہ آج جو نسخے رائج ہیں وہ محرف ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے اصلی نسخے نہیں ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی شریعت نے پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔
- ۴۔ اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لئے توریت یا انجیل پر یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا (اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فیصلے۔ پانچواں سمینار، پہلا فیصلہ ص: ۱۱۹)۔

خلاصہ بحث:

اسلام کا نظام سیاست موجودہ جمہوریت، ملوکیت اور آمریت سے مختلف ہے، اسلام جس نظام حکومت کے قیام کا طالب ہے وہ خلافت علی منہاج النبوة ہے۔ موجودہ مغربی اور جمہوری نظام سیاست کو عین اسلام یا اس سے قریب تر قرار دینا بہت بڑی بھول اور نادانی ہے۔ آج کل کی رائج جمہوریت بے شمار مفاسد اور مضار سے بھری پڑی ہے، اسلام سے اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ ایڈیشن میں امیدوار بننا اور ووٹ ڈالنا جائز ہے، جبکہ قوم و ملک کے مفاد کو اور خیر خواہی کو پیش نظر رکھا جائے اور اپنے ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر محض خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر خلوص نیت کے ساتھ اس میں شرکت کی جائے۔

سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ووٹ کی حیثیت محض ایک اظہار رائے اور مشورہ کی ہے۔ اگر کسی سے رائے یا مشورہ طلب کیا جائے تو وہ طالب کو رائے و مشورہ دے بھی سکتا ہے اور نہیں بھی

دے سکتا ہے۔ اسے دونوں کا اختیار ہے، اسے کسی صورت میں مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ ووٹ نہ دینے سے جب قوم و ملک کا نقصان ہو تو اظہار رائے کرنا بہتر ہے اور اپنا حق رائے وہی استعمال کرنا مناسب ہے۔

۲۔ ووٹ شہادت کے درجہ میں نہیں، اور نہ واجب و مستحب ہے، صرف جائز ہے۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کر سکتے ہیں جب کہ دیانت و امانت، اہلیت اور خدمت خلق کے اوصاف موجود ہوں ورنہ نہیں، اوصاف مطلوبہ پائے جانے کے وقت خود اپنے کو پیش نہ کرنا بلکہ دوسرے لوگوں کا اسے نامزد کرنا پسندیدہ ہے۔

۴۔ غیر مسلم ملکوں یا اسلامی ملکوں کے ان قانون ساز اداروں کا ممبر بننا جائز نہیں جو مخالف شریعت قانون بناتے ہیں۔ صرف شریعت کے مطابق قانون ساز اداروں کی ممبری جائز ہے۔

۵۔ صرف ان قانون ساز اداروں کا رکن بنا درست ہے جو مخالف شریعت قانون سازی نہ کرتے ہوں اور رکن منتخب ہونے پر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بھی جائز ہے، لیکن دستور کے اکثر بعض دفعات خلاف شریعت ہوں اور منتخب ہونے والا ممبر ان میں ترمیم کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اکثری کا لحاظ کرتے ہوئے حلف برداری کر سکتا ہے، لیکن مخالف شریعت دفعات کے ساتھ وفاداری کا پابند نہ ہوگا (لا طاعۃ لخلق فی معصیۃ الخالق)۔

۶۔ بائبل کا حلف لینا جائز نہیں، کیونکہ وہ محرف ہے، اور اگر لے لیا ہے تو اس کا پابند نہیں۔

۷۔ ان سیکولر پارٹیوں کے ساتھ شمولیت اختیار کر کے ایکشن لڑنا درست ہے، جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہوں۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، ان میں شریک ہونا جائز نہیں؟ اگرچہ شرکت سے اس کے ایجنڈے میں تبدیلی کی کوشش کی نیت ہو، کیونکہ ایسا ہوتا نہیں ہے، بلکہ شرکت کرنے والا ان میں ضم ہو جاتا ہے۔

۹۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں وہ ملک اور ملت کے احوال و مصالح اور مفادات کو سامنے رکھ کر مناسب ہو تو کسی سیاسی جماعت کی تشکیل کر سکتے ہیں، جب کہ اس کے قیام سے مسلمان مخالف ووٹ متحد نہ ہو اور فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ نہ اٹھائیں۔

۱۰۔ عورت کے لئے باپردہ پورے شرعی لوازمات اور تحفظات کے ساتھ صرف ووٹ ڈالنے کی اجازت ہے، امیدوار بننا یا کسی سیاسی عہدہ اور منصب کے لئے کوشش کرنا جائز نہیں۔ مغرب کی عیاری سے ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے، کیونکہ وہ تو خاتون خانہ کو شمع محفل بنانے اور تسکین خاطر حاصل کرنے اور آکھ سینکنے کے لئے طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر ناقصات العقل کو مساوات کا جھنڈا دکھا کر باہر نکالنا چاہتا ہے۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم۔

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی احکام و مسائل

مولانا محمد سعید قاسمی <sup>ط</sup>

ووٹ کی شرعی حیثیت:

جمہوری نظام حکومت میں ووٹنگ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ اس نظام میں حکمران کا انتخاب ووٹنگ ہی سے ہوتا ہے، چنانچہ گاؤں، شہر، صوبہ اور ملک کی سطح پر حکمران کے انتخاب کے لئے ووٹنگ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ووٹنگ کی شرعی حیثیت کے بارے میں گفتگو سے پہلے ہم اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ چنانچہ المنجد فی اللغة العربیة المعاصرة میں ہے:

تصويت: عملية جماعية يقوم بها المواطنون، فيدلون بأصواتهم في صناديق مغلقة إعراباً عن رأيهم في أمر عام أو اختيار ممثلهم في المجالس النيابية (المنجد في اللغة العربیة المعاصرة ص: ۸۹)۔ نیز آکسفورڈ ڈکشنری میں ہے:

Voting: the action of choosing sb or sth in an election or at a meeting (Oxford dictionary: 1450)

المنجد کی تعریف سے معلوم ہوا کہ ووٹنگ ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جس میں شہری اپنا ووٹ بند بکسوں میں ڈال کر کسی عمومی معاملے، یا قانون ساز مجالس کے لئے نمائندوں کے انتخاب کے سلسلے میں اپنی رائے دیتے ہیں، جبکہ آکسفورڈ ڈکشنری کی تعریف کے مطابق ایکشن یا میٹنگ میں کسی شخص یا چیز کے انتخاب کے طریقے کو ووٹنگ کہا جاتا ہے۔

۱۔ ووٹ ایک قسم کی شہادت ہے، گویا کہ رائے دہندہ یہ شہادت دیتا ہے کہ امیدوار جس منصب کے لیے ایکشن لڑ رہا ہے وہ اس کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے اور وہ منتخب ہو کر امانت و دیانت سے کام کرے گا۔ بوقت ضرورت شہادت دینا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء للہ (سورہ نساء: ۱۳۵)۔ شہادت چھپانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ولا تکتموا الشهادة ومن یکتتمها فإنه آثم قلبه (البقرة: ۲۸۳) جھوٹی گواہی سخت گناہ کبیرہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹی گواہی کو اکبر کبائر قرار دیا ہے: ذکو رسول اللہ ﷺ الکبائر أو سئل عن الکبائر فقال: "الشرك بالله و قتل النفس و عقوق الوالدین فقال: ألا أنبئکم بأکبر الکبائر؟ قال: قول الزور أو قال: شهادة الزور" قال شعبه: وأكثر ظنی أنه قال: "شهادة الزور" (صحیح البخاری: ۵۶۲۲)۔

لہذا جب ووٹ شہادت کی طرح ہے، تو بوقت ضرورت ووٹ دینا واجب ہے، کسی نااہل کو ووٹ دینا گناہ کبیرہ ہے، نیز اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ نہ دے کر کسی کو محض تعلق اور لحاظ کی بنا پر یا رشوت لے کر ووٹ دینا بھی ناجائز ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی یہی رائے ہے (جواہر لفقہ ۲۹۰/۲، فقہی مقالات ۲۸۶/۲)۔

لیکن ووٹ کو شہادت قرار دینا اس وقت تو درست ہے جب امیدوار اور رائے دہندہ دونوں مسلمان ہوں اور اگر امیدوار مسلمان ہے اور رائے دہندہ غیر مسلم ہے تو رائے دہندہ کی شہادت (ووٹ) مسلمان امیدوار کے حق میں غیر معتبر ہونا چاہیے، حالانکہ اس کے ووٹ کا اعتبار کیا جاتا ہے، اس لیے ووٹ کا علی الاطلاق شہادت ہونا محل غور ہے۔

۲۔ ووٹ ایک قسم کا مشورہ اور رائے ہے، رائے دہندہ امیدوار کے منصب کے لائق اور اس کا اہل ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس مشورے اور رائے دہی تلخ پوری امانت داری کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: المستشار مؤتمن (سنن ابی داؤد حدیث: ۵۱۳۰)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کے لئے سات نفری مجلس شوریٰ تشکیل دی تھی، جس کے ممبران میں سے ہر ایک کو خلیفہ کے انتخاب کے

<sup>ط</sup> مدرس دارالعلوم دیوبند۔

بارے میں رائے اور مشورہ دینا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنا اپنا مشورہ دیا اور بحیثیت خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب عمل میں آیا (البدایہ والنہایہ ۷/۱۳۵)۔

مجلس شوریٰ کے ذریعہ مشورے سے خلیفہ کے انتخاب کی طرح معاصر جمہوری نظام میں حکمران کے انتخاب کے لئے ووٹ کے طریقے کو بھی ایک قسم کا مشورہ اور رائے وہی کہا جاسکتا ہے۔ ووٹ کی مذکورہ بالا دونوں تعریفوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قسم کا مشورہ اور رائے وہی ہے۔ میرے نزدیک یہ حیثیت راجح ہے۔ جب ووٹ ایک قسم کی رائے اور مشورہ ہے تو جس طرح مشورہ دینا جائز ہے، اسی طرح عام حالات میں ووٹ دینا جائز ہوگا، البتہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ ووٹ نہ دینے کی صورت میں اہل اور لائق امیدوار نام ہو جائے گا اور کوئی ایسا نااہل شخص منتخب ہو جائے گا جو لوگوں پر ظلم کرنے کا اور ان کی حق تلفی کرے گا تو اس وقت ووٹ (مشورہ) دینا واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”انصر أخا ظالما أو مظلوما فقال رجل: یا رسول اللہ! انصرہ إذا كان مظلوما أفرأیت إذا كان ظالما کیف أنصرہ؟ قال: تحجزه أو تمنعه من الظلم فإن ذلك نصره“ (صحیح البخاری: ۶۱۶۲)

انتخاب میں امیدوار بننے کا حکم:

اگر کوئی شخص اقتدار طلبی کے بجائے قوم کی خدمت کے جذبے سے انتخاب میں امیدوار بنتا ہے اور وہ اس کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور اپنے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ منتخب ہونے کے بعد پوری امانت و دیانت سے ذمہ داری نبھائے گا تو ایسے شخص کے لئے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے۔ قال اجعلنی علی خزانن الارض إنی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵)۔

ورنہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کچھ لوگ کسی امانت دار اور باصلاحیت شخص کو امیدوار بنا کر ایکشن میں کھڑا کریں تاکہ اس کی امیدواری کو منصب طلبی پر محمول نہ کیا جائے جس کے متعلق حدیث میں وارد ہوا ہے: من طلب القضاء واستعان علیہ وکل إلیہ، ومن لم یطلبہ ولم یستعن علیہ أنزل اللہ ملکا یسدده (سنن ابوداؤد، حدیث: ۳۵۸۰)۔

### شریعت مخالف قانون ساز اداروں اور پارٹیوں میں شمولیت کا حکم:

ایسے قانون ساز ادارے جو شریعت مخالف قوانین بناتے ہیں اور ایسی پارٹیاں جو اپنے ممبروں کو اپنے جاری کردہ وہیپ (Whip) کے مطابق ووٹ دینے کا پابند کرتی ہیں (خواہ وہیپ ان کے ضمیر اور مذہب کے خلاف ہو) تو ان میں ممبر شپ حاصل کرنے کا حکم یہ ہے کہ شریعت کے پیمانے سے دیکھا جائے کہ مصلحت اور مفسدہ میں سے کون اہم اور بڑھا ہوا ہے؟ چنانچہ اگر ممبر شپ حاصل نہ کرنے میں عظیم مصلحت فوت ہو رہی ہے اور ممبر شپ حاصل کرنے کی صورت میں معمولی مفسدہ ہے تو ممبر شپ حاصل کرنا جائز ہے یا معاملہ اس کے برعکس ہے، یعنی ممبر شپ حاصل کرنے کی صورت میں عظیم مفسدہ ہے اور نہ حاصل کرنے کی صورت میں معمولی مصلحت فوت ہو رہی ہے تو ممبر شپ حاصل کرنا ناجائز ہے، اس لئے کہ عظیم مصلحت کے حصول کے لئے خفیف مفسدے کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے اور معمولی مصلحت کے حصول کے لئے عظیم مفسدے کا ارتکاب جائز نہیں۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام (م: ۶۲۰) فرماتے ہیں: إذا اجتمعت مصالح ومفاسد فإن أمکن تحصیل المصالح ودرء المفاسد، فعلنا ذلك امتثالاً لأمر اللہ تعالیٰ فیہما لقوله سبحانه وتعالیٰ: ”فاتقوا اللہ ما استطعتم“ وإن تعذر الدرء والتحصیل فإن كانت المفسدة أعظم من المصلحة درأنا المفسدة ولا نبالی بفوات المصلحة قال اللہ تعالیٰ: ”یسألونک عن الخمر والمیسر قل فیہما إثم کبیر ومنافع للناس وإثمہما أكبر من نفعہما“ حرہما لأن مفسدہما أكبر من نفعتہما۔

أما منفعة الخمر فبالتجارة ونحوها، وأما منفعة المیسر فیما يأخذہ القامر من القمور۔ وأما مفسدة الخمر فبإزالتها العقول، وما تحدتہ من العداوة والبغضاء والصد عن ذکر اللہ وعن الصلاة، وأما مفسدة القمار فبإيقاع العداوة والبغضاء والصد عن ذکر اللہ وعن الصلاة، وهذه مفاسد عظیمة لانسبة إلى المنافع المذكورة إلیها، وإن كانت المصلحة أعظم من المفسدة حصلنا المصلحة مع التزام المفسدة (قواعد الأحكام فی مصالح الأنام، ص: ۸۴۱)۔

شریعت مخالف دستور سے وفاداری کا حلف:

شریعت مخالف دستور سے وفاداری کے حلف کے سلسلے میں مسلمان ممبروں کو چاہئے کہ حلف برداری میں یہ نیت کریں کہ وہ اس ادارے میں اسلام اور

مسلمانوں کے مفاد کے ارادے سے شامل ہوئے ہیں، نہ کہ دنیا اور منصب کے حصول کے لئے اور اسلام کے اصولوں سے متصادم حلف میں کلام کو دوسرے معنی پر محمول کرنے کی کوشش کریں۔ سلیمان محمد تو بولیا کہ لکھتے ہیں: يجب عليهم أن ينووا عند حلف اليمين في المجلس أنهم دخلوا فيه بنية مصلحة الإسلام والمسلمين، وليس خبا للمنصب والدنيا، وأن يحاولوا تحريف الكلام في اليمين التي تتعارض مع مبادئ الإسلام (الأحكام السياسية للأقليات المسلمة في الفقه الإسلامي، ص: ۱۳۸)۔

مسلمان ممبر کے لئے بائبل پر حلف لینے کا حکم:

کیا قرآن کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جائے گی؟ اس سلسلے میں علما کی آراء مختلف ہیں، جمہور علماء کے نزدیک قرآن، یا اس کے کچھ حصے، یا مصحف کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جائے گی، بشرطیکہ قرآن سے اللہ کا کلام مراد ہو، کاغذ، روشنائی اور جلد مراد نہ ہو، احناف کے یہاں قرآن کی قسم درست نہیں ہے۔ البتہ علامہ ابن ہمام کی رائے ہے کہ قرآن کی قسم کھانا عرف میں رائج ہے، اس لئے قرآن کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جائے گی (رد المحتار، کتاب الایمان)، جمہور کی دلیل یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام اللہ کی ایک صفت ہے، جس طرح اللہ کی قسم کھائی جاسکتی ہے، اسی طرح اللہ کی صفت کی بھی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ جس طرح جمہور قرآن کی قسم کے انعقاد کے قائل ہیں، اسی طرح وہ تورات، انجیل اور زبور کی بھی قسم کے انعقاد کے قائل ہیں، بشرطیکہ قسم کھانے والا تورات، انجیل اور زبور سے وحی منزل مراد لے نہ کہ کاغذ، روشنائی اور جلد، کیونکہ وہ اللہ کی ایک صفت کی قسم کھانے والا کہلائے گا۔ الذین قالوا بانعقاد اليمين بالقرآن وهم الجمهور يقولون ذلك بالنسبة للحلف بالتوراة أو الإنجيل أو الزبور إذا أراد الحالف الوحي المنزل دون الورق والجلد والمداد، لأنه حلف بصفة من صفات الله عزوجل (أحكام اليمين بالله، از خالد بن علي بن محمد الشيقح، ص: ۶۵)۔

لہذا مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ مسلم ممبر کے لئے بوقت ضرورت بائبل (انجیل) کی قسم کھانے کی گنجائش ہے، لیکن قسم کے وقت اس کی یہ نیت ہو کہ وہ اس انجیل کی قسم کھا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بذریعہ وحی نازل فرمائی تھی۔ سیکولر پارٹی میں شمولیت کا حکم:

وہ سیکولر پارٹیاں جن سے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ مناسب طریقے سے ہو سکتا ہے، ساتھ ہی ان کے منشور کی بعض دفعات اسلام مخالف یا مسلم مفادات کے مغاثر ہیں تو ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شمولیت کا بھی حکم اسی مذکورہ بالا اصول (عظیم مصلحت کے حصول کے لئے معمولی مفسدے کے ارتکاب کا جواز) سے نکل آتا ہے، اگر ان پارٹیوں میں شمولیت سے مسلمانوں کے اہم مصالح کا حصول ہو رہا ہے اور ان کے نسبت معمولی مفسدے کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، تو شمولیت جائز ہے اور اگر معاملہ برعکس ہے تو شمولیت جائز نہیں۔ مسلم دشمن پارٹیوں میں شمولیت:

جو پارٹی مسلمانوں کی دشمن ہے اور اس کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے تو ایسی پارٹی میں کسی مسلمان کی شمولیت جائز نہیں، اس لئے کہ اسے اس پارٹی کے اسلام اور مسلم مخالف اصول و ضوابط کا پابند ہونا پڑے گا، اس طرح وہ اپنا کردار ادا نہیں کر پائے گا اور اس کی آزادی بھی سلب ہو جائے گی۔ هل يجوز أن ينضموا إلى حزب غير إسلامي؟ الأصل في هذه المسألة أنه لا يجوز أن يكون ولاؤه لغير دين الله، لأن في ذلك التزاما بمبادئ ذلك الحزب التي ربما تخالف الإسلام في الأغلب، وتفقد تصرفات المسلم وحرية (جاد الحق على جاد الحق، فتوى في بعض أحكام تتعلق بالأقليات الإسلامية في غير ديار المسلمين مجلة الأزهر، الجزء السادس، السنة الثالثة والستون: ۱۹۹۱م، بحوالہ الأحكام السياسية للأقليات المسلمة ص: ۱۳۶-۱۳۸)۔

البتہ اگر کوئی مسلمان طاقت ور ایمان دار اور مؤثر شخصیت کا مالک ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ غیر مسلم پارٹی میں شامل ہونے سے مسلم اقلیتوں کو فائدہ پہنچے گا اور وہ ان کے حقوق کا دفاع کرے گا تو اس کے لئے احتیاط اور ترقی کے ساتھ اس میں شامل ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اس سے مقاصد شریعت کی تکمیل ہوگی۔ مصالح راجحہ کا حصول ہوگا اور اشد ضررین کا دفعیہ۔ أما إذا كان المسلم قوی الإيمان والشخصية وصاحب نفوذ فيعتقد أن في انضمامه إلى غير الإسلامی نفعاً للأقليات المسلمة ودفاعاً عن حقوقها فلا مانع في ذلك مع الحذر واليقظة، وهذا

تحقیقاً لمقاصد الشریعة و رعایة للمصالح الراجحة و استبعاد الأشد الضررین (الأحكام السياسية للأقليات المسلمة ص: ۱۳۷، ۱۳۸)

غیر مسلم ملک میں مسلم اقلیت کے لئے سیاسی پارٹی کی تشکیل:

غیر مسلم ملک میں رہنے والی مسلم اقلیت کے لئے اپنی پارٹی تشکیل دینا جائز ہے۔ مسلم اقلیت کو چاہیے کہ وہ باہم متحد اور مربوط رہے اور ایک دوسرے کا تعاون کرے۔ خواہ اس کے لئے کوئی تنظیم بنائے یا پارٹی قائم کرے، اس لئے کہ اس میں تعاون و تعاون علی البر و اتقویٰ ہے (قادی الجزیۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء، ۲۰۷/۲۳)۔

نیز سلیمان محمد تو بولیاک اپنی کتاب الاحکام السیاسیۃ للأقلیات المسلمۃ میں مسلم اقلیت کے لئے پارٹی کی تشکیل کے لئے درج ذیل امور کا ملحوظ رکھنا ضروری قرار دیتے ہیں:

۱۔ یہ پارٹی قرآن و سنت کی بنیاد پر قائم ہو۔ اس بنیاد کے علاوہ کسی اور بنیاد پر پارٹی کا قیام اسلام میں قابل قبول نہیں ہے۔

۲۔ اس پارٹی کے قیام کا مقصد تعاون علی البر و اتقویٰ، رضائے خداوندی، اسلام کا دفاع اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے مختلف میدانوں میں جدوجہد ہونا چاہیے۔

۳۔ پارٹی اس ملک کے مسلمانوں کو ممکنہ حد تک ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے خواہ ان کی نسل، رنگ اور زبان کچھ بھی ہو۔ اگر ان میں اختلاف اور ناچاقی ہو تو صلح کرانے کی کوشش کرے۔

۴۔ اس ملک میں دوسری پارٹی قائم کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس کا نتیجہ ہوگا کہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوگا اور وہ کمزور پڑ جائیں گے اور دشمن کو انہیں نقصان پہنچانے کا موقع ملے گا۔ (جیسا کہ یوسینیا میں انتخاب سے پہلے پیش آیا کہ عادل ذوالفقار باشنشی اپنے حامیوں کے ساتھ مسلم پارٹی سے الگ ہو گئے جس سے مسلم رائے دہندگان کا ووٹ تقسیم ہو گیا) الا یہ کہ پارٹی قرآن و سنت کے راستے سے منحرف ہو جائے۔

۵۔ پارٹی اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملک اور عالم اسلام کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرے، تاکہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کو فروغ ملے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بین أخیکم و اتقوا اللہ لعلکم ترحمون“ (الحجرات ۱۰)

۶۔ یہ پارٹی عالم اسلام کی بعض پارٹیوں کی طرح غلطیوں کا ارتکاب نہ کرے اور مسلمانوں میں پارٹی سے وابستگی یا عدم وابستگی کی بنیاد پر تفریق نہ کرے، بلکہ انہیں چاہیے کہ پارٹی کا ساتھ دیں اگر وہ حق پر ہے اور تنقید کریں اور اگر پارٹی کوئی غلطی کر رہی ہے تو قیادت کے ساتھ خیر خواہی کی کوشش کریں۔

۷۔ ضروری ہے کہ یہ پارٹی اسلامی ہونے کے سیکولر اس کو دیگر سیاسی پارٹیوں پر قیاس نہ کیا جائے، نہ ہی اقتدار پرستی کا اسے ذریعہ بنایا جائے، بلکہ اس کو بھی دین کامل کا ایک حصہ سمجھا جائے۔ موصوف نے پارٹی کی تشکیل کے جواز کے لئے درج ذیل دلائل دیئے ہیں:

۱۔ جو مسلم اقلیت ایسے غیر مسلم ملک میں رہتی ہے جہاں جمہوری نظام قائم ہے، جو اصلاً جماعتی تکثیریت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نظام میں پارٹی افراد کے لئے حقوق حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جس کی کوئی پارٹی نہیں ہے وہ اپنے تمام حقوق حاصل نہیں کر سکتا۔ اسلام میں حقوق کا حصول ضرورت ہے، جو چیز ان کے حصول کا ذریعہ ہو وہ بھی ضرورت ہے، اس لئے ہم مسلم اقلیت کے لئے پارٹی کی تشکیل کے جواز کے قائل ہیں۔

۲۔ اسلام ہمیں اتحاد اور تعاون علی البر و اتقویٰ کا حکم دیتا ہے اور پارٹی کی تشکیل اس تعاون کی ایک مخصوص شکل ہے، اس لئے کہ بہت سے ممالک میں اس پر مسلم اقلیت کی بقا اور استحکام منحصر ہے۔

۳۔ قرآن مسلمانوں سے اقامت دین، تبلیغ خیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطالبہ کرتا ہے، ”و لکن منکم أمة یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینہون عن المنکر و أولئک ہم المفلحون“ (آل عمران: ۱۰۴) مسلم اقلیت سے اس کا مطالبہ ہے کہ وہ منظم ہوں، تاکہ ان کے لئے اس مقصد کی تکمیل ممکن ہو اور کسی غیر مسلم ملک میں تنظیم اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی صورت پارٹی کی تشکیل ہے۔

۴۔ ارتکاب اخف الضررین کے قاعدے کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم تسلیم کر لیں کہ پارٹی کی تشکیل میں کچھ مخالفت اور ضرر ہے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ نہ تشکیل دینے میں زیادہ ضرر ہے، اس لئے کہ ان ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا کو خطرہ لاحق ہوگا، ان کی آزادی سلب ہوگی اور حقوق پامال ہوں گے، اس لئے ہم ضرر اکبر کے دفع کے لئے ضرر اخف کے ارتکاب کی اجازت دیتے ہیں۔



۵۔ حقوق اور آزادی کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اسلام نے ان حقوق کے احترام کا حکم دیا ہے۔ اِن دمانکم وأموالکم علیکم حرام، کحرمة یومکم هذا فی شہرکم هذا الی یوم تلقون ربکم، ألا هل بلغت ا قالوا: نعم قال: اللهم اشهد، فلیبلغ الشاهد الغائب، فرب مبلغ أوعى من سامع، فلا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم بعض (صحیح البخاری ۲۰۳۵)۔

ان حقوق اور آزادی کے تحفظ کے سلسلے میں شارع کے مقصد کی تکمیل ایسی پارٹیوں کی تشکیل کے بغیر ممکن نہیں جن سے لوگوں کی حکام کے ظلم و ستم سے حفاظت ہو۔  
۶۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام مخالف طاقتیں، جماعتوں، دھڑوں، پارٹیوں اور محاذوں کی شکل میں کام کرتی ہیں اور عقل و شرع کی رو سے یہ بالکل غلط ہے کہ منظم طاقت وراجماعی کوشش کا غیر منظم معمولی انفرادی کوشش سے مقابلہ کیا جائے۔ اس لئے کہ اجتماعی کوشش کی کاٹ اسی قسم کی اجتماعی کوشش ہی ہے، طاقت کا جواب طاقت ہے اور لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وأعدوا لهم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترهبون بہ عدو اللہ وعدوکم (الانفال: ۶۰)۔

۷۔ جن ممالک میں مسلم پارٹی قائم ہے مثلاً برطانیہ، یوسینیا اور ہرزگوینیا وغیرہ وہاں کی صورت حال بہت بڑی دلیل ہے۔ ان پارٹیوں کا وہاں کے مسلمانوں کے اتھاہ، ترقی اور بیداری میں بڑا کردار ہے اور یوسینیا اور ہرزگوینیا میں تو مسلمانوں نے پارٹی ہی کے ذریعہ زندگی کے تمام میدانوں میں اپنا وجود ثابت کیا ہے۔ یہی صورت حال برطانیہ اور ترکی میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ پارٹیاں نہ ہوتیں تو مسلمان ان ممالک میں وہ کچھ حاصل نہ کر پاتے جو انہوں نے حاصل کیا ہے۔

۸۔ اسلام میں یہ بات طے ہے کہ احکام دنیا اور آخرت میں بندوں کے مصالح کی تکمیل کے لئے ہی مشروع ہوئے ہیں، جو حکم مصلحت سے مفسدہ تک پہنچ جائے یا حکمت سے کار عبث میں تبدیل ہو جائے تو شریعت سے اس حکم کا کوئی تعلق نہیں ہے (اولویات الحریکۃ ال اسلامیۃ فی الرحلۃ القادمیۃ ص ۱۲)۔

اگر ہم غیر مسلم ملک میں مسلم پارٹی کی تشکیل دینے کے عدم جواز کی بات کریں تو اس حکم سے لوگ تنگی میں مبتلا ہوں گے اور اپنے حقوق اور آزادی کا تحفظ کر پائیں گے نہ کہ اپنے وجود سے دفاع، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم مشروعیت احکام کی حکمت کے خلاف ہے اور شریعت لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کے لئے آئی ہے نہ کہ لوگوں کو تنگی اور حرج میں ڈالنے کے لئے۔

۹۔ نیز جب تک یہ پارٹیاں شریعت کے اصول و ضوابط کی پابندی کرتی ہیں تو ان کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے (احکام اسلامیۃ للآ قلیات المسلمۃ ص ۱۳۷-۱۳۸)۔

ایکشن میں عورتوں کا کردار:

جن طرح عورت پردے میں اپنی ذاتی اور خانگی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے، اسی طرح وہ ضرورت کے وقت ووٹ بھی دے سکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، جیسا کہ الیکشنوں میں مشاہدہ ہے۔ اس لیے کہ ووٹ اگر شہادت ہے (جیسا کہ بعض معاصر مفتیان کرام کی رائے ہے) تو عورت شہادت دے سکتی ہے۔

جہاں تک عورت کے الیکشن میں امیدوار بننے اور قانون ساز اداروں میں ممبر بننے کا معاملہ ہے تو ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور اس کی اجازت دی ہے (فتاویٰ معاصرہ از ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۲/۳۸۲)۔

غالباً ڈاکٹر موصوف نے اسلامی ممالک اور وہاں کے ماحول کو سامنے رکھ کر یہ رائے دی ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملک کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں جو مسلم یا غیر مسلم خواتین سیاست میں عملاً شریک ہیں ان کو دیکھ کر یہاں کی صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اگر مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لئے خواتین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے اور خود ان کی عزت و آبرو داؤ پر لگ جائے تو مصالح کے مقابلے میں مفسدہ بڑھنے کی وجہ سے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

البتہ جن حلقوں میں خواتین کے لئے سیٹ ریزرو ہے، وہاں کی صورت حال کا جائزہ لے کر کسی غیر مسلم امیدوار سے یہ مفاہمت کی جائے کہ مسلمان اسے ووٹ دیں اور وہ ان کے مفادات کا خیال رکھے۔ ☆☆☆

## ایکشن سے متعلق شرعی مسائل

مفتی عبدالرشید کانپور

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہے اور اکثر علماء کی یہی رائے ہے، اس لئے اس بارے میں زیادہ کچھ عرض نہیں کرنا ہے، البتہ بطور تمہید اس موقع پر مقاصد شریعت سے متعلق مختصر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق مفتی شفیع صاحب نے جو اہل فقہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، ہم اس کا خلاصہ ان ہی کی زبان میں پیش کر رہے ہیں، فرماتے ہیں: ”خلاصہ یہ کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسرے سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح اور قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے ہیں۔ اسی طرح نااہل غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی۔ اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے“ (جواہر لفقہ ۲۹۰/۲-۲۹۵)۔

چونکہ ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے، اس لئے جب تک بندے کے بس میں ہو وہ ادائے شہادت سے جان نہ چرائے (ہاں اگر ادائے شہادت میں جانی یا مالی نقصان کا خطرہ ہو تو یہ شکل مستثنیٰ ہے، ایسے موقع میں ادائے شہادت سے بچا جاسکتا ہے)۔

اسی لئے فقہائے کرام نے ادائے شہادت کو واجب لکھا ہے، ادائے شہادت اختیاری مسئلہ نہیں ہے کہ دل چاہے تو شہادت دے دے، دل نہ چاہے تو نہ دے بلکہ یہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں:

”بلکہ یہ فریضہ شرعی ہے، قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب و لازم بھی فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط“ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ”کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ“ ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لیے ادائیگی شہادت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ تیسری جگہ سورہ طلاق میں ارشاد ہے: ”واقیموا الشہادۃ للہ“ یعنی اللہ کے لیے سچی شہادت قائم کرو۔ ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔ ارشاد ہے: ”ولاتکتبوا الشہادۃ و من یکتبھا فانہ اثمہ قلبہ“ یعنی شہادت نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے۔ ان تمام آیات نے مسلمانوں پر فریضہ عائد کیا ہے کہ سچی گواہی دیں، گواہی سے جان نہ چرائیں، ضرور ادا کریں (جواہر لفقہ ۲۹۳/۲)۔

مفتی تقی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ”شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ”ولاتکتبوا الشہادۃ و من یکتبھا فانہ اثمہ قلبہ“ (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے)۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”و من کتب شہادۃ اذا دعی الیہا کان کمن شہد بالزور“ (جس کسی کو شہادت کے لئے بلا یا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا)۔

بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا فریضہ ادا کرے، اور اس میں کسی کے دعوے یا ترغیب کا انتظار بھی نہ کرے۔ حضرت زید بن خالدؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الا أخبرکم بخیر الشہداء الذی یأتی بشہادۃ قبل ان یسألھا“ (کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ادا کر دے)۔

ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن و حدیث کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں۔ اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے (فقہی مقالات ص: ۲۸۷، ج: ۲)۔

مدیر جامع العلوم جامع مسجد، پکا پور، کانپور۔

معلوم ہوا کہ ووٹ دینا یہ بندے کے لئے اختیاری عمل نہیں بلکہ از روئے شرع اس پر لازم ہے کہ وہ اس حق کا صحیح استعمال کرے۔

ایکشن میں امیدوار ہونا:

ویسے تو امیدوار دو چیزوں کا مدعی ہوتا ہے: ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا امیدوار ہے، دوسرے یہ ہے کہ دیانت اور امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا۔ اب اگر امیدوار کے اندر اس کی اہلیت اور قابلیت ہے تو اس کے لیے اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن اگر اس کے اندر اس کی اہلیت و صلاحیت نہیں ہے تو پھر کسی ایسے کو کھڑا کر کے اس کا سپورٹ (support) کرے جو اس کا اہل ہو اور ایسے شخص کے نہ ملنے پر تقابل کیا جائے کہ اس نااہل کے کھڑے ہونے میں ملت کا نقصان ہوگا یا نہ کھڑے ہونے میں، کم نقصان والی شق اپنالی جائے۔ تاہم اتنا ضرور خیال رہے کہ گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جن گناہوں کے نتائج پوری قوم کو بھگتنے پڑیں، ان کا معاملہ پرائیویٹ گناہوں کے مقابلہ میں بہت سخت ہے، لہذا امیدوار کو روزنا چاہیے کہ اس کے کسی عمل سے ملت کا نقصان نہ ہونے پائے، نیز امیدوار ہونا شرفاء پر ہی موقوف نہ رکھا جائے کیوں کہ جوں جوں زمانہ دور نبوت سے دور ہوتا جا رہا ہے اور قیامت قریب آتی جا رہی ہے، عملی انحطاط اور اخلاقی زوال بڑھتا جا رہا ہے۔

دوسری طرف گندی سیاست نے ایکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ شرعاً اور تقوے والے سیاست میں آنے سے گھبراتے ہیں، اگر ان اہلوں کو بھی روک دیا جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ملت کو خسارے کا سامنا کرنا پڑے، اس لیے ”امون الکلیتین“ کے اعتبار سے جوشق ”امون“ ہوا سے اختیار کر لیا جائے۔ سوال کے اجزاء کا مشترکہ اجمالی جواب: ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی ہوگی۔ ۲۔ ووٹ دینا موقع و محل کے اعتبار سے واجب اور ضروری ہوگا۔ ۳۔ ایکشن میں امیدوار ہونا درست ہے۔

۴۔ ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں کوشش یہ ہو رہی ہے کہ مسلمان از خود تنگ آ کر یا چڑھ کر امیدوار ہونا یا ووٹ دینا بند کر دیں اور اس طرح ان کے اس حق کو سلب کر دیا جائے تاکہ پھر من مانے قانون بنائے جائیں۔

بلاشبہ مسلمانوں کی سر بلندی کے لئے سیاسی استحکام بھی ناگزیر ہے تاکہ مسلمان کافروں کے دست نگر نہ رہیں۔ ایسی صورت حال میں اگر امیدوار کو پارٹی کی پالیسیوں کے مطابق شریعت کے خلاف یا اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ دینا پڑے تو اس کی گنجائش ہونی چاہیے۔

۵۔ اسی طرح اگر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑے تو مصالح عامہ کے پیش نظر اس کی بھی گنجائش ہوگی، اگرچہ بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفاد کے مغایر ہوں، عموماً ہوتا یہ ہے کہ کوئی بھی پارٹی جب کوئی وہمپ جاری کرتی ہے یا دستور بناتی ہے تو مجموعی اعتبار سے اسلام کے مخالف نہیں ہوتا، کیوں کہ انہیں دنیا کو یہ دکھانا بھی ہوتا ہے کہ ہم اسلام مخالف نہیں ہیں۔ گویا پارٹی کے وہمپ، دستوری پالیسیاں جزوی اعتبار سے مخالف اسلام ہوتی ہیں۔ اب اگر مسلمان بالکل بھی حصہ نہ لیں تو پھر یہ پارٹیاں مزید آزاد ہو جائیں گی، کھل کر مخالفت کریں گی اور ایسی پالیسیاں بنائیں گی جو عمومی اعتبار سے مذہب اسلام کے مخالف ہوں گی، اس لئے معاملہ کل اور جزیء کا سا ہو گیا۔ یعنی پارٹی میں رہ کر بعض اعتبار سے شریعت کی مخالفت ہوگی اور نہ رہنے کی صورت میں خدا جانے کیسے کیسے قانون بنائے جائیں کہ اصل دین ہی پر عمل مشکل ہو جائے۔

۶۔ اسی پر ”بائل پر حلف لینے کو“ قیاس کیا جاسکتا ہے۔ (اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے اس بحث سے صرف نظر کرتے ہیں کہ غیر اللہ پر حلف لینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے۔ قطع نظر کرتے ہوئے وہ قرآن ہے یا بائبل) بائبل پر حلف لینا یا کسی دوسرے مذہب کی کتاب پر حلف لینے کا ہرگز منشاء یہ نہیں ہوتا کہ حلف لینے والا اس کتاب پر ایمان لے آیا یا اس کتاب پر اس کا اعتقاد ہے۔ (مراد موجودہ محرف تورات ہے ورنہ اصلاً تو مسلمان تورات (بائبل) پر ایمان و اعتقاد رکھتا ہی ہے) بلکہ منشاء صرف مخاطب کو دکھانا ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب پر حلف لے رہا ہے۔ احترام ملحوظ نہیں ہوتا۔ ابن نجیم مصری ”الاشباہ والنظائر“ میں اس کی صراحت فرماتے ہیں کہ حلف لینے میں مظلوم اور مکرہ کی نیت کا اعتبار ہوگا نہ کہ ظالم اور مکرہ کی نیت کا۔

”وكذا اختلفوا هل الاعتبار لنية الحالف، أو لنية المستحلف والفتوى على اعتبار نية الحالف ان كان مظلوماً، لا ان كان ظالماً“ (الاشباہ والنظائر، ص: ۱۰۶)۔

مسلمان جہاں کہیں بھی اقلیت میں ہیں اور انہیں ایسے امور درپیش ہیں بلاشبہ مظلومین کی فہرست میں آتے ہیں۔ اگر مظلوم یا مکرہ کا سا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کیوں یہ سب کچھ برداشت کرتے، لہذا بائبل وغیرہ پر حلف لیتے وقت اگر ان کا عقیدہ ان کتابوں پر نہیں ہوتا اور بلاشبہ نہیں ہوتا (وہ تو فقط حاضرین کو دکھانے کے

لئے یہ عمل بادل ناخواستہ کر لیتے ہیں) تو ایسی صورت میں مظلوم اور مکرمہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

۷۔ کبھی بعض مصلحتوں کے پیش نظر ایسے امور کرنے پڑ جاتے ہیں جو بظاہر خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں۔ صلح حدیبیہ میں قریش کے سفیر نے معاہدے کی دستاویز سے لفظ ”رسول اللہ“ مٹانے کی ضد کی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو اس وقت معاہدہ لکھ رہے تھے فرمایا کہ اس کے کہنے کے مطابق ”رسول اللہ“ مٹادو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے تو نہ ہوگا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود لفظ ”رسول اللہ“ اپنے دست مبارک سے مٹا دیا اور اس کی جگہ پر ”محمد ابن عبد اللہ“ لکھوایا جیسا کہ قریش کے سفیر نے کہا تھا۔ معلوم ہوا کہ ملی و ملی مصلحتوں کے پیش نظر اس طرح کی چیزوں کو گوارا کر لیا جاتا ہے، ورنہ جھگڑا تو لفظ ”رسول اللہ“ ہی کا تھا۔ اس کے مٹانے کو گوارا نہ کیا جاتا۔

اس لئے وہ سیکور پارٹیاں جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے خلاف ہوں، ان کی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونے کی گنجائش ہونی چاہیے۔

۸۔ البتہ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، ایسی سیاسی پارٹیوں میں شریک ہونا جائز نہ ہوگا، رہی یہ نیت کہ وہ پارٹی میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو یہ صرف ایک وہم ہے جس کا خارج میں وجود مشکل ہے، کیوں کہ چند مسلمانوں کا پارٹی میں شامل ہو کر ایجنڈے کو تبدیل کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا خصوصاً جبکہ پارٹی کے منشور میں مسلم دشمنی شامل ہے۔ ملک کی فرقہ پرست پارٹیوں میں جن میں بعض مسلمان شامل ہیں یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے۔

۹۔ رہا مسئلہ مسلمانوں کی الگ پارٹی بنانے کا تو یہ ایک نازک مسئلہ ہے، ہر جگہ کے احوال و کوائف کے اعتبار سے ہی اس کا حکم لگے گا، ہمارے سامنے ایک مثال آسام کی ہے۔ مولانا بدرالدین اجمل صاحب نے آسام میں بہت دنوں تک وہاں کی پارٹیوں میں رہ کر مسلمانوں کے حقوق کی وہائی دیتے رہے اور ان آسامیوں کے لئے لڑتے رہے جن پر بنگلہ دیشی ہونے کا غلط الزام ہے، لیکن مایوسی کے بعد الگ پارٹی بنائی اور اچھے نتائج برآمد ہوئے، جبکہ ایک مثال اعظم گڑھ کی علماء کونسل کی ہے کہ ایکشن میں خود کوئی سیٹ کیا نکالتے خود اس گڑھ میں جہاں سے پارٹی وجود میں آئی فرقہ پرست پارٹی کے ممبر جیت گئے، اس لئے الگ پارٹی بنانے کا مسئلہ علاقوں کی نوعیت کے اعتبار سے ملت کے اصلی درد مند ارباب حل و عقد کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہئے۔

۱۰۔ عورتوں کا ایکشن میں امیدوار ہونے کا مسئلہ الگ سیاسی پارٹی بنانے سے زیادہ نازک ہے، کیوں کہ الگ سیاسی پارٹی بنانے میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہے اور یہاں نقصان ہی نقصان ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں:

سوال:- موجودہ دورفتن میں مسلم عورتوں کا کونسل و میونسپلٹی میں بطور امیدوار کھڑا ہونا از روئے شرع کیا ہے؟

جواب:- بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لئے مستحسن نہیں، کیوں کہ اس میں ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لئے معتذر ہے (کفایت المفتی ۳۰۸/۹)۔

اگر یہ شبہ ہو کہ پھر تو مسلمانوں کا سیاسی خسارہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں ملی نقصان ہوگا تو یہاں ایک مشورہ ہے جس کو ہم بھٹکل کے حوالہ سے ذکر کر رہے ہیں، بھٹکل صوبہ کرناٹک کا ایک مشہور علاقہ ہے، کچھ اسلامی تاریخ بھی اس جگہ سے وابستہ ہے۔ مسلمانوں کی اچھی پوزیشن ہے، دینی بھی، دنیوی بھی اور تمدنی بھی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہاں کوئی مسلمان ایکشن میں کھڑا نہیں ہوتا، اس کے باوجود ان کی سیاسی پکڑ کافی مضبوط ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سارے مسلمان ملکر کسی سیاسی پارٹی کو سپورٹ (Support) اس شرط پر کرتے ہیں کہ ان کے مطالبات تسلیم کئے جائیں، جو پارٹی اور جو امیدوار ان کے مطالبات اور شرائط کو پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اس کو سارے مسلمان مل کر سپورٹ (Support) کرتے ہیں۔ نتیجتاً وہ جیت جاتا ہے اور اس طرح مسلم ووٹ تقسیم نہ ہو کر اپنی قوت منالیتا ہے۔ یہاں بھی اگر ایسا ہی کر لیا جائے کہ وہ سٹیٹس جو خواتین کے لئے ریزرو ہیں ان میں مسلم خواتین امیدوار نہ ہو کر غیر مسلم خواتین کا سپورٹ (Support) اپنی شرائط و مطالبات پر کیا جائے تو وہ بہتر نتائج جو مسلم خواتین کو امیدوار بنا کر حاصل نہیں کئے جاسکتے وہ حاصل ہو جائیں گے۔ "ذک ما کنا نبغی"۔

☆☆☆

## ایکشن سے متعلق شرعی مسائل

مولانا کلیم اللہ عمری

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

قال اللہ تعالیٰ: ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فإنه آثم قلبه (البقرہ ۲۸۲) (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ، جو کوئی گواہی کو چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہوگا)۔

غیر اسلامی حکومتوں میں ہونے والے انتخابات میں مسلمانوں کی شرکت۔ شہادت و امانت، سفارش اور وکالت کے درجہ میں ہے، نیز جھوٹی گواہی اور غلط وکالت، رشوت لے کر ووٹ دینا، جعلی ووٹ ڈالنا گناہ کبیرہ کے درجہ میں ہے۔ مسلم قوم حق کی شہادت دینے کے لیے برپا کی گئی ہے اور مسلم قوم اس ملک کے کل پرزے ہیں جن کو پورے حقوق حاصل ہیں، وہ ووٹ کی قوت سے اپنی ناپسندیدہ اور نااہل شخصیات کو ہٹا کر پسندیدہ حکومتوں کو لا سکتے ہیں، بلکہ صالح اور اہل شخص کو ووٹ دینا ایک فریضہ اور باعث اجر و ثواب ہے، قابل لوگوں کو برسر اقتدار لانے کی ہر سعی مستحسن ہے اور نااہل لوگوں کو ووٹ دینا اور برسر اقتدار لانا بھی باعث گناہ ہے اور عند اللہ اس کا جواب دینا ہوگا۔

۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

قال اللہ تعالیٰ: إن اللہ یأمرکم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها (سورۃ النساء) (امانتیں اہل حق تک پہنچا دیا کرو)، وقال النبی: إذا وسد الأمر إلى غیر أهله فانتظر الساعة (جب نااہل کو کوئی ذمہ داری سونپی جائے گی تو قیامت کا انتظار کرو)۔

مذکورہ نصوص کی روشنی میں ووٹ ایک رائے اور شہادت و امانت ہے، جس کا شریعت کے پابند شخص کے حق میں استعمال کرنا جو نفاذ شریعت کے لیے کام کر رہا ہو اور امانت دار اور دیانت دار ہونا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے، البتہ مستحکم جمہوریت جہاں ملک کے لیے سلامتی کی ضامن ہے، وہیں مذہبی، لسانی اور تہذیبی اقلیتوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہے، اس نظام کا تحفظ ضروری ہے، جمہوری ملک کا ہر فرد ایک ووٹ کا مالک ہے، اسے اس ووٹ کا صحیح استعمال کرنا واجب ہے، اگر ووٹ کا استعمال صحیح نہ ہو تو نااہل لوگ حکومت و اقتدار پر قابض ہوں گے جو جائز نہیں ہے، لہذا مستحکم جمہوری نظام قائم کرنے والے صالح امانت دار و دیانت دار افراد کی موجودگی میں ہمارا ووٹ دینا جواز و استحباب کے درجہ میں ہوگا، البتہ نااہل اور نالائق افراد کے حکومت پر قابض ہونے کا اندیشہ ہو تو صالح افراد کو برسر اقتدار لانا یعنی ووٹ دینا شرعاً واجب ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ اقتدار کو صالح افراد کے حوالے کریں، اس لیے کہ اقتدار بھی ایک امانت ہے جسے اس کے حقداروں تک پہنچانا دینی فریضہ ہے، قابل لوگوں کو حکومت پر لانا اور ان کے لیے سفارش کرنا بھی ایک دینی فریضہ ہے، اور نااہل کو ووٹ دینا گویا جھوٹی گواہی دینا ہے جو کہ ایک کبیرہ گناہ ہے۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

صورت مسئلہ میں از روئے شریعت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اقتدار کا حریص یا طالب ریاست ہو، اسلامی نقطہ نظر سے جو شخص حکومت و ریاست یا کسی عہدہ کا طالب و متمنی ہو اسے ووٹ دینا جائز نہیں ہے، البتہ حکومت کے اعلان کی صورت میں نیک نیتی کے ساتھ قوم و ملت کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک قابل و لائق شخص کا (جو صالح، صالحیت اور صلاحیت سے متصف ہو) اپنا نام پیش کرنے میں یا جماعت کی طرف سے منتخب شخص کی نمائندگی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں ایکشن میں امیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنے سے قبل درج ذیل صفات سے متصف ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۔ عاقل و بالغ اور سلیم الخواس ہونا۔

۲۔ سربراہی کے لیے مرد ہونا۔

۳۔ حکمرانی کا صحیح علم، صلاحیت اور صلاحیت کا جمع ہونا۔

۴۔ صفت عدالت سے متصف ہونا۔

۵۔ مذکورہ صفات کے حامل شخص کا تقرر بطریق شوریٰ ہوتا کہ جمہور کی تائید اور موافقت تامہ ہو، نیز ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا مسئلہ مصالحت مرسلہ میں سے ہے یعنی جو مسلمان اپنے آپ کو اس لائق سمجھے کہ میں حکومت میں اپنی صلاحیت اور صلاحیت کی بنیاد پر قوم و ملک و ملت کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وزارت خوراک و زراعت کے لیے اپنی ذات کو پیش کیا اور عملاً قوم و ملک کو فائدہ پہنچایا یا عوام الناس کی کثرت رائے کسی کے ساتھ ہوتا ایسے افراد کا بحیثیت امیدوار پیش کرنا حالات اور مصالحت کی بنیاد پر کبھی واجب تو کبھی مستحب کے درجہ میں ہوگا۔

۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟

غیر مسلم ملکوں میں یا مسلم ملکوں میں قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، اس کا منشور یا دستور جو بنتا ہے اکثریت کے فیصلے کے مطابق ہی بنتا ہے تو ایسی صورت میں مسلمانوں کا الگ رہنا مزید من مانی کا باعث ہوگا، لہذا مسلمانوں کا ان اداروں میں ممبر بننا اور خلاف شریعت قانون کے سلسلہ میں آواز اٹھانے کی نیت سے اور صحیح رائے اور صحیح فکر پیش کرنے کی غرض سے اس ادارہ کا ممبر بننا باعث خیر ہوگا ان شاء اللہ (انما الأعمال بالنیات و انما لكل امرئ منہنوی (بخاری) یعنی اعمال کی قبولیت کا دار و مدار نیتوں پر موقوف ہے اور ہر آدمی کو وہی ملے گا، جو اس کی نیت ہے، نیز اخف الضررین کے اصول کے تحت جائز ہوگا، بصورت دیگر ایسے اداروں سے مسلمانوں کی دوری سے مزید من مانی ہی ہوگی اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہوگا۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

قانون ساز اداروں کے رکن کی حیثیت سے مسلمان کا بالجملة وفاداری کا حلف لینا جائز ہوگا اور دستور کی ہر دفعہ سے اتفاق و موافقت کوئی ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ جمہوری نظام میں ہر قانون کا اسلام کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ منکرات کے ازالہ کے لیے اس ادارہ میں رہ کر کوشش کرنا آسان ہوگا، لہذا ایسے رکن پر قانون ساز اداروں میں رہ کر اصلاح کی ہر ممکن کوشش کرنا واجب ہوگا، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فمن لم يسطع فليسانه ومن لم يسطع فليقلبه وذلك أضعف الإيمان (مسلم ۸۷)۔

البتہ بعض اہل علم کی رائے یہ بھی ہے کہ ایسے اداروں کی رکنیت صحیح نہیں ہے، بنی امیہ کے دور میں اکابر علماء حکومت کے ماتحت کام کرتے تھے، رکنیت قبول کرنے کی کوئی دلیل سلف صالحین سے منقول نہیں ہے۔

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

مسلم قوم کی فلاح و بہبود کی غرض سے کسی مجبور مسلمان کا بائبل پر حلف لینا (کہ میں اس انجیل کی قسم کھاتا ہوں، جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ ہے) (توریت) جائز ہوگا گویا کہ غیر محرف انجیل کی قسم مقصود و مطلوب ہے۔

بعض اہل علم نے شدت کے ساتھ منع کیا کہ ایسے ملکوں میں رکنیت قبول نہ کرنا اولیٰ ہے، اس لیے کہ مسلمان کا کسی منسوخ کتاب پر حلف لینا صحیح نہیں ہے۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

مذکورہ بالا پارٹی میں شرکت بھی تو ریتہ جائز ہے تاکہ مسلمان ان پارٹیوں میں شرکت کر کے اسلام اور اہل اسلام کے حق میں بھلائی کی راہیں تلاش کریں، اسلام اور اہل اسلام کے حق میں دفاع کرتے رہیں، اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں اور غیر اسلامی قوانین کی مخالفت حتی المقدور کرتے رہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کے رہنے سے مسلم دشمن قوم یا پارٹی کے لیے ضرر رسانی کی خاطر راہیں ہموار ہو جائیں گی، گویا کہ مسلمانوں کی ایسی پارٹی میں شرکت انہوں نے اہل بیتین کو اختیار

کرنے کے مترادف ہے اور یہ مصالحہ مرحلہ کی قبیل سے ہے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

قال اللہ تعالیٰ: یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء۔

مذکورہ آیت کی روشنی میں کھلم کھلا اسلام مخالف پارٹیوں میں شرکت یا ممبر بننا، کارکن بننا، شرعاً جائز نہیں ہے۔ البتہ باہر سے صحیح رائے دینا یا اس پارٹی کی مخالفت کرنا، یا حق کی خاطر آواز اٹھانا درست ہوگا۔

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے سیاسی پارٹی کے قیام کا عمل حق بہ جانب ہے، اس پر اجر و ثواب کی امید بھی کی جاسکتی ہے بشرطیکہ مقصود واضح ہو، یعنی خدمت خلق، انصاف کو عام کرنا، کرپشن ختم کرنا، مظلوموں کی حمایت کرنا، قوم و ملت کی صحیح رہنمائی کرنا، اسلامی نظام کو لاگو کرنا، اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا، موجودہ ماحول اسلامی بنا کر ہر شہری کو اس کا حق دلانا، کتاب و سنت کی بالادستی کو قائم کرنے کی پوری کوشش کرنا، اس طرح کے نیک جذبات کے ساتھ سیاسی جماعت کا قیام دین و دنیا کے لیے مفید ثابت ہوگا، نیز یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں علیحدہ سیاسی پارٹی بنانے میں قانوناً کوئی رکاوٹ نہ ہو تو مسلم قوم کی بھلائی کی خاطر ایک متحدہ تنظیم قائم کرنا جائز ہوگا اور اس میں مسلمانوں کی شرکت، تعاون اور یکجہتی کا مظاہرہ اپنی دینی حیثیت کا اظہار شمار ہوگا۔ باذن اللہ تعالیٰ۔

۱۰۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، کیا انھیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لیے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟

شرعاً عورت خانگی نظام کے لیے مخصوص ہے، البتہ جمہوری ممالک میں مسلم خواتین کا ووٹنگ میں شرکت چند حدود و قیود کے ساتھ اضطراری حالت میں جائز ہے، یعنی ۱۔ محرم کے ساتھ سفر کرنا، ۲۔ اختلاط سے پوری طرح بچنا، بلا ضرورت مردوں سے بات چیت سے دور رہنا۔ ۳۔ شرکیہ کاموں یا مخللوں یا بے حیائی کے کاموں میں اپنے مذہب کے قانون کے مطابق دور رہنا۔ ۴۔ پردہ کا مکمل پاس دلچاظ رکھنا، زیب و زینت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا۔ ۵۔ صفت عدالت سے متصف ہونا، ۶۔ مذکورہ منصب کی اہلیت و قابلیت کا ہونا۔ ۷۔ ولی کی اجازت، بھی ضروری ہے۔

جمہوری ملک میں سارے مسلمان اس حکومت کے کل پرزے ہیں، نیز اس ملک کی آزادی میں مسلمانوں کا بھی ایک بڑا اہم رول رہا ہے، اس ملک کی آزادی میں ہم نے اپنے خون پسینے کو بہایا ہے اور عزیزوں کی جان کے نذرانے پیش کیے ہیں، یہ ملک ہمارا بھی ہے، اس کی ترقی ہمارے لیے باعث فخر ہے، لہذا مسلم عورت کا ووٹنگ میں حصہ لینا جائز و درست ہوگا، نیز ان کا ایکشن میں امیدوار بننا بھی جائز ہوگا، مثال کے طور پر وزارت کے کسی ذیلی عہدہ، منصب پر فائز ہونے کے لیے، ایم ایل اے، ایم پی، یا مشیر خاص یا آفس سیکریٹری وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہونے کے لیے، البتہ سربراہ حکومت کا مرد ہونا، حکومت سازی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، لہذا عورت کا وزارت عظمیٰ، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، صدر ہند وغیرہ کے اعلیٰ مناصب پر بطور حاکم مقرر ہونا شرعاً صحیح نہیں معلوم ہوتا، جہاں سے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد قانون سازی یا حاکمیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے، شریعت مطہرہ نے ایسے ہی امور سے منع فرمایا ہے: ”لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأۃ“ (صحیح بخاری، باب کتاب النبی الی کسری و قیصر، حدیث: ۵۲۴۴)۔

مذکورہ حدیث آپ ﷺ نے یہ بات اس وقت بتائی تھی جب ایرانیوں نے ایک عورت کو بادشاہ بنا لیا تھا، اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے: ”إذا كانت أمراؤکم شرارکم وأغنیائوکم بخلانکم، وأمورکم الی نساءکم فبطن الأرض خیر لکم من ظہرها“ (جامع الترمذی، باب ۸۷، حدیث ۶۲۲)۔ ☆☆☆☆

## جمہوری ممالک میں الیکشن سے متعلق شرعی مسائل

مفتی سہیل اختر قاسمی

ووٹ کی شرعی حیثیت:

عصر حاضر میں ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں:

۱۔ شہادت: اس کی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے، ووٹر جس ممبر کو ووٹ دیتا ہے وہ اس بات کی گواہی بھی دیتا ہے کہ میں اس کو ملک و قوم کے لیے مفید اور خیر خواہ سمجھتا ہوں، اس کے اندر قابلیت و اہلیت اور دیانت و امانت جیسی صفات موجود ہیں، اور یہ شخص ملک و ملت کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔

۲۔ مشورہ: اس کی حیثیت مشورہ کی ہے، ووٹر حکومت اور نظم و نسق کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کون امیدوار زیادہ بہتر، ایماندار اور دیانت دار ہے، اور ملک و ملت کی خدمت بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔

۳۔ سفارت: اس کی حیثیت سفارش کی ہے کہ ووٹر اس امیدوار کے لیے ملکی نظم و نسق بہتر طور پر چلانے کی قدرت رکھنے کی سفارش کرتا ہے۔

۴۔ وکالت: ووٹ کی ایک حیثیت وکالت کی بھی ہے، گویا ووٹ دینے والا حق رائے دہی کا استعمال کر کے درحقیقت کسی امیدوار کو سیاسی امور اور کار حکومت کی انجام دہی کے لیے اپنا وکیل اور نائب منتخب کرتا ہے۔

۵۔ بیعت: اگر مسلم مملکت ہو تو ووٹ کی حیثیت سیاسی بیعت کی بھی ہے، گویا ووٹر اپنے ووٹ کے ذریعہ مقامی امیدوار کے واسطے سے سربراہ مملکت کی بیعت کرتا ہے۔

ووٹ کی مذکورہ پانچوں حیثیتوں کے پیش نظر اس کا استعمال بڑا نازک اور اہم ہے، لہذا رائے دہندگان اپنی پوری بصیرت کے ساتھ اس کا استعمال کریں، اگر کسی نے نااہل شخص کو ووٹ دے کر امیدوار بنا دیا اور جیتنے کے بعد اس شخص نے قوم و ملت کے حقوق کو پامال کیا اور ظلم و زیادتی کو راہ دی تو نااہل شخص کو ووٹ دینے کی وجہ سے وہ جھوٹی گواہی، غلط مشورہ، بری سفارش اور نااہل شخص کو وکیل اور نائب بنانے کے زمرہ میں داخل ہوگا، جس کا گناہ حق رائے دہی کے استعمال کرنے والے یعنی ووٹر کو ہوگا اور اگر اچھے، لائق امیدوار اور ملک و ملت سے ہمدردی رکھنے والے امیدوار کو ووٹ دیا اور پوری چھان بین کرنے کے بعد انہوں نے اپنے حق رائے دہندگی کو استعمال کیا تو اس کی نیکی اور ثواب کا بھی حقدار ہوگا۔ ان حیثیتوں کے لیے مندرجہ ذیل آیات اور احادیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے:

۱۔ فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور (الحج: ۳۰، ۳۱)۔

۲۔ ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فإنه آثم قلبه (البقرة: ۲۸۲)۔

۳۔ ومن یشفع شفاعۃ حسنة یکن له نصیب منها ومن یشفع شفاعۃ سیئة یکن له کفل منها وكان اللہ علی کل شیئ مقیتا (النساء: ۸۵)۔

۴۔ قال النبی ﷺ: المستشار مؤتمن (سنن الترمذی ۲، ۱۰۵)۔

ووٹ دینے کا شرعی حکم:

معاون قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔



ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی ہے اور شہادت میں یہ تفصیل ہے کہ شہادت کبھی واجب اور کبھی فرض کی حد تک پہنچتی ہے اور کبھی استحباب و اباحت کے درجہ میں ہوتی ہے، جہاں کہیں ترک شہادت سے مدعی کا حق سلب ہوتا ہو، وہاں شہادت دینا واجب ہوتا ہے اور جہاں گواہوں کی تعداد زیادہ ہو وہاں شہادت دینا مستحب اور مباح ہے۔

لما قال الامام القرطبي في تفسير هذه الآية: "ولا ياب الشهداء إذا ما دعوا" فإذا كانت الفسحة لكثرة الشهود والأمن من تعطل الحق فالمدعو مندوب، وله أن يتخلف لأدنى عذر وإن تخلف لغير عذر فلا إثم عليه ولا ثواب له. وإذا كانت الضرورة وخيف تعطل الحق أدنى خوف قوي الندب وقرب من الوجوب وإذا علم أن الحق يذهب ويتلف بتأخر الشاهد عن الشهادة فواجب عليه القيام بها لاسيما إن كانت محصلة وكان الدعاء إلى أدائها (الجامع لاحكام القرآن) (۳۰۳۹۸)۔

اسی طرح ووٹنگ کا عمل بھی بعض حالات میں واجب، بعض میں جائز اور بعض میں مباح ہے، ایکشن میں ووٹ کے دوران ہر شخص کو یہ اندازہ لگانا چاہئے کہ اگر میں نے حق دار امیدوار کو ووٹ نہیں دیا تو اس کے مقابلہ میں فرقہ پرست، فاسق و فاجر امیدوار کا میاب ہو جائے گا اور ملک و ملت کا بہت نقصان ہوگا، تو ایسی صورت میں اس کے لیے ووٹ کا استعمال کرنا ضروری و واجب ہے اور اگر یہ خطرہ نہ ہو تو ووٹ دینا جائز و مستحب ہے۔

ایکشن میں امیدوار بننے کا شرعی حکم:

اسلامی تشخص کی حفاظت، منکرات کا سدباب اور برسر اقتدار طبقہ کو خلاف شرع امور پر متنبہ کرنے کو حدیث میں افضل جہاد کہا گیا ہے، اس قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انتخابات میں شرکت کے بغیر صحیح طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے، اس لیے ضرورت کے تحت مرد و عورت کے ذریعہ ایوان حکومت تک پہنچ کر حق کی آواز بلند کرنا اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے حتی الوسع کوشش کرنا، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس لیے اگر کوئی بے دینی نظام کی ترویج و اشاعت کے مقابلہ میں اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے اپنے آپ کو ایکشن میں بہ حیثیت امیدوار پیش کرتا ہے تو یہ نہ صرف جائز اور مباح ہوگا بلکہ مستحسن قدم ہوگا، سیاست ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ انسان منصب خلافت پر فائز ہوتا ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں سیاست مستقل ایک شعبہ رہا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: "واجعل لی من لدنک سلطاناً نصیراً" (الاسرار: ۸۰) کی تفسیر میں مفسرین فرماتے ہیں:

قال الإمام الطبري: واجعل لي ملكاً ناصرًا ينصرني على من ناواني وعزاً أقيم به دينك وأدفع به عنه من أراد بسوء (جامع القرآن ۹۰۱۵۰)۔

ایکشن میں امیدوار پوری قوم کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہوتا ہے: ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت و اہلیت رکھتا ہے، جس کا وہ امیدوار ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ دیانت و امانت داری کے ساتھ اس کام کو انجام بھی دے گا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا: "اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم" (یوسف: ۵۵)۔

(مجھے سلطنت مصر کا والی و نگراں مقرر کر دیجئے، میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا ہوں)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خاص حالات میں عہدہ طلب کرنا اور اپنے آپ کو اس کا امیدوار بنا کر پیش کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس سے بہتر کوئی دوسرا متبادل انتظام کار نہ ہو۔ طلب عہدہ میں جب جاہ و منصب، مال و منال نہ ہو بلکہ قوم و ملت کی صحیح خدمت اور ان کے حقوق کی حفاظت مد نظر ہو، نیز وہ اس عہدے کے ساتھ انصاف بھی کر سکے، اور ان امور کو انجام دیتے وقت اسے اپنے ایمان اور عقیدہ کی حفاظت کا یقین بھی ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنے آپ کو ایکشن میں بطور امیدوار پیش کر سکتا ہے، یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر کوئی شخص اہلیت قضاء میں تنہا ہو تو اس اہل شخص کے لیے عہدہ قضاء طلب کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے تاکہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے، علامہ ابن عابدین شامی رقم طراز ہیں:

"أما إذا تعين بأن لم يكن أحد غيره يصلح للقضاء وجب عليه الطلب صيانةً لحقوق المسلمين" (رد المحتار ۸۰۴۰)۔

## پارٹی کی طرف سے وہیپ جاری ہونے کی صورت میں شرعی حکم:

اگر قانون ساز ادارے یا پارلیمنٹ مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں تو ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہے، کیونکہ ممبر بننے کے بعد ہی وہ اس طرح کے غیر شرعی قانون کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت کر سکتا ہے اور اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے اور شریعت کی حفاظت کے ساتھ وطن کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اس کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوت مدافعت پیدا کرنے کے لیے ایکشن میں شرکت ضروری ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

”من رأى منكراً فليغيره بيده وإن لم يستطع فبلسانه وإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيماء (ابوداؤد ۱۰۲۲۲)۔“

خاص طور پر ہندوستانی قانون کے مطابق ووٹ دینا اور ایکشن لڑنا اور انتخابات میں شرکت کرنا ہندوستانی کا حق ہے، اس حق کو استعمال کرنے سے ہی مفادات کا تحفظ ہوگا یا کم از کم وہ نقصانات کو کم کر سکیں گے، جس معاشرہ میں وہ زندگی گزار رہا ہے اس کی سماجی سرگرمیوں میں اس کی شرکت ہوگی اور جو قوانین اور نظام بنائے جائیں گے ان پر مباحثہ میں بھی کسی درجہ شرکت ہو سکے گی اور بسا اوقات وہ ان میں تبدیلی یا ان کے ضرر کو کم کر سکیں گے، یا ایسے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہو سکے گا جن کے ذمہ یہ ہو کہ وہ خلاف شرع قوانین کو پاس کرانے میں اس کی مخالفت کر سکیں اور جب مسلم ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوگا تو وہ ملک میں داخلی و خارجی پالیسی بنانے میں بھی شریک ہوں گے، پارٹی کی طرف سے وہیپ جاری ہونے کی صورت میں بھی کم سے کم وہ پارٹی کے اندر رہ کر مثبت انداز میں مخالفت کر سکتا ہے اور آج نہیں تو کل اس کی بات پارٹی کے لوگ قبول بھی کر سکتے ہیں اور اس طرح اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ممبر بننے میں کم سے کم مسلم مفادات کی حفاظت، تقلیل شر و ظلم کا کام وہ انجام دے سکتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے نجاست کے بالکلیہ ازالہ پر قادر نہ ہونے کی صورت میں نجاست کی تقلیل کا حکم دیا ہے اور ظلم کو دفع کرنے کا اختیار مکمل طور پر نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم تجویز کیا ہے۔ زبان و عمل سے غیر شرعی قوانین و امور کو روکنے کی صلاحیت نہ ہونے کی صورت میں دل سے اس کو برا سمجھنا بھی مستحسن ہے۔

## دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا:

شرعاً حلف ایسے معاملہ کو کہتے ہیں جس سے کام کرنے یا نہ کرنے سے متعلق حلف اٹھانے والے کے عزم و ارادہ کا پتہ چلتا ہے اور اسے پختہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ذاتی یا صفاتی نام میں سے کسی کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے، حدیث پاک میں بھی اس کی ہدایت دی گئی ہے کہ جسے قسم کھانی ہو یا حلف لیا ہو وہ اللہ کی قسم کھائے: لا تحلفوا بآبائکم ولا بالطواغیت فمن کان منکم حالفاً فليحلف بالله أولیدع (مصنف عبدالرزاق رقم: ۱۵۲۵) لہذا اللہ کے سوا کسی اور چیز کی قسم کھانی جائز نہیں ہے، ہندوستان یا اس جیسے دیگر ممالک میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ آزمانشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، وہاں ممبران پارلیمنٹ جو دستور سے وفاداری کا حلف اٹھا لیتے ہیں اسے حلف یا قسم نہ قرار دیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ ان کی طرف سے ملکی قوانین کی پاسداری کا وعدہ ہے اور شریعت میں اگرچہ وعدے کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مگر ناجائز امور کے وعدے کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہذا دستور میں جو غیر اسلامی امور ہیں ان کے تعلق سے کیا گیا وعدہ واجب الوفاء نہ ہوگا، کیونکہ شریعت سے متصادم امور کی انجام دہی کا وعدہ یا قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہوگا۔ حدیث میں ہے:

إذا كلفتم على يمين غيرها خيراً منها فكفر عن يمينك وأت بالذی هو خیر (متفق علیہ) اور اگر اس کے خلاف کرنا مصلحت عامہ کے خلاف ہو اور اس میں ضرر لاحق ہونے کا خطرہ تو اس طرح کی صورت حال میں ممبران کے لیے حلف لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ حدیث میں ہے:

لا ضرر ولا ضرار (ابن ماجہ رقم: ۲۲۲۰) اور إذا ابتلی ببلیتین... یختار أھوھما، الضرر الخاص یتحمل للضرر العام (الاشیاء والنظائر، ۸۹)۔

اس لیے ممبران کو نسل یا قانون ساز کو اس طرح حلف اٹھانے کی گنجائش دینی چاہئے، کیونکہ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور قاعدہ ہے: الضرورات تبیح المحظورات۔

## بائبل پر حلف لینے کا حکم:

قرآن مجید کے علاوہ دیگر آسمانی کتابیں اپنی اصلی حالت پر موجود نہیں ہیں، ان کتابوں میں بے پناہ تحریفات ہو گئی ہیں اور ان میں اکثر احکام بھی نزول قرآن کے بعد منسوخ ہو گئے، بائبل کے جو نسخے راج ہیں وہ محرف ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے اصل نسخے نہیں ہیں، اس لئے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے۔

البتہ اگر غیر اسلامی ممالک میں ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو ان ممالک میں مسلم ارکان قرآن پر حلف برداری کا مطالبہ کریں، اگر ان کے مطالبہ کو نہ مانا جائے تو تعظیم کی نیت کے بغیر بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ مجبوری کی حالت میں کلمہ کفر زبان سے نکلنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو تو ان ممالک میں بھی مسلم ممبران بھی اس طرح کی حلف برداری پر مجبور ہیں۔ (اس سلسلہ میں فقہ اکیڈمی مکتہ المکرمہ کے فیصلہ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے)۔

سیکولر پارٹی کے بعض دفعات اگر اسلام کے خلاف ہوں تو اس میں شرکت اور امیدوار بننے کا حکم:

سیکولر پارٹی میں شمولیت اور اس کی طرف سے اسمبلی یا پارلیمنٹری انتخابات میں شریک ہونے کی شروط اجازت ہے، ملک و ملت کی خدمت کے جذبہ سے اس میں شامل ہو سکتا ہے اور اس طرح کی پارٹی میں شامل ہو کر ملی مفادات کی حفاظت کرنے کی اجازت ہے اور شمولیت کے بعد اس پارٹی ممبر کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ خلاف اسلام منشور میں تبدیلی لانے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہے اور اصلاحی کوشش کبھی ترک نہ کرے۔

اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کے اس معاہدے اور عمل کو نظیر بنایا جاسکتا ہے، جو آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد یہودیوں کے دو مستحکم قبیلے بنو نضیر اور بنو قریظہ سے کیا تھا اور صلح حدیبیہ بھی اس طرح کے معاہدے کی ایک کڑی تھی، ان دونوں معاہدے میں حالانکہ غیر شرعی امور پر معاہدہ نہ تھا، مگر حالات اور وقت کی نزاکت کے تحت مذکورہ معاہدے سے اسلام اور مسلمانوں کو بڑا فائدہ ہوا، اسلام کی تبلیغ و اشاعت عام ہوئی، لوگوں کو اسلام سمجھنے کا موقع ملا اور اس کے بعد اسلام کی شوکت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس لئے جہاں کہیں بھی مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے ساتھ ملکی معاملہ میں شراکت میں معقول دینی و دنیوی فائدہ ہو تو اس کی شریعت میں گنجائش ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں صاحب تقویٰ اور بابصیرت اہل علم نے آزادی کے بعد سیکولر پارٹیوں میں شرکت کی، خود بھی ممبر بنے اور دوسروں کو بھی ممبر بنایا اور ان پارٹیوں کی طرف سے ایکشن میں امیدوار بھی بنتے رہے، مثال کے طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے کانگریس پارٹی میں شرکت کی، ملک کے پہلے وزیر تعلیم امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مجاہد ملت حضرت مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی وغیرہ نے نہ صرف سیکولر پارٹی میں شرکت کی بلکہ اس کی طرف سے ممبر پارلیمنٹ بھی بنے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار شرعی طور پر بھی سیکولر پارٹیوں میں شمولیت کو صحیح اور وقت کی ضرورت سمجھتے تھے۔

البتہ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے تو کسی مسلمان کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ ایسی پارٹی میں شامل ہو، یا ایکشن کے موقع پر اس کی طرف سے امیدوار بنے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكَافِرِ  
أُولِيَاءِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُمْ مَّؤْمِنِينَ (المائدہ: ۵۷)۔

لہذا جو سیاسی پارٹیاں اسلام دشمنی کو اپنا شعار بنائے ہوئی ہیں اور پارٹی کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو شامل کیے ہوئی ہیں، اس پارٹی میں شرکت اور اس کی طرف سے امیدوار بننے کی کس طرح گنجائش ہو سکتی ہے؟ ایسی پارٹیوں میں شمولیت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، بلکہ احکام الہی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ خواہ پارٹی میں شامل ہونے کی نیت اسلام مخالف ایجنڈے کی اصلاح ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تجربہ بتا رہا ہے کہ پارٹی کے مقاصد میں اس طرح کی شمولیت سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، البتہ شامل ہونے والے کا ایمان اور غیرت ضرور ختم ہو جاتی ہے، اس لئے میرے خیال میں ملی مفادات کے پیش نظر بغرض اصلاح اس طرح کی پارٹی میں شمولیت کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

مسلمانوں کے لئے علاحدہ سیاسی جماعت کا قیام:

ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علاحدہ سیاسی پارٹی قائم کرنا نہ صرف جائز ہوگا بلکہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ اسلام اور

مسلمانوں کی عظیم خدمت بھی ہوگی، اگر پارٹی مسلمانوں کی ہو تو اس کی خامیوں کی اصلاح کی جاسکتی ہے اور نقائص کو درست کیا جاسکتا ہے، اس کے برخلاف غیروں کی پارٹی کی اصلاح اور اسلام مخالف نظریات کو درست کرنا عملاً مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

میرے خیال میں اس پارٹی کا منشور اور اغراض و مقاصد کچھ اس طرح بنایا جائے جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے بھی گنجائش ہو اور وہ پارٹی خاص سیکولر ایجنڈے کے مطابق ہی کام کرے مگر دوسری قوموں کے ساتھ رواداری کا دامن بھی نہ چھوڑے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جب عدل و انصاف اور رواداری کے ساتھ حکومت کی تو غیروں نے بھی نہ صرف یہ کہ اس کو پسند کیا، بلکہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارنے کو دوسری جگہ زندگی گزارنے پر ترجیح دی۔

آج کل کے جو ہلکی حالات ہیں ان حالات میں یہ پارٹی دوسری سیکولر پارٹیوں سے انتخابی مفاہمت بھی کر سکتی ہے تاکہ ووٹ منتشر نہ ہو اور فرقہ پرست غیر سیکولر پارٹیوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ولا ینھکم اللہ عن الذین لہم یقاتلوکم فی الدین ولہم ینخرجوکم من دیارکم ان تبروہم ویقتطوا الیہم اب اللہ یحب المقسطین (الممتحنہ: ۸) (اللہ تعالیٰ تم کو منع فرماتے ہیں، ان لوگوں سے جو تم سے نہیں لڑے دین کے معاملہ میں اور تمہیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا معاملہ کرو)۔“

علامہ قرطبی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے بارے میں رخصت پر دلالت کرتی ہے جو اہل ایمان سے دشمنی اور جدال نہیں کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آزادی سے قبل بانی امارت شریعہ حضرت مولانا ابوالحسن محمد سجاد کے ذریعہ قائم کردہ ”مسلم انڈیا پنڈنٹ پارٹی“ اور ایکشن سے لے کر حکومت سازی تک اس پارٹی کے ذریعہ کیے گئے تجربات کو بھی اپنایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا ابوالحسن محمد سجاد بانی امارت شریعہ کی اس پارٹی نے ایکشن میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور کانگریس کے بعد صوبہ بہار کی دوسری سب سے کامیاب پارٹی بن کر ابھری، اس پارٹی کو تقریباً ۸۰ فیصد کامیابی ملی، اس کے تیس امیدواروں میں سے ۱۲۰ امیدوار کامیاب ہوئے۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت رابع اس پارٹی کے کامیاب امیدواروں میں سے ایک تھے۔ مولانا موصوف نہ صرف یہ کہ ایکشن میں کامیاب ہوئے بلکہ فریق مخالف کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ مسلم انڈیا پنڈنٹ پارٹی نے مولانا ابوالحسن محمد سجاد کی نگرانی میں بیرسٹر محمد یونس نے وزیر اعظم (اس وقت وزیر اعلیٰ کی جگہ وزیر اعظم کی اصطلاح مروج تھی) کے طور پر حلف برداری کی اور کامیابی کے ساتھ یہ حکومت چھ ماہ تک چلتی رہی اور اپنے مختصر دور حکومت میں اس پارٹی نے اہم خدمات ملک و ملت کے لئے انجام دیے۔ موجودہ وقت میں آسام میں مولانا بدرالدین اجمل قاسمی کے ذریعہ بنائی گئی ”یونائیٹڈ سیکولر فرینڈ“ اور جنوبی ہند میں ”مجلس اتحاد المسلمین“ اور ”انڈین مسلم لیگ“ جیسی پارٹیاں ہمارے لیے عمدہ مثال ہیں۔ ان پارٹیوں کے تجربات کے ذریعہ یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ جمہوری ملک میں ملکی قومی مفادات کی حفاظت کے ساتھ کس طرح کام کیا جانا ممکن ہے۔ ایکشن میں خواتین کا کردار:

ووٹ درحقیقت ایک قسم کی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ سابق میں گزر چکا ہے، ووٹ کے ذریعہ ووٹر امیدوار کی اہلیت و قابلیت اور سیاسی امور میں اس کی مہارت کی گواہی دیتا ہے یا اپنی رائے یا مشورہ کا اظہار کرتا ہے، اور عورت اہل الرائے و مشورہ اور اہل الشہادۃ والوکلتہ ہے، معلوم ہوا کہ عورت ووٹنگ کر سکتی ہے تاہم ایک مسلمان عورت کو ووٹ ڈالنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پردہ اور دیگر امور شرعیہ کا خیال کرتے ہوئے اپنے ووٹ کے حق کا استعمال کرے ورنہ وہ گنہگار ہوگی۔ اب رہی بات عورت کے ایکشن میں امیدوار بننے اور قانون ساز اداروں یعنی پارلیمنٹری ایکشن لڑنے کی تو اگر عورت ایکشن میں اس طرح حصہ لے کہ شرعی پردہ کا خیال رہے اور غیر شرعی امور کا ارتکاب نہ کرے تو اس صورت میں عورت کے لیے ایکشن لڑنا اور پارلیمنٹ میں اس کی رکنیت کی شرعاً گنجائش ہے، ارکان اسمبلی یا پارلیمنٹ عوام کی طرف سے اس کے نائب یا وکیل ہوتے ہیں اور عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی کی وکیل بنے۔ بقول علامہ مالدوری ”ارباب حل و عقد عورت بن سکتی ہے“ اس لئے اس امر کی گنجائش بہر حال نکالی جاسکتی ہے کہ عورت گھریلو معاملات کے علاوہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبر بنے۔ ہندوستانی معاشرہ و سماج کے حالات کے پیش نظر اگر خواتین کے لئے مردوں سے علاحدہ نشست کا انتظام ہو اور ان کی کارروائی و دیگر سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں شرعی حدود کی رعایت ہو تو وہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی ہے۔ اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر وہ ان حدود شرعیہ کی رعایت نہ کر سکے تو اس کا ممبر اسمبلی یا پارلیمنٹ بننا یا ایکشن لڑنا یہاں تک کہ ووٹ دینا بھی درست نہیں ہے۔ ☆☆☆

## ووٹ کی شرعی حیثیت

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی ؒ

۱۔ شرعاً ووٹ کی حیثیت شہادت (۱)، شفاعت (۲)، اور وکالت (۳) کی سی ہے، گویا کہ جس شخص کو ووٹ دیا جاتا ہے، اس کے حق میں ملک و ملت کے خیر خواہ ہونے کی شہادت دی جاتی ہے، متعلقہ امیدوار کو وکیل اور نمائندہ بنایا جاتا ہے۔

۲۔ الف۔ باعتبار حیثیت اولی (شہادت) اگر ووٹر پر کسی ایک امیدوار کی اہلیت اور صداقت و دیانت مشکف ہو جائے اور ووٹر کو یہ شرح صدر ہو کہ متعلقہ امیدوار بہتر صلاحیت کا حامل ہے، تو پھر اپنے ووٹ (حق رائے دہی) کا استعمال واجب ہے (۴)۔

ب۔ باعتبار دیگر حیثیات شفاعت (۵)، وکالت (۶) مذکورہ صفات کے حامل امیدوار کے حق میں ووٹنگ امر مستحب ہے۔

۳۔ عام حالات میں اسلامی مزاج کے مطابق عہدہ و اقتدار کی طلب غیر مستحسن ہے، کیوں کہ عہدہ کی طلب و حرص (۷) اور مسابقت ایک ایسی لذت ہے کہ اگر عہدہ چھن جائے تو پھر حسرتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے (۸)۔

لیکن اگر طلب عہدہ کے پیچھے کسی حظ نفس کا دخل نہ ہو بلکہ محض انسانیت کا درد، امانت و دیانت کے ساتھ مفادات عامہ کے تحفظ کا جذبہ کار فرما ہو، نیز انسانوں کو صحیح فائدہ پہنچانا، خلق خدا کو جبر و ظلم سے نجات دلانا اور شر و فتن سے بچانا مقصد ہو، فساق و فجار کے منتخب ہونے سے معاشرہ میں بے دینی کی ترویج کا خطرہ ہو، اور اس عہدہ و منصب کے لائق دیگر افراد موجود نہ ہوں، بلکہ تنہا وہی شخص اس عہدہ کے لیے موزوں ہو، تو اس پر مذکورہ تمام مقاصد کے حصول کے لیے الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا واجب ہے (۹)، البتہ وہ شخص از خود پرچہ داری داخل نہ کرے بلکہ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں پرچہ نامزدگی داخل کریں، تاکہ وہ طلب عہدہ میں متمہ نہ ہو (۱۰)۔

۴۔ جن غیر مسلم و مسلم ملکوں میں قانون ساز ادارے مخالف شرع قوانین بناتے ہیں وہاں مسلمانوں کے لئے ان اداروں کا ممبر بننا درست ہونا چاہئے اور ایسے ممبر شخص کو چاہئے کہ جمہوری حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے خلاف شرع قانون سازی کے خلاف آواز اٹھاتا رہے (۱۱)۔

رہی یہ بات کہ بسا اوقات پارٹی کی طرف سے وہیپ (Party whip) جاری ہونے پر ایسا شخص پارٹی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہوتا ہے اور اپنی ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا، تو یہ خصوصی صورت ہوتی ہے، عمومی نہیں اور اعتبار غلبہ کا ہوتا ہے شاذ و نادر کا نہیں (۱۲)، اور فقہ کا قاعدہ ہے: ”الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف“ کہ بڑے نقصان سے بچنے کے لئے چھوٹا نقصان گوارا کر لیا جاتا ہے (۱۳)، مذکورہ اداروں کا ممبر بننا یہ ضرر اخف ہے اور ممبر نہ بن کر امت کو بڑے خطرات اور نقصان عظیم میں ڈالنا یہ ضرر اشد ہے، لہذا ضرر اخف (ممبر بننا) کا ارتکاب کر کے ضرر اشد (امت کو نقصان عظیم میں ڈالنا) سے بچا جائے گا۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں، جب انہیں حلف دلایا جاتا ہے اس وقت حلف میں دستور کی تمام دفعات تفصیلاً مذکور نہیں ہوتیں، بلکہ اجمالی طور پر دستور سے وفاداری کا حلف دلایا جاتا ہے، تو مسلم ممبر کو چاہیے کہ وہ حلف اٹھاتے وقت اپنے دل میں انہی دفعات کے ساتھ وفاداری کی نیت (توریہ) کرے، جو موافق شرع ہیں، نہ کہ ان دفعات کی جو شریعت کے خلاف ہیں، اس طرح حلف اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے (۱۴)۔

۶۔ یہاں بھی توریہ والی صورت اختیار کی جاسکتی ہے، کہ بائبل کی جو باتیں غیر محرف ہیں، حلف لیتے وقت دل میں صرف ان کی نیت کرے نہ کہ محرف کی

ملدارالافتاء، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کو، ہندربار، مہاراشٹر۔

(حوالہ سابق)۔

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں، ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا باعتبار عموم درست ہونا چاہئے (۱۵)۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، اور کسی شخص کی یہ نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، تو ایسی پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ اس طرح کی پارٹیوں میں شرکت اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں تعاون کے مترادف ہے جو شرعاً ممنوع ہے (۱۶)۔

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت کا قائم کرنا جب کہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز جب یہ احساس بھی ہے بلکہ مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی مرتکز نہیں ہوتی اور مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلم مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت کا قائم کرنا درست نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ دفع ضرر جلب منفعت سے اولیٰ و مقدم ہے (۱۷)۔

۱۰۔ الف۔ خواتین انتخابات کے موقع پر اپنا حق رائے دہی (ووٹ) کا استعمال کر سکتی ہیں (۱۸)، بشرطیکہ پردہ اور دیگر امور شرعیہ کا لحاظ و خیال کریں، ورنہ ارتکاب معصیت سے ووٹ کا ترک افضل ہے۔ حضرت مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”عورتوں کا ووٹ دینا ممنوع نہیں ہے، ہاں! ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا“ (۱۹)۔

ب۔ بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لئے مستحسن نہیں ہے، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لئے معتذر ہے (۲۰)، لیکن اگر ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت ممکن ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے (۲۱)۔

ج۔ عورتیں قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں، البتہ ضروریات شرعیہ کی رعایت بھی لازم ہوگی، جیسا کہ کفایت الفتی کے ایک سوال و جواب سے مستفاد ہوتا ہے:

سوال: کونسلوں اور اسمبلیوں میں جہاں مسلم عورتوں کی نشست محفوظ ہو عورتوں کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: عورتوں کا کونسل میں جانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا، لیکن اگر جائیں تو حجاب کے ساتھ جانا ضروری ہوگا۔ (۲۱۸/۹ عورتوں کا کونسل میں جانا)۔

نیز فتاویٰ حقانیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

”اس پر فتن دور میں حالات کے پیش نظر عورت کو اسمبلی یا پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرنے سے احتراز کرنا چاہئے، اس لئے کہ موجودہ حالات میں انتخابات کے لئے مہم چلانے کے دوران عورت کے لئے پردہ برقرار رکھنا مشکل نظر آتا ہے، تاہم اگر عورت انتخابات میں اس طرح حصہ لے کہ شرعی پردے کا خاص خیال رہے اور کسی غیر شرعی امور کا ارتکاب نہ کرے تو اس صورت میں عورت کے لئے انتخاب لڑنا اور پارلیمنٹ میں اس کو رکنیت دینا شرعاً جواز کی گنجائش ہے، اس لئے کہ ارکان اسمبلی و پارلیمنٹ عوام اور قوم کی طرف سے ان کے وکلاء ہوتے ہیں، اور عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ کسی فرد کی وکیل بنے“ (۲۲) (فتاویٰ حقانیہ: ۳۱۷/۲-۳۱۸)۔

والحجۃ علی ما قلنا:

(۱) ما فی ”التنویز و شرحہ مع الشامیة“: (ہی) لغة خبر قاطع۔ و شرعاً: (اخبار صدق لإثبات حق)۔ فتح وفي الشامیة: قال فی البحر: ہی اخبار عن مشاہدۃ و عیان لا عن تخمین و حساب۔ (۱۱/۷۷، کتاب الشہادات، دار الکتب العلمیۃ بیروت، فتاویٰ بیات: ۵۰۶/۳-۵۰۷ کتاب الامارۃ القضاء، ووٹ کی شرعی حیثیت، فتاویٰ حقانیہ: ۳۰۲/۲ کتاب السیاسة، ووٹ کی شرعی حیثیت)۔

ما فی ”درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام“: الشہادۃ ہی الاخبار صدقاً عن یقین و عیان بلفظ من الشہادۃ۔ (۲۳۴)۔

تعریف الشہادۃ ونصابہا، تحت مادۃ: (۱۶۸۳)۔

ما فی ”العناية شرح الهداية“: وهي في اللغة عبارة عن الإخبار بصحة الشئ عن مشاهدة وعیان... وفي اصطلاح أهل الفقه: عبارة عن إخبار صادق في مجلس الحكم بلفظ الشہادۃ۔ الخ (۲، ۲۲۱) کتاب الشہادات، بیروت۔

(۲) ما فی ”الموسوعة الفقهية“: الشفاعة هي التوسط بالقول في وصول شخص إلى منفعة أو أخرىة أو إلى إخلص من مضرة كذلك (۲، ۱۱۳) روح المعاني: ۳، ۱۳۳، سورة النساء، الآية (۸۵)، (فتاویٰ حقانیہ: ۲، ۲۰۲ کتاب السياسة، ووث کی شرعی حیثیت)۔

(۳) ما فی ”حاشية الجوهرية النيرة“: الوكالة عقد تفويض ينيب فيه شخص شخصاً آخر عن نفسه في التصرف۔ (۱، ۲۳۶) کتاب الوكالة، تحقيق الياس قیلان۔

ما فی ”العناية شرح الهداية“: وفي اصطلاح الفقهاء: عبارة عن إقامة الإنسان غيره مقام نفسه في تصرف معلوم، وهي عقد جائز بالكتاب وهو قوله تعالى: فابعثوا أحدكم بورقكم هذه إلى المدينة (الكهف: ۱۹) ولم يلحقه النكير۔ (۲، ۲۲۲) کتاب الوكالة، الباب في شرح الكتاب للميداني: ۲، ۱۲۸ ط: احیاء التراث العربی، کتاب الفقه على المذاهب الأربعة: ۲، ۱۳۵ مباحث الوكالة، تعريفها)۔

وفي ”الدر المختار مع الشامية“: (وهو إقامة الغير مقام) نفسه... (في تصرف جائز معلوم)۔ (۱۱، ۲۶۵) کتاب الوكالة، الموسوعة الفقهية: ۲، ۲۵۵، وكالة۔ تبیین الحقائق: ۲، ۲۵۳ ط: دارالکتاب الإسلامی)۔

(جواہر الفقه: ۲، ۲۹۳ مکتبہ تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند، فقہی مقالات: ۲، ۲۸۹ مبین اسلامک پبلیشرز کراچی، جدید فقہی مسائل: ۱، ۲۶۵-۲۶۶ کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ کلاتھ مارکیٹ راولپنڈی، المسائل الجہتہ: ۲، ۱۸۵، فتاویٰ مینات: ۳، ۵۰۶-۵-۷ کتار الامارۃ والقضاء، فتاویٰ حقانیہ: ۲، ۳۰۲ کتاب السياسة، فتاویٰ اشاعت العلوم غیر مطبوعہ: رقم الفتویٰ: ۱۳۲ (رج: ۲)۔

(۳) ما فی ”القرآن الکریم“: کونوا قوامین لله شہداء بالقسط۔ (المائدہ: ۷) کونوا قوامین بالقسط شہداء لله (نساء: ۱۳۵) وأقیموا الشہادۃ لله (طلاق: ۲) ولا تکتبوا الشہادۃ ومن یکتبها فإنه آثم قلبه (البقرۃ: ۲۸۳)۔

ما فی ”المعجم الأوسط للطبرانی“ عن أبي بردة عن أبيه، عن النبي ﷺ قال: ”من كتب شهادة إذا دعي إليها كان كمن شهد بالزور“ (جس کسی کو شہادت کے لئے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا) (۱۵۶/۳ رقم الحدیث: ۳، ۱۶۷، بیروت، جمع الفوائد: ۱، ۲۶۲)۔

ما فی ”الصحيح لسلم“: عن زيد بن خالد الجهني، أن النبي ﷺ قال: ”ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها“ (کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے) (۶، ۲۹۶) رقم الحدیث: ۱۷۱۹، ۳۳۶۵، کتاب القضاء، باب بیان خیر الشہود (احیاء التراث العربی، جمع الفوائد: ۱، ۲۲۱) (فقہی مقالات: ۲، ۲۸۹-۲۹۱ غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل: ص، ۶۹-۷۰)۔

ما فی ”الجامع لأحكام القرآن للقرطبي“: ”ولا ياب الشهداء إذا مادعوا“ فإذا كانت الفسحة لكثرة الشهود والأمن تعطل الحق فالمدعو مندوب وله أن يتخلف لأدنى عذر، وإن تخلف لغير عذر فلا إثم ولا ثواب له، وإذا كانت الضرورة وخيف تعطل الحق أدنى خوف قوى الندب وقرب من الوجوب، وإذا علم أن الحق يذهب ويتلف بتأخر الشاهد عن الشہادۃ فواجب عليه القيام بها لا سيما إن كانت محصلة وكان الدعاء إلى أدائها۔ (۲، ۳۹۸) سورة البقرۃ: (۲۸۳)۔

ما فی ”أحكام القرآن للجصاص“: وقوله تعالى: ”ولا تکتبوا الشہادۃ ومن یکتبها فإنه آثم قلبه“ فهو

عموم فی سائر الشهادات التي يلزم الشاهد إقامتها وأدائها، وهو نظير قوله تعالى: "وأقيموا الشهادة لله" (الطلاق: ۲) وقوله: "يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على أنفسكم" (النساء: ۱۲۵) فنهى الله تعالى الشاهد بهذه الآيات عن كتمان الشهادة التي تركها يودي إلى تضييع الحقوق - (۱، ۶۳۸) سورة البقرة، (الآية ۲۸۲) وفيه أيضاً: وقوله تعالى: "وأقيموا الشهادة لله" فيه أمر بإقامة الشهادات عند الحاكم على الحقوق كلها... فانتظم ذلك معنيين أحدهما الأمر بإقامة الشهادة، والآخر أن إقامة الشهادة حق لله تعالى، وأفاد بذلك تأكيده والقيام به - (سورة الطلاق، الآية ۲) -

ما في "العناية شرح الهداية": قال (الشهادة فرض تلزم الشهود الخ) أداء الشهادة فرض يلزم الشهود بحيث لا يسعهم كتمانها أكد الفرض بوصفين وهو اللزوم وعدم سعة الكتمان دلالة على تاكده - (كتاب الشهادات: ۲، ۲۲۱) -

(۵) ما في "تفسير المظهری": (من يشفع شفاعة حسنة) راعى بها حق مسلم ودفع بها عنه ضرراً وجلب نفعاً لوجه الله تعالى (يكن له) أي للشافع (نصيب منها) وهو ثواب الشفاعة، قال مجاهد: هي شفاعة بعضهم لبعض ويوجر الشفيع على شفاعة وإن لم يشفع كذا روى ابن أبي حاتم وغيره عن الحسن وعن أبي موسى قال: كان النبي ﷺ إذا جاءه رجل يسئل أو طلب حاجة أقبل علينا بوجهه فقال: "أشفعوا توجروا ويقضي الله على لسان نبيه ما شاء"، متفق عليه - (سورة النساء، الآية ۸۵، التفسير الكبير للرازي: ۲، ۱۵۹، روح المعاني: ۳، ۱۳۲ - ۱۳۳) -

ما في "الأصول والقواعد للفقہ الإسلامي" (ترك الإحسان لا يكون إساءة) (ص ۱۳۲ القاعدة: ۸۷، شرح السير الكبير: ۲، ۱۱۰، باب ما يحمل عليه الفی وما يركبه الرجل من الدواب قواعد الفقه: ص ۷۰ القاعدة: ۸۲) -

(۶) ما في "العناية شرح الهداية" وفي اصطلاح الفقهاء: عبارة عن إقامة الإنسان غيره مقام نفسه في تصرف معلوم وهي عقد جائز بالكتاب وهو قوله تعالى: "فابعثوا أحدكم بورقكم هذه إلى المدينة" (الكهف: ۱۹) ولم يلحقه التكبير (۲، ۲۲۲)، كتاب الوكالة، الباب في شرح الكتاب للبيداني: ۲، ۱۳۸ ط احياء التراث العربي، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة: ۲، ۱۳۵، مباحث الوكالة، تعريفها، الأصول والقواعد للفقہ الإسلامي: ص ۱۳۲، القاعدة: ۸۷ -

(۷) ما في "مشكوة المصايح" عن عبد الرحمن بن سمرة قال: قال لي رسول الله ﷺ: "لا تسأل الإمارة فإنك إن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها" متفق عليه -

(۸) ما في "مشكوة المصايح" عن أبي هريرة عن النبي ﷺ: "إنكم ستجربون على الإمارة وستكون ندامة يوم القيامة فنعم المرصعة وبئست الفاطمة" رواه البخاري - (حضرت ابو هريره رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عنقریب تم عہدوں کی مسابقت میں کود پڑو گے، حالانکہ یہ قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگا، دو دھ دینے والا اور لذت بخش عہدہ بہت اچھا لگتا ہے، لیکن جب عہدہ چھن جاتا ہے اور دو دھ کا تھن منہ سے نکل جاتا ہے تو اتنا ہی برا لگتا ہے، پھر کیا حاصل ایسی لذتوں کا جن کے بعد حسرتوں کا سامنا کرنا پڑے) - (ص ۳۲۰، کتاب الامارة والقضاء، الفصل الاول، قدیمی) -

ما في "مشكوة المصايح" عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: "تجدون من خير الناس أشدهم كراهية لهذا الأمر حتى يقع فيه" متفق عليه - (حضرت ابو هريره رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ہمیشہ دیکھو گے کہ اچھے لوگ اس دوڑ سے دور بھاگتے ہیں جب تک کہ اس میں مبتلا نہ ہو جائیں) (ص ۳۲۰، کتاب الامارة والقضاء، الفصل الاول، قدیمی) -

(۹) ما في "البحر الرائق": وليس النهي عن السؤال على إطلاقه بل مقيد بأن لا يتمنى للقضاء، أما إن تعين بأن لم يكن أحد يصلح للقضاء وجب عليه الطلب صيانة لحقوق المسلمين ودفعاً لظلم الظالمين - (كتاب القضاء، بيروت، فتح القدير: ۶، ۲۲۳ - الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ۵، ۱۳۱، الأحكام السلطانية للماوردي: ص ۷۵) -



ما فی ”القرآن الکریم“ اجعلنی علی خزائن الأرض اِنی حفیظ علیہ۔ (یوسف نے) کہا مجھے ملک کے پیداواروں پر مامور کر دیجیے میں دیانت (بھی) رکھتا ہوں علم (بھی) رکھتا ہوں۔ (یوسف: ۵۵)۔

ما فی ”بیان القرآن للٹھانوی“ اجعلنی الخ۔ ”معلوم ہوا کہ جب کسی کام کی لیاقت اپنے اندر منحصر دیکھے خود اس کی درخواست جائز ہے مگر مقصود نفع رسائی ہونہ کہ نفس پروری“۔

(۱۰) علامہ کاسانی کتاب آداب القاضی میں تحریر فرماتے ہیں:

”عہدہ قضا کے طالب کو منصب قضا دینا جائز نہیں ہے، اگر اس میں اس عہدہ کی واقعی اہلیت موجود ہو تو با اتفاق فقہاء ایسے شخص کو عہدہ قضا دینا درست ہے، البتہ بہتر ہے کہ ایسے شخص کے بجائے کسی ایسے شخص کو تلاش کیا جائے جس میں عہدہ کی طلب نہ ہو، اس لئے کہ طلب کی بنا پر انسان اپنے حق میں متہم ہو جاتا ہے۔“ ”وأما ترك الطلب فليس بشرط لجواز التقليد بالإجماع فيجوز تقليد الطالب بلا خلاف، لأنه يقدر على القضاء بالحق، لكن لا ينبغي أن يقلد، لأن الطالب يكون متهماً“ (۹، ۹۱) کتاب آداب القاضی فصل فی من يصلح للقضاء، بیروت) (غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل: ص ۵۵)۔

(۱۱) ما فی ”معارف القرآن“: ”ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلاف شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کر لے تو اگرچہ اس کافر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم و جور کا اندیشہ قوی ہو تو مجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہو جاتی ہے، جس میں خود کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اعانت کا فائدہ حاصل ہو جائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین، صحابہ و تابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم و جابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کر لینا ثابت ہے (قرطبی و مظہری ۹۲/۵)۔

(۱۲) ما فی ”قواعد الفقہ“ العبرة للغالب الشائع لا للنادر“ (مجلة استنبول)۔

☆☆☆

## ایکشن کا مسئلہ

مولانا محمد مقصود فرقاتی جامع اعلیٰ مدرسہ قادیانہ، راپور۔

۱۔ ووٹ کو اکثر علماء نے شہادت تسلیم کیا ہے اور اس کا استعمال شرعاً جائز و درست ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری وقت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ایک لفافہ میں بند کر کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس پر بیعت لی، لہذا ووٹ کا استعمال اگر بغیر جبر و اکراہ و بلا طمع و لالچ کے ہو تو وہ درست ہے۔

۲۔ ووٹ کا استعمال ایک اپنی آزادانہ رائے کا اظہار ہے۔ بعض وقت یہ مباح ہوگا اور بعض وقت مستحب ہوگا اور بعض وقت واجب کے درجہ میں ہوگا۔ جیسے حالات ہوں گے ویسے ہی اس کا حکم ہوگا۔

۳۔ اگر کسی شخص کو اپنے اوپر یقین و اعتماد ہے کہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ قوم و ملت کی خدمت انجام دے گا اور کسی کے لالچ و دباؤ میں نہیں آئے گا تو پھر ایسا شخص ووٹ کے لیے اپنا نام پیش کر سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنا نام پیش کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیہ۔

۴۔ مذکورہ صورت میں قانون ساز اداروں کا ممبر بننا درست ہے جو قانون خلاف شریعت ہے اس میں اپنی رائے شریعت کے موافق دے یا اگر مناسب سمجھے تو ایسے موقع پر بغیر حاضر رہے، یہی حکم وہیپ جاری کرنے کی صورت میں ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے: لا طاعة لخلق فی معصیۃ الخالق اور قرآن کریم میں ہے: ولا تعاونوا علی الایثم والعدوان۔ دوسری جگہ ہے: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الظالمون۔

۵۔ وفاداری کا حلف لیتے وقت یہ نیت کرے کہ میں انہیں تو انین اور باتوں میں وفادار ہوں گا جو خلاف شریعت نہ ہوں اور جو قانون شریعت کے خلاف ہوگا میں اس میں قانون الہی کا وفادار رہوں گا۔

۶۔ موجودہ بائبل تحریف شدہ ہے جب بائبل کا حلف لے تو یہ نیت کرے کہ جو بائبل اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری تھی میں اس کی قسم کھاتا ہوں اور اس کا حلف لیتا ہوں۔

۷۔ پارٹیوں کے اکثر ارباب حل و عقد غیر مسلم ہی ہوتے ہیں اور وہ اسلام اور احکام اسلام سے واقف نہیں ہوتے، لہذا مسلمانوں کے تحفظ اور ان کے مفادات کی خاطر ان پارٹیوں میں شامل ہونا اور ان میں حصہ لینا درست ہے اور جو باتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوں انہیں خاموشی سے برداشت نہ کرے بلکہ اپنی حکمت عملی سے ان کے تدارک کی کوشش کرتا رہے۔ حدیث شریف ہے: کلمۃ حق عند سلطان جائز۔

۸۔ اس کا جواب بھی وہی ہے جو نمبر ۷ کا ہے۔ ہاں اگر مسلمان کو یہ یقین ہو کہ یہ پارٹی اپنے منشور کے اعتبار سے اور اسلام و مسلمانوں کی دشمنی اور ناپاک سازشوں کے اختیار سے باز نہیں آسکتی تو پھر ایسی صورت میں پارٹی میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔

۹۔ مسلمانوں کو چاہے وہ اقلیت میں ہوں، اپنے اندر اتحاد پیدا کر کے سیاسی جماعت قائم کرنا چاہئے اور مخالف پارٹیوں کو اپنی طاقت کا احساس کرانا چاہئے اور جو مسلمان دیگر پارٹیوں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی شمولیت اختیار کر لیتے ہیں، انہیں ان پارٹیوں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کا احساس دلانا چاہیے۔ بعض وقت مخالف طاقتیں مسلمانوں کے مقابلہ جو کامیاب ہو جاتی ہیں وہ بھی مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے ہو جاتی ہیں، لہذا مسلمانوں کو اپنی کمزوریاں دور کرنا چاہیے اور اسلام و قوم کی خاطر جدوجہد کرنا چاہئے۔

۱۰۔ اسلام کا نظریہ ہے کہ عورت گھر کی زینت ہے اور گھر کی ملکدہ ہے، عورت کے ذمہ گھر کے کام کو سنبھالنا اور بچوں کی تربیت کرنا ہے اور شوہر کے مال کی اس کی عدم موجودگی میں حفاظت کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے عورت کی جسمانی ساخت بھی ایسی بنائی ہے کہ اگر وہ اس کے خلاف کرے تو اس کی جسمانی ساخت زائد مشقت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر فطری طور پر اللہ رب العزت نے مرد کی کشش عورت کے اندر رکھی ہے، اس کے بعض اعضاء کی بناوٹ اور اس کا اظہار مرد کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس لئے عورت کو شریعت نے گھر سے باہر نکلنے اور غیر محرموں کے سامنے آنے جانے سے منع کیا ہے تاکہ فواحش کا وقوع کم سے کم ہو اگر عورت باپردہ رہ کر اور شریعت کے حدود پامال کئے بغیر لکھ پڑھ کر دیانتداری اور عزت و عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے قوم و ملت کی خدمت کے لئے ایکشن یا دیگر چیزوں میں حصہ لیتی ہے تو یہ جائز ہے، مگر ان شرائط کے ساتھ عورت کے لئے ان چیزوں میں حصہ لینا بہت دشوار ہے۔ ☆☆☆

## ایکشن کی شرعی حیثیت

مفتی اعجاز الحسن بانڈے القاسمی ع

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

ووٹ کے پاس ووٹ شرعی طور پر ایک امانت ہے جبکہ شرعی لحاظ سے ووٹ بیک وقت طالب ووٹ کے حق میں شہادت بھی ہے، سفارش بھی ہے اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے وکالت کے درجہ میں بھی ہے۔

اور یہ چاروں وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں تفصیل درج ہیں:

امانت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنے اعضاء اور ان موہوبہ اعضاء کے استعمال کا جو حق دیا ہے، یہ سب انسان کے پاس بطور امانت ہیں، انسان کی عقل و دماغ، ان کی صلاحیتیں اور ان کے استعمال کے بارے میں کل آخرت میں اللہ کے یہاں جواب دینا پڑے گا۔

انسان جو بولتا ہے خدا کی طرف سے ایک فرشتہ اس پر مقرر ہے: ”ما یلفظ من قول إلا لدیہ رقیب عتید“ (سورہ ق: ۱۸)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی طرف سے دیئے جانے والے مشورے کی صلاحیت کو امانت سے تعبیر کیا ہے۔ المستشار مومنین (ترغیب و تحذیر: ۲۸۲۲)

انسان شرعاً اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق مشورہ بالکل صحیح دے اور یہ حکم اس وقت اور تا کیدی بن جاتا ہے جبکہ اس کا تعلق انفرادی حیثیت سے نکل کر اجتماعیت کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ ایکشن میں کسی کی نامزدگی کے لیے مشورہ (ووٹ) کا تعلق امت کے اجتماعی مفاد سے وابستہ ہوتا ہے، اس لیے مشورہ (ووٹ) میں کسی قسم کا جھول یا رعایت قوم کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی لیے ایسے معاملے میں مشورہ (ووٹ) دینے سے پہلے خود بھی ذی رائے لوگوں کے ساتھ مشورہ انتہائی ضروری اور اہم ہے۔

”و امرهم شورئ بینہم“ (الشوری: ۳۸)۔ ”و شاورہم فی الامر“ (آل عمران: ۱۵۹)۔

تا کہ آپ کی رائے اور مشورہ (ووٹ) قومی مفادات کے لیے باوزن ثابت ہو، امام بخاری نے اس سلسلے میں کچھ واقعات بھی باب قول اللہ و شاورہم فی الامر، باب ۲۸، کتاب الاعتصام کے تحت نقل کیے ہیں، اس لیے اگر آپ نے ووٹ دے کر صحیح مشورہ دیا ہے تو امانت داری برتنے کی بناء پر آپ کو اس پر اجر بھی ملے گا اور جان بوجھ کر غلط آدمی کو ووٹ دے کر غلط مشورہ دیا تو خیانت، دھوکہ اور ظلم کا گناہ آپ کے نامہ اعمال میں درج ہوگا کہ یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔

شہادت:

ایکشن میں ووٹ استعمال کرنے کی ایک حیثیت شہادت کی بھی ہے کہ آپ جس شخص کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کر رہے ہیں، تو آپ گواہی دے رہے ہیں کہ میری نظر میں یہ دوسرے امیدواروں کی بہ نسبت نیک و صالح بھی ہے، لائق و قابل بھی ہے، یعنی ذاتی حیثیت سے یہ نیک ہے کہ جس منصب کے لیے امیدوار بنا ہے اس کے لیے اہل بھی ہے اور مطلوبہ منصب پر فائز ہونے کے بعد عدل و انصاف سے کام لے گا، کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فائق و لائق امیدوار سے آپ کی ان بن ہو اور نسبتاً نالائق امیدوار سے قربت ہو، ایسے موقع پر قابل و مستحق امیدوار کے مقابلے میں نالائق امیدوار کے حق میں ووٹ دینا جائز نہیں ہوگا۔

قرآن فرماتا ہے: ”ولا یجبر منکم شئ قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقویٰ“۔

طہ صدر مفتی سبیل الہدیٰ بھندری، لکھنؤ، کشمیر۔

(اور کسی کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم نا انصافی کرو، انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقویٰ سے قریب تر ہے کہ بے وقوف دوست کے مقابلے میں عقلمند دشمن بہتر ہوتا ہے) (المائدہ: ۸)۔

قرآن کریم نے مومن کی صفت یہ بتلایا ہے کہ وہ کبھی جھوٹی گواہی نہیں دیتا ہے: ”والذین لا یشہدوں الزور“ (الفرقان: ۴۲)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو قطعاً ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو بڑے گناہ نہ بتلاؤں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا: جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹی گواہی دینا یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار ارشاد فرمایا (مسلم شریف، باب الکبائر، حدیث نمبر: ۱۳۳)۔

قرآن کریم نے جھوٹ کو بت پرستی جیسے بڑے گناہ کے ساتھ بیان کر کے بچنے کا حکم دیا ہے: ”فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور“ (پس تم بت پرستی کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو) (الحج: ۳۰)۔

لہذا امیدواروں میں وجوہ امتیاز کی تحقیق و تفتیش ووٹر کے فرائض میں سے ہے کہ جہاں صحیح رائے ووٹ سے امت کا نفع وابستہ ہے، وہیں غلط ووٹ کی بناء پر عوام الناس شدید نقصان سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں تحقیق و تفتیش کے بعد صحیح امیدوار کے حق میں ووٹ دینا واجب کے درجہ میں ہوگا کہ ووٹ نہ دینے سے نادرست آدمی کے اقتدار میں آنے کا خطرہ پیدا ہوگا کہ کبھی ایک ووٹ سے پورا نظام حکومت بدلا جا سکتا ہے۔

سفارش:

امیدوار کے حق میں ووٹ دینے میں ایک پہلو سفارش کا بھی ہے اور نیک امور میں سفارش مطلوب ہونے کے ساتھ ساتھ ماجور بھی ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”من یشفع شفاعۃ حسنة یکن له نصیب منها“ (جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے) (النساء: ۸۵)۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ”اشفعوا فلتوجروا“ (مسلم شریف: ۶۶۹۱، ابوداؤد شریف: ۵۱۳۲)۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ومن یشفع شفاعۃ سیئة یکن له کفیل منها“ (اور جو کوئی بری سفارش کرتا ہے، اسے برائی میں سے حصہ ملتا ہے) (النساء: ۸۵)۔

وکالت:

جس امیدوار کے حق میں ووٹ دیا جا رہا ہے، وہ ووٹر کی رائے کے مطابق خود اس کی طرف سے اور منتخب ہونے کی شکل میں عوام کی طرف سے اقتدار عملی کے پاس وکیل کے درجہ میں ہے اور یہ بات طے ہے کہ وکیل عاقل، امانت دار، بھروسہ مند، معاملہ فہم اور نکتہ رس ہونا چاہیے کہ ان صفات سے عاری وکیل سود مند ہونے کے بجائے ضرر رساں ہی ثابت ہوگا۔

ہماری طرف سے ووٹ دینے کے نتیجے میں اس منتخب امیدوار ”وکیل“ کا معاملہ اس وقت اور اہم بن جاتا ہے جبکہ ان ہی کی رائے ووٹ پر ملک کی پوری انتظامیہ تشکیل پاتی ہے۔

اور شریعت میں یہ بات بالکل طے ہے کہ وکیل کے ذریعہ سے طے پانے والے امور و افعال موکل کی طرف بھی منسوب ہوتے ہیں، اس کا صحیح فیصلہ آپ کا صحیح فیصلہ اور اس کا غلط فعل آپ کا غلط فعل قرار پائے گا۔

لہذا ووٹر کا ووٹ دینے کا معاملہ کئی جہات سے اہمیت کا حامل ہے، جس قدر ووٹ دینا اہم ہے، اسی قدر غلط ووٹ دینا زبردست گناہ ہے۔

یہ ووٹ جس طرح ایک مرد کا حق ہے عورت جو زندگی کی گاڑی کا ایک اہم حصہ ہے، ووٹ کی اہمیت کے پیش نظر اس حق سے محروم قرار نہیں پاسکتی ہے۔

شریعت اسلام نے عورت کو مشورہ، گواہی، سفارش اور وکالت سے منع نہیں کیا ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ صلح حدیبیہ کے وقت ایک عورت حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ نے کس طرح پیغمبر ﷺ کے غم کو خوشی میں بدل دیا اور ظاہر اصحاب کو غیر شعوری اور مغلوب الحال ناراضگی کو اطاعت و فرمانبرداری میں تبدیل کر دیا۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور دین حق کے استحکام میں مرد و عورت دونوں برابر کے شریک ہیں اور صلح معاشرہ کا انقلاب بھی عورت و مرد کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے تو پھر عقل و انصاف کا وہ کونسا معیار ہے جو ایک صنف مرد کو عزت و احترام کا پرتو و مجسمہ اور امور مسلمین و معاملات عام کا یکطرفہ طور پر مکمل و تہاڑ مدار و کفیل قرار دے جبکہ دوسری صنف عورت کو ذلیل، حقیر اور معاشرہ کے لیے ایک ناسور و بے سود عنصر ثابت کر دے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عورت کی رائے، شہادت، سفارش اور وکالت کسی بھی طرح شریعت کی نظر میں رد نہیں ہے اور پھر جبکہ موجودہ طرز حکومت ہو کہ جہاں سروں کو گننا جاتا ہو تو لانا جاتا ہو، عورتوں کے ووٹ کی حیثیت اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے، لہذا جس طرح مرد ووٹ ڈالنے کا حق رکھتا ہے، عورت بھی اس کی مستحق قرار پاتی ہے کہ وہ ووٹ ڈالے۔ ہاں شریعت کے حدود پامال نہ ہوں، عورت کی حرمت و عظمت متاثر نہ ہو وغیرہ وغیرہ امور کی رعایت کے ساتھ عورت ووٹ ڈال سکتی ہے اور موجودہ نظام مملکت میں بالا ہتمام ڈالنا چاہیے کہ اس کے پیچھے رہنے یا ووٹ نہ دینے سے نفع کے بجائے ضرر شدید لاحق ہوگا۔

یہ تو تھیں مسئلہ سے متعلق ووٹ کے قبیل سے تفصیلات، مسئلہ کا ایک پہلو امیدوار بننے کا ہے، نیز اگر حکمراں جماعت کفار اور اہل باطل ہوں تو اس وقت امیدواری کے لیے میدان میں اترنا کیا حیثیت رکھتا ہے۔ سوال نمبر ۳ سے ۸ تک اسی قسم کے کچھ نکات کو ابھارا گیا ہے۔

امیدوار بننا، اہل کفر کے زیر کنٹرول ملک میں امیدوار بن کر قانونی اور تنظیمی شرائط پر حکمرانی کرنا مطلقاً ممنوع بھی نہیں قرار پاسکتا اور غیر مشروط طور پر جائز بھی نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں ہمارے سامنے جلیل القدر پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام کا کردار ہے جنہوں نے کافر بادشاہ کے سامنے اہلیت اور صفات بیان کر کے عہدہ طلب کیا:

”اجعلنی علی خزائن الأرض اینی حفیظ علیہ“ (یوسف: ۵۵) (مجھے خزانوں کا ذمہ دار بنائیے، میں ان کی حفاظت بھی کروں گا اور آمد و خرچ کے حساب سے بھی واقف ہوں)۔

امیدوار کے سلسلے میں کئی امور توجہ طلب ہیں:

۱۔ امیدوار کا مسلمان، متدین اور معاملہ فہم ہونا۔

۲۔ امیدوار مفوضہ منصب کا اہل ہو۔

۳۔ امیدوار کا امیدواری کے لیے انتخاب اصحاب رائے افراد کی طرف سے ہو۔

۴۔ امیدوار مفوضہ منصب کے استعمال میں خود مختار ہے یا پابند۔

۵۔ یہ پابندی شرعی ہے یا غیر اسلامی۔

۶۔ جس جماعت سے وابستہ ہے اس جماعت کا منشور کن بنیادوں پر بنا ہے، انسانیت اور عوامی مسائل کی بنیاد پر یا کمیونٹی کے مفادات کے تحت یہ اور ان جیسے دیگر اہم امور کی تعیین کے بعد ہی امیدوار کے حق میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے، جہاں تک اہل کفر کے زیر کنٹرول نظام مملکت میں حصول اقتدار کا مسئلہ ہے بایں طور کہ منشور بھی ایک خاص کمیونٹی کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو، اس میں ملکی معاملات میں برابری کے حقوق کا نعرہ ہونے کے باوصف حقیقت میں کفر کی برتری مطلوب و مدنظر ہوتی ہے، اگر چہ اس میں دوسری اقوام کے لیے بھی کچھ دفعات درآتی ہیں، حقیقت میں ان کا زیادہ تر تعلق ووٹوں کے حصول تک محدود ہوتا ہے، عملی دنیا میں وہ صرف سراب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نیز آزادی کے بعد سے آج تک ملکی حالات اس کا واضح ثبوت ہیں، لہذا فقہاء کرام کے اس پلیٹ فارم کو بڑی گہرائی کے ساتھ ان نکات پر غور کرنا ہوگا، کیونکہ ہمارا کوئی بھی فیصلہ شرعی قانون کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ بہت سارے معاملات ایسے بھی ہیں جن میں واضح لائحہ عمل کے بجائے سکوت اور توقف بہت سارے مفادات کا سبب بنتے ہیں، مسلمانوں کے ملکی، سماجی اور قانونی معاملات و مسائل سے صرف نظر اور چشم پوشی امت کے لیے نقصان دہ ہی نہیں بہت سارے تکالیف دہ حالات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ صاحب احکام القرطبی نے گرچہ کفار کے زیر انتظام ملکی معاملات میں قبول منصب پر جواز بھی نقل کیا ہے۔ لیکن اس کو کچھ شرائط کے ساتھ خاص کیا ہے، مثلاً یہ کہ وزارت میں مکمل خود مختار ہوں، فاسق و فاجر کی تابعداری نہ کرنی پڑے

(احکام القرآن للقرطبی ۱۸۳/۹) ☆☆☆

## جمہوری ممالک میں الیکشن کی شرعی حیثیت

مولانا محمد عثمان بستوی ع

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کی شرعی اعتبار سے چار حیثیتیں ہیں:

ووٹ یہ شہادت ہے یعنی ووٹ دینے والا امیدوار کے حق میں اپنے ووٹ کے ذریعہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت و صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے انجام دینے میں امانت و دیانت داری بھی ہے۔

دوسری حیثیت وکالت کی ہے، یعنی ووٹ دینے والا امیدوار کو اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں اپنا نمائندہ اور وکیل بنا کر بھیجتا ہے کہ یہ ممبر اس کی طرف سے اسمبلیوں میں پہنچ کر مفید کام انجام دے۔

تیسری حیثیت سفارش و شفاعت کی ہے، یعنی ووٹ دینے والا اپنے امیدوار کے لیے ایک اہم عہدہ دینے کی سفارش کرتا ہے، کہ اس امیدوار کے اندر لیاقت، صلاحیت، دیانت، امانت موجود ہے، لہذا اس کو یہ ذمہ دار عہدہ دیا جائے۔

چوتھی حیثیت ووٹ کی کم سے کم بقدر استطاعت تقلیل شروع ضرر ظلم کی ہے، یعنی اگر تمام امیدواروں میں سے کسی کے اندر صلاحیت، لیاقت، دیانت اور امانت موجود نہ ہو تو اس وقت ان تمام نمائندوں میں سے جس کے ذریعہ سے کم نقصان و ضرر پہنچنے کی امید ہو اسی کو ووٹ دے کر قوم و ملت کو ظلم و زیادتی سے جہاں تک ممکن ہو بچانے کی کوشش کرتا رہے۔

ووٹ کا حکم بحیثیت شہادت:

ووٹ شرعی نقطہ نظر سے شہادت و گواہی کی حیثیت رکھتا ہے اور ضرورت کے موقع پر شہادت و گواہی دینا ضروری اور اس کو چھپانا حرام ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ولا تکتوموا الشهادة ومن یکتومها فانه آثم قلبه“ دوسری جگہ ارشاد ہے: ”اقیموا الشهادة للہ“ اور ایک جگہ ہے: ”کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط“ اور ارشاد ہے: ”کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ“ ان سب آیات میں مسلمانوں کو سچی شہادت دینے اور جھوٹی شہادت سے بچنے کا حکم ہے، اسی طرح نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الا أخیرکم بخیر الشہداء الذی یأتی بشہادته قبل أن یسألها“ ان سب نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گواہی دینا فرض ہے اور اس سے اجتناب گناہ عظیم ہے، لہذا جب ووٹ شہادت و گواہی ہے، تو اس کو دینا لازم و ضروری ہے اور اس سے پرہیز گناہ ہے اور اس کا صحیح استعمال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

ووٹ کا حکم بحیثیت وکالت:

وکالت کا حکم شرعی یہ ہے کہ کام جو انسان کے ذمہ لازم و ضروری ہو اور انسان اس کام کو خود کرنے سے عاجز و مجبور ہو، لیکن اس کو وکیل اور نائب کے ذریعہ انجام دلانا ممکن ہو تو ایسے امور کی انجام دہی کے لیے وکیل بنانا واجب و لازم ہے۔ مثلاً مالدار مسلمان کے پاس حج کی مالی استطاعت تو موجود ہے، لیکن وہ چلنے پھرنے سے معذور ہونے کی بنا پر حج کرنے سے عاجز ہے تو ایسی صورت میں اس کے ذمہ وکیل کے ذریعہ حج بدل کرنا واجب و ضروری ہے اور حج بدل کرنے والا اس کی طرف سے وکالت و نیابت حج کرے گا، لہذا جب ملک کی اسمبلیوں میں پہنچ کر خود قوم و ملت سے ہی ظلم و زیادتی روکنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے تو کم از کم اپنا نمائندہ اور وکیل منتخب کر کے ظلم و زیادتی کو دور کرنا لازم ہوگا۔ فیجب علی کل من وجب علیہ الحج

ع مدرسہ ریاض العلوم گورنری۔

وعجز عن الأداء بنفسه“ الإحجاج عنه“ بان یلیب شخصاً یحج عنه فی حال حیاته أو بعد مماته، (الفقه الحنفی فی ثوبہ الجدید ۱۰۲۰۵) ویجب الإحجاج علی العاجز إن کان له مال (تبیین الحقائق ۲۰۲۲۲)۔

### ووٹ کا حکم بحیثیت شفاعت:

کسی کمزور طالب حق کے ساتھ مل کر اس کا حق دلانے اور اس سے ضرور نقصان دور کرنے کی کوشش کا نام سفارش و شفاعت ہے، جائز کام کے لیے سفارش جائز و مستحسن ہے، لیکن اگر کوئی واجب کام کسی کی سفارش پر موقوف ہو تو ایسی صورت میں اس واجب کی ادائیگی کے لیے سفارش کرنا واجب و ضروری ہے، کیونکہ سفارش کے معنی میں شہادت و گواہی اور حاجت روائی داخل ہے، اور یہ سب افعال و مسائل اور ذرائع ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ واجب و لازم مقاصد کے وسائل و ذرائع کا اختیار کرنا واجب و لازم اور جائز و مباح کے وسائل کا اختیار کرنا جائز و مباح ہے اور ناجائز حرام کے وسائل کو اختیار کرنا ناجائز و حرام ہے۔ حاصل یہ کہ سفارش ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے، لہذا اس کا حکم وہی ہوگا جو ان کے مقاصد کا ہو، جیسا کہ فقہ کا مشہور ضابطہ ہے: ”الأمور بمقاصدها“ اور ووٹ کے ذریعہ کسی کے لیے نمائندگی کی سفارش کر کے قوم سے ظلم و جور اور شر و فساد کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس مقصد کا حصول اسی ووٹ پر موقوف ہے، لہذا ووٹ دینا شرعاً واجب و ضروری ہے۔

### ووٹ کا حکم بحیثیت تقلیل شر و دفع ضرر:

جب انسان ظلم و جور کا شکار ہو اور اس پر جابر و ظالم حکمران مسلط ہوں اور ان کے قوانین احکام اسلام کے خلاف ہوں تو ایسی صورت میں اگر ان حکمرانوں سے علیحدہ رہنے کی صورت میں لوگوں پر ظلم و زیادتی میں اضافہ ہو اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صورت میں لوگوں کے اوپر ظلم و زیادتی کو کم کرنے کا ظن غالب ہو تو ان کے ساتھ مل کر کام کرنا اور لوگوں کو اپنی قدرت و استطاعت کے بقدر ان کے ظلم و زیادتی سے بچانا ضروری ہے، اس لیے کہ ہر مسلمان اپنی استطاعت کے بقدر منکر پر نکیر کا مکلف ہے، مثلاً حکومت کے ناجائز ٹیکس وصول کرنے کی ذمہ داری لینا تو اس میں چونکہ ایک ناجائز کام پر اعانت ہے، اس لیے یہ شرعاً جائز نہیں، لیکن اگر کوئی اس ذمہ داری کو قبول کر کے لوگوں سے اس ظلم کو بالکل ختم تو نہ کر سکتا ہو مگر اس کے خرچ وغیرہ کرنے میں صحیح مصرف کا انتخاب کر کے لوگوں کو مزید ٹیکس وغیرہ سے بچانے کی صلاحیت و قدرت رکھتا ہو تو حضرات فقہاء نے ایسی ذمہ داری کو قبول کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ بقدر ممکن ظلم و زیادتی میں کمی کی جاسکے، حاصل یہ ہے کہ ہر انسان پر اپنی استطاعت کے بقدر ناجائز و امر منکر کو کم کرنے اور روکنے کی کوشش کرنا لازم و ضروری ہے۔

### الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم:

عام اصول و ضابطہ تو یہی ہے کہ عہدہ اور منصب کو طلب نہ کیا جائے اور منصب طلب کرنے والے کو منصب سپرد نہ کیا جائے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حکومت طلب مت کرو، اس لیے کہ اگر اس کا حصول طلب و کوشش سے ہوگا تو اس پر اللہ رب العزت کی طرف سے مدد و نصرت نہ ہوگی (بخاری شریف ۸۵۰۱۲)۔

لیکن احوال کے تغیر یا نیت و مقصد کے بدل جانے کی وجہ سے اس کے احکام مختلف ہو جاتے ہیں۔ پس اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ صاحب صلاحیت لوگوں کا فقدان ہو اور ایک شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کا اہل موجود نہیں، اگر وہ نہیں کھڑا ہوگا تو منصب غیر اہل کے پاس چلا جائے گا تو وہ مصالح المسلمین اور حقوق ناس کے تحفظ کے لیے اس شخص کو جو اس کا اہل ہے اور حالات نے اس کو اس کام کے لیے متعین کر دیا ہے تو اس کے لیے نہ صرف یہ کہ منصب کی طلب جائز ہوگی بلکہ واجب ہو جائے گی (الدرمج الرد ۴۰۱۸)۔

### غیر مسلم ممالک کے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

ایسے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا جو خلاف شریعت قوانین بناتے ہیں، خواہ وہ مسلم ممالک کے ادارے ہوں یا غیر مسلم کے، اصول شریعت کی روشنی میں جائز نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ لیکن مجبوری اور ضرورت کے وقت خلاف

شریعت امور بھی جائز ہو جاتے ہیں، اس سلسلے میں حضرات فقہاء نے بڑی تفصیلی بحث فرمائی کہ جب دو خرابیوں میں سے کسی ایک میں ابتلاء ناگزیر ہو جائے تو اس کو اختیار کرے جس کا ضرر کم ہو اور اس کے بہت سے جزئیات و نظائر ذکر کیے گئے ہیں۔

دستور سے وفاداری کا حلف:

دستور سے وفاداری کا حلف درحقیقت یہ دستور کی دفعات کی پابندی کا عہد ہے کہ منصب و عہدہ کے دوران پوری امانت داری کے ساتھ دستور کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی جائے گی، یہ شرعی و اصطلاحی قسم نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ خلاف شریعت دستور کی پابندی کا عہد کرنا شرعاً جائز نہیں۔ فی الصاوی تحت قوله تعالى: إنكهم إذا مثلهم أي في الإثم أي ككفر أو غيره فالراضي بالكفر والراضي بالحرام عاص (صاوی مع جلالین ص ۷۳۲)۔

البتہ جب قانون ساز اداروں کی رکنیت اور اس کی وفاداری کا حلف ناگزیر مجبوری بن جائے اور ان چیزوں کی حفاظت اس کی رکنیت پر موقوف ہو جن کی حفاظت شریعت میں مطلوب ہے، وہ پانچ امور ہیں: (۱) دین (۲) نفس (۳) عقل (۴) نسل (۵) مال۔ ان پانچ امور کی حفاظت شریعت میں مقصود و مطلوب ہے، لہذا اگر ان کی حفاظت کماحقہ ایسے دستوری اداروں کی رکنیت پر موقوف ہو تو یہ ایک مجبوری ہے اور مجبوری میں بعض ناجائز امور بھی جائز ہو جاتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ صرف زبان سے اظہار تک کا معاملہ ہو دل سے رضاء بالکل نہ پائی جائے۔ اگر اس حلف میں دل سے رضاء بھی ہو تو یہ حرام ہونے کے ساتھ ساتھ اندیشہ کفر بھی ہے، اس لیے مجبوراً اگر ایسے قوانین کی پابندی کا عہد کرنا پڑے جس میں خلاف شریعت قوانین بھی شامل ہوں تو اس وقت اس نیت سے عہد کیا جائے کہ اس میں جو قانون جائز و مباح ہیں ان کی پابندی کی جائے گی اور جو قوانین خلاف شریعت ہیں اس کو بدلنے یا کم از کم اس کے ضرر کو کم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حاصل یہ کہ دستور سے وفاداری کا حلف و عہد بدرجہ مجبوری اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نیت صرف جائز و مباح قوانین کے پابندی کی ہو اور خلاف شریعت قوانین کا عہد صرف زبانی و رسمی ہو، کیونکہ یہ عہد اور حلف مقاصد شرع کی حفاظت کے لیے بدرجہ مجبوری ہے اور مجبوری کے یہی احکام ہیں اور مقاصد شرع کل پانچ ہیں:

مقصود الشرع خمسة وهو أن يحفظ عليهم دينهم ونفسهم وعقلهم ونسلهم وماله (المستصفیٰ ۷۸۲)۔

حضرات فقہاء نے غیر اللہ کی قسم کو ناجائز و حرام لکھا ہے، یہاں تک کہ متقدمین فقہاء نے قرآن کے حلف سے بھی منع کیا ہے۔ البتہ متاخرین فقہاء نے صفات الہی و کلام الہی کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے حلف کو جائز کہا ہے، لیکن دیگر کتب سماویہ محرفہ کے ذریعہ سے حلف میں تغلیظ کو اس لیے منع کیا ہے کہ اس حصہ سے بھی تغلیظ ہوتی ہے جو کلام الہی نہیں ہے، لہذا بغیر کسی سخت مجبوری و ضرورت کے کتب سماویہ محرفہ کو ہاتھوں میں لے کر قسم کھانا جائز نہیں۔ البتہ اگر کتب محرفہ پر حلف میں مجبوری ہو اور انصاف کا حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا ہی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ ان کو ہاتھ میں لے کر عہد و پیمانہ کیا جاسکتا ہے اور اس وقت نیت غیر محرف کی کرے۔

مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کیلئے غیر مسلم پارٹی میں شمولیت:

جب مسلمان اقلیت میں ہوں اور اپنی افرادی قوت سے نظام سیاست و حکومت قائم کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کسی غیر مسلم پارٹی میں شمولیت کے بغیر اہل اسلام کے مفادات کا تحفظ نہ ہو سکتا ہو تو ایسی مجبوری کے وقت ایسی غیر مسلم پارٹی میں شمولیت اختیار کی جائے جس کا ضرر و نقصان دوسری پارٹیوں کے مقابل میں کم ہو، اس لیے کہ اصول شرع کے اعتبار سے ایسی کسی بھی پارٹی میں شمولیت اور تعاون جائز نہیں جس کے دستور و منشور و قوانین خلاف شرع ہوں، لیکن جب یہ شمولیت مجبوری کی بنیاد پر ہو تو الضرورات تبیح المحظورات، الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف کے ضابطہ سے ایسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا جائز ہے جس کا نقصان کم از کم ہو اور یہ تعین کہ کس پارٹی سے ضرر و نقصان کم ہے اس کو پہچاننا بہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، لیکن ذاتی اغراض و مفاد سے اوپر اٹھ کر قوم کے مصالح و مفاد کو ملحوظ رکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون سی سیاسی جماعت اہل اسلام کے لیے کم ضرر رساں ہے اور یہ خیال کرنا کہ فلاں پارٹی مسلم دوست ہے اور ان کے تمام مصالح کی ضامن ہے۔ یہ ابلہ فریبی کے سوا کچھ نہیں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ولن ترضی عنک الیہود ولا النصارى حتی تتبع ملتہم (سورہ بقرہ: ۱۲۰)۔



مسلم دشمن پارٹی میں شمولیت کا حکم:

ایسی سیاسی پارٹی جو کھلم کھلا مسلم دشمنی کا اظہار کرتی ہو اور جن کا بنیادی مقصد اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہو، ایسی پارٹی میں شریک ہونا جائز نہیں اگرچہ کوئی شریک ہونے والا بذات خود نیک خصلت ہو اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہو، کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ اس پارٹی کی پالیسیاں مجموعی طور پر اپنے منشور کے خلاف نہیں ہوں گی۔

مسلم اقلیت کا سیاسی پارٹی تشکیل دینا:

وہ ممالک جہاں اہل اسلام اقلیت میں ہوں اور اپنی تعداد سے خود ایکشن وغیرہ جیتنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور غیر مسلم اکثریت ان کو ووٹ دینے اور سیاسی اتحاد پر راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں مسلم اقلیت کا اپنی سیاسی پارٹی کی تشکیل دے کر ایکشن لڑنا یہ اجتہادی مسائل میں ہے، اس میں اہل بصیرت اور سیاسی افکار و خیالات کے حاملین کا سخت اختلاف پایا جاتا ہے:

اول: امور سیاست سے تعلق رکھنے والے اکثر حضرات ہندوستان جیسے ممالک میں سیاسی پارٹی کی تشکیل کو اہل اسلام کے حق میں سخت مضرب خیال کرتے ہیں۔

دوم: مذکورہ بالا خیال کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں کسی سیاسی مسلم پارٹی کا قیام ضروری ہے جس کی وجوہات درج ذیل بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ جب مسلم ووٹ متحد ہو کر کسی سیاسی مسلم پارٹی کو ووٹ دے گا تو اگرچہ مسلم پارٹی جیتے گی نہیں، مبین سیکولر کا دعویٰ کرنے والی پارٹیوں کو ضرور ہرا سکتی ہے، ایسی صورت میں اقتدار کے لالچی سیکولر کا دعویٰ کرنے والے غیر مسلم پارٹیوں کے سربراہ مسلم پارٹی سے اتحاد پر آمادہ ہوں گے اور جب کوئی مسلم پارٹی بحیثیت ایک پارٹی کے اقتدار میں شریک ہوگی تو مسلمانوں کے جانی و ملی تحفظ کو زیادہ سے زیادہ دلا سکے گی۔ اس صورت میں اہل اسلام کا نفع زیادہ ہوگا، اہل اسلام دوسروں کے رحم و کرم پر نہ رہیں گے، بلکہ اپنے مفادات کا فیصلہ کرنے میں با اختیار ہوں گے۔

۲۔ وہ نقصانات جو فرقہ پرست پارٹیوں کی جیت کی صورت میں ظاہر ہونے کا اندیشہ کیا جاتا ہے وہ اندیشہ آج سیکولر کا دعویٰ کرنے والی پارٹیوں کے اقتدار کی صورت میں بھی کون سے ایسے نقصانات ہیں جو پائے نہیں جاتے صرف الفاظ کا فرق ہے، تمام غیر مسلم پارٹیاں مسلم دشمنی میں متحد و مساوی ہیں۔ فرق صرف لبادے کا ہے تو جن نقصانات کا خطرہ بتایا جاتا ہے وہ آج یقینی اور وقوعی ہیں۔ آسام کی صورتحال سب کے سامنے ہے وہ ہشت گردی کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ حکومتی نا انصافیاں کھلم کھلا ہیں، مدارس و مساجد کا تحفظ آج بھی دشوار ہے۔ فسادات کا تحفظ مفت ہے پھر ان حالات میں اگر اہل اسلام اپنی سیاسی پارٹی تشکیل دے کر اور مزید کچھ نقصان برداشت کر کے اپنے خلاف ہونے والے ظلم و حق تلفیوں کا مدد کریں تو یہ کوئی جرم نہیں بلکہ یہ نقل و عقل کے عین مطابق ہے، لہذا مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر یہ چیز لازم و ضروری ہو جاتی ہے کہ کوئی ایسی مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دے کر مسلم ووٹوں کو متحد کر کے مسلمانوں کو ہونے والے نقصانات کا بقدر استطاعت ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

جمہوری حکومت میں مسلم عورتوں کی شرکت:

اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ کا امداد الفتاویٰ (۹۱/۵-۹۳) پر مفصل کلام حدیث ”لن یفلح قوم ولوا أمرہم امرأۃ“ کے تحت موجود ہے وہ کلام بہت مفید ہے اس لیے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

حکومت کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم وہ جو عام بھی ہو عام بھی ہو، تام سے مراد یہ کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو، یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو اور عام یہ کہ اس کی حکومت کوئی محدود و قلیل جماعت نہ ہو، دوسری قسم وہ جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو، تیسری قسم وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو، مثال اول کی کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو، مثال ثانی کی کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلا شرکت ہو، مثال ثالث کی کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری درحقیقت والی نہیں بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور والی حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے، حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے۔ چنانچہ سبب ورود اس

حدیث کا کہ اہل فارس نے دختر کسریٰ کو بادشاہ بنایا تھا اور لفظ ”ولوا“ میں تولیت کے اطلاق سے متبادر اس کا کمال مفہوم ہونا پھر اس کی اسناد قوم کی طرف ہونا یہ سب اس کا قرینہ ہے، کیونکہ یہ طریقہ تولیت کا ملکہ کا سلطان ہی بنانے کے ساتھ خاص ہے کہ قوم کے اہل حل و عقد باہم متفق ہو کر کسی کو سلطان بنا دیتے ہیں اور سلطان کا کسی کو حکومت دینا یہ بھی بواسطہ سلطان کے قوم ہی کی طرف مسند ہوگا، بخلاف قسم ثانی کے کہ وہاں گوتولیت کامل ہوتی ہے مگر وہ مستفاد قوم سے حقیقت یا حکماً نہیں ہوتی اور بخلاف ثالث کے کہ وہاں گوا سناد اس کے قوم کی طرف صحیح ہے، اگر تولیت کامل نہیں ہے بلکہ وہ مشورہ محضہ ہے، کوئی اس مشورہ کو دوسرے منفرد مشورہ پر ترجیح ہو، لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے اور نہ تمام ارکان کے مخالف ہونے کی صورت میں بھی اسی کو سب پر ترجیح ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ قرینہ تو خود الفاظ حدیث سے ماخوذ ہے، اب دوسرے دلائل شرعیہ میں جو نظر کی جاتی ہے تو اس تفصیل کی تائید ہوتی ہے، حضرت بلقیس کی سلطنت کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے، اس میں آیت ہے: ما کنت قاطعة امرأ حتی تشهدون جس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سلطنت کا طرز عمل خواہ ضابطہ سے خواہ بلقیس کی عادت مستمرہ سے سلطنت جمہوری کا ساتھ اور بعد ان کے ایمان لے آنے کے کسی لیل سے ثابت نہیں کہ ان سے انتزاع سلطنت کیا گیا ہو، پھر ظاہر حکایت سلطنت اور عدم حکایت انتزاع سے اس سلطنت کا بحالہ باقی رہنا ہے اور تاریخ صراحتاً اسی کی موید ہے اور قاعدہ اصولیہ ہے کہ ”إذا قص الله ورسوله علينا أمراً من غير نكبر عليه فهو حجة لنا“ پس قرآن سے ظاہراً ثابت ہو گیا کہ سلطنت جمہوری عورت کی ہو سکتی ہے جو قسم ثالث ہے، حکومت کے اقسام ثلاثہ مذکورہ میں سے اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے اور عورت اہل ہے مشورہ کی، چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ پر عمل فرمایا اور انجام اس کا محمود ہوا اور اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو تو وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں، کیونکہ علت عدم فلاح کی نقصان عقل ہے اور جب مشورہ رجال سے اس کا انجبار ہو گیا تو علت مرتفع ہو گئی تو معلول یعنی عدم فلاح بھی منقش ہو گیا جیسے نقصان شہادت نساء انضمام شہادت رجال سے منجبر ہو جاتا ہے سلطنت بلقیس میں یہ شق بھی محتمل ہے جس کی طرف اوپر اس عبارت سے اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ خواہ بلقیس کی عادت مستمرہ اس اور حدیث شیخین میں ہے: فالإمام الذي على الناس راع الى قوله عليه السلام والمرأة راعية على بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنهم، لفظ راعیہ مثل لفظ ”راع“ جو اس سے قبل ہے مستعمل ہے معنی حاکم میں، اس حدیث سے قسم ثانی کا عورت کے لیے مشروع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورۃ کی شرط صحت اور قضاء میں گو شرط صحت نہیں مگر شرط صحت عن الاثم فرمایا ہے اور وصیت و شہادت میں کسی درجہ میں اس کو شرط نہیں کہا۔ ہکذا فی الدر المختار، باب الإمامة و کتاب القاصی الی القاضی، قضا کے اس حکم مذکور قسم اول و ثانی کے احکام کی تصریح ہے اور قسم ثالث مقیس ہے، قسم ثانی پر لا شتر کہا جانی کو نہ غیر جائین لوصف التمام والعموم جب دلائل بالا سے ثابت ہو گیا کہ حدیث میں مذکور قسم اول ہے تو معلوم ہو گیا کہ ایسی ریاستیں جو آج کل زیر فرمان عورتوں کے ہے، اس حدیث میں داخل نہیں، اس لیے کہ اگر اس کے محکومین کو مختصر قرار دیا جاوے تب تو وہ قسم ثانی ہے اور اگر اس جماعت کو مختصر نہ قرار دیا جائے جیسا ظاہر بھی ہے تب بھی وہ درحقیقت جمہوری ہے یا تو ظاہراً بھی جہاں پارلیمنٹ کا وجود مشاہد ہے اور یا صرف باطناً جہاں پارلیمنٹ تو نہیں ہے لیکن اکثر احکام میں کسی حاکم بالا سے جو صاحب سلطنت یا نائب سلطنت ہو منظوری لینا پڑتی ہے، پس اس طور سے وہ قسم ثالث ہے اور اب یہ بھی شبہ نہ رہا کہ ظاہراً یہ ریاست مثل قاضی کے ہیں اور قاضی عورت کا حکم حدود و قصاص میں نافذ نہیں ہوتا کما صرح بہ الفقہاء تو ایسے احکام کے نفاذ کی ان ریاست میں کوئی صورت صحت کی نہ ہوگی و جردنغ شبہ کی ظاہر ہے کہ وہ ریاست اولاً تو ولایت جمہوری ہے اور علی السبیل التزل یوں کہا جائے گا کہ چونکہ قضاۃ تو ذکور ہیں، اس لیے وہ احکام نافذ ہو جائیں گے، جیسا فقہاء نے قضاۃ منصوبین من السلطان غیر المسلم کے جمیع احکام کو صحیح و نافذ فرمایا ہے بالجملہ تحقیق مذکور سے ثابت ہو گیا کہ یہ ریاستیں عدم فلاح کے حکم سے بری ہیں۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

## جمہوری ممالک میں الیکشن اور اسلام کا نقطہ نظر

مفتی محمد نصر اللہ ندوی

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کے ذریعہ انسان اپنی رائے اور اندرونی خیال کا اظہار کرتا ہے کہ فلاں شخص اس کے نزدیک سب سے زیادہ لائق، امانت دار اور ثقہ ہے، اس لیے ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہے۔

ووٹ کا حکم:

موجودہ زمانہ میں ووٹ کی حیثیت صرف شہادت کی نہیں، بلکہ وہ جمہوری نظام حکومت میں ارباب حکومت کی اصلاح اور منکرات کی روک تھام کا ایک بڑا ذریعہ بھی ہے اور ہر مسلمان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ نیکی کو عام کرنے اور برائی کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ حدیث شریف میں ہے:

”من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان“ (مسلم حدیث نمبر: ۱۷۵)۔

لہذا اگر کوئی مسلمان ووٹ نہیں ڈالتا ہے تو گویا وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض منصبی سے پہلو تہی کرتا ہے اور حقدار تک حق پہنچانے میں کوتاہی کرتا ہے۔

واضح ہو کہ انتخابی مہم کے دوران امیدوار ہر ممکن طریقہ سے لوگوں سے رابطہ کرتا ہے، گھر گھر پہنچ کر ذاتی طور سے ملاقات کرتا ہے، پوسٹر، بینر، ہینڈ بیل، اشتہارات کے ذریعہ ووٹروں سے اپنے حق میں ووٹ ڈالنے کی اپیلیں کرتا ہے، گویا وہ ہر دوڑ سے اپنے حق میں گواہی طلب کرتا ہے۔ فقہی نقطہ نظر سے اگر گواہی طلب کی جائے اور اندیشہ ہو کہ اگر گواہی نہیں دی جائے گی تو حقدار کی حق تلفی ہوگی تو گواہی دینا واجب ہو جاتا ہے، اس لیے اگر کوئی امیدوار اس لائق ہو کہ اسے ووٹ دیا جائے اور نہ دینے کی صورت میں اس کی شکست کا ظن غالب ہو تو ووٹ ڈالنا واجب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولا يَأْبُ الشُّهَادَةَ إِذَا مَا دَعُوا“ (البقرة)، ”ولا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبِهِ“ (البقرة)، ”وأقيموا الشهادة لله“ (الطلاق)، ”يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على أنفسكم أو الوالدين والأقربين“ (النساء)۔

صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں:

إلا أن في الشهادة القائمة على حدود الله وأسبابها لا بد من طلب المشهود له لوجوب الأداء فإذا طلب وجب الأداء عليه حتى لو امتنع بعد الطلب ياتر لقوله تعالى: ولا يَأْبُ الشُّهَادَةَ إِذَا مَا دَعُوا أي دعوا لأداء الشهادة، لأن الشهادة أمانة المشهود له في ذمة الشاهد، قال سبحانه تعالى: ”إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها فليؤدوا الذي أوتمن أمانته“ (بدائع الصنائع ۶۰۲۸۲)۔

علماؤنا دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

البتہ اگر کوئی امیدوار معیار مطلوب پر پورا نہ اترتا ہو تو ایسی صورت میں ووٹ ڈالنا واجب نہیں ہوگا۔

### ایکشن میں امیدوار بننا:

عصر حاضر میں جمہوریت کے اندر جو مفسد ہیں ان میں ایک بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ ملک کا کوئی بھی شہری بشرطیکہ اس کی عمر ۲۱ سال ہو اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر ایکشن میں پیش کر سکتا ہے، خواہ اس کے اخلاق و اطوار کیسے ہی کیوں نہ ہو، اور اس کا ماضی کتنا ہی سیاہ کیوں نہ ہو جس کا نتیجہ ہے کہ آج قانون ساز اداروں میں ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کا پس منظر مجرمانہ اور جن کی شبیہ داغدار ہے۔ چنانچہ اب آئینی اداروں سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور پارلیمنٹ اور اسمبلی کا احترام تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے۔

ایسے میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ایسے لوگ میدان میں آئیں جن کا کردار صاف ستھرا ہو اور وہ خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہوں، نیز ان کو یقین ہو کہ وہ پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دے سکیں گے۔

لہذا اگر کوئی شخص مذکورہ صفات کا حامل ہو تو اس کے لیے ایکشن میں اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر پیش کرنا جائز ہے تاکہ زمین سے فساد کا خاتمہ ہو، عوام کے مفاد کا تحفظ ہو اور ملک خوشحالی اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہو سکے۔

ممتاز عالم دین شیخ عبدالرحمن البراک اس مسئلہ پر اپنے فتویٰ میں فرماتے ہیں:

فالواجب علی المسلم أن يفعل مما أوجب الله من تقواه ونصر دينه، ومن التعاون على البر والتقوى ما يستطيع، كما ينبغي له أن يفعل من الخير ما يقدر عليه مما يكفر الخير ويخفف الشر... آگے لکھتے ہیں:

ويجب على من يرشح لهذه المهمة بهذه النية ممن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله ويؤمن بقوله تعالى: "إن الحكم إلا لله" (الانعام: ۵۷) يجب عليه أن يخلص لله في مشاركته وأن يجتهد في تخفيف الشر، وأن لا يطالب بهذه المشاركة عرضاً من الدنيا ولا جاهاً عند الناس، كما يجب على أن يبرأ من كل ما يوضع في القانون من الباطل، مما لا يستطيع دفعه، وليس من الحكمة ترك الأمر لأهل الباطل، يحققون ما ربهم دون أن يجدوا معارضا من أهل الحق، فينبغي للمسلمين أن يجتهدوا فيما يمكن للخير ويدفع الشر، أو يخففه حسب الإمكان والله تعالى أعلم (المشاركة في الانتخابات النيابية ونحوها - ص: ۳)۔

لیکن اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ وہ ممبر اسمبلی یا ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے کے بعد عوام کے مفاد کا خیال نہیں کر پائے گا اور اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ نہیں ہو پائے گا تو اس کے لیے ایکشن میں امیدوار بننا جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ بحیثیت ممبر اسمبلی یا پارلیمنٹ اس کے اوپر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ ایک قومی امانت ہے اور جو شخص امانت کو ضائع کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی سخت باز پرس ہوگی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

وقد دلت سنة رسول الله ﷺ أن الولاية أمانة يجب أدائها في مواضع مثل ما تقدم ومثل قوله لابي ذر: "إنها أمانة وإنها يوم القيامة خزي وندامة إلا من أخذها بحقها وأدى الذي عليه فيها" رواه مسلم، وروى البخاري في صحيحه عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه أن النبي ﷺ قال: "إذا ضيبت الأمانة انتظر الساعة، قيل: يا رسول الله! وماذا إضاعتها؟ قال: إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة"، وقد أجمع المسلمون على معنى هذا فإن وصى اليتيم وناظر الوقف ووكيل الرجل في ماله عليه أن يتصرف له بالأصلح فالأصلح كما قال تعالى: "ولا تقربوا مال اليتيم إلا بالتي هي أحسن" ولم يقل إلا بالتي هي حسنة وذلك لأن الوالي راع على الناس بمنزلة راعي الغنم، كما قال النبي ﷺ: "كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته" فالإمام الذنب على الناس راع وهو مسئول في رعيته والمرأة راعية في بيت زوجها وهي مسئولة عن رعيته، والولد راع في مال أبيه وهو مسئول عن رعيته والعبد راع في مال سيده

وهو مسئول عن رعيته ألا فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته“ اخرجاه في الصحيحية (السياسة الشرعية: ۱۷)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص کے اندر امانت کو ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اس کے باوجود بھی وہ اس کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے اوپر نیز ان لوگوں کے اوپر جن کے حقوق اس سے وابستہ ہیں ظلم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے۔

قانون ساز اداروں کی ممبر شپ اختیار کرنا:

اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ یا پھر اس کے واسطے سے نبی اور رسول۔ کسی انسان کے ہاتھ میں قانون سازی کا اختیار دینا شرعاً درست نہیں ہے، مثلاً ممبران پارلیمنٹ وغیرہ کو لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر مسلمان ایسے اداروں سے کنارہ کش ہو جائیں تو ان کی حالت ناگفتہ بہ ہو جائے گی اور ترقی کے میدان میں ان کے امکانات معدوم ہو جائیں گے، یہی نہیں بلکہ قانون سازی کا پورا اختیار ملحدوں، کافروں اور مشرکوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا، پھر مسلمانوں کی جو درگت بنے گی اس کے تصور ہی سے حساس دل رکھنے والے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

لہذا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایسے اداروں سے دست کش ہو جائے بلکہ ان پر لازم ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں قانون ساز اداروں کی رکنیت اختیار کریں، لیکن ان کا مقصد ذاتی مفاد کا حصول نہ ہو، بلکہ ان کا نصب العین یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری کرے گا، اور دستور میں ان کو جو بنیادی حقوق دیے گئے ہیں ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا، نیز اللہ کی سر زمین پر عدل و انصاف کے قیام میں معاون بنے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (المائدہ)۔

سعودی عرب کے ممتاز علماء کی فتویٰ کمیٹی ”اللجنة الدائمة للبحوث والإفتاء“ نے اس مسئلہ کے بابت جو فتویٰ دیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ کریں:

ليس للمسلم (المرشح والمترشح) أن يتابع ويعمل بكل ما يصدر عن الناس النيابية من تشريعات وقوانين، بل ما كان منها موافقا للشريعة فيقره، ويعمل بمقتضاه موافقة للشريعة لالناس النواب، وما كان منها معارضا للشريعة وجب رده وعدم العمل بمقتضاه، فضلا عن إقراره لما ثبت في الصحيح عن النبي ﷺ أنه قال: ”إنما الطاعة في المعروف“ وقال: على المسلم الطاعة في أمر أحب أو كره ما لم يؤمر بمعصية وقال: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“ وقال: ”من أمركم بمعصية الله فلا تطيعوه“ (مجموع الفتاوى للجنة ۲۳، ۲۰۶)۔

معلوم ہوا کہ اگر مسلمان کافروں کے تحت رہ کر (جیسا کہ دنیا کے بیشتر آئینی اداروں کا حال ہے) لوگوں کے دینی و دنیوی حقوق کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ بالکل قانون ساز اداروں سے دست بردار ہو جائیں اور اپنے آپ کو ایک ایسی حکومت کے حوالہ کر دیں جو ان کے حقوق کو پامال کرے، بلکہ جس کے لیے مسلمانوں کا وجود ہی ناقابل برداشت ہو۔

سعودی عرب کے ممتاز عالم دین شیخ ابن باز اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

هذا الدخول خطير يعني برلمانات ومجالس نيابية ونحوها، الدخول فيها خطير، لكن ممن دخل فيها عن علم وبصيرة يريد الحق ويريد أن يوجه الناس إلى الخير ويريد أن يعرّف الباطل، ليس الأصل هو الطمع في الدنيا ولا الطمع في المعاش وإنما قد دخل لينصر دين الله وليجاهد في الحق، بهذه النية الطيبة أنا أرى أنه لا حرج في ذلك وإنه ينبغي حتى لا تخلو هذه الناس من الخير وأهله (مجلة لواء الإسلام العدد الثالث، ذوالقعدة: ۱۳۰۹)۔

دستور سے وفاداری کا حلف:

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جمہوری نظام میں حصہ لینا اور آئینی اداروں کا ممبر بننا از روئے مصلحت مسلمانوں کے لیے

ضروری ہے، تاہم اس نظام میں کچھ مفاسد بھی ہیں جن میں سے کچھ کا تذکرہ گزشتہ سطور میں آچکا ہے، ان مفاسد میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں دستور سے وفاداری کا حلف لینا پڑتا ہے۔ حالانکہ اس میں کچھ چیزیں خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ضرورت کے پیش نظر ایسا کرنے کی گنجائش ہوگی۔ فقہ کا قاعدہ ہے: الضرر الأشد يزال بالأخف۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دستور سے وفاداری کا حلف لینا شرعاً ناجائز اور دینی نقطہ نظر سے مضر ہے، تاہم اس سے گریز کرنے کی صورت میں مسلمانوں کا جو نقصان ہوگا وہ ناقابل بیان ہے۔ لہذا اس بلائے عظیم کو دفع کرنے کے لیے اس سے اہوں ضرر کو گوارا کرنا جائز بلکہ کبھی واجب ہوگا۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے لکھا ہے کہ اگر معصیت پر اعانت کسی عظیم مصلحت کا ذریعہ ہو اور عدم اعانت کسی بڑے فساد کا سبب ہو تو ایسی صورت میں معصیت پر اعانت درست ہوگی۔

فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ”الأمور بمقاصدھا“ یعنی شریعت میں بہت سی چیزوں کا دار و مدار ان کے مقاصد پر رکھا گیا ہے، لہذا دستور سے وفاداری کا حلف اس کے مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے درست ہوگا اور وہ مقصد ہے ملت کے مفاد کا تحفظ۔

### بائبل کی قسم کھانا:

بائبل ایک آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، باوجودیکہ وہ تحریف کا شکار ہو گئی اور اس کی حقیقت فنا ہو گئی، تاہم اصلا وہ آسمانی کتاب تھی۔ کتب فقہ میں اس بابت صراحت موجود ہے کہ اگر کوئی شخص یوں قسم کھائے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں انجیل سے بری ہو جاؤں تو یہ قسم منعقد ہو جائے گی اور وہ اگر قسم پوری نہیں کرتا ہے تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔

لیکن یہاں پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان کو بائبل پر حلف لینے کے لیے مجبور کرنا جمہوری نظام کی صریح خلاف ورزی ہے، کیونکہ جمہوریت میں ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے، پھر کیوں مسلمانوں کو بائبل پر حلف اٹھانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے؟ دراصل یہ یہود و نصاریٰ کی ایک خطرناک سازش ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو اپنے دین و ایمان سے برگشتہ کرنا اور ان کے اوپر زبردستی عیسائیت کو تھوپنا ہے، لہذا اگر کسی ملک میں اس طرح کا قانون ہے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جمہوری دائرہ میں اس کے خلاف آواز بلند کریں۔

### سیکولر پارٹی میں مسلمانوں کی شمولیت:

اسلام کا منشا یہ ہے کہ حکومت و سیاست کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو دینی جذبہ سے سرشار ہوں۔ جن کی رگوں میں عشق الہی کا خون گردش کر رہا ہو۔ اگر ایسے لوگ نہ ہوں تو پھر جو اوروں سے غنیمت ہوں یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام ایران پر روم کی فتح سے خوش ہوتے تھے، اس لیے کہ رومی عیسائی تھے جبکہ ایرانی مجوسی اور عیسائیت جو عیسائیت کے مقابلہ اسلام سے قریب تر ہے۔

اس لیے سیکولر ملک میں جو پارٹی اسلام اور مسلمانوں کے لیے کم سے کم نقصان دہ ہو اس میں شمولیت اختیار کرنا، اس کی طرف سے انتخاب لڑنا نیز اس کی حکومت میں شامل ہونا درست ہوگا۔

### مسلم دشمن پارٹی میں شمولیت:

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہے، مسلمانوں کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کے بارے میں کفر کا اندیشہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَأَن احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ...“ الآية آگے فرماتا ہے:

”أَفحکم الجاهلیة بیغنون ومن أحسن من الله حکما لقوم یوقنون“ (المائدة)۔

### علیحدہ مسلم سیاسی جماعت کا قیام:

مسلمان اس دنیا میں خیر امت بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

”کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله“ (النساء)۔  
 ارشاد نبوی ہے: ”من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان“ (مسلم)۔

اس وقت پورا ملک کرپشن، بدعنوانی، مہنگائی، غربت، فقر وفاقہ، بے روزگاری اور بھیاں تک جرائم سے دوچار ہے۔ آئے دن اخبارات میں اس طرح کے شرمناک اور روح فرساں واقعات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات کو تبدیل کرنے، ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے نیز عدل و انصاف کو قائم کرنے کی پہلی ذمہ داری کس کی بنتی ہے؟  
 یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ آج کے دور میں قوت نافذہ کے بغیر نہ تو ظلم کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عدل کو قائم کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ زمانہ جس کی لائٹھی اس کی بھینس کا مصداق ہے۔ اس لیے مذکورہ آیت کے ضمن میں حکومت کا بھی قیام داخل ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان اپنی پارٹی بنا لیں تب بھی انہیں سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا ہے کو پھر پارٹی بنانے سے کیا فائدہ؟

بلاشبہ یہ اشکال اپنی جگہ درست ہے، لیکن اس میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ مسلم سیاسی جماعت دوسروں کے مقابلہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ زیادہ کرے گی۔ اس کے زیر سایہ مسلمان بے خوف ہو کر امن و سلامتی کے زندگی گزاریں گے اور ایک نئے جوش و جذبہ کے ساتھ ترقی کے میدان میں آگے بڑھیں گے۔

ایک شبہ عام طور پر یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس قدم سے مسلم مخالف ووٹ متحد ہو جائے گا جس سے فرقہ پرست طاقتوں کا بہت فائدہ ہوگا۔  
 یہ صرف ایک خام خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تجربات و مشاہدات کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ آسام میں مولانا بدرالدین اجمل کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ کیا اس سے وہاں کے ہندوؤں کا ووٹ متحد ہو گیا؟ کیرالہ میں مسلم لیگ کا قابل ذکر تناسب ہے اور حکومت میں دخل بھی۔

☆☆☆

## ایکشن کے مسائل - اسلامی تناظر میں

مفتی شبیر احمد دیوبندی

ووٹ کی از روئے قرآن و سنت چند حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس کو اپنا ووٹ دے رہا ہے اس کے متعلق گویا اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے جو سخت گناہ کبیرہ اور وبال دنیا و آخرت ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کا ذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار کیا ہے: قال رسول اللہ ﷺ: "إن من أكبر الكبائر الشرك بالله وعقوق الوالدين واليمين الغموس" (بحوالہ مشکوٰۃ شریف باب الاقضية والشهادات، ص: ۳۲۸)۔

لہذا جس حلقہ میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے، لہذا ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رکمی مروت یا کسی طمع اور خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔

ووٹ کی دوسری حیثیت شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے۔ اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے: "ومن يشفع شفاعة حسنة يکن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يکن له كفل منها" یعنی جو شخص اچھی اور عمدہ سفارش کرتا ہے اس کو اس میں بھی حصہ ملتا ہے اور جو بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے اور اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق، ظالم کی سفارش کرے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے بیخ سالہ دور میں جو نیک عمل یا بد عمل کرے گا ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی ہے اور اس کا نفع و نقصان صرف اس کی ہی ذات کو پہنچتا ہو تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کے گردن پر رہا۔

مذکورہ الصدر بیان میں جس طرح قرآن و سنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے، بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے، قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب و لازم بھی فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "کونوا قوامین للہ شهداء بالقسط" اور ایک جگہ فرمایا ہے: "کونوا قوامین بالقسط شهداء للہ" ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں بلکہ اللہ کے لئے ادا کی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں۔ نیز ایک آیت میں تو اللہ نے کتمان شہادت کو واضح انداز میں حرام و گناہ کہا ہے، ارشاد ہے: "ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فانه آثم قلبه" یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے: ارشاد باری ہے: "ولا تکتبوا الشهادة ومن یکتبها فانه



آثم قلبہ“ اور حدیث میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے: ”قال رسول اللہ ﷺ: من كتم شهادة إذا دعي إليها كان كمن شهد بالزور“ (جمع الفوائد ۲۳۱/۲، مکتبہ مجمع الشيخ زکریا)۔ بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے یہ پسند کیا ہے کہ مطالبہ سے پہلے اپنا فریضہ ادا کر دے۔ دعوت و ترغیب کا انتظار نہ کرے، چنانچہ حضرت زید بن خالدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها“ (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، ص: ۳۲۷)۔

ووٹ بھی بلا شیخی ایک شہادت ہے، قرآن و سنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا یہ دینداری کا تقاضہ نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ لیکن اگر اپنا ووٹ اپنی دیا نندارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلق کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں حالانکہ وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ یہ اس کا اہل نہیں ہے یا اس کے مقابلے میں دوسرا اس سے زیادہ حقدار ہے، تو اس نے شرعی و دینی لحاظ سے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ اس نے آیت کریمہ: ”وإذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربى“ کے خلاف ورزی کی۔ نیز قرآن کریم میں تو جھوٹی شہادت کی مذمت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے ارشاد ہے: ”فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور“۔

۲، ۱، ۳۔ ان مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت میں شہادت ہی بہتر ہے تاکہ قرآن و احادیث میں جو شہادت صحیحہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور غلط بیانی پر جو وعید بیان کی گئی ہے، اس کے پیش نظر صاحب ووٹ اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کرے، غلط استعمال سے ڈرے، لہذا اب جبکہ ووٹ کی حیثیت شہادت ٹھہری تو ووٹ دینا واجب اور ضروری ہوگا۔ رہی بات امیدواری کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا تو اس میں اصل یہی ہے کہ اولاً خود کو پیش نہ کرے، لیکن جب اس میدان میں کوئی منصف و عادل و خدا ترس، رحم دل شخص نہ ہو تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہو، حق و انصاف کا دامن گیر ہو تو اس وقت امیدواری کے لئے اپنے کو پیش کرنا ضروری ہوگا تاکہ پوری قوم و ملت پر امن و سلامتی قائم ہو اور شرعی آزادی کی فضا قائم ہو۔ نیز اس کی ایک نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آپ کو ایسے وقت میں اس کام کے لئے پیش کرنا موجود ہے۔

۴۔ کسی بھی ممالک کے قانون ساز ادارے کا ممبر بننا جو خلاف شریعت قانون کو پاس کرے اس وقت درست ہوگا جبکہ وہ اس نیت سے بنے کہ خلاف شریعت قانون کو ختم کروں گا اور پھر یہ کہ ان قوانین سے متفق بھی نہ ہو تو اجازت ہوگی۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں اور ان سے دستور سے وفاداری کا جو حلف لیا جاتا ہے جبکہ اس کے بعض دفعات اسلام کی مخالفت پر مشتمل ہوتے ہیں تو ان اراکین کے لئے اس وقت حلف و وفاداری کی اجازت ہوگی، جبکہ وہ اس شرط اور نیت کے ساتھ حلف اٹھائے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا اور پارلیمنٹ جانے کی نیت بھی یہ ہو کہ میں اپنی قوم اور وطن کے حقوق کی حفاظت کروں گا اور حکومت کے ظلم و تشدد کا سدباب کروں گا (ماخوذ از کفایت الفتی ۳۷۲/۹)۔

۶۔ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من حلف بنخیر الله فقد كفر أو أشرك“ (ترمذی شریف: ۲۸۰) نیز قتادی عالمگیریہ میں ہے: ”أما اليمين بنخیر الله فنوعان: أحده اليمين بالآباء والأبناء والملائكة والصوم والصلاة وسائر الشرائع والكعبة الحرم وزمزم ونحو ذلك، ولا يجوز الحلف بشئ من ذلك (۵۷/۲) آگے ص: ۶۰ پر ہے: ”من حلف بنخیر الله لم يكن حالفاً كالنبي والكعبة هذا في الهداية“ اور الفقہ الاسلامی وادلتہ میں دکتور وہب زحلی اسی کے آگے لکھتے ہیں: ”وقال محمد بن مقاتل الرازی: لو حلف بالقرآن قال: يكون يمينا وبه أخذ جمهور مشايخنا هذا في المصمرات“۔

مذکورہ حدیث اور فقہی عبارات سے معلوم ہوا کہ حلف باللہ کی ہی اجازت ہے اور غیر اللہ پر حلف لینا جائز نہیں، لہذا موجودہ بائبل چونکہ تحریف شدہ ہے، اس لئے اس کو کتب سماویہ میں شمار کر کے ان پر حلف لینے کو درست نہیں کہا جاسکتا، لہذا غیر اللہ میں بائبل کا شمار ہوگا اور اس پر حلف لینا درست نہ ہوگا۔

ہاں مجبوراً بلا نیت تعظیم اور حصول اعتماد کے لئے حلف اٹھانے کی گنجائش ہوگی۔ دیکھئے مکہ فقہ اکیڈمی کا فیصلہ (قرارات مجلس مجمع الفتی

۸، ۷۔ ایسی سیاسی پارٹیاں جن کے اندر قوم پرستی اور تعصب و نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اسلام و مسلمانوں کی کھلی دشمنی پر مبنی ہوں تو ایسی پارٹی میں شرکت بالکل ناجائز نہ ہوگا، بلکہ ارشاد باری تعالیٰ: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ“ (یعنی گناہ اور سرکشی کے کام میں تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرو) کی وجہ سے حرام ہوگا۔ ہاں اگر بالکل کوئی خیر خواہ پارٹی نہ ہو مگر دوسری پارٹی کے مقابلے میں اچھی ہو تو اس صورت میں فقہی قاعدہ ”إذا تعارض مفسد تان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“ کہ جب دو مفسدوں میں تعارض ہو جائے تو خفیف ضرر کو گوارا کر کے شدید ضرر سے بچا جائے گا کے تحت اس میں شریک ہونا جائز ہوگا، نیز اس پارٹی میں شریک ہو کر خلاف شریعت چلنے والے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کی نیت بھی ہو۔

۹۔ جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں ہرگز مسلمان اپنی الگ جماعت قائم نہ کرے، بلکہ جمہوری پارٹی کو ترجیح دے۔ اس لئے کہ مسلمان کی حکومت تو حالات کے پیش نظر ایسے ملک میں محال کے درجے میں ہے۔ نیز الگ تنظیم قائم کرنے کی بنیاد پر اسلام دشمنی اور مخالفت میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور شریعت پر چلنا دشوار ہو جائے گا جو کہ اصل مقصود ہے، لہذا صرف اسی نیت سے کہ اسلام پر چلنا نصیب ہو جمہوریت کو ترجیح دی جائے اور اس طرح کا عمل نبی کریم ﷺ سے بھی ثابت ہے، جو یشاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے (تفصیل کے لئے کتاب الفتاویٰ دیکھئے)۔

۱۰۔ صحیح بخاری میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد متعدد طرق صحیح سے مروی ہے: ”لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ (کتاب الغازی ۶۳۷/۲) وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے معاملات کی ذمہ داری کسی عورت کے سپرد کر دے۔ اس حدیث میں یہ وضاحت بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی، جبکہ ایران کے باشندوں نے ایک عورت (بنت بوران بنت شیریہ) کو اپنا سربراہ بنا لیا تھا، لہذا یہ حدیث عورت کو سربراہ بنانے کے عدم جواز پر واضح دلیل ہے۔

نیز اس پر اجماع امت بھی ہے کہ عورت سربراہی نہیں کر سکتی، چنانچہ امام الحرمین اپنی کتاب غیاث الامم میں فرماتے ہیں: ”وأجمعوا أن المرأة لا يجوز أن تكون إماماً، واختلفوا في جواز كونها قاضية فيما تجوز شهادتها فيه“ نیز امام موصوف نے اپنی کتاب الارشاد فی اصول الاعتقاد میں امام بننے کی جو شرط ذکر کی ہے اس میں سب سے پہلی شرط ”الذکورۃ“ (یعنی مذکر) ذکر کی ہے۔ اسی طرح علامہ تفتازانی نے بھی شرح المقاصد میں اس کی متابعت کی ہے۔ ان الفاظ میں ”یشترط ان یکون مکلفاً حراً ذکراً عدلاً“ (تفصیل کے لئے دیکھئے نوادر الفقہ ۱۵۲/۲)۔

ان ساری آیات و روایات و اقوال سلف کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ عورت کے لئے کسی صورت میں جائز نہیں کہ وہ کسی بھی طرح کے عہدہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے۔ (خواہ امیدواری کے لئے پیش کرنا ہو یا قانون ساز اداروں کی ممبری کے لئے) بلکہ اس طرح کرنے میں نصوص کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ ہاں و دنگ کے لئے جاسکتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ پردے کا مکمل اہتمام ہو اور اپنے شوہر یا پھر اپنے محارم کے ساتھ ہو۔ چونکہ اپنے محارم وغیرہ کے ساتھ شریعت نے سفر کی اجازت دی ہے۔

واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم۔

☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

مفتی سلمان پالنپوری قاسمی ؒ

ووٹ کی شرعی حیثیت:

۱۔ کسی امیدوار ممبر کو ووٹ دینے کی از روئے شرع چند حیثیتیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔ ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور اسے اس ملک و ملت کے لئے مفید و خیر خواہ سمجھتا ہے۔

ب۔ دوسری حیثیت شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس امیدوار کے لئے ایک اہم عہدہ سنبھالنے کے لئے سفارش کرتا ہے۔

ج۔ ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹر اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت، دوسرے سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نا اہل شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن اثرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے (مستفاد از جواہر الفقہ ۹۲/۲-۹۱)۔

ووٹ دینے کا حکم کیا ہے؟

۲۔ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَرَ قَلْبِهِ (البقرة: ۲۸۳) (تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے)، نیز ارشاد خداوندی ہے: وَلَا يَأْبُ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دَعُوا (البقرة: ۲۸۳) (اور گواہ انکار نہ کریں جب وہ گواہی کے لئے بلائے جائیں)۔ نیز حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ كَتَمَ شَهَادَةً إِذَا دُعِيَ إِلَيْهَا كَانَتْ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّورِ“ (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ۶۲) (جس کسی کو شہادت کے لئے بلا یا جائے اور وہ شہادت کو چھپا دے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جھوٹی گواہی دینے والا) بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا فریضہ ادا کر دے اور اس میں کسی کی ترغیب کا انتظار نہ کرے۔ چنانچہ حضرت زید بن خالد روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِينَ يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَسْأَلَهَا (جمع الفوائد بحوالہ مالک و مسلم ۲۶۱) (کیا تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہیں؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے)۔ حاصل یہ کہ ووٹ کی حیثیت شہادت کی سی ہے اور شہادت کبھی واجب کے درجہ کو پہنچتی ہے اور کبھی استحباب اور اباحت کے درجہ میں ہوتی ہے۔ لہذا جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور ملک و ملت بالخصوص مسلمانوں کے حق میں مفید معلوم ہو اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا، جبکہ اسے ووٹ کی شدید ضرورت ہو (اسے ووٹ نہ دینے کی صورت میں کسی خائن، مسلم دشمن امیدوار کے جیت جانے کا قوی اندیشہ ہو) تو اسے ووٹ دینا واجب ہے اور اس وقت اپنے ووٹ کو محفوظ رکھنا یا کسی خائن و بددیانت کو ووٹ دینا پوری قوم و ملت پر ظلم کے مرادف ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے قرآن کریم کی آیت: وَلَا يَأْبُ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دَعُوا کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے: إِذَا

مدرسہ جامعہ خلیفہ ماہی شمالی گجرات۔

كانت الضرورة وخيف تعطل الحق أدنى خوف قوى الندب وقرب من الوجوب وإذا علم أن الحق يذهب ويتلف بتأخر الشاهد عن الشهادة فواجب عليه القيام بها لاسيما إن كانت محصلة وكان الدعاء إلى أدائها (الجامعة لاحكام القرآن ۲۹۸/۲)۔

اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح قابل اور مفید معلوم نہ ہو، مگر ان میں سے کوئی دوسروں کی بہ نسبت کم نقصان دہ ہو تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دینا جائز، بلکہ مستحسن ہے جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے پر تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہاء نے تجویز فرمایا ہے (جواہر الفقہ ج ۲/۲۹۳) حاصل یہ کہ وہ ووٹ دینا ہر صورت میں تو واجب ہو سکتا ہے، مثلاً کسی مسلم دشمن یا ملک دشمن پارٹی کو اقتدار سے روکنے کے لئے ووٹ کا استعمال کرنا ضروری ہو (مستفاد از کفایت الحق ۲۷۹/۳)۔

ایکشن میں امیدوار بننا:

۳۔ انگریزوں کا رائج کردہ جمہوری نظام، حکومت اور طریق انتخابات عقل و نقل ہر اعتبار سے محل نظر ہے اور موجودہ دور میں اس نظام میں اتنی خرابیاں در آئی ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس عمل میں کسی طرح بھی حصہ لینا بجائے خود ایک مفسدہ ہے، لیکن بد قسمتی سے چونکہ اب یہ نظام اکثر ممالک میں جڑ پکڑ چکا ہے اس کو نظر انداز کرنا مشکل ترین امر ہے اور اگر مسلمان اس سے بالکل الگ تھلگ ہو جائیں تو ان کے حقوق کے ضیاع کا واقعی خطرہ موجود ہے، اس لئے مجبوراً اس بڑے اور سنگین خطرہ سے بچنے کے لئے جمہوری ممالک کے ایکشن کے عمل میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لینے کی اجازت دی جائے گی تاکہ کسی نہ کسی درجہ میں حقوق کے تحفظ کا نظم ہو سکے۔ الاشاہ والنظائر میں ہے: اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضرراً یارتکاب أخفهما (الاشاہ ۱۳۵ بحوالہ جواہر الفقہ ۲/۲۹۳)۔

جو شخص کسی مجلس کی ممبری کے انتخاب کے لئے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے، ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا وہ امیدوار ہے، دوسرا یہ کہ وہ اس کام کو امانت و دیانت داری سے بخوبی انجام دے گا، اب اگر واقعی وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی وہ اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت داری سے اس کام کو بخوبی انجام بھی دے گا تو اس کا یہ عمل یعنی اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا کسی حد تک درست ہے، لیکن چونکہ جو کوئی خود اپنے آپ کو امانت و وزارت کے لئے پیش کرتا ہے، تو شریعت ایسے اقدام کی نفی کرتی ہے اور ایسے کام میں اللہ رب العزت کی مدد بھی شامل حال نہیں رہتی ہے، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے روایت ہے: قال رسول اللہ ﷺ: لا تسأل الإمارة فإنك إن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها (نسائی شریف ۲۵۸/۲ کتاب الامارة)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آپ عہدہ کا سوال نہ کیجئے، اس لئے کہ اگر آپ کو سوال کے بعد عہدہ دیا جائے گا تو آپ عہدہ کے حوالہ کر دیئے جائیں گے (اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ نہیں رہے گی) اور اگر آپ کو کوئی عہدہ بغیر سوال کے عطا کیا جاوے تو اس پر آپ کی مدد کی جائے گی)۔

لہذا اس کام کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ از خود اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش نہ کرے، بلکہ مسلمانوں کی جماعت اسے اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر لیں، البتہ اگر کسی علاقہ میں کوئی بھی شخص ان لوگوں میں سے ہو جو امیدوار بننا چاہتے ہیں، بظاہر اس عہدہ کا اہل نہ ہو اور جو لوگ اس عہدہ کے اہل ہیں امیدوار بننے کے لئے تیار نہیں اور ایک شخص کو اپنے متعلق یہ معلوم ہو کہ اگر یہ عہدہ مجھے مل جاوے تو دوسروں کے مقابلہ میں امت مسلمہ کو زیادہ راحت پہنچا سکتا ہوں اور لوگ اس کی اس اہلیت سے ناواقف ہوں، تو ایسے موقع پر اجعلنی علی خزائن الأرض إني حفيظ عليه (سورہ یوسف: ۵۵) کے پیش نظر ایسے شخص کے لئے از خود اس عہدہ کا مطالبہ کرنا جائز، بلکہ مستحسن ہے۔

اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت و لیاقت نہیں وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو وہ قوم و ملت کا خائن و غدار ہے، اس کا امیدواری میں کامیاب ہونا ملک و ملت کے لئے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا پہلے تو وہ خود غدار اور خیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بنے گا (مستفاد از جواہر الفقہ ۲۹۱/۲ و فتاویٰ حنائیہ ۳۱۵/۲)۔

## قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

۴۔ اسلامی یا غیر اسلامی ملکوں میں ایسے قانون ساز ادارے جو مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں ان اداروں کا ممبر بننے کے صحیح ہونے نہ ہونے کے متعلق قدرے تفصیل ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

اگر ایسے مخالف شریعت قانون ساز اداروں کی ممبری قبول نہ کرنے سے خود ان کو یا عامۃ المسلمین کو ضرر شدید لاحق ہونے کا غالب گمان ہو اور ممبر بننے والے شخص کو یہ امید اور توقع ہو کہ وہ ایسے قانون ساز اداروں کا ممبر بن کر مسلمانوں کے مذہبی اور قومی مفادات کو حاصل کرنے اور نقصان سے بچانے میں کوئی اہم رول ادا کر سکے گا، تو ایسے موقع پر قاعدہ شرعیہ: اذا تعارض مفسدات روعی اعظمہما ضرر ابار تکاب اخفہما (الاشیاء: ۱۲۵) کہ اشد المفسد تین سے بچنے کے لئے اخف المفسد تین کو اختیار کر لیا جاتا ہے، لہذا ایسے موقع پر اس کے لئے گنجائش ہے اور ہے تو یہ بھی براہی، لیکن دوسرے مفسدہ کی بہ نسبت پھر بھی اخف ہے اور بڑا مفسدہ یہ ہے کہ ہماری قوم دوسروں سے بالکل مغلوب نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ہم بھی حاکم ہوں گے اور قانون ساز اداروں کے ممبر ہوں گے تو ہم پر اگر ظلم بند نہیں تو کم ضرور ہوگا۔

الغرض اس قسم کی ممبری اور عہدوں کو اگر مضرت کو دفع کرنے کی غرض سے اختیار کیا جاوے تاکہ امت مسلمہ کو کفار کی جانب سے جو مظالم و مضرتیں پہنچتی ہیں، اہل مناصب بقدر امکان ان کو دفع کریں گے اور اگر بقدر امکان دفع نہ کر سکیں تو تغلیل و تخفیف تو کر سکیں گے، اس وقت ایسے اداروں میں بدرجہ مجبوری ممبر بننے کی گنجائش ہے، البتہ اگر کوئی شخص ایسے قانون ساز اداروں میں محض حصول نفع (دنیوی مقصد) کی غرض سے ممبری حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے ایسے اداروں کا ممبر بننا درست نہیں (مستفاد از اسلامی حکومت و دستور مملکت حضرت تھانوی ص ۲۳۶-۲۳۸)۔

واضح رہے کہ ایسے قانون ساز اداروں میں ممبر بننے کا جواز خصوصی حالات اور مصالح پر مبنی ہے جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا اور ایسے اداروں کا ممبر بننے والے کے لئے حتی الامکان شرعی حدود پر قائم رہنا لازم ہے اور جب کبھی خلاف شرع کوئی قانون بنایا جائے تو اس قانون کے مفسد اور مضرتیں حسن اسلوب سے عقلی طور پر سیاسی اور عام فہم زبان میں دیگر ارکان کو مثبت انداز میں سمجھا کر اپنے بس کی مخالفت کا اظہار کرے، کیونکہ خلاف شرع قانون ہمیشہ مفسد ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس کی بات نہ مانی جائے تو پھر مجبوری ہے، اس کی ذمہ داری اس پر نہ ہوگی ان شاء اللہ۔

## دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا:

۵۔ دستور سے وفاداری کا حلف یہ ایک قسم کا عہد ہے کہ دستور کے دفعات کی پابندی کی جائے گی اور رکن رہنے کے دوران پوری امانت داری اور باریکی کے ساتھ ذمہ داریوں کی ادائیگی کی جائے گی۔ دقیق معنوں میں وہ شرعی حلف نہیں ہے، جمہوری ممالک میں جہاں نظم و انتظام کا تعلق انتخابات سے ہے، وہاں قانون ساز اداروں کے اراکین کو ملک کے جن دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے، ان میں مخالف شرع قوانین کچھ ہی ہوتے ہیں، ورنہ اکثر قوانین درست، بنیادی مقاصد و مصالح پر مبنی ہوتے ہیں، لہذا وہ قوانین جو شریعت کے خلاف ہیں، ان کو ”لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق“ کی وجہ سے مستثنیٰ کر کے خصوصی حالات (مسلمانوں کے حقوق کا ضیاع یا ظلم کے بڑھ جانے کا خطرہ ہو تو رکنیت قبول نہ کرنے کی صورت میں) میں بیشتر درست قوانین کی طرف نظر کرتے ہوئے اس شرط اور نیت سے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا، اس طرح دستور سے حلف وفاداری اٹھالینے کی گنجائش ہو سکتی ہے، چنانچہ مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

”حلف وفاداری اس شرط اور نیت سے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا، اٹھالینے میں مضائقہ نہیں“ (کفایت المفتی ج ۲۲/۹۳)۔

## بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانا:

۶۔ ہندوستان کی عدالتوں میں مسلمانوں سے قرآن اور ہندوؤں سے شاستر اٹھوایا جاتا ہے، لیکن بعض مغربی ممالک میں عدالت میں ہر شخص اس بات

پر مجبور ہوتا ہے کہ تورات یا انجیل پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا عہد کر لے، مسلمان چونکہ ان کتابوں کو محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں، اس لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں، کیونکہ یہ ان کتابوں کی تعظیم اور بحالت موجودہ ان کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے مرادف ہوگا، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ دیگر ممبران سے قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف لینے کا مطالبہ کریں، اگر ان کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا جائے اور وہ اس پر مجبور ہوں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ موجودہ بائبل پر اس کی تعظیم کا ارادہ کئے بغیر اپنا ہاتھ رکھ کر اللہ کی قسم کھانے کی گنجائش ہے، چنانچہ اسی مسئلہ کے متعلق رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامی فقہ اکیڈمی کے اجلاس منعقدہ ۸ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء جن نکات پر متفق ہوئے، ان میں سے ایک یہ ہے:

”اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم کھانے والے کے لئے توریٹ یا انجیل یا دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمان کو چاہئے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا“ (قرارات مجلس مجمع الفقہی الاسلامی ۱۴۰۲/۸۵)۔

۷۔ وہ سیکولر پارٹیاں جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہوں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغائر ہوں، تو ایسی پارٹیوں میں شریک ہونے، ان کی حمایت کرنے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے کا مسئلہ حالات اور مصالح سے متعلق ہے۔ حالات اور مصالح جس کے متقاضی ہوں، اس اعتبار سے ان میں شریک ہونے، ان کی حمایت کرنے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ اس وقت کے مخلص خیر خواہ مسلم قائدین کی صواب دید پر موقوف ہے، چنانچہ اگر کسی ملک میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور مسلمانوں کی اپنی کوئی سیاسی پارٹی بھی نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے مخلص خیر خواہ مسلم قائدین کی رائے میں اپنے ملی، مذہبی اور معاشی حقوق کے تحفظ اور تحصیل انصاف و دفع ظلم یا تقلیل ظلم کے لئے کسی بھی غیر مسلم پارٹی کی حمایت اور اس میں شرکت ضروری ہو اور سب غیر مسلم پارٹیاں ایسی ہیں جن کے منشور کے بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغائر ہیں یا وہ خود اسلام و مسلمانوں کی دشمن ہیں، تو ایسی صورت میں ان سیکولر پارٹیوں میں شریک ہونے، ان کی طرف سے انتخاب لڑنے اور ان کی حکومت میں شامل ہونے کی گنجائش ہو سکتی ہے جو نسبتاً دوسروں سے بہتر ہوں اور ان کے ساتھ شریک ہونے پر یہ امید اور توقع ہو کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی مفادات کو حاصل کرنے اور نقصانات سے بچانے میں کوئی اہم رول ادا کر سکیں گی، اور اس وقت اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ بڑے شر اور ضرر سے بچنے کے لئے کمتر درجہ کے شر اور ضرر کو گوارا کیا جائے، چنانچہ فقہاء نے اس طرح کے اصول و قواعد کو مختلف الفاظ اور تعبیرات میں بیان کیا ہے: ”اذا تعارض مفسدتان روعی اعظهما ضرراً بارتکاب أخفهما“ جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی کو گوارا کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا (الاشاہ والنظار لابن نجیم ج ۱/۸۹)

مسلم مخالف پارٹی میں شمولیت:

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور انکے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، اور ان کے مقاصد میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا، ستانا، اور ان کو تباہ کرنا، ان کے مقدس مقامات کو ختم کرنا، کفر و شرک کی کھلم کھلا اعانت کرنا اور اس کو غالب کرنا ہو، تو ان میں مسلمانوں کی شرکت اور حمایت جائز نہیں، کیونکہ ایسی پارٹی میں شریک ہونا یا اس کے کسی امیدوار کو جتنا پارٹی کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہوگا اور بالواسطہ اس کے باطل عزائم اور نظریات کی تائید کرنا ہوگا، جس سے اسلام اور مسلمانوں کا نقصان ہوگا اور یہ شرعاً معصیت کی تائید اور اس پر تعاون ہوگا جو کہ ناجائز و حرام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب (سورہ مائدہ: ۲) (گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر کسی مسلمان کی یہ نیت ہو کہ وہ مسلم مخالف پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، تو کیا اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دو شرطوں کے ساتھ کسی مسلمان کو مسلم مخالف پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہو سکتی ہے:

۱۔ مسلم مخالف پارٹی میں شریک ہونے والے مسلمان کو قوی توقع ہو کہ وہ اس پارٹی کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش میں کامیاب ہو جائے گا۔  
 ۲۔ کسی مسلمان کے مسلم مخالف پارٹی میں شامل ہونے سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو۔ (اور یہ ناممکن ہے)۔  
 لیکن مسلم مخالف پارٹیوں کے مقاصد، عزائم اور رویہ کو دیکھتے ہوئے مذکورہ دونوں شرطوں کا پایا جانا بظاہر معذور معلوم ہوتا ہے، اس لئے کسی مسلمان کو مسلم مخالف پارٹی میں شامل ہونے کی بحالت موجودہ اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ”دفعہ الفسرد مقدم علی جلب المنفعة“ کے اصول کی روشنی میں۔

### مسلم اقلیت کا علیحدہ سیاسی پارٹی قائم کرنا:

۹۔ اگر اس طرح مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی پارٹی قائم کرنا موجودہ حالات میں زیادہ مضر ہو تو دفع المضرة اولیٰ من جلب المنفعة کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی پارٹی قائم کرنا درست نہیں، بلکہ کسی سیکولر پارٹی میں جو دوسروں سے نسبتاً بہتر ہو، ضم ہو جانا زیادہ مناسب ہے۔  
 بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں مسلمان فرعی اختلافات کو بنیاد بنا کر کئی ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں، وہاں مسلمانوں کا مسلم سیاسی پارٹی قائم کر کے متحد و متفق ہو جانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

### ایکشن میں خواتین کا کردار:

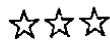
۱۰۔ الف۔ ہمارے ملک کے قانون کے تحت عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور موجودہ دور میں ووٹنگ میں حصہ لینے کے ساتھ بہت سے ملی و مذہبی مفاد وابستہ ہیں، لہذا مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اس جمہوری حق سے فائدہ اٹھا کر پردہ اور دیگر امور شرعیہ کا خیال کرتے ہوئے ووٹنگ میں حصہ لینا چاہئے، شرعاً عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینا ممنوع نہیں ہے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی فرماتے ہیں: ”عورتوں کا ووٹ بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا“ (کفایت الفتی ج ۱/۹ ص ۳)۔

ب۔ اس پر فتن دور میں حالات کے پیش نظر ایکشن میں عورت کا امیدوار بننا درست نہیں، کیونکہ موجودہ حالات میں انتخابات کے لئے ہم چلانے کے دوران اور جیت جانے کے بعد بھی عورت کے لئے پردہ اور دیگر حدود شرعیہ کا لحاظ رکھنا بہت مشکل نظر آتا ہے، چنانچہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

”اسلامی نقطہ نظر سے عورت ایکشن میں امیدوار نہیں ہو سکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سینیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا چارہ کار نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر راضی نہ ہوں تو کمتر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی امیدوار بنائیں“ (نئے مسائل اسلامی نقطہ نظر صفحہ ۱۲۶)۔

حضرت کفایت اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں: ”بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لئے مستحسن نہیں، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت معذور ہے“ (کفایت الفتی ج ۱/۹ ص ۳) تاہم اگر کوئی عورت غیر شرعی امور کا ارتکاب کئے بغیر ایکشن لڑے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، لیکن عصر حاضر میں یہ معذور ہے، لہذا ضرورت شدیدہ کے بغیر جائز نہیں۔

ج۔ عام حالات میں عورتوں کے لئے قانون ساز اداروں کا ممبر بننا درست نہیں، کیونکہ عورتوں کے لئے ممبر بننے کے بعد پردہ اور دیگر امور شرعیہ کا لحاظ مشکل ہے، ہاں خصوصی حالات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حاصل یہ کہ عورتوں کو عام حالات میں ایسے اداروں کی رکنیت اختیار کرنے سے احتراز کرنا چاہئے، جن میں امور شرعیہ کی رعایت کرنا مشکل ہے۔



## ایکشن سے متعلق شرعی مسائل

مولانا عبداللطیف پالنپوری

(ج: ۲) شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَرَ قَلْبِهِ الْآيَةَ“ لہذا جس حلقہ انتخاب میں صحیح نظریہ کا حامل، قابلیت رکھنے والا، دیا نندار نمائندہ کھڑا ہو تو اس کو ووٹ دینا چاہئے اور ایسے موقع پر ووٹ دینے سے غفلت برتنادست نہیں ہے اور جس نمائندہ کے بارے میں ضمیر و دیانت کا فیصلہ یہ ہو کہ یہ صحیح نظریہ کا حامل نہیں ہے یا قابلیت اور دیانتداری نہیں ہے یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلہ میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے، پھر بھی محض ذاتی تعلقات کی بنا پر اسے ووٹ دینا جھوٹی گواہی کے ذیل میں آتا ہے اور روپے پیسے لے کر کسی نا اہل کو ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے (جو اہر الفقہ ۲/۲۹۵، فقہی مقالات ۲/۲۹۱)۔

(ج: ۳) عام اسلامی حکم یہی ہے کہ از خود کسی عہدہ یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا ناجائز نہیں ہے، اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ”لَا تَسْأَلُ الْإِمَارَةَ فَإِنَّ أُعْطِيَتْهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وَكَلْتَ إِلَيْهَا وَإِنْ أُعْطِيَتْهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ اعْتَبَرْتَ عَلَيْهَا“ (بخاری شریف، ج: ۲، ص: ۱۰۵۸، طبع قدیم)۔

لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص جو اہل ہے خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو اہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے، تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ”اجعلنی علی خزائن الارض“ فرمانا اسی صورت پر محمول ہے۔..... اس شرعی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ انتخابات میں امیدوار بننا جائز نہیں ہے، لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو صالح اور اہل افراد اگر طلب اقتدار کے جذبے کے بجائے اصلاح حال کی غرض سے امیدوار بنیں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفاسد، سب و شتم، غیبت اور دوسرے محرّمات و منکرات سے مکمل پرہیز کا پورا اہتمام ہو (فتاویٰ عثمانی، ج: ۳، ص: ۵۰۷)۔

(ج: ۴) جمہوری ملک یا اسلامی ممالک کے قانون ساز اداروں کا اس نیت سے ممبر بننا جائز ہے کہ مخالف شریعت قوانین کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور ان کو رد کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ مسلمانوں کے مذہبی حقوق محفوظ رہیں اور اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر دے تو اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینا چاہیے، پارٹی کی پالیسی جو شریعت کے خلاف ہے اس کے مطابق ووٹ نہیں دینا چاہئے۔

(ج: ۵) جو شخص قانون ساز ادارے کا رکن منتخب ہو وہ حلف اٹھاتے وقت خلاف شریعت دفعات کا اپنے حلف میں استثناء کر دے۔

(ج: ۶) مسلمان چونکہ بائبل، توراہ وغیرہ کتابوں کو محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں، اس لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں، البتہ اگر اس پر مجبور ہوں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ ہاتھ رکھا جاسکتا ہے (جدید فقہی مسائل، ج: ۱، ص: ۴۶۹)۔

(ج: ۷) جمہوری ملک میں ووٹ اسلام اور کفر کی بنیاد پر نہیں دیئے جاتے اور نہ ہی اس بنیاد پر ایکشن لڑے جاتے ہیں، لہذا جس سیکولر پارٹی کے متعلق

ملک جامعہ نذیریہ کاکوی، گجرات۔



یہ توقع ہو کہ وہ صحیح خدمت کرے گی، نفع پہنچائے گی، حقوق دلوائے گی، ظلم کو روکے گی، مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرے گی، ایسی پارٹی میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہے۔ ساتھ ہی اسلام مخالف دفعات کو ختم کرنے کی سعی جاری رکھنا چاہئے (فتاویٰ محمودیہ)۔

(ج: ۸) جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونا جائز نہیں ہے اور اس نیت سے شریک ہونا کہ ایجنڈا بدلنے کی سعی کرے گا بظاہر بے سود ہے۔

(ج: ۹) وقت کے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر جو صورت مسلمانوں کے حق میں مفید ہو وہ اپنائی جائے۔

(ج: ۱۰) قرآن کریم وحدیث میں عورتوں کے لئے پردے کا حکم فرض درجہ کا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی ذمہ داری امور خانہ داری اور بچوں کی تربیت کی رکھی ہے، جبکہ ایکشن امیدواری اور قانون ساز اداروں کی ممبری کے ساتھ نہ پردے کا اہتمام ہو سکتا ہے، نہ امور خانہ داری کی انجام دہی پورے طور پر ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں عورتوں کے لئے ایکشن میں امیدواری اور قانون ساز اداروں کی ممبری کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ نیز جبکہ حدیث شریف میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے: "لن یفلح قوم ولوا أمرہم امرأۃ (بخاری شریف، ج: ۲، ص: ۶۳، طبع قدیم) اور ترمذی شریف کی روایت میں ہے: "وإذا كانت أمراءکم شرارکم وأغنیائکم بخلانکم وأمورکم إلى نساءکم فبطن الأرض خیر لکم من ظہرها" (ترمذی شریف ۵۲۲)۔

حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم کا ایک فتویٰ ہے: "مرد امیدواروں کی موجودگی میں جو بہترین نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اسے ووٹ دینا شرعاً جائز نہیں ہے (فتاویٰ عثمانی، ج: ۳، ص: ۵۱۳)۔

البتہ مفتی سعید احمد پالپوری دامت برکاتہم تحفۃ اللمعی میں تحریر فرماتے ہیں: "رہی استیلاء وتغلب کی صورت تو اس میں بالاجماع عورت کی امارت درست ہے، اس کے احکام نافذ اور واجب الاطاعت ہوں گے اور ایکشن پارٹی، ووٹ اور اکثریت تغلب ہی کی صورت ہے، کیونکہ جمہوریت میں سرگنے جاتے ہیں، بھیجا نہیں دیکھا جاتا (تحفۃ اللمعی، ج: ۵، ص: ۶۳۹)۔

ہاں! پردے کے اہتمام کے ساتھ عورتیں ووٹ دے سکتی ہیں۔



## ایکشن سے متعلق شرعی مسائل - ہندوستان کے تناظر میں

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی

ہندوستان جیسے ملک میں اسلامی حکومت کا قیام فی الوقت ممکن نہیں ہے اور دنیا کے قوانین کچھ ایسے ہیں کہ مسلم ممالک کی طرف ہجرت بھی نہیں کی جاسکتی، پھر جب رہنا نہیں ہے تو ایکشن سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرنے سے اسلام پر مکمل طور پر دشمنوں کے حاوی ہوجانے کا خطرہ ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایکشن سے مسلمانوں کے وسیع ترقی دینی و ملی مفاد متعلق ہیں۔ اگر وہ جمہوری نظام سے بے تعلق ہوجائیں تو اس سے ان کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے اور ان کے مفاد پر کاری ضرب لگ سکتی ہے جس کے بعد مسلمانوں کے لیے اپنے تعلیمی اور تبلیغی مساعی کا جاری رکھنا بہت ہی مشکل ہوجائے گا، اس لیے ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے میدان تعلیم، تجارت، صنعت اور فلاحی کاموں میں امتیاز اور تفوق پیدا کریں اور معاشرے میں ایسا لازمی عنصر بن جائیں جس کی ہر جگہ ضرورت پڑے، خاص قسم کے حالات میں اگر مفاد عامہ وابستہ ہوں تو غیر شرعی نظاموں میں شرکت کی گنجائش ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں وزیر خزانہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اجعلنی علی خزائن الارض (یوسف: ۵۵)۔

اور ظاہر ہے کہ اس وقت مصر قوانین الہیہ کے تابع حکومت نہیں تھی، اس کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام کی اس نظام میں شرکت پر قرآن شہادہ ہے، اس لیے ایکشن میں شریک ہونے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہے کہ کسی ناجائز چیز کا ارتکاب نہ ہو ورنہ جس گناہ کے کام کا ارتکاب وہ کرے گا اس کا گناہ اس پر ہوگا، اسی طرح ایکشن میں شرکت اتنی ہی ہوجتی شرعاً ضروری ہے۔ موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

سوال: ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: کسی امیدوار کو ووٹ دینے کی قرآن وحدیث کی رو سے چند حیثیتیں ہیں:

ووٹ کی پہلی شرعی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے اور اس کے بارے میں گواہی دے رہا ہے کہ میں اس کو قوم و ملک کے لیے مفید اور خیر خواہ سمجھتا ہوں اور یہ شخص اس کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت وامانت بھی اور اگر واقعی اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹ دیتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے کہ وہ جھوٹی شہادت دیتا ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور دنیا و آخرت میں وبال کا ذریعہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی شہادت کو اکبر الکبائر فرمایا ہے: من اکبر الکبائر شهادة الزور (بخاری: ۶۸۴۱)۔

جس حلقہ سے چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹ کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اکبر الکبائر میں اپنے آپ کو بتلا کرنا ہے۔ ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسی روایات یا کسی طمع و خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔

ووٹ کی دوسری شرعی حیثیت شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ وہ اپنے اس امیدوار کے لیے ایک اہم عہدہ کی نمائندگی اور ذمہ داری کی سفارش کرتا ہے، اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹ کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے:

من يشفع شفاعتة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعتة سيئة يكن له كفل منها (النساء: ۸۵) یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور جو شخص بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے۔

اچھی سفارش یہ ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق،

طریق دار عرفات، رائے بریلی۔

ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہمارے دوٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پانچ سالہ دور میں جو بھی اچھا یا برا کام کرے گا ہم بھی اس میں شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل نامزد کرتا ہے، اس طور پر کہ وہ سیاسی مسائل میں نمائندگی اور وکالت کرے گا، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی ہے اور اس کا نفع و نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا ہے تو اس کا یہ خود مدار ہوگا مگر یہاں ایسا نہیں، کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق سے متعلق ہے جس میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لیے اگر کسی نااہل کو اپنا ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت دوسرے سفارش تیسرے وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح اور قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب ہے، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن اثرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

جس طرح قرآن و سنت کی رو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے بلکہ ایک شرعی فریضہ ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب و لازم بھی فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کونوا قوامین بالقسط شهداء للہ (نساء: ۱۳۵) (اللہ کے لیے ادا کی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں)۔

اس آیت میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں۔

تیسری جگہ سورہ طلاق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

واقیموا الشہادۃ للہ (طلاق: ۲) (یعنی اللہ کے لیے سچی شہادت کو قائم کرو)۔

ایک آیت میں سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ قرار دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولاتکتبوا الشہادۃ و من یکتبھا فانہ اثم قلبہ (بقرہ: ۲۸۳) (یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے)۔

ان تمام آیتوں نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں، سچی گواہیاں ضرور دیں۔

سوال: اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا، ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

جواب: انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم شہادت کی ہے جس کا چھپانا اور اس میں جھوٹ بولنا، اس پر کوئی معاوضہ لینا یہ سب حرام ہیں، اس کو محض ایک سیاسی ہارجیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ ووٹ بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن و سنت کے تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دیانت داری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

۲۔ آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعہ جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا اور وہ اس سلسلہ میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا ان کی ذمہ داری آپ ہی پر عائد ہوگی، آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۳۔ سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، اس لیے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل اور دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

۴۔ جو امیدوار نظام اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے تو اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵۔ ووٹ کو پیسوں کے معاوضہ میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند نکتوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے، دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلہ میں کوئی دانشمندی نہیں ہو سکتی۔

سوال: ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ کسی ناجائز چیز کا ارتکاب نہ ہو، ورنہ جس گناہ کا ارتکاب وہ کرے گا اس کا گناہ اس پر ہوگا، اسی طرح ایکشن میں شرکت اتنی ہی ہوتی ہے جو شرعاً ضروری ہے۔ امیدوار وہی ہو سکتا ہے جس کو اپنے بارے میں مکمل اعتماد ہو کہ وہ حقیقتاً علم ہے یعنی امانت دار اور اپنی ذمہ داری سے واقف ہو، اور اس کی ادائیگی کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو۔ انتخابی مہم چلاتے وقت اس کا خاص خیال رکھا جائے کہ کوئی بھی خلاف واقعہ بات نہ کی جائے، نہ بے جا الزامات لگائے جائیں اور نہ ہی اپنی جھوٹی تعریف کی جائے، اس طرح کی مہم میں شرکت انشاء اللہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن اور بعض اوقات اس سے بھی بڑھ کر ہوگی۔

سوال: غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں، خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبر کے لیے وہپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا؟

جواب: مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک میں قانون ساز ادارے جو مخالف شریعت قوانین بناتے ہیں ان اداروں کا ممبر بننا درست نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہندوستان کے قانون کے مطابق جب پارٹی اپنے ممبر کے لیے وہپ جاری کر دیتی ہے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہوگا، اب اسے اپنے آپ پر اختیار نہیں کہ وہ اپنی ضمیر کی آواز پر ووٹ دے، لیکن اگر وہ ایسے موقع پر جو پارٹی نے وہپ جاری کی ہے اس پارٹی کی وہپ کو نہ مانے اور پارٹی کو بدل دے تو اس کے لیے اس پارٹی کا ممبر بننا درست ہوگا، اس لیے کہ جب وہ اس پارٹی سے الگ ہو گیا تو وہ اپنے ووٹ پر اختیار رکھتا ہے، اور پارٹی کے جاری کردہ وہپ سے ہٹ کر اپنا ووٹ استعمال کر سکتا ہے، اگر اس طرح وہ کرتا ہے تو اس کے لیے اس پارٹی کا ممبر بننا درست ہو جائے گا اور اب اسے پارٹی کے جاری کردہ وہپ کے خلاف ووٹ دینے کا اختیار ہے، لیکن اگر وہ پارٹی کے جاری کردہ وہپ پر قائم رہتا ہے تو اس کے لیے پارٹی کا ممبر بننا درست نہیں ہوگا۔

سوال: جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

جواب: جس ادارے کا قانون شریعت کے خلاف ہو اس ادارے کا رکن بننا درست نہیں ہے، جن اراکین کو دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے، اگر اس دستور کی دفعات شریعت کے مطابق ہے تو اس کا حلف لینا درست ہے اور اگر اس دستور کی دفعات شریعت کے خلاف ہے تو اس پر عمل درست نہیں ہوگا اور اگر وہ خلاف شریعت دستور کی دفعات پر عمل کرتے ہوئے اس پر حلف اٹھاتا ہے تو یہ حلف اٹھانا اس کے حق میں صحیح نہیں ہوگا، اور اگر وہ شریعت کے خلاف حلف اٹھالیتا ہے تو وہ شریعت سے بغاوت کرنے والا سمجھا جائے گا اور شریعت سے بغاوت کرنا اپنے آپ کو نقصان میں ڈالنا ہے۔

سوال: بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

جواب: انجیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے، مسلمانوں کے دلوں میں اس کی عظمت اسی طرح ہے جس طرح قرآن مجید کی ہے، لیکن یہ عظمت اس وقت ہے جبکہ وہ اپنی اصل نازل کردہ شکل میں موجود ہو جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور اگر اس طرح نہیں تو عام کتابوں کی طرح یہ بھی ایک کتاب سمجھی جائے گی، اس لیے مسلمان ارکان کے لیے بائبل پر حلف لینا اسی وقت صحیح ہوگا جبکہ وہ محرف نہ ہو (یعنی اس میں کسی طرح کی کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی ہو) تب تو اس پر حلف لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر وہ بائبل محرف ہے (تبدیل کردہ ہے) تو پھر اس بائبل پر حلف لینا جائز نہیں ہوگا۔ آج کل جو بائبل چل رہی ہے وہ محرف ہے اس لیے موجودہ بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف لینا صحیح نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کی منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفاد کے مخالف

ہوتی ہے، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

جواب: جن پارٹیوں کی منشور اسلام یا مسلم مخالف ہوں وہ چاہے کتنی ہی مسلمانوں کے مفاد کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہوں، ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ جب وہ اسلام اور مسلمان کے کھلے طور پر دشمن ہیں تو وہ مسلمانوں کا تحفظ کیسے کرے گی اور اس طرح کی پارٹی سے جب یہ ممکن نہیں تو ایسی پارٹی میں شریک ہونا اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا یا کسی کو لڑوانا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز نہیں ہوگا۔

سوال: جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

جواب: سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلمانوں کی دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہے، ایسی پارٹی میں مسلمان کا شریک ہونا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ جب مسلمان اس پارٹی میں شامل ہوگا تو وہ ان کے منشور میں بھی داخل ہوگا اور ان کے منشور میں داخل ہونا یہ ایک طرح سے ان کے منشور میں شامل چیزوں کا تعاون کرنا ہے اور ہر وہ چیز جو انسان کو معصیت کی طرف لے جائے اس کے تعاون کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔

معصیت میں تعاون کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (السائدہ: ۲) (گناہ اور معصیت کے کاموں میں تعاون نہ کرو)۔

البتہ اگر کوئی اس نیت سے ایسی پارٹی میں شامل ہوتا ہے کہ وہ اس کے منشور کو بدل دے گا تو اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی اجازت ہونی چاہیے، لیکن یہ شرکت اس وقت ہے جبکہ وہ منشور میں داخل چیزوں پر عمل نہ کرتے ہوئے اس پارٹی کے منشور کو بدل دے، لیکن اگر وہ اس منشور کو بدل نہیں سکتا تو پھر اس کے لیے شرکت جائز نہیں ہوگی۔

سوال: ایک ایسا ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں؟

جواب: جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور وہاں مسلمانوں کو اسلام کے مطابق کوئی کام کرنے کو نہ ملتا ہو، بلکہ سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہو تو ایسے ملک میں مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی جماعت بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ جب مسلمان اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکامات کے مطابق عمل نہیں کر سکتے تو الگ سے سیاسی جماعت بنانے سے کیا فائدہ؟

ایسے ملک یا ایسے علاقے میں اگر مسلم سیاسی جماعت بنائی گئی ہو تو اس سے مسلمانوں کو فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا اور اس کا نقصان اس شکل میں ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کے ووٹ آپس میں منتشر ہو جائیں گے، اس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے اور امیدوار کئی ہوں گے اور جب ایسا ہوگا تو لازماً دوسری تنظیمیں اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گی، اس لیے جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں اور انہیں سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہو تو وہاں مسلمانوں کو الگ سے سیاسی جماعت نہیں بنانا چاہیے، اس لیے کہ ایسا کرنے سے دوسری تنظیموں کو فائدہ ہوگا۔ اپنوں کو نقصان پہنچا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہماری سمجھ سے عقلمندی کی بات نہیں۔

سوال: ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ الیکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، کیا انہیں ووٹ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لیے الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں.....؟

جواب: امور سلطنت، ملکی نظم و نسق اور قیادت کا منصب مردوں کو عطا کیا گیا ہے اور یہ نہیں کو زیب دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مرد کو عورت کا حاکم بنایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہ علی بعض وبما أنفقوا" (سورۃ النساء: ۳۴) (مرد عورتوں پر نگران اور حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے مرد کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ نفقہ ادا کرتے ہیں)۔

ظاہر ہے کہ عظیم ذمہ داری مردوں کو ان کی عقل، فہم اور قوت فیصلہ، نیز ان کی جاں نشانہ محنت کی وجہ سے دی گئی ہے اور عورتیں اس صفت سے عموماً عاری

ہوتی ہیں، اس لیے وہ ملک کا نظم و نسق بہتر طریقے سے نہیں کر سکتی ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ (بخاری کتاب المغازی: ۴۲۲۵) (جس قوم کی قیادت عورت کے ہاتھ میں ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی)۔ فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت امیر یا خلیفہ نہیں بن سکتی، عورت کے لیے یہ منصب سنبھالنا درست نہیں ہے بلکہ اس منصب کے لیے مرد کا ہونا ضروری ہے۔

مذکورہ دلائل اور فقہاء کے اصول کی روشنی میں یہی حکم ممبر یا وزیر یا کسی بھی سیاسی نمائندہ بننے کے متعلق بھی ہوگا، یعنی عورت کے لیے سیاست میں حصہ لینا، لیڈری کرنا، انتخابات لڑنا درست نہیں ہے، کیونکہ ان تمام چیزوں میں غیر مردوں کے ساتھ میل جول ضروری ہے، جبکہ شریعت نے مرد و عورت کے ملاپ سے صاف منع کیا ہے۔

عورت کو ووٹ ڈالنے کے سلسلہ میں معاصر فقہاء کی دونوں رائیں ہیں:

بعض حضرات عورت کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتے ہیں، اس لیے کہ یہ عام انسانی حقوق میں ہے اور انسانی حقوق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے کسی عورت کو محروم نہ رکھا جائے، عورت کو ووٹ ڈالنے سے محروم رکھنا درست نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی لکھتے ہیں کہ ووٹ ڈالنے میں مرد و عورت کا میل جول ضروری ہے جبکہ شریعت نے اختلاط سے منع کیا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ عورت کے لیے ووٹ کے مراکز الگ سے قائم کئے جائیں، مراکز الگ قائم ہونے کی صورت میں عورت ووٹ دینے جا سکتی ہے (المرأة بین الفقه والقانون: ۱۵۵)۔

جبکہ بعض دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ انتخاب میں گواہی اور وکالت کے ساتھ مذکورہ منصب کے لیے مناسب فرد کا چننا ہوتا ہے اور یہ کام عورت سے نہیں ہو سکتا، لہذا عورت کے لیے ووٹ ڈالنا درست نہیں ہوگا (ولایة المرأة: ۳۵۷)۔

البتہ ایک بات قابل غور یہ ہے کہ جہاں عورتیں ایکشن میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیتی ہیں وہاں عموماً سارے کام مرد انجام دیتا ہے، عورت صرف نام کی امیدوار ہوتی ہے، جیسا کہ آج کل پردھانی اور دوسرے ایکشن میں ہوتا ہے، ایسی جگہوں پر عورت کا ایکشن میں حصہ لینا صحیح ہونا چاہیے۔

البتہ اس کا خاص خیال رکھا جائے کہ اگر عورت کو پردھانی کے کام سے متعلق بینک یا تحصیل یا تھانہ وغیرہ جانا پڑ جائے تو مکمل پردہ میں جائے اور افسران وغیرہ سے پست آواز میں بات کرے، اس لیے کہ جس طرح عورت کا پورے بدن کا پردہ کرنا ضروری ہے اسی طرح آواز کا پردہ کرنا بھی ضروری ہے۔

عورتوں کا شرعی حجاب یہ ہے کہ عورتیں سر سے پاؤں تک مکمل بدن کو کپڑوں کے ذریعہ چھپائے رکھیں، قرآن مجید میں وارد حجاب سے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسَأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ (احزاب: ۵۳)** (اور جب بیویوں سے مانگنے جاؤ تو مانگ لو پردے کے باہر سے)۔

اس لیے گھروں میں عورتیں اس طرح رہیں کہ باہر سے عورتوں کا وجود غیر مردوں کی نظر سے چھپی ہوئی ہو۔

دوسری جگہ وارد ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورتوں کو گھر سے باہر جانا پڑے تو اس وقت کسی برقع یا لمبی چادر کو سر سے پیر تک اوڑھ کر نکلیں جس میں بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو، البتہ ہاتھ پیر کی ہتھیلی اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

یدنین علیہن من جلابیہن ذلک أدنی أن یعرفن فلا یؤذین (الاحزاب: ۵۹) یعنی اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکالیا کریں، اس سے آزاد مسلمان عورتوں اور غیر مسلم عورتوں میں امتیاز برقرار رہے گا۔

عورت کی آواز اور چہرہ کا پردہ:

قرآن مجید میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے زیور پہن کر نہ نکلیں جس میں آواز ہو، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَلَا یَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ** یعنی عورتوں کو حکم ہے کہ وہ اپنے پیروں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ اس سے زیور وغیرہ کی آواز نکلے اور غیر محرموں تک پہنچے۔

الغرض اس آیت سے یہ بھی مفہوم نکلتا ہے کہ جب زیور کی آواز کے پوشیدہ رکھنے کا ایسا اہتمام ہے تو خود صاحب زیور (یعنی عورت) کی آواز جو کہ البتہ فتنہ اور میلان کا سبب ہو جاتی ہے اس کا اہتمام نہ ہوگا (بیان القرآن ۱۷/۸)۔

اس لیے کہ عورت کی آواز میں اس طرح کی کشش ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے لوگ فتنہ کا شکار ہوں گے، لہذا اسلام نے اس طرح کے دروازہ کو بند کر رکھا ہے جس سے فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ ☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

مفتی اکمل یزدانی القاسمی ؒ

ووٹ کی شرعی حیثیت گواہی کی ہے، گویا ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے وہ اس کے متعلق اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ اس کام کی قابلیت و اہلیت رکھتا ہے، متدین اور دیانت دار بھی ہے، لہذا یہ جانتے ہوئے کہ جسے میں ووٹ دے رہا ہوں وہ اس کا مستحق نہیں ہے، یہ جھوٹی شہادت اور گناہ کبیرہ ہے اور باعث خسران آخرت بھی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور میں شہادت کا ذمہ اور جھوٹی گواہی کی مذمت کی گئی ہے۔

ووٹ کی ایک حیثیت سفارش کی ہے (Recommendation) بایں اعتبار ووٹر اس نمائندہ کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے اور بزبان حال و قال وہ اس شخص کے اندر نمائندگی کی اہلیت کا یقین رکھتا ہے، لہذا ووٹر کسی کی سفارش کرنے سے پہلے اس بات کی ضرورت تحقیق کر لے کہ وہ قوم و ملت کیلئے نقصان دہ ثابت نہ ہو ورنہ مستحق عتاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ومن يشفع شفاعتة حسنة يکن له نصيب منها ومن يشفع شفاعتة سيئة يکن له كفيل منها“ جس میں نالائق و نااہل فاسق و فاجر کی سفارش کرنے کی صورت میں مستحق عذاب گردانا جائے گا۔

ووٹ کے ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے جس میں ووٹر اس کنڈیڈیٹ کو اپنا وکیل بناتا ہے مگر یہ ایسی توکیل ہے کہ اس کا نتیجہ شخص واحد پر مرتب نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم پر اس کا اثر پڑتا ہے، کیونکہ جمہوریت میں ایک ووٹ بھی کسی کو کامیاب و ناکام بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، لہذا حق رائے دہی کے ذریعہ کسی کو وکیل بنانے سے پہلے اس نمائندہ کے احوال و کیفیات کی پوری طرح جانکاری لے لے۔ یہی راہ سابق مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی کی ہے (جواہر الفقہ ۲۳۵/۵-۲۳۵) ووٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت مفتی تقی عثمانی سابق چیف جسٹس پاکستان کی رائے بھی شہادت ہی کی ہے (فقہی مقالات ۲۹۰/۲) یہی خیال حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کی ہے، البتہ انہوں نے ایک حیثیت ووٹ کی ”سیاسی بیعت“ کی مزید بتائی ہے۔

الحاصل: ووٹ کی شرعی حیثیت بیک وقت شہادت، سفارش، وکالت اور سیاسی بیعت کی ہو سکتی ہے، لہذا ایک نااہل کو قوم و ملت کیلئے غیر مفید سمجھنے کے باوجود ووٹ دینا، جھوٹی شہادت، غلط سفارش اور ناجائز وکالت ہے جو بے شمار دنیوی و اخروی نقصانات کا سبب ہے۔

۲۔ ووٹ کے شہادت کے درجہ میں ہونے پر تقریباً سب کا اتفاق ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک ووٹ حکومت کے بنانے یا گاڑنے کی پوری طاقت رکھتا ہے، لہذا ووٹ دینا صرف جائز یا مستحب ہی نہیں بلکہ واجب و ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”کونوا قوامین للہ شهداء بالقسط“ وفي موضع آخر ”کونوا قوامین بالقسط شهداء للہ“ جس میں سچی گواہی دینے کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے اور گواہی نہ دینے پر رب تعالیٰ نے ”ولا تکتبوا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه“ میں گناہ گار قرار دیا ہے۔

البتہ اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ ہو تو موجود امیدواروں میں جو بہتر ہو اسے ووٹ دینا مستحسن ہے، یہی رائے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی ہے (جواہر الفقہ ۵۳۵/۵)۔

لیکن اگر تمام ہی امیدوار بالکل ہی نااہل، فاجر و فاسق اور قوم و ملت کیلئے انتہائی نقصان دہ ہو تو ایسی صورت میں ایکشن سے علاحدہ رہنے میں

ملٹوڈل آفیسر، مدھیہ پردیش وقف بورڈ، بھوپال۔

اگر قوم و ملت کو جانی و مالی نقصان پہنچنے کا امکان عظیم نہ ہو تو ووٹ ڈالنے سے توقف کا راستہ اختیار کرنا جائز ہے، تارک ملامت نہیں، کیونکہ یہ شہادت زور سے بچنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے، چنانچہ فقہ الامت حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ تجربہ سے جو جماعت اسلام کے زیادہ قریب یا پابند ہو اور حقوق دلانے میں زیادہ کوشاں اور قربانی دینے والی ثابت ہو اس میں شرکت کر سکتے ہیں (فتاویٰ محمودیہ ۱/۳۵۱)۔

۳۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ میں حکومت سے متعلق جانکاری اور حکومت چلانے یا حکومت میں حصہ لیکر ان کو سپرد کئے گئے حکمہ جات کو چلانے کی قابلیت و اہلیت رکھتا ہے اور وہ دوسرے نمائندوں کے مقابلہ میں زیادہ امین و دیانت دار بھی ہے اور اس کے انتخاب نہ لڑنے کی صورت میں ملک و ملت کا نقصان ہے تو ایسے شخص کو الیکشن میں حصہ لینا واجب و ضروری ہے تاکہ قوم و ملت کو نا اہل اور ظالم لوگوں کی چنگل سے بچایا جاسکے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”الناس إذا راؤ الظالم فلم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله بعقاب“ (جمع الفوائد ۲/۱۵۷) جس میں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ ان سب پر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے۔ حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے وہ فرماتے ہیں: اگر حصہ لینے میں (الیکشن لڑنے میں) آپ کو احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور آپ حصہ لیکر اہل اسلام کی خدمت کر سکیں اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکیں تو حصہ لے سکتے ہیں (فتاویٰ محمودیہ ۱/۳۵۱)۔

۴۔ اگر کسی ملک کے قانون ساز ادارے (خواہ وہ ملک مسلم ہوں یا غیر مسلم) مخالف شریعت قوانین بناتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق پارٹی کے اپنے ممبروں کیلئے جاری وہیپ کے مطابق ان ممبروں کو پارٹی کی پالیسی کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رہتا تو ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا اس شرط پر درست ہوگا کہ ممبر نہ بننے کی صورت میں ملک و ملت کا مزید نقصان ہونے کا یقین قوی ہو۔ ادارے کی ممبر شپ لیکر مخالف شریعت قوانین بننے میں رکاوٹ کا کام کرنے کا ارادہ ہو اور حتی المقدور مخالف شریعت قانون نہ بننے دینے کا عزم مصمم رکھتا ہو۔ اس کے باوجود بھی اگر مخالف شریعت قانون بن جائے تو اس پر دستخط نہ کرے اور اگر وہ دستخط نہ کرنا فتنہ کا سبب ہو تو بادل ناخواستہ دستخط بھی کر دے، البتہ اسے اپنے کسی مکتوب میں اس عمل سے ناراضگی کے اظہار کرنے کو نہ بھولے، چونکہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں خصوصاً یہی راستہ زیادہ مناسب اور اوصوب ہے۔

۵۔ دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا چونکہ خود ہی ایک دستور ہے اور کسی بھی ملک کے داخلی و عائلی امور کو منضبط طریقے سے چلانے کیلئے دستور کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے، لہذا اگر دستور کے بعض دفعات خلاف شریعت ہوں اور اس کے بغیر حکومتی امور میں دخل و حصہ داری نہ ملتی ہو اور حصہ نہ ملنے کی صورت میں ملک و ملت کا بڑا نقصان ہو تو ایسی صورت میں بادل ناخواستہ بقدر مجبوری ایسی دستور سے وفاداری کا حلف لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ حکومت میں حصہ لیکر ایسے دفعات کو بالکل ختم کرنے یا ترمیم کرنے کی پوری جدوجہد کرے تاکہ آگے اس جرم عظیم کا بار بار ارتکاب نہ کرنا پڑے جیسا کہ اصول فقہ میں اس کا حل موجود ہے: ”من ابتلى ببليتين فيلختر أهروهما“۔

۶۔ عیسائی ملک میں مسلم ارکان کے لئے بائبل پر حلف لینا محض اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ حلف لینے وقت اس بات کی نیت ہو کہ میں آسمانی کتب کا حلف لیتا ہوں جو منزل من اللہ اور غیر محرف ہے، چنانچہ اسلام میں منجملہ اجمالاً تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وقولوا آمنا بالله وما أنزل إلينا وما أنزل إلى إبراهيم وإسماعيل وإسحاق ويعقوب والأسباط وما أوتي موسى وعيسى وما أوتي النبيون من ربهم، لا نفرق بين أحد منهم ونحن له مسلمون“۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم فرمایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ دور میں جو دیگر آسمانی کتابیں ہیں وہ تحریف سے خالی نہیں ہے، البتہ بہر حال وہ آسمانی ہیں۔

۷۔ مسلمانوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری خود کرنی چاہیے، خواہ آزادانہ طریق سے ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر آزاد لڑنے میں شکست کا خطرہ زیادہ ہو اور کوئی سیکولر پارٹی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ موزوں و مناسب ہو تو ملک و ملت کی فلاح کو مد نظر رکھتے ہوئے



مسلمانوں کا اس سیکولر پارٹی میں شریک ہونا اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا سب جائز ہے، بھلے ہی اس سیکولر پارٹی کے منشور کے بعض دفعات مخالف اسلام اور مسلم مفادات کے مغایر ہوں، جیسا کہ اصول فقہ کے حوالہ سے یہ بات گذری کہ دو آزماتوں میں سے جو کمتر ہو اس کو اختیار کر لیا جائے، البتہ اس سیکولر پارٹی میں شامل ہو کر اس کے منشور کے مخالف اسلام دفعات کو گفت و شنید سے ختم یا کم از کم ترمیم کرنے کا عزم مصمم رکھتا ہو۔ خوشی خوشی کسی کا ایسی پارٹی میں شمولیت مناسب نہیں ہے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹی کھلے طور پر مسلم دشمن ہو اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو ایسی پارٹی میں مسلمانوں کا شریک ہونا ناجائز ہے۔ چونکہ غیر مسلم ملکوں خصوصاً ہندوستان میں ساری سیکولر پارٹیاں انجام کے اعتبار سے ایک ہی تھالی کے چنے بٹے ہیں، جیسا کہ ماضی کی تاریخ گواہ ہے۔ لہذا اگر کوئی مسلمان مذکورہ پارٹی میں اس نیت سے شریک ہوتا ہے کہ اس پارٹی میں گھس کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی پوری کوشش کروں گا، بصورت دیگر اس پارٹی کو چھوڑ دوں گا تو ایسی صورت میں ایسی پارٹی میں شریک ہونے کی گنجائش ہے۔

۹۔ ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، انہیں سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہو اور اس بات کا احساس بھی کہ مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو مسترد کرنے اور فرقہ پرست تنظیموں کے فائدہ اٹھانے کا سبب بنے گا تو ایسی صورت میں مسلمانوں کیلئے علاحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا مناسب نہیں ہے، چونکہ اس میں ملک و ملت کے نقصان کا قوی امکان ہے جس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔ بصورت دیگر مسلم سیاسی جماعت کا قیام نہج خلافت کے حصول کی ایک پاک سعی ہے جسے ہر مسلمان کو کرنا چاہئے۔ یہ ملک و ملت کی فلاح کا ضامن ہے جس کا شریعت نے ہمیں بار بار حکم دیا ہے۔

۱۰۔ ایکشن میں خواتین کا کردار ایک بیدار و فعال اور ملک و ملت کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ایک ذمہ دار اور دیانت دار شخص کی طرح ہونا چاہیے۔

۲۔ جب ہندوستان میں رائج قوانین کے مطابق اس کا ایک ووٹ بھی حق و باطل، ہار و جیت کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے تو عورتوں کو اس میں سرگرم حصہ بھی لینا چاہئے، کیونکہ ان کے ووٹ کی بھی قیمت کسی اور کے مقابلہ کہیں سے کم نہیں ہے بشرطیکہ شرعی پردہ کا اہتمام کرے۔ یہی رائے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی ہے (کفایت المفتی ۷۳/۹)۔

۳۔ عورت کا بطور امیدوار کھڑا ہونا مستحسن نہیں ہے، کیونکہ اس میں ضروریات شرعیہ کی رعایت کرنا لگ بھگ ناممکن ہے بصورت دیگر جائز ہے۔

۴۔ چونکہ عورتوں کی سیاست میں حصہ داری کو حکومت ہند کے ذریعہ یقینی بنایا جا رہا ہے بلکہ بعض ریاستوں میں پنچایت کی سطح پر پچاس فیصد سٹیٹس ریز رو کر دی گئی ہیں اور آگے لوک سبھا سے پارلیمنٹ میں ۳۳ فیصد ریزرویشن بل کے مستقبل قریب میں قانونی شکل اختیار کرنے کی قوی امید بھی ہے، لہذا عورتیں قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں۔ اصول فقہ کی کلیہ الضرورات تبیح المحظورات اور من ابتلی بیلیتین فلیختر اھونھما اس کی طرف مشیر ہے۔ ورنہ عدم حصہ داری کی صورت میں ملک و ملت خصوصاً مسلمانوں کے نقصان کا یقینی امکان ہے جس سے بچانا ہر مسلمان کا فرض ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، البتہ اس میں بھی حتی المقدور ضروریات شرعیہ کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔



## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

مولانا محمد عمران ندوی ط

ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں، اس کی ایک حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے کہ وہ جس ممبر کو ووٹ دے رہا ہے، اس کے بارے میں گواہ ہے کہ اس کو ملک و قوم کے لئے مفید اور خیر خواہ سمجھتا ہے اور اس کی ایک حیثیت مشورہ کی بھی ہے کہ وہ حکومت اور نظم و نسق کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کون زیادہ بہتر ہے اور کون زیادہ ایماندار ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اور اس کی ایک حیثیت سفارش کی بھی ہے کہ وہ اپنے اس امیدوار کے لئے ایک اہم عہدہ اور ذمہ داری کی سفارش کرتا ہے۔

نیز اگر وہ مسلم ملک ہو تو ان سب کے علاوہ ووٹ کی حیثیت سیاسی بیعت کی ہے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ متعلقہ امیدوار کو وکیل بناتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے سربراہ مملکت کا انتخاب کرے، آج اگر وہ خوش قسمت ساعت آئے کہ دنیا کے کسی خطہ میں خلافت علی منہاج النبوة قائم ہو تو اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عامۃ المسلمین کے بالغ و مکلف مرد اپنے اپنے ووٹ کے ذریعہ نمائندہ منتخب کریں اور پھر وہ باہمی رائے سے امیر کا انتخاب کریں اور تمام لوگوں کی طرف سے وکالت اور نیابت اس کے ہاتھ پر بیعت کریں اور بیعت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہاتھ ہی سے بیعت کی جائے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے عبداللہ بن دینار سے دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے عبدالملک بن مروان سے بذریعہ مراسلت بیعت کی ہے۔ ابن عمرؓ نے اس روایت میں اپنی طرف سے سب و طاعت کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میرے بچوں نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔

”قال بايع الناس عبد الملك كتب إليه عبد الله بن عمر إلى عبد الملك أمير المؤمنين اني أقر بالسمع والطاعة لعبد الله عبد الملك أمير المؤمنين على سنة الله وسنة رسوله فيما استطعت وان بني قد أقروا بذلك“ (صحیح البخاری، ج: ۲، ص: ۱۰۶۹)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات کافی ہے کہ امیر کسی کو بیعت کے لئے وکیل بنائے یا بیعت کرنے والا کسی کو بطور وکیل بھیجے کہ وہ اس کی طرف سے اظہار و فاداری کرے، چنانچہ رسول اللہ نے ایک دفعہ عبادہ بن صامت کو اپنی طرف سے بیعت لینے کا حکم فرمایا تھا: بخاری شریف کی روایت ہے: ”قال لنا رسول الله ﷺ ونحن في مجلس، تبایعونی علی أن لا تشرکوا بالله شیئاً ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا أولادکم“ الخ: (صحیح البخاری ۲۰۱۰۷۱)۔

لیکن ہمارا ملک ہندوستان جو کہ سیکولر نظام کے تحت چل رہا ہے، یہاں پر ووٹ کی حیثیت محض شہادت کی ہوگی اور عند الاحناف اگر گواہی کا مطالبہ کیا جائے تو گواہی دینا واجب بھی ہو جاتا ہے۔

”الأصل عندنا أن لا يشهد إلا أن يطلب من الشهادة ويجب أن يشهد بعد الطلب“ (حاشیہ مشکوٰۃ، ج: ۲، ص: ۲۲۷)۔

جبکہ ہمارے ملک ہندوستان میں ووٹ دینے کا محض مطالبہ ہی نہیں بلکہ اس پر پوری طاقت صرف کر دی جاتی ہے، لہذا یہاں تو بدرجہ اولیٰ ووٹ دینا واجب ہوگا۔

ط مہتمم جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، اورنگ آباد۔

رہی بات اپنے آپ کو ایکشن میں بحیثیت امیدوار کے پیش کرنے کی، تو اگر اس کے اندر اس عہدے کے ذریعہ احکام الہی کو نافذ کرنے، حق قائم کرنے اور عدل و انصاف کو جاری کرنے کی اہلیت ہو اور اس عہدے کو طلب کرنے میں صرف رضائے الہی مقصود ہو تو ایسی صورت میں احقر کی رائے ہے کہ بحیثیت امیدوار کے پیش کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ حضرت یوسفؑ نے کہا تھا: ”قال اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیم“ (سورۃ یوسف: ۵۵) (آپ نے فرمایا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، بیشک میں حفاظت کرنے والا اور (معاشی مسائل کا) ماہر ہوں)۔

خلفاء راشدین کا عہدہ سنبھالنا بھی اسی قبیل سے تھا اور حضرت علیؑ کا حضرت معاویہؓ سے معارضہ اس لئے تھا کہ آپ اپنے آپ کو نفاذ شریعت کے لئے زیادہ قوی سمجھتے تھے اور اپنے نفس پر زیادہ ضبط اور قدرت رکھتے تھے۔

ابو عبد اللہ محمد بن احمد القرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ”لو علم انسان من نفسه أن یقوم بالحق فی القضاء والحسبة ولم یکن هناك من یصلح ولا یقوم مقامه، لتعین ذلك علیه، ووجب أن یتولها ویسأل ذلك ویخبر بصفاته التي یتحققها به من العلم والكفایة وغیر ذلك كما قال یوسف علیه السلام“ (تفسیر القرطبی ۹/۱۰۱۳۲)۔

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانیؒ نے نقل کیا ہے کہ کسی عہدے کی اہلیت کا اظہار جائز ہے، جبکہ انسان کو اپنی ذات پر پورا ضبط و قدرت ہو اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ انسان عہدہ قبول کر سکتا ہے خواہ حاکم وقت ظالم اور کافر بھی ہو جبکہ یہ علم ہو کہ اقامتہ الحق اور سیاستہ الحق اس کافر یا جابر کی تمکین کے بغیر ممکن نہیں (تفسیر مظہری، ج: ۵، ص: ۲۱۷)۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ: ”من لكعب بن الأشرف فانه قد أذى الله ورسوله فقام محمد بن مسلمة فقال یا رسول الله: أتحب أن أقتله، قال: نعم:“ (صحیح البخاری ۲، ۵۶۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے لئے کون تیار ہے تو محمد بن مسلمہؓ کھڑے ہو گئے، اور فرمایا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ پسند کریں گے کہ میں اس کو قتل کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرنے کی ذمہ داری دی نہیں تھی، بلکہ سوال کرنے پر محمد بن مسلمہؓ نے خود اپنے آپ کو پیش فرمایا۔

اسی طرح غزوہ حنین کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من یحرسنا اللیة قال انس بن أبی مرثد الغنوی: أنا یا رسول الله ﷺ“ (رواہ ابو داؤد، ص: ۲۲۸) (آج رات ہمارا پہرہ کون دے گا حضرت انس بن مرثد غنویؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پہرہ دوں گا)۔

اور فقہ کا اصول بھی ہے کہ ”الضرورات تبیح المحظورات“ (مبادئی فی علم اصول الفقہ، ص: ۳۲) ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیا کرتی ہیں اور آج جبکہ دنیا کو سخت ضرورت ہے ایسے افراد کی جو آگے بڑھ کر زمام مملکت اپنے ہاتھ میں لیں، تاکہ دنیا سے ظلم و استبداد کو ختم کیا جائے اور عدل و انصاف کو قائم کیا جائے اور یہ ظالمانہ و جاہرانہ نقشہ تبدیل ہو جائے۔

لہذا مذکورہ دلائل کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اہلیت رکھتا ہے تو اس کے لئے اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ مستحسن ہے۔

اب اگر مسلم ملکوں میں یا غیر مسلم ملکوں میں کچھ قانون ساز ادارے ایسے ہیں جو شریعت کے مخالف قوانین بناتے ہیں، تو احقر کی رائے یہ ہے کہ مسلمان اگر قوانین کو شرعی رخ دینے کی نیت سے اس کا ممبر بننا ہے تو درست ہے، یہ اسی صورت میں ہوگا، جبکہ اس کو اپنے اوپر قدرت ہو کہ ایسا کر سکے گا، لیکن اگر اس کو اپنے آپ پر خطرہ ہو کہ وہ اس میں شریک ہو کر خود اپنی ذہنیت بدل دے گا تو ایسے شخص کو ہرگز ممبر بننے کی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ

ہندوستان کے سیکولر نظام کو دیکھ کر اگر مسلمانوں کو ممبر بننے اور سیاست میں آنے سے روکا جائے گا تو کسی بھی پارٹی اور ادارہ کا ممبر بننے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی، کیونکہ سیکولر نظام یہودیوں کا بنایا ہوا نظام ہے اور یہودی ہمیشہ سے مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے پوری اسلامی شریعت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نظام اس طور پر تیار کیا ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لئے شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں شریک ہونے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

لہذا علماء امت کو چاہیے کہ دلائل کی روشنی میں کچھ ایسی شکلیں نکالیں جس سے کفار و مشرکین کی سازشوں کے یہ تانے بانے ٹوٹ جائیں اور مسلمانوں کے لئے سیاسی پارٹیوں میں شریک ہو کر قوانین کو شریعت کے مطابق تبدیل کرنے کی گنجائش نکل آئے۔

اگر کسی ملک میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہو، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو تو ایسی صورت میں مسلمان ممبر پر واجب ہے کہ وہ عدالت سے مطالبہ کرے کہ اس کے ہاتھ قرآن پر رکھوائے جائیں، اگر اس کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا جائے تو اب اسے مجبور سمجھا جائے گا اور اس کے لئے گنجائش ہوگی کہ وہ تورات یا انجیل یا ان دونوں پر دل میں ان کی تعظیم کئے بغیر اپنا ہاتھ رکھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان چونکہ اس کو منحرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں۔

نیز رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس منعقدہ ۸ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء اس مسئلہ میں جن نکات پر متفق ہوئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر مجبور ہوں اس پر اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ ہاتھ رکھا جاسکتا ہے۔

وہ سیکولر پارٹیاں جو مسلمانوں کے مفادات کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں ان پارٹیوں میں احقر کی رائے کے مطابق شامل ہونا جائز ہے، اگر ان کے منشور کی بعض دفعات اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہوں، کیونکہ موجودہ دور میں جبکہ تمام سیاسی پارٹیاں خود غرضی و مفاد پرستی کی جڑ بن چکی ہیں اور اسلام و مسلمانوں کو ہر طرف سے دبانے اور ان کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ ایسے پر فتن حالات میں یہ خواب دیکھنا کہ سیکولر پارٹیوں کے منشور کی تمام شقیں اسلام اور مسلمانوں کے موافق ہو جائیں تو یہ ناممکن ہے۔

لہذا اگر کسی پارٹی کی بعض دفعات اسلام اور مسلمانوں کے مخالف ہوں تو تمام فقہاء کا متفقہ اصول "للا کثر حکم الکثر" کے مطابق اکثر کو دیکھتے ہوئے کل کا حکم لگا دیں گے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح فرمائی تھی، اس کی تمام شقیں اسلام کے موافق نہیں تھیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات کو دیکھتے ہوئے صلح فرمائی، جبکہ حضرت عمرؓ جیسے صحابی کو اطمینان قلب نہیں ہو رہا تھا اور بار بار سوال کرتے جا رہے تھے، اس وقت بھی حالات تقریباً اسی رخ پر تھے کہ مسلمانوں کو اسلام سے ہٹا دیا جائے اور کسی طرح سے یہ آگے بڑھنے نہ پائیں۔

اسی طرح اگر کوئی سیاسی پارٹی کھلے طور پر مسلمانوں کی دشمن ہو اور ان کے منشور میں اسلام کی مخالفت شامل ہو، پھر بھی اگر کوئی مسلمان صحیح نیت اور اخلاص کے ساتھ اس پارٹی میں شامل ہو اور اس کا یہ ارادہ ہو کہ وہ اس پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا اور اس کو اپنے اوپر اعتماد بھی ہو کہ وہ ایسا کرنے پر طاقت و قدرت رکھتا ہے تو ایسی نیت کے ساتھ اس پارٹی میں شامل ہونا احقر کے نزدیک جائز ہوگا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: "إنما الأعمال بالنیات وإنما لامرئ ما نوى" (صحیح البخاری ۱۰۱۰ باب کیف کان بدو الوحی) (اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس کی نیت ہوتی ہے)، کیونکہ اگر باہر کا کوئی آدمی اس پر آواز اٹھائے کہ یہ شریعت کے خلاف عمل ہے تو اس کی آواز سنی نہیں جاتی اور سربراہ مملکت اس پر توجہ نہیں دیتا ہے، لیکن یہی عمل پارٹی میں رہتے ہوئے کرتا ہے تو سربراہ مملکت اس کا لحاظ رکھتا ہے اور بہت سے ظلم و ناانصافی سے بچ کر بیچ کی راہ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، اس کی کھلی مثال یوپی میں ملائم سنگھ اور اعظم خاں کی موجود ہے۔

لیکن مسلمانوں کے لئے الگ سے کوئی سیاسی پارٹی قائم کرنا احقر کی رائے کے مطابق جائز تو ہے، لیکن مناسب نہیں، کیونکہ یہ چیز ہندوؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے گی اور دوسری فرقہ پرست تنظیموں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔ جس کی وجہ سے ملک میں بجائے امن و امان

پھیلنے کے ظلم و استبداد کا بازار گرم ہو جائے گا۔ ہاں اگر کوئی ایسی تنظیم بنائی جائے جو غیر اسلامی قوانین کے خلاف آواز اٹھائے اور حکومت کے سامنے اپنے جائز مطالبات پیش کرے تو جائز ہے۔

شریعت اسلامیہ نے عورت کی عصمت و عزت کی حفاظت کا بہت اہتمام کیا ہے، شریعت کا منشاء یہ ہے کہ عورت شرعی ضرورت کے بغیر گھر سے نہ نکلے اور مردوں کے ساتھ اس کا اختلاط نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: ”وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ“ (سورۃ الاحزاب: الآیۃ: ۳۳) (اے نبی کی بیویو! تم اپنے گھروں میں ٹک کے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق علانیہ نہ پھرتی رہو)۔

اس آیت کی تفسیر میں ابو عبد اللہ بن احمد القرطبی نے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ ”معنی هذه الآیة الأمر بلزوم البيت وإن كان الخطاب للنساء النبي ﷺ فقد دخل غيرهن فيه بالمعنى، هذا لولم يرد دليل يخص جميع النساء، كيف والشريعة طافحة بلزوم النساء بيوتهن والآن كفاف عن الخروج منها إلا للضرورة“ (تفسیر القرطبی ۱۲-۱۳، ۱۱۷، ۱۱۸) (یہ حکم ان تمام ازواج مطہرات کے بارے میں ہے جو پوری امت کی ماں کے درجہ میں ہیں کہ وہ اپنے گھروں کو لازم پکڑیں اور بغیر کسی سخت ضرورت کے ان سے باہر نہ نکلیں، جب ان کو یہ خطاب ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ عام عورتوں کو تو بطریق اولیٰ یہ خطاب ہوگا اور ساری عورتیں اس حکم میں شامل ہوں گی)۔

غرضیکہ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ مرد اور عورت آپس میں بے پردہ نہ ملیں اور ان میں اختلاط نہ ہو، کیونکہ مرد اور عورت میں فطری طور پر ایک دوسرے کی طرف جاذبیت اور جنسی میلان موجود ہے اور شیطان ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے کہ ان کو معصیت میں مبتلا کر دے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: ”قال رسول الله ﷺ: لعن الله الناظر والمنظور إليه“، یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے نا محرم عورت کو دیکھنے والے پر اور اس عورت پر بھی جس کو دیکھا جائے (مشکوٰۃ المصابیح ۲/۲۷۰)۔

نیز وہ جگہیں جہاں مردوں اور عورتوں کے اختلاط کا اندیشہ تھا، وہاں پر شریعت نے عورتوں کو حاضر ہونے کا مکلف نہیں بنایا، مثلاً اس پر جمعہ وعیدین کی نماز واجب نہیں ہے، جماعت سے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے، جنازہ وغیرہ میں شریک ہونا واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ جگہیں ایسی ہیں جہاں پر عورت و مرد کا اختلاط لازم آتا ہے، لہذا اگر عورت ایکشن میں امیدوار بنے گی یا قانون ساز اداروں کی ممبر بنے گی تو قدم قدم پر مردوں کے ساتھ اختلاط ہوگا، کیونکہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے پارلیمنٹ، اسمبلی ہال اور اس کے علاوہ متعدد جگہوں پر حاضر ہونا پڑے گا اور مختلف بحث و مباحثہ میں حصہ لے گی، مردوں کو مخاطب کرے گی، لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے، جگہ جگہ مردوں کے ساتھ اختلاط اور تہائی کا موقع بھی آئے گا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

چنانچہ درمختار میں امامت کبریٰ کے شرائط بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

”ويشترط كونه مسلماً حراً ذكراً عاقلاً بالغاً قادراً“

شامی میں ہے: ”ولأن النساء أمرن بالقرار في البيوت فكان منبني حالهن على الستر“ (رد المحتار ۲/۲۸۰)۔  
مذکورہ بالا دلیل سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ سربراہ مملکت کا مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عاقل ہونا، مرد ہونا اور احکام جاری کرنے پر قدرت رکھنے والا ہونا شرط ہے۔ مرد ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ عورتوں کو گھر میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لہذا احقر کی رائے یہ ہے کہ عورت کا ایکشن میں امیدوار بننا اور قانون ساز اداروں کی ممبر بننا جائز نہیں ہوگا۔ ہاں ووٹنگ میں حصہ لے سکتی ہے، کیونکہ اس میں اگر خاتون ان تمام خرابیوں سے بچنا چاہے تو بیچ سکتی ہے۔ نیز ووٹنگ میں لیڈیز پولیس کی حفاظت میں بھی رہتی ہے۔

وما توفيقى إلا بالله۔

☆☆☆

## ووٹ اور اسلام کا نقطہ نظر

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی

الحمد لله والسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد!

ووٹ کی حقیقت شہادت اور گواہی کی سی ہے جس طرح گواہی جھوٹی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمٌ قَلْبًا (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی چھپائے اس کا دل گناہ گار ہے)، اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَتَمَ شَهَادَةً إِذَا دُعِيَ إِلَيْهَا كَانَتْ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّورِ (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ۶۲/۲) (جس کسی کو شہادت کے لیے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا)۔ لہذا ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن و سنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

۲۔ اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا، یا مستحب یا واجب؟

موجودہ حالات میں بحیثیت مسلمان ہمارے لئے ووٹ دینا شرعاً واجب ہے اور اس سے پہلو تہی برتنا کسی طرح روا اور جائز نہیں، مسلمانوں کے لئے اب ووٹ دینا ایک مذہبی فریضہ کے درجہ میں ہے اور کسی شدید ضرورت کے پیش آنے یا ضرر شدید کے اندیشہ کے بغیر ووٹ دینے سے غفلت برتنا گناہ کا باعث ہو سکتا ہے اور عند اللہ اس پر مواخذہ کا اندیشہ ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی دامت برکاتہم رقمطراز ہیں: شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمٌ قَلْبًا (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گناہ گار ہے۔ بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا فریضہ ادا کر دے اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار نہ کرے۔ حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں نہ بتاؤں گی بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ادا کر دے (جمع الفوائد ۲۶۱، فقہی مقالات ۴۷۷/۲) حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال (ووٹ دینے کا حکم) کے جواب میں اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں: اگر نفع ہو یعنی دین کی، قوم کی، ملک کی صحیح خدمت ..... ہو تو درست ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُوَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا (النساء: ۵۸، فتاویٰ محمودیہ ۶۱۸/۳)۔

۳۔ ”ایکشن“ میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

بنیادی طور پر اسلام ”ایکشن“ میں امیدواری کا قائل ہی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی عہدہ اور ذمہ داری کا طلب گار ہوگا میں اسے وہ ذمہ داری حوالہ نہیں کروں گا، اس سے زیادہ قبیح اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ آدمی خود عہدہ کا طالب ہو اور وہ لوگوں سے خواہش کرے کہ لوگ اسے منتخب کریں یہ درحقیقت بے شرمی کی بات ہے ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ نے سخت ناپسند فرمایا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر چیز کی گنجائش ہے سوائے اخلاق کے، اس لئے خود امیدوار بننے کے سوا چارہ نہیں، ان حالات میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ کم سے کم ایسا ہو کہ جب تک عام لوگ ایکشن میں امیدوار بننے کے لئے اصرار نہ کریں اور ان کی طرف سے مطالبہ نہ ہو امیدوار بننے سے گریز کیا جائے اور حتیٰ الوسع احتراز کیا جائے۔

”فتاویٰ عثمانی“ میں حضرت شیخ الاسلام ایک سوال عہدہ از خود طلب کرنا جائز نہیں اس کے بارے میں جواب دیتے ہوئے قہر از ہیں: ”عام اسلامی حکم یہی ہے کہ از خود کسی سرکاری یا عہدے کو یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا جائز نہیں اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا، لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نا اہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے اور حضرت یوسفؑ کا ”اجعلنی علی خزائن الأرض“ کہنا اسی صورت پر محمول ہے، اس شرعی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ انتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلب اقتدار کی بنیاد پر پورا نظام حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں ہے اور اگر منشا صرف طلب اقتدار ہو، یا دوسرے اہل لوگ موجود ہوں یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظام انتخابات میں امیدوار بننا جائز نہیں، لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو صالح اور اہل فہم افراد اگر طلب اقتدار کے جذبہ کے بجائے اصلاح حال کی غرض سے اس میں شامل ہوں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ منافس سب و شتم غیبت اور دوسرے محرمات و منکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو، جو اس دور میں شاذ و نادر ہے“ (فتاویٰ عثمانی ۱۳/۵۷)۔

۳۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سارے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت بھی قانون بنائے ہیں۔ ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لئے وہیپ جاری کر دے تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

مذکورہ صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا اس وقت درست ہوگا جبکہ ”مسلم ممبران“ ایسے مخالف شریعت قوانین کی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ آواز اٹھائیں اور قانون کی حد میں رہتے ہوئے پر زور احتجاج کریں، اس وقت پورے ملک کی صورت حال یہ ہے کہ یہ قانون ساز ادارے ہر روز ہر وقت ایسے مخالف شریعت قوانین مستقل بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں جو قوانین صریح طور پر دین و شریعت سے متصادم ہوتے ہیں، اب ایسی صورت حال میں مسلم ممبران اگر ممبر کی سیٹیں حاصل کرنے میں تردد اختیار کریں تو وہ ادارے پھر مزید ایسے قوانین جاری کریں گے جو زخم پر نمک پاشی کے مترادف ہوں گے، گویا ان کی تودیرینہ تمنا پوری ہوگئی اور اس طرح ان اداروں پر پوری طرح ”فراعنہ وقت“ کا مکمل قبضہ اور تسلط ہو جائے گا اور ہم اور ہمارے پرسنل لاء کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جائے گی۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

”کفایۃ المفتی“ میں ہے: حلف اور وفاداری اس شرط اور نیت سے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا، اٹھالینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور کونسل میں جانے کی نیت بھی یہ ہو کہ میں اپنی قوم اور وطن کے حقوق کی حفاظت کرنے اور حکومت کے ظلم اور تشدد کا انسداد کرنے کے لئے جا رہا ہوں (کفایۃ المفتی ۳۵/۹)۔

اس طرح کا ایک اور سوال کہ موجودہ دور میں اسمبلیوں کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟ آپ جواب تحریر فرماتے ہیں: ہندوستان میں حکومت کا معاملہ بڑی نزاکت اختیار کر چکا ہے، اس لئے کہ اس کے متعلق احکام دینا بہت مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ علماء اور مشائخ اسمبلیوں میں ممبر بن کر جائیں تو بہتر ہے۔ اس کے لئے جواز کا فتویٰ دیتا ہوں، ”اسمبلی میں جس عہد نامے پر دستخط کئے جاتے ہیں اس میں اتباع شریعت کے پختہ عہد کے ساتھ دستخط کئے جاسکتے ہیں“ (کفایۃ المفتی ۳۹/۹)۔

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟ اس بارے میں ہر ممبر کے لئے دو باتیں قابل توجہ اور قابل غور ہے:

(۱) اگر بائبل پر ہاتھ رکھ کر غیر اللہ کی قسم کھانا لازم قرار دیا جاتا ہے تو غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں، حدیث شریف میں اس بارے میں سخت ممانعت وارد

ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ طاعوت یعنی معبودان باطلہ اور اپنے آباؤ اجداد کی قسم نہ کھاؤ۔ (ابن ماجہ۔ باب التمی ان یحلف بغیر اللہ تعالیٰ) اور ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کو قسم کھانی ہو تو اللہ پاک کی قسم کھائے ورنہ نہیں کھائے خاموش رہے۔ نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر و شرک کیا (ترمذی ابواب اللہ و رد الایمان)، لہذا غیر اللہ کی قسم کھانے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

(۲) بلاشبہ ایک مومن کے ایمان کے مکمل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ تمام کتابوں پر ایمان رکھیں، اس لئے کہ یہ تمام کتابیں یعنی صحف ابراہیم، توریت، زبور اور انجیل بھی اللہ پاک کی طرف سے نازل کردہ کتابیں ہیں، لیکن اب مذکورہ آسمانی کتابیں محرف ہو چکی ہیں۔ خود قرآن کریم کا فرمان ہے: یحرفون الکلم من بعد مواضعہ (سورہ المائدہ: ۴۰) اور ان کتابوں کے اکثر مضامین تحریف شدہ ہیں اور آج اپنی اصل صورت میں موجود نہیں ہیں اس بنا پر کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اس پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھائے۔

اس موضوع پر پوری بحث کے بعد مکرمہ اکیڈمی کا فیصلہ نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو:

(۱) کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھے۔ اس لئے کہ آج جو نسخے رائج و معروف ہیں وہ محرف ہیں اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہونے والے اصل نسخے نہیں ہیں اور حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت نے پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

(۲) اگر غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لئے توریت یا انجیل پر یا ان دونوں پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمان کو چاہئے کہ وہ عدالت سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے اور اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور دونوں یا کسی ایک پر تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا (اسلامی فقہ اکیڈمی مکرمہ کے فیصلے صفحہ ۱۹۹)۔

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

موجودہ حالات میں مکمل ایماندار اور پاک صاف کردار کے حامل سیاسی لیڈر یا سیاسی جماعت جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایسے موقع پر شریعت مطہرہ کا اصول اور قاعدہ ہے کہ جہاں ”بہتر“ میسر نہ ہو وہاں نسبتاً کم خراب کو اختیار کیا جائے، اور دوسرے میں سے کمتر درجہ کا شر اختیار کیا جائے، اسلامی فقہ کا اصول ہے: إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما (قواعد الفقہ ص ۵۶) (جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی کو گوارا کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا)۔ اسی طرح ایک اور اصول ہے: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف (قواعد الفقہ ص ۸۸) لہذا ایسے موقع پر عدم شرکت سے پوری امت مسلمہ کو اور شدید نقصان لاحق ہوگا۔ لہذا شرکت کر کے مسلم لیڈران اپنی بھرپور کوشش کرتے ہوئے حدود میں رہتے ہوئے وہ دفعات جو ان کے منشور میں مخالف اسلام ہوں ان کے خلاف احتجاج اور آواز اٹھاتے رہیں، اس کے علاوہ شاید اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز کسی کی نیت یہ ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو کیا اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہے؟

اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں اور واضح ہو چکی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں کوئی بھی ایسی سیاسی پارٹی موجود نہیں جس کے منشور میں مخالف اسلام دفعات موجود نہ ہوں، اب موجودہ سیاست میں یہ یقین کر لینا کہ اس سیاسی پارٹی میں مخالف اسلام دفعات موجود نہیں ہیں یہ سیاست سے نابلد اور نادقف ہونے کے لئے کافی ہوگا، لہذا ایسے موقع پر مسلم لیڈران جس پارٹی میں شامل ہوں انہیں اس بات کا اہتمام کرنا ہوگا کہ خود بھی شریعت



پر عمل کی فکر کریں اور اس سیاسی پارٹی کے ایجنڈے میں جو بھی ایسے قوانین ہوں جو مخالف اسلام ہوں ان کو بدلنے کی بھرپور کوشش کریں ورنہ شامل ہونے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

۹۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکوز نہیں ہوتی وہاں خصوصاً دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔

اگر مسلمان منظم اور متحد ہو کر اپنی علیحدہ سیاسی جماعت کی بنیاد ڈال دیں تو ایک صالح انقلاب پیدا ہونے کی امید کی جاسکتی ہے اور ابھی حال ہی میں صوبہ آسام میں مسلم سیاسی جماعت کے قیام سے ایک بہت اچھا اور زرخیز نتیجہ برآمد ہوا ہے اور اگر واقعی میں کسی علاقہ میں مسلم سیاسی جماعت کا قیام تجربہ سے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہو اور یہ نقصان حقیقی ہو صرف شبہ کے درجہ میں نہ ہو اور یقیناً فرقہ پرست تنظیموں کو فائدہ پہنچ رہا ہو تو پھر ایسے علاقوں میں علیحدہ سیاسی جماعت کے قیام سے اجتناب بہتر ہے۔

۱۰۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ الیکشن میں خواتین کا کردار کیا ہونا چاہیے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہئے؟ کیا ان کے لئے الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے؟ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہے؟

صورت منقولہ میں دو باتیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ الگ ہوگا۔ ایک عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینا۔ دوسرا الیکشن میں امیدوار بننا۔ پہلے جزء کا حکم یہ ہے کہ ہمارے ملک کا قانون ہے کہ عورتیں بھی پولنگ میں حصہ لے سکتی ہیں اور انہیں بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ لہذا خواتین چند شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے ووٹ کے لئے اپنے گھر سے نکل سکتی ہیں۔

کفایت المفتی میں ہے: عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا ہوگا (۳۴۹/۹)۔ ایک دوسری جگہ حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: اگر پولنگ اسٹیشن پر عورتوں کے لئے پردے کا انتظام ہو اور غیر محرم مرد منتظم نہ ہوں بلکہ سپردینے والی عورتیں کام کرتی ہوں تو عورتوں کو ووٹ دینے کے لئے جانا جائز ہے اور غیر محرم مرد ہوں تو عورتیں نہ جائیں، بلکہ مطالبہ کریں کہ ان کے لئے زنانہ منتظم مقرر کیے جائیں (کفایت المفتی ۳۵۷/۹)۔

۲۔ ایک مسلمان عورت الیکشن میں امیدوار بن سکتی ہے کہ نہیں؟ اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اس پر فتن دور میں حالات کے پیش نظر عورت کو اسبلی یا پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرنے سے احتراز کرنا چاہئے، اس لئے کہ موجودہ حالات میں انتخابات کے لئے مہم چلانے کے دوران عورت کے لئے پردہ برقرار رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آتا ہے، اس لئے عصر حاضر میں پارلیمنٹ میں عورتوں کے کردار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی اجازت دینا یا پولنگ میں کھڑا ہونا کسی بھی طرح فائدہ مند نظر نہیں آتا۔ اور صرف اسلامی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ سماجی اعتبار سے بھی نقصان دہ نظر آتا ہے۔



## جمہوری نظام حکومت سے متعلق چند مسائل اور ان کا حل

مولانا محمد ابرار خان ندوی

دنیا کے بیشتر ممالک کا نظام حکمرانی جمہوری ہے، یہ الگ بات ہے کہ کہیں جمہوریت اپنے حقیقی معنی و مفہوم میں ہے، جہاں ہر شخص کو مذہبی، لسانی، تہذیبی آزادی حاصل ہے اور بعض ممالک میں جمہوریت کے نام پر ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔

مذکورہ دونوں قسم کی جمہوریتیں اسلام کے نظام حکمرانی سے متصادم ہیں۔ البتہ اول جمہوری نظام قدر غنیمت ہے کہ اس میں باشندگان ملک کو آزادی و حریت نصیب ہوتی ہے۔ گرچہ اس کے بعض اصول اسلام کے نظام حکمرانی کے مخالف ہیں۔ ذیل میں جمہوری ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو درپیش انہی چند مسائل کا تذکرہ اور ان کا شرعی حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کی حیثیت شہادت کی ہے۔ ایکشن میں امیدوار کو ووٹ دینا اس بات کی شہادت ہے کہ یہ شخص دیگر امیدواروں کے بہ نسبت زیادہ موزوں ہے، یا بالفاظ دیگر ممالک و ملت کے حق میں، بمقابلہ دوسروں کے کم ضرر رساں ہے۔

### ووٹ دینے کا حکم:

جمہوری نظام میں چونکہ حکومت کی تشکیل ووٹ کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، اس لئے ووٹ دینا واجب و ضروری ہے۔ اس کے درج ذیل اسباب ہیں:

۱۔ ووٹ شہادت ہے اور شہادت سے گریز کرنا اور اس کو چھپانا گناہ ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبًا، وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (سورۃ البقرہ: ۲۸۲) (اور شہادت کو ہرگز نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: جھوٹی شہادت دینا یا شہادت کو چھپانا کبیرہ گناہ ہے (تفسیر ابن کثیر، سورۃ بقرہ: ۱۷۳)۔

شہادت نہ دینے کی وجہ سے کسی حقدار کا حق مارا جائے اور دوسرا کوئی گواہ موجود نہ ہو، یا گواہ موجود ہو مگر اس کی گواہی لائق اعتناء نہ ہو تو ایسے مواقع پر شہادت دینا واجب ہے اور شہادت نہ دینا باعث گناہ ہے۔ فقہاء کرام نے اس پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ويلزم اداء الشهادة ويأثم بكتماها إذا طلب المدعى... وإن أدى غيره ولم تقبل شهادته، يأثم من لم يؤد إذا كان ممن تقبل شهادته، كذا في التبيين، وإن كان هو أسرع قبولاً من آخرين ليس له الامتناع عن الأداء (الفتاوى الهندية ۲۰۲۵۲)۔

(شہادت دینا ضروری ہے، اور اس کا چھپانا گناہ ہے، جب مدعی شہادت کا مطالبہ کرے..... اگر دوسرا شخص شہادت دے، لیکن اس کی شہادت قبول نہیں کی گئی تو وہ شخص شہادت نہ دینے کی وجہ سے گنہگار ہوگا جس کی شہادت قابل قبول ہے، اور اگر دوسروں کے مقابلہ اس کی گواہی زیادہ و جلد قابل قبول ہو تو اس کے لیے شہادت دینے سے احتراز درست نہیں)۔

مقام ربانی پبلک سیکنڈری اسکول، راجستھان۔

ایکشن میں امیدوار بننا:

اصل تو یہی ہے کہ جو عہدہ بغیر طلب ملے وہ بہتر و باعث خیر ہے اور جو عہدہ مانگے اسے نہ دیا جائے، لیکن جہاں صورتحال یہ ہو کہ عدل و انصاف کا خون کیا جا رہا ہو، لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی روا رکھی جا رہی ہو، حقوق کی پامالی ہو رہی ہو، اور کوئی شخص اپنے کو اس عہدہ کے لائق پاتا ہے اور امانت داری کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اپنے اندر محسوس کرتا ہے تو ایسے شخص کے لیے اس عہدہ کا مانگنا ناپسندیدہ عمل نہیں۔

سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ مصر میں قحط پڑنے والا ہے اور ملک کے موجودہ حکمران و ذمہ داران مملکت، وزراء و سیاسی رہنما نہایت کرپٹ ہیں تو انھوں نے بادشاہ وقت سے مطالبہ کیا کہ اس نازک گھڑی میں شعبہ مالیات میرے سپرد کر دیجئے، عوام کو کسی طرح کی پریشانی نہیں ہونے دوں گا۔ ارشاد خداوندی ہے:

قال اجعلنی علی خزائن الأرض، انی حفیظ علیہ (سورہ یوسف: ۵۵) (حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: مجھے زمین کے خزانوں کا نگران و ذمہ دار بنا دیجئے، میں باخبر و اچھی حفاظت کرنے والا ہوں)۔

آزادی کے بعد سے آج تک سیاسی رہنما، لیڈران مسلمانوں کو وعدے و وعید اور زبانی و کاغذی اعلانات کی حد تک بہلا پھسلا کر ایکشن میں ان کے دوڑوں کے ذریعہ اقتدار کا لطف اٹھاتے رہے اور مسلمان محروم و پسماندگی کا شکار ہوتے رہے تو ایسی صورت حال میں ملت کے باصلاحیت سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے علماء و دانشوران عملی سیاست میں شریک ہوں تاکہ مسلمانوں کو ان کے حقوق جائز مل سکیں، تعلیمی و اقتصادی بد حالی ختم ہو، حکومت کی اسکیموں سے وہ مستفید ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان ایکشن کے ذریعہ عہدوں کو حاصل کریں۔ ما لا یترو الواجب إلا بہ فهو واجب (الاشباہ والنظائر والقواعد الفقہیہ) (جس کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہو تو وہ چیز بھی واجب ہے)۔

قانون ساز اداروں کا ممبر بننا:

جمہوری ممالک میں قانون ساز ادارے ریڑھ کی ہڈی اور اصل کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو ان اداروں کا رکن بننا اور مجالس قانون ساز میں شریک ہو کر قانون کی تشکیل میں حصہ لینا بنیادی ضرورت ہے۔

بسا اوقات یہ ادارے بامقصد ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوتے ہیں اور بعض دفعہ یہ قوانین ملک کے مفاد میں بنائے جاتے ہیں۔ بنانے والوں کی نیت صاف ہوتی ہے، لیکن وہ مسلمانوں کے عقیدہ و مذہب سے متصادم ہوتے ہیں اگر مسلمان ان اداروں کے ممبر ہوں گے تو ان کی آراء بھی طلب کی جائیں گی۔ وہ اس طرح کے قوانین کی مخالفت اور اس کے سماجی و معاشی نقصانات سے دیگر ممبران کو آگاہ کریں گے۔ نتیجہ وہ چیز قانون کا حصہ نہ بن سکے گی اور اگر اکثریت کے اتفاق آراء سے اس طرح کے قوانین وضع کر لیے جائیں تو مسلمان ممبران کی ایمانی غیرت کا تقاضہ ہے کہ وہ کھل کر اس کی مخالفت کریں، اور اس میں ہمیشہ ملی مصالحت کو مد نظر رکھیں، البتہ حکمت و دانائی کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔

من رأی منکرأ فلیغیرہ بیدہ وإن لم یستطع فبلسانہ وإن لم یستطع فبقلبہ، وذلك أضعف الإیمان (متفق علیہ) (تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کی برائی کو روک دے، اگر ایسا نہیں کر سکتا تو زبان سے منع کر دے اور یہ بھی نہیں کر سکتا تو دل سے اسے برا سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے)۔

معروف فقہی قاضی خانؒ نے بڑی وضاحت سے تحریر فرمایا ہے:

إذا رأی رجل منکرأ من قوم وهو یعلم أنه لوها هم عنه قبلوا لایسعه أن یسکت، وإن کان یعلم أنه لو فهاهم لا یمنعون وسعه أن یتراک، والنهی أفضل (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الہندیہ ۲۰۶)۔

(اگر کوئی کچھ لوگوں کو دیکھے کہ کسی منکر کا ارتکاب کر رہے ہیں، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے منع کرنے سے وہ لوگ اس سے باز آ جائیں گے تو اس کے لیے خاموشی درست نہیں ہے اور اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کے روکنے سے بھی نہیں رکیں گے تو گنجائش ہے کہ وہ چھوڑ دے، لیکن منع کرنا بہتر ہے)۔

## دستور سے وفاداری:

دستور سے وفاداری ہر ملک کے شہری کے لیے لازم ہوتی ہے۔ مسلمان جو صرف حاکمیت الہ (رب العالمین) کا قائل ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قانون سازی کا اختیار صرف خالق کائنات کو ہے، کسی فرد یا جماعت کو نہیں ہے، انسان کے وضع کردہ قانون و دستور میں نقص و عیب لازمی ہے، اور جمہوری ممالک میں جو قوانین رائج ہیں وہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں، جن میں بعض دفعات شریعت اسلامی کے خلاف ہیں، مسلمان ممبران ان دفعات کو بدل نہیں سکتے ہیں، لہذا بدرجہ مجبوری قلمی ناگواری کے ساتھ دستور سے وفاداری کا زبانی اظہار کرنے کی گنجائش ہے، بحالت مجبوری، شریعت نے کلمہ کفر کہنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

ارشاد بانی ہے: ”و من کفر باللہ من بعد ایمانہ إلا من أکثره و قلبه مطمئن بالإیمان“ (سورۃ النحل: ۱۰۶)۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے ایک واقعہ ذکر کیا ہے جس سے کافی رہنمائی ملتی ہے۔ صاحب تفہیم القرآن نقل فرماتے ہیں: حضرت عمار بن یاسر ہیں کہ جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور والدہ کو سخت عذاب دے کر شہید کر دیا گیا، پھر ان کو اتنی ناقابل برداشت اذیت دی گئی کہ آخر کار انھوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا، جو کفار ان سے کہلوانا چاہتے تھے، پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ: ما ترکت حتی سببتک و ذکرک آلتہم بخیر (یا رسول اللہ! مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”کیف تجد قلبک“ (اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو)، عرض کیا ”مطمئناً بالإیمان“ (ایمان پر پوری طرح مطمئن)، اس پر حضور نے فرمایا: ”إن عادوا فعد“ (اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو پھر یہی باتیں کہہ دینا) (تفہیم القرآن ۲/۲۵۷)۔

مذکورہ واقعہ سے یہ روشنی ملتی ہے کہ صرف فرد واحد حضرت عمار بن یاسر کے حفظ جان کے سبب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معبودان باطل کی تعریف اور اپنی ذات اقدس کے سلسلہ میں ناروا الفاظ کہنے کی اجازت دے دی تو یہاں پوری ملت و قوم کا مسئلہ ہے۔ اگر ان چند ممبران نے دستور وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تو ان کی رکنیت ختم ہو جائے گی۔ ملک سے غداری اور آئین کی مخالفت دو بین کا مقدمہ قائم ہوگا اور ملک میں رہنے والے تمام مسلمان سخت آزمائش میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لیے پوری ملت کے تحفظ کے مقصد کے پیش نظر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بحالت مجبوری جائز ہے۔

## بائبل پر حلف لینا:

جن ممالک میں بائبل پر حلف اٹھانا قانوناً لازم ہے ورنہ ان کی ممبر شپ ختم کر دی جائے گی اور ملک سے بغاوت و غداری کے مجرم قرار پائیں گے، وہاں مسلمانوں کے لیے بحالت مجبوری اس کی گنجائش ہوگی۔

## سیکولر پارٹیوں میں شمولیت:

جمہوری ممالک میں اپنے مسائل کو حل کرانے کے لیے سیاسی قوت، سیاسی اثر و رسوخ ضروری ہے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ سیکولر سیاسی پارٹیوں سے روابط ہوں، ان کی رکنیت حاصل کی جائے اور حالات سازگار ہوں تو ان پارٹیوں کی طرف سے ایکشن میں امیدوار بن کر عملی سیاست کا مظاہرہ کیا جائے، الغرض سیاسی اثر و رسوخ حاصل کرنے کی جو بھی جائز صورت ممکن ہو اس کو اختیار کر کے ملک و قوم کی خدمت کی جائے، رہا یہ سوال کہ ان سیکولر سیاسی پارٹیوں کے منشور میں بعض چیزیں اسلام مخالف ہوتی ہیں تو اھوں البیتین کے تحت سیکولر پارٹیوں کی رکنیت اور ان کے ٹکٹ پر ایکشن لڑنا جائز ہے، البتہ مخالف اسلام منشور کی دفعات کی مخالفت کی جائے اور ان کو ختم کرانے کی حتی المقدور کوشش کرنا ضروری ہے۔

## اسلام دشمن پارٹیوں کی رکنیت و حمایت:

اسلام دشمن پارٹیوں میں شمولیت، ان کی پارٹیوں کے امیدوار کو ووٹ دینا یا کسی بھی قسم کی حمایت کرنا ناجائز ہے اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان میں شامل ہے۔ جس پارٹی کی بنیاد مسلم دشمنی میں قائم ہو، اس میں کسی مسلمان کا شامل ہو کر اس کے بنیادی ایجنڈے کو تبدیل کرانے کا خواب صرف ایک خام خیالی ہے۔

## مسلم سیاسی جماعت کا قیام مفید یا مضر:

علیحدہ مسلم سیاسی جماعت کا قیام مفید یا مضر، یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں اختلاف رائے ممکن ہے، لیکن آزادی کے بعد سے اب تک کا تجزیہ یہ ہے کہ

سیکلرز کم کا دعویٰ کرنے والی سیاسی جماعتوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو ووٹ بینک کے طور پر استعمال کیا، مسلمان ان کے خوشنما وعدوں سے متاثر ہو کر ووٹ دیتے رہے، لیکن ان کو سوائے ذلت و رسوائی، عیسیٰ بدحالی، اقتصادی و سیاسی پسماندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

مسلمان جو خیر امت ہے اور جس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی نفع رسانی اس کے ذمہ کیا گیا ہے تو موجودہ ملکی حالات میں مسلمان قائدین، علماء و دانشوران اگر سیاسی جماعت اس مقصد سے قائم کرتے ہیں کہ اپنی قوم کو ان کے جائز حقوق دلواسکیں، ملک میں جو کرپشن و استحصال اور لوٹ کھسوٹ اور ظلم و نا انصافی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے اس کا خاتمہ ہو، قوم کے ساتھ ملک کی خدمت و ترقی کا ایک نمونہ پیش کریں، تو یہ دعوتی نقطہ نظر سے بھی مفید ہوگا، جبکہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے میں کچھ نہ کچھ باتیں اسلام مخالف ہوتی ہیں، اور پارٹی کی پالیسی کے تحت مسلمان ممبران کو کام کرنا پڑتا ہے، تو ایسی جماعت جس کی قیادت اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو، اصول و ضوابط، اخلاق کی اصلاح اور انسانی خدمت اور ملک و قوم کی بھلائی و ترقی اس کے دستور میں شامل ہو، اور ممبران میں کچھ غیر مسلم بھی شامل کر لیے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس کے لیے درج ذیل امور کی رعایت مناسب ہوگی:

۱۔ جن حلقوں میں مسلمان فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں وہاں مسلمان امیدوار کھڑے کیے جائیں۔

۲۔ جن حلقوں میں مسلمان فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتے ہیں، وہاں سیکولر جماعتوں کے امیدوار کی حمایت کی جائے یا اپنی جماعت کی جانب سے غیر مسلم معتدل فکر کے افراد کو ٹکٹ دیا جائے۔

### مسلم خواتین اور سیاسی مناصب:

عورت کے مزاج و طبعی افتاد کے اعتبار سے یہ چیز پسند کی گئی ہے کہ وہ اندرون خانہ رہے، گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو، بچوں کی نگہداشت کرے، شوہر کی خدمت کرے، عورت کی جسمانی و ذہنی ساخت و طبعی میلانات کے لحاظ سے یہی اس کا اصل میدان ہے کہ اس کی گود میں ملت کے قائدین کی پرورش ہو، نہ کہ وہ خود قیادت و سیاست کی ذمہ داری سنبھالے۔

سیادت و قیادت یہ مردوں کا کام ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر یہ صلاحیت و ولایت فرمائی ہے، اسی سیادت کے لیے ملکوں کی سربراہی کے لیے مرد ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

معروف فقیہ علامہ شیخ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

(ویشترط کونہ حرّاً ذکراً) ولأن النساء أمرن بالقرار فی البیوت... وإلیہ أشار النبی ﷺ حیث قال: کیف یفلح قوم تمسکھم امرأۃ (امیر مملکت کا آزاد اور مرد ہونا شرط ہے، اس لیے کہ عورتوں کو گھر میں رہنے کو کہا گیا ہے..... اسی کی طرف نبی اکرم ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے کہ وہ قوم کیسے فلاح پاسکتی ہے جس کے امور مملکت عورت کے حوالہ ہو)۔

البتہ بعض فقہاء نے خلافت عظمیٰ کے علاوہ عورت کے لیے دیگر ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اجازت دی ہے۔

امام ابن حزم ظاہری رقم فرماتے ہیں:

وجائز أن تلی المرأة الحکم: وهو قول أبو حنیفة (جائز ہے کہ عورت حکومت کا کوئی عہدہ سنبھالے، امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے)۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کی ایک خاتون، جن کا نام شفا تھا، بازار کا نگر اس بنا دیا تھا۔



## ایکشن میں شرکت کا شرعی حکم

ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی

۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: قانونی و شرعی مصلحت و اہمیت کے پیش نظر ووٹ کبھی جائز ہوگا تو کبھی مستحب اور کبھی ناجائز ہوگا یہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن کے احکام شرعی واقعات و حالات، زمان و مکان کے بدلنے اور مصالح و مضار کی بنا پر بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ایسے موقعہ پر جبکہ مسلمانوں کے ووٹ کی کوئی حیثیت نہ ہو، ڈالنا یا نہ ڈالنا برابر ہو یا نہ ہو اس معاملہ کا مسلمانوں کے مصالح و مضار سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ ہو، لیکن یہ عام انسانی مصالح و مضار پر مبنی ہوگی، اور اگر مسلم مفادات والے مسائل چاہے وہ دفع مضرت کے لئے ہوں یا جلب مصلحت کے لئے دونوں صورتوں میں مصلحت و مضرت کے درجے کے اعتبار سے فرض یا واجب یا مستحب کا حکم ہوگا یا جن امیدواروں کے لئے ووٹنگ مطلوب ہے وہ سب مسلمانوں کے بارے میں ایک ہی درجہ کے شریک ہیں یا شریک نہ ہونے کے موقع رکھتے ہیں، یا دو یا دو سے زیادہ پارٹیاں ایک ہی درجے کی شریک ہیں تو ایسی صورت میں ڈالنا کا عدم اور ناجائز ہے۔ کبھی مصلحت شرعیہ اس بات کی متقاضی ہو کہ ضرر و نقصان کے کم ہونے میں ہی مصلحت ہے تو اس کے اعتبار سے اخف الضرر والے امیدوار یا پارٹی کو ووٹ ڈالنا ضروری ہوگا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ کفر کی تائید و ترویج ہے بلکہ یہ صرف مسلمانوں کی مصلحت پر مبنی حکم ہے نہ کہ کفر یا اس کے اہل سے محبت، اس طرح کہ ہمارے سامنے کچھ نمونے بھی ہیں کہ اہل روم کے اہل فارس پر غلبہ سے مسلمان خوش ہوئے (سورہ روم کی ابتدائی آیات) اسی طرح نجاشی کے اس کے اپنے مخالف پر غلبہ سے مسلمان خوش ہوئے جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے، (اس رائے کے قائلین میں سے شیخ یوسف القرضاوی ہیں (الخلاصۃ فی فقہ الاقلیات ۱-۹)۔ یہی قول مولانا اشرف علی تھانوی و مفتی محمد شفیع رحمہما اللہ کا بھی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ انہوں نے افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ، اور ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی شرعی حدود، کانگریس و مسلم لیگ وغیرہ میں شرکت اور ان کے امیدواروں کو ووٹ دینے کے بارے میں رائے قائم فرمائی ہے (دیکھئے: جواہر الفقہ ۵/۲۲۳ تا ۲۸۷)۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: جائز ہے بشرطیکہ وہ خالص امانت و ذمہ داری کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ اس کا اہل بھی ہو۔

۴۔ غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اصل میں تو ناجائز ہے، مگر حالات حاضرہ کے پس منظر میں نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے کہ ایسے اداروں میں ممبر بن کر مسلمانوں کی حفاظت کی کوشش کریں اور مسلم مخالف قوانین کو کم سے کم کرنے میں مددگار ثابت ہوں، نیت یہ رہے کہ اپنی استطاعت کے دائرہ میں مخالف شریعت قوانین نہ بننے پائیں۔ وہیپ کی شکل عدم استطاعت کا پہلو ہے ورنہ غیر مسلم ملک بلکہ مسلم ملک میں رہنا بھی مشکل ہوگا۔

اس طرح کے مسائل کی بنا مصالح و مفاسد خیر و شر، منافع و مضار کے درمیان مقابلہ و ترجیح پر ہے، یہی وہ فقہ ہے جو سیاست شریعیہ کی اساس ہے، دو مصلحتوں کے درمیان مقابلہ کو کسی زیادہ نفع بخش و بہتر اور دیر پا ہے، اسی طرح دو مضار کے درمیان تقابل کو نسا زیادہ مہلک اور نقصان دہ ہے جیسا کہ

ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی

فقہاء کی تشریح ہے کہ بڑے نقصان سے بچنے کے لئے چھوٹے نقصان کو، عمومی نقصان سے بچنے کے لئے خصوصی یا فردی نقصان کو برداشت کیا جائے گا وغیرہ، اسی طرح جب مصالح و مفاسد کا تعارض ہو تو زیادہ نفع بخش کو ترجیح ہوگی، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں شراب کے بارے میں فرمایا: ”یسألونک عن الخمر والمیسر قل فیہما اثم کبیر ومنافع للناس واثمہما اکبر من نفعہما“ (الخلاصۃ فی فقہ الاقلیات ۱-۹ جمعہ و اعداد الموسوعۃ الشاملۃ الاصدار الثانی)۔

۵۔ جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو عمل کہاں تک درست ہے؟

الجواب: حلف اٹھانا تو درست ہے، البتہ مخالف شریعت دفعات کی چیزوں میں عملی طور پر نیت و عمل پر حرمت و حلت کا مدار معتدلی بہ پر ہے۔

۶۔ بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟

الجواب: مجبوری کی حالت میں درست ہے، بشرطیکہ وہ اس بات پر کوشاں رہیں کہ کسی طرح وہاں کے قانون میں تبدیلی ہونے کی شکل پیدا ہو تاکہ یہ اضطراریت اختیار میں تبدیل ہو جائے، اختیاری شکل میں بائبل پر حلف لینا درست نہ ہوگا، چونکہ اس وقت وہ نصاریٰ کا شعار ہے اور ہمیں مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔

۷۔ بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغائر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

الجواب: جائز ہوگا، جلب مصلحت و دفع مضرت، نیز تحمل اخف الضررین وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے بشرطیکہ وہ خود صریح احکام شریعت کے خلاف کا مرتکب نہ ہو بلکہ اس کا پابند اور مسلم مفادات کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے، نیز اس کا ارادہ یہ ہو کہ ان دفعات کے ختم کرانے کی کوشش کرے گا، عدم استطاعت کی شکل میں معذور ہوگا، چونکہ ہندوستان کے قانون و آئینی پس منظر میں نیز سیاسی پارٹیوں میں سب ہی تقریباً خلاف شرع اسلامی ہیں کلیات کے اعتبار سے، اس صورت میں دو مصلحتوں یا دو مضرتوں کے درمیان ترجیح والے اصول پر ہی عمل کیا جائے گا جیسا کہ سوال نمبر دو کے جواب میں مذکور ہوا۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟

الجواب: ایسی پارٹی میں شریک ہونا جائز نہیں جبکہ اس کے ساتھ دوسری اخف الضررین والی پارٹیاں موجود ہوں۔ اگر اس طرح کی پارٹیوں میں سے کوئی نہ ہو تو پھر بھی ان کھلی دشمن پارٹیوں میں کم ضرر والی کو ترجیح ہوگی، البتہ یہ نیت کہ وہ ایسی پارٹی کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، اس کا حکم پارٹی کے دستور و ایجنڈے کی نوعیت پر موقوف ہوگا، اگر ایسا دستور ہے کہ اس کی اساسیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو صرف یہ گمان و خیال یا وہم ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر اس طرح کا ایجنڈا جو بدل سکتا ہے تو پھر طریقہ تبدیلی کی نوعیت پر حکم ہوگا، اگر ایسا طریقہ ہے جس سے وہ بااثر ہو سکتا ہے تو جائز ہوگا ورنہ ناجائز۔

۹۔ ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟

الجواب: درست ہے، جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے تو وہ اس پارٹی کے طریقہ، حکمت، جمہوری ملک میں کامیابی کی ہنر و مہارت سے متعلق ہے، ایسی پارٹی کی عدم موجودگی میں بھی ایسا ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایکشن میں خواتین کی کیا کردار ہونا چاہئے۔

الجواب: اس کے جواب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اول: صرف ووٹر کی حیثیت سے ووٹ ڈالنے کا حق، یہ بلاشبہ جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے اسلامی ملکوں میں بھی، اسی لئے ہندوستان میں بدرجہ اولیٰ

جائز ہے:-

دوم: عورت کا عام صدارتی انتخاب میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا، اکثر معاصر علماء کے نزدیک اسلامی ملکوں میں جائز نہیں، یہی قدیم فقہاء کا بھی قول ہے، اور یہی میرے نزدیک مختار قول ہے، بعض کے نزدیک جائز ہے۔

سوم: عورت کا عام صدارتی انتخاب کے علاوہ دوسری عام ولایات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا، اسلامی ملکوں میں عورت کے بارے میں علماء دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک جائز نہیں، یہ قول از ہر فتویٰ کمیٹی اور بہت سے معاصر علماء کا ہے، اور یہی قدیم فقہاء کے یہاں پایا جاتا ہے، دوسرا قول اس کے جواز کا ہے، اس کے موید بہت سے معاصرین علماء ہیں، میرا مختار قول اول ہے۔

چہارم: عورت کا پارلیا منٹری مجالس میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا: اسلامی ملکوں کے بارے میں دو قول ہیں ایک جواز دوسرے عدم جواز، یہ پارلیا منٹری مجالس بھی دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک میں مسئلہ صرف مشورہ و رائے کی حد تک ہوتا ہے، اس میں عورت کا شرعی پابندیوں کے ساتھ امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا جائز ہے، دوسری وہ پارلیا منٹری مجالس ہیں وہ ولایات عامہ میں داخل ہیں ان میں عورت کا امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا جائز نہیں۔

ہندوستان میں اس کا حکم:

ہندوستان اور اس جیسے دیگر غیر اسلامی ملکوں کے بارے میں دلائل شرعیہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالت مذکورہ میں دفع مضرت و جلب مصلحت اور مقاصد شریعت کے ساتھ ساتھ ان نصوص کی روشنی میں جو خواتین کے دائرہ عمل کی نوعیت پر دال ہیں یہ اصوب ہے کہ انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے۔ البتہ ان کا امیدوار یا ممبر بننا یہ بھی انہیں ذاتی طور پر اپنی شخصی زندگی میں شریعت کی حدود کی پابندی کرتے ہوئے جائز ہے، بلکہ موجودہ آئینہ حالات کے پس منظر میں ایسی بااہل مسلم خواتین کی شرعی و سیاسی تربیت امت مسلمہ کے تحفظ کے لئے ضروری و واجب شرعی ہے، چونکہ اس پر امت مسلمہ کے مصالح کی حفاظت اور دفع مضرت کی اساس قائم ہے ورنہ اس جیسی اہم جگہوں میں مسلمانوں کا خلاء نہ صرف ان کے مخالفین کو راہ ہموار فراہم کرے گا بلکہ قانونی جواز پر بھی دال ہوگا۔ پھر خواتین کے ریزرویشن کی شکل میں تو مسئلہ اختیاری معاملہ سے اضطراری حالت میں داخل ہو جاتا ہے۔ لہذا ایسی صورت میں استطاعت کے احکام سے اضطراری احکام میں مسئلہ داخل ہو جائے گا، ان تربیت یافتہ عورتوں کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ اس جبری حالت کو اپنی دماغی و ارادی قوتوں سے تبدیل کر کر ایسے اختیاری قانون میں تحویل کر دیں جو صرف اختیاری ہو۔ البتہ اگر اس کے بغیر بھی امت مسلمہ کی مصالح کی تکمیل میں کوئی خلل نہ ہو تو پھر عورتوں کی ان کی اہم ذمہ داریوں کو نبھانا زیادہ اولیٰ ہوگا۔ ہاں اگر مذکورہ بالا مشارکت کی وجہ سے شرعی حدود کی پابندی ذاتی زندگی میں ناممکن ہو تو پھر مشارکت کسی حال میں درست نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆



## ایکشن سے متعلق چند اہم مسائل

مولانا محمد ممتاز خاں ندوی ؒ

### (۱) ووٹ کی شرعی حیثیت:

کسی امیدوار کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن وحدیث چند حیثیتیں ہیں، ایک شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت وامانت بھی اور اگر حقیقت میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے، جو سخت گناہ کبیرہ اور وبال دنیا و آخرت ہے۔

اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع و خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرنے۔

دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے۔ اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے: ”وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا“ (سورہ نساء: ۸۴) یعنی جو اچھی سفارش کرتا ہے، اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے۔

اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے، جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، ظالم کی سفارش کرے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔

ووٹ کی تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کی کسی شخصی حق سے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان ایسے حقوق کے متعلق ہے، جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا، تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ووٹ کی تین حیثیتیں ہیں، ایک شہادت، دوسری سفارش، تیسری وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی، اسکے تباہ کن اثرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

### (۲) ووٹ کا حکم:

اگر ووٹ کی حیثیت شہادت کی مان لی جائے، اور امیدوار قابلیت اور امانت کی ودیانت کی صفت سے متصف ہے تو ایسی شہادت واجب ہے اور ایسی شہادت کو چھپانا گناہ عظیم ہے۔ ارشاد باری ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ“ (سورہ مائدہ: ۷) (اے ایمان والو! ایسے بن جاؤ کہ اللہ کے احکام کی پابندی کے لئے ہر وقت تیار ہو۔ اور انصاف کی گواہی دینے والے ہو)۔ دوسری جگہ ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ“ (سورہ نساء: ۱۳۴) (اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے ہو، اللہ کی خاطر گواہی دینے والے ہو)، ان دونوں آیتوں میں مسلمان پر فرض کیا گیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں۔ اللہ کے لیے ادائیگی شہادت کے

مستاد مدرسہ ضیاء العلوم میدان پورنکلیہ کلاں رائے بریلی (یو پی)۔

واسطے کھڑے ہوں جائیں۔ تیسری جگہ سورہ طلاق میں ہے: ”وأقيموا الشهادة لله“ (سورہ طلاق: ۶۵) یعنی اللہ کے لئے سچی شہادت کو قائم کرو، ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔ ارشاد ہے: ”ولا تکتبوا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه“ (سورہ بقرہ آیت ۲۸۲) یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہے۔

(۳) الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا:

جمہوری ممالک میں انتخاب میں شرکت سے بے شمار دینی و ملی مصالح اور مقاصد وابستہ ہیں اور کہیں کہیں تو اس کے بغیر ملت کا تشخص اور وجود ہی خطرہ میں ہے، لہذا ہندوستان میں جمہوری نظام غیر اسلامی ہونے کے باوجود اگر امیدوار کی نیت شرکت سے متصادم قوانین کو منسوخ کرانے کی کوشش اور خدمت خلق ہو تو اپنے آپ کو الیکشن میں امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا راقم کے نزدیک جائز ہے۔ صحیحین کی حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے: ”من رأى منك منكرأ فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فقلبه“ (رواہ البخاری) (جو کوئی تم میں سے کوئی برائی دیکھے، تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھے تو اس کو زبان سے کہے اور اس کی بھی استطاعت نہ رکھے تو اس کو دل سے برا جانے۔

انتخاب میں شرکت کے جواز پر فتاویٰ محمودیہ کا ایک فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیں:

سوال ۴۵۸: کیا اسلامی اصول کے مطابق اس ہندوستان کی سیاست میں ہم مسلمان بھی حصہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلياً

اگر اس حصہ لینے سے آپ کو احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، اور آپ حصہ لے کر اہل اسلام کی خدمت کر سکیں اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکیں تو حصہ لے سکتے ہیں (فتاویٰ محمودیہ ۱۳/۲۲۵)۔

(۴) ممبر بننا:

قانون ساز ادارے جو مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، خواہ یہ ادارے غیر مسلم ملکوں میں ہوں یا غیر ملکوں میں، راقم کے نزدیک ایسے اداروں کے ممبر بننے سے آدمی انہیں کے خیالات و افکار میں رنگ سکتا ہے اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان بھی ہے۔ لہذا ایسے اداروں کا ممبر بننا راقم کے نزدیک درست نہیں ہے۔

سورہ مائدہ کی آیت ہے: ”ولا تعاونوا على الإثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۱) (اور تم لوگ برائی اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

سورہ مائدہ ہی میں ہے: ”يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا دينكم هزوا ولعبا من الذين أتوا الكتاب من قبلكم والكفار أولياء واتقوا الله إن كنتم مومنين“ (سورہ مائدہ: ۵۶) (اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایسے لوگوں کو اپنا یا رومدگار نہ بناؤ۔ جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق دیکھ لیا بنا رکھا ہے اور اگر تم واقعی صاحب ایمان ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو)۔

سورہ ہود میں ہے: ”ولا تركزوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار وما لكم من دون الله من أولياء ثم لا تنصرون“ (سورہ ہود: ۱۱۲) (اور مت جھلو ان کی طرف جو ظالم ہیں، پھر تم کو لگے گی آگ اور کوئی تمہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار پھر نہیں مدد نہ پاؤ گے)۔

اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ”من رقع حول الحمى يوشك أن يقع فيه“ (رواہ بخاری)۔

(۵) حلف اٹھانا:

حلف اٹھاتے وقت اگر یہ نیت ہو کہ خلاف شریعت جو دفعات ہیں، ان کو میں مٹانے کی بھرپور کوشش کروں گا، خواہ مجھے قانون ساز اداروں سے

دست بردار ہونا پڑے، راقم کے نزدیک اس طرح کا حلف اٹھایا جاسکتا ہے۔ بصورت دیگر اس طرح کا حلف اٹھانا راقم کے نزدیک جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔ قرآن کریم میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۱) (اور تم لوگ برائی اور زیادتی کے کاموں میں مدد نہ کرو)۔

(۶) بائبل پر حلف لینا:

بائبل کو چونکہ مسلمان محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کو اقتدار علی اللہ گردانتے ہیں۔ اس لئے راقم کے نزدیک جائز نہیں کہ مسلمان ممبر بائبل پر حلف لے، کیونکہ یہ ان کتابوں کی تعظیم اور بحالت موجودہ ان کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے مرادف ہوگا، البتہ اگر وہ اس پر مجبور ہوں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ بائبل پر حلف لیا جاسکتا ہے، چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامی فقہ اکیڈمی کے اجلاس منعقدہ ۸ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء اس مسئلہ میں جن نکات پر متفق ہوئے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ: ”إذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب يكون مكرها ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيماً“ (قرارات مجلس المجمع الفقہی الإسلامی ۸۵، ۱۴۰۲)

(اگر کسی ملک میں غیر اسلامی حکومت ہو اور وہاں تورات یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کا حکم دیا جاتا ہو تو مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عدالت سے مطالبہ کرنے کے باوجود قرآن پر رکھوائیں جائیں، اگر اس کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا جائے تو اب اسے مجبور سمجھا جائے گا اور اس کے لئے گنجائش ہوگی کہ وہ تورات یا انجیل یا دونوں پر دل سے ان کی تعظیم کا ارادہ کیے بغیر اپنا ہاتھ رکھے)۔

(۷) سیکولر پارٹیوں کی طرف سے انتخاب لڑنا یا ان میں شامل ہونا:

ایسی پارٹیوں میں راقم کے نزدیک اس شرط کے ساتھ شرکت اور انتخاب لڑنے کی گنجائش ہے کہ جو دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغائر ہوں، ان کو منسوخ کرا کے وہ دفعات نافذ کراؤں گا جو اسلام اور مسلمانوں کے موافق ہوں۔ حدیث ہے: ”إنما الأعمال بالنیات“ (رواہ البخاری) (اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے)۔ اگر ایسی نیت نہ ہو تو پھر شرکت اور انتخاب لڑنے کی گنجائش نہیں ہوگی اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ”ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۱) (اور تم لوگ برائی اور زیادتی کے کاموں میں مدد نہ کرو)۔

(۸) مسلم دشمن پارٹی میں شریک ہونا:

مسلم دشمن پارٹیاں جن کا مشن ہی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ہو، ایسی پارٹیوں میں شرکت خواہ اس کی نیت پارٹی کے ایجنڈے کے بدلنے کی ہو، راقم کے نزدیک جائز نہیں ہے، کیونکہ جن پارٹیوں کا مشن ہی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ہو وہ حزب الشیطان ہیں، وہ کب فرد واحد کی آواز پر کان دھریں گے اور چارو ناچار یہ بیچارہ بھی ان کے خیالات و افکار کا حامی بن جائے گا۔

سورہ ممتحنہ میں ہے: ”إنما ینہاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاہروا علی إخراجکم أن تولوهم ومن یتولهم فأولئک هم الظالمون“ (سورہ ممتحنہ: ۸)۔

(اللہ تو منع کرتا ہے تم کو ان سے جوڑتے ہیں تم سے دین پر، اور نکال تم کو تمہارے گھروں سے اور شریک ہوئے تمہارے نکالنے میں کہ ان سے کر دوستی اور جو کوئی ان سے دوستی کرے، سو وہ لوگ ہی ہیں گناہگار)۔

حدیث ہے: ”من کثر سواد قوم فهو منهم“

فقہی ضابطہ ہے: ”الاعتبار للأقل“ (اعتبار اکثر کا ہے، نہ کہ اقل کا)۔

(۹) مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا:

مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا، اگرچہ سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہو، راقم کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ اس پارٹی سے مسلمانوں کے دینی و ملی کاموں میں تقویت ملے گی، اور غیروں کی نظر میں مسلمانوں کی ایک اہمیت ہوگی، اور رہی بات مسلمان مخالف ووٹ کے متحد ہونے کی تو اس طرح کی کوئی تدبیر اور مصلحت اختیار کی جائے کہ مسلمان مخالف ووٹ متحد نہ ہونے پائے۔

(۱۰) خواتین کا الیکشن میں حصہ لینا:

خواتین کا الیکشن میں امیدوار بننا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا راقم کے نزدیک جائز نہیں ہے، کیونکہ ان تمام چیزوں کا منصب مردوں کو عطا کیا گیا ہے اور یہ انہیں کو زیب دیتا ہے اور پھر یہ کہ ان تمام چیزوں میں غیر مردوں کے ساتھ میل جول ضروری ہے، جبکہ شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

سورہ نساء میں ہے: ”الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا“ (سورہ نساء: ۳۴) (مرد عورتوں پر نگران اور حاکم ہیں۔ اس وجہ سے کہ اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ نفقہ ادا کرتے ہیں)۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم ذمہ داری مردوں کو ان کی عقل، فہم اور قوت فیصلہ نیز ان کی ہم جو یا نہ فطرت کی وجہ سے دی گئی ہے اور عورتیں ان صفات سے عموماً عاری ہوتی ہیں، اس لئے وہ ملک کے نظم و نسق بہتر طریقے سے سنبھال نہیں سکتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس قوم کی قیادت عورت کے ہاتھ میں ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی: ”لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب کتاب النبی ﷺ)۔ (کسری ۲۲۵)۔

عورت کا ووٹ میں حصہ لینا:

عورت کیا ووٹ ڈال سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں معاصر فقہاء کی دورائیں ہیں: بعض حضرات عورت کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتے ہیں، کیونکہ یہ عام انسانی حقوق میں سے ہے۔ کسی عورت کو اس سے محروم کرنا درست نہیں ہوگا (المرأة بين الفقه والقانون ص ۱۵۵) جبکہ بعض دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ انتخاب میں گواہی اور وکالت کے ساتھ مذکورہ منصب کے لئے مناسب فرد کا چنا ہوتا ہے اور یہ کام عورت سے نہیں ہو سکتا، لہذا عورت کے لئے ووٹ ڈالنا درست نہیں ہوگا (بدایۃ الجہد ۲/۵۳۱، رد المحتار ۵/۴۳)۔

☆☆☆

## لیکشن سے مربوط چند مسائل

مولانا افتخار احمد مفتاحی ط

### سوال ۱: ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں:

۱۔ ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ہم چند مختلف المراج والصفات افراد میں سے جب کسی ایک کو ووٹ دیتے ہیں تو گویا اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ امیدوار ملک و ملت اور باشندگان ملک کی فلاح و بہبود کے نظریہ سے دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے، اس امیدوار میں خدمت خلق کا جذبہ ہے، امانت دار ہے مثبت سوچ رکھتا ہے۔ ملک کے مفاد میں ہر ممکن قربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔ تخریبی مزاج نہیں رکھتا ہے یہ اس بات کا اہل ہے کہ دیگر امیدواروں کے مقابل اس کو ترجیح دی جائے۔ اگر ووٹ دینے والے نے اہل کو چھوڑ کر نااہل کو ووٹ دیا، اپنے ذاتی مفاد کے پس منظر میں یا قرابت اور رشتہ داری کی بنیاد پر تو یہ جھوٹی گواہی ہوگی اور جھوٹی گواہی سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سختی سے منع کیا ہے۔ یہ گناہ کبیرہ ہے اور دنیا و آخرت میں وبال جان ہے، اللہ رب العزت نے سورہ حج میں ارشاد فرمایا: "فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" (الحج: ۳۰) (سوتم لوگ بتوں کی گندگی سے کنارہ کش رہو اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو)۔

۲۔ ووٹ کی دوسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ایک انسان اپنے کسی کام کسی کو وکیل بنا تا ہے اور نمائندہ کی حیثیت سے بھیجتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ووٹ اپنے علاقہ سے سیاسی معاملات میں وکیل بنا تا ہے کہ فلاں امیدوار اس حلقہ سے برائے حکومت تنظیمی ڈھانچے کے لئے وکیل ہے، لیکن کسی امیدوار کی وکالت کا معاملہ وکیل بنانے والے کی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دیگر لوگوں کے نفع یا ضرر کا باعث ہوگا۔ اس لئے کسی امیدوار کو وکیل بنانا ہے تو یہ سوچ سمجھ کر بنانا ہوگا کہ اس کی وکالت سے اگر عوام و خواص کا نقصان ہوگا تو وکیل کے ساتھ موکل بھی مورد الزام ٹھہرے گا اور پامالی حقوق کے گناہ میں شریک ہوگا۔

۳۔ ووٹ کی تیسری حیثیت سفارش کی ہے کہ ووٹ دینے والا جس کو ووٹ دیتا ہے وہ اس بات کی سفارش کرتا ہے کہ یہ امیدوار مفاد عامہ میں کام کرنے والا ہے، ملک کا خیر خواہ ہے اس علاقہ سے اسے نمائندہ بنایا جائے تو بہتر ہوگا، اگر ووٹ دینے والا سفارش کی تو ثواب کا مستحق ہوگا اور اگر جان بوجھ کر حقیقت واقعہ کے خلاف سفارش کی تو عتاب کا مستحق ہوگا، اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: "من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (النساء: ۸۵) (جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے، اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے)۔

۴۔ ووٹ کی چوتھی حیثیت مشورہ کی ہے کہ چند امیدواروں میں سے ایک کو ووٹ دے کر گویا یہ مشورہ دے رہا ہے کہ میری رائے میں یہی امیدوار متعلقہ ذمہ داری کے لئے زیادہ مناسب ہے، بہ نسبت دوسرے امیدواروں کے، لیکن مشورہ دینے والے کو چاہیے کہ دل کی آواز پر مشورہ دے، کسی دوسرے کے دباؤ یا ذاتی مفاد میں کوئی مشورہ نہ دے۔

سوال ۲: اگر ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا۔ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب؟

آیات قرآنیہ نے جہاں جھوٹی شہادت کی قباحت اور حرمت کو بیان کیا ہے، وہیں احقاق حق کے نقطہ نظر سے سچی شہادت کو لازم بھی قرار دیا ہے

ط جامعہ مفتاح العلوم سنو۔

اور اخفاء سے واضح لفظوں میں منع کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ”ولا تکتبوا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه“ (البقرہ ۲۸۳) (اور شہادت کا اخفاء مت کرو اور جو اخفاء کرے گا اس کا دل گناہگار ہے)۔

آیات قرآنیہ میں جس شدت سے گواہی دینے کا حکم دیا گیا اور کتمان شہادت سے منع کیا گیا، اس کے پس منظر میں فقہاء عظام اور محققین نے متحمل شہادۃ یعنی گواہ بننے کو اسی طرح فرض کفایہ قرار دیا ہے، جس طرح اداء شہادت یعنی گواہی دینا فرض کفایہ ہے، کیوں کہ بصورت دیگر اہل حقوق کے حقوق ضائع ہو جائیں گے فی المجتبیٰ عن الفضلی: تحمل الشهادة فرض علی الکفایة كأدائها والا لصاعت الحقوق (شامی)۔ فرض کفایہ ہونے کا حکم یہ ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے شہادت دے دی اور ان کی شہادت سے مظلوم کو اس کا حق مل گیا تو باقی افراد سے اس کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔

ووٹ میں ایک حیثیت گواہی کی ہے اور گواہی کے سلسلہ میں یہ واضح کیا جا چکا کہ بعض صورتوں میں فرض کفایہ اور بعض صورتوں میں فرض عین ہے۔ اسی طرح ووٹ دینا بھی بعض صورتوں میں فرض کفایہ اور بعض صورتوں میں فرض عین ہوگا۔

سوال ۳: ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

حضرات فقہاء نے عہدہ اور منصب کے طلب کے سلسلہ میں تفصیل بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی بھی عہدہ اور منصب کا طلب اگر وہ اس عہدہ کی اہلیت نہیں رکھتا ہے تو اس کا طلب کرنا مطلقاً ممنوع ہے اور ایسے ہی اگر منصب کی طلب جب جاہ و مال اور شرف کے پیش نظر ہو تو بھی منع ہے اور اگر عدل و انصاف کے قیام اور اصلاح بین الناس کے جذبہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں ہے (کنکح فیہم ۳/ ۲۹۴) مفسر قرآن علامہ قرطبی حضرت یوسف کے قول: اجعلنی علی خزائن الأرض الخ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لو علم إنسان من نفسه أنه يقوم بالحق فی القضاء أداء لحسبة ولم یکن هناك من یصلح ولا یقوم مقامه لتعین ذالک علیہ وجب ان یتولاه ویسأل ذلک ویخبر بصفاته التي يستحقها به من العلم والكفایة وغير ذالک كما قال یوسف علیہ السلام فأما لو كان هناك من یقوم بها ویصلح لها وعلم بذالک فالأولی أن لا یطلب لقوله علیہ السلام لعبد الرحمن: لا تسأل الإمارة الخ (تفسیر قرطبی ۹/ ۱۳۲)۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ رقمطراز ہیں: ”معلوم ہوا کہ جب کسی کام کی لیاقت اپنے اندر منحصر دیکھے تو خود اس کی درخواست جائز ہے مگر مقصود نفع رسانی ہو، نہ کہ نفس پروری (بیان القرآن)۔“

سوال ۴: غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یا نہیں؟

ایسے قانون ساز ادارے جو مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ان اداروں کی رکنیت اختیار کرنے اور نہ کرنے کے سلسلہ میں جب ہم بنظر غائر دیکھتے ہیں تو کوئی پہلو شرع سے خالی نظر نہیں آتا تاہم اس میں خیر کا بھی امکان ہے۔ اگر ہم ان اداروں کی رکنیت اختیار کرتے ہیں تو گویا مخالف شریعت قوانین بنانے والوں کا تعاون کرتے ہیں اور بظاہر یہ تعاون علی الاثم والمعصیۃ کی قبیل سے ہوگا جو از روئے شرع درست نہیں ہے، اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان (سورہ مائدہ: ۸) اور (مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر)۔

اس لئے جو ادارے مخالف شریعت قانون بناتے ہیں یقیناً یہ جوش انتقام میں ظلم و زیادتی کے مرتکب ہیں، ان کی اعانت نہ کر کے ان کو بنے اعتدالیوں سے روکنے کی ضرورت ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم ان اداروں کی رکنیت اختیار نہ کریں، لیکن دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ہم ان اداروں کی رکنیت اختیار کر لیتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم اپنے اخلاق، کردار اور اسلامی تعلیمات کی جامعیت کی بنیاد پر ان اداروں کو ایسے قوانین کے بنانے سے نروک سکیں جو مخالف شریعت ہوں اور انہیں مثبت سوچ پر آمادہ کر سکیں۔ الغرض دونوں پہلو (خیر اور شر) اس میں موجود ہیں، گویا ہم دوراہے پر کھڑے ہیں، لیکن قرآنی تعلیمات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ، فقہاء اور مجتہدین کے اقوال ہمارے لئے رہنما اصول ہیں، ان کی روشنی میں ہم فیصلہ کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس واقعہ کے خدو خال کو ہم دیکھیں تو زیر بحث مسئلہ میں رہنمائی مل سکتی ہے۔

سوال ۵: جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دستور میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

سوال ۴ کے ذیل میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ایسے قانون ساز ادارے جو مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ان کی رکنیت اختیار کرنا ضرورتاً جائز ہے، صورت مسئلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض قوانین خلاف شرع ہوتے ہیں اور بعض خلاف شرع نہیں ہوتے، اس لئے الامور بمقاصدھا، الضرورات تبیح المحظورات، انما الأعمال بالنیات وغیرہ قواعد کی بنیاد پر دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا بادل نخواستہ ضرورتاً جائز ہوگا اور حلف اٹھاتے وقت قلبی رجحان ان قوانین کی طرف ہو جو خلاف شرع نہ ہوں اور صورت مسئلہ کے جواز کو ذیل میں لکھے گئے مسئلہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر کفار مسلمانوں سے جنگ کی صورت میں مسلم قیدیوں یا بچوں کو ڈھال بنائے ہوئے ہوں اور اسلامی لشکر تیر چلاتے وقت مسلمان قیدیوں یا بچوں کو نشانہ بنانے کی نیت نہ کرے بلکہ کافروں کو نشانہ بنانے کی نیت کرے تو تیر چلانا درست ہوگا ورنہ حرام ہوگا (الاشاہد والنہوی)۔

سوال ۶: بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو تو کیا مسلم ارکان کے لئے یہ عمل درست ہوگا؟

تورات، زبور، انجیل اور قرآن آسمانی کتابیں ہیں، قرآن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: اِنَّا نَحْنُ الذِّكْرُ وَاِنَّا لَهٗ حٰفِظُوْنَ۔ یعنی ہم نے (ذکر) قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ تنزیل قرآن کے تذکرہ کے ساتھ اللہ رب العزت نے حفاظت قرآن کا بھی وعدہ کیا ہے۔ جبکہ قرآن کے سوا دیگر آسمانی کتابوں کی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے سوا تمام آسمانی کتابوں میں تحریف کی گئی اور جو بھی یہودیوں یا عیسائیوں کے تورات و انجیل کے نسخے آج دستیاب ہیں وہ سب محرف ہیں اور ان تحریف شدہ نسخوں پر حلف لینا درحقیقت ان کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق اور تعظیم کے مرادف ہوگا اور یہ مسلم ممبران کے لئے اصلاً جائز نہیں ہونا چاہیے، البتہ اگر مسلم ممبران کو اس پر حد درجہ مجبور کیا جائے اور بلا حلف اٹھائے ان کی رکنیت کو خارج تصور کیا جائے تو الضرورات تبیح المحظورات، بیحوز فی الضرورة مالا بیحوز فی غیرھا، اہون البلیتین وغیرہ قواعد کی رو سے ضرورتاً بادل نخواستہ بائبل پر حلف لینا جائز ہوگا، لیکن حلف لینے وقت دل میں یہ بات موجزن ہونی چاہیے کہ یہ کتاب تحریف شدہ ہے اور منسوخ ہو چکی ہے مکہ مکرمہ کی فقہ اکیڈمی نے منعقدہ ۱۶ تا ۱۸ ربیع الثانی ۱۴۹۲ء کے سیمینار میں با اتفاق رائے حلف لینے کو بدرجہ مجبوری جائز قرار دیا ہے۔

سوال ۷: بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کی منشور کے بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

قوانین اسلام کی بقاء اور مسلم مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کی جستجو ہونی چاہیے کہ کیا کوئی ایسی پارٹی بھی ہے جس کے منشور میں کوئی دفعہ مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر نہیں ہے، اگر کوئی ایسی پارٹی پائی جا رہی ہو جس کا ماضی مسلمانوں کے مفادات کا آئینہ کار ہو تو ایسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا چاہیے اور اس پارٹی کی طرف سے اٹھائے گئے امیدواروں کی بھرپور حمایت کرنا چاہیے، لیکن اگر ایسی کوئی پارٹی نہ پائی جا رہی ہو بلکہ جتنی سیاسی پارٹیاں میدان میں ہیں ان سبھی کے منشور میں کچھ نہ کچھ کم و بیش دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر پائے جا رہے ہوں تو اہون البلیتین پر عمل ہوگا، جو پارٹی نسبتاً مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو اس کا تعاون کیا جائے گا اور شمولیت اختیار کی جائے گی، اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا قوم و ملت کے لئے نقصان دہ ہوگا، اگر ہم نے متحد ہو کر اس پارٹی کو ووٹ دیا جو نسبتاً دوسرے سے بہتر ہے تو ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارا وزن بڑھتا جائے اور متاثر ہو کر وہ پارٹی اپنے منشور سے ان دفعات کو نکال دے جو مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہیں، لیکن اگر موجودہ تمام سیاسی پارٹیاں یکساں حیثیت کی حامل ہوں تو بھی ایکشن سے کنارہ کش نہیں ہوں گے بلکہ ان پارٹیوں کی طرف سے نامزد کئے گئے امیدواروں کے اخلاق و کردار پر نظر ڈالی جائے گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ کون امیدوار مسلمانوں کے حق میں زیادہ بہتر ہے، نقصان دہ نہیں ہے، اس امیدوار کو ترجیح دی جائے گی پھر بھی اصلاً پارٹی ہی پر نظر مرکوز رکھی جائے گی کیونکہ امیدوار پارٹی کے منشور کا پابند ہوتا ہے۔

سوال ۸: جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کیا کسی مسلمان کے لئے اس پارٹی میں

شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو اس کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

کسی بھی پارٹی کی بنیاد اس کے منشور پر ہوا کرتی ہے جس پارٹی میں شمولیت اختیار کی جائے گی گویا اس پارٹی کے منشور کی حمایت کا عہد و پیمانہ کرتا ہے، اس لئے اگر کوئی پارٹی میں شریک ہو کر منشور میں تبدیلی لانے کی نیت کرتا ہے تو بھی اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا، کیونکہ افراد کی ذاتی رائے پارٹی کے منشور یا فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ نکلا کہ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو مسلمانوں کے لئے اس پارٹی میں شامل ہونا جائز نہیں ہے، اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا تو بھی اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش سمجھ میں نہیں آتی۔

سوال ۹: ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکز نہیں ہوتی وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے اور اس سے فرقہ پرست تنظیم فائدہ اٹھالیتی ہیں۔

مذہب اسلام امن و شانتی کا مذہب ہے، عدل و انصاف کا پابند بنانا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ہر ممکن رعایت کرنے کا حکم دیتا ہے اور کوتاہی کی صورت میں بارگاہ ایزدی میں جواب دہی کا پابند بنانا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا وہاں عدل و انصاف کا بول بالا ہوا، ہر کس و ناکس کو حصول انصاف کا حق ملا، آج بھی اگر اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو جان و مال، عزت و آبرو کی مکمل حفاظت ہوگی، مقاصد شریعت کا تحفظ ہوگا بلا تفریق مذہب و ملت معاشی ترقی کی راہیں ہر شخص کے لئے ہموار ہوں گی، خدا کے عادلانہ نظام کا نفاذ آزادانہ طور پر ہوگا۔ اگر مستقل حکومت و سلطنت نہ ہو تو حکومت میں مؤثر طریقہ سے شمولیت بھی بہت سی مشکلات کو ختم کر سکتی ہے جہاں تک معاملہ مسلمانوں کے اقلیت میں رہتے ہوئے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے کا ہے تو چونکہ دنیا میں زیادہ تر جمہوری نظام قائم ہے اور جمہوریت میں سیاسی پارٹیوں کے قیام کو قانوناً جواز حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ آئے دن نئی نئی پارٹیاں وجود میں آتی رہتی ہیں تو مسلمانوں کے لئے بھی علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے کا جواز حاصل ہے اور قرآن کی آیت: **و اجعل لی من لدنک سلطاناً نصیراً** اچھی جواز کی طرف مشیر ہے، لیکن پارٹی کی تشکیل سے پہلے مفاد عامہ پر نظر رکھی جائے گی۔ جمہوریت میں مسلمان اور برادران وطن اگر تانے بانے کی طرح متحد ہو کر رہیں تو ملک کی سالمیت بھی ہوگی اور ترقی کے مواقع بھی زیادہ فراہم ہوں گے، لیکن تعصب و نفرت کا ماحول ہو، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جاتی ہوں اور مسلمانوں کو ترقیات سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہو تو اگر علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا مفید ہو تو علیحدہ جماعت قائم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بہتر اقدام ہوگا برخلاف اس کے اگر نقصان کا اندیشہ ہو تو علیحدہ جماعت قائم نہ کر کے اس جماعت اور پارٹی کی حمایت کی جائے جو مسلمانوں کے لئے دوسری پارٹیوں کے مقابل بہتر ہوں۔

سوال ۱۰: ایکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے، کیا انہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے؟ کیا ان کے لئے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟

از روئے شرع اصلاً عورتوں کا ایکشن میں ممبر بننا اور قانون ساز اداروں کی رکنیت اختیار کرنا درست نہیں ہے، لیکن مخصوص اور غیر معمولی حالت میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے ان خاص حالتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”یہ صحیح ہے کہ عورت کے طبعی حالات فرائض امامت کے منافی ہیں اور خود اسلام نے امام کے لئے جو ضروری شرائط قرار دیئے ہیں اس سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ امامت جمہوری اور خلافت الہی سے سبکدوش ہے، لیکن اس سے یہ غلط استدلال نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمان عورت کو کسی بھی حالت میں پبلک کی سیاسی اور فوجی رہبری جائز نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ساری ملت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی ہو اور اس کے خیال میں کوئی دوسرا اس فتنہ کو بجھانے والا نہ ہو (سیرت عائشہ صفحہ ۱۲۶)۔“

☆☆☆



## جمہوری ممالک میں الیکشن سے متعلق مسائل و احکام

مولانا محمد مجیب الرحمن ندوی

ووٹ کی شرعی حیثیت:

اقرآن وحدیث کی روشنی میں ووٹ کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی چند حیثیتیں ہیں مثلاً شہادت، سفارش، مشورہ، وکالت وغیرہ۔

شہادت:

یعنی مشاہدہ کی بناء پر کسی شے کے برحق اور صحیح ہونے کی خبر دینا شہادت و گواہی ہے (جامع الرموز ۳/۸۴)۔

پس کسی امیدار کو ووٹ دینا دراصل اس بات کی گواہی ہے کہ وہ فلاں منصب کا اہل اور امانتدار ہے، دیانتداری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکتا ہے، اس میں قوم و ملت کا درد ہے، خدمت خلق کا جذبہ ہے اور وہ ملک و ملت کا خیر خواہ ہے۔ ایسے امیدوار کو ووٹ دینا سچی گواہی ہے۔ اس کے برعکس نا اہل، خائن، ملک و ملت کے غدار، چور اچھے، مجرم پیشہ ور، بلکہ پولیس کے نامزد اور نامور مجرم اور خود غرض امیدوار کو ووٹ دینا جھوٹی گواہی ہے اور جھوٹی گواہی گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن مجید اور حدیث پاک نے شرک اور جھوٹی شہادت دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا ہے جس کا مقصد واضح ہے کہ جس طرح شرک اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور گناہ کبیرہ ہے، ویسے ہی جھوٹی شہادت بھی ناپسندیدہ اور گناہ کبیرہ ہے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم کو اکبر الکبائر (سب سے بڑا گناہ) نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی پھر آپ ﷺ ٹھیک سے بیٹھ گئے، حالانکہ اس سے پہلے ٹھیک لگائے ہوئے تھے، اور فرمایا: سنو شہادت زور یعنی جھوٹی گواہی اور برابر دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم لوگوں کو خیال ہوا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے (بخاری شریف، باب ماجاء فی شہادة الزور ۱/۳۶۲)۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور“ (سورۃ الحجہ: ۳۰)۔

یعنی بتوں کی گندگی سے بچتے رہو اور جھوٹی بات سے بچتے رہو۔ معلوم ہوا کہ جس طرح سچی شہادت دینا اجر و ثواب کا باعث ہے، وہیں قومی و مذہبی فریضہ بھی ہے۔

سفارش:

سفارش کی حقیقت یہ ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کو فائدہ پہنچے (تفسیر قرطبی ۱۹۰/۵)۔

اس اعتبار سے سفارش کی دو قسمیں ہوں گی: (۱) درست سفارش، (۲) نادرست سفارش۔

درست سفارش: اس میں سفارش کرنے والا اور جس کے حق میں سفارش کی جاتی ہے، دونوں جب تک سفارش کردہ شے کو بروئے کار لاتا رہے گا، تب تک سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

نادرست سفارش: ناجائز و ناحق سفارش جس کو قرآن میں ”شفاعت سیئہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں سفارش کرنے والا اس دوسرے شخص کے گناہ و جرم میں شریک ہوتا ہے جس کے حق میں اس نے سفارش کی اور اللہ کے یہاں اس کا بھی مواخذہ ہوگا جس کو قرآن نے اپنے معجزانہ الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

”من يشفع شفاعۃ حسنة یکن له نصیب منها ومن يشفع شفاعۃ سیئة یکن له کفیل منها وکان اللہ علی کل شیء مقیتاً“ (سورۃ النساء: ۸۵)۔

جامعۃ المعارف، راپور، یو پی۔

یعنی جو کوئی اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی بری سفارش کرے گا، اس پر اس میں سے بارہے گا اور اللہ ہر چیز پر طاقت رکھنے والا ہے، یعنی ووٹس جس امیدوار کو ووٹ دیتا ہے اس کے بارے میں ایکشن کمیشن بورڈ سے سفارش کرتا ہے کہ فلاں پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا اہل ہے اور وہ اس عہدہ کو بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔

مشورہ:

یعنی جس طرح دوسرے امور میں مشورہ کیا جاتا ہے، اسی طرح حکومت کے قیام اور امور مملکت کو بھی مشورہ کے ذریعہ انجام دینا چاہیے، اس لیے کہ یہ اسلام کا طرہ امتیاز رہا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ارباب حل و عقد منتخب کرے اور عوام ان کے تابع ہوں، ملک میں اصحاب رائے اور ارباب حل و عقد کی ایک شوریٰ ہو جو امیر المؤمنین کا انتخاب کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہم امور میں صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا حکم دیا ”وشاوہم فی الامر“ (آل عمران: ۱۵۹)، یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ اُفک میں حضرت علیؓ، حضرت اسامہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ اور حضرت بریرہؓ سے مشورہ لیا (بخاری شریف، کتاب المغازی، باب حدیث الالف ۵۸۱، ۵۰۵، ۲)۔

اسی طرح سے ووٹ وکالت کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یعنی ایک اعتبار سے ووٹ کا اپنی رائے وہی کا استعمال وکالت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وکالت میں انسان اپنے کام کا کسی کو نمائندہ دوکیل بناتا ہے۔ ووٹ ایک حق ہے جس کو لوگ استعمال کر کے سیاسی امور میں کسی کو نامزد کرتے ہیں کہ فلاں شخص یا فلاں امیدوار اس حلقہ سے حکومت کی تشکیل کرنے اور وزیر اعظم منتخب کرنے کے لیے وکیل ہے۔

لیکن یاد رہے کہ وکالت دو طرح کی ہوتی ہیں: اول اس کا فائدہ یا نقصان صرف مؤکل کی ذات تک محدود ہوتا ہے، دوسرے اس کا فائدہ یا نقصان عام ہوتا ہے، یعنی مؤکل اور اس کے علاوہ تمام لوگوں تک متعدی ہوتا ہے، اس اعتبار سے کسی نااہل امیدوار کو ووٹس نے ووٹ دے کر کامیاب کیا اور اس امیدوار نے قوم و ملت کے حقوق کو پامال کیا یا کسی بھی طرح کا ظلم اور جرم کیا تو چونکہ اس کے نقصان کا دائرہ وسیع ہے، اس لیے گناہ بھی اسی نسبت سے ہوگا اور ووٹس بھی اس گناہ میں برابر کا شریک ہوگا۔

۲۔ اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد کہ اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے تو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کا شہادت حسنہ کے درجہ میں ہونے کے تحت ووٹ دینا بھی آج کے دور میں مسلمانوں کی پسماندگی کے پیش نظر واجب ہے جس کو قرآن نے یوں کہا ہے: ”ولا تکتبوا الشهادة و من یکتبها فإنه آثم قلبه“ (سورۃ البقرۃ ۲۸۳)۔

۳۔ اگر بذات خود اس عہدہ سے بخوبی واقف ہے جس عہدہ کے ایکشن میں وہ اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کر رہا ہے اور اس عہدہ کی تمام ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دینے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہو اور اس کو دیانتداری کے ساتھ ادا کر سکتا ہو۔ خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہو، قوم و ملت اور ملک کا بھی خواہ ہو، اللہ کے یہاں جواب دہی کا احساس ہو تو ایسے آدمی کا اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا لازم و ضروری ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب کے واقعہ سے عیاں ہے۔

”قال اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیہ“ (سورۃ یوسف: ۵۵)۔

یعنی حضرت یوسفؑ نے کہا کہ زمین کے خزانوں پر مجھے مامور کر دیجئے (نگہبان بنا دیجئے) کیونکہ میں حفاظت کرنے والا موزوں اور باخبر ہوں اور اس کام سے بخوبی واقف ہوں (صفوۃ القفاہیر)۔

۴۔ اگر یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ قانون ساز ادارے جو مخالف شریعت قوانین بھی بناتے ہیں مگر ان کا ممبر بننے میں زیادہ فائدہ ہو اور ممبر بننا اور اس پر قائم رہنا بغیر معصیت کے ممکن نہ ہو تو فائدہ کے پیش نظر اس کو مجبوری کے تحت اضطراری حالت میں ظاہری ارتکاب کی اجازت ہوگی، مگر قلب سے کراہت و نفرت شدید ضروری ہے، کیونکہ شرح صدر و طیب قلب کی تو کوئی ضرورت نہیں، نہ کسی مخلوق کو اس کا علم ہے جو اس شخص سے کراہت قلب پر مواخذہ و دارو گیر کر سکے اور اس ملک میں موجودہ حالت کے تناظر میں درست اس لیے ہوگا کہ ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ممالک میں ممبر بننا یا اس میں شرکت کرنے سے بے شمار قومی و ملی اور مذہبی مفادات و مقاصد وابستہ ہیں اور کہیں تو اس کے بغیر ملت کا تشخص اور دین اسلام کی حفاظت بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

۵۔ جن ممالک میں قانون ساز ممبر کو مجبور کیا جاتا ہو کہ وہ حکومت کے دستور کے مطابق کچھ منتخب دفعات پر حلف لے جن میں کچھ دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، ایسی صورت میں ممبر کو چاہیے کہ کلی طور پر ان سے احتراز کریں، لیکن اگر ان دفعات سے بچنا ممکن نہ ہو اور کوئی صورت ایسی نظر نہ آئے جس کے ذریعہ ان سے بچا جاسکے اور یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آجائے کہ ممبر بننے کا تو اس کے مقابل کوئی دوسرا شخص ان ہی دفعات پر حلف لے کر ممبر بن جائے گا جس سے اسلام کو

امت مسلمہ کو اور شریعت کو بڑے نقصان کا امکان ہے تو غیر شرعی دفعات کو برا سمجھتے ہوئے کراہت نفس کے ساتھ ناگزیر حالات میں اسلامی شریعت پر آنچ آنے سے بچاتے ہوئے اس کے تحفظ کی خاطر ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے تحت حلف لے لیں، اس لیے کہ اس کا حلف نہ لینا زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگا، حلف لینے سے اور فقہی اصول ہے کہ جب دو فساد ایک ساتھ جمع ہو جائے تو کم تر کو قبول کر لینا چاہیے لہذا حلف اٹھالینا چاہیے۔

۶۔ ہر مسلم رکن کے لیے بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا یا حلف لینا جائز نہیں، اس لیے کہ مسلمان اس کتاب کو محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس پر حلف لینا اس کتاب کی تعظیم ہوگی جو بجانب اللہ ہونے کی تصدیق کے مترادف ہوگی، لیکن جب مسلم ارکان اس پر مجبور ہو جائیں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اس پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ حلف لیا جاسکتا ہے۔

”إذا كان القضاء في بلاد ما حكمه غير إسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الإنجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فإن لم يستجب لطلبه يعتبر مكرها ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون آية ينوي بذلك تعظيماً“ (مجمع الفقہی الاسلامی ۸۵)۔  
یعنی اگر کسی ملک میں غیر اسلامی حکومت ہو اور وہاں تورات یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کا حکم دیا جائے تو مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عدالت سے مطالبہ کرے کہ اس کے ہاتھ قرآن پر رکھوائے جائیں، اگر اس کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا جائے تو اب اسے مجبور سمجھا جائے گا اور اس کے لیے گنجائش ہوگی کہ وہ تورات یا انجیل یا ان دونوں پر اپنا ہاتھ رکھے اور حلف لے۔

۷۔ جو سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہوں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفاد کے مغاثر ہوں تو بہتر ہے کہ ایسی پارٹیوں میں شریک نہ ہوں، لیکن اگر ایسی پارٹیوں میں شریک ہوئے بغیر اسلام کی دعوت کو عام کرنا اور مسلمانوں کا تحفظ ممکن نہ ہو تو اس طور پر شریک ہو کہ شریک ہونے والا اسلام کے جذبہ سے سرشار ہو، اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کا عزم ہو تو کراہت قلب کے ساتھ اس کو قبول کرے، یعنی شریک ہو جائے مگر دل میں اس کا برا ہونا تسلیم ہو، جیسا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب اپنی کتاب کفایت المفتی میں ص ۶۳ پر رقمطراز ہیں کہ کفار سے اشتراک یا دوستی کسی بھی دفعات میں درست نہیں، لیکن اگر مقصود دین کی حفاظت ہو تو اشتراک جائز ہے۔

۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہو تو ایسی پارٹی سے احتراز لازمی ہے۔ اس لیے کہ فقہی اصول: ”ما اجتمع الحلال والحرام إلا وقد غلب الحرام“۔

۹۔ مسلمانوں کے اقلیت میں ہوتے ہوئے ایک سیاسی پارٹی بنانا اس وقت صحیح ہوگا جب مسلمانوں کی سیاسی پارٹی تمام برائیوں کے ازالہ کے ساتھ ساتھ اسلام اور دین شریعت کا تحفظ اور اس کے فروغ کو مقدم رکھتے ہوئے تمام مذاہب کے لوگ ہندو، بودھ، سکھ، عیسائی اور مسلمان بھائیوں کو مظلوم، غریب، ناتواں اور پریشان لوگوں کی مدد کے لیے ابھارے اور اپنے روایتی طرز سے ہٹ کر ایک انقلابی راستہ ہموار کرنے جس سے مسلمانوں کو بھی یہ احساس ہو جائے کہ حقیقتاً اگر وہ اب بھی نہ جاگے تو آنے والے زمانہ سے اسلام اور دین شریعت کو نقصان پہنچنے کے وسیع امکان ہیں، لہذا اس صورت حال کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ دین میں پختگی کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی پختگی پیدا کریں۔

۱۰۔ جہاں تک عورت کا دوٹنگ میں حصہ لینے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں سیاسی مفکرین اور فلسفیوں کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو حق رائے دہی ماننا چاہیے اور انہیں اس سے محروم رکھنا سراسر زیادتی اور ناانصافی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس سے قوم کا نصف حصہ ہر قسم کی سیاسی ترقی سے محروم رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ملکوں میں عورتوں کو یہ حق حاصل ہے، اسی طرح مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اپنی تصنیف کفایت المفتی (۳۷۹) پر رقمطراز ہیں کہ عورتوں کا دوٹو بننا منسوخ نہیں ہے، ہاں دوٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہے، یعنی اگر پولنگ اسٹیشن پر عورتوں کے لیے پردہ کا معقول نظم ہو اور غیر محرم مرد منتظم نہ ہوں یہاں تک کہ پیچہ وغیرہ دینے والی بھی عورتیں ہی ہوں تو عورتوں کو دوٹ دینے کے لیے جانا جائز ہے، لیکن اگر اس کے برخلاف ہو یعنی کام کرنے والا عملہ غیر محرم مرد کا ہو تو عورتیں نہ جائیں بلکہ مطالبہ کریں کہ ان کے لیے زنانہ منتظم کا عملہ مقرر کیا جائے۔

جہاں تک تعلق ایکشن میں امیدوار بن کر قانون ساز اداروں کے ممبر بننے کا ہے، اس کو امام بخاریؒ نے اپنی تصنیف بخاری شریف میں اس روایت کو نقل کر کے واضح کر دیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ شاہ فارس کی بیٹی کے بادشاہ ہونے پر فرمایا تھا: ”لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة“، یعنی ایسی قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جس نے کسی عورت کو دالی ریاست بنا دیا ہو۔ ☆☆☆

## ایکشن سے متعلق چند اہم مسائل

قاضی محمد حسن ندوی مدظلہ العالی

### ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت:

مروجہ جمہوری نظام چاہے اسلامی مملکت میں رائج ہو یا غیر اسلامی مملکت میں اسلامی طریق انتخاب سے درست نہیں، کیونکہ اس میں متعدد مفاسد اور خرابیاں ہیں، تاہم جب تک یہ نظام مسلم یا غیر مسلم ممالک میں رائج ہے اس وقت تک اس نظام سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی پابندی کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح انتخابات سے بے تعلق رہنا جائز نہیں، کیونکہ اس وقت ووٹ بڑی طاقت ہے، ووٹ کے ذریعہ سیاسی اور سماجی زندگی میں قوموں کا درجہ و مقام متعین ہوتا ہے اور مسلمانوں کے قومی مفادات کے ساتھ ساتھ ملی و مذہبی مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہے اور عدم شرکت کی صورت میں قومی و ملی نقصانات و خطرات کا بڑا امکان ہے جو شرکت و شمولیت کے نقصان سے زیادہ مہلک اور پریشان کن ہیں۔

اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "إذا ابتلی ببلیتین فلیختر أھوھما" یعنی جب دو مفاسد جمع ہو جائیں اور دونوں میں سے ایک سے دوچار ہونا ناگزیر ہو تو اول درجہ کے مفسدہ کو اختیار کر لینا چاہیے۔ لہذا جلب منفعت اور دفع مضرت کے تحت انتخابات میں مسلمانوں کی شرکت اور ووٹ دینا، ایکشن میں حصہ لینا شرعاً درست ہے۔

### ۲۔ ووٹ اگر شہادت کے درجہ میں ہے تو شرعاً اس کا حکم:

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی چار حیثیتیں ہیں: شہادت، سفارش، مشورہ، وکالت۔

پہلی حیثیت: شہادت: یہ پہلو زیادہ غالب ہے، اس لیے شہادت کی لغوی اور شرعی اعتبار سے یہاں وضاحت کی جاتی ہے۔

### شہادت کی لغوی تعریف:

شہادت کے لغوی معنی ہے اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر کسی امر کے ثبوت و صحت کی خبر دینا۔ (جامع الرموز ۴/۳۸۴) "شہادۃ" کا لفظ مشاہدہ سے مشتق ہے۔ بعض نے "شہودتے" بھی مشتق مانا ہے جس کے معنی حضور کے ہیں، چونکہ گواہی دینے والا قاضی کے اجلاس میں حاضر ہوتا ہے اس لیے اس کو شاہد کہتے ہیں۔

### شہادت کی اصطلاحی تعریف:

اس سچی خبر کو "شہادۃ" کہتے ہیں جو مجلس قضا میں شہادت کے ساتھ ادا کی جائے۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: والشہادۃ لخبۃ: اخبار قاطعہ و فی عرف اهل الشرع اخبار صدق لاثبات حق بلفظ الشہادۃ فی مجلس القضاء (فتح القدیر ۲/۲۳۹) (شہادۃ: یقینی اور قطعی خبر دینا ہے اور شرع میں سچی بات کی خبر دینا کسی حق کے اثبات کے لیے لفظ شہادت کے ساتھ مجلس قضا میں)، یہ حقیقت ہے کہ ووٹس کسی امیدوار کو ووٹ دیتا ہے تو دراصل وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ امیدوار اس منصب کا اہل ہے، امانت و دیانتداری کے ساتھ اس فریضہ کو ادا کرے گا، اس میں قوم و ملت کی ہمدردی اور خدمت خلق کا جذبہ ہے، ایسے امیدوار کو ووٹ دینا سچی شہادت اور گواہی ہے۔

قرآن وحدیث میں سچی گواہی دینے کی ترغیب ہی نہیں ہے بلکہ کتمان شہادت پر وعید ہے اور سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے۔

"والذین ہم بشہادۃھم قائمون... أولئک فی جنت مکرمون" (سورۃ مجارج: ۳۳-۳۵) (اور جو اپنی گواہی پر

ط استاذ حدیث و فقہ دارالعلوم مائلی والا، بھروچ، گجرات۔

سیدھے ہیں، ..... وہی لوگ باغوں میں عزت سے ہیں۔

دوسری جگہ پر ہے: یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط (سورہ بقرہ: ۲۸۳) (اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری پابندی کرنے اور عدل کے ساتھ شہادت دینے والے بنے رہو)۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ اگر ووٹرز کی نگاہ میں امیدوار اس عہدے کے لائق ہے اور امیدوار میں ساری خوبیاں ہیں تو مصالحت زندگی اور مقاصد زندگی کے خاطر ایسے امیدوار کو ووٹ دینا شرعاً اور اخلاقاً واجب ہوگا، البتہ موجودہ حالات میں سیاسی عہدہ پر فائز ہونے والے عموماً نا اہل ہوتے ہیں اور ان کی نااہلی کی وجہ سے ملک میں امن و امان اور عدل و انصاف کا ماحول قائم ہونے کے بجائے، ظلم و جبر، نا انصافی، بد امنی کا ماحول قائم رہتا ہے، اس لیے مسلمانوں کی بڑی ذمہ داری ہے کہ امیدوار کے انتخاب میں اسلامی نقطہ نظر کو پیش نظر رکھے اور ایسے امیدوار کو ووٹ دے جو واقعی قوم و ملت کے ہمدرد، ورنہ ووٹ دینا باعث گناہ ہوگا، کیونکہ ووٹ دینا شفاعت ہے، اگر باصلاحیت اور مستحق شخص کے لیے سفارش کی تو یہ باعث ثواب ہے، لیکن اگر اس شخص کے لیے سفارش کی جو اس کا اہل نہیں ہے تو یہ باعث گناہ ہوگا۔

اگر کسی امیدوار میں اہلیت، امانت داری و دیانت داری نہیں ہے، ووٹ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو یہ جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے اور بخاری شریف میں جھوٹی گواہی کو شرک کے ساتھ کبار میں شمار کیا ہے (بخاری شریف، بحوالہ جواہر المفقہ ۲/ ۲۹۲)۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم:  
امیدوار کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بعض امیدوار وہ ہوتے ہیں جن میں کچھ کمال اور خوبیاں ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے وہ عہدے کے مستحق ہوتے ہیں تو ان کی چاہت اور طلب کے بغیر ان کو عہدہ کے لیے دعوت دی جاتی ہے، کبھی وہ اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، لیکن ان کو ضرورت کے تحت فائز کیا جاتا ہے تو ایسے امیدوار کی غیبی طور پر مدد ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے: عن عبد الرحمن بن سمرہ قال، قال رسول اللہ ﷺ: لا تسأل الإمارة فإن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها (مشکوٰۃ شریف ۲/ ۳۳۲) (حضرت عبد الرحمن بن سمرہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عہدہ اور حکومت کی طلب مت کرو، کیونکہ اگر تجھے طلب سے ملے گا تو خدا تجھے چھوڑ دے گا اور جو بغیر طلب کے ملے تو اللہ تعالیٰ اس پر تیری مدد کرے گا)۔

ہندوستان میں بھی ایسے سربراہ گزرے ہیں جنہوں نے قوم و ملت کے لیے سب کچھ کیے اپنا کوئی ذاتی سرمایہ نہیں بنایا، ڈاکٹر راجندر پرشاد بارہ سال ہندوستان کے صدر رہے جب وہ سبکدوش ہو کر اپنے وطن پٹنہ گئے تو ان کے رہنے کے لیے کوئی مکان بھی میسر نہیں تھا (اسلام اور جدید فکری مسائل: ۳۲۵)۔

۲۔ بعض امیدوار وہ ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی اہلیت اور کمال نہیں ہوتا، لیکن وہ حب مال اور حب جاہ کی وجہ سے اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لیے جان و مال کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں، اگر وہ کامیاب ہو بھی جاتے ہیں تو وہ قوم و ملت کے لیے ہمدرد کے بجائے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

۴۔ قانون ساز ادارے کا ممبر بننا:

اگر قانون ساز ادارے شریعت مطہرہ کے خلاف قوانین بناتے ہیں تو ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا معصیت کو عام کرنے اور معصیت میں تعاون کرنے کا سبب ہوگا، اس لیے ان اداروں کا ممبر بننا مسلمانوں کے لیے درست نہیں ہوگا۔ ارشاد الہی ہے: تعاونا علی البر والتقوی ولا تعاونا علی الإثم والعدوان (سورہ مائدہ: ۲)، کیونکہ جو اس طرح کی پارٹی کا ممبر بننا ہے وہ اس کی پالیسی کے خلاف کوئی عمل نہیں کر سکتا۔

۵۔ وفاداری کا حلف اٹھانا جبکہ بعض دفعات خلاف شریعت ہوں:

چونکہ قانون ساز اداروں کے رکن سے جو حلف لیا جاتا ہے وہ دراصل وفاداری اور ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ایک طرح سے اقرار لیا جاتا ہے۔ قسم کی

صورتوں میں سے یہ بھی ایک صورت ہے جس طرح ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا درست ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام لے کر حلف لینا درست اور جائز ہے، لیکن اگر دستور میں بعض دفعات خلاف شریعت ہیں، اس کے سلسلہ میں حلف لینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ مسلمان کا یہ عمل قرآن اور شریعت کے خلاف ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ”خیر ائمتہ“ ہونے کی وجہ سے امر بالمعروف اور النہی عن المنکر کا فریضہ اس امت کے ہر فرد پر عائد کیا ہے، اسی طرح تعاونوا علی البر والتقویٰ کا حکم دیا ہے اور خلاف اسلام دستور پر حلف لینا ان دونوں آیات کے خلاف ہوگا، اس لیے ایسے دستور سے وفاداری کا حلف لینا درست نہیں بلکہ ایسے دفعات کے سلسلہ میں توقف کرے، شریعت کے مطابق کرنے کے لیے درخواست دے، اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق اس کے لیے کوشش کرے، یہ دینی اور اخلاقی فریضہ ہوگا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيماں (مسلم شریف: کتاب الایمان ۱/۵۱)۔

## ۶۔ عیسائی ملکوں میں مسلمان کا بائبل پر حلف لینا:

چونکہ قسم کے ذریعہ منکلم کے کلام اور بیان میں وزن پیدا ہوتا ہے، مذکورہ صورت میں منکلم کے کلام کو سامعین اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لیے ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے کی شرعاً اجازت ہے۔

اس کے علاوہ کسی کی قسم کھانا درست نہیں، کیونکہ قسم کی صحت کے لیے کسی مصحف، توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں اگر حاکم قسم کو پختہ کرنا چاہتا ہے تاکہ حالف جھوٹ بولنے سے ڈرے تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر حلف لینے کی اجازت ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی اور کتاب یعنی توریت، انجیل پر حلف لینا درست نہیں ہوگا۔

ہاں اگر کسی عیسائی ملک میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا ضروری ہو تو ایسی صورت میں مسلمان ممبر کو چاہیے کہ پہلے حکومت سے درخواست کرے مجھے قرآن مجید پر حلف لینے کی اجازت دے، درخواست دینے کے بعد بھی حکومت کی طرف سے اجازت نہ ہو تو اسے مجبور سمجھا جائے گا اور توریت یا انجیل پر تنظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھ کر حلف لینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا (اسلامی فقہ اکیڈمی، مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے: ۱۱۹-۱۲۰)۔

۷۔ منشور کی بعض دفعات شریعت کے خلاف ہوں، ایسی پارٹی میں شرکت اور انتخاب لڑنے کا حکم: کسی ایسی پارٹی میں شرکت اور ان کی طرف سے انتخاب لڑنا درست نہیں ہے جن کی منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام ہو۔

ہاں اگر صورت حال یہ ہے کہ اس پارٹی میں شرکت باعث ضرر ہے اور عدم شرکت کی صورت میں بھی مسلمانوں کے لیے ضرر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تو ایسی صورت میں دیکھا جائے کہ کس صورت میں کم ضرر ہے اور کس صورت میں زیادہ ضرر ہے؟ لہذا اگر اس پارٹی کی ممبری قبول نہ کرنے میں اور انتخاب میں شرکت نہ کرنے میں اشد ضرر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے تو مذکورہ قاعدہ کے تحت اس پارٹی میں شرکت اور انتخاب لڑنا جائز اور درست ہوگا تاکہ اشد ضرر سے اپنے آپ کو اور مسلمانوں کو بچایا جاسکے لو کان أحدہما أعظم ضررا من الآخر... فإن الأشد یزال بالأخف (الاشیاء والنظائر ۱۰۹)۔

۸۔ جس پارٹی کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت ہے اس پارٹی میں مسلمان کی شرکت:

جو پارٹی اور سیاسی جماعت اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہے، نیز اس کے قول و فعل سے یہ بات ظاہر ہے اور اس کا منشور بھی اسلام کے خلاف ہے۔ ایسی پارٹی میں شریک ہونا معصیت اور گناہ کو عام کرنے میں تعاون کرنا لازم آئے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے: ”ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۲) اس لیے مذکورہ پارٹی میں شرکت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۹۔ مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا:

بلاشبہ سیاسی جماعت کے قیام کا حکم اس کے اہداف و نتائج اور فوائد کی بنیاد پر ہوگا، اس کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور فائدے کی درج ذیل شکلیں ہیں:

۱۔ ایک شکل یہ ہے کہ ملک میں ان کے وجود کو تقویت ملے گی۔ ان کی اجتماعیت میں مضبوطی اور دینی صورت حال کو پائیدار بنانے میں مدد ملے گی۔

۲۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس سیاسی جماعت کی وجہ سے اسلام کے مستقبل اور منفرد وجود کو تحفظ ملنے کا امکان رہے گا۔ دعوت الی اللہ ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کے تحت لوگوں کی اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اسلامی قضایا کی نصرت و حمایت میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے جیسے فلسطین کا مسئلہ، امت مسلمہ کی ترقی و عروج کا مسئلہ، ہندوستان میں مسجد اور مدرسہ کا مسئلہ۔

۴۔ چوتھی شکل یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں اسلامی شریعت کو فیصلہ بنانے میں بھی سیاسی پارٹی سے مدد مل سکتی ہے۔

سیاسی جماعت کے قیام کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کا سیاسی اعتبار سے نقصان ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرکوز نہیں ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام فرقہ پرست تنظیموں کو فائدہ پہنچانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے، اس لیے ایسی جگہوں میں علیحدہ سیاسی جماعت قائم نہ کریں بلکہ سیکولر پارٹی میں شمولیت کر کے امانت دار شخص کو ووٹ دینا چاہیے، اپنے ووٹ کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے۔

۱۰۔ ایکشن میں عورتوں کا کردار:

اندرون خانہ کی ذمہ داریاں اصلاً عورتوں کے ذمہ ہیں، بغیر ضرورت شرعی باہر نکلنا درست نہیں، جن صورتوں میں عورتوں کو باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے وہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ پردہ اور محرم کے ساتھ ہے، اس لیے ایکشن میں امیدوار بننا اور قانون ساز اداروں کا ممبر بننا عورتوں کے لیے درست نہیں ہے، کیونکہ یہ امور عورتوں کی فطرت اور اندرون خانہ کی ذمہ داریوں سے خارج ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان صورتوں میں مردوں سے اختلاط ہوگا۔ بے حیائیاں عام ہوں گی، عورتوں کی نگاہوں میں شوہر اور اولاد کی ذمہ داریاں کم ہو جائیں گی بلکہ عزت و عصمت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس لیے عورتوں کا ایکشن میں امیدوار بننا اور قانون ساز اداروں کا ممبر بننا جائز نہیں ہے۔

حدیث میں ہے: لن یفلح قوم ولوا أمرہم امرأۃ (بخاری شریف: ۴۳۲۵)۔

البتہ خواتین کو ووٹنگ میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی، کیونکہ ووٹ ایک بڑی طاقت ہے، اسی پر سماجی زندگی میں قوموں کا درجہ و مقام متعین ہوتا ہے اور مسلمانوں کے قومی مفادات کے ساتھ ساتھ مذہبی مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہے بلکہ شہریت (Nationality) ان ہی کو حاصل ہوتی ہے، جن کا ووٹرسٹ میں نام ہوتا ہے اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے، ورنہ غیر شہری قرار دیا جاتا ہے۔ الغرض ووٹنگ میں حصہ نہ لینے کی صورت میں قومی، ملی اور مذہبی اعتبار سے بہت زیادہ نقصان ہے، اس لیے عورتوں کا ووٹنگ میں حصہ لینے کی اجازت دو شرطوں کے ساتھ ہوگی:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ پردہ اور کسی محرم مرد کے ساتھ پولنگ پر جائے اور ووٹنگ میں حصہ لے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورتوں کے لیے علیحدہ کوئی جگہ (پولنگ مقام) خاص کی جائے تاکہ مردوں سے اختلاط نہ ہو اور نہ کسی گناہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

دکتور الشیخ مصطفیٰ السباعی رقمطراز ہیں: وقد تقرّر دفعاً لذلك المحذور أن یحصل لهن مراکز للاقتراء خاصة لهن فتذهب

المرأة و تودی واجبہا تم تعود الی بیتها دون أن تختلط بالرجال أو تقع فی الحرمان (المرأة بین الفقه والقانون ۱۰۱۲)

سد فتنہ کے طور پر عورتوں کے ووٹنگ کے لیے علیحدہ جگہ متعین کی جائے تاکہ عورت وہاں اپنے و جوب کو ادا کر سکے اور پھر اپنے گھر مردوں سے اختلاط اور گناہوں میں پڑے بغیر واپس آجائے۔

☆☆☆

## الیکشن سے متعلق مسائل

مولانا حیدر علی قاسمی

### ۱۔ ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ کے سلسلہ میں غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس کو ووٹ دیا جاتا ہے گویا اس کے بارے میں یہ گواہی دی جاتی ہے کہ یہ آدمی نیک، امانت دار اور دیانت دار ہے، اس کے اندر اہلیت و قابلیت اور صلاحیت و استعداد ہے۔ یہ اس کام کو صحیح ڈھنگ سے انجام دینے پر قادر ہے اور فلاں منصب اور عہدہ کے لائق ہے۔ اس اعتبار سے شہادت کے احکام اس پر جاری ہوتے ہیں، یہی قول حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا ہے، چنانچہ حضرت اپنی کتاب 'فقہی مقالات' میں تحریر فرماتے ہیں: "ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن وحدیث کے تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں" (فقہی مقالات ۲۸۸/۲)۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'جواہر الفقہ' میں تحریر فرماتے ہیں: کسی امیدوار ممبر کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن وحدیث چند حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی اہلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت و امانت بھی۔ اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کا ذبہ کو شرک کے ساتھ کبار میں شمار فرمایا ہے (جواہر الفقہ ۲۹۲/۲)۔

چند سطروں کے بعد حضرت تحریر فرماتے ہیں: انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے، جس کا چھپانا بھی حرام اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہرجیت اور دن کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے علم و عمل اور دنیا داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے" (جواہر الفقہ ۲۹۳/۲)۔

نیز یہ بات بھی واضح ہے کہ جس طرح شہادت کے ذریعہ حقوق ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح عصر حاضر میں ووٹ کے ذریعہ بھی حقوق ثابت ہوتے ہیں۔ مذکورہ وجوہ اور امور کی بنیاد پر بندہ کے نزدیک ووٹ شرعی اعتبار سے شہادت ہے۔

### ۲۔ ووٹ کا شرعی حکم:

ووٹ شہادت کے درجہ میں ہے اور شہادت کے سلسلہ میں اللہ رب العزت اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: "کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط" (سورہ مائدہ: ۸) (یعنی کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی) (ترجمہ شیخ الہند)۔

مذکورہ آیت قرآنی سے سچی شہادت قائم کرنے کی اہمیت اور ضرورت واضح ہو جاتی ہے، جبکہ احادیث نبویہ میں بھی سچی شہادت قائم کرنے اور جھوٹی شہادت سے اجتناب کرنے کی تاکید وارد ہوئی ہے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من کتم شہادۃ اذا دعی الیہا کان کمن شہد بالزور" (جمع الفوائد ۱/۶۲ بحوالہ فقہی مقالات ۲۸۸/۲) یعنی جس شخص کو شہادت کے لئے بلا یا جائے اور وہ اسے چھپائے تو وہ جھوٹی گواہی دینے والے کی طرح ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ سچی شہادت قائم کرنا اور جھوٹی شہادت سے احتیاط کرنا ضروری ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ ووٹ صرف سماجی اعتبار سے ضروری نہیں ہے بلکہ دینی اعتبار سے بھی ضروری ہے، ووٹ کے بغیر دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے

جامعہ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی، نوگاون، آسام۔



نقصان کا خطرہ ہے اور ووٹ کے بغیر حقوق اور مطالبات کا حصول ناممکن ہے، حقوق اور مطالبات کے حصول کیلئے اچھے آدمی کو ووٹ دینا ضروری ہے اور اصول یہ ہے 'ما لایتم الواجب الا بہ فهو واجب۔'

مذکورہ وجوہ اور دلائل کی بناء پر راقم السطور کے نزدیک ووٹ دینا واجب ہے۔

۳۔ ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم:

ویسے تو عام حالات میں کسی منصب اور عہدہ کا مطالبہ کرنا شریعت اسلامیہ کی رو سے جائز اور درست نہیں ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے: "عن عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لا تسأل الإمارة فإنك إن أعطيتها عن مسألة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسألة أعنت عليها" (نسائی شریف ۳۰۳۳) (عبدالرحمن بن سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم امارت (عہدہ) کا مطالبہ نہ کرو، اس لئے کہ اگر مطالبہ کی بنیاد پر تم کو عہدہ ملے تو تم اس کے حوالہ کر دینے جاؤ گے (خدا کی مدد شامل حال نہیں ہوگی) اور اگر بغیر مطالبہ کے عہدہ ملے تو (منجانب اللہ) تمہاری مدد کی جائے گی)۔

البتہ اگر صورت حال ایسی ہو کہ اگر منصب کا مطالبہ نہ کیا جائے تو دوسرے غیر اہل اور ناقابل آدمی اس منصب پر قابض ہو جائیں گے جو منصب کا حق ادا نہیں کر پائیں گے جس سے لوگوں کے نقصان کا خطرہ ہوگا، قوم و ملت کی ہلاکت اور تباہی کا ذریعہ ہوگا، لوگوں پر ظلم و ستم کا ڈر ہوگا اور مختلف قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونے کا ظن غالب ہوگا اور یہ امیدوار سمجھ رہا ہے کہ اس کے اندر استعداد اور صلاحیت ہے، صحیح طریقہ سے کام کرنے کی لیاقت ہونے کے ساتھ ساتھ امانت دار اور دیانت دار بھی ہے اور لوگوں کی خیر خواہی، نفع رسانی اور نیک نیتی کے ساتھ عہدہ اور منصب کا مطالبہ کرے، دنیا کی عزت و جاہ، شہرت و مادی ترقی اور اتباع ہوی مقصود نہ ہو، تو ایسی صورت میں محض خیر خواہی اور نفع رسانی کی غرض سے ایکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی مطالبہ کیا، چنانچہ قرآن پاک میں مذکور ہے: "قال اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم" (سورہ یوسف: ۵۵) یعنی یوسف نے کہا کہ مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا ہوں (ترجمہ شیخ الہند)۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صاحب ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں: "سأل العمل لعمله بقدرته عليه ولما فيه من المصالح للناس" (ابن کثیر ۳۰۶۳) یعنی حضرت یوسف نے عہدہ کی درخواست کی ہے، اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ وہ اس پر قادر ہیں اور اس میں لوگوں کے مصالح مضمر ہیں۔ تقریباً یہی بات فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے، جیسا کہ حضرت مفتی محمود الحسن صاحب فرماتے ہیں: "اگر حصہ لینے میں احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور حصہ لے کر اہل اسلام کی خدمت کر سکے اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکے تو حصہ لینا جائز ہے" (فتاویٰ محمودیہ ۳۲۵/۱۳)۔

۴، ۵۔ مخالف شریعت قوانین وضع کرنے والے اداروں کا ممبر بننا اور مخالفت شریعت دفعات اور دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا:

اگر کوئی ادارہ ایسا ہو کہ وہ مخالف شریعت قوانین وضع کرتا ہو اور اس کے ممبر بننے کے بعد اس کے وضع کردہ قوانین کے پابند اور تابع ہو جانا پڑے، اس کی مخالفت کی گنجائش نہ ہو اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہ ہو، بلکہ اسی پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینا ضروری ہو تو ایسی صورت میں ایسے ادارہ کا ممبر بننا عام حالات میں جائز اور درست نہیں ہے، کیوں کہ اس میں بہت ساری برائیاں اور خرابیاں موجود ہیں۔ مثلاً شریعت کی مخالفت تعاون علی الاثم ہے جو جائز نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) (اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر) (ترجمہ شیخ الہند)۔

اسی طرح اگر قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہونے کی صورت میں مخالف شریعت دفعات اور دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑے اور دستور سے وفاداری کے حلف کی صورت میں مخالف شریعت، اطاعت غیر، تعاون علی الاثم، کتمان شہادت، شرک، اتباع نفس، وعدہ خلافی اور دھوکہ دینا لازم آئے تو اس میں شرکت درست نہیں، ہاں جان و مال کی حفاظت، عزت و آبرو کے خیال اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر اس میں شرکت کی گنجائش ہونی چاہئے۔ باقی عام حالات میں جائز نہیں ہے، جیسا کہ تفصیل سوال نمبر ۴ کے جواب میں آچکی ہے۔

## ۶۔ مسلم ارکان کیلئے بائبل پر حلف لینا:

یہ بات کسی بھی اہل علم پر مخفی نہیں ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے، اس کی تعظیم، اس کی تکریم اور اس کی قدر ملحوظ ہوتی ہے اور یہ واضح ہے کہ تمام تر تعظیم و تکریم اور قدر و منزلت صرف اور صرف خدائے واحد کیلئے ہے، اس میں غیر کی شرکت کی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”إن الله ينهاكم أن تحلفوا بأبائكم من كان حالفاً فليحلف بالله أو ليصمت“ (مشکوٰۃ شریف: ۳۹۶) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں منع فرمایا ہے کہ تم آباء و اجداد کی قسم کھاؤ، جو آدمی قسم کھانا چاہے وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔

مشکوٰۃ شریف کی مشہور و معروف شرح مرقات میں ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں: ”الحكمة في النهي عن الحلف بغير الله تعالى أن الحلف يقتضي تعظيم المحلوف به وحقيقة العظمة المختصة به تعالى فلا يضاهاه غيره“ (مرقات: ۳، ۵۵۴) یعنی غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ قسم محلوف بہ (جس کی قسم کھائی جائے) کی تعظیم کا تقاضا کرتی ہے اور حقیقی تعظیم صرف اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے، کوئی ان کے مشابہ نہیں ہے، لہذا عام حالات میں عیسائی ممالک کے مسلم ارکان کے لئے بائبل پر حلف لینا جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر شرعی ضرورت متقاضی ہو اور بائبل پر حلف لیے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو، اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں ”الضرورات تبيح المحظورات“ (قواعد الفقہ ص: ۸۹) ”المشقة تجلب التيسير“ (الاشباه والنظائر ص: ۱۲۵) اور قرآن کی آیت: ”إلا ما اضطررتم إليه“ (سورہ انعام: ۱۱۹) (مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اس کے کھانے پر) کے تحت اس کی گنجائش ہوگی۔

۷۔ جو سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں ان میں شریک ہونا:

اگر مسلمان جمہوری نظام سے الگ تھلگ ہو جائیں گے اور کسی بھی پارٹی میں شریک نہیں ہوں گے تو عصر حاضر میں جن حالات اور مصائب سے دوچار ہیں آئندہ خدانہ کرے۔ ان سے زیادہ حالات اور مصیبتیں آسکتی ہیں اور اس وقت جس طرح مظلوم و محروم ہیں آئندہ اس سے زیادہ ظلم و ستم سے دوچار ہو سکتے ہیں اور حقوق ضائع ہونے کا خطرہ ہے جس کی بناء پر ضرر و حرج اور تنگی و عسرت پیش آنا معمولی بات ہے۔ حالانکہ اسلام میں تنگی اور عسرت نہیں ہے اور یہ دین ضرر و حرج سے محفوظ ہے، چنانچہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ”يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر“ (سورہ بقرہ: ۱۸۵) (اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری) (ترجمہ شیخ الہند)۔

نیز شریعت مطہرہ میں اس بات کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ اگر دونوں طرف برائیاں موجود ہوں اور دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ضروری ہو تو احسن البلیغین کو اختیار کیا جائے گا، جیسا کہ مذکور ہے: ”إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما“ (الاشباه والنظائر ص: ۱۲۵) (اگر دو برائیاں جمع ہو جائیں تو دونوں میں سے کم درجہ کی برائی کا ارتکاب کر کے بڑے درجہ کی برائی سے بچا جائے گا)۔ اور دوسرا قاعدہ ہے: ”الضرر الاشد يزال بالضرر الاخف“ (قواعد الفقہ ص: ۸۸)۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کو مکمل طور پر حاصل نہیں کی جاسکتی ہے تو اس کو مکمل چھوڑنا بھی معقول بات نہیں ہے، بلکہ جس مقدار میں حاصل کی جاسکتی ہے اس کو حاصل کرنا چاہیے جیسا کہ ”إن لم يدرك الكل لم يدرك الكل“۔

ان وجوہات کی بناء پر جو سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں۔ ان پارٹیوں کے اندر شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا بندہ کے نزدیک جائز ہے، اگرچہ ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاڑ ہوں۔

## ۸۔ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں ان میں شریک ہونا:

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، کسی مسلمان کے لئے اس قسم کی پارٹی میں شریک ہونا جائز اور درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی پارٹی میں شرکت کرنا اور اسلام و مسلمان کی مخالفت کرنا تعاون علی الاثم ہے جو جائز نہیں ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں مذکور ہے: ”ولا تعاونوا على الإثم والعدوان“ (سورہ مائدہ: ۲) (اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر) (ترجمہ شیخ الہند)۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس پارٹی میں شامل ہونے کی صورت میں شرک کے ارتکاب کا خطرہ ہے، اس لئے کہ جب آدمی اس پارٹی میں شریک ہوگا تو اس کے

احکام اور قوانین شرک پر مبنی ہو سکتے ہیں، جبکہ شرک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی ظلم اور گناہ ہی نہیں ہے جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے: "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" (سورہ لقمان: ۱۳) (بیشک شرک بنانا بھاری بے انصافی ہے)۔ اور دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا" (سورہ نساء: ۳۶) (اور بندگی کرو اللہ کی اور شرک نہ کرو اس کا کسی کو) (ترجمہ شیخ الہند)۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اس قسم کی پارٹیوں میں شرکت سے دین و مذہب کا نقصان ہوگا، کیونکہ جب آدمی اس پارٹی میں شریک ہوگا تو پارٹی کو مان کر زندگی گزارے گا، جبکہ دین اور اسلام کی مخالف پارٹی ہے اور آدمی کا ماحول سے متاثر ہونا امر بدیہی ہے، جو بھی آدمی کسی ماحول میں رہتا ہے تو اس ماحول سے متاثر ہوتا ہے جیسا کہ تجربات اور حالات شاہد ہیں۔

لہذا بندہ کی رائے یہ ہے کہ جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں ان میں شریک ہونا جائز اور درست نہیں ہے اگرچہ نیت ہو کہ اس میں شامل ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔

## ۹۔ ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں سیاسی جماعت قائم کرنا:

شریعت اسلامیہ یہ چاہتی ہے کہ دنیا میں تمام لوگ سکون کے ساتھ زندگی گزاریں، تمام مصائب و آلام سے بچ کر اپنے خالق و مالک کی عبادت میں مصروف رہیں، کسی پر ظلم و ستم نہ ہو، ہر ایک کو مناسب حق ملے، کسی کو ضرر و حرج اور تنگی و عسرت پیش نہ آئے، بلکہ ہر ایک کے لئے خیر و آسانی ہو، چنانچہ قرآن کریم میں ہے: "يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (سورہ بقرہ: ۱۸۵) (اللہ چاہتا ہے کہ تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری) (ترجمہ شیخ الہند)۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے: "وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ" (سورہ حج: ۷۸)۔

اب اگر مسلمان ظلم و ستم سے دوچار ہوں، اپنے حقوق سے محروم ہوں، اپنے مطالبات وصول کرنے سے عاجز ہوں اور یہ سمجھ رہے ہوں کہ سیاسی جماعت کے قیام کے بغیر ظلم و ستم سے بچنے اور حقوق و مطالبات وصول کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے اور امید یہ ہے کہ سیاسی جماعت کے قیام سے مسلمان ظلم و ستم سے محفوظ رہیں گے، ان کے حقوق ملیں گے اور ان کے مطالبات پورے ہوں گے تو ایسی صورت میں سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہے۔

## ۱۰۔ عورتوں کا الیکشن میں حصہ لینا:

شریعت اسلامیہ اور احکام اسلام میں غور کرنے سے یہ بات واضح اور ظاہر ہو جاتی ہے کہ جتنے امور استعلاء، استیلاء اور اعلان شان و شوکت سے متعلق ہیں وہ سب کے سب مردوں کے پیردہیں، جیسا کہ نبوت و رسالت، اذان و اقامت، خطبہ جمعہ و عیدین، امامت و استخلاف، ولایت نیک اور حق تعزیر وغیرہ۔ الیکشن میں حصہ لینا بھی استعلاء و استیلاء اور اعلان شان و شوکت سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے الیکشن میں عورتوں کا حصہ لینا جائز اور درست نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِذَا كَانَ أَمْرًاؤُكُمْ خِيَارَكُمْ وَأَغْنِيَاكُمْ سَمْحًاؤُكُمْ وَأُمُورَكُمْ شُورَى بَيْنَكُمْ فَظَهَرَ الْأَرْضَ خَيْرَ لَكُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَإِذَا كَانَ أَمْرًاؤُكُمْ شَرَارَكُمْ وَأَغْنِيَاؤُكُمْ بَخْلًاؤُكُمْ وَأُمُورَكُمْ إِلَى نِسَائِكُمْ فَبَطْنِ الْأَرْضِ خَيْرَ لَكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا" (ترمذی ۵۲۱۲)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے امراء تم میں سب سے بہتر ہوں، تمہارے مالدار لوگ تم میں سب سے زیادہ سخی ہوں اور تمہارے امور مشورہ کے ذریعہ طے پائیں تو زمین کا ظاہر تمہارے لئے اس کے باطن سے بہتر ہے اور جب تمہارے امراء تم میں سب سے بدتر لوگ ہوں اور تمہارے مالدار تم میں سب سے بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے پیردہوں تو زمین کا باطن تمہارے لئے ظاہر سے بہتر ہے)۔

لہذا حکم خداوندی: "قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَخْفَضُنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظُنَّ فُرُوجَهُنَّ" (سورہ نور: ۳۱) پر عمل کرتے ہوئے الیکشن میں عورتوں کے لئے حصہ لینا جائز نہیں ہوگا۔

عصر حاضر میں بے حیائی اور عریانی عام ہو گئی ہے، لوگ سہولت پسند ہو گئے ہیں، ہر آدمی سہولت اور آسانی کی تلاش میں ہے، ایسی صورت میں اگر عورتوں کے لئے الیکشن میں حصہ لینے کو جائز قرار دیا جائے تو اور زیادہ فتنے پیش آنے کا خطرہ ہے، لہذا حفظاً للبنات عورتوں کے لئے الیکشن میں حصہ لینے کو ناجائز قرار دینے میں خیر نظر آتا ہے۔ ☆☆☆

## ایکشن سے مربوط شرعی مسائل

مولانا محمد قمر الزماں ندوی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سماج و معاشرہ اور انسانی سوسائٹی کو منظم و مرتب کرنے کے لئے تنظیم و حکومت کی ضرورت پڑتی ہے۔ تنظیم کا ایک دائرہ تو محدود ہوتا ہے جس کو ہم خاندان کہتے ہیں، دوسرا دائرہ بہت ہی وسیع، ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہوتا ہے جس کو سلطنت اور حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور سچائی یہ ہے کہ ایسے کسی نظام کے بغیر انسان کی تمام ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ہر مذہب سماج ریاست و حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارتا آیا ہے۔

جمہوریت اور سیکورلزم:

حکومت کی تشکیل کے مختلف طریقے زمانہ قدیم سے مروج رہے ہیں۔ عصر حاضر میں جو سیاسی نظام (POLITICAL SYSTEM) مشرق سے مغرب تک پھیلا ہے اور جس کو غلبہ حاصل ہے، وہ جمہوری نظام (DEMOCRACY) ہے۔

یہ بات دو دو چار کی طرح عیاں ہے کہ جمہوریت اور سیکورلزم کے تصورات و نظریات اسلامی تعلیمات سے جوڑ نہیں کھاتے، (اگرچہ جمہوریت کے بعض اصول اسلام کے طرز حکمرانی سے بہت قریب ہیں) اس لئے اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں ہوگی کہ انہیں اسلامی نظریات سمجھ کر قبول کر لیا جائے، لیکن یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ شریعت اسلامی کا ایک قاعدہ اور ضابطہ ہے کہ ”من ابتلی ببلیتین فلیختر اھوھما“ یعنی اگر دو برائیوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑے اور وہ ناگزیر ہو جائے تو ضروری ہے کہ ان دونوں میں جو ہلکی برائی ہے اس کو اختیار کیا جائے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی فرماتے ہیں: ”اور یہ شرعی اور عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر جمع ہوں۔ ایک اشد (سنگین) دوسرا ہون (یعنی کم درجہ کا) تو ہون کو اختیار کر لینا چاہئے، یعنی جہاں دونوں شقوق میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد ایک میں اخف تو اشد سے بچنے کے لئے یا اس کو رفع کرنے کے لئے اخف کو گوارا کر لیا جاتا ہے اور ہے تو یہ بھی برا مگر دوسرے مفسدہ کے مقابلے میں پھر بھی اخف ہے (ملفوظات اشرفیہ ۴۱، مروجہ سیاست کے شرعی احکام صفحہ ۳۴)۔

جمہوریت اور آمریت میں قابل ترجیح کون؟

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر مسلم ملک میں آمریت کو جمہوریت (آمریت میں عوام الناس کا اختیار ختم کر دیا جاتا ہے، بادشاہ وقت سیاہ و سفید کا تہا ما ملک بن جاتا ہے۔ ظاہری بات ہے جس ملک میں آمریت قائم ہو، وہاں مسلمانوں کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور تحریر و تقریر کی آزادی نہیں مل سکے گی) کے مقابلے میں ترجیح دینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ جہاں دو برائیوں میں سے ایک برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے وہاں مسلمان پر لازم ہے کہ دونوں میں جو ہلکی برائی ہو اس کو اختیار کرے اور جمہوریت بہر حال غیر مسلم مذہبی آمریت سے ہلکی برائی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ سیکولر جمہوری حکومت کی تائید (اس میں شرکت اور انتخاب میں حصہ لینا اور امیدوار بننا) اس لئے نہیں ہے کہ سیکولرزم اور جمہوریت اسلامی چیزیں ہیں بلکہ صرف اس لئے اس کی تائید کی جائے گی کہ آمریت کے مقابلے میں یہ چھوٹی برائی ہے اور جمہوری نظام میں مسلمانوں کو اس کا موقع ضرور ملے گا کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کریں اور تحریر و تقریر کی آزادیوں سے فائدہ اٹھا کر اسلامی معاشرتی اقدار کی ترویج کے لئے فضا ہوا کر لیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیکولرزم (لانڈہیت) کی پہلی تعبیر تو مسلمانوں کے لئے کسی بھی حال میں قابل قبول نہیں ہے، البتہ غیر مسلم ممالک میں عبوری طور پر سیکولرزم کی جو تعبیر مسلمان اپنا سکتے ہیں اور ان کے نزدیک قابل قبول ہے (عارضی اور وقتی طور پر) وہ یہ ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا، ریاست مذہب کے

مؤلف: استاذ فقہ و ادب مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ، پرتاپ گڑھ، یو پی۔

معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی، مذہبی گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی حاصل ہوگی۔

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عصر حاضر کی گندی اور بے لگام سیاست نے ایکشن اور ووٹ کے لفظ کو اتنا بدنام اور داغدار کر دیا ہے کہ انتخاب اور ایکشن کے ساتھ مکر و فریب، رشوت، جھوٹ اور دغا بازی کا تصور لازم سا ہو گیا ہے، اس لئے زیادہ تر شریف اور سادہ لوح لوگ اس جنجال میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتے اور یہ غلط فہمی بھی عام ہو گئی ہے کہ ایکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں، ایسے حضرات کا منشا تو برا نہیں، لیکن نتائج بہت برے ہیں یہ سوچ کر آج کی سیاست مکر و فریب کا دوسرا نام ہے اس لئے نہ ایکشن میں کھڑا ہونا چاہئے اور نہ ووٹ اور حق رائے دہی کا استعمال کرنا چاہئے۔ یہ نظریہ دین و شریعت کے خلاف اور ملک و ملت کے لئے بھی سخت نقصان دہ اور مضر ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ جمہوری ملکوں میں مسلمانوں کے ووٹ کی کتنی اہمیت ہے اور مسلمان کس طرح حکومت کو آنے سے روک سکتے ہیں اور ان کی حکومت کو ختم کر سکتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَرُ قَلْبِهِ“ (اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گناہ گار رہے گا) اور جمع الفوائد اور طبرانی کی روایت ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ كَتَمَ شَهَادَةً إِذَا دَعِيَ إِلَيْهَا كَانَتْ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّورِ“ (جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ص ۶۲) (جس کسی کو شہادت کے لئے بلا یا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا)۔

ووٹ بلاشبہ ایک شہادت ہے، اس لئے قرآن وحدیث کے مذکورہ احکام اس پر بھی جاری ہوں گے، لہذا ووٹ نہ دینا اور اس حق کو محفوظ رکھنا یہ دین داری کا تقاضہ نہیں بلکہ اس کا صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان پر فرض اور ضروری ہے۔

دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹ اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے ”وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا“ (یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں بھی اس کا حصہ لگتا ہے)۔ اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور پوری امانت اور دیانت کے ساتھ قوم و سماج کی فلاح و بہبود میں لگا رہے اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق اور فاسق ظالم کی سفارش کرے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے بیچ سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا، ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے، ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت کسی شخص کے حق سے متعلق ہوتی، اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں، کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق سے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔ نیز اگر مسلم ملک ہے تو وہاں ووٹ کی حیثیت ان سب کے علاوہ سیاسی بیعت کی ہے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ متعلقہ امیدوار کو وکیل بناتا ہے کہ وہ اس طرف سے سربراہ مملکت کا انتخاب کرے۔ خدا کرے جلد ہی ہمارے ملک میں وہ خوش قسمت ساعت آئے (آمین) (مستفاد از جواہر المفقہ ص ۲۹۳)۔

### ایکشن میں بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا حکم:

مذہب اسلام اس بات سے منع کرتا ہے کہ لوگ خود کسی عہدہ یا منصب کے طلب گار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی مطالبہ کے بغیر کسی ذمہ داری پر فائز کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص مدد ہوتی ہے اور جب مطالبہ اور سوال کے ذریعہ کوئی عہدہ حاصل کرتا ہے تو اپنے نفس کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اللہ کی مدد اس کے شریک حال نہیں ہوتی ہے (ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۳۲۳)۔

لیکن اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ وہ اس میدان میں قوم و ملت اور سماج و معاشرہ کی صحیح خدمت کر سکیں گے اور امانت و دیانت کا دامن حتی المقدور نہیں

چھوڑیں گے اور قرآنی حکم اور سنت یوسفی کو زندہ کرنے کا جذبہ ہو کہ ”جعلنی علی خزائن الارض لانی حفیظ علیم“ تو وہ شخص ایکشن (انتخاب) میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کر سکتے ہیں بلکہ عصر حاضر میں اگر شریف دین دار اور معتدل مزاج لوگ انتخابات کے معاملے میں بالکل یکسو ہو کر بیٹھ جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ پورا میدان شریروں، فتنہ پردازوں اور بے ایمانوں کے ہاتھ میں آجائے گا، اس لئے احقر کی رائے میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ پوری بیدار مغزی اور فہم و فراست کے ساتھ اس میں بھرپور حصہ لیں اور جن کے اندر اہلیت اور قابلیت ہو ان کو ضرور میدان میں اتاریں اور ان کی دامے درے قدمے سنبھالیں اور خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا مسلمان جیتنے کی پوزیشن میں ہیں اور مسلمان ملی اتحاد کا ثبوت دین اور مسلمان قائد کو منتخب کر کے ایوان زیریں تک پہنچائیں اور باطل طاقتوں کو مضبوط نہ ہونے دیں بلکہ میر جعفر اور میر صادق جیسے مسلمانوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچائیں۔

### مخالف شریعت قانون ساز ادارہ کا ممبر بننے کا حکم؟

ایسے غیر مسلم ممالک جہاں قانون ساز ادارے شریعت کے مخالف قوانین وضع کرتے ہوں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا اور ان قوانین کی تائید و موافقت کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن جمہوری ملکوں میں ہر ممبر کو آزادی رائے کا حق ملتا ہے اور وہ اپنے مذہب کو اس قانون سے مستثنیٰ کر سکتا ہے جو مخالف شریعت ہو (غالباً تمام جمہوری ملکوں میں مسلم پرسنل لاء اور اس کے عائلی نظام پر مسلمانوں کو عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ تعزیریاتی معاملات اور معاشی و اقتصادی نظام میں مسلمانوں کو آزادی حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں)۔

### خلاف شریعت دستور اور دفعات پر رضا مندی اور حلف لینے کا حکم؟

یہ سچ ہے کہ جو مسلمان قانون ساز ادارے کے رکن منتخب ہوتے ہیں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے جبکہ دستور و آئین میں بہت سی دفعات خلاف شریعت بھی ہوتی ہیں، تو کیا مسلم ارکان کے لیے اس طرح کا حلف لینا درست ہے؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ چونکہ مجموعی طور پر جو دستور اور دفعات ہیں، وہ اسلام کے مخالف نہیں ہیں، البتہ کچھ شقیں ضرور اسلام کے مخالف ہیں، اس سلسلہ میں مسلمان ارکان یہ کریں کہ جمہوری حدود میں رہ کر اسلام کے مخالف دستور کو ہٹوانے کی کوشش حتیٰ المقدور کرتے رہیں۔ حکومت کے ناجائز فیصلوں اور اقدامات کی تائید نہ کریں۔

### مسلم ارکان کا بائبل پر حلف لینا کیسا ہے؟

جن مغربی ملکوں میں عیسائی ارکان کے ساتھ ساتھ مسلم ممبران کو بھی بائبل پر حلف لینا پڑتا ہو، وہاں مسلم ممبران کے لیے جائز نہیں ہے کہ بائبل پر حلف اٹھائیں اور تورات یا انجیل پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے اور دستور سے وفاداری کا حلف اٹھائیں، کیونکہ مسلمان ان کتابوں کو محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں، اس لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھائیں کیونکہ یہ ان کتابوں کی تعظیم اور بحالت موجودہ ان کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے مرادف ہوگا۔

البتہ اگر وہ مجبور ہوں اور بظاہر اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو اور ایوان میں ان مسلم ارکان کی موجودگی سے دینی، ملی اور شرعی فائدہ وابستہ ہو اور ایوان میں ان کی موجودگی سے مسلمان ظلم و زیادتی سے بچتے ہوں تو کراہت خاطر کے ساتھ ممبران بائبل پر حلف اٹھا سکتے ہیں۔ حلف لیتے وقت دل سے یہ نیت ہو کہ اصلاً یہ حلف ان آسمانی کتابوں پر ہے جو محرف شدہ نہیں ہیں۔

### وہ سیکولر پارٹیاں جن کے بعض منشور غیر اسلامی ہوں ان میں شرکت کا حکم؟

وہ سیاسی پارٹیاں جو سیکولر ہیں اور جو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ اگر ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغاثر ہیں تب بھی مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کو دیکھتے ہوئے اور مسلم دشمن پارٹیوں کو اقتدار سے محروم رکھنے اور دور کرنے کے لیے ان پارٹیوں میں شرکت کی گنجائش ہونی چاہیے ورنہ مسلم دشمن پارٹیوں کی جیت ہوگی اور مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان کا اندیشہ ہی نہیں خطرہ یقینی ہوگا، البتہ ان سیکولر پارٹیوں میں شامل مسلم ارکان کی مذہبی دینی اور ملی ذمہ داری ہوگی کہ حکمت و دانشمندی کے ساتھ اور آپسی اتحاد کر کے دستور اور منشور سے اسلام کے مخالف اور مسلم مفادات کے مغاثر چیزوں کو نکلوانے کی جی جان لگا کر کوشش کریں اور اس کے لیے جو بھی حکمت عملی ہو طے کریں اور قوم و ملت کو جوڑ کر ایسا دباؤ بنائیں کہ وہ سیکولر پارٹیاں مجبور

ہو جائیں، پارٹی کے منشور میں اسلام اور مسلمان کے مخالف دفعات کے نکالنے پر احقر کی رائے ان شرائط کے ساتھ ان پارٹیوں میں شرکت، پارٹی کا امیدوار بننا اور حمایت کرنا درست اور جائز ہوگا۔

### مسلم دشمن سیاسی پارٹیوں میں شرکت کا حکم؟

جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم کے دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہی نہیں بلکہ مسلمانوں سے دشمنی اور اسلام کے مخالف کا زہی کے لیے پارٹی قائم کی گئی ہے جن کے ایجنڈے میں اسلام کے مخالف کا ذکر کی صراحت موجود ہو، امیدوار بننا درست نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی پارٹی میں شرکت کرتا ہے، اس کی تشہیر و حمایت کرتا ہے یا اس کو طاقت و قوت فراہم کرتا ہے تو وہ مسلمان اسلام کا دشمن اور قوم کا دشمن کہلائے گا اور اس پارٹی سے اسلام اور مسلمانوں کو جو کچھ نقصان پہنچے گا، اس کا وبال اور گناہ اس کے رجسٹر میں لکھا جائے گا اور عند اللہ وہ شخص ماخوذ ہوگا۔ قرآن مجید و واضح لفظوں میں اعلان کرتا ہے: ”تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب۔“

### کیا مسلمانوں کے لیے الگ سیاسی پارٹی قائم کرنا جائز ہوگا؟

مسلمانوں کے لیے الگ سیاسی پارٹی بنانا کیسا ہے؟ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مسلمان امیر یا مسلمان ارباب حل و عقد کا کام ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی الگ سیاسی پارٹی قائم کرنا زیادہ مناسب ہے یا دوسری سیکولر سیاسی پارٹیوں میں شرکت اور انہیں قوت پہنچانا زیادہ بہتر ہے، احقر کی رائے میں اس سلسلہ میں کوئی حتمی اور قطعی بات نہیں کہی جاسکتی، بلکہ حالات اور مصالحوں کے پیش نظر فیصلہ کیا جانا چاہیے، ممکن ہے کہ بعض ملکوں اور بعض صوبوں میں شاید مسلمانوں کی سیاسی پارٹی قائم کرنا زیادہ نتیجہ بخش اور سود مند ہو (جیسے کشمیر اور آسام اور کیرل وغیرہ وہاں مسلم پارٹیاں ہیں اور حکومت میں ان کا اہم رول ہوتا ہے۔ کشمیر میں تو مسلمان ہی وزیر اعلیٰ بھی ہوتا ہے اور ان کی ہی پارٹی کی حکومت ہوتی ہے) اور بعض میں قومی سیکولر پارٹیوں میں شمولیت شاید بہتر ہو، بہر حال سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کے اندر اجتماعیت ہونا انتہائی ضروری ہے، یہ ضروری نہیں کہ مسلمانوں کے نام پر کوئی سیاسی پارٹی تشکیل دی جائے، لیکن سیاسی امور میں بصیرت رکھنے والے مخلص مسلمان قائدین کا جمع ہو کر مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کو پیش نظر رکھ کر لائحہ عمل اور بنیادی خطوط طے کرنا اور مسلمانوں کا اس پر کاربند ہونا از حد ضروری ہے، مسلمانوں کی کیف و ماہیت سیاست میں شرکت ان کے لیے نفع بخش کے بجائے ضرر رساں ہوگی، لیکن یہ بات بھی یہاں یاد رہے کہ مسلمانوں کے لیے کسی بھی حال میں فسطائی اور فرقہ پرست پارٹیوں میں شرکت درست نہیں ہوگا۔

### ایکشن میں خواتین کا کردار:

جمہوری ملکوں میں ووٹنگ میں مرد اور عورت کے حقوق یکساں ہیں، یعنی دونوں کے ووٹ کی حیثیت برابر ہے، اس لیے جن مفادات کے حصول اور منکرات سے بچنے کے لیے ایکشن میں شرکت کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ان کے مطابق عورتوں کا بھی ووٹنگ میں حصہ لینا ضروری اور واجب ہے، البتہ عورتوں پر واجب ہوگا کہ وہ حجاب اور پردہ کے ساتھ باہر نکلیں گی اور حق رائے دہی کا استعمال کریں گی، جہاں تک عورت کا انتخاب میں حصہ لینا ہے یعنی بحیثیت امیدوار کھڑا ہونا ہے تو اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام نے امامت کبریٰ اور امامت صغریٰ جس طرح مردوں سے متعلق رکھا ہے، اسی طرح خلافت، امارت، گورنری، ایوان کی رکنیت، شوریٰ کی ممبریت اور قضا کے فرائض بھی مردوں کے سپرد کیے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: ”ولہذا کانت النبوة یختصہ بالرجال وکذلک الملک الأعظم لبقولہ علیہ السلام: ”لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأۃ“ (رواہ البخاری)، وکذا منصب القضاء وغیر ذلک۔ (اور انہی وجوہ سے نبوت مردوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے اور اسی طرح خلافت و امارت، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے امور مملکت عورتوں کے سپرد کر دیے، اور اسی طرح قضا وغیرہ کے مناصب بھی مردوں ہی سے متعلق رہے ہیں، البتہ ملک و ملت کے وہ مسائل جو عورتوں ہی سے متعلق ہیں، ان میں عورتوں کی مدد لی جاسکتی ہے اور ضرورت پڑنے پر قوی طور پر دوسری ذمہ داریاں بھی عورتوں کی صنفی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کے سپرد کی جاسکتی ہیں۔



## ایکشن میں مسلمانوں کی حصہ داری

مولانا محمد قمر عالم قاسمی ؒ

۱۔ ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں: (۱) سفارش (۲) شہادت (۳) مشورہ (۴) وکیل نامزد کرنا۔

۱۔ قرآن کریم نے سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرمایا کہ اس کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے اور یہ بھی بتلا دیا ہے کہ نہ ہر سفارش بری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا اور بری سفارش کرنے والے کو عذاب کا جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: ”من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها وكان الله على كل شيء مقبلاً“ (سورہ نساء: ۸۵)۔

سفارش کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کر دیا جائے، لہذا جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا۔ چنانچہ بخاری شریف کی ایک حدیث شریف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اشفعوا فلتؤجروا ويقضى الله على لسان نبيه ما شاء“ (بخاری شریف ۸۹۱۲ کتاب لادب)۔ لہذا کسی امیدوار کو ووٹ دینے والا گویا سفارش کرتا ہے کہ یہ امیدوار اس عہدے کے لائق ہے۔

۲۔ ووٹ کی دوسری حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے کہ انسان جس امیدوار کو ووٹ دے رہا ہے وہ اس کے بارے میں گواہ ہے کہ اس کو ملک و قوم کے لئے بہتر مناسب، مفید اور خیر خواہ سمجھتا ہے۔ شہادت حقہ کی قرآن وحدیث میں بڑی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: ”ولا تكتموا الشهادة“ (سورہ بقرہ) اور ”وأقيموا الشهادة لله“۔

۳۔ اس کی ایک حیثیت مشورہ کی ہے کہ ووٹ دہندہ حکومت اور نظم و نسق کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کون زیادہ بہتر اور ایماندار ہو سکتا ہے۔

۴۔ اس کی ایک حیثیت وکیل نامزد کرنے کی ہے کہ ووٹ دہندہ سیاسی مسائل میں اس کو اپنا وکیل اور نمائندہ نامزد کرتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے سربراہ مملکت کا انتخاب کرے۔

اپنے حق رائے دہی کے استعمال کی حیثیت موجودہ دور میں ملکی حالات کے پیش نظر بڑی نازک اور اہم ہے، ایک شخص کو غیر مفید اور نامناسب سمجھنے کے باوجود اس کو ووٹ دینا جھوٹی گواہی، جھوٹا مشورہ اور غلط سفارش جیسے گناہوں کا ووٹ دہندہ مرتکب ہوگا۔

سوال ۲: کا جواب یہ ہے کہ جس کے متعلق یہ ظن غالب ہو کہ وہ خیر خواہی اور ہمدردی کرے گا اور مسلمانوں کے مفادات میں کام کرے گا اور وہ مسلمانوں کے مختلف النوع مسائل پارلیمنٹ یا اسمبلی یا میونسپلیٹی میں اٹھائے گا۔ ایسے شخص کو ووٹ دینا زیادہ بہتر، افضل اور جائز ہوگا اور جس کے متعلق ایسا ظن غالب ہو کہ قوم اور ملک و ملت خصوصاً مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچائے گا ایسے امیدوار کو ووٹ دینا ناجائز ہوگا، خصوصاً جب کہ اس امیدوار کا تعلق کسی ایسے فرقہ پرست سیاسی پارٹی سے ہو جس کا بنیادی مقصد ہی اسلام اور مسلمانوں کو زک اور نقصان پہنچانا ہو۔

سوال ۳ کا جواب: اس سوال کے جواب کی دو حیثیت ہے: (۱) ایک امیدوار ایسا ہے جس کا مقصد صرف دنیوی زر و دولت کمانا اور اپنی سیاسی بلا لادتی قائم کرنا ہے اور عہدے کا طالب ہے، قوم و ملک کی خدمت مقصود نہیں ہے۔ ان نیتوں کے ساتھ اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا جائز نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی شخص کے بارے میں فرمایا کہ ہم ایسے شخص کو عہدہ نہیں دیا کرتے جو اس کا طلب گار ہو یا اس کی خواہش رکھتا ہو (مسلم شریف ۱۲۰۲ باب

ط مفتی مدرسہ حسینیہ، رانچی، جھارکھنڈ۔



انہی عن طلب الامارة الخ۔

۱۔ اسلام ان لوگوں کو حکومت اور عہدے کا اہل سمجھتا ہے جو اس کو ایک مقدس امانت سمجھتے ہوں۔ مخلوق خدا کی صحیح خدمت کر سکتے ہوں اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانے ہوں، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں مقاصد کے پیش نظر خزانہ ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی اور کہا: ”اجعلنی علی خزانة الارض انی حفیظ علیہ“ (سورہ یوسف: ۵۵)۔

سوال ۵۳ کا جواب: مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ان ملکوں میں قانون ساز ادارے کا ممبر بننا اس وقت جائز ہے جہاں یہ معلوم ہو کہ اگر وہ یا اس طرح کے لوگ اس ادارے کا ممبر نہیں بنے گا تو لوگوں کے خاص کر مسلمانوں کے دینی، تعلیمی، مالی، ملی اور سماجی وغیرہ حقوق ضائع ہوں گے، انصاف نہ ہو سکے گا، اگر سارے کے سارے ممبران، بے ایمان، کافر، مشرک، یہود و نصاریٰ ہی ہوں گے تو مسلمانوں کا اور زیادہ نقصان ہوگا تو ان حالات میں اس ادارے کا ممبر بننا نہ بننے سے بہر حال بہتر ہوگا۔ (اس کی مثال ہمارے ہندوستان میں گجرات اور پڑوسی ملک برما (میانمار) کی صورت حال کسی سے پوشیدہ نہیں ہے) اور جو قانون خلاف شرع بنتے ہوں، اسے حتیٰ الوسع روکنے کی کوشش کرے تو یہ بری الذمہ ہو جائے گا اور اصول فقہ کا مشہور ضابطہ ہے: ”الضرورات تبیح المحظورات اور جہاں تک پارٹی کی پالیسی کے مطابق وہ پیپ جاری ہونے کے وقت ووٹ دینے کا ہے تو اگر شریعت و سنت اور اسلام کے خلاف ہے تو ووٹنگ میں حصہ نہ لے، خواہ اس کی ممبری شپ باقی رہے یا ختم ہو جائے۔

سوال ۶ کا جواب: اللہ کے سوا کسی چیز کی قسم کھانی جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”جسے قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔“ ”فمن كان حالفا فليحلف بالله أو ليصمت“ (مسلم شریف ۳۶۲۲ باب انہی عن ائلف لغیر اللہ تعالیٰ)۔ لہذا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر حلف لے، اس لئے کہ آج جو نئے رائج ہیں وہ محرف ہیں۔

سوال ۸۷ کا جواب: اگر اس کی یہ نیت ہے کہ پارٹی کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو منشور اور ایجنڈے ہیں اسے بدلنے کی کوشش کرے گا تو ایسی سیاسی سیکولر پارٹی میں شریک ہونے، اس پارٹی کی طرف سے انتخاب لڑنے اور اس کی حکومت میں شامل ہونے کی شرعاً گنجائش ہوگی اور ایسی سیاسی پارٹی جو کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کی پارٹی میں شریک نہ ہونا چاہیے ورنہ اغلب یہ ہے کہ وہ ضمیر فروش اور ایمان کا سودا ہی کر بیٹھے گا۔

سوال ۹ کا جواب: جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں خواہ ہندوستان ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور ملک، مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا چاہئے اور مسلمانوں کو متحد ہو کر اس مسلم سیاسی پارٹی کو ووٹ دینا چاہئے، تاکہ مسلم سیاسی پارٹی کے امیدوار زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو کر میونسپلٹی، اسمبلی اور پارلیمنٹ میں پہنچ سکیں، احقر اس خدشہ سے اتفاق نہیں کرتا کہ مسلم سیاسی جماعت کے قیام سے مسلمان مخالف ووٹ متحد ہوگا اور اس سے فرقہ پرست طاقتیں فائدہ اٹھائیں گی، کیونکہ غیروں میں بھی درجنوں علاقائی، صوبائی اور ملک گیر پارٹیاں ہیں اور ہر پارٹی سے اتنے خاصے لوگ جڑے ہوئے ہیں وہ کسی قیمت پر ان پارٹیوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔

سوال ۱۰ کا جواب: عورتوں کو مکمل پردے میں رہ کر ووٹنگ میں حصہ لینا چاہئے، اور ایسے تمام مناصب جن میں ہر کس و ناکس کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی ضرورت پیش آتی ہو، شریعت اسلامی نے ان کی ذمہ داری مردوں پر عائد کی ہے اور عورتوں کو اس سے سبکدوش رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو سربراہ مملکت یا اس کا ممبر بنانے کا کوئی تصور نہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأة“ (بخاری شریف ۶۳۷۲ کتاب النبی الی کسریٰ ذیقصر)۔

چنانچہ امت کا اس پر اتفاق و اجماع ہے کہ عورت کو سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں (بدایۃ المجتہد ۳۴۹۲ ماخوذ آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/۳۳۳)۔

جب عورت کو سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں تو عورت کو الیکشن وغیرہ میں بحیثیت امیدوار انتخاب لڑنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم وأكمل۔

☆☆☆

## ایکشن سے متعلق شرعی احکام

مفتی محمد اشرف قاسمی ع

۱۔ ووٹ کی تین شرعی حیثیت شہادت، وکالت اور سفارش کی ہے۔

۲۔ اگر قبضی طور پر کوئی ملت کا مہر دے اور خیر خواہی کے جذبہ سے ایکشن میں امیدوار ہے اور ووٹر کو یہ معلوم ہے تو پھر اس کے حق میں ووٹ دینا واجب ہے، ووٹ نہ دینے کی صورت میں گنہگار ہوگا۔

۳۔ اصحاب بصیرت لوگوں کی رائے و مشورہ سے امیدواری کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا سنت ہے۔ اگر اپنے اوپر اعتماد ہو، امور قیادت کی ادائیگی کا اور اس کے مقابل میں کوئی دوسرا قابل اور لائق اطمینان نہ ہو تو بوقت وسعت امیدواری کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا واجب ہے۔

۴۔ جمہوریت کی بنیادیں دو بڑی برائیوں پر ہے: ایک اللہ کی حاکمیت کے خلاف عوامی حاکمیت، دوسرے اکثریت کی رائے کو قانون سازی میں اصل کردار جب کہ اسلام میں ”کثرت رائے“ کے بجائے درست رائے قابل قبول ہے، اس لیے مسلم ملکوں کی جمہوریت میں خدا سے باغیانہ بنیادوں کو کھود کر پھینکنا وہاں کے مسلمانوں پر ضروری ہے۔ وہاں ایسے اداروں کا ممبر بننا حرام ہے، ان اداروں کا ممبر بننے کے بجائے نئی پارٹی بنا کر پہلے ایکشن میں کامیابی کے ذریعہ اللہ کی حاکمیت اور درست رائے کو بالادستی دی جائے، اگر ایکشن میں کامیابی کے بعد یا کسی طرح افہام و تفہیم کے ذریعہ یہ ادارے راہ راست پر نہیں آتے ہیں تو ایسے اداروں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ دوسرے ممالک کے صاحب حیثیت مسلمانوں کے ذمہ لازم و ضروری ہے۔

ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ملک میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی رعایت میں قانون سازی کی شرعی طور پر اجازت ہے، اس لیے جب تک ان کا کوئی دفعہ اسلام اور مسلمانوں کے مفادات سے نہ ٹکرائے، اس پارٹی کا ممبر بننا جائز ہے اور اگر پارٹی کی پالیسیاں جائز و واجب ضمیر کی آواز دبا سکیں تو پھر اس پارٹی سے مستعفی ہو کر فوراً پارٹی کی اس پالیسی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا ضروری ہے، کیونکہ ضمیر کی آواز پر روک لگانا دستور ہند کے دفعہ نمبر ۲۵، ۲۶ کے خلاف ہے۔ مستعفی ہونے کے بعد پارٹی کی ساتھ تو کمزور ہوگی، قانونی چارہ جوئی سے جمہوریت کو ایسا تحفظ فراہم ہوگا جس میں ہمارا ملی فائدہ ہے اور دوسری پارٹیاں بھی محتاط رویہ اختیار کریں گی۔

۵۔ قانون ساز اداروں کا رکن منتخب ہونے کے بعد دستور ہند سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہے جو دفعات خلاف شریعت ہیں وہ ان دفعات سے جن میں مذہبی آزادی دی گئی ہے خود بخود مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔

۷۔ سیکولر سمجھی جانے والی پارٹیاں مسلمانوں کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔ بہتر ہے کہ اپنے تیر چلانے والوں سے چٹ جایا جائے یا پھر بروقت جو پارٹی اپنے منشور میں ہمارے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرے، اس پارٹی میں شریک ہو کر انتخاب لڑ جائے اور پھر اس کی حکومت میں اس وقت تک رہا جائے جب تک وہ ہمارے مفادات کی حفاظت کرتی ہے اور جب وہ ہمارے مفادات کے خلاف کام کرنے لگے تو پہلے فہمائش سے کام لیا جائے ورنہ پھر مستعفی ہو کر دوسری پارٹی کا دروازہ دیکھا جائے۔ مسلمانوں کو کسی ایک پارٹی کا بندھوا بننا مناسب نہیں ہے۔

۸۔ دشمن کی صفوں میں شگاف پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے بیچ میں گھسا جائے، اگر اصلاح و تبدیلی کی کوئی صورت نہ بن سکے تو اس طور سے مستعفی ہو جائے کہ پارٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہو سکے۔ اگر ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے دفعات ہیں تو پھر قانونی طور پر ان کے خلاف چارہ جوئی کی جائے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فریضہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف

دارالافتاء مہد پور ضلع جین۔

دفعات بنانے والوں کو دوزخ سے بچانے اور ہمیشہ ہمیش کی جنت میں داخل کرنے کے لیے اپنے ان دشمنوں کے پاس جائیں، توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان کی دعوت دیں اور مسلمانوں کے تئیں ان کے غلط عقیدے کو درست کریں۔ بہت ممکن ہے کہ ہم نے اپنی اس دینی ذمہ داری سے تغافل برتا ہے تو اس کے پاداش میں ان کی طرف سے دنیا میں ہم سے انتقام لیا جا رہا ہے۔

۹۔ حکومت اقلیت و اکثریت کی بنیاد پر نہیں قائم ہوتی ہے بلکہ لیاقت بڑی وجہ ہے، خلق خدا کو آرام و راحت جس سے بھی ملے گی وہ اس کا استقبال کرے گی۔ ہم نے آج سے کہیں زیادہ چھوٹی اقلیت میں رہ کر حکومت کی ہے۔ آج بھی سب سے بڑی اقلیت ہی ملک کے سیاہ و سفید کی مالک ہے، اس لیے اقلیت کے خوف سے اپنی پارٹی نہ بنانا بلکہ مسلسل دوسری پارٹیوں کے سامنے کارہ گدائی لے کر گھومنا یہ ہمارے شامت اعمال کا اثر ہے۔ ہم نے جیسا کہ ابھی تک کوئی پارٹی نہیں بنائی ہے، دوسری پارٹیوں سے ٹکٹ لے کر بحیثیت امیدوار کھڑے ہوتے ہیں تو اس صورت میں بھی یہی خوف باقی رہتا ہے کہ جہاں ہمارا لائق مند امیدوار ہے وہاں فرقہ پرست پارٹی کسی طریقہ سے ایک دو تین کئی ایک مسلم ممبران کو امیدوار بنا کر ہمارے ووٹوں کو منقسم کر دے۔ الیکشن کمیشن میں اگر ہمارے نمائندے نہیں ہیں تو وہ ہمارے اکثریتی علاقوں کو ایسا تقسیم کر دے کہ کوئی امیدوار اس اکثریتی حلقے سے کامیاب نہ ہو سکے۔ بہت سی پارٹیاں مسلسل ہارتی رہتی ہے، لیکن اپنی پارٹی کو کالعدم کرنے کے بجائے بار بار میدان میں اتر رہی ہیں اور پھر ایک دن ان کو کامیابی بھی ملتی ہے۔ بی جے پی اور بہوجن سماج پارٹی کی ابتدائی تاریخ گاؤں کے سرپنچوں کے الیکشن سے بھی زیادہ غیر حوصلہ بخش رہی ہیں، لیکن جہد مسلسل کی وجہ سے وہ آج اس مقام پر ہیں، بنا بریں مسلمانوں کو اپنی سیاسی جماعت بنانے کے لیے خوف و اندیشہ کو دل و دماغ سے نکالنا ہوگا، نیز مسلمانوں کی سیاسی جماعت محض مسلم ووٹوں کی بنیاد پر نہیں قائم ہو سکتی۔ اکثریتی طبقے کو اپنے اخلاق و کردار اور اسلامی اعلیٰ اقدار و حکمرانی اور اپنے انتظامی مجالس کو پیش کر کے اطمینان دلانا ہوگا۔ آج بھی ہندوستان میں بہت بڑی اکثریت انصاف پسند حکمرانوں کی منتظر ہے۔

۱۰۔ عورتوں کا فطری فریضہ ماں بننا ہے، پھر گھر داری میں اپنے اعمال کو محدود رکھنا ہے، لیکن اس کی قیادت سربراہی بھی جائز و ثابت ہے، اس لیے خاص حالات میں مرد کسی بھی وجہ سے الیکشن کی امیدواری اور قانون ساز اداروں کی ممبری کے لیے نہ فرما، ہم ہوں تو ہماری عورتوں کو شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے آگے آنا چاہیے۔ جہاں تک ہندوستان میں عورتوں کی حکومت میں ریزرویشن کے رجحان کا مسئلہ ہے تو اس پر اس پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ سرمایہ دار طبقہ نیز پیدا کنی طور پر اپنے کو حکمرانی کا حقدار سمجھنے والوں نے اپنے گھروں میں اقتدار کو محصور کرنے کے لیے یہ پلان نہ بنایا ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمام کمزور طبقات کو اس قانون کے خلاف کارروائی کرنا ضروری ہے، خاص کر مسلمانوں کی ناکامی کی صورت میں حکومت و اقتدار کو بدنیت طبقہ کے ہاتھ میں جانے سے روکنے کے لیے عورتیں اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے الیکشن میں امیدوار اور قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں۔



## چوتھا باب

### اختتامی امور

مناقشہ:

## الیکشن سے مربوط شرعی مسائل

مولانا عتیق احمد بستوی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، اس وقت جو موضوع آپ حضرات کے سامنے پیش ہونے والا ہے وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے، الیکشن سے مربوط شرعی مسائل، اس سوالنامے میں بہت ہی اہم سوال اٹھائے گئے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ علماء کا تعلق اور بصیرت کا امتحان ہے کہ وہ کس طرح سے ان مسائل کے بارے میں کوئی فیصلہ فرماتے ہیں، جو مسائل واضح اور سادہ ہوتے ہیں حلال و حرام کا پہلو واضح ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ان کو تو سمیناروں میں زیر بحث لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس وقت جو عالمی حالات ہیں اور جو سیاسی نظام دنیا میں چل رہا ہے اور پوری مسلم دنیا کے لئے جو مسائل کھڑے ہیں ان پر غور کرنا یہ ہماری ذمہ داری ہے، اس ملک میں ہم رہتے ہیں اور یہاں ایک نظام چل رہا ہے، الیکشن کا، جمہوریت کا، اس کا ہم حصہ ہیں اور اس ملک کے ہم شہری ہیں، ہمارے حقوق ہیں، ہماری ذمہ داریاں ہیں، ظاہر بات ہے یہ نظام ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے، اگرچہ ہم بھی اس میں کچھ شریک ہیں، شیئر ہمارا بھی ہے، لیکن یہ نظام اس ملک کے تمام باشندوں کا بنایا ہوا ہے، میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ جو مسائل زیر بحث ہیں۔ یہ مت سوچئے کہ صرف ہندوستان کے لئے ہے، نہیں، آج تقریباً پچاس فیصد مسلمان ایسے ملکوں میں آباد ہیں جہاں غلبہ غیر مسلموں کا ہے، قانون سازی ان کے ہاتھ میں ہے اور سیاسی نظام کی تشکیل وہ کرتے ہیں، ان ملکوں میں مسلمان کس طرح رہیں، وہاں کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے جو اپنا مطلوبہ کردار ہے مسلمان کی حیثیت سے، اسے کس طرح ادا کریں، یہ بہت بڑا چیلنج ہے اور بہت بڑا سوال ہے عام مسلمانوں کے لئے، سوالنامہ جو مرتب کیا گیا تھا اس میں تمام شقوں کے احاطے کی کوشش کی گئی، اور اس سلسلہ میں سوالات کو دو حصوں میں کیا گیا ہے، دو عرض آپ کے سامنے پیش ہوں گے اور چونکہ مقالات کافی اس موضوع پر آئے ہیں موضوع کی اہمیت کی بنیاد پر، آپ کے پاس تخصیص مقالات کا رسالہ بھی ہوگا جس میں سوالنامہ بھی درج ہے اور ابھی جو عرض پیش ہونے والا ہے اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا، تو سوال ۱ سے سوال ۶ تک کا عرض جناب مولانا رحمت اللہ ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ذمہ کیا گیا تھا، انہوں نے بڑی محنت سے ان مقالات کو پڑھ کر عرض تیار کیا ہے۔ میری ایک گزارش یہ ہے کہ دلائل تو پورے ذکر کئے جائیں، لیکن جتنا اختصار ممکن ہو عرض میں اس کو ملحوظ رکھیں تاکہ مناقشہ کا موقع زیادہ مل سکے ہمارے شرکاء کو۔

مولانا عتیق احمد بستوی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، ابھی آپ کے سامنے، سوالنامے کے سات سوالات سے متعلق عرض پیش ہوا، مقالے ماشاء اللہ کافی آئے، اور ہر مقالہ نگار کا حق ہے کہ اس کی رائے کو اہمیت دی جائے اور اس کو پیش کیا جائے، اس لئے اس احساس کے تحت کہ کوئی اہم بات چھوٹ نہ جائے عرض لمبا ہو جاتا ہے اور کافی دیر تک آپ کو سننا پڑتا ہے، لیکن اس عرض کا لمبا ہونا انشاء اللہ ہم کو معاون ہوگا فیصلہ کرنے میں، تین سوالات باقی رہ گئے ہیں، اس کا دوسرا عرض ہے، لیکن ہم لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ جو سوالات پیش ہوئے ہیں اس پر مناقشہ ہو، تبادلہ خیالات ہو، جن حضرات کو اظہار رائے کرنا ہے وہ اپنا نام لکھ کر بھیج دیں، موضوع بہت ہی نازک ہے، بڑا اہم ہے، یہ جو عرض پڑھا گیا اس کی روشنی میں ایک بات تو یہ محسوس ہوئی کہ جن حضرات نے بھی مقالے لکھے ہیں ان کی غالب اکثریت ایک دو کو چھوڑ کر اس کی قائل ہے کہ گویا ووٹ دینا اور الیکشن میں شرکت جائز ہے، میں سمجھتا ہوں کہ جو مقالے آئے ہیں اور جو آراء ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں جواز کا رجحان ہے، اور ظاہر بات ہے کہ ہم کوئی نیا سفر نہیں شروع کرنے جا رہے ہیں، اس ملک میں ایک زمانے سے غیر مسلم اقتدار قائم ہے، شروع میں ایک موقف تھا کہ بالکل اس جمہوری نظام میں طاغوتی نظام میں شرکت درست نہیں ہے، لیکن رفتہ رفتہ ہمارے بزرگوں نے جو فیصلہ فرمایا تھا، وہ یہ کہ موجودہ حالات میں کوئی اور راستہ نہیں ہے اور الیکشن کا بائیکاٹ اور الیکشن میں شرکت نہ کرنا، ووٹ نہ دینا یہ گویا خودکشی ہے، موجودہ حالات میں، موجودہ ملک میں یہ فیصلہ ہمارے علماء کا ہے، اس تعلق سے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاؤس میں ابھی جو عرض پیش ہوا اس کی روشنی میں تقریباً اتفاق ہے، آگے یہ گفتگو بڑھتی ہے کہ یہ

شہادت ہے تو کیل ہے، رائے ہے، اس دوٹ دینے کو ہم واجب قرار دیدیں، جائز قرار دیدیں، مستحب قرار دیں، کئی آراء سامنے آئی ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر اس ملک میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا چاہئے، پارلیمنٹ کی ممبری ہو یا اسمبلی کی ممبری ہو، یا صوبائی یا مرکزی ہو، جب آپ نے اس کو جائز قرار دیا ان محظورات کے باوجود جو محظورات موجود ہیں، ظاہر ہے اس میں بہت سی منکرات ہیں، خرابیاں ہیں، لیکن یہ جو مسئلہ ہے اپنے نام کو ہم خود امیدوار کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس کی تائید کچھ لوگ کرتے ہیں، تو اس کے بارے میں دو آراء سامنے آئی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کو یہاں کے نظام میں شامل ہونا ہے، اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ایکشن جو موجودہ جمہوری نظام ہے، اس نظام میں شمولیت گویا ہمارے مفاد میں ہے، اگر اس میں ہم شامل نہ ہوں، اپنی رائے کا استعمال نہ کریں تو کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں، کیسے کیسے قوانین بن سکتے ہیں جن کی زد ہمارے مذہب پر اور ہمارے حقوق پر پڑ سکتی ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جو نظام بنایا ہوا ہو امیدواری کے لئے اس کو بھی اختیار کرنا ہوگا ہمیں ”راڈا مثبت الٹھی مثبت بلو ازمہ“ اس میں ہمارے واسطے ایسی گنجائش نہیں ہے کہ صاحب ایک آدمی اپنا نام تجویز نہ کرے پیش نہ کرے اور اس کی قانونی کارروائی نہ کرے اور اس کو کھڑا ہوا مان لیا جائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، بہت ہی فاضلانہ عرض مسئلہ ابھی آپ حضرات نے سماعت فرمایا اور جو بنیادی بات تھی اس کی طرف حضرت مولانا عتیق احمد صاحب نے توجہ دلائی۔ اسلام کا جو نظام سیاست ہے اس میں شریعت نے اصول و مبادی کو زیادہ بیان کیا ہے اور جزوی تصریحات نسبتاً کم ہیں اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حالات میں جوں جوں تبدیلی آئی اس دور کے علماء نے اس نظم کو قائم رکھنے کے لئے اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے کام لیا، مثلاً آپ جانتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں کہیں امارت قاہرہ کا ذکر نہیں ہے جس میں جبر و باؤ کے ذریعہ کوئی امیر بن گیا ہو، لیکن قاضی ابوالحسن ماوردی اور بعد کے علماء نے تقسیم کی اس امارت کی جو عامۃ المسلمین کے اختیار پر مبنی ہو اور اس امارت کی جو قہر پر مبنی ہو اور نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے یہ بھی فرمایا کہ امارت قاہرہ بھی قائم ہو جاتی ہے حکم میں فرق ہوتا ہے خروج کے، کہ جو امارت اختیار المسلمین سے ہو، اس کے خلاف خروج مطلقاً جائز نہیں ہے اور امارت قاہرہ کے خلاف خروج اس وقت جائز ہے جب کہ اس کے نتیجہ خیز ہونے کی امید ہو، اسی طرح آپ جانتے ہیں کہ ہماری فقہ میں مملکت اسلامی میں تعدد کا کوئی تصور نہیں تھا، خلفاء راشدین کے دور میں پھر حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں پھر اس کے بعد ایک عرصہ تک اموی اور عباسی دور میں پوری دنیائے اسلام میں ایک ہی خلیفہ ہوا کرتے تھے، لیکن جب حالات بدلے اور عالم اسلام مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گیا تو امام الحرمین قاضی ابوالحسن ماوردی اور دیگر علماء نے تعدد مملکت اسلامیہ اور تعدد بلاد اسلامیہ کے تصور کو قبول کر لیا کہ ایک سے زیادہ اسلامی مملکتیں بھی ہو سکتی ہیں، اگر ان کے درمیان سمندر حائل ہو جو ایک دوسرے کو ملنے سے روکتا ہو اور ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑا سمندر کے حامل ہونے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان اختلاف بھی ہوتا ہے اس اختلاف کی وجہ سے اگر ایک کرنے کی کوشش کی جائے تو اور زیادہ خونریزی ہوتی ہے، تو یہ علماء نے اپنے زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے قبول فرمایا ہے، لیکن بہر حال وہ اسلامی ملکوں میں تھے اب ہم جس ملک میں ہیں اور آج دنیا کے پچاس فیصد مسلمان ایسے ملکوں میں ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہیں ہمارے فقہاء نے فرق کیا ہے دارالاسلام اور دارالکفر کے احکام میں۔ اور دارالکفر اور دارالحرب کے احکام میں، اس کی بنیاد یہ ہے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک وہ جگہ ہے جہاں خود آپ نظام بنانے کے موقف میں ہیں اور ایک وہ جگہ ہے جہاں آپ نظام بنانے کے موقف میں نہیں ہیں بلکہ ایک بننے بنائے نظام کا حصہ ہیں تو جہاں آپ نظام بنانے کے موقف میں ہوتے ہیں وہاں آپ کی قدرت و طاقت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور شریعت کے جو اعلیٰ ترین احکام ہیں ان کی تنفیذ کی کوشش ہم پر واجب ہوتی ہے اور جہاں ہم خود نظام بنانے کے موقف میں نہیں ہیں، وہاں جیسا کہ مولانا عتیق احمد صاحب نے بھی ابھی نقل فرمایا حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ جب آپ نے پوچھا کہ معرفت کس کا نام ہے علم کس کا نام ہے؟ مخاطب نے کہا: ”معرفة الخیر من الشر“ تو حضرت عمر نے کہا یہ بھی کوئی علم کی بات ہے، ایک طرف خیر ہو، ایک طرف شر ہو تو آدمی خیر کو اختیار کرے گا، علم نام ہے، معرفة خیر الشرین کا جہاں دوشر ہو، ان میں سے مسلمانوں کے لئے نسبتاً کونسا شر کم ضرر رساں ہے اس کو اختیار کرنے کا، ہم جس ملک میں رہتے ہیں یہاں مسلمانوں نے حکومت بھی کی ہے ایک طویل دور تک اور ایک دور انگریزوں کی غلامی کا بھی گزارا ہے، پھر ہمارے بزرگوں کی کوششوں سے یہ ملک آزاد ہوا۔ اور جب ملک آزاد ہونے کو آیا تو ایک طوفان اٹھا ہندوستان میں، ایک تحریک اٹھی جو دو قومی نظریہ کی حامل تھی، اور بظاہر ان کی بات لوگوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی، اس کو اسلام سے قریب تر فکر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا، لیکن ہمارے اکثر علماء کی رائے یہ تھی کہ اس برصغیر میں جو حالات ہیں اس میں مسلمانوں کے مفاد میں یہ بات ہے کہ متحدہ ہندوستان رہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے حالات ہمارے ان بزرگوں کی رائے پر مہر تصدیق لگاتے ہیں، سیاست کا باب ایسا ہے کہ جس میں مصالح کا بڑا دخل ہے، ہمارے سامنے کتاب وسنت کی نظیریں بھی ہیں اصول بھی ہیں، فقہاء کے یہاں جو آراء میں تبدیلی ہوتی ہے وہ تبدیلیاں بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خود ہمارے اس ملک کے بزرگوں کا طرز عمل بھی ہے، آزادی سے پہلے بھی ہمارے بزرگوں نے ایکشن میں حصہ لیا جب محدود آزادی کے ساتھ ایکشن ہوتا تھا اور آزادی کے بعد بھی

انہوں نے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ مسلمان اپنی طاقت کو مؤثر بنانے کے لئے اور اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے اس ملک میں ایکشن میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیں، اور آج کے حالات میں جب بہت ساری تبدیلیاں آگئی ہیں پھر ہمیں اس پر غور کرنا ہے۔ ایک بات صرف میں عرض کر دیتا ہوں، سوالات میں تو بہت سے پہلو دریافت کئے جاتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلو آشکار ہو جائے، اب جیسے ووٹ کی حیثیت کیا ہے، شہادت ہے یا وکالت ہے یا شفاعت ہے یا مشورہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس اصطلاح سے عام مسلمانوں کو لینا دینا نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ حکم شرعی اس پر کیا مرتب ہوتا ہے، یہی اصل عام مسلمانوں کے لئے اہم ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ جتنی باتیں سوالات میں آئیں ہیں وہ ساری باتیں تجویز میں شامل بھی ہوں بلکہ مجموعی طور پر گفتگو ہوگی، اور پھر اس کے بعد جو آپ لوگوں کا فیصلہ ہوگا اور یقیناً اس میں حکم شرعی کی رعایت بھی ہوگی، اور مصلحت وقت کا لحاظ بھی ہوگا ان میں جن چیزوں کو تجویز میں شامل رکھنا اور پھر اس کو شائع کرنا مناسب ہوگا ان کی اشاعت عمل میں آئے گی، ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ موضوع بڑا نازک ہے، لیکن جو مسائل امت کو درپیش ہیں ہم ان سے منہ نہیں چھپا سکتے، ہمارے بزرگوں نے گفتگو کی یہی خواتین کی سربراہی کا مسئلہ کتنا پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن ہمارے بزرگوں نے اس پر بھی اظہار خیال کیا تو اگر ان مسائل سے ہم منہ چھپالیں اور ان کے نازک ہونے کی وجہ سے ہم ان کو زیر بحث نہیں لائیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ جرأت عالمانہ کے مغائر ہے، ہم اس پر بحث کریں جو مناسب رائے ہو وہ قائم کریں اور اگر کسی بات کا عوام میں زیادہ اظہار اور تشہیر مناسب نہ ہو تو یہ مجمع اس سے واقف ہو جائے گا ہر جز کو تجویز کی شکل میں لانا ضروری نہیں ہے۔ یہ مولانا کی خواہش پر ایک دو بات میرے ذہن میں آئی وہ عرض کر دی۔

مفتی نذیر احمد کشمیری:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، حضرات گرامی! اس موضوع کے انتخاب کرنے میں غیر معمولی بصیرت کا مظاہرہ ہوا ہے، اس پر فقہ اکیڈمی کے ذمہ داران بہت مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، پہلی بات یہ کہ ووٹ شہادت ہے یا شہادت کے علاوہ کچھ اور ہے۔ عام طور پر جن نصوص کا تعلق شہادت سے ہے ان تمام نصوص کو ووٹ پر منطبق کیا جا رہا ہے، حتیٰ کہ ہمارے بزرگوں کے فتاویٰ بھی موجود ہیں، جیسے جو اہر لفتہ میں ووٹ کی شرعی حیثیت کا مستقل ایک جز موجود ہے، لیکن ہمیشہ اس پر تامل رہتا ہے کہ شہادت نام ہے اظہار ما یعلم کا تو کیا امیدوار کے تمام حالات سے ووٹ دینے والا واقف ہوتا ہے، عامہ تو ایسا ہے کہ وہ نام کے حد تک تب واقف ہوتا ہے جب کوئی پارٹی کسی امیدوار کو کھڑا کر دیتی ہے، دوسرے علاقے کے پارٹیوں کے مفاد کے مطابق ایک آدمی کو کھڑا کیا گیا اور پھر عوام سے کہا جاتا ہے کہ صاحب اس کو ووٹ دیا جائے اس کے یہاں اس کی امانت اس کی دیانت، اس کی صداقت کسی بھی چیز سے ہم واقف نہیں ہیں، تو اب یہ آدمی اس کے حق میں گواہی دے گا تو کیسے گواہی دے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ امانت دار ہے، دیانت دار ہے، ملک کا وفادار وغیرہ، اس لئے شہادت کا درجہ دینا مکمل تامل ہے اس پر اچھی طرح سے غور ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کو شہادت کا درجہ دیا جائے، تو پھر بے شمار وہ انسان جو ووٹ نہیں ڈالتے اور ہر ملک کا حال یہی ہے کہ جب ووٹنگ ہوتی ہے تو اس کے بعد تجزیہ کیا جاتا ہے کہ کتنے فیصد لوگوں نے ووٹ میں حصہ لیا، کہیں تیس فیصد لوگوں نے، کہیں چالیس فیصد لوگوں نے تو بقیہ تمام آبادی جو ووٹوں میں حصہ نہیں لیتی ہے وہ خود ان ملکوں کے قانون کے مطابق مجرم نہیں ہیں۔ تو ہم کیسے ووٹ کو شہادت کا درجہ دے کر کہیں نہیں صاحب اس کی ادائیگی جو ہے لازم ہے اور آپ خاموش نہیں بیٹھ سکتے ہیں، پھر ہمارے بزرگوں میں بے شمار حضرات کا معمول ہے کہ وہ ووٹ نہیں ڈالتے ہیں، تو کیا ہم کہیں گے کہ وہ تمام کے تمام تارک واجب تھے، اپنی اپنی رائے دینے کا حق ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ تمام مقالات میں اس واقعہ کا تذکرہ نہیں آیا جس میں نبی کریم ﷺ نے قبیلہ بنو تمیم کے ایک آدمی کو قبیلہ کے لئے ذمہ دار مقرر کیا تھا اور حضرت ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے رائے طلب کی تھی جو شان نزول ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیؐ والی آیت کا اور حضرت ابو بکر نے ابن معبد کا نام پیش کیا، حضرت عمر فاروق نے اقرع بن حابس کا نام پیش کیا اور اس پر آپس میں تیز کلامی بھی ہوئی تو گویا ملک کا سربراہ دو اہم ترین شخصیات سے نام لینا چاہتا ہے کہ ان دونوں میں کون مناسب رہے گا، انہوں نے اپنی اپنی رائے دی اس کے بعد کس کے حق میں فیصلہ ہوا یہ امر آخر ہے، بس ٹھیک اسی طرح سے یہاں گویا ایکشن کمیشن رائے لے رہا ہے، ووٹ دینے والا رائے دینے کا پابند ہے، لہذا اس کو مشورہ قرار دیا جائے نہ کہ شہادت۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ صاحب ووٹ ڈالنا واجب ہے تو کیا ہم کہیں کہ بے شمار وہ انسان جو ووٹ نہیں ڈالتے وہ ترک وجوب کے مرتکب ہو رہے ہیں، ممکن ہے مسلمان ملکوں میں یہ کہا جاسکے، لیکن غیر مسلم ملک میں جہاں ایک طرف سے ایک ایسا شخص جس کے کردار کی، دیانت داری کی، امانت داری کی ہم گواہی نہیں دے سکتے اور دوسری طرف سے دوسرا شخص بھی کھڑا ہے اس کی حالت بھی یہی ہے لہذا ہمیں یہ کہا جانا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ جواز کا درجہ ہے۔ ایک طرف ہم ”أحدون البلیتین“ کہہ رہے ہیں تو أحدون البلیتین کو اختیار کرنا واجب نہیں ہوا کرتا، اسی طرح سے ایک مسئلہ آیا کہ امیدواری کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا جائز ہے یا نہیں، جواز میں تو کوئی شک نہیں، اس لئے کہ نصوص بتائی جا رہی ہیں اور خوب اچھی طرح سے اس کو پیش کیا گیا، لیکن بعض حضرات نے کہا کہ یہ واجب علی العین ہے، اور بعضوں نے کہا کہ یہ

فرض علی الکفایہ ہے اور بعضوں نے اس کو لازم کر دیا۔ اب اگر یہ واجب اور لازم کی بات کہی جائے تو ہمارے دینی اداروں کے ان تمام ذمہ داران کو جو نظام چلاتے ہیں ان کو پھر اپنے آپ کو ووٹ کے لئے پیش کر دینا چاہئے، ان سے زیادہ بہتر اور کون مناسب ہے، اگر یہ واجب کا درجہ ہو؟ تو زیادہ سے زیادہ جائز کا درجہ قرار دیا جاسکتا ہے، نیز ان تمام مسائل کو حل کرتے ہوئے یہ بھی ذہن میں رکھنا ہے کہ جمہوریت دراصل ہے کیا؟ یہ دراصل رولنگ کلاس طبقہ وجود میں آتا ہے اور یہ ملک پر حکومت کرتا ہے کبھی ایک پارٹی ہوتی ہے کبھی دوسری پارٹی ہوتی ہے کبھی ایک طبقہ آتا ہے کبھی دوسرا طبقہ آتا ہے، اگر نیا کوئی انسان کھڑا ہو جائے تو چیخ و پکار کے بعد پھر اس کو اپنے ساتھ شامل کیا جائے گا کہ تم باہر رہ کر کیا چیزوں کے اندر شامل ہو جاؤ، چاہے اس پارٹی کے ساتھ چاہے اس پارٹی کے ساتھ، اصل میں دنیا و حصوں میں تقسیم ہے ایک اپر کلاس کا طبقہ وہ کہیں ایک طبقہ کے ساتھ ہو گا کہیں دوسرے طبقہ کے ساتھ دوسرا عوام کا طبقہ ہے، اس نکتہ کو ذہن میں رکھ کر ہمیں غور کرنا ہے، اس کے علاوہ بھی چند باتیں ہیں وہ انشاء اللہ میں آگے عرض کروں گا۔ ان ہی باتوں پر میں اکتفاء کر رہا ہوں، و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا خالد حسین نیوی قاسمی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، دو امور کی طرف حضرات علماء و مفتیان کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، اول کا تعلق گزشتہ دن کی بحث سے ہے کل کی نشست میں بیچ و فاء سے متعلق بہت سی چشم کشا امور زیر غور آئیں، البتہ پوری بحث میں ایک بات آنے سے رہ گئی کہ بیچ و فاء کا معاملہ صرف بلخ، بخارا، سمرقند کا مخصوص مسئلہ نہیں تھا، یہ صحیح ہے کہ اس مسئلہ کی شروعات ان ہی علاقوں سے ہوئی، ابتدائے امر میں علماء نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا، (مولانا خالد صاحب میں معذرت چاہتا ہوں اگر اس بارے میں کوئی بات آپ کو فرمائی ہے، لکھ کر کے آپ حوالہ کر دیجئے مولانا عبید اللہ صاحب کو، اس وقت جو موضوع ہے ایکشن کا اس کے بارے میں آپ فرمادیں۔ مولانا عتیق صاحب)۔ اس مسئلہ میں یہ عرض ہے کہ ہمارے سامنے ایکشن سے متعلق جو تلخیص مقالات ہے، اس میں مولانا عبدالرشید قاسمی نے بھٹکل کے تعلق سے یہ تحریر کیا ہے کہ وہاں کوئی مسلمان ایکشن میں کھڑا نہیں ہوتا، اس کے باوجود ان کی سیاسی پکڑ کافی مضبوط ہے، میرا خیال ہے کہ موصوف کی رائے غیر واقعی ہے، گزشتہ ایام سے فرقہ پرستوں اور ایجنسیوں نے بھٹکل کو اپنے نشانہ پر لے رکھا ہے، فرقہ پرستوں کی طرف سے خانہ ساز فرضی نام انڈین مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر قرار دینے کی مذموم کوشش اور بے قصور مسلم نوجوانوں کو نار چر اور انہیں ہراساں کرنے کا سلسلہ چل رہا ہے، اس سے نوشتہ دیوار کچھ اور نظر آتا ہے، اگر بھٹکل کا کوئی اپنا ممبر پارلیمنٹ ہوتا تو ان مظالم کے خلاف آواز بلند کرتا تو صورت حال مختلف ہوتی، ہندوستان میں ایکشن سے متعلق شرعی مسائل پر غور کرتے ہوئے اس کے موجودہ جمہوری حیثیت کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہئے۔ فرقہ پرست طاقتیں اس حیثیت کو مسخ کر کے اس کو ہندو راشٹر بنانا چاہتی ہے، ہندو احمیاء پرستی کی تحریک شباب پر ہے، ایسے حالات میں اس کی جمہوری حیثیت کی حفاظت بھی ہماری ذمہ داری ہے، محسوس ہو رہا ہے کہ بعض فاضل مقالہ نگار اس کو ایک اسلامی امارت فرض کر کے گفتگو فرما رہے ہیں، جب کہ اس کی جمہوری حیثیت کو پیش نظر رکھنی چاہئے۔ جزاک اللہ۔

مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس صاحب ندوی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، ووٹ کی حیثیت کے بارے میں جو بات آئی ہے اور درجہ بندی کے تعلق سے جو ایک رائے آئی کہ اس کو جائز ہی ہونا چاہئے۔ ایک بات اس میں ملحوظ رہنا چاہئے کہ اسلامی ملک اور غیر اسلامی ممالک دونوں کے درمیان حکم میں فرق ہوتا ہے اور ہم جو گفتگو کرنے کے لئے بیٹھیں ہیں اس میں زیر بحث وہ ممالک ہیں جہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے، اس لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے، اسلامی ملک کا حکم کچھ اور ہوتا ہے اور غیر اسلامی ملک کا حکم کچھ اور ہوتا ہے، اس لئے غیر اسلامی ممالک کے اندر ووٹ کا استعمال تو واجب ہی ہونا چاہئے اس کو جائز یا مستحب قرار دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے، حالات سب کے سامنے موجود ہیں اس لئے اس کو واجب ہر حال میں ہونا چاہئے چاہے جو بھی حیثیت آپ دیں، اس لئے کہ انسان کی فطرت ہے جس چیز کو ہم جائز کہتے ہیں انسان کہتا ہے چھوڑ دو جائز ہی تو ہے گناہ تو ہو گا نہیں تو آدمی صرف نظر کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مستحب مسنون تک کو آدمی صرف نظر کر دیتا ہے، لیکن جب کسی چیز کو واجب قرار دیا جاتا ہے تو انسان اس کو اہمیت دیتا ہے تو اب چون کہ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ووٹ دیں یہ نہیں چاہتے کہ لوگ ووٹ نہ دیں اگر ہم ووٹ نہیں دیں گے تو مقصد ہی حاصل نہیں ہو گا، تو ضروری ہے کہ ہم واجب قرار دیں تاکہ لوگ ووٹ دیں اور تلقین بھی کریں کہ شرعی اعتبار سے واجب ہے نہیں دو گے تو گنہگار ہو گے، دوسری بات یہ ہے کہ ووٹ دینا ہون الہیبتین کا مسئلہ ہے، ہمارے خیال سے وہ مناسب بات نہیں ہے، ووٹ کا استعمال ہون الہیبتین نہیں ہے یہاں تو درجہ بندی کی بات ہو رہی ہے کہ ووٹ دینا واجب ہے یا مستحب ہے، کیا نہیں ہے؟ درجہ بندی کے اندر ہون الہیبتین کا مسئلہ آتا ہی نہیں سرے سے، جزاک اللہ۔

مولانا عبدالرشید (کانپور):..... مجھے تین باتیں کہنی ہیں ایک تو یہ کہ شہادت، رائے اور مشورہ یہ چیزیں آئی ہیں، مفتی تقی صاحب نے بھی اور مفتی شفیع صاحب نے بھی مفصل لکھ دیا ہے، اس میں حقیقتاً شہادت کسی نے بھی نہیں کہا بلکہ وہ ایک تشبیہ کی شکل ہوتی ہے، تشبیہ دینا ہوتا ہے، مطلب یہ نہیں کہ شہادت کہہ

کر کے شہادت کے پورے احکام اس پر لاگو کر دیئے جائیں۔ اور شہادت کہنے کا منشا بھی اصل میں عوام کو آمادہ کرنا ہے، ورنہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ خالی رائے اور خالی مشورہ ہے تو پھر یہ طاقتیں چاہتی ہیں کہ تمہاری رائے ہے، تو تمہاری رائے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، ہمارا پرسل لا تو یہ کہتا ہے کہ بغیر رائے مانگے رائے نہ دی جائے، کوئی ہم سے کہہ سکتا ہے کہ بھائی ہمیں آپ کی رائے کی ضرورت نہیں، آپ کے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے، تو جو یہ طاقتیں چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کو ووٹ سے محروم کر دیا جائے اس کو طاقت فراہم کرے گی، اس لئے ان حضرات نے شہادت تشبیہاً کہا ہے تاکہ مسلمانوں کے اندر اس کا شعور و ذوق پیدا ہو جائے، ہفتی نذیر صاحب نے جو ابھی بات کہی ہے کہ واجب نہ کہا جائے کم سے کم یہ جس صوبے سے تعلق رکھتے ہیں ان کو تو یہ بات نہیں کہنی چاہئے۔ یہاں پر بھی واجب کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ یہ جب دیکھا گیا کہ مسلمانوں میں بے حسی ہو رہی ہے، کوئی نکلنا ہی نہیں صرف اس بنیاد پر کہ صاحب یہ بھی خراب یہ بھی خراب ہے۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا! اگر ہم اس کو واجب سے کم درجہ لیتے ہیں تو پھر ظاہر بات ہے کہ پھر اختیار ہوگا اور مسلمان کا ایکشن کے لئے نہ نکلنے کی وجہ سے ان کا خسارہ ہوگا۔ تیسری بات اور آخری بات یہ کہ جو خالد نیوی صاحب نے بھٹکل کے حوالے سے کی ہے، بھٹکل والی بات جو میں نے اپنے مقالے میں ذکر کی ہے وہ صرف عورت کے حوالے سے ذکر کی ہے، کہ عورت کو ایکشن میں کھڑے ہونے کی کیا نوعیت ہے، ظاہر ہے عورت کا کھڑا ہونا کتنا نقصان دہ ہے برقع نوحے گئے ان کا خود ہمارے کانپور کے اندر جو سبھا سمد میں ہماری عورتیں گئی ہیں جیت کر کے وہاں جب انہوں نے ذرا سا حجاب کیا تو ان کا نقاب بھی پھاڑ دیئے گئے، ان کے دوپٹے بھی نوح دیئے گئے، اس حوالہ سے ہم نے بھٹکل کا ذکر کیا تھا، خود ہمارا جانا بھٹکل میں ہوا انہوں نے یہ کہا کہ ایک نظام ہے اس نظام کے تحت ہم پارٹی والوں کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی ہمارے مشورے ہیں اور ہماری مانگیں ہیں تم ہماری کون سی مانگ کو پورا کرو گے جو پارٹی ہمارے مانگ کو پورا کرتی ہے ہم اس کو سپورٹ کر دیتے ہیں۔ اور اس کا فائدہ ہم کو مل رہا ہے کہ ہم نے اپنے انجینئرنگ کالج میں جمعہ کے دن کی چھٹی کو منظور کر لیا، حالانکہ اس زمانے میں بی جے پی کی حکومت تھی اور آج بھی کرناٹک میں ہے، یہاں ایڈوانٹی آئے تھے اور کہا کہ بتائیے بھائی ہمارے صوبے کرناٹک میں جمعہ کے دن چھٹی، ہمارے لئے کلکتہ ہے، لیکن ہم نے اتوار کے بجائے جمعہ کے دن کی چھٹی منظور کرائی یہ صرف اس بنیاد پر کہ ہم جو بات ان لوگوں سے کہتے ہیں وہ اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس بنیاد پر خالی ہم ان کا تعاون کرتے ہیں، اور اپنی مانگوں کو رکھتے ہیں، تو وہ بات صرف عورتوں سے متعلق تھی۔ (مولانا عبدالرشید صاحب ابھی عورتوں سے متعلق عرض بھی پیش نہیں ہوا ہے جب عرض پیش ہو جائے گا تو اس وقت یہ وضاحت فرمائیں گے: مولانا عتیق صاحب)۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، سوال نمبر ۲ میں یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ اگر ووٹ شہادت کے درجے میں ہے تو اس کا حکم کیا ہوگا یہ مستحب ہے، یا واجب ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تو اس سلسلہ میں سوال نمبر ۲ کے جواب میں عارض مولانا رحمت اللہ ندوی صاحب نے اس میں میری طرف تضاد کی نسبت کی ہے، یعنی اس کی تفصیل میں اور اس کے خلاصہ میں دونوں میں تضاد معلوم ہوتا اور تعارض معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سے چوک ہوئی ہے اور مولانا نے آگے اور پیچھے دیکھے بغیر اس کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، اصل میں، میں نے پہلے یہ کہا تھا کہ ووٹ فرض کفایہ بھی ہے اور ووٹ فرض عین بھی ہے، عام حالات میں یہ فرض کفایہ ہے کہ بعض لوگوں کے دینے سے ختم ہو جاتا ہے اور مخصوص حالات میں، جب کہ مقاصد شریعت کا تحفظ مشکل ہو جائے تو اس وقت یہ فرض عین ہو جائے گا اور ہر شخص پر دینا ضروری ہو جائے گا، میں نے عام بات کہی تھی اور پھر دونوں نقطہ نظر کے دلائل بھی میں نے پیش کئے تھے، پھر بعد میں ملکی حالات پر اور ہندوستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے یہ لکھا تھا کہ یہاں چون کہ مقاصد شریعت کا تحفظ ابھی باقی ہے اور ابھی خطرہ میں نہیں پڑا ہے، اس بنیاد پر بہتر ہے کہ یہاں فرض عین نہ کہا جائے، چنانچہ جو میری عبارت ہے وہ یہ ہے کہ ہم حالات ایسے نہیں ہیں کہ ووٹ کو فرض عین قرار دیا جائے، (مولانا تنظیم صاحب! آپ کی عبارت میں ان کو تعارض محسوس ہوا اور تعارض نہیں ہوگا میں سمجھتا ہوں اس میں اگر ان کو تعارض کا شبہ ہوا تو اور واضح کر دیجئے اپنی عبارت کو، انشاء اللہ وہ ریمارکس جو ہیں اس کو ہم غائب کر دیں گے، جو تبصرہ ہے عرض میں شخصی طور پر لوگوں کے تعلق سے اس کو ہم حذف کر دیں گے: مولانا عتیق احمد صاحب)، ٹھیک ہے، دوسری بات مجھے اور کہنی ہے کہ ووٹ کے سلسلہ میں یہ فرض عین ہے یا فرض کفایہ۔ حضرت مفتی شفیع صاحب نے جو ہر الفقہ میں ”لا تکتسوا الشہادۃ“، ”کو نوا قوا امین بالقسط شہداء للہ“، وغیرہ دلائل کی روشنی میں ووٹ کے سلسلہ میں لکھا ہے اور فرمایا ہے کہ کسی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے، یعنی حضرت نے ان ہی آیات کی روشنی میں لکھا ہے اس کے آگے لکھتے ہیں: ”اس لئے اگر آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظر یہ کا حامل اور دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینا چاہئے اور اس میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور خود حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ نے لکھا ہے، اس طرح بعض اوقات ایک جاہل اور ان پڑھ انسان کی معمولی سی غفلت بھول چوک اور بددیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے، اس لئے موجودہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے، اس لئے یہ ہر شخص کا شرعی، اخلاقی قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا کہ اس وقت فی الواقع



مستحق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض عین ہے، ان کے پاس ایسے حالات ہوں گے کہ انہوں نے اس کو فرض عین کہا، لیکن میں نے ہندوستان کے نقطہ نظر میں اور ماحول میں کہا تھا کہ یہاں پر فرض کفایہ ہو سکتا ہے، جزاک اللہ۔

مولانا ابرار خاں ندوی:..... قانون ساز اداروں کی رکنیت، وہ ادارے جو کبھی کبھار اسلام مخالف قانون بھی بناتے ہیں، اس سلسلہ میں دو نقطہ نظر سامنے آئے ایک جواز کا اور ایک عدم جواز کا تو اس میں ہمیں یہ چیز اپنے ذہنوں میں رکھنی چاہئے کہ یہ ادارے ہمیشہ اسلام مخالف قانون نہیں بناتے، بسا اوقات تو یہ تصدراً اسلام مخالف بناتے ہیں وہاں اگر مسلمان ممبر ہوں گے تو وہ اس کی مخالفت کریں گے اور اس کا برملا اظہار کریں گے، لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ قانون بنانے والوں کی نیت بالکل صاف ہوتی ہے اور وہ ملک کے مفاد میں قانون بناتے ہیں، لیکن ہم وہاں موجود نہیں ہیں اور اتفاق سے وہ قانون مسلمانوں کے یا اسلام سے ٹکراتا ہے ان کی نیت بالکل صاف ہے ملک کے مفاد میں بنا رہے ہیں، لیکن وہ قانون اسلام سے ٹکراتا ہے، اسلام کے احکام کا انہیں علم نہیں، وہاں اگر مسلمان ممبر ہوں گے تو ان کی رائے ضرور طلب کی جائے گی اور جو قانون بنانے جا رہے ہیں وہ اس کی مضرتیں اور اس کے نقصانات کو واضح کریں گے تو وہ قانون نہیں بنے گا، اس لئے ضروری ہے کہ ہم وہاں موجود ہوں ورنہ وہ قانون بن جائے گا، بعد میں ہم شور مچاتے رہیں گے، کیوں کہ ان کی نیت صاف تھی بس اتنا عرض کرنا تھا، جزاک اللہ۔

مولانا اشرف قاسمی (ایم پی):..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، مجھے مقالہ نگار موصوف کی ایک عبارت پر اعتراض ہے، اس سے مجھے بھی تکلیف ہے تمام مسلمانوں کو تکلیف ہو سکتی ہے، انہوں نے ایک بات کہی، دلیل کے اعتبار سے یہ غیر مسلم اکثریت والے ممالک میں شیخ چلی کے پلاؤ جیسی ہے، حکومت کا خواب و خیال دیکھنا یہ ہمارے خیال سے بہت تکلیف دہ بات ہے اور بصیرت سے بعید ہے، اس سے پہلے جو ہماری حکومتیں رہی ہیں بہت ہی چھوٹی اقلیت میں رہے ہیں، اور یہاں کی اکثریت نے ہماری حکومتوں کو آٹھ سو سال قبول کیا، پھر ایسی صورت میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں شیخ چلی کا خواب ہے، جب کہ اس وقت بھاگنے کا راستہ نہیں تھا، مخالف طاقتیں غیر مسلم مضبوط تھے اور ان کا پلان بھی مضبوط تھا ابھی بھاگنے کے بھی ذرائع ہیں سارے اسباب موجود ہیں۔ پھر یہ بات کیسے کہہ دی گئی، جو لوگ دانہ اسی لئے کھاتے ہیں کہ اس سے بننے والا خون اللہ کے راستے میں بنے گا وہ تو ایسا نہیں سوچ سکتے خیر، اس کی گواہ تو راہور ان کی بیٹیاں ہیں جس پر ایک ہزار سال تک انسانوں کے چڑھنے اترنے کی شہادت نہیں ملتی، لیکن اللہ کے ایسے بندوں نے چڑھ کر کے پورے تحفظ حاصل کر کے دکھلا دیا کہ یہ خواب ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بہت غلط عبارت ہے خیر چون کہ ابھی اعتراض کی بات آئی تو پھر دوسری باتیں بھی اپنی ذکر کر دوں ہمارے اساتذہ کرام موجود ہیں یہاں، ہماری رائے صفحہ ۳۸ پر یہ ذکر کی ہے کہ ووٹ دینا رائے ہے اور رائے کے حساب سے جواز کے دائرے میں آتا ہے ہمارا پورا مقالہ شاید پڑھا نہیں، ہم نے نمبر ۱ کے جواب میں لکھا ہے، ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت و کالت اور سفارش کی ہے، یہ شہادت و کالت و سفارش ان فقہی و شرعی ضابطوں کے مطابق سو فیصد کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ عرفی و اصطلاحی طور پر یہ وکالت و شہادت ہے تو ہندوستان کے تناظر میں جہاں سرگنے جاتے ہیں ان سروں کو بھی شرعی طور پر اہمیت ہوتی ہے، عید کے موقع پر جب باہر نکلنے کا حکم دیا گیا راستہ بدلنے کا حکم دیا گیا، ان حکمتوں پر غور کریں کہ کیا حکمتیں ہیں اس سے بھی ہم کچھ راستہ فراہم کر سکتے ہیں تو ہمارے مقالہ میں جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت و کالت اور سفارش کی ہے، شہادت، وکالت، سفارش مکمل فقہی ضابطوں کے مطابق نہیں ہے، بلکہ میں نے عرضی طور پر یہ بات کہی ہے، اور یہ میری بات اس مسئلہ سے متعلق، جزاک اللہ۔

مولانا شوکت ثنا قاسمی (حیدرآباد):..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، ہندوستان کے موجودہ نظام سیاست میں جب کہ تقریباً اکثر جگہوں پر فرقہ پرست طاقتیں سرگرم ہیں اور ان کی یہ خواہش اور سازش ہے کہ مسلمانوں اور سیکولر امیدواروں کو پارلیمنٹ، اسمبلی اور قانون ساز اداروں میں جانے سے روکا جائے، دوسری طرف ووٹنگ کے سلسلہ میں مسلمانوں میں اتنا جوش و خروش نہیں پایا جاتا جتنا کہ غیر قوموں میں موجود ہے جس کی وجہ سے متعدد مقامات پر مسلم امیدوار یا سیکولر امیدواروں کو شکست ہوئی، اور یہ بھی واضح ہے کہ علاقے کی تعمیر و تخریب اور خیر و شر اور امن و امان میں علاقے کے نمائندہ کا بڑا دخل ہوتا ہے، خاص طور پر فسادات کے دور میں ان کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، جیسا کہ تمام حضرات پر یہ بات واضح ہے کہ جس ایریا میں ایم ایل اے یا ایم پی فرقہ پرست ہوتا ہے وہاں جو فسادات ہوتے ہیں مسلمانوں کی جو صورت حال ہے وہ بالکل واضح ہے ان حالات کے پیش نظر ووٹ کو صرف ایک رائے اور اختیاری عمل قرار دینا زمانہ و حالات و ضروریات کے ہم آہنگ نہیں ہے، اگر یہ صرف ایک رائے اور اختیاری عمل ہوتا تو انگریز کے دور میں اور اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند اور امارت شریعہ کے اکابر اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں فرماتے جب کہ صورت حال اس کے برعکس ہے جیسے کہ مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الفتاویٰ کے کتاب سیاسیات سے یہ

بات بالکل واضح ہوتی ہے، اس لئے دو ٹونگ کو ضروری قرار دیتے ہوئے مسلم تنظیمیں اور ائمہ اور فتویٰ کے ذریعہ عوام میں شعور اور احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، جزاک اللہ۔

مولانا عتیق احمد صاحب:..... ابھی انشاء اللہ ہمارے پاس وقت بہت ہے، دوسری نشست میں جو نام باقی رہ گئے ہیں انشاء اللہ ان حضرات کے خیالات بھی ہم نہیں گے، یہ نشست چوں کہ ہمیں ساڑھے گیارہ تک ختم کرنا ہے اور اس کے بعد چائے کا وقفہ ہے اس کے بعد عرض مسئلہ ہوگا مختصر سا ہے اور اس کے بعد گفتگو ہوگی، جن حضرات کے نام باقی رہ گئے ہیں ان کو بعد میں موقع دیا جائے گا۔ اس اجلاس کے صدر ہمارے بزرگ و مخدوم مولانا اسماعیل صاحب دامت برکاتہم ہیں جو جامعہ اسلامیہ کے قدیم ترین استاذ ہیں، یہاں کے نائب مہتمم ہیں اور ہم سب کے بزرگ ہیں، وہی صدارت فرما رہے ہیں اس نشست کی۔ اس کے بعد کی نشست انشاء اللہ مفتی سلمان صاحب کی صدارت میں ہوگی، میں صاحب صدر حضرت مولانا اسماعیل صاحب دامت برکاتہم سے درخواست کرتا ہوں کہ کچھ صدارتی کلمات فرمائیں اور اسی پر گویا یہ نشست ختم ہوگی پھر چائے کا وقفہ ہوگا۔

صدارتی کلمات:

حضرت مولانا اسماعیل صاحب (نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ):..... نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، أما بعد! میں تو اس کا اہل نہیں تھا، بہر حال مجھے صدر بنا دیا گیا، میں آپ حضرات کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سمینار کو کامیاب فرمائے اور مسلمانوں کے مسائل کے حل کا ذریعہ بنائے، اور ملت کے جو مسائل پیچیدہ ہیں ان کو سلجھانے کا ذریعہ بنائے اور اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کے جو کارکنان حضرات ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے ان کی کوششوں کو بار آور فرمائے اور تمام مسلمانوں کے لئے اس سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع عنایت فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا عتیق احمد بستوی:..... یہ دوسری نشست ہے اس کا موضوع بھی ایکشن سے مربوط مسائل ہیں، ابھی ایک عرض باقی ہے مفتی اقبال احمد قاسمی صاحب عرض پیش کریں گے، اس نشست کی صدارت ملک کے معروف مفتی و فقیہ حضرت مولانا سلمان منصور پوری فرما رہے ہیں اور انشاء اللہ عرض مختصر ہے بہت طویل نہیں ہے اس کے بعد جن حضرات کے نام میرے پاس موجود ہیں مناقشے کے لئے اور اظہار رائے کے لئے ان کو انشاء اللہ دعوت دی جائے گی، پہلے مفتی اقبال احمد قاسمی صاحب عرض مسئلہ پیش کریں گے سوال ۷ سے سوال نمبر ۱۰ سے متعلق۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، عرض مکمل ہوا، اور اس عرض میں جو سوالات زیر بحث آئے وہ بھی بہت اہم ہیں اور غیر معمولی ہیں، خاص طور سے خواتین کا امیدوار بن کر کھڑا ہونا اور پارلیمنٹ میں میونسپلٹیوں میں اور گاؤں پانچیتوں میں ان کا امیدوار بننا یہ بڑا نازک اور حساس مسئلہ ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ ہمارے واسطے بڑی نزاکت ہے کہ ہم کیا رائے قائم کریں اور کیا فتویٰ دیں، ہم جانتے ہیں جن لوگوں نے یہ اسکیم بنائی ہے کہ عورتوں کے لئے اتنی سیٹیں ریزرو کر دی جائے اور یہ بات مختلف صوبوں میں قانون بن چکی ہے، عمل میں آرہی ہے، پارلیمنٹ میں بھی اسمبلیوں میں بھی عورتوں کے لئے ریزرویشن کی بات، بات کی حد تک نہیں ہے، یہ قانون تیار ہوا اور پارلیمنٹ میں شاید پاس ہو چکا ہے، لوک سبھا میں پاس ہوا ہے اب راجیہ سبھا کا مرحلہ ہے، تھوڑی سی چپقلش جو ان کی آپس کی ہے کہ بعض پارٹیاں کہتی ہیں کہ بھائی جو ریزرویشن خواتین کا ہوا اس میں بھی ریزرویشن ہونا چاہئے دلہنوں کا، چکی ذاتوں کا، اس جھگڑے کی وجہ سے وہ مل تھوڑا سا اٹکا ہوا ہے، لیکن دیر سویر جب بھی ہو وہ مل پاس ہوگا، اور جہاں تک گاؤں کی پانچیتیں ہیں اور دوسرے ادارے ہیں ان میں تو صورت حال عملاً قانون بن چکا ہے اور نافذ ہو چکا ہے۔ اب صورت حال کیا ہے کہ اگر آپ یہ فیصلہ لیتے ہیں کہ تمام مصالح کو دیکھتے ہوئے کہ بھائی عورتوں کا کھڑا ہونا اور شریک ہونا امیدوار کی حیثیت سے جانا درست نہیں ہے تو میڈیا انتظار میں ہے بس میڈیا انتظار میں ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ آپ فرمائیں اور اس کے بعد ان کو موقع ملے کہ اسلام تو عورتوں کا مخالف ہے، اسلام عورتوں کو آگے نہیں جانے دیتا کہ تھوڑا سا ترقی کریں، آگے آئیں اور ان کو قوت ملے، اور اگر ہم دوسرا کوئی فیصلہ کرنے کی سوچیں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے نقصانات بھی ہیں، عورتیں جب امیدوار کی حیثیت سے کھڑی ہوں گی تو جاء البرود و لجات ایکشن کے تقاضے سب پورے کرنے پڑیں گے، ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد ان کی اسلامیت، نسوانیت کس حد تک بچے گی محفوظ رہے گی یہ بہت ہی سنگین مسئلہ ہے، ان دو نازک مشکلات کے درمیان اس مسئلہ کے تعلق سے آپ کو اظہار رائے کرنی ہے اور فیصلہ کرنا ہے، ایسا فیصلہ جو ملت اسلامیہ کے لئے اور اس ملک کے لئے فائدہ مند ہو اور جو معتز میں

ہو سکتی ہیں اس سے ہم بچیں، دوسرا ایک اہم موضوع مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کی بات بھی ہے بہت ہی اہم موضوع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک تو پورے ملک کی سطح پر کسی ایک ایسی پارٹی کے قیام کی بات ہے اور مختلف صوبوں کے حالات کے اعتبار سے یہ مسائل بھی کافی اہم ہیں، کچھ صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی ہے آسام میں ہے ادھر آپ کے کیرالا وغیرہ میں ہے کچھ مسلم پارٹیاں ہیں بھی، اس کے کچھ فائدے بھی ہم کو مل رہے ہیں، بلیس گے، لیکن ظاہر ہے یہ ہر صوبے کی صورت حال نہیں ہو سکتی۔ ہمیں تو مرکزی موضوع پر گفتگو کرنی ہے کہ پورے ملک کی سطح پر کیا کسی مسلم پارٹی کا قیام تنہا مسلمانوں کی بنیاد پر کیا ہمارے فائدے میں ہے، ملت کے فائدے میں ہے یا نہیں ہے۔ دوسرے مختلف صوبوں میں الگ الگ صورت حال ہے وہاں کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو تفتہ بھی چاہتا ہے اور سیاسی بصیرت بھی چاہتا ہے اس بارے میں کوئی رائے حتمی قائم کرنے میں، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس ہاؤس میں بعض حضرات ہیں جو ملک کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں یہاں کی سیاسی صورت حال سے وہ اپنی رائے ضرور پیش فرمائیں تاکہ اس سے ہم روشنی حاصل کریں۔ ہمارے پاس ناموں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے اور یہ جو تین مزید سوالات آگے ہیں اس تعلق سے بھی جو لوگ اظہار رائے کر چکے ہیں ان کی رائے بھی مزید ہو سکتی ہے میں دعوت دیتا ہوں مولانا شاہین جمال صاحب کو۔

مولانا شاہین جمال صاحب:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، ہم لوگ اسلامک فقہا کیڈمی کے اس سمینار میں سیاست کے شرعی مسائل بیان کرنے اور اس پر بحث کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں، کوئی سیاسی پلیٹ فارم بنانے کے لئے حاضر نہیں ہوئے ہیں، ہمیں اس کا ہر حال میں خیال رکھنا چاہئے کہ سیاسی پلیٹ فارم بنانا الگ چیز ہے اور سیاسی مسائل پر شرعی نقطہ نظر پیش کرنا یہ الگ چیز ہے، اس پس منظر میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کہنا کہ ہمارا ہدف اسلامی حکومت کا قیام ہونا چاہئے بہت غلط بات ہے، فرقہ پرستوں کو اس جملے پر اس ملک میں طوفان اٹھانے کا ہوا امل جائے گا اور ان کو ہماری طرف سے بلاوجہ یہ شبہ ملے گی کہ ہم لوگ کچھ ایسا کرنے جا رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے ہم صرف شرعی مسائل کے نقطہ نظر پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، کسی اسلامی حکومت کے ہدف کو یہاں بیان کرنے اور اس کے قیام کی جدوجہد کرنے کے لئے حاضر نہیں ہوئے ہیں اور یہ علماء حضرات جو ہیں کیا اس پوزیشن میں جب کہ دنیا کی یہی علماء کی جماعت سب سے زیادہ اختلاف و انتشار کی شکار ہے ایک سو چھین مسلم ملکوں میں آج تک ایک بھی اسلامی ملک موجود نہیں ہے، وہ مسلم ملک ضرور ہے، لیکن اسلامی ملک موجود نہیں ہے، ایسی حالت میں اگر کوئی یہ لکھ دیتا ہے کہ شیخ چلی کا خواب ہے تو آپ اس کو گوارہ کیوں نہیں کر پاتے، مصر گیا وہاں کے لوگوں نے کہا کہ ہندوستان کے علماء بہت منتشر ہیں، بہت مختلف ہیں، ہم نے کہا کہ بالکل متفق ہیں بالکل متفق ہیں، کہا ہم رات دن خبریں پڑھتے ہیں بہت منتشر ہیں، بہت مختلف ہیں بڑا آپس میں جنگ و جدال ہے مسائل پر ہم نے کہا کہ بالکل متفق ہیں کہنے لگے کس بات پر، میں نے کہا: ”یتفقون علیٰ اٹھ لا یتفقون“ سب متفق ہیں کہ اتفاق نہیں کریں گے ہمیں اپنے اتفاق کے نقطہ نظر پر ہر حال میں توجہ دینا چاہئے بس یہ ایک ایسی بات ہے جو اس وقت کے موجودہ ماحول میں مجھے یہ عرض کرنا ضروری محسوس ہوا اس لئے میں نے یہ بات عرض کر دی، جزاک اللہ۔

مولانا راشد وحید قاسمی (کانپور):..... ایکشن کے تعلق سے بہت مفید گفتگو ہوئی جو تمام اصولی انداز میں کی گئی اور اس کا اظہار بھی بتایا گیا ایک خاص سلسلہ میں ہتھیار کرنی ہے کہ ایکشن کے زمانے میں ایک کنفیوژن یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم بنیاد کس کو بنا کر ووٹ دیں پارٹی کو بنیاد بنائیں یا امیدوار کو بنیاد بنائیں، پارٹیاں کچھ وہ ہیں جن کا ایجنڈہ فرقہ پرستانہ ہے، اگر ان پارٹیوں کو ہم ووٹ دیتے ہیں، وہ مرکز میں پہنچنے کے بعد ایسی پالیسیاں بناتی ہیں جو دور رس ہوتے ہیں اور ان کے اثرات پورے ملک پر پڑتے ہیں، اس کی ایک مثال ہے کہ پچھلے دنوں میں ایک فرقہ پرست پارٹی مرکز میں پہنچی اور اس نے آسام میں بوڈولینڈ کا علاقہ ایک خاص کردیا فرقہ پرستوں کے لئے اور اس علاقے میں رمضان کے شروع میں جو حادثات پیش آئے وہ تقریباً چار لاکھ پچاس ہزار مسلمان وہاں سے باہر پھر رہے ہیں، نہ گھر ہے نہ در ہے، ایک تو حالات یہ ہیں، دوسرے اگر ہم امیدوار بناتے ہیں کسی فرد کو تو وہی پارٹی جس نے اپنی پالیسی کی بنیاد پر آسام میں بوڈولینڈ بنایا ہمارے کانپور میں اس کے امیدوار ہیں سلیل بشنوی، وہ بہت اچھے آدمی ہیں اپنے علاقے میں کام بھی کرتے ہیں، مسلمانوں کی حمت بھی ہوتی ہے سب ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں دوسری پارٹی جس کا ایجنڈہ سیکولر ہے، لیکن اس میں ایسے وزراء اور ایسے امیدوار شامل ہوتے ہیں کہ جس کا نتیجہ ہم کو الہ آباد کی شکل میں دیکھنا پڑتا ہے تو پورے ملک کا اور ریاست کا یہ معاملہ ہے امیدوار اور پارٹیاں۔ تو جب ہم ایکشن کے موقع پر کسی کو ووٹ دینا چاہیں تو ہم بنیاد کس چیز کو بنائیں، پارٹی کو اس کے ایجنڈے کو دیکھتے ہوئے یا امیدوار کے شخصی کیرئیر کو، ایک بات تو یہ ہے، دوسری چیز اس سلسلہ میں رہنمائی کون کرے گا، انطباق عوام نہیں کر سکتی، یا عام علماء بھی نہیں کر سکتے، اس سلسلہ میں ہم امید کرتے ہیں اکابر سے کہ وہ رہنمائی فرمائیں گے۔ دوسری بات یہ پیش کرنا ہے کہ ابھی ایک مقالہ نگار کی طرف سے یہ آیا

کہ ووٹ دینے کو واجب قرار دیا جائے تو واجب اور جائز یہ شرعی اصطلاح ہے یہ پچھلے دنوں بھی اس کا ایک تجزیہ کیا گیا، کہ امریکہ کے خلاف ایک بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا تھا جمعیت کی طرف سے کہ جو یہودی پروڈیکٹ ہیں اور جن سے ان کو تقویت ملتی ہے ان کا بائیکاٹ کر دیا جائے، لیکن جب بائیکاٹ کیا گیا پورے ملک میں تو کانپور میں ایک مفتی ہیں اور بڑے معتبر ہیں، انہوں نے میڈیا کے سامنے پبلسٹی کا بوتل پیتے ہوئے باقاعدہ اس کے رد کا اعلان کیا، اب اگر اسی طرح سے ووٹ دینا اور نہ دینا اگر ہم ان کو ان اصطلاحوں میں بیان کریں گے کہ یہ واجب ہے یا ناجائز ہے تو یہ فتویٰ والی بات ہوگی۔ ہم لوگ جو بیٹھے ہیں یا مقصد ہے وہ یہ ہے کہ ہم پر یکینکل راستہ کیا اختیار کر سکتے ہیں، اس سلسلہ میں میری گزارش یہ ہے کہ تجویز میں اصطلاحوں کو ذکر کرنے کے بجائے ایک ترغیب کا انداز اختیار کیا جائے، ایک صاحب نے دلیل دیتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ اگر ہم واجب نہیں گے تو یہ واجب والی بات لوگوں پر مؤثر ہوگی ایسا نہیں ہے، پچھلے تجربات اس کے گواہ ہیں کہ واجب کی بات مؤثر نہیں ہوتی ہے جو مؤثر ہوگی وہ ہماری کنونشن ہوگی ہماری ترغیب ہوگی، کہ ہم جا جا کر کے انفرادی طور پر اور ایک ایسے انداز میں لوگوں کو ترغیب دیں اور آمادہ کریں کہ ہمیں کیا کرنا ہے، جزاک اللہ۔

مفتی سعید الرحمن صاحب (ممبئی): ..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، الیکشن میں حالات کے اعتبار سے ایک تو ووٹ دینے کی بات ہے دوسرا مسئلہ ہم لوگوں کو اس مجلس میں یہ بھی واضح کرنا چاہئے کہ ووٹ دینے والے حضرات پر دھانی، ایم ایل اے اور ایم پی تک جو ووٹ دیتے ہیں وہ کوئی سائیکل لیتا کوئی موٹر سائیکل لیتا ہے تب ووٹ دیتا ہے، اسی طرح امیدواروں کے اندر جو اہلیت حکومت کی جانب سے مطلوب ہے اس کو بھی کھل کر سامنے آنا چاہئے، غالباً عوام تو عوام تمام علماء کرام کو بھی یہ معلوم نہ ہو کہ ایک امیدوار کے اندر مطلوبہ صفات جو حکومت کی طرف سے ہیں اسلامی نقطہ نظر کے علاوہ وہ کیا ہیں، اس لئے ماہرین سے اس مسئلہ میں معلوم کر کے پورے ملک میں ہر انسان تک پہنچانا چاہئے، ایک بات تو یہ عرض کرنی تھی ووٹ دینے والے اور ووٹ لینے والے کے تعلق سے، دوسری بات یہ عرض کرنا ہے کہ بار بار یہ بات سامنے آرہی ہے کہ جن کا قانون سیکور ہو وہ لوگ بہت مفید ہوتے ہیں عملی طور پر یہ بات نہیں ہے، ہمارے یہاں ممبئی میں جب شیو سینا کی حکومت قائم ہوئی کانگریس کے چالیس سال یا ۳۵ سال کے بعد تو شیو سینا حکومت کے زمانے میں نظم و انتظام میں بھی اچھائی رہی اور مسجدیں بھی زیادہ بنائی گئی، ان کو موموں زیادہ دیا گیا مدارس کو بھی فائدہ زیادہ پہنچا تو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اگرچہ قانون نہ ہو مگر ان کی نرمی اتنی مفید ہوتی ہے کہ ہمارے لئے موثر ہوتی ہے، اس لئے اکیڈمی کا پیغام بہت ہی اہم ہے کہ ہم کس نتیجے پر پہنچیں۔ خالی کوئی ایسا رجحان نہ پیدا ہو جائے کہ ہمارا غالباً صحیح نظر کوئی خاص پارٹی بن جائے کہ اس کے قوانین بن جائیں، اس کے افراد قوانین پر قسطی نہ ہوں، قوانین سیکور ہوں اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لئے ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے لئے مفید کون ہو سکتا ہے اور کون ہمارے لئے اہوں اور زیادہ فائدہ مند ہوگا، ان گزارشات کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ تجاویز پر اس کا خیال رکھا جائے اور مرتب کی جائے۔

مفتی محمد زید صاحب: ..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، الیکشن اور سیاست کے تعلق سے دو تین باتیں حضرت تھانویؒ کے تعلق سے عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک بات تو عرض میں آچکی ہے، حضرت تھانویؒ نے بڑی وضاحت سے اس بات کو ارشاد فرمایا کہ حکم کی دو قسمیں ہوتی ہیں: حکم اصلی اور حکم عارضی اور تفسیر بیان کرتے ہوئے اخیر میں فرمایا ہے کہ موجودہ حالات میں، اس وقت کے حالات میں آج کے حالات بہت سنگین ہیں، کہ حالات اور مفاسد کے پیش نظر عارضی حکم کو ترجیح دی ہے اور عارضی حکم میں بہت سے ایسے کاموں کو گوارا کیا جاتا ہے جو ناجائز بھی ہوا کرتے ہیں اور غالباً اسی اصول کی روشنی میں حضرت تھانویؒ نے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کا نام ہے صائب الکلام فی مناصب المحرام جس میں واضح طور پر مولانا تھانویؒ نے ناجائز مناصب، ناجائز نوکریاں، سرکاری ملازمتوں کو نہ صرف جائز لکھا ہے بلکہ اس کی ترغیب دی ہے اور یہ بھی لکھا ہے ساتھ میں کہ اگرچہ ناجائز کام کرنا پڑیں گے اگرچہ ناجائز فیصلے کرنا پڑیں گے تب بھی مسلمانوں کو ایسی نوکریاں اور ایسے عہدے لینا چاہئے پھر اس کی وجوہات اور اس کے دلائل تحریر فرمائے ہیں، حضرت تھانویؒ کی یہ چیز تین جگہ موجود ہے، امداد الفتاویٰ میں دوسرے انداز سے ہے، بوادر النواہر میں جو رسالہ ہے اس میں دوسرے انداز سے ہے، حکیم الامت نقوش و تاثرات، اس میں بھی ہے، اس پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کا حاشیہ ہے انہوں نے اس پر کچھ کلام بھی کیا ہے، بہر حال حضرت تھانویؒ نے اس کو گوارا کیا ہے اس کو لکھا ہے اس کی ترغیب دی ہے اور اس کی وجوہات بیان فرمائے ہیں کہ اگر ہم فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو نقصان تو نہیں پہنچا سکیں گے ہم، تیسری بات یہاں پر یہ بھی ہے کہ الیکشن اور سیاست کے تعلق سے حضرت تھانویؒ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اصل تو یہی تھا کہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی مستقل علیحدہ ہونی چاہئے ہر زمانے میں، اور اس کے بعد پھر استدراک کیا ہے، لیکن موجودہ زمانے میں حالات ایسے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے دشوار اور عملاً ناممکن ہے تو آنحضرتؐ کے ضررین کو اختیار کرتے ہوئے مولانا تھانویؒ نے اس کی ترغیب دی ہے کہ جو جماعت سیاسی پارٹی مسلمانوں کے لئے کم نقصان دہ ہو یا مفید ہو دوسروں کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دی جائے اس کو ووٹ دیا جائے۔ یہ بات مولانا تھانویؒ علیہ الرحمہ نے لکھی ہے اور

آخر میں ایک اہم بات فرمائی ہے علماء کرام کے تعلق سے اور سیاست کے میدان میں جو لوگ اترتے ہیں اور ایکشن میں کھڑے ہوتے ہیں اور جیتتے ہیں ان کے بارے میں کہا ہے کہ مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت ایسی بنانی چاہئے جو ایکشن میں کھڑے ہو چکے ہیں اور جیت چکے ہیں تو ان پر واجب ہے کہ علماء کرام و مشائخ کے پاس جا کر سیکھیں کہ ہم کو کیا کرنا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اگر ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو علماء کرام کو چاہئے کہ وہ خود ان کے پاس جائیں اس موقع پر ان کو یہ کرنا ہے کہ اس ملک میں ان کو یہ کرنا ہے تمہارے اختیارات یہ ہیں، یعنی ان کو تو اپنی رہنمائی لینا چاہئے سیاسی حضرات کو اور علماء کرام کو لکھا ہے کہ وہ جا کر ان کی رہنمائی کریں تقریر یا تحریر یا یہ بات البدائع جو حضرت تھانوی کے مقالات کا مجموعہ ہے بہت وضاحت و تاکید کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایکشن میں لوگ جیت جاتے ہیں تو ان کی رہنمائی نہیں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً“ آپ سب کے نبی ہیں۔ اس جیسے ملک میں موجودہ حالات میں جو سیاسی طبقہ ہے آپ اس کے بھی نبی ہیں، آپ کی ہدایات قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا ہیں سیاسی طبقہ کے لئے وہ علماء کرام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس ملک میں سیاست میں اترنے اور جیتنے کے بعد کیا کرنا چاہئے ان کو سیکھنا چاہئے اور ممبران کی رہنمائی کرنی چاہئے۔ جزاک اللہ۔

مولانا نصر اللہ ندوی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، دو تین باتیں عرض کرنی ہے ووٹ ڈالنے کا جو شرعی حکم ہے اس پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے جو زمین حقائق ہیں ان کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ووٹ کے تئیں بہت کم دلچسپی ہے، یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایکشن کمیشن کے سامنے ایک قانون زیر غور ہے کہ اگر ووٹر دو مرتبہ ووٹ نہیں ڈالتا ہے تو اس کا نام ووٹر لسٹ سے خارج کر دیا جائے گا گو یا اگر ہم اس کو واجب نہیں قرار دیں گے تو حکومت اس کو واجب قرار دینے کے لئے تیار ہے اور نام کو ووٹر لسٹ سے بچانے کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ مفتی جمیل صاحب بھی کہیں گے کہ ووٹ ڈالنا واجب ہوگا، اور ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ خواتین کی امیدواری کے تعلق سے بہت ہی قیمتی باتیں آئی ہیں، دو باتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ ملت کی آبرو کا تحفظ اور ایک خواتین کی آبرو کا تحفظ، یہ اصل وہ نکتہ ہے جس کو ہمیں پوری وضاحت کے ساتھ اور تنقیح کے ساتھ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس میں خیر الشریعہ کونسا پہلو ہے اس کو بھی دھیان میں رکھنا چاہئے۔ ایک بات سے پارٹی کی تشکیل کے تعلق سے مسلم پارٹی کی تشکیل، اس پر بہت سے لوگوں کے تحفظات ہیں خدشات ہیں، لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اگر مسلم پارٹی کا نام نہ دیا جائے سیکولر پارٹی کا نام دیا جائے، انصاف پارٹی، عدل پارٹی۔ ظلم کے خاتمہ کا نام دیا جائے اور کام وہی ہو جو مسلمان چاہتے ہیں جیسا کہ دو تین مقالہ نگاروں نے اس کا تذکرہ کیا ہے تو اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہو سکتا یہ بات بھی قابل لحاظ ہے، جزاک اللہ۔

مفتی غلام رسول منظور القاسمی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، مجھے دو تین باتیں عرض کرنی ہے سب سے پہلے تو ہمارے دوست مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی نے بیان کر دی ہے جو شیخ چلی کے حوالے سے بات کہی گئی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض ہمارے دوست مقالہ نگار نے یہ آیت ”وَأَعِدُوا لِلَّهِ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ الخ سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ آیت درحقیقت جہاد مع الکفار یعنی قتال کے سلسلہ میں ہے لیکن بہت سے حضرات نے اس سے ایکشن میں کھڑے ہونے پر استدلال کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے، اس سلسلہ میں بھی غمخو کرنے کی ضرورت ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا شاہین جمالی صاحب نے بڑے جمال کے انداز میں اور جلال کے انداز میں بیان فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے ذہن و دماغ سے وہ تصورات اور وہ خیالات جو ہمارے اکابر و اسلاف نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں کوششیں کی ہیں اور ان کا جو ہدف تھا وہ ہم چھوڑ دیں اور اپنے ذہن سے نکال دیں۔ قرآن کریم کی آیت پر غور کریں اور اس سے اندازہ لگائیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو پیدا فرمایا اس کا مقصد کیا ہے تو اس سلسلہ میں ذرا سا غور کرنے کی ضرورت ہے، کم از کم اپنے ذہن و دماغ میں تو یہ تصور قائم رکھیں چاہے خارج میں نہ کریں وجود خارجی نہ ہو جو ذہنی تو ضرور ہونا چاہئے، جزاک اللہ۔

مولانا عارف باللہ (حیدرآباد):..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، ووٹ کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں درجہ بندی کی گئی اور اس سلسلہ میں جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں واجب، جائز اور کوئی شرعی حیثیت نہیں، میرے خیال میں اس سلسلہ میں تمام اقوال کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے اور اس میں کئی مقالہ نگار کی طرح میں نے بھی لکھا ہے کہ موجودہ جو حالات اور پس منظر ہیں اس پس منظر میں اس کو حالات کے لحاظ سے فرض عین کا درجہ دیا جانا چاہئے اور اس لئے کہ بعض لوگ دینے نہیں جاتے تو بھائی بہن بہن سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو واجب اور فرض عین کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن لوگ اس میں سستی برتتے ہیں تو اس کی وجہ سے اس کے درجہ کو ہم کم تو نہیں کر سکتے، حالات یہ ہیں یہاں کے جمہوری طرز حکومت میں کہ جو حکومت بھی برسر اقتدار آتی ہے وہ کثرت رائے کی بنا پر اقتدار میں آتی ہے اور اس میں ایک ایک ووٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، علامہ اقبال کے بقول ہندوں کو گنا کرتے ہیں تو لائیں کرتے تو یہاں صورتحال یہ ہے کہ ووٹ دینے میں ایک شخص کی بھی کوتاہی کی

وجہ سے مقصد کے حصول میں رکاوٹ ہو سکتی ہے، اگر ہم مسلمانوں میں اس کی اہمیت کو بیان کریں اور اس کا صحیح درجہ بیان کر کے اس کا مسلمانوں میں شعور پیدا کریں تو ظاہری بات ہے کہ مسلمان میں دوٹرس جتنے زیادہ ہوں گے، مسلمان کے حق میں جو مفید ہیں انشاء اللہ وہ زیادہ ہی آگے آسکیں گے، اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر اداء شہادت عام حالات میں فرض کفایہ ہے لیکن بعض مخصوص حالات میں جب کہ اس سے رکنے کی وجہ سے مقصد کے حصول میں رکاوٹ ہو سکتی ہو تو وہ چیز فرض عین بن جاتی ہے، تو یہاں ایک ایک دوٹ کی چوں کہ اہمیت ہے اس لئے ایک آدمی بھی اگر دوٹ دینے سے پیچھے رہ جائے تو شاید وہی ایک دوٹ کسی دوسرے غلط آدمی کے آگے بڑھنے کا ذریعہ بن جائے، اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ اس کو فرض عین ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات آئی تھی مفتی عبدالرشید صاحب کانپوری کی طرف سے مفتی تقی صاحب، مفتی شفیع صاحب نے جو دوٹ کو شہادت کہا ہے تو وہ توجیہ کر رہے تھے کہ ان حضرات نے اس کو شہادت تشبیہا کہا ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس پر شہادت کا اطلاق نہیں ہوگا ان حضرات کے نزدیک، مفتی تقی صاحب کی بات میں یہ صراحت ہے کہ جیسا کہ اس کا ایک اقتباس میرے پاس ہے، کہ مفتی تقی صاحب نے لکھا ہے دوٹ شرعی اعتبار سے شہادت ہے، لہذا دوٹ پر شرعی اعتبار سے وہ تمام احکام جاری ہوتے ہیں جو شہادت پر جاری ہوتے ہیں، اسی طرح سے پہلے جو عارض تھے انہوں نے عرض مسئلہ میں تلخیص کرتے ہوئے میری رائے کو بالکل ہی بدل دیا ہے اور انہوں نے یہ کہا کہ دستور میں موجود دفعات خلاف شرع نہ ہونے کی صورت میں العبرۃ للغالب کے تحت حلف درست مانتے ہیں، چوں کہ بہت سی دفعات خلاف شرع ہوتی ہیں اور معصیت کی قسم کھانا ظاہر ہے انہوں نے اس کو ایسا مختصر کیا ہے کہ بات کچھ سے کچھ ہوگئی ہے، میرا موقف یہ تھا کہ دستور کے دفعات سے وفاداری کا حلف اٹھانا اصلاً جائز ہے دشواری پیدا ہوتی ہے اس میں بعض خلاف شرع دفعات ہونے کی وجہ سے لیکن عموماً موافق شرع دفعات زیادہ ہوتے ہیں اور مخالف شرع دفعات اگر ہوتے بھی ہیں تو مغلوب کے درجہ میں ہوتے ہیں اور فقہاء نے جہاں بہت سے مسائل میں مغلوب سے صرف نظر کرتے ہوئے غالب کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو جائز مانا ہے اور اس پر احکام کا انطباق کیا ہے، یہاں بھی دستور کے دفعات سے حلف اٹھانا جائز ہوگا اس کے غالب کا اعتبار کرتے ہوئے کیوں کہ غالب جو دفعات ہوتے ہیں وہ موافق شرع ہوتے ہیں مخالف شرع نہیں ہوتے، جزاک اللہ۔

مفتی انور علی اعظمی (مؤ): ..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ وکفی وسلام علی عباده الذین اصطفیٰ، أما بعد! مجھے خواتین کے امیدوار ہونے کے تعلق سے ایک بات عرض کرنی ہے، ابھی پارلیمنٹ میں تو خواتین کے لئے ریزرویشن بل پاس نہیں ہوا ہے لیکن عالمی پیمانے پر جو سازش چل رہی ہے اس کا ایک حصہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کے لئے ایکشن میں سیٹیں ریزرو کی جائیں تاکہ مسلمان عورتیں باہر نکلنے کے لئے مجبور ہوں، سیٹیں ریزرو ہوجانے کے بعد مسلمانوں کی مجبوری کی وجہ سے بڑی وقتوں کا سامنا ہوگا اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ اور جمعیت علماء اس طرح کی تنظیموں کو ہمیں متوجہ کرنا چاہئے کہ وہ اس طرح کے بلوں کے پاس ہونے سے پہلے جو اس کا سدباب ہو سکتا ہے کریں، فی الحال پنجپت کی سطح پر بہت سی ریاستوں میں عورتوں کے لئے سیٹیں ریزرو ہوگئی ہیں، ایسی جگہوں پر مسلمانوں کے لئے عورتوں کو امیدوار بنانا ایک مجبوری ہے اگر مسلمان عورتیں ایکشن سے دور رکھی جائیں تو بہت سے شہروں میں مسلمانوں کا اجتماعی نقصان ہوگا، اس لئے عورتیں پنجپت کی سطح پر امیدوار بنیں اور اپنے محرم کے ساتھ آئیں جائیں اب تک جو چیزیں تجربے میں آچکی ہیں وہ یہ ہے کہ ایک چیئر مین عورت اپنے شوہر کو نمائندہ بنا کر نگر پالیسا کی ذمہ داریاں پوری کر سکتی ہیں۔ بعض بعض جگہوں پر جہاں ان کا جانا ضروری ہے وہاں پر اپنے شوہروں کے ساتھ یا اپنے محرم کے ساتھ جا کر اپنی ذمہ داری پوری کر لے گی۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں کسی مسلم اکثریتی شہر میں غیر مسلم عورت چیئر مین ہوگی اور مسلمانوں کو اسے پانچ سال تک جھیلنا پڑے گا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت ساری جگہوں پر نقصان اور طرح طرح کی پریشانیاں اٹھانی پڑ سکتی ہیں تو اس لئے مجبوری کے درجہ میں تو اس کی گنجائش ہے، البتہ جن اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اب ان کے لئے سیٹیں پاس نہیں ہوتی ہیں ان کے لئے ہمیں مخالفت کرنا اور پوری کوشش صرف کرنی چاہئے، جزاک اللہ۔

مفتی مقصود فرقانی صاحب (راپور): ..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا“، اور حدیث پاک میں ہے: ”كَلِمَةٌ رَاعٍ وَكَلِمَةٌ مَسْئُولٍ عَنْ رَعِيَّتِهِ“، ایک دوسری حدیث پاک میں ہے، صحابہ کرامؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ ”متی الساعة؟“ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إِذَا ضَبِيعَتِ الْأَمَانَةُ“، صحابہ نے کہا اس کا کیا مطلب ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”إِذَا وَسَدَ الْأَمْرُ إِلَىٰ غَيْرِ أَهْلِهِ“، مجھے اس قرآنی آیت اور احادیث کی روشنی میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہم علماء کی اس پر کیا ذمہ داری ہوتی ہے اور یہ ایکشن کے وقت جو ہنگامہ آرائی ہوتی ہے علماء کے بیانات بھی آتے ہیں تو آخر میں یہ جو مسائل پیش آتے ہیں کہ کس پارٹی کو حمایت کرنا

چاہئے کس کو دوٹ دینا چاہئے۔ تو اگر ہمارے علماء اس کی ذمہ داری قبول فرمائیں اور جیسا کہ بعض حضرات نے فرمایا کہ رہنمائی کریں تو یہ مسائل بہت کم آسکتے ہیں اور ان کا بہت اچھا نکل سکتا ہے، اس کے بہت سے فوائد ہوں گے، ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو اعتماد حاصل ہوگا دوسرے حکومت میں انشاء اللہ انقلاب آسکتا ہے اور تیسرے یہ کہ عورتوں کے لئے نمائندہ بننے کا موقع کم ملے گا، چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے دوٹ کا جو صحیح مصرف ہے اس کا استعمال ہوگا۔ تو میری اس وقت جو گزارش ہے وہ یہی کہ ہمیں بھی اپنی ذمہ داری کا احساس رہنا چاہئے۔ اب ایک بات جو ہمارے بہت سے مقالہ نگار حضرات نے فرمائی فرض عین کے تعلق سے تو اس میں تو اختلاف آگیا، سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چار فرض عین ہیں جو فرض عین ہیں ان کے تارک کا ٹھکانا جو بیان کیا گیا وہ جہنم ہے اب یہ جو فرض عین ہوگا اس کے تارک کا ٹھکانا اور مقام کیا ہوگا کیڈمی کو اس کا بھی احساس رہنا چاہئے، جزاک اللہ۔

مولانا زاہد صاحب گڑھی سلیم پور:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، نشست اول میں دوٹ کی شرعی حیثیت سے جو بات کہی گئی ہے اس میں عام طور پر لوگوں نے دوٹ کو شہادت قرار دینے کی کوشش کی ہے جب کہ دوسرے لوگوں نے اور بھی بہت سی رائے دی ہیں، ان میں سے ایک رائے مشورہ اور رائے کے تعلق سے بھی آئی ہے کہ دوٹ کی شرعی حیثیت مشورہ اور رائے کی ہے اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ حضرت عمرؓ کا ایک اثر ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ کے اندر ذکر کیا گیا ہے، لا خلافة الا عن مشورۃ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں یہ نص کا درجہ رکھتا ہے اور احناف کے یہاں ضابطہ ہے کہ اگر اصحاب مذہب سے کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے اور کوئی قول صحابی ہے تو اس میں ان اقوال صحابہ میں سے کسی بھی قول کو چھوڑ کر کے اپنا کوئی مستقل قول اختیار کرنا رائے قائم کرنا مذہب حنفی کے مناسب نہیں ہے، موافق نہیں ہے، اس لئے اس سلسلہ میں تو بات قریب طے ہے کہ دوٹ کی شرعی حیثیت رائے اور مشورہ کی ہونی چاہئے، دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ عرض مسئلہ میں جن حضرات کی رائے پیش کی گئی ہے ان میں ایک رائے ہے کہ دوٹ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ گویا شریعت ہماری ایسی ہے کہ دنیا کے بہت سے مسائل اور بہت سی صورتیں اس کے دسترس سے باہر ہے اور وہ اس کے حل سے عاجز ہے اور ناقص ہے، جب کہ قرآن کریم میں ”ونزلنا علیک الكتاب تبييناً لكل شئ“ کے ذریعہ سے جو اس کی کاملیت کو اور اس کی وضاحت کے اتمام کو بیان کیا گیا ہے تو اس کی عظمت اس سے متزلزل ہوتی ہے اور یہ نظر یہ اس آیت کے خلاف ثابت ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ بعض حضرات نے کہا کہ دوٹ کی شرعی حیثیت جن حضرات نے شہادت قرار دی ہے تو اس کی تفسیر شرعی و عرفی کے طور پر کی ہے تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر شہادت عرفی اس کو قرار دیا جائے تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ اور یہ تفسیر جو کی جا رہی ہے اور اس کی حیثیت کی جو بات کی جا رہی ہے اس کا کیا منشا ہے، میں اپنے ذہن سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ ہم اس کے اوپر جو احکام جاری ہونے والے ہیں ان احکام کے لئے ایک جہت متعین کر لیں۔ اور جہت متعین کرنے کے لئے یا تو رائے اور مشورے کی بات آتی ہے یا شہادت کی بات آتی ہے، اور شہادت کا مفہوم ہمیں شرعی نقطہ نظر سے وہی لینا ہوگا جو حضرات فقہاء نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے اور اس کے لئے جو شرائط مقرر کئے گئے ہیں ان سب کا لحاظ کرنا ہوگا، ورنہ وہ سارے شرائط کا عدم قرار دینے جاتے ہیں، تیسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ خلاف شریعت دستور سے وفاداری کے حلف کے مسئلہ میں جن لوگوں نے جواز حلف کی بات کہی ہے اور اس کے استدلال پر صلح حدیبیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح کے جو واقعات ہیں ان سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال بھی محل نظر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ابھی حضرت مولانا عتیق صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے توجہ دلائی ہے کہ دستور ہند کا مطالعہ کرنا چاہئے تو اس سلسلہ میں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر دستور کے اندر کوئی خلاف شرع بات ہے تو اس کی دونو عینیں ہیں یا تو خلاف شرع بات ایسی ہے کہ بالکل شرک کے قریب ہے اور کفر و شرک میں مبتلا کرنے والی چیز ہے اور دوسری یہ عمل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اگر وہ ایسی چیز ہے جو اعتقادی طور پر کفر و شرک کو ثابت کرتی ہو تو اس میں بلا اگر مہلکی اس کی موافقت کرنا اور اس کا حلف اٹھانا قطعاً جائز نہیں ہے اور شریعت میں اس کا کوئی جواز ثابت نہیں ہے الا یہ کہ اگر کوئی ایسی چیز ہے جو شریعت نے بہت سے امور میں معاصی اور گناہ ہونے کے باوجود ان کے اندر کچھ ضروریات ایسی سامنے آئی ہیں کہ جس کی وجہ سے تخفیف کا پہلو اختیار کیا ہے تو اس سلسلہ میں تو گنجائش نکل سکتی ہے لیکن جو پہلو کفر و شرک سے متعلق ہے اس کے جواز کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے، و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین، جزاک اللہ۔

مولانا مغفور باندوی صاحب:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، ایک سوال تو یہ ہے کہ عرض مسئلہ میں بات آئی تھی عورتوں کے امیدوار بننے کے تعلق سے دو رائے

سامنے آئی ایک مطلقاً جواز کی اور ایک استثناء کے ساتھ عدم جواز کی، خصوصاً جب سٹیٹس ریزرو ہوں اس وقت، عرض یہ کرنا ہے کہ یہ جو قول اختیار کیا گیا ہے کہ تخصیص کی صورت میں عورتوں کو امیدوار بننے کی اجازت دی گئی ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے چون کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ مقصود ہے، اس لئے عورتوں کو امیدوار بنایا جائے، اس سے قبل جو ایکشن ہوئے تھے پردھانی کے خصوصاً بندیل کھنڈ کے علاقے میں اس میں تقریباً ساری سٹیٹس ہریجن کی رکھی گئی تھیں تو ایسی صورت میں کیا کریں گے، کہ جب ساری سٹیٹس بیک وارڈ میں چلی جائیں تو جو شکل مسلمان اس صورت میں اختیار کریں وہی صورت اس میں بھی اختیار کی جاسکتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مقاصد شریعت میں سے ایک مقصد عصمت کی حفاظت کا بھی ہے اور روایت موجود ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”من قتل دون عرضہ فهو شہید“ تو جہاں عصمت کی حفاظت اتنی اہم چیز ہے تو محض ایک ظاہری چیز کو اور وقتی چیز کو حاصل کرنے کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

مولانا قمر الزماں ندوی صاحب:..... مجھے دو تین باتیں کہنی ہے پہلی بات یہ کہ بہت سے مقالہ نگار حضرات اور مندوب کو یہ اندیشہ اور خطرہ ہے کہ اگر ووٹ ڈالنے کو ضروری قرار دیا جائے تو بہت سے وہ لوگ جو ووٹ نہیں ڈالتے ہیں ترک واجب کا گنہگار بنانا پڑے گا، میرے خیال میں یہ رائے اور یہ خدشہ اور اندیشہ درست نہیں ہے، اکابر علماء کی تحریروں کو ان کے مضامین کو اگر ہم پڑھتے ہیں تو انہوں نے آج نہیں آج سے بیس پچیس پچاس سال پہلے ووٹ کی اہمیت اور اس کا مقام اور ہندوستان کے حالات میں اس کی کتنی ضرورت ہے اس پر ہمارے اکابر علماء نے بہت تفصیل سے اور کھل کر لکھا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے وضاحت کر دی کہ ”ان الحکمہ الا للہ“۔ آیت کی تفسیر ہم کیا کریں اور اس کی کیا تاویل کریں ہندوستان جیسے حالات میں، اس لئے یہ خدشہ ظاہر کرنا کہ ترک واجب کا گنہگار وہ ہوں گے یہ بات درست نہیں، الحمد للہ آج مسلمان بیدار ہو گئے ہیں اور جتنی بھی ملی تنظیمیں ہیں جمعیت علماء، جماعت اسلامی، مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا ملی کونسل ان کے علماء اور اکابر وہ گھر گھر اور ضلع ضلع جا کر یہ بتا رہے ہیں کہ اس کی اہمیت کیا ہے، ایک بات ہمارے دوست مولانا نصر اللہ ندوی نے کہہ دی ہے اس میں صرف ایک بات کا اضافہ کروں گا کہ ووٹ نہ ڈالنے کا کتنا خطرناک نتیجہ آج نکل رہا ہے کہ ابھی حکومت نے یہ متعین کر دیا کہ جس کو ریزرویشن بنانا ہے وہ بھی اپنی آئی ڈی اور شناختی کارڈ ساتھ میں لائیں تو بہت سے وہ حضرات جو اس چیز کو اہمیت نہیں دیتے ہیں، وہ نہ ایکشن میں ووٹ ڈالتے ہیں اور نہ شناختی کارڈ بنواتے ہیں اور نہ ووٹر لسٹ میں ان کا نام ہوتا ہے اور آج شناختی کارڈ بنوانے کے لئے ووٹر لسٹ میں نام ہونا ضروری ہے یہ ساری چیزیں جو مشکلات آرہے ہیں بہت سے لوگ ریزرویشن نہیں بنوا پارہے ہیں ہمارے مفتیان کرام کو ان پر بھی نظر کرنی ہوگی۔

آخری بات میں عرض کروں گا کہ ہندوستان کے حالات کو بعض علماء مدنی زندگی پر فٹ کر دیتے ہیں اور بعض علماء کی زندگی پر فٹ کر دیتے ہیں۔ میری رائے میں کی زندگی سے ہم لوگ نکل تو چکے ہیں لیکن ابھی مدنی زندگی تک پہنچنے نہیں ہیں، اس لئے اتنے سخت فیصلے صادر کرنا اور اسلام کو بہت مشکل بنا کر پیش کرنا میری رائے میں درست نہیں ہے، ہم سب دعا کریں کہ اللہ ہم کو مدنی زندگی کے قریب نہیں بلکہ وہاں تک پہنچادیں، تاکہ سارے ملی اور شرعی مسائل اسلام کے جاری و نازد ہو جائیں، جزاک اللہ۔

مولانا سیف الرحمن آبادی:..... ایکشن سے مربوط شرعی مسائل پر مقالات اور عرض مسئلہ سامنے آیا اور یہ بہت ہی اہم موضوع ہے، وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے، لیکن ہم اس بات کی طرف توجہ دلا نا چاہتے ہیں کہ اگر ایک بھیٹر علماء کرام کے پاس حاضر ہو کر یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کو فرض عین، جائز، واجب، مستحب نہ بتائیے نہ شہادت، وکالت، شفاعت بتائیے بلکہ یہ بتائیے کہ ہمیں ووٹ کسے دینا ہے، تو اس کے لئے ہمارے پاس کیا حل ہے، تو ہماری رائے یہ ہے کہ فقہ اکیڈمی اور جمعیت علماء اور دیگر تنظیمیں اس سلسلہ میں اپنے عوام کو مطمئن کریں اور اس سلسلہ میں ہم نے ایک فتویٰ اپنے شہر میں دیا تھا اس کو لوگوں نے بہت پسند کیا، ہم نے کہا جب سوال آئے کہ پارٹیوں میں جو سب سے زیادہ ہماری ہمدرد ہو، دشمنی میں سب سے ہلکی ہو، مخالفت میں سب سے کم ہو، ملی مفادات میں زیادہ کام کرنی ہو اس کو ووٹ دینا چاہئے، پارٹی کا نام نہیں لیا گیا، اب رہی بات امیدواروں میں کس کو ووٹ دیا جائے تو امیدواروں میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ اچھوں میں جو سب سے اچھا ہو اور بروں میں جو سب سے کم برا ہو، اس کو ووٹ ڈالا جائے، اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ علماء کے بارے میں یہ احساس نہیں ہو پاتا کہ یہ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، یا کس امیدوار کے حامی ہیں اور برادران وطن کو بھی اور اپنی قوم مسلم کو بھی یہ بات سمجھائی جائے کہ برادری، قوم اور وطنی تعصب کے دباؤ میں ووٹ



نہ ڈالا جائے بلکہ اللہ کے لئے اخلاص کے ساتھ ڈالا جائے، اور اسلامی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ووٹ ڈالا جائے، جہاں ووٹ ڈالا جاتا ہے، وہاں کوئی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ رہتے ہیں، جزاک اللہ۔

مولانا اسد اللہ اسامی صاحب:..... الحمد لله والصلاة والسلام على من لا نبي بعده: مجھے چار باتیں کہنی ہے، مختصر ووٹ دینے کے سلسلہ میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اسے واجب قرار دیا جانا چاہئے، بعض مقالہ نگاروں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حیثیت کچھ بھی ہو لیکن ووٹ دینے کو واجب قرار دیا جائے، یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تک ووٹ کی شرعی حیثیت تسلیم نہ کر لی جائے تب تک اس پر مرتب ہونے والی چیز یعنی ووٹ ڈالنے کو واجب کیسے قرار دیا جاسکتا ہے، مقالہ نگاروں نے جو ووٹ کی حیثیت بیان کی، اس میں شہادت، شاید شہادت کو چھوڑ کر کسی میں یہ پہلو نہیں کہ اسے واجب قرار دیا جاسکے اور شہادت کا انکار کرنے والوں نے مقالہ میں جو دلائل پیش کئے ہیں اب تک کے مناقشے کے دوران ان دلائل کا جواب سامنے نہیں آیا، میرے خیال میں یہ مشکل بھی ہے کہ شہادت کو پورے طور پر ووٹ پر منطبق کیا جائے، اس لئے اتنی دیر تک بحث و مناقشے کے دوران اس کا کوئی جواب نہیں آیا، چونکہ برادران قاسمی کا طرہ امتیاز رہا ہے کہ وہ انگوں کے اقوال سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر متضاد اقوال ہیں، وہ بھی سامنے رکھتے ہیں، اس عادت اور اس طرہ امتیاز کے پیش نظر میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے سب سے اولین مفتی، مفتی اعظم کا ایک فتویٰ جو فتاویٰ دارالعلوم کے سترہویں جلد میں چھپا ہوا ہے اس کی عبارت نقل کرتا ہوں، اس سے ہو سکے تجویز میں کچھ روشنی مل سکے، حضرت نے ایک فتویٰ کے جواب میں لکھا ہے، مذکورہ کا وٹسنگ کی مہمبری میں ووٹ دینا اور ووٹ دلانے میں کوشش کرنا شرعاً نہ فرض ہے نہ واجب ہے، بلکہ بسا اوقات متصف بحرمت و کراہت ہوتی ہے، مجھے امید ہے تجویز میں اس جزء کو بھی سامنے رکھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہنی تھی کہ دوسری پارٹی میں شمولیت کے سلسلہ میں چھٹے سوال میں ایک جملہ آیا کہ کبھی ضمیر کے خلاف ووٹ دینا پڑتا ہے؛ یہ ایک مبہم تعبیر ہے، ضمیر کے خلاف سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ بھی داخل ہے کہ چاہے شریعت کے خلاف کرنا پڑتا ہے، ظاہر ہے اگر داخل بھی ہے تو اس سلسلہ میں جواز کے قائلین نے جو دلائل پیش کئے ہیں، ”لا یكلف اللہ نفساً الا وسعها“ یا ملی مفادات وغیرہ میرے خیال میں ہر دلیل نظر ثانی کے محتاج ہیں، اس میں سے کوئی ایسی دلیل نہیں سمجھ میں آرہی ہے کہ جس میں یہ ہو کہ اس کو برداشت کر کے شریعت کے نصوص اور قرآن و حدیث کے نصوص کے خلاف ووٹ دیا جائے۔ آخری بات خواتین سے متعلق کہنی ہے کہ خواتین کے سلسلہ میں ہم سب کو سو فیصد پتہ ہے کہ ایکشن میں کھڑی ہونے سے لے کر امیدوار کے آخری مدت تک جو کچھ مرحلہ ہوتا ہے، جو مخصوص ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے، پردہ اس کی رعایت ہو ہی نہیں پاتی تو ملی مفاد کچھ بھی ہو، لیکن قرآن کریم کے صریح حکم کی خلاف ورزی جو بدیہی ہے، اس کو نظر انداز کر کے اگر مگر لگا کر جواب دینا کہ اگر ایسا ہو تو خواتین کے لئے ایکشن میں امیدوار بننا جائز ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، بلکہ حضرت مولانا نظام الدین صاحب نے کل کی نشست میں جو بات کہی تھی اگر وہ اپنائی جائے کہ یہ سب مل ہے اور خواتین کے ریزرویشن دینے کا مطلب یہ ہے کہ گاؤں کی تمام عورتوں کو باہر کرنا، اس لئے کہ ایک امیدوار ہوگی تو ان کے ساتھ دسیوں خواتین ہوں گی تو اگر فقہ اکیڈمی والے مسلم پرسنل لا بورڈ سے درخواست کریں، اسی سلسلہ میں ابتداء کوشش تو کر لیں کہ ریزرویشن کا سلسلہ بند ہو، اگر کوشش نہ کریں تو لوگ اس کو حرام سمجھ کر کریں تو وہ زیادہ اہوں ہے چہ جائیکہ لوگ حرام کو حلال سمجھ کر کریں، اتنی بات مجھے عرض کرنی تھی، جزاک اللہ۔

مولانا جسیم الدین قاسمی (مہمبئی):..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، مستقل مسلم جماعت کی تشکیل کے سلسلہ میں بہت سی رائے آئی ان میں مفتی تنظیم عالم قاسمی مفتی عبدالرشید قاسمی وغیرہ کی جو رائے آئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے وہاں پریسکولر پارٹی کا تعاون کیا جائے جب کہ ایسے علاقے میں جہاں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے، مثلاً آسام کے اندر تیس فیصد ہے تو ایسے علاقوں میں مسلمانوں کی مستقل پارٹی ہونی چاہئے، نیز عورتوں کے ریزرویشن کے تعلق سے یہ کہنا ہے جیسا کہ حضرت مولانا زید صاحب نے فرمایا کہ حضرت تھانوی کی رائے مناسب بلکہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ اس کو عارضی حکم قرار دیا جائے اور عورتوں کو گنجائش دی جائے جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحب نے فرمایا کہ بہار کے اندر ریزرویشن کی وجہ سے مسلمانوں نے پچاس سیٹیں کھودیں، ایکشن کے اندر، اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ رائے بہت مناسب ہے، جزاک اللہ۔

مولانا رفاقت حسین قاسمی:..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، بس ایک منٹ کا وقت دیا گیا ہے، بہت مختصر وقت ہے صرف میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں، حکم عارضی اور حکم اصلی کی بات آئی ہے تو اگرچہ فقہاء کی عبارتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ حکم عارضی کی مدت فلاں ہے، لیکن جب یہ حکم عارضی ہے اور اسلامی مملکت بھی اصل ہے جس کی یہاں بات آگئی، اور الحمد للہ بہت ساری باتیں سامنے آگئی، میری رائے یہ ہے کہ ان تمام مشقوں میں جو جواز عدم جواز اور وجوب کی بات آرہی ہے ان سب میں صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ نیت یہ رکھی جائے کہ ہم اسلامی مملکت قائم ہو رہی ہے، ان سب میں صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ نیت یہ رکھی جائے کہ ہم اسلامی مملکت قائم کریں گے ورنہ تو کتاب الجہاد اور کتاب الحدود تو گویا کہ بالکل ہی معطل ہو جائیں گے، جب تک عملی طور پر اس سلسلہ میں سنجیدہ کوشش نہ کی جائے، باقاعدہ تجویز میں یہ بات علماء کی مجلس میں طے نہ کی جائے کہ اس پر سنجیدہ عملی سرگرمیاں بھی شروع کی جائیں گی، اس وقت تک ان میں سے کسی بھی چیز کا جواز اس حقیر کی رائے میں سمجھ میں نہیں آتا، جزاک اللہ۔

مفتی حبیب اللہ صاحب (راجستھان):..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، جمہوری ملک میں طاقت و قوت و دُلوں پر ہوتی ہے، اس لئے مسلمانوں کو اپنی الگ پارٹی بنا کر طاقت کا اظہار کرنا چاہئے، اور دباؤ بنا کر مسلمانوں کے مسائل حل کرائیں، ہماری فیصد دیکھ کر کے وہ لوگ ڈرتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں، آئندہ ہم لوگوں کو ووٹ دیں اور جمہوری ملک کے اندر یہی طریقہ ہے دباؤ بنا کر مسائل حل کرانے کا، جزاک اللہ۔  
صدارتی کلمات:

مفتی سلمان منصور پوری صاحب (شاہی مراد آباد):..... بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن سيدنا محمداً عبده ورسوله، صلى الله تبارك وتعالى عليه وعلى آله وأصحابه وذرياتہ أجمعين، أما بعد، فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم، ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب، صدق الله العلي العظيم۔  
حضرات مفتیان عظام، گرامی قدر علماء کرام!

اس وقت ہم لوگ ایک نہایت حساس اور نازک ترین موضوع پر بحث میں اور گفتگو میں حصہ لے رہے ہیں، یہ موضوع ایسا ہے جیسا کہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا عتیق احمد صاحب دامت برکاتہم نے بھی توجہ دلائی، کہ ذرا سا سوشہ بھی اگر ہمارے مخالفوں کو مل گیا تو وہ آسمان سر پر اٹھا سکتے ہیں، ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اگرچہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ اجلاس ایک بند جگہ پر ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں یہ بند نہیں ہے اور اس کا ہمیں بار بار تجربہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بات دیواروں تک محدود ہے لیکن حقیقت میں وہ ایسی جگہوں تک پہنچ جاتی ہے جہاں ہم نہیں پہنچنا چاہتے، اگرچہ ہماری نیت بالکل صاف ہے، جتنے بھی یہ حضرات یہاں تشریف فرما ہیں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جس کا ملک کے بارے میں، ملک کے نظام کے بارے میں کوئی غلط رخ دینے کا ارادہ ہو، ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ہماری یہ بحث ہے، یہ خالص علمی اور فقہی روشنی میں ہو رہی ہے، اور ابھی تک بحث کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا کہ ہم نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو، اس لئے اس گفتگو سے کسی فرد کے کسی بات سے اس سیمینار کو غلط رخ نہیں دینا چاہئے، ہمارا یہ ملک جمہوری اعتبار سے پوری دنیا میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کو جمہوری بنوانے میں ہمارے بڑوں کا ہمارے اکابر کا بڑا کردار ہے، جب تک یہ ملک باقی رہے گا ان بزرگوں کے احسانات کا کبھی بھی ہم بدلہ ادا نہیں کر سکتے، خاص طور پر جس وقت یہ نظر آنے لگا کہ اب ملک سے انگریز جا کر رہے گا، اور انگریزی حکومت کی طرف سے یہ پلاننگ ہوئی کہ بھائی جب ہم چھوڑ کر جائیں گے تو اقتدار کا خلا کون پُر کرے گا، اقتدار تو رہنا چاہئے، تو لندن سے مشن آئے تھے، اور وہ یہاں کے سیاسی پارٹیوں اور سربراہوں سے مذاکرات کرتے تھے کہ بھائی ہم جائیں گے تو کیا ہوگا، تو اس وقت کے اکابر نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسوں میں ایک تجویز دی تھی جس کو مدنی فارمولہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور وہ تجویز یہ تھی کہ یہ ملک جیسا پہلے سے متحد ہے متحد رہے اور جس صوبے کے اندر جس آبادی کو اکثریت حاصل ہو وہاں اس کی حکومت ہو، اور مرکز میں ایک قومی اور وفاقی حکومت کا ایک ڈھانچہ بنے جس میں ۴۹ فیصد ہندو اور ۴۵ فیصد مسلمان اور ۱۰ فیصد ساری بقیہ

اقلیتیں رہیں، یہ مدنی فارمولہ پیش کیا گیا اور کانگریس کسی حد تک اسے ماننے پر تیار ہو چکی تھی، لیکن وہ جماعت جو اپنا الگ ملک بنانے کا مطالبہ کر رہی تھی اس نے اس کی مخالفت اور شدت سے مخالفت کی اور کانگریس میں جو منافقین تھے اور ایک لابی تھی منافقین کی جو آج بھی موجود ہے اس نے بھی اس کی مخالفت کی اور یہ فارمولہ تسلیم نہیں کیا گیا، اور ہماری بد قسمتی، تقدیر کا فیصلہ کہ ملک بنا تین حصوں میں اور جب ملک بٹ گیا تو یہاں کی جو فرقہ پرست لابی تھی اس نے یہ کہا کہ صاحب آپ نے اپنی قربانیوں کا حق لے لیا اب آپ چلے گئے، اب جس طرح آپ نے اپنا ملک بنایا ہے یہ ہمارا ملک ہے ہم جس طرح چاہیں اس میں دستور بنائیں، حکومت چلائیں، قوانین بنائیں، اس میں آپ کا کچھ حصہ نہیں ہونا چاہئے، ایک بڑی لابی تھی، لیکن ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو روشن فرمائے اور نور فرمائے انہوں نے ان کانگریسی لیڈروں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر یہ کہا کہ کیا ابھی سے نظریں بدلنے لگے، کون تھا جیلوں میں جو تمہارے ساتھ تھا، کون تھا جو سڑکوں پر گولیاں کھا رہا تھا، اور جو لوگ گئے ہیں وہ ہم نہیں تھے ہم تو یہیں تھے، یہیں رہیں گے، یہیں ہمارے رہنے کا ارادہ ہے، تم ان کی بات مت کرو ہمارے سامنے، یہ ملک ہم سے ہے اور ہم اس ملک سے ہیں، یہ جب دم دار انداز میں بات کی گئی حضرت مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر پوری قوت کے ساتھ انہوں نے مخالفت کی تقسیم کی، اور یہ کہا کہ اگر آپ نے اسے منظوری دی تو آپ اپنی تاریخ کے اوپر کا لک پوت کر انہیں گے، حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ودیگر اس وقت کے اکابر نے یہ کہا کہ یہ ملک ہمارا ہے اور یہاں پر ایسے قوانین بنانے پڑیں گے کہ ہمیں پوری طرح مذہبی حقوق حاصل ہوں یہ کتاب ابھی آپ کے سامنے آئی ہے نفاذ شریعت کے بارے میں، حضرت مولانا عتیق احمد صاحب دامت برکاتہم نے لکھی ہے اس میں حضرت مدنی کا ایک مقولہ شروع کے صفحات میں نقل کیا گیا ہے کہ میرا یہ مطالبہ کے یہاں قاضی قائم کیا جائے، اور یہ فرمایا کہ اگر انگریز نہیں کرے گا تو جب ہمیں آزادی ملے گی تو ہم اس کی کوشش کریں گے، جہاں تک ہو سکے، وہ دستور بنا اور اس دستور میں مذہبی حقوق دیئے گئے، دستور کے کئی حصے ہیں، کچھ حصہ تو وہ ہے جو پارلیمنٹ بدل سکتی ہے لیکن کچھ بنیادی دفعات ہیں ایسی بنیادی دفعات کہ آج اگر پارلیمنٹ سو فیصدی بھی آکر کوئی پارٹی بدلنا چاہے تو ان دفعات کو بدل نہیں سکتی ہے، ان میں سے ہمارے مذہبی حق کی آزادی بھی ان ہی دفعات میں شامل ہے اور اس ملک کی بنیاد جو سیکولر ازم کے اوپر رکھی گئی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بددینی یہاں پھیلا دیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس اسٹیٹ کا اس حکومت کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہوگا، حضرت مجاہد ملت سے کسی نے پوچھا یہ عجیب بات ہے آپ عالم ہیں، جمعیت علماء کے سکریٹری جنرل ہیں اور آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم سیکولر پارٹی کا ساتھ دیتے ہیں، حضرت نے فرمایا مسکرا کر بھائی اللہ کے بندو یہاں سیکولرزم دنیا میں ایک نئی شکل میں آیا ہے، اسلام ازم کے مقابلہ میں نہیں ہے بندو ازم کے مقابلہ میں ہے، اس لئے ہم نے اسے قبول کیا ہے، اب اس کی وجہ سے یہ مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں جن کو آج کے سوالنامے میں اٹھایا گیا ہے، یہ ایسے مسائل ہیں کہ اگر ان اصولوں پر ان کو منطبق کرنے کی کوشش کریں گے جو شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ الگ تھلگ کر دیئے جائیں گے، آپ کو یہاں وہ اصول اپنانا پڑے گا جو فقہاء نے ایسے موقعوں کے لئے وضع فرمایا ہے کہ بھائی دیکھ لو مفسدہ کس میں زیادہ ہے جس میں کم مفسدہ ہو اسے اختیار کر لو، اور میں نے جو اپنی رائے یہاں بھیجی تھی، تاخیر سے بھیجی، اس لئے وہ اس میں شامل نہیں ہو سکی، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تجویز اس انداز میں آنی چاہئے کہ ہر ہر جزئیہ کا قطعی حکم واضح نہ کیا جائے، کیونکہ پھر آپ کے لئے مشکلات ہوں گی، تبدیلی کرنی پڑے گی، بلکہ ایک ایسی مجمل بات جامع بات اور ایسی مصلحت پر مبنی عبارت لائی جائے جس کی بنیاد پر کسی کو انگریزوں کے لئے موقع نہ ملے، اور ہمارے جو سیاسی مقاصد ہیں اس ملک کے ملی اجتماعی ان میں بھی کوئی رکاوٹ نہ آئے، اس کو تجویز میں پیش نظر رکھا جانا چاہئے، مناقشے کے اندر کئی اہم موضوعات پر آپ حضرات نے گفتگو کی، مجھے ایک ہلکے سے اشارہ میں یہ بات عرض کرنی ہے کہ الگ مسلم جماعت کی بات کی جاتی ہے پھر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اسلام یا مسلم نام کے بجائے سیکولر یا کسی مشترک نام سے جماعت بنا لینی چاہئے، یہ ایسا موضوع ہے جو اب سے نہیں بیسیوں سال سے ہمارے درمیان زیر بحث ہے اور میں کہتا ہوں کہ زیر بحث نہیں ہے بلکہ زیر تجربہ بھی ہے بلکہ اور آگے بڑھ کر تجربے سے بھی کچھ آگے ہی بڑھ چکے ہیں، اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس ہندوستان کے اندر مسلم آبادی زیادہ تر ایسی جگہوں میں رہتی ہے جو گاؤں دیہات کا علاقہ ہے، ہم امر وہ میں بیٹھے ہیں، حیدرآباد والے حیدرآباد میں بیٹھے ہیں، مرادآباد والے مرادآباد میں ہیں تو وہاں زندہ باد مردہ باد بہت نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم بس زمین ادھر سے ادھر کر دیں گے، لیکن ہمیں یہ یاد نہیں رہتا کہ ہمارے مسلم طبقہ کی بہت بڑی آبادی گاؤں دیہات میں رہتی ہے جہاں سو گھر غیر کے ہیں تو دس ہمارے